تذکیر القرآن

سادہ اسلوب میں قرآن مجید کے تذکیری پہلو
اور گہرے معانی کو سمجھنے کے لیے ایک آسان تفسیر

مولانا وحید الدّین خاں

بسم الله الرحمن الرحيم

تذکیر القرآن

مولانا وحید الدین خاں

Goodword

This book is copyright free

First published by Goodword Books 1985
Reprinted 2023
ISBN 978-93-91969-29-5

English version:
Quran Commentary (2011)

Arabic version:
Tazkirul Quran (2021)

Thai version:
Tazkirul Quran (2021)

Sindhi version:
Tazkirul Quran (2020)

Hindi version:
Tazkirul Quran (2008)

Goodword Books
A-21, Sector 4, NOIDA-201301, Delhi-NCR, India
Tel. +91 120 4131448, Mob. +91-8588822672
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

CPS International
Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Mob. +91-9999944119
email: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Center for Peace and Spirituality, USA
2665 Byberry Road, Bensalem, PA 19020, USA
Mob. 617-960-7156
email: kkaleemuddin@gmail.com
www.cpsusa.net

فہرست

	دیباچہ تذکیر القرآن	7
1	الفاتحہ	17
2	البقرہ	18
3	آلِ عمران	127
4	النساء	185
5	المائدہ	250
6	الانعام	305
7	الاعراف	368
8	الانفال	439
9	التوبہ	468
10	یونس	521
11	ہود	564
12	یوسف	604
13	الرعد	635
14	ابراہیم	655
15	الحجر	674
16	النحل	691
17	بنی اسرائیل	733
18	الکہف	772
19	مریم	801
20	طٰہٰ	820
21	الانبیاء	847
22	الحج	871
23	المومنون	896
24	النور	917
25	الفرقان	940
26	الشعراء	956
27	النمل	980
28	القصص	998
29	العنکبوت	1020
30	الرّوم	1037
31	لقمان	1050
32	السجدہ	1058
33	الاحزاب	1064
34	سبا	1086
35	فاطر	1100
36	یٰس	1113
37	الصّٰفّٰت	1125
38	ص	1141
39	الزّمر	1155
40	المؤمن	1175
41	حٰم السجدہ	1195
42	الشوریٰ	1209
43	الزّخرف	1225
44	الدّخان	1240
45	الجاثیہ	1247
46	الاحقاف	1256
47	محمد	1267
48	الفتح	1278
49	الحجرات	1288
50	ق	1294
51	الذّاریات	1300
52	الطور	1308
53	النجم	1313
54	القمر	1318
55	الرّحمٰن	1324

56	الواقعہ	1329
57	الحدید	1335
58	المجادلہ	1343
59	الحشر	1349
60	الممتحنہ	1355
61	الصّف	1360
62	الجمعہ	1364
63	المنافقون	1466
64	التغابن	1369
65	الطّلاق	1372
66	التحریم	1376
67	الملک	1380
68	القلم	1384
69	الحاقّہ	1389
70	المعارج	1393
71	نوح	1397
72	الجنّ	1400
73	المزمّل	1405
74	المدّثّر	1409
75	القیامہ	1415
76	الدّہر	1418
77	المرسلات	1424
78	النبا	1427
79	النّازعات	1430
80	عبس	1433
81	التکویر	1436
82	الانفطار	1438
83	المطفّفین	1440
84	الانشقاق	1443
85	البروج	1445
86	الطارق	1447
87	الأعلیٰ	1448
88	الغاشیۃ	1450
89	الفجر	1451
90	البلد	1455
91	الشّمس	1456
92	اللیل	1458
93	الضحیٰ	1461
94	الانشراح	1463
95	التین	1464
96	العلق	1466
97	القدر	1468
98	البیّنہ	1469
99	الزلزال	1471
100	العٰدیٰت	1473
101	القارعہ	1474
102	التکاثر	1475
103	العصر	1477
104	الھمزہ	1478
105	الفیل	1479
106	قریش	1480
107	الماعون	1481
108	الکوثر	1482
109	الکافرون	1483
110	النصر	1485
111	اللہب	1486
112	الاخلاص	1487
113	الفلق	1488
114	النّاس	1489

دیباچہ تذکیر القرآن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن اگرچہ ایک اعلیٰ ترین علمی کتاب ہے۔ اس میں فطری حدود کے اندر علم و عقل کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ مگر قرآن میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے معروف علمی اور فنی انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ فنی آداب اور علمی تفصیلات کو چھوڑ کر اصل بات کو مؤثر دعوتی اسلوب میں بیان کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا مقصد علمی مطالعہ پیش کرنا نہیں ہے، اس کا مقصد تذکیر و نصیحت ہے اور تذکیر و نصیحت کے لیے ہمیشہ سادہ اسلوب کارآمد ہوتا ہے، نہ کہ فنی اسلوب۔

تاہم یہ ایک طالب علمانہ ضرورت ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک آدمی قرآن کے بیانات کی علمی تفصیلات اور اس کے فنی پہلوؤں کو جاننا چاہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لیے کیا انداز اختیار کیا جائے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس کے اپنے سادہ دعوتی اسلوب میں کی جائے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تفسیر میں نصیحت اور تذکیر کی فضا باقی رہے گی، جو قرآن کا اصل مقصود ہے۔ مگر ایسی صورت میں خالص علمی تقاضوں کی رعایت نہ ہو سکے گی۔ دوسری طرف اگر علمی و فنی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفصل تفسیر لکھی جائے تو بعض خاص طبیعتوں کو وہ پسند آسکتی ہے، مگر عام لوگوں کے لیے وہ ایک خشک دستاویز بن کر رہ جائے گی۔ مزید یہ کہ وہ قرآن کے اصل مقصد — تذکیر و نصیحت کو مجروح کرنے کی قیمت پر ہوگا۔

اس مسئلہ کا ایک سادہ حل یہ ہے کہ تفسیر اور معلومات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ قرآن کے ساتھ جو تفسیر شائع کی جائے وہ خود تو نصیحت اور تذکیر کے انداز میں ہو۔ اس کے بعد اس سے الگ ایک مستقل کتاب قاموس القرآن یا قرآنی انسائیکلو پیڈیا کے طور پر مرتب کر کے شائع کی جائے۔ اس دوسری کتاب میں وہ تمام فنی بحثیں اور علمی اور تاریخی معلومات ہوں جو قرآنی حوالوں کو تفصیلی انداز میں سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق آیات کے ذیل میں جو تفسیر لکھی جائے اس میں تو

آنجناب کی زندگی کے صرف قابل عبرت پہلوؤں کی وضاحت ہو جن کی طرف قرآن میں اشارے کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے بارے میں جو تاریخی اور اثریاتی معلومات ہیں ان کو قاموس القرآن میں جمع کر دیا جائے جن کو آدمی لفظ ''ابراہیم'' کے تحت دیکھ سکے۔ اسی طرح نحوی، فقہی، کلامی اور طبیعیاتی مسائل کی تفصیلات بھی قرآن کی انسائیکلو پیڈیا میں درج ہوں، نہ کہ قرآن کی تفسیر میں۔

تذکیر القرآن اسی نہج پر قرآن کی ایک خدمت ہے۔ تذکیر القرآن کو ہم نے اصل مطالبِ قرآن کی یاد دہانی تک محدود رکھا ہے۔ یہ انداز عین وہی ہے جو خود قرآن نے اختیار کیا ہے۔ قرآن میں طبیعیات اور فلکیات کے حوالے ہیں، مگر ان کی تفصیلات کو خدا نے چھوڑ دیا کہ بعد کے زمانے کے اہل علم انھیں دریافت کر کے ان کو مدوّن کریں۔ قرآن میں قدیم شخصیتوں کا ذکر ہے۔ مگر خدا نے یہ کام آئندہ آنے والے ماہرین اثریات (archaeologists) کے لیے باقی رکھا کہ وہ ان کی تحقیق کریں اور ان کی تاریخی تفصیلات سے دنیا کو آگاہ کریں۔ خدا قرآن میں خود ان تمام واقعات کو شامل کر سکتا تھا۔ مگر وہ صرف اس قیمت پر ہوتا کہ قرآن میں عبرت اور نصیحت کی فضا ختم ہو جائے۔ چنانچہ خدا نے ہر چیز سے باخبر ہونے کے باوجود، سارا زور صرف نصیحت کی باتوں پر دیا اور بقیہ تفصیلات کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا۔

قرآن میں ایک طرف معلومات کی نوعیت کی بے شمار تفصیلی باتوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف بنیادی نصیحت والی باتوں کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ قرآن میں مضامین کی تکرار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ لوگ اس کو معلومات کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھ لیں۔ قرآن خدا اور آخرت کی باتوں کو لوگوں کی روح کی غذا بنانا چاہتا ہے۔ کسی چیز کو آدمی معلوماتی طور پر پڑھے تو اس کی تکرار اس کو ناگوار ہو گی۔ مگر جو چیز آدمی کی زندگی میں روح کی غذا بن کر داخل ہو جائے اس کی ہر تکرار آدمی کو نئی لذت دیتی ہے۔ جہاں لذت ہو وہاں تکرار کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن میں یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا تا کہ وہ لوگ چھٹ کر الگ ہو جائیں جو معلومات اور تکرار کی اصطلاحوں میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ انسان چن لیے جائیں جن کے لیے قرآنی حقیقتیں لذت روح کا درجہ حاصل کر چکی ہوں۔

قرآن ایک دعوتی کتاب

قرآن عام طرز کی علمی تصنیف نہیں، وہ ایک دعوتی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایک خاص قوم کے اندر اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا اور اس کو اپنے

پیغام کی پیغام بری پر مامور فرمایا۔ اس پیغمبر نے اپنے ماحول میں یہ کام شروع کیا اور اسی کے ساتھ قرآن کا تھوڑا تھوڑا حصہ حسب ضرورت اس کے اوپر اترتا رہا، یہاں تک کہ ۲۳ سال میں پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے ساتھ قرآن کی بھی تکمیل ہو گئی۔

قرآن اگرچہ خدا کی ابدی رہنمائی ہے مگر مذکورہ ترتیب نے اسی کے ساتھ اس کو تاریخی کتاب بھی بنا دیا ہے۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ابدی رہنمائی کو تاریخ کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ایسی حالت میں بعد کے زمانے میں قرآن کی تفسیر کرنا آدمی کو ایک نئے مسئلہ سے دوچار کر دیتا ہے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس ابتدائی پس منظر کی روشنی میں کی جائے جس میں قرآن کے احکام اترے تھے تو قرآن قدیم زمانہ کی ایک تاریخی کتاب معلوم ہوگی۔ اس کے برعکس، قرآن کی تفسیر اگر اس کی ابدی اہمیت کی بنیاد پر کی جائے تو اس کا تاریخی پہلو مجروح ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے بعد کے زمانہ میں قرآن کی تفسیر کرنا ایک ایسا کام بن گیا ہے، جس میں دوگونہ پہلوؤں کو نبھانا ضروری ہو۔

دوسرے الفاظ میں، قرآن کی ابدی رہنمائی کو سمجھنے کے لیے ایک اہم بات یہ ہے کہ قرآن اکثر وقتی ریفرنس میں ابدی بات کہتا ہے۔ مثلاً مدینہ کے ایک گھریلو اختلاف کے سلسلہ میں ایک آیت نازل ہوئی، جس کا ایک جزء یہ تھا: وَالصُّلْحُ خَيْر (4:128)۔ یعنی، صلح بہتر ہے۔ ابتدائی نزول کے اعتبار سے یہ ایک وقتی اور مخصوص ریفرنس ہے۔ مگر وسیع تر انطباق (universal application) کے اعتبار سے وہ ایک ابدی تعلیم ہے، اور زندگی کے ہر میدان کے لیے ہے۔ یعنی زندگی کے ہر میدان میں صلح بہتر ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ نکتہ جاننا ضروری ہے۔

تذکیر القرآن میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے۔ اس میں تاریخی پس منظر بھی مختصر طور پر دکھایا گیا ہے مگر اس طرح نہیں کہ قرآن ایک تاریخی کتاب معلوم ہونے لگے، اسی طرح اس میں قرآنی تعلیمات کو آج کے حالات کے مطابق کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے، مگر ایسا نہیں کہ قرآن اپنی تاریخی بنیاد سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔

قرآن کا مقصدِ نزول

قرآن کس لیے اتارا گیا ہے۔ ایک لفظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے بارے میں خدا کی اسکیم کو بتانے کے لیے۔ انسان کو خدا نے ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ موجودہ محدود دنیا میں پچاس سال یا سو سال گزار کر اس کو آخرت کی دنیا میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں اس کو مستقل طور پر رہنا ہے۔ موجودہ دنیا

عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت کی دنیا اس کا انجام پانے کی جگہ۔ آج کی زندگی میں آدمی جیسا عمل کرے گا اسی کے مطابق وہ اپنی اگلی زندگی میں اچھا یا برا بدلہ پائے گا۔ کوئی اپنی نیک کرداری کے نتیجہ میں ابدی طور پر جنت میں جائے گا اور کوئی اپنی بد کرداری کی وجہ سے ابدی طور پر جہنم میں۔ قرآن اس لیے اتارا گیا کہ وہ اس سنگین مسئلہ سے آدمی کو باخبر کرے اور اس کو بتائے کہ اگلی زندگی میں بُرے انجام سے بچنے کے لیے اسے اپنی موجودہ زندگی میں کیا کرنا چاہیے۔

خدا نے انسان کو فہم و شعور کے اعتبار سے اسی صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے جو اس کو انسانوں سے مطلوب ہے۔ پھر اس نے گردوپیش کی پوری کائنات کو مطلوبہ درست کردار کا عملی مظاہرہ بنا دیا ہے۔ تاہم یہ سب کچھ خاموش زبان میں ہے۔ انسانی فطرت احساسات کی صورت میں اپنا کام کرتی ہے اور فطرت کے مظاہر تمثیل کی صورت میں۔ قرآن اس لیے آیا کہ فطرت اور کائنات میں جو کچھ خاموش زبان میں موجود ہے وہ نطق کی زبان میں اس کا اعلان کر دے تاکہ کسی کے لیے اس کا سمجھنا مشکل نہ رہے۔ فطرت اور کائنات اگر آدمی کی خاموش رہنما ہیں تو قرآن ایک ناطق رہنما۔

مزید یہ کہ قرآن ایک ایسے پیغمبر پر اتارا گیا، جو غلبہ کا پیغمبر تھا۔ پچھلے انبیاء صرف داعی کی حیثیت سے بھیجے گئے۔ ان کا کام اس وقت ختم ہو جاتا تھا جب کہ وہ اپنی مخاطب قوم کو خدا کی مرضی سے پوری طرح آگاہ کر دیں۔ انھوں نے اپنی مخاطب قوموں کی زبان میں کلام کیا۔ مگر انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے ان کی بات نہیں مانی۔ اس طرح پچھلے زمانوں میں خدا کی مرضی انسان کی زندگی میں عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ پیغمبر آخر الزماں کو خدا نے غلبہ کی نسبت دی۔ یعنی آپ کے لیے فیصلہ کر دیا کہ آپ کا مشن صرف پیغام رسانی پر ختم نہ ہوگا بلکہ خدا کی خصوصی مدد سے اس کو عملی واقعہ بننے تک پہنچایا جائے گا۔ اس خدائی فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے دین کے حق میں ہمیشہ کے لیے ایک مزید تائیدی بنیاد فراہم ہو گئی۔ یعنی مذکورہ بالا اہتمام کے علاوہ انسان کی حقیقی زندگی میں خدا کی مرضی کا ایک کامل عملی نمونہ۔

پچھلے زمانے میں خدا کے جتنے پیغمبر آئے وہ سب اسی دعوت کو لے کر آئے جس کو لے کر پیغمبر آخر الزماں کو بھیجا گیا تھا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ عام طور پر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان کے پیغام کو نہ مانا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کو اپنی دنیوی مصلحتوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کو غلط طور پر یہ اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے خدا کے سچے دین کو پکڑا تو ان کی بنی بنائی دنیا تباہ ہو جائے گی۔ قرآن کی تاریخ اس اندیشہ کی عملی تردید ہے۔ قرآن کے ذریعہ جو تحریک چلائی گئی اس کو خدا نے اپنی خصوصی نصرت کے ذریعہ دعوت

سے شروع کرکے واقعہ بننے کے مرحلہ تک پہنچایا اور اس کے عملی نتائج کو دیا۔ اس طرح خدا کے دین کی ایک مستقل تاریخ وجود میں آ گئی۔ اب قیامت تک لوگ حقیقی تاریخ کی زبان میں دیکھ سکتے ہیں کہ خدا کے سچے دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کس طرح زمین و آسمان کی تمام برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

پھر اسی کے ذریعہ قرآن کی مستقل حفاظت کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ ایک بڑے جغرافیہ میں اہل اسلام کا اقتدار اور وہاں اسلامی تہذیب و تمدن کا غلبہ اس بات کی ضمانت بن گیا کہ قرآن کو ایسا حفاظتی ماحول مل جائے جہاں کوئی اس میں کسی قسم کی تبدیلی پر قادر نہ ہو سکے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے قرآن کا چوکیدار بنا ہوا ہے۔

ربانی دسترخوان

قرآن کو کچھ لوگ فضائل کی کتاب سمجھتے ہیں، کچھ لوگ مسائل کی کتاب اور کچھ لوگ سیاست کی کتاب۔ تینوں باتوں میں جزئی صداقت ہے مگر ان میں سے کوئی بھی قرآن کی صحیح تعبیر نہیں۔

قرآن کو فضائل کی کتاب ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی آیتوں اور سورتوں میں طلسماتی برکتیں چھپی ہوئی ہیں، اور قرآن کے محض الفاظ کو دہرا لینا ان برکتوں کے حصول کے لیے کافی ہے۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو قرآن کی وہ تمام آیتیں بے معنی ہو جاتی ہیں، جن میں آدمی کو غور کرنے پر اُبھارا گیا ہے۔ قرآن ایسی آیتوں سے بھرا ہوا ہے جو آدمی کو ترغیب دیتی ہیں کہ وہ الفاظ سے گزر کر معانی کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کرے۔ وہ قرآن میں تدبر کرے اور قرآنی زاویۂ نگاہ سے اپنے آپ کو اور کائنات کو دیکھے۔ ان تعلیمات کی روشنی میں دیکھیے تو قرآن کا مقصد ایسے انسان پیدا کرنا ہے جن کی فکری قوتیں بیدار ہوں، جو قرآن سے ذہنی غذا حاصل کریں اور عبرت کی نگاہ کے ساتھ دنیا میں زندگی گزاریں۔ ایسی حالت میں قرآن کو فضائل کی کتاب کہنا قرآن کی تصغیر (underestimation) ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ذہنوں کو کھولنے والی کتاب نہیں۔ وہ صرف برکت کی کتاب ہے جس کو بند ذہن کے ساتھ پڑھا جائے اور پھر بند غلاف میں محفوظ کرکے رکھ دیا جائے۔

اسی طرح قرآن کو مسائل کی کتاب کہنا بھی قرآن پر ظلم کرنا ہے۔ ”مسائل“ کے لفظ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قرآن ایسے اعمال کی کتاب ہے جن کو ظاہری آداب کے ساتھ ادا کر لینا کافی ہو، حالانکہ قرآن میں اس کے مطلوب اعمال کے ظاہری آداب کا ذکر ہی نہیں۔ قرآن آدمی کو ایمان کی دعوت دیتا ہے مگر وہ اس ایمان کو ایمان نہیں مانتا جو داخل القلب ایمان (49:14) نہ ہو، جس میں صحت مخارج کے ساتھ بس کلمہ ایمان کے

الفاظ کو دہرا دیا گیا ہو۔ قرآن کے نزدیک حقیقی ایمان وہ ہے جو روح میں اتر جائے، جس میں آدمی کے دل کی دھڑکنیں شامل ہو جائیں، قرآن نماز کو فلاح کا ذریعہ بتایا ہے مگر قرآن کی مطلوب نماز وہ ہے جو خشوع کی نماز ہو نہ کہ سہو کی نماز۔ قرآن چاہتا ہے کہ لوگ اللہ کا ذکر کریں، مگر وہ ذکر نہیں جو تکرار لسان کے طور پر ہوتا ہے، بلکہ ایسا ذکر جس میں وہ والہانہ شیفتگی شامل ہو، جو قومی ہیروؤں کے ذکر میں ہوتی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ قرآن کے نزدیک قربانی بہت بڑا عمل ہے مگر وہ قربانی نہیں جو گوشت اور خون کے ہم معنی ہو بلکہ وہ قربانی جو آدمی کے لیے تقوی کا ذریعہ بن جائے۔ اس طرح کے بے شمار احکام ہیں جو بتاتے ہیں کہ قرآن معروف معنوں میں مسائل کی کتاب نہیں بلکہ حقیقت کی کتاب ہے۔ وہ انسان کے اندر زندہ عمل دیکھنا چاہتا ہے، نہ کہ محض ظاہری آداب وقواعد والا عمل۔

قرآن میں یقیناً بعض سیاسی نوعیت کے احکام ہیں۔ مگر قرآن کو کتابِ سیاست سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے بعض جزئی مشابہت کی بنا پر انسان کو معاشی حیوان سمجھنا۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین یہ دیکھتے ہیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ واقعہ ہوا کہ دعوت وتبلیغ سے شروع ہو کر آپ کا مشن حکومت و سیاست تک پہنچا۔ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیغمبر اس لیے آتے ہیں کہ مخصوص احکام کی بنیاد پر خدا کی حکومت قائم کریں۔ مگر قرآن سے یہ ثابت ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے ان کا مشن الگ الگ نہ تھا بلکہ سب کا مشن ایک تھا۔ حتیٰ کہ قرآن (6:90) میں پچھلے نبیوں کا ذکر کر کے نبی آخر الزماں سے کہا گیا ہے کہ تم بھی انھیں کی پیروی کرو (فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ)۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ جب نبیوں کا مشن خدائی حکومت قائم کرنا ہوتا ہے تو آخری نبی کے سوا دوسرے نبیوں نے بھی آپ کی طرح حکومت کیوں نہ قائم کی۔

اس نقطۂ نظر کے حاملین اس کا جواب دیتے ہیں کہ عمل کی حد تک تمام نبیوں نے خدائی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کی۔ البتہ کسی کا عمل کوشش کے مرحلہ میں رہ گیا اور کسی کا عمل آخری نتیجہ تک پہنچا۔ مگر یہ جواب متعدد وجوہ سے غلط ہے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لیجیے۔ اگر آنجناب کا مشن یہ تھا کہ مصر کے اقتدار سے فرعون کو بے دخل کر کے وہاں خدائی قانون کی حکومت قائم کریں تو ایسا کیوں ہوا کہ جب خدا نے فرعون کو ہلاک کر دیا اور اس کی پوری جنگی طاقت کو سمندر میں غرق کر دیا تو حضرت موسیٰ مصر کو چھوڑ کر صحرائے سینا میں چلے گئے۔ اگر آپ کا مشن مصر میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا تھا تو فرعون کی غرقابی کے بعد مصر میں اس کا پورا موقع آپ کے لیے کھل چکا تھا۔ ایسی حالت میں مصر کو چھوڑ کر چلے جانے کی کیا توجیہ کی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن خدائی نعمتوں کا ابدی خزانہ ہے، قرآن خدا کا تعارف ہے، قرآن بندے اور خدا کا مقام ملاقات ہے۔ مگر اس قسم کے مفروضہ خیالات نے قرآن کو لوگوں کے لیے ایک ایسی کتاب بنا دیا جو یا تو ایک چٹیل زمین ہے جہاں آدمی کی روح کے لیے کوئی غذا نہیں یا وہ کسی شاعر کے مجموعہ کلام کی طرح ایک ایسا لفظی مجموعہ ہے جس سے ہر آدمی بس اپنے مخصوص ذہن کی تصدیق حاصل کر لے۔ وہ اصلاً خود اپنے آپ کو پائے اور یہ سمجھ کر خوش ہو کہ اس نے خدا کو پالیا ہے۔

قرآن فہمی کے شرائط

قرآن ایک فکری کتاب ہے اور فکری کتاب میں ہمیشہ ایک سے زیادہ تعبیر کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لیے قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والا خالی الذہن ہو۔ اگر پڑھنے والے کا ذہن خالی نہ ہو تو وہ قرآن میں خود اپنی بات پڑھے گا۔ اس کو سمجھنے کے لیے قرآن کی ایک آیت کی مثال لیجیے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (2:165)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حالاں کہ ایمان رکھنے والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

ایک شخص جو سیاسی ذوق رکھتا ہو اور سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کو کام سمجھتا ہو وہ جب اس آیت کو پڑھے گا تو اس کا ذہن پوری آیت میں بس انداد (مدمقابل) پر رک جائے گا۔ وہ قرآن سے ''مدمقابل'' کا لفظ لے لے گا اور بقیہ مفہوم کو اپنے ذہن سے جوڑ کر کہے گا کہ اس سے مراد سیاسی مدمقابل ٹھہرانا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کو خدا کا سیاسی مدمقابل بنائے۔ اس تشریح کے مطابق یہ آیت اس کے لیے اس بات کا اجازت نامہ بن جائے گی کہ جس کو وہ خدا کا ''سیاسی مدمقابل'' بنا ہوا دیکھے، اور اس سے ٹکراؤ شروع کر دے۔ اس کے برعکس، جو آدمی سادہ ذہن کے ساتھ اس کو پڑھے گا وہ ''انداد'' کے لفظ پر نہیں رکے گا بلکہ پوری آیت کی روشنی میں اس کا مفہوم متعین کرے گا۔ ایسے شخص کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ یہاں مدمقابل ٹھہرانے کی جس صورت کا ذکر ہے وہ باعتبار محبت ہے، نہ کہ باعتبار سیاست۔ یعنی آیت یہ کہہ رہی ہے کہ آدمی کو سب سے زیادہ محبت صرف خدا سے کرنا چاہئے۔ ''حبّ شدید'' کے معاملے میں کسی دوسرے کو خدا کا ہمسر نہیں بنانا چاہئے۔

قرآن کا ایک عمومی مفہوم ہے اور اس کو سمجھنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی خالی الذہن ہو کر قرآن پڑھے۔ مگر جو شخص قرآن کے گہرے معانی تک پہنچنا چاہے اس کو ایک اور شرط پوری کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اس راہ کا مسافر بنے جس کا مسافر اس کو قرآن بنانا چاہتا ہے۔ قرآن آدمی کی عملی زندگی کی رہنما کتاب ہے اور کسی عملی کتاب کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی عملاً ان تجربات سے گزرے جن کی طرف اس کتاب میں رہنمائی کی گئی ہے۔

یہ عمل کوئی سیاسی یا سماجی عمل نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اس عمل میں آدمی کو خود اپنے نفس کے مقابلہ میں کھڑا ہونا پڑتا ہے، نہ کہ حقیقتاً کسی خارج کے مقابلہ میں۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی ظاہری دنیا کی سطح پر نہ جیے، بلکہ غیب کی دنیا کی سطح پر جیے۔ اس سلسلے میں جن مراحل کی نشان دہی قرآن میں کی گئی ہے ان کو وہ شخص کیسے سمجھ سکتا ہے جو ان مراحل سے آشنا نہ ہوا ہو۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی صرف اللہ سے ڈرے اور صرف اللہ سے محبت کرے۔ اب جس کا دل اللہ کی محبت میں نہ تڑپا ہو، جس کے بدن کے رونگٹے اللہ کے خوف سے نہ کھڑے ہوئے ہوں وہ کیسے جان سکتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا کیا ہے اور اللہ سے محبت کرنا کیا۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی خدائی مشن میں اپنے آپ کو اس طرح شامل کرے کہ وہ اس کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لے۔ اب جس شخص نے خدا کے کام کو اپنا ذاتی کام نہ بنایا ہو وہ کیوں کر جانے گا کہ خدا کے ساتھ اپنے کو شامل کرنے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی انسانوں کے چھیڑے ہوئے مسائل میں گم نہ ہو، بلکہ خدا کی طرف سے برسنے والے فیضان میں اپنے کو گم کرے۔ اب جس شخص پر ایسے صبح و شام ہی نہ گزرے ہوں جب کہ خدا کے فیضان میں وہ نہا اُٹھے وہ کیسے سمجھ سکتا ہے کہ خدائی فیضان میں نہانے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی جہنم سے بھاگے اور جنت کی طرف دوڑے۔ اب جو شخص اس طرح زندگی گزارے کہ جہنم کو اس نے اپنا مسئلہ نہ بنایا ہو اور جنت اس کی ضرورت نہ بنی ہو اس کو کیا معلوم کہ جہنم سے بھاگنا کیا ہوتا ہے اور جنت کی طرف دوڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی اللہ کی عظمت و کبریائی کے احساس سے سرشار ہو۔ اب جو شخص اپنی عظمت و کبریائی کے مینار میں لذت لے رہا ہو اس کو اس کیفیت کا ادراک کہاں ہو سکتا ہے جب کہ آدمی خدا کی کبریائی کو اس طرح پاتا ہے کہ اپنی طرف اس کو عجز کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

قرآنی عمل اصلاً نفس یا انسان کے اندرونی وجود کی سطح پر ہوتا ہے۔ مگر انسان کسی خلا میں زندگی نہیں گزارتا بلکہ دوسرے بہت سے انسانوں کے درمیان رہتا ہے۔ اس لیے قرآنی عمل باعتبار حقیقت ذاتی عمل ہونے کے باوجود، دو پہلوؤں سے دوسرے انسانوں سے بھی متعلق ہو جاتا ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ

آدمی جس قرآنی راستہ کو خود اپناتا ہے اسی راستہ کو اختیار کرنے کی وہ دوسروں کو بھی دعوت دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہ رشتہ آدمی کو بے شمار تجربات سے گزارتا ہے جو مختلف صورتوں میں آخر وقت تک جاری رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مختلف قسم کے انسانوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے طرح طرح کے تعلقات و معاملات پیش آتے ہیں۔ کسی سے لینا ہوتا ہے اور کسی کو دینا، کسی سے اتفاق ہوتا ہے اور کسی سے اختلاف، کسی سے دوری ہوتی ہے اور کسی سے قربت۔ ان مواقع پر آدمی کیا رویہ اختیار کرے اور کس قسم کا ردعمل پیش کرے، قرآن ان امور میں اس کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اگر آدمی اپنی خواہش پر چلنا چاہے تو قرآن کا یہ باب اس پر بند رہے گا اور اگر وہ اپنے کو قرآن کی ماتحتی میں دیدے تو اس پر قرآنی تعلیمات کے ایسے بھید کھلیں گے جو کسی اور طرح اس پر کھل نہیں سکتے۔

قرآن آدمی کو جو مشن دیتا ہے وہ حقیقتاً کوئی ''نظام'' قائم کرنے کا مشن نہیں ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو قرآنی کردار کی صورت میں ڈھالنے کا مشن ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب فرد ہے، نہ کہ سماج۔ اس لیے قرآن کا مشن فرد پر جاری ہوتا ہے، نہ کہ سماج پر۔ تاہم افراد کی قابل لحاظ تعداد جب اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھالتی ہے تو اس کے سماجی نتائج بھی لازماً نکلنا شروع ہوتے ہیں۔ یہ نتائج ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ حالات کے اعتبار سے ان کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ قرآن میں مختلف انبیاء کے واقعات انھیں سماجی نتائج اور سماجی ردعمل کے مختلف نمونے ہیں اور اگر آدمی نے اپنی آنکھیں کھول رکھی ہوں تو وہ ہر صورت حال کی بابت قرآن میں رہنمائی پاتا چلا جاتا ہے— قرآن فطرت انسانی کی کتاب ہے۔ قرآن کو وہی شخص بخوبی طور پر سمجھ سکتا ہے جس کے لیے قرآن اس کی فطرت کا مثنیٰ (counterpart) بن جائے۔

تذکیر القرآن کی خصوصیات

1۔ تذکیر القرآن کا خاص مقصد قرآن کی یاددہانی ہے۔ قرآن کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ نصیحت ہے۔ تذکیر القرآن کی ترتیب میں سب سے زیادہ اسی پہلو کا لحاظ کیا گیا ہے کہ وہ پڑھنے والے کے لیے نصیحت بن سکے۔

2۔ قرآن عام انسانی کتاب کی طرح ابواب کے انداز میں نہیں ہے۔ بلکہ شذرات کے انداز میں ہے۔ اگرچہ قرآن کی سورتوں اور عبارتوں میں ایک گہری ترتیب بھی ہے۔ مگر اس کا عام انداز یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ایک پورا پیغام ہے۔ ایک ایک ''پیراگراف'' میں ایک ایک بات

ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تذکیر القرآن میں اسی شذراتی انداز کو تشریح کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن کا ایک ٹکڑا یا ایک "پیراگراف" لے کر اس میں جو بات کہی گئی ہے اس کو مسلسل مضمون کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ متعلقہ تشریح کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں معانی کا سلسلہ نہ ٹوٹے اور وہ قرآن کی تذکیری غذا مسلسل لیتا چلا جائے۔

3۔ تذکیر القرآن کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے قرآن کا زیر تشریح ٹکڑا (پیراگراف) درج کیا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل اس کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد ایک لکیر دے کر متعلقہ ٹکڑے کی تشریح ہے۔ جہاں تشریح ختم ہوتی ہے وہاں پھر قرآن کا اگلا ٹکڑا درج کر کے دوبارہ مذکورہ ترتیب سے ترجمہ اور تشریح درج ہے۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک پوری سورہ کی تفسیر ہے۔ اس ترتیب میں قاری ہر تشریح کو پڑھتے ہوئے بیک وقت اس کا متن بھی سامنے رکھ سکتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی۔

4۔ تذکیر القرآن میں یہ حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ ہر جزء میں ایک پوری بات آجائے۔ آدمی اگر ایک صفحہ پڑھے تب بھی قرآنی نصیحت کا کوئی حصہ اسے مل جائے اور زیادہ صفحات پڑھے تب بھی۔

5۔ تذکیر القرآن میں ترجمہ کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ نہ پوری طرح لفظی ہے اور نہ پوری طرح بامحاورہ۔ بلکہ درمیان کی ایک صورت اختیار کی گئی ہے۔ دونوں ہی انداز کے اپنے اپنے فائدے ہیں اور درمیانی انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ دونوں پہلوؤں کی رعایت شامل رہے۔

6۔ تفسیر میں عام طور پر تفصیل سے پرہیز کیا گیا ہے، زیادہ تر جو چیز پیش نظر رکھی گئی ہے، وہ یہ کہ قرآن کی فطری سادگی اس کی تفسیر میں بھی باقی رہے، قرآن ایک طرف خدا کے جلال کا اظہار ہے اور دوسری طرف وہ انسان کی عبدیت کا آئینہ ہے۔ تفسیر میں بس انھیں اصل پہلوؤں کو غیر فنی انداز میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جمعہ 13 نومبر 1981

وحید الدین

www.mwkhan.com

۱۔ سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝۱
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۲ الرَّحۡمٰنِ
الرَّحِيۡمِ ۝۳ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝۴
اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۝۵
اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝۶ صِرَاطَ
الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ
الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا الضَّآلِّيۡنَ ۝۷ ع

۱۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۲۔ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ ۳۔ بہت مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ ۴۔ انصاف کے دن کا مالک ہے۔ ۵۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ۶۔ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ ۷۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا۔ ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا، اور نہ ان لوگوں کا راستہ جو راستے سے بھٹک گئے۔

بندے کے لیے کسی کام کا سب سے بہتر آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو اپنے رب کے نام سے شروع کرے۔ وہ ہستی جو تمام رحمتوں کا خزانہ ہے اور جس کی رحمتیں ہر وقت ابلتی رہتی ہیں، اس کے نام سے کسی کام کا آغاز کرنا گویا اس سے یہ دعا کرنا ہے کہ تو اپنی بے پایاں رحمتوں کے ساتھ میری مدد پر آجا اور میرے کام کو خیر وخوبی کے ساتھ مکمل کردے۔ یہ بندے کی طرف سے اپنی بندگی کا اعتراف ہے اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی کی الٰہی ضمانت بھی۔

قرآن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مومن کے قلبی احساسات کے لیے صحیح ترین الفاظ مہیا کرتا ہے۔ بسم اللہ اور سورۂ فاتحہ اسی نوعیت کے دعائیہ کلام ہیں۔ سچائی کو پالینے کے بعد فطری طور پر آدمی کے اندر جو جذبہ ابھرتا ہے، اسی جذبہ کو ان الفاظ میں مجسّم کردیا گیا ہے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کی حمد کرے، اور الحمدللہ کلچر کو اپنائے۔ آدمی کا وجود اس کے لیے اللہ کا ایک عظیم عطیہ ہے۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اگر کسی آدمی سے کہا جائے کہ تم اپنی دونوں آنکھوں کو نکلوادو یا دونوں پیروں کو کٹوادو، اس کے بعد تم کو ملک کی بادشاہی دے دی جائے گی تو کوئی بھی شخص اس کے لیے تیار نہ ہوگا۔ گویا کہ یہ ابتدائی قدرتی عطیے بھی بادشاہ کی بادشاہی سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اسی طرح آدمی جب اپنے گردوپیش کی دنیا کو دیکھتا ہے تو یہاں ہر طرف خدا کی مالکیت اور رحیمیت ابلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کو ہر طرف غیر معمولی اہتمام نظر آتا ہے۔ اس کو دکھائی دیتا ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں حیرت انگیز طور پر انسانی زندگی

کے موافق بنادی گئی ہیں۔ یہ مشاہدہ اس کو بتاتا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم کارخانہ بے مقصد نہیں ہوسکتا۔ لازمی طور پر ایسا دن آنا چاہیے جب ناشکروں سے ان کی ناشکر گزار زندگی کی باز پرس کی جائے اور شکر گزاروں کو ان کی شکر گزار زندگی کا انعام دیا جائے۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا! تو فیصلہ کے دن کا مالک ہے۔ میں اپنے آپ کو تیرے آگے ڈالتا ہوں اور تجھ سے مدد چاہتا ہوں، تو مجھ کو اپنے سایہ میں لے لے۔ خدایا! ہم کو وہ راستہ دکھا جو تیرے نزدیک سچا راستہ ہے۔ ہم کو اس راستہ پر چلنے کی توفیق دے جو تیرے مقبول بندوں کا راستہ ہے۔ ہم کو اس راستے سے بچا جو بھٹکے ہوئے لوگوں کا راستہ ہے یا ان لوگوں کا جو اپنی ڈھٹائی کی وجہ سے تیرے غضب کا شکار ہوجاتے ہیں—اللہ کا مطلوب بندہ وہ ہے جو ان احساسات و کیفیات کے ساتھ دنیا میں جی رہا ہو۔ سورۂ فاتحہ اس بندۂ مومن کی چھوٹی تصویر ہے، اور بقیہ قرآن اس بندۂ مومن کی بڑی تصویر۔

۲۔ سُوۡرَۃُ الۡبَقَرَۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡهِ ۚۛ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنۡ رَّبِّهِمۡ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ الف لام میم۔ ۲۔ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ راہ دکھاتی ہے ڈر رکھنے والوں کو۔ ۳۔ جو یقین کرتے ہیں بن دیکھے، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۴۔ اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو تمھارے اوپر اترا اور جو تم سے پہلے اتارا گیا، اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۵۔ انھیں لوگوں نے اپنے رب کی راہ پائی ہے اور وہی کامیابی کو پہنچنے والے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے۔ مگر قرآن فہمی کی شاہ کلید (master key) تقویٰ ہے۔ یعنی وہ ہدایت کی کتاب اس کے لیے ہے جو فی الواقع ہدایت کو جاننے کے معاملہ میں سنجیدہ ہو، جو حق کا متلاشی (seeker of truth) ہو۔ جس آدمی کے اندر یہ شرط موجود ہو، وہ قرآن کو سمجھے گا۔ اور جس آدمی

کے اندر یہ بنیادی شرط نہ پائی جائے وہ دوسری تمام خصوصیات کے باوجود بھٹک کر رہ جائے گا، وہ فنی اعتبار سے قرآن کا ماہر ہو کر بھی قرآن فہمی سے محروم رہے گا۔

سچی طلب جو فطرت کی زمین پر اگتی ہے وہ خود پانے ہی کا ایک آغاز ہوتا ہے۔ سچی طلب اور سچی یافت دونوں ایک ہی سفر کے پچھلے اور اگلے مرحلے ہیں۔ یہ گویا خود اپنی فطرت کے بند صفحات کو کھولنا ہے۔ جب آدمی اس کا سچا ارادہ کرتا ہے تو فوراً فطرت کی مطابقت اور اللہ کی نصرت اس کا ساتھ دینے لگتی ہے، اس کو اپنی فطرت کی مبہم پکار کا متعین جواب ملنا شروع ہو جاتا ہے۔

ایک آدمی کے اندر سچی طلب کا جاگنا عالَم ظاہر کے پیچھے عالم باطن کو دیکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ تلاش جب یافت کے مرحلہ میں پہنچتی ہے تو وہ ایمان بالغیب بن جاتی ہے۔ وہی چیز جو ابتدائی مرحلہ میں ایک برتر حقیقت کے آگے اپنے کو ڈال دینے کی بے قراری کا نام ہوتا ہے وہ بعد کے مرحلہ میں اللہ کا نمازی بننے کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ وہی جذبہ جو ابتداءً اپنے کو خیر اعلیٰ کے لیے وقف کر دینے کے ہم معنی ہوتا ہے، وہ بعد کے مرحلہ میں اللہ کی راہ میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرنے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہی کھوج جو زندگی کے ہنگاموں کے آگے اس کا آخری انجام معلوم کرنے کی صورت میں کسی کے اندر ابھرتی ہے وہ آخرت پر یقین کی صورت میں اپنے سوال کا جواب پا لیتی ہے۔

سچائی کو پانا گویا اپنے شعور کو حقیقت اعلیٰ کے ہم سطح کر لینا ہے۔ جو لوگ، اس طرح حق کو پا لیں وہ ہر قسم کی نفسیاتی گرہوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ سچائی کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔ اس لیے سچائی جہاں بھی ہو اور جس بندۂ خدا کی زبان سے اس کا اعلان کیا جا رہا ہو وہ فوراً اس کو پہچان لیتے ہیں اور اس پر لبیک کہتے ہیں۔ کوئی جمود، کوئی تقلید اور کوئی تعصّباتی دیوار ان کے لیے اعترافِ حق میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات ہوں وہ اللہ کے سایہ میں آ جاتے ہیں۔ اللہ کا بنایا ہوا نظام ان کو قبول کر لیتا ہے۔ ان کو دنیا میں اس سچے راستہ پر چلنے کی توفیق مل جاتی ہے جس کی آخری منزل یہ ہے کہ آدمی آخرت کی ابدی نعمتوں میں داخل ہو جائے۔

حق کو وہی پا سکتا ہے جو اس کا ڈھونڈھنے والا ہے اور جو ڈھونڈنے والا ہے وہ ضرور اس کو پاتا ہے۔ یہاں ڈھونڈنے اور پانے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٦ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧ ع

۶۔ جن لوگوں نے انکار کیا، ان کے لیے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ماننے والے نہیں ہیں۔
۷۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

ایک شخص اپنی آنکھ کو بند کر لے تو آنکھ رکھتے ہوئے بھی وہ سورج کو نہ دیکھے گا۔ کوئی شخص اپنے کان میں روئی ڈال لے تو کان رکھتے ہوئے بھی وہ باہر کی آواز کو نہیں سنے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ حق کا بھی ہے۔ حق کا اعلان خواہ کتنا ہی واضح صورت میں ہو رہا ہو مگر کسی کے لیے وہ قابلِ فہم یا قابلِ قبول اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ اس کے لیے اپنے دل کے دروازے کھلا رکھے۔ جو شخص اپنے دل کے دروازے بند کر لے، اس کے لیے کائنات میں خدا کی خاموش پکار اور داعی کی زبان سے اس کا لفظی اعلان دونوں بے سود ثابت ہوں گے۔

حق کی دعوت جب اپنی بے آمیز شکل میں اٹھتی ہے تو وہ اتنی زیادہ مبنی بر حقیقت اور اتنی زیادہ مطابقِ فطرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس کی نوعیت کو سمجھنے سے عاجز نہیں رہ سکتا۔ جو شخص بھی کھلے ذہن سے اس کو دیکھے گا اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ عین حق ہے۔ مگر اُس وقت عملی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف وقت کا ڈھانچہ ہوتا ہے جو صدیوں کے عمل سے ایک خاص صورت میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس ڈھانچہ کے تحت کچھ مذہبی یا غیر مذہبی گدیاں بن جاتی ہیں جن پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کچھ عزت وشہرت کی صورتیں رائج ہو جاتی ہیں جن کے جھنڈے اٹھا کر کچھ لوگ وقت کے اکابر کا مقام حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ کچھ کاروبار اور مفادات قائم ہو جاتے ہیں جن کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر کے بہت سے لوگ اطمینان کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

ان حالات میں جب ایک غیر معروف کونے سے اللہ اپنے ایک بندے کو کھڑا کرتا ہے اور اس کی زبان سے اپنی مرضی کا اعلان کراتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اپنی بنی بنائی دنیا بھنگ ہوتی نظر آتی ہے۔ حق کے پیغام کی تمام تر صداقت کے باوجود دو چیزیں ان کے لیے اس کو صحیح طور پر سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں — کبر اور دنیا پرستی۔ جو لوگ مروجہ ڈھانچہ میں بڑائی کے مقامات پر بیٹھے ہوئے ہوں، ان کو ایک ”چھوٹے آدمی“ کی بات ماننے میں اپنی عزت خطرہ میں پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ احساس ان کے اندر گھمنڈ کی نفسیات کو جگا دیتا ہے۔ داعی کو وہ اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھ کر اس کی دعوت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح دنیوی مفادات کا سوال بھی قبولِ حق میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ کیوں کہ حق کا داعی مروجہ سماجی روایت کا نمائندہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک نئی اور غیر مانوس آواز کو لے کر اٹھتا ہے، اس لیے اس کو ماننے کی صورت میں لوگوں کو اپنے مفادات کا ڈھانچہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔

یہی وہ کنڈیشننگ کی حالت ہے جس کو قرآن میں مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو لوگ دعوت حق کے معاملہ کو سنجیدہ معاملہ نہ سمجھیں، جو گھمنڈ اور دنیا پرستی کی نفسیات میں مبتلا ہوں، ان کے ذہن کے اوپر ایسے غیر محسوس پردے پڑ جاتے ہیں جو حق بات کو ان کے ذہن میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ کسی چیز کے بارے میں آدمی کے اندر مخالفانہ نفسیات جاگ اٹھیں تو اس کے بعد وہ اس کی معقولیت کو سمجھ نہیں پاتا۔ خواہ اس کے حق میں کتنے ہی واضح دلائل پیش کیے جا رہے ہوں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ
بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا
يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا
يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾ؕ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ
فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ
لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا
نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ
الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ اِذَا
قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا
اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ
هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِذَا
لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا
خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ
اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ
يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا
الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

۸۔ اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، حالاں کہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ ۹۔ وہ اللہ کو اور مومنین کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ۱۰۔ ان کے دلوں میں روگ ہے تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔ ۱۱۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ ۱۲۔ آگاہ، یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں، مگر وہ نہیں سمجھتے۔ ۱۳۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔ آگاہ، کہ بے وقوف یہی لوگ ہیں، مگر وہ نہیں جانتے۔ ۱۴۔ اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، اور جب اپنے شیطانوں کی مجلس میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو ان سے صرف ہنسی کرتے ہیں۔ ۱۵۔ اللہ ان سے ہنسی کر رہا ہے اور وہ ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دے رہا ہے، وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ۱۶۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے راہ کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کی تجارت مفید ثابت نہ ہوئی، اور وہ نہ ہوئے راہ پانے والے۔

جو لوگ فائدوں اور مصلحتوں کو اولین اہمیت دیے ہوئے ہوتے ہیں ان کے نزدیک یہ نادانی کی بات ہوتی ہے کہ کوئی شخص تحفظات کے بغیر اپنے آپ کو ہمہ تن حق کے حوالے کر دے۔ ایسے لوگوں کی حقیقی وفاداریاں

اپنے دنیوی مفادات کے ساتھ ہوتی ہیں۔ البتہ اسی کے ساتھ وہ حق سے بھی اپنا ایک ظاہری رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ اس کو وہ عقل مندی سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کی دنیا بھی محفوظ ہے اور اسی کے ساتھ ان کو حق پرستی کا تمغہ بھی حاصل ہے۔ مگر یہ ایک ایسی خوش فہمی ہے جو صرف آدمی کے اپنے دماغ میں ہوتی ہے۔ اس کے دماغ کے باہر کہیں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ آزمائش کا ہر موقع ان کو سچے دین سے کچھ اور دور، اور اپنے مفاد پرستانہ دین سے کچھ اور قریب کر دیتا ہے۔ اس طرح گویا ان کے نفاق کا مرض بڑھتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ جب سچے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو ان کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ سچائی کی خاطر اپنے کو برباد کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اپنے طریقے کو وہ اصلاح کا طریقہ کہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو نظر آتا ہے کہ اس طرح کسی سے جھگڑا مول لیے بغیر اپنے سفر کو کامیابی کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ صرف بے شعوری کی بات ہے۔ اگر وہ گہرائی کے ساتھ سوچیں تو ان پر کھلے گا کہ اصلاح یہ ہے کہ بندے صرف اپنے رب کے ہو جائیں۔ اس کے برعکس، فساد یہ ہے کہ خدا اور بندے کے تعلق کو درست کرنے کے لیے جو تحریک چلے اس میں روڑے اٹکائے جائیں۔ ان کا یہ بظاہر نفع کا سودا حقیقۃً گھاٹے کا سودا ہے۔ کیوں کہ وہ بے آمیز حق کو چھوڑ کر ملاوٹی حق کو اپنے لیے پسند کر رہے ہیں جو کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔ اپنے دنیوی معاملات میں ہوشیار ہونا اور آخرت کے معاملہ میں سرسری توقعات کو کافی سمجھنا، گویا خدا کے سامنے جھوٹ بولنا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں ان کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کی جھوٹی زندگی آدمی کو اللہ کے یہاں عذاب کے سوا کسی اور چیز کا مستحق نہیں بناتی۔

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِی اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ وَ تَرَكَهُمۡ فِیۡ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿ۙ۱۸﴾ اَوۡ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعۡدٌ وَّ بَرۡقٌ ۚ یَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِیۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۱۹﴾ یَكَادُ الۡبَرۡقُ یَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِیۡهِ ۙ وَ اِذَاۤ اَظۡلَمَ

۱۷۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی آنکھ کی روشنی چھین لی اور ان کو اندھیرے میں چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ ۱۸۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔ ۱۹۔ یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو، اس میں تاریکی بھی ہو اور گرج چمک بھی۔ وہ کڑک سے ڈر کر موت سے بچنے کے لیے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس رہے ہوں۔ حالاں کہ اللہ منکروں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ ۲۰۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی نگاہوں کو اچک لے۔ جب بھی ان پر بجلی

عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۳ ۲

چمکتی ہے، اس میں وہ چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو وہ رک جاتے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور ان کی آنکھوں کو چھین لے۔ اللہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

کسی کمرے میں کالی اور سفید چیزیں ہوں تو جب تک اندھیرا ہے وہ اندھیرے میں گم رہیں گی۔ مگر روشنی جلاتے ہی کالی چیز کالی اور سفید چیز سفید دکھائی دینے لگے گی۔ یہی حال اللہ کی طرف سے اٹھنے والی دعوتِ نبوت کا ہے۔ یہ خدائی روشنی جب ظاہر ہوتی ہے تو اس کے اجالے میں ہدایت اور ضلالت صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔ نیک عمل کیا ہے اور اس کے ثمرات کیا ہیں، برا عمل کیا ہے اور اس کے ثمرات کیا ہیں، سب کھل کر ٹھیک ٹھیک سامنے آجاتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے آپ کو حق کے تابع کرنے کے بجائے حق کو اپنا تابع بنائے ہوئے تھے، وہ اس صورت حال کو دیکھ کر گھبرا اٹھتے ہیں۔ ان کا چھپا ہوا حسد اور گھمنڈ زندہ ہو کر ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ خدائی آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی ان کی منفی نفسیات ابھر آتی ہیں۔ ان کے اندرونی تعصّبات ان کے حواس پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ آنکھ، کان، زبان رکھتے ہوئے بھی وہ ایسے ہو جاتے ہیں گویا کہ وہ اندھے ہیں، وہ بہرے ہیں، وہ گونگے ہیں۔ اب وہ نہ تو کسی پکارنے والے کی پکار کو سن سکتے ہیں، نہ اس کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں، نہ کسی قسم کی نشانی سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے صحیح رویہ یہ تھا کہ پکارنے والے کی پکار پر غور کرتے، مگر اس کے بجائے انھوں نے اس سے بچنے کا سادہ سا علاج یہ دریافت کیا ہے کہ اس کی بات کو سرے سے سنا ہی نہ جائے، اس کو کوئی اہمیت ہی نہ دی جائے۔

اسی طرح ایک اور نفسیات ہے جو حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہ ڈر کی نفسیات ہے۔ بارش اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر بارش جب آتی ہے تو اپنے ساتھ کڑک اور گرج بھی لے آتی ہے جس سے کمزور لوگ ہیبت کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح جب اللہ کی طرف سے حق کی دعوت اٹھتی ہے تو ایک طرف اگر وہ انسانوں کے لیے عظیم کامرانیوں کا امکان کھولتی ہے تو دوسری طرف اس میں کچھ وقتی اندیشے بھی دکھائی دیتے ہیں — اس کو مان لینے کی صورت میں اپنی بڑائی کا خاتمہ، زندگی کے بنے بنائے نقشے کو بدلنے کی ضرورت، رواجی ڈھانچہ سے ٹکراؤ کے مسائل، آخرت کے بارے میں خوش خیالیوں کے بجائے حقائق پر بھروسہ کرنا۔ اس قسم کے اندیشوں کو دیکھ کر وہ کبھی رک جاتے ہیں اور کبھی تذبذب کے ساتھ چند قدم آگے بڑھتے ہیں۔ مگر یہ احتیاطیں ان کے کچھ بھی کام آنے والی نہیں ہیں۔ کیوں کہ خدائی پکار کے لیے اپنے کو کھلے دل سے پیش نہ کرکے وہ زیادہ شدید طور پر اپنے کو خدا کی نظر میں قابل سزا بنا رہے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۙ﴿۲۱﴾ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّـكُمۡ‌ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوۡا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ؕ كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِىۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ‌ؕ وَلَهُمۡ فِيۡهَآ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ‌ۙ وَّهُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۱۔ اے لوگو، اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، تا کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ ۲۲۔ وہ ذات جس نے زمین کو تمھارے لیے بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت بنایا، اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمھاری غذا کے لیے۔ پس تم کسی کو اللہ کے برابر نہ ٹھہراؤ حالاں کہ تم جانتے ہو۔ ۲۳۔ اگر تم اس کلام کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے کے اوپر اتارا ہے تو لاؤ اس کے جیسی ایک سورہ اور بلا لو اپنے مدد گاروں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔ ۲۴۔ پس اگر تم یہ نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر۔ وہ تیار کی گئی ہے منکروں کے لیے۔ ۲۵۔ اور خوش خبری دے دو، ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے، اس بات کی کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جب بھی ان کو ان باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے: یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا۔ اور ملے گا ان کو ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔ اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ جوڑے ہوں گے۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

انسان اور انسان کے سوا جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب کا پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔ اس نے پوری کائنات کو نہایت حکمت کے ساتھ قائم کیا ہے۔ وہ ہر آن ان کی پرورش کر رہا ہے۔ اس لیے انسان کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کو بغیر کسی شرکت کے خالق، مالک اور رازق تسلیم کرے، وہ اس کو اپنا سب کچھ بنا لے۔ مگر خدا چونکہ نظر نہیں آتا اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی نظر آنے والی چیز کو اہم سمجھ کر اس کو خدائی کے مقام پر بٹھا لیتا ہے۔ وہ ایک مخلوق کو، جزئی یا کلی طور پر، خالق کے برابر ٹھہرا

لیتا ہے، کبھی اس کو خدا کا نام دے کر اور کبھی خدا کا نام دیے بغیر۔

یہی انسان کی اصل گمراہی ہے۔ پیغمبر کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ آدمی صرف ایک خدا کو بڑائی کا مقام دے۔ اس کے علاوہ جس جس کو اس نے خدائی عظمت کے مقام پر بٹھا رکھا ہے اس کو عظمت کے مقام سے اتار دے۔ جب خالص خدا پرستی کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ تمام لوگ اپنے اوپر اس کی زد پڑتی ہوئی محسوس کرنے لگتے ہیں جن کا دل خدا کے سوا کہیں اور اٹکا ہوا ہو۔ جنھوں نے خدا کے سوا کسی اور کے لیے بھی عظمت کو خاص کر رکھا ہو۔ ایسے لوگوں کو اپنے فرضی معبودوں سے جو شدید تعلق ہو چکا ہوتا ہے اس کی وجہ سے ان کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ بے حقیقت ہیں اور حقیقت صرف اس پیغام کی ہے جو آدمیوں میں سے ایک آدمی کی زبان سے سنایا جا رہا ہے۔

جو دعوت خدا کی طرف سے اٹھے اس کے اندر لازمی طور پر خدائی شان شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا ناقابلِ تقلید اسلوب اور اس کا غیر مفتوح استدلال اس بات کی کھلی علامت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ انکار کریں ان کو خدا کی دنیا میں جہنم کے سوا کہیں اور پناہ نہیں مل سکتی۔ البتہ جو لوگ خدا کے کلام میں خدا کو پالیں انھوں نے گویا آج کی دنیا میں کل کی دنیا کو دیکھ لیا۔ یہی لوگ ہیں جو آخرت کے باغوں میں داخل کیے جائیں گے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا
بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا
فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا
الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ
بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ
كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾
الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ
مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ
يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ
هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَ
كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ

۲۶۔ اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ بیان کرے
مثال مچھر کی یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ پھر
جو ایمان والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے
ان کے رب کی جانب سے۔ اور جو منکر ہیں وہ کہتے
ہیں کہ اس مثال کو بیان کر کے اللہ نے کیا چاہا
ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ
کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو اس سے راہ
دکھاتا ہے۔ اور وہ گمراہ کرتا ہے ان لوگوں کو جو
نافرمانی کرنے والے ہیں۔ ۲۷۔ جو اللہ کے عہد
کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس
چیز کو توڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا
ہے اور زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ یہی لوگ
ہیں نقصان اٹھانے والے۔ ۲۸۔ تم کس طرح
اللہ کا انکار کرتے ہو، حالاں کہ تم بے جان تھے تو
اس نے تم کو زندگی عطا کی۔ پھر وہ تم کو موت دے

يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِي
خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ
اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ
ع سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

گا۔ پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۲۹۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔ پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور سات آسمان درست کیے۔ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

کسی بندہ کے اوپر اللہ کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ وہ عبدیت کے اس عہد کو نبھائے جو پیدا کرنے والے اور پیدا کیے جانے والے کے درمیان اول روز سے قائم ہو چکا ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان وہ اس طرح رہے کہ وہ ان تمام رشتوں اور تعلقات کو پوری طرح استوار کیے ہوئے ہو جن کے استوار کیے جانے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ تیسری چیز یہ کہ جب خدا اپنے ایک بندے کی زبان سے اپنے پیغام کا اعلان کرائے تو اس کے خلاف بے بنیاد باتیں نکال کر خدا کے بندوں کو اس سے دور نہ کیا جائے۔ حق کی دعوت دینا دراصل لوگوں کو فطری حالت پر لانے کی کوشش کرنا ہے، اس لیے جو شخص لوگوں کو اس سے روکتا ہے وہ زمین میں فساد ڈالنے کا مجرم بنتا ہے۔

اللہ کا یہ احسان کہ وہ آدمی کو عدم سے وجود میں لے آیا، اتنا بڑا احسان ہے کہ آدمی کو ہمہ تن اس کے آگے بچھ جانا چاہیے۔ پھر اللہ نے انسان کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ نہیں دیا بلکہ اس کو رہنے کے لیے ایک ایسی زمین دی جو اس کے لیے انتہائی طور پر موافق ڈھنگ سے بنائی گئی تھی۔ پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے بہت آگے کی ہے۔ انسان ہر وقت اس نازک امکان کے کنارے کھڑا ہوا ہے کہ اس کی موت آجائے اور اچانک وہ مالک کائنات کے سامنے حساب کتاب کے لیے پیش کر دیا جائے۔ ان باتوں کا تقاضا ہے کہ آدمی ہمہ تن اللہ کا ہو جائے، اس کی یاد اور اس کی اطاعت میں زندگی گزارے۔ ساری عمر وہ اس کا بندہ بنا رہے۔

پیغمبرانہ دعوت کے انتہائی واضح اور مدلّل ہونے کے باوجود کیوں بہت سے لوگ اس کو قبول نہیں کر پاتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شوشہ یا غیر متعلق (irrelevant) بات نکالنے کا فتنہ ہے۔ آدمی کے اندر نصیحت پکڑنے کا ذہن نہ ہو تو وہ کسی بات کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیتا۔ ایسے آدمی کے سامنے جب بھی کوئی دلیل آتی ہے تو وہ اس کو سطحی طور پر دیکھ کر ایک شوشہ یا غیر متعلق بات نکال لیتا ہے۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ دعوت کوئی معقول دعوت نہیں ہے۔ اگر وہ معقول دعوت ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ اس میں اس قسم کی بے وزن باتیں شامل ہوں۔ مگر جو نصیحت پکڑنے والے ذہن ہیں، جو باتوں پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں، ان کو حق کے پہچاننے میں دیر نہیں لگتی، خواہ حق کو ''مچھر'' جیسی مثالوں ہی میں کیوں نہ بیان کیا گیا ہو۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي
الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ

۳۰۔ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو

يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ اِنِّيْٓ
اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ
كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ
اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا
مَا عَلَّمْتَنَا ۗ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٢﴾
قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ
اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ
اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ
وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿٣٣﴾

بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ۳۱۔ اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ۔ ۳۲۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہم کو بتایا۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ ۳۳۔ اللہ نے کہا اے آدم، ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب آدم نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اللہ نے کہا— کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں۔ اور مجھ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

خلیفہ کے لفظی معنی ہیں کسی کے بعد اس کی جگہ لینے والا، جانشین۔ وراثتی اقتدار کے زمانہ میں یہ لفظ کثرت سے حکمرانوں کے لیے استعمال ہوا جو ایک کے بعد دوسرے کی جگہ تخت پر بیٹھتے تھے۔ اس طرح استعمالی مفہوم کے لحاظ سے خلیفہ کا لفظ صاحب اقتدار کے ہم معنی ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کیا تو یہ بھی فیصلہ فرمایا کہ وہ ایک با اختیار مخلوق کی حیثیت سے زمین پر آباد ہوگا۔ فرشتوں کو اندیشہ ہوا کہ اختیار و اقتدار پا کر انسان بگڑ نہ جائے اور زمین میں خوں ریزی کرنے لگے۔ فرشتوں کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔ اللہ کو بھی اس امکان کا پورا علم تھا۔ مگر اللہ کی نظر اس بات پر تھی کہ انسانوں میں اگر بہت سے لوگ آزادی پا کر بگڑیں گے تو ایک قابل لحاظ تعداد ان لوگوں کی بھی ہوگی جو آزادی اور اختیار کے باوجود اپنی حیثیت کو اور اپنے رب کے مقام کو پہچانیں گے اور کسی دباؤ کے بغیر خود اپنے ارادہ سے تسلیم و اطاعت کا طریقہ اختیار کریں گے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ اگرچہ نسبتاً کم تعداد میں ہوں گے مگر وہ فصل کے دانوں کی طرح قیمتی ہوں گے۔ فصل میں لکڑی اور بھس کی مقدار ہمیشہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر دانے کم ہونے کے باوجود، اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ ان کی خاطر لکڑی اور بھس کے ڈھیر کو بھی اُگنے اور پھیلنے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔

اللہ نے اپنی قدرت سے آدم کی تمام ذرّیت کو بیک وقت ان کے سامنے کر دیا۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ دیکھو یہ ہے اولادِ آدم۔ اب بتاؤ کہ ان میں کون کون اور کیسے کیسے لوگ ہیں۔ فرشتے عدمِ واقفیت کی وجہ سے نہ بتا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ان کے ناموں، بالفاظ دیگر شخصیتوں سے آگاہ کیا اور پھر کہا کہ فرشتوں کے سامنے ان کا تعارف کراؤ۔ جب آدم نے تعارف کرایا تو فرشتوں کو معلوم ہوا کہ آدم کی اولاد میں فسادیوں اور بُرے لوگوں کے علاوہ کیسے کیسے صلحا و متقین ہوں گے۔ انسان کا سب سے بڑا جرم، انکارِ رب کے بعد، زمین میں فساد کرنا اور خون بہانا ہے۔ کسی فرد یا گروہ کے لیے جائز نہیں کہ وہ ایسی کارروائیاں کرے جس کے نتیجے میں زمین پر خدا کا قائم کیا ہوا فطری نظام بگڑ جائے، انسان انسان کی جان مارنے لگے۔ ایسا ہر فعل آدمی کو خدا کی رحمتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ زمین میں خدا کے بنائے ہوئے فطری نظام کا قائم رہنا اس کی اصلاح ہے اور زمین کے فطری نظام کو بگاڑنا اس کا فساد۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ
فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫
وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٤ وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ
اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا
رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٣٥
فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا
كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ
اِلٰى حِيْنٍ ۝٣٦ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ
فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ ۝٣٧ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ
فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ

۳۴۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور منکروں میں سے ہو گیا۔ ۳۵۔ اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں سے کھاؤ آسودگی کے ساتھ جہاں سے چاہو۔ اور اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ ۳۶۔ پھر شیطان نے اس درخت کے ذریعہ دونوں کو لغزش میں مبتلا کر دیا اور ان کو اس عیش سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا تم سب اترو یہاں سے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ اور تمھارے لیے زمین میں ٹھہرنا اور کام چلانا ہے ایک مدت تک۔ ۳۷۔ پھر آدم نے سیکھ لیے اپنے رب سے چند بول تو اللہ اس پر متوجہ ہوا۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ۳۸۔ ہم نے کہا تم سب یہاں سے اترو۔ پھر جب آئے تمھارے پاس میری

هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ۝٣٨ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝٣٩ ع

طرف سے کوئی ہدایت تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۳۹۔ اور جو لوگ انکار کریں گے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلائیں گے تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

آدم کو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور ابلیس کے درمیان کھڑا کیا اور سجدہ کے امتحان کے ذریعہ آدم کو عملی طور پر بتایا کہ ان کے لیے زمین پر دو ممکن راہیں ہوں گی۔ ایک فرشتوں کی طرح حکم الٰہی کے سامنے جھک جانا، خواہ اس کا مطلب اپنے سے کمتر ایک بندے کے آگے جھکنا کیوں نہ ہو۔ دوسرا ابلیس کی طرح اپنے کو بڑا سمجھنا اور دوسرے کے آگے جھکنے سے انکار کر دینا۔ انسان کی پوری زندگی اسی امتحان کی رزم گاہ ہے۔ یہاں ہر وقت آدمی کو 2 رویوں میں سے کسی ایک رویہ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ ایک ملکوتی رویہ، یعنی دنیا کی زندگی میں جو معاملہ بھی پیش آئے، اللہ کے حکم کی تعمیل میں آدمی حق وانصاف کے آگے جھک جائے۔ دوسرا شیطانی رویہ، یعنی جب کوئی معاملہ پیش آئے تو آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جاگ اٹھیں اور وہ ان کے زیر اثر آ کر صاحب معاملہ کے آگے جھکنے سے انکار کر دے۔

ممنوعہ درخت کا معاملہ بھی اسی ذیل کا ایک عملی سبق ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر ایک عورت اور مرد کے لیے کوئی نہ کوئی شجر ممنوعہ (forbidden tree) ہوتا ہے۔ انسان کے بھٹکنے کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آجائے اور اس حد میں قدم رکھ دے جس میں جانے سے اللہ نے منع کیا ہے۔ ”منع کیے ہوئے پھل“ کو کھاتے ہی آدمی اللہ کی نصرت، بالفاظ دیگر جنت کے استحقاق سے محروم ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ محرومی ایسی نہیں ہے جس کی تلافی نہ ہو سکتی ہو۔ یہ امکان آدمی کے لیے پھر بھی کھلا رہتا ہے کہ وہ دوبارہ اپنے رب کی طرف لوٹے اور اپنے رویہ کو درست کرتے ہوئے اللہ سے معافی کا طلب گار ہو۔ جب بندہ اس طرح پلٹتا ہے تو اللہ بھی اس کی طرف پلٹ آتا ہے اور اس کو اس طرح پاک کر دیتا ہے گویا اس نے گناہ ہی نہیں کیا تھا۔

کسی انسانی آبادی میں اللہ کی دعوت کا اٹھنا بھی اسی قسم کا ایک سخت امتحان ہے۔ داعیٔ حق بھی گویا ایک ”آدم“ ہوتا ہے جس کے سامنے لوگوں کو جھک جانا ہے۔ اگر وہ اپنے کبر اور اپنے تعصب کی وجہ سے اس کا اعتراف نہ کریں تو گویا کہ انھوں نے ابلیس کی پیروی کی۔ خدا اس دنیا میں عیاناً سامنے نہیں آتا، وہ اپنی نشانیوں کے ذریعہ لوگوں کو جانچتا ہے۔ جس نے خدا کی نشانی میں خدا کو پایا اسی نے خدا کو پایا اور جس نے خدا کی نشانی میں خدا کو نہیں پایا وہ خدا سے محروم رہا۔

”تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے“۔ دشمنی (عداوت) ایک اخلاقی برائی ہے۔ مگر یہاں دشمنی مطلق معنی

میں نہیں ہے۔دنیا کے خالق نے اس دنیا کو آزادی اور مسابقت (competition) کے اصول پر بنایا ہے۔ یہاں ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ جب انسان اپنی آزادی کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے تو اس سے فطری طور پر دنیا میں مسابقت اور چیلنج کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ہمیشہ ایک کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ ایذاء (harm) کا تجربہ ہوتا ہے۔ مگر انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ یہی دشمنی (بمعنی کامپٹیشن) دنیا کی تمام ترقیوں کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ اس دنیا میں دشمن ہی کسی انسان کا سب سے بڑا مددگار ہے۔ نادان دوست غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور دشمن آدمی کو چوکنا رکھتا ہے۔

يٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ‌ۚ وَاِيَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ‌ۖ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ۡوَّاِيَّایَ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَـقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوا الۡحَـقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ‌ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَۙ ﴿۴۵﴾ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾ ع ۵

۴۰۔ اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس احسان کو جو میں نے تمھارے اوپر کیا۔ اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا، اور میرا ہی ڈر رکھو۔ ۴۱۔ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے۔ تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمھارے پاس ہے۔ اور تم سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے نہ بنو۔ اور نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا۔ اور مجھ سے ڈرو۔ ۴۲۔ اور صحیح میں غلط کو نہ ملاؤ اور سچ کو نہ چھپاؤ، حالاں کہ تم جانتے ہو۔ ۴۳۔ اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور جھکنے والوں کے ساتھ جھک جاؤ۔ ۴۴۔ تم، لوگوں سے نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ حالاں کہ تم کتاب کو پڑھتے ہو، کیا تم سمجھتے نہیں۔ ۴۵۔ اور مدد چاہو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ بھاری ہے، مگر ان لوگوں پر نہیں جو ڈرنے والے ہیں۔ ۴۶۔ جو گمان رکھتے ہیں کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

یہود یا بنی اسرائیل کون ہیں۔ یہ حضرت ابراہیم کے پوتے، حضرت یعقوب بن اسحاق کی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ حضرت یعقوب کے چوتھے بیٹے کا نام یہودا (Juda) تھا۔ اُن سے منسوب ہو کر بعد کو یہ

لوگ عام طور پر یہودی کہے جانے لگے۔ حضرت یعقوب کا عُرفی نام اسرائیل تھا۔ اس نسبت سے قوم یہود کو بنی اسرائیل (Children of Israel) بھی کہا جاتا ہے۔

قرآن میں امت یہود کا ذکر مختلف مقامات پر آیا ہے، اور ان کی تنقید کی گئی ہے۔ یہ تنقید اصلاً یہود کی شکایت کے طور پر نہیں ہے، بلکہ وہ امت مسلمہ کی نصیحت کے طور پر ہے۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو ان کا کیا حال ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن میں امت یہود (یا نصاری) کے حوالے سے اسی زوال کے ظاہرے کی نشاندہی فرمائی ہے، اور اہل ایمان کو بتایا ہے کہ اس وقت انھیں کیا کرنا چاہیے۔

کسی گروہ پر اللہ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ وہ اس کے پاس اپنا پیغمبر بھیجے اور اس کے ذریعے اس گروہ کے اوپر ابدی فلاح کا راستہ کھولے۔ نبی آخرالزماں کی بعثت سے پہلے یہ نعمت بنی اسرائیل کو دی گئی تھی مگر مدت گزرنے کے بعد ان کا دین ان کے لیے ایک قسم کی تقلیدی رسم بن گیا تھا، نہ کہ شعوری فیصلہ کے تحت اختیار کی ہوئی ایک چیز۔ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے حقیقت کھول دی۔ ان میں سے جن افراد کا شعور زندہ تھا وہ فوراً آپ کی صداقت کو پہچان گئے اور آپ کے ساتھی بن گئے۔ اور جن لوگوں کے لیے ان کا دین آبائی رواج بن چکا تھا ان کو آپ کی آواز نامانوس آواز لگی، وہ بدک گئے اور آپ کے مخالف بن کر کھڑے ہو گئے۔

اگرچہ آپ کی نبوت کے بارے میں پچھلی آسمانی کتابوں میں اتنی واضح علامتیں تھیں کہ ان کے ماننے والوں کے لیے آپ کی صداقت کو سمجھنا مشکل نہ تھا، مگر دنیوی مفاد اور مصلحتوں کی خاطر انھوں نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ صدیوں کے عمل سے ان کے یہاں جو مذہبی ڈھانچہ بن گیا تھا اس میں ان کو سرداری حاصل ہوگئی تھی۔ وہ بزرگوں کی گدیوں پر بیٹھ کر عوام کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ مذہب کے نام پر طرح طرح کے نذرانے سال بھر ان کو ملتے رہتے تھے۔ ان کو نظر آیا کہ اگر انھوں نے نبی عربی کو سچا مان لیا تو ان کی مذہبی بڑائی ختم ہوجائے گی۔ مفادات کا سارا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔ اہل کتاب کو چوں کہ اس وقت عرب میں مذہب کی نمائندگی کا مقام حاصل تھا، لوگ ان سے نبی عربی کی بابت پوچھتے۔ وہ اپنے زوال یافتہ ذہنیت کی بنا پر معصومانہ انداز میں کوئی ایسی شوشہ کی بات کہہ دیتے جس سے پیغمبر کی ذات اور آپ کا مشن لوگوں کی نظر میں مشتبہ ہوجائے۔ اپنے وعظوں میں وہ لوگوں سے کہتے کہ حق پرست بنو اور حق کا ساتھ دو۔ مگر عملاً جب خود ان کے لیے حق کا ساتھ دینے کا وقت آیا تو وہ حق کا ساتھ نہ دے سکے۔

خدا کی پکار پر لبیک کہنا جب اس قیمت پر ہو کہ آدمی کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ بدلنا پڑے، عزت وشرف کی گدیوں سے اپنے کو اتارنا ہو تو یہ وقت ان لوگوں کے لیے بڑا سخت ہوتا ہے جو اِنھیں دنیوی جلووں میں اپنا مذہبی مقام بنائے ہوئے ہوں، مگر وہ لوگ جو خشوع کی سطح پر جی رہے ہوں ان کے لیے یہ چیزیں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ وہ اللہ کی یاد میں، اللہ کے لیے خرچ کرنے میں، اللہ کے حکم کے آگے جھک جانے میں اور اللہ کے لیے صبر کرنے میں وہ چیز پالیتے ہیں جو دوسرے لوگ دُنیا کے تماشوں میں پاتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ڈرنے کی چیز اللہ کا غضب ہے، نہ کہ دنیوی اندیشے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ
نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا
شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ
يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ
يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ
بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ
الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ
اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى
اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ
بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ
اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ
يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ
الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ
فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ
لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ

۴۷۔اے بنی اسرائیل، میرے اس احسان کو یاد
کرو جو میں نے تمھارے اوپر کیا اور اس بات کو
کہ میں نے تم کو دنیا والوں پر فضلیت دی۔
۴۸۔اور ڈرو اس دن سے کہ کوئی جان کسی
دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی۔ نہ اس کی
طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی۔ اور نہ اس
سے بدلے میں کچھ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی
مدد کی جائے گی۔ ۴۹۔اور جب ہم نے تم کو
فرعون کے لوگوں سے چھڑایا۔ وہ تم کو بڑی تکلیف
دیتے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور
تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے۔ اور اس میں
تمھارے رب کی طرف سے بھاری آزمائش
تھی۔ ۵۰۔اور جب ہم نے دریا کو پھاڑ کر تمھیں
پار کرایا۔ پھر بچایا تم کو، اور ڈبادیا فرعون کے
لوگوں کو اور تم دیکھتے رہے۔ ۵۱۔اور جب ہم
نے موسیٰ سے وعدہ کیا چالیس رات کا۔ پھر تم نے
اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ظالم
تھے۔ ۵۲۔ پھر ہم نے اس کے بعد تم کو معاف
کردیا، تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۵۳۔ اور جب ہم
نے موسیٰ کو کتاب دی اور فیصلہ کرنے والی چیز
تاکہ تم راہ پاؤ۔ ۵۴۔اور جب موسیٰ نے اپنی قوم
سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو
معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اب اپنے
پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ ہو اور اپنے
مجرموں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرو۔ یہ تمھارے
لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر
ہے۔ تو اللہ نے تمھاری توبہ قبول فرمائی۔ بے
شک وہی توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا
ہے۔ ۵۵۔اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم

الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

تمھارا یقین نہیں کریں گے، جب تک ہم اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں تو تم کو بجلی نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ ۵۶۔ پھر ہم نے تمھاری موت کے بعد تم کو اٹھایا تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۵۷۔ اور ہم نے تمھارے اوپر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انھوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا، وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا پر فضیلت دی تھی۔ یعنی ان کو اپنے اس خاص کام کے لیے چنا تھا کہ ان کے پاس اپنی وحی بھیجے اور ان کے ذریعہ دوسری قوموں کو اپنی مرضی سے باخبر کرے۔ پھر اس منصب کی نسبت سے ان کو اور بہت سی نعمتیں اور سہولتیں دی گئیں۔ اپنے دشمنوں پر غلبہ، وقتی لغزشوں سے درگزر، غیر معمولی حالات میں غیر معمولی نصرت اور ''خداوند کی طرف سے ان کے لیے روٹی کا انتظام'' وغیرہ۔ اس سے ان کی بعد کی نسلیں اس غلط فہمی میں پڑ گئیں کہ ہم اللہ کی خاص امت ہیں۔ ہم ہر حال میں آخرت کی کامیابی حاصل کریں گے۔ مگر خدا کے اس قسم کے معاملات کسی کے لیے موروثی نہیں ہوتے۔ کسی گروہ کے اگلے لوگوں کا فیصلہ ان کے پچھلے لوگوں کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا بلکہ ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے۔ خدا کے انصاف کا دن اتنا سخت ہوگا کہ وہاں اپنے عمل کے سوا کوئی بھی دوسری چیز کسی کے کام آنے والی نہیں۔

سچی دین داری یہ ہے کہ آدمی اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ بنائے۔ اللہ کو دیکھے بغیر اللہ پر یقین کرے۔ آخرت کے حساب سے ڈر کر زندگی گزارے۔ پاک روزی سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ جن لوگوں پر اس کو اختیار حاصل ہے ان کو جرم کرنے سے روک دے۔

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع ۶
وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ

۵۸۔ اور جب ہم نے کہا کہ داخل ہو جاؤ اس شہر میں اور کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ، اور داخل ہو دروازہ میں سر جھکائے ہوئے اور کہو کہ اے رب! ہماری خطاؤں کو بخش دے۔ ہم تمھاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ بھی دیں گے۔ ۵۹۔ تو انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے۔ اس پر ہم نے ان لوگوں کے اوپر جنھوں نے ظلم کیا، ان کی نافرمانی کے

بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ
مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا
تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝٦٠ وَإِذْ قُلْتُمْ
يَا مُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ مِن
بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ
قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ
خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ وَ
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَاءُو
بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ
بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ
ع ۱۳/۶ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝٦١

سبب سے، آسمان سے عذاب اُتارا۔ ۶۰۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو تو اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد مچانے والے بن کر۔ ۶۱۔ اور جب تم نے کہا اے موسیٰ، ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہر گز صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب کو ہمارے لیے پکارو کہ وہ نکالے ہمارے لیے جو اگتا ہے زمین سے، ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا کیا تم ایک بہتر چیز کے بدلے ایک ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو۔ کسی شہر میں اترو تو تم کو ملے گی وہ چیز جو تم مانگتے ہو۔ اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور وہ غضبِ الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد پر نہ رہتے تھے۔

پچھلی آسمانی کتابوں کو ماننے والی قوموں پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعامات کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ خدا کے شکر گزار بندے بنتے۔ مگر انھوں نے بالکل برعکس ثبوت دیا۔ مثلاً ایک بڑا شہر یہود کے قبضہ میں دے دیا گیا اور کہا گیا کہ اس میں داخل ہو تو فاتحانہ غرور اور شان وشوکت سے نہیں بلکہ عجز کے ساتھ اور اللہ سے معافی مانگتے ہوئے۔ مگر وہ اس کے بجائے تفریحی کلمات بولنے لگے۔ ان کو من وسلویٰ کی قدرتی غذائیں دی گئیں تاکہ وہ معاشی جدوجہد سے فارغ رہ کر احکام الٰہی کی بجا آوری میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہوں مگر انھوں نے چٹپٹے اور مسالہ دار کھانوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ انھوں نے دنیا میں ضرورت پر قناعت نہ کرکے لذت کی تلاش کی۔ ان کی بے حسی اتنی بڑھی کہ اللہ کی کھلی کھلی نشانیاں بھی ان کے دلوں کو پگھلانے کے لیے کافی ثابت نہ ہوئیں۔ ان کی تنبیہ کے لیے جو اللہ کے بندے اُٹھے ان کا انھوں نے انکار کیا۔ ان میں یہ ڈھٹائی اس لیے پیدا ہوئی کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ نجات یافتہ گروہ ہیں۔ مگر خدا کے یہاں نسلی اور گروہی بنیاد پر کوئی فیصلہ ہونے والا نہیں۔ ایک یہودی کو بھی اسی خدائی قانون سے جانچا جائے گا جس سے ایک کرسچن یا مسلمان، وغیرہ کو جانچا

جائے گا۔ جنت اسی کے لیے ہے جو جنت والے عمل کرے، نہ کہ کسی نسل یا گروہ کے لیے۔

زمین کے اوپر شکر، صبر، تواضع اور قناعت کے ساتھ رہنا زمین کی اصلاح ہے۔ اس کے برعکس، ناشکری، بے صبری، گھمنڈ اور حرص کے ساتھ رہنا زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ کیوں کہ اس سے خدا کا قائم کیا ہوا فطری نظام ٹوٹتا ہے۔ یہ حد سے نکل جانا ہے جب کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ ہر ایک اپنی حد کے اندر عمل کرے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

۶۲۔ یوں ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، ان میں سے جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اس نے نیک کام کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔

آیت میں چار گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک، مسلمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ دوسرے، یہود جو اپنے کو حضرت موسیٰ کی امت کہتے ہیں۔ تیسرے، نصاریٰ جو حضرت مسیح کی امت ہونے کے دعویدار ہیں۔ چوتھے، صابی جو اپنے کو حضرت یحییٰ کی امت بتاتے تھے اور قدیم زمانے میں عراق کے علاقہ میں آباد تھے۔ وہ اہلِ کتاب تھے اور کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ مگر اب صابی فرقہ ختم ہو چکا ہے۔ دنیا میں اب اس کا کہیں وجود نہیں۔

یہاں مسلمانوں کو الگ نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کا اور دوسرے پیغمبروں سے نسبت رکھنے والی امتوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گروہ ہونے کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک سب برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ گروہ کے اعتبار سے ایک گروہ اور دوسرے گروہ میں کوئی فرق نہیں۔ سب کی نجات کا ایک ہی محکم اصول ہے، اور وہ ہے ایمان اور عمل صالح۔ کوئی گروہ اپنے کو خواہ مسلمان کہتا ہو یا وہ اپنے کو یہودی یا مسیحی یا صابی کہے، ان میں سے کوئی بھی محض ایک مخصوص گروہ ہونے کی بنا پر خدا کے یہاں کوئی خصوصی درجہ نہیں رکھتا۔ درجہ کا اعتبار اس پر ہے کہ کس نے خدا کی منشا کے مطابق اپنی عملی زندگی کو ڈھالا۔

نبی کے زمانہ میں جب اس کے ماننے والوں کا گروہ بنتا ہے تو اس کی بنیاد ہمیشہ ایمان اور عمل صالح پر ہوتی ہے۔ اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ نبی کی پکار سن کر کچھ لوگوں کے اندر ذہنی اور فکری انقلاب آتا ہے۔ ان کے اندر ایک نیا عزم جاگتا ہے۔ ان کی زندگی کا نقشہ جو اب تک ذاتی خواہشوں کی بنیاد پر چل رہا تھا وہ خدائی تعلیمات کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ یہی لوگ حقیقی معنوں میں نبی کی امت ہوتے ہیں۔ ان کے لیے نبی کی زبان سے آخرت کی نعمتوں کی بشارت دی جاتی ہے۔

مگر بعد کی نسلوں میں صورت حال بدل جاتی ہے۔ اب خدا کا دین ان کے لیے ایک قسم کی قومی روایت بن جاتا ہے۔ جو بشارتیں ایمان وعمل کی بنیاد پر دی گئی تھیں ان کو محض گروہی تعلق کا نتیجہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ وہ گمان کر لیتے ہیں کہ ان کے گروہ کا اللہ سے کوئی خاص رشتہ ہے جو دوسرے لوگوں سے نہیں ہے۔ جو شخص اس مخصوص گروہ سے تعلق رکھے، خواہ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے وہ کیسا ہی ہو، بہر حال اس کی نجات ہو کر رہے گی۔ جنت اس کے اپنے گروہ کے لیے ہے اور جہنم صرف دوسرے گروہوں کے لیے۔

مگر اللہ کا کسی گروہ سے خصوصی رشتہ نہیں۔ اللہ کے یہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ صرف اس بات کا ہے کہ آدمی اپنے فکر اور عمل میں کیسا ہے۔ آخرت میں آدمی کے انجام کا فیصلہ اس کے حقیقی کردار کی بنیاد پر ہوگا، نہ کہ گروہی نسبتوں کی بنیاد پر۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَكُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِيۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡكُمۡ فِى السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـئِيۡنَ ۚ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۳۔ اور جب ہم نے تم سے تمھارا عہد لیا اور طور پہاڑ کو تمھارے اوپر اٹھایا۔ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ، اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم بچو۔ ۶۴۔ اس کے بعد تم اس سے پھر گئے۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ضرور تم ہلاک ہو جاتے۔ ۶۵۔ اور ان لوگوں کا حال تم جانتے ہو جو سبت (سنیچر) کے معاملہ میں اللہ کے حکم سے نکل گئے تو ہم نے ان کو کہا کہ تم لوگ ذلیل بندر بن جاؤ۔ ۶۶۔ پھر ہم نے اس کو عبرت بنا دیا ان لوگوں کے لیے جو اس کے روبرو تھے اور ان لوگوں کے لیے جو اس کے بعد آئے۔ اور اس میں ہم نے نصیحت رکھ دی ڈر والوں کے لیے۔

بائبل کی روایت بتاتی ہیں کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں جب یہود سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ خدائی تعلیمات پر ٹھیک ٹھیک عمل کریں گے تو ''خدا نے پہاڑ کو ان کے اوپر الٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ توریت کو یا تو قبول کرو ورنہ یہیں تم سب کو ہلاک کر دیا جائے گا (تالمود)۔ یہی معاملہ ہر اس شخص کا ہے جو اللہ پر ایمان لاتا ہے۔ ایمان لانا گویا اللہ سے یہ عہد کرنا ہے کہ آدمی کا جینا اور مرنا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ یہ ایک بے حد سنگین اقرار ہے۔ اس میں ایک طرف عاجز بندہ ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ خدا ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں آسمان وزمین کی طاقتیں ہیں۔ اگر بندہ اپنے عہد پر پورا اترے تو اس کے لیے خدا کی لازوال نعمتیں ہیں۔ اور اگر وہ عہد کر کے اس سے پھر جائے تو اس کے لیے یہ شدید خطرہ ہے کہ اس کا خدا اس کو جہنم میں ڈال دے جہاں وہ اس طرح جلتا رہے کہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ اس کے لیے باقی نہ ہو۔

ایمانی عہد کے وقت حضرت موسیٰ کی قوم پر جو کیفیت گزری تھی وہی ہر بندۂ مومن سے مطلوب ہے — ہر شخص جو اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ ایمان کی رسّی میں باندھتا ہے، اس کو اس کی سنگینی سے اس طرح کانپنا چاہیے گویا کہ اس نے اگر اس عہد کے خلاف کیا تو ”زمین و آسمان اس کے اوپر گر پڑیں گے“۔

ایک گروہ جس کو اللہ کی طرف سے شریعت دی جائے اس کی گمراہی کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ عملاً اس کے خلاف چلے اور تاویلوں کے ذریعے یہ ظاہر کرے کہ وہ عین خدا کے حکم پر قائم ہے۔ ان کو یہ حکم تھا کہ وہ ایک مخصوص دن کو روزہ اور عبادت کے لیے مخصوص رکھیں۔ اس دن کسی قسم کا کوئی دنیوی کام نہ کریں۔ مگر انھوں نے اس حرمت کو باقی نہ رکھا۔ وہ دوسرے دنوں کی طرح اس مخصوص دن بھی اپنے دنیوی کاروبار کرنے لگے۔ البتہ وہ طرح طرح کی لفظی تاویلوں سے ظاہر کرتے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ عین خدا کے حکم کے مطابق ہے۔ ان کی یہ ڈھٹائی اللہ کو اتنی ناپسند ہوئی کہ وہ بندر بنا دیے گئے — جب بھی آدمی شریعت سے انحراف کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو جانوروں کی سطح پر لے جاتا ہے جو کسی اخلاقی ضابطہ کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے جو لوگ ظاہر میں خدا کے دین کو ماننے کا اقرار کریں، مگر اس کے ساتھ اپنے دنیوی مفاد کے لیے حیلہ جوئی کا طریقہ اختیار کریں ان کو ڈرنا چاہیے کہ خدا کا قانون ان کو اسی حیوانی ذلت میں نہ مبتلا کر دے جس میں پچھلی قومیں اپنے اسی قسم کے فعل کی وجہ سے مبتلا ہوئے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ؕ وَ اِنَّاۤ اِنْ

۶۷۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم ایک بقرہ (گائے) ذبح کرو۔ انھوں نے کہا: کیا تم ہم سے ہنسی کر رہے ہو۔ موسیٰ نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں ایسا نادان بنوں ۶۸۔ انھوں نے کہا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہم سے بیان کرے کہ وہ بقرہ کیسی ہو۔ موسیٰ نے کہا، اللہ فرماتا ہے کہ وہ بقرہ نہ بوڑھی ہو نہ بچہ، ان کے بیچ کی ہو۔ اب کر ڈالو جو حکم تم کو ملا ہے۔ ۶۹۔ انھوں نے کہا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ بیان کرے کہ اس کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ نے کہا، اللہ فرماتا ہے کہ وہ گہرے زرد رنگ کی ہو۔ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو۔ ۷۰۔ انھوں نے کہا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہم سے بیان کر دے کہ وہ کیسی ہو۔ کیوں کہ

شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوۡلٌ تُثِيۡرُ الۡاَرۡضَ وَ لَا تَسۡقِى الۡحَـرۡثَ‌ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيۡهَا ‌ؕ قَالُوۡا الۡـــٰٔنَ جِئۡتَ بِالۡحَـقِّ‌ ؕ فَذَبَحُوۡهَا وَ مَا كَادُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾
ع ۸/۸
وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِيۡهَا ‌ؕ وَاللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ‌ۚ‏ ﴿۷۲﴾ فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا ‌ؕ كَذٰلِكَ يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى ۙ وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۳﴾

بقرہ میں ہم کو شبہ پڑ گیا ہے۔ اور اللہ نے چاہا تو ہم راہ پالیں گے۔ ۷۱۔ موسیٰ نے کہا، اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی بقرہ ہو کہ محنت کرنے والی نہ ہو، زمین کو جوتنے والی اور کھیتوں کو پانی دینے والی نہ ہو۔ وہ صحیح سالم ہو، اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ انھوں نے کہا: اب تم واضح بات لائے۔ پھر انھوں نے اس کو ذبح کیا۔ اور وہ ذبح کرتے نظر نہ آتے تھے۔ ۷۲۔ اور جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا، پھر ایک دوسرے پر اس کا الزام ڈالنے لگے۔ حالاں کہ اللہ کو ظاہر کرنا منظور تھا جو کچھ تم چھپانا چاہتے تھے۔ ۷۳۔ پس ہم نے حکم دیا کہ مارو اس مُردے کو اس کے ایک ٹکڑے سے۔ اس طرح زندہ کرتا ہے اللہ مُردوں کو۔ اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بنی اسرائیل میں قتل کا ایک واقعہ ہوا۔ قاتل کا پتہ لگانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کے واسطہ سے ان کو یہ حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کا گوشت مقتول پر مارو، مقتول اللہ کے حکم سے قاتل کا نام بتادے گا۔ یہ ایک معجزاتی تدبیر تھی جو چند مقاصد کے لیے اختیار کی گئی:

۱۔ مصر میں لمبی مدت تک قیام کرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل مصری تہذیب اور رسوم سے متاثر ہوگئے۔ مصری قوم گائے کو پوجتی تھی۔ چنانچہ مصریوں کے اثر سے بنی اسرائیل میں بھی گائے کے مقدس ہونے کا ذہن پیدا ہوگیا۔ جب مذکورہ واقعہ ہوا تو اللہ نے چاہا کہ اس واقعہ کے ذیل میں ان کے ذہن سے گائے کے تقدس کو توڑا جائے۔ چنانچہ قاتل کا پتہ لگانے کے لیے گائے کے ذبح کی تدبیر اختیار کی گئی۔

۲۔ اسی طرح بنی اسرائیل نے یہ غلطی کی تھی کہ فقہی موشگافی (hair splitting) اور بحث کے نتیجہ میں خدا کے سادہ دین کو ایک بوجھل دین بنا ڈالا تھا۔ چنانچہ مذکورہ واقعہ کے ذیل میں ان کو یہ سبق دیا گیا کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آئے اس کو سادہ معنوں میں لے کر فوراً اس کی تعمیل میں لگ جاؤ۔ کھود کرید کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا کہ حکم کی تفصیلات جاننے اور اس کے حدود متعین کرنے کے لیے موشگافیاں کرنے لگے تو تم سخت آزمائش میں پڑ جاؤ گے۔ اس طرح ایک سادہ حکم شرائط کا اضافہ ہوتے ہوتے ایک سخت حکم بن جائے گا جس کی تعمیل تمھارے لیے بے حد مشکل ہو۔

۳۔ اس واقعہ کے ذریعہ انسانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ دوسری زندگی اسی طرح ایک ممکن زندگی ہے جیسے پہلی زندگی۔ اللہ ہر آدمی کو مرنے کے بعد زندہ کر دے گا اور اس کو دوبارہ ایک نئی دنیا میں اٹھائے گا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝٧٤

۷۴۔ پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھر کی مانند ہو گئے یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے۔ اور بعض پتھر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔

خدا کے حکم کے بارے میں جو لوگ بحثیں اور تاویلیں کریں ان کے اندر دھیرے دھیرے بے حسی کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے دل سخت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کا نام سب سے بڑی ہستی کا نام ہے۔ آدمی کے اندر ایمان زندہ ہو تو خدا کا نام اس کو ہلا دیتا ہے۔ بولنے سے زیادہ اسے چپ لگ جاتی ہے۔ مگر جب دلوں میں جمود اور بے حسی آتی ہے تو خدا کی باتوں میں بھی اسی قسم کی بحثیں اور تاویلیں شروع کر دی جاتی ہیں جو عام انسانی کلام میں کی جاتی ہیں۔ اس قسم کا عمل ان کی بے حسی میں اور اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو جاتے ہیں۔ اب خدا کا تصور ان کے دلوں کو نہیں پگھلاتا، وہ ان کے اندر تڑپ پیدا نہیں کرتا۔ وہ ان کی روح کے اندر ارتعاش پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

پتھروں کا ذکر یہاں تمثیل کے طور پر کیا گیا ہے۔ خدا نے اپنی کائنات کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ آدمی کے لیے عبرت و نصیحت کا سامان بن گئی ہے۔ یہاں کی ہر چیز خاموش مثال کی زبان میں اسی مرضیٔ رب کا عملی نشان ہے جو مرضیٔ رب قرآن میں ان الفاظ کے ذریعہ بیان کی گئی ہے۔

پتھروں کے ذریعہ خدا نے اپنی دنیا میں جو تمثیلات قائم کی ہیں ان میں سے تین چیزوں کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

پہاڑوں پر ایک مشاہدہ یہ سامنے آتا ہے کہ پتھروں کے اندر سے پانی کے سوتے بہتے رہتے ہیں جو بالآخر مل کر دریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اس انسان کی تمثیل ہے جس کے دل میں اللہ کا ڈر بسا ہوا ہو اور وہ آنسوؤں کی صورت میں اس کی آنکھ سے بہہ پڑتا ہے۔

دوسری مثال اس پتھر کی ہے جو بظاہر خشک چٹان معلوم ہو، مگر جب توڑنے والے اس کو توڑتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نیچے پانی کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ایسی چٹانوں کو توڑ کر کنوئیں بنائے جاتے ہیں۔ یہ اس انسان کی تمثیل ہے جو بظاہر خدا سے دور معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس پر ایک حادثہ گزرا۔ اس حادثے نے اس کی روح کو ہلا دیا۔ وہ آنسوؤں کے سیلاب کے ساتھ خدا کی طرف دوڑ پڑا۔

پتھروں کی دنیا میں تیسری مثال ہبوط (لینڈ سلائڈ) کی ہے۔ یعنی پہاڑوں کے اوپر سے پتھر کے ٹکڑوں کا

لڑھک کر نیچے آجانا۔ یہ اس انسان کی تمثیل ہے جس نے کسی انسان کے مقابلے میں غلط رویہ اختیار کیا۔ اس کے بعد اس کے سامنے خدا کا حکم پیش کیا گیا۔ خدا کا حکم سامنے آتے ہی وہ ڈھ پڑا۔ انسان کے سامنے وہ جھکنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر جب انسان کا معاملہ خدا کا معاملہ بن گیا تو وہ عاجزانہ طور پر اس کے آگے گر پڑا۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَ قَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِهٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۵۔ کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ یہ یہود تمھارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے۔ حالاں کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ اللہ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو بدل ڈالتے تھے سمجھنے کے بعد، اور وہ جانتے ہیں۔ ۷۶۔ جب وہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اور جب وہ آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم ان کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمھارے رب کے پاس تم سے حجت کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔ ۷۷۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

مدینہ کے لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان کے اس قدر جلد آپ کو پہچان لینے اور آپ کو مان لینے کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ یہودی پڑوسیوں سے اکثر سنتے رہتے تھے کہ ایک آخری نبی آنے والے ہیں۔ اس بنا پر نبی آخر الزماں کی آمد کی خبر ان کے لیے ایک مانوس خبر تھی۔ یہ مسلمان طبعی طور پر اس امید میں تھے کہ جن یہودیوں کی باتیں سن کر ان کے دل کے اندر قبولِ اسلام کا ابتدائی جذبہ ابھرا تھا وہ یقیناً خود بھی آگے بڑھ کر اس پیغمبر کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ وہ پُر جوش طور پر ان یہودیوں کے پاس اسلام کا پیغام لے کر جاتے اور ان کو دعوت دیتے کہ وہ آپ پر ایمان لا کر آپ کا ساتھ دینے والے بنیں۔

مگر مسلمانوں کو اس وقت سخت دھکا لگتا جب وہ دیکھتے کہ ان کی امیدوں کے برعکس یہودِ مدینہ ان کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک اور فتنہ پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ فتنہ یہ تھا کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے کہ پیغمبر اسلام کا معاملہ اتنا یقینی نہیں جتنا تم لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ اگر وہ اتنا یقینی ہوتا تو مدینہ کے یہ یہودی علماء ضرور ان کی طرف دوڑ پڑتے۔ کیوں کہ وہ آسمانی کتابوں کے بارے میں تم سے زیادہ جانتے ہیں۔

مگر کسی بات کو قبول کرنے کے لیے اس بات کا جاننا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس بات کے بارے میں سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ پچھلی قوموں کا حال یہ تھا کہ انھوں نے خود اپنے پاس کی ان کتابوں میں تبدیلیاں کر ڈالیں جن کو وہ آسمانی کتابیں مانتے تھے۔ اپنی مقدس کتابوں میں وہ جس بات کو اپنی خواہش کے خلاف دیکھتے اس میں تاویل یا تحریف کرکے اس کو اپنی خواہش کے مطابق بنا لیتے۔ وہ اپنے دین کو اپنے دنیوی مفادات کے تابع بنائے ہوئے تھے۔ جو لوگ اپنے عمل سے اس قسم کی غیر سنجیدگی کا ثبوت دے رہے ہوں وہ اپنے سے باہر کسی حق کو ماننے پر کیسے راضی ہو جائیں گے۔

کوئی بات خواہ کتنی ہی برحق ہو، اگر آدمی اس کا انکار کرنا چاہے تو وہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی تاویل ڈھونڈ لے گا۔ اس تاویل کی آخری صورت کا نام تحریف ہے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے معاملہ کی سنگینی آدمی کے دل سے نکل جاتی ہے۔ وہ خدا کے حکم کو سنتا ہے مگر لفظی تاویل کرکے مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا اپنا معاملہ اس حکم کی زد میں نہیں آتا۔ وہ خدا کو مانتا ہے مگر اس کی بے حسی اس کو ایسے ایسے کاموں کے لیے ڈھیٹ بنا دیتی ہے، جو کوئی ایسا آدمی ہی کر سکتا ہے جو نہ خدا کو مانتا ہو اور نہ یہ جانتا ہو کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور اس کی باتوں کو سن رہا ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ
النصف اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ
لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ
يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا
بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ
اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَ
قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا
مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا
فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى
اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٠﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً
وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

۷۸۔ اور ان میں ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو مگر آرزوئیں۔ ان کے پاس گمان کے سوا اور کچھ نہیں۔ ۷۹۔ پس خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑی سی پونجی حاصل کرلیں۔ پس خرابی ہے اس چیز کی بدولت جو ان کے ہاتھوں نے لکھی۔ اور ان کے لیے خرابی ہے اپنی اس کمائی سے۔ ۸۰۔ اور وہ کہتے ہیں ہم کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔ کہو، کیا تم نے اللہ کے پاس سے کوئی وعدہ لے لیا ہے کہ اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ کے اوپر ایسی بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ ۸۱۔ ہاں جس نے کوئی برائی کی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے

النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۲﴾ ع	لیا، تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۸۲۔ اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، وہ جنت والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

آرزوؤں (امانی) سے مراد وہ جھوٹے قصے کہانیاں ہیں جو خدائی کتاب کی حامل زوال یافتہ قوموں نے اپنے دین کے بارے میں گھڑ رکھی تھیں اور جو اپنی ظاہر فریبی کی وجہ سے عوام میں خوب پھیل گئی تھیں (أَكَاذِيبُ مُخْتَلِفَةٌ سَمِعُوهَا مِنْ عُلَمَائِهِمْ فَنَقَلُوهَا عَلَى التَّقْلِيدِ، قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ، وَاخْتَارَهُ الْفَرَّاءُ) البحر المحيط، جلد 1، صفحہ 445۔ ان قصے کہانیوں کا خلاصہ یہ تھا کہ جہنم کی آگ یہود کے لیے نہیں ہے۔ ان میں اپنے بزرگوں سے منسوب کر کے ایسی باتیں ملائی گئی تھیں جن سے یہ ثابت ہو کہ (وہ) اللہ کے خاص بندے ہیں۔ وہ جس دین کو مانتے ہیں اس میں ایسے طلسماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں کہ اس کی معمولی معمولی چیزیں بھی آدمی کو جہنم کی آگ سے بچانے اور جنت کے باغوں میں پہنچا دینے کے لیے کافی ہیں۔

سستی نجات کے یہ مقدس نسخے عوام کے لیے بہت کشش رکھتے تھے۔ کیوں کہ اس میں ان کو اپنی اس خوش خیالی کی تصدیق مل رہی تھی کہ ان کو اپنی غیر ذمہ دارانہ زندگی پر روک لگانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی جدوجہد کے بغیر محض ٹونے ٹوٹکے کی برکت سے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ جو دینی واعظین قدیم بزرگوں کے حوالے سے یہ خوش کن کہانیاں سناتے تھے ان کو لوگوں کے درمیان زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ آخرت کے معاملے کو آسان بنانا ان کے لیے شان دار دنیوی تجارت کا ذریعہ بن گیا۔ ان کے گرد عوام کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ ان کے اوپر نذرانوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ لوگوں کو مفت جنت حاصل کرنے کا راستہ بتاتے تھے، لوگوں نے اس کے بدلے ان کے لیے اپنی طرف سے مفت دنیا فراہم کر دی۔

یہی ہر دور میں حامل کتاب قوموں کا مرض رہا ہے۔ جو لوگ اس قسم کے لذیذ خوابوں میں جی رہے ہوں، جو یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ چند رسمی اعمال کے سوا ان پر کسی ذمہ داری کا بوجھ نہیں ہے۔ جو اس خوش گمانی میں مبتلا ہوں کہ ان کے سارے حقوق خدا کے یہاں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکے ہیں، ایسے لوگ سچے دین کی دعوت کو کبھی گوارا نہیں کرتے۔ کیوں کہ ایسی باتیں ان کو اپنی میٹھی نیند کو خراب کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، وہ ان کو زندگی کی برہنہ حقیقتوں کے سامنے کھڑا کر دیتی ہیں۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ ۚ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّ	۸۳۔ اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور نیک سلوک کرو گے ماں باپ کے ساتھ، قرابت

ذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا
الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَ
اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور یہ کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر تم اس سے پھر گئے سوا تھوڑے لوگوں کے۔ اور تم اقرار کرکے اس سے ہٹ جانے والے لوگ ہو۔

انسان کے اوپر اللہ کا پہلا حق یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبادت گزار بنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ دوسرا حق بندوں کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ اس حسن سلوک کا آغاز اپنے ماں باپ سے ہوتا ہے اور پھر رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے گزر کر ان تمام انسانوں تک پہنچ جاتا ہے جن سے عملی زندگی میں سابقہ پیش آئے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جب بھی کوئی معاملہ پڑے تو وہاں ایک ہی برتاؤ اپنے بھائی کے ساتھ درست ہے۔ اور وہ وہی ہے جو انصاف اور خیر خواہی کے مطابق ہو۔

اس معاملہ میں آدمی کا اصل امتحان ''یتیموں اور مسکینوں'' بالفاظ دیگر، کمزور افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو طاقت ور ہے اس کا طاقت ور ہونا خود اس بات کی ضمانت ہے کہ لوگ اس کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ مگر کمزور آدمی کے ساتھ حسن سلوک کے لیے اس قسم کا کوئی اضافی محرک نہیں۔ اس لیے سب سے زیادہ حسن سلوک جہاں مطلوب ہے وہ کمزور لوگ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہر چیز کی نفی ہوجاتی ہے وہاں خدا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کے ساتھ وہی شخص حسن سلوک کرے گا جو فی الواقع اللہ کی خوشنودی کے لیے ایسا کر رہا ہو۔ کیوں کہ وہاں کوئی دوسرا محرک موجود ہی نہیں۔

جب معاملہ کمزور آدمی سے ہو تو مختلف وجوہ سے حسن سلوک کا شعور دب جاتا ہے۔ کمزور آدمی کو مدد دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پانے والے کے مقابلہ میں دینے والا اپنے کو اونچا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ نفسیات کمزور آدمی کی عزت نفس کو ملحوظ رکھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ کمزور کی طرف سے متوقع نیازمندی کا اظہار نہ ہو تو فوراً اس کو نااہل سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کا اظہار مختلف تکلیف دہ صورتوں میں ہوتا رہتا ہے، ایک دو بار مدد کرنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص مستقل طور پر میرے سر نہ ہوجائے، اس لیے اس سے چھٹی لینے کی خاطر اس کے ساتھ غیر شریفانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے، وغیرہ۔

بھلی بات بولنا تمام اعمال کا خلاصہ ہے۔ ایک حقیقی خیر خواہی کا کلمہ کہنا آدمی کے لیے ہمیشہ سب سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ آدمی اچھی اچھی تقریریں کرتا ہے۔ مگر جب ایک اچھی بات کسی دوسرے کے اعتراف کے ہم معنی ہو تو آدمی ایسی اچھی بات منھ سے نکالنے کے لیے سب سے زیادہ بخیل ہوتا ہے۔ سامنے کا آدمی اگر بے زور ہے تو اس کے لیے شرافت کے الفاظ بولنا بھی وہ ضروری نہیں سمجھتا۔ اگر کسی سے شکایت یا برہمی پیدا ہوجائے تو آدمی سمجھ لیتا ہے کہ وہ انصاف کے ہر خدائی حکم سے اس کو مستثنیٰ کرنے میں حق بجانب ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ
وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ
اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ
هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا
مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ
بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى
تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ
بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ
اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ
يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

۸۴۔ اور جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا کہ تم اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے۔ اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ ۸۵۔ پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ ان کے مقابلہ میں ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ۔ پھر اگر وہ تمھارے پاس قید ہو کر آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر ان کو چھڑاتے ہو۔ حالاں کہ خود ان کا نکالنا تمھارے اوپر حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن ان کو سخت عذاب میں ڈال دیا جائے۔ اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔ ۸۶۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔ پس نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔

قدیم مدینہ کے اطراف میں تین غیر عرب قبیلے آباد تھے — بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع۔ یہ سب موسوی شریعت کو مانتے تھے۔ مگر ان کی زوال یافتہ ذہنیت نے ان کو الگ الگ گروہوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اپنی دنیوی سیاست کے تحت وہ مدینہ کے مشرک قبائل — اوس اور خزرج کے ساتھ مل گئے تھے۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ نے قبیلہ اوس کا ساتھ پکڑ لیا تھا۔ بنو قینقاع قبیلہ خزرج کے حلیف بنے ہوئے تھے۔ اس طرح دو گروہ بن کر وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ جنگ بعاث اسی قسم کی ایک جنگ تھی جو ہجرت نبوی سے پانچ سال پہلے واقع ہوئی۔ ان لڑائیوں میں یہ اہل کتاب مشرک قبائل کے ساتھ مل کر دو دو گروپس میں تقسیم ہو جاتے۔ ایک گروپ میں شامل ہونے والے اہل کتاب مشرکین کے ساتھ مل کر دوسرے گروپ میں شامل ہونے والے اہل کتاب کو قتل کرتے اور ان کو ان کے گھروں سے بے گھر کرتے۔ پھر جب جنگ ختم ہو جاتی تو وہ تورات خدائی کتاب کا حوالہ دے کر اپنے ہم مذہبوں سے چندہ کی اپیلیں کرتے تا کہ اپنے گرفتار بھائیوں کو فدیہ دے کر مشرک قبائل کے ہاتھ

سے چھڑایا جا سکے۔ انسان کے جان و مال کے احترام کے بارے میں وہ خدا کے حکم کو توڑتے اور پھر اپنی ظالمانہ سیاست کا شکار ہونے والوں کے ساتھ نمائشی ہمدردی کر کے ظاہر کرتے کہ وہ بہت دیندار ہیں۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کو ناحق قتل کر دیا جائے اور اس کے بعد شرعی طریقہ پر اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے—— شریعت کے اصلی اور اساسی احکام آدمی سے جاہلی زندگی چھوڑنے کے لیے کہتے ہیں۔ وہ اس کی خواہش نفس سے ٹکراتے ہیں۔ وہ اس کی دنیا دارانہ سیاست پر روک لگاتے ہیں، اس لیے آدمی ان احکام کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ حقیقی دین داری کے جوئے میں اپنے کو ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ معمولی اور نمائشی چیزوں کی دھوم مچا کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدا کے دین پر پوری طرح قائم ہے۔ مگر یہ خدا کے دین کا خود ساختہ ایڈیشن تیار کرنا ہے۔ یہ دین کے اخروی پہلو کو نظر انداز کرنا ہے اور دین کے بعض وہ پہلو جو اپنے اندر دنیوی رونق اور شہرت رکھتے ہیں ان میں دین داری کا کمال دکھانا ہے۔ دین میں اس قسم کی جسارت آدمی کو اللہ کے غضب کا مستحق بناتی ہے، نہ کہ اللہ کے انعام کا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ
بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ
مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى
اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫
وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا
غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ
فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ
كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ
وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا
عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ

۸۷۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ اور عیسیٰ بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح پاک سے اس کی تائید کی۔ تو جب بھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا جس کو تمھارا دل نہیں چاہتا تھا تو تم نے تکبر کیا۔ پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو مار ڈالا۔ ۸۸۔ اور یہود کہتے ہیں کہ ہمارے دل بند ہیں۔ نہیں، بلکہ اللہ نے ان کے انکار کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی ہے۔ اس لیے وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ ۸۹۔ اور جب آئی اللہ کی طرف سے ان کے پاس ایک کتاب جو سچا کرنے والی ہے اس کو جو ان کے پاس ہے اور وہ پہلے سے منکروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔ پھر جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو انھوں نے پہچان رکھا تھا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس اللہ کی لعنت ہے انکار کرنے والوں پر۔ ۹۰۔ کیسی بری ہے وہ چیز جس سے انھوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کہ وہ انکار کر

اَنۡفُسَهُمۡ اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بَغۡيًا اَنۡ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۹۰﴾

رہے ہیں اللہ کے اتارے ہوئے کلام کا اس ضد کی بنا پر کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اُتارے۔ پس وہ غصہ پر غصہ کما کر لائے اور انکار کرنے والوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

تورات اللہ کی کتاب تھی جو بنی اسرائیل پر اتری مگر دھیرے دھیرے تورات کی حیثیت ان کے یہاں قومی تبرک کی ہوگئی۔ قومی عظمت اور نجات کی علامت کے طور پر اب بھی وہ اس کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ مگر رہنما کتاب کے مقام سے اس کو انھوں نے ہٹا دیا تھا۔ حضرت موسیٰ کے بعد بار بار ان کے درمیان انبیا اٹھے، مثلاً یوشع نبی، داؤد نبی، زکریا نبی، یحییٰ نبی، وغیرہ۔ ان کے آخری نبی حضرت عیسیٰ تھے۔ یہ تمام انبیا ان کو یہ نصیحت دینے کے لیے آئے کہ خدائی تعلیمات کو اپنی عملی زندگیوں میں شامل کرو۔ مگر تورات کے تقدس پر ایمان رکھنے کے باوجود یہ آوازان کے لیے تمام آوازوں سے زیادہ ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی۔ وہ خدا کے نبیوں کو نبی ماننے سے انکار کرتے، حتی کہ ان کو قتل کر ڈالتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تورات کے نام پر وہ جس زندگی کو اختیار کیے ہوئے تھے وہ حقیقۃً نفسانیت اور دنیا پرستی کی ایک زندگی تھی، جس کے اوپر انھوں نے خدا کی کتاب کا لیبل لگا لیا تھا۔ خدا کے نبی جب بے آمیز حق کی دعوت پیش کرتے تو ان کو نظر آتا کہ یہ دعوت ان کی مذہبی حیثیت کی نفی کر رہی ہے۔ اب ان کے اندر گھمنڈ کی نفسیات جاگ اٹھتیں۔ وہ نبیوں کے اعتراف کے بجائے ان کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتے۔

یہی معاملہ قدیم عرب کے یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا۔ وہ اپنی کتابوں میں آخری رسول کی پیشین گوئی کو دیکھ کر کہتے کہ جب وہ نبی آئے گا تو ہم اس کے ساتھ مل کر کافروں اور مشرکوں کو زیر کریں گے۔ مگر ان کی یہ بات محض ایک جھوٹی تقریر تھی جو اپنے کو مذہب کا پاسبان ظاہر کرنے کے لیے وہ کرتے تھے۔ چنانچہ ''وہ نبی'' آیا تو ان کی حقیقت کھل گئی۔ ان کے جاہلی تعصّبات اپنے گروہ سے باہر کے ایک نبی کا اعتراف کرنے میں رکاوٹ بن گئے۔ قرآن میں آپ کی صداقت کے بارے میں جو واضح دلائل دیے جا رہے تھے، ان کے جواب سے وہ عاجز تھے۔ اس لیے وہ کہنے لگے کہ تمھاری ظاہر فریب باتوں سے متاثر ہو کر ہم اپنے اسلاف کا دین نہیں چھوڑ سکتے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ ؕ قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ اِنۡ

۹۱۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کلام پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہمارے اوپر اترا ہے۔ اور وہ اس کلام کا انکار کرتے ہیں جو اس کے پیچھے آیا ہے۔ حالاں کہ وہ حق ہے اور سچا کرنے والا ہے

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى
بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ
وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ
وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَ
اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ
بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ
الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ
يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ
النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ
يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ
بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ع ١٠

اس کا جوان کے پاس ہے۔ کہو، اگر تم ایمان والے ہو تو تم اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو۔ ۹۲۔ اور موسیٰ تمھارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا۔ پھر تم نے اس کے پیچھے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنے والے ہو ۹۳۔ اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور طور پہاڑ کو تمھارے اوپر کھڑا کیا۔ جو حکم ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو۔ انھوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے نہیں مانا۔ اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑا ان کے دلوں میں رچ بس گیا۔ کہو، اگر تم ایمان والے ہو تو کیسی بری ہے وہ چیز جو تمھارا ایمان تم کو سکھاتا ہے۔ ۹۴۔ کہو، اگر اللہ کے یہاں آخرت کا گھر خاص تمھارے لیے ہے، دوسروں کو چھوڑ کر، تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو۔ ۹۵۔ مگر وہ کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے بہ سبب اس کے جو وہ اپنے آگے بھیج چکے ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ ۹۶۔ اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے، ان لوگوں سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس کی عمر پائے۔ حالاں کہ اتنا جینا بھی اس کو عذاب سے بچا نہیں سکتا۔ اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

عرب کے اہل کتاب جو قرآن کی دعوت کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے، اس کی وجہ ان کا یہ احساس تھا کہ وہ پہلے سے حق پر ہیں اور حق پرستوں کی سب سے بڑی جماعت (بنی اسرائیل) سے وابستگی رکھتے ہیں۔ مگر یہ دراصل گروہ پرستی تھی جس کو انھوں نے حق پرستی کے ہم معنی سمجھ رکھا تھا۔ وہ گروہی حق کو خالص حق کا مقام دیے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حق جب اپنی بے آمیز صورت میں ظاہر ہوا تو وہ اس کو لینے کے لیے آگے نہ بڑھ سکے۔ اگر خالص حق ان کا مقصود ہوتا تو ان کے لیے یہ جاننا مشکل نہ ہوتا کہ قرآن کا آنا خود ان کی مقدس کتاب تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہے، اور یہ کہ قرآن کے نزول کے بعد اب قرآن ہی کتابِ حق ہے، نہ کہ ان کا اپنا گروہی مذہب۔

ان کا معاملہ فی الواقع حق پرستی کا معاملہ نہیں۔ اس کا ثبوت ان کی اپنی تاریخ میں یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے گروہ کے نبیوں (مثلاً حضرت زکریا، حضرت یحییٰ) کو قتل کیا جنھوں نے ان کی زندگیوں پر تنقید کی، جو ان کے خلاف گواہی دیتے تھے تاکہ ان کو خدا کی طرف پھرالائیں (نحمیاہ 9:26)۔ حضرت موسیٰ نے جو معجزات پیش کیے اس کے بعد ان کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ مگر کوہ طور کے چالیس روزہ قیام کے زمانہ میں جب حضرت موسیٰ کا شخصی دباؤ ان کے سامنے نہ رہا تو انھوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ ان کے سر پر پہاڑ کھڑا کردیا گیا تب بھی صرف وقتی طور پر جان بچانے کے لیے انھوں نے کہہ دیا کہ ہاں ہم نے سنا۔ مگر اس کے بعد ان کی اکثریت بدستور نافرمانی کی زندگی پر قائم رہی۔ اگر وہ سچ مچ خدا پرست ہوتے تو ان کی ساری توجہ خدا کی اس دنیا کی طرف لگ جاتی جو موت کے بعد آنے والی ہے۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ موجودہ دنیا کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

قُلۡ مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِیۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلۡبِكَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَ هُدًى وَّبُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۷﴾ مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِيۡلَ وَمِيۡكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكۡفُرُ بِهَآ اِلَّا الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوۡا عَهۡدًا نَّبَذَهٗ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ نَبَذَ فَرِيۡقٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ كَاَنَّهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

۹۷۔ کہو کہ جو کوئی جبریل کا مخالف ہے تو اس نے اس کلام کو تمھارے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے، وہ سچا کرنے والا ہے اس کا جو اس کے آگے ہے اور وہ ہدایت اور خوش خبری ہے ایمان والوں کے لیے۔ ۹۸۔ جو کوئی دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ ایسے منکروں کا دشمن ہے۔ ۹۹۔ اور ہم نے تمھارے اوپر واضح نشانیاں اتاریں اور کوئی ان کا انکار نہیں کرتا مگر وہی لوگ جو حد سے گزر جانے والے ہیں۔ ۱۰۰۔ کیا جب بھی وہ کوئی وعدہ کریں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو توڑ پھینکے گا۔ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔ ۱۰۱۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آیا جو سچا کرنے والا تھا اس چیز کا جو ان کے پاس ہے تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ اس کو جانتے ہی نہیں۔

قدیم زمانہ میں بہت سی قوموں کو ان کی سرکشی کے نتیجہ میں سخت سزائیں دی گئیں۔ سنت اللہ کے مطابق ہر سزا سے پہلے پیغمبروں کی زبان سے اس کی پیشگی خبر دی جاتی۔ یہ خبر اللہ کی طرف سے جبریل فرشتہ کے

ذریعہ پیغمبر کے پاس آتی اور وہ اس سے اپنی قوم کو آگاہ کرتے۔ اس قسم کے واقعات میں اصل سبق یہ تھا کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ اللہ کی نافرمانی سے بچے تاکہ وہ عذاب الٰہی کی زد میں نہ آجائے۔ مگر عرب کے اہل کتاب ان واقعات سے اس قسم کا سبق نہ لے سکے۔ اس کے بجائے وہ کہنے لگے کہ جبریل فرشتہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ ہمیشہ آسمان سے ہمارے خلاف احکام لے کر آتا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ اللہ نے جبریل کے ذریعہ مجھ پر وحی کی ہے تو ان لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ جبریل تو ہمارا پرانا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت جو صرف اسرائیلی گروہ کا حق تھا، اس کو اس نے ایک اور قبیلہ کے فرد تک پہنچا دیا۔

اس قسم کی بے معنی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جو فسق اور بے قیدی کی زندگی گزار رہے ہوں۔ اہل کتاب کا حال یہ تھا کہ وہ نفس پرستی، آبائی تقلید، نسلی اور قومی عصبیت کی سطح پر جی رہے تھے۔ اور کچھ نمائشی قسم کے مذہبی کام کرکے ظاہر کرتے تھے کہ وہ عین دین خداوندی پر قائم ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی جھوٹی دین داری میں مبتلا ہوں وہ سچے اور بے آمیز دین کی دعوت سن کر ہمیشہ بگڑ جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسی دعوت ان کو ان کے بڑائی کے مقام سے اتارنے کے ہم معنی نظر آتی ہے۔ وہ مشتعل نفسیات کے تحت ایسی باتیں بولنے لگتے ہیں جو گرامر کے اعتبار سے درست ہونے کے باوجود حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرشتوں کا آنا اور رسولوں کا مبعوث ہونا سب مکمل طور پر خدائی منصوبہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں جب دلائل یہ ظاہر کر رہے ہوں کہ پیغمبر عربی کے پاس وہی چیز آئی ہے جو ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ پر آئی تھی اور وہ پچھلے آسمانی صحیفوں کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق ہے تو یہ صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے— آدمی بہت سی باتیں یہ ظاہر کرنے کے لیے بولتا ہے کہ وہ ایمان پر قائم ہے، حالاں کہ وہ باتیں صرف اس کا ثبوت ہوتی ہیں کہ آدمی کا ایمان اور خدا پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

۱۰۲۔ اور وہ اس چیز کے پیچھے پڑ گئے جس کو شیاطین، سلیمان کی سلطنت پر لگا کر پڑھتے تھے۔ حالاں کہ سلیمان نے کفر نہیں کیا، بلکہ یہ شیاطین تھے جنھوں نے کفر کیا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور وہ اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی، جب کہ ان کا حال یہ تھا کہ جب بھی وہ کسی کو اپنا یہ فن سکھاتے تو اس سے کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش کے لیے ہیں۔ پس تم منکر نہ بنو۔ مگر وہ ان سے وہ چیز سیکھتے جس سے مرد اور اس کی عورت کے درمیان جدائی ڈال دیں۔ حالاں کہ وہ اللہ کے اِذن کے

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ
عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ
كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۱۰۲ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا
لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ۱۰۳ ع　ع ۱۲/۱۲

بغیر اس سے کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے جو ان کو نقصان پہنچائے اور نفع نہ دے۔ اور وہ جانتے تھے کہ جو کوئی اس چیز کا خریدار ہو، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ کیسی بری چیز ہے جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ کاش، وہ اس کو سمجھتے۔ ۱۰۳۔ اور اگر وہ مومن بنتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کا بدلہ ان کے لیے بہتر تھا، کاش وہ اس کو سمجھتے۔

آسمانی کتاب کے حامل کسی گروہ کا بگاڑ ہمیشہ صرف ایک ہوتا ہے — نجاتِ آخرت جس کا انحصار تمام تر عملِ صالح پر رکھا گیا ہے، اس کا راز بے عملی میں تلاش کرلینا۔ اللہ کا کلام حقیقۃً عمل کی پکار ہے۔ مگر جب قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے افراد مقدس کلام کے لکھ لینے یا زبان سے بول دینے کو ہر قسم کی برکتوں کا پُراسرار نسخہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہی وہ نفسیاتی زمین ہے جس کے اوپر سحر اور کہانت اور عملیات وجود میں آتے ہیں۔ چھومنتر جیسی چیزوں سے جنت حاصل کرنے والے دنیا کو بھی چھومنتر کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ بزرگوں سے عقیدت کو نجات کا ذریعہ سمجھنے والے ارواح سے تعلق قائم کرکے اپنے دنیوی مسائل حل کرنے لگتے ہیں۔ اوراد و ظائف کے طلسماتی اثرات پر یقین کرنے والے سیاسی چمتکار دکھا کر ملت کی تعمیر اور دین کے احیا کا منصوبہ بناتے ہیں۔

جب قوم کے افراد بے عملی اور توہم پرستی (superstition) کے راستے پر چل پڑتے ہیں تو ان کے درمیان ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کے لیے سحر و کہانت تجارت بن جاتی ہے، اور اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے مشہور قومی بزرگوں کا نام استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ایسا ہر زمانے میں ہوا ہے، مثلاً یہود نے اپنے زوال کے زمانے میں سحر و کہانت کو جسٹیفائی (justify) کرنے کے لیے اس کو حضرت سلیمان کی طرف منسوب کردیا۔

انھوں نے کہنا شروع کیا کہ سلیمان کو جنوں اور ہواؤں پر جو غیر معمولی اقتدار حاصل تھا وہ سب علم سحر کی بنا پر تھا اور یہ سلیمانی علم بعض جنوں کے ذریعہ ہم کو حاصل ہوگیا ہے۔ اس طرح حضرت سلیمان کی طرف منسوب ہو کر عملیات کا فن ان کے اندر بڑے پیمانے پر پھیل گیا۔ اس وقت قوم یہود کی آزمائش کے لیے بابل میں دو فرشتے بھیجے گئے۔ یہ دونوں فرشتے درویشوں کی شکل میں آکر ان کو جادو اور کہانت کی حقیقت بتاتے اور ان سے بچاؤ کا عمل سکھاتے تھے۔ تاہم وہ لازمی طور پر انھیں اس بات سے آگاہ کرتے تھے کہ یہ تمھارا امتحان ہے، یعنی تم اس کا صحیح استعمال کرنا۔ اس انتباہ کے باوجود وہ اس فن پر ٹوٹ پڑے۔ حتی کہ انھوں نے اس کو ناجائز مقاصد میں استعمال کرنا شروع کردیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا
وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ
عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ
بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ ﴿١٠٥﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ
بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٦﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿١٠٧﴾ اَمْ
تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْــَٔـلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ
مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ
بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿١٠٨﴾

۱۰۴۔ اے ایمان والو، تم راعِنا نہ کہو بلکہ اُنظرنا کہو
اور سنو۔ اور انکار کرنے والوں کے لیے دردناک
سزا ہے۔ ۱۰۵۔ جن لوگوں نے انکار کیا، چاہے
اہل کتاب ہوں یا مشرکین، وہ نہیں چاہتے کہ
تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے کوئی
بھلائی اترے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت
کے لیے چن لیتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔
۱۰۶۔ ہم جس آیت کو ملتوی کرتے ہیں یا بھلا دیتے
ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مثل دوسری لاتے
ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا
ہے۔ ۱۰۷۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے
آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اور تمھارے لیے
اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار۔
۱۰۸۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوالات
کرو جس طرح اس سے پہلے موسیٰ سے سوالات کیے
گئے اور جس شخص نے ایمان کو انکار سے بدل لیا، وہ
یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

کسی کو خدا کی طرف سے سچائی ملے اور وہ اس کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے تو لوگ اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس کی دعوت میں لوگوں کو اپنی حیثیت کی نفی (negation) دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن زوال یافتہ لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں کہ وہ اپنی روایتی عظمت کی نفی کریں۔ کیوں کہ وہ پیغمبری کو اپنا قومی حق سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہوتی ہے کہ ان کے گروہ کے سوا کسی اور گروہ میں خدا کے پیغمبر کا ظہور ہو۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے اہل کتاب آپ کی دعوت کے بارے میں کنفیوزن (confusion) پیدا کرنے والی بحثیں چھیڑتے تا کہ لوگوں کو اس شبہ میں ڈال دیں کہ آپ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ محض ایک شخص کی ذاتی اپج ہے۔ وہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیز نہیں ہے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ قرآن میں بعض قانونی احکام تورات سے مختلف تھے۔ ان کو دیکھ کر وہ کہتے کہ کیا خدا بھی حکم دینے میں غلطی کرتا ہے کہ ایک بار ایک حکم دے اور اس کے بعد اسی معاملہ میں دوسرا حکم بھیجے۔ اس طرح کے شبہات انھوں نے اتنی کثرت سے پھیلائے کہ خود مسلمانوں میں کچھ سادہ مزاج لوگ ان کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

سوالات کرنے لگے۔ اپنے زوال یافتہ ذہنیت کی وجہ سے وہ اس حد تک چلے گئے کہ جب یہ لوگ آپ کی مجلسوں میں بیٹھتے تو ایسے الفاظ بولتے جن سے آپ کا بے حقیقت ہونا ظاہر ہوتا۔ مثلاً ''ہماری طرف توجہ کیجیے'' کے لیے عربی زبان میں ایک شائستہ لفظ اُنظرنا تھا۔ مگر وہ اس کو چھوڑ کر 'راعِنا' کہتے۔ کیوں کہ تھوڑا سا کھینچ کر اس کو 'راعینا' کہہ دیا جائے تو اس کے معنی ''ہمارے چرواہے'' کے ہو جاتے ہیں، اسی طرح کبھی الف کو دبا کر وہ اس کو راعِنَ کہتے جس کے معنیٰ احمق کے ہوتے ہیں۔

ہدایت کی گئی کہ (1) گفتگو میں صاف الفاظ استعمال کرو، مشتبہ الفاظ مت بولو جس میں کوئی برا پہلو نکل سکتا ہو (2) جو بات کہی جائے اس کو غور سے سنو اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ (3) سوال کی کثرت آدمی کو سیدھے راستہ سے بھٹکا دیتی ہے، اس لیے سوال و جواب کے بجائے عبرت اور نصیحت کا ذہن پیدا کرو۔ (4) اپنے ایمان کی حفاظت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی غلطی کی بنا پر تم اپنے ایمان ہی سے محروم ہو جاؤ۔ (5) دنیا میں کسی کے پاس کوئی خیر دیکھو تو حسد اور جلن میں مبتلا نہ ہو، کیوں کہ یہ اللہ کا ایک عطیہ ہے جو اس کے فیصلہ کے تحت اس کے ایک بندے کو پہنچا ہے۔

''ہم جس آیت کو ملتوی کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مثل دوسری آیت لاتے ہیں''۔ ظاہرِ الفاظ کے اعتبار سے یہاں صرف آیت کے نسخ (abrogation) کا ذکر ہے۔ مگر وسیع تر معنوں میں وہ اللہ تعالی کے عمومی قانون کا بیان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جب بھی کسی صورتِ حال کو بدلا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ کسی نئی بہتر صورت کو لایا جائے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝109 وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝110 وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝111

۱۰۹۔ بہت سے اہل کتاب دل سے چاہتے ہیں کہ تمھارے مومن ہو جانے کے بعد وہ کسی طرح پھر تم کو منکر بنا دیں، اپنے حسد کی وجہ سے، باوجود یہ کہ حق ان کے سامنے واضح ہو چکا ہے۔ پس معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آجائے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۱۱۰۔ اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔ اور جو بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے، اس کو تم اللہ کے پاس پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ یقیناً اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۱۱۔ اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو یہودی ہوں یا عیسائی ہوں، یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہو کہ لاؤ

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۳ ۹ ۱۴

اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔ ۱۱۲۔ بلکہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ مخلص بھی ہے تو ایسے شخص کے لیے اجر ہے اس کے رب کے پاس، ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔

قرآن کی آواز اگر چہ بہت سے لوگوں کے لیے نامانوس آواز تھی۔ تاہم انھیں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس کو اپنے دل کی آواز پا کر اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ یہ صورت حال قدیم آسمانی کتابوں کی حامل قوم کے لیے ناقابلِ برداشت بن گئی۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی چیز کی ترقی کے ہم معنی تھی جس کو وہ بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ کیا کہ ایک طرف مشرکین کو ابھار کر ان کو اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ کر دیا۔ دوسری طرف وہ نئے اسلام لانے والوں کو طرح طرح کے شبہات اور مغالطے میں ڈالتے تاکہ وہ قرآن اور صاحب قرآن سے بدظن ہو جائیں، اور دوبارہ اپنے آبائی مذہب کی طرف واپس چلے جائیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر ایسے لوگوں کے خلاف اشتعال پیدا ہونا فطری تھا۔ مگر اللہ نے اس سے ان کو منع فرما دیا۔ حکم ہوا کہ ان سے بحث مباحثہ یا ان کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی موجودہ مرحلہ میں ہرگز نہ کی جائے۔ اس معاملہ میں تمام تر اللہ پر بھروسہ کیا جائے اور اس وقت کا انتظار کیا جائے جب اللہ تعالیٰ حالات میں ایسی تبدیلی کر دے کہ ان کے خلاف کوئی فیصلہ کن کارروائی کرنا ممکن ہو جائے۔ بر وقت مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ صبر کریں اور نماز اور زکوٰۃ پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جائیں۔ صبر آدمی کو اس سے بچاتا ہے کہ وہ ردعمل کی نفسیات کے تحت منفی کارروائیاں کرنے لگے۔ نماز آدمی کو اللہ سے جوڑتی ہے۔ اور اپنے مال میں دوسرے بھائیوں کو حق دار بنانا وہ چیز ہے جس سے باہمی خیر خواہی اور اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

نئے اسلام لانے والوں سے وہ کہتے کہ تم کو اپنا آبائی مذہب چھوڑنا ہے تو نیا مذہب اختیار کرنے کے بجائے پہلے سے موجود آسمانی مذاہب میں سے کوئی ایک اختیار کر لو، یہودی بن جاؤ یا پھر عیسائی بن جاؤ۔ کیوں کہ جنت تو صرف یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے ہے جو ہمیشہ سے نبیوں اور بزرگوں کی جماعت رہی ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ کسی گروہ سے وابستگی کسی کو جنت کا مستحق نہیں بناتی۔ جنت کا فیصلہ آدمی کے اپنے عمل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، نہ کہ گروہی فضیلت کی بنیاد پر۔ احسان کے معنی ہیں کسی کام کو اچھی طرح کرنا۔ اسلام میں اچھا ہونا یہ ہے کہ اللہ کے لیے آدمی کی حوالگی اتنی کامل ہو کہ ہر دوسری چیز کی اہمیت اس کے ذہن سے حذف ہو جائے۔ گروہی تعصّبات، شخصی وفاداریاں اور دنیوی مصالح کوئی بھی چیز اس کے لیے اللہ کی آواز کی طرف دوڑ پڑنے میں رکاوٹ نہ بنے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪
وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ
وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ
لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ
يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ
اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا
خَآئِفِيْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي
الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ
وَالْمَغْرِبُ ۗ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ
وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا
فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

۱۱۳۔ اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں، اور نصاریٰ نے کہا کہ یہود کسی چیز پر نہیں۔ اور وہ سب آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہا جن کے پاس علم نہیں، انھیں کا سا قول۔ پس اللہ قیامت کے دن اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں یہ جھگڑ رہے تھے۔ ۱۱۴۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روکے کہ وہاں اللہ کے نام کی یاد کی جائے اور ان کو اجاڑنے کی کوشش کرے۔ ان کا حال تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسجدوں میں اللہ سے ڈرتے ہوئے داخل ہوں۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بھاری سزا ہے۔ ۱۱۵۔ اور پورب اور پچھم اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم جدھر رخ کرو، اسی طرف اللہ ہے۔ یقیناً اللہ وسعت والا ہے، علم والا ہے۔ ۱۱۶۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ اسی کے حکم بردار ہیں سارے۔ ۱۱۷۔ وہ آسمانوں اور زمین کو وجود میں لانے والا ہے۔ وہ جب کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو بس اس کے لیے فرما دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں تین بڑی قومیں آباد تھیں، یہود، نصاریٰ، اور مشرکین۔ یہود نے نبیوں اور بزرگوں سے وابستگی کو حق کا معیار بنایا۔ اس وجہ سے ان کو اپنی قوم حق پر اور دوسری قومیں باطل پر نظر آئیں۔ نصاریٰ نے اپنے اندر یہ امتیاز دیکھا کہ اللہ نے اپنا ''اکلوتا بیٹا'' ان کے پاس بھیجا۔ مکہ کے مشرکین اپنی یہ خصوصیت سمجھتے تھے کہ وہ اللہ کے مقدس گھر کے پاسبان ہیں۔ اس طرح ہر گروہ نے اپنے حسب حال حق وصداقت کا ایک خودساختہ معیار بنا رکھا تھا اور جب وہ اس معیار کی روشنی میں دیکھتا تو لامحالہ اس کو اپنی ذات برسرحق اور دوسروں کی برسر باطل نظر آتی۔ مگر ان کی عملی حالت جس چیز کا ثبوت دے رہی تھی وہ اس

کے بالکل برعکس تھی۔ وہ گروہ گروہ بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کو جب بھی موقع ملتا، وہ عبادت کے لیے بنے ہوئے خدا کے گھر کو اپنے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہ پر بند کر دیتا اور اس طرح خدا کے گھر کی ویرانی کا باعث بنتا۔ عبادت خانہ تو وہ مقام ہے جہاں انسان اللہ سے ڈرتے ہوئے اور کانپتے ہوئے داخل ہو۔ اگر یہ لوگ واقعۃً خدا والے ہوتے تو کیسے ممکن تھا کہ وہ عبادت کے لیے آنے والے کسی بندے کو روکیں یا اس کو ستائیں۔ وہ تو اللہ کی عظمت کے احساس سے دبے ہوئے ہوتے، پھر ان سے اس قسم کی سرکشی کا صدور کیوں کر ہوسکتا تھا۔

انھوں نے اللہ کو انسان کے اوپر قیاس کیا۔ ایک انسان اگر مشرق میں ہو تو اسی وقت وہ مغرب میں نہیں ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا بھی اسی طرح کسی خاص سمت میں موجود ہے۔ یقیناً اللہ نے اپنی عبادت کے لیے رخ کا تعین کیا ہے مگر وہ عبادت کی تنظیمی ضرورت کی بنا پر ہے، نہ اس لیے کہ خدا اسی خاص رخ میں ملتا ہے۔ اسی طرح انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے انھوں نے خدا کا بیٹا فرض کر لیا۔ حالاں کہ خدا اس قسم کی چیزوں سے بلند و برتر ہے۔ جو لوگ اس طرح خودساختہ دین کو خدا کا دین بتائیں، ان کے لیے خدا کے یہاں رسوائی اور عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ
اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ
قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ
اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا
تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ
تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ
مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ
وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ
جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ
وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ
بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴/۹/۱۴

۱۱۸۔ اور جو لوگ علم نہیں رکھتے، انھوں نے کہا: اللہ کیوں نہیں کلام کرتا ہم سے یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح ان کے اگلے بھی انھیں کی سی بات کہہ چکے ہیں، ان سب کے دل ایک جیسے ہیں، ہم نے پیش کر دی ہیں نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنے والے ہیں۔ ۱۱۹۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور تم سے دوزخ میں جانے والوں کی بابت کوئی پوچھ نہیں ہوگی۔ ۱۲۰۔ اور یہود اور نصاریٰ ہرگز تم سے راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ۔ تم کہو کہ جو راہ اللہ دکھاتا ہے، وہی اصل راہ ہے۔ اور اگر بعد اس علم کے جو تم کو پہنچ چکا ہے، تم نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلہ میں نہ تمھارا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ ۱۲۱۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پڑھتے ہیں جیسا کہ حق ہے پڑھنے کا۔ یہی لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر۔ اور جو اس کا انکار کرے تو وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔

اللہ کے وہ بندے جو اللہ کی طرف سے اس کے دین کا اعلان کرنے کے لیے آئے، ان کو ہر زمانہ میں ایک ہی قسم کے ردعمل سے سابقہ پیش آیا: ''اگر تم خدا کے نمائندے ہو تو تمھارے ساتھ دنیا کے خزانے کیوں نہیں''۔ یہ شبہ ان لوگوں کو ہوتا جو اپنے دنیا پرستانہ مزاج کی وجہ سے مادی بڑائی کو بڑائی سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ خدا کی نمائندگی کرنے والے میں بھی یہی بڑائی دیکھنا چاہتے تھے۔ جب داعیٔ حق کی زندگی میں ان کو اس قسم کی بڑائی دکھائی نہ دیتی تو وہ اس کا انکار کردیتے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ایک ''معمولی آدمی'' کیوں کر وہ شخص ہوسکتا ہے جس کو زمین و آسمان کے مالک نے اپنے پیغام کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے چنا ہو۔ اللہ کے ان بندوں کی زندگی اور ان کے کلام میں اللہ اپنی نشانیوں کی صورت میں شامل ہوتا، بالفاظ دیگر معنوی بڑائیاں پوری طرح ان کے ساتھ ہوتیں۔ مگر اس قسم کی چیزیں لوگوں کو نظر نہ آتیں، اس لیے وہ ان کو ''بڑا'' ماننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتے۔ دلیل اپنی کامل صورت میں موجود ہو کر بھی ان کے ذہن کا جزء نہ بنتی۔ کیوں کہ وہ ان کے کنڈیشنڈ مائنڈ کے مطابق نہ ہوتی۔

اہلِ کتاب قدیم زمانہ میں آسمانی مذہب کے نمائندے تھے مگر زوال کا شکار ہونے کے بعد دین ان کے لیے ایک گروہی طریقہ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے گروہ سے وابستہ رہنے کو دین سمجھتے اور گروہ سے الگ ہوجانے کو بے دینی۔ ان کے گروہ میں شامل ہونا یا نہ ہونا ہی ان کے نزدیک حق اور ناحق کا معیار بن گیا تھا۔ دین جب اپنی بے آمیز صورت میں ان کے سامنے آیا تو ان کا گروہی دین داری کا مزاج اس کو قبول نہ کرسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ بے آمیز دین کو وہی اختیار کرے گا جس نے اپنی فطرت کو زندہ رکھا ہے۔ جن کی فطرت کی روشنی بجھ چکی ہے ان سے کسی قسم کی کوئی امید نہیں۔ دین کو ایسے لوگوں کے لیے قابل قبول بنانے کی خاطر دین کو بدلا نہیں جاسکتا۔

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾

۱۲۲۔ اے بنی اسرائیل، میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں نے تمھارے اوپر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تم کو تمام دنیا والوں پر فضیلت دی۔ ۱۲۳۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں کوئی شخص کسی شخص کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی کو کوئی سفارش فائدہ دے گی اور نہ کہیں سے ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔ ۱۲۴۔ اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو اس نے پورا کردکھایا۔ اللہ نے کہا میں تم کو سب لوگوں کا امام بناؤں گا۔ ابراہیم نے کہا: اور میری اولاد میں سے بھی۔ اللہ نے کہا: میرا وعدہ ظالموں تک نہیں پہنچتا۔

بنی اسرائیل کو اس کارِ خاص کے لیے چنا گیا تھا کہ وہ انسانوں کو اللہ کی طرف بلائیں اور ان کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ ان کے اعمال کے بارے میں ان کا مالک ان سے سوال کرنے والا ہے۔ اس کام کی رہنمائی کے لیے ان کے درمیان مسلسل پیغمبر آتے رہے۔ حضرت ابراہیم، یعقوب، یوسف، موسیٰ، داؤد، سلیمان، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ علیہم السلام وغیرہ۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل پر زوال آیا تو انھوں نے اس منصبی فضیلت کو نسلی اور گروہی فضیلت کے معنی میں لے لیا۔ اور اس طرح اس کی بابت اپنے استحقاق کو کھو دیا۔ اسماعیلی خاندان میں نبی عربی کا آنا دراصل بنی اسرائیل کی مقام فضیلت سے معزولی اور اس کی جگہ بنی اسماعیل کے تقرر کا اعلان تھا۔ بنی سرائیل میں جو لوگ فی الواقع خدا پرست تھے ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نبی عربی جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے آیا ہوا کلام ہے۔ مگر جو لوگ گروہی تعصّبات کو دین بنائے ہوئے تھے ان کے لیے اپنے سے باہر کسی فضیلت کا اعتراف کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

پیغمبر عربی کے ذریعہ ان کو متنبہ کیا گیا کہ یاد رکھو آخرت میں حقیقی ایمان اور سچے عمل کے سوا کسی بھی چیز کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ دنیا میں ایک شخص دوسرے شخص کا بار اپنے سر لے لیتا ہے۔ کسی معاملہ میں کسی کی سفارش کام آجاتی ہے۔ کبھی معاوضہ دے کر آدمی چھوٹ جاتا ہے۔ کبھی کوئی مددگار مل جاتا ہے جو پشت پناہی کر کے بچا لیتا ہے۔ مگر آخرت میں اس قسم کی کوئی چیز کسی کے کام آنے والی نہیں۔ آخرت کسی گروہ کی نسلی وراثت نہیں، وہ اللہ کے بے لاگ انصاف کا دن ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو درجۂ فضیلت ملا اس کا فیصلہ اس وقت کیا گیا جب وہ کڑی جانچ میں خدا کے سچے فرماں بردار ثابت ہوئے۔ اللہ کی یہی سنت ان کی نسل کے بارے میں بھی ہے کہ جو عمل میں پورا اترے گا وہ اس وعدۂ الٰہی میں شریک ہوگا۔ اور جو عمل کے ترازو پر اپنے کو سچا ثابت نہ کر سکے اس کا وہی انجام ہوگا جو اس قسم کے دوسرے مجرمین کے لیے اللہ کے یہاں مقدر ہے۔

حضرت ابراہیم کو نہایت کڑی آزمائشوں کے بعد پیشوائی کا مقام دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امامت و قیادت کے منصب کا استحقاق قربانیوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ قربانی کی قیمت پر کسی مقصد کو اختیار کرنے والا اس مقصد کی راہ میں سب سے آگے ہوتا ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر وہی اس کا قائد بنتا ہے۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ

۱۲۵۔ اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے اکٹھا ہونے کی جگہ اور امن کا مقام ٹھیرایا۔ اور حکم دیا کہ مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنا لو۔ اور ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ ۱۲۶۔ اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو، جو

مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

ان میں سے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھیں، پھلوں کی روزی عطا فرما۔ اللہ نے کہا جو انکار کرے گا، میں اس کو بھی تھوڑے دنوں فائدہ دوں گا۔ پھر اس کو آگ کے عذاب کی طرف دھکیل دوں گا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

ساری دنیا کے اہل ایمان ہر سال اپنے وطن کو چھوڑ کر بیت اللہ آتے ہیں۔ یہاں کسی کے لیے کسی ذی حیات پر زیادتی کرنا جائز نہیں۔ حرم کعبہ کو دائمی طور پر عبادت کی جگہ بنا دیا گیا ہے۔ اس مقام کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا جاتا ہے۔ کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔ دنیا سے الگ ہو کر اللہ کی یاد کی جاتی ہے اور اللہ کے لیے رکوع وسجود کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ دنیا کا سب سے زیادہ خشک علاقہ تھا جہاں ریتیلی زمینوں اور پتھریلی چٹانوں کی وجہ سے کوئی فصل پیدا نہیں ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ وہ انتہائی طور پر غیر محفوظ تھا۔ چار ہزار برس پہلے حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ اپنے خاندان کو اس علاقہ میں لے جاؤ اور اس کو وہاں بسادو۔ حضرت ابراہیم نے بلا جھجک اس پر عمل کیا۔ اور جب خاندان کو اس بے آب وگیاہ مقام پر پہنچا چکے تو دعا کی: خدایا میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب تو اپنے بندے کی پکار کو سن لے اور اس بستی کو امن وامان کی بستی بنا دے۔ اور اس خشک زمین پر ان کے لیے خصوصی رزق کا انتظام فرما۔ دعا قبول ہوئی اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ علاقہ آج تک امن اور رزق کی کثرت کا نمونہ بنا ہوا ہے۔

مومن کو دنیا میں اس طرح رہنا ہے کہ وہ بار بار یاد کرتا رہے کہ خواہ وہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہو اس کو بہر حال ایک روز لوٹ کر خدا کے یہاں جانا ہے۔ وہ جن انسانوں کے درمیان رہے، بے ضرر بن کر رہے۔ وہ زمین کو خدا کی عبادت کی جگہ سمجھے اور اس کو اپنی آلودگیوں سے پاک رکھے۔ اس کی پوری زندگی خدا کے گرد گھومتی ہو وہ بظاہر دنیا میں رہے مگر اس کا دل اپنے رب میں اٹکا ہوا ہو۔ وہ ہمہ تن اللہ کے آگے جھک جائے۔ پھر یہ کہ دین جس چیز کا تقاضا کرے، خواہ وہ ایک ''چٹیل میدان'' میں بیوی بچوں کو لے جا کر ڈال دینا ہو، بندہ پوری وفاداری کے ساتھ اس کے لیے راضی ہو جائے۔ اور جب تعمیل حکم کر چکے تو خدا سے مدد کی درخواست کرے۔ عجب نہیں کہ خدا اپنے بندے کی خاطر چٹیل بیابان میں رزق کے چشمے جاری کر دے۔

دنیا کی رونق، خواہ کسی کو دین کے نام پر ملے، اِس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اللہ نے اس کو امامت و پیشوائی کے منصب کے لیے قبول کر لیا ہے۔ دنیا کی چیزیں صرف آزمائش کے لیے ہیں جو سب کو ملتی ہیں۔ جب کہ امامت یہ ہے کہ کسی بندے کو قوموں کے درمیان خدا کی نمائندگی کے لیے منتخب کر لیا جائے۔

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا
مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً
لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ۸ ۱۵

۱۲۷۔ اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے: اے ہمارے رب، قبول کر ہم سے، یقینا تو ہی سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۱۲۸۔ اے ہمارے رب، ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری نسل میں سے اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھا اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہم کو معاف فرما، تو معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ۱۲۹۔ اے ہمارے رب، اور ان میں ان ہی میں کا ایک رسول اٹھا جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

اللہ کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ حجاز کو اسلام کی دعوت کا عالمی مرکز بنائے۔ اس مرکز کے قیام اور انتظام کے لیے حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا انتخاب ہوا۔ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی زبان سے جو کلمات نکل رہے تھے وہ ایک اعتبار سے دعا تھے اور دوسرے اعتبار سے وہ دو روحوں کا اپنے آپ کو اللہ کے منصوبے میں دے دینے کا اعلان تھا۔ ایسی دعا خود مطلوب الٰہی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ پوری طرح قبول ہوئی۔ عرب کے خشک بیابان سے اسلام کا ابدی چشمہ پھوٹ نکلا۔ بنی اسماعیل کے دل اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اپنے دین کی خدمت کے لیے نرم کردیے۔ ان کے اندر سے ایک طاقت ور اسلامی دعوت برپا ہوئی۔ ان کے ذریعہ سے اللہ نے اپنے بندوں کو وہ طریقے بتائے جن سے وہ خوش ہوتا ہے اور اپنی رحمت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پھر انھیں کے اندر سے اس آخری رسول کی بعثت ہوئی جس نے تاریخ میں پہلی بار یہ کیا کہ کار نبوت کو ایک مکمل تاریخی نمونہ کی صورت میں قائم کردیا۔

نبی کا پہلا کام تلاوت آیات ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جو کسی چیز کے اوپر دلیل بنے۔ انسان کی فطرت میں اور باہر کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کی بے شمار نشانیاں رکھ دی ہیں۔ یہ اشارات کی صورت میں ہیں۔ پیغمبر ان اشارات کو کھولتا ہے۔ وہ آدمی کو وہ نگاہ دیتا ہے جس سے وہ ہر چیز میں اپنے رب کا جلوہ دیکھنے لگے۔ کتاب سے مراد قرآن ہے۔ نبی کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کی وحی کا مہبط بنتا ہے اور اس کو خدا سے لے کر انسان تک پہنچاتا ہے۔ حکمت کا مطلب ہے بصیرت۔ جب آدمی خدا کی نشانیوں کو دیکھنے کی نظر پیدا کرلیتا ہے، جب وہ اپنے ذہن کو قرآن کی تعلیمات میں ڈھال لیتا ہے تو اس کے اندر ایک فکری روشنی جل اٹھتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ کے ہم شعور بنالیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اس صحیح فیصلہ تک پہنچ جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو

مطلوب ہے۔ تزکیہ کا مطلب ہے کسی چیز کو غیر موافق عناصر سے پاک کر دینا تا کہ وہ موافق فضا میں اپنے فطری کمال کو پہنچ سکے۔ نبی کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسے انسان تیار ہوں جن کے سینے اللہ کی عقیدت کے سوا ہر عقیدت سے خالی ہوں۔ ایسی روحیں وجود میں آئیں جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوں، ایسے افراد پیدا ہوں جو کائنات سے وہ ربانی رزق پا سکیں، جو اللہ نے اپنے مومن بندوں کے لیے رکھ دیا ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ
نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ
فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ
رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ
وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ
الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ
يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا
تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ
وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ
اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

۱۳۰۔ اور کون ہے جو ابراہیم کے دین کو پسند نہ کرے، مگر وہ جس نے اپنے آپ کو احمق بنا لیا ہو۔ حالاں کہ ہم نے اس کو دنیا میں چن لیا تھا اور آخرت میں وہ نیک لوگوں میں سے ہوگا۔ ۱۳۱۔ جب اس کے رب نے کہا کہ اپنے آپ کو حوالے کر دو تو اس نے کہا: میں نے اپنے آپ کو رب العالمین کے حوالے کیا۔ ۱۳۲۔ اور اسی کی نصیحت کی ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور اسی کی نصیحت کی یعقوب نے اپنی اولاد کو۔ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمھارے لیے اسی دین کو چن لیا ہے۔ پس ایمان کے سوا کسی اور حالت پر تم کو موت نہ آئے۔ ۱۳۳۔ کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا۔ جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے۔ انھوں نے کہا: ہم اسی خدا کی عبادت کریں گے جس کی عبادت آپ اور آپ کے آباء ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کرتے آئے ہیں، وہی ایک معبود ہے اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔ ۱۳۴۔ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے ان کے اعمال کی پوچھ نہ ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت عین وہی تھی جو حضرت ابراہیم کی دعوت تھی۔ مگر یہود، جو حضرت ابراہیم کا پیرو ہونے پر فخر کرتے تھے، آپ کی دعوت کے سب سے بڑے مخالف بن گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

پیغمبر عربی جس دین ابراہیمی کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے وہ ''اسلام'' تھا۔ یعنی اللہ کے لیے کامل حوالگی و سپردگی۔ قرآن کے مطابق یہی حضرت ابراہیم کا دین تھا اور اپنی اولاد کو انھوں نے اسی کی وصیت کی۔ اس کے برعکس یہود نے حضرت ابراہیم کی طرف جو دین منسوب کر رکھا تھا اس میں حوالگی و سپردگی کا کوئی سوال نہ تھا۔ اس میں خواہش پرستی کی زندگی گزارتے ہوئے محض سستے تخیلات کے تحت جنت کی ضمانت حاصل ہو جاتی تھی۔ پیغمبر عربی کے لائے ہوئے دین میں نجات کا دارومدار تمام تر عمل پر تھا، جب کہ یہود نے ''اللہ کے مقبول بندوں'' کی جماعت سے وابستگی اور عقیدت کو نجات کے لیے کافی سمجھ لیا تھا۔ اوّل الذکر کے نزدیک دین آسمانی ہدایت کا نام تھا اور ثانی الذکر کے نزدیک محض ایک گروہی مجموعہ کا جو نسلی روایات اور قومی تخیلات کے تحت ایک خاص صورت میں بن گیا تھا۔

ماضی یا حال کے بزرگوں سے اپنے کو منسوب کر کے یہ اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ ہمارا انجام بھی انھیں کے ساتھ ہوگا۔ ہمارے عمل کی کمی ان کے عمل کی زیادتی سے پوری ہو جائے گی۔ یہود اس خوش فہمی کو یہاں تک لے گئے کہ انھوں نے نسلی نجات کا عقیدہ وضع کر لیا۔ انھوں نے اپنی تمام امیدیں اپنے بزرگوں کے تقدس پر قائم کر لیں۔ مگر یہ نفسیاتی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہر ایک کو وہی ملے گا جو اس نے کیا۔ ایک سے نہ دوسرے کے جرائم کی پوچھ ہوگی اور نہ ایک کو دوسرے کی نیکیوں میں سے حصہ ملے گا۔ ہر ایک اپنے کیے کے مطابق اللہ کے یہاں بدلہ پائے گا۔ ''تم نہ مرنا مگر اسلام پر'' یعنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے میں رکاوٹیں آئیں گی۔ تمھاری تمناؤں کی عمارت گرے گی۔ پھر بھی تم آخر وقت تک اس پر قائم رہنا۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ

۱۳۵۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ کہو کہ نہیں، بلکہ ہم تو پیروی کرتے ہیں ابراہیم کے دین کی جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھا۔ ۱۳۶۔ کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی ہے اور اس پر بھی جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتاری گئی اور جو ملا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرماں بردار ہیں۔ ۱۳۷۔ پھر اگر وہ ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ راہ پا گئے اور اگر وہ پھر جائیں تو اب وہ ضد پر ہیں۔ پس

اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝١٣٧ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝١٣٨ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝١٣٩ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝١٤٠ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٤١ ع ١٦

تمھاری طرف سے اللہ ان کے لیے کافی ہے اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۱۳۸۔ کہو ہم نے لیا اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ۱۳۹۔ کہو، کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو، حالاں کہ وہ ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں اور ہم خالص اس کے لیے ہیں۔ ۱۴۰۔ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد سب یہودی یا نصرانی تھے۔ کہو کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اس گواہی کو چھپائے جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس آئی ہوئی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ ۱۴۱۔ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے ان کے کیے ہوئے کی پوچھ نہ ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کی طرف بلاتے تھے وہ وہی ابراہیمی دین تھا جس سے اہل کتاب اپنے کو منسوب کیے ہوئے تھے۔ پھر وہ آپ کے مخالف کیوں ہوگئے۔ وجہ یہ تھی کہ پیغمبر عربیؐ کی دعوت کے مطابق، دین یہ تھا کہ آدمی اپنی زندگی کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے، وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر اللہ والا بن جائے۔ اس کے برعکس اہل کتاب کے یہاں دین بس ایک قومی فخر کے نشان کے طور پر باقی رہ گیا تھا۔ پیغمبر عربی کی دعوت سے ان کی پُرفخر نفسیات پر زد پڑتی تھی۔ اس لیے وہ آپ کے دشمن بن گئے۔

جو لوگ گروہی فضیلت کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ اپنے سے باہر کسی صداقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اپنے گروہ کے پیغمبرانِ خدا کو تو مانیں گے مگر اسی خدا کا ایک پیغمبر اُن کے گروہ سے باہر آئے تو وہ اس کا انکار کر دیں گے۔ دین کے نام پر وہ جس چیز سے واقف ہیں وہ صرف گروہ پرستی ہے، اس لیے وہی شخصیتیں ان کو عظیم نظر آتی ہیں جو ان کے اپنے گروہ سے تعلق رکھتی ہوں، مگر جس شخص کے لیے دین خدا پرستی کا نام ہو وہ خدا کی طرف سے آنے والی ہر آواز کو پہچان لے گا اور اس پر لبیک کہے گا۔ یہود کے علما کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ پیغمبر عربی اللہ کے آخری رسول ہیں اور ان کی دعوت سچی خدا پرستی کی دعوت ہے، مگر اپنی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر انھوں نے

لوگوں کے سامنے ایک ایسی حقیقت کا اعلان نہیں کیا جس کا اعلان کرنا ان کے اوپر خدا کی طرف سے فرض کیا گیا تھا۔

''پچھلے لوگوں کو ان کی کمائی کا بدلہ ملے گا اور اگلے لوگوں کو ان کی کمائی کا''— اس کا مطلب یہ ہے کہ حق کے معاملہ میں وراثت نہیں۔ پچھلی قومیں، مثلاً یہود، اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کے پچھلے بزرگوں کی نیکیوں کا ثواب ان کے بعد کے لوگوں کو بھی پہنچتا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں نے یہ سمجھ لیا کہ گناہ پچھلی نسل سے اگلی نسل کو وراثۃً منتقل ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کے عقیدے بالکل بے اصل ہیں۔ خدا کے یہاں ہر آدمی کو جو کچھ ملے گا، اپنے ذاتی عمل کی بنیاد پر ملے گا، نہ کہ کسی دوسرے کے عمل کی بنیاد پر۔

''اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ راہ یاب ہوئے''— گویا صحابہ کرام اپنے زمانہ میں جس ڈھنگ پر ایمان لائے تھے وہی وہ ایمان ہے جو اللہ کے یہاں اصلاً معتبر ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے اندر اتنے زیادہ دینی کام ہو رہے ہیں، مگر مسلمانوں میں کوئی واقعی بیداری اب تک پیدا نہ ہو سکی۔ اس سوال کا جواب اس آیت میں موجود ہے۔ اصحابِ رسول کی زندگیوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امت کے حصہ اول (صحابہ کرام) کو اسلام بطور معرفت (ڈسکوری) ملا تھا۔ ان کا ایمان داخل القلب ایمان (الحجرات، 49:14) تھا۔ اب دوبارہ یہی کرنا ہے کہ موجودہ مسلم نسلوں کو اسلام معرفت کے درجہ میں حاصل ہو جائے۔ اسلام ان کے لیے ری ڈسکوری کا معاملہ بن جائے۔ اس کے بعد ہی موجودہ مسلمانوں میں کوئی بڑا دینی انقلاب آسکتا ہے۔ امام مالک ابن انس (وفات 179ھ) نے کہا کہ وہب ابن کیسان تابعی (وفات 127ھ) کہا کرتے تھے: اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح بھی اسی طرح ہوگی جس طرح اس کے ابتدائی حصہ کی اصلاح ہوئی تھی (مسند الموطا للجوہری، اثر نمبر 783)۔

صحابۂ کرام کے زمانہ میں صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف قدیم انبیاء تھے جن کی حیثیت تاریخی طور پر مسلّم ہو چکی تھی دوسری طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو ابھی اپنی تاریخ کے آغاز میں تھے۔ آپ کی ذات کے گرد ابھی تک تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوئی تھیں اس کے باوجود انھوں نے آپ کو پہچانا اور آپ پر ایمان لائے۔ گویا اللہ کے نزدیک حق کا وہ اعتراف معتبر ہے جب کہ آدمی نے حق کو مجرد سطح پر دیکھ کر اسے مانا ہو۔ حق جب قومی وراثت بن جائے یا تاریخی عمل کے نتیجہ میں اس کے گرد عظمت کے مینار کھڑے ہو چکے ہوں تو حق کو ماننا حق کو ماننا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی چیز کو ماننا ہوتا ہے جو قومی فخر اور تاریخی تقاضا بن چکی ہو۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ وَ

☆۱۴۲۔ اب بے وقوف لوگ کہیں گے کہ مسلمانوں کو کس چیز نے ان کے قبلہ سے پھیر دیا۔ کہو کہ مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ ۱۴۳۔ اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا تاکہ تم ہو بتانے والے لوگوں پر، اور رسول ہو تم پر بتانے والا۔

يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۗ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۗ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۗ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤٣﴾

اور جس قبلہ پر تم تھے، ہم نے اس کو صرف اس لیے ٹھہرایا تھا کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ اور بیشک یہ بات بھاری ہے، مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے۔ اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھارے ایمان کو ضائع کردے۔ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنے والا، مہربان ہے۔

قبلہ کا تعلق مظاہرِ عبادت سے ہے، نہ کہ حقیقت عبادت سے۔ قبلہ کا اصل مقصد عبادت کی تنظیم کے لیے ایک عمومی رخ کا تعین کرنا ہے۔ ہر سمت اللہ کی سمت ہے۔ وہ اپنے بندوں کے لیے جو سمت بھی مقرر کردے وہی اس کی پسندیدہ عبادتی سمت ہوگی، خواہ وہ مشرق کی طرف ہو یا مغرب کی طرف۔ مگر لمبی مدت تک بیت المقدس کی طرف رخ کرکے عبادت کرنے کی وجہ سے قبلۂ اوّل کو تقدس حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ 2 ہجری میں جب قبلہ کی تبدیلی کا اعلان ہوا تو بہت سے لوگوں کے لیے اپنے ذہن کو اس کے مطابق بنانا مشکل ہو گیا۔ آپ کی مخالفت کرنے والے لوگوں نے اس کو بہانہ بنا کر آپؐ کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلانی شروع کیں —— بیت المقدس ہمیشہ سے نبیوں کا قبلہ رہا ہے۔ پھر اس کی مخالفت کیوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ساری تحریک یہود کی ضد میں چلائی جا رہی ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ مدعیٔ رسالت خود اپنے مشن کے بارے میں متحیر و متردد (confused) ہیں، کبھی کعبہ کی طرف رخ کرکے عبادت کرنے کو کہتے ہیں اور کبھی بیت المقدس کی طرف۔ کسی نے کہا: اگر کعبہ ہی اصل قبلہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے جو مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے ان کی نمازیں بے کار گئیں، وغیرہ۔ مگر جو سچے خدا پرست تھے، جو مظاہر میں اٹکے ہوئے نہیں تھے، ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اصل چیز قبلہ کی سمت نہیں، اصل چیز خدا کا حکم ہے۔ اللہ کی طرف سے جس وقت جو حکم آجائے وہی اس وقت کا قبلہ ہوگا۔ روایات میں آتا ہے کہ ہجرت کے تقریباً سترہ ماہ بعد جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ مدینہ میں نماز ادا کر رہے تھے۔ حکم معلوم ہوتے ہی آپ نے اور مسلمانوں نے عین حالتِ نماز اپنا رخ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف کرلیا، یعنی شمال سے جنوب کی طرف۔

قبلہ کی تبدیلی ایک علامت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو امامت سے معزول کرکے امتِ محمدی کو اس کی جگہ مقرر کردیا ہے۔ اب قیامت تک بیت المقدس کے بجائے کعبہ خدا کے دین کی دعوت اور خدا پرستوں کے باہمی اتحاد کا عالمی مرکز ہوگا۔ ''وسط'' کے معنی بیچ کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے درمیانی وسیلہ ہیں۔ اللہ کا پیغام رسول کے ذریعہ ان کو پہنچا

ہے۔ اب اس پیغام کو انھیں قیامت تک تمام قوموں کو پہنچاتے رہنا ہے، اسی پر دنیا میں بھی ان کے مستقبل کا انحصار ہے اور اسی پر آخرت میں ان کی نجات کا بھی۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ
فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ
فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٤﴾
وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ
مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ
مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا
يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ
لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ اَلْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾ ع ١٧

۱۴۴۔ ہم تمھارے منھ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں۔ پس ہم تم کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو تم پسند کرتے ہو، اب اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے رُخ کو اسی کی طرف کرو۔ اور اہل کتاب خوب جانتے ہیں کہ یہ حق ہے اور ان کے رب کی جانب سے ہے۔ اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۱۴۵۔ اور اگر تم ان اہل کتاب کے سامنے تمام دلیلیں پیش کر دو تب بھی وہ تمھارے قبلہ کو نہ مانیں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کر سکتے ہو۔ اور نہ وہ خود ایک دوسرے کے قبلہ کو مانتے ہیں۔ اور اس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے، اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو یقیناً تم ظالموں میں ہو جاؤ گے۔ ۱۴۶۔ جن کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک گروہ حق کو چھپا رہا ہے، حالاں کہ وہ اس کو جانتا ہے۔ ۱۴۷۔ حق وہ ہے جو تیرا رب کہے۔ پس تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ جن امور میں ابھی وحی نہ آئی ہو ان میں آپ پچھلے انبیاء کے طریقے کی پیروی کرتے تھے۔ اسی بنا پر آپ نے ابتدا میں بیت المقدس کو قبلہ بنالیا تھا جو حضرت سلیمان کے زمانہ سے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا قبلہ رہا ہے۔ یہود کو جب اللہ تعالیٰ نے دین کی امامت وپیشوائی سے معزول کیا تو اس کے بعد یہ بھی ضروری ہو گیا کہ دین کو زوال یافتہ روایات سے جدا کر دیا جائے تاکہ خدا کا دین ہر اعتبار سے اپنی خالص شکل میں نمایاں ہو سکے۔ اسی مصلحت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبدیلی قبلہ کے

حکم کا انتظار رہتا تھا۔ چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال یہ حکم آ گیا۔ بنی اسرائیل کے انبیاء جو یہود کو خبر دار کرنے کے لیے آئے، وہ پہلے ہی اس فیصلۂ الٰہی کی بابت یہود کو بتا چکے تھے اور ان کے علما اس معاملہ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ تاہم ان میں صرف چند لوگ (جیسے عبد اللہ بن سلّام اور مخیریق رضی اللہ عنہما) ایسے نکلے جنھوں نے آپ کی تصدیق کی اور اس بات کا اقرار کیا کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے دین کا اظہار فرمایا ہے۔ ان کے نہ ماننے کی وجہ محض ان کی خواہش پرستی تھی۔ وہ جن گروہی خوش خیالیوں میں جی رہے تھے، ان سے وہ نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ اور جو انکار محض خواہش پرستی کی بنا پر پیدا ہوا اس کو توڑنے میں کبھی کوئی دلیل کامیاب نہیں ہوتی۔ ایسا آدمی دلائل کے انکار سے اپنے لیے وہ رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے خالق نے صرف دلائل کے اعتراف میں رکھا ہے۔

اللہ کی طرف سے جب کسی امرِ حق کا اعلان ہوتا ہے تو وہ ایسے قطعی دلائل کے ساتھ ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اس کی صداقت کو پہچاننے سے عاجز نہ رہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ شبہ میں پڑیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ خدا سے آشنا نہ تھے۔ اس لیے وہ خدا کی بولی کو پہچان نہ سکے۔ اسی طرح وہ لوگ جو حق کے خلاف کچھ الفاظ بول کر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے حق کا اعتراف نہ کرنے کے لیے مضبوط استدلالی سہارے دریافت کر لیے ہیں، بہت جلد ان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ محض فرضی سہارے تھے جو ان کے نفس نے اپنی جھوٹی تسکین کے لیے وضع کر لیے تھے۔

وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ
جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ
مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ
حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ
اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ

۱۴۸۔ ہر ایک کے لیے ایک رخ ہے، جدھر وہ منہ کرتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو۔ تم جہاں کہیں ہوگے، اللہ تم سب کو لے آئے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔
۱۴۹۔ اور تم جہاں سے بھی نکلو، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو۔ بے شک یہ حق ہے، تمھارے رب کی طرف سے ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔
۱۵۰۔ اور تم جہاں سے بھی نکلو، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو اور تم جہاں بھی ہو، اپنے رخ کو اسی کی طرف رکھو تاکہ لوگوں کو تمھارے اوپر کوئی حجت باقی نہ رہے، سوا ان لوگوں کے جو ان میں بے انصاف ہیں۔ پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ اور تاکہ میں اپنی نعمت تمھارے اوپر پوری

وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ۝١٥٠ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا
مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا
لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝١٥١ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ
وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝١٥٢ ع ١٨ ٥ ٢

کردوں۔ اور تاکہ تم راہ پا جاؤ۔ ۱۵۱۔ جس طرح ہم نے تمھارے درمیان ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تم کو وہ چیزیں سکھا رہا ہے جن کو تم نہیں جانتے تھے۔ ۱۵۲۔ پس تم مجھ کو یاد رکھو، میں تم کو یاد رکھوں گا۔ اور میرا احسان مانو، میری ناشکری مت کرو۔

کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا تو زوال یافتہ ذہن والے لوگوں نے اس قسم کی بحثیں چھیڑ دیں کہ مغرب کی سمت خدا کی سمت ہے یا مشرق کی سمت۔ وہ اس مسئلہ کو بس رخ بندی کے مسئلہ کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ ان کی ناسمجھی تھی۔ کعبہ کو قبلہ مقرر کرنے کا معاملہ سادہ طور پر ایک عباداتی رخ مقرر کرنے کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک علامت تھی کہ اللہ کے بندوں کے لیے اس سب سے بڑے خیر کے اترنے کا وقت آگیا ہے جس کا فیصلہ بہت پہلے کیا جاچکا تھا۔ یہ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) کی دعا کے مطابق نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہے۔ اب وہ آنے والا آگیا ہے جو انسان کے اوپر اللہ کی ابدی ہدایت کا دروازہ کھولے اور اس کی نعمتِ ہدایت کو آخری حد تک کامل کردے — جو دین اللہ کی طرف سے بار بار بھیجا جاتا رہا، مگر انسانوں کی غفلت و سرکشی سے ضائع ہوتا رہا، اس کو اس کی کامل شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کردے۔ خدا کا دین جو اب تک محض روایتی افسانہ بنا ہوا تھا اس کو ایک حقیقی واقعہ کی حیثیت سے انسانی تاریخ میں شامل کردے۔ وہ دین جس کا کوئی مستقل نمونہ قائم نہیں ہوسکا تھا اس کو ایک زندہ عملی نمونے کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے رکھ دے۔ یہ ہدایت الٰہی کی تکمیل کا معاملہ ہے، نہ کہ مختلف سمتوں میں سے کوئی زیادہ "مقدس سمت" مقرر کرنے کا۔

کعبہ کی تعمیر کے وقت ہی یہ مقدر ہوچکا تھا کہ آخری رسول کے ذریعہ جس دین کا ظہور ہوگا اس کا مرکز کعبہ ہوگا۔ پچھلے انبیاء لوگوں کو مسلسل اس کی خبر دیتے رہے۔ اس طرح اللہ کی طرف سے کعبہ کو تمام قوموں کے لیے قبلہ مقرر کرنا گویا نبی آخر الزماں کی حیثیت کو ثابت شدہ بنانا تھا۔ اب جو سنجیدہ لوگ ہیں ان کے لیے اللہ کا یہ اعلان آخری حجت ہے، اور جو لوگ آخرت سے بے خوف ہیں ان کی زبان کو کوئی بھی چیز روکنے والی ثابت نہیں ہوسکتی۔ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہی ہدایت کا راستہ پاتے ہیں۔ اللہ کو یاد رکھنا ہی کسی کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اللہ اس کو یاد رکھے۔ اللہ سے خوف رکھنا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اللہ اس کو دوسری تمام چیزوں سے بے خوف کردے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ
وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَا
تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ يُّقۡتَلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ ؕ
بَلۡ اَحۡيَآءٌ وَّ لٰكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾
وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ وَالۡجُـوۡعِ وَ
نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَ
بَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ
مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّـآ اِلَيۡهِ
رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓـئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ
رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

۱۵۳۔اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
۱۵۴۔اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تم کو خبر نہیں۔
۱۵۵۔اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو۔
۱۵۶۔جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔
۱۵۷۔یہی لوگ ہیں جن کے اوپر ان کے رب کی شاباشیاں ہیں اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو راہ پر ہیں۔

دین یہ ہے کہ آدمی اپنے خالق کو اس طرح پالے کہ اس کی یاد میں اور اس کی شکر گزاری میں اس کے صبح وشام بسر ہونے لگیں۔ اس قسم کی زندگی ہی تمام خوشیوں اور لذتوں کا خزانہ ہے۔ مگر یہ خوشیاں اور لذتیں اپنی حقیقی صورت میں آدمی کو صرف آخرت میں ملیں گی۔ موجودہ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے انعام کے لیے نہیں بنایا بلکہ امتحان کے لیے بنایا ہے، یہاں ایسے حالات رکھے گئے ہیں کہ خدا پرستی کی راہ میں آدمی کے لیے رکاوٹیں پڑیں تا کہ معلوم ہو کہ کون اپنے ایمان کے اظہار میں سنجیدہ ہے اور کون سنجیدہ نہیں—— نفس کے محرکات، بیوی بچوں کے تقاضے، دنیا کی مصلحتیں، شیطان کے وسوسے، سماجی حالات کا دباؤ، وغیرہ۔ یہ چیزیں فتنہ کی صورت میں آدمی کو گھیرے رہتی ہیں۔ آدمی کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان فتنوں کو پہچانے اور ان سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ذکر وشکر کے تقاضے پورا کرے۔

ان امتحانی مشکلات کے مقابلہ میں کامیابی کا واحد ذریعہ نماز اور صبر ہے۔ یعنی اللہ سے لپٹنا اور ہر قسم کی ناخوش گواریوں کو برداشت کرتے ہوئے بالارادہ حق کے راستہ پر جمے رہنا۔ جو لوگ ناموافق حالات سامنے آنے کے باوجود نہ بدکیں اور بظاہر غیر اللہ میں نفع دیکھتے ہوئے اللہ کے ساتھ اپنے کو باندھے رہیں وہی وہ لوگ ہیں جو سنتِ الٰہی کے مطابق کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے۔

حق کی راہ میں مشکلات ومصائب کا دوسرا سبب مومن کا تبلیغی کردار ہے۔ تبلیغ ودعوت کا کام نصیحت اور

تنقید کا کام ہے۔ اور نصیحت اور تنقید ہمیشہ آدمی کے لیے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز رہی ہے، ان میں بھی نصیحت سننے کے لیے سب سے زیادہ حساس وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دنیا کے کاروبار کو دین کے نام پر کررہے ہوں۔ داعی کی ذات اور اس کے پیغام میں ایسے تمام لوگوں کو اپنی حیثیت کی نفی (negation) نظر آنے لگتی ہے۔ داعی کا وجود ایک ایسی ترازو بن جاتا ہے جس پر ہر آدمی تُل رہا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ داعی بنا بھڑ کے چھتہ میں ہاتھ ڈالنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے ماحول کے اندر بے جگہ کردیا جاتا ہے۔ اس کی معاشیات برباد ہوجاتی ہیں۔ اس کی ترقیوں کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ حتی کہ اس کی جان تک خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ مگر وہی آدمی راہ پر ہے جس کو بے راہ بتا کر ستایا جائے۔ وہی پاتا ہے جو اللہ کی راہ میں کھوئے۔ وہی جی رہا ہے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دے۔ آخرت کی جنت اسی کے لیے ہے جو اللہ کی خاطر دنیا کی جنت سے محروم ہو گیا ہو۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿١٥٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿١٥٩﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٦١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿١٦٢﴾

۱۵۸۔ صفا اور مروہ، بے شک اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں۔ پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے اور جو کوئی شوق سے کچھ نیکی کرے تو اللہ قدردان ہے، جاننے والا ہے۔ ۱۵۹۔ جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی کھلی نشانیوں کو اور ہماری ہدایت کو، بعد اس کے کہ ہم اس کو لوگوں کے لیے کتاب میں کھول چکے ہیں تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور ان پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ ۱۶۰۔ البتہ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کرلی اور واضح طور پر بیان کردیا تو ان کو میں معاف کردوں گا اور میں ہوں معاف کرنے والا، مہربان۔ ۱۶۱۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور وہ اسی حال میں مرگئے تو وہی لوگ ہیں کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ ۱۶۲۔ اسی حال میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان پر سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ ان کو ڈھیل دی جائے گی۔

حضرت ابراہیم کا وطن عراق تھا۔ اللہ کے حکم سے وہ اپنی بیوی ہاجرہ اور چھوٹے بچے اسماعیل کو لاکر اُس مقام پر چھوڑ گئے جہاں آج مکہ ہے۔ اس وقت یہاں نہ کوئی آبادی تھی اور نہ پانی۔ پیاس کا تقاضا ہوا تو ہاجرہ پانی کی تلاش میں نکلیں۔ پریشانی کے عالم میں وہ صفا اور مروہ نامی پہاڑیوں کے درمیان دوڑتی رہیں۔ سات چکر لگانے کے بعد ناکام لوٹیں تو دیکھا کہ ان کی قیام گاہ کے پاس ایک چشمہ پھوٹ نکلا ہے۔ یہ چشمہ بعد کو زمزم کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ اللہ کا معاملہ اپنے بندوں سے کیا ہے۔ اللہ کا کوئی بندہ اگر اللہ کی راہ میں بڑھتے ہوئے اس حد تک چلا جائے کہ اس کے قدموں کے نیچے ریگستان اور بیابان کے سوا کچھ نہ رہے تو اللہ اپنی قدرت سے ریگستان میں اس کے لیے رزق کے چشمے جاری کردے گا — حج اور عمرہ میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کا مقصد اسی تاریخ کی یاد کو تازہ کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات میں اللہ کی نشانیاں اتنی واضح تھیں کہ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ آپ کی زبان پر اللہ کا کلام جاری ہوا ہے۔ مگر اہل کتاب کے علما نے آپ کا اقرار نہیں کیا۔ ان کو اندیشہ تھا کہ اگر وہ پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیں تو ان کی مذہبی بڑائی ختم ہوجائے گی۔ ان کی جمی ہوئی تجارتیں اجڑ جائیں گی۔ اپنی کامیابی کا راز انھوں نے حق کو چھپانے میں سمجھا، حالاں کہ ان کی کامیابی کا راز حق کے اعلان میں تھا۔ حق کی طرف بڑھنے میں وہ اپنے آپ کو بے زمین ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ بھول گئے کہ یہی وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ جو بندہ حق کی خاطر بے زمین ہوجائے وہ سب سے بڑی زمین کو پالیتا ہے، یعنی اللہ رب العالمین کی نصرت کو۔

تاہم اللہ کی رحمت کا دروازہ آدمی کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ابتدائی طور پر غلطی کرنے کے بعد اگر آدمی کو ہوش آجائے اور وہ پلٹ کر صحیح رویہ اختیار کرلے۔ وہ اس امر حق کا اعلان کرے جس کو اللہ چاہتا ہے کہ اس کا اعلان کیا جائے تو اللہ اس کو معاف کردے گا۔ مگر جو لوگ عدم اعتراف پر قائم رہیں اور اسی حال میں مرجائیں تو وہ اللہ کی رحمتوں سے دور کردیے جائیں گے۔

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ
ع ۱۹ الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ
مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ

۱۶۳۔ اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بڑا مہربان ہے، نہایت رحم والا ہے۔ ۱۶۴۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو انسانوں کے کام آنے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں، اور اس پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے اتارا۔ پھر اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشی۔ اور اس نے زمین

فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّ تَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

میں سب قسم کے جانور پھیلا دئے۔ اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان حکم کے تابع ہیں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

انسان کا خدا ایک ہی خدا ہے اور وہی اس قابل ہے کہ وہ انسان کی توجہات کا مرکز بنے۔ ہمارا وجود اور وہ سب کچھ جو ہم کو زمین پر حاصل ہے وہ اسی لیے ہے کہ ہمارا یہ خدا رحمتوں اور مہربانیوں کا خزانہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو حقیقی معنوں میں اپنا معبود بنائے۔ وہ اسی کے لیے جیے اور اسی کے لیے مرے اور اپنی تمام امیدوں اور تمناؤں کو ہمیشہ کے لیے اسی کے ساتھ وابستہ کردے۔ جس طرح ایک چھوٹا بچہ اپنا سب کچھ صرف اپنی ماں کو سمجھتا ہے اسی طرح خدا انسان کے لیے اس کا سب کچھ بن جائے۔

ہمارے سامنے پھیلی ہوئی کائنات اللہ کا ایک عظیم الشان تعارف ہے۔ زمین و آسمان کی صورت میں ایک اتھاہ کارخانہ کا موجود ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ضرور اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ طرح طرح کے ظاہری اختلاف اور تضاد کے باوجود تمام چیزوں کا حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنا ثابت کرتا ہے کہ اس کا خالق و مالک صرف ایک ہے۔ کائنات کی چیزوں میں نفع بخشی کی صلاحیت ہونا گویا اس بات کا اعلان ہے کہ اس کی منصوبہ بندی کامل شعور کے تحت بالارادہ کی گئی ہے۔ بظاہر بے جان چیزوں میں قدرتی عمل سے جان اور تازگی کا آجانا بتاتا ہے کہ کائنات میں موت محض عارضی ہے، یہاں ہر موت کے بعد لازماً دوسری زندگی آتی ہے۔ ایک ہی پانی اور ایک ہی خوراک سے قسم قسم کے جان داروں کا ان گنت تعداد میں پایا جانا اللہ کی بے حساب قدرت کا پتہ دیتا ہے۔ ہوا کا مکمل طور پر انسان کو اپنے گھیرے میں لیے رہنا بتاتا ہے کہ انسان پوری طرح اپنے خالق کے قبضے میں ہے۔ کائنات کی تمام چیزوں کا انسانی ضرورت کے مطابق سدھا ہوا (customized) ہونا ثابت کرتا ہے کہ انسان کا خالق ایک بے حد مہربان ہستی ہے، وہ اس کی ضروریات کا اہتمام اس وقت سے کر رہا ہوتا ہے جب کہ اس کا وجود بھی نہیں ہوتا۔

کائنات میں اس قسم کی نشانیاں گویا مخلوقات کے اندر خالق کی جھلکیاں ہیں۔ وہ اللہ کی ہستی کا، اس کے ایک ہونے کا، اس کے تمام صفاتِ کمال کا جامع ہونے کا اتنے بڑے پیمانہ پر اظہار کر رہی ہیں کہ کوئی آنکھ والا اس کو دیکھنے سے محروم نہ رہے اور کوئی عقل والا اس کو پانے سے عاجز نہ ہو — دلائل کو وہی شخص پاتا ہے جو دلائل پر غور کرتا ہو۔ وہ سچائی کو جاننے کے معاملہ میں سنجیدہ ہو۔ وہ مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرتا ہو۔ وہ ظاہری چیزوں میں الجھ کر نہ رہ گیا ہو بلکہ ظاہری چیزوں کے پیچھے چھپی ہوئی اصل حقیقت کو جاننے کا حریص ہو۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع ۲۰

۱۶۵۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہیے۔ اور جو ایمان والے ہیں، وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب سے دوچار ہوں گے کہ زور سارا کا سارا اللہ کا ہے اور اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔ ۱۶۶۔ جب کہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے ان لوگوں سے الگ ہوجائیں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے۔ عذاب ان کے سامنے ہوگا اور ان کے سب طرف کے رشتے بالکل ٹوٹ چکے ہوں گے۔ ۱۶۷۔ وہ لوگ جو پیچھے چلے تھے، کہیں گے کاش ہم کو دنیا کی طرف لوٹنے کا موقع مل جاتا تو ہم بھی ان سے الگ ہوجاتے جیسے یہ ہم سے الگ ہوگئے۔ اس طرح اللہ ان کے اعمال کو انھیں حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ آگ سے نکل نہ سکیں گے۔

آدمی اپنی فطرت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ ایک خارجی سہارا چاہتا ہے، ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کی تلافی کرے اور اس کے لیے اعتماد ویقین کی بنیاد ہو۔ کسی کو اس حیثیت سے اپنی زندگی میں شامل کرنا اس کو اپنا معبود بنانا ہے۔ جب آدمی کسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے محبت وعقیدت کے جذبات اس کے لیے خاص ہوجاتے ہیں۔ آدمی عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ کسی سے حُبّ شدید کرے، اور جس سے کوئی حب شدید کرے وہی اس کا معبود ہے۔ موجودہ دنیا میں چوں کہ خدا نظر نہیں آتا ہے اس لیے ظاہر پرست انسان عام طور پر نظر آنے والی ہستیوں میں سے کسی ہستی کو وہ مقام دے دیتا ہے جو در اصل خدا کو دینا چاہیے۔ یہ ہستیاں اکثر وہ سردار یا پیشوا ہوتے ہیں جو کسی ظاہری خصوصیت کی بنا پر لوگوں کا مرجع بن جاتے ہیں۔ آدمی کی فطرت کا خلا جو حقیقۃً اس لیے تھا کہ اس کو رب العالمین سے پُر کیا جائے وہاں وہ کسی سردار یا پیشوا کو بٹھالیتا ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ کسی انسان کے گرد کچھ ظاہری رونق دیکھ کر لوگ اس کو ''بڑا'' سمجھ لیتے ہیں۔ کوئی

اپنے غیر معمولی شخصی اوصاف سے لوگوں کو متاثر کرلیتا ہے۔ کوئی کسی گدی پر بیٹھ کر سیکڑوں سال کی روایات کا وارث بن جاتا ہے۔ کسی کے یہاں انسانوں کی بھیڑ دیکھ کر لوگوں کو غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ وہ عام انسانوں سے بلندتر کوئی انسان ہے۔ کسی کے گرد پُراسرار کہانیوں کا ہالہ تیار ہوجاتا ہے اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ غیر معمولی قوتوں کا حامل ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کی اس کائنات میں خدا کے سوا کسی کو کوئی زور یا بڑائی حاصل نہیں۔ انسان کو خدا کا درجہ دینے کا کاروبار اسی وقت تک ہے، جب تک خدا ظاہر نہیں ہوتا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی صورت حال اس قدر بدل جائے گی کہ ''بڑے'' اپنے ''چھوٹوں'' سے بھاگنا چاہیں گے اور چھوٹے اپنے ''بڑوں'' سے۔ وہ وابستگی جس پر آدمی دنیا میں فخر کرتا تھا، جس سے وفاداری اور شیفتگی دکھا کر آدمی سمجھتا تھا کہ اس نے سب سے بڑی چٹان کو پکڑ رکھا ہے وہ آخرت کے دن اس طرح بے معنی ثابت ہوگی جیسے اس کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔ آدمی اپنی گزری ہوئی زندگی کو حسرت کے ساتھ دیکھے گا اور کچھ نہ کرسکے گا۔

يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ كُلُوۡا مِمَّا فِى الۡاَرۡضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ‌ؕ اِنَّهٗ لَـکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاۡمُرُكُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَالۡفَحۡشَآءِ وَاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَـتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ‌ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡئًا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ‌ؕ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡـىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

۱۶۸۔ لوگو! زمین کی چیزوں میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۱۶۹۔ وہ تم کو صرف برے کام اور بے حیائی کی تلقین کرتا ہے اور اس بات کی کہ تم اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تم کو کوئی علم نہیں۔ ۱۷۰۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر چلو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی کہ ان کے باپ دادا نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ سیدھی راہ جانتے ہوں۔ ۱۷۱۔ اور ان منکروں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسے جانور کے پیچھے چلّا رہا ہو جو بلانے اور پکارنے کے سوا اور کچھ نہیں سنتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

شرک کیا ہے، جذباتِ عبودیت کی تسکین کے لیے خدا کے سوا کوئی دوسرا مرکز بنالینا۔ خدا انسان کی سب سے بڑی اور لازمی ضرورت ہے۔ خدا کی طلب انسانی فطرت میں اس طرح بسی ہوئی ہے کہ کوئی شخص

خدا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انسان کی گم راہی خدا کو چھوڑنا نہیں ہے بلکہ اصلی خدا کی جگہ کسی فرضی خدا کو اپنا خدا بنا لینا ہے۔ اس لیے شریعت میں ہر اس چیز کو حرام قرار دیا گیا ہے جو کسی بھی درجہ میں آدمی کی فطری طلب کو اللہ کے سوا کسی اور کی طرف موڑ دینے والی ہو۔

بت پرست قومیں بتوں کے نام پر جانور چھوڑتی ہیں اور ان جانوروں سے نفع اٹھانا حرام سمجھتی ہیں۔ اس طرح کسی چیز کو اپنے لیے حرام کرلینا محض ایک سادہ قانونی معاملہ نہیں بلکہ یہ خدا کے دین کے بجائے ایک خودساختہ دین ایجاد کرنا ہے۔ کیوں کہ جب ایک چیز کو اس طرح حرام ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی خودساختہ عقیدہ کی وجہ سے اس کو مقدس سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ خدا کے حقوق میں غیر خدا کو ساجھی بنانا ہے، یہ احترام وتقدس کے ان فطری جذبات کو تقسیم کرنا ہے جو صرف خدا کے لیے ہیں اور جن کو صرف خدا ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ شیطان اس قسم کے رواج اس لیے ڈالتا ہے تاکہ وہ آدمی کے اندر چھپے ہوئے استعجاب وتقدس کے جذبات کو مختلف سمتوں میں بانٹ کر اللہ کے ساتھ اس کے تعلق کو کمزور کردے۔

ایک بار جب کسی غیر اللہ کو مقدس مان لیا جائے تو انسان کی توہم پرستی اس میں نئی نئی برائیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ ایک ''جانور'' کو ان پُراسرار اوصاف کا حامل گمان کرلیا جاتا ہے جو صرف خدا کے لیے خاص ہیں۔ اس کو خدا کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس سے برکت اور کار برآری کی امید کی جاتی ہے۔ یہ چیز جب اگلی نسلوں تک پہنچتی ہے تو وہ اس کو آباواجداد کی مقدس سنت سمجھ کر اس طرح پکڑ لیتی ہیں کہ اب اس پر کسی قسم کا غور وفکر ممکن نہیں ہوتا۔ حتی کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ لوگ دلیل کی زبان سمجھنے سے اتنا زیادہ عاری ہوجاتے ہیں گویا کہ ان کے پاس نہ آنکھ اور کان ہیں جن سے وہ دیکھیں اور سنیں اور نہ ان کے پاس دماغ ہے جس سے وہ کسی بات کو سمجھیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا
رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ
تَعْبُدُوْنَ ﴿١٧٢﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ
وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ
اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ
عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٧٣﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ

۱۷۲۔ اے ایمان والو، ہماری دی ہوئی پاک
چیزوں کو کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اس کی
عبادت کرنے والے ہو۔ ۱۷۳۔ اللہ نے تم پر
حرام کیا ہے صرف مردار کو اور خون کو اور سور کے
گوشت کو۔ اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام
لیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو جائے، وہ نہ خواہش
مند ہو اور نہ حد سے آگے بڑھنے والا ہو، تو اس پر
کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان
ہے۔ ۱۷۴۔ جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو

وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا
يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ
اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١٧٤ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا
الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ
اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝١٧٥ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي
الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ۝١٧٦ ع ٢١

اللہ نے اپنی کتاب میں اتاری ہے اوراس کے بدلے میں تھوڑا مول لیتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں صرف آگ بھر رہے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ نہ ان سے ہم کلام ہوگا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔
۱۷۵۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کا سودا کیا اور بخشش کے بدلے عذاب کا، تو کیسی سہار ہے ان کو آگ کی۔
۱۷۶۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے اپنی کتاب کو ٹھیک ٹھیک اتارا، مگر جن لوگوں نے کتاب میں کئی راہیں نکال لیں، وہ ضد میں دور جا پڑے۔

کھانے پینے کی چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے جو احساسات آدمی کے اندر ابھرنے چاہئیں وہ شکر اور اطاعت الٰہی کے احساسات ہیں۔ یعنی یہ کہ ’’ہم اللہ کی دی ہوئی چیز کو اللہ کے حکم کے مطابق کھا رہے ہیں‘‘۔ یہ احساس آدمی کے اندر خدا پرستی کا جذبہ ابھارتا ہے۔ مگر خود ساختہ طور پر جو عقیدے بنائے جاتے ہیں اس میں یہ نفسیات بدل جاتی ہیں۔ اب انسان کی توجہ چیزوں کے مفروضہ خواص کی طرف لگ جاتی ہے۔ جن چیزوں کو پا کر اللہ کے شکر کا جذبہ ابھرتا اب ان سے خود ان چیزوں کے احترام وتقدس کا جذبہ ابھرتا ہے۔ آدمی مخلوق کو خالق کا درجہ دے دیتا ہے۔ کسی چیز کے حرام ہونے کی بنیاد اس کا مفروضہ تقدس یا اس کے بارے میں توہماتی عقائد نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے اسباب بالکل دوسرے ہیں۔ یہ کہ وہ چیزیں ناپاک ہوں اور شریعت نے ان کی ناپاکی کی تصدیق کی ہو۔ جیسے مُردار، خون، سور۔ یا خدا کے پیدا کیے ہوئے جانور کو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کرنا، وغیرہ۔ اضطرار کی حالت میں آدمی حرام کو کھا سکتا ہے۔ جب کہ بھوک یا بیماری یا حالات کا کوئی دباؤ آدمی کو اس کے استعمال پر مجبور کردے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ آدمی حرام چیز کو رغبت سے نہ کھائے اور نہ اس کو واقعی ضرورت سے زیادہ لے۔

اس قسم کے توہماتی عقائد جب عوامی مذہب بن جائیں تو علماء کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ اس کے بارے میں اللہ کا حکم جانتے ہوئے بھی وہ اس کے اعلان سے ڈرنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ عوام سے کٹ جائیں گے جن کے درمیان مقبولیت حاصل کرکے وہ ’’بڑے‘‘ بنے ہوئے ہیں۔ گمراہ عوام سے مصالحت اگرچہ دنیا میں ان کو عزت اور دولت دے دیتی ہے مگر اللہ کی نظر میں ایسے لوگ بدترین مجرم ہیں۔ حق کو مصلحت کی خاطر چھپانا ان لغزشوں میں نہیں ہے جن سے آخرت میں اللہ درگزر فرمائے گا۔ یہ وہ جرائم

ہیں جو آدمی کو اللہ کی نظر عنایت سے محروم کردیتے ہیں۔ ان میں بھی زیادہ برے وہ لوگ ہیں جن کے سامنے حق پیش کیا جائے اور وہ اعتراف کرنے کے بجائے اس میں بے معنی بحثیں نکالنے لگیں۔ ایسے لوگوں کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہیں اور بالآخر وہ حق سے اتنا دور ہوجاتے ہیں کہ کبھی اس کی طرف نہیں لوٹتے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

۱۷۷۔ نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ پورب اور پچھّم کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر۔ اور مال دے اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں۔ اور صبر کرنے والے سختی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔ یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں ڈر رکھنے والے۔

یہود نے مغرب کو اپنا قبلۂ عبادت بنایا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کو۔ دونوں اپنے اپنے قبلے کی سمت کو مقدس سمجھتے تھے۔ دونوں کو بھروسہ تھا کہ انھوں نے خدا کی مقدس سمت کو اپنا قبلہ بنا کر خدا کے یہاں اپنا درجہ محفوظ کرلیا ہے۔ مگر خدا پرستی یہ نہیں ہے کہ آدمی کسی ''مقدس ستون'' کو تھام لے، خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی خود اللہ کے دامن کو پکڑ لے۔ دینی عمل کی اگرچہ ایک ظاہری صورت ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ اس اللہ کو پالینا ہے جو زمین و آسمان کا نور ہے، جو آدمی کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ کے یہاں جو چیز کسی کو مقبول بناتی ہے وہ کسی قسم کی ظاہری چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہ عمل ہے جو آدمی اپنے پورے وجود کے ساتھ خالص اللہ کے لیے کرتا ہے۔ اللہ کا مقبول بندہ وہ ہے جو اللہ کو اس طرح پالے کہ اللہ اس کی پوری ہستی میں اتر جائے۔ وہ آدمی کے شعور میں شامل ہوجائے۔ وہ اس کے مال و دولت کا مالک بن جائے۔ وہ اس کی یادوں میں سما جائے۔ وہ اس کے کردار پر چھا جائے۔ آدمی اپنے رب کو اس طرح پکڑ لے کہ سخت ترین وقتوں میں بھی خدا کی رسّی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اللہ کا حق اس کی سچی وفاداری سے ادا ہوتا ہے، نہ کہ محض اِدھر یا اُدھر رُخ کرلینے سے۔

اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اپنا سب کچھ بنا لے۔ آخرت کے دن پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دنیا کے بجائے آخرت کو زندگی کا اصل مسئلہ سمجھنے لگے۔ فرشتوں پر ایمان یہ ہے کہ وہ خدا کے ان کارندوں کو مانے جو خدا کے حکم کے تحت دنیا کا انتظام چلا رہے ہیں۔ کتاب پر ایمان یہ ہے کہ آدمی یہ یقین کرے کہ اللہ نے انسان کے

لیے اپنا ہدایت نامہ بھیجا ہے جس کی اُسے لازماً پابندی کرنی ہے۔ پیغمبروں پر ایمان یہ ہے کہ اللہ کے ان بندوں کو اللہ کا نمائندہ تسلیم کیا جائے جن کو اللہ نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے چنا۔ پھر یہ ایمانیات آدمی کے اندر اتنی گہری اتر جائیں کہ وہ اللہ کی محبت اور شوق میں اپنا مال ضرورت مندوں کو دے اور انسانوں کو مصیبت سے چھڑائے۔ نماز قائم کرنا اللہ کے آگے ہمہ تن جھک جانا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنا اپنے مال میں خدا کے مستقل حصے کا اقرار کرنا ہے۔ ایسا بندہ جب کوئی عہد کرتا ہے تو اس کے بعد وہ اس سے پھرنا نہیں جانتا۔ کیوں کہ وہ ہر عہد کو خدا سے کیا ہوا عہد سمجھتا ہے۔ اس کو اللہ کے اوپر اتنا بھروسہ ہو جاتا ہے کہ تنگی اور مصیبت ہو یا جنگ کی نوبت آجائے، ہر حال میں وہ خدا پرستی کے راستہ پر جما رہتا ہے۔ یہ اوصاف جس کے اندر پیدا ہو جائیں وہی سچا مومن ہے اور سچا مومن اللہ سے اندیشہ رکھنے والا ہوتا ہے، نہ کہ کسی جھوٹے سہارے پر اعتماد کر کے اس سے نڈر ہو جانے والا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَۨا ښ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ ۭ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

۱۷۸۔ اے ایمان والو، تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا جاتا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔ پھر جس کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ معروف کی پیروی کرے اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے ایک آسانی اور مہربانی ہے۔ اب اس کے بعد بھی جو شخص زیادتی کرے، اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۱۷۹۔ اور اے عقل والو، قصاص میں تمھارے لیے زندگی ہے تاکہ تم بچو۔ ۱۸۰۔ تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ اپنے پیچھے، مال چھوڑ رہا ہو تو وہ معروف کے مطابق وصیت کر دے اپنے ماں باپ کے لیے اور اپنے قرابت داروں کے لیے۔ یہ ضروری ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ۱۸۱۔ پھر جو کوئی وصیت کو سننے کے بعد اس کو بدل ڈالے تو اس کا گناہ اسی پر ہوگا جس نے اس کو بدلا، یقیناً اللہ سننے والا، جاننے

عَلِيْمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ
اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ
ع ۲۲ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨٢﴾

والا ہے۔ ۱۸۲۔ البتہ جس کو وصیت کرنے والے کی بابت یہ اندیشہ ہو کہ اس نے جانب داری یا حق تلفی کی ہے اور وہ آپس میں صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

قتل کے معاملہ میں اسلام میں قصاص کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی قاتل کے ساتھ وہی کیا جائے جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے۔ اس طرح ایک طرف آئندہ کے لیے قتل کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اپنی جان کا خوف آدمی کو دوسرے کی جان لینے سے روکتا ہے اور نتیجۃً سب کی جانیں محفوظ ہوجاتی ہیں۔ قاتل کے قتل سے پورے معاشرہ کے لیے زندگی کی ضمانت پیدا ہوجاتی ہے۔ دوسری طرف مقتول کے ورثا کا انتقامی جذبہ ٹھنڈا ہو کر سماج میں کسی نئی تخریبی کارروائی کے امکان کو ختم کردیتا ہے۔ تاہم قصاص کا معاملہ اسلام میں قابل راضی نامہ ہے۔ یعنی مقتول کے ورثاء چاہیں تو قاتل کو قتل کرسکتے ہیں، چاہیں تو دیت (مالی معاوضہ) لے سکتے ہیں اور چاہیں تو معاف کرسکتے ہیں۔ اس گنجائش کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے کی فضا باقی رہے، ایک دوسرے کو حریف سمجھنے کی فضا کسی حال میں پیدا نہ ہو۔ نیز خون بہا کے اصول کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے مقتول کے وارثوں کو اپنے چلے جانے والے فرد خاندان کا ایک مالی بدل مل جاتا ہے۔

جب کوئی مرجاتا ہے تو یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کی وراثت کا کیا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ اس کی وراثت کو اس کے رشتہ داروں میں معروف طریقہ سے تقسیم کردیا جائے۔ یہ گویا مال کا تقویٰ ہے۔ جب مرنے والوں کے رشتہ داروں تک حصہ بحصہ اس کا چھوڑا ہوا مال پہنچ جائے تو اس سے معاشرہ میں یہ فضا بنتی ہے کہ ازروئے حق جس کو جو دیا جانا چاہیے وہ دیا جاچکا ہے۔ اس طرح خاندان کے اندر متروکہ مال یا جائداد کے حصول کے لیے باہمی نزاع پیدا نہیں ہوتی، خاندان کا جو شخص قانونی اعتبار سے وارث نہ قرار پاتا ہو، مگر اخلاقی اعتبار سے وہ مستحق ہو تو مرنے والے کو چاہیے کہ وصیت کے ذریعہ اس خلا کو پُر کردے۔ (یہاں وراثت کے بارے میں معروف کے مطابق وصیت کرنے کا حکم ہے۔ آگے سورہ النساء میں ہر ایک کے حصہ کو قانونی طور پر معین کردیا گیا ہے)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا
كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ﴿١٨٣﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ

۱۸۳۔ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم پرہیز گار بنو۔ ۱۸۴۔ گنتی کے چند دن۔ پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں تعداد

مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَہُوَ خَیۡرٌ لَّہٗ ؕ وَ اَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾

شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡہُدٰی وَ الۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَہِدَ مِنۡکُمُ الشَّہۡرَ فَلۡیَصُمۡہُ ؕ وَ مَنۡ کَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ ۫ وَ لِتُکۡمِلُوا الۡعِدَّۃَ وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمۡ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾

پوری کرلے۔ اور جو اس کو بہ مشقت برداشت کرسکیں، تو ایک روزہ کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور تم روزہ رکھو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم جانو۔ ۱۸۵۔ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور کھلی نشانیاں راستہ کی اور حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا۔ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے، وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمھارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اور اس لیے کہ تم گنتی پوری کرلو اور اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔

روزہ بیک وقت دو چیزوں کی تربیت ہے۔ ایک شکر، دوسرے تقویٰ۔ کھانا اور پانی اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ مگر عام حالات میں آدمی کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ روزہ میں جب وہ دن بھر ان چیزوں سے رکا رہتا ہے اور سورج ڈوبنے کے بعد شدید بھوک پیاس کی حالت میں کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھانا اور پانی اللہ کی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ اس تجربہ سے اس کے اندر اپنے رب کے شکر کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہی روزہ آدمی کے لیے تقویٰ کی تربیت بھی ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی دنیا کی زندگی میں خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچے۔ وہ ان چیزوں سے رُکا رہے جن سے خدا نے روکا ہے اور وہی کرے جس کے کرنے کی خدا نے اجازت دی ہے۔ روزہ میں صرف رات کو کھانا اور دن کو کھانا پینا چھوڑ دینا گویا خدا کو اپنے اوپر نگراں بنانے کی مشق ہے۔ مومن کی پوری زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔ رمضان کے مہینے میں وقتی طور پر چند چیزوں کو چھڑا کر آدمی کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ ساری عمر ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اس کے رب کو ناپسند ہیں — قرآن بندے کے اوپر اللہ کا انعام ہے اور روزہ بندے کی طرف سے اس انعام کا عملی اعتراف۔ روزہ کے ذریعہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کی شکر گزاری کے قابل بناتا ہے اور یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق دنیا میں متقیانہ زندگی گزار سکے۔

روزہ سے دلوں کے اندر نرمی اور تواضع (modesty) آتی ہے۔ اس طرح روزہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت

پیدا کرتا ہے کہ وہ ان کیفیتوں کو محسوس کر سکے جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہیں۔ روزہ کی پُرمشقت تربیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ اللہ کی شکر گزاری میں اس کا سینہ تڑپے اور اللہ کے خوف سے اس کے اندر کپکپی پیدا ہو۔ جب آدمی اس نفسیاتی حالت کو پہنچتا ہے، اسی وقت وہ اس قابل بنتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر ایسا شکر ادا کرے جس میں اس کے دل کی دھڑکنیں شامل ہوں۔ وہ ایسے تقویٰ کا تجربہ کرے جو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے کر دے۔ وہ اللہ کو ایسے بڑے کی حیثیت سے پائے جس میں اس کا اپنا وجود بالکل چھوٹا ہو گیا ہو۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ
اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ
فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ
یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ
الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآىِٕكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ
لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ
تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ وَ عَفَا
عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ
اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَكُمُ
الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ
الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَى الَّیْلِ ۚ وَ لَا
تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ
یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾
وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ
وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ
ع ۲۳ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع

۱۸۶۔ اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں نزدیک ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں، تا کہ وہ ہدایت پائیں۔ ۱۸۷۔ تمھارے لیے روزہ کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے جانا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم کو معاف کر دیا۔ تو اب تم ان سے ملو اور چاہو جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔ اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے الگ ظاہر ہو جائے۔ پھر پورا کرو روزہ رات تک۔ اور جب تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے خلوت نہ کرو۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں تو ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تا کہ وہ بچیں۔ ۱۸۸۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طور پر نہ کھاؤ اور ان کو حاکموں تک نہ پہنچاؤ، تا کہ دوسروں کے مال کا کوئی حصہ بطریقِ گناہ کھا جاؤ۔ حالاں کہ تم اس کو جانتے ہو۔

روزہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے صبر کا عمل ہے اور صبر، یعنی حکم الٰہی کی تعمیل میں مشکلات کو برداشت کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی اس قلبی حالت کو پہنچتا ہے جو اس کو خدا سے قریب کرے اور اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلوائے جو قبولیت کو پہنچنے والے ہوں۔ اللہ کو وہی پاتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرے، اللہ تک اسی شخص کے الفاظ پہنچتے ہیں جس نے اپنی روح کے تاروں کو اللہ سے ملا رکھا ہو۔

شریعت آدمی کے اوپر کوئی غیر فطری پابندی عائد نہیں کرتی۔ روزہ میں دن کے اوقات میں ازدواجی تعلق ممنوع ہونے کے باوجود رات کے اوقات میں اس کی اجازت، افطار وسحر کے اوقات جاننے کے لیے جنتری کا پابند کرنے کے بجائے عام مشاہدہ کو بنیاد قرار دینا اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ جزئی تفصیلات میں بندوں کو گنجائش دیتے ہوئے اللہ نے عمومی حدیں واضح فرمادی ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ مقرر حدوں کا پوری طرح پابند رہے اور تفصیلی جزئیات میں اس روش کو اختیار کرے جو تقویٰ کی روح کے مطابق ہے۔

روزہ کے حکم کے فوراً بعد یہ حکم کہ ''ناجائز مال نہ کھاؤ'' بتاتا ہے کہ روزہ کی حقیقت کیا ہے۔ روزہ کا اصل مقصد آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنا ہے کہ جہاں خدا کی طرف سے رکنے کا حکم ہو، وہاں آدمی رک جائے، حتی کہ اگر حکم ہو تو جائز چیز سے بھی، جیسا کہ روزہ میں ہوتا ہے۔ اب جو شخص خدا کے حکم کی بنا پر حلال کمائی تک سے رک جائے وہ اسی خدا کے حکم کی بنا پر حرام کمائی سے کیوں نہ اپنے آپ کو روکے رکھے گا۔

مومن کی زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔ اس کو ساری عمر کچھ چیزوں سے ''افطار'' کرنا ہے اور کچھ چیزوں سے مستقل طور پر ''روزہ'' رکھ لینا ہے۔ رمضان کا مہینہ اسی کی تربیت ہے۔ پھر روزہ کی محتاط زندگی اور اس کا پُرمشقت عمل یہ سبق دیتا ہے کہ اللہ کا عبادت گزار بندہ وہ ہے جو تقویٰ کی سطح پر اللہ کی عبادت کر رہا ہو۔ اللہ کو پکارنے والا صرف وہ ہے جو قربانیوں کی سطح پر اللہ کی نزدیکی حاصل کرے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٨٩﴾ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿١٩٠﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ

۱۸۹۔ وہ تم سے چاندوں کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ اوقات ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے۔ اور نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں آؤ چھت پر سے، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی پرہیزگاری کرے۔ اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ۱۹۰۔ اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو لڑتے ہیں تم سے۔ اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۹۱۔ اور قتل کرو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو

اَخۡرَجُوۡكُمۡ وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَلَا
تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰى
يُقٰتِلُوۡكُمۡ فِيۡهِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ ؕ
كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ
اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا
تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انۡتَهَوۡا
فَلَا عُدۡوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۹۳﴾

نکالا ہے۔ اور فتنہ سخت تر ہے قتل سے۔ اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو۔ یہی سزا ہے منکروں کی۔ ۱۹۲۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۱۹۳۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہوجائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو اس کے بعد سختی نہیں ہے مگر ظالموں پر۔

چاند کا گھٹنا بڑھنا تاریخ جاننے کے لیے ہے، نہ کہ توہم پرستوں کے خیال کے مطابق اس لیے کہ بڑھتے چاند کے دن مبارک ہیں اور گھٹتے چاند کے دن منحوس۔ یہ آسمان پر ظاہر ہونے والا قدرت کا کیلنڈر ہے تا کہ اس کو دیکھ کر لوگ اپنے معاملات اور اپنی عبادات کا نظام مقرر کریں۔ اسی طرح بہت سے لوگ ظاہری رسوم کو دین داری سمجھ لیتے ہیں۔ قدیم عربوں نے یہ فرض کرلیا تھا کہ حج کا احرام باندھنے کے بعد اپنے اور آسمان کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا احرام کے آداب کے خلاف ہے۔ اس مفروضہ کی بنا پر وہ ایسا کرتے کہ جب احرام باندھ کر گھر سے باہر آجاتے تو دوبارہ دروازہ کے راستہ سے گھر میں نہ جاتے بلکہ دیوار کے اوپر سے چڑھ کر صحن میں داخل ہوتے۔ مگر اس قسم کے ظاہری آداب کا نام دین داری نہیں۔ دین داری یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور زندگی میں اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کو پابندی کرے۔

مومن کو دین کا عامل بننے کے ساتھ دین کا مجاہد بھی بننا ہے۔ یہاں جس جہاد کا ذکر ہے وہ جہاد وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آیا۔ عرب کے مشرکین اتمام حجت کے باوجود دعوت رسالت سے انکار کرکے اپنے لیے زندگی کا حق کھو چکے تھے، نیز انھوں نے جارحیت کا آغاز کرکے اپنے خلاف فوجی اقدام کو درست ثابت کردیا تھا۔ اس بنا پر ان کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم ہوا۔ ''اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہوجائے'' کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی جبر کا خاتمہ ہوجائے اور مذہب کے معاملے میں انسان کو آزادی حاصل ہوجائے۔ اس حکم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کو توحید کا دائمی مرکز بنا دیا۔

اہلِ ایمان کو جنگ کی اجازت صرف اس وقت ہے جب کہ فریق مخالف کی طرف سے حملہ کا آغاز ہوچکا ہو۔ دوسرے یہ کہ جب اہل ایمان غلبہ پالیں تو اس کے بعد ماضی کے جرائم پر کسی کے لیے کوئی سزا نہیں۔ ہتھیار ڈالتے ہی ماضی کے جرائم معاف کردیے جائیں گے۔ اس کے بعد سزا کا مستحق صرف وہ شخص ہوگا جو آئندہ کسی قابل سزا جرم کا ارتکاب کرے۔ عام حالات میں قتل کا حکم اور ہے اور جنگی حالات میں قتل کا حکم اور۔

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛۚ وَاَحۡسِنُوۡا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۹۵﴾

۱۹۴۔ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے اور حرمتوں کا بھی قصاص ہے۔ پس جس نے تم پر زیادتی کی تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ ۱۹۵۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور کام اچھی طرح کرو۔ بے شک اللہ پسند کرتا ہے اچھی طرح کام کرنے والوں کو۔

حرام مہینوں (محرم، رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ) میں یا حرم مکہ کے حدود میں لڑائی گناہ ہے۔ مگر جب مخالفین اسلام تمھارے خلاف کارروائی کرنے کے لیے اس کی حرمت کو توڑ دیں تو تم کو بھی حق ہے کہ قصاص کے طور پر تم ان کی حرمت کا لحاظ نہ کرو۔ مگر دشمن کے ساتھ دشمنی میں تم کو اللہ سے بے خوف نہ ہو جانا چاہیے۔ کسی حد کو توڑنے میں تم اپنی طرف سے ابتدا نہ کرو اور نہ کوئی ایسا اقدام کرو جو ضروری حد سے زیادہ ہو—اللہ کی مدد کسی کو اسی وقت ملتی ہے جب کہ وہ اشتعال کے اوقات میں بھی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کا پابند بنا رہے۔

قصاص اور ظلم میں یہ فرق ہے کہ قصاص فریق ثانی کی طرف سے کی ہوئی زیادتی کے برابر اور اس کے بقدر ہوتا ہے۔ جب کہ ظلم ان حدبندیوں سے باہر نکل جانے کا نام ہے۔ ایک شخص کو کسی سے تکلیف پہنچے تو وہ دوسرے کو اتنی ہی تکلیف پہنچا سکتا ہے جتنی اس کو پہنچی ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ نصیحت بری لگے تو گالی اور استہزاء سے اس کا جواب دینا یا زبان وقلم کی شکایت کے بدلے میں جارحیت دکھانا تقویٰ کے سراسر خلاف ہے۔ اسی طرح مالی نقصان کے بدلے جانی نقصان، معمولی چوٹ کے بدلے زیادہ بڑی چوٹ، ایک قتل کے بدلے بہت سے آدمیوں کا قتل، اس قسم کی تمام چیزیں ظلم کی تعریف میں آتی ہیں۔ مسلمان کے لیے برابر کا بدلہ (قصاص) جائز ہے مگر ظلم کسی حال میں جائز نہیں۔

اللہ کی راہ میں جدوجہد سب سے زیادہ جس چیز کا تقاضا کرتی ہے وہ مال ہے۔ اور مال کی قربانی بلاشبہ آدمی کے لیے سب سے زیادہ مشکل چیز ہے۔ اس لیے حکم دیا کہ اللہ کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اس کی راہ میں خوب مال خرچ کرو اور اس کام کو اس کی بہتر سے بہتر صورت میں انجام دو۔ ''اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو'' سے مراد بخل ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو، کیوں کہ خرچ میں دل تنگ ہونا دنیا و آخرت کی بربادی ہے۔ آدمی مال خرچ کر دینے کو ہلاکت سمجھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا ہلاکت ہے۔ آدمی کے پاس جو کچھ ہے اگر وہ اس کو اللہ کے حوالے نہ کرے تو

اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ کیوں اس کو آدمی کے حوالے کرے گا۔

آدمی اپنی دولت کا استعمال صرف یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کو اپنی ذات پر یا اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرے۔ مگر اس ذہن کو قرآن ہلاکت بتاتا ہے۔ اس کے بجائے دولت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ دین کی ضرورتوں میں خرچ کیا جائے۔ مال کو صرف اپنے ذاتی حوصلوں کی تکمیل میں خرچ کرنا فرد اور معاشرہ کو خدا کے غضب کا مستحق بنا تا ہے۔ اس کے برعکس، جب مال کو اللہ کے دین کی راہ میں خرچ کیا جائے تو فرد اور جماعت دونوں اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں کے مستحق بنتے ہیں۔ خرچ کرنے والے کو اس کا فائدہ بے شمار صورتوں میں دنیا میں بھی حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ
فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا
رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ
كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ
فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۥ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى
الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ
يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ
اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ
لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ ع ۲۴ ۸
فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا
فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ
الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَ اتَّقُوْنِ يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

۱۹۶۔ اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے لیے۔ پھر اگر تم گھر جاؤ تو جو قربانی کا جانور میسر ہو، وہ پیش کر دو اور اپنے سروں کو نہ منڈاؤ جب تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر نہ پہنچ جائے۔ تم میں سے جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ فدیہ دے روزہ یا صدقہ یا قربانی کا۔ جب امن کی حالت ہو اور کوئی حج تک عمرہ کا فائدہ حاصل کرنا چاہے تو وہ قربانی پیش کرے جو اس کو میسر آئے۔ پھر جس کو میسر نہ آئے تو وہ حج کے ایام میں تین دن کے روزے رکھے اور سات دن کے روزے جب کہ تم گھروں کو لوٹو۔ یہ پورے دس دن ہوئے۔ یہ اس شخص کے لیے ہے جس کا خاندان مسجد حرام کے پاس آباد نہ ہو۔ اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ ۱۹۷۔ حج کے متعین مہینے ہیں۔ پس جس نے حج کا عزم کر لیا تو پھر اس کو حج کے دوران نہ کوئی فحش بات کرنی ہے اور نہ گناہ کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔ اور جو نیک کام تم کرو گے، اللہ اس کو جان لے گا۔ اور تم زادِ راہ لو۔ بہترین زادِ راہ تقویٰ کا زادِ راہ ہے۔ اور اے عقل والو، مجھ سے ڈرو۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی حج کا رواج تھا۔ مگر وہ ان کے لیے گویا ایک قومی رسم یا تجارتی میلہ تھا، نہ کہ اللہ واحد کی عبادت۔ مگر حج وعمرہ ہو یا اور کوئی عبادت، ان کی اصل قیمت اسی وقت ہے جب کہ وہ خالصۃً اللہ کے لیے ادا کی جائیں۔ جو شخص اپنی روزانہ زندگی میں اللہ کا پرستار بنا ہوا ہو، جب وہ اللہ کی عبادت کے لیے اٹھتا ہے تو اس کی ساری نفسیات سمٹ کر اسی کے اوپر لگ جاتی ہیں۔ وہ ایک ایسی عبادت کا تجربہ کرتا ہے جو ظاہری طور پر دیکھنے میں تو آداب ومناسک کا ایک مجموعہ ہوتی ہے، مگر اپنی اندرونی روح کے اعتبار سے وہ ایک ایسی ہستی کا اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دینا ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہو اور آخرت کی پکڑ کا اندیشہ جس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہو۔

مومن وہ ہے جو شہوت کے لیے جینے کے بجائے مقصد کے لیے جینے لگے۔ وہ اپنے معاملات میں خدا کی نافرمانی سے بچنے والا ہو اور اجتماعی زندگی میں آپس کی لڑائی جھگڑے سے بچا رہے۔ حج کا سفر ان اخلاقی اوصاف کی تربیت کے لیے بہت موزوں ہے، اس لیے اس میں خصوصی طور پر ان کی تاکید کی گئی۔ اسی طرح حج میں سفر کا پہلو لوگوں کو سامان سفر کے اہتمام میں لگا دیتا ہے۔ مگر اللہ کے مسافر کی سب سے بڑی زادراہ تقویٰ ہے۔ ایک شخص سامان سفر کے پورے اہتمام کے ساتھ نکلے، دوسرا شخص اعتماد علی اللہ کا سرمایہ لے کر نکلے تو دوران سفر دونوں کی نفسیات یکساں نہیں ہوسکتیں۔

''اے عقل والو میرا تقویٰ اختیار کرو'' سے معلوم ہوا کہ تقویٰ ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق عقل سے ہے۔ تقویٰ کسی ظاہری ہیئت کا نام نہیں، یہ عقل یا شعور کی ایک حالت ہے۔ انسان جب شعور کی سطح پر اپنے رب کو پالیتا ہے تو اس کا ذہن اس کے بعد خدا کے جلال وجمال سے بھر جاتا ہے۔ اس وقت روح کی لطیف سطح پر جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں انھیں کا نام تقویٰ ہے۔

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ۖ وَ اذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ ۚ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ

۱۹۸۔ تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔ پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس ہو تو اللہ کو یاد کرو مشعرِ حرام کے نزدیک۔ اور اس کو یاد کرو جس طرح اللہ نے بتایا ہے۔ اس سے پہلے یقیناً تم راہ بھٹکے ہوئے لوگوں میں تھے۔ ۱۹۹۔ پھر طواف کو چلو جہاں سے سب لوگ چلیں اور اللہ سے معافی مانگو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ۲۰۰۔ پھر جب تم اپنے حج کے اعمال پورے کرلو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ پس

اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ
رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی
الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا النصف
كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ
تَعَجَّلَ فِیْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ
تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

کوئی آدمی کہتا ہے: اے ہمارے رب، ہم کو اسی دنیا میں دے دے، اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔ ۲۰۱۔ اور کوئی آدمی ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب، ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ ۲۰۲۔ انھیں لوگوں کے لیے حصہ ہے ان کے کیے کا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ ۲۰۳۔ اور اللہ کو یاد کرو مقرر دنوں میں۔ پھر جو شخص جلدی کرکے دو دن میں مکہ واپس آجائے اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو شخص ٹھہر جائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ اس کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرے۔ اور تم اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تم اسی کے پاس اکٹھا کیے جاؤ گے۔

اصل چیز اللہ کا تقویٰ ہے۔ کسی کے اندر یہ مطلوب حالت موجود ہو تو اس کے بعد حج کے دوران معاشی ضرورت کے تحت اس کا کچھ کاروبار کر لینا یا بعض مراسم حج کی ادائیگی میں کسی کا آگے یا کسی کا پیچھے ہو جانا کوئی حرج پیدا نہیں کرتا۔ حج کے دوران جو فضا جاری رہنی چاہیے وہ ہے اللہ کا خوف، اللہ کی یاد، اللہ کی نعمتوں کا شکر، اللہ کے لیے حوالگی کا جذبہ۔ حج کے دوران کوئی ایسا فعل نہیں ہونا چاہیے جو ان کیفیات کے خلاف ہو۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کے لیے عبادت کی ادائیگی کے موقع پر اپنی برتری کا اظہار یا آباء واجداد کے کارنامے بیان کرنا وغیرہ، بالواسطہ طور پر اپنے کو نمایاں کرنے کی ایک صورت ہے۔ یہ چیزیں ایک ایسی عبادت کے ساتھ بے جوڑ ہیں جو یہ بتاتی ہو کہ تمام انسان یکساں ہیں، جس میں اس بات کا اعلان کیا جاتا ہو کہ تمام بڑائی صرف اللہ کے لیے ہے۔ حج کے زمانہ میں بھی اگر آدمی ان چیزوں کی تربیت حاصل نہ کرے تو زندگی کے بقیہ لمحات میں وہ کس طرح ان پر قائم رہ سکے گا۔

دعائیں، خاص طور پر حج کی دعائیں، آدمی کی اندرونی حالت کا اظہار ہیں۔ کوئی شخص آخرت کی عظمتوں کو اپنے دل میں لیے ہوئے جی رہا ہو تو حج کے مقامات پر اس کے دل سے آخرت والی دعائیں ابلیں گی۔ اس کے برعکس، جو شخص دنیا کی چیزوں میں اپنا دل لگائے ہوئے ہو، وہ حج کے مواقع پر اپنے خدا سے سب سے زیادہ جو چیز مانگے گا وہ وہی ہوگی جس کی تڑپ لیے ہوئے وہ وہاں پہنچا تھا۔ اور سب سے بہتر دعا تو یہ ہے کہ آدمی اپنے رب سے کہے کہ خدایا دنیا میں تیرے نزدیک جو چیز بہتر ہو وہ مجھ کو دنیا

میں دے دے اور آخرت میں تیرے نزدیک جو چیز بہتر ہو وہ مجھ کو آخرت میں دے دے اور اپنی ناراضگی سے مجھ کو بچالے۔

''تم اسی کے پاس اکٹھا کیے جاؤ گے'' یہ حج کا سب سے بڑا سبق ہے جو عرفات کے میدان میں دنیا بھر کے لاکھوں انسانوں کو بیک وقت جمع کر کے دیا جاتا ہے۔ عرفات کا اجتماع قیامت کے اجتماع کی ایک تمثیل ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾

۲۰۴۔ اور لوگوں میں سے کوئی ہے کہ اس کی بات دنیا کی زندگی میں تم کو خوش کن لگتی ہے اور وہ اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ حالاں کہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ ۲۰۵۔ اور جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو وہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور کھیتیوں اور جانوں کو ہلاک کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ ۲۰۶۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو وقار اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ پس ایسے شخص کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ۲۰۷۔ اور لوگوں میں کوئی ہے کہ اللہ کی خوشی کی تلاش میں اپنی جان کو بیچ دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔

جو شخص مصلحت کو اپنا دین بنائے اس کی باتیں ہمیشہ لوگوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ وہ لوگوں کی پسند کو دیکھ کر اس کے مطابق بولتا ہے، نہ کہ یہ دیکھ کر کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ اس کے سامنے کوئی مستقل معیار نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ مخاطب کی رعایت سے ہر وہ انداز اختیار کر لیتا ہے جو مخاطب پر اثر ڈالنے والا ہو۔ حق کا وفادار نہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے یہ مشکل نہیں رہتا کہ دل میں کوئی حقیقی جذبہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ زبان سے خوب صورت باتیں کرے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بات کے اسٹیج پر وہ مصلح کے روپ میں نظر آتا ہے اور عمل کے میدان میں اس کی سرگرمیاں فساد کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس کی وجہ اس کا تضاد ہے۔ عملی نتائج ہمیشہ عمل سے پیدا ہوتے ہیں، نہ کہ الفاظ سے۔ وہ اگرچہ زبان سے حق پرستی کے الفاظ بولتا ہے۔ مگر عمل کے اعتبار سے وہ جس سطح پر ہوتا ہے وہ صرف ذاتی مفاد ہے۔ یہ چیز اس کے قول و عمل میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ بات کے مقام سے ہٹ کر جب وہ عمل کے مقام پر آتا ہے تو اس کے مفاد کا تقاضا کھینچ کر اس کو ایسی سرگرمیوں کی طرف لے جاتا ہے جو صرف

تخریب پیدا کرنے والی ہیں۔ یہاں وہ اپنے ذاتی فائدے کی خاطر دوسروں کا استحصال کرتا ہے۔ وہ عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو جذباتی باتوں کی شراب پلاتا ہے۔ وہ اپنی قیادت قائم کرنے کی خاطر پوری قوم کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ وہ تعمیر کے بجائے تخریب کی سیاست چلاتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح زیادہ آسانی سے عوام کی بھیڑ اپنے گرد اکٹھا کی جاسکتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کے مفاد اور مصلحت کے ساتھ اپنی زندگی کا سودا کیا۔ حق واضح ہوجانے کے بعد بھی وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ کیوں کہ اس میں ان کو اپنے وقار کا بت ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ ظاہری طور پر نرم باتوں کے پیچھے ان کی متکبرانہ نفسیات ان کو ایک ایسے حق کے داعی کے سامنے جھکنے سے روک دیتی ہے جس کو وہ اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اللہ کی رضا کے ساتھ اپنی زندگی کا سودا کرتے ہیں۔ ایسا شخص اپنے عادات و خیالات سے دست بردار ہو کر خدا کی باتوں کو قبول کرتا ہے۔ وہ اپنے مال کو خدا کے حوالے کر کے اس کے بدلے بے مال بن جانے کو گوارا کرلیتا ہے۔ وہ رواجی دین کو رد کر کے خدا کے بے آمیز دین کو لیتا ہے، خواہ اس کی وجہ سے اس کو غیر مقبولیت پر راضی ہونا پڑے۔ وہ مصلحت پرستی کے بجائے اعلان حق کو اپنا شیوہ بناتا ہے، اگرچہ اس کے نتیجہ میں وہ لوگوں کے عتاب کا شکار رہتا رہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ
كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ
لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٠٨﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿٢٠٩﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ
اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ
الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٢١٠﴾ ع ٢٥/١٤/٩ سَلْ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ
وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ
فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ
كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ

۲۰۸۔ اے ایمان والو، اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۲۰۹۔ اگر تم پھسل جاؤ بعد اس کے کہ تمھارے پاس واضح دلیلیں آچکی ہیں تو جان لو کہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۲۱۰۔ کیا لوگ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ بادل کے سائبانوں میں آئے اور فرشتے بھی آجائیں اور معاملہ کا فیصلہ کردیا جائے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف پھیرے جاتے ہیں۔ ۲۱۱۔ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے ان کو کتنی کھلی کھلی نشانیاں دیں۔ اور جو شخص اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے جب کہ وہ اس کے پاس آچکی ہو تو اللہ یقینا سخت سزا دینے والا ہے۔ ۲۱۲۔ خوش نما کردی گئی ہے دنیا کی زندگی ان لوگوں کی نظر میں

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾

جو منکر ہیں اور وہ ایمان والوں پر ہنستے ہیں۔ حالاں کہ جو پرہیزگار ہیں، وہ قیامت کے دن ان کے مقابلہ میں اونچے ہوں گے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے، بے حساب روزی دے دیتا ہے۔

اسلام کو اختیار کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ تحفظات اور مصلحتوں کا لحاظ کیے بغیر اس کو اپنایا جائے۔ اسلام جس چیز کو کرنے کو کہے اس کو کیا جائے اور جس چیز کو چھوڑنے کو کہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ کسی آدمی کا پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اسلام کو اسی حد تک اختیار کرے جس حد تک اسلام اس کی زندگی سے ٹکراتا نہ ہو۔ وہ اس اسلام کو لے لے جو اس کے لیے مفید یا کم از کم بے ضرر ہو۔ اور اس اسلام کو چھوڑے رہے جو اس کے محبوب عقائد، اس کی پسندیدہ عادات، اس کے دنیوی فائدے، اس کے شخصی وقار، اس کی قائدانہ مصلحتوں کو مجروح کرتا ہو۔ آدمی ابتداءً پوری طرح ارادہ کر کے اسلام کو اختیار کرتا ہے۔ مگر جب وہ وقت آتا ہے کہ وہ اپنے فکری ڈھانچہ کو توڑے یا اپنے مفاد کو نظر انداز کر کے اسلام کا ساتھ دے تو وہ پھسل جاتا ہے۔ وہ ایسے اسلام پر ٹھہر جاتا ہے جس میں اس کے مفادات بھی مجروح نہ ہوں اور اسلام کا تمغہ بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

اسلام کے پیغام کی صداقت پر یقین کرنے کے لیے اگر وہ دلائل چاہتے ہیں تو دلائل پوری طرح دیے جا چکے ہیں۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کو معجزات دکھائے جائیں تو جو شخص کھلے کھلے دلائل کو نہ مانے اس کو چپ کرنے کے لیے معجزات بھی ناکافی ثابت ہوں گے۔ اس کے بعد آخری چیز جو باقی رہتی ہے وہ یہ کہ خدا اپنے فرشتوں کے ساتھ سامنے آجائے۔ مگر جب ایسا ہوگا تو وہ کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ فیصلہ کا وقت ہوگا، نہ کہ عمل کرنے کا۔ انسان کا امتحان یہی ہے کہ وہ دیکھے بغیر محض دلائل کی بنیاد پر مان لے۔ اگر اس نے دیکھ کر مانا تو اس ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔

وہ لوگ جو مصلحتوں کو نظر انداز کر کے اسلام کو اپنائیں اور وہ لوگ جو مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے مسلمان بنیں، دونوں کے حالات یکساں نہیں ہوتے۔ پہلا گروہ اکثر دنیوی اہمیت کی چیزوں سے خالی ہو جاتا ہے جب کہ دوسرے گروہ کے پاس ہر قسم کی دنیوی رونقیں جمع ہو جاتی ہیں۔ یہ چیز دوسرے گروہ کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے۔ وہ اپنے کو برتر خیال کرتا ہے اور پہلے گروہ کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ مگر یہ صورت حال انتہائی عارضی ہے۔ موجودہ دنیا کو توڑ کر جب نیا بہتر نظام بنے گا تو وہاں آج کے ''بڑے'' پست کر دیے جائیں گے اور وہی لوگ بڑائی کے مقام پر نظر آئیں گے جن کو آج ''چھوٹا'' سمجھ لیا گیا تھا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

۲۱۳۔ لوگ ایک امت تھے۔ انھوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان کے ساتھ اتاری کتاب حق کے ساتھ، تاکہ وہ فیصلہ کردے ان باتوں کا جن میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ اختلافات انھیں لوگوں نے کیے جن کو حق دیا گیا تھا، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، آپس کی ضد کی وجہ سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق سے حق کے معاملہ میں ایمان والوں کو راہ دکھائی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔
۲۱۴۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہوجاؤ گے، حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تمھارے اگلوں پر گزرے تھے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ یاد رکھو، اللہ کی مدد قریب ہے۔

دین میں اختلاف تعبیر وتشریح کے اختلاف سے شروع ہوتا ہے۔ ہر ایک اپنے ذہنی سانچہ کے مطابق خدا کے دین کا ایک تصور قائم کرلیتا ہے۔ ایک ہی کتابِ ہدایت کو مانتے ہوئے بھی لوگوں کی رائیں الگ الگ ہوجاتی ہیں۔ اس وقت اللہ اپنے چنے ہوئے بندے کے ذریعہ امرحق کا اعلان کراتا ہے۔ یہ آواز اگرچہ انسان کی زبان میں ہوتی ہے اور بظاہر عام آدمیوں جیسے ایک آدمی کے ذریعہ بلند کی جاتی ہے۔ تاہم جو سچے متلاشئ حق ہیں وہ اس کے اندر شامل خدائی گونج کو پہچان لیتے ہیں اور اپنے اختلاف کو بھول کر فوراً اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو اپنے خود ساختہ دین کے ساتھ اپنے کو اتنا زیادہ وابستہ کرچکا ہوتا ہے کہ اس کے اندر یہ جذبہ ابھر آتا ہے کہ میں دوسرے کی بات کیوں مانوں۔ اس کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اسی چیز کا انکار کردیتا ہے جس کا وہ اپنے خیال کے مطابق علم بردار بنا ہوا تھا۔

حق جب روشن دلائل کے ساتھ آجائے اور اس کے باوجود آدمی اس کا ساتھ نہ دے تو اس کی وجہ ہمیشہ یہ

ہوتی ہے کہ آدمی کو نظر آتا ہے کہ اس کا ساتھ دینے میں اس کی خوش گمانیوں کا محل ڈھ جائے گا۔ اس کے مفادات کا نظام ٹوٹ جائے گا۔ اس کی آسودہ زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس کا وقار باقی نہیں رہے گا۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو اللہ کو اپنے وفادار بندوں سے مطلوب ہے۔ جس راستہ کی دشواریوں سے گھبرا کر آدمی اس پر آنا نہیں چاہتا وہی وہ راستہ ہے جو جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جنت کی واحد قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے۔ آدمی اپنے وجود کو فکر و عمل کے جن نقشوں کے حوالے کیے ہوئے ہے وہاں سے اکھاڑ کر جب وہ اس کو خدا کے نقشہ میں لانا چاہتا ہے تو اس کی پوری شخصیت ہل جاتی ہے۔ اس میں اس وقت اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے جب کہ اس کے ساتھ وہ خدا کے دین کا داعی بن کر کھڑا ہو جائے۔ داعی بننا بالفاظ دیگر دوسروں کے اوپر ناصح اور ناقد بننا ہے اور اپنے خلاف نصیحت اور تنقید کو سننا ہر زمانہ میں انسان کے لیے مبغوض ترین امر رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مدعو کی طرف سے اتنا شدید ردعمل سامنے آتا ہے جو داعی کے لیے ایک بھونچال سے کم نہیں ہوتا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾ ع ٢٦/٦/١٠

۲۱۵۔ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو مال تم خرچ کرو تو اس میں حق ہے تمھارے ماں باپ کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا۔ اور جو بھلائی تم کرو گے، وہ اللہ کو معلوم ہے۔ ۲۱۶۔ تم پر لڑائی کا حکم ہوا ہے اور وہ تم کو گراں معلوم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمھارے لیے بھلی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کے جان اور مال کے استعمال کا بہترین مصرف اس کے بیوی بچے ہیں۔ وہ اپنے اثاثہ کو اپنے ذاتی حوصلوں اور تمناؤں میں لٹا کر خوش ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شریعت یہ کہتی ہے کہ اپنے جان اور مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ یہ دونوں مدیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک خود اپنے اوپر خرچ کرنا ہے اور دوسرا غیروں کے اوپر۔ ایک اپنی طاقت کو دنیا کی ظاہری چیزوں کے حصول پر لگانا ہے اور دوسرا آخرت کی نظر نہ آنے والی چیزوں پر۔ مگر انسان کو جو چیز ناپسند ہے وہی اللہ کی نظر میں بھلائی ہے۔ کیوں کہ وہ اس کی اگلی وسیع تر زندگی میں اس کو نفع دینے والی ہے۔ اور انسان کو جو چیز پسند ہے وہ اللہ کی نظر میں برائی ہے۔ کیوں کہ اس کا جو کچھ فائدہ ہے اسی عارضی دنیا میں ہے، آخرت میں اس سے کسی کو کچھ ملنے والا نہیں۔

یہی اصول زندگی کے تمام معاملات کے لیے صحیح ہے — آدمی آزاد اور بے قید زندگی کو پسند کرتا ہے، حالاں کہ اس کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی رسی میں باندھ کر رکھے۔ آدمی اپنی تعریف کرنے والے کو دوست بناتا ہے، حالاں کہ اس کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ اس شخص کو اپنا دوست بنائے جو اس کی غلطیوں کو اسے بتاتا ہو۔ آدمی ایک حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس طرح اس نے لوگوں کی نظر میں اپنے وقار کو بچالیا۔ حالاں کہ اس کے لیے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنی عزت کو خطرہ میں ڈال کر کھلے دل سے حق کا اعتراف کرلے۔ آدمی محنت اور قربانی والے دین سے بے رغبت رہتا ہے اور اس دین کو لے لیتا ہے جس میں معمولی باتوں پر جنت کی خوش خبری مل رہی ہو۔ حالاں کہ اس کے لیے زیادہ بہتر تھا کہ وہ محنت اور قربانی والے دین کو اختیار کرتا۔ آدمی ''زندگی'' کے مسائل کو اہمیت دیتا ہے، حالاں کہ زیادہ بڑی عقل مندی یہ ہے کہ آدمی ''موت'' کے مسائل کو اہمیت دے۔

''اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان سطحی جذبات ومحرکات سے بلند ہے جن سے بلند نہ ہونے کی وجہ سے انسان کی رائے متاثر رائے بن جاتی ہے۔ وہ صحیح رُخ کو چھوڑ کر غلط رخ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اللہ کا فیصلہ ہر قسم کی غیر متعلق چیزوں کی ملاوٹ سے پاک ہے۔ اس کا فیصلہ بے آمیز فیصلہ ہے۔ اس لیے اس کے برحق ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ انسان کے فیصلے طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے مغلوب رہتے ہیں۔ وہ پست محرکات کے زیر اثر رائیں قائم کرتا ہے، اس لیے انسان کی رائے اکثر اوقات نہ مبنی برحق ہوتی ہے اور نہ مطابق واقعہ۔ خدا جو کہے اسی کو تم حق سمجھو اور اس کے مقابلہ میں اپنے خیال کو چھوڑ دو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

۲۱۷۔ لوگ تم سے حرمت والے مہینہ کی بابت پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑنا کیسا ہے۔ کہہ دو کہ اس میں لڑنا بہت برا ہے۔ مگر اللہ کے راستہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ بڑی برائی ہے۔ اور یہ لوگ تم سے برابر لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تم کو تمھارے دین سے پھیر دیں اگر قابو پائیں۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے عمل ضائع ہوگئے دنیا میں اور آخرت میں۔ اور وہ آگ میں پڑنے والے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۱۸۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

رجب 2 ہجری میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مسلمانوں کے ایک دستہ اور مشرکین قریش کی ایک جماعت کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ یہ واقعہ مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ میں پیش آیا۔ قریش کا ایک آدمی مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ یہ جمادی الثانی کی 30 تاریخ ہے۔ مگر چاند 29 کا ہو گیا تھا اور وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی۔ رجب کا مہینہ ماہ حرام میں شمار ہوتا ہے اور صدیوں کے رواج سے اس معاملہ میں عربوں کے جذبات بہت شدید تھے۔ اس طرح مخالفین کو موقع مل گیا کہ وہ مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کریں کہ یہ لوگ حق پرستی سے اتنا دور ہیں کہ حرام مہینوں کی حرمت کا بھی خیال نہیں کرتے۔ جواب میں کہا گیا کہ ماہ حرام میں لڑنا یقیناً گناہ ہے۔ مگر مسلمانوں سے یہ فعل تو بھول سے اور اتفاقاً ہو گیا اور تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ جان بوجھ کر اور مستقل طور پر تم اس سے کہیں زیادہ بڑے جرم کر رہے ہو۔ تمھارے درمیان اللہ کی پکار بلند ہوئی ہے مگر تم اس کو ماننے سے انکار کر رہے ہو اور دوسروں کو بھی اس کو اختیار کرنے سے روکتے ہو۔ تمھارے ضد اور عناد کا یہ حال ہے کہ اللہ کے بندوں کے اوپر اللہ کے گھر کا دروازہ بند کرتے ہو، ان کو ان کے اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کرتے ہو۔ حتی کہ جو لوگ اللہ کے دین کی طرف بڑھتے ہیں ان کو طرح طرح سے ستاتے ہو تاکہ وہ اس کو چھوڑ دیں۔ حالاں کہ کسی کو اللہ کے راستہ سے ہٹانا اس کو قتل کر دینے سے بھی زیادہ برا ہے — اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے کہ آدمی خود بڑی بڑی برائیوں میں مبتلا ہو اور دوسرے کی ایک معمولی خطا کو پا جائے تو اس کو شہرت دے کر اس کو بدنام کرے۔

مخالفتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو اپنے گھروں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ دین پر قائم رہنے کے لیے ان کو جہاد کی حد تک جانا پڑتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک دو طرفہ عمل ہے جو خدا پرستوں اور خدا دشمنوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کے نہیں بلکہ اپنی ذات کے پجاری ہیں۔ جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے اللہ سے بے خوف ہو کر اللہ کے بندوں کو ستاتے ہیں۔ دوسری طرف اسی واقعہ کے درمیان ایمان اور ہجرت اور جہاد کی نیکیاں ظہور میں آتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے حالات کی شدت کے باوجود اللہ پر اپنے بھروسہ کو باقی رکھا اور کس نے اس کو کھو دیا۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ

۲۱۹۔ لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی

مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ؕ وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ
الۡعَفۡوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ۙ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ؕ
وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡيَتٰمٰى ؕ قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ
خَيۡرٌ ؕ وَاِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ
يَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ
لَاَعۡنَتَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۰﴾

ہیں۔ اور ان کا گناہ بہت زیادہ ہے، ان کے فائدے سے۔ اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو حاجت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے احکام کو بیان کرتا ہے تا کہ تم دھیان کرو۔ ۲۲۰۔ دنیا اور آخرت کے معاملات میں۔ اور وہ تم سے یتیموں کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ جس میں ان کی بہبود ہو وہ بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کرلو تو وہ تمھارے بھائی ہیں۔ اور اللہ کو معلوم ہے کہ کون خرابی پیدا کرنے والا ہے اور کون درستگی پیدا کرنے والا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشکل میں ڈال دیتا۔ اللہ زبردست ہے، تدبیر والا ہے۔

چند سوالات کا جواب دیتے ہوئے یہاں کچھ بنیادی اصول بتا دیے گئے ہیں (1) کسی چیز کا نقصان اگر اس کے نفع سے زیادہ ہو تو وہ قابل ترک ہے۔ (2) اپنی واقعی ضرورت سے زیادہ جو مال ہو اس کو اللہ کی راہ میں دے دینا چاہیے۔ (3) باہمی معاملات میں ان طریقوں سے بچنا جو کسی بگاڑ کا سبب بن سکتے ہوں اور ان طریقوں کو اختیار کرنا جو اصلاح پیدا کرنے والے ہوں۔

شراب پی کر آدمی کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ جوا کھیلنے والے کو کبھی محنت کے بغیر کافی دولت ہاتھ آجاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان چیزوں میں نفع کا پہلو ہے۔ مگر دوسرے اعتبار سے ان کے اندر دینی اور اخلاقی نقصانات ہیں اور یہ نقصانات ان کے نفع سے بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے ان سے منع کر دیا گیا۔ کسی چیز کو لینے یا نہ لینے کا یہی معیار زندگی کے دوسرے امور کے لیے بھی ہے۔ مثلاً وہ تمام سیاسی اور غیر سیاسی سرگرمیاں، وہ تمام تقریبات اور جلسے قابل ترک ہیں جن کے بارے میں دینی اور اقتصادی جائزہ بتائے کہ ان میں نفع کم ہے اور نقصان زیادہ۔

مسلمان وہ ہے جو آخرت کو اپنی منزل بنائے، جو اس تڑپ کے ساتھ اپنی صبح و شام کر رہا ہو کہ اس کا خدا اس سے راضی ہو جائے۔ ایسے شخص کے لیے دنیا کا ساز و سامان زندگی کی ضرورت ہے، نہ کہ زندگی کا مقصد۔ وہ مال حاصل کرتا ہے، وہ دنیا کے کاموں میں مشغول ہوتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس کے لیے حاجت اور ضرورت کے درجہ میں ہوتا ہے، نہ کہ مقصد کے درجہ میں۔ اس کے اثاثہ کی جو چیز اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ ہو، اس کا بہترین مصرف اس کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو اپنے رب کی راہ میں دے دے، تا کہ وہ اس سے راضی ہو اور اس کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے۔ اس کی ہر چیز بقدر حاجت

اپنے لیے ہوتی ہے اور حاجت سے جو زیادہ ہو وہ دین کے لیے۔

باہمی معاملات اور کاروبار کے اکثر مسائل اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں صرف بنیادی ہدایات دی جاسکتی ہیں۔ ان کی تمام عملی تفصیلات کو قانون کے الفاظ میں متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں یہ اصول مقرر کردیا گیا کہ اپنی نیت کو درست رکھو اور جو کارروائی کرو یہ سوچ کر کرو کہ وہ کسی بگاڑ کا سبب نہ بنے۔ بلکہ صاحب معاملہ کے حق میں بہتری پیدا کرنے والی ہو۔ اگر تم دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتے ہوئے اس کے مصالح کی پوری رعایت رکھو گے اور تمھارا مقصود صرف اصلاح و درستگی ہوگا تو اللہ کے یہاں تمھاری پکڑ نہیں۔

وَ لَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ؕ
وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّ لَوۡ
اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى
يُؤۡمِنُوۡا ؕ وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ
وَّ لَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى
النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡٓا اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ
بِاِذۡنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ
يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾ وَ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ ع ۲۷ ۵ ۱۱
الۡمَحِيۡضِ ؕ قُلۡ هُوَ اَذًى ۙ فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ
فِى الۡمَحِيۡضِ ۙ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ ۚ
فَاِذَا تَطَهَّرۡنَ فَاۡتُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ اَمَرَكُمُ
اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيۡنَ وَ يُحِبُّ
الۡمُتَطَهِّرِيۡنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٌ لَّكُمۡ ۪
فَاۡتُوۡا حَرۡثَكُمۡ اَنّٰى شِئۡتُمۡ ۫ وَ قَدِّمُوۡا
لِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡٓا اَنَّكُمۡ
مُّلٰقُوۡهُ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۲۳﴾

۲۲۱۔ اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں، اور مومن کنیز بہتر ہے ایک مشرک عورت سے، اگرچہ وہ تم کو اچھی معلوم ہو۔ اور اپنی عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں، مومن غلام بہتر ہے ایک آزاد مشرک سے، اگرچہ وہ تم کو اچھا معلوم ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت کی طرف اور اپنی بخشش کی طرف بلاتا ہے اپنے حکم سے۔ وہ اپنے احکام لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔ ۲۲۲۔ اور وہ تم سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ ایک گندگی ہے، اس میں عورتوں سے الگ رہو۔ اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔ پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہوجائیں تو اس طریقہ سے ان کے پاس جاؤ جس کا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور وہ دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو۔ ۲۲۳۔ تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ اور اپنے لیے آگے بھیجو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تمھیں ضرور اس سے ملنا ہے۔ اور ایمان والوں کو خوش خبری دے دو۔

مرد اور عورت جب نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھی بنتے ہیں تو اس کا اصل مقصد شہوت رانی نہیں ہوتا بلکہ یہ اسی قسم کا ایک بامقصد تعلق ہے جو کسان اور کھیت کے درمیان ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کو اتنا ہی سنجیدہ ہونا چاہیے جتنا کھیتی کا منصوبہ بنانے والا سنجیدہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔

ایک یہ کہ جوڑے کے انتخاب میں سب سے زیادہ جس چیز کو دیکھا جائے وہ ایمان ہے۔ میاں بیوی کا تعلق بے حد نازک تعلق ہے۔ اس کے بہت سے نفسیاتی، خاندانی اور سماجی پہلو ہیں۔ اس قسم کا تعلق دو شخصوں کے درمیان اگر اعتقادی موافقت کے بغیر ہو تو بالآخر وہ دو میں سے کسی ایک کی بربادی کا باعث ہوگا — ایک مومن اپنے غیر مومن جوڑے سے اعتقادی مصالحت کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے دین کو برباد کرلیا۔ اور اگر وہ مصالحت نہ کرے تو اس کے بعد دونوں میں جو کش مکش ہوگی اس کے نتیجے میں اس کا گھر برباد ہوجائے گا۔ دوسری چیز یہ کہ دو صنفوں کا یہ تعلق خدا کی بناوٹ کے مطابق اپنے فطری ڈھنگ پر قائم ہو۔ فطرت بھی خدا کا حکم ہے۔ قرآن کے ملفوظ احکام کی پابندی جس طرح ضروری ہے اسی طرح اس فطری نظام کی پابندی بھی ضروری ہے جو خدا نے تخلیقی طور پر ہمارے لیے بنا دیا ہے۔ تیسری چیز یہ کہ ہر مرحلہ میں آدمی کے اوپر اللہ کا خوف غالب رہے۔ وہ جو بھی رویہ اختیار کرے یہ سوچ کر کرے کہ بالآخر اس کو رب العالمین کے یہاں جانا ہے جو کھلے اور چھپے ہر چیز سے باخبر ہے — ''اور اپنے لیے آگے بھیجو'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنی آخرت کے لیے عمل صالح بھیجو۔ یعنی جو کچھ کرو یہ سمجھ کر کرو کہ تمھارا کوئی کام صرف دنیوی کام نہیں ہے بلکہ ہر کام کا ایک اخروی پہلو ہے۔ مرنے کے بعد تم اپنے اس اخروی پہلو سے دوچار ہونے والے ہو۔ تم کو اس معاملہ میں حد درجہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ تمھارا عمل آخرت کے پیمانہ میں صالح عمل قرار پائے، نہ کہ غیر صالح عمل۔

وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِىۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيۡنَ يُؤۡلُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِهِمۡ تَرَبُّصُ اَرۡبَعَةِ اَشۡهُرٍ ۚ فَاِنۡ فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ

۲۲۴۔ اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ تم بھلائی نہ کرو اور پرہیزگاری نہ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کرو۔ اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۲۲۵۔ اللہ تمھاری بے ارادہ قسموں پر تم کو نہیں پکڑتا، مگر وہ اس کام پر پکڑتا ہے جو تمھارے دل کرتے ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا، تحمل والا ہے۔ ۲۲۶۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھالیں، ان کے لیے چار مہینے تک کی مہلت ہے۔ پھر اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ معاف کردینے والا، مہربان ہے۔ ۲۲۷۔ اور اگر وہ طلاق کا فیصلہ کریں تو یقیناً اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۲۲۸۔ اور طلاق دی ہوئی عورتیں

بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ
اَنۡ يَّكۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِىۡٓ اَرۡحَامِهِنَّ اِنۡ
كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ
وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ
اَرَادُوۡٓا اِصۡلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ
عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۖ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ
دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع ۲۸ ۱۲

اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں، اور اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ نے پیدا کیا ہے ان کے پیٹ میں۔ اور اس دوران میں ان کے شوہر ان کو پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اگر وہ صلح کرنا چاہیں۔ اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے، تدبیر والا ہے۔

ضد اور غصہ میں کبھی ایک آدمی قسم کھالیتا ہے کہ میں فلاں آدمی کے ساتھ کوئی نیک سلوک نہیں کروں گا۔ قدیم زمانہ میں عربوں میں اس طرح کی قسموں کا بہت رواج تھا۔ وہ ایک بھلائی کا کام یا ایک اصلاح کا کام نہ کرنے کی قسم کھالیتے اور جب ان کو اس نوعیت کے کام کے لیے پکارا جاتا تو کہہ دیتے کہ ہم تو اس کو نہ کرنے کی قسم کھا چکے ہیں۔ یہ کہنا کہ میں بھلائی کا کام نہ کروں گا، یوں بھی ایک غلط بات ہے اور اس کو خدا کے نام کی قسم کھا کر کہنا اور بھی زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ خدا تو وہ ہستی ہے جو سراپا رحمت اور خیر ہے۔ پھر ایسے خدا کا نام لے کر اپنے کو رحمت اور خیر کے کاموں سے الگ کرنا کیوں کر درست ہوسکتا ہے — بگاڑ ہر حال میں برا ہے۔ لیکن اگر بگاڑ کو خدا یا اس کے دین کا نام لے کر کیا جائے تو اس کی برائی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

بعض لوگ قسم کو تکیہ کلام بنا لیتے ہیں اور غیر ارادی طور پر قسم کے الفاظ بولتے رہتے ہیں۔ یہ ایک لغو بات ہے اور ہر آدمی کو اس سے بچنا چاہیے۔ تاہم میاں بیوی کے تعلق کی نزاکت کی وجہ سے اس طرح کے معاملات میں ایسی قسم کو قانونی طور پر غیر موثر قرار دیا گیا۔ البتہ وہ کلام جو آدمی سوچ سمجھ کر منھ سے نکالے اور جس کے ساتھ قلبی ارادہ شامل ہوجائے، اس کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص ارادۃً یہ قسم کھالے کہ میں اپنی عورت کے پاس نہ جاؤں گا تو اس کو قابل لحاظ قرار دے کر اس کو ایک قانونی مسئلہ بنا دیا گیا اور اس کے احکام مقرر کیے گئے۔

خاندانی نظام میں، خواہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کے حقوق بھی ہیں اور ہر ایک کی ذمہ داریاں بھی۔ ہر فرد کو چاہیے کہ دوسرے سے اپنا حق لینے کے ساتھ دوسرے کو اس کا حق بھی پوری طرح ادا کرے۔ کوئی شخص اتفاقی حالات یا اپنی فطری بالادستی سے فائدہ اٹھا کر اگر دوسرے کے ساتھ ناانصافی کرے گا تو وہ خدا کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ
تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ
تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّآ اَنۡ
يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ
اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا
فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا
تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَ مَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا
تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ
فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ
اِنۡ ظَنَّآ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ
حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾ وَ
اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ
فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ
بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَ لَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا
لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَ مَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ
نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَ
اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَ مَآ اَنۡزَلَ
عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ
وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ
عَلِيۡمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع ۲۹ ۱۳

۲۲۹۔ طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا۔ اور تمھارے لیے یہ بات جائز نہیں کہ تم نے جو کچھ ان عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ لے لو مگر یہ کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدوں پر قائم نہ رہ سکیں گے، پھر اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ دونوں اللہ کی حدوں پر قائم نہ رہ سکیں گے تو دونوں پر گناہ نہیں اس مال میں جس کو عورت فدیہ میں دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں تو ان سے باہر نہ نکلو۔ اور جو شخص اللہ کی حدوں سے نکل جائے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ ۲۳۰۔ پھر اگر وہ اس کو طلاق دیدے تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں جب تک کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔ پھر اگر وہ مرد اس کو طلاق دیدے تب گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر مل جائیں بشرطیکہ انھیں اللہ کی حدوں پر قائم رہنے کی توقع ہو۔ یہ خداوندی ضابطے ہیں جن کو وہ بیان کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو دانش مند ہیں۔ ۲۳۱۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت تک پہنچ جائیں تو ان کو یا قاعدہ کے مطابق رکھ لو یا قاعدہ کے مطابق رخصت کر دو۔ اور تکلیف پہنچانے کی غرض سے نہ روکو تا کہ ان پر زیادتی کرو۔ اور جو ایسا کرے گا، اس نے اپنا ہی برا کیا۔ اور اللہ کی آیتوں کو کھیل نہ بناؤ۔ اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو اور اس کتاب و حکمت کو جو اس نے تمھاری نصیحت کے لیے اتاری ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

طلاق ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو غیر معمولی حالات میں پیش آتا ہے۔ مگر اس انتہائی جذباتی معاملہ میں بھی تقویٰ اور احسان پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں مومن سے کس قسم کا سلوک اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

نکاح کے رشتہ کو یکبارگی توڑنے کے بجائے اس کو تین مرحلوں میں انجام دینے کا حکم ہوا جو چند ماہ میں اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ایک انتہائی ہیجانی معاملہ میں اس قسم کا سنجیدہ طریقہ مقرر کرکے بتایا گیا کہ اختلاف کے وقت مومن کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ اپنے مخالف فریق کے ساتھ اس کا سلوک غیر جذباتی انداز میں سوچا ہوا صابرانہ فیصلہ ہو، نہ کہ اشتعال کے تحت ظاہر ہونے والا اچانک فیصلہ۔ اسی طرح طلاق کے جتنے آداب مقرر کیے گئے ہیں، سب میں زندگی کا بہت گہرا سبق موجود ہے — علیحدگی کا ارادہ کرنے کے بعد بھی آدمی ایک مدت تک دوبارہ اتحاد کے امکان پر غور کرتا رہے۔ تعلقات کے خاتمہ کی نوبت آجائے تب بھی وہ اس کو حقوق انسانیت کے خاتمہ کے ہم معنی نہ بنائے۔ باہمی سلوک کے لیے اللہ کا جو قانون ہے اس کی مکمل پابندی کی جائے۔ شریعت کے کسی حکم کو قانونی حیلوں کے ذریعہ کالعدم نہ کیا جائے۔ قانون کی تعمیل میں صرف قانون کے الفاظ کو نہ دیکھا جائے بلکہ اس کی حکمت (روح قانون) کو بھی سامنے رکھا جائے۔ علیحدگی سے پہلے اپنے سابقہ ساتھی کو جو کچھ دیا تھا اس کو علیحدگی کے بعد واپس لینے کی کوشش نہ کی جائے۔ جس طرح تعلقات کے زمانہ کو خوش اسلوبی کے ساتھ گزارا تھا اسی طرح علیحدگی کے زمانہ کو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ گزارا جائے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ

۲۳۲۔ اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو ان کو نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں۔ جب کہ وہ دستور کے موافق آپس میں راضی ہوجائیں۔ یہ نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہو۔ یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔
۲۳۳۔ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں، ان لوگوں کے لیے جو پوری مدت تک دودھ پلانا چاہتے ہوں۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق۔ کسی کو حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق۔ نہ کسی ماں کو

بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اس کے بچہ کے سبب سے تکلیف دی جائے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچہ کے سبب سے۔ اور یہی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں، اور اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلواؤ تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ تم قاعدہ کے مطابق وہ ادا کر دو جو تم نے ان کو دینا ٹھہرایا تھا۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

ایک عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی اور زمانہ عدت میں رجعت نہ کی۔ جب عدت ختم ہو چکی تو دوسرے لوگوں کے ساتھ پہلے شوہر نے بھی نکاح کا پیغام دیا۔ عورت نے اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرنا منظور کر لیا۔ مگر عورت کا بھائی غصہ میں آ گیا اور نکاح کو روک دیا۔ اس پر یہ حکم اترا کہ جب دونوں دوبارہ ازدواجی تعلق قائم کرنے پر راضی ہیں تو تم رکاوٹ نہ ڈالو۔

طلاق کے بعد بھی اکثر بہت سے مسائل باقی رہتے ہیں۔ کبھی پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کا معاملہ ہوتا ہے۔ کبھی مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ایسے مواقع پر مشکلات پیدا کرنا درست نہیں۔ کبھی مطلقہ عورت بچے والی ہوتی ہے اور سابقہ شوہر کے بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ایک دوسرے کو تکلیف دینے سے منع کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ معاملہ کو جذبات کا سوال نہ بناؤ، اس کو باہمی مشورہ اور رضامندی سے طے کر لو—اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف اور علیحدگی کے وقت معاملہ کو نمٹانے کا مومنانہ طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ طرفین کی جانب جو مسائل باقی رہ گئے ہوں ان کو ایک دوسرے کو پریشان کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ ان کو ایسے ڈھنگ سے طے کیا جائے جو دونوں جانب کے لیے بہتر اور قابل قبول ہو۔ ایمان روح کی پاکیزگی ہے پھر جس کی روح پاک ہو چکی ہو وہ اپنے معاملات میں ناپاکی کا طریقہ کیسے اختیار کر سکتا ہے۔

نصیحت کسی کے لیے صرف اس بنا پر قابل قبول نہیں ہو جاتی کہ وہ برحق ہے۔ ضروری ہے کہ سننے والا اللہ پر یقین رکھتا ہو اور اس کی پکڑ سے ڈرنے والا ہو۔ وہ سمجھے کہ نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو رد کرنے کے لیے آج اگر میں نے کچھ الفاظ پا لیے تو اس سے اصل مسئلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ کیوں کہ معاملہ بالآخر اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہے اور وہاں کسی قسم کا زور اور کوئی لفظی حجت کام آنے والی نہیں۔

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ
اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ
خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ
عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا
تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا
مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى
يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ع ۳۰ ۱۴
اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ
تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى
الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا
بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ
طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ
فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ
اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ
عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ

۲۳۴۔ اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک انتظار میں رکھیں۔ پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچیں تو جو کچھ وہ اپنی ذات کے بارے میں قاعدہ کے موافق کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اللہ تمھارے کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔

۲۳۵۔ اور تمھارے لیے اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ ان عورتوں کو پیغام دینے میں کوئی بات اشارۃً کہو یا اپنے دل میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ضرور ان کا دھیان کرو گے۔ مگر چھپ کر ان سے وعدہ نہ کرو، تم ان سے صرف دستور کے مطابق کوئی بات کہہ سکتے ہو۔ اور عقدِ نکاح کا ارادہ اس وقت تک نہ کرو جب تک مقررہ مدت اپنی ختم کو نہ پہنچ جائے۔ اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے۔ پس اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا، تحمل والا ہے۔

۲۳۶۔ اگر تم عورتوں کو ایسی حالت میں طلاق دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لیے کچھ مہر مقرر کیا ہے تو ان کے مہر کا تم پر کچھ مواخذہ نہیں۔ البتہ ان کو دستور کے مطابق کچھ سامان دے دو، وسعت والے پر اپنی حیثیت کے مطابق ہے اور تنگی والے پر اپنی حیثیت کے مطابق، یہ نیکی کرنے والوں پر لازم ہے۔

۲۳۷۔ اور اگر تم ان کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور تم ان کے لیے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا آدھا ادا کر دو، الا یہ کہ وہ معاف کر دیں، یا وہ مرد معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور

لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷

تمھارا معاف کردینا زیادہ قریب ہے تقویٰ سے۔ اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت مت کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

نکاح اور طلاق کے قوانین بیان کرتے ہوئے بار بار تقویٰ اور احسان کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی حکم کو اس کی اصلی روح کے ساتھ زیرِ عمل لانے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ کے افراد خالص قانونی معاملہ کرنے والے نہ ہوں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کا جذبہ رکھتے ہوں۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ دوسرے کے ساتھ بہتر سلوک نہ کرنا خود اپنے بارے میں بہتر سلوک نہ کیے جانے کا خطرہ مول لینا ہے۔ کیوں کہ بالآخر سارا معاملہ خدا کے یہاں پیش ہونا ہے اور وہاں نہ لفظی تاویلیں کسی کے کام آئیں گی اور نہ کسی کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ معاملہ سے متعلق کسی بات کو چھپا سکے۔

اگر نکاح کے وقت عورت کا مہر مقرر ہوا اور تعلق قائم ہونے سے پہلے طلاق ہو گئی تو باعتبار قانون آدھا مہر دینا لازم کیا گیا ہے۔ مگر خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ دونوں فریق اس معاملہ میں قانونی برتاؤ کے بجائے فیاضانہ برتاؤ کا طریقہ اختیار کرنا چاہیں۔ عورت کے اندر یہ مزاج ہو کہ جب تعلق قائم نہیں ہوا تو میں آدھا مہر بھی چھوڑ دوں۔ مرد کے اندر یہ جذبہ ابھرے کہ اگرچہ قانوناً میرے اوپر صرف آدھے کی ذمہ داری ہے مگر فیاضی کا تقاضا ہے کہ میں پورا کا پورا ادا کردوں — فیاضی اور وسعتِ ظرف کا یہی مزاج تمام معاملات میں مطلوب ہے۔ وہی معاشرہ مسلم معاشرہ ہے جس کے افراد کا یہ حال ہو کہ ہر ایک دوسرے کو دینا چاہے، نہ یہ کہ ہر ایک دوسرے سے لینے کا حریص بنا ہوا ہو۔ مزید یہ کہ وسعتِ ظرف کا یہ معاملہ دشمنی کے وقت بھی ہو، نہ کہ صرف دوستی کے وقت۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝۲۳۸ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۹ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ

۲۳۸۔ پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی۔ اور کھڑے ہو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے۔ ۲۳۹۔ اگر تم کو اندیشہ ہو تو پیدل یا سواری پر پڑھ لو۔ پھر جب حالتِ امن آجائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے، جس کو تم نہیں جانتے تھے۔ ۲۴۰۔ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کردیں کہ ایک سال تک ان کو گھر میں رکھ کر

اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ
مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ
بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَي الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع ۳۱ ۱۵

خرچ دیا جائے۔ پھر اگر وہ خود سے گھر چھوڑ دیں تو جو کچھ وہ اپنی ذات کے معاملہ میں دستور کے مطابق کریں، اس کا تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۲۴۱۔ اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو بھی دستور کے مطابق خرچ دینا ہے، یہ لازم ہے پرہیزگاروں کے لیے۔ ۲۴۲۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

نماز گویا دین کا خلاصہ ہے۔ نماز مومنانہ زندگی کی وہ مختصر تصویر ہے جو پھیلتی ہے تو مکمل اسلامی زندگی بن جاتی ہے۔ یہاں ایک مختصر فقرہ میں نماز کے تین اہم ترین اجزاء کو بیان کر دیا گیا ہے (1) نماز کا پانچ وقت کے لیے فرض ہونا۔ (2) نماز کا ایک قابل اہتمام چیز ہونا۔ (3) یہ بات کہ نماز کی اصل حقیقت عجز ہے۔

''پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی''۔ اس سے معلوم ہوا کہ نمازوں میں ایک بیچ کی نماز ہے اور پھر اس کے دونوں طرف نمازیں ہیں۔ اس جملہ میں اطراف کی ''نمازوں'' سے کم از کم چار کا عدد مراد لینا ضروری ہے کیوں کہ عربی زبان میں صلوات (نمازوں) کا اطلاق تین یا اس سے زیادہ کے عدد کے لیے ہوتا ہے۔ پہلا ممکن عدد جس میں ''نمازوں'' کے درمیان ایک ''بیچ کی نماز'' بن سکے چار ہی ہے۔ اس طرح ایک نماز بیچ کی نماز ہو کر اس کے دونوں طرف دو دو نمازیں ہو جاتی ہے۔ ''بیچ کی نماز'' سے مراد عصر کی نماز ہے جیسا کہ روایات سے ثابت ہے۔ نماز کے دوسرے پہلو کو بتانے کے لیے ''محافظت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا نماز اسی طرح حفاظت کی ایک چیز ہے جس طرح مال آدمی کے لیے حفاظت کی چیز ہوتا ہے۔ نماز کے اوقات کا پورا لحاظ، اس کو بتائے ہوئے طریقہ پر ادا کرنے کا اہتمام، ایسی چیزوں سے بالقصد پرہیز جو آدمی کی نماز میں کوئی خرابی پیدا کرنے والی ہوں وغیرہ، محافظت نماز میں شامل ہیں۔ نماز کا تیسرا پہلو عجز ہے۔ یہ نماز کی اصل روح ہے، نماز بندے کا اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نماز کے وقت آدمی کے اوپر وہ کیفیت طاری ہو جو سب سے بڑے کے آگے کھڑے ہونے کی صورت میں سب سے چھوٹے کے اوپر طاری ہوتی ہے۔

معاشرت کے احکام بتاتے ہوئے یہ کہنا کہ ''یہ حق ہے متقیوں کے اوپر'' شریعت کے ایک اہم پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ باہمی معاملات میں کچھ حقوق وہ ہیں جن کو قانون نے متعین کر دیا ہے۔ مگر ایک آدمی پر دوسرے کے حقوق کی حدیں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ متعین حقوق کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں۔ یہ حقوق وہ ہیں جن کو آدمی کا تقویٰ اس کو محسوس کراتا ہے۔ اور آدمی کا متقیانہ احساس جتنا شدید ہو اتنا ہی

زیادہ وہ اس کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہے۔ اندر کا یہ زور اگر موجود نہ ہو تو آدمی کبھی صحیح طور پر دوسروں کے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾

۲۴۳۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے موت کے ڈر سے، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ تو اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ۔ پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا۔ بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ ۲۴۴۔ اور اللہ کی راہ میں لڑو اور جان لو کہ اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۲۴۵۔ کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے کہ اللہ اس کو بڑھا کر اس کے لیے کئی گنا کر دے۔ اور اللہ ہی تنگی بھی پیدا کرتا ہے اور کشادگی بھی۔ اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

مکہ سے تنگ آ کر مسلمان مدینہ چلے آئے۔ مدینہ میں اپنے دین کے مطابق رہنے کے لیے نسبتاً آزادانہ ماحول تھا۔ مگر مخالفین اسلام نے اب بھی ان کو نہ چھوڑا۔ انھوں نے فوجی حملے شروع کر دیے تاکہ مدینہ سے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں۔ اس وقت حکم ہوا کہ ان سے مقابلہ کرو۔ مخالفین کی نسبت سے اس وقت مسلمانوں کی طاقت بہت کم تھی۔ اس لیے کچھ لوگوں کے اندر بے ہمتی پیدا ہوئی۔ یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ یاد دلا کر بتایا گیا کہ زندگی کے معرکہ میں شکست سے ڈرنے ہی کا نام شکست ہے۔

بنی اسرائیل کی ایک پڑوسی قوم فلستی نے ان پر حملہ کر دیا۔ بنی اسرائیل شکست کھا گئے۔ فلستیوں نے دو حملوں میں ان کے 34 ہزار آدمی مار ڈالے۔ بنی اسرائیل اتنا ڈرے کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بائبل کے الفاظ میں ''حشمت بنی اسرائیل سے جاتی رہی'' (سموئیل 4:22)۔ بنی اسرائیل کا سارا گھرانا خوف میں مبتلا ہو کر نوحہ وفریاد کرنے لگا۔ اسی حال میں ان کو 20 سال گزر گئے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ فلستیوں کے سامنے ان کو شکست کیوں ہوئی۔ ان کے نبی سموئیل نے کہا کہ شکست کی وجہ خدا میں تمھارے یقین کا کمزور ہو جانا ہے۔ انھوں نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں کو اپنے بیچ سے دور کر دو اور خداوند کے لیے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو۔ خدا فلستیوں کے ہاتھ سے تم کو رہائی دے گا۔ تب اسرائیلیوں نے اجنبی دیوتاؤں کو اپنے سے دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔ اب جب دوبارہ فلستیوں اور اسرائیلیوں میں جنگ ہوئی تو بائبل

کے الفاظ میں ’’خداوند فلستیوں کے اوپر اس دن بڑی کڑک کے ساتھ گرجا اور ان کو گھبرادیا۔ اور انھوں نے اسرائیلیوں کے آگے شکست کھائی (سموئیل 7:70)۔ اللہ پر اعتماد کے راستہ کو چھوڑ کر ان پر ملّی موت واقع ہوئی تھی، اللہ پر اعتماد کے راستہ کو اختیار کرنے کے بعد ان کو ملّی زندگی حاصل ہوگئی۔

قرض حسن کے معنی ہیں اچھا قرض۔ یہاں اس سے مراد وہ انفاق ہے جو خدا کے دین کی راہ میں کیا جائے۔ یہ انفاق خالص اللہ کے لیے ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا مفاد شامل نہیں ہوتا۔ اس لیے خدا نے اس کو اپنے ذمے قرض قرار دیا۔ اور چوں کہ وہ بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ اس کو لوٹائے گا اس لیے اس کو قرض حسن فرمایا۔

مومن کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا کوئی محرومی کی بات نہیں۔ یہ اللہ کے فضل کا نیا دروازہ کھلنا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے جان ومال کو اللہ کے لیے خرچ کرکے اللہ کی ان عنایتوں کا مستحق بنتا ہے جو عام حالات میں کسی کو نہیں ملتیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ

۲۴۶۔ کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا موسیٰ کے بعد، جب کہ انھوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کردیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ نبی نے جواب دیا: ایسا نہ ہو کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے تب تم نہ لڑو۔ انھوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں۔ حالاں کہ ہم کو اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے اور اپنے بچوں سے جدا کیا گیا ہے۔ پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو تھوڑے لوگوں کے سوا سب پھر گئے۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ۲۴۷۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا: اللہ نے طالوت کو تمھارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کو ہمارے اوپر بادشاہی کیسے مل سکتی ہے، حالاں کہ اس کے مقابلہ میں ہم بادشاہی کے زیادہ حقدار ہیں۔ اور اس کو زیادہ دولت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے کہا اللہ نے تمھارے مقابلہ میں اس کو چنا ہے اور علم اور جسم میں اس کو زیادتی دی ہے۔ اور اللہ

وَالۡجِسۡمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤۡتِىۡ مُلۡكَهٗ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَ
اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمۡ نَبِيُّهُمۡ اِنَّ
اٰيَةَ مُلۡكِهٖۤ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ التَّابُوۡتُ فِيۡهِ سَكِيۡنَةٌ
مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى وَاٰلُ
هٰرُوۡنَ تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۴۸﴾ ع ۳۲ ۱۶

اپنی سلطنت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے۔ ۲۴۸۔ اوران کے نبی نے ان سے کہا کہ طالوت کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے تسکین ہے اورآلِ موسیٰ اورآلِ ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ اس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے۔ اس میں تمھارے لیے بڑی نشانی ہے، اگر تم یقین رکھنے والے ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تقریباً تین سو سال بعد بنی اسرائیل اپنے پڑوس کی مشرک قوموں سے مغلوب ہوگئے۔ اسی حال میں تقریباً چوتھائی صدی گزارنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ وہ اپنے پچھلے دور کو واپس لائیں۔ اب اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ان کو ایک امیرلشکر کی ضرورت تھی۔ ان کے نبی سموئیل (1020-1100 ق م) نے ان کے لیے ایک شخص کا تقرر کیا جس کا نام قرآن میں طالوت اور بائبل میں ساؤل آیا ہے۔ ذاتی اوصاف کے اعتبار سے وہ ایک موزوں شخص تھا۔ مگر بنی اسرائیل اس کی سرداری قبول کرنے کے بجائے اس قسم کے اعتراضات نکالنے لگے کہ وہ تو چھوٹے خاندان کا آدمی ہے۔ اس کے پاس مال و دولت نہیں۔ مگر اس طرح کی اختلافی بحثیں کسی قوم کے زوال یافتہ ہونے کی علامت ہیں۔ اللہ کے فیصلے وسعت اور علم کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہی بندہ اللہ کا محبوب بندہ ہے جو خود بھی وسیع النظری کا طریقہ اختیار کرے اور جو فیصلہ کرے حقائق کی بنیاد پر کرے، نہ کہ تعصّبات اور مصلحتوں کی بنیاد پر۔ تاہم صندوق کو واپس لاکر اللہ نے طالوت کے تقرر کی ایک غیر معمولی تصدیق بھی فرمادی۔

بنی اسرائیل کے یہاں ایک مقدس صندوق تھا جو مصر سے خروج کے زمانہ سے ان کے یہاں چلا آرہا تھا۔ اس میں تورات کی تختیاں اور دوسری متبرک چیزیں تھیں۔ بنی اسرائیل اس کو اپنے لیے فتح وکامیابی کا نشان سمجھتے تھے۔ فلستی اس صندوق کو ان سے چھین کر اٹھالے گئے تھے۔ مگر اس کو انھوں نے جس جس بستی میں رکھا وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں۔ اس سے انھوں نے برا شگون لیا اور صندوق کو ایک بیل گاڑی پر رکھ کر ہانک دیا۔ وہ اس کو لے کر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ یہودیوں کی آبادی میں پہنچ گئے — اللہ اپنے کسی بندے کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی اس کے گرد ایسی غیر معمولی چیزیں جمع کردیتا ہے جو عام انسانوں کے ساتھ جمع نہیں ہوتیں۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّىۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡٓ اِلَّا مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوۡا مِنۡهُ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۙ قَالُوۡا لَا طَاقَةَ لَنَا الۡيَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةً ۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ قَالُوۡا رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۵۰﴾ؕ فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۛ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۵۱﴾

۲۴۹۔ پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلا تو اس نے کہا: اللہ تم کو ایک ندی کے ذریعہ آزمانے والا ہے۔ پس جس نے اس کا پانی پیا وہ میرا ساتھی نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا، وہ میرا ساتھی ہے، مگر یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو انھوں نے اس میں سے خوب پیا بجز تھوڑے آدمیوں کے۔ پھر جب طالوت اور جو اس کے ساتھ ایمان پر قائم رہے تھے، دریا پار کر چکے تو وہ لوگ بولے کہ آج ہم کو جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ جو لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں، انھوں نے کہا کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ۲۵۰۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انھوں نے کہا: اے ہمارے رب، ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو جمادے اور ان منکروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔ ۲۵۱۔ پھر انھوں نے اللہ کے حکم سے ان کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اللہ نے داؤد کو بادشاہت اور دانائی عطا کی اور جن چیزوں کا چاہا علم بخشا، اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا رہے تو زمین فساد سے بھر جائے۔ مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

حضرت موسیٰ کے تقریباً 3 سو سال بعد اور حضرت مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ایسا ہوا کہ فلستیوں نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور فلسطین کے اکثر علاقے ان سے چھین لیے۔ ایک عرصہ کے بعد بنی اسرائیل نے چاہا کہ وہ فلستیوں کے خلاف اقدام کریں اور اپنے علاقے ان سے واپس لیں۔ اس وقت ان کے درمیان

ایک نبی تھے جن کا نام سموئیل تھا۔ وہ شام کے ایک قدیم شہر رامہ میں رہتے تھے اور بنی اسرائیل کے اجتماعی امور کے ذمہ دار تھے۔ بنی اسرائیل کا ایک وفد ان سے ملا۔ اور کہا کہ آپ اب بوڑھے ہو چکے ہیں، اس لیے آپ ہم میں سے کسی کو ہمارے اوپر بادشاہ مقرر کر دیں تاکہ ہم اس کی رہنمائی میں جنگ کر سکیں۔ تورات کے الفاظ میں "اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری لڑائی کرے"۔

حضرت سموئیل مشاہدے کی بنا پر اگرچہ اپنی قوم کے کردار کے بارے میں اچھی رائے نہ رکھتے تھے تاہم ان کے مطالبہ کی بنا پر انھوں نے کہا کہ اچھا میں تمھارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے قبیلہ بن یمین کے ایک بہادر نوجوان ساؤل (طالوت) کو ان کا بادشاہ (سردار) مقرر کر دیا۔

ساؤل (طالوت) بنی اسرائیل کا لشکر لے کر دشمن کی طرف بڑھے۔ راستہ میں دریائے یردن پڑتا تھا۔ اس کو پار کر کے دشمن کے علاقہ میں پہنچنا تھا۔ چوں کہ طالوت کو بنی اسرائیل کی کمزوریوں کا علم تھا، انھوں نے ان کی جانچ کے لیے ایک سادہ طریقہ استعمال کیا۔ دریا کو پار کرتے ہوئے انھوں نے اعلان کیا کہ کوئی شخص پانی نہ پیئے۔ البتہ ایک آدھ چلو لے لے تو کوئی حرج نہیں۔ بنی اسرائیل کی بڑی تعداد اس امتحان میں پوری نہ اتری۔ تاہم اس مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں کامیابی دی۔ حضرت داؤد جو اس وقت صرف ایک نوجوان تھے، انھوں نے اس جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ فلستیوں کی فوج کا زبردست پہلوان جالوت ان کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے بعد فلستیوں نے اسرائیل کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیے۔

مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے اندر مشکلات پر جمے رہنے اور سردار کی اطاعت کرنے کا مادہ ہو۔ طالوت کا اپنے ساتھیوں کو پانی پینے سے منع کرنا اسی استعداد کی جانچ کی ایک سادہ سی تدبیر تھی۔ بائبل کے بیان کے مطابق ان میں سے صرف 600 آدمی ایسے نکلے جنھوں نے راستہ میں آنے والے دریا کا پانی نہیں پیا۔ جن لوگوں نے پانی پیا انھوں نے گویا اپنی اخلاقی کمزوریوں کو اور پختہ کر لیا۔ اس لیے دشمن کا بظاہر طاقت ور ہونا اب ان کو اور زیادہ محسوس ہونے لگا۔ دوسری طرف جن لوگوں نے پانی نہیں پیا تھا ان کے اس فعل سے ان کا صبر اور اطاعت کا مزاج اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ ان کو وہ حقیقت اور زیادہ واضح صورت میں دکھائی دینے لگی جس کو بائبل کے بیان کے مطابق طالوت کے ایک ساتھی نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا: اور یہ ساری جماعت جان لے کہ خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعے سے نہیں بچاتا۔ اس لیے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا (1 سموئیل 17:48)۔

اقتدار جس کے پاس ہو وہ کچھ دنوں بعد گھمنڈ میں پڑ کر ظلم کرنے لگتا ہے۔ اس لیے اقتدار اگر کسی کے پاس مستقل طور پر جمع ہو جائے تو اس کے ظلم و فساد سے زمین بھر جائے۔ اس کی تلافی کا انتظام اللہ نے اس طرح کیا ہے کہ وہ صاحبان اقتدار کو بدلتا رہتا ہے۔ وہ بے اقتدار لوگوں میں سے ایک گروہ کو اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے صاحب اقتدار کو ہٹا کر اس کے منصب پر دوسرے کو بٹھا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی برسرِ اقتدار جماعت کا ظلم بڑھ جائے تو یہ اس کے خلاف اٹھنے والے گروہ کے لیے خدائی مدد کا

وقت ہوتا ہے۔ اگر وہ صبر اور اطاعت کی شرط کو پورا کرتے ہوئے اپنے آپ کو خدائی منصوبہ میں شامل کر دے تو بظاہر کم ہونے کے باوجود وہ خدا کی مدد سے زیادہ کے اوپر غالب آجائے گا— خدا کا خوف محض ایک منفی چیز نہیں، وہ ایک علم ہے جو آدمی کے ذہن کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کے اصلی اور حقیقی روپ میں دیکھ سکے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٢٥٢ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝٢٥٣ ع ۳۳ ۵

۲۵۲۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک۔ اور بے شک تو پیغمبروں میں سے ہے۔ ☆ ۲۵۳۔ ان پیغمبروں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا۔ اور بعض کے درجے بلند کیے۔ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں دیں اور ہم نے اس کی مدد کی روح القدس سے۔ اور اللہ اگر چاہتا تو ان کے بعد والے صاف حکم آجانے کے بعد نہ لڑتے، مگر انھوں نے اختلاف کیا۔ پھر ان میں سے کوئی ایمان لایا اور کسی نے انکار کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے، مگر اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

اللہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا جب لوگوں کو پکارتا ہے تو اس کی پکار میں ایسی نشانیاں شامل ہوتی ہیں کہ لوگوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے باوجود لوگ اس کا انکار کر دیتے ہیں اور یہ انکار کرنے والے سب سے پہلے وہ لوگ ہوتے ہیں جو رسالت کو مانتے چلے آرہے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ جس رسول کو مان رہے ہوتے ہیں اس کی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ اس کی افضلیت کا تصور قائم کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہمارا رسول اتنا افضل ہے اور اس کو ہم مان رہے ہیں تو اب کسی اور کو ماننے کی کیا ضرورت۔

ہر پیغمبر مختلف حالات میں آتا ہے اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ہر ایک کو الگ الگ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے کسی پیغمبر کو ایک فضیلت (خصوصی چیز) دی جاتی ہے اور کسی کو دوسری فضیلت۔ بعد کے دور میں پیغمبر کی یہی فضیلت اس کے امتیوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ اپنے نبی کو دی جانے والی فضیلت کو تائیدی فضیلت کے بجائے مطلق فضیلت کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم

سب سے افضل پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ اس لیے اب ہمیں کسی اور کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ حضرت موسیٰ کے ماننے والوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا۔ کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا نبی اتنا افضل ہے کہ خدا براہِ راست اس سے ہم کلام ہوا۔ حضرت مسیح کے ماننے والوں نے نبی آخر الزماں کا انکار کیا۔ کیوں کہ انھوں نے سمجھا کہ وہ ایسی ہستی کو مان رہے ہیں جس کی فضیلت اتنی زیادہ ہے کہ خدا نے اس کو باپ کے بغیر پیدا کیا۔ اسی طرح اللہ کے وہ بندے جو امت محمدی کی اصلاح وتجدید کے لیے اٹھے ان کا بھی لوگوں نے انکار کیا۔ کیوں کہ ان کے مخاطبین کی نفسیات یہ تھی کہ ہم بزرگوں کے وارث ہیں، ہم اکابر کا دامن تھامے ہوئے ہیں پھر ہم کو کسی اور کی کیا ضرورت۔ امتوں کے زوال کے زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ دنیا کے راستہ پر چل پڑتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی جنت بھی محفوظ رہے۔ اس وقت یہ عقیدہ ان کے لیے ایک نفسیاتی سہارا بن جاتا ہے۔ وہ اپنی مقدس شخصیتوں کی افضلیت کے تصور میں یہ تسکین پا لیتے ہیں کہ دنیا میں خواہ وہ کچھ بھی کریں ان کی آخرت کبھی مشتبہ نہیں ہوگی۔

یہی غلط اعتماد ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے کی مخالفت پر جری بناتا ہے۔ اللہ کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے کوئی دوسرا انظام قائم کرتا جس میں کسی کے لیے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ مگر یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں تو اسی بات کی آزمائش ہورہی ہے کہ آدمی غیب کی حالت میں خدا کو پائے۔ انسان کی زبان سے بلند ہونے والی خدائی آواز کو پہچانے۔ ظاہری پردوں سے گزر کر سچائی کو اس کے باطنی روپ میں دیکھ لے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٥٤﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ

۲۵۴۔ اے ایمان والو، خرچ کرو ان چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید وفروخت ہے اور نہ دوستی ہے اور نہ سفارش۔ اور جو منکر ہیں وہی ہیں ظلم کرنے والے۔ ۲۵۵۔ اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے مگر جو وہ چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں

وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ
الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿٢٥٥﴾ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ
قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ
بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ
بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥٦﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ
يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ
يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ
ع ۳۴ ۴ ۲ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥٧﴾

اورزمین پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے۔ اور وہی ہے بلند مرتبہ، بڑا۔ ۲۵۶۔ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت، گمراہی سے الگ ہوچکی ہے۔ پس جو شخص شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۲۵۷۔ اللہ کام بنانے والا ہے ایمان والوں کا، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے، اور جن لوگوں نے انکار کیا ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

خدا کو وہی پاتا ہے جو انفاق کی قیمت دے کر خدا کو اختیار کرے۔ اور کوئی آدمی جب خدا کو پالیتا ہے تو وہ ایک ایسی روشنی کو پالیتا ہے جس میں وہ بھٹکے بغیر چلتا رہے۔ یہاں تک کہ جنت میں پہنچ جائے۔ اس کے برعکس، جو شخص انفاق کی قیمت دیے بغیر خدا کو اختیار کرے وہ ہمیشہ اندھیرے میں رہتا ہے۔ جہاں شیطان اس کو بہکا کر ایسے راستوں پر چلاتا ہے جس کی آخری منزل جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

انفاق سے مراد اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو دین کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ اپنی مصلحتوں کو قربان کر کے دین کی طرف آگے بڑھنا ہے۔ آدمی جب کسی عقیدہ کو انفاق کی قیمت پر اختیار کرے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو اختیار کرنے میں سنجیدہ (sincere) ہے۔ یہ سنجیدہ ہونا بے حد اہم ہے۔ کسی معاملہ میں سنجیدہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو آدمی پر اس معاملہ کے بھیدوں کو کھولتا ہے۔ سنجیدہ ہونے کے بعد ہی یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اور اس کے مقصد کے درمیان حقیقی تعلق قائم ہو، اور مقصد کے تمام پہلو اس پر واضح ہوں۔ اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہے جو اپنی ہستی کی حوالگی کی قیمت پر دین کو اختیار نہ کرے۔ ایسا شخص کبھی دین کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوگا، اور اس بنا پر وہ آخرت کے معاملہ کو ایک آسان معاملہ فرض کر لے گا۔ وہ سمجھے گا کہ بزرگوں کی سفارش یا دین کے نام پر کچھ رسمی اور ظاہری کارروائیاں آخرت کی نجات کے لیے کافی ہیں۔ آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس راز کو نہ سمجھے گا کہ آخرت تو مالکِ کائنات کے عظمت وجلال کے ظہور کا دن ہے۔ ایسے ایک دن کے بارے میں محض سرسری چیزوں پر کامیابی کی امید کر لینا خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ کرنا ہے جو خدا کے یہاں آدمی

کے جرم کو بڑھانے والا ہے، نہ کہ وہ اس کی مقبولیت کا سبب بنے — خدا کی بات آدمی کے سامنے دلیل کی زبان میں آتی ہے اور وہ کچھ الفاظ بول کر اس کو رد کر دیتا ہے۔ یہی شیطانی وسوسہ ہے۔ ہدایت اس کو ملتی ہے جو شیطان کے وسوسہ سے اپنے کو بچائے اور خدائی دلیل کو پہچان کر اس کے آگے جھک جائے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

۲۵۸۔ کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں حجت کی۔ کیوں کہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ وہ بولا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تم اس کو پچھم سے نکال دو۔ تب وہ منکر حیران رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔

موجودہ زمانہ میں عوامی تائید سے حکومت کا استحقاق حاصل ہوتا ہے۔ مگر جمہوریت کے دور سے پہلے اکثر بادشاہ لوگوں کو یہ یقین دلا کر ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ خدا کا انسانی پیکر ہیں۔ قدیم عراق کے بادشاہ نمرود کا معاملہ یہی تھا جو حضرت ابراہیم کا ہم عصر تھا۔ اس کی قوم سورج کو دیوتاؤں کا سردار مانتی تھی۔ اور اس کی پوجا کرتی تھی۔ نمرود نے کہا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لیے وہ لوگوں کے اوپر حکومت کرنے کا خدائی حق رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس وقت کے عراق میں جب توحید کی آواز بلند کی تو اس کا سیاست وحکومت سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ آپ لوگوں سے صرف یہ کہہ رہے تھے کہ تمھارا خالق اور مالک صرف ایک اللہ ہے۔ کوئی نہیں جو خدائی میں اس کا شریک ہو۔ اس لیے تم اسی کی عبادت کرو۔ اسی سے ڈرو اور اسی سے امیدیں قائم کرو۔ تاہم اس غیر سیاسی دعوت میں نمرود کو اپنی سیاست پر زد پڑتی ہوئی نظر آئی۔ ایسا عقیدہ جس میں سورج کو ایک بے زور مخلوق بتایا گیا ہو وہ گویا اس اعتقادی بنیاد ہی کو ڈھا رہا تھا جس کے اوپر نمرود نے اپنا سیاسی تخت بچھا رکھا تھا۔ اس وجہ سے وہ آپ کا دشمن ہو گیا۔

حضرت ابراہیم نے نمرود سے جو گفتگو کی اس سے انبیاء کا طریقِ دعوت معلوم ہوتا ہے۔ نمرود کے سوال کے جواب میں آنجناب نے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔ نمرود نے مناظرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ موت اور زندگی پر تو میں بھی اختیار رکھتا ہوں۔ جس کو چاہوں مروا دوں اور جس کو چاہوں زندہ رہنے دوں۔ آنجناب نمرود کا جواب دے سکتے تھے۔ مگر آپ نے گفتگو کو مناظرہ بنانا پسند نہ کیا۔ اس لیے آپ نے فوراً دوسری مثال پیش کر دی جس کے جواب میں نمرود اس قسم کی بات نہ کہہ

سکتا تھا جو اس نے پہلی مثال کے جواب میں کہی۔ حضرت ابراہیم کے لیے نمرود حریف نہ تھا۔ بلکہ مدعو کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے ان کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ استدلال کا کون سا حکیمانہ انداز ان کو اختیار کرنا چاہیے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے اس کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز کو آدمی دو مختلف معنوں میں لے سکے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس دولت اور اقتدار آ جائے تو وہ اس کو ایسے رخ سے دیکھ سکتا ہے کہ اس کی کامیابی اس کو اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ نظر آئے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کو ایسے رخ سے دیکھے کہ اس کو محسوس ہو کہ جو کچھ اس کو ملا ہے وہ سراسر خدا کا انعام ہے۔ پہلی صورت ظلم کی صورت ہے، اور دوسری شکر کی صورت۔ جس شخص کے اندر ظالمانہ مزاج ہو اس کے لیے موجودہ دنیا صرف گمراہی کی خوراک ہوگی۔ اس کو ہر واقعہ میں گھمنڈ اور خود پسندی کی غذا ملے گی۔ اس کے برعکس، جس کے اندر شکر کا مزاج ہوگا، اس کے لیے ہر واقعہ میں ہدایت کا سامان ہوگا۔ خدا کی دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اس کے لیے رزق ایمانی کا دسترخوان بن جائے گی۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ

۲۵۹۔ یا جیسے وہ شخص جس کا گزر ایک بستی پر سے ہوا۔ اور وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی۔ اس نے کہا: ہلاک ہو جانے کے بعد اللہ اس بستی کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا۔ پھر اللہ نے اس پر سو برس تک کے لیے موت طاری کر دی۔ پھر اس کو اٹھایا۔ اللہ نے پوچھا تم کتنی دیر اس حالت میں رہے۔ اس نے کہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم۔ اللہ نے کہا نہیں، بلکہ تم سو برس اس حال میں رہے۔ اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ سڑی نہیں ہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو۔ اور تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں۔ اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر واضح ہو گیا تو کہا میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۲۶۰۔ اور جب ابراہیم نے کہا کہ

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع ۳۵

اے میرے رب، مجھ کو دکھادے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ اللہ نے کہا: کیا تم نے یقین نہیں کیا۔ ابراہیم نے کہا کیوں نہیں، مگر اس لیے کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے۔ فرمایا تم چار پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلا لو۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ پہاڑی پر رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ۔ وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ اور جان لو کہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

یہاں موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کے جن دو تجربات کا ذکر ہے ان کا تعلق انبیاء سے ہے۔ پہلا تجربہ غالباً حضرت عزیر کے ساتھ گزرا جن کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ اور دوسرا تجربہ حضرت ابراہیم سے تعلق رکھتا ہے۔ جن کا زمانہ 2160-1985 ق م کے درمیان ہے۔ انبیاء خدا کی طرف سے اس لیے مقرر ہوتے ہیں کہ لوگوں کو غیبی حقائق سے باخبر کریں۔ اس لیے ان کو وہ غیبی چیزیں بے پردہ کر کے دکھا دی جاتی ہیں جن پر دوسروں کے لیے اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ انبیاء کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ ان چیزوں کو ذاتی مشاہد بن کر ان کی بابت لوگوں کو باخبر کرسکیں۔ وہ لوگوں کو جن غیبی حقیقتوں کی خبر دیں ان کے متعلق کہہ سکیں کہ ہم ایک دیکھی ہوئی چیز سے تم کو خبردار کر رہے ہیں، نہ کہ محض سنی ہوئی چیز سے۔

انبیاء کو چالیس سال کی عمر میں نبوت دی جاتی ہے۔ نبوت سے پہلے ان کی پوری زندگی لوگوں کے سامنے اس طرح گزرتی ہے کہ ان سے کسی شخص کو جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوتا۔ تقریباً نصف صدی تک ماحول کے اندر اپنے سچے ہونے کا ثبوت دینے کے بعد وہ وقت آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو لوگوں کے سامنے ان غیبی حقیقتوں کے اعلان کے لیے کھڑا کرے جن کو آزمائش کی مصلحت کی بنا پر لوگوں سے چھپا دیا گیا ہے۔ ماحول کے یہ سب سے زیادہ سچے لوگ ایک طرف اپنے مشاہدہ سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں اور دوسری طرف عقل اور فطرت کے شواہد سے اس کو مدلل کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ انبیاء کو ہمیشہ شدید ترین حالات سے سابقہ پیش آتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے قول سے پھرتے نہیں وہ انتہائی ثابت قدمی کے ساتھ اپنی بات پر جمے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں وہ پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ فرضی طور پر انھوں نے کوئی بات نہیں گھڑ لی ہے۔ کیوں کہ گھڑی ہوئی بات کو پیش کرنے والا کبھی اتنے سخت حالات میں اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور نہ اس کی بات خارجی کائنات سے اتنا زیادہ مطابق ہو سکتی ہے کہ وہ سراپا اس کی تصدیق بن جائے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ
كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا
يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ
خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ
حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا
صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ
مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ
تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا
يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

۲۶۱۔ جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ
کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ
ہو جس سے سات بالیں پیدا ہوں، ہر بالی میں
سو دانے ہوں۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے لیے
چاہتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا، جاننے والا ہے۔
۲۶۲۔ جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ
کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان
رکھتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کے لیے
ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور ان کے
لیے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔
۲۶۳۔ مناسب بات کہہ دینا اور درگزر کرنا اس
صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔ اور اللہ
بے نیاز ہے، تحمل والا ہے۔ ۲۶۴۔ اے ایمان
والو، احسان رکھ کر اور ستا کر اپنے صدقہ کو ضائع نہ
کرو، جس طرح وہ شخص جو اپنا مال دکھاوے کے
لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن
پر ایمان نہیں رکھتا۔ پس اس کی مثال ایسی ہے
جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور
کا مینھ پڑے اور وہ اس کو بالکل صاف کر دے۔
ایسے لوگوں کو اپنی کمائی کچھ بھی ہاتھ نہ لگے گی۔ اور
اللہ منکروں کو راہ نہیں دکھاتا۔

ہر عمل جو آدمی کرتا ہے وہ گویا ایک بیج ہے جو آدمی ''زمین'' میں ڈالتا ہے۔ اگر اس کا عمل اس لیے تھا کہ لوگ اسے دیکھیں تو اس نے اپنا بیج دنیا کی زمین میں ڈالا تا کہ یہاں کی زندگی میں اپنے کیے کا پھل پا سکے۔ اور اگر اس کا عمل اس لیے تھا کہ اللہ اس کو ''دیکھے'' تو اس نے آخرت کی زمین میں اپنا بیج ڈالا جو اگلی دنیا میں اپنے پھول اور پھل کی بہاریں دکھائے۔ دنیا میں ایک دانہ سے ہزار دانے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی حال آخرت کے کھیت میں دانہ ڈالنے کا بھی ہے۔

دنیا کے فائدہ یا دنیا کی شہرت و عزت کے لیے خرچ کرنے والا اسی دنیا میں اپنا معاوضہ لینا چاہتا

ہے۔ ایسے آدمی کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ مگر جو شخص اللہ کے لیے خرچ کرے اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی پر احسان نہیں جتاتا، اس نے جب اللہ کے لیے خرچ کیا ہے تو انسان پر اس کا کیا احسان۔ اس کی رقم خرچ ہو کر جن لوگوں تک پہنچتی ہے ان کی طرف سے اس کو اچھا جواب نہ ملے تو وہ ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کو تو اچھا جواب اللہ سے لینا ہے، پھر انسانوں سے ملنے یا نہ ملنے کا اسے کیا غم۔ اگر کسی سائل کو وہ نہیں دے سکتا تو وہ اس سے برُا کلمہ نہیں کہتا۔ بلکہ نرمی کے ساتھ معذرت کر دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ بول رہا ہے خدا کے سامنے بول رہا ہے۔ خدا کا خوف اس کو انسان کے سامنے اپنی زبان کو کنٹرول کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

پتھر کی چٹان کے اوپر کچھ مٹی جم جائے تو بظاہر وہ مٹی دکھائی دے گی۔ مگر بارش کا جھونکا آتے ہی مٹی کی اوپری تہہ بہہ جائے گی اور اندر سے خالی پتھر نکل آئے گا۔ ایسا ہی حال اس انسان کا ہوتا ہے جو بس اوپری دین داری لیے ہوئے ہو۔ دین اس کے اندر تک داخل نہ ہوا ہو۔ ایسے آدمی سے اگر کوئی سائل بے ڈھنگے انداز سے سوال کر دے یا کسی کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے آجائے جو اس کی انا پر ضرب لگانے والی ہو تو وہ بپھر کر انصاف کی حدوں کو توڑ دیتا ہے۔ ایسا ایک واقعہ ایک ایسا طوفان بن جاتا ہے جو اس کی اوپری "مٹی" کو بہا لے جاتا ہے اور پھر اس کے اندر کا انسان سامنے آجاتا ہے جس کو وہ دین کے ظاہری لبادہ کے پیچھے چھپائے ہوئے تھا — اللہ کے لیے عمل کرنا گویا دیکھے پر اَن دیکھے کو ترجیح دینا ہے جو اس بلند نظری کا ثبوت دے وہی وہ شخص ہے جس پر خدا کی چھپی ہوئی معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔

وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَتَثۡبِيۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبۡوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتۡ اُكُلَهَا ضِعۡفَيۡنِۚ فَاِنۡ لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُۙ لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِۙ وَاَصَابَهُ الۡكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَاۤ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ كَذٰلِكَ

۲۶۵۔ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال کو اللہ کی رضا چاہنے کے لیے اور اپنے نفس میں پختگی کے لیے خرچ کرتے ہیں، ایک باغ کی طرح ہے جو بلندی پر ہو۔ اس پر زور کا مینھ پڑا تو وہ دوگنا پھل لایا۔ اور اگر زور کا مینھ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی کافی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۶۶۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں۔ اور وہ بوڑھا ہوجائے اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں۔ تب اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ ہو۔ پھر وہ

ع ۳۶ ۴ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ ع

باغ جل جائے۔ اللہ اس طرح تمھارے لیے کھول کر نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔

آدمی جب کسی چیز کے لیے عمل کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس کے حق میں اپنی قوت ارادی کو مضبوط کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی خواہش کے تحت عمل کرے تو اس نے اپنے دل کو اپنی خواہش پر جمایا۔ اس کے برعکس آدمی اگر وہاں عمل کرے جہاں خدا چاہتا ہے کہ عمل کیا جائے تو اس نے اپنے دل کو خدا پر جمایا۔ دونوں راہوں میں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی آسان حالات میں عمل کرنا ہوتا ہے اور کبھی مشکل حالات میں۔ تاہم مواقع جتنے شدید ہوں، آدمی کو جتنا زیادہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا عمل کرنا پڑے اتنا ہی زیادہ وہ اپنے پیش نظر مقصد کے حق میں اپنے ارادہ کو مستحکم کرے گا۔ عام حالات میں اللہ کی راہ میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرنا بھی باعثِ ثواب ہے۔ مگر جب مخالف اسباب کی وجہ سے خصوصی قوت ارادی کو استعمال کرکے آدمی اللہ کی راہ میں اپنا اثاثہ دے تو اس کا ثواب اللہ کے یہاں بہت زیادہ ہے — جس مد میں خرچ کرنا دنیوی اعتبار سے بے فائدہ ہو اس میں اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرنا، جس کو دینے کا دل نہ چاہے اس کو اللہ کے لیے دینا، جس سے خوش معاملگی پر طبیعت آمادہ نہ ہو اس سے اللہ کی خاطر خوش معاملگی کرنا، وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو سب سے زیادہ خدا پرستی پر جماتی ہیں اور اس کو خدا کی خصوصی رحمت ونصرت کا مستحق بناتی ہیں۔

آدمی جوانی کی عمر میں باغ لگاتا ہے تاکہ بڑھاپے کی عمر میں اس کا پھل کھائے۔ پھر وہ شخص کیسا بدنصیب ہے جس کا ہرا بھرا باغ اس کی آخر عمر میں عین اس وقت برباد ہوجائے جب کہ وہ سب سے زیادہ اس کا محتاج ہو اور اس کے لیے وہ وقت بھی ختم ہوچکا ہو جب کہ وہ دوبارہ نیا باغ لگائے اور اس کو ازسرنو تیار کرے۔ ایسا ہی حال ان لوگوں کا ہے جنھوں نے دین کا کام دنیوی عزت ومنفعت کے لیے کیا۔ وہ بظاہر نیکی اور بھلائی کا کام کرتے رہے۔ مگر ان کا کام صرف شکلاً ہی عام دنیاداروں سے مختلف تھا۔ باعتبار حقیقت دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ عام دنیادار جس دنیوی ترقی اور ناموری کے لیے دنیوی نقشوں میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے، اسی دنیوی ترقی اور ناموری کے لیے انھوں نے دینی نقشوں میں دوڑ دھوپ جاری کردی۔ جو شہرت وعزت دوسرے لوگ دنیا کی عمارت میں اپنا اثاثہ خرچ کرکے حاصل کر رہے تھے، اسی شہرت وعزت کو انھوں نے دین کی عمارت میں اپنا اثاثہ خرچ کرکے حاصل کرنا چاہا۔ ایسے لوگ جب مرنے کے بعد آخرت کے عالم میں پہنچیں گے تو وہاں ان کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ انھوں نے جو کچھ کیا اِسی دنیا کے لیے کیا۔ پھر وہ اپنے کیے کا پھل اگلی دنیا میں کس طرح پا سکتے ہیں — خدا کی نشانیاں ہمیشہ ظاہر ہوتی ہیں۔ مگر وہ خاموش زبان میں ہوتی ہیں۔ ان سے وہی سبق لے سکتا ہے جو اپنے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کرچکا ہو۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا۟ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُوا۟ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾ ٱلشَّيْطَٰنُ يَعِدُكُمُ ٱلْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِٱلْفَحْشَآءِ ۖ وَٱللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُؤْتِى ٱلْحِكْمَةَ مَن يَشَآءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِىَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُو۟لُوا۟ ٱلْأَلْبَٰبِ ﴿٢٦٩﴾

۲۶۷۔ اے ایمان والو، خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین میں سے پیدا کیا ہے۔ اور ردی چیز کا قصد نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو۔ حالاں کہ تم کبھی اس کو لینے والے نہیں، الا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔ ۲۶۸۔ شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور بری بات کی تلقین کرتا ہے اور اللہ وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا۔ اور اللہ وسعت والا ہے، جاننے والا ہے۔ ۲۶۹۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت دے دیتا ہے اور جس کو حکمت ملی اس کو بڑی دولت مل گئی۔ اور نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

آدمی دنیا میں جو کچھ کماتا ہے اس کو خرچ کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو شیطان کے بتائے ہوئے راستہ میں خرچ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو اللہ کے بتائے ہوئے راستہ میں خرچ کیا جائے۔ شیطان یہ کرتا ہے کہ آدمی کے ذاتی تقاضوں کی اہمیت اس کے دل میں بٹھاتا ہے۔ وہ اس کو سکھاتا ہے کہ تم نے جو کچھ کمایا ہے اس کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس کو اپنی ذاتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگاؤ۔ پھر جب شیطان دیکھتا ہے کہ آدمی کے پاس اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ مال ہے تو وہ اس کے اندر ایک اور جذبہ بھڑکا دیتا ہے۔ یہ نمود و نمائش کا جذبہ ہے۔ اب وہ اپنی دولت کو بے دریغ نمائشی کاموں میں بہانے لگتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس نے اپنی دولت کو بہترین مصرف میں لگایا۔

آدمی کو چاہیے کہ اپنے مال کو اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ اللہ کی چیز سمجھے۔ وہ اپنی کمائی میں سے اپنی حقیقی ضرورت کے بقدر لے لے اور اس کے بعد جو کچھ ہے اس کو بلند تر مقاصد میں لگائے۔ وہ خدا کے کمزور بندوں کو دے اور خدا کے دین کی ضرورتوں میں خرچ کرے۔ آدمی جب اللہ کے کمزور بندوں پر اپنا مال خرچ کرتا ہے تو گویا وہ اپنے رب سے اس بات کا امیدوار بن رہا ہوتا ہے کہ آخرت میں جب وہ خالی ہاتھ خدا کے سامنے حاضر ہو تو اس کا خدا اس کو اپنی رحمتوں سے محروم نہ کرے۔ اسی طرح جب وہ دین کی ضرورتوں میں اپنا مال دیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کے مشن میں شریک کرتا ہے۔ وہ اپنے مال کو خدا کے مال میں شامل کرتا ہے تا کہ اس کی حقیر پونجی خدا کے بڑے خزانہ میں مل کر زیادہ ہو جائے۔

جو شخص اپنے مال کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق خرچ کرتا ہے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو حکمت و دانائی میں سے حصہ ملا ہے۔ سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ آدمی مال کی محبت میں مبتلا ہو اور اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے رک جائے اور سب سے بڑی دانائی یہ ہے کہ اقتصادی مفادات آدمی کے لیے اللہ کی راہ میں بڑھنے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ وہ اپنے آپ کو خدا میں اتنا ملا دے کہ خدا کو اپنا اور اپنے کو خدا کا سمجھنے لگے۔ جو شخص ذاتی مصلحتوں کے خول میں جیتا ہے اس کے اندر وہ نگاہ پیدا نہیں ہوسکتی جو بلند تر حقیقتوں کو دیکھے اور اعلیٰ کیفیات کا تجربہ کرے۔ اس کے برعکس، جو شخص ذاتی مصلحتوں کو نظر انداز کرکے خدا کی طرف بڑھتا ہے وہ اپنے آپ کو محدودیتوں سے اوپر اٹھاتا ہے، وہ اپنے شعور کو اس خدا کے ہم سطح کرلیتا ہے جو غنی و حمید اور وسیع و علیم ہے۔ وہ چیزوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھنے لگتا ہے۔ کیوں کہ وہ ان حدبندیوں کے پار ہو جاتا ہے جو آدمی کے لیے کسی چیز کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے میں رکاوٹ بنتی ہیں — کوئی بات خواہ کتنی ہی سچی ہو مگر اس کی سچائی کسی آدمی پر اسی وقت کھلتی ہے جب کہ وہ اس کو کھلے ذہن سے دیکھ سکے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ؗ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ

۲۷۰۔ اور تم جو خرچ کرتے ہو یا جو نذر مانتے ہو اس کو اللہ جانتا ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ ۲۷۱۔ اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تب بھی اچھا ہے اور اگر تم انھیں چھپا کر محتاجوں کو دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اور اللہ تمھارے گناہوں کو دور کر دے گا اور اللہ تمھارے کاموں سے واقف ہے۔ ۲۷۲۔ ان کو ہدایت پر لانا تمھارا ذمہ نہیں۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے اپنے ہی لیے کرو گے۔ اور تم نہ خرچ کرو مگر اللہ کی رضا چاہنے کے لیے۔ اور تم جو مال خرچ کرو گے، وہ تم کو پورا کر دیا جائے گا اور تمھارے لیے اس میں کمی نہ کی جائے گی۔ ۲۷۳۔ صدقات ان حاجت مندوں کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہوں، زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ناواقف آدمی ان کو غنی خیال کرتا ہے، ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے۔ تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے

بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع
اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہے۔ ۲۷۴۔ جو لوگ اپنے مالوں کو رات اور دن، چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لیے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی سب سے بڑی مد یہ ہے کہ ان دینی خادموں کی مالی مدد کی جائے جو دین کی جدوجہد میں اپنے کو ہمہ تن لگا دینے کی وجہ سے بے معاش ہو گئے ہوں۔ ایک کامیاب تاجر کے پاس کسی دوسرے کام کے لیے وقت نہیں رہتا۔ ٹھیک یہی معاملہ خدمت دین کا ہے۔ جو شخص یک سوئی کے ساتھ اپنے آپ کو دین کی خدمت میں لگائے اس کے پاس معاشی جدوجہد کے لیے وقت نہیں رہے گا۔ مزید یہ کہ ہر کام کی اپنی ایک فطرت ہے اور اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ آدمی کا ذہن ایک خاص ڈھنگ پر بناتا ہے جو شخص تجارت میں لگتا ہے اس کے اندر دھیرے دھیرے تجارتی مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ تجارت کی راہ کی باریکیاں فوراً اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ جب کہ وہی آدمی دین کے راستہ کی باتوں کو گہرائی کے ساتھ پکڑ نہیں پاتا۔ یہی معاملہ برعکس صورت میں دین کی خدمت کرنے والے کا ہوتا ہے۔ اب اس کا حل کیا ہو۔ کیوں کہ کسی معاشرہ میں دونوں قسم کے کاموں کا ہونا ضروری ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس معاشی وسائل جمع ہو گئے ہیں اس میں وہ ان لوگوں کا حصہ بھی لگائیں جو دینی مصروفیت کی وجہ سے اپنی معاشیات فراہم نہ کر سکے۔ یہ گویا ایک طرح کی خاموش تقسیم کار ہے جو طرفین کے درمیان خالص رضائے الٰہی کے لیے وقوع میں آتی ہے۔ خادم دین نے اپنے آپ کو اللہ کے لیے یکسو کیا تھا، اس لیے وہ انسان سے نہیں مانگتا اور نہ اس سے پانے کا امیدوار رہتا ہے۔ دوسری طرف صاحب معاش یہ سوچتا ہے کہ میرے پاس معاشی وسائل اس قیمت پر آئے ہیں کہ میں دین کی راہ میں وہ خدمت نہ کر سکا جو مجھ کو کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ میں اپنے مال میں اپنے ان بھائیوں کا حصہ لگاؤں جو گویا میری کمی کی تلافی خدا کے یہاں کر رہے ہیں۔

جب دین کی جدوجہد اس مرحلہ میں ہو کہ دین کے نام پر معاشی عہدے نہ ملتے ہوں، جب دین کی راہ میں لگنے والا آدمی بے روزگار ہو جائے، اس وقت دین کے خادموں کو اپنا مال دینا بظاہر ماحول کے ایک غیر اہم طبقہ سے اپنا رشتہ جوڑنا ہے۔ ایسے افراد پر خرچ کرنا مجلسوں میں قابل تذکرہ نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کی حیثیت اور ناموری میں اضافہ نہیں کرتا۔ مگر یہی وہ خرچ ہے جو آدمی کو سب سے زیادہ اللہ کی رحمتوں کا مستحق بناتا ہے۔

اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ‌ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَيۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا‌ ۘ‌ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ‌ؕ فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمۡرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ‌ؕ وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِى الصَّدَقٰتِ ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيۡمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ‌ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾

۲۷۵۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ قیامت میں نہ اٹھیں گے مگر اس شخص کی مانند جس کو شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا کہ تجارت کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا سود لینا۔ حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ پھر جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو شخص پھر وہی کرے تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۷۶۔ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ پسند نہیں کرتا ناشکروں کو، گنہ گاروں کو۔ ۲۷۷۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی، ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس۔ ان کے لیے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔

بندوں کے درمیان باہمی طور پر جو معاشی تعلقات مطلوب ہیں ان کی علامت زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے حقوق کا اعتراف یہاں تک کرتا ہے کہ وہ خود اپنی کمائی کا ایک حصہ نکال کر اپنے بھائی کو دیتا ہے۔ جو دین حقوق شناسی کا ایسا ماحول بنانا چاہتا ہو وہ سود کے دولت پرستانہ طریقہ کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتا۔ ایسے معاشرہ میں باہمی لین دین تجارت کے اصول پر ہوتا ہے، نہ کہ سود کے اصول پر تجارت میں بھی آدمی نفع لیتا ہے۔ مگر تجارت کا جو نفع ہے وہ آدمی کی محنت اور اس کے خطرات مول لینے کی قیمت ہوتا ہے۔ جب کہ سود کا نفع محض خود غرضی اور زر اندوزی کا نتیجہ ہے۔

سود کا کاروبار کرنے والا اپنی دولت دوسرے کو اس لیے دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی دولت کو مزید بڑھائے۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ اس کا سرمایہ یقینی شرح سے بڑھ رہا ہے۔ مگر اس عمل کے دوران وہ خود اپنے اندر جو انسان تیار کرتا ہے وہ ایک خود غرض اور دنیا پرست انسان ہے۔ اس کے برعکس، جو آدمی اپنی کمائی میں

سے صدقہ کرتا ہے، جو دوسروں کی ضرورت مندی کو اپنے لیے تجارت کا سودا نہیں بناتا بلکہ اس کے ساتھ اپنے کو شریک کرتا ہے، ایسا شخص اپنے عمل کے دوران اپنے اندر جو انسان تیار کر رہا ہے وہ پہلے سے بالکل مختلف انسان ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے دل میں دوسروں کی خیر خواہی ہے۔ جو ذاتی دائرہ سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔

دنیا میں آدمی اس لیے نہیں بھیجا گیا ہے کہ وہ یہاں اپنی کمائی کے ڈھیر لگائے۔ آدمی کے لیے ڈھیر لگانے کی جگہ آخرت ہے۔ دنیا میں آدمی کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان میں کون ہے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اس کو آخرت کی جنتی دنیا میں بسایا جائے۔ جو لوگ اس صلاحیت کا ثبوت دیں گے ان کو خدا جنت کا باشندہ بننے کے لیے چن لے گا، اور باقی تمام لوگ کوڑا کرکٹ کی طرح جہنم میں پھینک دیے جائیں گے — صدقہ کی روح حاجت مند کو اپنا مال خدا کے لیے دینا ہے اور سود کی روح استحصال کے لیے دینا۔ صدقہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی آخرت میں اپنے لیے نعمتوں کا ڈھیر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سود اس بات کی علامت ہے کہ وہ اسی دنیا میں اپنے لیے ڈھیر لگانے کا خواہش مند ہے۔ یہ دو الگ الگ انسان ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ خدا کے یہاں دونوں کا انجام یکساں قرار پائے۔ دنیا اسی کو ملتی ہے جس نے دنیا کے لیے محنت کی ہو، اسی طرح آخرت اسی کو ملے گی جس نے آخرت کے لیے اپنے اثاثہ کو قربان کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوۡا مَا
بَقِىَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنۡ
لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَرَسُوۡلِهٖ ۚ وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَـكُمۡ رُءُوۡسُ
اَمۡوَالِكُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾
وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى
مَيۡسَرَةٍ ‌ؕ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ
كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ
فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ ۖ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ
ع ۳۸ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾ ع

۲۷۸۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔ ۲۷۹۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کے لیے خبر دار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کرلو تو اصل رقم کے تم حق دار ہو، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ ۲۸۰۔ اور اگر ایک شخص تنگی والا ہے تو اس کی فراخی تک مہلت دو۔ اور اگر تم معاف کردو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ ۲۸۱۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا پورا پورا مل جائے گا۔ اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

معاشرہ کی اصلاح کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاشرہ کا کوئی فرد نہ کسی دوسرے کے اوپر زیادتی کرے اور نہ دوسرا کوئی اس کے اوپر زیادتی کرے۔ نہ کوئی کسی کے اوپر ظالم بنے اور نہ کوئی کسی کو مظلوم بنائے۔ سودخواری ایک کھلا ہوا معاشی ظلم ہے۔ اس لیے اسلام نے اس کو حرام ٹھہرایا۔ حتی کہ اسلامی اقتدار کے تحت سودی کاروبار کو فوجداری جرم قرار دیا۔ تاہم ایک سودخوار کو جس طرح دوسرے کے ساتھ ظالمانہ کاروبار کرنے کی اجازت نہیں ہے اسی طرح کسی دوسرے کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ سودخوار کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائے۔ کسی کا مجرم ہونا اس کو اس کے دیگر حقوق سے محروم نہیں کرتا۔ سودخوار کے خلاف جب کارروائی کی جائے گی تو صرف اس کے سودی اضافہ کو ساقط کیا جائے گا۔ اپنی اصل رقم کو واپس لینے کا وہ پھر بھی حق دار ہوگا۔ تاہم عمومی قانون کے ساتھ اسلام انسانی کمزوریوں کی بھی آخری حد تک رعایت کرتا ہے۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ کوئی قرض دار اگر وقت پر تنگدست ہے تو اس کو اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک وہ اپنے ذمہ کی رقم ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ اسی کے ساتھ یہ تلقین بھی کی گئی کہ کوئی شخص قرض کی رقم ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو اس کے ذمہ کی رقم کو سرے سے معاف کر دینے کا حوصلہ پیدا کرو۔ معاف کرنے والا خدا کے یہاں اجر کا مستحق بنتا ہے اور دنیا میں اس کا یہ فائدہ ہے کہ معاشرہ کے اندر باہمی رعایت اور ہمدردی کی فضا پیدا ہوتی ہے جو بالآخر سب کے لیے مفید ہے۔

تاہم صرف قانون کا نفاذ معاشرہ کی صلاح وفلاح کا ضامن نہیں۔ حقیقی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ میں تقویٰ کی فضا موجود ہو۔ اس لیے قانونی حکم بتاتے ہوئے ایمان، تقویٰ اور آخرت کا اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ جس طرح ایک سیکولر نظام اسی وقت کامیابی کے ساتھ چلتا ہے جب کہ شہریوں کے اندر اس کے مطابق قومی کردار موجود ہو۔ اسی طرح اسلامی نظام اسی وقت صحیح طور پر وقوع میں آتا ہے جب کہ افراد کے قابل لحاظ حصہ میں تقویٰ کی روح پائی جاتی ہو۔ قومی کردار یا تقویٰ دراصل مطلوبہ نظام کے حق میں افراد کی آمادگی کا نام ہے۔ اور افراد کے اندر جب تک ایک درجہ کی آمادگی نہ ہو، محض قانون کے زور پر اس کو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

مزید یہ کہ اسلام کی رو سے اصلاح معاشرہ بجائے خود مطلوب چیز نہیں ہے۔ اسلام میں اصل مطلوب فرد کی اصلاح ہے۔ معاشرہ کی اصلاح صرف اس کا ایک ثانوی نتیجہ ہے۔ قرآن جس ایمان، تقویٰ اور فکر آخرت کی طرف بلاتا ہے اس کا تحقق فرد کے اندر ہوتا ہے، نہ کہ کسی اجتماعی ہیئت کے اندر۔ اس لیے قرآنی دعوت کا اصل مخاطب فرد ہے، اور معاشرہ کی اصلاح افراد کی اصلاح کا اجتماعی ظہور۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ
اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ
بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ
يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا
يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ
الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ
يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ
فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ
اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ
وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا
تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى
اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ
لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ
تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ
فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ
وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ
كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ
فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ

۲۸۲۔ اے ایمان والو، جب تم کسی مقرر مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور اس کو لکھے تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا، انصاف کے ساتھ۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا اللہ نے اس کو سکھایا، اسی طرح اس کو چاہئے کہ لکھ دے۔ اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق آتا ہے۔ اور وہ ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس پر حق آتا ہے بے سمجھ ہو یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چاہئے کہ اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ انکار نہ کریں جب وہ بلائے جائیں۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اس کو لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کا طریقہ ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ تم شبہ میں نہ پڑو۔ لیکن اگر کوئی سودا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں لین دین کیا کرتے ہو تو تم پر کوئی الزام نہیں کہ تم اس کو نہ لکھو۔ مگر جب یہ سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔ اور کسی لکھنے والے کو یا گواہ کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمھارے لیے گناہ کی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرو، اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۲۸۳۔ اور اگر تم

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى
سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوضَةٌ ط
فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي
اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ ط وَلَا
تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ط وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهُ اٰثِمٌ
ع ۳۹ قَلْبُهُ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو رہن رکھنے کی چیزیں قبضہ میں دے دی جائیں۔ اور اگر تم میں سے ایک شخص دوسرے شخص کا اعتبار کرتا ہو تو چاہئے کہ جس شخص پر اعتبار کیا گیا، وہ اعتبار کو پورا کرے۔ اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص چھپائے گا اس کا دل گنہ گار ہوگا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو جاننے والا ہے۔

دو آدمیوں کے درمیان نقد معاملہ ہو تو لین دین ہو کر اسی وقت معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر ادھار معاملات کی نوعیت مختلف ہے۔ ادھار معاملہ میں اگر ساری بات زبانی ہو تو کاغذی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بعد کو اختلاف پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ طرفین اپنے اپنے مطابق معاملہ کی تصویر پیش کرتے ہیں اور کوئی ایسی قطعی بنیاد نہیں ہوتی جس کی روشنی میں صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادائیگی کے وقت اکثر دونوں کو ایک دوسرے سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا حل تحریر ہے۔ نقد معاملہ کو لکھ لیا جائے تو وہ بھی بہتر ہے۔ مگر ادھار معاملات کے لیے تو ضروری ہے کہ ان کو باقاعدہ تحریر میں لایا جائے اور اس پر گواہ بنا لیے جائیں۔ اختلاف کے وقت یہی تحریر فیصلہ کی بنیاد ہوگی۔ یہ مسلمان کے لیے تقویٰ اور عدل کی ایک حفاظتی تدبیر ہے۔ کتابت شدہ شرائط کے مطابق وہ اپنے حقوق کو ادا کر کے خدا اور اس کی مخلوق کے سامنے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

مسلمان خدا کے دین کے گواہ ہیں۔ جس طرح اللہ کی بات کو جانتے ہوئے چھپانا جائز نہیں، اسی طرح انسانی معاملات میں کسی کے پاس کوئی گواہی ہو تو اس کو چاہیے کہ اس کو ظاہر کر دے۔ گواہی کو چھپانا اپنے اندر مجرمانہ ذہن کی پرورش کرنا ہے اور معاملہ کے منصفانہ فیصلہ میں وہ حصہ ادا نہ کرنا ہے، جو وہ کر سکتا ہے۔ انسان کا ضمیر چاہتا ہے کہ جب ایک چیز حق نظر آئے تو اس کے حق ہونے کا اعتراف کیا جائے۔ اور جب ایک چیز ناحق دکھائی دے تو اس کے ناحق ہونے کا اعلان کیا جائے۔ ایسی حالت میں جو شخص اپنے وقار اور مصلحت کی خاطر اپنی زبان کو بند رکھتا ہے وہ گویا ایسا مجرم ہے جو اپنے جرم پر خود ہی گواہ بن گیا ہو۔

''اور اللہ سے ڈرو، اللہ تم کو سکھاتا ہے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کا اصل سرچشمہ تقویٰ ہے۔ آدمی کا اخلاص اور اس کا خوف خدا، دیانت داری اور مخلوق کی خیر خواہی اور ذمہ داری کا احساس، یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی آدمی کے لیے علم و آگہی کی سب سے بڑی ضمانت ہیں۔ تقویٰ کا تعلق علم سے یہ ہے کہ تقویٰ انسان کو ڈی کنڈیشنڈ مائنڈ (deconditioned mind) بناتا ہے۔ وہ آدمی کے ذہن کو بیدار کرتا ہے۔ وہ انسان کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ انسان کو زیادہ گہرے غور و فکر کے قابل بنا دیتا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ
تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ
بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾ اٰمَنَ
الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ
مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫
غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا
يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا
تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا
وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا
طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ
وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٨٦﴾ ع

۲۸۴۔ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ تم اپنے دل کی باتوں کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ۲۸۵۔ رسول ایمان لایا ہے اس پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر اترا ہے۔ اور مسلمان بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔ سب ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب، اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ ۲۸۶۔ اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اس کو ملے گا وہی جو اس نے کمایا اور اس پر پڑے گا وہی جو اس نے کیا۔ اے ہمارے رب، ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا ہم غلطی کر جائیں۔ اے ہمارے رب، ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا بوجھ تو نے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے ہمارے رب، ہم سے وہ نہ اٹھوا جس کی طاقت ہم کو نہیں۔ اور درگزر کر ہم سے۔ اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تو ہمارا کارساز ہے۔ پس انکار کرنے والوں کے مقابل میں ہماری مدد کر۔

کائنات کی ہر چیز اللہ کے زیر حکم ہے۔ ذرہ سے لے کر ستاروں تک سب خدا کے مقررہ نقشہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ اسی راستہ پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کے لیے خدا نے ان کو پابند کر دیا ہے۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے کو خود مختار حالت میں پاتا ہے۔ بظاہر وہ آزاد ہے کہ اپنی مرضی سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ مگر انسان کی آزادی مطلق نہیں ہے بلکہ امتحان کے لیے ہے۔ انسان کو بھی کائنات کے بقیہ

اجزاء کی طرح خدا کی پابندی کرنی ہے۔ جس پابند زندگی کو بقیہ کائنات نے بزور اختیار کیا ہے وہی پابند زندگی انسان کو اپنے ارادہ سے اختیار کرنا ہے۔ انسان کو ظاہری صورت حال سے دھوکا کھا کر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی ہر وقت مالک کائنات کی نظر میں ہے، وہ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات کی نگرانی کر رہا ہے خواہ وہ اس کے اندر ہو یا اس کے باہر۔

''اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق''—اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ پر فہرست احکام کے اعتبار سے عمل کی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے، بلکہ انسان یا گروہ کی اپنی وسعت کے اعتبار سے ذمہ داری ہوتی ہے۔

وہ کون سا انسان ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ وہ ایمان اور اطاعت والا انسان ہے۔ ایمان سے مراد آدمی کی شعوری حوالگی ہے اور اطاعت سے مراد اس کی عملی حوالگی۔ شعور کے اعتبار سے یہ مطلوب ہے کہ آدمی اللہ کو اپنے خالق اور مالک کی حیثیت سے اپنے اندر اتار لے۔ وہ اس حقیقت کو پا گیا ہو کہ کائنات کا نظام کوئی بے روح مشینی نظام نہیں ہے بلکہ ایک زندہ نظام ہے جس کو خدا اپنے فرماں بردار کارندوں کے ذریعہ چلا رہا ہے۔ اس نے خدا کے بندوں میں سے ان بندوں کو پہچان لیا ہو جن کو خدا نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے چنا۔ خدا نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو کتاب اتاری ہے اس کو وہ حقیقی معنوں میں اپنے فکر و خیال کا جزء بنا چکا ہو۔ رسالت اور پیغمبری اس کو پوری انسانی تاریخ میں ایک مسلسل واقعہ کی صورت میں نظر آنے لگے۔ ایمانیات کو اس طرح اپنے دل و دماغ میں بٹھا لینے کے بعد وہ اپنی زندگی ہمہ تن اس کے نقشہ پر ڈھال دے۔

پھر یہ ایمان و اطاعت اس کے لیے کوئی رسمی اور ظاہری معاملہ نہ ہو بلکہ وہ اس کی روح کو اس طرح گھلا دے کہ وہ اللہ کو پکارنے لگے۔ اس کا وجود خدا کی یاد میں ڈھل جائے۔ اس کی زندگی تمام تر خدا کے اوپر نربھر ہو جائے۔

٣۔ سُوۡرَۃُ اٰلِ عِمۡرٰنَ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

الٓمّٓ ﴿١﴾ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ
الۡقَیُّوۡمُ ﴿٢﴾ نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ
وَالۡاِنۡجِیۡلَ ﴿٣﴾ مِنۡ قَبۡلُ ہُدًی لِّلنَّاسِ
وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ۬ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

١۔ الٓمّٓ۔ ٢۔ اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ اور سب کا تھامنے والا۔ ٣۔ اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ، تصدیق کرنے والی اس چیز کی جو اس کے آگے ہے، اور اس نے تورات اور انجیل اتاری۔ ٤۔ اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے اور اللہ نے فرقان اتارا۔

اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُوانۡتِقَامٍ ۝۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخۡفٰى عَلَيۡهِ شَىۡءٌ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ؕ ۝۵ هُوَ الَّذِىۡ يُصَوِّرُكُمۡ فِى الۡاَرۡحَامِ كَيۡفَ يَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۶

بے شک جن لوگوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست ہے، بدلہ لینے والا ہے۔ ۵۔ بے شک اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ ۶۔ وہی تمھاری صورت بناتا ہے ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

کائنات کا خالق و مالک کوئی مشینی خدا نہیں بلکہ ایک زندہ اور باشعور خدا ہے۔ اس نے ہر زمانہ میں انسان کے لیے رہنمائی بھیجی۔ انھیں میں سے وہ کتابیں تھیں جو تورات و انجیل کی صورت میں پچھلے انبیاء پر اتاری گئیں۔ مگر انسان ہمیشہ یہ کرتا رہا کہ اس نے اپنی تاویل و تشریح سے خدا کی تعلیمات کو طرح طرح کے معنی پہنائے اور خدا کے ایک دین کو کئی دین بنا ڈالا۔ آخر اللہ نے اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق آخری کتاب (قرآن) اتاری جو انسانوں کے لیے صحیح ہدایت نامہ بھی ہے اور اسی کے ساتھ وہ کسوٹی بھی جس سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کیا جا سکے۔ قرآن بتاتا ہے کہ اللہ کا سچا دین کیا ہے اور وہ دین کون سا ہے جو لوگوں نے اپنی خود ساختہ تشریحات کے ذریعے بنا رکھا ہے۔ اب جو لوگ خدا کی کتاب کو نہ مانیں یا اپنی رایوں اور تعبیروں کے تحت گھڑے ہوئے دین کو نہ چھوڑیں وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے آنکھ دی مگر روشنی آجانے کے باوجود انھوں نے نہ دیکھا۔ جن کو خدا نے عقل دی مگر دلیل آجانے کے بعد بھی انھوں نے نہ سمجھا اپنی چھوٹی بڑائی کی خاطر وہ حق کے آگے جھکنے کو تیار نہ ہوئے۔

اللہ اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے کیسا ہے، اس کا حقیقی تعارف خود وہی کر سکتا ہے۔ اس کی ہستی کا دوسری موجودات سے کیا تعلق ہے، اس کو بھی وہ خود ہی صحیح طور پر بتا سکتا ہے۔ خدا نے اپنی کتاب میں اس کو اتنی واضح صورت میں بتا دیا ہے کہ جو شخص جاننا چاہے وہ ضرور جان لے گا۔ یہی معاملہ انسان کے لیے ہدایت نامہ مقرر کرنے کا ہے۔ انسان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کون سا رویہ ہے جو انسان کی کامیابی کا ضامن ہے، اس کو بتانے کے لیے پوری کائنات کا علم درکار ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ وہی ہو سکتا ہے جو بقیہ کائنات سے ہم آہنگ ہو اور دنیا کے وسیع تر نظام سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہو۔ انسان کے لیے صحیح راہ عمل کا تعین وہی کر سکتا ہے جو نہ صرف انسان کو پیدائش سے موت تک جانتا ہو بلکہ اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ پیدائش سے پہلے کیا ہے اور موت کے بعد کیا۔ ایسی ہستی خدا کے سوا کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ انسان کے لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ خدا پر بھروسہ کرے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو پورے یقین کے ساتھ پکڑ لے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ
مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ
مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ
فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ
وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا
اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا
بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ
اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ
النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝۹ ع

۷۔ وہی ہے جس نے تمھارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کے مطلب کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ ۸۔ اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کو نہ پھیر جب کہ تو ہم کو ہدایت دے چکا۔ اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت دے۔ بے شک تو ہی سب کچھ دینے والا ہے۔ ۹۔ اے ہمارے رب، تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن جس میں کوئی شبہ نہیں۔ بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

قرآن میں دو طرح کے مضامین ہیں۔ ایک وہ جو انسان کی معلوم دنیا سے متعلق ہیں۔ مثلاً تاریخی واقعات، کائناتی نشانیاں، دنیوی زندگی کے احکام وغیرہ۔ دوسرے وہ جن کا تعلق ان غیبی امور سے ہے جو آج کے انسان کے لیے ناقابل ادراک ہیں۔ مثلاً خدا کی صفات، جنت دوزخ کے احوال، وغیرہ۔ پہلی قسم کی باتوں کو قرآن میں محکم انداز، بالفاظ دیگر براہِ راست اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی باتیں انسان کی نامعلوم دنیا سے متعلق ہیں، وہ انسانی زبان کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس لیے ان کو متشابہ انداز یعنی تمثیل وتشبیہہ کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ''انسان کا ہاتھ'' کہا جائے تو یہ براہِ راست زبان کی مثال ہے اور ''اللہ کا ہاتھ'' تمثیلی زبان کی مثال۔ جو لوگ اس فرق کو نہیں سمجھتے وہ متشابہ آیتوں کا مفہوم بھی اسی طرح متعین کرنے لگتے ہیں جس طرح محکم آیتوں کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے فطری دائرہ سے باہر نکلنے کی کوشش ہے۔ اس قسم کی کوشش کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی ہمیشہ بھٹکتا رہے اور کبھی منزل پر نہ پہنچے۔ کیوں کہ ''انسان کے ہاتھ'' کو متعین طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر ''خدا کے ہاتھ'' کو موجودہ عقل کے ساتھ متعین طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

متشابہات کے سلسلے میں صحیح علمی وعقلی موقف یہ ہے کہ آدمی اپنی محدودیت کا اعتراف کرے۔ جن باتوں کو وہ متعین صورت میں اپنے حواس کی گرفت میں نہیں لا سکتا ان کے مجمل تصور پر قناعت کرے۔ جب حواس کی محدودیت کی وجہ سے انسان کے لیے ان حقائق کا کلّی احاطہ ممکن نہیں تو حقیقت پسندی یہ ہے کہ ان امور میں

تعیّنات کی بحث نہ چھیڑی جائے۔ اس کے بجائے اللہ سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ آدمی کو اس قسم کی بے نتیجہ بحثوں میں الجھنے سے بچائے۔ وہ آدمی کو ایسی عقل سلیم دے جو اپنے مقام کو پہچانے اور ان حقائق کے مجمل یقین پر راضی ہوجائے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب کہ یہ حقیقتیں اپنی تفصیلی صورت میں کھل کر سامنے آجائیں گی مگر آدمی جب تک امتحان کی دنیا میں ہے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

جس طرح راستہ کی پھسلن ہوتی ہے اسی طرح عقل کے سفر کی بھی پھسلن ہے۔ اور عقل کی پھسلن یہ ہے کہ کسی معاملہ کو آدمی اس کے صحیح رخ سے نہ دیکھے۔ کسی چیز کی حقیقت آدمی اسی وقت سمجھتا ہے جب کہ وہ اس کو اس رخ سے دیکھے جس رخ سے اس کو دیکھنا چاہیے۔ اگر وہ کسی اور رُخ سے دیکھنے لگے تو عین ممکن ہے کہ وہ صحیح رائے قائم نہ کرسکے اور غلط فہمیوں میں پڑ کر رہ جائے۔ سب سے بڑی دانائی یہ ہے کہ آدمی اس راز کو جان لے کہ کسی چیز کو دیکھنے کا صحیح ترین رخ کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ
وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ
وَقُوْدُ النَّارِ ﴿١٠﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ
وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ
فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿١١﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ
وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٢﴾
قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ
تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ
يَّرَوْنَھُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ
يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿١٣﴾

۱۰۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا، ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اور یہی لوگ آگ کے ایندھن ہوں گے۔ ۱۱۔ ان کا انجام ویسا ہی ہوگا جیسا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والوں کا ہوا۔ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ اس پر اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث ان کو پکڑ لیا۔ اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ۱۲۔ انکار کرنے والوں سے کہہ دو کہ اب تم مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف جمع کرکے لے جائے جاؤ گے اور جہنم بہت برا ٹھکانا ہے۔ ۱۳۔ بے شک تمھارے لیے نشانی ہے ان دو گروہوں میں جن میں (بدر میں) مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا منکر تھا۔ یہ منکر کھلی آنکھوں سے ان کو دوگنا دیکھتے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی مدد کا زور دے دیتا ہے۔ اس میں آنکھ والوں کے لیے بڑا سبق ہے۔

حق کی دعوت جب بھی اٹھتی ہے تو وہ لوگوں کو ایک غیر اہم آواز معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف وقت کا ماحول ہوتا ہے جس کے قبضہ میں ہر قسم کے مادی وسائل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف حق کا قافلہ ہوتا ہے جس کو

ابھی ماحول میں کوئی جماؤ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ مادی مفادات وابستہ نہیں ہوتے۔ ان حالات میں حق کی طرف بڑھنا ماحول سے کٹنے اور مفادات سے محروم ہونے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مفادات کو بچانے کی خاطر حق کو نہیں مانتا۔ اپنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر ایک تنہا داعی کی صف میں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مگر یہ چیزیں جو انسان کو آج اہم نظر آتی ہیں وہ فیصلہ کے دن کسی کے کچھ کام نہ آئیں گی۔ ان چیزوں کی جو کچھ اہمیت ہے صرف اس وقت تک ہے جب کہ معاملہ انسان اور انسان کے درمیان ہے۔ جب قیامت کا پردہ پھٹے گا اور معاملہ انسان اور خدا کے درمیان ہوجائے گا تو یہ چیزیں اتنی بے قیمت ہوجائیں گی جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ داعی اس دنیا میں بظاہر بے زور دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت میں وہی زور والا ہے۔ کیوں کہ اس کے پیچھے خدا ہے۔ منکر بظاہر اس دنیا میں طاقت ور دکھائی دیتا ہے۔ مگر وہ بالکل بے طاقت ہے۔ کیوں کہ اس کی طاقت ایک وقتی فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

نبوت کے چودھویں سال بدر کا معرکہ آخرت میں ہونے والے واقعہ کا ایک دنیوی نمونہ تھا۔ حق کا انکار کرنے والے تعداد اور طاقت میں بہت زیادہ تھے اور حق کو ماننے والے تعداد اور طاقت میں بہت کم تھے۔ اس کے باوجود منکرین کو غیر معمولی شکست ہوئی اور حق کے پیروؤں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ اللہ ہمیشہ حق کے پیروؤں کی جانب ہوتا ہے۔ اتنے غیر معمولی فرق کے باوجود اتنی غیر معمولی فتح اللہ کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ یہ خدا کی طرف سے اس بات کا ایک مظاہرہ ہے کہ حق اس عالم میں تنہا نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ منکرین کے لیے وہ ایک ظاہری دلیل بھی ہے جس میں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ خدا کی اس دنیا میں وہ کتنے بے جگہ ہیں۔ داعیٔ حق کے کلام اور اس کی زندگی میں کھلی ہوئی علامتیں ہوتی ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ مگر جو سرکش لوگ ہیں وہ اس کو رد کرنے کے لیے الفاظ کی ایک پناہ گاہ بنا لیتے ہیں۔ وہ جھوٹی توجیہات میں جیتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آخرت کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں انھیں یہ پتا چل جائے گا کہ وہ جن الفاظ کا سہارا لیے ہوئے تھے وہ حقیقت کے اعتبار سے کس قدر بے معنی تھے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ

۱۴۔ لوگوں کے لیے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی — عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی۔ یہ دنیوی زندگی کے سامان ہیں۔ اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ ۱۵۔ کہو، کیا میں تم کو بتاؤں اس سے بہتر چیز۔ ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا وَ
اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ
اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَقِنَا عَذَابَ
النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالۡقٰنِتِیۡنَ
وَالۡمُنۡفِقِیۡنَ وَالۡمُسۡتَغۡفِرِیۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ ﴿۱۷﴾

رہیں گے۔ اور ستھری بیویاں ہوں گی اور اللہ کی رضامندی ہوگی۔ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے۔ ۱۶۔ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب، ہم ایمان لے آئے۔ پس تو ہمارے گناہوں کو معاف کردے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ ۱۷۔ وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچے ہیں فرماں بردار ہیں اور خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی رات کو مغفرت مانگنے والے ہیں۔

دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس لیے یہاں کی چیزوں میں آدمی کے لیے ظاہری کشش رکھی گئی ہے۔ اب خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہے جو ظاہری کشش سے متاثر ہو کر دنیا کی چیزوں میں کھو جاتا ہے۔ اور کون ہے جو اس سے اوپر اٹھ کر آخرت کی ان دیکھی چیزوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ آدمی کو دنیا کی چیزوں میں تسکین ملتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ماحول کے اندر ان کے ذریعہ سے وقار قائم ہوتا ہے۔ یہ چیزیں ہوں تو اس کے سب کام بنتے چلے جاتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہی چیزیں اصل اہمیت کی چیزیں ہیں۔ اس کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں سمٹ کر بیوی بچوں اور مال وجائداد کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ یہی چیز آخرت کے تقاضوں کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دنیا کی چیزوں کی اہمیت کا احساس آدمی کو آخرت کی چیزوں کی طرف سے غافل کر دیتا ہے۔ دنیا میں اپنے بچوں کے مستقبل کی تعمیر میں وہ اتنا مشغول ہوتا ہے کہ اس کو یاد نہیں رہتا کہ دنیا سے ماورا بھی کوئی ''مستقبل'' ہے جس کی تعمیر کی اس کو فکر کرنا چاہیے۔ دنیا میں اپنے گھر کو آباد کرنا اس کے لیے اتنا محبوب بن جاتا ہے کہ اس کو کبھی خیال نہیں آتا کہ اس کے سوا بھی کوئی ''گھر'' ہے جس کو آباد کرنے میں اس کو لگنا چاہیے۔ دنیا میں دولت سمیٹنا اور جائداد بنانا اس کو اتنا زیادہ قیمتی معلوم ہوتے ہیں کہ وہ سوچ نہیں پاتا کہ اس کے سوا بھی کوئی ''دولت'' ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے کو وقف کرے۔ مگر اس قسم کی تمام چیزیں صرف موجودہ عارضی زندگی کی رونق ہیں۔ اگلی طویل تر زندگی میں وہ کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

جو شخص آخرت کی مستقل زندگی کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے اس کی زندگی کیسی زندگی ہوگی۔ دنیا کی رونقیں اس کی نظر میں حقیر بن جائیں گی۔ وہ اس یقین سے بھر جائے گا کہ آخرت کا معاملہ تمام تر اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرے گا اور سب سے زیادہ آخرت کا حریص بن جائے گا۔ معاملات میں وہ اپنی خواہش کے پیچھے نہیں چلے گا بلکہ اللہ کی عدالت کو سامنے رکھ کر اپنا رویہ متعین کرے گا۔ اس کے قول وعمل میں فرق نہیں ہوگا۔ اس کا مال اپنا مال نہ رہے گا بلکہ خدا کے لیے وقف

ہو جائے گا۔ اللہ کی راہ میں چلنے میں خواہ کتنی ہی مشکلیں پیش آئیں وہ پوری استقامت کے ساتھ اس پر قائم رہے گا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوگا کہ اللہ کو چھوڑنے کے بعد کوئی نہیں ہے جو اس کا سہارا بنے۔ اس کا دل اللہ کی یاد سے اس طرح پگھل اٹھے گا کہ وہ بے تابانہ اس کو پکارنے لگے گا۔ اس کی تنہائیاں اپنے رب کی صحبت میں بسر ہونے لگیں گی۔ اللہ کی عظمت و کمال کے آگے اس کو اپنا وجود سرتاپا غلط نظر آئے گا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا — اے میرے رب مجھے معاف کر دے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
النصف الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٨﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ
الْاِسْلَامُ ۫ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا
بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ
اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ
لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ
ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ
ع ٢ ١١/١٠ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ
يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ
النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

۱۸۔ اللہ کی گواہی ہے اور فرشتوں کی اور اہل علم کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ قائم رکھنے والا ہے انصاف کا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۱۹۔ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اور اہل کتاب نے اس میں جو اختلاف کیا وہ آپس کی ضد کی وجہ سے کیا، بعد اس کے کہ ان کو صحیح علم پہنچ چکا تھا۔ اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے تو اللہ یقیناً جلد حساب لینے والا ہے۔ ۲۰۔ پھر اگر وہ تم سے اس بارے میں جھگڑیں تو ان سے کہہ دو کہ میں اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو ہیں وہ بھی۔ اور اہل کتاب سے اور اَن پڑھوں سے پوچھو کیا تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو۔ اگر وہ اسلام لائیں تو انھوں نے راہ پالی۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو تمھارے اوپر صرف پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے۔ ۲۱۔ جو لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو مار ڈالتے ہیں جو لوگوں میں سے انصاف کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں، ان کو ایک دردناک سزا کی خوش خبری دے دو۔ ۲۲۔ یہی وہ

وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۲﴾

لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کا مددگار کوئی نہیں۔

کائنات کا خدا ایک ہی خدا ہے اور وہ عدل وقسط کو پسند کرتا ہے۔ تمام آسمانی کتابیں اپنی صحیح صورت میں اسی کا اعلان کر رہی ہیں۔ پھیلی ہوئی کائنات جس کو اس کا مالک اپنے غیر مرئی کارندوں (فرشتوں) کے ذریعہ چلا رہا ہے وہ کامل طور پر ویسی ہی ہے جیسا کہ اس کو ہونا چاہیے۔ ثابت شدہ علم انسانی کے مطابق کائنات ایک حد درجہ وحدانی نظام ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات کا مدبر صرف ایک ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر چیز کا اپنے محل مناسب میں ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خدا عدل کو پسند کرنے والا خدا ہے، نہ کہ بے انصافی کو پسند کرنے والا۔ پھر جو خدا وسیع تر کائنات میں مسلسل عدل کو قائم کیے ہوئے ہو وہ انسان کے معاملے میں خلافِ عدل باتوں پر کیسے راضی ہو جائے گا۔

کائنات کا ہر جزء کامل طور پر "مسلم" ہے۔ یعنی اپنی سرگرمیوں کو اللہ کے مقررہ نقشہ کے مطابق انجام دیتا ہے۔ ٹھیک یہی رویہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے رب کو پہچانے اور اس کے مطلوبہ نقشہ کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے۔ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا مرکز توجہ بنانا یا یہ خیال کرنا کہ اللہ کا فیصلہ عدل کے سوا کسی اور بنیاد پر ہو سکتا ہے، ایسی بے اصل بات ہے جس کے لیے موجودہ کائنات میں کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن کی دعوت اسی سچے اسلام کی دعوت ہے۔ جو لوگ اس سے اختلاف کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کا حق ہونا ان پر واضح نہیں ہے۔ اس کی وجہ ضد ہے۔ اس کو ماننا انھیں داعیٔ قرآن کی فکری برتری تسلیم کرنے کے ہم معنی نظر آتا ہے، اور ان کی حسد اور کبر کی نفسیات اس قسم کا اعتراف کرنے پر راضی نہیں۔ سیدھی طرح حق کو مان لینے کے بجائے وہ چاہتے ہیں کہ اس زبان ہی کو بند کر دیں جو حق کا اعلان کر رہی ہے۔ تاہم خدا کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ داعیٔ حق کی زبان کو بند کرنے کے لیے ان کا ہر منصوبہ ناکام ہوگا اور جب خدا کے عدل کا ترازو کھڑا ہوگا تو وہ دیکھ لیں گے کہ ان کے وہ اعمال کس قدر بے قیمت تھے جن کے بل پر وہ اپنی نجات اور کامیابی کا یقین کیے ہوئے تھے — سچی دلیل خدا کی نشانی ہے۔ جو شخص دلیل کے سامنے نہیں جھکتا وہ گویا خدا کے سامنے نہیں جھکتا۔ ایسے لوگ قیامت میں اس طرح اٹھیں گے کہ وہ سب سے زیادہ بے سہارا ہوں گے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُدۡعَوۡنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ وَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ۠

۲۳۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو اللہ کی کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا۔ ان کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جا رہا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ پھر ان کا ایک گروہ منھ پھیر لیتا ہے بے رخی کرتے ہوئے۔ ۲۴۔ یہ اس سبب سے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو ہرگز آگ

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ
لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۫ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا
كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ
مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ
وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ
تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ
الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾
تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي
الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ
وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ
تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

نہ چھوئے گی بجز گنے ہوئے چند دنوں کے۔ اور ان کی بنائی ہوئی باتوں نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ ۲۵۔ پھر اس وقت کیا ہوگا جب ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور ہر شخص کو جو کچھ اس نے کیا ہے، اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ ۲۶۔ تم کہو، اے اللہ، سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ اور تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ تیرے ہاتھ میں ہے سب خوبی۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۷۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو بے جان سے جان دار کو نکالتا ہے اور تو جان دار سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

اللہ کی ہدایت ایک ہی ہدایت ہے جو مختلف قوموں کی زبان میں ان کے پیغمبروں پر اتاری جاتی رہی ہے۔ وہی قرآن کی صورت میں پیغمبر آخر الزماں پر اتاری گئی ہے۔ اس یکسانیت کی وجہ سے آسمانی کتابوں کو جاننے اور ماننے والوں کے لیے قرآن کی دعوت کو پہچاننا مشکل نہیں۔ قرآن کی دعوت میں اور پچھلی آسمانی تعلیمات میں اگر کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ قرآن کی دعوت ان کی اپنی ملاوٹوں سے دین خداوندی کو پاک کر رہی ہے۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ بہت سے لوگ قرآن کی دعوت کا انکار کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی دعوت کو وہ اپنے لیے کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھتے۔ اپنے خود ساختہ عقائد کی بنا پر انھوں نے اپنے کو جہنم کی آگ سے محفوظ فرض کر لیا ہے۔ اپنی اس نفسیات کے تحت وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اس حق کا اعتراف نہ کریں تو اس سے ان کی نجات خطرہ میں پڑنے والی نہیں۔ مگر جب خدا کے انصاف کا ترازو کھڑا ہوگا اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ وہ محض خوش خیالیوں کے اندھیرے میں پڑے ہوئے تھے۔

ہر قسم کی عزت وطاقت اللہ کے اختیار میں ہے۔ وقت کے بڑے جس کو بے حقیقت سمجھ لیں، خدا

چاہے تو اسی کے حق میں عزت وسربلندی کا فیصلہ کردے۔ علم کی گدیوں پر بیٹھنے والے جس کے جہل کا فتویٰ دیں، خدا چاہے تو اسی کے ذریعہ علم کا چشمہ جاری کردے۔ خدا کی نظر میں اگر کوئی عزت وطاقت کا مستحق ہوسکتا ہے تو وہ جو اس کو خالص خدا کی چیز سمجھے اور خدا کی نظر میں اس کا سب سے زیادہ غیر مستحق اگر کوئی ہے تو وہ جو اس کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لے۔ خدا وسیع تر کائنات میں روزانہ بہت بڑے پیمانہ پر یہ کرشمہ دکھا رہا ہے کہ وہ تاریکی کو روشنی کے اوپر اوڑھا دیتا ہے اور روشنی کو تاریکی کے اوپر ڈال دیتا ہے۔ وہ مردہ عناصر سے زندگی وجود میں لاتا ہے اور زندہ چیزوں کو مردہ عناصر میں تبدیل کرتا ہے۔ خدا کی یہی قدرت اگر انسانی تاریخ میں ظاہر ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ جو لوگ حق کے نام پر ناحق کا کاروبار کررہے ہوں وہ ہمیشہ سچی دعوتِ حق کے مخالف ہوجاتے ہیں۔ ایسے داعی کو بے گھر کیا جاتا ہے۔ اس کے معاشی ذرائع برباد کیے جاتے ہیں۔ مگر ایسا شخص براہِ راست اللہ کی سرپرستی میں ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے خصوصی رزق کا انتظام کرتا ہے۔ دوسروں کو ان کی معاشی محنت کے حساب سے رزق دیا جاتا ہے، اور ایسے شخص کو بلا حساب۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ
دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا
مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ
وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝٢٨ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ
صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٩ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا
عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۛ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ
سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا
بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ
رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝٣٠ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ ع ۳ ۱۱
اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

۲۸۔ مومنین کو چاہئے کہ وہ اہلِ ایمان کو چھوڑ کر منکروں کو دوست نہ بنائیں۔ اور جو شخص ایسا کرے گا تو اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر ایسی حالت میں کہ تم ان سے بچاؤ کرنا چاہو۔ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنی ذات سے۔ اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۲۹۔ کہہ دو کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۰۔ جس دن ہر شخص اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گا، اور جو برائی کی ہوگی اس کو بھی۔ اس دن ہر آدمی یہ چاہے گا کہ کاش، ابھی یہ دن اس سے بہت دور ہوتا۔ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنی ذات سے۔ اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ ۳۱۔ کہو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور

ذُنُوۡبَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝٣١ قُلۡ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ‌ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝٣٢

تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ۳۲۔ کہو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ پھر اگر وہ اعراض کریں تو اللہ منکروں کو دوست نہیں رکھتا۔

مومن تمام انسانوں کے ساتھ نیکی اور عدل کا سلوک کرنے والا ہوتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ مگر جب غیر مسلموں کے ساتھ دوستی مسلمانوں کے مفاد کی قیمت پر ہو تو ایسی دوستی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ تاہم بچاؤ کی تدبیر کے طور پر اگر کسی وقت ایک مسلمان یا کسی مسلم گروہ کو غیر مسلموں سے وقتی تعلق قائم کرنا پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ نیت کو دیکھتا ہے اور جب نیت درست ہو تو وہ کسی کو اس کے عمل پر نہیں پکڑتا۔ تمام معاملات میں اصل قابل لحاظ چیز اللہ کا خوف ہے۔ آدمی کسی معاملہ میں جو رویہ اختیار کرے، اس کو اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اللہ اس کا حساب لے گا۔ اور اس کے انصاف کے ترازو میں جو غلط ٹھہرے گا وہ اس کی سزا پا کر رہے گا۔ اللہ سے کسی انسان کی کوئی بات اوجھل نہیں، خواہ وہ اس نے چھپ کر کی ہو یا علانیہ کی ہو۔ جب امتحان کا پردہ ہٹے گا او آخرت کا عالم سامنے آئے گا تو آدمی کے اعمال کی پوری کھیتی اس کے سامنے ہوگی۔ یہ منظر اتنا ہولناک ہوگا کہ وہ چیزیں جو دنیا میں اس کے نفس کی لذت بنی ہوئی تھیں، وہ چاہے گا کہ وہ اس سے بہت دور چلی جائیں۔

اللہ کسی کے اسلام کو جہاں دیکھتا ہے وہ اس کا قلب ہے۔ مومن وہی ہے جس کا اللہ سے تعلق قلبی محبت کی حد تک قائم ہو جائے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو اللہ کی محبت و توجہ کا مستحق بنتے ہیں۔ اور جو شخص اللہ سے اس طرح تعلق قائم کرے، اس سے اگر کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں تو اللہ اس سے درگزر فرماتا ہے۔ اللہ سرکشوں کے لیے بہت سخت ہے۔ مگر جو لوگ عاجزی کا رویہ اختیار کریں، وہ ان کے لیے نرم پڑ جاتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جس سینہ میں کسی کی محبت موجود ہو اسی سینہ میں محبوب کے دشمن کی محبت جمع نہیں ہو سکتی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محبوب اگر ایسی ہستی ہو جو آدمی کے لیے آقا و مالک کا درجہ رکھتی ہو تو اس کے ساتھ محبت صرف محبت کی حد تک نہ رہے گی بلکہ لازماً وہ اطاعت و فرماں برداری کا جذبہ پیدا کرے گی۔ خدا کی جس محبت کے بعد خدا کے دشمنوں سے قلبی تعلق ختم نہ ہو یا اس کی اطاعت و فرماں برداری کا جذبہ پیدا نہ ہو تو وہ جھوٹی محبت ہے۔ ایسے شخص کا شمار اللہ کے یہاں انکار کرنے والوں میں ہوگا، نہ کہ ماننے والوں میں — رسول وہ شخص ہے جس کے کامل خدا پرست ہونے کی گواہی خود خدا نے دی ہے، اس لیے خدا پرستانہ زندگی کے لیے رسول کا نمونہ ہی موجودہ دنیا میں واحد مستند نمونہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ اٰلَ
اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾
ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌۚ ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ
اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا
فَتَقَبَّلْ مِنِّىْۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ
وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰىؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
وَضَعَتْؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰىۚ وَاِنِّىْ
سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْۤ اُعِيْذُهَا بِكَ
وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾
فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا
نَبَاتًا حَسَنًاۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّاؕ كُلَّمَا
دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَۙ وَجَدَ
عِنْدَهَا رِزْقًاۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَاؕ
قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ
مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا
زَكَرِيَّا رَبَّهٗۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِىْ مِنْ
لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةًۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ
الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ
يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ

۳۳۔ بے شک اللہ نے آدم کو اور نوح کو اور آل
ابراہیم کو اور آل عمران کو سارے عالم کے اوپر
منتخب کیا ہے۔ ۳۴۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد
ہیں۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔
۳۵۔ جب عمران کی بیوی نے کہا اے میرے
رب، میں نے نذر کیا تیرے لیے جو میرے پیٹ
میں ہے وہ آزاد رکھا جائے گا۔ پس تو مجھ سے
قبول کر بے شک تو سننے والا، جاننے والا ہے۔
۳۶۔ پھر جب اس نے جنا تو اس نے کہا اے
میرے رب، میں نے تو لڑکی کو جنا ہے اور اللہ
خوب جانتا ہے کہ اس نے کیا جنا ہے اور لڑکا
نہیں ہوتا لڑکی کی مانند۔ اور میں نے اس کا نام
مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو
شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔
۳۷۔ پس اس کے رب نے اس کو اچھی طرح
قبول کیا اور اس کو عمدہ طریقہ سے پروان چڑھایا
اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا۔ جب کبھی
زکریا ان کے پاس حجرہ میں آتا تو وہ وہاں رزق
پاتا۔ اس نے پوچھا اے مریم، یہ چیز تمھیں کہاں
سے ملتی ہے۔ مریم نے کہا یہ اللہ کے پاس سے
ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے
حساب رزق دے دیتا ہے۔ ۳۸۔ اس وقت
زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اس نے کہا اے
میرے رب، مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد
عطا کر، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔ ۳۹۔
پھر فرشتوں نے اس کو آواز دی جب کہ وہ حجرہ
میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی
خوش خبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے

بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا
وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ
رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ
وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ
مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً ؕ
قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ
اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ
بِالْعَشِىِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع وَاِذْ قَالَتِ ع ۴ ۱۱ ۱۲
الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ
وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ
اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ
الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ
نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ
يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

والا ہوگا اور سردار ہوگا اور اپنے نفس کو روکنے والا ہوگا اور نبی ہوگا نیکوں میں سے۔ ۴۰۔ زکریا نے کہا اے میرے رب، میرے یہاں لڑکا کس طرح ہوگا، حالاں کہ میں بوڑھا ہو چکا اور میری عورت بانجھ ہے۔ فرمایا اسی طرح اللہ کر دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ۴۱۔ زکریا نے کہا اے میرے رب، میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔ کہا تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکو گے، مگر اشارہ سے اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرتے رہو اور شام اور صبح اس کی تسبیح کرو۔ ۴۲۔ اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم، اللہ نے تم کو منتخب کیا اور تم کو پاک کیا اور تم کو دنیا بھر کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب کیا ہے۔ ۴۳۔ اے مریم، اپنے رب کی فرماں برداری کرو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ ۴۴۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کر رہے ہیں اور تم ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے اور نہ تم اس وقت ان کے پاس موجود تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

اللہ نے حضرت زکریا کو بڑھاپے میں اولاد دی، حضرت مریم کو حجرہ میں رزق پہنچایا، حضرت مسیح کو بغیر باپ کے پیدا کیا، آلِ ابراہیم میں ایسے صلحا پیدا کیے جن کو خدا کی پیغام بری کے لیے چنا جائے۔ اللہ نے اپنے ان بندوں کو یہ انعامات یوں ہی نہیں دیے بلکہ ان کو اس کا مستحق پا کر ایسا کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی اولاد سے معاشی توقعات قائم نہیں کیں، ان کی خوشی اس میں تھی کہ ان کی اولاد اللہ کی راہ میں سرگرم ہو۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے اندر اس تمنا کی پرورش کی کہ ان کی اولاد شیطان سے بچی رہے، وہ نیک بندوں کی جماعت میں شامل ہو جائے۔ کسی کے اندر بھلائی دیکھ کر وہ

حسد اور جلن میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کے نیک جذبات کے اثر سے ان کی اولاد بھی ایسی ہوئی جو دنیا کی زندگی میں اپنے نفس پر قابو رکھنے والی ہو، وہ اللہ کو یاد کرے۔ بدی اور نیکی کے درمیان وہ نیکی کے راستہ کو اختیار کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ اپنے رزقِ خاص سے کھلاتا پلاتا ہے اور ان کو اپنی خصوصی رحمت کے لیے قبول کر لیتا ہے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ
النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّ مِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ
وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۗ قَالَ كَذٰلِكِ
اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۗ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا
فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ
رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ
الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ
اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ
الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ
وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۗ اِنَّ فِيْ

۴۵۔ جب فرشتوں نے کہا اے مریم، اللہ تم کو خوش خبری دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت میں مرتبہ والا ہوگا اور اللہ کے مقرب بندوں میں ہوگا۔ ۴۶۔ وہ لوگوں سے باتیں کرے گا جب ماں کی گود میں ہوگا اور جب پوری عمر کا ہوگا۔ اور وہ صالحین میں سے ہوگا۔ ۴۷۔ مریم نے کہا اے میرے رب، مجھے کس طرح لڑکا ہوگا، جب کہ کسی مرد نے مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ ۴۸۔ اور اللہ اس کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائے گا۔ ۴۹۔ اور وہ رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف کہ میں تمھارے پاس تمھارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے لیے مٹی سے پرندہ کی مانند صورت بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں۔ اور میں اللہ کے حکم سے مُردے کو زندہ کرتا ہوں۔ اور میں تم کو بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہو۔ بے شک اس میں تمھارے

ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝٤٩ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝٥٠ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝٥١

لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ ۵۰۔ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے کی ہے اور میں اس لیے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمھارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کردی گئی ہیں۔ اور میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۵۱۔ بے شک اللہ میرا رب ہے اور تمھارا بھی۔ پس اس کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔

یہود کی نسل کو اللہ نے اس خاص منصب کے لیے چن لیا تھا کہ ان پر اپنی ہدایت اتارے تا کہ وہ خود اللہ کے راستے پر چلیں اور دوسروں کو اس سے آگاہ کریں۔ مگر بعد کے زمانے میں یہود کے اندر بگاڑ آ گیا۔ حتی کہ اللہ کی نظر میں وہ اس قابل نہ رہے کہ آسمانی ہدایت کے امین بن سکیں۔ اب اللہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ یہ امانت ان سے چھین کر آل ابراہیم کی دوسری شاخ (بنی اسماعیل) کو دے دی جائے۔ اس فیصلہ کے نفاذ سے پہلے یہود پر اتمام حجت ضروری تھا۔ حضرت مسیح اسی اتمام حجت کے لیے بھیجے گئے۔ آنجناب کی فوق العادت پیدائش اور آپ کو غیر معمولی معجزات کا دیا جانا اسی لیے تھا کہ یہود کو اس بارے میں کوئی شبہ نہ رہے کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں اور خدا کی طرف سے بول رہے ہیں۔ حضرت مسیح اپنے ساتھ نہ صرف فوق الفطری نشانیاں رکھتے تھے بلکہ وہ اتنے مؤثر اور مدلل انداز میں بولتے تھے کہ ان کے زمانہ میں کوئی اس طرح بولنے پر قادر نہ تھا۔ پہلی بار جب آپ نے یروشلم کے ہیکل میں تقریر کی تو آپ کے زمانے کے علما آپ کی باتوں کو سن کر دنگ رہ گئے (لوقا ۲:۴۸) یہ ان کی معجز نما شخصیت اور ان کے مبہوت کردینے والے کلام ہی کا اثر تھا کہ اگرچہ آپ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے مگر آپ کے سامنے کسی کو جرأت نہ ہوسکی کہ اس پہلو سے آپ کو مطعون کرے۔ تاہم وہ لوگ اتنے بے حس اور اتنے سرکش ہو چکے تھے کہ انتہائی کھلے کھلے دلائل سامنے آجانے کے باوجود انھوں نے آپ کو ماننے سے انکار کردیا۔ ''اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لیے'' — یعنی جو دلیل پیش کی جارہی ہے وہ بذات خود اگرچہ مکمل ہے مگر وہ اسی شخص کے لیے دلیل بنے گی جو ماننے کا مزاج رکھتا ہو۔ جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ اپنے خیالات کے کہر سے باہر آ کر دلیل پر غور کرے۔ جس کی فطرت اس حد تک زندہ ہو کہ ذاتی وقار کا سوال اس کے لیے حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ
اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ
وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾
الربع ع ۵ ۱۳/۱۳ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع
اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ
اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ
بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾
وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ
الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

۵۲۔ پھر جب عیسیٰ نے ان کا انکار دیکھا تو کہا کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں۔ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہیے کہ ہم فرماں بردار ہیں۔ ۵۳۔ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے اتارا، اور ہم نے رسول کی پیروی کی۔ پس تو لکھ لے ہم کو گواہی دینے والوں میں۔ ۵۴۔ اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ ۵۵۔ جب اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ، میں تم کو واپس لینے والا ہوں اور تم کو اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور جن لوگوں نے انکار کیا ہے ان سے تمھیں پاک کرنے والا ہوں اور جو تمھارے پیرو ہیں ان کو قیامت تک ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے۔ پھر میری طرف ہوگی سب کی واپسی۔ پس میں تمھارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن میں تم جھگڑتے تھے۔ ۵۶۔ پھر جو لوگ منکر ہوئے ان کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اور آخرت میں اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ ۵۷۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کو اللہ ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۵۸۔ یہ ہم تم کو سناتے ہیں اپنی آیتیں اور پُرحکمت مضامین۔

بنی اسرائیل کے بڑوں نے حضرت مسیح کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بڑوں کے ہاتھ میں ہر قسم کے وسائل ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ مذہب کی گدیوں پر قابض ہونے کی وجہ سے عوام کی نظر میں وہی مذہب کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ جس کو رد کر دیں، وہ نہ صرف وسائل حیات سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ حق کی خاطر سب کچھ کھونے کے بعد بھی لوگوں کی نظر میں بددین ہی بنا رہتا ہے۔ ایسے وقت میں داعیٔ حق کا ساتھ دینا

انتہائی مشکل کام ہے۔ یہ شبہات اور مخالفتوں کی عمومی فضا میں اس کی صداقت پر گواہ بننا ہے۔ یہ حق کی جانب اس وقت کھڑا ہونا ہے جب کہ حق تنہا رہ گیا ہو۔

حق جب اپنی بے آمیز صورت میں اٹھتا ہے تو وہ تمام لوگ اپنے اوپر اس کی زد پڑتی ہوئی محسوس کرتے ہیں جو اپنی خلافِ حق زندگی پر حق کا لیبل لگا کر لوگوں کے درمیان عزت کا مقام حاصل کیے ہوئے ہوں۔ وہ داعی کو زیر کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے شوشے نکال کر عوام کو اس کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اور بالآخر طاقت کے ذریعہ اس کو مٹا دینے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ مگر اللہ کی نصرت ہمیشہ داعی کے ساتھ ہوتی ہے، اس لیے کوئی مخالفت اس کی آواز کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ مخالفتوں کے علی الرغم وہ اپنے مشن کو مکمل کرتا ہے — جو لوگ دعوت حق کے مخالف بنیں وہ اللہ کی نظر میں فساد کرنے والے ہیں۔ کیوں کہ وہ لوگوں کو جنت کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔ اس سے بڑا کوئی فساد نہیں ہوسکتا کہ خدا کے بندوں کو خدائی جنت کی طرف جانے سے روکا جائے۔

حضرت مسیح یہودی قوم میں پیدا ہوئے مگر ان لوگوں نے آپ کی نبوت نہیں مانی۔ انھوں نے آنجناب کو ختم کرنے کے لیے آپ کے خلاف جھوٹا مقدمہ بنایا اور آپ کو فلسطین کی رومی عدالت میں لے گئے۔ عدالت سے آپ کو سولی پر چڑھانے کا فیصلہ ہوگیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان پر اٹھا لیا اور رومی سپاہیوں نے ایک اور آدمی کو آپ کا ہم شکل پا کر اسے سولی دے دی۔ اس جرم پر خدا نے یہ فیصلہ کر دیا کہ حضرت مسیح کو ماننے والی قوم قیامت تک یہودی قوم پر غالب رہے گی۔ اِن دونوں قوموں کے ساتھ یہ خدا کا دنیوی معاملہ ہے۔ آخرت کا معاملہ اس کے علاوہ ہے، جو خدا کی عام سنت کے تحت ہوگا۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ
خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾
الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٦٠﴾
فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ
وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ قف
ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى
الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ

۵۹۔ بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اللہ نے اس کو مٹی سے بنایا۔ پھر اس کو کہا کہ ہو جا، تو وہ ہو گیا۔ ۶۰۔ حق بات ہے تیرے رب کی طرف سے۔ پس تم نہ ہو شک کرنے والوں میں۔ ۶۱۔ پھر جو تم سے اس بارے میں حجت کرے بعد اس کے کہ تمھارے پاس علم آچکا ہے تو ان سے کہو کہ آؤ، ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمھارے بیٹوں کو، اپنی عورتوں کو اور تمھاری عورتوں کو۔ اور ہم اور تم خود بھی جمع ہوں۔ پھر ہم مل کر دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ ۶۲۔ بے شک یہ

الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع

سچا بیان ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۶۳۔ پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو اللہ مفسدوں کو جاننے والا ہے۔

مسیحی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت مسیح عام انسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کی پیدائش توالد وتناسل کے عام قاعدہ کے خلاف باپ کے واسطہ کے بغیر ہوئی۔ پھر آپ کو عام انسانوں کی طرح ایک انسان کیسے کہا جائے۔ آپ کا طریقِ پیدائش خود بتاتا ہے کہ وہ بشر سے ماوراتھے۔ وہ انسان کے بیٹے نہیں بلکہ خدا کے بیٹے تھے۔ کہا گیا کہ تمھارے سوال کا جواب انسان اول (آدم) کی تخلیق میں موجود ہے۔ تم خود یہ مانتے ہو کہ آدم سب سے پہلے بشر ہیں۔ وہ معروف طریقے کے مطابق مرد اور عورت کے تعلق سے وجود میں نہیں آئے۔ بلکہ براہِ راست خدا کے حکم کے تحت وجود میں آئے۔ پھر باپ کے بغیر پیدا ہونے کی بنا پر جب آدم خدا کے بیٹے نہیں ہیں تو اسی طرح باپ کے بغیر پیدا ہونے کی بنا پر مسیح کیسے خدا کے بیٹے ہو جائیں گے۔

نجران (یمن) نزول قرآن کے زمانہ میں مسیحی مذہب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ان کے علما اور پیشواؤں کا ایک وفد ۹ ھ میں مدینہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسیحی عقائد کے بارے میں بحث کی۔ آپ نے مختلف دلائل ان کے سامنے پیش کیے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ مسیح خدا کے بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ خدا ایک زندہ ہستی ہے، اس پر کبھی موت آنے والی نہیں۔ مگر عیسیٰ پر موت اور فنا آنے والی ہے (وَأَنَّ عِيسَىٰ يَأْتِي عَلَيْهِ الْفَنَاءُ) أسباب نزول القرآن للواحدي، صفحہ 97۔ آپ کے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا مگر وہ برابر کج بحثی کرتے رہے۔ جب آپ نے دیکھا کہ وہ دلیل سے ماننے والے نہیں ہیں تو آپؐ نے ان کو ایک آخری چیلنج دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اپنے کو برسرِ حق سمجھتے ہو تو مباہلہ (ایک دوسرے پر لعنت کی بددعا) کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اگلے دن صبح کو آپ باہر نکلے۔ آپؐ کے ساتھ آپ کے دونوں نواسے حسن اور حسین تھے۔ ان کے پیچھے حضرت فاطمہؓ اور ان کے پیچھے حضرت علیؓ۔ نجرانی عیسائی یہ دیکھ کر مرعوب ہو گئے اور باہم مشورہ کی مہلت مانگی۔ علیحدہ مشورہ میں ان کے ایک عالم نے کہا: تم جانتے ہو کہ اللہ نے بنی اسماعیل میں پیغمبر بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ بعید نہیں کہ یہ وہی پیغمبر ہوں۔ پھر ایک پیغمبر سے مباہلہ اور ملاعنہ کرنے کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ تمھارے چھوٹے اور بڑے سب ہلاک ہو جائیں اور نسلوں تک اس کا اثر باقی رہے۔ خدا کی قسم میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ دعا کریں تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں گے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بستیوں کی طرف روانہ ہو جائیں۔

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ
بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشۡرِكَ
بِهٖ شَیۡـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا
مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا
بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ لِمَ
تُحَآجُّوۡنَ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ
وَ الۡاِنۡجِیۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا
تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۵﴾ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِیۡمَا
لَکُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِیۡمَا لَیۡسَ لَکُمۡ
بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾
مَا کَانَ اِبۡرٰهِیۡمُ یَهُوۡدِیًّا وَّ لَا نَصۡرَانِیًّا وَّ لٰکِنۡ
کَانَ حَنِیۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ
الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ
لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَ هٰذَا النَّبِیُّ وَ الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا ؕ وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۸﴾ وَدَّتۡ
طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡکِتٰبِ لَوۡ یُضِلُّوۡنَکُمۡ ؕ
وَ مَا یُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَ مَا
یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۶۹﴾ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ لِمَ تَکۡفُرُوۡنَ
بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ اَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾ یٰۤاَهۡلَ
الۡکِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ
وَ تَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۱﴾ ع ۸ ۱۵

۶۴۔ کہو اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مسلّم ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ اس سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو، ہم فرماں بردار ہیں۔ ۶۵۔ اے اہل کتاب، تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔ حالاں کہ تورات اور انجیل تو اس کے بعد اتری ہیں۔ کیا تم اس کو نہیں سمجھتے۔ ۶۶۔ تم وہ لوگ ہو کہ تم اُس بات کے بارے میں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں کچھ علم تھا۔ اب تم ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں کوئی علم نہیں۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ۶۷۔ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی۔ بلکہ وہ حنیف مسلم تھا اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ ۶۸۔ لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو ہے جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ پیغمبر اور جو اس پر ایمان لائے۔ اور اللہ ایمان والوں کا ساتھی ہے۔ ۶۹۔ اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ وہ کسی طرح تم کو گمراہ کردے۔ حالاں کہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر خود اپنے آپ کو۔ مگر وہ اس کا احساس نہیں کرتے۔ ۷۰۔ اے اہل کتاب، تم اللہ کی نشانیوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالاں کہ تم گواہ ہو۔ ۷۱۔ اے اہل کتاب، تم کیوں صحیح میں غلط کو ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو۔ حالاں کہ تم جانتے ہو۔

توحید نہ صرف پیغمبروں کی اصل تعلیم ہے بلکہ تورات اور انجیل کے موجودہ غیر مستند نسخوں میں بھی وہ ایک مسلّم حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ اس مسلّمہ معیار پر جانچا جائے تو اسلام ہی کامل طور پر صحیح دین ثابت ہوتا ہے، نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے۔ صرف اسی کی عبادت کی جائے۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ کسی انسان کو وہ مقام نہ دیا جائے جو مالک کائنات کے لیے خاص ہے۔ یہ توحید اپنی خالص صورت میں صرف قرآن اور اسلام میں محفوظ ہے۔ دوسرے مذاہب نے نظری طور پر توحید کا اقرار کرتے ہوئے عملی طور پر وہ سب کچھ اختیار کر لیا جو توحید کے سراسر خلاف تھا۔ زبان سے خدا کو رب کہتے ہوئے انھوں نے اپنے نبیوں اور بزرگوں کو عملاً رب کا درجہ دے دیا۔

مکہ کے مشرکین اپنے مذہب کو ابراہیمی مذہب کہتے تھے۔ یہود و نصاریٰ بھی اپنی مذہبی تاریخ کو حضرت ابراہیم کے ساتھ جوڑتے تھے۔ ہر زمانہ کے لوگ اسی طرح اپنے نبیوں اور بزرگوں کے نام کو اپنی بدعات اور تحریفات کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد ان کا بنایا ہوا مذہب عوام کے ذہنوں پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ وہ اسی کو اصل مذہب سمجھنے لگتے ہیں۔ ان حالات میں جب سچے اور بے آمیز دین کی دعوت اٹھتی ہے تو اس کے مخالفین اس کو بے اعتبار ثابت کرنے کے لیے سب سے آسان طریقہ یہ سمجھتے ہیں کہ عوام میں یہ مشہور کر دیں کہ وہ اسلاف کے دین کے خلاف ہے۔ وہ شخص جو ''اسلاف'' کے دین کا حقیقی نمائندہ ہوتا ہے اس کو خود اسلاف ہی کے نام پر رد کر دیا جاتا ہے۔ یہ گویا حق کے اوپر باطل کا پردہ ڈالنا ہے۔ یعنی ایسی باتیں کہنا جو فی نفسہٖ بے حقیقت ہوں مگر عوام تجزیہ نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کو درست سمجھ لیں اور حق سے دور ہو جائیں۔ ''مسلم حنیف'' وہ ہے جو توحید کے راستہ پر یکسو ہو کر چلے اور غیر حنیف وہ ہے جو دائیں بائیں کی پگڈنڈیوں پر مڑ جائے۔ کوئی ایک ذیلی پہلو کو لے کر اتنا بڑھائے کہ اسی کو سب کچھ بنا دے۔ کوئی دوسرے ذیلی پہلو کو لے کر اس پر اتنے تشریحی اضافے کرے کہ وہی ساری حقیقت نظر آنے لگے۔ لوگ دین کے ذیلی پہلوؤں کو کُل دین سمجھ لیں اور توحید کی سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر کے راستوں میں دوڑنے لگیں۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا
بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ
النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ
یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ
دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ

۷۲۔ اور اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ مومنوں پر جو چیز اتاری گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دو، شاید کہ مومنین بھی اس سے پھر جائیں۔ ۷۳۔ اور یقین نہ کرو مگر صرف اس کا جو چلے تمھارے دین پر۔ کہو، ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے۔ اور یہ اسی کی دین ہے کہ کسی کو

يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ
عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ۙ
يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو
الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ
وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ
اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ
سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى
فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

وہی کچھ دے دیا جائے جو تم کو دیا گیا تھا۔ یا وہ تم سے تمھارے رب کے یہاں حجت کریں۔ کہو، بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑا وسعت والا ہے، علم والا ہے۔ ۷۴۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے۔ اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔ ۷۵۔ اور اہل کتاب میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس امانت کا ڈھیر رکھو تو وہ اس کو تمھیں ادا کر دے۔ اور ان میں کوئی ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار امانت رکھ دو تو وہ تم کو ادا نہ کرے، اِلّا یہ کہ تم اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ، یہ اس سبب سے کہ وہ کہتے ہیں کہ غیر اہل کتاب کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں۔ اور وہ اللہ کے اوپر جھوٹ لگاتے ہیں حالاں کہ وہ جانتے ہیں۔ ۷۶۔ بلکہ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور اللہ سے ڈرے تو بے شک اللہ ایسے متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔

ایک گروہ جس میں انبیا اور صلحا پیدا ہوئے ہوں، جس کے درمیان عرصہ تک دین کا چرچا رہے، اکثر وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ وہ اور حق دونوں ایک ہیں۔ وہ ہدایت کو ایک گروہی چیز سمجھ لیتا ہے، نہ کہ اصولی چیز۔ رسول اللہ کے زمانے میں اہلِ کتاب کا معاملہ یہی تھا۔ ان کا ذہن، تاریخی روایات کے اثر سے یہ بن گیا تھا کہ جو ہمارے گروہ میں ہے وہ ہدایت پر ہے اور جو ہمارے گروہ سے باہر ہے وہ ہدایت سے خالی ہے۔ جو لوگ حق کو اس طرح گروہی چیز سمجھ لیں وہ ایسی صداقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو ان کے گروہ کے باہر ظاہر ہوئی ہو۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ حق وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے، نہ کہ وہ جو کسی شخص یا گروہ کی طرف سے ملے۔ وہ اگرچہ دین خداوندی کا نام لیتے ہیں مگر ان کا دین حقیقۃً گروہ پرستی ہوتا ہے، نہ کہ خدا پرستی۔ ان کا یہ مزاج ان کی آنکھ پر ایسا پردہ ڈال دیتا ہے کہ اپنے گروہ سے باہر کسی کا فضل و کمال انھیں دکھائی نہیں دیتا۔ کھلے کھلے دلائل سامنے آنے کے بعد بھی وہ اس کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے حلقہ سے باہر اٹھنے والی دعوتِ حق کے شدید مخالف بن جاتے ہیں — دو عملی کا طریقہ اختیار کر کے وہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے بنیاد باتیں مشہور کر کے لوگوں کو اس کی صداقت کے بارے میں مشتبہ کرتے ہیں۔

شریعت خداوندی کے سراسر خلاف وہ اپنے لیے اس کو جائز کر لیتے ہیں کہ وہ اخلاق کے دو معیار بنائیں، ایک غیروں کے لیے، دوسرا اپنے گروہ کے لیے۔

کسی کو اپنے دین کی نمائندگی کے لیے قبول کرنا اللہ کی خصوصی رحمت ہے۔ اس کا فیصلہ گروہی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ یہ سعادت اس کو ملتی ہے جس کو اللہ اپنے علم کے مطابق پسند کرے۔ اور اللہ اس شخص کو پسند کرتا ہے جو اللہ کے ساتھ اپنے کو اس طرح وابستہ کر لے کہ وہ اس کا نگراں بن جائے جس سے وہ ڈرے، وہ اس کا آقا بن جائے جس کے ساتھ کیے ہوئے عہد اطاعت کو وہ کبھی نظر انداز نہ کر سکے — اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو امانت کو پورا کرنے والے ہوں اور عہد کے پابند ہوں۔ ایسے ہی لوگوں پر اللہ کی رحمتیں اترتی ہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ امانت کی ادائیگی کے معاملہ میں بے پروا ہوں اور عہد کو پورا کرنے میں حسّاس نہ رہیں وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہیں۔ ایسے لوگ اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں سے دور کر دیے جاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا

۷۷۔ جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچتے ہیں، ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت کے دن، اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۷۸۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی زبانوں کو کتاب میں موڑتے ہیں تاکہ تم اس کو کتاب میں سے سمجھو، حالاں کہ وہ کتاب میں سے نہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، حالاں کہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں۔ اور وہ جان کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ ۷۹۔ کسی انسان کا یہ کام نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکمت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم اللہ والے بنو، اس واسطے کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو۔ ۸۰۔ اور نہ وہ تمھیں یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں

الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع

اور پیغمبروں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، بعد اس کے کہ تم اسلام لا چکے ہو۔

ایک شخص جب ایمان لاتا ہے تو وہ اللہ سے اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری کرے گا اور بندوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گا جو خدا کی شریعت کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ایک پابند زندگی ہے جس کو عہد کی زندگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس زندگی پر قائم ہونے کے لیے نفس کی آزادیوں کو ختم کرنا پڑتا ہے، بار بار اپنے فائدوں اور مصلحتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس لیے اس عہد کی زندگی کو وہی شخص نباہ سکتا ہے جو نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر اس کو اختیار کرے۔ جس شخص کا حال یہ ہو کہ نفس پر چوٹ پڑے یا دنیا کا مفاد خطرہ میں نظر آئے تو وہ عہد خداوندی کو نظر انداز کر دے اور اپنے فائدوں اور مصلحتوں کی طرف جھک جائے، اس نے گویا آخرت کو دے کر دنیا خریدی۔ جب آخرت کے پہلو اور دنیا کے پہلو میں سے کسی ایک کو لینے کا سوال آیا تو اس نے دنیا کے پہلو کو ترجیح دی۔ جو شخص آخرت کو اتنی بے قیمت چیز سمجھ لے وہ آخرت میں اللہ کی عنایتوں کا حق دار کس طرح ہو سکتا ہے۔

جو لوگ آخرت کو اپنی دنیا کا سودا بنائیں وہ دین یا آخرت کے منکر نہیں ہو جاتے۔ بلکہ دین اور آخرت کے پورے اقرار کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ پھر ان دو متضاد رویوں کو وہ کس طرح ایک دوسرے کے مطابق بناتے ہیں۔ اس کا ذریعہ تحریف ہے، یعنی آسمانی تعلیمات کو خود ساختہ معنی پہنانا۔ ایسے لوگ اپنی دنیا پرستانہ روش کو آخرت پسندی اور خدا پرستی ثابت کرنے کے لیے دینی تعلیمات کو اپنے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ کبھی خدا کے الفاظ کو بدل کر اور کبھی خدا کے الفاظ کی اپنی مفید مطلب تشریح کر کے۔ وہ اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے کتاب الٰہی کو بدل دیتے ہیں تاکہ جو چیز کتاب الٰہی میں نہیں ہے اس کو عین کتاب الٰہی کی چیز بنا دیں، اپنی بے خدا زندگی کو باخدا زندگی ثابت کر دکھائیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بدترین جرم ہے کہ آدمی اللہ کی طرف ایسی بات منسوب کرے جو اللہ نے نہ کہی ہو۔

کسی تعلیم کی صداقت کی سادہ اور یقینی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملائے، لوگوں کے خوف و محبت کے جذبات کو بیدار کر کے اس کو اللہ کی طرف موڑ دے۔ اس کے برعکس، جو تعلیم شخصیت پرستی یا اور کوئی پرستی پیدا کرے، جو انسان کے نازک جذبات کا مرکز توجہ کسی غیر خدا کو بناتی ہو، اس کے متعلق سمجھنا چاہیے کہ وہ سراسر باطل ہے خواہ بظاہر اپنے اوپر اس نے حق کا لیبل کیوں نہ لگا رکھا ہو۔ قرآن کا مقصد انسان کے اندر ربّانی بصیرت کو زندہ کرنا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے جس کی ربانی بصیرت زندہ ہو جائے وہی دراصل قرآن کا قاری ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ
مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ
مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى
ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ
فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨١﴾
فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْفٰسِقُوْنَ ﴿٨٢﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ
اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ
كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ
وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ
وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ
رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ
لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ
دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا
كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ
حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ
عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

۸۱۔ اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جو
کچھ میں نے تم کو کتاب اور حکمت دی، پھر
تمھارے پاس پیغمبر آئے جو سچا ثابت کرے ان
پیشین گوئیوں کو جو تمھارے پاس ہیں تو تم اس پر
ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے کہا
کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔
انھوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا اب
گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔
۸۲۔ پس جو شخص اس کے بعد پھر جائے تو ایسے
ہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۸۳۔ کیا یہ لوگ اللہ کے
دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ
اسی کے فرماں بردار ہیں جو آسمانوں اور زمین میں
ہیں، خوشی سے یا ناخوشی سے، اور سب اسی کی طرف
لوٹائے جائیں گے۔ ۸۴۔ کہو ہم اللہ پر ایمان
لائے اور اس پر جو ہمارے اوپر اتارا گیا اور جو اتارا
گیا ابراہیم پر اسمٰعیل پر اسحاق پر اور یعقوب پر اور
اولادِ یعقوب پر۔ اور جو دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ اور
دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم
ان کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور ہم اسی کے
فرماں بردار ہیں۔ ۸۵۔ اور جو شخص اسلام کے سوا
کسی دوسرے دین کو چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز
قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں
سے ہوگا۔ ۸۶۔ اللہ کیوں کر ایسے لوگوں کو ہدایت
دے گا جو ایمان لانے کے بعد منکر ہوگئے۔
حالاں کہ وہ گواہی دے چکے کہ یہ رسول برحق ہے
اور ان کے پاس روشن نشانیاں آچکی ہیں۔ اور اللہ
ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ۸۷۔ ایسے لوگوں کی
سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ
تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا ۚ فَإِنَّ اللَّهَ
غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ
إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ
تَوْبَتُهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ
مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ
افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ
ع ۹ ۱۱ ۱۷ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٩١﴾ ع

سارے انسانوں کی لعنت ہوگی۔ ۸۸۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ ۸۹۔ البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۹۰۔ بے شک جو لوگ ایمان لانے کے بعد منکر ہوگئے پھر وہ کفر میں بڑھتے رہے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔ ۹۱۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور انکار کی حالت میں مر گئے، اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ میں دیں تو قبول نہ کیا جائے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اللہ کو پانا ایک ابدی حقیقت کو پانا ہے، یہ پوری کائنات کا ہم سفر بننا ہے۔ اطاعتِ الٰہی پوری کائنات کا دین ہے، انسان کا بھی اور دوسری موجودات کا بھی۔ فرق یہ ہے کہ دوسری موجودات سے تسخیری (جبری) اطاعت مطلوب ہے، اور انسان سے اختیارانہ اطاعت (submission by choice)۔ یعنی جس اصول کی پیروی حیوان جبلت (instinct) کے تحت مجبورانہ طور پر کر رہے ہیں، اس دین کی پیروی انسان کو اختیارانہ طور پر کرنا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ اسلام کا مطلب دراصل آزادانہ فیصلے کے تحت دینِ فطرت کی پیروی کرنا ہے یعنی اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کا پابند بنانا۔

جو لوگ دریافت کی سطح پر اللہ کو پالیں وہ ہر قسم کے تعصّبات سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ حق کو ہر حال میں پہچان لیتے ہیں، چاہے اس کا پیغام ''اسرائیلی پیغمبر'' کی زبان سے بلند ہو یا ''اسماعیلی پیغمبر'' کی زبان سے۔ مگر جو لوگ گروہ پرستی کی سطح پر جی رہے ہوں، حق ان کو حق کی صورت میں صرف اس وقت نظر آتا ہے جب کہ وہ ان کے اپنے گروہ کے کسی فرد کی طرف سے آئے۔ اللہ اگر ان کے گروہ سے باہر کسی شخص کو اپنے پیغام کی پیغام رسانی کے لیے اٹھائے تو ایسا پیغام ان کے ذہن کا جزء نہیں بنتا۔ حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ ان کا دل اس کے حق وصداقت ہونے کی گواہی دے رہا ہو۔ ایسے لوگ خواہ اپنے کو ماننے والوں میں شمار کریں مگر اللہ کے یہاں ان کا نام نہ ماننے والوں میں لکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے حق کو اپنے گروہ کی نسبت سے جانا، نہ کہ اللہ کی نسبت سے۔ ایسے حق کا اقرار نہ کرنا جس کے حق ہونے پر آدمی کے دل نے گواہی دی ہو، اللہ کے نزدیک بدترین جرم ہے۔ ایسے لوگ آخرت میں اتنے ذلیل ہوں گے کہ اللہ اور اس کی تمام مخلوقات ان پر لعنت کریں گی۔

اپنے سے باہر ظاہر ہونے والے حق کا اعتراف نہ کرنا بظاہر اپنے ایمان کو بچانا ہے۔ مگر حقیقۃً یہ اپنے ایمان

کو برباد کرنا ہے۔ اللہ کا مومن بندہ اللہ کے مسلسل فیضان پر جیتا ہے۔ پھر جو شخص اپنے کو خود پرستی اور گروہ پرستی کے خول میں بند کر لے اس کے اندر اللہ کا فیضان کس راستہ سے داخل ہوگا۔ اور اللہ کے فیضان سے محرومی کے بعد وہ کیا چیز ہوگی جو اس کے ایمان کی پرورش کرے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ۚ
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾
كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا
مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ
اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ
فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ
اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ
وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ
اِبْرٰهِيْمَ ڬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَي
النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ
سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ڰ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ
شُهَدَاۗءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

☆ ۹۲۔ تم ہرگز نیکی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو۔ اور جو چیز بھی تم خرچ کروگے اس سے اللہ باخبر ہے۔ ۹۳۔ سب کھانے کی چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں بجز اس کے جو اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا قبل اس کے کہ تورات اترے۔ کہو کہ تورات لاؤ اور اس کو پڑھو، اگر تم سچے ہو۔ ۹۴۔ اس کے بعد بھی جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں وہی ظالم ہیں۔ ۹۵۔ کہو، اللہ نے سچ کہا۔ اب ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو حنیف تھا اور وہ شرک کرنے والا نہ تھا۔ ۹۶۔ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہان کے لیے ہدایت کا مرکز۔ ۹۷۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے، جو اس میں داخل ہوجائے وہ مامون ہے۔ اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی منکر ہوا تو اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔ ۹۸۔ کہو اے اہل کتاب، تم کیوں اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہو۔ حالاں کہ اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۹۹۔ کہو، اے اہل کتاب، تم ایمان لانے والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو۔ تم اس میں عیب ڈھونڈتے ہو۔ حالاں کہ تم گواہ بنائے گئے ہو۔ اور اللہ تمھارے کاموں سے بے خبر نہیں۔

قدیم آسمانی کتب کو ماننے والے علما نے بطورِ خود جو فقہ بنا رکھی تھی اس میں اونٹ اور خرگوش کا گوشت کھانا حرام تھا، جب کہ اسلام میں وہ جائز تھا۔ اب وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ اسلام اگر خدا کا اترا ہوا دین ہے تو اس میں بھی حرام وحلال کے مسائل وہی کیوں نہیں ہیں جو پچھلے زمانہ میں اتارے ہوئے خدا کے دین میں تھے۔ اسی طرح وہ کہتے کہ بیت المقدس اب تک تمام انبیاء کا قبلۂ عبادت رہا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا ایسا دین اتارے جس میں اس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا ہو۔

حق کی دعوت جب اپنی خالص شکل میں اٹھتی ہے تو ان لوگوں پر اس کی زد پڑنے لگتی ہے جو خدا کے دین کے نام پر اپنا ایک عوامی دین رائج کیے ہوئے ہوں۔ ایسے لوگ اس کے مخالف ہوجاتے ہیں اور لوگوں کو دعوتِ حق سے پھیرنے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات نکالتے ہیں۔ ان کے خودساختہ دین میں اساسات دین پر زور باقی نہیں رہتا۔ اس کے بجائے جزئیاتِ دین میں موشگافیوں سے دین داری کا ایک ظاہری ڈھانچہ بن جاتا ہے۔ آدمی کی حقیقی زندگی کیسی ہی ہو، نیکی اور تقویٰ کا کمال یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ وہ اس ظاہری ڈھانچہ کا خوب اہتمام کرے۔ وہ ''خرگوش'' کو یہ کہہ کر نہ کھائے کہ ہمارے اکابر اس سے پرہیز کرتے تھے۔ دوسری طرف کتنی ہی حرام چیزوں کو اپنے لیے جائز کیے ہوئے ہو۔ وہ ''بیت المقدس'' کی طرف رخ کرنے میں قطب نما کی سوئی کی طرح سیدھا ہوجانا ضروری سمجھتا ہو۔ مگر صبح وشام کی سرگرمیوں کو خدا رخی بنانے سے اس کو دل چسپی نہ ہو۔ مگر نیکی کا درجہ کسی کو قربانی سے ملتا ہے، نہ کہ سستی ظاہرداریوں سے۔ خدا کا نیک بندہ وہ ہے جو اپنی محبت کا ہدیہ اپنے رب کو پیش کرے، جس کے لیے اللہ کے مقابلے میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ رہے۔ حق کو ماننے کے لیے جب وقار کی قیمت دینی ہو، اللہ کے راستہ میں بڑھنے کے لیے جب مال خرچ کرنا ہو اور بچوں کے مستقبل کو خطرہ میں ڈالنا پڑے، اس وقت وہ اللہ کی خاطر سب کچھ گوارا کرلے۔ ایسے نازک مواقع پر جو شخص اپنی محبوب چیزوں کو دے کر اللہ کو لے لے وہی نیک اور خدا پرست بنا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ﴿١٠٠﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٠١﴾ ع يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ

۱۰۰۔ اے ایمان والو، اگر تم اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مان لوگے تو وہ تم کو ایمان کے بعد پھر منکر بنا دیں گے۔ ۱۰۱۔ اور تم کس طرح انکار کرو گے، حالاں کہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جارہی ہیں اور تمھارے درمیان اس کا رسول موجود ہے۔ اور جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو وہ پہنچ گیا سیدھی راہ پر۔ ۱۰۲۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنا چاہیے۔ اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ ۱۰۳۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ

جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔ اور اللہ کا یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پس تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے تو اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم راہ پاؤ۔

دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ شیطان آدمی کے ایمان کو اچک لے جائے اور فرشتے اس کی روح اس حال میں قبض کریں کہ وہ ایمان سے خالی ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی ہر وقت باہوش رہے، وہ اپنے آپ پر نگراں بن جائے۔ ایمان سے دور ہونے کی ایک صورت وہ ہے جب کہ دین کے اجزاء میں تبدیلی کرکے اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنا دیا جائے۔ دین کی اصل رسّی تقویٰ ہے۔ یعنی اللہ سے ڈرنا اور مرتے دم تک اپنے ہر معاملہ میں وہی رویہ اختیار کرنا جو اللہ کے سامنے جواب دہی کے تصور سے بنتا ہو۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس سے انحراف یہ ہے کہ ''تقویٰ'' کے بجائے، کسی اور چیز کو مدارِ دین سمجھ لیا جائے اور اس پر اس طرح زور دیا جائے جس طرح خوف خدا اور فکر آخرت پر دیا جاتا ہے۔ جب بھی دین میں اس قسم کی تبدیلی کی جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملّت کے درمیان اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ کوئی ایک ضمنی چیز پر زور دیتا ہے تو کوئی دوسری ضمنی چیز پر، اور اس طرح ملت فرقے فرقے میں بٹ کر رہ جاتی ہے۔ اول الذکر سے ایک اللہ توجہ کا مرکز بنتا ہے اور ثانی الذکر سے متفرق مسائل توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ جب دین میں سارا زور و تاکید تقویٰ (اللہ سے ڈرنے) پر دیا جائے تو اس سے باہمی اتفاق وجود میں آتا ہے اور جب اس کے سوا دوسری چیزوں پر زور دیا جانے لگے تو اس سے باہمی اختلاف کی وہ برائی پیدا ہوتی ہے جو لوگوں کو جہنم کے کنارے پہنچا دیتی ہے۔ کسی گروہ کے اندر اختلاف دنیا میں بھی عذاب ہے اور آخرت میں بھی عذاب۔

اسلام سے پہلے مدینہ میں دو قبیلے تھے — اوس اور خزرج۔ یہ دونوں عرب قبیلے تھے مگر وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ان باہمی لڑائیوں نے ان کو کمزور کر دیا تھا۔ جب وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے تو ان کی لڑائیاں ختم ہوگئیں، وہ بھائی بھائی کی طرح مل کر رہنے لگے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر اسلام میں ہر آدمی اپنا وفادار رہتا ہے اور اسلام میں صرف ایک اللہ کا۔ جس سماج میں لوگ اپنے یا اپنے گروہ کے وفادار ہوں وہاں قدرتی طور پر کئی وفاداریاں وجود میں آتی ہیں۔ اور کئی وفاداریوں کے عملی نتیجہ ہی کا نام اختلاف اور ٹکراؤ ہے۔ اس کے برعکس، جس معاشرہ میں تمام لوگ ایک خدا کے وفادار بن جائیں وہاں سب کا رخ ایک مرکز کی طرف ہوجاتا ہے، سب ایک رسّی سے بندھ جاتے ہیں۔ اِس طرح باہمی اختلاف اور ٹکراؤ کے اسباب اپنے آپ ختم ہوجاتے ہیں۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ
وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا
تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ
بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ
تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ
وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ
بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾
وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى
اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع

۱۰۴۔ اور ضرور ہے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیکی کی طرف بلائے، وہ بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔
۱۰۵۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور باہم اختلاف کرلیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح احکام آچکے تھے۔ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ ۱۰۶۔ جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے کالے ہوں گے، تو جن کے چہرے کالے ہوں گے ان سے کہا جائے گا کیا تم اپنے ایمان کے بعد منکر ہو گئے، تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کے سبب سے۔
۱۰۷۔ اور جن کے چہرے روشن ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۰۸۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم نہیں چاہتا۔ ۱۰۹۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ کے لیے ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

"تم میں ایک گروہ ہو جو دعوت الی الخیر کا کام کرے اور نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے" یہ ارشاد بیک وقت دو باتوں کو بتا رہا ہے۔ ایک کا تعلق خواص سے ہے اور دوسرے کا تعلق عوام سے۔ امت کے خواص کے اندر یہ روح ہونی چاہیے کہ وہ امت کے اندر برائی کو برداشت نہ کریں، وہ نیکی اور بھلائی کے لیے تڑپنے والے ہوں۔ ان کا یہ جذبۂ اصلاح انھیں مجبور کرے گا کہ وہ لوگوں کے احوال سے غیر متعلق نہ رہیں، وہ اپنے بھائیوں کو نیکی کی راہ پر چلنے کے لیے اکسائیں اور انھیں برائی سے دور رہنے کی تلقین کریں۔

تاہم اس عمل کی کامیابی کے لیے امت کے عوام کے اندر اطاعت کا جذبہ ہونا بھی لازماً ضروری ہے۔ عوام کو چاہیے کہ وہ اپنے خواص کا احترام کریں۔ وہ ان کے کہنے سے چلیں اور جہاں وہ روکیں وہاں وہ رک جائیں۔ وہ اپنے آپ کو اپنے دینی ذمہ داروں کے حوالے کردیں۔ جس مسلم گروہ میں خواص اور عوام کا یہ حال ہو وہی فلاح پانے والا گروہ ہے۔ سمع وطاعت کی اس فضا ہی میں کسی معاشرہ کے اندر وہ اوصاف جنم لیتے ہیں جو

اس کو دنیا میں طاقت ور اور آخرت میں نجات یافتہ بناتے ہیں۔

خواص کے اندر اس روح کے زندہ ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ ان کی ساری توجہ خیر، بالفاظ دیگر اساسات دین پر مرتکز رہتی ہے۔ فرعی اور جزئی مسائل میں موشگافیاں کرنے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ جو لوگ خدا کی عظمتوں کے نقیب بنیں اور آخرت کے منذر اور مبشر بن کر اٹھیں ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ ظاہری مسائل کی جزئیات میں اپنی مہارت دکھائیں۔ اس کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انھیں حقیقی مسائل کی اصلاح میں لگا دیتا ہے۔ فرضی اور قیاسی مسائل میں ذہنی ورزش کرنا انھیں اسی طرح بے معنی اور بے فائدہ معلوم ہونے لگتا ہے جس طرح ایک کسان کو شطرنج کا کھیل۔

عوام کو اس نظام اطاعت پر اپنے کو راضی کرنے کا یہ فائدہ ملتا ہے کہ وہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹنے سے بچ جاتے ہیں۔ ایک حکم کے تحت چلنے کے نتیجے میں سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اتحاد و اتفاق ان کی عام صفت بن جاتی ہے اور بلاشبہ اتحاد و اتفاق سے زیادہ بڑی طاقت اس دنیا میں کوئی نہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿١١٠﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١١١﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾

۱۱۰۔ اب تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ ایمان والے ہیں اور ان میں اکثر نافرمان ہیں۔ ۱۱۱۔ وہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے مگر کچھ ستانا۔ اور اگر وہ تم سے مقابلہ کریں گے تو تم کو پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ان کو مدد بھی نہ پہنچے گی۔ ۱۱۲۔ اور ان پر مسلط کردی گئی ذلت، خواہ وہ کہیں بھی پائے جائیں، سوا اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان پر مسلط کردی گئی پستی۔ یہ اس واسطے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے رہے اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ اس سبب سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے نکل جاتے تھے۔

یہود دین خداوندی کے حامل بنائے گئے تھے۔ مگر وہ اس کو لے کر کھڑے نہ ہو سکے اور اس کو محفوظ رکھنے میں بھی ناکام رہے۔ اس کے بعد اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنا دین اس کی صحیح صورت میں بھیجا۔ اب امت مسلمہ لوگوں کے درمیان خدا کی رہنمائی کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ اس منصب کا تقاضا ہے کہ یہ امت اللہ کی سچی مومن بنے۔ وہ دنیا کو بھلائی کی تلقین کرے اور ان چیزوں سے باخبر کرے جو اللہ کے نزدیک برائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کام چونکہ خدائی کام ہے اس لیے خدا نے اس کے ساتھ اپنا تحفظاتی نظام بھی شامل کر دیا ہے۔ جو لوگ اس کارِ خداوندی کے لیے اٹھیں گے ان کے لیے خدا کی ضمانت ہے کہ ان کے مخالفین ان کو معمولی اذیتوں کے سوا کوئی حقیقی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ تاہم یہود کے انجام کی صورت میں اس کی بھی دائمی مثال قائم کر دی گئی کہ اس منصب حق پر سرفراز کیے جانے کے بعد جو لوگ بدعہدی کریں ان کی سزا اسی دنیا میں اس طرح شروع ہو جاتی ہے کہ ان کو ذاتی عزت و سرفرازی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ خدا کی رحمتوں سے محرومی کی وجہ سے ان کی بے حسی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو ان کی کوتاہیوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اٹھیں۔

"یہود پر ذلّت مسلط کر دی گئی اِلّا یہ کہ انھیں اللہ کی یا بندوں کی امان حاصل ہو"۔ یہ اللہ کی ایک خصوصی سنت ہے جس کا تعلق اس قوم سے ہے جس کو خدا نے اپنے دین کا نمائندہ بنایا ہو۔ دین کی سچی نمائندگی ایسی قوم کے لیے غلبہ کی ضمانت ہوتی ہے۔ اور دین کی سچی نمائندگی سے ہٹنا اس کو موجودہ دنیا میں مغلوب کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسی قوم اگر دین خدا کی نمائندگی سے ہٹ جائے تو موجودہ دنیا میں کبھی وہ ذاتی غلبہ حاصل نہیں کر سکتی۔ کسی درجہ میں اگر کبھی اس کو اختیار مل جائے تو وہ اپنے علاوہ کسی دوسرے کے بل پر ہوگا۔ یا تو اس لیے کہ اس کو کسی خدائی حکومت کی طرف سے امان دیا گیا ہے یا اس لیے کہ کسی غیر قوم کی حکومت نے اس کو اپنی حمایت و سرپرستی میں لے لیا ہے۔

کوئی قوم ذلّت کی اس سزا کی مستحق اس وقت بنتی ہے جب کہ اس کا یہ حال ہو جائے کہ وہ خدائی نشانیوں کا انکار کرنے لگے۔ نشانیوں کا انکار سچے دلائل کا انکار ہے۔ حق ہمیشہ دلائل کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے جو شخص سچی دلیل کا انکار کرتا ہے، وہ خود خدا کا انکار کر رہا ہے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿١١٣﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ

۱۱۳۔ سب اہل کتاب یکساں نہیں۔ ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے۔ وہ راتوں کو اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔ ۱۱۴۔ وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں۔ اور برائی سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں۔ یہ صالح لوگ

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ
يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ
اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا
يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ
رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ
اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

ہیں۔ ۱۱۵۔ جو نیکی بھی وہ کریں گے اس کی ناقدری
نہ کی جائے گی اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا
ہے۔ ۱۱۶۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا تو
اللہ کے مقابلہ میں ان کے مال اور اولاد ان کے
کچھ کام نہ آئیں گے۔ اور وہ لوگ دوزخ والے
ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۱۷۔ وہ اس دنیا
کی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کی
مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان
لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا
ہے پھر وہ اس کو برباد کردے۔ اللہ نے ان پر ظلم
نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

نیکیوں میں سبقت (مُسَارَعَةٌ فِي الْخَيْرَاتِ) سے مراد اس آیت میں مومنین اہلِ کتاب کا یہ عمل ہے کہ نبی آخر الزماں کی زبان سے جب خدائی سچائی کا اعلان ہوا تو انھوں نے فوراً اس کو پہچان لیا اور اس کی طرف عاجزانہ دوڑ پڑے۔ اس وقت ایک طرف دین موسیٰ تھا جو تاریخی عظمت اور روایتی تقدس کے زور پر قائم تھا۔ دوسری طرف دین محمد تھا جس کی پشت پر ابھی تک صرف دلیل کی طاقت تھی، تاریخی عظمت اور روایاتی تقدس کا وزن ابھی تک اس کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ اپنے دین اور وقت کے نبی کے دین میں یہ فرق وقت کے نبی کے دین کو ماننے میں زبردست رکاوٹ تھا۔ مگر وہ اس رکاوٹ کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے اور بڑھ کر وقت کے نبی کے دین کو مان لیا۔

مال واولاد کی محبت آدمی کو قربانی والے دین پر آنے نہیں دیتی۔ البتہ نمائشی قسم کے اعمال کا مظاہرہ کرکے وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے دین پر قائم ہے۔ مگر جس طرح سخت ٹھنڈی ہوا اچانک پوری کھیتی کو برباد کردیتی ہے، اسی طرح قیامت کا طوفان ان کے نمائشی اعمال کو بے قیمت کرکے رکھ دے گا — یہود میں صرف چند لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ''امت قائمہ'' کی حیثیت سے ان کا مستقل ذکر کرنا ظاہر کرتا ہے کہ چند آدمی اگر اللہ سے ڈرنے والے ہوں تو وہ بھیڑ کے مقابلہ میں اللہ کی نظر میں زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

نجات کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ کسی پیغمبر کے نام پر جو نسلی امت بن گئی ہے، آدمی اس امت میں شامل رہے۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ وہ عہد کا پابند بنے۔ عہد سے مراد ایمان ہے۔ ایمان بندے اور خدا کے درمیان ایک عہد ہے۔ ایمان لاکر بندہ اپنے آپ کو اس کا پابند کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح

اللہ کا وفادار اور اطاعت گزار بنائے گا۔ بالفاظ دیگر، گروہی نسبت نہیں بلکہ ذاتی عمل وہ چیز ہے جو کسی آدمی کو خدا کی رحمت اور بخشش کا مستحق بناتی ہے۔

اس عہد میں تمام ایمانی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ تنہائیوں میں اللہ کی یاد، اللہ کی عبادت گزاری، آخرت کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنا، اپنے آس پاس جو افراد ہوں ان کو بھلائی پر لانے کی کوشش کرنا، جو افراد برائی کا ارتکاب کریں ان کو برائی سے ہٹانے میں پورا زور لگا دینا، خدا کی پسند کے کاموں میں دوڑ کر حصہ لینا۔ جو لوگ ایسا کریں وہی عہد ربانی پر پورے اترے۔ وہ خدا کے مقبول بندے ہیں۔ ان کا عمل خدا کے علم میں ہے، وہ ان کو ان کے عمل کا بدلہ دے گا اور فیصلہ کے دن ان کی پوری قدردانی فرمائے گا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا۟ مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ ٱلْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَٰهِهِمْ وَمَا تُخْفِى صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ ٱلْءَايَٰتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١١٨﴾ هَٰٓأَنتُمْ أُو۟لَآءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِٱلْكِتَٰبِ كُلِّهِۦ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَوْا۟ عَضُّوا۟ عَلَيْكُمُ ٱلْأَنَامِلَ مِنَ ٱلْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا۟ بِغَيْظِكُمْ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ ٱلصُّدُورِ ﴿١١٩﴾ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا۟ بِهَا وَإِن تَصْبِرُوا۟ وَتَتَّقُوا۟ لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿١٢٠﴾ ع ۱۲

۱۱۸۔ اے ایمان والو، اپنے غیر کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ ان کو خوشی ہوتی ہے تم جس قدر تکلیف پاؤ۔ ان کی عداوت ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے، ہم نے تمھارے لیے نشانیاں کھول کر ظاہر کردی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔ ۱۱۹۔ تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ حالاں کہ تم سب آسمانی کتابوں کو مانتے ہو۔ اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہو، تم اپنے غصہ میں مرجاؤ۔ بے شک اللہ دلوں کی بات کو جانتا ہے۔ ۱۲۰۔ اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو ان کو رنج ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ جو کچھ وہ کررہے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے۔

مسلمان اسی خدائی دین پر ایمان لائے تھے جو سابق اہل کتاب (یہود) کو اپنے نبیوں کے ذریعہ ملا تھا۔ دونوں کا دین اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک تھا۔ مگر یہود مسلمانوں کے اس قدر دشمن ہو گئے کہ مسلمان اپنی ساری خصوصیات کے باوجود ان کے نزدیک ایک کلمۂ خیر کے بھی حق دار نہ تھے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کو اگر کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوتے۔ گویا وہ ان کو انسانی ہمدردی کا مستحق بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود نے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف منسوب کرکے ایک خود ساختہ دین بنا رکھا تھا اور اس کے بل پر عوام میں قیادت کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے۔ خدا کے دین میں ساری توجہ خدا کی طرف رہتی ہے۔ جب کہ خود ساختہ دین میں لوگوں کی توجہ ان افراد کی طرف لگ جاتی ہے جو اس خود ساختہ دین کے خالق اور شارح ہوں۔ ایسے لوگ سچے دین کی دعوت کو کبھی گوارا نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کو نظر آتا ہے کہ وہ ان کو ان کے مقام عظمت سے ہٹا رہی ہے۔ جب ایسی صورت پیش آئے تو اللہ کے سچے بندوں کا کام یہ ہے کہ وہ منفی ردعمل سے بچیں اور مکمل طور پر صبر و تقویٰ پر قائم رہیں۔ صبر کا مطلب ہے ہر حال میں اپنے آپ کو حق کا پابند رکھنا، اور تقویٰ یہ ہے کہ فیصلہ کن طاقت صرف اللہ کو سمجھا جائے، نہ کہ کسی اور کو۔ مسلمان اگر اس قسم کے مثبت رویہ کا ثبوت دیں تو کسی کی دشمنی ان کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچائے گی خواہ دشمن مقدار میں کتنے ہی زیادہ ہوں۔ تاہم اس کے ساتھ مسلمانوں کو حقیقت پسند بھی بننا چاہیے۔ ان کو اپنے دوست اور دشمن کے درمیان تمیز کرنا چاہیے تاکہ کوئی ان کی صاف دلی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔

مسلمانوں کے دل میں یہود کے لیے محبت ہونا اور یہود کے دل میں مسلمانوں کے لیے محبت نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ دونوں میں سے کون حق پر ہے، اور کون ناحق پر۔ اللہ سراپا رحم اور عدل ہے۔ وہ تمام انسانوں کا خالق و مالک ہے۔ اس لیے جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو پالیتا ہے اس کا سینہ تمام خدا کے بندوں کے لیے کھل جاتا ہے۔ اس کے لیے تمام انسان یکساں طور پر اللہ کی عیال بن جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کے لیے وہی چاہنے لگتا ہے، جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ مگر جو لوگ اللہ کو حقیقی طور پر پائے ہوئے نہ ہوں جنھوں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں نہ ملایا ہو وہ صرف اپنی ذات کی سطح پر جیتے ہیں۔ ان کا سرمایۂ حیات اپنے فائدے اور اپنے گروہی تعصّبات ہوتے ہیں۔ ان کا یہ مزاج ان کو ایسے لوگوں کا دشمن بنا دیتا ہے جو ان کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آئیں، جو ان کے اپنے گروہ میں شامل نہ ہوں۔ خدا کو مانتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ یہاں کسی کی کوئی تدبیر اللہ کی مشیّت کے بغیر مؤثر نہیں ہوسکتی۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ

۱۲۱۔ جب تم صبح کو اپنے گھر سے نکلے اور مسلمانوں کو جنگ کے مقامات پر متعین کیا اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۱۲۲۔ جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ

وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ
رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ ؕ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا
وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ
ثلٰثة بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ
مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ
قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ ۙ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا
خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ
اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي
الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ
ع ۱۳ ۹ ۴ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا۔ اور اللہ ہی پر چاہیے کہ مومنین بھروسہ کریں۔ ۱۲۳۔ اور اللہ تمھاری مدد کر چکا ہے بدر میں جب کہ تم کمزور تھے۔ پس اللہ سے ڈرو تا کہ تم شکر گزار رہو۔ ۱۲۴۔ جب تم مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لیے کافی نہیں کہ تمھارا رب تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے۔ ۱۲۵۔ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو اور دشمن تمھارے اوپر یک دم آپہنچے تو تمھارا رب پانچ ہزار نشان کیے ہوئے فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔ ۱۲۶۔ اور یہ اللہ نے اس لیے کیا تا کہ تمھارے لیے خوش خبری ہو اور تمھارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں اور مدد صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۱۲۷۔ تا کہ اللہ منکروں کے ایک حصہ کو کاٹ دے یا ان کو ذلیل کر دے کہ وہ ناکام لوٹ جائیں۔ ۱۲۸۔ تم کو اس امر میں کوئی دخل نہیں۔ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا ان کو عذاب دے، کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔ ۱۲۹۔ اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ غفور اور رحیم ہے۔

یہ آیتیں جنگ احد (۳ھ) کے بعد نازل ہوئیں۔ احد کی جنگ میں دشمنوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک ہزار آدمی مقابلہ کے لیے نکلے تھے۔ مگر راستہ میں عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ اس واقعہ سے کچھ انصاری مسلمانوں میں پست ہمتی پیدا ہوئی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد دلایا کہ ہم اپنے بھروسہ پر نہیں بلکہ اللہ کے بھروسہ پر نکلے ہیں تو اللہ نے اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ان مسلمانوں کے سینے کھول دیے۔ مومن کے اندر اگر حالات کی شدت سے وقتی کمزوری پیدا

ہوجائے تو ایسے وقت میں اللہ اس کو تنہا چھوڑ نہیں دیتا بلکہ اس کا مددگار بن کر دوبارہ اس کو ایمان کی حالت پر جما دیتا ہے۔ اللہ کی یہی مدد اجتماعی سطح پر اس طرح ہوئی کہ احد کی لڑائی میں مسلمانوں کی ایک کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دشمن ان کے اوپر غالب آگئے اب دشمن فوج کے لیے پورا موقع تھا کہ وہ شکست کے بعد مسلمانوں کی طاقت کو پوری طرح کچل ڈالے۔ مگر فوجی تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ دشمن فوج فتح کے باوجود میدان جنگ کو چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ یہ اللہ کی خصوصی مدد تھی کہ اس نے دشمن کے رخ کو ''مدینہ'' کے بجائے ''مکہ'' کی طرف موڑ دیا۔ حتی کہ جو مغلوب تھے انھوں نے غالب آنے والوں کا پیچھا کیا۔

مومن کا مزاج یہ ہونا چاہیے کہ وہ تعداد یا اسباب کی کمی سے نہ گھبرائے۔ تعداد کم ہو تو یقین کرے کہ اللہ اپنے فرشتوں کو بھیج کر بھی تعداد کی کمی پوری کردے گا۔ سامان کم ہو تو وہ بھروسہ رکھے کہ اللہ اپنی طرف سے ایسی صورتیں پیدا کرے گا جو اس کے لیے سامان کی کمی کی تلافی بن جائے۔ کامیابی کا دارومدار مادی اسباب پر نہیں بلکہ صبر اور تقویٰ پر ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں ان کے حق میں اللہ کی مدد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، ان کے مخالفین کے ایک حصہ کو کاٹ لینا۔ دوسرے، مخالفین کو شکست دے کر انھیں مغلوب کرنا۔ پہلی کامیابی دعوت کی راہ سے آتی ہے۔ فریقِ مخالف کے جن افراد میں اللہ کچھ زندگی پاتا ہے ان کے اوپر دین کی حقانیت کو روشن کر دیتا ہے۔ وہ باطل کی صف کو چھوڑ کر حق کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں اور اس طرح وہ فریقِ مخالف کی کمزوری اور اہلِ ایمان کی قوت کا باعث بنتے ہیں۔ دوسری صورت میں اللہ اہلِ ایمان کو قوت اور حوصلہ دیتا ہے اور ان کی خصوصی مدد کر کے ان کو فریقِ مخالف پر غالب کر دیتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا
مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝١٣٠
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝١٣١
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝١٣٢
وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ
عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ
لِلْمُتَّقِيْنَ ۝١٣٣ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ
الضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ
النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝١٣٤
وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا

۱۳۰۔ اے ایمان والو، سود کئی گنا بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ۱۳۱۔ اور ڈرو اس آگ سے جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ ۱۳۲۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۱۳۳۔ اور دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین جیسی ہے۔ وہ تیار کی گئی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ۱۳۴۔ جو لوگ کہ خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں۔ وہ غصہ کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۳۵۔ اور ایسے لوگ کہ جب وہ کوئی کھلی برائی کر بیٹھیں یا

اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠
وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا
عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ
جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ
الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ
فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ
هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

اپنی جان پر کوئی ظلم کرڈالیں تو وہ اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ۱۳۶۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا۔ ۱۳۷۔ تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔ ۱۳۸۔ یہ بیان ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔

سودی کاروبار زر پرستی کی آخری بدترین شکل ہے۔ جو شخص زر پرستی میں مبتلا ہو وہ رات دن اس فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح اس کا مال دونا اور چوگنا ہو۔ وہ دنیا کا مال حاصل کرنے کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ حالاں کہ صحیح بات یہ ہے کہ آدمی آخرت کی جنت کی طرف دوڑے اور اللہ کی رحمت ونصرت کا زیادہ سے زیادہ حریص ہو۔ آدمی اپنا مال اس لیے بڑھانا چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کو عزت حاصل ہو، دنیا میں اس کے لیے شان دار زندگی کی ضمانت ہو جائے۔ مگر موجودہ دنیا کی عزت وکامیابی کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل اہمیت کی چیز جنت ہے جس کی خوشیاں اور لذّتیں بے حساب ہیں۔ عقلمند وہ ہے جو اس جنت کی طرف دوڑے۔ جنت کی طرف دوڑنا یہ ہے کہ آدمی اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں دے۔ دنیوی کامیابی کا ذریعہ مال کو ''بڑھانا'' ہے اور اخروی کامیابی کو حاصل کرنے کا ذریعہ مال کو ''گھٹانا'' — پہلی قسم کے لوگوں کا سرمایہ اگر مال کی محبت ہے تو دوسرے لوگوں کا سرمایہ اللہ اور رسول کی محبت۔ پہلی قسم کے لوگوں کو اگر دنیا کے نفع کا شوق ہوتا ہے تو دوسری قسم کے لوگوں کو آخرت کے نفع کا۔ پہلی قسم کے لوگوں کو دنیا کے نقصان کا ڈر لگا رہتا ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کو آخرت کے نقصان کا۔

جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے اندر ''احسان'' کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی جو کام کریں اس طرح کریں کہ وہ اللہ کی نظر میں زیادہ سے زیادہ پسندیدہ قرار پائے۔ وہ آزاد زندگی کے بجائے پابند زندگی گزارتے ہیں۔ خدا کے دین کی ضرورت کو وہ اپنی ضرورت بنا لیتے ہیں اور اس کے لیے ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، خواہ ان کے پاس کم ہو یا زیادہ۔ ان کو جب کسی پر غصہ آجائے تو وہ اس کو اندر ہی اندر برداشت کر لیتے ہیں۔ کسی

سے شکایت ہو تو اس سے بدلہ لینے کے بجائے اس کو معاف کر دیتے ہیں۔ غلطیاں ان سے بھی ہوتی ہیں مگر وہ وقتی ہوتی ہیں۔ غلطی کے بعد وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور دوبارہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بیتاب ہو کر اللہ کو پکارنے لگتے ہیں کہ وہ ان کو معاف کر دے اور ان کی غلطیوں پر اپنی رحمتوں کا پردہ ڈال دے۔ قرآن میں جو بات لفظی طور پر بتائی گئی ہے وہ تاریخ میں عمل کی زبان میں موجود ہے۔ مگر نصیحت وہی پکڑتے ہیں جو نصیحت کی طلب رکھتے ہوں۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ
مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ
نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا
يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ
تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ
كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠
فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾ ع ١٤ ١٤ ٥

۱۳۹۔ اور ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ ۱۴۰۔ اگر تم کو کوئی زخم پہنچے تو دشمن کو بھی ویسا ہی زخم پہنچا ہے۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ لوگوں کو گواہ بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۱۴۱۔ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو چھانٹ لے اور انکار کرنے والوں کو مٹا دے۔ ۱۴۲۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالاں کہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا نہیں جنھوں نے جہاد کیا اور نہ ان کو جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ ۱۴۳۔ اور تم موت کی تمنا کر رہے تھے اس سے ملنے سے پہلے، سو اب تم نے اس کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ایمان لانا گویا اللہ کے لیے جینے اور اللہ کے لیے مرنے کا اقرار کرنا ہے۔ جو لوگ اس طرح مومن بنیں ان کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو دنیا میں غلبہ اور آخرت میں جنت دے گا اور ان کو یہ اہم ترین اعزاز عطا کرے گا کہ جن لوگوں نے دنیا میں ان کو رد کر دیا تھا ان کے اوپر ان کو اپنی عدالت میں گواہ بنائے اور ان کی گواہی کی بنیاد پر ان کے مستقل انجام کا فیصلہ کرے۔ مگر یہ مقام محض لفظی اقرار سے نہیں مل جاتا اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی صبر اور جہاد کی سطح پر اپنے سچے ہونے کا ثبوت دے۔ مومن خواہ اپنی ذاتی زندگی کو ایمان و اسلام پر قائم کرے یا وہ دوسروں کے سامنے خدا کے دین کا گواہ بن کر کھڑا ہو، ہر حال میں اس کو دوسروں کی طرف سے مشکلات اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ان مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرنا جہاد ہے، اور ہر حال میں اپنے اقرار پر جمے رہنے کا

نام صبر ہے۔ جو لوگ اس جہاد اور صبر کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو جنت کی آبادکاری کے قابل ٹھہرے۔ نیز اسی سے دنیا کی سربلندی کا راستہ کھلتا ہے۔ ''جہاد'' ان کے مسلسل اور مکمل عمل کی ضمانت ہے اور ''صبر'' اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ کبھی کوئی جذباتی اقدام نہیں کریں گے۔ اور یہ دو باتیں جس گروہ میں پیدا ہو جائیں اس کے لیے خدا کی اس دنیا میں کامیابی اتنی ہی یقینی ہو جاتی ہے جتنی موافق زمین میں ایک بیج کا بارآور ہونا۔

ایک شخص اللہ کے راستے پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو دوسروں کی طرف سے طرح طرح کے مسائل پیش آتے ہیں۔ یہ مسائل کبھی اس کو بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کرتے ہیں۔ کبھی مصلحت پرستی کا سبق دیتے ہیں۔ کبھی اس کے اندر منفی نفسیات ابھارتے ہیں۔ کبھی خدا کے خالص دین کے مقابلہ میں ایسے عوامی دین کا نسخہ بتاتے ہیں جو لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان ہے۔ ان مواقع پر آدمی جو ردعمل ظاہر کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقرارِ ایمان میں سچا تھا یا جھوٹا۔ اگر اس کا عمل اس کے دعوائے ایمان کے مطابق ہو تو وہ سچا ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو جھوٹا۔ شہید (اللہ کا گواہ) بننا اس سفر کی آخری انتہا ہے۔ اللہ کا ایک بندہ لوگوں کے درمیان حق کا داعی بن کر کھڑا ہوا۔ اس کا حال یہ تھا کہ وہ جس چیز کی طرف بلا رہا تھا، خود اس پر پوری طرح قائم تھا۔ لوگوں نے اس کو حقیر سمجھا مگر اس نے کسی کی پروا نہ کی۔ اس پر مشکلات آئیں مگر وہ اس کو اپنے مقام سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ وہ نہ کمزور پڑا اور نہ منفی نفسیات کا شکار ہوا۔ حتی کہ اس کے جان و مال کی بازی لگ گئی پھر بھی وہ اپنے دعوتی موقف سے نہ ہٹا۔ یہ امتحان حد درجہ طوفانی امتحان ہے۔ مگر اس سے گزرنے کے بعد ہی وہ انسان بنتا ہے جس کو اللہ اپنے بندوں کے اوپر اپنا گواہ قرار دے۔ آدمی جب ہر قسم کے حالات کے باوجود اپنے دعوتی عمل پر قائم رہتا ہے تو وہ اپنے پیغام کے حق میں اپنے یقین کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ جس بات کی خبر دے رہا ہے وہ ایک حد درجہ سنجیدہ معاملہ ہے، نہ کہ کوئی سرسری معاملہ۔

''ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں''۔ یعنی حکومتی اقتدار اس دنیا میں کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے۔ یہ خدا کی سنتِ ابتلاء کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالی کبھی ایک گروہ کو سیاسی غلبہ دیتے ہیں اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ کسی گروہ کو سیاسی اقتدار ملے تب بھی وہ اس کے لیے امتحان ہے اور کسی گروہ سے سیاسی اقتدار چھن جائے تب بھی وہ اس کے لیے امتحان۔ آدمی کو چاہیے کہ دونوں حالتوں میں وہ اپنی ذمہ داریوں پر دھیان دے، نہ کہ اقتدار ملنے پر احساس برتری میں مبتلا ہو اور اقتدار چھن جائے تو احساس کمتری کا شکار ہو جائے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡــًٔا ؕ وَسَيَجۡزِى

۱۴۴۔ محمد بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص پھر جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔ ۱۴۵۔ اور کوئی

اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ
تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ
یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْہَا ۚ وَمَنْ یُّرِدْ
ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ نُؤْتِہٖ مِنْہَا ؕ وَسَنَجْزِی
الشّٰکِرِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَکَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَہٗ
رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَہَنُوْا لِمَآ اَصَابَہُمْ فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَکَانُوْا ؕ وَ
اللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا کَانَ قَوْلَہُمْ
اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا
وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا
وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰہُمُ
اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَۃِ ؕ
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع ۱۵

جان مر نہیں سکتی بغیر اللہ کے حکم کے۔ اللہ کا لکھا ہوا وعدہ ہے۔ اور جو شخص دنیا کا فائدہ چاہتا ہے، اس کو ہم دنیا میں سے دے دیتے ہیں۔ اور جو آخرت کا فائدہ چاہتا ہے، اس کو ہم آخرت میں سے دے دیتے ہیں۔ اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کا بدلہ ضرور عطا کریں گے۔ ۱۴۶۔ اور کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں، ان سے نہ وہ پست ہمت ہوئے، نہ انھوں نے کمزوری دکھائی۔ اور نہ وہ دبے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۴۷۔ ان کی زبان سے اس کے سوا کچھ اور نہ نکلا کہ اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے کام میں ہم سے جو زیادتی ہوئی اس کو معاف فرما اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور منکر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ ۱۴۸۔ پس اللہ نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

احد کی جنگ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس وقت کچھ مسلمانوں میں پست ہمتی پیدا ہو گئی۔ مگر اللہ کے حقیقی بندے وہ ہیں جن کی دینداری کسی شخصیت کے اوپر قائم نہ ہو۔ اللہ کو وہ دین داری مطلوب ہے جب کہ بندہ اپنی ساری روح اور ساری جان کے ساتھ صرف ایک اللہ کے ساتھ جڑ جائے۔ مومن وہ ہے جو اسلام کو اس کی اصولی صداقت کی بنا پر پکڑے، نہ کہ کسی شخصیت کے سہارے کی بنا پر۔ جو شخص اس طرح اسلام کو پاتا ہے اس کے لیے اسلام ایک ایسی نعمت بن جاتا ہے جس کے لیے اس کی روح کے اندر شکر کا دریا موجزن ہو جائے۔ وہ دنیا کے بجائے آخرت کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔ زندگی اس کے لیے ایک ایسی ناپائدار چیز بن جاتی ہے جو کسی بھی لمحہ موت سے دوچار ہونے والی ہو۔ وہ کائنات کو ایک ایسے خدائی کارخانہ کی حیثیت سے دیکھ لیتا ہے جہاں ہر واقعہ خدا کے اِذن کے تحت ہو رہا ہے۔ جہاں دینے والا بھی وہی ہے اور چھیننے والا بھی وہی۔ ایسے ہی لوگ اللہ کی راہ کے سچے مسافر ہیں۔ اللہ اگر چاہتا ہے تو دنیا کا عزت و اقتدار بھی ان کو دے دیتا ہے اور آخرت کی عظیم اور

ابدی انعامات توصرف انھیں کے لیے ہیں۔ تاہم یہ درجہ کسی کو صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ ہر قسم کے امتحان میں پورا اترے۔ اس کے ظاہری سہارے کھوئے جائیں تب بھی وہ اللہ پر اپنی نظریں جمائے رہے۔ جان کا خطرہ بھی اس کو پست ہمت نہ کر سکے۔ دنیا برباد ہو رہی ہو تب بھی وہ پیچھے نہ ہٹے۔ اس کے سامنے کوئی نقصان آئے تو اس کو وہ اپنی کوتاہی کا نتیجہ سمجھ کر اللہ سے معافی مانگے۔ کوئی فائدہ ملے تو اس کو خدا کا انعام سمجھ کر شکر ادا کرے۔ مومن کا یہ امتحان جو ہر روز لیا جا رہا ہے کبھی اُن ہلا دینے والے مقامات تک بھی پہنچ جاتا ہے جہاں زندگی کی بازی لگی ہوئی ہو۔ ایسے مواقع پر بھی جب آدمی بزدلی نہ دکھائے، نہ وہ بے یقینی میں مبتلا ہو اور نہ وہ کسی حال میں دین کے دشمنوں کے سامنے ہار ماننے کے لیے تیار ہو تو گویا وہ امتحان کی آخری جانچ میں بھی پورا اترا۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ہر قسم کی سرفرازیاں ہیں۔ تاریخ میں وہی لوگ سب سے زیادہ قیمتی ہیں جنھوں نے اس طرح اللہ کو پایا ہو اور اپنے آپ کو اس طرح اللہ کے منصوبہ میں شامل کر دیا ہو — نازک مواقع پر اہل ایمان کا باہم متحد رہنا اور صبر کے ساتھ حق پر جمے رہنا وہ چیزیں ہیں جو اہلِ ایمان کو اللہ کی نصرت کا مستحق بناتی ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا
خٰسِرِيْنَ ﴿١٤٩﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ
النّٰصِرِيْنَ ﴿١٥٠﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ
يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ
وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥١﴾ وَ لَقَدْ
صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ
بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓي اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي
الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا
تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ
مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ
لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

۱۴۹۔ اے ایمان والو، اگر تم منکروں کی بات مانو گے تو وہ تم کو الٹے پاؤں پھیر دیں گے، پھر تم ناکام ہو کر رہ جاؤ گے۔ ۱۵۰۔ بلکہ اللہ تمھارا مددگار ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔ ۱۵۱۔ ہم منکروں کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیں گے کیوں کہ انھوں نے ایسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جس کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے ظالموں کے لیے۔ ۱۵۲۔ اور اللہ نے تم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دکھایا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم خود کمزور پڑ گئے اور تم نے کام میں جھگڑا کیا اور تم کہنے پر نہ چلے جب کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھا دی تھی جو کہ تم چاہتے تھے۔ تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے بعض آخرت چاہتے تھے۔ پھر اللہ نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا، تاکہ وہ تمھاری آزمائش کرے اور اللہ نے تم کو معاف کر دیا اور

ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٢﴾ إِذْ تُصْعِدُوْنَ
وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ
اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا
عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٥٣﴾

اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا فضل والا ہے۔
۱۵۳۔ جب تم چڑھے جارہے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تم کو تمھارے پیچھے سے پکار رہا تھا۔ پھر اللہ نے تم کو غم پر غم دیا تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمھارے ہاتھ سے چوک گئی اور نہ اس مصیبت پر جو تم پر پڑے۔ اور اللہ خبردار ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

جنگ احد میں وقتی شکست سے مخالفوں کو موقع ملا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کا معاملہ کوئی خدائی معاملہ نہیں ہے۔ کچھ لوگ محض طفلانہ جوش کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنے جوش کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اگر یہ خدائی معاملہ ہوتا تو ان کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں شکست کیوں ہوتی۔ مگر اس طرح کے واقعات خواہ بظاہر مسلمانوں کی غلطی سے پیش آئیں، وہ ہر حال میں خدا کا امتحان ہوتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں "احد" کا حادثہ پیش آنا ضروری ہے تاکہ یہ کھل جائے کہ کون اللہ پر اعتماد کرنے والا تھا اور کون پھسل جانے والا۔ اس قسم کے واقعات مومن کے لیے دوطرفہ آزمائش ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لوگوں کی مخالفانہ باتوں سے متاثر نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ وقتی تکلیف سے گھبرا نہ جائے، اور ہر حال میں ثابت قدم رہے۔

مشکل مواقع پر اہل ایمان اگر جمے رہ جائیں تو بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی نصرتِ رعب نازل ہوتی ہے، جو شخص یا گروہ اللہ کے سچے دین کے سوا کسی اور چیز کے اوپر کھڑا ہوا ہے وہ حقیقۃً بے بنیاد زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ کیوں کہ اللہ کی اتاری ہوئی سچائی کے سوا اس دنیا میں کوئی اور حقیقی بنیاد نہیں۔ اس لیے جب کوئی دین خداوندی کے اوپر کھڑا ہو اور جماؤ کا ثبوت دے تو جلد ہی ایسا ہوتا ہے کہ اہل باطل کی صفوں میں انتشار شروع ہو جاتا ہے۔ دلائل کے اعتبار سے ان کا بے بنیاد ہونا ان کے افراد میں بے یقینی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اپنے کو کم اور اہل ایمان کو زیادہ دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی ذہنی شکست بالآخر عملی شکست تک پہنچتی ہے۔ وہ اہلِ حق کے مقابلہ میں ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے شکست اور کمزوری کا سبب ہمیشہ ایک ہوتا ہے، اور وہ ہے تنازع فی الامر۔ یعنی رایوں کے اختلاف کی بنا پر الگ ہو جانا۔ انسانوں کے درمیان اتفاق کبھی اس معنی میں نہیں ہوسکتا کہ سب کی رائیں بالکل ایک ہو جائیں۔ اس لیے کسی گروہ میں اتحاد کی صورت صرف یہ ہے کہ رایوں میں اختلاف کے باوجود عمل میں اختلاف نہ کیا جائے۔ جب تک کسی گروہ میں یہ بلند نظری پائی جائے گی وہ متحد اور نتیجتاً طاقت ور رہے گا۔ اور جب رایوں کا اختلاف کر کے لوگ الگ الگ ہونے لگیں تو اس کے بعد لازماً کمزوری اور اس کے نتیجہ میں شکست واقع ہوگی۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً
نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآئِفَةٌ
قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ
الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا
مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ
لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ
لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ
شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ
الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا
فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ
اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ
وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾ ع

۱۵۴۔ پھر اللہ نے تمھارے اوپر غم کے بعد اطمینان اتارا یعنی اونگھ، جس کا تم میں سے ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی کہ اس کو اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ وہ اللہ کے بارے میں خلافِ حقیقت خیالات، جاہلیت کے خیالات قائم کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے۔ کہو، سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں ایسی بات چھپائے ہوئے ہیں جو وہ تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس معاملہ میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہو، اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن کا قتل ہونا لکھ دیا گیا تھا، وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل پڑتے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ کو آزمانا تھا جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اور نکھارنا تھا جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے۔ اور اللہ جانتا ہے سینوں والی بات کو۔

۱۵۵۔ تم میں سے جو لوگ پھر گئے تھے اس دن کہ دونوں گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی، ان کو شیطان نے ان کے بعض اعمال کے سبب سے پھسلا دیا تھا۔ اللہ نے ان کو معاف کر دیا۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

زندگی کے معرکہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ آدمی کا چین اس سے رخصت نہ ہو۔ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا منصوبہ بنانے کے قابل رہے۔ اللہ پر بھروسہ کی وجہ سے اہلِ ایمان کو یہ چیز کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ حتی کہ ہلا دینے والے موقع پر جب کہ لوگوں کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں، اس وقت بھی وہ اس قابل رہتے ہیں کہ ایک نیند لے کر دوبارہ تازہ دم ہو سکیں۔ احد کے موقع پر اس کا ایک مظاہرہ اس طرح ہوا کہ شکست کے بعد سخت ترین حالات کے باوجود وہ سو سکے اور اگلے دن حمراء الاسد تک دشمن کا پیچھا کیا، جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے نتیجہ میں فاتح دشمن مرعوب ہو کر مکہ واپس چلا گیا۔ یہ سچے

اہل ایمان کا حال ہے۔ مگر جو لوگ پورے معنوں میں اللہ کو اپنا ولی و سرپرست بنائے ہوئے نہ ہوں، ان کو ہر طرف بس اپنی جان کا خطرہ نظر آتا ہے۔ دین کی فکر سے خالی لوگ اپنی ذات کی فکر میں پڑے رہتے ہیں وہ اللہ کی نصرتِ اطمینان میں سے اپنا حصہ نہیں پاتے۔

احد کے موقع پر عبداللہ بن اُبی کی رائے تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخلص مسلمانوں کے مشورہ پر باہر نکلے اور احد پہاڑ کے دامن میں مقابلہ کیا۔ درّہ پر متعین دستہ کی غلطی سے جب شکست ہوئی تو ان لوگوں کو موقع ملا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ اگر ہماری بات مانی گئی ہوتی اور مدینہ میں رہ کر لڑتے تو اس بربادی کی نوبت نہ آتی۔ مگر موت خدا کی طرف سے ہے اور وہیں آ کر رہتی ہے جہاں وہ کسی کے لیے لکھی ہوئی ہے۔ احتیاطی تدبیریں کسی کو موت سے بچا نہیں سکتیں۔ اس طرح کے واقعات، خواہ بظاہر ان کا جو سبب بھی نظر آئے، وہ اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ تاکہ اللہ کے سچے بندے اللہ کی طرف رجوع کر کے مزید رحمتوں کے مستحق بنیں۔ اور جو سچے نہیں ہیں ان کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آجائے۔

احد کے درہ پر جو پچاس تیر انداز متعین تھے جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو فتح ہوگئی ہے تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ چل کر مال غنیمت لوٹیں۔ مگر عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے کچھ ساتھیوں نے کہا: نہیں۔ ہم کو ہر حال میں یہیں رہنا ہے کیوں کہ یہی رسول اللہ کا حکم ہے۔ بالآخر گیارہ کو چھوڑ کر بقیہ لوگ چلے گئے۔ باہمی اختلاف کی اس کمزوری سے شیطان نے اندر داخل ہونے کا راستہ پالیا۔ تاہم انھوں نے جب اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو اللہ نے ان کو معاف کر دیا اور ابتدائی نقصان کے بعد ان کی مدد اس طرح کی کہ دشمنوں کے دل میں رعب ڈال کر ان کو واپس کر دیا۔ حالاں کہ اس وقت وہ مدینہ سے صرف چند میل کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١٥٦﴾ وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿١٥٧﴾ وَ لَئِنْ مُّتُّمْ

۱۵۶۔ اے ایمان والو، تم ان لوگوں کے مانند نہ ہوجانا جنھوں نے انکار کیا۔ وہ اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں، جب کہ وہ سفر یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آجاتی ہے، کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔ تاکہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں سببِ حسرت بنادے۔ اور اللہ ہی جلاتا ہے اور مارتا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۵۷۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مرجاؤ تو اللہ کی مغفرت اور رحمت اس سے بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔ ۱۵۸۔ اور تم مرگئے یا مارے گئے

اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿١٥٨﴾ فَبِمَا
رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا
غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ
فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي
الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ
اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا
الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٦٠﴾

بہرحال تم اللہ ہی کے پاس اکٹھا کیے جاؤ گے۔
۱۵۹۔ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان کے لیے
نرم ہو۔ اگر تم تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ
تمھارے پاس سے بھاگ جاتے۔ پس ان کو
معاف کردو اور ان کے لیے مغفرت مانگو اور
معاملات میں ان سے مشورہ لو۔ پھر جب فیصلہ کرلو
تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بیشک اللہ ان سے محبت کرتا
ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۱۶۰۔ اگر اللہ
تمھارا ساتھ دے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور
اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو اس کے بعد کون
ہے جو تمھاری مدد کرے۔ اور اللہ ہی کے اوپر
بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔

اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ تاہم یہاں ہر چیز پر اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ واقعات بظاہر اسباب کے تحت ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر حقیقتاً وہ اللہ کے حکم کے تحت ہو رہے ہوتے ہیں۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری اسباب میں نہ اٹکے بلکہ ان کے پیچھے کام کرنے والی قدرتِ خداوندی کو دیکھ لے۔ غیر مومن وہ ہے جو اسباب میں کھو جائے اور مومن وہ ہے جو اسباب سے گزر کر اصل حقیقت کو پالے۔ ایک شخص مومن ہونے کا مدعی ہو مگر اسی کے ساتھ اس کا حال یہ ہو کہ زندگی و موت اور کامیابی و ناکامی کو وہ تدبیروں کا نتیجہ سمجھتا ہو تو اس کا ایمانی دعویٰ معتبر نہیں۔ غیر مومن کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ اس غم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں نے فلاں تدبیر کی ہوتی تو میں حادثہ سے بچ جاتا۔ مگر مومن کے ساتھ جب کوئی حادثہ گزرتا ہے تو وہ یہ سوچ کر مطمئن رہتا ہے کہ اللہ کی مرضی یہی تھی۔ جو لوگ دنیوی اسباب کو اہمیت دیں وہ اپنی پوری زندگی دنیا کی چیزوں کو حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ ''مرنے'' سے زیادہ ''جینا'' ان کو عزیز ہو جاتا ہے۔ مگر پانے کی اصل چیز وہ ہے جو آخرت میں ہے۔ یعنی اللہ کی جنت و مغفرت۔ اور جنت وہ چیز ہے جس کو صرف زندگی ہی کی قیمت پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آدمی کا وجود ہی جنت کی واحد قیمت ہے۔ آدمی اگر اپنے وجود کو نہ دے تو وہ کسی اور چیز کے ذریعہ جنت حاصل نہیں کر سکتا۔

اہلِ ایمان کے ساتھ جس اجتماعی سلوک کا حکم پیغمبر کو دیا گیا ہے وہی عام مسلم سربراہ کے لیے بھی ہے۔ مسلم سربراہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نرم دل اور نرم گفتار ہو۔ یہ نرمی صرف روزمرہ کی عام زندگی ہی میں مطلوب نہیں ہے بلکہ ایسے غیر معمولی مواقع پر بھی مطلوب ہے جب کہ اسلام اور غیر اسلام کے تصادم کے

وقت لوگوں سے ایک حکم کی نافرمانی ہو اور نتیجہ میں جیتی ہوئی جنگ ہار میں بدل جائے۔ سربراہ کے اندر جب تک یہ وسعت اور بلند نظری نہ ہو طاقت ور اجتماعیت قائم نہیں ہوسکتی۔ غلطی خواہ کتنی ہی بڑی ہو، اگر وہ صرف ایک غلطی ہے، شر پسندی نہیں ہے تو وہ قابل معافی ہے۔ سربراہ کو چاہیے کہ ایسی ہر غلطی کو بھلا کر وہ لوگوں سے معاملہ کرے۔ حتی کہ وہ لوگوں کا اتنا خیر خواہ ہو کہ ان کے حق میں اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔ اس کی نظر میں لوگوں کی اتنی قدر ہو کہ معاملات میں وہ ان سے مشورہ لے۔ جب آدمی کو یہ یقین ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے کیے سے ہوتا ہے تو اس کے بعد انسانی اسباب اس کی نظر میں ناقابل لحاظ ہوجائیں گے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ
بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا
كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ
رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ
مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ
دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ
الْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ النصف

۱۶۱۔ اور نبی کا یہ کام نہیں کہ وہ کچھ چھپا رکھے اور جو کوئی چھپائے گا وہ اپنی چھپائی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا۔ پھر ہر جان کو اس کے کیے ہوئے کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔ ۱۶۲۔ کیا وہ شخص جو اللہ کی مرضی کا تابع ہے، وہ اس شخص کے مانند ہوجائے گا جو اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔ ۱۶۳۔ اللہ کے یہاں ان کے درجے الگ الگ ہوں گے۔ اور اللہ دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ ۱۶۴۔ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

احد کے درہ پر متعین جن چالیس افراد نے نافرمانی کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف کر دیا تھا۔ تاہم ان لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ آپ نے شاید صرف اوپری طور پر ہم کو معاف کیا ہے۔ دل میں آپ اب بھی خفا ہیں اور کسی وقت ہمارے اوپر خفگی نکالیں گے۔ فرمایا کہ یہ پیغمبر کا طریقہ نہیں۔ پیغمبر اندر اور باہر ایک ہوتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے سربراہ کو کیسا ہونا چاہیے۔ مسلم سربراہ کا دل ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے اندر بغض، نفرت، کینہ اور حسد بالکل جگہ نہ پا سکے — حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ

اس کے ساتھیوں سے ایک بھیانک غلطی ہوگئی ہو۔ مسلم سربراہ کو چاہیے کہ بڑی سے بڑی غلطی کرنے والوں کے خلاف بھی وہ دل میں کوئی جذبہ چھپا کر نہ رکھے۔ آج کے دن ان کے ساتھ اس طرح رہے جیسے پچھلے دن ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ جب ایک سربراہ پر اعتماد کرکے اپنے معاملات کو اس کے سپرد کردے تو سربراہ کو ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے جان و مال کو وہ اپنے ذاتی حوصلوں اور تمناؤں کی تکمیل پر قربان کردے۔ یہ اللہ کے غضب سے بے خوف ہونا ہے۔ جو شخص لوگوں کو یہ بتانے کے لیے اٹھا ہو کہ لوگ اللہ کی مرضی پر چلیں وہ خود کیوں کر اس حال میں اللہ سے ملنا پسند کرے گا کہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف چلا ہو۔

پیغمبر نے اپنی زندگی سے جو مثالی نمونہ قائم کیا ہے، قیامت تک تمام مصلحین کو اسی کے مطابق بننا ہے۔ اصلاح کے کام کے لیے ضروری ہے کہ آدمی جن لوگوں کے درمیان کام کرنے کو اٹھے ان کو ہر اعتبار سے وہ ''اپنا'' نظر آئے، اس کی زبان، اس کا طرز کلام، اس کا رہن سہن ہر چیز اجنبیت سے پاک ہو۔ وہ اپنے اور اپنے مخاطبین کے درمیان ایسی فضا نہ بنائے جو کسی پہلو سے ایک دوسرے کو دور کرنے والی ہو یا ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں فریق بنا کر کھڑا کردے۔ لوگوں کے درمیان جو کام کرنا ہے وہ سب سے پہلے یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ ان نشانیوں کو پڑھنے لگیں جو ان کی ذات میں اور باہر کی دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اللہ کی دلیلوں کو جان کر ان کو اپنے ذہن کا جزء بنائیں۔ دوسرا کام تزکیہ ہے۔ یہ مقصد زبانی گفتگو اور صحبت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ عمومی تحریر اور تقریر میں بات زیادہ تر اصولی انداز میں ہوتی ہے جب کہ انفرادی گفتگوؤں میں بات زیادہ متعین اور زیادہ مفصل صورت میں ہوتی ہے۔ نیز داعی کا اپنا وجود بھی پوری طرح اس کی تقویت کے لیے موجود رہتا ہے۔ عمومی کلام اگر دعوت ہوتا ہے تو انفرادی ملاقاتیں مدعو کے لیے تزکیہ کے ہم معنی بن جاتی ہیں۔ تیسری چیز کتاب ہے۔ یعنی زندگی گزارنے کے بابت آسمانی ہدایات کو بتانا جس کا دوسرا نام شریعت ہے اور چوتھی چیز حکمت ہے۔ یعنی دین کے گہرے بھیدوں سے پردہ اٹھانا، بین السطور میں چھپے ہوئے حقائق کو نمایاں کرنا۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ
قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ

۱۶۵۔ اور جب تم کو ایسی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی مصیبت تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آ گئی۔ کہو یہ تمھارے اپنے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۶۶۔ اور دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن تم کو جو مصیبت پہنچی، وہ اللہ کے حکم سے پہنچی اور اس واسطے کہ اللہ مومنین کو جان لے۔ ۱۶۷۔ اور ان کو بھی جان

وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ
ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ
لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ
يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ
قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ
اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

لے جو منافق تھے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا دشمن کو دفع کرو۔ انھوں نے کہا اگر ہم جانتے کہ جنگ ہونا ہے تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ یہ لوگ اس دن ایمان سے زیادہ کفر کے قریب تھے۔ وہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں۔ ۱۶۸۔ یہ لوگ جو خود بیٹھے رہے، اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو مارے نہ جاتے۔ کہو تم اپنے اوپر سے موت کو ہٹا دو اگر تم سچے ہو۔

حق و باطل کے مقابلہ میں آخری فتح حق کو ہوتی ہے۔ کیوں کہ اللہ ہمیشہ حق کے ساتھ ہوتا ہے۔ تاہم یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں شر پسندوں کو بھی عمل کی پوری آزادی ہے۔ اس لیے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہل حق کی کسی کمزوری، مثلاً باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر شر پسند ان کو وقتی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تاہم اس طرح کے واقعات کا ایک مفید پہلو بھی ہے۔ اس کے ذریعہ خود مسلمانوں کی جماعت کی جانچ ہو جاتی ہے۔ ناموافق حالات کو دیکھ کر غیر مخلص لوگ چھٹ جاتے ہیں اور جو سچے مسلمان ہیں وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جمے رہتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ کون قابل اعتماد ہے اور کون ناقابل اعتماد۔ مزید یہ کہ اتفاقی غلطی سے نقصان اٹھانے کے بعد جب اہل ایمان دوبارہ صبر اور انابت اور توکل علی اللہ کا ثبوت دیتے ہیں تو خدا کی رحمت ان کی طرف پہلے سے بھی زیادہ متوجہ ہو جاتی ہے۔

حق و باطل کے معرکہ میں جو لوگ اس طرح شرکت کریں کہ اسی کی راہ میں اپنے کو مٹا دیں، ان کے متعلق اہل دنیا اکثر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ انھوں نے خواہ مخواہ اپنے کو برباد کر لیا۔ مگر یہ صرف نادانی کی بات ہے۔ اللہ کی راہ میں کھونا ہی تو سب سے بڑا پانا ہے۔ کیوں کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیں وہی وہ لوگ ہیں جو سب سے زیادہ اللہ کے انعامات کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔

اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کا ذکر نادان لوگ اس طرح کرتے ہیں جیسے دوسری راہوں میں اپنی زندگیاں لگانے والوں پر موت نہیں آتی، جیسے کہ صرف مجاہدین فی سبیل اللہ مرتے ہیں اور دوسرے لوگ مرتے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات سراسر بے معنی ہے۔ موت خدا کا ایک عام قانون ہے۔ وہ بہر حال ہر ایک کے لیے اپنے وقت پر آنے والی ہے۔ آدمی خواہ ایک راستہ میں چل رہا ہو یا دوسرے راستہ میں، وہ کسی حالت میں موت کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔

جولوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ کبھی اپنی بات میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ ان کا دل تو اعتراف کررہا ہوتا ہے کہ حق کے لیے قربانی نہ دے کر انھوں نے سخت کوتاہی کی ہے۔ مگر زبان سے قربانی کرنے والوں کو مطعون کر کے اپنا ظاہری بھرم قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جن کے بارے میں خود ان کا دل گواہی دے رہا ہوتا ہے وہ جھوٹے الفاظ ہیں، ان کی کوئی واقعی حقیقت نہیں۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
يُرْزَقُوْنَ ۙ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا
بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ ع ۱۷ ۱۶ ۸
الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ
اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ
قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا
اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا
رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾
اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا
تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

۱۶۹۔ اور جولوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس، ان کو روزی مل رہی ہے۔ ۱۷۰۔ وہ خوش ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل میں سے ان کو دیا ہے اور خوش خبری لے رہے ہیں کہ جولوگ ان کے پیچھے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں، ان کے لیے بھی نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۱۷۱۔ وہ خوش ہورہے ہیں اللہ کے انعام اور فضل پر اور اس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ ۱۷۲۔ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے حکم کو مانا بعد اس کے کہ ان کو زخم لگ چکا تھا، ان میں سے جو نیک اور متقی ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ ۱۷۳۔ جن سے لوگوں نے کہا کہ دشمن نے تمھارے خلاف بڑی طاقت جمع کرلی ہے اس سے ڈرو، لیکن اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کردیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ ۱۷۴۔ پس وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ واپس آئے۔ ان لوگوں کو کوئی برائی پیش نہ آئی۔ اور وہ اللہ کی رضامندی پر چلے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔ ۱۷۵۔ یہ شیطان ہے جو تم کو اپنے دوستوں کے ذریعہ ڈراتا ہے۔ تم ان سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

جو لوگ اسلام دشمنوں سے لڑے اور شہید ہوئے ان کو منافقین ''موتِ ضیاع'' کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسلمان ایک شخص کے بہکاوے میں آ کر اپنی جانیں ضائع کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ جس کو تم موت سمجھتے ہو وہی حقیقت میں زندگی ہے۔ تم صرف دنیا کا نفع نقصان جانتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کی راہ میں جان دینا تمھیں اپنے آپ کو برباد کرنا معلوم ہوتا ہے مگر اللہ کی راہ میں مرنے والے تم سے زیادہ بہتر زندگی پائے ہوئے ہیں۔ وہ آخرت میں تم سے زیادہ عیش کی حالت میں ہیں۔

شیطان کا یہ طریقہ ہے کہ وہ جن انسانوں کو اپنے قریب پاتا ہے انھیں اکسا کر کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ دین کی طرف بڑھنے کے خوفناک نتائج دکھا کر لوگوں کو دین کے راستے سے ہٹا دیں۔ یہ لوگ مخالفین کی قوت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں تاکہ اہل ایمان مرعوب ہو جائیں۔ مگر اس قسم کی باتیں اہل ایمان کے حق میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ان کا یہ یقین از سر نو زندہ ہو جاتا ہے کہ مشکل حالات میں ان کا خدا انھیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔

احد کی جنگ مدینہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہوئی۔ جنگ کے بعد کافروں کا لشکر ابوسفیان کی قیادت میں واپس روانہ ہوا۔ مدینہ سے آٹھ میل پر حمراء الاسد پہنچ کر انھوں نے پڑاؤ ڈالا۔ یہاں ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ احد سے واپس ہو کر انھوں نے غلطی کی ہے۔ یہ بہترین موقع تھا کہ مدینہ تک مسلمانوں کا پیچھا کیا جاتا اور ان کی طاقت کا آخری طور پر خاتمہ کر دیا جاتا۔ اس درمیان میں ان کو قبیلہ عبد القیس کا ایک تجارتی قافلہ مل گیا جو مدینہ جا رہا تھا۔ کافروں نے اس قافلہ کو کچھ رقم دے کر آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پہنچ کر ایسی خبریں پھیلائے جس سے مسلمان ڈر جائیں۔ چنانچہ قافلہ والوں نے مدینہ پہنچ کر کہنا شروع کیا کہ ہم دیکھ آئے ہیں کہ مکہ والے بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں اور وہ دوبارہ مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا اللہ پر بھروسہ اس بات کی ضمانت بن گیا کہ کافروں کی تدبیر الٹی پڑ جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے ارادہ سے باخبر ہو گئے۔ قبل اس کے کہ مکہ والوں کی فوج مدینہ کی طرف چلے وہ خود پیغمبر کی رہنمائی میں اپنی جمعیت بنا کر تیزی سے حمراء الاسد کی طرف روانہ ہو گئے۔ مکہ والوں کو جب یہ خبر ملی کہ مسلمانوں کی فوج اقدام کر کے ان کی طرف آ رہی ہے تو وہ سمجھے کہ مسلمانوں کو نئی کمک مل گئی ہے۔ وہ گھبرا کر مکہ کی طرف واپس چلے گئے۔

وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ

۱۷۶۔ اور وہ لوگ تمھارے لیے باعثِ غم نہ بنیں جو انکار میں سبقت کر رہے ہیں۔ وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔

لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ لَنۡ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيۡـــًٔا ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ خَيۡرٌ لِّاَنۡفُسِهِمۡ ‌ؕ اِنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلٰى مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ حَتّٰى يَمِيۡزَ الۡخَبِيۡثَ مِنَ الطَّيِّبِ ‌ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ‌ ۚ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَلَكُمۡ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ ۱۷۷۔ جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا ہے، وہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔ ۱۷۸۔ اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں، وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو ان کو مہلت دے رہے ہیں یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ ہم تو بس اس لیے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ جرم میں اور بڑھ جائیں اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۷۹۔ اللہ ایسا نہیں کہ وہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر کہ تم اب ہو جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ کر لے۔ اور اللہ ایسا نہیں کہ وہ تم کو غیب سے باخبر کر دے۔ بلکہ اللہ چن لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور اگر تم ایمان لاؤ اور پرہیز گاری اختیار کرو تو تمھارے لیے بڑا اجر ہے۔

زندگی کا اصل مسئلہ وہ نہیں جو دکھائی دے رہا ہے۔ اصل مسئلہ وہ ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہے۔ لوگ دنیا کے جہنم سے بچنے کی فکر کرتے ہیں اور اپنی ساری توجہ دنیا کی جنت کو حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ مگر زیادہ عقل مندی کی بات یہ ہے کہ آدمی آخرت کے جہنم سے اپنے کو بچائے اور وہاں کی جنت کی طرف دوڑے۔ دنیا میں پیسہ والا ہونا اور بے پیسہ والا ہونا، جائداد والا ہونا اور بے جائداد والا ہونا، عزت والا ہونا اور بے عزت والا ہونا، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو ہر آدمی کو آنکھوں سے نظر آتی ہیں۔ اس لیے وہ ان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ اپنی ساری کوشش اس مقصد کے لیے لگا دیتا ہے کہ وہ یہاں محروم نہ رہے۔ مگر انسان کا اصل مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے جس کو اللہ نے امتحان کی مصلحت سے چھپا دیا ہے اور اس سے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے یہ طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ وہ اپنے کچھ بندوں کو غیب کی پیغام بری کے لیے چنے۔ ان کو موت کے اس پار کی حقیقتوں سے خبردار کرے اور پھر ان کو مقرر کرے کہ وہ دوسروں کو اس سے باخبر کر دیں۔ انسان کی اصل جانچ یہ ہے کہ وہ خدا کے داعی کی آواز میں سچائی کی جھلکیوں کو پالے، وہ ایک لفظی پکار میں حقیقت کی عملی تصویر دیکھ لے۔ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی باتوں میں خدائی بات کی گونج سن لے۔

ایمان یہ ہے کہ آدمی خود پسندی نہ کرے۔ کیوں کہ خود پسندی خدا کے بجائے اپنے آپ کو بڑائی کا مقام دینا ہے۔ وہ دنیا میں غرق نہ ہو۔ کیوں کہ دنیا میں غرق ہونا ظاہر کرتا ہے کہ آدمی آخرت کو اصل اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کبر، بخل، ناانصافی اور غیر اللہ کی عقیدت ومحبت سے اپنے کو بچائے اور اس کے بجائے خدا پرستی، تواضع، فیاضی اور انصاف پسندی کو اپنا شیوہ بنائے۔ ایسا کرنا ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے ایمان میں سنجیدہ ہے۔ اس نے فی الواقع اپنے آپ کو خدا اور آخرت کی طرف لگا دیا ہے۔ اور ایسا نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے ایمان میں سنجیدہ نہیں۔ اقرارِ ایمان کے باوجود عملاً وہ اسی دنیا میں جی رہا ہے جہاں دوسرے لوگ جی رہے ہیں۔ آخرت میں خبیث روحوں اور طیب روحوں کی جو تقسیم ہوگی وہ حقیقت کے اعتبار سے ہوگی، نہ کہ محض ظاہری نمائش کے اعتبار سے — دنیا میں برے لوگوں کو جو ڈھیل دی گئی ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ وہ اپنے اندر کی بُرائی کو پوری طرح ظاہر کردیں۔ مگر وہ خواہ کتنی ہی کوشش کریں وہ اہلِ حق کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ وہ اپنی آزادی کو صرف اپنے خلاف استعمال کرسکتے ہیں، نہ کہ دوسروں کے خلاف۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ
لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع ۱۸ ۹
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ
فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وقف لازم
وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ
ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ
لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ ج اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ
اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا
بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ

۱۸۰۔ اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل میں سے دیا ہے، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخل کر رہے ہیں اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ اور اللہ ہی وارث ہے زمین اور آسمانوں کا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۱۸۱۔ اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جنھوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم لکھ لیں گے ان کے اس قول کو اور ان کے پیغمبروں کو ناحق مار ڈالنے کو بھی۔ اور ہم کہیں گے کہ اب آگ کا عذاب چکھو۔ ۱۸۲۔ یہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ناانصافی کرنے والا نہیں۔ ۱۸۳۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم کسی رسول کو تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جس کو آگ کھالے، ان سے کہو کہ مجھ سے

رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ
فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ
كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ
جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾
كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ
اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ
النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

پہلے تمھارے پاس رسول آئے کھلی نشانیاں لے کر اور وہ چیز لے کر جس کو تم کہہ رہے ہو، پھر تم نے کیوں ان کو مار ڈالا، اگر تم سچے ہو۔ ۱۸۴۔ پس اگر یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ ۱۸۵۔ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو پورا اجر تو بس قیامت کے دن ملے گا۔ پس جو شخص آگ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کیا جائے، وہی کامیاب رہا اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے۔

ظاہری طور پر آدمی ایک قول دے کر مومن بن جاتا ہے مگر اللہ کی نظر میں وہ اس وقت مومن بنتا ہے جب کہ وہ اپنی جان اور اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے دے۔ جان و مال کی قربانی کے بغیر کسی کا ایمان اللہ کے یہاں معتبر نہیں۔ آدمی اپنے مال کو اس لیے بچاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے دنیوی مستقبل کا تحفظ کر رہا ہے۔ مگر آدمی کا حقیقی مستقبل وہ ہے جو آخرت میں سامنے آنے والا ہے اور آخرت کی دنیا میں ایسا بچایا ہوا مال آدمی کے حق میں صرف وبال ثابت ہوگا۔ جو مال دنیا میں زینت اور فخر کا ذریعہ دکھائی دے رہا ہے وہ آخرت میں خدا کے حکم سے سانپ کی صورت اختیار کر لے گا جو ابدی طور پر اس کو ڈستا رہے۔

جو لوگ قربانی والے دین کو نہیں اپناتے وہ اپنے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مختلف باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ مال خدا نے ہماری ضرورت کے لیے پیدا کیا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم اس کو اپنی ضرورتوں میں خرچ کریں، اور اس سے اپنے دنیوی آرام کا سامان کریں۔ کبھی ان کی بے حسی ان کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ خود داعیٔ حق کو مشتبہ کرنے کے لیے طرح طرح کے شوشے نکالتے ہیں تاکہ یہ ثابت کرسکیں کہ وہ شخص سچا داعی ہی نہیں، جس کا ظہور یہ تقاضا کر رہا ہے کہ اپنی زندگی اور اپنے مال کو قربان کر کے اس کا ساتھ دیا جائے۔ اس قسم کے لوگ جو باتیں کہتے ہیں وہ بظاہر دلیل کے روپ میں ہوتی ہیں مگر حقیقۃً وہ ایمانی تقاضوں سے فرار کے لیے ہیں۔ اس لیے خواہ کیسی ہی دلیل پیش کی جائے وہ اس کو رد کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ تلاش کر لیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ان کا آخری انجام موت ہے، اور موت کا مرحلہ سامنے آتے ہی صورت حال بالکل بدل جائے گی۔ موت تمام جھوٹے سہاروں کو باطل کر دے گی۔ اس کے بعد آدمی اپنے آپ کو ٹھیک اس مقام پر کھڑا ہوا پائے گا جہاں وہ حقیقۃً تھا، نہ کہ اس مقام پر جہاں وہ اپنے آپ کو ظاہر کر رہا تھا— موجودہ دنیا میں کسی کا ترقی کرنا یا موجودہ دنیا میں کسی کا ناکام ہو جانا، دونوں حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی سطح کی

چیزیں ہیں۔ نہ یہاں کی نعمتیں کسی کے برسرِ حق ہونے کا ثبوت ہیں، اور نہ کسی کا یہاں مشکلات و مصائب میں مبتلا ہونا، اس کے برسرِ باطل ہونے کا ثبوت۔ کیوں کہ دونوں ہی امتحان کے نقشے ہیں، نہ کہ انجام کی علامتیں۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۟ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع ۱۹/۹/۱۰

۱۸۶۔ یقیناً تم اپنے جان اور مال میں آزمائے جاؤ گے۔ اور تم بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے ان سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی اور ان سے بھی جنھوں نے شرک کیا۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔
۱۸۷۔ اور جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم خدا کی کتاب کو پوری طرح لوگوں کے لیے ظاہر کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے۔ مگر انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا۔ کیسی بری چیز ہے جس کو وہ خرید رہے ہیں۔ ۱۸۸۔ جو لوگ اپنے ان کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کیے اس پر ان کی تعریف ہو، ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔
۱۸۹۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے زمین اور آسمان کی بادشاہی، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ایمان کا سفر آدمی کو ایسی دنیا میں طے کرنا ہوتا ہے جہاں اپنوں اور غیروں کی طرف سے طرح طرح کے زخم لگتے ہیں۔ مگر مومن کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو، وہ ہر صورت حال کا مثبت جواب دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہے۔ لوگوں کی طرف سے اشتعال دلانے والے مواقع پیش آتے ہیں مگر وہ پابند ہوتا ہے کہ ہر قسم کے جھٹکوں کو اپنے اوپر سہے اور جوابی ذہن کے تحت کوئی کارروائی نہ کرے۔ بار بار ایسے معاملات سامنے آتے ہیں جب کہ دل کہتا ہے کہ حدودِ خداوندی کو توڑ کر اپنا مدعا حاصل کیا جائے مگر اللہ کا ڈر اس کے قدموں کو روک دیتا ہے۔ اسی طرح دین کی مختلف ضرورتیں سامنے آتی ہیں اور جان و مال کی قربانی کا تقاضا کرتی ہیں۔ ایسے مواقع پر آسان دین کو چھوڑ کر مشکل دین کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ واقعہ ایمان کے سفر کو ہمت اور عالی حوصلگی کا زبردست امتحان بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن بننا اپنے آپ کو صبر اور تقویٰ

کے امتحان میں کھڑا کرنا ہے۔ جو اس امتحان میں پورا اترا وہی وہ مومن بنا جس کے لیے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

آسمانی کتاب کے حامل کسی گروہ پر جب زوال آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ وہ خدا ورسول کا نام لینا چھوڑ دے یا خدا کی کتاب سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کردے۔ دین ایسے گروہ کی نسلی روایات میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہ اس کا پُرفخر قومی اثاثہ بن جاتا ہے۔ اور جس چیز سے اس طرح کا نسلی اور قومی تعلق قائم ہوجائے اس سے علیحدگی کسی گروہ کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔ تاہم اس کا یہ تعلق محض رسمی تعلق ہوتا ہے، نہ کہ فی الواقع حقیقی تعلق۔ وہ اپنی دنیوی سرگرمیاں بھی دین کے نام پر جاری کرتے ہیں۔ وہ بے دین ہو کر بھی اپنے کو دین دار کہلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ان کو اس کام کا کریڈٹ دیا جائے جس کو انھوں نے کیا نہیں۔ وہ نجاتِ اُخروی سے بے فکر ہو کر زندگی گزارتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایسے عقیدے بنا لیتے ہیں جس کے مطابق ان کو اپنی نجات بالکل محفوظ نظر آتی ہے۔ وہ اپنے گھڑے ہوئے دین پر چلتے ہیں مگر اپنے کو دین خداوندی کا عَلَم بردار بتاتے ہیں۔ وہ دنیوی مقاصد کے لیے سرگرم ہوتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں کو آخرت کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ خودساختہ سیاست چلاتے ہیں اور اس کو خدائی سیاست ثابت کرتے ہیں۔ وہ قومی مفادات کے لیے اٹھتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ خیر الامم کا کردار ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر کوئی شخص بے دینی کو دین کہنے لگے تو اس بنا پر وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا، آدمی دنیا کی طرف دوڑے اور آخرت سے بے پرواہو جائے تو یہ صرف گمراہی ہے اور اگر وہ اپنے دنیوی کاروبار کو خدا اور رسول کے نام پر کرنے لگے تو یہ گمراہی پر ڈھٹائی کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ یہ ایسے کام پر انعام چاہنا ہے جس کو آدمی نے انجام ہی نہیں دیا۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ

۱۹۰۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ ۱۹۱۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ ۱۹۲۔ اے ہمارے رب، تو نے جس کو آگ میں ڈالا، اس کو تو نے واقعی رسوا کردیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ ۱۹۳۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو

اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا
یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا ٭ۖ
رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ کَفِّرۡ عَنَّا
سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۳﴾ۚ رَبَّنَا
وَ اٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخۡزِنَا
یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۱۹۴﴾

سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ ۱۹۴۔ اے ہمارے رب، تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے کیے ہیں، ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک خاموش اعلان ہے۔ آدمی جب اپنے کان اور آنکھ سے مصنوعی پردوں کو ہٹاتا ہے تو وہ اس خاموش اعلان کو ہر طرف سننے اور دیکھنے لگتا ہے۔ اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی کائنات جس کے ستارے اور سیارے کھربوں سال تک بھی ختم نہیں ہوتے وہاں انسان اپنی تمام خواہشوں اور تمناؤں کو لیے ہوئے صرف پچاس سال اور سو سال میں ختم ہوجائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں درختوں کا حسن اور پھولوں کی لطافت ہے۔ جہاں ہوا اور پانی اور سورج جیسی بے شمار بامعنی چیزوں کا اہتمام کیا گیا ہے وہاں انسان کے لیے حزن اور غم کے سوا کوئی انجام نہ ہو۔ پھر یہ بھی اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی دنیا جہاں یہ اتھاہ امکان رکھا گیا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا بیج زمین میں ڈالا جائے تو اس کے اندر سے ہرے بھرے درخت کی ایک پوری کائنات نکل آئے وہاں آدمی نیکی کی زندگی اختیار کرکے بھی اس کا کوئی پھل نہ پاتا ہو۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر روز تاریک رات کے بعد روشن دن آتا ہے وہاں صدیاں گزر جائیں اور عدل وانصاف کا اجالا اپنی چمک نہ دکھائے۔ ایک ایسی دنیا جس کی گود میں زلزلے اور طوفان سو رہے ہیں۔ وہاں انسان ظلم پر ظلم کرتا رہے مگر کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا سامنے نہ آئے۔ جو لوگ حقیقتوں میں جیتے ہیں اور گہرائیوں میں اتر کر سوچتے ہیں ان کے لیے ناقابلِ یقین ہوجاتا ہے کہ ایک بامعنی کائنات بے معنی انجام پر ختم ہوجائے۔ وہ جان لیتے ہیں کہ حق کا داعی جو پیغام دے رہا ہے وہ نطق کی زبان میں اسی بات کا اعلان ہے، جو خاموش زبان میں ساری کائنات میں نشر ہو رہا ہے۔ ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ جب سچائی کھلے اور جب انصاف کا سورج نکلے تو اس دن وہ ناکام ونامراد نہ ہوجائیں، وہ اپنے رب کو پکارتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، وہ مفاد اور مصلحت کی تمام حدود کو توڑ کر داعی حق کے ساتھ ہوجاتے ہیں۔ تاکہ جب کائنات کا ''اجالا'' اور کائنات کا ''اندھیرا'' ایک دوسرے سے الگ کیے جائیں تو کائنات کا مالک ان کو اجالے میں جگہ دے، وہ ان کو اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کے لیے نہ چھوڑے۔

عقل اور بے عقلی کا حقیقی پیمانہ اس سے بالکل مختلف ہے جو انسانوں نے بطور خود بنا رکھا ہے۔ یہاں عقل والا وہ ہے جو اللہ کی یادیں جئے، جو کائنات کے تخلیقی منصوبہ میں کام کرنے والی خدائی معنویت کو پالے۔ اس کے برعکس، بے عقل وہ ہے جو اپنے دل ودماغ کو دوسری دوسری چیزوں میں اٹکائے، جو دنیا میں اس طرح زندگی گزارے جیسے کہ اس کو مالک کائنات کے تخلیقی منصوبہ کی خبر ہی نہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ
عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا
وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ
سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ
سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَ
اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ
تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ۭ
مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَ
بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ
لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا
عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَاِنَّ مِنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ
لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ

۱۹۵۔ ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور وہ لڑے اور مارے گئے، میں ان کی خطائیں ضرور ان سے دور کردوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کا بدلہ ہے اللہ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے۔ ۱۹۶۔ اور ملک کے اندر منکروں کی سرگرمیاں تم کو دھوکے میں نہ ڈالیں۔ ۱۹۷۔ یہ تھوڑا سا فائدہ ہے۔ پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔ ۱۹۸۔ البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کی میزبانی ہوگی اور جو کچھ اللہ کے پاس نیک لوگوں کے لیے ہے وہی سب سے بہتر ہے۔ ۱۹۹۔ اور بے شک اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کتاب کو بھی مانتے ہیں جو تمھاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب کو بھی مانتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، وہ اللہ کے آگے

أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ
اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۠ قف
وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾ ع ٢٠

جھکے ہوئے ہیں اور وہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔
۲۰۰۔ اے ایمان والو، صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہوگے۔

اہلِ ایمان کی ذمہ دارانہ زندگی ان کو نفس کی آزادیوں سے محروم کر دیتی ہے۔ ان کے اعلانِ حق میں بہت سے لوگوں کو اپنے وجود کی تردید دکھائی دینے لگتی ہے اور وہ ان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ صورت حال کبھی اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے وطن میں بے وطن کر دیے جاتے ہیں۔ ان کو مخالفین کی ظالمانہ کارروائیوں کے مقابلہ میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اللہ کے دین کو انھیں جان و مال کی قربانی کی قیمت پر اختیار کرنا ہوتا ہے۔ ان امتحانات میں پورا اترنے کے لیے اہل ایمان کو جو کچھ کرنا ہے وہ یہ کہ وہ دنیا کی مصلحتوں کی خاطر آخرت کی مصلحتوں کو بھول نہ جائیں۔ وہ مشکلات اور ناخوش گواریوں پر صبر کریں، وہ اپنے اندر ابھرنے والے منفی جذبات کو دبائیں اور متاثر ذہن کے تحت کوئی کارروائی نہ کریں۔ پھر ان کو باہر کے حریفوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا ہے۔ یہ ثابت قدمی ہی وہ چیز ہے جو اللہ کی نصرت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ تمام اہلِ ایمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہیں، وہ دینی جدوجہد کے لیے باہم جڑ جائیں اور ایک جان ہو کر اجتماعی قوت سے مخالف طاقتوں کا مقابلہ کریں۔ ایمان دراصل صبر کا امتحان ہے اور اس امتحان میں وہی شخص پورا اترتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔

دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے پروا لوگوں کو زور اور غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی عزتیں اور رونقیں ان کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف اہل ایمان اکثر حالات میں بے زور بنے رہتے ہیں۔ شان و شوکت کا کوئی حصہ ان کو نہیں ملتا۔ مگر یہ صورت حال انتہائی عارضی ہے۔ قیامت آتے ہی حالات بالکل بدل جائیں گے۔ بے خوفی کے راستہ سے دنیا کی عزتیں سمیٹنے والے رسوائی کے گڑھے میں پڑے ہوں گے اور خوفِ خدا کی وجہ سے بے حیثیت ہو جانے والے ہر قسم کی ابدی عزتوں اور کامیابیوں کے مالک ہوں گے۔ وہ اللہ کے مہمان ہوں گے اور اللہ کی مہمانی سے زیادہ بڑی کوئی چیز اس زمین و آسمان کے اندر نہیں۔

۴۔ سُوۡرَةُ النِّسَاۤء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَ بَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً‌ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَ الۡاَرۡحَامَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا ۝١ وَاٰتُوا الۡيَتٰمٰٓى اَمۡوَالَهُمۡ‌ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِيۡثَ بِالطَّيِّبِ‌ ۖ وَلَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَهُمۡ اِلٰٓى اَمۡوَالِكُمۡ‌ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوۡبًا كَبِيۡرًا ۝٢ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانْكِحُوۡا مَا طَابَ لَـكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ‌ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ‏ ۝٣ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً‌ ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَـكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓـئًـا مَّرِیۡٓـئًـا‏ ۝٤

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور خبردار رہو قرابت والوں سے۔ بے شک اللہ تمھاری نگرانی کر رہا ہے۔ ۲۔اور یتیموں کا مال ان کے حوالے کرو۔ اور برے مال کو اچھے مال سے نہ بدلو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ۳۔اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلو۔ اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو یا جو کنیز تمھاری ملک میں ہو۔ اس میں امید ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو گے۔ ۴۔اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔ پھر اگر وہ اس میں سے کچھ تمھارے لیے چھوڑ دیں اپنی خوشی سے تو تم اس کو ہنسی خوشی سے کھاؤ۔

تمام انسان باعتبار پیدائش ایک ہیں۔ بالآخر ایک ہی عورت اور ایک ہی مرد سب کے ماں اور باپ ہیں۔ اس لحاظ سے ضروری ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو اپنا سمجھے۔ سب کے سب ایک مشترک گھرانے کے افراد کی طرح مل جل کر انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ رہیں۔ پھر ان میں جو خونی رشتے ہیں ان میں یہ نسلی اتحاد اور زیادہ قریبی ہوجاتا ہے اس لیے خونی رشتوں میں حسن سلوک کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ انسان کے درمیان اس باہمی حسن سلوک کی اہمیت صرف اخلاقی اعتبار سے نہیں ہے بلکہ یہ خود آدمی کا اپنا ذاتی مسئلہ

ہے۔ کیوں کہ تمام انسانوں کے اوپر عظیم وبرتر خدا ہے۔ وہ آخر میں سب سے حساب لینے والا ہے اور دنیا میں ان کے عمل کے مطابق آخرت میں ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ انسان کے معاملہ کو صرف انسان کا معاملہ نہ سمجھے بلکہ اس کو اللہ کا معاملہ سمجھے۔ وہ اللہ کی پکڑ سے ڈرے اور اپنے آپ کو اس عمل کا پابند بنائے جو اس کو اللہ کے غضب سے بچانے والا ہو۔

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص رحم کو جوڑے گا اس سے جڑوں گا اور جو شخص رحم کو کاٹے گا میں اس سے کٹوں گا (مَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهُ) مسند احمد، حدیث نمبر 6494۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے تعلق کا امتحان بندوں سے تعلق کے معاملہ میں لیا جاتا ہے۔ وہی شخص اللہ سے ڈرنے والا ہے جو بندوں کے حقوق کے معاملے میں اللہ سے ڈرے، وہی شخص اللہ سے محبت کرنے والا ہے جو بندں کے ساتھ محبت میں اس کا ثبوت دے۔ یہ بات عام انسانی تعلقات میں بھی مطلوب ہے۔ مگر رحمی رشتوں سے حسن سلوک کے معاملے میں اس کی اہمیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ صرف اللہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

یتیم لڑکے اور لڑکیاں کسی خاندان یا سماج کا سب سے زیادہ کمزور حصہ ہوتے ہیں۔ اس لیے خدا سے ڈر کا سب سے زیادہ سخت امتحان یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کے بارے میں ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ یتیموں کے بارے میں وہی کرے جو انصاف اور خیر خواہی کا تقاضا ہو اور جس میں یتیموں کے حقوق زیادہ سے زیادہ محفوظ رہنے کی ضمانت ہو۔ یہ بہت گناہ کی بات ہے کہ مشترک اثاثہ کی ایسی تقسیم کی جائے جس میں اچھی چیزیں اپنے حصے میں رکھ لی جائیں اور دوسرے کے حصے میں خراب چیزیں ڈال کر گنتی پوری کر دی جائے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا

۵۔ اور نادانوں کو اپنا وہ مال نہ دو جس کو اللہ نے تمھارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے اور اس مال میں سے ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے بھلائی کی بات کہو۔ ٦۔ اور یتیموں کو جانچتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم ان میں ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔ اور ان کا مال اسراف سے اور اس خیال سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے نہ کھا جاؤ۔ اور جس کو حاجت نہ ہو وہ یتیم کے مال سے پرہیز کرے اور جو شخص محتاج ہو، وہ دستور کے موافق کھائے۔ پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالے کرو تو ان پر گواہ ٹھہرالو اور اللہ حساب لینے

تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ
مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ
اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝٧ وَ اِذَا حَضَرَ
الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ
فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝٨ وَ
لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً
ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۪ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا
قَوْلًا سَدِيْدًا ۝٩ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ
الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ
وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝١٠ ع

کے لیے کافی ہے۔ ۷۔ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں سے مردوں کا بھی حصہ ہے اور ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں سے عورتوں کا بھی حصہ ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، ایک مقرر کیا ہوا حصہ۔ ۸۔اور اگر تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور محتاج موجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان سے ہمدردی کی بات کہو۔ ۹۔اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ناتواں بچے چھوڑ جاتے تو انھیں ان کی بہت فکر رہتی۔ پس ان کو چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور بات پکی کہیں۔ ۱۰۔جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

مال نہ عیش کے لیے ہے اور نہ اظہار فخر کے لیے۔ وہ آدمی کے لیے زندگی کا ذریعہ ہے۔ وہ دنیا میں اس کے قیام وبقا کا سامان ہے۔ مال کا ذریعۂ زندگی ہونا ایک طرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کو بذات خود مقصود بنا لینا درست نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ انتہائی ضروری ہے کہ مال کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اور اس کو اس کے حق دار تک پہنچانے کا پورا اہتمام کیا جائے۔ کسی کے مال کو ٹھیک ٹھیک ادا نہ کرنا گویا خدا کے اس انتظام میں فساد ڈالنا ہے جو خدا نے اپنے بندوں کی رزق رسانی کے لیے کیا۔ یتیم کسی سماج کا سب سے کمزور حصہ ہوتا ہے اس لیے اس کے مال کی حفاظت اور اس کے معاملہ میں ہر قسم کے ظلم سے اپنے کو بچانا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ حتی کہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی انصاف کے مطابق ان کے ساتھ جو معاملہ کرے اس کو لکھ کر اس پر گواہی لے لے تاکہ سماج کے اندر شکایت اور اختلاف کی فضا پیدا نہ ہو اور وہ لوگوں کے سامنے بری الذمہ ہو سکے۔ جب بھی آدمی کے ہاتھ میں کسی کا معاملہ ہو تو اس کو یہ سمجھ کر معاملہ کرنا چاہیے کہ اس کی ہر کوتاہی اللہ کے علم میں ہے۔ صاحب معاملہ اپنی کمزوری کی وجہ سے خواہ اس کے خلاف کچھ نہ کر سکے مگر خدا اس کو ضرور قیامت کے دن پکڑے گا اور اگر اس نے حق کے خلاف معاملہ کیا ہے تو وہ اس کو سخت سزا دے گا اور اس کے لیے کسی طرح بھی خدا کی سزا سے بچنا ممکن نہ ہوگا۔

دنیا میں کمزور کا حق دبا کر آدمی خوش ہوتا ہے۔ مگر ہر ناجائز مال جو آدمی اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے، وہ گویا اپنے پیٹ میں آگ ڈال رہا ہے۔ دنیا میں ایسے مال کا آگ ہونا بظاہر محسوس نہیں ہوتا مگر آخرت میں یہ حقیقت کھل جائے گی۔ یہاں آدمی کو عمل کی آزادی ضرور دی گئی ہے مگر نتیجہ آدمی کے اپنے اختیار میں نہیں۔ جو شخص اپنے کو برے انجام سے بچانا چاہتا ہے اس کو دوسروں کے ساتھ بھی برا نہیں کرنا چاہیے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنے، وہ اپنی استعداد کے مطابق دوسروں کو دے۔ اگر کوئی شخص دینے کی حیثیت میں نہیں ہے تو آخری اسلامی درجہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کا دل نہ دکھائے، وہ اپنی زبان کھولے تو سیدھی اور سچی بات کہنے کے لیے کھولے، ورنہ خاموش رہے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّھُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ

۱۱۔ اللہ تم کو تمھاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر عورتیں دو سے زائد ہیں تو ان کے لیے دو تہائی ہے اس مال سے جو مورث چھوڑ گیا ہے، اور اگر وہ اکیلی ہے تو اس کے لیے آدھا ہے۔ اور میت کے ماں باپ کو دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اس مال کا جو وہ چھوڑ گیا ہے بشرطیکہ مورث کے اولاد ہو۔ اور اگر مورث کے اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا تہائی حصہ ہے اور اگر اس کے بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ یہ حصے وصیت نکالنے کے بعد یا ادائے قرض کے بعد ہیں جو وہ کر جاتا ہے۔ تمھارے باپ ہوں یا تمھارے بیٹے ہوں، تم نہیں جانتے کہ ان میں تمھارے لیے سب سے زیادہ نافع کون ہے۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے۔ بے شک اللہ علم والا، حکمت والا ہے۔ ۱۲۔ اور تمھارے لیے اس مال کا آدھا حصہ ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑیں، بشرطیکہ ان کے اولاد نہ ہو۔ اور اگر ان کے اولاد ہو تو تمھارے لیے بیویوں کے ترکہ کا چوتھائی حصہ ہے وصیت نکالنے کے بعد

بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾ ع ۲ ۱۳

جس کی وہ وصیت کر جائیں یا ادائے قرض کے بعد۔ اور ان بیویوں کے لیے چوتھائی حصہ ہے تمھارے ترکہ کا اگر تمھارے اولاد نہیں ہے، اور اگر تمھارے اولاد ہے تو ان کے لیے آٹھواں حصہ ہے تمھارے ترکہ کا بعد وصیت نکالنے کے جس کی تم وصیت کر جاؤ یا ادائے قرض کے بعد۔ اور اگر کوئی مورث مرد یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں اور نہ فروع، اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ اور اگر وہ اس سے زائد ہوں، تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے بعد وصیت نکالنے کے جس کی وصیت کی گئی ہو یا ادائے قرض کے بعد، بغیر کسی کو نقصان پہنچائے۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ علیم اور حلیم ہے۔ ۱۳۔ یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۱۴۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے مقرر کیے ہوئے ضابطوں سے باہر نکل جائے گا، اس کو وہ آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت والا عذاب ہے۔

آدمی جو قانون بناتا ہے اس میں کسی نہ کسی پہلو کی طرف جھکاؤ ہو جاتا ہے۔ قدیم قبائلی دور میں لڑکا بہت اہمیت رکھتا تھا۔ کیوں کہ وہ قبیلہ کے لیے طاقت کا ذریعہ تھا۔ اس لیے وراثت میں لڑکی کو محروم کر کے سارا حق لڑکے کو دے دیا گیا۔ موجودہ زمانے میں اس کا ردعمل ہوا تو لڑکا اور لڑکی دونوں برابر کر دیے گئے۔ لیکن پچھلا اصول اگر غیر منصفانہ تھا تو موجودہ اصول غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ صرف اللہ ہے جس کا علم وحکمت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ جو قانون دے وہ ہر قسم کی بے اعتدالی سے پاک ہو۔ اللہ نے اس

سلسلہ میں جوضابطے مقرر کیے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ سماجی انصاف کا حقیقی ذریعہ ہیں بلکہ آخرت کی زندگی سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔ یتیموں کے حقوق ادا کرنا، وصیت کی تعمیل کرنا، وراثت کو اس کے وارثوں تک پہنچانا ان امور میں سے ہیں جن پر آدمی کی دوزخ اور جنت کا انحصار ہے۔ 1/3 حصہ میں وصیت کرنا شرعاً جائز ہے۔ لیکن کوئی شخص ایسی وصیت کرے جس کا مقصد حق دار کو وراثت سے محروم کرنا ہو تو یہ ایسا گناہ ہے جو اس کو جہنم کا مستحق بنا سکتا ہے (مَنْ ضَارَّ فِي وَصِيَّتِهِ أَلْقَاهُ اللّٰهُ فِي وَادِي جَهَنَّمَ) البحر المحیط لأبی حیان الأندلسی، جلد 3، صفحہ 549۔ اس معاملہ میں آدمی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے ضابطہ پر چلنا ہے، نہ کہ ذاتی خواہشوں اور خاندانی مصلحتوں کے اوپر۔

وَ الّٰتِيۡ يَاۡتِيۡنَ الۡفَاحِشَةَ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ فَاسۡتَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِنَّ اَرۡبَعَةً مِّنۡكُمۡ ۚ فَاِنۡ شَهِدُوۡا فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ فِي الۡبُيُوۡتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ يَجۡعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيۡلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ يَاۡتِيٰنِهَا مِنۡكُمۡ فَاٰذُوۡهُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۷﴾ وَ لَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّيۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۸﴾

۱۵۔ اور تمھاری عورتوں میں سے جو کوئی بدکاری کرے تو ان پر اپنوں میں سے چار مرد گواہ کرو۔ پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھو، یہاں تک کہ ان کو موت اٹھالے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے۔ ۱۶۔ اور تم میں سے دو مرد جو وہی بدکاری کریں تو ان کو اذیت پہنچاؤ۔ پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان کا خیال چھوڑ دو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔ ۱۷۔ توبہ، جس کو قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے، وہ ان لوگوں کی ہے جو بری حرکت نادانی سے کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کرلیتے ہیں۔ وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۱۸۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو برابر گناہ کرتے رہیں، یہاں تک کہ جب موت ان میں سے کسی کے سامنے آجائے تب وہ کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ منکر ہیں، ان کے لیے تو ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

کوئی مرد یا عورت اگر ایسا فعل کر بیٹھے جو شریعت کے نزدیک گناہ ہو تب بھی اس کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے

گا وہ قانون کے مطابق کیا جائے گا، نہ کہ قانون سے آزاد ہو کر۔ قانون کے تقاضے پورا کیے بغیر کسی کو مجرم قرار دینا درست نہیں۔ کسی کا مجرم ہونا دوسرے کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس کے خلاف ظالمانہ کارروائی کرنے لگے۔ سزا کا مقصد عدل کا قیام ہے، اور عدل کا قیام ظلم اور بے انصافی کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ اور اگر گناہ کرنے والا تائب ہو اور اپنی اصلاح کرلے تو اس کے بعد تو لازم ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ شفقت اور درگزر کا معاملہ کیا جائے۔ کسی کے ماضی کی بنیاد پر اس کو مطعون کرنا درست نہیں۔ جب اللہ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اپنی اصلاح کرلینے والوں کی طرف دوبارہ مہربانی کے ساتھ پلٹ آتا ہے تو انسانوں کو کیا حق ہے کہ ایسے کسی شخص کو طنز وملامت کا نشانہ بنائیں۔ ایسے کسی شخص کو طنز وملامت کا نشانہ بنا کر آدمی خود اپنے آپ کو مجرم ثابت کر رہا ہے نہ کہ کسی دوسرے آدمی کو۔

توبہ زبان سے "توبہ" کا لفظ بولنے کا نام نہیں۔ یہ اپنی گنہ گاری کے شدید احساس کا نام ہے۔ اور آدمی اگر اپنی توبہ میں سنجیدہ ہو اور واقعی شدت کے ساتھ اس نے اپنی گنہ گاری کو محسوس کیا ہو تو وہ آدمی کے لیے اتنا سخت معاملہ ہوتا ہے کہ توبہ آدمی کے لیے اپنی سزا آپ دینے کے ہم معنی بن جاتی ہے۔ یہ کیفیت آدمی کے اندر اگر اللہ کے ڈر سے پیدا ہوئی ہو تو اللہ ضرور اس کو معاف کر دیتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے توبہ کی اللہ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں جو اتنے جری ہوں کہ جان بوجھ کر اللہ کی نافرمانی کرتے رہیں۔ اور تنبیہ کے باوجود اس پر قائم رہیں، البتہ جب دنیا سے جانے کا وقت آجائے تو کہیں کہ "میں نے توبہ کی"، اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی بے فائدہ ہے جو آخرت میں عذاب کو سامنے دیکھ کر اپنے جرم کا اقرار کریں گے۔

توبہ کی حقیقت بندے کا اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے تاکہ اس کا رب بھی اس کی طرف پلٹے۔ توبہ اس شخص کے لیے ہے جو وقتی جذبہ سے مغلوب ہو کر بری حرکت کر بیٹھے، پھر اس کا احتسابِ نفس جلد ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس کرادے۔ وہ برائی کو چھوڑ کر دوبارہ نیکی کی روش اختیار کرے اور شریعت کے مطابق اپنی زندگی کی اصلاح کرلے۔ ایسا ہی آدمی توبہ کرنے والا ہے اور جو شخص اس طرح توبہ کرے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے گھر کا بھٹکا ہوا آدمی دوبارہ اپنے گھر واپس آجائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا ‌ؕ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ‌ ۚ وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ ۚ فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا

۱۹۔ اے ایمان والو، تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی اپنی میراث میں لے لو اور نہ ان کو اس غرض سے روکے رکھو کہ تم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ ان سے لے لو، مگر اس صورت میں کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کریں۔ اور ان کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمھارے لیے بہت بڑی

كَثِيْرًا ﴿١٩﴾ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ
مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا
تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا
وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿٢٠﴾ وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ
اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ
مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿٢١﴾ وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ
اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ
ع ۳ ۸ ۱۴ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿٢٢﴾

بھلائی رکھ دی ہو۔ ۲۰۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اس کو بہت سا مال دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تم اس کو بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے۔ ۲۱۔ اور تم کس طرح اس کو لو گے جب کہ ایک، دوسرے سے خلوت کر چکا ہے اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ ۲۲۔ اور ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہیں، مگر جو پہلے ہو چکا۔ بے شک یہ بے حیائی ہے اور نفرت کی بات ہے اور بہت برا طریقہ ہے۔

مرنے والے کے مال میں یقیناً بعد والوں کو وراثت کا حق ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مرنے والے کی بیوی کو بھی بعد کے لوگ اپنی میراث سمجھ لیں اور جس طرح چاہیں اس کو استعمال کریں۔ مال ایک بے حس اور محکوم چیز ہے اور اس میں وراثت چلتی ہے۔ مگر انسان ایک زندہ اور آزاد ہستی ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے — عورت میں اگر کوئی جسمانی یا مزاجی کمی ہے تو اس کو برداشت کرتے ہوئے عورت کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اللہ کی دی ہوئی دوسری خصوصیتوں کو بروئے کار لا کر گھر کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرے۔ آدمی کو چاہیے کہ ظاہری ناپسندیدگی کو بھول کر باہمی تعلق کو نبھائے۔ کسی خاندان اور اسی طرح کسی معاشرہ کی ترقی واستحکام کا راز یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کی کمیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی خوبیوں کو بروئے کار آنے کا موقع دیں۔ جو لوگ اللہ کی خاطر موجودہ دنیا میں صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کریں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی جنّتوں میں داخل کیے جائیں گے۔

جب آدمی کو اپنا شریک حیات ناپسند ہو اور وہ صبر کا طریقہ اختیار نہ کر کے علیٰحدگی کا فیصلہ کرے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس علیحدگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے وہ دوسرے فریق کی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ وہ اس پر جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ وہ اس کے خلاف ظالمانہ کارروائی کرتا ہے تاکہ وہ گھبرا کر خود ہی بھاگ جائے۔ اسی طرح جب آدمی کسی سے تعلق توڑتا ہے تو ضد میں آکر فریق ثانی کو دی ہوئی چیزیں اس سے واپس چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہ سب عہد کی خلاف ورزی ہے اور عہد اللہ کی نظر میں ایسی مقدس چیز ہے کہ اگر وہ غیر تحریری شکل میں ہو تب بھی اس کی پابندی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ تحریری عہد کی۔

''جو ہو چکا سو ہو چکا'' کا اصول صرف نکاح سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عام اصول ہے۔ زندگی کے نظام میں جب بھی کوئی تبدیلی آتی ہے، خواہ وہ گھریلو زندگی میں ہو یا قومی زندگی میں، تو ماضی کے بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جو نئے انقلاب کے معیار پر غلط نظر آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ماضی کو کریدنا اور گزری ہوئی غلطیوں پر احکام صادر کرنا بے شمار نئے مسائل پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ماضی کو بھلا دیا جائے اور صرف حال اور مستقبل کی اصلاح پر اپنی کوششیں لگا دی جائیں۔

''اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے گزر بسر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس کے اندر تمھارے لیے کوئی بڑی بھلائی رکھ دی ہو'' — یہ فقرہ یہاں اگرچہ میاں بیوی کے تعلق کے بارے میں آیا ہے مگر اس کے اندر ایک عمومی تعلیم بھی ہے۔ قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ ایک متعین معاملہ کا حکم بتاتے ہوئے اس کے درمیان ایک ایسی کلی ہدایت دے دیتا ہے جس کا تعلق آدمی کی پوری زندگی سے ہو۔

دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے مل جل کر رہنا ناگزیر ہے۔ کوئی شخص بالکل الگ تھلگ زندگی گزار نہیں سکتا۔ اب چوں کہ طبیعتیں الگ الگ ہیں، اس لیے جب بھی کچھ لوگ مل کر رہیں گے ان کے درمیان لازماً شکایات پیدا ہوں گی۔ ایسی حالت میں قابلِ عمل صورت صرف یہ ہے کہ شکایتوں کو نظر انداز کیا جائے اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعلق کو نبھانے کا اصول اختیار کیا جائے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے ساتھی کی ایک خرابی آدمی کے سامنے آتی ہے اور وہ بس اسی کو لے کر اپنے ساتھی سے روٹھ جاتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ سوچے تو وہ پائے گا کہ ہر ناموافق صورت حال میں کوئی خیر کا پہلو موجود ہے۔ کبھی کسی واقعہ میں آدمی کے لیے صبر کی تربیت کا امتحان ہوتا ہے۔ کبھی اس کے اندر اللہ کی طرف رجوع اور انابت کی غذا ہوتی ہے۔ کبھی ایک چھوٹی سی تکلیف میں کوئی بڑا اسبق چھپا ہوا ہوتا ہے، وغیرہ۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ أَبْنَآئِكُمُ

۲۳۔ تمھارے اوپر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، تمھاری بیٹیاں، تمھاری بہنیں، تمھاری پھوپھیاں، تمھاری خالائیں، تمھاری بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا، تمھاری دودھ شریک بہنیں، تمھاری عورتوں کی مائیں اور ان کی بیٹیاں جو تمھاری پرورش میں ہیں جو تمھاری ان بیویوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے، لیکن اگر ابھی تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور تمھارے صلبی بیٹوں کی بیویاں اور یہ کہ تم اکھٹا کرو

الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ
الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿23﴾ وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ
النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاۗءَ ذٰلِكُمْ اَنْ
تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ
مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْھُنَّ
اُجُوْرَھُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿24﴾ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ
مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ
فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ
الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ
مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِهِنَّ
وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ
غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ
اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ
مَا عَلَي الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ
لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا

دو بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ☆ ۲۴۔ اور وہ عورتیں بھی حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں، مگر یہ کہ وہ جنگ میں تمھارے ہاتھ آئیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے تمھارے اوپر۔ ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں، وہ سب تمھارے لیے حلال ہیں بشرطیکہ تم اپنے مال کے ذریعہ سے ان کے طالب بنو، ان کو قیدِ نکاح میں لے کر، نہ کہ بدکاری کے طور پر۔ پھر ان عورتوں میں سے جن کو تم کام میں لائے، ان کو ان کا طے شدہ مہر دے دو۔ اور مہر کے ٹھہرانے کے بعد جو تم نے آپس میں راضی نامہ کیا ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۲۵۔ اور تم میں سے جو شخص قدرت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو اس کو چاہیے کہ وہ تمھاری ان کنیزوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمھارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں۔ اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے، تم آپس میں ایک ہو۔ پس ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لو اور معروف طریقہ سے ان کے مہر ادا کر دو، اس طرح کہ وہ قید نکاح میں لائی جائیں، نہ کہ آزاد شہوت رانی کریں اور چوری چھپے آشنائیاں کریں۔ پھر جب وہ قید نکاح میں آ جائیں اور اس کے بعد وہ بدکاری کی مرتکب ہوں تو آزاد عورتوں کے لیے جو سزا ہے اس کی نصف سزا ان پر ہے۔ یہ اس کے لیے ہے جو تم میں سے بدکاری کا اندیشہ رکھتا ہو۔ اور اگر تم ضبط

ع خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۵ ع

سے کام لو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

انسان کے اندر بہت سی فطری خواہشیں ہیں۔ انھیں میں سے ایک شہوانی خواہش ہے جو عورت اور مرد کے درمیان پائی جاتی ہے۔ شریعت تمام انسانی جذبات کی حد بندی کرتی ہے۔ اسی طرح اس نے شہوانی جذبات کے لیے بھی حدود اور ضابطے مقرر کیے ہیں۔ شریعت الٰہی کے مطابق عورت اور مرد کے درمیان صرف وہی شہوانی تعلق صحیح ہے جو نکاح کی صورت میں ایک سنجیدہ معاشرتی معاہدہ کی حیثیت سے قائم ہو۔ پھر یہ کہ جس طرح فطری جذبات کی تسکین ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ خاندانی زندگی میں تقدس کی فضا موجود رہے۔ اس مقصد کے لیے نسب یا رضاعت یا مصاہرت کے تحت قائم ہونے والے کچھ رشتوں کو حرام قرار دے دیا گیا تاکہ بالکل قریبی رشتوں کے درمیان تعلق، شہوانی جذبات سے اوپر رہے۔

انسان کی عزت و بڑائی کا معیار وہ دکھائی دینے والی چیزیں نہیں ہیں جن پر لوگ ایک دوسرے کی عزت و بڑائی کو ناپتے ہیں۔ بلکہ بڑائی کا معیار وہ نہ دکھائی دینے والا ایمان ہے جو صرف اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ گویا کسی کا عزت والا ہونا یا بے عزت والا ہونا ایسی چیز نہیں جو آدمی کو معلوم ہو۔ یہ تمام تر نامعلوم چیز ہے اور اس کا فیصلہ آخرت میں اللہ کی عدالت میں ہونے والا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو آدمی سے برتری کا احساس چھین لیتا ہے۔ اور برتری کا احساس ہی وہ چیز ہے جو بیشتر معاشرتی خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝۲۷ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝۲۸

۲۶۔ اللہ چاہتا ہے کہ وہ تمھارے واسطے بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور تم پر توجہ کرے، اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۲۷۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ وہ تمھارے اوپر توجہ کرے اور جو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے بہت دور نکل جاؤ۔ ۲۸۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ کو ہلکا کرے، اور انسان کمزور بنایا گیا ہے۔

زندگی کے طریقے جو قرآن میں بتائے گئے ہیں وہ کوئی نئے نہیں ہیں۔ ہر دور میں اللہ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ان کا اعلان کراتا رہا ہے۔ ہر زمانہ کے خدا پرست لوگوں کا اسی پر عمل تھا۔ مگر قدیم آسمانی کتابوں کے محفوظ نہ رہنے کی وجہ سے یہ طریقے گم ہو گئے۔ اب اللہ نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ ان کو عربی زبان میں

اتارا اور ان کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ آج جب کوئی گروہ ان طریقوں پر اپنی زندگی کو ڈھالتا ہے تو گویا وہ صالحین کے اس ابدی قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے جن کو اللہ کی رحمتوں میں حصہ ملا، جو ہر زمانہ میں اللہ کے اُس راستہ پر چلے جس کو اللہ نے اپنے وفادار بندوں کے لیے کھولا تھا۔

ہر انسانی گروہ میں ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں صدیوں کے رواج سے جڑ جما لیتی ہیں۔ وہ لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ ان کے خلاف سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب اللہ کا کوئی بندہ معاشرتی اصلاح کا کام شروع کرتا ہے تو اس قسم کے لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ اپنے مانوس طریقوں کو چھوڑ کر نامانوس طریقوں کو اختیار کرنا ان کے لیے سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی اصلاحی تحریک کے دشمن بن جاتے ہیں، جو ان کو ان کے باپ دادا کے طریقوں سے ہٹانا چاہتی ہو۔ اس سلسلہ میں مذہبی طبقہ کا ردعمل اور بھی زیادہ شدید ہوتا ہے۔ جب دین کا اندرونی پہلو کمزور ہوتا ہے تو خارجی موشگافیاں جنم لیتی ہیں۔ اب آداب وقواعد کا ایک ظاہری ڈھانچہ بنا لیا جاتا ہے۔ لوگ دین کی اصلی کیفیات سے خالی ہوتے ہیں اور ظاہری آداب وقواعد کی پابندی کر کے سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کے دین پر قائم ہیں۔ یہ خود ساختہ دین اسلاف سے منسوب ہو کر دھیرے دھیرے مقدس بن جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خدا کا سادہ اور فطری دین ان کو اجنبی معلوم ہوتا ہے، اور اپنا جکڑ بندیوں والا دین عین برحق نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں جو تحریک اصلی اور ابتدائی دین کو زندہ کرنے کے لیے اٹھے وہ اس کے شدید مخالف بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں ان کو اپنی دین داری کی نفی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً خدا کی شریعت میں حیض کے زمانہ میں عورت کے ساتھ مباشرت ناجائز ہے، اس کے علاوہ دوسرے تعلقات اسی طرح رکھے جاسکتے ہیں جس طرح عام دنوں میں ہوتے ہیں۔ یہودیوں نے اس سادہ حکم پر اضافہ کر کے یہ مسئلہ بنایا کہ ایام ماہواری میں عورت کی پکائی ہوئی چیز کو کھانا، اس کے ہاتھ کا پانی پینا، اس کے ساتھ ایک جگہ بیٹھنا، اس کو اپنے ہاتھ سے چھونا، سب ناجائز یا کم از کم تقویٰ کے خلاف ہے۔ اس طرح حائضہ عورت سے مکمل دوری گویا پارسائی کی علامت بن گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جب خدا کی اصلی شریعت کو زندہ کیا تو یہودی بگڑ گئے۔ وہ چیز جس پر انھوں نے اپنی پارسائی کی عمارت کھڑی کی تھی دفعۃً گرتی ہوئی نظر آئی — خدا کے سادہ دین کو جب بھی زندہ کیا جائے تو وہ لوگ اس کے سخت مخالف ہو جاتے ہیں، جو بناوٹی دین کے اوپر اپنی دین داری کی عمارت کھڑی کیے ہوئے ہوں۔ یہ ان سے سرداری چھیننے کے ہم معنی ہوتا ہے اور سرداری کا چھننا کوئی برداشت نہیں کرتا۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

۲۹۔ اے ایمان والو، آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے۔ اور خون نہ کرو آپس میں۔ بے شک اللہ تمھارے اوپر بڑا مہربان

كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٢٩﴾ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿٣٠﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ
مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾ وَ لَا تَتَمَنَّوْا
مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٣٢﴾ وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا
مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ
الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿٣٣﴾ ع ٥ ٨ ٢

ہے۔ ۳۰۔ اور جو شخص سرکشی اور ظلم سے ایسا کرے گا، اس کو ہم ضرور آگ میں ڈالیں گے۔ اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔ ۳۱۔ اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچتے رہے جن سے تمھیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمھاری چھوٹی برائیوں کو معاف کردیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔ ۳۲۔ اور تم ایسی چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ مردوں کے لیے حصہ ہے اپنی کمائی کا اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اپنی کمائی کا۔ اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ۳۳۔ اور ہم نے والدین اور قرابت مندوں کے چھوڑے ہوئے میں سے ہر ایک کے لیے وارث ٹھہرادئے ہیں اور جن سے تم نے عہد باندھ رکھا ہو تو ان کو ان کا حصہ دے دو، بے شک اللہ کے روبرو ہے ہر چیز۔

ایک کا مال دوسرے تک پہنچنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے کی ضرورت فراہم کرے اور اس سے اپنی محنت کا معاوضہ لے۔ یہ تجارت ہے اور شریعت کے مطابق، یہی کسب معاش کا صحیح طریقہ ہے۔ اس کے بجائے چوری، دھوکا، جھوٹ، رشوت، سود، جوا وغیرہ سے جو مال کمایا جاتا ہے وہ خدا کی نظر میں ناجائز طریقے سے کمایا ہوا مال ہے۔ یہ لوٹ کی مختلف قسمیں ہیں، اور جو لوگ تجارت کے بجائے لوٹ کو اپنا ذریعہ معاش بنائیں خواہ وہ دنیا میں کامیاب رہیں مگر آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔ آدمی کی جان کا معاملہ بھی یہی ہے۔ آدمی کو مارنے کا حق صرف ایک قائم شدہ حکومت کو ہے جو خدا کے قانون کے تحت باقاعدہ الزام ثابت ہونے کے بعد اس کے خلاف کارروائی کرے۔ اس کے سوا جو شخص کسی کو اس کی زندگی سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ فعل حرام کا ارتکاب کرتا ہے جس کے لیے اللہ کے یہاں سخت سزا ہے۔ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا جرم عدوان اور سرکشی ہے، یعنی حد سے نکلنا اور ناحق کسی کو ستانا۔ جو لوگ عدوان اور ظلم سے اپنے کو بچائیں ان کے ساتھ اللہ یہ خصوصی معاملہ فرمائے گا کہ وہ آخرت کی دنیا میں اس طرح داخل ہوں گے کہ ان کی معمولی کوتاہیاں اور لغزشیں ان سے دور کی جا چکی ہوں گی۔

دنیا میں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان فرق رکھا گیا ہے۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں کم حصہ ملا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کوئی اچھے حالات میں پیدا ہوتا ہے اور کوئی برے حالات میں۔ کسی کے پاس بڑے بڑے ذرائع ہیں اور کسی کے پاس معمولی ذرائع۔ آدمی جب کسی دوسرے کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھتا ہے تو اس کے اندر فوراً اس کے خلاف جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے اجتماعی زندگی میں حسد، عداوت اور باہمی کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ مگر ان چیزوں کے اعتبار سے اپنے یا دوسرے کو تولنا نادانی ہے۔ یہ سب دنیوی اہمیت کی چیزیں ہیں۔ یہ دنیا میں ملی ہیں اور دنیا ہی میں رہ جانے والی ہیں۔ اصل اہمیت آخرت کی کامیابی کی ہے اور آخرت کی کامیابی میں ان چیزوں کا کچھ بھی دخل نہیں۔ آخرت کی کامیابی کا انحصار اس عمل پر ہے جو آدمی ارادہ واختیار سے اللہ کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے بہترین عقل مندی یہ ہے کہ آدمی حسد سے اپنے آپ کو بچائے اور اللہ سے توفیق کی دعا کرتے ہوئے اپنے آپ کو آخرت کے لیے عمل کرنے میں لگا دے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ
اللّٰهُ بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ وَّبِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ
اَمۡوَالِهِمۡ‌ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ
لِّلۡغَيۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ‌ ؕ وَالّٰتِىۡ تَخَافُوۡنَ
نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِى
الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ‌ ۚ فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ
فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلِيًّا كَبِيۡرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ
بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا
مِّنۡ اَهۡلِهَا‌ ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ
اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا
خَبِيۡرًا ﴿۳۵﴾

۳۴۔ مرد، عورتوں کے اوپر قوام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال خرچ کیے۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والی، پیٹھ پیچھے نگہبانی کرتی ہیں اللہ کی حفاظت سے۔ اور جن عورتوں سے تم کو سرکشی کا اندیشہ ہو، ان کو سمجھاؤ اور ان کو ان کے بستر میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو سزا دو۔ پس اگر وہ تمھاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف الزام کی راہ نہ تلاش کرو۔ بے شک اللہ سب سے اوپر ہے، بہت بڑا ہے۔ ۳۵۔ اور اگر تمھیں میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک منصف، مرد کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو اور ایک منصف، عورت کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، خبردار ہے۔

جہاں بھی آدمیوں کا کوئی مجموعہ ہو، خواہ وہ خاندان کی صورت میں ہو یا مملکت کی صورت میں، ضروری ہے

کہ اس کے اوپر سردار اور سربراہ ہو، اور یہ سربراہ لازماً ایک ہی ہوسکتا ہے۔ دنیا کے بارے میں اللہ کا بنایا ہوا جو منصوبہ ہے اس میں خاندان کی سربراہی کے لیے مرد کو متعین کیا گیا ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ مرد کی بناوٹ اور عورت کی بناوٹ میں جو حیاتیاتی اور نفسیاتی فرق ہے وہ اللہ کے اسی تخلیقی منصوبہ کی مطابقت میں ہے۔ اب اگر کچھ لوگ اللہ کے منصوبہ کے خلاف چلیں تو وہ صرف بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بنیں گے۔ کیوں کہ خدا کا کارخانہ تو مرد اور عورت کو بدستور اپنے منصوبہ کے مطابق بناتا رہے گا جس میں ''قوامیت'' کی صلاحیتیں مرد کو دی گئی ہوں گی اور ''اطاعت'' کی صلاحیتیں عورت کو۔ جب کہ ان کے معاشرتی استعمال میں خدائی تخلیق کی رعایت نہ ہورہی ہوگی۔ ایسے ہر تضاد کا نتیجہ اس دنیا میں صرف بگاڑ ہے۔

بہترین عورت وہ ہے جو اللہ کے تخلیقی منصوبہ میں اپنے کو شامل کرتے ہوئے مرد کی برتری تسلیم کرلے۔ اسی طرح بہترین مرد وہ ہے جو اپنی برتر حیثیت کی بنا پر اس حقیقت کو بھول نہ جائے کہ خدا اس سے بھی زیادہ برتر ہے۔ خدا کی عدالت میں عورت مرد کا کوئی فرق نہیں، یہ فرق تمام تر صرف انتظام دنیا کے اعتبار سے ہے، نہ کہ آخرت میں تقسیم انعامات کے اعتبار سے۔ مرد کو چاہیے کہ وہ عورت کے حق میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا پورا اہتمام کرے۔ کوئی عورت اگر ایسی ہو جو مرد کی انتظامی بڑائی کو نہ مانے تو ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ مرد کے اندر انتقام کا جذبہ ابھر آئے یا وہ الزمات لگا کر عورت کو بدنام کرے۔ کوئی بھی برتری کسی کو انصاف کی پابندی سے بری الذمہ نہیں کرتی۔ البتہ خصوصی حالات میں مرد کو یہ حق ہے کہ عورت کے اندر اگر وہ سرتابی دیکھے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ یہ اصلاح اولاً سمجھانے بجھانے سے شروع ہوگی۔ پھر دباؤ ڈالنے کے لیے ترکِ کلام اور ترکِ تعلق کیا جاسکتا ہے، وغیرہ۔

دو آدمیوں میں جب باہمی اختلاف ہو تو دونوں کا ذہن ایک دوسرے کے بارے میں متاثر ذہن بن جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں خالص واقعاتی انداز سے سوچ نہیں پاتے۔ ایسی حالت میں معاملہ کو طے کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں اپنے سوا کسی دوسرے کو حَکَم (arbitrator) بنانے پر راضی ہوجائیں۔ دوسرا شخص معاملہ سے ذاتی طور پر وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے گا اور ایسے فیصلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے گا جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہو۔

وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ وَ مَا مَلَکَتۡ

۳۶۔ اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ اور اچھا سلوک کرو ماں باپ کے ساتھ اور قرابت داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں اور قرابت دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ اور مملوک

اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا
فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ
النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾
وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ
يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾
وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ
عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ
اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

کے ساتھ۔ بے شک اللہ پسند نہیں کرتا اترانے والے، بڑائی کرنے والے کو۔ ۳۷۔ جو کہ بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل سکھاتے ہیں اور جو کچھ انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔ اور ہم نے منکروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۳۸۔ اور جو لوگ اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو وہ بہت برا ساتھی ہے۔ ۳۹۔ ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے اور اللہ نے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے۔ اور اللہ ان سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۴۰۔ بے شک اللہ ذرا بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اگر نیکی ہو تو وہ اس کو دگنا بڑھا دیتا ہے اور اپنے پاس سے بہت بڑا ثواب دیتا ہے۔

انسان کے پاس جو کچھ ہے سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے، وہ اس کا عبادت گزار بن جائے۔ جب آدمی اس طرح اللہ والا بنتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر تواضع کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مزاج ان انسانوں سے تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے جن کے درمیان وہ زندگی گزار رہا ہو۔ اس کا یہ مزاج ماں باپ کے معاملہ میں حسن سلوک کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہر شخص جس سے اس کا واسطہ پڑتا ہے وہ اس کو ایسا انسان پاتا ہے جیسے وہ اللہ کو اپنے اوپر کھڑا ہوا دیکھ رہا ہو۔ وہ ہر ایک کا حق اس کے تعلق کے موافق اور اس کی حاجت مندی کے مناسب ادا کرنے والا بن جاتا ہے۔ جو شخص بھی کسی حیثیت سے اس کے رابطے میں آتا ہے اس کو نظر انداز کرنا اس کو ایسا لگتا ہے جیسے وہ خود اپنے کو اللہ کے یہاں نظر انداز کیے جانے کا خطرہ مول لے رہا ہے۔

جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے نہ کرے اس کے اندر فخر کی نفسیات ابھرتی ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے اس کو وہ اپنی محنت و قابلیت کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کمائی کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔ کمزور

رشتہ داروں یا محتاجوں سے تعلق جوڑنا اس کو اپنے مقام سے نیچے درجہ کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنی مصلحتوں یا خواہشوں کی تسکین میں خوب مال خرچ کرتا ہے مگر وہ مدیں جن میں خرچ کرنا اس کی انا کو غذا دینے والا نہ ہو وہاں خرچ کرنے میں اس کا دل تنگ ہوتا ہے۔ نمائش کے مواقع پر خرچ کرنے میں وہ فیاض ہوتا ہے اور خاموش دینی مواقع پر خرچ کرنے میں بخیل۔ جو لوگ خدا کی نعمت سے تواضع کے بجائے فخر کی غذا لیں، جو خدا کے دیے ہوئے مال کو خدا کی بتائی ہوئی جگہوں میں خرچ نہ کریں، البتہ اپنے نفس کے تقاضوں پر خرچ کرنے کے لیے فیاض ہوں، ایسے لوگ شیطان کے ساتھی ہیں۔ شیطان نے ان کو کچھ سامنے کا نفع دکھایا تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑے اور خدا جس ابدی نفع کا وعدہ کر رہا تھا اس سے ان کو دل چسپی نہ ہو سکی۔ ان کے لیے خدا کے یہاں سخت عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔ آدمی خود جو کام نہ کرے اس کو وہ غیر اہم بتاتا ہے۔ یہ اپنے معاملہ کو نظریاتی معاملہ بنانا ہے، یہ اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ مگر اس قسم کی کوئی بھی کوشش اللہ کے یہاں کسی کے کام آنے والی نہیں۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ
جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى
بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ
ع ۶/۲ حَدِيْثًا ﴿٤٢﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا
الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا
تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى
تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ
اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ
النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا
طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٤٣﴾

۴۱۔ پھر اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور تم کو ان لوگوں کے اوپر گواہ بنا کر کھڑا کریں گے۔ ۴۲۔ وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اور پیغمبر کی نافرمانی کی، وہ اس روز تمنا کریں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جائے، اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔ ۴۳۔ اے ایمان والو، نزدیک نہ جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو تم کہتے ہو، اور نہ اس وقت جب کہ غسل کی حاجت ہو مگر سفر کرتے ہوئے، یہاں تک کہ غسل کر لو۔ اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے حاجت سے آیا ہو یا تم عورتوں کے پاس گئے ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کر لو اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو، بے شک اللہ معاف کرنے والا، بخشنے والا ہے۔

حق کا داعی جب آتا ہے تو وہ ایک معمولی انسان کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے گرد ظاہری بڑائیاں

اور رونقیں جمع نہیں ہوتیں۔ اس لیے وقت کے بڑے اس کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ ایک ایسا شخص بھی ان سے زیادہ حق وصداقت والا ہوسکتا ہے جو دنیوی شان وشوکت میں ان سے کم ہو۔ مگر جب قیامت آئے گی اور خدا کی عدالت قائم ہوگی تو وہ حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ وہی شخص جس کو انھوں نے بے قیمت سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا وہ آخرت کی عدالت میں خدائی گواہ بنا دیا گیا ہے۔ وہی وہ شخص ہے جس کے بیان پر لوگوں کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے ہوں۔ یہ وہاں مجرم کے مقام پر کھڑے ہوں گے اور وہ خدا کی طرف سے بولنے والے کے مقام پر۔ یہ ایسا سخت اور ہولناک لمحہ ہوگا کہ لوگ چاہیں گے کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس کے اندر سما جائیں۔ مگر ان کی یہ شرمندگی ان کے کام نہ آئے گی۔ خدا کے یہاں ان کے قول و عمل سے لے کر ان کی سوچ تک کا ریکارڈ موجود ہوگا اور خدا انھیں دکھا دے گا کہ حق کے داعی کا انکار جو انھوں نے کیا وہ ناواقفیت کے سبب سے نہ تھا بلکہ گھمنڈ کی وجہ سے تھا۔ انھوں نے اپنے کو بڑا سمجھا اور داعیٔ حق کو چھوٹا جانا۔ حقیقت کو اس کی برہنہ صورت میں دیکھنے اور جاننے کے باوجود محض اس لیے اس کے منکر ہوگئے کہ اس کو ماننے میں ان کی اپنی بڑائی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی تھی۔

شریعت میں غیر معمولی حالات میں غیر معمولی رخصت دی گئی ہے۔ مرض یا سفر یا پانی کا نہ ہونا یہ تینوں آدمی کے لیے غیر معمولی حالتیں ہیں۔ اس لیے ان مواقع پر یہ رخصت دی گئی کہ اگر نقصان کا اندیشہ ہو تو وضو یا غسل کے بجائے تیمم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ عام وضو پانی سے ہوتا ہے۔ تیمم گویا مٹی سے وضو کرنا ہے۔ وضو کا مقصد آدمی کے اندر پاکی کی نفسیات پیدا کرنا ہے اور تیمم، وضو نہ کرسکنے کی صورت میں، اس پاکی کی نفسیات کو باقی رکھنے کی ایک مادی تدبیر ہے۔

''نماز اس وقت پڑھو جب کہ تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو''— یہاں یہ آیت شراب کا ابتدائی حکم بتانے کے لیے آئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ نماز کے بارے میں ایک اہم حقیقت کو بھی بتا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو فہم وشعور کے تحت ادا کی جاتی ہے۔ نماز محض اس کا نام نہیں ہے کہ کچھ الفاظ اور کچھ حرکات کو صحتِ ادا کے ساتھ دہرایا جائے۔ اسی کے ساتھ نماز میں آدمی کے ذہن کا حاضر رہنا بھی ضروری ہے۔ وہ نماز کو جان کر نماز پڑھے، اپنی زبان اور اپنے جسم سے وہ جس خدا کے سامنے جھکنے کا ارادہ کر رہا ہے، اسی خدا کے سامنے اس کی سوچ اور اس کا ارادہ بھی جھک گیا ہو۔ اس کا جسم جس خدا کی عبادت کر رہا ہے، اس کا شعور بھی اسی خدا کا عبادت گزار بن جائے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِيۡلَ ﴿٤٤﴾ وَ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِكُمۡ ؕ وَ	۴۴۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ ملا تھا۔ وہ گمراہی کو مول لے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ سے بھٹک جاؤ۔ ۴۵۔ اللہ تمھارے دشمنوں کو خوب جانتا

كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۫ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

ہے۔ اور اللہ کافی ہے حمایت کے لیے اور اللہ کافی ہے مدد کے لیے۔ ۴۶۔ یہود میں سے ایک گروہ بات کو اس کے محل سے ہٹا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے سنا اور نہ مانا۔ اور کہتے ہیں کہ سنو اور تمہیں سنوایا نہ جائے۔ وہ اپنی زبان کو موڑ کر کہتے ہیں راعنا، دین میں عیب لگانے کے لیے۔ اور اگر وہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا، اور سنو اور ہم پر نظر کرو تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر اور درست ہوتا، مگر اللہ نے ان کے انکار کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے۔ پس وہ ایمان نہ لائیں گے مگر بہت کم۔

اللہ کی کتاب کسی گروہ کو اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ اس سے اپنی سوچ اور اپنے عمل کو درست کرے۔ مگر جب آسمانی کتاب کی حامل کوئی قوم زوال کا شکار ہوتی ہے، جیسا کہ یہود ہوئے، تو خدا کی کتاب سے وہ ہدایت کے بجائے گمراہی کی غذا لینے لگتی ہے۔ خدا کے احکام اس کے لیے خشک جزئیاتی بحثوں کا موضوع بن جاتے ہیں۔ اب اس کے یہاں اعتقادیات کے نام پر فلسفیانہ قسم کی موشگافیاں جنم لیتی ہیں۔ وہ اس کے لیے ایسی سرگرمیوں کی تعلیم دینے والی کتاب بن جاتی ہے جس کا آخرت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایسے لوگ اپنی روایتی نفسیات کی وجہ سے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی ہر بات کو خدا کی بات ثابت کریں وہ اپنے عمل کا دینی جواز فراہم کرنے کے لیے خدا کی کتاب کو بدل دیتے ہیں۔ خدا کے کلمات کو اس کے موقع ومحل سے ہٹا کر وہ اس کی خود ساختہ تشریح کرتے ہیں۔ وہ الفاظ میں الٹ پھیر کر کے اس سے ایسا مفہوم نکالتے ہیں جس کا اصل خدائی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

''یہود کو کتاب کا کچھ حصہ ملا تھا'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کو خدا کی کتاب کے الفاظ پڑھنے کو ملے مگر خدا کی کتاب پر عمل کرنا جو اصل مقصود تھا، اس سے وہ دور رہے۔ لفظ کے معاملہ میں وہ حامل کتاب بنے رہے مگر عمل کے معاملہ میں انھوں نے عام دنیا دارانہ قوموں کا راستہ اختیار کر لیا۔ مزید یہ کہ عام لوگ دنیاداری کو دنیاداری کے نام پر کرتے ہیں اور انھوں نے یہ ڈھٹائی کی کہ اپنی دنیاداری کے لیے خدا کی کتاب سے سند پیش کرنے لگے۔

پھر ان کی گمراہی اپنی ذات تک نہیں رکی۔ وہ اپنے کو خدا کے دین کا نمائندہ سمجھتے تھے اس لیے جب غیر یہودی عربوں نے پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دینا شروع کیا تو یہود اپنی دینداری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے خود پیغمبر کے مخالف ہو گئے۔ انھوں نے آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات میں طرح طرح کے شوشے نکال کر

لوگوں کو اس شبہ میں مبتلا کرنا شروع کیا کہ یہ خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں بلکہ محض ذاتی حوصلہ کے تحت دین خدا کے عَلَم بردار بن کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ مگر اس معرکہ میں اللہ غیر جانب دار نہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں اپنے وفاداروں کا ساتھ دے گا اور انھیں کامیاب کر کے رہے گا۔

''لعنت'' دراصل بے حسی کی آخری صورت ہے۔ آدمی کی بے حسی جب اس نوبت کو پہنچ جائے کہ اس کو حق اور ناحق کی کوئی تمیز نہ رہے تو اسی کو لعنت کہتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ ع

۴۷۔ اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی اس پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتارا ہے، تصدیق کرنے والی اس کتاب کی جو تمھارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں پھر ان کو الٹ دیں پیٹھ کی طرف یا ان پر لعنت کریں جیسے ہم نے لعنت کی سبت والوں پر۔ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ ۴۸۔ بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے، اس کو وہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا، اس نے بڑا طوفان باندھا۔ ۴۹۔ کیا تم نے دیکھا ان کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں۔ بلکہ اللہ ہی پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ ۵۰۔ دیکھو، یہ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے لیے یہی کافی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک بات کو سنتا ہے مگر وہ حقیقۃً نہیں سنتا۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی اس بات کو سمجھنے کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو اور اس پر عمل کرنے سے اس کو کوئی دل چسپی نہ ہو۔ یہ مزاج جب اپنے آخری درجہ میں پہنچتا ہے تو آدمی کی ناسمجھی کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کے چہرے کے نشانات مٹا دیے گئے ہوں اور اب وہ چیزوں کو اس طرح دیکھ اور سُن رہا ہو جیسے کوئی شخص سر کے پچھلے حصہ کی طرف سے چیزوں کو دیکھے اور سنے جہاں نہ دیکھنے کے لیے آنکھ ہے اور نہ سننے کے لیے کان۔ حق بات کو سمجھنے کے لیے آدمی کا اس طرح اندھا بہرا ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ حق کے ساتھ مسلسل بے پروائی کی بنا پر خدا نے اس کو اپنی توفیق سے محروم کر دیا ہے۔ خدا نے اس کو کان دیا مگر اس نے نہیں سنا، خدا نے اس کو آنکھ دی مگر اس نے نہیں

دیکھا تو اب خدا نے بھی اس کو ویسا ہی بنا دیا جیسا اس نے خود سے اپنے کو بنا رکھا تھا — بے حسی جب اپنی آخری درجہ میں پہنچتی ہے تو وہ مسخ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

یہود کا یہ خیال تھا کہ ہم پیغمبروں کی نسل سے ہیں، اس بنا پر ہمارا گروہ مقدس گروہ ہے۔ انھوں نے بے شمار روایتیں اور کہانیاں گھڑ رکھی تھیں جو ان کے نسلی شرف اور گروہی فضیلت کی تصدیق کرتی تھیں۔ وہ انھیں خوش خیالیوں میں جی رہے تھے انھوں نے بطور خود یہ عقیدہ قائم کرلیا تھا کہ ہر وہ شخص جو یہودی ہے اس کی نجات یقینی ہے۔ کوئی یہودی کبھی جہنم کی آگ میں نہیں ڈالا جائے گا۔

''وہ اپنے کو پاکیزہ ٹھہراتے ہیں حالاں کہ اللہ جس کو چاہے پاکیزہ ٹھہرائے'' کا فقرہ اس خیال کی تردید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی نسل یا گروہ سے وابستگی کی بنا پر کسی کو فضیلت یا شرف نہیں مل جاتا۔ بلکہ اس کا تعلق خدا کے قانون عدل سے ہے۔ جو شخص خدائی قانون کے مطابق اپنے کو شرف کا مستحق ثابت کرے وہ شرف والا ہے اور جو شخص اپنے عمل سے اپنے کو مستحق ثابت نہ کرسکے وہ محض کسی گروہ سے وابستگی کی بنا پر شرف کا مالک نہیں بن جائے گا۔

گروہی نجات کا عقیدہ خواہ یہودی قائم کریں یا کوئی اور ایسا عقیدہ بنالے، وہ سراسر باطل ہے۔ جو لوگ ایسا عقیدہ بناتے ہیں وہ اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مگر یہ خدا پر جھوٹ لگانا ہے۔ کیوں کہ خدا نے کبھی ایسی تعلیم نہیں دی۔ خدا اگر ایک انسان اور دوسرے انسان میں گروہی تعلق کی بنا پر فرق کرنے لگے تو یہ ظلم ہوگا اور خدا سراسر عدل ہے، وہ کبھی کسی کے ساتھ ظلم کرنے والا نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿٥١﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿٥٢﴾ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿٥٣﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ

۵۱۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب سے حصہ ملا تھا، وہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور منکروں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ ۵۲۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے، تم اس کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ ۵۳۔ کیا خدا کے اقتدار میں کچھ ان کا بھی دخل ہے، پھر تو یہ لوگوں کو ایک تل برابر بھی نہ دیں۔ ۵۴۔ کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اس بنا پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے۔ پس ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی ہے اور ہم نے ان کو ایک بڑی

وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿٥٤﴾ فَمِنْهُمْ
مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى
بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿٥٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا
سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ
جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا
الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿٥٦﴾ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ
نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿٥٧﴾

سلطنت بھی دے دی۔ ۵۵۔ ان میں سے کسی نے اس کو مانا اور کوئی اس سے رکا رہا اور ایسوں کے لیے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے۔ ۵۶۔ بے شک جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کا انکار کیا، ان کو ہم سخت آگ میں ڈالیں گے۔ جب ان کے جسم کی کھال جل جائے گی تو ہم ان کی کھال کو بدل کر دوسری کر دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۵۷۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کو ہم باغوں میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں ان کے لیے ستھری بیویاں ہوں گی اور ان کو ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

آسمانی کتاب کی حامل کسی قوم پر جب زوال آتا ہے تو وہ عمل کے بجائے خوش عقیدگی کی سطح پر جینے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے درمیان جبت یعنی توہمات خوب پھیلتے ہیں۔ جو چیز حقیقی عمل کے ذریعے ملتی ہے اس کو وہ عملیات اور فرضی عقیدوں اور سفلی اعمال کے راستے سے پانے کی کوشش شروع کر دیتی ہے۔ ایسے لوگ دین کے معاملہ کو ''پاک کلمات'' اور ''بابرکت نسبتوں'' کا معاملہ سمجھ لیتے ہیں جس کے محض زبانی تلفظ یا رسمی تعلق سے معجزاتی واقعات ظاہر ہوتے ہوں۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ زبان سے دین کا نام لیتے ہوئے اپنی عملی زندگی کو طاغوت یعنی شیطان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ حقیقی زندگی میں نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات پر چل پڑتے ہیں مگر اسی کے ساتھ اپنے اوپر دین کا لیبل لگا کر سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کرنے لگیں وہی خدا کا دین ہے۔ ایسی حالت میں جب ان کے درمیان بے آمیز حق کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ سب سے زیادہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کی دینی حیثیت کی نفی کر رہی ہے۔ منکرینِ حق کا وجود ان کے لیے اس قسم کا چیلنج نہیں ہوتا اس لیے منکروں کے معاملہ میں وہ نرم ہوتے ہیں مگر حق کے داعی کے لیے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا۔ ان کے اندر حاسدانہ آگ بھڑک اٹھتی ہے کہ جب دین کے اجارہ دار ہم تھے تو دوسرے کسی شخص کو دین کی نمائندگی کا درجہ کیسے مل گیا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ خدا آدمی کی قلبی استعداد کی بنیاد پر کسی کو اپنے دین کا نمائندہ چنتا ہے، نہ کہ نمائشی چیزوں کی بنیاد پر۔

لعنت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں سے بالکل دور کر دیا جائے۔ کھانا اور پانی بند ہونے سے جس طرح آدمی کی مادی زندگی ختم ہو جاتی ہے اسی طرح خدا کی نصرت سے محرومی کے بعد آدمی کی ایمانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لعنت زدہ آدمی لطیف احساسات کے اعتبار سے اس طرح ایک ختم شدہ انسان بن جاتا ہے کہ اس کے اندر حق اور ناحق کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ کھلی کھلی نشانیاں سامنے آنے کے بعد بھی اس کو اعتراف کی توفیق نہیں ہوتی۔ وہ لایعنی شوشوں اور واقعی دلائل کے درمیان فرق نہیں کرتا۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰٓى
أَهْلِهَا ۙ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ
تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ
إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ يٰٓأَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَإِنْ تَنٰزَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ
فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ
وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ ع ۸ ۵
يَزْعُمُوْنَ أَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ
أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا
إِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ أُمِرُوْٓا أَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ
وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ
بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ
أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُوْلِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ
يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ ۚ فَكَيْفَ إِذَآ
أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيْهِمْ ثُمَّ

۵۸۔ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو، بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۵۹۔ اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں اہلِ اختیار کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تمھارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بات اچھی ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔
۶۰۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہے تمھاری طرف اور جو اتارا گیا ہے تم سے پہلے، وہ چاہتے ہیں کہ مقدمہ کو لے جائیں شیطان کی طرف، حالاں کہ ان کو حکم ہو چکا ہے کہ اس کو نہ مانیں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر بہت دور ڈال دے۔ ۶۱۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم دیکھو گے کہ منافقین تم سے کترا جاتے ہیں۔ ۶۲۔ پھر اس وقت کیا ہوگا جب ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر پہنچے گی، اس وقت یہ تمھارے پاس قسمیں کھاتے

جَآءُوۡكَ يَحۡلِفُوۡنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡسَانًا وَّتَوۡفِيۡقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُ اللّٰهُ مَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ۗ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَعِظۡهُمۡ وَقُلۡ لَّهُمۡ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَوۡلًاۢ بَلِيۡغًا ﴿۶۳﴾

ہوے آئیں گے کہ خدا کی قسم، ہم کو تو صرف بھلائی اور ملاپ سے غرض تھی۔ ۶۳۔ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ پس تم ان سے اعراض کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔

ہر ذمہ داری ایک امانت ہے اور اس کو ٹھیک ادا کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جب کسی سے معاملہ پڑے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ وہی کرے جو انصاف کا تقاضا ہو، خواہ معاملہ دوست کا ہو یا دشمن کا۔ اگر امانت داری اور انصاف کا طریقہ بظاہر اپنے فائدوں اور مصلحتوں کے خلاف نظر آئے تب بھی اس کو انصاف اور سچائی ہی کے طریقے پر قائم رہنا ہے۔ کیوں کہ بہتری اس میں ہے جو اللہ بتائے، نہ کہ اس میں جو ہمارے نفس کو پسند ہو۔ جہاں کہیں مسلم حکومت قائم ہے وہاں کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس کے قوانین کی پاسداری کریں اور اگر حکومتی معاملات میں پرامن طور پر حصہ لینے کا موقع ہو تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس میں حصہ لیں۔ ایسے مواقع نہ ہونے کی شکل میں، یعنی جہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہے تو وہاں وہ اپنے اندر کے قابلِ اعتماد افراد کو اپنا سربراہ بنالیں اور ان کی ہدایات لیتے ہوئے دینی زندگی گزاریں۔ جب کسی معاملہ میں اختلاف ہو تو ہر فریق پر لازم ہے کہ وہ اس بات کو مان لے جو اللہ اور رسول کی طرف سے آرہی ہو۔ ہر آدمی کو اختلاف رائے کی آزادی ہے مگر اجتماعی فیصلہ کو نہ ماننے کی آزادی کسی کو بھی حاصل نہیں۔ اجتماعی نظام مسلم معاشرہ کی اجتماعی ضرورت ہے۔

مدینہ کے ابتدائی زمانہ میں اختلافی معاملات میں فیصلہ لینے کے لیے بیک وقت دو عدالتیں پائی جاتی تھیں۔ ایک، یہودی سرداروں کی جو پہلے سے چلی آرہی تھی۔ دوسری، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ہجرت کے بعد قائم ہوئی۔ مسلمانوں میں جو لوگ اپنے مفاد کی قربانی کی قیمت پر دیندار بننے کے لیے تیار نہ تھے وہ ایسا کرتے کہ جب ان کو اندیشہ ہوتا کہ ان کا مقدمہ کمزور ہے اور وہ رسولِ خدا کی عدالت سے اپنے موافق فیصلہ نہ لے سکیں گے تو وہ کعب بن اشرف یہودی کی عدالت میں چلے جاتے۔ یہ بات سراسر ایمان کے خلاف ہے۔ آدمی اگر اللہ کے فیصلہ پر راضی نہ ہو بلکہ اپنی پسند کا فیصلہ لینا چاہے تو اس کا ایمان کا دعویٰ جھوٹا ہے، خواہ وہ اپنے رویہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے کتنے ہی خوب صورت الفاظ اپنے پاس رکھتا ہو۔ تاہم ایسے لوگوں سے نہ الجھتے ہوئے ان کو مؤثر انداز میں نصیحت کرنے کا کام پھر بھی جاری رہنا چاہیے۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا

۶۴۔ اور ہم نے جو رسول بھیجا، اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر وہ جب کہ انھوں نے اپنا برا کیا تھا، وہ تمھارے پاس آتے اور اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان

اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا
تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾ وَ لَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا
قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ
لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّ اِذًا
لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾
وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾ وَمَنْ يُّطِعِ
اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ
وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ
الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿٧٠﴾ ع

کے لیے معافی چاہتا تو یقینا وہ اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پاتے۔ ۶۵۔ پس تیرے رب کی قسم، وہ کبھی ایمان والے نہیں ہوسکتے جب تک وہ اپنے باہمی جھگڑے میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو فیصلہ تم کرو، اس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور اس کو خوشی سے قبول کرلیں۔ ٦٦۔ اور اگر ہم ان کو حکم دیتے کہ اپنے آپ کو ہلاک کرو یا اپنے گھروں سے نکلو تو ان میں سے تھوڑے ہی اس پر عمل کرتے۔ اور یہ لوگ وہ کرتے جس کی انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو ان کے لیے یہ بات بہتر اور ایمان پر ثابت رکھنے والی ہوتی۔ ٦٧۔ اور اس وقت ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا اجر دیتے۔ ٦٨۔ اور ان کو سیدھا راستہ دکھاتے۔ ٦٩۔ اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی پیغمبر اور صدیق اور شہید اور صالح کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت۔ ۷۰۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کا علم کافی ہے۔

رسول اس لیے نہیں آتا کہ لوگ بس اس کے عقیدت مند ہوجائیں اور اس کی بارگاہ میں الفاظ کے گلدستے پیش کرتے رہیں۔ رسول اس لیے آتا ہے کہ آدمی اس سے اپنی زندگی کا طریقہ معلوم کرے اور اس پر عملاً کاربند ہو۔ اس معاملہ میں آدمی کو اتنا زیادہ شدید ہونا چاہیے کہ نازک مواقع پر بھی وہ رسول اللہ کی اطاعت سے نہ ہٹے۔ جب دو آدمیوں کا مفاد ایک دوسرے سے ٹکرا جائے اور دو آدمیوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف تلخی ابھر آئے اس وقت بھی آدمی کو اپنے نفس کو دبانا ہے اور بالارادہ اپنے کو رسول والے طریقہ کا پابند بنانا ہے۔ نزاع کے موقع پر جو شخص رسول کی رہنمائی کو قبول کرے وہی رسول کو ماننے والا ہے۔ حتی کہ رسول کا طریقہ اپنے ذوق اور اپنی مصلحت کے خلاف ہو تب بھی وہ دل کی رضامندی کے ساتھ اس کو قبول کرلے۔ وہ اپنے احساس کو اتنا زندہ رکھے کہ اگر وقتی طور پر کبھی اس سے غلطی ہوجائے تو وہ جلد ہی چونک اٹھے۔ وہ جان لے کہ رسول کو چھوڑ کر وہ شیطان کے پیچھے چل پڑا تھا۔ وہ فوراً پلٹے اور معافی کا طالب ہو۔ جو شخص نفسیاتی جھٹکوں کے مواقع پر دین پر قائم نہ رہ سکے اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ان

شدید تر مواقع پر ثابت قدم رہے گا جب کہ وطن کو چھوڑ کر اور جان و مال کی قربانی دے کر آدمی کو اپنے ایمان کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔

نفس پرستی اور مصلحت پسندی کی زندگی اختیار کرنے کے نتیجہ میں آدمی جو سب سے بڑی چیز کھوتا ہے وہ صراط مستقیم ہے۔ یعنی وہ راستہ جس کو پکڑ کر آدمی چلتا رہے یہاں تک کہ اپنے رب تک پہنچ جائے۔ یہ راستہ خدا کی کتاب اور رسول کی سنت میں واضح طور پر موجود ہے۔ مگر آدمی جب اپنی سوچ کو تحفظات کا پابند کر لیتا ہے تو وضاحت کے باوجود وہ صراطِ مستقیم کو دیکھ نہیں پاتا۔ وہ دین کا مطالعہ اپنی خواہشوں اور مصلحتوں کے زیر اثر کرتا ہے، نہ کہ دین کی بے آمیز صورت میں۔ اس کے ذہن میں اپنے حسب حال دین کا ایک خود ساختہ تصور قائم ہو جاتا ہے۔ وہ ایمان کا مدعی ہو کر بھی ایمان سے محروم رہتا ہے۔ ایسے لوگ اس جنت کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جنھوں نے ہر قسم کی مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر دین کو اختیار کیا تھا۔ وہ لوگ جو خدا کے عہد کو پورا کرنے والے ہیں، جو حق کی گواہی آخری حد تک دینے والے ہیں اور جن کی زندگیاں حد درجہ پاکیزہ ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا

۷۱۔ اے ایمان والو، اپنی احتیاط کر لو پھر نکلو جدا جدا یا اکھٹے ہو کر۔ ۷۲۔ اور تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو دیر لگا دیتا ہے۔ پھر اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ نہ تھا۔ ۷۳۔ اور اگر تم کو اللہ کا کوئی فضل حاصل ہو تو کہتا ہے، گویا تمھارے اور اس کے درمیان کوئی رشتۂ محبت ہی نہیں، کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کرتا۔ ۷۴۔ پس چاہیے کہ لڑیں اللہ کی راہ میں وہ لوگ جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچ دیتے ہیں۔ اور جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے، پھر مارا جائے یا غالب ہو تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔ ۷۵۔ اور تم کو کیا ہوا کہ تم نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں کہ خدایا، ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے

مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝٧٥ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝٧٦ ع

لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی پیدا کردے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار کھڑا کردے۔ ۷۶۔ جولوگ ایمان والے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جومنکر ہیں، وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو۔ بے شک شیطان کی چال بہت کمزور ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں ہر ایک کو عمل کی آزادی ہے۔ یہاں شریر لوگوں کو بھی موقع ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں اور اسی کے ساتھ خدا کے نیک بندوں کو اپنے اقرار ایمان کا ثبوت اس طرح دینا ہے کہ وہ شریر لوگوں کی طرف سے ڈالی جانے والی مصیبتوں کے باوجود ثابت قدم رہیں۔ اہلِ ایمان کو خدا کے دشمنوں کے مقابلہ میں ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔ پرامن تدبیروں اور جنگی تیاریوں سے ان کو پوری طرح اپنے بچاؤ کا انتظام کرنا ہے۔ ان کو متفرق طور پر بھی اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہے اور مل کر بھی۔ اسی کے ساتھ خود مسلمانوں کی صف میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں، جیسا کہ غزوۂ احد میں ظاہر ہوا، جو دنیا کے نقصان کا خطرہ مول لیے بغیر آخرت کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کاموں میں تو خوب حصہ لیتے ہیں جن میں دنیوی فائدہ کا کوئی پہلو ہو۔ مگر ایسا دینی کام جس میں دنیوی اعتبار سے نقصان کا اندیشہ ہو اس سے علیحدگی کے لیے خوبصورت عذر تلاش کرلیتے ہیں۔ ان کی یہ ذہنیت اس لیے ہے کہ اسلام قبول کرنے کے باوجود عملاً وہ اسی موجودہ دنیا کی سطح پر جی رہے ہیں۔ اگر ان کو یقین ہو کہ اصل اہمیت کی چیز آخرت ہے تو دنیا کی کامیابی وناکامی ان کے لیے ناقابلِ لحاظ بن جائے۔ اللہ کی راہ کا مجاہد حقیقۃً وہ ہے جو صرف آخرت کا طالب ہو، جو دنیا کے فائدوں اور مصلحتوں کو قربان کرکے اللہ کی راہ میں بڑھے، نہ کہ وہ جو ایسے جہاد کا غازی بننا پسند کرے جس میں کوئی زخم لگے بغیر بڑے بڑے کریڈٹ ملتے ہوں، جس میں الفاظ بول کر شہرت وعزت کا مقام حاصل ہوتا ہو۔

خدا کی راہ کی لڑائی وہ ہے جو اس بندۂ خدا کو پیش آئے جو صرف خدا کے لیے اٹھا ہو۔ وہ لوگوں کو جہنم سے ڈرائے اور لوگوں کو جنت کی طرف بلائے۔ کسی سے وہ مادی یا سیاسی جھگڑا نہ چھیڑے۔ پھر بھی شریر لوگ اس سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اور شیطان کی راہ میں لڑنے والے وہ لوگ ہیں جو کسی بندۂ خدا سے اس بنا پر لڑ پڑیں کہ اس کی باتوں سے ان کی انانیت پر ضرب پڑتی ہے۔ اس کے

پیغام کے پھیلاؤ میں ان کو اپنا معاشی یا سیاسی خطرہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے دلائل کو توڑنے کے لیے وہ جارحیت کے سوا اور کوئی دلیل اپنے پاس نہیں پاتے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَ
اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ
الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ
اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ
عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ
اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝٧٧ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا
يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ
وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ
اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ
عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ
الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝٧٨ مَآ
اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ
سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ
رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝٧٩

۷۷۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا
گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور
زکوٰۃ دو۔ پھر جب ان کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان
میں سے ایک گروہ انسانوں سے ایسا ڈرنے لگا
جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ
کہتے ہیں اے ہمارے رب، تو نے ہم پر لڑائی
کیوں فرض کر دی۔ کیوں نہ چھوڑے رکھا ہم کو
تھوڑی مدت تک۔ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے
اور آخرت بہتر ہے اس کے لیے جو پرہیزگاری
کرے، اور تمھارے ساتھ ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ ۷۸۔
اور تم جہاں بھی ہوگے، موت تم کو پالے گی، اگرچہ تم
مضبوط قلعوں میں ہو۔ اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچتی
ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور
اگر ان کو کوئی برائی پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ
تمھارے سبب سے ہے۔ کہہ دو کہ سب کچھ اللہ
کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کا کیا حال ہے کہ
لگتا ہے کہ کوئی بات ہی نہیں سمجھتے۔ ۷۹۔ تم کو جو
بھلائی بھی پہنچتی ہے، وہ خدا کی طرف سے پہنچتی
ہے اور تم کو جو برائی پہنچتی ہے، وہ تمھارے اپنے ہی
سبب سے ہے۔ اور ہم نے تم کو انسانوں کی طرف
پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔

ہجرت سے پہلے مکہ میں اسلام کے مخالفین مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے۔ مارنا پیٹنا، ان کی معاشیات کو تباہ کرنا، ان کو مسجد حرام میں عبادت سے روکنا، ان کو تبلیغ کی اجازت نہ دینا، ان کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کرنا، یہ سب انھوں نے مسلمانوں کے لیے جائز کر لیا تھا۔ جو شخص اسلام قبول کرتا اس پر وہ ہر قسم کا دباؤ ڈالتے تاکہ

وہ اسلام کو چھوڑ کر اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ جائے۔ مخالفین اسلام کی اس جارحیت نے مسلمانوں کے لیے اصولاً جائز کر دیا تھا کہ وہ ان کے خلاف تلوار اٹھائیں۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار جنگ کی اجازت مانگتے۔ مگر آپ ہمیشہ یہ کہتے کہ مجھ کو جنگ کا حکم نہیں دیا گیا۔ تم صبر کرو اور نماز اور زکوۃ کی ادائیگی کرتے رہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قبل از وقت کوئی اقدام کرنا اسلام کا طریقہ نہیں۔ مکہ میں مسلمانوں کی اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف فیصلہ کن اقدام کر سکتے۔ اس وقت مکہ والوں کے مقابلہ میں تلوار اٹھانا اپنی مصیبتوں کو اور بڑھانے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ طاقت ور دشمن جو ابھی تک صرف انفرادی ظلم کر رہا ہے اس کو اپنی طرف سے مکمل جنگی کارروائی کرنے کا جواز فراہم کر دیا جائے۔ عملی اقدام ہمیشہ اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ اس کے لیے ضروری تیاری کر لی گئی ہو۔ اس سے پہلے اہلِ ایمان سے صرف انفرادی احکام کا تقاضا کیا جاتا ہے جو ہر حال میں آدمی کے لیے ضروری ہیں۔ یعنی اللہ سے تعلق جوڑنا، بندوں کے حقوق ادا کرنا اور دین کی راہ میں جو مشکلیں پیش آئیں ان کو برداشت کرنا۔

قرآن میں قربانی کے احکام آئے تو مصلحت پرست لوگوں کو اپنی زندگی کا نقشہ بکھرتا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ احد میں شکست ہوئی تو اس کو وہ رسول کی بے تدبیری کا نتیجہ بتا کر رسول کی رہنمائی کے بارے میں لوگوں کو بدظن کرنے لگے۔ فائدہ والی باتوں کو اللہ کا فضل بتا کر وہ اپنی اسلامیت کا مظاہرہ کرتے اور عملی اسلام سے گریز کے لیے رسول کو غلط ثابت کرتے — خدا کو مان کر آدمی کے لیے ممکن رہتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر چلتا رہے۔ مگر خدا کے داعی کو ماننے کے بعد اس کا ساتھ دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے جو آدمی کے لیے مشکل ترین کام ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ

۸۰۔ جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو الٹا پھرا تو ہم نے ان پر تم کو نگراں بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ ۸۱۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو قبول ہے۔ پھر جب تمھارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو وہ کہہ چکا تھا۔ اور اللہ ان کی سرگوشیوں کو لکھ رہا ہے۔ پس تم ان سے اعراض کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے۔ ۸۲۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔

مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَ لَوۡ
رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ
لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَلَوۡ لَا
فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ
الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۳﴾

۸۳۔ اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔

خدا کے داعی کو ماننا ''اپنے جیسے انسان'' کو ماننا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی خدا کو مانتا ہے مگر وہ خدا کے داعی کو ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ مگر آدمی کا اصل امتحان یہی ہے کہ وہ خدا کے داعی کو پہچانے اور اس کے ساتھ اپنے کو کھڑا کرے۔ داعی کے معاملہ کو جب آدمی خدا کا معاملہ نہ سمجھے تو وہ اس کے بارے میں سنجیدہ بھی نہیں ہوتا۔ سامنے وہ رسمی طور پر ہاں کر دیتا ہے مگر جب الگ ہوتا ہے تو اپنی سابقہ روش پر چلنے لگتا ہے۔ وہ اس کے خلاف ایسی باتیں پھیلاتا ہے جن کا پھیلانا سراسر غیر ذمہ دارانہ فعل ہو۔ جو لوگ خدا کے داعی کے ساتھ اس قسم کا بے پروائی کا سلوک کریں وہ خدا کے یہاں یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم نہیں جانتے تھے۔ آدمی اگر ٹھہر کر سوچے تو داعی کی صداقت کو جاننے کے لیے وہ کلام ہی کافی ہے جو خدا نے اس کی زبان پر جاری کیا ہے۔

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ اس کا کوئی بیان کسی بھی مسلمہ صداقت کے خلاف نہیں۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو انسانی فطرت کے خلاف ہو۔ اس میں کوئی ایسا بیان نہیں جو سابق آسمانی کتابوں کے ذریعہ جانی ہوئی کسی حقیقت سے ٹکراتا ہو۔ اس میں کوئی ایسا اشارہ نہیں جو تجربی علوم سے دریافت شدہ کسی واقعہ کے غیر مطابق ہو۔ حقائق واقعی سے یہ مکمل مطابقت اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہوا کلام ہے۔ تاہم کسی بھی سچائی کا سچائی نظر آنا اس پر موقوف ہے کہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ قرآن کا اختلاف کثیر سے خالی ہونا اس شخص کو دکھائی دے گا جو قرآن میں ''تدبر'' کرے۔ جو شخص تدبر کرنا نہ چاہے اس کے لیے بے معنی اعتراضات نکالنے کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہوا ہے جب تک قیامت آکر موجودہ امتحانی حالات کا خاتمہ نہ کردے۔

اسلامی معاشرہ وہ ہے جس کے افراد اتنے خود شناس ہوں کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں اپنی نااہلی کو جان لیں۔ وہ کسی معاملہ کو اہل تر شخص کے حوالے کرکے اس کی رہنمائی پر راضی ہوجائیں۔ یہ خود شناسی ہی واحد چیز ہے جو اجتماعی زندگی میں کسی کو شیطان کے پیچھے چل پڑنے سے بچاتی ہے۔ آدمی اگر اپنے آپ کو نہ جانے تو وہ اہلیت نہ رکھتے ہوئے بھی نازک معاملات میں کود پڑتا ہے اور پھر خود بھی ہلاک ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی

ہلاک کرتا ہے۔ اجتماعی معاملات میں بولنے سے زیادہ چپ رہنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ شیطان کی مدد کرنا ہے کہ آدمی جو بات سنے اس کو دوسروں کے سامنے دہرانے لگے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

النصف

ع ۱۱ / ۸

۸۴۔ پس لڑو اللہ کی راہ میں۔ تم پر اپنی جان کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں اور اہلِ ایمان کو ابھارو۔ امید ہے کہ اللہ منکروں کا زور توڑ دے اور اللہ بڑا زور والا اور بہت سخت سزا دینے والا ہے۔ ۸۵۔ جو شخص کسی اچھی بات کے حق میں کہے گا، اس کے لیے اس میں سے حصہ ہے، اور جو اس کی مخالفت میں کہے گا، اس کے لیے اس میں حصہ ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ۸۶۔ اور جب کوئی تم کو دعا دے تو تم بھی دعا دو اس سے بہتر یا الٹ کر وہی کہہ دو، بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ ۸۷۔ اللہ ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی بات اور کس کی ہو سکتی ہے۔

دین داری کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی عملی طور پر جہاں ہے وہیں رہے، وہ اپنی حقیقی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ کرے۔ البتہ کچھ اوپری مظاہر کا اہتمام کر کے سمجھے کہ میں دین دار بن گیا ہوں۔ ایسے دین سے کسی کو ضد نہیں ہوتی۔ لوگ اس کی مخالفت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مگر جب دین کے ایسے تقاضے پیش کیے جائیں جو قربانی کا مطالبہ کرتے ہوں، جس میں آدمی کو اپنی بنی بنائی زندگی اجاڑنا پڑے تو اس کے سامنے آنے کے بعد لوگوں میں دو فریق ہو جاتے ہیں۔ ایک طبقہ دعوت کے مخالفین کا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سستے مظاہر کے ذریعہ اپنی دین داری کا سکہ قائم کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ قربانی والے دین کے مخالف بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسے دین کو اختیار کرنا ان کو برتری کے مقام سے اترنے کے ہم معنی نظر آتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جس کی فطرت زندہ ہوتی ہے۔ وہ چیزوں کو مفاد اور مصلحت سے اوپر اٹھ کر دیکھتا ہے۔ ایک بات کا حق ثابت ہو جانا ہی اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو قبول کر لے۔ یہ صورت حال کبھی اتنی سنگین ہو جاتی ہے کہ حق کی تائید وحمایت میں زبان کھولنا جہاد کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، حق کے بارے میں خاموشی یا مخالفت کا رویہ اختیار

کرنا آدمی کو انعام کا مستحق بنا دیتا ہے۔ تاہم جہاں تک سچے اہل ایمان کا تعلق ہے ان کو ہر حال میں یہ حکم ہے کہ عام معاشرتی تعلقات کو اس اختلاف سے متاثر نہ ہونے دیں۔ اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی رویہ اختیار نہ کریں۔ مسلمان کا رویہ دوسروں کے ردعمل میں نہیں بننا چاہیے بلکہ اس قسم کی چیزوں کو نظر انداز کرکے بننا چاہیے۔ یہ معاملہ اللہ سے متعلق ہے کہ وہ کس کو کیا بدلہ دے اور کسی کے لیے کیا فیصلہ کرے۔

نازک حالات میں دعوت حق کو زندہ رکھنے کی ضمانت صرف یہ ہوتی ہے کہ کم از کم داعی اپنی ذات کی سطح پر یہ عزم رکھے کہ وہ ہر حال میں اپنے موقف پر قائم رہے گا خواہ کوئی تائید کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ ایسے حالات میں داعی کا عزم اس کو اللہ کی خصوصی نصرت کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال بدر صغریٰ کا غزوہ ہے جو احد کے صرف ایک ماہ بعد پیش آیا۔ اس وقت مدینہ میں ایسی کیفیت چھائی ہوئی تھی کہ صرف ستر آدمی رسول اللہ کے ساتھ نکلے۔ مگر اس مختصر قافلہ کو اللہ کی یہ خصوصی مدد ملی کہ مکہ والوں پر ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ مقابلہ میں نہ آسکے۔ خدا کی سنت ہے کہ وہ منکرین کا زور توڑے۔ مگر خدا کی یہ سنت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ دین کے علم بردار اپنی بے سروسامانی کے باوجود خدا کے دشمنوں کا زور توڑنے کے لیے نکل پڑے ہوں۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ
بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ
اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ
سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا
فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ
حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَ
لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا
الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ
يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ

۸۸۔ پھر تم کو کیا ہوا ہے کہ تم منافقوں کے معاملہ میں دو گروہ ہو رہے ہو۔ حالاں کہ اللہ نے ان کے اعمال کے سبب سے ان کو الٹا پھیر دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ان کو راہ پر لاؤ جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے۔ اور جس کو اللہ گمراہ کر دے تم ہرگز اس کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ ۸۹۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے انکار کیا ہے، تم بھی انکار کرو تا کہ تم سب برابر ہو جاؤ۔ پس تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ پھر اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو اور جہاں کہیں ان کو پاؤ، انھیں قتل کرو اور ان میں سے کسی کو ساتھی اور مددگار نہ بناؤ۔
۹۰۔ مگر وہ لوگ جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جن کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے، یا وہ لوگ جو تمھارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے سینے تنگ ہو رہے ہیں تمھاری لڑائی سے اور اپنی قوم کی لڑائی

فَلَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ وَاَلۡقَوۡا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيۡلًا ۝٩٠ سَتَجِدُوۡنَ
اٰخَرِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّاۡمَنُوۡكُمۡ وَيَاۡمَنُوۡا
قَوۡمَهُمۡ ؕ كُلَّمَا رُدُّوۡۤا اِلَى الۡفِتۡنَةِ اُرۡكِسُوۡا
فِيۡهَا ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَعۡتَزِلُوۡكُمۡ وَيُلۡقُوۡۤا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ
وَيَكُفُّوۡۤا اَيۡدِيَهُمۡ فَخُذُوۡهُمۡ وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ
ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ ؕ وَاُولٰٓـئِكُمۡ جَعَلۡنَا لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ
سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ۝٩١ ع

سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر زور دے دیتا تو وہ ضرور تم سے لڑتے۔ پس اگر وہ تم کو چھوڑے رہیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمھارے ساتھ صلح کا رویہ رکھیں تو اللہ تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔ ۹۱۔ دوسرے کچھ ایسے لوگوں کو بھی تم پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں۔ جب کبھی وہ فتنہ کا موقع پائیں، وہ اس میں کود پڑتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر تم سے یکسو نہ رہیں اور تمھارے ساتھ صلح کا رویہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم ان کو پکڑو اور ان کو قتل کرو جہاں کہیں پاؤ۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلی حجت دی ہے۔

آدمی جب اللہ کے دین کو اختیار کرتا ہے تو اس کے بعد اس کی زندگی میں بار بار ایسے مرحلے آتے ہیں جہاں یہ جانچ ہوتی ہے کہ وہ اپنے فیصلہ میں سنجیدہ ہے یا نہیں۔ اسی سلسلے کا ایک امتحان ''ہجرت'' ہے۔ یعنی دین کی راہ میں جب دنیا کے فائدے اور مصلحتیں حائل نظر آئیں تو فائدوں اور مصلحتوں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف بڑھ جانا۔ حتی کہ اگر رشتہ دار اور گھر بار کو چھوڑنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو بھی چھوڑ دینا۔ ایسا نازک موقع پیش آنے کی صورت میں اگر ایسا ہو کہ آدمی اپنے فائدوں اور مصلحتوں کو نظر انداز کر کے حق کی طرف بڑھے تو اس نے حق کے ساتھ اپنے قلبی تعلق کو پختہ کیا۔ اس کے برعکس، اگر ایسا ہو کہ ایسے موقع پر آدمی اپنے فائدوں اور مصلحتوں سے لپٹا رہے تو اس نے حق کے ساتھ اپنے قلبی تعلق کو کمزور کیا۔ جو شخص پہلی راہ پر چلے اس کے اندر حق کی مزید قبولیت کا مادہ پیدا ہوتا ہے، وہ برابر حق کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ اور جو شخص دوسری راہ اختیار کرے اس کے اندر حق کی قبولیت کا مادہ گھٹتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اتنا بے حس ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر حق کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

جب دین کے سخت تقاضے سامنے آتے ہیں تو لوگوں میں مختلف گروہ بن جاتے ہیں۔ کوئی مخلصین کا ہوتا ہے اور کوئی مخالفین کا۔ اور کچھ ایسے لوگوں کا جو ظاہر میں حق سے قریب مگر اندر سے اس سے دور ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اہلِ ایمان ہر ایک سے اس کے حسب حال معاملہ کریں۔ وہ فتنہ کے استیصال میں سخت اور اخلاقی ذمہ داریوں کو نبھانے میں نرم ہوں۔ وہ کمزوروں کے ساتھ رعایت کا سلوک کریں۔ دوسروں سے متاثر ہونے کے بجائے خود ان کو متاثر کرنے کی کوشش کریں۔ کسی کو اگر اللہ خاموش کر کے بٹھا دے تو اس سے بلا ضرورت لڑائی نہ چھیڑیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ
وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ
مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ
يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ
قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى
اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ
مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا
وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا
عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

۹۲۔ اور مومن کا کام نہیں کہ وہ مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہوجائے۔ اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کردے تو وہ ایک مومن غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے، الّا یہ کہ وہ معاف کردیں۔ پھر مقتول اگر ایسی قوم میں سے تھا جو تمھاری دشمن ہے اور وہ خود مومن تھا تو وہ ایک مومن غلام کو آزاد کرے۔ اور اگر وہ ایسی قوم سے تھا کہ تمھارے اور اس کے درمیان عہد ہے تو وہ اس کے وارثوں کو خوں بہا دے اور ایک مومن کو آزاد کرے۔ پھر جس کو میسر نہ ہو تو وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ توبہ ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔
۹۳۔ اور جو شخص کسی مومن کو جان کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے جو حقوق ہیں ان میں سب سے بڑا حق یہ ہے کہ وہ اس کی جان کا احترام کرے۔ اگر ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کردے تو اس نے سب سے بڑا معاشرتی جرم کیا۔ ایک شخص جب دوسرے شخص کو قتل کرتا ہے تو وہ اس کے اوپر آخری ممکن وار کرتا ہے۔ نیز یہ وہ جرم ہے جس کے بعد مجرم کے لیے اپنے جرم کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ قتل عمد کی سزا خلود فی النار ہے۔ جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر مار ڈالے اس سے اللہ اتنا غضب ناک ہوتا ہے کہ اس کو ملعون قرار دے کر اس کو ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ البتہ قتل خطا کا جرم ہلکا ہے۔ کوئی شخص کسی مسلمان کو غلطی سے مار ڈالے، اس کے بعد اس کو غلطی کا احساس ہو وہ اللہ کے سامنے روئے گڑگڑائے اور مقررہ قاعدہ کے مطابق اس کی تلافی کرے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردے گا۔ غلطی کے بعد مال خرچ کرنا یا مسلسل روزے رکھنا گویا خود اپنے ہاتھوں اپنے کو سزا دینا ہے۔ جب آدمی کے اوپر شدت سے یہ احساس طاری ہوتا ہے کہ اس سے غلطی ہوگئی تو وہ چاہتا ہے کہ اپنے اوپر اصلاحی عمل کرے۔ اللہ نے

بتایا کہ ایسی حالت میں آدمی کو اپنی اصلاح کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

یہاں اصلاً قتل کا حکم بتایا گیا ہے۔ تاہم اسی نوعیت کے دوسرے معاشرتی جرائم بھی ہیں اور مذکورہ حکم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دوسری چیزوں کے بارے میں شریعت کا تقاضا کیا ہے۔

ایک مسلمان کا فرض جس طرح یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو زندگی سے محروم کرنے کی کوشش نہ کرے، اسی طرح ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق بھی ہے کہ وہ اس کو بے عزت نہ کرے۔ اس کا مال نہ چھینے۔ اس کو بے گھر نہ کرے۔ اس کے روزگار میں خلل نہ ڈالے۔ اس کے سکون کو غارت کرنے کا منصوبہ نہ بنائے۔ وہ چیزیں جو اس کے لیے زندگی کے اثاثہ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں سے کسی چیز کو اس سے چھیننے کی کوشش نہ کرے۔ ایک آدمی اگر غلطی سے ایسا کوئی فعل کر بیٹھے جس سے اس کے مسلمان بھائی کو اس قسم کا کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہونا چاہیے اور غلطی کے احساس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے بھائی کے نقصان کی تلافی کرے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ آدمی قصداً ایسی کارروائی کرے جس کا سوچا سمجھا مقصد اپنے بھائی کو نقصان پہنچانا اور اس کو پریشان کرنا ہو تو درجہ کے فرق کے ساتھ یہ بھی اسی نوعیت کا جرم ہے جیسا قتل عمد۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ

۹۴۔ اے ایمان والو، جب تم سفر کرو اللہ کی راہ میں تو خوب تحقیق کرلیا کرو اور جو شخص تم کو سلام کرے اس کو یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔ تم دینوی زندگی کا سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس بہت سامانِ غنیمت ہے۔ تم بھی پہلے ایسے ہی تھے۔ پھر اللہ نے تم پر فضل کیا تو تحقیق کرلیا کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔ ۹۵۔ برابر نہیں ہوسکتے بیٹھے رہنے والے اہلِ ایمان جن کو کوئی عذر نہیں اور وہ اہلِ ایمان جو اللہ کی راہ میں لڑنے والے ہیں اپنے مال اور اپنی جان سے۔ مال و جان سے جہاد کرنے والوں کا درجہ اللہ نے بیٹھے رہنے والوں کی نسبت بڑا رکھا ہے، اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر اجر عظیم

اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنۡهُ وَ مَغۡفِرَةً وَّ رَحۡمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۹۶﴾ ع ۱۳

میں برتری دی ہے۔ ۹۶۔ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے۔اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

عرب کے مخالف قبائل میں کچھ ایسے افراد تھے جو اندر مسلمان تھے مگر ہجرت کر کے ابھی اپنے قبیلہ سے کٹے نہیں تھے۔ ایک غزوہ میں ایسا ایک شخص مسلمان کی تلوار کی زد میں آ گیا۔ اس نے ''السلام علیکم'' کہہ کر ظاہر کیا کہ میں تمھارا دینی بھائی ہوں۔ بعض پر جوش مسلمانوں نے پھر بھی اس کو قتل کر دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ مسلمان نہیں ہے اور محض اپنے کو بچانے کی خاطر السلام علیکم کہہ رہا ہے۔ مگر السلام علیکم کہنے کی حد تک بھی کوئی شخص مسلمان ہو تو اس پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔ حتی کہ جنگ کے موقع پر بھی نہیں جب کہ یہ اندیشہ ہو کہ دشمن اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ کسی مسلمان کا مارا جانا اللہ کے نزدیک اتنا بڑا حادثہ ہے کہ ساری دنیا کا فنا ہو جانا بھی اس کے مقابلہ میں کم ہے (لَزَوَالُ الدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ) سنن الترمذی، حدیث نمبر 1395۔

جب بھی کوئی شخص اس قسم کا اسلامی جوش دکھاتا ہے کہ وہ دوسرے آدمی کی اسلامیت کو ناقابلِ تسلیم قرار دے کر اس کو سزا دینے پر اصرار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہمیشہ دنیوی محرکات ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی مادی لالچ، کبھی انتقام کی آگ، کبھی اپنے کسی حریف کو میدان سے ہٹانے کا شوق، بس اس قسم کے جذبات ہیں جو اس کے باعث بنتے ہیں۔ اگر آدمی کے سینہ میں اللہ سے ڈرنے والا دل ہو تو وہ اسلام کا اظہار کرنے والے کے الفاظ کو قبول کر لے گا اور اس کے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر کے خاموش ہو جائے گا۔

عمل کے لحاظ سے مسلمانوں کے دو درجے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو فرائض کے دائرہ میں اسلامی زندگی اختیار کریں۔ وہ اللہ کی عبادت کریں اور حرام وحلال کے حدود کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی گزاریں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو قربانی کی سطح پر اسلام کو اختیار کریں۔ وہ خود اسلام کو اپناتے ہوئے دوسروں کو بھی اسلام پر لانے کی کوشش کریں اور اس راہ کی مصیبتوں کو برداشت کریں۔ وہ اسلام کے محاذ پر اپنی جان ومال کو لے کر حاضر ہو جائیں۔ وہ فرائض کے حدود میں نہ ٹھہریں بلکہ فرائض سے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو اسلام کے لیے پیش کر دیں۔ یہ دونوں ہی گروہ مخلص ہیں اور دونوں اللہ کی رحمتوں میں اپنا حصہ پائیں گے۔ مگر دوسرے گروہ کا معاملہ بنیادی طور پر الگ ہے۔ انھوں نے ناپ کر خدا کی راہ میں نہیں دیا اس لیے خدا بھی ان کو ناپ کر نہیں دے گا۔ انھوں نے مصلحتوں کی پروا کیے بغیر خدا کے مشن میں اپنے آپ کو شریک کیا اس لیے خدا بھی پروا کیے بغیر ان کو اپنی رحمتوں میں لے لے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي
الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً
فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ
وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿٩٧﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ
الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى
اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا
غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ
فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ
يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ
يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ
كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٠﴾ ع ۱۴

۹۷۔ جو لوگ اپنا برا کر رہے ہیں، جب ان کی جان فرشتے نکالیں گے تو وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہم زمین میں بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم وطن چھوڑ کر وہاں چلے جاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ۹۸۔ مگر وہ بے بس مرد اور عورتیں اور بچے جو کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور نہ کوئی راہ پا رہے ہیں۔ ۹۹۔ یہ لوگ، امید ہے کہ اللہ انھیں معاف کر دے گا اور اللہ معاف کرنے والا، بخشنے والا ہے۔ ۱۰۰۔ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں وطن چھوڑے گا، وہ زمین میں بڑے ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے، پھر اس کو موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے یہاں مقرر ہو چکا اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

مومن کی فطرت چاہتی ہے کہ اس کو آزادانہ ماحول ملے جہاں اس کی ایمانی ہستی کے اظہار کے لیے کھلے مواقع ہوں۔ جب بھی ایسا نہ ہو تو آدمی کو چاہیے کہ اپنا ماحول بدل دے۔ اسی کا نام ہجرت ہے۔ ہجرت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی اپنے کو غیر موافق فضا سے نکالے اور اپنے کو موافق فضا میں لے جائے۔ ایک ادارہ ہے جس میں بعض شخصیتوں کا زور ہے۔ وہاں رہنے والا ایک آدمی محسوس کرتا ہے کہ میں یہاں شخصیت پرست بن کر تو رہ سکتا ہوں مگر خدا پرست بن کر نہیں رہ سکتا۔ اب اگر وہ آدمی اپنے مفاد کی خاطر ایسے ماحول سے مصالحت کر کے اس میں پڑا رہے اور جو چیز اس کو حق نظر آئے اس کے حق ہونے کا اعلان نہ کرے، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جائے تو اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اسی طرح کوئی قوم ہے جس کا ایک قومی مذہب ہے۔ وہ اسی شخص کو اعزاز عطا کرتی ہے جو اس کے قوم پرستانہ مذہب کو اپنائے، جو شخص ایسا نہ کرے وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص اس قوم کا ساتھی بنتا ہے اور اسی حال میں اس کی موت آجاتی ہے تو اس نے اپنی جان پر

ظلم کیا۔ اسی طرح ایک ماحول میں حق کی دعوت اٹھتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ بکھرے ہوئے اہل ایمان اس کی پشت پر جمع ہوں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو اس کی خدمت میں لگائیں۔ وہ اپنے مال سے اس کی مدد کریں۔ مگر ایمان والے اپنے فائدوں اور مصلحتوں کے خول میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ اپنے خول سے باہر آئیں اور حق کے قافلہ میں شریک ہو کر اس کی قوت کا باعث بنیں۔ اگر وہ اسی حال میں اپنی زندگی کے دن پورے کر دیتے ہیں تو وہ خدا کے یہاں اس حال میں پہنچیں گے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا۔ تاہم وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو اس قدر معذور ہوں کہ ان سے کوئی تدبیر نہ بن رہی ہو اور نہ باہر سے ان کے لیے کوئی راہ کھل رہی ہو۔

آدمی اپنے ماحول میں ناموافق حالات دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ ساری دنیا اس کے لیے ایسی ہی ناموافق ہوگی۔ مگر خدا کی وسیع دنیا میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں۔ یہاں اگر ''مکہ'' ہے جہاں داعی کو پتھر مارے جاتے ہیں تو یہاں ''یثرب'' بھی ہے جہاں داعی کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو ماحول سے مصالحت کے بجائے ماحول کی تبدیلی کے اصول کو اپنانا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ نئے مقام کو اپنا میدان عمل بنانا اس کے لیے نئے امکانات کا دروازہ کھولنے کا سبب بن جائے۔

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾ وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ

۱۰۱۔ اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو، اگر تم کو ڈر ہو کہ منکر تم کو ستائیں گے۔ بے شک منکر لوگ تمھارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ ۱۰۲۔ اور جب تم اہلِ ایمان کے درمیان ہو اور ان کے لیے نماز قائم کرو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمھارے ساتھ کھڑی ہو اور وہ اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو۔ پس جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمھارے پاس سے ہٹ جائیں اور دوسری جماعت آئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور وہ تمھارے ساتھ نماز پڑھیں۔ اور وہ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار لیے رہیں۔ منکر لوگ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے کسی طرح غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ اور تمھارے اوپر کوئی گناہ نہیں اگر تم کو

كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَاۗءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّھُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ ع ۱۵ ۱۲

بارش کے سبب سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار اتار دو اور اپنے بچاؤ کا سامان لیے رہو۔ بے شک اللہ نے منکروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۰۳۔ پس جب تم نماز ادا کرلو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔ پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کی اقامت کرو۔ بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے۔ ۱۰۴۔ اور قوم کا پیچھا کرنے سے ہمت نہ ہارو۔ اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو وہ بھی تمھاری طرح دکھ اٹھاتے ہیں اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو امید وہ نہیں رکھتے۔ اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

دین میں جتنے اعمال بتائے گئے خواہ وہ نماز اور زکوۃ کی قسم سے ہوں یا تبلیغ اور جہاد کی قسم سے، سب کا آخری مقصود اللہ کی یاد ہے۔ تمام اعمال کا اصل مدعا یہ ہے کہ ایسا انسان تیار ہو جو اس طرح جیے کہ خدا اس کی یادوں میں بسا ہوا ہو۔ زندگی کا ہر موڑ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جائے۔ اندیشہ کا موقع اس کو اللہ سے ڈرائے، امید کا موقع اس کے اندر اللہ کا شوق پیدا کرے۔ اس کا بھروسہ اللہ پر ہو۔ اس کی توجہات اللہ کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ جو چیز ملے اس کو وہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی جانے اور جو چیز نہ ملے اس کو اللہ کے حکم کا نتیجہ سمجھے۔ اس کی پوری اندرونی ہستی اللہ کے جلال و جمال میں کھوئی ہوئی ہو۔ یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ جنگ کے نازک ترین موقع پر بھی کسی نہ کسی شکل میں نماز ادا کرنے کا حکم ہوا تاکہ موت کے کنارے کھڑے ہو کر انسان کو یاد دلایا جائے کہ وہ اصل چیز کیا ہے جو بندے کو اس دنیا سے لے کر اپنے رب کے پاس جانا چاہیے۔

اہل ایمان کا بھروسہ اگرچہ تمام تر اللہ پر ہوتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ حکم ہے کہ دشمنوں سے اپنے بچاؤ کا ظاہری سامان مہیا رکھو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی مدد ظاہری سامان کے اندر ہو کر ہی آتی ہے۔ اہل ایمان نے اگر اپنے بچاؤ کا ممکن انتظام نہ کیا ہو تو گویا انھوں نے وہ شکل ہی کھڑی نہیں کی جس کے ڈھانچے میں اللہ کی مدد اتر کر ان کی طرف آئے۔ مومن کو دنیا میں جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ اللہ کے منصوبہ کی قیمت ہیں کہ وہ آزمائشی حالات پیدا کر کے دیکھے کہ کون سچائی پر قائم رہنے والا ہے اور کون دوسروں کو ناحق ستانے والا۔

اسلام اور غیر اسلام کی کش مکش میں کبھی اہل اسلام کو شکست اور نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت کچھ لوگ پست ہمت ہونے لگتے ہیں۔ مگر ایسے حادثات میں بھی اللہ کی مصلحت شامل رہتی ہے۔ وہ اس لیے پیش آتے ہیں کہ بندہ کے اندر مزید انابت اور توجہ ابھرے اور اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی مزید عنایتوں کا مستحق بنے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿105﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿106﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿107﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿108﴾

۱۰۵۔ بے شک ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف حق کے ساتھ اتاری ہے، تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تم کو دکھایا ہے۔ اور بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو۔ ۱۰۶۔ اور اللہ سے بخشش مانگو۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۱۰۷۔ اور تم ان لوگوں کی طرف سے نہ جھگڑو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں۔ اللہ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو خیانت والا اور گنہ گار ہو۔ ۱۰۸۔ وہ انسانوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے۔ حالاں کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ سرگوشیاں کرتے ہیں اس بات کی جس سے اللہ راضی نہیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

انسان کی یہ ضرورت ہے کہ وہ مل جل کر رہے۔ یہی ضرورت قوم یا گروہ کو وجود میں لاتی ہے۔ اجتماعیت سے وابستہ ہو کر ایک آدمی اپنی طاقت کو ہزاروں لاکھوں گنا بڑا کر لیتا ہے۔ مگر دھیرے دھیرے ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز اجتماعی ضرورت کے طور پر بنی تھی وہ اجتماعی مذہب کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ وہ بذات خود لوگوں کا مقصود بن جاتی ہے۔ اب یہ ذہن بن جاتا ہے کہ ''میرا گروہ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ میری قوم خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر'' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنا حلقہ اہم دکھائی دیتا ہے اور دوسرا حلقہ غیر اہم۔ اپنے حلقہ کا آدمی اگر باطل پر ہے تب بھی اس کی حمایت ضروری سمجھی جاتی ہے اور دوسرے حلقہ کا آدمی اگر حق پر ہے تب بھی اس کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔

کسی گروہ میں یہ ذہن بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی گروہی مصلحتوں اور جماعتی تعصّبات کو معیار کا درجہ دے دیا۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ہدایت کو معیار کا درجہ دے اور اس کی روشنی میں اپنا

رویہ متعین کرے نہ کہ دنیوی مصلحتوں اور جماعتی تعصّبات کے تحت۔ ایک آدمی غلطی کرے تو اس کا ہاتھ پکڑا جائے خواہ وہ اپنا ہو۔ ایک آدمی صحیح بات کہے تو اس کا ساتھ دیا جائے خواہ وہ کوئی غیر ہو۔ حتی کہ ایسا معاملہ جس میں ایک فریق اپنا ہو اور ایک فریق باہر کا، تب بھی معاملہ کو اپنے اور غیر کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ حق اور ناحق کی نظر سے دیکھا جائے اور ہر دوسری چیز کی پرواہ کیے بغیر اپنے کو حق کی جانب کھڑا کیا جائے۔

سچائی کو چھوڑنا، خود اپنے آپ کو چھوڑنے کے ہم معنی ہے۔ جب آدمی دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے ساتھ خیانت کر چکا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر سینہ کے اندر اللہ نے اپنا ایک نمائندہ بٹھا دیا ہے۔ یہ انسان کا ضمیر ہے۔ جب بھی آدمی حق کے خلاف جانے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ اندر کا چھپا ہوا نمائندۂ حق اس کو ٹوکتا ہے۔ اس اندرونی آواز کو آدمی دباتا ہے اور اس کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ انصاف کے راستہ کو چھوڑے اور بے انصافی کے راستہ پر چل پڑے۔ مزید یہ کہ آدمی جب ناحق میں کسی کا ساتھ دیتا ہے تو وہ انسان کا لحاظ کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دنیوی تعلقات اور مصلحتوں کی وجہ سے وہ ایک شخص کو نظر انداز نہیں کر پاتا اس لیے وہ اس کو غلط جانتے ہوئے بھی اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ مگر ناحق کے باوجود ایک شخص کو نہ چھوڑنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے خدا کو چھوڑ دے۔ عین اس وقت جب کہ وہ دنیا میں ایک شخص کا ساتھ دیتا ہے، آخرت میں وہ خدا کے ساتھ سے محروم ہو جاتا ہے۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿١٠٩﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ
سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ
اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١١٠﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا
فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ﴿١١١﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ
يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا
مُّبِيْنًا ﴿١١٢﴾ ع ١٦/١٣ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ
لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا
يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ

۱۰۹۔ تم لوگوں نے دنیا کی زندگی میں تو ان کی طرف سے جھگڑا کر لیا۔ مگر قیامت کے دن کون ان کے بدلے اللہ سے جھگڑا کرے گا یا کون ہوگا ان کا کام بنانے والا۔ ۱۱۰۔ اور جو شخص برائی کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پائے گا۔ ۱۱۱۔ اور جو شخص کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اپنے ہی حق میں کرتا ہے اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۱۱۲۔ اور جو شخص کوئی غلطی یا گناہ کرے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو اس نے ایک بڑا بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لے لیا۔ ۱۱۳۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو یہ ٹھان ہی لیا تھا کہ وہ تم کو بہکا کر رہے گا۔ حالاں کہ وہ اپنے آپ کو بہکا

شَیۡءٍ ؕ وَ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَیۡكَ عَظِیۡمًا ﴿۱۱۳﴾

رہے ہیں۔ وہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ چیز سکھائی ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا فضل ہے تم پر بہت بڑا۔

دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں ہر آدمی سے غلطی ہوسکتی ہے۔ خدا کے معاملہ میں بھی اور بندوں کے معاملہ میں بھی۔ جب کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی غلطی پر شرمندہ ہو۔ وہ اللہ کی طرف اور زیادہ توجہ کے ساتھ دوڑے۔ وہ اللہ سے درخواست کرے کہ وہ اس کی غلطی کو معاف کر دے اور آئندہ کے لیے اس کو نیکی کی توفیق دے۔ جو شخص اس طرح اللہ کی پناہ چاہے تو اللہ بھی اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ اللہ اس کے دینی احساس کو بیدار کر کے اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو کر دنیا میں رہنے لگے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی جب غلطی کرے تو وہ غلطی کو ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔ بلکہ اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جائے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی حمایت سے خود ان لوگوں سے لڑنے لگے جو اس کی غلطی سے اس کو آگاہ کر رہے ہیں۔ جو لوگ اپنی غلطی پر اس طرح اکڑتے ہیں اور جو لوگ ان کا ساتھ دیتے ہیں وہ خدا کے نزدیک بدترین مجرم ہیں۔ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے جن الفاظ کا سہارا لیتے ہیں وہ آخرت میں بالکل بے معنی ثابت ہوں گے اور جن حمایتیوں کے بھروسے پر وہ گھمنڈ کر رہے ہیں وہ بالآخر جان لیں گے کہ وہ کچھ بھی ان کے کام آنے والے نہ تھے۔

ایک شخص کسی کا مال چرائے اور جب پکڑے جانے کا اندیشہ ہو تو اس کو دوسرے کے گھر میں رکھ کر کہے کہ فلاں نے اس کو چرایا تھا۔ ایک شخص کسی عورت کو اپنی ہوس کا نشانا بنانا چاہے اور جب وہ پاک دامن خاتون اس کا ساتھ نہ دے تو وہ جھوٹے افسانے گھڑ کر اس خاتون کو بدنام کرے۔ دو آدمی مل کر ایک کام شروع کریں۔ اس کے بعد ایک شخص کو محسوس ہو کہ اس کی ذاتی مصلحتیں مجروح ہو رہی ہیں، وہ تدبیر کر کے اس کام کو بند کرا دے اور اس کے بعد مشہور کرے کہ اس کے بند ہونے کی ذمہ داری فریق ثانی کے اوپر ہے۔ یہ سب اپنا جرم دوسرے کے سر ڈالنے کی کوششیں ہیں۔ مگر ایسی کوششیں صرف آدمی کے جرم کو بڑھاتی ہیں، وہ اس کو بری الذمہ ثابت نہیں کرتیں۔ اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ وہ ہدایت کے دروازے کھولے۔ وہ آدمی کو سمجھائے کہ غلطی کرنے کے بعد اپنی غلطی کو مان لو، نہ کہ بحث کر کے اپنے کو صحیح ثابت کرو۔ کسی سے معاملہ پڑے تو ساتھیوں کے بل پر گھمنڈ نہ کرو بلکہ اللہ سے ڈر کر تواضع کا انداز اختیار کرو۔ کسی کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع مل جائے تو اپنے کو کامیاب سمجھ کر خوش نہ ہو بلکہ اللہ سے دعا کرو کہ وہ تم کو ظالم بننے سے بچائے۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ
بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ۭ
وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ
الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ
غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ
جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع

۱۱۴۔ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں۔ بھلائی والی سرگوشی صرف اس کی ہے جو صدقہ کرنے کو کہے یا کسی نیک کام کے لیے کہے یا لوگوں میں صلح کرانے کے لیے کہے۔ جو شخص اللہ کی خوشی کے لیے ایسا کرے تو ہم اس کو بڑا اجر عطا کریں گے۔ ۱۱۵۔ مگر جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستہ کے سوا کسی اور راستہ پر چلے گا، حالاں کہ اس پر راہ واضح ہو چکی تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

حق کی بے آمیز دعوت جب اٹھتی ہے تو وہ زمین پر خدا کا ترازو کھڑا کرنا ہوتا ہے۔ اس کی میزان میں ہر آدمی اپنے کو تُلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ حق کی دعوت ہر ایک کے اوپر سے اس کا ظاہری پردہ اتار دیتی ہے اور ہر شخص کو اس کے اس مقام پر کھڑا کر دیتی ہے جہاں وہ باعتبار حقیقت تھا۔ یہ صورت حال اتنی سخت ہوتی ہے کہ لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ سارا ماحول داعی کے لیے ایسا بن جاتا ہے جیسے وہ انگاروں کے درمیان کھڑا ہوا ہو۔

جو لوگ دعوت حق کے ترازو میں اپنے کو بے وزن ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں ان کے اندر ضد اور گھمنڈ کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ تیزی سے مخالفانہ رخ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ایسی دعوت کو مٹا دیں جو ان کی حق پرستانہ حیثیت کو مشتبہ ثابت کرتی ہو۔ ان کے لیے اپنی زبان کا استعمال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ دعوت اور داعی کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلائیں۔ اس کو زیر کرنے کے منصوبے بنائیں۔ وہ لوگوں کو منع کریں کہ اس کی مالی مدد نہ کرو۔ جو اللہ کے بندے اللہ کی رسّی کے گرد متحد ہو رہے ہوں ان کو بدگمانیوں میں مبتلا کر کے منتشر کریں۔

اس کے برعکس، جو لوگ اپنی فطرت کو زندہ رکھے ہوئے تھے ان کو اللہ کی مدد سے یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائیں، وہ اس کا ساتھ دیں، وہ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ان کی زبان کا استعمال یہ ہوتا ہے کہ وہ کھلے طور پر سچائی کا اعتراف کرلیں۔ وہ لوگوں سے کہیں کہ یہ اللہ کا کام ہے اس میں اپنا مال اور اپنا وقت خرچ کرو۔ وہ لوگوں کو ترغیب دیں کہ وہ اپنی قوتوں کو نیکی اور بھلائی کے کاموں میں لگائیں۔ وہ آپس کی رنجشوں اور شکایتوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ حق کا اعتراف ان کے اندر جو نفسیات جگاتا ہے اس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ اس قسم کے تعمیری کاموں میں لگ جائیں۔

اللہ کے نزدیک یہ ایک ناقابلِ معافی جرم ہے کہ حق کی دعوت کی مخالفت کی جائے اور جو لوگ حق کی

دعوت کے گرد جمع ہوئے ہیں ان کو اپنی دشمنی کی آگ میں جلانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے اکثر گناہوں میں یہ امکان رہتا ہے کہ وہ انسان کی غفلت یا کمزوری کی وجہ سے صادر ہوئے ہوں۔ مگر دعوت حق کی مخالفت تمام تر سرکشی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور سرکشی کسی آدمی کا وہ جرم ہے جس کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا، اِلّا یہ کہ وہ اپنی غلطی کا اقرار کرے اور سرکشی سے باز آجائے۔ دین کی دعوت جب بھی اپنی بے آمیز شکل میں اٹھتی ہے تو وہ ایک خدائی کام ہوتا ہے جو خدا کی خصوصی مدد پر شروع ہوتا ہے۔ ایسے کام کی مخالفت کرنا گویا خدا کے مقابلہ میں کھڑا ہونا ہے اور کون ہے جو خدا کے مقابلہ میں کھڑا ہو کر کامیاب ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا
دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ
بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿١١٦﴾ اِنْ
يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ
يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۙ﴿١١٧﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ
وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا
مَّفْرُوْضًا ۙ﴿١١٨﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ
لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ
لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ
الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ
خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿١١٩﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ وَمَا
يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿١٢٠﴾ اُولٰٓئِكَ
مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَ لَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا
مَحِيْصًا ﴿١٢١﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

۱۱۶۔ بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے سوا دوسرے گناہوں کو بخش دے گا جس کے لیے چاہے گا۔ اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا وہ بہک کر بہت دور جا پڑا۔ ۱۱۷۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں دیویوں کو اور وہ پکارتے ہیں سرکش شیطان کو۔ ۱۱۸۔ اس پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور شیطان نے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا۔ ۱۱۹۔ میں ان کو بہکاؤں گا اور ان کو جھوٹی امیدیں دلاؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ کو بدلیں گے اور جو شخص اللہ کے سوا شیطان کو اپنا دوست بنائے تو وہ کھلے ہوئے نقصان میں پڑ گیا۔ ۱۲۰۔ وہ ان کو وعدہ دیتا ہے اور ان کو امیدیں دلاتا ہے اور شیطان کے تمام وعدے فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ۱۲۱۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔ ۱۲۲۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا۔

جو شخص ایک اللہ کو پکڑ لے اس کے عمل کی جڑیں خدا میں قائم ہوجاتی ہیں۔ اس سے وقتی لغزش بھی ہوتی ہے۔ مگر اس کے بعد جب وہ پلٹتا ہے تو دوبارہ وہ حقیقی سرے کو پالیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے سوا کہیں اور اٹکا ہوا ہو وہ گویا اس زمین سے محروم ہے جو اس کائنات میں واحد حقیقی زمین ہے۔ بظاہر اگر وہ کوئی اچھا عمل کرے تب بھی وہ خدا کے سرچشمہ سے نکلا ہوا عمل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک اوپری عمل ہوتا ہے جو معمولی جھٹکا لگتے ہی باطل ثابت ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کے ساتھ کیا ہوا عمل آخرت میں اپنا نتیجہ دکھاتا ہے اور شرک کے ساتھ کیا ہوا عمل اسی دنیا میں برباد ہو کر رہ جاتا ہے، وہ آخرت تک نہیں پہنچتا۔

اس دنیا میں آدمی کا اصلی مقابلہ شیطان سے ہے۔ تاہم شیطان کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ وہ اتنا کرسکتا ہے کہ آدمی کو لفظی وعدوں کا فریب دے اور فرضی تمناؤں میں الجھائے۔ اور اس طرح لوگوں کو حق سے دور کردے۔ شیطان کی گمراہی کی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک، توہم پرستی اور دوسرے، خدا کی تخلیق میں فرق کرنا۔ توہم پرستی یہ ہے کہ کسی چیز سے ایسے نتیجہ کی امید کرلی جائے جس نتیجہ کا کوئی تعلق اس سے نہ ہو۔ مثلاً خود ساختہ مفروضوں کی بنیاد پر اللہ کے سوا کسی اور چیز کو معاملات میں مؤثر مان لینا، حالاں کہ اس دنیا میں اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ یا زندگی کو عملاً دنیا کے حصول میں لگا دینا اور آخرت کے بارے میں فرضی خوش خیالیوں کی بنا پر یہ امید قائم کرلینا کہ وہ اپنے آپ حاصل ہوجائے گی۔ شیطان کے بہکاوے کا دوسرا طریقہ اللہ کے بتائے ہوئے نقشہ کو بدلنا ہے۔ خدا نے انسان کو اس فطرت پر پیدا کیا ہے کہ وہ اپنی تمام توجہ کو اللہ کی طرف لگائے، اس فطرت کو بدلنا یہ ہے کہ انسان کی توجہات کو دوسری دوسری چیزوں کی طرف مائل کردیا جائے۔ یا کسی مقصد کے حصول کا جو طریقہ فطری طور پر مقرر کیا گیا ہے اس کو بدل کر کسی خود ساختہ طریقے سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ کائنات کے خدائی نقشہ کی مطابقت میں انسان کو جس طرح رہنا چاہیے اس نقشہ کو ناپید کردیا جائے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ

۱۲۳۔ نہ تمھاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی بھی برا کرے گا، اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ نہ پائے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ مدد گار۔
۱۲۴۔ اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے

الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَ مَنْ
اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ
مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ
وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۸ ۱۱ ۱۵

لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ ۱۲۵۔ اور اس سے بہتر کس کا دین ہے جو اپنا چہرہ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ نیکی کرنے والا ہو۔ اور وہ چلے دین ابراہیم پر جو یکسو تھا اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ۱۲۶۔ اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

خدا اور آخرت کو ماننے والے لوگ جب دنیا پرستی میں غرق ہوتے ہیں تو وہ خدا اور آخرت کا انکار کر کے ایسا نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ آخرت کے معاملہ کو رسمی عقیدہ کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں اور عملاً اپنی تمام محنتیں اور سرگرمیاں دنیا کو حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ دنیا کی عزت اور دنیا کے فائدہ کو سمیٹنے کے معاملہ میں وہ پوری طرح سنجیدہ ہوتے ہیں۔ ان کو پانے کے لیے ان کے نزدیک مکمل جدوجہد ضروری ہوتی ہے۔ مگر آخرت کی کامیابی کو پانے کے لیے صرف خوش فہمیاں ان کو کافی نظر آنے لگتی ہیں۔ کسی بزرگ کی سفارش، کسی بڑے گروہ سے وابستگی، کچھ پاک کلمات کا ورد، بس اس قسم کے سستے اعمال سے یہ امید قائم کر لی جاتی ہے کہ وہ آدمی کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ سے بچائیں گے اور اس کو جنت کے پُر بہار باغوں میں داخل کریں گے۔ مگر اس قسم کی خوش خیالیاں خواہ ان کو کتنے ہی خوب صورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہو، وہ کسی کے کچھ کام آنے والے نہیں۔ اللہ کا نظام حد درجہ محکم نظام ہے۔ اس کے یہاں تمام فیصلے حقیقتوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں، نہ کہ محض آرزوؤں کی بنیاد پر۔ اللہ کی عدالت میں ہر آدمی کا اپنا عمل دیکھا جائے گا اور جیسا جس کا عمل ہوگا ٹھیک اسی کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ کے قانونِ عدل کے سوا کوئی بھی دوسری چیز نہیں جو اللہ کے یہاں فیصلہ کی بنیاد بننے والی ہو۔

اللہ کا وہ بندہ کون ہے جس پر اللہ اپنی رحمتوں کی بارش کرے گا۔ اس کی ایک تاریخی مثال ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہ وہ بندے ہیں جو دنیا میں اللہ کے مومن بن کر رہیں۔ جو اپنے آپ کو ہمہ تن اپنے رب کی طرف یکسو کر لیں۔ جو اپنی وفاداریاں پوری طرح اللہ کے لیے خاص کر دیں۔ انھوں نے دنیا میں اپنے معاملات کو اس طرح قائم کیا ہو کہ وہ ظلم اور سرکشی سے دور رہنے والے اور عدل اور تواضع کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہوں۔ چہرہ آدمی کے پورے وجود کا نمائندہ ہے۔ چہرہ خدا کی طرف پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود کو خدا کی طرف پھیر دے۔

اللہ تمام کائنات کا مالک ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کی طاقتیں ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں اللہ نے اپنے کو غیب کے پردہ میں چھپا دیا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اسی لیے پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی خدا کو نہیں دیکھتا، وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں۔ اگر آدمی یہ جان لے کہ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں تو آدمی پر جو کچھ قیامت کے دن بیتنے والا ہے وہ اس پر آج ہی بیت جائے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿١٢٧﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٢٩﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿١٣٠﴾

۱۲۷۔ اور لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اللہ تمھیں ان کے بارے میں حکم دیتا ہے اور وہ آیات بھی جو تمھیں کتاب میں ان یتیم عورتوں کے بارے میں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جن کو تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لیے لکھا گیا ہے اور چاہتے ہو کہ ان کو نکاح میں لے آؤ۔ اور جو آیات کمزور بچوں کے بارے میں ہیں، اور یتیموں کے ساتھ انصاف کرو اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ ۱۲۸۔ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی صلح کر لیں اور صلح بہتر ہے اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خداترسی سے کام لو تو جو کچھ تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۱۲۹۔ اور تم ہرگز عورتوں کو برابر نہیں رکھ سکتے اگرچہ تم ایسا کرنا چاہو۔ پس بالکل ایک ہی طرف نہ جھک پڑو کہ دوسری کو لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو۔ اور اگر تم اصلاح کر لو اور ڈرو تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۱۳۰۔ اور اگر دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے احتیاج کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا، حکمت والا ہے۔

پوچھنے والوں نے بعض معاشرتی امور کی بابت شرعی حکم دریافت کیا تھا۔ اس سلسلے میں حکم بتاتے ہوئے خیر وانصاف اور صلاح وتقویٰ پر زور دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی قانون اسی وقت اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے جب کہ اس کو عمل میں لانے والا آدمی اللہ سے ڈرتا ہو اور فی الواقع انصاف کا طالب ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو قانون کی ظاہری تعمیل کے باوجود حقیقی بہتری پیدا نہیں ہوسکتی۔ معاشرہ کی واقعی اصلاح صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ برائی کرنے والا برائی سے اس لیے ڈرے کہ اصل معاملہ خدا سے ہے اور برائی کرنے کے بعد میں کسی طرح اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ اسی طرح بھلائی کرنے والا یہ سوچے کہ لوگوں کی طرف سے خواہ مجھے اس کا کوئی صلہ نہ ملے مگر اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور وہ ضرور مجھ کو اس کا انعام دے گا۔ جہنم کا اندیشہ آدمی کو ظلم سے روکتا ہے اور جنت کی امید اس نقصان کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے جو حق پرستانہ زندگی کے نتیجہ میں لازماً سامنے آتا ہے۔

میاں بیوی یا دو آدمیوں میں اختلاف کی وجہ ہمیشہ حرص ہوتی ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق کا لحاظ کیے بغیر صرف اپنے مطالبات کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ذہنیت ہر ایک کو دوسرے کی طرف سے غیر مطمئن بنا دیتی ہے۔ صحیح مزاج یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کی معذوری کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہوئے کسی باہمی تصفیہ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ اللہ کا مطالبہ جس طرح یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی رعایت کرے، اسی طرح اللہ بھی اپنے بندوں کے ساتھ آخری حد تک رعایت فرماتا ہے۔ اللہ کے یہاں آدمی کی پکڑ اس کی فطری کمزوریوں پر نہیں ہے بلکہ اس کی اس سرکشی پر ہے جو وہ جان بوجھ کر کرتا ہے۔ اگر آدمی اللہ سے ڈرے اور دل میں اصلاح کا جذبہ رکھے تو وہ نیت کی درستگی کے ساتھ جو کچھ کرے گا اس کے لیے وہ اللہ کے یہاں قابل معافی قرار پائے گا۔ اسی کے ساتھ آدمی کو کبھی اس غلط فہمی میں نہ پڑنا چاہیے کہ وہ دوسرے کا کام بنانے والا ہے۔ ہر ایک کا کام بنانے والا صرف اللہ ہے، خواہ وہ بظاہر ایک طرح کے حالات میں ہو یا دوسری طرح کے حالات میں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ

۱۳۱۔ اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور ہم نے حکم دیا ہے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تم کو بھی کہ اللہ سے ڈرو۔ اور اگر تم نے نہ مانا تو اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز ہے، سب خوبیوں والا ہے۔ ۱۳۲۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں

يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ
ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا
ع ۱۹ ۸ ۱۲ وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بھروسہ کے لیے اللہ کافی ہے۔ ۱۳۳۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اے لوگو، اور دوسروں کو لے آئے۔ اور اللہ اس پر قادر ہے۔ ۱۳۴۔ جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہو تو اللہ کے پاس دنیا کا ثواب بھی ہے اور آخرت کا ثواب بھی۔ اور اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

دنیا میں آدمی کو جو صالح زندگی اختیار کرنا ہے وہ اس کو اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب کہ وہ اندر سے اللہ والا بن گیا ہو۔ اللہ کو مالک کائنات کی حیثیت سے پالینا، صرف اللہ سے ڈرنا اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا، آخرت کو اصل سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو جانا، یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی آدمی کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ دنیا میں اس طرح کی صالح زندگی گزارے جو اللہ کو مطلوب ہے اور جو اس کو آخرت کی دنیا میں کامیاب کرنے والی ہے۔ اسی لیے نبیوں کی تعلیمات میں ہمیشہ اسی پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے۔

موجودہ دنیا آزمائش کے لیے ہے۔ یہاں ہر آدمی کو جانچ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا ہے اور کون برا۔ اس مقصد کے لیے موجودہ دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں آدمی کو ہر قسم کے عمل کی آزادی ہو۔ حتی کہ اس کو یہ موقع بھی حاصل ہو کہ وہ اپنے سیاہ کو سفید کہہ سکے اور اپنی بے عملی کو عمل کا نام دے۔ یہاں ایک آدمی کے لیے ممکن ہے کہ وہ برائیوں میں مبتلا ہو مگر اس کو بیان کرنے کے لیے وہ بہترین الفاظ پالے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی ایک کھلی ہوئی سچائی کا انکار کر دے اور اپنے انکار کی ایک خوب صورت توجیہ تلاش کر لے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی جاہ طلبی، شہرت پسندی، نفع اندوزی اور مصلحت پر اپنی زندگی کی تعمیر کرے اور اس کے باوجود وہ لوگوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جائے کہ وہ خالص حق کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص خدا کے دین کو اپنے دنیوی اور مادی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے، اور پھر بھی وہ دنیا میں پھلتا اور پھولتا رہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی حلال کو چھوڑ کر حرام ذرائع اختیار کرے، انصاف کے بجائے وہ ظلم کے راستہ پر چلے اور اس کے باوجود اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو۔ ان مختلف مواقع پر آدمی چاہے تو اپنے کو حق وصداقت کا پابند بنا لے اور چاہے تو سرکشی اور بے انصافی کی طرف چل پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کے تمام احکام میں اہمیت کی چیز یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرتا ہے یا نہیں۔ یہ صرف اللہ کا ڈر ہے جو اس کو ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے۔ اگر اللہ کا ڈر نہ ہو تو ایک ایسی دنیا میں کسی کو باطل سے روکنے والی کیا چیز ہو سکتی ہے جہاں باطل کو بھی حق کے پیرایہ میں بیان کیا جا سکتا ہو اور جہاں بے انصافی کی بنیاد پر بھی بڑی بڑی ترقیاں حاصل کی جا سکتی ہوں۔ جہاں ہر ظالم کو اپنے ظلم کو چھپانے کے لیے خوب صورت الفاظ مل جاتے ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ وَ اِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۳۵﴾

۱۳۵۔ اے ایمان والو، انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، چاہے وہ تمھارے یا تمھارے ماں باپ یا عزیزوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج تو اللہ تم سے زیادہ دونوں کا خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تم کجی کروگے یا پہلوتہی کروگے تو جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے ایسا معاملہ آتا ہے جس میں ایک راستہ اپنے مفاد اور خواہش کا ہوتا ہے اور دوسرا حق اور انصاف کا۔ جو لوگ اللہ کی طرف سے غافل ہوتے ہیں، جن کو یقین نہیں ہوتا کہ اللہ ہر وقت ان کو دیکھ رہا ہے وہ ایسے مواقع پر اپنی خواہش کے رخ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ اس کو کامیابی سمجھتے ہیں کہ حق کی پروانہ کریں اور معاملہ کو اپنے مفاد اور اپنی مصلحت کے مطابق طے کریں۔ مگر جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، جو اللہ کو اپنا نگراں بنائے ہوئے ہیں وہ تمام تر انصاف کے پہلو کو دیکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو حق و انصاف کا تقاضا ہو۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو موت آئے تو اس حال میں آئے کہ انھوں نے کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کی ہو، وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر قسط اور عدل پر قائم کیے ہوئے ہوں۔

ان کی انصاف پسندی کا یہ جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ ان کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ انصاف سے ہٹا ہوا کوئی رویہ دیکھیں اور اس کو برداشت کرلیں۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ سامنے آتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہو تو وہ ایسے موقع پر حق کا اعلان کرنے سے باز نہیں رہتے۔ اگر انصاف کا اعلان کرنے میں ان کے قریبی تعلق والوں پر زد پڑتی ہو یا ان کی اپنی مصلحتیں مجروح ہوتی ہوں تب بھی وہ وہی کہتے ہیں جو انصاف کی رو سے انھیں کہنا چاہیے۔ ان کی زبان کھلتی ہے تو اللہ کے لیے کھلتی ہے، نہ کہ کسی اور چیز کے لیے۔ اسی طرح یہ بات بھی غلط ہے کہ صاحب معاملہ طاقت ور ہو تو اس کو اس کا حق دیا جائے اور اگر صاحب معاملہ کمزور ہو تو اس کا حق اس کو نہ دیا جائے۔ مومن وہ ہے جو ہر آدمی کے ساتھ انصاف کرے، خواہ وہ زور آور ہو یا کمزور۔

جب کوئی آدمی ناانصافی کا ساتھ دے تو وہ یہ کہہ کر ایسا نہیں کرتا کہ میں ناانصافی کرنے والے کا ساتھی ہوں۔ بلکہ وہ اپنی ناانصافی کو انصاف کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقع پر ہر آدمی دو میں سے کوئی ایک رویہ اختیار کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ کرتا ہے کہ بات کو بدل دیتا ہے۔ وہ معاملہ کی نوعیت کو ایسے الفاظ میں بیان

کرتا ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ ناانصافی کا معاملہ نہیں بلکہ عین انصاف کا معاملہ ہے جس کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے وہ اسی کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خاموشی اختیار کرلے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہاں ناانصافی کی جارہی ہے وہ کترا کر نکل جائے اور جو کہنے کی بات ہے اس کو زبان پر نہ لائے۔ اس قسم کا طرزِ عمل ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے اوپر اللہ کو نگراں نہیں سمجھتا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ
الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ
الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ
مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ
ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝١٣٦ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ
كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا
لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ
سَبِيْلًا ۝١٣٧ؕ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا
اَلِيْمَا ۝١٣٨ۙ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ
الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝١٣٩

۱۳۶۔ اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے نازل کی۔ اور جو شخص انکار کرے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو وہ بہک کر دور جاپڑا۔ ۱۳۷۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر انکار کیا، پھر ایمان لائے پھر انکار کیا، پھر وہ انکار میں بڑھتے گئے تو اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ان کو راہ دکھائے گا۔ ۱۳۸۔ منافقوں کو خوش خبری دے دو کہ ان کے لیے ایک درد ناک عذاب ہے۔ ۱۳۹۔ وہ لوگ جو مومنوں کو چھوڑ کر منکروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت کی تلاش کر رہے ہیں، تو عزت ساری اللہ کے لیے ہے۔

''ایمان والو ایمان لاؤ'' ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ مسلمانوں مسلمان بنو۔ اپنے کو مسلمان کہنا یا مسلمان سمجھنا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ آدمی اللہ کے یہاں بھی مسلمان قرار پائے۔ اللہ کے یہاں صرف وہ شخص مسلمان قرار پائے گا جو اللہ کو اس طرح پائے کہ وہی اس کے یقین واعتماد کا مرکز بن جائے۔ جو رسول کو اس طرح مانے کہ ہر دوسری رہنمائی اس کے لیے بے حقیقت ہو جائے۔ جو آسمانی کتاب کو اس طرح اپنائے کہ اس کی سوچ اور جذبات بالکل اس کے تابع ہو جائیں۔ جو فرشتوں کے عقیدہ کو اس طرح اپنے دل میں بٹھائے کہ اس کو محسوس ہونے لگے کہ اس کے دائیں بائیں ہر وقت خدا کے چوکیدار کھڑے ہوئے ہیں۔ جو آخرت کا اس طرح اقرار کرے کہ وہ اپنے ہر قول وفعل کو آخرت کی میزان پر جانچنے لگے۔ جو شخص اس طرح

مومن بنے وہی اللہ کے نزدیک اس راستہ پر ہے جو ہدایت اور کامیابی کا راستہ ہے۔ اور جو شخص اس طرح مومن نہ بنے وہ ایک بھٹکا ہوا انسان ہے، خواہ وہ اپنے آپ خود کو کتنا ہی مومن و مسلم سمجھتا ہو۔

ماننے اور نہ ماننے کا یہ معرکہ آدمی کی زندگی میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ جب بھی کوئی معاملہ پڑتا ہے تو آدمی کا ذہن دو میں سے کسی ایک رخ پر چل پڑتا ہے۔ یا خواہشات کی طرف یا حق کے تقاضے پورے کرنے کی طرف۔ اگر ایسا ہو کہ معاملہ کے وقت آدمی کی سوچ اور جذبات خواہش کی سمت میں چل پڑیں تو گویا ایمان لانے والے نے ایمان سے انکار کیا۔ اس کے برعکس، اگر وہ اپنی سوچ اور جذبات کو حق کا پابند بنا لے تو گویا ایمان لانے والا ایمان لے آیا۔ آدمی مسلمان بن کر دنیا کی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک حق بات اس کے سامنے آتی ہے۔ اب ایک شخص وہ ہے جو ایسے موقع پر تواضع کا رویہ اختیار کرے اور حق کا اعتراف کرے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کے اندر کبر کی نفسیات جاگ اٹھیں اور وہ حق بات کو ٹھکرا دے۔ پہلی صورت ایمان کی صورت ہے اور دوسری صورت ایمان کا انکار کرنے کی۔ جو شخص سچا مومن نہ ہو وہ دنیا کی عزت و جاہ کو پسند کرتا ہے اس لیے وہ ان لوگوں کی طرف جھک پڑتا ہے جن سے منسوب ہو کر اس کی عزت و جاہ میں اضافہ ہو، خواہ وہ اہلِ باطل ہوں۔ اس کو ان لوگوں سے دل چسپی نہیں ہوتی جن سے منسوب ہونا اس کی عزت و جاہ میں اضافہ نہ کرے، خواہ وہ اہلِ حق ہوں۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَۨا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ

۱۴۰۔ اور اللہ کتاب میں تم پر یہ حکم اتار چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا جار ہا ہے اور ان کا مذاق کیا جار ہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ ورنہ تم بھی انھیں جیسے ہو جاؤ گے۔ اللہ منافقوں کو اور منکروں کو جہنم میں ایک جگہ اکھٹا کرنے والا ہے۔ ۱۴۱۔ وہ منافق تمھارے لیے انتظار میں رہتے ہیں۔ اگر تم کو اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے۔ اور اگر منکروں کو کوئی حصہ مل جائے تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا۔ تو اللہ ہی تم لوگوں کے درمیان قیامت

ع ۱۷ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾

کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز منکروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا۔

اللہ کی پکار جب بھی کسی انسانی گروہ میں اٹھتی ہے تو اتنی مضبوط بنیادوں پر اٹھتی ہے کہ دلیل کے ذریعہ اس کی کاٹ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے جو لوگ اس کو ماننا نہیں چاہتے وہ اس کا مذاق اڑا کر اس کو بے وزن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہ اپنے اس رویہ سے بتا رہے ہیں کہ وہ حق کے معاملہ کو کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھتے اور جب آدمی کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو تو اس وقت اس سے بحث کرنا بالکل بے کار ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی چپ ہو جائے اور اس وقت کا انتظار کرے جب کہ گفتگو کا موضوع بدل جائے اور مخاطب اس قابل ہو جائے کہ وہ بات کو سن سکے۔ جس مجلس میں خدا کی دعوت کا مذاق اڑایا جائے وہاں بیٹھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی حق کے معاملہ میں غیرت مند نہیں۔

منافق اس کی پروا نہیں کرتا کہ اصول پسندی کا تقاضا کیا ہے، بلکہ جس چیز میں فائدہ نظر آئے اس طرف وہ جھک جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس حلقہ کے ساتھ جوڑتا ہے جس کا ساتھ دینے میں اس کے دنیوی حوصلے پورے ہوتے ہوں، خواہ وہ اہلِ ایمان کا حلقہ ہو یا غیر اہل ایمان کا۔ وہ جس مجلس میں جاتا ہے اس کو خوش کرنے والی باتیں کرتا ہے۔ مصلحتوں کی بنا پر کبھی اس کو سچے اہل ایمان کے ساتھ جڑنا پڑے تب بھی وہ دل سے ان کا خیر خواہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ سچے اہلِ ایمان کا وجود کسی معاشرہ میں حق کا پیمانہ بن جاتا ہے۔ اس لیے جو لوگ جھوٹی دین داری پر کھڑے ہوئے ہوں وہ چاہتے ہیں کہ ایسے پیمانے ٹوٹ جائیں جو ان کی دین داری کو مشتبہ ثابت کرنے والے ہیں۔ مگر اہلِ ایمان کے بدخواہ جو کچھ زور دکھا سکتے ہیں اسی دنیا میں دکھا سکتے ہیں۔ آخرت میں وہ ان کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

منافق وہ ہے جو بظاہر دین دار مگر اندر سے بے دین ہو۔ ایسے شخص کا انجام کافر کے ساتھ ہونا بتاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ظاہری دین داری اور کھلی ہوئی بے دینی میں کوئی فرق نہیں۔ کیوں کہ ظاہر کی سطح پر خواہ دونوں مختلف نظر آئیں مگر باطن کی سطح پر دونوں ایک ہوتے ہیں۔ اور اللہ کے یہاں اعتبار باطن کا ہے، نہ کہ ظاہر کا۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ

۱۴۲۔ منافقین اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں۔ حالاں کہ اللہ ہی نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں محض لوگوں کو دکھانے کے لیے۔ اور وہ اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ ۱۴۳۔ وہ دونوں کے بیچ لٹک رہے ہیں، نہ

فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ
عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي
الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ
نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَ
اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اِدھر ہیں اور نہ اُدھر۔ اور جس کو اللہ بھٹکا دے تم اس کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے۔ ۱۴۴۔ اے ایمان والو، مومنوں کو چھوڑ کر منکروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی کھلی حجت قائم کر لو۔ ۱۴۵۔ بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہوں گے اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ ۱۴۶۔ البتہ جو لوگ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر لیں تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ ایمان والوں کو بڑا ثواب دے گا۔ ۱۴۷۔ اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا، اگر تم شکرگزاری کرو اور ایمان لاؤ۔ اللہ بڑا اقدرداں ہے، سب کچھ جاننے والا ہے۔

جو لوگ اپنے کو اللہ کے حوالے کیے ہوئے نہ ہوں وہ اپنے کو اپنے دنیوی مفاد کے حوالے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ دنیوی مفاد جس سے وابستہ ہو وہ اسی کے ساتھ ہو جاتے ہیں، خواہ وہ دین دار ہو یا بے دین۔ ایسے لوگ زبان سے اسلام کے الفاظ بولتے ہیں اور بعض اسلامی اعمال بھی ظاہری حد تک ادا کرتے رہتے ہیں، مگر ان کا عمل اللہ کے لیے نہیں ہوتا۔ بلکہ لوگوں کی نظر میں مسلمان بنے رہنے کے لیے ہوتا ہے۔ ان کا اصلی دین موقع پرستی ہوتا ہے مگر لوگوں کے سامنے وہ اپنے کو خدا پرست ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ گویا خدا کو دھوکا دے رہے ہیں۔ وہ خدا والے نہ ہو کر اپنے کو خدا والا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلام کو سچا دین جانتے ہیں، اس کے باوجود اپنے مفادات کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ سے وہ دونوں کے درمیان معلق رہتے ہیں، نہ پوری طرح اپنے عقیدہ کے لیے یکسو ہوتے اور نہ پوری طرح اپنے مفادات کے لیے۔ ایسے لوگ اللہ کی مدد سے محروم رہتے ہیں۔ کیوں کہ اللہ کی مدد کا مستحق بننے کے لیے اللہ کے راستہ پر جمنا ضروری ہے۔ اور یہی چیز ان کے یہاں موجود نہیں ہوتی — حق کو ماننے والے اور حق کا انکار کرنے والے جب الگ الگ ہو چکے ہوں تو ایسی حالت میں حق کا انکار کرنے والوں کا ساتھ دینا اپنے خلاف خدا کی کھلی حجت قائم کرنا ہے۔ یہ کسی کے قابلِ سزا ہونے کا ایسا ثبوت ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اس قسم کے لوگ اپنے دکھاوے کے اعمال کی بنا پر خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ اسلام کی ظاہری نمائش کے باوجود حقیقت کے اعتبار سے وہ اسلام سے دور تھے، اس لیے ان کا انجام بھی ان کی حقیقت کے اعتبار سے

ہوگا، نہ کہ ان کے ظاہر کے اعتبار سے۔ تاہم کسی کی گمراہی کی وجہ سے خدا اس کا دشمن نہیں ہوجاتا۔ اس قسم کے لوگ اگر اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں، وہ اپنی زندگی کو بدلیں، اپنی توجہات کو ہر طرف سے موڑ کر اللہ کی طرف لگائیں اور یکسو ہوکر دین کے راستہ پر چلنے لگیں تو یقیناً اللہ انہیں معاف کردے گا۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ
اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾
اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا
بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ
نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ
ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ
اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ
مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع ۲۱/۱۱

☆ ۱۴۸۔ اللہ بدگوئی کو پسند نہیں کرتا مگر یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۱۴۹۔ اگر تم بھلائی کو ظاہر کرو یا تم اس کو چھپاؤ یا کسی برائی سے درگزر کرو تو اللہ معاف کرنے والا، قدرت رکھنے والا ہے۔ ۱۵۰۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کررہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ میں ایک راہ نکالیں۔ ۱۵۱۔ ایسے لوگ پکے منکر ہیں اور ہم نے منکروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کررکھا ہے۔ ۱۵۲۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہ کیا، ان کو اللہ ان کا اجر دے گا اور اللہ غفور اور رحیم ہے۔

کسی شخص کے اندر کوئی دینی یا دنیوی عیب معلوم ہو تو اس کو شہرت دینا اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ نصیحت کا حق ہر ایک کو ہے۔ مگر نصیحت یا تو کسی کا نام لیے بغیر عمومی انداز میں کی جانی چاہیے یا متعلقہ شخص سے مل کر تنہائی میں۔ اللہ صبح وشام لوگوں کے جرائم نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ بندوں کو بھی اپنے اندر یہی اخلاق پیدا کرنا ہے۔ البتہ اگر ایک شخص مظلوم ہو تو اس کے لیے رخصت ہے کہ وہ ظالم کے ظلم کو لوگوں کے سامنے بیان کرے۔ تاہم مظلوم اگر صبر کرے اور ظلم کرنے والے کو معاف کردے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ اس طرح وہ ثابت کرتا ہے کہ اس کو دنیا کے نقصان سے زیادہ آخرت کے نقصان کی فکر ہے۔ جو شخص کسی بڑے غم میں مبتلا ہو اس کے لیے چھوٹے غم بے حقیقت ہوجاتے ہیں۔ یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس کے دل میں آنے والے ہولناک دن کا غم سمایا ہوا ہو۔

مکہ کے لوگ حضرت ابراہیم کی نبوت کو مانتے تھے۔ اسی طرح یہودی حضرت موسیٰ کی نبوت کو تسلیم کرتے تھے اور مسیحی حضرت عیسیٰ کی نبوت کو۔ مگر ان سب نے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک ماضی کے پیغمبر کو ماننے کے لیے تیار تھا مگر ان میں سے کوئی بھی وقت کے پیغمبر کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ حالاں کہ جن نبیوں کو وہ مان رہے تھے وہ بھی اپنے زمانہ میں اسی قسم کے مخالفانہ ردعمل سے دوچار ہوئے تھے جس سے پیغمبر عربی کو دوچار ہونا پڑا — اس قسم کی ہر کوشش حق پرستی اور نفس پرستی کے درمیان راستہ نکالنے کے لیے ہوتی ہے تاکہ خواہشات کا ڈھانچہ بھی ٹوٹنے نہ پائے اور آدمی خدا کی جنت تک پہنچ جائے۔

اصل یہ ہے کہ ماضی کی نبوت ایک مانی ہوئی نبوت ہوتی ہے جب کہ وقت کے پیغمبر کو ماننے کے لیے آدمی کو نیا ذہنی سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ ماضی کی نبوت زمانہ گزرنے کے بعد ایک تسلیم شدہ نبوت بن جاتی ہے۔ وہ پیدائشی طور پر آدمی کے ذہن کا جز بن چکی ہوتی ہے۔ مگر زمانۂ حال کا پیغمبر ایک متنازعہ شخصیت ہوتا ہے، وہ دیکھنے والوں کو محض "ایک انسان" دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے اس کو ماننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی ایک نیا ذہنی سفر کرے۔ وہ خدا کو دوبارہ شعور کی سطح پر پائے۔ ماضی کے پیغمبر کو ماننا تقلیدی ایمان کے تحت ہوتا ہے اور وقت کے پیغمبر کو ماننا ارادی ایمان کے تحت۔ مگر اللہ کے یہاں قیمت ارادی ایمان کی ہے، نہ کہ تقلیدی ایمان کی۔

یَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤى اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلۡمِهِمۡ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَعَفَوۡنَا عَنۡ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيۡنَا مُوۡسٰى سُلۡطٰنًا مُّبِيۡنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ بِمِيۡثَاقِهِمۡ وَقُلۡنَا لَهُمُ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُلۡنَا لَهُمۡ لَا تَعۡدُوۡا فِى السَّبۡتِ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۱۵۴﴾

۱۵۳۔ اہل کتاب تم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے ایک کتاب اتار لاؤ۔ پس موسیٰ سے وہ اس سے بھی بڑی چیز کا مطالبہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اللہ کو بالکل سامنے دکھا دو۔ پس ان کی اس زیادتی کے باعث ان پر بجلی آپڑی۔ پھر کھلی نشانی آجانے کے بعد انھوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ پھر ہم نے اس سے درگزر کیا۔ اور موسیٰ کو ہم نے کھلی حجت عطا کی۔ ۱۵۴۔ اور ہم نے ان کے اوپر کوہِ طور کو اٹھایا ان سے عہد لینے کے واسطے۔ اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازے میں داخل ہو سر جھکائے ہوئے اور ان سے کہا کہ سَبت کے معاملہ میں زیادتی نہ کرنا۔ اور ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا۔

خدا کا پیغمبر انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ عام آدمی کی صورت میں لوگوں کے سامنے آتا ہے۔

اس لیے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایک عام آدمی کو کس طرح خدا کا نمائندہ مان لیں۔ وہ کیسے یقین کرلیں کہ سامنے کا آدمی ایک ایسا شخص ہے جو خدا کی طرف سے بولنے کے لیے مقرر ہوا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جو کلام تم پیش کررہے ہو اس کو آسمان سے آتا ہوا دکھاؤ یا خدا خود تمھاری تصدیق کے لیے آسمان سے اتر پڑے تب ہم تمھاری بات مانیں گے۔ مگر اس قسم کا مطالبہ حد درجہ غیر سنجیدہ مطالبہ ہے۔ کیوں کہ انسان کا امتحان تو یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر مانے، وہ حقیقتوں کو ان کی معنوی صورت میں پالے۔ ایسی حالت میں دکھا کر منوانے کا کیا فائدہ۔ نیز یہ کہ اگر کچھ دیر کے لیے عالم کے نظام کو بدل دیا جائے اور آدمی کو اس کے مطالبہ کے مطابق چیزوں کو دکھا دیا جائے تب بھی وہ بے فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ دکھانا بہرحال وقتی ہوگا، نہ کہ مستقل۔ اور انسان کی آزادی جو اس کو سرکشی کی طرف لے جاتی ہے اس کے بعد بھی باقی رہے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دیکھنے کے وقت تک وہ سہم کر مان لے گا اور اس کے بعد دوبارہ اپنی آزادی کا غلط استعمال شروع کردے گا جیسا کہ دیکھنے سے پہلے کررہا تھا۔ یہود کی مثال اس کی تاریخی تصدیق کرتی ہے۔

کوہ طور کے دامن میں غیر معمولی حالات پیدا کرکے یہود سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ اپنے عبادت خانہ میں تواضع کے ساتھ داخل ہوں اور خشوع کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔ اور یہ کہ معاش کے حصول کے لیے جو جدوجہد کریں وہ اللہ کے حدود میں رہ کر کریں، نہ کہ اس سے آزاد ہو کر (خروج، 19:16-19)۔ مگر یہود نے اس قسم کے تمام عہدوں کو توڑ دیا۔

''موسیٰ کو ہم نے سلطان مبین (کھلی حجت) دی''— اللہ کا یہ معاملہ ہر پیغمبر کے ساتھ ہوتا ہے۔ پیغمبر اگرچہ ایک عام انسان کی طرح ہوتا ہے مگر اس کے کلام اور اس کے احوال میں ایسے کھلے ہوئے دلائل موجود ہوتے ہیں جو اس کی خدائی حیثیت کو قطعیت کے ساتھ ثابت کررہے ہوتے ہیں۔ مگر ظالم انسان ہر خدائی نشانی کی ایک ایسی توجیہہ ڈھونڈ لیتا ہے جس کے بعد وہ اس کو رد کرکے اپنی سرکشی کی زندگی کو بدستور جاری رکھے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۵۵ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝۱۵۶ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ

۱۵۵۔ ان کو جو سزا ملی وہ اس پر کہ انھوں نے اپنے عہد کو توڑا اور اس پر کہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس پر کہ انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور ان کے کہنے پر کہ ہمارے دل تو بند ہیں۔ بلکہ اللہ نے ان کے انکار کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے تو وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ ۱۵۶۔ اور ان کے انکار پر اور مریم پر بڑا بہتان باندھنے پر۔ ۱۵۷۔ اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے مسیح بن

اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ
لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ
مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ
مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًۢا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَ
كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

مریم، اللہ کے رسول کو قتل کر دیا۔ حالاں کہ انھوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی دی، بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جو لوگ اس میں اختلاف کر رہے ہیں وہ اس کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اس کا کوئی علم نہیں، وہ صرف اٹکل پر چل رہے ہیں۔ اور بے شک انھوں نے اس کو قتل نہیں کیا۔
۱۵۸۔ بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

یہود پر آسمانی ہدایت اتاری گئی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ دنیا میں اللہ کی مرضی پر چلیں تو آخرت میں اللہ ان کو جنت دے گا۔ انھوں نے پہلے حصہ کو بھلا دیا البتہ دوسرے حصہ کو اپنا پیدائشی حق سمجھ لیا۔ یہود ہر قسم کے بگاڑ میں مبتلا ہوئے۔ اس کے باوجود اپنے نجات یافتہ ہونے کے بارے میں ان کا یقین اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب ان کو نئے نبی کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ وہ بطور طنز کہتے—— ''ہمارے دل تو بند ہیں''۔ ان کا یہ جملہ رسول کو ماننے کے بارے میں اپنی عدم صلاحیت کا اظہار نہ تھا بلکہ اس اطمینان کا اظہار تھا کہ وہ رسول کے ساتھ خواہ جو بھی سلوک کریں ان کی نجات کسی حال میں مشتبہ ہونے والی نہیں۔

جو لوگ اس قسم کے جھوٹے یقین میں مبتلا ہوں وہ ہر قسم کے جرم پر جری ہو جاتے ہیں۔ خدا پر ایمان ان کو جس عہد خداوندی میں باندھتا ہے اس کو توڑنا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ اللہ کی طرف سے ظاہر ہونے والے کھلے دلائل کے باوجود وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حق کی طرف بلانے والے جو ان کی غیر خدا پرستانہ روش کو بے نقاب کرتے ہیں ان کے خلاف جارحانہ اقدام کرنے سے وہ نہیں جھجکتے۔ حتی کہ جھوٹی تہمت لگا کر داعی کو بے عزت کرنے سے بھی انھیں کوئی چیز نہیں روکتی۔ یہود نے حضرت مسیح کے خلاف قتل کا اقدام کیا اور اس کے بعد فخریہ کہا کہ ''مریم کا بیٹا مسیح جو اپنے کو رسول کہتا تھا اس کو ہم نے مار ڈالا''۔ مگر اس قسم کے لوگ اللہ کے داعیوں کے خلاف جو بھی سازش کریں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اللہ کی طاقت اور اس کا حکیمانہ نظام ہمیشہ حق کے داعیوں کی پشت پر ہوتا ہے۔ ہر سازش اور مخالفت کے باوجود وہ اس وقت تک اپنا کام جاری رکھنے کی توفیق پاتے ہیں جب کہ وہ اپنے حصہ کا کام مکمل کر لیں۔

جو لوگ حق کے مقابلہ میں سرکشی کا رویہ اختیار کریں اللہ ان سے حق کو قبول کرنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے۔ وہ اپنی مخالفانہ سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہیں یہاں تک کہ خدا کے فرشتے ان کو مجرم کی حیثیت سے پکڑ کر خدا کی عدالت میں حاضر کر دیتے ہیں۔

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ ﴿۱۵۹﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ ﴿۱۶۰﴾ وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع ۲۲

۱۵۹۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔ ۱۶۰۔ پس یہود کے ظلم کی وجہ سے ہم نے وہ پاک چیزیں ان پر حرام کردیں جو ان کے لیے حلال تھیں۔ اور اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے۔ ۱۶۱۔ اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے تھے، حالاں کہ اس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے تھے۔ اور ہم نے ان میں سے منکروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۱۶۲۔ مگر ان میں جو لوگ علم میں پختہ اور ایمان والے ہیں، وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو تمھارے اوپر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور وہ نماز کے پابند ہیں اور زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم ضرور بڑا اجر دیں گے۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ کوئی یہودی یا عیسائی نہیں مرے گا یہاں تک کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے (لَا يَمُوتُ النَّصْرَانِيُّ وَلَا الْيَهُودِيُّ حَتَّى يُؤْمِنَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) تفسیر ابن کثیر، جلد 2، ص 454۔ یہود و نصاریٰ کے پاس آسمانی علم تھا۔ ایسے لوگ یہ سمجھنے میں غلطی نہیں کرسکتے تھے کہ پیغمبر عربی کی دعوت خالص خدائی دعوت ہے۔ مگر پیغمبر عربی کو ماننا اور ان کے مشن میں اپنا مال اور اپنی زندگی لگانا ان کو دنیوی مصلحتوں کے خلاف نظر آتا تھا۔ اس بنا پر انھوں نے آپ کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ مگر جب موت آدمی کے سامنے آتی ہے تو اس قسم کی تمام مصلحتیں باطل ہوتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ اس وقت آدمی کے ذہن سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں اور حق اپنی کھلی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ موت کے دروازے پر پہنچ کر آدمی اس چیز کا اقرار کرلیتا ہے جس کو وہ موت سے پہلے ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر اس وقت کے اقرار کی اللہ کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔

جب کوئی گروہ خدائی دین کے بجائے خودساختہ دین کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی دینی حیثیت کو ظاہر کرنے

کے لیے کچھ خود ساختہ نشانات بھی قائم کرتا ہے۔ وہ اپنے مزاج اور اپنے حالات کے لحاظ سے حرام وحلال کے نئے قاعدے بناتا ہے اور ان کا خصوصی اہتمام کرکے ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ دین پر قائم ہے۔ ایسے لوگوں کا دین بعض ظاہری چیزوں کے اہتمام پر مبنی ہوتا ہے، نہ کہ اللہ والا بننے پر۔ چنانچہ وہ اس سے نہیں ڈرتے کہ اللہ کے منع کیے ہوئے طریقوں سے دنیوی فائدے حاصل کریں اور اللہ کے لیے ہونے والے کام کا راستہ روکیں۔ ایسے لوگوں کا انجام اللہ کے یہاں بے دینوں کے ساتھ ہوگا، نہ کہ دین داروں کے ساتھ۔

یہودیوں میں چند لوگ، عبد اللہ بن سلّام وغیرہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ کا ساتھ دیا۔ جو لوگ انسانی اضافوں سے گزر کر اصلی آسمانی دین سے آشنا ہوتے ہیں، جو عصبیت اور تقلید اور مفاد پرستی کی ذہنیت سے آزاد ہوتے ہیں ان کو سچائی کو سمجھنے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ وہ ہر قسم کے ذہنی خول سے باہر آکر سچائی کو دیکھ لیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

۱۶۳۔ ہم نے تمھاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح ہم نے نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی بھیجی تھی۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی تھی۔ اور ہم نے داؤد کو زبور دی۔ ۱۶۴۔ اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور ایسے رسول بھی جن کا حال ہم نے تم کو نہیں سنایا۔ اور موسیٰ سے اللہ نے کلام کیا۔ ۱۶۵۔ اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور پھر جنت اور جہنم بنائی۔ اس کے بعد انسان کو زمین پر بسایا۔ یہاں انسان کو آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی مستقل نہیں ہے بلکہ وقتی ہے اور امتحان کے لیے ہے۔ وہ اس

لیے ہے تا کہ اچھے اور برے کو چھانٹا جائے۔ خدا یہ دیکھ رہا ہے کہ لوگوں میں کون وہ شخص ہے جو اپنی آزادی کے باوجود حقیقت پسندی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور اپنے کو اللہ کا بندہ بنا کر رکھتا ہے اور کون وہ ہے جو اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے بتاتا ہے کہ وہ ایک سرکش انسان ہے۔ دنیا میں دونوں قسم کے لوگ ملے ہوئے ہیں۔ دونوں کو یہاں یکساں طور پر خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے۔ مگر امتحان کی مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد دونوں گروہ ایک دوسرے سے الگ کردیے جائیں گے۔ پہلے گروہ کو ابدی طور پر جنت کے باغوں میں بسایا جائے گا اور دوسرے گروہ کو ابدی طور پر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

زندگی کے بارے میں اللہ کا یہ منصوبہ انسان کو بڑی نزاکت میں ڈال رہا ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مختصر زندگی کا انجام دو انتہائی صورتوں میں سامنے آنے والا ہے، یا ابدی راحت یا ابدی عذاب۔ اس لیے اللہ نے رہنمائی کے دوسرے فطری انتظامات کے علاوہ پیغمبروں اور کتابوں کے بھیجنے کا انتظام کیا تا کہ کوئی شخص زندگی کی حقیقت سے بے خبر نہ رہے اور فیصلہ کے دن یہ نہ کہہ سکے کہ ہم کو الٰہی منصوبہ کا پتہ نہ تھا تا کہ ہم اپنی زندگی کو اس کے مطابق بناتے۔

اللہ کے اس منصوبہ کے لازم معنی یہ ہیں کہ شروع سے آخر تک آنے والے تمام نبیوں کا پیغام اور ان کا منصبی فریضہ ایک ہو۔ جب تمام انسان ایک ہی امتحان کی ترازو میں کھڑے ہوئے ہیں تو ان کے امتحان کا پرچہ ایک دوسرے سے مختلف کیسے ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام نبیوں کا پیغام ایک تھا اور اسی ایک پیغام سے انھوں نے تمام انسانوں کو باخبر کیا۔ اور وہ یہ کہ ہر آدمی ایک ایسے نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے جس کے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف جہنم۔ وہ ایک طرف چلے تو جنت میں پہنچے گا اور دوسری طرف چلے تو جہنم میں جا گرے گا— تمام نبیوں کی دعوت ایک تھی۔ البتہ زمانی ضرورت کے اعتبار سے ان کو خدا کی تائید مختلف صورتوں میں ملی۔ اللہ کی یہ سنت آج بھی باقی ہے۔ ڈرانے اور خوش خبری سنانے کا پیغمبرانہ کام کرنے کے لیے آج جو لوگ اٹھیں گے وہ اپنے حالات کے لحاظ سے یقیناً اللہ کی خصوصی تائید کے مستحق ہوں گے۔ تا کہ وہ اپنی دعوتی ذمہ داری کو مؤثر طور پر جاری رکھ سکیں۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۞١٦٦ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۞١٦٧ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۞١٦٨ اِلَّا طَرِيْقَ

۱۶۶۔ مگر اللہ گواہ ہے اس پر جو اس نے تمھارے اوپر اتارا ہے کہ اس نے اس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ ۱۶۷۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا، وہ بہک کر بہت دور نکل گئے۔ ۱۶۸۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور ظلم کیا، ان کو اللہ ہرگز نہیں بخشے گا اور نہ ہی ان

جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَآ اَبَدًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۱۶۹﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَـقِّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَاٰمِنُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ ؕ وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۷۰﴾

کو کوئی راستہ دکھائے گا۔ ۱۶۹۔ جہنم کے راستے کے سوا، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور اللہ کے لیے یہ آسان ہے۔ ۱۷۰۔ اے لوگو، تمھارے پاس رسول آچکا تمھارے رب کی ٹھیک بات لے کر۔ پس مان لو تا کہ تمھارا بھلا ہو اور اگر نہ مانو گے تو اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہود کو آسمانی مذہب کے نمائندہ کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ مذہب کے بڑے بڑے مناصب پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو منظور نہ ہوا کہ وہ اپنے سوا کسی اور کی بڑائی تسلیم کریں۔ انھوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ آپ اللہ کی طرف سے انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم دین کے اجارہ دار ہیں۔ ہم جس شخص کی دینی صداقت کو تسلیم نہ کریں، وہ بطور واقعہ بھی غیر تسلیم شدہ بن جاتا ہے۔ مگر وہ بھول گئے کہ یہ کائنات خدا کی کائنات ہے اور اس کا نظام خدا کے فرماں بردار فرشتے چلا رہے ہیں۔ اس لیے یہاں کسی کی اصل تصدیق وہ ہے جو خدا کی طرف سے ہو اور کائنات کا پورا نظام جس کی تائید کرے۔ اور یقیناً خدا اور اس کی پوری کائنات اپنے پیغمبر کے ساتھ ہے، نہ کہ کسی کے خود ساختہ مزعومات کے ساتھ۔

خدا کی پکار کے مقابلہ میں جو لوگ یہ ردعمل دکھائیں، یعنی کہ وہ اس کا اعراض وانکار کریں اور وہ لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے روکیں۔ وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ بندگی کے صحیح مقام سے بھٹک کر بہت دور نکل گئے ہیں۔ وہ ایسی بات کہتے ہیں جس کی تردید ساری کائنات کر رہی ہے۔ وہ ایک ایسے منصوبہ کے خلاف محاذ بنا رہے ہیں جس کی پشت پر زمین و آسمان کا مالک کھڑا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی نادانی اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔ ایسے لوگ دین کے نام پر سب سے بڑی بے دینی کر رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے لیے اس قسم کا ظالمانہ رویہ پسند کریں ان کا ذہن اعتراف کے بجائے انکار کے رخ پر چلنے لگتا ہے۔ وہ دن بدن حق سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابدی بربادی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ خدا کی دعوت کا انکار خود خدا کا انکار ہے۔ خدا کی دعوت اتنے کھلے ہوئے دلائل کے ساتھ ہوتی ہے کہ اس کو سمجھنا کسی کے لیے مشکل نہ رہے۔ اس کے باوجود جو لوگ خدا کی دعوت کا انکار کریں وہ گویا خدا کے سامنے ڈھٹائی کر رہے ہیں۔ اور ڈھٹائی اللہ کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔

اگر آدمی نے اپنے دل کی کھڑکیاں کھلی رکھی ہوں تو اللہ کی پکار اس کو عین اپنی تلاش کا جواب معلوم

ہوگی۔ اس کو محسوس ہوگا کہ وہ حق جو انسانی باتوں میں ڈھک کر رہ گیا تھا، اللہ نے اس کی بے آمیز شکل میں اس کے اعلان کا انتظام کیا ہے۔ یہ اللہ کے علم اور حکمت کا ظہور ہے، نہ کہ کسی شخص کے ذاتی جوش کا کوئی معاملہ۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا
عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ
مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَ
رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ لَا
تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ
وَكِيْلًا ؑ ﴿۱۷۱﴾ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ ع ۲۳/۳
عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ
يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ
اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ
فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا
فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

۱۷۱۔ اے اہل کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف اِلقا فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں۔ باز آجاؤ، یہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس ایک اللہ ہی ہے۔ وہ اِس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کا کارساز ہونا کافی ہے۔ ۱۷۲۔ مسیح کو ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے عار نہ ہوگا اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہوگا۔ اور جو اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو اللہ ضرور سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔ ۱۷۳۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے تو ان کو وہ پورا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے ان کو مزید بھی دے گا اور جن لوگوں نے عار اور تکبر کیا ہوگا ان کو دردناک عذاب دے گا۔ اور وہ اللہ کے مقابلہ میں نہ کسی کو اپنا دوست پائیں گے اور نہ مددگار۔

آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ کسی چیز میں کوئی امتیازی پہلو دیکھتا ہے تو اس کے بارے میں مبالغہ آمیز تصور قائم کر لیتا ہے۔ وہ اس کا مقام متعین کرنے میں حد سے آگے نکل جاتا ہے۔ اسی کا نام غلو ہے۔ شرک اور شخصیت پرستی کی تمام قسمیں اصلاً اسی غلو کی پیداوار ہیں۔

دین میں غلو یہ ہے کہ دین میں کسی چیز کا جو درجہ ہو اس کو اس کے واقعی درجہ پر نہ رکھا جائے بلکہ اس کو بڑھا کر زیادہ بڑا درجہ دینے کی کوشش کی جائے — اللہ اپنے ایک بندے کو باپ کے بغیر پیدا کرے تو کہہ دیا جائے کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ اللہ کسی کو کوئی بڑا مرتبہ دے دے تو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی مافوق شخصیت ہے اور بشری غلطیوں سے پاک ہے۔ دنیا کی چمک دمک سے بچنے کی تاکید کی جائے تو اس کو بڑھا چڑھا کر ترک دنیا تک پہنچا دیا جائے۔ زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں کچھ احکام دیے جائیں تو اس میں مبالغہ کر کے اسی کی بنیاد پر ایک پورا دینی فلسفہ بنا دیا جائے۔ اس قسم کی تمام صورتیں جن میں کسی دینی چیز کو اس کے واقعی مقام سے بڑھا کر مبالغہ آمیز درجہ دیا جائے۔ وہ غلو کی فہرست میں شامل ہوگا۔

ہر قسم کی طاقتیں صرف اللہ کو حاصل ہیں۔ اس کے سوا جتنی چیزیں ہیں سب عاجز اور محکوم ہیں۔ انسان اپنے شعور کے کمال درجے پر پہنچ کر جو چیز دریافت کرتا ہے وہ یہ کہ خدا قادر مطلق ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں عاجز مطلق۔ پیغمبر اور فرشتے اس شعور میں سب سے آگے ہوتے ہیں، اس لیے وہ خدا کی قدرت اور اپنے عجز کے اعتراف میں بھی سب سے آگے ہوتے ہیں۔ اعتراف ہی انسان کا اصل امتحان ہے۔ جس کو اپنے عجز کا شعور ہو جائے اس نے خدا کے مقابلہ میں اپنی نسبت کو پالیا۔ اور جس کو اپنے عجز کا شعور نہ ہو وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی نسبت کو پانے سے محروم رہا۔ پہلا شخص آنکھ والا ہے جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کو پہنچے گا۔ دوسرا شخص اندھا ہے جس کے لیے اس کے سوا کوئی انجام نہیں کہ وہ بھٹکتا رہے یہاں تک کہ ذلت کے گڑھے میں جا گرے۔

يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ
فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّ
يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾
يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ
اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ
فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ
يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا

۱۷۴۔ اے لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمھارے اوپر ایک واضح روشنی اتار دی۔ ۱۷۵۔ پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو انھوں نے مضبوط پکڑ لیا، ان کو ضرور اللہ اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور ان کو اپنی طرف سیدھا راستہ دکھائے گا۔ ۱۷۶۔ لوگ تم سے حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اللہ تم کو کلالہ (وہ مُورث جس کے بھائی بہن کے علاوہ کوئی اور وارث موجود نہ ہو) کے بارے میں حکم بتاتا ہے۔ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے ترکہ کا نصف ہے۔ اور وہ مرد اس بہن کا وارث ہوگا، اگر اس

الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً
رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ
الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَ
اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۧ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۴ ۵

بہن کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر دو بہنیں ہوں تو ان کے لیے اس کے ترکہ کا دوتہائی ہوگا۔ اور اگر کئی بھائی بہن مرد عورتیں ہوں تو ایک مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔ اللہ تمھارے لیے بیان کرتا ہے، تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اللہ کی طرف سے جب اس کی پکار انسانوں کے سامنے بلند ہوتی ہے تو وہ ایسی کھلی ہوئی صورت میں بلند ہوتی ہے جو تاریکیوں کو ختم کر کے حقائق کو آخری حد تک روشن کر دے۔ اسی کے ساتھ وہ ایسے دلائل سے مسلّح ہوتی ہے جس کا رد کرنا کسی کے لیے ممکن نہ ہو۔ وہ اس کا استہزا تو کر سکتے ہیں مگر دلیل کی زبان میں اس کو کاٹ نہیں سکتے۔ خدا وہ ہے جو سورج نکالتا ہے تو روشنی اور تاریکی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔ خدا کی یہی قدرت اس کی پکار میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے بعد حق اور باطل ایک دوسرے سے اس طرح الگ ہو جاتے ہیں کہ کسی آنکھ والے کے لیے اس کا جاننا ناممکن نہ رہے۔ تاہم سورج کو دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی آنکھ کھولے۔ اسی طرح خدا کی پکار سے ہدایت لینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس پر دھیان دے۔ جو شخص دھیان نہ دے وہ خدا کی پکار کے درمیان رہ کر بھی اس سے محروم رہے گا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حق کو مضبوطی کے ساتھ پکڑا جائے۔ کیوں کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں شیطان ہر آدمی کے پیچھے لگا ہوا ہے جو طرح طرح کے دھوکے میں ڈال کر آدمی کو حق سے بدکاتا رہتا ہے۔ اگر آدمی شیطان کے وسوسوں سے لڑ کر حق کا ساتھ دینے کا فیصلہ نہ کرے تو یقیناً شیطان اس کو درمیان میں اچک لے گا۔ تاہم آزمائش کی اس دنیا میں انسان اکیلا نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کی طرف چلنا چاہیں گے ان کو ہر موڑ پر خدا کی رہنمائی حاصل ہوگی۔ وہ خدا کی مدد سے منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہوں گے۔ جب آدمی کا یہ حال ہو جائے کہ وہ صرف حق کو اہمیت دے تو اللہ کی توفیق سے اس کے اندر یہ صلاحیت ابھر آتی ہے کہ وہ خالص حق پر مضبوطی کے ساتھ جمے اور دوسری راہوں میں بھٹکنے سے بچا رہے۔

میراث اور ترکہ کا حکم بتاتے ہوئے یہ کہنا کہ ''اللہ اپنا حکم بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہی میں نہ پڑو'' ظاہر کرتا ہے کہ میراث اور ترکہ کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ان امور میں سے ہے جس میں اللہ کے بتائے ہوئے قاعدے کی پابندی نہ کرنا آدمی کو گمراہی کی خندق میں ڈال دیتا ہے۔

۵۔ سُوۡرَۃُ الۡمَآئِدَۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ۬ؕ
اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَہِیۡمَۃُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی
عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ
اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ۱ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰہِ وَ لَا الشَّہۡرَ
الۡحَرَامَ وَ لَا الۡہَدۡیَ وَ لَا الۡقَلَآئِدَ وَ لَاۤ
آٰمِّیۡنَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ یَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنۡ
رَّبِّہِمۡ وَ رِضۡوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلۡتُمۡ
فَاصۡطَادُوۡا ؕ وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ
صَدُّوۡکُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ۘ
وَ تَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡبِرِّ وَ التَّقۡوٰی ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوۡا
عَلَی الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ
اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ۲ ربع

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ اے ایمان والو، عہد و پیمان کو پورا کرو۔ تمھارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے، سوا ان کے جن کا ذکر آگے کیا جارہا ہے۔ مگر احرام کی حالت میں شکار کو حلال نہ جانو۔ اللہ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۲۔ اے ایمان والو، بے حرمتی نہ کرو اللہ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینوں کی اور نہ حرم میں قربانی والے جانوروں کی اور نہ پٹے بندھے ہوئے نیاز کے جانوروں کی اور نہ حرمت والے گھر کی طرف آنے والوں کی جو اپنے رب کا فضل اور اس کی خوشنودی ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ اور جب تم احرام کی حالت سے باہر آجاؤ تو شکار کرو۔ اور کسی قوم کی دشمنی کہ اس نے تم کو مسجد حرام سے روکا ہے، تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم زیادتی کرنے لگو۔ تم نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

مومن کی زندگی ایک پابند زندگی ہے۔ وہ دنیا میں آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اس کے باوجود وہ اللہ کی آقائی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو پابند بنالیتا ہے، وہ اپنے آپ کو ازخود عہد کی رسّی میں باندھ لیتا ہے۔ اللہ کا معاملہ ہو یا بندوں کا معاملہ، دونوں قسم کے معاملات میں اس نے اپنے کو پابند کرلیا ہے کہ وہ آزادانہ عمل نہ کرے بلکہ خدا کے حکم کے مطابق عمل کرے۔ وہ انھیں چیزوں کو اپنی خوراک بنائے جو خدا نے اس کے لیے حلال کی ہیں اور جو چیزیں خدا نے حرام کی ہیں ان کو کھانا چھوڑ دے۔ کسی موقع پر اگر کسی جائز چیز سے بھی روک دیا جائے جیسا کہ احرام کی حالت میں یا حرام مہینوں کے بارے میں حکم سے واضح ہوتا ہے تو اس کو بھی بے چون وچرا مان لے۔ کوئی چیز کسی دینی حقیقت کی علامت بن جائے تو اس کا احترام کرے۔ کیوں کہ ایسی چیز کا احترام خود دین کا احترام ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کے خوف سے کرے، نہ کہ کسی اور جذبے سے۔

آدمی عام حالات میں اللہ کے حکموں پر عمل کرتا ہے۔ مگر جب کوئی غیر معمولی حالت پیدا ہوتی ہے تو وہ بدل کر دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ اللہ سے ڈرنے والا ایکا یک اللہ سے بے خوف انسان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ موقع وہ ہے جب کہ کسی کی کوئی مخالفانہ حرکت اس کو مشتعل کر دیتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی انصاف کی حدوں کو بھول جاتا ہے اور یہ چاہنے لگتا ہے کہ جس طرح بھی ہو اپنے حریف کو ذلیل اور ناکام کرے۔ مگر اس قسم کی معاندانہ کارروائی خدا کے نزدیک جائز نہیں، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ مسجد حرام کی زیارت جیسے پاک کام سے کسی نے دوسرے کو روکا ہو۔ کوئی شخص اس قسم کی ظالمانہ کارروائی کرنے کے لیے اٹھے اور کچھ لوگ اس کا ساتھ دینے لگیں تو یہ گناہ کی راہ میں کسی کی مدد کرنا ہوگا۔ جب کہ اللہ سے ڈرنے والوں کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ صرف نیکی کے کاموں میں دوسرے کی مدد کریں۔ جو شخص حق پر ہو اس کا ساتھ دینا اور جو ناحق پر ہو اس کا ساتھ نہ دینا، موجودہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ مگر اسی مشکل کام پر آدمی کے اُخروی انجام کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۳

۳۔ تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو اور وہ جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے اور وہ جس کو درندے نے کھایا ہو مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا اور وہ جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے۔ یہ گناہ کا کام ہے۔ آج منکر تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو پورا کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ پس جو بھوک سے مجبور ہو جائے، لیکن وہ گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

بعض جانور اپنے طبی اور اخلاقی نقصانات کی وجہ اس قابل نہیں کہ انسان ان کو اپنی خوراک بنائے۔ خنزیر کو اللہ تعالیٰ نے اسی سبب سے حرام قرار دیا۔ اسی طرح جانور کے جسم میں گوشت کے علاوہ کئی دوسری چیزیں ہوتی ہیں جو انسانی خوراک بننے کے قابل نہیں۔ انھیں میں سے خون بھی ہے۔ چنانچہ اسلام میں جانور کو ذبح کرنے کی ایک خاص صورت مقرر کی گئی ہے تاکہ جانور کے جسم کا خون پوری طرح بہہ کر نکل جائے۔ ذبح کے سوا

جانور کو مارنے کے جو طریقے ہیں ان میں خون جانور کے گوشت میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے، وہ پوری طرح اس سے الگ نہیں ہوتا۔ اسی سبب سے شریعت میں مردار کی تمام قسموں کو بھی حرام کر دیا گیا۔ کیوں کہ مردار جانور کا خون فوراً ہی اس کے گوشت میں جذب ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایسا گوشت بھی حرام کر دیا گیا جس میں کسی طرح مشرکانہ عقیدہ کی آمیزش ہوجائے۔ مثلاً غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا یا غیر اللہ کے تقرب کی خاطر جانور کو قربان کرنا۔ تاہم اللہ نے اپنی رحمت خاص سے یہ گنجائش دے دی کہ کسی کو بھوک کی ایسی مجبوری پیش آجائے کہ اس کو موت یا حرام خوراک میں سے ایک کو لینا ہو تو وہ موت کے مقابلہ میں حرام خوراک کو اختیار کرے۔

اسلام سے پہلے جو دور گزرا ہے اس میں مسلسل طور پر توحید کی تحریک خشیت انسانی (human fear) کے مسئلہ سے دوچار رہی ہے۔ یہاں اس بات کا اعلان ہے کہ خشیت انسانی کے دور کا خاتمہ ہوگیا، اب دنیا خشیت ربانی کے دور میں داخل ہوچکی ہے۔ پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے انقلاب نے ہمیشہ کے لیے اس امکان کو ختم کر دیا ہے کہ زمین کا کوئی حصہ اہل اسلام کے لیے دوبارہ دار الخوف بن جائے۔ قرآن کو ماننے والی امت کو خدا نے اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا ہے کہ وہ اپنی امکانی قوت کے اعتبار سے ہر بیرونی خطرہ کی زد سے باہر جا چکی ہے۔ اب اگر اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے، نہ کہ خارجی حملوں کی وجہ سے۔ اور اندرونی کمزوریوں سے پاک رہنے کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ اس کے افراد اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے کامل کر دیا''، یعنی تم کو جو احکام دیے جانے تھے وہ سب دے دیے گئے۔ تمھارے لیے جو کچھ بھیجنا مقدر کیا گیا وہ سب بھیجا جا چکا۔ یہاں علی الاطلاق دین کے کامل کیے جانے کا ذکر نہیں ہے بلکہ امت محمدی پر جو قرآن نازل ہونا شروع ہوا تھا اس کے پورے ہونے کا اعلان ہے۔ یہ نزول کی تکمیل کا ذکر ہے، نہ کہ دین کی تکمیل کا۔ اسی لیے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ ''آج میں نے دین کو کامل کر دیا'' بلکہ یہ فرمایا کہ ''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے کامل کر دیا''۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کا دین ہر زمانہ میں اپنی کامل صورت میں انسان کو دیا گیا ہے۔ خدا نے کبھی ناقص دین انسان کے پاس نہیں بھیجا۔

دوسرے الفاظ میں، اکمالِ دین یا تکمیلِ دین (completion of religion) سے مراد احکامِ دین کی فہرست کی تکمیل نہیں ہے اور نہ اُس سے یہ مراد ہے کہ شریعت کی کوئی ارتقائی ترتیب تھی جو پچھلے پیغمبروں کے ذریعہ شروع ہوئی، اور 10 ہجری میں پیغمبر اسلام کے ذریعہ یہ ارتقائی ترتیب مکمل ہوگئی۔ اِس سے مراد صرف آیاتِ قرآنی کے نزول کی تکمیل ہے۔ اِس سے مراد عملاً وہی چیز ہے جس کو قرآن کی دوسری سورہ میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9)۔ اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اب اسلام حکومتی معنوں میں غالب ہوگیا ہے۔ یہاں اکمال دین سے مراد استحکام دین ہے۔ یعنی اسلام کی راہ کے موانع (obstacles) ختم ہوگئے۔ خود آیت کے الفاظ سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے — آج منکرین تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے، پس تم اُن سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ دوسرے الفاظ میں، اب خدا کے دین کے حق میں ایسے اسباب جمع ہوگئے ہیں جو دین اور اہل دین کو اِس سے محفوظ کر دیتے ہیں کہ وہ ماضی کی طرح انسانی رکاوٹوں اور مذہبی جبر کا شکار بنیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ
الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ
تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ
اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَ
اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴﴾
اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫
وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ
مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ
يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِي
الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۵﴾ ع ۵/۵

۴۔ وہ پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا چیز حلال کی گئی ہے۔ کہو کہ تمھارے لیے ستھری چیزیں حلال ہیں۔ اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے سدھایا ہے، تم ان کو سکھاتے ہو اس میں سے جو اللہ نے تم کو سکھایا۔ پس تم ان کے شکار میں سے کھاؤ جو وہ تمھارے لیے پکڑ رکھیں۔ اور ان پر اللہ کا نام لو اور اللہ سے ڈرو، اللہ بے شک جلد حساب لینے والا ہے۔ ۵۔ آج تمھارے لیے سب ستھری چیزیں حلال کردی گئیں۔ اور اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ اور حلال ہیں تمھارے لیے پاک دامن عورتیں مومن عورتوں میں سے اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جب تم انھیں ان کے مہر دے دو اس طرح کہ تم نکاح میں لانے والے ہو، نہ اعلانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو۔ اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے گا تو اس کا عمل ضائع ہوجائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

وہ تمام چیزیں جن کو فطرت کی نگاہ پاک اور ستھرا محسوس کرتی ہے۔ اور وہ تمام جانور جو اپنی سرشت کے لحاظ سے انسان کی سرشت سے مناسبت رکھتے ہیں انسان کے لیے حلال ہیں۔ البتہ یہ شرط ہے کہ خارجی سبب سے ان کے اندر کوئی شرعی یا طبی خرابی نہ پیدا ہوگئی ہو۔ تاہم اس اصول کو انسان محض اپنی عقل سے پوری طرح متعین نہیں کرسکتا۔ اس لیے اس کو تعین کے ساتھ بھی بیان کردیا گیا۔ سدھائے ہوئے جانور کا شکار بھی اسی لیے حلال ہے کہ وہ شکار کو اپنے مالک کے لیے پکڑ کر رکھتا ہے۔ گویا اس نے آدمی کی خو سیکھ لی۔ ایسا جانور گویا شکار کے معاملے میں خود آدمی کا قائم مقام بن گیا۔

حلال و حرام کا قانون خواہ کتنی ہی تفصیل کے ساتھ بتا دیا جائے بالآخر آدمی کا اپنا ارادہ ہی ہے جو اس کو کسی چیز سے روکتا ہے اور کسی چیز کی طرف لے جاتا ہے۔ آدمی کے اوپر اصل نگراں قانون کی دفعات نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ اگر آدمی خود نہ چاہے تو قانون کو مانتے ہوئے وہ اس سے فرار کی راہیں تلاش کرلے گا۔ یہ صرف اللہ کا خوف ہے جو آدمی کو پابند کرتا ہے کہ وہ قانون کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ ملحوظ رکھے۔ اسی لیے حرام و حلال کا

قانون بتاتے ہوئے کہا گیا: اللہ سے ڈرو، اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

مسلمان عورت کے لیے کسی حال میں جائز نہیں کہ وہ غیر مسلم مرد سے نکاح کرلے۔ مگر مسلمان مردوں کو مخصوص شرائط کے تحت اجازت دی گئی ہے کہ وہ اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح کرسکتے ہیں۔ اس گنجائش کی حکمت یہ ہے کہ عورت فطرۃً تاثر پذیر مزاج رکھتی ہے۔ اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ عملی زندگی میں آنے کے بعد اپنے مسلم شوہر اور مسلم معاشرہ کا اثر قبول کرلے اور اس طرح نکاح اس کے لیے اسلام میں داخلہ کا ذریعہ بن جائے۔

''جو شخص ایمان سے انکار کرے تو اس کا عمل ضائع ہوگیا''، یعنی ایمان کے بغیر عمل کی کوئی حقیقت نہیں۔ عمل وہی ہے جو خالص اللہ کے لیے کیا جائے۔ جو عمل اللہ کے لیے نہ ہو وہ خود اپنے لیے ہوتا ہے۔ پھر اپنی خاطر کیے ہوئے عمل کی قیمت اللہ کیوں دے گا۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

۶۔ اے ایمان والو، جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو غسل کرلو۔ اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرلو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس سے مسح کرلو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ وہ تم پر کوئی تنگی ڈالے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم شکر گزار بنو۔

نماز کا مقصد آدمی کو برائیوں سے پاک کرنا ہے۔ وضو اسی کی ایک خارجی تیاری ہے۔ آدمی جب نماز کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے وہ پانی کے پاس جاتا ہے۔ پانی بہت بڑی نعمت ہے جو آدمی کے لیے ہر قسم کی گندگی کو دھونے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسی طرح نماز بھی ایک ربانی چشمہ ہے جس میں نہا کر آدمی اپنے آپ کو برے جذبات اور گندے خیالات سے پاک کرتا ہے۔

آدمی وضو کو شروع کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتا ہے تو گویا عمل کی زبان میں یہ دعا کرتا ہے کہ خدایا میرے ان ہاتھوں کو برائی سے بچا اور ان کے ذریعہ جو برائیاں مجھ سے ہوئی ہیں ان کو دھو کر صاف کردے۔ پھر وہ اپنے منھ میں پانی ڈالتا ہے اور اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اس کی روح زبان حال سے کہہ اٹھتی ہے کہ خدایا میں نے اپنے منھ میں جو غلط خوراک ڈالی ہو، میں نے اپنی زبان سے جو برا کلمہ نکالا ہو، میری آنکھوں نے جو بری چیز دیکھی ہو ان

سب کو تو مجھ سے دور کر دے۔ پھر وہ پانی لے کر اپنے ہاتھوں کو سر کے اوپر پھیرتا ہے تو اس کا وجود سراپا اس دعا میں ڈھل جاتا ہے کہ خدایا میرے ذہن نے جو بری باتیں سوچی ہوں اور جو غلط منصوبے بنائے ہوں ان کے اثرات کو مجھ سے دھو دے اور میرے ذہن کو پاک صاف ذہن بنا دے۔ پھر جب وہ اپنے پیروں کو دھوتا ہے تو اس کا عمل اس کے لیے اپنے رب کے سامنے یہ درخواست بن جاتا ہے کہ وہ اس کے پیروں سے برائی کی گرد کو دھو دے اور اس کو ایسا بنا دے کہ سچائی اور انصاف کے راستے کے سوا کسی اور راستہ پر وہ کبھی نہ چلے۔ اس طرح پورا وضو آدمی کے لیے گویا اس دعا کی عملی صورت بن جاتا ہے ــــ خدایا مجھے غلطی سے پلٹنے والا بنا اور مجھ کو برائیوں سے پاک رہنے والا بنا۔

عام حالات میں پاکی کا احساس پیدا کرنے کے لیے وضو کافی ہے۔ مگر جنابت کی حالت ایک غیر معمولی حالت ہے۔ اس لیے اس میں پورے جسم کا دھونا (غسل) ضروری قرار دیا گیا۔ وضو اگر چھوٹا غسل ہے تو غسل بڑا وضو ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ وہ بندوں کو غیر ضروری مشقت میں ڈالے۔ اس لیے معذوری کی حالتوں میں پاکی کے احساس کو تازہ کرنے کے لیے تیمم کو کافی قرار دیا گیا۔ وضو اور غسل کے سادہ طریقے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ اس طرح طہارت شرعی کو طہارت طبعی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ معذوری کی حالت میں تیمم کی اجازت مزید نعمت ہے کیوں کہ یہ غلو سے بچانے والی ہے جس میں اکثر مذاہب کے لوگ مبتلا ہوئے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ
وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٧
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ
شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ
عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ
لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ۝٨ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝٩ وَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
الْجَحِيْمِ ۝١٠ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا
نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا

۷۔ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور اس کے اس عہد کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا ہے۔ جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ دلوں کی بات تک جانتا ہے۔
۸۔ اے ایمان والو، اللہ کے لیے انصاف کے ساتھ قائم رہنے والے گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔
۹۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر ہے۔
۱۰۔ اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، ایسے لوگ دوزخ والے ہیں۔
۱۱۔ اے ایمان والو، اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب ایک قوم نے ارادہ کیا کہ

اِلَیۡکُمۡ اَیۡدِیَہُمۡ فَکَفَّ اَیۡدِیَہُمۡ عَنۡکُمۡ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾ ع

وہ تم پر دست درازی کرے تو اللہ نے تم سے ان کے ہاتھ کو روک دیا۔ اور اللہ سے ڈرو اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ایمان ایک عہد ہے جو بندے اور خدا کے درمیان قرار پاتا ہے۔ بندہ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ سے ڈر کر رہے گا اور اللہ اس کا ضامن ہوتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں بندہ کا کفیل ہوجائے گا۔ بندے کو اپنے عہد میں پورا اترنے کے لیے دو باتوں کا ثبوت دینا ہے۔ ایک یہ کہ وہ قوّامُ للہ بن جائے، یعنی وہ خدا کی باتوں پر خوب قائم رہنے والا ہو۔ اس کا وجود ہر موقع پر صحیح ترین جواب پیش کرے، جو بندے کو اپنے رب کے لیے پیش کرنا چاہیے۔ وہ جب کائنات کو دیکھے تو اس کا ذہن خدا کی قدرتوں اور عظمتوں کے تصور سے سرشار ہوجائے۔ وہ جب اپنے آپ کو دیکھے تو اس کو اپنی زندگی سراپا فضل اور احسان نظر آئے۔ اس کے جذبات امنڈیں تو خدا کے امنڈیں۔ اس کی توجہات کسی چیز کو اپنا مرکز بنائیں تو خدا کو بنائیں۔ اس کی محبت خدا کے لیے ہو۔ اس کے اندیشے خدا سے وابستہ ہوں۔ اس کی یادوں میں خدا سمایا ہوا ہو۔ وہ خدا کی عبادت و اطاعت کرے۔ وہ خدا کے راستہ میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے دین کے راستہ میں لگا کر خوش ہوتا ہو۔

عہد پر قائم رہنے کی دوسری شرط بندوں کے ساتھ انصاف ہے۔ انصاف کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ کمی بیشی کیے بغیر وہ سلوک کرنا جس کا وہ باعتبار واقعہ مستحق ہے۔ معاملات میں حق کو اپنانا، نہ کہ اپنی خواہشات کو۔ اس معاملہ میں بندے کو اتنا زیادہ پابند بننا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اپنے کو انصاف سے باندھے رہے جب کہ وہ دشمنوں اور باطل پرستوں سے معاملہ کررہا ہو، جب کہ شکایتیں اور تلخ یادیں اس کو انصاف کے راستہ سے پھیرنے لگیں۔

دنیا میں خدا نشانیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی ایسے دلائل کی صورت میں جس کی کاٹ آدمی کے پاس موجود نہ ہو۔ جب آدمی کے سامنے خدا کی دلیل آئے اور وہ اس کو ماننے کے بجائے لفظی تکرار کرنے لگے تو اس نے خدا کی نشانی کو جھٹلایا۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں سخت سزا پائیں گے۔ اور جن لوگوں نے اس کو مان لیا وہ خدا کے انعام کے مستحق ہوں گے۔

وَ لَقَدۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۚ وَ بَعَثۡنَا مِنۡہُمُ اثۡنَیۡ عَشَرَ نَقِیۡبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰہُ اِنِّیۡ مَعَکُمۡ ؕ لَئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَیۡتُمُ الزَّکٰوۃَ وَ اٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِیۡ وَ عَزَّرۡتُمُوۡہُمۡ وَ اَقۡرَضۡتُمُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا

۱۲۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کیے۔ اور اللہ نے کہا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کروگے اور زکوٰۃ ادا کروگے اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کروگے اور اللہ کو قرضِ حسن دو گے تو میں تم سے تمھارے گناہ ضرور دور کردوں گا اور تم کو ضرور ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن

الۡاَنۡهٰرُ ۚ فَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ
سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ
وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوۡنَ الۡـكَلِمَ عَنۡ
مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ ۚ وَلَا
تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنۡهُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا
مِّنۡهُمۡ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاصۡفَحۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾

کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس تم میں سے جو شخص اس کے بعد انکار کرے گا تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ ۱۳۔ پس ان کی عہد شکنی کی بنا پر ہم نے ان پر لعنت کردی اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کردیا۔ وہ کلام کو اس کی جگہ سے بدل دیتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی، اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے۔ اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہتے ہو، بجز تھوڑے لوگوں کے۔ ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو، اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

بنی اسرائیل سے ان کے پیغمبر کی معرفت خدا پرستانہ زندگی گزارنے کا عہد لیا گیا اور ان کے بارہ قبائل سے بارہ سرداران کی نگرانی کے لیے مقرر کیے گئے۔ بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا وہ یہ تھا کہ وہ نماز کے ذریعے اپنے کو اللہ والا بنائیں۔ وہ زکوٰۃ کی صورت میں بندوں کے حقوق ادا کریں۔ پیغمبروں کا ساتھ دے کر وہ اپنے کو اللہ کی پکار کی جانب کھڑا کریں اور اللہ کے دین کی جدوجہد میں اپنا اثاثہ خرچ کریں۔ ان کاموں کی ادائیگی اور اپنے درمیان ان کی نگرانی کا اجتماعی نظام قائم کرنے کے بعد ہی وہ خدا کی نظر میں اس کے مستحق تھے کہ خدا ان کا ساتھی ہو۔ وہ ان کو پاک صاف کرکے اس قابل بنائے کہ وہ جنت کی لطیف فضاؤں میں داخل ہوسکیں۔ جنت کسی کو عمل سے ملتی ہے، نہ کہ کسی قسم کے نسلی تعلق سے۔

اس عہد میں جن اعمال کا ذکر ہے یہی دین کے اساسی اعمال ہیں۔ یہی وہ شاہراہ ہے جو تمام انسانوں کو خدا اور اس کی جنت کی طرف لے جانے والی ہے۔ مگر جب آسمانی کتاب کی حامل قوموں میں بگاڑ آتا ہے تو وہ اس شاہراہ کے دائیں بائیں مڑ جاتی ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ دین کا تصور بدل دیا جاتا ہے۔ عبادت کے نام پر غیر متعلق بحثیں شروع ہوجاتی ہیں۔ نجات کے ایسے راستے تلاش کرلیے جاتے ہیں جو بندوں کے حقوق ادا کیے بغیر آدمی کو منزل تک پہنچا دیں۔ دعوتِ حق کے نام پر ان کے یہاں بے معنیٰ قسم کے دنیوی ہنگامے جاری ہوجاتے ہیں۔ وہ دنیوی اخراجات کی بہت سی مدیں بناتے ہیں اور انھیں کو دین کے لیے خرچ کا نام دے دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے دنیوی مصالح کے مطابق ایک دین گھڑتے ہیں اور اسی کو خدا کا دین کہنے لگتے ہیں۔ جب کوئی گروہ بگاڑ کی اس نوبت تک پہنچتا ہے تو خدا اپنی توجہ اس سے ہٹا لیتا ہے۔ خدا کی توفیق سے محروم ہو کر ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کی زبان سمجھتے ہیں اور اسی میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت کا فرشتہ آجاتا ہے تا کہ ان کو پکڑ کر خدا کی عدالت میں پہنچا دے۔

وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۪ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ان سے ہم نے عہد لیا تھا۔ پس جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی، اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے۔ پھر ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دیا۔ اور آخر اللہ ان کو آگاہ کردے گا اس سے جو کچھ وہ کر رہے تھے۔

آسمانی کتاب کی حامل قوموں پر جب بگاڑ آتا ہے تو وہ دین کے محکم حصہ کو چھوڑ کر اس کے غیر محکم حصہ پر دوڑ پڑتی ہیں۔ اس کا نتیجہ دنیا میں اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور آخرت میں رسوائی کی صورت میں۔

مسیح علیہ السلام باپ کے بغیر ایک پاکباز خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ پیدائش کے بعد انھوں نے اپنی زبان سے اپنا جو تعارف کرایا وہ یہ تھا "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں"۔ اب حضرت مسیح کے بارے میں رائے قائم کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آنجناب نے اپنے بارے میں جو واضح الفاظ فرمائے ہیں انھیں کی پابندی کی جائے اور آپ کو وہی سمجھا جائے جو ان الفاظ سے براہِ راست طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں اپنے قیاس کو دخل دیا جائے اور کہا جائے کہ "انسان وہ ہے جو کسی باپ کا بیٹا ہو۔ مسیح کسی باپ کے بیٹے نہ تھے۔ اس لیے وہ خدا کے بیٹے تھے"۔ پہلی رائے کی بنیاد خود مسیح کا محکم اور مستند قول ہے۔ اس لیے اگر اس کو اختیار کیا جائے تو اس میں اختلاف پیدا نہ ہوگا۔ جب کہ دوسری رائے کی بنیاد محض انسانی قیاس پر ہے۔ اس لیے جب دوسری رائے کو اختیار کیا جائے گا تو رایوں کا اختلاف شروع ہوجائے گا، جیسا کہ مسیح کو ماننے والوں کے ساتھ بعد کے زمانہ میں ہوا۔

آسمانی کتاب کی حامل کسی قوم میں جب بگاڑ آتا ہے تو اس کے اندر اسی قسم کی خرابیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ وہ محکم دین کو چھوڑ کر قیاسی دین پر چل پڑتی ہے۔ یہیں سے اختلاف اور فرقہ بندیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ فقہ اور کلام، روحانیت اور سیاست میں خدا و رسول نے جو کھلے ہوئے احکام دیے ہیں لوگ ان کے سادہ مفہوم پر قانع نہیں رہتے بلکہ بطور خود نئی نئی بحثیں نکالتے ہیں۔ کبھی زمانے کے خیالات سے متاثر ہو کر، کبھی اپنی دنیوی خواہشوں کو دینی جواز عطا کرنے کے لیے، کبھی بزعم خود خدا کے ناقص دین کو کامل بنانے کے لیے، اپنی طرف سے ایسی باتیں دین میں داخل کردی جاتی ہیں جو حقیقۃً دین کا حصہ نہیں ہوتیں۔ اس طرح نئے نئے دینی اڈیشن تیار ہوجاتے ہیں۔ کوئی روحانی اڈیشن، کوئی سیاسی اڈیشن، کوئی اور اڈیشن۔ ہر ایک کے گرد اس کے موافق ذوق رکھنے والے لوگ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ بالآخر ان کا ایک فرقہ بن جاتا ہے۔ ان کی بعد کی نسلیں اس کو اسلام کا ورثہ سمجھ کر اس کی حفاظت شروع کردیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے کہ وہ قیامت تک کبھی ختم نہ ہو۔

کیوں کہ انسان ماضی کو ہمیشہ مقدس سمجھ لیتا ہے اور جو چیز مقدس بن جائے وہ کبھی ختم نہیں ہوتی — مذہب کے نام پر فرقہ بندی ایک طرف مقدس ہو کر ابدی بن جاتی ہے۔ دوسری طرف خدا کا حکم بن کر دوسروں کے خلاف نفرت اور جارحیت کا اجازت نامہ بھی۔

يَاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ ﴿۱۵﴾ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۶﴾ لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ ؕ قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۷﴾

۱۵۔ اے اہل کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے۔ وہ کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمھارے سامنے کھول رہا ہے جن کو تم چھپاتے تھے۔ اور وہ درگزر کرتا ہے بہت سی چیزوں سے۔ بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کرنے والی کتاب آچکی ہے۔
۱۶۔ اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور وہ اپنی توفیق سے ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لا رہا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ ۱۷۔ بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو مسیح ابن مریم ہے۔ کہو پھر کون اختیار رکھتا ہے اللہ کے آگے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اہلِ کتاب نے اپنے دین میں دو قسم کی غلطیاں کیں۔ ایک یہ کہ کچھ تعلیمات کو تاویل یا تحریف کے ذریعہ دین سے خارج کر دیا۔ مثلاً انھوں نے اپنی کتاب میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ اب ان کو اپنی نجات کے لیے کسی اور پیغمبر کو ماننے کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے آبائی مذہب سے وابستگی ان کی نجات کے لیے بالکل کافی تھی۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے دین کے نام پر ایسی پابندیاں اپنے اوپر ڈال لیں جو خدا نے ان کے اوپر نہ ڈالی تھیں۔ مثال کے طور پر قربانی کی ادائیگی کے وہ جزئی مسائل جن کا حکم ان کے نبیوں نے ان کو نہیں دیا تھا بلکہ ان کے علماء نے اپنی فقہی موشگافیوں سے بطور خود ان کو گھڑ لیا۔

قرآن ان کے لیے ایک نعمت بن کر آیا۔ اس نے ان کے لیے دین خداوندی کی ''تجدید'' کی۔ قرآن نے ان کو اندھیرے سے نکالا، یعنی وہ ایسے راستے پر چلتے رہیں جس کے متعلق وہ اس خوش فہمی میں ہوں کہ وہ جنت کی طرف جارہا ہے، حالاں کہ وہ ان کو خدا کے غضب کی طرف لے جارہا ہو۔ قرآن نے ایک طرف ان کی کھوئی ہوئی تعلیمات کو ان کی اصلی صورت میں پیش کیا۔ دوسری طرف قرآن نے یہ کیا کہ انھوں نے اپنے آپ کو جن غیر ضروری دینی پابندیوں میں مبتلا کرلیا تھا اس سے انھیں آزاد کردیا۔ اب جو لوگ اپنی خواہشوں کی پیروی کریں وہ بدستور اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ اور جن کو اللہ کی رضا کی تلاش ہو وہ حق کی سیدھی راہ کو پالیں گے۔ وہ اللہ کی توفیق سے اپنے آپ کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا اپنی کامل صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ دلیل کی زبان میں ہوتا ہے۔ اور دلیل انھیں لوگوں کے ذہن کا جزء بنتی ہے جو اس کے لیے اپنے ذہن کو کھلا رکھیں۔

خدا کو چھوڑ کر انسانوں نے جو خدا بنائے ہیں ان میں سے ہر ایک کا یہ حال ہے کہ وہ نہ کوئی چیز بطور خود پیدا کرسکتے ہیں اور نہ کسی چیز کو بطور خود مٹا سکتے ہیں۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ جو ہستیاں پیدائش اور موت پر قادر نہ ہوں وہ خدا کس طرح ہوسکتی ہیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾ ع ۳ ۸

۱۸۔ اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ تم کہو کہ پھر وہ تمھارے گناہوں پر تم کو سزا کیوں دیتا ہے۔ نہیں، بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سے ایک آدمی ہو۔ وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ۱۹۔ اے اہلِ کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، وہ تم کو صاف صاف بتا رہا ہے، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد۔ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور آگاہ کرنے والا نہیں آیا۔ پس اب تمھارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جوقوم کتاب اور پیغمبر کی حامل بنائی جائے اور وہ اس کے ماننے کا ثبوت دے دے تو اس پر خدا کی بہت سی نعمتیں نازل ہوتی ہیں — مخالفین کے مقابلہ میں خصوصی نصرت، ترقی و بلندی، مغفرت اور جنت کا وعدہ، وغیرہ۔ قوم کے ابتدائی لوگوں کے لیے یہ ان کے عمل کا بدلہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کیا اس لیے خدا نے ان پر اپنی نعمتیں برسائیں۔ مگر بعد کی نسلوں میں صورت حال بدل جاتی ہے۔ اب ان کے لیے سارا معاملہ قومی معاملہ بن جاتا ہے۔ اولین لوگوں کو جو چیز عمل کے سبب سے ملی تھی، بعد کے لوگ قومی اور نسلی تعلق کی بنا پر اپنے کو اس کا مستحق سمجھ لیتے ہیں۔ وہ یقین کر لیتے ہیں کہ وہ خدا کے خاص لوگ ہیں اور وہ خواہ کچھ بھی کریں خدا کی نعمتیں ان کو ملا کر رہیں گی۔ حاملِ کتاب قوموں کو اس غلط فہمی سے نکالنے کی خاطر خدا نے ان کے لیے یہ خصوصی قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ان کا خدا ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ اگر وہ دنیا میں اپنے دشمنوں پر غالب آرہے ہوں تو وہ خدا کے مقبول گروہ ہیں اور اگر ان کے دشمن ان پر غلبہ پالیں تو وہ خدا کے نامقبول گروہ ہیں۔ کوئی حامل کتاب گروہ کثرت تعداد کے باوجود اگر دنیا میں مغلوب اور ذلیل ہو رہا ہو تو اس کو ہرگز یہ امید نہ رکھنا چاہیے کہ آخرت میں وہ سربلند اور باعزت رہے گا۔

کسی قوم کو بحیثیت قوم کے خدا کا محبوب سمجھنا سراسر باطل خیال ہے۔ خدا کے یہاں فرد فرد کا حساب ہونا ہے، نہ کہ قوم قوم کا۔ ہر آدمی جو کچھ کرے گا اسی کے مطابق وہ خدا کے یہاں بدلہ پائے گا۔ ہر آدمی اللہ کی نظر میں بس ایک انسان ہے، خواہ وہ اِس قوم سے تعلق رکھتا ہو یا اُس قوم سے۔ ہر آدمی کے مستقبل کا فیصلہ اِس بنیاد پر کیا جائے گا کہ امتحان کی دنیا میں اس نے کس قسم کی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ جنت کسی کا قومی وطن نہیں اور جہنم کسی کا قومی جیل خانہ نہیں۔ اللہ کے فیصلہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے ایسے افراد اٹھاتا ہے جو لوگوں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس کو جہنم سے ڈراتے ہیں اور جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ خدا کے اسی بشیر و نذیر کا ساتھ دے کر آدمی خدا کو پاتا ہے، نہ کہ کسی اور طریقے سے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ
وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ
اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا
الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا
تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا
خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا

۲۰۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ اس نے تمھارے اندر نبی پیدا کیے۔ اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا تھا۔
۲۱۔ اے میری قوم، اس پاک زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے۔ اور اپنی پیٹھ کی طرف نہ لوٹو ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔
۲۲۔ انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ، وہاں ایک

جَبَّارِيْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا
مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿٢٢﴾
قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا
دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ
فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالُوْا
يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا
فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا
قٰعِدُوْنَ ﴿٢٤﴾

زبردست قوم ہے۔ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم داخل ہوں گے۔ ۲۳۔دو آدمی جو اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے اوران دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا، انھوں نے کہا کہ تم ان پر حملہ کرکے شہر کے پھاٹک میں داخل ہوجاؤ۔ جب تم اس میں داخل ہوجاؤ گے تو تم ہی غالب ہوگے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔ ۲۴۔انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم کبھی وہاں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں ہیں۔ پس تم اور تمھارا خداوند دونوں جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے پیغام کولوگوں تک پہنچانے کے لیے کسی گروہ کو چن لیتا ہے۔اس گروہ کے اندر وہ اپنے پیغمبر اور اپنی کتاب بھیجتا ہے اور اس کو مامور کرتا ہے کہ وہ اس پیغام کو دوسروں تک پہنچائے۔جس طرح وحی ایک خاص شخص پر اترتی ہے اسی طرح وحی کا حامل بھی ایک خاص گروہ کو بنایا جاتا ہے۔قدیم زمانہ میں یہ خاص حیثیت بنی اسرائیل کو حاصل تھی اور نبی آخر الزماں کے بعد امت محمدی اس خصوصی منصب پر مامور ہے۔

اللہ کو جس طرح یہ مطلوب ہے کہ کوئی قوم اس کے دین کی نمائندگی کرے۔اسی طرح اس کو یہ بھی مطلوب ہے کہ جو قوم اس کے دین کی نمائندہ ہو وہ دنیا میں باعزت اور سربلند ہوتا کہ لوگوں پر اس بات کا مظاہرہ ہوسکے کہ قیامت کے بعد جو نیا اور ابدی عالم بنے گا اس میں ہر قسم کی سرفرازیاں صرف اہل حق کو حاصل ہوں گی۔باقی لوگ مغلوب کرکے خدا کی رحمتوں سے دور پھینک دیے جائیں گے۔تاہم اس گروہ کو یہ دنیوی انعام یک طرفہ طور پر نہیں دیا جاتا۔ اس کے لیے اس کو استحقاق کے امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔اس کو عملی طور پر یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ پر اعتماد کرنے والا اور صبر کی حد تک اس کی مرضی پر قائم رہنے والا ہے۔

بنی اسرائیل جب تک اس معیار پر قائم رہے ان کو خدا نے ان کی حریف قوموں پر غالب کیا۔حتی کہ ایک زمانہ تک وہ اپنے وقت کی مہذب دنیا میں سب سے زیادہ سربلند حیثیت رکھتے تھے۔مگر حضرت موسیٰ تشریف لائے تو بنی اسرائیل پر زوال آچکا تھا۔امتحان کے وقت ان کی اکثریت اعتماد علی اللہ اور صبر کا ثبوت دینے کے لیے تیار نہ ہوئی۔حتی کہ ان کا ایک طبقہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے گستاخی کرنے لگا۔ان کے

دل میں اللہ سے بھی زیادہ دنیا کی طاقت ورقوموں کا ڈر سمایا ہوا تھا— جب خدا کا کوئی نمائندہ گروہ خدا کے کام کے لیے قربانی نہ دے تو گویا کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا خود زمین پر اترے اور اپنے دین کا کام خود انجام دے، خواہ وہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں کی طرح اس بات کو زبان سے کہہ دے یا دوسرے لوگوں کی طرح زبان سے نہ کہے بلکہ صرف اپنے عمل سے اس کو ظاہر کرے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ ع ۷ ۸

۲۵۔ موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب، اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر میرا اختیار نہیں۔ پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کردے۔ ۲۶۔ اللہ نے کہا: وہ ملک ان پر چالیس سال کے لیے حرام کردیا گیا۔ یہ لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے۔ پس تم اس نافرمان قوم پر افسوس نہ کرو۔

بنی اسرائیل جب حضرت موسیٰ کی قیادت میں مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں پہنچے تو اس زمانہ میں شام و فلسطین کے علاقہ میں ایک ظالم قوم (عمالقہ) کی حکومت تھی۔ اللہ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ ظالم لوگ اپنی عمر پوری کر چکے ہیں۔ تم ان کے ملک میں داخل ہو جاؤ، تم کو خدا کی مدد حاصل ہوگی اور تم معمولی مقابلہ کے بعد ان کے اوپر قبضہ پالو گے۔ مگر بنی اسرائیل پر اس قوم کی ایسی ہیبت طاری تھی کہ وہ ان کے ملک میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اللہ سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہ رہی۔ اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ کردیا کہ وہ چالیس سال (1440-1400 ق م) تک فاران اور شرق اردن کے درمیان صحرا میں بھٹکتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ 20 سال سے لے کر اوپر کی عمر تک کے سارے لوگ ختم ہو جائیں گے۔ اس دوران ان کی ایک نئی نسل نئے حالات میں پرورش پا کر اٹھے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ 40 سال کی صحرائی زندگی میں ان کے تمام بڑی عمر والے مر کر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی نئی نسل نے یوشع بن نون کی قیادت میں شام و فلسطین کو فتح کیا۔ یہ یوشع بن نون ان دو صالح اسرائیلیوں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے عمالقہ کے ملک میں داخل ہو جاؤ۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ اگر ہم اس ملک پر حملہ کریں تو ہم کو شکست ہوگی اور اس کے بعد "ہمارے بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے"۔ مگر یہی بچے بڑے ہو کر عمالقہ کے ملک میں داخل ہوئے اور اس پر قبضہ کیا۔ بچوں میں یہ طاقت اس لیے پیدا ہوئی کہ انھوں نے لمبی مدت تک صحرائی زندگی کی مشقتوں کو برداشت کیا تھا۔ بچوں کے باپ جن پُرخطر حالات کو اپنے بچوں کے حق میں موت سمجھتے تھے انھیں پُرخطر حالات

کے اندر داخل ہونے میں ان کے بچوں کی زندگی کا راز چھپا ہوا تھا۔

موافق حالات میں جینا بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے اندر تمام بہترین اوصاف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ اس کو حالات کا مقابلہ کرکے زندہ رہنا پڑے۔ مصر میں بنی اسرائیل صدیوں تک عافیت کی زندگی گزارتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مُردہ قوم بن گئے۔ مگر خروج کے بعد ان کو جو صحرائی زندگی حاصل ہوئی اس میں زندگی ان کے لیے سراپا چیلنج تھی۔ ان حالات میں جو لوگ بچپن سے جوانی کی عمر کو پہنچے وہ قدرتی طور پر بالکل دوسری قسم کے لوگ تھے۔ صحرائی حالات نے ان کے اندر سادگی، ہمت، جفاکشی اور حقیقت پسندی پیدا کردی تھی۔ اور یہی وہ اوصاف ہیں، جو کسی قوم کو زندہ قوم بناتے ہیں — کوئی قوم اگر حالات کے نتیجہ میں مردہ قوم بن جائے تو اس کو دوبارہ زندہ قوم بنانے کے لیے غیر معمولی حالات میں ڈال دیا جاتا ہے۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

النصف

۲۷۔ اور ان کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ سناؤ۔ جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہ ہوئی۔ اس نے کہا میں تجھ کو مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ تو صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے۔ ۲۸۔ اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔ ۲۹۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی لے لے پھر تو آگ والوں میں شامل ہو جائے۔ اور یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی۔

اللہ کے لیے جو عمل کیا جائے اس کا اصل بدلہ تو آخرت میں ملتا ہے، تاہم بعض اوقات دنیا میں بھی ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ آدمی کا عمل خدا کے یہاں مقبول ہوا یا نہیں۔ آدم کے بیٹوں میں سے قابیل اور ہابیل کے ساتھ بھی ایسی ہی صورت پیش آئی۔ قابیل کسان تھا اور ہابیل بھیڑ بکریوں کا کام کرتا تھا۔ ہابیل نے اپنی محنت کی کمائی اللہ کے لیے دی۔ وہ اللہ کے یہاں مقبول ہوئی اور اس کی برکت اس کی زندگی اور اس کے کام میں ظاہر ہوئی۔ قابیل نے بھی اپنی زراعت میں سے کچھ اللہ کے لیے پیش کیا مگر وہ قبول نہ ہوا اور وہ خدا کی برکت پانے سے محروم رہا۔ یہ دیکھ کر قابیل کے دل میں اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کے لیے حسد پیدا

ہوگیا۔ یہ حسد اتنا بڑھا کہ اس نے ہابیل سے کہا کہ میں تم کو جان سے مار ڈالوں گا۔ ہابیل نے کہا کہ تمھاری قربانی قبول نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ تمھارے دل میں خدا کا خوف نہیں۔ تم کو میرے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ مگر حسد اور بغض کی آگ جب کسی کے اندر بھڑکتی ہے تو وہ اس کو اس قابل نہیں رکھتی کہ وہ اپنی غلطیوں کا جائزہ لے۔ وہ بس ایک ہی بات جانتا ہے— جس طرح بھی ہو اپنے مفروضہ حریف کا خاتمہ کردے۔

ہابیل نے قابیل سے کہا کہ تم خواہ میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھاؤ، میں تمھارے قتل کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک انسان کی دوسرے انسان سے لڑائی کو اللہ نے سراسر حرام قرار دیا ہے۔ حتی کہ اگر ایک انسان اپنے بھائی کے قتل کے درپے ہوجائے تو اس وقت بھی اخلاقی عزیمت یہ ہے کہ دوسرا بھائی اپنے بھائی کے خون کو اپنے لیے حلال نہ کرے۔ وہ اپنی طرف سے جارحانہ اقدام نہ کرکے باہمی ٹکراؤ کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کردے۔ اس کے برعکس، اگر وہ بھی جواب میں جارحیت کرنے لگے تو معاشرہ کے اندر عمل اور ردعمل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجائے گا۔

دو انسان جب ایک دوسرے کی بربادی کے درپے ہوں تو گناہ دونوں کے درمیان تقسیم ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ ایک شخص دوسرے شخص کی بربادی کی کارروائیاں کرے اور دوسرا شخص صبر اور دعا میں مشغول ہو تو پہلا شخص نہ صرف اپنے گناہ کا بوجھ اٹھاتا ہے بلکہ دوسرے شخص کے اس ممکن گناہ کا بوجھ بھی اس کے اوپر ڈال دیا جاتا ہے، جو صبر اور دعا کے طریقہ پر نہ چلنے کی صورت میں وہ کرتا۔

فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبۡحَثُ فِى الۡاَرۡضِ لِيُرِيَهٗ كَيۡفَ يُوَارِىۡ سَوۡءَةَ اَخِيۡهِ‌ ؕ قَالَ يٰوَيۡلَتٰٓى اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوۡءَةَ اَخِىۡ‌ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۰۔ پھر اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر راضی کرلیا اور اس نے اس کو قتل کر ڈالا۔ پھر وہ نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہوگیا۔
۳۱۔ پھر خدا نے ایک کوّے کو بھیجا جو زمین میں کریدتا تھا، تاکہ وہ اس کو دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے۔ اس نے کہا افسوس میری حالت پر کہ میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہوسکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا۔ پس وہ بہت شرمندہ ہوا۔

دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لیے کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر جلنا اور اس کے نقصان کے درپے ہونا گویا خدا کے منصوبہ کو باطل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ ایسا آدمی اگرچہ موجودہ امتحان کی دنیا میں ایک حد تک عمل کرنے کا موقع پاتا ہے۔ مگر خدا کی نظر میں وہ بدترین مجرم ہے۔ ہابیل نے اپنے

بڑے بھائی کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد اس کے دل میں جھجھک پیدا ہوئی۔ اس کو محسوس ہوا کہ وہ واقعی بلا سبب اپنے بھائی کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر اس کا حسد کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے ذہن میں ایسے عذرات گھڑ لیے جو اس کے لیے اپنے بھائی کے قتل کو جائز ثابت کر سکیں۔ اس کی اندرونی کشمکش نے بالآخر خود ساختہ توجیہات میں اپنے لیے تسکین تلاش کر لی اور اس نے اپنے بھائی کو مار ڈالا— ضمیر کی آواز خدا کی آواز ہے۔ ضمیر کے اندر کسی عمل کے بارے میں سوال پیدا ہونا آدمی کا امتحان کے میدان میں کھڑا ہونا ہے۔ اگر آدمی اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے تو وہ کامیاب ہوا۔ اور اگر اس نے جھوٹے الفاظ کا سہارا لے کر ضمیر کی آواز کو دبا دیا تو وہ ناکام ہو گیا۔

حدیث میں ہے کہ زیادتی اور قطع رحم ایسے گناہ ہیں کہ ان کی سزا اسی موجودہ دنیا سے شروع ہو جاتی ہے (مَا مِنْ ذَنْبٍ أَحْرَى أَنْ يُعَجِّلَ اللَّهُ لِصَاحِبِهِ الْعُقُوبَةَ مَعَ مَا يُؤَخِّرُ لَهُ فِي الْآخِرَةِ، مِنْ بَغْيٍ، أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ) مسند احمد، حدیث نمبر 20374۔ قابیل نے اپنے بھائی کے ساتھ جو ناحق ظلم کیا تھا اس کی سزا نہ صرف اس کو آخرت میں ملے گی بلکہ اسی دنیا سے اس کا انجام شروع ہو گیا۔ مجاہد اور جبیر تابعی سے منقول ہے کہ قتل کے بعد قابیل کا یہ حال ہوا کہ اس کی پنڈلی اس کی ران سے چپک گئی۔ وہ بے یار و مددگار زمین پر پڑا رہتا، یہاں تک کہ اسی حال میں ذلّت اور تکلیف کے ساتھ مر گیا (ابن کثیر)

قابیل کو کوّے کے ذریعہ یہ تعلیم دی گئی کہ وہ لاش کو زمین کے نیچے دفن کر دے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ انسان فطرت کے راستے کو جاننے کے معاملہ میں جانور سے بھی زیادہ کم عقل ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے تو اس سے زیادہ ظالم اور کوئی نہیں۔ نیز اس میں اس حقیقت کی طرف بھی لطیف اشارہ ہے کہ جرم سے پہلے اگر آدمی جرم کے ارادہ کو اپنے سینے میں دفن کر دے تو اس کو شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دل کے احساس کو دل کے اندر دبائے، اس کو دل سے باہر آ کر واقعہ نہ بننے دے۔ برے احساس کو دل کے باہر نکالنے سے پہلے تو صرف احساس کو دفن کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر اس نے اس کو باہر نکالا تو پھر ایک زندہ انسان کی ''لاش'' کو دفن کرنے کا مسئلہ اس کے لیے پیدا ہو جائے گا جو دفن ہو کر بھی خدا کے یہاں دفن نہیں ہوتا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا

۳۲۔ اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور جس نے ایک شخص کو بچایا تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو بچا لیا۔ اور ہمارے پیغمبر ان کے پاس

مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ فِي الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ ﴿٣٢﴾
اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ يُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَ
يَسۡعَوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ يُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ
يُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ
خِلَافٍ اَوۡ يُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمۡ
خِزۡىٌ فِي الدُّنۡيَا وَلَهُمۡ فِي الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيۡمٌ ۙ﴿٣٣﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ
تَقۡدِرُوۡا عَلَيۡهِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ
رَّحِيۡمٌ ﴿٣٤﴾ ع ٥ / ٨ / ٩

کھلے ہوئے احکام لے کر آئے۔ اس کے باوجود ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں زیادتیاں کرتے ہیں۔ ۳۳۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد کرنے کے لیے دوڑتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا وہ سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹے جائیں یا ان کو ملک سے باہر نکال دیا جائے۔ یہ ان کی رسوائی دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ ۳۴۔ مگر جو لوگ توبہ کرلیں تمھارے قابو پانے سے پہلے تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

کوئی شخص جب کسی شخص کو قتل کرتا ہے تو وہ صرف ایک انسان کا قاتل نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں کا قاتل ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ حرمت کے اس قانون کو توڑتا ہے جس میں تمام انسانوں کی زندگیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی کو ظالم کے ظلم سے نجات دیتا ہے تو وہ صرف ایک شخص کا نجات دہندہ نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں کا نجات دہندہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس نے اس اصول کی حفاظت کی کہ تمام انسانوں کی جان محترم ہے۔ کسی کو کسی کے اوپر ہاتھ اٹھانے کا حق نہیں۔ جب کوئی شخص کسی کی عزت یا اس کے مال یا اس کی جان پر حملہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر ہنگامی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے کسی ایک واقعہ کو بھی اس نظر سے دیکھیں گویا سارے لوگوں کی جان اور مال اور آبرو خطرے میں ہے۔ کسی معاشرہ میں ایک دوسرے کے احترام کی روایات لمبی تاریخ کے نتیجہ میں بنتی ہیں۔ اور اگر ایک بار یہ روایات ٹوٹ جائیں تو دوبارہ لمبی تاریخ کے بعد ہی ان کو معاشرہ کے اندر قائم کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ معاشرہ کے اندر فساد کی روایت قائم کریں وہ معاشرہ کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

خدا نے اپنی دنیا کا نظام جس اصول پر قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے حصہ کا فرض انجام دے۔ کوئی شخص دوسرے کے دائرہ میں بے جا مداخلت نہ کرے۔ تمام جمادات اور حیوانات اسی فطرت پر عمل کر رہے ہیں۔ انسان کو بھی پیغمبروں کے ذریعہ یہ ہدایات واضح طور پر بتا دی گئی ہیں۔ مگر انسان جو کہ دیگر مخلوقات کے برعکس وقتی طور پر آزاد رکھا گیا ہے، سرکشی کرتا ہے اور اس طرح فطرت کے نظام میں فساد پیدا کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں سخت مجرم ہیں۔ اور وہ لوگ اور بھی زیادہ بڑے مجرم ہیں جو خدا اور رسول سے جنگ کریں۔ یعنی خدا اپنے بندوں

کے درمیان ایسی دعوت اٹھائے جو لوگوں کو مفسدانہ طریقوں سے بچنے اور فطرت خداوندی پر زندگی گزارنے کی طرف بلاتی ہو تو وہ اس کا راستہ روکیں اور اس کے خلاف تخریبی کارروائیاں کریں۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں عبرت ناک سزا ہے اور آخرت میں بھڑکتی ہوئی آگ۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡهِ الۡوَسِیۡلَةَ وَ جَاهِدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِهٖ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ اَنَّ لَهُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَهٗ مَعَهٗ لِیَفۡتَدُوۡا بِهٖ مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنۡهُمۡ ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۳۶﴾ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنۡهَا ۫ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ ﴿۳۷﴾ وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَیۡدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَ اَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوۡبُ عَلَیۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۴۰﴾

۳۵۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور اس کا قرب تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۳۶۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ہے کہ اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اتنا ہی اور ہو، تاکہ وہ اس کو فدیہ میں دے کر قیامت کے دن کے عذاب سے چھوٹ جائیں، تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔ ۳۷۔ وہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں مگر وہ اس سے نکل نہ سکیں گے اور ان کے لیے ایک مستقل عذاب ہے۔ ۳۸۔ اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کے کئے کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۳۹۔ پھر جس نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کی اور اصلاح کرلی تو اللہ بے شک اس پر توجہ کرے گا۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۴۰۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے۔ وہ جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کردے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بندے کے لیے سب سے بڑی چیز اللہ کی قربت ہے۔ یہ قربت اپنی محسوس اور کامل صورت میں تو آخرت میں حاصل ہوگی۔ تاہم کسی بندے کا عمل جب اس کو اللہ سے قریب کرتا ہے تو ایک لطیف احساس کی صورت میں اس کا تجربہ اس کو اسی دنیا میں ہونے لگتا ہے۔ اس قربت تک پہنچنے کا ذریعہ تقویٰ اور جہاد ہے۔ یعنی ڈرنے اور جدوجہد کرنے کی سطح پر اللہ کا پرستار بننا۔ آدمی کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے کو حق اور ناحق کے درمیان کھڑا ہوا پاتا ہے۔ حق کی طرف بڑھنے میں اس کی انا ٹوٹتی ہے۔ اس کی دنیوی

مصلحتوں کا ڈھانچہ بکھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب کہ ناحق کا طریقہ اختیار کرنے میں اس کی اَنا قائم رہتی ہے۔ اس کی مصلحتیں پوری طرح محفوظ دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے وقت میں جو شخص خدا سے ڈرے اور تمام دوسری باتوں کو نظر انداز کرکے خدا کو پکڑ لے۔ اور ہر مشکل اور ہر ناخوش گواری کو جھیل کر خدا کی طرف بڑھے تو یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو خدا سے قریب کرتی ہے۔ اور اِس قربت کا نقد تجربہ آدمی کو حسیّات کی سطح پر ایک لطیف ادراک کی صورت میں اسی وقت ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص تقویٰ اور جہاد کے راستے پر چلنے کے لیے تیار نہ ہو اس نے خدا کا انکار کیا۔ وہ خدا سے دور ہوکر ایسے عذاب میں پڑ جاتا ہے، جس سے وہ کسی طرح چھٹکارا نہ پا سکے گا۔

جزا کا معاملہ تمام تر خدا کے اختیار میں ہے۔ نہ تو ایسا ہے کہ کوئی بعد کی زندگی میں اصلاح کرلے تب بھی اس کے پچھلے اعمال اس سے نہ دھلیں اور نہ یہ بات ہے کہ یہاں کوئی اور طاقت ہے جو سفارش یا مداخلت کے زور پر کسی کے انجام کو بدل سکے۔ سارا معاملہ ایک خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی کمال درجہ حکمت اور قدرت کے ساتھ سب کا فیصلہ کرے گا۔

سماجی جرائم کے لیے اسلام کی سزائیں دو خاص پہلوؤں کو سامنے رکھ کر مقرر کی گئی ہیں۔ ایک، آدمی کے جرم کی سزا۔ دوسرے یہ کہ سزا ایسی عبرت ناک ہو کہ اس کو دیکھ کر دوسرے مجرمین کی حوصلہ شکنی ہو۔ تاہم مجرم اگر جرم کے بعد اپنے فعل پر شرمندہ ہو۔ وہ اللہ سے معافی مانگے اور آئندہ اس قسم کی چیزوں کو بالکل چھوڑ دے تو امید ہے کہ آخرت میں اللہ اسے معاف کردے گا۔

يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ښ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اے پیغمبر، تم کو وہ لوگ رنج میں نہ ڈالیں جو کفر کی راہ میں بڑی تیزی دکھا رہے ہیں۔ خواہ وہ ان میں سے ہوں جو اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالاں کہ ان کے دل ایمان نہیں لائے یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں، جھوٹ کے بڑے سننے والے، سننے والے دوسرے لوگوں کی خاطر جو تمھارے پاس نہیں آئے۔ وہ کلام کو اس کے مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کرلینا اور اگر یہ حکم نہ ملے تو اس سے بچ کر رہنا۔ اور جس کو اللہ فتنہ میں ڈالنا چاہے تو تم اللہ کے مقابل اس کے معاملہ میں کچھ نہیں کرسکتے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے نہ چاہا کہ وہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

مدینہ میں اندرونی طور پر دو قسم کے لوگ اسلامی دعوت کے مخالفت کررہے تھے۔ایک منافقین، دوسرے یہود۔منافقین وہ لوگ تھے جو ظاہری اور نمائشی اسلام کو لیے ہوئے تھے۔ سچے اسلام کی دعوت میں ان کو اپنے اغراض و مفادات پر زد پڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہود وہ لوگ تھے جو مذہب کی نمائندگی کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو محسوس ہوتا تھا کہ اسلامی دعوت ان کو ان کے برتری کے مقام سے نیچے اتار رہی ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ سچے اسلام کی دعوت کو اپنا مشترک دشمن سمجھتے تھے۔اس لیے اسلام کے خلاف مہم چلانے میں دونوں ایک ہوگئے۔ان کے ''بڑے'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ خود نہ آتے۔البتہ ان کے ''چھوٹے'' اس پر لگے ہوئے تھے کہ وہ آپ کی باتوں کو سنیں اور ان کو اپنے بڑوں تک پہنچائیں۔ پھر یہ لوگ اس کو الٹے معنی پہناتے اور آپ کو اور آپ کی تحریک کو بدنام کرتے۔ان کی سرکشی نے ان کو ایسا ڈھیٹ بنا دیا تھا کہ وہ اللہ کے کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹا کر اس سے اپنا مفیدِ مطلب مفہوم نکالنے سے بھی نہ ڈرتے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کو خدا اور رسول کے تابع نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ جو بات اپنے ذوق کے مطابق ہو اس کو لے لو اور جو بات ذوق کے مطابق نہ ہو اس کو چھوڑ دو۔ یہ مزاج کسی آدمی کے لیے سخت فتنہ ہے۔جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ وہ حق کے مقابلہ میں مفاد اور مصلحت کو ترجیح دیں، جو ہر حال میں اپنے کو بڑائی کے مقام پر دیکھنا چاہیں، جو حق کو زیر کرنے کے لیے اس کے خلاف تخریبی سازشیں کریں، حتی کہ اپنے عمل کو جائز ثابت کرنے کے لیے خدا کے کلام کو بدل ڈالیں، ایسے لوگوں کی نفسیات بالآخر یہ ہو جاتی ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔انھوں نے خدا کا ساتھ چھوڑا، اس لیے خدا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ایسے لوگ خدا کی توفیق سے محروم ہو کر باطل مشغلوں میں لگے رہتے ہیں، یہاں تک کہ آگ کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

اللہ کا جو بندہ اللہ کے سچے دین کا پیغام لے کر اٹھا ہو اس کو مخالفتوں کی وجہ سے بے ہمت نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کی سرگرمیاں حقیقۃً داعی کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہیں۔ اس لیے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ دعوتی عمل سے اللہ کو جو چیز مطلوب ہے وہ صرف یہ کہ اصل بات سے بخوبی طور پر لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے۔اور یہ کام اللہ کی مدد سے لازماً اپنی تکمیل تک پہنچ کر رہتا ہے۔

سَمّٰعُوۡنَ لِلۡكَذِبِ اَكّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ ؕ فَاِنۡ جَآءُوۡكَ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ اَوۡ اَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ تُعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ فَلَنۡ يَّضُرُّوۡكَ شَيۡـئًـا ‌ؕ وَاِنۡ

۴۲۔ وہ جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں، حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔ اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو خواہ ان کے درمیان فیصلہ کرو یا ان کو ٹال دو۔ اگر تم ان کو ٹال دو گے تو وہ تمھارا کچھ بگاڑ

حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ
عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ
ع ۹ ۶ ۱۰ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع

نہیں سکتے۔ اور اگر تم فیصلہ کرو تو اِن کے درمیان انصاف کے مطابق فیصلہ کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۴۳۔ اور وہ کیسے تم کو حکم بناتے ہیں، حالاں کہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، اور پھر وہ اس سے منھ موڑ رہے ہیں۔ اور یہ لوگ ہرگز ایمان والے نہیں ہیں۔

حرام (سُحت) سے مراد رشوت ہے۔ رشوت کی ایک عام شکل وہ ہے جو براہِ راست اسی نام پر لی جاتی ہے۔ چنانچہ یہودی علماء میں ایسے لوگ تھے جو رشوت لے کر غلط مسائل بتایا کرتے تھے۔ تاہم رشوت کی ایک اور صورت وہ ہے جس میں براہِ راست لین دین نہیں ہوتا مگر وہ تمام رشوتوں میں زیادہ بڑی اور زیادہ قبیح رشوت ہوتی ہے۔ یہ ہے دین کو عوامی پسند کے مطابق بنا کر پیش کرنا تا کہ عوام کے درمیان مقبولیت ہو، لوگوں کا اعزاز و اکرام ملے، لوگوں کے چندے اور نذرانے وصول ہوتے رہیں۔

دین کو اس کی بے آمیز صورت میں پیش کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی عوام کے اندر نامقبول ہو جائے۔ اس کے برعکس دین کو اگر ایسی صورت میں پیش کیا جائے کہ زندگی میں کوئی حقیقی تبدیلی بھی نہ کرنا پڑے اور آدمی کو دین بھی حاصل رہے تو ایسے دین کے گرد بہت جلد بھیڑ کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے —— وہ دین جس میں اپنی دنیا پرستانہ زندگی کو بدلے بغیر کچھ سستے اعمال کے ذریعہ جنت مل رہی ہو۔ وہ دین جو قومی اور مادی ہنگامہ آرائیوں کو دینی جواز عطا کرتا ہو۔ وہ دین جس میں یہ موقع ہو کہ آدمی اپنی جاہ پسندی کے لیے سرگرم ہو، پھر بھی وہ جو کچھ کرے سب دین کے خانہ میں لکھا جاتا رہے۔ جو لوگ اس قسم کا دین پیش کریں وہ بہت جلد عوام کے اندر محبوبیت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

یہود کے قائدین اسی قسم کا دین چلا کر عوام کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ وہ عوام کو ان کا پسندیدہ دین پیش کر رہے تھے اور عوام اس کے معاوضہ میں ان کو مالی تعاون سے لے کر اعزاز و اکرام تک ہر چیز نثار کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچے دین کی آواز بلند کرنا ان کو ناقابلِ برداشت معلوم ہوا۔ کیوں کہ یہ ان کے مفادات کے ڈھانچہ کو توڑنے کے ہم معنی تھا، آپ سے ان کو اتنی ضد ہو گئی کہ آپ کے متعلق کسی اچھی خبر سے ان کو کوئی دل چسپی نہ رہی۔ البتہ اگر وہ آپ کے بارے میں کوئی بری خبر سنتے تو اس میں خوب دل چسپی لیتے اور اس میں اضافہ کر کے اس کو پھیلاتے۔ جن لوگوں میں اس قسم کا بگاڑ آجائے ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اگر وہ دینی فیصلہ لینے کی طرف رجوع بھی ہوتے ہیں تو اس امید میں کہ فیصلہ اپنی خواہش کے مطابق ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ جانتے ہوئے کہ یہ خدا اور رسول کا فیصلہ ہے اس کو ماننے

سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کرنا محض ایک فیصلہ کو نہ ماننا نہیں ہے بلکہ خود ایمان واسلام کا انکار کرنا ہے۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَاخۡشَوۡنِ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وَكَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيۡهَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ۙ وَالۡعَيۡنَ بِالۡعَيۡنِ وَالۡاَنۡفَ بِالۡاَنۡفِ وَالۡاُذُنَ بِالۡاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالۡجُرُوۡحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنۡ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ وَقَفَّيۡنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰىةِ ۖ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۶﴾ وَلۡيَحۡكُمۡ اَهۡلُ الۡاِنۡجِيۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۴۔ بے شک ہم نے تورات اتاری ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے مطابق، خدا کے فرماں بردار انبیاء یہودی لوگوں کا فیصلہ کرتے تھے اور ان کے درویش اور علماء بھی۔ اس لیے کہ وہ خدا کی کتاب پر نگہبان ٹھہرائے گئے تھے۔ اور وہ اس کے گواہ تھے۔ پس تم انسانوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کو متاعِ حقیر کے عوض نہ بیچو۔ اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ منکر ہیں۔ ۴۵۔ اور ہم نے اس کتاب میں ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلا ان کے برابر۔ پھر جس نے اس کو معاف کر دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو شخص اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ ۴۶۔ اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا تصدیق کرتے ہوئے اپنے سے قبل کی کتاب تورات کی اور ہم نے اس کو انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے اور وہ تصدیق کرنے والی تھی اپنے سے اگلی کتاب تورات کی اور ہدایت اور نصیحت ڈرنے والوں کے لیے۔ ۴۷۔ اور چاہیے کہ انجیل والے اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا ہے۔ اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

خدا کی کتاب اس لیے آتی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی ابدی فلاح کی راہ دکھائے۔ خواہش پرستی کے اندھیرے سے نکال کر ان کو حق پرستی کی روشنی میں لائے۔ جو خدا سے ڈرنے والے ہیں وہ خدا کی کتاب کو خدا اور بندے کے درمیان مقدس عہد سمجھتے ہیں جس میں اپنی طرف سے کمی یا زیادتی جائز نہ ہو۔ وہ اس کی تعمیل اس طرح کرتے ہیں جس طرح کسی کے پاس کوئی امانت ہو اور وہ ٹھیک ٹھیک اس کی ادائیگی کرے۔ اللہ کی کتاب بندوں کے حق میں اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ضرورت ہوتی ہے کہ زندگی کے معاملات میں اسی کی ہدایت پر چلا جائے اور باہمی نزاعات میں اسی کے احکام کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ خدا کی کتاب کو اگر یہ حاکمانہ حیثیت نہ دی جائے بلکہ اپنے معاملات ونزاعات کو اپنی دنیوی مصلحتوں کے تابع رکھا جائے تو یہ خدا کی کتاب سے انکار کے ہم معنی ہوگا، خواہ تبرک کے طور پر اس کا کتنا ہی زیادہ ظاہری احترام کیا جاتا ہو۔ جو لوگ اپنے کو مسلم کہیں مگر ان کا حال یہ ہو کہ وہ اختیار اور آزادی رکھتے ہوئے بھی اپنے معاملات کا فیصلہ اللہ کی کتاب کے مطابق نہ کریں بلکہ خواہشوں کی شریعت پر چلیں، وہ اللہ کی نظر میں کافر اور ظالم اور فاسق ہیں۔ وہ خدا کی حاکمانہ حیثیت کا انکار کرنے والے ہیں، وہ حق کے تلف کرنے والے ہیں، وہ اطاعت خداوندی کے عہد سے نکل جانے والے ہیں۔ حکم شریعت کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کے بعد آدمی کی کوئی حیثیت خدا کے یہاں باقی نہیں رہتی۔

قصاص کے سلسلے میں شریعت کا تقاضا ہے کہ کسی کی حیثیت کی پروا کیے بغیر اس کا نفاذ کیا جائے۔ تاہم بعض اوقات آدمی کی جارحیت اس کی شر پسندی کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ وقتی جذبہ کے تحت صادر ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر مجروح جارح کو معاف کردے تو یہ اس کی طرف سے جارح کے لیے ایک صدقہ ہوگا اور سماج میں وسعت ظرف کی فضا پیدا کرنے کا ذریعہ۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَۃً وَّ مِنۡہَاجًا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰہِ

۴۸۔ اور ہم نے تمھاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، تصدیق کرنے والی پچھلی کتاب کی اور اس کے مضامین پر نگہبان۔ پس تم ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا۔ اور جو حق تمھارے پاس آیا ہے، اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک طریقہ ٹھہرایا۔ اور اگر خدا چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اللہ نے چاہا کہ وہ اپنے دئے ہوئے حکموں میں تمھاری آزمائش کرے۔ پس تم

مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۴۸﴾

بھلائیوں کی طرف دوڑو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تم کو آگاہ کر دے گا، اُس چیز سے جس میں تم اختلاف کر رہے تھے۔

یہاں ''کتاب'' سے مراد دین کی اصلی اور اساسی تعلیمات ہیں۔ اللہ کی یہ کتاب ایک ہی کتاب ہے اور وہی ایک کتاب، زبان اور ترتیب کے فرق کے ساتھ، تمام نبیوں کی طرف اتاری گئی ہے۔ تاہم دین کی حقیقت جس ظاہری ڈھانچہ میں متشکل ہوتی ہے اس میں مختلف انبیاء کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ نہیں کہ دین کے اتارنے میں کوئی ارتقائی ترتیب ہے۔ یعنی پہلے کم ترقی یافتہ اور غیر کامل دین اتارا گیا اور اس کے بعد زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ کامل دین اترا۔ اس فرق کی وجہ خدا کی حکمت ابتلا ہے، نہ کہ حکمت ارتقاء۔ قرآن کے مطابق ایسا صرف اس لیے ہوا کہ لوگوں کو آزمایا جائے۔ زمانہ گزرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ دین کی اندرونی حقیقت گم ہو جاتی ہے، اور ظواہر و رسوم مقدس ہو کر اصل بن جاتے ہیں۔ لوگ عبادت اس کو سمجھ لیتے ہیں کہ ایک خاص ڈھانچہ کو ظاہری شرائط کے ساتھ دہرا لیا جائے۔ اس لیے ظاہری ڈھانچہ میں بار بار تبدیلیاں کی گئیں تاکہ ڈھانچہ کی مقصودیت کا ذہن ختم ہو اور خدا کے سوا کوئی اور چیز توجہ کا مرکز نہ بننے پائے۔ اس کی ایک مثال قبلہ کی تبدیلی ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عبادت کریں۔ یہ حکم صرف رخ بندی کے لیے تھا۔ مگر دھیرے دھیرے ان کا ذہن یہ بن گیا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے ہی کا نام عبادت ہے۔ اس وقت سابقہ حکم کو بدل کر کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اب کچھ لوگ سابقہ روایت سے لپٹے رہے اور کچھ لوگوں نے خدا کی ہدایت کو پالیا۔ اس طرح تبدیلیٔ قبلہ سے یہ کھل گیا کہ کون در و دیوار کو پوجنے والا تھا اور کون خدا کو پوجنے والا (بقرہ، 2:143)۔

اب اس قسم کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ کیوں کہ ڈھانچہ کو نبی بدلتا ہے اور نبی اب آنے والا نہیں۔ تاہم جہاں تک اصل مقصود کا تعلق ہے وہ بدستور باقی ہے۔ اب بھی خدا کے یہاں اس کا سچا پرستار وہی شمار ہوگا جو ظاہری ڈھانچہ کی پابندی کے باوجود ظاہری ڈھانچہ کو مقصودیت کا درجہ نہ دے، جو ظواہر سے ذہن کو آزاد کر کے خدا کی عبادت کرے۔ پہلے یہ مقصد ظاہری ڈھانچہ کو توڑ کر حاصل ہوتا تھا اب اس کو ذہنی شکست و ریخت (deconditioning) کے ذریعہ حاصل کرنا ہوگا۔

ظواہر کے نام پر دین میں جو جھگڑے ہیں وہ صرف اس لیے ہیں کہ لوگوں کی غفلت نے ان کو اصل حقیقت سے بے خبر کر دیا ہے۔ اگر حقیقت کو وہ اس طرح پالیں جس طرح وہ آخرت میں دکھائی دے گی تو تمام جھگڑے ابھی ختم ہو جائیں۔

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ
اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ
بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾
اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ
اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

۴۹۔ اوران کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اوران کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اوران لوگوں سے بچو کہ کہیں وہ تم کو پھسلا دیں تمھارے اوپر اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے۔ پس اگر وہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ ان کو ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اور یقیناً لوگوں میں سے زیادہ آدمی نافرمان ہیں۔ ۵۰۔ کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ اور اللہ سے بہتر کس کا فیصلہ ہوسکتا ہے، ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں۔

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفے الگ الگ کتابیں نہیں ہیں۔ یہ سب ایک ہی کتابِ الٰہی کے مختلف ایڈیشن ہیں جس کو یہاں ''الکتاب'' کہا گیا ہے۔ خدا کی طرف سے جتنی کتابیں آئیں، خواہ وہ جس دور میں اور جس زبان میں آئی ہوں، سب کا مشترک مضمون ایک ہی تھا۔ تاہم پچھلی کتابوں کے حاملین بعد کے زمانہ میں ان کو ان کی اصلی صورت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس لیے خدا نے ایک کتاب مُهَيْمِنْ (قرآن) اتارا۔ یہ خدا کی طرف سے اس کی کتاب کا مستند ایڈیشن ہے اور اس بنا پر وہ ایک کسوٹی ہے جس پر جانچ کر معلوم کیا جائے کہ بقیہ کتابوں کا کون سا حصہ اصلی حالت میں ہے اور کون سا وہ ہے جو بدلا جا چکا ہے۔

یہود خدا کے سچے دین کے ساتھ اپنی باتوں کو ملا کر ایک خود ساختہ دین بنائے ہوئے تھے۔ اس خود ساختہ دین سے ان کی عقیدتیں بھی وابستہ تھیں اور ان کے مفادات بھی۔ اس لیے وہ کسی طرح تیار نہ تھے کہ اس کو چھوڑ کر پیغمبر کے لائے ہوئے بے آمیز دین کو مان لیں۔ انھوں نے حق کے آگے جھکنے کے بجائے اپنے لیے یہ طریقہ پسند کیا کہ وہ حق کے علم بردار کو اتنا زیادہ پریشان کریں کہ وہ خود ان کے آگے جھک جائے، وہ خدا کے سچے دین کو چھوڑ کر ان کے اپنے بنائے ہوئے دین کو اختیار کرلے۔ خدا اگر چاہتا تو پہلے ہی مرحلہ میں ان ظالموں کا ہاتھ روک دیتا اور وہ حق کے داعی کو ستانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ مگر اللہ نے انھیں چھوٹ دی کہ وہ اپنے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لا سکیں۔ ایسا اس لیے ہوتا کہ یہ بات پوری طرح کھل جائے کہ دین داری کے یہ دعوے دار سب سے زیادہ بے دین لوگ ہیں۔ وہ خدا کے پرستار نہیں ہیں بلکہ خود اپنی ذات کے پرستار ہیں۔ اللہ کی یہ سنت اگرچہ حق کے داعیوں کے لیے بڑا سخت امتحان ہے۔ مگر یہی وہ عمل ہے جس کے ذریعہ یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کون جنت کا مستحق ہے اور کون جہنم کا۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنا چاہتا ہے، اللہ کے حکم کا پابند بن کر رہنا اس کو گوارا نہیں ہوتا۔ حتی کہ دین خداوندی کی خود ساختہ تشریح کرکے وہ اس کو بھی اپنی خواہشوں کے سانچہ میں ڈھال لیتا ہے۔ ایسی حالت میں بے آمیز دین کو وہی لوگ قبول کریں گے جو چیزوں کو خواہش کی سطح پر نہ دیکھتے ہوں بلکہ اس سے اوپر اٹھ کر اپنی رائے قائم کرتے ہوں۔ اللہ کی بات بلا شبہ صحیح ترین بات ہے۔ مگر موجودہ آزمائشی دنیا میں ہر سچائی پر ایک شبہہ کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اس پردہ کو پھاڑ کر اس پر یقین کرے، وہ غیب کو شہود میں دیکھ لے۔ جو شخص ظاہری شبہات میں اٹک جائے وہ ناکام ہو گیا اور جو شخص ظاہری شبہات کے غبار کو پار کرکے سچائی کو پالے وہ کامیاب رہا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡیَهُوۡدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوۡلِیَآءَ ؔ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَی الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوۡنَ فِیۡهِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ نَخۡشٰۤی اَنۡ تُصِیۡبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَی اللّٰهُ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِالۡفَتۡحِ اَوۡ اَمۡرٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖ فَیُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ نٰدِمِیۡنَ ﴿ؕ۵۲﴾ وَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ ۙ اِنَّهُمۡ لَمَعَكُمۡ ؕ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَاَصۡبَحُوۡا خٰسِرِیۡنَ ﴿۵۳﴾ الثلٰثۃ

۵۱۔ اے ایمان والو، یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو شخص ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا۔ اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ ۵۲۔ تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے، وہ ان ہی کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ تو ممکن ہے کہ اللہ فتح دیدے یا اپنی طرف سے کوئی خاص بات ظاہر کرے تو یہ لوگ اس چیز پر جس کو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں نادم ہوں گے۔ ۵۳۔ اور اس وقت اہل ایمان کہیں گے کیا یہ وہی لوگ ہیں جو زور وشور سے اللہ کی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ گھاٹے میں رہے۔

عرب میں مسلمان ابھی ایک نئی طاقت کی حیثیت رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ ان کے مخالفین ان کو اکھاڑنے کی کوشش میں رات دن لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف عرب کے یہودی اور عیسائی قبائل کا یہ حال تھا کہ وہاں کے بیشتر اقتصادی وسائل پر ان کا قبضہ تھا۔ صدیوں کی تاریخ نے ان کی عظمت لوگوں کے دلوں پر بٹھا رکھی تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ ایسی طاقت کو ملک سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی جماعت میں جو کمزور لوگ تھے وہ چاہتے تھے کہ اسلام کی جدوجہد میں اس طرح شریک نہ ہوں کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دشمن بنالیں۔ تا کہ یہ کش مکش اگر مسلمانوں کی شکست پر ختم ہو تو یہود و نصاریٰ کی طرف سے انھیں کسی انتقامی کارروائی کا سامنا نہ کرنا

پڑے۔ یہ لوگ مستقبل کے موہوم خطرہ سے بچنے کے لیے اپنے کو وقت کے یقینی خطرہ میں مبتلا کر رہے تھے، اور وہ ان کی دہری وفاداری تھی۔ جو شخص بے ضرر معاملات میں حق پرست بنے اور ضرر کا اندیشہ ہو تو باطل پرستوں کا ساتھ دینے لگے، اس کا انجام خدا کے یہاں انھیں لوگوں میں ہوگا جن کا اس نے خطرہ کے مواقع پر ساتھ دیا۔

کسی کی زندگی میں وہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے جب کہ اسلام پر قائم رہنے کے لیے اس کو کسی قسم کی قربانی دینی پڑے۔ ایسے مواقع آدمی کے اسلام کی تصدیق یا تردید کرنے کے لیے آتے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی جس اسلام کا ثبوت بے خطر حالات میں دے رہا تھا اسی اسلام کا ثبوت وہ اس وقت بھی دے جب کہ جذبات کو دبا کر یا جان ومال کا خطرہ مول لے کر آدمی اپنے اسلام کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس امتحان میں پورا اترنے کے بعد ہی آدمی اس قابل بنتا ہے کہ اس کا خدا اس کو اپنے وفادار بندوں میں لکھ لے۔ ان مواقع پر استقامت کا ثبوت دینا ہی کسی آدمی کے پچھلے اعمال کو باقیمت بناتا ہے۔ اور اگر وہ ایسے مواقع پر استقامت کا ثبوت نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے پچھلے تمام اعمال کو بے قیمت کرلیا۔

دنیا کا ہر امتحان ارادہ کا امتحان ہے۔ آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ خطرات کو نظر انداز کرکے ارادہ کا ثبوت دے دے، وہ اللہ کی طرف اپنا پہلا قدم اٹھا دے۔ اس کے بعد فوراً خدا کی مدد اس کا سہارا بن جاتی ہے۔ مگر جو شخص ارادہ کا ثبوت نہ دے، جو خدا کی طرف اپنا پہلا قدم نہ اٹھائے وہ اللہ کی نظر میں ظالم ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا یک طرفہ طور پر اپنی مدد کا سہارا نہیں بھیجتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ
دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ
وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَى
الۡكٰفِرِيۡنَ يُجَاهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا
يَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَاۤئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ
يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا
وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الَّذِيۡنَ
يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ
رٰكِعُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنۡ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَ
الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فَاِنَّ حِزۡبَ اللّٰهِ هُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۵۶﴾ ع ٨/٦ ١٢

۵۴۔ اے ایمان والو، تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ وہ مومنوں کے لیے نرم اور منکروں کے اوپر سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔
۵۵۔ تمھارے دوست تو بس اللہ اور اس کا رسول اور وہ ایمان والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔
۵۶۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کو دوست بنائے تو بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔

ایمان لانے کے بعد جو شخص ایمان کے تقاضے پورے نہ کرے وہ اللہ کی نظر میں دین کو قبول کرنے کے بعد دین سے پھر گیا۔ اللہ کی نظر میں سچے ایمان والے لوگ وہ ہیں جن کے اندر ایمان اس طرح داخل ہو کہ ان کو محبت کی سطح پر اللہ سے تعلق پیدا ہو جائے، ان کو اسلامی مقاصد کی تکمیل اتنی عزیز ہو کہ جو لوگ اسلام کی راہ میں ان کے بھائی بنیں ان کے لیے ان کے دل میں نرمی اور ہمدردی کے سوا کوئی اور چیز باقی نہ رہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے اس درجہ شفیق بن جائیں کہ ان کی طاقت اور ان کی صلاحیت کبھی مسلمانوں کے مقابلہ میں استعمال نہ ہو۔ وہ دین کے معاملہ میں اتنے پختہ ہوں کہ غیر اسلامی لوگوں کے افکار و اعمال سے کوئی اثر قبول نہ کریں۔ ان کے جذبات اس درجہ اصول کے تابع ہو جائیں کہ حق کو قبول کرنے کے معاملے میں وہ پھول سے زیادہ نازک ثابت ہوں مگر ناحق کے معاملہ میں وہ پتھر سے زیادہ سخت بن جائیں۔ تاکہ کوئی بھی ان کو اپنے بے جا مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے۔

اسلامی زندگی ایک بامقصد زندگی ہے اور اسی لیے وہ جدوجہد کی زندگی ہے۔ مسلمان کا مشن یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اللہ کے تمام بندوں تک پہنچائے۔ جہنم کی طرف جاتی ہوئی دنیا کو جنت کے راستہ پر لانے کی کوشش کرے۔ اس کام میں فطری طور پر آدمی کو طرح طرح کی مشکلات اور طرح طرح کی ملامت و مخالفت کا سامنا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ دو الگ الگ گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک دنیا پرستوں کا اور دوسرا آخرت کے مسافروں کا۔ ان کے درمیان ایک مستقل کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ ان سارے مواقع پر وہ اس انسان کا ثبوت دے جو اللہ کے بھروسہ پر چل رہا ہے اور اللہ کے سوا کسی کی پروا کیے بغیر اپنا اسلامی سفر جاری رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ موت کے دروازہ میں داخل ہو کر خدا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

اس طرح کے لوگ کسی مقام پر جب قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں تو زمین کا غلبہ بھی انھیں کے لیے مقدر کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔ یعنی ان کا مرکز توجہ تمام تر اللہ بن جاتا ہے۔ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ یعنی ان کے باہمی تعلقات ایک دوسرے کی خیر خواہی پر قائم ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے آگے جھکنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی معاملات دنیا میں کوئی بھی چیز ان کو انانیت پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ وہ ہر موقع پر وہی کرتے ہیں جو اللہ چاہے۔ وہ تواضع اختیار کرنے والے ہوتے ہیں، نہ کہ سرکشی کرنے والے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ
اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى

۵۷۔ اے ایمان والو، ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور نہ منکروں کو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم ایمان والے ہو۔ ۵۸۔ اور جب تم

الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوۡهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ
قَوۡمٌ لَّا يَعۡقِلُوۡنَ ۝۵۸ قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ هَلۡ
تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ
اِلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاَنَّ اَكۡثَرَكُمۡ
فٰسِقُوۡنَ ۝۵۹ قُلۡ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ
مَثُوۡبَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ
عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ وَعَبَدَ
الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنۡ
سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ۝۶۰

نماز کے لیے پکارتے ہوتو وہ لوگ اس کو مذاق اور کھیل بنالیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔ ۵۹۔ کہو کہ اے اہلِ کتاب، تم ہم سے صرف اس لیے ضد رکھتے ہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ہم سے پہلے اترا۔ اور تم میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔ ۶۰۔ کہو کیا میں تم کو بتاؤں وہ جو اللہ کے یہاں انجام کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ وہ جس پر خدا نے لعنت کی اور جس پر اس کا غضب ہوا۔ اور جن میں سے بندر اور سور بنادئے اور انھوں نے شیطان کی پرستش کی۔ ایسے لوگ مقام کے اعتبار سے بدتر اور راہِ راست سے بہت دور ہیں۔

وہ لوگ جو خود ساختہ دین کی بنیاد پر خدا پرستی کے اجارہ دار بنے ہوئے ہوں ان کے درمیان جب سچے اور بے آمیز دین کی دعوت اٹھتی ہے تو اس کے خلاف وہ اتنی شدید نفرت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اپنی معقولیت تک کھو بیٹھتے ہیں۔ حتی کہ ایسی چیزیں جو بلا اختلاف قابل احترام ہیں ان کا بھی مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ یہی مدینہ کے یہود کا حال تھا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کی اذان کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں رکتے تھے۔ جو لوگ اتنے بے حس اور اتنے غیر سنجیدہ ہوجائیں ان سے ایک مسلمان کا تعلق دعوت کا تو ہوسکتا ہے مگر دوستی کا نہیں ہوسکتا۔

ان لوگوں کی خدا سے بے خوفی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ سچے مسلمانوں کو مجرم سمجھتے ہیں اور اپنے تمام جرائم کے باوجود اپنے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا معاملہ خدا کے یہاں بالکل درست ہے۔ جب وہ اپنی اس کیفیت کی اصلاح نہیں کرتے تو بالآخر ان کی بے حسی ان کو اس نوبت تک پہنچاتی ہے کہ ان کی عقل حق و باطل کے معاملہ میں کند ہوجاتی ہے۔ وہ شکل کے اعتبار سے انسان مگر باطن کے اعتبار سے بدترین جانور بن جاتے ہیں۔

وہ لطیف احساسات جو آدمی کے اندر خدا کے چوکی دار کی طرح کام کرتے ہیں، جو اس کو برائیوں سے روکتے ہیں وہ ان کے اندر ختم ہوجاتے ہیں۔ مثلاً حیاء، شرافت، وسعت ظرف، پاکیزہ طریقوں کو پسند کرنا، وغیرہ۔ اس گراوٹ کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی شیطانی راستوں پر چل پڑے۔ جب کوئی گروہ اس نوبت کو پہنچتا ہے تو وہ لعنت کا مستحق بن جاتا ہے، وہ خدا کی رحمت سے آخری حد تک دور ہوجاتا ہے۔ اس کی انسانیت مسخ ہوجاتی ہے وہ فطرت کے سیدھے راستہ سے بھٹک کر جانوروں کی طرح جینے لگتا ہے۔

انسان کو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے سے جو چیز روکتی ہے، وہ عقل ہے۔ مگر جب آدمی پر ضد اور عداوت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی عقل اس کی خواہش کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ اب وہ ظاہر میں انسان مگر باطن میں حیوان ہوتا ہے۔ حتی کہ صاحب بصیرت آدمی اس کو دیکھ کر جان لیتا ہے کہ اس کے ظاہری انسانی ڈھانچہ کے اندر کون سا حیوان چھپا ہوا ہے۔

وَاِذَا جَآءُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوۡا بِالۡكُفۡرِ
وَهُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِهٖ‌ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا كَانُوۡا
يَكۡتُمُوۡنَ ۝٦١ وَتَرٰى كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ يُسَارِعُوۡنَ فِى
الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ‌ ؕ لَبِئۡسَ مَا
كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝٦٢ لَوۡلَا يَنۡهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَ
الۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ‌ ؕ
لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ ۝٦٣

٦١۔ اور جب وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالاں کہ وہ منکر آئے تھے اور منکر ہی چلے گئے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جسے وہ چھپا رہے ہیں۔ ٦٢۔ اور تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ گناہ اور ظلم اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں۔ کیسے برے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ ٦٣۔ ان کے مشائخ اور علماء ان کو کیوں نہیں روکتے گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے۔ کیسے برے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔

مدینہ کے یہودیوں میں کچھ لوگ تھے جو اسلام سے ذہنی طور پر مرعوب تھے۔ نیز اسلام کا بڑھتا ہوا غلبہ دیکھ کر کھلم کھلا اس کا حریف بننا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ اندر سے اپنے آبائی دین پر جمے ہوئے تھے مگر الفاظ بول کر ظاہر کرتے تھے کہ وہ بھی مومن ہیں۔ ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ اصل معاملہ کسی انسان سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اور خدا وہ ہے جو دلوں تک کا حال جانتا ہے۔ وہ کسی سے جو معاملہ کرے گا حقیقت کے اعتبار سے کرے گا، نہ کہ ان الفاظ کی بنا پر جو اس نے مصلحت کے طور پر اپنے منھ سے نکالا تھا۔

یہود کے خواص میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک ربّی جن کو مشائخ کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے احبار جو اُن کے علماء اور فقہا کی مانند تھے۔ دونوں قسم کے لوگ اگرچہ دین ہی کو اپنا صبح وشام کا مشغلہ بنائے ہوئے تھے۔ دین کے نام پر ان کی قیادت قائم تھی۔ اور دین ہی کے نام پر ان کو بڑی بڑی رقمیں ملتی تھی۔ مگر ان کی قیادت ومقبولیت کا راز عوام پسند دین کی نمائندگی تھی، نہ کہ خدا پسند دین کی نمائندگی۔ ان کا بولنا اور ان کا چلنا بظاہر دین کے لیے تھا۔ مگر حقیقۃً وہ ایک قسم کی دنیاداری تھی جو دین کے نام پر جاری تھی۔ وہ دین کے نام پر لوگوں کو وہی چیز دے رہے تھے جس کو وہ دین کے بغیر اپنے لیے پسند کیے ہوئے تھے۔

خدا کا پسندیدہ دین تقویٰ کا دین ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ اس کی زبان گناہ کے کلمات نہ بولے، وہ اپنی سرگرمیوں میں حرام طریقوں سے پوری طرح بچتا ہو۔ جن لوگوں سے اس کا

معاملہ پیش آئے ان کے ساتھ وہ انصاف کرنے والا ہو، نہ کہ ظلم کرنے والا۔ مگر آدمی کا نفس ہمیشہ اس کو دنیا پرستی کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ وہ ایسی زندگی گزارنا چاہتا ہے جس میں اس کو صحیح اور غلط نہ دیکھنا ہو بلکہ صرف اپنے فائدوں اور مصلحتوں کو دیکھنا ہو۔ یہود کے عوام اسی حالت پر تھے۔ اب ان کے خواص کا کام یہ تھا کہ وہ ان کو اس سے روکتے۔ مگر انھوں نے عوام سے ایک خاموش مفاہمت کرلی۔ وہ عوام کے درمیان ایسا دین تقسیم کرنے لگے جس میں اپنی حقیقی زندگی کو بدلے بغیر نجات کی ضمانت ہو اور بڑے بڑے درجات طے ہوتے ہوں۔ یہ خواص اپنے عوام کی حقیقی زندگیوں کو نہ چھیڑتے البتہ ان کو ملت یہود کی فضیلت کے جھوٹے قصے سناتے۔ ان کے قومی ہنگاموں کو دین کے رنگ میں بیان کرتے۔ رسمی قسم کے اعمال دہرا دینے پر یہ بشارت دیتے کہ ان کے ذریعہ سے ان کے لیے جنت کے محل تعمیر ہو رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت برا کام ہے کہ لوگوں کے درمیان ایسا دین تقسیم کیا جائے جس میں حقیقی عملی زندگی کو بدلنا نہ ہو، البتہ کچھ نمائشی چیزوں کا اہتمام کرکے جنت کی ضمانت مل جائے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾

۶۴۔ اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ انھیں کے ہاتھ بندھ جائیں اور لعنت ہو ان کو اس کہنے پر۔ بلکہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ اور تمھارے اوپر تمھارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ اترا ہے، وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور انکار کو بڑھا رہا ہے۔ اور ہم نے ان کے درمیان دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔ جب کبھی وہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اس کو بجھا دیتا ہے۔ اور وہ زمین میں فساد پھیلانے میں سرگرم ہیں۔ حالاں کہ اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن میں جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ اللہ کو قرض حسن دو تو یہود نے اس کو مذاق کا موضوع بنالیا۔ وہ کہتے کہ اللہ فقیر ہے اور اس کے بندے امیر ہیں۔ اللہ کے ہاتھ آج کل تنگ ہو رہے ہیں۔ ان کی اس قسم کی باتوں کا رخ خدا کی طرف نہیں بلکہ رسول اور قرآن کی طرف ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خدا اس سے برتر ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی ہو۔ اس طرح کی باتیں وہ دراصل یہ ظاہر کرنے کے لیے کہتے تھے کہ یہ رسول سچا رسول نہیں۔ اور قرآن خدا کی کتاب نہیں۔ اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہوتا تو (نعوذ باللہ) ایسی

مضحکہ خیز باتیں اس میں نہ ہوتیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کی باتیں کریں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ حقیقی دینی جذبہ سے خالی ہیں، وہ بے حسی کی سطح پر جی رہے ہیں۔

موجودہ امتحانی دنیا میں انسان کو عمل کی آزادی ہے۔ یہاں ایک شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ''قرآن خدا کی کتاب ہے''۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہنا چاہے کہ ''قرآن ایک بناوٹی کتاب ہے'' تو اس کو بھی اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ مل جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آدمی ایک واقعہ سے ہدایت پکڑ سکتا ہے اور اسی واقعہ سے دوسرا آدمی سرکشی کی غذا بھی لے سکتا ہے۔

یہود نے جب قرآن کی ہدایت کو ماننے سے انکار کیا تو وہ سادہ معنوں میں محض انکار نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے ان کا یہ زعم شامل تھا کہ ہم تو نجات یافتہ لوگ ہیں، ہمیں کسی اور ہدایت کو ماننے کی کیا ضرورت۔ جو لوگ اس قسم کی پُر فخر نفسیات میں مبتلا ہوں ان کے اندر شدید ترین قسم کی انانیت جنم لیتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں جب ان کا معاملہ دوسروں سے پڑتا ہے تو وہاں بھی وہ اپنی ''میں'' کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ آپس کے اختلاف اور عناد کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

پیغمبر کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ انسان بھی اسی اطاعت خداوندی کے دین کو اپنا لے جس کو کائنات کی تمام چیزیں اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی زمین کی اصلاح ہے۔ اب جو لوگ پیغمبرانہ دعوت کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں وہ خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ تاہم انسان کو بس اتنی ہی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے اندر کے فساد کو باہر لائے، دوسروں کی قسمت کا مالک بننے کی آزادی کسی کو نہیں۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾ ع

ع ۹ / ۱۳

۶۵۔ اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور اللہ سے ڈرتے تو ہم ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے۔ ۶۶۔ اور اگر وہ تورات اور انجیل کی پابندی کرتے اور اس کی جو ان پر ان کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے تو وہ کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے۔ کچھ لوگ ان میں سیدھی راہ پر ہیں۔ لیکن زیادہ ان میں ایسے ہیں جو بہت برا کر رہے ہیں۔

تمام گمراہیوں کا اصل سبب آدمی کا ڈھیٹ ہو جانا ہے۔ اگر آدمی اللہ سے ڈرے تو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگ سکتی کہ کون سی بات خدا کی طرف سے آئی ہوئی بات ہے۔ ڈر کی نفسیات اس کے اندر سے دوسرے تمام محرکات کو حذف کر دے گی اور آدمی خدا کی بات کو فوراً پہچان کر اس کو مان لے گا۔ جب آدمی

اس حد تک اپنے آپ کو خدا کی طرف متوجہ کردے تو اس کے بعد وہ بھی خدا کی توجہ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ خدا اس کی بشری کمزوریوں کو اس سے دھو دیتا ہے اور مرنے کے بعد اس کو جنت کے نعمت بھرے باغوں میں جگہ دیتا ہے۔ آدمی کی برائیاں، بالفاظ دیگر اس کی نفسیاتی کمزوریاں، وہ چیزیں ہیں جو اس کو جنت کے راستہ پر بڑھنے نہیں دیتیں۔ خدا کی توفیق سے جو شخص اپنی نفسیاتی کمزوریوں پر قابو پالیتا ہے وہی جنت کی منزل تک پہنچتا ہے۔

جب بھی حق کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ لوگ اس سے متوحش ہو جاتے ہیں جو سابقہ نظام کے تحت سرداری کا مقام حاصل کیے ہوئے ہوں۔ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کو قبول کرتے ہی ان کے معاشی مفادات اور ان کی قائدانہ عظمتیں ختم ہو جائیں گی۔ مگر یہ صرف تنگ نظری ہے۔ ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ جس چیز کو وہ توحش کی نظر سے دیکھ رہے ہیں وہ صرف ان کی اہلیت کو جانچنے کے لیے ظاہر ہوئی ہے۔ آئندہ وہ خدا کے انعامات کے مستحق ہوں یا نہ ہوں اس کا فیصلہ ان کی اپنی تحفظاتی تدبیروں پر نہیں ہوگا بلکہ اس پر ہوگا کہ دعوت حق کے ساتھ وہ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ گویا دعوت حق کے انکار کے ذریعہ وہ اپنی جس بڑائی کو بچانا چاہتے ہیں وہی انکار وہ چیز ہے جو خدا کے نزدیک ان کے استحقاق کو ختم کر رہا ہے۔

آسمانی کتاب کی حامل قوموں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اصل خدائی تعلیمات میں افراط یا تفریط (بڑھا کر یا گھٹا کر) کر کے وہ ایک خود ساختہ دین بنا لیتے ہیں اور لمبی مدت گزرنے کے بعد اس کے افراد اس سے اس قدر مانوس ہو جاتے ہیں کہ اسی کو اصل خدائی مذہب سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب خدا کا سیدھا اور سچا دین ان کے سامنے آتا ہے تو وہ اس کو اپنے لیے غیر مانوس پا کر متوحش ہوتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کا یہی حال تھا۔ چنانچہ ان کی بہت بڑی اکثریت اسلام کی صداقت کو پانے سے قاصر رہی۔ صرف چند لوگ (مثلاً نجاشی شاہ حبش، عبداللہ بن سلام، وغیرہ) جو اعتدال کی راہ پر باقی تھے، انھیں اسلام کی صداقت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ انھوں نے بڑھ کر اسلام کو اس طرح اپنا لیا جیسے وہ پہلے سے اسی راستہ پر چل رہے ہوں اور اپنے سفر کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گئے ہوں۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اے پیغمبر، جو کچھ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دیتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں آئے تو ایسا نہ تھا کہ وہاں دین کا نام لینے والا کوئی نہ ہو۔ بلکہ ان کا

سارا معاشرہ دین ہی کے نام پر قائم تھا۔ دین کے نام پر بہت سے لوگ پیشوائی اور قیادت کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے۔ دین کے نام پر لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں۔ دینی مناصب کا حامل ہونا معاشرہ میں عزت اور فخر کی علامت بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود آپ کو عرب کے لوگوں کی طرف سے سخت ترین مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دین خداوندی کے نام پر ان کے یہاں ایک خودساختہ دین رائج ہو گیا تھا۔ صدیوں کی روایات کے نتیجہ میں اس دین کے نام پر گدّیاں بن گئی تھیں اور مفادات کی بہت سی صورتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ایسے ماحول میں جب پیغمبر اسلام نے بے آمیز دین کی دعوت پیش کی تو لوگوں کو نظر آیا کہ وہ ان کی دینی حیثیت کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے۔ ان کو اندیشہ ہوا کہ اگر یہ دین پھیلا تو ان کا وہ مذہبی ڈھانچہ ڈھ جائے گا جس میں ان کو بڑائی کا مقام ملا ہوا ہے۔

یہ صورت حال داعی کے لیے بہت سخت ہوتی ہے۔ اپنے دعوتی کام کو کھلے طور پر انجام دینا وقت کی مذہبی طاقتوں سے لڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اس کو دکھائی دیتا ہے کہ اگر میں کسی مصالحت کے بغیر سچے دین کی تبلیغ کروں تو مجھ کو سخت ترین ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرا مذاق اڑایا جائے گا۔ مجھ کو بے عزت کیا جائے گا۔ میری معاشیات تباہ کی جائیں گی۔ میرے خلاف جارحانہ کارروائیاں ہوں گی۔ میں اعوان وانصار سے محروم ہو جاؤں گا۔

اب اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں دنیوی مصلحتوں کے سِرے ہاتھ سے چھوٹتے ہیں۔ اور اگر دنیوی مصلحتوں کا لحاظ کیا جائے تو دعوتی عمل کی پوری انجام دہی ناممکن نظر آتی ہے۔ یہاں خدا کا وعدہ داعی کو یکسو کرتا ہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ داعی اگر اپنے آپ کو خدا کے پیغام کی پیغام رسانی میں لگا دے تو لوگوں کی طرف سے ڈالی جانے والی مشکلات میں خدا اس کے لیے کافی ہو جائے گا۔ داعی کو چاہیے کہ وہ صرف دعوت کے تقاضوں کی تکمیل میں لگ جائے اور مدعو قوم کی طرف سے ڈالے جانے والے مصائب میں وہ خدا پر بھروسہ کرے۔

مخاطبین کا ردعمل ایک فطری چیز ہے اور داعی کو بہرحال اس سے سابقہ پیش آتا ہے۔ مگر اس کا اثر اسی دائرہ تک محدود رہتا ہے جتنا خدا کے قانونِ آزمائش کا تقاضا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ مخالفین اس حد تک قابو یافتہ ہو جائیں کہ وہ دعوتی مہم کو روک دیں یا اس کو تکمیل تک پہنچنے نہ دیں۔ ایک سچی دعوت کا اپنے دعوتی نشانہ تک پہنچنا ایک خدائی منصوبہ ہوتا ہے اس لیے وہ لازماً پورا ہو کر رہتا ہے۔ اس کے بعد مدعو گروہ کا ماننا اس کی اپنی ذمہ داری ہے جو اسی کے بقدر نتیجہ خیز ہوتی ہے جتنا مدعو خود چاہتا ہو۔

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰى شَیۡءٍ حَتّٰى تُقِیۡمُوا التَّوۡرٰىةَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ

۶۸۔ کہہ دو، اے اہل کتاب تم کسی چیز پر نہیں جب تک تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور اس کو جو تمھارے اوپر اترا ہے تمھارے رب کی طرف

اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ وَلَيَزِيۡدَنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا ۚ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۶۸﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالصّٰبِـُٔوۡنَ وَالنَّصٰرٰى مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۹﴾

سے۔ اور جو کچھ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے، وہ یقیناً ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو بڑھائے گا۔ پس تم انکار کرنے والوں کے اوپر افسوس نہ کرو۔ ۶۹۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور صابی اور نصرانی، جو شخص بھی ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لیے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یہود کا یہ حال تھا کہ ان کے افراد عملاً خدا کے دین پر قائم نہ تھے۔ انھوں نے اپنے نفس کو اور اپنی زندگی کے معاملات کو خدا کے تابع نہیں کیا تھا۔ البتہ خوش گمانیوں کے تحت انھوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ خدا کے یہاں ان کی نجات یقینی ہے۔ وہ اپنی قومی فضیلت کے افسانوں اور اپنے بزرگوں کے تقدس کی داستانوں میں جی رہے تھے مگر اللہ کے یہاں اس قسم کی خوش خیالیوں کی کوئی قیمت نہیں۔ اللہ کے یہاں جو کچھ قیمت ہے وہ صرف اس بات کی ہے کہ آدمی اللہ کے احکام کا پابند بنے اور اپنی حقیقی زندگی کو خدا کے دین پر قائم کرے۔

جو لوگ جھوٹی آرزوؤں میں جی رہے ہوں ان کے سامنے جب یہ دعوت آتی ہے کہ اللہ کے یہاں عمل کی قیمت ہے، نہ کہ آرزوؤں اور تمناؤں کی تو ایسی دعوت کے خلاف وہ شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسی دعوت میں ان کو اپنی خوش خیالیوں کا محل گرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال ان کے لیے آزمائش بن جاتی ہے۔ وہ ایسی دعوت کے سخت مخالف ہو جاتے ہیں۔ نمائشی خدا پرستی کے اندر چھپی ہوئی ان کی خود پرستی بے پردہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ جس دعوت سے ان کو ربانی غذا لینا چاہیے تھا اس سے وہ صرف انکار اور سرکشی کی غذا لینے لگتے ہیں۔

قدیم زمانہ میں جو پیغمبر آئے ان کے ماننے والوں کی نسلیں دھیرے دھیرے مستقل قوم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اب پیغمبروں کے نمونہ پر عمل تو باقی نہیں رہتا۔ البتہ اپنی عظمت وفضیلت کے قصیدے قصے کہانیوں کی صورت میں خوب پھیل جاتے ہیں۔ ہر گروہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم سب سے افضل ہیں۔ ہماری نجات یقینی ہے۔ اللہ کے یہاں ہمارا درجہ سب سے بڑا ہوا ہے۔ مگر اس قسم کے گروہی مذاہب کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ اللہ کے یہاں ہر شخص کا مقدمہ انفرادی حیثیت میں پیش ہوگا اور اس کے مستقبل کی بابت جو کچھ فیصلہ ہوگا وہ تمام تر اس کے اپنے عمل کی بنیاد پر ہوگا، نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

خدا کی کتاب کو قائم کرنا نام ہے — اللہ پر یقین کرنے کا، آخرت کی پکڑ کے اندیشہ کو اپنے اوپر طاری کرنے کا اور انسانوں کے درمیان صالح کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کا۔ یہی اصل دین ہے اور فرد کو یہی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ آسمانی کتاب کی حامل قوم کی قیمت دنیا میں اسی وقت ہے جب کہ اس کے افراد

اِس دینِ خداوندی پر قائم ہوں۔ اس سے ہٹنے کے بعد وہ خدا کی نظر میں بالکل بے قیمت ہوجاتے ہیں، حتی کہ کھلے ہوئے کافروں اور مشرکوں سے بھی زیادہ بے قیمت۔

لَقَدۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ ۢ بِمَا لَا تَهۡوٰٓى اَنۡفُسُهُمۡ ۙ فَرِيۡقًا كَذَّبُوۡا وَ فَرِيۡقًا يَّقۡتُلُوۡنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوۡۤا اَلَّا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ فَعَمُوۡا وَصَمُّوۡا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ثُمَّ عَمُوۡا وَصَمُّوۡا كَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۰۔ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے۔ جب کوئی رسول ان کے پاس ایسی بات لے کر آیا جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا تو بعضوں کو انھوں نے جھٹلایا اور بعضوں کو قتل کردیا۔ ۷۱۔ اور خیال کیا کہ کچھ خرابی نہ ہوگی۔ پس وہ اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے ان پر توجہ کی۔ پھر ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے بن گئے۔ اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کررہے ہیں۔

یہود سے اللہ نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ ایمان واطاعت کا عہد لیا تھا۔ وہ کچھ دن اس پر قائم رہے۔ اس کے بعد ان میں بگاڑ شروع ہوگیا۔ اب اللہ نے ان کے درمیان اپنے مصلحین اٹھائے جو ان کو اپنے عہد کی یاد دہانی کریں۔ مگر یہود کی بے راہی اور سرکشی بڑھتی ہی چلی گئی۔ انھوں نے خود نصیحت کرنے والوں کی زبان بند کرنے کی کوشش کی۔ حتی کہ کتنے لوگوں کو قتل کردیا۔ جب ان کی سرکشی حد کو پہنچ گئی تو اللہ نے بابل ونینویٰ (عراق) کے بادشاہ بنوخذ نصر کو ان کے اوپر مسلط کردیا جس نے 586 ق م میں یروشلم پر حملہ کرکے اس کو ڈھا دیا۔ اور یہودیوں کو گرفتار کرکے اپنے ملک لے گیا تاکہ ان سے بیگار لے۔ اس واقعہ کے بعد یہود کے دل نرم ہوئے۔ انھوں نے اللہ سے معافی مانگی۔ اب اللہ نے سائرس (شاہ ایران) کے ذریعہ ان کی مدد کی۔ سائرس نے 539 ق م میں کلدانیوں کے اوپر حملہ کیا اور ان کو شکست دے کر ان کے ملک پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اس نے یہود کو جلاوطنی سے نجات دلاکر ان کو ان کے وطن جانے اور وہاں دوبارہ بسنے کی اجازت دے دی۔

اب یہود کو نئی زندگی ملی اور ان کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہ دوبارہ غفلت اور سرکشی میں مبتلا ہوئے۔ اب پھر نبیوں اور مصلحین کے ذریعہ اللہ نے ان کو متنبہ کیا۔ مگر وہ ہوش میں نہ آئے، یہاں تک کہ انھوں نے حضرت یحیٰی کو قتل کردیا اور (اپنی حد تک) حضرت مسیح کو بھی۔ اب اللہ کا غضب ان پر بھڑکا اور 70 عیسوی میں رومی شہنشاہ ٹائٹس کو ان پر مسلط کردیا گیا۔ جس نے ان کے ملک پر حملہ کرکے ان کو ویران کردیا۔ اس کے بعد یہود کبھی اپنی ذاتی بنیادوں پر کھڑے نہ ہوسکے۔

آسمانی کتاب کی حامل قوموں کی نفسیات بعد کے زمانہ میں یہ بن جاتی ہے کہ وہ خدا کے خاص لوگ ہیں۔

وہ جو کچھ بھی کریں اس پر ان کی پکڑ نہیں ہوگی۔ خدا کی تعلیمات میں اس عقیدہ کے خلاف کھلے کھلے بیانات ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان کے بارے میں اندھے بہرے بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے گرد خود ساختہ عقیدوں اور فرضی قصے کہانیوں کا ایسا ہالہ بنا لیتے ہیں کہ خدا کی تنبیہات ان کو دکھائی اور سنائی نہیں دیتیں۔ یہود کی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی ایک حاملِ کتاب قوم کو اس کے ''دشمنوں کے قبضہ'' میں دے دیا جائے تو یہ اس کے لیے خدا کی طرف سے آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہلکی سزا دے کر قوم کو جگایا جائے۔ اگر اس کے نتیجہ میں قوم کے افراد میں خدا پرست جذبات جاگ اٹھیں تو اس کے اوپر سے سزا اٹھا لی جاتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو خدا اس کو رد کر کے پھینک دیتا ہے اور پھر کبھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ
ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ
بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ
النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝٧٢ لَقَدْ كَفَرَ
الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ
اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا
يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝٧٣ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ
وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٧٤ مَا
الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا
يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ
ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝٧٥ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ

۷۲۔ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا کہ
خدا تو ہی مسیح ابن مریم ہے۔ حالاں کہ مسیح نے کہا
تھا کہ اے بنی اسرائیل، اللہ کی عبادت کرو جو میرا
رب ہے اور تمھارا رب بھی۔ جو شخص اللہ کا شریک
ٹھہرائے گا تو اللہ نے حرام کی اس پر جنت اور اس
کا ٹھکانا آگ ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار
نہیں۔ ۷۳۔ یقینا ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں
نے کہا کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے۔ حالاں کہ کوئی
معبود نہیں بجز ایک معبود کے۔ اور اگر وہ باز نہ
آئے اس سے جو وہ کہتے ہیں تو ان میں سے کفر پر
قائم رہنے والوں کو ایک دردناک عذاب پکڑے
گا۔ ۷۴۔ یہ لوگ اللہ کے آگے توبہ کیوں نہیں
کرتے اور اس سے معافی کیوں نہیں چاہتے۔ اور
اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۷۵۔ مسیح ابن مریم تو
صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت
سے رسول گزر چکے ہیں۔ اور ان کی ماں ایک
راست باز خاتون تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے
تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے دلیلیں
بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھو وہ کدھر الٹے چلے

دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمۡلِکُ لَکُمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا ؕ وَ اللّٰہُ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۷۶﴾

جا رہے ہیں۔ ۷۶۔ کہو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمھارے نقصان کا اختیار رکھتی ہے اور نہ نفع کا۔ اور سننے والا اور جاننے والا صرف اللہ ہی ہے۔

حضرت مسیح کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی معجزے دیے۔ یہ معجزے اس لیے تھے کہ لوگ آپ کے پیغمبر ہونے کو پہچانیں اور آپ پر ایمان لائیں۔ مگر معاملہ برعکس ہوا۔ عیسائیوں نے آپ کے معجزات کو دیکھ کر یہ عقیدہ قائم کیا کہ آپ خدا ہیں۔ آپ کے اندر خدا حلول کیے ہوئے ہے۔ یہود نے یہ کہہ کر آپ کو نظر انداز کر دیا کہ یہ ایک شعبدہ باز اور جادوگر ہیں۔ حضرت مسیح اللہ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لیے آئے تھے۔ مگر ایک گروہ نے آپ سے شرک کی غذا لی اور دوسرے گروہ نے انکار کی۔

معبود وہی ہو سکتا ہے جو خود بے احتیاج ہو اور دوسرے کو نفع نقصان پہنچانے کی قدرت رکھے۔ کھانا آدمی کے محتاج ہونے کی آخری علامت ہے۔ جو کھانے کا محتاج ہے وہ ہر چیز کا محتاج ہے۔ جو شخص کھانا کھاتا ہو وہ مکمل طور پر ایک محتاج ہستی ہے۔ ایسی ہستی خدا کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہی معاملہ نفع نقصان کا ہے۔ کسی کو نفع ملنا یا کسی کو نقصان پہنچنا ایسے واقعات ہیں جن کے ظہور میں آنے کے لیے پوری کائنات کی مساعدت درکار ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص اس قسم کے کائناتی اسباب فراہم کرنے پر قادر نہیں۔ اس لیے انسانوں میں سے کسی انسان کا یہ درجہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کو معبود فرض کر لیا جائے۔

جب بھی آدمی خدا کے سوا کسی اور کو اپنی عقیدت و محبت کا مرکز بناتا ہے تو اس کے پیچھے یہ چھپا ہوا جذبہ ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی دنیا میں کوئی بڑا درجہ حاصل ہے۔ وہ خدا کے یہاں اس کا مددگار بن سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی تمام امیدیں محض جھوٹی امیدیں ہیں۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں خدا کے سوا دوسری چیزوں کا بے بس ہونا کھلا ہوا نہیں ہے۔ اس لیے یہاں آدمی غلط فہمی میں پڑا ہوا ہے۔ مگر آخرت میں جب تمام حقائق کھول دیے جائیں گے تو آدمی دیکھے گا کہ خدا کے سوا جن سہاروں پر وہ بھروسہ کیے ہوئے تھا وہ کس قدر بے قیمت تھے۔

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوۡۤا اَہۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا وَّ ضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ ﴿٪۷۷﴾

ع ۹ ۱۴

۷۷۔ کہو، اے اہل کتاب، اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے خیالات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا۔ اور وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔

حضرت مسیح کے ابتدائی شاگردوں کے نزدیک مسیح ''ایک انسان تھا جو خدا کی طرف سے تھا''۔ وہ آپ کو انسان اور اللہ کا رسول سمجھتے تھے۔ مگر آپ کا دین جب شام کے علاقہ سے باہر نکلا تو اس کو مصر و یونان کے فلسفہ سے سابقہ پیش آیا۔ مسیحیت قبول کر کے ایسے لوگ مسیحیت میں داخل ہوئے جو وقت کے فلسفیانہ افکار سے متاثر تھے۔ اس طرح اندرونی اسباب اور بیرونی محرکات کے تحت مسیحیت میں ایک نیا دور شروع ہوا جب کہ مسیحیت کو وقت کے غالب فلسفیانہ اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔

اس زمانہ کی مہذب دنیا میں مصر و یونان کے فلسفیوں کا زور تھا۔ وقت کے ذہین لوگ عام طور پر انھیں کے افکار کی روشنی میں سوچتے تھے۔ یونانی فلاسفہ نے اپنے قیاسات کے ذریعہ عالم کی ایک خیالی تصویر بنا رکھی تھی۔ وہ حقیقت کی تعبیر تین اقنوموں (hypostasis) کی صورت میں کرتے تھے — وجود، حیات اور علم۔ مسیحی علماء جو خود بھی ان افکار سے مرعوب تھے، نیز وقت کے ذہین طبقہ کو مسیحیت کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے مذہب کو وقت کے غالب فکر پر ڈھالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسیحیت کی ایسی تعبیر کی جس میں خدا کا دین بھی اسی ''تین'' کے جامہ میں ڈھل جائے اور لوگ اس کو اپنے ذہن کے مطابق پا کر اس کو قبول کر لیں۔ انھوں نے کہا کہ مذہبی حقیقت بھی ایک تثلیث کی صورت گری ہے۔ اقنومِ وجود باپ ہے۔ اقنومِ حیات بیٹا ہے اور اقنومِ علم روح القدس ہے۔ اس کلامی مذہب کو مکمل کرنے کے لیے اور بہت سے خیالات اس میں داخل کیے گئے۔ مثلاً یہ کہ حضرت مسیح ''کلام'' کا جسدی ظہور ہیں۔ ہبوطِ آدم کے بعد ہر انسان گنہ گار ہو چکا ہے۔ اور انسان کی نجات کے لیے خدا کے بیٹے کو مصلوب ہو کر اس کا کفارہ دینا پڑا، وغیرہ۔ اس طرح چوتھی صدی عیسوی میں مصری، یونانی اور رومی تخیلات میں ڈھل کر وہ چیز تیار ہوئی جس کو موجودہ مسیحیت کہا جاتا ہے۔

خدا کی سواء السبیل سے بھٹکنے کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ لوگ گم راہ قوموں کے خیالات سے مرعوب ہو کر دین کو ان کے خیالات کے سانچہ میں ڈھالنے لگتے ہیں۔ خدا کے دین کو مانتے ہوئے اس کی تعبیر اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ وہ غالب افکار کے مطابق نظر آنے لگے۔ وہ خدا کے دین کے نام پر غیر خدا کے دین کو اپنا لیتے ہیں۔ نصاریٰ نے اپنے دین کو اپنے زمانہ کی مشرک قوموں کے افکار میں ڈھال لیا اور اسی کو خدا کا مقبول دین کہنے لگے۔ یہی چیز کبھی اس طرح پیش آتی ہے کہ دین کو خود اپنے قومی عزائم کے سانچہ میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ اس دوسری تحریف کی مثال یہود ہیں۔ انھوں نے خدا کے دین کی ایسی تعبیر کی کہ وہ ان کی دنیوی زندگی کی تصدیق کرنے والا بن جائے۔ مسلمانوں کے لیے کتابِ الٰہی کے متن میں اس قسم کی تعبیرات داخل کرنے کا موقع نہیں ہے۔ تاہم متن کے باہر انھیں وہ سب کچھ کرنے کی آزادی ہے جو پچھلی قوموں نے کیا۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا

۷۸۔ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، ان پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد

عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٧٨﴾ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ
عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾
تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ
لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَ لَوْ
كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ
مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ
فٰسِقُوْنَ ﴿٨١﴾

سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ ۷۹۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔ ۸۰۔ تم ان میں بہت آدمی دیکھو گے کہ کفر کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ کیسی بری چیز ہے جو انھوں نے اپنے لیے آگے بھیجی ہے کہ خدا کا غضب ہوا ان پر اور وہ ہمیشہ عذاب میں پڑے رہیں گے۔ ۸۱۔ اگر وہ ایمان رکھنے والے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور اس پر جو اس کی طرف اترا تو وہ منکروں کو دوست نہ بناتے۔ مگر ان میں اکثر نافرمان ہیں۔

ایمان آدمی کو ظلم اور برائی کے بارے میں حسّاس بنا دیتا ہے۔ وہ کسی کو ظلم اور برائی کرتے دیکھتا ہے تو تڑپ اٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ فوراً اسے روک دے۔ برے لوگوں سے اس کا تعلق جدائی کا ہوتا ہے، نہ کہ دوستی کا۔ مگر جب ایمانی جذبہ کمزور پڑ جائے تو آدمی صرف اپنی ذات کے بارے میں حساس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اس کو صرف وہ برائی برائی معلوم ہوتی ہے جس کی زد اس کے اپنے اوپر پڑے۔ جس برائی کا رخ دوسروں کی طرف ہو اس کے بارے میں وہ غیر جانب دار ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل جو اس زوال کا شکار ہوئے اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ انھوں نے اپنی زبان سے اچھی بات بولنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے خواص اب بھی خوبصورت تقریریں کرتے تھے مگر اس معاملہ میں وہ اتنے سنجیدہ نہ تھے کہ جب کسی کو ظلم اور برائی کرتے دیکھیں تو وہاں کود پڑیں اور اس کو روکنے کی کوشش کریں۔ حضرت داؤد اپنے زمانے کے یہود کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان میں کوئی نیکوکار نہیں، ایک بھی نہیں (زبور، 14:3)۔ مگر اسی کے ساتھ آپ کے کلام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہود اپنے ہمسایوں سے صلح کی باتیں کرتے تھے جب کہ ان کے دلوں میں بدی ہوتی تھی (زبور، 28:3)۔ وہ خدا کے آئین کو بیان کرتے اور خدا کے عہد کو زبان پر لاتے جب کہ وہ خدا کی باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتے ہیں (زبور 50:16-17)۔ حضرت مسیح اپنے زمانہ کے یہودیوں کے بارے میں فرماتے ہیں: اے ریاکار فقیہو تم پر افسوس، تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو طول دیتے ہو۔ تم پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دسواں حصہ دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ اے اندھے راہ بتانے والو، مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو تم ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو (متّی 23:23-26)۔

یہود خدا کا آئین بیان کرتے تھے۔ وہ لمبی نمازیں پڑھتے اور فصلوں میں دسواں حصہ نکالتے۔ مگر ان کی باتیں

صرف کہنے کے لیے ہوتی تھیں۔ وہ بےضرر احکام پر نمائشی اہتمام کے ساتھ عمل کرتے تھے مگر جب صاحب معاملہ سے انصاف کرنے کا سوال ہوتا، جب ایک کمزور پر رحم کا تقاضا ہوتا، جب اپنے نفس کو کچل کر اللہ کے حکم کو ماننے کی ضرورت ہوتی تو وہ پھسل جاتے۔ حتی کہ اگر کوئی خدا کا بندہ ان کی غلطیوں کو بتاتا تو وہ اس کے دشمن ہوجاتے۔ یہی چیز ہے جس نے ان کو لعنت اور غضب کا مستحق بنا دیا۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا
الۡيَهُوۡدَ وَالَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَهُمۡ
مَّوَدَّةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّيۡسِيۡنَ وَرُهۡبَانًا وَّاَنَّهُمۡ لَا
يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ۝٨٢ وَاِذَا سَمِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَى
الرَّسُوۡلِ تَرٰۤى اَعۡيُنَهُمۡ تَفِيۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا
عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَـقِّ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا
فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ۝٨٣ وَمَا لَنَا لَا نُؤۡمِنُ
بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الۡحَـقِّ ۙ وَنَطۡمَعُ اَنۡ
يُّدۡخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الصّٰلِحِيۡنَ ۝٨٤
فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوۡا جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا
الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ
الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝٨٥ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا
ع ١١ ٩ بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ۝٨٦ ع

۸۲۔ ایمان والوں کے ساتھ عداوت میں تم سب سے بڑھ کر یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ اور ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں تم سب سے زیادہ ان لوگوں کو پاؤ گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں عالم اور راہب ہیں۔ اور اس لیے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ ☆ ۸۳۔ اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ ۸۴۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ ۸۵۔ پس اللہ ان کو اس قول کے بدلہ میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا۔ ۸۶۔ اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔

اس آیت میں جنت کو ''قول'' کا بدلہ قرار دیا گیا۔ مگر وہ قول کیا تھا جس نے اس کے قائلین کو ابدی جنت کا مستحق بنایا۔ وہ قول ان کی پوری ہستی کا نمائندہ تھا۔ وہ ان کی شخصیت کی پھٹن کی آواز تھا۔ انھوں نے اللہ کے کلام کو اس طرح سنا کہ اس کے اندر جو حق تھا اس کو وہ پوری طرح پا گئے۔ وہ ان کے دل و دماغ میں اتر گیا۔ اس نے

ان کے اندر ایسا انقلاب برپا کیا کہ ان کے حوصلوں اور تمناؤں کا مرکز بدل گیا۔ تعصب اور مصلحت کی تمام دیواریں ڈھ پڑیں۔ انھوں نے حق کے ساتھ اپنے آپ کو اس طرح شامل کیا کہ اس سے الگ ان کی کوئی ہستی باقی نہ رہی۔ وہ اس کے گواہ بن گئے، اور گواہ بننا ایک حقیقت کا انسان کی صورت میں مجسم ہونا ہے۔ قرآن اب ان کے لیے محض ایک کتاب نہ رہا بلکہ مالک کائنات کی زندہ نشانی بن گیا۔ یہ ربانی تجربہ جوان پر گزرا بظاہر اس کا اظہار اگرچہ لفظوں کی صورت میں ہوا تھا مگر ان کے یہ الفاظ نہ تھے بلکہ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے ان کے پورے وجود کو ہلا دیا۔ حتی کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ پڑیں۔

قول اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی قسم کے لسانی تلفظ کا نام نہیں۔ وہ آدمی کے عمل کو معنویت کا روپ دینے کی اعلیٰ ترین صورت ہے جس کا اختیار معلوم کائنات میں صرف انسان کو حاصل ہے۔ ایک حقیقی قول سب سے زیادہ لطیف اور سب سے زیادہ بامعنی واقعہ ہے۔ قول آدمی کی ہستی کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ قول ناطقِ عمل ہے۔ اس لیے جب کوئی شخص قول کی سطح پر اپنی عبدیت کا ثبوت دے دے تو وہ جنت کا یقینی استحقاق حاصل کر لیتا ہے۔

حق کو نہ ماننے کی سب سے بڑی وجہ ہمیشہ کبر ہوتا ہے۔ جن کے دلوں میں کبر چھپا ہوا ہو وہ حق کی دعوت کے مقابلہ میں سب سے زیادہ سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر کبر نہ ہو، خواہ وہ دوسری کسی گمراہی میں مبتلا ہوں، وہ حق کی مخالفت میں کبھی اتنا آگے نہیں جاسکتے کہ اس کے جانی دشمن بن جائیں۔ اور کسی حال میں اس کو قبول نہ کریں۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ
اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ
الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا
طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ لَا
يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ
يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ
اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ
اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ

۸۷۔ اے ایمان والو، ان ستھری چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۸۸۔ اور اللہ نے تم کو جو حلال چیزیں دی ہیں، ان میں سے کھاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ ۸۹۔ اللہ تم سے تمھاری بے معنی قسموں پر گرفت نہیں کرتا۔ مگر جن قسموں کو تم نے مضبوط باندھا، ان پر وہ ضرور تمھاری گرفت کرے گا۔ ایسی قسم کا کفارہ ہے دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا کھلانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا کپڑا پہنا دینا یا ایک گردن آزاد کرنا۔ اور جس کو

يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾	میسر نہ ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ کفارہ ہے تمھاری قسموں کا جب کہ تم قسم کھا بیٹھو۔ اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے تا کہ تم شکر ادا کرو۔

بندہ اور خدا کا تعلق ایک زندہ تعلق ہے جو نفسیات کی سطح پر قائم ہوتا ہے۔ یہ تمام تر ایک اندرونی واقعہ ہے۔ مگر مذہب کے زوال کے زمانہ میں جب یہ اندرونی تعلق کمزور پڑتا ہے تو لوگوں میں یہ ذہن ابھرتا ہے کہ اس کو خارجی ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ انھیں میں سے دنیوی لذتوں کو چھوڑنا بھی ہے جس کو رہبانیت کہا جاتا ہے۔ یہ خیال کرلیا جاتا ہے کہ مادی چیزوں سے دوری آدمی کو خدا سے قریب کرنے کا باعث بنے گی۔ صحابہ میں سے بعض افراد اس قسم کے رہبانی خیالات سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ گوشت نہ کھائیں۔ راتوں کو نہ سوئیں۔ اپنے آپ کو خصی کرالیں اور گھروں کو چھوڑ کر درویشی کی زندگی اختیار کرلیں۔ حتی کہ بعض نے اس کی قسمیں بھی کھالیں۔ اس پر انھیں منع کیا گیا اور کہا گیا کہ حلال کو حرام کرنے سے کوئی شخص خدا کی قربت حاصل نہیں کرسکتا۔ آدمی جو کچھ حاصل کرتا ہے فطرت کے حدود میں رہ کر حاصل کرتا ہے، نہ کہ اس سے آزاد ہو کر۔

اسلام کے مطابق اصل ''رہبانیت'' تقویٰ اور شکر ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچے۔ اس کے اندر یہ خواہش ابھرتی ہے کہ ایک حرام چیز سے لذت حاصل کرے مگر وہ خدا کے ڈر سے رُک جاتا ہے۔ کسی کے اوپر غصہ آجاتا ہے اور وہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کو تہس نہس کردے مگر خدا کا ڈر اسے اپنے بھائی کے خلاف تخریبی کارروائی سے روک دیتا ہے۔ اس کا دل کہتا ہے کہ بے قید زندگی گزارے مگر خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے کو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کا پابند بنالے۔ یہی معاملہ شکر کا ہے۔ آدمی کو کوئی دنیوی چیز حاصل ہوتی ہے۔ صحت، دولت، عہدہ، سازوسامان، مقبولیت کا کوئی حصہ اس کو ملتا ہے۔ مگر وہ خود پسندی اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز کو خدا کا عطیہ سمجھ کر اس کے احسان کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ تواضع اور ممنونیت کے جذبات میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو خدا سے جوڑتی ہیں۔ خدا سے ڈرنے اور اس کا شکر ادا کرنے سے آدمی اس کی قربت حاصل کرتا ہے۔ مادی چیزوں سے دوری یقیناً مطلوب ہے۔ مگر وہ ذہنی وقلبی دوری ہے، نہ کہ جسمانی دوری۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّمَا يُرِيْدُ	۹۰ ۔اے ایمان والو، شراب اور جوا اور تھان اور پانسے سب گندے کام ہیں، شیطان کے۔ پس تم ان سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ ۹۱۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ وہ

الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّوۡقِعَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ
فِى الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ وَيَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ
الصَّلٰوةِ‌ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّنۡتَهُوۡنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ
وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاحۡذَرُوۡا‌ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ
فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۹۲﴾
لَيۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جُنَاحٌ فِيۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوْا
وَّاَحۡسَنُوۡا‌ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۲ ۲

تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم ان سے باز آؤ گے۔ ۹۲۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور بچو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمے صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔ ۹۳۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔ جب کہ وہ ڈرے اور ایمان لائے اور نیک کام کیا۔ پھر ڈرے اور ایمان لائے پھر ڈرے اور نیک کام کیا۔ اور اللہ نیک کام کرنے والوں کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔

شراب اور جوا اور وہ آستانے جو خدا کے سوا کسی دوسرے کو پوجنے یا کسی اور کے نام پر نذر اور قربانی چڑھانے کے لیے ہوں اور پانسہ یعنی فال گیری اور قرعہ اندازی کے وہ طریقے جن میں غیر اللہ سے استعانت کا عقیدہ شامل ہو، سب گندے شیطانی کام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں انسان کو ذہنی و عملی پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ شراب آدمی کے اندر لطیف انسانی احساسات کو ختم کر دیتی ہے اور جوا بے غرضی کی نفسیات کے لیے قاتل ہے۔ اسی طرح تھان اور پانسے وہ چیزیں ہیں جن کی بنیاد یا تو سطحی جذبات پر قائم ہوتی ہے یا تو ہماتی خیالات پر۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اللہ کو یاد کرنے والا اور اس کی عبادت کرنے والا بن جائے۔ وہ خدا کی اور اس کے پیغمبر کی اطاعت میں اپنے کو ڈال دے۔ ان افعال کے لیے آدمی کا سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ مگر مذکورہ چیزیں آدمی کے اندر سے سب سے زیادہ جو چیز ختم کرتی ہیں، وہ سنجیدگی ہی ہے۔ اسلام وہ انسان بنانا چاہتا ہے جو حقیقتوں کا ادراک کرے، جب کہ شراب آدمی کو حقیقتوں سے غافل کر دینے والی چیز ہے۔ اسلام کا مطلوب انسان وہ ہے جو مادیت سے بلند ہو کر جئے، جب کہ جوا آدمی کو مجرمانہ حد تک مادیت کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اسلام وہ انسان بنانا چاہتا ہے جو واقعات کی بنیاد پر اپنے کو کھڑا کرے، جب کہ آستانے اور پانسے انسان کو توہمات کی وادیوں میں گم کر دیتے ہیں۔

شراب بڑھی ہوئی بے حسی پیدا کرتا ہے اور جوا بڑھی ہوئی خود غرضی۔ اور یہ دونوں چیزیں باہمی فساد کی جڑ ہیں۔ جو لوگ بے حس ہو جائیں وہ دوسرے کی عزت کو عزت اور دوسرے کی چیز کو چیز نہیں سمجھتے، ایسے لوگ ظلم، بے انصافی، دوسروں کو ناحق ستانے میں آخری حد تک جری ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جوا استحصال اور خود غرضی کی

بدترین صورت ہے، جب کہ ایک آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کو لوٹ کر اپنے لیے ایک بڑی کامیابی حاصل کرے۔ شرابی آدمی دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے سے عاری ہوتا ہے اور جوئے باز کے لیے دوسرا آدمی صرف استحصال کا موضوع ہوتا ہے۔ ان خصوصیات کے لوگ جس معاشرہ میں جمع ہوجائیں وہاں آپس کی بے اعتمادی، ایک دوسرے سے شکایات، باہمی ٹکراؤ اور دشمنی کے سوا اور کیا چیز پرورش پائے گی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَيَبۡلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَىۡءٍ مِّنَ الصَّيۡدِ تَنَالُهٗۤ اَيۡدِيۡكُمۡ وَ رِمَاحُكُمۡ لِيَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ يَّخَافُهٗ بِالۡغَيۡبِ‌ ۚ فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۹۴﴾ يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡتُلُوا الصَّيۡدَ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ‌ ؕ وَمَنۡ قَتَلَهٗ مِنۡكُمۡ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثۡلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحۡكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ هَدۡيًاۢ بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ اَوۡ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيۡنَ اَوۡ عَدۡلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوۡقَ وَبَالَ اَمۡرِهٖ‌ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ‌ ؕ وَمَنۡ عَادَ فَيَنۡتَقِمُ اللّٰهُ مِنۡهُ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

۹۴۔ اے ایمان والو، اللہ تمھیں اس شکار کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈالے گا جو بالکل تمھارے ہاتھوں اور تمھارے نیزوں کی زد میں ہوگا، تاکہ اللہ جانے کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔ پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۹۵۔ اے ایمان والو، شکار کو نہ مارو جب کہ تم حالتِ احرام میں ہو۔ اور تم میں سے جو شخص اس کو جان بوجھ کر مارے تو اس کا بدلہ اسی طرح کا جانور ہے جیسا کہ اس نے مارا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے۔ یا اس کے کفارہ میں چند محتاجوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ یا اس کے برابر روزے رکھنے ہوں گے، تاکہ وہ اپنے کیے کی سزا چکھے۔ اللہ نے معاف کیا جو کچھ ہوچکا۔ اور جو شخص پھرے گا تو اللہ اس سے بدلہ لے گا۔ اور اللہ زبردست ہے، بدلہ لینے والا ہے۔

حج یا عمرہ کے لیے یہ قاعدہ ہے کہ کعبہ پہنچنے سے پہلے مقررہ مقامات سے احرام باندھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کعبہ تک کے سفر میں جانور یا چڑیاں سامنے آتی ہیں جن کو بآسانی شکار کیا جاسکتا ہو۔ مگر ایسے شکار کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ آدمی خواہ خود شکار کرے یا کسی دوسرے کو شکار کرنے میں مدد دے، دونوں چیزیں احرام کی حالت میں ناجائز ہیں۔ روایات کے مطابق یہ آیت حدیبیہ کے سفر میں اتری جب کہ مسلمانوں نے عمرہ کے ارادہ سے احرام باندھ رکھا تھا۔ اس وقت چڑیاں اور جانور کثیر تعداد میں اتنے قریب پھر رہے تھے کہ بآسانی انھیں تیر یا نیزے سے مارا جاسکتا تھا۔ مسلمان اس وقت اپنی عادت اور ضرورت کے تحت چاہتے بھی تھے کہ ان کا شکار

کریں۔ مگر حکم اترتے ہی ہر ایک نے اپنا ہاتھ روک لیا — یہ حکم جو احرام کی حالت میں جانوروں کے بارے میں دیا گیا ہے وہی روزمرہ کی زندگی میں عام انسانوں کے ساتھ مطلوب ہے۔

اس حکم کا اصل مقصد یہ ہے کہ "اللہ جان لے کہ کون ہے جو اللہ کو دیکھے بغیر اللہ سے ڈرتا ہے"۔ دنیا میں انسان کو رکھ کر خدا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اب وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ لوگوں میں کون اتنا حقیقت شناس ہے کہ بظاہر خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ اس کو اس کی تمام طاقتوں کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور کون اتنا غافل ہے کہ خدا کو اپنے سامنے نہ پا کر بےخوف ہو جاتا ہے اور مَن مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے۔ اس کا تجربہ حج کے سفر میں چند دن اور انسانی تعلقات میں روزانہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی کسی کی زد میں اس طرح آتا ہے کہ اس کے لیے بالکل ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی جان پر حملہ کرے۔ وہ اس کو مالی نقصان پہنچائے۔ وہ اس کے بارے میں ایسی بات کہے جس سے اس کی رسوائی ہوتی ہو۔ اب ایک شخص وہ ہے جو اس طرح قابو پانے کے باوجود خدا کے ڈر سے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ کو اس کے معاملہ میں روک لیتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جو کسی پر قابو پاتے ہی اس کو ذلیل کرتا ہے اور اس کو اپنی طاقت کا نشانہ بناتا ہے۔ ان میں سے پہلے شخص نے یہ ثابت کیا کہ وہ دیکھے بغیر اللہ سے ڈرتا ہے اور دوسرے نے اپنے بارے میں برعکس حالت کا ثبوت دیا۔ پہلے کے لیے خدا کے یہاں بےحساب انعامات ہیں اور دوسرے کے لیے دردناک عذاب۔

اُحِلَّ لَكُمۡ صَيۡدُ الۡبَحۡرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمۡ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيۡكُمۡ صَيۡدُ الۡبَرِّ مَا دُمۡتُمۡ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۹۶﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الۡـكَعۡبَةَ الۡبَيۡتَ الۡحَـرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهۡرَ الۡحَـرَامَ وَ الۡهَدۡىَ وَالۡقَلَاۤئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۹۷﴾ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ؕ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ

۹۶۔ تمھارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا، تمھارے فائدہ کے لیے اور قافلوں کے لیے۔ اور جب تک تم احرام میں ہو خشکی کا شکار تمھارے اوپر حرام کیا گیا۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے پاس تم حاضر کیے جاؤ گے۔ ۹۷۔ اللہ نے کعبہ، حرمت والے گھر، کو لوگوں کے لیے قیام کا باعث بنایا۔ اور حرمت والے مہینوں کو اور قربانی کے جانوروں کو اور گلے میں پٹّے پڑے ہوئے جانوروں کو بھی، یہ اس لیے کہ تم جانو کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۹۸۔ جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے اور بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۹۹۔ رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے

لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٠﴾ ع ۱۳

۱۰۰۔ کہو کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے، اگر چہ ناپاک کی کثرت تم کو بھلی لگے۔ پس اللہ سے ڈرو، اے عقل والو، تا کہ تم فلاح پاؤ۔

حالتِ احرام میں شکار حرام ہے مگر جو لوگ دریا یا سمندر سے بیت اللہ کا سفر کر رہے ہوں ان کے لیے جائز ہے کہ وہ پانی میں شکار کریں اور اس کو کھائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شکار کی یہ ممانعت اس کے اندر کسی ذاتی حرمت کی بنا پر نہ تھی، بلکہ محض ''آزمائش'' کے لیے تھی۔ انسان کو آزمانے کے لیے اللہ نے علامتی طور پر کچھ چیزیں مقرر کر دیں۔ اس لیے جہاں شارع نے محسوس کیا کہ جو چیز آزمائش کے لیے تھی وہ بندوں کے لیے غیر ضروری مشقت کا سبب بن جائے گی وہاں قانون میں نرمی کر دی گئی۔ کیوں کہ سمندر کے سفر میں اگر زادِ راہ نہ رہے تو آدمی کے لیے اپنی زندگی کو باقی رکھنے کی اس کے سوا اور صورت نہیں رہتی کہ وہ آبی جانوروں کو اپنی خوراک بنائے۔

کعبہ اسلام اور ملّت اسلام کا دائمی مرکز ہے۔ کعبہ کی طرف رخ کرنے کو نماز کی شرط ٹھہرا کر اللہ نے دنیا کے ایک ایک مسلمان کو کعبہ کی مرکزیت کے ساتھ جوڑ دیا۔ پھر حج کی صورت میں اس کو اسلام کا بین اقوامی اجتماع گاہ بنا دیا۔ زیارتِ کعبہ کے ذیل میں جو شعائر مقرر کیے گئے ہیں ان کے احترام کی وجہ ان کا کوئی ذاتی تقدس نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آدمی کے امتحان کی علامت ہیں۔ بندہ جب ان شعائر کے بارے میں اللہ کے حکم کو پورا کرتا ہے تو وہ اپنے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ کرتا ہے کہ اللہ اگرچہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا مگر وہ زندہ موجود ہے۔ وہ حکم دیتا ہے، وہ بندوں کی نگرانی کرتا ہے، وہ ہماری تمام حرکتوں سے باخبر ہے۔ یہ احساسات آدمی کے اندر اللہ کا ڈر پیدا کرتے ہیں اور اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ زندگی کے مختلف مواقع پر اللہ کا سچا بندہ بن کر رہ سکے۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جس طرف بھیڑ ہو، جدھر ظاہری ساز و سامان کی کثرت ہو اسی کو اہم سمجھ لیتا ہے۔ مگر خدا کے نزدیک ساری اہمیت صرف کیفیت کی ہے۔ مقدار کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ جو لوگ ''کثرت'' کی طرف دوڑیں اور ''قلت'' کو نظر انداز کر دیں، وہ اپنے خیال سے بڑی ہوشیاری کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ انتہائی نادان ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو خدا کے ڈر کے تحت اپنا رویہ متعین کرے، نہ کہ مادی مصالح یا دنیوی اندیشوں کے تحت۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ

۱۰۱۔ اے ایمان والو، ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو وہ تم کو گراں گزریں۔ اور اگر تم ان کے متعلق سوال کرو گے ایسے وقت میں جب کہ قرآن اتر رہا ہے تو وہ تم پر

عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا
قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا
كٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا
سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِیْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ
الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ اِذَا
قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى
الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ
اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ
شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ
اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا
فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر کیا۔ اور اللہ بخشنے والا، تحمل والا ہے۔ ۱۰۲۔ ایسی ہی باتیں تم سے پہلے ایک جماعت نے پوچھیں۔ پھر وہ ان کے منکر ہو کر رہ گئے۔ ۱۰۳۔ اللہ نے بَحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام (بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور) مقرر نہیں کیے۔ مگر جن لوگوں نے کفر کیا وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۱۰۴۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہے اس کی طرف آؤ اور رسول کی طرف آؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے۔ کیا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔ ۱۰۵۔ اے ایمان والو، تم اپنی فکر رکھو۔ کوئی گمراہ ہو تو اس سے تمھارا کچھ نقصان نہیں اگر تم ہدایت پر ہو۔ تم سب کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کر رہے تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اے لوگو تم پر حج فرض کیا گیا ہے۔ یہ سن کر قبیلہ بنی اسد کا ایک شخص اٹھا اور کہا: اے خدا کے رسول کیا ہر سال کے لیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر سخت غضب ناک ہوئے اور فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں کہہ دیتا ہاں تو ہر سال کے لیے فرض ہو جاتا اور جب فرض ہو جاتا تو تم لوگ ہر سال اس کو کر نہ پاتے اور پھر کفر کا ارتکاب کرتے۔ پس جو میں چھوڑوں اس کو تم بھی چھوڑ دو۔ جب میں کسی چیز کا حکم دوں تو اس کو کرو اور جب میں کسی چیز سے روکوں تو اس سے رک جاؤ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 814)۔

غیر ضروری سوالات میں پڑنے کی ممانعت جو نزول قرآن کے وقت تھی وہی آج بھی مطلوب ہے۔ آج بھی صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو حکم جس طرح دیا گیا ہے اس کو اسی طرح رہنے دیا جائے۔ غیر ضروری سوالات قائم کر کے اس کی حدود و قیود کو بڑھانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جو حکم مجمل صورت میں ہے اس کو مفصل بنانا، جو مطلق ہے

اس کو مقید کرنا اور جو چیز غیر معین ہے اس کو معین کرنے کے درپے ہونا دین میں ایسا اضافہ ہے جس سے اللہ اور رسول نے منع فرمایا ہے۔

کسی قوم کے جو گزرے ہوئے بزرگ ہوتے ہیں، زمانہ گزرنے کے بعد وہ مقدس حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اکثر گمراہیاں انھیں گزرے ہوئے لوگوں کے نام پر ہوتی ہیں۔ حتی کہ اگر وہ بکری اور اونٹ کی تعظیم کا رواج قائم کر گئے ہوں تو اس کو بھی بعد کے لوگ سوچے سمجھے بغیر دہراتے رہتے ہیں۔ جس بگاڑ کی روایت ماضی کے تقدس پر قائم ہوں اس کی جڑیں اتنی گہری جمی ہوئی ہوتی ہیں کہ اس سے لوگوں کو ہٹانا سخت دشوار ہوتا ہے۔ اس قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے اوپر اٹھنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی کے اندر واقعی معنوں میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ بالآخر اس کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ ایسا شخص آج ہی اس حقیقت کو مان لیتا ہے جس کو موت کے بعد ہر آدمی ماننے پر مجبور ہوگا مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٧﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ

۱۰۶۔ اے ایمان والو، تمھارے درمیان گواہی وصیت کے وقت، جب کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے، اس طرح ہے کہ دو معتبر آدمی تم میں سے گواہ ہوں۔ یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو تمھارے غیروں میں سے دو گواہ لے لیے جائیں۔ پھر اگر تم کو شبہ ہو جائے تو دونوں گواہوں کو نماز کے بعد روک لو اور وہ دونوں خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم کسی قیمت کے عوض اس کو نہ بیچیں گے، خواہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔ اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم گنہ گار ہوں گے۔ ۱۰۷۔ پھر اگر پتہ چلے کہ ان دونوں نے کوئی حق تلفی کی ہے تو ان کی جگہ دو اور شخص ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کا حق پچھلے دو گواہوں نے مارنا چاہا تھا۔ وہ خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی

یَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ ؕ وَ
اتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ
الْفٰسِقِیْنَ ۠﴿۱۰۸﴾ ع ۱۴

ہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔ ۱۰۸۔ یہ قریب ترین طریقہ ہے کہ لوگ گواہی ٹھیک دیں، یا اس سے ڈریں کہ ہماری قسم ان کی قسم کے بعد الٹی پڑے گی۔ اور اللہ سے ڈرو اور سنو۔ اللہ نافرمانوں کو سیدھی راہ نہیں چلاتا۔

ایک آدمی سفر کرتا ہے اور اس کے ساتھ مال ہے۔ راستہ میں اس کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ اب اگر وہ اپنے قریب دو مسلمان پائے تو ان کو اپنا مال دے دے اور اس کے بارے میں انھیں وصیت کر دے۔ اگر دو مسلمان بروقت نہ ملیں تو غیر مسلموں میں سے دو آدمی کے ساتھ یہی معاملہ کرے۔ یہ دو صاحبان مال لا کر اس کو وارثوں کے حوالے کریں۔ اس وقت وارثوں کو اگر ان کے بیان کے بارے میں شبہ ہو جائے تو کسی نماز کے بعد مسجد میں ان گواہوں کو روک لیا جائے۔ یہ دونوں شخص عام مسلمانوں کے سامنے قسم کھائیں کہ انھوں نے مرنے والے کی طرف سے جو کچھ کہا صحیح کہا۔ اگر وارث اس کے حلفیہ بیان پر مطمئن نہ ہوں تو وارثوں میں سے دو آدمی اپنی بات کے حق میں قسم کھائیں اور پھر ان کی قسم کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے۔ وارثوں کو یہ حق دینا گویا ایک ایسا روک قائم کرنا ہے کہ کوئی خیانت کرنے والا خیانت کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

شریعت میں ایک مصلحت یہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ روزمرہ کے معاملات میں ایسے احکام دیے جائیں جو آدمی کی وسیع تر زندگی کے لیے سبق ہوں۔ کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے مال کا حق داروں تک پہنچنا ایک خاندانی اور معاشی معاملہ ہے۔ مگر اس کو دو اہم باتوں کی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ ایک یہ کہ لوگوں میں یہ مزاج بنے کہ معاملات میں وہ تعلق اور رشتہ داری کا لحاظ نہ کریں، بلکہ صرف حق کا لحاظ کریں۔ وہ یہ دیکھیں کہ حق کیا ہے، نہ یہ کہ بات کس کے موافق جارہی ہے اور کس کے خلاف۔ دوسرے یہ کہ ہر بات کو خدا کی گواہی سمجھنا۔ کوئی بات جو آدمی کے پاس ہے، وہ خدا کی امانت ہے۔ کیوں کہ آدمی نے اس کو خدا کی دی ہوئی آنکھ سے دیکھا اور خدا کے دیے ہوئے حافظہ میں اس کو محفوظ رکھا۔ اور اب خدا کی دی ہوئی زبان سے وہ اس کے متعلق اعلان کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ امانت میں خیانت ہوگی کہ آدمی بات کو اس طرح نہ بیان کرے جیسا کہ اس نے دیکھا اور جس طرح اس کے حافظہ نے اس کو محفوظ رکھا۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَاۤ
اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ
الْغُیُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ

۱۰۹۔ جس دن اللہ پیغمبروں کو جمع کرے گا، پھر پوچھے گا تم کو کیا جواب ملا تھا۔ وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا تو ہی ہے۔ ۱۱۰۔ جب اللہ کہے گا اے عیسیٰ ابن مریم،

اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۫ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا ۚ وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمھاری ماں پر کیا جب کہ میں نے روح پاک سے تمھاری مدد کی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی۔ اور جب میں نے تم کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔ اور جب تم مٹی سے پرندہ جیسی صورت میرے حکم سے بناتے تھے پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی۔ اور تم اندھے اور جُذامی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے۔ اور جب تم مُردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تم سے روکا جب کہ تم ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو ان کے منکروں نے کہا یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

پیغمبروں پر جو لوگ ایمان لائے، بعد کے زمانہ میں سب کے اندر بگاڑ پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنے طور پر ایک دین بنایا اور اس کو اپنے پیغمبر کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کے باوجود ہر گروہ اپنے آپ کو اپنے پیغمبر کی امت شمار کرتا رہا۔ حالانکہ پیغمبر کی اصل تعلیمات سے ہٹنے کے بعد اس کا پیغمبر سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ یہودی اپنے کو حضرت موسیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور عیسائی اپنے کو حضرت عیسیٰ کی طرف۔ حالاں کہ ان کے مروجہ دین کا خدا کے ان پیغمبروں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حقیقت موجودہ امتحان کی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ مگر قیامت کے دن وہ کھول دی جائے گی۔ اس دن خدا تمام پیغمبروں کو اور اسی کے ساتھ ان کی امتوں کو جمع کرے گا۔ اس وقت امتوں کے سامنے ان کے پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی امتوں کو کیا تعلیم دی اور امتوں نے تمھاری تعلیمات کو کس طرح اپنایا۔ اس طرح ہر امت پر اس کے پیغمبر کی موجودگی میں واضح کیا جائے گا کہ اس نے خدا کے دین کے معاملہ میں اپنے پیغمبروں کی کیا کیا خلاف ورزی کی ہے اور کس طرح خود ساختہ دین کو ان کی طرف منسوب کیا ہے۔

انھیں پیغمبروں میں سے ایک مثال حضرت عیسیٰ کی ہے جو خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے کے انبیاء کی درمیانی کڑی ہیں۔ حضرت عیسیٰ کو انتہائی خصوصی معجزے دیے گئے۔ آپ پر ایمان لانے والے بہت کم تھے اور آپ کے مخالفین (یہود) کو ہر طرح کا دنیوی زور حاصل تھا۔ اس کے باوجود وہ حضرت عیسیٰ کا کچھ نقصان نہ کر سکے اور نہ آپ کے ساتھیوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان معجزات کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ

لوگ آپ کے لائے ہوئے دین کو مان لیتے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ آپ کے مخالفین نے یہ کہہ کر آپ کو نظر انداز کر دیا کہ وہ جو معجزے دکھا رہے ہیں وہ سب جادو کا کرشمہ ہے۔ اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے انھوں نے بعد کے زمانے میں آپ کو خدائی کا درجہ دے دیا۔ قیامت کے دن آپ کی پیروی کا دعویٰ کرنے والوں کے سامنے یہ حقیقت کھول دی جائے گی کہ حضرت عیسیٰ نے جو کمالات دکھائے وہ سب خدا کے حکم سے تھے۔ آپ کے دشمنوں نے آپ کو جن خطرات میں ڈالا ان سے بھی اللہ ہی نے آپ کو بچایا۔ جب صورت حال یہ تھی اور حضرت عیسیٰ خود سامنے کھڑے ہو کر اس کی تصدیق کر رہے ہیں تو اب ان کے امتی بتائیں کہ انھوں نے آپ کی طرف جو دین منسوب کیا وہ کس نے انھیں دیا تھا۔

وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ
بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا
مُسْلِمُوْنَ ﴿١١١﴾ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى
ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ
عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١١٢﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ
مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ
صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿١١٣﴾ قَالَ
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا
مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا
وَاٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ
الرّٰزِقِيْنَ ﴿١١٤﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ
فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ
اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١١٥﴾ ع ۱۵/۵

۱۱۱۔ اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈال دیا کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرماں بردار ہیں۔ ۱۱۲۔ جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تمھارا رب یہ کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان اتارے۔ عیسیٰ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔ ۱۱۳۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تو نے ہم سے سچ کہا اور ہم اس پر گواہی دینے والے بن جائیں۔ ۱۱۴۔ عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی کہ اے اللہ، ہمارے رب، تو آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار جو ہمارے لیے ایک عید بن جائے، ہمارے اگلوں کے لیے اور ہمارے پچھلوں کے لیے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو۔ اور ہم کو عطا کر، تو ہی بہترین عطا کرنے والا ہے۔ ۱۱۵۔ اللہ نے کہا میں یہ خوان ضرور تم پر اتاروں گا۔ پھر اس کے بعد تم میں سے جو شخص منکر ہوگا، اس کو میں ایسی سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی۔

لوگوں کو حق کی طرف پکارنے کا کام اگرچہ داعی انجام دیتا ہے مگر پکار پر لبیک کہنا ہمیشہ خدا کی توفیق سے

ہوتا ہے دعوت کی صداقت کو دلائل سے جان لینے کے بعد بھی بہت سی رکاوٹیں باقی رہتی ہیں جو آدمی کو اس کی طرف بڑھنے نہیں دیتیں — داعی کا ایک عام انسان کی صورت میں دکھائی دینا، یہ اندیشہ کہ دعوت قبول کرنے کے بعد زندگی کا بنا بنایا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا، یہ سوال کہ اگر یہ سچائی ہے تو فلاں فلاں بڑے لوگ کیا سچائی سے محروم تھے، وغیرہ۔ یہ ایک انتہائی نازک موڑ ہوتا ہے جہاں آدمی فیصلہ کے کنارے پہنچ کر بھی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ جس شخص کے اندر وہ کچھ خیر دیکھتا ہے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو شبہ کی سرحد پار کرا دیتا ہے اور اس کو یقین کے دائرہ میں داخل کر دیتا ہے۔

خدا کی طرف سے ہر وقت انسان کو رزق فراہم کیا جا رہا ہے۔ حتی کہ پوری زمین انسان کے لیے رزق کا دسترخوان بنی ہوئی ہے۔ مگر مومنینِ مسیح نے آسمان سے طعام اتارنے کا مطالبہ کیا تو ان کو سخت تنبیہ کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام حالات میں ہم کو جو رزق ملتا ہے وہ اسباب کے پردے میں مل رہا ہے۔ جب کہ مومنینِ مسیح کا مطالبہ یہ تھا کہ اسباب کا پردہ ہٹا کر ان کا رزق انھیں دیا جائے۔ یہ چیز سنت اللہ کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اگر اسباب کا ظاہری پردہ ہٹا دیا جائے تو امتحان کس بات کا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ کھیت سے لہلہاتی ہوئی فصل کا پیدا ہونا یا مٹی کے اندر سے ایک شاداب درخت کا نکل کر کھڑا ہو جانا بھی اسی طرح معجزہ ہے جس طرح بادلوں میں ہو کر کسی خوان کا ہماری طرف آنا۔ مگر ان واقعات کا معجزہ ہونا ہم کو اس لیے نظر نہیں آتا کہ وہ پردہ میں ہو کر ظاہر ہو رہے ہیں۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ پردہ کو پھاڑ کر حقیقت کو دیکھ سکے۔ وہ ''زمین'' سے نکلنے والے رزق کو ''آسمان'' سے اترنے والے رزق کے روپ میں پالے۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ کرے کہ میں دیکھ کر مانوں گا تو گویا وہ کہہ رہا ہے کہ امتحان سے گزرے بغیر میں خدا کی رحمت میں داخل ہوں گا۔ حالاں کہ خدا کی سنت کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں۔

وَاِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِىۡ وَاُمِّىَ اِلٰهَيۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبۡحٰنَكَ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَـيۡسَ لِىۡ ۚ بِحَقٍّ ؕ اِنۡ كُنۡتُ قُلۡتُهٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَهٗ ؕ تَعۡلَمُ مَا فِىۡ نَفۡسِىۡ وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِىۡ نَفۡسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِىۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ

۱۱۶۔ اور جب اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بنا لو۔ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے، میرا یہ کام نہ تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے، بے شک تو ہی ہے چھپی باتوں کا جاننے والا۔ ۱۱۷۔ میں نے ان سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا

رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا
دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ
الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ
اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾
قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ
صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ
عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾
لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ
ع ۱۶ ۵ ۲ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

تھا۔ یہ کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب ہے اور تمھارا بھی۔ اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھ کو وفات دے دی تو ان پر تو ہی نگراں تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔ ۱۱۸۔ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو ہی زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۱۱۹۔ اللہ کہے گا آج وہ دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔ ۱۲۰۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قیامت جب آئے گی تو حقیقتیں اس طرح کھل جائیں گی کہ آدمی بغیر بتائے ہوئے یہ جان لے گا کہ سچ کیا ہے اور غلط کیا۔ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے کہ ساری طاقتیں صرف ایک اللہ کو حاصل ہیں۔ خالق اور مالک، معبود اور مطلوب ہونے میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ اس کے سوا کسی کو نہ کوئی طاقت حاصل ہے اور نہ اس کے سوا کوئی اس قابل ہے کہ اس کی عبادت واطاعت کی جائے۔ ایسی حالت میں جب خدا اپنے پیغمبروں سے پوچھے گا کہ میں نے تم کو کیا پیغام دے کر دنیا میں بھیجا تھا تو یہ ایک ایسی بات کا پوچھنا ہوگا جو پہلے ہی لوگوں کے لیے معلوم شدہ بن چکی ہوگی۔ اس سوال کا جواب اس وقت اتنا کھلا ہوا ہوگا کہ کسی کے بولے بغیر قیامت کا پورا ماحول اس کا جواب پکار رہا ہوگا۔ یہ سوال وجواب محض لوگوں کی رسوائی میں اضافہ کرنے کے لیے ہوگا۔ وہ اس لیے ہوگا کہ پیغمبروں کے سامنے کھڑا کر کے لوگوں پر واضح کیا جائے کہ پیغمبروں کے نام پر جو دین تم نے بنا رکھا تھا وہ ان کی حقیقی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔

یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس لیے یہاں ہر ایک کو آزادی ہے۔ یہاں آدمی خدا اور رسول کی طرف ایسا دین منسوب کر کے بھی پھل پھول سکتا ہے جس کا خدا اور رسول سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہاں فرضی امیدوں اور جھوٹی آرزوؤں پر بھی جنت کو اپنا حق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنی قیادت کے ہنگامے کھڑے کرے اور یہ ثابت کرے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہی عین خدا کا دین ہے۔ مگر قیامت میں اس قسم کی کوئی چیز

کام آنے والی نہیں۔قیامت میں جو چیز کام آئے گی وہ صرف یہ کہ آدمی خدا کی نظر میں سچا ثابت ہو۔آسمانی کتاب کی حامل قوموں کا امتحان یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان کی دعوے دار بنتی ہیں یا نہیں۔ان کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے دعوائے ایمان کو سچا ثابت کرتی ہیں یا نہیں۔

٦ ۔ سُوْرَۃُ الْاَنْعَام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ
جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ① هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ
طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ
اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ② وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي
الْاَرْضِ ؕ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا
تَكْسِبُوْنَ ③

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا۔پھر بھی منکر لوگ دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ ۲۔وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک مدت مقرر کی اور مقررہ مدت اسی کے علم میں ہے۔پھر بھی تم شک کرتے ہو۔ ۳۔اور وہی اللہ آسمانوں میں ہے اور وہی زمین میں۔ وہ تمھارے چھپے اور کھلے کو جانتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

آسمان اور زمین کا نظام اپنی ساری وسعتوں کے باوجود اتنا مربوط اور اتنا وحدانی ہے کہ وہ پکار رہا ہے کہ اس کا خالق اور منتظم ایک خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ پھر زمین وآسمان کی یہ کائنات اپنے پھیلاؤ اور اپنی حکمت و معنویت کے اعتبار سے ناقابلِ قیاس حدتک عظیم ہے۔سورج کے روشن کرہ کے گرد خلا میں زمین کی حد درجہ منظم گردش اور اس سے زمین کی سطح پر روشنی اور تاریکی اور دن اور رات کا پیدا ہونا انسان کے تمام قیاس وگمان سے کہیں زیادہ بڑا واقعہ ہے۔اب جو خدا اتنے بڑے کائناتی کارخانہ کو اتنے باکمال طریقہ پر چلارہا ہے اس کی ذات میں وہ کون سی کمی ہوسکتی ہے جس کی تلافی کے لیے وہ کسی کو اپنا شریک ٹھہرائے۔حقیقت یہ ہے کہ ہماری دنیا اور اس کے اندر قائم شدہ حیرت ناک نظام خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خدا صرف ایک ہے اور یہی نظام اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ یہ خدا اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کو اپنی تخلیق اور انتظام میں کسی مددگار کی ضرورت نہیں۔

موجودہ دنیا کی عمر محدود ہے۔ یہاں دکھ سے خالی زندگی ممکن نہیں۔ یہاں ہر خوش گواری کے ساتھ ناخوش گواری کا پہلو لگا ہوا ہے۔ یہاں شر کو خیر سے اور خیر کو شر سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ایسی حالت میں آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخرت کی ابدی دنیا جو ہر قسم کے حزن (فاطر، 35:34) سے خالی ہوگی کیسے بن جائے

گی۔ اگر کسی اور مادہ سے آخرت کی دنیا بننے والی ہوتو انسان اس سے واقف نہیں اور اگر اسی دنیا کے مادہ سے وہ دوسری دنیا بننے والی ہے تو اس دنیا کے اندر اس قسم کی ایک کامل دنیا کو وجود میں لانے کی صلاحیت نہیں۔

مگر سوال کرنے والے کا خود اپنا وجود ہی اس سوال کا جواب دینے کے لیے کافی ہے۔ انسان کا جسم پورا کا پورا مٹی (زمینی اجزاء) سے بنا ہے، مگر اس کے اندر ایسی منفرد صلاحیتیں ہیں، جن میں سے کوئی صلاحیت بھی مٹی کے اندر نہیں۔ آدمی سنتا ہے، وہ بولتا ہے، وہ سوچتا ہے، وہ طرح طرح کے حیرت ناک عمل انجام دیتا ہے۔ حالاں کہ وہ جس مٹی سے بنا ہے وہ اس قسم کا کوئی بھی عمل انجام نہیں دے سکتی۔ زمینی اجزاء سے حیرت انگیز طور پر ایک غیر زمینی مخلوق بن کر کھڑی ہوگئی ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر روز آدمی کے سامنے آرہا ہے۔ ایسی حالت میں کیسی عجیب بات ہے کہ آدمی آخرت کے واقع ہونے پر شک کرے۔ اگر مٹی سے جیتا جاگتا انسان نکل سکتا ہے۔ اگر مٹی سے خوشبودار پھول اور ذائقہ دار پھل برآمد ہو سکتے ہیں تو ہماری موجودہ دنیا سے ایک اور زیادہ کامل اور زیادہ معیاری دنیا کیوں ظاہر نہیں ہو سکتی۔

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٤﴾ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٥﴾ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٦﴾

۴۔ اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے، وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ ۵۔ چنانچہ جو حق ان کے پاس آیا ہے، اس کو بھی انھوں نے جھٹلا دیا۔ پس عنقریب ان کے پاس اس چیز کی خبریں آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ ۶۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ ان کو ہم نے زمین میں جما دیا تھا جتنا تم کو نہیں جمایا اور ہم نے ان پر آسمان سے خوب بارش برسائی اور ہم نے نہریں جاری کیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے باعث ہلاک کر ڈالا۔ اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوموں کو اٹھایا۔

خدا اور آخرت کی دعوت جو خدا کی براہِ راست تائید سے اٹھی ہو اس کے ساتھ واضح علامتیں ہوتی ہیں جو اس بات کا اعلان کر رہی ہوتی ہیں کہ یہ ایک سچی دعوت ہے اور خدا کی طرف سے ہے — اس کا اس فطرت کے انداز پر ہونا جس پر خدا کی ابدی دنیا کا نظام قائم ہے۔ اس کا ایسے دلائل کی بنیاد پر اٹھنا جس کا توڑ کسی کے لیے ممکن نہ ہو۔

اس کی پشت پر ایسے داعی کا ہونا جس کی سنجیدگی اور اخلاق پر شبہ نہ کیا جاسکتا ہو۔ اس کے ساتھ ایسے تائیدی واقعات کا وابستہ ہونا کہ مخالفین اپنی برتر قوت کے باوجود اس کے خلاف اپنے تخریبی منصوبوں میں کامیاب نہ ہوئے ہوں۔ اس طرح کے واضح قرائن ہیں جو اس کے برحق ہونے کی طرف کھلا اشارہ کررہے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود انسان اس پر یقین نہیں کرتا اور اس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام تائیدی قرائن اپنی ساری وضاحت کے باوجود ہمیشہ اسباب کے پردہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آدمی کے سامنے جب یہ قرآئن آتے ہیں تو وہ ان کو مخصوص اسباب کی طرف منسوب کرکے انھیں نظر انداز کردیتا ہے، اس کا ذہن اعتراف کے رخ پر چلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دعوت اگر خدا کی طرف سے ہوتی تو خدا اور فرشتے برہنہ صورت میں اس کے ساتھ موجود ہوتے۔ حالاں کہ یہ خیال سراسر باطل ہے۔ کیوں کہ خدا اور فرشتے جب برہنہ صورت میں سامنے آجائیں تو وہ فیصلہ کا وقت ہوتا ہے، نہ کہ دعوت اور تبلیغ کا۔

جن لوگوں کو زمین میں جماؤ حاصل ہو، جنھوں نے اپنے لیے معاشی سازوسامان جمع کرلیا ہو، جن کو اپنے آس پاس عظمت ومقبولیت کے مظاہر دکھائی دیتے ہوں وہ ہمیشہ غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے گرد جمع شدہ چیزوں کے مقابلہ میں ان چیزوں کو حقیر سمجھ لیتے ہیں، جو داعی حق کے گرد خدا نے جمع کی ہیں۔ ان کی یہ خود اعتمادی اتنا بڑھتی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھی بے خوف ہوجاتے ہیں۔ وہ داعی حق کی اس تنبیہ کا مذاق اڑانے لگتے ہیں کہ تمھاری سرکشی جاری رہی تو تمھاری مادی ترقیاں تم کو خدا کی پکڑ سے نہ بچاسکیں گی۔ داعی حق کو ناچیز سمجھنا ان کی نظر میں داعی کی تنبیہات کو بھی ناچیز بنا دیتا ہے۔ ماضی کے وہ تاریخی واقعات بھی ان کو سبق دینے کے لیے کافی ثابت نہیں ہوتے جب کہ بڑے بڑے مادی استحکام کے باوجود خدا نے لوگوں کو اس طرح مٹا دیا جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی — زمین میں بار بار ایک قوم کا گرنا اور دوسری قوم کا ابھرنا ظاہر کرتا ہے کہ یہاں مکافات کا قانون نافذ ہے۔ مگر آدمی سبق نہیں لیتا۔ پچھلے لوگ دوبارہ اسی عمل کو دہراتے ہیں جس کی وجہ سے اگلے لوگ برباد ہوگئے۔

وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٧ وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝٨ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝٩ وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ

۷۔ اور اگر ہم تم پر ایسی کتاب اتارتے جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی اور وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے، تب بھی انکار کرنے والے یہ کہتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ ۸۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملہ کا فیصلہ ہوجاتا، پھر انھیں کوئی مہلت نہ ملتی۔ ۹۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو اس کو بھی آدمی بناتے اور ان کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب

ع سَخِرُوۡا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝١٠ قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ثُمَّ انْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝١١

پڑے ہوئے ہیں۔ ۱۰۔اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو ان میں سے جن لوگوں نے مذاق اڑایا، ان کو اس چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ ۱۱۔کہو، زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

دنیا میں آدمی کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ یہاں اس کو حق کے انکار کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔حتی کہ اس کو یہ موقع بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے افکار کی خوب صورت توجیہہ کرسکے۔امتحان کی اس دنیا میں اتنی وسعت ہے کہ یہاں الفاظ ہر اس مفہوم میں ڈھل جاتے ہیں جس میں انسان ان کو ڈھالنا چاہے۔داعی اگر ایک عام انسان کے روپ میں ظاہر ہو تو آدمی اس کو یہ کہہ کر نظر انداز کرسکتا ہے کہ یہ ایک شخص کا قیادتی حوصلہ ہے، نہ کہ کوئی حق و صداقت کا معاملہ۔اسی طرح اگر آسمان سے کوئی لکھی لکھائی کتاب اتر آئے تو اس کو رد کرنے کے لیے بھی وہ یہ الفاظ پالے گا کہ یہ تو ایک جادو ہے۔

مکہ کے لوگ کہتے تھے کہ پیغمبر اگر خدا کی طرف سے اس کی پیغام بری کے لیے مقرر کیا گیا ہے تو اس کے ساتھ خدا کے فرشتے کیوں نہیں جو اس کی تصدیق کریں۔اس قسم کی باتیں آدمی اس لیے کہتا ہے کہ وہ دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتا۔اگر وہ سنجیدہ ہو تو اس کو فوراً معلوم ہوجائے گا کہ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔امتحان اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ غیبی حقیقتوں پر پردہ پڑا ہوا ہو۔اگر غیبی حقیقتیں کھل جائیں اور خدا اور اس کے فرشتے سامنے آجائیں تو پھر پیغمبری اور دعوت رسانی کا کوئی سوال ہی نہ ہوگا۔کیوں کہ اس کے بعد کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوگی کہ وہ حقائق کا انکار کرسکے— موجودہ دنیا میں لوگ اپنی ظاہر پرستی کی وجہ سے خدا کے داعی کو اس کی باتوں کی عظمت میں نہیں دیکھ پاتے، وہ اس کا اندازہ صرف اس کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے کرتے ہیں اور ظاہری اعتبار سے غیر اہم پاکر اس کا انکار کردیتے ہیں۔حتی کہ وہ اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔خدا کے داعی کا معاملہ ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک معمولی آدمی اچانک اٹھ کر بہت بڑی حیثیت کا دعویٰ کرنے لگے۔

اس دنیا میں دعوت رسانی کا سارا معاملہ خدا کے قانون التباس کے تحت ہوتا ہے۔یہاں حق کے اوپر ایک شبہ کا پہلو رکھا گیا ہے تاکہ آدمی اقرار کے دلائل کے ساتھ کچھ انکار کے وجوہ بھی پاسکتا ہو۔آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ اس شبہ کے پردے کو پھاڑ کر اپنے کو یقین کے مقام پر پہنچائے۔وہ شبہ کے پہلوؤں کو حذف کرکے یقین کے پہلوؤں کو لے لے۔آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر مانے۔جب حقیقت کو دکھا دیا جائے تو پھر ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ قُلْ
لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ
لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ
فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَ
النَّهَارِ ۭ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ
اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّيْٓ
اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَ لَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ
اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾
مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

۱۲۔ پوچھو کہ کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کہو سب کچھ اللہ کا ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت لکھ لی ہے۔ وہ ضرور تم کو جمع کرے گا قیامت کے دن، اس میں کوئی شک نہیں۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔ ۱۳۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ٹھیرتا ہے رات میں اور جو کچھ دن میں۔ اور وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۱۴۔ کہو، کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو مددگار بناؤں جو بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اس کو کوئی نہیں کھلاتا۔ کہو مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور تم ہرگز مشرکوں میں سے نہ بنو۔ ۱۵۔ کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۱۶۔ جس شخص سے وہ اس روز ہٹا لیا گیا، اس پر اللہ نے بڑا رحم فرمایا اور یہی کھلی ہوئی کامیابی ہے۔

انسان کھلے ہوئے حق کا انکار کرتا ہے۔ وہ طاقت پا کر دوسروں کو ذلیل کرتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے ظلم کا نشانہ بناتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا انسان کو اس دنیا میں مطلق اقتدار حاصل ہے۔ کیا یہاں اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ کیا خدا کے یہاں تضاد ہے کہ اس نے بقیہ دنیا کو رحمت و معنویت سے بھر رکھا ہے اور انسان کی دنیا کو ظلم اور بے انصافی سے۔ ایسا نہیں ہے۔ جو خدا زمین و آسمان کا مالک ہے وہی خدا اس مخلوق کا مالک بھی ہے جو دن کو متحرک ہوتی ہے اور راتوں کو قرار پکڑتی ہے۔ خدا جس طرح بقیہ کائنات کے لیے سراپا رحمت ہے اسی طرح وہ انسانوں کے لیے بھی سراپا رحمت ہے۔ فرق یہ ہے کہ بقیہ دنیا میں خدا کی رحمتوں کا ظہور اول دن سے ہے اور انسان کی دنیا میں اس کی رحمتوں کا کامل ظہور قیامت کے دن ہوگا۔

انسان ارادی مخلوق ہے اور اس سے ارادی عبادت مطلوب ہے۔ اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنے ارادہ کا صحیح استعمال نہ کریں، وہ اس قابل نہیں کہ ان کو خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنایا جائے۔ کیوں کہ

انھوں نے اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا نہ کیا۔ آزمائشی مدت پوری ہونے کے بعد سارے لوگ ایک نئی دنیا میں جمع کیے جائیں گے۔ اس دن خدا اسی طرح دنیا کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گا جس طرح آج وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ اس روز خدا کے انصاف کا ترازو کھڑا ہوگا۔ اس دن وہ لوگ سرفراز ہوں گے جنھوں نے حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرکے اپنے کو خدائی اطاعت میں دے دیا۔ اور وہ لوگ گھاٹے میں رہیں گے جنھوں نے حقیقتِ واقعہ کا اعتراف نہیں کیا اور خدا کی دنیا میں سرکشی اور ہٹ دھرمی کے طریقے پر چلتے رہے۔

انسان جب بھی سرکشی کرتا ہے کسی آسرے پر کرتا ہے۔ مگر جن چیزوں کے آسرے پر انسان سرکشی کرتا ہے ان کی اس کائنات میں کوئی حقیقت نہیں۔ یہاں ہر چیز بے زور ہے، زور والا صرف ایک خدا ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس لیے فیصلہ کے دن وہی شخص بامراد ہوگا جس نے حقیقی سہارے کو اپنا سہارا بنایا ہوگا، جس نے حقیقی دین کو اپنی زندگی کے دین کی حیثیت سے اختیار کیا ہوگا۔

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا
هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ
الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ
شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ
وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ
بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً
اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾

۱۷۔ اور اگر اللہ تجھ کو کوئی دکھ پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر اللہ تجھ کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۸۔ اور اسی کا زور ہے اپنے بندوں پر۔ اور وہ حکمت والا، سب کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۱۹۔ تم پوچھو کہ سب سے بڑا گواہ کون ہے۔ کہو اللہ، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور مجھ پر یہ قرآن اترا ہے، تاکہ میں تم کو اس سے خبردار کردوں اور اس کو جسے یہ پہنچے۔ کیا تم اس کی گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں۔ کہو، میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہو، وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں بَری ہوں تمھارے شرک سے۔

ہمارے سامنے جو عظیم کائنات پھیلی ہوئی ہے اس کے مختلف اجزاء باہم اتنے زیادہ مربوط ہیں کہ یہاں کسی ایک واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے بھی پوری کائنات کی مساعدت ضروری ہے۔ اس بنا پر کوئی بھی انسان کسی واقعہ کو ظہور میں لانے پر قادر نہیں۔ کیوں کہ کوئی بھی انسان کائنات کے اوپر قابو یافتہ نہیں۔ یہاں ایک چھوٹی سی چیز بھی اس وقت وقوع میں آتی ہے جب کہ بے شمار عالمی اسباب اس کی پشت پر جمع ہو گئے ہوں۔ اور خدا کے سوا

کوئی نہیں جو ان اسباب پر حکمراں ہو۔ کائناتی اسباب کے درمیان آدمی صرف ایک حقیر ارادہ کا مالک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کو کوئی سکھ ملے یا کسی کو کوئی دکھ پہنچے، دونوں ہی براہ راست خدا کی اجازت کے تحت ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی کا یہ سوچنا بھی حماقت ہے کہ وہ کسی کو آباد یا برباد کرسکتا ہے۔ اور یہ بات بھی مضحکہ خیز حد تک بے معنی ہے کہ خدا کے سوا بھی کوئی ہے جس سے آدمی ڈرے یا خدا کے سوا بھی کوئی ہے جس سے وہ اپنی امیدیں وابستہ کرے۔

دنیا میں اہل حق اور اہل باطل کے درمیان جو کش مکش جاری ہے اس میں فیصلہ کن چیز صرف خدا کی کتاب ہے۔ خدا کے سوا کسی کو حقائق کا علم نہیں، اور خدا کے سوا کسی کو کسی قسم کا زور حاصل نہیں۔ اس لیے خدا ہی وہ ہستی ہے جو اس جھگڑے میں واحد ثالث ہے۔ اور خدا نے قرآن کی صورت میں یہ ثالث لوگوں کے درمیان رکھ دیا ہے اب آدمی کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ اگر وہ قرآن کی صداقت سے بے خبر ہے تو وہ تحقیق کر کے جانے کہ کیا واقعۃً وہ خدا کی کتاب ہے۔ اور جب وہ جان لے کہ وہ فی الواقع خدا کی کتاب ہے تو اس کو لازماً اس کے فیصلہ پر راضی ہوجانا چاہیے۔ جو آدمی قرآن کے فیصلہ پر راضی نہ ہو وہ یہ خطرہ مول لے رہا ہے کہ آخرت میں رسوائی اور عذاب کی قیمت پر اس کو اس کے فیصلہ پر راضی ہونا پڑے۔

قرآن اس لیے اتارا گیا ہے کہ فیصلہ کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو آنے والے وقت سے ہوشیار کردیا جائے۔ رسول نے یہی کام اپنے زمانہ میں کیا اور آپ کی امت کو یہی کام آپ کے بعد قیامت تک انجام دینا ہے۔ قرآن اس بات کی پیشگی اطلاع ہے کہ آخرت کی ابدی دنیا میں لوگوں کا خدا لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ پہنچانے والے اس وقت اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوجاتے ہیں جب کہ وہ اس کو پوری طرح لوگوں تک پہنچادیں۔ مگر سننے والے خدا کے یہاں اس وقت سبک دوش ہوں گے جب کہ وہ اس کو مانیں اور اس کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کریں۔ داعی کی ذمہ داری ''تبلیغ'' پر ختم ہوتی ہے اور مدعو کی ذمہ داری ''اطاعت'' پر۔

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ‌ۘ اَلَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰﴾ ع۲/۸ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ‌ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَيَوۡمَ نَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ نَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَيۡنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمۡ تَكُنۡ فِتۡنَتُهُمۡ

۲۰۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے کو گھاٹے میں ڈالا وہ اس کو نہیں مانتے۔ ۲۱۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ یقیناً ظالموں کو فلاح نہیں ملتی۔ ۲۲۔ اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم کہیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمھارے وہ شریک کہاں ہیں جن کا تم کو دعویٰ تھا۔ ۲۳۔ پھر ان کے

اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشۡرِكِيۡنَ ﴿۲۳﴾ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ كَذَبُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

پاس کوئی فریب نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ اپنے رب کی قسم، ہم شرک کرنے والے نہ تھے۔ ۲۴۔ دیکھو یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولے اور کھوئی گئیں ان سے وہ باتیں جو وہ بنایا کرتے تھے۔

حقیقت آدمی کے لیے جانی پہچانی چیز ہے۔ کیوں کہ وہ آدمی کی فطرت میں پیوست ہے اور کائنات میں ہر طرف خاموش زبان میں بول رہی ہے۔ یہود ونصاریٰ کا معاملہ اس باب میں اور بھی زیادہ آگے تھا۔ کیوں کہ ان کے انبیاء اور ان کے صحیفے ان کو قرآن اور پیغمبر آخر الزماں کے بارے میں صاف لفظوں میں پیشگی خبر دے چکے تھے، حتی کہ ان کے لیے اسے جاننا ایسا ہی تھا جیسا اپنے بیٹے کو جاننا۔

اس قدر کھلا ہوا ہونے کے باوجود انسان کیوں حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی وجہ وقتی نقصان کا اندیشہ ہے۔ حقیقت کو ماننا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑائی کے مقام سے اتارے، وہ تقلیدی ڈھانچہ سے باہر آئے، وہ ملے ہوئے فائدوں کو ترک کرے۔ آدمی یہ قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس لیے وہ حق کو بھی قبول نہیں کرتا۔ وقتی فائدے کی خاطر وہ اپنے کو ابدی گھاٹے میں ڈال دیتا ہے۔

اپنے اس موقف پر مطمئن رہنے کے لیے مزید یہ بات اس کو دھوکہ میں ڈالتی ہے کہ وہ امتحان کی اس دنیا میں ہمیشہ اپنے موافق توجیہات پانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ وہ سچائی کے حق میں ظاہر ہونے والے دلائل کو رد کرنے کے لیے جھوٹے الفاظ پالیتا ہے۔ حتی کہ یہاں اس کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ حقیقت کی خودساختہ تعبیر کرکے یہ کہہ سکے کہ سچائی عین وہی ہے جس پر میں قائم ہوں۔

جب بھی آدمی خدا کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے تو دھیرے دھیرے ان چیزوں کے گرد تائیدی باتوں کا طلسم تیار ہوجاتا ہے۔ وہ موہوم آرزوؤں اور جھوٹی تمناؤں کا ایک خودساختہ ہالہ بنالیتا ہے جو اس کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ اس نے بڑے مضبوط سہارے کو پکڑ رکھا ہے۔ مگر قیامت میں جب تمام پردے پھٹ جائیں گے اور آدمی دیکھے گا کہ خدا کے سوا تمام سہارے بالکل جھوٹے تھے تو اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راہ نہ ہوگی کہ وہ خود اپنی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگے۔ گویا اس قسم کے لوگ اس وقت خود اپنے خلاف جھوٹے گواہ بن جائیں گے۔ دنیا میں وہ جن چیزوں کے حامی بنے رہے اور جن سے منسوب ہونے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے رہے، آخرت میں خود ان کے منکر ہوجائیں گے۔ انھوں نے عقائد اور توجیہات کا جو جھوٹا قلعہ کھڑا کیا تھا وہ اس طرح ڈھ جائے گا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى
قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ
وَقْرًا ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ
حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْـَٔوْنَ
عَنْهُ ۚ وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا
يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ
فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا
وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا
كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا
لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾

۲۵۔اور ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو تمھاری طرف کان لگاتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں۔ اور ان کے کانوں میں بوجھ ہے۔ اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ تمھارے پاس تم سے جھگڑنے آتے ہیں تو وہ منکر کہتے ہیں کہ یہ تو بس پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ۲۶۔ وہ لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے الگ رہتے ہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں مگر وہ نہیں سمجھتے۔ ۲۷۔اور اگر تم ان کو اس وقت دیکھو جب وہ آگ پر کھڑے کیے جائیں گے اور کہیں گے کہ کاش ہم پھر بھیج دیے جائیں تو ہم اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔ ۲۸۔اب ان پر وہ چیز کھل گئی جس کو وہ اس سے پہلے چھپاتے تھے۔ اور اگر وہ واپس بھیج دیے جائیں تو وہ پھر وہی کریں گے جس سے وہ روکے گئے تھے۔ اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ ہر بات کی مفید مطلب توجیہ کر سکے۔ اس لیے جو لوگ تعصب کا ذہن لے کر بات سنتے ہیں ان کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے ان کے کان بند ہوں اور ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہوں۔ وہ سن کر بھی نہیں سنتے اور بتانے کے بعد بھی نہیں سمجھتے۔ دلائل اپنی ساری وضاحت کے باوجود ان کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں مجادلہ کے ذہن سے سنتے ہیں، نہ کہ نصیحت کے ذہن سے۔ ان کے اندر بات کو سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی بات کا اصل پہلو ان کے ذہن کی گرفت میں نہیں آتا۔ اس کے برعکس ہر بات کو الٹی شکل دینے کے لیے انھیں کوئی نہ کوئی چیز مل جاتی ہے۔ دلائل ان کے ذہن کا جزء نہیں بنتے۔ اپنے مخالفانہ ذہن کی وجہ سے وہ ہر بات میں کوئی ایسا پہلو نکال لیتے ہیں جس کو غلط معنی دے کر وہ اپنے آپ کو بدستور مطمئن رکھیں کہ وہ حق پر ہیں۔

جو لوگ یہ مزاج رکھتے ہوں ان کے لیے تمام دلائل بے کار ہیں۔ کیوں کہ امتحان کی اس دنیا میں کوئی بھی

دلیل ایسی نہیں جو آدمی کو اس سے روک دے کہ وہ اس کی تردید کے لیے کچھ خود ساختہ الفاظ نہ پائے۔ اگر کوئی دلیل نہ مل رہی ہو تب بھی وہ حقارت کے ساتھ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کردے گا— "یہ کون سی نئی بات ہے۔ یہ تو وہی پرانی بات ہے جو ہم بہت پہلے سے سنتے چلے آرہے ہیں"۔ اس طرح آدمی اس کی صداقت کو مان کر بھی اس کو رد کرنے کا ایک بہانہ پالے گا۔ ایسے لوگ خدا کے نزدیک دہرے مجرم ہیں۔ کیوں کہ وہ نہ صرف خود حق سے رکتے ہیں بلکہ ایک خدائی دلیل کو غلط معنی پہنا کر عام لوگوں کی نظر میں بھی اس کو مشکوک بناتے ہیں جو اتنی سمجھ نہیں رکھتے کہ باتوں کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرسکیں۔

دنیا کی زندگی میں اس قسم کے لوگ خوب بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔ دنیا میں حق کا انکار کرکے آدمی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لیے وہ غلط فہمی میں پڑا رہتا ہے۔ مگر قیامت میں جب اس کو آگ کے اوپر کھڑا کرکے پوچھا جائے گا تو ان پر ساری حقیقتیں کھل جائیں گی۔ اچانک وہ ان تمام باتوں کا اقرار کرنے لگے گا جن کو وہ دنیا میں ٹھکرا دیا کرتا تھا۔

وَ قَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا
نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا
عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ
قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع۳ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ
كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتْهُمُ
السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا
فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ
عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ
مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ
الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

۲۹۔ اور وہ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ اور ہم پھر اٹھائے جانے والے نہیں۔ ۳۰۔ اور اگر تم اس وقت دیکھتے جب کہ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔ وہ ان سے پوچھے گا: کیا یہ حقیقت نہیں ہے، وہ جواب دیں گے ہاں، ہمارے رب کی قسم، یہ حقیقت ہے۔ خدا فرمائے گا۔ اچھا تو عذاب چکھو اس انکار کے بدلے جو تم کرتے تھے۔ ۳۱۔ یقیناً وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ سے ملنے کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی ان پر اچانک آئے گی تو وہ کہیں گے ہائے افسوس، اس باب میں ہم نے کیسی کوتاہی کی اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو، کیسا برا بوجھ ہے جس کو وہ اٹھائیں گے۔ ۳۲۔ اور دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ رکھتے ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے۔

جب بھی کوئی آدمی حق کا انکار کرتا ہے یا نفس کی خواہشات پر چلتا ہے تو ایسا اس بنا پر ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر دنیا میں نہیں رہتا کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھایا جائے گا اور مالک کائنات کے سامنے حساب کتاب کے لیے کھڑا کیا جائے گا۔ دنیا میں آدمی کو اختیار ملا ہوا ہے جس کو وہ بے روک ٹوک استعمال کرتا ہے۔ اس کو مال و دولت اور دوست اور ساتھی حاصل ہیں، جن پر وہ بھروسہ کرسکتا ہے۔ اس کو عقل ملی ہوئی ہے جس سے وہ سرکشی کی باتیں سوچے اور اپنے ظالمانہ عمل کی خوبصورت توجیہہ کرسکے۔ یہ چیزیں اس کو دھوکے میں ڈالتی ہیں۔ وہ خدا کے سوا دوسری چیزوں پر جھوٹا بھروسہ کرلیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ جیسا میں آج ہوں ویسا ہی میں ہمیشہ رہوں گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں اس کو جو کچھ ملا ہوا ہے وہ بطور امتحان ہے، نہ کہ بطور استحقاق۔

اس قسم کی زندگی خواہ وہ آخرت کا انکار کرکے ہو یا انکار کے الفاظ بولے بغیر ہو، آدمی کا سب سے بڑا جرم ہے۔ جن دنیوی چیزوں کو آدمی اپنا سب کچھ سمجھ کر ان پر ٹوٹتا ہے۔ آخر کس حق کی بنا پر وہ ایسا کررہا ہے۔ آدمی جس روشنی میں چلتا ہے اور جس ہوا میں سانس لیتا ہے اس کا کوئی معاوضہ اس نے ادا نہیں کیا ہے۔ وہ جس زمین سے اپنا رزق نکالتا ہے اس کا کوئی بھی جزء اس کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ وہ تمام پسندیدہ چیزیں جن کو حاصل کرنے کے لیے آدمی دوڑتا ہے ان میں سے کوئی چیز نہیں جو اس کی اپنی ہو۔ جب یہ چیزیں انسان کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں تو جو ان تمام چیزوں کا مالک ہے کیا، اس کا آدمی کے اوپر کوئی حق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا موجودہ دنیا کو استعمال کرنا ہی لازم کردیتا ہے کہ وہ ایک روز اس کے مالک کے سامنے حساب کے لیے کھڑا کیا جائے۔

جو لوگ دنیا کو خدا کی دنیا سمجھ کر زندگی گزاریں ان کی زندگی تقویٰ کی زندگی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ اس کو خدا کی دنیا نہ سمجھیں ان کی زندگی لہو ولعب کی زندگی ہوتی ہے۔ لہولعب کی زندگی چند روز کا تماشا ہے جو مرنے کے ساتھ ختم ہوجائے گا۔ اور تقویٰ کی زندگی خدا کے ابدی اصولوں پر قائم ہے اس لیے وہ ابدی طور پر آدمی کا سہارا بنے گی۔ موجودہ دنیا میں آدمی ان حقیقتوں کا انکار کرتا ہے مگر امتحان کی آزادی ختم ہوتے ہی وہ اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہوگا اگرچہ اس وقت کا اقرار اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنْ كَانَ

۳۳۔ ہم کو معلوم ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس سے تم کو رنج ہوتا ہے۔ یہ لوگ تم کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی نشانیوں کا انکار کررہے ہیں۔

۳۴۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور تکلیف پہنچانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچ گئی۔ اور اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور

كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۳۵ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۭ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۳۶

النصف

پیغمبروں کی کچھ خبریں تم کو پہنچ ہی چکی ہیں۔ ۳۵۔ اور اگر ان کی بے رخی تم پر گراں گزر رہی ہے تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے لیے کوئی نشانی لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ بنو۔ ۳۶۔ قبول تو وہی لوگ کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور مُردوں کو اللہ اٹھائے گا پھر وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد، خدا کی قسم ہم تم کو نہیں جھٹلاتے۔ یقیناً تم ہمارے درمیان ایک سچے آدمی ہو۔ مگر ہم اس چیز کو جھٹلاتے ہیں جس کو تم لائے ہو۔ مکہ کے لوگ جو ایمان نہیں لائے وہ آپ کو ایک اچھا انسان مانتے تھے۔ مگر کسی کے متعلق یہ ماننا کہ اس کی زبان پر حق جاری ہوا ہے اس کو بہت بڑا اعزاز دینا ہے اور اتنا بڑا اعزاز دینے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ آپ کو جب وہ "سچا" یا "ایمان دار" کہتے تو ان کو یہ نفسیاتی تسکین حاصل رہتی کہ آپ ہماری ہی سطح کے ایک انسان ہیں۔ مگر اس بات کا اقرار کہ آپ کی زبان پر خدا کا کلام جاری ہوا ہے آپ کو اپنے سے اونچا درجہ دینے کے ہم معنی تھا۔ اور اس قسم کا اعتراف آدمی کے لیے مشکل ترین کام ہے۔

موجودہ دنیا میں خدا اپنی براہ راست صورت میں سامنے نہیں آتا، وہ دلائل اور نشانیوں کی صورت میں انسان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے حق کے دلائل کو نہ ماننا یا اس کے حق میں ظاہر ہونے والی نشانیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا گویا خدا کو نہ ماننا اور خدا کی طرف سے آنکھیں پھیر لینا ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہوسکتا کہ خدا مجبور کن معجزات کے ساتھ سامنے آئے۔ مجبور کن معجزات کے جلو میں خدا کی دعوت پیش کی جائے تو پھر اختیار کی آزادی ختم ہو جائے گی اور امتحان کے لیے آزادانہ اختیار کا ماحول ہونا ضروری ہے۔ داعی کو اس بات کا غم نہ کرنا چاہیے کہ اس کے ساتھ صرف دلائل کا وزن ہے، غیر معمولی قسم کی تسخیری قوتیں اس کے پاس موجود نہیں۔ داعی کو اس فکر میں پڑنے کے بجائے صبر کرنا چاہیے۔ دعوت حق کی جدوجہد ایک طرف داعی کے صبر کا امتحان ہوتی ہے اور دوسری طرف مخاطبین کے لیے اس بات کا امتحان کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان میں نمائندۂ خدا ہونے کی جھلک دیکھیں۔ وہ انسان کے منھ سے نکلے ہوئے کلام میں خدائی کلام کی عظمتوں کو پالیں، وہ مادی زور سے خالی دلائل کے آگے اس طرح جھک جائیں جس طرح وہ زور آور خدا کے آگے جھکیں گے — زندہ لوگوں کے لیے ساری کائنات نشانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور جنھوں نے اپنے احساسات کو مردہ کر لیا ہو وہ قیامت کے زلزلہ کے سوا کسی اور چیز سے سبق نہیں لے سکتے۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ
اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي
الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ
اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ
ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ
يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

۳۷۔ اور وہ کہتے ہیں کہ رسول پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتری۔ کہو، اللہ بے شک قادر ہے کہ کوئی نشانی اتارے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۳۸۔ اور جو بھی جانور زمین پر چلتا ہے اور جو بھی پرندہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہے، وہ سب تمھاری ہی طرح کے انواع ہیں۔ ہم نے لکھنے میں کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے۔ پھر سب اپنے رب کے پاس اکٹھے کیے جائیں گے۔ ۳۹۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔

ان آیات کے اختصار کو کھول دیا جائے تو پورا مضمون اس طرح ہوگا — وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ غیر معمولی نشانی کیوں نہیں، جو اس کے پیغام کے برحق ہونے کا ثبوت ہو۔ تو اللہ ہر قسم کی نشانی اتارنے پر قادر ہے۔ مگر اصل سوال نشانی کا نہیں بلکہ لوگوں کی بے علمی کا ہے۔ نشانیاں تو بے شمار تعداد میں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں جب لوگ اِن موجود نشانیوں سے سبق نہیں لے رہے ہیں تو کوئی نئی نشانی اتارنے سے وہ کیا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ طرح طرح کے چلنے والے جانور اور مختلف قسم کے اڑنے والی چڑیاں جو زمین میں اور فضا میں موجود ہیں وہ تمھارے لیے نشانیاں ہی تو ہیں۔ ان تمام زندہ مخلوقات سے بھی اللہ کو وہی کچھ مطلوب ہے جو تم سے مطلوب ہے۔ اور ہر ایک سے جو کچھ مطلوب ہے وہ خدا نے اس کے لیے لکھ دیا ہے، انسان کو شرعی طور پر اور دوسری مخلوقات کو جبلّی طور پر۔ چڑیوں اور جانوروں جیسی مخلوقات خدا کے لکھے پر پورا پورا عمل کر رہی ہے۔ مگر انسان خدا کے لکھے کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے یہ معاملہ نشانی کا نہیں بلکہ اندھے پن کا ہے، بقیہ تمام مخلوقات جو دین اختیار کیے ہوئے ہیں، انسان کے لیے اس کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنے کا جواز کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کو عمل کرنا ہے وہ نشانی کا مطالبہ کیے بغیر عمل کر رہے ہیں اور جن کو عمل کرنا نہیں ہے وہ نشانیوں کے ہجوم میں رہ کر نشانیاں مانگ رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام یہی ہے کہ قیامت میں سب کو جمع کر کے دکھا دیا جائے کہ ہر قسم کے حیوانات کس طرح حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کر کے خدا کے راستہ پر چل رہے تھے۔ یہ صرف انسان تھا جو اس سے انحراف کرتا رہا۔

جانوروں کی دنیا مکمل طور پر مطابق فطرت دنیا ہے۔ ان کے یہاں رزق کی تلاش ہے مگر لوٹ اور ظلم نہیں ہے۔ ان کے یہاں ضرورت ہے مگر حرص اور خود غرضی نہیں۔ ان کے یہاں باہمی تعلقات ہیں مگر ایک دوسرے کی

کاٹ نہیں۔ ان کے یہاں اونچ نیچ ہے مگر حسد اور غرور نہیں۔ ان کے یہاں ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے مگر بغض وعداوت نہیں۔ ان کے یہاں کام ہورہے ہیں مگر انھیں کریڈٹ لینے کا شوق نہیں۔ مگر انسان سرکشی کرتا ہے۔ وہ خدائی نقشہ کا پابند بننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ انسان سے جس چیز کا مطالبہ ہے وہ ٹھیک وہی ہے جس پر دوسرے حیوانات قائم ہیں۔ پھر اس کے لیے معجزہ مانگنے کی کیا ضرورت۔ حیوانات کی صورت میں چلتی پھرتی نشانیاں کیا آدمی کے سبق کے لیے کافی نہیں ہیں جو خدائی طریق عمل کا زندہ نمونہ پیش کررہی ہیں اور اس طرح پیغمبر کی تعلیمات کے برحق ہونے کی عملی تصدیق کرتی ہیں۔

قُلۡ اَرَءَیۡتَكُمۡ اِنۡ اَتٰىكُمۡ عَذَابُ اللّٰهِ اَوۡ اَتَتۡكُمُ السَّاعَةُ اَغَيۡرَ اللّٰهِ تَدۡعُوۡنَ ۚ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝٤٠ بَلۡ اِيَّاهُ تَدۡعُوۡنَ فَيَكۡشِفُ مَا تَدۡعُوۡنَ اِلَيۡهِ اِنۡ شَآءَ وَتَنۡسَوۡنَ مَا تُشۡرِكُوۡنَ ۝٤١ ع

۴۰۔ کہو، یہ بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے یا قیامت آجائے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے۔ بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ ۴۱۔ بلکہ تم اسی کو پکارو گے۔ پھر وہ دور کردیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو، اگر وہ چاہتا ہے۔ اور تم بھول جاتے ہو ان کو جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔

ابوجہل کے لڑکے عکرمہ اسلام کے سخت دشمن تھے۔ وہ فتح مکہ تک اسلام کے مخالف بنے رہے۔ فتح مکہ کے دن انھوں نے ایک مسلمان کو تیر مار کر ہلاک کردیا تھا۔ عکرمہ ان اشخاص میں تھے جن کے متعلق فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ جہاں ملیں قتل کردیے جائیں۔

مکہ جب فتح ہوگیا تو عکرمہ مکہ چھوڑ کر جدہ کی طرف بھاگے۔ انھوں نے چاہا کہ کشتی کے ذریعہ بحر قلزم پار کرکے حبش پہنچ جائیں۔ مگر وہ کشتی میں سوار ہو کر سمندر میں پہنچے تھے کہ تند ہواؤں نے کشتی کو گھیر لیا۔ کشتی خطرہ میں پڑ گئی۔ کشتی کے مسافر سب مشرک لوگ تھے۔ انھوں نے لات اور عزیٰ وغیرہ اپنے بتوں کو مدد کے لیے پکارنا شروع کیا۔ مگر طوفان کی شدت بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ مسافروں کو یقین ہوگیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی۔ اب کشتی والوں نے کہا کہ اس وقت لات وعزیٰ کچھ کام نہ دیں گے۔ اب صرف ایک خدا کو پکارو، وہی تم کو بچا سکتا ہے۔ چنانچہ سب ایک خدا کو پکارنے لگے۔ اب طوفان تھم گیا اور کشتی واپس اپنے ساحل پر آگئی۔ عکرمہ پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم، دریا میں اگر کوئی چیز خدا کے سوا کام نہیں آسکتی تو یقیناً خشکی میں بھی خدا کے سوا کوئی دوسری چیز کام نہیں آسکتی۔ خدایا میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو نے مجھ کو اس سے نجات دے دی جس میں اس وقت میں پھنسا ہوا ہوں تو میں ضرور محمد کے یہاں جاؤں گا اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں ان کو معاف کرنے والا درگزر کرنے والا اور مہربان پاؤں گا (اللَّهُمَّ إِنَّ لَكَ عَلَيَّ عَهْدًا إِنْ أَنْتَ عَافَيْتَنِي مِمَّا أَنَا فِيهِ أَنْ آتِيَ مُحَمَّدًا - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - حَتَّى أَضَعَ يَدِي فِي يَدِهِ،

فَلَأَجِدَنَّهُ عَفُوًّا كَرِيمًا) سنن النسائی، حدیث نمبر 4067۔

ساری تاریخ کا یہ مشاہدہ ہے کہ انسان نازک لمحات میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔حتی کہ وہ شخص بھی جو عام زندگی میں خدا کے سوا دوسروں پر بھروسہ کیے ہو یا سرے سے خدا کو مانتا نہ ہو۔ یہ خدا کے وجود اور اس کے قادر مطلق ہونے کی فطری شہادت ہے۔غیر معمولی حالات میں جب ظاہری پردے ہٹ جاتے ہیں اور آدمی تمام مصنوعی خیالات کو بھول چکا ہوتا ہے اس وقت آدمی کو خدا کے سوا کوئی چیز یاد نہیں آتی۔ بالفاظ دیگر، مجبوری کے نقطہ پر پہنچ کر ہر آدمی خدا کا اقرار کر لیتا ہے، قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ یہی اقرار اور اطاعت آدمی اس وقت کرنے لگے جب کہ بظاہر مجبور کرنے والی کوئی چیز اس کے سامنے موجود نہ ہو۔

بقیہ حیوانات اپنی جبلّت کے تحت حقیقت پسندانہ زندگی گزار رہے ہیں۔مگر انسان کو جو چیز حقیقت پسندی اور اعتراف کی سطح پر لاتی ہے وہ خوف کی نفسیات ہے۔حیوانات کی دنیا میں جو کام جبلت کرتی ہے، انسان کی دنیا میں وہی کام تقویٰ انجام دیتا ہے۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَاَخَذۡنٰہُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّہُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوۡ لَاۤ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا وَ لٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُکِّرُوۡا بِہٖ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ اَبۡوَابَ کُلِّ شَیۡءٍ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰہُمۡ بَغۡتَۃً فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۲۔ اور تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے۔ پھر ہم نے ان کو پکڑا سختی میں اور تکلیف میں تا کہ وہ گڑ گڑائیں۔ ۴۳۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ وہ گڑ گڑائے، بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور شیطان ان کے عمل کو ان کی نظر میں خوش نما کر کے دکھاتا رہا۔ ۴۴۔ پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر خوش ہو گئے جو انھیں دی گئی تھی تو ہم نے اچانک ان کو پکڑ لیا۔ اس وقت وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔ ۴۵۔ پس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور ساری تعریف اللہ کے لیے ہے، تمام جہانوں کا رب۔

آدمی کے سامنے ایک حق آتا ہے اور وہ اس کو نہیں مانتا تو اللہ اس کو فوراً نہیں پکڑتا۔ بلکہ اس کو مالی نقصان اور جسمانی تکلیف کی صورت میں کچھ جھٹکے دیتا ہے، تا کہ اس کی سوچنے کی صلاحیت بیدار رہو اور وہ اپنے رویہ کے بارے میں نظر ثانی کرے۔زندگی کے حوادث محض حوادث نہیں ہیں، وہ خدا کے بھیجے ہوئے محسوس پیغامات

ہیں جو اس لیے آتے ہیں تا کہ غفلت میں سوئے ہوئے انسان کو جگائیں۔ مگر آدمی اکثر ان چیزوں سے نصیحت نہیں لیتا۔ وہ یہ کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیتا ہے کہ یہ تو اتار چڑھاؤ کے واقعات ہیں اور اس قسم کے اتار چڑھاؤ زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ اس طرح ہر موقع پر شیطان کوئی خوش نما توجیہہ پیش کر کے آدمی کے ذہن کو نصیحت کے بجائے غفلت کی طرف پھیر دیتا ہے۔ آدمی جب بار بار ایسا کرتا ہے تو حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں اس کے دل کی حساسیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ قساوت (بے حسی) کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب آدمی خدا کی طرف سے آئی ہوئی تنبیہات کو نظر انداز کر دے تو اس کے بعد اس کے بارے میں خدا کا انداز بدل جاتا ہے۔ اب اس کے لیے خدا کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر آسانیوں اور کامیابیوں کے دروازے کھولے جائیں۔ اس پر خوش حالی کی بارش کی جائے۔ اس کی عزت و مقبولیت میں اضافہ کیا جائے۔ یہ درحقیقت ایک سزا ہے، جو اس لیے ہوتی ہے تا کہ آدمی مطمئن ہو کر اپنی بے حسی کو اور بڑھا لے، وہ حق کو نظر انداز کرنے میں اور زیادہ ڈھیٹ ہو جائے اور اس طرح خدا کی سزا کا استحقاق اس کے لیے پوری طرح ثابت ہو جائے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو اس کے بعد اچانک اس پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس کو دنیوی زندگی سے محروم کر کے آخرت کی عدالت میں حاضر کر دیا جاتا ہے تا کہ اس کی سرکشی کی سزا میں اس کے لیے جہنم کا فیصلہ ہو۔

یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ یہاں ہر قسم کی بڑائی اور تعریف کا حق صرف ایک ذات کے لیے ہے۔ اس لیے جب کوئی شخص خدا کی طرف سے آئے ہوئے حق کو نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ دراصل خدا کی ناقدری کرتا ہے۔ وہ خدا کی عظمتوں کی دنیا میں اپنی عظمت قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایسا ظلم کرتا ہے جس سے بڑا کوئی ظلم نہیں۔ وہ اس خدا کے سامنے گستاخی کرتا ہے جس کے سامنے عجز کے سوا کوئی اور رویہ کسی انسان کے لیے درست نہیں۔

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَاَبۡصَارَكُمۡ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِهٖ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ ثُمَّ هُمۡ يَصۡدِفُوۡنَ ﴿۴۶﴾ قُلۡ اَرَءَيۡتَكُمۡ اِنۡ اَتٰٮكُمۡ عَذَابُ اللّٰهِ بَغۡتَةً اَوۡ جَهۡرَةً هَلۡ يُهۡلَكُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ ۚ فَمَنۡ اٰمَنَ وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ

۴۶۔ کہو، یہ بتاؤ کہ اللہ اگر چھین لے تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اس کو واپس لائے۔ دیکھو ہم کیوں کر طرح طرح سے نشانیاں بیان کرتے ہیں، پھر بھی وہ اعراض کرتے ہیں۔ ۴۷۔ کہو، یہ بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تمھارے اوپر اچانک یا اعلانیہ آجائے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا۔ ۴۸۔ اور رسولوں کو ہم صرف خوش خبری دینے والے یا ڈرانے والے کی حیثیت سے بھیجتے ہیں۔ پھر جو ایمان لایا اور اپنی اصلاح کی تو ان کے

عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ﴿٤٩﴾ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ
خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ
لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى
اِلَيَّ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۗ
اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٥٠﴾ ع ٥

لیے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۴۹۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو ان کو عذاب پکڑ لے گا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ ۵۰۔ کہو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ کہو، کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ کیا تم غور نہیں کرتے۔

آدمی کو کان اور آنکھ اور دل جیسی صلاحیتیں دینا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا خالق اس سے کیا چاہتا ہے۔ خالق یہ چاہتا ہے کہ آدمی بات کو سنے اور دیکھے، وہ عقلی دلیل سے اس کو مان لے۔ اگر آدمی اپنی ان خداداد صلاحیتوں سے وہ کام نہ لے جو اس سے مقصود ہے تو گویا وہ اپنے کو اس خطرہ میں ڈال رہا ہے کہ اس کو نااہل قرار دے کر یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں۔ کس قدر محروم ہے وہ شخص جس کو اندھا اور بہرا اور بے عقل بنا دیا جائے۔ کیوں کہ ایسا آدمی دنیا میں بالکل ذلیل اور بے قیمت ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس سے بھی بڑی محرومی یہ ہے کہ آدمی کے پاس بظاہر کان ہوں مگر وہ حق کو سننے کے لیے بہرے ہو جائیں۔ بظاہر آنکھ ہو مگر وہ حق کو دیکھنے کے لیے اندھی ہو۔ سینہ میں دل موجود ہو مگر وہ حق کو سمجھنے کی استعداد سے خالی ہو جائے۔ چھیننے کی یہ قسم پہلی قسم سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ کیوں کہ وہ آدمی کو آخرت کے اعتبار سے ذلیل اور بے قیمت بنا دیتی ہے جس سے بڑی محرومی کوئی دوسری نہیں۔

آدمی کو انکار حق کے انجام سے ڈرایا جائے تو ڈھیٹ آدمی بے خوفی کا جواب دیتا ہے۔ دنیا میں اپنے معاملات کو درست دیکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کے اپنے لیے نہیں ہے۔ حتی کہ جو زیادہ ڈھیٹ ہیں وہ حق کے داعی سے کہتے ہیں کہ تم اگر سچے ہو تو عذاب کو لا کر دکھاؤ۔ وہ نہیں سمجھتے کہ خدا کا عذاب آیا تو وہ خود انھیں کے اوپر پڑے گا، نہ کہ کسی دوسرے کے اوپر۔

اللہ کا داعی منذر اور مبشر بن کر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر، آدمی کا امتحان خدا کے یہاں جس بنیاد پر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی آگاہی کی زبان میں حق کو پہچانے اور اپنی اصلاح کر لے۔ اگر اس نے آگاہی کی زبان میں حق کو نہ پہچانا اور اس کو ماننے کے لیے طلسمات وعجائبات کا مطالبہ کیا تو گویا وہ اندھے پن کا ثبوت دے رہا ہے اور اندھوں کے لیے خدا کی اس دنیا میں بھٹکنے اور برباد ہونے کے سوا کوئی انجام نہیں۔

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

۵۱۔اور تم اس وحی کے ذریعہ سے ڈراؤ ان لوگوں کو جو اندیشہ رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے اس حال میں کہ اللہ کے سوا نہ ان کا کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا، شاید کہ وہ اللہ سے ڈریں۔ ۵۲۔اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کرو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ تم پر نہیں اور تمھارے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ ان پر نہیں کہ تم ان کو اپنے سے دور کر کے بے انصافوں میں سے ہو جاؤ۔ ۵۳۔اور اس طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے، تا کہ وہ کہیں کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل ہوا ہے۔ کیا اللہ شکر گزاروں سے خوب واقف نہیں۔

نصیحت ہمیشہ ان لوگوں کے لیے کارگر ہوتی ہے جو اندیشہ کی نفسیات میں جیتے ہوں۔ جس کو کسی چیز کا کھٹکا لگا ہوا ہو اسی کو خطرے سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس، جو لوگ بے خوفی کی نفسیات میں جی رہے ہوں وہ کبھی نصیحت کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتے، اس لیے وہ نصیحت کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔

بے خوفی کی نفسیات پیدا ہونے کا سبب عام طور پر دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک، دنیا پرستی، دوسری اکابر پرستی۔ جو لوگ دنیا کی چیزوں میں گم ہوں یا دنیا کی کوئی کامیابی پا کر اس پر مطمئن ہو گئے ہوں، حتی کہ انھیں یہ بھی یاد نہ رہتا ہو کہ ایک روز ان کو مر کر خالق و مالک کے سامنے حاضر ہونا ہے، ایسے لوگ آخرت کو کوئی قابل لحاظ چیز نہیں سمجھتے۔ اس لیے آخرت کی یاددہانی ان کے ذہن میں اپنی جگہ حاصل نہیں کرتی۔ ان کا مزاج ایسی باتوں کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو آخرت کے معاملہ کو سفارش کا معاملہ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ جن بڑوں کے ساتھ انھوں نے اپنے کو وابستہ کر رکھا ہے وہ آخرت میں ان کے مددگار اور سفارشی بن جائیں گے اور کسی بھی ناموافق صورتِ حال میں ان کی طرف سے کافی ثابت ہوں گے۔ ایسے لوگ اس بھروسہ پر جی رہے ہوتے ہیں کہ انھوں نے مقدس ہستیوں کا دامن تھام رکھا ہے، وہ خدا کے محبوب و مقبول گروہ کے ساتھ

شامل ہیں اس لیے اب ان کا کوئی معاملہ بگڑنے والا نہیں ہے۔ یہ نفسیات ان کو آخرت کے بارے میں نڈر بنا دیتی ہے، وہ کسی ایسی بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو آخرت میں ان کی حیثیت کو مشتبہ کرنے والی ہو۔

جو لوگ مصلحتوں کی رعایت کر کے دولت و مقبولیت حاصل کیے ہوئے ہوں وہ کبھی حق کی بے آمیز دعوت کا ساتھ نہیں دیتے۔ کیوں کہ حق کا ساتھ دینا ان کے لیے یہ معنی رکھتا ہے کہ اپنی مصلحتوں کے بنے بنائے ڈھانچہ کو توڑ دیا جائے۔ پھر جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حق کے گرد معمولی حیثیت کے لوگ جمع ہیں تو یہ صورت حال ان کے لیے اور زیادہ فتنہ بن جاتی ہے۔ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ساتھ دے کر وہ اپنی حیثیت کو گرا لیں گے۔ وہ حق کو حق کی کسوٹی پر نہ دیکھ کر اپنی کسوٹی پر دیکھتے ہیں اور جب حق ان کی اپنی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو وہ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ ع ۶ ۵ ۱۲

۵۴۔ اور جب تمھارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے ہیں تو ان سے کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔ تمھارے رب نے اپنے اوپر رحمت لکھ لی ہے۔ بے شک تم میں سے جو کوئی نادانی سے برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد وہ توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۵۵۔ اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں، اور تاکہ مجرمین کا طریقہ ظاہر ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک قسم کے لوگ وہ تھے جو آپ کی صداقت پر معجزے طلب کرتے رہے۔ دوسرے لوگ وہ تھے جو قرآن کی آیات کو سن کر آپ کے مومن بن گئے۔ یہی امتحان ہر زمانہ میں انسان کے ساتھ جاری ہے۔ موجودہ دنیا میں خدا خود سامنے نہیں آتا، وہ داعی کی زبان سے اپنے دلائل کا اعلان کراتا ہے، وہ اپنی صداقت کو لفظوں کے روپ میں ڈھال کر انسان کے سامنے لاتا ہے۔ اب جس کی فطرت زندہ ہے وہ انھیں دلائل میں خدا کا جلوہ دیکھ لیتا ہے اور اس کا اقرار کر کے اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جنھوں نے اپنی فطرت پر مصنوعی پردے ڈال رکھے ہیں، وہ ''الفاظ'' کے روپ میں خدا کو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ خدا کو اس کی استدلالی صورت میں دیکھ نہیں پاتے اس لیے چاہتے ہیں کہ خدا اپنی مشاہداتی صورت میں ان کے سامنے آئے۔ مگر موجودہ امتحان کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہاں وہی شخص خدا کو پائے گا جو خدا کو حالتِ غیب میں پا لے، جو شخص خدا کو حالتِ شہود میں دیکھنے پر اصرار کرے، اس کا انجام خدا کی اس دنیا میں محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو لوگ اپنی کجی کی وجہ سے حق سے دور رہتے ہیں وہ حق کو قبول کرنے والوں پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں تا کہ ان کے مقابلہ میں اپنے کو بہتر ثابت کرسکیں۔ ان کو اپنے جرائم نظر نہیں آتے۔ البتہ حق پرستوں سے اگر کبھی کوئی غلطی ہوگئی تو اس کو خوب بڑھا کر بیان کرتے ہیں، تا کہ یہ ظاہر ہو کہ جو لوگ اس دعوت کے گرد جمع ہیں وہ قابل اعتبار لوگ نہیں ہیں۔ حالاں کہ اصل صورت حال اس کے برعکس ہے۔ جن لوگوں نے ناحق کو چھوڑ کر حق کو قبول کیا ہے انھوں نے اپنے اس عمل سے ایمان واصلاح کے راستہ پر چلنے کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح وہ خدا کے قانون کے مطابق اس کے مستحق ہوگئے کہ انھیں اصلاح حال کی توفیق ملے اور وہ خدا کی رحمتوں میں اپنا حصہ پائیں۔ اس کے برعکس جو لوگ حق سے دور پڑے ہوئے ہیں وہ اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ ایمان واصلاح کا طریقہ اختیار کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ خدا کی توفیق سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی ڈھٹائی کبھی ختم نہیں ہوتی اور ڈھٹائی ہی خدا کی اس دنیا میں کسی کا سب سے بڑا جرم ہے۔

خدا ''نشانیوں'' کی زبان میں بولتا ہے۔ نشانیاں اس شخص کے لیے کار آمد ہوتی ہیں جو ان کو پڑھنا چاہے۔ اسی طرح ہدایت اسی کو ملے گی جو اس کا طالب ہو۔ جو شخص ہدایت کی طلب نہ رکھتا ہو اس کے لیے خدا کی اس دنیا میں بھٹکنے کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَاۗءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّىْ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۭ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

۵۶۔ کہو، مجھے اس سے روکا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ کہو، میں تمھاری خواہشوں کی پیروی نہیں کرسکتا۔ اگر میں ایسا کروں تو میں بے راہ ہوجاؤں گا اور میں راہ پانے والوں میں سے نہ رہوں گا۔ ۵۷۔ کہو میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اس کو جھٹلا دیا ہے۔ وہ چیز میرے پاس نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو۔ فیصلہ کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ وہی حق کو بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۵۸۔ کہو، اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو تو میرے اور تمھارے درمیان معاملے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔

خدا کے سوا جس چیز کو آدمی معبود کا درجہ دیتا ہے وہ اس کی ایک خواہش ہوتی ہے جس کو وہ واقعہ فرض کرلیتا

ہے۔ کبھی اپنی بے عملی کے انجام سے بچنے کے لیے وہ کسی کو خدا کا مقرب یقین کر لیتا ہے جو خدا کے یہاں اس کا مددگار اور سفارشی بن جائے۔ کبھی وہ ایک شخصیت کے حق میں طلسماتی عظمت کا تصور قائم کر لیتا ہے تا کہ اپنے کو اس سے منسوب کر کے اپنے چھوٹے پن کی تلافی کر سکے۔ کبھی اپنی سہل پسندی کی وجہ سے وہ ایسا خدا گھڑ لیتا ہے جو سستی قیمت پر مل جائے اور معمولی معمولی چیزوں سے جس کو خوش کیا جا سکے۔

مگر اس قسم کی تمام چیزیں محض مفروضات ہیں اور مفروضات کسی کو حقیقت تک نہیں پہنچا سکتے۔ تاہم آدمی اپنی سستی طلب میں کبھی اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ خود ان لوگوں کو چیلنج کرنے لگتا ہے جنھوں نے کائنات کے حقیقی مالک کی طرف اپنے کو کھڑا کر رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ساری بڑائی اگر اسی ایک خدا کے لیے ہے جس کے تم نمائندہ ہو تو ہم جیسے نافرمانوں پر اس کا عتاب نازل کر کے دکھاؤ۔ یہ جرأت ان کو اس لیے ہوتی ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ توحید کے داعیوں کے مقابلہ میں ان کے اپنے گرد زیادہ دنیوی رونقیں جمع ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ مادی چیزیں ان کو دنیا داری اور مصلحت پرستی کی بنا پر ملی ہیں اور توحید کے داعی جو ان چیزوں سے خالی ہیں وہ اس لیے خالی ہیں کہ ان کی آخرت پسندی نے ان کو مصلحت پرستی کی سطح پر آنے سے روکے رکھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ آدمی کے مادی حالات کیا ہیں۔ بلکہ یہ کہ وہ حقیقی دلیل پر کھڑا ہوا ہے یا مفروضات اور خوش گمانیوں پر۔ بالآخر وہی شخص کامیاب ہوگا جو واقعی دلیل پر کھڑا ہو۔ جو لوگ مفروضات پر کھڑے ہوئے ہیں ان کا آخری انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی اس دنیا میں بالکل بے سہارا ہو کر رہ جائیں۔ جس دنیا کا سارا نظام محکم قوانین پر چل رہا ہو اس کا آخری انجام خوش خیالیوں کے تابع کیوں کر ہو جائے گا۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿59﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

۵۹۔ اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، اس کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ خشکی میں اور سمندر میں ہے۔ اور درخت سے گرنے والا کوئی پتہ نہیں جس کا اس کو علم نہ ہو اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں گرتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر سب ایک کھلی ہوئی کتاب میں درج ہے۔ ۶۰۔ اور وہی ہے جو رات میں تم کو وفات دیتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے۔ پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں تا کہ مقررہ مدت پوری ہو جائے۔ پھر اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے۔ پھر وہ تم کو باخبر کر دے گا اس

ع ۱۴ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۰﴾ وَ هُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ وَ
يُرۡسِلُ عَلَيۡكُمۡ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ
اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا وَهُمۡ لَا
يُفَرِّطُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ مَوۡلٰٮهُمُ
الۡحَـقِّ ؕ اَلَا لَهُ الۡحُكۡمُ قف وَهُوَ اَسۡرَعُ
الۡحٰسِبِيۡنَ ﴿۶۲﴾

سے جو تم کرتے رہے ہو۔ ۶۱۔ اور وہ غالب ہے اپنے بندوں کے اوپر اور وہ تمھارے اوپر نگراں بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی روح قبض کرلیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ ۶۲۔ پھر سب، اللہ، اپنے مالکِ حقیقی کی طرف واپس لائے جائیں گے۔ سن لو، حکم اسی کا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

خدا نے یہ دنیا اس طرح بنائی ہے کہ وہ ان حقیقتوں کی عملی تصدیق بن گئی ہے جن کی طرف انسان کو دعوت دی جارہی ہے۔ اگر آدمی اپنی آنکھوں کو بند نہ کرے اور اپنی عقل پر مصنوعی پردے نہ ڈالے تو پوری کائنات اس کو قرآن کی فکری دعوت کا عملی مظاہرہ دکھائی دے گی۔

درخت کے تنہ میں شاخ نکلتی ہے اور شاخ میں پتے۔ مگر دونوں کے جوڑوں میں فرق ہوتا ہے۔ گویا کہ بنانے والے کو معلوم ہے کہ شاخ کو اپنے تنے سے جڑا رہنا ہے اور پتہ کو الگ ہو کر گرجانا ہے۔ اگر شاخ کی جڑ کے مقابلہ میں پتہ کی جڑ میں یہ انفرادی خصوصیت نہ ہو تو پتہ شاخ سے جدا نہ ہو اور درخت کو ہر سال نئی زندگی دینے کا نظام ابتر ہوجائے۔ اسی طرح جب ایک دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے تو زمین میں پہلے سے اس کے لیے وہ تمام ضروری خوراک موجود ہوتی ہے جس سے رزق پا کر وہ بڑھتا ہے اور بالآخر پورا درخت بنتا ہے۔ اب کیسے ممکن ہے کہ جو خدا پتہ اور دانہ تک کے احوال سے باخبر ہو وہ انسانوں کے احوال سے بے خبر ہوجائے۔

ہماری زمین ساری کائنات میں ایک انوکھا واقعہ ہے۔ یہاں کا نظام استثنائی طور پر انسان جیسی ایک مخلوق کے حسب حال بنایا گیا ہے۔ زمین کے اندر کا ایک بڑا حصہ آگ ہے مگر وہ پھٹ نہیں پڑتا۔ سورج انتہائی صحیح حسابی فاصلہ پر ہے، وہ اس سے نہ دور جاتا ہے اور نہ قریب ہوتا ہے۔ آدمی کو ہر وقت ہوا اور پانی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہوا کو گیس کی شکل میں ہر جگہ پھیلا دیا گیا ہے اور پانی کو رقیق سیال کی صورت میں زمین کے نیچے رکھ دیا گیا ہے۔ اس قسم کے بے شمار انتظامات ہیں جن کو زمین پر مسلسل برقرار رکھا جاتا ہے۔ اگر ان میں معمولی فرق آجائے تو انسان کے لیے زمین پر زندگی گزارنا ناممکن ہوجائے۔

نیند بڑی عجیب چیز ہے۔ آدمی چلتا پھرتا ہے۔ وہ دیکھتا اور بولتا ہے۔ مگر جب وہ سوتا ہے تو اس کے تمام حواس اس طرح معطل ہوجاتے ہیں جیسے زندگی اس سے نکل گئی ہو۔ اس کے بعد جب وہ نیند پوری کرکے اٹھتا ہے تو وہ پھر ویسا ہی انسان ہوتا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ یہ گویا زندگی اور موت کی تمثیل ہے۔ یہ معاملہ ہمارے لیے اس بات کو قابل فہم بنا دیتا ہے کہ آدمی کس طرح مرے گا اور کس طرح وہ دوبارہ زندہ ہو کر کھڑا کیا جائے گا۔ یہ

واقعات ثابت کرتے ہیں کہ سارے انسان خدا کے اختیار میں ہیں اور جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا اپنے اختیار کے مطابق ان کا فیصلہ کرے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾

۶۳۔ کہو، کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے، تم اس کو پکارتے ہو عاجزی سے اور چپکے چپکے کہ اگر خدا نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکرگزار بندوں میں سے بن جائیں گے۔ ۶۴۔ کہو، خدا ہی تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور ہر تکلیف سے، پھر بھی تم شرک کرنے لگتے ہو۔ ۶۵۔ کہو، خدا قادر ہے اس پر کہ وہ تم پر کوئی عذاب بھیج دے تمھارے اوپر سے یا تمھارے پیروں کے نیچے سے یا تم کو گروہ گروہ کر کے ایک کو دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو، ہم کس طرح دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔ ۶۶۔ اور تمھاری قوم نے اس کو جھٹلا دیا ہے حالاں کہ وہ حق ہے۔ کہو، میں تمھارے اوپر داروغہ نہیں ہوں۔ ۶۷۔ ہر خبر کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم جلد ہی جان لوگے۔

انسان کو اس دنیا میں جتنی مصیبتیں پیش آتی ہیں اتنی کسی بھی دوسرے جان دار کو پیش نہیں آتی۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے، تاکہ آدمی پر ایسے حالات طاری کیے جائیں جب کہ اس کے اندر سے تمام مصنوعی خیالات ختم ہو جائیں اور آدمی اپنی اصل فطرت کو دیکھ سکے۔ چنانچہ جب بھی آدمی پر کوئی کڑی مصیبت پڑتی ہے تو وہ یکسو ہو کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن سے تمام بناوٹی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ جان لیتا ہے کہ اس دنیا میں انسان تمام تر عاجز ہے اور ساری قدرت صرف خدا کو حاصل ہے۔ مگر جیسے ہی مصیبت کے حالات ختم ہوتے ہیں وہ بدستور غفلت کا شکار ہو کر ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا۔

شرک کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کسی دوسری چیز پر اعتماد کرنا ہے اور توحید یہ ہے کہ آدمی کا سارا اعتماد اللہ پر ہو جائے۔ شرک کی ایک صورت وہ ہے جو بتوں اور دوسرے مظاہر پرستش کے ساتھ پیش آتی ہے۔ مگر شکر کے بجائے ناشکری کا رویہ اختیار کرنا بھی شرک ہے۔ شرک کی زیادہ عام صورت یہ ہے کہ

آدمی خود اپنے کو بت بنالے، وہ اپنے آپ پر اعتماد کرنے لگے۔ آدمی جب اکڑ کر چلتا ہے تو گویا وہ اپنے جسم وجان پر اعتماد کررہا ہے۔ آدمی جب اپنی کمائی کو اپنی کمائی سمجھتا ہے تو گویا وہ اپنی قابلیت پر بھروسہ کررہا ہے۔ آدمی جب ایک حق کو نظر انداز کرتا ہے تو گویا وہ سمجھتا ہے کہ میں جو بھی کروں، کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ آدمی جب کسی کے اوپر ظلم کرنے میں جری ہوتا ہے تو اس وقت اس کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میں اس کے اوپر اختیار رکھتا ہوں، اس کے حق میں اپنی مَن مانی کرنے سے مجھے کوئی روکنے والا نہیں۔ یہ ساری صورتیں گھمنڈ کی صورتیں ہیں اور گھمنڈ خدا کے نزدیک سب سے بڑا شرک ہے۔ کیوں کہ یہ اپنے آپ کو خدا کے مقام پر رکھنا ہے۔

آدمی اگر اپنے حال پر سوچے تو وہ گھمنڈ نہ کرے۔ وہ ایسی ہواؤں سے گھرا ہوا ہے جو کسی بھی وقت طوفان کی صورت اختیار کرکے اس کی زندگی کو تہس نہس کرسکتی ہیں۔ وہ ایسی زمین پر کھڑا ہوا ہے جو کسی بھی لمحہ زلزلہ کی صورت میں پھٹ سکتی ہے۔ وہ جس سماج میں رہتا ہے اس میں ہر وقت اتنی عداوتیں موجود رہتی ہیں کہ ایک چنگاری پورے سماج کو خاک وخون کے حوالے کرنے کے لیے کافی ہے۔

وَ اِذَا رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ يَخُوۡضُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا
فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰى يَخُوۡضُوۡا فِىۡ حَدِيۡثٍ
غَيۡرِهٖ‌ ؕ وَ اِمَّا يُنۡسِيَنَّكَ الشَّيۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ
بَعۡدَ الذِّكۡرٰى مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۶۸﴾ وَ مَا
عَلَى الَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ وَّ
لٰـكِنۡ ذِكۡرٰى لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۶۹﴾ وَذَرِ الَّذِيۡنَ
اتَّخَذُوۡا دِيۡنَهُمۡ لَعِبًا وَّ لَهۡوًا وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ
الدُّنۡيَا وَذَكِّرۡ بِهٖۤ اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا كَسَبَتۡ ‌ۖ
لَيۡسَ لَهَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ‌ ۚ وَاِنۡ
تَعۡدِلۡ كُلَّ عَدۡلٍ لَّا يُؤۡخَذۡ مِنۡهَا‌ ؕ اُولٰٓـئِكَ
الَّذِيۡنَ اُبۡسِلُوۡا بِمَا كَسَبُوۡا‌ ۚ لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ

۶۸۔ اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں عیب نکالتے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تم کو بھلادے تو یاد آنے کے بعد ایسے بے انصاف لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ ۶۹۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، ان پر ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری نہیں، البتہ یاد دلانا ہے شاید کہ وہ بھی ڈریں۔ ۷۰۔ ان لوگوں کو چھوڑو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اور قرآن کے ذریعہ نصیحت کرتے رہو تاکہ کوئی شخص اپنے کیے میں گرفتار نہ ہوجائے، اس حال میں کہ اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار اور سفارشی اس کے لیے نہ ہو۔ اگر وہ دنیا بھر کا معاوضہ دے تب بھی وہ قبول نہ کیا جائے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کیے میں گرفتار ہوگئے۔ ان

ع حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝٧٠ ع
14

کے لیے کھولتا ہوا پانی پینے کے لیے ہوگا اور درد ناک سزا ہوگی اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔

عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر امت کے لیے ایک عید کا دن مقرر کیا تا کہ اس دن وہ اللہ کی بڑائی کریں اور اس کی عبادت کریں اور اللہ کی یاد سے اس کو معمور کریں۔ مگر بعد کے لوگوں نے اپنی عید (مذہبی تیوہار) کو کھیل تماشا بنالیا (تفسیر کبیر، جلد 13، صفحہ 24)۔

ہر دینی عمل کا ایک مقصد ہوتا ہے اور ایک اس کا ظاہری پہلو ہوتا ہے۔ عید کا مقصد اللہ کی بڑائی اور اس کی یاد کا اجتماعی مظاہرہ ہے۔ مگر عید کی ادائیگی کے کچھ ظاہری پہلو بھی ہیں۔ مثلاً کپڑا پہننا یا اجتماع کا سامان کرنا وغیرہ۔ اب عید کو کھیل تماشا بنانا یہ ہے کہ اس کے اصل مقصد پر توجہ نہ دی جائے البتہ اس کے ظاہری اور مادی پہلوؤں کی خوب دھوم مچائی جائے۔ مثلاً کپڑوں اور سامانوں کی نمائش، خرید وفروخت کے ہنگامے، تفریحات کا اہتمام، اپنی حیثیت اور شان وشوکت کے مظاہرے، وغیرہ۔

امتوں کے بگاڑ کے زمانے میں یہی معاملہ تمام دینی اعمال کے ساتھ پیش آتا ہے۔ لوگ دینی عمل کی اصل حقیقت کو الگ کرکے اس کے ظاہری پہلو کو لے لیتے ہیں۔ اب جو لوگ اس نوبت کو پہنچ جائیں کہ وہ دین کے مقصدی پہلو کو بھلا کر اس کو اپنے دنیوی تماشوں کا عنوان بنالیں وہ اپنے اس عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں اور جو لوگ کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہوں ان کو اس معاملہ کی کوئی ایسی بات سمجھائی نہیں جاسکتی جو ان کے مزاج کے خلاف ہو۔ مزید یہ کہ مادی چیزوں کا مالک ہونا ان کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ سچائی کے مالک بھی وہی ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں ان کی ضرورتیں بفراغت پوری ہو رہی ہیں۔ ہر جگہ وہ رونق محفل بنے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی میں کہیں کوئی رخنہ نہیں۔ اس لیے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ آخرت میں بھی وہی کامیاب رہیں گے۔ ایسے لوگ عین اپنی نفسیات کی بنا پر آخرت کی باتوں کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ مگر وہ جان لیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ یوں ہی ختم ہو جانے والا نہیں۔ ان کا عمل ان کو گھیرے میں لے رہا ہے۔ عنقریب وہ اپنی سرکشی میں پھنس کر رہ جائیں گے اور کسی حال میں اس سے چھٹکارا نہ پاسکیں گے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۠ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ

اے۔ کہو، کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہم کو نفع دے سکتے اور نہ ہم کو نقصان پہنچا سکتے۔ اور کیا ہم الٹے پاؤں پھر جائیں۔ بعد اس کے کہ اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا چکا ہے، اس شخص کی مانند جس کو شیطانوں نے بیابان میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران پھر رہا ہو، اس کے ساتھی اس کو سیدھے

وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ
اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَ يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ
فَيَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ النصف
يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ
وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

راستہ کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجاؤ۔ کہو کہ رہنمائی تو صرف اللہ کی رہنمائی ہے اور ہم کو حکم ملا ہے کہ ہم اپنے آپ کو عالَم کے رب کے حوالے کر دیں۔ ۷۲۔ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اللہ سے ڈرو اور وہی ہے جس کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ ۷۳۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور جس دن وہ کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائے گا۔ اس کی بات حق ہے اور اسی کی حکومت ہوگی اس روز جب صور پھونکا جائے گا۔ وہ غائب وحاضر کا عالم اور حکیم، خبیر ہے۔

جو لوگ خدا کے سوا دوسرے سہاروں پر اپنی زندگی قائم کریں ان کی مثال اس مسافر کی سی ہوتی ہے جو بے نشان صحرا میں بھٹک رہا ہو۔ صحرا میں بھٹکنے والا مسافر فوراً جان لیتا ہے کہ اس نے اپنا راستہ کھو دیا ہے۔ راستہ دکھائی دیتے ہی وہ فوراً اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا کے بجائے دوسرے سہاروں پر جیتے ہیں ان کو اپنے بے راہ ہونے کی خبر نہیں ہوتی۔ ان کے آس پاس پکارنے والے پکارتے ہیں کہ اصل راستہ یہ ہے، ادھر آجاؤ، مگر وہ اس قسم کی آوازوں پر دھیان نہیں دیتے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلے معاملہ میں آدمی کی عقل کھلی ہوئی ہوتی ہے، صحیح راستہ کو دیکھنے میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسری صورت میں آدمی کی عقل شیطان کے زیر اثر آجاتی ہے۔ اس کی سوچ اپنے فطری ڈھنگ پر کام نہیں کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سن کر بھی نہیں سنتا اور دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔

خدا کے سوا دوسری چیزوں کا طالب بننا ایسی چیزوں کا طالب بننا ہے جو اس دنیا میں فائدہ نقصان کی طاقت نہیں رکھتیں۔ زمین وآسمان اپنے پورے نظام کے ساتھ انکار کر رہے ہیں کہ یہاں ایک ہستی کے سوا کسی اور ہستی کو کوئی طاقت حاصل ہو۔ اسی طرح جن دنیوی رونقوں کو آدمی اپنا مقصود بناتا ہے اور ان کو پانے کی کوشش میں سچائی اور انصاف کے تمام تقاضوں کو روندڈالتا ہے، وہ بھی سراسر باطل ہے۔ کیوں کہ انسانی زندگی اگر اسی ظالمانہ حالت پر تمام ہو جائے تو یہ دنیا بالکل بے معنی قرار پاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا خود غرض اور انانیت پسند لوگوں کی تماشا گاہ ہے۔ حالانکہ کائنات کا نظام جس باکمال خدا کی تجلیاں دکھا رہا ہے اس سے انتہائی بعید ہے کہ وہ اس طرح کی کوئی بے مقصد تماشا گاہ کھڑی کرے۔

دنیا کی موجودہ صورت حال بالکل عارضی ہے۔ خدا کسی بھی دن اپنا نیا حکم جاری کر کے اس نظام کو توڑ

دے گا۔ اس کے بعد انسان کی موجودہ آزادی ختم ہوجائے گی اور خدا کا اقتدار انسانوں پر بھی اسی طرح قائم ہوجائے گا جس طرح آج وہ بقیہ کائنات پر قائم ہے۔ اس وقت کامیاب وہ ہوں گے جنھوں نے امتحان کے زمانہ میں اپنے کو خدا کے حوالے کیا تھا، جو کسی دباؤ کے بغیر اللہ سے ڈرنے والے اور اس کے آگے ہمہ تن جھک جانے والے تھے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾ ۚ

۷۴۔ اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو معبود مانتے ہو۔ میں تم کو اور تمھاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔ ۷۵۔ اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو دکھادی آسمانوں اور زمین کی حکومت، اور تاکہ اس کو یقین آجائے۔ ۷۶۔ پھر جب رات نے اس پر اندھیرا کرلیا، اس نے ایک تارہ کو دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۷۷۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ ڈوب گیا تو اس نے کہا اگر میرا رب مجھ کو ہدایت نہ کرے تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہوجاؤں۔ ۷۸۔ پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے لوگو، میں اس شرک سے بری ہوں جو تم کرتے ہو۔ ۷۹۔ میں نے اپنا رخ یک سو ہوکر اس کی طرف کرلیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیم کی کہانی جو یہاں بیان ہوئی ہے وہ تلاش حق کی کہانی نہیں ہے بلکہ مشاہدۂ حق کی کہانی ہے۔ حضرت ابراہیم چار ہزار سال پہلے عراق میں ایسے ماحول میں پیدا ہوئے جہاں سورج، چاند، اور تاروں کی پرستش ہورہی تھی۔ تاہم فطرت کی رہنمائی اور اللہ کی خصوصی مدد نے آنجناب کو شرک سے محفوظ رکھا۔ آپ کی بیدار

نگاہیں کائنات کے پھیلے ہوئے شواہد میں توحید کے کھلے ہوئے دلائل دیکھتیں، کائنات کے آئینہ میں ہر طرف آپ کو ایک خدا کا چہرہ نظر آتا تھا۔ آپ قوم کی حالت پر افسوس کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ کھلے ہوئے حقائق کے باوجود کیوں تم لوگ اندھے بنے ہوئے ہو۔

رات کا وقت ہے۔ حضرت ابراہیم آسمان میں خدائے واحد کی نشانیاں دیکھ رہے ہیں۔ اسی عالم میں سیارہ زہرہ چمکتا ہوا ان کے سامنے آتا ہے جس کو ان کی قوم معبود سمجھ کر پوجتی تھی۔ ان کے دل میں بطور سوال نہیں بلکہ بطور استعجاب یہ خیال آتا ہے کہ کیا یہی وہ چیز ہے جو میرا رب ہو، یہی وہ معبود ہے جس کی ہمیں پرستش کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کو اپنے سامنے ڈوبتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کا ڈوبنا ان کے لیے اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی ایک مشاہداتی دلیل بن جاتی ہے۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ جو چیز ایک لمحہ کے لیے چمکے اور پھر غائب ہو جائے وہ کیسے اس قابل ہو سکتی ہے کہ اس کو پوجا جائے۔ بالکل یہی تجربہ ان کو چاند اور سورج کے ساتھ بھی گزرتا ہے۔ ہر ایک چمک کر تھوڑی دیر کے لیے استعجاب پیدا کرتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے۔ یہ فلکیاتی مشاہدات جو ان کے اپنے لیے توحید کی کھلی ہوئی تصدیق تھے اسی کو وہ قوم کے سامنے اپنی تبلیغ میں بطور استدلال پیش کرتے ہیں اور انداز کلام وہ اختیار کرتے ہیں جس کو اصطلاح میں حجت الزامی کہا جاتا ہے، یعنی مخاطب کے الفاظ کو دہرا کر پھر اسے قائل کرنا۔ حجت الزامی کا یہ طریقہ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی مذکور ہوا ہے۔ مثلاً وَانْظُرْ إِلَىٰ إِلَٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا (20:97)۔ یعنی، اور تو اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو برابر معتکف رہتا تھا۔

کائنات میں خدا کی جو تخلیقی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ کسی بندہ کے لیے اضافہ ایمان کا ذریعہ بھی ہیں اور انھیں سے دعوت حق کے لیے مضبوط دلائل بھی حاصل ہوتے ہیں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَ
قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ
شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَيْفَ
اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ
اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ
سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ

۸۰۔ اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے کہا کیا تم اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو، حالاں کہ اس نے مجھے راہ دکھا دی ہے۔ اور میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، کیا تم نہیں سوچتے۔ ۸۱۔ اور میں کیوں کر ڈروں تمھارے شریکوں سے جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک ٹھہراتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نہیں اتاری۔ اب دونوں فریقوں میں سے امن کا زیادہ مستحق کون

یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ الۡاَمۡنُ وَ
ع ۹/۱۴ ۱۵ ہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ﴿۸۲﴾ وَ تِلۡکَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیۡنٰہَاۤ
اِبۡرٰہِیۡمَ عَلٰی قَوۡمِہٖ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ
نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ ﴿۸۳﴾

ہے، اگر تم جانتے ہو۔ ۸۲۔ جو لوگ ایمان لائے اور نہیں ملایا انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی نقصان، انھیں کے لیے امن ہے اور وہی سیدھی راہ پر ہیں۔ ۸۳۔ یہ ہے ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ بے شک تمھارا رب حکیم اور علیم ہے۔

جب کسی چیز یا کسی شخصیت کو معبود کا درجہ دے دیا جائے تو اس کے بعد فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ پر اسرار عظمتوں کے تصورات وابستہ ہو جاتے ہیں۔ لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس ذات کو کائناتی نقشہ میں کوئی ایسا برتر مقام حاصل ہے جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں۔ اس کو خوش کرنے سے قسمتیں بنتی ہیں اور اس کو ناراض کرنے سے قسمتیں بگڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے جب اپنی قوم کے بتوں کے بارے میں کہا کہ یہ بے حقیقت ہیں، انھیں خدا کی اس دنیا میں کوئی زور حاصل نہیں تو لوگوں کو اندیشہ ہونے لگا کہ اس گستاخی کے نتیجہ میں کوئی وبال نہ آپڑے۔ وہ حضرت ابراہیم سے بحثیں کرنے لگے۔ انھوں نے آپ کو ڈرایا کہ تم ایسی باتیں نہ کرو، ورنہ ان معبودوں کا غضب تمھارے اوپر نازل ہوگا۔ تم اندھے ہو جاؤ گے، تم پاگل ہو جاؤ گے، تم برباد ہو جاؤ گے، وغیرہ۔

اس دنیا میں صرف خدا کی ایک ذات ہے جس کی کبریائی دلیل و برہان کے اوپر قائم ہے۔ اس کے سوا بڑائی اور معبودیت کی جتنی قسمیں ہیں سب توہماتی عقائد کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہیں۔ خدا کی خدائی اپنے آپ قائم ہے، جب کہ دوسری تمام خدائیاں صرف ان کے ماننے والوں کی بدولت ہیں۔ اگر ماننے والے نہ مانیں تو یہ خدائیاں بھی بے وجود ہو کر رہ جائیں۔

ظاہری حالات کو دیکھ کر ان معبودوں کے پرستار اکثر اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ سچے خدا پرستوں کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ مقام پر کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر یہ بدترین غلط فہمی ہے۔ محفوظ حیثیت دراصل اس کی ہے جو دلیل اور برہان پر کھڑا ہوا ہے۔ دنیوی رواج سے مصالحت کر کے کوئی شخص اپنے لیے محفوظ دیوار حاصل کرے تو آخری انجام کے اعتبار سے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

جھوٹے معبودوں کا غلبہ کبھی اس نوبت کو پہنچتا ہے کہ سچے خدا پرست بھی اس سے مرعوب ہو کر اس سے سازگاری کر لیتے ہیں۔ دنیوی مصلحتیں اور مادی مفادات ان سے اس درجہ وابستہ ہو جاتے ہیں کہ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ باعزت زندگی حاصل کرنے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ان معبودوں کے تحت بنے ہوئے ڈھانچہ سے مصالحت کر لی جائے۔ مگر اس قسم کا رویہ اپنے ایمان میں ایسا نقصان شامل کر لینا ہے جو خود ایمان ہی کو خدا کی نظر میں مشتبہ بنا دے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ
وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ
وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَ
هٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَ
زَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ
وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾
وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَ
اجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ
فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ
اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ
ع ۱۰ ۸ ۱۲ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع

۸۴۔ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے، ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت دی اس سے پہلے۔ اور اس کی نسل میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم نیکوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ ۸۵۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی، ان میں سے ہر ایک صالح تھا۔ ۸۶۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ ۸۷۔ اور ان کے باپ دادوں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی، اور ان کو ہم نے چن لیا اور ہم نے سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ ۸۸۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ اس سے سرفراز کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ اور اگر وہ شرک کرتے تو ضائع ہوجاتا جو کچھ انھوں نے کیا تھا۔ ۸۹۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی۔ پس اگر یہ مکہ والے اس کا انکار کردیں تو ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مقرر کردئے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ ۹۰۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی، پس تم بھی ان کے طریقہ پر چلو۔ کہہ دو، میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ تو بس ایک نصیحت ہے دنیا والوں کے لیے۔

''فضیلت'' کسی کا نسلی یا قومی لقب نہیں۔ یہ اللہ کا ایک عطیہ ہے جس کا تحقق صرف ان افراد کے لیے ہوتا ہے جو ہدایت کے مطابق اپنے کو صالح بنائیں، شرک کی تمام قسموں سے اپنے کو بچائیں اور ''بلا معاوضہ نصیحت'' کے دعوتی منصوبہ میں اپنے کو ہمہ تن شامل کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی کتاب کو اپنا حقیقی رہنما بناتے ہیں۔ وہ

اس کے ساتھ اپنے وجود کو اتنا زیادہ شامل کر لیتے ہیں کہ ان پر اس راہ کے وہ بھید کھلنے لگتے ہیں جن کو حکمت کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا چن لیتا ہے اور ان میں سے جن کو چاہتا ہے اپنے دین کی پیغام رسانی کی توفیق دیتا ہے، دورِ نبوت میں اللہ کے خصوصی پیغمبر کی حیثیت سے اور ختم نبوت کے بعد اللہ کے عام داعی کی حیثیت سے۔ اللہ کا انعام خواہ وہ پیغمبروں کے لیے ہو یا عام انسانوں کے لیے، تمام تر نیک عملی (احسان) کی بنیاد پر ملتا ہے، نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

دعوتِ حق کا کام صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو اس کی خاطر اتنا زیادہ یکسو اور بے نفس ہو چکے ہوں کہ وہ مدعو سے کسی قسم کی مادی توقع نہ رکھیں۔ جس شخص یا گروہ تک آپ آخرت کا پیغام پہنچا رہے ہوں اسی سے آپ اپنے دنیوی حقوق کے لیے احتجاج اور مطالبات کی مہم نہیں چلا سکتے ہیں۔ داعی کا ایسا کرنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اس کی دعوت مدعو کی نظر میں مضحکہ خیز بن کر رہ جائے اور ماحول کے اندر کبھی اس کو سنجیدہ مہم کی حیثیت حاصل نہ ہو۔

مکہ میں کچھ لوگ آپ پر ایمان لائے۔ مگر بحیثیت ''قوم'' مکہ والوں نے آپ کا انکار کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مدینہ والوں کے دل آپ کی دعوت کے حق میں نرم کر دیے اور وہ بحیثیت قوم آپ کے مومن بن گئے۔ حتی کہ آپ کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ آپ مکہ سے مدینہ جا کر وہاں اسلام کا مرکز قائم کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مدد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل درجہ میں حاصل ہوئی۔ تاہم آپ کی امت میں اٹھنے والے داعیوں کو بھی اللہ یہ مدد دے سکتا ہے اور اپنی مصلحت کے مطابق دیتا رہا ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ‌ؕ قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡـكِتٰبَ الَّذِىۡ جَآءَ بِهٖ مُوۡسٰى نُوۡرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ‌ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا‌ ۚ وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ‌ؕ قُلِ اللّٰهُ‌ۙ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَلِتُنۡذِرَ اُمَّ

۹۱۔ اور انھوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب انھوں نے کہا کہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ کہو کہ وہ کتاب کس نے اتاری تھی جس کو لے کر موسیٰ آئے تھے، وہ روشن تھی اور رہنمائی تھی لوگوں کے واسطے، جس کو تم نے ورق ورق کر رکھا ہے۔ کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو۔ اور تم کو وہ باتیں سکھائیں جن کو نہ جانتے تھے تم اور نہ تمھارے باپ دادا۔ کہو کہ اللہ نے اتاری۔ پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی کج بحثیوں میں کھیلتے رہیں۔ ۹۲۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، برکت والی ہے، تصدیق کرنے والی ان کی جو اس سے پہلے ہیں۔

الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَهَا ؕ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ یُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ وَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۹۲﴾

اور تاکہ تو ڈرائے مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو۔ اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں، وہی اس پر ایمان لائیں گے۔ اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت مکہ کے لوگوں کے سامنے آئی تو ان کے کچھ لوگوں نے بعض یہود سے پوچھا کہ تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا محمد پر واقعی خدا کا کلام نازل ہوا ہے۔ یہود نے جواب دیا "خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے"۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب ہے۔ کیوں کہ یہود تو خود نبیوں کو ماننے والے تھے، اور اس طرح گویا وہ اقرار کر رہے تھے کہ بشر پر خدا کا کلام اترتا ہے۔ مگر جب آدمی مخالفت میں اندھا ہو جائے تو وہ مخالف کی تردید کے جوش میں کبھی یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنی مانی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگے۔

یہود کے اندر یہ ڈھٹائی اس لیے پیدا ہوئی کہ انھوں نے خدا کی کتاب کو ورق ورق کر دیا تھا۔ وہ خدا کی تعلیمات کے کچھ حصے کو سامنے لاتے اور بقیہ کو کتاب میں بند رکھتے۔ مثلاً وہ انعام والی آیتوں کو خوب سنتے سناتے اور ان آیتوں کو چھوڑ دیتے جن میں وہ اعمال بتائے گئے ہیں جن کے کرنے سے کسی کو مذکورہ انعام ملتا ہے۔ وہ ایسی آیتوں کا خصوصی تذکرہ کرتے جن سے ان کی شور وغل کی سیاست کی تائید نکلتی ہو اور ان آیتوں کو نظر انداز کر دیتے جن میں خاموش اصلاح کے احکام دیے گئے ہوں۔ وہ ایسی آیتوں کے درس میں بڑا اہتمام کرتے جن میں ان کے لیے لفظی موشگافیوں کا کمال دکھانے کا موقع ہو، مگر ان آیتوں سے سرسری گزر جاتے جن میں دین کے ابدی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ وہ ایسی آیتوں کا خوب چرچا کرتے جن سے اپنی فضیلت نکلتی ہو اور ان آیتوں سے بے توجہی برتتے ہیں جن سے ان کی ذمہ داریاں معلوم ہوتی ہیں۔ جو لوگ خدا کی کتاب کو اس طرح "ورق ورق" کریں ان کے اندر فطری طور پر ڈھٹائی آجاتی ہے۔ وہ غیر سنجیدہ بحثیں کرتے ہیں، متضاد بیانات دیتے ہیں۔ ان سے کسی حقیقی تعاون کی امید نہیں کی جا سکتی۔ جو لوگ خدا کی کتاب کے ساتھ انصاف نہ کریں، وہ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کیسے انصاف کر سکتے ہیں۔

دین کی دعوت اصلاً لوگوں کو ہوشیار کرنے کی دعوت ہے۔ اس قسم کی دعوت خواہ کتنے ہی کامل انسان کی طرف سے پیش کی جائے وہ سننے والے کے دل میں اس وقت جگہ کرے گی جب کہ وہ اپنے سینہ میں ایک اندیشہ ناک دل رکھتا ہو اور آخرت کے معاملہ کو ایک سنجیدہ معاملہ سمجھتا ہو۔ سننے والے میں اگر یہ ابتدائی مادہ موجود نہ ہو تو سنانے والا اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ قَالَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ وَ لَمۡ یُوۡحَ اِلَیۡهِ شَیۡءٌ وَّ مَنۡ قَالَ

۹۳۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھے یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، حالاں کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو۔ اور

سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ
الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا
اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ
عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ
الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَ لَقَدْ
جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ
تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَ مَا
نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ
فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَ ضَلَّ
عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع

کہے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتاروں گا۔ اور کاش تم اس وقت دیکھو جب کہ یہ ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ لاؤ اپنی جانیں نکالو۔ آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا اس سبب سے کہ تم اللہ پر جھوٹی باتیں کہتے تھے۔ اور تم اللہ کی نشانیوں سے تکبر کرتے تھے۔ ۹۴۔ اور تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آ گئے جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ اسباب ہم نے تم کو دیا تھا سب تم پیچھے چھوڑ آئے۔ اور ہم تمھارے ساتھ ان سفارش والوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمھارا کام بنانے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ تمھارا رشتہ ٹوٹ گیا اور تم سے جاتے رہے وہ دعوے جو تم کرتے تھے۔

اللہ جب اپنے کسی بندے کو اپنی پکار بلند کرنے کے لیے کھڑا کرتا ہے تو اسی کے ساتھ اس کو خصوصی توفیق بھی عطا کرتا ہے۔ اس کے کردار میں خوفِ آخرت کی جھلک ہوتی ہے۔ اس کی باتوں میں خدائی استدلال کی طاقت نظر آتی ہے۔ بے پناہ مخالفتوں کے باوجود وہ اپنے پیغام رسانی کے عمل کو اعلیٰ ترین شکل میں جاری رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی زمین پر خدا کی نشانی ہوتا ہے۔ مگر جن کی نگاہیں دنیوی عظمت کی چیزوں میں گم ہوں وہ آخرت کے داعی کی عظمت کو سمجھ نہیں پاتے۔ حتی کہ ان کے مادی پیمانہ میں ان کی اپنی ذات برتر اور اللہ کے داعی کی ذات کم تر دکھائی دیتی ہے۔ یہ چیز ان کو تکبر میں مبتلا کر دیتی ہے اور جو لوگ تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں ان سے کوئی بھی نامعقول رویہ مستبعد نہیں رہتا۔ حتی کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ وہ بھی ویسا ہی کلام تخلیق کر سکتے ہیں جیسا کلام خدا کی طرف سے کسی بندہ پر اترتا ہے—— وہ خدا کو طلسماتی نشانیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے وہ بشری نشانیوں میں ظاہر ہونے والے خدا کو پہچان نہیں پاتے۔

یہ تکبر جو کسی آدمی کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ اس دنیوی حیثیت اور مادی سامان کی بنا پر ہوتا ہے جو اس کو دنیا میں ملا ہوا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ اسے حاصل ہے وہ محض آزمائش کے لیے اور متعین مدت تک کے لیے ہے۔ موت کا وقت آتے ہی اچانک یہ تمام چیزیں چھن جائیں گی۔ اس کے بعد ہر آدمی اپنی زندگی کے

اس مرحلہ میں پہنچ جاتا ہے، جہاں نہ اس کی دولت ہوگی اور نہ اس کی حیثیت، جہاں نہ اس کے ساتھی ہوں گے اور نہ اس کے سفارشی۔ وہ ہوگا اور اس کا خدا ہوگا۔ دنیا میں اس کو جن چیزوں پر ناز تھا ان میں سے کوئی چیز بھی اس دن اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے موجود نہ ہوگی۔

دنیا میں ہر آدمی الفاظ کے طلسم میں جیتا ہے۔ ہر آدمی اپنے حسبِ حال ایسے الفاظ تلاش کر لیتا ہے جس میں اس کا وجود بالکل برحق دکھائی دے، اس کا راستہ سیدھا منزل کی طرف جاتا ہوا نظر آئے۔ مگر آخرت کا انقلاب جب حقیقتوں کے پردے پھاڑ دے گا تو لوگوں کے یہ الفاظ اس قدر بے معنی ہو جائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَ النَّوٰی ؕ یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ مُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّیۡلَ سَکَنًا وَّالشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ حُسۡبَانًا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۹۶﴾ وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ النُّجُوۡمَ لِتَہۡتَدُوۡا بِہَا فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۷﴾

۹۵۔ بے شک اللہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ جان دار کو بے جان سے نکالتا ہے اور وہی بے جان کو جان دار سے نکالنے والا ہے۔ وہی تمھارا اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے رہو۔ ۹۶۔ وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات کو سکون کا وقت بنایا اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔ یہ ٹھہرایا ہوا ہے بڑے غلبہ والے کا، بڑے علم والے کا۔ ۹۷۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان کے ذریعہ سے خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ پاؤ۔ بے شک ہم نے دلائل کھول کر بیان کر دئے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔

انسان کو جب ایک موٹر کار یا اور کوئی چیز بنانا ہوتا ہے تو وہ اس کے ہر جزء کو الگ الگ بناتا ہے۔ اور پھر اس کے اجزاء جوڑ کر مطلوبہ چیز تیار کرتا ہے، مگر خدا جب ایک درخت اگاتا ہے یا ایک انسان پیدا کرتا ہے تو اس کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ وہ کسی چیز کو اس کے پورے مجموعہ کے ساتھ بیک وقت برآمد کر دیتا ہے۔ خدائی کارخانہ میں پورا کا پورا درخت یا پورا کا پورا انسان ایک ہی بیج یا ایک ہی بوند سے بتدریج نکل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ انتہائی انوکھی تکنیک ہے جس پر کسی بھی انسان کو قابو نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں انسان سے برتر ایک ہستی موجود ہے جس کا منصوبہ تمام منصوبوں سے بلند ہے۔

سورج کی جسامت زمین سے بارہ لاکھ گنا زیادہ ہے۔ اور زمین چاند سے چوگنا زیادہ بڑی ہے۔ یہ سب اجرام مسلسل حرکت میں ہیں۔ چاند زمین سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل دور رہ کر زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اور زمین

سورج سے تقریباً ساڑھے نو کروڑ میل کے فاصلے پر رہتے ہوئے سورج کے گرد دو طریقہ سے گھوم رہی ہے، ایک اپنے محور پر اور دوسرے سورج کے مدار پر۔ اسی طرح ستاروں کی گردش کا معاملہ ہے جو دہشت ناک حد تک بعید فاصلوں پر حد درجہ باقاعدگی کے ساتھ متحرک ہیں۔ اسی کائناتی تنظیم سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سے اوقات کا نقشہ مقرر ہوتا ہے۔ اسی سے خشکی اور تری میں انسان کے لیے اپنی زندگی کی ترتیب قائم کرنا ممکن ہوتا ہے۔ یہ اتنا بڑا نظام اتنی صحت کے ساتھ چل رہا ہے کہ ہزاروں سال میں بھی اس کے اندر کوئی فرق نہیں آتا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ایک ایسی ہستی ہے جس کی طاقتیں لامحدود حد تک زیادہ ہیں۔

خدا کی یہ نشانیاں بہت بڑے پیمانہ پر بتا رہی ہیں کہ اس کارخانہ کا بنانے والا بہت بڑے علم والا ہے۔ کوئی بے علم ہستی اتنا بڑا ڈھانچہ قائم نہیں کرسکتی۔ وہ بہت غلبہ والا ہے، اس کے بغیر اتنے بڑے کارخانہ کا اس طرح چلنا ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس کی منصوبہ بندی انتہائی حد تک کامل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو اتنی بڑی کائنات میں اس قدر معنویت اور ہم آہنگی کا وجود ناممکن ہوجائے۔

خدا کی دنیا خدا کے دلائل سے بھری ہوئی ہے۔ مگر دلیل ایک نظری معقولیت کا نام ہے، نہ کہ کسی ہتھوڑے کا۔ اس لیے دلیل کو ماننا کسی کے لیے صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ وہ فی الواقع سنجیدہ ہو، وہ شعوری طور پر اس کے لیے تیار ہو کہ وہ دلیل کو مان لے گا، خواہ وہ اس کی موافقت میں جارہی ہو یا اس کے خلاف۔

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۞٩٨ وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۞٩٩

۹۸۔ اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے، پھر ہر ایک کے لیے ایک ٹھکانہ ہے اور ہر ایک کے لیے اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ ہم نے دلائل کھول کر بیان کردئے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں۔ ۹۹۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے نکالی اگنے والی ہر چیز۔ پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخ نکالی جس سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کردیتے ہیں۔ اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے گچھے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے اور زیتون کے اور انار کے، آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے۔ اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے۔ بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان کی طلب رکھتے ہیں۔

انسانی کارخانے اس پر قادر نہیں کہ وہ ایک ایسی مشین بنادیں کہ اس کے بطن سے اسی قسم کی بے شمار مشینیں خود بخود نکلتی چلی جائیں۔ ہمارے کارخانوں کو ہر مشین الگ الگ بنانی پڑتی ہے۔ مگر خدا کے کارخانہ میں یہ واقعہ ہر روز ہورہا ہے۔ درخت کا ایک بیج بو دیا جاتا ہے۔ پھر اس بیج سے بے شمار درخت نکلتے چلے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت سے شروع ہو کر کھرب ہا کھرب انسان پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں اور ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ جس خدا نے کائنات کو پیدا کیا ہے اس کی قدرت بے حد وسیع ہے۔ وہ اس نادر تخلیق پر قادر ہے کہ ایک ابتدائی چیز وجود میں لائے اور پھر اس کے اندر سے بے حساب گنا زیادہ بڑی بڑی چیزیں مسلسل نکلتی چلی جائیں۔ اسی طرح خدا موجودہ دنیا سے ایک زیادہ شاندار اور زیادہ معیاری دنیا نکال سکتا ہے۔ آخرت کا عقیدہ کوئی دور کا عقیدہ نہیں بلکہ جس امکان کو ہم ہر روز دیکھ رہے ہیں اسی امکان کو مستقبل کے ایک واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے۔

مٹی بظاہر ایک مُردہ اور جامد چیز ہے۔ پھر اس کے اوپر بارش ہوتی ہے۔ پانی پاتے ہی مٹی کے اندر سے ایک نئی سرسبز دنیا نکل آتی ہے۔ اس کے اندر سے طرح طرح کی فصلیں اور قسم قسم کے پھل دار درخت وجود میں آجاتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی موجودہ دنیا کے بعد آنے والی دنیا کی ایک تمثیل ہے۔ مٹی پر پانی پڑنے سے زمین کے اوپر رنگ اور خوشبو اور ذائقہ کا ایک سرسبز و شاداب چمن کھل اٹھنا اُس امکان کو بتاتا ہے جو دنیا کے خالق نے یہاں رکھ دیا ہے۔ آج کی دنیا میں انسان جو نیک عمل کرتا ہے وہ اسی قسم کا ایک امکان ہے۔ جب خدا کی رحمتوں کی بارش ہوگی تو یہ امکان ہرا بھرا ہو کر آخرت کی لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں تبدیل ہوجائے گا۔

انسان اولاً ماں کے بطن کے سپرد ہوتا ہے پھر موجودہ دنیا میں آتا ہے۔ قبر بھی گویا اسی قسم کا ایک ''بطن'' ہے۔ آدمی قبر کے سپرد کیا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ اگلی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تاکہ اپنے عمل کے مطابق جنت یا جہنم میں داخل کردیا جائے — انسان سے غیب کی جس دنیا کو ماننے کا مطالبہ کیا جارہا ہے اس کی جھلکیاں اور اس کے دلائل موجودہ محسوس کائنات میں پوری طرح موجود ہیں۔ مگر مانتا وہی ہے جو پہلے سے ماننے کے لیے تیار ہو۔ ''ایمان'' کی راہ میں آدمی جب آدھا سفر طے کرچکا ہوتا ہے اس کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایمان کی دعوت اس کے ذہن کا جزء بنے اور وہ اس کو قبول کرلے۔ جو شخص ایمان کے الٹے رخ پر سفر کررہا ہو اس کو ایمان کی دعوت کبھی نفع نہیں پہنچا سکتی۔

وَجَعَلُوۡا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ الۡجِنَّ وَخَلَقَہُمۡ وَخَرَقُوۡا لَہٗ بَنِیۡنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ ع ۱۲/۱۸ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ	۱۰۰۔ اور انھوں نے جنات کو اللہ کا شریک قرار دیا۔ حالاں کہ اسی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور بے جانے بوجھے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تراشیں۔ پاک اور برتر ہے وہ ان باتوں سے جو یہ

وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ
صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ
عَلِیْمٌ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ
خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ
شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَ
هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ
الْخَبِیْرُ ﴿۱۰۳﴾ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ
فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ
وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾

بیان کرتے ہیں۔ ۱۰۱۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۱۰۲۔ یہ ہے اللہ تمھارا رب۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی ہر چیز کا خالق ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو۔ اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ ۱۰۳۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں۔ مگر وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔ وہ بڑا باریک بیں اور بڑا باخبر ہے۔ ۱۰۴۔ اب تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آچکی ہیں۔ پس جو بینائی سے کام لے گا وہ اپنے ہی لیے، اور جو اندھا بنے گا وہ خود نقصان اٹھائے گا۔ اور میں تمھارے اوپر کوئی نگراں نہیں ہوں۔

قدیم ترین زمانہ سے انسان کی یہ کمزوری رہی ہے کہ جس چیز میں بھی کوئی امتیاز یا کوئی پر اسراریت دیکھتا ہے اس کو وہ خدا کا شریک سمجھ لیتا ہے۔ اور اس سے مدد لینے یا اس کی آفتوں سے بچنے کے لیے اس کو پوجنے لگتا ہے۔ اسی ذہن کے تحت بہت سے لوگوں نے فرشتے اور کواکب اور جنّات کو پوجنا شروع کردیا۔ حالاں کہ ان چیزوں کے خدا نہ ہونے کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے ان کے اندر ''خلق'' کی صفت نہیں۔ انھوں نے نہ اپنے آپ کو پیدا کیا اور نہ وہ کسی دوسری چیز کو پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ ان کو خود کسی دوسری ہستی نے تخلیق کیا ہے۔ پھر جو خالق ہے وہ خدا ہوگا یا جو مخلوق ہے وہ خدا بن جائے گا۔

ایک درخت کو کمال درجہ موزونیت کے ساتھ وہ تمام چیزیں پہنچتی ہیں جو اس کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح کائنات کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ جب یہ حقیقت ہے کہ ان چیزوں کو جو کچھ ملتا ہے کسی دینے والے کے دیے سے ملتا ہے تو یقیناً دینے والا ہر جزو کل سے باخبر ہوگا۔ اگر وہ ان سے باخبر نہ ہو تو ہر چیز کی اس کی عین ضرورت کے مطابق کارسازی کس طرح کرے۔ اب جو خدا اتنی کامل صفات کا مالک ہو وہ آخر کس ضرورت کے لیے کسی کو اپنی خدائی میں شریک کرے گا۔

انسان خدا کو محسوس صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جب وہ اس کو محسوس صورت میں نظر نہیں آتا تو وہ دوسری محسوس چیزوں کو خدا فرض کر کے اپنی ظاہر پرستی کی تسکین کر لیتا ہے۔ مگر یہ خدا کی ہستی کا بہت کمتر اندازہ ہے۔ آخر جو خدا ایسا عظیم ہو کہ اتنی بڑی کائنات پیدا کرے اور انتہائی نظم کے ساتھ اس کو مسلسل چلاتا رہے،

وہ اتنا معمولی کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک کمزور مخلوق اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے ہاتھوں سے چھوئے۔ البتہ انسان دل کی راہ سے خدا کو پاتا ہے اور یقین کی آنکھ سے اس کو دیکھتا ہے۔ جو شخص بصیرت کی آنکھ سے دیکھ کر ماننے پر راضی ہو وہی خدا کو پائے گا۔ جو بصارت سے دیکھنے پر اصرار کرے وہ خدا کو پانے سے اسی طرح محروم رہے گا جس طرح وہ شخص پھول کی خوشبو کو جاننے سے محروم رہتا ہے جو اس کو کیمیائی معیاروں پر پرکھ کر جاننا چاہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۗ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۵۔ اور اس طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ کہیں کہ تم نے پڑھ دیا اور تاکہ ہم اچھی طرح کھول دیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ ۱۰۶۔ تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جارہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ۱۰۷۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ اور ہم نے تم کو ان کے اوپر نگراں نہیں بنایا ہے اور نہ تم ان پر مختار ہو۔ ۱۰۸۔ اور اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، ان کو گالی نہ دو، ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوش نما بنا دیا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت اللہ انھیں بتادے گا جو وہ کرتے تھے۔

ایک شخص وہ ہے جس کے اندر طلب کی نفسیات ہو، جو سچائی کی تلاش میں رہتا ہو۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو دولت یا اقتدار کا کوئی حصہ پا کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ پائے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کے اندر کوئی کمی نہیں ہے جو کوئی شخص آکر پوری کرے۔ حق کی دعوت جب اٹھتی ہے تو اس کو قبول کرنے والے زیادہ تر پہلی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو دوسری قسم کے لوگ ہیں وہ اس کو کوئی قابل لحاظ چیز نہیں سمجھتے۔ وہ کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کرتے۔ اس لیے اس کی اہمیت بھی ان پر واضح نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں حق کی دعوت کا مقصد دو ہوتا ہے۔ جو سچے طالب ہیں ان کی طلب کا جواب فراہم کرنا۔ اور جو لوگ طالب نہیں ہیں ان پر حجت قائم کرنا۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے دعوت کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے ماننے والے بن جائیں۔ اور دوسری

قسم کے لوگوں کے لیے یہ کہ وہ کہہ اٹھیں کہ ”تم نے بتا دیا تم نے بات ہم تک پہنچا دی“۔

جو لوگ دعوت کا انکار کرتے ہیں وہ اپنے انکار کو برحق ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں نکالتے ہیں۔ ایسے موقع پر داعی کے دل میں یہ خیال آنے لگتا ہے کہ وہ دعوت کے انداز میں ایسی تبدیلی کر دے جس سے وہ مدعو کے لیے قابل قبول بن جائے۔ مگر اس قسم کا انحراف درست نہیں۔ داعی کو ہمیشہ اسی اسلوب پر قائم رہنا چاہیے جو براہِ راست خدا کی طرف سے تلقین کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اصل مقصد انسان کو خدا سے جوڑنا ہے، نہ کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو اپنے حلقہ میں شامل کرنا۔ دوسری طرف یہ بات بھی غلط ہے کہ مدعو کے رویہ سے مشتعل ہو کر ایسی باتیں کی جائیں کہ اس کی گمراہی جاہلانہ بدکلامی تک جا پہنچے۔

آدمی جن خاص روایات میں پیدا ہوتا ہے اور جن افکار سے وہ مانوس ہو جاتا ہے، ان کے حق میں اس کے اندر ایک طرح کی عصبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے مطابق اس کا ایک فکری ڈھانچہ بن جاتا ہے جس کے تحت وہ سوچتا ہے۔ یہی فکری ڈھانچہ حق کو قبول کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جب تک آدمی اس فکری ڈھانچہ کو نہ توڑے اس کے ذہن میں وہ دروازہ نہیں کھلتا جس کے ذریعہ حق کی آواز اس کے اندر داخل ہو۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ
اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ
اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ
كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١٠﴾ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ ع ۱۳/۱۹
اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا
عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
يَجْهَلُوْنَ ﴿١١١﴾

۱۰۹۔ اور یہ لوگ اللہ کی قسم بڑے زور سے کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آجائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا خبر کہ اگر نشانیاں آجائیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۱۱۰۔ اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے جیسا کہ یہ لوگ اس کے اوپر پہلی بار ایمان نہیں لائے۔ اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیں گے۔☆ ۱۱۱۔ اور اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور ہم ساری چیزیں ان کے سامنے اکٹھا کر دیتے تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہ تھے، الا یہ کہ اللہ چاہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔

حق ایک شخص کے سامنے دلائل کے ساتھ آتا ہے اور وہ اس کا انکار کر دیتا ہے تو اس کی وجہ ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ بات کو اس کے صحیح رخ سے دیکھنے کے بجائے الٹے رخ سے دیکھنا۔ کوئی بات خواہ کتنی ہی مدلّل ہو، آدمی اگر

اس کو ماننا نہ چاہے تو وہ اس کو رد کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ پالے گا۔ مثلاً داعی کے دلائل کو دلائل کی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے وہ یہ بحث چھیڑ دے گا کہ تمھارے سوا جو دوسرے بزرگ ہیں کیا وہ سب حق سے محروم تھے، اور اسی طرح دوسری باتیں۔

جس آدمی کے اندر اس قسم کا مزاج ہو اس کا راہ راست پر آنا انتہائی مشکل ہے۔ وہ ہر بات کو غلط رخ دے کر اس کے انکار کا ایک بہانہ تلاش کر سکتا ہے۔ نظری دلائل کو رد کرنے کے لیے اگر اس کو یہ الفاظ مل رہے تھے کہ یہ اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے تو حسی مشاہدہ کو رد کرنے کے لیے وہ الفاظ پالے گا کہ یہ نظر کا دھوکا ہے۔ اس کی حقیقت ایک فرضی طلسم کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو مزاج نظری دلیل کو ماننے میں رکاوٹ بنا تھا وہی مزاج حسی دلیل کو ماننے میں بھی رکاوٹ بن جائے گا۔ آدمی اب بھی اسی طرح محروم رہے گا جیسے وہ پہلے محروم تھا۔

اس قسم کے لوگ اپنی نفسیات کے اعتبار سے سرکش واقع ہوتے ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے کو اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک داعی جب ان کے سامنے حق کا پیغام لے کر آتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ماحول میں اجنبی ہوتا ہے، وہ وقت کی عظمتوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنا اپنی حیثیت کو نیچے گرانے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس لیے برتری کی نفسیات رکھنے والے لوگ اس کو قبول نہیں کر پاتے۔ وہ طرح طرح کی توجیہات پیش کر کے اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

دانائی یہ ہے کہ آدمی خدا کے نقشہ کو مانے اور اس کے مطابق اپنے ذہن کو چلانے کے لیے تیار ہو۔ اس کے برعکس، نادانی یہ ہے کہ آدمی خدا کے نقشہ کے بجائے خود ساختہ معیار قائم کرے اور کہے کہ جو چیز مجھ کو اس معیار پر ملے گی میں اس کو مانوں گا اور جو چیز اس معیار پر نہیں ملے گی، اس کو نہیں مانوں گا۔ ایسے آدمی کے لیے اس دنیا میں صرف بھٹکنا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں آدمی خدا کے مقرر کیے ہوئے طریقوں کی پیروی کر کے منزل تک پہنچ سکتا ہے، نہ کہ اس کے مقررہ طریقہ کو چھوڑ کر۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۲۔ اور اسی طرح ہم نے شریر آدمیوں اور شریر جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا۔ وہ ایک دوسرے کو پر فریب باتیں سکھاتے ہیں دھوکا دینے کے لیے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے۔ پس تم انھیں چھوڑ دو کہ وہ جھوٹ باندھتے رہیں۔ ۱۱۳۔ اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اور تا کہ وہ اس کو پسند کریں اور تا کہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیں۔

ابن جریر نے حضرت ابوذر سے نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شریک ہوا۔ یہ ایک لمبی مجلس تھی۔ آپ نے فرمایا اے ابوذر، کیا تم نے نماز پڑھ لی۔ میں نے کہا نہیں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا: اٹھو اور دو رکعت نماز پڑھو۔ وہ نماز پڑھ کر دوبارہ مجلس میں آ کر بیٹھے تو آپ نے فرمایا: اے ابوذر کیا تم نے جن وانس کے شیطانوں کے مقابلہ میں اللہ سے پناہ مانگی۔ میں نے کہا نہیں اے خدا کے رسول، کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں، وہ شیاطینِ جن سے بھی زیادہ برے ہیں (نَعَمۡ، هُمۡ شَرٌّ مِنۡ شَيَاطِينِ الۡجِنِّ) تفسیر ابن جریر الطبری، جلد 9، صفحہ 500۔

یہاں شیاطین انس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دعوت حق کو بے اعتبار ثابت کرنے کے لیے قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر عزت ومقبولیت کا مقام حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب حق کی دعوت اپنی بے آمیز شکل میں اٹھتی ہے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کو برہنہ کر رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے سیدھا راستہ تو یہ تھا کہ وہ حق کی وضاحت کے بعد اس کو مان لیں مگر حق کے مقابلہ میں اپنا مقام ان کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اپنی حیثیت کو بچانے کے لیے وہ خود داعی اور اس کی دعوت کو مشتبہ ثابت کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ خوش نما الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ داعی اور اس کی دعوت میں ایسے شوشے نکالتے ہیں جو اگر چہ بذاتِ خود بے حقیقت ہوتے ہیں مگر بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔

موجودہ دنیا میں جو امتحانی حالات پیدا کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں صحیح بات کہنے والے کو بھی الفاظ مل جاتے ہیں اور غلط بات کہنے والے کو بھی۔ حق کا داعی اگر حق کو دلائل کی زبان میں بیان کر سکتا ہے تو اسی کے ساتھ باطل پرستوں کو بھی یہ موقع حاصل ہے کہ وہ حق کے خلاف کچھ ایسے خوش نما الفاظ بول سکیں جو لوگوں کو دلیل معلوم ہوں اور وہ اس سے متاثر ہو کر حق کا ساتھ دینا چھوڑ دیں۔ یہ صورت حال امتحان کی غرض سے ہے اس لیے وہ لازماً قیامت تک باقی رہے گی۔ اس دنیا میں بہر حال آدمی کو اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ سچے دلائل اور بے بنیاد باتوں کے درمیان فرق کرے اور بے بنیاد باتوں کو رد کر کے سچے دلائل کو قبول کرلے۔

شیاطینِ انس اپنی ذہانت سے حق کے خلاف جو پُر فریب شوشے نکالتے ہیں وہ انھیں لوگوں کو متاثر کرتے ہیں جو آخرت کے فکر سے خالی ہوں۔ آخرت کا اندیشہ آدمی کو انتہائی سنجیدہ بنا دیتا ہے اور جو شخص سنجیدہ ہو اس سے باتوں کی حقیقت کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ مگر جو لوگ آخرت کے اندیشہ سے خالی ہوں وہ حق کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ اسی لیے وہ شوشہ اور دلیل کا فرق بھی سمجھ نہیں پاتے۔

اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِىۡ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكُمُ الۡكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَقِّ

۱۱۴۔ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں۔ حالاں کہ اس نے تمھاری طرف واضح کتاب اتاری ہے۔ اور جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی، وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے واقعیت کے ساتھ۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي
الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ
يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾
اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَ
هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

پس تم نہ ہو شک کرنے والوں میں۔ ۱۱۵۔ اور تمھارے رب کی بات پوری سچی ہے اور انصاف کی۔ کوئی بدلنے والا نہیں اس کی بات کو اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۱۱۶۔ اور اگر تم لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں ہیں تو وہ تم کو خدا کے راستہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ ۱۱۷۔ بے شک تمھارا رب خوب جانتا ہے ان کو جو اُس کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور خوب جانتا ہے ان کو جو راہ پائے ہوئے ہیں۔

قرآن میں ذبیحہ کے احکام اترے اور یہ کہا گیا کہ مردہ جانور نہ کھاؤ، ذبح کیا ہوا کھاؤ تو کچھ لوگوں نے کہا: مسلمانوں کا مذہب بھی عجیب ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کا مارا ہوا جانور حلال سمجھتے ہیں اور جس کو اللہ نے مارا ہوا اس کو حرام بتاتے ہیں۔ اس جملہ میں لفظی تک بندی کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے۔ مگر بہت سے لوگ اس کو سن کر دھوکے میں آگئے اور اسلام کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہے۔ ہر زمانہ میں ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو باتوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے سمجھتے ہوں۔ بیشتر لوگ الفاظ کے گورکھ دھندے میں گم رہتے ہیں۔ وہ خیالی باتوں کو حقیقی سمجھ لیتے ہیں، صرف اس لیے کہ ان کو خوبصورت الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

مگر یہ دنیا ایسی دنیا ہے جہاں تمام بنیادی حقیقتوں کے بارے میں خدا کے واضح بیانات آچکے ہیں۔ اس لیے یہاں کسی کے لیے اس قسم کی بے راہی میں پڑنا قابل معافی نہیں ہوسکتا۔ خدا کا کلام ایک کھلی ہوئی کسوٹی ہے جس پر جانچ کر ہر آدمی معلوم کرسکتا ہے کہ اس کی بات محض ایک لفظی شعبدہ ہے یا کوئی واقعی حقیقت ہے۔ خدا نے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام ضروری امور کی بابت سچا بیان دے دیا ہے۔ اس نے انسانی تعلقات کے تمام پہلوؤں کے بارے میں کامل انصاف کی راہ بتادی ہے۔ آدمی اگر فی الواقع سنجیدہ ہو تو اس کے لیے یہ جاننا کچھ بھی مشکل نہیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ اب اس کے بعد شبہ میں وہی پڑے گا جس کا حال یہ ہو کہ اس کی سوچ خدا کے کلام کے سوا دوسری چیزوں کے زیر اثر کام کرتی ہو۔ جو شخص اپنی سوچ کو خدائی حقیقتوں کے موافق بنالے اس کے لیے یہاں فکری بے راہ روی کا کوئی امکان نہیں۔

اس خدائی وضاحت کے بعد بھی اگر آدمی بھٹکتا ہے تو خدا کو اس کا حال اچھی طرح معلوم ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے اپنی بڑائی قائم رکھنے کی خاطر اپنے سے باہر ظاہر ہونے والی سچائی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کون ہے جس کے تعصب نے اس کو اس قابل نہ رکھا کہ وہ بات کو سمجھ سکے۔ کس نے سستی

نمائش میں اپنی رغبت کی وجہ سے سچائی کی آواز پر دھیان نہیں دیا۔ کون ہے جو حسد کی نفسیات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے حق سے نا آشنا رہا۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿١١٩﴾ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿١٢٠﴾ وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿١٢١﴾ ع

۱۱۸۔ پس کھاؤ اس جانور میں سے جس پر اللہ کا نام لیا جائے، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔ ۱۱۹۔ اور کیا وجہ ہے کہ تم اس جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، حالاں کہ خدا نے تفصیل سے بیان کردی ہیں وہ چیزیں جن کو اس نے تم پر حرام کیا ہے، سوا اس کے کہ اس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔ اور یقیناً بہت سے لوگ اپنی خواہشات کی بنا پر گم راہ کرتے ہیں بغیر کسی علم کے۔ بے شک تمھارا رب خوب جانتا ہے حد سے نکل جانے والوں کو۔ ۱۲۰۔ اور تم گناہ کے ظاہر کو بھی چھوڑ دو اور اس کے باطن کو بھی۔ جو لوگ گناہ کما رہے ہیں، ان کو جلد بدلہ مل جائے گا اس کا جو وہ کر رہے تھے۔ ۱۲۱۔ اور تم اس جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ یقیناً یہ بے حکمی ہے اور شیاطین القا کر رہے ہیں اپنے ساتھیوں کو تاکہ وہ تم سے جھگڑیں۔ اور اگر تم ان کا کہا مانو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔

دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب ہمارے لیے "مالِ غیر" ہے۔ کیوں کہ سب کا سب خدا کا ہے۔ اس کو اپنے لیے جائز کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس کو خدا کے بتائے ہوئے طریقے سے حاصل کیا جائے اور اس کو خدا کے بتائے ہوئے طریقہ سے استعمال کیا جائے۔ یہی معاملہ جانوروں کا بھی ہے۔

جانور ہمارے لیے قیمتی خوراک ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کو خوراک بنانے کا حق ہم کو کیسے ملا۔ جانور کو خدا بناتا ہے اور وہی اس کو پرورش کر کے تیار کرتا ہے۔ پھر ہمارے لیے کیسے جائز ہوا کہ ہم اس کو اپنی خوراک بنائیں۔ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اسی سوال کا جواب ہے۔ اللہ کا نام لینا کوئی لفظی رسم نہیں۔ یہ دراصل جانور کے اوپر خدا کی مالکانہ حیثیت کو تسلیم کرنا اور اس کے عطیہ پر خدا کا شکر ادا کرنا ہے۔ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اسی

اعتراف وتشکر کی ایک علامت ہے اور یہی اعتراف وتشکر وہ ''قیمت'' ہے جس کو ادا کرنے سے مالک کے نزدیک اس کا ایک جانور ہمارے لیے حلال ہو جاتا ہے۔ تاہم جس کو اتفاقی مجبوری پیش آجائے اس کو اس پابندی سے آزاد کر دیا گیا ہے۔

جب آدمی حرام وحلال اور جائز وناجائز میں خدا کا حکم چھوڑتا ہے تو اس کے بعد توہمات اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ لوگ توہماتی خیالات کی بنا پر اشیاء کے بارے میں طرح طرح کی رائیں قائم کر لیتے ہیں۔ ان توہمات کے پیچھے کچھ خود ساختہ فلسفے ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد پر ان کے کچھ ظواہر قائم ہوتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کے فرماں بردار بننا چاہیں ان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان توہمات کو فکری اور عملی دونوں اعتبار سے مکمل طور پر چھوڑ دیں۔

کھانے پینے اور دوسرے امور میں ہر قوم کا ایک رواجی دین بن جاتا ہے۔ اس رواجی دین کے بارے میں لوگوں کے جذبات بہت شدید ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے حق میں اسلاف اور بزرگوں کی تصدیقات شامل رہتی ہیں۔ اس سے ہٹنا بزرگوں کے دین سے ہٹنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اس لیے جب حق کی دعوت اس رواجی دین سے ٹکراتی ہے تو حق کی دعوت کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ وقت کے بڑے ایسی خوش کن باتیں نکالتے ہیں جن سے وہ اپنے عوام کو مطمئن کر سکیں کہ تمھارا رواجی دین صحیح اور یہ ''نیا دین'' بالکل باطل ہے۔ مگر اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ قیامت میں جب وہ حقیقتوں کو کھولے گا تو ہر آدمی دیکھ لے گا کہ وہ حقیقت کی زمین پر کھڑا تھا یا توہمات کی زمین پر۔

اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰہُ وَ جَعَلۡنَا لَہٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنۡ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡہَا ؕ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَۃٍ اَکٰبِرَ مُجۡرِمِیۡہَا لِیَمۡکُرُوۡا فِیۡہَا ؕ وَ مَا یَمۡکُرُوۡنَ اِلَّا بِاَنۡفُسِہِمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ وَ اِذَا جَآءَتۡہُمۡ اٰیَۃٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰی نُؤۡتٰی مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ رُسُلُ اللّٰہِ ؕ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ

۱۲۲۔ کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، وہ اس سے نکلنے والا نہیں۔ اس طرح منکروں کی نظر میں ان کے اعمال خوش نما بنا دئے گئے ہیں۔ ۱۲۳۔ اور اس طرح ہر بستی میں ہم نے گنہ گاروں کے سردار رکھ دئے ہیں کہ وہ وہاں حیلے کریں۔ حالاں کہ وہ جو حیلہ کرتے ہیں اپنے ہی خلاف کرتے ہیں، مگر وہ اس کو نہیں سمجھتے۔ ۱۲۴۔ اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک ہم کو بھی

يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

وہی نہ دیا جائے جو خدا کے پیغمبروں کو دیا گیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کس کو بخشے۔ جولوگ مجرم ہیں ضرور ان کو اللہ کے یہاں ذلت نصیب ہوگی اور سخت عذاب بھی، اس وجہ سے کہ وہ مکر کرتے تھے۔

اللہ کی نظر میں وہ شخص زندہ ہے جس کے سامنے ہدایت کی روشنی آئی اور اس نے اس کو اپنے راستہ کی روشنی بنالیا۔ اس کے مقابلہ میں مردہ وہ ہے جو ہدایت کی روشنی سے محروم ہو کر باطل کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہو۔

مُردہ آدمی اوہام وتعصّبات کے جال میں اتنا پھنسا ہوا ہوتا ہے کہ سیدھے اور سچے حقائق اس کے ذہن کی گرفت میں نہیں آتے۔ وہ اشیاء کی ماہیت سے اتنا بے خبر ہوتا ہے کہ لفظی بحث اور حقیقی کلام میں فرق نہیں کر پاتا۔ وہ اپنی بڑائی کے تصور میں اتنا ڈوبا ہوا ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کی طرف سے آئی ہوئی سچائی کا اعتراف کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن پر رواجی خیالات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ ان سے ہٹ کر کسی اور معیار پر وہ چیزوں کو جانچ نہیں پاتا۔ اپنی ان کمزوریوں کی بنا پر وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہتا ہے، بظاہر زندہ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک مُردہ انسان بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس جو شخص ہدایت کے لیے اپنا سینہ کھول دیتا ہے وہ ہر قسم کی نفسیاتی گرہوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ سچائی کو پہچاننے میں اسے ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ الفاظ کے پردے کبھی اس کے لیے حقیقت کا چہرہ دیکھنے میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ ذوق اور عادت کے مسائل اس کی زندگی میں کبھی یہ مقام حاصل نہیں کرتے کہ اس کے اور حق کے درمیان حائل ہو جائیں۔ سچائی اس کے لیے ایک ایسی روشن حقیقت بن جاتی ہے جس کو دیکھنے میں اس کی نظر کبھی نہ چوکے اور جس کو پانے کے لیے وہ کبھی سست ثابت نہ ہو۔ وہ خود بھی حق کی روشنی میں چلتا ہے اور دوسروں کو بھی اس میں چلانے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ لوگ جو خود ساختہ چیزوں کو خدا کا مذہب بتا کر عوام کا مرجع بنے ہوئے ہوتے ہیں وہ ہر ایسی آواز کے دشمن بن جاتے ہیں جو لوگوں کو سچے دین کی طرف پکارے۔ ایسی ہر آواز ان کو اپنے خلاف بے اعتمادی کی تحریک دکھائی دیتی ہے۔ یہ وقت کے بڑے لوگ حق کی دعوت میں ایسے شوشے نکالتے ہیں جس سے وہ عوام کو اس سے متاثر ہونے سے روک سکیں۔ وہ حق کے دلائل کو غلط رخ دے کر عوام کو شبہات میں مبتلا کرتے ہیں۔ حتی کہ بے بنیاد باتوں کے ذریعے داعی کی ذات کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کی کوششیں صرف ان کے جرم کو بڑھاتی ہیں، وہ داعی اور دعوت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں — حق پرست وہ ہے جو حق کو اس وقت دیکھ لے جب کہ اس کے ساتھ دنیوی عظمتیں شامل نہ ہوئی ہوں۔ دنیوی عظمت والے حق کو ماننا دراصل دنیوی عظمتوں کو ماننا ہے نہ کہ خدا کی طرف سے آئے ہوئے حق کو۔

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّھۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ
لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ
صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی
السَّمَآءِ ؕ کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ عَلَی
الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ ھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ
مُسۡتَقِیۡمًا ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ
یَّذَّکَّرُوۡنَ ﴿۱۲۶﴾ لَھُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ وَ ھُوَ
وَلِیُّھُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

۱۲۵۔ اللہ جس کو چاہتا ہے کہ ہدایت دے تو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے تو اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے، جیسے اس کو آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہو۔ اس طرح اللہ گندگی ڈال دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔ ۱۲۶۔ اور یہی تمھارے رب کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے واضح کر دی ہیں نشانیاں غور کرنے والوں کے لیے۔ ۱۲۷۔ انھیں کے لیے سلامتی کا گھر ہے ان کے رب کے پاس۔ اور وہ ان کا مددگار ہے اس عمل کے سبب سے جو وہ کرتے رہے۔

حق اپنی ذات میں اتنا واضح ہے کہ اس کا سمجھنا کبھی کسی آدمی کے لیے مشکل نہ ہو۔ پھر بھی ہر زمانہ میں بے شمار لوگ حق کی وضاحت کے باوجود حق کو قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ ان کے اندر کی وہ رکاوٹیں ہیں جو وہ اپنی نفسیات میں پیدا کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو مقدس ہستیوں سے اتنا زیادہ وابستہ کر لیتا ہے کہ ان کو چھوڑتے ہوئے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل برباد ہو جائے گا۔ کسی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنی مصلحتوں کا نظام ٹوٹنے کا اندیشہ اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتا ہے کہ اس کے لیے حق کی طرف اقدام کرنا ممکن نہیں رہتا۔ کسی کو نظر آتا ہے کہ حق کو ماننا اپنی بڑائی کے مینار کو اپنے ہاتھ سے ڈھا دینا ہے۔ کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ ماحول کے رواج کے خلاف ایک بات کو اگر میں نے مان لیا تو میں سارے ماحول میں اجنبی بن کر رہ جاؤں گا۔ اس طرح کے خیالات آدمی کے اوپر اتنا مسلط ہو جاتے ہیں کہ حق کو ماننا اس کو ایک بے حد مشکل بلندی پر چڑھائی کے ہم معنی نظر آنے لگتا ہے جس کو دیکھ کر ہی آدمی کا دل تنگ ہونے لگتا ہے۔

اس کے برعکس، معاملہ ان لوگوں کا ہے جو نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا نہیں ہوتے، جو حق کو ہر دوسری چیز سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے سے متلاشی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے جب حق ان کے سامنے آتا ہے تو بلا تاخیر وہ اس کو پہچان لیتے ہیں اور تمام عذرات اور اندیشوں کو نظر انداز کر کے اس کو قبول کر لیتے ہیں۔

خدا اپنے حق کو نشانیوں (اشاراتی حقائق) کی صورت میں لوگوں کے سامنے لاتا ہے۔ اب جو لوگ اپنے دلوں میں کمزوریاں لیے ہوئے ہیں وہ ان اشارات کی خود ساختہ تاویل کر کے اپنے لیے اس کو نہ ماننے کا جواز بنا لیتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے سینے کھلے ہوتے ہیں وہ اشارات کو ان کی اصل گہرائیوں کے ساتھ پا لیتے ہیں اور ان کو اپنے ذہن کی غذا بنا لیتے ہیں۔ ان کی زندگی فی الفور اس سیدھے راستہ پر چل پڑتی ہے جو خدا کی براہِ راست رہنمائی

میں طے ہوتا ہے اور بالآخر آدمی کو ابدی کامیابی کے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

خدا کے یہاں جو کچھ قیمت ہے وہ عمل کی ہے، نہ کہ کسی اور چیز کی۔ جو شخص عملی طور پر خدا کی فرماں برداری اختیار کرے گا، وہی اس قابل ٹھہرے گا کہ خدا اس کی دست گیری کرے، اور اس کو اپنے سلامتی کے گھر تک پہنچا دے۔ یہ سلامتی کا گھر خدا کی جنت ہے جہاں آدمی ہر قسم کے دکھ اور آفت سے محفوظ رہ کر ابدی سکون کی زندگی گزارے گا۔ خدا کی یہ مدد افراد کو ان کے عمل کے مطابق موت کے بعد آنے والی زندگی میں ملے گی۔ لیکن اگر افراد کی قابلِ لحاظ تعداد دنیا میں خدا کی فرماں بردار بن جائے تو ایسی جماعت کو دنیا میں بھی اس کا ایک حصہ دے دیا جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ
اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ
اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ
بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ
لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا
شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿١٢٨﴾
وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا
ع ١٥ كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ
اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ
اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا
شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا
كٰفِرِيْنَ ﴿١٣٠﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ
الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿١٣١﴾

۱۲۸۔ اور جس دن اللہ ان سب کو جمع کرے گا، اے جنوں کے گروہ، تم نے بہت سے لے لیے انسانوں میں سے۔ اور انسانوں میں سے ان کے ساتھی کہیں گے اے ہمارے رب، ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا اور ہم پہنچ گئے اپنے اس وعدہ کو جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔ خدا کہے گا اب تمھارا ٹھکانا آگ ہے، ہمیشہ اس میں رہو گے مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک تمھارا رب حکمت والا، علم والا ہے۔ ۱۲۹۔ اور اسی طرح ہم ساتھ ملا دیں گے گنہ گاروں کو ایک دوسرے سے، بہ سبب ان اعمال کے جو وہ کرتے تھے۔ ۱۳۰۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، کیا تمھارے پاس تمھیں میں سے پیغمبر نہیں آئے جو تم کو میری آیتیں سناتے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے۔ وہ کہیں گے ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا۔ اور وہ اپنے خلاف خود گواہی دیں گے کہ بے شک ہم منکر تھے۔ ۱۳۱۔ یہ اس وجہ سے کہ تمھارا رب بستیوں کو ان کے ظلم پر اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں کہ وہاں کے لوگ بے خبر ہوں۔

کسی کے گمراہ کرنے سے جب کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو یہ یک طرفہ معاملہ نہیں ہوتا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا مقصد پورا کررہے ہیں۔ شیطان جب آدمی کو سبز باغ دکھا کر اپنی طرف لے جاتا ہے تو وہ اپنے اس چیلنج کو صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے، جو اس نے آغاز تخلیق میں خدا کو دیا تھا کہ میں تیری مخلوق کے بڑے حصہ کو اپنا ہمنوا بنالوں گا (بنی اسرائیل، 17:61)۔ دوسری طرف جو لوگ اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کرتے ہیں ان کے سامنے بھی واضح مفادات ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ جنوں کے نام پر اپنے سحر کے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں یا اپنی شاعری اور کہانت کا رشتہ کسی جنّی استاد سے جوڑ کر عوام کے اوپر اپنی برتری قائم کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام تحریکیں جو شیطانی ترغیبات کے تحت اٹھتی ہیں، ان کا ساتھ دینے والے بھی اسی لیے ان کا ساتھ دیتے ہیں کہ ان کو امید ہوتی ہے کہ اس طرح عوام کے اوپر آسانی کے ساتھ وہ اپنی قیادت قائم کرسکتے ہیں۔ کیوں کہ خدائی پکار کے مقابلہ میں شیطانی نعرے ہمیشہ عوام کی بھیڑ کے لیے زیادہ پرکشش ثابت ہوئے ہیں۔

قیامت میں جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا تو یہ بات کھل جائے گی کہ جو لوگ بے راہ ہوئے یا جنھوں نے دوسروں کو بے راہ کیا انھوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ حق کو نظرانداز کرنا تھا، نہ کہ حق سے بے خبر رہنا۔ وہ دنیوی تماشوں سے اوپر نہ اٹھ سکے، وہ وقتی فائدوں کو قربان نہ کرسکے۔ ورنہ خدا نے اپنے خاص بندوں کے ذریعہ جو ہدایت کھولی تھی وہ اتنی واضح تھی کہ کوئی شخص حقیقتِ حال سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر ان کی دنیا پرستی ان کی آنکھوں کا پردہ بن گئی۔ جاننے کے باوجود انھوں نے نہ جانا۔ سننے کے باوجود انھوں نے نہ سنا۔

آخرت میں وہ مصنوعی سہارے ان سے چھن جائیں گے جن کے بل پر وہ حقیقت سے بے پروا بنے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کو نظر آجائے گا کہ کس طرح ایسا ہوا کہ حق ان کے سامنے آیا مگر انھوں نے جھوٹے الفاظ بول کر اس کو رد کردیا۔ کس طرح ان کی غلطی ان پر واضح کی گئی مگر خوبصورت تاویل کرکے انھوں نے سمجھا کہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے میں وہ کامیاب ہوگئے ہیں۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ
بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٢﴾ وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ
ذُوالرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ
مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ
ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿١٣٣﴾ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ
لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يٰقَوْمِ
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ

۱۳۲۔ اور ہر شخص کا درجہ ہے اس کے عمل کے لحاظ سے، اور تمھارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں۔ ۱۳۳۔ اور تمھارا رب بے نیاز، رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو اٹھالے اور تمھارے بعد جس کو چاہے تمھاری جگہ لے آئے۔ جس طرح اس نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے۔ ۱۳۴۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے، وہ آکر رہے گی اور تم خدا کو عاجز نہیں کرسکتے۔ ۱۳۵۔ کہو، اے لوگو تم عمل کرتے رہو اپنی جگہ پر،

تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ تم جلد ہی جان لوگے کہ انجام کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ یقیناً ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

دنیا کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اور دوسرے شخص کے مرتبہ میں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق ٹھیک اس تناسب سے ہوتا ہے جو ایک آدمی اور دوسرے آدمی کی جدوجہد میں پایا جاتا ہے۔ کسی آدمی کی دانش مندی، اس کی محنت، مصلحتوں کے ساتھ اس کی رعایت جس درجہ کی ہوتی ہے اسی درجہ کی کامیابی اس کو یہاں حاصل ہوتی ہے۔

ایسا ہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ آخرت میں درجات اور مقامات کی تقسیم ٹھیک اسی تناسب سے ہوگی، جس تناسب سے کسی آدمی نے دنیا میں اس کے لیے عمل کیا ہے۔ آخرت کے لیے بھی آدمی کو اسی طرح وقت اور مال خرچ کرنا ہے، جس طرح وہ دنیا کے لیے اپنے وقت اور مال کو خرچ کرتا ہے۔ آخرت کے معاملہ میں بھی اس کو اسی طرح ہوشیاری دکھانی ہے، جس طرح وہ دنیا کے معاملہ میں ہوشیاری دکھاتا ہے۔ آخرت کی باتوں میں بھی اس کو مصلحتوں اور نزاکتوں کی اسی طرح رعایت کرنا ہے جس طرح وہ دنیا کی باتوں میں مصلحتوں اور نزاکتوں کی رعایت کرتا ہے۔ جس خدا کے ہاتھ میں آخرت کا فیصلہ ہے وہ ایک ایک شخص کے احوال سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا کہ وہ ہر ایک کو وہی دے جو اس کے استحقاق کے بقدر اس کو ملنا چاہیے۔

خدا نے امتحان اور عمل کی یہ جو دنیا بنائی ہے اس کے ذریعہ اس نے انسان کے لیے ایک قیمتی امکان کھولا ہے۔ وہ چند دن کی زندگی میں اچھے عمل کا ثبوت دے کر ابدی زندگی میں اس کا انجام پا سکتا ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے سے خدا کا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ موجودہ لوگ اگر اس کے تخلیقی منصوبہ کو قبول نہ کریں تو خدا کو اس کی پروا نہیں۔ وہ ان کی جگہ دوسروں کو اٹھا سکتا ہے، جو اس کے تخلیقی منصوبہ کو مانیں اور اپنے آپ کو اس کے ساتھ کریں۔ حتی کہ وہ ریگستان کے ذروں اور درخت کے پتوں کو اپنے وفادار بندوں کی حیثیت سے کھڑا کر سکتا ہے۔

ایک ایسی دنیا جو سراسر حق اور انصاف پر قائم ہو وہاں ظالموں اور سرکشوں کو چھوٹ ملنا خود ہی بتا رہا ہے کہ یہ چھوٹ کوئی انعام نہیں ہے بلکہ ان کو ان کے آخری انجام تک پہنچانے کے لیے ہے۔ جو شخص حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور اس کے باوجود بظاہر اس کا کچھ نہیں بگڑتا اس کو اس صورت حال پر خوش نہیں ہونا چاہیے۔ یہ حالت سراسر وقتی ہے۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ آدمی سے وہ سب کچھ چھین لیا جائے جس کے بل پر وہ سرکشی کر رہا ہے اور اس کو ہمیشہ کے لیے ایک ایسی بربادی میں ڈال دیا جائے جہاں سے کبھی اسے نکلنا نہ ہو۔ جہاں نہ دوبارہ عمل کا موقع ہو اور نہ اپنے عمل کے انجام سے اپنے کو بچانے کا۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

۱۳۶۔ اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے، اس میں سے انھوں نے خدا کا کچھ حصہ مقرر کیا ہے۔ پس وہ کہتے ہیں کہ یہ حصّہ اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ حصہ ہمارے شریکوں کا ہے۔ پھر جو حصہ ان کے شریکوں کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو حصہ اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ ۱۳۷۔ اور اس طرح بہت سے مشرکوں کی نظر میں ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوش نما بنا دیا ہے، تاکہ ان کو برباد کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنادیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس ان کو چھوڑ دو کہ وہ اپنی افترا میں لگے رہیں۔

مشرکین میں یہ رواج تھا کہ وہ فصل اور مویشی میں سے اللہ کا اور بتوں کا حصہ نکالتے۔ اگر وہ دیکھتے کہ خدا کے حصہ کا جانور یا غلہ اچھا ہے تو اس کو بدل کر بتوں کی طرف کر دیتے۔ مگر بتوں کا اچھا ہوتا تو اس کو خدا کی طرف نہ کرتے۔ پیداوار کی تقسیم کے وقت بتوں کے نام کا کچھ حصہ اتفاقاً اللہ کے حصہ میں مل جاتا تو اس کو الگ کر کے بتوں کی طرف لوٹا دیتے۔ اور اللہ کے نام کا کچھ حصہ بتوں کی طرف چلا جاتا تو اس کو نہ لوٹاتے۔ اسی طرح اگر کبھی نذر و نیاز کا غلہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو خدا کا حصہ لے لیتے مگر بتوں کے حصہ کو نہ چھوتے۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل ہو جائے۔ کہنے کے لیے وہ خدا کو مانتے تھے مگر ان کا اصل یقین اپنے بتوں کے اوپر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی محسوس بتوں کو اسی لیے گھڑتا ہے کہ اس کو غیر محسوس خدا پر پورا بھروسہ نہیں ہوتا۔

یہی حال ہر اس شخص کا ہوتا ہے جو زبان سے تو اللہ کو مانتا ہو مگر اس کا دل اللہ کے سوا کہیں اور اٹکا ہوا ہو۔ جو لوگ کسی زندہ یا مردہ ہستی کو اپنی عقیدتوں کا مرکز بنا لیں ان کا حال بھی یہی ہوتا ہے کہ جو وقت ان کے یہاں خدا کی یاد کا ہے اس میں تو وہ اپنے ''شریک'' کی یاد کو شامل کر لیتے ہیں۔ مگر جو وقت ان کے نزدیک اپنے شریک کی یاد کا ہے اس میں خدا کا تذکرہ انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ شیفتگی اور وارفتگی کا جو حصہ خدا کے لیے ہونا چاہیے اس کا کوئی جزء وہ بآسانی اپنے شریکوں کو دے دیں گے۔ مگر اپنے شریک کے لیے وہ جس شیفتگی اور وارفتگی کو ضروری سمجھتے ہیں اس کا کوئی حصہ کبھی خدا کو نہیں پہنچے گا۔ جو مجلس خدا کی عظمت و کبریائی بیان کرنے کے لیے منعقد کی جائے اس میں ان کے شریکوں کی عظمت و کبریائی کا بیان تو کسی نہ کسی طرح داخل ہو جائے گا۔ مگر جو مجلس اپنے شریکوں کی عظمت و

کبریائی کا چرچا کرنے کے لیے ہو وہاں خدا کی عظمت وکبریائی کا کوئی گزر نہ ہوگا۔

ان شریکوں کی اہمیت کبھی ذہن پر اتنا زیادہ غالب آتی ہے کہ آدمی اپنی اولاد تک کو اس کے لیے نثار کر دیتا ہے۔ اپنی اولاد کو خدا کے لیے پیش کرنا ہو تو وہ پیش نہیں کرے گا مگر اپنے شریکوں کی خدمت میں انھیں دینا ہو تو وہ بخوشی اس کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی تمام چیزیں خدا کے دین کے نام پر کی جاتی ہیں مگر حقیقۃً وہ افترا ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک ایسی چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے جس کا حکم خدا نے نہیں دیا۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ع ۱۶

۱۳۸۔ اور کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیتی ممنوع ہے، انھیں کوئی نہیں کھا سکتا سوا اس کے جس کو ہم چاہیں، اپنے گمان کے مطابق۔ اور فلاں چوپائے ہیں کہ ان کی پیٹھ حرام کر دی گئی ہے اور کچھ چوپائے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یہ سب انھوں نے اللہ پر افترا کیا ہے۔ اللہ جلد ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا۔ ۱۳۹۔ اور کہتے ہیں کہ جو فلاں قسم کے جانوروں کے پیٹ میں ہے، وہ ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور وہ ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے۔ اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ اللہ جلد ان کو اس کہنے کی سزا دے گا۔ بے شک اللہ حکمت والا، علم والا ہے۔ ۱۴۰۔ وہ لوگ گھاٹے میں پڑ گئے جنھوں نے اپنی اولاد کو قتل کیا نادانی سے بغیر کسی علم کے۔ اور انھوں نے اس رزق کو حرام کر لیا جو اللہ نے ان کو دیا تھا، اللہ پر بہتان باندھتے ہوئے۔ وہ گمراہ ہو گئے اور وہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔

قدیم عرب کے لوگ اپنے مذہب کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی طرف منسوب کرتے تھے۔ مگر عملاً ان کے یہاں جو مذہب تھا وہ ایک خود ساختہ مذہب تھا جو ان کے پیشواؤں نے گھڑ کر ان کے درمیان رائج کر دیا تھا۔ پیداوار اور چوپایوں کی جو نذریں خدا یا اس کے شریکوں کے نام پر پیش ہوتیں ان کے لیے ان کے یہاں بہت سی کڑی پابندیاں تھیں۔ مثلاً بحیرہ یا سائبہ (جانوروں) کو اگر ذبح کیا اور اس کے پیٹ سے زندہ بچہ نکلا تو اس کا گوشت صرف مرد کھائیں، عورتیں نہ کھائیں۔ اور اگر بچہ مردہ حالت میں ہو تو اس کو مرد عورت دونوں کھا سکتے ہیں۔ اسی طرح

بعض جانوروں کی پیٹھ پر سوار ہونا یا ان کے اوپر بوجھ لادنا ان کے نزدیک حرام تھا۔ بعض جانوروں کی نسبت ان کا عقیدہ تھا کہ ان پر سوار ہوتے وقت یا ان کو ذبح کرتے وقت یا ان کا دودھ نکالتے وقت خدا کا نام نہیں لینا چاہیے۔

ایسے لوگ دین کے اصل تقاضے (اللہ سے تعلق اور آخرت کی فکر) سے انتہائی حد تک دور ہوتے ہیں۔ وہ روزانہ اللہ کے حدود کو توڑتے رہتے ہیں۔ البتہ کچھ غیر متعلق ظاہری چیزوں میں تشدد کی حد تک قواعد وضوابط کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ شیطان کی نہایت گہری چال ہے۔ وہ لوگوں کو اصل دین سے دور کرکے کچھ دوسری چیزوں کو دین کے نام پر ان کے درمیان جاری کر دیتا ہے اور ان میں شدت کی نفسیات پیدا کرکے آدمی کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ کمالِ احتیاط کی حد تک خدا کے دین پر قائم ہے۔ عبادت کے ظواہر میں تشدد بھی اسی خاص نفسیات کی پیداوار ہے۔ آدمی خشوع اور تضرع سے خالی ہوتا ہے اور بعض ظاہری آداب کا شدید التزام کرکے سمجھتا ہے کہ اس نے کمال ادائیگی کی حد تک عبادت کا فعل انجام دے دیا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کی گمراہی اس سے واضح ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے قتلِ اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو درست سمجھ لیا۔ وہ خدا کے پاکیزہ رزق سے لوگوں کو محروم کر دیتے ہیں۔ وہ معمولی مسائل پر لڑتے رہتے ہیں اور ان بڑی چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کی اہمیت کو عقل عام کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّ غَيۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ وَّالنَّخۡلَ وَالزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ۙ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ الۡاَنۡعَامِ حَمُوۡلَةً وَّفَرۡشًا ؕ كُلُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۙ﴿۱۴۲﴾

۱۴۱۔ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے باغ پیدا کیے، کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور کچھ نہیں چڑھائے جاتے۔ اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ اس کے کھانے کی چیزیں مختلف ہوتی ہیں اور زیتون اور انار، باہم ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ وہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو اس کے کاٹنے کے دن۔ اور اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۴۲۔ اور اس نے مویشیوں میں بوجھ اٹھانے والے پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے بھی۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمھیں دی ہیں۔ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

خدا نے انسان کے لیے طرح طرح کی غذائیں پیدا کی ہیں۔ کچھ چیزیں وہ ہیں جو زمین میں پھیلتی ہیں۔ مثلاً خربوزے، سبزیاں وغیرہ۔ کچھ چیزیں وہ ہیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ مثلاً انگور وغیرہ۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو

اپنے تنا پر کھڑی رہتی ہیں۔ مثلاً کھجور، آم وغیرہ۔ اسی طرح آدمی کی ضرورت کے لیے مختلف قسم کے چھوٹے بڑے جانور پیدا کیے۔ مثلاً اونٹ گھوڑے اور بھیڑ بکریاں۔

آدمی ایک علیحدہ مخلوق ہے اور بقیہ چیزیں علیحدہ مخلوق۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ پیدا ہوئے ہیں۔ مگر انسان دیکھتا ہے کہ دونوں میں زبردست ہم آہنگی ہے۔ آدمی کے جسم کو اگر غذائیت درکار ہے تو اس کے باہر ہرے بھرے درختوں میں حیرت انگیز قسم کے غذائی پیکٹ لٹک رہے ہیں۔ اگر اس کی زبان میں مزہ کا احساس پایا جاتا ہے تو پھلوں کے اندر اس کی تسکین کا اعلیٰ سامان موجود ہے۔ اگر اس کی آنکھوں میں حسنِ نظر کا ذوق ہے تو قدرت کا پورا کارخانہ حسن اور دل کشی کا مرقع بنا ہوا ہے۔ اگر اس کو سواری اور بار برداری کے ذرائع درکار ہیں تو یہاں ایسے جانور موجود ہیں جو اس کے لیے نقل وحمل کا ذریعہ بھی بنیں اور اسی کے ساتھ اس کے لیے قیمتی غذا بھی فراہم کریں۔ اس طرح کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ توحید کا اعلان بن گئی ہے۔ کیوں کہ کائنات کے مختلف مظاہر میں یہ وحدت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کا خالق ومالک ایک ہو۔

آدمی جب دیکھتا ہے کہ اتنا عظیم کائناتی اہتمام اس کے کسی ذاتی استحقاق کے بغیر ہو رہا ہے تو اس یک طرفہ انعام پر اس کا دل شکر کے جذبے سے بھر جاتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ سارا معاملہ آدمی کے لیے تقویٰ کی غذا بن جاتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ ہر عنایت (privilege) کے ساتھ ذمہ داری (responsibility) ہو۔ یہ چیز آدمی کو جزا وسزا کی یاد دلاتی ہے اور اس کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ دنیا میں اس احساس کے ساتھ رہے کہ ایک دن اس کو خدا کے سامنے حساب کے لیے کھڑا ہونا ہے۔ یہ احساسات اگر حقیقی طور پر آدمی کے اندر جاگ اٹھیں تو لازمی طور پر اس کے اندر دو باتیں پیدا ہوں گی۔ ایک یہ کہ اس کو جو کچھ ملے گا اس میں وہ اپنے مالک کا حق بھی سمجھے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ صرف واقعی ضرورت کے بقدر خرچ کرے گا، نہ کہ فضول اور بے موقع خرچ کرنے لگے۔ مگر شیطان یہ کرتا ہے کہ اصل رخ سے آدمی کا ذہن موڑ کر اس کو دوسری غیر متعلق باتوں میں الجھا دیتا ہے۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ

۱۴۳۔ اللہ نے آٹھ جوڑے پیدا کیے۔ دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ پوچھو کہ دونوں نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ۔ یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں۔ مجھے دلیل کے ساتھ بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ ۱۴۴۔ اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پوچھو کہ دونوں نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ۔ یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا تھا۔ پھر

اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ
عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع
قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى
طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا
مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا
اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا
عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے تا کہ وہ لوگوں کو بہکا دے بغیر علم کے۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔ ۱۴۵۔ کہو، مجھ پر جو وحی آئی ہے، اس میں تو میں کوئی چیز نہیں پاتا جو حرام ہو کسی کھانے والے پر سوا اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے، یا ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ لیکن جو شخص بھوک سے بے اختیار ہو جائے، نہ نافرمانی کرے اور نہ زیادتی کرے، تو تیرا رب بخشنے والا، مہربان ہے۔

عربوں میں گوشت اور دودھ وغیرہ کے لیے جو جانور پائے جاتے تھے ان میں سے چار زیادہ معروف تھے۔ بھیڑ بکری اور اونٹ گائے۔ ان کے بارے میں انھوں نے طرح طرح کے تحریمی قاعدے بنا لیے تھے۔ مگر ان تحریمی قاعدوں کے پیچھے اپنے مشرکانہ رواجوں کے سوا کوئی دلیل ان کے پاس نہ تھی۔ بھیڑ اور بکری اور اونٹ اور گائے، خواہ نر ہوں یا مادہ، عقلی طور پر کوئی سبب حرمت ان کے اندر موجود نہیں ہے، ان کا تمام کا تمام گوشت انسان کی بہترین غذا ہے۔ ان میں کوئی ایسی ناپاک عادت بھی نہیں جو ان کے بارے میں انسانی طبیعت میں کراہت پیدا کرتی ہو۔ آسمان سے اترے ہوئے علم میں بھی ان کی حرمت کا ذکر نہیں۔

پھر کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ان حیوانات کے بارے میں لوگوں کے اندر طرح طرح کے تحریمی قاعدے بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ شیطانی ترغیبات ہیں۔ انسان کے اندر فطری طور پر خدا کا شعور اور حرام وحلال کا احساس موجود ہے۔ آدمی اپنے اندرونی تقاضے کے تحت کسی ہستی کو اپنا خدا بنانا چاہتا ہے اور چیزوں میں جائز ناجائز کا فرق کرنا چاہتا ہے۔ شیطان اس حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسان کو اگر سادہ حالات میں عمل کرنے کا موقع ملا تو وہ فطرت کے صحیح راستہ کو پکڑ لے گا۔ اس لیے وہ فطرتِ انسانی کو کند کرنے کے لیے طرح طرح کے غلط رواج قائم کرتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر کچھ فرضی خدا گھڑتا ہے۔ وہ حرام وحلال کے نام پر کچھ بے بنیاد محرمات وضع کرتا ہے۔ اس طرح شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی انھیں فرضی چیزوں میں الجھ کر رہ جائے اور اصلی سچائی تک نہ پہنچے۔ وہ سیدھے راستے سے بھٹک چکا ہو۔ مگر بظاہر اپنے کو چلتا ہوا دیکھ کر یہ سمجھے کہ میں ''راستہ'' پر ہوں۔ حالاں کہ وہ ایک ٹیڑھی لکیر ہو، نہ کہ سیدھا راستہ۔

جو لوگ اس طرح شیطانی بہکاوے کا شکار ہوں وہ خدا کی نظر میں ظالم ہیں۔ ان کو خدا نے سمجھ دی تھی جس سے وہ حق وباطل میں تمیز کر سکتے تھے۔ مگر ان کے تعصّبات ان کے لیے پردہ بن گئے۔ سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود وہ سمجھنے سے دور رہے۔

وَعَلَى الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا كُلَّ ذِىۡ ظُفُرٍ‌ۚ وَمِنَ
الۡبَقَرِ وَالۡغَنَمِ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ شُحُوۡمَهُمَاۤ اِلَّا مَا
حَمَلَتۡ ظُهُوۡرُهُمَاۤ اَوِ الۡحَـوَايَاۤ اَوۡ مَا اخۡتَلَطَ بِعَظۡمٍ‌ؕ
ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِبَـغۡيِهِمۡ‌ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾
فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقُلْ رَّبُّكُمۡ ذُوۡ رَحۡمَةٍ وَّاسِعَةٍ‌ۚ وَلَا
يُرَدُّ بَاۡسُهٗ عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۴۷﴾

۱۴۶۔ اور یہود پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے تھے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی سوا اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے لگی ہو یا کسی ہڈی سے ملی ہوئی ہو۔ یہ سزا دی تھی ہم نے ان کو ان کی سرکشی پر اور یقیناً ہم سچے ہیں۔ ۱۴۷۔ پس اگر وہ تم کو جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمھارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے۔ اور اس کا عذاب مجرم لوگوں سے ٹل نہیں سکتا۔

شریعتِ خداوندی میں اصل محرمات ہمیشہ وہی رہے ہیں جو اوپر کی آیت میں بیان ہوئے۔ یعنی مردار، بہایا ہوا خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ اس کے سوا اگر کچھ چیزیں حرام ہیں تو وہ انھیں کی تشریح و تفصیل ہیں۔

مگر اسی کے ساتھ اللہ کی ایک سنتِ تحریم اور ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی حامل کتاب قوم اطاعت کے بجائے سرکشی کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو اس کی سرکشی کی سزا کے طور پر اس کو نئی نئی مشکلات میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس پر ایسی چیزیں حرام کردی جاتی ہیں جو اصلاً شریعت خداوندی میں حرام نہ تھیں۔

اس حرمت کی شکل کیا ہوتی ہے۔ اس کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے اندر ایسے پیشوا اٹھتے ہیں جو دین کی حقیقت سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ وہ صرف ظاہری دین داری سے واقف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جو اہتمام دین کی معنوی حقیقتوں میں کرنا چاہیے وہی اہتمام وہ ظاہری آداب و قواعد میں کرنے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ظواہرِ دین میں غیر ضروری موشگافیاں وجود میں آتی ہیں۔ ایسے لوگ دین کے خود ساختہ ظاہری معیار وضع کرتے ہیں۔ وہ غلو اور تشدد کر کے سادہ حکم کو پیچیدہ اور جائز چیز کو ناجائز بنا دیتے ہیں۔

مثلاً یہود کے اندر جب سرکشی آئی تو ان کے درمیان ایسے علماء اٹھے جنھوں نے اپنی موشگافیوں سے یہ قاعدہ بنایا کہ کسی چوپایہ کے حلال ہونے کے لیے دو شرطیں بیک وقت ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے پاؤں چرے ہوئے ہوں، دوسری یہ کہ وہ جگالی کرتا ہو۔ ان میں سے کوئی ایک شرط بھی اگر نہ پائی جائے تو وہ جانور حرام سمجھا جائے گا۔ اس خود ساختہ شرط کی وجہ سے اونٹ، سافان (cony) اور خرگوش جیسی چیزیں بھی خواہ مخواہ حرام قرار پا گئیں۔ اسی طرح ''ناخن'' کی تشریح میں غلو کر کے انھوں نے غیر ضروری طور پر شتر مرغ، قاز اور بط وغیرہ کو اپنے لیے حرام کرلیا۔ اس قسم کی غیر فطری بندشوں نے ان کے لیے وہاں تنگی پیدا کردی جہاں خدا نے ان کے لیے فراخی رکھی تھی۔

حق کو نہ ماننے کے بعد آدمی فوراً خدا کی پکڑ میں نہیں آتا۔ وہ بدستور اپنے کو آزاد اور بھرپور پاتا ہے۔ اس بنا

پر اکثر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ حق کو نہ ماننے سے اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ خدا کے منصوبۂ تخلیق کی حکمت کی وجہ سے بچا ہوا ہے۔ خدا آدمی کی سرکشی کے باوجود اس کو آخری حد تک موقع دیتا ہے۔ بالآخر جب وہ اپنی روش کو نہیں بدلتا تو اچانک خدا کا عذاب اس کو اپنی پکڑ میں لے لیتا ہے۔ کبھی دنیا میں اور کبھی دنیا اور آخرت دونوں میں۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ
اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ
كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا
بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ
لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ
فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ قُلْ هَلُمَّ
شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ
حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَ
لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ
يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ع ۱۸ ۶ ۵

۱۴۸۔ جنھوں نے شرک کیا، وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کر لیتے۔ اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے قبل ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ کہو کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جس کو تم ہمارے سامنے پیش کرو۔ تم تو صرف گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل سے کام لیتے ہو۔ ۱۴۹۔ کہو کہ پوری حجت تو اللہ کی ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ ۱۵۰۔ کہو کہ اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس پر گواہی دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اگر وہ جھوٹی گواہی دے بھی دیں تو تم ان کے ساتھ گواہی نہ دینا، اور تم ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں۔

حق کی بے آمیز دعوت ہمیشہ اپنے ماحول میں اجنبی دعوت ہوتی ہے۔ ایک طرف مروجہ دین ہوتا ہے جس کو تمام اجتماعی اداروں میں غلبہ کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ صدیوں کی روایات اس کو باوزن بنانے کے لیے اس کی پشت پر موجود ہوتی ہیں۔ دوسری طرف حق کی دعوت ہوتی جو ان تمام اضافی خصوصیات سے خالی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کے لیے سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ جس دین کو اتنا درجہ اور اتنی مقبولیت حاصل ہو وہ دین خدا کی پسند کے مطابق نہ ہوگا۔ لوگ فرض کر لیتے ہیں کہ مروجہ دین کا اتنا پھیلاؤ اسی لیے ممکن ہوسکا کہ خدا کی مرضی اس کے شامل حال تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کو یہ پھیلاؤ کبھی حاصل نہ ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ جس دین کو خدا کی دنیا میں ہر

طرف بلند مقام حاصل ہو وہ خدا کا پسندیدہ دین ہوگا یا وہ دین جس کو خدا کی دنیا میں کہیں کوئی مقام حاصل نہیں۔

مگر حق و باطل کا فیصلہ حقیقی دلائل پر ہوتا ہے، نہ کہ اس قسم کے قیاسات پر۔ خدا نے اس دنیا کو امتحان گاہ بنایا ہے۔ یہاں آدمی کو یہ موقع ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے اختیار کرے اور جس چیز کو چاہے اختیار نہ کرے۔ یہ معاملہ تمام تر آدمی کے اپنے اوپر منحصر ہے۔ ایسی حالت میں کسی چیز کا رواج عام اس کے برحق ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کوئی چیز برحق ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ دلائل کی بنیاد پر ہوگا، نہ کہ رواجی عمل کی بنیاد پر۔

دنیا کو اللہ نے امتحان گاہ بنایا۔ انسان پر اپنی مرضی جبراً مسلط کرنے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا کہ انسان کو صحیح اور غلط کا علم دیا اور یہ معاملہ انسان کے اوپر چھوڑ دیا کہ وہ صحیح کو لیتا ہے یا غلط کو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں دلیل (حجت) خدا کی نمائندہ ہے۔ آدمی جب ایک سچی دلیل کے آگے جھکتا ہے تو وہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ اور جب وہ ایک سچی دلیل کو ماننے سے انکار کرتا ہے ہو تو وہ خدا کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔

جب آدمی دلیل کے آگے نہیں جھکتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہش سے اوپر اٹھ نہیں پاتا۔ وہ باطل کو حق کہنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ اپنے عمل کو جائز ثابت کر سکے۔ اس کی ڈھٹائی اس کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ خدا کی نشانیوں کو نظر انداز کر دے۔ وہ اس بات سے بے پروا ہو جاتا ہے کہ خدا اس کو بالآخر پکڑنے والا ہے۔ وہ دوسری چیزوں کو وہ اہمیت دیتا ہے جو اہمیت صرف خدا کو دینا چاہیے۔

قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِيَّاهُمۡ ۚ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ ذٰلِكُمۡ وَصّٰٮكُمۡ بِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾

۱۵۱۔ کہو، آؤ میں سناؤں وہ چیزیں جو تمھارے رب نے تم پر حرام کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کام کے پاس نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو نہ مارو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

خدائی پابندی کے نام پر لوگ طرح طرح کی رسمی اور ظاہری پابندیاں بنا لیتے ہیں اور ان کا خصوصی اہتمام کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے خدائی پابندیوں کا حق ادا کر دیا۔ مگر خدا انسان سے جن پابندیوں کا اہتمام چاہتا ہے وہ حقیقی پابندیاں ہیں، نہ کہ کسی قسم کے رسمی مظاہر۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کو اپنا خدا بنائے۔ اس کے سوا کسی کی بڑائی کا غلبہ اس کے ذہن پر نہ ہو۔ اس کے سوا کسی کو وہ قابل بھروسہ نہ سمجھتا ہو۔ اس کے سوا کسی سے وہ امید قائم نہ کرے اس کے سوا کسی سے وہ نہ ڈرے اور نہ اس کے سوا کسی کی شدید محبت میں مبتلا ہو۔

والدین اکثر حالات میں کمزور اور محتاج ہوتے ہیں اور اولاد طاقت ور۔ ان سے حسن سلوک کا محرک مفاد نہیں ہوتا بلکہ صرف حق شناسی ہوتا ہے۔ اس طرح والدین کے حقوق ادا کرنے کا معاملہ آدمی کے لیے اس بات کا سب سے پہلا امتحان بن جاتا ہے کہ اس نے خدا کے دین کو قول کی سطح پر اختیار کیا ہے یا عمل کی سطح پر۔ اگر وہ والدین کی کمزوری کے بجائے ان کے حق کو اہمیت دے، اگر اپنے دوستوں اور اپنی بیوی بچوں کی محبت اس کو والدین سے دور نہ کرے تو گویا اس نے اس بات کا پہلا ثبوت دے دیا کہ اس کا اخلاق اصول پسندی اور حق شناسی کے تابع ہوگا، نہ کہ مفاد اور مصلحت کے تابع۔

انسان اپنے حرص اور ظلم کی وجہ سے خدا کے پیدا کیے ہوئے رزق کو تمام بندوں تک منصفانہ طور پر پہنچنے نہیں دیتا۔ اور جب اس کی وجہ سے قلت کے مصنوعی مسائل پیدا ہوتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ کھانے والوں کو قتل کر دو یا پیدا ہونے والوں کو پیدا نہ ہونے دو۔ اس قسم کی باتیں خدا کے نظام رزق پر بہتان کے ہم معنیٰ ہیں۔

بہت سی برائیاں ایسی ہیں جو اپنی ہیئت میں اتنی فحش ہوتی ہیں کہ ان کی برائی کو جاننے کے لیے کسی بڑے علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسانی فطرت اور اس کا ضمیر ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ یہ کام انسان کے کرنے کے قابل نہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص فحاشی یا بے حیائی کے کام میں مبتلا ہو وہ گویا ثابت کر رہا ہے کہ وہ اس ابتدائی درجۂ انسانیت سے بھی محروم ہے جہاں سے کسی انسان کے انسان ہونے کا آغاز ہوتا ہے۔

ہر انسان کی جان محترم ہے۔ کسی انسان کو ہلاک کرنا کسی کے لیے جائز نہیں جب تک خالق کے قانون کے مطابق وہ کوئی ایسا جرم نہ کرے جس میں اس کی جان لینا مخصوص شرائط کے ساتھ مباح ہو گیا ہو — یہ باتیں اتنی واضح ہیں کہ عقل سے کام لینے والا ان کی صداقت کو جاننے سے محروم نہیں رہ سکتا۔

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ

۱۵۲۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اسے طاقت ہو۔ اور جب بولو تو انصاف کی بات بولو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کا اللہ نے تمھیں حکم دیا

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ ۱۵۳۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ یہی میری سیدھی شاہراہ ہے پس اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے جدا کردیں گے۔ یہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچتے رہو۔

یتیم کسی سماج کا سب سے کمزور فرد ہوتا ہے۔ وہ تمام اضافی اسباب اس کی ذات میں حذف ہوجاتے ہیں جو عام طور پر کسی کے ساتھ اچھے سلوک کا محرک بنتے ہیں۔ ''یتیم'' کے ساتھ ذمہ داری کا معاملہ وہی شخص کرسکتا ہے جو خالص اصولی بنیاد پر باکردار بنا ہو، نہ کہ فائدہ اور مصلحت کی بنیاد پر۔ یتیم کسی سماج میں حسن سلوک کی آخری علامت ہوتا ہے۔ جو شخص یتیم کے ساتھ خیر خواہانہ سلوک کرے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بدرجہ اولیٰ خیر خواہانہ سلوک کرے گا۔

کائنات کی ہر چیز دوسری چیز سے اس طرح وابستہ ہے کہ ہر چیز دوسرے کو وہی دیتی ہے جو اس کو دینا چاہیے اور دوسرے سے وہی چیز لیتی ہے جو اس کو لینا چاہیے۔ یہی اصول انسان کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ جب وہ دوسرے انسان کے لیے ناپے تو ٹھیک ناپے اور جب تولے تو ٹھیک تولے۔ ایسا نہ کرے کہ اپنے لیے ایک پیمانہ استعمال کرے اور غیر کے لیے دوسرا پیمانہ۔

زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی کو کسی کے خلاف اظہار رائے کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر خدا کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی وہی بات کہے جو انصاف کے معیار پر پوری اترنے والی ہو۔ کوئی اپنا ہو یا غیر ہو۔ اس سے دوستی کے تعلقات ہوں یا دشمنی کے تعلقات، ایسا شخص ہو جس سے کوئی فائدہ وابستہ ہے یا ایسا شخص ہو جس سے کوئی فائدہ وابستہ نہیں، ان تمام چیزوں کی پروا کیے بغیر آدمی وہی کہے جو فی الواقع درست اور حق ہے۔

ہر آدمی فطرت کے عہد میں بندھا ہوا ہے۔ کوئی عہد لکھا ہوا ہوتا ہے اور کوئی عہد وہ ہوتا ہے جو لفظوں میں لکھا ہوا نہیں ہوتا مگر آدمی کا ایمان، اس کی انسانیت اور اس کی شرافت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس موقع پر ایسا کیا جائے۔ دونوں قسم کے عہدوں کو پورا کرنا ہر مومن و مسلم کا فریضہ ہے— یہ تمام باتیں انتہائی واضح ہیں۔ آسمانی وحی اور آدمی کی عقل ان کے برحق ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ مگر ان سے وہی شخص نصیحت پکڑے گا، جو خود بھی نصیحت پکڑنا چاہتا ہو۔

یہ احکام (الانعام، 6:151-153) شریعت الٰہی کے بنیادی احکام ہیں۔ ان پر ان کے سیدھے مفہوم کے اعتبار سے عمل کرنا خدا کی سیدھی شاہراہ پر چلنا ہے۔ اور اگر تاویل اور موشگافیوں کے ذریعہ ان میں شاخیں نکالی جائیں اور سارا زور ان شاخوں پر دیا جانے لگے تو یہ اِدھر اُدھر کے متفرق راستوں میں بھٹکنا ہے جو کبھی آدمی کو خدا تک نہیں پہنچاتا۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ
اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ
رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٤﴾ وَهٰذَا ع ١٩
كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُوْنَ ﴿١٥٥﴾ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ
عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ
دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿١٥٦﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ
عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ
جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ
عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا
سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿١٥٧﴾ هَلْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ
رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ
بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ
تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا
خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٥٨﴾

۱۵۴۔ پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی نیک کام کرنے والوں پر اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے اور ہر بات کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت، تاکہ وہ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں۔ ۱۵۵۔ اور اسی طرح ہم نے یہ کتاب اتاری ہے، ایک برکت والی کتاب۔ پس اس پر چلو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ ۱۵۶۔ اس لیے کہ تم یہ نہ کہنے لگو کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی اور ہم ان کو پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے۔ ۱۵۷۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے بہتر راہ پر چلنے والے ہوتے۔ پس آ چکی تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت۔ تو اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ جو لوگ ہماری نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں ہم ان کو ان کے اعراض کی پاداش میں بہت برا عذاب دیں گے۔ ۱۵۸۔ یہ لوگ کیا اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمھارا رب آئے یا تمھارے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو۔ جس دن تمھارے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی آپہنچے گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لا چکا ہو یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی ہو۔ کہو تم راہ دیکھو، ہم بھی راہ دیکھ رہے ہیں۔

خدا کی طرف سے جو کتاب آتی ہے اس میں اگرچہ بہت سی تفصیلات ہوتی ہیں مگر بالآخر اس کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے۔ یہ کہ آدمی اپنے رب کی ملاقات پر یقین کرے۔ یعنی دنیا میں وہ اس طرح زندگی گزارے کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے اپنے آپ کو خدا کے یہاں جواب دہ سمجھتا ہو۔ اس کی زندگی ایک ذمہ دارانہ زندگی ہو، نہ کہ آزاد اور

بے قید زندگی۔ یہی پچھلی کتابوں کا مقصد تھا اور یہی قرآن کا مدعا بھی ہے۔

خدا نے بقیہ دنیا کو براہِ راست اپنے جبری حکم کے تحت اپنا پابند بنا رکھا ہے۔ مگر انسان کو اس نے پورا اختیار دے دیا ہے۔ اس نے انسان کی ہدایت کا یہ طریقہ رکھا ہے کہ رسول اور کتاب کے ذریعہ دلائل کی زبان میں وہ لوگوں کو حق اور باطل سے باخبر کرتا ہے۔ دنیا میں خدا کی مرضی لوگوں کے سامنے دلیل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں دلیل کو ماننا خدا کو ماننا ہے اور دلیل کو جھٹلانا خدا کو جھٹلانا۔

قیامت کا دھما کہ ہونے کے بعد تمام چھپی ہوئی حقیقتیں لوگوں کے سامنے آجائیں گی۔ اس وقت ہر آدمی خدا اور اس کی باتوں کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ مگر اس وقت کے ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔ ماننا وہی ماننا ہے جو حالتِ غیب میں ماننا ہو۔ ایمان دراصل یہ ہے کہ دیکھنے کے بعد آدمی جو کچھ ماننے پر مجبور ہوگا اس کو وہ دیکھے بغیر مان لے۔ جو شخص دیکھ کر مانے اس نے گویا مانا ہی نہیں۔

جو لوگ آج اختیار کی حالت میں اپنے کو خدا کا پابند بنا لیں ان کے لیے خدا کے یہاں جنت ہے۔ اس کے برعکس، جو لوگ قیامت کے آنے کے بعد خدا کے آگے جھکیں گے ان کا جھکنا صرف ان کے جرم کو مزید ثابت کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے خود اپنے اعتراف کے مطابق، ایک ماننے والی بات کو نہ مانا، انھوں نے ایک کیے جانے والے کام کو نہ کیا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُہُمۡ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِہَا ۚ وَ مَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجۡزٰۤی اِلَّا مِثۡلَہَا وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾

۱۵۹۔ جنھوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور گروہ گروہ بن گئے تم کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر وہی ان کو بتادے گا جو وہ کرتے تھے۔ ۱۶۰۔ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس کا دس گنا ہے۔ اور جو شخص برائی لے کر آئے گا تو اس کو بس اس کے برابر بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

دین یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کے سوا کسی کو اپنی زندگی میں برتر مقام نہ دے۔ وہ حق شناسی کی بنیاد پر تعلقات قائم کرے، نہ کہ مفاد کی بنیاد پر، جس کی پہلی علامت والدین ہیں۔ وہ رزق کو خدا کا عطیہ سمجھے اور خدائی نظام میں مداخلت نہ کرے، اس معاملہ میں آدمی کی گمراہی اس کو قتل اولاد اور تحدید نسل کی حماقت تک لے جاتی ہے۔ وہ فحش اور بے حیائی کے کاموں سے بچے تا کہ برائی کے بارے میں اس کے دل کی حساسیت زندہ رہے۔ وہ کمزور کا استحصال نہ کرے جس کا قریبی امتحان آدمی کے لیے یتیم کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ حقوق کی ادائیگی اور لین دین میں ترازو کی طرح بالکل ٹھیک رہے۔ وہ اپنی زبان کا استعمال ہمیشہ حق کے مطابق کرے۔ وہ اس احساس

کے ساتھ زندگی گزارے کہ ہر حال میں وہ عہد خداوندی میں بندھا ہوا ہے، وہ کسی بھی وقت خدائی عہد کی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہے۔ یہی کسی آدمی کے لیے خدا کی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کا سیدھا راستہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دائیں اور بائیں بھٹکے بغیر اس سیدھے راستہ پر ہمیشہ قائم رہے۔

اوپر جو دس احکام (آیات 153-151) بیان ہوئے وہ سب سادہ فطری احکام ہیں۔ ہر آدمی کی عقل ان کے سچے ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ اگر صرف ان چیزوں پر زور دیا جائے تو کبھی اختلاف اور فرقہ بندی نہ ہو۔ مگر جب قوموں پر زوال آتا ہے تو ان میں ایسے رہنما پیدا ہوتے ہیں جو ان سادہ احکام میں طرح طرح کی غیر فطری شقیں نکالتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو دینی اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

توحید میں اگر یہ بحث چھیڑی جائے کہ خدا جسم رکھتا ہے یا وہ بغیر جسم ہے۔ یتیم کے معاملے میں موشگافیاں کی جائیں کہ یتیم ہونے کی شرائط کیا ہیں۔ یا یہ نکتہ نکالا جائے کہ ان خدائی احکام پر اس وقت تک عمل نہیں ہوسکتا جب تک حکومت پر قبضہ نہ ہو۔ اس لیے سب سے پہلا کام ”غیر اسلامی“ حکومت کو بدلنا ہے — اس قسم کی بحثیں اگر شروع کر دی جائیں تو ان کی کوئی حد نہ ہوگی۔ اور ان پر عمومی اتفاق حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے بعد مختلف فکری حلقے بنیں گے۔ الگ الگ فرقے اور جماعتیں قائم ہوں گی۔ باہمی اتفاق باہمی افتراق کی صورت اختیار کر لے گا۔

اس سادہ اور فطری دین پر اپنی ساری توجہ لگانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ مگر اس کے لیے آدمی کو نفس سے لڑنا پڑتا ہے۔ ماحول کی ناسازگاری کے باوجود صبر اور قربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اس پر جمے رہنا پڑتا ہے۔ یہ ایک بڑا پُرمشقت عمل ہے اس لیے اس کا بدلہ بھی خدا کے یہاں کئی گنا بڑھا کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ برائی کرتے ہیں، جو خدا کی دنیا میں خدا کے مقرر راستہ کے سوا دوسرے راستوں پر چلتے ہیں وہ اگرچہ بہت بڑا جرم کرتے ہیں۔ تاہم خدا ان کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کرتا۔ وہ ان کو اتنی ہی سزا دیتا ہے جتنا انھوں نے جرم کیا ہے۔

قُلۡ اِنَّنِیۡ هَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۬ۚ دِیۡنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُكِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾ۙ لَا شَرِیۡكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیۡءٍ ؕ وَ لَا

۱۶۱۔ کہو، میرے رب نے مجھ کو سیدھا راستہ بتا دیا ہے۔ دینِ صحیح ابراہیم کی ملت کی طرف جو یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ ۱۶۲۔ کہو میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے جہان کا۔ ۱۶۳۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلے فرماں بردار ہوں۔ ۱۶۴۔ کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں جب کہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور جو شخص بھی کوئی کمائی کرتا

تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾ ع

ہے وہ اسی پر رہتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹنا ہے۔ پس وہ تمھیں بتادے گا وہ چیز جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔ ۱۶۵۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تم میں سے ایک کا رتبہ دوسرے پر بلند کیا، تاکہ وہ آزمائے تم کو ان چیزوں میں جو اس نے تم کو دی ہیں۔ تمھارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

قرآن کی صورت میں خدا نے اپنا وہ بے آمیز دین نازل کردیا ہے جو اس نے حضرت ابراہیم اور دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا۔ اب جو شخص خدا کی رحمت و نصرت میں حصہ دار بننا چاہتا ہو وہ اس دین کو پکڑ لے، وہ اپنی عبادت کو خدا کے لیے خاص کردے۔ وہ خدا سے قربانی کی سطح پر تعلق قائم کرے۔ وہ جیے تو خدا کے لیے جیے اور اس کو موت آئے تو اس حال میں آئے کہ وہ ہمہ تن خدا کا بندہ بنا ہوا ہو۔ عظیم کائنات اپنے تمام اجزا کے ساتھ اطاعت خداوندی کے اسی دین پر قائم ہے۔ پھر انسان اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ کیسے اختیار کرسکتا ہے۔ خدا کی اطاعت کی دنیا میں خدا کی سرکشی کا طریقہ اختیار کرنا کسی کے لیے کامیابی کا سبب کس طرح بن سکتا ہے۔ یہ معاملہ ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے، کوئی نہ کسی کے انعام میں شریک ہوسکتا اور نہ کوئی کسی کی سزا میں آدمی کو چاہیے کہ اس معاملہ میں وہ اسی طرح سنجیدہ ہو جس طرح دنیا میں کوئی مسئلہ کسی کا ذاتی مسئلہ ہو تو وہ اس میں آخری حد تک سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

دنیا کا نظام یہ ہے کہ یہاں ایک شخص جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آتا ہے۔ ایک قوم پیچھے ہٹا دی جاتی ہے اور دوسری قوم اس کے بجائے زمین کے ذرائع و وسائل پر قبضہ کرلیتی ہے۔ یہ واقعہ بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہاں کسی کا اقتدار دائمی نہیں۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جس کسی کو زمین پر موقع ملتا ہے تو وہ گزرے ہوئے لوگوں کے انجام کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے ظلم اور سرکشی کو جائز ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل گھڑ لیتا ہے مگر جب خدا حقیقتوں کو برہنہ کرے گا تو آدمی دیکھے گا کہ اس کی ان باتوں کی کوئی قیمت نہ تھی، جن کو وہ اپنے موقف کے جواز کے لیے مضبوط دلیل سمجھے ہوئے تھا۔

دنیا میں آدمی کی سرکشی کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں کو اپنے حق میں خدا کا انعام سمجھ لیتا ہے ہے۔ حالاں کہ دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ صرف بطور آزمائش ہے، نہ کہ بطور انعام۔ دنیا کی چیزوں کو آدمی اگر انعام سمجھے تو اس کے اندر فخر پیدا ہوگا اور اگر وہ ان کو آزمائش سمجھے تو اس کے اندر عجز پیدا ہوگا۔ فخر کی نفسیات ڈھٹائی پیدا کرتی ہے اور عجز کی نفسیات اطاعت۔

۷۔ سُوْرَةُ الْاَعْرَاف

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ فَلَا يَكُنۡ فِىۡ
صَدۡرِكَ حَرَجٌ مِّنۡهُ لِتُنۡذِرَ بِهٖ وَ ذِكۡرٰى
لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ
رَّبِّكُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ؕ
قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۳﴾ وَ كَمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ
اَهۡلَكۡنٰهَا فَجَآءَهَا بَاۡسُنَا بَيَاتًا اَوۡ هُمۡ
قَآئِلُوۡنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعۡوٰىهُمۡ اِذۡ جَآءَهُمۡ
بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۵﴾
فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِيۡنَ اُرۡسِلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ
الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيۡهِمۡ بِعِلۡمٍ وَّ مَا
كُنَّا غَآئِبِيۡنَ ﴿۷﴾ وَ الۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذِ اۨلۡحَقُّ ۚ
فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۸﴾ وَ مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ
فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ بِمَا كَانُوۡا
بِاٰيٰتِنَا يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۹﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ الٓمّٓصٓ۔ ۲۔ یہ کتاب ہے جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے۔ پس تمھارا دل اس کے باعث تنگ نہ ہو، تاکہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈراؤ، اور وہ ایمان والوں کے لیے یاددہانی ہے۔
۳۔ جو اترا ہے تمھاری جانب تمھارے رب کی طرف سے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ تم بہت کم نصیحت مانتے ہو۔ ۴۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کردیا۔ ان پر ہمارا عذاب رات کو آپہنچا، یا دوپہر کو جب کہ وہ آرام کررہے تھے۔
۵۔ پھر جب ہمارا عذاب ان پر آیا تو وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے کہ واقعی ہم ظالم تھے۔ ۶۔ پس ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان لوگوں سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے۔
۷۔ پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کردیں گے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غائب نہ تھے۔ ۸۔ اس دن وزن دار صرف حق ہوگا۔ پس جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی لوگ کامیاب ٹھہریں گے۔
۹۔ اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، کیوں کہ وہ ہماری نشانیوں کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے۔

خدا کی کتاب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک نصیحت ہے۔ مگر وہ عملاً صرف ان تھوڑے سے لوگوں کے لیے نصیحت بنتی ہے، جو اپنی فطری صلاحیت کو زندہ کیے ہوئے ہوں۔ بقیہ لوگوں کے لیے وہ صرف اس برے انجام سے ڈرانے کے ہم معنی ہو کر رہ جاتی ہے جس کی طرف وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے بڑھ رہے ہیں۔ داعی یہ دیکھ

کر تڑپتا ہے کہ جو چیز مجھے کامل صداقت کے روپ میں دکھائی دے رہی ہے اس کو بیشتر لوگ باطل سمجھ کر ٹھکرا رہے ہیں۔ جو چیز میری نظر میں پہاڑ سے بھی زیادہ اہم ہے اس کے ساتھ لوگ ایسا بے پروائی کا سلوک کر رہے ہیں جیسے اس کی کچھ حقیقت ہی نہ ہو، جیسے وہ بالکل بے اصل ہو۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کے لیے موقع ہے کہ اگر وہ کسی بات کو نہ ماننا چاہے تو وہ اس کو نہ مانے، حتی کہ وہ اس کو رد کرنے کے لیے خوبصورت الفاظ بھی پالے۔ مگر یہ صورت حال بالکل عارضی ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اچانک کھل جائے گا کہ داعی کی بات لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ ثابت شدہ تھی۔ یہ صرف مخالفین کا تعصب اور ان کی انانیت تھی جس نے انھیں دلیل کو دلیل کی صورت میں دیکھنے نہ دیا۔ اس وقت کھل جائے گا کہ داعیٔ حق کی باتوں کی رد میں جو دلیلیں وہ پیش کرتے تھے وہ محض دھاندلی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی استدلال۔

دنیا میں جو چیزیں کسی کو باوزن بناتی ہیں وہ یہ کہ اس کے گرد مادی رونقیں جمع ہوں۔ وہ الفاظ کے دریا بہانے کا فن جانتا ہو۔ اس کے ساتھ عوام کی بھیڑ اکھٹا ہو گئی ہو۔ چوں کہ حق کے داعی کے ساتھ عام طور پر یہ اسباب جمع نہیں ہوتے اس لیے دنیا کے لوگوں کی نظر میں اس کی بات بے وزن اور اس کے مخالفوں کی بات وزن دار بن جاتی ہے۔ مگر قیامت جب مصنوعی پردوں کو پھاڑے گی تو صورت حال بالکل برعکس ہو جائے گی۔ اب سارا وزن حق کی طرف ہوگا اور ناحق بالکل بے دلیل اور بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا
ع ۸ مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰ وَلَقَدْ
خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ
اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ڰ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ
يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۱۱ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا
تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲
قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ
فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳ قَالَ

۱۰۔ اور ہم نے تم کو زمین میں جگہ دی اور ہم نے تمھارے لیے اس میں زندگی کا سامان فراہم کیا، مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔ ۱۱۔ اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمھاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس انھوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ ۱۲۔ خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا، جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ ۱۳۔ خدا نے کہا کہ تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے۔ پس نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔

اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٤﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿١٥﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿١٧﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٨﴾

۱۴۔ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے جب کہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ ۱۵۔خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ۱۶۔ابلیس نے کہا کہ چوں کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لیے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ ۱۷۔پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے، اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ ۱۸۔خدا نے کہا کہ نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

خدا نے انسان کو اس دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس لیے دیا ہے کہ اس کا نفسیاتی جواب وہ شکر کی صورت میں پیش کرے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جس کو آدمی اپنے رب کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان اس کے اندر دوسرے دوسرے جذبات ابھار کر اس کو شکر کی نفسیات سے دور کر دیتا ہے۔

آدم اور ابلیس کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور گمراہی کا معرکہ کہاں برپا ہے۔ یہ معرکہ ان مواقع پر برپا ہے جہاں آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جاگتی ہیں۔ امتحان کی اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اوپر اٹھ جاتا ہے، کبھی کوئی شخص دولت وعزت میں دوسرے سے زیادہ حصہ پالیتا ہے۔ کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاملہ پڑتا ہے کہ ایک شخص کے لیے دوسرے کو اس کا جائز حق دینا اپنے کو نیچے گرانے کے ہم معنی نظر آتا ہے۔ کبھی کسی شخص کی زبان سے خدا ایک سچائی کا اعلان کراتا ہے اور وہ ان لوگوں کو اپنے سے برتر دکھائی دینے لگتا ہے جو اس سچائی تک پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔ ایسے مواقع پر شیطان آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جگا دیتا ہے۔ ’’میں بہتر ہوں‘‘ کے جذبہ سے مغلوب ہو کر وہ اپنے بھائی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہی خدا کی نظر میں شیطان کے راستہ پر چلنا ہے۔ جس شخص نے ایسے مواقع پر حسد اور گھمنڈ کا طریقہ اختیار کیا اس نے اپنے کو جہنمی انجام کا مستحق بنا لیا جو شیطان کے لیے مقدر ہے اور جس نے ایسے مواقع پر شیطان کے پیدا کیے ہوئے جذبات کو اپنے اندر کچل ڈالا اس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ اس قابل ہے کہ اس کو جنت کے باغوں میں بسایا جائے۔

جو کچھ کسی کو ملتا ہے خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لیے کسی کی فضیلت کا اعتراف دراصل خدا کی تقسیم کے برحق ہونے کا اعتراف ہے اور اس کی فضیلت کو نہ ماننا خدا کی تقسیم کو نہ ماننا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کسی حق

کی بنا پر دوسرے کے آگے جھکتا ہے تو وہ کسی آدمی کے آگے نہیں جھکتا بلکہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ کیوں کہ ایسا وہ خدا کے حکم کی بنا پر کر رہا ہے، نہ کہ اس آدمی کے ذاتی فضل کی بنا پر۔

وَيَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝١٩ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝٢٠ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝٢١

۱۹۔ اور اے آدم، تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو اور کھاؤ جہاں سے چاہو، مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ ۲۰۔ پھر شیطان نے دونوں کو بہکایا تاکہ وہ کھول دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ تمھارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتہ نہ بن جاؤ یا تم کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے۔ ۲۱۔ اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

جنت اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ آدم اور ان کی بیوی کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ اس میں طرح طرح کی چیزیں تھیں اور خدا کی طرف سے ان کو آزادی تھی کہ ان کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ بے شمار جائز چیزوں کے درمیان صرف ایک چیز کے استعمال سے روک دیا گیا تھا۔ شیطان نے اسی ممنوعہ مقام سے ان پر حملہ کیا۔ اس نے وسوسہ اندازیوں کے ذریعہ سکھایا کہ جس چیز سے تمھیں روکا گیا ہے وہی جنت کی اہم ترین چیز ہے۔ اسی میں تقدس اور ابدیت کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔ آدم اور ان کی بیوی ابلیس کی مسلسل تلقین سے متاثر ہو گئے۔ اور بالآخر ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا۔ مگر جب انھوں نے ایسا کیا تو نتیجہ ان کی توقعات کے بالکل برعکس نکلا۔ ان کی اس خلاف ورزی نے خدا کا لباسِ حفاظت ان کے جسم سے اتار دیا۔ وہ اس دنیا میں بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے جہاں اس سے پہلے ان کو ہر طرح کی سہولت اور حفاظت حاصل تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا وہ خاص حربہ کیا ہے جس سے وہ انسان کو بہکا کر خدا کی رحمت و نصرت سے دور کر دیتا ہے۔ وہ ہے— حلال رزق کے پھیلے ہوئے میدان کو آدمی کی نظر میں کمتر کر کے دکھانا اور جو چند چیزیں حرام ہیں ان کو خوب صورت طور پر پیش کر کے یقین دلانا کہ تمام بڑے بڑے فائدوں اور مصلحتوں کا راز بس انھیں چند چیزوں میں چھپا ہوا ہے۔

شیطان اپنا یہ کام ہر ایک کے ساتھ اس کے اپنے ذوق اور حالات کے اعتبار سے کرتا ہے۔ کسی کو تمام قیمتی غذاؤں سے بے رغبت کر کے یہ سکھاتا ہے کہ شاندار تندرستی حاصل کرنا چاہتے ہو تو شراب پیو۔ کہیں لاکھوں بے روزگار مرد کام کرنے کے لیے موجود ہوں گے مگر وہ ترغیب دے گا کہ اگر ترقی کی منزل تک جلد پہنچنا چاہتے ہو تو

عورتوں کو گھر سے باہر لا کر انھیں مختلف تمدنی شعبوں میں سرگرم کردو۔ کسی کے پاس اپنے مخالف کو زیر کرنے کا یہ قابل عمل طریقہ موجود ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مستحکم بنائے مگر شیطان اس کے کان میں ڈالے گا کہ تمھارے لیے اپنے مخالف کو شکست دینے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ اس کے خلاف تخریبی کارروائیاں شروع کردو۔ کسی کے لیے "اپنی تعمیر آپ" کے میدان میں کام کرنے کے لیے بےشمار مواقع کھلے ہوئے ہوں گے مگر وہ سکھائے گا کہ دوسروں کے خلاف احتجاج اور مطالبہ کا طوفان برپا کرنا اپنے کو کامیابی کی طرف لے جانے کا سب سے زیادہ قریبی راستہ ہے۔ کسی کے سامنے حکومت وقت سے تصادم کیے بغیر بےشمار دینی کام کرنے کے مواقع موجود ہوں گے مگر وہ اس کو اس غلط فہمی میں ڈالے گا کہ غیر اسلامی حکمرانوں کو اگر کسی نہ کسی طرح پھانسی پر چڑھا دیا جائے یا ان کو گولی مار کر ختم کردیا جائے تو اس کے بعد آناً فاناً اسلام کا مکمل نظام سارے ملک میں قائم ہوجائے گا، وغیرہ۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوۡرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَـنَّةِ‌ ؕ وَنَادٰٮهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمۡ اَنۡهَكُمَا عَنۡ تِلۡكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّـكُمَاۤ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَـكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَـنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَـنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَـكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيۡهَا تَحۡيَوۡنَ وَفِيۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ وَمِنۡهَا تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۲۵﴾ ع ۲ ۱۵ ۹

۲۲۔ پس مائل کرلیا ان کو فریب سے۔ پھر جب دونوں نے درخت کا پھل چکھا تو ان کی شرم گاہیں ان پر کھل گئیں۔ اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو پکارا کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۲۳۔ انھوں نے کہا، اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔ ۲۴۔ خدا نے کہا، اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، اور تمھارے لیے زمین میں ایک خاص مدت تک ٹھہرنا اور نفع اٹھانا ہے۔ ۲۵۔ خدا نے کہا، اسی میں تم جیو گے اور اسی میں تم مروگے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے۔

آدم اور شیطان دونوں ایک دوسرے کے دشمن کی حیثیت سے زمین پر بھیجے گئے ہیں۔ اب قیامت تک دونوں کے درمیان یہی جنگ جاری ہے۔ شیطان کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے راستہ پر لائے اور جس طرح وہ خود خدا کی رحمت سے محروم ہوا ہے انسان کو بھی خدا کی رحمت سے محروم کردے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ شیطان کے منصوبہ کو ناکام بنادے۔ وہ شیطان کی پکار کو نظرانداز کرکے خدا کی پکار کی طرف دوڑے۔

آدم اور شیطان کی یہ جنگ عملاً انسانوں میں دو گروہ بن جانے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ کچھ لوگ

شیطان کی ترغیبات کا شکار ہو کر اس کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ خدا کی آواز پر لبیک کہہ کر یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ شیطان کے تمام ساتھی اس کو بے عزت کرنے اور ناکام بنانے کے لیے ہر قسم کی تدبیریں کرنا شروع کر دیں۔ ہر دور میں یہ دیکھا گیا ہے کہ سچے حق پرست جو ہمیشہ کم تعداد میں ہوتے ہیں، لوگوں کی سخت ترین عداوتوں کا شکار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی شیطان کی دشمنانہ کارروائیاں ہیں۔ وہ لوگوں کو سچے حق پرست آدمی کے خلاف بھڑکا دیتا ہے۔ وہ مختلف طریقہ سے لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت کی آگ بھرتا ہے۔ چنانچہ وہ شیطان کا آلۂ کار بن کر ایسے آدمی کو ستانا شروع کر دیتے ہیں۔

شیطان کا اصل جرم عدم اعتراف تھا۔ شیطان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر آدمی کے اندر یہی عدم اعتراف کا مزاج پیدا کر دے۔ وہ چھوٹے کو بھڑکاتا ہے کہ وہ اپنے بڑے کا لحاظ نہ کرے۔ معاملات کے دوران جب ایک شخص کے ذمہ دوسرے کا کوئی حق آتا ہے تو وہ اس کو سکھاتا ہے کہ وہ حق دار کا حق ادا نہ کرے۔ کوئی خدا کا بندہ سچائی کا پیغام لے کر اٹھتا ہے تو لوگوں کے دل میں طرح طرح کے شبہات ڈال کر انھیں آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس کی بات نہ مانیں۔ دو فریقوں کے درمیان نزاع ہو اور ایک فریق اپنے حالات کے اعتبار سے کچھ دینے پر راضی ہو جائے تو شیطان فریق ثانی کے ذہن میں یہ بات ڈالتا ہے کہ اس کی پیش کش کو قبول نہ کرو، اور اتنا زیادہ کا مطالبہ کرو جو وہ نہ دے سکتا ہو۔ تاکہ جنگ و فساد مستقل طور پر جاری رہے۔

اس طرح شیطان کے بہکاووں سے ہر جگہ لوگوں کے درمیان دشمنیاں جاری رہتی ہیں۔ انسانوں میں دو گروہ بن جاتے ہیں اور ان میں ایسا ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

۲۶۔ اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھارے بدن کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت بھی۔ اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ غور کریں۔

۲۷۔ اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا، اس نے ان کے لباس اتروائے تاکہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کر دے۔ وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ اس کی ظاہری چیزیں اس کی باطنی حقیقتوں کی علامت ہیں۔ ظاہری چیزوں پر غور کرکے آدمی چھپی ہوئی حقیقتوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اسی قسم کی ایک چیز لباس ہے۔

خدا نے انسان کو لباس دیا جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ اس کے حسن ووقار کو بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آدمی کے روحانی وجود کے لیے بھی اسی طرح ایک لباس ضروری ہے، یہ لباس تقویٰ ہے۔ تقویٰ آدمی کا معنوی لباس ہے جو ایک طرف اس کو شیطان کے حملوں سے بچاتا ہے اور دوسری طرف اس کے باطن کو سنوار کر اس کو جنت کی لطیف ونفیس دنیا میں بسانے کے قابل بناتا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس کیا ہے۔ یہ ہے — اللہ کا خوف، حق کا اعتراف، اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک معیار رکھنا، اپنے کو بندہ سمجھنا، تواضع کو اپنا شعار بنانا، دنیا میں گم ہونے کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ رہنا۔ آدمی جب ان چیزوں کو اپنائے تو وہ اپنے اندرونی وجود کو ملبوس کرتا ہے اور اگر وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو وہ اپنے اندرون کو ننگا کرلیتا ہے۔ ظاہری جسم کو کپڑے کا بنا ہوا لباس ڈھانکتا ہے اور باطنی جسم کو تقویٰ کا لباس۔

آدمی کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کو بہکاتا ہے۔ وہ خدا کے ممنوعہ درخت کو ہر قسم کے خیر کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ وہ ایسے معصوم راستوں سے اس کی طرف آتا ہے کہ آدمی کا گمان بھی نہیں جاتا کہ ادھر سے اس کی طرف گمراہی آرہی ہوگی۔ شیطان آدمی کے تمام نازک مقامات کو جانتا ہے اور انھیں نازک مقامات سے وہ اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ کبھی ایک بے حقیقت نظریہ کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کبھی ایک جزئی حقیقت کو کلی حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے لاتا ہے۔ کبھی معمولی چیزوں میں فوائد کا خزانہ بتا کر سارے لوگوں کو اس کی طرف دوڑا دیتا ہے۔ کبھی ایک بے فائدہ حرکت میں ترقی کا راز بتاتا ہے۔ کبھی ایک تخریبی عمل کو تعمیر کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

شیطان کن لوگوں کو بہکانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں پر کامیاب ہوتا ہے جو امتحان کے مواقع پر ایمان کا ثبوت نہیں دے پاتے۔ جو خدا کی نشانیوں پر غور نہیں کرتے۔ جو دلائل کی زبان میں بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ جنھیں اپنے ذاتی رجحانات کے مقابلہ میں حق کے تقاضے کو ترجیح دینا گوارا نہیں ہوتا۔ جن کو ایسی سچائی سچائی نظر نہیں آتی جس میں ان کے فائدوں اور مصلحتوں کی رعایت شامل نہ ہو۔ جنھیں وہ حق پسند نہیں آتا جو ان کی ذات کو نیچا کرکے خود ان کے مقابلہ میں اونچا ہونا چاہتا ہو۔

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور جب وہ کوئی فحش (کھلی برائی) کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے ہوئے پایا ہے اور خدا نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔ کہو، اللہ کبھی برے کام کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے ذمہ وہ بات لگاتے ہو جس کا تمھیں کوئی علم

قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَ اَقِیۡمُوۡا
وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّادۡعُوۡهُ
مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ۬ كَمَا بَدَاَكُمۡ
تَعُوۡدُوۡنَ ﴿۲۹﴾ فَرِیۡقًا هَدٰی وَ فَرِیۡقًا حَقَّ
عَلَیۡهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا
الشَّیٰطِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ
وَ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾

نہیں۔ ۲۹۔ کہو کہ میرے رب نے قِسط کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر نماز کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھو۔ اور اسی کو پکارو اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ جس طرح اس نے تم کو پہلے پیدا کیا، اسی طرح تم دوسری بار بھی پیدا ہوگے۔ ۳۰۔ ایک گروہ کو اس نے راہ دکھادی اور ایک گروہ ہے کہ اس پر گمراہی ثابت ہوچکی۔ انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنایا اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

قدیم عرب میں لوگ ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے اور اس کی حمایت میں یہ کہتے کہ خدا کی عبادت دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو کر فطری حالت میں کرنا چاہیے۔ حالاں کہ برہنگی ایسی کھلی ہوئی برائی ہے جس کا برا ہونا عقل عام سے معلوم ہوسکتا ہے، اسی طرح آدمی یہ عقیدہ قائم کرلیتا ہے کہ بےعملی اور سرکشی کے باوجود سفارشوں کی بنیاد پر خدا اس کو انعامات سے نوازے گا۔ حالاں کہ وہ اپنے سرکش غلاموں کے معاملہ میں محض کسی کے کہنے سے ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ معمولی معمولی ناقابلِ فہم اعمال جن سے دنیا میں ایک گھر بھی نہیں بن سکتا، ان سے یہ امید کرلیتا ہے کہ وہ آخرت میں اس کے لیے عالی شان محل تعمیر کردیں گے۔ الفاظ کا شور و غل جن سے دنیا میں ایک درخت بھی نہیں اُگتا ان کے متعلق یہ خوش گمانی قائم کرلیتا ہے کہ وہ آخرت میں اس کے لیے جنت کے باغ اگا رہے ہیں۔

قِسط سے مراد وہ منصفانہ روش ہے جو ہر ناپ میں پوری اترے، وہ عین وہی ہو جو کہ ہونا چاہیے۔ عبادت انسان کی ایک فطری خواہش ہے۔ وہ کسی کو سب سے اونچا مان کر اس کے آگے اپنے کو ڈال دینا چاہتا ہے۔ اس معاملہ میں قِسط یہ ہوگا کہ آدمی صرف خدا کا عبادت گزار بنے جو اس کا خالق اور رب ہے۔ انسان کسی کو یہ مقام دینا چاہتا ہے کہ وہ اس کے لیے اعتماد کی بنیاد ہو۔ اس معاملہ میں قِسط یہ ہوگا کہ آدمی خدا کو اپنی زندگی میں اعتماد کی بنیاد بنائے جو ساری طاقتوں کا مالک ہے۔ اسی طرح موت کے بعد ایک اور زندگی کو ماننا عین قسط ہے۔ کیوں کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ عدم سے وجود کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس لیے موت کے بعد دوبارہ پیدا ہونے کو ماننا عین اسی حقیقت کو ماننا ہے جو اول پیدائش کے وقت ہر آدمی کے ساتھ پیش آچکی ہے۔

حق کے داعی کا انکار کرنے کے لیے آدمی قدیم بزرگوں کا سہارا لیتا ہے۔ قدیم بزرگ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی عظمت تاریخی طور پر قائم ہوچکی ہے۔ ہر آدمی کی نظر میں ان کا برسرحق ہونا مسلّمہ امر بنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف سامنے کا داعیٔ حق ایک نیا آدمی ہوتا ہے جس کے ساتھ ابھی تاریخ کی تصدیق جمع نہیں ہوئی ہے۔ قدیم بزرگ کو آدمی اس کی تاریخ کے ساتھ دیکھ رہا ہوتا ہے اور نئے داعی کو اس کی تاریخ کے بغیر۔ وہ قدیم بزرگوں کے

نام پر داعیٔ حق کا انکار کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ عین ہدایت پر ہے۔ مگر اس طرح کی غلط فہمی کسی کے لیے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتی۔ یہ خدا کے نام پر شیطان کی پیروی ہے، نہ کہ حقیقۃً خدا کی پیروی۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ وَّ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا وَ لَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۳۱﴾ ع ۳ ۱۰ قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ؕ قُلۡ ہِیَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا خَالِصَۃً یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۲﴾ قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَ مَا بَطَنَ وَ الۡاِثۡمَ وَ الۡبَغۡیَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ اَنۡ تُشۡرِکُوۡا بِاللّٰہِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ سُلۡطٰنًا وَّ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۱۔ اے اولادِ آدم، ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہنو اور کھاؤ پیو۔ اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
۳۲۔ کہو اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کھانے کی پاک چیزوں کو۔ کہو وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انھیں کے لیے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔
۳۳۔ کہو، میرے رب نے تو بس فحش باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں، اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاؤ جس کا تم علم نہیں رکھتے۔

عرب کے کچھ قبائل ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اس کو بڑی قربت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ ایسا کرتے تھے کہ جب وہ حج کے لیے نکلتے تو بعض متعین چیزیں مثلاً بکری کا دودھ یا گوشت استعمال کرنا چھوڑ دیتے اور یہ خیال کرتے کہ وہ پرہیز گاری کا کوئی بڑا عمل کر رہے ہیں۔ یہ گمراہی کی وہ قسم ہے جس میں ہر زمانہ کے لوگ مبتلا رہے ہیں۔ ایسے افراد اپنی حقیقی اور مستقل زندگی میں دین کے تقاضوں کو شامل نہیں کرتے۔ البتہ چند مواقع پر کچھ غیر متعلق قسم کے بے فائدہ اعمال کا خصوصی اہتمام کر کے یہ مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین پر معمولی جزئیات کی حد تک عمل کر رہے ہیں۔ وہ خدا کی مرضیات پر کامل ادائیگی کے حد تک قائم ہیں۔

انسان کے بارے میں اللہ کی اصل مرضی تو یہ ہے کہ آدمی اسراف سے بچے، وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز نہ کرے۔ وہ حلال کو حرام نہ کرے اور خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو اپنے لیے حلال نہ سمجھ لے۔ وہ فحش

کاموں سے اپنے کو دور رکھے۔ وہ ان برائیوں سے بچے جن کا برا ہونا عقل عام سے ثابت ہوتا ہے۔ وہ بَغی کی روش چھوڑ دے۔ جب بھی اس کے سامنے کوئی حق آئے تو ہر دوسری چیز کو نظر انداز کرکے وہ حق کو اختیار کرلے۔ وہ شرک سے اپنے آپ کو پوری طرح پاک کرے، اللہ کے سوا کسی سے وہ برتر تعلق قائم نہ کرے جو صرف ایک خدا کا حق ہے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ اپنی پسند کا ایک طریقہ اختیار کرے اور اس کو بلا دلیل خدا کی طرف منسوب کردے، اپنے ذاتی دین کو خدا کا دین کہنے لگے۔ وہ پوری طرح خدا کا بندہ بن کر رہے، ایسی کوئی روش اختیار نہ کرے جو بندہ ہونے کے اعتبار سے اس کے لیے درست نہ ہو۔

آخرت میں کسی کو جو نعمتیں ملیں گی وہ بطور انعام ملیں گی۔ اس لیے وہ صرف ان خدا کے بندوں کے لیے ہوں گی جن کے لیے خدا جنت میں داخلہ کا فیصلہ کرے گا۔ مگر دنیا میں کسی کو جو نعمتیں ملتی ہیں وہ محدود مدت کے لیے بطور آزمائش ملتی ہیں۔ اس لیے یہاں کی نعمتوں میں ہر ایک کو اس کے پرچۂ امتحان کے بقدر حصہ مل جاتا ہے۔ اس امتحان میں پورا اترنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی خود سامان امتحان سے دوری اختیار کرلے۔ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو مقرر کی ہوئی حدود کے مطابق استعمال کرے۔ وہ ان کے ملنے پر شکر کا جواب پیش کرے، نہ کہ بے نیازی اور ڈھٹائی کا۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٤﴾
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ
اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ
اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى
اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا

۳۴۔ اور ہر قوم کے لیے ایک مقررہ مدت ہے۔ پھر جب ان کی مدت آجائے گی تو وہ نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۳۵۔ اے بنی آدم، اگر تمھارے پاس تمھیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیات سنائیں تو جو شخص ڈرا اور جس نے اصلاح کرلی، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۳۶۔ اور جو لوگ میری آیات کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں، وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۳۷۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے، ان کے نصیب کا جو حصہ لکھا ہوا ہے وہ انھیں مل کر رہے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کے لیے ان کے پاس پہنچیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ

اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قَالُوۡا ضَلُّوۡا عَنَّا وَ شَہِدُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ اَنَّہُمۡ کَانُوۡا کٰفِرِیۡنَ ﴿۳۷﴾

کے سوا جن کو تم پکارتے تھے کہاں ہیں۔ وہ کہیں گے کہ وہ سب ہم سے کھوئے گئے۔ اور وہ اپنے اوپر اقرار کریں گے کہ بے شک وہ انکار کرنے والے تھے۔

موجودہ دنیا میں کسی کو کام کا موقع اسی وقت تک ہے جب تک اس کی امتحان کی مقررہ مدت پوری ہوجائے۔ فرد کی مدت اس کی عمر کے ساتھ پوری ہوتی ہے۔ مگر قوم کے بارے میں خدائی فیصلہ کے نفاذ کی اس قسم کی کوئی حد نہیں۔ اس کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ حق کے سامنے آنے کے بعد وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے۔ جس قوم کی مدت پوری ہوجائے اس کو کبھی غیر معمولی عذاب بھیج کر فنا کر دیا جاتا ہے اور کبھی اس کی سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کو عزت و بڑائی کے مقام سے ہٹا دیا جائے۔

کسی آدمی کے لیے جنت یا دوزخ کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے جب حق آیا تو اس نے اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ جب بھی کوئی حق ایسے دلائل کے ساتھ سامنے آجائے جس کی صداقت پر آدمی کی عقل گواہی دے رہی ہو تو اس آدمی پر گویا خدا کی حجت پوری ہوگئی۔ اس کے بعد بھی اگر آدمی اس حق کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ یقیناً کبر کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا رکھنے کی نفسیات اس کے لیے رکاوٹ بن گئی کہ وہ حق کو بڑا بنا کر اس کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا بنانے پر راضی کرلے۔ ایسے آدمی کے لیے خدا کے یہاں جہنم کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

آدمی جب بھی حق کا انکار کرتا ہے تو وہ کسی اعتماد کے اوپر کرتا ہے۔ کسی کو دولت و اقتدار کا اعتماد ہوتا ہے۔ کوئی اپنی عزت و مقبولیت پر بھروسہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ کسی کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ اس کے معاملات اتنے درست ہیں کہ حق کو نہ ماننے سے اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ کسی کو یہ ناز ہوتا ہے کہ اس کی ذہانت نے اپنی بات کو عین خدا کی بات ثابت کرنے کے لیے شاندار الفاظ دریافت کر لیے ہیں۔ مگر یہ انسان کی بہت بڑی بھول ہے۔ وہ آزمائش کی چیزوں کو اعتماد کی چیز سمجھے ہوئے ہیں۔ قیامت کے دن جب یہ تمام جھوٹے سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو اس وقت اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ وہ محض سرکشی کی بنا پر حق کا انکار کرتا رہا۔ اگرچہ اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لیے وہ بہت سے اصولی الفاظ بولتا تھا۔

قَالَ ادۡخُلُوۡا فِیۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ فِی النَّارِ ؕ کُلَّمَا دَخَلَتۡ اُمَّۃٌ لَّعَنَتۡ اُخۡتَہَا ؕ حَتّٰۤی اِذَا ادَّارَکُوۡا فِیۡہَا جَمِیۡعًا ۙ قَالَتۡ اُخۡرٰىہُمۡ

۳۸۔ خدا کہے گا، داخل ہوجاؤ آگ میں جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں کے ساتھ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ جب بھی کوئی گروہ جہنم میں داخل ہوگا وہ اپنے ساتھی گروہ پر لعنت کرے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اس میں جمع ہوجائیں گے تو ان

لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا
تَعْلَمُوْنَ ۟ وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا
كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۟ ع

کے پچھلے اپنے اگلوں کے بارے میں کہیں گے، اے ہمارے رب، یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا پس تو ان کو آگ کا دہرا عذاب دے۔ خدا کہے گا کہ سب کے لیے دہرا ہے مگر تم نہیں جانتے۔ ۳۹۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے، تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ پس اپنی کمائی کے نتیجہ میں عذاب کا مزہ چکھو۔

اس آیت میں ''اُمت'' سے مراد گمراہ کرنے والے لیڈر اور ''اُخت'' سے مراد گمراہ ہونے والے عوام ہیں۔ آخرت میں جب ہر دور کے بے راہ قائدین اور ان کا ساتھ دینے والے بے راہ عوام جہنم میں ڈالے جائیں گے تو یہ ایک بڑا عبرت ناک منظر ہوگا۔ دنیا میں تو وہ ایک دوسرے کے بڑے خیر خواہ اور فدا کار بنے ہوئے تھے۔ قائدین اپنے عوام کی ہر خواہش کا احترام کرتے تھے اور عوام اپنے قائدین کو ہیرو بنائے ہوئے تھے۔ مگر جب جہنم کی آگ انہیں پکڑے گی تو ان کی آنکھوں سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جائیں گے۔ اب ہر ایک دوسرے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے لگے گا۔ پیروی کرنے والے اپنے قائدین سے کہیں گے کہ تم پر لعنت ہو۔ تمہاری قیادت کیسی بری قیادت تھی جس نے چند دن کے جھوٹے تماشے دکھائے اور اس کے بعد ہم کو اتنی بڑی تباہی میں ڈال دیا۔ اس کے جواب میں قائدین اپنے پیروؤں سے کہیں گے کہ تم اپنی پسند کا ایک دین چاہتے تھے اور ایسا دین ہمارے پاس دیکھ کر ہمارے پیچھے دوڑ پڑے۔ ورنہ عین اسی زمانہ میں ایسے بھی خدا کے بندے تھے جو تم کو کامیابی کے سچے راستہ کی طرف بلاتے تھے۔ تم نے ان کی پکار سنی، مگر تم نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

رہنما اپنے پیروؤں سے کہیں گے کہ تم کسی اعتبار سے ہم سے بہتر نہیں ہو۔ ہم نے اپنی خواہشوں کی خاطر قیادتیں کھڑی کیں اور تم نے بھی اپنی خواہشوں کی خاطر ہمارا ساتھ دیا۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں کا درجہ ایک ہے۔ اس لیے یہاں تم کو بھی وہی سزا بھگتنی ہے جو ہمارے لیے ہمارے اعمال کے سبب سے مقدر کی گئی ہے۔

پیروؤں کی جماعت اپنے رہنماؤں کے بارے میں خدا سے کہے گی کہ انھوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا اس لیے ان کو ہمارے مقابلہ میں دگنا عذاب دیا جائے۔ جواب ملے گا کہ تمھارے رہنماؤں میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب مل رہا ہے مگر تم کو اس کا احساس نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہنم میں جس کو جو عذاب ملے گا وہ اس کو اتنا زیادہ سخت ہوگا کہ وہ سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ تکلیف میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ہر شخص جس تکلیف میں ہوگا وہی تکلیف اس کو سب سے زیادہ معلوم ہوگی۔

دنیا میں مفاد پرست رہنما اور ان کے مفاد پرست پیرو خوب ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ ہر

ایک کے پاس دوسرے کے لیے عمدہ الفاظ ہیں۔ ہر ایک دوسرے کی بہتری میں لگا ہوا ہے۔ مگر آخرت میں ہر ایک دوسرے سے نفرت کرے گا، ہر ایک دوسرے کو شدید تر عذاب میں دھکیلنا چاہے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

۴۰۔ بے شک جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے۔ اور ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ۴۱۔ ان کے لیے دوزخ کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا۔ اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ ۴۲۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے۔ ہم کسی شخص پر اس کی طاقت کے موافق ہی بوجھ ڈالتے ہیں۔ یہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۴۳۔ اور ان کے سینہ کی ہر خلش کو ہم نکال دیں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو یہاں تک پہنچایا اور ہم راہ پانے والے نہ تھے اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ کرتا۔ ہمارے رب کے رسول سچی بات لے کر آئے تھے۔ اور آواز آئے گی کہ یہ جنت ہے جس کے تم وارث ٹھہرائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے۔

خدا کے داعیوں کے مقابلہ میں کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ان کے مدعو کے اندر متکبرانہ نفسیات جاگ اٹھتی ہیں اور وہ ان کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داعی کی طرف صرف نشانی (دلیل) کا زور ہوتا ہے اور مدعو کی طرف مادی رونقوں کا زور۔ داعی دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے اور اس کے مدعو مادیات کی بنیاد پر۔ دلیل کی طاقت دکھائی نہیں دیتی اور مادی طاقت آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے۔ یہی فرق لوگوں کے اندر کبر کا مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ لوگ داعی کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کا خدا کی رحمت میں داخل ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا۔ انھوں نے خدا کو نظر انداز کیا اس لیے خدا نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا۔ خدا نے اپنے داعی کے ذریعے ان کو اپنی جھلکیاں دکھائیں۔ خدا ان کے سامنے دلائل کے روپ میں ظاہر ہوا مگر انھوں نے اس کو بے وزن سمجھا۔ انھوں نے خدائی نشانیوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ ایسے لوگ کیوں کر خدا کی رحمتوں میں حصہ پا سکتے ہیں۔

دوزخیوں کا یہ حال ہوگا کہ جو لوگ دنیا میں ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے وہ وہاں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے اور ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہوں گے۔ مگر جنت کا ماحول اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ یہاں سب کے دل ایک دوسرے کے لیے کھلے ہوئے ہوں گے۔ ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لیے محبت اور خیر خواہی کا چشمہ پھوٹ رہا ہوگا۔ دوزخی انسان کے لیے اس کا ماضی ایک دکھ بھری داستان بنا ہوا ہوگا اور جنتی انسان کے لیے اس کا ماضی ایک خوش گوار یاد۔

برے لوگوں کے لیے ان کی اگلی زندگی اس طرح شروع ہوگی کہ ان کا سینہ حسرت اور یاس کا قبرستان بنا ہوا ہوگا۔ ان کا ماضی ان کے لیے تلخ یادوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ دوسری طرف اچھے لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ ان کی زبانیں اس خدا کی یاد سے تر ہوں گی جس کو انھوں نے بجا طور پر اپنا سہارا بنایا تھا۔ وہ حق کے علم برداروں کی دی ہوئی خبر کو عین سچا پا کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ خدا کا یہ کتنا بڑا احسان تھا کہ اس نے انھیں ان داعیان حق کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائی۔

وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۴۔ اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے کہ ہم سے ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو سچا پایا، کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدہ کو سچا پایا۔ وہ کہیں گے ہاں۔ پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔ ۴۵۔ جو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اس میں کجی ڈھونڈتے تھے اور وہ آخرت کے منکر تھے۔

ان آیات میں قدیم زمانہ کے کچھ لوگوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ جنت اور جہنم تو ایک دوسرے سے بہت زیادہ دور واقع ہوں گی، جنت آسمانوں کے اوپر ہوگی اور دوزخ سب سے نیچے تحت الثریٰ میں۔ پھر جنت والوں کی آوازیں جہنم والوں تک کس طرح پہنچیں گی۔ مگر اب ریڈیو اور ٹیلی وژن کے دور میں یہ سوال کوئی سوال نہیں۔ آج انسان یہ جان چکا ہے کہ دور کے فاصلوں سے کسی کو دیکھنا بھی ممکن ہے اور اس کی آواز سننا بھی۔ جو بات قدیم انسان کو نا قابلِ فہم نظر آتی تھی وہ آج کے انسان کے لیے خود اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں پوری طرح قابلِ فہم

ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی کوئی بات اگر آج کی معلومات کی روشنی میں سمجھ میں نہ آرہی ہو تو اس بنا پر اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگانا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ علم کے اضافہ کے بعد کل وہ چیز ایک جانی پہچانی چیز بن جائے جو آج بظاہر ان جانی چیز کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ آخرت میں جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان تعلق موجودہ قسم کے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعہ قائم ہوگا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جدید دریافتوں نے اس بات کو قابل فہم بنا دیا ہے کہ خدا کی کائنات میں ایسے انتظامات بھی ممکن ہیں کہ ایک دوسرے سے بہت دور رہ کر بھی دو آدمی ایک دوسرے کو دیکھیں اور ایک دوسرے سے بخوبی طور پر بات کریں۔

کسی دلیل کا وزن آدمی اسی وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ جو لوگ آخرت کو اہمیت نہ دیں وہ آخرت سے متعلق دلائل کا وزن بھی محسوس نہیں کر پاتے۔ آخرت کی بات ان کے سامنے انتہائی مضبوط دلائل کے ساتھ آتی ہے۔ مگر اس کے بارے میں ان کا غیر سنجیدہ ذہن اس کے اندر کوئی نہ کوئی عیب تلاش کر لیتا ہے۔ وہ طرح طرح کے اعتراض نکال کر خود بھی شک وشبہ میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی شک وشبہ میں مبتلا کرتے ہیں، ایسے لوگ خدا کی نظر میں سخت مجرم ہیں۔ وہ آخرت میں صرف خدا کی لعنت کے مستحق ہوں گے خواہ دنیا میں وہ اپنے کو خدا کی رحمتوں کا سب سے بڑا حق دار سمجھتے رہے ہوں۔

کوئی دلیل خواہ کتنی ہی وزنی اور قطعی ہو، آدمی کے لیے ہمیشہ یہ موقع رہتا ہے کہ وہ کچھ خوب صورت الفاظ بول کر اس کی صداقت کے بارے میں لوگوں کو مشتبہ کر دے۔ عوام ایک حقیقی دلیل اور ایک لفظی شوشہ میں فرق نہیں کر پاتے اس لیے وہ اس قسم کی باتیں سن کر حق سے بدک جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اس طرح کے شوشے نکال کر لوگوں کو حق سے بدکاتے ہیں وہ آخرت کے دن خدا کی رحمتوں سے آخری حد تک دور ہوں گے۔

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۣ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ ع وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا

۴۶۔ اور دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی۔ اور اعراف کے اوپر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر وہ امیدوار ہوں گے۔ ۴۷۔ اور جب دوزخ والوں کی طرف ان کی نگاہ پھیری جائے گی تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہم کو شامل نہ کرنا ان ظالم لوگوں کے ساتھ۔ ۴۸۔ اور اعراف والے ان لوگوں کو پکاریں گے

مَآ اَغْنٰی عَنْکُمْ جَمْعُکُمْ وَ مَا کُنْتُمْ تَسْتَکْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

جنھیں وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ تمھارے کام نہ آئی تمھاری جماعت اور تمھارا اپنے کو بڑا سمجھنا۔ ۴۹۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کی نسبت تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ ان کو کبھی اللہ کی رحمت نہ پہنچے گی۔ جنت میں داخل ہو جاؤ، اب نہ تم پر کوئی ڈر ہے اور نہ تم غم گین ہوگے۔

دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کی جانب سے آئی ہوئی سختیوں سے مومن وغیر مومن سب یکساں دو چار ہوتے ہیں۔ مگر آخرت میں ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں دونوں کے درمیان ''آڑ'' قائم ہو جائے گی۔ وہاں مومنین کو ملی ہوئی نعمتوں کی کوئی خوشبو کافروں کو نہیں ملے گی اور اسی طرح کافروں کو ملی ہوئی تکلیفوں کا کوئی اثر جنت والوں تک نہیں پہنچے گا۔

عرف کے معنی عربی زبان میں بلندی کے ہوتے ہیں۔ اعراف والے کا مطلب ہے بلندیوں والے۔ اس سے مراد پیغمبروں اور داعیوں کا گروہ ہے جنھوں نے مختلف وقتوں میں لوگوں کو حق کا پیغام دیا۔ قیامت میں جب لوگوں کا حساب ہوگا اور ہر ایک کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے اور داعئ حق کی بات جو وہ دنیا میں کہتا تھا آخری طور پر صحیح ثابت ہو چکی ہوگی اس وقت ہر داعی اپنی قوم کو خطاب کرے گا۔ خدا کے حکم سے آخرت میں ان کے لیے اونچا اسٹیج مہیا کیا جائے گا جس پر کھڑے ہو کر وہ پہلے اپنے ماننے والوں کو خطاب کریں گے۔ یہ لوگ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر وہ اس کے امیدوار ہوں گے۔ اس کے بعد ان کا رخ ان کے جھٹلانے والوں کی طرف کیا جائے گا۔ وہ ان کی بری حالت دیکھ کر کمالِ عبدیت کی وجہ سے کہہ اٹھیں گے کہ خدایا ہمیں ان ظالموں میں شامل نہ کر۔ وہ گروہ منکرین کے لیڈروں کو ان کے چہرہ کی ہیئت سے پہچان لیں گے اور ان سے کہیں گے تم کو اپنے جس جتھے اور اپنے جس ساز و سامان پر گھمنڈ تھا اور جس کی وجہ سے تم نے ہمارے پیغامِ حق کو جھٹلا دیا وہ آج تمھارے کچھ کام نہ آسکا۔

حق کا انکار کرنے والے وقت کے قائم شدہ نظام کے سایہ میں ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں ان کی حیثیت ہمیشہ مضبوط ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، جو لوگ حق کے داعیوں کا ساتھ دیتے ہیں ان کا ساتھ دینا صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ وقت کے جمے ہوئے نظام کی سرپرستی انھیں حاصل نہ رہے۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ حق کو نہیں مانتے وہ ماننے والوں کی بے چارگی کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی جنتوں میں جائیں گے۔ اصحاب اعراف قیامت میں ایسے لوگوں سے کہیں گے کہ اب دیکھ لو کہ حقیقت کیا تھی اور تم اس کو کیا سمجھے ہوئے تھے۔ بالآخر کون کامیاب رہا اور کون ناکام ٹھہرا۔

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اَنۡ اَفِیۡضُوۡا عَلَیۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَہُمَا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿ۙ۵۰﴾ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَہُمۡ لَہۡوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتۡہُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ۚ فَالۡیَوۡمَ نَنۡسٰہُمۡ کَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ یَوۡمِہِمۡ ہٰذَا ۙ وَ مَا کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۰۔ اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ پانی ہم پر ڈال دو یا اس میں سے جو اللہ نے تمھیں کھانے کو دے رکھا ہے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ نے ان دونوں چیزوں کو منکروں کے لیے حرام کر دیا ہے۔ ۵۱۔ وہ جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا تھا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ پس آج ہم ان کو بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور جیسا کہ وہ ہماری نشانیوں کا انکار کرتے رہے۔

دنیا دو قسم کی غذاؤں کا دسترخوان ہے۔ ایک دنیوی اور دوسری اخروی۔ ایک انسان وہ ہے جس کی روح کی غذا یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو نمایاں ہوتے ہوئے دیکھے۔ دنیا کی رونقیں اپنے گرد پا کر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مادی سازوسامان کا مالک ہو کر وہ اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے۔ ایسا آدمی خدا اور آخرت کو بھولا ہوا ہے۔ اس کے سامنے خدا کی بات آئے گی تو وہ اس کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دے گا۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سرسری سلوک کرے گا جیسے وہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ ہو بلکہ محض کھیل تماشا ہو۔

ایسے آدمی کے لیے آخرت کے انعامات میں کوئی حصہ نہیں۔ اس نے اپنے اندر ایک ایسی روح کی پرورش کی جس کی غذا صرف دنیا کی چیزیں بن سکتی تھیں۔ پھر آخرت کی چیزوں سے اس کی روح کیوں کر اپنی خوراک پا سکتی ہے۔ جو انسان آج آخرت میں نہ جیا ہو اس کے لیے آخرت کل کے دن بھی زندگی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

دوسرا انسان وہ ہے جو غیبی حقیقتوں میں گم رہا ہو۔ جس کی روح کو آخرت کی یاد میں لذت ملی ہو۔ جس کی غذا یہ رہی ہو کہ وہ خدا میں جیے اور خدا کی فضاؤں میں سانس لے۔ یہی وہ انسان ہے جس کے لیے آخرت رزق کا دسترخوان بنے گی۔ وہ جنت کے باغوں میں اپنے لیے زندگی کا سامان حاصل کر لے گا۔ اس نے عالم غیب میں خدا کو پایا تھا اس لیے عالم شہود میں بھی وہ خدا کو پالے گا۔

خدا کی دنیا میں آدمی خدا کو کیوں بھلا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا ایسی نشانیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے جو صرف سوچنے سے ذہن کی پکڑ میں آتی ہیں، جب کہ دنیا کی چیزیں آنکھوں کے سامنے اپنی تمام رونقوں کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ آدمی ظاہری چیزوں کی طرف جھک جاتا ہے اور خدا کی طرف اشارہ کرنے والی نشانیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر ایسا ہر عمل دنیا کی قیمت پر آخرت کو چھوڑنا ہے۔ اور جس نے موت سے پہلے والی زندگی میں آخرت کو چھوڑا وہ موت کے بعد والی زندگی میں بھی آخرت سے محروم رہے گا۔

اللہ جب ایک چیز کو حق کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے لائے اور وہ اس کو اہمیت نہ دیں، وہ اس کے ساتھ غیر سنجیدہ معاملہ کریں تو یہ دراصل خود خدا کو غیر اہم سمجھنا اور اس کے ساتھ غیر سنجیدہ معاملہ کرنا ہے۔ دنیا میں حق کو نظر انداز کرنے سے آدمی کا کچھ بگڑتا نہیں، حق کی پشت پر جو خدائی طاقتیں ہیں وہ ابھی غیب میں ہونے کی وجہ سے اس کو نظر نہیں آتیں۔ یہ صورت حال اس کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ جو لوگ اس طرح حق کو نظر انداز کریں وہ یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ خدا بھی آخرت کے دن انھیں نظر انداز کردے۔

وَلَقَدۡ جِئۡنٰهُمۡ بِكِتٰبٍ فَصَّلۡنٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ هُدًی وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا تَاۡوِيۡلَهٗ ؕ يَوۡمَ يَاۡتِيۡ تَاۡوِيۡلُهٗ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ نَسُوۡهُ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ۚ فَهَلۡ لَّنَا مِنۡ شُفَعَآءَ فَيَشۡفَعُوۡا لَنَاۤ اَوۡ نُرَدُّ فَنَعۡمَلَ غَيۡرَ الَّذِيۡ كُنَّا نَعۡمَلُ ؕ قَدۡ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۳﴾ ع ۶ ۱۳

۵۲۔ اور ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنیاد پر مفصل کیا ہے، ہدایت اور رحمت بنا کر ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۵۳۔ کیا اب وہ اسی کے منتظر ہیں کہ اس کا مضمون ظاہر ہوجائے۔ جس دن اس کا مضمون ظاہر ہوجائے گا تو وہ لوگ جو اس کو پہلے بھولے ہوئے تھے بول اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے پیغمبر حق لے کر آئے تھے۔ پس اب کیا کوئی ہماری سفارش کرنے والے ہیں کہ وہ ہماری سفارش کریں یا ہم کو دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ ہم اس سے مختلف عمل کریں جو ہم پہلے کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور ان سے گم ہوگیا وہ جو وہ گھڑتے تھے۔

قرآن آدمی کو موت کے بعد آنے والی زندگی سے ڈراتا ہے، وہ آخرت کے حساب کتاب سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر آدمی چوکنا نہیں ہوتا۔ قرآن کی یہ خبریں اگرچہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ وہ کائنات کی اٹل حقیقتیں ہیں۔ تاہم ابھی وہ واقعات کی صورت میں ظاہر نہیں ہوئیں، ابھی وہ مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس بنا پر غافل انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ وہ ان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کردیتا ہے۔

مگر یہ باتیں خدا کی طرف سے ہیں جو تمام باتوں کا جاننے والا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی فطرت کو بگاڑا نہیں ہے، جن کی آنکھوں پر مصنوعی پردے نہیں پڑے ہوئے ہیں، وہ قرآن کی ان باتوں کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔ وہ ان کو عین وہی چیز معلوم ہوگی جس کی تلاش ان کی فطرت پہلے سے کررہی تھی۔ قرآن ان کے لیے زندگی اور یقین کا خزانہ بن جائے گا۔

اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہے جو قرآن کی آگاہی کو کوئی سنجیدہ چیز نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی اسی غفلت کی

حالت میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ وہ وقت ان پر پھٹ پڑے جس کی خبر انھیں دی جارہی ہے۔ اس وقت آدمی اچانک دیکھے گا کہ وہ بالکل بے سہارا ہو چکا ہے۔ وہ جن مسائل کو اہم سمجھ کر ان میں الجھا ہوا تھا اس دن وہ بالکل بے حقیقت نظر آئیں گے۔ وہ جن چیزوں پر بھروسہ کیے ہوئے تھا وہ سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں گے۔ وہ جن امیدوں پر جی رہا تھا وہ سب جھوٹی خوش خیالیاں ثابت ہوں گی۔

آخرت کا مسئلہ آج محض ایک نظریہ ہے، وہ بظاہر کوئی سنگین مسئلہ نہیں۔ اس لیے آدمی اس کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو پاتا۔ مگر موت کے بعد آنے والی زندگی میں جب آخرت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ پھٹ پڑے گی، اس وقت ہر آدمی اس بات کو ماننے پر مجبور ہوگا جس کو وہ اس سے پہلے ماننے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت آدمی جان لے گا کہ اس سے پہلے جو بات دلیل کی زبان میں کہی جارہی تھی وہ عین حقیقت تھی مگر میں اس کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو سکا اس لیے میں اس کو سمجھ بھی نہ پایا۔

جب وہ تمام چیزیں آدمی کا ساتھ چھوڑ دیں گی جن کو وہ دنیا میں اپنا سہارا بنائے ہوئے تھا تو وہ چاہے گا کہ دنیا میں اسے دوبارہ بھیج دیا جائے تاکہ وہ صحیح زندگی گزارے۔ مگر زندگی کا یہ موقع کسی کو دوبارہ ملنے والا نہیں۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۫ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

۵۴۔ بے شک تمھارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ اڑھاتا ہے رات کو دن پر، دن اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا۔ اور اس نے پیدا کیے سورج اور چاند اور ستارے، سب تابع دار ہیں اس کے حکم کے۔ یاد رکھو، اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم کرنا۔ بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔ ۵۵۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۵۶۔ اور زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد۔ اور اسی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں سے قریب ہے۔

زمین و آسمان اور اس کی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ اس پیدا کرنے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ وہ تمام چیزوں کو بنا کر ان کو انتشار کی حالت میں چھوڑ دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے تمام چیزوں کو ایک حد درجہ کامل اور حکیمانہ نظام کے تحت جوڑا اور ان کو اس طرح چلایا کہ ہر چیز ٹھیک اسی طرح کام کرتی ہے جیسا کہ مجموعی مصلحت کے اعتبار سے اس کو کرنا چاہیے۔

انسان بھی اسی دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ پھر ایسی اصلاح یافتہ دنیا میں اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس کا رویہ وہی ہونا چاہیے جو بقیہ تمام چیزوں کا ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو اسی خالق کے منصوبے میں دے دے جس کے منصوبہ میں بقیہ کائنات پوری تابعداری کے ساتھ اپنے آپ کو دیے ہوئے ہے۔

کائنات کی تمام چیزیں احسان (حسن کارکردگی) کی حد تک اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے انسان کو بھی احسان کی حد تک اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ یہاں کوئی چیز کبھی اعتداء (اپنی مقررہ حد سے تجاوز) نہیں کرتی۔ اس لیے انسان کے واسطے بھی لازم ہے کہ وہ عدل اور حق کی خدائی حدوں سے تجاوز نہ کرے۔ مزید یہ کہ انسان نطق اور شعور کی اضافی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس لیے نطق اور شعور کی سطح پر بھی اس کی حوالگئ رب کا اظہار ہونا ضروری ہے۔ انسان کے اندر خدا کی معرفت اتنی گہرائی تک اتر جانا چاہیے کہ اس کی زبان سے بار بار اس کا اظہار ہونے لگے۔ وہ خدا کو اس طرح پکارے جس طرح بندہ اپنے خالق و مالک کو پکارتا ہے۔ اس کو خدا کی خدائی کا اتنا ادراک ہونا چاہیے کہ خدا کے سوا اس کی امیدوں اور اس کے اندیشوں کا کوئی مرجع باقی نہ رہے۔ وہ خدا ہی سے ڈرے اور اسی سے اپنی تمام تمنائیں وابستہ کرے۔ خدا کے ساتھ خوف اور امید کو وابستہ کرنا خدا کی تابعداری کی آخری اور انتہائی صورت ہے۔

بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کو خدا کی رحمت حاصل ہو، مگر یہ رحمت صرف ان اشخاص کا حصہ ہے جو اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا زیادہ متعلق کر لیں کہ ان کے تمام جذبات کا رخ اللہ کی طرف ہو جائے۔ وہ اسی کو پکاریں اور اسی کے ساتھ عاجزی کریں۔ ان کو پانے کی امید اسی سے ہو اور چھننے کا ڈر بھی اسی سے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی قربت چاہی اس لیے خدا نے بھی ان کو اپنے قریب جگہ دے دی۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾ ع ۵ ۱۴

۵۷۔ اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر جب وہ بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کے ذریعہ پانی اتارتے ہیں۔ پھر ہم اس کے ذریعہ سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم غور کرو۔ ۵۸۔ اور جو زمین اچھی ہے اس کی پیداوار نکلتی ہے اس کے رب کے حکم سے اور جو زمین خراب ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان کے لیے جو شکر کرنے والے ہیں۔

دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ اس کے مادی واقعات اس کے روحانی پہلوؤں کی تمثیل بن گئے ہیں۔

جب کہیں بارش ہوتی ہے تو اس مقام کے ہر حصہ تک اس کا پانی یکساں طور پر پہنچتا ہے۔ مگر فیض اٹھانے کے اعتبار سے مختلف زمینوں کا حال مختلف ہوتا ہے۔ کوئی حصہ وہ ہے کہ پانی اس کو ملا تو اس کے اندر سے ایک لہلہاتا ہوا چمنستان نکل آیا۔ دوسری طرف کسی حصہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بارش پا کر بھی بے فیض پڑا رہتا ہے۔ وہاں جھاڑ جھنکاڑ کے سوا کچھ نہیں اگتا۔

یہی حال اس روحانی بارش کا ہے جو خدا کی طرف سے ہدایت کی صورت میں اتری ہے۔ اس ہدایت کا پیغام ہر آدمی کے کانوں تک پہنچتا ہے۔ مگر فائدہ ہر ایک کو اپنی اپنی استعداد کے بقدر ملتا ہے۔ جس کے اندر قبول حق کی صلاحیت زندہ ہے وہ اس سے بھر پور فیض حاصل کرتا ہے۔ اس سے اس کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ اس کی فطرت اچانک جاگ اٹھتی ہے۔ اس کا ربط اپنے مالک اعلیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی خشک نفسیات میں ربانی کیفیات کا باغ کھل اٹھتا ہے۔

اس کے برعکس حال اس شخص کا ہوتا ہے جس نے اپنی فطری سلامتی کو کھو دیا ہو۔ ہدایت کی بارش اپنے تمام بہترین امکانات کے باوجود اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ اس کے بعد بھی وہ ویسا ہی خشک پڑا رہتا ہے جیسا کہ وہ اس سے پہلے تھا۔ اور اگر اس کے اندر کوئی فصل نکلتی ہے تو وہ جھاڑ جھنکاڑ کی فصل ہوتی ہے۔ ہدایت کی بارش پا کر اس کے اندر سے حسد، حجت بازی، حق کی مخالفت جیسی چیزیں جاگ اٹھتی ہیں، نہ کہ حق کا اعتراف کرنے اور اس کا ساتھ دینے کی۔

بارش کے پانی کو قبول کرنے کے لیے زمین کا خشک ہونا ضروری ہے۔ جو زمین خشک نہ ہو، پانی اس کے اوپر سے گزر جائے گا، وہ اس کے اندر داخل نہیں ہوگا۔ اسی طرح خدا کی ہدایت صرف اس آدمی کے اندر جڑ پکڑتی ہے جو اس کا طالب ہو جس نے اپنی روح کو غیر خدائی باتوں سے خالی کر رکھا ہو۔ اسکے برعکس جو شخص خدا کی ہدایت سے بے پروا ہو، جس کا دل دوسری دلچسپیوں یا دوسری عظمتوں میں اٹکا ہوا ہو، اس کے پاس خدا کی ہدایت آئے گی مگر وہ اس کے اندرون میں داخل نہیں ہوگی، وہ اس کی روح کی غذا نہیں بنے گی، وہ اس کی فطرت کی زمین کو سیراب کرکے اس کے اندر خدا کا باغ نہیں اگائے گی۔

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۝۵۹ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهٖۤ اِنَّا لَـنَرٰٮكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۝۶۰	۵۹۔ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ نوح نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۶۰۔ اس کی قوم کے بڑوں نے کہا کہ ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ
رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ
لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَوَ
عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ
مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ
فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿٦٤﴾ ع ٨ ٦ ١٥

۶۱۔ نوح نے کہا کہ اے میری قوم، مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے، بلکہ میں بھیجا ہوا ہوں سارے عالم کے پروردگار کا۔ ۶۲۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں۔ اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ۶۳۔ کیا تم کو اس پر تعجب ہوا کہ تمھارے رب کی نصیحت تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم بچو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۶۴۔ پس انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے نوح کو بچا لیا اور ان لوگوں کو بھی جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے ان لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ بے شک وہ لوگ اندھے تھے۔

حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک تمام اولادِ آدم توحید پر قائم تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ اس کے بعد لوگوں نے اپنے اکابر اسلاف کی شکلیں بنانا شروع کیں تاکہ ان کے احوال وعبادات کی یاد تازہ رہے۔ ان بزرگوں کے نام وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، نسر تھے۔ دھیرے دھیرے ان بزرگوں نے ان کے درمیان معبود کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہ لوگ قدیم عراق میں آباد تھے۔ جب بگاڑ اس نوبت کو پہنچا تو اللہ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت نوح کو پیغمبر بنا کر ان کی طرف بھیجا۔ مگر انھوں نے حضرت نوح کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ تقویٰ کی روش اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اس انکار کی وجہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ایک آدمی جو دیکھنے میں انھیں جیسا ہے وہ خدا کی طرف سے خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے چنا گیا ہے۔ وہ اپنے کو جن اکابر کے دین پر سمجھتے تھے ان کے مقابلہ میں حضرت نوح ان کو بہت معمولی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ ان قدیم اکابر کی عظمت صدیوں کی تاریخ سے مسلم ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلہ میں حضرت نوح ایک معاصر شخص تھے۔ ان کے نام کے ساتھ تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ قوم نے آپ کا انکار کر دیا۔ انھوں نے وقت کے پیغمبر کو احمق اور گمراہ کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق آپ اکابر کے دین سے منحرف ہو گئے تھے۔ حضرت نوح کی خیر خواہی، ان کے ساتھ دلائل کا زور، ان کا راہِ حق پر قائم ہونا، کوئی بھی چیز قوم کو متاثر نہ کر سکی۔

حضرت نوح کی طرف سے اتمام حجت کے بعد قوم غرق کر دی گئی۔ اس غرقابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے

خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔ انھوں نے چاہا کہ ''معمولی شخصیت'' کے بجائے کسی ''مسلمہ شخصیت'' کے ذریعہ انھیں خدا کا پیغام پہنچایا جائے۔ مگر خدا کی نظر میں یہ اندھاپن تھا۔ خدا نے آدمی کو بصیرت اس لیے دی ہے کہ وہ ''نشانی'' کے روپ میں حق کو پہچان لے، نہ کہ حسّی مظاہرہ کی صورت میں۔ جو لوگ نشانی کے روپ میں حق کو نہ پہچانیں وہ خدا کی نظر میں آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کی رحمت میں کوئی حصہ نہیں۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

۶۵۔ اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ انھوں نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ سو کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۶۶۔ اس کی قوم کے بڑے جو انکار کر رہے تھے بولے، ہم تو تم کو بے عقلی میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم کو گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ ۶۷۔ ہود نے کہا کہ اے میری قوم، مجھے کچھ بے عقلی نہیں۔ بلکہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں۔ ۶۸۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمھارا خیر خواہ اور امین ہوں۔ ۶۹۔ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ تمھارے پاس تمہیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ تمھارے رب کی نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے۔ اور یاد کرو جب کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ بھی زیادہ دیا۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

حضرت نوح کی کشتی میں جو اہلِ ایمان بچے تھے ان میں آپ کے پوتے اِرم کی اولاد سے ایک نسل چلی۔ وہ قدیم یمن میں آباد تھے اور عاد کہلاتے تھے۔ یہ لوگ ابتداءً حضرت نوح کے دین پر تھے۔ بعد کو جب ان میں بگاڑ پیدا ہوا تو اللہ نے حضرت ہود کو ان کے اوپر اپنا پیغمبر مقرر کیا۔ مگر قوم کے سرداروں کو آپ کے اندر وہ عظمت نظر نہ آئی جو ان کے خیال مطابق خدا کے پیغمبر کے اندر ہونا چاہیے تھی۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ شخص یا تو احمق ہے یا پھر وہ جھوٹا دعویٰ کر رہا ہے۔

''میں تمھارا ناصح اور امین ہوں''۔ پیغمبر کی زبان سے یہ فقرہ بتاتا ہے کہ داعی اور مدعو کا رشتہ قومی حریف یا

سیاسی مدمقابل جیسا رشتہ نہیں ہے۔ یہ خیر خواہی اور امانت داری کا رشتہ ہے۔ داعی کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے دل میں مدعو کے لیے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ مدعو کی طرف سے خواہ کیسا ہی ناخوش گوار رویہ سامنے آئے مگر داعی آخر وقت تک مدعو کا خیر خواہ بنا رہے۔ پھر جو پیغام وہ دے رہا ہے اس کو دیتے ہوئے اس کے اندر یہ احساس نہ ہو کہ یہ میری کوئی اپنی چیز ہے جو میں دوسروں کو عطا کر رہا ہوں۔ بلکہ یہ جذبہ ہو کہ یہ خود دوسروں کی چیز ہے۔ یہ دوسروں کے لیے خدا کی امانت ہے جو میں ان کو پہنچا کر بری الذمہ ہو رہا ہوں۔

پیغمبروں کی دعوت کی بنیاد ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ انسان کے اوپر خدا کی نعمتیں یاد دلائیں اور اس کو اس بات سے ڈرائیں کہ اگر وہ خدا کا شکر گزار بن کر نہ رہا تو وہ خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔ قومی جھگڑوں اور مادی مسائل کو پیغمبر کبھی اپنی دعوت کا عنوان نہیں بناتے۔ وہ آخری حد تک اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اور مدعو کے درمیان اصل دعوت کے سوا کوئی چیز بحث کی بنیاد نہ بننے پائے، قوم ان کو صرف توحید اور آخرت کے داعی کے روپ میں دیکھے، نہ کہ کسی اور روپ میں۔

''خدا کی نعمتوں کو یاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو''—اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کا استحقاق اُس کے لیے ہے جس نے دنیا میں خدا کی نعمتوں کا اعتراف کیا ہو۔ جنت خدا کے منعم ومحسن ہونے کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ اس لیے آخرت کی جنت کو وہی پائے گا جس نے دنیا میں خدا کے منعم ومحسن ہونے کو پالیا ہو۔ یہی معرفت جنت کی اصل قیمت ہے۔

قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِنَعۡبُدَ اللّٰهَ وَحۡدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا‌ۚ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدۡ وَقَعَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ رِجۡسٌ وَّ غَضَبٌ‌ؕ اَتُجَادِلُوۡنَنِىۡ فِىۡۤ اَسۡمَآءٍ سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ‌ؕ فَانْتَظِرُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِيۡنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا‌ وَمَا كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۷۲﴾ ع ۸ / ۱۵

۷۰۔ ہود کی قوم نے کہا، کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ پس تم جس عذاب کی دھمکی ہم کو دیتے ہو، اس کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ ۷۱۔ ہود نے کہا، تم پر تمھارے رب کی طرف سے ناپاکی اور غصہ واقع ہو چکا ہے۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ جن کی خدا نے کوئی سند نہیں اتاری۔ پس انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ ۷۲۔ پھر ہم نے بچالیا اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور ماننے نہ تھے۔

انسان ناموں کے ذریعہ کسی چیز کا تصور قائم کرتا ہے۔ کسی شخص کے ساتھ اچھا لفظ لگ جائے تو وہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور اگر برا لفظ لگ جائے تو برا دکھائی دینے لگتا ہے۔ خدا کے سوا دوسری چیزیں یا ہستیاں جو آدمی کی توجہات کا مرکز بنتی ہیں اس کی وجہ بھی یہی نام ہوتے ہیں۔ لوگ کسی شخصیت کو غوث پاک، گنج بخش، غریب نواز، مشکل کشا جیسے الفاظ سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ الفاظ دھیرے دھیرے ان شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں کہ لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ جس کو غوث (فریادرس) کہا جاتا ہے وہ واقعی فریاد کو پہنچنے والا ہے اور جس کو مشکل کشا کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ سچ مچ مشکلوں کو حل کرنے والا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نام صرف انسانوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ ان ناموں کا کوئی مسمّٰی کہیں موجود نہیں۔ ان کے حق میں نہ کوئی شرعی دلیل ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل۔

ناموں کی شریعت کی ایک قسم وہ ہے جو جاہل انسانوں کے درمیان رائج ہے۔ تاہم اس کی ایک زیادہ مہذب صورت بھی ہے جو تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان مقبول ہے۔ یہاں بھی کچھ شخصیتوں کے ساتھ کچھ غیر معمولی الفاظ وابستہ کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً قدسی صفات، محبوب خدا، ستون اسلام، نجات دہندہ ملت وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ دھیرے دھیرے مذکورہ شخصیتوں کے نام کا جزء بن جاتے ہیں۔ لوگ ان شخصیتوں کو ویسا ہی غیر معمولی سمجھ لیتے ہیں جیسا کہ ان کو دیے ہوئے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔

جو چیز ''باپ دادا'' سے چلی آ رہی ہو، بالفاظ دیگر جس نے تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہو اور طویل روایات کے نتیجہ میں جس کے ساتھ ماضی کا تقدس شامل ہو گیا ہو وہ لوگوں کی نظر میں ہمیشہ عظیم ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ''آج'' کے داعی کی بات ہلکی دکھائی دیتی ہے۔ وہ حال کے داعی کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کو اعتماد ہوتا ہے کہ وہ اسلاف کی عظمتوں کے وارث ہیں پھر کون ان کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

خدا کے معاملہ میں ڈھٹائی آدمی کو دھیرے دھیرے بے حس بنا دیتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ وہ نصیحت اور یاد دہانی کی زبان میں کوئی اصلاح قبول کر سکے۔ ایسے لوگ گویا اس بات کے منتظر ہیں کہ خدا عذاب کی زبان میں ان کے سامنے ظاہر ہو۔

وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ انھوں نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک کھلا ہوا نشان آ گیا ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے۔ پس اس کو چھوڑ دو کہ وہ کھائے اللہ کی زمین میں۔ اور اس کو کوئی گزند

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

نہ پہنچانا ورنہ تم کو ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا۔

۷۴۔اور یاد کرو جب کہ خدا نے عاد کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں ٹھکانا دیا، تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

قوم عاد کی تباہی کے بعد اس کے صالح افراد عرب کے شمال مغرب میں حجر کے علاقہ میں آباد ہوئے۔ ان کی نسل بڑھی اور انھوں نے زراعت اور تعمیر میں بڑی ترقیاں کیں۔ انھوں نے میدانوں میں محل بنائے اور پہاڑوں کو تراش کر ان کو بڑے بڑے حجری مکانات کی صورت دے دی۔ بعد کو ان میں وہ خرابیاں پیدا ہوگئیں جو مادی ترقی اور دنیوی خوش حالی کے ساتھ قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ عیش پرستی، آخرت فراموشی، حدود اللہ سے بے پروائی، اللہ کی بڑائی کو بھول کر اپنی بڑائی قائم کرنا۔ اس وقت اللہ نے حضرت صالح کو کھڑا کیا تاکہ وہ ان کو اللہ کی پکڑ سے ڈرائیں۔ مگر انھوں نے نصیحت قبول نہ کی۔ وہ اپنے فساد کو صلاح میں بدلنے پر راضی نہ ہوئے۔ جس کائنات میں تمام چیزیں خدا کی تابع بن کر رہ رہی ہیں وہاں انھوں نے خدا کا سرکش بن کر رہنا چاہا۔ جہاں ہر چیز اپنی حد کے اندر اپنا عمل کرتی ہے وہاں انھوں نے اپنی حد سے تجاوز کرکے زندہ رہنا چاہا۔ یہ ایک اصلاح یافتہ دنیا میں فساد پھیلانا تھا۔ چنانچہ ان کو دنیا میں بسنے کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا۔

قوم ثمود کو جانچنے کے لیے خدا نے ایک اونٹنی مقرر کی اور کہا کہ اس کو تکلیف نہ پہنچانا ورنہ ہلاک کر دیے جاؤ گے۔ خدا کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان کے لیے ایک خوفناک شیر مقرر کر دے۔ مگر خدا نے شیر کے بجائے اونٹنی کو مقرر فرمایا۔ اس کا راز یہ ہے کہ آدمی کی خداترسی کا امتحان ہمیشہ ''اونٹنی'' کی سطح پر لیا جاتا ہے، نہ کہ ''شیر'' کی سطح پر۔ سماج میں ہمیشہ کچھ ناقۃ اللہ (خدا کی اونٹنی) جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ کم زور افراد ہیں جن کے ساتھ وہ مادی زور نہیں ہوتا جو لوگوں کو ان کے خلاف کارروائی کرنے سے روکے۔ جن کے ساتھ حسن سلوک کا محرک صرف اخلاقی احساس ہوتا ہے، نہ کہ کوئی ڈر۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جن کی سطح پر لوگوں کی خداپرستی جانچی جارہی ہے۔ یہی وہ افراد ہیں جن کے ذریعہ کسی کو جنت کا سرٹیفکٹ دیا جارہا ہے اور کسی کو جہنم کا۔

ثمود نے فن تعمیر میں کمال پیدا کیا۔ متعلقہ علوم مثلاً ریاضی، ہندسہ، انجینئرنگ میں بھی یقیناً انھوں نے ضروری دستگاہ حاصل کی ہوگی ورنہ یہ ترقیات ممکن نہ ہوتیں۔ مگر ان کو جس بات کا مجرم ٹھہرایا گیا وہ ان کی مادی ترقیاں نہیں تھیں بلکہ زمین میں فساد پھیلانا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جائز حدود میں ترقی کرنے سے خدا نہیں روکتا۔ البتہ زندگی کے معاملات میں آدمی کو اس نظام اصلاح کا پابند رہنا چاہیے جو خدا نے پوری کائنات میں قائم کر رکھا ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ
لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ
اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ
قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ
الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ
كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ
رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ
فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى
عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ
رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ
النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

۷۵۔ان کی قوم کے بڑے جنھوں نے گھمنڈ کیا، وہ ان مومنین سے بولے جو ناتوان گنے جاتے تھے، کیا تم کو یقین ہے کہ صالح اپنے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو جو وہ لے کر آئے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ۷۶۔ وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔ ۷۷۔ پھر انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے پھر گئے۔ اور انھوں نے کہا، اے صالح، اگر تم پیغمبر ہو تو وہ عذاب ہم پر لے آؤ جس سے تم ہم کو ڈراتے تھے۔ ۷۸۔ پھر انھیں زلزلہ نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھر میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ ۷۹۔ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ اے میری قوم، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔

پیغمبر جب آتا ہے تو اپنے زمانہ میں وہ ایک متنازعہ شخصیت ہوتا ہے، نہ کہ ثابت شدہ شخصیت۔ مزید یہ کہ اس کے ساتھ دنیا کی رونقیں جمع نہیں ہوتیں، وہ دنیا کی گدیوں میں سے کسی گدی پر بیٹھا ہوا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ پیغمبر کے معاصر ہوتے ہیں وہ پیغمبر کے پیغمبر ہونے کو سمجھ نہیں پاتے اور اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ وہ شخص جس کو ہم صرف ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے جانتے ہیں وہی وہ شخص ہے جس کو خدا نے اپنے پیغام کی پیغام رسانی کے لیے چنا ہے۔

''ہم صالح کے پیغام (إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ) پر ایمان لائے ہیں'' — حضرت صالح کے ساتھیوں کا یہ جواب بتاتا ہے کہ ان میں اور دوسروں میں کیا فرق تھا۔ منکرین نے حضرت صالح کی شخصیت کو دیکھا اور مومنین نے آپ کے اصل پیغام کو۔ منکروں کو حضرت صالح کی شخصیت میں ظاہری عظمت دکھائی نہ دی، انھوں نے آپ کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے برعکس، مومنین نے حضرت صالح کے پیغام میں حق کے دلائل اور سچائی کی جھلکیاں دیکھ لیں، وہ فوراً ان کے ساتھی بن گئے۔ سچائی ہمیشہ دلائل کے زور پر ظاہر ہوتی ہے، نہ کہ دنیوی عظمتوں کے زور پر۔ جو

لوگ دلائل کے روپ میں حق کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ فوراً اس کو پالیتے ہیں۔ اور جو لوگ ظاہری بڑائیوں میں اٹکے ہوئے ہوں وہ مشتبہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں کبھی حق کا ساتھ دینے کی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔

حضرت صالح کی اونٹنی کو مارنے والا اگرچہ قوم کا ایک سرکش آدمی تھا۔ مگر یہاں اس کو پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا ''ان لوگوں نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی گروہ کا ایک شخص برا عمل کرے اور دوسرے لوگ اس کے برے فعل پر راضی رہیں۔ تو سب کے سب اس مجرمانہ فعل میں شریک قرار دیے جاتے ہیں۔

جو قوم خواہش پرستی کا شکار ہو اس کو حقیقت پسندی کی باتیں اپیل نہیں کرتیں۔ وہ ایسے شخص کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی جو اس کو سنجیدہ عمل کی طرف بلاتا ہو۔ اس کے برعکس، جو لوگ خوش نما الفاظ بولیں اور جھوٹی امیدوں کی تجارت کریں، ان کے گرد بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ سچے خیر خواہ کے لیے اس کے اندر کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ ان لوگوں کی طرف وہ تیزی سے دوڑ پڑتی ہے جو اس کا استحصال کرنے کے لیے اٹھے ہوں۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ ع ۱۰ / ۱۲ / ۱۷

۸۰۔ اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم کھلی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ ۸۱۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۸۲۔ مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھیں اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔ ۸۳۔ پھر ہم نے بچالیا لوط کو اور اس کے گھر والوں کو، اس کی بیوی کے سوا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی۔ ۸۴۔ اور ہم نے ان پر بارش برسائی پتھروں کی، پھر دیکھو کہ کیسا انجام ہوا مجرموں کا۔

حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ وہ جس قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے وہ دریائے اردن کے کنارے جنوبی شام کے علاقہ میں آباد تھی۔ اس قوم کی خوش حالی اس کو عیش پرستی کی طرف لے گئی۔ حتی کہ ان لوگوں کی بے راہ روی اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لیے ہم جنسی کے طریقے کو اختیار کر لیا۔ پیغمبر نے ان کو اس کھلی ہوئی بے حیائی سے ڈرایا۔

کائنات کے لیے فطرت کی ایک اسکیم ہے۔ اس اسکیم کو قرآن میں اصلاح کہا گیا ہے۔ اس اصلاح کے خلاف چلنے کا نام فساد ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں اسی اصلاحی راستہ پر چل رہی ہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو اپنی آزادی کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے اور فطرت کے راستہ کے خلاف اپنا راستہ بناتا ہے۔ حضرت لوط کی قوم اسی قسم کے ایک فساد میں مبتلا تھی۔ جنسی تعلق کا طریقہ یہ ہے کہ عورت اور مرد باہم بیوی اور شوہر بن کر رہیں۔ یہ اصلاح کے طریقہ پر چلنا ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ ہو کہ مرد مرد یا عورت عورت کے درمیان جنسی تعلقات قائم کیے جانے لگیں تو یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے گزر جانا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں فساد کہا گیا ہے۔

حضرت لوط پر صرف ان کے قریبی لوگوں میں سے چند افراد ایمان لائے۔ باقی پوری قوم اپنی ہوس پرستی میں غرق رہی۔ انھوں نے کہا ''جب یہ ہم سب لوگوں کو گندہ سمجھتے ہیں اور خود پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام۔ پھر تو یہ نکل جائیں ہمارے شہر سے''۔ ان کا یہ قول دراصل گھمنڈ کا قول تھا۔ ان کو یہ کہنے کی جرأت اس لیے ہوئی کہ وہ اپنی اکثریت اور مادی تفوق کی وجہ سے اپنے کو محفوظ حالت میں سمجھتے تھے۔ گھمنڈ کی نفسیات میں مبتلا لوگ ہمیشہ اپنے کمزور پڑوسیوں سے کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہمارا طریقہ پسند نہیں وہ ہماری زمین کو چھوڑ دیں۔ مگر یہ خدا کی دنیا میں شرک کرنا ہے اور شرک سب سے بڑا جرم ہے۔

حضرت لوط کی قوم پر خدا کا عذاب آیا تو عذاب کا شکار ہونے والوں میں پیغمبر کی بیوی بھی شامل تھیں۔ اس سے انعام اور سزا کے باب میں خدا کا بے لاگ انصاف ظاہر ہوتا ہے۔ خدا کے انصاف کے ترازو میں رشتوں اور دوستیوں کا کوئی لحاظ نہیں۔ خدا کا فیصلہ اتنا بے لاگ ہے کہ اس نے حضرت نوح کے بیٹے، حضرت ابراہیم کے باپ، حضرت لوط کی بیوی اور حضرت محمد کے چچا کو بھی معاف نہیں کیا۔ اور دوسری طرف فرعون کی بیوی نے صالح عمل کا ثبوت دیا تو اس کو جنت میں داخل کر دیا۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا

۸۵۔ اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمھارا معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے دلیل پہنچ چکی ہے۔ پس ناپ اور تول پوری کرو۔ اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں۔ اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد۔ یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ ۸۶۔ اور راستوں پر مت بیٹھو کہ ڈراؤ اور اللہ کی راہ سے ان لوگوں کو روکو جو اس پر ایمان

عِوَجًا ۚ وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ كُنۡتُمۡ قَلِيۡلًا فَكَثَّرَكُمۡ ۖ وَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۸۶﴾ وَ اِنۡ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنۡكُمۡ اٰمَنُوۡا بِالَّذِىۡۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا فَاصۡبِرُوۡا حَتّٰى يَحۡكُمَ اللّٰهُ بَيۡنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ ﴿۸۷﴾

لا چکے ہیں اور اس راہ میں کجی تلاش کرو۔ اور یاد کرو جب کہ تم بہت تھوڑے تھے پھر تم کو بڑھا دیا۔ اور دیکھو فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ۸۷۔ اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس پر ایمان لایا ہے جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیم کے ایک صاحب زادہ مدیان تھے جو آپ کی تیسری بیوی قطورہ سے پیدا ہوئے۔ اہل مدین انھیں کی نسل سے تھے۔ یہ قوم بحر احمر کے عرب ساحل پر آباد تھی۔ یہ لوگ خدا کو ماننے والے تھے اور اپنے کو دین ابراہیمی کا حامل سمجھتے تھے۔ مگر حضرت ابراہیم کے پانچ سو سال بعد ان کے اندر بگاڑ آ گیا۔ یہ ایک تجارت پیشہ قوم تھی اور اس کے بگاڑ کا سب سے زیادہ اظہار اسی پہلو سے ہوا۔ وہ ناپ تول اور لین دین میں دیانت داری کے اصولوں پر پوری طرح قائم نہیں رہے۔

اہلِ مدین کا معاملاتی بگاڑ جب بہت بڑھ گیا تو خدا نے حضرت شعیب کو ان کی طرف اپنا پیغام لے کر بھیجا۔ آپ نے ان کو بتایا کہ معاملات میں راستی اور دیانت داری کا طریقہ اختیار کرو۔ آپ نے کھلے کھلے دلائل کے ذریعے ان کو آخری حد تک باخبر کر دیا۔ مگر وہ نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ حتی کہ ان کا حال یہ ہوا کہ خود حضرت شعیب کی دعوت کو مٹانے پر تل گئے۔ وہ آپ کی باتوں میں طرح طرح کے شوشے نکال کر لوگوں کو آپ کے بارے میں غلط فہمی میں ڈالتے۔ وہ جارحانہ کارروائیوں کے ذریعے کوشش کرتے کہ لوگ آپ کا ساتھ نہ دیں۔ بالآخر ان پر خدائی عذاب آیا اور وہ تباہ کر دیے گئے۔

دوسرے سے معاملہ کرنے میں بے انصافی خدا کے قائم کردہ نظام اصلاح کے خلاف ہے۔ خدا نے اپنی دنیا کا نظام کامل انصاف پر قائم کیا ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو لیتے وقت دوسرے سے زیادہ لے اور دیتے وقت دوسرے کو کم دے۔ یہاں ہر چیز حسابی صحت کی حد تک انصاف کے اصول پر قائم ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو بھی وہی کرنا چاہیے جو اس کے گرد و پیش کی ساری کائنات کر رہی ہے۔ ایسا نہ کرنا خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرنا ہے۔

بندوں کے حقوق کی رعایت اور باہمی معاملات کی درستگی خدا کی نظر میں اتنی زیادہ اہم ہے کہ اس کی مخالفت پر ایک قوم، ایمان کے دعوے دار ہونے کے باوجود تباہ کر دی گئی۔ خدا بہتر فیصلہ کرنے والا ہے اور بہتر فیصلہ جانب داری کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ خدا بے کلمہ والوں کو ان کی بے انصافی پر پکڑے اور کلمہ والوں کو ٹھیک اسی بے انصافی پر چھوڑ دے۔

انسان عام طور پر فطرت کی سطح پر جیتے ہیں ۔ اور فطرت کی سطح پر ہمیشہ ایک دوسرے کے درمیان اچھے تعلقات ہی ہوتے ہیں ۔ مگر بعد کی نسل میں پیدا ہونے والے نا اہل لیڈر جھوٹے ایشو لے کر لوگوں کی سوچ بگاڑ دیتے ہیں اور یہیں سے فساد کا آغاز ہو جاتا ہے ۔ یہ نا اہل لیڈر فطرت کے نظام کو بگاڑنے کا کام کر رہے ہیں ۔ یہ وہی چیز ہے جس سے آیت 85 میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے: اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد ۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۛ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۱

☆ ۸۸۔ قوم کے بڑے جو متکبر تھے انھوں نے کہا کہ اے شعیب ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تم ہماری ملّت میں پھر آجاؤ۔ شعیب نے کہا، کیا ہم بیزار ہوں تب بھی۔ ۸۹۔ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر ہم تمھاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دی۔ اور ہم سے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارا رب ہر چیز کو اپنے علم سے گھیرے ہوئے ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۹۰۔ اور ان بڑوں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے انکار کیا تھا کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو تم برباد ہو جاؤ گے۔ ۹۱۔ پھر ان کو زلزلہ نے پکڑ لیا۔ پس وہ اپنے گھر میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ ۹۲۔ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا گویا وہ کبھی اس بستی میں بسے ہی نہ تھے، جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی گھاٹے میں رہے۔ ۹۳۔ اس وقت شعیب ان سے منہ موڑ کر چلا اور کہا، اے میری قوم، میں تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا چکا اور تمھاری خیر خواہی کر چکا۔ اب میں کیا افسوس کروں منکروں پر۔

حضرت شعیب کی قوم خدا کے انکار کی مجرم نہ تھی بلکہ خدا پر افتراء کرنے کی مجرم تھی۔ یعنی اس نے خدا کی طرف ایک ایسے دین کو منسوب کر رکھا تھا جس کو خدا نے ان کے لیے اتارا نہ تھا۔ یہی تمام انبیاء کی قوموں کا حال رہا ہے۔ انبیاء کی قومیں سب وہی تھی جن پر اس سے پہلے خدا نے اپنا دین اتارا تھا مگر بعد کو انھوں نے خود ساختہ تبدیلیوں اور اضافوں کے ذریعہ اس کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ انھوں نے خدا کے دین کو اپنی خواہشات کا دین بنا ڈالا اور اسی کو خدا کا دین کہنے لگے۔

وقت کے قائم شدہ دین میں جن لوگوں کو عزت اور بڑائی کا مقام ملا ہوا تھا انھوں نے محسوس کیا کہ دلیل کے اعتبار سے ان کے پاس پیغمبر کی باتوں کا توڑ نہیں ہے۔ تاہم اقتدار کے ذرائع سب انھیں کے پاس تھے۔ انھوں نے دلیل کے میدان میں اپنے کو لاجواب پا کر یہ چاہا کہ زور وقوت کے ذریعہ وہ پیغمبر کو خاموش کر دیں۔ انھوں نے پیغمبر کے ساتھیوں کو بطور وارننگ یہ یاد دلایا کہ وقت کے نظام میں زندگی کے تمام سرے انھیں لوگوں کے پاس ہیں جن کو وہ باطل ٹھہرا رہے ہیں۔ یہ باطل لوگ اگر ان کے خلاف متحرک ہو جائیں تو اس کے بعد وہ زندگی کے ذرائع کہاں پائیں گے۔ مگر وہ بھول گئے کہ خدا ان سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اور خدا جس کے خلاف ہو جائے اس کے لیے کہیں جائے پناہ نہیں۔

کسی شخص کے لیے صرف اس وقت تک چھوٹ ہے جب تک اس پر امر حق واضح نہ ہوا ہو۔ امر حق جب بخوبی طور پر واضح ہو جائے اور اس کے بعد بھی آدمی سرکشی کرے تو وہ ہمدردی کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ اسی بنیاد پر دنیا میں بھی کسی مجرم کے لیے سزا ہے اور اسی بنیاد پر آخرت میں بھی لوگوں کے لیے ان کے جرم کے مطابق سزا کا فیصلہ ہوگا۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَةٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ یَضَّرَّعُوۡنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الۡحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوۡا وَّقَالُوۡا قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَیۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰكِنۡ كَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا كَانُوۡا

۹۴۔ اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا، اس کے باشندوں کو ہم نے سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ گڑگڑائیں۔ ۹۵۔ پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا یہاں تک کہ انھیں خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ تکلیف اور خوشی تو ہمارے باپ دادا کو بھی پہنچتی رہی ہے۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا گمان بھی نہ رکھتے تھے۔ ۹۶۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی نعمتیں کھول دیتے۔ مگر انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو پکڑ لیا ان کے اعمال کے بدلے۔ ۹۷۔ پھر کیا بستی والے اس

يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٦﴾ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ
يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿٩٧﴾ اَوَ
اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا
ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩٨﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ
فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾ ع ١٢ ٦ ٢

سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آپڑے جب کہ وہ سوتے ہوں۔
۹۸۔ یا کیا بستی والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہمارا عذاب آپہنچے ان پر دن چڑھے جب وہ کھیلتے ہوں۔
۹۹۔ کیا یہ لوگ اللہ کی تدبیروں سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ پس اللہ کی تدبیروں سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہوں۔

حدیث میں آیا ہے کہ مومن پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور منافق کی مثال گدھے کی طرح ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے مالک نے کس لیے اس کو باندھا اور کیوں اس کو چھوڑ دیا (لَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ حَتَّى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنْ ذُنُوبِهِ وَالْمُنَافِقِ مَثَلُهُ كَمَثَلِ الْحِمَارِ لَا يَدْرِي فِيمَ رَبَطَهُ أَهْلُهُ وَلَا فِيمَ أَرْسَلُوهُ) تفسیر ابن کثیر، جلد 3، صفحہ 450۔

خدا انسان کے اوپر مختلف قسم کی تکلیفیں ڈالتا ہے تاکہ اس کا دل نرم ہو۔ خدا کے سوا دوسری چیزوں پر اس کا اعتماد ٹوٹ جائے، اس کا وہ گھمنڈ جاتا رہے جو آدمی کے لیے اپنے سے باہر کسی سچائی کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس طرح خدائی انتظام کے تحت آدمی کے اندر کمی اور بے چارگی کی نفسیات پیدا کی جاتی ہے تاکہ وہ حق کی آواز پر کان لگائے۔ خدا کا یہ معاملہ عام لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور پیغمبر کے مخاطب گروہ کے ساتھ بھی۔ تاہم یہ معاملہ سنت الٰہی کے تحت التباس واشتباہ کے پردہ میں ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آفت آتی ہے تو وہ اسباب وعلل کے روپ میں آتی ہے۔ یہ صورت حال بہت سے لوگوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ تو ایک ہونے والی بات تھی جو ہوئی۔ پھر جب وہ مصیبتوں سے اثر نہیں لیتے تو خدا ان کے حالات بدل کر ان کو خوش حالی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اب اس قسم کے لوگ اور بھی زیادہ مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ محض حوادث روزگار کی بات تھی۔ یہ وہی عام اتار چڑھاؤ تھا جو ہمیشہ لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہم کو برے دن کے بعد اچھے دن دیکھنے کو ملے۔ وہ پہلی تنبیہ سے بھی سبق لینے سے محروم رہتے ہیں اور دوسری تنبیہ سے بھی۔

سرکشی کے بعد کسی کو ترقی ملنا سخت خطرناک ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا نے اس کو ایسی حالت میں پکڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے جب کہ وہ اپنے پکڑے جانے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بے خوف ہو چکا ہو۔

ایمان اور تقویٰ کی زندگی کا فائدہ اگرچہ اصلاً آخرت میں ملنے والا ہے۔ تاہم خدا اگر چاہتا ہے تو دنیا میں بھی وہ ایسے لوگوں کو فراخی اور عزت کی صورت میں ان کے عمل کا ابتدائی انعام دے دیتا ہے۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ
اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَ
نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ
الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ
جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا
بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى
قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ
عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٢﴾

۱۰۰۔ کیا سبق نہیں ملا ان کو جو زمین کے وارث ہوئے ہیں اس کے اگلے باشندوں کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو پکڑ لیں ان کے گناہوں پر۔ اور ہم نے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے پس وہ نہیں سمجھتے۔ ۱۰۱۔ یہ وہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ہمارے رسول نشانیاں لے کر آئے تو ہرگز نہ ہوا کہ وہ ایمان لائیں اس بات پر جس کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اس طرح اللہ منکرین کے دلوں پر مہر کردیتا ہے۔ ۱۰۲۔ اور ہم نے ان کے اکثر لوگوں میں عہد کا نباہ نہ پایا اور ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان پایا۔

زمین پر بار بار یہ واقعہ ہوتا ہے کہ ایک قوم کو یہاں عزت اور خوش حالی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس پر زوال آتا ہے۔ وہ میدان سے ہٹادی جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم عزت اور خوش حالی کے تمام مقامات پر قابض ہوجاتی ہے۔

یہ واقعہ خدا کی ایک نشانی ہے۔ وہ آدمی کو خدا کی یاد دلانے والا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ملنے یا نہ ملنے کے سرے کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ خدا نے انسان کو دیکھنے اور سمجھنے کی جو طاقت دی ہے اس کو کام میں لاکر وہ بآسانی اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ جان سکتا ہے کہ اصل سرچشمہ اگر کسی اور کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو جو گروہ ایک بار غالب آجاتا وہ کبھی دوسرے کو اوپر آنے نہ دیتا۔ آدمی اگر اس قسم کا سبق لے تو قوموں کے عروج وزوال میں اس کو ربانی غذا ملے گی۔ مگر جب بھی ایک قوم پیچھے ہٹتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم اوپر آتی ہے تو اس کے افراد اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ پچھلی قوم کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ صرف پچھلی قوم کے لیے تھا، ہمارے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

خدا نے آنکھ کان اور عقل کی صلاحیت انسان کو اس لیے دی ہے کہ وہ اس سے سبق لے، وہ ان کے ذریعہ خدا کے اشارات کو سمجھے۔ مگر جب آدمی اپنی ان صلاحیتوں سے وہ کام نہیں لیتا جو اس کو لینا چاہیے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ خدا کے قانون کے تحت اس کے دل کی حساسیت مردہ ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ان معاملات میں اس کے جذبات کند ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس کے دل ودماغ پر بے حسی کی مہر لگ جاتی ہے۔ اب اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ وہ دیکھنے کے باوجود نہ دیکھے اور سننے کے باوجود نہ سنے۔ وہ عقل رکھتے ہوئے بھی باتوں کو نہ سمجھے۔ وہ انسان ہوتے ہوئے بے انسان بن جائے۔

انسانیت کا آغاز حضرت آدم کے مومنین سے ہوا۔ اس کے بعد جب بگاڑ ہوا تو یاد دہانی کے لیے خدا کے پیغمبر آئے۔ اب یہ ہوا کہ پیغمبر کے ذریعے اصلاح قبول کرنے والے افراد کو بچا کر ان لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا جنھوں نے اصلاح قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ مگر بعد کی نسلیں دوبارہ اپنے پیغمبر کے ہاتھ پر کیے ہوئے عہد اسلام کو بھلا بیٹھیں اور دوبارہ وہی انجام پیش آیا جو پہلی بار مومنینِ آدم کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ صورت بار بار پیش آتی رہی حتیٰ کہ نسل انسانی کی اکثریت کے لیے تاریخ نافرمانی اور عہد شکنی کی تاریخ بن گئی۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى
يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾
حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا
الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ
فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ
كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ
لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ ع
اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ
يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾
قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي
الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ
عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

۱۰۳۔ پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس، مگر انھوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا۔ پس دیکھو کہ مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔ ۱۰۴۔ اور موسیٰ نے کہا اے فرعون، میں پروردگار عالم کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ ۱۰۵۔ سزاوار ہوں کہ اللہ کے نام پر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں۔ میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں۔ پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔ ۱۰۶۔ فرعون نے کہا، اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ ۱۰۷۔ تب موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو یکایک وہ ایک صاف اژدہا بن گیا۔ ۱۰۸۔ اور اس نے اپنا ہاتھ نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ ۱۰۹۔ فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ ۱۱۰۔ وہ چاہتا ہے کہ تم کو تمھاری زمین سے نکال دے۔ ۱۱۱۔ اب تمھاری کیا صلاح ہے۔ انھوں نے کہا، موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو مہلت دو اور شہروں میں ہرکارے بھیجو۔ ۱۱۲۔ وہ تمھارے پاس سارے ماہر جادوگر لے آئیں۔

پیغمبر کا خطاب اولاً ان لوگوں سے ہوتا ہے جو وقت کے سردار ہوں، جن کو ماحول میں فکری قیادت

حاصل ہو۔ یہ لوگ اپنی برتر ذہنی صلاحیت کی وجہ سے سب سے زیادہ اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ سچائی کے پیغام کو اس کی گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے پیغمبرانہ دعوت کے ساتھ ہمیشہ ''ظلم'' کا سلوک کیا۔ یعنی اپنی ذہانت کو اس کے لیے استعمال کیا کہ حق کے پیغام کو ٹیڑھے معنی پہنائیں۔ مثلاً ایک نشانی جو یہ ثابت کر رہی ہو کہ وہ خدا کے زور پر ظاہر ہوئی ہے اس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ یہ جادو کے زور پر دکھائی گئی ہے۔ یا تحریک کو بدنام کرنے کے لیے اس کو سیاسی معنی پہنانا اور یہ کہنا کہ یہ لوگ محض اپنے اقتدار کے لیے اٹھے ہیں۔ عوام چوں کہ باتوں کا تجزیہ نہیں کر پاتے اس لیے اس قسم کی باتیں ان کو حق سے مشتبہ کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ مگر داعیٔ حق کے خلاف ایسے شوشے نکالنا بہت بڑا جرم ہے۔ اس طرح وقت کے بڑے اپنی قیادت کا تحفظ تو ضرور کر لیتے ہیں مگر یہ تحفظ ان کو صرف اس قیمت پر ملتا ہے کہ ان کی آخرت ہمیشہ کے لیے غیر محفوظ ہو جائے۔

خدا کامل حق پر ہے۔ اس لیے جو شخص خدا کی طرف سے اٹھے اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ حق وانصاف کے سوا کوئی دوسرا کلمہ اپنی زبان سے نکالے۔ اگر وہ حق کے سوا کوئی بات بولے تو وہ خدا کی نمائندگی کے استحقاق کو کھو دے گا اور خدا کے یہاں انعام کے بجائے سزا کا مستحق ہو جائے گا۔

حضرت موسیٰ بیک وقت بنی اسرائیل کی طرف بھی مبعوث تھے اور فرعون اور اس کی قبطی قوم کی طرف بھی۔ بنی اسرائیل میں اگرچہ اس وقت بہت سی کمزوریاں آچکی تھیں۔ تاہم بنیادی طور پر انھوں نے حضرت موسیٰ کا ساتھ دیا۔ اس کے برعکس، فرعون اور اس کی قوم نے (چند افراد کو چھوڑ کر) آپ کا انکار کیا۔ بالآخر چالیس سالہ تبلیغ کے بعد آپ نے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے باہر جانے دے تاکہ وہ بیابان کی کھلی فضا میں جا کر ایک خدا کی عبادت کر سکیں (خروج 5:1)

حضرت موسیٰ اگرچہ سچائی کے نمائندہ تھے۔ مگر فرعون نے اس کو جادو کا معاملہ سمجھا اور جادوگروں کے ذریعہ آپ کو زیر کرنے کا فیصلہ کیا۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا
اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ
لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ
تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ
اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ
اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۳۔ اور جادوگر فرعون کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا، ہم کو انعام تو ضرور ملے گا اگر ہم غالب رہے۔ ۱۱۴۔ فرعون نے کہا، ہاں اور یقیناً تم ہمارے مقربین میں داخل ہو گے۔ ۱۱۵۔ جادوگروں نے کہا، یا تو تم ڈالو یا ہم ڈالنے والے بنتے ہیں۔ ۱۱۶۔ موسیٰ نے کہا، تم ہی ڈالو۔ پھر جب انھوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان پر دہشت طاری کر دی اور بہت بڑا کرتب

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ
تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا
صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ
هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

۱۱۷۔اور ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ اپنا عصا ڈال دو۔تو اچانک وہ نگلنے لگا اس کو جو انھوں نے گھڑا تھا۔ ۱۱۸۔ پس حق ظاہر ہو گیا اور جو کچھ انھوں نے بنایا تھا، وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ ۱۱۹۔پس وہ لوگ وہیں ہار گئے اور ذلیل ہو کر رہے۔ ۱۲۰۔اور جادو گر سجدہ میں گر پڑے۔ ۱۲۱۔انھوں نے کہا، ہم ایمان لائے رب العالمین پر۔ ۱۲۲۔ جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا۔

کسی ماحول میں جس چیز کی اہمیت لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی ہو اسی نسبت سے ان کے پیغمبر کو معجزہ دیا جاتا ہے۔قدیم مصر میں جادو کا بہت زور تھا اس لیے حضرت موسیٰ کو اسی نوعیت کا معجزہ دیا گیا۔

فرعون کے طے کردہ پروگرام کے مطابق مصریوں کے قومی تیوہار (یوم الزینہ) کے موقع پر ان کے تمام بڑے بڑے جادو گر جمع ہوئے۔جادوگروں نے کہا کہ پہلے ہم اپنا کرتب سامنے لائیں یا تم جو کچھ دکھانا چاہتے ہو دکھاؤ گے۔حضرت موسیٰ نے کہا پہلے تم اپنا کرتب سامنے لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے دشمن کے خلاف اقدام کرنے میں کبھی پہل نہیں کرتا۔وہ آخر وقت تک دشمن کو موقع دیتا ہے کہ وہ خود پہل کرے۔فریق مخالف جب اس طرح پہل کی ذمہ داری اپنے اوپر لے چکا ہوتا ہے اس وقت پیغمبر اپنی پوری قوت کو استعمال کر کے اسے زیر کر دیتا ہے۔نظریاتی دعوت کے معاملہ میں پیغمبر کا طریقہ اقدام کا ہوتا ہے اور عملی ٹکراؤ کے معاملہ میں دفاع کا۔

مصر میں حضرت موسیٰ کی دعوت تقریباً چالیس سال تک جاری رہی ہے۔جادو گروں سے مقابلہ کا واقعہ اس کے آخری زمانہ کا ہے۔اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جادو گر حضرت موسیٰ کی دعوت سے آشنا رہے ہوں گے۔ تاہم ابھی تک ان کی آنکھ کا پردہ نہیں ہٹا تھا۔جب انھوں نے اپنے مخصوص فن کے میدان میں حضرت موسیٰ کی برتری دیکھی تو حجابات اٹھ گئے۔ان کو نظر آگیا کہ یہ جادو گری کا معاملہ نہیں بلکہ خدائی پیغمبری کا معاملہ ہے۔وہ بے اختیار ہو کر خدا کے سامنے گر پڑے۔

جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو خیال بندی کی وجہ سے وہ لوگوں کو چلتا پھرتا سانپ نظر آنے لگیں۔مگر جب موسیٰ کا عصا سانپ بن کر میدان میں گھوما تو جادوگروں کی ہر لاٹھی اور رسّی صرف لاٹھی اور رسّی ہو کر رہ گئی۔جادوگر جادو کے حدود کو جانتے تھے۔اس واقعہ میں جادوگروں کو نظر آگیا کہ انسانی تدبیریں اپنے کمال پر پہنچ کر بھی کتنی حقیر ہیں اور خدا کتنا عظیم اور کتنا زیادہ طاقت ور ہے۔اس کے بعد فرعون ان کو اپنے تمام اقتدار کے باوجود بے وقعت نظر آنے لگا۔ وہی جادوگر جو خدا کی عظمت کو دیکھنے سے پہلے فرعون سے انعام کے طالب تھے۔

اب انھوں نے فرعون کی طرف سے بدترین سزاؤں کی دھمکی کو بھی اس طرح نظر انداز کردیا جیسے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۴/۱۸

۱۲۳۔ فرعون نے کہا، تم لوگ موسیٰ پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں۔ یقیناً یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے شہر میں اس غرض سے کی ہے کہ تم اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو، تو تم بہت جلد جان لو گے۔ ۱۲۴۔ میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھادوں گا۔ ۱۲۵۔ انھوں نے کہا، ہم کو اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۱۲۶۔ تو ہم کو صرف اس بات کی سزا دینا چاہتا ہے کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے۔ اے رب، ہم پر صبر انڈیل دے اور ہم کو وفات دے اسلام پر۔

حق کے لیے جان قربان کرنا حق کے حق ہونے کی آخری گواہی دینا ہے۔ جادوگروں کو خدا کی مدد سے اسی کی توفیق حاصل ہوئی۔ جادوگروں نے اپنے آپ کو سخت ترین سزا کے لیے پیش کرکے یہ ثابت کردیا کہ ان کا حضرت موسیٰ پر ایمان لانا کوئی حیلہ اور سازش کا معاملہ نہیں، یہ سچے اعترافِ حق کا معاملہ ہے۔ مگر جادوگروں کا سب سے بڑا عمل فرعون کی متکبرانہ نفسیات کے لیے سب سے بڑا تازیانہ تھا۔ انھوں نے فرعون کے مقابلہ میں موسیٰ کا ساتھ دے کر فرعون کو ساری قوم کے سامنے رسوا کردیا تھا۔ چنانچہ فرعون ان کے خلاف غصہ سے بھر گیا۔ اس نے جادوگروں کے ساتھ اسی ظالمانہ کارروائی کا فیصلہ کیا جو ہر وہ متکبر شخص کرتا ہے جس کو زمین پر کسی قسم کا اختیار حاصل ہوجائے۔ جادوگر بھی دلیل کے میدان میں ہارے اور فرعون بھی۔ مگر جادوگر اپنی شکست کا اعتراف کرکے خدا کی ابدی نعمتوں کے مستحق بن گئے اور فرعون نے اس کو اپنی عزت کا مسئلہ بنالیا۔ اس کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ اپنی جھوٹی انانیت کی تسکین کے لیے دنیا میں وہ حق پرستوں پر ظلم کرے اور آخرت میں خدا کے ابدی عذاب میں ڈال دیا جائے۔

فرعون نے موسیٰ کی دعوت قبول کرنے یا نہ کرنے کو اپنی ''اجازت'' کا مسئلہ سمجھا۔ اور جادوگروں نے ''نشانی''

کا۔ متکبر آدمی کا مزاج ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے، نہ کہ دلیل اور ثبوت کو۔ ایسے لوگ کبھی حق کو قبول کرنے کی توفیق نہیں پاتے۔

اس نازک ترین موقع پر جادوگروں نے جو کامل استقامت دکھائی وہ سراسر خدا کی مدد سے تھی اور ان کی زبان سے جو دعا نکلی وہ بھی تمام تر الہامی دعا تھی۔ جب کوئی بندہ اپنے آپ کو ہمہ تن خدا کے حوالے کر دیتا ہے تو اس وقت وہ خدا کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کو خدا کا خصوصی فیضان پہنچنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو خدا کے القا کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ وہی دعا کرتا ہے جس کے متعلق اس کا خدا پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے قبول کر لی گئی ہے۔

جادوگروں کا یہ کہنا کہ خدایا ہمارے اوپر صبر انڈیل دے اور ہماری موت آئے تو اسلام پر آئے، دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ ہم نے اپنے بس بھر اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا ہے۔ اب جو کچھ ہمارے بس سے باہر ہے اس کے واسطے تو ہمارے لیے کافی ہو جا۔ جب بھی کوئی بندہ دین کی راہ میں دل سے یہ دعا کرتا ہے تو خدا یقیناً اس کی مشکلات میں اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَاۗءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۣۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵/۵

۱۲۷۔ قوم فرعون کے سرداروں نے کہا، کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑیں۔ فرعون نے کہا کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔ اور ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں۔ ۱۲۸۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور آخری کامیابی اللہ سے ڈرنے والوں ہی کے لیے ہے۔ ۱۲۹۔ موسیٰ کی قوم نے کہا، ہم تمھارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمھارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا قریب ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔

بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کے سامنے جو مسئلہ پیش کیا وہ حکومت کا پیدا کیا ہوا تھا۔ مگر پیغمبر نے اس کا جو حل بتایا وہ یہ تھا کہ اللہ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی مسائل کے بارے میں دنیا دار لیڈروں کے سوچنے کے انداز اور پیغمبر کے سوچنے کے انداز میں کیا فرق ہے۔ دنیا دار لیڈر اس قسم کے مسئلہ کا حل حکومت کی سطح پر تلاش کرتا ہے، خواہ وہ حکومت سے مصالحت کی صورت میں ہو یا حکومت سے تصادم کی صورت میں۔ مگر پیغمبر نے جو حل بتایا وہ یہ تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہو اس کو برداشت کرتے ہوئے خدا سے مدد کے طالب بنو، حکومت کی طرف سے بے نیاز ہو کر خدا کی طرف رجوع کرو۔

پھر پیغمبر نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ عام قومی ذوق کے خلاف جو حل پیش کر رہا ہے وہ کیوں پیش کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسائل اگرچہ بظاہر اقتدار کی طرف سے پیش آ رہے ہیں اور بظاہر اقتدار ہی کے ذریعہ ان کا حل بھی نکلے۔ مگر خود اقتدار کیسے کسی کو ملتا ہے۔ وہ محض اپنی تدبیروں سے کسی کو نہیں مل جاتا بلکہ براہِ راست خدا کی طرف سے کسی کو دیے جانے کا فیصلہ ہوتا ہے اور کسی سے چھینے جانے کا۔ جب اقتدار کا تعلق خدا سے ہے تو مسئلہ کے حل کی جڑ بھی یقیناً خدا ہی کے پاس ہو سکتی ہے۔

پھر یہ کہ یہ اقتدار جس کو بھی دیا جائے وہ حقیقتاً اس کے حق میں آزمائش ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بے طاقتی بھی آزمائش ہے اور طاقت ور ہونا بھی آزمائش۔ آج جس کے پاس اقتدار ہے، اس کے پاس بھی اس لیے ہے کہ اس کو آزمایا جائے کہ وہ ظالم اور متکبر بنتا ہے یا انصاف اور تواضع کی روش اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جب اقتدار کا فیصلہ تمھارے حق میں کیا جائے گا اس وقت بھی اس کا مقصد تم کو جانچنا ہی ہوگا جس طرح ایک گروہ کی نااہلی کی بنا پر اس سے اقتدار چھین کر کسی دوسرے گروہ کو دیا جاتا ہے اسی طرح دوسرا گروہ اگر نااہل ثابت ہو تو اس سے بھی چھین کر دوبارہ کسی اور کو دے دیا جائے گا۔

خوش حالی اور اقتدار جس کو آدمی دنیا میں چاہتا ہے وہ حقیقت میں آخرت میں ملنے والی چیز ہے۔ کیوں کہ دنیا میں یہ چیز بطور آزمائش ملتی ہے اور آخرت میں وہ بطور انعام خدا کے صالح بندوں کو دی جائیں گی۔

وَلَقَدۡ اَخَذۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ بِالسِّنِیۡنَ وَنَقۡصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَذَّكَّرُوۡنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوۡا بِمُوۡسٰی وَمَنۡ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوۡا مَهۡمَا تَاۡتِنَا بِهٖ مِنۡ اٰیَةٍ لِّتَسۡحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳۲﴾

۱۳۰۔ اور ہم نے فرعون والوں کو قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو نصیحت ہو۔ ۱۳۱۔ لیکن جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے کہ یہ ہمارے لیے ہے اور اگر ان پر کوئی آفت آتی تو اس کو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے۔ سنو، ان کی بدبختی تو اللہ کے پاس ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ ۱۳۲۔ اور انھوں نے موسیٰ سے کہا، ہم کو مسحور کرنے کے لیے تم خواہ کوئی بھی نشانی لاؤ ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

کسی بات کو غلط کہنا ہو تو اس کا غلط ہونا لفظوں کی صورت میں بتایا جاتا ہے اور کسی بات کو صحیح کہنا ہو تو اس کو بھی لفظوں ہی کے ذریعہ صحیح کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کو مجرم قرار دینا ہو تو اس کو لفظوں کے ذریعہ مجرم قرار دیا جاتا ہے اور اگر کسی کو برسرِ حق ظاہر کرنا ہو تو اس کا برسرِ حق ہونا بھی لفظوں میں بتایا جاتا ہے۔ مگر الفاظ کا استعمال کرنے والا انسان ہے اور موجودہ امتحان کی دنیا میں انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ الفاظ کو جس طرح چاہے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔

امتحان کی اس دنیا میں آدمی کو جو آزادی دی گئی ہے اس میں سب سے زیادہ نازک آزادی یہ ہے کہ وہ حق کو باطل کہنے کے لیے بھی الفاظ پالیتا ہے اور باطل کو حق کہنے کے لیے بھی۔ وہ ایک کھلے ہوئے پیغمبرانہ معجزے کو جادو کہہ کر نظر انداز کرسکتا ہے۔ خدا اس کو کوئی نعمت دے تو وہ اس کو ایسے الفاظ میں بیان کرسکتا ہے گویا کہ اس کو جو کچھ ملا ہے اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کی بدولت ملا ہے۔ حق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے خدا اس کے اوپر کوئی تنبیہی سزا بھیجے تو وہ آزاد ہے کہ اس کو وہ انھیں خدا پرست بندوں کی نحوست کا نتیجہ قرار دے دے جن کے ساتھ برا رویہ اختیار کرنے ہی کی وجہ سے اس پر یہ تنبیہ آئی ہے۔ خدا کی طرف سے ہر بات اس لیے آتی ہے کہ آدمی اس سے نصیحت پکڑے۔ مگر الفاظ کے ذریعے آدمی ہر نصیحت کو ایک الٹا رخ دے دیتا ہے اور اس کے اندر جو سبق کا پہلو ہے اس کو پانے سے محروم رہ جاتا ہے۔

"تم خواہ کوئی بھی نشانی دکھاؤ ہم ایمان نہیں لائیں گے"۔ فرعون کا یہ جملہ بتاتا ہے کہ حق اپنی مکمل صورت میں موجود ہونے کے باوجود صرف اسی کو ملتا ہے جو اس کو پانا چاہے۔ بالفاظ دیگر، جو شخص حق کے معاملے میں سنجیدہ ہو، جس کے اندر فی الواقع یہ آمادگی ہو کہ حق خواہ جہاں اور جس صورت میں بھی ملے وہ اس کو لے لے گا، اُس پر حق کا حق ہونا کھلتا ہے۔ اِس کے برعکس، جو شخص اس معاملے میں سنجیدہ نہ ہو، جس کا حال یہ ہو کہ جو کچھ اس کے پاس ہے بس اسی پر وہ مطمئن ہے، وہ حق کو حق کی صورت میں دیکھنے سے عاجز رہے گا اور اسی لیے وہ اس کو اختیار بھی نہ کرسکے گا۔ اپنے حال پر مگن رہنا آدمی کو اپنے باہر کی چیزوں کے لیے بے خبر بنا دیتا ہے۔ وہ جان کر بھی نہیں جانتا، وہ سن کر بھی نہیں سنتا۔

آدمی اگر غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے تو وہ ضرور حقیقت کو پالے گا۔ مگر اکثر لوگ اپنے نفسیات کے زیر اثر رائے قائم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حقیقت کو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ
وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ
مُّفَصَّلٰتٍ ۣ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ

۱۳۳۔ پھر ہم نے ان کے اوپر طوفان بھیجا اور ٹڈی اور جوئیں اور مینڈک اور خون۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ دکھائیں۔ پھر بھی انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ ۱۳۴۔ اور جب ان پر کوئی عذاب پڑتا تو کہتے اے موسیٰ، اپنے

قَالُوۡا یٰمُوۡسَی ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ بِمَا عَہِدَ عِنۡدَکَ ۚ لَئِنۡ کَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَنُؤۡمِنَنَّ لَکَ وَ لَنُرۡسِلَنَّ مَعَکَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا کَشَفۡنَا عَنۡہُمُ الرِّجۡزَ اِلٰۤی اَجَلٍ ہُمۡ بٰلِغُوۡہُ اِذَا ہُمۡ یَنۡکُثُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

رب سے ہمارے لیے دعا کرو جس کا اس نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ اگر تم ہم پر سے اس عذاب کو ہٹا دو تو ہم ضرور تم پر ایمان لائیں گے اور تمھارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ ۱۳۵۔ پھر جب ہم ان سے دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لیے جہاں بہر حال انھیں پہنچنا تھا تو اسی وقت وہ عہد کو توڑ دیتے۔

حضرت موسیٰ نے مصر میں تقریباً 40 سال تک پیغمبری کی۔ آپ کے مشن کے دو اجزاء تھے۔ ایک، فرعون کو توحید کا پیغام دینا۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے جانا اور وہاں آزادانہ فضا میں ان کی دینی تربیت کرنا۔ بنی اسرائیل (حضرت یعقوب کی اولاد) اس وقت شدید طور پر قبطی بادشاہ (فرعون) کی گرفت میں تھے۔ قبطی قوم ان کو اپنے زراعتی اور تعمیری کاموں میں بطور مزدور استعمال کرتی تھی۔ اس لیے قبطی حکمراں نہیں چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل مصر سے باہر چلے جائیں۔

حضرت موسیٰ نے ابتداءً جب فرعون سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ مصر سے باہر جانے دو تو فرعون اور اس کے درباریوں نے اس کو سیاسی معنی پہنا کر آنجناب پر یہ الزام لگایا کہ وہ قبطی قوم کو مصر سے نکال دینا چاہتے ہیں (الاعراف، 7:110)۔ یہ بات سراسر بے معنی تھی۔ کیوں کہ حضرت موسیٰ کا منصوبہ تو خود اپنے آپ کو مصر سے باہر لے جانے کا تھا، اور فرعون نے یہ الٹا الزام لگایا کہ وہ قبطیوں کو ان کے ملک سے باہر نکال دینا چاہتے ہیں۔ اس وقت فرعون اور اس کے ساتھی اقتدار کے گھمنڈ میں تھے اس لیے سیدھی بات بھی ان کو ٹیڑھی نظر آئی۔

مگر بعد کے مرحلہ میں خدا نے فرعون اور اس کی قوم پر ہر طرح کی بلائیں نازل کیں۔ ان پر کئی سال تک مسلسل قحط پڑے۔ شدید گرج چمک کے ساتھ اولوں کا طوفان آیا۔ ٹڈیوں کے دل آئے جو فصل اور باغ کو کھا گئے اور ہر قسم کی سبزی کا خاتمہ کر دیا۔ جوئیں اور مینڈک اس کثرت سے ہو گئے کہ کپڑوں اور بستروں میں جوئیں ہی جوئیں تھیں اور گھروں اور راستوں میں ہر طرف مینڈک ہی مینڈک کودنے لگے۔ دریاؤں اور تالابوں کا پانی خون ہو گیا۔ فرعون اور اس کی قوم جب ان عجیب وغریب مصیبتوں میں مبتلا ہوئے تو وہ کہہ اٹھے کہ خدا اگر ان مصیبتوں کو ہم سے ٹال دے تو ہم بنی اسرائیل کو موسیٰ کے ساتھ جانے دیں گے — حضرت موسیٰ کے جس مطالبہ میں پہلے قبطیوں کے اخراج کی سیاسی سازش دکھائی دی تھی وہ اب خود بنی اسرائیل کی ہجرت کے ہم معنیٰ نظر آنے لگی۔

آدمی اپنے کو محفوظ حالت میں پا رہا ہو تو وہ طرح طرح کی باتیں بناتا ہے۔ مگر جب اس سے حفاظت چھین لی جائے اور اس کو عجز اور بے بسی کے مقام پر کھڑا کر دیا جائے تو اچانک وہ حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ اب وہ بات

خود ہی اس کی سمجھ میں آجاتی ہے جو پہلے سمجھانے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر انکار کی طاقت رکھتے ہوئے اقرار کرنے کا نام اقرار ہے۔ الفاظ چھن جانے کے بعد کوئی اقرار اقرار نہیں۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

۱۳۶۔ پھر ہم نے ان کو سزا دی اور ان کو سمندر میں غرق کردیا کیوں کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروا ہوگئے۔ ۱۳۷۔ اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان کو ہم نے اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنادیا جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا نیک وعدہ پورا ہوگیا بہ سبب اس کے کہ انھوں نے صبر کیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کردیا جو وہ بناتے تھے اور جو وہ چڑھاتے تھے۔

انبیاء کی مخاطب قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ تکذیب آیات کی بنا پر آتا ہے۔ یعنی نشانیوں کو جھٹلانا۔ اس کے مقابلہ میں انبیاء کے ساتھیوں پر جو خصوصی نصرت اترتی ہے اس کا استحقاق ان کو صبر کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، یعنی اپنے جذبات کو تھام کر اللہ کے طریقہ پر ثابت قدم رہنا۔

نشانیوں سے مراد وہ دلائل ہیں جو حق کو حق ثابت کرنے والے ہوتے ہیں مگر آدمی اپنی متکبرانہ نفسیات کی وجہ سے ان کو ماننے پر قادر نہیں ہوتا۔ وہ دلیل کے معاملہ کو دلیل پیش کرنے والے کا معاملہ بنالیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے دلیل مان لی تو فلاں شخص کے مقابلہ میں میرا مرتبہ گھٹ جائے گا۔ وہ دلیل پیش کرنے والے کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اونچا رکھنے کی خاطر دلیل کی برتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر یہی انسان کی آزمائش کا اصل مقام ہے۔ موجودہ دنیا میں خدا نشانیوں یا دلائل کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے، آخرت میں وہ بے حجاب ہو کر ظاہر ہوجائے گا۔ مگر ایمان وہی معتبر ہے جب کہ آدمی غیب میں چھپے ہوئے حق کو پالے۔ اس کے برعکس، قیامت کے دن حق کو سامنے دیکھ کر اس کو ماننا صرف آدمی کے جرم کو ثابت کرے گا، نہ کہ وہ اس کو انعام کا مستحق بنائے گا۔ ایسا اقرار صرف اس بات کا ثبوت ہوگا کہ آدمی نے اپنی بے پروائی کی وجہ سے حق کو نہ جانا۔ اگر وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہوتا تو یقیناً وہ اس کو جان لیتا۔

اس کے مقابلہ میں خدا کے وفادار بندے وہ ہیں جن کی سب سے نمایاں خصوصیت صبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی زندگی سراسر صبر کی زندگی ہے۔ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان سے حق کا اعلان سن کر اس کو مان لینا، عادتوں اور مصلحتوں پر قائم شدہ زندگی کو حق اور اصولوں کی بنیاد پر قائم کرنا، لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی ایذاؤں

کو خدا کی خاطر نظر انداز کرنا، حق کے مخالفین کی ڈالی ہوئی مصیبتوں سے پست ہمت نہ ہونا، یہ سب ایمان کے لازمی مراحل ہیں اور آدمی صبر کے بغیر ان مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔

فرعون کو اپنے اقتدار پر اور اپنے باغوں اور عمارتوں پر گھمنڈ تھا۔ حضرت موسیٰ کی ہجرت کے بعد فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ اولوں اور ٹڈیوں نے مصر کے سرسبز و شاداب باغات کو اجاڑ دیا اور زلزلوں نے ان کی شان دار عمارتیں ڈھا دیں۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ کی چند نسلوں کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے زمانہ میں بنی اسرائیل اطراف مصر (شام و فلسطین) پر قابض ہو گئے۔ نشانیوں کو جھٹلانے والے ہمیشہ خدا کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں اور صبر کرنے والے ہمیشہ خدا کی نصرت کے۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَ اِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶

۱۳۸۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ پھر ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کو پوجنے میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا اے موسیٰ، ہماری عبادت کے لیے بھی ایک بت بنا دے جیسے ان کے بت ہیں۔ موسیٰ نے کہا، تم بڑے جاہل لوگ ہو۔ ۱۳۹۔ یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ برباد ہونے والا ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ باطل ہے۔ ۱۴۰۔ اس نے کہا، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمھارے لیے تلاش کروں، حالاں کہ اس نے تم کو تمام اہل عالم پر فضیلت دی ہے۔ ۱۴۱۔ اور جب ہم نے فرعون والوں سے تم کو نجات دی جو تم کو سخت عذاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش تھی۔

بنی اسرائیل بحر احمر کے شمالی سرے کو پار کر کے جزیرہ نمائے سینا میں پہنچے۔ پھر شمال سے جنوب کی طرف سمندر کے کنارے کنارے اپنا سفر شروع کیا۔ اس درمیان میں کسی مقام سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل نے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ بت کی پرستش میں مشغول ہے۔ اس وقت بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں نے (نہ کہ سارے بنی اسرائیل نے) یہ تقاضا کیا کہ ان کے لیے ایک بت بنا دیا جائے۔

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ظاہر پرستی ہے۔ وہ غیب میں چھپے ہوئے خدا پر اپنا ذہن پوری طرح جما

نہیں پاتا۔ اس لیے وہ کسی نہ کسی ظاہری چیز میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ کچھ بے شعور لوگ پتھر اور دھات کے بنے ہوئے بتوں کے آگے جھکتے ہیں۔ اور جو لوگ زیادہ مہذب ہیں وہ کسی شخصیت، کسی قوم یا کسی تمدنی ڈھانچہ کو اپنا مرکز توجہ بنا لیتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے کچھ افراد نے جب حضرت موسیٰ سے ظاہری بت گھڑنے کی فرمائش کی تو آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ سب برباد کیا جانے والا ہے۔ یعنی ہمارا مشن تو یہ ہے کہ ہم ان ظاہری خداؤں کو توڑ کر ختم کر دیں اور آدمی کو پوری طرح صرف ایک خدا کا پرستار بنائیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ہم خود ہی اس قسم کا ایک ظاہری خدا اپنے لیے گھڑ لیں۔

''بنی اسرائیل کو تمام اہل عالم پر فضیلت دی'' سے مراد کسی قسم کی نسلی فضیلت نہیں ہے بلکہ منصبی فضیلت ہے۔ یہ اسی معنی میں ہے جس میں امت محمدی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''تم خیر امت ہو''۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی گروہ کو اپنی کتاب کا حامل بناتا ہے اور اس کے ذریعہ دوسری اقوام تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ منصب بنی اسرائیل (یہود) کو حاصل تھا، ختم نبوت کے بعد یہ منصب امت محمدی کو دیا گیا ہے۔

فرعون کو یہ موقع ملنا کہ وہ بنی اسرائیل پر ظلم کرے۔ یہ بنی اسرائیل کے لیے بطور آزمائش تھا، نہ کہ بطور عذاب۔ اس طرح کی آزمائش اس لیے ہوتی ہے کہ اہلِ ایمان کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا جائے۔ یہ معلوم کیا جائے کہ کون مشکل حالات میں خدا کے دین سے پھر جاتا ہے اور کون ہے جو صبر کی حد تک خدا کے دین پر قائم رہنے والا ہے۔

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى

۱۴۲۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا، میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا، اصلاح کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔ ۱۴۳۔ اور جب موسیٰ ہمارے وقت پر آ گیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا، مجھے اپنے کو دکھا دے کہ میں تجھ کو دیکھوں۔ فرمایا، تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو تم بھی مجھ کو دیکھ سکو گے۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ

صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب ہوش آیا تو بولا، تو پاک ہے، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔

حضرت ہارون موسیٰ کے بڑے بھائی تھے، حضرت موسیٰ کی عمر ان سے تین سال کم تھی۔ مگر نبوت اصلاً حضرت موسیٰ کو ملی اور حضرت ہارون ان کے ساتھ صرف مددگار کی حیثیت سے شریک کیے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی عہدوں کی تقسیم میں اصل اہمیت استعداد کی ہے، نہ کہ عمر یا اسی قسم کی دوسری اضافی چیزوں کی۔

حضرت موسیٰ کو مصر میں دعوتی احکام دیے گئے تھے اور صحرائے سینا میں پہنچنے کے بعد پہاڑی پر بلا کر قانونی احکام دیے گئے۔ اس سے خدائی احکام کی ترتیب معلوم ہوتی ہے۔ عام حالات میں خدا پرستوں سے جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ کہ وہ ذاتی زندگی کو درست کریں، اور خدا کے پرستار بن کر رہیں۔ اسی کے ساتھ دوسروں کو بھی توحید و آخرت کی طرف بلائیں۔ مگر جب اہل ایمان آزاد اور بااختیار گروہ کی حیثیت حاصل کرلیں، جیسا کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل تھے، تو ان پر یہ فرض بھی عائد ہو جاتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو شرعی قوانین کی بنیاد پر قائم کریں۔

حضرت موسیٰ نے اپنی غیر موجودگی کے لیے جب حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کا نگراں بنایا تو فرمایا: أَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ (7:142)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی سربراہ کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا بنیادی اصول کیا ہے۔ وہ ہے — اصلاح اور مفسدین کی پیروی نہ کرنا۔ اصلاح سے مراد یہ ہے کہ مختلف افراد کے درمیان انصاف کا توازن کسی حال میں ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ ہر ایک کو وہی ملے جو اس کو ازروئے عدل ملنا چاہیے اور ہر ایک سے وہی چھینا جائے جو ازروئے عدل اس سے چھینا جانا چاہیے۔ اس اصلاحی عمل میں اکثر وقت خرابی پیدا ہوتی ہے جب کہ سردار ''مفسدین'' کی پیروی کرنے لگے۔ یہ پیروی کبھی اس شکل میں ہوتی ہے کہ اس کے مقربین اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر جو کچھ کہیں وہ ان کو مان لے۔ اور کبھی اس طرح ہوتی ہے کہ مفسدین کی طاقت سے خوف زدہ ہو کر وہ خاموشی اختیار کر لے۔

حضرت موسیٰ نے خدا کو دیکھنا چاہا اور جب معلوم ہوا کہ خدا کو دیکھنا ممکن نہیں تو انھوں نے توبہ کی اور بغیر دیکھے ایمان کا اقرار کیا — انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر خدا کو مانے۔ خدا کو دیکھنا ایک اخروی انعام ہے پھر وہ موجودہ دنیا میں کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ

۱۴۴۔ اللہ نے فرمایا، اے موسیٰ، میں نے تم کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور اپنے کلام کے ذریعہ سے سرفراز کیا۔ پس اب لو جو کچھ میں نے تم کو عطا کیا ہے۔ اور شکر گزاروں میں سے بنو۔ ۱۴۵۔ اور ہم

كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۗ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾

نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔ پس اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔ عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔

حضرت موسیٰ کو پہلی بار نبوت پہاڑ کے اوپر ملی تھی اور دوسری بار بھی تورات کے احکام ان کو پہاڑ پر بلا کر دیے گئے۔ یہ اس بات کا ایک اشارہ ہے کہ خدا کا فیضان حاصل کرنے کی سب سے زیادہ موزوں جگہ فطرت کا ماحول ہے، نہ کہ انسانی آبادیوں کا ماحول۔ انسانوں کی پرشور دنیا سے نکل کر آدمی جب پتھروں اور درختوں کی خاموش دنیا میں پہنچتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ مصنوعی احساسات سے خالی ہو کر اپنی فطری حالت پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ کسی آدمی کے لیے بہترین لمحہ ہوتا ہے جب کہ وہ بے آمیز فطری انداز میں سوچے اور یکسو ہو کر اپنے رب سے جُڑ سکے۔

پیغمبر عام انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی اعتبار سے کوئی غیر انسانی مخلوق نہیں ہوتا۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیدائشی استعداد کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اس لیے خدا اس کو چنتا ہے کہ وہ اس کے پیغام کا حامل بنے اور لوگوں کے درمیان اس کی قابلِ اعتماد نمائندگی کرے۔ حضرت موسیٰ اس وقت اپنی قوم کے بہترین شخص تھے اس لیے خدا نے ان کو اپنا پیغمبر چنا اور ان پر اپنا کلام اتارا۔

خدا کے کلام میں اگرچہ ہدایت سے متعلق ہر قسم کی ضروری تفصیل موجود ہوتی ہے مگر وہ الفاظ میں ہوتی ہے اور موجودہ امتحانی دنیا میں بہر حال اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ آدمی ان الفاظ کی غلط تشریح کر کے اس کو غیر مطلوب معنی پہنا دے۔ مگر جو شخص ہدایت کے معاملے میں سنجیدہ ہو اور خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو وہ ان الفاظ سے وہی معنی لے گا جو کلام الٰہی کے شایانِ شان ہے، نہ کہ وہ جو اس کے نفس کو مرغوب ہے۔

''میں عنقریب تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا''، یعنی اپنے اس سفر میں آگے چل کر تم ان قوموں کے کھنڈرات سے گزرو گے جنھیں اس سے پہلے خدا کی ہدایت دی گئی تھی۔ مگر وہ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ حالات کے دباؤ یا جذبات کے میلان کو نظر انداز کر کے وہ اس پر ٹھیک طرح قائم نہ رہ سکے۔ چنانچہ ان کا انجام یہ ہوا کہ وہ ہلاک کر دیے گئے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمھارا انجام بھی دنیا و آخرت میں وہی ہوگا جو ان پچھلی قوموں کا ہوا۔ خدا کا معاملہ جیسا ایک قوم کے ساتھ ہے ویسا ہی معاملہ دوسری قوم کے ساتھ ہے۔ عدل الٰہی کی میزان میں ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اس دنیا میں یہ موقع ہے کہ آدمی اپنی خود ساختہ تشریح سے خدا کے احسن کلام کا کوئی غیر احسن مفہوم نکال لے۔ مگر یہ ایسی جسارت ہے جو فرماں برداری کے دعوے دار کو بھی نافرمانوں کی فہرست میں شامل کر دیتی ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع

۱۴۶۔ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق گھمنڈ کرتے ہیں۔ اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں۔ اور اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو نہ اپنائیں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا لیں گے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کی طرف سے اپنے کو غافل رکھا۔ ۱۴۷۔ اور جنھوں نے ہماری نشانیوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، ان کے اعمال اکارت ہو گئے اور وہ بدلے میں وہی پائیں گے جو وہ کرتے تھے۔

دنیا میں زندگی گزارنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی نے اپنی آنکھ اور کان کھلے رکھے ہوں۔ وہ چیزوں کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھتا اور سنتا ہو۔ ایسے آدمی کے سامنے حق آئے گا تو وہ اس کو پہچان لے گا۔ دنیا میں بکھری ہوئی خدائی نشانیاں اس کو جو سبق دیں گی وہ ان کو پالے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی متکبرانہ نفسیات کے ساتھ جی رہا ہو۔ وہ زمین میں اس طرح رہتا ہو جیسے وہ اس کا مالک ہے، اس کو اپنے ذاتی داعیات کے سوا کسی اور چیز کی پروا نہ ہو۔ وہ سمجھتا ہو کہ یہاں جو کچھ اسے مل رہا ہے وہ اپنی لیاقت کی وجہ سے مل رہا ہے۔ اپنی ملی ہوئی چیزوں میں اس کو کسی اور کی مرضی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس دوسرے آدمی کا استغناء اس کے لیے قبول حق میں رکاوٹ بن جائے گا۔

پہلے آدمی کی نفسیات لینے والی نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اپنے کھلے ذہن کی وجہ سے خدا کے ہر اشارہ کو پڑھ لیتا ہے۔ اور فوراً اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسرے آدمی کی نفسیات بے نیازی کی نفسیات ہوتی ہے۔ اس کے سامنے حق کے دلائل آتے ہیں مگر وہ ان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے سامنے قدرت خاموش زبان میں اپنا نغمہ چھیڑتی ہے مگر وہ اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس کو اپنے سے باہر کسی سچائی کی طرف رغبت نہیں ہوتی — موت کے بعد آنے والی دنیا صرف پہلے لوگوں کے لیے ہے۔ دوسرے لوگ خدا کی ابدی دنیا میں اسی طرح نظر انداز کر دیے جائیں گے جس طرح موجودہ امتحان کی دنیا میں وہ خدا کی بات کو نظر انداز کیے ہوئے تھے۔

گمراہی کا راستہ نفس کے محرکات کے تحت بنتا ہے اور ہدایت کا راستہ وہ ہے جو نفس اور ماحول کے اثرات

سے اوپر اٹھ کر خالص خدا کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اب جو لوگ اپنی ذات کی سطح پر جی رہے ہوں، جو صرف اپنے نفس کے اندر ابھرنے والے داعیات کو جانتے ہوں وہ گمراہی کے راستے کو عین اپنی چیز سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ ہدایت کا راستہ ان کو اپنے مزاج کے اعتبار سے اجنبی دکھائی دے گا اس لیے وہ اس کی طرف بڑھنے میں بھی ناکام ثابت ہوں گے۔

بڑائی کی نفسیات اس چیز کو بآسانی قبول کر لیتی ہے جس میں اس کی بڑائی باقی رہے۔ اور جہاں اس کی بڑائی مشتبہ ہوتی ہو اس سے اسے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ڮ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ ع

ع ۱۸ ۸

۱۴۸۔ اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنایا۔ ایک دھڑ جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے اور نہ کوئی راہ دکھاتا ہے۔ اس کو انھوں نے معبود بنالیا اور وہ بڑے ظالم تھے۔ ۱۴۹۔ اور جب وہ پچھتائے اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ گمراہی میں پڑ گئے تھے تو انھوں نے کہا، اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہم کو نہ بخشا تو یقیناً ہم برباد ہو جائیں گے۔ ۱۵۰۔ اور جب موسیٰ رنج اور غصہ میں بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف لوٹا تو اس نے کہا، تم نے میرے بعد میری بہت بری جانشینی کی۔ کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے پہلے ہی جلدی کر لی۔ اور اس نے تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ہارون نے کہا، اے میری ماں کے بیٹے، لوگوں نے مجھے دبالیا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں۔ پس تو دشمنوں کو میرے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھ کو ظالموں کے ساتھ شامل نہ کر۔ ۱۵۱۔ موسیٰ نے کہا، اے میرے رب معاف کر دے مجھ کو اور میرے بھائی کو اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

بنی اسرائیل کے گروہ میں اس وقت سامری نام کا ایک بہت شاطر آدمی تھا۔ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو حضرت ہارون کی نگرانی میں چھوڑ کر پہاڑ پر چلے گئے تو اس نے لوگوں کو بہکایا۔ اس نے لوگوں سے زیورات لے کر ان کو بچھڑے کی صورت میں ڈھال دیا۔ بت گری کے قدیم مصری فن کے مطابق بچھڑے کی یہ مورت اس طرح بنائی گئی تھی کہ جب اس کے اندر سے ہوا گزرے تو اس کے منھ سے خُوار (بیل کی ڈکار کی سی آواز) آئے۔ لوگ عام طور پر عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ چنانچہ اتنی سی بات پر بہت سے لوگ شبہ میں پڑ گئے اور اس کے بارے میں خدائی تصور قائم کرلیا۔ ایک شاطر آدمی نے کچھ عوامی باتیں کرکے بھیڑ کی بھیڑ اپنے گرد جمع کرلی۔ اس کا زور اتنا بڑھا کہ حضرت ہارون اور اغلباً ان کے چند ساتھیوں کے سوا کوئی کھلم کھلا احتجاج کرنے والا بھی نہ نکلا۔ ظاہر ہے کہ جس عوامی طوفان میں پیغمبر کے نائب کی آواز دب جائے وہاں کیسے کوئی بولنے کی جرأت کرسکتا ہے۔

عوام کا ذوق ہر زمانہ میں یہی رہا ہے اور آج بھی وہ پوری طرح موجود ہے۔ آج بھی ایک ہوشیار آدمی اپنی تقریروں اور تحریروں سے کسی نہ کسی "خوار" پر لوگوں کی بھیڑ جمع کرلیتا ہے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ جس چیز کے گرد وہ جمع ہو رہے ہیں وہ محض ایک تماشا ہے، نہ کہ فی الواقع کوئی حقیقت۔ کوئی سنجیدہ آدمی اگر اس تماشے کی حقیقت کو کھولتا ہے تو اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو بنی اسرائیل کے درمیان حضرت ہارون کا ہوا۔

حضرت موسیٰ نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل مشرکانہ فعل میں مشغول ہیں تو ان کو گمان ہوا کہ حضرت ہارون نے اصلاح کے سلسلہ میں کوتاہی کی ہے۔ چنانچہ غصہ میں انھیں پکڑ لیا۔ مگر جیسے ہی انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنی اصلاحی کوشش میں کوئی کمی نہ کی تھی تو ان کے بیان کے بعد فوراً رک گئے اور اپنے لیے اور حضرت ہارون کے لیے خدا سے دعا کرنے لگے — ایک مومن کو دوسرے مومن کے بارے میں بڑی سے بڑی غلط فہمی ہوسکتی ہے مگر معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کو غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَيَنَالُهُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَذِلَّةٌ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِي الۡمُفۡتَرِيۡنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيۡنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهَا وَاٰمَنُوۡۤا ۟ اِنَّ رَبَّكَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۵۳﴾

۱۵۲۔ بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا، ان کو ان کے رب کا غضب پہنچے گا اور ذلت دنیا کی زندگی میں۔ اور ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں جھوٹ باندھنے والوں کو۔ ۱۵۳۔ اور جن لوگوں نے برے کام کیے پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لائے تو بے شک اس کے بعد تیرا رب بخشنے والا، مہربان ہے۔

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے کو یہاں افتراء (جھوٹ باندھنا) کہا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ باطل کام حق کے نام پر کیا تھا۔ انھوں نے اپنا یہ کام خدا کے دین کا انکار کرکے نہیں کیا تھا بلکہ خدا کے دین کو مانتے ہوئے کیا تھا۔ اپنی اس بے دینی کو وہ دینی الفاظ میں بیان کرتے

تھے۔ مشرکین کے عام عقیدہ کی طرح، وہ کہتے تھے کہ خدا ان کی گھڑی ہوئی مورت میں حلول کر آیا ہے۔ اِس لیے اس کی عبادت خود خدا کی عبادت کے ہم معنی ہے۔ حتی کہ اس فعل کے لیڈر سامری نے اس کے حق میں کشف و کرامت کی دلیل بھی تلاش کرلی۔ اس نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ جبریل آئے ہیں اور میں نے ان کے گھوڑے کے نقش قدم سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی ہے اور ایک بچھڑا بنا کر اس کے اندر وہ مٹی ڈال دی تو مقدس مٹی کی برکت سے وہ بچھڑا بولنے لگا۔ گویا سامری اور اس کے ساتھی خدا کی طرف ایسی بات منسوب کر رہے تھے جو خدا نے خود نہیں بتائی تھی۔ اس قسم کی نسبت افتراء (خدا پر جھوٹ باندھنا) ہے خواہ وہ ایک صورت میں ہو یا دوسری صورت میں۔

کوئی حامل دین گروہ جب اس قسم کا افتراء کرتا ہے، وہ بے دینی کے فعل کو دین کا نام دے دیتا ہے تو یہ چیز خدا کے غضب کو شدید طور پر بھڑکا دیتی ہے۔ اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ انسان توبۂ نصوح کرے، یعنی خالص توبہ۔ سورہ البقرہ آیت 54 کے مطابق انھوں نے قتلِ نفس (self-killing) کیا یعنی خالص توبہ کی۔ سورہ البقرہ کی مذکورہ آیت یہ بھی بتاتی ہے کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی۔ ایسا ہونے کے بعد ان کو جسمانی طور پر قتل کرنا، شریعت کا تقاضا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذکورہ واقعہ میں قتلِ نفس کا لفظ شدت توبہ کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی ایسی توبہ جو نفسیاتی طور پر سیلف کیلنگ کے ہم معنی بن جائے۔

توبہ کی اصل حقیقت شرمندگی ہے۔ بندہ پر جب گناہ کے بعد اس قسم کی شدید ندامت طاری ہو، اور وہ اس طرح اللہ کے سامنے گریہ وزاری کرے، جیسے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گا۔ تو ایسی توبہ ہمیشہ گناہ سے معافی کا سبب بن جاتی ہے۔ گناہ پر توبہ یہ ہے کہ گناہ ہوجانے کے بعد آدمی اپنے اس فعل پر شدید شرمندہ ہو۔ یہ شرمندگی اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود سے فیصلہ کرے کہ آئندہ وہ ایسا فعل نہ کرے گا۔ کوئی گنہ گار جب اس طرح شرمندگی کا اور آئندہ کے لیے پرہیز کے عزم کا ثبوت دے دیتا ہے تو گویا کہ وہ دوبارہ ایمان لاتا ہے، دین کے دائرہ سے نکل جانے کے بعد وہ دوبارہ خدا کے دین میں داخل ہوتا ہے۔

وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ

۱۵۴۔ اور جب موسیٰ کا غصہ تھما تو اس نے تختیاں اٹھائیں اور جو ان میں لکھا ہوا تھا، اس میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ ۱۵۵۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت کے لیے پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا تو موسیٰ نے کہا اے رب، اگر تو چاہتا تو پہلے ہی تو ان کو ہلاک

قَبْلُ وَ اِيَّایَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ
مِنَّا ۚ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ
وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ
ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَ اكْتُبْ لَنَا
فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ
اِلَیْكَ ؕ قَالَ عَذَابِیْۤ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ
وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا
لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ
هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ ۚ

کر دیتا اور مجھ کو بھی۔ کیا تو ہم کو ایسے کام پر ہلاک کرے گا جو ہمارے اندر کے بیوقوفوں نے کیا۔ یہ سب تیری آزمائش ہے، تو اس سے جس کو چاہے گمراہ کر دے اور جس کو چاہے ہدایت دے۔ تو ہی ہمارا تھامنے والا ہے۔ پس ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔
۱۵۶۔ اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ اللہ نے کہا، میں اپنا عذاب اسی پر ڈالتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو۔ پس میں اس کو لکھ دوں گا ان کے لیے جو ڈر رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ ان کے اندر خدا پر وہ یقین نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کو پہاڑ پر بلایا گیا۔ حضرت موسیٰ مقررہ وقت کے مطابق بنی اسرائیل کے 70 نمائندہ افراد کو لے کر دوبارہ کوہ طور پر گئے۔ وہاں خدا نے گرج چمک اور زلزلہ کے ذریعے ایسے حالات پیدا کیے جس سے بنی اسرائیل کے لوگوں کے اندر انابت وخشیت پیدا ہو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ خدا کے سامنے روئے گڑگڑائے اور اجتماعی توبہ کی۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ تورات کے احکام پر سچائی کے ساتھ عمل کریں گے۔

اس موقع پر حضرت موسیٰ نے دعا کی ''اے ہمارے رب، ہمارے لیے دنیا اور آخرت میں بھلائی لکھ دے'' اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا ''میں جس پر چاہتا ہوں اپنا عذاب ڈالتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے'' حضرت موسیٰ کی دعا بحیثیت مجموعی اپنی پوری امت کے لیے تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے جواب میں واضح کر دیا کہ نجات اور کامیابی کوئی گروہی چیز نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ ہر ہر فرد کے لیے اس کے ذاتی عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگرچہ میں تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم ہوں۔ مگر جو شخص عمل صالح کا ثبوت نہ دے وہ میری پکڑ سے بچ نہیں سکتا، خواہ وہ کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

خدا کی کتاب ہدایت ورحمت ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی زندگی میں آدمی کے لیے بہترین رہنما ہے اور آخرت میں خدا کی رحمت کا یقینی ذریعہ۔ مگر خدا کی کتاب کا یہ فائدہ صرف اس کو ملتا ہے جو ''ڈر'' رکھتا ہو، جس کو اندیشہ لگا ہوا ہو کہ معلوم نہیں خدا میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سچے طالب حق ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے

جب حق آتا ہے تو وہ کسی قسم کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر اس کو پالیتے ہیں۔ اس کے بعد خدا ان کے خوف اور امید کا مرکز بن جاتا ہے۔ ان کا سب کچھ خدا کے لیے وقف ہوجاتا ہے۔ ان کا ڈر ان کے شعور کو بیدار کردیتا ہے۔ ان کی نگاہ سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والی نشانیوں کو پہچاننے میں وہ کبھی نہیں چوکتے۔ وہ اندیشہ کی نفسیات میں جیتے ہیں، نہ کہ قناعت کی نفسیات میں۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷ ع

۱۵۷۔ جو لوگ پیروی کریں گے اس رسول کی جو نبیٔ امی ہے، جس کو وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور ان کو برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور قیدیں اتارتا ہے جو ان پر تھیں۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی عزت کی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

بنی اسرائیل دیکھتے چلے آرہے تھے کہ جتنے نبی آتے ہیں وہ سب ان کی اپنی قوم میں آتے ہیں۔ آخری رسول خدا کے منصوبہ کے مطابق بنی اسماعیل میں آنے والا تھا اس لیے خدا نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ذریعے انھیں پہلے سے اس کی خبر کردی۔ ان کی کتابوں میں کثرت سے اس کی پیشین گوئیاں ابھی تک موجود ہیں۔ ایسا اس لیے ہوا تا کہ جب آخری رسول آئے تو وہ کسی بڑے فتنہ میں نہ پڑیں اور بہ آسانی اس کو پہچان کر اس کے ساتھی بن جائیں۔

پیغمبر اسلام پڑھے لکھے نہ تھے۔ آپ امی رسول تھے۔ اُمّیت کے ساتھ پیغمبری، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آخری اور انتہائی صورت میں جمع ہوئی یہی ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ معرفت خداوندی کا اظہار ہمیشہ ''امیت'' کی سطح پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ کسی ایسے شخص کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے جو دنیوی معیار کے لحاظ سے اس قسم کے عظیم کام کا اہل نہ سمجھا جاتا ہو۔ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا نے بقراط اور افلاطون کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہو۔

دین کی اصل روح اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب اندرونی روح سرد پڑتی ہے تو ظواہر کا زور بہت بڑھ جاتا ہے۔ اب غیر ضروری موشگافیاں کرکے نئے نئے مسائل بنائے جاتے ہیں۔

روحانیت کے نام پر مشقوں اور ریاضتوں کا ایک پورا ڈھانچہ کھڑا کر لیا جاتا ہے۔ عوامی توہمات مقدس ہو کر نئی شریعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہود کا یہی حال ہو چکا تھا۔ انھوں نے خدا کے دین کے نام پر توہمات اور جکڑ بندیوں کا ایک خود ساختہ ڈھانچہ بنا لیا تھا اور اس کو خدا کا دین سمجھتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے ان کے سامنے دین کو اس کی فطری صورت میں پیش کیا۔ غیر ضروری پابندیوں کو ختم کر کے سادہ اور سچے دین کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی۔

پیغمبر جب آتا ہے تو سب سے بڑی نیکی یہ ہوتی ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ مگر یہ ایمان عام معنوں میں محض ایک کلمہ پڑھنا نہیں ہے۔ یہ بے روح ڈھانچہ والے دین سے نکل کر زندہ شعور والے دین میں داخل ہونا ہے۔ سابقہ مذہبی ڈھانچہ سے آدمی کی وابستگی محض تاریخی روایات یا نسلی رواج کے زور پر ہوتی ہے۔ مگر نئے پیغمبر کے دین کو جب وہ قبول کرتا ہے تو وہ اس کو شعوری فیصلہ کے تحت قبول کرتا ہے، وہ رسم سے نکل کر حقیقت کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ سادہ بات ہر دور میں انسان کے لیے مشکل ترین بات ثابت ہوئی ہے۔

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَۨا الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ کَلِمٰتِہٖ وَ اتَّبِعُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

۱۵۸۔ کہو، اے لوگو، بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے امی رسول و نبی پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ ۱۵۹۔ اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کے مطابق رہنمائی کرتا ہے اور اسی کے مطابق انصاف کرتا ہے۔

’’کہو میں سب انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں‘‘ کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے تمام پیغمبر قومی پیغمبر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین اقوامی پیغمبر ہیں۔ یہ بات بطور تقابل نہیں کہی گئی ہے بلکہ بطور واقعہ کہی گئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی دو بعثتیں ہیں۔ ایک براہِ راست، دوسری بواسطۂ امت۔ آپ کی براہِ راست بعثت عرب کے لیے تھی (الانعام، 6:92) اور آپ کی بالواسطہ بعثت سارے عالم کے لیے ہے (الحج، 22:78)۔ حکماً یہی نوعیت خدا کے تمام پیغمبروں کی تھی۔ مگر دوسرے پیغمبروں کا دین محفوظ حالت میں باقی نہ رہ سکا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہوا کہ وہ تمام عالم کے لیے نذیر و بشیر بنتے۔ آج مسیحیت کی تبلیغ سارے عالم میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود حضرت مسیح کی نبوت صرف فلسطین تک محدود ہو کر رہ گئی۔ کیوں کہ حضرت مسیح کے بعد

ان کی تعلیمات اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہیں۔ آج مسیحیت کے نام سے جو دین لوگوں تک پہنچ رہا ہے وہ حقیقۃً سینٹ پال کا دین ہے، نہ کہ مسیح کا دین۔ گویا نبیوں کے وسعت کار میں جو فرق ہے وہ فرق باعتبار واقعہ ہے، نہ کہ باعتبار تفویض۔

پیغمبر عربی کے متعلق بائبل میں یہ پیشین گوئی ہے کہ زمین کے سب قبیلے اس کے وسیلے سے برکت پائیں گے (پیدائش، 3-12:1)۔ سب قوموں تک آپ کی برکت پہنچنا اس لیے ممکن ہوسکا کہ آپ کا لایا ہوا دین محفوظ ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کا دین محفوظ نہیں۔ اس لیے بظاہر اس کی آواز سب تک پہنچ کر بھی اس کی برکت سب تک نہ پہنچ سکی۔

عرب میں یہودی قبائل آباد تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو یہ فخر تھا کہ ان کے پاس خدا کی مقدس کتاب ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے سے باہر کسی سچائی کو ماننے کے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ ان کا یہ احساس کہ وہ سب سے بڑی سچائی کو لیے ہوئے ہیں ان کے لیے کسی دوسرے کی طرف سے آنے والی سچائی کو قبول کرنے میں مانع ہوجاتا ہے۔ یہی حال یہود کا ہوا۔ ان کی بہت بڑی اکثریت ضد اور تعصب کی نفسیات میں مبتلا ہوگئی۔ صرف چند لوگ (عبداللہ بن سلّام وغیرہ) ایسے نکلے جنھوں نے کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھا۔ انھوں نے اپنی دنیوی عزت کی پروا کیے بغیر اس کی صداقت کا اعلان کیا اور اپنی دنیوی زندگی کو اس کے حوالے کردیا۔

''رسول ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے کلمات (ارشادات) پر''۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ فلسفیوں کے خدا اور پیغمبر کے خدا میں کیا فرق ہے۔ فلسفی کا خدا ایک مجرد روح ہے۔ اس کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے کائنات میں قوت کشش کو ماننا۔ قوت کشش نہ بولتی اور نہ حکم دیتی ہے۔ مگر پیغمبر کا خدا ایک زندہ اور باشعور خدا ہے۔ وہ انسانوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے اور اس حکم کے ماننے یا نہ ماننے پر ہر ایک کے لیے انعام یا سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

وَ قَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ ۚ فَانۡۢبَجَسَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَیۡهِمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهِمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰی ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ وَ مَا ظَلَمُوۡنَا وَ لٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ

۱۶۰۔ اور ہم نے ان کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انھیں الگ الگ گروہ بنادیا۔ اور جب موسیٰ کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا پانی پینے کا مقام معلوم کرلیا۔ اور ہم نے ان پر بدلیوں کا سایہ کیا اور ان پر من وسلویٰ اتارا۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ ۱۶۱۔ اور جب

يَظۡلِمُوۡنَ ﴿١٦٠﴾ وَ اِذۡ قِيۡلَ لَهُمُ اسۡكُنُوۡا هٰذِهِ
الۡقَرۡيَةَ وَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ وَقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ وَّ
ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطِيۡٓـٰٔتِكُمۡ ؕ
سَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا
مِنۡهُمۡ قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ فَاَرۡسَلۡنَا
عَلَيۡهِمۡ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ ﴿١٦٢﴾ ع

ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں جا کر بس جاؤ۔ اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ اور کہو ہم کو بخش دے اور دروازہ میں جھکے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ ہم نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیتے ہیں۔ ۱۶۲۔ پھر ان میں سے ظالموں نے بدل ڈالا دوسرا لفظ اس کے سوا جو ان سے کہا گیا تھا۔ پھر ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اس لیے کہ وہ ظلم کرتے تھے۔

مصر کی مشرکانہ فضا سے نکال کر خدا نے بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں پہنچایا۔ یہاں ان کی تنظیم قائم کی گئی۔ ان کو بارہ جماعتوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر جماعت کے اوپر ایک نگراں تھا اور حضرت موسیٰ سب کے اوپر نگراں تھے۔

پھر بنی اسرائیل کو خصوصی طور پر تمام ضروریات زندگی عطا کی گئیں۔ پہاڑی چشمے نکال کر ان کے لیے پانی فراہم کیا گیا۔ کھلے صحرا میں سایہ کے لیے ان پر مسلسل بدلیاں بھیجی گئیں۔ ان کی خوراک کے لیے من وسلویٰ اترا جو بہ آسانی انھیں اپنے خیموں کے سامنے مل جاتا تھا۔ ان کی باقاعدہ سکونت کے لیے ایک پورا شہر اریحا (وادئ یردن میں) ان کے حوالے کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ تمھاری تمام ضروریات کا ہم نے انتظام کر دیا ہے۔ اب حرص اور لذت پرستی میں مبتلا ہو کر ناپاک چیزوں کی طرف نہ دوڑو۔ اس کے بجائے قناعت اور اللہ کے آگے شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرو۔

"باب (دروازہ) میں جھکے ہوئے داخل ہو"— یہاں باب سے مراد بستی کا دروازہ نہیں ہے بلکہ ہیکل سلیمانی کا دروازہ ہے۔ زمین میں اقتدار دینے کے بعد بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اپنی عبادت گاہ میں خاشع بن کر جاؤ اور گناہوں سے مغفرت مانگو۔ مسلمانوں کے یہاں جس طرح کعبہ کو بیت اللہ (خدا کا گھر) کہا جاتا ہے اسی طرح یہود کے یہاں ہیکل کو باب اللہ (خدا کا پھاٹک) کہا جاتا ہے۔ یہود کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے عبادت خانہ میں عجز وتواضع کے ساتھ داخل ہو کر اپنے رب کی عبادت کرو اور اللہ کی عظمت وجلال کو یاد کر کے اس کے آگے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے رہو۔ مگر یہود خدا کی نصیحتوں کو بھول گئے۔ وہ خدا کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کے بجائے خدا کے نام پر خود ساختہ راہوں کی طرف چلنے لگے۔ انھوں نے عجز کے بجائے سرکشی کا طریقہ اپنایا۔ شکر کا کلمہ بولنے کے بجائے وہ بے صبری کے کلمات بولنے لگے۔

یہود جب بگاڑ کی اس حد کو پہنچ گئے تو خدا نے اپنی عنایات ان سے واپس لے لیں۔ رحمت کے بجائے ان کو مختلف قسم کے عذابوں نے گھیر لیا۔

وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ
الۡبَحۡرِۘ اِذۡ يَعۡدُوۡنَ فِى السَّبۡتِ اِذۡ تَاۡتِيۡهِمۡ
حِيۡتَانُهُمۡ يَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا وَّ يَوۡمَ لَا
يَسۡبِتُوۡنَ ۙ لَا تَاۡتِيۡهِمۡ ۛۚ كَذٰلِكَ ۛۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا
النصف كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ
تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۙ اللّٰهُ مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُهُمۡ
عَذَابًا شَدِيۡدًا ؕ قَالُوۡا مَعۡذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمۡ
وَلَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

۱۶۳۔اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے تھی۔ جب وہ سبت (سنیچر) کے بارے میں تجاوز کرتے تھے۔ جب ان کے سبت کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر آتیں اور جس دن سبت نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ ان کی آزمائش ہم نے اس طرح کی، اس لیے کہ وہ نافرمانی کررہے تھے۔ ۱۶۴۔ اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے۔ انھوں نے کہا، تمھارے رب کے سامنے الزام اتارنے کے لیے اور اس لیے کہ شاید وہ ڈریں۔

یہود کو یہ تلقین کی گئی تھی کہ وہ ہفتہ کا ایک دن (سنیچر) عبادت اور ذکرِ خدا کے لیے خاص رکھیں۔ اس دن کوئی معاشی کام نہ کریں۔ بائبل کے مطابق حکم یہ تھا کہ جو شخص سبت کے قانون کی خلاف ورزی کرے وہ مار ڈالا جائے (خروج 31:14)۔ مگر جب یہود میں بگاڑ آیا تو وہ اس کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ ان کے مصلحین نے متوجہ کیا تو وہ نہ مانے۔ تاہم مصلحین نے اپنی کوشش مسلسل جاری رکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کا کام اگرچہ بظاہر دوسروں کے لیے ہوتا ہے مگر وہ خود اپنے لیے کیا جاتا ہے۔ اس کا اصل محرک اپنے آپ کو اللہ کے یہاں بری الذمہ ٹھہرانا ہے۔ اگر یہ محرک زندہ نہ ہو تو آدمی درمیان میں ٹھہر جائے گا، وہ اپنی اصلاح اور تبلیغ کے عمل کو آخر وقت تک جاری نہیں رکھ سکتا۔

یہود کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ کو ان کے لیے اور سخت کر دیا گیا۔ بحر قلزم کی مشرقی خلیج کے کنارے ایلہ شہر میں یہود کی آبادیاں تھیں۔ ان کی معیشت کا انحصار زیادہ تر مچھلیوں کے شکار پر تھا۔ خدا کے حکم سے یہ ہوا کہ سنیچر کے دن ان کے ساحل پر مچھلیوں کی آمد بہت بڑھ گئی۔ بقیہ چھ دنوں میں مچھلیاں بہت کم آتیں۔ مگر ممنوعہ دن (سنیچر) کو وہ کثرت سے پانی کی سطح کے اوپر تیرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔

یہ یہود کے لیے بڑی سخت آزمائش تھی۔ گویا پہلے اگر یہ نوعیت تھی کہ سنیچر کے علاوہ چھ جائز دنوں میں شکار کرنے کا پورا موقع تھا تو اب صرف ایک حرام دن ہی شکار کرنے کا موقع ان کے لیے باقی رہ گیا۔ اب یہود نے یہ کیا کہ وہ حیلہ کے ذریعہ حرام کو حلال کرنے لگے۔ وہ سنیچر کے دن شکار نہ کرتے۔ البتہ وہ سمندر کا پانی کاٹ کر باہر بنے ہوئے حوضوں میں لاتے۔ سنیچر کے دن مچھلیاں چڑھتیں تو وہ نالی کے راستہ سے ان کے بنائے ہوئے حوض میں آجاتیں۔ اس کے بعد وہ حوض کا منھ بند کرکے مچھلیوں کے دریا میں لوٹنے کا راستہ روک دیتے۔ پھر اگلے دن

اتوار کو جا کر ان کو پکڑ لیتے۔ اس طرح وہ ایک ناجائز فعل کو جواز کی صورت دینے کی کوشش کرتے تاکہ ان پر یہ حکم صادق نہ آئے کہ انھوں نے سنیچر کے دن شکار کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص جائز ذرائع سے اپنی ضروریات فراہم کرنے پر قناعت نہ کرے تو وہ اپنے آپ کو اس خطرہ میں ڈالتا ہے کہ اس کے لیے جائز ذرائع کا دروازہ سرے سے بند کر دیا جائے اور ناجائز ذریعہ کے سوا اس کے لیے حصول معاش کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖۤ اَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ وَ اَخَذۡنَا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍۢ بَـئِيۡسٍۢ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوۡا عَنۡ مَّا نُهُوۡا عَنۡهُ قُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـِٕيۡنَ ﴿۱۶۶﴾

۱۶۵۔ پھر جب انھوں نے بھلا دی وہ چیز جو ان کو یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ ۱۶۶۔ پھر جب وہ بڑھنے لگے اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔

ایک کام جس سے خدا نے منع کیا ہو اس کو کرنا گناہ ہے اور حیلہ کے ذریعہ ناجائز کو جائز بنا کر کرنا گناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ قانون سبت کی خلاف ورزی کرکے یہود اسی قسم کے مجرم بن گئے تھے۔ ایسے لوگ خدا کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ خدا کی ان عنایتوں سے محروم ہو جاتے ہیں جو اس نے اس دنیا میں صرف انسان کے لیے مخصوص کی ہیں۔ ایسے لوگ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آ جاتے ہیں۔

قانون سبت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا۔ ''اللہ نے ان کو بندر بنا دیا'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی صورت بندروں کی صورت ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اخلاق بندروں جیسا ہو گیا۔ ان کا دل اور ان کی سوچ انسانوں کے بجائے بندر جیسے ہو گئے۔ قیل: بل جعل أخلاقهم كأخلاقها وإن لم تكن صورتهم كصورتها (المفردات للراغب الأصفهاني، صفحہ 666)۔ وَرُوِيَ عَنْ مُجَاهِدٍ فِي تَفْسِيرِ هَذِهِ الْآيَةِ أَنَّهُ إِنَّمَا مُسِخَتْ قُلُوبُهُمْ فَقَطْ، وَرُدَّتْ أَفْهَامُهُمْ كَأَفْهَامِ الْقِرَدَةِ (تفسیر القرطبی، جلد 1، صفحہ 443)۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے اندر اس کے خالق نے عقل اور ضمیر رکھ دیا ہے۔ اس کے اندر جب کوئی خواہش اٹھتی ہے تو اس کی عقل و ضمیر متحرک ہو کر فوراً اس کے سامنے یہ سوال کھڑا کر دیتے ہیں کہ ایسا کرنا تمھارے لیے درست ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس، بندر کا حال یہ ہے اس کی خواہش اور اس کے عمل کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں۔ جو بات بھی اس کے جی میں آ جائے وہ فوراً اس کو کر ڈالتا ہے۔ اس کو نہ اپنی خواہش کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہوتی اور نہ اس پر عمل کرنے کے بعد اس پر شرمندہ ہونے کی۔

اب انسان کا بندر ہوجانا یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرتے کرتے اتنا بے حس ہوجائے کہ اس قسم کے نازک احساسات اس کے اندر سے جاتے رہیں۔ اس کے دل میں جو بھی خواہش پیدا ہو اس کو وہ کر گزرے۔ جب بھی کوئی شخص اس کی زد میں آجائے تو وہ اس کی عزت اور اس کے مال پر حملہ کردے۔ کسی سے شکایت پیدا ہو تو فوراً اس کو ذلیل کرنے کے لیے کھڑا ہوجائے۔ کسی سے اختلاف ہوجائے تو اس پر غرانے لگے۔ کوئی اس کو اپنی راہ میں رکاوٹ نظر آئے تو فوراً اس سے لڑنا شروع کردے۔ سچا انسان وہ ہے جو اپنے آپ پر خدا کی لگام لگالے۔ اور بندر انسان وہ ہے جو بے قید ہوکر وہ سب کچھ کرنے لگے جو اس کا نفس اس سے کرنے کے لیے کہے۔

برائی سے روکنا ایک قسم کا اعلانِ برأت ہے۔ اس لیے کسی گروہ پر جب خدا کی یہ سزا آتی ہے تو اس کی زد میں آنے سے وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو برائی سے اس حد تک بے زار ہوں کہ وہ اس کے روکنے والے بن جائیں۔

وَ اِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبۡعَثَنَّ عَلَيۡهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ يَّسُوۡمُهُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعۡنٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اُمَمًا ۚ مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۶۸﴾

۱۶۷۔ اور جب تمھارے رب نے اعلان کردیا کہ وہ ان پر قیامت کے دن تک ضرور ایسے لوگ بھیجتا رہے گا جو ان کو نہایت برا عذاب دیں۔ بے شک تیرا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۱۶۸۔ اور ہم نے ان کو گروہ گروہ کرکے زمین میں متفرق کردیا۔ ان میں کچھ نیک ہیں اور ان میں کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم نے ان کی آزمائش کی اچھے حالات سے اور برے حالات سے تاکہ وہ باز آئیں۔

ان آیات میں یہود کے لیے جس سزا کا اعلان ہے اس کے ساتھ الیٰ یوم القیامہ (قیامت کے دن تک) کی شرط لگی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا وہ ہے جس کا تعلق دنیا سے ہے۔ آخرت کے انجام کا معاملہ اس سے الگ ہے جس کا ذکر دوسرے مقامات پر آیا ہے۔

کسی کام کے کرنے پر جب بڑا انعام رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کو نہ کرنے پر اتنی ہی بڑی سزا بھی ہوگی۔ یہی معاملہ اس قوم کا ہے جو کتاب آسمانی کی حامل بنائی گئی ہو۔ یہود کو خدا نے اسی منصب پر فائز کیا تھا۔ چنانچہ آخرت کے وعدے کے علاوہ دنیا میں بھی ان کو غیر معمولی انعامات دیے گئے۔ مگر یہود نے مسلسل نافرمانی کی۔ وہ دین کے نام پر بے دینی کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ان کو منصبِ فضیلت سے ہٹا دیا۔ ان کے لیے یہ فیصلہ ہوا کہ جب تک دنیا قائم ہے وہ خدا کی سزا کا مزہ چکھتے

رہیں گے اور آخرت میں جو کچھ ہونا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب قیامت تک ان پر کبھی اچھے حالات نہیں آئیں گے۔ جیسا کہ خود ان آیات میں صراحت ہے۔ ان پر ''حسنات'' کے وقفے بھی پڑیں گے۔ مگر یہ حسنہ کا وقفہ بھی ان کے لیے ایک قسم کا عتاب ہوگا تا کہ وہ مزید سرکشی کر کے اور زیادہ سزا کے مستحق بنیں۔

ان آیات میں یہود کے لیے دو سزاؤں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ ان پر ایسی قومیں مسلّط کی جائیں گی جو ان کو ظلم کا نشانہ بنائیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہود کبھی بنوکدنصر اور کبھی ٹائٹس رومی کے شدائد کا نشانہ بنے۔ کبھی وہ مسلمانوں کی ماتحتی میں دیے گئے۔ موجودہ زمانہ میں انھوں نے مشرقی یورپ میں اپنا زبردست اقتصادی جال پھیلا لیا تو ہٹلر نے انھیں تباہ و برباد کر ڈالا۔ اب ارض مقدس میں ان کا اجتماع بظاہر اس کی علامت ہے کہ ان کی پوری قوت شاید اجتماعی طور پر ہلاک کی جانے والی ہے۔

دوسری سزا جس کا یہاں ذکر ہے وہ ''تقطیع'' ہے۔ یعنی ان کی جمعیت کو مختلف حصوں میں بانٹ کر منتشر کر دینا۔ یہ دوسرا واقعہ بھی تاریخ میں بار بار ان کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

اللہ کا یہ قانون صرف یہود کے لیے نہیں تھا۔ وہ بعد کے اس گروہ کے لیے بھی ہے جس کو یہود کی معزولی کے بعد خدا کی گواہی کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ مسلمان اگر اپنے کو اس حال میں پائیں کہ کفار و مشرکین نے ان پر غلبہ پالیا ہو اور ان کی جمعیت چھوٹے چھوٹے جغرافیوں میں بٹ کر متفرق ہوگئی ہو تو ان کو خدا کی طرف لوٹنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احتساب الٰہی کی زد میں آگئے ہیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ

۱۶۹۔ پھر ان کے پیچھے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث بنے، وہ اسی دنیا کی متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یقیناً بخش دئے جائیں گے۔ اور اگر ایسی ہی متاع ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیں گے۔ کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہیں۔ اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لیے، کیا تم سمجھتے نہیں۔ ۱۷۰۔ اور جو لوگ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، بے شک

الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع ۲۱

ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ ۱۷۱۔ اور جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر اٹھایا گویا کہ وہ سائبان ہے۔ اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر آپڑے گا۔ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے، اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم بچو۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہود کو جب خدائی احکام دیے گئے تو اس کی کارروائی پہاڑ کے دامن میں ہوئی تھی۔ اس وقت ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ یہود کو محسوس ہوا کہ پہاڑ ان کے اوپر گرا چاہتا ہے۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ خدا سے عہد باندھنے کا معاملہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ اگر تم نے اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا تو یاد رکھو کہ اس عہد کا دوسرا فریق وہ عظیم ہستی ہے جو چاہے تو پہاڑ کو تمھارے اوپر گرا کر تمھیں ہلاک کردے۔

اس وقت یہود میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اللہ سے ڈرنے والے اور نیک عمل کرنے والے تھے۔ مگر بعد کو دھیرے دھیرے انھوں نے دنیا کو اپنا مقصود بنا لیا۔ وہ جائز ناجائز کا فرق کیے بغیر مال جمع کرنے میں لگ گئے۔ آسمانی کتاب کو اب بھی وہ پڑھتے تھے مگر اس کی تعلیمات کی خود ساختہ تاویلیں کرکے اس کو انھوں نے ایسا بنا لیا کہ خدا بھی ان کو اپنی باغیانہ زندگی کا حامی نظر آنے لگا۔ ان کی بے حسی یہاں تک بڑھی کہ وہ یہ کہہ کر مطمئن ہوگئے کہ ہم برگزیدہ امت ہیں۔ ہم نبیوں کی اولاد ہیں۔ خدا اپنے محبوب بندوں کے صدقے میں ہم کو ضرور بخش دے گا۔

یہی واقعہ ہر نبی کی امت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ابتدائی دور میں اس کے افراد خدا سے ڈرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر اگلی نسلوں میں یہ روح (spirit) نکل جاتی ہے۔ وہ دوسرے دنیا دار لوگوں کی طرح ہوجاتے ہیں۔ ان کے درمیان اب بھی دین موجود ہوتا ہے۔ خدا کی کتاب اب بھی ان کے یہاں پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ مگر یہ سب قومی وراثت کے طور پر ہوتا ہے، نہ کہ حقیقۃً عہد خداوندی کے طور پر۔ وہ عملاً آخرت کو بھول کر دنیا پرستی کی راہ میں چل پڑتے ہیں۔ وہ صحیح اور غلط سے بے نیاز ہو کر اپنی خواہشوں کو اپنا مذہب بنا لیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی فخر ہوتا ہے کہ وہ افضل الامم ہیں۔ وہ محبوبِ خدا کے امتی ہیں۔ وہ آسمانی کتاب کے وارث ہیں۔ کلمہ توحید کی برکت سے وہ ضرور بخش دیے جائیں گے۔

مگر اصل چیز یہ ہے کہ آدمی خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے، وہ نماز کو قائم کرے۔ اور کتاب الٰہی کو پکڑنے اور نماز کو قائم کرنے کا معیار یہ ہے کہ آدمی ''مصلح'' بن گیا ہو۔ خدا کی کتاب سے تعلق اور خدا کی عبادت کرنا آدمی کو مصلح بناتا ہے، نہ کہ مفسد۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

۱۷۲۔ اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی۔ ۱۷۳۔ یا کہو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے۔ تو کیا تو ہم کو ہلاک کرے گا اس کام پر جو غلط کار لوگوں نے کیا۔ ۱۷۴۔ اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ رجوع کریں۔

ایک جانور کو اس کے ماں باپ سے الگ کر دیا جائے اور اس کی پرورش بالکل علیحدہ ماحول میں کی جائے تب بھی بڑا ہو کر وہ مکمل طور پر اپنی نسلی خصوصیات پر قائم رہتا ہے۔ وہ اپنے تمام معاملات میں عین وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو اس کی جبلت (instinct) میں پیوست ہے۔ یہی معاملہ انسان کا ''شعور رب'' کے بارے میں ہے۔ انسان کی روح میں ایک خالق و مالک کا شعور اتنی گہرائی کے ساتھ جما دیا گیا ہے کہ وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتا۔ موجودہ زمانہ میں ایک اعتبار سے روس اور دوسرے اعتبار سے ترکی کا تجربہ بتاتا ہے کہ مکمل طور پر مخالفِ مذہب ماحول میں تربیت پانے کے باوجود انسان کی فطرت عین وہی باقی رہتی ہے جو اقرارِ مذہب کے ماحول میں ہمیشہ پائی جاتی رہی ہے۔

تاہم جانور اور انسان میں ایک فرق ہے۔ جانور اپنی فطرت کی خلاف ورزی پر قادر نہیں۔ وہ مجبور ہیں کہ عملاً بھی وہی کریں جو ان کے اندر کی فطرت انھیں سبق دے رہی ہے۔ اس کے برعکس، انسان کا حال یہ ہے کہ شعور فطرت کی حد تک پابند ہونے کے باوجود عمل کے معاملے میں وہ پوری طرح آزاد ہے۔ جب بھی کوئی بات سامنے آتی ہے تو اس کی عقل اور اس کا ضمیر اندر سے اشارہ کرتے ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ مگر اس کے باوجود انسان کو اختیار ہے کہ وہ چاہے اپنی اندرونی آواز کی پیروی کرے، چاہے اس کو نظر انداز کر کے مَن مانی کارروائی کرنے لگے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا امتحان ہو رہا ہے اور اسی پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہونا ہے۔ جو شخص خدائی آواز پر کان لگائے اور وہی کرے جو خدا فطرت کی خاموش زبان میں اس سے کہہ رہا ہے، وہ امتحان میں پورا اترا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ اور جو شخص فطرت کی سطح پر نشر

ہونے والی خدائی آواز کو نظر انداز کردے وہ خدا کی نظر میں مجرم ہے۔ اس کو مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ خدا بھی اس کو نظر انداز کردے گا جس طرح اس نے خدا کی آواز کو نظر انداز کیا تھا۔

فطرت کی یہ آواز ہر آدمی کے اوپر خدا کی دلیل ہے۔ اب کسی کے پاس نہ تو بے خبری کا عذر ہے اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ماضی سے جو چلا آرہا تھا وہی ہم بھی کرنے لگے۔ جب انسان پیدائش ہی سے خدا کا شعور لے کر آتا ہے اور ماحول کے علی الرغم اس کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے تو اب کسی شخص کے پاس بے راہ ہونے کا کیا عذر ہے۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

۱۷۵۔ اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ ۱۷۶۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس کا تعاقب کرے تب بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دو تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم یہ احوال ان کو سناؤ تاکہ وہ سوچیں۔ ۱۷۷۔ کیسی بری مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ ۱۷۸۔ اللہ جس کو راہ دکھائے، وہی راہ پانے والا ہوتا ہے اور جس کو وہ بے راہ کردے تو وہی گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص امیہ بن ابی الصلت تھا۔ اعلیٰ انسانی اوصاف کے ساتھ وہ حکیمانہ کلام میں بھی ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں میں ایک پیغمبر کے آنے کی پیشین گوئیاں موجود ہیں تو اس کو گمان ہوا کہ شاید وہ پیغمبر میں ہی ہوں۔ بعد کو جب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی خبر ملی اور اس نے آپ کا اعلیٰ کلام سنا تو اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ پیغمبر اسلام کا سخت مخالف بن گیا۔ امیہ بن ابی الصلت کو خدا نے جو اعلیٰ خصوصیات دی تھیں ان کا صحیح استعمال یہ تھا کہ وہ خدا کے پیغمبر کو پہچانے اور ان کا ساتھی بن جائے۔ مگر خدا کی نوازشوں سے اس نے اپنے اندر یہ ذہن بنایا کہ اب

خدا کو میرے سوا کسی اور پر اپنا فضل نہ کرنا چاہیے۔ پیغمبر خدا کو نہ ماننے میں اسے دنیوی فائدہ نظر آتا تھا اس کے برعکس، آپ کو ماننے میں اخروی فائدہ تھا۔ اس نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دی۔ وہ اگر اعتراف کے رخ پر چلتا تو وہ فرشتوں کو اپنا ہم سفر بناتا۔ مگر جب وہ حسد اور گھمنڈ کے راستہ پر چل پڑا تو وہاں شیطان کے سوا کوئی اور نہ تھا جو اس کا ساتھ دے۔ یہ مثال ان تمام لوگوں پر صادق آتی ہے جو حسد اور کبر کی بنا پر سچائی کو نظر انداز کریں یا اس کو ماننے سے انکار کریں۔

کسی آدمی کا ایسا بننا اپنے آپ کو انسانیت کے مقام سے گرا کر کتے کے مقام پر پہنچا دینا ہے۔ کتا اچھے سلوک پر بھی ہانپتا ہے اور برے سلوک پر بھی۔ یہی حال ایسے آدمی کا ہے۔ خدا نے جب اس کو دیا تب بھی اس نے اس سے سرکشی کی غذا لی اور نہ دیا تب بھی وہ سرکش ہی بنا رہا۔ حالاں کہ چاہیے یہ تھا کہ جب خدا نے اس کو دیا تھا تو وہ اس کا احسان مند ہوتا اور جب خدا نے نہیں دیا تو وہ خدا کی تقسیم پر راضی رہ کر اس کی طرف رجوع کرتا۔

کسی کو راستہ دکھانے کے لیے خدا خود سامنے نہیں آتا بلکہ وہ نشانیوں (دلائل) کی صورت میں اپنا راستہ لوگوں کے اوپر کھولتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ دلائل اور نشانیوں کے روپ میں ظاہر ہونے والے حق کو پہچان لیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے پر راضی ہو جائیں وہی اس دنیا میں ہدایت یاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ دلائل اور نشانیوں کو اہمیت نہ دیں ان کے لیے ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ
الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ
اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا
يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ
اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَ لِلّٰهِ
الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا
الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَ مِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ
ع يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ

۱۷۹۔ اور ہم نے جنات اور انسان میں سے بہتوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں غافل۔ ۱۸۰۔ اور اللہ کے لیے ہیں سب اچھے نام۔ پس انھیں سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو، جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں۔ وہ بدلہ پا کر رہیں گے اپنے کاموں کا۔ ۱۸۱۔ اور ہم نے جن کو پیدا کیا ہے ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو حق کے مطابق رہنمائی کرتا ہے، اور حق کے مطابق فیصلہ کرتا

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

ہے۔ ۱۸۲۔ اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ ۱۸۳۔ اور میں ان کو ڈھیل دیتا ہوں، بے شک میرا داؤ بڑا مضبوط ہے۔

سچائی ایک ایسی چیز ہے جس کو ہر آدمی کو خود پانا پڑتا ہے۔ خدا نے ہر آدمی کو دل اور آنکھ اور کان دیے ہیں۔ آدمی انھیں صلاحیتوں کو استعمال کر کے سچائی کو پاتا ہے۔ اور جو شخص ان صلاحیتوں کو استعمال نہ کرے وہ یقیناً سچائی کو پانے سے محروم رہے گا، خواہ سچائی اس سے کتنا ہی زیادہ قریب موجود ہو۔

سچائی کو پانا ہر آدمی کا ایک شعوری اور ارادی فعل ہے۔ سچائی کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے اپنے دل کے دروازے اس کے لیے کھلے رکھے ہوں۔ اس کو وہی دیکھ سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر مصنوعی پردے نہ ڈالے ہوں۔ اس کی آواز اسی کو سنائی دے سکتی ہے جس نے اپنے کان میں کسی قسم کے ڈاٹ نہ لگا رکھے ہوں۔ ایسے لوگ سچائی کی آواز کو پہچان کر اس کے آگے اپنے کو ڈال دیں گے۔ اور جس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہو وہ چوپایوں کی طرح ناسمجھ بنا رہے گا۔ پہاڑ جیسے دلائل کا وزن محسوس کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ اس کے سامنے خدا کی تجلّیاں ظاہر ہوں گی مگر وہ اس کو دیکھنے سے عاجز ہوگا۔ اس کے پاس خدا کا نغمہ چھیڑا جائے گا مگر وہ اس کو سننے سے محروم رہے گا۔ سچائی ہمیشہ بیدار لوگوں کو ملتی ہے۔ غافلوں کے لیے کوئی سچائی سچائی نہیں۔

خدا کے بارے میں انسان کے بے راہ ہونے کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہوئے اپنے ذہن میں خدا کی غلط تصویر بنا لیتا ہے۔ وہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیتا ہے جو اس کے شایان شان نہیں ہیں۔ مثلاً انسانوں کے حالات پر قیاس کر کے خدا کے مقربین کا عقیدہ بنا لینا۔ بادشاہوں کو دیکھ کر یہ فرض کر لینا کہ جس طرح بادشاہوں کے نائب اور مددگار ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے بھی نائب اور مددگار ہیں۔ خدائی فیصلہ کے بارے میں ایسا خیال قائم کر لینا جس میں آدمی کی اپنی خواہشیں تو پوری ہو رہی ہوں مگر وہ خداوندی عدل سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ یہ خدا کے ناموں میں کجی کرنا ہے کہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو اس کی عظمت کے شایان شان نہ ہوں۔

خدا کسی آدمی کی کج روی پر فوراً اس کو نہیں پکڑتا۔ اس طرح اس کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ یا تو خدا کی تنبیہات کو دیکھ کر سنبھل جائے یا مزید ڈھیٹ ہو کر اپنے جرم کو پوری طرح ثابت شدہ بنا دے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ

۱۸۴۔ کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو ایک صاف ڈرانے والا ہے۔ ۱۸۵۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام پر نظر نہیں کی اور جو کچھ اللہ نے

مِنْ شَیْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ
اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ
یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ
وَ یَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾
یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ
اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا
هُوَ ؔۘ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا
تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ
عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ
لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ
لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ
الْخَیْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا
نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۲۳ ۱۲

پیدا کیا ہے ہر چیز سے، اور اس بات پر کہ شاید ان کی مدت قریب آ گئی ہو۔ پس اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔ ۱۸۶۔ جس کو اللہ بے راہ کر دے اس کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ اور وہ ان کو سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ ۱۸۷۔ وہ تم سے قیامت کی بابت پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا۔ کہو، اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ وہ بھاری ہو رہی ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ وہ جب تم پر آئے گی تو اچانک آجائے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی تحقیق کر چکے ہو۔ کہو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۱۸۸۔ کہو، میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب کو جانتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک ڈرانے والا، اور خوش خبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔

بامقصد آدمی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر مصلحت پسند انسان ہوتا ہے۔ وہ وقت کے رواج سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔ وہ ماحول میں جمے ہوئے مصالح سے بے پروا ہو کر اپنا کام کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے نشانہ کی خاطر اپنا جان و مال سب کچھ قربان کر دیتا ہے جس کا کوئی نتیجہ بظاہر اس دنیا میں ملنے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بامقصد آدمی کو اکثر اپنے معاصرین کی طرف سے جو سب سے بڑا خطاب ملتا ہے وہ ''مجنون'' ہے۔ خدا کا پیغمبر اپنے وقت کا سب سے بڑا بامقصد انسان ہوتا ہے۔ اس لیے خدا کے پیغمبروں کو ہر زمانہ کے لوگوں نے یہی کہا کہ یہ مجنون ہو گئے ہیں۔

خدا کے دین کے داعی کو مجنون کہنا تمام ظلموں میں سب سے بڑا ظلم ہے۔ کیوں کہ وہ جس پیغام کو لے کر اٹھتا ہے وہ ایک ایسا پیغام ہے جس کی تصدیق تمام زمین و آسمان کر رہے ہیں۔ وہ ایسے خدا کی طرف بلاتا ہے جو اپنی

کائناتی تخلیقات میں ہر طرف انتہائی حد تک نمایاں ہے۔ وہ ایسی آخرت کی خبر دیتا ہے جو زمین و آسمان میں اس طرح سنگین حقیقت بنی ہوئی ہے جس طرح کسی ماں کے پیٹ میں پورا حمل۔ لوگ حق کے بارے میں سنجیدہ نہیں، اس لیے حق کی خاطر جان کھپانے والا انھیں مجنون دکھائی دیتا ہے۔ اگر وہ حق کی قدر و قیمت کو جانتے تو کبھی ایسا نہ کہتے۔

''قیامت کس تاریخ کو آئے گی''۔ اس قسم کے سوالات غیر سنجیدہ ذہن سے نکلے ہوئے سوالات ہیں۔ قیامت کو ماننے کا انحصار قیامت کے حق میں اصولی دلیل پر ہے، نہ کہ اس بات پر کہ قیامت کی تاریخ متعین صورت میں بتا دی جائے۔ جب یہ دنیا دار الامتحان ہے تو یہاں قیامت کو تنبیہہ کی زبان میں بتایا جائے گا، نہ کہ حسابی تعینات کی زبان میں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ۖ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

۱۸۹۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اس کو ایک ہلکا سا حمل رہ گیا۔ پھر وہ اس کو لیے پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اپنے رب اللہ سے دعا کی — اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد دی تو ہم تیرے شکر گزار رہیں گے۔ ۱۹۰۔ مگر جب اللہ نے ان کو تندرست اولاد دے دی تو وہ اس کی بخشی ہوئی چیز میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ ۱۹۱۔ کیا وہ شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ ۱۹۲۔ اور وہ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ ۱۹۳۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمھاری پکار پر نہ چلیں گے۔ برابر ہے خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ ۱۹۴۔ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ تمھارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس تم ان کو پکارو، وہ تمھیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔

کائنات اپنے خالق کا جو تعارف کراتی ہے وہ ایسا تعارف ہے جو کسی حال میں شرک کے تصور کو قبول نہیں کرتا۔ کائنات میں بے شمار اجزاء الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ مگر تمام اجزاء مل کر ایک ہم آہنگ کُل بن جاتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا تضاد یا ٹکراؤ نہیں۔ یہ کامل ہم آہنگی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس دنیا کا خالق و مالک ایک ہو اور وہی تنہا اس کو چلا رہا ہو۔

مرد اور عورت کے معاملہ کو دیکھیے۔ ایک مرد اور ایک عورت میں جو کامل مطابقت ہوتی ہے وہ شاید موجودہ کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے جس کا تجربہ ایک شخص کرتا ہے۔ مرد ایک منفرد اور مستقل وجود ہے اور عورت اس سے الگ ایک مستقل وجود۔ مگر یہ مرد اور عورت جب میاں اور بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دونوں کا وجود اس طرح ایک دوسرے میں شامل ہو جاتا ہے کہ ان میں کوئی دوئی باقی نہیں رہتی۔ ہر ایک کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اُس کے لیے پیدا کیا گیا ہوں اور وہ میرے لیے۔ دونوں کے درمیان یہ گہری سازگاری اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایک ہی ارادہ نے اپنے پیشگی منصوبہ کے تحت دونوں کو ایک خاص ڈھنگ پر بنایا ہے۔ کائنات میں اگر ایک سے زیادہ ہستیوں کی کارفرمائی ہوتی تو دو مختلف اور متضاد چیزوں کے درمیان یہ کامل ہم آہنگی ممکن نہ ہوتی۔

مگر کیسی عجیب بات ہے کہ جس کائنات میں توحید کے اتنے زیادہ دلائل موجود ہیں وہاں آدمی شرک کو اپنا مذہب بناتا ہے۔ دو انسانوں میں "وحدت" کے کرشمہ سے ایک تیسرے بچہ نے جنم لیا مگر جب وہ پیدا ہو گیا تو کسی نے یہ عقیدہ بنالیا کہ یہ اولاد فلاں زندہ بزرگ کی برکت سے ہوئی ہے۔ کسی نے اس کو مفروضہ دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیا۔ کسی نے کہا کہ یہ مادہ کی اندھی طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ ہے۔ کسی نے یہ سمجھا کہ یہ خود اس کی اپنی کمائی ہے جو ایک خوبصوت بچہ کی صورت میں اس کو حاصل ہوئی ہے۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾

۱۹۵۔ کیا ان کے پاؤں ہیں کہ ان سے چلیں۔ کیا ان کے ہاتھ ہیں کہ ان سے پکڑیں۔ کیا ان کے آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھیں۔ کیا ان کے کان ہیں کہ ان سے سنیں۔ کہو، تم اپنے شریکوں کو بلاؤ۔ پھر تم لوگ میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ ۱۹۶۔ یقیناً میرا کارساز اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ کارسازی کرتا ہے نیک بندوں کی۔ ۱۹۷۔ اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا، وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٩٨﴾

اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ ۱۹۸۔ اور اگر تم ان کو راستہ کی طرف پکارو تو وہ تمھاری بات نہ سنیں گے اور تم کو نظر آتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر وہ کچھ نہیں دیکھتے۔

بت پرست لوگ پتھر یا دھات کی جو مورتیاں بناتے ہیں، اس کا فلسفہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خارجی مظاہر ہیں، جن کے اندر ان کا مزعومہ دیوتا حلول کر آیا ہے۔ ان مظاہر کی پرستش ان کے نزدیک اُن معبودوں کی پرستش ہے جن کی وہ محسوس علامتیں ہیں۔ تاہم عوام کی سطح پر عملاً بت پرستی جو شکل اختیار کرتی ہے وہ یہ کہ لوگ خود ان مورتیوں کو مقدس سمجھنے لگتے ہیں۔ ان بتوں میں نہ چلنے کی طاقت ہوتی، نہ پکڑنے کی، نہ دیکھنے کی اور نہ سننے کی۔ مگر وہی انسان ان کی بابت یہ فرض کر لیتا ہے کہ وہ اس کے کام آئیں گے اور اس کی حاجتیں پوری کریں گے۔

تاہم یہ معاملہ معروف قسم کے بتوں کا ہی نہیں ہے۔ ان کے سوا جن چیزوں کو انسان معبودیت کا درجہ دیتا ہے ان کا حال بھی یہ ہے، وطن اور قوم سے لے کر زندہ یا مردہ شخصیتوں تک جن چیزوں سے بھی وہ جذبات وابستہ کیے جاتے ہیں جو صرف ایک خدا کا حق ہے، ان کی حقیقت کیا ہے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ کوئی بھی پاؤں یا ہاتھ یا آنکھ والا ایسا نہیں جس کے پاؤں اور ہاتھ اور آنکھ اس کے اپنے ہوں۔ ہر ''پاؤں'' والے کے پاس دیا ہوا پاؤں ہے اور اگر اس کا پاؤں چھن جائے تو وہ اس کو دوبارہ واپس نہیں لا سکتا۔ ہر ''ہاتھ'' والے کے پاس دیا ہوا ہاتھ ہے اور اگر اس کا ہاتھ باقی نہ رہے تو وہ دوبارہ اپنا ہاتھ نہیں بنا سکتا۔ ہر ''آنکھ'' والے کی آنکھ دی ہوئی آنکھ ہے اور اگر اس کی آنکھ جاتی رہے تو اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ دوبارہ اپنے لیے آنکھ تیار کر لے۔

غیر اللہ کی پرستش کرنے والے لوگ اپنے بتوں کے بھروسہ پر ہمیشہ ایک خدا کے پرستاروں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ مگر یہ لوگ بہت جلد جان لیں گے کہ خدا کی اس دنیا میں ان کا بھروسہ کس قدر بے بنیاد تھا۔ جس خدا کا ظہور موجودہ دنیا میں کتابی میزان کی صورت میں ہوا ہے، اس کا ظہور عنقریب عدالتی میزان کی صورت میں ہونے والا ہے۔ اس وقت ہر آدمی دیکھ لے گا کہ کام بنانے والا صرف خدا تھا۔ اگرچہ آدمی اپنی نادانی کی وجہ سے دوسروں کو اپنا کام بنانے والا سمجھتا رہا۔ شریکوں کے پاس تو سرے سے مدد کرنے کی کوئی طاقت ہی نہیں، مگر خدا اپنے وفادار بندوں کی مدد دنیا میں بھی کرتا ہے۔ اور آخرت میں بھی۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٠٠﴾ اِنَّ

۱۹۹۔ درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ ۲۰۰۔ اور اگر تم کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۲۰۱۔ جو لوگ ڈر رکھتے

اَلَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ
تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۚ﴿۲۰۱﴾ وَ اِخْوَانُهُمْ
یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال
انھیں چھوجاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور
پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ ۲۰۲۔ اور جو
شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے
جاتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے۔

توحید اور آخرت، نیکی اور عدل کی طرف بلانا ''عُرف'' کی طرف بلانا ہے۔ یعنی ان بھلائیوں کی طرف جو عقل وفطرت کے نزدیک جانی پہچانی ہیں۔ مگر یہ سادہ ترین کام ہر زمانے میں مشکل ترین کام رہا ہے۔ انسان کی حُبِ عاجلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر زمانہ میں لوگ اپنی زندگی کا نظام دنیوی مفاد اور ذاتی مصلحتوں کی بنیاد پر قائم کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ حق کا نام لے کر باطل پرستی کے مشغلہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب بھی سچائی کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو ہر آدمی اپنے آپ پر اس کی زد پڑتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی اس کا مخالف بن کر کھڑا ہوجاتا ہے۔

ایسی حالت میں داعی کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے درگزر اور اعراض۔ یعنی لوگوں سے الجھے بغیر بالکل ٹھنڈے طور پر اپنا کام جاری رکھنا۔ داعی اگر لوگوں کے نکالے ہوئے شوشوں کا جواب دینے لگے تو حق کی دعوت مناظرہ کی صورت اختیار کرلے گی۔ داعی اگر لوگوں کی طرف سے چھیڑے ہوئے غیر ضروری سوالات میں اپنے کو مشغول کرے تو وہ صرف اپنے وقت اور اپنی طاقت کو ضائع کرے گا۔ داعی اگر لوگوں کی طرف سے آنے والی تکلیفوں پر ان سے جھگڑنے لگے تو دعوتِ حق دعوت نہ رہے گی بلکہ معاشی اور سیاسی لڑائی بن جائے گی۔ اس لیے حق کی دعوت کو اس کی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ داعی جاہلوں اور معاندوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گواریوں پر صبر کرے اور ان سے الجھے بغیر اپنے مثبت کام کو جاری رکھے۔

تاہم موجودہ دنیا میں کوئی شخص نفس اور شیطان کے حملوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صرف اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہی حساسیت موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ڈھال ہے۔ جب بھی آدمی کے اندر کوئی غلط خیال آتا ہے یا کسی قسم کی منفی نفسیات ابھرتی ہے تو اس کی حساسیت فوراً اس کو بتا دیتی ہے کہ وہ پھسل گیا ہے۔ ایک لمحہ کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگتے ہوئے دوبارہ اپنے کو درست کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس، جو لوگ اللہ کے ڈر سے خالی ہوتے ہیں ان کے اندر شیطان داخل ہو کر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور ان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھی بن کر وہ کسی گڑھے کی طرف چلے جارہے ہیں۔ حساسیت آدمی کی سب سے بڑی محافظ ہے، جب کہ بے حسی آدمی کو شیطان کے مقابلہ میں غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔

وَ اِذَا لَمۡ تَاۡتِہِمۡ بِاٰیَۃٍ قَالُوۡا لَوۡ لَا اجۡتَبَیۡتَہَا ؕ
قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ مِنۡ رَّبِّیۡ ۚ ہٰذَا
بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّقَوۡمٍ
یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾ وَ اِذَا قُرِیَٔ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا
لَہٗ وَ اَنۡصِتُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾ وَ اذۡکُرۡ
رَّبَّکَ فِیۡ نَفۡسِکَ تَضَرُّعًا وَّ خِیۡفَۃً وَّ دُوۡنَ
الۡجَہۡرِ مِنَ الۡقَوۡلِ بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ وَ لَا
تَکُنۡ مِّنَ الۡغٰفِلِیۡنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ
رَبِّکَ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ
یُسَبِّحُوۡنَہٗ وَ لَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدۃ ع ۲۴

۲۰۳۔ اور جب تم ان کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) نہیں لائے تو وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہ تم چھانٹ لائے کچھ اپنی طرف سے۔ کہو، میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ سوجھ کی باتیں ہیں تمھارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔ ۲۰۴۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ ۲۰۵۔ اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو اپنے دل میں، عاجزی اور خوف کے ساتھ اور پست آواز سے، اور غافلوں میں سے نہ بنو۔ ۲۰۶۔ جو (فرشتے) تیرے رب کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے۔ اور وہ اس کی پاک ذات کو یاد کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے کہ اگر تم خدا کے پیغمبر ہو تو خدا کے یہاں سے کوئی معجزہ کیوں نہیں لائے۔ خدا کے لیے انتہائی آسان تھا کہ وہ آپ کو ایک معجزہ دے دیتا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اصل مقصد جاتا رہتا۔

مثلاً فرض کیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جدید طرز کی ایک موٹر کار اتار دی جاتی جس میں لاؤڈ اسپیکر نصب ہوتا۔ آپ اس میں بیٹھ کر چلتے اور لوگوں کے درمیان تبلیغ کرتے۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں ایسی ایک کار لوگوں کے لیے انتہائی حیرت ناک معجزہ ہوتی۔ مگر اس کا نقصان یہ ہوتا کہ لوگوں کی توجہ اصل بات سے ہٹ جاتی۔ اصل مقصد تو یہ تھا کہ خدا کا کلام لوگوں کے لیے بصیرت بنے۔ اس سے لوگوں کو سوچنے کا ڈھنگ اور عمل کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ اس سے روحوں کو خدائی ٹھنڈک ملے۔ مگر مذکورہ معجزہ کے بعد یہ سارا منصوبہ دھرا رہ جاتا اور لوگ بس طلسماتی سواری کے عجوبہ میں محو ہو کر رہ جاتے۔

کراماتی چیزوں میں کھونے کا نام دین نہیں۔ دین یہ ہے کہ آدمی خدا کے کلام پر دھیان دے۔ اس کو غور کے ساتھ پڑھے اور توجہ کے ساتھ سنے۔ دین دار ہونے کی پہچان یہ ہے کہ خدا کے ساتھ آدمی کا گہرا

تعلق قائم ہو جائے۔ اس کے دل میں گداز پیدا ہو۔ وہ خدا کی یاد کرنے والا بن جائے۔ خدا کی عظمت اس کے دل ودماغ پر اس طرح چھا جائے کہ وہ اس کے اندر تواضع اور خوف کی کیفیت پیدا کر دے۔ خدا کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی آواز پست ہو جائے۔ وہ غفلت سے نکل کر بیداری کے عالم میں پہنچ جائے۔

آخر میں فرشتوں کا کردار بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم بھی ایسا ہی کرو تا کہ تمھیں فرشتوں کی معیت حاصل ہو۔ جب آدمی اپنے آپ کو گھمنڈ سے پاک کرتا ہے۔ اور خدا کے کمالات سے اتنا سرشار ہوتا ہے کہ اس کے دل سے ہر وقت اس کی یاد ابلتی رہتی ہے تو وہ فرشتوں کا ہم سطح ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں کسی انسان کی ترقی کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے ملکوتی کردار کا حامل بن جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے فرشتوں کے پڑوس میں زندگی گزارنے لگے۔

۸۔ سُوۡرَةُ الۡاَنۡفَال

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَيۡنِكُمۡ ۖ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝١ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۝٢ۚۖ الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ۝٣ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَهُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَمَغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ۝٤ۚ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ وہ تم سے انفال (مال غنیمت) کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ انفال اللہ اور اس کے رسول کے ہیں۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ ۲۔ ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۳۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۴۔ یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت ہیں اور ان کے لیے عزت کی روزی ہے۔

سورہ انفال جنگ بدر (2 ہجری) کے بعد اتری۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی اور اس کے بعد میدانِ جنگ سے کافی مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔ مگر یہ اموال عملاً ایک گروہ کے قبضہ میں تھے۔ اس بنا پر جنگ

کے بعد غنیمت کی تقسیم پر نزاع پیدا ہوگئی۔ جنگ میں کچھ لوگ پچھلی صف میں تھے۔ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ آخری مرحلہ میں دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اس طرح میدان جنگ سے مالِ غنیمت لوٹنے کا موقع ایک خاص فریق کو ملا۔ دوسرے لوگ جو اس وقت میدانِ جنگ سے دور تھے وہ دشمن کے چھوڑے ہوئے اموال کو حاصل نہ کر سکے۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ اصولی طور پر تو جنگ کے تمام شرکاء اپنے کو مال غنیمت میں حصہ دار سمجھتے تھے۔ مگر مالِ غنیمت عملاً صرف ایک گروہ کے قبضہ میں تھا۔ ایک فریق کے پاس دلیل تھی اور دوسرے فریق کے پاس مال۔ ایک کے پاس اپنے حق کو ثابت کرنے کے لیے صرف الفاظ تھے، جب کہ دوسرے کا حق کسی دلیل وثبوت کے بغیر خود قبضہ کے زور پر قائم تھا۔

اس قسم کے تمام جھگڑے خدا کے خوف کے منافی ہیں۔ خدا کا خوف آدمی کے اندر ذمہ داری کی نفسیات ابھارتا ہے۔ ایسے آدمی کی توجہ فرائض پر ہوتی ہے، نہ کہ حقوق پر۔ وہ اپنی طرف دیکھنے کے بجائے خدا کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اس کا دل خدا اور رسول کی اطاعت کے لیے نرم پڑ جاتا ہے۔ وہ خدا کا عبادت گزار بندہ بن جاتا ہے۔ لوگوں کو دے کر اسے تسکین ملتی ہے، نہ کہ لوگوں سے چھین کر۔ یہ اوصاف آدمی کے اندر حقیقت پسندی اور حق کے اعتراف کا مادہ پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت پسندی اور اعترافِ حق کی فضا کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپس کے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کبھی اتفاقاً ابھرتے ہیں تو ایک بار کی تنبیہ ان کی اصلاح کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

خدا کی پکڑ کا اندیشہ ہر ایک کو اس حد پر پہنچا دیتا ہے جس حد پر اس کو فی الواقع ہونا چاہیے تھا۔ اور جہاں ہر آدمی اپنی واقعی حد پر رکنے کے لیے راضی ہو جائے وہاں جھگڑے کا کوئی گزر نہیں۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ﴿٥﴾ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿٦﴾ وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ

۵۔ جیسا کہ تمھارے رب نے تم کو حق کے ساتھ تمھارے گھر سے نکالا۔ اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔ ۶۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تم سے جھگڑ رہے تھے باوجود یہ کہ وہ ظاہر ہو چکا تھا، گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں آنکھوں دیکھتے۔ ۷۔ اور جب خدا تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک تم کو مل جائے گی۔ اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے۔ اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ حق کا حق ہونا ثابت

دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۷﴾ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۚ﴿۸﴾

کردے اپنے کلمات سے اور منکروں کی جڑ کاٹ دے۔ ۸۔ تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

شعبان 2ھ میں معلوم ہوا کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے مکہ کی طرف واپس جارہا ہے۔ اس قافلہ کے ساتھ تقریباً 50 ہزار اشرفی کا سامان تھا۔ اس کا راستہ مدینہ کے قریب سے گزرتا ہے۔ یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے قافلۂ تجارت پر حملہ کریں۔ چنانچہ قافلہ کے سردار ابوسفیان بن حرب نے تیز رفتار اونٹنی کے ذریعہ مکہ والوں کے پاس یہ خبر بھیجی کہ مدد کے لیے دوڑو ورنہ مسلمان تجارتی قافلہ کو لوٹ لیں گے۔ مکہ میں اس خبر سے بڑا جوش پیدا ہوگیا۔ چنانچہ 950 سوار جن میں 600 زرہ پوش تھے مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تمام خبریں مل رہی تھیں۔ اب مدینہ کے مسلمان دو گروہوں کے درمیان تھے۔ ایک شام سے آنے والا تجارتی قافلہ۔ دوسرا مکہ سے مدینہ کی طرف بڑھنے والا جنگی لشکر۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ تجارتی قافلہ کی طرف بڑھا جائے۔ اس قافلہ کے ساتھ بمشکل 40 محافظ تھے۔ اس کو بہ آسانی مغلوب کرکے اس کے سامان پر قبضہ کیا جاسکتا تھا۔ مگر خدا کا منصوبہ دوسرا تھا۔ خدا کو دراصل منکرین حق کا زور توڑنا تھا، نہ کہ کچھ اقتصادی فائدہ حاصل کرنا۔ خدا نے مخصوص حالات پیدا کرکے ایسا کیا کہ تمام مخالف سرداروں کو مکہ سے نکالا اور ان کو مدینہ سے 20 میل کے فاصلہ پر بدر کے مقام پر پہنچا دیا تاکہ مسلمانوں کو ان سے ٹکرا کر ہمیشہ کے لیے ان کا خاتمہ کردیا جائے۔ اللہ کے رسول نے جب مسلمانوں کو خدا کے اس منصوبہ سے مطلع کیا تو سب کے سب متفق ہو کر بدر کی طرف بڑھے۔ ان کی تعداد اگرچہ صرف 313 تھی۔ ان کے پاس ہتھیار کم تھے۔ مگر اللہ نے ان کی خصوصی مدد فرمائی۔ انھوں نے قریش کے لشکر کو بری طرح شکست دی۔ ان کے ستر سردار قتل ہوئے اور ستر گرفتار کرلیے گئے۔ بدر کا میدان کفر کے مقابلہ میں اسلام کی فتح کا میدان بن گیا— جب بھی ایسا ہو کہ ایک طرف مادی فائدہ ہو اور دوسری طرف دینی فائدہ تو یہ تقسیم خود اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا کی مرضی دینی فائدہ کی طرف ہے، نہ کہ مادی فائدہ کی طرف۔

اسلامی جدوجہد کا نشانہ کبھی معاشی مفاد حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ اسلامی جدوجہد کا نشانہ ہمیشہ باطل کا زور توڑنا ہوتا ہے۔ خواہ وہ نظریاتی طاقت کے ذریعہ ہو یا حالات کے اعتبار سے مادی طاقت کے ذریعہ۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴿۹﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ

۹۔ جب تم اپنے رب سے فریاد کررہے تھے تو اس نے تمھاری فریادسنی کہ میں تمھاری مدد کے لیے ایک ہزار فرشتے لگاتار بھیج رہا ہوں۔ ۱۰۔ اور یہ اللہ نے صرف اس لیے کیا تاکہ تمھارے لیے خوش

قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝١٠ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ ع ١٥
اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً
لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ
وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ
الْاَقْدَامَ ۝١١ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ
اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ
فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا
فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ
بَنَانٍ ۝١٢ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝١٣ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ
اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝١٤

خبری ہو اور تاکہ تمھارے دل اس سے مطمئن ہوجائیں۔ اور مدد تو اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے۔ یقینا اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔
۱۱۔ جب اللہ نے تم پر اونگھ ڈال دی اپنی طرف سے تمھاری تسکین کے لیے اور آسمان سے تمھارے اوپر پانی اتارا تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ تمھیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کردے اور تمھارے دلوں کو مضبوط کردے اور اس سے قدموں کو جمادے۔ ۱۲۔ جب تیرے رب نے فرشتوں کو حکم بھیجا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں، تم ایمان والوں کو جمائے رکھو۔ میں منکروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا۔ پس تم ان کی گردن کے اوپر مارو اور ان کے پور پور پر ضرب لگاؤ۔ ۱۳۔ یہ اس سبب سے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔ ۱۴۔ یہ تو اب چکھو اور جان لو کہ منکروں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔

بدر کی لڑائی بڑے نازک حالات میں ہوئی۔ تقریباً ایک ہزار مسلّح دشمنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف 313 تھی۔ ان کے پاس ہتھیار بھی کم تھے۔ اس قسم کے حالات دیکھ کر بعض مسلمانوں کے دل میں یہ وسوسہ آنے لگا کہ جس مشن کے لیے وہ اپنی زندگی ویران کر رہے ہیں اس کے ساتھ شاید خدا کی مدد شامل نہیں۔ اگر وہ حق ہوتا تو ایسے نازک موقع پر خدا کیوں ان کا ساتھ نہ دیتا۔ کیوں اسباب کے اعتبار سے دشمن برتر نظر آرہے ہیں۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے بدر کے علاقہ میں زور کی بارش برسائی۔ مسلمانوں نے حوض بنا بنا کر بارش کا پانی جمع کرلیا۔ دشمن نے مسلمانوں کو زمین کے پانی سے محروم کیا تھا، خدا نے ان کے لیے آسمان سے پانی کا انتظام کردیا۔ اسی طرح خدا نے یہ غیر معمولی انعام فرمایا کہ مسلمانوں کے اوپر نیند طاری کردی۔ سونا آدمی کے تازہ دم ہونے کے لیے بہت ضروری ہے۔ مگر میدان جنگ کے حالات اس قدر وحشت ناک ہوتے ہیں کہ آدمی کی نیند اڑ جاتی ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یہ خصوصی مدد فرمائی کہ جنگ کے دن سے پہلے والی رات کو ان پر

نیند طاری کردی۔ وہ رات کو ذہنی بوجھ سے فارغ ہو کر سو گئے اور صبح کو پوری طرح تازہ دم ہو کر اٹھے — جو حالات مسلمانوں کے اندر وسوسہ پیدا کرنے کا سبب بن رہے تھے، انھیں حالات کے اندر خدا نے ایسے امکانات پیدا کردیے کہ ان کے اندر نیا یقین واعتماد ابھر آیا۔

مقابلہ کے وقت اہل حق سے جو چیز مطلوب ہے وہ ثابت قدمی ہے۔ انھیں کسی حال میں بد دل نہیں ہونا چاہیے۔ اس ثابت قدمی کا نقد انعام خدا کی طرف سے یہ ملتا ہے کہ دشمنانِ حق کے دلوں میں رعب ڈال دیا جاتا ہے۔ اور جو گروہ اپنے حریف سے مرعوب ہو جائے اس کو کوئی چیز شکست سے نہیں بچا سکتی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٦﴾

۱۵۔ اے ایمان والو، جب تمھارا مقابلہ منکرین سے میدانِ جنگ میں ہو تو ان سے پیٹھ مت پھیرو۔
۱۶۔ اور جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری، سوا اس کے کہ جنگی چال کے طور پر ہو یا دوسری فوج سے جا ملنے کے لیے، تو وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

اسلام اور غیر اسلام کا ٹکراؤ جب جنگ کے میدان تک پہنچ جائے تو یہ گویا دونوں فریقوں کے لیے آخری فیصلہ کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے نازک لمحہ میں اگر کوئی شخص یا گروہ ایسا کرے کہ عین معرکہ کے وقت وہ میدان چھوڑ کر بھاگے تو اس نے بدترین جرم کیا۔ ایک طرف اس نے حق کو بچانے کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بچانے کو زیادہ اہم سمجھا، اس نے اپنے مقصد کے مقابلہ میں اپنی ذات کو ترجیح دی۔ اور یہ سب کچھ اس نے اس وقت کیا جب کہ اس حق کی زندگی کی بازی لگی ہوئی تھی جس کو اعلیٰ ترین صداقت قرار دے کر وہ اس پر ایمان لایا تھا۔

دوسرے یہ کہ ایسے نازک موقع پر اکثر ایک چھوٹا سا واقعہ بہت بڑے واقعہ کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک شخص یا ایک گروہ کا میدان چھوڑ کر بھاگنا پوری فوج کا حوصلہ توڑ دیتا ہے۔ ایک شخص کی بھگدڑ بالآخر عام بھگدڑ کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور ہنگامی حالات میں جب کسی مجمع میں عام بھگدڑ شروع ہو جائے تو وہ اپنی آخری حد پر پہنچنے سے پہلے کہیں نہیں رکتی۔

اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورت ہے جب کہ کوئی سپاہی یا سپاہیوں کا کوئی دستہ جنگی تدبیر کے لیے پیچھے ہٹتا ہے یا وہ اپنے ایک مورچہ سے ہٹ کر کسی دوسرے مورچہ کی طرف سمٹنا چاہتا ہے۔ فرار کے طور پر اگر کوئی پیچھے ہٹتا ہے تو وہ بلاشبہ ناقابل معافی جرم کرتا ہے۔ مگر جو پیچھے ہٹنا تدبیر جنگ سے تعلق رکھتا ہو، وہ جائز ہے۔ اس کے لیے آدمی پر کوئی الزام نہیں۔

مذکورہ حکم اصلاً جنگ سے متعلق ہے۔ تاہم دوسری مشابہ صورتیں بھی درجہ بدرجہ اسی کے ذیل میں آسکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص بے آمیز اسلام کے خاموش اور تعمیری عمل کی طرف لوگوں کو پکارے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد جب وہ

دیکھے کہ اس کی دعوت لوگوں میں زیادہ مقبول نہیں ہو رہی ہے تو وہ بے صبری کا شکار ہو جائے اور خاموش تعمیر کے محاذ کو چھوڑ کر ایسے اسلام کی طرف دوڑے جس کے ذریعے عوام میں بہت جلد شہرت اور مرتبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جنگ کے میدان سے بھاگنا شعور اور ارادہ کے تحت ہوتا ہے۔ مگر جنگی میدان کے باہر جو معرکہ جاری ہے اس سے ''بھاگنا'' ایک غیر شعوری واقعہ ہے۔ آدمی طبعی طور پر نتیجہ پسند واقع ہوا ہے۔ وہ اپنے کام کا اعتراف چاہتا ہے۔ اس کا یہ مزاج غیر شعوری طور پر اس کو ان کاموں سے ہٹا دیتا ہے جن میں فوری نتیجہ نکلتا ہوا نظر نہ آتا ہو۔ وہ اپنے اندر کام کرنے والے غیر شعوری اثرات کے تحت ان چیزوں کی طرف کھنچ اٹھتا ہے جن میں بظاہر یہ امید ہو کہ فوراً عزت و کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ اس قسم کا ہر انحراف اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسی نوعیت کی چیز ہے جس کو مذکورہ آیت میں میدان مقابلہ سے بھاگنا کہا گیا ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع

۱۷۔ پس ان کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا۔ اور جب تو نے ان پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تا کہ اللہ اپنی طرف سے ایمان والوں پر خوب احسان کرے۔ بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۱۸۔ یہ تو ہو چکا۔ اور بے شک اللہ منکرین کی تمام تدبیریں بے کار کر کے رہے گا۔ ۱۹۔ اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا۔ اور اگر تم باز آ جاؤ تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے اور تمھارا جتھا تمھارے کچھ کام نہ آئے گا خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ہو۔ اور بے شک اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ جب بدر کا معرکہ گرم ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دعا کرتے ہوئے یہ الفاظ نکلے: يَا رَبُّ إِنْ تَهْلِكْ هَذِهِ الْعِصَابَةُ فَلَنْ تُعْبَدَ فِي الْأَرْضِ أَبَدًا (دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 79)۔ یعنی، اے میرے رب، اگر یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو کبھی زمین پر تیری پرستش نہ ہو گی۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ میں مٹھی بھر خاک لی اور اس کو مشرکین کی طرف پھینکتے ہوئے کہا: شَاهَتِ الْوُجُوهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 2762)۔ یعنی، چہرے بگڑ جائیں۔ اس کے بعد کافروں کے لشکر کا یہ حال ہوا جیسے سب کی آنکھوں میں ریت پڑ گئی ہو۔ چنانچہ مسلمانوں نے نہایت آسانی سے جس کو چاہا قتل کیا اور جس کو چاہا گرفتار کر لیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے کہ وہ اہلِ ایمان کی مدد کرتا ہے۔ ان کے دشمن خواہ کتنی ہی سازش کریں وہ ان کی

سازشوں کو اپنی تدبیروں سے بے اثر کر دیتا ہے۔ وہ ان کو مغلوب کر کے اہل ایمان کو ان کے اوپر غالب کر دیتا ہے۔ مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ اہلِ ایمان اپنے ارادہ کو خدا کے ارادہ میں اس طرح ملا دیں کہ خدا کی منشا اور اہلِ ایمان کی منشا دونوں ایک ہو جائے۔ جب بندہ اس طرح اپنے آپ کو خدا کے مطابق کر لیتا ہے تو جو کچھ خدا کا ہے وہ اس کا ہو جاتا ہے کیوں کہ جو کچھ اس کا ہے وہ خدا کو دے چکا ہوتا ہے۔

بدر کے لیے روانگی سے پہلے مکہ کے سردار بیت اللہ گئے اور کعبہ کے پردہ کو پکڑ کر یہ دعا کی: خدایا، اس کی مدد کر جو دونوں لشکروں میں سب سے اعلیٰ ہو، جو دونوں گروہوں میں سب سے معزز ہو، جو دونوں قبیلوں میں سب سے بہتر ہو (اللّٰهُمَّ انْصُرْ أَعْلَى الْجُنْدَيْنِ، وَأَكْرَمَ الْفِئَتَيْنِ، وَخَيْرَ الْقَبِيلَتَيْنِ) تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 33۔ بدر کی لڑائی میں سرداران مکہ کو کامل شکست اور اہلِ ایمان کو کامل فتح ہوئی۔ اس طرح خود سرداران مکہ کے معیار کے مطابق یہ ثابت ہو گیا کہ خدا کے نزدیک اعلیٰ واشرف گروہ وہ نہیں ہیں بلکہ اہلِ اسلام ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ جو لوگ ایسا کریں ان کے لیے آخرت میں سخت ترین عذاب ہے اور اسی کے ساتھ دنیا میں بھی۔

"دونوں میں جو سب سے اعلیٰ اور سب سے اشرف ہو اس کو فتح دے"— یہ بظاہر دعا تھی مگر حقیقۃً وہ اپنے حق میں پُرفخر اعتماد کا اظہار تھا۔ اس کے پیچھے ان کی یہ نفسیات کام کر رہی تھی کہ ہم کعبہ کے پاسبان ہیں۔ ہم ابراہیم واسماعیل سے نسبت رکھنے والے ہیں۔ جب ہمارے ساتھ اتنی بڑی فضیلتیں جمع ہیں تو جیت بہر حال ہماری ہونی چاہیے۔ مگر خدا کے یہاں ذاتی عمل کی قیمت ہے، نہ کہ خارجی انتسابات کی۔ خارجی انتساب خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو آدمی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿٢١﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾

۲۰۔ اے ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو حالاں کہ تم سن رہے ہو۔ ۲۱۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سنا، حالاں کہ وہ نہیں سنتے۔ ۲۲۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۲۳۔ اور اگر ان میں کسی بھلائی کا علم اللہ کو ہوتا تو وہ ضرور انھیں سننے کی توفیق دیتا اور اگر اب وہ انھیں سنوا دے تو وہ ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے۔

آدمی کے سامنے جب حق بات پیش کی جائے تو ایک صورت یہ ہے کہ وہ اس کو ان تمام صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے سنے جو خدا نے اس کو بحیثیت انسان عطا کی ہیں۔ وہ اس پر پوری طرح دھیان دے۔ وہ اس

کی صداقت کے وزن کو محسوس کرلے۔ اور پھر اپنی زبان سے وہ صحیح جواب پیش کرے جو ایک حق کے مقابلہ میں انسان کی فطرت کو پیش کرنا چاہیے۔ جو شخص ایسا کرے اس نے گویا پیش کی ہوئی بات کو انسان کی طرح سنا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس کو اس طرح سنے جیسے کہ اس کے پاس سننے کے لیے کان نہیں ہیں۔ اس کے سمجھنے کی صلاحیت اس کی سچائی کو پکڑنے سے عاجز رہ جائے۔ وہ اپنی زبان سے وہ صحیح جواب پیش نہ کرسکے جو اس کو ازروئے واقعہ پیش کرنا چاہیے۔ جو شخص ایسا کرے اس نے گویا پیش کی ہوئی بات کو جانور کی طرح سنا۔

کوئی بات خواہ وہ کتنی ہی برحق ہو اس کی حقانیت صرف اسی شخص پر کھلتی ہے جو دل کی آمادگی کے ساتھ اس کو سنے۔ اس کے برعکس، جو شخص حسد، کبر، مصلحت اندیشی اور ظاہر پرستی کا مزاج اپنے اندر لیے ہوئے ہو وہ سچائی کو قابل غور نہیں سمجھے گا، وہ اس کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنے گا، اس لیے وہ اس کی صداقت کو پانے میں بھی یقینی طور پر ناکام رہے گا۔

ایمان بظاہر ایک قول ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک انسانی فیصلہ ہے۔ ایمان محض شہادت کے الفاظ کی تکرار نہیں بلکہ اپنی معنوی حالت کا لفظی اظہار ہے۔ اگر آدمی کی حالت فی الواقع وہی ہو جس کا وہ ان الفاظ کے ذریعے اعلان کررہا ہے تو وہ خدا کی نظر میں حقیقی مومن ہے۔ مومن سنجیدہ ترین انسان ہے اور سنجیدہ انسان کبھی ایسا نہیں کرسکتا کہ اس کی اندرونی حالت کچھ ہو اور بولے ہوئے الفاظ میں وہ اپنے کو کچھ ظاہر کرے۔

جس آدمی کا ایمان اپنی اندرونی حقیقت کے اعلان کے ہم معنی ہو وہ ایمان کا اقرار کرتے ہی عملاً خدا کو اپنا معبود بنالے گا اور اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اس کی پیروی کرنے والا بن جائے گا۔ زبان سے ایمان کا اقرار اس کے لیے اپنی سمت سفر بتانے کے ہم معنی ہوگا، نہ کہ کسی قسم کے لسانی تلفظ کے ہم معنی۔ اس کے برعکس، حالت اس شخص کی ہے جس نے بات سنی۔ وہ اس کے دلائل کے مقابلہ میں لاجواب بھی ہوگیا۔ مگر وہ اس کی روح میں نہیں اتری۔ وہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں شامل نہیں ہوئی۔ تاہم اوپری طور پر اس نے زبان سے کہہ دیا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ مگر اس کی واقعی زندگی اس کے بعد بھی ویسی ہی رہی جیسی کہ وہ اس سے پہلے تھی۔ یہ دوسری نفاق کی صورت ہے اور خدا کے یہاں ایسے منافقانہ ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۖ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾

۲۴۔ اے ایمان والو، اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تم کو اس چیز کی طرف بلا رہا ہے جو تم کو زندگی دینے والی ہے۔ اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ اسی کی طرف تمھارا اکٹھا ہونا ہے۔ ۲۵۔ اور ڈرو اس فتنہ سے جو خاص انھیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

''زندگی کی پکار'' سے مراد یہاں جہاد کی پکار ہے۔ یعنی حق کو دوسروں تک پہنچانے کی جدوجہد۔ یہ جدوجہد ابتداءً زبان وقلم کے ذریعہ تلقین کی صورت میں شروع ہوتی ہے۔ مگر مدعو کا مخالفانہ ردعمل اس کو مختلف مراحل تک پہنچادیتا ہے، حتی کہ ہجرت اور جنگ تک بھی۔

آدمی انفرادی سطح پر اپنے خیال کے مطابق ایک دینی زندگی بناتا ہے۔ اس زندگی کو وہ اپنے حالات سے اس طرح مطابق کرلیتا ہے کہ وہ اس کو عافیت کا جزیرہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھتا تو اس کا بنابنایا آشیانہ اجڑ جائے گا۔ اس کی لگی بندھی زندگی بے ترتیب ہوکر رہ جائے گی۔ اس کے وقت اور اس کے مال کا وہ نظام باقی نہ رہے گا، جو اس نے اپنے ذاتی تقاضوں کے تحت بنا رکھا ہے۔

اس قسم کے اندیشے اس کے لیے دعوت واصلاح کی جدوجہد میں نکلنے اور اس کی راہ میں جان ومال پیش کرنے کے لیے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ مگر یہ سراسر نادانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس عافیت کدہ کو اپنے لیے زندگی سمجھ رہا ہے، وہ اس کا قبرستان ہے۔ اور جس قربانی میں اس کو اپنی موت نظر آتی ہے اسی میں اس کی زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔

دعوت واصلاح کا عمل، بشرطیکہ وہ آخرت کے لیے ہو، نہ کہ دنیوی مقاصد کے لیے، انتہائی اہم عمل ہے۔ وہ آدمی کے مُردہ دین کو زندہ دین بناتا ہے۔ وہ اعلیٰ ترین سطح پر انسان کو خدا سے جوڑتا ہے۔ وہ ان قیمتی دینی تجربات سے آدمی کو آشنا کرتا ہے جو انفرادی خول میں رہ کر کبھی حاصل نہیں ہوتے۔ خدا کی طرف سے اتنی اہم پکار کو سن کر جو لوگ اس کے بارے میں بے توجہ رہیں، وہ یہ خطرہ مول لے رہے ہیں کہ ان کے اور حق کے درمیان ایک نفسیاتی آڑ کھڑی ہوجائے۔ ان کی یہ فطری صلاحیت ہمیشہ کے لیے کُند ہوجائے کہ وہ حق کی پکار سنیں اور اس کی طرف دوڑ کر اپنے رب کو پالیں۔

انسان کی زندگی ایک سماجی زندگی ہے۔ کوئی شخص اس کے اندر اپنا انفرادی جزیرہ بنا کر نہیں رہ سکتا۔ اگر ایک شخص ذاتی دین داری پر قانع ہے تو وہ ہر وقت اس اندیشہ میں ہے کہ اجتماعی بگاڑ کے نتیجہ میں کوئی عمومی آگ پھیلے اور وہ خود بھی اس کی لپیٹ میں آجائے۔ اصلاحی جدوجہد اصلاح کے ساتھ براءت بھی ہے۔ اگر آدمی اپنی براءت پیش کرنے میں ناکام رہے تو خدا اس کے معاملہ کو کیوں دوسروں سے الگ کرے گا۔

کوئی برائی ہمیشہ چھوٹی سطح سے شروع ہوتی ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے بڑی بن جاتی ہے۔ اگر ایسا ہو کہ برائی جب اپنی ابتدائی حالت میں ہو اسی وقت کچھ لوگ اس کے خلاف اٹھ جائیں تو وہ آسانی کے ساتھ اسے کچل دیں گے۔ لیکن جب برائی پھیل چکی ہو تو اس کی جڑیں اتنی گہری ہوجاتی ہیں کہ پھر اس کو ختم کرنا ممکن نہیں رہتا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي
الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ
فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ
الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٢٦ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا
اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٢٧ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ
اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ
اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝٢٨ ع ٣ ٩ ١٧

۲۶۔اور یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے اور زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ لوگ اچانک تم کو اچک نہ لیں۔ پھر اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور اپنی نصرت سے تمھاری تائید کی اور تم کو پاکیزہ روزی دی تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۲۷۔اے ایمان والو، خیانت نہ کرو اللہ اور رسول کی اور خیانت نہ کرو اپنی امانتوں میں حالاں کہ تم جانتے ہو۔ ۲۸۔اور جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش ہے۔ اور یہ کہ اللہ ہی کے پاس ہے بڑا اجر۔

مکہ میں مسلمان بالکل بےبسی کی حالت میں تھے۔ ہر وقت اندیشہ لگا رہتا کہ کب ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ وہ ایسے کمزور کی مانند تھے جس کو ہر طرح دبایا جاتا ہے اور اس کے جائز حقوق بھی اس کو نہیں دیے جاتے۔ بالآخر ان کے لیے مدینہ کا راستہ کھلا۔ ان کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ مدینہ جا کر اپنا مرکز بنائیں اور وہاں کے ماحول میں آزادی اور عزت کے ساتھ رہیں۔

مشکل کے بعد آسانی فراہم کرنے کا یہ معاملہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔ آدمی کے حالات جب اس حد پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ اپنے آپ کو بےبس محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اچانک خدا کی مدد ظاہر ہو کر حالات کو بدل دیتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے تاکہ آدمی یقین کرے کہ جو کچھ ہوا وہ خدا کی طرف سے ہوا۔ اس احساس کی بنا پر وہ خدا کے انعامات کے جذبہ سے سرشار ہو جائے۔

آدمی خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اس طرح وہ عہد کرتا ہے کہ وہ خدا اور رسول کے راستہ پر چلے گا۔ مگر جب ایمانی طریقہ کو اختیار کرنے میں اس کے مال و اولاد کے تقاضے حائل ہوتے ہیں تو وہ ایمان کے تقاضے کو چھوڑ کر مال و اولاد کے تقاضے کو پکڑ لیتا ہے۔ یہ ایمانی عہد کے ساتھ کھلی ہوئی غداری ہے۔ اس غداری کی شناعت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ آدمی جس چیز کے ساتھ غداری کا معاملہ کر رہا ہے وہ بھی خود خدا کا ایک عطیہ ہے۔

آدمی کا مال اور اس کی اولاد کیا ہے۔ وہ خدا ہی کا دیا ہوا تو ہے۔ وہ بندہ کے پاس خدا کی امانت ہے۔ اس امانت کا اگر کوئی سب سے بہتر مصرف ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ جب دینے والا اس کو مانگے تو اس کو بخوشی اس کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر جب خدا کہتا ہے کہ میرے دین کے لیے اٹھو اور اس میں اپنی اپنی قوتیں لگاؤ تو آدمی اسی امانت کو اپنے لیے عذر بنا لیتا ہے جس کو خدا کے دین کی راہ میں دے کر اسے خدا سے کیے ہوئے عہدِ ایمان کو پورا کرنا تھا — وہ کامیابی کے کنارے پہنچ کر اپنے کو ناکاموں کی فہرست میں لکھوا لیتا ہے۔

کوئی فعل خدا کے یہاں جرم اس وقت بنتا ہے جب کہ یہ جانتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے کہ وہ غلط ہے۔ کسی شخص پر اگر اس کے ایک کام کی غلطی واضح ہو جاتی ہے اور اس کے بعد بھی وہ اس کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہے۔ کیوں کہ غلطی کو غلطی جاننے کے بعد اس کو دہرانا ڈھٹائی ہے اور ڈھٹائی خدا کے یہاں قابل معافی نہیں۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝٢٩ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝٣٠

۲۹۔ اے ایمان والو، اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لیے فرقان بہم پہنچائے گا اور تم سے تمھارے گناہوں کو دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۳۰۔ اور جب منکر تمھاری نسبت تدبیریں سوچ رہے تھے کہ وہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیریں کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر والا ہے۔

فرقان کے معنی ہیں فرق کرنے والی چیز۔ یہاں فرقان سے مراد حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہے۔ آدمی اگر اللہ سے ڈرے، وہ وہی کرے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اس سے بچے جس سے اللہ نے منع کیا ہے تو اس کو اس بات کی توفیق ملتی ہے کہ وہ حق اور باطل کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھ سکے (مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ بِفِعْلِ أَوَامِرِهِ وَتَرْكِ زَوَاجِرِهِ وُفِّقَ لِمَعْرِفَةِ الْحَقِّ مِنَ الْبَاطِلِ) تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 43۔

انسانی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والی سب سے بڑی چیز ڈر ہے۔ جس معاملہ میں انسان کے اندر ڈر کی نفسیات پیدا ہو جائے اس معاملہ میں وہ حد درجہ حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ ڈر کی نفسیات اس کے ذہن کے تمام پردوں کو اس طرح ہٹا دیتی ہے کہ اس بارے میں وہ ہر قسم کی غفلت یا غلط فہمی سے بلند ہو کر صحیح ترین رائے قائم کر سکے۔ یہی معاملہ اس بندۂ خدا کے ساتھ پیش آتا ہے جس کو رب العالمین کے ساتھ تقویٰ (ڈر) کا تعلق پیدا ہو گیا ہو۔

یہ فرقان تقریباً وہی چیز ہے جس کو معرفت یا بصیرت کہا جاتا ہے۔ بصیرت کسی آدمی میں وہ اندرونی روشنی پیدا کرتی ہے کہ وہ ظاہری پہلوؤں سے دھوکا کھائے بغیر ہر بات کو اس کے اصل روپ میں دیکھ سکے۔ جب بھی کوئی آدمی کسی معاملہ میں اپنے کو اتنا زیادہ شامل کرتا ہے کہ وہ اس کی پروا کرنے لگے۔ وہ اس کے بارے میں اندیشہ ناک رہتا ہو تو اس کے بعد اس کے اندر ایک خاص طرح کی حساسیت پیدا ہوتی ہے جو اس کو اس معاملہ کے موافق اور مخالف کی پہچان کرا دیتی ہے۔ یہ فرقانی معاملہ ہر ایک کے ساتھ پیش آتا ہے خواہ وہ ایک مذہبی آدمی

ہو یا ایک تاجر اور ڈاکٹر اور انجینئر۔ کوئی بھی آدمی جب اپنے کام سے تقویٰ (کھٹک) کی حد تک اپنے کو وابستہ کرتا ہے تو اس کو اس معاملہ کی ایسی معرفت ہو جاتی ہے کہ ادھر اُدھر کے مغالطوں میں اُلجھے بغیر وہ اس کی حقیقت تک پہنچ جائے۔

کسی آدمی کے اندر یہ خدائی بصیرت (فرقان) پیدا ہونا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہ برائیوں سے بچے، وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرے اور بالآخر خدا کے فضل کا مستحق بن جائے۔ یہ فرقان (حق و باطل کی نفسیاتی تمیز) پیدا ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو حق کے ساتھ اتنا زیادہ وابستہ کر چکا ہے کہ اس میں اور حق میں کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ اور حق دونوں ایک دوسرے کا مُثنّٰی (counterpart) بن چکے ہیں۔ اس کے بعد اس کا بچایا جانا اتنا ہی ضروری ہو جاتا ہے جتنا حق کو بچایا جانا۔ ایسے لوگ براہِ راست خدا کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ اب ان کے خلاف تدبیریں کرنا خود حق کے خلاف تدبیریں کرنا بن جاتا ہے۔ اور خدا کے خلاف تدبیر کرنے والا ہمیشہ ناکام رہتا ہے خواہ اس نے کتنی ہی بڑی تدبیر کر رکھی ہو۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ
نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣١﴾ وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا
هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً
مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَا كَانَ
اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ
مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَ مَا لَهُمْ اَلَّا
يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ
اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٤﴾ وَ
مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً
وَّ تَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ
تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٥﴾

۳۱۔ اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کر دیں۔ یہ تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں۔ ۳۲۔ اور جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ، اگر یہی حق ہے تیرے پاس سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا اور کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ ۳۳۔ اور اللہ ایسا کرنے والا نہیں کہ ان کو عذاب دے اس حال میں کہ تم ان میں موجود ہو اور اللہ ان پر عذاب لانے والا نہیں جب کہ وہ استغفار کر رہے ہوں۔ ۳۴۔ اور اللہ ان کو کیوں نہ عذاب دے گا حالاں کہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں جب کہ وہ اس کے متولی نہیں۔ اس کے متولی تو صرف اللہ سے ڈرنے والے ہو سکتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے۔ ۳۵۔ اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ پس اب چکھو عذاب اپنے کفر کا۔

ہم بھی ایسا کلام بنا سکتے ہیں، ہم ناحق پر ہیں تو ہمارے اوپر پتھر کیوں نہیں برستا— یہ سب گھمنڈ کی باتیں ہیں۔ آدمی جب دنیا میں اپنے کو محفوظ حیثیت میں پاتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ حق کا انکار کرنے یا اس کو نظر انداز کرنے سے اس کا کچھ نہیں بگڑا تو اس کے اندر جھوٹے اعتماد کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ بالکل درست ہے۔ اس کا یہ احساس اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلواتا ہے جو عام حالات میں کسی کی زبان سے نہیں نکلتے۔

اس قسم کے لوگوں میں یہ دلیری خدا کے قانونِ مہلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا یقیناً مجرموں کو سزا دیتا ہے مگر خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ آدمی کو ہمیشہ اس وقت پکڑتا ہے جب کہ اس کے اوپر حق و باطل کی وضاحت کا کام مکمل طور پر انجام دے دیا گیا ہو۔ اس کام کی تکمیل سے پہلے کسی کو ہلاک نہیں کیا جاتا۔ نیز یہ کہ دعوتی عمل کے درمیان اگر ایک ایک دو دو آدمی اس سے متاثر ہو کر اپنی اصلاح کر رہے ہوں تب بھی سزا کا نزول رکا رہتا ہے تاکہ یہ عمل اس حد تک مکمل ہو جائے کہ جتنی سعید روحیں ہیں سب اس سے باہر آچکی ہوں۔

امتوں میں بگاڑ آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ ان کے درمیان سے دین کی صورتیں مٹ جائیں۔ بگاڑ کے زمانہ میں ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ خوفِ خدا والا دین جاتا رہتا ہے اور اس کی جگہ دھوم والا دین آجاتا ہے۔ اب قوم کے پاس عمل نہیں ہوتا بلکہ ماضی کی شخصیتیں اور ان کے نام پر قائم شدہ گدّیاں ہوتی ہیں۔ لوگ ان شخصیتوں اور ان گدیوں سے وابستہ ہو کر سمجھتے ہیں کہ ان کو وہی عظمت حاصل ہو گئی ہے جو تاریخی اسباب سے خود ان شخصیتوں اور گدیوں کو حاصل ہے۔ لوگ اندر سے خالی ہوتے ہیں مگر بڑے بڑے ناموں پر نمائشی اعمال کر کے سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا دینی کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

مکہ کے لوگ اسی قسم کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ ان کو فخر تھا کہ وہ بیت اللہ کے وارث ہیں۔ ابراہیم و اسماعیل جیسے جلیل القدر پیغمبروں کی امت ہیں۔ ان کو کعبہ کے خادم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب ان کو اتنے دینی اعزازات حاصل ہیں اور وہ اتنے بڑے بڑے دینی کارنامے انجام دے رہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ خدا ان کو جہنم میں ڈال دے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۝۳۶ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ

۳۶۔ جن لوگوں نے انکار کیا وہ اپنے مال کو اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ وہ اس کو خرچ کرتے رہیں گے پھر یہ ان کے لیے حسرت بنے گا پھر وہ مغلوب کیے جائیں گے۔ اور جنھوں نے انکار کیا، ان کو جہنم کی طرف

الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝37

اکٹھا کیا جائے گا۔ ۳۷۔ تا کہ اللہ ناپاک کو الگ کردے پاک سے اور ناپاک کو ایک پر ایک رکھے پھر اس ڈھیر کو جہنم میں ڈال دے، یہی لوگ ہیں خسارہ میں پڑنے والے۔

انسانوں میں کچھ پاک ہیں اور کچھ ناپاک۔ کچھ روحوں کی غذا وہ چیزیں ہوتی ہیں جو خدا کو پسند ہیں اور کچھ روحوں کو ان چیزوں میں لذت ملتی ہے جو ان کے نفس کو یا شیطان کو مرغوب ہیں۔

عام حالات میں یہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے سے ملے رہتے ہیں۔ بظاہر ان میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان حق و باطل کی کش مکش برپا کرتا ہے تا کہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور یہ معلوم ہو جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔

اس کش مکش کے دوران کھل جاتا ہے کہ کون حق کے سامنے آنے کے بعد فوراً اس کو مان لیتا ہے اور کون وہ ہے جو اس کا انکار کر دیتا ہے۔ کون دوسروں کے ساتھ معاملہ پڑنے پر انصاف کی حد پر قائم رہتا ہے اور کون بے انصافی پر اتر آتا ہے۔ کون خدا کی زمین میں متواضع بن کر رہتا ہے اور کون سرکش بن کر۔ کون سچائی کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے والا ہے اور کون تعصب اور نمائش کی راہ میں۔

جو لوگ حق کو چھوڑ کر دوسری راہوں میں اپنی کوششیں صرف کرتے ہیں ان کے اس عمل کو شیطان ان کی نظر میں اس طرح حسین بناتا رہتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اعلیٰ کارنامے انجام دے رہے ہیں، وہ شان دار مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر اس غلط فہمی کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ بہت جلد آدمی پر وہ وقت آجاتا ہے جب کہ وہ جان لیتا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ صرف اپنی قوت اور اپنے مال کو ضائع کرنا تھا، وہ جس مستقبل کی طرف بڑھ رہا تھا وہ حسرت اور مایوسی کا مستقبل تھا، اگرچہ جھوٹی خوش فہمی کے تحت وہ اس کو روشن مستقبل کی طرف سفر کے ہم معنی سمجھتا رہا تھا۔

بے آمیز حق کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ تمام لوگ اپنے اوپر اس کی زد پڑتی ہوئی محسوس کرتے ہیں جو ملاوٹی دین کی بنیاد پر سرداری قائم کیے ہوئے تھے۔ وہ اس رواجی ڈھانچہ کی حفاظت میں اپنی ساری طاقت خرچ کر دیتے ہیں جس کے اندر انھیں بڑائی کا مقام حاصل ہے۔ مگر ایسے لوگ بے آمیز حق کے مقابلہ میں لازماً ناکام ہوتے ہیں، کبھی دلیل کے میدان میں اور کبھی اسی کے ساتھ عمل کے میدان میں بھی۔

موجودہ دنیا کے ہنگامے صرف اس لیے جاری کیے گئے ہیں کہ پاک روحوں اور ناپاک روحوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ یہ چھانٹنے کا عمل جب پورا ہو جائے گا تو خدا پاک روحوں کو جنت میں داخل کر دے گا اور ناپاک روحوں کو ایک ساتھ جمع کر کے جہنم میں دھکیل دے گا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا
قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ
سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٣٨ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا
تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ
انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٣٩ وَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى
وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝٤٠

۳۸۔ انکار کرنے والوں سے کہو کہ اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے وہ انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہ پھر وہی کریں گے تو ہمارا معاملہ اگلوں کے ساتھ گزر چکا ہے۔ ۳۹۔ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے ان کے عمل کا۔ ۴۰۔ اور اگر انھوں نے اعراض کیا تو جان لو کہ اللہ تمھارا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مولیٰ ہے اور کیا ہی اچھا مددگار۔

اسلام کا اصول یہ ہے کہ جو شخص جیسا عمل کرے اس کے مطابق وہ اپنا بدلہ پائے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس عام اصول میں اپنی رحمت سے ایک خاص استثناء رکھا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی جب ''توبہ'' کرلے تو اس کے بعد اس کے پچھلے اعمال پر اس کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ ایک شخص خدا سے دوری کی زندگی گزار رہا تھا۔ پھر اس کو ہدایت کی روشنی ملی۔ اس نے سچا مومن بن کر صالح زندگی اختیار کرلی تو اس سے پہلے اس نے جو برائیاں کی تھیں وہ سب معاف کر دی جائیں گی۔ اس کے پچھلے گناہوں کی بنا پر اس کو نہیں پکڑا جائے گا۔

ٹھیک یہی اصول اجتماعی اور سیاسی معاملہ میں بھی ہے۔ کسی مقام پر حق اور باطل کی کش مکش برپا ہوتی ہے، آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے، اس ٹکراؤ کے دوران باطل کے علم بردار حق کے لیے اٹھنے والوں پر ظلم کرتے ہیں۔ بالآخر جنگ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ حق پرست غالب آجاتے ہیں اور ناحق کے علم بردار مغلوب ہو کر زیر کر دیے جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی اسلام کا اصول وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ یعنی فتح کے بعد پچھلے ظلم وستم پر کسی کو سزا نہیں دی جائے گی۔ البتہ جو شخص فتح کے بعد کوئی ایسی حرکت کرے جو اسلامی قانون میں جرم قرار دی گئی ہو تو ضرور کارروائی کے بعد اس کو وہ سزا ملے گی جو شریعت نے ایسے ایک مجرم کے لیے مقرر کی ہے۔

فتنہ کا مطلب ستانا (persecution) ہے۔ قدیم زمانہ میں سرداری اور حکومت شرک کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ آج حکومت کرنے والے عوام کے نمائندہ بن کر حکومت کرتے ہیں۔ ماضی میں خدا یا خدا کے شریکوں کا نمائندہ بن کر لوگ حکومت کیا کرتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں شرک کو قدیم سماج میں بااقتدار حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اہل شرک اہل توحید کو ستاتے رہتے تھے۔ اللہ نے اپنے رسول اور آپ کے ساتھیوں کو حکم دیا کہ شرک اور اقتدار کے باہمی تعلق کو توڑ دو تاکہ مشرکین اہل توحید کو ستانے کی طاقت سے محروم ہوجائیں۔ چنانچہ آپ کے ذریعہ جو عالمی انقلاب آیا اس نے ہمیشہ کے لیے شرک کا رشتہ سیاسی نظام سے ختم کر دیا۔ اب شرک ساری دنیا میں صرف ایک مذہبی عقیدہ ہے، نہ کہ وہ سیاسی نظریہ جس کی بنیاد پر حکومتوں کا قیام عمل میں آتا ہے۔

تاہم جہاں تک عرب کا تعلق ہے وہاں یہ مقصد دہری صورت میں مطلوب تھا، یہاں شرک اور مشرکین دونوں کو ختم کرنا تھا تاکہ حرمین کے علاقہ کو ابدی طور پر خالص توحید کا مرکز بنا دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جزیرہ عرب سے مشرکین کو نکال دو۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شروع ہوا اور حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں اپنی تکمیل کو پہنچا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۱

☆۴۱۔ اور جان لو کہ جو کچھ مال غنیمت تمھیں حاصل ہو، اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لیے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر اتاری فیصلہ کے دن، جس دن کہ دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

غنیمت عربی زبان میں اس مال کو کہتے ہیں جو میدانِ جنگ میں دشمن سے لڑ کر حاصل کیا گیا ہو۔ قدیم زمانہ میں یہ رواج تھا کہ جنگ کے بعد دشمن کی جو چیز جس کے ہاتھ لگے وہ اسی کی سمجھی جائے۔ اسلام نے یہ اصول مقرر کیا کہ ہر ایک کو جو کچھ ملا وہ سب کا سب لا کر امیر کے پاس جمع کرے، کوئی شخص سوئی کا دھاگا تک چھپا کر نہ رکھے۔

اس طرح سارا مالِ غنیمت اکھٹا کرنے کے بعد اس میں سے پانچواں حصہ خدا کا ہے جس کو رسول نیابت کے طور پر وصول کرکے پانچ جگہ اس طرح خرچ کرے گا کہ — ایک حصہ اپنی ذات پر، پھر اپنے ان رشتہ داروں پر جنھوں نے رشتہ کی بنیاد پر مشکل وقتوں میں آپ کے دینی مشن میں آپ کا ساتھ دیا، اور یتیموں پر اور حاجت مندوں پر اور مسافروں پر — اس کے بعد بقیہ چار حصے کو تمام فوجیوں کے درمیان اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ سوار کو دو حصہ ملے اور پیدل کو ایک حصہ۔

اسلام یہ ذہن بنانا چاہتا ہے کہ آدمی جو چیز پائے اس کو وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھے۔ اس دنیا میں کسی واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے بے شمار اسباب کی بیک وقت موافقت ضروری ہے جو کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ بدر کی لڑائی میں ایک بے حد طاقت ور گروہ کے مقابلہ میں ایک کمزور گروہ کا فیصلہ کن طور پر غلبہ پانا اس بات کا ایک غیر معمولی ثبوت تھا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوا ہے۔ ایسی حالت میں فتح کے بعد ملی ہوئی چیز کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھنا عین اس حقیقت کو ماننا تھا جو واقعات کے نتیجے میں فطری طور پر سامنے آئی ہے۔

مال غنیمت میں دوسرے مستحق بھائیوں کا حصہ رکھنا اس بات کا سبق ہے کہ اموال میں حق دار ہونے کی بنیاد صرف محنت اور وراثت نہیں بلکہ ایسی بنیادیں بھی ہیں جو محنت اور وراثت جیسی چیزوں کے دائرہ میں نہیں آتیں۔ استحقاق کی

ان دوسری مدوں کا اعتراف گویا اس واقعہ کا عملی اعتراف ہے کہ آدمی چیزوں کو خدا کی چیز سمجھتا ہے، نہ کہ اپنی چیز۔

غنیمت کے اس قانون میں تیسرا زبردست سبق یہ ہے کہ ملکیت کی بنیاد قبضہ نہیں بلکہ اصول ہے۔ کوئی شخص محض اس بنا پر کسی چیز کا مالک نہیں بن جائیگا کہ وہ اتفاق سے اس کے قبضہ میں آگئی ہے۔ قبضہ کے باوجود آدمی کو چاہیے کہ وہ اس چیز کو ذمہ دار افراد کے حوالے کردے اور اصولی اور قانونی بنیاد پر اس کو جتنا ملنا چاہیے اس کو لے کر اس پر راضی ہوجائے۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَ الرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَ لٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۟ۙ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَ لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ ع

۴۲۔ اور جب کہ تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر۔ اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔ اور اگر تم اور وہ وقت مقرر کرتے تو ضرور اس تقرر کے بارے میں تم میں اختلاف ہوجاتا۔ لیکن جو ہوا وہ اس لیے ہوا تاکہ اللہ اس امر کا فیصلہ کردے جس کو ہو کر رہنا تھا، تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے، وہ روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جس کو زندگی حاصل کرنا ہے، وہ روشن دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ یقیناً اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۴۳۔ جب اللہ تمھارے خواب میں ان کو تھوڑا دکھاتا رہا۔ اگر وہ ان کو زیادہ دکھادیتا تو تم لوگ ہمت ہار جاتے اور آپس میں جھگڑنے لگتے اس معاملہ میں۔ لیکن اللہ نے تم کو بچالیا۔ یقیناً وہ دلوں تک کا حال جانتا ہے۔ ۴۴۔ اور جب اللہ نے ان لوگوں کو تمھاری نظر میں کم کر کے دکھایا اور تم کو ان کی نظر میں کم کر کے دکھایا تاکہ اللہ اس امر کا فیصلہ کردے جس کا ہونا طے تھا۔ اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا لوگوں پر پوری طرح کھل جائے۔ یہ کام ابتداءً دعوت کے ذریعہ دلائل کی زبان میں ہوتا ہے۔ داعی طاقت ور اور عام فہم دلائل کے ذریعہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کرتا ہے۔ احقاق حق اور ابطال باطل کے اس کام کی تکمیل بالآخر غیر معمولی واقعات سے کی

جاتی ہے، خواہ یہ غیر معمولی واقعہ کوئی آسمانی معجزہ ہو یا زمینی غلبہ۔ بدر کی جنگ میں یہی دوسرا واقعہ پیش آیا۔

قریش مکہ سے اس لیے نکلے کہ شام سے آنے والے اپنے تجارتی قافلہ کی مدد کریں۔ مسلمان مدینہ سے اس لیے نکلے کہ تجارتی قافلہ پر حملہ کریں۔ تجارتی قافلہ معروف راستہ کو چھوڑ کر سمندری ساحل سے گزرا اور بچ گیا۔ اور یہ دونوں فریق بدر پہنچ کر آمنے سامنے ہو گئے۔ یہ اللہ کی تدبیر سے ہوا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اہل ایمان کو فتح دی گئی۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن کی صداقت لوگوں پر پوری طرح کھل گئی۔ جو لوگ سچے طالب تھے ان پر آخری حد تک یہ بات واضح ہو گئی کہ یہی حق ہے۔ اور جو لوگ اپنے اندر کسی قسم کی نفسیاتی پیچیدگی لیے ہوئے تھے انھوں نے اس کے بعد بھی اپنے مسلک پر قائم رہ کر ثابت کر دیا کہ وہ اسی قابل ہیں کہ انھیں ہلاک کر دیا جائے۔

بدر میں قریش کی فوج کی تعداد زیادہ تھی۔ اگر مسلمان ان کی اصل تعداد کو دیکھتے تو کوئی کہتا کہ لڑو اور کوئی کہتا کہ نہ لڑو۔ اس طرح اختلاف پیدا ہو جاتا اور اصل کام ہونے سے رہ جاتا۔ خدا نے حسب موقع کبھی تعداد گھٹا کر دکھائی اور کبھی بڑھا کر۔ اس طرح ممکن ہو سکا کہ تمام مسلمان بے جگری کے ساتھ لڑیں۔ خدا کو جب کوئی کام مطلوب ہوتا ہے تو وہ اسی طرح اپنی مدد بھیج کر اس کام کی تکمیل کا سامان کر دیتا ہے۔

عمل کے دوران جو حالات پیش آتے ہیں وہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور یہ دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں کہ کس شخص نے اپنے حالات کے اندر کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

۴۵۔ اے ایمان والو، جب کسی گروہ سے تمھارا مقابلہ ہو تو تم ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ۴۶۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تمھارے اندر کمزوری آجائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ۴۷۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھلاتے ہوئے نکلے اور جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ حالاں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

کامیابی خدا کی مدد سے آتی ہے۔ مگر خدا کی مدد ہمیشہ اسباب کے پردہ میں آتی ہے، نہ کہ بے اسبابی کے حالات میں۔ مسلمان اگر اپنے ممکن اسباب کو جمع کر دیں تو بقیہ کمی خدا کی طرف سے پوری کر کے انھیں کامیاب

کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ بے اسبابی کا مظاہرہ کریں تو خدا کبھی ایسا نہیں کرسکتا کہ بے اسبابی کے نقشہ میں ان کے لیے اپنی مدد بھیج دے۔

اسباب کیا ہیں۔ اسباب یہ ہیں کہ مسلمان اقدام میں پہل نہ کریں۔ وہ اپنی جڑوں کو مضبوط کرنے میں لگے رہیں تا آں کہ حریف خود چڑھائی کر کے ان سے لڑنے کے لیے آجائے۔ پھر جب ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو وہ اس کے مقابلہ میں پوری طرح جماؤ کا ثبوت دیں۔ اللہ کی یاد، بالفاظ دیگر، مقصود اصلی کا مکمل استحضار رکھیں تا کہ ان کا قلبی حوصلہ باقی رہے۔ سردار کے حکم کے تحت پوری طرح منظم رہیں۔ باہمی اختلافات کو نظر انداز کریں، نہ یہ کہ اختلافات کو بڑھا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ وہ اپنے اتحاد سے حریف کو مرعوب کر دیں۔ وہ صبر کریں، یعنی جوش کے بجائے ہوش کو اپنائیں۔ جلد کامیابی کے شوق میں غیر پختہ اقدام نہ کریں۔ ان کی نظر ہمیشہ آخری منزل پر ہو، نہ کہ وقتی مصالح اور منافع پر — انھیں چیزوں کا نام اسباب ہے اور انھیں اسباب کے پردہ میں خدا کی مدد آتی ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا ''غیب'' میں رہ کر اپنے تمام تصرفات انجام دیتا ہے، اسی لیے جب وہ مسلمانوں کی مدد کرتا ہے تو اسباب کے پردہ میں کرتا ہے۔ مسلمان اگر اسباب کا ماحول پیدا نہ کریں وہ بے حوصلگی کا ثبوت دیں، وہ ابتدائی تیاری کے بغیر اقدامات کرنے لگیں، وہ اختلاف و انتشار میں مبتلا ہوں، تو ان کو کبھی یہ امید نہ کرنی چاہیے کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا اور بے اسبابی کا شکار ہونے کے باوجود ماورائے اسباب طریقوں سے ان کی مدد کر کے ان کے تمام کام بنا دے گا۔

مسلمان اگر اپنے حریف کے مقابلہ میں اپنے کو بہتر حالات میں پائیں تب بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کافروں کی طرح اپنی طاقت پر گھمنڈ کریں، وہ فخر و نمائش کے جذبات میں مبتلا ہو جائیں۔ وہ بڑائی کے زعم میں اس حد تک آگے بڑھیں کہ ایک شخص کے صرف اس لیے مخالف بن جائیں کہ وہ ایسے حق کی دعوت دے رہا ہے جس کی زد خود ان کی اپنی ذات پر بھی پڑ رہی ہے۔

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ

۴۸۔ اور جب شیطان نے انھیں ان کے اعمال خوش نما بنا کر دکھائے اور کہا کہ لوگوں میں سے آج کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور میں تمھارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور کہا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ۴۹۔ جب منافق اور جن کے دلوں میں روگ ہے، وہ کہتے تھے کہ ان لوگوں کو ان

دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۹

کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے، اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ بڑا زبردست اور حکمت والا ہے۔

مکہ کے مخالفین اپنے آپ کو برسرحق اور پیغمبر کے ساتھیوں کو برسرباطل سمجھتے تھے۔اس پر ان کو اتنا یقین تھا کہ انھوں نے کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کی کہ خدایا، دونوں فریقوں میں سے جو فریق حق پر ہو تو اس کو کامیاب کر اور جو فریق باطل پر ہو تو اس کو ہلاک کردے۔تاہم ان کا یہ یقین جھوٹا یقین تھا۔اس قسم کا یقین ہمیشہ شیطان کی تزئین کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

شیطان نے مکہ کے لوگوں کو سکھایا کہ تم تاریخ کے مسلّمہ پیغمبروں (ابراہیم واسماعیل علیہما السلام) کے ماننے والے ہو جب کہ مسلمان ایک ایسے شخص کو مانتے ہیں جس کا پیغمبر ہونا ابھی ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔تم کعبہ کے وارث ہو جب کہ مسلمانوں کو کعبہ کی سرزمین سے نکال دیا گیا ہے۔تم اسلاف کی روایتوں کو قائم رکھنے کے لیے لڑ رہے ہو جب کہ مسلمان اسلاف کی روایتوں کو توڑنے کے لیے اٹھے ہیں۔شیطان نے مکہ والوں کے دلوں میں اس قسم کے خیالات ڈال کر ان کو جھوٹے یقین میں مبتلا کر دیا تھا۔وہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں بالکل درست کر رہے ہیں اور خدا کی مدد بہر حال ہمیں حاصل ہوگی۔

مکہ کے مخالفین ایک طرف اپنے جھوٹے یقین کو اس قسم کی چیزوں کی بنا پر سچا یقین سمجھ رہے تھے۔دوسری طرف جب وہ دیکھتے کہ پیغمبر کے ساتھی ان سے بھی زیادہ یقین اور سرفروشی کے جذبہ کے ساتھ اسلام کے محاذ پر اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہیں تو وہ ان کے سچے یقین کو یہ کہہ کر بے اعتبار ثابت کرتے تھے کہ یہ محض ایک مذہبی جنون ہے۔وہ ایک شخص (پیغمبر) کی خوبصورت باتوں سے جوش میں آکر دیوانے ہو رہے ہیں۔ان کے یقین اور قربانی کی اس سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں۔

مگر جب دونوں گروہوں میں مقابلہ ہوا اور مسلمانوں کے لیے اللہ کی مدد اتر پڑی تو شیطان مخالفین اسلام کو چھوڑ کر بھاگا۔ایک طرف خدا کی مدد سے مسلمانوں کے دل اور زیادہ قوی ہو گئے۔دوسری طرف مخالفین کا جھوٹا یقین بے دلی اور پست ہمتی میں تبدیل ہو گیا۔کیوں کہ ان کا اعتماد شیطان پر تھا اور شیطان اب ان کو چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔

جو لوگ اللہ پر بھروسہ کریں اللہ ضرور ان کی مدد کرتا ہے۔مگر اللہ کی مدد ہمیشہ اس وقت آتی ہے جب کہ اہلِ ایمان اللہ پر یقین کا اتنا بڑا ثبوت دے دیں کہ بے یقین لوگ کہہ اٹھیں کہ یہ مجنون ہو گئے ہیں۔

وَلَوۡ تَرٰۤى اِذۡ يَتَوَفَّى الَّذِيۡنَ كَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓـئِكَةُ يَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ‌ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ۙ ﴿۵۱﴾ كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ‌ ۙ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ ؕ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّـعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ‌ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۙ ﴿۵۳﴾ كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ‌ ۙ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ‌ ۚ وَكُلٌّ كَانُوۡا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۵۴﴾

۵۰۔ اور اگر تم دیکھتے جب کہ فرشتے ان منکرین کی جان قبض کرتے ہیں، مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر، اور یہ کہتے ہوئے کہ اب جلنے کا عذاب چکھو۔ ۵۱۔ یہ بدلہ ہے اس کا جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا تھا اور اللہ ہرگز بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ ۵۲۔ فرعون والوں کی طرح اور جو ان سے پہلے تھے کہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا، پس اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑ لیا۔ بے شک اللہ قوت والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے۔ ۵۳۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ اس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے، اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اس کو نہ بدل دیں جو ان کے نفسوں میں ہے۔ اور بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۵۴۔ فرعون والوں کی طرح اور جو ان سے پہلے تھے کہ انھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا پھر ہم نے ان کے گناہوں کے سبب سے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے فرعون والوں کو غرق کر دیا اور یہ سب لوگ ظالم تھے۔

نعمت کا انحصار حالتِ استحقاق نعمت پر ہے۔ قومی سطح پر کسی کو جو نعمتیں ملتی ہیں وہ ہمیشہ اس استحقاق کے بقدر ہوتی ہیں جو نفسی حالت کے اعتبار سے اس کے یہاں پایا جاتا ہے۔ یہ ''نفس'' چونکہ فرد کے اندر ہوتا ہے اس لیے اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اجتماعی انعامات کا انحصار انفرادی حالات پر ہے۔ افراد کی سطح پر قوم جس درجہ میں ہو اسی کے بقدر اس کو اجتماعی انعامات دیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گروہ اگر خدا کے اجتماعی انعامات کو پانا چاہتا ہے تو اس کو اپنے افراد کی نفسی اصلاح پر اپنی طاقت صرف کرنا چاہیے۔ اسی طرح کوئی قوم اگر اپنے کو اس حال میں دیکھے کہ اس سے اجتماعی نعمتیں چھن گئی ہیں تو اس کو خود نعمتوں کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنے افراد کی اصلاح کے پیچھے دوڑنا چاہیے۔ کیوں کہ افراد ہی کے بگڑنے سے اس کی نعمتیں چھنی ہیں اور افراد ہی کے بننے سے دوبارہ وہ اسے مل سکتی ہیں۔

جب کوئی قوم عدل کے بجائے ظلم اور تواضع کے بجائے سرکشی کا رویہ اختیار کرتی ہے تو خدا کی طرف سے اس کے سامنے سچائی کا اعلان کرایا جاتا ہے تا کہ وہ متنبہ ہوجائے۔ یہ اعلان کمالِ وضاحت کے اعتبار سے خدا کی ایک نشانی ہوتا ہے۔ اس کو ماننا خدا کو ماننا ہوتا ہے اور اس کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا۔ خدا کی دعوت جب آیت (نشانی) کی حد تک برہنہ ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے پھر بھی وہ اس کا انکار کریں تو اس کے بعد لازماً وہ سزا کے مستحق ہوجاتے ہیں۔ اس سزا کا آغاز اگرچہ دنیا ہی سے ہوجاتا ہے۔ تاہم دنیا کی سزا اس سزا کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو موت کے بعد آدمی کے سامنے آنے والی ہے۔ فرشتوں کی مار، ساری مخلوق کے سامنے رسوائی اور جہنم کی آگ میں جلنا۔ یہ سب اتنے ہولناک مراحل ہیں کہ موجودہ حالات میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

انسان جب ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اولاً اس کے لیے تنبیہات ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر وہ ان سے سبق نہ لے تو بالآخر وہ خدا کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آجاتا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٥﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ ع

۵۵۔ بے شک سب جانداروں میں بدترین اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے انکار کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے۔ ۵۶۔ جن سے تم نے عہد لیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔ ۵۷۔ پس اگر تم ان کو لڑائی میں پاؤ تو ان کو ایسی سزا دو کہ جو ان کے پیچھے ہیں وہ بھی دیکھ کر بھاگ جائیں، تا کہ انھیں عبرت ہو۔ ۵۸۔ اور اگر تم کو کسی قوم سے بدعہدی کا ڈر ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو، ایسی طرح کہ تم اور وہ برابر ہوجائیں۔ بے شک اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔

مدینہ کے یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے خدا کی نظر میں مجرم ہو چکے تھے۔ اس جرم پر مزید اضافہ ان کی بدعہدی تھی۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود مدینہ کے درمیان یہ تحریری معاہدہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے معاملہ میں غیر جانب دار رہیں گے۔ مگر یہود خفیہ طور پر آپ کے دشمنوں (مشرکین) سے مل کر آپ کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ یہ کفر پر بدعہدی کا اضافہ تھا۔ یہ انکار کے ساتھ کمینگی کو جمع کرنا تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں ہولناک عذاب ہے اور دنیا میں یہ حکم ہے کہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے تا کہ ان کی شرارتوں کا خاتمہ ہو اور ان کے ارادے پست ہوجائیں۔

اگر کسی قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو اور مسلمان ان کی طرف سے بدعہدی کے اندیشہ کی بنا پر اس عہد کو توڑنا

چاہیں تو ضروری ہے کہ وہ پہلے انھیں اس کی اطلاع دیں تاکہ دونوں پیشگی طور پر یہ جان لیں کہ اب دونوں کے درمیان عہد کی حالت باقی نہیں رہی۔ امیر معاویہ اور رومی حکمراں میں ایک بار میعادی معاہدہ تھا۔ معاہدہ کی مدت قریب آئی تو امیر معاویہ نے اپنی فوجوں کو خاموشی کے ساتھ روم کی سرحد پر جمع کرنا شروع کیا تاکہ معاہدہ کی تاریخ ختم ہوتے ہی اگلی صبح کو اچانک رومی علاقہ پر حملہ کردیا جائے۔ اس وقت ایک صحابی حضرت عمرو بن عنبسہ گھوڑے پر سوار ہوکر آئے۔ وہ باآواز بلند کہہ رہے تھے اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وفاء لا غدر (اللہ اکبر، اللہ اکبر، عہد کو پورا کرو، عہد کو نہ توڑو)، انھوں نے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی: مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ، فَلَا يَحِلَّنَّ عُقْدَةً وَلَا يَشُدَّهَا حَتَّى يَنْقَضِيَ أَمَدُهَا، أَوْ يَنْبِذَ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ (مسند احمد، حدیث نمبر 17015)۔ یعنی جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو کوئی گرہ نہ کھولی جائے اور نہ باندھی جائے یہاں تک کہ معاہدہ کی مدت پوری ہوجائے یا برابری کے ساتھ عہد اس کی طرف پھینک دیا جائے۔

دوسری صورت وہ ہے جب کہ صرف اندیشہ کی بات نہ ہو بلکہ فریق ثانی کی طرف سے عملاً معاہدہ کی واضح خلاف ورزی ہوچکی ہو۔ ایسی صورت میں اجازت ہے کہ فریق ثانی کو مطلع کیے بغیر جوابی کارروائی کی جائے۔ غزوۂ مکہ اسی کی مثال ہے۔ قریش نے آپ کے حلیف (بنو خزاعہ) کے خلاف بنوبکر کی جارحانہ کارروائی میں شریک ہوکر معاہدۂ حدیبیہ کی یک طرفہ خلاف ورزی کی تو آپ نے قریش کو پیشگی اطلاع دیے بغیر ان کے خلاف خاموش کارروائی فرمائی۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ

۵۹۔ اور انکار کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہرگز اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے۔ ۶۰۔ اور ان کے لیے جس قدر تم سے ہوسکے تیار رکھو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ اس سے تمھاری ہیبت رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمھارے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کروگے، وہ تمھیں پورا کردیا جائے گا اور تمھارے ساتھ کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ ۶۱۔ اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۶۲۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمھارے لیے کافی ہے۔ وہی ہے

اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۶۳﴾

جس نے اپنی نصرت اور مومنین کے ذریعہ تم کو قوت دی۔ ۶۳۔ اوران کے دلوں میں اتفاق پیدا کردیا۔ اگرتم زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر ڈالتے، تب بھی تم ان کے دلوں میں اتفاق پیدا نہ کرسکتے۔ لیکن اللہ نے ان میں اتفاق پیدا کردیا، بے شک وہ زور آور ہے، حکمت والا ہے۔

اسلام کا اعتماد استعمال قوت سے زیادہ مظاہرۂ قوت پر ہے۔ اسی لیے اہل اسلام کو قوت مُرہبہ فراہم کرنے کا حکم دیا گیا، یعنی وہ چیزیں جو حریف کو اس قدر مرعوب کریں کہ وہ اقدام کا حوصلہ کھودے۔ اسلام وقت کے معیار کے مطابق اپنے کو طاقت ور بناتا ہے، مگر لازماً لڑنے کے لیے نہیں۔ بلکہ اس لیے تاکہ اس کے دشمنوں پر اس کی دھاک قائم رہے اور وہ اس کے خلاف جارحانہ کارروائی کی ہمت نہ کریں۔ اسلام کو وقت کے معیار کے مطابق فکری اور عملی اعتبار سے طاقت ور بنانے میں جو لوگ اپنی کمائی خرچ کریں گے وہ کئی گنا زیادہ مقدار میں اس کا بدلہ اپنے رب کے یہاں پائیں گے۔

اسلام کی فتح کا راز اصلاً جنگی مقابلوں میں نہیں بلکہ اس کے اصولوں کی تبلیغ میں ہے۔ اس لیے حکم ہوا کہ جب بھی فریق ثانی صلح کی پیش کش کرے تو ہر اندیشہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو قبول کرلو۔ کیوں کہ اندیشہ بہر حال یقینی نہیں اور جنگ بندی کا یہ فائدہ یقینی ہے کہ پُرامن فضا میں اسلام کا دعوتی عمل شروع ہو جائے اور اس طرح جنگ کا رکنا اسلام کی نظریاتی توسیع کا سبب بن جائے۔

اسلام خود اپنی ذات میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ خدا اور آخرت کا عقیدہ اگر پوری طرح کسی گروہ کے افراد میں پیدا ہو جائے تو ان کے اندر سے وہ تمام نفسیاتی خرابیاں نکل جاتی ہیں جو نااتفاقی اور باہمی ٹکراؤ کا باعث ہوتی ہیں۔ اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب باہم جڑ کر ایک ہو جاتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے۔ متحد گروہ اگر تعداد میں کم ہو تب بھی وہ اپنے سے زیادہ تعداد رکھنے والے گروہ پر غالب آجائے گا۔

باہمی اتفاق سب سے زیادہ مشکل چیز ہے۔ کسی گروہ کی نصرت یافتہ ہونے کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کے افراد باہم متحد رہیں، کوئی بھی چیز ان کے اتحاد کو توڑنے والی ثابت نہ ہو۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ
ع ۸ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۴﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ
عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ
یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ

۶۴۔ اے نبی، تمھارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ مومنین جنھوں نے تمھارا ساتھ دیا ہے۔ ۶۵۔ اے نبی، مومنین کو لڑائی پر ابھارو۔ اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سو ہوں گے تو وہ ہزار منکروں پر غالب

يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾

آئیں گے، اس واسطے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ ٦٦۔اب اللہ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کردیا اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ پس اگر تم میں سو ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

اہلِ ایمان کی تعداد غیر اہل ایمان کی زیادہ تعداد پر غالب آنے کی وجہ یہ بتائی کہ اہلِ ایمان کے اندر فقہ ہوتی ہے جب کہ غیر اہلِ ایمان فقہ سے محروم ہیں۔ فقہ کے لفظی معنی سمجھ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ بصیرت اور شعور ہے جو ایمان کے نتیجہ میں ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ خدا پر ایمان کسی آدمی کے لیے وہی معنی رکھتا ہے جو اندھیرے کمرے میں بجلی کے بلب کا جل جانا۔ بلب پورے کمرے کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ اس کی ہر چیز واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ اسی طرح ایمان آدمی کو ایک ربانی شعور عطا کرتا ہے جس کے بعد وہ تمام حقیقتوں کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے لگتا ہے۔

ایمان کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی اور موت کی حقیقت کو سمجھ لیتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ اصل چیز حیاتِ دنیا نہیں بلکہ حیاتِ آخرت ہے۔ یہ چیز اس کو بے پناہ حد تک نڈر بنا دیتی ہے۔ وہ موت کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ اس کے لیے جنت میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ مومن شہادت کو جنت کا مختصر راستہ سمجھتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جان دینا اس کے لیے مطلوب چیز بن جاتا ہے، جب کہ غیر مومن کی جنت یہی موجودہ دنیا ہے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تاکہ اپنی جنت کا لطف اٹھا سکے۔ غیر مومن قومی شعور کے تحت لڑتا ہے اور مومن جنتی شعور کے تحت، اور قومی شعور والا کبھی اتنی بے جگری کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔

مومن خدا سے ڈرنے والا ہوتا ہے، وہ آخرت کی فکر کرنے والا ہوتا ہے، یہ مزاج اس کو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک کرتا ہے۔ وہ ضد، نفرت، تعصب، انتقام اور گھمنڈ جیسی چیزوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ دوسری طرف غیر مومن کا معاملہ سراسر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر مومن کے اقدامات منفی نفسیات کے تحت ہوتے ہیں اور مومن کے اقدامات ایجابی نفسیات کے تحت۔ غیر مومن جذباتی انداز سے عمل کرتا ہے اور مومن حقیقت پسندانہ انداز سے۔ غیر مومن انسانوں کا دشمن ہوتا ہے اور مومن صرف انسانوں کی برائی کا۔ غیر مومن تنگ ظرفی کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور مومن وسعتِ ظرف کے ساتھ۔

ہزار کے مقابلہ میں سو اور دو ہزار کے مقابلہ میں ایک ہزار کے الفاظ بتاتے ہیں کہ قتال کا حکم جماعت اور فوج کے لیے ہے۔ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا کہ ایک دو آدمی ہوں تب بھی وہ لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾ ع ۵

٦٧۔ کسی نبی کے لیے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خوں ریزی نہ کرلے۔ تم دنیا کے اسباب چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ٦٨۔ اور اگر اللہ کا ایک لکھا ہوا پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو طریقہ تم نے اختیار کیا، اس کے باعث تم کو سخت عذاب پہنچ جاتا۔ ٦٩۔ پس جو مال تم نے لیا ہے اس کو کھاؤ، وہ تمھارے لیے حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

بدر کی لڑائی میں مسلمانوں نے ستر بڑے بڑے مشرکینِ مکہ کو قتل کیا۔ اس کے بعد جب ان کے پاؤں اکھڑنے لگے تو ان کے 70 آدمیوں کو گرفتار کرلیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں اکثر سردار تھے۔ جنگ کے بعد مشورہ ہوا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے۔ صحابہ کی اکثریت نے یہ رائے دی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اس وقت اسلام دشمنوں نے مسلسل حالت جنگ برپا کررکھی تھی۔ مگر مسلمانوں کے پاس مال نہ ہونے کی وجہ سے سامانِ جنگ کی بہت کمی تھی۔ یہ خیال کیا گیا کہ فدیہ سے جو رقم ملے گی اس سے سامانِ جنگ خریدا جاسکتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذ اس رائے کے خلاف تھے۔ حضرت عمر نے کہا: اے خدا کے رسول یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں۔ یعنی اس وقت دشمنوں کی اصل طاقت ہماری مٹھی میں آگئی ہے، ان کو قتل کرکے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا جائے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی رائے پر عمل فرمایا۔

بعد کو جب وہ آیتیں اتریں جن میں جنگ پر تبصرہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے فدیہ کی رقم کو جائز ٹھہراتے ہوئے اس روش پر اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا اگرچہ بظاہر رحمت وشفقت کا معاملہ تھا۔ مگر وہ اللہ کے دوررس منصوبہ کے مطابق نہ تھا۔ اللہ کا اصل منصوبہ کفر وشرک کی جڑ اکھاڑنا تھا۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے قریش کے تمام لیڈروں کو (ابولہب اور ابوسفیان کو چھوڑ کر) بدر کے میدان میں جمع کردیا اور ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ پوری طرح مسلمانوں کے قابو میں آگئے۔ اگر ان لیڈروں کو اس وقت ختم کردیا جاتا تو کفر وشرک کی مزاحمت بدر کے میدان میں پوری طرح دفن ہوجاتی۔ مگر لیڈروں کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منظم ہوکر دوبارہ اپنی مزاحمت کی تحریک جاری رکھنے کے قابل ہوگئے۔

یہ فیصلہ جنگی مصلحت کے خلاف تھا۔ وہ مسلمانوں کے لیے عذاب عظیم (سخت مصیبتوں) کا باعث بن جاتا۔ یہ لیڈر اپنے عوام کو ساتھ لے کر اسلام کے سارے معاملہ کو تہس نہس کر دیتے۔ مگر اللہ نے آخری رسول اور آپ کے اصحاب کے لیے پہلے سے مقدر کر دیا تھا کہ وہ لازماً غالب رہیں گے، ان کو زیر کرنے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگی تدبیر میں اس کوتاہی کے باوجود قریش اہل ایمان کے اوپر غالب نہ آسکے۔ اور بالآخر وہی ہوا جس کا ہونا پہلے سے خدا کے یہاں لکھا جا چکا تھا، یعنی مسلمانوں کی فتح اور اسلام کا غلبہ۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٠﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾

۷۰۔ اے نبی، تمھارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمھارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، اس سے بہتر وہ تمھیں دے دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۷۱۔ اور اگر یہ تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بدعہدی کی تو خدا نے تم کو ان پر قابو دے دیا اور اللہ علم والا، حکمت والا ہے۔

بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا مسلمانوں کے لیے ایک جنگی غلطی تھی۔ مگر خود قیدیوں کے حق میں یہ ایک نئی زندگی فراہم کرنے کے ہم معنیٰ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جو اپنی مخالفتِ حق کے نتیجہ میں ہلاکت کے مستحق ہو چکے تھے ان کو ایک بار اور موقع مل گیا کہ وہ اسلام کی دعوت اور اس کے مقابلہ میں اپنی بے جا روش پر دوبارہ غور کر سکیں۔ اس مہلت نے ان کے لیے اپنی اصلاح کا نیا دروازہ کھول دیا۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ ان قیدیوں کے دل میں شکست کی بنا پر انتقام کی آگ بھڑکے۔ فدیہ دینے کی وجہ سے ان کو جو ذلت اور نقصان ہوا ہے اس کا بدلہ لینے کے لیے وہ بے چین ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ پھر اسی غلطی کو دہرائیں گے جس کے نتیجے میں وہ خدا کی پکڑ کے مستحق بن گئے تھے۔ وہ اپنی قوتوں کو اسلام کی مخالفت میں صرف کریں گے، جس کا انجام دنیا میں ہلاکت ہے اور آخرت میں عذاب۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ بدر کے میدان میں پیش آنے والے غیر معمولی واقعہ پر غور کریں کہ مسلمانوں کو کم تر اسباب کے باوجود اتنی کھلی ہوئی فتح کیوں نصیب ہوئی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا مسلمانوں کے دین کے ساتھ ہے، نہ کہ قریش کے دین کے ساتھ۔ یہ دوسرا ذہن اگر پیدا ہو جائے تو وہ ان کو آمادہ کرے گا کہ وہ اپنی سابقہ روش کو بدلیں اور جس دین کو پہلے اختیار نہ کر سکے، اس کو اب سے اختیار کر لیں۔ اور اس طرح دنیا اور آخرت میں خدا کے انعام کے مستحق بنیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قریش کے لوگوں میں ایک تعداد ایسی نکلی جن کے دل میں مذکورہ سوال جاگ اٹھا اور جلد یا بدیر وہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ حضرت عباس بن عبد المطلب نے زمانہ قید ہی میں اسلام قبول کرلیا۔ کچھ دوسرے لوگ بعد کو اسلام کے حلقہ میں آگئے۔ یہ لوگ اگرچہ گروہی تعصب کی نظر میں ذلیل ہوئے مگر انھوں نے خدا کی نظر میں عزت حاصل کرلی۔ دنیا کا نقصان اٹھا کر وہ آخرت کے فائدہ کے مالک بن گئے۔

قیدیوں کو چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ وہ اس کو احسان سمجھ کر اس کا اعتراف نہیں کریں گے بلکہ پہلے کی طرح دوبارہ سازش اور تخریب کاری کا راستہ اختیار کرکے اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں گے۔ مگر قرآن نے اس اندیشہ کو اہمیت نہ دی۔ کیوں کہ خالص حق کے لیے جو تحریک اٹھتی ہے وہ عام طرز کی انسانی تحریک نہیں ہوتی۔ وہ ایک خدائی معاملہ ہوتا ہے۔ اس کی پشت پر خود خدا ہوتا ہے اور خدا سے لڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَھَاجَرُوۡا وَ جٰھَدُوۡا بِاَمۡوَالِھِمۡ وَاَنۡفُسِھِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِکَ بَعۡضُھُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یُھَاجِرُوۡا مَا لَکُمۡ مِّنۡ وَّلَایَتِھِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوۡا ۚ وَاِنِ اسۡتَنۡصَرُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ فَعَلَیۡکُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَبَیۡنَھُمۡ مِّیۡثَاقٌ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡضُھُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡہُ تَکُنۡ فِتۡنَۃٌ فِی الۡاَرۡضِ وَفَسَادٌ کَبِیۡرٌ ؕ﴿۷۳﴾

۷۲۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا۔ اور وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی، وہ لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان لائے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمھارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں جب تک کہ وہ ہجرت کرکے نہ آجائیں۔ اور وہ تم سے دین کے معاملہ میں مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے، الا یہ کہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف ہو جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۷۳۔ اور جو لوگ منکر ہیں، وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ پھیلے گا اور بڑا فساد ہوگا۔

عام طور پر جب ایک آدمی دوسرے کی مدد کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ آدمی اس کے اپنے خاندان کا ہے، اس سے گروہی اور جماعتی تعلق ہے۔ مگر ہجرت کے بعد مدینہ میں جو اسلامی معاشرہ قائم ہوا وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں گھر والوں نے اپنے گھر ایسے لوگوں کو دیے جن سے تعلق کی بنیاد صرف دین تھی۔ جو لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ آئے وہ بھی اللہ کے لیے اور آخرت طلبی کے لیے آئے۔ اور جنھوں نے ان اجنبی لوگوں کو

اپنے مال اور اپنی جائداد میں شریک کیا وہ بھی صرف اس لیے تاکہ ان کا خدا ان سے خوش ہو اور آخرت میں انھیں جنتوں میں داخل کرے۔

یہ ایسا سماج تھا جس میں اہم چیز خاندان اور نسب نہیں بلکہ ایمان و اسلام تھا۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے مگر دنیوی فائدہ کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے فائدہ کے لیے۔ وہ ایک دوسرے کو دیتے تھے مگر پانے والے سے کسی بدلہ کی امید میں نہیں بلکہ اللہ سے انعام کی امید میں۔ وہی معاشرہ حقیقۃً اسلامی معاشرہ ہے جہاں تعلقات خاندانی رشتوں اور گروہی عصبیتوں پر قائم نہ ہوں بلکہ حق کی بنیاد پر قائم ہوں۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے حامی و ناصر اس بنیاد پر ہوں کہ وہ ان کے دینی بھائی ہیں، نہ کہ اس بنیاد پر کہ دنیوی مصلحتوں میں سے کوئی مصلحت ان کے ساتھ وابستہ ہے۔

ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے حق کے معاملہ میں مدد طلب کرے تو اس وقت اس کی مدد کرنا بالکل لازم ہے۔ اگر مسلمانوں میں باہمی مدد کی یہ روح باقی نہ رہے تو یہ ہوگا کہ شریر لوگ کمزور مسلمانوں پر دلیر ہوجائیں گے اور ان کی زندگی اور ان کے ایمان کا محفوظ رہنا سخت مشکل ہوجائے گا۔ حق کے مخالفین اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے انتہائی متعصب ہوتے ہیں پھر حق کے ماننے والے اپنے ساتھیوں کی مدد میں کیوں نہ سرگرم ہوں۔ اس میں استثنا صرف اس وقت ہے جب کہ معاملہ بین اقوامی ہو اور مسلمانوں کی مدد کرنا بین اقوامی پیچیدگیاں پیدا کرنے کے ہم معنی سمجھا جائے۔

''ہجرت'' جنت میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ ایک بندہ جب خدا کے ناپسندیدہ مقام سے نکل کر خدا کے پسندیدہ مقام کی طرف جاتا ہے تو دراصل وہ غیر جنت کو چھوڑ کر جنت میں داخل ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾ ع

۷۴۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے بخشش ہے اور بہترین رزق ہے۔ ۷۵۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا وہ بھی تم میں سے ہیں۔ اور خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں اللہ کی کتاب میں۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

خدا پر ایمان لانا خدا کے لیے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ ایسے لوگ اکثر ان لوگوں کے درمیان اجنبی بن جاتے ہیں جو خدا کے سوا کسی اور چیز کی خاطر زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ اجنبیت کبھی اتنی بڑھتی ہے کہ ہجرت کی

نوبت آجاتی ہے۔ ماحول کی مخالفت کے نتیجہ میں پوری زندگی جدوجہد اور جاں فشانی کی زندگی بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے نزدیک سچے مومن ہیں۔ اس کے بعد سچا ایمان ان لوگوں کا ہے جو اسلام کی خاطر برباد ہوجانے والے اس قافلہ کے پشت پناہ بنیں وہ ان کو جگہ دیں اور ان کی ہر ممکن مدد کے لیے کھڑے ہوجائیں۔ جن کی زندگیاں نہیں لٹی ہیں وہ اپنا اثاثہ ان لوگوں کے حوالے کردیں جن کی زندگیاں اسلام کی راہ میں لٹ گئی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی مسلم بننے کے لیے آدمی کو دو میں سے کم از کم ایک چیز کا ثبوت دینا ہے۔ آدمی یا تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ اس طرح وابستہ کرے کہ اگر اس کو اپنی بنی بنائی دنیا اجاڑ دینی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرے، آرام کی زندگی کو بے آرام کی زندگی بنا دینا پڑے تو اس کو بھی گوارا کرلے۔ پھر یہ کہ اسلام کی خاطر جب کچھ لوگ اپنا اثاثہ لٹا دیں تو وہ لوگ جو ابھی لٹنے سے محفوظ ہیں وہ پہلے فریق کی مدد کے لیے اپنا بازو کھول دیں، حتیٰ کہ ضرورت ہو تو اپنی کمائی اور اپنی جائداد میں بھی ان کو شریک کرلیں — سچا ایمان کسی کو یا تو "مہاجر" بننے کی سطح پر ملتا ہے یا "انصار" بننے کی سطح پر۔

یہی دو قسم کے لوگ ہیں جن کے لیے خدا کے یہاں مغفرت اور رزق کریم ہے۔ آخرت میں آنے والی جنت انتہائی ستھری اور نفیس دنیا ہے۔ وہ ایک کامل دنیا ہے اور کامل دنیا میں بسائے جانے کے لائق وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو خود بھی کامل ہوں۔ کوئی انسان اپنی بشری کمزوریوں کی بنا پر ایسی کاملیت کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ تاہم اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص مذکورہ دونوں کسوٹی میں سے کسی ایک کسوٹی پر پورا اترے گا خدا اپنی قدرت سے اس کی کمیوں کی تلافی کرکے اس کو جنت میں داخل کردے گا۔

دین کی بنیاد پر بھائی بننے والوں کی مدد اور حمایت بے حد اہم ہے تاہم وہ رحمی رشتوں کے حقوق اور ان کے درمیان وراثتوں کی تقسیم پر اثر انداز نہ ہوگی۔ اپنی خواہش کے تحت کوئی شخص اپنے اہل خاندان کے لیے جن چیزوں کو ضروری سمجھ لے ان کی کوئی اہمیت اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ تاہم اللہ نے خود اپنی کتاب میں اہل خاندان کے لیے حقوق اور وراثت کا جو قانون مقرر کردیا ہے وہ ہر حال میں قائم رہے گا۔ اور کوئی دوسری چیز اس کی ادائیگی کے لیے عذر نہیں بن سکتی۔

۹۔ سُوْرَۃُ التَّوبَۃ

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ
اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ
اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝٢ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ

۱۔ اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ ۲۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے اور یہ کہ اللہ منکروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ ۳۔ اعلان ہے

رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۴﴾

اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن لوگوں کے لیے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں۔ اب اگر تم لوگ توبہ کرو تو تمھارے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم منہ پھیروگے تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوش خبری دے دو۔ ۴۔ مگر جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کیا تھا، پھر انھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا معاہدہ ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک اللہ پرہیز گاروں کو پسند کرتا ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو رہنے بسنے کا جو موقع دیا گیا ہے وہ کسی حق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض آزمائش کے لیے ہے۔ خدا جب تک چاہتا ہے کسی کو اس زمین پر رکھتا ہے اور جب اس کے علم کے مطابق اس کی مدت امتحان پوری ہو جاتی ہے تو اس پر موت وارد کر کے اس کو یہاں سے اٹھا لیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ پیغمبر کے مخاطبین کے ساتھ دوسری صورت میں کیا جاتا ہے۔ پیغمبر جن لوگوں کے درمیان آتا ہے ان پر وہ آخری حد تک حق کی گواہی دیتا ہے۔ پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے بعد جو لوگ ایمان نہ لائیں وہ خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق کھو دیتے ہیں۔ وہ آزمائش کی غرض سے یہاں رکھے گئے تھے۔ اتمام حجت نے آزمائش کی تکمیل کر دی۔ پھر اس کے بعد زندگی کا حق کس لیے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے کام کی تکمیل کے بعد ان کے اوپر کوئی نہ کوئی ہلاکت خیز آفت آتی ہے اور ان کا استیصال کر دیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ مگر ان پر کوئی آسمانی آفت نہیں آئی۔ ان کے اوپر خدا کی مذکورہ سنت کا نفاذ اسباب کے نقشہ میں کیا گیا ہے۔ اولاً قرآن کے برتر اسلوب اور پیغمبر کے اعلیٰ کردار کے ذریعہ ان کو دعوت پہنچائی گئی۔ پھر اہلِ توحید کو مکہ کے اہلِ شرک پر غالب کر کے ان کے اوپر اتمام حجت کر دیا گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور اس کے باوجود وہ انکار کی روش پر قائم رہے تو ان کو مسلسل خیانت اور عہد شکنی کا مجرم قرار دے کر ان کو الٹی میٹم دیا گیا کہ چار ماہ کے اندر اپنی اصلاح کر لو، ورنہ مسلمانوں کی تلوار سے تمھارا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

پھر یہ سارا معاملہ تقویٰ کے اصول پر کیا گیا، نہ کہ قومی سیاست کے اصول پر — مشرکین کو دلائل کے میدان میں لاجواب کر دیا گیا، ان کو پیشگی انتباہ کے ذریعہ کئی مہینہ تک سوچنے کا موقع دیا گیا۔ آخر وقت تک

ان کے لیے دروازہ کھلا رکھا گیا کہ جولوگ توبہ کرلیں وہ خدا کے انعام یافتہ بندوں میں شامل ہوجائیں۔ جن بعض قبائل نے معاہدہ نہیں توڑا تھا ان کے معاملہ کو معاہدہ توڑنے والوں سے الگ رکھا گیا، وغیرہ۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ ع

۵۔ پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی گھات میں۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۶۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو تم اس کو پناہ دے دو تا کہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کے امان کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

مہلت کے چار مہینے گزرنے کے بعد یہاں جس جنگ کا حکم دیا گیا وہ کوئی عام جنگ نہ تھی یہ خدا کے قانون کے مطابق وہ عذاب تھا جو پیغمبر کے انکار کے نتیجہ میں ان پر ظاہر کیا گیا۔ انھوں نے اتمام حجت کے باوجود خدا کے پیغمبر کا انکار کر کے اپنے کو اس کا مستحق بنالیا تھا کہ ان کے لیے تلوار یا اسلام کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رکھی جائے۔ یہ خدا کا ایک خصوصی قانون ہے جس کا تعلق پیغمبر کے مخاطبین سے ہے، نہ کہ عام لوگوں سے۔ تاہم اتمام حجت کے بعد بھی اس حکم کا نفاذ اچانک نہیں کیا گیا بلکہ آخری مرحلہ میں پھر انھیں چار ماہ کی مہلت دی گئی۔

انتقام معاف کرنا نہیں جانتا۔ انتقامی جذبہ کے تحت جو کارروائی کی جائے اس کو صرف اس وقت تسکین ملتی ہے جب کہ وہ اپنے حریف کو ذلیل اور برباد ہوتے ہوئے دیکھ لے۔ مگر عرب کے مشرکین کے خلاف جو کارروائی کی گئی اس کا تعلق کسی قسم کے انتقام سے نہیں تھا بلکہ وہ سراسر حقیقت پسندانہ اصول پر مبنی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے شدید حکم کے باوجود ان کے لیے یہ گنجائش ہر وقت باقی تھی کہ وہ دین اسلام کو اختیار کر کے اپنے کو اس سزا سے بچالیں اور اسلامی برادری میں عزت کی زندگی حاصل کرلیں۔ کسی کی توبہ کے قابل قبول ہونے کے لیے صرف دو عملی شرط کا پایا جانا کافی ہے — نماز اور زکوٰۃ۔

جنگ کے دوران میں دشمن کا کوئی فرد یہ کہے کہ میں اسلام کو سمجھنا چاہتا ہوں تو مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس کو امان دے کر اپنے ماحول میں آنے کا موقع دیں اور اسلام کے پیغام کو اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کریں۔ پھر بھی اگر وہ قبول نہ کرے تو اپنی حفاظت میں اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دیں۔ عام حکم کے تحت اگرچہ وہ گردن زدنی ہے مگر ایسا نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے دین کی بات نہیں مانی ہے تو اس کو

قتل کردیا جائے۔ جب کوئی شخص امان میں ہو تو امان کے دوران اس پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔

جنگ کے زمانہ میں دشمن کو اس قسم کی رعایت دینا انتہائی نازک ہے۔ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ دشمن کا کوئی جاسوس اس رعایت کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے اندر گھس آئے اور ان کے فوجی راز معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ مگر اسلام کی نظر میں دعوت و تبلیغ کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم ہے کہ اس نازک خطرہ کے باوجود اس کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

ایک شخص اگر بے خبری اور لاعلمی کی بنا پر ظلم کرے تو اس کا ظلم خواہ کتنا ہی زیادہ ہو مگر اسی کے ساتھ ہر ممکن رعایت کی جائے گی تاوقتیکہ اس کی لاعلمی اور بے خبری ختم ہو جائے۔

"تم سے پناہ مانگے تو تم اس کو پناہ دے دو، تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کے امان کی جگہ پہنچا دو۔" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کو یہ مطلوب ہے کہ ایک ایسا اسلامی مرکز اور دعوتی ماحول بنے جہاں تمام انسان بغیر کسی جھجک کے آئیں، اور امن و سلامتی کے ماحول میں خدا کی باتوں کو سنیں۔ مکی دور میں دار ارقم کی یہی حیثیت تھی، ہجرت کے بعد مدینہ اس قسم کا اسلامی مرکز بن گیا تھا۔ آج بھی ضرورت ہے کہ اپنے حالات کے لحاظ سے ہم اس قسم کا دار الاسلام فراہم کریں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ ہمارے خلاف جنگ نہ چھیڑیں ہم بھی ان کے خلاف جنگ نہیں چھیڑ سکتے ہیں۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۷ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۸ ۚ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۹ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

۷۔ ان مشرکوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کوئی عہد کیسے رہ سکتا ہے، مگر جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس، پس جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ ۸۔ کیسے عہد رہے گا جب کہ یہ حال ہے کہ اگر وہ تمھارے اوپر قابو پائیں تو تمھارے بارے میں نہ قرابت کا لحاظ کریں اور نہ عہد کا۔ وہ تم کو اپنے منہ کی بات سے راضی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے دل انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں اکثر بدعہد ہیں۔ ۹۔ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیا، پھر انھوں نے اللہ کے راستہ سے روکا۔ بہت برا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۱۰۔ کسی مومن کے معاملہ میں وہ نہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہد کا، یہی لوگ ہیں زیادتی کرنے والے۔ ۱۱۔ پس

اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١١﴾

اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔ اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیات کو جاننے والوں کے لیے۔

مسلمانوں کو جب زور حاصل ہو گیا تو قریش نے ان سے معاہدے کر لیے۔ تاہم وہ ان معاہدوں سے خوش نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے ''دشمن'' سے یہ معاہدہ انھوں نے اپنی بربادی کی قیمت پر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت اس انتظار میں رہتے تھے کہ جہاں موقع ملے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں یا کم از کم انھیں بدنام کریں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک فریق کی طرف سے اس قسم کی خیانت کا مظاہرہ ہو تو دوسرے فریق کے لیے کسی معاہدہ کی پابندی ضروری نہیں رہتی۔

یہ قریش کا حال تھا، جن کو مسلمانوں کے عروج میں اپنی قیادت چھنتی ہوئی نظر آتی تھی۔ تاہم کچھ دوسرے عرب قبائل (بنو کنانہ، بنو خزاعہ، بنو ضمرہ) جو اس قسم کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے، انھوں نے مسلمانوں سے معاہدے کیے اور اپنے معاہدے پر قائم رہے۔ جب چار ماہ کی مہلت کا اعلان کیا گیا تو ان کے معاہدہ کی میعاد پوری ہونے میں تقریباً نو مہینے باقی تھے۔ حکم ہوا کہ ان سے معاہدہ کو آخر وقت تک باقی رکھو، کیوں کہ تقویٰ کا تقاضا یہی ہے۔ مگر اس مدت کے ختم ہونے کے بعد پھر کسی سے اس قسم کا معاہدہ نہیں کیا گیا اور تمام مشرکین کے سامنے صرف دو صورتیں باقی رکھی گئیں یا اسلام لائیں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

معاشرتی زندگی کی بنیاد ہمیشہ دو چیزوں پر ہوتی ہے — رشتہ داری یا قول و قرار۔ جن سے رحمی رشتے ہیں ان کے حقوق کا لحاظ آدمی رحمی رشتوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اور جن سے قول و قرار ہو چکا ہے ان سے قول و قرار کی بنا پر۔ مگر جب آدمی کے اوپر دنیا کے مفاد اور اس کی مصلحت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ دونوں باتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے حقیر فائدہ کی خاطر رحمی حقوق کو بھی بھول جاتا ہے اور قول و قرار کو بھی۔ ایسے لوگ حد سے گزر جانے والے ہیں۔ وہ خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں اگر وہ چھوٹ گئے تو آخرت میں وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہ سکیں گے۔ اِلّا یہ کہ وہ توبہ کریں اور سرکشی سے باز آئیں۔ کوئی شخص ماضی میں خواہ کتنا ہی برا رہا ہو مگر جب وہ اصلاح قبول کر لے تو وہ اسلامی برادری کا ایک معزز رکن بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿١٢﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا

۱۲۔ اور اگر عہد کے بعد یہ اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمھارے دین میں عیب لگائیں تو کفر کے ان سرداروں سے لڑو۔ بے شک ان کی قسمیں کچھ نہیں، تا کہ وہ باز آئیں۔ ۱۳۔ کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جنھوں نے اپنے عہد توڑ دیے اور

بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾	رسول کو نکالنے کی جسارت کی اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ میں پہل کی۔ کیا تم ان سے ڈرو گے۔ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ ۱۴۔ ان سے لڑو۔ اللہ تمھارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا اور ان کو رُسوا کرے گا اور تم کو ان پر غلبہ دے گا اور اہلِ ایمان کے سینہ کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دل کی جلن کو دور کر دے گا۔ ۱۵۔ اور اللہ توبہ نصیب کرے گا جس کو چاہے گا اور اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے۔

ائمہ کفر سے مراد قریش ہیں جو اپنے قائدانہ مقام کی وجہ سے عرب میں اسلام کے خلاف تحریک کی امامت کرر ہے تھے۔ قریش کے اس کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تحریک جب اٹھتی ہے تو اس کا پہلا مخالف کون گروہ بنتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جس کو بے آمیز حق کے پیغام میں اپنی بڑائی پر زد پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وہ سر برآوردہ طبقہ ہے جس کے پاس وہ ذہن ہوتا ہے کہ وہ اسلامی دعوت میں شوشے نکال کر لوگوں کو اس کی طرف سے مشتبہ کرے۔ اسی کے پاس وہ وسائل ہوتے ہیں کہ وہ اسلام کے داعیوں کی حوصلہ شکنی کے لیے ان کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈالے۔ اسی کے پاس وہ زور ہوتا ہے کہ وہ حق پرستوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کی تدبیر کرے۔ حتی کہ اسی کو یہ مواقع حاصل ہوتے ہیں کہ اسلام کے ماننے والوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی آگ بھڑکا سکے۔

''ان کے عہد کچھ نہیں'' بہت معنیٰ خیز فقرہ ہے۔ جو لوگ دشمنی اور ضد کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہوں ان کے وعدے اور معاہدے بالکل غیر یقینی ہوتے ہیں۔ ان کی نفسیات میں اپنے حریف کے خلاف مستقل اشتعال برپا رہتا ہے۔ ان کے اندر ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ وہ اگر معاہدہ بھی کر لیں تو اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کو دیر تک باقی رکھنے پر قادر نہیں ہوتے۔ زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ اپنے منفی جذبات سے مغلوب ہو کر وہ معاہدہ کو توڑ دیتے ہیں اور اس طرح اہلِ حق کو یہ موقع دیتے ہیں کہ اپنے اوپر پہل کا الزام لیے بغیر وہ ان کے خلاف مدافعانہ کارروائی کریں اور خدا کی مدد سے ان کا خاتمہ کر دیں۔

تمام حکمت اور دانائی کا سرا اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر اعتراف کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر وہ شعور جگاتا ہے کہ وہ حقیقتوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے کے لیے خدائی منصوبہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ خدا کی منشا کو جان کر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے آپ کو اس میں لگا دیتا ہے۔ وہ اس صحیح ترین راستہ پر چل پڑتا ہے جس کی آخری منزل صرف کامیابی ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کی آنکھوں

کو اشک آلود کردیتا ہے۔مگر اللہ کے لیے بھیگی ہوئی آنکھ ہی وہ آنکھ ہے جس کے لیے یہ مقدر ہے کہ اس کو ٹھنڈک حاصل ہو، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَ لَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَلَمۡ يَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوۡلِهٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلِيۡجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۶ ع ۲/۸

۱۶۔ کیا تمھارا یہ گمان ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے حالاں کہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنھوں نے جہاد کیا اور جنھوں نے اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

موجودہ دنیا میں آدمی جب کسی چیز کو اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے تو اس کو حاصل کرنے میں طرح طرح کے مسائل اور تقاضے سامنے آتے ہیں۔ اگر آدمی کو اپنا مقصد عزیز ہے تو وہ ان مسائل کو عبور کرنے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے میں اپنی ساری قوت لگا دیتا ہے۔اسی کا نام جہاد ہے۔ یہ جہاد اس دنیا میں ہر ایک کو پیش آتا ہے۔ ہر آدمی کو جہاد کی سطح پر اپنی طلب کا ثبوت دینا پڑتا ہے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی طلب میں کامیاب ہو۔ فرق یہ ہے کہ غیر مومن دنیا کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور مومن آخرت کی راہ میں۔

یہی جہاد یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے مقصد میں کتنا سنجیدہ ہے۔ایک شخص جو ایمان کا مدعی ہو اس کے سامنے بار بار مختلف مواقع آتے ہیں جو اس کے دعوے کا امتحان ہوں۔ کبھی اس کا دل کسی کے خلاف بغض وحسد کے جذبات سے متاثر ہونے لگتا ہے اور اس کا ایمان اس سے کہتا ہے کہ اس قسم کے تمام جذبات کو اپنے اندر سے نکال دو۔ کبھی اس کی زبان پر ناپسندیدہ کلمات آتے ہیں اور ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس وقت اپنی زبان کو پکڑ لیا جائے۔ کبھی معاملات کے دوران کسی کو ایسا حق دینا پڑتا ہے جو قلب کو بالکل ناگوار ہو مگر ایمان یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ حق دار کو انصاف کے مطابق اس کا پورا حق پہنچایا جائے۔ اسی طرح اسلام کی دعوت کبھی ایسے موڑ پر پہنچ جاتی ہے کہ ایمان یہ کہتا ہے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی جان ومال قربان کردو۔ ایسے تمام مواقع پر گریز یا فرار سے بچنا اور ہر قیمت پر ایمان واسلام کے تقاضے پورے کرتے رہنا، اسی کا نام جہاد ہے۔

جب کوئی شخص اسلام کے لیے مجاہد بن جائے تو اس کا تمام تر نفسیاتی تعلق اللہ اور رسول اور اہل ایمان سے ہو جاتا ہے۔ وہ ان کے سوا کسی کو اپنا ولیجہ نہیں بناتا۔ وَلَجَ کے معنی ہیں داخل ہونا۔ ولیجہ کسی وادی کے اس غار کو کہتے ہیں جہاں راستہ چلنے والے بارش وغیرہ سے پناہ لیں۔ اسی سے ولیجہ ہے، یعنی ولی دوست۔

موجودہ دنیا میں جب بھی آدمی کسی وسیع تر مقصد کو اپناتا ہے تو اس کو لازماً ایسا کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی مرکزیت سے وابستہ ہو۔ وہ اپنے قائد کا مکمل وفادار بنے۔ وہ اس راہ کے ساتھیوں سے پوری طرح جڑ جائے۔ مقصدیت کے احساس کے ساتھ یہ چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ ان کے بغیر بامقصد زندگی کا دعویٰ بالکل جھوٹا ہے۔ اسی طرح آدمی جب دین کو سنجیدگی کے ساتھ اپنی زندگی میں داخل کرے گا تو لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ خدا اور رسول اور

اہلِ ایمان اس کا "ولیجہ" بن جائیں۔ وہ ہر اعتبار سے ان کے ساتھ جڑ جائے گا۔ سنجیدگی کے ساتھ دین اختیار کرنے والے کے لیے اللہ اور رسول اور اہل ایمان، عملی طور پر، ایسی وحدت کے اجزاء ہیں جن کے درمیان تقسیم ممکن نہیں۔

اس معاملہ کی نزاکت بہت بڑھ جاتی ہے جب یہ سامنے رکھا جائے کہ اس کی جانچ کرنے والا وہ ہے جس کو کھلے اور چھپے کا علم ہے، وہ ہر آدمی سے اس کی حقیقت کے اعتبار سے معاملہ کرے گا، نہ کہ اس کے ظاہری رویہ کے اعتبار سے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

۱۷۔ مشرکوں کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں حالاں کہ وہ خود اپنے اوپر کفر کے گواہ ہیں۔ ان لوگوں کے اعمال اکارت گئے اور وہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔ ۱۸۔ اللہ کی مسجدوں کو تو وہ آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ ایسے لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں میں سے بنیں۔ ۱۹۔ کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کے بسانے کو برابر کر دیا اس شخص کے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ ۲۰۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا، ان کا درجہ اللہ کے یہاں بڑا ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ۲۱۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لیے دائمی نعمت ہوگی۔ ۲۲۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ ہی کے پاس بڑا اجر ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت عرب میں یہ صورت حال تھی کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع تھے اور مشرکین بیت اللہ کے گرد۔ اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عظمتوں کی وہ تاریخ وابستہ نہیں ہوئی تھی جس کو آج ہم جانتے ہیں۔ لوگوں کو آپ عام انسانوں کی طرح ایک انسان دکھائی دیتے تھے۔ دوسری طرف

مسجد حرام ہزاروں برس کی تاریخ کے نتیجہ میں عظمت وتقدس کی علامت بنی ہوئی تھی۔ مشرکین کی نظر میں اپنی تصویر تو یہ تھی کہ وہ ایک مقدس ترین مرکز کے خادم اور آباد کار ہیں۔ دوسری طرف جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے تو اس وقت کے حالات میں ان کو ایسا معلوم ہوتا جیسے کچھ لوگ بس ایک دیوانہ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

مگر مشرکین کا یہ خیال سراسر باطل تھا۔ وہ ظواہر کا تقابل حقائق سے کرنے کی غلطی کر رہے تھے۔ مسجد حرام کے زائرین کو پانی پلانا، اس کے اندر روشنی اور صفائی کا انتظام۔ کعبہ پر غلاف چڑھادینا۔ مسجد کے فرش اور دیوار کی مرمت، یہ سب ظاہری نمائش کی چیزیں ہیں۔ یہ بھلا ان اعمال کے برابر ہوسکتی ہیں جب کہ آدمی اللہ کو پالیتا ہے اور آخرت کی فکر میں جینے لگتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور اپنے اثاثہ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ دوسری تمام بڑائیوں کا انکار کر کے ایک خدا کو اپنا بڑا بنالیتا ہے۔ سچائی کو پانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کو معانی کی سطح پر پایا ہو، نہ کہ ظواہر کی سطح پر۔ جو قربانی کی حد تک سچائی سے تعلق رکھنے والے ہوں، نہ کہ محض سطحی اور نمائشی کارروائیوں کی حد تک۔

اللہ سے تعلق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تعلق وہ ہے جو رسمی عقیدہ کی حد تک ہوتا ہے، جس میں آدمی کچھ دکھاوے کے اعمال تو کرتا ہے مگر اپنے کو اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔ دوسرا تعلق وہ ہے جب کہ آدمی اپنے ایمان میں اتنا سنجیدہ ہو کہ اس راہ میں اس کو جو کچھ چھوڑنا پڑے وہ اس کو چھوڑ دے اور جو چیز دینی پڑے اس کو دینے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہی دوسری قسم کے بندے ہیں جو مرنے کے بعد خدا کے یہاں اعلیٰ ترین انعامات سے نوازے جائیں گے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾ ع ۳ / ۸ / ۹

۲۳۔ اے ایمان والو، اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں۔ اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائیں گے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ ۲۴۔ کہو کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے لڑکے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راستہ نہیں دیتا۔

لوگوں کے لیے اپنا خاندان، اپنی جائداد، اپنے معاشی مفادات سب سے قیمتی ہوتے ہیں۔ انھیں چیزوں کو وہ سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں وہ ان کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنا سب کچھ ان کے اوپر نثار کردیتے ہیں۔ اس قسم کی زندگی دنیا دارانہ زندگی ہے۔ ایسا آدمی جو کچھ پاتا ہے بس اسی دنیا میں پاتا ہے۔ موت کے بعد والی ابدی دنیا میں اس کے لیے کچھ نہیں۔ اس کے برعکس، دوسری زندگی وہ ہے جب کہ آدمی اللہ اور رسول کو اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کو سب سے زیادہ اہمیت دے اور اس کی خاطر دوسری ہر چیز چھوڑنے کے لیے تیار رہے۔ یہی دوسری زندگی خدا پرستانہ زندگی ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لیے آخرت میں ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔

ایک زندگی وہ ہے، جو دنیوی تعلقات اور دنیوی مفادات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ دوسری زندگی وہ ہے جو ایمان کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ دونوں میں سے جس چیز کو بھی آدمی اپنی زندگی کی بنیاد بنائے، وہ ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ وہ اس کی خاطر دوسری چیزوں کو چھوڑ دے۔ وہ کچھ لوگوں سے تعلق قائم کرے اور کچھ دوسرے لوگوں سے بے تعلق ہوجائے۔ وہ کچھ چیزوں کی بقاء اور ترقی میں اپنی ساری توجہ لگادے اور کچھ دوسری چیزوں کی بقاء اور ترقی کے معاملہ میں بے پروا بنا رہے۔ کچھ نقصانات اس کو کسی قیمت پر گوارا نہ ہوں، وہ جان پر کھیل کر اپنا بہترین سرمایہ خرچ کرکے ان کو بچانے کی کوشش کرے اور کچھ دوسرے نقصانات کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے مگر ان کے بارے میں اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہ ہو۔ دنیا ہمیشہ ان لوگوں ملتی ہے جو دنیا کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیں۔ اسی طرح آخرت صرف ان لوگوں کے حصہ میں آئے گی جو آخرت کی خاطر دوسری چیزوں کو قربان کردیں۔

ترجیح (ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے کا معاملہ) انتہائی سنگین ہے۔ حتی کہ وہی آدمی کے کفر وایمان کا فیصلہ کرتا ہے۔ خدا کی دنیا میں جس طرح کھلے کافروں کے لیے کامیابی مقدر نہیں ہے اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی یہاں کامیابی کا کوئی امکان نہیں، جو ایمان کا دعویٰ کریں اور جب نازک موقع آئے تو وہ آخرت پسندانہ روش کے مقابلہ میں دنیادارانہ روش کو ترجیح دیں۔ ایسے مدعیانِ ایمان اگر اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہوں تو ان کو اس وقت معلوم ہوجائے گا جب اللہ اپنا فیصلہ ظاہر کردے گا۔

لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيۡ مَوَاطِنَ كَثِيۡرَةٍ ۙ وَّيَوۡمَ حُنَيۡنٍ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَيۡـًٔا وَّضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّيۡتُمۡ مُّدۡبِرِيۡنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَاَنۡزَلَ جُنُوۡدًا

۲۵۔ بے شک اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تمھاری کثرت نے تم کو نازیں مبتلا کردیا تھا۔ پھر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی۔ اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ ۲۶۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے رسول

لَّمۡ تَرَوۡهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَذٰلِكَ
جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝٢٦ ثُمَّ يَتُوۡبُ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِ
ذٰلِكَ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝٢٧
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِكُوۡنَ نَجَسٌ
فَلَا يَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَـرَامَ بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا ۚ
وَاِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ
فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝٢٨

اور مومنین پر اپنی سکینت اتاری اور ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور اللہ نے منکروں کو سزا دی اور یہی منکروں کا بدلہ ہے۔ ۲۷۔ پھر اس کے بعد اللہ جس کو چاہے توبہ نصیب کردے اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۲۸۔ اے ایمان والو، مشرکین بالکل ناپاک ہیں۔ پس وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آئیں اور اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تم کو بے نیاز کردے گا، اللہ علیم اور حکیم ہے۔

مسلمانوں کا غلبہ کافروں کو ان کے کفر کی سزا کا اگلا نتیجہ ہے۔ مگر کافروں کا کفر مسلمانوں کے اسلام کی نسبت سے متحقق ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اپنی اسلامیت کھودیں تو کافروں کا کفر کس چیز کے مقابلہ میں ثابت ہوگا اور کس بنیاد پر خدا وہ تفریقی معاملہ کرے گا جو ایک کے لیے انعام بنے اور دوسرے کے لیے سزا۔

رمضان 8ھ میں مسلمانوں نے قریش کو کامیاب طور پر مغلوب کرکے مکہ کو فتح کیا۔ مگر اگلے ہی مہینہ شوال 8ھ میں ان کو ہوازن وثقیف کے مشرک قبائل کے مقابلہ میں شکست ہوئی، جب کہ فتح مکہ کے وقت مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی اور ہوازن وثقیف سے مقابلہ کے وقت بارہ ہزار۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش سے مقابلہ کے وقت مسلمان صرف اللہ کے بھروسے پر نکلے تھے۔ مگر ہوازن وثقیف کے مقابلہ پر نکلتے ہوئے انھیں یہ ناز ہوگیا کہ اب تو ہم فاتحِ مکہ ہیں۔ ہمارے ساتھ بارہ ہزار آدمیوں کا لشکر ہے، آج ہم کو کون شکست دے سکتا ہے۔ جب وہ خدا کے اعتماد پر تھے تو انھیں کامیابی ہوئی، جب ان کو اپنی ذات پر اعتماد ہوگیا تو انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اپنی ذات پر بھروسہ آدمی کے اندر گھمنڈ کا جذبہ ابھارتا ہے جس کے نتیجہ میں خارجی حقیقتوں سے بے پروائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ نظم کی پابندی میں کوتاہ ہوجاتا ہے۔ وہ بے جا خود اعتمادی کی وجہ سے غیر حقیقت پسندانہ اقدام کرنے لگتا ہے جس کا نتیجہ اس عالم اسباب میں لازمی شکست ہے۔ اس کے برعکس خدا پر بھروسہ سب سے بڑی طاقت پر بھروسہ ہے۔ اس سے آدمی کے اندر تواضع کا جذبہ ابھرتا ہے۔ وہ انتہائی حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ اور حقیقت پسندی بلاشبہ تمام کامیابیوں کی جڑ ہے۔

ابتداءً جب یہ حکم آیا کہ حرم میں مشرکوں کا داخلہ بند کردو تو مسلمانوں کو تشویش ہوئی کیوں کہ غیر زرعی ملک ہونے کی وجہ سے عرب کی اقتصادیات کا انحصار تجارت پر تھا اور تجارت کی بنیاد ہمیشہ مشترکہ تعلقات پر ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے سوچا کہ جب حرم میں مشرکین کا آنا بند ہوگا تو ان کے ساتھ تجارتی رشتے بھی ٹوٹ جائیں گے۔ مگر ان

کی نظر اس امکان پر نہیں گئی کہ آج کے مشرک کل کے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عربوں کے عمومی طور پر اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے تجارتی سرگرمیاں دوبارہ نئی صورت سے بحال ہوگئیں۔ نیز اس ابتدائی قربانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر اسلام ایک بین اقوامی دین بن گیا۔ جو معاشی دروازے مقامی سطح پر بند ہوتے نظر آتے تھے وہ عالمی سطح پر کھل گئے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾
ع ۵ ۱۰
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

۲۹۔ ان اہل کتاب سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے ہیں اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ ۳۰۔ اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ وہ ان لوگوں کی بات کی نقل کر رہے ہیں جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا۔ اللہ ان کو ہلاک کرے، وہ کدھر بہکے جا رہے ہیں۔ ۳۱۔ انھوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالاں کہ ان کو صرف یہ حکم تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں۔

ایمان زندہ ہو تو آدمی ہر واقعہ کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ کسی چیز کو صرف اس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ خدا کی نسبت سے اس کے بارے میں رائے قائم کرلے۔ وہ پھول کی خوشبو کو اس وقت سمجھتا ہے جب کہ اس میں اسے خدا کی مہک مل جائے۔ وہ سورج کو اس وقت دریافت کرتا ہے جب کہ وہ اس کے معطی کو معلوم کرلے۔ ہر بڑائی اس کو خدا کا عطیہ نظر آتی ہے۔ ہر خوبی اس کو خدا کا احسان یاد دلاتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر خدا سے آدمی کا تعلق گھٹ کر صرف موہوم عقیدہ کے درجہ پر آجائے تو خدا اس کے زندہ شعور کے لیے ایک لامعلوم چیز بن جائے گا۔ وہ دنیا کی نظر آنے والی چیزوں پر خدا کو قیاس کرنے لگے گا۔

رسول اللہ کے خلاف جارحیت کرنے والے مشرکین (بنو اسماعیل) بھی تھے اور اہلِ کتاب (بنو اسرائیل)

بھی۔ مگر دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ کیا گیا۔ مشرکین کے ساتھ جنگ یا اسلام کا اصول اختیار کیا گیا۔ مگر اہلِ کتاب کے لیے حکم ہوا کہ اگر وہ جزیہ (سیاسی اطاعت) پر راضی ہو جائیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلاً مخاطب تھے اور اہلِ کتاب تبعاً۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم پر پیغمبر کے ذریعہ براہِ راست دعوت پہنچائی جاتی ہے اس سے اتمام حجت کے بعد زندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے کسی ریاست میں ایک شخص کے باغی ثابت ہونے کے بعد اس سے زندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک دوسرے گروہوں کا تعلق ہے ان کے ساتھ وہی سیاسی معاملہ کیا جاتا ہے جو عام بین اقوامی اصول کے مطابق درست ہو۔

دوسری قسم کے لوگ طبعی طور پر خالق کو ان دنیوی چیزوں کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں جن کو وہ جانتے ہیں۔ وہ خالق کو مخلوق کی سطح پر اتار لاتے ہیں۔ یہی حال یہود و نصاریٰ کا اپنے بگاڑ کے زمانے میں ہوا۔ اب خدا ان کے یہاں موہوم معتقدات کے خانہ میں چلا گیا۔ چنانچہ وہ اپنے نظر آنے والے اکابر اور بزرگوں کو وہ درجہ دینے لگے جو درجہ خدائے عالم الغیب کو دینا چاہیے۔ انھوں نے دیکھا کہ یونانی اور رومی قومیں سورج کو خدا بنا کر اس کے لیے بیٹا فرض کیے ہوئے ہیں تو ان کو بھی اپنے بزرگوں کے لیے یہی سب سے اونچا لفظ نظر آیا۔ انھوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں، اب اور ابن کے الفاظ کی خود ساختہ تشریح کرکے خدا کو باپ اور اپنے پیغمبر کو اس کا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ خدا صرف ایک ہی ہے، وہ ہر مشابہت سے پاک ہے، وہی تنہا اس کا مستحق ہے کہ اس کو بڑا بنایا جائے اور اس کی عبادت کی جائے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ الصف

۳۲۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ ۳۳۔ اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

اِن آیتوں میں خدا نے اپنے اس مستقل فیصلہ کا اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے دین کو قیامت تک پوری طرح محفوظ رکھے گا، ماضی کی طرح اب ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا کہ لوگ اپنی ملاوٹوں سے خدا کے دین کو گم کر دیں۔ یا کوئی طاقت اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے میں کامیاب ہو۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو زمین پر بسایا تو اسی کے ساتھ اس کے لیے اپنا ہدایت نامہ بھی انسان کے حوالے کر دیا۔ بعد کے دور میں جب لوگ غفلت اور دنیا پرستی میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے خدا کے الفاظ کو بدل کر اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق بنا لیا۔ مثلاً اپنے بزرگوں کو خدا کے یہاں سفارشی مان کر یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ ہم جو کچھ بھی

کریں، ہمارے بزرگ اپنے سفارش کے زور پر ہم کو خدا کے یہاں نجات دلا دیں گے یا یہ کہ جنت اور جہنم سب اسی دنیا میں ہیں۔ اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ لوگ جو چاہتے تھے اس کو انھوں نے خدا کی طرف منسوب کرکے خدا کی کتاب میں لکھ دیا۔ اس کے بعد خدا نے دوسرا نبی بھیجا جس نے خدا کے دین کو انسانی ملاوٹوں سے الگ کرکے دوبارہ اس کو صحیح شکل میں پیش کیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں لوگوں نے اس کو بھی بدل ڈالا۔ یہی بار بار ہوتا رہا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ ایک آخری رسول بھیجے اور اس کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کرے کہ خدا کا دین ہمیشہ کے لیے اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہو جائے۔ پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تاریخ نبوت کا یہی عظیم کارنامہ انجام پایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس وقت لوگوں نے خود ساختہ طور پر بہت سے دین بنا رکھے تھے۔ عرب کے مشرکین کا ایک دین تھا جس کو وہ دینِ ابراہیم کہتے تھے۔ یہود کا ایک دین تھا جس کو وہ دینِ موسیٰ کہتے تھے۔ نصاریٰ کا ایک دین تھا جس کو وہ دینِ مسیح کہتے تھے۔ یہ سب خدا کے دین کے خود ساختہ ایڈیشن تھے جن کو انہوں نے غلط طور پر خدا کی طرف سے آیا ہوا دین قرار دے رکھا تھا۔ خدا نے ان سب دینوں کو رد کر دیا اور پیغمبر عربی کے دین کو اپنے دین کے واحد مستند ایڈیشن کے طور پر قیامت تک کے لیے قائم کر دیا۔

آج اسلام واحد دین ہے جس کے متن میں کوئی تبدیلی ممکن نہ ہو سکی جب کہ دوسرے تمام ادیان انسانی تحریفات کا شکار ہو کر اپنی اصلی تصویر گم کر چکے ہیں۔ اسلام واحد دین ہے جو تاریخی طور پر معتبر دین ہے جب کہ دوسرے تمام ادیان اپنے حق میں تاریخی اعتباریت کھو چکے ہیں۔ اسلام وہ واحد دین ہے جس کی تمام تعلیمات ایک زندہ زبان میں پائی جاتی ہیں جب کہ دوسرے تمام ادیان کی ابتدائی کتابیں ایسی زبانوں میں ہیں جو اب مردہ ہو چکی ہیں۔ اسلام کی صورت میں خدا نے مذہب کی جو روشنی جلائی وہ کبھی مدھم نہیں ہوئی اور نہ بجھائی جا سکی۔ وہ کامل طور پر دنیا کے سامنے موجود ہے اور ہر دوسرے دین کے اوپر اپنی اصولی برتری کو مسلسل قائم رکھے ہوئے ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ ٱلْأَحْبَارِ وَٱلرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَٰطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۗ وَٱلَّذِينَ يَكْنِزُونَ ٱلذَّهَبَ وَٱلْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِى نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُواْ مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

۳۴۔ اے ایمان والو، اہل کتاب کے اکثر علماء اور مشائخ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ ۳۵۔ اس دن اس مال پر دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ یہی ہے وہ جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کیا تھا۔ پس اب چکھو جو تم جمع کرتے رہے۔

دوسرے کا مال لینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو حق کے مطابق لیا جائے۔ یعنی آدمی دوسرے کی کوئی واقعی خدمت کرے یا اس کو کوئی حقیقی نفع پہنچائے اور اس کے بدلے میں اس کا مال حاصل کرے۔ یہ بالکل جائز ہے۔ باطل طریقے سے دوسرے کا مال لینا یہ ہے کہ دوسرے کو دھوکے میں ڈال کر اس کا مال حاصل کیا جائے۔ یہ دوسرا طریقہ ناجائز ہے اور خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہے۔

باطل طریقے سے دوسرے کا مال کھانا وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں استحصال (exploitation) کہا جاتا ہے۔ یہود کے اکابر بہت بڑے پیمانہ پر اپنے عوام کا مذہبی استحصال کر رہے تھے۔ وہ عوام میں ایسی جھوٹی کہانیاں پھیلائے ہوئے تھے جس کے نتیجہ میں لوگ بزرگوں سے غیر معمولی امیدیں وابستہ کریں اور پھر ان کو بزرگ سمجھ کر ان کی برکت لینے کے لیے آئیں اور انھیں ہدیے اور نذرانے پیش کریں۔ وہ خدا کے دین کی خدمت کے نام پر لوگوں سے رقمیں وصول کرتے تھے، حالاں کہ جو دین وہ لوگوں کے درمیان تقسیم کر رہے تھے وہ ان کا اپنا بنایا ہوا دین تھا، نہ کہ حقیقۃً خدا کا اتارا دین۔ وہ ملت یہود کے احیاء کے نام پر بڑے بڑے چندے وصول کرتے تھے، حالاں کہ احیاءِ ملت کے نام پر جو کچھ کر رہے تھے وہ صرف یہ تھا کہ لوگوں کو خوش خیالیوں میں الجھا کر انھیں اپنی قیادت کے لیے استعمال کرتے رہیں۔ وہ تعویذ گنڈے میں پُراسرار اوصاف بتا کر ان کو لوگوں کے ہاتھوں فروخت کرتے تھے۔ حالاں کہ ان کا حال یہ تھا کہ خود اپنے نازک معاملات میں وہ کبھی ان تعویذ گنڈوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

آدمی کے پاس جو مال آتا ہے اس کے دو ہی جائز مصرف ہیں۔ اپنی واقعی ضرورتوں میں خرچ کرنا، اور جو کچھ واقعی ضرورت سے زائد ہو اس کو خدا کے راستہ میں دے دینا۔ اس کے علاوہ جو طریقے ہیں وہ سب آدمی کے لیے عذاب بننے والے ہیں۔ خواہ وہ اپنے مال کو فضول خرچیوں میں اڑاتا ہو یا اس کو جمع کر کے رکھ رہا ہو۔

جو لوگ یہود کی طرح خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر کسی گروہ کے اوپر اپنی قیادت قائم کیے ہوئے ہوں اور خدا کے دین کے نام پر لوگوں کا استحصال کر رہے ہوں وہ کسی ایسی دعوت کو سخت ناپسند کرتے ہیں جو خدا کے سچے اور بے آمیز دین کو زندہ کرنا چاہتی ہو۔ ایسے دین میں انھیں اپنی مذہبی حیثیت بے اعتبار ہوتی نظر آتی ہے۔ انھیں دکھائی دیتا ہے کہ اگر اس کو عوام میں فروغ حاصل ہو تو ان کی مذہبی تجارت بالکل بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گی۔ وہ ایسی تحریک کے اٹھتے ہی اسے سونگھ لیتے ہیں اور اس کے مخالف بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ

۳۶۔ مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کی کتاب میں، جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی ہے سیدھا دین۔ پس ان میں تم اپنے

الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا
الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ
اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنَّمَا
النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا
لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا
حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ ع ٥/٨/١١

اوپر ظلم نہ کرو۔ اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ ۳۷۔ مہینوں کا ہٹا دینا کفر میں ایک اضافہ ہے۔ اس سے کفر کرنے والے گمراہی میں پڑتے ہیں، وہ کسی سال حرام مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں تاکہ خدا کے حرام کیے ہوئے کی گنتی پوری کر کے اس کے حرام کیے ہوئے کو حلال کر لیں۔ ان کے برے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دئے گئے ہیں۔ اور اللہ انکار کرنے والوں کو راستہ نہیں دکھاتا۔

دینی احکام پر ہر شخص الگ الگ بھی عمل کر سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ تمام اہل ایمان ایک ساتھ ان پر عمل کریں تاکہ ان میں اجتماعیت پیدا ہو۔ اسی اجتماعیت کے مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر عبادات کی ادائیگی کے لیے متعین اوقات اور تاریخیں مقرر کی گئی ہیں۔ یہ تاریخیں اگر شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے رکھی جائیں تو ان کے زمانہ میں یکسانیت آجاتی۔ مثلاً روزہ ہمیشہ ایک موسم میں آتا اور حج ہمیشہ ایک موسم میں۔ مگر یکسانیت آدمی کے اندر جمود پیدا کرتی ہے اور تبدیلی سے نئی قوت عمل بیدار ہوتی ہے۔ اس بنا پر دینی امور کے اجتماعی نظام کے لیے چاند کا قدرتی کیلنڈر اختیار کیا گیا۔

اسی اصول کی وجہ سے حج کی تاریخیں مختلف موسموں میں آتی ہیں، کبھی سردیوں میں اور کبھی گرمیوں میں۔ قدیم زمانہ میں جب کہ حج کا اجتماع زبردست تجارتی اہمیت رکھتا تھا۔ مختلف موسموں میں حج کا آنا تجارتی اعتبار سے مضر معلوم ہوا۔ اہل عرب کو دینی مصلحتوں کے مقابلہ میں دنیوی مصلحتیں زیادہ اہم نظر آئیں۔ انہوں نے چاہا کہ ایسی صورت اختیار کریں کہ حج کی تاریخ ہمیشہ ایک ہی موافق موسم میں پڑے۔ اس موقع پر یہود و نصاریٰ کا کبیسہ کا حساب ان کے علم میں آیا۔ اپنی خواہشوں کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے وہ ان کو پسند آگیا اور انہوں نے اس کو اپنے یہاں رائج کر لیا۔ یعنی مہینوں کو ہٹا کر ایک کی جگہ دوسرے کو رکھ دینا۔ مثلاً محرم کو صفر کی جگہ کر دینا اور صفر کو محرم کی جگہ۔

نسئی کے اس طریقے سے اہل عرب کو دو فائدے ہوئے۔ ایک یہ کہ حج کے موسم کو تجارتی تقاضے کے مطابق کر لینا۔ دوسرے یہ کہ حرام مہینوں (محرم، رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ) میں کسی کے خلاف لڑائی چھیڑنا ہو تو حرام مہینہ کی جگہ غیر حرام مہینہ رکھ کر لڑائی کو جائز کر لینا۔ اہل عرب کے سامنے حضرت ابراہیم کا طریقہ بھی تھا۔ مگر ان

کے ذہن پر چونکہ تجارتی مقاصد اور قبائلی تقاضوں کا غلبہ تھا۔ اس لیے ان کو نسئی کا طریقہ زیادہ اچھا معلوم ہوا اور انھوں نے اپنے معاملات کے لیے اس کو اختیار کرلیا۔

''تم بھی مل کر لڑو جس طرح وہ مل کر لڑتے ہیں''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ خدا سے بے خوفی پر متحد ہوجاتے ہیں، تم خدا سے خوف (تقویٰ) پر متحد ہوجاؤ۔ وہ منفی مقاصد کے لیے باہم جڑ جاتے ہیں تم مثبت مقاصد کے لیے آپس میں جڑ جاؤ۔ وہ دنیا کی خاطر ایک ہوجاتے ہیں تم آخرت کی خاطر ایک ہوجاؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ
انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى
الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ
الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ
اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ
شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا
تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ
لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ
سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ
جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ
اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

۳۸۔ اے ایمان والو، تم کو کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے لگے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی پر راضی ہوگئے۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کا سامان تو بہت تھوڑا ہے۔ ۳۹۔ اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو دردناک سزا دے گا اور تمھاری جگہ وہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۰۔ اگر تم رسول کی مدد نہ کرو گے تو اللہ خود اس کی مدد کرچکا ہے جب کہ منکروں نے اس کو نکال دیا تھا، وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور اللہ نے منکروں کی بات نیچی کردی اور اللہ ہی کی بات تو اونچی ہے اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

یہ آیتیں غزوہ تبوک (9ھ) کے ذیل میں اتری ہیں۔ اس موقع پر مدینہ کے منافقین کی طرف سے جو عمل ظاہر ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمزور ایمان والے لوگ جب کسی اسلامی معاشرہ میں داخل ہوجاتے ہیں تو نازک مواقع پر ان کا کردار کیا ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام سے تعلق کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی سے آدمی کی تمام وفاداریاں وابستہ ہوجائیں۔ وہ آدمی کے لیے زندگی و موت کا مسئلہ بن جائے۔ دوسرے یہ کہ آدمی کی حقیقی دلچسپیاں تو کہیں اور اٹکی

ہوئی ہوں اور اوپری طور پر وہ اسلام کا اقرار کرلے۔ پہلی قسم کے لوگ سچے مومن ہیں اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو شریعت کی اصطلاح میں منافق کہا گیا ہے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ عام حالات میں بھی وہ اسلام کو پکڑے ہوئے ہوتا ہے اور قربانی کے لمحات میں بھی وہ پوری طرح اس پر قائم رہتا ہے۔ اس کے برعکس، منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بےضرر اسلام یا نمائشی دین داری میں تو بہت آگے دکھائی دیتا ہے۔ مگر جب قربانی کی سطح پر اسلام کے تقاضوں کو اختیار کرنا ہو تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مومن کے سامنے اصلاً آخرت ہوتی ہے اور منافق کے سامنے اصلاً دنیا۔ مومن آخرت کی بے پایاں نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا، اس لیے جب بھی دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے راستہ میں حائل ہو تو وہ اس کو نظر انداز کرکے دین کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس، منافق ایسے اسلام کو پسند کرتا ہے جس میں دنیا کو بگاڑے بغیر اسلامیت کا کریڈٹ مل رہا ہو۔ اس لیے جب ایسا موقع آتا ہے کہ دنیا کو کھو کر اسلام کو پانا ہو تو وہ دنیا کی طرف جھک جاتا ہے، خواہ اس کے نتیجہ میں اسلام کی رسی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔

اسلام اور غیر اسلام کی کش مکش کے جو لمحات موجودہ دنیا میں آتے ہیں وہ بظاہر دیکھنے والوں کو اگرچہ دو انسانی گروہوں کی کش مکش دکھائی دیتی ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک خدائی معاملہ ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر خود خدا اسلام کی طرف سے کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے کسی واقعہ کو اسباب کے روپ میں اس لیے ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ ان لوگوں کو خدمتِ دین کا کریڈٹ دیا جائے جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے حوالے کرچکے ہیں۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾ ع ٦ ۵ ۱۲

۴۱۔ ہلکے اور بوجھل اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۴۲۔ اگر نفع قریب ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمھارے پیچھے ہو لیتے، مگر یہ منزل ان پر کٹھن ہوگئی۔ اب وہ قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے ہوسکتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

مدینہ کے منافقین میں ایک طبقہ کم زور عقیدہ کے مسلمانوں کا تھا۔ انھوں نے اسلام کو حق سمجھ کر اس کا اقرار کیا تھا۔ وہ اسلام کی ان تعلیمات پر عمل کرتے تھے جو ان کی دنیوی مصلحتوں کے خلاف نہ ہوں۔ مگر جب اسلام کا تقاضا ان کے دنیوی تقاضوں سے ٹکراتا تو ایسے موقع پر وہ اسلامی تقاضے کو چھوڑ کر اپنے دنیوی تقاضے کو پکڑ لیتے۔ مدینہ کے معاشرہ میں مومن اس شخص کا نام تھا جو قربانی کی سطح پر اسلام کو

اختیار کیے ہوئے ہو اور منافق وہ تھا جو اسلام کی خاطر قربانی کی حد تک جانے کے لیے تیار نہ ہو۔

تبوک کا معاملہ ایک علامتی تصویر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں مومن کون ہوتا ہے اور منافق کون۔ اس موقع پر روم جیسی بڑی اور منظم طاقت سے مقابلہ کے لیے نکلنا تھا۔ زمانہ شدید گرمی کا تھا۔ فصل بالکل کاٹنے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ہر قسم کی ناسازگاری کا مقابلہ کرتے ہوئے شام کی دور دراز سرحد پر پہنچنا تھا۔ پھر مسلمانوں میں سامان والے تھے اور کچھ بے سامان والے۔ کچھ آزاد تھے اور کچھ اپنے حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ مگر حکم ہوا کہ ہر حال میں نکلو، کسی بھی چیز کو اپنے لیے عذر نہ بناؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے یہاں اصل مسئلہ مقدار کا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کو پیش کر دے۔ یہی دراصل جنت کی قیمت ہے، خواہ وہ بظاہر دیکھنے والوں کے نزدیک کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

منافق کی خاص پہچان یہ ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ بے مشقت سفر کر کے خدمت اسلام کا ایک بڑا کریڈٹ مل رہا ہے تو وہ فوراً ایسے سفر کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر ایسا سفر درپیش ہو جس میں مشقتیں ہوں اور سب کچھ کر کے بھی بظاہر کوئی عزت اور کامیابی ملنے والی نہ ہو تو ایسی دینی مہم کے لیے اس کے اندر رغبت پیدا نہیں ہوتی۔

ایک حقیقی دینی مہم سامنے ہو اور آدمی عذرات پیش کر کے اس سے الگ رہنا چاہے تو یہ صاف طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے خدا کے دین کو اپنی زندگی میں سب سے اونچا مقام نہیں دیا ہے۔ عذر پیش کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ پیش نظر مقصد کے مقابلہ میں کوئی اور چیز آدمی کے نزدیک زیادہ اہمت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا عذر کسی آدمی کو خدا کی نظر میں بے اعتبار ثابت کرنے والا ہے، نہ یہ کہ اس کی بنا پر اس کو مقبولین کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ منافقت دراصل خدا سے بے پروا ہو کر بندوں کی پروا کرنا ہے۔ آدمی اگر خدا کی قدرت کو جان لے تو وہ کبھی ایسا نہ کرے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ
لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٤٣﴾
لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ
اَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٤﴾ اِنَّمَا
يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ
رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَ لَوْ اَرَادُوا

۴۳۔ اللہ تم کو معاف کرے، تم نے کیوں انھیں اجازت دے دی۔ یہاں تک کہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔
۴۴۔ جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، وہ کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ وہ اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد نہ کریں، اور اللہ ڈرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔
۴۵۔ تم سے اجازت تو وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ پس وہ اپنے شک میں

الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

بھٹک رہے ہیں۔ ۴۶۔ اور اگر وہ نکلنا چاہتے تو ضرور وہ اس کا کچھ سامان کر لیتے۔ مگر اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہ کیا اس لیے انھیں جمار ہنے دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔

منافق وہ ہے جو اسلام کے نفع بخش یا بے ضرر پہلوؤں میں آگے آگے رہے مگر جب اس کے مفادات پر زد پڑتی نظر آئے تو وہ پیچھے ہٹ جائے۔ ایسے مواقع پر اس قسم کے کمزور لوگ جس چیز کا سہارا لیتے ہیں وہ عذر ہے۔ وہ اپنی بے عملی کو خوبصورت توجیہات میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سربراہ اگر اجتماعی مصالح کے پیش نظر ان کے عذر کو قبول کر لے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ انھوں نے اپنے الفاظ کے پردے میں نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی بے عملی کو چھپا لیا۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ اصل معاملہ انسان سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اور وہ ہر آدمی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ خدا ایسے لوگوں کا راز کبھی دنیا میں کھول دیتا ہے اور آخرت میں تو بہر حال ہر ایک کا راز کھولا جانے والا ہے۔

کسی کا لڑکا بیمار ہو یا کسی کی لڑکی کی شادی ہو تو اس وقت وہ اپنے آپ کو اور اپنے مال کو اس سے بچا کر نہیں رکھتا۔ اس کی زندگی اور اس کا مال تو اسی لیے ہے کہ ایسا کوئی موقع آئے تو وہ اپنا سب کچھ نثار کر کے ان کے کام آسکے۔ ایسا کوئی وقت اس کے لیے بڑھ کر قربانی دینے کا ہوتا ہے، نہ کہ عذرات کی آڑ تلاش کرنے کا۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ جو شخص اپنے دین میں سنجیدہ ہو وہ دین کے لیے قربانی کا موقع آنے پر کبھی عذر تلاش نہیں کرے گا۔ اس کے سینے میں جو ایمانی جذبات بے قرار تھے وہ تو گویا اسی دن کے انتظار میں تھے کہ جب کوئی موقع آئے تو وہ اپنے آپ کو نثار کر کے خدا کی نظر میں اپنے کو وفادار ثابت کر سکے۔ پھر ایسا موقع پیش آنے پر وہ عذر کا سہارا کیوں ڈھونڈے گا۔

مومن خدا سے ڈرنے والا ہوتا ہے اور ڈر کا جذبہ آدمی کے اندر سب سے زیادہ قوی جذبہ ہے۔ ڈر کا جذبہ دوسرے تمام جذبات پر غالب آجاتا ہے۔ جس چیز سے آدمی کو ڈر اور اندیشہ کا تعلق ہو اس کے بارے میں وہ آخری حد تک سنجیدہ اور حقیقت پسند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص ڈر کی سطح پر خدا کا مومن بن جائے تو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ کس موقع پر اسے کس قسم کا ردعمل پیش کرنا چاہیے۔

آخرت کا نفع سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آدمی اس کے لیے قربانی دینے میں شک میں پڑ جاتا ہے۔ مگر اس شک کے پردہ کو پھاڑنا ہی اس دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَ

۴۷۔ اگر یہ لوگ تمھارے ساتھ نکلتے تو وہ تمھارے لیے خرابی ہی بڑھانے کا باعث بنتے اور وہ تمھارے درمیان فتنہ پردازی کے لیے دوڑ

فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ۝٤٧ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ
وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ
اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝٤٨

دھوپ کرتے اور تم میں ان کی سننے والے ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ ۴۸۔ یہ پہلے بھی فتنہ کی کوشش کر چکے ہیں اور وہ تمھارے لیے کاموں کا الٹ پھیر کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہو گیا اور وہ ناخوش ہی رہے۔

دین کو اختیار کرنا ایک مخلصانہ ہوتا ہے اور دوسرا منافقانہ۔ مخلصانہ طور پر دین کو اختیار کرنا یہ ہے کہ دین کے مسئلہ کو آدمی اپنی زندگی کا مسئلہ بنائے، اپنی زندگی اور اپنے مال پر وہ سب سے زیادہ دین کا حق سمجھے۔ اس کے برعکس، منافقانہ طور پر دین کو اختیار کرنا یہ ہے کہ دین سے بس رسمی اور ظاہری تعلق رکھا جائے۔ دین کو آدمی اپنی زندگی میں یہ مقام نہ دے کہ اس کے لیے وہ وقف ہو جائے اور ہر قسم کے نقصان کا خطرہ مول لے کر اس کی راہ میں آگے بڑھے۔

اپنی غلطی کو ماننا اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں کمتر تسلیم کرنا ہے اور اس قسم کا اعتراف کسی آدمی کے لیے مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے موقف کو صحیح ثابت کر دے۔ چنانچہ منافقانہ طور پر اسلام کو اختیار کرنے والے ہمیشہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی موقع ملے تو مخلص مومنوں کو مطعون کریں اور ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو زیادہ درست ثابت کر سکیں۔

مدینہ کے منافقین مسلسل اس کوشش میں رہتے تھے۔ مثلاً غزوۂ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو مدینہ میں بیٹھ رہنے والے منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ان کو معاملات جنگ کا تجربہ نہیں ہے۔ انھوں نے جوش کے تحت اقدام کیا اور ہماری قوم کے جوانوں کو غلط مقام پر لے جا کر خواہ مخواہ کٹوا دیا۔

انسانوں میں کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مسائل کا گہرا تجزیہ کر سکیں اور اس حقیقت کو جانیں کہ کسی بات کا قواعدِ زبان کے اعتبار سے صحیح الفاظ میں ڈھل جانا اس کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ وہ بات معنی کے اعتبار سے بھی صحیح ہو گی۔ بیشتر لوگ سادہ فکر کے ہوتے ہیں اور کوئی بات خوبصورت الفاظ میں کہی جائے تو وہ بہت جلد اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر کسی مسلم گروہ میں منافق قسم کے افراد کی موجودگی ہمیشہ اس گروہ کی کمزوری کا باعث ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے کو درست ثابت کرنے کی کوشش میں اکثر ایسا کرتے ہیں کہ باتوں کو غلط رخ دے کر ان کو اپنے مفید مطلب رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ اس سے سادہ فکر کے لوگ متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر غیر ضروری طور پر شبہ اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

منافقین کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود جب بدر کی فتح ہوئی تو عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے کہا: هَذَا الْأَمْرُ قَدْ تَوَجَّهَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4566)۔ یعنی یہ چیز تو اب چل نکلی۔ اسلام کا غلبہ ظاہر ہونے کے بعد انھیں اسلام کی صداقت پر یقین کرنا چاہیے تھا مگر اس وقت بھی انھوں نے اس سے حسد کی غذا لی۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖؗ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

۴۹۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے رخصت دے دیجیے اور مجھ کو فتنہ میں نہ ڈالیے۔ سن لو، وہ تو فتنہ میں پڑ چکے۔ اور بے شک جہنم منکروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ ۵۰۔ اگر تمھیں کوئی اچھائی پیش آتی ہے تو ان کو دکھ ہوتا ہے اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور وہ خوش ہو کر لوٹتے ہیں۔ ۵۱۔ کہو، ہمیں صرف وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا کارساز ہے اور اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ۵۲۔ کہو، تم ہمارے لیے صرف دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی کے منتظر ہو۔ مگر ہم تمھارے حق میں اس کے منتظر ہیں کہ اللہ تم پر عذاب بھیجے اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں سے۔ پس تم انتظار کرو ہم بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہیں۔

مدینہ میں ایک شخص جُد بن قیس تھا۔ تبوک کے غزوہ میں نکلنے کے لیے اعلان عام ہوا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا کہ مجھے اس غزوہ سے معاف رکھیے۔ یہ رومی علاقہ ہے۔ وہاں رومی عورتوں کو دیکھ کر میں فتنہ میں پڑ جاؤں گا، مگر ایسے مواقع پر عذر پیش کرنا بجائے خود فتنہ میں پڑنا ہے۔ کیوں کہ نازک مواقع پر آدمی کے اندر دین کی خاطر فدا ہو جانے کا جذبہ بھڑکنا چاہیے، نہ کہ عذرات تلاش کر کے پیچھے رہ جانے کا۔ پھر ایسے کسی عذر کو دینی اور اخلاقی رنگ دینا اور بھی زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ یہ بے عملی پر فریب کاری کا اضافہ ہے۔

اس قسم کا مزاج حقیقۃً آدمی کے اندر اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز تر رکھتا ہے۔ خطرات کے موقع پر ایسے لوگ دین کی راہ میں آگے بڑھنے سے رکے رہتے ہیں۔ پھر جب سچے حق پرستوں کو ان کی غیر مصلحت اندیشانہ دینداری کی وجہ سے کبھی کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے تو یہ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے اپنے لیے حفاظتی پہلو اختیار کر لیا تھا۔ اس کے برعکس، اگر ایسا ہو کہ سچے حق پرست خطرات کا مقابلہ کریں اور اس میں انھیں کامیابی ہو تو ان لوگوں کے دل تنگ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا کوئی واقعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہ تھی۔

سچے اہل ایمان کے لیے اس دنیا میں ناکامی کا سوال نہیں۔ ان کی کامیابی یہ ہے کہ خدا ان سے راضی ہو اور یہ

ہر حال میں انھیں حاصل ہوتا ہے۔ مومن پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کے دل کی انابت کو بڑھاتی ہے۔ اگر اس کو کوئی سکھ ملتا ہے تو اس کے اندر احسان مندی کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ شکر کر کے خدا کی مزید عنایتوں کا مستحق بنتا ہے۔

''تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کر رہے ہیں'' بظاہر مومنین کا کلمہ ہے۔ مگر حقیقۃً یہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا ان لوگوں سے تہدیدی انداز میں کہہ رہا ہے کہ تم لوگ اہلِ حق کی بربادی کے منتظر ہو، حالاں کہ خدا کے تقدیری نظام کے مطابق انھیں ابدی کامیابی ملنے والی ہے۔ اور تمھارے ساتھ جو ہونا ہے وہ یہ کہ تمھارے جرم کو آخری حد تک ثابت کر کے تم کو دائمی طور پر رسوائی اور عذاب کے حوالے کر دیا جائے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ
مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَ مَا
مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ
كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ
اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَ لَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ
كٰرِهُوْنَ ﴿٥٤﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ
اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ
كٰفِرُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ
مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿٥٦﴾ لَوْ
يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا
اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿٥٧﴾

۵۳۔ کہو، تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ بے شک تم نافرمان لوگ ہو۔ ۵۴۔ اور وہ اپنے خرچ کی قبولیت سے صرف اس لیے محروم ہوئے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور یہ لوگ نماز کے لیے آتے ہیں تو گرانی کے ساتھ آتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں تو ناگواری کے ساتھ۔ ۵۵۔ تم ان کے مال اور اولاد کو کچھ وقعت نہ دو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ ان کے ذریعے سے انھیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ منکر ہوں۔ ۵۶۔ وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالاں کہ وہ تم میں سے نہیں۔ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو تم سے ڈرتے ہیں۔ ۵۷۔ اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ پائیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو وہ بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔

مدینہ میں یہ صورت پیش آئی کہ عمومی طور پر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں اکثریت مخلص اہل ایمان کی تھی تاہم ایک تعداد وہ تھی جس نے وقت کی فضا کا ساتھ دیتے ہوئے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اس کے اندر وہ سپردگی پیدا نہیں ہوئی تھی جو حقیقی ایمان اور سچے تعلق باللہ کا تقاضا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو منافقین کہا جاتا ہے۔
یہ منافقین زیادہ تر مدینہ کے مال دار لوگ تھے اور یہی مال داری ان کے نفاق کا اصل سبب تھی۔ جس کے

پاس کھونے کے لیے کچھ نہ ہو وہ زیادہ آسانی کے ساتھ اسلام کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جس میں اپنا سب کچھ کھو دینا پڑے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کھونے کے لیے ہو وہ عام طور پر مصلحت اندیشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے بے ضرر احکام کی تعمیل تو وہ کسی نہ کسی طرح کر لیتے ہیں۔ مگر اسلام کے جن تقاضوں کو اختیار کرنے میں جان و مال کی محرومی دکھائی دے رہی ہو، جس میں قربانی کی سطح پر مومن بننے کا سوال ہو، ان کی طرف بڑھنے کے لیے وہ اپنے کو آمادہ نہیں کر پاتے۔

مگر قربانی والے اسلام سے پیچھے رہنا ان کے ''نماز روزہ'' کو بھی بے قیمت کر دیتا ہے۔ مسجد کی عبادت کا بہت گہرا تعلق مسجد کے باہر کی عبادت سے ہے۔ اگر مسجد سے باہر آدمی کی زندگی حقیقی دین سے خالی ہو تو مسجد کے اندر بھی اس کی زندگی حقیقی دین سے خالی ہوگی اور ظاہر ہے کہ بے روح عمل کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ خدا سچے عمل کو قبول کرتا ہے، نہ کہ جھوٹے عمل کو۔

کسی آدمی کے پاس دولت کی رونقیں ہوں اور آدمیوں کا جتھا اس کے گردوپیش دکھائی دیتا ہو تو عام لوگ اس کو رشک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ سب سے زیادہ بدقسمت لوگ ہیں۔ عام طور پر ان کا جو حال ہوتا ہے وہ یہ کہ مال و جاہ ان کے لیے ایسے بندھن بن جاتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی طرف بھرپور طور پر نہ بڑھ سکیں۔ وہ خدا کو بھول کر ان میں مشغول رہیں یہاں تک کہ موت آجائے اور وہ بے رحمی کے ساتھ ان کو ان کے مال و جاہ سے جدا کر دے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ
اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ
اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ
اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ
سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ
اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ
لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا
وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ
الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ

۵۸۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جو تم پر صدقات کے بارے میں عیب لگاتے ہیں۔ اگر اس میں سے انھیں دے دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ ۵۹۔ کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے جو کچھ انھیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ اللہ اپنے فضل سے ہم کو اور بھی دے گا اور اس کا رسول بھی، ہم کو تو اللہ ہی چاہیے۔ ۶۰۔ صدقات (زکوٰۃ) تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان کارکنوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مقرر ہیں۔ اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہے۔ نیز گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور مسافر کی

فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾

امداد ہیں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علم والا، حکمت والا ہے۔

یہاں زکوٰۃ کے مصارف بتائے گئے ہیں۔ یہ مصارف قرآن کی تصریح کے مطابق آٹھ ہیں:

1۔ فقراء — جن کے پاس کچھ نہ ہو۔

2۔ مساکین — جن کو بقدر حاجت میسر نہ ہو۔

3۔ عاملین — جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات کی وصولی اور اس کے حساب کتاب پر مامور ہوں۔

4۔ مؤلفۃ القلوب — تالیف قلب اسلام کا ایک ابدی اصول ہے۔ یہ مکمل خیر خواہی کے ساتھ دل میں نرم گوشہ (soft corner) پیدا کرنے کی ایک پر امن تدبیر ہے یعنی مدعو کے ساتھ اس نوعیت کا حسنِ سلوک جس سے مدعو کے دل میں اسلام کے لیے قربت پیدا ہو، وہ معتدل ذہن کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرے، وہ کسی تعصب کے بغیر کھلے ذہن کے ساتھ اسلام کو سمجھے۔ تالیف قلب کی کوئی حد نہیں، زکاۃ کے ذریعے مدد کرنا بھی اسی نوعیت کا ایک طریقہ ہے۔

5۔ رقاب — غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے یا اسیروں کا فدیہ دے کر انھیں رہا کرنے کے لیے۔

6۔ غارمین — جو مقروض ہو گئے ہوں یا جن کے اوپر ضمانت کا بار ہو۔

7۔ سبیل اللہ — اس کا مطلب ہے وہ تمام طریقہ جو اللہ تک پہنچانے والا ہو۔ یعنی وہ تمام کوششیں جو اللہ کی اطاعت کے لیے ہوں، اور ہر خیر کا راستہ (الطَّرِيقُ الْمُوصِلَةُ إِلَيْهِ تَعَالَى، فَيَدْخُلُ فِيهِ كُلُّ سَعْيٍ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ، وَفِي سَبِيلِ الْخَيْرِ) الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ، جلد 24، صفحہ 166۔ دوسرے الفاظ میں، اسلام کی تعلیمات کو پر امن انداز میں انسانوں تک پہنچانا۔

8۔ ابن السبیل — مسافر جو حالت سفر میں ضرورت مند ہو جائے خواہ اپنے مقام پر وہ مالدار ہو۔

اجتماعی نظم کے تحت جب زکوٰۃ وصدقات کی تقسیم کی جائے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو حق تلفی یا غیر منصفانہ تقسیم کی شکایت ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی شکایت اکثر خود شکایت کرنے والے کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ تقسیم کا ذمہ دار خواہ کتنا ہی پاکباز ہو، لوگوں کی حرص اور ان کا محدود طرز فکر بہر حال اس قسم کی شکایتیں نکال لے گا۔

مزید یہ کہ اس قسم کی شکایت سب سے زیادہ آدمی کے اپنے خلاف پڑتی ہے، وہ آدمی کے فکری امکانات کو بروئے کار لانے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ آدمی اگر شکایتی مزاج کو چھوڑ کر ایسا کرے کہ اس کو جو کچھ ملا ہے اس پر وہ راضی ہو جائے اور اپنی سب سوچ کا رخ اللہ کی طرف کر لے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ اس کے اندر نئی ہمت پیدا ہوگی۔ اس کے اندر چھپی ہوئی ایجابی صلاحیتیں جاگ اٹھیں گی۔ وہ ملی ہوئی رقم کو زیادہ کار آمد مصرف میں لگائے گا۔ عطیات پر انحصار کرنے کے بجائے اس کے اندر اپنے آپ پر اعتماد کرنے کا ذہن ابھرے گا۔ وہ خدا کے بھروسہ پر نئے اقتصادی مواقع کی تلاش کرنے لگے گا۔ دوسروں سے بیزاری کے بجائے دوسروں کو ساتھی بنا کر کام کرنے کا جذبہ اس کے اندر پیدا ہوگا، وغیرہ۔

وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَيَقُوۡلُوۡنَ
هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ
وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ؕ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ
اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿٦١﴾ يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ
لَكُمۡ لِيُرۡضُوۡكُمۡ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ اَنۡ
يُّرۡضُوۡهُ اِنۡ كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿٦٢﴾ اَلَمۡ
يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّهٗ مَنۡ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَاَنَّ
لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيۡهَا ؕ ذٰلِكَ الۡخِزۡىُ
الۡعَظِيۡمُ ﴿٦٣﴾

۶۱۔ اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے۔ کہو کہ وہ تمھاری بھلائی کے لیے کان ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور وہ رحمت ہے ان کے لیے جو تم میں اہل ایمان ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ ۶۲۔ وہ تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کریں۔ حالاں کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اس کو راضی کریں، اگر وہ مومن ہیں۔ ۶۳۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔

مدینہ کے منافقین اپنی نجی مجلسوں میں اسلامی شخصیتوں کا مذاق اڑاتے۔ مگر جب وہ مسلمانوں کے سامنے آتے تو قسم کھا کر یقین دلاتے کہ وہ اسلام کے وفادار ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان مدینہ میں طاقت ور تھے۔ وہ منافقین کو نقصان پہنچانے کی حیثیت میں تھے۔ اس لیے منافقین مسلمانوں سے ڈرتے تھے۔

اس سے منافق کے کردار کا اصل پہلو سامنے آتا ہے۔ منافق کی دین داری انسان کے ڈر سے ہوتی ہے، نہ کہ خدا کے ڈر سے۔ وہ ایسے مواقع پر اخلاق وانصاف والا بن جاتا ہے جہاں انسان کا دباؤ ہو یا عوام کی طرف سے اندیشہ لاحق ہو۔ مگر جہاں اس قسم کا خطرہ نہ ہو اور صرف خدا کا ڈر ہی وہ چیز ہو جو آدمی کی زبان کو بند کرے اور اس کے ہاتھ پاؤں کو روکے تو وہاں وہ بالکل دوسرا انسان ہوتا ہے۔ اب وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کو نہ بااخلاق بننے سے کوئی دل چسپی ہو اور نہ انصاف کا رویہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت۔

جو لوگ مصلحتوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور اس بنا پر تحفظات سے اوپر اٹھ کر خدا کے دین کا ساتھ نہیں دے پاتے وہ عام طور پر معاشرہ کے صاحب حیثیت لوگ ہوتے ہیں۔ اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے لیے وہ ان لوگوں کی تصویر بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو سچے اسلام کو لے کر اٹھے ہیں۔ وہ ان کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کی مہم چلاتے ہیں۔ ان کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں بے بنیاد قسم کے اعتراضات نکالتے ہیں۔

ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ بے حد سنگین بات ہے۔ یہ اہلِ ایمان کی مخالفت نہیں بلکہ خود خدا کی

مخالفت ہے۔ یہ خدا کا حریف بن کر کھڑا ہونا ہے۔ ایسے لوگ اگر اپنی معصومیت ثابت کرنے کے بجائے اپنی غلطی کا اقرار کرتے اور کم از کم دل سے اسلام کے داعیوں کے خیر خواہ بن جاتے تو شاید وہ قابلِ معافی ٹھہرتے۔ مگر ضد اور مخالفت کا طریقہ اختیار کرکے انھوں نے اپنے کو خدا کے دشمنوں کی فہرست میں شامل کرلیا۔ اب رسوائی اور عذاب کے سوا ان کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

اللہ کا ڈر آدمی کے دل کو نرم کردیتا ہے۔ وہ لوگوں کی بے بنیاد باتوں کو بھی خاموشی کے ساتھ سن لیتا ہے، یہاں تک کہ نادان لوگ کہنے لگیں کہ یہ تو سادہ لوح ہیں، باتوں کی گہرائی کو سمجھتے ہی نہیں۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ ع

۶۴۔ منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں مومنوں پر ایسی سورہ نازل نہ ہوجائے جو ان کو ان کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ کردے۔ کہو کہ تم مذاق اڑالو، اللہ یقیناً اس کو ظاہر کردے گا جس سے تم ڈرتے ہو۔ ۶۵۔ اور اگر تم ان سے پوچھو تو وہ کہیں گے کہ ہم تو ہنسی اور دل لگی کررہے تھے۔ کہو، کیا تم اللہ سے اور اس کی آیات سے اور اس کے رسول سے ہنسی، دل لگی کررہے تھے۔ ۶۶۔ بہانے مت بناؤ، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔ اور ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کردیں تو دوسرے گروہ کو تو ضرور سزا دیں گے کیوں کہ وہ مجرم ہیں۔

غزوہ تبوک کے موقع پر مدینہ میں یہ فضا تھی کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے وہ ارباب عزیمت شمار ہورہے تھے اور جو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ رہے تھے وہ منافق اور پست ہمت سمجھے جاتے تھے۔ بیٹھ رہنے والے منافقین نے رسول اور اصحابِ رسول کے عمل کو کم تر ظاہر کرنے کے لیے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ کسی نے کہا: یہ قرآن پڑھنے والے ہمیں تو اس کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتے کہ وہ ہم میں سب سے زیادہ بھوکے ہیں، ہم میں سب سے زیادہ جھوٹے ہیں۔ اور ہم میں سب سے زیادہ بزدل ہیں: مَا أَرَى قُرَّاءَنَا هَؤُلَاءِ إِلَّا أَرْغَبَنَا بُطُونًا، وَأَكْذَبَنَا أَلْسِنَةً، وَأَجْبَنَنَا عِنْدَ اللِّقَاءِ (تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 171)۔ کسی نے کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ رومیوں سے لڑنا بھی ویسا ہی ہے جیسا عربوں کا آپس میں لڑنا۔ خدا کی قسم کل یہ سب لوگ رسیوں میں باندھے ہوئے نظر آئیں گے (أَتَحْسِبُونَ جِلَادَ بَنِي الْأَصْفَرِ كَقِتَالِ الْعَرَبِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا! وَاللَّهِ لَكَأَنَّا بِكُمْ غَدًا مُقَرَّنِينَ فِي الْحِبَالِ) سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 525۔ کسی نے کہا: یہ صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ روم کے محل اور ان کے قلعے فتح کرنے جارہے ہیں، ان کی حالت پر افسوس ہے (يَظُنُّ هَذَا أَنْ يَفْتَحَ قُصُورَ الرُّومِ

وَ نَحْصُونَهَا . هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ) تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 172۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے ان لوگوں کو بلا کر پوچھا۔ وہ کہنے لگے: ہم تو صرف ہنسی کھیل کی باتیں کر رہے تھے (إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ) تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 171۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا اللہ اور اس کے احکام اور اس کے رسول کے معاملہ میں تم ہنسی کھیل کر رہے تھے۔

اللہ اور رسول کی بات ہمیشہ کسی آدمی کی زبان سے بلند ہوتی ہے۔ یہ آدمی اگر دیکھنے والوں کی نظر میں بظاہر معمولی ہو تو وہ اس کا استہزاء کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہ استہزاء اس آدمی کا نہیں ہے خود خدا کا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ صرف یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں سخت مجرم ہیں، ان کی جھوٹی تاویلیں ان کی حقیقت کو چھپانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

نفاق اور ارتداد دونوں ایک ہی حقیقت کی دو صورتیں ہیں۔ آدمی اگر اسلام اختیار کرنے کے بعد کھلم کھلا منکر ہو جائے تو یہ ارتداد ہے۔ اور اگر ایسا ہو کہ ذہن اور قلب کے اعتبار سے وہ اسلام سے دور ہو مگر لوگوں کے سامنے وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرے تو یہ نفاق ہے۔ ایسے منافقین کا انجام خدا کے یہاں وہی ہے جو مرتدین کا ہے، اِلّا یہ کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی غلطیوں کا اقرار کر کے اپنی اصلاح کر لیں۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ

۶۷۔ منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔ بے شک منافقین بہت نافرمان ہیں۔ ۶۸۔ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور منکروں سے اللہ نے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لیے بس ہے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔ ۶۹۔ جس طرح تم سے اگلے لوگ، وہ تم سے زور میں زیادہ تھے اور مال و اولاد کی کثرت میں تم سے بڑھے ہوئے تھے تو انھوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا، جیسا کہ تمھارے اگلوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اور تم نے بھی وہی بحثیں کیں جیسی بحثیں

حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمۡ يَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ۙ وَقَوۡمِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاَصۡحٰبِ مَدۡيَنَ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتِ‌ ؕ اَتَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ‌ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۷۰﴾

انھوں نے کی تھیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہوگئے اور یہی لوگ گھاٹے میں پڑنے والے ہیں۔ ۷۰۔ کیا انھیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزرے۔ قومِ نوح اور عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیم اور اصحاب مدین اور الٹی ہوئی بستیوں کی۔ ان کے پاس ان کے رسول دلیلوں کے ساتھ آئے، تو ایسا نہ تھا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا، مگر وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔

پہلے لوگوں کو خدا نے جاہ و مال دیا تو انھوں نے اس سے فخر اور گھمنڈ اور بے حسی کی غذا لی۔ تاہم بعد والوں نے ان کے انجام سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ انھوں نے بھی دنیا کے ساز و سامان سے اپنے لیے وہی حصہ پسند کیا جس کو ان کے پچھلوں نے پسند کیا تھا۔ یہی ہر دور میں عام آدمی کا حال رہا ہے۔ وہ حق کے تقاضوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مال و اولاد کے تقاضے ہی اس کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہوتے ہیں۔

منافق کا حال بھی باعتبار حقیقت یہی ہوتا ہے۔ وہ ظاہری طور پر تو مسلمانوں جیسا نظر آتا ہے مگر اس کے جینے کی سطح وہی ہوتی ہے جو عام دنیا داروں کی سطح ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض نمائشی اعمال کو چھوڑ کر حقیقی زندگی میں وہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسے عام دنیا دار ہوتے ہیں۔ منافق کی قلبی دلچسپیاں دین دار کے مقابلہ میں دنیا داروں سے زیادہ وابستہ ہوتی ہیں۔ آخرت کی مد میں خرچ کرنے سے اس کا دل تنگ ہوتا ہے مگر بے فائدہ دنیوی مشاغل میں خرچ کرنا ہو تو وہ بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتا ہے۔ حق کا فروغ اس کو پسند نہیں آتا البتہ ناحق کا فروغ ہو تو اس کو وہ شوق سے گوارا کرتا ہے۔ ظاہری دین داری کے باوجود وہ خدا اور آخرت کو اس طرح بھولا رہتا ہے جیسے اس کے نزدیک خدا اور آخرت کی کوئی حقیقت نہیں۔

ایسے لوگ اپنے ظاہری اسلام کی بنا پر خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ دنیا میں ان کے لیے لعنت ہے اور آخرت میں ان کے لیے عذاب۔ دنیا میں بھی وہ خدا کی رحمتوں سے محروم رہیں گے اور آخرت میں بھی۔

خدا کے ساتھ کامل وابستگی ہی وہ چیز ہے جو آدمی کے عمل میں قیمت پیدا کرتی ہے۔ کامل وابستگی کے بغیر جو عمل کیا جائے، خواہ وہ بظاہر دینی عمل کیوں نہ ہو، وہ آخرت میں اسی طرح بے قیمت قرار پائے گا جیسے روح کے بغیر کوئی جسم، جو جسم سے ظاہری مشابہت کے باوجود عملاً بے قیمت ہوتا ہے۔

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ‌ ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ

۷۱۔ اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی

الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ
اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ
جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ ع ۹ ۱۵

سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔
۷۲۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے باغوں کا کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وعدہ ہے، ستھرے مکانوں کا ہمیشگی کے باغوں میں اور اللہ کی رضامندی جو سب سے بڑھ کر ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

منافقانہ طور پر اسلام سے وابستہ رہنے والے لوگوں میں جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ ہیں آخرت سے غفلت، دنیوی ضرورتوں سے دل چسپی، بھلائی کے ساتھ تعاون سے دوری اور نمائشی کاموں کی طرف رغبت۔ ان مشترک خصوصیات کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے خوب ملے جلے رہتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کو مشترک دل چسپی کا موضوعِ گفتگو دیتی ہیں۔ اس سے انھیں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا میدان حاصل ہوتا ہے۔ یہ ان کے لیے باہمی تعلقات کا ذریعہ بنتا ہے۔

یہی معاملہ ایک اور شکل میں سچے اہل ایمان کا ہوتا ہے۔ ان کے دل میں خدا کی لگن لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کو سب سے زیادہ آخرت کی فکر ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی چیزوں سے بطور ضرورت تعلق رکھتے ہیں نہ کہ بطور مقصد، خدا کی پسند کا کام ہو رہا ہو تو ان کا دل فوراً اس کی طرف کھنچ اٹھتا ہے۔ برائی کا کام ہو تو اس سے ان کی طبیعت اِبا کرتی ہے۔ ان کی زندگی اور ان کا اثاثہ سب سے زیادہ خدا کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ اپنے لیے۔ وہ خدا کی یاد کرنے والے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہوتے ہیں۔

اہل ایمان کے یہ مشترک اوصاف انھیں ایک دوسرے سے قریب کر دیتے ہیں۔ سب کی دوڑ خدا کی طرف ہوتی ہے۔ سب کی اطاعت کا مرکز خدا کا رسول ہوتا ہے۔ جب وہ ملتے ہیں تو یہی وہ باہمی دلچسپی کی چیزیں ہوتی ہیں جن پر وہ بات کریں۔ انھیں اوصاف کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر ان کے آپس کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ اسی سے انھیں وہ مقصد ہاتھ آتا ہے جس کے لیے وہ متحدہ کوشش کریں۔ اسی سے ان کو وہ نشانہ ملتا ہے، جس کی طرف سب مل کر آگے بڑھیں۔

دنیا میں اہلِ ایمان کی زندگی ان کی آخرت کی زندگی کی تمثیل ہے۔ دنیا میں اہل ایمان اس طرح جیتے ہیں جیسے ایک باغ میں بہت سے شاداب درخت کھڑے ہوں۔ ہر ایک دوسرے کے حسن میں اضافہ کر رہا ہو۔ ان درختوں کو فیضانِ خداوندی سے نکلنے والے آنسو سیراب کر رہے ہوں۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا اس طرح

خیرخواہ اور ساتھی ہو کہ پورا ماحول امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔ یہی ربانی زندگی آخرت میں جنتی زندگی میں تبدیل ہوجائے گی۔ وہاں آدمی نہ صرف اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹے گا بلکہ خدا کی خصوصی رحمت سے ایسے انعامات پائے گا جن کا اس سے پہلے اس نے تصور نہیں کیا تھا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۷۳﴾ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ یَنَالُوْا ۚ وَ مَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ یَّتَوَلَّوْا یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِی الْاَرْضِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۷۴﴾

۷۳۔ اے نبی، منکروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر کڑے بن جاؤ۔ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ۷۴۔ وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا۔ حالاں کہ انھوں نے کفر کی بات کہی اور وہ اسلام کے بعد منکر ہوگئے اور انھوں نے وہ چاہا جو انھیں حاصل نہ ہوسکی۔ اور یہ صرف اس کا بدلہ تھا کہ ان کو اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کردیا۔ اگر وہ توبہ کریں تو ان کے حق میں بہتر ہے اور اگر وہ اعراض کریں تو خدا ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور زمین میں ان کا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ مددگار۔

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تقریباً 80 منافقین مدینہ میں موجود تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منافقین سے جس جہاد کا حکم دیا گیا ہے، وہ جنگ کے معنی میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ان منافقین کا خاتمہ کرا دیتے۔ اس سے مراد دراصل وہ جہاد ہے جو زبان اور برتاؤ اور شدت احتساب کے ذریعہ کیا جاتا ہے: وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: أُمِرَ بِالْجِهَادِ... مَعَ الْمُنَافِقِينَ بِاللِّسَانِ وَشِدَّةِ الزَّجْرِ وَالتَّغْلِيظِ (تفسیر القرطبی، جلد 8، صفحہ 204)۔ چنانچہ جمہور امت کے نزدیک منافقین کے مقابلہ میں جہاد بالسیف مشروع نہیں ہے۔

منافقت یہ ہے کہ آدمی اسلام کو اس طرح اختیار کرے کہ وہ اس کو مفادات اور مصلحتوں کے تابع کیے ہوئے ہو۔ اس قسم کے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کچھ خدا کے بندے غیر مصلحت پرستانہ انداز میں اسلام کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں تو ایسا اسلام انھیں اپنے اسلام کو بے وقعت ثابت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے داعیوں سے انھیں سخت نفرت ہوجاتی ہے۔ وہ ان کو اکھاڑنے کے درپے ہوجاتے ہیں۔ جس اسلام کے نام پر وہ اپنی تجارتیں قائم کرتے ہیں اسی اسلام کے داعیوں کے وہ دشمن بن جاتے ہیں۔

منافقین کی یہ دشمنی سازش اور استہزاء کے انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی کو دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر کسی وجہ سے سچے اسلام کے داعیوں کے بارے میں مخالفانہ جذبات ہیں تو وہ اس کو ابھارتے ہیں تا کہ وہ ان سے لڑ جائیں۔ وہ مخلص اہلِ ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے ان کی قربانیاں بے حقیقت معلوم ہونے لگیں۔ وہ ان کی معمولی باتوں کو اس طرح بگاڑ کر پیش کرتے ہیں کہ عوام میں ان کی تصویر خراب ہو جائے۔ تبوک کے سفر میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک پڑاؤ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی گم ہوگئی۔ کچھ مسلمان اس کو تلاش کرنے کے لیے نکلے۔ یہ بات منافقوں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: یہ صاحب ہم کو آسمان کی خبریں بتاتے ہیں۔ مگر ان کو اپنی اونٹنی کی خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔

منافق مسلمان سچے اسلام کے داعیوں کو ناکام کرنے کے لیے شیطان کے آلۂ کار بنتے ہیں۔ مگر سچے اسلام کے داعیوں کا مددگار ہمیشہ خدا ہوتا ہے۔ وہ منافقوں کی تمام سازشوں کے باوجود ان کو بچا لیتا ہے۔ اور منافقین کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جرم ثابت کر کے اس کے مستحق بنتے ہیں کہ ان کو دنیا میں بھی عذاب دیا جائے اور آخرت میں بھی۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰىنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَ تَوَلَّوۡا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰٮهُمۡ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِيۡنَ يَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِيۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ فِى الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ اِلَّا جُهۡدَهُمۡ فَيَسۡخَرُوۡنَ مِنۡهُمۡ‌ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنۡهُمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۹﴾ اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ‌ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ

۷۵۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اس نے ہم کو اپنے فضل سے عطا کیا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور ہم صالح بن کر رہیں گے۔ ۷۶۔ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کیا تو وہ بخل کرنے لگے اور برگشتہ ہو کر انھوں نے منہ پھیر لیا۔ ۷۷۔ پس اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا اس دن تک کے لیے جب کہ وہ اس سے ملیں گے، اس سبب سے کہ انھوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ ۷۸۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ اللہ ان کے راز اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے اور اللہ تمام چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا ہے۔ ۷۹۔ وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مومنوں پر جو دل کھول کر صدقات دیتے ہیں اور جو صرف اپنی محنت مزدوری سے انفاق کرتے ہیں، وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک

سَبۡعِیۡنَ مَرَّۃً فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۸۰﴾ ع

عذاب ہے۔ ۸۰۔ تم ان کے لیے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ انھیں معاف کرنے کی درخواست کرو گے تو اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کا انکار کیا اور اللہ نافرمانوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

ثعلبہ بن حاطب انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے لیے دعا کیجیے کہ خدا مجھے مال دے دے۔ آپ نے فرمایا: تھوڑے مال پر شکر گزار ہونا اس سے بہتر ہے کہ تم کو زیادہ مال ملے اور تم شکر ادا نہ کرسکو۔ مگر ثعلبہ نے بار بار درخواست کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ خدایا، ثعلبہ کو مال دے دے۔ اس کے بعد ثعلبہ نے بکری پالی۔ اس کی نسل اتنی بڑھی کہ مدینہ کی زمین ان کی بکریوں کے لیے تنگ ہوگئی۔ ثعلبہ نے مدینہ کے باہر ایک وادی میں رہنا شروع کیا۔ اب ثعلبہ کے اسلام میں کمزوری آنا شروع ہوئی۔ پہلے ان کی جماعت کی نماز چھوٹی۔ پھر جمعہ چھوٹ گیا۔ حتی کہ یہ نوبت آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عامل ثعلبہ کے پاس زکوٰۃ لینے کے لیے گیا تو ثعلبہ نے زکوٰۃ نہیں دی اور کہا کہ زکوٰۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے (مَا هٰذِهٖ إِلَّا جِزْيَةٌ، مَا هٰذِهٖ إِلَّا أُخْتُ الْجِزْيَةِ) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، جلد 1، صفحہ 462۔

وہ شخص خدا کی نظر میں منافق ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ مال کے لیے خدا سے دعائیں کرے اور جب خدا اس کو مال والا بنا دے تو وہ اپنے مال میں خدا کا حق نکالنا بھول جائے۔ آدمی کے پاس مال نہیں ہوتا تو وہ مال والوں کو برا کہتا ہے کہ یہ لوگ مال کو غلط کاموں میں برباد کرتے ہیں۔ اگر خدا مجھ کو مال دے تو میں اس کو خیر کے کاموں میں خرچ کروں۔ مگر جب اس کے پاس مال آتا ہے تو اس کی نفسیات بدل جاتی ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ پہلے اس نے کیا کہا تھا اور کن جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اب وہ مال کو اپنی محنت اور لیاقت کا نتیجہ سمجھ کر تنہا اس کا مالک بن جاتا ہے۔ خدا کا حق ادا کرنا اسے یاد نہیں رہتا۔

اس قسم کے لوگ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے مزید سرکشی یہ کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ کسی نے زیادہ دیا تو اس کو ریاکار کہہ کر گراتے ہیں۔ اور کسی نے اپنی حیثیت کی بنا پر کم دیا تو کہتے ہیں کہ خدا کو اس آدمی کے صدقہ کی کیا ضرورت تھی۔ جو لوگ اتنا زیادہ اپنے آپ میں گم ہوں انھیں اپنے آپ سے باہر کی اعلیٰ ترحقیقتیں کبھی دکھائی نہیں دیتیں۔

فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ بِمَقۡعَدِہِمۡ خِلٰفَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ وَ کَرِہُوۡۤا اَنۡ یُّجَاہِدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ

۸۱۔ پیچھے رہ جانے والے اللہ کے رسول سے پیچھے بیٹھ رہنے پر بہت خوش ہوئے اور ان کو گراں گزرا کہ وہ اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨٤﴾

کریں۔ اور انھوں نے کہا کہ گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انھیں سمجھ ہوتی۔ ۸۲۔ پس وہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ، اس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے۔ ۸۳۔ پس اگر اللہ تم کو ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لائے اور وہ تم سے جہاد کے لیے نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ کبھی نہیں چلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے لڑو گے۔ تم نے پہلی بار بھی بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا، پس پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ ۸۴۔ اور ان میں سے جو کوئی مرجائے، اس پر تم کبھی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔

غزوۂ تبوک سخت گرمی کے موسم میں ہوا۔ مدینہ سے چل کر شام کی سرحد تک تین سو میل جانا تھا۔ منافق مسلمانوں نے کہا کہ ایسی تیز گرمی میں اتنا لمبا سفر نہ کرو۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھول گئے کہ خدا کی پکار سننے کے بعد کسی خطرہ کی بنا پر نہ نکلنا اپنے آپ کو شدید تر خطرہ میں مبتلا کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دھوپ سے بھاگ کر آگ کے شعلوں کی پناہ لی جائے۔

جو لوگ خدا کے مقابلہ میں اپنے کو اور اپنے مال کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں وہ جب اپنی خوبصورت تدبیروں سے اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ مسلمان بھی بنے رہیں اور اسی کے ساتھ ان کی زندگی اور ان کے مال کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کو عقل مند سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کو بے وقوف کہتے ہیں جنھوں نے خدا کی رضا کی خاطر اپنے کو ہلکان کر رکھا ہو۔

مگر یہ سراسر نادانی ہے۔ یہ ایسا ہنسنا ہے جس کا انجام رونے پر ختم ہونے والا ہے۔ کیوں کہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں اس قسم کی ''ہوشیاری'' سب سے بڑی نادانی ہوگی۔ اس وقت آدمی افسوس کرے گا کہ وہ جنت کا طلب گار تھا مگر اس نے اپنے اثاثہ کی وہی چیز اس کے لیے نہ دی جو دراصل جنت کی واحد قیمت تھی۔

اس قسم کے منافق ہمیشہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی تحفظاتی پالیسی کی وجہ سے اپنے گرد مال وجاہ کے اسباب جمع کر لیتے ہیں اس بنا پر عام مسلمان ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ان کی شان دار زندگیاں اور ان کے خوب

صورت باتیں لوگوں کی نظر میں ان کو عظیم بنا دیتی ہیں۔ یہ کسی اسلامی معاشرہ کے لیے ایک سخت امتحان ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ میں ایسے لوگوں کو نظر انداز کیا جانا چاہیے، نہ یہ کہ ان کو عزت کا مقام دیا جانے لگے۔

جن لوگوں کے بارے میں پوری طرح معلوم ہو جائے کہ وہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے ہیں مگر حقیقۃً وہ اپنے مفادات اور اپنی دنیوی مصلحتوں کے وفادار ہیں ان کو حقیقی اسلامی معاشرہ کبھی عزت کے مقام پر بٹھانے کے لیے راضی نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہے کہ وہ اسلامی تقریبات میں صرف پیچھے کی صفوں میں جگہ پائیں۔ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ دینی مناصب کے لیے وہ نااہل قرار پائیں۔ جس معاشرہ میں ایسے لوگوں کو عزت کا مقام ملا ہوا ہو وہ کبھی خدا کا پسندیدہ معاشرہ نہیں ہو سکتا۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ ع ۱۱/۹/۱۷

۸۵۔ اور ان کے مال اور ان کی اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان کے ذریعے سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ منکر ہوں۔ ۸۶۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان کے مقدور والے تم سے رخصت مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ دیجیے کہ ہم یہاں ٹھہرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں۔ ۸۷۔ انھوں نے اس کو پسند کیا کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں۔ اور ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی پس وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ ۸۸۔ لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، انھوں نے اپنے مال اور جان سے جہاد کیا اور انھیں کے لیے ہیں خوبیاں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ ۸۹۔ ان کے لیے اللہ نے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

منافق اپنے دنیا پرستانہ طریقوں کی وجہ سے اپنے آس پاس دنیا کا ساز و سامان جمع کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ مددگاروں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ یہ چیزیں سطحی قسم کے لوگوں کے لیے مرعوب کن بن جاتی ہیں۔ لیکن گہری نظر سے دیکھنے والوں کے لیے اس کی ظاہری چمک دمک قابل رشک نہیں بلکہ قابل عبرت ہے۔ کیوں کہ یہ چیزیں

جن لوگوں کے پاس جمع ہوں وہ ان کے لیے خدا کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو کسی تحفظ اور کسی مصلحت کے بغیر خدا کی طرف بڑھے۔ مگر جو لوگ دنیا کی رونقوں میں گھرے ہوئے ہوں وہ ان سے اوپر نہیں اٹھ پاتے جب بھی وہ خدا کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں ان کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ کھو دیں گے۔ وہ اس قربانی کی ہمت نہیں کر پاتے، اس لیے وہ خدا کے وفادار بھی نہیں ہوتے۔ ان کی دنیوی ترقیاں ان کو اس بربادی کی قیمت پر ملتی ہیں کہ آخرت میں وہ بالکل محروم ہو کر حاضر ہوں۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب خدا کا دین کہتا ہے کہ اپنی اَنا (ego) کو دفن کر کے خدا کو پکڑو تو وہ اپنی بڑھی ہوئی اَنا کو دفن نہیں کر پاتے۔ جب خدا کا دین ان سے شہرت اور مقبولیت سے خالی راستوں پر چلنے کے لیے کہتا ہے تو وہ اپنی شہرت و مقبولیت کو سنبھالنے کی فکر میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ جب خدا کے دین کی جدوجہد، زندگی اور مال کی قربانی مانگتی ہے تو ان کو اپنی زندگی اور مال اتنے قیمتی نظر آتے ہیں کہ وہ اس کو غیر دنیوی مقصد کے لیے قربان نہ کر سکیں۔

یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کے دل کی حساسیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بے حسی کا شکار ہو کر اس تڑپ کو کھو دیتے ہیں جو آدمی کو خدا کی طرف کھینچے اور غیر خدا پر راضی نہ ہونے دے۔

اس کے برعکس، جو سچے اہلِ ایمان ہیں وہ سب سے بڑا مقام خدا کو دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے دوسری ہر چیز انھیں خدا کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہے۔ وہ ہر قربانی دے کر خدا کی طرف بڑھنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے خدا کی رحمتیں اور نعمتیں ہیں۔ ان کے اور خدا کی ابدی جنت کے درمیان موت کے سوا کوئی چیز حائل نہیں۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ

۹۰۔ بدوی عربوں میں سے بھی بہانہ کرنے والے آئے کہ انھیں اجازت مل جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولے، وہ بیٹھ رہے۔ ان میں سے جنھوں نے انکار کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ ۹۱۔ کوئی گناہ کمزوروں پر نہیں ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کریں۔ نیک کاروں پر کوئی الزام نہیں اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۹۲۔ اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آئے کہ تم ان کو سواری دو۔ تم نے کہا کہ

اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو اس پر سوار کردوں تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس غم میں کہ انھیں کچھ میسر نہیں جو وہ خرچ کریں۔ ۹۳۔ الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو تم سے اجازت مانگتے ہیں حالاں کہ وہ مال دار ہیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی، پس وہ نہیں جانتے۔

دعوتِ دین کی جدوجہد جب لوگوں سے ان کی زندگی اور ان کے مال کا تقاضا کر رہی ہو اس وقت صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود عذر کرکے بیٹھ رہنا بدترین جرم ہے۔ یہ دینی پکار کے معاملہ میں بے حسی کا ثبوت ہے۔ ایک مسلمان کے لیے اس قسم کا رویہ خدا اور رسول سے غداری کرنے کے ہم معنی ہے۔ ایسے لوگ خدا کی رحمتوں میں کوئی حصہ پانے کے حقدار نہیں ہیں۔ ان کے پاس جو کچھ تھا اس کو جب انھوں نے خدا کے لیے پیش نہیں کیا تو خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ کس لیے انھیں دے دے گا۔ قیمت ادا کیے بغیر کوئی چیز کسی کو نہیں مل سکتی۔

تاہم معذورین کے لیے خدا کے یہاں معافی ہے۔ جو شخص بیمار ہو، جس کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ نہ ہو، جو اسبابِ سفر نہ رکھتا ہو، ایسے لوگوں سے خدا درگزر فرمائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ نہ کرنے کے باوجود سب کچھ ان کے خانہ میں لکھ دیا جائے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپس ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: مدینہ کچھ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم کوئی راستہ نہیں چلے اور تم نے کوئی وادی طے نہیں کی مگر وہ برابر تمھارے ساتھ رہے (إِنَّ بِالْمَدِينَةِ أَقْوَامًا، مَا سِرْتُمْ مَسِيرًا، وَلاَ قَطَعْتُمْ وَادِيًا إِلَّا كَانُوا مَعَكُمْ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 4423۔

یہ خوش قسمت لوگ کون ہیں جو نہ کرنے کے باوجود کرنے کا انعام پاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو معذور ہونے کے ساتھ تین باتوں کا ثبوت دیں — نصح، یعنی عملی شرکت نہ کرتے ہوئے بھی قلبی شرکت۔ احسان، یعنی عدم شرکت کے باوجود کم از کم زبان سے ان کے بس میں جو کچھ ہے اس کو پوری طرح کرتے رہنا۔ حزن، یعنی اپنی کوتاہی پر اتنا شدید رنج جو آنسوؤں کی صورت میں بہہ پڑے۔

کوئی آدمی جب اپنی عملی زندگی میں ایک چیز کو غیر اہم درجہ میں رکھے اور بار بار ایسا کرتا رہے تو اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ اس چیز کی اہمیت کا احساس اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ اس چیز کے تقاضے اس کے سامنے آتے ہیں مگر دل کے اندر اس کے بارے میں تڑپ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی طرف بڑھ نہیں پاتا۔ یہ وہی چیز ہے جس کو بے حسی کہا جاتا ہے اور اسی کو قرآن میں دلوں پر مہر کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

يَعۡتَذِرُوۡنَ اِلَيۡكُمۡ اِذَا رَجَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ‌ؕ قُلْ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا لَنۡ نُّـؤۡمِنَ لَـكُمۡ قَدۡ نَـبَّاَنَا اللّٰهُ مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ‌ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَـكُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَـكُمۡ اِذَا انْقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ‌ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ‌ؕ اِنَّهُمۡ رِجۡسٌ‌ وَّمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ‌ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۵﴾ يَحۡلِفُوۡنَ لَـكُمۡ لِتَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ‌ۚ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرۡضٰى عَنِ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۹۶﴾

☆ ۹۴۔تم جب ان کی طرف پلٹو گے تو وہ تمھارے سامنے عذرات پیش کریں گے۔ کہہ دو کہ بہانے نہ بناؤ۔ ہم ہرگز تمھاری بات نہ مانیں گے۔ بے شک اللہ نے ہم کو تمھارے حالات بتادئے ہیں۔ اب اللہ اور رسول تمھارے عمل کو دیکھیں گے۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، وہ تم کو بتادے گا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ ۹۵۔ یہ لوگ تمھاری واپسی پر تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو۔ پس تم ان سے درگزر کرو بے شک وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے بدلہ میں اس کے جو وہ کرتے رہے۔ ۹۶۔ وہ تمھارے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے راضی ہوجاؤ۔ اگر تم ان سے راضی بھی ہوجاؤ تو اللہ نافرمان لوگوں سے راضی ہونے والا نہیں۔

’’تمھارے حالات ہم کو اللہ نے بتادیے ہیں‘‘ کا فقرہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں جن منافقین کا ذکر ہے ان سے مراد زمانۂ نزول قرآن کے منافقین ہیں۔ کیوں کہ براہِ راست وحی خداوندی کے ذریعہ آگاہ ہونے کا معاملہ صرف زمانۂ رسالت میں ہوا یا ہوسکتا تھا۔ بعد کے زمانہ میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق یہ کل بیاسی (82) افراد تھے جن کے نفاق کے بارے میں اللہ نے بذریعہ وحی مطلع فرمایا تھا (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 2، صفحہ 125)۔

تاہم اس علم کے باوجود صحابہ کرام کو ان کے ساتھ جس سلوک کی اجازت دی گئی، وہ تغافل اور اعراض تھا، نہ کہ ان کو ہلاک کرنا۔ ان کو سزا یا عذاب دینے کا معاملہ پھر بھی خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ مدینہ کے منافقین کے ساتھ اگرچہ اتنی سختی کی گئی کہ انھوں عذرات پیش کیے تو ان کے عذرات قبول نہیں کیے گئے۔ حتی کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری نے منافقانہ روش اختیار کرنے کے بعد زکوٰۃ پیش کی تو ان کی زکوٰۃ لینے سے انکار کردیا گیا۔ تاہم ان میں سے کسی کو بھی آپ نے قتل نہیں کرایا۔ عبد اللہ بن ابی کے لڑکے عبد اللہ نے اپنے باپ کی منافقانہ حرکت پر سخت کارروائی کرنی چاہی تو آپ نے روک دیا اور فرمایا: انھیں چھوڑ دو، بخدا جب تک وہ ہمارے درمیان ہیں ہم ان کے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے (دَعْهُ فَلَعَمْرِي لَنُحْسِنَنَّ صُحْبَتَهُ مَا دَامَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا) الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 2، صفحہ 50۔

بعد کے زمانہ کے منافقین کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ تاہم دونوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ دور اول کے منافقین سے ان کی حالتِ قلبی کی بنیاد پر معاملہ کیا گیا، مگر بعد کے منافقین سے ان کی حالت ظاہری کی بنیاد پر معاملہ کیا جائے گا۔ ان سے اعراض وتغافل کا سلوک صرف اس وقت جائز ہوگا جب کہ ان کے عمل سے ان کی منافقت کا خارجی ثبوت مل رہا ہو۔ ان کی نیت یا ان کی قلبی حالت کی بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ بعد کے لوگ عذر پیش کریں تو ان کا عذر بھی قبول کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ان کے صدقات وغیرہ بھی۔ ان کے انجام کو اللہ کے حوالے کرتے ہوئے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو ظاہری قانون کے مطابق کسی کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔

جنت کسی کو ذاتی عمل کی بنیاد پر ملتی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی جماعت یا گروہ میں شامل ہونے کی بنیاد پر۔ منافقین سب کے سب مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے وہ ان کے ساتھ نماز روزہ کرتے تھے مگر اس کے باوجود ان کے جہنمی ہونے کا اعلان کیا گیا۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٩٧﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٩٨﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٩﴾ ع ۱۲

۹۷۔ دیہات والے کفر ونفاق میں زیادہ سخت ہیں اور وہ اسی لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے اس کے حدود سے بے خبر رہیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۹۸۔ اور دیہاتیوں میں ایسے بھی ہیں جو خدا کی راہ میں خرچ کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمھارے لیے زمانہ کی گردشوں کے منتظر ہیں۔ بری گردش خود انھیں پر ہے اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۹۹۔ اور دیہاتیوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں، وہ اس کو اللہ کے یہاں قرب کا اور رسول کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں بے شک وہ ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے۔ اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جس نے دیہات میں سکونت اختیار کی وہ سخت مزاج ہوجائے گا (مَنْ سَكَنَ الْبَادِيَةَ جَفَا) سنن الترمذی، حدیث نمبر 2256۔ شہر کے اندر علمی ماحول ہوتا ہے، تعلیمی ادارے قائم ہوتے ہیں۔ وہاں علم وفن کا چرچا رہتا ہے۔ جب کہ دیہات میں لوگوں کو اس کے مواقع حاصل نہیں ہوتے۔ اسی کے ساتھ دیہات

کے لوگوں کے رہن سہن کے طریقے اور ان کے معاشی ذرائع بھی نسبتاً معمولی ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیہات کے لوگوں کے اندر زیادہ گہرا شعور پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی طبیعت میں سختی اور ان کے سوچنے کے انداز میں سطحیت پائی جاتی ہے۔ ان کے لیے مشکل ہوتا ہے کہ وہ دین کی نزاکتوں کو سمجھیں اور ان کو اپنے اندر اتاریں۔

اللہ ہر بات کو جانتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ حکیم اور رحیم بھی ہے۔ وہ دیہات کے لوگوں، بالفاظ دیگر عوام، کی اس کمزوری سے باخبر ہے اور اپنی حکمت ورحمت کی بنا پر انھیں اس کی پوری رعایت دیتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں سے خدا کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ وہ گہری معرفت اور اعلیٰ دین داری کا ثبوت دیں۔ وہ اگر نیک نیت ہوں تو خدا ان سے سادہ دین داری پر راضی ہوجائے گا۔

عوام کی دین داری یہ ہے کہ وہ سچے دل سے خدا کا اقرار کریں۔ اپنے اندر اس احساس کو تازہ رکھیں کہ آخرت کا ایک دن آنے والا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ خدا کی راہ میں دیں اور یہ سمجھیں کہ اس کے ذریعہ سے انھیں خدا کی قربت اور برکت حاصل ہوگی۔ وہ خدا کی نمائندگی کرنے والے پیغمبر کو خوش کرکے اس کی دعائیں لینے کے طالب ہوں۔ یہ دین داری کی عوامی سطح ہے، اور اگر آدمی کی نیت میں بگاڑ نہ ہو تو اس کا خدا اس سے اسی سادہ دین داری کو قبول کرلے گا۔

لیکن اگر عوام ایسا کریں کہ وہ خدا اور اس کے احکام سے بالکل غافل ہوجائیں، ان کو دین سے اتنی بے تعلقی ہو کہ دین کی راہ میں کچھ خرچ کرنا ان کو جرمانہ معلوم ہونے لگے، اسلام کی ترقی سے انھیں وحشت ہوتی ہو تو بلاشبہ وہ ناقابل معافی ہیں۔ عوام کی کم فہمی کی بنا پر ان کو یہ رعایت تو ضرور دی جاسکتی ہے کہ ان سے گہری دین داری کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ لیکن ان کی کم فہمی اگر سرکشی اور اسلام کے ساتھ بے وفائی کی صورت اختیار کرلے تو وہ کسی حال میں بخشے نہیں جاسکتے۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۛ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۰۔ اور مہاجرین وانصار میں جو لوگ سابق اور مقدم ہیں اور جنھوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔
۱۰۱۔ اور تمھارے گردوپیش جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی منافق ہیں۔ وہ نفاق پر جم گئے ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم ان کو دہرا عذاب دیں گے۔ پھر وہ ایک عذاب عظیم کی طرف بھیجے جائیں گے۔

خدا کے دین کی دعوت جب بھی شروع کی جائے تو دو میں سے کوئی ایک صورت پیش آتی ہے۔ یا تو ماحول اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں دین کے لیے پکارنے والے اجنبی بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ کے اندر بے جگہ کر دیے جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو مہاجر (چھوڑنے والا) کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جب کہ ماحول خدا کے دین کی دعوت کے لیے سازگار ثابت ہو۔ ایسے ماحول میں جو لوگ دین کے داعی بنتے ہیں ان کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہیں آتا کہ ان کا سب کچھ ان سے چھن جائے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ اگر ایسا کریں کہ وہ پہلے لوگوں کا سہارا بن کر کھڑے ہو جائیں تو یہی انصار (مدد کرنے والے) قرار پاتے ہیں۔ دورِ اول میں مکہ کے حالات نے وہاں کے مسلمانوں کو مہاجر بنا دیا اور مدینہ کے حالات نے وہاں کے مسلمانوں کو انصار کی حیثیت دے دی۔

خدا کی رضامندی اور اس کی جنت کسی آدمی کو یا تو مہاجر بننے کی قیمت پر ملتی ہے یا انصار بننے کی قیمت پر۔ یا تو وہ خدا کے لیے اتنا یکسو ہو کہ دنیا کے سرے اس سے چھوٹ جائیں۔ یا اگر وہ اپنے کو صاحب وسائل پاتا ہے تو اپنے وسائل کے ذریعہ وہ اول الذکر گروہ کی محرومی کا بدل بن جائے۔ دورِ اول کے مسلمان (صحابہ کرام) اس ہجرت ونصرت کا کامل نمونہ تھے۔ بعد کے مسلمانوں میں جو لوگ اس ہجرت ونصرت کے معاملہ میں اپنے پیش روؤں کی تقلید کریں گے وہ بالتبع اس مقدس خدائی گروہ میں شامل ہوتے چلے جائیں گے۔ خدا کچھ لوگوں کو محروم کرتا ہے تا کہ ان کے اندر اِنابت کا جذبہ ابھرے اسی طرح خدا کچھ لوگوں کو محرومی سے بچاتا ہے تا کہ وہ محروموں کی مدد کر کے خدا کے لیے خرچ کرنے والے بنیں۔ یہ خدا کا منصوبہ ہے۔ جو لوگ اس کا ثبوت نہ دیں، وہ ایسے لوگ ہیں، جو خدا کے منصوبہ پر راضی نہ ہوئے۔ اس لیے خدا بھی آخرت کے دن ان سے راضی نہ ہوگا۔

"وہ اللہ سے راضی ہو گئے" یعنی جس کو اللہ نے ایسے حالات میں اٹھایا کہ اس کو سب کچھ چھوڑنے کی قیمت پر دین کو اختیار کرنا پڑا تو وہ اس میں ثابت قدم رہا۔ اسی طرح جس کے حالات کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ اپنے اثاثہ میں ایسے دینی بھائیوں کو شریک کرے جن سے اس کا تعلق صرف مقصد کا ہے، نہ کہ رشتہ داری کا تو وہ بھی اس پر راضی ہو گیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی خوشی حاصل کی اور یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیے جائیں گے۔

منافق وہ ہے جو مسلمان ہونے کا دعوی کرے مگر جب ہجرت اور نصرت کی قیمت پر دین دار بننے کا سوال ہو تو اس کے لیے اپنے کو راضی نہ کر سکے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ

۱۰۲۔ کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انھوں نے ملے جلے عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے۔ امید ہے کہ اللہ ان پر توجہ کرے۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان

مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

ہے۔ ۱۰۳۔ تم ان کے مالوں میں سے صدقہ لو، اس سے تم ان کو پاک کرو گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔ اور تم ان کے لیے دعا کرو۔ بے شک تمھاری دعا ان کے لیے وجہِ تسکین ہوگی۔ اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۱۰۴۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اور وہی صدقات کو قبول کرتا ہے۔ اور اللہ توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔ ۱۰۵۔ کہو کہ عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور اہلِ ایمان تمھارے عمل کو دیکھیں گے اور تم جلد اس کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو تمام کھلے اور چھپے کو جانتا ہے۔ وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ ۱۰۶۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کا حکم آنے تک ٹھہرا ہوا ہے، یا وہ ان کو سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول کرے گا، اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

کچھ ایسے لوگ ہیں جن کی طبیعتوں میں اگرچہ شر نہیں ہوتا۔ وہ معمول والے دینی اعمال بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب دین کا کوئی ایسا تقاضا سامنے آتا ہے جس میں اپنے بنے ہوئے نقشہ کو توڑ کر دین دار بننے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی زندگی اور مال کو اس طرح دین کے لیے نہیں دے پاتے جس طرح انھیں دینا چاہیے۔ قوتِ فیصلہ کی کمزوری یا دنیا میں ان کی مشغولیت ان کے لیے دین کی راہ میں اپنا حصہ ادا کرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ قصور وار ہوتے ہیں تاہم ان کا قصور اس وقت معاف کر دیا جاتا ہے جب کہ یاد دہانی کے بعد وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیں اور شرمندگی کے احساس کے ساتھ دوبارہ دین کی طرف لوٹ آئیں۔

اعتراف اور شرمندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے اندر از سرِ نو دینی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ اپنے احساسِ گناہ کو دھونے کے لیے اپنے محبوب مال کا ایک حصہ خدا کی راہ میں پیش کریں۔ جب ان کی طرف سے ایسا ردعمل ظاہر ہو تو پیغمبر کو تلقین کی گئی کہ اب انھیں ملامت نہ کرو بلکہ ان کو نفسیاتی سہارا دینے کی کوشش کرو۔ ان کو دعائیں دو تا کہ ان کے دل کا بوجھ دوبارہ ایمانی عزم واعتماد میں تبدیل ہو جائے۔

خدا کے نزدیک اصل برائی غلطی کرنا نہیں ہے بلکہ غلطی پر قائم رہنا ہے۔ جو آدمی غلطی کرنے کے بعد اس

کی تاویلیں ڈھونڈنے لگے وہ برباد ہوگیا اور جو شخص غلطی کا اعتراف کرکے اپنی اصلاح کرلے وہ خدا کے نزدیک قابل معافی ٹھہرا۔

غلطی کرنے کے بعد آدمی ہمیشہ دو امکانات کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلے۔ دوسرا یہ کہ وہ ڈھٹائی کرنے لگے، جو شخص اپنی غلطی کا اعتراف کرلے اس کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے۔ وہ دوبارہ خدا کی رحمتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص ڈھٹائی کا طریقہ اختیار کرے وہ گویا خدا کے غضب کے راستہ پر چل پڑا۔ وہ اپنے کو بے خطا ثابت کرنے کے لیے جھوٹی تاویلیں کرے گا۔ ایک غلطی کو نبھانے کے لیے وہ دوسری بہت سی غلطیاں کرتا چلا جائے گا۔ پہلے شخص کے لیے خدا کی رحمت ہے اور دوسرے شخص کے لیے خدا کی سزا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا
وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ
حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ
اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ
يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ
يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ
الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى
تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ
اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ
فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ
الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ

۱۰۷۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی نقصان پہنچانے کے لیے اور کفر کے لیے اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالنے کے لیے اور اس لیے تاکہ کمین گاہ فراہم کریں اس شخص کے لیے جو پہلے سے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ رہا ہے۔ اور یہ لوگ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو صرف بھلائی چاہی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ۱۰۸۔ تم اس عمارت میں کبھی کھڑے نہ ہونا۔ البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقوی پر پڑی ہے، وہ اس لائق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۱۰۹۔ کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا سے ڈر پر اور خدا کی خوشنودی پر رکھی، یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے کنارے پر رکھی جو گرنے کو ہے۔ پھر وہ عمارت اس کو لے کر جہنم کی آگ میں گر پڑی۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ ۱۱۰۔ اور یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہمیشہ ان کے دلوں میں

ع ۱۳ ۲ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع

شک کی بنیاد بنی رہے گی بجز اس کے کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ہوجائیں۔ اور اللہ علیم، حکیم ہے۔

زندگی کی تعمیر کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک تقویٰ، دوسرے ظلم۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خدا کے ڈر کی بنیاد پر زندگی کی عمارت اٹھائی جائے۔ آدمی کی تمام سرگرمیاں جس فکر کے ماتحت چل رہی ہوں وہ فکر یہ ہو کہ اس کو اپنے تمام قول و فعل کا حساب ایک ایسی ہستی کو دینا ہے جو کھلے اور چھپے سے باخبر ہے اور ہر ایک کو اس کے حقیقی کارناموں کے مطابق جزا یا سزا دینے والا ہے۔ ایسا شخص گویا مضبوط چٹان پر اپنی عمارت کھڑی کر رہا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اس قسم کے اندیشہ سے خالی ہو۔ وہ دنیا میں بالکل بے قید زندگی گزارے۔ وہ کسی پابندی کو قبول کیے بغیر جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ ایسے شخص کی زندگی کی مثال اس عمارت کی سی ہے جو ایسی کھائی کے کنارے اٹھادی گئی ہو جو بس گرنے ہی والی ہو اور اچانک ایک روز اس کا مکان اپنے مکینوں سمیت گہرے کھڈ میں گر پڑے۔

جو لوگ ظلم کی بنیاد پر اپنی زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں ان کے جرائم میں سب سے زیادہ سخت جرم وہ ہے جس کی مثال مدینہ میں مسجد ضرار کی صورت میں سامنے آئی۔ اس وقت مدینہ میں دو مسجدیں تھیں۔ ایک آبادی کے اندر مسجد نبوی۔ دوسری مضافات میں مسجد قبا۔ منافق مسلمانوں نے اس کے توڑ پر ایک تیسری مسجد تعمیر کرلی۔ اس قسم کی کارروائی بظاہر اگرچہ دین کے نام پر ہوتی ہے مگر حقیقۃً اس کا مقصد ہوتا ہے اپنی قیادت اور پیشوائی کو قائم رکھنے کی خاطر دعوتِ حق کا مخالف بن جانا۔ جو لوگ اپنی خود پرستی کی وجہ سے دعوت حق کو قبول نہیں کرپاتے وہ اس کے خلاف محاذ بناتے ہیں، اس کے خلاف تخریبی کارروائیاں کرتے ہیں۔ ان کی منفی سرگرمیاں مسلمانوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے تخریبی عمل کو دین کے نام پر کرتے ہیں۔ حتی کہ وہ مسلّمہ دینی شخصیتوں کو اپنے اسٹیج پر لانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں انھیں اعتماد حاصل ہوجائے۔

یہ لوگ اپنی اندھی دشمنی میں بھول جاتے ہیں کہ حق کی مخالفت دراصل خدا کی مخالفت ہے جو خدا کی دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ایسے لوگوں کے لیے جو چیز مقدر ہے وہ صرف یہ کہ وہ حسرت و افسوس کے ساتھ مریں اور اللہ کی رحمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجائیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ

۱۱۱۔ بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جان اور ان کے مال کو خرید لیا ہے جنت کے بدلے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ ایک سچا وعدہ ہے، تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں۔ اور اللہ

وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔ پس تم خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے۔ اور یہی ہے سب سے بڑی کامیابی۔ ۱۱۲۔ وہ توبہ کرنے والے ہیں۔ عبادت کرنے والے ہیں۔ حمد کرنے والے ہیں۔ خدا کی راہ میں پھرنے والے ہیں۔ رکوع کرنے والے ہیں۔ سجدہ کرنے والے ہیں۔ بھلائی کا حکم کرنے والے ہیں۔ برائی سے روکنے والے ہیں۔ اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور مومنوں کو خوش خبری دے دو۔

اللہ کا مومن بننا اللہ کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ دینا ہے۔ بندہ اپنا مال اور اپنی زندگی اللہ کو دیتا ہے تا کہ اللہ اس کے بدلے میں اپنی جنت اسے دے دے۔ یہ دراصل حوالگی اور سپردگی کی تعبیر ہے۔ کسی بھی چیز سے حقیقی تعلق ہمیشہ حوالگی اور سپردگی کی سطح پر ہوتا ہے۔ تعلق کا یہی درجہ اللہ کے معاملہ میں بھی مطلوب ہے۔ جنت کی ابدی نعمتیں کسی کو کامل حوالگی کے بغیر نہیں مل سکتیں۔

جب آدمی خدا کے دین کو اس طرح اختیار کرتا ہے تو دین کا معاملہ اس کے لیے کوئی علٰحدہ معاملہ نہیں رہتا۔ بلکہ وہ اس کا ذاتی معاملہ بن جاتا ہے۔ اب وہی اس کی دلچسپیوں اور اس کے اندیشوں کا مرکز ہوتا ہے۔ دین اگر مال کا تقاضا کرے تو وہ اپنا مال اس کے لیے حاضر کر دیتا ہے۔ دین کے لیے اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو وقف کرنا پڑے تو وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو اس کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ حتی کہ اگر وہ مرحلہ آجائے جب کہ اپنے وجود کو مٹا کر یا مال سے بے مال ہونے کا خطرہ مول لے کر دین میں اپنا حصہ ادا کرنا ہو تو اس سے بھی وہ دریغ نہیں کرتا۔

جو لوگ اس طرح اپنے کو اللہ کے حوالے کریں ان کے اندر کس قسم کے انفرادی اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی حساسیت اتنی بیدار ہو جاتی ہے کہ غلطی ہوتے ہی وہ اس کو جان لیتے ہیں اور فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ وہ اللہ کے لیے بچھ جانے والے ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی عظمتوں کو اس طرح پا لیتے ہیں کہ ان کے قلب اور زبان سے بے اختیار اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ وہ سائح ہو جاتے ہیں، یعنی انسانی دنیا سے نکل کر خدائی دنیا میں جانا ان کے لیے زیادہ سکون کا باعث ہوتا ہے۔ خدا کے آگے جھکنا ان کے لیے محبوب چیز بن جاتا ہے۔ جو بھی ان کے ربط میں آتا ہے اس کو بھلائی کے راستے پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے سامنے کسی کو برائی کرتے دیکھتے ہیں تو اس کو روکنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ خدا کی حدبندیوں کے معاملہ میں حد درجہ چوکنا ہو جاتے ہیں، وہ حدود اللہ کے اس طرح نگہبان بن جاتے ہیں جس طرح باغباں اپنے

باغ کا— یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے خدائی انعامات کی خوش خبری ہے۔

خدا کی جنت تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ مگر خدا کی جنت ایک موعود انعام ہے، وہ نقد انعام نہیں۔ جنت کی اسی موجل نوعیت کا یہ نتیجہ ہے کہ لوگ جنت کو چھوڑ کر حقیر فائدوں کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١١٣﴾ وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿١١٤﴾ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١١٦﴾

۱۱۳۔ نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں روا نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی ہوں جب کہ ان پر کھل چکا کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ ہیں۔ ۱۱۴۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا صرف اس وعدہ کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کرلیا تھا۔ پھر جب اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔ بے شک ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا۔ ۱۱۵۔ اور اللہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کرتا جب تک ان کو صاف صاف وہ چیزیں بتا نہ دے جن سے انھیں بچنا ہے، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ۱۱۶۔ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں، وہ جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔

ایک شخص کافر و مشرک ہو اور اس کے سامنے اتمام حجت کی حد تک دین کی دعوت آجائے، اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے تو خدا کے قانون کے مطابق وہ جہنمی ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے اس کے بعد نجات کی دعا کرنا گویا ایمان کو بے وقعت بنانا اور خدائی انصاف کی تردید کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی دعا سے منع کر دیا گیا۔

تاہم آیت میں مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ کا لفظ بتاتا ہے کہ اس حکم کا تعلق زمانہ رسالت کے مشرکین سے ہے جن کے بارے میں وحی کے ذریعہ بتا دیا گیا تھا کہ وہ جہنمی ہیں۔ ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور ان کے حق میں مغفرت کی دعا نہ کریں (التوبہ، 9:84)۔ یہ بات مدینہ کے منافقوں کو بہت ناگوار ہوئی۔ انھوں نے اس کو لے کر آپ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع

کردیا۔ وہ کہتے کہ یہ نبی تو نبی رحمت ہیں اور اپنے کو ابراہیم کا پیرو بتاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بھائیوں اور اپنے رشتہ داروں کے لیے استغفار سے روکتے ہیں۔ حالاں کہ ابراہیم کا حال یہ تھا کہ اپنے مشرک باپ کے لیے بھی انھوں نے مغفرت کی دعا کی۔

جواب دیا گیا کہ ابراہیم بڑے دردمند اور انسانیت کے غم میں گھلنے والے تھے۔ اپنے اس جذبہ کے تحت انھوں نے عہد کرلیا کہ وہ اپنے مشرک باپ کے حق میں خدا سے دعا کریں گے۔ مگر جب وحی نے تنبیہ کی تو اس کے بعد وہ فوراً اس سے باز آگئے۔

اللہ نے ہر آدمی کے اندر برائی کی فطری تمیز رکھی ہے۔ جب آدمی کے سامنے ایک ایسا پیغام آتا ہے جو اس کو برائی سے روکتا ہے تو اس کا وجود اندر سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے دل کے اندر ایک خاموش کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ آدمی اگر اس کھٹک کو نظر انداز کردے، وہ فطرت کی گواہی کے باوجود بچنے والی چیز سے نہ بچے تو اس کی فطری حساسیت کمزور پڑ جاتی ہے، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بالکل مردہ ہوجاتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو گم راہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ''ہدایت دینے کے بعد گمراہ کرنا'' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کا خطرہ مسلمانوں کے لیے بھی اسی طرح ہے جس طرح غیر مسلموں کے لیے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَ
الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ
مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ
ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ۙ وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ
حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا
رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا
اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ
عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ
ع الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ع

۱۱۷۔ اللہ نے نبی پر اور مہاجرین و انصار پر توجہ فرمائی جنھوں نے تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی۔ بے شک اللہ ان پر مہربان ہے، رحم کرنے والا ہے۔ ۱۱۸۔ اور ان تینوں پر بھی اس نے توجہ فرمائی جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آگئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے خود اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر اللہ ان کی طرف پلٹا تا کہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک گروہ وہ نکلا جس نے اپنا بہترین اثاثہ اسلام کے حوالے کردیا۔ ان کی فصل

کٹنے کے لیے تیار تھی مگر وہ اس کو چھوڑ کر ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گئے جس میں سخت گرمی کے تین سو میل طے کر کے وقت کی سب سے بڑی طاقت ورسلطنت کا مقابلہ کرنا تھا۔ سامان کی کمی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمیوں کی باری لگی ہوئی تھی۔ کھانے کے لیے بعض اوقات صرف ایک کھجور ایک آدمی کے حصہ میں آتی تھی۔ تاہم یہ انتہائی سخت مرحلہ صرف ارادوں کے امتحان کے لیے سامنے لایا گیا تھا۔ جب ارادہ کرنے والوں نے ارادہ کا ثبوت دے دیا تو خدا نے دشمن کے اوپر رعب طاری کر دیا۔ وہ مقابلہ کے میدان سے ہٹ گئے اور مسلمان خون بہائے بغیر کامیاب وکامراں ہو کر واپس آ گئے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2769)

دوسرا طبقہ معترفین (التوبہ، 9:102) کا تھا۔ یہ لوگ اپنے دنیوی مشاغل کی وجہ سے سفر پر روانہ نہ ہو سکے۔ تاہم فوراً ہی بعد ان کو محسوس ہو گیا کہ انھوں نے غلطی کی ہے۔ ان کے اندر اعتراف اور شرمندگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان کے آنسوؤں کی کثرت نے ان کے عمل کی کمی کی تلافی کر دی۔ خدا نے ان کو بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے دی۔ کیوں کہ انھوں نے عاجزانہ طور پر اپنی غلطی کو مان لیا۔

تیسرا گروہ مخلّفین (التوبہ، 9:118) کا تھا۔ یہ تین نوجوان کعب بن مالک، مرارۃ بن رُبیع، ہلال بن اُمیۃ تھے۔ وہ اگرچہ سفر پر نہ نکلنے کو اپنی کوتاہی سمجھتے تھے مگر ان کے اندر توبہ وانابت کا اتنا شدید احساس پہلے مرحلہ میں نہیں ابھرا تھا جو مطلوبہ معیار کے مطابق ہو۔ چنانچہ ان کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کا معاملہ کیا گیا۔ یہ لوگ اس مقاطعہ کے باوجود مطمئن رہ سکتے تھے۔ وہ اپنے گھر اور اپنے باغوں میں مشغول ہو جاتے۔ وہ برہمی اور ناوفاداری کے راستوں پر چلنا شروع کر دیتے۔ وہ ناراض عناصر کے ساتھ مل کر اپنی علیحدہ جمعیت بنا لیتے۔ وہ عام مسلمانوں سے الگ اپنا ایک جزیرہ بنا کر اس کے اندر اپنی خوشیوں کی دنیا بسا سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ خدا اور رسول سے دوری کے احساس نے ان کو اس قدر پریشان کر دیا کہ نہ باہر ان کے لیے سکون کی کوئی جگہ نظر آئی اور نہ اپنے دل کے اندر ان کے لیے سکون کا کوئی گوشہ باقی رہا۔ بالفاظ دیگر ان کی پریشانی اختیارانہ تھی، نہ کہ مجبورانہ۔ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا دل پگھل اٹھا۔ 50 دن میں وہ توبہ وانابت کے مطلوبہ معیار پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد انھیں بھی معاف کر دیا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١١٩﴾ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ

۱۱۹۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔ ۱۲۰۔ مدینہ والوں اور اطراف کے بدویوں کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھ رہیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اس لیے کہ جو پیاس اور تھکان اور بھوک بھی ان کو خدا کی راہ میں لاحق ہوتی ہے اور جو قدم بھی وہ منکروں کو رنج پہنچانے

مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا
اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ لَا يُنْفِقُوْنَ
نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ
وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

والا اٹھاتے ہیں اور جو چیز بھی وہ دشمن سے چھینتے ہیں، ان کے بدلے میں ان کے لیے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ ۱۲۱۔ اور جو چھوٹا یا بڑا خرچ انھوں نے کیا اور جو میدان انھوں نے طے کیے، وہ سب ان کے لیے لکھا گیا تا کہ اللہ ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔

انسانی زندگی اجتماعی زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی کا اپنے ذوق اور رجحان کے اعتبار سے ایک حلقہ بن جاتا ہے جس میں وہ اپنے روز وشب گزارتا ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوں اور ایمان کے راستہ پر چلنا چاہیں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی صحبتوں اور ملاقاتوں کے لیے ان لوگوں کو چنیں جو سچے لوگ ہوں۔ یعنی جن کے دل کا خوفِ خدا ان کی زندگی کی روش بن گیا ہو۔ جن کے قول اور عمل کے درمیان مطابقت پائی جاتی ہو۔ سچوں کے ساتھ رہ کر آدمی سچا بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر وہ جھوٹوں کا ساتھ پکڑے تو بالآخر وہ خود بھی جھوٹا بن جائے گا۔

آدمی کے سامنے ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ جان کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کی خدمت کرنے کا سوال ہو۔ جب بھوک پیاس کا مقابلہ کرکے اسلام کے لیے اپنا حصہ ادا کرنا ہو۔ جب اپنے کو تھکا کر خدا کی راہ میں آگے بڑھنا ہو۔ جب دشمنوں کا خطرہ مول لے کر اپنے کو اسلام کی صف میں شامل کرنا ہو۔ جب اپنی پرسکون زندگی کو درہم برہم کرکے خدا ورسول کا ساتھ دینا ہو۔ ایسے مواقع پر آدمی احتیاط اور بچاؤ کا طریقہ اختیار کرکے پیچھے بیٹھ جانے کو پسند کرتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہی تو وہ مواقع ہیں جب کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کا عملی ثبوت پیش کرسکتا ہے۔ جب کہ وہ جنت کے لیے اپنی امیدواری کو خدا کی نظر میں قابل قبول ثابت کرسکتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہنے والوں میں ایک ابوخیثمہ انصاری بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے بعد وہ اپنے باغ میں گئے۔ وہاں خوش گوار سایہ تھا، بیوی نے پانی چھڑک کر زمین کو ٹھنڈا کیا، چٹائی کا فرش بچھایا، تازہ کھجور کے خوشے لاکر سامنے رکھے اور ٹھنڈا پانی پینے کے لیے پیش کیا۔ ابوخیثمہ دنیوی آسانیوں ہی کی خاطر تبوک کے سفر پر نہ جاسکے تھے۔ مگر جب جانے والے اور رہنے والے کے درمیان فرق اس انتہائی نوبت کو پہنچ گیا جو اب ان کے سامنے تھا تو ابوخیثمہ اس کو برداشت نہ کرسکے۔ انھوں نے کہا ''میں یہاں باغ کے سایہ میں ہوں اور خدا کے بندے لو اور گرمی میں کوہ وبیابان طے کررہے ہیں''۔ انھوں نے تلوار سنبھالی اور تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر اسی وقت روانہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ گرد وغبار میں اٹے ہوئے قافلۂ تبوک سے جا ملے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 5419)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾ ع ١٥

۱۲۲۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہلِ ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا، تاکہ وہ دین میں گہری سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔

قرآن کی یہ آیت ایک اعتبار سے زیر بحث صورت حال سے متعلق ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک کلی حکم کو بتا رہی ہے۔ ایک طرف وہ بتاتی ہے کہ مدینہ کے اطراف میں بسنے والے دیہاتیوں کی تعلیم و تربیت کس طرح کی جائے۔ دوسری طرف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تعلیمی نظام اور نئی نسلوں کے لیے اس کا تربیتی ڈھانچہ کن اصولی بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے۔

تعلیم ایک ایسا کام ہے جس میں آدمی کو دوسری مشغولیتوں سے فارغ ہو کر شامل ہونا پڑتا ہے۔ اب اگر سارے لوگ بیک وقت تعلیمی کام میں لگ جائیں تو زندگی کی دوسری سرگرمیاں، مثلاً حصول معاش کی کوششیں، متاثر ہو جائیں گی۔ اسلام کا یہ طریقہ نہیں کہ ایک کام کو بگاڑ کر دوسرا کام انجام دیا جائے، اس لیے حکم دیا گیا کہ باری باری کا اصول مقرر کرو۔ کچھ لوگ تعلیم کے مرکز میں آئیں تو کچھ اور لوگ دوسری سرگرمیوں کو انجام دینے میں لگے رہیں۔ اس طرح دونوں کام بیک وقت انجام پاتے رہیں گے۔

اس آیت میں اسلامی تعلیم کے لیے تفقہ فی الدین کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد معروف فقہی تعلیم نہیں ہے جو شکل دین (بمقابلہ روح دین) کے تفصیلی علم کا نام ہے اور جس کے نتیجہ میں دین کا علم مسائل کے علم کے ہم معنی بن گیا ہے۔ یہاں تفقہ فی الدین کا مطلب خدا کے اتارے ہوئے اساسی دین کو جاننا اور اس میں سمجھ حاصل کرنا ہے۔ اس سے مراد وہ علم ہے جو حق شناسی پیدا کرے جو بنیادی حقیقتوں سے آدمی کو باخبر کرے اور آخرت کی بنیادوں پر زندگی کی تعمیر کرنا سکھائے۔

آیت میں تفقہ فی الدین (تعلیم دین) کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی قوم کے اوپر انذار کا کام کرنے کے قابل ہو سکے۔ انذار کے معنی ہیں ڈرانا۔ قرآن میں یہ لفظ آخرت کے مسئلہ سے ڈرانے اور ہوشیار کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تعلیم سے ایسے افراد تیار ہوں جو قوموں کے اوپر خدا کی طرف سے منذر بن کر کھڑے ہو سکیں۔ تاکہ لوگ خدا سے ڈریں اور دنیا کی زندگی میں اس روش سے بچیں جو انھیں آخرت کے ابدی عذاب کی طرف لے جانے والی ہو۔ اسلامی تعلیم دعوت الی اللہ کی تعلیم کا نام ہے، نہ کہ معروف معنوں میں صرف مسائل فقہ یا جزئیات شرع کی تعلیم کا۔

اس اعتبار سے اسلامی تعلیم کا نصاب دو خاص چیزوں پر مشتمل ہونا چاہیے:

1۔ قرآن و سنت

2۔ وہ علوم جو مدعو کی نسبت سے ضروری ہوں۔ مثلاً مخاطب کی زبان، اس کے طرز فکر اور اس کی نفسیات، وغیرہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ
الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
ع اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۲۳ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ
فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ
يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝۱۲۴ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَ
هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۲۵ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ
كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا
هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۱۲۶ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ
بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ۭ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ
انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا
يَفْقَهُوْنَ ۝۱۲۷

۱۲۳۔ اے ایمان والو، ان منکروں سے جنگ کرو جو تمھارے آس پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ۱۲۴۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کر دیا۔ پس جو ایمان والے ہیں، ان کا اس نے ایمان زیادہ کر دیا اور وہ خوش ہو رہے ہیں۔ ۱۲۵۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے تو اس نے بڑھادی ان کی گندگی پر گندگی۔ اور وہ مرنے تک منکر ہی رہے۔ ۱۲۶۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ سبق حاصل کرتے ہیں۔ ۱۲۷۔ اور جب کوئی سورہ اتاری جاتی ہے تو یہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھتا تو نہیں، پھر چل دیتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا اس وجہ سے کہ یہ سمجھ سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔

''قریب کے منکروں سے جنگ کرو'' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اسلامی جدوجہد کوئی بے منصوبہ جدوجہد نہیں ہے بلکہ اس میں ترتیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ پہلے قریب کی رکاوٹوں پر قابو پانے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے بعد دور کی رکاوٹوں سے نپٹا جائے گا۔ اسی سے یہ بات بھی نکلی کہ سب سے پہلا مجاہدہ خود اپنے نفس سے کیا جانا چاہیے۔ کیوں کہ آدمی کے سب سے قریب اس کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ باہر کے دشمنوں کی باری اس کے بعد آتی ہے۔ پھر اسلام دشمنوں سے بھی اولاً جو چیز مطلوب ہے وہ سختی (غلظہ) ہے یعنی وہ مضبوطی جو دشمنوں کے لیے رعب کا باعث بن جائے (إِذْ كَانَ ذَلِكَ يُوقِعُ الْمَهَابَةَ لَنَا فِي صُدُورِهِمْ وَالرُّعْبَ فِي قُلُوبِهِمْ) احکام القرآن للجصاص، جلد 3، صفحہ 208۔

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ دشمنوں سے مقابلہ کی ساری کارروائی تقویٰ کی بنیاد پر کی جائے۔ تقویٰ (خوف خدا) کی روش ہی مسلمانوں کے لیے نصرت خداوندی کی ضامن ہے۔ تقویٰ سے ہٹتے ہی وہ خدا کی مدد سے محروم ہوجائیں گے۔ وہ خدا سے دور ہوجائیں گے، اور خدا ان سے۔

تقویٰ گویا بندے اور خدا کے درمیان نقطۂ ملاقات ہے۔ جب آدمی خدا سے ڈرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس مقام پر لاتا ہے جہاں خدا اسے دیکھنا چاہتا تھا، جہاں خدا نے اسے بلا رکھا تھا۔ ایسی حالت میں تقویٰ ہی آدمی کو خدا کے قریب کرنے والا بن سکتا ہے، نہ کہ کوئی دوسری چیز۔ جب خدا اپنے بندے کو متقی کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اس بندے کی طرف کیسے متوجہ ہوگا جو غیر متقی کے روپ میں اس کے سامنے آئے۔

قرآن نے اپنی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ اس کی آیتوں کو سن کر مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر اضافۂ ایمان کا تعلق آدمی کی اپنی قلبی صلاحیت پر ہے، نہ کہ صرف آیتوں کو سن لینے پر۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب قرآن اترا تو اس کے الفاظ ابھی صرف الفاظ تھے، وہ تاریخی واقعہ نہیں بنے تھے۔ اس وقت قرآن کی اہمیت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو حقیقت کو اس کی مجرد صورت میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ظاہر پرست منافقین کے اندر یہ صلاحیت نہ تھی۔ ان کو قرآن کے الفاظ صرف الفاظ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چند الفاظ کا مجموعہ کسی کے یقین واعتماد میں اضافہ کا سبب کیسے بن جائے گا۔ چنانچہ جب کوئی نئی آیت اترتی تو وہ یہ کہہ کر مذاق اڑاتے کہ عربی کے ان الفاظ نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا۔

اس بات کو آدمی اس وقت تک سمجھ نہیں سکتا جب تک وہ تاریخ کو حذف کرکے قرآن کو اس کے مجرد روپ میں دیکھنے کی نظر نہ پیدا کرے۔ آج ''قرآن'' کے لفظ کے ساتھ وہ تمام تاریخی عظمتیں شامل ہو چکی ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت موجود نہ تھیں، اور بعد کو ہزار سال سے زیادہ عرصہ میں اس کے گرد جمع ہوئیں۔

مگر زمانۂ نزول میں قرآن کی حیثیت مجرد ایک کتاب کی تھی۔ اس وقت ظاہر بیں انسان اس کو صرف ایک ''کتاب'' کے روپ میں دیکھتا تھا، نہ کہ تاریخ ساز صحیفہ کے روپ میں۔ وہ لوگ جو قرآن کو اس کی چھپی ہوئی عظمت کے ساتھ دیکھ رہے تھے جب وہ قرآن سے غیر معمولی تاثر قبول کرتے تو ظاہر بینوں کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر یہ ایک کتاب ہی تو ہے۔ پھر ایک لفظی مجموعہ میں وہ کون سی خاص بات ہے کہ لوگ اس سے اس قدر متاثر ہو رہے ہیں۔

خدا ایسے لوگوں کو بار بار مختلف قسم کے جھٹکے دیتا ہے تاکہ ان کے دل کی حساسیت بڑھے اور وہ باتوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ پکڑنے کے قابل ہوجائیں۔ مگر جب آدمی خود نصیحت نہ لینا چاہے تو کوئی خارجی چیز اس کی نصیحت کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ نصیحت لینے والی کوئی بات سامنے آئے اور آدمی اس کو نظر انداز کردے تو اس کا یہ عمل اس کو نصیحت کے معاملہ میں بے حس بنا دیتا ہے۔

''وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں مگر وہ نہ توبہ کرتے اور نہ سبق حاصل کرتے''۔

یہاں آزمائش سے مراد قحط، مرض، بھوک وغیرہ میں مبتلا کیا جانا ہے۔ اس قسم کی آفتیں آدمی کی زندگی میں بار بار پیش آتی ہیں مگر وہ ان سے توبہ اور عبرت کی غذا نہیں لیتا — توبہ حقیقۃً تذکرّ کے نتیجہ کا دوسرا نام ہے۔

ہر آدمی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ سال میں ایک دو بار ضرور کچھ غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ واقعات خدائی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ خدا کے مقابلے میں انسان کی بے چارگی کو یاد دلاتے ہیں۔ کبھی وہ آخرت کے مقابلے میں موجودہ دنیا کی بے وقعتی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے مواقع آدمی کے لیے اِس بات کا امتحان ہوتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے لیے سبق بنائے، وہ مادی واقعات میں غیر مادی حقائق کو دیکھ لے۔

سبق والی چیز سے آدمی سبق کیوں نہیں لے پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک چیز کو دوسری چیز سے مربوط نہیں کر پاتا۔ دنیا کے واقعات سے سبق لینے کے لیے یہ صلاحیت درکار ہے کہ آدمی ایک بات کو دوسری بات سے جوڑ کر دیکھنا جانتا ہو۔ وہ ظاہری واقعہ کو چھپی ہوئی حقیقت سے ملا کر دیکھ سکے۔ وہ پیش آنے والی چیز کے آئینہ میں اس چیز کو پڑھ سکے جو ابھی پیش نہیں آئی۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۶ / ۵

۱۲۸۔ تمھارے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم میں سے ہے۔ تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کا حریص ہے۔ ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ ۱۲۹۔ پھر بھی اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا۔ اور وہی مالک ہے عرش عظیم کا۔

اِس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصویر بتائی گئی ہے کہ اسلام کی جدوجہد میں ان کا سارا اعتماد صرف ایک اللہ پر ہے۔ وہ لوگوں کو جس خدا کی طرف بلانے کے لیے اٹھے ہیں وہ ایسا خدا ہے جو سارے اقتدار کا مالک ہے۔ تمام خزانوں کی کنجیاں اس کے پاس ہیں۔ رسول اسی ایمان ویقین کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس لیے بالکل فطری ہے کہ اس کا سارا بھروسہ صرف ایک خدا پر ہو۔ وہ ہر قسم کی مصلحتوں اور اندیشوں سے بے پروا ہو کر حق کی خدمت میں لگا رہے۔

پھر یہ بتایا کہ خدا کا رسول لوگوں کے حق میں حد درجہ شفیق اور مہربان ہے۔ وہ دوسروں کی تکلیفوں پر اس طرح کڑھتا ہے جیسے کہ وہ تکلیف خود اس کے اوپر پڑی ہو۔ وہ حرص کی حد تک لوگوں کی ہدایت کا طالب ہے۔ دعوتِ حق کی جدوجہد کے لیے اس کو جس چیز نے متحرک کیا ہے، وہ سراسر خیر خواہی کا جذبہ ہے، نہ کہ کوئی شخصی حوصلہ یا قومی مسئلہ — وہ خود لوگوں کی بھلائی کے لیے اٹھا ہے، نہ کہ اپنی ذاتی بھلائی کے لیے۔

عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگ پروانوں کی طرح آگ میں گر رہے ہیں اور میں ان کی کمر پکڑ کر ان کو آگ میں گرنے سے روک رہا ہوں (أَلَا وَإِنِّي آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ أَنْ تَهَافَتُوا فِي النَّارِ كَتَهَافُتِ الْفَرَاشِ، أَوِ الذُّبَابِ) مسند احمد، حدیث نمبر 3704۔

رسول کی اس تصویر کی شکل میں حق کے داعی کی تصویر ہمیشہ کے لیے بتادی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے داعی کے اندر دو خاص صفات نمایاں طور پر ہونی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اس کا بھروسہ صرف ایک اللہ پر ہو۔ دوسری یہ کہ مدعو کے لیے اس کے دل میں صرف محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ہو، اس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اگرچہ مدعو کی طرف سے طرح طرح کی شکایتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے اور داعی کے درمیان قومی اور مادی جھگڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سب کے باوجود یہ مطلوب ہے کہ داعی ان تمام چیزوں کو نظر انداز کرے اور مدعو کے لیے رحمت ورافت کے سوا کوئی اور جذبہ اپنے اندر پیدا نہ ہونے دے۔

داعی کو ردعمل کی نفسیات سے بلند ہونا پڑتا ہے۔ اس کو یک طرفہ طور پر ایسا کرنا پڑتا ہے کہ وہ مدعو کا خیر خواہ بنے، خواہ مدعو نے اس کے خلاف کتنا ہی زیادہ قابلِ شکایت رویہ کیوں نہ اختیار کیا ہو۔ داعی خدا کے لیے جیتا ہے اور مدعو اپنی ذات کے لیے۔

ابتداءً اسلام میں جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا ان کے لیے آپ کا ساتھ دینا اپنی بنی بنائی زندگی کو اجاڑ دینے کے ہم معنی بن گیا۔ اس سے کچھ لوگوں کے اندر یہ خیال پیدا ہوا کہ رسول ہمارے لیے مصیبت بن کر آیا ہے۔ مگر یہ وہی بات ہے جو عین مطلوب ہے۔ حق کی دعوت اسی لیے اٹھی ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کا مصرف آخرت کی دنیا ہے، نہ کہ موجودہ دنیا۔ اس لیے اگر رسول کا لایا ہوا دین اختیار کرنے میں دنیوی نقشہ بگڑتا ہوا نظر آئے تو اس پر آدمی کو مطمئن رہنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی متاع کو خدا نے آخرت کے لیے قبول کر لیا۔

۱۰۔ سُوْرَۃُ یُوْنُس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ① اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ②

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ الٓرٰ، یہ پُر حکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔ ۲۔ کیا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ہم نے انھیں میں سے ایک شخص پر وحی کی کہ لوگوں کو ڈراؤ اور جو ایمان لائیں ان کو خوش خبری سنا دو کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچا مرتبہ ہے۔ منکروں نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے۔

پیغمبر کا کلام انتہائی محکم دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے غیر معمولی انداز کی بنا پر خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بول رہا ہے۔ اس کے باوجود ہر زمانہ میں لوگوں نے پیغمبر کا انکار کیا۔ اس کی وجہ انسان کی ظاہر پرستی ہے۔ پیغمبر اپنے معاصرین کی نظر میں عام انسانوں کی طرح بس ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کے گرد ابھی عظمت کی وہ تاریخ جمع نہیں ہوتی جو بعد کے زمانہ میں اس کے نام کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے پیغمبر کے زمانہ کے لوگ پیغمبر کو محض ایک انسان سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ پیغمبر کو نہ خدا کے بھیجے ہوئے کی حیثیت میں دیکھ پاتے اور نہ مستقبل میں بننے والی تاریخ کے اعتبار سے اس کا اندازہ کر پاتے جب کہ ہر آدمی اس کی پیغمبرانہ عظمت کو ماننے پر مجبور ہوگا۔

پیغمبر کا کلام سراپا اعجاز ہوتا ہے جو سننے والوں کو بے دلیل کر دیتا ہے۔ مگر منکرین اس کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ ادبی ساحری ہے۔ وہ دلیل کے میدان میں اپنے آپ کو عاجز پا کر اس کے اوپر عیب لگانے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ پیغمبر کے کلام کی صداقت کو مشتبہ کرتے ہیں۔ پیغمبر کا کلام جن لوگوں کو مفتوح کر رہا تھا ان کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ محض سادگی میں پڑے ہوئے ہیں، ورنہ یہ سارا معاملہ الفاظ کے فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ زبان کی جادوگری ہے، نہ کہ کوئی واقعی اہمیت کی چیز۔

پیغمبر کا اصل مشن انذار و تبشیر ہے۔ یعنی خدا کی پکڑ سے ڈرانا اور جو لوگ خدا سے ڈر کر دنیا میں رہنے کے لیے تیار ہوں، ان کو جنت کی خوش خبری دینا۔ پیغمبر اس لیے آتا ہے کہ لوگوں کو اس حقیقتِ واقعہ سے آگاہ کر دے کہ آدمی اس دنیا میں آزاد اور خود مختار نہیں ہے اور نہ زندگی کا قصہ آدمی کی موت کے ساتھ ختم ہو جانے والا ہے۔ بلکہ موت کے بعد ابدی زندگی ہے اور آدمی کو سب سے زیادہ اسی کی فکر کرنی چاہیے۔ جو شخص غفلت برتے گا یا سرکشی کرے گا وہ موت کے بعد کی دنیا میں اس حال میں پہنچے گا کہ وہاں اس کے لیے دکھ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

ظاہر پرست انسان ہمیشہ یہ سمجھتا رہا ہے کہ عزت اور ترقی اس شخص کے لیے ہے، جس کے پاس دنیا کا اقتدار ہے، جو دنیا کی دولت کا مالک ہے۔ پیغمبر بتاتا ہے کہ یہ سراسر دھوکا ہے۔ یہ عزت و ترقی تو وہ ہے جو موجودہ عارضی زندگی میں انسانوں کے درمیان ملتی ہے۔ مگر عزت اور ترقی دراصل وہ ہے جو مستقل زندگی میں خدا کے یہاں حاصل ہو۔ وہی عزت و ترقی حقیقی ہے اور اسی کے ساتھ دائمی بھی۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ③ اِلَيْهِ

۳۔ بے شک تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر قائم ہوا۔ وہی معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے پس تم اسی کی عبادت کرو، کیا تم سوچتے نہیں۔ ۴۔ اسی کی طرف

مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہ پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہ دوبارہ پیدا کرے گا تا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔ اور جنھوں نے انکار کیا ان کے انکار کے بدلے ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے۔

کائنات میں مختلف قسم کی چیزیں ہیں۔ علمی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان چیزوں کا ظہور بیک وقت نہیں ہوا بلکہ تدریج کے ساتھ ایک کے بعد ایک ہوا ہے۔ قرآن اس تدریجی تخلیق کو چھ ادوار (periods) میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ دَوری تخلیق ثابت کرتی ہے کہ کائنات کی پیدائش شعوری منصوبہ کے تحت ہوئی ہے۔ پھر کائنات کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کا نظام حد درجہ محکم قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ ہر چیز ٹھیک اسی طرح عمل کرتی ہے جس طرح مجموعی تقاضے کے تحت اسے عمل کرنا چاہیے۔ یہ واقعہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کارخانہ کائنات کا ایک زندہ مدبر ہے جو ہر لمحہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔

کائنات کا یہ حیران کن نظام خود ہی پکار رہا ہے کہ اس کا مالک اتنا کامل اور اتنا عظیم ہے جس کے یہاں کسی سفارشی کی سفارش چلنے کا کوئی سوال نہیں۔ کائنات اپنی خصوصیات کے آئینہ میں اپنے خالق کی خصوصیات کو بتا رہی ہے۔

ساری کائنات میں ''قسط'' کا نظام قائم ہے۔ یہاں ہر ایک کے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اسی کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ ہر ایک کو وہی ملتا ہے جو اس نے کیا تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جاتا ہے جس کے لیے اس نے نہیں کیا تھا۔ زمین کا جو حصہ رات کے اسباب جمع کرے وہاں تاریکی پھیل کر رہتی ہے اور زمین کا جو حصہ روشنی کے اسباب پیدا کرے اس کے اوپر روشن سورج چمک کر رہتا ہے۔

یہ مادی نتائج کا حال ہے مگر اخلاقی نتائج کے معاملہ میں دنیا کی تصویر بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ انسان نیکی کرتا ہے اور اس کو نیکی کا پھل نہیں ملتا۔ انسان سرکشی کرتا ہے مگر اس کی سرکشی اپنا نتیجہ دکھائے بغیر جاری رہتی ہے۔ خالق کی جو مرضی اس کی دوسری مخلوقات میں چل رہی ہے اس کی وہی مرضی انسان کے معاملات میں کیوں ظاہر نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں خدائی انصاف کے ظہور کو خدا نے بعد کو آنے والی دنیا کے لیے موخر کر دیا ہے۔ پہلی زندگی انسان کو عمل کے لیے دی گئی ہے، دوسری زندگی اس کو اپنے عمل کا نتیجہ پانے کے لیے دی جائے گی۔ اور دوسری زندگی کا ظہور یقیناً اتنا ہی ممکن ہے جتنا پہلی زندگی کا ظہور۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝۶

۵۔ اللہ ہی ہے جس نے سورج کو چمکتا بنایا اور چاند کو روشنی دی اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے ان کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ ٦۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، ان میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں۔

سورج ہماری زمین سے نہایت درست فاصلہ پر قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے لیے روشنی اور حرارت جیسی نعمتوں کا خزانہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس اندازہ میں فرق ہو جائے تو سورج ہمارے لیے سورج نہ رہے بلکہ آگ کی جہنم بن جائے، وہ زندگی کے بجائے موت کا پیغام ثابت ہو۔ چاند ایک حد درجہ ریاضیاتی حساب کے مطابق اپنے مدار پر ٹھیک ٹھیک گردش کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ چاند بذات خود بے نور ہونے کے باوجود ہمارے لیے نہ صرف ٹھنڈی روشنی دے بلکہ مہینہ اور سال کی قدرتی تقویم بھی فراہم کرے۔ یہ فلکیاتی نشانیاں ثابت کرتی ہیں کہ اس کائنات میں گہری مقصدیت ہے، اور مقصدیت والی کائنات کا آخری انجام بے مقصد نہیں ہوسکتا۔

پھر ہماری دنیا میں رات کے بعد دن کا آنا مادی تمثیل کی زبان میں اس اخلاقی حقیقت کو بتا رہا ہے کہ موجودہ دنیا میں یہ قانون نافذ ہے کہ تاریکی کے بعد روشنی پھیلے، اندھیرے کے بعد اجالے کا ظہور ہو۔ یہاں حقوق کی پامالی کے بعد حقوق کی ادائیگی کا نظام آنے والا ہے۔ انسان کی سرکشی کی جگہ خدائی انصاف کو غلبہ ملنے والا ہے۔ یہاں اس وقت کا آنا مقدر ہے جب کہ دھاندلی ختم ہو اور حق کے اعتراف کا ماحول چاروں طرف قائم ہو جائے۔

آخرت کی حقیقتوں کو خدا نے نشانیوں کے انداز میں ظاہر کیا ہے۔ بالفاظ دیگر، خدا موجودہ دنیا میں دلیل کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے، نہ کہ محسوس مشاہدہ کے روپ میں۔ پھر خدا جس روپ میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے اسی روپ میں ہم اس کو پا سکتے ہیں، نہ کہ کسی اور روپ میں۔

خدا نے اس دنیا میں ہدایت کے راستے کھول رکھے ہیں مگر یہ ہدایت انھیں کا مقدر ہے جو خدائی نقشہ کے مطابق اس کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہاں وہی لوگ صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق پائیں گے جو دلیل کی زبان میں بات کو سمجھنے اور ماننے کے لیے تیار ہوں۔ جو لوگ سچی دلیل کے آگے نہ جھکیں وہ گویا خدا کے آگے نہیں جھکے۔ انھوں نے خدا کو نہیں مانا۔ ایسے لوگوں کو اپنے لیے جہنم کے سوا کسی اور چیز کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔

زمین و آسمان میں اگرچہ بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ انھیں لوگوں کے لیے سبق بنتی ہیں جو ڈر رکھنے

والے ہیں۔ڈر یا اندیشہ وہ چیز ہے جو آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔جب تک آدمی کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو وہ اس معاملہ پر پورا دھیان نہیں دے گا اور نہ اس کے پہلوؤں کو سمجھے گا— پوری کائنات ایک زبردست تخلیقی توازن میں جکڑی ہوئی ہے۔یہ اس بات کا کھلا ہوا اشارہ ہے کہ کائنات کا مالک ایسا مالک ہے جو انسان کو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔اسی طرح پہلی زندگی جس کا ہم تجربہ کررہے ہیں وہ اس کا یقینی ثبوت ہے کہ دوسری زندگی بھی ممکن ہے۔ موجودہ دنیا میں مادی نتائج کا نکلنا مگر اخلاقی نتائج کا نہ نکلنا تقاضا کرتا ہے کہ ایک اور دنیا بنے جہاں اخلاقی نتائج اپنی پوری صورت میں ظاہر ہوں۔یہ سب انتہائی محکم باتیں ہیں مگر ان کا محکم ہونا وہی شخص جانے گا جو اندیشہ کی نفسیات کے تحت زندگی کے معاملہ کو دیکھتا ہو۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ اطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ﴿۷﴾ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۸﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَہۡدِیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ بِاِیۡمَانِہِمۡ ۚ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ﴿۹﴾ دَعۡوٰىہُمۡ فِیۡہَا سُبۡحٰنَکَ اللّٰہُمَّ وَ تَحِیَّتُہُمۡ فِیۡہَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعۡوٰىہُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰﴾ ع

۷۔بے شک جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے بے پروا ہیں۔ ۸۔ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا بہ سبب اس کے جو وہ کرتے تھے۔ ۹۔بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، اللہ ان کے ایمان کی بدولت ان کو (جنت میں) پہنچا دے گا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، نعمت کے باغوں میں۔ ۱۰۔اس میں ان کا قول ہوگا کہ اے اللہ تو پاک ہے۔اور ملاقات ان کی سلام سے ہوگی۔ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے جہان کا۔

جہنم کس کے لیے ہے— ان لوگوں کے لیے جو اس دن کو بھولے ہوئے ہوں جب کہ خدا سے ان کا سامنا ہوگا۔جو آخرت کی ابدی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی عارضی چیزوں پر راضی ہو گئے ہوں۔جن کا یہ حال ہو کہ دنیا میں انھیں جو کچھ امتحان کے طور پر ملا ہے اسی پر وہ مطمئن ہو جائیں۔جو غیر خدائی چیزوں میں اتنا دل لگالیں کہ خدا کی طرف سے ظاہر کی جانے والی حقیقتوں سے غافل ہو جائیں۔یہ سب خدا کے نزدیک جہنمی راستوں میں چلنا ہے، اور جو لوگ جہنمی راستوں میں چل رہے ہوں وہ آخر کار جہنم کے سوا اور کہاں پہنچیں گے۔

''اللہ انھیں ان کے ایمان کی وجہ سے جنت کی منزل تک پہنچائے گا'' اس سے معلوم ہوا کہ ایمان آدمی کے لیے رہنمائی ہے۔وہ آدمی کو غلط راہوں سے بچا کر صحیح راستہ پر چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کو حقیقی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

ایمان خدا کی دریافت ہے۔جس آدمی کو ایمان حاصل ہو جائے اس کو علم کا سرا ہاتھ آجاتا ہے، وہ اس قابل

ہوجاتا ہے کہ ہر معاملہ میں صحیح مقام سے اپنی سوچ کا آغاز کرسکے۔ وہ فکری بے راہ روی سے بچ کر فکری صحت کا مالک بن جائے۔ مزید یہ کہ خدا کو ماننا کسی کتابی فلسفہ کو ماننا نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ خدا کو ماننا ہے جو بالآخر تمام انسانوں کو اپنے یہاں جمع کرکے ان کا حساب لینے والا ہے۔ اس طرح ایمان آدمی کے اندر اپنے انجام کے بارے میں اندیشہ کی کیفیت پیدکرکے اس کو انتہائی سنجیدہ انسان بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ اپنی تمام کارروائیوں کو صحیح اور غلط کی روشنی میں دیکھے اور صرف صحیح رخ پر چلے اور غلط رخ پر چلنے سے ہمیشہ پرہیز کرے۔

اس طرح ایمان آدمی کو صحیح فکر بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ قوت تمیز بھی جو اس کے لیے مستقل عملی رہنما بن جائے۔

آخرت کی جنت ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے دنیا میں اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کیا ہو۔ آخرت خدا کے براہِ راست جلوؤں میں سرشار ہونے کا مقام ہے، وہاں بسنے کا موقع صرف ان لوگوں کو ملے گا جو دنیا میں خدا کے بالواسطہ جلوؤں سے سرشار ہوئے تھے۔ آخرت میں لوگوں کے دل ایک دوسرے کے لیے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبات سے بھرے ہوئے ہوں گے، اس لیے وہاں کی آبادی میں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ دوسروں کے لیے ان کے دل میں سلامتی اور خیر خواہی کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑫

۱۱۔ اگر اللہ لوگوں کے لیے عذاب اسی طرح جلد پہنچادے جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں جلدی کرتا ہے تو ان کی مدت ختم کردی گئی ہوتی۔ لیکن ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ۱۲۔ اور انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دور کردیتے ہیں تو وہ ایسا ہوجاتا ہے گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گزرجانے والوں کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دئے گئے ہیں۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص قابل انعام عمل کرے تو اس کا عمل فوراً اس کے اعمال نامہ میں شامل کردیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص قابل سزا فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو خدا اس کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی موڑ پر متنبہ ہوکر اپنی اصلاح کرلے۔ خدا کا یہ قانون انسان کے لیے بہت بڑی رحمت ہے، ورنہ انسان

اتنا ظالم ہے کہ وہ ہر وقت برائی کرنے پر آمادہ رہتا ہے، اور اگر لوگوں کو ان کی برائیوں پر فوراً پکڑا جانے لگے تو ان کی مہلتِ عمر بہت جلد ختم ہو جائے اور زمین کی پشت چلنے والے انسانوں سے خالی ہو جائے۔

دنیا کی زندگی میں سرکش وہ لوگ بنتے ہیں جو دنیا میں یہ سمجھ کر رہیں کہ مرنے کے بعد انھیں خدا کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ جو پکڑ کے اندیشہ سے خالی ہو کر زندگی گزارتے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں کہ جو دھاندلی چاہیں کریں اور جو فساد چاہیں پھیلائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان سچائی اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک ہی حقیقی محرک ہے، اور وہ یہ کہ آدمی یہ سمجھے کہ سب طاقت وروں کے اوپر ایک طاقت ور ہے۔ ہر آدمی اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ ایک دن تمام انسانوں کو پکڑے گا اور ہر ایک مجبور ہوگا کہ اپنے بارے میں اس کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ آدمی بار بار کسی نہ کسی تکلیف یا حادثہ کی زد میں آجاتا ہے، آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں وہ بالکل بے بس ہے۔ اُس وقت آدمی بے اختیار ہو کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مگر یہ حالت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ مصیبتوں کی گرفت میں ہو، مصیبت سے نجات پاتے ہی وہ دوبارہ ویسا ہی غافل اور سرکش بن جاتا ہے جیسا وہ پہلے تھا۔ ایسے لوگوں کے اظہار بندگی کو خدا تسلیم نہیں کرتا۔ کیوں کہ اظہار بندگی وہ مطلوب ہے جو آزادانہ حالات میں کی جائے، مجبورانہ حالات میں ظاہر کی ہوئی بندگی کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔

آدمی ایک توجیہہ پسند مخلوق ہے۔ وہ ہر عمل کا ایک جواز تلاش کرتا ہے۔ اگر آدمی سرکشی کو اپنے لیے پسند کرلے تو اس کا ذہن بھی اسی طرف مڑ جائے گا۔ وہ عملاً سرکشی کرے گا اور اس کا ذہن اس کی سرکشی کو درست ثابت کرنے کے لیے اس کو خوب صورت الفاظ فراہم کرتا رہے گا۔ اسی کا نام تزئین اعمال ہے۔ آدمی اپنی غلطیوں کو خوش نما الفاظ میں بیان کر کے اپنے کو مطمئن کر لیتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص آگ کا انگارہ اپنے ہاتھ میں لے لے اور سمجھے کہ وہ اس کو نہیں جلائے گا، کیوں کہ اس کا نام اس نے سرخ پھول رکھ دیا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

۱۳۔ اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ انھوں نے ظلم کیا۔ اور ان کے پیغمبران کے پاس کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم لوگوں کو۔ ۱۴۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔

"پیغمبر اپنی قوموں کے پاس بینات کے ساتھ آئے مگر انھوں نے نہ مانا"۔ بینہ جمع بینات کے معنی دلیل کے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا داعی ہمیشہ بینات کی بنیاد پر اٹھتا ہے۔ لوگوں کو اسے دلائل کی سطح پر پہچاننا پڑتا ہے۔ جو لوگ ظاہری عظمتوں اور عوامی استقبالیوں میں خدا کے داعی کو پانا چاہیں وہ کبھی اس کو نہیں پائیں گے، کیونکہ خدا کا داعی وہاں موجود نہیں ہوتا۔ نبی معجزہ دکھاتا ہے۔ مگر معجزہ آخری مرحلہ میں اتمام حجت کے لیے آتا ہے، دعوتی مرحلہ میں سارا کام دلائل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

کسی شخص یا گروہ کا ظالم ہونا یہ ہے کہ وہ دلیل کے روپ میں ظاہر ہونے والی دعوت خداوندی کو نہ پہچانے اور اپنے خود ساختہ معیار پر نہ پانے کی وجہ سے اس کا انکار کردے۔ ایسے لوگ اپنی اس روش کی وجہ سے خدائی قانون کی زد میں آجاتے ہیں۔

ماضی کی جن قوموں پر انکار نبوت کے جرم میں خدا کا عذاب نازل ہوا وہ سرے سے نبوت کی منکر نہ تھیں۔ یہ تمام قومیں کسی نہ کسی سابق پیغمبر کو مانتی تھیں۔ البتہ انھوں نے وقت کے پیغمبر کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پچھلے پیغمبر کا معاملہ یہ تھا کہ اس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات قائم ہو گئی تھیں اور قومی عصبیتیں اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھیں۔ جب کہ معاصر پیغمبر ابھی اس قسم کی اضافی خصوصیات سے خالی تھا۔ انھوں نے اس گزرے ہوئے پیغمبر کا اقرار کیا جو نسلوں کی روایات کے نتیجہ میں ان کا قومی پیغمبر بن چکا تھا، جس کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنا تاریخی عظمت کے مینارے سے اپنے کو منسوب کرنے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے اپنے قومی پیغمبر کو پیغمبر مانا مگر اس پیغمبر کا انکار کر دیا جس کو صرف دلیل اور برہان کے ذریعہ جانا جاسکتا تھا۔

یہ جرم خدا کی نظر میں اتنا شدید تھا کہ وہ لوگ نبی کے منکر قرار دے کر ہلاک کر دیے گئے۔

"پھر ہم نے اس کے بعد تم کو ملک میں خلیفہ بنایا"۔ خلیفہ کے اصل معنی ہیں بعد کو آنے والا۔ یہ لفظ جانشین، خاص طور پر، اقتدار میں جانشین کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ جانشینی انسان کی ہوتی ہے، نہ کہ خدا کی۔ کوئی انسان اقتدار میں خدا کا جانشین نہیں ہوسکتا۔ انسان ہمیشہ کسی مخلوق کا جانشین ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی خلافت کا لفظ آیا ہے وہ مخلوق کی جانشینی کے لیے ہے، نہ کہ خدا کی جانشینی کے لیے۔

کسی کو خلیفہ (جانشین) بنانا اعزاز کے لیے نہیں بلکہ صرف امتحان کے لیے ہوتا ہے۔ جانشین بنانے کا مطلب ایک کے بعد دوسرے کو کام کا موقع دینا ہے، ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو امتحان کے میدان میں کھڑا کرنا ہے۔ جیسے ہندستان میں دیسی راجاؤں کی جگہ مغلوں کو اختیار دیا گیا۔ پھر ان کو ہٹا کر انگریز ان کے جانشین بنائے گئے۔ اس کے بعد انھیں ملک سے نکال کر اکثریتی فرقہ کے لیے جگہ خالی کی گئی۔ ان میں سے ہر بعد کو آنے والا اپنے پہلے کا خلیفہ تھا۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ	۱۵۔ اور جب ان کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی

غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ
اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا
مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥﴾ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا
تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ
لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى
اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الْمُجْرِمُوْنَ ﴿١٧﴾

اور قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو۔ کہو کہ میرا یہ کام نہیں کہ میں اپنے جی سے اس کو بدل دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔
۱۶۔ کہو کہ اللہ اگر چاہتا تو میں اس کو تمھیں نہ سناتا اور نہ اللہ اس سے تمھیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تمھارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۱۷۔ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ یقیناً مجرموں کو فلاح حاصل نہیں ہوتی۔

مکہ کے قریش خدا اور رسول کو مانتے تھے۔ وہ اپنے کو ملّت ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے۔ حتی کہ اسلام کی بہت سی دینی اصطلاحیں مثلاً صلاۃ، صوم، زکوٰۃ، حج وغیرہ وہی ہیں جو پہلے سے ان کے یہاں رائج تھیں۔ اس کے باوجود کیوں انھوں نے کہا کہ دوسرا قرآن لاؤ یا اس قرآن میں کچھ ترمیم کردو تب ہم اس کو مانیں گے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن میں خدا کے خالص دین کا اعلان تھا۔ جب کہ قریش خدا کے دین کے نام پر ایک ملاوٹی دین کو اختیار کیے ہوئے تھے۔

قرآن کی توحید سے ان کے مشرکانہ عقیدۂ خدا پر زد پڑتی تھی۔ قرآن کے تصور عبادت کی روشنی میں ان کی عبادتیں محض کھیل تماشا معلوم ہوتی تھیں۔ وہ پیغمبر کو اپنے قومی فخر کا نشان بنائے ہوئے تھے اور قرآن اُن سے ایک ایسے پیغمبر کو ماننے کا مطالبہ کر رہا تھا جو ان کی عملی زندگی میں رہنما کا درجہ حاصل کرلے۔ انھوں نے کعبہ کی خدمت کو اپنی دین داری کا سب سے بڑا ثبوت سمجھ رکھا تھا جب کہ قرآن نے بتایا کہ دین داری یہ ہے کہ آدمی خدا سے ڈرے اور جو کچھ کرے آخرت کو سامنے رکھ کر کرے۔

آدمی چند الفاظ بول کر حق کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں ''کھٹکا'' نہیں ہوتا۔ اگر آدمی کے دل میں یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ وہ اپنے قول و فعل کے لیے خدا کے یہاں جواب دہ ہے تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جائے گا۔ اور جو شخص سنجیدہ ہو وہ معاملہ کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھے گا، وہ سرسری طور پر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

۱۸۔اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جوان کو نہ نقصان پہنچاسکیں اور نہ نفع پہنچاسکیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہو، کیاتم اللہ کوایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اس کو آسمانوں اورزمین میں معلوم نہیں۔ وہ پاک اور برتر ہے اس سے جس کو وہ شریک کرتے ہیں۔ ۱۹۔اورلوگ ایک ہی امت تھے۔ پھرانھوں نے اختلاف کیا۔اوراگرتمھارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان اس امر کا فیصلہ کردیا جاتا جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔

ہماری دنیا میں جوواقعات ہورہے ہیں وہ بظاہر مادی اسباب کے تحت ہورہے ہیں۔مگرحقیقت یہ ہے کہ تمام واقعات کے پیچھے خدا کا تصرف کام کررہا ہے۔اس دنیا میں کسی کو کوئی ذاتی اختیار حاصل ہی نہیں۔توحید یہ ہے کہ آدمی ظاہری چیزوں سے گزرکر غیب میں چھپے ہوئے خدا کو پالے۔اس کے مقابلے میں شرک یہ ہے کہ آدمی ظاہری چیزوں میں اٹک کررہ جائے۔وہ چیزوں ہی کو چیزوں کے خالق کا مقام دے دے۔

اس دنیا میں خدا کے سوا کسی کے پاس نفع دینے یا نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں۔جوآدمی اس حقیقت کو پالیتا ہے اس کی تمام توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔وہ خدا ہی کی پرستش کرتا ہے۔وہ اسی سے ڈرتا ہے اوراسی سے امیدیں قائم کرتا ہے۔وہ اپنا سب کچھ ایک خدا کو بنالیتا ہے۔اس کے برعکس، جولوگ چیزوں میں اٹکے ہوئے ہوں وہ اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کسی غیر خدا کو اپنا خدا بنالیتے ہیں اوران غیر خداؤں سے وہی امیدیں اور اندیشے وابستہ کرلیتے ہیں جو درحقیقت خدائے واحد کے ساتھ وابستہ کرنا چاہیے۔اسی کی ایک صورت شفاعت کا عقیدہ ہے۔لوگ یہ فرض کرلیتے ہیں کہ انسانوں یا غیر انسانوں میں کچھ ایسی برتر ہستیاں ہیں جوخدا کی نظر میں مقدس ہیں۔خداان کی سنتا ہے اوران کی سفارش پر دنیوی رزق یا اخروی نجات کے فیصلے کرتا ہے۔مگر اس قسم کا عقیدہ باطل ہے۔وہ خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ ہے۔

خدااس قسم کے ہرشرک سے پاک ہے۔خدا اپنی صفات کا جوتعارف اپنی عظیم کائنات میں کرارہا ہے اس کے لحاظ سے اس قسم کے تمام عقائد بالکل بے جوڑ ہیں۔ایسے کسی عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ خداوہ نہیں ہے، جو بظاہر اپنی تخلیقی صفات کے آئینہ میں نظرآرہا ہے یا پھر خدا کی صفتوں میں تضاد ہے۔ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی چیز ممکن نہیں۔

خدا نے انسانیت کا آغاز دین فطرت سے کیا تھا۔ اس وقت تمام انسانوں کا ایک ہی دین تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے فرق کرکے دین کے مختلف روپ بنا لیے۔ اس کی وجہ اس آزادی کا غلط استعمال ہے جو لوگوں کو امتحان کی غرض سے دی گئی ہے۔ اگر خدا ظاہر ہوجائے تو اس کی طاقتوں کو دیکھ کر لوگوں کی سرکشی ختم ہوجائے اور اچانک اختلاف کی جگہ اتحاد پیدا ہوجائے۔ کیوں کہ شدت خوف رایوں کے تعدد کو ختم کردیتا ہے۔ مگر خدا قیامت سے پہلے اس صورت حال میں مداخلت نہیں کرے گا۔ موجودہ دنیا کو خدا نے امتحان کے لیے بنایا ہے اور امتحان کی فضا باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقت چھپی رہے اور لوگوں کو موقع ہو کہ وہ اپنی عقل کو صحیح رخ پر بھی استعمال کرسکیں اور غلط رخ پر بھی۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿٢١﴾

۲۰۔ اور وہ کہتے ہیں کہ نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، کہو کہ غیب کی خبر تو اللہ ہی کو ہے۔ تم لوگ انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ ۲۱۔ اور جب کوئی تکلیف پڑنے کے بعد ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ فوراً ہماری نشانیوں کے معاملہ میں حیلے بنانے لگتے ہیں۔ کہو کہ خدا اپنے حیلوں میں ان سے بھی زیادہ تیز ہے۔ یقیناً ہمارے فرشتے تمھاری حیلہ بازیوں کو لکھ رہے ہیں۔

مکہ کے لوگ جب مسلسل انکار کی روش پر قائم رہے تو خدا نے ان پر قحط بھیجا جو سات سال مسلسل رہا اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے بعد ختم ہوا۔ یہ ایک نشانی تھی جس سے انھیں یہ سبق لینا چاہیے تھا کہ رسول کا انکار کرنے کے بعد وہ خدائی پکڑ کی زد میں آجائیں گے۔ مگر ان کا حال یہ ہوا کہ جب تک قحط رہا الحاح وزاری کرتے رہے اور جب قحط رخصت ہوا تو کہنے لگے کہ یہ تو زمانہ کی گردشیں ہیں جو ہر ایک کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ اس کا رسول کو ماننے یا نہ ماننے سے کوئی تعلق نہیں۔

پیغمبر سے لوگ نشانی مانگتے ہیں۔ مگر اصل سوال نشانی کے ظہور کا نہیں بلکہ اس سے سبق لینے کا ہے۔ کیوں کہ نشانی صرف دیکھنے کے لیے ہوتی ہے وہ مجبور کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ نشانی ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ آدمی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس کو مانے یا کوئی جھوٹی توجیہ نکال کر اسے رد کردے۔

تاہم جب خدا کی آخری نشانی ظاہر ہوتی ہے تو اس کے مقابلہ میں انسان کو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ آخری نشانی اتمام حجت کے بعد خدا کی عدالت بن کر آتی ہے اور وہ مختلف پیغمبروں کے لیے مختلف صورتوں میں آتی ہے۔ پیغمبر آخر الزماں کے لیے مختلف مصلحتوں کی بنا پر یہ نشانی اس صورت میں ظاہر ہوئی کہ منکرین کو مغلوب

کر کے مومنین کو ان کے اوپر غالب کر دیا گیا۔ شاہ عبد القادر صاحب اس سلسلہ میں موضح القرآن میں لکھتے ہیں: ''یعنی اگر کہیں کہ ہم کیسے جانیں کہ تمھاری بات سچ ہے۔ فرمایا کہ آگے حق تعالی اس دین کو روشن کرے گا اور مخالف ذلیل اور برباد ہو جائیں گے۔ سو ویسا ہی ہوا۔ سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے۔ اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے۔ حالاں کہ فیصلہ کا دن دنیا میں نہیں''۔

آدمی جب سرکشی کرتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا کچھ بگڑتا ہوا نظر نہیں آتا تو وہ اور بھی زیادہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کی پکڑ سے باہر ہے۔ حالانکہ یہ عین خدا کی تدبیر ہوتی ہے۔ خدا سرکش آدمی کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ بےفکر ہو کر خوب سرکشی کرے۔ اور اس سرکشی کے دوران خدا کے کارندے پردہ میں رہ کر خاموشی کے ساتھ اس کے تمام اقوال وافعال کو لکھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو اچانک موت کا فرشتہ ظاہر ہو کر اس کو پکڑ لیتا ہے تاکہ اس کو اس کے اعمال کا حساب دینے کے لیے خدا کے سامنے حاضر کر دے۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؗ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

۲۲۔ وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں لوگوں کو لے کر موافق ہوا سے چل رہی ہوتی ہیں اور لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ یکایک تند ہوا آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہم گھر گئے۔ اس وقت وہ اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو یقیناً ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ ۲۳۔ پھر جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین میں ناحق کی سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو، تمھاری سرکشی تمھارے اپنے ہی خلاف ہے، دنیا کی زندگی کا نفع اٹھالو، پھر تم کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر ہم بتادیں گے جو کچھ تم کر رہے تھے۔

انسان ایک بے حد حساس وجود ہے۔ وہ تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان پر جب تکلیف کا کوئی لمحہ آتا ہے تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے

ہیں۔ فکر کے لمحات میں آدمی اس حقیقت کا اعتراف کر لیتا ہے جس کا اعتراف کرنے کے لیے وہ بے فکری کے لمحات میں تیار نہ ہوتا تھا۔

اس کی ایک مثال سمندر کا سفر ہے۔ سمندر میں سکون ہو اور کشتی منزل کی طرف رواں ہو تو اس کے مسافروں کے لیے یہ بڑا خوش گوار لمحہ ہوتا ہے۔ اس وقت ان کے اندر ایک جھوٹا اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا معاملہ درست ہے، اب اس کو کوئی بگاڑنے والا نہیں۔

اس کے بعد سمندری ہوائیں اٹھتی ہیں۔ پہاڑ جیسی موجیں مسافروں کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ ان کے درمیان بڑے سے بڑا جہاز بھی معمولی تنکے کی طرح ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہلاکت کے سوا دوسرا کوئی انجام نہیں۔ اس وقت خدا کے منکر خدا کا اقرار کر لیتے ہیں۔ دیوتاؤں کو پوجنے والے خدائے واحد کو پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی قوت اور اپنی تدبیر پر بھروسہ کرنے والے ہر دوسری چیز کو چھوڑ کر صرف خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک تجرباتی ثبوت ہے کہ توحید ایک فطری عقیدہ ہے۔ توحید کے سوا دوسرے تمام عقیدے بالکل بے بنیاد ہیں۔

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ خدا کو نہ ماننے کے لیے آدمی خواہ کتنا ہی فلسفہ پیش کرے، حقیقۃً اس قسم کی تمام باتیں بے فکری کی نظریہ سازی ہیں۔ انسان اگر جانے کہ دنیا کے مواقع محض وقتی طور پر اس کو امتحان کے لیے دیے گئے ہیں تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جائے۔ اس کے ذہن سے تمام مصنوعی دیواریں گر جائیں اور ایک خدا کو ماننے کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہ رہے۔

وہ وقت آنے والا ہے جب انسان خدا کے جلال کو دیکھ کر کانپ اٹھے اور تمام خدائی باتوں کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے۔ مگر عقل مند وہ ہے جو موجودہ زندگی کے تجربات میں آنے والی زندگی کی حقیقتوں کو دیکھ لے اور آج ہی اس بات کو مان لے جس کو وہ کل ماننے پر مجبور ہوگا۔ مگر کل کا ماننا اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا یَاۡكُلُ النَّاسُ وَالۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَازَّیَّنَتۡ وَظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَیۡهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمۡرُنَا لَیۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِیۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے پانی، ہم نے اس کو آسمان سے برسایا تو زمین کا سبزہ خوب نکلا جس کو آدمی کھاتے ہیں اور جس کو جانور کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین پوری رونق پر آگئی اور سنور اٹھی اور زمین والوں نے گمان کر لیا کہ اب یہ ہمارے قابو میں ہے تو اچانک اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو آ گیا، پھر ہم نے اس کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا گویا کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

دنیا کی زندگی امتحان کے لیے ہے۔ اس لیے انسان کو یہاں مکمل آزادی اور ہر قسم کے کھلے مواقع دیے گئے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جس قسم کا مستقبل چاہے اپنے لیے بنائے۔ مگر انھیں حالات کے درمیان ایسے واقعات بھی رکھ دیے گئے ہیں جو سوچنے والوں کے لیے نصیحت کا کام کرتے ہیں، جو اس حقیقت کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ محض وقتی ہے اور بہت جلد اس سے چھن جانے والا ہے۔

انھیں میں سے ایک زمین کی سرسبزی کا واقعہ ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو زمین ہر قسم کی نباتات سے لہلہا اٹھتی ہے۔ آدمی ان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ معاملہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے اور بہت جلد وہ تیار فصل کا مالک بننے والا ہے۔ عین اس وقت اچانک کوئی آفت آجاتی ہے۔ مثلاً بگولا آگیا، اولے پڑ گئے، ٹڈی دل پہنچ گیا اور ایک لمحہ میں ساری فصل کا خاتمہ کر دیا۔

یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ آدمی ایک عمدہ جسم لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کے اسباب اس کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ اپنے لیے ایک کامیاب اور شاندار زندگی بنالیتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا معاملہ اس کے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے بعد کسی دن یا کسی رات میں اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ اپنے آپ کو بااختیار سمجھنے والا یکایک اپنے کو اس حال میں پاتا ہے کہ مجبوری اور بے اختیاری کے سوا اس کے پاس اور کوئی سرمایا نہیں — آدمی اگر اس حقیقت کو سامنے رکھے تو وہ دنیا میں کبھی سرکش نہ بنے، وہ کبھی کسی کے ساتھ ظلم اور بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝٢٥ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرۡهَقُ وُجُوۡهَهُمۡ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝٢٦ وَالَّذِيۡنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ ۭ بِمِثۡلِهَا ۙ وَتَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغۡشِيَتۡ وُجُوۡهُهُمۡ قِطَعًا مِّنَ الَّيۡلِ مُظۡلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝٢٧

۲۵۔ اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ ۲۶۔ جن لوگوں نے بھلائی کی، ان کے لیے بھلائی ہے اور اس پر مزید بھی۔ اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت۔ یہی جنت والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۷۔ اور جنھوں نے برائیاں کمائیں تو برائی کا بدلہ اس کے برابر ہے۔ اور ان پر رسوائی چھائی ہوئی ہوگی۔ کوئی ان کو اللہ سے بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا کہ ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دئے گئے ہیں۔ یہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

دنیا کے ظاہری حالات سے آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔ وہ وقتی چیز کو مستقل چیز سمجھ لیتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہوجاتا ہے کہ خوشیوں اور راحتوں کی زندگی جو وہ چاہتا ہے وہ اس کو اسی موجودہ دنیا میں حاصل ہوسکتی ہے۔ مگر انسانی آرزوؤں کی دنیا دراصل آخرت میں بننے والی ہے اور اس کو وہی شخص پائے گا جو خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

دنیا میں آدمی بالفرض سب کچھ حاصل کرلے تب بھی وہ اس پر قادر نہیں کہ اپنی زندگی کو دکھ اور غم سے پاک کرسکے۔ یہاں ہر خوشی کے ساتھ کوئی اندیشہ لگا ہوا ہے۔ یہاں کی ہر کامیابی بہت جلد کسی دکھ کی نذر ہوجاتی ہے۔ دکھ اور رنج سے خالی زندگی ایک ایسی انوکھی زندگی ہے جو صرف جنت کے ماحول میں آدمی کو حاصل ہوگی۔ جو لوگ اس راز کو پالیں وہی وہ لوگ ہیں جو جنت کا راستہ اختیار کریں گے اور بالآخر خدا کی ابدی جنتوں میں پہنچیں گے۔

راحت اور خوشی کی زندگی جو انسان کو بے حد مرغوب ہے وہ خدا کے وفادار بندوں کو کامل طور پر جنت میں ملے گی۔ مگر راحت اور خوشی کا ایک اور درجہ ہے جو معروف راحتوں اور خوشیوں سے بہت بلند ہے۔ یہ مالک کائنات کا دیدار ہے جو اہلِ جنت کو خصوصی طور پر حاصل ہوگا۔ جو خدا راحتوں اور لذتوں کا خالق ہے وہ یقینی طور پر تمام راحتوں اور لذتوں کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہوچکے ہوں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا۔ اے جنت والو، تمھارے لیے خدا کا ایک وعدہ باقی ہے جس کو اب وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ جنت والے یہ سن کر کہیں گے کہ وہ کیا ہے۔ کیا ہمارے پلڑے بھاری نہیں کردیے گئے۔ کیا ہمارے چہروں کو روشن نہیں کردیا گیا۔ کیا خدا نے ہمیں جنت میں نہیں داخل کردیا اور ہم کو آگ سے نہیں بچالیا۔ اس کے بعد ان کے اوپر سے حجاب اٹھالیا جائے گا اور وہ اپنے رب کو دیکھنے لگیں گے۔ پس خدا کی قسم کوئی نعمت جو خدا نے انھیں دی ہے وہ ان کے لیے خدا کو دیکھنے سے زیادہ محبوب نہ ہوگی اور نہ اس سے زیادہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈی کرنے والی ہوگی (فَوَاللّٰهِ مَا أَعْطَاهُمْ شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَيْهِ، وَلَا أَقَرَّ لِأَعْيُنِهِمْ) مسند احمد، حدیث نمبر 18941

آدمی کے لیے اس سے زیادہ سخت حالت اور کوئی نہیں کہ وہ ایک ایسی بے بسی سے دوچار ہو جو ابدی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی ناکامی میں پڑا ہوا پائے جو دوبارہ کامیابی میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ جو لوگ آخرت میں جہنم کے باشندے قرار دیے جائیں گے وہ اسی حالت سے دوچار ہوں گے۔ ان کے چہرے شدید مایوسی کی وجہ سے ایسے کالے ہوجائیں گے گویا کہ وہ تہ بتہ اندھیروں میں ڈوب گئے ہیں۔ آدمی کو اگرچہ اس کی برائی کا بدلہ اتنا ہی دیا جائے گا جتنا اس نے برائی کی ہے۔ مگر ابدی محرومی کا احساس اس کے لیے اتنا سخت ہوگا کہ اس کا چہرہ تک اس کی وجہ سے سیاہ پڑ جائے گا۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا

۲۸۔ اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم شرک کرنے والوں سے کہیں گے کہ ٹھہرو تم بھی اور تمھارے بنائے ہوئے شریک بھی۔ پھر ہم ان

بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع النصف ۳ ۱۰ ۸

کے درمیان تفریق کردیں گے اوران کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ۲۹۔ اللہ ہمارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ ہم تمھاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔ ۳۰۔ اس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دو چار ہوگا جو اس نے کیا تھا اور لوگ اللہ اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو جھوٹ انھوں نے گھڑے تھے وہ سب ان سے جاتے رہیں گے۔

شرک کا پورا کاروبار جھوٹی امیدوں پر قائم ہوتا ہے، وہ واقعات جو خدا کے کیے سے ہورہے ہیں ان کو آدمی جھوٹے معبودوں کی طرف منسوب کردیتا ہے اور اس طرح خودساختہ تصور کے تحت ان کو اپنی عقیدت و پرستش کا مرکز بنالیتا ہے۔ اپنے ان معبودوں پر اس کا اعتماد اتنا بڑھتا ہے کہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ آخرت میں بھی وہ ضرور خدا کے مقابلہ میں اس کے مددگار بن جائیں گے، اور اس کو خدا کی پکڑ سے بچالیں گے۔

یہ سراسر جھوٹی امیدیں ہیں۔ مگر دنیا کی زندگی میں ان کا جھوٹ ہونا ظاہر نہیں ہوتا کیوں کہ یہاں امتحان کی وجہ سے ہر چیز پر غیب کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہاں آدمی کو موقع ہے کہ وہ واقعات کو اپنے فرضی معبودوں کی طرف منسوب کرے اور اس طرح ان کی معبودیت پر مطمئن ہوجائے۔ مگر آخرت میں ساری حقیقتیں کھل جائیں گی۔ وہاں معلوم ہوگا کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کسی کو کوئی زور حاصل نہ تھا۔

موجودہ دنیا میں آدمی اس خوش فہمی میں جی رہا ہے کہ وہ اپنے بڑوں یا اپنے معبودوں کی مدد سے آخرت کے مرحلے میں کامیاب ہوجائے گا۔ مگر آخرت میں اچانک اس پر کھلے گا کہ اس کا اعتماد سراسر جھوٹا تھا۔ یہاں کسی کو صرف وہی ملے گا جو اس نے خود کیا تھا۔ فرضی سہارے وہاں اس طرح غائب ہوجائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا

۳۱۔ کہو کہ کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے، یا کون ہے جو کان پر اور آنکھوں پر اختیار رکھتا ہے۔ اور کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور کون معاملات کا انتظام کررہا ہے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ۔ کہو کہ پھر کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۳۲۔ پس وہی اللہ

بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

تمھارا پروردگارِ حقیقی ہے۔ سچائی کے بعد بھٹکنے کے سوا اور کیا ہے، تم کدھر پھرے جاتے ہو۔ ۳۳۔ اسی طرح تیرے رب کی بات سرکشی کرنے والوں کے حق میں پوری ہوچکی ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔

انسان کو رزق کی ضرورت ہے۔ یہ رزق انسان کو کیسے ملتا ہے۔ کائنات کے مجموعی عمل سے۔ ساری کائنات حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ ایک خاص رخ پر عمل کرتی ہے۔ تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسان کے لیے وہ رزق فراہم ہو جس کے بغیر اس کا وجود اس سرزمین پر ممکن نہیں۔ خدائی کے مفروضہ شرکاء یا دیوی دیوتا خود مشرکین کے عقیدہ کے مطابق، انسان کے لیے رزق فراہم نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ ہر مفروضہ شریک کسی جزء کا معبود ہے، اور جزء کا معبود کبھی ایسے واقعہ کو ظہور میں نہیں لاسکتا جو کل اجزا کی موافقت سے ظہور میں آتا ہو۔

اسی طرح مثلاً انسان کے اندر کان اور آنکھ جیسی حیرت انگیز صلاحیتیں ہیں۔ وہ بھی کسی دیوتا کی دی ہوئی نہیں ہوسکتی۔ دیوی دیوتا یا تو خود ان صلاحیتوں سے محروم ہیں یا اگر کسی مفروضہ معبود کے اندر یہ صلاحیتیں ہوں تو وہ ان کا خالق نہیں۔ حتی کہ خود اس سے یہ صلاحیتیں ویسے ہی چھن جاتی ہیں جیسے عام انسانوں سے چھن جاتی ہیں۔ اسی طرح بے جان چیزوں میں جان ڈالنا اور جان دار کو بے جان کردینا بھی مفروضہ معبودوں کے لیے ممکن نہیں۔ نہ اس کا کوئی ثبوت ہے اور نہ کوئی پوجنے والا ان کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ یہ چیزیں ان معبودوں سے انسان کو ملیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ انسان ایک بڑے خدا کو مانتا ہے۔ اس کے باوجود وہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتا ہے جو اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی کردیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خدا کا ڈر نہیں۔ جھوٹے خیالات کے ذریعہ اس نے اپنے آپ کو یہ تسلی دے لی ہے کہ خدا اس سے باز پرس کرنے والا نہیں۔ اور اگر باز پرس کی نوبت آئی تو اس کی مدد پر ایسی ہستیاں ہیں جو خدا کے یہاں سفارش کرکے اس کو بچالیں — ڈر آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ جب کسی کے دل سے ڈر نکل جائے تو اس کو غیر منصفانہ رویہ اختیار کرنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ ایسا آدمی سرکش ہوجاتا ہے، اور سرکش آدمی کبھی سچائی کا اعتراف نہیں کرتا۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ

۳۴۔ کہو، کیا تمھارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہو، پھر وہ دوبارہ بھی پیدا کرے۔ کہو، اللہ ہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا۔ پھر تم کہاں بھٹکے جاتے ہو۔ ۳۵۔ کہو، کیا تمھارے شرکاء میں کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دو کہ

يَهْدِىْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِىْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّىْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۚ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ پیروی کیے جانے کا مستحق ہے یا وہ جس کو خود ہی راستہ نہ ملتا ہو بلکہ اسے راستہ بتایا جائے۔ تم کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔ ۳۶۔ ان میں سے اکثر صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور گمان حق بات میں کچھ بھی کام نہیں دیتا۔ اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

اللہ کے سوا جن کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، خواہ وہ انسان ہوں یا غیر انسان، کوئی بھی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ کسی غیر موجود کو موجود کر دے۔ یہ صرف اللہ ہے جس کے لیے تخلیق کا عمل ثابت ہے۔ اور جب تخلیق کا عمل ایک بار اللہ کے لیے ثابت ہے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا اعادہ کر سکتا ہے اور کرے گا۔ پھر جب وجود اول اور وجود ثانی دونوں کا اختیار صرف ایک اللہ کو ہے تو دوسرے شریکوں کی طرف توجہ لگانا بالکل عبث ہے۔ ان سے آدمی نہ اپنی پہلی زندگی میں کچھ پانے والا ہے اور نہ دوسری زندگی میں۔

یہی معاملہ رہنمائی کا ہے۔ ''اللہ رہنمائی کرتا ہے'' یہ چیز پیغمبروں کی ہدایت سے ثابت ہے۔ پیغمبروں نے جس ہدایت کو خدائی ہدایت کہہ کر انسان کے سامنے پیش کیا وہ مسلّم طور پر ایک ہدایت ہے۔ اس کے برعکس، شریکوں کا حال یہ ہے کہ وہ یا تو سرے سے اس قابل نہیں کہ وہ انسان کو حق اور ناحق کے بارے میں کوئی علم عطا کریں (مثلاً بت) یا وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی وجہ سے خود رہنمائی کے محتاج ہیں، کجا کہ وہ دوسروں کو کوئی واقعی رہنمائی فراہم کریں (مثلاً انسانی معبود)، جب صورت حال یہ ہے تو انسان کو صرف ایک خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے، نہ کہ فرضی شریکوں کی طرف۔

شرک کا کاروبار کسی واقعی علم پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ مفروضات اور قیاسات پر قائم ہے۔ کچھ ہستیوں کے بارے میں بے بنیاد طور پر یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ وہ خدائی صفات کے حامل ہیں۔ حالاں کہ اتنی بڑی رائے کسی حقیقی علم کی بنیاد پر قائم کی جا سکتی ہے، نہ کہ محض اٹکل اور قیاس کی بنیاد پر۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ

۳۷۔ اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اس کو بنا لے۔ بلکہ یہ تصدیق ہے ان پیشین گوئیوں کی جو اس کے پہلے سے موجود ہیں۔ اور کتاب کی تفصیل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خداوند عالم کی طرف سے ہے۔ ۳۸۔ کیا لوگ کہتے ہیں

فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

کہ اس شخص نے اس کو گڑھ لیا ہے۔ کہو کہ تم اس کی مانند کوئی سورہ لے آؤ۔ اور اللہ کے سوا تم جن کو بلاسکو بلالو، اگر تم سچے ہو۔ ۳۹۔ بلکہ یہ لوگ اس چیز کو جھٹلا رہے ہیں جو ان کے علم کے احاطے میں نہیں آئی۔ اور جس کی حقیقت ابھی ان پر نہیں کھلی۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، پس دیکھو کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

قرآن اپنی دلیل آپ ہے، قرآن کا مافوق انداز کلام انتہائی طور پر ناقابل تقلید ہے، اور یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن ایک غیر انسانی کلام ہے۔ اگر وہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو یقیناً دوسرے انسانوں کے لیے بھی یہ ممکن ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ویسا ہی ایک کلام بنالیں۔

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ ان پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے جو اس کے بارے میں پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہیں۔ آسمانی تعلیمات کی حامل قومیں پہلے سے ایک آخری ہدایت نامہ کی منتظر تھیں۔ قرآن اسی انتظار کا جواب بن کر آیا ہے، پھر اس میں شک کرنے کی کیا ضرورت۔ مزید یہ کہ وہ ''کتاب'' کی تفصیل ہے۔ یعنی وہ الٰہی تعلیمات جو تمام آسمانی کتابوں کا خلاصہ ہیں انھیں کو وہ صحیح اور بے آمیز روپ میں پیش کرتا ہے۔ یہ ایک واضح قرینہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اسی خدا کی طرف سے آیا ہے جس کی طرف سے پچھلی آسمانی کتابیں آئی تھیں۔

جب کوئی شخص کہتا ہے کہ قرآن ایک انسانی تصنیف ہے تو وہ اپنی دعوے کو ایک ایسے میدان میں لاتا ہے جہاں اس کو جانچنا آسان ہو۔ کیوں کہ وہ اپنی یا دوسروں کی انسانی صلاحیتوں کو کام میں لا کر قرآن جیسی ایک کتاب یا اس کے جیسی ایک سورہ تیار کرسکتا ہے۔ اور اس طرح عملی طور پر اس دعوے کو رد کرسکتا ہے کہ قرآن خدائی ذہن سے نکلی ہوئی کتاب ہے۔ مگر قرآنی چیلنج کے باوجود کسی کا ایسا نہ کرسکنا آخری طور پر ثابت کر رہا ہے کہ قرآن کو انسانی کتاب کہنے والوں کا دعویٰ درست نہیں۔ قرآن کی صداقت کے یہ دلائل ایسے نہیں ہیں کہ آدمی ان کو سمجھ نہ سکے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کو جھٹلانے کے نتائج سے وہ بے خوف ہیں۔ ان کو یہ ڈر نہیں کہ قرآن کا انکار کر کے وہ کسی عذاب کی پکڑ میں آجائیں گے ان کی مخالفانہ روش کی وجہ وہ غیر سنجیدگی ہے جو ان کی بے خوفی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، نہ کہ کسی قسم کا عقلی اور استدلالی اطمینان۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ ع وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ

۴۰۔ اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو قرآن پر ایمان لے آئیں گے اور وہ بھی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور تیرا رب مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ ۴۱۔ اور اگر وہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ

اَنۡتُمۡ بَرِیۡٓـــُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ ؕ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ وَ لَوۡ کَانُوۡا لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّنۡظُرُ اِلَیۡکَ ؕ اَفَاَنۡتَ تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَ لَوۡ کَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡـًٔا وَّ لٰکِنَّ النَّاسَ اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾

میرا عمل میرے لیے ہے اور تمھارا عمل تمھارے لیے۔ تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو۔ ۴۲۔ اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو تمھاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے جب کہ وہ سمجھ سے کام نہ لے رہے ہوں۔ ۴۳۔ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمھاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے اگرچہ وہ دیکھ نہ رہے ہوں۔ ۴۴۔ اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا، مگر لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

ایمان نہ لانے والے خدا کی نظر میں مفسد ہیں۔ کیوں کہ اپنی فطرت کو بگاڑ کر ہی کسی کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے سے باز رہے۔ ایسا آدمی اپنے ضمیر کی آواز کو دباتا ہے، وہ اپنے سوچنے کی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا، وہ کھلے کھلے دلائل کو جھوٹے الفاظ بول کر نظر انداز کر دیتا ہے، وہ سن کر نہیں سنتا اور سمجھنے کے باوجود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ حق کے مقابلے میں اپنے تعصّبات اور اپنے مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔

بحث و مناظرہ کرنے والے لوگ آخر وقت تک اپنی بحث جاری رکھتے ہیں۔ ''میرا معاملہ میرے ساتھ ہے اور تمھارا معاملہ تمھارے ساتھ''۔ اس قسم کا جملہ کہنا ان کو اپنی شکست نظر آتا ہے، مگر داعی فتح و شکست کی نفسیات سے بلند ہو کر کام کرتا ہے۔ اس لیے جب وہ دیکھتا ہے کہ مخاطب ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے اور مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ اصل فیصلہ اللہ کے یہاں ہونا ہے۔ خدا کی میزان میں جو شخص جیسا نکلے گا ویسا ہی اس کا انجام ہوگا۔

حق کو نہ ماننے والوں میں ایک طبقہ وہ ہے جو شروع سے اپنا منکر ہونا ظاہر کر دیتا ہے۔ مگر زیادہ ہوشیار قسم کے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بظاہر وہ باتوں کو اس طرح سنتے ہیں گویا کہ وہ سچ مچ سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ اس کو سمجھنا نہیں ہے۔ وہ داعی کی صداقت کی نشانیوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ کھلے دل سے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا ذہن پہلے سے یہ طے کیے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنا اور ماننا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی ظاہری سادگی سے داعی اس خوش گمانی میں پڑ جاتا ہے کہ وہ قبولیت حق کے قریب ہیں۔ مگر خدا کی نظر میں وہ ایسے لوگ ہیں جو کان رکھتے ہوئے بہرے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بن جائیں۔ ایسے لوگوں کو کبھی خدا کی طرف سے قبول حق کی توفیق نہیں ملتی۔

خدا نے انسان کو بہترین صلاحیتیں دی ہیں۔ اگر وہ ان صلاحیتوں کو استعمال کرے تو وہ کبھی گمراہ نہ ہو۔ مگر

انسان اپنے کو آزاد پا کر غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ بے جا سرکشی کرنے لگتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس نے خدا کی اسکیم کو نہیں سمجھا، جو چیز اس کو آزمائش کے طور پر دی گئی تھی اس کو اس نے اپنا حق سمجھ لیا۔

وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۴۵﴾ وَ اِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا یَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

۴۵۔ اور جس دن اللہ ان کو جمع کرے گا، گویا کہ وہ بس دن کی ایک گھڑی دنیا میں تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ بے شک سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے ملنے کو جھٹلایا اور وہ راہِ راست پر نہ آئے۔ ۴۶۔ ہم تم کو اس کا کوئی حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا تمھیں وفات دے دیں، بہرحال ان کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ گواہ ہے اس پر جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ ۴۷۔ اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔

آج آخرت انسان کے سامنے نہیں ہے۔ آج ایک دیکھنے والے کو اسے تصور کی نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے جو شخص آخرت کے معاملے میں سنجیدہ نہ ہو اس کو آخرت بہت دور کی چیز معلوم ہوگی۔ مگر جب آخرت سب سے بڑی حقیقت کی حیثیت سے انسان کے اوپر ٹوٹ پڑے گی اور وہ اس کو اس کی تمام سنگینیوں کے ساتھ اپنی آنکھ سے دیکھنے لگے گا، اس وقت وہ اپنی موجودہ سرکشی کو بھول جائے گا، اس وقت اس کو دنیا کے وہ لمحات بہت حقیر معلوم ہوں گے جن کی وجہ سے وہ غفلت میں پڑ گیا تھا اور آخرت کے بارے میں سوچنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔

آخرت کسی اجنبی دنیا میں واقع نہیں ہوگی بلکہ ہماری جانی پہچانی دنیا میں واقع ہوگی۔ وہاں آدمی اپنے آپ کو اسی ماحول میں پائے گا جس ماحول میں اس نے اس سے پہلے حق کا انکار کیا تھا، وہ اپنے آپ کو انھیں لوگوں کے درمیان دیکھے گا جن کے بل پر وہ سرکشی کرتا تھا مگر اس دن وہ لوگ اس کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اس وقت ہر بات اس کے ذہن میں اس طرح تازہ ہوگی گویا اس پر کوئی مدت گزری ہی نہیں۔

داعی اور مدعو کا معاملہ آسمان کے نیچے پیش آنے والے تمام معاملات میں سب سے زیادہ نازک معاملہ ہے۔ داعی اگر فی الواقع حق کو لے کر اٹھا ہے تو وہ اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہے۔ اس کا اقرار خدا کا اقرار ہے اور اس کا انکار خدا کا انکار۔ ایسا ایک واقعہ انجام سے خالی نہیں ہوسکتا۔ داعیٔ حق کے ظہور کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ

اس کی زبان سے جاری ہونے والے ربانی کلام کے سامنے تمام لوگ بے دلیل ہوکر رہ جاتے ہیں۔ یہ باطل کے اوپر حق کی پہلی فتح ہے۔ دوسری فتح آخرت میں ہوگی جب کہ اس کے مخالفین خدا کے اذن سے اس کے مقابلہ میں بے زور ہوکر رہ جائیں گے۔ پہلا واقعہ لازمی طور پر اسی دنیا میں پیش آتا ہے اور دوسرا واقعہ بھی جزئی طور پر موجودہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اگر خدا اس کو موجودہ دنیا میں ظاہر کرنا چاہے۔

یہ معاملہ ہر گروہ کے ساتھ پیش آنا لازمی ہے جب کہ وہ براہِ راست خدا کے سامنے کھڑا ہونے سے پہلے موجودہ دنیا میں بالواسطہ طور پر نمائندۂ خدا کے سامنے کھڑا کیا جائے۔ اس طرح خدا دیکھتا ہے کہ کون ہے جو اس وقت اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب میں ہے اور کون ہے جو ایسا نہیں کرتا۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے جنت ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لیے دوزخ۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴۸ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝۴۹ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۵۰ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۵۱ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۵۲

۴۸۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۴۹۔ کہو میں اپنے واسطے بھی برے اور بھلے کا مالک نہیں، مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لیے ایک وقت ہے۔ جب ان کا وقت آجاتا ہے تو پھر نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے اور نہ آگے۔ ۵۰۔ کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ کا عذاب تم پر رات کو آپڑے یا دن کو آجائے تو مجرم لوگ اس سے پہلے کیا کرلیں گے۔ ۵۱۔ پھر کیا جب عذاب واقع ہوچکے گا تب اس پر یقین کروگے۔ اب قائل ہوئے اور تم اسی کا تقاضا کرتے تھے۔ ۵۲۔ پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کا عذاب چکھو۔ یہ اسی کا بدلہ مل رہا ہے جو کچھ تم کماتے تھے۔

انسان موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد پاتا ہے۔ وہ بظاہر دیکھتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، کوئی اس کو پکڑنے والا نہیں، کوئی اس کو سزا دینے والا نہیں۔ یہ صورت حال اس کو بھلاوے میں ڈال دیتی ہے۔ حتی کہ خدا کا داعی جب اس کو اس کے عمل کے انجام سے ڈراتا ہے تو وہ خدا کے داعی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے — ہماری سرکشی پر تم جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ کب پوری ہوگی۔

اس قسم کی باتوں کا سبب نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیوں کہ یہ پکڑ خود داعیٔ حق کی طرف سے نہیں آنے والی ہے بلکہ خدا کی طرف سے آنے والی ہے۔ اور خدا ہر آن اپنی دنیا میں بتا رہا ہے کہ اس کا طریقہ جلدی کا طریقہ نہیں۔ کشتی میں سوراخ ہو اور کوئی ملاح اس کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی کشتی کو دریا میں ڈال دے تو خدا کا لازمی

قانون ہے کہ ایسی کشتی پانی میں ڈوب جائے۔ مگر ایسی کشتی فوراً پانی میں نہیں ڈوبتی بلکہ خدا کی سنت کے مطابق اپنے مقرر وقت پر ڈوبتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں جو انسان کو خدائی سنت کا تعارف کرا رہی ہیں مگر ان کو دیکھنے کے باوجود وہ کہتا ہے کہ اگر ان اعمال پر خدا کا عذاب ہے تو وہ عذاب جلد کیوں نہیں آجاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان خدا کی پکڑ کے بارے میں سنجیدہ نہیں۔

زلزلہ اور طوفان خدائی واقعات ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ جب معاملہ خدا اور انسان کے درمیان ہو تو فیصلہ کا اختیار تمام تر صرف فریقِ اول کو ہوتا ہے۔ مگر انسان اس پہلو پر غور نہیں کرتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ خدا کا قانون فوراً حرکت میں نہیں آرہا ہے اور چونکہ وہ فوراً حرکت میں نہیں آتا اس لیے وہ غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ مگر جب خدا کا فیصلہ آئے گا تو اس وقت انسان اپنے کو بے بس پاکر سب کچھ مان لے گا۔ حالاں کہ اس وقت کا ماننا کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ عمل کا انجام پانے کا وقت ہوگا، نہ کہ عمل کرنے کا۔

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ
لَحَقٌّ ؔؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ ع ۱۰
نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَ
اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ
بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ
لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ
اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ
يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

۵۳۔ اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے۔ کہو کہ ہاں میرے رب کی قسم، یہ سچ ہے اور تم اس کو تھکا نہ سکو گے۔ ۵۴۔ اور اگر ہر ظالم کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اس کو فدیہ میں دے دینا چاہے گا۔ اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو اپنے دل میں پچھتائیں گے۔ اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ ۵۵۔ یاد رکھو، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے، یاد رکھو، اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۵۶۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

عرب کے لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اگر تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو تم کو آخرت کا عذاب پکڑ لے گا۔ اس کے جواب میں وہ آپ کی بات کا مذاق اڑانے لگے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ آخرت کے منکر تھے۔ وہ دراصل پیغمبر اسلام کی تنبیہ کو بے وزن سمجھ رہے تھے، نہ کہ نفس آخرت کو۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اس وقت تک مسلّم نہ ہوئی تھی۔ اس وقت آپ کے مخاطبین آپ کو ایک معمولی انسان کے روپ میں دیکھتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسے معمولی انسان کی بات نہ ماننے سے ان کے اوپر خدا کا عذاب کیسے آجائے گا۔ انھیں آپ کے نمائندۂ خدا ہونے پر شک تھا، نہ کہ خود خدا اور آخرت پر۔

یہ تقابل حقیقتاً اقرار آخرت اور انکار آخرت کے درمیان نہ تھا۔ بلکہ بڑی شخصیت کے دین اور چھوٹی

شخصیت کے دین کے درمیان تھا۔ وہ ماضی کے مشہور بزرگوں کے ساتھ اپنے کو منسوب کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو مسلّمہ شخصیتوں کے دین پر سمجھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں جب وہ سامنے کے پیغمبر کو دیکھتے تو وہ ان کو ایک معمولی انسان کے روپ میں نظر آتا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تاریخ کی جن بڑی بڑی شخصیتوں کے ساتھ وہ اپنے کو وابستہ کیے ہوئے ہیں، ان سے وابستگی ان کے لیے باعث نجات نہ ہو۔ بلکہ نجات کے لیے یہ ضروری ہو کہ وہ اپنے آپ کو اس شخص کے ساتھ وابستہ کریں جس کو بظاہر کوئی تقدس اور عظمت حاصل نہیں۔ یہی وہ نفسیات تھی جس کی وجہ سے ان کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ آپ کا مذاق اڑائیں۔

آدمی ایک حساس مخلوق ہے۔ وہ تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا۔ دنیا میں جب تک اس کو عذاب کا سامنا نہیں ہے وہ حق کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ اس کو بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ مگر جب آخرت کا عذاب سامنے ہوگا تو اس پر اتنی گھبراہٹ طاری ہوگی کہ سب کچھ اس کو حقیر معلوم ہونے لگے گا۔ ساری دنیا کی دولت اور تمام دنیا کی نعمت بھی اگر اس کے پاس ہو تو عذاب کے مقابلہ میں وہ اتنی بے قیمت نظر آئے گی کہ وہ چاہے گا کہ سب کچھ دے کر صرف اتنا ہو جائے کہ وہ اس تکلیف سے نجات پا جائے۔

مگر آخرت کا مسئلہ کوئی سودے بازی کا مسئلہ نہیں۔ وہ تو اپنے کیے کا انجام بھگتنے کا مسئلہ ہے۔ زندگی اور موت کے بارے میں خدا کا جو منصوبہ ہے اس کا یہ لازمی جزء ہے۔ خدائی انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ ہو۔ اور خدائی قدرت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ بہر حال ہو کر رہے گا۔

اس کے پیش آنے میں جو کچھ دیر ہے، وہ صرف اس مقررہ وقت کے آنے کی ہے جب کہ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہو اور سارے انسان خدا کے یہاں اپنے آخری انجام کا فیصلہ سننے کے لیے حاضر کر دیے جائیں۔

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَ هُدًى
وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ
بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا
يَجْمَعُوْنَ ﴿٥٨﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ
قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٩﴾
وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

۵۷۔ اے لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے نصیحت آ گئی اور اس کے لیے شفاء جو سینوں میں ہوتی ہے اور اہل ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت۔ ۵۸۔ کہو کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے۔ اب چاہیے کہ لوگ خوش ہوں، یہ اس سے بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔ ۵۹۔ کہو، یہ بتاؤ کہ اللہ نے تمھارے لیے جو رزق اتارا تھا، پھر تم نے اس میں سے کچھ کو حرام ٹھہرایا اور کچھ کو حلال۔ کہو، کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو۔ ۶۰۔ اور قیامت کے دن کے بارے میں ان لوگوں کا کیا

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى
النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ۧ60

خیال ہے جو اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں۔ بے شک اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

انسان ایک نفسیاتی مخلوق ہے۔ نفسیات کے بننے سے وہ بنتا ہے اور نفسیات کے بگڑنے سے وہ بگڑ جاتا ہے۔ خدا کی کتاب کی صورت میں جو ہدایت اتری ہے وہ انسان کے لیے سراسر رحمت ہے۔ اس میں انسان کے لیے بہترین نصیحت موجود ہے۔ مگر اس نصیحت کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی نے اپنی راست فکری نہ کھوئی ہو۔ جو شخص اپنی راست فکری کی صلاحیت کو بگاڑ لے، اس کے لیے خدا کا نصیحت نامہ بے اثر رہے گا۔

موجودہ دنیا کی چیزیں اور اس کی رونقیں آدمی کے سامنے ''نقد'' ہوتی ہیں۔ آدمی ہر آن ان کی لذت اور خوبی کا تجربہ کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتیں صرف ''وعدہ'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آدمی صرف ان کے بارے میں سنتا ہے، وہ ان کا تجربہ نہیں کرتا۔ اس بنا پر اکثر لوگ دنیا کی نقد چیزوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مگر جو شخص گہرائی کے ساتھ سوچے گا وہ اس بات پر خوش ہوگا کہ خدا نے اپنی ہدایت اتار کر اس کے لیے ابدی نعمتوں کے حصول کا دروازہ کھول دیا ہے۔

اللہ نے جو کچھ انسان کو دیا ہے، خواہ وہ زرعی پیداوار کی صورت میں ہو یا دوسری صورت میں، سب کا سب رزق ہے۔ آدمی اگر ان چیزوں کو خدا کا دیا ہوا سمجھے اور خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ان میں تصرف کرے تو اس کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھرے گا۔ مگر شیطان ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اس نسبت کو بدل دے، تاکہ اس ''رزق'' کے استعمال کے وقت آدمی کو خدائی یاد نہ آئے بلکہ دوسری چیزوں کی یاد آئے — قدیم زمانہ میں شیطان نے پیداوار میں مفروضہ دیوی دیوتاؤں کے مراسم مقرر کیے تاکہ آدمی ان کو لیتے ہوئے خدا کو یاد نہ کرے بلکہ دیوی دیوتاؤں کو یاد کرلے۔ موجودہ زمانہ میں یہی مقصد شیطان مادی توجیہات کے ذریعے حاصل کر رہا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ملنے والی چیز کو مادی عوامل کے تحت ملنے والی چیز بنا کر لوگوں کو دکھا رہا ہے تاکہ لوگ جب ان نعمتوں کو پائیں تو وہ اس کو خدا کا رزق نہ سمجھیں بلکہ صرف مادہ کا کرشمہ سمجھیں۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ
وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ
شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ
رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي
السَّمَاۗءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ

۶۱۔ اور تم جس حال میں بھی ہو اور قرآن میں سے جو حصہ بھی سنا رہے ہو اور تم لوگ جو کام بھی کرتے ہو، ہم تمھارے اوپر گواہ رہتے ہیں جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک

کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۶۱﴾ اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿ۚۖ۶۲﴾ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿ؕ۶۳﴾ لَہُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿ؕ۶۴﴾ وَ لَا یَحۡزُنۡکَ قَوۡلُہُمۡ ۘ اِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ؕ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶۵﴾

واضح کتاب میں ہے۔ ۶۲۔ سن لو، اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۶۳۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔ ۶۴۔ ان کے لیے خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۶۵۔ اور تم کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے۔ زور سب اللہ ہی کے لیے ہے، وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

دعوت اس دنیا کے تمام کاموں میں مشکل ترین کام ہے۔ داعی اپنے پورے وجود کو دعوتی عمل میں شامل کرتا ہے، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی پیغام کا داعی بن سکے۔ اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ وہ ہے جو مخاطبین کی طرف سے پیش آتا ہے۔

داعی جب خدا کے دین کو بے آمیز صورت میں پیش کرتا ہے اور اس کو کھلے دلائل کی زبان میں مبرہن کر دیتا ہے تو وہ تمام لوگ بپھر اٹھتے ہیں جو خود ساختہ دین کو خدا کا دین بتا کر دین دار بنے ہوئے ہوں یا دینی پیشوائی کا مقام حاصل کیے ہوئے ہوں۔ وہ داعی کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے بنیاد پروپیگنڈا، سازشیں، حتی کہ جارحانہ کارروائیاں، ہر چیز کو وہ اپنے لیے جائز کر لیتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں ملی ہوئی آزادی انھیں موقع دیتی ہے اور وہ داعی کے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال یہاں تک پہنچتی ہے کہ دلیل کی طاقت تمام تر ایک طرف ہو جاتی ہے اور مادیات کی طاقت تمام تر دوسری طرف۔

یہ صورت حال بلاشبہ بے حد سخت ہے۔ اس کے بعد ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ مخالفین حق کے حوصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے کو کامیاب سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف داعی پر بھی یہ خیال گزرتا ہے کہ کیا خدا اس معاملے میں غیر جانب دار ہے۔ کیا وہ مجھے حق و باطل کے اس معرکہ میں ڈال کر خود علیحدہ ہو گیا ہے۔

مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا حق کا ساتھ نہ دے۔ مخالفین کا بے دلیل ہو جانا اور دلیل کی قوت کا تمام تر داعی کی طرف ہونا یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا داعی کے ساتھ ہے نہ کہ دوسرے گروہ کے ساتھ۔ کیوں کہ دلیل موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے جس کے ساتھ دلیل ہے اس کے ساتھ گویا خدا ہے۔ مخالفین حق کو جارحیت کا موقع صرف اس آزادی کی وجہ سے مل رہا ہے جو امتحان کی خاطر انھیں دی گئی ہے۔ امتحانی دنیا کے ختم ہوتے ہی یہ صورت حال بدل جائے گی۔ اس وقت عزت و برتری اس کے لیے ہوگی جو دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوا

تھا۔ جو لوگ دلیل سے خالی تھے وہ وہاں کی دنیا میں رسوا اور ناکام ہو کر رہ جائیں گے۔ اللہ کے سچے داعیوں کا گروہ خدا کے دوستوں کا گروہ ہے۔ اللہ ان کو آخرت میں ایک ایسی اعلیٰ زندگی کی خوش خبری دیتا ہے جہاں نہ انھیں پچھلی زندگی کے لیے کوئی پچھتاوا ہوگا اور نہ اگلی زندگی کے لیے کوئی اندیشہ۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝٦٦ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝٦٧

٦٦۔ سنو، جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب اللہ ہی کے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں وہ کس چیز کی پیروی کر رہے ہیں، وہ صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ محض اٹکل دوڑا رہے ہیں۔ ٦٧۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی تاکہ تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن بنایا۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔

زمین و آسمان کے پیچھے کون ہے جو اس کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو چلا رہا ہے۔ یہ سوال ہر زمانہ میں انسان کی تلاش کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ مگر اس سوال کا صحیح جواب پانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی ماوراء طبیعیات دنیا تک دیکھ سکے اور ماوراء طبیعیات تک دیکھنے والی آنکھ کسی کو حاصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ جواب جو وہ بطور خود قائم کرتا ہے وہ محض قیاس و گمان کی بنیاد پر ہوتا ہے، نہ کہ حقیقی علم کی بنیاد پر۔

اس دنیا میں حقیقی علم کی بنیاد پر بولنے والے صرف وہ لوگ ہیں جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لوگ ہیں جن کا ربط عالم بالا سے براہِ راست قائم ہوتا ہے۔ خدا خود انھیں اپنی طرف سے حقیقت کی خبر دیتا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں پیغمبر کا علم ہی واحد علم ہے جس پر یقینی طور پر بھروسہ کیا جا سکے۔

پیغمبروں کے دعوے کی صداقت کو جانچنے کے لیے اگرچہ ہمارے پاس کوئی براہِ راست ذریعہ نہیں ہے۔ تاہم ایک بالواسطہ ذریعہ یقینی طور پر موجود ہے۔ اور وہ کائنات کی آیات (نشانیاں) ہیں۔ یہ نشانیاں پیغمبروں کے بیان کردہ معنوی حقائق کی عملی تصدیق کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زمین پر رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد رات آتی ہے۔ یہ گردش ایک انتہائی محکم نظام کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ جو ریاضیاتی صحت کی حد تک منظم ہے۔ مزید یہ کہ یہ گردش حیرت ناک حد تک ہماری زندگی کے موافق ہے۔ اس کے پیچھے واضح طور پر ایک بامقصد منصوبہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال یقینی طور پر ایک ایسے قادر مطلق اور رحمان و رحیم کے وجود کا ثبوت ہے جس کی خبر پیغمبر دیتے ہیں۔

جو لوگ اپنے خیال کے مطابق ''شریکوں'' کی پیروی کر رہے ہیں، وہ شرکاء خواہ قدیم الٰہیاتی شرکاء ہوں یا

جدید مادی شرکاء، وہ کسی واقعی حقیقت کی پیروی نہیں کررہے ہیں۔ بلکہ صرف اپنے قیاس وگمان کی پیروی کررہے ہیں۔ پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والی حقیقت کی تصدیق ساری کائنات کررہی ہے مگر ''مشرکین'' جس چیز کے مدعی ہیں اس کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ هُوَ الۡغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾ قُلۡ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ الۡكَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ﴿ؕ۶۹﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنۡیَا ثُمَّ اِلَیۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ نُذِیۡقُهُمُ الۡعَذَابَ الشَّدِیۡدَ بِمَا كَانُوۡا یَكۡفُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾ ع

۶۸۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ وہ پاک ہے، بے نیاز ہے۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ کیا تم اللہ پر ایسی بات گھڑتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ ۶۹۔ کہو، جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ ۷۰۔ ان کے لیے بس دنیا میں تھوڑا فائدہ اٹھالینا ہے۔ پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے۔ پھر ان کو ہم اس انکار کے بدلے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

خدا کے لیے بیٹے بیٹیاں ماننا خدا کو انسان کے اوپر قیاس کرنا ہے۔ انسان کمیوں اور محدودیتوں کا شکار ہے، اس لیے اس کو اولاد کی ضرورت ہے تاکہ ان کے ذریعے وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی تلافی کرے مگر خدا کے معاملہ میں یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے۔

مخلوقات کا نظام خود ہی اس قسم کے خالق کی تردید ہے۔ مخلوقات کا عالمی نظام جس خدا کی شہادت دے رہا ہے وہ یقینی طور پر ایک ایسا خدا ہے جو اپنی ذات میں آخری حد تک کامل ہے۔ وہ ہر قسم کے عیبوں اور کمیوں سے پاک ہے۔ خدا اگر اپنی ذات میں کامل نہ ہوتا، اگر وہ عیبوں اور کمیوں والا خدا ہوتا تو کبھی وہ موجودہ کائنات جیسی کائنات کو نہیں بنا سکتا تھا اور نہ اس کو اس طرح چلا سکتا تھا جس طرح وہ انتہائی معیاری صورت میں چل رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جس خدائے واحد کا تصور پیش کررہا ہے اس کا وجود تو زمین وآسمان کی تمام نشانیوں سے ثابت ہے۔ مگر مشرکین نے خدا کا جو تصور بنا رکھا ہے، اس کا کوئی ثبوت موجودہ کائنات میں موجود نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ بے ثبوت خدا کو ماننا خود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ کیوں کہ جو خدا سرے سے موجود نہ ہو وہ کیسے کسی کی مدد پر آئے گا اور کیسے کسی کو بامراد کرے گا۔ جو خدا حقیقی طور پر موجود ہے، مشرکین اس کو مانتے نہیں، اور جس خدا کو مانتے ہیں اس کا کہیں وجود نہیں۔ ایسی حالت میں مشرکین موجودہ کائنات میں کیوں کر کامیاب ہوسکتے ہیں۔ ان کے لیے جو واحد انجام مقدر ہے وہ صرف یہ کہ بالآخر وہ بے بس اور بے سہارا ہو کر رہ جائیں اور ہمیشہ کے لیے ذلت وناکامی میں پڑے رہیں۔

موجودہ دنیا میں انکار یا شرک کا رویہ اختیار کرنے سے کسی کا کچھ بگڑتا نہیں۔ اس سے آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ مگر یہ صورت حال صرف امتحان کی مہلت کی بنا پر ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان کی وجہ سے عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی موجودہ صورت حال بھی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے جس کا وہ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر سرکش بنا ہوا تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے عقل سے کہا: ''اے عقل، اس کائنات میں میں نے تجھ سے افضل، تجھ سے حسین اور تجھ سے بہتر مخلوق پیدا نہیں کی'' (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 1845)۔ انسان کو ایسی عظیم نعمت دینے کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی عظیم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک سچائی کا انکار سب سے بڑا جرم ہے۔ سچائی کو جب دلیل سے ثابت کر دیا جائے تو آدمی کے اوپر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو مانے۔ عقلی طور پر ثابت شدہ ہو جانے کے بعد اگر وہ سچائی کا انکار کرتا ہے تو وہ ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ خدا نے جب انسان کو ایسی عقل دی جس سے وہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا جان سکے تو اس کے بعد کیا چیز ہوگی جو خدا کے یہاں اس کے لیے عذر بن سکے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

۷۱۔ اور ان کو نوح کا حال سناؤ۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، اگر میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی آیتوں سے نصیحت کرنا تم پر گراں ہو گیا ہے تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ تم اپنا متفقہ فیصلہ کرلو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو، تم کو اپنے فیصلہ میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ پھر تم لوگ میرے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے ہو، وہ کر گزرو اور مجھ کو مہلت نہ دو۔ ۷۲۔ اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی ہے۔ میری مزدوری تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ ۷۳۔ پھر انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے نوح کو اور جو لوگ اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان کو جانشین بنایا۔ اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ دیکھو کہ کیا انجام ہوا ان کا جن کو ڈرایا گیا تھا۔

حضرت نوح قدیم ترین زمانہ کے رسول ہیں۔ وہ جب تک خاموش تھے، قوم ان کی عزت کرتی رہی۔ مگر جب آپ حق کے داعی بن کر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو بتانے لگے کہ ایسا کرو اور ویسا نہ کرو تو وہ قوم کی نظر میں ایک ناپسندیدہ شخص بن گئے۔ یہاں تک کہ قوم نے اعلان کردیا کہ تم اپنی تبلیغ و نصیحت سے باز آؤ ورنہ ہم تم کو اپنی زمین میں نہیں رہنے دیں گے۔

حضرت نوح نے کہا کہ تم لوگ میرے معاملہ کو ایک انسان کا معاملہ سمجھتے ہو، اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ مگر یہ معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ مجھ سے لڑنے کے لیے تم کو خدا سے لڑنا پڑے گا۔ تم کو اگر یقین نہ ہو تو تم اس طرح تجربہ کر سکتے ہو کہ اپنے ساتھیوں اور شریکوں کو ملا کر میرے خلاف کوئی متفقہ منصوبہ بناؤ اور اپنی تمام طاقت کے ساتھ اس کی تعمیل کر گزرو۔ تم دیکھو گے کہ میرے مقابلہ میں تمھارا ہر منصوبہ ناکام ہے۔ موجودہ دنیا میں داعی حق کی صداقت کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ کوئی بھی اس کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

جو شخص خدا کی طرف سے حق کی دعوت لے کر اٹھے وہ ہمیشہ نشانی (دلیل) کے زور پر اٹھتا ہے۔ دلیل چونکہ ایک ذہنی چیز ہے اس لیے ظاہر پسند انسان اس کی عظمت کو سمجھ نہیں پاتا۔ وہ ذہنی طور پر لاجواب ہونے کے باوجود اس کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

حق کے داعی کو جن آدابِ دعوت کا لازمی طور پر لحاظ کرنا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ داعی اپنے مدعو سے کسی بھی قسم کا معاشی اور مادی مطالبہ نہ کرے۔ خواہ اس یک طرفہ دست برداری کی وجہ سے اس کو کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان آخر وقت تک داعی اور مدعو کا تعلق باقی رہے، وہ کسی بھی حال میں قومی حریف اور مادی رقیب کا تعلق نہ بننے پائے۔

حضرت نوح نے جب اتمام حجت کی حد تک حق کا پیغام پہنچا دیا، پھر بھی ان کی قوم سرکشی پر قائم رہی تو سرکشوں کو سیلاب میں غرق کر کے زمین ان سے خالی کرا لی گئی اور مومنینِ نوح کو موقع دیا گیا کہ وہ زمین کے وارث بن کر اس پر آباد ہوں۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ''خلافت'' کہا جاتا ہے۔ سیلاب سے پہلے قومِ نوح زمین کی خلیفہ بنی ہوئی تھی، سیلاب کے بعد مومنین نوح زمین کے خلیفہ قرار پائے۔

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رُسُلًا اِلٰی قَوۡمِهِمۡ فَجَآءُوۡهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا كَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا بِهٖ مِنۡ قَبۡلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطۡبَعُ عَلٰی قُلُوۡبِ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ پھر ہم نے نوح کے بعد کتنے رسول بھیجے۔ وہ ان کے پاس کھلی کھلی دلیلیں لے کر آئے، مگر وہ اس پر ایمان لانے والے نہ بنے جس کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے نکل جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

اِس آیت میں ''حد سے گزر جانے والا'' ان لوگوں کو کہا گیا ہے جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک بار اگر وہ حق کا انکار کردیں تو اس کے بعد وہ اس کو اپنی ساکھ کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور پھر اس کو مسلسل نظر انداز کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں ان کا علم دین اور ان کا برسرِحق ہونا مشتبہ نہ ہونے پائے۔

جو لوگ اس قسم کا رویہ اختیار کریں ان کو دنیا میں یہ سزا ملتی ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ یعنی خدا کے قانون کے تحت ان کی نفسیات دھیرے دھیرے ایسی بن جاتی ہے کہ بالآخر حق کے معاملہ میں ان کا شدتِ احساس باقی نہیں رہتا۔ ابتداءً ان کے اندر جو تھوڑی سی حساسیت زندہ تھی وہ بھی بالآخر مردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتے کہ حق اور ناحق کے معاملے میں تڑپیں اور ناحق کو چھوڑ کر حق کو قبول کرلیں۔ حضرت نوح اور ان کے بعد آنے والے بیشتر رسولوں کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

اللہ کی طرف سے جب بھی کوئی داعیٔ حق آتا ہے تو وہ اس حال میں آتا ہے کہ اس کے گرد کسی قسم کی ظاہری عظمت نہیں ہوتی۔ اس کے پاس جو واحد چیز ہوتی ہے وہ صرف دلیل ہے۔ جو لوگ دلیل کی زبان میں حق کو مانیں وہی داعیٔ حق کو مانتے ہیں۔ جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ دلیل کی زبان انھیں متاثر نہ کرسکے وہ داعیٔ حق کو پہچاننے سے بھی محروم رہتے ہیں اور اس کا ساتھ دینے سے بھی۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

۷۵۔ پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر بھیجا، مگر انھوں نے گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ ۷۶۔ پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے سچی بات پہنچی تو انھوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ ۷۷۔ موسیٰ نے کہا کہ کیا تم حق کو جادو کہتے ہو جب کہ وہ تمھارے پاس آچکا ہے۔ کیا یہ جادو ہے، حالاں کہ جادو والے کبھی فلاح نہیں پاتے۔ ۷۸۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم کو اس راستے سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور اس ملک میں تم دونوں کی بڑائی قائم ہوجائے، اور ہم کبھی تم دونوں کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔

فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے اپنی مجرمانہ ذہنیت کی بنا پر موسیٰ اور ہارون کی بات نہیں مانی۔ وہ چیزوں کو دلیل کے معیار سے دیکھنے کے بجائے جاہ واقتدار کے معیار سے دیکھتے تھے۔ اس خودساختہ معیار کے نام پر انھوں

نے اپنے کو اونچا اور موسیٰ و ہارون کو نیچا سمجھ لیا۔ ان کی یہ نفسیات ان کے لیے اس حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی، جو ان کے نزدیک ایک چھوٹا آدمی ان کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

حضرت موسیٰ کے استدلال کی زبان جب فرعون کی سمجھ میں نہیں آئی تو آپ نے عصا اور یدِ بیضا کے معجزات دکھائے۔ ان معجزات کا توڑ فرعون کے پاس نہ تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ یہ جادو ہے۔ اس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں اپنی شکست کو ایک جھوٹی توجیہہ میں چھپانے کی کوشش کی۔ اس نے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ موسیٰ کا معاملہ حق کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جادو کا معاملہ ہے، یہ صحیح ہے کہ جادو اور معجزہ میں کچھ ظاہری مشابہت ہوتی ہے۔ مگر بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ جادو محض شعبدہ اور کرشمہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں معجزہ کو مستقل کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جادو بالآخر جادو ثابت ہوتا ہے اور معجزہ بالآخر معجزہ۔

اس موقع پر فرعون نے لوگوں کو حضرت موسیٰ کی دعوت سے پھیرنے کے لیے دو اور باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ موسیٰ ہم کو ہمارے آبائی دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ فرعون کو چاہیے تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کے پیغام کو حق اور ناحق کی اصطلاح میں سمجھنے کی کوشش کرے۔ مگر اس نے اس کو آبائی اور غیر آبائی معیار سے جانچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حق اور ناحق کے معیار سے دیکھنے میں اپنے آپ کو غلط ماننا پڑتا۔ جب کہ آبائی اور غیر آبائی کی تقسیم میں اپنی روش پر بدستور موجود رہنے کا جواز مل رہا تھا۔

فرعون نے دوسری بات یہ کہی کہ ”موسیٰ اور ہارون اس ملک میں اپنی کبریائی قائم کرنا چاہتے ہیں“ یہ بھی عوام کو بھڑکانے کے لیے محض ایک سیاسی شوشہ تھا، کیوں کہ حضرت موسیٰ نے تو اول مرحلہ میں فرعون کے سامنے یہ بات رکھ دی تھی کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ فرعون کو خدا کا پیغام پہنچائیں اور اس کے بعد بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں چلے جائیں۔ ایسی حالت میں یہ الزام سراسر خلاف واقعہ تھا کہ وہ مصر کی حکومت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿٧٩﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿٨٠﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨١﴾ وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع ۸ ۱۲

۷۹۔ اور فرعون نے کہا کہ تمام ماہر جادوگروں کو میرے پاس لے آؤ۔ ۸۰۔ جب جادوگر آئے تو موسیٰ نے ان سے کہا کہ جو کچھ تمھیں ڈالنا ہے ڈالو۔ ۸۱۔ پھر جب جادوگروں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے۔ بے شک اللہ اس کو باطل کر دے گا، اللہ یقیناً مفسدوں کے کام کو سدھرنے نہیں دیتا۔ ۸۲۔ اور اللہ اپنے حکم سے حق کو حق کر دکھاتا ہے، خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

فرعون کا ماہر جادوگروں کو بلانا اس لیے نہ تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ جادوگروں کے ذریعہ وہ حضرت موسیٰ کو زیر کرلے گا۔ یہ کسی عقلی فیصلہ سے زیادہ فرعون کی اس بڑھی ہوئی خواہش کا نتیجہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کو نہ مانے۔

خدا کے پیغمبر کو جادوگروں کے ذریعہ غلط ثابت کرنے کا منصوبہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کا ناکام ہونا پہلے سے معلوم تھا۔ مگر آدمی جب کسی حقیقت کو نہ ماننا چاہے تو اس کی یہ خواہش اس کو یہاں تک لے جاتی ہے کہ وہ احمقانہ تدبیروں سے اس کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کا بند باندھتا ہے حالاں کہ وہ خود جان رہا ہوتا ہے کہ سیلاب کے مقابلہ میں تنکوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جادوگروں نے میدان میں رسّیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی صورت میں دکھائی دیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بہت بڑا سانپ بن کر میدان میں دوڑنے لگا۔ حضرت موسیٰ کا یہ "سانپ" محض سانپ نہ تھا، وہ دراصل خدا کی ایک طاقت تھی جو اس لیے ظاہر ہوئی تھی کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کردے۔ چنانچہ اس کے سامنے آتے ہی جادوگروں کی رسّی، رسّی رہ گئی اور ان کی لکڑی لکڑی۔

یہ خود اپنے منتخب کیے ہوئے میدان میں فرعون کی شکست تھی۔ مگر اب بھی فرعون نے شکست نہ مانی۔ اب اس نے حضرت موسیٰ کی تردید کے لیے کچھ اور الفاظ تلاش کر لیے جس طرح اس کو پہلے مرحلہ میں آپ کی تردید کے لیے کچھ الفاظ مل گئے تھے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾

۸۳۔ پھر موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے کہ کہیں وہ ان کو کسی فتنہ میں نہ ڈال دے، بے شک فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو حد سے گزر جاتے ہیں۔ ۸۴۔ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم واقعی فرماں بردار ہو۔ ۸۵۔ انھوں نے کہا، ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا، اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔ ۸۶۔ اور اپنی رحمت سے ہم کو منکر لوگوں سے نجات دے۔

نئے فکر کو قبول کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے معاشرہ میں نئے نئے مسائل سے دوچار ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ عمر کے لوگ اکثر کسی نئے فکر کو قبول کرنے میں محتاط ہوتے ہیں۔ مختلف وجوہ سے زیادہ عمر کے لوگوں پر مصلحت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ وہ نئے فکر کی صحت کو ماننے کے باوجود آگے بڑھ کر اس کا ساتھ نہیں دے پاتے۔

مگر نوجوان طبقہ عام طور پر اس قسم کی مصلحتوں سے خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ تاریخ میں ایسا ہوا کہ کسی نئی اور انقلابی دعوت کو قبول کرنے میں وہی لوگ زیادہ آگے بڑھے جو ابھی زیادہ عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ یہی صورتِ حال حضرت موسیٰ کے ساتھ پیش آئی۔

حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے والے نوجوان کو ایک طرف فرعون کا خطرہ تھا۔ دوسری طرف خود اپنی قوم کے بڑوں کی طرف سے ان کو حوصلہ افزائی نہیں ملی۔ یہ بڑے اگرچہ حضرت موسیٰ کی نبوت کو مانتے تھے مگر اپنی مصلحت اندیشی کی بنا پر وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے بیٹیاں پُرجوش طور پر حضرت موسیٰ کا ساتھ دیں اور اس کے نتیجہ میں وہ فرعون کے ظلم کا شکار بنیں۔

مگر اس قسم کی صورتِ حال کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ آدمی مخالفین حق کے ڈر سے خاموش ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کو چاہیے کہ وہ انسانی مخالفتوں کے مقابلہ میں خدائی نصرتوں پر نظر رکھے، وہ خدا کے بھروسہ پر اس حق کا ساتھ دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہو جس کا ساتھ دینے کے لیے ذاتی طور پر وہ اپنے آپ کو عاجز پا رہا تھا۔

وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰی وَ اَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر مقرر کر لو اور اپنے ان گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو۔ اور اہل ایمان کو خوش خبری دے دو۔

قبلہ کے معنی عربی میں مرجع یا مرکز توجہ کے ہیں۔ یہاں گھروں کو قبلہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی بستیوں میں کچھ گھروں یا ان گھروں کے بعض مناسب حصوں کو اس مقصد کے لیے مخصوص کر دیا جائے کہ وہ حضرت موسیٰ کی دینی جدوجہد کے لیے بطور مرکز کے کام دیں۔ یہاں تنظیمی اجتماعات ہوں، باہمی مشورے ہوں اور دعوتی عمل کی خاموش منصوبہ بندی کی جائے۔

حضرت موسیٰ کی توحید و آخرت کی باتیں مصر کے بادشاہ فرعون کو سخت ناگوار تھیں۔ اس نے ان کے اوپر نہایت سخت قسم کی پابندیاں عائد کر دیں۔ یہاں تک کہ کھلے طور پر دینی سرگرمیاں جاری رکھنا ان کے لیے سخت دشوار ہو گیا۔ اس وقت حکم ہوا کہ فرعون سے ٹکرانے کے بجائے یہ کرو کہ اپنے کام کو قریبی دائرہ میں سمیٹ لو۔ اپنی بستیوں میں چھوٹے دعوتی اور تنظیمی مراکز بنا کر محدود دائرہ میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھو۔

ان حالات میں ان کو جو دوسرا حکم دیا گیا وہ نماز کی اقامت تھا۔ یعنی اللہ سے تعلق جوڑنے اور اس سے مدد مانگنے کے لیے نمازوں کا اہتمام، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ نماز دراصل خدا سے قریب ہو کر خدا سے مدد مانگنے کی ایک صورت ہے۔ نماز میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو عجز اور تواضع کے مقام پر لاتا ہے اور عجز اور تواضع ہی وہ مقام ہے جہاں بندہ اور خدا کی ملاقات ہوتی ہے۔ بندہ کے لیے اپنے رب سے ملنے کا دوسرا کوئی مقام نہیں۔

یہ جو پروگرام بتایا گیا اسی کی تکمیل میں ان کے لیے فلاح اور نجات کا راز چھپا ہوا تھا۔ یہ حکم گویا اس بات کی

خوش خبری تھی کہ خدا ان کو اس حالت سے نکالنے والا ہے جس میں ان کے دشمنوں نے ان کو مبتلا کر دیا ہے۔ اس میں اہل ایمان کو یہ سبق ہے کہ حالات جب اہل ایمان کو اتنا پیچھے دھکیل دیں کہ عملاً ان کے لیے گھر اور مسجد کے سوا کوئی اور میدانِ کار باقی نہ رہے تو انھیں چاہیے کہ اسی ملے ہوئے دائرے کو اپنے عمل کے لیے خاص کر لیں۔ خارجی دنیا کے خلاف شکایت اور احتجاج کا میمورنڈم مرتب کرنے میں وہ اپنا وقت ضائع نہ کریں، بلکہ گھروں اور مسجدوں کو مرکز بنا کر ایک طرف اپنے رب کے ساتھ اور دوسری طرف اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ جڑ جائیں اور جو دائرہ بھی ان کے لیے باقی رہ گیا ہے، اس کے اندر دینی بیداری کی کوشش جاری رکھیں۔

وَ قَالَ مُوْسٰی رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤی اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ۝۸۸ قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۸۹

۸۸۔ اور موسیٰ نے کہا، اے ہمارے رب، تو نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں رونق اور مال دیا ہے۔ اے ہمارے رب، اس لیے کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔ اے ہمارے رب، ان کے مال کو غارت کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔ ۸۹۔ فرمایا، تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ اب تم دونوں جمے رہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

جو لوگ آخرت کی فکر کرتے ہیں وہ عام طور پر دنیوی ساز و سامان جمع کرنے میں ان لوگوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں جو آخرت سے بے فکر ہو کر دنیا حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہوں۔ دنیوی کمی آخرت کی طرف دھیان لگانے کی قیمت ہے، اور دنیوی زیادتی آخرت سے غافل ہونے کی قیمت۔

مزید یہ کہ جس کے پاس دنیا کی رونق اور سامان زیادہ جمع ہو جائیں وہ بڑائی کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے اندر یہ صلاحیت کھو دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کی زبان سے جاری ہونے والے حق کو پہچانیں اور اس کے آگے جھک جائیں۔ اپنے وسائل کو اگر وہ خدا کا عطیہ سمجھتے تو اس کو حق کی تائید میں استعمال کرتے، مگر وہ اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھتے ہیں اس لیے وہ اس کو صرف اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ حق کو دبائیں اور اس طرح ماحول کے اندر اپنی برتری قائم رکھیں۔

''تاکہ وہ تیری راہ سے بھٹکائیں'' کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے دیے ہوئے مال و اسباب کو صرف اس لیے استعمال کیا کہ اس کے ذریعے سے خدا کے بندوں کو خدا سے دور کریں، انھوں نے اس کو حق کی خدمت میں لگانے کے بجائے باطل کی خدمت میں لگایا، یہاں شدت بیان کی خاطر کلام کا اسلوب بدل گیا ہے۔

حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے سامنے سچے دین کی دعوت پیش کی اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور خدا کی نصرتوں کے ذریعہ اس کو اتمام حجت کی حد تک واضح کردیا، اس کے باوجود فرعون اور اس کے ساتھیوں نے آنجناب کے پیغام کو نہیں مانا۔ اس وقت حضرت موسیٰ نے دعا کی کہ خدایا ان کے اوپر وہ سزا نازل فرما جو تیرے قانون کے تحت ایسے سرکشوں کے لیے مقدر ہے۔ ایسے موقع پر پیغمبر کی بددعا خود خدا کے فیصلہ کا اعلان ہوتا ہے جو نمائندہ خدا کی زبان سے جاری کیا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی دعا قبول ہوگئی۔ تاہم جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے، حضرت موسیٰ کی دعا اور فرعون کی تباہی کے درمیان 40 سال کا فاصلہ ہے (تفسیر النسفی، جلد 2، صفحہ 38)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد بھی لمبی مدت تک یہ صورت حال باقی رہی کہ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھی اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے۔ اور دوسری طرف فرعون اور اس کے ساتھیوں کی شان و شوکت بدستور ملک میں قائم تھی۔ ایسی حالت میں آدمی اگر خدا کی اس سنت سے بے خبر ہو کہ وہ سرکشوں کو مہلت دیتا ہے تو وہ جلد بازی میں اصل کام چھوڑ دے گا اور مایوسی اور بددلی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ
فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ
اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا
الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ
الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ
كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ
بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ
كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ع ۹ ۱۴

۹۰۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا، سرکشی اور زیادتی کی غرض سے۔ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں، مگر وہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔ اور میں اس کے فرماں برداروں میں ہوں۔ ۹۱۔ کیا اب، اور اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا اور تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ ۹۲۔ پس آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے، اور بیشک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل رہتے ہیں۔

مصر میں حضرت موسیٰ کا مشن دو طرفہ تھا۔ ایک، فرعون کو توحید اور آخرت کی طرف بلانا۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو مصر سے باہر صحرائی ماحول میں لے جانا اور وہاں ان کی تربیت کرنا۔ جب فرعون پر دعوتِ حق کی تکمیل ہوچکی تو اللہ کے حکم سے وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ صحرائے سینا پہنچنے کے لیے انھیں دریا کو پار کرنا تھا۔ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی رہنمائی میں دریا کے کنارے پہنچے تو اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ نے پانی پر اپنا عصا مارا۔ پانی بیچ سے پھٹ کر دائیں بائیں کھڑا ہوگیا، اور درمیان میں خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل اس راستہ سے بآسانی پار ہوگئے۔

فرعون اپنے لشکر کے ساتھ بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل پانی کے درمیان ایک خشک راستہ سے گزر رہے ہیں۔ دریا کے وسیع پاٹ نے پھٹ کر حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو راستہ دے دیا تھا۔ یہ واقعہ دراصل خدا کی ایک نشانی تھا۔ فرعون کو اس سے یہ سبق لینا چاہیے تھا کہ موسیٰ حق پر ہیں اور خدا ان کے ساتھ ہے۔ مگر اس نے دریا کے پھٹنے کو خدائی واقعہ سمجھنے کے بجائے عام واقعہ سمجھا۔ اپنے اور موسیٰ کے درمیان فرعون کو صرف دریا نظر آیا، حالاں کہ وہاں خود خدا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس واقعہ میں فرعون کے لیے اطاعت اور انابت کا پیغام تھا وہ اس کے لیے صرف سرکشی میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ اس نے "دریا" کو دیکھا مگر "خدا" کو نہیں دیکھا۔ اس نے سمجھا کہ جس طرح موسیٰ اور ان کے ساتھیوں نے دریا کو پار کیا ہے اسی طرح وہ بھی دریا کو پار کر سکتا ہے۔

اپنے اس ذہن کے ساتھ فرعون اور اس کا لشکر دریا میں داخل ہو گئے۔ دریا کا پانی جو دو ٹکڑے ہوا تھا وہ موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے لیے ہوا تھا، وہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لیے نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ فرعون اور اس کا لشکر جب بیچ دریا میں پہنچے تو خدا کے حکم سے دونوں طرف کا پانی مل گیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت اس میں غرق ہو گیا۔ غرق ہوتے ہوئے فرعون نے ایمان کا اقرار کیا مگر وہ بے سود تھا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اختیاری ایمان معتبر ہے، نہ کہ وہ ایمان جب کہ آدمی ایمان لانے پر مجبور ہو گیا ہو۔

خدا سے نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہلاکت ہے، اس کا نمونہ دورِ رسالت میں بار بار انسان کے سامنے آتا تھا۔ تاہم اس قسم کے کچھ نمونے خدا نے مستقل طور پر محفوظ کر دیے ہیں تاکہ وہ بعد کے زمانے میں بھی انسان کو سبق دیتے رہیں جب کہ نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا ہو۔ انھیں میں سے ایک تاریخی نمونہ فرعونِ موسیٰ (رعمیس ثانی) کا ہے جس کی ممی کی ہوئی لاش ماہرین اثریات کو قدیم مصری شہر تھیبس (Thebes) میں ملی تھی اور اب وہ قاہرہ کے میوزیم میں نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانا دیا اور ان کو ستھری چیزیں کھانے کے لیے دیں۔ پھر انھوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ علم ان کے پاس آچکا تھا۔ یقیناً تیرا رب قیامت کے دن ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے۔

بنی اسرائیل قدیم زمانہ میں خدا کے دین کے حامل تھے۔ ان کے ساتھ خدا نے یہ احسان کیا کہ ان کے دشمن (فرعون) سے ان کو نجات دی۔ اس کے بعد وہ ان کو سینا کی کھلی فضا میں لے گیا۔ وہاں ان کے لیے خصوصی انتظام کے تحت پانی اور رزق مہیا کیا۔ صحرائی تربیت کے ذریعہ ان کے اندر ایک نئی طاقت ور نسل تیار کی۔ اس

نسل نے حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ایک عظیم ملک فتح کیا اور شام اور اردن اور فلسطین جیسے سرسبز علاقہ میں بنی اسرائیل کی سلطنت قائم کی جو کئی سو سال تک باقی رہی۔

اس احسان کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ بنی اسرائیل خدا کے فرماں بردار اور شکر گزار رہتے اور خدا کے دین کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بناتے۔ مگر واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے وہ راہ سے بے راہ ہو گئے۔

ان کا راہ سے بے راہ ہونا کیا تھا۔ یہ آپس کا اختلاف تھا۔ ان کے پاس خدا کا اتارا ہوا علم موجود تھا جو واحد سچائی تھا۔ مگر انھوں نے اس علم کی تشریح وتاویل میں اختلاف کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے (تفسیر النسفی، جلد 2، صفحہ 40)۔ کوئی امت جب تک خدا کے اتارے ہوئے دین (العلم) پر رہتی ہے، اس میں اتفاق واتحاد رہتا ہے۔ مگر بعد کو ان کے درمیان اس العلم کی تشریح میں اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک اختلافی رائے لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ دوسری اختلافی رائے لے کر۔ ہر ایک اپنے اپنے مسلک کو برحق ثابت کرنے کے لیے بحث مباحثہ اور تقریر اور مناظرہ کا طوفان کھڑا کرتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ اصل العلم کتابوں میں بند پڑا رہتا ہے اور سارا زور ان کی تاویلات وتشریحات میں صرف ہونے لگتا ہے۔ اس طرح بنیادی دینی تعلیمات (العلم) میں متحد الرائے ہونے کے باوجود لوگ ذیلی تعلیمات میں مشغول ہو کر مختلف الرائے ہو جاتے ہیں۔

''اللہ قیامت کے دن فیصلہ کردے گا'' بظاہر متعدی ہے مگر حقیقۃً وہ لازم کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت میں جب خدا ظاہر ہوگا تو ہر آدمی اپنے اختلاف کو بھول کر اسی بات کو مان لے گا، جو واحد سچائی ہے۔ اگر وہ خدا سے ڈرتے تو آج ہی سب کے سب ایک رائے پر پہنچ جاتے۔ مگر خدا سے بے خوف ہو کر وہ الگ الگ راہوں میں بٹ گئے ہیں۔ بے خوفی سے رایوں کا تعدد پیدا ہوتا ہے اور خوف سے رایوں کا اتحاد۔

فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡـَٔلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ‌ ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۝۹۴ وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝۹۵

۹۴۔ پس اگر تم کو اس چیز کے بارے میں شک ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو تم سے پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ بے شک یہ تم پر حق آیا ہے تمھارے رب کی طرف سے، پس تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ ۹۵۔ اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے، ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گے۔

پیغمبر بے آمیز حق کو لے کر اٹھتا ہے، اور بے آمیز حق کی دعوت کو قبول کرنا انسان کے لیے ہمیشہ سخت دشوار کام رہا ہے۔ لوگ عام طور پر ملاوٹی حق کی بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی دنیا پرستانہ زندگی پر حق کا لیبل لگا

لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں بے آمیز حق کی دعوت کو ماننا اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ داعیٔ حق کو ماننے کے لیے اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ اور اپنے آپ کو چھوٹا کرنا بلا شبہ انسان کے لیے مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ حق کی دعوت اٹھے اور لوگ جوق درجوق اس کی طرف دوڑنا شروع کردیں۔ حق کا استقبال اس دنیا میں ہمیشہ اعراض اور مخالفت کی صورت میں کیا گیا ہے۔

داعی جب اپنے ماحول میں حق کی یہ بے وقعتی دیکھتا ہے تو کبھی کبھی اس پر یہ شبہ گزرتا ہے کہ میں غلطی پر تو نہیں ہوں۔ اس آیت میں داعی کو اسی نفسیات سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اس شبہ کے غلط ہونے کا ایک نہایت واضح ثبوت یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں اور داعیوں کو بھی ہمیشہ اسی طرح کی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ جو لوگ سابق انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو بخوبی معلوم ہے کہ اس دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک پیغمبر اٹھے اور فوراً اس کو عوامی مقبولیت حاصل ہوجائے۔ پھر یہی بات اگر بعد کے زمانہ کے داعیوں کے ساتھ پیش آئے تو اس پر حیران و پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

آدمی کی عقل اگر کسی چیز کی سچائی پر گواہی دے اور وہ صرف لوگوں کی بے توجہی یا مخالفت کی وجہ سے اس چیز کو چھوڑ دے تو یہ گویا اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانا ہے۔ اللہ نشانیوں (دلائل) کے روپ میں انسان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے جس چیز کی صداقت پر دلیل قائم ہوجائے اس کو ماننا آدمی کے اوپر خدا کا حق ہوجاتا ہے۔ پھر جو شخص خدا کا حق ادا نہ کرے اس کے حصہ میں نقصان اور ہلاکت کے سوا کیا آئے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٩٨﴾

۹۶۔ بے شک جن لوگوں پر تیرے رب کی بات پوری ہوچکی ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۹۷۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو سامنے آتا نہ دیکھ لیں۔ ۹۸۔ پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اس کا ایمان اس کو نفع دیتا، یونس کی قوم کے سوا۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا اور ان کو ایک مدت تک بہرہ مند ہونے کا موقع دیا۔

انسان کے سامنے جب ایک حق بات آتی ہے تو اس کی عقل گواہی دیتی ہے کہ یہ صحیح ہے۔ مگر کسی حق کو لینے کے لیے آدمی کو کچھ دینا پڑتا ہے اور اسی دینے کے لیے آدمی تیار نہیں ہوتا۔ اس کی خاطر آدمی کو دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے مفاد کو خطرہ میں ڈالنا ہوتا ہے۔ اپنی رائے اور اپنے وقار کو کھونا پڑتا ہے۔ یہ اندیشے آدمی کے لیے قبولِ حق میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ جس چیز کا جواب اس کو

قبولیت اوراعتراف سے دینا چاہیے تھا اس کا جواب وہ انکار اور مخالفت سے دینے لگتا ہے۔

آدمی کی نفسیات کچھ اس طرح بنی ہیں کہ وہ ایک بار جس رخ پر چل پڑے اسی رخ پر اس کا پورا ذہن چلنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار حق سے انحراف کرنے کے بعد بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوبارہ حق کی طرف لوٹے۔ کیوں کہ ہر آنے والے دن وہ اپنے فکر میں پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ حق کی طرف واپس آجائے۔

اس طرح کے لوگ اپنے موقف کو بتانے کے لیے ایسے الفاظ بولتے ہیں جس سے ظاہر ہو کہ ان کا کیس نظریاتی کیس ہے۔ مگر حقیقۃً وہ صرف ضد اور تعصب اور ہٹ دھرمی کا کیس ہوتا ہے جو اپنی دنیوی مصلحتوں کی خاطر اختیار کیا جاتا ہے۔ تاہم عذاب خداوندی کے ظہور کے وقت آدمی کا یہ بھرم کھل جائے گا۔ خوف کی حالت اس کو اس چیز کے آگے جھکنے پر مجبور کردے گی جس کے آگے وہ بےخوفی کی حالت میں جھکنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔

پچھلے زمانہ میں جتنے رسول آئے سب کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ ان کی مخاطب قوم آخر وقت تک ایمان نہیں لائی۔ البتہ جب وہ عذاب کی پکڑ میں آگئے تو انھوں نے کہا کہ ہم ایمان قبول کرتے ہیں۔ جب تک خدا انھیں دلیل کی زبان میں پکار رہا تھا، انھوں نے نہیں مانا اور جب خدا نے انھیں اپنی طاقتوں کی زد میں لے لیا تو کہنے لگے کہ اب ہم مانتے ہیں۔ مگر ایسا ماننا خدا کے یہاں معتبر نہیں۔ خدا کو وہ ماننا مطلوب ہے جب کہ آدمی دلیل کے زور پر جھک جائے، نہ کہ وہ طاقت کے زور پر جھکے۔

حضرت یونس علیہ السلام عراق کے ایک قدیم شہر نینویٰ میں بھیجے گئے۔ انھوں نے وہاں تبلیغ کی مگر وہ لوگ ایمان نہ لائے۔ آخر حضرت یونس نے پیغمبروں کی سنت کے مطابق ہجرت کی۔ وہ یہ کہہ کر نینویٰ سے چلے گئے کہ اب تمھارے اوپر خدا کا عذاب آئے گا۔ حضرت یونس کے جانے کے بعد عذاب کی ابتدائی علامتیں ظاہر ہوئیں۔ مگر اس وقت انھوں نے وہ نہ کیا جو قوم ہود نے کیا تھا کہ انھوں نے عذاب کا بادل آتے دیکھ کر کہا کہ یہ ہمارے لیے بارش برسانے آرہا ہے۔ قوم یونس کے اندر فوراً چونک پیدا ہوگئی۔ سارے لوگ اپنے مویشیوں اور عورتوں اور بچوں کو لے کر میدان میں جمع ہوگئے اور خدا کے آگے عاجزی کرنے لگے۔ اس کے بعد عذاب ان سے اٹھا لیا گیا۔ جس طرح ظہور عذاب سے پہلے کا ایمان قابلِ اعتبار ہے اسی طرح وقوع عذاب کے قریب کا ایمان بھی قابل اعتبار ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ اتنا کامل ہو جتنا کامل قوم یونس کا ایمان تھا۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

۹۹۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ پھر کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مومن ہوجائیں۔ ۱۰۰۔ اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر ایمان لاسکے۔ اور اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

’’تیرا رب چاہتا تو سارے لوگ مومن بن جاتے‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لیے یہ ممکن تھا کہ انسانی دنیا کا نظام بھی اسی طرح بنائے جس طرح بقیہ دنیا کا نظام ہے۔ جہاں ہر چیز مکمل طور پر خدا کے حکم کی پابند بنی ہوئی ہے۔ مگر انسان کے سلسلہ میں خدا کی یہ اسکیم ہی نہیں۔ انسان کے سلسلہ میں خدا کی اسکیم یہ ہے کہ آزادانہ ماحول میں رکھ کر انسان کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ خود اپنے ذاتی فیصلہ سے خدا کا فرماں بردار بنے۔ وہ اپنے اختیار سے وہ کام کرے جو بقیہ دنیا بے اختیاری کے ساتھ کر رہی ہے۔ جنت کی ابدی نعمتیں اسی اختیارانہ اطاعت کی قیمت ہیں۔

’’کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو ایمان کی نعمت ملے گی تو اس طریقہ کی پیروی کر کے ملے گی جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ موجودہ دنیا میں ایمان کو پانے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ایمان کی دعوت کو اپنی عقل کے استعمال سے سمجھے۔ جس شخص کی عقل کے اوپر اس کی دنیوی مصلحتیں غالب آجائیں اس کی عقل گویا گندگی کی کیچڑ میں لت پت ہو گئی ہے۔ ایسے شخص کے لیے اس دنیا میں ایمان کی نعمت پانے کا کوئی سوال نہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۱/۱۵

۱۰۱۔ کہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسے دیکھو۔ اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچاتے جو ایمان نہیں لاتے۔ ۱۰۲۔ وہ تو بس اس طرح کے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس طرح کے دن ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو پیش آئے۔ کہو، انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ ۱۰۳۔ پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے۔ اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ ہم ایمان والوں کو بچا لیں گے۔

ہمارے چاروں طرف جو کائنات ہے اس میں بے شمار نشانیاں موجود ہیں جو خدا کے وجود کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس کائنات کے بارے میں خدا کا منصوبہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ دنیا میں ڈراوے (آندھی اور بھونچال) جیسے واقعات بھی پیش آتے رہتے ہیں جو انسان کو خدا اور آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ بنائیں۔ مگر یہ سب کچھ عالم امتحان میں ہوتا ہے، یعنی ایسی دنیا میں جہاں آدمی کو اختیار ہے کہ مانے یا نہ مانے۔ چنانچہ آدمی یہ کرتا ہے کہ جب نشانیاں اور ڈراوے سامنے آتے ہیں تو وہ ان کی کوئی نہ کوئی خود ساختہ توجیہ کر کے بات کو دوسرے رخ کی طرف پھیر دیتا ہے اور نصیحت سے محروم رہ جاتا ہے۔

جب آدمی دلیل کی زبان میں بات کو نہ مانے تو گویا وہ صرف اس دن کا انتظار کر رہا ہے جب کہ امتحان کا پردہ ہٹا دیا جائے اور خدا اپنا آخری فیصلہ سنانے کے لیے سامنے آجائے۔ مگر وہ دن جب آئے گا تو وہ آج کے دن سے

بالکل مختلف ہوگا۔ آج تو ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں بظاہر یکساں حالت میں نظر آتے ہیں۔ مگر جب فیصلہ کا دن آئے گا تو اس کے بعد وہی لوگ امن میں رہیں گے جو حق پرست ثابت ہوئے تھے۔ بقیہ تمام لوگ اس طرح عذاب کی لپیٹ میں آجائیں گے کہ اس کے بعد ان کے لیے کوئی راہ نہ ہوگی جس سے بھاگ کر وہ نجات حاصل کریں۔

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡ دِیۡنِیۡ
فَلَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ
لٰکِنۡ اَعۡبُدُ اللّٰهَ الَّذِیۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ ۚۖ وَ اُمِرۡتُ
اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ﴿۱۰۴﴾ وَ اَنۡ اَقِمۡ
وَجۡهَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ۚ وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ
الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾ وَ لَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا
یَنۡفَعُکَ وَ لَا یَضُرُّکَ ۚ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّکَ اِذًا
مِّنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا
کَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنۡ یُّرِدۡکَ بِخَیۡرٍ فَلَا
رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ ؕ یُصِیۡبُ بِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ
عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۰۷﴾

۱۰۴۔ کہو، اے لوگو! اگر تم میرے دین کے متعلق شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اللہ کے سوا۔ بلکہ میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے اور مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے بنوں۔ ۱۰۵۔ اور یہ کہ اپنا رخ یکسو ہو کر دین کی طرف کروں۔ اور مشرکوں میں سے نہ بنوں۔ ۱۰۶۔ اور اللہ کے علاوہ ان کو نہ پکارو جو تم کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ پھر اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ ۱۰۷۔ اور اگر اللہ تم کو کسی تکلیف میں پکڑ لے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کو دور کر سکے۔ اور اگر وہ تم کو کوئی بھلائی پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں۔ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

داعی اولاً دلیل کی زبان میں اپنی بات کہتا ہے۔ مگر جب لوگ دلیل سننے کے باوجود شک وشبہ میں پڑے رہتے ہیں تو اس کے پاس آخری چیز یہ رہ جاتی ہے کہ عزم کی زبان میں اپنے پیغام کی صداقت کا اظہار کر دے۔

توحید کے داعی کا شرک کے پرستاروں سے یہ کہنا کہ ”میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی عبادت تم لوگ کرتے ہو“، محض ایک دعویٰ نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک دلیل بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ — میں بھی تمھارے جیسا ایک انسان ہوں۔ میرے پاس بھی وہی عقل ہے جو تمھارے پاس ہے۔ پھر جس بات کی صداقت میری سمجھ میں آرہی ہے اس کی صداقت تمھاری سمجھ میں آخر کیوں نہیں آتی۔

سچائی اگر ایک انسان کی سطح پر قابل فہم ہو جائے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے بھی قابلِ فہم تھی۔ اس کے باوجود اگر دوسرے لوگ انکار کریں تو یقیناً اس کی وجہ خود ان کا اپنا کوئی نقص ہوگا، نہ کہ

دعوت حق کا نقص۔ جس چیز کو ایک آنکھ والا دیکھ رہا ہو اور دوسرا آنکھ والا شخص اسے نہ دیکھے تو وہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آنکھ والا حقیقۃً آنکھ والا نہیں۔ کیوں کہ اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ جس چیز کو ایک آنکھ والا دیکھ لے اس کو دوسرا شخص آنکھ رکھتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔

موت اس بات کا اعلان ہے کہ آدمی اس دنیا میں کامل طور پر بے اختیار ہے۔ موت ان تمام چیزوں کو باطل ثابت کردیتی ہے جن کے سہارے آدمی انکار اور سرکشی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ موت ایک طرف آدمی کو اپنے عجز اور دوسری طرف خدا کی قدرت کا تعارف کراتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں کوئی نہیں جس کو نفع دینے یا نقصان پہنچانے کا اختیار حاصل ہو۔ اس طرح موت آدمی کو ہر دوسری چیز سے کاٹ کر خدا کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ مکمل طور پر انسان کو خدا کا پرستار بناتی ہے۔ اگر آدمی کے اندر سبق لینے کا ذہن ہو تو صرف موت کا واقعہ اس کی اصلاح کے لیے کافی ہوجائے۔

ہر انسان پر ایک وقت آتا ہے جب کہ وہ بے بسی کے ساتھ اپنے آپ کو موت کے حوالے کردیتا ہے۔ اسی طرح کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ فائدہ اور نقصان کے معاملہ میں وہی ہونے دے جو وہ چاہتا ہے۔ وہ مطلوب فائدہ کو ہر حال میں پالے اور غیر مطلوب نقصان سے ہر حال میں محفوظ رہے۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان ایک بے اختیار مخلوق ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں کوئی اور بھی ہے جو اس کے اوپر حکمرانی کررہا ہے۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ؕ﴿۱۰۸﴾ وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ ع ۱۱ / ۱۶

۱۰۸۔ کہو، اے لوگو، تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس حق آگیا ہے۔ جو ہدایت قبول کرے گا، وہ اپنے ہی لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا، اور میں تمھارے اوپر ذمہ دار نہیں ہوں۔ ۱۰۹۔ اور تم اس کی پیروی کرو جو تم پر وحی کی جاتی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

دعوت کا کام اصلاً اعلانِ حق کا کام ہے۔ کسی گروہ کے اوپر اس وقت پیغام رسانی کا حق ادا ہوجاتا ہے جب کہ داعی امر حق کو دلیل کے ذریعہ پوری طرح واضح کردے اور اسی کے ساتھ اس بات کا ثبوت دے دے کہ وہ اس معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔ داعی اگر وقت کے معیار کے مطابق امر حق کو مدلّل کردے۔ وہ نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر حق کی مکمل گواہی دے دے۔ وہ ہر تکلیف اور ناخوش گواری کو برداشت کرتا ہوا اپنے دعوتی کام کو جاری رکھے تو اس کے بعد مخاطب کے اوپر وہ اتمام حجت ہوجاتا ہے جس کے بعد خدا کے یہاں کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

داعی کا کام اصلاً اتباعِ وحی ہے۔ یعنی اپنی ذات کی حد تک عملاً مرضئ رب پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو مرضئ رب کی طرف پکارتے رہنا۔ اس کام کو ہر حال میں حکمت اور صبر اور خیر خواہی کے ساتھ مسلسل جاری رکھنا ہے۔

اس کے بعد جتنے بقیہ مراحل ہیں وہ سب براہِ راست طور پر خدا سے متعلق ہیں۔ داعی کی طرف سے کوئی دوسرا عملی اقدام صرف اس وقت درست ہے جب کہ خود خدا کی طرف سے اس کا فیصلہ کیا جا چکا ہو اور اس کے آثار ظاہر ہو جائیں۔

خدا کا فیصلہ ہمیشہ حالات کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے، جب خدا کے علم میں داعی کا دعوتی کام مطلوب حد کو پہنچ چکا ہوتا ہے تو خدا حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جس کو استعمال کر کے داعی اپنے عمل کے اگلے مرحلہ میں داخل ہو جائے۔

۱۱۔ سُوْرَۃُ ھُود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ
لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا
اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَنِ
اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ یُمَتِّعۡکُمۡ
مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّ یُؤۡتِ کُلَّ
ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَہٗ ؕ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنِّیۡۤ
اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ کَبِیۡرٍ ﴿۳﴾ اِلَی
اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۴﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ الٓرٰ۔ یہ کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر ایک دانا اور خبیر ہستی کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی۔ ۲۔ کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ میں تم کو اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ ۳۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، وہ تم کو ایک مدت تک عطا کرے گا اچھا سامانِ زندگی، اور وہ زیادہ بہتر عمل کرنے والے کو زیادہ عطا کرتا ہے۔ اور اگر تم پھر جاؤ تو میں تمھارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۴۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن کی دعوت یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے۔ وہ ایک خدا کو اپنا سب کچھ بنائے۔ وہ اسی سے ڈرے اور اسی سے امید رکھے۔ اس کے ذہن و دماغ پر اسی کا غلبہ ہو۔ اپنی زندگی کے معاملات میں وہ سب سے زیادہ اس کی مرضی کا لحاظ کرے۔ وہ اپنے آپ کو عابد کے مقام پر رکھ کر خدا کو معبود کا مقام دینے پر راضی ہو جائے۔

پیغمبرانہ دعوت دراصل اسی چیز سے انسان کو باخبر کرنے کی دعوت ہے۔ قرآن میں اس کو انتہائی محکم زبان اور واضح اسلوب میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اب انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ اس کے مقابلہ میں صحیح ردعمل پیش کرے۔ حسد، گھمنڈ، مصلحت بینی اور گروہ پرستی جیسی چیزوں کے زیر اثر آ کر وہ اس کو نظر انداز نہ کر دے۔ بلکہ سیدھی طرح اس کو مان کر خدا کی طرف پلٹ آئے۔ وہ اپنی ماضی کی غلطیوں کے لیے خدا سے معافی مانگے اور مستقبل کے لیے خدا سے مدد کی درخواست کرے۔

آدمی کے سامنے کھانا پیش کیا جائے اور وہ کھانے کو قبول کر لے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی جسمانی پرورش کا انتظام کیا۔ اس کے برعکس، اگر وہ کھانا قبول نہ کرے تو گویا اس نے اپنے آپ کو جسمانی پرورش سے محروم

رکھا۔ ایسا ہی معاملہ دعوت حق کا ہے۔ جب آدمی حق کو قبول کرتا ہے تو درحقیقت وہ اس رزق ربانی کو قبول کرتا ہے جو اس کے اندر داخل ہو کر اس کی روح اور اس کے جسم کی صالح پرورش کا سبب بنے اور بالآخر اس کو روحانی ترقی کی اس منزل کی طرف لے جائے جو اس کو جنت کے باغوں کا مستحق بناتی ہے۔

جو شخص دعوت حق کو قبول نہ کرے اس نے گویا اپنی روح کو ربانی پرورش کے مواقع سے محروم کر دیا۔ حق کو ماننے والا اگر تواضع میں جی رہا تھا تو یہ دوسرا شخص گھمنڈ کی نفسیات میں جئے گا۔ حق کو ماننے والے کے لمحات اگر خدا کی یاد میں بسر ہو رہے تھے تو اس کے لمحات غیر خدا کی یاد میں بسر ہوں گے۔ حق کو ماننے والا اگر مواقع حیات میں اطاعت خداوندی کا رویہ اختیار کیے ہوئے تھا تو یہ اس کی جگہ سرکشی کا رویہ اختیار کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلا شخص اس دنیا سے اس حال میں جائے گا کہ اس کی روح صحت مند اور ترقی یافتہ روح ہوگی اور جنت کی فضاؤں میں بسائے جانے کی مستحق ٹھہرے گی۔ اور دوسرے شخص کی روح بیمار اور پچھڑی ہوئی روح ہوگی اور صرف اس قابل ہوگی کہ اس کو جہنم کے کوڑا خانہ میں پھینک دیا جائے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

۵۔ دیکھو، یہ لوگ اپنے سینوں کو لپیٹتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں۔ خبردار، جب وہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں، اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ دلوں کی بات تک جاننے والا ہے۔ ☆۶۔ اور زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ اور وہ جانتا ہے جہاں کوئی ٹھہرتا ہے اور جہاں وہ سونپا جاتا ہے سب کچھ ایک کھلی ہوئی کتاب میں موجود ہے۔

قریش کے بعض سرداروں نے ایسا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو وہ بے پروائی کے ساتھ اٹھے۔ اپنی چادر اپنے اوپر ڈالی اور روانہ ہو گئے۔

یہ دراصل کسی بات کو نظر انداز کرنے کی ایک صورت ہے۔ کوئی آدمی جب داعی کو حقیر سمجھے اور اس کے مقابلہ میں اپنے کو برتر خیال کرے تو اس وقت وہ اسی قسم کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ مگر آدمی بھول جاتا ہے کہ جس نفسیات کے تحت وہ ایسا کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے۔ یہ صرف ایک انسان (داعی) کو نظر انداز کرنا نہیں ہے بلکہ خود خدا کو نظر انداز کرنا ہے جو ہر کھلے اور چھپے کو جاننے والا ہے۔

پھر آدمی کا حال اس وقت کیا ہوگا جب وہ خدا کا سامنا کرے گا۔ وہ دیکھے گا کہ جس خدا کو اس نے نظر انداز کیا تھا وہی وہ ہستی تھا جس سے اس کو وہ سب کچھ ملا تھا جو اس کے پاس تھا۔ حتی کہ وہ اسباب بھی جن کے بل پر اس نے خدا کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ آدمی خدا کی دنیا میں ہے اور بالآخر وہ خدا کی طرف جانے والا ہے۔ مگر وہ اس طرح رہتا ہے جیسے کہ نہ آج خدا سے اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ آئندہ اس کا خدا سے کوئی واسطہ پڑنے والا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ
أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ
أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوثُونَ
مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ
هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝٧ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ
الْعَذَابَ إِلَىٰٓ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا
يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا
عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝٨ ع

۷۔اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ تم کو آزمائے کہ کون تم میں اچھا کام کرتا ہے۔اور اگر تم کہو کہ مرنے کے بعد تم لوگ اٹھائے جاؤ گے تو منکرین کہتے ہیں یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ ۸۔اور اگر ہم کچھ مدت تک ان کی سزا کو روک دیں تو کہتے ہیں کہ کیا چیز اس کو روکے ہوئے ہے۔ آگاہ، جس دن وہ ان پر آپڑے گا تو وہ ان سے پھیرا نہ جاسکے گا اور ان کو گھیرے گی وہ چیز جس کا وہ مذاق اڑا رہے تھے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے چھ دنوں یعنی چھ ادوار (periods) میں پیدا کیا ہے۔زمین پر ایک ایسا دور گزرا ہے جب کہ اس کی سطح پانی سے ڈھکی ہوئی تھی۔خدا کی سلطنت کے اس حصہ میں اس وقت صرف پانی نظر آتا تھا۔اس کے بعد خدا کے حکم سے خشکی کے علاقے ابھر آئے اور پانی سمندروں کی گہرائی میں جمع ہو گیا۔اس طرح یہ ممکن ہوا کہ زمین پر موجودہ انواع حیات ظہور میں آئیں۔

خدا اگر چہ قادر ہے کہ واقعات کو اچانک ظاہر کر دے۔مگر یہ دنیا انسان کے لیے بطور امتحان گاہ بنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے موجودہ دنیا کو منصوبہ کے تحت بنایا اور اپنی تخلیقات پر اسباب کا پردہ قائم رکھا۔

دنیا کی پیدائش اور اس پر انسان کی آبادکاری سے خدا کا مقصود اچھا عمل کرنے والے کا انتخاب ہے۔''اچھا عمل'' دراصل حقیقت پسندانہ عمل کا دوسرا نام ہے۔یعنی کسی دباؤ کے بغیر وہ کرنا جو از روئے حقیقت آدمی کو کرنا چاہیے۔ حقیقت پسند شخص وہ ہے جو اسباب کے ظاہری پردہ سے گزر کر خدا کی چھپی ہوئی کارفرمائی کو دیکھ لے۔ بظاہر اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے اختیار کر لے۔سرکشی کی زندگی گزارنے کا موقع رکھتے ہوئے خدا کا تابعدار بن جائے۔

موجودہ دنیا میں ایسے ہی حقیقت پسند انسانوں کا چناؤ ہو رہا ہے۔جب چناؤ کی یہ مدت ختم ہوگی تو موجودہ نظام کو ختم کر کے دوسرا معیاری نظام بنایا جائے گا جہاں تمام اچھی چیزیں صرف اچھا عمل کرنے والوں کے لیے ہوں گی اور تمام بری چیزیں صرف برا عمل کرنے والوں کے لیے۔

اللہ تعالیٰ اپنے قانون مہلت کی وجہ سے منکروں اور سرکشوں کو فوراً نہیں پکڑتا۔ان کو انتہائی حد تک موقع دیتا ہے کہ وہ یا تو متنبہ ہو کر اپنی اصلاح کر لیں یا آخری طور پر اپنے آپ کو مجرم ثابت کر دیں۔ یہ قانون مہلت بعض سرکشوں کے لیے غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔وہ اپنی حیثیت کو بھول کر بڑی بڑی باتیں کرنے لگتے ہیں۔مگر جب وہ خدا کی پکڑ میں آجائیں گے اس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ وہ خدا کے مقابلہ میں کس قدر بے بس تھے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا
مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿٩﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ
نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ
السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿١٠﴾ اِلَّا
الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿١١﴾

۹۔ اور اگر ہم انسان کو اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں پھر اس سے اس کو محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ ۱۰۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی تھی، اس کو ہم نعمت سے نوازتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ساری مصیبتیں مجھ سے دور ہوگئیں، وہ اترانے والا اور اکڑنے والا بن جاتا ہے۔ ۱۱۔ مگر جو لوگ صبر کرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر۔

موجودہ دنیا میں آدمی کو کبھی راحت دی جاتی ہے اور کبھی مصیبت۔ مگر یہاں نہ راحت انعام کے طور پر ہے اور نہ مصیبت سزا کے طور پر۔ دونوں ہی کا مقصد جانچ ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں انسان کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے وہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مختلف حالات میں آدمی نے کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔

وہ آدمی ناکام ہے جس کا حال یہ ہو کہ جب اس کو خدا کی طرف سے کوئی راحت پہنچے تو وہ فخر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ اور جو افراد اس کو اپنے سے کم دکھائی دیں ان کے مقابلہ میں وہ اکڑنے لگے۔ اسی طرح وہ شخص بھی ناکام ہے کہ جب اس سے کوئی چیز چھنے اور وہ مصیبت کا شکار ہو تو وہ ناشکری کرنے لگے۔ کسی محرومی کے بعد بھی آدمی کے پاس خدا کی دی ہوئی بہت سی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ مگر آدمی ان کو بھول جاتا ہے اور کھوئی ہوئی چیز کے غم میں ایسا پست ہمت ہوتا ہے گویا اس کا سب کچھ لٹ گیا ہے۔

اس کے برعکس، ایمان میں پورا اترنے والے وہ ہیں جو صابر اور صالح العمل ہوں۔ یعنی ہر جھٹکے کے باوجود اپنے آپ کو اعتدال پر باقی رکھیں اور وہی کریں جو خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے انھیں کرنا چاہیے۔

صبر یہ ہے کہ آدمی کی نفسیات حالات کے زیر اثر نہ بنے بلکہ اصول اور نظریہ کے تحت بنے۔ حالات خواہ کچھ ہوں وہ ان سے بلند ہو کر خالص حق کی روشنی میں اپنی رائے بنائے۔ وہ حالات سے غیر متاثر رہ کر اپنے عقیدہ اور شعور کی سطح پر زندہ رہنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اسی قسم کی زندگی نیک عملی کی زندگی ہے۔ جو لوگ اس نیک عملی کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو اگلی زندگی میں خدا کی رحمتوں کے حصہ دار ہوں گے اور خدا کی ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَاۗىِٕقٌۢ
بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ
اَوْ جَاۗءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ

۱۲۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس چیز کا کچھ حصہ چھوڑ دو جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے۔ اور تم اس بات پر تنگ دل ہو کہ وہ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں

عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ
قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّ ادْعُوْا
مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِیْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ
اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ
اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

آیا۔ تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے۔ ۱۳۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کتاب کو گھڑ لیا ہے۔ کہو، تم بھی ایسی ہی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ ۱۴۔ پس اگر وہ تمھارا کہا پورا نہ کر سکیں تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر کیا تم حکم مانتے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شرک کی تردید کی اور لوگوں کو توحید کی طرف بلایا تو آپ کے مخاطبین بگڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی باتوں سے ان کے ان بڑوں پر زد پڑتی تھی جن کے دین کو انھوں نے اختیار کر رکھا تھا اور جن سے انتساب پر وہ فخر کرتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ قدیم عربوں کے یہ اکابر تاریخی طور پر ان کی نظر میں باعظمت بنے ہوئے تھے، جب کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ ابھی تاریخ کی عظمتیں شامل نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت آپ لوگوں کو ایک بے حیثیت انسان کے روپ میں نظر آتے تھے۔ عرب کے لوگ یہ دیکھ کر سخت برہم ہوتے تھے کہ ایک معمولی آدمی ایسی باتیں کہہ رہا ہے جس سے ان کے اکابر و اعاظم بے اعتبار ثابت ہو رہے ہیں۔

ایسی حالت میں داعی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ وہ، کم از کم وقتی طور پر، تنقیدی انداز سے پرہیز کرے اور صرف مثبت طور پر اپنا پیغام پیش کرے۔ ''شاید تم وحی کے بعض حصہ کی تبلیغ چھوڑ دو گے'' سے مراد وحی خداوندی کا یہی تنقیدی حصہ ہے۔ مگر اللہ تعالی کو وضاحت مطلوب ہے اور تنقید کے بغیر وضاحت ممکن نہیں۔ پھر اگر حق کو پوری طرح کھولنے کے نتیجہ میں لوگ داعی کو استہزاء اور مخالفت کا موضوع بنائیں تو اس سے گھبرانے کی کیا ضرورت۔ مدعو کی طرف سے یہ مخالفانہ ردعمل تو دراصل وہ قیمت ہے جو کسی آدمی کو بے آمیز حق کا داعی بننے کے لیے اس دنیا میں ادا کرنی پڑتی ہے۔

خدا کے داعی کے برحق ہونے کا سب سے زیادہ یقینی ثبوت اس کا ناقابل تقلید کلام ہے۔ جو لوگ پیغمبر کو حقیر سمجھ رہے تھے اور یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس بظاہر معمولی آدمی کو وہ سچائی ملی ہے جو ان کے اکابر کو بھی نہیں ملی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ پیغمبر کی صداقت کو اس معیار پر نہ جانچو کہ مادی اعتبار سے وہ کیسا ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے دیکھو کہ وہ جس کلام کے ذریعہ اپنی دعوت پیش کر رہا ہے وہ کلام اتنا عظیم ہے کہ تم اور تمھارے تمام اکابر مل کر بھی ویسا کلام نہیں بنا سکتے۔ یہ ناقابلِ تقلید امتیاز اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے بول رہا ہے۔ پیغمبر کے برسرحق ہونے کی اس واضح نشانی کے بعد آخر لوگوں کو خدا کا حکم بردار بننے میں کس چیز کا انتظار ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا نُوَفِّ
اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَ هُمْ فِیْهَا لَا

۱۵۔ جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتے ہیں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتے ہیں۔ اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی

يُبْخَسُوْنَ ﴿١٥﴾ أُولَٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾

جاتی۔ ۱۶۔یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا وہ برباد ہوا اور خراب گیا جو انھوں نے کمایا تھا۔

دین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملاوٹی دین، دوسرا بے آمیز دین۔ ملاوٹی دین دراصل دنیا کے اوپر دین کا لیبل لگانے کا دوسرا نام ہے۔ وہ دنیا اور دین کے درمیان مصالحت کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ ملاوٹی دین کی بنیاد پر بڑے بڑے ادارے قائم ہوتے ہیں۔ مفاد پرست لوگ اس کے ذریعے دین کے نام پر دنیا حاصل کر لیتے ہیں۔

بے آمیز دین کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ بے آمیز دین کی دعوت جب کسی ماحول میں اٹھتی ہے تو وہ صرف ایک نظری سچائی ہوتی ہے۔ معاشی مفادات اور قیادتی مصالح اس کے ساتھ جمع نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں جو لوگ ملاوٹی دین کے نام پر عزت اور مقام حاصل کیے ہوئے ہوں ان کے سامنے جب بے آمیز دین کی دعوت آتی ہے تو وہ سخت متوحش ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کو اختیار کرنے کی صورت میں انھیں نظر آتا ہے کہ تمام دنیوی چیزیں ان سے چھن جائیں گی۔

اس اعتبار سے کسی ماحول میں بے آمیز دین کی دعوت کا اٹھنا وہاں ایک نازک امتحان کا برپا ہونا ہے۔ ایسے وقت میں جو لوگ دنیا کی عزت اور دنیا کے مفادات کو قابلِ ترجیح سمجھیں اور بے آمیز دین کا ساتھ نہ دیں ان کی ساری دوڑ دھوپ دنیا کے خانہ میں چلی جاتی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اس دین کا ساتھ دیا جس میں ان کے دنیوی مفادات محفوظ تھے۔ اور اس دین کا ساتھ نہ دیا جس میں انھیں اپنے دنیوی مفادات چھنتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ بظاہر خواہ دینی سرگرمیوں میں مشغول ہوں، اصل مقصود کے اعتبار سے وہ دنیا کے حصول میں مشغول ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوششوں کا آخرت میں کوئی نتیجہ ملنا ممکن نہیں۔

انھوں نے اگرچہ اپنی سرگرمیوں کو دین کے نام سے موسوم کر رکھا تھا وہ اپنے قومی میلوں کے اوپر جشن دینی کا بورڈ لگاتے تھے۔ وہ اپنی قومی لڑائیوں کو مقدس جنگ کا نام دیتے تھے۔ وہ اپنی قیادتی نمائش کو دینی کانفرنس کہتے تھے، وہ اپنے سیاسی ہنگاموں کو مذہب کی اصطلاحات میں بیان کرتے تھے، وہ اپنے دنیوی جذبات کے تحت دھوم مچاتے تھے اور اس کو خدا اور رسول کے ساتھ جوڑتے تھے۔ مگر یہ ساری تعمیرات دنیا کی زمین میں تھیں، وہ آخرت کی زمین میں نہ تھیں، اس لیے قیامت کا زلزلہ انھیں بالکل برباد کر دے گا۔ اگلی دنیا میں ان کا کوئی انجام ان کے حصہ میں نہ آئے گا۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ

۱۷۔ بھلا ایک شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل پر ہے، اس کے بعد اللہ کی طرف سے اس کے لیے ایک گواہ بھی آ گیا، اور اس سے پہلے

رَحْمَةً ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود تھی، ایسے ہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جماعتوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے وعدہ کی جگہ آگ ہے۔ پس تم اس کے بارے میں کسی شک میں نہ پڑو۔ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔

پیغمبر اسلام نے عرب میں توحید کی دعوت پیش کی تو کچھ لوگوں نے اس کو مانا اور زیادہ لوگ اس کے منکر ہو گئے۔ یہی ہر زمانہ میں دعوت حق کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

خدا نے ہر آدمی کو فطرتِ صحیح پر پیدا کیا ہے۔ گردوپیش کی دنیا میں ہر طرف ایسی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو اپنے خالق کا اعلان کرتی ہیں اور اسی کے ساتھ اس کے تخلیقی منصوبہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ پھر انسانیت کے بالکل ابتدائی زمانہ سے خدا کے رسول آتے رہے اور خدا کی باتیں لوگوں کو بتاتے رہے۔ انھیں میں سے ایک پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جن کی لائی ہوئی کتاب اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اب جو شخص سنجیدہ ہو اور چیزوں سے سبق لینا جانتا ہو تو وہ حقیقت سے اتنا مانوس ہوگا کہ داعی جب اس کے سامنے حقیقت کا اعلان کرے گا تو فوراً وہ اس کو پہچان لے گا۔ اس کا دل اور اس کا دماغ حق کے حق ہونے پر گواہی دیں گے۔ وہ آگے بڑھ کر اس کو اس طرح اختیار کر لے گا جیسے وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہو۔

مگر اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو بہت زیادہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں دیکھتے۔ وہ سطحی تماشوں اور وقتی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنا مزاج بگاڑ لیتے ہیں۔ غیر متعلق چیزوں کی مصروفیت انھیں اس کا موقع نہیں دیتی کہ وہ داعی اور اس کی دعوت پر ٹھہر کر سوچیں۔ چنانچہ ان کے سامنے جب حق کی دعوت آتی ہے تو وہ اس کو پہچان نہیں پاتے۔ وہ اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر اس کے منکر بلکہ مخالف بن جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی اور خدا کے تخلیقی منصوبہ کی ناقدری کی۔ ان کے لیے آخرت میں جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسانی فطرت، زمین وآسمان کے واقعات اور پچھلی آسمانی کتابیں قرآن کے حق ہونے کی گواہی دے رہی ہیں۔ اس کے بعد اگر لوگوں کی اکثریت اس کا انکار کرتی ہے تو اس کی وجہ منکرین کے اندر تلاش کی جائے گی، نہ یہ کہ خود قرآن کے کتاب حق ہونے پر شک کیا جائے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ۙ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ

۱۸۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے ظالموں کے اوپر۔

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
هُمْ كٰفِرُوْنَ ⑲ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ
فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا
يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ⑳
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ㉑ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ
الْاَخْسَرُوْنَ ㉒

۱۹۔ان لوگوں کے اوپر جو اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں۔ یہی لوگ آخرت کے منکر ہیں۔ ۲۰۔وہ لوگ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے، ان پر دہرا عذاب ہوگا۔ وہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے۔ ۲۱۔یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انھوں نے گھڑ رکھا تھا۔ ۲۲۔اس میں شک نہیں کہ یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہیں گے۔

''خدا پر جھوٹ گھڑنے'' سے مراد خدا کی ذات پر جھوٹ گھڑنا نہیں ہے۔ اس سے مراد خدا کی بات پر جھوٹ گھڑنا ہے۔ خدا اپنا پیغام سنانے کے لیے خود سامنے نہیں آتا بلکہ ایک انسان کی زبان سے اس کا اعلان کراتا ہے۔ یہ انسان اس وقت بظاہر ایک معمولی انسان ہوتا ہے، مگر اس کے کلام میں خدا کی واضح جھلکیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگ اس کو اس کے کلام کے اعتبار سے دیکھیں تو وہ اس کی عظمتوں میں خدا کو پالیں۔ مگر لوگوں کی سطحیت اور ظاہر پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہیں سنانے والے کی معمولی حیثیت میں اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ پیغمبر کا معمولی ہونا انھیں نظر آتا ہے مگر پیغام کا غیر معمولی ہونا انھیں دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ اس کو ایک عام انسان کا معاملہ سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کی بات میں جھوٹے اعتراضات نکالتے ہیں۔ اور اس کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

اس ظالمانہ رویہ کی اصل وجہ بے خوفی کی نفسیات ہے۔ لوگوں کو آخرت پر یقین نہیں۔ ان کے دلوں میں خدائے قہار وجبار کا خوف نہیں۔ اس لیے وہ اس پیغام کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو پاتے اور جس معاملہ میں آدمی سنجیدہ نہ ہو وہ اس کے متعلق صحیح ردعمل پیش کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے گا۔

مگر لوگوں کی یہ غیر سنجیدگی اس وقت رخصت ہو جائے گی جب وہ قیامت میں مالک کائنات کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت ان کی موجودہ آزادی ان سے چھن چکی ہوگی۔ جن اسباب و وسائل کے بھروسہ پر وہ سرکش بنے ہوئے تھے وہ خدا کا ٹیپ ریکارڈر بن کر ان کے خلاف گواہی دینے لگیں گے۔ اس وقت عیاناً یہ کھل جائے گا کہ خدا کے داعی کو جو انھوں نے جھٹلایا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو سمجھنے سے عاجز تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے بارے میں سنجیدہ نہ تھے۔ قیامت کی ہولناکی اچانک انھیں سنجیدہ بنا دے گی۔ اس وقت اپنی بے بسی کے ماحول میں وہ اس بات کو پوری طرح سمجھ لیں گے جس کو دنیا میں اپنی آزادی کے ماحول میں سمجھ نہیں پاتے تھے۔

اللہ نے انسان کو ایسی اعلیٰ صلاحیتیں دی ہیں کہ اگر وہ ان کو استعمال کرے تو وہ ہر بات کو اس کی گہرائی تک سمجھ سکتا ہے۔ اور اپنے دنیوی معاملات میں واقعۃً وہ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ مگر آخرت کے معاملہ میں آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ کان رکھتے ہوئے بہرا بن جاتا ہے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے۔

آدمی کی کامیابی اس کی سنجیدگی (sincerity) کی قیمت ہے۔ جو لوگ دنیا کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ دنیا میں کامیاب رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ آخرت میں کامیاب رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰی وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِیْرِ وَ السَّمِیْعِ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع ۲

۲۳۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی، وہی لوگ جنت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۴۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے اور سننے والا۔ کیا یہ دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ کیا تم غور نہیں کرتے۔

اخبات کے معنی ہیں عاجزی کرنا۔ عربی میں کہتے ہیں، ھو خبیت القلب (وہ شکستہ دل ہے)۔ یہی ایمان کا خلاصہ ہے۔ ایمان نہ کوئی وراثت ہے اور نہ کسی لفظی مجموعہ کی لسانی ادائیگی۔ ایمان ایک دریافت ہے۔ آدمی جب اپنے سمع وبصر (بالفاظ دیگر شعور) کو استعمال کر کے خدا کو پاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کا ادراک کرتا ہے تو اس وقت اس کے اوپر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسی کا نام عجز (اخبات) ہے۔ عجز خدا کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کی پہچان کا لازمی نتیجہ ہے۔

ایمان، اخبات اور عمل صالح تینوں ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ ایمان خدا کے وجود اور اس کی صفات کمال کی شعوری دریافت ہے۔ اخبات اس قلبی حالت کا نام ہے جو خدا کی دریافت کے نتیجہ میں لازماً آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ عمل صالح اسی شعور اور اسی کیفیت سے پیدا ہونے والی خارجی صورت ہے۔ آدمی جب خدا کے ذہن سے سوچتا ہے۔ جب اس کا دل خدائی کیفیات سے بھر جاتا ہے تو اس وقت اس کے عین فطری نتیجے کے طور پر اس کی ظاہری زندگی خدائی عمل میں ڈھل جاتی ہے۔ اسی کا نام عمل صالح ہے۔ جو شخص ایمان، اخبات اور عمل صالح کا پیکر بن جائے وہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ اور وہی وہ انسان ہے جس کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے گا۔

دنیا میں اعلیٰ ترین امتحانی حالات پیدا کر کے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اپنے آپ کو کیا ثابت کرتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے اپنے سمع وبصر (شعور) کو صحیح طور پر استعمال کر کے حقیقت واقعہ کو جانا اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیا۔ یہ دیکھنے اور سننے والے لوگ ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اپنے سمع وبصر کو صحیح طور پر

استعمال نہیں کیا۔ اس کو نہ حقیقت واقعہ کی معرفت حاصل ہوئی اور نہ وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال سکا۔ یہ اندھے اور بہرے لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں بالکل مختلف قسم کے انسان ہیں۔ اور دو مختلف انسانوں کا انجام ایک جیسا نہیں ہوسکتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٥﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٦﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾

۲۵۔ اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تم کو کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۲۶۔ یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ میں تم پر ایک درد ناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ ۲۷۔ اس کی قوم کے سرداروں نے کہا، جنھوں نے انکار کیا تھا کہ ہم تو تم کو بس اپنے جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی تمھارا تابع ہوا ہو، سوائے ان کے جو ہم میں پست لوگ ہیں، بے سمجھے بوجھے۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ تم کو ہمارے اوپر کچھ بڑائی حاصل ہے، بلکہ ہم تو تم کو جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

خدا کے جتنے پیغمبر آئے، اسی لیے آئے کہ وہ انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ کریں۔ یہ منصوبہ کہ انسان موجودہ دنیا میں بغرض امتحان رکھا گیا ہے۔ یہاں اگر چہ بظاہر مختلف چیزوں کی عبادت کے مواقع ہیں۔ مگر اصل مطلوب صرف یہ ہے کہ انسان خدا کا عابد بنے۔ جو لوگ خدا کے عابد نہ بنیں وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے مرنے کے بعد کی زندگی میں سخت عذاب ہے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہی بات کہی۔ وہ اس کے لیے نذیر مبین بن گئے۔ مگر آپ کی قوم نے آپ کی بات نہیں مانی۔

اس کی وجہ لوگوں کی ظاہر پرستی تھی۔ انسان کی گمراہی کی نظریاتی طور پر بہت سی قسمیں ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر دور کے انسانوں کی گمراہی صرف ایک رہی ہے۔ اور وہ ہے ظاہر پرستی یا دنیا پسندی۔ دنیا پرست لوگ، عین اپنے مزاج کے مطابق، دنیوی چیزوں کو حق اور ناحق کا معیار سمجھتے ہیں۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جس کے پاس ظاہری رونقیں ہوں وہ حق پر ہے اور جو دنیا کی رونقوں سے محروم ہو وہ ناحق پر۔

خدا کا داعی جب اٹھتا ہے تو اپنے ہم عصروں کو وہ صرف انسانوں میں سے ایک انسان نظر آتا ہے۔ دنیوی اعتبار سے اس کے گرد و پیش بڑائی کا کوئی خصوصی نشان نہیں ہوتا۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جس دین کا علم بردار ہوتا ہے اس کے ساتھ چوں کہ ابھی تک دنیوی فائدے وابستہ نہیں ہوتے، اس لیے اس کی طرف بڑھنے

والے زیادہ وہ تہی دست لوگ ہوتے ہیں جنھیں ایک "نئے دین" کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کچھ کھونا نہ پڑے۔ یہ صورت حال خاص طور پر، وقت کے بڑوں کے لیے، فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ جب دنیا ان کے ساتھ نہیں ہے تو حق بھی ان کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ حتی کہ قوم میں ایسے لوگ بھی نکلتے ہیں جو ان کو جھوٹا اور دھوکا باز کہنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَ اٰتٰٮنِىۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِهٖ فَعُمِّيَتۡ عَلَيۡكُمۡ ؕ اَنُلۡزِمُكُمُوۡهَا وَاَنۡتُمۡ لَهَا كٰرِهُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَ يٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَلٰـكِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوۡمِ مَنۡ يَّنۡصُرُنِىۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ طَرَدْتُّهُمۡ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَـكُمۡ عِنۡدِىۡ خَزَآٮِٕنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ وَلَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّىۡ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِيۡنَ تَزۡدَرِىۡۤ اَعۡيُنُكُمۡ لَنۡ يُّؤۡتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيۡرًا ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ ۖۚ اِنِّىۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾

۲۸۔ نوح نے کہا اے میری قوم، بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ پر اپنے پاس سے رحمت بھیجی ہے، مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا سکتے ہیں جب کہ تم اس سے بیزار ہو۔ ۲۹۔ اور اے میری قوم، میں اس پر تم سے کچھ مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمہ ہے اور میں ہرگز ان کو اپنے سے دور کرنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے رب سے ملنا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں تم لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔ ۳۰۔ اور اے میری قوم، اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کے مقابلہ میں کون میری مدد کرے گا۔ کیا تم غور نہیں کرتے۔ ۳۱۔ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب کی خبر رکھتا ہوں۔ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو لوگ تمھاری نگاہوں میں حقیر ہیں، ان کو اللہ کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو میں ہی ظالم ہوں گا۔

یہاں "بینہ" سے مراد دلیل ہے اور رحمت سے مراد نبوت ہے (تفسیر النسفی، جلد 2، صفحہ 55)۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر جب کسی قوم کو دعوت دیتا ہے تو وہ دو چیزوں کے اوپر کھڑا ہوتا ہے، دلیل اور نبوت۔ پیغمبر کے بعد کوئی داعی بھی اسی وقت داعی ہے جب کہ وہ انھیں دو چیزوں پر کھڑا ہو۔ اس فرق کے ساتھ کہ دلیل کے بعد

دوسری چیز جو اس کے پاس ہوگی وہ بالواسطہ طور پر پیغمبر سے ملی ہوگی۔ جب کہ پیغمبر کے پاس وہ براہِ راست خدا کی طرف سے آئی ہے۔

قوم جس وقت خدا کے داعی کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے کہ اس کے یہاں ظاہری اعتبار سے کوئی قابل لحاظ چیز نہیں، عین اسی وقت اس کے پاس ایک بہت بڑی قابل لحاظ چیز موجود ہوتی ہے۔ اور وہ دلیل اور ہدایت ہے۔ دلیل اور ہدایت کی بڑائی کامل طور پر خدا کے داعی کے پاس موجود ہوتی ہے۔ مگر یہ بہر حال معنوی بڑائی ہے۔ اور جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر میں اٹکی ہوئی ہوں ان کو معنوی بڑائی کیوں کر دکھائی دے گی۔

دعوت الی اللہ کا کام خالص اخروی کام ہے۔ اس کی صحیح کارکردگی کے لیے ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان زر اور زمین کے جھگڑے نہ ہوں۔ یہ ذمہ داری خود داعی کو لینی پڑتی ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ہو۔ اور اس کی خاطر وہ ہر قسم کے مادی اور معاشی جھگڑے یک طرفہ طور پر ختم کر دے۔ جس داعی کا یہ حال ہو کہ وہ ایک طرف دعوت دے اور دوسری طرف مدعو سے دنیوی چیزوں کے لیے احتجاج اور مطالبہ بھی کر رہا ہو، وہ داعی نہیں، مسخرہ ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہ مدعو کی نظر میں ہو سکتی ہے اور نہ خدا کی نظر میں۔

مدعو کا امتحان یہ ہے کہ وہ بظاہر ایک بے عظمت انسان کے اندر حق کی عظمت کو دیکھ لے۔ اسی طرح داعی کا امتحان یہ ہے کہ وہ کسی بے دین کا اس لیے استقبال نہ کرنے لگے کہ وہ مال وجاہ کا مالک ہے، اور کسی دین دار کو اس لیے ناقابلِ لحاظ نہ سمجھ لے کہ اس کے پاس دنیوی شان وشوکت کی چیزیں موجود نہیں۔ داعی اگر ایسا کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ زبان سے آخرت کی اہمیت کا وعظ کہہ رہا ہے اور عمل سے دنیا کی اہمیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنی تردید آپ ہے۔ اور جو شخص اپنی تردید آپ کرے اس کی بات کی دوسروں کی نظر میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا
فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣٢﴾
قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ
اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ
اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ
اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَ اِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٤﴾ؕ

۳۲۔ انھوں نے کہا کہ اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کر لیا۔ اب وہ چیز لے آؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے رہے ہو، اگر تم سچے ہو۔ ۳۳۔ نوح نے کہا اس کو تو تمھارے اوپر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ جا سکو گے۔ ۳۴۔ اور میری نصیحت تم کو فائدہ نہیں دے گی اگر میں تم کو نصیحت کرنا چاہوں جب کہ اللہ یہ چاہتا ہو کہ وہ تم کو گمراہ کرے۔ وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت نوح نے اپنی قوم سے جدال (جھگڑا اور مناظرہ) نہیں کیا تھا۔ وہ سنجیدہ انداز میں اپنا صالح پیغام ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مگر آپ کی سنجیدہ دعوت آپ کی قوم کو الٹی صورت میں نظر آرہی تھی۔ اس کی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جب اس کی اپنی ذات زد میں آرہی ہو تو وہ سنجیدگی کھو دیتا ہے۔ ایسی بات کو وہ دلیل اور ثبوت کے اعتبار سے نہیں دیکھتا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس کو رد کر دیتا ہے۔ داعی حق کی ٹھوس دلیل بھی اس کو بحث وجدال معلوم ہونے لگتی ہے۔

''بہت جدال کر چکے'' کا جملہ دراصل یہ بتانے کے لیے نہیں ہے کہ نوح نے کیا کہا تھا۔ بلکہ وہ اس کو بتاتا ہے کہ سننے والوں نے آپ کی بات کو کیا درجہ دیا تھا۔

اسی طرح مخالفینِ نوح کا عذاب کو طلب کرنا حقیقۃً عذاب کو طلب کرنا نہیں تھا۔ بلکہ حضرت نوح کا مذاق اڑانا تھا کہ دیکھو یہ شخص ایسی بات کہہ رہا ہے جو کبھی ہونے والی نہیں۔ وہ اپنی پوزیشن کو اتنا مستحکم سمجھتے تھے جس میں ان کے خیال کے مطابق کہیں سے عذاب آنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی ذہن کے تحت انھوں نے کہا کہ ہمارے انکار کی سزا میں جس عذاب کی تم خبر دیتے رہے ہو وہ عذاب لاؤ۔ اور چونکہ ان کے نزدیک ایسا عذاب کبھی آنے والا نہ تھا اس لیے اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ہم حق پر ہیں اور تم ناحق پر۔

حضرت نوح نے جواب دیا کہ تم معاملہ کو میری نسبت سے دیکھ رہے ہو اور چوں کہ میں کمزور ہوں اس لیے تمھاری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عذاب کبھی تمھارے اوپر آسکتا ہے۔ اگر معاملہ کو خدا کی نسبت سے دیکھتے تو تم یہ نہ کہتے۔ کیونکہ پھر تمھیں نظر آجاتا کہ اس دنیا میں ظالموں کے لیے عذاب کا آنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا سورج کا نکلنا اور زلزلہ کا پھٹنا۔

داعیٔ حق کی بات کو ماننے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ سننے والا اس کو کہنے والے کے اعتبار سے نہ دیکھے بلکہ جو کہا گیا ہے اس کے اعتبار سے دیکھے۔ چوں کہ حضرت نوح کی قوم آپ کی بات کو بس ایک عام انسان کی بات سمجھ رہی تھی، اس لیے آپ نے فرمایا کہ اس ذہن کے تحت تم میری بات کی قدر و قیمت کبھی نہیں پاسکتے۔ اب تو تمھارے لیے اسی دن کا انتظار کرنا ہے جب کہ خدا براہِ راست تمھارے سامنے آجائے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع ۳ / ۱۱ / ۲

۳۵۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرا جرم میرے اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو، اس سے میں بری ہوں۔

جو لوگ کہتے تھے کہ پیغمبر نے یہ کلام خود گھڑ لیا ہے، یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے، وہ وحی و الہام کے منکر نہ تھے۔ حتی کہ وہ ماضی کے رسولوں کو مانتے تھے۔ پھر انھوں نے ایسا کیوں کہا۔ یہ دراصل وحی کا انکار نہیں تھا بلکہ صاحب وحی کا انکار تھا۔ جو شخص خدا کی طرف سے بول رہا تھا وہ دیکھنے میں ان کو ایک معمولی انسان دکھائی دیتا

تھا۔ ان کا ظاہر پرست مزاج سمجھ نہیں پاتا تھا کہ ایسا ایک آدمی وہ شخص کیسے ہوسکتا ہے جس کو خدا نے اپنے پیغام کی پیغام بری کے لیے چنا ہو۔

''میرا جرم میرے اوپر، تمھارا جرم تمھارے اوپر'' یہ دراصل کلمہ رخصت ہے۔ جب مخاطب دلیل سے بات کو نہیں مانتا، ہر قسم کی وضاحت کے باوجود وہ انکار پر تلا ہوا ہے تو داعی محسوس کرتا ہے کہ اس کے لیے اب آخری چارۂ کار صرف یہ ہے کہ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوجائے کہ میں اور تم دونوں حاکم اصلی کے سامنے پیش ہونے والے ہیں۔ وہاں ہر ایک کا حال کھل جائے گا۔ اور ہر آدمی اپنی حقیقت کے اعتبار سے جیسا تھا اس کے مطابق اسے بدلہ دیا جائے گا۔ جب دلیل کی حد ختم ہوجائے تو داعی کے لیے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ وہ یقین کی زبان میں کلام کر کے علیحدگی اختیار کر لے۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

۳۶۔ اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمھاری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا، سوا اس کے جو ایمان لا چکا ہے۔ پس تم ان کاموں پر غمگین نہ ہو جو وہ کر رہے ہیں۔ ۳۷۔ اور ہمارے روبرو اور ہمارے حکم سے تم کشتی بناؤ اور ظالموں کے حق میں مجھ سے بات نہ کرو، بے شک یہ لوگ غرق ہوں گے۔ ۳۸۔ اور نوح کشتی بنانے لگا۔ اور جب اس کی قوم کا کوئی سردار اس پر گزرتا تو وہ اس کی ہنسی اڑاتا، انھوں نے کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنسیں گے۔ ۳۹۔ تم جلد جان لوگے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کر دے اور اس پر وہ عذاب اترتا ہے جو دائمی ہے۔

انسان سے جو ایمان مطلوب ہے وہ ایمان وہ ہے جب کہ آدمی شعوری طور پر اپنے آزادانہ فیصلہ سے ایمان قبول کرے۔ پیغمبر کے طویل دعوتی عمل کے باوجود جو لوگ ایمان نہ لائیں وہ ایسا کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ آزادانہ فیصلہ کے تحت خدا کے مومن بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی آزادی چھین لی جائے اور ان کو لے جا کر براہِ راست خدائے ذوالجلال کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تاکہ جس چیز کا انھوں نے مومنانہ اقرار نہیں کیا تھا، اس کا وہ مجرمانہ اقرار کریں اور اپنی سرکشی کی سزا بھگتیں۔

حضرت نوح کی سیکڑوں سال کی تبلیغ کے بعد ان کی قوم کے لیے یہ وقت آ گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت نوح سے کہہ دیا گیا کہ اب تبلیغ کے کام سے فارغ ہو کر کشتی تیار کرو تاکہ جب سرکشوں کو غرق کرنے کے لیے خدا

کا سیلاب آئے تو اس وقت تم اور تمھارے ساتھی اہل ایمان اس میں پناہ لے سکیں۔

حضرت نوح نے ایک بہت بڑی تین منزلہ کشتی تیار کی۔ اس کو بنانے میں کئی سال لگ گئے۔ جس زمانہ میں حضرت نوح اپنے چند ساتھیوں کو لے کر کشتی بنا رہے تھے تو قوم کے سرکش لوگ آتے جاتے ہوئے اسے دیکھتے۔ چوں کہ وہ لوگ عذاب کی بات کو محض فرضی سمجھ رہے تھے اس لیے جب انھوں نے دیکھا کہ آنے والے مفروضہ عذاب سے بچنے کے لیے کشتی بھی تیار کی جارہی ہے تو وہ حضرت نوح کا اور بھی زیادہ مذاق اڑانے لگے۔

ایک آدمی سرکشی اور ناانصافی کے ذریعہ دولت سمیٹ رہا ہو تو ظاہر پرست آدمی اس کے گرد دنیا کا ساز و سامان دیکھ کر اس کو کامیاب سمجھ لے گا۔ مگر جو شخص جانتا ہو کہ دنیا کا نظام اخلاقی قوانین پر چل رہا ہے، وہ مذکورہ شخص کی وقتی کامیابی میں مستقبل کی عظیم تباہی کا منظر دیکھ رہا ہوگا — قوم نوح کے ظاہر پرست لوگ اگرچہ حضرت نوح کا مذاق اڑا رہے تھے، مگر حقیقتِ واقعہ کی نظر میں خود ان کا مذاق اڑ رہا تھا۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ

۴۰۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور طوفان ابل پڑا، ہم نے نوح سے کہا کہ ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوا ان اشخاص کے جن کی بابت پہلے کہا جاچکا ہے اور سب ایمان والوں کو بھی۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ ۴۱۔ اور نوح نے کہا کہ کشتی میں سوار ہوجاؤ، اللہ کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا بھی۔ بیشک میرا رب بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۴۲۔ اور کشتی پہاڑ جیسی موجوں کے درمیان ان کو لے کر چلنے لگی۔ اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جو اس سے الگ تھا۔ اے میرے بیٹے، ہمارے ساتھ سوار ہوجا اور منکروں کے ساتھ مت رہ۔ ۴۳۔ اس نے کہا میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی سے بچا لے گا۔ نوح نے کہا کہ آج کوئی اللہ کے حکم سے بچانے والا نہیں، مگر وہ جس پر اللہ رحم کرے۔ اور دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ ڈوبنے والوں میں شامل ہوگیا۔ ۴۴۔ اور کہا گیا کہ اے

وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

زمین، اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا۔ اور پانی سکھا دیا گیا۔ اور معاملہ کا فیصلہ ہو گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہو ظالموں کی قوم۔

جب کشتی بن کر تیار ہو گئی تو خدا کے حکم سے طوفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ زمین سے پانی کے دہانے پھوٹ پڑے۔ اوپر سے مسلسل بارش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ تمام لوگ اس میں ڈوب گئے۔ صرف وہ چند انسان اور کچھ مویشی بچے جو حضرت نوح کی کشتی میں سوار تھے۔ حتی کہ حضرت نوح کا بیٹا بھی غرق ہو گیا — خدا کی نظر میں کسی کی قیمت اس کے عمل کے اعتبار سے ہے، نہ کہ رشتہ کے اعتبار سے، خواہ وہ رشتہ پیغمبر کا کیوں نہ ہو۔

جب تمام ڈوبنے والے ڈوب چکے تو خدا نے حکم دیا کہ طوفان تھم جائے، اور طوفان تھم گیا۔ پانی سمندروں اور دریاؤں میں چلا گیا اور زمین دوبارہ رہنے کے قابل ہو گئی۔

طوفانِ نوح کے موقع پر دیکھنے والوں نے یہ منظر دیکھا کہ اونچے پہاڑ پر چڑھنے والے ڈوب گئے اور ہولناک موجوں کے باوجود کشتی میں بیٹھنے والے سلامت رہے۔ اس کی وجہ خود پہاڑ میں یا کشتی میں نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حکم خداوندی کا معاملہ تھا۔ حکم خداوندی اگر پہاڑ کے ساتھ ہوتا تو پہاڑ اپنے چڑھنے والوں کو بچاتا اور کشتی کا سہارا لینے والے ہلاک ہو جاتے۔ مگر اس موقع پر حکم خداوندی کشتی کے ساتھ تھا۔ اس لیے کشتی والے محفوظ رہے اور دوسری چیزوں کی پناہ لینے والے غرق ہو گئے۔

دنیا میں اسباب کا نظام محض ایک پردہ ہے۔ ورنہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے براہِ راست خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری پردہ سے گزر کر اصل حقیقت کو دیکھ لے۔ وہ اسباب کے اندر خدائی طاقتوں کو کام کرتا ہوا پا لے۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۗ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۗ

۴۵۔ اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے، اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے۔ اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔ ۴۶۔ خدا نے کہا اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں نہیں۔ اس کے کام خراب ہیں۔ پس مجھ سے اس چیز کے لیے سوال نہ کرو جس کا تمھیں علم نہیں۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔ ۴۷۔ نوح نے کہا کہ اے میرے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں

وَ اِلَّا تَغْفِرْلِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۴۷﴾

کہ تجھ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اور اگر تو مجھے معاف نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میں برباد ہو جاؤں گا۔

طوفانِ نوح میں جو لوگ غرق ہوئے ان میں خود حضرت نوح کا بیٹا کنعان بھی تھا۔ حضرت نوح نے اس کو اپنی کشتی میں بٹھانا چاہا۔ مگر اس کے لیے ڈوبنا مقدر تھا اس لیے وہ نہیں بیٹھا۔ پھر انھوں نے اس کے بچاؤ کے لیے خدا سے دعا کی تو جواب ملا کہ یہ نادانی کا سوال ہے، ایسے سوالات نہ کرو۔

اصل یہ ہے کہ خدا کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں ہوتا کہ جو لوگ بزرگوں کی اولاد ہیں۔ یا جو کسی حضرت کا دامن تھامے ہوئے ہیں ان سب کو نجات یافتہ قرار دے کر جنتوں میں داخل کر دیا جائے۔ خدا کے یہاں نجات کا فیصلہ خالص عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے، نہ کہ نسبی یا گروہی تعلق کی بنیادوں پر۔

دنیا میں اگر نسبی رشتہ کا اعتبار ہے تو آخرت میں اخلاقی رشتہ کا اعتبار۔ طوفانِ نوح اسی لیے آیا تھا کہ انسانوں کے درمیان دوسری تمام تقسیمات کو توڑ کر اخلاقی تقسیم قائم کر دے۔ جو عملِ صالح والے لوگ ہیں ان کو خدائی کشتی میں بٹھا کر بچا لیا جائے اور غیر عمل صالح والے تمام لوگوں کو طوفان کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی واقعہ دوبارہ قیامت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور زیادہ کامل طور پر ہوگا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ ع ۴

۴۸۔ کہا گیا کہ اے نوح، اترو، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر اور ان گروہوں پر جو تمھارے ساتھ ہیں۔ اور (ان سے ظہور میں آنے والے) گروہ کہ ہم ان کو فائدہ دیں گے، پھر ان کو ہماری طرف سے ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ ۴۹۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمھاری قوم۔ پس صبر کرو بے شک آخری انجام ڈرنے والوں کے لیے ہے۔

جب تمام برے لوگ غرق ہو چکے تو طوفان تھم گیا۔ پانی دھیرے دھیرے زمین میں اور سمندروں میں چلا گیا۔ حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی تھی، آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سے نکل کر زمین پر اترے۔ زمین دوبارہ خدا کے حکم سے سرسبز اور آباد ہو گئی۔

حضرت نوح جن لوگوں کے درمیان آئے وہ حضرت آدم کی نبوت کو ماننے والے لوگ تھے۔ آپ کے بعد

آپ کی امت ابتداءً راہ راست پر رہی۔ اس کے بعد اس کی اگلی نسلوں میں بگاڑ آیا تو دوبارہ انبیاء بھیجے گئے۔ یہ بعد کو آنے والے انبیاء ان قوموں میں آئے جو حضرت نوح کی نبوت کو مانتی تھیں۔ اس کے باوجود جب انھوں نے وقت کے نبی کو مان کر اپنی اصلاح نہ کی تو وہ ہلاک کردی گئیں۔ گویا صرف کسی نبی کو ماننا یا اس کی طرف اپنے کو منسوب کرنا نجات یافتہ ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایمان مطلوب ہے جو زندہ ایمان ہو اور جس کے اندر یہ طاقت ہو کہ وہ آدمی کی زندگی کو نیک عملی کی زندگی میں تبدیل کردے۔

حضرت نوح کی تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ باطل پرستوں کا زور خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اور ان کی زندگی خواہ کتنی ہی طویل ہو جائے، بالآخر ان کے لیے جو چیز مقدر ہے وہ ہلاکت ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اہلِ ایمان خواہ کتنے ہی کم ہوں اور خواہ وہ بظاہر کتنے ہی بے زور ہوں۔ مگر جب خدا کا فیصلہ ظاہر ہوتا ہے تو یہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنائے جاتے ہیں، ابتداءً موجودہ دنیا میں اور آخری طور پر آخرت میں۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۵۲﴾

۵۰۔ اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ ۵۱۔ اے میری قوم، میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔ ۵۲۔ اور اے میری قوم، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تمھارے اوپر خوب بارشیں برسائے گا۔ اور تمھاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ اور تم مجرم ہو کر روگردانی نہ کرو۔

قوم عاد کی ہدایت کے لیے حضرت ہود کو اٹھایا گیا جو انھیں کے بھائی تھے۔ یہ پیغمبروں کے باب میں ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ قوم کا فرد ہونے کی وجہ سے وہ بخوبی طور پر قوم کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی زبان کو جانتے ہیں اور زیادہ موثر طور پر اس کے اندر دعوت حق کا کام کرسکتے ہیں۔

حضرت ہود نے اپنی قوم کو ایک اللہ کی عبادت کا پیغام دیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ تمھارا جو دین ہے وہ محض ایک جھوٹ ہے جو تم نے گھڑ لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا طریقہ معروف معنوں میں صرف ''مثبت طور پر'' اپنی بات کہنے کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ وہ کھلی کھلی تنقید بھی کرتا ہے۔ کیوں کہ جب تک تنقید وتجزیہ کے ذریعہ ناحق کا ناحق ہونا واضح نہ کیا جائے اس وقت تک حق کا حق ہونا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

ہر پیغمبر کے زمانہ میں ایسا ہوا کہ اس کے مخالفین اس کی پیغمبری کو ماننے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ وہ کوئی

بڑا عہدیدار ہو، اس کو دولت کے خزانے حاصل ہوں، وہ عالی شان عمارتوں میں رہتا ہو۔ مگر حق کے داعی کو جانچنے کا یہ معیار صحیح نہیں۔ داعی کی صداقت جانچنے کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ اپنے مشن میں پوری طرح سنجیدہ ہو، اس کی بات آخری حد تک مدلّل ہو۔ وہ ہر قسم کی دنیوی غرض سے بالاتر ہو۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ عین حقیقتِ واقعہ ہو۔ اس کا پیغام کائناتی نظام سے کامل مطابقت رکھتا ہو۔ اس کو اختیار کرنا کامیابی کی شاہراہ پر چلنا ہو۔

تمھاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ اس فقرہ کا مطلب مادی قوت میں اضافہ نہیں ہے۔ کیونکہ قوم عاد اپنے زمانہ میں نہایت طاقت ور تھی۔ قرآن (41:15) سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر نے جب ان کو عذاب سے ڈرایا تو انھوں نے کہا کہ ہم سے زیادہ طاقت ور کون ہے (مَنۡ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً)۔ اس لیے مادی قوت میں اضافہ کی بات، دعوتی اعتبار سے ان کے لیے زیادہ پرکشش نہیں ہو سکتی تھی۔

اِس آیت میں قوت پر اضافہ کا مطلب ہے مادی قوت پر ایمانی قوت کا اضافہ۔ پیغمبر کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم ایمانی زندگی اختیار کر لو تو اس سے تم کو اخلاقی اور روحانی قوت حاصل ہوگی۔ موجودہ مادی زور کے ساتھ اخلاقی اور روحانی زور ملنے سے تمھاری طاقت گھٹے گی نہیں بلکہ وہ مزید بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

قَالُوۡا يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّ مَا نَحۡنُ بِتَارِكِيۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ وَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۝٥٣ اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰىكَ بَعۡضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوۡٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَ اشۡهَدُوۡۤا اَنِّيۡ بَرِيۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ۝٥٤ مِنۡ دُوۡنِهٖ فَكِيۡدُوۡنِيۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ۝٥٥ اِنِّيۡ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيۡ وَرَبِّكُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيۡ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۝٥٦

۵۳۔ انھوں نے کہا کہ اے ہود، تم ہمارے پاس کوئی کھلی ہوئی نشانی لے کر نہیں آئے ہو، اور ہم تمھارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اور ہم ہرگز تم کو ماننے والے نہیں ہیں۔ ۵۴۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تمھارے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔ ہود نے کہا، میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بری ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو۔ ۵۵۔ اس کے سوا۔ پس تم سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو، پھر مجھ کو مہلت نہ دو۔ ۵۶۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا جو میرا رب ہے اور تمھارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔

قوم نے حضرت ہود سے کہا کہ تمھارے پاس اپنے برسرحق ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع بھی حضرت ہود کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ آنجناب کے پاس یقیناً دلیل تھی، مگر وہ

مخاطبین کو دلیل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آدمی عام طور پر کسی بات کو خالص دلیل کی بنیادوں پر جانچ نہیں پاتا بلکہ اس اعتبار سے دیکھتا ہے کہ جو شخص اس کو پیش کر رہا ہے وہ کیسا ہے۔ چوں کہ پیش کرنے والا اپنے زمانہ میں لوگوں کو ایک ناقابلِ لحاظ انسان دکھائی دیتا تھا اس لیے اس کی بات بھی لوگوں کو ناقابلِ لحاظ نظر آتی تھی۔

جب ایک شخص وقت کے جمے ہوئے مذہب کو چھوڑ کر خالص بے آمیز دین کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ماحول میں وہ اجنبی بلکہ حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ لوگ اس کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی ایسا شخص ہو جس کو خللِ دماغی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو۔ حضرت ہود کے معاملہ میں یہی صورت حال تھی جس کی وجہ سے ان کی قوم کے لوگوں کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ”ہمارا تو خیال ہے کہ تمھارے اوپر ہمارے بزرگوں کی مار پڑ گئی ہے“۔ مگر داعیٔ حق کی صداقت کا ثبوت، نظری دلائل کے بعد، ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے مخالفین ہر قسم کی کوششوں کے باوجود اس کو زیر نہیں کر پاتے۔

خدا کے پیغمبر جن قوموں میں آئے وہ سب خدا کو ماننے والی تھیں۔ گویا داعی بھی خدا پرست ہونے کا مدعی تھا اور مدعو بھی خدا پرست ہونے کا مدعی۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا دونوں میں سے کس گروہ کے ساتھ ہے۔ اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ خدا صراط مستقیم (سیدھی شاہراہ) پر ہے۔ اس لیے جو دین کے سیدھے خط پر چل رہا ہے وہ براہِ راست خدا تک پہنچے گا اور جو ٹیڑھے راستوں پر چل رہا ہے اس کا راستہ اِدھر اُدھر بھٹک کر رہ جائے گا۔ وہ خدا تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حضرت ہود نے جب کہا کہ ”میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے“ تو دوسرے لفظوں میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ میں جس چیز کی طرف بلا رہا ہوں وہ صراطِ مستقیم (دین کی شاہراہ) ہے۔ اور تم لوگ جن چیزوں کو دین سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہو وہ دین کی شاہراہ کے اطراف میں پگڈنڈیاں نکال کر ان کے اوپر دوڑنا ہے۔ اس قسم کی دوڑ آدمی کو خدا تک نہیں پہنچاتی، وہ اس کو ادھر ادھر بھٹکا کر چھوڑ دیتی ہے۔

اِن آیات کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضرت ہود کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم یہ نکلتی ہے — توحید، عبادتِ الٰہی، استغفار، توبہ، نعمتوں پر خدا کا شکر، توکل علی اللہ، خدا کو اپنا پروردگار ماننا، صرف خدا کو تمام طاقتوں کا مالک سمجھنا، خدا کو اپنے اوپر نگراں بنا لینا۔ کبر کی روش کے بجائے اطاعت کی روش اختیار کرنا۔

یہ سب دین کی بنیادی تعلیمات ہیں۔ ان تعلیمات پر چلنا اور ان کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا گویا دین کی شاہراہ پر چلنا ہے۔ اس پر چلنے والا سیدھے خدا تک پہنچتا ہے۔ اس کے سوا جن چیزوں کو آدمی اہمیت دے اور ان کی دھوم مچائے وہ گویا اصل شاہراہ کے دائیں بائیں پگڈنڈیاں نکال کر ان کے اوپر دوڑ رہا ہے۔ ایسی دوڑ آدمی کو صرف خدا سے دور کرنے والی ہے، وہ اس کو خدا کے قریب نہیں پہنچا سکتی۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِهٖۤ
اِلَيۡكُمۡ ؕ وَيَسۡتَخۡلِفُ رَبِّىۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ۚ وَ
لَا تَضُرُّوۡنَهٗ شَيۡـًٔـا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ
حَفِيۡظٌ ﴿۵۷﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا هُوۡدًا وَّ
الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيۡنٰهُمۡ
مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ﴿۵۸﴾ وَ تِلۡكَ عَادٌ ۙ
جَحَدُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَ عَصَوۡا رُسُلَهٗ
وَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتۡبِعُوۡا
فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا لَعۡنَةً وَّيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ
اِنَّ عَادًا كَفَرُوۡا رَبَّهُمۡ ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّعَادٍ
قَوۡمِ هُوۡدٍ ﴿۶۰﴾ ع ۵

۵۷۔ اگر تم اعراض کرتے ہو تو میں نے تم کو وہ پیغام پہنچادیا جس کو دے کر مجھے تمھاری طرف بھیجا گیا تھا۔ اور میرا رب تمھاری جگہ تمھارے سوا کسی اور گروہ کو جانشین (خلیفہ) بنائے گا۔ تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ ۵۸۔ اور جب ہمارا حکم آپہنچا، ہم نے اپنی رحمت سے بچادیا ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور ہم نے ان کو ایک سخت عذاب سے بچادیا۔ ۵۹۔ اور یہ عاد تھے کہ انھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا۔ اور اس کے رسولوں کو نہ مانا اور ہر سرکش اور مخالف کی بات کی اتباع کی۔ ۶۰۔ اور ان کے پیچھے لعنت لگادی گئی اس دنیا میں اور قیامت کے دن۔ سن لو، عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سن لو، دوری ہے عاد کے لیے جو ہود کی قوم تھی۔

جو لوگ خدا کی بات کو نظر انداز کر دیں، خدا بھی انھیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ جو موجودہ دنیا میں جزئی طور پر پیش آتا ہے یہی قیامت میں کلی اور آخری طور پر پیش آئے گا۔ اس وقت تمام سرکش لوگ خدا کی رحمتوں سے دور کر دیے جائیں گے۔ اور خدا کی رحمت صرف ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو دنیا کی زندگی میں خدا کے تابع اور وفادار بن کر رہے تھے۔

اس دنیا میں خدا نے ''استخلاف'' کا اصول رائج کیا ہے۔ یعنی ایک قوم کو ہٹانے کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ زمین پر متمکن کرنا۔ دنیا میں یہ تمکن امتحان کی غرض سے وقتی طور پر ہوتا ہے۔ آخرت میں خدا کی معیاری دنیا میں یہ تمکن انعام کے طور پر مستقل طور پر سچے اہل ایمان کو حاصل ہوگا۔

موجودہ امتحانی دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں آدمی ہمیشہ خیر اور شر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کو آزادی ہوتی ہے کہ دونوں میں سے جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ مزید یہ کہ اکثر حالات میں اس دنیا میں شر کا غلبہ ہوتا ہے۔ خیر کی جانب صرف نشانیوں (نظری دلائل) کا زور ہوتا ہے۔ دوسری طرف شر کی جانب مادی طاقت موجود ہوتی ہے، وہ بھی اتنی بڑی مقدار میں کہ اس کے علم بردار سرکشی اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر ماحول کے اندر ایسی دباؤ کی فضا پیدا کرتے ہیں کہ عام آدمی حق کی طرف بڑھنے کی جرأت ہی نہ کرے۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ
اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا
فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ
قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ
فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ
مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا
تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ قَالَ يٰقَوْمِ
اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ
اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ
اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ
تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

۶۱۔اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔اس نے کہا،اے میری قوم،اللہ کی عبادت کرو۔اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔اسی نے تم کو زمین سے بنایا،اور اس میں تم کو آباد کیا۔پس معافی چاہو،پھر اس کی طرف رجوع کرو۔بے شک میرا رب قریب ہے،قبول کرنے والا ہے۔
۶۲۔انھوں نے کہا کہ اے صالح اس سے پہلے ہم کو تم سے امید تھی۔کیا تم ہم کو ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو،اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے اور ہم بڑے خلجان میں ہیں۔
۶۳۔اس نے کہا کہ اے میری قوم بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے رحمت دی ہے تو مجھ کو خدا سے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں۔پس تم کچھ نہیں بڑھاؤ گے میرا سوائے نقصان کے۔

حضرت صالح نے اپنی قوم کو ایک خدا کی عبادت کی طرف بلایا۔یہی ہر زمانہ میں تمام پیغمبروں کا مقصد تھا۔مگر حضرت صالح کی قوم آپ کے پیغام کو قبول نہ کرسکی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ اس کو براہِ راست خدا سے جوڑنے کی بات کرتے تھے،جب کہ قوم کا حال یہ تھا کہ وہ خدا کے نام پر صرف اپنے اعاظم واکابر سے جڑی ہوئی تھی۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے کسی چیز کی اہمیت اور معنویت صرف اس وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ ان کے قومی بزرگوں کے قول وعمل میں اس کی تصدیق مل جائے۔اب چونکہ حضرت صالح کے پاس صرف دلیل کا زور تھا،ان کی قوم ان کی بات کی اہمیت کو محسوس نہ کرسکی۔حضرت صالح جس دین کی طرف بلارہے تھے اس کی اہمیت خدا کی وحی اور زمین وآسمان کی نشانیوں میں غور کرنے سے واضح ہوتی تھی۔جب کہ ان کی قوم صرف اس دین کی اہمیت سے باخبر تھی جو اکابر قوم کے ملفوظات اور معمولات سے ثابت ہوتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قوم آپ کے دلائل کے مقابلہ میں لاجواب ہو کر بھی بس ایک قسم کے شبہ کی حالت میں پڑی رہی۔

حضرت صالح،دوسرے تمام پیغمبروں کی طرح،شخصیت اور ذہانت میں اپنی قوم کے ممتاز فرد تھے۔لوگ

امید رکھتے تھے کہ بڑے ہو کر وہ قوم کے ایک کارآمد فرد ثابت ہوں گے۔ مگر وہ بڑی عمر کو پہنچے تو انھوں نے قوم کے مروجہ مذہب پر تنقید شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر قوم کے لوگوں کو ان کے بارہ میں سخت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے کہا، ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ تم ہمارے قائم شدہ مذہبی نظام کے ایک ستون بنو گے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے مذہبی نظام کو بے بنیاد ثابت کرنے پر اپنا سارا زور لگائے ہوئے ہو— یہی معاملہ ہر دور میں خدا کے سچے داعیوں کو اپنی قوم کی طرف سے پیش آیا ہے۔

وَ يٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۠ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ ع ۶ ۸

۶۴۔ اور اے میری قوم، یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی ہے۔ پس اس کو چھوڑ دو کہ وہ اللہ کی زمین میں کھائے۔ اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ بہت جلد تم کو عذاب پکڑ لے گا۔ ۶۵۔ پھر انھوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ تب صالح نے کہا کہ تین دن اور اپنے گھروں میں فائدہ اٹھا لو۔ یہ ایک وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا۔ ۶۶۔ پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے (محفوظ رکھا)۔ بیشک تیرا رب ہی قوی اور زبردست ہے۔ ۶۷۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، ان کو ایک ہولناک آواز نے پکڑ لیا، پھر صبح کو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ ۶۸۔ جیسے کہ وہ کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سنو، ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو، پھٹکار ہے ثمود کے لیے۔

حضرت صالح اپنی قوم سے کہتے تھے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم خدا کی پکڑ میں آ جاؤ گے۔ ان کی قوم اگرچہ خدا اور رسالت کی منکر نہ تھی مگر اس نے حضرت صالح کی بات کو ایک مذاق سمجھا۔ کیوں کہ حضرت صالح کے پاس اپنی پیغمبری کو ثابت کرنے کے لیے صرف نظری دلیل تھی اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ صرف نظری دلیل کی بنیاد پر بہت کم اس کے لیے تیار ہوتا ہے کہ ایک مانوس چیز کو چھوڑے اور دوسری غیر مانوس چیز کو اختیار کر لے۔

حضرت صالح کی قوم جب نظری نشانیوں کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوئی تو آخری مرحلہ میں اس کے مطالبہ

کے مطابق اس کے لیے حسّی نشانی بھی ظاہر کردی گئی۔ یہ ایک اونٹنی تھی جو لوگوں کے سامنے ٹھوس چٹان کے اندر سے نکل آئی۔ ایسی نشانی کے بارے میں خدا کا قانون ہے کہ جب وہ ظاہر کی جاتی ہے تو اس کے بعد لوگوں کے لیے امتحان کی مزید مہلت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حضرت صالح نے اعلان کر دیا کہ اب تم لوگ یا تو توبہ کر کے میری بات مان لو، ورنہ تم سب لوگ ہلاک کر دیے جاؤ گے۔ مگر جو لوگ نظری دلائل کی قوت کو محسوس نہ کرسکیں وہ حسی دلائل کو دیکھ کر بھی اس سے عبرت پکڑنے میں ناکام رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد بھی حضرت صالح کی قوم اپنی سرکشی سے باز نہ آئی۔ حتی کہ اس نے خود اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے لیے مزید مہلت کا سوال نہ تھا۔ چنانچہ وہ مٹادی گئی۔

قوم صالح (ثمود) کا علاقہ شمالی مغربی عرب (الحجر) تھا۔ حضرت صالح کو حکم ہوا کہ تم یہاں سے باہر چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنے مخلص ساتھیوں کو لے کر شام کی طرف چلے گئے۔ اس کے بعد ایک سخت زلزلہ آیا اور ساری قوم اس کی لپیٹ میں آ کر بری طرح ہلاک ہوگئی۔

وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

۶۹۔ اور ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لے کر آئے۔ کہا تم پر سلامتی ہو۔ ابراہیم نے کہا تم پر بھی سلامتی ہو۔ پھر دیر نہ گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔ ۷۰۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو وہ کھٹک گیا اور دل میں ان سے ڈرا۔ انھوں نے کہا کہ ڈرو نہیں، ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ۷۱۔ اور ابراہیم کی بیوی کھڑی تھی، وہ ہنس پڑی۔ پس ہم نے اس کو اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے آگے یعقوب کی۔ ۷۲۔ اس نے کہا، اے خرابی، کیا میں بچہ جنوں گی، حالاں کہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے۔ یہ تو ایک عجیب بات ہے۔ ۷۳۔ فرشتوں نے کہا، کیا تم اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو۔ ابراہیم کے گھر والو، تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ بے شک اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے۔

حضرت ابراہیم کی عمر تقریباً سو سال ہو چکی تھی کہ ایک روز چند انتہائی خوب صورت نوجوان ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ حضرت ابراہیم نے ان کو مہمان سمجھ کر فوراً ان کے کھانے کا انتظام کیا۔ مگر وہ انسان نہیں تھے بلکہ خدا کے فرشتے تھے۔ وہ بیک وقت دو مقصد کے لیے آئے تھے۔ ایک، حضرت ابراہیم کو اولاد کی بشارت دینا۔ دوسرے، حضرت لوط کی قوم کو ہلاک کرنا جو انکار اور سرکشی کی آخری حد پر پہنچ چکی تھی۔

حضرت ابراہیم اور ان کی اہلیہ کو اسحاق (بیٹے) اور یعقوب (پوتے) کی بشارت دینا عام معنوں میں محض اولاد کی بشارت نہ تھی۔ یہ صالح اور داعی انسانوں کا ایک گھرانا وجود میں لانا تھا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ اکثر کوئی ''گھرانا'' ہوتا ہے جو دین حق کی خدمت کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ نبیوں کی تاریخ اور نبیوں کے بعد ان کے سچے پیروؤں کے واقعات یہی بتاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص جس پر سچائی کا انکشاف ہوتا ہے وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی نظر میں ایک معمولی انسان ہوتا ہے۔ اس بنا پر عام لوگوں کے لیے اس کے مقام کو پہچاننا اور اس کا ساتھ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مگر اس کے اپنے گھر والوں کے لیے ذاتی رشتہ ایک مزید وجہ بن جاتا ہے۔ جس چیز کو باہر والے ظاہر بینی کی بنا پر دیکھ نہیں پاتے، گھر والے ذاتی تعلق کی بنا پر اس کو محسوس کر لیتے ہیں۔ اور اس کے مشن میں اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿٧٥﴾ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿٧٦﴾

۷۴۔ پھر جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اس کو خوش خبری ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ ۷۵۔ بے شک ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل تھا اور رجوع کرنے والا تھا۔ ۷۶۔ اے ابراہیم اس کو چھوڑو۔ تمھارے رب کا حکم آچکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جو لوٹایا نہیں جاتا۔

حضرت ابراہیم کی یہ گفتگو ان فرشتوں سے ہوئی جو قوم لوط کو ہلاک کرنے کے لیے آئے تھے۔ چونکہ یہ فرشتے خدا کی طرف سے اور اس کے حکم کی تعمیل میں آئے تھے، اس لیے خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ پیغمبر اور فرشتوں کے درمیان اس گفتگو کا ایک جزء سورۂ عنکبوت (آیت 32) میں مذکور ہے۔ اور اس کا تفصیلی ذکر موجودہ بائبل (پیدائش باب 18) میں آیا ہے۔

حضرت ابراہیم کی دعا قوم لوط کے حق میں منظور نہیں ہوئی۔ اسی طرح اس سے پہلے حضرت نوح کی دعا اپنے بیٹے کے لیے منظور نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغفرت کی دعا معروف معنوں میں کوئی سفارش نہیں ہے جو کہ ایک شخص دوسرے شخص کے لیے کرے۔ اور وہ دعا کرنے والے کی بزرگی کی بنا پر اس کے حق میں مان لی جائے۔

دعا خود اپنے آپ کو خدا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اگر حضرت نوح کے بیٹے یا حضرت لوط کی قوم کے لوگوں کے اندر خود دعا کا جذبہ ابھر آتا اور وہ اپنی نجات کے لیے خدا کو پکارتے تو یقیناً خدا انھیں معاف کر دیتا اور اپنی رحمت ان کی طرف بھیج دیتا۔ عذاب کا لوٹا دیا جانا ممکن ہے، جیسا کہ حضرت یونس کی قوم کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر وہ جب بھی لوٹے گا خود زیرِ سزا افراد کی دعاؤں سے لوٹے گا، نہ کہ کسی غیر شخص کی دعاؤں سے، خواہ یہ غیر شخص پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

ایک شخص کو دوسرے شخص کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے۔ اور ہر زمانہ میں پیغمبروں نے اور صالح لوگوں نے دوسروں کے لیے دعائیں کی ہیں۔ مگر یہ دعا حقیقۃً خود دعا کرنے والے کے حلیم اور اوّاہ اور منیب ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ کا ایک بندہ جو اللہ سے ڈرتا ہو وہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے اور اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دعائیں کرنے لگتا ہے۔ تاہم کسی کی دعا دوسرے کے حق میں اسی وقت مفید ہوگی جب کہ وہ خود بھی اللہ سے ڈر کر اللہ کو پکار رہا ہو۔

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ﴿۷۷﴾ وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ﴿۷۹﴾

۷۷۔ اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو وہ گھبرایا اور ان کے آنے سے دل تنگ ہوا۔ اس نے کہا آج کا دن بڑا سخت ہے۔ ۷۸۔ اور اس کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ اور وہ پہلے سے برے کام کر رہے تھے۔ لوط نے کہا اے میری قوم، یہ میری بیٹیاں ہیں، وہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو میرے مہمانوں کے سامنے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے۔ ۷۹۔ انھوں نے کہا، تم جانتے ہو کہ ہم کو تمھاری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں، اور تم جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔

حضرت لوط کے پاس جو فرشتے آئے وہ عذاب کے فرشتے تھے۔ مگر وہ نہایت خوب صورت نوجوانوں کی صورت میں بستی کے اندر داخل ہوئے۔ یہ دراصل ان کو آخری طور پر مجرم ثابت کرنے کے لیے تھا۔ آدمی جب مسلسل ایک برائی کرتا ہے تو اس کے بارے میں وہ بالکل بے حس ہو جاتا ہے۔ یہی حال قوم لوط کا تھا۔ وہ اب کھلم کھلا بدکاری کرنے لگے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ خوبصورت لڑکے حضرت لوط کے گھر آئے ہوئے ہیں تو وہ شہوت کے جذبات لیے ہوئے آپ کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ انھوں نے انتہائی بے حیائی کے ساتھ مطالبہ شروع کر دیا کہ ان لڑکوں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔

حضرت لوط نے شریر لوگوں کو اس طرح آتے ہوئے دیکھا تو آپ پر سخت شرم اور غیرت طاری ہوئی۔ آپ نے کہا ''یہ قوم کی بیٹیاں ہیں، ان میں سے جس سے چاہو نکاح کرلو اور اپنی فطری خواہش پوری کرو''۔ کسی قوم میں جو بڑے بوڑھے ہوتے ہیں وہ قوم کی تمام لڑکیوں کو بیٹی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اسی معنی میں حضرت لوط نے قوم کی بیٹیوں کو ''میری بیٹیاں'' فرمایا۔ مگر ان لوگوں نے حضرت لوط کی جائز پیش کش کو ٹھکرا دیا اور ناجائز کی طرف بدستور دوڑتے رہے۔ اس سے آخری طور پر ثابت ہوگیا کہ یہ مجرم لوگ ہیں اور یقیناً اس قابل ہیں کہ انھیں ہلاک کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ سب کے سب ہلاک کر دیے گئے۔

''کیا تم میں ایک بھی رجلِ رشید نہیں''— یہ اس بندۂ خدا کا آخری کلمہ ہوتا ہے جس کے پاس شریر لوگوں کو روکنے کے لیے مادی قوت نہ ہو اور معقولیت کی تمام باتیں ان کو روکنے کے لیے ناکافی ثابت ہوئی ہوں۔ اس وقت اس طرح کا جملہ بول کر وہ قوم کی غیرت کو پکارتا ہے اور اس کے ضمیر کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر ایسا ہو کہ لوگ بدستور بے حس بنے رہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کے اندر انسانیت اور شرافت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہا۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ
شَدِيْدٍ ﴿٨٠﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ
لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ
الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا
امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ
مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ
بِقَرِيْبٍ ﴿٨١﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا
سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ
سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿٨٢﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ
رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٣﴾ ع ۱۵ النصف

۸۰۔ لوط نے کہا، کاش میرے پاس تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں۔ ۸۱۔ فرشتوں نے کہا کہ اے لوط، ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ وہ ہرگز تم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ پس تم اپنے لوگوں کو لے کر کچھ رات رہے نکل جاؤ۔ اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے۔ مگر تمھاری عورت، اس پر وہی کچھ گزرنے والا ہے جو ان لوگوں پر گزرے گا۔ ان کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے، کیا صبح قریب نہیں۔ ۸۲۔ پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور اس پر پتھر برسائے کنکر کے، تہہ بہ تہہ۔ ۸۳۔ تمھارے رب کے پاس سے نشان لگائے ہوئے۔ اور وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔

حضرت لوط ابتداءً آنے والے نوجوانوں کو انسان سمجھ رہے تھے۔ جب حضرت لوط کی پریشانی بڑھی اور وہ اپنے کو خطرہ میں محسوس کرنے لگے تو انھوں نے بتایا کہ ہم فرشتے ہیں۔ اور خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ یعنی یہ معاملہ انسانی معاملہ نہیں بلکہ خدائی معاملہ ہے۔ وہ نہ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ تمھارا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب قوم لوط کے لوگ آگے بڑھنے سے نہ رکے تو ایک فرشتہ نے اپنا بازو گھمایا۔ اس کے بعد وہ سب کے سب اندھے

ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ — بھاگو، لوط کے مہمان تو بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔

جب خدا کسی قوم کو اس کی سرکشی کی بنا پر ہلاک کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ اس پورے علاقے کے لیے ایک عام حکم ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر اس علاقے میں بسنے والے تمام جاندار خدائی عذاب کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ البتہ خدا کے خصوصی انتظامات کے تحت وہ لوگ اس سے بچا لیے جاتے ہیں جنھوں نے ان سرکش لوگوں کے اوپر حق کا اعلان کیا ہو۔ اعلانِ حق خدا کی پکڑ سے بچنے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ موجودہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

حضرت لوط کی بیوی کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ دل سے حضرت لوط کے ساتھ نہ تھی۔ مگر آخر وقت میں جب حضرت لوط یہ کہہ کر بستی سے نکلے کہ صبح تک یہاں عذاب آجائے گا تو وہ بھی آپ کے قافلہ کے ساتھ ہو گئی۔ تاہم ابھی یہ لوگ راستے میں تھے کہ پیچھے زلزلہ اور طوفان کا شور سنائی دیا۔ حضرت لوط اور ان کے مخلص ساتھیوں نے پیچھے توجہ نہ دی۔ مگر حضرت لوط کی بیوی پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی اور جب اس کو دھواں اور شور دکھائی دیا تو اس کی زبان سے نکلا وقوماہ! (ہائے میری قوم!)۔ اسی وقت عذاب کا ایک پتھر آکر اس کو لگا اور وہیں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اس میں سبق یہ ہے کہ ایک شخص اگر واقعۃً خدا اور رسول کا وفادار نہیں ہے تو کسی اور محرک کے تحت قافلۂ حق کے ساتھ لگ جانے سے وہ نجات نہیں پائے گا۔ اس کی کمزوری کہیں نہ کہیں ظاہر ہو گی اور وہیں وہ بیٹھ کر رہ جائے گا۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

۸۴۔ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، اور میں تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۸۵۔ اور اے میری قوم، ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ اور زمین پر فساد نہ مچاؤ۔ ۸۶۔ جو اللہ کا دیا ہوا بچا رہے، وہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور میں تمھارے اوپر نگہبان نہیں ہوں۔

مدین کا علاقہ حجاز اور شام کے درمیان تھا۔ ان کے پیغمبر حضرت شعیب کا اپنی قوم سے یہ کہنا کہ ''اگر تم ایمان والے ہو'' ظاہر کرتا ہے کہ ان کی قوم مومن ہونے کی مدعی تھی۔ بالفاظ دیگر، وہ اپنے زمانہ کی مسلمان قوم تھی۔ وہ حضرت شعیب سے پہلے آنے والے نبی کی امت تھی اور اب لمبا عرصہ گزرنے کے بعد ان کی بعد کی نسلوں میں بگاڑ آ گیا تھا۔

حضرت شعیب نے ان سے کہا کہ اگر تم مومن ہونے کے دعوے دار ہو تو تمھارا دعویٰ خدا کے یہاں اسی وقت

مانا جائے گا جب کہ تم اپنے دعوے کے تقاضے پورے کرو۔ تقاضا پورا کیے بغیر دعوے کی کوئی قیمت نہیں۔

تمھارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم صرف ایک اللہ کی عبادت کرو۔ لین دین میں انصاف برتو۔ دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔ اور اس میں کسی طرح کی کمی نہ کرے۔ زمین میں اس طرح رہو جس طرح خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندے رہیں۔ جائز طریقہ سے حاصل کیے ہوئے رزق پر قناعت کرو، نہ کہ نافرمانی کرکے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم ایسا کرو تبھی تم خدا کے یہاں مومن ٹھہروگے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ خدا کا عذاب تم کو پکڑ لے۔

حضرت شعیب نے ایک طرف یہ کہا کہ لوگوں کو کم نہ دو۔ دوسری طرف یہ فرمایا کہ ''آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم شعیب میں کچھ غریب تھے اور کچھ امیر۔ کچھ زیادہ پانے والے تھے اور کچھ وہ تھے جن کو گھٹا کر مل رہا تھا۔ اگر سارے لوگ کم پانے والے ہوتے تو ان میں ''اچھے حال والا'' کون باقی رہتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جن مخاطبین کا ذکر ہے وہ قوم کے بااثر اور صاحب حیثیت افراد تھے۔ انبیاء اگرچہ ہر ایک کی ہدایت کے لیے آتے ہیں مگر ان کا خطاب خاص طور پر وقت کے ممتاز طبقہ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ عوام انھیں لوگوں کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ خواص تک دعوت پہنچنا بالواسطہ طور پر عوام تک بھی دعوت کا پہنچنا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ انھوں نے کہا کہ اے شعیب، کیا تمھاری نماز تم کو یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ یا اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا چھوڑ دیں۔ بس تم ہی تو ایک دانش مند اور نیک چلن آدمی ہو۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ نماز بول کر دین مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمھارا دین تم کو ایسا حکم دے رہا ہے۔ انھوں نے نماز کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ نماز دین کی سب سے زیادہ واضح علامت ہے (وقد يراد بالصلاة الدينُ والمعنى: دينُك يأمرك بذلك؟ وأطلق عليه الصلاة لأنها أظهر شعار الدين) صفوۃ التفاسیر، جلد 2، صفحہ 25۔

حضرت شعیب کی قوم دین دار ہونے کی مدعی تھی۔ وہ عبادت بھی کرتی تھی۔ مگر انھوں نے اپنے دین اور عبادت کے ساتھ شرک اور بدمعاملگی کو بھی جمع کر رکھا تھا۔ حضرت شعیب نے ان کو سچی خدا پرستی اور لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ کی دعوت دی اور کہا کہ دین کے ساتھ اگر شرک ہے اور عبادت کے ساتھ

اگر بد معاملگی بھی جاری ہے تو ایسے دین اور ایسی عبادت کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔
اس قسم کی باتوں سے قوم کا دینی بھرم کھلتا تھا۔ اس سے ان کے اس زعم پر زد پڑتی تھی کہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی وہ دین دار ہیں اور عبادت گزاری کا تمغہ بھی ہر حال میں انھیں ملا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم ہی ایک خدا کے عبادت گزار ہو۔ کیا ہمارے وہ تمام بزرگ جاہل تھے یا ہیں جن کے طریقہ کو ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیا تمھارے سوا کوئی یہ جاننے والا نہیں کہ عبادت کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ شاید تم سمجھتے ہو کہ صرف تم ہی دنیا بھر میں ایک سمجھ دار اور صالح پیدا ہوئے ہو۔
قوم شعیب کو وہ لوگ زیادہ بڑے معلوم ہوتے تھے جو لمبی روایات کے نتیجہ میں بڑے بن چکے تھے۔ یا جو اب اونچی گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی لیے ان کو حضرت شعیب کے بارے میں ایسا کہنے کی جرأت ہوئی۔

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَرَزَقَنِىۡ مِنۡهُ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِيۡدُ اَنۡ اُخَالِفَكُمۡ اِلٰى مَاۤ اَنۡهٰٮكُمۡ عَنۡهُ ؕ اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ؕ وَمَا تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ اُنِيۡبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوۡمِ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شِقَاقِىۡۤ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ هُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡكُمۡ بِبَعِيۡدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ رَحِيۡمٌ وَّدُوۡدٌ ﴿۹۰﴾

۸۸۔ شعیب نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے مجھ کو اچھا رزق بھی دیا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میں خود وہی کام کروں جس سے میں تم کو روک رہا ہوں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک ہو سکے۔ اور مجھے توفیق تو اللہ ہی سے ملے گی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے۔ اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ ۸۹۔ اور اے میری قوم، ایسا نہ ہو کہ میری مخالفت کر کے تم پر وہ آفت آپڑے جو قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر آئی تھی، اور لوط کی قوم تو تم سے دور بھی نہیں۔ ۹۰۔ اور اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف پلٹ آؤ۔ بے شک میرا رب مہربان اور محبت والا ہے۔

ماننے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے تقلیدی طور پر ماننا۔ دوسرا صحیح سمجھ کر ماننا۔ پہلی صورت میں آدمی کسی بات کو اس لیے مانتا ہے کہ لوگ اس کو مانتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ اس کو اس لیے مانتا ہے کہ اس نے خود دلیل کی بنیاد پر پایا ہے کہ وہ بات صحیح ہے۔ اوّل الذکر اگر رسمی اقرار ہے تو ثانی الذکر شعوری دریافت۔
حق کو دلیل (یا شعور) کی سطح پر پانا ہی مومن کا اصل سرمایہ ہے۔ اسی سے وہ زندہ یقین حاصل ہوتا ہے جب کہ آدمی ہر چیز سے بے پروا ہو کر لوگوں کے درمیان کھڑا ہو اور حق کی نمائندگی کر سکے۔ حق کی شعوری یافت ہر دوسری چیز کا بدل ہے۔ جس کو یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کو پھر کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عام آدمی ''روٹی'' پر جیتا ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو دلیل حق پر جیتا ہے۔ اس طرح کا رزق (شعوری یافت) ملنے کے بعد آدمی کے لیے ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے۔ قول وعمل کا تضاد رسمی ایمان کا نتیجہ ہے اور قول وعمل کی یکسانیت شعوری ایمان کا نتیجہ۔

''شقاق'' کی تشریح میں حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ میری دشمنی تم کو ایمان کا راستہ چھوڑ دینے پر نہ ابھارے کہ اس کے بعد تم کو وہ سزا ملے جو کافروں کو ملی (لَا يَحْمِلَنَّكُمْ مُعَادَاتِي عَلَى تَرْكِ الْإِيمَانِ فَيُصِيبَكُمْ مَا أَصَابَ الْكُفَّارَ) تفسیر القرطبی، جلد 9، صفحہ 90۔

داعی چونکہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو ایک عام انسان کی مانند نظر آتا ہے۔ اس لیے اس کی ناقدانہ باتوں سے وہ لوگ بگڑ اٹھتے ہیں جن کو ماحول میں اونچی حیثیت حاصل ہو۔ ایک معمولی آدمی کی یہ جرأت ان کے لیے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے کہ وہ ان پر اور ان کے بڑوں پر تنقید کرے۔ اس وجہ سے ان کے اندر داعی کے خلاف ضد اور نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔

کسی آدمی کے اندر اس قسم کی نفسیات کا پیدا ہونا اس کا نہایت کڑے امتحان میں مبتلا کیا جانا ہے۔ کیونکہ ایسا آدمی ایک شخص کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے اس کی طرف سے آنے والی خدائی بات کو بھی حقیر سمجھ لیتا ہے۔ وہ ایک انسان کو نظر انداز کرنے کے نام پر خود خدا کو نظر انداز کردیتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ
اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ
لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿٩١﴾
قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ
اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ
اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾ وَيٰقَوْمِ
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ
هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ
رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾

۹۱۔ انھوں نے کہا کہ اے شعیب، جو تم کہتے ہو، اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے۔ اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کردیتے۔ اور تم ہم پر کچھ بھاری نہیں۔ ۹۲۔ شعیب نے کہا کہ اے میری قوم، کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے۔ اور اللہ کو تم نے پس پشت ڈال دیا۔ بے شک میرے رب کے قابو میں ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۹۳۔ اور اے میری قوم، تم اپنے طریقہ پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقہ پر کام کرتا رہوں گا۔ جلد ہی تم کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کے اوپر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ اور انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

حضرت شعیب کو حدیث میں خطیب الانبیاء کہا گیا ہے (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 4071)۔ آنجناب اپنی قوم کو اس کی اپنی قابل فہم زبان میں نہایت موثر انداز میں سمجھاتے تھے۔ پھر آپ کی بات قوم کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قوم کا ذہنی سانچہ (شاکلہ) بگڑا ہوا تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز اور تھا اور حضرت شعیب کے سوچنے کا انداز اور۔ اس بنا پر آنجناب کی بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔

قوم انسانوں کی تعظیم میں گم تھی۔ آپ اس کو ایک اللہ کی تعظیم کی طرف بلاتے تھے۔ وہ خوش عقیدگی کو نجات کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھی، آپ کا کہنا تھا کہ صرف عمل کے ذریعہ نجات ہوسکتی ہے۔ قوم کا خیال تھا کہ وہ اپنے کو مومن سمجھتی ہے اس لیے وہ مومن ہے۔ آپ نے کہا کہ مومن وہ ہے جو خدا کی میزان میں مومن قرار پائے۔ قوم کے نزدیک نماز کی حیثیت بس ایک غیر موثر قسم کے رسمی ضمیمہ کی تھی، آپ نے اعلان کیا کہ نماز آدمی کی زندگی اور اس کے آمد وخرچ کی محاسب ہے۔ قوم سمجھتی تھی کہ ایمان بس ایک بے روح اقرار ہے، آپ نے بتایا کہ ایمان وہ ہے جو ایک زندہ شعور کے طور پر حاصل ہوا ہو۔

اس طرح حضرت شعیب اور ان کی قوم کے درمیان ایک قسم کی دوری (gap) پیدا ہوگئی تھی۔ یہی ذہنی دوری قوم کے لیے آپ کی سیدھی اور سچی بات کو سمجھنے میں رکاوٹ بنی رہی۔

''اگر تمھارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کردیتے''— یہ جملہ بتاتا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم کس قدر بے حس اور ظاہر پرست ہوچکی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ حضرت شعیب نے جب قوم کے دینی بھرم کو بے نقاب کیا تو قوم کے لوگ ان کے دشمن بن گئے۔ اس وقت حضرت شعیب کے ساتھ نہ عوام کی بھیڑ تھی جو لوگوں کو روکے اور نہ آپ دولت اور حیثیت کے مالک تھے جس کو دیکھ کر لوگ مرعوب ہوں۔ آپ کے پاس صرف صداقت اور معقولیت کا زور تھا اور ایسے لوگوں کے نزدیک صرف صداقت اور معقولیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

ایسی حالت میں وہ یقیناً آپ پر قاتلانہ حملہ کردیتے۔ تاہم جس چیز نے انھیں اس قسم کے اقدام سے روکا وہ قبیلہ کے انتقام کا اندیشہ تھا۔ قبائلی دور میں قبیلہ کے کسی فرد کو مارنے کا مطلب یہ تھا کہ قبائلی دستور کے مطابق پورا قبیلہ اس سے خون کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوجائے۔ یہ اندیشہ قوم شعیب کے لیے آپ کے خلاف کسی انتہائی اقدام میں مانع بن گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے موجودہ زمانہ میں شریر افراد کی شرارت سے اکثر اوقات لوگ اس لیے محفوظ رہتے ہیں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے کوئی جارحیت کی تو ان کو پولیس اور عدالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ	۹۴۔ اور جب ہمارا حکم آیا ہم نے شعیب کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچالیا۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، ان کو کڑک

ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿٩٥﴾ ع ۸ / ۱۲ / ۸

نے پکڑ لیا۔ پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ ۹۵۔ گویا کہ وہ کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے۔ سنو، پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو۔

حضرت شعیب کی قوم کے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ مدین کے مالک ہیں جو چیز انھیں امتحان کی مصلحت کے تحت دی گئی تھی اس کو انھوں نے اپنا مستقل حق سمجھ لیا۔ اس احساس کے تحت انھوں نے آپ کے خلاف جارحانہ تدبیریں کیں۔ انھوں نے آپ کو یہ دھمکی بھی دی کہ ہم تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے (الاعراف، 7:88)۔ مگر وہی زمین جس کو وہ اپنی زمین سمجھتے تھے اور جس کے وہ مالک بنے ہوئے تھے، وہاں خدا کے حکم سے ہولناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زلزلہ آیا، جس کے نتیجہ میں یہ پورا علاقہ تباہ ہو گیا۔ وہ خود اپنی دنیا میں اس طرح مٹ کر رہ گئے جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔

البتہ قوم کے وہ افراد جنھوں نے حضرت شعیب کی بات مانی تھی اور آپ کے ساتھ ہو گئے تھے ان کو خصوصی نصرت سے بچا لیا گیا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا أَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾ وَأُتْبِعُوْا فِي هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾

۹۶۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا۔ ۹۷۔ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف۔ پھر وہ فرعون کے حکم پر چلے حالاں کہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ ۹۸۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے ہوگا اور ان کو آگ پر پہنچائے گا۔ اور کیسا برا گھاٹ ہے جس پر وہ پہنچیں گے۔ ۹۹۔ اور اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ کیسا برا انعام ہے جو ان کو ملا۔

حضرت موسیٰ نے حق کی دعوت آخری ممکن حد تک پیش کر دی۔ انھوں نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو نہ صرف نظری طور پر بے دلیل کر دیا بلکہ عصا کے معجزے کی صورت میں اپنی صداقت کا کھلا ہوا ظاہری ثبوت بھی انھیں دکھا دیا پھر بھی فرعون کی قوم فرعون ہی کے ساتھ رہی، وہ حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے نزدیک ساری اہمیت اقتدار اور دنیوی ساز و سامان کی تھی اور یہ چیزیں وہ حضرت موسیٰ کے اندر نہ دیکھتے تھے۔ وہ آپ کی باتوں پر حیران ضرور ہوتے تھے۔ مگر جب وہ حضرت موسیٰ کا مقابلہ فرعون سے کرتے تو ان کو ایک طرف بے سروسامانی دکھائی دیتی اور دوسری طرف ہر قسم کا مادی جاہ و جلال۔ یہ

تقابل ان کے لیے فیصلہ کن بن گیا۔ اور وہ دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود اس کے لیے تیار نہ ہوئے کہ فرعون کو چھوڑ دیں اور اس سے الگ ہو کر حضرت موسیٰ کے ساتھ ہو جائیں۔

جو لوگ دنیا میں کسی کا ساتھ صرف اس لیے دیں گے کہ اس کے پاس مادی بڑائی کی چیزیں تھیں، وہ آخرت میں بھی اس کے ساتھ کر دیے جائیں گے۔ مگر دنیا کے برعکس یہ بہت برا ساتھ ہوگا۔ کیونکہ اس دن اس آدمی سے اس کا تمام سامان چھن چکا ہوگا۔ اب اس کا وجود صرف ذلّت اور بربادی کا نشان ہوگا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی اسی آگ میں پہنچا دے گا جو خود اس کے لیے اس کی گمراہ قیادت کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے مقدر کی جا چکی ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۰۔ یہ بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تم کو سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض بستیاں اب تک قائم ہیں اور بعض مٹ گئیں۔ ۱۰۱۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ پھر جب تیرے رب کا حکم آ گیا تو ان کے معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے۔ اور انھوں نے ان کے حق میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں بڑھایا۔

قدیم تاریخوں میں بادشاہوں اور فوجی جنرلوں کے حالات درج ہیں مگر نبیوں اور ان کی اقوام کے حالات کسی تاریخ میں درج نہیں۔ دوسری طرف قرآن کو دیکھیے تو اس میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ نبیوں اور ان کی قوموں کے حالات ملتے ہیں۔ بقیہ باتیں اس نے اس طرح نظر انداز کر دی ہیں جیسے اس کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ انسان نے جو تاریخ لکھی اس میں اس نے وہی بات چھوڑ دی جو خالق کے نزدیک سب سے زیادہ قابل تذکرہ تھی۔

دور نبوت کی ان ہلاک شدہ بستیوں میں سے بعض بستیاں ایسی ہیں، جو ابھی تک آباد ہیں۔ جیسے مصر جو فرعون کا مقام تھا دوسری طرف قوم ہود اور قوم لوط جیسی اقوام ہیں جن کی بستیاں ان کے باشندوں سمیت ناپید ہو گئیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کے کچھ نشانات کھنڈر کی صورت میں کھڑے ہیں یا زمین کی کھدائی سے برآمد کیے گئے ہیں۔

ان بستیوں کا ہلاک کیا جانا بظاہر ایک ظالمانہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب یہ دیکھیے کہ کیوں ایسا ہوا تو عین مطابق حقیقت بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی بد عملی کے نتائج تھے۔ جو کچھ ہوا وہ ان کی بدکرداری کے بعد ہوا، نہ کہ ان کی بدکرداری سے پہلے۔

جب بھی آدمی سرکشی اور ظلم کرتا ہے تو وہ کسی برتے پر کرتا ہے۔ وہ کچھ چیزوں یا ہستیوں کو اپنا سہارا سمجھ لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ مشکل وقتوں میں اس کے مددگار ثابت ہوں گے۔ مگر یہ سہارے اسی وقت تک

سہارے ہیں جب تک خدا ڈھیل دے رہا ہو۔ جب خدا کے قانون کے مطابق ڈھیل کی مدّت ختم ہوجائے اور خدا اپنا آخری فیصلہ ظاہر کردے اس وقت آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب محض جھوٹے مفروضے تھے جن کو اس نے اپنی نادانی کی وجہ سے سہارا سمجھ لیا تھا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿١٠٢﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿١٠٣﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿١٠٤﴾ؕ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿١٠٥﴾

۱۰۲۔ اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب کہ وہ بستیوں کو ان کے ظلم پر پکڑتا ہے۔ بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہے۔ ۱۰۳۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہے جس میں سب لوگ جمع ہوں گے۔ اور وہ حاضری کا دن ہوگا۔ ۱۰۴۔ اور ہم اس کو ایک مدت کے لیے ٹال رہے ہیں جو مقرر ہے۔ ۱۰۵۔ جب وہ دن آئے گا تو کوئی جان اس کی اجازت کے بغیر کلام نہ کرسکے گی۔ پس ان میں کچھ بدبخت ہوں گے، اور کچھ نیک بخت۔

موجودہ دنیا میں انسان کو رہنے اور بسنے کا موقع صرف امتحان کی بنا پر حاصل ہے۔ پیغمبروں کے ذریعہ اتمام حجت کے بعد بھی جو لوگ منکر بنے رہیں وہ خدا کی زمین میں مزید ٹھہرنے کا حق کھودیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے منکرین کو خدا نے ہلاک کردیا (العنکبوت، 35:40)۔ یہ ہلاکت زیادہ تر اس طرح ہوئی کہ عام زمینی آفتوں میں شدت پیدا کردی گئی مثلاً آندھی، سیلاب، یا زلزلہ جو عام حالات میں ایک حد کے اندر رہتے ہیں، ان کو غیر محدود طور پر شدید کردیا گیا۔

ماضی میں اس طرح قوموں کی تباہی کے واقعات کو جغرافی تاریخ کے ماہرین موسمی تغیّرات (climatic pulsations) کا نام دیتے ہیں۔ گویا جو کچھ ہوا وہ محض جغرافی اتھل پتھل کے نتیجہ میں ہوا۔ اگرچہ وہ اس واقعہ کی کوئی توجیہہ نہیں کرپاتے کہ اس قسم کے شدید موسمی تغیرات صرف ماضی میں کیوں پیش آئے۔ وہ اب (ختم نبوت کے بعد) کیوں نہیں پیش آتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعات سادہ معنوں میں صرف جغرافی واقعات نہ تھے بلکہ یہ حکم خداوندی کا ظہور تھا۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام عدل پر قائم ہے۔ یہاں خود قانون قدرت کے تحت لازماً ایسا ہونے والا ہے کہ ظالم اپنے ظلم کی سزا پائے اور عادل کو اپنے عدل کا انعام ملے۔ ان واقعات کو موسمی تغیرات کہنا ان کو جغرافیہ کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔ اس کے برعکس، اگر ان کو خدائی تغیرات مانا جائے تو وہ آدمی کے لیے خوفِ خدا اور فکر آخرت کا زبردست سبق بن جائیں گے۔

پیغمبروں کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے وہ گویا بڑی قیامت سے پہلے اس کی ایک چھوٹی نشانی تھے۔ ان میں ایسا ہوا کہ منکرین کو ایک مدّت تک ڈھیل دی گئی۔ اس کے بعد خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا تو سب کے سب ہلاک

کردیے گئے۔صرف وہ لوگ بچ سکے جوحق کا ساتھ دینے کی وجہ سے خدا کے نزدیک نیک بخت قرار پاچکے تھے۔ان کے علاوہ جو لوگ خدا کی میزان میں سرکش اور بدبخت تھے وہ لازمی طور پر عذاب کی زد میں آئے۔حتی کہ پیغمبروں کی سفارش بھی ان کو بچانہ سکی،جیسا کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا
زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴿١٠٦﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٠٧﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ
سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ
السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ؕ
عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿١٠٨﴾ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ
مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا
يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ
نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿١٠٩﴾ ع ۹ ۱۴

۱۰۶۔پس جولوگ بدبخت ہیں وہ آگ میں ہوں گے۔ان کو وہاں چیخنا ہے اور دھاڑنا۔ ۱۰۷۔وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں،مگر جو تیرا رب چاہے۔بے شک تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۱۰۸۔اور جو لوگ نیک بخت ہیں ۔وہ جنت میں ہوں گے، وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں،مگر جو تیرا رب چاہے بخشش ہے بے انتہا۔ ۱۰۹۔پس تو ان چیزوں سے شک میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کررہے ہیں۔یہ تو بس اسی طرح عبادت کر رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کررہے تھے۔اور ہم ان کا حصہ انھیں پورا پورا دیں گے بغیر کسی کمی کے۔

قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت اور سب سے زیادہ تکرار کے ساتھ جس چیز کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ حالت پر چھوڑ نہیں دیے جائیں گے۔بلکہ موت کے بعد وہ خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔ وہاں ہر ایک اپنی کارکردگی کے مطابق جنت یا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اس اہمیت اور تکرار کی وجہ لوگوں کا ''شک'' ہے۔لوگ دیکھتے ہیں کہ زمین پر بے شمار انسان ایسے ہیں جو خدا کی ہدایت کو نہیں مانتے۔بے شمار انسان ایسے ہیں جو خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر عمل کرتے ہیں۔بیشتر انسان خدا پسند زندگی کے بجائے خود پسند زندگی گزار رہے ہیں۔پھر بھی ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔پھر بھی سارے لوگ کامیاب ہیں۔بظاہر یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا کہ خدا کے وفاداروں کو کوئی خصوصی انعام مل رہا ہو یا خدا کے نافرمانوں کو کوئی خاص سزا بھگتنی پڑتی ہو۔

اس بنا پر لوگوں کو شک ہونے لگتا ہے۔ان کو یقین نہیں آتا کہ انسانوں کا جو انجام مسلسل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے سوا بھی کوئی انجام ان کے لیے مقدر ہے۔یہاں قرآن بتاتا ہے کہ لوگوں کا مسلسل

غیرحق پر چلنا اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور پھر اس کو معقول پا کر اسے اختیار کرلیا۔ اس کا سبب دراصل رواج کی پیروی ہے، نہ کہ دلیل اور معقولیت کی پیروی۔

اس کے باوجود لوگوں کے عمل کا انجام ان کے سامنے نہیں آتا تو اس کا سبب مہلتِ امتحان ہے۔ زمین پر موت سے پہلے کی زندگی جانچ کی زندگی ہے۔ اس لیے موت تک انسان کو یہاں ڈھیل دی جارہی ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ موت اس مقررہ مدت کا خاتمہ ہے۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مقام امتحان سے اٹھا کر مقام عدالت میں پہنچا دیا جائے۔ وہاں ہر ایک کو وہی ملے گا جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جائے گا جس کو اس نے استحقاق کے بغیر اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۰۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ پھر اس میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات نہ آچکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور ان کو اس میں شبہ ہے جو مطمئن نہیں ہونے دیتا۔ ۱۱۱۔ اور یقیناً تیرا رب ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا۔ وہ باخبر ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔

''موسی کی کتاب میں اختلاف'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مخاطبین اس کے بیانات کے بارے میں کئی رائے ہوگئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے جھٹلایا اور کچھ لوگوں نے تسلیم کیا (فَاخْتَلَفَ فِي ذَلِكَ الْكِتَابِ قَوْمُ مُوسَى فَكَذَّبَ بِهِ بَعْضُهُمْ، وَصَدَّقَ بِهِ بَعْضُهُمْ) تفسیر الطبری، جلد 12، صفحہ 592۔

جب بھی کوئی بات کہی جائے تو آدمی اس کے بارے میں ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک، صحیح تعبیر۔ دوسری، غلط تعبیر۔ اگر سننے والے فی الواقع سنجیدہ ہوں تو وہ ہمیشہ ایک ہی صحیح تعبیر تک پہنچیں گے۔ ان کی سنجیدگی ان کے لیے اتحاد رائے کی ضامن بن جائے گی۔ اس کے برعکس، اگر وہ بات کے بارے میں سنجیدہ نہ ہوں تو وہ اس کو کوئی اہمیت نہ دیں گے اور اپنے خیال کے مطابق اس کی مختلف تعبیریں کریں گے۔ کوئی ایک بات کہے گا، کوئی دوسری بات۔ اس طرح ان کی غیر سنجیدگی انھیں اختلاف رائے تک پہنچا دے گی۔

یہ صورت تمام پیغمبروں کے ساتھ پیش آئی۔ اس کے باوجود خدا اس کو گوارا کرتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے موجودہ دنیا کو عمل کی جگہ بنایا ہے اور اگلی آنے والی دنیا کو بدلہ پانے کی جگہ۔ خدا کی یہی سنت ہے جس کی بنا پر لوگوں کو مکمل آزادی ملی ہوئی ہے۔ موجودہ صورتِ حال اسی مہلت امتحان کی بنا پر ہے، نہ کہ خدا کے عجز یا لوگوں کے کسی استحقاق کی بنا پر۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۲۔ پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمھارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو بیشک وہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ ۱۱۳۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے۔ ۱۱۴۔ اور نماز قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاددہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لیے۔ ۱۱۵۔ اور صبر کرو، اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

دعوتِ حق کا ابتدائی استقبال نظر انداز کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد مخالفت شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ مخالفت اپنے آخری نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ داعیوں کے لیے بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔ اس وقت ان کے درمیان دو قسم کے ذہن ابھرتے ہیں۔ کچھ لوگ جھنجھلا کر یہ چاہنے لگتے ہیں کہ مخالفین سے ٹکرا جائیں اور ان لوگوں سے قوت کے ذریعے نپٹیں جن کے لیے نظری دلائل بے اثر ثابت ہوئے ہیں۔ دوسرا ذہن وہ ہے جو یہ سوچتا ہے کہ مخاطبین کے لیے قابل قبول بنانے کی خاطر اپنی دعوت میں کچھ ترمیم کرلی جائے۔ دعوت کے ان اجزاء کا ذکر نہ کیا جائے جن کو سن کر مخاطبین بگڑ جاتے ہیں۔

پہلا رویہ اگر حد سے تجاوز کرنا ہے تو دوسرا رویہ باطل سے مصالحت کرنا۔ اور یہ دونوں ہی اللہ کی نظر میں یکساں طور پر غلط ہیں۔ خاص طور پر دوسری چیز (قابل قبول بنانے کی خاطر تبدیلی) تو جرم کا درجہ رکھتی ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے، وہ حق کا اعلان ہے۔ اور مصالحت کی صورت میں حق کا واضح اعلان نہیں ہوسکتا۔

دعوت کی راہ میں جب کوئی مشکل پیش آئے تو داعی کو چاہیے کہ خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ رجوع کرے کیونکہ سب کچھ کرنے والا وہی ہے۔ خدا کی مدد ہی تمام مشکلات کے حل کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ

۱۱۶۔ پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایسے اہلِ خیر ہوتے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے۔ ایسے تھوڑے لوگ نکلے جن کو ہم نے ان میں سے بچالیا۔ اور ظالم لوگ تو اسی

ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿116﴾ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿117﴾

عیش میں پڑے رہے جو انھیں ملا تھا اور وہ مجرم تھے۔ ۱۱۷۔ اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ناحق تباہ کردے، حالاں کہ اس کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔

یہاں پچھلوں سے مراد پچھلی امتیں بالفاظ دیگر پچھلی مسلم قومیں ہیں۔ قوم کا بگاڑ ہمیشہ اس طرح ہوتا ہے کہ دنیوی سامان جو خدا کی طرف سے انھیں اس لیے دیا گیا تھا کہ اس سے ان کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے، وہ ان کے لیے سرمستی اور دنیا پرستی پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

ایسی حالت میں مسلم قوم کی اصلاح کے لیے جو کام کرنا ہے اس کا عنوان شریعت کی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ حکم ایک مسلمان کی اس ذمہ داری کو بتاتا ہے جو اپنے قریبی ماحول کی اصلاح کے سلسلہ میں اس پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں ہمیشہ ایسے افراد موجود رہنے چاہییں جو مسلمانوں کو خدا اور آخرت کی یاد دلائیں۔ وہ ان کے اخلاق کی نگرانی کریں۔ وہ معاملات میں ان کو راہِ راست پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

کسی قوم میں ایسے اہلِ خیر کا نہ نکلنا ہمیشہ دو سبب سے ہوتا ہے۔ یا تو پوری قوم کی قوم بگڑ چکی ہو اور اس میں کوئی صالح انسان باقی نہ رہا ہو یا صالح افراد موجود تو ہوں مگر عمومی بگاڑ کی وجہ سے وہ زبان کھولنے کی ہمت نہ کرتے ہوں۔ انھیں اندیشہ ہو کہ اگر انھوں نے سچی بات کہی تو قوم کے درمیان وہ بے عزت ہو کر رہ جائیں گے۔

مذکورہ دونوں صورتوں میں قوم خدا کی نظر میں اپنا اعتبار کھو دیتی ہے اور اس کی مستحق ہو جاتی ہے کہ ایک یا دوسری صورت میں وہ عتابِ خداوندی کی زد میں آجائے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿118﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿119﴾

۱۱۸۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے۔ ۱۱۹۔ سوا ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے۔ اور اس نے اسی لیے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے اکٹھے بھر دوں گا۔

ہماری دنیا میں انسان کے سوا دوسری بے شمار مخلوقات بھی ہیں۔ یہ سب ہمیشہ فطرت کے ایک ہی مقرر راستہ پر چلتی ہیں۔ اسی طرح انسان کو بھی خدا ایک ہی صراطِ مستقیم کا پابند بنا سکتا تھا۔ مگر انسان کے بارے میں خدا کی یہ اسکیم ہی نہیں۔ انسان کے سلسلے میں خدا کا منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جائے جو خود اپنے آزادانہ اختیار

کے تحت ایک چیز کو لے اور دوسری چیز کو چھوڑ دے۔ انسان کی دنیا میں اختلاف (کسی کا ایک راستہ پر چلنا اور کسی کا دوسرے راستہ پر) دراصل اسی خاص خدائی منصوبہ کی بنا پر ہے۔

یہ منصوبہ یقیناً ایک پرخطر منصوبہ تھا کیوں کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت سے لوگ آزادی کا غلط استعمال کرکے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنالیں گے۔ مگر اسی پرخطر منصوبہ کے ذریعے وہ اعلیٰ روحیں بھی چنی جاسکتی تھیں جو خدا کی رحمت خاص کی مستحق قرار پائیں۔ خدا نے اپنی رحمتیں ساری کائنات کو بطور عطیہ دے رکھی ہیں۔ اب خدا نے یہ منصوبہ اس لیے بنایا تاکہ اپنی رحمت وہ اپنی ایک مخلوق کو یہ کہہ کر دے کہ یہ تمھارا حق ہے۔

خدا کی رحمت اس شخص کو ملتی ہے جس کا شعور اتنا بیدار ہوگیا ہو کہ وہ امتحانی اختیار کے اندر اپنی حقیقی بے اختیاری کو جان لے۔ وہ انسانی قدرت کے پردہ میں خدا کی قدرت کو دیکھ لے۔ یہ شعور ایسے آدمی سے سرکشی کی طاقت چھین لیتا ہے۔ حتی کہ اس کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ جب خدا اپنی رحمت کو اس کا حق کہہ کر پیش کرے تو اس کا شعورِ حقیقت پکار اٹھے — خدایا، یہ تیری رحمتوں ہی کا ایک کرشمہ ہے، ورنہ میرا عمل تو کسی قیمت کا مستحق نہیں۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا
نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ
مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ قُلْ
لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ
اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ
الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ع ۱۰/۱۴

۱۲۰۔ اور ہم رسولوں کے احوال سے سب چیز تمہیں سنا رہے ہیں۔ جس سے تمھارے دل کو مضبوط کریں اور اس میں تمھارے پاس حق آیا ہے اور مومنوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی۔ ۱۲۱۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لائے، ان سے کہو کہ تم اپنے طریقے پر عمل کرتے رہو اور ہم اپنے طریقہ پر عمل کر رہے ہیں۔ ۱۲۲۔ اور انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں۔ ۱۲۳۔ اور آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اللہ کے پاس ہے اور وہی تمام امور کا مرجع ہے۔ پس تم اس کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو اور تمھارا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔

قرآن میں رسولوں کے احوال اس لیے سنائے گئے ہیں کہ بعد کے داعیوں کو اس سے سبق حاصل ہو۔ رسولوں کے احوال میں داعی دیکھتا ہے کہ ان کی مخاطب قوموں نے ان سے جھگڑے کیے۔ سیدھی بات کو غلط رخ دے کر انھیں مطعون کیا۔ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ ان کو اس طرح رد کردیا جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

مگر بالآخر اللہ نے ان کی مدد کی۔ ان کی بات سب سے برتر ثابت ہوئی۔ مخالفین کی تمام کارروائیاں ناکام

ہوکررہ گئیں۔ دونوں گروہوں کا یہ مختلف انجام اپنی ابتدائی صورت میں موجودہ دنیا ہی میں پیش آیا اور آخرت میں وہ اپنی کامل ترین صورت میں پیش آئے گا۔

ان مثالوں سے داعی کو یہ تاریخی اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ اس کو دعوتِ حق کی راہ میں جو مشکلیں پیش آرہی ہیں ان میں اس کے لیے نہ مایوسی کا سوال ہے اور نہ گھبراہٹ کا۔ دعوت حق کی راہ میں یہ چیزیں ہمیشہ پیش آتی ہیں۔ اور اس کو بھی بالآخر اس طرح کامیابی حاصل ہوگی جس طرح اس سے پہلے خدا کے سچے داعیوں کو حاصل ہوئی۔

۱۲۔ سُوْرَۃُ یُوسُف

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ① قف اِنَّاۤ
اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ②
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ
اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ
قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ③

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ الٓرٰ، یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ ۲۔ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۳۔ ہم تم کو بہترین سرگزشت سناتے ہیں اس قرآن کی بدولت جو ہم نے تمھاری طرف وحی کیا۔ اس سے پہلے بے شک تو بے خبروں میں تھا۔

قرآن اگرچہ ساری دنیا کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ تاہم اس کے مخاطبِ اوّل عرب تھے۔ اس لیے وہ عربی زبان میں اترا۔ اب اس پر ایمان لانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تعلیمات کو ہر زبان میں منتقل کریں۔ اور اس کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچائیں۔

قرآن کی تعلیمات قرآن میں مختلف انداز اور اسلوب سے بیان کی گئی ہیں۔ کہیں وہ کائناتی استدلال کی زبان میں ہیں، کہیں انذار اور تبشیر کی زبان میں اور کہیں تاریخ کی زبان میں۔ سورہ یوسف میں یہ پیغام حضرت یوسف کے قصہ کی شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس سورہ میں اہل ایمان کو ایک پیغمبر کی سرگزشت کی صورت میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ حق کے لیے اٹھنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ اور مخالفین کی تمام سازشوں کے باوجود بالآخر ان کو کامیاب کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے اندر تقویٰ اور صبر کی صفت موجود ہو۔ یعنی وہ اللہ سے ڈرنے والے ہوں اور ہر حال میں حق کے راستے پر جمے رہیں۔

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ
اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ
لِیْ سٰجِدِیْنَ ④ قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ

۴۔ جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان، میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں۔ میں نے ان کو دیکھا کہ وہ مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔ ۵۔ اس کے باپ نے کہا کہ

رُءۡيَاكَ عَلٰۤى اِخۡوَتِكَ فَيَكِيۡدُوۡا لَكَ كَيۡدًا ؕ
اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۵﴾ وَ
كَذٰلِكَ يَجۡتَبِيۡكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنۡ
تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ وَ يُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ
وَعَلٰۤى اٰلِ يَعۡقُوۡبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيۡكَ
مِنۡ قَبۡلُ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶﴾ ع

اے میرے بیٹے، تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا کہ وہ تمھارے خلاف کوئی سازش کرنے لگیں۔ بے شک شیطان آدمی کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۶۔ اور اسی طرح تیرا رب تجھ کو منتخب کرے گا اور تم کو باتوں کی حقیقت تک پہنچنا سکھائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت پوری کرے گا جس طرح وہ اس سے پہلے تمھارے اجداد — ابراہیم اور اسحاق پر اپنی نعمت پوری کر چکا ہے۔ یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے۔

حدیث میں ہے کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔ اپنے دل کی بات، شیطان کا ڈراوا اور خدا کی بشارت (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2263)۔ عام آدمی کا خواب تینوں میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ مگر پیغمبر کا خواب ہمیشہ خدا کی بشارت ہوتا ہے، کبھی راست انداز میں اور کبھی تمثیلی انداز میں۔

حضرت یوسف کا زمانہ انیسویں صدی قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ آپ کے والد حضرت یعقوب فلسطین میں رہتے تھے۔ حضرت یوسف اور ان کے بھائی بن یامین ایک ماں سے تھے اور بقیہ دس بھائی دوسری ماؤں سے۔ اس خواب میں سورج اور چاند سے مراد آپ کے والدین ہیں اور گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی۔ اس میں یہ بشارت تھی کہ حضرت یوسف کو پیغمبری ملے گی اور اسی کے ساتھ یہ خواب آپ کے اس عروج واقتدار کی تمثیل تھا جو بعد کو مصر پہنچ کر آپ کو ملا اور جس کے بعد سارے اہل خاندان مجبور ہوئے کہ وہ آپ کی عظمت کو تسلیم کرلیں۔

حضرت یوسف کے دس سوتیلے بھائی آپ کی شخصیت اور مقبولیت کو دیکھ کر آپ سے حسد رکھتے تھے۔ اس لیے آپ کے والد (حضرت یعقوب) نے خواب سن کر فوراً کہا کہ اپنے بھائیوں سے اس کا ذکر نہ کرنا ورنہ وہ تمھارے اور زیادہ دشمن ہوجائیں گے۔

کسی کی بڑائی دیکھ کر اس کے خلاف جلن پیدا ہونا خالص شیطانی فعل ہے۔ جس شخص کے اندر یہ صفت پائی جائے اس کو اپنے بارے میں توبہ کرنی چاہیے۔ کیوں کہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خدا کے فیصلہ پر راضی نہیں۔ وہ شیطان کی ہدایت پر چل رہا ہے، نہ کہ خدا کی ہدایت پر۔

یہاں اتمام نعمت کا لفظ حضرت یوسف کے لیے بھی بولا گیا ہے جن کو حکومت حاصل ہوئی اور حضرت ابراہیم کے لیے بھی جن کو کوئی حکومت نہیں ملی۔ پھر دونوں کے درمیان وہ مشترک چیز کیا تھی جس کو اتمام نعمت کہا گیا ہے۔ وہ نبوت تھی۔ یعنی خدا کی اس خصوصی ہدایت کی توفیق جو کسی کو آخرت میں اعلیٰ مراتب تک پہنچانے والی

ہے۔ خدا کی ہدایت انسان کے اوپر خدا کی نعمتوں کی تکمیل ہے۔ یہ نعمت پیغمبروں کو براہِ راست طور پر ملتی ہے اور عام صالحین کو بالواسطہ طور پر۔

لَقَدۡ کَانَ فِیۡ یُوۡسُفَ وَ اِخۡوَتِہٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیۡنَ ﴿۷﴾ اِذۡ قَالُوۡا لَیُوۡسُفُ وَ اَخُوۡہُ اَحَبُّ اِلٰۤی اَبِیۡنَا مِنَّا وَ نَحۡنُ عُصۡبَۃٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنِۣ ﴿۸﴾ اقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡہُ اَرۡضًا یَّخۡلُ لَکُمۡ وَجۡہُ اَبِیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ قَوۡمًا صٰلِحِیۡنَ ﴿۹﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡہُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ وَ اَلۡقُوۡہُ فِیۡ غَیٰبَتِ الۡجُبِّ یَلۡتَقِطۡہُ بَعۡضُ السَّیَّارَۃِ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿۱۰﴾

۷۔ حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں میں پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔
۸۔ جب اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں۔ حالاں کہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ یقیناً ہمارا باپ ایک کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہے۔
۹۔ یوسف کو قتل کردو یا اس کو کسی جگہ پھینک دو تاکہ تمھارے باپ کی توجہ صرف تمھاری طرف ہوجائے۔ اور اس کے بعد تم بالکل ٹھیک ہوجانا۔
۱۰۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو۔ اگر تم کچھ کرنے ہی والے ہوتو اس کو کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو۔ کوئی راہ چلتا قافلہ اس کو نکال لے جائے گا۔

مکہ کے آخری دنوں میں جب کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہ کا انتقال ہوچکا تھا مکہ کے لوگوں نے آپ کی مخالفت تیز تر کردی۔ اس زمانہ میں مکہ کے بعض لوگوں نے آپ سے حضرت یوسف کا حال پوچھا جن کا نام انھوں نے اسفار کے دوران بعض یہودیوں سے سنا تھا۔ یہ سوال اگرچہ انھوں نے تمسخر کی غرض سے کیا تھا مگر اللہ تعالی نے اس کو خود پوچھنے والوں کی طرف لوٹا دیا۔ اس قصہ کے ذریعہ بالواسطہ طور پر انھیں بتایا گیا ہے کہ تم لوگ وہ ہو جن کے حصہ میں یوسف کے بھائیوں کا کردار آیا ہے۔ جب کہ پیغمبر کا انجام خدا کی رحمت سے وہ ہونے والا ہے جو یوسف کا مصر میں ہوا۔

حضرت یعقوب دیکھ رہے تھے کہ ان کی اولاد میں سب سے زیادہ لائق اور صالح حضرت یوسف ہیں۔ ان کے اندر انھیں مستقبل کے نبی کی شخصیت دکھائی دیتی تھی۔ اس بنا پر ان کو حضرت یوسف سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ مگر آپ کے دس صاحب زادے معاملہ کو دنیوی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ باپ کی نظر میں سب سے زیادہ اہم چیز ان کا جتھا ہونا چاہیے۔ کیوں کہ وہی اس قابل ہے کہ خاندان کی مدد اور حمایت کرسکے۔ ان کا یہ یک طرفہ نقطہ نظر یہاں تک پہنچا کہ انھوں نے سوچا کہ یوسف کو میدان سے ہٹا دیں تو باپ کی ساری توجہ ان کی طرف ہوجائے گی۔

وہ لوگ جب حضرت یوسف کے خلاف منصوبہ بنانے بیٹھے تو ان کے ایک بھائی (یہودا) نے یہ تجویز پیش کی کہ یوسف کو قتل کرنے کے بجائے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انتظام تھا۔ اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ کوئی گروہ جب ناحق کسی بندے کے درپے ہوجاتا ہے تو خود اس گروہ میں سے ایک ایسا شخص نکلتا ہے جو اپنے لوگوں کو کسی ایسی معتدل تدبیر پر راضی کرلے جس کے اندر سے اس بندۂ خدا کے لیے نیا امکان کھل جائے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ
اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا
يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ
اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ
يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾
قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ
اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

۱۱۔ انھوں نے اپنے باپ سے کہا، اے ہمارے باپ، کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے۔ حالاں کہ ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں۔ ۱۲۔ کل اس کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے، کھائے اور کھیلے، اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔ ۱۳۔ باپ نے کہا، میں اس سے غمگین ہوتا ہوں کہ تم اس کو لے جاؤ اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے جب کہ تم اس سے غافل ہو۔ ۱۴۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا جب کہ ہم ایک پوری جماعت ہیں، تو ہم بڑے خسارے والے ثابت ہوں گے۔

حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو جو جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے مطالعہ سے انھوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہ صحرا میں کھیلنے کودنے کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یوسف کے خلاف ان کے بھائیوں کی سازش کا معاملہ ہے۔ مگر اللہ سے ڈرنے والا انسان اللہ پر بھروسہ کرنے والا انسان ہوتا ہے۔ حضرت یعقوب نے اگرچہ اپنی فراست سے یہ محسوس کرلیا تھا کہ کیا ہونے جارہا ہے۔ تاہم وہ خدا کی قدرت کو ہر دوسری چیز سے اوپر سمجھتے تھے۔ ان کو خدا کی بالادستی پر کامل یقین تھا۔ چنانچہ واضح خطرات کے باوجود انھوں نے یوسف کو خدا کے بھروسہ پر ان کے بھائیوں کے حوالے کردیا۔

یہ خدا سے ڈرنے والے انسان کی تصویر تھی۔ دوسری طرف حضرت یوسف کے بھائیوں میں ان لوگوں کی تصویر نظر آتی ہے جن کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں۔ یہ لوگ ایک بندۂ خدا کو ناحق برباد کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں خدا کے سوا کسی اور کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ وہ لفظوں کے اعتبار سے اپنے کو خیر خواہ ثابت کررہے تھے۔ حالانکہ خدا کے نزدیک خیر خواہ وہ ہے جو عمل کے اعتبار سے اپنے کو خیر خواہ ثابت کرے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ
غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ
بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَ
جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا
يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ
عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ
بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَ جَآءُوْ
عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ
لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ
الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

۱۵۔ پھر جب وہ اس کو لے گئے اور یہ طے کرلیا کہ اس کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے یوسف کو وحی کی کہ تو ان کو ان کا یہ کام جتائے گا اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے۔ ۱۶۔ اور وہ شام کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔ ۱۷۔ انھوں نے کہا کہ اے ہمارے باپ، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے لگے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا۔ پھر اس کو بھیڑیا کھا گیا۔ اور آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے، چاہے ہم سچے ہوں۔ ۱۸۔ اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر لے آئے۔ باپ نے کہا نہیں، بلکہ تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک بات بنادی ہے۔ اب صبر ہی بہتر ہے۔ اور جو بات تم ظاہر کر رہے ہو، اس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔

حضرت یوسف کا اصل قصہ یقینی طور پر اس سے زیادہ مفصّل ہے جتنا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مگر قرآن کا اصل مقصد نصیحت ہے، نہ کہ واقعہ نگاری۔ اس لیے وہ صرف ان پہلوؤں کو لیتا ہے جو نصیحت اور تذکیر کے لیے مفید ہوں۔ اور بقیہ تمام اجزاء کو حذف کردیتا ہے تاکہ تاریخ نگار اس کو مرتب کریں۔

روایات کے مطابق حضرت یوسف تین دن تک اندھے کنوئیں میں رہے۔ انھیں تین دنوں میں غالباً خواب کے ذریعہ آپ کو آپ کا مستقبل دکھایا گیا۔ اس میں آپ نے دیکھا کہ آپ کنویں سے نکلتے ہیں اور پھر عظمت وشان کے ایک اونچے مقام پر پہنچتے ہیں۔ حتی کہ آپ کے اور آپ کے بھائیوں کے درمیان حیثیت کے اعتبار سے اتنا فرق ہوجاتا ہے کہ وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو پہچان نہیں پاتے۔

حضرت یوسف کے بھائیوں نے جو کچھ کیا وہ انتہائی اشتعال انگیز حرکت تھی۔ مگر ایک طرف حضرت یوسف کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اپنے معاملہ کو خدا کے حوالے کردیا اور سنسان مقام پر اندھے کنویں کے اندر خاموش بیٹھے ہوئے خدا کی مدد کا انتظار کرتے رہے۔ دوسری طرف آپ کے والد حضرت یعقوب نے صبر جمیل کی روش اختیار کی۔ بعض تفسیروں میں آیا ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: اگر یوسف کو بھیڑیا کھاجاتا تو وہ اس کی قمیص کو بھی ضرور پھاڑ ڈالتا (لَوْ أَكَلَهُ السَّبُعُ لَخَرَقَ الْقَمِيصَ) تفسیر الطبری، جلد 13، صفحہ 36۔ یعنی وہ بھیڑیا بھی کیسا شریف بھیڑیا تھا جو یوسف کو تو اٹھالے گیا اور خون آلود قمیص کو نہایت صحیح وسالم حالت میں اتار کر تمھارے حوالے کر گیا۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَأَدْلٰى
دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوْهُ
بِضَاعَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ
شَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ
ع وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

۱۹۔اور ایک قافلہ آیا تو انھوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا۔ اس نے اپنا ڈول لٹکا دیا۔ اس نے کہا، خوش خبری ہو، یہ تو ایک لڑکا ہے۔ اور اس کو تجارت کا مال سمجھ کر محفوظ کرلیا۔ اور اللہ خوب جانتا تھا جو وہ کررہے تھے۔ ۲۰۔اور انھوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت، چند درہم کے عوض بیچ دیا۔ اور وہ اس سے بے رغبت تھے۔

حضرت یوسف کے بھائی جب آپ کو اندھے کنویں میں ڈال کر چلے گئے تو تین دن بعد ایک تجارتی قافلہ ادھر سے گزرا جو مدین سے مصر جا رہا تھا۔ قافلہ کے ایک آدمی نے پانی کی خاطر کنویں میں ڈول ڈالا تو حضرت یوسف (جو اس وقت تقریباً 16 سال کے تھے) ڈول پکڑ کر باہر آ گئے۔

یہ بردہ فروشی کا زمانہ تھا۔ اس لیے قافلہ والے خوش ہوئے کہ وہ مصر لے جا کر لڑکے کو فروخت کرسکیں گے۔ چنانچہ جب وہ مصر پہنچے تو اپنے دیگر سامانوں کے ساتھ حضرت یوسف کو بھی بازار میں رکھا۔ وہاں ایک آدمی نے ہونہار لڑکا دیکھ کر آپ کو بیس درہم میں خرید لیا۔

حضرت یوسف کے بھائی آپ کو بے وطن کرکے کنویں میں ڈال چکے تھے۔ قافلہ والوں نے غلام کی حیثیت سے فروخت کردیا۔ اس کے بعد مصر کے ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بیوی (زلیخا) نے آپ کو قید خانہ میں قید کرا دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراحل کو آپ کے لیے عزّت و سربلندی تک پہنچنے کا زینہ بنا دیا — کس قدر فرق ہے علم انسانی میں اور علم خداوندی میں۔

وَ قَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ
لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ
اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ
فِى الْاَرْضِ ۫ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ
الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ
اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ
نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

۲۱۔اور اہل مصر میں سے جس شخص نے اس کو خریدا، اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو اچھی طرح رکھو۔ امید ہے کہ وہ ہمارے لیے مفید ہو یا ہم اس کو بیٹا بنالیں۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں جگہ دی۔ اور تاکہ ہم اس کو باتوں کی تاویل سکھائیں۔ اور اللہ اپنے کام پر غالب رہتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۲۲۔اور جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا ہم نے اس کو حکم اور علم عطا کیا۔ اور نیکی کرنے والوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مصری حکومت کے ایک افسر (فوطیفار) نے حضرت یوسف کو خریدا۔ معمولی کپڑے میں چھپی ہوئی آپ کی شاندار شخصیت کو اس نے پہچان لیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی غلام نہیں ہے بلکہ شریف خاندان کا لڑکا ہے۔ کسی وجہ سے وہ قافلہ کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے اس کو یہاں لا کر بیچ دیا۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو غلام کی طرح نہ رکھنا۔ یہ ایک لائق نوجوان معلوم ہوتا ہے اور اس قابل ہے کہ ہمارے گھر اور جائداد کا انتظام سنبھال لے۔ مزید یہ کہ فوطیفار بے اولاد تھا اور کسی کو اپنا متبنیٰ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ ارادہ بھی کرلیا کہ اگر واقعی یہ نوجوان اس کی امیدوں کے مطابق نکلا تو وہ اس کو اپنا بیٹا بنا لے گا۔

حضرت یوسف جب تقریباً چالیس سال کے ہوئے تو خدا نے ان کو ایک طرف نبوت عطا کی اور دوسری طرف اقتدار۔ ان کو یہ انعام ان کے حسن عمل کی وجہ سے ملا۔ خدا کے انعام کا دروازہ ہمیشہ محسنین کے لیے کھلا ہوا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دور نبوت میں کسی کو اس کے حسنِ عمل کے نتیجہ میں نبی بھی بنایا جاسکتا تھا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس کو صرف وہ انعامات ملیں گے جو نبوت کے علاوہ ہیں۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

۲۳۔ اور یوسف جس عورت کے گھر میں تھا وہ اس کو پھسلانے لگی اور ایک روز اس نے دروازے بند کر دیے اور بولی کہ آجا۔ یوسف نے کہا خدا کی پناہ۔ وہ میرا آقا ہے، اس نے مجھ کو اچھی طرح رکھا ہے۔ بے شک ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے۔ ۲۴۔ اور عورت نے اس کا ارادہ کرلیا اور وہ بھی اس کا ارادہ کرتا اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کر دیں۔ بے شک وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔

عزیز مصر کی بیوی زلیخا حضرت یوسف پر فریفتہ ہوگئی۔ وہ برابر آپ کو پھسلاتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک روز موقع پا کر اس نے کمرہ کا دروازہ بند کرلیا۔

ایک غیر شادی شدہ نوجوان کے لیے یہ بڑا نازک موقع تھا۔ مگر حضرت یوسف نے اپنی فطرت ربّانی کو محفوظ رکھا تھا اور یہ فطرت اس وقت حضرت یوسف کے کام آگئی۔ حق اور ناحق بھلائی اور برائی کو پہچاننے کی یہ طاقت ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ وہ ہر موقع پر انسان کو متنبہ کرتی ہے۔ جو شخص اس کو نظر انداز کر دے اس نے گویا خدا کی آواز کو نظر انداز کر دیا۔ ایسا آدمی خدا کی مدد سے محروم ہو کر دھیرے دھیرے

اپنی فطرت کو کمزور کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص خدائی پکار کے ظاہر ہوتے ہی اس کے آگے جھک جائے، خدا کی مدد اس کی استعداد بڑھاتی رہتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ آئندہ زیادہ قوت کے ساتھ برائی کے مقابلہ میں ٹھہر سکے۔

حضرت یوسف کو جس چیز نے برائی سے روکا وہ حقیقۃً اللہ کا ڈر تھا۔ مگر زلیخا کے لیے خدا کا حوالہ دینا اس وقت بے اثر رہتا۔ یہ موقع اعلان حق کا نہیں تھا بلکہ ایک نازک صورت حال سے اپنے آپ کو بچانے کا تھا اسی نزاکت کی بنا پر آپ نے زلیخا کو اس کے شوہر کا حوالہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ میرا آقا ہے۔ اس نے مجھے نہایت عزت کے ساتھ اپنے گھر میں رکھا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے محسن کے ناموس پر حملہ کروں۔

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ
وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا
جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ
يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ
رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ
اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ
فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اِنْ
كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ
دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ
عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَ
اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ
الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۳ ۹ ۱۴

۲۵۔ اور دونوں دروازے کی طرف بھاگے۔ اور عورت نے یوسف کا کرتا پیچھے سے پھاڑ دیا۔ اور دونوں نے اس کے شوہر کو دروازے پر پایا۔ عورت بولی کہ جو تیری گھر والی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے، اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ اسے قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے۔ ۲۶۔ یوسف بولا کہ اسی نے مجھے پھسلانے کی کوشش کی۔ اور عورت کے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہو تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے۔ ۲۷۔ اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے۔ ۲۸۔ پھر جب عزیز نے دیکھا کہ اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو اس نے کہا کہ بے شک یہ تم عورتوں کی چال ہے۔ اور تمھاری چالیں بہت بڑی ہوتی ہیں۔ ۲۹۔ یوسف، اس سے درگزر کرو۔ اور اے عورت تو اپنی غلطی کی معافی مانگ۔ بے شک تو ہی خطا کار تھی۔

حضرت یوسف اپنے آپ کو بچانے کے لیے دروازے کی طرف بھاگے۔ زلیخا بھی ان کے پیچھے دوڑی اور پیچھے سے آپ کا کرتا پکڑ لیا۔ کھینچ تان میں پیچھے کا دامن پھٹ گیا۔ تاہم حضرت یوسف دروزاہ کھول کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازہ کے باہر اتفاق سے زلیخا کا شوہر موجود تھا۔ اس کو دیکھتے ہی زلیخا نے سارا الزام حضرت یوسف پر ڈال

دیا۔ایک لمحہ پہلے وہ جس شخص سے اظہار محبت کر رہی تھی، ایک لمحہ بعد اس پر جھوٹا الزام لگانے لگی۔

حضرت یوسف نے بتایا کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔اب سوال یہ تھا کہ فیصلہ کیسے کیا جائے کہ غلطی کس کی ہے۔کوئی تیسرا شخص موقع پر موجود نہیں تھا جو عینی گواہی دے۔اس وقت گھر کے ایک مرد دانا نے لوگوں کو رہنمائی دی۔اغلب ہے کہ یہ شخص پہلے حالات سے باخبر تھا۔نیز اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ یوسف کا کرتا آگے کے بجائے پیچھے کی طرف سے پھٹا ہوا ہے۔مگر اس نے اپنی بات کو ایسے انداز میں کہا گویا کہ وہ لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ جب عینی شہادت موجود نہیں ہے تو قرینہ کی شہادت (circumstantial evidence) دیکھ کر فیصلہ کرلو۔اور قرینہ کی شہادت یہ تھی کہ حضرت یوسف کا کُرتا پیچھے کی جانب سے پھٹا ہوا تھا۔یہ واضح طور پر اس کا ثبوت تھا کہ اس معاملہ میں اقدام زلیخا کی طرف سے ہوا ہے، نہ کہ یوسف کی طرف سے۔

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ

۳۰۔اور شہر کی عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔وہ اس کی محبت میں فریفتہ ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کھلی ہوئی غلطی پر ہے۔۳۱۔پھر جب اس نے ان کا فریب سنا تو اس نے ان کو بلا بھیجا۔اور ان کے لیے ایک مجلس تیار کی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھری دی اور یوسف سے کہا کہ تم ان کے سامنے آؤ۔پھر جب عورتوں نے اس کو دیکھا تو وہ دنگ رہ گئیں۔اور انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔اور انھوں نے کہا حاشا للہ، یہ آدمی نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔۳۲۔اس نے کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھ کو ملامت کر رہی تھیں اور میں نے اس کو رجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بچ گیا۔اور اگر اس نے وہ نہیں کیا جو میں اس سے کہہ رہی ہوں تو وہ قید میں پڑے گا اور ضرور بے عزت ہوگا۔۳۳۔یوسف نے کہا، اے میرے رب، قید خانہ مجھ کو اس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ مجھے بلا رہی ہیں۔اور اگر تو نے ان کے فریب کو مجھ سے دفع نہ

اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ
لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

کیا تو میں ان کی طرف مائل ہوجاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہوجاؤں گا۔ ۳۴۔ پس اس کے رب نے اس کی دعا قبول کرلی اور ان کے فریب کو اس سے دفع کردیا۔ بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس قصہ میں ایک طرف مصر کے اونچے طبقہ کی خواتین تھیں اور دوسری طرف حضرت یوسف۔ خواتین آپ کو بس ایک خوب صورت جوان کی صورت میں دیکھ رہی تھیں۔ اسی طرح حضرت یوسف ان خواتین کو تسکین نفس کے سامان کے روپ میں دیکھ سکتے تھے۔ مگر انتہائی ہیجان خیز حالات میں بھی آپ نے ایسا نہیں کیا۔

خواتین کا حال یہ تھا کہ وہ سب کی سب آپ کی پُرکشش شخصیت کی طرف متوجہ تھیں۔ حتی کہ شدّت محویت میں انھوں نے چھری سے پھل کاٹتے ہوئے اپنے ہاتھ زخمی کرلیے۔ مگر حضرت یوسف اپنی تمام تر توجہ خدا کی طرف لگائے ہوئے تھے۔ خدا کی عظمت و کبریائی کا احساس آپ کے اوپر اتنا غالب آچکا تھا کہ کوئی دوسری چیز آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی — کتنا فرق ہے ایک انسان اور دوسرے انسان میں۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ
لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ؑ وَ دَخَلَ مَعَهُ
السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ
اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ
اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ
مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾

۳۵۔ پھر نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ان لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ ایک مدت کے لیے اس کو قید کردیں۔ ۳۶۔ اور قید خانہ میں اس کے ساتھ دو اور جوان داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے (ایک روز) کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھارہی ہیں۔ ہم کو اس کی تعبیر بتاؤ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تم نیک لوگوں میں سے ہو۔

مصر کے اعلیٰ طبقہ کی خواتین جب حضرت یوسف کو اپنی طرف راغب نہ کرسکیں تو اس کے بعد انھوں نے آپ کے لیے جو مقام پسند کیا وہ قید خانہ تھا۔ چوں کہ اس وقت آپ کی حیثیت ایک غلام کی تھی اس لیے قدیم رواج کے مطابق آپ کو قید خانہ بھیجنے کے لیے کسی عدالتی کارروائی کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کا آقا خود اپنے فیصلہ سے آپ کو قید میں ڈالنے کا اختیار رکھتا تھا۔

مگر قید خانہ آپ کے لیے نیا عظیم تر زینہ بن گیا۔ اب تک ایسا تھا کہ مصر کے ایک یا چند افسروں کے گھرانے آپ سے متعارف ہوئے تھے۔ اب اس کا امکان پیدا ہوگیا کہ آپ کی شخصیت کا چرچا خود بادشاہ مصر تک پہنچے۔

اس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ جس قید خانہ میں رکھے گئے اس میں دو اورنوجوان قید ہو کر آئے۔ یہ دونوں شاہی محل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں نے قید خانہ میں خواب دیکھے اور آپ سے اس کی تعبیر پوچھی۔ آپ نے انھیں خواب کی تعبیر بتادی۔ یہ تعبیر بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ان میں سے ایک قید خانہ سے چھوٹ کر دوبارہ شاہی محل میں پہنچا تو اس نے ایک موقع پر بادشاہ سے بتایا کہ قید خانہ میں ایک ایسا نیک انسان ہے جو خواب کی بالکل صحیح تعبیر بتاتا ہے — اس طرح آپ کا قید ہونا آپ کے لیے شاہی محل تک رسائی کا ابتدائی زینہ بن گیا۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ؕ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

۳۷۔ یوسف نے کہا، جو کھانا تم کو ملتا ہے، اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان خوابوں کی تعبیر بتادوں گا۔ یہ اس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ لوگ آخرت کے منکر ہیں۔ ۳۸۔ اور میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔ ہم کو یہ حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے ہمارے اوپر اور سب لوگوں کے اوپر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ ۳۹۔ اے میرے جیل کے ساتھیو، کیا جدا جدا کئی معبود بہتر ہیں یا اللہ اکیلا زبردست۔ ۴۰۔ تم اس کے سوا نہیں پوجتے ہو مگر کچھ ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے اس کی کوئی سند نہیں اتاری۔ اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے۔ مگر بہت لوگ نہیں جانتے۔

نوجوان قیدیوں نے اپنے خواب کی تعبیر جاننے کے لیے حضرت یوسف سے رجوع کیا۔ انھوں نے جس انداز سے سوال کیا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آپ کی شخصیت سے متاثر ہیں۔ اور آپ کی رائے پر اعتماد کرتے

ہیں۔حضرت یوسف جیسے نیک اور بااصول انسان کے ساتھ ایک عرصہ تک رہنے کے بعد ایسا ہونا بالکل فطری تھا۔

حضرت یوسف کے دعوتی جذبے نے فوراً محسوس کرلیا کہ یہ بہترین موقع ہے کہ ان نوجوانوں کو دینِ حق کا پیغام پہنچایا جائے۔مگر خواب کی تعبیر فوراً بتادینے کے بعد ان کی توجہ آپ کی طرف سے ہٹ جاتی۔ چنانچہ آپ نے حکیمانہ انداز اختیار کیا اور خواب کی تعبیر کو تھوڑی دیر کے لیے مؤخر کردیا۔اس کے بعد آپ نے توحید پر مختصر تقریر کی۔اس میں مخاطب کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے نہایت خوب صورت استدلال کے ساتھ اپنا پیغام انھیں سنادیا۔

درخت، پتھر، ستارے یا ارواح وغیرہ کو جو لوگ پوجتے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ وہ بطور خود ان کو مشکل کشا اور حاجت روا جیسے القاب دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ واقعةً وہ مشکل کشا اور حاجت روا ہیں۔حالاں کہ یہ سب انسان کے اپنے بنائے ہوئے اسم ہیں جن کا مسمی خارج میں کہیں موجود نہیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ
رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ
الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ
فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ
نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ
الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ
سِنِيْنَ ۝۴۲ ع ۵

۴۱۔اے میرے قید خانہ کے ساتھیو،تم میں سے ایک اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔اور جو دوسرا ہے اس کو سولی دی جائے گی۔پھر پرندے اس کے سر میں سے کھائیں گے۔اس امر کا فیصلہ ہو گیا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔ ۴۲۔اور یوسف نے اس شخص سے کہا جس کے بارے میں اس نے گمان کیا تھا کہ وہ بچ جائے گا کہ اپنے آقا کے پاس میرا ذکر کرنا۔پھر شیطان نے اس کو اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا۔پس وہ قید خانہ میں کئی سال پڑا رہا۔

دونوجوان جو جیل میں لائے گئے وہ شاہ مصر (ریان بن الولید) کے ساقی اور خبّاز (bread-maker) تھے۔ دونوں پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے بادشاہ کے کھانے میں زہر ملانے کی کوشش کی۔ان میں سے جو ساقی تھا وہ تحقیق کے بعد الزام سے بری ثابت ہوا اور رہائی پا کر دوبارہ بادشاہ کا ساقی مقرر ہوا۔اس کے خواب کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ بادشاہ کو خواب میں شراب پلا رہا ہے کچھ دن بعد وہ بیداری میں اس کو شراب پلائے گا۔خبّاز پر الزام ثابت ہو گیا۔اس کو سولی دے کر چھوڑ دیا گیا کہ چڑیاں اس کا گوشت کھائیں اور وہ لوگوں کے لیے عبرت ہو۔

حضرت یوسف کی دونوں تعبیریں بالکل درست ثابت ہوئیں۔مگر ساقی قید سے چھوٹ کر دوبارہ محل میں پہنچا تو وہ حسبِ وعدہ بادشاہ سے حضرت یوسف کا ذکر کرنا بھول گیا۔اس کو اپنا کیا ہوا وعدہ صرف اس وقت یاد آیا جب کہ بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور درباریوں سے کہا کہ اس کی تعبیر بتاؤ۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

۴۳۔ اور بادشاہ نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیاں ہیں اور دوسری سات سوکھی بالیاں، اے دربار والو، میرے خواب کی تعبیر مجھے بتاؤ اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو۔ ۴۴۔ وہ بولے یہ خیالی خواب ہیں۔ اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں۔ ۴۵۔ ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اس کو ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا کہ میں تم لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا، پس مجھ کو (یوسف کے پاس) جانے دو۔

مصر کا بادشاہ اگرچہ مشرک اور شرابی تھا، مگر خدا کی طرف سے اس کو مستقبل کے بارے میں ایک سچا خواب دکھایا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا حق کے داعیوں کی مدد کن کن طریقوں سے کرتا ہے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ فریق ثانی کو کوئی ایسا خواب دکھایا جائے جس سے اس کے ذہن پر داعی کی عظمت اور اہمیت قائم ہو اور اس کا دل نرم ہو کر داعی کے لیے نئے راستے کھل جائیں۔

بادشاہ کے ساقی نے جب بادشاہ کا خواب سنا اس وقت اس کو قید خانہ کا ماجرا یاد آیا۔ اس نے بادشاہ اور درباریوں کے سامنے اپنا ذاتی تجربہ بتایا کہ کس طرح یوسف کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیر دو قیدیوں کے حق میں لفظ بلفظ صحیح ثابت ہوئی۔ اس کے بعد وہ بادشاہ سے اجازت لے کر قید خانہ پہنچا تاکہ یوسف سے بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کرے۔

حضرت یوسف کی اسی حیثیت کے تعارف سے ان کے لیے قید خانہ سے باہر آنے کا راستہ کھلا۔ خدا ایسا کر سکتا تھا کہ رہائی کے بعد حضرت یوسف کو مزید قید خانہ میں نہ رہنے دے۔ وہ ساقی کو محل کے اندر پہنچتے ہی یاد دلا سکتا تھا کہ وہ وعدہ کے مطابق بادشاہ کے سامنے یوسف کا ذکر کرے۔ مگر خدا کا ہر کام اپنے مقرر وقت پر ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے کوئی کام کرنا خدا کا طریقہ نہیں۔

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ

۴۶۔ یوسف اے سچے، مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں۔ اور سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔ تاکہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں

ارْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝٤٦ قَالَ
تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا
حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا
تَاْكُلُوْنَ ۝٤٧ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ
شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝٤٨ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ۝٤٩ ع

تا کہ وہ جان لیں۔ ۴۷۔ یوسف نے کہا کہ تم سات سال تک برابر کھیتی کرو گے۔ پس جو فصل تم کاٹو، اس کو اس کی بالیوں میں چھوڑ دو مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ۔ ۴۸۔ پر اس کے بعد سات سخت سال آئیں گے۔ اس زمانہ میں وہ غلہ کھالیا جائے گا جو تم اس وقت کے لیے جمع کرو گے، بجز تھوڑا سا جو تم محفوظ کرلو گے۔ ۴۹۔ پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر مینہ برسے گا۔ اور وہ اس میں رس نچوڑیں گے۔

حضرت یوسف نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ سات موٹی گائیں اور سات ہری بالیں سات برس ہیں۔ ان میں لگاتار اچھی پیداوار ہوگی۔ حیوانات اور نباتات خوب بڑھیں گے۔ اس کے بعد سات سال قحط پڑے گا جس میں تم سارا اچھلا اندوختہ کھا کر ختم کر ڈالو گے۔ صرف آئندہ بیج ڈالنے کے لیے تھوڑا سا باقی رہ جائے گا۔ یہ بعد کے سات سال گویا دبلی گائیں اور سوکھی بالیں ہیں جو پچھلی گایوں اور ہری بالوں کا خاتمہ کر دیں گی۔

اسی کے ساتھ حضرت یوسف نے اس کی تدبیر بھی بتا دی۔ آپ نے کہا کہ پہلے سات سال میں جو پیداوار ہو اس کو نہایت حفاظت سے رکھو اور کفایت کے ساتھ خرچ کرو۔ ضروری خوراک سے زیادہ جو غلّہ ہے اس کو بالوں کے اندر رہنے دو۔ اس طرح وہ کیڑے وغیرہ سے محفوظ رہے گا۔ اور سات سال کی پیداوار چودہ سال تک کام آئے گی۔ مزید آپ نے یہ خوش خبری بھی سنا دی کہ بعد کے سات سالہ قحط کے بعد جو سال آئے گا وہ دوبارہ فراوانی کا سال ہوگا۔ اس میں خوب بارش ہوگی، کثرت سے دودھ اور پھل لوگوں کو حاصل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو ایک عجیب خواب دکھایا اور حضرت یوسف کے ذریعہ اس کی کامیاب تعبیر ظاہر فرمائی۔ اس طرح آپ کے لیے یہ موقع فراہم کیا گیا کہ مصر کے نظام حکومت میں آپ کو نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ
قَالَ ارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ
الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ
عَلِيْمٌ ۝٥٠ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ
يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا

۵۰۔ اور بادشاہ نے کہا کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ پھر جب قاصد اس کے پاس آیا تو اس نے کہا کہ تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ میرا رب تو ان کے فریب سے خوب واقف ہے۔ ۵۱۔ بادشاہ نے پوچھا، تمھارا

عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾

کیا ماجرا ہے جب تم نے یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ حاشاللہ، ہم نے اس میں کچھ برائی نہیں پائی۔ عزیز کی بیوی نے کہا اب حق کھل گیا۔ میں نے ہی اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی اور بلاشبہ وہ سچا ہے۔

قید خانہ سے نکل کر حضرت یوسف کو ایک ملکی کردار ادا کرنا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ آپ کی شخصیت ملکی سطح پر ایک معروف شخصیت بن جائے۔ اس کی صورت بادشاہ کے خواب کے ذریعہ پیدا ہوگئی۔ بادشاہ نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ وہ اس کی تعبیر کے لیے اتنا بے چین ہوا کہ عام اعلان کر کے تمام ملک کے علماء، پیروں اور دانشوروں کو اپنے دربار میں جمع کیا۔ اور ان سے کہا کہ وہ اس خواب کی تعبیر بتائیں مگر سب کے سب عاجز رہے۔ اس طرح خواب کا واقعہ ایک عمومی شہرت کا واقعہ بن گیا۔ اب جب حضرت یوسف نے خواب کی تعبیر بیان کی اور بادشاہ نے اس کو پسند کیا تو اچانک وہ تمام ملک کی نظروں میں آگئے۔

بادشاہ نے ساری بات سننے کے بعد متعلقہ عورتوں سے اس کی تحقیق کی۔ سب نے بیک زبان حضرت یوسف کو بری الذمہ قرار دیا۔ عزیز مصر کی بیوی اعتراف حق میں سب سے آگے نکل گئی۔ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ اب سچائی کھل چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا قصور میرا تھا۔ یوسف کا کچھ بھی قصور نہ تھا۔ عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) کا یہ اقرار اتنا عظیم عمل ہے کہ عجب نہیں کہ اس کے بعد اس کو ایمان کی توفیق دے دی گئی ہو۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

۵۲۔ یہ اس لیے کہ (عزیز مصر) یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی۔ اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو چلنے نہیں دیتا۔ ☆ ۵۳۔ اور میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتا۔ نفس تو بدی ہی سکھاتا ہے، الا یہ کہ میرا رب رحم فرمائے۔ بے شک میرا رب بخشنے والا، مہربان ہے۔

بادشاہ نے جب حضرت یوسف کو بلایا تو وہ فوراً قید خانہ سے باہر نہیں آگئے۔ بلکہ یہ کہا کہ پہلے اس واقعہ کی تحقیق ہونی چاہیے جس کو بہانہ بنا کر مجھ کو قید کیا گیا تھا۔ خدا کے نزدیک اگرچہ آپ پوری طرح بری الذمہ تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ آپ کو عوام کے درمیان پیغمبری کی خدمت انجام دینی تھی۔ یعنی خدا کی امانتِ ہدایت کو اس کے بندوں تک پہنچانا تھا۔ مذکورہ واقعہ میں آپ پر اپنے آقا کے ساتھ خیانت کا الزام لگایا گیا تھا۔

یہ ایک بہت نازک معاملہ تھا اور عوام کے سامنے آنے سے پہلے ضروری تھا کہ آپ کے اوپر سے یہ الزام ختم ہو کیوں کہ جس شخص کو لوگ بندوں کے معاملہ میں امانت دار نہ سمجھیں اس کو وہ خدا کے معاملہ میں امانت دار نہیں سمجھ سکتے۔

مومن بیک وقت دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک انسان اور دوسرے خدا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو انسانوں کی نسبت سے معاملہ کی وضاحت کے لیے کوئی ایسا کلمہ بولنا پڑتا ہے جس میں بظاہر ادعا کا پہلو نظر آتا ہو۔ مگر اس کا دل اس وقت بھی عجز کے احساس سے بھرا ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب وہ اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے دیکھتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ خدا کی نسبت سے وہ صرف عاجز ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا کا تصور ہر آن مومن کو متوازن کرتا رہتا ہے — حضرت یوسف کا مذکورہ کلام مومن کی شخصیت کے اسی دوگونہ پہلو کی تصویر ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ ع ۸

۵۴۔ اور بادشاہ نے کہا، اس کو میرے پاس لاؤ۔ میں اس کو خاص اپنے لیے رکھوں گا۔ پھر جب یوسف نے اس سے بات کی تو بادشاہ نے کہا، آج سے تم ہمارے یہاں معزز اور معتمد ہوئے۔
۵۵۔ یوسف نے کہا کہ مجھ کو ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو۔ میں نگہبان ہوں اور جاننے والا ہوں۔
۵۶۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں با اختیار بنا دیا۔ وہ اس میں جہاں چاہے جگہ بنائے۔ ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں۔ اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔
۵۷۔ اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے، ایمان اور تقویٰ والوں کے لیے۔

''مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو''۔ یہاں خزانوں سے مراد غلہ کے کھتے (granaries) ہیں۔ حضرت یوسف نے بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر شاہ مصر سے یہ اختیار مانگا کہ وہ حکومتی وسائل کے تحت سارے ملک میں غلّہ کے بڑے بڑے کھتے بنوائیں تاکہ ابتدائی سات سالوں میں کسانوں سے فاضل غلّہ لے کر وہاں محفوظ کیا جا سکے (تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 397)۔ بادشاہ راضی ہو گیا اور اپنے آئینی اور قانونی اقتدار کے تحت آپ کو ہر قسم کا اختیار دے دیا۔

مصر کا بادشاہ مشرک تھا۔ آیت نمبر 76 سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کے تقرر کے تقریباً دس سال بعد تک بھی اسی بادشاہ کا قانون (دین الملک) مصر میں رائج تھا۔ یہ خدا کے ایک پیغمبر کا اسوہ ہے جو بتاتا ہے کہ

غیر مسلم حکومت کے تحت کوئی ذیلی عہدہ قبول کرنا اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ اسی بنا پر اسلاف نے ظالم بادشاہ کے تحت قضا کے عہدے قبول کیے (تفسیر النسفی، جلد 2، صفحہ 119)۔

مصر میں اختیار سنبھالنے سے حضرت یوسف کا مقصد کیا تھا، قرآن کی تفصیل سے بظاہر اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندگان خدا کو طویل قحط کی مصیبت سے بچایا جائے، اور پھر اس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کے لیے مصر میں آباد ہونے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

ایمان اور تقویٰ کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے خدا نے ابدی جنت کا یقینی وعدہ کیا ہے۔ دنیا کی زندگی میں بھی ان کو خدا کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ تاہم اس میں ایک فرق ہے۔ جہاں تک حق کے اعلان کا معاملہ ہے، اس کی توفیق ہر ایک کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ مگر عملی یافت کے معاملہ میں سب کی نصرت یکساں انداز میں نہیں۔ عملی نصرت کسی کو ایک ڈھنگ پر ملتی ہے اور کسی کو دوسرے ڈھنگ پر۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

۵۸۔ اور یوسف کے بھائی مصر آئے پھر وہ اس کے پاس پہنچے، پس یوسف نے ان کو پہچان لیا۔ اور انھوں نے یوسف کو نہیں پہچانا۔ ۵۹۔ اور جب اس نے ان کا سامان تیار کر دیا تو کہا کہ اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لے آنا۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں غلہ بھی پورا ناپ کر دیتا ہوں اور بہترین میزبانی کرنے والا بھی ہوں۔ ۶۰۔ اور اگر تم اس کو میرے پاس نہ لائے تو نہ میرے پاس تمھارے لیے غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس آنا۔ ۶۱۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس کے بارے میں اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے۔

حضرت یوسف کے اقتدار کے ابتدائی سات سال تک خوب فصل پیدا ہوئی۔ آپ نے سارے ملک میں بڑے بڑے کھتے بنوائے اور کسانوں سے ان کا فاضل غلہ خرید کر ہر سال ان کھتوں میں محفوظ کرتے رہے اس کے بعد جب قحط کے سال شروع ہوئے تو آپ نے اس غلہ کو دار السلطنت میں منگوا کر مناسب قیمت پر فروخت کرنا شروع کر دیا۔

یہ قحط چونکہ مصر کے علاوہ اطراف کے علاقوں (شام، فلسطین، شرق اردن وغیرہ) تک پھیلا ہوا تھا، اس لیے جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ مصر میں غلّہ سستی قیمت پر فروخت ہو رہا ہے تو برادران یوسف بھی غلّہ لینے کے لیے مصر آئے۔ یہاں حضرت یوسف کو اگرچہ انھوں نے بیس سال بعد دیکھا تھا، تاہم آپ کی شکل وصورت میں انھیں

اپنے بھائی کی جھلک نظر آئی۔ مگر جلد ہی انھوں نے اس کو اپنے دل سے نکال دیا۔ کیوں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جس شخص کو وہ اندھے کنویں میں ڈال چکے ہیں وہ مصر کے تخت پر متمکن ہوسکتا ہے۔

حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو ایک ایک اونٹ فی کس غلّہ دلوایا۔ اب ان کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ بن یامین کے نام پر ایک اونٹ غلّہ اور حاصل کریں۔ انھوں نے درخواست کی کہ ہمارے ایک بھائی (بن یامین) کو بوڑھے باپ نے اپنے پاس روک لیا ہے۔ اگر ہم کو اس بھائی کے حصہ کا غلّہ بھی دیا جائے تو بڑی عنایت ہو۔ حضرت یوسف نے کہا کہ غائب کا حصہ دینا ہمارا طریقہ نہیں۔ تم دوبارہ آؤ تو اپنے اس بھائی کو بھی ساتھ لاؤ۔ اس وقت تم اس کا حصہ پاسکو گے۔ تم میری بخشش کا حال دیکھ چکے ہو۔ کیا اس کے بعد بھی تمھیں اپنے بھائی کو لانے میں تردد ہے۔ حضرت یوسف نے مزید کہا کہ جو بھائی تم بتا رہے ہو اگر تم اگلی بار اس کو نہ لائے تو سمجھا جائے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور محض دھوکہ دے کر ایک اونٹ غلّہ اور لینا چاہتے تھے۔ اس کی سزا یہ ہوگی کہ آئندہ خود تمھارے حصہ کا غلّہ بھی تم کو نہیں دیا جائے گا۔

وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

۶۲۔ اور اس نے اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کا مال ان کے اسباب میں رکھ دو، تاکہ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو اس کو پہچان لیں، شاید وہ پھر آئیں۔
۶۳۔ پھر جب وہ اپنے باپ کے پاس لوٹے تو کہا کہ اے باپ، ہم سے غلہ روک دیا گیا، پس ہمارے بھائی (بن یامین) کو ہمارے ساتھ جانے دے کہ ہم غلہ لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔
۶۴۔ یعقوب نے کہا، کیا میں اس کے بارے میں تمھارا ویسا ہی اعتبار کروں جیسا کہ اس سے پہلے اس کے بھائی کے بارے میں تمھارا اعتبار کر چکا ہوں۔ پس اللہ بہتر نگہبان ہے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

حضرت یوسف نے غالباً بھائیوں سے قیمت لینا مروّت کے خلاف سمجھا یا اس خیال سے کہ مال کی کمی ان کے دوبارہ یہاں آنے میں رکاوٹ نہ بن جائے، اپنے آدمیوں کو ہدایت کی کہ جو رقم انھوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کی ہے، وہ خاموشی سے ان کے سامان میں ڈال دیا جائے تاکہ جب وہ گھر پر جا کر اپنا سامان کھولیں تو اس کو پالیں اور اپنے بھائی (بن یامین) کو لے کر دوبارہ یہاں آئیں۔

حضرت یعقوب نے ایک طرف بن یامین کے سلسلہ میں اپنے بیٹوں پر بے اعتمادی کا اظہار کیا دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ تم کو یا کسی اور کو کوئی طاقت حاصل نہیں۔ ہونا وہی ہے جو خدا چاہے۔ مگر یہ ہونا انسان کے

کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے تاکہ جو بُرا ہے وہ برا کرکے اپنی حقیقت کو ثابت کرے۔ اور جو اچھا ہے وہ اچھا کرکے اپنے آپ کو اس فہرست میں لکھوائے جس کا وہ مستحق ہے۔

وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَ نَمِيْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۟ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۟

۶۵۔ اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی ان کو لوٹا دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا، اے ہمارے باپ، اور ہم کو کیا چاہیے۔ یہ ہماری پونجی بھی ہم کو لوٹا دی گئی ہے۔ اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل وعیال کے لیے رسد لائیں گے۔ اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے۔ اور ایک اونٹ کا بوجھ غلہ اور زیادہ لائیں گے۔ یہ غلہ تو تھوڑا ہے۔ ۶۶۔ یعقوب نے کہا، میں اس کو تمھارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا جب تک تم مجھ سے خدا کے نام پر یہ عہد نہ کرو کہ تم اس کو ضرور میرے پاس لے آؤ گے، الا یہ کہ تم سب گھر جاؤ۔ پھر جب انھوں نے اس کو اپنا پکا قول دے دیا، اس نے کہا کہ جو ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ نگہبان ہے۔

گھر لوٹ کر جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی رقم ان کی غلّہ کی بوری میں موجود ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اپنے والد سے کہا کہ آپ ضرور ہمارے ساتھ بن یامین کو جانے دیں۔ ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے۔ اور اپنے حصہ کے علاوہ اس کے حصہ کا بھی مزید ایک اونٹ غلّہ لائیں گے۔ یہ غلّہ جو ہم لائے ہیں یہ تو اخراجات کے لیے تھوڑا ہے۔ حضرت یوسف نے تقسیم کا جو نظام قائم کیا تھا، اس کے تحت غالباً ایسا تھا کہ باہر کے ایک آدمی کو ایک اونٹ غلہ دیا جاتا تھا۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۟ وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ

۶۷۔ اور یعقوب نے کہا کہ اے میرے بیٹو، تم سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں تم کو اللہ کی کسی بات سے نہیں بچا سکتا۔ حکم تو بس اللہ کا ہے۔ میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ۶۸۔ اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے

اَمَرَهُمۡ اَبُوۡهُمۡ ؕ مَا كَانَ يُغۡنِىۡ عَنۡهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ اِلَّا حَاجَةً فِىۡ نَفۡسِ يَعۡقُوۡبَ قَضٰٮهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ لِّمَا عَلَّمۡنٰهُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾ ع ۸/۱۱/۲

باپ نے ان کو ہدایت کی تھی، وہ ان کو نہیں بچا سکتا تھا اللہ کی کسی بات سے۔ وہ بس یعقوب کے دل میں ایک خیال تھا جو اس نے پورا کیا۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

مصر کا قدیم دارالسلطنت ایک ایسا شہر تھا جس کے چاروں طرف اونچی فصیل تھی اور مختلف سمتوں میں داخلہ کے لیے دروازے بنے ہوئے تھے۔ حضرت یعقوب کا اپنے بیٹوں سے یہ کہنا کہ تم لوگ اکٹھا ہو کر ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہو بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہو، اس اندیشہ کی بنا پر تھا کہ ان کے دشمن انھیں ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں (قیل إنہ أحب أن لا یفطن بھم أعداؤھم فیحتالوا لإھلاکھم) تفسیر النسفی، جلد 2، صفحہ 124۔

اس اندیشہ کا معاملہ اسی سورہ کی آیت نمبر 73 سے واضح ہے جس میں برادرانِ یوسف اپنی برأت ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ہم یہاں فساد کے لیے یا چوری کے لیے نہیں آئے ہیں۔ برادرانِ یوسف مصر میں باہر سے آئے تھے۔ ان کے لباس مقامی لوگوں کے لباس سے مختلف تھے۔ وہ اپنے حلیہ سے یقیناً مصر والوں کو اجنبی دکھائی دیتے ہوں گے۔ ایسے گیارہ آدمیوں کا ایک ساتھ شہر میں داخل ہونا انھیں لوگوں کی نظر میں مشتبہ بنا سکتا تھا۔ اس لیے مقامی لوگوں سے کسی غیر ضروری ٹکراؤ سے بچنے کے لیے انھوں نے ان کو یہ ہدایت کی کہ شہر میں داخل ہو تو ایک ساتھ جتھے کی صورت میں داخل نہ ہو۔

مومن کی نظر ایک طرف خدا کی قدرت کاملہ پر ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کائنات میں خدا کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں امتحان کی مصلحت سے خدا نے ہر معاملہ کو ظاہری اسباب کے ماتحت کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یعقوب نے ایک طرف اپنے بیٹوں کو دنیوی تدبیر اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ دوسری طرف یہ بھی فرما دیا کہ جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا کیوں کہ یہاں خدا کے سوا کسی کو کوئی طاقت حاصل نہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰى يُوۡسُفَ اٰوٰٓى اِلَيۡهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىۡۤ اَنَا اَخُوۡكَ فَلَا تَبۡتَـئِسۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىۡ رَحۡلِ اَخِيۡهِ ثُمَّ اَذَّنَ

۶۹۔ اور جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھا۔ کہا کہ میں تمھارا بھائی (یوسف) ہوں۔ پس غمگین نہ ہو اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۷۰۔ پھر جب ان کا سامان تیار کرا دیا تو پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے

مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿٧٠﴾
قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿٧١﴾
قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ
حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ
لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَ
مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ
كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٧٤﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ
فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي
الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ
اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ
كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ
اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ
نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ
عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٦﴾

قافلہ والو، تم لوگ چور ہو۔ ۷۱۔ انھوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا، تمھاری کیا چیز کھوئی گئی ہے۔ ۷۲۔ انھوں نے کہا، ہم شاہی پیمانہ نہیں پا رہے ہیں۔ اور جو اس کو لائے گا اس کے لیے ایک بارِ شُتر غلہ ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ ۷۳۔ انھوں نے کہا، خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم لوگ اس ملک میں فساد کرنے کے لیے نہیں آئے اور نہ ہم کبھی چور تھے۔ ۷۴۔ انھوں نے کہا اگر تم جھوٹے نکلے تو اس چوری کرنے والے کی سزا کیا ہے۔ ۷۵۔ انھوں نے کہا، اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کے اسباب میں وہ ملے پس وہی شخص اپنی سزا ہے۔ ہم لوگ ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ ۷۶۔ پھر اس نے اس کے (چھوٹے) بھائی سے پہلے ان کے تھیلوں کی تلاشی لینا شروع کیا۔ پھر اس کے بھائی کے تھیلے سے اس کو برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔

برادرانِ یوسف روانہ ہونے لگے تو حضرت یوسف نے ازراہِ محبت اپنا پانی پینے کا پیالہ (جو غالباً چاندی کا تھا) اپنے بھائی بن یامین کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کی خبر نہ بن یامین کو تھی اور نہ درباروالوں کو۔ اس کے بعد خدا کی قدرت سے ایسا ہوا کہ غلّہ ناپنے کا شاہی پیمانہ (جو خود بھی قیمتی تھا) کہیں اِدھر اُدھر (misplace) ہو گیا۔ تلاش کے باوجود جب وہ نہیں نکلا تو کارندوں کا شبہ بردرانِ یوسف کی طرف گیا جو ابھی یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ ایک کارندہ نے آواز دے کر قافلہ کو بلایا۔ پوچھ گچھ کے دوران انھوں نے بطور خود چوری کی وہ سزا تجویز کی جو شریعت ابراہیمی کی رو سے ان کے یہاں رائج تھی۔ یعنی جو سارق (چور) ہے وہ ایک سال تک مالک کے یہاں غلام بن کر رہے۔

اس کے بعد کارندے نے تلاشی شروع کی۔ اب غلّہ کا پیمانہ تو ان کے یہاں نہیں ملا۔ مگر دربار کی ایک اور خاص چیز (چاندی کا پیالہ) بن یامین کے سامان سے برآمد ہو گیا۔ چنانچہ بن یامین کو حسب فیصلہ حضرت یوسف کے حوالہ کر دیا گیا۔ اگر شاہ مصر کے قانون پر فیصلہ کی قرارداد ہوئی ہوتی تو حضرت یوسف اپنے بھائی کو نہ پاتے۔ کیوں کہ شاہ مصر کے مروجہ قانون میں چور کی سزا یہ تھی کہ اس کو مارا جائے اور مسروقہ چیز کی قیمت اس سے وصول کی جائے۔ اس واقعہ میں حضرت یوسف کی نیت شامل نہ تھی، یہ خدائی تدبیر سے ہوا اس لیے خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

نوٹ: بن یامین کے سامان میں سقایہ رکھا گیا تھا جس کی ضمیر ''ھا'' ہے۔ مگر شاہی کارندہ ''صواع'' تلاش کر رہا تھا جس کی ضمیر ''ہ'' ہے۔ اب تلاش کے بعد کارندہ نے جو چیز برآمد کی اس کے لیے قرآن میں ضمیر ''ھا'' استعمال ہوئی ہے (ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ)۔ ضمیر کا یہ فرق بتاتا ہے کہ تلاش کے بعد بن یامین کے سامان سے سقایہ نکلا تھا، نہ کہ صواع۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿٧٧﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٧٨﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿٧٩﴾ ع

۷۷۔ انھوں نے کہا اگر یہ چوری کرے تو اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ پس یوسف نے اس بات کو اپنے دل میں رکھا، اور اس کو ان پر ظاہر نہیں کیا۔ اس نے اپنے جی میں کہا، تم خود ہی برے لوگ ہو، اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ ۷۸۔ انھوں نے کہا کہ اے عزیز، اس کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے سو تو اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لے۔ ہم تجھ کو بہت نیک دیکھتے ہیں۔ ۷۹۔ اس نے کہا، اللہ کی پناہ کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے۔ اس صورت میں ہم ضرور ظالم ٹھہریں گے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی کسی نانی کے یہاں ایک بت تھا۔ حضرت یوسف اپنے بچپن میں اس کو چپکے سے ان کے یہاں سے اٹھا لائے اور اس کو توڑ ڈالا۔ اسی واقعہ کو بہانہ بنا کر برادرانِ یوسف نے کہا کہ ''اس کا بڑا بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے''۔ ایک واقعہ جو آپ کی غیرت توحید کو بتا رہا تھا اس کو محض ایک ظاہری مشابہت کی وجہ سے انھوں نے چوری کے خانہ میں ڈال دیا۔

برادرانِ یوسف کا حال یہ تھا کہ مصر کے تخت پر بیٹھے ہوئے یوسف کو تو وہ عزیز (حضور، سرکار) کہہ رہے تھے اور اس کے سامنے خوب تواضع دکھا رہے تھے۔ مگر کنعان کا یوسف جو ان کی نظر میں صرف ایک دیہاتی لڑکا تھا، اس کو عین اسی وقت ناحق چوری کے الزام میں ملوّث کر رہے تھے۔

حضرت یوسف کو علم تھا کہ ان کے رکھے ہوئے پیالہ کی وجہ سے بن یامین خواہ مخواہ چور بن رہا ہے۔ مگر وقتی مصلحت کی بنا پر وہ خاموش رہے اور واقعہ کو اپنی رفتار سے چلنے دیا جو بھائیوں اور شاہی کارندے کے درمیان ہو رہا تھا۔ ایک بار جب آپ کو بولنا پڑا تو یہ نہیں کہا کہ "جس نے ہماری چوری کی ہے" بلکہ یہ فرمایا کہ "جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے"۔

فَلَمَّا اسۡتَیۡـَٔسُوۡا مِنۡهُ خَلَصُوۡا نَجِیًّا ؕ قَالَ كَبِیۡرُهُمۡ اَلَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اَبَاكُمۡ قَدۡ اَخَذَ عَلَیۡكُمۡ مَّوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنۡ قَبۡلُ مَا فَرَّطۡتُّمۡ فِیۡ یُوۡسُفَ ۚ فَلَنۡ اَبۡرَحَ الۡاَرۡضَ حَتّٰی یَاۡذَنَ لِیۡۤ اَبِیۡۤ اَوۡ یَحۡكُمَ اللّٰهُ لِیۡ ۚ وَ هُوَ خَیۡرُ الۡحٰكِمِیۡنَ ﴿۸۰﴾ اِرۡجِعُوۡۤا اِلٰۤی اَبِیۡكُمۡ فَقُوۡلُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابۡنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدۡنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمۡنَا وَ مَا كُنَّا لِلۡغَیۡبِ حٰفِظِیۡنَ ﴿۸۱﴾ وَسۡـَٔلِ الۡقَرۡیَةَ الَّتِیۡ كُنَّا فِیۡهَا وَ الۡعِیۡرَ الَّتِیۡۤ اَقۡبَلۡنَا فِیۡهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۸۲﴾

۸۰۔ جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو وہ الگ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے۔ ان کے بڑے نے کہا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمھارے باپ نے اللہ کے نام پر پکا اقرار لیا اور اس سے پہلے یوسف کے معاملہ میں جو زیادتی تم کر چکے ہو، وہ بھی تم کو معلوم ہے۔ پس میں اس زمین سے ہرگز نہیں ٹلوں گا جب تک میرا باپ مجھے اجازت نہ دے یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ فرما دے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۸۱۔ تم لوگ اپنے باپ کے پاس جاؤ اور کہو کہ اے ہمارے باپ، تیرے بیٹے نے چوری کی اور ہم وہی بات کہہ رہے ہیں جو ہم کو معلوم ہوئی اور ہم غیب کے نگہبان نہیں۔ ۸۲۔ اور تو اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لے جہاں ہم تھے اور اس قافلہ سے پوچھ لے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ اور ہم بالکل سچے ہیں۔

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں میں غالباً ایک بھائی دوسروں سے مختلف تھا۔ اسی بھائی نے ابتدائی مرحلہ میں مشورہ دیا تھا کہ یوسف کو قتل نہ کرو بلکہ کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو تا کہ کوئی آتا جاتا قافلہ اس کو نکال لے جائے۔ یہی حال اب اس بھائی کا مصر میں ہوا۔ وہ دوسرے بھائیوں سے الگ ہو گیا۔ اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ جس باپ کے نزدیک وہ ایک بھائی کو کھونے کا مجرم بن چکا ہے، اسی باپ کے سامنے اب وہ دوسرے بھائی کو کھونے کا مجرم بن کر حاضر ہو۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِىْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّىْ وَحُزْنِىْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِىَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

۸۳۔ باپ نے کہا، بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے، پس میں صبر کروں گا۔ امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لائے گا۔ وہ جاننے والا، حکیم ہے۔ ۸۴۔ اور اس نے رخ پھیر لیا اور کہا، ہائے یوسف، اور غم سے اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں۔ وہ گھٹا گھٹا رہنے لگا۔ ۸۵۔ انھوں نے کہا، خدا کی قسم، تو یوسف ہی کی یاد میں رہے گا۔ یہاں تک کہ گھل جائے یا ہلاک ہوجائے۔ ۸۶۔ اس نے کہا، میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ صرف اللہ سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ۸۷۔ اے میرے بیٹو، جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے صرف منکر ہی ناامید ہوتے ہیں۔

''تم نے بات بنالی ہے'' کہہ کر حضرت یعقوب نے برادران یوسف کے دل کا کھوٹ واضح کیا۔ وہ باپ کے یہاں سے گئے تو مکمل حفاظت کا وعدہ کرکے اس کو ساتھ لے گئے۔ اور جب بن یامین کے اسباب میں سے پیالہ برآمد ہوا تو اس کی طرف سے اتنی مدافعت بھی نہ کر سکے کہ یہ کہتے کہ محض پیالہ برآمد ہونے سے وہ چور کیسے ثابت ہوگیا۔ شاید کسی اور نے رکھ دیا ہو یا کسی غلطی سے وہ اس کے اسباب کے ساتھ بندھ گیا ہو۔ اس کے برعکس، انھوں نے یہ کیا کہ یہ کہہ کر اس کے جرم کو مصریوں کی نظر میں اور پختہ کردیا کہ اس کا بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے۔

حضرت یعقوب اگرچہ دو عزیز بیٹوں کو کھونے کی وجہ سے بے حد غم زدہ تھے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ خدا سے اس کی رحمت کی امید بھی لگائے ہوئے تھے۔ ان کا اب بھی یہ خیال تھا کہ یوسف کا ابتدائی زمانہ کا خواب ایک خدائی بشارت تھا اور وہ ضرور پورا ہوگا۔ اسی لیے انھوں نے بیٹوں سے کہا کہ جاؤ یوسف کو تلاش کرو اور بن یامین کی رہائی کی بھی کوشش کرو۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ

۸۸۔ پھر جب وہ یوسف کے پاس پہنچے، انھوں نے کہا، اے عزیز، ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے اور ہم تھوڑی پونجی لے کر

فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۝ قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِيْ ٞ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

آئے ہیں، تو ہم کو پورا غلہ دے اور ہم کو صدقہ بھی دے۔ بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو اس کا بدلہ دیتا ہے۔ ۸۹۔ اس نے کہا، کیا تم کو خبر ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جب کہ تم کو سمجھ نہ تھی۔ ۹۰۔ انھوں نے کہا، کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو۔ اس نے کہا ہاں، میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر فضل فرمایا۔ جو شخص ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

''تقویٰ اور صبر کرنے والوں کا اجر خدا ضائع نہیں کرتا''— یہی بات پورے قصہ یوسف کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی ایک واضح مثال قائم کرنی تھی کہ معاملات دنیا میں جو شخص اللہ سے ڈرنے والا طریقہ اختیار کرے اور بے صبری والے طریقوں سے بچے، بالآخر وہ خدا کی مدد سے ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ حضرت یوسف کے واقعہ کو اسی حقیقت کی ایک نظر آنے والی مثال بنا دیا گیا۔

مصر میں ابتداءً سات اچھے سال اور اس کے بعد سات خراب سال دونوں خدا کے اذن کے تحت ہوئے۔ خدا چاہتا تو تمام سالوں کو اچھے سال بنا دیتا۔ اسی طرح حضرت یوسف کا کنویں میں ڈالا جانا اور پھر اس سے نکل کر مصر پہنچنا دونوں خدا کی نگرانی میں ہوا۔ خدا چاہتا تو آپ کو کنویں کے مرحلہ سے گزارے بغیر مصر کے اقتدار تک پہنچا دیتا۔ لیکن اگر یہ تمام غیر معمولی حالات پیش نہ آتے تو اسباب کی اس دنیا میں وہ اس بات کی مثال کیسے بنتے کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے تقویٰ اور صبر کی روش پر قائم رہیں۔

واقعات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس کے اندر شہرت کا مادہ ہو۔ اور دوسرا وہ جس کے اندر شہرت کا مادہ نہ ہو۔ دو واقعات نوعیت کے اعتبار سے بالکل یکساں درجے کے ہوسکتے ہیں۔ مگر ایک واقعہ شہرت پکڑے گا اور دوسرا گمنام ہو کر رہ جائے گا۔ حضرت یوسف کے ساتھ نصرت خداوندی کا جو معاملہ ہوا وہ دوسرے صلحاء اور محسنین کے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔ مگر حضرت یوسف کے واقعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شہرت کا مادہ بھی پوری طرح موجود تھا۔ اس لیے وہ بخوبی طور پر لوگوں کی نظر میں آ گیا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ۝ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ٞ وَ هُوَ اَرْحَمُ

۹۱۔ بھائیوں نے کہا، خدا کی قسم، اللہ نے تم کو ہمارے اوپر فضیلت دی، اور بے شک ہم غلطی پر تھے۔ ۹۲۔ یوسف نے کہا، آج تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تم کو معاف کرے اور وہ سب مہربانوں

الرّٰحِمِيْنَ ﴿٩٢﴾ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٣﴾ ع

سے زیادہ مہربان ہے۔ ۹۳۔ تم میرا یہ کرتا لے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، اس کی بینائی پلٹ آئے گی اور تم اپنے گھر والوں کے ساتھ میرے پاس آجاؤ۔

جب حقیقت کھل گئی تو بھائیوں نے حضرت یوسف کی بڑائی کو تسلیم کرتے ہوئے کھلے طور پر اپنی غلطی کا اقرار کرلیا۔ دوسری طرف حضرت یوسف نے بھی اس عالی ظرفی کا ثبوت دیا جو ایک سچے خدا پرست کو ایسے موقع پر دینا چاہیے۔ انھوں نے اپنے بھائیوں کو کوئی ملامت نہیں کی۔ انھوں نے ماضی کے تلخ واقعات کو اچانک بھلا دیا اور بھائیوں سے دوبارہ برادرانہ تعلقات استوار کر لیے۔

اِس واقعہ میں انفرادی نصرت کے ساتھ اجتماعی نصرت کی مثال بھی موجود ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ حالات پیدا ہوئے کہ بنی اسرائیل فلسطین سے نکل کر مصر پہنچیں اور وہاں عزت اور خوش حالی کا مقام حاصل کریں۔ چنانچہ حضرت یوسف کے زمانہ میں حضرت یعقوب کا خاندان مصر منتقل ہو گیا اور تقریباً پانچ سو سال تک وہاں عزت کے ساتھ رہا۔ بائبل کے بیان کے مطابق سب افراد خاندان جو اس موقع پر مصر گئے ان کی تعداد 67 تھی۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿٩٤﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿٩٥﴾ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٩٨﴾

۹۴۔ اور جب قافلہ (مصر سے) چلا تو اس کے باپ نے (کنعان میں) کہا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں۔ ۹۵۔ لوگوں نے کہا، خدا کی قسم، تم تو ابھی تک اپنے پرانے غلط خیال میں مبتلا ہو۔ ۹۶۔ پس جب خوش خبری دینے والا آیا، اس نے کرتا یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا، پس اس کی بینائی لوٹ آئی۔ اس نے کہا، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ۹۷۔ برادرانِ یوسف نے کہا، اے ہمارے باپ، ہمارے گناہوں کی معافی کی دعا کیجیے۔ بے شک ہم خطاوار تھے۔ ۹۸۔ یعقوب نے کہا، میں اپنے رب سے تمھارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا۔ بے شک وہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

حضرت یوسف اپنے باپ سے جدا ہو کر 20 سال سے زیادہ مدّت تک پڑوسی ملک مصر میں رہے۔ مگر حضرت یعقوب کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ البتہ آخر وقت میں آپ کا پیرہن مصر سے چلا تو آپ کو اس کے پہنچنے سے پہلے اس کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں کا علم ان کا ذاتی علم نہیں ہوتا بلکہ خدا کا عطیہ ہوتا ہے۔ اگر ذاتی علم ہوتا تو حضرت یعقوب پہلے ہی جان لیتے کہ ان کے صاحب زادے مصر میں ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ آپ حضرت یوسف کے بارے میں صرف اس وقت مطلع ہوئے جب کہ اللہ نے آپ کو اس کی خبر دی۔

حضرت یعقوب کے ساتھ آپ کے خاندان والوں کی گفتگوئیں جو اس سورہ میں مختلف مقامات پر نقل ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان والوں کی نظر میں حضرت یعقوب کو وہ عظمت حاصل نہ تھی جو ایک پیغمبر کے لیے ہونی چاہیے۔ وہی لوگ جو ماضی کے بزرگوں کی پرستش کر رہے ہوتے ہیں وہ زندہ بزرگوں کی عظمت ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مُردہ بزرگوں کے گرد ہمیشہ مبالغہ آمیز قصوں اور طلسماتی کہانیوں کا ہالہ بنا دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے ذہن میں "بزرگ" کی ایک مصنوعی تصویر بیٹھ جاتی ہے۔ چونکہ زندہ بزرگ اس مصنوعی تصویر کے مطابق نہیں ہوتا اس لیے وہ لوگوں کو بزرگ بھی نظر نہیں آتا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

۹۹۔ پس جب وہ سب یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے والدین کو اپنے پاس بٹھایا۔ اور کہا کہ مصر میں ان شاء اللہ امن چین سے رہو۔
۱۰۰۔ اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لیے سجدے میں جھک گئے۔ اور یوسف نے کہا اے باپ، یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اس کو سچا کر دیا اور اس نے میرے ساتھ احسان کیا کہ اس نے مجھے قید سے نکالا اور تم سب کو دیہات سے یہاں لایا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا تھا۔ بے شک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کی عمدہ تدبیر کر لیتا ہے، وہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

یہاں تخت سے مراد تخت شاہی نہیں ہے بلکہ وہ تخت ہے جس پر حضرت یوسف اپنے عہدہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے بیٹھتے تھے۔ سجدہ سے مراد بھی معروف سجدہ نہیں بلکہ رکوع کے انداز پر جھکنا

ہے۔ کسی بڑے کی تعظیم کے لیے اس انداز میں جھکنا قدیم زمانہ میں بہت معروف تھا۔

''اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ'' کا مطلب یہ ہے کہ میرا رب جس کام کو کرنا چاہے اس کے لیے وہ نہایت مخفی راہیں نکال لیتا ہے۔ خدا اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لیے ایسی تدبیریں پیدا کرلیتا ہے جس کی طرف عام انسانوں کا گمان بھی نہیں جاسکتا۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔ اے میرے رب، تو نے مجھ کو حکومت میں سے حصہ دیا اور مجھ کو باتوں کی تعبیر کرنا سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، تو میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مجھ کو فرماں برداری کی حالت میں وفات دے اور مجھ کو نیک بندوں میں شامل فرما۔

غیر مومن ہر چیز کو انسان کے اعتبار سے دیکھتا ہے اور مومن ہر چیز کو خدا کے اعتبار سے۔ حضرت یوسف کو اعلیٰ حکومتی عہدہ ملا تو اس کو بھی انھوں نے خدا کا عطیہ قرار دیا۔ ان کو تاویل اور تعبیر کا علم حاصل ہوا تو انھوں نے کہا کہ یہ مجھ کو خدا نے سکھایا ہے۔ ان کے اپنوں نے انھیں مصیبت میں ڈالا تو اس کو بھی انھوں نے اس نظر سے دیکھا کہ یہ خدا کی لطیف تدبیریں تھی جن کے ذریعہ وہ مجھ کو ارتقائی سفر کرا رہا تھا۔

خدا کی عظمت کے احساس نے ان سے ذاتی عظمت کے تمام احساسات چھین لیے تھے۔ دنیوی بلندی کی چوٹی پر پہنچ کر بھی ان کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے — خدایا، تو ہی تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ تو ہی میرے سب کام بنانے والا ہے۔ تو دنیا اور آخرت میں میری مدد فرما۔ مجھ کو ان لوگوں میں شامل فرما جو دنیا میں تیری پسند پر چلنے کی توفیق پاتے ہیں اور آخرت میں تیرا ابدی انعام حاصل کرتے ہیں۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع

۱۰۲۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں اور تم اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے، جب یوسف کے بھائیوں نے اپنی رائے پختہ کی اور وہ تدبیریں کر رہے تھے۔ ۱۰۳۔ اور تم خواہ کتنا ہی چاہو، اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۱۰۴۔ اور تم اس پر ان سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے۔ یہ تو صرف ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے۔

حضرت یوسف کا قصہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہوا وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن وحی ربّانی ہے، نہ کہ کلام انسانی۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے پیش آیا۔ آپ نے اس واقعہ کو نہ تو بطور خود دیکھا تھا اور نہ وہ کسی تاریخ میں لکھا ہوا تھا کہ آپ اس کو پڑھیں یا کسی سے پڑھوا کر سنیں۔ وہ صرف تورات کے صفحات میں تھا۔ اور پریس کے دور سے قبل تورات ایک ایسی کتاب تھی جس کی واقفیت صرف یہودی مراکز کے چند یہودی علماء کو ہوتی تھی، اور کسی کو نہیں۔

مزید یہ کہ قرآن میں اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، بنیادی طور پر تورات کے مطابق ہونے کے باوجود، تفصیلات میں وہ اس سے کافی مختلف ہے۔ یہ اختلاف بذات خود قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیونکہ جہاں جہاں دونوں میں اختلاف ہے وہاں قرآن کا بیان واضح طور پر عقل وفطرت کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کا بیان پڑھ کر واقعی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی پیغمبرانہ سیرت کے مناسب ہے جب کہ تورات کے بیانات پیغمبرانہ سیرت کے مناسب حال نہیں۔ اسی طرح واقعہ کے کئی بے حد قیمتی اجزاء (مثلاً قید خانہ میں حضرت یوسف کی تقریر، آیت 40-37) جو قرآن میں منقول ہوئی ہے۔ بائبل یا تالمود میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ حتی کہ بعض تاریخی غلطیاں جو بائبل میں موجود ہیں ان کا اعادہ قرآن میں نہیں ہوا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل حضرت یوسف کے زمانہ کے بادشاہ کو فرعون کہتی ہے۔ حالاں کہ فرعون کا خاندان حضرت یوسف کے پانچ سو سال بعد مصر میں حکمراں بنا ہے۔ حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر میں ایک عرب خاندان حکومت کر رہا تھا جس کو چرواہے بادشاہ (HyksosKings) کہا جاتا ہے (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو، بائبل، کتاب پیدائش)۔

حق کو نہ ماننے کا سبب اگر دلیل ہو تو دلیل سامنے آنے کے بعد آدمی فوراً اس کو مان لے گا۔ مگر اکثر حالات میں انکارِ حق کا سبب ہٹ دھرمی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ حق کو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ اس کو ماننا نہیں چاہتے۔ حق کو ماننا اکثر حالات میں اپنے کو چھوٹا کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے، اور اپنے کو چھوٹا کرنا آدمی کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے لوگ ہر قسم کے دلائل اور قرائن سامنے آنے کے بعد بھی اپنی روش کو نہیں چھوڑتے۔ وہ اس کو گوارا کر لیتے ہیں کہ حق چھوٹا ہو جائے مگر وہ اپنے آپ کو چھوٹا کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ جو دنیا میں اپنے آپ کو چھوٹا کر لے وہ آخرت میں بڑا کیا جائے گا۔ اور جو شخص دنیا میں اپنے کو چھوٹا نہ کرے وہی وہ شخص ہے جو آئندہ آنے والی دنیا میں ہمیشہ کے لیے چھوٹا ہو کر رہ جائے گا۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿١٠٥﴾ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿١٠٦﴾

۱۰۵۔ اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے۔ ۱۰۶۔ اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے ہیں وہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بھی

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ
اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا
يَشْعُرُوْنَ ﴿١٠٧﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى
اللّٰهِ ۟ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ
وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٨﴾

ٹھہراتے ہیں۔ ۱۰۷۔ کیا یہ لوگ اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان پر عذاب الٰہی کی کوئی آفت آپڑے یا اچانک ان پر قیامت آجائے اور وہ اس سے بے خبر ہوں۔ ۱۰۸۔ کہو، یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے۔ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

حق کے ظہور کے بعد جو لوگ اس کو نہ مانیں وہ اپنے انکار کو ہمیشہ اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ جو دلیل مطلوب تھی وہ دلیل حق کی طرف سے ان کے سامنے نہیں آئی۔ اگر ایسی دلیل ہوتی تو وہ اس کو ضرور مان لیتے۔ گویا ان کے اعراض یا انکار کا سبب ان کے باہر ہے، نہ کہ ان کے اندر۔

مگر حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ حق اتنا واضح ہے کہ جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو زمین وآسمان کی تمام نشانیاں اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ وہ ساری کائنات میں سب سے زیادہ ثابت شدہ چیز ہوتا ہے۔ مگر حق کو پانے کے لیے اصل ضرورت دیکھنے والی آنکھ اور عبرت پکڑنے والے دماغ کی ہے۔ اور یہی چیز منکرین کے یہاں موجود نہیں ہوتی۔

حق کے مقابلہ میں آدمی جب سرکشی دکھائی دیتا ہے تو اکثر حالات میں اس کی وجہ ''شرک'' ہوتا ہے۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کو مانتے ہوئے انھوں نے کچھ اور زندہ یا مُردہ ہستیاں فرض کر رکھی ہیں جن پر وہ اپنا اعتماد قائم کیے ہوئے ہیں، جن کو وہ بڑائی کا مقام دیتے ہیں۔ اس طرح ہر ایک نے خدا کے سوا کچھ ''بڑے'' بنا رکھے ہیں۔ وہ انھیں بڑوں کے بھروسہ پر جی رہے ہیں۔ حالانکہ خدا کے یہاں سب چھوٹے ہیں۔ وہاں کسی کو جو چیز بچائے گی وہ اس کا ذاتی عمل ہے، نہ کہ مفروضہ بڑوں کی بڑائی۔

پیغمبر کا کام ایک اللہ کی طرف بلانا ہے۔ یہی اس کا مشن ہے۔ اس مشن کو اس نے بصیرت کے طور پر اختیار کیا ہے، نہ کہ تقلید کے طور پر۔ گویا پیغمبرانہ دعوت وہ دعوت ہے جو انسان کو ایک خدا سے جوڑنے کی دعوت ہو اور جس کی صداقت داعی کے اوپر اتنی کھل چکی ہو کہ وہ اس کے لیے بصیرت اور معرفت بن جائے۔ اسی طرح پیغمبر کے پیرو وہ لوگ ہیں جو حق کو بصیرت کی سطح پر پائیں اور توحید کی سطح پر اس کا اعلان کریں۔

آدمی اپنے وقتی اطمینان کو مستقل اطمینان سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ کسی کے پاس اس بات کی ضمانت نہیں کہ اس کی مہلتِ عمر کب تک ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب موت آکر اس کے تمام مزعومات کو باطل کر دے گی۔ کب قیامت کا زلزلہ اس کی بنی بنائی دنیا کو الٹ پلٹ دے گا۔ آدمی اپنے آپ کو یقینی انجام کی دنیا میں سمجھتا ہے حالانکہ وہ ہر لمحہ ایک غیر یقینی انجام کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

۱۰۹۔ اور ہم نے تم سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے رسول بھیجے سب آدمی ہی تھے۔ ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے تھے اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، کیا تم سمجھتے نہیں۔
۱۱۰۔ یہاں تک کہ جب پیغمبر مایوس ہو گئے اور وہ خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کو ہماری مدد آپہنچی۔ پس نجات ملی جس کو ہم نے چاہا اور مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جا سکتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جو لوگ رسالت اور پیغمبری کو مانتے تھے وہ بھی اس وقت اس کے منکر ہو گئے، جب کہ خود اپنی قوم کے اندر سے ایک شخص پیغمبر ہو کر ان کے سامنے کھڑا ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ماضی کا پیغمبر تاریخی طور پر ثابت شدہ پیغمبر بن چکا ہوتا ہے، جب کہ حال کا پیغمبر ایک نزاعی شخصیت ہوتا ہے۔ تاریخی پیغمبر کو ماننا ہمیشہ انسان کے لیے آسان ترین کام رہا ہے اور نزاعی پیغمبر کو ماننا ہمیشہ اس کے لیے مشکل ترین کام۔

عاد اور ثمود اور مدین اور قوم لوط وغیرہ کی تباہ شدہ بستیاں قریش کے آس پاس کے علاقوں میں موجود تھیں۔ وہ اپنے سفروں کے دوران ان کو دیکھتے تھے۔ یہ آثار زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ پیغمبر کو نزاعی دور میں نہ پہچاننے ہی کی وجہ سے ان قوموں پر خدا کا عذاب آیا اور وہ ہلاک کر دی گئیں۔ اس کے باوجود قریش نے ان سے سبق نہیں لیا۔ اس کی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ایک غلط کام کرتا ہے مگر کچھ خود ساختہ خیالات کی بنا پر اپنے آپ کو غلط کاروں کی فہرست سے الگ کر لیتا ہے۔

سورہ یوسف کی آیت 110 کی تشریح سورہ بقرہ کی آیت 214 سے ہو رہی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے — ’’کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل کر دیے جاؤ گے۔ حالانکہ تم پر ابھی وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے والوں پر گزرے تھے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئے گی۔ جان لو، خدا کی مدد قریب ہے‘‘۔

خدا ہمیشہ داعی کی مدد کرتا ہے۔ مگر مدد مدعو کے خلاف داعی کے حق میں خدا کا فیصلہ ہوتا ہے، اسی لیے یہ مدد ہمیشہ اس وقت آتی ہے جب کہ دعوتی جدوجہد اپنی تکمیل کے آخری مرحلہ میں پہنچ چکی ہو، خواہ اس تاخیر کی وجہ سے دعوت دینے والوں پر مایوسی کے احساسات طاری ہونے لگیں۔

’’اور آخرت کا گھر متقیوں کے لیے زیادہ بہتر ہے‘‘— اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں اہل ایمان کے ساتھ جو

سلوک کیا جاتا ہے وہ آخرت میں ان کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کی علامت ہوتا ہے۔

دنیا میں خدا حق کے داعیوں کی اس طرح مدد کرتا ہے کہ ان کی بات تمام دوسری باتوں پر بلند و بالا ثابت ہوتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کی تمام سازشوں اور مخالفتوں کے باوجود اپنا مشن پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ یہی عزت اور سربلندی ان کو آخرت میں زیادہ کامل اور معیاری صورت میں حاصل ہوگی۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾ ع

۱۱۱۔ ان کے قصوں میں سمجھ دار لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔ یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں، بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے۔ اور تفصیل ہے ہر چیز کی۔ اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔

پچھلے پیغمبروں اور ان کی قوموں کی کہانی عبرت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ اگر آدمی عقل سے کام لے تو وہ ماضی کے واقعہ میں حال کی نصیحت پالے گا۔ دوسروں کے انجام کو دیکھ کر وہ اپنے احوال کو درست کرلے گا۔

قرآن کسی انسان کی گھڑی ہوئی کتاب نہیں، وہ خدا کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے۔ وہ عین اس پیشین گوئی کے مطابق آئی ہے جو پچھلی آسمانی کتابوں میں کی گئی تھی۔ اس میں ہدایت سے متعلق ہر ضروری چیز کا بیان موجود ہے۔ وہ اپنے آغاز کے اعتبار سے انسانوں کے لیے رہنمائی ہے اور اپنے انجام کے اعتبار سے ان کے لیے رحمت۔

۱۳۔ سُوْرَةُ الرَّعْد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ الٓمّٓرٰ، یہ کتاب الٰہی کی آیتیں ہیں۔ اور جو کچھ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے وہ حق ہے، مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ ۲۔ اللہ ہی ہے جس نے آسمان کو بلند کیا بغیر ایسے ستون کے جو تمھیں نظر آئیں۔ پھر وہ اپنے تخت پر متمکن ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند بنایا، ہر ایک ایک مقررہ وقت پر چلتا ہے۔ اللہ ہی ہر

مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲

کام کا انتظام کرتا ہے۔ وہ نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو۔

قرآن ایک خدا کو ماننے کی دعوت دیتا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ خدا اگر ہے تو ہم کو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ مگر ہماری معلوم کائنات بتاتی ہے کہ کسی چیز کا دکھائی نہ دینا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کا کوئی وجود بھی نہیں۔ اس کی ایک مثال قوتِ کشش ہے۔ خلا میں بے شمار الگ الگ ستارے اور سیارے ہیں۔ انسانی علم کہتا ہے کہ ان اجرام سماوی کے درمیان ایک غیر مرئی قوت کشش ہے جو وسیع خلا میں ان کو سنبھالے ہوئے ہے۔ پھر انسان جب غیر مرئی ہونے کے باوجود قوت کشش کی موجودگی کا اقرار کر رہا ہے تو غیر مرئی ہونے کی وجہ سے خدا کے وجود کا انکار کرنے میں وہ کیوں کر حق بجانب ہوگا۔

یہی معاملہ وحی ورسالت کا ہے۔ کائنات کا طالب علم جب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ یہاں ہر چیز ایک نظام کی پابند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام چیزیں کسی خاص حکم میں جکڑی ہوئی ہیں۔ یہ "حکم" خود ان چیزوں کے اندر موجود نہیں ہے۔ یقیناً وہ خارج سے آتا ہے۔ گویا تمام دنیا اپنے عمل کے لیے "خارج" سے ہدایات لے رہی ہے۔ انسان کے علاوہ بقیہ دنیا میں اس خارجی ہدایت کا نام قانون فطرت ہے، اور انسان کی دنیا میں اس کا نام وحی والہام۔ وحی دراصل اسی خارجی رہنمائی کی انسانی دنیا تک توسیع ہے جس کو بقیہ دنیا میں قانونِ فطرت کہا جاتا ہے۔

کائنات گویا ایک مشین ہے اور قرآن اس کی گائڈ بک۔ ان دونوں کے درمیان کامل مطابقت ہے۔ خدا نے ان دونوں چیزوں میں آیات کے اعتبار سے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ ایک، عالم کائنات (يُدَبِّرُ الْاَمْرَ) کی سطح پر۔ دوسرے، الہامی شریعت (يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ) کی سطح پر۔ اوّل الذکر خدا کی تدبیر امر کی مثال ہے۔ اور ثانی الذکر خدا کی تفصیل آیات کی مثال۔ اول الذکر مقام پر وہ براہِ راست اپنی مرضی نافذ کر رہا ہے۔ ثانی الذکر معاملہ میں وہ چاہتا ہے کہ انسان خدا کی مرضی کو جانے اور بطور خود اس کو اپنی زندگی میں نافذ کرے۔ جو کچھ کائنات میں عملاً نظر آتا ہے وہ قرآن میں لفظی طور پر موجود ہے۔ یہ مطابقت بیک وقت دو باتیں ثابت کرتی ہے۔ ایک یہ کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور دوسرے یہ کہ قرآن اسی خالق کی کتاب ہے، نہ کہ محدود انسانی دماغ کی تخلیق۔

وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳

۳۔ اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا۔ اور اس میں پہاڑ اور ندیاں رکھ دیں اور ہر قسم کے پھلوں کے جوڑے اس میں پیدا کیے۔ وہ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے۔ بے شک ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔

آسمان کی نشانیوں کے بعد جب زمین کے حالات پر غور کیا جائے تو وہ انسان کی رہائش کے لیے انتہائی بامعنی طور پر موزوں نظر آتی ہے۔

زمین ایک قدرتی فرش کی مانند آدمی کے قدموں کے نیچے پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ایک طرف انسان کی ضرورت کے لیے سمندر کی گہرائیاں ہیں تو دوسری طرف پہاڑوں کی بلندیاں بھی ہیں تا کہ دونوں مل کر زمین کا توازن برقرار رکھیں۔ درخت ایک دوسرے سے الگ الگ بھی ہو سکتے تھے مگر ان میں جوڑے ہیں جن کے درمیان تزویج کے عمل سے دانے اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ زمین کا یہ حال ہے کہ سورج کے چاروں طرف اپنی سالانہ دوری گردش کے ساتھ اپنے محور پر بھی مسلسل گردش کرتی ہے جس کا دور 24 گھنٹہ میں پورا ہوتا ہے اور جس سے رات اور دن پیدا ہوتے ہیں۔

اس قسم کی نشانیوں پر جو شخص بھی سنجیدگی سے غور کرے گا وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ دنیا ایک بااختیار مالک کے تحت ہے اور اس نے اپنے ارادہ کے تحت اس کی ایک بامقصد منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ باشعور منصوبہ بندی کے بغیر زمین پر یہ معنویت ہرگز ممکن نہ تھی۔

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۟ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ④

۴۔ اور زمین میں پاس پاس مختلف قطعے ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتی ہے اور کھجوریں ہیں، ان میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دہرے۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اور ہم ایک کو دوسرے پر پیداوار میں فوقیت دیتے ہیں۔ بے شک ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ کوئی اچھی زمین ہے اور کوئی بنجر زمین۔ ایک اگتی ہے اور اسی کے پاس دوسری نہیں اگتی (أَرْضٌ طَيِّبَةٌ وَأَرْضٌ سَبِخَةٌ، نَبَتَتْ هَذِهِ، وَهَذِهِ إِلَى جَنْبِهَا لَا تَنْبُتُ) البحر المحيط لأبی حيان الأندلسی، جلد 6، صفحہ 348۔ مجاہد نے کہا کہ یہی معاملہ بنی آدم کا ہے۔ ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی، حالانکہ سب کی اصل ایک ہے (كَمَثَلِ بَنِي آدَمَ صَالِحِهِمْ وَخَبِيثِهِمْ وَأَبُوهُمْ وَاحِدٌ) حسن بصری نے کہا کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے بنی آدم کے دلوں کے لیے دی ہے (هَذَا مَثَلٌ ضَرَبَهُ اللَّهُ تَعَالَى لِقُلُوبِ بَنِي آدَمَ) تفسیر البغوی، جلد 3، صفحہ 7۔

زمین میں ایک عجیب نشانی یہ ہے کہ ایک ہی مٹی ہے۔ ایک ہی پانی سے اس کو سیراب کیا جاتا ہے مگر ایک جگہ سے ایک درخت نکلتا ہے اور اسی کے پاس دوسری جگہ سے دوسرا درخت۔ ایک میں میٹھا پھل ہے اور دوسرے میں کھٹا پھل۔ کوئی زیادہ پیداوار دیتا ہے اور کوئی کم پیداوار۔

یہ انسانی واقعہ کی زمینی تمثیل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ تمام انسان بظاہر یکساں ہیں اور ان سب کے پاس ایک ہی ہدایت آتی ہے۔ مگر ہدایت سے استفادہ کے معاملہ میں ایک انسان اور دوسرے انسان میں

بہت زیادہ فرق ہوجاتا ہے۔ کوئی اس سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور کوئی اس کا منکر بن جاتا ہے۔ کوئی تھوڑی ہدایت لیتا ہے اور کسی کی زندگی ہدایت سے مالا مال ہوجاتی ہے۔ گویا جیسی زمین ویسی پیداوار کا اصول یہاں بھی ہے اور وہاں بھی۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۵

۵۔ اور اگر تم تعجب کرو تو تعجب کے قابل ان کا یہ قول ہے کہ — جب ہم مٹی ہوجائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں وہ آگ والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری زندگی کے منکرین کا کیس نہایت عجیب ہے۔ وہ جس واقعہ کے ظہور کو ایک بار مان رہے ہیں اسی واقعہ کے دوبارہ ظہور کا انکار کردیتے ہیں۔

جو لوگ دوسری زندگی کے وقوع کو نہیں مانتے وہ دوسری زندگی کا عقیدہ رکھنے والوں پر حیرانی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ دوسری زندگی کو ماننا ایک غیر علمی بات کو ماننا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ کیوں کہ کوئی منکر جس چیز کا انکار کرسکتا ہے، وہ صرف دوسری زندگی ہے۔ جہاں تک پہلی زندگی کا تعلق ہے اس کا انکار کرنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ تو ایک زندہ واقعہ کے طور پر ہر آدمی کے سامنے موجود ہے۔ پھر جب پہلی زندگی کا وجود میں آنا ممکن ہے تو دوسری زندگی کا وجود میں آنا ناممکن کیوں ہو۔

ایسے لوگ ہمیشہ بہت کم پائے گئے ہیں جو خدا کے منکر ہوں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک خالق کو مانتے ہیں مگر وہ آخرت کو نہیں مانتے۔ مگر آخرت کے انکار کے بعد خالق کے اقرار کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ خدا اس کائنات کا خالق ہی نہیں وہ بذاتِ خود حق بھی ہے۔ خدا کا سراپا حق اور عدل ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کرے حق اور عدل کے مطابق کرے۔ آخرت دراصل خدا کی صفت عدل کا ظہور ہے۔ خدا کا ماننا وہی ماننا ہے جب کہ اس کے ساتھ آخرت کو بھی مانا جائے۔ آخرت کو مانے بغیر خدا کا عقیدہ مکمل نہیں ہوتا۔

جو لوگ حق کے سیدھے اور سچے پیغام کو نہیں مانتے اس کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ جمود اور تعصب اور اَنانیت کے شکار ہوتے ہیں۔ ان سے بات کیجیے تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خود اپنے خیالات کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔ اس سے نکل کر وہ آزادانہ طور پر کسی خارجی حقیقت پر غور نہیں کرسکتے۔ اسی حالت کو ''گردن میں طوق پڑنا'' فرمایا۔ کیوں کہ گردن میں طوق ہونا غلامی کی علامت ہے۔ گویا کہ یہ لوگ خود اپنے خیالات کے غلام

ہیں۔ جولوگ اس طرح اپنے آپ کو دنیا میں قیدی بنالیں، آخرت میں بھی ان کے حصے میں قیدہی آئے گی۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٦

٦۔ وہ بھلائی سے پہلے برائی کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ حالاں کہ ان سے پہلے مثالیں گزر چکی ہیں اور تمھارا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود ان کو معاف کرنے والا ہے۔ اور بے شک تمھارا رب سخت سزا دینے والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے لوگوں سے کہتے تھے کہ خدا کی ہدایت کو مانو ورنہ تم خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا ”خدایا، محمد جو کچھ پیش کر رہے ہیں اگر وہ حق ہے تو تو ہمارے اوپر آسمان سے پتھر برسا“۔ یہ دعا بظاہر خدا سے تھی مگر حقیقۃً اس کا رخ رسول کی طرف تھا۔ آپ اس وقت مکہ کے لوگوں کو بالکل بے وزن معلوم ہوتے تھے۔ ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے معمولی آدمی کے انکار پر خدا ہمیں سزا دے گا۔ ”محمد“ کے انکار پر عذاب آنا ان کو اتنا بعید از وقوع نظر آتا تھا کہ وہ بطور استہزا کہتے تھے کہ تم جس خدائی عذاب کی دھمکی دے رہے ہو، ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے اوپر آجائے۔

فرمایا کہ تمھارے انکارِ حق کے سبب سے تمھارے اوپر خدا کا عذاب تو آنے ہی والا ہے۔ یہ صرف تمھاری بدبختی ہے کہ تم اس کو جلد بلانا چاہتے ہو۔ حالاں کہ تم کو چاہیے تھا کہ اس وقفہ کو دعوتِ قرآن پر غور وفکر اور اس کی قبولیت میں استعمال کرو نہ کہ عذاب کو قبل از وقت بلانے میں۔

لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں پھر اس کو مانیں۔ مگر یہ صرف اندھے پن کا مطالبہ ہے۔ اگر ان کے پاس آنکھیں ہوں تو جو کچھ دوسروں کے ساتھ پیش آیا وہی ان کے سبق کے لیے کافی ہے۔ ان سے پہلے کتنی قومیں گذر چکی ہیں جنھوں نے انھیں کی طرح اپنے زمانے کے پیغمبروں کو جھٹلایا اور بالآخر انھیں اس کی سزا بھگتنی پڑی۔

خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ انسان کو عمل کی مہلت دیتا ہے۔ یہی قانون مہلت ہے جس نے لوگوں کو سرکش بنا رکھا ہے۔ مگر مہلت کی ایک حد ہے۔ اس حد کے بعد جو چیز ان کا انتظار کر رہی ہے وہ صرف دردناک عذاب ہے جس سے وہ اپنے آپ کو بچا نہ سکیں گے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝٧ ع

٧۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا، وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری۔ تم تو صرف خبردار کردینے والے ہو۔ اور ہر قوم کے لیے ایک راہ بتانے والا ہے۔

آج ساری دنیا میں ایک ارب سے بھی زیادہ انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مانتے ہیں۔ مگر آپ کی زندگی میں مکہ والوں کی سمجھ میں نہ آسکا کہ آپ کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں آپ کی نبوت ایک نزاعی (controversial) نبوت تھی۔ مگر اب اپنی تاریخ کے انتہائی دور میں آپ کی نبوت ایک ثابت شدہ (established) نبوت بن چکی ہے۔ نزاعی دور میں پیغمبر کو پہچاننا جتنا مشکل ہے، اثباتی دور میں اس کو پہچاننا اتنا ہی آسان ہوجاتا ہے۔

مکہ کے لوگوں کے پاس جو پیمانہ تھا وہ دولت، اقتدار، اور مقبولیتِ عوام کا پیمانہ تھا۔ اس اعتبار سے آپ ان کو غیر معمولی نظر نہ آتے تھے۔ اس لیے انھوں نے چاہا کہ آپ کے ساتھ کوئی غیر معمولی نشانی ہو جو ان کے لیے آپ کے پیغمبر ہونے کا قطعی ثبوت بن جائے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ یہ لوگ ایسی چیز مانگ رہے ہیں جو خدائی منصوبہ کے مطابق نہیں، اس لیے وہ کسی کو ملنے والی بھی نہیں۔

موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں ہدایت ایسی صریح نشانیوں کے ساتھ نہیں آسکتی کہ اس کے بعد آدمی کے لیے شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ کیوں کہ ایسی حالت میں امتحان کی مصلحت فوت ہوجاتی ہے۔ یہاں بہر حال یہی ہوگا کہ آدمی کو ''خبر'' کی سطح پر جانچ کر اس کا یقین کرنا پڑے گا۔ جو شخص اس امتحان میں پورا نہ اترے، اس کے حصہ میں ہدایت بھی کبھی نہیں آسکتی۔

خدا ہر قوم میں اس کے اپنے اندر کے ایک آدمی کو کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ اس کی مانوس زبان میں اس کو خدا کا پیغام دے۔ یہ انتظام قوموں کی آسانی کے لیے تھا۔ مگر اکثر ایسا ہوا کہ قوموں نے اس سے الٹا اثر لے کر خدا کے پیغمبروں کا انکار کردیا۔ ان کی نگاہیں پیغام رساں کے معمولی پن پر اٹک کر رہ گئیں، وہ پیغام کے غیر معمولی پن کو نہ دیکھ سکیں۔

اَللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ کُلُّ اُنۡثٰی وَ مَا تَغِیۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَ مَا تَزۡدَادُ ؕ وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ ﴿۸﴾ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ الۡکَبِیۡرُ الۡمُتَعَالِ ﴿۹﴾ سَوَآءٌ مِّنۡکُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَ مَنۡ جَہَرَ بِہٖ وَ مَنۡ ہُوَ مُسۡتَخۡفٍۭ بِالَّیۡلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّہَارِ ﴿۱۰﴾

۸۔ اللہ جانتا ہے ہر مادہ کے حمل کو۔ اور جو کچھ رحموں میں گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کو بھی۔ اور ہر چیز کا اس کے یہاں ایک اندازہ ہے۔ ۹۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے، سب سے بڑا ہے، سب سے برتر۔ ۱۰۔ تم میں سے کوئی شخص چپکے سے بات کہے اور جو پکار کر کہے اور جو رات میں چھپا ہوا اور جو دن میں چل رہا ہو، خدا کے لیے سب یکساں ہیں۔

ماں کا پیٹ ایک حیرت انگیز فیکٹری ہے۔ اس خدائی فیکٹری میں جو انسانی پیداوار تیار ہوتی ہے اس کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ وہ ''مقرر مقدار'' کے مطابق عمل کرتی ہے۔ آج کل کی زبان میں گویا ڈیمانڈ اور سپلائی کے درمیان مسلسل ایک توازن برقرار رہتا ہے۔

مثلاً یہ فیکٹری ہزاروں سال سے کام کر رہی ہے۔ اس سے مرد بھی پیدا ہو رہے ہیں اور عورتیں بھی۔ مگر دونوں جنسوں کی تعداد کے درمیان ہمیشہ ایک تناسب قائم رہتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اس فیکٹری سے سب مرد ہی مرد پیدا ہو جائیں یا سب عورتیں ہی عورتیں پیدا ہونے لگیں۔ جنگ جیسا کوئی حادثہ مقامی طور پر کبھی اس تناسب کو برہم کر دیتا ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر دیکھا گیا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہی یہ قدرتی کارخانہ اس تناسب کو دوبارہ قائم کر دیتا ہے۔

یہی معاملہ اس فیکٹری سے نکلنے والے مرد وعورت کے درمیان صلاحیتوں کے توازن کا ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ پیدا ہونے والے مرد وعورت سب یکساں استعداد کے نہیں ہوتے۔ ان کی صلاحیتوں میں بہت زیادہ تنوع (diversity) ہے۔ اس تنوع کی غیر معمولی تمدنی اہمیت ہے۔ کیوں کہ تمدن کے کاروبار کو چلانے کے لیے مختلف قسم کی صلاحیتوں کے انسان درکار ہیں۔ ماں کی فیکٹری نہایت خاموشی سے ہر قسم کی استعداد والے انسان اس طرح کامیابی کے ساتھ تیار کر رہی ہے جیسے اس کو باہر سے ''آرڈر'' موصول ہوتے ہوں۔ اور وہ پیٹ کے اندر اس کے مطابق انسانوں کی تشکیل کر رہی ہو۔ اگر انسانی پیداوار میں یہ تنوع نہ ہو تو تمدن کا سارا نظام سرد پڑ جائے اور تمام ترقیاں ماند ہو کر رہ جائیں۔

ماں کے پیٹ کے عمل میں اس منصوبہ بندی کا ہونا صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ ساز ہے۔ بالارادہ منصوبہ بندی کے بغیر اس قسم کا نظام اس قدر تسلسل کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ومالک ایک ایسی ہستی ہے جس کو نہ صرف کھلے کی خبر ہے بلکہ وہ چھپے کو بھی جانتا ہے۔ رحم کے اندر اور ماں کے پیٹ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بظاہر ایک مخفی چیز ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ خدا کو اس کی مکمل خبر ہے۔ پھر جو ہستی ایک کے چھپے اور کھلے کو جانتی ہے وہ دوسرے کے چھپے اور کھلے کو کیوں نہیں جانے گی۔ فرشتوں کا عقیدہ بھی اسی سے ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ ''نگرانی'' کے موجودہ نظام کی گویا توسیع ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے نگراں ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اس کو نہ بدل ڈالیں جو ان کے جی میں ہے۔ اور جب اللہ کسی قوم پر کوئی آفت لانا چاہتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں اور اللہ کے سوا اس کے مقابلہ میں کوئی ان کا مددگار نہیں۔

دنیا میں قوموں کا عروج وزوال اَلل ٹپ طور پر نہیں ہوتا بلکہ خدا کی نگرانی اور فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ خدا جب کسی قوم کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس نعمت کو اس وقت تک اس کے لیے باقی رکھتا ہے جب تک وہ

اپنے اندر اس کی استعداد باقی رکھے۔ استعداد کھودینے کے بعد وہ قوم لازمی طور پر خدائی نعمت کو بھی کھودیتی ہے، مثلاً اپنے درمیان اتحاد کھونے کے بعد خارجی دنیا میں رعب سے محروم ہوجانا، وغیرہ۔

دنیا میں کوئی قوم جو کچھ پاتی ہے، خدا کے قانون کے تحت پاتی ہے اور کوئی قوم جو کچھ کھوتی ہے خدا کے قانون کے تحت کھوتی ہے۔ خدا کے سوا یہاں نہ کوئی دینے والا ہے اور نہ کوئی چھیننے والا۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

۱۲۔ وہی ہے جو تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی پیدا ہوتا ہے اور امید بھی۔ اور وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔ ۱۳۔ اور بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف سے اور وہ بجلیاں بھیجتا ہے، پھر جس پر چاہے انھیں گرادیتا ہے اور وہ لوگ خدا کے باب میں جھگڑتے ہیں، حالاں کہ وہ زبردست ہے، قوت والا ہے۔

بجلی چمکتی ہے تو کبھی وہ نئے خوش گوار موسم کی آمد کا پیغام ہوتی ہے اور کبھی وہ صاعقہ بن کر زمین پر گرتی ہے اور چیزوں کو جلاڈالتی ہے۔ اسی طرح بادل اٹھتے ہیں تو کبھی وہ مفید بارش کی صورت میں زمین پر برستے ہیں اور کبھی طوفان اور سیلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک ہی چیز میں ڈر کا پہلو بھی ہے اور امید کا پہلو بھی۔ دنیا کا انتظام کرنے والا جس چیز کے ذریعہ دنیا والوں پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اسی کو وہ تباہ کن عذاب بھی بنا سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ آدمی کبھی اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے مامون نہ سمجھے۔

غافل انسان ہمیشہ کسی انوکھی اور طلسماتی نشانی کے ظہور کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کا شعور بیدار ہے، وہ اپنے آس پاس روزمرہ کے واقعات میں ہر قسم کی اعلیٰ نشانی پالیتے ہیں۔ بجلی کی کڑک چمک ان کے دل کی دھڑکنیں تیز کردیتی ہیں۔ اور بارش کے قطرے دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ پڑتا ہے۔ خدا کی طاقتوں کو براہِ راست دیکھ کر فرشتوں کا جو حال ہوتا ہے وہی حال سچے انسانوں کا اس وقت ہوجاتا ہے جب کہ انھوں نے خدا کی طاقتوں کو ابھی براہِ راست نہیں دیکھا ہے۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ

۱۴۔ سچا پکارنا صرف خدا کے لیے ہے۔ اور اس کے سوا جن کو لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی اس سے زیادہ دادرسی نہیں کرسکتے جتنا پانی اس شخص کی کرتا

كَفَّيْهِ إِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہوتا کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے اور وہ اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں۔ اور منکرین کی پکار سب بے فائدہ ہے۔

اگر آپ ہاتھ پھیلا کر سمندر کے پانی کو پکاریں تو ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ سمندر آپ کی پکار کو سنے اور اس کا پانی سمندر کی گہرائیوں سے نکل کر آپ کی طرف آئے اور آپ کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرے۔ مگر اسی سمندر کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ قدرت کے قانون کے تحت اس کا پانی نمک کے جز کو چھوڑ کر فضا میں بلند ہوتا ہے۔ پھر گرمی اور کشش اور ہوا کے عمل سے متحرک ہو کر وہ آپ کی بستی کے اوپر آتا ہے اور میٹھے پانی کی صورت میں برس کر آپ کی زمین کو سیراب کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سمندر بظاہر عظیم ہونے کے باوجود سراسر عاجز ہے اس کو کسی قسم کا ذاتی اختیار حاصل نہیں۔

یہی اس دنیا کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ ایسی حالت میں عقل مند انسان صرف وہ ہے جو خالق کو پوجے، نہ کہ مخلوق کو، جو چیزوں کے رب کو اپنا مرکز توجہ بنائے، نہ کہ خود چیزوں کو۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدة قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

السجدة ۳

۱۵۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں، خوشی سے یا مجبوری سے اور ان کے سائے بھی صبح اور شام۔ ۱۶۔ کہو، آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے۔ کہہ دو کہ اللہ۔ کہو کیا پھر بھی تم نے اس کے سوا ایسے مددگار بنا رکھے ہیں جو خود اپنی ذات کے نفع اور نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ کہو، کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں، یا کیا اندھیرا اور اجالا دونوں برابر ہو جائیں گے۔ کیا انھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنھوں نے بھی پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ نے پیدا کیا، پھر پیدائش ان کی نظر میں مشتبہ ہو گئی۔ کہو، اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہے اکیلا، زبردست۔

خدا کا مطالبہ انسان سے یہ ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ یہی "جھکنا" تمام کائنات کا دین ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز خدا کے حکم کے آگے کامل طور پر جھکی ہوئی ہے۔ اسی جھکاؤ کی ایک علامت ہے چیزوں کے سایہ

کا صبح وشام مغرب اور مشرق کی طرف گرنا۔ چیزوں کا یہ سایہ گویا اس سجدہ کو مادی طور پر ممثل کر رہا ہے جو انسان سے شعوری طور پر مطلوب ہے۔ اوّل الذکر سجدے کا علامتی روپ ہے اور ثانی الذکر اس کا حقیقی روپ۔

وسیع کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ساری کائنات ایک ہی آفاقی قانون میں بندھی ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خالق اور مالک ایک ہے۔ انسان کا علمی اور عقلی مطالعہ کسی بھی طرح یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس کائنات میں ایک سے زیادہ طاقتوں کی کارفرمائی ہو۔ ایسی حالت میں ایک خدا کے سوا مزید خدا ماننا سراسر بے بنیاد مفروضہ ہے۔

''آنکھ'' کا مشاہدہ تو صرف ایک خدا کا پتہ دیتا ہے۔ اس لیے جو لوگ ایک خدا سے زیادہ خدا مانیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ اندھے ہیں۔ انھوں نے اپنے اندھے پن کی وجہ سے کئی خدا فرض کر لیے ہیں، نہ کہ حقیقی معنوں میں علم اور مشاہدہ کی بنیاد پر۔

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ؕ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے، وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے۔

خدا نے اپنی دنیا اس طرح بنائی ہے کہ یہاں مادی واقعات اخلاقی حقیقتوں کی تمثیل بن گئے ہیں۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ کو انسان سے شعور کی سطح پر مطلوب ہے، انھیں کو بقیہ دنیا میں مادی سطح پر دکھایا جا رہا ہے۔

یہاں قرآن میں فطرت کے دو واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جب بارش ہوتی ہے اور اس کا پانی بہہ کر ندیوں اور نالوں میں پہنچتا ہے تو پانی کے اوپر ہر طرف جھاگ پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح جب چاندی اور دوسری معدنیات کو صاف کرنے کے لیے آگ پر تپاتے ہیں تو اس کا میل کچیل جھاگ کی صورت میں اوپر آجاتا ہے۔ مگر جلد ہی بعد یہ ہوتا ہے کہ دونوں چیزوں کا جھاگ، جس میں انسان کے لیے کوئی فائدہ نہیں فضا میں اڑ جاتا ہے۔ اور پانی اور دھات اپنی جگہ پر محفوظ رہ جاتے ہیں جو انسان کے لیے مفید ہے۔

یہ فطرت کے واقعات ہیں جن کے ذریعے خدا تمثیل کے روپ میں دکھا رہا ہے کہ اس نے زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے لیے کیا اصول مقرر فرمایا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اس دنیا میں صرف اس شخص یا قوم کو جگہ ملتی ہے

جودوسروں کے لیے نفع بخشی کا ثبوت دے۔ جوفرد یا گروہ دوسرے انسانوں کو نفع پہنچانے کی طاقت کھودے اس کے لیے خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۭ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ڏ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝18ۧ

۱۸۔ جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار کو لبیک کہا، ان کے لیے بھلائی ہے اور جن لوگوں نے اس کی پکار کو نہ مانا، اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے، اور اس کے برابر اور بھی تو وہ سب اپنی رہائی کے لیے دے ڈالیں۔ ان لوگوں کا حساب سخت ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔

دنیا میں خدا کا یہ قانون ہے کہ خواہ وقتی طور پر میل اور جھاگ ابھر کر اوپر آجائے مگر بالآخر جس چیز کو یہاں مقام ملتا ہے وہ وہی ہے جو حقیقی ہے اور جس میں نفع بخشی کی صلاحیت ہے، آخرت کے اعتبار سے بھی انسانوں کا معاملہ یہی ہے۔ دنیا میں کچھ لوگ اپنی اضافی حیثیت کی بنا پر نمایاں ہوسکتے ہیں۔ مگر آخرت میں وہی لوگ اونچی جگہ پائیں گے جو حقیقی اوصاف کے مالک ہیں۔

دنیا میں جو لوگ حق کی پکار پر لبیک نہیں کہتے، اس کی وجہ ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ بے آمیز حق کی طرف بڑھنے میں اُنھیں دنیا کے فائدے ہاتھ سے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو حق کو نظر انداز کرنے کی قیمت ہمیشہ یہ ملتی ہے کہ وہ دنیا میں عزت اور مقبولیت اور خوش حالی کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ حق کا انکار کرکے اونچی گدیوں پر سرفراز نظر آتے ہیں۔

مگر ان چیزوں کی حیثیت میل اور جھاگ سے زیادہ نہیں۔ آخرت میں یہ سارے لوگ وقتی جھاگ کی طرح دور پھینکے جا چکے ہوں گے۔ اور وہی لوگ نمایاں نظر آئیں گے جنھوں نے تمام وقتی فائدوں کو نظر انداز کرکے اپنے آپ کو حق کے حوالے کیا تھا۔

جو لوگ دنیا کی حیثیت اور دنیا کے فائدوں کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ اس کی خاطر حق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، آخرت میں یہ چیزیں ان کو اتنی حقیر دکھائی دیں گی کہ وہ چاہیں گے کہ یہ ساری دنیا اور اس کے برابر ایک اور دنیا مل جائے تو وہ ان سب کو صرف عذاب سے بچنے کی خاطر فدیہ میں دے دیں۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝19ۙ

۱۹۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے وہ حق ہے، کیا وہ اس کے مانند ہوسکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت تو عقل والے لوگ ہی قبول کرتے ہیں۔

انسانوں میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جس نے خدا کی دی ہوئی عقل سے سوچا اور حقائق کی روشنی میں ایک یقینی فیصلہ تک پہنچا۔ اس طرح بے لاگ جائزہ کے نتیجہ میں اس کا دل جس چیز پر مطمئن ہوا اس کو اس نے ارادہ اور شعور کے ساتھ اختیار کرلیا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو قومی روایات اور تقلیدی خیالات کے دائرہ میں سوچتے ہوں۔ جو چیزوں کو دلائل کی نظر سے دیکھنے کے بجائے رواج کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ اور پھر جو چیز انھیں عوام میں چلتی ہوئی دکھائی دے اسی کو حق سمجھ کر اختیار کرلیں۔

قرآن کے نزدیک پہلا شخص وہ ہے جو علم کی روشنی میں ایمان لایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا آدمی قرآن کی نظر میں اندھا ہے۔ پہلا آدمی خود اپنی بصیرت سے حق اور باطل کو جانتا ہے۔ جب کہ دوسرے آدمی کا سرمایہ صرف سنی سنائی باتیں ہیں۔ لوگ جس کو باطل سمجھ لیں اس کو اس نے باطل سمجھ لیا، لوگ جس کو حق سمجھیں، اس کے متعلق اس نے بھی یقین کرلیا کہ وہ حق ہوگی۔

حق کی دعوت ایسے لوگوں کی تلاش کے لیے اٹھتی ہے جو اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کرسکتے ہوں۔ باقی جو لوگ آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بنے ہوئے ہوں ان کو حق کی دعوت کچھ فائدہ نہیں پہنچائے گی۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝٢٠ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝٢١ وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝٢٢ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝٢٣ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝٢٤

۲۰۔ وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس کے عہد کو نہیں توڑتے۔ ۲۱۔ اور جو اس کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ برے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ ۲۲۔ اور جنھوں نے اپنے رب کی رضا کے لیے صبر کیا۔ اور نماز قائم کی۔ اور ہمارے دئے میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کیا۔ اور جو برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انھیں لوگوں کے لیے ہے۔ ۲۳۔ ابدی باغ جن میں وہ داخل ہوں گے۔ اور وہ بھی جو اس کے اہل بنیں، ان کے آباء واجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے۔ اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔ ۲۴۔ کہیں گے تم لوگوں پر سلامتی ہو اس صبر کے بدلے جو تم نے کیا۔ پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر۔

انسان کو خدا نے پیدا کیا۔ اس نے اس کو رہنے کے لیے بہترین دنیا دی۔ وہ ہر آن اس کی پرورش کر رہا ہے۔ یہ واقعہ انسان کو اپنے خالق ومالک کے ساتھ ایک فطری عہد میں باندھ دیتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان سرکش نہ بنے بلکہ حقیقت واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے خدا کے آگے جھک جائے۔

دنیا میں انسان کی زندگی مختلف قسم کے تعلقات وروابط کے درمیان ہے۔ انسان کی عبدیت کا تقاضا ہے کہ وہ اسی سے جڑے جس سے جڑنا خدا کو پسند ہے اور اس سے کٹ جائے جس سے کٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر خدا کی عظمت کا احساس اتنی شدّت سے طاری ہو کہ وہ اس کے آگے جھک جائے، جس کی ایک مقرر صورت کا نام نماز ہے۔ وہ اپنے اثاثہ میں سے دوسروں کو اسی طرح دے جس طرح خدا نے اپنے اثاثہ میں سے اس کو دیا ہے۔ اس کو کسی کی طرف سے برے سلوک کا تجربہ ہو تو وہ اچھے سلوک کے ساتھ اس کا جواب دے۔ کیوں کہ وہ خود بھی یہ چاہتا ہے کہ آخرت میں خدا اس کی برائیوں کو نظر انداز کر دے اور اس کے ساتھ فضل ورحمت کا معاملہ فرمائے۔

یہ سب کچھ مسلسل صبر کا طالب ہے۔ نفس کے محرکات کے مقابلہ میں صبر۔ مفادات کے ضیاع کے مقابلہ میں صبر۔ ماحول کے دباؤ کے مقابلہ میں صبر۔ مگر مومن کو جنت کی خاطر ان تمام چیزوں پر صبر کرنا ہے۔ صبر ہی جنت کی قیمت ہے۔ صبر کی قیمت ادا کیے بغیر کسی کو خدا کی ابدی جنت نہیں مل سکتی۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿٢٥﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿٢٦﴾ ع ۴

۲۵۔ اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ ۲۶۔ اللہ جس کو چاہتا ہے روزی زیادہ دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اور وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہیں۔ اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں ایک متاعِ قلیل کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسان اپنے خدا سے عہد فطرت میں بندھا ہوا ہے اور دوسرے انسانوں سے عہد آدمیت میں۔ ان دونوں عہدوں کو توڑنا خدا کی زمین میں فساد کرنا ہے۔ خدا کی زمین میں اصلاح یافتہ بن کر رہنا یہ ہے کہ آدمی مذکورہ دونوں عہدوں کا پابند بن کر زندگی گزارے۔ اس کے برعکس، خدا کی زمین میں فسادی بننا یہ ہے کہ آدمی ان عہدوں سے آزاد ہو جائے۔ اس کو نہ خدا کے حقوق کی پروا ہو اور نہ انسانوں کے حقوق کی۔

ایسے لوگ خدا کے نزدیک لعنت زدہ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی رحمتوں میں حصہ دار نہیں بنائے جائیں گے۔ انھوں نے خدا کی زمین کو گندا کیا، اس لیے وہ اسی قابل ہیں کہ آئندہ ان کو صرف گندے گھر میں جگہ ملے۔

دنیا میں کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ اب جس کو زیادہ ملا وہ احساس برتری میں مبتلا ہوجاتا ہے اور جس کو کم ملا وہ احساس کمتری میں۔ مگر خدا کی نظر میں یہ دونوں غلط ہیں۔ صحیح ردعمل یہ ہے کہ زیادہ ملے تو آدمی خدا کا شکرگزار بنے، کم ملے تو وہ صبر اور قناعت کا طریقہ اختیار کرے۔

دنیا پرست لوگ ہمیشہ حق کے داعی کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی صرف ظاہری عظمتوں کو پہچاننا جانتا ہے۔ چوں کہ داعی کے پاس صرف معنوی عظمت ہوتی ہے اس لیے وہ اس کو پہچان نہیں پاتا۔ وہ اس کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کردیتا ہے۔ مگر جب حقیقت کا پردہ پھٹے گا اس وقت انسان جانے گا کہ جس نظر آنے والی رونق کو وہ سب کچھ سمجھے ہوئے تھا وہ بالکل بے قیمت تھی۔ قدروقیمت کی چیز دراصل وہ تھی جو دکھائی نہ دینے کی وجہ سے اس کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

۲۷۔ اور جنھوں نے انکار کیا، وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ کہو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور وہ اپنا راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہو۔ ۲۸۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سنو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ۲۹۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کیے، ان کے لیے خوش خبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔

حق کے داعی کو نہ ماننے کی وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو داعی کے گرد محسوس قسم کے کرشمے نظر نہیں آتے۔ مگر یہ عین اسی مقام پر نا کام ہونا ہے جہاں آدمی کو کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ آدمی حق کو اس کے مجرد روپ میں پہچانے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کردے۔ اب جو شخص اصرار کرے کہ وہ محسوس کرشموں کی دلیل کے بغیر نہیں مانے گا، اس کا انجام اس دنیا میں یہی ہوسکتا ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق کبھی اس کو حق نہ ملے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم ہوجائے۔

یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں آدمی صرف ''یاد'' کی سطح پر خدا کو پاسکتا ہے۔ وہ اس کو ''مشاہدہ'' کی سطح پر نہیں پاسکتا۔ جو لوگ اس خدائی منصوبہ پر راضی ہوں گے وہ خدا کو پائیں گے۔ اور جو لوگ اس پر راضی نہ ہوں وہ خدا کو پانے سے اسی طرح محروم رہیں گے جس طرح ننگی آنکھ سے سورج کو دیکھنے پر اصرار کرنے والا سورج کو دیکھنے سے۔

اس دنیا میں کامیابی صرف اس شخص کے لیے ہے جو خدا کے منصوبہ کو مانے اور اس کے

مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے۔ کیوں کہ دنیا کی تخلیق کرنے والا خدا ہے، نہ کہ کوئی انسان۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اسی طرح ہم نے تم کو بھیجا ہے، ایک امت میں جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں، تا کہ تم لوگوں کو وہ پیغام سنا دو جو ہم نے تمھاری طرف بھیجا ہے۔ اور وہ مہربان خدا کا انکار کر رہے ہیں۔ کہو کہ وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

جب یہ دنیا دار الامتحان ہے تو اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ حسّی نشانیاں دکھانے کے بعد لوگوں کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اب اگر لوگوں کے مطالبہ پر خدا فوراً کوئی حسّی نشانی ظاہر کر دے اور اس کے بعد بھی لوگ نہ مانیں تو فوراً وہ ہلاکت کے مستحق ہو جائیں گے۔ مگر یہ خدائے رحمان ورحیم کی خاص عنایت ہے کہ وہ لوگوں کے مطالبہ کے باوجود حسی نشانیاں ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ نصیحت اور دلیل کی زبان میں حق کا پیغام پہنچاتا رہتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مہلت ملتی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر کے خدا کی رحمتوں کے مستحق بن سکیں۔

ایسی حالت میں داعی کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے نادان مطالبہ کی وجہ سے گھبرا نہ جائے۔ وہ خدا کے منصوبہ پر راضی رہتے ہوئے لوگوں کو اس کی طرف بلاتا رہے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ
ع ۵/۱۰ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

۳۱۔ اور اگر ایسا قرآن اترتا جس سے پہاڑ چلنے لگتے، یا اس سے زمین ٹکڑے ہو جاتی یا اس سے مردے بولنے لگتے۔ بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کے لیے ہے۔ کیا ایمان لانے والوں کو اس سے اطمینان نہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو سارے لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ اور انکار کرنے والوں پر کوئی نہ کوئی آفت آتی رہتی ہے، ان کے اعمال کے سبب سے، یا ان کی بستی کے قریب کہیں نازل ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آ جائے۔ یقیناً اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ ۳۲۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے انکار کرنے والوں کو ڈھیل دی، پھر میں نے ان کو پکڑ لیا۔ تو دیکھو کیسی تھی میری سزا۔

حق کو نہ ماننے کا اصل سبب دلیل کی کمی نہیں بلکہ انسان کی یہ آزادی ہے کہ وہ چاہے تو مانے اور چاہے تو نہ مانے۔ جب تک انسان کو انکار کی آزادی حاصل ہے وہ کسی بھی چیز کا انکار کرنے کے لیے عذر تلاش کر سکتا ہے۔

اس کے سامنے الفاظ میں ایک دلیل لائی جائے تو وہ کچھ دوسرے الفاظ بول کر اسے رد کر دے گا۔ کائنات کی نشانیوں کا حوالہ دیا جائے تو وہ اس کی تردید کے لیے خود ساختہ توجیہ تلاش کر لے گا۔ حتی کہ اگر پہاڑ چلائے جائیں اور زمین پھاڑ دی جائے اور مُردوں کو زندہ کر دیا جائے تب بھی کوئی چیز آدمی کو یہ کہنے سے روک نہیں سکتی کہ یہ تو جادو ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انکار کرنے والا بظاہر دلیل مانگتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ استہزاء کر رہا ہوتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ شخص جو چیز پیش کر رہا ہے وہ حق نہیں۔ اگر وہ فی الواقع حق ہوتا تو ضرور اس کے پاس ایسی دلیل ہوتی کہ سارے لوگ اس کو ماننے پر مجبور ہو جاتے۔

خدا نے لوگوں کو مہلت دی ہے اس کی وجہ سے لوگ بے خوف ہو گئے ہیں۔ مگر جب مہلت ختم ہو گی اور خدا لوگوں کو پکڑے گا تو آدمی دیکھے گا کہ وہ کس قدر بے اختیار تھا، اگرچہ وہ فرضی طور پر اپنے کو خود مختار سمجھتا رہا۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

۳۳۔ پھر کیا جو ہر شخص سے اس کے عمل کا حساب کرنے والا ہے (اور وہ جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے، یکساں ہیں)، اور لوگوں نے اللہ کے شریک بنا لیے ہیں۔ کہو کہ ان کا نام لو۔ کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دے رہے ہو جس کو وہ زمین میں نہیں جانتا۔ یا تم اوپر ہی اوپر باتیں کر رہے ہو، بلکہ انکار کرنے والوں کو ان کا فریب خوشنما بنا دیا گیا ہے۔ اور وہ راستہ سے روک دئے گئے ہیں۔ اور اللہ جس کو گمراہ کرے اس کو کوئی راہ بتانے والا نہیں۔ ۳۴۔ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت سخت ہے۔ کوئی ان کو اللہ سے بچانے والا نہیں۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات میں ریکارڈنگ کا نظام ہے۔ آدمی جو کچھ بولتا ہے یا جو کچھ کرتا ہے، وہ کائناتی انتظام کے تحت فوراً ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کائنات کا خدا کسی ایسی ہستی ہی کو مانا جا سکتا ہے جس کے اندر ''سننے'' اور ''دیکھنے'' کی طاقت ہو۔ مگر انسانوں نے اب تک جتنے شرکاء فرض کیے ہیں، سب کے سب وہ

ہیں جن کے اندر نہ سننے کی طاقت ہے اور نہ دیکھنے کی۔ ایسی حالت میں کیوں کر وہ موجودہ کائنات جیسی دنیا کے خالق ومالک ہوسکتے ہیں۔ جو خود نہ سنے وہ اپنی مخلوقات میں سننے کا مادہ کس طرح پیدا کرے گا جو خود نہ دیکھے وہ دوسری چیزوں کو دیکھنے کے قابل کیسے بنائے گا۔

اسی طرح کائنات میں اتنی زیادہ وحدت ہے کہ وہ کسی طرح شرک کو قبول نہیں کرتی۔ جس شریک کا بھی نام لیا جائے، کائنات پورے وجود کے ساتھ اس کو تسلیم کرنے سے انکار کردے گی۔

منکرین کے لیے ان کا مکر خوش نما بنا دیا گیا ہے، یہاں مکر سے مراد ان کا ''قول'' ہے جس کا ذکر اسی آیت میں اوپر موجود ہے۔ جب بھی آدمی حق کا انکار کرتا ہے تو اس کا ذہن اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لیے کوئی قول گھڑ لیتا ہے۔ یہ قول اگر چہ بے حقیقت الفاظ کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر جو لوگ حق کے معاملہ میں زیادہ سنجیدہ نہ ہوں وہ کچھ نہ کچھ الفاظ بول کر سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے اپنے انکار واعراض کو حق بجانب ثابت کردیا ہے۔ خواہ ان کے بولے ہوئے الفاظ ان کے اپنے ذہن کے باہر کوئی قیمت نہ رکھتے ہوں۔

اس قسم کے جھوٹے الفاظ کسی آدمی کو صرف موجودہ دنیا میں سہارا دے سکتے ہیں۔ آخرت میں جب ہر چیز کی حقیقت کھلے گی تو یہ خوشنما الفاظ اتنے بے وزن ہو جائیں گے کہ آدمی ان کو دہراتے ہوئے بھی شرم محسوس کرے گا۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور جنت کی مثال جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس کا پھل اور سایہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ انجام ان لوگوں کا ہے جو خدا سے ڈرے اور منکروں کا انجام آگ ہے۔

جنت کی قیمت تقویٰ ہے۔ یعنی اللہ کی عظمت کا اتنا شدید احساس جو ڈر بن کر آدمی کے دل میں سما جائے۔ جو لوگ دنیا میں خدا سے ڈریں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کے اُن گھروں میں بسائے جائیں گے جہاں آدمی کے لیے کسی قسم کا ڈر نہ ہوگا۔ جس کے چاروں طرف سرسبز باغات ان کی عظمت وشان کو دوچند کررہے ہوں گے۔

اس کے برعکس، حال ان لوگوں کا ہے جو دنیا میں بے خوف بن کر رہے۔ وہ آخرت میں اپنے آپ کو آگ کی دنیا میں پائیں گے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ

۳۶۔ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی، وہ اس چیز پر خوش ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے۔ اور ان گروہوں میں ایسے بھی ہیں جو اس کے بعض حصہ کا انکار کرتے ہیں۔ کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ

لَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ ۝۳۶
وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝۳۷ ع

ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔ ۳۷۔ اور اسی طرح ہم نے اس کو ایک حکم کی حیثیت سے عربی میں اتارا ہے۔ اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو بعد اس کے کہ تمھارے پاس علم آچکا ہے تو خدا کے مقابلہ میں تمھارا نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔

قرآن آیا تو یہود ونصاریٰ میں دو گروہ ہو گئے۔ ان میں جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے تھے اور حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کی سچی تعلیمات پر قائم تھے، انھوں نے قرآن کو اپنے دل کی آواز سمجھا اور خوش ہو کر اس کو قبول کر لیا۔ مگر جو لوگ عصبیت اور گروہ بندی کو دین سمجھے ہوئے تھے وہ اپنے مانوس دائرہ سے باہر آنے والی سچائی کو پہچان نہ سکے اور اس کے مخالف بن کر کھڑے ہو گئے اللہ سے ان کی بے خوفی نے دعوتِ حق کی مخالفت میں بھی ان کو بے خوف بنا دیا۔

جو شخص عصبیت اور گروہ بندی کی بنا پر سچائی کا مخالف بنتا ہے وہ در اصل خدا کو چھوڑ کر اپنی خواہشات پر چلتا ہے۔ ایسے لوگوں کی رعایت سے دعوت حق میں کوئی تبدیلی کرنا داعی کے لیے جائز نہیں۔ داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے قول اور فعل سے بے لاگ حق پر پوری طرح جما رہے۔ ایسے لوگوں کے مقابلہ میں اس کو استقامت کا ثبوت دینا ہے، نہ کہ مصالحت کا۔

آدمی کے سامنے اس کی قابل فہم زبان میں حق کا علم آجائے۔ اس کے باوجود وہ خواہشات کا پیرو بنا رہے تو یہ بے حد سنگین بات ہے۔ کیونکہ یہ ایسا فعل ہے جو آدمی کو خدا کی مدد سے یکسر محروم کر دیتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ
اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ
بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝۳۸
يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ
الْكِتٰبِ ۝۳۹

۳۸۔ اور ہم نے تم سے پہلے کتنے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیویاں اور اولاد عطا کیا اور کسی رسول کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی اِذن کے بغیر کوئی نشانی لے آئے۔ ہر ایک وعدہ لکھا ہوا ہے۔ ۳۹۔ اللہ جس کو چاہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہے باقی رکھتا ہے۔ اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب۔

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے وہ سب عام انسان کی طرح ایک انسان تھے اور دنیوی تعلقات رکھتے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ قوموں نے اس کے باوجود پچھلے پیغمبروں کو مانا اور اپنے معاصر پیغمبر کا اسی سبب سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے ساتھ مزید ایک چیز شامل تھی جو معاصر پیغمبر کو حاصل نہ تھی۔ یہ مزید چیز تاریخی عظمت ہے۔ قوموں نے تاریخی عظمت کی بنا پر پچھلے پیغمبروں کو مانا اور

تاریخی عظمت سے خالی ہونے کی بنا پر معاصر پیغمبر کا انکار کر دیا۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ حقیقت کو اس کے مجرد روپ میں دیکھ نہیں پاتا۔ زندہ پیغمبر کے ساتھ حقیقت مجرد روپ میں تھی۔ اس لیے انسان ان کو پہچان نہ سکا۔ تاریخ کے پیغمبر کے ساتھ اضافی اہمیتیں بھی شامل ہو چکی تھیں اس لیے اس نے ان کو پہچان لیا اور ان کا معتقد بن گیا۔

''امُّ الکتاب'' سے مراد خدا کا وہ اصل نوشتہ ہے جو خدا کے پاس ہے اور جس میں ہدایت کی وہ تمام اصولی باتیں لکھی ہوئی ہیں جو خدا کو انسان سے مطلوب ہیں۔ مختلف پیغمبروں پر جو کتابیں اتریں وہ سب اسی ام الکتاب سے ماخوذ تھیں۔ خدا نے اپنی یہ کتاب کبھی ایک زبان میں اتاری اور کبھی دوسری زبان میں۔ کبھی اس کے لیے تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا گیا اور کبھی اس کو براہِ راست پیرایہ میں بیان کیا گیا۔ کبھی نازل ہونے کے بعد اس کی حفاظت کی ذمہ داری انسانوں پر ڈالی گئی اور کبھی اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی۔

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

۴۰۔ اور جس کا ہم ان سے عہد کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ ہم تم کو دکھا دیں یا ہم تم کو وفات دے دیں، پس تمھارے اوپر صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے اوپر ہے حساب لینا۔ ۴۱۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور اللہ فیصلہ کرتا ہے، کوئی اس کے فیصلہ کو ہٹانے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ ۴۲۔ جو ان سے پہلے تھے انھوں نے بھی تدبیریں کیں مگر تمام تدبیریں اللہ کے اختیار میں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ہر ایک کیا کر رہا ہے اور منکرین جلد جان لیں گے کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے۔

خدا کے دین کو اختیار کرنے کا انجام عام طور پر آخرت میں سامنے آتا ہے۔ مگر پیغمبر کے مخاطبین اگر پیغمبر کی دعوت کا انکار کر دیں تو اس کا برا انجام ان کے لیے موجودہ دنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔

تاہم اس دنیوی انجام کا کوئی ایک اصول نہیں۔ یہ مختلف پیغمبروں کے زمانہ میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص مصالح کی بنا پر خدا کا یہ فیصلہ اس شکل میں ظاہر ہوا کہ پیغمبر کے متبعین کو پیغمبر کے منکرین پر غالب کر دیا گیا۔

مکی دور کے آخری زمانہ میں جب کہ مکہ کے سرداروں نے آپ کا انکار کر دیا تھا، عین اسی وقت یہ ہو رہا تھا

کہ اسلام کی دعوت دھیرے دھیرے مدینہ میں اور مکہ کے بیرونی قبائل میں پھیل رہی تھی۔ گویا اسلام کی دعوتی قوت مکہ کے اطراف کو فتح کرتی ہوئی مکہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پیغمبر آخر الزماں کے لیے خدا کی سنت دعوتی فتوحات کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

یہاں دعوتی تدبیر کو خدائی تدبیر کہا گیا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قریش نے جب مکہ سے آپ کو نکالا تو انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ انھوں نے آپ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس وقت آپ ایک ایسے شخص تھے جس کی معاشیات برباد ہو چکی تھی۔ جس کو خود اپنے قبیلہ کی حمایت سے محروم کر دیا گیا تھا۔

قریش یہ سب کر کے اپنے طور پر خوش تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے پیغمبر کے ''مسئلہ'' کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ مگر وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے کہ داعی کا سب سے بڑا ہتھیار دعوت ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کو کوئی شخص کبھی داعی سے چھین نہیں سکتا۔ داعی کی دوسری محرومیاں اس کے داعیانہ زور کو اور بڑھا دیتی ہیں، وہ کسی طرح اس کو کم نہیں کرتیں۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ قریش اپنے خیال کے مطابق پیغمبر سے اس کا سب کچھ چھین چکے تھے، اس کی دعوت چاروں طرف عرب کے قبائل میں پھیل رہی تھی۔ لوگوں کے دل اس سے مسخر ہوتے جا رہے تھے۔ یہ عمل خاموشی کے ساتھ مسلسل جاری تھا۔ اور فتح مکہ گویا اسی کا انتہائی نقطہ تھا — مکہ والوں نے جن لوگوں کو ''دس سو'' سمجھ کر گھر سے بے گھر کیا تھا وہ صرف چند سال میں ''دس ہزار'' بن کر دوبارہ مکہ میں اس طرح واپس آئے کہ مکہ والوں کو یہ ہمت بھی نہ تھی کہ ان کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کریں۔

حق کی دعوت سے جن لوگوں کے مفادات پر زد پڑتی ہے وہ اس کو زیر کرنے کے لیے اس کے خلاف تدبیریں کرتے ہیں۔ مگر تمام تدبیروں کا سرا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہر ایک کے اوپر پورا اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی اس برتر حیثیت کا ابتدائی ظہور اسی موجودہ دنیا میں ہو رہا ہے۔ اس کا کامل اور انتہائی ظہور آخرت میں ہوگا جب کہ اندھے بھی اس کو دیکھ لیں اور بہرے بھی اس کو سننے لگیں۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾ ع ۶ ۱۲

۴۳۔ اور منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو، کہو کہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اور اس کی گواہی جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔

ظاہر پرست لوگ جس وقت حق کے داعی میں نشانیاں نہ پا کر اس کی صداقت کے بارہ میں شبہ کر رہے ہوتے ہیں عین اسی وقت معنوی نشانیاں پوری طرح اس کی تصدیق کے لیے موجود ہوتی ہیں۔ سچائی اپنی دلیل آپ ہے۔ مگر اس کو محسوس کرنا صرف اس شخص کے لیے ممکن ہے جو ظواہر سے گزر کر حقائق کو دیکھنے کی نگاہ اپنے اندر پیدا

کر چکا ہو۔ ورنہ جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر میں اٹکی ہوئی ہوں وہ حق کو بے دلیل سمجھ کر اس کا انکار کردیں گے۔ حالاں کہ عین اسی وقت دلائل کا انبار اس کی تصدیق کے لیے ان کے قریب موجود ہوگا۔

۱۴۔ سُوۡرَۃُ اِبۡرٰھِیۡم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ اِلَیۡکَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ۙ بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ وَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِۣ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَۃِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ الٓر۔ یہ کتاب ہے جس کو ہم نے تمھاری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تم لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاؤ، ان کے رب کے حکم سے خدائے عزیز اور حمید کے راستے کی طرف۔ ۲۔ اس اللہ کی طرف کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور منکروں کے لیے ایک عذاب شدید کی تباہی ہے۔ ۳۔ جو کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ راستہ سے بھٹک کر دور جا پڑے ہیں۔

ایمان یہ ہے کہ آدمی خدا کو ایک ایسی ہستی کی حیثیت سے پالے جو ساری طاقتوں کا مالک ہے اور ساری خوبیوں والا بھی ہے۔ ایسا واقعہ کسی آدمی کے لیے محض ایک رسمی عقیدہ نہیں ہوتا۔ یہ کسی آدمی کا بے علمی کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی میں آنا ہے۔ یہ غیب کے پردے سے گزر کر شہود کے جلوے کو دیکھ لینا ہے۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کا ادراک کرلینا ہے۔ ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک شعوری یافت ہے، نہ کہ کسی مجموعۂ الفاظ کی بے روح تکرار — خدا کی کتاب اس لیے آتی ہے کہ آدمی کو اس شعوری درجہ پر پہنچائے۔

اللہ کے اذن سے ہدایت ملنا، بظاہر ہدایت کے معاملہ کو اللہ کی طرف منسوب کرنا ہے۔ مگر اس ارشاد کا رخ حقیقۃً خود انسان کی طرف ہے۔ ''اذن'' سے مراد خدا کا وہ مقررہ قانون ہے جو اس نے انسان کی ہدایت وضلالت کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کے مطابق آدمی کی اپنی سنجیدہ طلب واحد شرط ہے جو اس کو ہدایت تک پہنچاتی ہے۔ اس دنیا میں جس شخص کو ہدایت ملتی ہے وہ محض کسی داعی کی داعیانہ کوششوں سے نہیں ملتی بلکہ خدا کے قانون کے تحت ملتی ہے۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ہدایت کی نعمت کو صرف وہ شخص پائے گا جو خود ہدایت کا طالب ہو۔ ذاتی طلب کے بغیر کسی کو ہدایت نہیں مل سکتی۔

ہدایت کے راستہ کو خدا نے انتہائی حد تک صاف اور روشن بنایا ہے۔ زمین و آسمان میں اس کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ خدا کی کتاب اس کے حق میں ناقابلِ انکار دلائل فراہم کرتی ہے۔ انسانی فطرت اس کی صداقت کی گواہی دے رہی ہے۔ گویا تمام بہترین قرائن اس کے حق میں جمع ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ ہدایت کے راستہ کو اختیار نہ کریں وہ یقینی طور پر دنیوی مفاد کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں، نہ کہ کسی واقعی سبب کی بنا پر۔ اگرچہ ایسے لوگ اپنی روش کو درست ثابت کرنے کے لیے کچھ "دلائل" بھی پیش کرتے ہیں مگر یہ دلائل صرف سیدھی بات میں ٹیڑھ نکالنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ لوگوں کی نظر میں اپنے نہ ماننے کا جواز فراہم کریں۔

ایسی حالت میں ہدایت سے محروم صرف وہی شخص رہ سکتا ہے جس کی مفاد پرستی اور دنیوی رغبت نے اس کو بالکل اندھا بہرا بنا دیا ہو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

۴۔ اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا، تاکہ وہ ان سے بیان کر دے پھر اللہ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

خدا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پیغمبروں کو خود مدعو قوم کے اندر سے اٹھاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے، ان کی اپنی قابل فہم زبان میں انھیں حق کی طرف بلائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جو چیز انسان کی بہتری کے لیے کی گئی تھی اس سے اس نے الٹا نتیجہ نکال لیا۔ اس نے جب دیکھا کہ پیغمبر انھیں کی طرح کا ایک آدمی ہے اور ان کی اپنی مانوس زبان میں کلام کر رہا ہے تو انھوں نے پیغمبر کو معمولی سمجھ کر اس کا انکار کر دیا جو چیز ان کی ہدایت کو آسان بنانے کے لیے کی گئی تھی اس کو انھوں نے اپنی گمراہی کا ذریعہ بنا دیا۔

خدا ایسا نہیں کرتا کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے شعبدے دکھائے۔ وہ کسی قوم کے پاس ایسا پیغمبر بھیجے جو انوکھی زبان یا طلسماتی اسلوب میں کلام کر کے لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دے۔ خدا لوگوں کی عجائب پسندی کی خاطر کرشمے دکھانے کے انداز اختیار نہیں کرتا۔ خدا کا طریقہ سادگی اور حقیقت پسندی کا طریقہ ہے۔ خدا نے اپنی دنیا کو حقائق کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اور انسان کی ہدایت کی اسکیم کو بھی وہ حقائق کی بنیاد پر چلاتا ہے، نہ کہ طلسمات کی بنیاد پر۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڏ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ⑤

۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر اجالے میں لاؤ اور ان کو اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ۔ بے شک ان کے اندر بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔

''آیات اللہ'' سے مراد کائنات کی وہ نشانیاں ہیں جو خدا کی بات کو برحق ثابت کرتی ہیں۔''ایام اللہ'' سے مراد تاریخ کے وہ یادگار واقعات ہیں جب کہ خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا اور خدا کی خصوصی مدد سے حق نے باطل کے اوپر فتح پائی۔ ایک اگر کائناتی دلیل ہے تو دوسری تاریخی دلیل۔

مگر عجیب بات ہے کہ یہی دونوں چیزیں ہماری دنیا میں سب سے زیادہ غیر موجود نظر آتی ہیں۔ آیات اللہ کو غلط تشریح وتعبیر کے پردہ میں چھپا دیا گیا ہے اور ایام اللہ کا یہ حال ہے کہ تاریخ نگاری کا کام جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا انھوں نے ایام الانسان تو خوب قلم بند کیے مگر ایام اللہ ان کی کتابوں میں غیر مذکور رہ گئے۔ ایسی حالت میں کسی بندہ خدا کے لیے باطل کے اندھیرے سے نکلنے کی صورت یہ ہے کہ وہ صبر اور شکر کا ثبوت دے۔

حق کے اعتراف کی واحد قیمت اپنی بے اعترافی ہے۔ حق کو پانے کے لیے اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے۔ اور یہ چیز صبر کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ پھر حق کا ادراک آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ اس کائنات میں جو تقسیم ہے وہ منعم اور منعم علیہ کی ہے۔ خدا دینے والا ہے اور انسان پانے والا۔ اس حقیقتِ واقعہ کی دریافت کے بعد آدمی کے اندر جو صحیح جذبہ پیدا ہونا چاہیے اسی کا نام شکر ہے۔ گویا حقیقت تک پہنچنے کے لیے آدمی کو صبر کا ثبوت دینا پڑتا ہے اور حقیقت کو اپنے اندر اتارنے کے لیے شکر کا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ ع ۱۴ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

۶۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے اوپر اللہ کے اس انعام کو یاد کرو جب کہ اس نے تم کو فرعون کی قوم سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور جو تمھارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑا امتحان تھا۔ ۷۔ اور جب تمھارے رب نے تم کو آگاہ کردیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔ اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ ۸۔ اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم انکار کرو اور زمین کے سارے لوگ بھی منکر ہوجائیں تو اللہ بے پروا ہے، خوبیوں والا ہے۔

ان آیات میں حضرت موسیٰ کی جس تقریر کا حوالہ ہے وہ غالباً آپ کی وہ تقریر ہے جو آپ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے سامنے فرمائی تھی۔ یہ تقریر موجودہ بائبل (کتاب استثنا) میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

حضرت موسیٰ کی اس مفصل تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں خدا والے بن کر رہو اور خدا کی باتوں کا چرچا کرو تو دنیا کی تمام چیزیں تمھارا ساتھ دیں گی۔ سب قوموں کے درمیان تمھارا رعب قائم ہوگا۔ خدا تمھارے دشمنوں کو زیر کرے گا۔ حتی کہ اگر کبھی دریا تمھارے راستے میں حائل ہو تو خدا حکم دے گا اور دریا پھٹ کر تمھیں راستہ دے دے گا، جب کہ اسی دریا میں تمھارے دشمن غرق ہو جائیں گے۔

اس کے برعکس، اگر تم ایسا نہ کرو تو تم خدا کی نظر میں لعنتی ٹھہرو گے، یعنی تم خدا کی رحمتوں سے دور ہو جاؤ گے۔ تمھاری محنت کی پیداوار دوسرے لوگ کھائیں گے، تمھارے ہر کام بگڑتے چلے جائیں گے، تم فکری اور عملی اعتبار سے دوسری قوموں کے زیرِ دست ہو جاؤ گے۔

خدا کا یہ قانون معروف معنوں میں ''یہود'' کے لیے نہیں ہے بلکہ حاملِ کتاب قوم کے لیے ہے۔ جو قوم بھی حاملِ کتاب ہو، اس کے ساتھ خدا کا یہی معاملہ ہے، خواہ وہ ماضی کے حاملینِ کتاب ہوں یا حال کے حاملین کتاب۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ⑨

۹۔ کیا تم کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، قوم نوح اور عاد اور ثمود اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان کے پیغمبر ان کے پاس دلائل لے کر آئے تو انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ دیے اور کہا کہ جو تم کو دے کر بھیجا گیا ہے ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو ہم اس کے بارے میں سخت الجھن والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

خدا کے جتنے رسول مختلف قوموں میں آئے سب کے ساتھ ایک ہی قصہ پیش آیا۔ ہر قوم نے اپنے پیغمبروں کی مخالفت کی۔ ہر جگہ ان کا منھ بند کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ ان کا ''شک'' تھا۔ یہ شک اس لیے تھا کہ ان کے سامنے ایک طرف ان کا آبائی دین تھا جس کی پشت پر اکابر اور اعاظم کے نام تھے۔ دوسری طرف پیغمبر کا دین تھا، جو بظاہر ایک معمولی انسان کے ذریعہ پیش کیا جا رہا تھا۔ دلائل کا زور پیغمبر کے دین کے ساتھ نظر آتا تھا مگر تاریخی عظمت اور عوامی بھیڑ آبائی دین کے ساتھ دکھائی دیتی تھی۔ پیغمبر کے مخاطبین کا یہ حال ہوا کہ وہ دلائل کو رد کرنے کی قوت اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ اور یہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اعاظم اور اکابر کو کس طرح غلط سمجھ لیں۔ اس دو طرفہ صورت حال نے انھیں کنفیوزن میں مبتلا

کر دیا۔ اگر چہ وہ عملاً اپنے آبائی دین کے ساتھ وابستہ رہے مگر دینِ حق کے مضبوط دلائل کی بنا پر اپنے قلب و دماغ کو آبائی دین کے تئیں بھی شک سے آزاد نہ کر سکے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ قَالُوْٓا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَأْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٠﴾

۱۰۔ ان کے پیغمبروں نے کہا، کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو وجود میں لانے والا ہے۔ وہ تم کو بلا رہا ہے کہ تمھارے گناہ معاف کر دے اور تم کو ایک مقرر مدت تک مہلت دے۔ انھوں نے کہا کہ تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے جیسے ایک آدمی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم کو ان چیزوں کی عبادت سے روک دو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ تم ہمارے سامنے کوئی کھلی سند لے آؤ۔

اس آیت کا تعلق اصلاً قدیم قوموں سے ہے۔ مگر قرآن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خدا کی ابدی تعلیمات کو تاریخ کے سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے قرآن میں ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جن میں مخاطبِ اول کی رعایت کے ساتھ بعد کے انسانوں کی رعایت بھی پوری طرح شامل ہو۔

اس آیت میں ''فاطر'' کا لفظ اسی کی ایک مثال ہے۔ فاطر کے لفظی معنی ہیں ''پھاڑنے والا''۔ عمومی مفہوم کے لحاظ سے فاطر کا لفظ یہاں خالق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مگر اس کا خالص لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ ہوگا— ''کیا تم کو خدا کے بارہ میں شک ہے جو زمین و آسمان کا پھاڑنے والا ہے''۔

لفظی ترجمہ کے اعتبار سے یہ آیت موجودہ زمانہ میں منکرین خدا کے لیے خدا کے وجود کو ثابت کر رہی ہے۔ جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین و آسمان کا مادہ ابتداءً ایک سالم گولے کی صورت میں تھا۔ جس کو سپر ایٹم کہا جاتا ہے۔ معلوم قوانینِ فطرت کے مطابق اس کے تمام اجزاء انتہائی شدت کے ساتھ اندر کی طرف جڑے ہوئے تھے۔ موجودہ وسیع کائنات اسی سپر ایٹم میں انفجار سے وجود میں آئی۔ اس آیت میں فاطر (پھاڑنے والا) کا لفظ اسی کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ایک خالق کے وجود کا قطعی ثبوت ہے۔ کیوں کہ سپر ایٹم کے اجزاء جو مکمل طور پر اندر کی طرف کھنچے ہوئے تھے، ان کو بیرونی سمت میں متحرک کرنا اپنے آپ نہیں ہوسکتا۔ لازم ہے کہ اس کے لیے کسی خارجی مداخلت کو مانا جائے۔ اسی مداخلت کرنے والی طاقت کا دوسرا نام خدا ہے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ

۱۱۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا، ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمھارے ہی جیسے انسان ہیں مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنا انعام

وَمَا كَانَ لَنَآ اَنۡ نَّاۡتِيَكُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدۡ هَدٰٮنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيۡتُمُوۡنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ ع ۲/۱۴

فرماتا ہے اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھائیں بغیر خدا کے حکم کے۔ اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ۱۲۔ اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ اس نے ہم کو ہمارے راستے بتائے۔ اور جو تکلیف تم ہمیں دوگے ہم اس پر صبر ہی کریں گے۔ اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

پیغمبروں کے مخاطبین نے جب اپنے ہم عصر پیغمبروں کو یہ کہہ کر رد کیا کہ "تم تو ہمارے جیسے ایک بشر ہو" تو اس کی وجہ حقیقۃً یہ نہیں تھی کہ وہ پیغمبری کے لیے غیر بشر ہونے کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ دراصل وہ فرق تھا جو ان کے اپنے تصور کے مطابق ان کو پچھلے پیغمبر اور ہم عصر پیغمبر میں نظر آتا تھا۔

گزرا ہوا پیغمبر بھی اگرچہ اپنے وقت میں ویسا ہی تھا جیسا کہ ہم عصر پیغمبر۔ مگر بعد کے دور میں گزرے ہوئے پیغمبروں کے متبعین نے ان کے گرد طلسماتی قصوں کا ہالہ بنا دیا۔ بعد کے دور میں پیغمبروں کی شخصیتوں کو ایسا افسانوی رنگ دے دیا گیا جو ابتداءً ان کے یہاں موجود نہ تھا۔ اب قوموں کے سامنے ایک طرف فرضی شعبدوں والا پیغمبر تھا، دوسری طرف حقیقی واقعات والا پیغمبر۔ اس تقابل میں پچھلا پیغمبر پیغمبری کے لیے معیاری نمونہ بن گیا۔ اور جب قوموں نے اس معیار کے اعتبار سے دیکھا تو وقت کا حقیقی پیغمبر ان کو ماضی کے افسانوی پیغمبر سے کم نظر آیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

پیغمبروں نے اپنے مخاطبین سے کہا کہ تمھاری ان باتوں کے جواب میں ہمارے پاس صبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تم غیر بشریت کی سطح پر ہدایت کے طالب ہو۔ اور خدا نے ہم کو صرف بشریت کی سطح پر ہدایت دینے کی طاقت عطا کی ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں کہ تمھاری ایذاؤں کو برداشت کریں اور اس سارے معاملہ کو خدا کے حوالے کر دیں۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِرُسُلِهِمۡ لَنُخۡرِجَنَّكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِىۡ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوۡحٰۤى اِلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ لَنُهۡلِكَنَّ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسۡكِنَنَّكُمُ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَافَ مَقَامِىۡ وَخَافَ وَعِيۡدِ ﴿۱۴﴾

۱۳۔ اور انکار کرنے والوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ یا تو ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے یا تم کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ تو پیغمبروں کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ ۱۴۔ اور ان کے بعد تم کو زمین پر بسائیں گے۔ یہ اس شخص کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اور جو میری وعید سے ڈرے۔

پیغمبروں کی دعوت سے ان کی قوموں کے دین پر زد پڑتی تھی۔ وہ لوگ اپنے جن افراد کو قوم کے اکابر کا درجہ دیے ہوئے تھے، پیغمبروں کے تجزیہ میں وہ اصاغر قرار پا رہے تھے۔ اس بنا پر وہ پیغمبروں سے بگڑ گئے۔ وہ دلائل سے تو ان کو رد نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ وقت کے نظام میں ان کو ہر قسم کا اختیار حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی متکبرانہ نفسیات نے انھیں سمجھایا کہ پیغمبر کو بے گھر اور بے زمین کر دیا جائے۔ جس چیز کا توڑ ان کے پاس دلیل کی زبان میں نہ تھا، اس کا توڑ انھوں نے طاقت کے ذریعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

جو زمین آدمی کے پاس ہے، وہ اس کے پاس بطور امتحان ہے، نہ کہ بطور حق۔ اگر آدمی یہ سمجھے کہ یہ خدا کی چیز ہے جس کو اس نے امتحان کی غرض سے اس کی تحویل میں دیا ہے تو اس سے آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات پیدا ہوگی۔ وہ ڈرے گا کہ جس خدا نے دیا ہے وہ اس کو دوبارہ اس سے چھین نہ لے۔ مگر غافل لوگ اس کو اپنا ذاتی حق سمجھ لیتے ہیں۔ ان کا یہی احساس ان کو ظالم اور متکبر بنا دیتا ہے۔

پیغمبر کی دعوت جب تکمیل کے مرحلہ پر پہنچتی ہے تو یہ مخاطب قوم کے لیے مہلت امتحان ختم ہونے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ دنیا کو اپنے لیے بالکل بدلا ہوا پاتے ہیں۔ جن چیزوں کو وہ اپنی چیز سمجھ کر متکبرانہ منصوبے بنا رہے تھے وہ چیزیں اچانک ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ زمین ان سے چھین کر دوسرے لوگوں کو دے دی جائے جو ان کے مقابلہ میں اس کا زیادہ استحقاق رکھتے ہوں۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۙ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۙ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

۱۵۔ اور انھوں نے فیصلہ چاہا اور ہر سرکش، ضدی، نامراد ہوا۔ ۱۶۔ اس کے آگے دوزخ ہے اور اس کو پیپ کا پانی پینے کو ملے گا۔ ۱۷۔ وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پئے گا اور اس کو حلق سے مشکل سے اتار سکے گا۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی ہوئی ہوگی، مگر وہ کسی طرح نہیں مرے گا اور اس کے آگے سخت عذاب ہوگا۔

خدا کے نزدیک کسی آدمی کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس کو خدا کی طرف بلایا جائے اور وہ جبّار اور عنید بن کر اس کا جواب دے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں ایسا شدید عذاب کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو موت اور ہلاکت کے کنارے پائیں گے۔

جب آدمی کسی کے خلاف ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ کسی کے بل پر ایسا کرتا ہے۔ یہ مخالفین اپنے آپ کو ''اکابر'' کے دین پر سمجھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر اور اس کے ساتھی ان کو ''اصاغر'' دکھائی دیتے تھے۔ ان کی یہی نفسیات تھی جس نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ پیغمبر اور اس کے ساتھوں کے اوپر ہر قسم کے ظلم کو اپنے

لیے جائز سمجھ لیں۔ اپنے کو ''اکابر'' سے منسوب کرنے ہی کی وجہ سے وہ ''اصاغر'' کے خلاف ہر قسم کی کارروائیوں کے لیے دلیر ہو گئے۔

مَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ اَعۡمَالُهُمۡ كَرَمَادِ ِۨاشۡتَدَّتۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ يَوۡمٍ عَاصِفٍ‌ؕ لَا يَقۡدِرُوۡنَ مِمَّا كَسَبُوۡا عَلٰى شَىۡءٍ‌ؕ ذٰ لِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِيۡدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَـقِّ‌ؕ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ وَيَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِيۡدٍۙ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰ لِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيۡزٍ ﴿۲۰﴾

۱۸۔ جن لوگوں نے اپنے رب کا انکار کیا، ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جس کو ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے میں سے کچھ بھی نہ پا سکیں گے۔ یہی دور کی گمراہی ہے۔ ۱۹۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو بالکل ٹھیک پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے۔ ۲۰۔ اور یہ خدا پر کچھ بھی دشوار نہیں۔

عرب کے جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا وہ سب خدا اور مذہب کو ماننے والے لوگ تھے۔ پھر کیوں وہ آپ کے منکر بن گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی سطح پر حق اپنی مجرد صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ جب کہ وہ لوگ صرف اس چیز کو حق سمجھتے تھے جو ان کے قومی بزرگوں کے ذریعہ انھیں ملا ہو۔ انھوں نے اپنے مسلّم قومی بزرگوں کے دین کو پہچانا، مگر وہ ''محمد بن عبد اللہ'' کے دین کو پہچاننے میں ناکام رہے۔

جو لوگ قومی روایات کے زیر اثر دین کو پائیں ان کے یہاں بھی دینی مظاہر موجود ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر ان کے یہاں دین کی دھوم پائی جاتی ہے۔ تاہم یہ سب کچھ محض ظاہری دینداری ہوتی ہے، دین کی اصل حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ حقیقی دینداری ہے، نہ کہ ظاہری ہنگامے۔

خدا کو وہ انسان مطلوب ہے جس نے ذاتی شعور کی سطح پر حق کو پایا ہو۔ جس نے عالم غیب میں خدا کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے حق کو اس کی مجرد صورت میں پہچانا ہو اور اس کا ساتھ دیا ہو۔ جس کی روح خدا کے سمندر میں نہائی ہو۔ جو خدا کی محبت میں تڑپا ہو اور خدا کے خوف سے جس کی آنکھوں نے آنسو بہائے ہوں۔

پہلی قسم کے لوگوں کی دینداری اوپری دین داری ہے۔ قیامت کی آندھی اس کو اسی طرح اڑا لے جائے گی جس طرح سطح زمین کی خس و خاشاک تیز ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ اس کے برعکس، دوسری قسم کے لوگوں کا دین حقیقی دین ہے۔ وہ انسانی وجود کی آخری گہرائی تک پیوست ہوتا ہے۔ ایسے وجود کے لیے آندھی صرف اس لیے آتی ہے کہ وہ اس کی مضبوطی کو ثابت کرے، نہ کہ اس کو اکھاڑ لے جائے۔

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کی تخلیق حقائق پر ہوئی ہے۔ ایسی کائنات میں صرف حقیقی عمل کی قیمت ہو سکتی ہے، نہ کہ مفروضوں اور خوش گمانیوں کی۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٢١﴾ ع ٣ ۹ ۱۵

۲۱۔ اور خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے۔ پھر کمزور لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو بڑائی والے تھے، ہم تمھارے تابع تھے تو کیا تم اللہ کے عذاب سے کچھ ہم کو بچاؤ گے۔ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ ہم کو کوئی راہ دکھاتا تو ہم تم کو بھی ضرور وہ راہ دکھا دیتے۔ اب ہمارے لیے یکساں ہے کہ ہم بے قرار ہوں یا صبر کریں، ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

انسان، بطور واقعہ اگرچہ ہر وقت ''خدا کے سامنے'' ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو بظاہر خدا کے سامنے نہیں پاتا۔ آخرت میں یہ پردہ ہٹ جائے گا۔ اس وقت آدمی دیکھے گا کہ وہ اس طرح کامل طور پر خدا کے سامنے تھا کہ اس کی کوئی چیز خدا سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

دنیا میں جو لوگ حق کو نظر انداز کرتے ہیں ان کا سب سے بڑا سہارا ان کے مفروضہ اکابر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ مُردہ اکابر ہوں یا زندہ اکابر۔ چھوٹے جو کچھ کرتے ہیں اپنے بڑوں کے بل پر کرتے ہیں۔ آخرت میں جب یہ لوگ اپنے آپ کو بالکل بے بسی کی حالت میں پائیں گے تو وہ اپنے بڑوں سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم تمھاری رہنمائی پر اعتماد کیے ہوئے تھے، اب یہاں بھی تم ہماری کچھ رہنمائی کرو۔

اس کے جواب میں ان کے بڑے اپنے چھوٹوں سے کہیں گے کہ آج کا دن تو اسی لیے آیا ہے کہ وہ ہمارے بے رہنما ہونے کو بے نقاب کرے۔ پھر اب ہم تم کو کیا رہنمائی دے سکتے ہیں۔ ہماری رہنمائی تو محض وقتی فریب تھی جو پچھلی دنیا میں ختم ہوگئی۔ اب تو یہی ہے کہ تم بھی اپنے بھٹکنے کا نتیجہ بھگتو اور ہم بھی اپنی گمراہی کا نتیجہ بھگتیں۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، بہر حال اب ہمارا اس کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ

۲۲۔ اور جب معاملہ کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے اس کی خلاف ورزی کی۔ اور میرا تمھارے اوپر کوئی زور نہ تھا، مگر یہ کہ میں نے تم کو بلایا تو تم نے میری بات کو مان لیا، پس تم مجھ کو الزام نہ دو، اور تم اپنے آپ کو الزام دو۔ نہ میں تمھارا مددگار ہو سکتا ہوں اور نہ تم میرے مددگار ہو سکتے ہو۔ میں خود اِس سے بیزار

اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

ہوں کہ تم اس سے پہلے مجھ کو شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

خدا کی دنیا واقعات کی دنیا ہے، نہ کہ تخیلات کی دنیا۔ یہاں شیطان کے وعدے پر اٹھنا یہ ہے کہ آدمی غیر حقیقی بنیادوں پر اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہے۔

آدمی حق کے داعی کو نظر انداز کردے اور دوسرے دوسرے کارنامے دکھا کر حق کا علم بردار ہونے کا کریڈٹ لے۔ وہ آخرت کے لیے عمل نہ کرے اور خود ساختہ مفروضوں کے تحت یہ امید قائم کرلے کہ اس کی نجات ہوجائے گی۔ وہ خدا کے احکام کے مطابق زندگی نہ گزارے اور یہ یقین کرلے کہ اس کا نام اپنے آپ خدا کے محبوب بندوں میں لکھ لیا جائے گا — یہ سب شیطان کے وعدوں پر بھروسہ کرنا ہے۔ اور آخرت میں آدمی جان لے گا کہ صرف خدا کا وعدہ سچا وعدہ تھا۔ اور باقی تمام وعدے جھوٹے بھروسے تھے جو کبھی پورے ہونے والے نہیں۔

خدا کی دنیا میں غیرِ خدا سے امید قائم کرنا شرک ہے۔ اس لیے جو لوگ خدائی حقیقتوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور غیر خدائی توقعات پر اپنی زندگی کا محل کھڑا کرنا چاہتے ہیں، وہ گویا خدا کے ساتھ دوسری چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رہے ہیں۔ یہ دوسری چیزیں فیصلہ کے دن ان کا کچھ بھی سہارا نہ بن سکیں گی۔

وَ اُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے۔ اس میں ان کی ملاقات ایک دوسرے پر سلامتی ہوگی۔

ملاقات کے وقت السلام علیکم کہنا محض ایک معاشرتی رسم نہیں۔ یہ قلبی تعلق کی ایک ظاہری علامت ہے۔ دنیا کا السلام علیکم بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہی ہے اور آخرت کا السلام علیکم بھی مزید اضافہ کے ساتھ یہی۔

جو لوگ دنیا میں اس طرح رہے کہ ان کے اندر ایک دوسرے کے لیے خیر خواہی کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ جو شکایتوں کو نظر انداز کرکے ایک دوسرے سے محبت کرنا جانتے تھے۔ جو دوسرے کے لیے ہمیشہ وہ الفاظ بولتے تھے جس میں اس کا اعتراف اور احترام شامل ہو۔ جو دوسرے کے لیے وہی چیز پسند کرتے تھے جو اپنے لیے پسند کرتے تھے۔ جن کے سینے میں دوسروں کے لیے سلامتی کے چشمے ابلتے تھے اور جن کی آنکھیں دوسرے کی بھلائی کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کی نفیس دنیا میں بسائے جانے کے اہل ٹھہریں

گے۔ دنیا میں بھی ان کا یہ حال تھا کہ جب وہ اپنے بھائیوں سے ملتے تو ان کے لیے ان کی محبت اور خیر خواہی ''السلام علیکم'' کی صورت میں ٹپکتی تھی۔ آخرت میں یہی چیز اور زیادہ لطیف اور خالص بن کر اپنے جنتی پڑوسیوں کے بارے میں ان کی زبانوں سے نکلے گی۔

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِى السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤۡتِىۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍۢ بِاِذۡنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيۡثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيۡثَةِ ِاجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ مَا لَهَا مِنۡ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

۲۴۔ کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے، جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ۲۵۔ وہ ہر وقت پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ ۲۶۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک خراب درخت کی ہے، جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کوئی ثبات نہ ہو۔

موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مختلف حقیقتوں کی ظاہری تمثیلات قائم کی ہیں۔ شجرۂ طیبہ (اچھا درخت) ایک اعتبار سے مومن کی تمثیل ہے۔

درخت کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ پوری کائنات کو اپنا غذائی دستر خوان بناتا ہے اور اس طرح بیج سے ترقی کر کے ایک عظیم درخت کی صورت میں زمین کے اوپر کھڑا ہو جاتا ہے۔ درخت زمین سے پانی اور معدنیات اور نمکیات لے کر بڑھتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ہوا اور سورج سے اپنے لیے غذا حاصل کرتا ہے۔ وہ نیچے سے بھی خوراک لیتا ہے اور اوپر سے بھی۔

یہی مومن کا معاملہ بھی ہے۔ عام درخت اگر مادی درخت ہے تو مومن شعوری درخت۔ مومن ایک طرف دنیا میں خدا کی تخلیقات اور اس کے نظام کو دیکھ کر عبرت اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔ دوسری طرف ''اوپر'' سے اس کو مسلسل خدا کا فیضان پہنچتا رہتا ہے۔ وہ مخلوقات سے بھی اپنے لیے اضافۂ ایمان کی خوراک حاصل کرتا ہے اور خالق سے بھی اس کی قربت اور ملاقات برابر جاری رہتی ہے۔

درخت ہر موسم میں اپنے پھل دیتا ہے۔ اسی طرح مومن ہر موقع پر وہ صحیح رویہ ظاہر کرتا ہے جو اسے ظاہر کرنا چاہیے۔ معاشی تنگی ہو یا معاشی فراخی، خوشی کا لمحہ ہو یا غم کا۔ شکایت کی بات ہو یا تعریف کی۔ زور آوری کی حالت ہو یا بے زوری کی، ہر موقع پر اس کی زبان اور اس کا کردار وہی رد عمل ظاہر کرتا ہے جو خدا کے سچے بندے کی حیثیت سے اسے ظاہر کرنا چاہیے۔

دوسری مثال شجرۂ خبیثہ (جھاڑ جھنکاڑ) کی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات سے اس کو بالکل برعکس قسم کی خوراک مہیا کی جارہی ہے جس کے نتیجے میں اس کے اوپر کانٹے اگتے ہیں۔ اس کی شاخوں میں کڑوے اور بدمزہ پھل لگتے ہیں۔ اس کے پاس کوئی شخص جائے تو وہ بدبو سے اس کا استقبال کرتا ہے۔ ایسے درخت کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ وہ جہاں اگے وہاں سے اس کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ غیر مومن کا ہے۔ وہ زمین میں ایک غیر مطلوب وجود کی حیثیت سے اُگتا ہے۔ کائنات اپنی تمام بہترین نشانیوں کے باوجود اس کے لیے ایسی ہو جاتی ہے جیسے یہاں اس کے لیے نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی نصیحت۔ خدا کا فیضان اگرچہ ہر وقت برستا ہے مگر اس کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس کے کردار اور معاملات میں اس کا اظہار نہیں ہوتا۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙۗ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۧ ﴿۲۷﴾ ع ۴ ۱۶

۲۷۔ اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

''خدا اہل ایمان کو کلمۂ توحید کے ذریعہ دنیا میں بھی ثابت قدم رکھتا ہے اور آخرت میں بھی''— دنیا میں ثابت قدم رہنے سے مراد اپنی زندگی کے ہر موڑ پر خیر اور عمل صالح کی روش پر قائم رہنا ہے۔ آخرت میں ثابت قدم رہنے سے مراد یہ ہے کہ قبر کے سوال وجواب کے وقت وہ کامیاب رہیں گے۔

انسان ہر لمحہ حالت امتحان میں ہے۔ اس پر طرح طرح کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ احوال آتے ہیں۔ ان مواقع پر صحیح خدائی روش پر صرف وہ لوگ قائم رہتے ہیں جو اپنے اندر ''درختِ ایمان'' اگا چکے ہوں۔ وہ پیش آمدہ صورتِ حال میں اس صحیح ترین ردعمل کا ثبوت دیتے ہیں جو خدا کی مرضی کے مطابق انھیں دینا چاہیے۔ اس کے برعکس، جس آدمی کی شخصیت جھاڑ جھنکاڑ کی مانند اُگی ہو وہ ہر تجربہ میں کڑواہٹ کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ ہر موقع پر کانٹا اور بدبو ثابت ہوتا ہے۔

دونوں قسم کے انسان جب قبر کے مرحلہ میں آخری طور پر جانچے جائیں گے تو جو شجرۂ طیبہ تھا وہ شجرۂ طیبہ ثابت ہو کر جنت کے باغ میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور جو شجرۂ خبیثہ تھا اس کے ساتھ ایسا معاملہ ہوگا گویا وہ دنیا سے صرف اس لیے اکھاڑا گیا تھا کہ جہنم کا ایندھن بننے کے لیے جہنم کی آگ میں پھینک دیا جائے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ ۙ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ

۲۸۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کے بدلے کفر کیا اور جنھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں پہنچا دیا۔ ۲۹۔ جہنم، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔

اَنۡدَادًا لِّيُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعُوۡا فَاِنَّ مَصِيۡرَكُمۡ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور انھوں نے اللہ کے مقابل ٹھہرائے، تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں۔ کہو کہ چند دن فائدہ اٹھالو، آخر کار تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے۔

ان آیات کا ابتدائی خطاب قریش کے سرداروں سے ہے۔ مگر اس عمومی انطباق میں وہ تمام لیڈر شامل ہیں جو انکارِ حق کی مہم کی سرداری کرتے ہیں۔

کسی قوم کے بڑے وہی لوگ بنتے ہیں جن کو خصوصی نعمتیں اور مواقع حاصل ہوں۔ ان نعمتوں اور مواقع کا صحیح ترین استعمال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے حق کی دعوت اٹھے تو وہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ اس کی جانب کھڑے ہوں اور اس کی پوری مدد کریں۔ جو چیزیں خدا کی دی ہوئی ہیں ان پر سب سے زیادہ حق خدا کا ہے، نہ کہ کسی اور کا۔

مگر اکثر حالات میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ حق کو قبول نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف اٹھنے والی تحریک کی قیادت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے سے باہر اٹھنے والے حق کو قبول کرنا گویا اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں چھوٹا کرنا ہے۔ اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس پر راضی ہو جائیں جن کو کسی وجہ سے ماحول میں بڑائی کا درجہ مل گیا ہو۔

انسان کو ایک خدا چاہیے۔ ایک ایسی ہستی جسے وہ اپنی زندگی میں سب سے بڑا مقام دے سکے۔ چنانچہ جب بھی کوئی شخص لوگوں کی توجہ خدائے واحد سے ہٹاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی توجہ کسی غیر خدا کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ خدا کو چھوڑنا ہمیشہ غیر خدا کو اپنا خدا بنانے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ خدا سے لوگوں کو ہٹانے والے کسی غیر خدا میں فرضی طور پر وہ اعلیٰ صفات ثابت کرتے ہیں جو صرف خدا میں پائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ جب تک غیر خدا میں وہ اعلیٰ صفات ثابت نہ کی جائیں لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب ایک خدا کی پرستش چھوڑتا ہے تو وہ اس کے بعد لازمی طور پر توہم پرستی میں پڑ جاتا ہے۔ خدا کو چھوڑنے کا واحد بدل اس دنیا میں توہم پرستی ہے۔

قُلۡ لِّعِبَادِیَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِیَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ میرے جو بندے ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ وہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کریں، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی۔

آدمی کے اوپر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کے کچھ ساتھی ہیں تو وہ ساتھیوں کا زور استعمال کرتا ہے۔ اور اگر دولت ہے تو دولت کو اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اپنے کو بچانے کی تڑپ آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں کی طرف دوڑے۔

نماز اور انفاق حقیقۃً مسئلہ آخرت کے بارے میں آدمی کے اسی احساس کا دنیوی اظہار ہیں۔ نماز گویا آخرت کی ہولناکی کو یاد کر کے خدا کی پناہ کی طرف بھاگنا ہے تاکہ اس کی مدد سے وہ اپنے آپ کو بچائے۔ اسی طرح دنیا میں کھلے اور چھپے خرچ کرنا گویا اپنی کمائی کو آخرت کی مد میں دینا ہے تاکہ وہ آخرت کی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذریعہ بنے۔

آخرت میں وہی آدمی سہارا پائے گا جس نے دنیا میں خدا کا سہارا پکڑا ہو۔ آخرت میں وہی آدمی چھٹکارا حاصل کرے گا جس نے دنیا میں اس کی خاطر اپنے دائیں بائیں خرچ کیا ہو۔ جو لوگ دنیا میں ایسا نہ کر سکیں وہ آخرت میں سہارا کے لیے دوڑیں گے مگر وہاں وہ کوئی سہارا نہ پائیں گے۔ وہ آخرت میں خرچ کرنا چاہیں گے مگر ان کے پاس کچھ نہ ہوگا جس کو فدیہ دے کر وہ وہاں کی مصیبتوں سے نجات حاصل کریں۔

اَللّٰهُ الَّذِيۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الۡفُلۡكَ لِتَجۡرِيَ فِي الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الۡاَنۡهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ دَآئِبَيۡنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡهُ ؕ وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ ع ۵ ۱۷

۳۲۔ اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے مختلف پھل نکالے تمھاری روزی کے لیے اور کشتی کو تمھارے لیے مسخر کر دیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور اس نے دریاؤں کو تمھارے لیے مسخر کیا۔ ۳۳۔ اور اس نے سورج اور چاند کو تمھارے لیے مسخر کر دیا کہ وہ برابر چلے جارہے ہیں اور اس نے رات اور دن کو تمھارے لیے مسخر کر دیا۔ ۳۴۔ اور اس نے تم کو ہر چیز میں سے دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے۔ بے شک انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔

موجودہ دنیا انتہائی حیرت ناک حد تک خدا کی گواہی دے رہی ہے۔ وسیع خلا میں ستاروں اور سیاروں کی گردش، پانی کے ذریعہ زمین پر زندگی اور رزق کی فراہمی، خشکی وتری اور فضا پر انسان کو یہ قدرت ہونا کہ ان میں وہ اپنی سواریاں دوڑائے، دریاؤں اور پہاڑوں کے ذریعے زمین کا انسان کے موافق ہو جانا سورج اور چاند کے ذریعہ موسموں کا اور رات دن کا انتظام، سب کچھ اس سے زیادہ عظیم ہے کہ ان کو لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ انسان اور

کائنات میں اتنی کامل مطابقت ہے کہ انسان کی ہر قابل قیاس یا ناقابل قیاس ضرورت پیشگی طور پر یہاں بافراط موجود ہے۔

یہ تمام چیزیں اتنی زیادہ عجیب ہیں کہ آدمی کو ہلادیں اور اس کو عبدیت کے جذبے سے سرشار کردیں۔ اس کے باوجود ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کائنات کو دیکھ کر آدمی کے اندر استعجاب کی کیفیت پیدا ہو۔ خالق کائنات کے تصور سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی پیدا ہوتے ہی کائنات کو دیکھتا ہے، دیکھتے دیکھتے وہ اس کو ایک عام چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس میں اسے کوئی انوکھا پن نظر نہیں آتا۔

مزید یہ کہ اس دنیا میں آدمی کو جب کوئی چیز ملتی ہے تو وہ بظاہر اس کو اسباب کے تحت ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس بنا پر وہ سمجھ لیتا ہے کہ جو چیز اس کو ملی ہے وہ اس کی اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کے اندر دینے والے خدا کے لیے شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

انسان کی یہی وہ غفلت ہے جس کو یہاں بے انصافی اور ناشکر گزاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿٣٥﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٦﴾

۳۵۔ اور جب ابراہیم نے کہا، اے میرے رب، اس شہر کو امن والا بنا۔ اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ ۳۶۔ اے میرے رب، ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کردیا۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے۔ اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو تو بخشنے والا، مہربان ہے۔

حضرت ابراہیم کے زمانہ تک ملکوں اور قوموں کا یہ حال ہو چکا تھا کہ ہر طرف شرک کا دور دورہ تھا۔ سورج چاند اور دوسرے مظاہر فطرت انسان کی پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ قدیم زمانہ میں زندگی کی تمام سرگرمیوں پر شرک کا اس طرح غلبہ ہوا کہ انسانی نسلوں میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔ بظاہر یہ ناممکن نظر آنے لگا کہ لوگوں کو شرک کی فضا سے نکال کر توحید کے دائرے میں لایا جاسکے۔ اس وقت خدا کے حکم خاص کے تحت حضرت ابراہیم عراق سے نکل کر عرب کے صحرا میں آئے جو تمدن سے دور بالکل غیر آباد علاقہ تھا۔ آپ نے الگ تھلگ ماحول میں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بچہ اسماعیل کو بسایا۔ تاکہ یہاں وقت کے مشرکانہ تسلسل سے کٹ کر ایک نئی نسل تیار ہو۔ جو آزادانہ فضا میں پرورش پاکر اپنی فطرت صحیحہ پر قائم ہوسکے — حضرت ابراہیم کا کلام دعا کے انداز میں اسی خاص حقیقت کو ظاہر کررہا ہے۔

بنواسماعیل کو خشک اور غیر آباد بیابان میں بسانے سے خدا کا منصوبہ یہی تھا۔ اب یہاں کے جن لوگوں نے

توحید کو اپنے دل کی آواز بنایا وہ گویا باغ ابراہیم کی صحیح پیداوار تھے۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے دوبارہ شرک کا طریقہ اختیار کرلیا وہ اس باغ کی ناقص پیداوار قرار پائیں گے۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک بے کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما، تاکہ وہ شکر کریں۔

قدیم مکہ جہاں بنو اسماعیل بسائے گئے وہاں کی پہاڑی اور صحرائی دنیا گویا خدا کی معرفت کی قدرتی تربیت گاہ تھی۔ دوسری طرف وہاں انسانی تعمیرات کے اعتبار سے واحد قابل لحاظ نشان کعبۃ اللہ تھا۔ ایک طرف فطرت کا ماحول انسان کے اندر خدا کی یاد ابھارنے والا تھا۔ اس کے بعد اپنے قریب اس کو جو نمایاں چیز نظر آتی تھی وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی بنائی ہوئی پتھروں کی مسجد تھی جس میں داخل ہو کر وہ خدا کی یاد میں مشغول ہو جائے۔

پھر اس ماحول میں بنو اسماعیل کو معجزاتی طور پر زمزم کے ذریعہ پانی مہیا کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ان کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ ایسی پیداوار سے ان کو رزق ملے جو ان کے قدموں کے نیچے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ گویا ان کو شاکر بنانے کا خصوصی اہتمام تھا۔ غیر معمولی نعمت سے آدمی کے اندر شکر کا غیر معمولی جذبہ ابھرتا ہے۔ اور یہی وہ حکمت ہے جو حضرت ابراہیم کی اس دعا میں چھپی ہوئی تھی کہ صحرا میں انھیں پھلوں کی روزی دے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿۳۸﴾ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع ۶ ۱۸

۳۸۔ اے ہمارے رب، تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں۔ اور اللہ سے کوئی چیز مخفی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ ۳۹۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق دئے۔ بے شک میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔ ۴۰۔ اے میرے رب، مجھے نماز قائم کرنے والا بنا، اور میری اولاد میں بھی۔ اے میرے رب، میری دعا قبول کر۔ ۴۱۔ اے ہمارے رب، مجھے معاف فرما اور میرے والدین کو اور مومنین کو، اس روز جب کہ حساب قائم ہوگا۔

حضرت ابراہیم کی اس دعا میں وہ تمام جذبات جھلک رہے ہیں جو ایک سچے بندے کے اندر خدا کو پکارتے ہوئے امنڈتے ہیں۔ اس کی عبدیت زور کرتی ہے کہ وہ خدا کے سامنے اپنے عجز کا اقرار کرے۔ جو کچھ مانگے احتیاج کی بنیاد پر مانگے، نہ کہ استحقاق کی بنیاد پر۔ ایک طرف وہ ملی ہوئی نعمتوں کا اعتراف کرے اور دوسری طرف ادب کے تمام تقاضوں کے ساتھ اپنی درخواست پیش کرے۔ وہ اقرار کرے کہ خدا دینے والا ہے اور انسان پانے والا۔

وہ اپنے رب سے یہ توفیق مانگے کہ وہ دنیا میں اس کا پرستار بن کر رہے۔ اسی کی درخواست وہ اپنے لیے بھی کرے اور اپنے اہل خاندان کے لیے بھی اور اسی کی درخواست تمام مومنین کے لیے بھی۔ دعا کے وقت اس کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ ہو وہ دنیا کا نہ ہو بلکہ آخرت کا ہو جہاں ابدی طور پر آدمی کو رہنا ہے۔

ان آداب کے ساتھ جو دعا کی جائے وہ پیغمبرانہ دعا ہے اور ایسی دعا اگر سچے دل سے نکلے تو وہ ضرور خدا کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ﴿۴۳﴾

۴۲۔ اور ہرگز مت خیال کرو کہ اللہ اس سے بے خبر ہے جو ظالم لوگ کر رہے ہیں۔ وہ ان کو اس دن کے لیے ڈھیل دے رہا ہے جس دن آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ ۴۳۔ وہ سر اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے۔ ان کی نظر ان کی طرف ہٹ کر نہ آئے گی اور ان کے دل بدحواس ہوں گے۔

آدمی کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کا مخالف بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں ایسی بے خوفی کا مظاہرہ کرتا ہے جیسے کہ اس سے زیادہ بہادر دنیا میں اور کوئی نہیں۔

مگر یہی حق جو موجودہ دنیا میں ''داعی'' کی سطح پر ظاہر ہوتا ہے وہ آخرت میں ''خدا'' کی سطح پر ظاہر ہوگا۔ اس دن ایسے لوگوں کی ساری بہادری جاتی رہے گی۔ آخرت کا ہولناک منظر دیکھ کر ان کا یہ حال ہوگا کہ جب ان کی نگاہیں اٹھیں گی تو وہ اٹھی کی اٹھی رہ جائیں گی، پلک جھپکنے کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ وہ سر اٹھائے ہوئے تیزی سے میدان حشر کی طرف بھاگ رہے ہوں گے۔ اور ان کے دل دہشت کی وجہ سے اڑ رہے ہوں گے۔

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ

۴۴۔ اور لوگوں کو اس دن سے ڈرا دو جس دن ان پر عذاب آجائے گا۔ اس وقت ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہم کو تھوڑی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کرلیں گے اور رسولوں کی

الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ
مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾ وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ
فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَ قَدْ
مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ
كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

پیروی کریں گے۔ کیا تم نے اس سے پہلے قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم پر کچھ زوال آنا نہیں ہے۔ ۴۵۔ اور تم ان لوگوں کی بستیوں میں آباد تھے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اور تم پر کھل چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور ہم نے تم سے مثالیں بیان کیں۔ ۴۶۔ اور انھوں نے اپنی ساری تدبیریں کیں اور ان کی تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں۔ اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔

آدمی کا حال یہ ہے کہ ایک دن پہلے تک بھی وہ اپنے انجام کا احساس نہیں کرتا۔ اس کو اگر کوئی قوت یا حیثیت حاصل ہو تو وہ اس طرح اکڑتا ہے گویا کہ اس کی حیثیت کبھی اس سے چھننے والی نہیں۔ وہ خدا کی دعوت کو ٹھکراتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ وہ جن چیزوں کے بل پر اس کو ٹھکرا رہا ہے وہ سب خدا ہی کی دی ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے دلائل آتے ہیں مگر وہ ان پر دھیان نہیں دیتا۔ ماضی کے سرکشوں کا انجام اس کے سامنے ہوتا ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لیے تھا۔ خود اس کے اپنے لیے کبھی ایسا ہونے والا نہیں۔

موجودہ دنیا میں جن لوگوں کو مواقع حاصل ہیں وہ حق کو نظر انداز کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر موت کے بعد جب وہ اپنی سرکشی کا انجام دیکھیں گے تو ان کو اپنے ماضی پر اس قدر شرم آئے گی کہ وہ چاہیں گے کہ اگر انھیں دوبارہ مہلت ملے تو وہ موجودہ دنیا میں آکر خود اپنی تردید کریں اور اس چیز کو مان لیں جس کا اس سے پہلے انھوں نے فخریہ طور پر انکار کردیا تھا۔

حق کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔ جس حق کے ساتھ خدا ہو اس کی مخالفت کرنے والے ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، خواہ وہ اس کے خلاف اتنی بڑی تیاریوں کے ساتھ آئے ہوں جو پہاڑ کو ہلانے کے لیے بھی کافی ثابت ہو۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ﴿۴۷﴾ يَوْمَ تُبَدَّلُ
الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا
لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَ تَرَى الْمُجْرِمِيْنَ

۴۷۔ پس تم اللہ کو اپنے پیغمبروں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھو۔ بے شک اللہ زبردست ہے، بدلہ لینے والا ہے۔ ۴۸۔ جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی۔ اور سب ایک زبردست اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔

يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿۴۹﴾
سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ
النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا
كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هَٰذَا
بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا
أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو
الْأَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۱ ۱۹

۴۹۔ اور تم اس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھو گے۔ ۵۰۔ ان کے لباس تار کول کے ہوں گے۔ اور ان کے چہروں پر آگ چھائی ہوئی ہوگی۔ ۵۱۔ تاکہ اللہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دے۔ بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ ۵۲۔ یہ لوگوں کے لیے ایک اعلان ہے اور تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ ڈرا دیے جائیں۔ اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہی ایک معبود ہے اور تاکہ دانش مند لوگ نصیحت حاصل کریں۔

پیغمبر خدا کے دین کی گواہی اپنی کامل صورت میں دیتا ہے۔ اس لیے پیغمبر کے ساتھ خدا کی نصرت بھی اپنی کامل صورت میں آتی ہے۔ بعد کے پیرو جتنا جتنا پیغمبر کے نمونہ پر پورے اتریں گے اتنا اتنا وہ خدا کی نصرت کے مستحق ہوتے چلے جائیں گے۔

آج انسان زمین پر ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ خشکی اور تری کا مالک ہو۔ وہ فضاؤں اور خلاؤں کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ وہ اختیار رکھتا ہے کہ یہاں کے وسائل کو جس طرح چاہے استعمال کرے اور جس طرح چاہے استعمال نہ کرے۔ مگر یہ سب کچھ صرف اس لیے ہے کہ خدا نے امتحان کی مدت تک زمین وآسمان کو انسان کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی حالات یکسر بدل جائیں گے۔ اس کے بعد زمین بھی دوسری زمین ہوگی اور آسمان بھی دوسرا آسمان۔ انسان اچانک اپنے کو ایک اور ہی دنیا میں پائے گا۔

جہاں آدمی اپنے کو حکمراں سمجھتا تھا وہاں ساری حکومت صرف خدا کے لیے ہو چکی ہوگی۔ جہاں ہر چیز اس کے حکم کے تابع تھی وہاں ہر چیز اس کی تابع داری کرنا چھوڑ دے گی۔ موجودہ دنیا میں جو لوگ بڑے بنے ہوئے تھے وہ اس دن بے بس مجرم کے روپ میں نظر آئیں گے۔ جو لباس آج جسم کو زینت دیتا ہے وہ اس دن ایسا ہو جائے گا جیسے جسم کے اوپر تار کول پھیر دی گئی ہو۔ پُر رونق چہرے اس دن آگ میں جھلسے ہوئے ہوں گے۔ اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جو دنیا میں خدا کا بندہ بن کر رہنے پر راضی نہ ہوئے۔ جنھوں نے خدا کی طرف سے ہونے والے اعلان کو نظر انداز کیا۔

حقیقت کا حقیقت ہونا کافی نہیں ہے کہ آدمی اس کو مان لے۔ حقیقت کو ماننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خود بھی اس کو ماننا چاہے۔ جو شخص حقیقت کے معاملہ میں سنجیدہ ہو، جو خالی الذہن ہو کر اس کو سنے وہی حقیقت کو سمجھے گا، وہی حقیقت کا صحیح استقبال کرنے میں کامیاب ہوگا۔

۱۵۔ سُوْرَۃُ الْحِجْر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
الٓرٰ قف تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ①
رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا
مُسْلِمِیْنَ ② ذَرْھُمْ یَاْکُلُوْا وَ یَتَمَتَّعُوْا وَ
یُلْھِھِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ③ وَ مَآ
اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا وَ لَھَا کِتَابٌ
مَّعْلُوْمٌ ④ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّۃٍ اَجَلَھَا وَ مَا
یَسْتَاْخِرُوْنَ ⑤

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ الرٰ۔ یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور ایک واضح قرآن کی۔ ☆ ۲۔ وہ وقت آئے گا جب انکار کرنے والے لوگ تمنا کریں گے کہ کاش وہ ماننے والے بنے ہوتے۔ ۳۔ ان کو چھوڑو کہ وہ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور خیالی امید ان کو بُھلاوے میں ڈالے رکھے، پس آئندہ وہ جان لیں گے۔ ۴۔ اور ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کا ایک مقرر وقت لکھا ہوا تھا۔ ۵۔ کوئی قوم نہ اپنے مقرر وقت سے آگے بڑھتی اور نہ پیچھے ہٹتی ہے۔

دنیا میں انسان کو جو آزادی ملی ہوئی ہے وہ صرف امتحان کی مدّت تک کے لیے ہے۔ یہ ایک بہت نازک صورت حال ہے۔ اگر آدمی واقعی طور پر اس کو سوچے تو وہ ایسا محسوس کرے گا کہ جو مدت کل ختم ہونے والی ہے وہ گویا آج ختم ہو چکی ہے۔ یہ خیال اس کو ہلا کر رکھ دے گا۔ مگر آدمی صرف ''آج'' میں جیتا ہے، وہ ''کل'' پر دھیان نہیں دیتا۔ اس کے سامنے حقیقت کھولی جاتی ہے مگر وہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ خود ساختہ طور پر کچھ فرضی سہارے تلاش کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سہارے فیصلہ کے وقت اس کے کام آئیں گے۔

مگر غفلت اور خوش گمانی کا طلسم اس وقت ٹوٹ جاتا ہے جب مدت ختم ہوتی ہے اور خدا کے فرشتے اس کے پاس آجاتے ہیں تا کہ اس کو امتحان کی دنیا سے نکال کر انجام کی دنیا میں پہنچا دیں۔

اس وقت اس کو وہ مواقع یاد آنے لگتے ہیں جب کہ اس نے ایک سچی دلیل کو جھوٹے الفاظ کے ذریعہ رد کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب اس نے ضمیر کی آواز کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کی تھی۔ جب اس نے خدا کے داعی میں خدا کی جھلکیاں پانے کے باوجود ذاتی پندار کی خاطر اس کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جب وہ دیکھے گا کہ میری کوئی تدبیر میرے کام نہیں آئی تو وہ کہے گا کہ کاش میں نے وہ نہ کیا ہوتا جو میں نے کیا۔ کاش میں ''منکر'' کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے ''مسلم'' کا طریقہ اختیار کرتا۔

وَقَالُوْا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ اِنَّکَ
لَمَجْنُوْنٌ ⑥ ط لَوْ مَا تَاْتِیْنَا بِالْمَلٰٓئِکَۃِ اِنْ کُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ⑦ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ اِلَّا
بِالْحَقِّ وَمَا کَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ ⑧

۶۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر نصیحت اتری ہے تو بے شک دیوانہ ہے۔ ۷۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا۔ ۸۔ ہم فرشتوں کو صرف فیصلہ کے لیے اتارتے ہیں اور اس وقت لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی۔

پیغمبر کے مخاطبین نے پیغمبر کے اوپر دیوانگی کا شبہ کیا۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ پیغمبر کی دعوت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ "میں خدا کا نمائندہ ہوں۔ جو شخص میری بات مانے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو شخص نہیں مانے گا وہ ناکام ہوکر رہ جائے گا"۔ مگر یہ مخاطبین عملاً جو کچھ دیکھ رہے تھے وہ اس کے برعکس تھا۔ ان کا اپنا یہ حال تھا کہ ان کو رائج الوقت نظام میں سرداری اور پیشوائی کا مقام حاصل تھا۔ دوسری طرف پیغمبر ایک غیر رواجی دین کا داعی ہونے کی وجہ سے مروجہ نظام میں بے حیثیت اور اجنبی بنا ہوا تھا۔ اس فرق کی بنا پر مخاطبین کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ تم ہم کو دیوانہ معلوم ہوتے ہو۔ ہر قسم کی دنیوی خوبیاں تو خدا نے ہم کو دے رکھی ہیں اور تم کہتے ہو کہ کامیابی تمھارے لیے ہے اور تمھارا ساتھ دینے والوں کے لیے۔ مگر یہ ان کے زاویۂ نظر کا فرق تھا۔ وہ اپنی چیزوں کو "انعام" کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ حالاں کہ یہ تمام چیزیں صرف "آزمائش" کا سامان ہیں جو موجودہ دنیا میں کسی کو وقتی طور پر دی جاتی ہیں۔

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ تمھارے دعوے کے مطابق تمھارے پاس خدا کے فرشتے آتے ہیں تو یہ فرشتے ہمیں کیوں نہیں دکھائی دیتے۔ یہ بھی زاویۂ نظر کے فرق کی بنا پر تھا۔ پیغمبر کے پاس جو فرشتہ آتا ہے وہ وحی کا فرشتہ ہوتا ہے جو خدا کا کلام پیغمبر تک پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ خدا کے وہ فرشتے بھی ہیں جو اس لیے آتے ہیں کہ وہ حقیقت کو لوگوں کے سامنے بےنقاب کردیں۔ مگر وہ دعوت کی تکمیل کے بعد آتے ہیں اور جب وہ آتے ہیں تو یہ فیصلہ کرنے کا وقت ہوتا ہے، نہ کہ ایمان کی طرف بلانے کا۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾	۹۔ بے شک یہ یاددہانی (کتاب) ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

قرآن کو خدا نے اتارا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے — نزولِ قرآن کے وقت اس ارشاد کا براہِ راست خطاب قریش سے تھا۔ مگر وسیع تر معنوں میں یہ پوری انسانیت کے لیے ایک چیلنج تھا۔ اس طرح ساتویں صدی عیسوی سے لے کر قیامت تک کے انسانوں کے سامنے ایک ایسا قطعی معیار رکھ دیا گیا جس کے اوپر جانچ کر وہ دیکھ سکیں کہ قرآن واقعی خدا کی کتاب ہے یا نہیں۔

جس وقت یہ چیلنج دیا گیا اس وقت تمام ظاہری امکانات اس کے سراسر خلاف تھے۔ کسی نزاعی کتاب کو مستقل طور پر محفوظ رکھنے کے لیے طاقت ور جماعت درکار ہے۔ اور نزولِ قرآن کے وقت اس کے حاملین اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں بالکل کمزور حیثیت رکھتے تھے۔ کاغذ اور پریس کا دور ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا جس نے موجودہ زمانہ میں کسی کتاب کی حفاظت کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ کتاب جیسی ایک چیز کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کی زبان کو محفوظ رکھنا بھی لازمی طور پر ضروری تھا، جب کہ تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی زبان کبھی مستقل طور پر باقی نہیں رہتی۔ قرآن موجودہ سائنسی دور سے بہت پہلے روایتی دور میں آیا۔ ایسی حالت میں اس کے زندہ اور محفوظ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے مضامین ابدی جانچ میں پورے اتریں۔

ان تمام چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے قرآن پوری طرح محفوظ رہا۔ اور آج بھی وہ پوری طرح محفوظ ہے۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں تیار کی جانے والی کوئی بھی کتاب اس طرح زندہ اور محفوظ نہیں جس طرح قرآن آج زندہ اور محفوظ ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب: عظمتِ قرآن)

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ شِیَعِ
الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا کَانُوۡا
بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۱۱﴾ کَذٰلِکَ نَسۡلُکُہٗ فِیۡ قُلُوۡبِ
الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۲﴾ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ قَدۡ خَلَتۡ سُنَّۃُ
الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَوۡ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَظَلُّوۡا فِیۡہِ یَعۡرُجُوۡنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوۡۤا اِنَّمَا سُکِّرَتۡ
اَبۡصَارُنَا بَلۡ نَحۡنُ قَوۡمٌ مَّسۡحُوۡرُوۡنَ ﴿۱۵﴾ ع ۱۵ ۱

۱۰۔ اور ہم تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔ ۱۱۔ اور جو رسول بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا استہزاء کرتے رہے۔ ۱۲۔ اسی طرح ہم یہ (استہزاء) مجرمین کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ ۱۳۔ وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یہ دستور اگلوں سے ہوتا آیا ہے۔ ۱۴۔ اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے جس پر وہ چڑھنے لگتے۔ ۱۵۔ تب بھی وہ کہہ دیتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

ہر دور میں خدا کے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے بطور خود جو فرضی معیار کسی کو نمائندۂ خدا قرار دینے کے لیے بنا رکھے تھے، اس پر ان کے پیغمبر پورے نہیں اترتے تھے، اس معیار کے اعتبار سے پیغمبر انھیں کم تر نظر آتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے پیغمبروں کو استہزاء کا موضوع بنا لیا۔

کسی نئی حقیقت کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے اور خالص واقعات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے لیے تیار ہو۔ جو لوگ سچائی کا انکار کرتے ہیں وہ اکثر اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ سچائی ان کو اپنے مانوس معیار کے اعتبار سے اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مانوس معیار لمبے عرصے کے بعد ان کے دل میں ایسا رچ بس جاتا ہے کہ اس سے باہر نکل کر سوچنا ان کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ آخر وقت تک بھی اپنے مانوس دائرے سے باہر کی سچائی کو پہچان نہیں پاتے۔

قوموں کے اسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ معجزے کو دیکھ کر بھی لوگ ایمان نہیں لائے۔ جس شخصیت کے بارے میں ان کے مادی حالات کی بنا پر ان کا یہ ذہن بن گیا تھا کہ یہ ایک معمولی آدمی ہے وہ پھر بھی ان کی نظر میں معمولی ہی رہا۔ بعد کو اگر اس نے کوئی خارقِ عادت چیز دکھائی تو چونکہ دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے وہ بظاہر اب بھی ان کے لیے غیر اہم تھی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی جادو یا نظر بندی ہے، نہ کہ حقیقۃً ان کے نمائندۂ خدا ہونے کا ثبوت۔

وَ لَقَدۡ جَعَلۡنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ زَیَّنّٰہَا

۱۶۔ اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لیے اسے رونق دی۔ ۱۷۔ اور اس کو ہر

لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

شیطان مردود سے محفوظ کیا۔ ۱۸۔ اگر کوئی چوری چھپے سننے کے لیے کان لگاتا ہے تو ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

کائنات میں بے شمار ستارے پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر یہ ستارے مجموعوں کی صورت میں ہیں۔ ہر ایک مجموعہ کو ایک کہکشاں کہا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بروج سے مراد یہ کہکشائیں ہوں۔

وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ میں سادہ طور پر صرف ''زینت'' مراد نہیں ہے بلکہ آسمان کا وہ حیران کن منظر مراد ہے جو رات کے وقت اس کا ہوتا ہے۔ رات کو جب بادل اور گرد و غبار نہ ہوں، کھلے میدان میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف نظر ڈالیں تو وسیع آسمان میں جگمگاتے ہوئے ستاروں کا منظر اتنا حیران کن حد تک شاندار ہوتا ہے کہ آدمی اس کو دیکھ کر خدا کی عظمت وجلال کے احساس میں ڈوب جائے۔

پچھلے تقریباً چار سو سال کے درمیان فلکیات کے میدان میں جو دریافتیں ہوئی ہیں، اس سے بھی ''زینت'' کی توجیہ ہوتی ہے۔ جدید فلکیاتی مطالعے کے بعد انسان اس حقیقت کو ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ کائنات میں کمال درجے کی معنویت پائی جاتی ہے۔ کائنات ویل پلانڈ (well-planned) کائنات ہے، کائنات ایک ویل منیجڈ (well-managed) کائنات ہے، کائنات ایک ویل ڈیزائنڈ (well-designed) کائنات ہے، کائنات ایک ویل ڈسپلنڈ (well-disciplined) کائنات ہے۔ اس دریافت سے انسان کے اندر ایک تحیر کا احساس (sense of awe) پیدا ہوجاتا ہے۔ اب سائنسداں عام طور پر یہ مانتے ہیں کہ کائنات ایک انٹلجنٹ کائنات (intelligent universe) ہے۔

جو لوگ پیغمبر سے کہتے تھے کہ آسمان سے فرشتہ اترتا ہوا ہمیں دکھاؤ ان سے کہا گیا کہ تاروں بھرے آسمان کا وہ منظر جو ہر روز تمھارے سامنے کھولا جاتا ہے کیا وہ تمھارے شعور کو جگانے اور تمھارے دلوں کو پگھلانے کے لیے کم ہے کہ تم دوسرے معجزات کا تقاضا کرتے ہو۔

زمین پر انسان کے ساتھ شیطان بھی بسائے گئے ہیں۔ یہاں شیاطین کو پوری آزادی ہے کہ وہ جدھر چاہیں جائیں اور جس طرح چاہیں لوگوں کو بہکائیں، مگر زمین سے ماوراء جو خدا کی دنیا ہے اس میں شیاطین کی پرواز کے لیے ناقابل عبور رکاوٹیں قائم کردی گئی ہیں۔ وہ ایک خاص حد سے آگے اس کے اندر داخل نہیں ہو پاتے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾

۱۹۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس پر ہم نے پہاڑ رکھ دئے اور اس میں ہر چیز ایک اندازے سے اگائی۔ ۲۰۔ اور ہم نے تمھارے لیے اس میں معیشت کے اسباب بنائے اور وہ چیزیں جن کو تم روزی نہیں دیتے۔

جغرافی مطالعہ بتاتا ہے کہ زمین ابتداءً خشک گولے کی صورت میں تھی پھر وہ پھٹی جس کی وجہ سے سمندر کی گہرائیاں پیدا ہوئیں اور ان میں پانی جمع ہو گیا۔ ان گہرائیوں کو متوازن رکھنے کے لیے زمین پر جگہ جگہ اونچے پہاڑ ابھر آئے۔ اس کے بعد زمین پر نباتات اور حیوانات وجود میں آئے اور خوب پھیلے۔ ان میں سے ہر ایک کے اندر بڑھنے کی لامحدود صلاحیت ہے، مگر ان کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کا ایک اندازہ مقرر ہے۔ ہر چیز بڑھتے بڑھتے ایک خاص حد پر رک جاتی ہے، وہ اس سے آگے نہیں جانے پاتی۔

مثلاً پودوں اور درختوں میں اپنی نسل بڑھانے کی اتنی زیادہ استعداد ہے کہ اگر کسی ایک پودے کو اس کی اندرونی استعداد کے اعتبار سے بلا روک ٹوک بڑھنے دیا جائے تو چند سال کے اندر ساری سطح زمین پر ہر طرف بس وہی پودا نظر آئے گا۔ کسی دوسری چیز کے لیے یہاں کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زبردست ناظم ہے جو ہر ایک پر کنٹرول قائم کیے ہوئے ہے۔ یہی معاملہ حیوانات کا ہے۔ ان کے اندر بھی افزائش نسل کی لامحدود صلاحیت ہے۔ مگر ہر ایک کی تعداد ایک حد پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اسی طرح حیوانات میں اپنی جسامت بڑھانے کی استعداد اتنی زیادہ ہے کہ ایک پتنگے کو بڑھنے دیا جائے تو وہ ہاتھی کے برابر ہو جائے۔ مگر قدرتی کنٹرول ایک خاص حد پر اس کی جسامت کو روک دیتا ہے۔ اگر چیزیں اپنی حد پر نہ رکیں تو زمین پر انسان کی رہائش ناممکن ہو جائے گی۔

انسان کو اپنی معیشت اور تمدن کے لیے بے شمار چیزیں درکار ہیں۔ یہ ساری چیزیں عین ہماری ضرورت کے مطابق زمین پر مہیا کر دی گئی ہیں۔ ان تمام چیزوں کی فراہمی اور ہر ایک کی بقا کا انتظام خدا کی طرف سے ہے۔ اگر ہم کو ان کے لیے رزق کا انتظام کرنا ہو تو ہمارے لیے ان کا حصول ناممکن ہو جائے۔

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىٕنُهٗ ٘ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

۲۱۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور ہم اس کو ایک متعین اندازے کے ساتھ ہی اتارتے ہیں۔ ۲۲۔ اور ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں۔ پھر ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے تم کو سیراب کرتے ہیں۔ اور تمھارے بس میں نہ تھا کہ تم اس کا ذخیرہ جمع کر کے رکھتے۔

حد بندی کا اصول کائنات کی تمام چیزوں میں رائج ہے۔ ہوا ایک حد کے اندر چلتی ہے، حالانکہ خدا کبھی کبھی دکھاتا ہے کہ وہ آندھی بھی بن سکتی ہے۔ سورج ایک خاص فاصلہ پر ہے۔ اگر وہ اس سے اوپر چلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے۔ سورج نیچے آجائے تو زمین جلتی ہوئی بھٹی بن جائے۔ زمین کی کشش نہایت موزوں

مقدار میں ہے۔ اگر زمین کی جسامت دگنا ہوتی تو اس کی کشش اتنی بڑھ جاتی کہ بوجھ کی وجہ سے آدمی کے لیے زمین پر چلنا مشکل ہوتا۔ اور اگر زمین کی جسامت موجودہ جسامت سے نصف کے بقدر کم ہوتی تو اس کی کشش اتنی گھٹ جاتی کہ آدمی اور اس کے مکانات ہلکے پن کی وجہ سے زمین پر ٹھہر نہ سکتے۔ یہی حال ان تمام چیزوں کا ہے جن کے درمیان انسان رہتا ہے۔ ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے وہ نہ اس سے گھٹتا ہے اور نہ اس سے بڑھتا ہے۔

زمین پر انسان اور تمام جانداروں کی زندگی کا انحصار پانی پر ہے۔ زیرِ زمین پانی کے ذخیروں سے لے کر فضائی بادلوں تک پانی کی فراہمی کا نظام اتنے عجیب اور اتنے عظیم پیمانے پر ہے جس کا قائم کرنا ہر گز انسان کے بس میں نہیں۔ اس عجیب اور عظیم انتظام کو خدا مسلسل عین انسانی ضرورت کے مطابق قائم کیے ہوئے ہے۔

انسان ایک بے حد نازک مخلوق ہے۔ اس کے ماحول میں کوئی فرق اس کی پوری ہستی کو تہ و بالا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ایسی حالت میں بے شمار اجزاء کی ایک کائنات، لاتعداد امکانات کا حامل ہونے کے باوجود، عین اسی مخصوص امکانی اندازے پر قائم ہے جو انسان جیسی ایک مخلوق کے لیے مناسب ہے۔ یہ اعتدال اور تناسب ہر گز اتفاقی نہیں ہوسکتا۔ یقیناً اس کا کوئی زبردست خالق اور ناظم ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص خدا کو نہ مانے یا خدا کو مان کر اس کا شریک ٹھہرائے وہ صرف اپنے غیر معقول ہونے کا ثبوت دیتا ہے، نہ کہ عقیدۂ توحید کے غیر معقول ہونے کا۔

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ع

۲۳۔ اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں۔ اور ہم ہی باقی رہ جائیں گے۔ ۲۴۔ اور ہم تمھارے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور تمھارے پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔ ۲۵۔ اور بے شک تمھارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ وہ علم والا ہے، حکمت والا ہے۔

دنیا میں انسان کو بسانا، پھر یہاں سے اس کو اٹھا لینا دونوں خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اگر یہ انسان کی مرضی سے ہوتا تو وہ کبھی یہاں نہ آسکتا اور آنے کے بعد کبھی یہاں سے واپس نہ جاتا۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے بھی زمین و آسمان خدا کے تھے اور اس کے بعد بھی وہ خدا کے رہیں گے۔

زمین پر ان گنت چیزیں ہیں۔ مگر ہر ایک کی ایک انفرادیت ہے۔ ہر چیز وہی خاص اور متعین کردار ادا کرتی ہے، جو اس کو ادا کرنا چاہیے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کا خالق ایک ایک چیز کا انفرادی علم رکھتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اس کے اپنے خصوصی وظیفہ میں لگائے ہوئے ہے۔ حتی کہ ایک آدمی کے ہاتھ کے انگوٹھے پر جو نشان ہوتا ہے، وہ بھی تمام دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک شخص کے انگوٹھے کا نشان پھر کبھی کسی دوسرے انسان کے ساتھ دہرایا نہیں جاتا۔

ایسے قادر اور باخبر خدا کے لیے اس میں کیا مشکل ہے کہ وہ ہر آدمی کا الگ الگ حساب لے اور ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

۲۶۔ اور ہم نے انسان کو سنے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا۔ ۲۷۔ اور اس سے پہلے جنوں کو ہم نے آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔

انسان کا وجود دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک جسم اور دوسرے روح۔ جسم تمام تر ارضی مادوں سے بنا ہے۔ انسانی جسم کا تجزیہ بتاتا ہے کہ وہ انھیں اجزاء کی ترکیب سے بنا ہے جس کو عرف عام میں پانی اور مٹی کہتے ہیں۔ گویا جسم کے اعتبار سے انسان سراسر ایک بے حیات اور بے شعور وجود کا نام ہے۔ مگر جب خدا اس کے اندر اپنے پاس سے روح ڈال دے تو اچانک یہی جسم ایسی صلاحیتوں کا حامل بن جاتا ہے جو معلوم کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔ یہاں دوسری مخلوق وہ ہے جس کو جن کہتے ہیں۔ جن انسان کے حریف ہیں۔ جن آگ کے شعلوں سے بنائے گئے ہیں۔ گویا کہ وہ عین اپنی پیدائش کے اعتبار سے جلانے والی مخلوق ہیں۔ جس طرح مٹی والی زمین اپنے آپ کو آگ والے سورج سے دور رکھتی ہے تاکہ وہ جل نہ جائے۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جنوں سے بچائے۔ ورنہ وہ اس کو اخلاقی اور دینی اعتبار سے جلا ڈالیں گے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

۲۸۔ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سنے ہوئے گارے کی سوکھی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ ۲۹۔ جب میں اس کو پورا بنا لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا۔ ۳۰۔ پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ ۳۱۔ مگر ابلیس، کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ۳۲۔ خدا نے کہا اے ابلیس، تجھ کو کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ ۳۳۔ ابلیس نے کہا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو تو نے سنے ہوئے گارے کی سوکھی مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ابلیس نے سجدہ نہ کرنے کی وجہ بظاہر یہ بتائی کہ انسان میرے مقابلہ میں کم تر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ خود ابلیس کا اپنا احساس کمتری تھا۔ وہ یہ دیکھ کر جل اٹھا کہ میں پہلے سے کائنات میں ہوں اور مجھ کو یہ

عزت نہیں ملی کہ تمام مخلوقات سے مجھے سجدہ کرایا جائے۔ اور انسان جو ابھی پیدا کیا گیا ہے اس کو تمام مخلوقات سے سجدہ کرایا جارہا ہے۔ اس نے انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ ''انسان مجھ سے کم تر ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ کا مستحق دراصل میں تھا پھر غیر مستحق کی عزت افزائی کو میں کیوں کر تسلیم کروں۔

یہی گھمنڈ اور حسد تمام اجتماعی خرابیوں کی جڑ ہے۔ موجودہ دنیا میں ایسے مواقع انسان کے سامنے بار بار آتے ہیں۔ جو شخص ایسے موقع پر جلن کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو اس نے فرشتوں کی پیروی کی اور جو شخص جلن کا شکار ہو جائے وہ گویا شیطان کا پیرو بنا۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَّ إِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٣٥﴾ قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٣٦﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٣٧﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٣٨﴾

۳۴۔ خدا نے کہا تو یہاں سے نکل جا، کیوں کہ تو مردود ہے۔ ۳۵۔ اور بے شک تجھ پر روز جزا تک لعنت ہے۔ ۳۶۔ ابلیس نے کہا اے میرے رب، تو مجھے اس دن تک کے لیے مہلت دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ ۳۷۔ خدا نے کہا، تجھ کو مہلت ہے۔ ۳۸۔ اس مقرر وقت کے دن تک۔

انسان کی تخلیق کے بعد واقعات نے جو رخ اختیار کیا اس نے شیطان کو مستقل طور پر انسان کا دشمن بنا دیا۔ اب قیامت تک کے لیے آدمی شیطان کی زد میں ہے۔ انسان کے لیے سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ وہ شیطان کے فریب سے چوکنا رہے۔ موجودہ دنیا میں یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی کامیابی کا فیصلہ بھی ہو رہا ہے اور اسی مقام پر اس کی ناکامی کا فیصلہ بھی۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾

۳۹۔ ابلیس نے کہا، اے میرے رب، جیسا تو نے مجھ کو گمراہ کیا ہے اسی طرح میں زمین میں ان کے لیے مزین کروں گا اور سب کو گمراہ کردوں گا۔ ۴۰۔ سوائے ان کے جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔

ابلیس کے سامنے ایک آزمائشی صورت حال آئی۔ اس میں وہ شکست کھا گیا۔ اب اس کے لیے صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی ہار مان لے۔ مگر اس کے بجائے اس نے یہ کیا کہ خود خدا پر الزام دینے لگا کہ اس نے جو کچھ کیا مجھ کو گمراہ کرنے کی خاطر کیا۔ جس واقعہ سے اس کی اپنی کمزوری ثابت ہو رہی تھی اس کو اس نے چاہا کہ خدا کے اوپر ڈال دے — اپنی شکست کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دینا اسی شیطانی اسوہ کی پیروی ہے۔

ابلیس نے انسان کو سجدہ نہ کرنے کا سبب یہ بتایا کہ انسان کو مٹی سے بنایا گیا ہے اور مجھ کو آگ سے۔

اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ مٹی کے مقابلہ میں آگ کو فضیلت کیوں حاصل ہو۔ مگر ابلیس کے اپنے ذہنی خانہ میں خود ساختہ تصور کے تحت یہ ہوا کہ مٹی حقیر چیز بن گئی اور آگ افضل چیز۔ اسی کا نام تزئین ہے۔ یہ ایک نفسیاتی چیز ہے، نہ کہ کوئی عقلی چیز۔ ابلیس نے اپنی غلطی ماننے کے بجائے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دوسروں سے بھی وہی غلطی کرائے۔ وہ خود جس نفسیاتی کمزوری کا شکار ہوا ہے، اسی نفسیاتی کمزوری میں تمام انسانوں کو مبتلا کردے۔

ابلیس نے کہا کہ تیرے منتخب بندوں کے علاوہ سب کو میں گمراہ کروں گا — یہ خدا کے منتخب بندے کون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے مقابلہ میں سیدھی راہ پر آچکے ہیں، یعنی عبدیت کی راہ۔ بالفاظ دیگر، خدا کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کے اعتراف کی راہ۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ ع ۳ ۱۹ ۳

۴۱۔ اللہ نے فرمایا، یہ ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے۔ ۴۲۔ بے شک جو میرے بندے ہیں، ان پر تیرا زور نہیں چلے گا۔ سوا ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کریں۔ ۴۳۔ اور ان سب کے لیے جہنم کا وعدہ ہے۔ ۴۴۔ اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازہ کے لیے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں۔

صراطِ مستقیم کی تشریح مجاہد اور حسن اور قتادہ سے یہ مروی ہے کہ اس سے مراد حق کا راستہ ہے جو اللہ کی طرف نکلتا ہے اور اسی پر ختم ہوتا ہے (طَرِيْقُ الْحَقِّ مَرْجِعُهَا إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى، وَإِلَيْهِ تَنْتَهِي) تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 535۔ اگر آدمی شرک کی راہ چلے تو وہ راہ خدا تک نہیں پہنچے گی بلکہ شریکوں تک پہنچے گی۔ وہ اگر سرکشی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کی منزل آدمی کا اپنا وجود ہوگا، نہ کہ خدا۔ اگر وہ بے قید ہو کر زندگی گزارے تو وہ مختلف سمتوں میں بھٹکے گا۔ اس کا سفر خدا پر منتہی نہیں ہوسکتا۔

مگر جب آدمی صرف خدا کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے اور اسی کو سب کچھ سمجھ کر اپنی زندگی کو خدا کے رخ پر چلاتا ہے تو بالکل قدرتی بات ہے کہ اس کا سفر خدا کی طرف جاری ہو اور بالآخر وہ خدا تک پہنچ جائے۔ خدا قادر ہے اور انسان عاجز۔ اس لیے خدا اور بندے کے درمیان ایک ہی صحیح نسبت ہے اور وہ عبدیت کی نسبت ہے۔ عبدیت کی روش اختیار کرنا خدا کے ساتھ اپنی صحیح ترین نسبت کو پالینا ہے۔ جس شخص کی نسبت خدا کے ساتھ قائم ہوجائے اس پر شیطان کا زور نہیں چلتا۔ اور جس نے خدا کے ساتھ اپنی نسبت قائم نہ کی، اس کی نسبت شیطان کے ساتھ قائم ہوجاتی ہے۔ پھر وہ شیطان کے مشوروں پر چلنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پہنچ جاتا ہے جہاں بالآخر شیطان کو پہنچنا ہے۔

جہنم جو شیطان اور اس کے ساتھیوں کا آخری ٹھکانا ہے، اس کے سات درجے ہیں۔ (قَالَ عِكْرِمَةُ:

"سَبْعَةُ أَبْوَابٍ" سَبْعَةُ أَطْبَاقٍ) تفسیر ابن کثیر، جلد4، صفحہ 536۔ جہنمی لوگ اپنے اعمال کے فرق کے لحاظ سے سات بڑے گروہوں میں تقسیم کیے جائیں گے اور اس کے مطابق جہنم کے سات طبقات میں سے کسی ایک طبقہ میں جگہ پائیں گے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٤٥﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿٤٧﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿٤٨﴾ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٤٩﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿٥٠﴾

۴۵۔ بے شک ڈرنے والے باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ ۴۶۔ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی اور امن کے ساتھ۔ ۴۷۔ اور ان کے سینوں کی کدورتیں ہم نکال دیں گے، سب بھائی بھائی کی طرح رہیں گے، تختوں پر آمنے سامنے۔ ۴۸۔ وہاں ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔ ۴۹۔ میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بخشنے والا، رحمت والا ہوں۔ ۵۰۔ اور میری سزا دردناک سزا ہے۔

جنت کی زندگی بے خوف زندگی ہوگی۔ اس کے مستحق وہ لوگ قرار پائیں گے جنھوں نے دنیا میں خدا کا خوف کیا۔ دنیا میں خدا کا خوف آخرت کی بے خوفی کی قیمت ہے۔

آپس کی رنجشیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک سرکشی کی وجہ سے، دوسری غلط فہمی کی وجہ سے۔ سرکشی کی بنا پر رنجش اور عناد پیدا ہونا سب سے بڑی اجتماعی برائی ہے۔ اہل ایمان کو اسے دنیا ہی میں ختم کر لینا ہے۔ جو لوگ اس کو دنیا میں ختم نہ کریں وہ آخرت میں جہنم کا خطرہ مول لے رہے ہیں۔

دوسری رنجش وہ ہے جو غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کبھی ختم ہو جاتی ہے اور کبھی طرفین کے اخلاص کے باوجود آخر وقت تک باقی رہتی ہے۔ یہ دوسری قسم کی رنجش آخرت میں مکمل طور پر ختم ہو جائے گی۔ کیوں کہ آخرت حقیقتوں کے کامل ظہور کی دنیا ہے۔ جب تمام حقیقتیں بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گی تو ایک مخلص آدمی کے لیے کوئی وجہ باقی نہ رہے گی کہ وہ کیوں اپنے بھائی کے خلاف خواہ مخواہ رنجش رکھے۔

جنت کی زندگی اتنی لطیف اور نفیس زندگی ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم موجودہ دنیا کی لذتیں اور خوشیاں آنے والی لذتوں اور خوشیوں کی دنیا کا ایک ابتدائی تعارف ہیں۔ ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جس جنت کا تعارف اتنا لذیذ ہو وہ خود کتنی زیادہ لذیذ ہوگی۔

موجودہ دنیا میں کوئی شخص بالفرض ہر قسم کی لذتیں جمع کر لے تب بھی طرح طرح کی ناخوشگواریاں اس کی ہر لذت کو بے معنی بنا دیتی ہیں۔ مگر جنت ایک ایسی جگہ ہے جس کی لذتیں ہر قسم کی ناخوش گواریوں سے پاک ہوں گی۔ حدیث میں آیا ہے کہ اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ صحت مند رہو گے اور کبھی بیمار نہ

ہو گے۔ اب تم ہمیشہ جیو گے اور کبھی نہ مرو گے۔ اب تم ہمیشہ جوان رہو گے اور کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ یہاں رہو گے تم کو یہاں سے کبھی جانا نہ ہوگا (یُقَالُ یَا أَهْلَ الْجَنَّةِ، إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَصِحُّوا فَلَا تَمْرَضُوا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَعِيشُوا فَلَا تَمُوتُوا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَشِبُّوا فَلَا تَهْرَمُوا أَبَدًا، وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تُقِيمُوا فَلَا تَظْعَنُوا أَبَدًا) تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 539۔

وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

۵۱۔ اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں سے آگاہ کرو۔ ۵۲۔ جب وہ اس کے پاس آئے پھر انھوں نے سلام کیا۔ ابراہیم نے کہا کہ ہم تم لوگوں سے اندیشہ ناک ہیں۔ ۵۳۔ انھوں نے کہا کہ اندیشہ نہ کرو ہم تم کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا۔ ۵۴۔ ابراہیم نے کہا، کیا تم اس بڑھاپے میں مجھ کو اولاد کی بشارت دیتے ہو۔ پس تم کس چیز کی بشارت مجھ کو دے رہے ہو۔ ۵۵۔ انھوں نے کہا کہ ہم تمھیں حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں۔ پس تو ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔ ۵۶۔ ابراہیم نے کہا کہ اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا اور کون ناامید ہوسکتا ہے۔

حضرت ابراہیم کے پاس فرشتے انسانی صورت میں آئے۔ سوال وجواب کے دوران انھوں نے کہا کہ ہم حق کے ساتھ آئے ہیں۔ یہ حق (امر واقعی) کیا تھا جس کے لیے فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس آئے۔ یہ ایک غیر معمولی انعام کی بشارت تھی جس کی عام حالات میں توقع نہیں کی جاسکتی۔ انسان پر جب خدا کوئی غیر معمولی انعام کرنا چاہتا ہے تو اس کی تکمیل کے لیے وہ اس کے پاس خصوصی فرشتے بھیجتا ہے۔

اس قسم کے فرشتے پیغمبروں کے پاس بھی آتے ہیں اور غیر پیغمبروں کے پاس بھی۔ فرق یہ ہے کہ پیغمبر کے پاس فرشتے آتے ہیں تو وہ ان کو دیکھتا ہے اور شعوری طور پر واقف ہوتا ہے کہ یہ فرشتے ہیں۔ مگر عام انسان کو اس قسم کا یقینی ادراک نہیں ہوتا۔ البتہ فرشتوں کی خصوصی قربت اس کے اندر خصوصی کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ یہ کیفیات گویا اس کا اشارہ ہوتی ہیں کہ اس وقت آدمی خدا کے بھیجے ہوئے خصوصی فرشتوں کی صحبت میں ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّاۤ اٰلَ

۵۷۔ کہا، اے بھیجے ہوئے فرشتو، اب تمھاری مہم کیا ہے۔ ۵۸۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ۵۹۔ مگر لوط کے گھر

لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا
امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَا ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ ع

والے کہ ہم ان سب کو بچالیں گے۔ ۶۰۔ بجز اس کی بیوی کے کہ ہم نے ٹھہرالیا ہے کہ وہ ضرور مجرم لوگوں میں رہ جائے گی۔

حضرت ابراہیم فلسطین میں رہتے تھے۔ اس کے قریب ہی بحر مردار کے کنارے آپ کے بھتیجے حضرت لوط تھے۔ حضرت لوط نے اس علاقہ میں بسنے والوں پر تبلیغ کی۔ مگر وہ اصلاح قبول کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی سرکشی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ یہ ہوا کہ ان کو ہلاک کردیا جائے۔ یہ فرشتے اسی خدائی فیصلہ کے نفاذ کے لیے آئے تھے۔

غالباً حضرت لوط کے چند اہل خاندان کے سوا اور کوئی شخص ان پر ایمان نہ لایا۔ گھر سے باہر والوں کے لیے داعی حق کو قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کے لیے بہت سی نفسیاتی رکاوٹیں حائل ہوجاتی ہے۔ تاہم خود اپنے خونی رشتہ داروں کے لیے یہ رکاوٹیں نہیں ہوتیں۔ چنانچہ لوگ نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ داعیٔ حق کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

حضرت لوط کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ آپ کی دعوت پر غالباً صرف آپ کی لڑکیاں ایمان لائیں۔ اولاد کو اپنے باپ سے جو خصوصی تعلق ہوتا ہے، وہ باپ کی دعوت کو قبول کرنے میں خصوصی مددگار بن جاتا ہے۔ ان لڑکیوں نے حضرت لوط کے ساتھ نجات پائی۔ مگر آپ کی بیوی دل سے آپ کی مومن نہ بن سکی۔ چنانچہ اس کو دوسرے مجرموں کے ساتھ ہلاک کردیا گیا۔ خدا کے قانون میں محض رشتہ داری کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ
اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ
بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَ اَتَيْنٰكَ
بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ
بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ اتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَ لَا
يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّ امْضُوْا حَيْثُ
تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَاۤ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ
دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

۶۱۔ پھر جب بھیجے ہوئے فرشتے خاندانِ لوط کے پاس آئے۔ ۶۲۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ ۶۳۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ ہم تمھارے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کرتے ہیں۔ ۶۴۔ اور ہم تمھارے پاس حق کے ساتھ آئے ہیں، اور ہم بالکل سچے ہیں۔ ۶۵۔ پس تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کے ساتھ نکل جاؤ۔ اور تم ان کے پیچھے چلو اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور وہاں چلے جاؤ جہاں تم کو جانے کا حکم ہے۔ ۶۶۔ اور ہم نے لوط کے پاس حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کٹ جائے گی۔

ایک ’’حق‘‘ وہ تھا جس کو لے کر فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے تھے۔ دوسرا حق وہ ہے جس کو لے کر وہ حضرت لوط کے پاس پہنچے۔ پہلا حق خدا کے خصوصی انعام کی صورت میں تھا۔ دوسرا حق خدا کی خصوصی سزا کی صورت میں۔

حضرت لوط کے پاس فرشتے انسان کی صورت میں آئے۔ یہ فرشتے اس لیے آئے تھے کہ وہ پیغمبر کو نہ ماننے والوں کے درمیان وہ فیصلہ نافذ کردیں جو خدا نے ان کی سرکشی کی بنا پر ان کے لیے مقدر کیا ہے۔ ان کی ہدایت کے مطابق، حضرت لوط رات کے اندھیرے میں دوسرے اہل ایمان کو لے کر بستی سے نکل گئے۔ اس کے بعد صبح سویرے شدید زلزلہ کے دھماکوں سے وہ پورا علاقہ تلپٹ ہوگیا۔ تمام منکرین انتہائی بے دردی کے ساتھ ہلاک کردیے گئے۔

یہ ہلاکت کہاں ہوئی۔ یہ ان کی اسی دنیا میں ہوئی جس کو وہ اپنی دنیا سمجھے ہوئے تھے۔ جہاں کی ہر چیز ان کو اپنی ساتھی اور مددگار دکھائی دیتی تھی۔ خدا جب حکم دیتا ہے تو عین وہی نقشہ آدمی کے لیے ہلاکت کا نقشہ بن جاتا ہے، جس کو وہ اپنے لیے کامیابی کا نقشہ سمجھے ہوئے تھا۔ جس محل کے اندر اپنے آپ کو پا کر آدمی فخر کرتا ہے اس محل کو اس طرح کھنڈر کردیا جاتا ہے جیسے کہ وہ ایک ملبہ تھا جو آدمی کے سر پر پٹک دیا گیا۔

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿٦٩﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٧١﴾

۶۷۔ اور شہر کے لوگ خوش ہو کر آئے۔ ۶۸۔ اس نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں، تم لوگ مجھ کو رسوا نہ کرو۔ ۶۹۔ اور تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو ذلیل نہ کرو۔ ۷۰۔ انھوں نے کہا کیا ہم نے تم کو دنیا بھر کے لوگوں سے منع نہیں کردیا۔ ۷۱۔ اس نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کو کرنا ہے۔

قومِ لوط کی بستی (سدوم) میں جو فرشتے آئے وہ نہایت خوبصورت نوجوان کی صورت میں آئے۔ یہ گویا فحاشی میں ڈوبی ہوئی اس قوم کی جانچ کا آخری پرچہ تھا۔ چنانچہ یہ لوگ اپنی بڑھی ہوئی سرکشی کی بنا پر ان نوجوان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ حسب عادت ان کے ساتھ بدکاری کرنا چاہتے تھے۔ مگر انھیں معلوم نہ تھا کہ وہ جن کو پرکشش نوجوان سمجھ رہے ہیں وہ دراصل عذاب کے فرشتے ہیں، جو صرف اس لیے آئے ہیں کہ ان کو ہمیشہ کے لیے ذلیل کرکے چھوڑ دیں۔

’’میری بیٹیاں‘‘ سے مراد قوم کی بیٹیاں ہیں۔ حضرت لوط نے جب دیکھا کہ ظالم لوگ منع کرنے کے باوجود مہمانوں پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں تو آپ نے ان سے کہا کہ خدارا، میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھ کو رسوا نہ کرو۔ اگر تم کو کچھ کرنا ہے تو یہ قوم کی لڑکیاں ہیں ان میں سے جس سے چاہو نکاح کرلو۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

۷۲۔ تیری جان کی قسم، وہ اپنی سرمستی میں مدہوش تھے۔ ۷۳۔ پس دن نکلتے ہی ان کو چنگھاڑ نے پکڑ لیا۔ ۷۴۔ پھر ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان لوگوں پر کنکر کے پتھر کی بارش کردی۔ ۷۵۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں کے لیے۔ ۷۶۔ اور یہ بستی ایک سیدھی راہ پر واقع ہے۔ ۷۷۔ بے شک اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔

قوم لوط کا یہ حال کیوں ہوا کہ وہ سرکشی میں آپے سے باہر ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے معاملہ کو حضرت لوط کی نسبت سے دیکھا۔ چونکہ وہ حضرت لوط کے مقابلہ میں طاقت ور تھے۔ اس لیے انھوں نے سمجھا کہ ہم جو چاہیں کریں، کوئی ہمارا کچھ بگاڑنے والا نہیں۔

اگر وہ معاملہ کو اللہ کی نسبت سے دیکھتے تو صورت حال بالکل برعکس ہوتی۔ اب ان کو معلوم ہوتا کہ ان کی سرکشی سراسر مضحکہ خیز ہے۔ کیوں کہ خدا کے مقابلہ میں کسی بھی طاقت ور کی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ عین صبح کو ان پر کڑک چمک کا شدید طوفان آیا۔ خدا نے ہواؤں کو حکم دیا اور انھوں نے قوم لوط کی بستیوں (سدوم اور عمورہ) پر کنکریوں کی بارش شروع کردی۔ قوم کی قوم تھوڑی دیر میں تباہ ہو کر رہ گئی۔

اس واقعہ میں غور کرنے والوں کے لیے یہ نصیحت ہے کہ اس دنیا میں کسی کا سابقہ حقیقۃً انسان سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اگر آدمی اس حقیقت کو جان لے تو اس کی ساری سرکشی ختم ہو جائے۔ ''بے شک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں (متوسمین) کے لیے۔'' توسم کا مطلب ہے، مادی تجربات کو اللہ کی معرفت میں ڈھال لینا۔ یعنی ظاہری چیزوں میں علامتیں دیکھ کر اس سے عارفانہ حقیقتوں کو دریافت کرنا۔ واقعات کے اندر چھپے ہوئے مختلف اسباق (lessons) کو دریافت کرنا۔

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾
ع ۵ ۱۹ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾
وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾
وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَ
كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾

۷۸۔ اور ایکہ والے یقیناً ظالم تھے۔ ۷۹۔ پس ہم نے ان سے انتقام لیا۔ اور یہ دونوں بستیاں کھلے راستے پر واقع ہیں۔ ۸۰۔ اور حجر والوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ ۸۱۔ اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں۔ مگر وہ اس سے منہ پھیرتے رہے۔ ۸۲۔ اور وہ پہاڑوں کو تراش کر ان میں گھر بناتے

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّیۡحَةُ مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۸۳﴾ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ ﴿۸۴﴾

تھے کہ امن میں رہیں۔ ۸۳۔ پس ان کو صبح کے وقت سخت آواز نے پکڑ لیا۔ ۸۴۔ پس ان کا کیا ہوا ان کے کچھ کام نہ آیا۔

اصحاب ایکہ سے مراد حضرت شعیب کی قوم ہے۔ اس قوم کا اصل نام بنی مدیان تھا۔ یہ لوگ موجودہ تبوک کے علاقہ میں آباد تھے۔ اصحاب حجر سے مراد قوم ثمود ہے جس کی طرف حضرت صالح مبعوث ہوئے۔ یہ علاقہ موجودہ مدینہ کے شمال میں واقع تھا۔

اصحاب ایکہ کی سرکشی نے ان کو نہ صرف شرک میں مبتلا کیا بلکہ ان کو بدترین اخلاقی جرائم تک پہنچا دیا۔ حضرت شعیب کی یاددہانی کے باوجود انھوں نے سبق نہیں لیا تو خدا نے زمین کو حکم دیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جو زمین ان کے لیے گہوارۂ عیش بنی ہوئی تھی، وہی ان کے لیے گہوارۂ عذاب بن گئی۔

قوم ثمود سنگ تراشی کے فن میں ماہر تھے۔ انھوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر ان کو شاندار گھروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنی حفاظت کا آخری انتظام کر لیا ہے۔ جب انھوں نے خدا کی پکار کو نظر انداز کر دیا تو خدا نے حکم دیا اور ان کے عظیم مکانات ان کے لیے عظیم قبروں میں تبدیل ہو گئے۔

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ فَاصۡفَحِ الصَّفۡحَ الۡجَمِیۡلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۶﴾

۸۵۔ اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، حکمت کے بغیر نہیں بنایا اور بلاشبہ قیامت آنے والی ہے۔ پس تم خوبی کے ساتھ درگزر کرو۔ ۸۶۔ بے شک تمھارا رب سب کا خالق ہے، جاننے والا ہے۔

زمین و آسمان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ پورا نظام حد درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ یہاں ہر چیز ٹھیک ویسی ہی ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ اس پورے نظام میں صرف انسان ہے جو خلافِ حقیقت رویہ اختیار کرتا ہے۔ انسان اور کائنات میں یہ تضاد تقاضا کرتا ہے کہ وہ ختم ہو۔ قیامت کا عقیدہ اس اعتبار سے عین عقلی اور منطقی عقیدہ ہے۔ کیوں کہ قیامت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے جو اس تضاد کو ختم کرنے والی ہو۔

دعوت الی اللہ کے عمل کا ایک اہم جزء ''اعراض'' ہے۔ یعنی مخاطب جب غیر متعلق بحث اور جھگڑا چھیڑے تو اس کے ساتھ مشغول ہونے کے بجائے اس سے الگ ہو جانا۔ اعراض کا اصول اختیار کیے بغیر دعوت کا کام موثر طور پر نہیں کیا جا سکتا۔

اعراض کی مصلحت یہ ہے کہ مدعو ہمیشہ داعی سے غیر متعلق جھگڑے چھیڑتا ہے۔ اب اگر داعی یہ کرے کہ ہر ایسے موقع پر مدعو سے لڑ جائے تو غیر متعلق امور پر ٹکراؤ تو خوب ہوگا مگر اصل دعوتی کام بغیر ہوئے پڑا رہ جائے گا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ
الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا
مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ
اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ كَمَاۤ اَنْزَلْنَا
عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ
عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾
عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

۸۷۔ اور ہم نے تم کو سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کیا ہے۔ ۸۸۔ تم اس متاعِ دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو دی ہیں اور ان پر غم نہ کرو اور ایمان والوں پر اپنے شفقت کے بازو جھکا دو۔ ۸۹۔ اور کہو کہ میں ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۹۰۔ اسی طرح ہم نے تقسیم کرنے والوں پر بھی اتارا تھا۔ ۹۱۔ جنھوں نے اپنے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ ۹۲۔ پس تیرے رب کی قسم، ہم ان سب سے ضرور پوچھیں گے۔ ۹۳۔ جو کچھ وہ کرتے تھے۔

سات مثانی سے مراد سورہ فاتحہ ہے۔ سورہ فاتحہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے اور بقیہ قرآن اس کی تفصیل۔ یہ قرآن بلا شبہ زمین و آسمان کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس کا ہدایت نامہ ہونا اس کے ماننے والوں کے لیے آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اور اس کا آخری کتاب ہونا لازم ٹھہراتا ہے کہ ضرور اس کو اپنے مخالفین کے اوپر غلبہ حاصل ہو۔ کیوں کہ اگر غلبہ نہ ہو تو وہ آخری کتاب کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتی۔

داعی کو چاہیے کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کو سوچ کر وہ مایوس نہ ہو۔ بلکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو دیکھ کر مطمئن ہو اور ان کی دل جوئی اور تربیت میں پوری توجہ صرف کرے۔

قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے مراد تورات کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ یہود نے اپنی آسمانی کتاب کو عملاً دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا اس کی جو تعلیم ان کی خواہشات کے خلاف ہوتی اس کو وہ چھوڑ دیتے اور جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی اس کو لے لیتے۔ پہلی قسم کی آیتیں ان کے یہاں صرف تقدس کے خانہ میں پڑی رہتیں۔ ان پر وہ نہ زیادہ دھیان دیتے اور نہ ان کو زیادہ پھیلاتے۔ البتہ دوسری قسم کی آیتوں کی وہ خوب اشاعت کرتے۔ بالفاظ دیگر انھوں نے کتاب خداوندی کو اپنے مفادات کے تابع بنالیا تھا، نہ کہ خدائی احکام کے تابع۔

کسی چیز کو پانے کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے اس کے اجزاء کو پانا۔ دوسرا ہے اس کو اس کی کلی حیثیت میں پانا۔ درخت کو جب آدمی اس کی کلی حیثیت میں پہچان لے تو وہ کہتا ہے کہ یہ درخت ہے۔ لیکن اگر وہ اس کو اس کی کلی حیثیت میں نہ پہچانے تو وہ تنہ اور شاخ اور پتی اور پھول اور پھل کا ذکر کرے گا۔ وہ اس واحد لفظ کو نہ بول سکے گا جس کے بولنے کے بعد اس کے تمام متفرق اجزاء ایک اصل میں جڑ کر وحدت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

یہی معاملہ خدا کی کتاب کا بھی ہے۔ خدا کی کتاب میں بہت سے متفرق احکام ہیں اسی کے ساتھ اس کا ایک کلی اور مرکزی نکتہ ہے۔ جو لوگ خدا کی کتاب میں گم ہوں وہ خدا کی کتاب کو اس کی کلی حیثیت میں پالیں

گے۔ اس کے برعکس، جو لوگ خود اپنے آپ میں گم ہوں وہ خدا کی کتاب کو دیکھتے ہیں تو خدا کی کتاب ان کو بس مختلف اور متفرق احکام کا مجموعہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ ان میں سے اپنے ذوق اور حالات کے مطابق کوئی جزء لے لیتے ہیں اور اس پر اس طرح زور صرف کرنے لگتے ہیں جیسے کہ بس وہی ایک چیز سب کچھ ہو۔

درخت کی جڑ میں پانی دینے سے پورے درخت میں پانی پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح جب خدا کی کتاب کے کلی اور مرکزی پہلو کو زندہ کیا جائے تو اس کے زندہ ہوتے ہی بقیہ تمام اجزاء لازمی طور پر زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر کسی ایک جزء کو لے کر اس پر زور دیا جائے تو اس کی ظاہری دھوم تو مچ سکتی ہے مگر اس سے دین کا حقیقی احیاء نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس کو زندگی مرکزی پہلو کے زندہ ہونے سے ملتی ہے اور وہ سرے سے زندہ ہی نہیں ہوا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾
اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيْنَ
يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ
يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ
صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ
حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾ ع ۲۰ ۶

۹۴۔ پس جس چیز کا تم کو حکم ملا ہے، اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ۹۵۔ ہم تمھاری طرف سے ان مذاق اڑانے والوں کے لیے کافی ہیں۔ ۹۶۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو شریک کرتے ہیں۔ پس عنقریب وہ جان لیں گے۔ ۹۷۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس سے تمھارا دل تنگ ہوتا ہے۔ ۹۸۔ پس تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اور سجدہ کرنے والوں میں سے بنو۔ ۹۹۔ اور اپنے رب کی عبادت کرو۔ یہاں تک کہ تمھارے پاس یقینی بات آجائے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو بولنے اور کرنے کی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ اس لیے داعی جب خدا کی طرف بلانے کا کام شروع کرتا ہے تو دوسروں کی طرف سے طرح طرح کی بے معنی باتیں کہی جاتی ہیں۔ لوگ مختلف قسم کے غیر متعلق مسائل چھیڑ دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے مقابلہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اگر وہ ایسے مواقع پر لوگوں سے لڑنے لگے تو وہ دعوتِ حق کے مثبت کام کو انجام نہیں دے سکتا۔

اس دنیا میں حق کے داعی کے لیے ایک ہی مثبت طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ وہ الجھنے والوں سے نہ الجھے۔ اور جو حق اسے ملا ہے اس کا وہ پوری طرح اعلان کر دے۔ ہر اس بات کو وہ خدا کے حوالے کر دے جس سے نمٹنے کی طاقت وہ اپنے اندر نہ پاتا ہو۔ دنیا کے ناموافق حالات جب اس کو ستائیں تو وہ آخرت کی طرف اپنی توجہ کو پھیر دے۔ انسانوں کی بے اعتنائی جب اس کو تنگ دل کرے تو وہ خدا کی یاد میں مشغول ہو جائے۔

سچے داعی کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس پر غم کی کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پا سکا اس کو وہ خدا سے پانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز میں خدا

کے سامنے کھڑے ہونے سے اس کو تسکین ملتی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہا کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ خدا کے ساتھ سرگوشیوں میں مشغول ہو کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے وہ سب کچھ پالیا جو اس کو پانا چاہیے تھا۔

۱۶۔ سُوۡرَةُ النَّحۡل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
اَتٰۤى اَمۡرُ اللّٰهِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَ
تَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۞ ۱ يُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِكَةَ
بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ
عِبَادِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا
فَاتَّقُوۡنِ ۞ ۲ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ
بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۞ ۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ آ گیا اللہ کا فیصلہ، پس اس کی جلدی نہ کرو۔ وہ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جس کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۲۔ وہ فرشتوں کو اپنے حکم کی روح کے ساتھ اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کہ لوگوں کو خبردار کردو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ پس تم مجھ سے ڈرو۔ ۳۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ برتر ہے اس شرک سے جو وہ کررہے ہیں۔

دین کی حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور کائنات میں اس کی کارفرمائی کو اس طرح جان لے کہ ایک خدا کی ذات ہی اس کو سب کچھ نظر آنے لگے۔ اسی سے وہ ڈرے اور اسی سے وہ ہر قسم کی امید رکھے۔ ایک خدا اس کے قلب و دماغ کی تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔

یہی اللہ کو الٰہ بنانا اور اس کی عبادت کرنا ہے۔ انسانوں کے اندر یہی کیفیت پیدا کرنے کے لیے تمام پیغمبر اس دنیا میں آئے۔ جو لوگ اس عبدیت کا ثبوت دیں وہ فیصلہ کے دن کامیاب ٹھہریں گے۔ جو لوگ اس کے خلاف چلیں وہ فیصلہ کے دن نامراد ہوجائیں گے۔ یہ فیصلہ عام انسانوں کے لیے قیامت میں ہوگا۔ مگر پیغمبر کے مخاطبین کے لیے وہ اسی دنیا سے شروع ہوجاتا ہے۔

کائنات میں مکمل وحدت ہے اور اسی کے ساتھ مکمل مقصدیت بھی۔ کائنات کی وحدت اس سے انکار کرتی ہے کہ یہاں ایک خدا کے سوا کسی اور کو مرکز توجہ بنانا کسی کے لیے جائز ہو۔ اور اس کی مقصدیت تقاضا کرتی ہے کہ اس کا خاتمہ ایک بامعنیٰ انجام پر ہونا چاہیے، نہ کہ بے معنی انجام پر۔ گویا کائنات کا نظام بیک وقت توحید کی دلیل بھی فراہم کرتا ہے اور آخرت کی دلیل بھی۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ
مُّبِيْنٌ ④ وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا
دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۖ ⑤ وَ لَكُمْ
فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ
تَسْرَحُوْنَ ۖ ⑥ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ
تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ
رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ ⑦ وَّالْخَيْلَ وَ
الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً ؕ وَ
يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ⑧

۴۔اس نے انسان کو ایک بوند سے بنایا۔ پھر وہ یکا یک کھلم کھلا جھگڑنے لگا۔ ۵۔اور اس نے چوپایوں کو بنایا، ان میں تمھارے لیے پوشاک ہے اور دوسرے فائدے بھی، اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔ ۶۔اور ان میں تمھارے لیے رونق ہے، جب کہ شام کے وقت ان کو لاتے ہو اور جب صبح کے وقت چھوڑتے ہو۔ ۷۔اور وہ تمھارے بوجھ ایسے مقامات تک پہنچاتے ہیں جہاں تم سخت محنت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بے شک تمھارا رب بڑا شفیق، مہربان ہے۔ ۸۔اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تا کہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کے لیے بھی اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

انسان کا آغاز ایک حقیر مادہ سے ہوتا ہے۔ مگر انسان جب بڑا ہوتا ہے تو وہ خدا کا مدمقابل بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خدا کی کائنات میں بے خدا بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اگر انسان اپنی ابتدائی حقیقت کو نظر میں رکھے تو کبھی وہ زمین میں سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرے۔

انسان کو موجودہ دنیا میں جو نعمتیں حاصل ہیں ان میں سے ایک چوپائے ہیں۔ یہ گویا قدرت کی زندہ مشینیں ہیں جو انسان کی مختلف ضروریات فراہم کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ یہ چوپائے گھاس اور چارہ کھاتے ہیں۔ اور ان کو انسانی خوراک کے لیے گوشت اور دودھ میں تبدیل کرتے ہیں۔ وہ اپنے جسم پر بال اور اون نکالتے ہیں جن سے آدمی اپنی پوشاک بناتا ہے۔ وہ انسان کو اور اس کے سامان کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پہنچاتے ہیں۔ ان چوپایوں کا گلہ آدمی کے اثاثہ میں شامل ہو کر اس کی حیثیت اور شان میں اضافہ کرتا ہے۔

''اور خدا ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے''۔ اس سے مراد وہ فائدے ہیں جو چوپایوں کے علاوہ دوسرے ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان دوسرے ذرائع کا ایک حصہ قدیم زمانہ میں بھی انسان کو حاصل تھا۔ اور ان کا بڑا حصہ موجودہ زمانہ میں دریافت کر کے انسان ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مثال کے طور پر جانور کی جگہ مشین۔

دنیا میں انسان کے لیے جو بے شمار نعمتیں ہیں وہ انسان نے خود نہیں بنائی ہیں بلکہ وہ خدا کی طرف سے اس کے لیے مہیا کی گئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک مہربان خالق ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے خالق کا شکر گزار بنے اور اس کا حق ادا کرے جو محسن ہونے کی حیثیت سے اس کے اوپر لازم آتا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٩ ع

۹۔ اور اللہ تک پہنچتی ہے سیدھی راہ۔ اور بعض راستے ٹیڑھے بھی ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کے لیے متعین سڑک ہوتی ہے جو سیدھی منزل تک پہنچاتی ہے۔ سواریاں اپنی منزل مقصود کے مطابق انھیں سیدھی سڑکوں پر چلتی ہیں۔ تاہم ان سڑکوں کے علاوہ اطراف میں بھی راستے اور پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ان متفرق راستوں کو راستہ سمجھ کر ان پر چل پڑے تو وہ کبھی اپنی مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اصل منزل کے دائیں بائیں بھٹک کر رہ جائے گا۔

یہی معاملہ خدا تک پہنچنے کا بھی ہے۔ خدا نے انسان کو واضح طور پر بتا دیا ہے کہ وہ کون سا راستہ ہے جو اس کو خدا تک پہنچانے والا ہے۔ یہ راستہ توحید اور تقویٰ کا راستہ ہے۔ جو شخص اس راستہ کو اختیار کرے گا وہ خدا تک پہنچے گا اور جو شخص دوسرے راستوں پر چلے گا وہ اِدھر اُدھر بھٹک جائے گا۔ وہ کبھی اپنے رب تک نہیں پہنچ سکتا۔

دنیا میں ہر چیز خدا کے مقرر کیے ہوئے راستے پر چلتی ہے۔ خدا اگر چاہتا تو اسی طرح انسان کو بھی ایک مقرر راستہ کا پابند بنا دیتا۔ مگر انسان کا تخلیقی منصوبہ دوسری اشیاء کے تخلیقی منصوبہ سے مختلف ہے۔ دوسری اشیاء سے صرف پابندی مطلوب ہے۔ مگر انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ اختیاری پابندی ہے۔ اسی اختیاری پابندی کا موقع دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سچے راستے پر چلتا ہے اور کوئی اس کو چھوڑ کر خود ساختہ راہوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝١٠ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝١١

۱۰۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، تم اس میں سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے ہیں جن میں تم چَراتے ہو۔ ۱۱۔ وہ اسی سے تمھارے لیے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ بے شک اس کے اندر نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

بادل اوپر فضا سے پانی برساتے ہیں اور نیچے زمین پر اس سے نہایت بامعنی قسم کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ ''زمین و آسمان'' کا اس طرح ہم آہنگ ہو کر عمل کرنا واضح طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ جو خدا آسمان کا ہے، وہی خدا زمین کا بھی ہے۔

کائنات کے مختلف حصوں کے درمیان کامل ہم آہنگی ہے۔ یہ ہم آہنگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ساری کائنات کا خالق و مالک صرف ایک ہے۔ کائنات کے موجودہ ڈھانچہ میں ایک سے زیادہ خدا کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب جب خالق و مالک حقیقۃً صرف ایک خدا ہے تو اس کے سوا دوسری جس چیز کو بھی معبودیت کا درجہ دیا جائے گا، وہ سراسر بے بنیاد ہوگا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَ
الْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَمَا ذَرَاَ
لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

۱۲۔اور اس نے تمھارے کام میں لگا دیا رات کو اور دن کو اور سورج کو اور چاند کو اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں عقل مند لوگوں کے لیے۔ ۱۳۔اور زمین میں جو چیزیں مختلف قسم کی تمھارے لیے پھیلائیں، بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کریں۔

سورج، چاند، ستارے وسیع خلا میں انتہائی صحت کے ساتھ مسلسل گردش کرتے ہیں۔ زمین میں طرح طرح کی مخلوقات (حیوانات، نباتات، جمادات) بے شمار تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ اوّل الذکر میں تسخیر امر کا پہلو نمایاں ہے۔ اور ثانی الذکر میں اختلاف الوان کا پہلو۔ ایک منظر خدا کی قدرت کے بے پناہ ہونے کو یاد دلاتا ہے۔ دوسرا منظر خدائی صفات کے اَن گنت ہونے کو۔

یہ مناظر اتنے حیرت ناک ہیں کہ جو شخص ان کو نظر ٹھہرا کر دیکھے وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان چیزوں میں اس کو خدا کی عظمت اور اس کی ربوبیت دکھائی دے گی۔ وہ ظاہری واقعات کے اندر چھپے ہوئے غیبی حقائق کو دریافت کرے گا۔ وہ مخلوقات کو دیکھ کر خالق کی معرفت میں ڈوب جائے گا۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا
طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ
فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمھارے کام میں لگا دیا، تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور نکالو جس کو تم پہنتے ہو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اس میں چیرتی ہوئی چلتی ہیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

سمندر میں لوہے کا ٹکڑا ڈالیں تو فوراً ڈوب کر پانی کی تہ میں چلا جائے گا مگر اسی لوہے کو جب جہاز کی شکل دے دی جائے تو وہ بھاری بوجھ لیے ہوئے سمندر میں تیرنے لگتا ہے اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتا ہے۔

یہ خدا کا خاص قانون ہے جس کے ذریعہ اس نے سمندر جیسی مہیب مخلوق کو انسان کے لیے کارآمد بنا رکھا ہے۔ اسی طرح سمندر کے اندر حیرت ناک انتظام کے تحت مچھلی کی صورت میں تازہ گوشت تیار کیا جاتا ہے اور اس کے اندر انسانی زینت کے لیے قیمتی موتی بنتے ہیں۔

خدا کے لیے انتظام دنیا کی دوسری صورتیں بھی ممکن تھیں۔ مثلاً ایسا ہوسکتا تھا کہ زمین پر سمندر نہ ہوں۔ یا

انسان جس طرح خشکی پر چلتا ہے اسی طرح وہ سمندر میں چلنے لگے۔ مگر خدا نے ایسا نہیں کیا اس کا مقصد آدمی کے اندر شکر گزاری کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ آدمی جب اپنے پیروں سے سمندر میں نہ چل سکے اور کشتی اور جہاز پر بیٹھے تو نہایت آسانی سے سمندر کو عبور کرنے لگے تو اس کو دیکھ کر قدرتی طور پر آدمی کے اندر شکر کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جس سمندر کو میں اپنے قدموں کے ذریعہ پار نہیں کر سکتا تھا، خدا نے کشتی اور جہاز کے ذریعہ اس کو پار کرنے کا انتظام کر دیا۔ وہ فضا جس میں میں خود نہیں اڑ سکتا تھا، اس میں ہوائی جہاز کے ذریعہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اُڑنے کی صورت پیدا کر دی۔

اس قسم کے فرق نظام قدرت میں اسی لیے رکھے گئے ہیں کہ وہ انسان کے شعور کو جگائیں اور اس کے اندر اپنے رب کے لیے شکر اور احسان مندی کا جذبہ پیدا کریں۔

وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

۱۵۔ اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دئے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈگمگانے نہ لگے اور اس نے نہریں اور راستے بنائے تاکہ تم راہ پاؤ۔ ۱۶۔ اور بہت سی دوسری علامتیں بھی ہیں، اور لوگ تاروں سے بھی راستہ معلوم کرتے ہیں۔

یہاں دو چیزوں کا ذکر ہے۔ پہاڑ ابھار کر زمین پر توازن قائم کرنے کا۔ اور زمین و آسمان میں ایسی علامتیں قائم کرنا جو لوگوں کے لیے راستہ معلوم کرنے کا کام دیں۔

جغرافی مطالعہ بتاتا ہے کہ زمین میں جب گہرائیاں پیدا ہوئیں اور ان میں پانی جمع ہو کر سمندر بنے تو زمین ہلنے لگی۔ اس کے بعد خشکی پر اونچے پہاڑ ابھر آئے۔ اس طرح دو طرفہ عمل کے نتیجے میں زمین پر توازن قائم ہو گیا۔ اگر زمین کی سطح پر یہ توازن نہ ہوتا تو انسان کے لیے یہاں زندگی ناممکن یا کم از کم سخت دشوار ہو جاتی۔

اسی طرح انسان کو اپنے سفر اور نقل و حرکت کے لیے علامتوں کی ضرورت ہے جن کی مدد سے وہ سمت کو پہچانے اور بھٹکے بغیر اپنے منزل پر پہنچ جائے۔ اس کا انتظام بھی یہاں کامل طور پر موجود ہے۔ قدیم زمانہ کا انسان دریاؤں اور ستاروں جیسی چیزوں سے اپنے راستے پہچانتا تھا۔ اب وہ مقناطیسی آلات کی مدد سے اپنا راستہ اور دوسری ضروری باتیں معلوم کرتا ہے۔ خشکی اور تری، نیز فضاؤں اور خلاؤں میں تیز رفتار پروازیں اسی کی مدد سے ممکن ہوتی ہیں۔ اگر اس قسم کی علامتیں موجود نہ ہوں تو انسانی سرگرمیاں انتہائی حد تک سمٹ کر رہ جائیں۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَ اللّٰهُ

۱۷۔ پھر کیا جو پیدا کرتا ہے وہ برابر ہے اس کے جو کچھ پیدا نہیں کر سکتا، کیا تم سوچتے نہیں۔ ۱۸۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم ان کو گن نہ سکو گے، بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۱۹۔ اور اللہ جانتا

يَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ﴿١٩﴾

ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔

دنیا میں جتنی چیزیں ہیں ان میں سے کسی کے اندر تخلیق (عدم سے وجود میں لانے) کی طاقت نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دنیا اپنی خالق آپ نہیں ہے۔ اس کا خالق وہی ہوسکتا ہے جس کے اندر یہ طاقت ہو کہ ایک چیز جو موجود نہیں ہے اس کو موجود کردے۔ اس لیے ایک خدا کا عقیدہ عین فطری ہے۔ کائنات کی توجیہہ ایک ایسے خدا کو مانے بغیر نہیں ہوسکتی جس کے اندر تخلیق کی صلاحیت کامل درجہ میں پائی جائے۔

مشرکین نے خدا کے سوا جتنے شریک خدا کے گھڑے ہیں یا منکرین نے خدا کو چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو خدا کا بدل بنانے کی کوشش کی ہے، ان میں سے کوئی بھی نہیں جس کے اندر ذاتی تخلیق کی صلاحیت ہو۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ شرک اور الحاد کے گھڑے ہوئے تمام خدا سراسر فرضی ہیں۔ کیوں کہ جس کے اندر تخلیقی قوت نہ ہو اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنا سراسر بے بنیاد ہے کہ وہ ایک موجود کائنات کا خدا ہے۔ جو خود ذاتی وجود نہ رکھتا ہو وہ کس طرح دوسری چیز کو وجود دے سکتا ہے۔

خدا کو اپنے بندوں سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ اس کی نعمتوں پر شکر گزاری ہے۔ اگرچہ خدا کی نعمتیں اس سے زیادہ ہیں کہ کوئی شخص بھی ان کا واقعی شکر ادا کرسکے۔ مگر خدا بے نیاز ہے۔ وہ زیادہ نعمت کے لیے تھوڑا شکر بھی قبول کرلیتا ہے۔ تاہم یہ شکر حقیقی شکر ہونا چاہیے، نہ کہ محض رسمی قسم کی حمد خوانی۔

وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَخۡلُقُوۡنَ
شَيۡـًٔا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ ﴿٢٠﴾ اَمۡوَاتٌ غَيۡرُ اَحۡيَآءٍ ۚ
وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَيَّانَ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿٢١﴾ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ
قُلُوۡبُهُمۡ مُّنۡكِرَةٌ وَّهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿٢٢﴾ لَا جَرَمَ
اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ؕ اِنَّهٗ لَا
يُحِبُّ الۡمُسۡتَكۡبِرِيۡنَ ﴿٢٣﴾

۲۰۔ اور جن کو لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ۲۱۔ وہ مردہ ہیں جن میں جان نہیں اور وہ نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ۲۲۔ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، مگر جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں۔ ۲۳۔ اللہ یقینا جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اکثر شرک کی صورت یہ ہوتی ہے کہ پچھلے بزرگوں کو مقدس اور مقرب مان کر لوگ ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ پرستش سراسر احمقانہ ہوتی ہے۔ جن مدفون بزرگوں کی بڑی بڑی قبریں بنا کر لوگ ان سے مرادیں مانگتے ہیں وہ خود مُردہ حالت میں عالم برزخ میں پڑے ہوتے ہیں۔ ان کو خود اپنے بارے میں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے، کجا کہ وہ کسی دوسرے کی مدد کریں۔

’’وہ تکبر کرتے ہیں‘‘ کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خدا سے تکبر کرتے ہیں۔ زمین و آسمان کے خالق سے تکبر کی جرأت کون کرے گا۔ اس سے مراد دراصل خدا کے داعی سے تکبر ہے نہ کہ خود خدا سے تکبر۔ اللہ کا جو بندہ توحید کا داعی بن کر اٹھتا ہے وہ دنیوی اعتبار سے اپنے مخاطبین کے مقابلہ میں ہمیشہ کم ہوتا ہے۔ کیونکہ مخاطب رواجی مذہب کا حامل ہونے کی وجہ سے وقت کے نقشہ میں اونچا درجہ حاصل کیے ہوئے ہوتا ہے۔ جب کہ داعی حق ’’نئے دین‘‘ کا علم بردار ہونے کی بنا پر ان درجات و مقامات سے محروم ہوتا ہے۔ وہ مخاطبین کو اپنے مقابلہ میں مادی اعتبار سے کمتر نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان کے اندر برتری کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی بات کو بے وزن سمجھ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کا کیس اگرچہ تکبر کا کیس ہوتا ہے لیکن وہ اس کو اصولی اور نظریاتی کیس بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مگر اللہ کو لوگوں کی اندرونی نفسیات کا حال خوب معلوم ہے۔ اللہ ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے ان کے ساتھ سلوک کرے گا، نہ کہ ان کی ظاہری باتوں کے اعتبار سے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿٢٥﴾ ع

۲۴۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ۲۵۔ تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی جن کو وہ بغیر کسی علم کے گمراہ کر رہے ہیں۔ یاد رکھو، بہت برا ہے وہ بوجھ جس کو وہ اٹھا رہے ہیں۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں نبوت کا دعویٰ کیا اور اس کی خبر دھیرے دھیرے عرب کے دوسرے قبائل میں پہنچی تو وہ ملاقات کے وقت مکہ کے سرداروں سے پوچھتے کہ جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے۔ اس کے جواب میں مکہ کے سردار کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس سے آپؐ کی شخصیت اور آپ کے کلام کے بارے میں لوگ شک میں مبتلا ہو جائیں (التفسیر المظہری، جلد 5، صفحہ 334)۔

اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بات کو بگڑے ہوئے الفاظ میں بیان کیا جائے۔ مثلاً قرآن میں پیغمبروں کا جو ذکر ہے اس کے متعلق وہ ’’پچھلے پیغمبروں کی تاریخ‘‘ کا لفظ بھی بول سکتے تھے، مگر اس کو انھوں نے ’’پچھلے لوگوں کے قصے کہانیوں‘‘ کا نام دے دیا۔

دعوت حق سے لوگوں کو اس طرح پھیرنا یا مشتبہ کرنا خدا کے نزدیک بدترین جرم ہے۔ ایسے لوگوں کو

قیامت کے دن دگنا عذاب ہوگا۔ کیوں کہ وہ نہ صرف خود گمراہ ہوئے بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بھی بنے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٧﴾

۲۶۔ ان سے پہلے والوں نے بھی تدبیریں کیں۔ پھر اللہ ان کی عمارت پر بنیادوں سے آ گیا۔ پس چھت اوپر سے ان کے اوپر گر پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آ گیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ ۲۷۔ پھر قیامت کے دن اللہ ان کو رسوا کرے گا اور کہے گا کہ وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کے لیے تم جھگڑا کیا کرتے تھے۔ جن کو علم دیا گیا تھا وہ کہیں گے کہ آج رسوائی اور عذاب منکروں پر ہے۔

جو لوگ جھوٹی بنیادوں پر بڑائی کا مقام حاصل کیے ہوئے ہیں، وہ جب کسی دعوتِ حق کو اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں تو ان کو اپنے مقام کے لیے خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے مقام کے تحفظ کے لیے یہ تدبیر کرتے ہیں کہ دعوتِ حق کے خلاف ایسی فتنہ انگیز باتیں پھیلاتے ہیں جن سے عوام اس کے بارے میں مشتبہ ہوجائیں اور اس کے گرد جمع نہ ہوسکیں۔

مگر دعوت حق کے خلاف ایسے لوگوں کی تدبیریں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ مخالفین حق اپنی جن بنیادوں پر بھروسہ کررہے تھے عین وہی بنیادیں اس طرح کمزور ثابت ہوتی ہیں کہ ان کی چھت ان کے اوپر گر پڑتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی قدرتی زلزلہ ان کی بنیادوں کو ہلا کر ان کی تعمیرات کو ان کے اوپر گرا دیتا ہے۔ کبھی ان کے عوام ان کا ساتھ چھوڑ کر حق کی صفوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے مددگاروں کو کھو کر مجبور ہوجاتے ہیں کہ دعوتِ حق کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ یہ انجام اپنی آخری اور تکمیلی صورت میں قیامت میں سامنے آئے گا۔ جب کہ منکرین اپنی ابدی ذلت کو دیکھیں گے اور کچھ نہ کرسکیں گے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٨﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ

۲۸۔ جن لوگوں کو فرشتے اس حال میں وفات دیں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کررہے ہوں گے تو اس وقت وہ سپر ڈال دیں گے کہ ہم تو کوئی برا کام نہ کرتے تھے، ہاں بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے تھے۔ ۲۹۔ اب جہنم کے دروازوں میں

فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

داخل ہو جاؤ۔ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہو۔ پس کیسا برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔

تکبر سب سے بڑا جرم ہے۔ خدا انسان کی ہر غلطی معاف کر دے گا مگر وہ تکبر کو معاف نہیں کرے گا۔ تکبر کے اظہار کی دو بڑی صورتیں ہیں۔ ایک تکبر وہ جو عام بندوں کے درمیان ظاہر ہوتا ہے۔ ایک آدمی طاقت، دولت اور دیگر ساز و سامان میں اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ پاتا ہے، اس بنا پر وہ اس سے تکبر کرنے لگتا ہے۔

دوسرا زیادہ شدید تکبر وہ ہے جو داعیٔ حق کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خدا کا ایک بندہ خدا کے سچے دین کی دعوت لے کر اٹھتا ہے۔ اب جو لوگ جھوٹے دین کی بنیاد پر بڑائی کا مقام حاصل کیے ہوئے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اوپر اس کی زد پڑ رہی ہے۔ وہ سچے دین کے معیار پر بے قیمت قرار پا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ بھڑ اٹھتے ہیں۔ اور داعیٔ حق کو متکبرانہ نفسیات کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

آدمی جب کسی کے مقابلہ میں تکبر کرتا ہے تو اس لیے کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر جب موت کے فرشتے آئیں گے اور اس کو بے بس کر دیں گے، اس وقت اس کو معلوم ہوگا کہ معاملہ کسی انسان کا نہیں بلکہ خدا کا تھا، انسان کسی دوسرے انسان کے مقابلہ میں طاقت ور ہو سکتا ہے مگر خدا کے مقابلہ میں کون طاقت ور ہے۔ خدا کے فرشتے جب انسان کو اپنے قبضہ میں لیتے ہیں تو اس وقت ہر آدمی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ مگر اللہ کا سچّا بندہ وہ ہے جو اس موقع کے آنے سے پہلے خدا کے آگے ہتھیار ڈال دے۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوْا خَيْرًا ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۰﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ ۭ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

۳۰۔ اور جو تقویٰ والے ہیں ان سے کہا گیا کہ تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے تو انھوں نے کہا کہ نیک بات۔ جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیا خوب گھر ہے تقویٰ والوں کا۔ ۳۱۔ ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کے لیے وہاں سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں، اللہ پرہیزگاروں کو ایسا ہی بدلہ دے گا۔ ۳۲۔ جن کی روح فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کے بدلے میں۔

جولوگ کبر کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ خدا کی بات سنتے ہیں تو ان کا ذہن الٹی سمت میں چلنے لگتا ہے۔ اس بنا پر وہ اس سے نصیحت نہیں لے پاتے۔ مگر جس شخص کے دل میں اللہ کا ڈر ہو وہ خدا کی بات کو پوری آمادگی کے ساتھ سنے گا۔ ایسے شخص کے لیے اللہ کا کلام معرفت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کو اس کے اندر حقیقت کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

جنت کی صفت یہ ہے کہ وہاں وہ سب کچھ ہے جو انسان چاہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو کبھی کسی انسان کو، حتی کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل نہ ہوسکی۔ موجودہ دنیا میں انسان کی محدودیت اور خارجی حالات کی عدم موافقت کی بنا پر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ انسان جو کچھ چاہتا ہے اسے حاصل کرلے۔ یہ تصور کہ ''جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جو انسان چاہے گا'' اتنا پر کیف ہے کہ اس کی خاطر جو قربانی بھی دینی پڑے وہ یقیناً ہلکی ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۳۳ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۴ ع

۳۳۔ کیا یہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمھارے رب کا حکم آجائے۔ ایسا ہی ان سے پہلے والوں نے کیا۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کررہے تھے۔ ۳۴۔ پھر ان کو ان کے برے کام کی سزائیں ملیں۔ اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا۔

خدا کی بات انسان کے سامنے اولاً دلائل کے ذریعے بیان کی جاتی ہے۔ یہ دعوتی مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر وہ دلائل کے ذریعے نہ مانے تو پھر وہ وقت آجاتا ہے جب کہ انفرادی موت یا اجتماعی قیامت کی صورت میں اس کو لوگوں کے سامنے کھول دیا جائے۔

آدمی کے سامنے اگر خدا کی بات دلائل کے ذریعے آئے اور وہ اس کو نظر انداز کردے تو گویا وہ اس دوسرے مرحلہ کا انتظار کررہا ہے جب کہ خدا اور اس کے فرشتے ظاہر ہوجائیں اور آدمی اس بات کو ذلت کے ساتھ ماننے پر مجبور ہوجائے جس کو اسے عزت کے ساتھ ماننے کا موقع دیا گیا تھا، مگر اس نے نہیں مانا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَي الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۳۵

۳۵۔ اور جن لوگوں نے شرک کیا وہ کہتے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ ایسا ہی ان سے پہلے والوں نے کیا تھا، پس رسولوں کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچادینا ہے۔

غافل انسان اپنے حق سے انحراف کو جائز ثابت کرنے کے لیے جو باتیں کرتا ہے، اس میں ایک بات یہ ہے کہ جب اس دنیا میں ہر چیز خدا کی مرضی سے ہوتی ہے تو ہمارا موجودہ عمل بھی خدا کی مرضی سے ہے۔ اس کی مرضی نہ ہوتی تو ہم ایسا کر ہی نہ پاتے۔ اگر واقعی خدا کو ہمارے کام پسند نہ ہوتے تو وہ ہمیں ایسا کام کرنے کیوں دیتا۔ پھر تو ایسا ہونا چاہیے تھا کہ جب بھی ہم اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کریں تو وہ فوراً ہمیں روک دے۔

یہ بات آدمی صرف اس لیے کہتا ہے کہ وہ حق ناحق کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ سنجیدہ ہوتو فوراً اس کی سمجھ میں آجائے کہ اس کو موجودہ عمل کی جو چھوٹ ہے، وہ امتحان کی وجہ سے ہے، نہ کہ خدا کی پسند کی وجہ سے۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝۳۶ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۝۳۷

۳۶۔ اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پس ان میں سے کچھ کو اللہ نے ہدایت دی اور کسی پر گمراہی ثابت ہوئی۔ پس زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ۳۷۔ اگر تم اس کی ہدایت کے حریص ہو تو اللہ اس کو ہدایت نہیں دیتا جس کو وہ گمراہ کر دیتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔

خدا نے کہیں براہِ راست اپنے پیغمبر بھیجے اور کہیں پیغمبر کے نائب اور نمائندہ کے ذریعہ بالواسطہ طور پر اپنا پیغام پہنچانے کا انتظام کیا۔ ان تمام لوگوں نے انسان کو جس چیز کی تلقین کی وہ یہی تھی کہ عبادت کا حق صرف ایک خدا کو ہے۔ شیطان اس عبادت سے انسان کو پھیرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ شیطانی ترغیبات سے بچے۔ ورنہ وہ آدمی کو جھوٹے معبودوں کی پرستش کے راستے پر ڈال دے گا۔

ہدایت اگرچہ واضح ہے۔ مگر اس کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا انحصار تمام تر اس بات پر ہے کہ آدمی اس کے بارے میں کتنا سنجیدہ ہے۔ جو شخص ہدایت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے گا اس کو اس کی صداقت کو پانے میں دیر نہیں لگے گی۔ مگر جو شخص اس کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو وہ معمولی معمولی باتوں پر اٹک کر رہ جائے گا۔ ایسا آدمی کبھی حق کو نہیں پا سکتا۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ۙ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ ؕ بَلٰی وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۳۸ لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ وَ لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ

۳۸۔ اور یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، سخت قسمیں کہ جو شخص مرجائے گا اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا۔ ہاں، یہ اس کے اوپر ایک پکا وعدہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۳۹۔ تاکہ ان کے سامنے اس چیز کو کھول دے جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اور انکار کرنے والے لوگ

كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٤٠﴾

جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔ ۴۰۔ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اتنا ہی ہمارا کہنا ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

موجودہ دنیا کچھ اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں حق اور ناحق اس طرح ثابت نہیں ہو پاتے کہ کسی کے لیے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ یہاں آدمی ہر دلیل کو کاٹنے کے لیے کچھ الفاظ پا لیتا ہے۔ ہر ثابت شدہ چیز کو مشتبہ کرنے کے لیے وہ کوئی نہ کوئی بات نکال لیتا ہے۔

یہ بات کائنات کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ مادی علوم میں آدمی کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ قطعی نتائج تک پہنچ سکے۔ اسی طرح یہ بھی ضرور ہونا چاہیے کہ انسانی معاملات میں قطعی حقائق کھل کر سامنے آجائیں۔ یہی وہ کام ہے جو قیامت میں انجام پائے گا۔ شاہ عبد القادر دہلوی لکھتے ہیں — ''اس جہان میں بہت باتوں کا شبہ رہا۔ کسی نے اللہ کو مانا اور کوئی اس کا منکر رہا تو دوسرا جہان ہونا لازم ہے کہ جھگڑے تحقیق ہوں۔ سچ اور جھوٹ جدا ہو اور مطیع اور منکر اپنا کیا پائیں''۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٤٢﴾

۴۱۔ اور جن لوگوں نے اللہ کے لیے اپنا وطن چھوڑا، بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا، ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے، کاش وہ جانتے۔ ۴۲۔ وہ ایسے ہیں جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

اکثر مفسرین نے اس آیت کو ان 80 صحابہ سے متعلق مانا ہے جو مکہ میں مخالفین اسلام کی زیادتیوں کا نشانہ بن رہے تھے اور بالآخر اپنا وطن چھوڑ کر حبش چلے گئے۔ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے پہلے مکی دور میں پیش آیا۔

حق کے معاملہ میں ہمیشہ دو گروہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو حق کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ اس کی خاطر ملی ہوئی چیزوں کو چھوڑیں یا اپنی زندگی کا نقشہ بدلیں۔ دوسرے وہ لوگ جو حق کو اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ وہی ان کے نزدیک سب سے اہم چیز بن جاتا ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر تکلیف کو سہنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ حق کو اپنا اہم ترین مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ ہر دوسری چیز کو چھوڑ سکتے ہیں مگر حق کو نہیں چھوڑ سکتے۔

ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے گروہوں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں نے حق کو اپنی زندگی میں اہم ترین مقام دیا وہ خدا کی ابدی نعمتوں کے مستحق ٹھہریں گے۔ اور جن لوگوں نے حق کو نظر انداز کیا انھیں خدا بھی نظر انداز کر دے گا۔ وہ خدا کے یہاں کوئی عزت کا مقام نہیں پا سکتے اور نہ وہ خدا کی نعمتوں میں حصہ دار بن سکتے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٣﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٤﴾ النصف

۴۳۔ اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، پس اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ ۴۴۔ ہم نے بھیجا تھا ان کو دلائل اور کتابوں کے ساتھ۔ اور ہم نے تم پر بھی یاددہانی اتاری تاکہ تم لوگوں پر اس چیز کو واضح کردو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے اور تاکہ وہ غور کریں۔

''اہل علم'' سے مراد یہاں اہل کتاب ہیں۔ یا وہ لوگ جو پچھلی امتوں اور پچھلے پیغمبروں کے تاریخی حالات کا علم رکھتے ہیں۔ جو چیز ان سے پوچھنے کے لیے فرمائی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ بلکہ یہ کہ پچھلے زمانوں میں جو پیغمبر آئے وہ انسان تھے یا غیر انسان۔ مکہ والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انسان ہونے کو اس بات کی دلیل بناتے تھے کہ آپ خدا کے پیغمبر نہیں ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ جن قوموں میں اس سے پہلے پیغمبر آتے رہے ہیں (مثلاً یہود)، ان سے پوچھ کر معلوم کرلو کہ ان کے یہاں جو پیغمبر آئے وہ انسان تھے یا فرشتے۔

پیغمبر صرف ''یاددہانی'' کے لیے آتا ہے، یہ یاددہانی اصلاً دلائل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبر اپنے آپ کو اس معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ثابت کرے۔ اگر ایک شخص لوگوں کو جنت اور جہنم سے باخبر کرے اور اسی کے ساتھ وہ ایسے کاموں میں مشغول ہو جو جنت اور جہنم کے معاملہ میں اس کو غیر سنجیدہ ثابت کرتے ہوں تو اس کا دعوتی کام لوگوں کی نظر میں مذاق بن کر رہ جائے گا۔

تاہم دعوت خواہ کتنے ہی اعلیٰ درجہ پر اور کتنے ہی کامل انداز میں پیش کردی جائے اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جو خود بھی اس پر دھیان دیں۔ جو لوگ دھیان نہ دیں وہ کسی بھی حالت میں دعوت حق سے فیض یاب نہیں ہوسکتے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٤٦﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰي تَخَوُّفٍ ۭ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٤٧﴾

۴۵۔ کیا وہ لوگ جو بری تدبیریں کررہے ہیں، وہ اس بات سے بے فکر ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے یا ان پر عذاب وہاں سے آجائے جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو۔ ۴۶۔ یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے تو وہ لوگ خدا کو عاجز نہیں کرسکتے۔ ۴۷۔ یا ان کو اندیشہ کی حالت میں پکڑ لے۔ پس تمہارا رب شفیق اور مہربان ہے۔

یہ آیت مکی دور کے آخری زمانہ کی ہے جب کہ مکہ کے مخالفین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازشیں کررہے تھے۔ پیغمبر خدا کی زمین پر خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لیے پیغمبر کے خلاف اس قسم کی سازش کرنا ایسے ہی لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو خدا کی پکڑ سے بالکل بے خوف ہو چکے ہوں۔

حالاں کہ خدا انسان کے اوپر اتنا زیادہ قابو یافتہ ہے کہ وہ چاہے تو انسان کو زمین میں دھنسا دے یا جس مقام کو آدمی اپنے لیے محفوظ سمجھے ہوئے ہے وہیں سے اس کے لیے ایک عذاب پھٹ پڑے۔ یا خدا ایسا کرے کہ لوگوں کی سرگرمیوں کے دوران انھیں پکڑ لے، پھر وہ اپنے آپ کو اس سے بچا نہ سکیں۔ خدا یہ بھی کرسکتا ہے کہ وہ اس طرح انھیں پکڑے کہ وہ خطرے کو محسوس کررہے ہوں اور اس کے لیے پوری طرح بیدار رہوں۔

غرض خدا ہر حالت میں انسان کو پکڑ سکتا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو شرارتیں کرتے دیکھتا ہے اور اس کے باوجود وہ ان کو نہیں پکڑتا تو لوگوں کو بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ اس کی مصلحت امتحان ہے، نہ کہ اس کا عجز۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا
ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ
دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا
يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ
يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ السجدة ع ۶ ۱۰ ۱۲ السجدة ۳

۴۸۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے اس کے سائے دائیں طرف اور بائیں طرف جھک جاتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے، اور وہ سب عاجز ہیں۔ ۴۹۔ اور اللہ ہی کو سجدہ کرتی ہیں جتنی چیزیں چلنے والی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ۵۰۔ وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔

انسان ایک ایسی دنیا میں سرکشی کرتا ہے، جس میں اس کے چاروں طرف اس کو تابعداری کا سبق دیا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر مادی اجسام کے سائے۔ ایک چیز جو کھڑی ہوئی ہو، اس کا سایہ زمین پر پڑ جاتا ہے۔ اس طرح وہ سجدہ کو ممثل کررہا ہے۔ وہ تمثیلی انداز میں بتاتا ہے کہ انسان کو کس طرح اپنے خالق کے آگے جھک جانا چاہیے۔

فرشتے اگرچہ انسان کو نظر نہیں آتے۔ مگر عظیم کائنات کا اس قدر منظم ہو کر چلنا ثابت کرتا ہے کہ اس کو چلانے کے لیے خدا نے اپنے جو کارندے مقرر کیے ہیں وہ انتہائی طاقت ور ہیں۔ یہ فرشتے غیر معمولی طاقت ور ہونے کے باوجود خدا کے حد درجہ مطیع ہیں۔ اگر وہ حد درجہ مطیع نہ ہوں تو کائنات کا نظام اس درجہ صحت اور یکسانیت کے ساتھ مسلسل چلتا ہوا نظر نہ آئے۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے صحیح رویہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی اطاعت میں دے دے، وہ مکمل طور پر اس کا فرماں بردار بن جائے۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ
اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٥١﴾ وَ
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ
وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿٥٢﴾

۵۱۔ اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود مت بناؤ۔ وہ ایک ہی معبود ہے، تو مجھ ہی سے ڈرو۔ ۵۲۔ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اسی کی اطاعت ہے ہمیشہ۔ تو کیا تم اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو۔

پیغمبروں کے ذریعہ خدا نے انسان کو اس سے ڈرایا ہے کہ وہ ایک معبود کے سوا دوسرے معبود اپنے لیے بنائے۔ اس کائنات کا معبود صرف ایک ہے۔ اسی سے آدمی کو ڈرنا چاہیے۔ اس کو صرف اسی کی تابع داری کرنا چاہیے۔

اگر آدمی کو اس بات کا صحیح ادراک ہوجائے کہ خدا ہی انسان کا اور تمام موجودات کا خالق و مالک ہے۔ اسی پر اس کی زندگی کا سارا دارومدار ہے تو اس ادراک کے لازمی نتیجہ کے طور پر جو کیفیت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے اسی کا نام تقویٰ ہے۔

زمین وآسمان میں خدا ہی کی دائمی اطاعت ہے۔ یہاں ہر چیز مکمل طور پر قانونِ خداوندی میں جکڑی ہوئی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں کسی اور کی عبادت کرنا یا کسی اور سے امید قائم کرنا بالکل بے بنیاد ہے۔ موجودہ کائنات ایسے شرک کو قبول کرنے سے سراسر انکار کرتی ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا
مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔرُوْنَ ﴿٥٣﴾ ۚ ثُمَّ اِذَا
كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ
بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ
اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾
وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا
رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْــَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ
تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٦﴾

۵۳۔ اور تمھارے پاس جو نعمت بھی ہے، وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب تم کو تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے فریاد کرتے ہو۔ ۵۴۔ پھر جب وہ تم سے تکلیف دور کردیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔ ۵۵۔ تاکہ وہ منکر ہوجائیں اس چیز سے جو ہم نے ان کو دی ہے۔ پس چند روزہ فائدے اٹھالو۔ جلد ہی تم جان لوگے۔ ۵۶۔ اور یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے ان کا حصہ لگاتے ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں۔ خدا کی قسم، جو افترا تم کر رہے ہو، اس کی تم سے ضرور باز پرس ہوگی۔

پوری تاریخ کا تجربہ ہے کہ آدمی جب کسی ایسی مصیبت میں پڑتا ہے جہاں وہ اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگے تو اس وقت وہ خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ منکر اور مشرک دونوں ہی ایسا کرتے ہیں۔ اس تجربہ سے معلوم ہوا کہ خدا کا تصور انسانی فطرت میں پیوست ہے۔ جب تمام دوسرے علائق کٹ جاتے ہیں تو آخری چیز جو باقی رہتی ہے وہ صرف خدا ہے۔

مگر یہ انسان کی عجیب غفلت ہے کہ جب وہ مصیبت سے نجات پاتا ہے تو دوبارہ اپنے فرضی خداؤں کی یاد میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وہ ملی ہوئی نعمت کو خدا کے بجائے دوسری دوسری چیزوں کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ اس کو وہ عظیم سبق یاد نہیں رہتا جو خود اس کی فطرت نے چند لمحہ پہلے اس کو دیا تھا۔

شیطان نے فرضی معبودوں کی معبودیت کے عقیدے کو پختہ کرنے کے لیے طرح طرح کی جھوٹی رسمیں عوام میں رائج کر رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے — اپنی آمدنی میں فرضی معبودوں کا حصہ نکالنا۔ اس قسم کی رسمیں خدا کی دنیا میں ایک بہتان کی حیثیت رکھتی ہیں کیوں کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز کے لیے غیر خدا کا شکر ادا کرنے کے ہم معنی ہیں۔

وَ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ ۚ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾ ع ۱۳

۵۷۔ اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ اس سے پاک ہے، اور اپنے لیے وہ جو دل چاہتا ہے۔ ۵۸۔ اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ جی میں گھٹتا رہتا ہے۔ ۵۹۔ جس چیز کی اس کو خوش خبری دی گئی ہے اس کے عار سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے۔ اس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اس کو مٹی میں گاڑ دے۔ کیا ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔ ۶۰۔ بری مثال ہے ان لوگوں کے لیے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اللہ کے لیے اعلیٰ مثالیں ہیں۔ وہ غالب اور حکیم ہے۔

ایک خدا کے سوا انسان نے دوسرے جو معبود بنائے ہیں ان میں دیوتا بھی ہیں اور دیویاں بھی۔ یہاں دیویوں کے عقیدے کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لیے ایک عام مثال دی گئی ہے۔ مرد کے مقابلہ میں عورت چونکہ کمزور ہوتی ہے، اس کے علاوہ عام حالات میں وہ اثاثہ سے زیادہ ذمہ داری ہوتی ہے، اس لیے عام طور پر لوگ لڑکے کی پیدائش پر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اور لڑکی کی پیدائش پر کم۔ اب جب کہ لڑکے اور لڑکی میں یہ فرق ہے تو

خدا اگر اپنے لیے اولاد پیدا کرتا تو وہ لڑکیاں کیوں پیدا کرتا۔

انسان کس لیے اولاد چاہتا ہے۔ اس لیے تاکہ وہ اس کے ذریعے سے اپنی کمی کو پورا کر سکے۔ مگر خدا اس طرح کی کمیوں سے بلند ہے۔ خدا کی عظمت وقدرت جو اس کی کائنات میں ظاہر ہوئی ہے وہ بتاتی ہے کہ خدا اس سے بلند وبرتر ہے کہ اس کے اندر ایسی کوئی کمی ہو جس کی تلافی کے لیے وہ اپنے یہاں لڑکا اور لڑکی پیدا کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا اگر کمیوں والا ہوتا تو وہ خدا ہی نہ ہوتا۔ خدا اسی لیے خدا ہے کہ وہ ہر قسم کی تمام کمیوں سے پاک ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾

٦١۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر پکڑتا تو زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ ایک مقرر وقت تک لوگوں کو مہلت دیتا ہے۔ پھر جب ان کا مقرر وقت آجائے گا تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

ظلم پر گرفت کی ایک شکل یہ ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص ظلم کرے فوراً اس کو پکڑ کر سخت سزا دی جائے۔ مگر خدا کا یہ طریقہ نہیں۔ اگر خدا ایسا کرے تو زمین پر کوئی چلنے والا باقی نہ رہے۔ خدا نے ہر شخص اور ہر قوم کو ایک مقرر مہلت دی ہے۔ اس مدت تک وہ ہر ایک کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز سے یا خارجی تنبیہات سے چوکنا ہو اور اپنی اصلاح کر لے۔ اصلاح کرتے ہی لوگوں کے پچھلے تمام جرائم معاف کر دیے جاتے ہیں۔ وہ ایسے ہو جاتے ہیں کہ جیسے انھوں نے ابھی نئی زندگی شروع کی ہو۔

دورانِ مہلت نہ پکڑنا جس طرح خدا نے اپنے اوپر لازم کیا ہے اسی طرح اس نے یہ بھی اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ ختم مہلت کے بعد وہ لوگوں کو ضرور پکڑے۔ مہلت ختم ہونے کے بعد کسی کو مزید موقع نہیں دیا جاتا، نہ فرد کو نہ قوم کو۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾

٦٢۔ اور وہ اللہ کے لیے وہ چیز ٹھہراتے ہیں جس کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے۔ لازماً ان کے لیے دوزخ ہے اور وہ ضرور اس میں پہنچا دیے جائیں گے۔

انسانی گمراہیوں کی بہت بڑی وجہ خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ کرنا ہے۔ اکثر غلط عقائد اسی لیے بنے کہ خدا کو اس سے کم سمجھ لیا گیا جیسا کہ وہ حقیقۃً ہے۔ حتی کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جو چیزیں کمتر سمجھ کر وہ خود اپنے

لیے پسند نہیں کرتے (مثلاً بیٹیاں یا اپنی ملک میں کسی اجنبی کی شرکت)، اس کو بھی وہ خدا کے لیے ثابت کرنے لگتے ہیں۔

خدا کے اسی کمتر اندازہ کا نتیجہ ہے کہ لوگ خدا پر عقیدہ رکھتے ہوئے خدا سے بے خوف رہتے ہیں۔ وہ نہایت معمولی معمولی چیزوں کے بارے میں یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ وہ ان کو خدا کی قربت دے دیں گی۔ اور آخرت کی تمام نعمتیں ان کے حصے میں لکھ دی جائیں گی۔ جو چیز ایک عام انسان کو بھی خوش نہیں کرسکتی اس کے متعلق یہ عقیدہ بنا لیا جاتا ہے کہ وہ خدا کو خوش کر دے گی۔ اس قسم کی کوئی حرکت غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے جس کو خدا کبھی معاف نہیں کرسکتا۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾

۶۳۔ خدا کی قسم، ہم نے تم سے پہلے مختلف قوموں کی طرف رسول بھیجے۔ پھر شیطان نے ان کے کام ان کو اچھے کرکے دکھائے۔ پس وہی آج ان کا ساتھی ہے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۶۴۔ اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لیے اتاری ہے کہ تم ان کو وہ چیز کھول کر سنا دو جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، اور وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

رسول کی دعوت جب اٹھتی ہے تو سننے والے محسوس کرتے ہیں کہ یہ ان کے رواجی مذہب سے ٹکرا رہی ہے۔ اب چونکہ وہ اس رواجی مذہب سے مانوس ہوتے ہیں اور اس سے ان کے بہت سے مفادات وابستہ ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اس سے لپٹے رہیں۔ اس وقت شیطان انھیں ایسے خوب صورت الفاظ سجھا دیتا ہے جس سے وہ پیغمبر کے دین کو چھوڑنے اور رواجی دین پر قائم رہنے کو درست ثابت کرسکیں۔

آدمی اگر رسول کی بات کو سیدھی طرح مان لے تو یہ خدا کو اپنا ساتھی بنانا ہے۔ اس کے برعکس، اگر وہ خوب صورت تاویلات کا سہارا لے تو یہ شیطان کو اپنا ساتھی بنانا ہوگا۔

پیغمبر آخر الزمان کو بھیج کر خدا نے یہ انتظام کیا تھا کہ لوگ مذہبی اختلافات کے جنگل کے درمیان خدا کے سچے راستے کو معلوم کرسکیں۔ یہی صورت حال آج بھی باقی ہے۔ ایک شخص خدا کے راستے کی تلاش میں ہو اور وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرے تو وہ یقیناً ذہنی انتشار میں پڑ جائے گا۔ کیوں کہ مذاہب کی جو تعلیمات آج موجود ہیں ان میں باہم سخت اختلافات ہیں۔ چنانچہ حق کے متلاشی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس چیز کو صحیح سمجھے اور کس چیز کو غلط۔

ایسی حالت میں پیغمبر آخر الزماں کا لایا ہوا دین خدا کے بندوں کے لیے رحمت ہے کیونکہ دوسرے ادیان

کے برعکس، آپ کا دین ایک محفوظ دین ہے۔ وہ تاریخی اعتبار سے پوری طرح مستند ہے۔ اس بنا پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے جو دین چھوڑا وہی وہ حقیقی دین ہے جو خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾ ع ٨

٦٥۔ اور اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کردیا۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔

بارش اور نباتات کا نظام اپنے اندر بہت بڑا سبق رکھتا ہے۔ مختلف عوامل کی متحدہ کارفرمائی سے پانی کے قطرے فضا میں جا کر دوبارہ زمین پر بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ پھر یہ بارش حیرت انگیز طور پر زمین پر سبزہ اگانے کا سبب بنتی ہے۔

اس واقعہ میں ایک طرف یہ سبق ہے کہ اس کائنات میں چاروں طرف ایک خدا کی کارفرمائی ہے۔ اگر یہاں کئی خداؤں کی کارفرمائی ہوتی تو کائنات کی مختلف طاقتیں اس طرح ہم آہنگ ہو کر مشترکہ عمل نہیں کرسکتی تھیں۔ کائنات کے نظام کی وحدانیت واضح طور پر اس کا ثبوت ہے کہ اس کا خالق و مالک صرف ایک ہے، نہ کہ ایک سے زیادہ۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ خدا کی قدرت اتنی عظیم ہے کہ وہ مردہ جسم میں زندگی پیدا کرسکتی ہے۔ وہ سوکھی ہوئی چیزوں میں ہریالی، رنگ، خوشبو اور مزہ کا باغ اگا سکتی ہے۔

پہلے واقعہ میں توحید کا ثبوت ہے، اور دوسرا واقعہ تمثیل کے روپ میں بتا رہا ہے کہ اسی طرح انسانی روحوں کے لیے بھی ایک خدائی بارش ہے، اور وہ وحی ہے۔ جو شخص اپنی مردہ اور سوکھی ہوئی روح کو نئی زندگی دینا چاہے، اسے اپنے آپ کو وحی خداوندی کی بارش میں نہلانا چاہیے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾

٦٦۔ اور بے شک تمھارے لیے چوپایوں میں سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، خوش گوار پینے والوں کے لیے۔ ٦٧۔ اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے بھی۔ تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔

دودھ دینے والے جانوروں میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ جو کچھ کھاتے ہیں وہ ایک طرف ان کے اندر گوبر اور خون بناتا ہے، دوسری طرف اسی کے درمیان سے دودھ جیسا قیمتی سیال بھی بن کر نکلتا ہے جو انسان کے

لیے بے حد قیمتی غذا ہے۔ یہی حال درختوں کا ہے۔ ان کے اندر مٹی اور پانی جیسی چیزیں داخل ہوتی ہیں اور پھر ان کے اندرونی نظام کے تحت وہ رس دار پھل کی صورت میں شاخوں میں لٹک پڑتی ہیں۔

یہ واقعات اس لیے ہیں کہ وہ لوگوں کو خدا کی یاد دلائیں۔ آدمی اس میں خدا کی قدرت کی جھلکیاں دیکھنے لگے، حتی کہ اس کا یہ احساس اتنا بڑھے کہ وہ پکار اٹھے کہ خدایا تو جو گوبر اور خون کے درمیان سے دودھ جیسی چیز نکالتا ہے، میرے ناموافق حالات کے اندر سے موافق نتائج ظاہر کردے۔ تو جو مٹی اور پانی کو پھل میں تبدیل کردیتا ہے، میری بے قیمت زندگی کو باقیمت زندگی بنادے۔

''تم ان سے نشہ کی چیز بھی بناتے ہو اور رزقِ حسن بھی''۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں خدا نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کا صحیح استعمال بھی ہے اور ان کا غلط استعمال بھی۔ کھجور اور انگور کو اس کی قدرتی صورت میں کھایا جائے تو وہ صحت بخش غذا ہے جس سے جسم اور عقل کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر انسانی عمل سے اس کو نشہ میں تبدیل کردیا جائے تو وہ جسم کو بھی نقصان پہنچاتی ہے اور عقل کو بھی بگاڑ دینے والی ہے۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ
الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾
ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ
ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ
اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

۶۸۔ اور تمھارے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کیا کہ پہاڑوں اور درختوں اور جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں ان میں گھر بنا۔ ۶۹۔ پھر ہر قسم کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے، اس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

یہاں ایک مادی مثال کی صورت میں معنوی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ شہد کی مکھی خدا کی قدرت کا ایک حیرت ناک شاہکار ہے۔ وہ ریاضیاتی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے انتہائی معیاری قسم کا چھتہ (honeycomb) بناتی ہے۔ پھر خاص منصوبہ بند انداز میں پھولوں کا رس (nectar) چوس کر لاتی ہے۔ اس کو ایک کامل ترین نظام کے تحت چھتوں میں اکٹھا کرتی ہے۔ پھر عین قوانین صحت کے مطابق شہد جیسی قیمتی چیز تیار کرتی ہے، جو انسان کے لیے غذا بھی ہے اور علاج بھی۔ یہ سب کچھ اتنے عجیب اور اتنے منظم انداز میں ہوتا ہے کہ اس پر موٹی موٹی کتابیں لکھی گئی ہیں، پھر بھی اس کا بیان مکمل نہیں ہوا۔ شہد کی یہ خدائی فیکٹری تمام انسانی کارخانوں سے زیادہ پیچیدہ اور زیادہ کامیاب ہے۔ تاہم بظاہر وہ ایسی مکھیوں کے ذریعہ چلایا جارہا ہے جنھوں نے کہیں اس فن کی تعلیم نہیں پائی۔ حتیٰ کہ ان کو اپنے اعمال کا ذاتی شعور بھی حاصل نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی کروانے والا ہے جو اپنی مخفی ہدایات کے ذریعہ مکھیوں سے یہ سب کچھ کروا رہا ہے۔ شہد کی مکھیوں کو اگر کوئی

دیکھنے والا دیکھے تو وہ ان کی حیران کن حد تک بامعنی سرگرمیوں میں خدا کی کارفرمائی کا زندہ مشاہدہ کرنے لگے گا۔شہد کی مکھی کی مثال دینے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس پر اسس میں شہد کی مکھی دوسری تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے پھولوں کے پاس پہنچ کر صرف اس کا نکٹر لیتی ہے، کسی اور چیز میں ڈسٹریکٹ نہیں ہوتی۔ یہی تدبر ہے۔ یہ دنیا ایک جنگل کی مانند ہے، مگر اس میں ہر جگہ حکمت و معرفت کے نکٹر چھپے ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ انسان کو عقل و تدبر کی صلاحیت ملی ہوئی ہے، جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا کے جنگل میں ڈسٹریکٹ (distract) نہ ہو۔انسان کو چاہیے کہ وہ کائنات میں غور و فکر کے ذریعہ حکمت و معرفت کا نکٹر حاصل کرے۔ جو طریقہ شہد کی مکھی کے لیے ''رس'' حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، وہی انسان کی سطح پر پہنچ کر ''معرفت'' کا ذریعہ بن جاتا ہے، جس میں انسان کی روح کی غذا بھی ہے اور اس کی اخلاقی بیماریوں کا علاج بھی۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ اور اللہ نے تم کو پیدا کیا، پھر وہی تم کو وفات دیتا ہے۔ اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں کہ جاننے کے بعد وہ کچھ نہ جانیں۔ بے شک اللہ علم والا ہے، قدرت والا ہے۔

زندگی کا مظہر جو زمین پر ہے اس کے کئی پہلو انسان کے سامنے آتے ہیں — ایک شخص نہیں تھا اس کے بعد وہ دنیا میں موجود ہو گیا، پھر ہر ایک مرتا ہے مگر سب کا ایک وقت نہیں۔ کوئی بچپن میں مرتا ہے، کوئی جوانی میں اور کوئی بڑھاپے میں۔ پھر یہ منظر بھی عجیب ہے کہ عمر کی آخری حد پر پہنچ کر عقل اور علم اور طاقت آدمی سے بالکل رخصت ہو جاتے ہیں۔ انسان موجودہ زمین پر بظاہر آزاد ہے مگر اس کو اپنی کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں۔

یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ تا کہ انسان کو بتایا جائے کہ علم اور قدرت دونوں صرف خدا کا حصہ ہیں۔ انسانی زندگی میں مذکورہ قسم کے جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں انسان کا اپنا کوئی دخل نہیں۔ وہ ان میں کوئی تبدیلی کرنے پر قادر نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اور کرنے والے کے ذریعے ہو رہا ہے۔ بچپن سے موت تک انسان کی زندگی یہ گواہی دیتی ہے کہ یہاں سارا علم بھی صرف خدا کے لیے ہے اور ساری قدرت بھی صرف خدا کے لیے — انسان کی مجبوری قادر مطلق خدا کی موجودگی کا ثبوت ہے۔

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں بڑائی دے دی۔ پس جن کو بڑائی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے غلاموں کو نہیں دے دیتے کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں۔ پھر کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔

یہاں ایک سادہ سی مثال کے ذریعہ اس عقیدہ کو غلط ثابت کیا گیا ہے کہ خدا کے کچھ شریک ہیں۔ اور اس نے اپنے اختیارات کا ایک حصہ اپنے ان شریکوں کو دے دیا ہے۔ وہ مثال یہ کہ دنیا میں روزی کی تقسیم یکساں نہیں۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی کے پاس بہت زیادہ ہوتا ہے اور کسی کے پاس اتنا کم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ والے کے یہاں نوکر اور غلام بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب کوئی بھی زیادہ والا ایسا نہیں کرتا کہ اپنی دولت اپنے نوکروں میں بانٹ دے اور اس طرح اپنا اور نوکروں کا فرق مٹا کر یکساں ہو جائے۔ پھر خدا کے بارے میں یہ ماننا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے اختیارات دوسروں کو تقسیم کر دیے ہیں۔

کوئی شخص اپنی بڑائی کا آپ انکار نہیں کرتا۔ پھر جو بات ایک انسان بھی پسند نہیں کرتا، حالانکہ اس کے پاس کوئی ذاتی اثاثہ نہیں، اس بات کو خدا کیوں پسند کرے گا جس کے پاس جو کچھ ہے اس کا اپنا ذاتی ہے۔ کسی دوسرے کا دیا ہوا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام عقیدے خدا کی ہستی کی نفی کر رہے ہیں۔ وہ خدا کو غیر خدا کی سطح پر پہنچا رہے ہیں جو کسی حال میں ممکن نہیں۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۙ﴿۷۲﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۚ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

۷۲۔ اور اللہ نے تمھارے لیے تم ہی میں سے بیویاں بنائیں اور تمھاری بیویوں سے تمھارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تم کو ستھری چیزیں کھانے کے لیے دیں۔ پھر کیا یہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔ ۷۳۔ اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کے لیے آسمان سے کسی روزی پر اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین سے، اور نہ وہ قدرت رکھتے ہیں۔ ۷۴۔ پس تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی بے شمار ضرورتیں ہیں۔ ان تمام ضرورتوں کا انتظام نہایت کامل صورت میں دنیا کے اندر موجود ہے۔ آدمی کو بھوک پیاس لگتی ہے تو یہاں کھانے پینے کی بہترین چیزیں افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ آدمی کو شخصی سکون کے لیے بیوی درکار ہے تو یہاں عین اس کے تقاضوں کے مطابق مسلسل عورتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ آدمی کے سامنے اپنی نسل کی بقا کا مسئلہ ہے تو یہاں اس کے لیے بیٹے اور پوتے کی پیدائش کا نظام بھی موجود ہے۔

یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ مگر ہر زمانے میں انسان نے یہ غلطی کی کہ خدا کی ان نعمتوں کو غیر خدا کی

طرف منسوب کردیا۔ مشرک لوگ ان کو خدا کے سوا دیوی دیوتاؤں یا زندہ مُردہ ہستیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور جو ملحد ہیں وہ اس کو قوانین فطرت کے اندھے عمل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ نعمتوں کا یہ نظام اس لیے تھا کہ اس کو دیکھ کر آدمی کے اندر شکر خداوندی کا جذبہ امنڈے۔ مگر خود ساختہ تخیلات کی بنا پر یہ نظام اس کے لیے صرف کفرِ خداوندی کی غذا دینے کا ذریعہ بن گیا۔

اکثر اعتقادی گمراہیاں مثالوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً انسان کے بیٹے بیٹیاں ہیں تو اسی پر قیاس کر کے سمجھ لیا گیا کہ خدا کے بھی بیٹے بیٹیاں ہیں۔ دنیا میں بڑے لوگوں کے یہاں کچھ افراد ہوتے ہیں جو مقرب اور سفارشی ہوتے ہیں۔ اس کو مثال بنا کر فرض کرلیا گیا کہ خدا کے دربار میں بھی کچھ قربت والے ہیں اور خدا کے یہاں ان کی سفارشیں چلتی ہیں۔

اسی قسم کی تمثیلات سے شرک اور گمراہی کی اکثر قسمیں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ خالق کو مخلوق کے اوپر قیاس کرنا ہے جو سراسر جہالت ہے۔ خالق ہر اعتبار سے مخلوق سے مختلف ہے۔ مخلوق کی کوئی مثال خالق پر چسپاں نہیں ہوتی۔ مثال کے ذریعہ بات کو سمجھانا بجائے خود غلط نہیں۔ مگر مثال اسی وقت کارآمد ہے جب کہ آدمی کو اصل اور تشبیہہ دونوں کا علم ہو۔ انسان جب خدا کی حقیقت کو نہیں جانتا تو کیسے وہ اس کے مطابق کوئی مثال لا سکتا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

۷۵۔ اور اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا، اور ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے اچھا رزق دیا ہے، وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔ کیا یہ یکساں ہوں گے۔ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے، لیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے۔

مشرکانہ تمثیلات کی غلطی واضح کرنے کے لیے یہاں ایک سادہ اور عام مثال دی گئی ہے۔ ایک شخص ہے جس کے پاس ہر قسم کے اسباب ہیں اور وہ ان کا ذاتی مالک ہے۔ وہیں دوسرا شخص ہے جو کسی بھی چیز کا ذاتی مالک نہیں۔ یہ دونوں آدمی ایک دوسرے سے نوعی طور پر مختلف ہیں۔ اس لیے ایک کی مثال دوسرے پر کبھی چسپاں نہیں ہوگی۔ پھر خدا اور بندے میں یہ نوعی فرق تو اپنے کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ انسان کے واقعات سے خدا پر مثال قائم کی جائے۔ اس کائنات میں خدا اور دوسری چیزوں کے درمیان جو تقسیم ہے وہ خالق اور مخلوق کی تقسیم ہے، نہ کہ خدا اور شریکِ خدا کی۔ خدا کی ہستی وہ ہستی ہے جو ہر قسم کے کمالات کا ذاتی سرچشمہ ہے۔ جو ہر قسم کی نعمتوں کا تنہا بخشنے والا ہے۔ اس کائنات میں سب سے زیادہ خلافِ واقعہ بات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے لیے وہ چیزیں فرض کی جائیں جن میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٦﴾ ع ١٦

۷۶۔ اور اللہ ایک اور مثال بیان کرتا ہے کہ دو شخص ہیں، جن میں سے ایک گونگا ہے، کوئی کام نہیں کرسکتا اور وہ اپنے مالک پر ایک بوجھ ہے۔ وہ اس کو جہاں بھیجتا ہے وہ کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا۔ کیا وہ اور ایسا شخص برابر ہو سکتے ہیں جو انصاف کی تعلیم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے۔

اوپر آیت نمبر 75 میں خدا کے مقابلے میں شرکاء کا بے حقیقت ہونا بتایا گیا تھا۔ اب آیت 76 میں رسول کے مقابلہ میں ان ہستیوں کا بے حقیقت ہونا واضح کیا جارہا ہے جن کے بل پر آدمی رسول کی ہدایت کو نظر انداز کرتا ہے۔

پیغمبر کو خدا اپنی خصوصی توجہ کے ذریعہ اس شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو حق کی شاہراہ ہے اور جو براہِ راست خدا تک پہنچانے والی ہے۔ پیغمبر اور اس کے ساتھی اس شاہراہ پر خود چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف رہنمائی دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کے راستے کے سوا دوسرے راستوں کی طرف بلاتے ہیں۔ ان کی مثال اندھے بہرے کی ہے۔ ان کے پاس کان نہیں کہ وہ خدا کی آوازوں کو سنیں، ان کے پاس آنکھ نہیں کہ اس کے ذریعہ خدا کے جلوؤں کو دیکھیں۔ ان کے اندر وہ قلب و دماغ نہیں کہ وہ کائنات میں پھیلی ہوئی خدائی نشانیوں کو پالیں۔

سمع و بصر و فواد اس لیے دئے گئے تھے کہ ان کے ذریعہ آدمی مخلوقات کے آئینہ میں خالق کا جلوہ دیکھے۔ مگر انسان نے ان کا استعمال یہ کیا کہ وہ خود مخلوقات میں اٹک کر رہ گیا۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٧٧﴾

۷۷۔ اور آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں اللہ ہی کے لیے ہیں اور قیامت کا معاملہ بس ایسا ہوگا جیسے آنکھ جھپکنا بلکہ اس سے بھی جلد۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

عالم ظاہر کے پیچھے ایک غیبی نظام ہے۔ یہ غیبی نظام خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ اپنی محدودیت کی وجہ سے اگرچہ ہم اس غیبی نظام کو نہیں دیکھتے مگر خود اس غیبی نظام پر ہماری ہر چیز بالکل کھلی ہوئی ہے۔ خدا غیب میں رہ کر ہر آن اپنی دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو دیکھ رہا ہے۔ اس کو ہر بات کا صحیح ترین اندازہ ہے۔ خدا جب فیصلہ کرے گا کہ اب انسان کے امتحان کی مدت تمام ہو چکی ہے، عین اس وقت وہ اشارہ کرے گا اور اس کے بعد پلک جھپکتے میں موجودہ نظام یک لخت ٹوٹ جائے گا اور نیا نظام بالکل مختلف بنیادوں پر قائم ہوگا تاکہ ہر ایک کو اس اصل مقام پر پہنچادیا جائے جہاں وہ باعتبار واقعہ تھا، نہ کہ اس مقام پر جہاں وہ مصنوعی طور پر اپنے آپ کو بٹھائے ہوئے تھا۔

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ اور اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، تم کسی چیز کو نہ جانتے تھے۔ اور اس نے تمھارے لیے کان اور آنکھ اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ بالکل عاجز اور بے سمجھ بچہ ہوتا ہے۔ مگر بڑا ہو کر وہ ان حیرت انگیز قوتوں کا مالک بن جاتا ہے جن کو کان اور آنکھ اور عقل کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آدمی جس روز پیدا ہو اسی روز اس کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود ہوں جو بڑی عمر کو پہنچ کر اس کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ صرف اس لیے کہ انسان کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو۔ اوّلاً وہ اپنی ابتدائی بے بسی کی حالت کو دیکھے اور پھر یہ دیکھے کہ بعد کو کس طرح وہ ایک ترقی یافتہ حالت کو پہنچ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ خدا کی ملی ہوئی نعمت کا احساس کرے اور خدا کی احسان مندی کے جذبہ سے سرشار ہو جائے۔

کسی آدمی کے اندر یہ کیفیت صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو صحیح طور پر استعمال کرے۔ اس کے کان اور آنکھ اور دل بس ظاہری دنیا میں اٹک کر نہ رہ جائیں بلکہ وہ اس کے لیے ایسے روشن دان بن جائیں جن کے ذریعہ جھانک کر کوئی شخص غیب کی جھلکیوں کو دیکھ لیتا ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾

۷۹۔ کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ وہ آسمان کی فضا میں مسخر ہو رہے ہیں۔ ان کو صرف اللہ تھامے ہوئے ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔
۸۰۔ اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں کو مقام سکون بنایا اور تمھارے لیے جانوروں کی کھال کے گھر بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور قیام کے دن ہلکا پاتے ہو۔ اور ان کے اون اور ان کے روئیں اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں ایک مدت تک کے لیے بنائیں۔

پرندوں کا فضا میں اڑنا قدرت کی ایک عظیم منصوبہ بندی کے تحت ممکن ہوتا ہے۔ پرواز کے مقصد کے لیے پرندوں کی نہایت موزوں بناوٹ، جس کی مشینی نقل ہوائی جہاز کی صورت میں کی گئی ہے۔ زمین کے اوپر ہوا جو پرندوں کے لیے ایسی ہی ہے جیسے کشتی کے لیے سمندر۔ زمینی کشش کی وجہ سے ہوا کا مسلسل زمین کے اوپر قائم رہنا وغیرہ۔ یہ اعلیٰ انتظامات اگر نہ ہوں تو فضا میں پرندوں کا اڑنا ممکن نہ ہو سکے۔

اس واقعہ کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو آدمی کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا وہ خدا کو اپنی کائنات میں عمل کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ وہ تخلیقی نظام کے اندر اس کے خالق کو پا جائے گا۔ وہ مصنوعات کے درمیان صانع کا جلوہ دیکھ لے گا۔

یہی معاملہ خود انسان کا ہے۔ گھر آدمی کے لیے سکون کا مقام ہے۔ لیکن گھر کیسے بنتا ہے۔ خدا کے بہت سے انتظامات ہیں جن کی وجہ سے زمین پر ایک گھر کا قیام ممکن ہوتا ہے۔ وہ تمام تعمیری اجزاء جن کے ذریعے ایک مکان بنتا ہے، پیشگی طور پر ہماری دنیا میں رکھ دئے گئے ہیں۔ زمین میں نہایت مناسب مقدار میں قوت کشش ہے جس کی وجہ سے مکانات زمین کی سطح پر جمے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی زمین کے اوپر مکانات اڑ جائیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جن سے آدمی ہلکے پھلکے خیمے بناتا ہے اور وہ چیزیں جن میں یہ صلاحیت ہے کہ انسان کے لباس کی صورت میں ڈھل جائیں اور اس کی زینت کا اور موسموں میں اس کی جسمانی حفاظت کا کام دیں۔

اس طرح کی تمام چیزیں اس لیے ہیں کہ آدمی کے اندر اپنے رب کی نعمتوں پر شکر کا جذبہ بیدار ہو، وہ اس کی عظمت وقدرت کے احساس سے اس کے آگے گر پڑے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور اللہ نے تمھارے لیے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے اور تمھارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہ بنائی اور تمھارے لیے ایسے لباس بنائے جو تم کو گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بنائے جو لڑائی میں تم کو بچاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تاکہ تم فرماں بردار بنو۔

چھت کا اور دوسری چیزوں کا سایہ کتنی اہمیت رکھتا ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اپنے آپ کو کسی ایسے صحرا میں پائے جہاں کسی قسم کا کوئی سایہ نہ ہو۔ سورج کی حد درجہ حسابی حرارت کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک معمولی آڑ بھی ہمیں سایہ دے دیتی ہے۔ حالاں کہ اگر سورج کی حرارت موجودہ حرارت سے زیادہ ہوتی، جو یقینی طور پر ممکن تھی، تو ہمارے تمام سایہ دار گھر آگ کی بھٹی میں تبدیل ہو جاتے۔ پہاڑ جیسی سخت چٹانوں میں ایسے شگاف ہونا جہاں آدمی اپنی پناہ گاہیں بنا سکے۔ دنیا میں ایسی چیزیں موجود ہونا جو باریک ریشوں میں ڈھل کر آدمی کو اس کے جسم کے بچاؤ کے لیے لباس دیں۔ اس قسم کی چیزیں آدمی جیسی مخلوق کے لیے اتنی اہم ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو زمین پر نہ انسان کا وجود ہوتا اور نہ کسی انسانی تہذیب کا۔

یہ معرفت بیک وقت آدمی کے اندر دو چیزیں پیدا کرتی ہے۔ ایک، خدا کے لیے احسان مندی کا جذبہ،

کیوں کہ وہی ہے جس نے آدمی کو ایسی قیمتی نعمتیں دیں، دوسری، اندیشہ کا جذبہ، کیوں کہ خدا اگر اپنی نعمتوں کو واپس لے لے تو اس کے بعد آدمی کے پاس ان کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ یہ احساسات جب آدمی کے اندرون کو اس طرح جگادیں کہ وہ اپنے رب کے سامنے گر پڑے تو اسی کا نام عبادت ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٨٢﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٣﴾ ع ١٧

۸۲۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو تمھارے اوپر صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔
۸۳۔ وہ لوگ خدا کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر وہ اس کے منکر ہوجاتے ہیں اور ان میں اکثر لوگ ناشکر ہیں۔

جو شخص بھی کائنات کا مطالعہ کرتا ہے، خواہ وہ ایک عام آدمی ہو یا ایک سائنس داں، اس پر ایسے لمحات گذرتے ہیں، جب کہ مخلوقات پر غور کرتے ہوئے اس کا ذہن خالق کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ اس کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ حیرت ناک چیزیں نہ تو اپنے آپ بن گئی ہیں اور نہ مفروضہ معبودوں نے ان کو بنایا ہے۔ ان کا بنانے والا یقیناً خدائے بزرگ و برتر ہے۔

مگر خدا کو ماننا لازمی طور پر آدمی کی اپنی زندگی میں تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ آدمی سے اس کی آزادی چھین لیتا ہے۔ اس لیے آدمی پر جب یہ تجربہ گزرتا ہے تو وقتی تاثر کے بعد وہ اپنے ذہن کو اس طرف سے ہٹا دیتا ہے۔ وہ خدا کو پاکر بھی خدا کو چھوڑ دیتا ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٥﴾

۸۴۔ اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گواہ اٹھائیں گے۔ پھر انکار کرنے والوں کو ہدایت نہ دی جائے گی۔ اور نہ ان سے توبہ لی جائے گی۔
۸۵۔ اور جب ظالم لوگ عذاب کو دیکھیں گے تو وہ عذاب نہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔

پیغمبر اور پیغمبر کے سچے پیروؤں کا قوموں کے سامنے حق کا داعی بن کر اٹھنا بظاہر ایک معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ دنیا نے عام طور پر ان واقعات کو اتنا کم اہم سمجھا ہے کہ ایک پیغمبر آخر الزماں کو چھوڑ کر کوئی بھی دوسرا پیغمبر نہیں جس کا کام اس کی معاصر تاریخوں میں قابل ذکر قرار پایا ہو۔

مگر یہ کام اس وقت بے حد اہم اور بے حد سنگین بن جاتا ہے جب کہ اس کو آخرت سے جوڑ کر دیکھا جائے۔ کیوں کہ آخرت کی عظیم عدالت میں یہی پیغمبر اور داعی خدا کے گواہ ہوں گے اور انھیں کی گواہی پر لوگوں کے ابدی

مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ جن افراد کے بارے میں گواہ یہ کہیں گے کہ انھوں نے حق کو مانا اور اپنے آپ کو اس کی اطاعت میں دیا وہ وہاں کی ابدی دنیا میں جنتی قرار پائیں گے۔ اور جن کے بارے میں خدا کے یہ گواہ بتائیں گے کہ انھوں نے حق کا انکار کیا اور اس کی اطاعت پر راضی نہیں ہوئے وہ ابدی جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

کسی قوم میں خدا کے سچے داعی اٹھیں اور وہ قوم ان کی بات نہ مانے تو یہ اس کے مجرم ہونے کا قطعی ثبوت ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ قوم یہ کہنے کا حق کھو دیتی ہے کہ ہم کو قیامت اور جنت دوزخ کی خبر نہ تھی، اس لیے ہم کو آج کے دن سزا سے معاف رکھا جائے۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا شُرَکَآءَھُمْ قَالُوْا
رَبَّنَا ھٰۤؤُلَآءِ شُرَکَآؤُنَا الَّذِیْنَ کُنَّا نَدْعُوْا
مِنْ دُوْنِکَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَیْھِمُ الْقَوْلَ اِنَّکُمْ
لَکٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَ اَلْقَوْا اِلَی اللّٰہِ یَوْمَئِذِ ِ
السَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْھُمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾
اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
زِدْنٰھُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا کَانُوْا
یُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

۸۶۔ اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب، یہی ہمارے وہ شرکاء ہیں جن کو ہم تجھے چھوڑ کر پکارتے تھے۔ تب وہ بات ان کے اوپر ڈال دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔ ۸۷۔ اور اس دن وہ اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی افترا پردازیاں ان سے گم ہوجائیں گی۔ ۸۸۔ جنھوں نے انکار کیا اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکا، ہم ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے، بوجہ اس فساد کے جو وہ کرتے تھے۔

قیامت میں یہ حقیقت آخری حد تک کھل جائے گی کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اس وقت جب پوجنے والے اپنے ان معبودوں کو دیکھیں گے جن کو وہ پوجتے تھے تو وہ ایسی باتیں کہیں گے جن سے ان کی برأت ثابت ہوتی ہو۔ گویا کہ یہ جھوٹے معبود دھوکا دے کر ان سے غیر خدا کی پرستش کراتے رہے۔ مگر وہ معبود فوراً اس کی تردید کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تمھاری اپنی سرکشی تھی۔ تم نے خدا کی تابعداری سے بچنے کے لیے بطور خود جھوٹے معبود گھڑے اور ان کے نام پر اپنے خواہش پرستانہ مذہب کو جائز ثابت کرتے رہے۔

ایک وہ شخص ہے جو حق کی دعوت کو قبول نہیں کرتا۔ دوسرا وہ ہے جو اسی کے ساتھ دوسروں کو بھی طرح طرح سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلی روش اگر گمراہی ہے تو دوسری روش گمراہی کی قیادت۔ گمراہ لوگوں کو جو عذاب ہوگا، اس کا دگنا عذاب ان لوگوں کو ملے گا جو دنیا میں گمراہی کی قیادت کرتے رہے۔

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾ ع ۱۲/۱۸

۸۹۔ اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گواہ انھیں میں سے ان پر اٹھائیں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لیے۔ وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرماں برداروں کے لیے۔

اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ کسی قوم پر انذار و تبشیر کا کام خود اس قوم کے کسی منتخب فرد کے ذریعہ انجام دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قوم میں جو پیغمبر آئے وہ خود اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اب امت مسلمہ کو قیامت تک اسی طرح ہر قوم کے اندر دعوت وشہادت کی ذمہ داری انجام دینا ہے۔

یہ دنیا میں قوموں کو دعوت دینے والے آخرت میں قوموں کے اوپر خدا کے گواہ ہوں گے۔ انھیں کی گواہی پر قوم کے ہر فرد کے لیے ثواب یا عذاب کا فیصلہ کیا جائے گا۔

قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے — اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسری آسمانی کتابوں میں ہر چیز کا بیان نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر آسمانی کتاب جو خدا کی طرف سے آئی اس میں ہر چیز کا بیان موجود تھا۔ تاہم اس ہر چیز کا تعلق دنیا کے علوم وفنون سے نہیں ہے بلکہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی کے علم سے ہے۔ وہ تمام چیزیں جو آخرت میں کسی کو کامیاب یا ناکام بنانے والی ہیں وہ سب اصولی طور پر قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اب جو لوگ اس سے ہدایت لیں گے، ان کے لیے وہ ایک عظیم نعمت بن جائے گی۔ اور جو لوگ اس سے ہدایت نہ لیں ان کے حصہ میں صرف یہ آئے گا کہ وہ اس کا انکار کر کے اپنی ہلاکت کے لیے وجہ جواز فراہم کر دیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا۔ اور اللہ روکتا ہے فحشاء سے اور منکر سے اور سرکشی سے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔

دنیا میں کوئی اللہ کا بندہ کس طرح رہے، اس کا واضح بیان اس آیت میں موجود ہے۔ اس کی اسی اہمیت کی بنا پر خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس آیت کو جمعہ کے ہفتہ وار خطبہ میں شامل کیا تھا (مرآۃ الزمان فی تواریخ الاعیان، جلد 10، صفحہ 190)۔

پہلی چیز جس کا ایک شخص کو اہتمام کرنا ہے وہ عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا جو حق دوسرے پر آتا ہے وہ اس کو پوری طرح ادا کرے، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور، اور خواہ وہ پسندیدہ شخص ہو یا ناپسندیدہ۔ حقوق کی ادائیگی میں صرف حق کا لحاظ کیا جائے نہ کہ دوسرے اعتبارات کا۔

دوسری چیز احسان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عالی ظرفی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کیا جائے۔ قانونی دائرہ سے آگے بڑھ کر لوگوں کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ حتی الامکان وہ اپنے لیے اپنے حق سے کم پر راضی ہو جائے، اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔

تیسری چیز ایتاء ذی القربیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس طرح اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کو پورا کرتا ہے، اسی طرح وہ دوسرے قریبی لوگوں کی ضرورت کے بارے میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحب استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں ہی کا حق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔

اس کے بعد آیت میں تین چیزوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

پہلی چیز فحشاء ہے۔ اس سے مراد کھلی ہوئی اخلاقی برائیاں ہیں۔ یعنی وہ برائیاں جن کا برا ہونا خود اپنے ضمیر کے تحت ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے۔ اور لوگ عام طور پر اس کو شرم ناک سمجھتے ہیں۔

دوسری چیز منکر ہے۔ منکر معروف کا الٹا ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کو ہر معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، منکر سے مراد وہ نامعقول کام ہیں جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہیں۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کو انسان عام طور پر برا جانتے ہیں اور جن کو قبول کرنے سے انسان کی فطرت انکار کرتی ہے۔

تیسری چیز بغی ہے۔ اس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا۔ اس میں ہر وہ سرکشی داخل ہے جب کہ آدمی اپنی واقعی حد سے گزر کر دوسرے شخص پر دست درازی کرے۔ وہ کسی کی جان یا مال یا آبرو لینے کے لیے اس کے اوپر ناحق کارروائیاں کرے۔ وہ اپنے زور واثر کو ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال کرنے لگے۔

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَیُبَیِّنَنَّ لَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

۹۱۔ اور تم اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم آپس میں عہد کر لو۔ اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد نہ توڑو۔ اور تم اللہ کو ضامن بھی بنا چکے ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۹۲۔ اور تم اس عورت کی مانند نہ بنو جس نے اپنا محنت سے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ دیا۔ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بناتے ہو، محض اس وجہ سے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے۔ اور اللہ اس کے ذریعے سے تمھاری آزمائش کرتا ہے اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو اچھی طرح تم پر ظاہر کر دے گا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔

سوت کاتنا محنت کے ذریعہ بکھرے ہوئے ریشوں کا یکجا کرنا ہے۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ انسان کے لیے کارآمد چیزیں تیار ہوں۔ اب اگر کوئی مرد یا عورت دن بھر محنت کر کے سوت کاتے اور پھر شام کے وقت اپنے کاتے ہوئے سوت کو پارہ پارہ کردے تو اس کی ساری محنت بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

یہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو آپس میں ایک معاہدہ کریں اور پھر ایک یا دوسرا فریق کسی معقول سبب کے بغیر اس کو توڑ ڈالے۔ کاتے ہوئے سوت کو خواہ مخواہ بکھیرنا اپنی محنت کو اکارت کرنا ہے۔ اسی طرح کیے ہوئے معاہدے کو توڑ ڈالنا اس پورے عمل کو باطل کرنا ہے جس کے نتیجے میں باہمی اتفاق کا ایک معاملہ وجود میں آیا تھا۔

موجودہ دنیا میں ایک آدمی دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر زندگی گزارتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنا کام دوسرے بہت سے آدمیوں کے درمیان کرنا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اجتماعی زندگی میں باہمی اعتماد کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اسی اجتماعی زندگی کو قائم کرنے کی خاطر بار بار ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان معاہدے اور قول وقرار وجود میں آتے ہیں، کبھی قسم کھا کر اور کبھی قسم کے بغیر۔ اب اگر لوگ ایسا کریں کہ معاہدوں کو حقیقی جواز کے بغیر توڑ ڈالیں تو اجتماعی زندگی میں فساد پھیل جائے اور کسی قسم کی تعمیر ممکن نہ رہے۔

خدا کے نام پر معاہدہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ باقاعدہ قسم کے الفاظ ادا کر کے کسی سے کوئی عہد کیا جائے۔ دوسری یہ کہ قسم کے الفاظ نہ بولے جائیں تاہم جو معاہدہ کیا گیا ہے اس میں خدا کا حوالہ بھی کسی پہلو سے شامل ہو۔ ایسی تمام صورتوں میں عہد کرنے والے گویا خدا کو اس معاملہ کا گواہ یا ضامن بناتے ہیں۔ ایسے معاہدے جن میں خدا کا نام شامل کیا گیا ہو ان کو توڑنا اور بھی زیادہ برا ہے، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کو دوسروں کے اوپر اپنا اعتبار قائم کرنا تھا تو اس نے خدا کے نام کو استعمال کیا اور جب اس پر نفس یا مفاد کے تقاضے غالب آئے تو اس نے خدا کو نظر انداز کر دیا۔

افراد یا قوموں کے درمیان جو معاہدے ہوتے ہیں ان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اصولوں کے تابع ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ مفادات کے تابع ہوں۔ قدیم زمانے میں اور آج بھی عام حالت یہ ہے کہ جب معاہدہ کرنے میں کوئی فائدہ نظر آیا تو معاہدہ کر لیا۔ اور جب توڑنا مفید معلوم ہوا تو اس کو توڑ دیا۔ اس کے برعکس، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ معاہدات کو شرعی اور اخلاقی اصولوں کے تابع رکھا جائے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾

۹۳۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ بے راہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور ضرور تم سے تمھارے اعمال کی پوچھ ہوگی۔

دنیا میں اختلافات ہیں۔ حق اور ناحق ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ خدا کا وہ منصوبہ ہے جس کے تحت اس نے موجودہ دنیا کو بنایا ہے۔ اور وہ منصوبہ امتحان ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو جانچ کی غرض سے رکھا گیا ہے۔ یہ مقصد اس کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا تھا کہ ہر آدمی کو ماننے اور نہ ماننے کی آزادی ہو۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی آزادی ہو وہ حق کو ناحق ثابت کرے اور ناحق کو حق کے روپ میں پیش کرے۔ اگر یہ مصلحت نہ ہوتی تو خدا تمام انسانوں کو اسی طرح اپنے حکم کا پابند بنا دیتا جس طرح وہ بقیہ کائنات کو اپنے حکم کا پابند بنائے ہوئے ہے۔

یہ صورت حال قیامت تک کے لیے ہے۔ قیامت کے دن کھل جائے گا کہ کس نے اپنی سمجھ کو صحیح طور پر استعمال کیا اور کس نے اپنے مفاد کی خاطر سچائی کو نظر انداز کیا۔ اس وقت خدا ہر ایک کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جس کا اس نے موجودہ امتحانی مرحلہ میں اپنے کو اہل ثابت کیا تھا۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٥﴾

۹۴۔ اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ کوئی قدم جمنے کے بعد پھسل جائے اور تم اس بات کی سزا چکھو کہ تم نے اللہ کی راہ سے روکا اور تمھارے لیے ایک بڑا عذاب ہے۔ ۹۵۔ اور اللہ کے عہد کو تھوڑے فائدے کے لیے نہ بیچو۔ جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

قسم کھا کر معاہدہ کرنا پختہ معاہدہ کی آخری صورت ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت کے تحت تمام معاہدے آجاتے ہیں۔

اگر مسلمان ایسا کریں کہ وہ دوسروں سے معاہداتی معاملے کریں اور پھر کسی حقیقی سبب کے بغیر محض مفاد کی خاطر ان کو توڑ دیں تو اس سے ماحول میں مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ ختم ہوجائے گی۔ اور نتیجۃً ان کا یہ عمل لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب منکر اسلام دیکھے گا کہ مسلمان نے معاہدہ کیا اور پھر اس نے اس سے بے وفائی کی تو اس کو دین اسلام پر اعتماد باقی نہ رہے گا اور اس کی وجہ سے وہ خدا کے دین میں داخل ہونے سے رک جائے گا (لِأَنَّ الْكَافِرَ إِذَا رَأَى أَنَّ الْمُؤْمِنَ قَدْ عَاهَدَهُ ثُمَّ غَدَرَ بِهِ، لَمْ يَبْقَ لَهُ وُثُوقٌ بِالدِّينِ، فَانْصَدَّ بِسَبَبِهِ عَنِ الدُّخُولِ فِي الْإِسْلَامِ) تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 600۔

عہد کو غیر شرعی طور پر توڑنے کا واقعہ ہمیشہ اس لیے پیش آتا ہے کہ آدمی کو یہ نظر آنے لگتا ہے کہ اگر وہ معاہدہ کو توڑ دے تو اس کو فلاں دنیوی فائدہ حاصل ہوجائے گا۔ مگر مومن کی نظر آخرت پسندانہ نظر ہوتی ہے۔ جب بھی اس کا نفس اس قسم کی تحریک کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کو یہ کہہ کر دبا دیتا ہے کہ معاہدہ توڑنے میں اگر دنیا کا فائدہ ہے تو معاہدہ نہ توڑنے میں آخرت کا فائدہ۔ اور دنیا کے فائدہ کے مقابلہ میں آخرت کا فائدہ یقیناً زیادہ بڑا ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَ
لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً
طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾

۹۶۔ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہوجائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ اور جو لوگ صبر کریں گے، ہم ان کے اچھے کاموں کا اجر ان کو ضرور دیں گے۔ ۹۷۔ جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو زندگی دیں گے، ایک اچھی زندگی، اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا ہم ان کو بہترین بدلہ دیں گے۔

خدا کے داعی کا ساتھ دینا رواج یافتہ مذہبی نظام کو چھوڑ کر غیر رواجی مذہب کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنا ہے۔ اس طرح کا اقدام ہمیشہ آدمی کے لیے مشکل ترین ہوتا ہے۔ اس میں اس فائدہ کو نظر انداز کرنا ہوتا ہے جو انسانوں سے مل رہا ہے۔ اور اس فائدہ کی طرف بڑھنا ہوتا ہے جو خدا سے ملنے والا ہے۔

اس قسم کا فیصلہ کرنے کے لیے واحد چیز جو درکار ہے وہ ''صبر'' ہے۔ یعنی یہ برداشت کہ آدمی کل کے فائدہ کی خاطر آج کا نقصان گوارا کرسکے۔ یہ صلاحیت کہ آدمی نظر آنے والی چیز کے مقابلہ میں اس کو زیادہ اہمیت دے سکے جو نظر نہیں آتی۔ یہ حوصلہ کہ آدمی قربانی کی قیمت پر کسی چیز کو اختیار کرے، نہ کہ محض فوری نفع کی قیمت پر۔ خدا کے جو بندے اس اولوالعزمی کا ثبوت دیں یقیناً وہ اس قابل ہیں کہ خدا ان کو اپنی اعلیٰ ترین نعمتوں سے نوازے۔

جو افراد بے آمیز حق کا ساتھ دینے کی وجہ سے مروجہ نظام میں نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان کو لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ برباد ہوگئے۔ مگر خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو ان کی قربانیوں کا بھرپور معاوضہ دے گا۔ موت کے بعد کی ابدی دنیا میں وہ انھیں نہایت بہتر زندگی سے نوازے گا۔ جن چیزوں کو انھوں نے وقتی طور پر کھویا ہے، ان کو وہ زیادہ بہتر شکل میں ابدی طور پر دے دے گا۔

خدا کا یہ وعدہ عورتوں کے لیے بھی اسی طرح ہے جس طرح وہ مردوں کے لیے ہے۔ خدا کے یہاں جزا کے معاملہ میں عورت اور مرد کی کوئی تقسیم نہیں۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ
الرَّجِيْمِ ﴿٩٨﴾ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٩٩﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى
الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿١٠٠﴾ ع ۱۳ ۱۱ ۱۹

۹۸۔ پس جب تم قرآن کو پڑھو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو۔ ۹۹۔ اس کا زور ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان والے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۱۰۰۔ اس کا زور صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں، اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

قرآن کو پڑھنے کی دوصورتیں ہیں۔ ایک، اپنی نصیحت کے لیے پڑھنا۔ دوسری، دعوت کی خاطر دوسروں کے سامنے پیش کرنا، خواہ قرآن کے الفاظ دُہرائے جائیں یا اس کے مطالب بیان کیے جائیں۔ دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ آدمی شیطان کے مقابلہ میں خدا کی پناہ مانگے۔ تعوذ کا مطلب صرف کچھ مقرر الفاظ کی تکرار نہیں بلکہ اپنے آپ کو شعوری طور پر مسلح کرنا ہے تاکہ شیطان کا حملہ بے اثر ہو کر رہ جائے۔

شیطان ہر وقت آدمی کی گھات میں ہے۔ وہ قرآن کے الفاظ کے مفہوم کو اس کے قاری کے ذہن میں بدل دیتا ہے۔ اور جو چیز متن میں نہ ہو اس کو تفسیر میں شامل کرا دیتا ہے۔ اسی طرح شیطان داعی اور مدعو کے درمیان ایسے فتنے ابھارتا ہے جس کے نتیجے میں دعوت کا عمل رک جائے۔

تاہم شیطان کو خدا نے صرف بہکانے اور ورغلانے کی آزادی دی ہے۔ اس کو یہ طاقت نہیں دی کہ وہ کسی کو بزور گمراہی کے راستے پر ڈال دے۔ جو لوگ خدا سے اپنا ذہنی رابطہ قائم کیے ہوئے ہوں ان پر اس کا کچھ بس نہیں چلتا۔ البتہ جو لوگ خدا سے غافل ہوں اور شیطان کی باتوں پر دھیان دیں ان کے اوپر شیطان مسلط ہو جاتا ہے اور پھر جدھر چاہتا ہے ادھر انھیں لے جاتا ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٠٢﴾

۱۰۱۔ اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ اتارتا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ تم گھڑ لائے ہو۔ بلکہ ان میں اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔ ۱۰۲۔ کہو کہ اس کو روح القدس نے تمھارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ وہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور وہ ہدایت اور خوش خبری ہو فرماں برداروں کے لیے۔

قرآن ایک دعوتی کتاب ہے۔ اس کے مختلف حصے 23 سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا کرکے اترتے رہے۔ دعوت وتربیت کے مصالح کے تحت بعض احکام میں تدریج کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا۔ مثلاً پہلے یہ حکم آیا کہ مخالفوں کے مقابلہ میں صبر کرو۔ اس کے بعد یہ حکم آیا کہ ان سے بطورِ دفاع جنگ کرو۔

اس قسم کی ''تبدیلیوں'' کو لے کر مخالفین یہ کہتے کہ قرآن خدا کی کتاب نہیں۔ یہ محمد کی اپنی تصنیف ہے، جس کو انھوں نے خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اگر وہ خدا کی طرف سے ہوتی تو اس میں کبھی اس قسم کی تبدیلیاں نہ ہوتیں۔

مخالفین اگر قرآن کے معاملہ میں سنجیدہ ہوتے اور تبدیلی کے واقعہ کو صحیح رخ سے دیکھتے تو اس میں انھیں

تدریج فی الاحکام کی حکمت نظر آتی۔ مگر جب انھوں نے اس کو غلط رخ سے دیکھا تو تبدیلی کا واقعہ انھیں انسانی علم کی کمی کا نتیجہ نظر آیا، جس چیز میں ان کے لیے تصدیق کا سامان چھپا ہوا تھا اس کو انھوں نے اپنے لیے افترا کا ذریعہ بنالیا۔

قرآن کو حق کے ساتھ اتارا گیا ہے —— یہاں حق سے مراد خدا کا خالص اور بے آمیز دین ہے۔ جو لوگ سچائی کے طالب ہوں اور ملاوٹی دینوں میں اطمینان نہ پاتے ہوں، ان کے لیے قرآنی دین میں اپنی تلاش کا جواب بھی ہے اور ان کی تسکین قلب کا سامان بھی۔

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ
بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ
وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَ
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

۱۰۳۔ اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک آدمی سکھاتا ہے۔ جس شخص کی طرف وہ منسوب کرتے ہیں، اس کی زبان عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی زبان ہے۔ ۱۰۴۔ بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے، اللہ ان کو کبھی راہ نہیں دکھائے گا اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ ۱۰۵۔ جھوٹ تو وہ لوگ گھڑتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

مکہ میں کچھ عجمی غلام تھے۔ ان کے نام تفسیر کی کتابوں میں حبر، یسار، عائش، یعیش وغیرہ آئے ہیں۔ اس ضمن میں سلمان فارسی کا نام بھی لیا گیا ہے جو بعد کو مسلمان ہو گئے۔ یہ غلام یا یہودی تھے یا نصرانی۔ اس بنا پر وہ قدیم آسمانی مذاہب، یہودیت اور نصرانیت کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔ ان میں سے کسی کی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس طرح کی ملاقاتوں کو بنیاد بنا کر قریش کے لیڈروں نے کہا کہ ''یہی عجمی لوگ محمد کو کچھ باتیں بتا دیتے ہیں اور وہ ان کو خدائی کلام بتا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں''۔

یہ مضحکہ خیز بات انھوں نے کیوں کہی۔ اس کی وجہ وہی عام برائی ہے جو ہر زمانہ میں اور ہمیشہ دنیا میں پائی گئی ہے۔ وہ ہے —— اپنے ہم عصر کو میرٹ کی سطح پر نہ پہچاننا۔ قریش کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک معاصر شخصیت تھے، اس لیے وہ آپ کو پہچاننے اور آپ کی قدر کرنے میں ناکام رہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ معاصرانہ نفسیات کے فتنہ میں مبتلا ہوں وہ کبھی حق کو قبول کرنے کی توفیق نہیں پاتے۔ وہ حق کو مان لینے کے بجائے یہ کرتے ہیں کہ حق کے علم بردار کے خلاف جھوٹی باتیں گھڑتے رہتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر داعی کی شخصیت کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ اسی میں مشغول رہتے ہیں، یہاں تک کہ مر کر خدا کی پکڑ کے مستحق بن جاتے ہیں۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٦﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠٧﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٠٨﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٠٩﴾

۱۰۶۔ جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ سے منکر ہوگا، سوائے اس کے جس پر زبردستی کی گئی ہو بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو، لیکن جو شخص دل کھول کر منکر ہوجائے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا اور ان کو بڑی سزا ہوگی۔ ۱۰۷۔ یہ اس واسطے کہ انھوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کیا اور اللہ منکروں کو راستہ نہیں دکھاتا۔ ۱۰۸۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر مہر کردی۔ اور یہ لوگ بالکل غافل ہیں۔ ۱۰۹۔ لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ لوگ گھاٹے میں رہیں گے۔

خدا کے یہاں حقیقت کا اعتبار کیا جاتا ہے، نہ کہ محض ظاہر کا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں انسان کے ساتھ بہت رعایت کی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص دل سے خدا کا سچا وفادار ہو مگر سخت مجبوری کی حالت میں اپنی جان بچانے کے لیے وقتی طور پر کوئی خلافِ ایمان کلمہ کہہ دے تو خدا کے یہاں اس پر اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔ مگر وہ لوگ خدا کے یہاں ناقابلِ معافی ہیں جو اندر سے بدل چکے ہوں۔ جو شیطانی شبہات یا حالات کے دباؤ سے متاثر ہو کر دل کی رضامندی سے کسی اور راستہ پر چل پڑیں۔

جب آدمی ایمان کے بجائے غیر ایمان کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کی وجہ ہمیشہ دنیا پرستی ہوتی ہے۔ وہ دنیوی مفاد کو خطرہ میں دیکھ کر غیر مومنانہ روش پر چل پڑتا ہے۔ اگر وہ آخرت کی قدر و قیمت کو سمجھتا تو دنیا کا مفاد اس کو اتنا حقیر نظر آتا کہ اس کو یہ بات بالکل لغو معلوم ہوتی کہ دنیا کی خاطر وہ آخرت کو چھوڑ دے۔

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے فائدے اگر کسی کے نزدیک اہم ترین بن جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ معاملات کو آخرت کے نقطۂ نظر سے سوچ نہیں پاتا۔ وہ دیکھتا اور سنتا ہے مگر دنیا کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے چیزوں کا اخروی پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ وہ اسی پہلو کو دیکھ پاتا ہے جو دنیوی مصالح سے تعلق رکھتے ہوں۔ جو لوگ غفلت کے اس مرتبہ کو پہنچ جائیں ان کے حصہ میں ابدی نقصان کے سوا اور کچھ نہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٠﴾ يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ ع

۱۱۰۔ پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے آزمائش میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور قائم رہے تو ان باتوں کے بعد بے شک تیرا رب بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۱۱۱۔ جس

نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

دن ہر شخص اپنی ہی طرف داری میں بولتا ہوا آئے گا۔ اور ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

ماحول پر ناحق کا غلبہ ہو، اس وقت کوئی شخص حق کو قبول کرلے تو وہ سخت آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ چاروں طرف سے ماحول کا دباؤ زور کرتا ہے کہ آدمی دوبارہ رواجی دین کی طرف لوٹ جائے۔ ایسی حالت میں اگر وہ حق پر قائم رہے، وہ ہر چیز حتیٰ کہ جائداد اور وطن کو چھوڑ دے مگر حق کو نہ چھوڑے تو وہ مہاجر اور مجاہد ہے۔ اور اللہ کی نظر میں بہت بڑے ثواب کا مستحق ہے۔

دنیا کی آزمائش میں جو چیز حق پر ثابت قدم رکھنے والی ہے وہ صرف آخرت کی یاد ہے۔ ہر آدمی پر بہت جلد ایک ہولناک دن آنے والا ہے۔ وہ دن ایسا سخت ہوگا کہ آدمی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں تک کو بھول جائے گا۔ وہاں نہ کوئی شخص کسی کی طرف سے بول سکے گا اور نہ کوئی شخص کسی کا سفارشی بن کر کھڑا ہوگا۔ اگر آدمی کو اس آنے والے دن کا احساس ہو تو اس کا یہی حال ہوگا کہ وہ ہر قسم کا نقصان گوارا کرلے گا مگر حق کو کبھی نہ چھوڑے گا۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۲۔ اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن و اطمینان میں تھے۔ ان کو ان کا رزق فراغت کے ساتھ ہر طرف سے پہنچ رہا تھا۔ پھر انھوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کو ان کے اعمال کے سبب سے بھوک اور خوف کا مزا چکھایا۔ ۱۱۳۔ اور ان کے پاس ایک رسول انھیں میں سے آیا تو اس کو انھوں نے جھوٹا بتایا، پھر ان کو عذاب نے پکڑ لیا اور وہ ظالم تھے۔

انسانوں کی کوئی آبادی اطمینان کی حالت میں ہو اور اس کے درمیان رزق کی فراوانی ہو۔ پھر خدا اپنے کسی بندے کو ان کے درمیان کھڑا کرے جو ان کو حق کی طرف بلائے تو ایسی حالت میں ہمیشہ دو میں سے کوئی ایک صورت پیش آتی ہے۔ یا تو یہ آبادی حق کو قبول کرکے مزید خدائی انعامات کی مستحق بنے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر یہ ہوتا کہ اس پر طرح طرح کے حادثات گزرتے ہیں۔ یہ حادثات اس کے حق میں خدائی عذاب نہیں ہوتے بلکہ خدائی تنبیہات ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ چوکنے ہوجائیں۔ ان کی حساسیت جاگے اور وہ خدا کے داعی کی پکار پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہوجائیں۔

اگر اس قسم کی تنبیہات کارگر نہ ہوں تو دعوت کی تکمیل کے بعد دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ اس قوم کو ہلاک کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کے عالم میں پہنچ کر اپنے ابدی انجام کو بھگتے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۴۔ سو جو چیزیں اللہ نے تم کو حلال اور پاک دی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔ ۱۱۵۔ اس نے تو تم پر صرف مردار کو حرام کیا ہے اور خون کو اور سور کے گوشت کو اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو جائے بشرطیکہ وہ نہ طالب ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو، تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

اس آیت کا تعلق روزمرّہ کھانے والی چیزوں سے ہے۔ خدا نے جو قابلِ خوراک چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں چند متعین چیزوں کو چھوڑ کر بقیہ سب انسان کے لیے حلال ہیں۔ تاہم قدیم مشرک انسان نے یہ کیا کہ خدا کی حلال کی ہوئی بہت سی غذاؤں کو بطور خود اپنے لیے حرام کر لیا۔ جدید ملحد انسان نے اس کے برعکس یہ کیا ہے کہ خدا کی حرام کی ہوئی بہت سی غذاؤں کو بطور خود اپنے لیے حلال ٹھہرا لیا۔ یہ دونوں چیزیں اس روح کی قاتل ہیں جس کو غذائی نعمتوں کے ذریعے انسان کے اندر پیدا کرنا مقصود ہے۔

غذا انسان کی تمام ضرورتوں میں سب سے زیادہ اہم ضرورت ہے جس کا ہر انسان کو صبح وشام تجربہ ہوتا ہے۔ خدا کو یہ مطلوب ہے کہ آدمی جب غذا کا استعمال کرے تو وہ اس کو خدا کا عطیہ سمجھ کر کھائے اور اس پر خدا کا شکر ادا کرے۔ مگر انسان نے پورے معاملہ کو الٹ دیا۔

قدیم مشرکانہ دور میں اس نے ان غذاؤں کو دیوتاؤں کے ساتھ منسوب کیا اور اس طرح ان کو خدا کے بجائے دیوتاؤں کی یاد کا ذریعہ بنا دیا۔ جدید ملحدانہ زمانہ میں یہ ہوا ہے کہ انسان نے سارے معاملہ کو اپنی لذتِ نفس کے تابع کر دیا۔ اس نے خدا کی حرام غذاؤں کو بھی اپنے لیے حلال ٹھہرا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزیں اس کے لیے صرف اپنی لذت کا دسترخوان بن کر رہ گئیں۔

مجبوری کی حالت میں اگر کوئی شخص خدا کے غذائی قانون کو بدلے تو وہ ندامت کے جذبے کے تحت ایسا کرے گا، نہ کہ سرکشی کے جذبہ کے تحت۔ اس لیے اس سے نفسیاتِ انسانی میں کوئی خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا

۱۱۶۔ اور اپنی زبانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹ کی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے، اور یہ حرام ہے کہ تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹی تہمت لگائیں گے وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ ۱۱۷۔ وہ

يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت کا تعلق عام قانون سازی سے نہیں ہے بلکہ غذائی چیزوں میں حرام وحلال مقرر کرنے سے ہے۔ انسان ہمیشہ یہ کرتا رہا ہے کہ وہ کھانے کی چیزوں میں بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھہراتا ہے۔ ایسا یا تو توہمات کے تحت ہوتا ہے یا خواہشات کے تحت۔ مگر اس کو کرنے والے اس کو مذہب کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔

مذکورہ قسم کی تحریم وتحلیل کا یہ نقصان ہے کہ اس سے لوگوں میں توہم پرستی اور خواہش پرستی کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ آدمی کے لیے صحیح بات یہ ہے کہ وہ دنیا میں خدا پرست بن کر رہے۔

موجودہ زندگی میں امتحان کی وجہ سے انسان کو آزادی حاصل ہے۔ توہمات اور خواہشات کو اپنا دین بنانے کا موقع ملنے کی وجہ یہی آزادی ہے۔ جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو اچانک انسان پائے گا کہ اس کے لیے ایک ہی ممکن راستہ تھا۔ یعنی خدا پرستی کو اپنا دین بنانا۔ اس کے علاوہ جن چیزوں کو اس نے اپنایا، وہ صرف امتحانی آزادی کا غلط استعمال تھا، نہ کہ اس کا کوئی جائز حق۔ اس وقت اس کو وہی سزا بھگتنی پڑے گی، جو امتحان میں ناکام ہونے والوں کے لیے مقدر ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ اور یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کردی تھیں جو ہم اس سے پہلے تم کو بتا چکے ہیں کہ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔

یہود کی مذہبی کتابوں میں بعض ایسی کھانے کی چیزیں حرام ہیں جو اسلام کی شریعت میں حرام نہیں کی گئی ہیں (النساء، 4:160)۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ خود خدا نے دو قسم کے احکام دئے ہیں۔ یہود پر بھی اصلاً وہی غذائی چیزیں حرام ٹھیرائی گئی تھیں جو یہاں (النحل، آیت 115) میں مذکور ہیں۔ مگر بعد کو یہود نے خود ساختہ تصورات کے تحت کچھ جائز چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرلیا۔ پیغمبروں کی فہمائش کے باوجود وہ اپنے اس خود ساختہ دین کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔

مزید یہ کہ اولاً انھوں نے خدا کے حلال کو حرام کیا اور اس طرح اپنے آپ کو ناحق مصیبتوں میں ڈالا۔ اور پھر جب وہ اس حرام پر قائم نہ رہ سکے تو عقیدۃً اس کو حرام سمجھتے ہوئے عملاً اس کو اپنے لیے جائز بنالیا۔ اس طرح وہ دہرے مجرم بن گئے۔

آدمی اگر کسی خود ساختہ نظریہ کے تحت ایک جائز چیز کو اپنے لیے ناجائز بنالے اور اس کی خاطر قربانیاں دینا شروع کردے، تو یہ محض اپنی جان پر ظلم کرنا ہوگا، نہ کہ خدا کے راستے میں قربانی پیش کرنا۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ ع ۱۵ ۹ ۲۱

۱۱۹۔ پھر تمھارا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے جہالت سے برائی کرلی، اس کے بعد توبہ کیا اور اپنی اصلاح کی تو تمھارا رب اس کے بعد بخشنے والا، مہربان ہے۔

جب برائی کے ساتھ سرکشی اور تعصب کے جذبات اکٹھا ہوجائیں تو آدمی اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، خواہ اس کے عمل کو غلط ثابت کرنے کے لیے کتنے ہی دلائل دیے جائیں۔ مگر برائی کی دوسری قسم وہ ہے جو محض نادانی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ آدمی بے خبری میں یا نفس سے مغلوب ہوکر کوئی غلطی کربیٹھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر عام طور پر ڈھٹائی نہیں ہوتی۔ جب دلیل سے اس پر اس کی غلطی واضح ہوجائے تو وہ فوراً پلٹ آتا ہے اور دوبارہ اپنے کو صحیح رویہ پر قائم کرلیتا ہے۔

پہلی قسم کے لوگوں کے لیے معافی کا کوئی سوال نہیں۔ مگر دوسری قسم کے لوگوں کے لیے یہ بشارت ہے کہ خدا انھیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے گا کیوں کہ وہ اپنے بندوں پر بہت زیادہ مہربان ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ؕ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

۱۲۰۔ بے شک ابراہیم ایک الگ امت تھا، اللہ کا فرماں بردار، اور اس کی طرف یکسو، اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ ۱۲۱۔ وہ اس کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا۔ خدا نے اس کو چن لیا۔ اور سیدھے راستے کی طرف اس کی رہنمائی کی۔ ۱۲۲۔ اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی بھلائی دی اور آخرت میں بھی وہ اچھے لوگوں میں سے ہوگا۔ ۱۲۳۔ پھر ہم نے تمھاری طرف وحی کی کہ ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو یکسو تھا اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔

حضرت ابراہیم کو قرآن میں خدا کے مطلوب انسان کے نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ انسانوں کے لیے نمونہ کیسے بنے۔ اس لیے کہ وہ ماحول کے بگاڑ کے علی الرغم تنہا ایمان پر قائم ہونے والے انسان تھے۔ وہ اکیلے خدا کے لیے کھڑے ہوئے جب کہ اس راہ میں کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہ تھا۔

حضرت ابراہیم پوری طرح اپنے آپ کو خدا کی پابندی میں دیے ہوئے تھے۔ انھوں نے عالم گیر مشرکانہ ماحول میں اپنے آپ کو توحید کے لیے یکسو کرلیا تھا۔ وہ تمام چیزوں کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھتے تھے اور ان

کے لیے ان کا دل خدا کے شکر کے جذبہ سے بھرا رہتا تھا۔حضرت ابراہیم کے اس کمالِ ایمان کی وجہ سے خدا نے ان پر اپنی ہدایت کی راہیں کھول دیں اور ان کو پیغمبری کے لیے چن لیا تاکہ وہ دنیا والوں کو خدا کے دین سے آگاہ کریں۔

حضرت ابراہیم کو دنیا کا حسنہ (بہتری) دی گئی اور آخرت کی بہتری بھی۔ یہ معلوم ہے کہ دنیا میں حضرت ابراہیم کو نہ عوام کی بھیڑ ملی، نہ اقتدار کا تخت، اور نہ اور کوئی دنیوی رونق کی چیز۔اس کے باوجود قرآن کی یہ گواہی ہے کہ ان کو خدا کی طرف سے دنیا کی بہتری ملی تھی۔اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی نظر میں دنیا کی بہتری نہ عوامی مقبولیت کا نام ہے اور نہ دولت وحکومت کا۔ بلکہ دنیا کی بہتری خدا کی نظر میں اصلاً وہی چیزیں ہیں جن کو یہاں حضرت ابراہیم کی خصوصیات کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۲۴

۱۲۴۔سبت انھیں لوگوں پر عائد کیا گیا تھا جنھوں نے اس میں اختلاف کیا تھا۔ اور بے شک تمھارا رب قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کردے گا جس بات میں وہ اختلاف کررہے تھے۔

ہفتہ کا ایک دن تمام شریعتوں میں اجتماعی عبادت کا دن رہا ہے۔ یہود اس کو سنیچر (سبت) کے دن مناتے ہیں۔عیسائی اتوار کے دن۔اور مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ جمعہ کے دن اس کا اہتمام کریں۔

یہود کے بزرگوں نے موشگافیاں کرکے بطور خود سبت (sabbath) کے لیے نئے نئے ضوابط بنائے اور اپنے آپ کو مصنوعی پابندیوں میں جکڑ لیا۔ پھر جب ان پابندیوں پر عمل کرنا ان کو ناممکن معلوم ہوا تو اپنے بزرگوں کے تقدس کی وجہ سے وہ ان کو رد نہ کرسکے۔البتہ عملی طور پر انھوں نے ان کے خلاف چلنا شروع کردیا۔

خدا کے دین میں بعد کے عالموں اور بزرگوں نے اپنی تشریحات سے جو اختلافات پیدا کیے ان کا فیصلہ دنیا میں ہونے والا نہیں۔مگر جب قیامت آئے گی تو خدا بتادے گا کہ اصل آسمانی دین کیا تھا اور وہ کیا چیزیں تھیں جو لوگوں نے اپنی طرف سے اضافہ کرکے دین میں شامل کردیں۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۲۵

۱۲۵۔ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقہ سے بحث کرو۔ بے شک تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ پر چلنے والے ہیں۔

دعوت کا عمل ایک ایسا عمل ہے جو انتہائی سنجیدگی اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت ابھرتا ہے۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے سامنے داعی بن کر کھڑا ہو۔ وہ دوسروں کو

اس لیے پکارتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اگر میں نے ایسا نہ کیا تو میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں گا۔ اس نفسیات کا قدرتی نتیجہ ہے کہ آدمی کا دعوتی عمل وہ انداز اختیار کرلیتا ہے جس کو حکمت، موعظت حسنہ اور جدال احسن کہا گیا ہے۔

حکمت سے مراد دلیل و برہان ہے۔ کوئی دعوتی عمل اسی وقت حقیقی دعوتی عمل ہے جب کہ وہ ایسے دلائل کے ساتھ ہو جس میں مخاطب کے ذہن کی پوری رعایت شامل ہو۔ مخاطب کے نزدیک، کسی چیز کے ثابت شدہ چیز ہونے کی جو شرائط ہیں، ان شرائط کی تکمیل کے ساتھ جو کلام کیا جائے اسی کو یہاں حکمت کا کلام کہا گیا ہے۔ جس کلام میں مخاطب کی ذہنی وفکری رعایت شامل نہ ہو وہ غیر حکیمانہ کلام ہے۔ اور ایسا کلام کسی کو داعی کا مرتبہ نہیں دے سکتا۔

موعظتِ حسنہ اس خصوصیت کا نام ہے جو دردمندی اور خیر خواہی کی نفسیات سے کسی کے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ جس داعی کا یہ حال ہو کہ خدا کے عظمت وجلال کے احساس سے اس کی شخصیت کے اندر بھونچال آ گیا ہو جب وہ خدا کے بارے میں بولے گا تو یقینی طور پر اس کے کلام میں عظمتِ خداوندی کی بجلیاں چمک اٹھیں گی، جو داعی جنت اور جہنم کو دیکھ کر دوسروں کو اسے دکھانے کے لیے اٹھے، اس کے کلام میں یقینی طور پر جنت کی بہاریں اور جہنم کی ہولناکیاں گونجتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ان چیزوں کی آمیزش داعی کے کلام کو ایسا بنا دے گی جو دلوں کو پگھلا دے اور آنکھوں کو اشک بار کر دے۔

دعوتی کلام کی ایجابی خصوصیات یہی دو ہیں — حکمت اور موعظت حسنہ۔ تاہم ہمیشہ دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو غیر ضروری بحثیں کرتے ہیں۔ جن کا مقصد الجھانا ہوتا ہے، نہ کہ سمجھنا سمجھانا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں مذکورہ قسم کا داعی جو انداز اختیار کرتا ہے، اسی کا نام جِدَال بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ہے۔ وہ ٹیڑھی بات کا جواب سیدھی بات سے دیتا ہے، وہ سخت الفاظ سن کر بھی اپنی زبان سے نرم الفاظ نکالتا ہے۔ وہ الزام تراشی کے مقابلہ میں استدلال اور تجزیہ کا انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ اشتعال کے اسلوب کے جواب میں صبر کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔

داعی حق کی نظر سامنے کے انسان کی طرف نہیں ہوتی بلکہ اس خدا کی طرف ہوتی ہے جو سب کے اوپر ہے۔ اس لیے وہ وہی بات کہتا ہے جو خدا کے میزان میں حقیقی بات ٹھہرے، نہ کہ انسان کی میزان میں۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ
وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَ
اصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ
عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ
مُحْسِنُونَ ﴿١٢٨﴾ ع ١٦ ٩ ٢٢

۱۲۶۔ اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے۔ ۱۲۷۔ اور صبر کرو اور تمہارا صبر خدا ہی کی توفیق سے ہے اور تم ان پر غم نہ کرو اور جو کچھ تدبیریں وہ کر رہے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو۔ ۱۲۸۔ بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیز گار ہیں اور جو نیکی کرنے والے ہیں۔

یہاں داعی کا وہ کردار بتایا گیا ہے جو مخالفین کے مقابلہ میں اس کو اختیار کرنا ہے۔ فرمایا کہ اگر مخالفین کی

طرف سے ایسی تکلیف پہنچے جس کو تم برداشت نہ کرسکو تو تم کو اتنا ہی کرنے کی اجازت ہے جتنا تمھارے ساتھ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ اجازت صرف انسان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے بطور رعایت ہے۔ ورنہ داعی کا اصل کردار تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی ہر تکلیف پر صبر کرے۔ وہ مدعو سے حساب چکانے کے بجائے ایسے تمام معاملات کو خدا کے خانہ میں ڈال دے۔

مخاطب اگر حق کو نہ مانے۔ وہ اس کو مٹانے کے درپے ہو جائے تو اس وقت داعی کو سب سے بڑی تدبیر جو کرنی ہے وہ صبر ہے۔ یعنی ردعمل کی نفسیات یا جوابی کارروائیوں سے بچتے ہوئے مثبت طور پر حق کا پیغام پہنچاتے رہنا۔ داعی کو اصلاً جو ثبوت دینا ہے وہ یہ کہ وہ فی الواقع اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اس کے اندر وہ کردار پیدا ہو چکا ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آدمی دنیا کے پردوں سے گزر کر خدا کو اس کی چھپی ہوئی عظمتوں کے ساتھ دیکھ لے۔ اگر داعی یہ ثبوت دے دے تو اس کے بعد بقیہ امور میں خدا اس کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دعوت کے مخالفین کی کوئی تدبیر داعی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی، خواہ وہ تدبیر کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی نگاہیں انسانوں میں اٹکی ہوئی ہوں۔ جن کو بس انسانوں کی کارروائیاں دکھائی دیتی ہوں۔ دوسرے وہ لوگ جن کی نگاہیں خدا میں اٹکی ہوئی ہوں۔ جو خدا کی طاقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ پہلی قسم کے لوگ کبھی صبر پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف دوسری قسم کے انسان ہیں جن کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں کو سہہ لیں۔ اور جو کچھ خدا کی طرف سے ملنے والا ہے اس کی خاطر اس کو نظر انداز کر دیں جو انسان کی طرف سے مل رہا ہے۔

داعی کو جس طرح جوابی نفسیات سے پرہیز کرنا ہے اسی طرح اس کو جوابی کارروائی سے بھی اپنے آپ کو بچانا ہے۔ مخالفین کی سازشیں اور تدبیریں بظاہر ڈراتی ہیں کہ کہیں وہ دعوت اور داعی کو تہس نہس نہ کر ڈالیں۔ مگر داعی کو ہر حال میں خدا پر بھروسہ رکھنا ہے۔ اس کو یہ یقین رکھنا ہے کہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اور وہ یقیناً دعوت حق کا ساتھ دے کر باطل پرستوں کو ناکام بنا دے گا۔

١٧۔ سُوْرَةُ بَنِیْ اِسْرَآءِیْل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

☆١۔ پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے، تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک واقعہ وہ گزرا جس کا یہاں ذکر کیا گیا۔ ہجرت سے ایک سال پہلے مکہ کے حالات بے حد سخت تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے ختم ہوجائے گی۔ عین اس وقت اللہ نے پیغمبر اسلام کو ایک عظیم نشانی دکھائی۔ یہ نشانی اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ تھا کہ اسلام کی تاریخ نہ صرف یہ کہ اپنی تکمیل تک پہنچے گی۔ بلکہ اس کے گرد ایسے عملی حالات جمع کیے جائیں گے کہ وہ ابدی طور پر زندہ اور محفوظ رہے۔ کیوں کہ اب اسی کو قیامت تک تمام قوموں کے لیے خدا کے دین کا مستند ماخذ قرار پانا ہے۔

اللہ اپنے خصوصی اہتمام کے تحت پیغمبر اسلام کو مکہ سے فلسطین (بیت المقدس) لے گیا۔ یہ جسمانی یا روحانی سفر آپ کے سفر معراج کی پہلی منزل تھی۔ یہاں بیت المقدس میں پچھلے تمام پیغمبر بھی جمع تھے۔ ان سب نے مل کر باجماعت نماز ادا کی اور پیغمبر اسلام نے آگے کھڑے ہو کر ان سب کی امامت فرمائی۔ آپ کی امامت کا یہ واقعہ گویا اس خدائی فیصلہ کی ایک علامت تھا کہ پچھلی تمام نبوتیں اب ہدایتِ الٰہی کے مستند ماخذ کی حیثیت سے منسوخ کردی گئیں۔ اب خدائی ہدایت کو جاننے کے لیے تمام قوموں کو پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے دین کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس اہم تقریب کو انجام دینے کے لیے فلسطین موزوں ترین جگہ تھی۔ فلسطین پچھلے اکثر انبیاء کا مرکزِ دعوت رہا ہے۔ اس لیے خدا نے اپنے اس فیصلہ کے اظہار کے لیے اسی خاص علاقہ کا انتخاب فرمایا۔

اسراء کا واقعہ گویا مستقبل کے ایک عظیم انقلاب کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے نظریاتی انقلاب کا آغاز کیا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان کے لیے ممکن ہوجائے گا کہ وہ ایک رات میں دور کی کسی منزل کا سفر کرے اور پھر اسی رات کو دوبارہ اپنے مقام پر واپس آجائے (تفصیل کے لیے دیکھیے: اسلام دورِ جدید کا خالق)۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝۲ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳

۲۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بناؤ۔ ۳۔ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا، بے شک وہ ایک شکر گزار بندہ تھا۔

اسراء کے مذکورہ واقعہ کا مطلب یہ تھا کہ بنی اسرائیل (یہود) کو حاملِ کتاب کے مقام سے معزول کردیا گیا اور ان کی جگہ بنو اسماعیل کو کتابِ الٰہی کا حامل بنادیا گیا۔ یہ واقعہ خدا کی سنت کے تحت عمل میں آیا۔ خدا اس دنیا میں حق کے اعلان کے لیے کسی متعین گروہ کو منتخب کرتا ہے۔ یہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو اس دنیا میں کسی کو ملتا ہے۔

تاہم یہ انتخاب نسل یا قوم کی بنیاد پر نہیں ہے۔ اس کا استحقاق کسی گروہ کے لیے صرف اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے لیے ضروری اہلیت کا ثبوت دے۔ اہلیت کے ختم ہوتے ہی اس کا استحقاق بھی ختم ہوجاتا ہے۔ امّتِ آدم، امّتِ نوح، امتِ موسیٰ، امتِ مسیح، ہر ایک کے ساتھ یہ واقعہ ہوچکا ہے۔ آئندہ امت کے

لیے بھی خدا کا قانون یہی ہے، اس میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔

اس منصب کے لیے جو اہلیت درکار ہے، وہ یہ کہ خدا کے سوا کسی کو وکیل (کارساز) نہ بنایا جائے۔ صرف ایک خدا پر سارا بھروسہ کرکے اپنے تمام معاملات اس کے حوالے کردئے جائیں۔

خدا کو جب آدمی اس کی تمام عظمتوں اور قدرتوں کے ساتھ پاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کو اپنا وکیل بنالیتا ہے۔ جس شخص کو خدا کی حقیقی معرفت ہوجائے، اس کا حال یہی ہوگا کہ وہ اس دنیا میں خدا کو اپنا سب کچھ بنالے گا۔ جو لوگ اس طرح خدا کو پالیں وہی موجودہ دنیا میں مومنانہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ مومنانہ زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو تمام مخلوقات سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ اور تمام مخلوقات سے وہی شخص اوپر اٹھ سکتا ہے جو سب سے بڑی چیز— مخلوقات کے خالق و مالک کو پالے۔

دعوتِ حق کی ذمہ داری بھی وہی لوگ صحیح طور پر ادا کرسکتے ہیں جن کو خدا کی معرفت کا یہ درجہ حاصل ہوجائے۔ دعوتِ حق کے لیے کامل بے غرضی اور کامل یکسوئی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اور کامل بے غرضی اور کامل یکسوئی اس کے بغیر کسی کے اندر پیدا نہیں ہوسکتی کہ اس کی تمام امیدیں اور اندیشے خدا سے وابستہ ہوچکے ہوں، خدا ہی اس کا سب کچھ بن چکا ہو۔

وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴﴾ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ﴿۵﴾ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ﴿۶﴾

۴۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں بتادیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین (شام) میں خرابی کروگے اور بڑی سرکشی دکھاؤگے۔ ۵۔ پھر جب ان میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے بھیجے، نہایت زور والے۔ وہ گھروں میں گھس پڑے اور وعدہ پورا ہوکر رہا۔ ۶۔ پھر ہم نے تمھاری باری ان پر لوٹا دی اور مال اور اولاد سے تمھاری مدد کی اور تم کو زیادہ بڑی جماعت بنادیا۔

یہاں فساد سے مراد دینی بگاڑ ہے جو حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے درمیان ظاہر ہوا۔ اس کے دو دور ہیں۔ پہلے دور کے بگاڑ کی تفصیلات پرانے عہدنامہ میں زبور، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے دور کے بگاڑ کی تفصیل حضرت مسیح کی زبان سے ہے جو نئے عہدنامہ میں متی اور لوقا کی انجیلوں میں موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے اٹھا کر بیت المقدس لے جایا گیا تا کہ ''آپ کو خدا کی نشانیاں دکھائی جائیں''۔ ان نشانیوں میں سے ایک نشانی وہ تاریخ بھی ہے جو بیت المقدس سے وابستہ ہے۔

یہ تاریخ دراصل خدا کے ایک قانون کا ظہور ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ آسمانی کتاب کی حامل قوم اگر کتاب

الٰہی کے حقوق ادا کرے تو اس کو (آخرت کی کامیابی کے علاوہ) دنیا میں سرفرازی دی جائے۔ اور اگر وہ کتاب کے حقوق ادا نہ کرے تو اس کو دنیا کی جابر قوموں کے حوالے کر دیا جائے جو اس کو اپنے ظلم واستغلال کا نشانہ بنائیں۔ یہ گویا ایک علامت ہے جو اسی دنیا میں بتا دیتی ہے کہ خدا اس قوم سے خوش ہے یا ناخوش۔

اس قانون کا ظہور سابق حاملینِ کتاب (یہود) پر بار بار ہوا ہے جن میں سے دو نمایاں واقعات کا یہاں بطور نصیحت حوالہ دیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل پر اولاً خدا نے یہ انعام کیا کہ ان کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائی اور پھر حضرت موسیٰ کے بعد ان کے لیے ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ فلسطین پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت قائم کر سکیں۔ مگر بعد کو یہود کے اندر بگاڑ آ گیا۔ ایک طرف وہ مشرک قوموں پر داعی بننے کے بجائے خود ان کے مدعو بن گئے اور ان کے اثر سے مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہو گئے۔ دوسری طرف وہ آپس کے اختلاف کا شکار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

خدا کی نافرمانی کے نتیجہ میں بنی اسرائیل پر جو کچھ گزرا اس میں سے ایک نمایاں واقعہ بابل (عراق) کے بادشاہ نبوکدنضر کا ہے۔ یہود کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر نبوکدنضر نے فلسطین پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔ اس کے بعد اس نے خود یہود کے شاہی خاندان میں سے ایک شخص کو اپنا نمائندہ بنا دیا کہ وہ اس کی طرف سے ان کے اوپر حکومت کرے۔ مگر یہود نے اس ''ماتحتی'' کو اپنے قومی فخر کے خلاف سمجھا اور اس کے خلاف بغاوت کے درپے ہو گئے۔ ان کے اندر ایسے شاعر اور مقرر پیدا ہوئے جنھوں نے پرجوش انداز میں یہود کو ابھارنا شروع کیا۔ یہود کے پیغمبر یرمیاہ نے متنبہ کیا کہ یہ سب جھوٹے لیڈر ہیں۔ تم ان کے فریب میں نہ آؤ۔ تم اپنی موجودہ کمزوریوں کے ساتھ شاہ بابل کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے بجائے تم ایسا کرو کہ شاہ بابل کی سیاسی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی دینی اصلاح اور تعمیری جدوجہد میں لگ جاؤ یہاں تک کہ اللہ آئندہ تمھارے لیے مزید راہیں پیدا کر دے۔ مگر یہود نے یرمیاہ نبی کی نصیحت کو نہیں مانا۔ خوش فہم لیڈروں کی باتوں میں آ کر انھوں نے شاہ بابل کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس کے بعد شاہ بابل سخت غضب ناک ہو گیا۔ اس نے دوبارہ 586 ق م میں اپنی پوری طاقت سے فلسطین پر حملہ کیا۔ یہود کو مکمل شکست ہوئی۔ شاہ بابل نے نہ صرف یہود کو زبردست دنیوی نقصانات پہنچائے بلکہ یروشلم میں یہود کے عبادت خانہ کو مکمل طور پر ڈھا دیا جو یہود کی عظمت کا آخری نشان تھا۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ

۷۔ اگر تم اچھا کام کرو گے تو تم اپنے لیے اچھا کرو گے اور اگر تم برا کام کرو گے تب بھی اپنے لیے برا کرو گے۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اور بندے بھیجے کہ وہ تمھارے چہرے کو بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں گھس جائیں جس طرح وہ اس میں پہلی بار گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا زور چلے اس کو برباد کر دیں۔ ۸۔ بعید نہیں

اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ⑧

کہ تمھارا رب تمھارے اوپر رحم کرے۔ اور اگر تم پھر وہی کروگے تو ہم بھی وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو منکرین کے لیے قید خانہ بنادیا ہے۔

حوادث کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے اندر رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوئی تو خدا نے دوبارہ ان کی مدد کی۔ اس بار خدا نے شاہ ایران سائرس (خسرو) کو اٹھایا۔ اس نے 539 ق م میں بابل پر حملہ کیا، اور اس کی حکومت کو شکست دے کر اس کے اوپر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اس نے یہود پر یہ مہربانی کی کہ ان کو دوبارہ بابل سے ان کے وطن فلسطین جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ واپس آئے اور ایک عرصہ کے بعد دوبارہ اپنا عبادت خانہ تعمیر کیا۔

تاہم یہود کی نئی نسل میں دوبارہ وہی بگاڑ پیدا ہونے لگا جو ان کی پچھلی نسل میں پیدا ہوا تھا۔ اس درمیان میں ان کے اندر مختلف اتار چڑھاؤ آئے۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان حضرت یحییٰ اور حضرت مسیح اٹھے۔ ان پیغمبروں نے یہود کی روش پر تنقیدیں کیں۔ ان کی اس بے دینی کو کھولا جو وہ دین کے نام پر کر رہے تھے۔ مگر یہود اس تنقید وتجزیہ کا اثر قبول کرنے کے بجائے بگڑ گئے۔ حتی کہ انھوں نے حضرت یحییٰ کو قتل کردیا اور حضرت مسیح کو سولی پر چڑھانے کے لیے تیار ہوگئے۔

اب دوبارہ ان پر خدا کا غضب بھڑکا۔ 70ء میں رومی بادشاہ تیتس (Titus) اٹھا اور اس نے یروشلم پر حملہ کرکے اس کو بالکل تباہ وبرباد کرڈالا۔

یہود کی تاریخ کے یہ واقعات خود یہود کے نزدیک بھی مسلم ہیں۔ مگر یہود جب ان تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ان کو ظالموں کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ مگر قرآن واضح طور پر ان کو خود یہود کے خانہ میں ڈال رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیاسی حالات ہمیشہ اخلاقی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ کوئی ظالم کسی کے اوپر ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ قوم کی دینی اور اخلاقی حالت کا بگاڑ لوگوں کو یہ موقع دے دیتا ہے کہ وہ اس کو اپنے ظلم واستغلال کا نشانہ بنائیں۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ⑨ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۧ⑩ ع

۹۔ بلاشبہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور وہ بشارت دیتا ہے ایمان والوں کو جو اچھے عمل کرتے ہیں کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ ۱۰۔ اور یہ کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، ان کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

قرآن تمام انسانوں کو توحید کی طرف بلاتا ہے۔ یعنی ایک خدا کو مان کر اپنے آپ کو اس کی اطاعت میں

دے دینا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے زیادہ صحیح، جس سے زیادہ معقول اور جس سے زیادہ مطابقِ فطرت بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ توحید بلا شبہ سب سے بڑی حقیقت ہے اور اسی کے ساتھ سب سے بڑی صداقت۔

توحید کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ یہی تمام انسانوں کے لیے جانچ کا معیار ہو۔ اسی کی بنیاد پر کسی کو صحیح قرار دیا جائے اور کسی کو غلط۔ کوئی کامیاب ٹھہرے اور کوئی ناکام۔

موجودہ دنیا میں بظاہر یہ معیار سامنے نہیں آتا اور اس کی بنیاد پر انسانوں کی عملی تقسیم نہیں کی جاتی۔ مگر یہ صرف خدا کے قانون امتحان کی وجہ سے ہے۔ انفرادی طور پر موت اور اجتماعی طور پر قیامت اس مدت امتحان کی آخری حد ہے۔ یہ حد آتے ہی انسان دو گروہوں کی صورت میں الگ الگ کر دئے جائیں گے۔ توحید کے راستہ کو اختیار کرنے والے اپنے آپ کو جنت میں پائیں گے اور اس کو اختیار نہ کرنے والے اپنے آپ کو جہنم میں۔

وَ يَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾

۱۱۔ اور انسان برائی مانگتا ہے جس طرح اس کو بھلائی مانگنا چاہیے اور انسان بڑا جلد باز ہے۔
۱۲۔ اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔ پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن کر دیا، تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اور ہم نے ہر چیز کو خوب کھول کر بیان کیا ہے۔

رات اور دن کا نظام بتاتا ہے کہ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تاریکی ہو اور اس کے بعد روشنی آئے۔ خدائی نقشہ میں دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں۔ جس طرح روشنی میں فائدے ہیں اسی طرح تاریکی میں بھی فائدے ہیں۔ دنیا میں اگر رات اور دن کا فرق نہ ہو تو آدمی اپنے اوقات کی تقسیم کس طرح کرے۔ وہ اپنے کام اور آرام کا نظام کس طرح بنائے۔

آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ''تاریکی'' سے گھبرائے اور صرف ''روشنی'' کا طالب بن جائے۔ کیوں کہ خدا کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ جو آدمی ایسا چاہتا ہو اس کو خدا کی دنیا چھوڑ کر اپنے لیے دوسری دنیا تلاش کرنی پڑے گی۔

مگر عجیب بات ہے کہ یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ وہ ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو تاریکی کا مرحلہ پیش نہ آئے اور فوراً ہی اس کو روشنی حاصل ہو جائے۔ اسی کمزوری کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو عجلت (جلد بازی) کہا جاتا ہے۔ عجلت دراصل خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔ اور خداوندی منصوبہ پر راضی نہ ہونا ہی تمام انسانی بربادیوں کا اصل سبب ہے۔

خدا چاہتا ہے کہ انسان دنیا کی فوری لذتوں پر صبر کرے تاکہ وہ آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔ مگر انسان اپنی عجلت کی وجہ سے دنیا کی وقتی لذتوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ آگے کی طرف اپنا سفر طے نہیں کر پاتا۔

آدمی کی عاجلہ (دنیا) پسندی اس کو آخرت کی نعمتوں سے محروم کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

یہی دنیا کا معاملہ بھی ہے۔ دنیا میں بھی حقیقی کامیابی صبر سے ملتی ہے نہ کہ جلد بازی سے۔ یہود کو ان کے پیغمبر یرمیاہ نے نصیحت کی کہ تم بابل کے حکمراں کے سیاسی غلبہ کو فی الحال تسلیم کرلو اور ابتدائی مرحلہ میں اپنی کوششوں کو صرف دعوتی اور تعمیری میدان میں لگاؤ۔ اس کے بعد وہ وقت بھی آئے گا جب کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے غلبہ اور اقتدار کی راہیں کھول دے۔ مگر یہود کی عجلت پسندی اس پر راضی نہیں ہوئی۔ انھوں نے چاہا کہ ''تاریکی'' کے مرحلہ سے گزرے بغیر وہ ''روشنی'' کے مرحلہ میں داخل ہوجائیں۔ انھوں نے فوراً شاہ بابل کے خلاف سیاسی لڑائی شروع کردی۔ چوں کہ خدا کے نظام میں ایسا ہونا ممکن نہیں تھا، ان کے حصہ میں ذلّت اور رسوائی کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ﴿۱۴﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

۱۳۔ اور ہم نے ہر انسان کی قسمت اس کے گلے کے ساتھ باندھ دی ہے۔ اور ہم قیامت کے دن اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا۔ ۱۴۔ پڑھ اپنی کتاب۔ آج اپنا حساب لینے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔ ۱۵۔ جو شخص ہدایت کی راہ چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے چلتا ہے۔ اور جو شخص بے راہی کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لیے بے راہ ہوتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور ہم کبھی سزا نہیں دیتے جب تک ہم کسی رسول کو نہ بھیجیں۔

قدیم زمانہ میں توہم پرست لوگ اکثر چڑیوں کے اڑنے سے یا ستاروں کی گردش سے یا طرح طرح کے فال سے اپنی قسمت کا حال معلوم کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں جو لوگ اس قسم کے توہمات پر یقین نہیں رکھتے وہ بھی اپنی قسمت کے معاملہ کو کسی نہ کسی پر اسرار سبب کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی خارجی عامل ہے جو اس سلسلے میں اصل موثر حیثیت رکھتا ہے۔

فرمایا کہ تمھاری قسمت نہ چڑیوں اور ستاروں کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ کسی دوسری خارجی چیز سے اس کا تعلق ہے۔ ہر آدمی کی قسمت کا معاملہ تمام تر اس کے اپنے عمل پر منحصر ہے۔ ہر آدمی جو کچھ سوچتا یا کرتا ہے وہ اس کے اپنے وجود کے ساتھ نقش ہو رہا ہے۔ آدمی اس کو قیامت کے دن ایک ایسی ڈائری کی صورت میں لکھا ہوا پائے گا جس میں ہر چھوٹی اور بڑی چیز درج ہو۔

خدا نے قوموں کے درمیان رسول کھڑے کیے اور کتاب اتاری۔ اس نے ایسا اس لیے کیا تا کہ لوگوں کو آنے والے سخت دن سے پہلے اس کی خبر ہو جائے۔ اب یہ ہر آدمی کے اپنے فیصلہ کرنے کی بات ہے کہ زندگی کے اگلے مستقل مرحلہ میں وہ اپنا کیا انجام دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہدایت کے طریقہ پر چل کر جنت میں پہنچنا چاہتا ہے یا ہدایت کے طریقہ کو چھوڑ کر جہنم میں گرنے کا سامان کر رہا ہے۔

وَ اِذَآ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نُّہۡلِکَ قَرۡیَۃً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِیۡہَا فَفَسَقُوۡا فِیۡہَا فَحَقَّ عَلَیۡہَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰہَا تَدۡمِیۡرًا ﴿۱۶﴾ وَ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ ؕ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ﴿۱۷﴾

۱۶۔ اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ تب ان پر بات ثابت ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ۱۷۔ اور نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں۔ اور تیرا رب کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے کے لیے اور ان کو دیکھنے کے لیے۔

کسی قوم کی اصلاح یا کسی قوم کے بگاڑ کا معیار اس قوم کا سر برآوردہ طبقہ ہوتا ہے۔ یہی طبقہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہی طبقہ اپنے وسائل کے ذریعے لوگوں پر اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی طبقہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی گروہ کے اوپر قائد بننے کی قیمت ادا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کے سر برآوردہ طبقہ کی اصلاح پوری قوم کی اصلاح ہے اور کسی قوم کے سر برآوردہ طبقہ کا بگاڑ پوری قوم کا بگاڑ۔ حضرت نوح کے زمانہ سے لے کر اب تک کی قوموں کا جائزہ لیا جائے تو ہر ایک کی تاریخ اس عام اصول کی صحت کی تصدیق کرے گی۔

اسی عام حکم میں قوم کے ان ''بڑوں'' کا معاملہ بھی شامل ہے جو قوم کو اپنی قیادت کی شکارگاہ بناتے ہیں، اور اس طرح اس کی غلط رہنمائی کر کے اس کی ہلاکت کا سامان کرتے ہیں۔ وہ قوم کو حقیقت پسندی کے بجائے جذباتیت کا درس دیتے ہیں۔ اس کو معانی کے بجائے الفاظ کے طلسم میں گم کرتے ہیں۔ اس کو سنجیدگی کے بجائے تخیلات کی فضا میں اڑاتے ہیں۔ وہ اس کو حقائق کا اعتراف کرنے کے بجائے خوش خیالیوں میں جینا سکھاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ قوم کو خدا کے بجائے غیر خدا کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔

جب کسی قوم پر اس قسم کے رہنما چھا جائیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے یہاں سے اس قوم کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس قسم کا ہر واقعہ خدا کی اجازت کے تحت ہوتا ہے۔ اور کسی شخص یا قوم کا کوئی عمل خدا سے چھپا ہوا نہیں ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا
نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ
يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ
الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

۱۸۔ جو شخص عاجلہ (دنیا) کو چاہتا ہو، اس کو ہم اس میں سے دے دیتے ہیں، جتنا بھی ہم جس کو دینا چاہیں۔ پھر ہم نے اس کے لیے جہنم ٹھہرا دی ہے، وہ اس میں داخل ہوگا بدحال اور راندہ ہو کر۔ ۱۹۔ اور جس نے آخرت کو چاہا اور اس کے لیے دوڑ کی جو کہ اس کی دوڑ ہے اور وہ مومن ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوگی۔

موجودہ دنیا میں آدمی دو راستوں کے درمیان ہے ایک کا فائدہ نقد ملتا ہے اور دوسرے کا فائدہ ادھار۔ جو شخص پہلے راستہ پر چلے اس نے عاجلہ کو پسند کیا۔ اور جو شخص دوسرے راستہ کو اختیار کرے اس نے آخرت کو پسند کیا۔

ایک طرف آدمی کے سامنے مصلحت پرستی کا طریقہ ہے جس کو اختیار کرنے سے فوری طور پر عزت اور دولت ملتی ہے۔ دوسری طرف بے لاگ حق پرستی کا طریقہ ہے جس کا کریڈٹ آدمی کو موت کے بعد کی زندگی میں ملے گا۔ کسی سے شکایت پیدا ہو جائے تو ایک صورت یہ ہے کہ اس کے بارے میں اپنے دل کے اندر انتقام کی نفسیات پیدا کرلی جائے اور اس کے خلاف وہ سب کچھ کیا جائے جو اپنے بس میں ہے۔ اس کے برعکس، دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو معاف کر دیا جائے۔ اور اس کے لیے اچھی دعائیں کرتے ہوئے سارے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دیا جائے۔ اسی طرح آدمی کے پاس جو مال ہے اس کے خرچ کی ایک شکل یہ ہے کہ اس کو اپنے شوق کی تکمیل اور اپنی عزت کو بڑھانے کی راہوں میں لگایا جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو خدا کے دین کے مدوں میں خرچ کیا جائے۔

اسی طرح تمام معاملات میں آدمی کے سامنے دو مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک خواہش پرستی کا طریقہ اور دوسرا خدا پرستی کا طریقہ۔ ایک سامنے کی چیزوں کو اہمیت دینا اور دوسرا غیب کی حقیقتوں کو اہمیت دینا۔ ایک مصلحت پرستی کا انداز اور دوسرا اصول پرستی کا انداز۔ ایک بے صبری کے تحت کر گزرنا اور دوسرا صبر کے ساتھ وہ کرنا جو کرنا چاہیے۔

پہلے طریقہ میں وقتی فائدہ ہے اور اس کے بعد ہمیشہ کی محرومی۔ دوسرے طریقہ میں وقتی نقصان ہے اور اس کے بعد ہمیشہ کی عزّت اور کامیابی۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ
وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ

۲۰۔ ہم ہر ایک کو تیرے رب کی بخشش میں سے پہنچاتے ہیں، ان کو بھی اور ان کو بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کسی کے اوپر بند نہیں۔ ۲۱۔ دیکھو ہم

كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

نے ان کے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے۔ اور یقیناً آخرت اور بھی زیادہ بڑی ہے، درجہ کے اعتبار سے اور فضیلت کے اعتبار سے۔

دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی، دونوں ہی اللہ کے فراہم کیے ہوئے مواقع اور انتظامات کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہیں۔ جو شخص دنیا کی کامیابی حاصل کرتا ہے وہ بھی خدا کے انتظامات سے فائدہ اٹھا کر ایسا کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنائے اس کے لیے بھی خدا نے ایسے انتظامات کر رکھے ہیں جو اس کے آخرت کے سفر کو آسان بنانے والے ہیں۔

دنیا میں کوئی آدمی آگے نظر آتا ہے اور کوئی پیچھے۔ کسی کے پاس زیادہ ہے اور کسی کے پاس کم۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی دنیا میں مواقع کی کوئی حد نہیں۔ دنیا میں جو شخص جتنا زیادہ عمل کرتا ہے وہ اتنا زیادہ اس کا پھل پاتا ہے۔ اسی طرح آخرت کے لیے جو شخص جتنا زیادہ عمل کا ثبوت دے گا وہ اتنا ہی زیادہ انعام وہاں پائے گا۔ مزید یہ کہ آخرت میں ملنے والی چیز ابدی ہوگی جب کہ دنیا میں ملنے والی چیز صرف وقتی ہوتی ہے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

ع ۲ / ۱۲ / ۲

۲۲۔ تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنا، ورنہ تو مذموم اور بے کس ہو کر رہ جائے گا۔ ۲۳۔ اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو ان کو اُف نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو، اور ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔ ۲۴۔ اور ان کے سامنے نرمی سے عجز کے بازو جھکا دو۔ اور کہو کہ اے رب، ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انھوں نے مجھے بچپن میں پالا۔ ۲۵۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ تمھارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم نیک رہو گے تو وہ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دینے والا ہے۔

خدا انسان کا سب کچھ ہے۔ وہ اس کا خالق بھی ہے اور مالک بھی اور رازق بھی۔ مگر خدا غیب میں ہے۔ وہ اپنے آپ کو منوانے کے لیے انسان کے سامنے نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی جب خدا کی بڑائی اور اس کے

مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے تو وہ محض اپنے ارادہ کے تحت ایسا کرتا ہے، نہ کہ کسی ظاہری دباؤ کے تحت۔

اس اعتبار سے بوڑھے ماں باپ کا معاملہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے خدا کے معاملہ جیسا ہے۔ کیوں کہ بوڑھے ماں باپ کا اپنی اولاد کے اوپر کوئی مادی زور نہیں ہوتا۔ اولاد جب اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے تو وہ اپنے آزادانہ ذہنی فیصلہ کے تحت ایسا کرتی ہے، نہ کہ مادی دباؤ کے تحت۔

موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہی ہے۔ یہاں اس کو حق اور انصاف کے راستہ پر چلنا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس کو اس کے لیے مجبور کیا گیا ہو۔ اس کو خود اپنے ارادہ کے تحت وہ کرنا ہے جو وہ اُس وقت کرتا ہے جب کہ خدا اس کے سامنے اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے۔

یہ اختیارانہ عمل انسان کے لیے بڑا سخت امتحان ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے اس کو انسان کے لیے آسان کر دیا ہے۔ وہ انسان کو اس حاکم کی طرح نہیں جانچتا جو چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی سختی سے حساب لیتے ہیں۔ آدمی اگر بنیادی طور پر خدا کا وفادار ہے تو اس کی چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو وہ نظر انداز کر دیتا ہے۔ انسان اگر غلطی کر کے پلٹ آئے تو وہ اس کو معاف کر دیتا ہے خواہ اس نے بظاہر کتنا بڑا جرم کر دیا ہو۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ
السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿٢٦﴾ اِنَّ
الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ
الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿٢٧﴾ وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ
عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا
فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿٢٨﴾

۲۶۔ اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو۔ اور فضول خرچی نہ کرو۔ ۲۷۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ ۲۸۔ اور اگر تم کو اپنے رب کے فضل کے انتظار میں جس کی تمھیں امید ہے، ان سے اعراض کرنا پڑے تو تم ان سے نرمی کی بات کہو۔

ہر آدمی جو کچھ اپنی محنت سے کماتا ہے اس کو وہ اپنے اوپر خرچ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ تاہم شریعت کا حکم ہے کہ وہ فضول خرچی سے بچے۔ وہ اپنے مال کو اپنی واقعی ضرورتوں میں خرچ کرے، نہ کہ فخر اور نمائش کے لیے۔

دوسری بات یہ کہ ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی کمائی میں دوسرے ضرورت مندوں کا بھی حق سمجھے۔ خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا اس کے پڑوسی ہوں۔ مسافر ہوں یا اور کسی قسم کے حاجت مند ہوں۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محتاج کو دینے کے قابل نہیں ہوتا۔ تاہم اس وقت کے لیے بھی حکم ہے کہ اگر تم مال دینے کے قابل نہیں تو اپنے ضرورت مند بھائی کو نرم بات دو اور اس سے معافی کا کلمہ کہو۔ کیوں کہ وہ تم کو ایک نیکی کا موقع دینے آیا تھا مگر تم اس موقع کو اپنے لیے استعمال نہ کر سکے۔

اپنے کمائے ہوئے مال کو خدا کی مرضی کے مطابق خرچ کرنے میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے، جو اپنے

مال کو بے فائدہ مدوں میں ضائع ہونے سے بچائے۔ ورنہ اس کے پاس مال ہی نہ ہوگا جس کو وہ خدا کے راستوں میں دے۔ حقیقت یہ ہے کہ فضول خرچی شیطان کا ایک حربہ ہے جس کے ذریعہ سے وہ صاحبِ مال کو اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے ضرورت مندوں کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾ ع ۳ ۸

۲۹۔ اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ ۳۰۔ بے شک تیرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے۔ اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا، دیکھنے والا ہے۔

اسلام ہر معاملہ میں اعتدال کو پسند کرتا ہے۔ زیادتی اور کمی سے بچ کر جو درمیانی راستہ ہے وہی اسلام کے نزدیک بہترین راستہ ہے (خَيْرُ الأُمُورِ أَوْسَاطُهَا) السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 6319۔ چنانچہ یہی تعلیم خرچ کے معاملہ میں بھی دی گئی ہے کہ آدمی نہ تو ایسا کرے کہ اتنا بخیل ہو کہ وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائے۔ اور نہ اتنا زیادہ خرچ کرے کہ اس کے بعد بالکل خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ رہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہیں ہوا (مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ) مسند احمد، حدیث نمبر 4269۔

مال کے سلسلہ میں بے اعتدالی کا ذہن اکثر اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ آدمی کی نظر سے یہ حقیقت اوجھل ہو جاتی ہے کہ دینے والا خدا ہے۔ وہی اپنے مصالح کے تحت کسی کو کم کر دیتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا ہے جس کے لیے صرف محتاجی مناسب ہے۔ اگر میں اس کو غنی کر دوں تو اس کے دین میں بگاڑ آجائے۔ اور میرے بندوں میں کوئی ایسا ہے جس کے لیے صرف امیری مناسب ہے۔ اگر میں اس کو فقیر بنا دوں تو اس کے دین میں بگاڑ آجائے (إِنَّ مِنْ عِبَادِي الْمُؤْمِنِينَ مَنْ لَا يُصْلِحُ إِيمَانَهُ إِلَّا الْغِنَى، لَوْ أَفْقَرْتُهُ لَأَفْسَدَهُ ذَلِكَ، وَإِنَّ مِنْ عِبَادِي الْمُؤْمِنِينَ مَنْ لَا يُصْلِحُ إِيمَانَهُ إِلَّا الْفَقْرُ، لَوْ أَغْنَيْتُهُ لَأَفْسَدَهُ ذَلِكَ) بحر الفوائد للکلاباذی، حدیث نمبر 671۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ﴿٣١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿٣٢﴾

۳۱۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان کو قتل کرنا بڑا گناہ ہے۔ ۳۲۔ اور زنا کے قریب نہ جاؤ، وہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔

خدا ہی نے تمام جانداروں کو پیدا کیا ہے۔ وہی ان کے رزق کا انتظام کرتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی

انسان کا کسی کو رزق کی تنگی کا نام لے کر ہلاک کرنا ایک ایسا کام کرنا ہے جس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جب رزق کا انتظام خدا کی طرف سے ہو رہا ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ کسی جان کو اس اندیشہ سے ہلاک کرے کہ وہ کھائے گی کیا۔

''ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی'' ان الفاظ کے ذریعہ انسان کے ذہن کو اس معاملہ میں تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف موڑا گیا ہے۔ غور کیجیے کہ جو انسان موجود ہیں وہ اپنا رزق کس طرح حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اس کو خدا کے فراہم کردہ پیداواری وسائل پر عمل کر کے حاصل کر رہے ہیں۔ یہی طریقہ آئندہ آنے والی نسل کے لیے بھی درست ہے۔ تم کو چاہیے کہ مزید پیدا ہونے والوں کو خدا کے پیدواری وسائل میں مزید عمل کرنے پر لگاؤ، نہ کہ خود پیدا ہونے والوں کی آمد کو روکنے لگو۔

خدا انسانوں کے درمیان جن اعمال کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہتا ہے ان میں سے ایک زنا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ''زنا کے قریب نہ جاؤ'' یعنی زنا اتنی بڑی برائی اور بے حیائی ہے کہ اس کے مقدمات سے بھی تم کو پرہیز کرنا چاہیے۔ یہاں اس سلسلہ میں صرف اصولی حکم دیا گیا ہے۔ اس کے تفصیلی احکام آگے سورۂ نور میں بیان کیے گئے ہیں۔

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور جس جان کو خدا نے محترم ٹھہرایا ہے اس کو قتل مت کرو مگر حق پر۔ اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے۔ پس وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔

حق شرعی کے بغیر کسی کو قتل کرنا سراسر حرام ہے۔ جو شخص شرعی جواز کے بغیر قتل کیا جائے وہ مظلومانہ قتل ہوا۔ ایسی حالت میں مقتول کے اولیاء کو قاتل کے اوپر پورا اختیار رہے۔ وہ چاہیں تو اس سے قصاص لیں۔ چاہیں تو خوں بہا لے کر چھوڑ دیں۔ اور چاہیں تو سرے سے معاف کر دیں۔ اسلامی قانون کے مطابق قتل کے معاملہ میں اصل مدعی مقتول کے اولیاء ہیں، نہ کہ حکومت۔ حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مقتول کے اولیاء کی مرضی کو نافذ کرنے میں ان کی مدد کرے۔

قتل اتنا بھیانک جرم ہے کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ساری دنیا کا چلا جانا اللہ کے نزدیک اس سے اہون ہے کہ ایک مومن کو ناحق قتل کر دیا جائے (لَزَوَالُ الدُّنْيَا أَهْوَنُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ) سنن النسائی، حدیث نمبر 3987۔ اس کے باوجود مقتول کے اولیاء کو یہ حق نہیں کہ وہ قاتل سے بدلہ لیتے ہوئے اس کے ساتھ زیادتی کریں۔ مثلاً وہ قاتل کا مثلہ کریں یا قاتل کے بدلے اس کے کسی ساتھی کو قتل کر دیں، وغیرہ۔ مقتول کے ورثاء اگر بدلہ لینے میں زیادتی کریں تو یہاں حکومت اسی طرح ان کی مزاحم ہو جائے گی جس طرح وہ ان

کےحق قصاص کے معاملہ میں ان کی مددگار رہوئی تھی۔

اس سے اسلامی شریعت کی یہ روح معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی زیادہ مظلوم ہو، اگر وہ ظالم سے بدلہ لینا چاہتا ہے تو وہ صرف ظلم کے بقدر بدلہ لے سکتا ہے۔اس سے زیادہ کوئی کارروائی کرنے کی اجازت اسے ہرگز حاصل نہیں۔

وَ لَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ ۪ وَ اَوۡفُوۡا بِالۡعَہۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَہۡدَ کَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۴﴾ وَ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ اِذَا کِلۡتُمۡ وَ زِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّ اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۳۵﴾

۳۴۔اور تم یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر جس طرح کہ بہتر ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جائے۔اور عہد کو پورا کرو بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔ ۳۵۔اور جب ناپ کر دو تو پورا ناپو اور ٹھیک ترازو سے تول کر دو۔ یہ بہتر طریقہ ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔

نابالغ یتیم کے سرپرست اس کے قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں۔مگر یتیم کا مال ان کے ولیوں کے ہاتھ میں اس وقت تک کے لیے بطور امانت ہے جب تک کہ یتیم عاقل و بالغ نہ ہوجائے۔اولیاء کو چاہیے کہ وہ یتیم کے مال کو ہاتھ نہ لگائیں۔وہ صرف اس وقت اس میں تصرف کرسکتے ہیں جب کہ خود یتیم کی خیر خواہی اور ترقی کا تقاضا ہو۔اور یتیم جیسے ہی اپنے نفع نقصان کو سمجھنے کے قابل ہو اس کا مال پوری طرح اس کے حوالے کردیا جائے۔

عہد کو پورا کرنا انسانی کردار کی اہم ترین صفت ہے۔جو آدمی ایک عہد کرے اور پھر اس کو پورا نہ کرے وہ بالکل بے قیمت انسان ہے، بندوں کے نزدیک بھی اور خدا کے نزدیک بھی۔

''عہد اللہ کے نزدیک قابل پرسش ہے''— یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ جب ایک آدمی کسی دوسرے آدمی سے عہد کرتا ہے تو یہ صرف دو انسانوں کا باہمی معاملہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں خدا بھی تیسرے فریق کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے۔آدمی کو عہد توڑتے ہوئے ڈرنا چاہیے کہ عہد کا دوسرا فریق صرف ایک کمزور انسان نہیں ہے بلکہ وہ خدا ہے جس کی پکڑ سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

دنیا میں ہر قسم کا کاروبار ناپ تول کی بنیاد پر قائم ہے۔اس سلسلہ میں حکم دیا گیا کہ ناپ تول بالکل ٹھیک رکھا جائے اور جو چیز دی جائے پورے ناپ تول کے ساتھ دی جائے۔

یہ طریقہ بیک وقت اپنے اندر دو پہلو رکھتا ہے۔ایک طرف وہ انسانی عظمت کے مطابق ہے۔ناپ تول میں فرق کرنا کردار کی پستی ہے۔اور ناپ تول میں پورا دینا کردار کی بلندی۔اس کا دوسرا عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس سے کاروبار کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔کیوں کہ کاروبار کی ترقی کی بنیاد تمام تر اعتماد پر ہے اور ناپ تول صحیح دینا وہ چیز ہے جس سے کسی شخص کا کاروباری اعتماد لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے۔

وَ لَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۶﴾ وَ لَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَ لَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا ﴿۳۷﴾ کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنۡدَ رَبِّکَ مَکۡرُوۡہًا ﴿۳۸﴾

۳۶۔ اور ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کی تم کو خبر نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کی آدمی سے پوچھ ہوگی۔ ۳۷۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ تم زمین کو پھاڑ نہیں سکتے اور نہ تم پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکتے ہو۔ ۳۸۔ یہ سارے بُرے کام تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔

قتادہ نے کہا ہے کہ ”میں نے دیکھا“ مت کہو جب کہ تم نے دیکھا نہ ہو۔ ”میں نے سنا“ مت کہو جب کہ تم نے سنا نہ ہو۔ ”میں نے جانا“ مت کہو جب کہ تم نے جانا نہ ہو (لَا تَقُلْ رَأَيْتُ وَلَمْ تَرَ، وَسَمِعْتُ وَلَمْ تَسْمَعْ، وَعَلِمْتُ وَلَمْ تَعْلَمْ) تفسیر الطبری، جلد 14، صفحہ 594۔

جس آدمی کو اس بات کا ڈر ہو کہ خدا کے یہاں ہر بات کی پوچھ ہوگی وہ کبھی بے تحقیق بات اپنی زبان سے نہیں نکالے گا اور نہ آنکھ بند کر کے بے تحقیق بات کی پیروی کرے گا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کان اور آنکھ اور دماغ سے وہ کام لے جس کے لیے وہ بنائے گئے ہیں اور وہی بات منھ سے نکالے یا عمل میں لائے جو پوری طرح ثابت ہو چکی ہو۔ اس حکم میں تمام بے بنیاد چیزیں آ گئیں۔ مثلاً جھوٹی گواہی دینا، غلط تہمت لگانا، سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کسی کے درپے ہو جانا، محض تعصب کی بنا پر ناحق بات کی حمایت کرنا، ایسی چیزوں کے پیچھے پڑنا جن کو اپنی محدودیت کی بنا پر انسان جان نہیں سکتا — سمع و بصر و فواد بظاہر انسان کے قبضہ میں ہیں۔ مگر یہ انسان کے پاس بطور امانت ہیں۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ ان چیزوں کو خدا کی منشاء کے مطابق استعمال کرے۔ ورنہ ان کی بابت اس سے سخت باز پرس ہوگی۔

انسان ایک ایسی زمین پر ہے جس کو وہ پھاڑ نہیں سکتا، وہ ایک ایسے ماحول میں ہے جہاں اونچے اونچے پہاڑ اس کی ہر بلندی کی نفی کر رہے ہیں۔ یہ خدا کے مقابلے میں انسان کی حیثیت کا ایک تمثیلی اعلان ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی دنیا میں متکبر بن کر نہ رہے۔ وہ عجز اور تواضع کا طریقہ اختیار کرے، نہ کہ اکڑنے اور سرکشی کرنے کا۔

ذٰلِکَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ ؕ وَ لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتُلۡقٰی فِیۡ جَہَنَّمَ مَلُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ﴿۳۹﴾

۳۹۔ یہ وہ باتیں ہیں جو تمھارے رب نے حکمت میں سے تمھاری طرف وحی کی ہے۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا، ورنہ تم جہنم میں ڈال دیے جاؤ گے، ملامت زدہ اور راندہ ہو کر۔

اوپر کی آیتوں میں جو احکام دیے گئے ان کو یہاں حکمت کہا گیا ہے۔ حکمت کا مطلب ہے ٹھوس حقیقت،

دانائی کی بات۔ یہ باتیں جو یہاں بتائی گئی ہیں یہ زندگی کے محکم حقائق ہیں۔ ان کی بنیاد پر درست زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اور جو انسانی معاشرہ ان سے خالی ہو اس کے لیے خدا کی دنیا میں ہلاکت کے سوا اور کوئی چیز مقدر نہیں۔ آج بھی اور آج کے بعد کی زندگی میں بھی۔

مذکورہ بالا نصیحتوں کا بیان توحید سے شروع ہوا تھا (آیت نمبر 22)، اب ان کا خاتمہ بھی توحید پر کیا گیا ہے (آیت نمبر 39)۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ تمام بھلائیوں کی بنیاد یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کو اپنا خدا بنائے۔ وہ اسی سے ڈرے اور اسی سے محبت کرے۔ خدا سے درست تعلق ہی میں زندگی کی درستی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اگر خدا سے تعلق درست نہ ہو تو کوئی بھی دوسری چیز انسانی زندگی کے نظام کو درست نہیں کرسکتی۔ خدا انسان کا آغاز ہے اور وہی اس کا اختتام بھی۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِیْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا ۝۴۰ ع
وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝۴۱
قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ۝۴۲
سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِیْرًا ۝۴۳
تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝۴۴

۴۰۔ کیا تمھارے رب نے تم کو بیٹے چن کر دئے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالیں۔ بے شک تم بڑی سخت بات کہتے ہو۔ ۴۱۔ اور ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ لیکن ان کی بیزاری بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ۴۲۔ کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ اور بھی معبود ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ عرش والے کی طرف ضرور راستہ نکالتے۔ ۴۳۔ اللہ پاک اور برتر ہے اس سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ ۴۴۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو۔ مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ وہ حلم والا، بخشنے والا ہے۔

حقیقت اتنی کامل اور مکمل ہے کہ جو بھی خلاف واقعہ بات اس کے ساتھ منسوب کی جائے وہ فوراً بے جوڑ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا معاملہ ہے۔

مشرک لوگ اپنے مفروضہ شرکاء کو خدا کی اولاد کہتے ہیں مگر یہ بات خود ہی اپنے دعوے کی تردید ہے۔ اگر ان شرکاء کو مؤنث قرار دے کر خدا کی بیٹیاں کہا جائے تو فوراً یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ بیٹیاں خود مشرکین کے اعتراف کے مطابق، کمزور صنف سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر خدا نے کمزور صنف کو اپنا شریک بنانا کیوں پسند کیا۔ کیسی عجیب بات

ہوگی کہ خدا انسانوں کو ان کی محبوب اولاد کی حیثیت سے بیٹا دے اور خود اپنے لیے بیٹیوں کا انتخاب کرے۔

اس کے برعکس، اگر ان شرکاء کو بیٹا فرض کیا جائے جو انسانی تجربات کے مطابق قوت وطاقت کی علامت ہے تب بھی یہ بات ناقابل فہم ہے۔ کیوں کہ اقتدار ایک ناقابل تقسیم چیز ہے۔ جب بھی کسی نظام میں ایک سے زیادہ صاحب طاقت اور صاحب اقتدار ہوں تو ان کے درمیان لازماً کش مکش شروع ہوجاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو مطلق اقتدار مل جائے۔ اب اگر کائنات میں ایک سے زیادہ طاقت ور ہستیاں ہوتیں تو ان کے درمیان ضرور اقتدار کی جنگ برپا ہوجاتی اور کائنات کے سارے نظام میں اختلال وانتشار پیدا ہوجاتا۔ مگر چوں کہ کائنات میں کوئی اختلال وانتشار نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہاں دوسری ایسی ہستیاں بھی موجود نہیں جو خدا کے ساتھ اس کی طاقت میں حصہ دار ہوں۔

شرکاء کو اگر بیٹے کہا جائے تب بھی وہ صورت واقعہ سے ٹکراتا ہے اور بیٹیاں کہا جائے تب بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایسے ہر تصور کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے جس میں خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک کیا گیا ہو۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۙ﴿۴۵﴾ وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

۴۵۔ اور جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان ایک چھپا ہوا پردہ حائل کردیتے ہیں جو آخرت کو نہیں مانتے۔ ۴۶۔ اور ہم ان کے دلوں پر پردہ رکھ دیتے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کردیتے ہیں اور جب تم قرآن میں تنہا اپنے رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔

یہاں جس چیز کو ''چھپا ہوا پردہ'' کہا گیا ہے وہ دراصل نفسیاتی پردہ ہے۔ اس سے مراد وہ صورت حال ہے جب کہ آدمی بطور خود اپنے ذہن میں کسی غیر صداقت کو صداقت کا مقام دے دے۔ ایسے شخص کے سامنے جب ایک ایسا حق آتا ہے جس کے مطابق اس کی مفروضہ صداقتوں کی نفی ہو رہی ہو تو ایسی بے آمیز دعوت اس کے لیے ناقابل فہم بن جاتی ہے۔ اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی دعوت بھی سچی دعوت ہوسکتی ہے جس کو ماننے کی صورت میں وہ چیز باطل قرار پائے جس کو اب تک وہ مسلّمہ صداقت سمجھے ہوئے تھا۔ وہ نئی دعوت کے دلائل کا توڑ نہیں کر پاتا۔ تاہم اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا کہ یہی وہ مطلق صداقت ہے جس کو اسے دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر مان لینا چاہیے۔

بے آمیز صداقت کا اعلان ہمیشہ دوسری مفروضہ صداقتوں کی نفی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو سن کر وہ لوگ بھڑ اٹھتے ہیں جو اس کے سوا دوسری چیزوں یا شخصیتوں کو بھی عظمت اور تقدس کا مقام دئے ہوئے ہوں۔

ان کے اندر آخرت کی جواب دہی کا یقین نہ ہونا انھیں غیر سنجیدہ بنا دیتا ہے اور غیر سنجیدہ ذہن کے ساتھ کوئی بات سمجھی نہیں جاسکتی۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۴۸﴾

۴۷۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جب وہ تمھاری طرف کان لگاتے ہیں تو وہ کس لیے سنتے ہیں اور جب کہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو بس ایک سحرزدہ آدمی کے پیچھے چل رہے ہو۔ ۴۸۔ دیکھو تمھارے اوپر وہ کیسی کیسی مثالیں چست کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کھوئے گئے، وہ راستہ نہیں پاسکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں دلائل کا زور اتنا زیادہ تھا کہ عرب کے عام لوگ اس سے مرعوب ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر وہاں کے سرداروں کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر ان لوگوں نے بڑی تعداد میں نئے دین کو قبول کرلیا تو ہماری سرداری ختم ہوجائے گی۔ انھوں نے لوگوں کو اس سے پھیرنے کے لیے ایک تدبیر کی۔ انھوں نے کہا کہ اس شخص کے کلام میں تم جو زور دیکھ رہے ہو وہ دراصل ساحرانہ کلام کا زور ہے۔ یہ ''ادب'' کا معاملہ ہے، نہ کہ حقیقۃً صداقت کا معاملہ۔ اس طرح انھوں نے یہ کیا کہ جس کلام کی عظمت میں لوگ صداقت کی جھلک دیکھ رہے تھے اس کو لوگوں کی نظر میں ''قلم کے جادو'' کے ہم معنی بنا دیا۔

جو لوگ کسی دعوت کو اس کے جوہر کی بنیاد پر نہ دیکھیں بلکہ اس اعتبار سے دیکھیں کہ وہ ان کی حیثیت کی تصدیق کرتی ہے یا تردید، ایسے لوگ کبھی صداقت کو پانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِیْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا قُلِ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ قَرِیْبًا ﴿۵۱﴾ یَوْمَ یَدْعُوْكُمْ

۴۹۔ اور وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈی اور ریزہ ہوجائیں گے تو کیا ہم ازسرنو اٹھائے جائیں گے۔ ۵۰۔ کہو کہ تم پتھر یا لوہا ہوجاؤ۔ ۵۱۔ یا اور کوئی چیز جو تمھارے خیال میں ان سے بھی زیادہ سخت ہو۔ پھر وہ کہیں گے کہ وہ کون ہے جو ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ تم کہو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا ہے۔ پھر وہ تمھارے آگے اپنا سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا، کہو کہ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب آپہنچا ہو۔ ۵۲۔ جس دن خدا تم

فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾ ع ۵

کو پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار پر چلے آؤ گے اور تم یہ خیال کرو گے کہ تم بہت تھوڑی مدت رہے۔

انسان کا وجود اول واضح طور پر اس کے وجود ثانی کو ممکن ثابت کرتا ہے۔ جو شخص انسان کی پہلی پیدائش کو بطور واقعہ مانتا ہو، اس کے پاس کوئی حقیقی دلیل نہیں جس سے وہ انسان کی دوسری پیدائش کے امکان کو نہ مانے۔

پھر یہ کہ انسان کی پیدائش ثانی، کم از کم ان لوگوں کے لیے ہرگز مستبعد نہیں جو انسان کو پتھر اور لوہا (بالفاظ دیگر مادی اشیاء کا مجموعہ) سمجھتے ہیں کیوں کہ جسم کے خلیات (cells) کے ٹوٹنے کے ساتھ اسی معلوم دنیا میں یہ واقعہ ہو رہا ہے کہ آدمی کا مادی وجود مسلسل ختم ہوتا ہے اور پھر دوبارہ بنتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حشر ونشر اسی واقعہ کو موت کے بعد ماننا ہے جس کا موت سے پہلے ہم بار بار تجربہ کر رہے ہیں۔

قیامت دراصل اسی دن کا نام ہے جب کہ غیب کا پردہ پھٹ جائے اور خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ بالکل سامنے آجائے۔ جب ایسا ہوگا تو منکر بھی وہی کرنے پر مجبور ہوگا جو آج صرف سچا مومن کر پاتا ہے۔ اس وقت تمام لوگ خدا کے کمالات کا اقرار کرتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑیں گے۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾

۵۳۔ اور میرے بندوں سے کہو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہو۔ شیطان ان کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔ بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

یہ آیت داعی اور مدعو کے نازک رشتہ کے بارے میں ہے۔ حکم دیا گیا ہے کہ مدعو کی طرف سے خواہ کتنی ہی سخت بات کہی جائے اور کتنا ہی اشتعال انگیز معاملہ کیا جائے، داعی کو ہر حال میں قول احسن کا پابند رہنا ہے۔ کیوں کہ داعی اگر جوابی ذہن کے تحت کارروائی کرے تو مدعو کے اندر مزید نفرت اور ضد کی نفسیات ابھرے گی۔ اور داعی اور مدعو کے درمیان ایسی کش مکش پیدا ہوگی کہ لوگ داعی کی بات کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سننے کے قابل ہی نہ رہیں۔

داعی اور مدعو کے اندر ضد اور نفرت کی فضا پیدا ہونا سراسر شیطان کی موافقت میں ہے تاکہ وہ حق کے پیغام کو لوگوں کے لیے ناقابل قبول بنا دے۔ اس لیے اگر داعی اپنے کسی فعل سے مدعو کے اندر ضد اور نفرت کی نفسیات جگانے لگے تو گویا کہ اس نے شیطان کا کام کیا، اس نے اپنے دشمن کا کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دے دیا۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَ

۵۴۔ تمھارا رب تم کو خوب جانتا ہے، اگر وہ چاہے تو تم پر رحم کرے یا اگر وہ چاہے تو تم کو عذاب دے۔ اور ہم نے تم کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔

لَقَدۡ فَضَّلۡنَا بَعۡضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعۡضٍ وَّ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اورتمھارا رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور دی۔

ایک شخص سچے دین کی دعوت دے اور دوسرا شخص اس کو نہ مانے تو داعی کے اندر جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ شخص کیسا ہے کہ کھلی ہوئی صداقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کبھی بات اور آگے بڑھتی ہے اور وہ اعلان کر بیٹھتا ہے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ اس قسم کا کلام داعی کے لیے کسی حال میں جائز نہیں۔

ایک ہے حق کا پیغام پہنچانا۔ اور ایک ہے پیغام کے ردعمل کے مطابق ہر ایک کو اس کا بدلہ دینا۔ پہلا کام داعی کا ہے اور دوسرا کام خدا کا۔ داعی کو کبھی یہ غلطی نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے دائرہ سے گزر کر خدا کے دائرہ میں داخل ہو جائے۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان اپنے اپنے مقتداؤں کی فضیلت کی بحث اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ہر ایک اپنے پیشوا کو دوسرے سے اعلیٰ اور افضل ثابت کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو بحث اصول کے دائرہ میں رہنی چاہیے وہ شخصیت کے دائرہ میں چلی جاتی ہے اور تعصّبات کو جگا کر قبول حق کی راہ میں مزید رکاوٹ کھڑی کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا کہ یہ خدا کا معاملہ ہے کہ وہ کس کو کیا درجہ دیتا ہے۔ تم کو چاہیے کہ اس قسم کی بحث سے اعراض کرتے ہوئے اصل پیغام کو پہنچانے میں لگے رہو۔

قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَلَا یَمۡلِکُوۡنَ کَشۡفَ الضُّرِّ عَنۡکُمۡ وَ لَا تَحۡوِیۡلًا ﴿۵۶﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الۡوَسِیۡلَةَ اَیُّهُمۡ اَقۡرَبُ وَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَهٗ وَ یَخَافُوۡنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحۡذُوۡرًا ﴿۵۷﴾

۵۶۔ کہو کہ ان کو پکارو جن کو تم نے خدا کے سوا معبود سمجھ رکھا ہے۔ وہ نہ تم سے کسی مصیبت کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ وہ اس کو بدل سکتے ہیں۔ ۵۷۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کا قرب ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قریب ہو جائے۔ اور وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور وہ اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ واقعی تمھارے رب کا عذاب ڈرنے ہی کی چیز ہے۔

انسان جن ہستیوں کو اللہ کے سوا اپنا معبود بناتا ہے وہ سب وہی ہیں جو اللہ کی مخلوق ہیں۔ مثلاً بزرگ یا فرشتے وغیرہ۔ غور سے دیکھیے تو یہ معبودیت سراسر یک طرفہ ہوتی ہے۔ ان ہستیوں نے خود اپنے خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ صرف دوسرے لوگ ہیں، جو ان کو معبود فرض کرکے ان کی تقدیس و تعظیم میں لگے ہوئے ہیں۔

اگر کسی کو حاضر سے غائب تک دیکھنے کی نظر حاصل ہو اور وہ پوری صورت حال پر نظر کرے تو وہ عجیب مضحکہ خیز منظر دیکھے گا۔ وہ دیکھے گا کہ انسان کچھ ہستیوں کو بطور خود معبود کا درجہ دے کر ان کی پرستش کر رہا ہے۔ اور ان سے مرادیں مانگ رہا ہے جب کہ عین اسی وقت خود ان ہستیوں کا یہ حال ہے کہ وہ اللہ کی عظمت کے احساس سے سہمے ہوئے ہیں اور اس کی رحمت و قربت کی تلاش میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اور کوئی بستی ایسی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں۔ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔

افراد کے لیے جس طرح فنا کا قانون ہے اسی طرح قوموں اور بستیوں کے لیے بھی فنا کا قانون ہے۔ کوئی بستی چاہے وہ کتنی ہی مضبوط اور پُر رونق ہو، بہر حال وہ ایک دن ختم ہو کر رہے گی۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ وہ اپنے گناہ اور سرکشی کی وجہ سے پہلے ہلاک کر دی جائے۔ یا وہ باقی رہے یہاں تک کہ جب آخرت قائم ہونے کا وقت آئے تو زمین کی تمام آبادیوں کے ساتھ اس کو اکٹھے مٹا دیا جائے۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾

۵۹۔ اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی ان کو سمجھانے کے لیے۔ پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور نشانیاں ہم صرف ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں۔

پیغمبروں کے ساتھ جو غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کی عمومی نصرت کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کو تائید کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو مشرکین کے مطالبہ کے طور پر ظاہر کیے جاتے ہیں۔ ان کا اصطلاحی نام معجزہ ہے۔ پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کے ساتھ تائید الٰہی کے بے شمار واقعات پیش آئے۔ مگر جہاں تک فرمائشی نشانی (معجزہ) کا تعلق ہے آپ کے لیے ان کو بھیجنا موقوف کر دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ جو لوگ غیر معمولی نشانی کا مطالبہ کریں، ان کے اوپر غیر معمولی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ چنانچہ خدا کا یہ قانون ہے کہ جو لوگ غیر معمولی نشانی (معجزہ) دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائیں ان کو سخت عذاب بھیج کر نیست و نابود کر دیا جائے۔ اب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا اس لیے آپ کی مخاطب قوم کے ساتھ ایسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ بالکلیہ تباہی کی

صورت میں قوم مٹ جاتی۔ پھر پیغمبر کے بعد پیغمبر کی نمائندگی کے لیے دنیا میں کون باقی رہتا۔

پیغمبر آخر الزماں کے مخاطبین کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی کہ ان کے مطالبہ کے باوجود ان کو محسوس معجزات نہیں دکھائے گئے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ ان کا بھی وہی سخت انجام ہو جو اس سے پہلے قوم ثمود کا ہوا۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۠﴿۶۰﴾ ع ۸

۶۰۔ اور جب ہم نے تم سے کہا کہ تمھارے رب نے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ اور وہ رؤیا جو ہم نے تم کو دکھایا وہ صرف لوگوں کی جانچ کے لیے تھا، اور اس درخت کو بھی جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے۔ اور ہم ان کو ڈراتے ہیں، لیکن ان کی غایت سرکشی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

لوگ خدا کے داعی سے اکثر اپنے تجویز کردہ معجزہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ کھلے ذہن کے ساتھ دیکھیں تو داعی کی خصوصی نصرت کی شکل میں وہ معجزہ انھیں دکھایا جا چکا ہوتا ہے، جس کو وہ داعی کی صداقت کو جانچنے کے لیے دیکھنا چاہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین آپ سے حسی معجزات مانگ رہے تھے۔ فرمایا کہ کیا یہ معجزہ تمھاری آنکھ کھولنے کے لیے کافی نہیں کہ دعوت کے ابتدائی دور میں جب اس کی بظاہر کوئی طاقت نہیں تھی، یہ اعلان کیا گیا کہ خدا تمھیں گھیرے میں لیے ہوئے ہے (وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ 85:20)۔ یہ پیشین گوئی قبائلِ عرب میں اسلام کی توسیع سے پوری ہو گئی۔ پھر اس کی تکمیل بدر کی فتح اور صلح حدیبیہ کے بعد مکہ کی فتح کی صورت میں ہوئی۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی صبح کو جب یہ اعلان کیا کہ آج رات میں بیت الحرام سے بیت المقدس تک گیا تو لوگوں کو یقین نہیں آیا۔ اس کے بعد ایسے افراد بلائے گئے جو بیت المقدس کو دیکھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے آپ نے بیت المقدس کی عمارت کی پوری تفصیل بیان کر دی۔

مگر ان واقعات کو لوگوں نے مذاق میں ٹال دیا حالاں کہ وہ آپ کی صداقت کا معجزاتی ثبوت تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ حسی معجزہ دکھانے کا نہیں ہے بلکہ دعوت پر سنجیدہ غور وفکر کا ہے۔ اگر لوگ دعوت کے بارے میں سنجیدہ نہ ہوں تو ہر چیز کو مذاق اور استہزاء کی نذر کر دیں گے۔ خواہ وہ بات بذات خود کتنی ہی قابل لحاظ کیوں نہ ہو۔

قرآن (37:62) میں جب ڈرایا گیا کہ جہنم میں زقوم کا کھانا ہوگا تو روایات میں آتا ہے کہ ابو جہل نے کہا کہ ہمارے لیے کھجور اور مکھن لے آؤ جب وہ لایا گیا تو وہ دونوں کو ملا کر کھانے لگا اور کہا تم لوگ بھی کھاؤ یہی زقوم ہے (قَالَ أَبُو جَهْلٍ: هَاتُوا لَنَا تَمْرًا وَزُبْدًا، وَجَعَلَ يَأْكُلُ هَذَا بِهَذَا وَيَقُولُ: تَزَقَّمُوا، فَلَا نَعْلَمُ الزَّقُّومَ غَيْرَ هَذَا) تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 92۔

اسی طرح قرآن (17:60) میں شجرۂ ملعونہ کا ذکر ہے جو جہنمیوں کا کھانا ہوگا۔ جب قرآن میں یہ آیت اتری تو قریش کے ایک سردار نے کہا: ابو کبشہ کے لڑکے کو دیکھو۔ وہ ہم سے ایسی آگ کا وعدہ کرتا ہے جو پتھر تک کو جلا دے گی۔ پھر اس کا گمان ہے کہ اس کے اندر ایک درخت اگتا ہے حالانکہ معلوم ہے کہ آگ جلانے والی چیز ہے (إِنَّ ابْنَ أَبِي كَبْشَةَ يُوعِدُكُمْ بِنَارٍ تُحْرِقُ الْحِجَارَةَ ثُمَّ يَزْعُمُ أَنَّهُ يَنْبُتُ فِيهَا شَجَرَةٌ، وَتَعْلَمُونَ أَنَّ النَّارَ تُحْرِقُ الشَّجَرَةَ) تفسیر البغوی، جلد 5، صفحہ 103۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾

۶۱۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔ اس نے کہا کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے۔ ۶۲۔ اس نے کہا، ذرا دیکھ، یہ شخص جس کو تو نے مجھ پر عزت دی ہے اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے لوگوں کے سوا اس کی تمام اولاد کو کھا جاؤں گا۔

فرشتے اور ابلیس کا قصہ بتاتا ہے کہ ماننے والے کیسے ہوتے ہیں اور نہ ماننے والے کیسے۔ ماننے والے لوگ حق کو حق کے لحاظ سے دیکھتے ہیں چنانچہ اس کو سمجھنے میں انھیں دیر نہیں لگتی۔ وہ فوراً اس کو سمجھ کر اسے مان لیتے ہیں۔ جیسا کہ آدم کی پیدائش کے وقت فرشتوں نے کیا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو حق کو اپنے ذات کی نسبت سے دیکھتے ہیں۔ شیطان نے یہی کیا۔ اس نے حق کو اپنی ذات کی نسبت سے دیکھا۔ چوں کہ سجدۂ آدم کا حکم آدم کو بظاہر بڑا بنا رہا تھا اور اس کو چھوٹا، اس نے ایسے حق کو ماننے سے انکار کر دیا جس کو ماننے کے بعد اس کی اپنی ذات چھوٹی ہو جائے۔

شیطان نے خدا کو جو چیلنج دیا تھا اس کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو ہر وہ شخص شیطان کا شکار نظر آئے گا جو حق کو اس لیے نظر انداز کر دے کہ اس کو ماننے کی صورت میں اس کی اپنی ذات دوسرے کے مقابلہ میں چھوٹی ہو جاتی ہے۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا

۶۳۔ خدا نے کہا کہ جا، ان میں سے جو بھی تیرا ساتھی بنا تو جہنم تم سب کا پورا پورا بدلہ ہے۔ ۶۴۔ اور ان میں سے جس پر تیرا بس چلے، تو اپنی آواز سے ان کا قدم اکھاڑ دے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا اور ان کے مال اور اولاد میں ان کا ساجھی بن جا اور ان سے وعدہ کر۔ اور شیطان کا

غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ﴿۶۵﴾

وعدہ ایک دھوکہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ ۶۵۔ بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا زور نہیں چلے گا اور تیرا رب کارسازی کے لیے کافی ہے۔

’’انسانوں میں سے جو شخص شیطان کی راہ چلے گا‘‘۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ خواہ شیطان کے راستے پر چلے یا خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر۔ اسی آزادی کے استعمال میں انسان کا اصل امتحان ہے۔ یہیں کامیاب ہو کر وہ یا تو خدا کا انعام پاتا ہے یا ناکام ہو کر شیطان کے انجام کا مستحق بن جاتا ہے۔

شیطان کو اس دنیا میں آزادی حاصل ہے کہ وہ انسان کو اپنا ساتھی بنائے۔ وہ اس کے اوپر اپنی ساری کوشش استعمال کرے۔ وہ اس کے اندر گھس کر اس کے مال و اولاد میں شامل ہو جائے۔ مگر شیطان کو کسی بھی درجہ میں انسان کے اوپر کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ شیطان کے بس میں صرف یہ ہے کہ وہ آواز اور الفاظ کے ذریعے لوگوں کو بہکائے۔ وہ بے حقیقت چیزوں کو خوش نما بنا کر انھیں عظیم حقیقت کے روپ میں پیش کرے۔

آیت میں لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (ان پر تیرا زور نہیں چلے گا) کے الفاظ بتاتے ہیں کہ شیطان امکانی طور پر انسان کے مقابلہ میں زیادہ طاقت ور ہے۔ پھر ایک ایسی دنیا جہاں شیطان اپنے تمام ’’سوار اور پیادے‘‘ کے ذریعہ انسان کے اوپر حملہ آور ہو وہاں اس سے بچنے کا راستہ کیا ہے۔ اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ انسان خدا کو حقیقی معنوں میں اپنا کارساز بنائے۔ جو شخص ایسا کرے گا خدا اس کو اس طرح اپنی حفاظت میں لے لے گا کہ شیطان اس کے مقابلہ میں اپنی تمام طاقتوں کے باوجود عاجز ہو کر رہ جائے۔

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿۶۶﴾ وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

۶۶۔ تمھارا رب وہ ہے جو تمھارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ بے شک وہ تمھارے اوپر مہربان ہے۔ ۶۷۔ اور جب سمندر میں تم پر کوئی آفت آتی ہے تو تم ان معبودوں کو بھول جاتے ہو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے تھے۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم دوبارہ پھر جاتے ہو۔ اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

خدا نے موجودہ دنیا کو خاص قوانین کا پابند بنا رکھا ہے۔ اس بنا پر انسان کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ سمندر میں اپنا جہاز چلائے اور ہوا میں اپنی سواریاں دوڑائے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ انسان اپنے حق میں اپنے خدا کی رحمتوں کو پہچانے اور اس کا شکرگزار بنے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کو بس ایسا ہی ہونا ہے۔ وہ ایک ارادی واقعہ کو اپنے آپ ہونے والا واقعہ فرض کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ان واقعات کو دیکھ کر اس کے اندر کوئی خدائی احساس نہیں جاگتا۔

خدا کی معرفت اتنی حقیقی ہے کہ وہ انسان کی فطرت کے اندر آخری گہرائی تک پیوست ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس پر کوئی آفت آپڑے جس کے مقابلہ میں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرے۔ مثلاً اتھاہ سمندر میں طوفان کا آنا اور جہاز کا اس کے اندر پھنس جانا۔ اس طرح کے لمحات میں انسان کے اوپر سے اس کے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں وہ ایک خدا کو پہچان کر اسے پکارنے لگتا ہے۔

یہ وقتی تجربہ انسان کو اس لیے کرایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی پوری زندگی کو اس پر ڈھال لے۔ وہ وقتی اعتراف کو اپنا مستقل ایمان بنالے۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ سمندر کے طوفان میں وہ جس حقیقت کو یاد کرتا ہے، خشکی کے ماحول میں پہنچتے ہی وہ اسے بھول جاتا ہے۔

خدا کی خدائی کو ماننے کا نام توحید ہے اور خدا کی خدائی کو نہ ماننے کا نام شرک۔ اس اعتبار سے توحید کی اصل حقیقت اعتراف ہے اور شرک کی اصل حقیقت عدم اعتراف۔ انسان سے اس کے خدا کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی اعتراف ہے۔ مگر انسان اتنا ظالم ہے کہ وہ اعتراف کے بقدر بھی خدا کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿٦٨﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿٦٩﴾

۶۸۔ کیا تم اس سے بے ڈر ہو گئے کہ خدا تم کو خشکی کی طرف لا کر زمین میں دھنسا دے یا تم پر پتھر برسانے والی آندھی بھیج دے، پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ ۶۹۔ یا تم اس سے بے ڈر ہو گئے کہ وہ تم کو دوبارہ سمندر میں لے جائے پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے اور تم کو تمھارے انکار کے سبب سے غرق کر دے۔ پھر تم اس پر کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا نہ پاؤ۔

خدا انسان کو اس کی سرکشی کے باوجود فوراً نہیں پکڑتا۔ بلکہ اس پر وقتی آفت بھیج کر اس کو خبردار کرتا ہے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب آفت آتی ہے تو وقتی طور پر اس کے اندر احساس جاگتا ہے مگر آفت کے رخصت ہوتے ہی اس کا احساس بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ بعد کو بھی وہ اتنا ہی خدا کے قبضہ میں ہوتا ہے جتنا کہ وہ پہلے تھا۔

سمندر کے سفر سے اگر ایک بار وہ سلامتی کے ساتھ واپس آ گیا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو دوبارہ سمندر کا سفر پیش آئے اور وہ دوبارہ اسی آفت میں گھر جائے جس میں وہ پہلے گھرا تھا۔ مزید یہ کہ خشکی کے خطرات سمندر کے خطرات سے کم نہیں ہیں۔ سمندر میں جو چیز طوفان ہے خشکی پر وہی چیز زلزلہ بن جاتی ہے۔ پھر وہ کون سا مقام ہے جہاں آدمی کوئی ایسی چیز پالے جو خدا کے مقابلہ میں اس کی طرف سے روک بن سکے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾ ع

۷۰۔اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

دنیا کی تمام مخلوقات میں انسان کو خصوصی فضیلت حاصل ہے۔ ’’تکریم‘‘ یعنی انسان کے ساتھ حَمَلْنٰا کا معاملہ کیا گیا ہے، اللہ نے ان کو خشکی اور تری میں سفر کرنے کے لیے سواری عطا کی۔ جب کہ حیوانات کے ساتھ حَمَلْنٰا کا معاملہ نہیں کیا گیا۔ جانور اپنے پیروں کے ذریعہ زمین پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کر کے خشکی کا سفر کرایا۔ مچھلیاں اپنی جسمانی محنت سے سمندر میں تیرتی ہیں۔ چڑیاں اپنے بازوؤں کے ذریعہ فضا میں اڑتی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر فضا میں اڑنے کا انتظام کیا یا بذریعہ کشتی ان کو سمندر کی سطح پر سفر کرایا گیا ہے۔

چاند اور ستارے بے شعور مخلوق ہیں جب کہ انسان شعور اور ارادہ کا مالک ہے۔ درخت پر دوسرے جس طرح چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں مگر انسان خود دوسری چیزوں کے اوپر تصرف کرتا ہے۔ جانور صرف اپنے اعضاء کے ذریعہ عمل کرتے ہیں مگر انسان اوزار اور مشین بنا کر ان کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ دریا کے لیے صرف یہ ممکن ہے کہ وہ نشیب کے رخ پر بہے مگر انسان بلندیوں پر چڑھتا ہے اور بہاؤ کے الٹے رخ پر سفر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

انسان کے لیے اس دنیا میں رزق کا شاہانہ انتظام کیا گیا ہے۔ درخت کے پتے شمسی انرجی کو کیمیائی انرجی میں تبدیل کرتے ہیں تاکہ اس سے انسان کی غذا تیار ہو۔ جانور گھاس کھاتے ہیں تاکہ اس کو انسان کے لیے دودھ اور گوشت کی شکل میں لوٹائیں۔ مکھیاں رات دن سرگرم رہتی ہیں تاکہ وہ دنیا بھر کے پھولوں کا رس چوس کر انسان کے لیے شہد کا ذخیرہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ کیسا عجیب کَرَّمْنَا کا معاملہ ہے جو انسان کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس انعام کا تقاضا تھا کہ انسان خدا کا شکر گزار بنے۔ مگر تمام مخلوقات میں انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے کم خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾ وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾

۷۱۔جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے رہنما کے ساتھ بلائیں گے۔ پس جس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ لوگ اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ ۷۲۔اور جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور بہت دور پڑا ہوگا راستے سے۔

دنیا میں ہر انسانی گروہ اپنے رہنماؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ آخرت میں بھی ہر گروہ اپنے اپنے رہنما کے ساتھ بلایا جائے گا۔ اچھے لوگ اپنے رہنما کے ساتھ اور برے لوگ اپنے رہنما کے ساتھ۔

اس کے بعد ہر ایک کو اس کی زندگی کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔ نیک لوگوں کا اعمال نامہ ان کے دائیں ہاتھ میں اور برے لوگوں کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں۔ یہ گویا ایک محسوس علامت ہوگی کہ پہلا گروہ خدا کا مقبول گروہ ہے اور دوسرا گروہ اس کا نامقبول گروہ۔

آخرت میں اچھے اور برے کی جو تقسیم ہوگی وہ اس بنیاد پر ہوگی کہ کون دنیا میں اندھا بن کر رہا اور کون بینا بن کر۔ دنیا میں چوں کہ خدا خود براہِ راست انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔ اس لیے دنیا کی زندگی میں خدا کی باتوں کو کائنات کی خاموش نشانیوں اور داعیانِ حق کے الفاظ سے جاننا پڑتا ہے۔ جو لوگ اس بالواسطہ کلام سے معرفت حاصل کریں، وہ خدا کی نظر میں ''بینا'' لوگ ہیں۔ اور جو لوگ بالواسطہ کلام کی زبان نہ سمجھیں اور اس وقت کے منتظر ہوں جب خدا ظاہر ہو کر خود کلام فرمائے گا وہ خدا کی نظر میں ''اندھے'' لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں کا براہِ راست کلام کو سننا کچھ بھی کام نہ آئے گا۔ وہ اس وقت بھی حقیقت سے بہت دور رہیں گے جیسا کہ آج اس سے دور پڑے ہوئے ہیں۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖۗ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَ لَوْ لَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۗ ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

۷۳۔ اور قریب تھا کہ یہ لوگ فتنہ میں ڈال کر تم کو اس سے ہٹا دیں جو ہم نے تم پر وحی کی ہے، تاکہ تم اس کے سوا ہماری طرف غلط بات منسوب کرو اور تب وہ تم کو اپنا دوست بنا لیتے۔ ۷۴۔ اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔ ۷۵۔ پھر ہم تم کو زندگی اور موت دونوں کا دہرا (عذاب) چکھاتے۔ اس کے بعد تم ہمارے مقابلہ میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اصل نکتہ یہ تھا کہ خدا صرف ایک ہے اور اس کے سوا جن بتوں کو تم پوجتے ہو وہ سب باطل ہیں۔ اہل مکہ اگرچہ ایک بڑے خدا کا اقرار کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ وہ دوسرے خداؤں کو بھی مانتے تھے۔

یہ دوسرے خدا کون تھے۔ یہ ان کے بزرگ اور اکابر تھے جن کو وہ مقدس سمجھتے تھے اور ان کی سنگی تصویریں بنا کر ان کے سامنے جھکنا شروع کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید سے بزرگوں کے اس عقیدہ پر زد پڑتی تھی۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مصالحت کے لیے کہتے تھے کہ ہم آپ کے معبود کو مانیں گے، شرط یہ ہے کہ آپ ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دیں (مساوِمتهم له أن يعبدوا إلٰهه مقابل أن يترك التنديد بآلهتهم وما كان عليه آباؤهم) صفوۃ التفاسیر، جلد 2، صفحہ 157۔

اس دنیا میں وہ شخص فوراً لوگوں کی نظر میں مبغوض ہو جاتا ہے جو ایسی بات کہے جس کی زد لوگوں کے بڑوں پر پڑتی ہو۔ اس کے برعکس، لوگوں کے درمیان محبوب بننے کا سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ ایسی بات کہو جس میں سب لوگ اپنے اپنے بزرگوں کی تصدیق پا رہے ہوں۔ مگر پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ سچائی کا کھلا اعلان کیا جائے۔ اس کی پروا نہ کی جائے کہ کس بزرگ پر اس کی زد پڑتی ہے اور کس پر نہیں پڑتی۔

دعوتی عمل سے اصل مقصود حقیقت کا کامل اعلان ہے۔ اسی لیے اعلان کے معاملہ میں کسی کمی یا رعایت کی اجازت نہیں ہے۔ پیغمبر یا غیر پیغمبر، جو بھی دعوتِ حق کے لیے اٹھے اس کو حقیقت کا واشگاف اعلان کرنا ہے، خواہ اس کی یہ قیمت دینی پڑے کہ دنیا میں اس کا کوئی دوست باقی نہ رہے۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٧٦﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿٧٧﴾ ع ٨/٨

۷۶۔ اور یہ لوگ اس سرزمین سے تمھارے قدم اکھاڑنے لگے تھے تاکہ تم کو اس سے نکال دیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو تمھارے بعد یہ بھی بہت کم ٹھہرنے پاتے۔ ۷۷۔ جیسا کہ ان رسولوں کے بارے میں ہمارا طریقہ رہا ہے جن کو ہم نے تم سے پہلے بھیجا تھا اور تم ہمارے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

جب بھی کسی گروہ میں سچے دین کی دعوت اٹھتی ہے تو صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو مذہب کے نام پر قائم شدہ گدیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ دوسری طرف حق کا داعی ہوتا ہے جو بے آمیز دین کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے وقت کے ماحول میں تنہا اور بے زور دکھائی دیتا ہے۔ یہ فرق لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے۔ وہ داعی حق کو بالکل بے قیمت سمجھ لیتے ہیں۔ حتی کہ یہ چاہتے ہیں کہ اس کو اپنی بستی سے نکال دیں۔

ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ زمین خدا کی زمین ہے۔ یہاں کسی بندۂ خدا کے خلاف تخریب کا منصوبہ بنانا خود اپنے آپ کو خدا کی نظر میں مجرم ثابت کرنا ہے۔ خدا کے داعی کو کسی بستی سے نکالنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شہر سے اس شخص کو نکال دیا جائے جس کو وہاں حکومتِ وقت کے نمائندہ کی حیثیت حاصل ہو۔ ایسے شخص کو بستی میں نہ رہنے دینے کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ بستی والے خود وہاں نہ رہنے پائیں۔

آدمی دوسرے کو نکالتا ہے حالاں کہ وہ خود اپنے آپ کو نکال رہا ہوتا ہے۔ آدمی دوسرے کو چھوٹا کرنا چاہتا ہے حالاں کہ وہ خود اپنے آپ کو اس مالک حقیقی کی نظر میں چھوٹا کر رہا ہوتا ہے، جس کو حقیقۃً یہ اختیار ہے کہ وہ جس کو چاہے چھوٹا کرے اور جس کو چاہے بڑا کرے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿٧٨﴾

۷۸۔ نماز قائم کرو سورج ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے تک۔ اور خاص کر فجر کی قرآت۔ بے شک فجر کی قرآت مشہود ہوتی ہے۔

آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: ''قائم رکھو نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک''۔ ان الفاظ سے بظاہر یہ نکلتا ہے کہ دوپہر بعد سے لے کر رات کا اندھیرا چھانے تک مسلسل نماز پڑھی جاتی رہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کی عظمت اور اس کے احسانات کا تقاضا یہی ہے کہ بندے ہر وقت اس کی عبادت کرتے رہیں۔ مگر حدیث کی تشریح نے اس عام حکم کو خاص کر دیا۔ حدیث نے اس مشکل حکم کو اس طرح آسان کر دیا کہ اس نے قرار دیا کہ عام اوقات میں لوگ صرف ذکر (یاد) کی حد تک خدا سے اپنا تعلق وابستہ رکھیں، اور دوپہر سے رات تک کے اوقات میں چار بار (ظہر، عصر، مغرب، عشا) اس کی عبادت کر لیا کریں۔

اسی طرح آیت کے دوسرے ٹکڑے کا لفظی ترجمہ یہ ہے — ''اور قرآن پڑھنا فجر کا''۔ اس کو بھی اگر اس کے ظاہری مفہوم میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ روزانہ صبح کے تمام اوقات میں قرآن پڑھا جاتا رہے مگر یہاں حدیث کی تشریح نے ہمارے لیے آسانی پیدا کر دی۔ حدیث کے مطابق اس حکم کا متعین مطلب یہ ہے کہ صبح کے وقت بھی ایک نماز ادا کی جائے، اور اس (پانچویں) نماز کا نمایاں پہلو یہ ہو کہ اس میں قرآن کی لمبی تلاوت کی جائے۔

وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

۷۹۔ اور رات کو تہجد پڑھو، یہ نفل ہے تمھارے لیے۔ امید ہے کہ تمھارا رب تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے۔

تہجد کی نماز کی روح اللہ کو اپنی مخصوص تنہائیوں میں یاد کرنا ہے۔ تہجد کے لفظی معنی رات کی بیداری کے ہیں۔ رات کا وقت تنہائی اور سکون کا وقت ہوتا ہے۔ رات کو آدمی جب ایک نیند پوری کر کے اٹھتا ہے تو وہ اس کے تمام اوقات میں سب سے بہتر وقت ہوتا ہے۔ ان لمحات میں آدمی جب خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نماز کی صورت میں ہاتھ باندھ کر خدا کے کلام کو پڑھتا ہے تو گویا وہ اپنی عبدیت کی آخری تصویر بنا رہا ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ اس کا دل بھی اس کا ساتھ دے رہا ہو اور اس کی شخصیت اس طرح پگھل اٹھی ہو کہ وہ بے قرار ہو کر آنکھوں کے راستہ سے بہہ پڑے۔

مقام محمود کے لفظی معنی ہیں تعریف کیا ہوا مقام۔ اس محمودیت کا ایک دنیوی پہلو ہے اور ایک اس کا، اُخروی پہلو۔ اُخروی پہلو وہ ہے جس کو مفسرین شفاعت کبریٰ کہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، قیامت کے دن تمام انبیاء اپنے مومنین کی شفاعت کریں گے۔ یہ شفاعت گویا ان کے مومن ہونے کی تصدیق ہوگی، جس کے بعد ان لوگوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا، جن کو خدا جنت میں داخل کرنا چاہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سب سے بڑی ہوگی۔ کیوں کہ اپنے امتیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ سب سے بڑی تعداد کی شفاعت فرمائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محمودیت کا دنیوی پہلو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ایسی تاریخ جمع ہو جائے کہ آپ تمام اقوام عالم کی نظر میں مسلمہ طور پر قابل ستائش اور لائق اعتراف بن جائیں۔ خدا کا یہ منصوبہ آپ کے حق میں مکمل

طور پر پورا ہوا۔ آج دنیا کے تمام لوگ آپ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ کی نبوت ایک مسلّم نبوت بن چکی ہے، نہ کہ نزاعی نبوت جیسا کہ وہ آپ کے ظہور کے ابتدائی سالوں میں تھی۔

محمودی نبوت، دنیوی اعتبار سے مسلمہ (established) نبوت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ایسی نبوت جس کے حق میں تاریخی شہادتیں اتنی زیادہ کامل طور پر موجود ہوں کہ آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیمات کے بارے میں کسی کے لیے شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ انسان، خود اپنے مسلمہ علمی معیار کے مطابق آپ کی حیثیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجائے۔ اقرار واعتراف کی آخری صورت تعریف ہے، اس لیے اس کو "مقام محمود" کہا گیا ہے۔

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

۸۰۔ اور کہو کہ اے میرے رب، مجھ کو داخل کر سچا داخل کرنا اور مجھ کو نکال سچا نکالنا۔ اور مجھ کو اپنے پاس سے مددگار قوت عطا کر۔ ۸۱۔ اور کہہ کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹنے ہی والا تھا۔

پیغمبر اسلام کو عرب کے سردار "مذموم" بنا دینا چاہتے تھے۔ مگر اللہ کا فیصلہ تھا کہ آپ کو "محمود" کے مقام تک پہنچایا جائے۔ اس کے لیے اللہ کا منصوبہ یہ تھا کہ مدینہ میں آپ کے لیے موافق حالات پیدا کیے جائیں اور مکہ سے نکال کر آپ کو مدینہ لے جایا جائے۔ مدینہ میں اسلام کا اقتدار قائم ہو۔ تبلیغی کوشش کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ مکہ فتح کرلیں اور بالآخر سارا عرب مسخر ہوجائے۔ اس طرح توحید کی پشت پر وہ طاقت جمع ہو جو مسلسل عمل کے ذریعہ ساری دنیا سے شرک کا غلبہ ختم کردے۔

یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کو یہاں دعا کی صورت میں پیغمبر اسلام کو تلقین کیا گیا۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَ لَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

۸۲۔ اور ہم قرآن میں سے اتارتے ہیں جس میں شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے، اور ظالموں کے لیے اس سے نقصان کے سوا اور کچھ نہیں بڑھتا۔

قرآن خالص سچائی کا اعلان ہے۔ خالص سچائی جب پیش کی جاتی ہے تو ان تمام لوگوں پر اس کی زد پڑتی ہے جو یا تو سچائی سے خالی ہوں یا ملاوٹی سچائی لیے ہوئے ہوں۔ اب جو لوگ حقیقت پسند ہیں ان کے سامنے جب خالص سچائی آتی ہے تو وہ سچائی کو معیار بناتے ہیں، نہ کہ اپنی ذات کو۔ وہ اپنے آپ کو سچائی پر ڈھال لیتے ہیں، نہ یہ کہ خود سچائی کو اپنے اوپر ڈھالنے لگیں۔ اس طرح ان کی سنجیدگی اور حقیقت پسندی قرآن کو ان کے لیے رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کے اندر اپنی بڑائی کا احساس چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے سامنے جب بے آمیز سچائی آتی ہے تو اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر ان کا ذہن الٹے رخ پر چل پڑتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچ پاتے کہ ''اگر میں سچائی کو اختیار کرلوں تو میں سچا بن جاؤں گا''۔ اس کے بجائے وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ''اگر میں نے سچائی کو مانا تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا''۔ وہ جانے والی چیز کی حفاظت میں رہنے والی چیز کو کھو دیتے ہیں۔ وہ اپنی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر سچائی کو چھوٹا کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔

وَاِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ‌ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـــُٔوۡسًا ﴿۸۳﴾ قُلۡ كُلٌّ يَّعۡمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖؕ فَرَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَنۡ هُوَ اَهۡدٰى سَبِيۡلًا ﴿۸۴﴾ ع ۹

۸۳۔ اور آدمی پر جب ہم انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے اور پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ناامید ہو جاتا ہے۔ ۸۴۔ کہو کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمھارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔

ہر انسان پر یہ حالات گزرتے ہیں کہ جب اس کو راحت اور فراوانی حاصل ہوتی ہے تو وہ زبردست خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کسی بات کو ماننے کے لیے وہ اتنا کڑا بن جاتا ہے جیسے کہ وہ ایسا لوہا ہے جو جھکنا نہیں جانتا۔ مگر جب اس کے اسباب چھن جاتے ہیں اور اس کو عجز کا تجربہ ہوتا ہے تو اچانک وہ بے ہمت ہو جاتا ہے۔ وہ مایوسی سے نڈھال ہو جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے بارے میں اس تجربہ سے گزرتا ہے۔ مگر کوئی ایسا نہیں جو اس تجربہ میں اپنے آپ کو دریافت کرلے۔ وہ یہ سوچے کہ دنیا میں جب کہ اسے آزادی حاصل ہے وہ حق کے مقابلہ میں اتنی سرکشی دکھا رہا ہے۔ مگر اس وقت اس کا کیا حال ہوگا جب کہ قیامت آئے گی اور اس سے اس کا سارا اختیار چھین لے گی۔ آدمی کتنا زیادہ کمزور ہے مگر وہ کتنا زیادہ اپنے کو طاقت ور سمجھتا ہے۔

شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ ہے۔ ہر آدمی کے حالات اور رجحانات کے تحت دھیرے دھیرے اس کا ایک خاص ذہنی سانچہ بن جاتا ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر سوچتا ہے اور اسی کے مطابق اس کا نقطۂ نظر بنتا ہے مگر صحیح نقطۂ نظر وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق صحیح ہو اور غلط وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق غلط ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہ کرنا ہے کہ اس کے شاکلہ نے اس کا جو ذہنی خول بنا دیا ہے وہ اس خول کو توڑے۔ تاکہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسی کہ وہ ہیں۔ بالفاظ دیگر، وہ چیزوں کو ربانی نگاہ سے دیکھنے لگے — جو لوگ اپنے ذہنی خول میں گم ہوں، وہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ اور جو لوگ اپنے ذہنی خول سے نکل کر خدائی نقطہ نظر کو پالیں وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پائی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵

۸۵۔ اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یہاں روح سے مراد وحی الٰہی ہے۔ عرب کے جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا، وہ وحی والہام کے منکر نہ تھے۔ اس سوال کا رخ ان کے نزدیک رسول اللہ کی بے خبری کی طرف تھا، نہ کہ حقیقۃً اپنی بے خبری کی طرف۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رسول اللہ کے گرد عظمت کی تاریخ نہیں بنی تھی۔ لوگوں کو آپ محض ایک عام انسان نظر آتے تھے۔ چوں کہ انھیں یقین نہیں تھا کہ خدا کا فرشتہ آپ کے پاس خدا کی وحی لے کر آتا ہے۔ اس لیے انھوں نے آپ کا مذاق اڑانے کے لیے یہ سوال کیا۔

تاہم اس سوال کے جواب میں قرآن میں ایک اہم اصولی بات بتادی گئی۔ وہ یہ کہ انسان کو صرف ’’علم قلیل‘‘ دیا گیا ہے، وہ ’’علم کثیر‘‘ کا مالک نہیں ہے۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان سوالات میں نہ الجھے جن کو وہ اپنی پیدائشی کم علمی کی بنا پر جان نہیں سکتا۔

قدیم زمانہ میں انسان صرف آنکھ کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔ تاہم بصری مطالعہ نے بتایا کہ آنکھ صرف ایک حد تک کام کرتی ہے۔ اس لیے وہ کلی مطالعہ کے لیے کافی نہیں۔ مثلاً ایک چیز جو دور سے دیکھنے میں ایک نظر آتی ہے، قریب سے جا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو تھیں۔

موجودہ زمانہ میں آلاتی مطالعہ وجود میں آیا تو انسان نے سمجھا کہ آلات اس کی محدودیت کا بدل ہیں۔ آلاتی مطالعہ کے ذریعے چیزوں کو ان کی آخری حد تک دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر بیسویں صدی میں پہنچ کر اس خوش خیالی کا خاتمہ ہو گیا۔ اب معلوم ہوا کہ چیزیں اس سے زیادہ پیچیدہ اور اس سے زیادہ پراسرار ہیں کہ آلات کی مدد سے ان کو پوری طرح دیکھا جاسکے۔

ایسی حالت میں اجمالی علم پر قانع ہونا انسان کے لیے حقیقت پسندی کا تقاضا بن گیا ہے، نہ کہ محض عقیدہ کا تقاضا۔ ہماری صلاحیتیں محدود ہیں اور ہم سے ماورا جو عالم ہے وہ لامحدود۔ پھر محدود کے لیے کس طرح ممکن ہے کہ وہ لامحدود کا احاطہ کر سکے۔ انسان کی محدودیت کا تقاضا ہے کہ وہ بالواسطہ علم پر قناعت کرے اور براہِ راست علم پر اصرار کرنا چھوڑ دے۔ بالفاظ دیگر قرینہ سے حاصل شدہ علم کو بھی اسی طرح معقول (valid) مان لے جس طرح وہ مشاہدہ سے حاصل شدہ علم کو معقول مانتا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝۸۶ اِلَّا

۸۶۔ اور اگر ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں جو ہم نے وحی کے ذریعہ تم کو دیا ہے، پھر تم اس کے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی نہ پاؤ۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ
كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ
الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا
يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ
ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

۸۷۔ مگر یہ صرف تمھارے رب کی رحمت ہے، بے شک تمھارے اوپر اس کا بڑا فضل ہے۔ ۸۸۔ کہو کہ اگر تمام انسان اور جنات جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تب بھی وہ اس کے جیسا نہ لاسکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص خاص اوقات میں اترتا تھا۔ ان مخصوص اوقات کے علاوہ آپ خود بھی اس پر قادر نہ تھے کہ قرآن جیسا کلام وضع کرسکیں۔ دوسرے وقتوں میں آپ کی زبان سے جو کلام نکلتا تھا، وہ ہمیشہ قرآن کے کلام سے مختلف ہوتا تھا۔ جب کبھی لمبی مدت کے لیے وحی رکتی تو آپ بے حد پریشان ہوجاتے۔ مگر آپ کے لیے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ خود یا کسی کی مدد سے قرآن جیسا کلام بنالیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی زبان اور آپ کی اپنی زبان میں بے حد نمایاں فرق ہوتا تھا۔ یہ فرق آج بھی ہر عربی داں قرآن اور حدیث کی زبان کا تقابل کرکے دیکھ سکتا ہے۔

یہ واقعہ اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے کہ قرآن محمد کا کلام نہیں۔ وہ محمد کے سوا ایک اور برتر ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔

جو لوگ قرآن کو انسانی کلام کہتے تھے ان سے کہا گیا کہ اگر تمھارا خیال صحیح ہے تو بحیثیت انسان کے تمھیں بھی اس کی قدرت ہونی چاہیے۔ تم تنہا یا دوسرے انسانوں کو لے کر قرآن جیسا کلام بنالاؤ۔ مگر اس وقت کے لوگوں میں سے کسی کے لیے ممکن نہ ہوسکا کہ وہ اس چیلنج کا جواب دے۔ بعد کے زمانہ میں بھی کوئی ادیب یا عالم قرآن جیسے کلام کا نمونہ پیش نہ کرسکا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے کوشش کی مگر وہ سراسر ناکام رہے۔ وہ قرآن جیسی ایک سورہ بھی نہ بنا سکے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ
كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا
كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ
لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ
جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ

۸۹۔ اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے، پھر بھی اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے۔ ۹۰۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کردو۔ ۹۱۔ یا تمھارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہوجائے، پھر تم اس باغ کے بیچ میں بہت سی

خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾ ع

نہریں جاری کردو۔ ۹۲۔ یا جیسا کہ تم کہتے ہو، ہمارے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرادو یا اللہ اور فرشتوں کو لاکر ہمارے سامنے کھڑا کردو۔ ۹۳۔ یا تمھارے پاس سونے کا کوئی گھر ہوجائے یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمھارے چڑھنے کو بھی نہ مانیں گے جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتاردو جسے ہم پڑھیں۔ کہو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کا پیغام پیش کیا تو آپ کے معاصرین نے کہا کہ ہم تم کو اس وقت مانیں گے جب کہ تم خارقِ عادت کرشمے دکھاؤ۔ مگر اس قسم کے مطالبات خدا کے منصوبۂ تخلیق کے خلاف ہیں۔ انسان کو خدا نے باشعور وجود کے طور پر پیدا کیا ہے۔ یہ ساری کائنات میں ایک انتہائی نادر عطیہ ہے، جو اس لیے دیا گیا ہے کہ انسان ذاتی شعور کے ذریعہ حق کو پہچانے، نہ کہ مسحور کن کرشموں کے ذریعہ۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کا امتحان ''دلیل'' کی سطح پر ہورہا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو دلیل کی زبان میں حق کو پہچاننا اور اس کو اختیار کرنا ہے۔ جو لوگ دلیل کی سطح پر حق کو نہ پہچانیں، وہی وہ لوگ ہیں جو بالآخر ناکام ونامراد رہیں گے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿٩٦﴾

۹۴۔ اور جب ان کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا اور کوئی چیز مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ۹۵۔ کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے کہ اس میں چلتے پھرتے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ ۹۶۔ کہو کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا، دیکھنے والا ہے۔

اس طرح کی آیات کو آج جب ایک آدمی پڑھتا ہے تو اس کو تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیسے ہٹ دھرم لوگ تھے جنھوں نے پیغمبر اعظم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیا۔ اس تعجب کی وجہ دراصل یہ ہے کہ آج کا ایک آدمی

منکرین کا تقابل ''پیغمبر اعظم'' سے کرتا ہے۔ جب کہ دورِ اول کے منکرین کے سامنے جو شخص تھا وہ ایک ایسا شخص تھا جو ابھی تک صرف ''محمد بن عبد اللہ'' تھا۔ وہ ساری تاریخ اس وقت مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی جس کے بعد دنیا نے آپ کو پیغمبر اعظم کی حیثیت سے تسلیم کیا۔

پیغمبر اپنے زمانے کے لوگوں کو صرف ایک ''بشر'' نظر آتا ہے۔ بعد کو جب تاریخی تصدیقات جمع ہو جاتی ہیں تو لوگوں کو نظر آتا ہے کہ یہ واقعی پیغمبر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ اس کے ہم زمانہ مخاطبین نے اس کا انکار کیا اور بعد کے لوگ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔

موجودہ دنیا میں آدمی حالتِ امتحان میں ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ فرشتوں کے ذریعہ اس کو حق سے باخبر کیا جائے۔ فرشتوں کے ذریعہ حق سے باخبر کرنے کا مطلب حقیقت کو آخری حد تک بے نقاب کر دینا ہے۔ جب حقیقت کو آخری حد تک بے نقاب کر دیا جائے تو اس کے بعد آدمی کا امتحان کس چیز میں ہوگا۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾

النصف

۹۷۔ اللہ جس کو راہ دکھائے وہی راہ پانے والا ہے۔ اور جس کو وہ بے راہ کر دے تو تم ان کے لیے اللہ کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔ اور ہم قیامت کے دن ان کو ان کے منہ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے اکھٹا کریں گے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ جب اس کی آگ دھیمی ہوگی ہم اس کو مزید بھڑکا دیں گے۔ ۹۸۔ یہ ہے ان کا بدلہ اس سبب سے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کا انکار کیا۔ اور کہا کہ جب ہم ہڈی اور ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے۔

دنیا میں آدمی اپنی حیثیت مادی کے مطابق جیتا ہے، آخرت میں وہ اپنی حیثیت روحانی کے مطابق نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں راہ سے بے راہ ہوئے وہ قیامت میں اٹھیں گے تو اپنے آپ کو اندھا، بہرا، گونگا پائیں گے۔ ان کا راہ سے بے راہ ہونا اس لیے تھا کہ انھوں نے آنکھ اور کان اور زبان کو اس مقصد میں استعمال نہیں کیا جس کے لیے وہ انھیں دئے گئے تھے۔ انھوں نے خدا کی نشانیوں کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے خدا کے دلائل کو نہیں سنا۔ ان کی زبان حق کی حمایت میں نہیں کھلی۔ وہ آنکھ، کان اور زبان رکھتے ہوئے حق کی نسبت سے بے آنکھ، بے کان اور بے زبان ہو گئے۔ موت کے بعد جب وہ عالم حقیقی میں پہنچیں گے تو وہاں وہ اپنے آپ کو

اپنی اصلی صورت میں پائیں گے، نہ کہ اس مصنوعی صورت میں جو حالت امتحان میں ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر انھیں موجودہ دنیا میں حاصل تھی۔

''جب ہم ریزہ ریزہ ہوجائیں گے'' کہنے والے ایک وہ ہیں جو زبانِ قال سے یہ جملہ دہرائیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو زبانِ حال سے اس کو کہیں۔ یہ دوسرے لوگ وہ ہیں جو آنکھ اور کان اور زبان کو اس کے مقصد تخلیق کے خلاف استعمال کریں اور یہ گمان رکھیں کہ ان کا یہ عمل بس اسی دنیا میں گم ہو کر رہ جائے گا، وہ آخرت میں پہنچنے والا نہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٩٩﴾

۹۹۔ کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ اس پر قادر ہے کہ ان کے مانند دوبارہ پیدا کردے اور اس نے ان کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس پر بھی ظالم لوگ انکار کیے بغیر نہ رہے۔

زمین و آسمان ہمارے سامنے ایک حقیقت کے طور پر موجود ہیں۔ ہم ان کا انکار نہیں کر سکتے۔ یہ موجودگی ثابت کرتی ہے کہ یہاں کوئی زندہ ہستی ہے جو یہ طاقت رکھتی ہے کہ وہ پہلی بار تخلیق کرے، وہ نہیں سے ہے کو وجود میں لائے۔ پھر جب پہلی تخلیق ممکن ہے تو دوسری تخلیق کیوں ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی تخلیق کو ماننے کے بعد دوسری تخلیق کو ماننے میں کوئی علمی وعقلی دلیل مانع نہیں رہتی۔

اتنے کھلے ہوئے قرینہ کے باوجود جو شخص تخلیقِ ثانی کو نہ مانے وہ ظالم ہے۔ وہ ہٹ دھرمی کی زمین پر کھڑا ہوا ہے، نہ کہ دلیل اور معقولیت کی زمین پر۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿١٠٠﴾ ع ۱۱

۱۰۰۔ کہو کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس صورت میں تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔

انسان تنگ ظرف واقع ہوا ہے۔ وہ ہر قسم کے شرف کو اپنے لیے یا اپنے گروہ کے لیے جمع کر لینا چاہتا ہے۔ اگر نعمتوں کی تقسیم انسان کے ہاتھ میں ہوتی تو جن لوگوں کے پاس دولت وعظمت آ گئی تھی وہی نبوت کو بھی اپنے پاس جمع کر لیتے۔ وہ اس کو دوسروں کے پاس جانے نہ دیتے۔

مگر خدا معاملات کو جوہر کے اعتبار سے دیکھتا ہے، نہ کہ گروہی تعصّبات کی نظر سے۔ وہ تمام انسانوں پر نظر ڈالتا ہے۔ اور پوری نسل میں جو سب سے بہتر انسان ہوتا ہے اس کو نبوت کے لیے چن لیتا ہے۔ نبوت کا انتخاب

اگر انسان کرنے لگیں تو یہاں بھی وہی کیفیت پیدا ہو جائے جو انسانی اداروں میں جانب داری کی وجہ سے نااہل انسانوں کی بھیڑ کی صورت میں نظر آتی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ۙ﴿۱۰۳﴾ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ؕ﴿۱۰۴﴾

۱۰۱۔ اور ہم نے موسیٰ کو نو نشانیاں کھلی ہوئی دیں۔ تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ، میرے خیال میں تو ضرور تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ ۱۰۲۔ موسیٰ نے کہا کہ تو خوب جانتا ہے کہ ان کو آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے اتارا ہے، آنکھیں کھول دینے کے لیے اور میرا خیال ہے کہ اے فرعون، تو ضرور شامت زدہ آدمی ہے۔ ۱۰۳۔ پھر فرعون نے چاہا کہ ان کو اس سرزمین سے اکھاڑ دے۔ پس ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا۔ ۱۰۴۔ اور ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم زمین میں رہو۔ پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تم سب کو اکھٹا کر کے لائیں گے۔

فرعون کے سامنے کھلی ہوئی نشانیاں پیش کی گئیں تو اس نے کہا کہ یہ ''جادو'' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کی طرف سے خواہ کتنی ہی طاقت ور دلیل اور کتنی ہی بڑی نشانی پیش کر دی جائے، انسان کے لیے یہ دروازہ بند نہیں ہوتا کہ وہ کچھ الفاظ بول کر اس کو رد کر دے — وہ خدائی نشانی کو انسانی جادو کہہ دے۔ وہ علمی دلیل کو ناقص مطالعہ کہہ کر ٹال دے۔ وہ واضح قرائن کو غیر معقول کہہ کر نظر انداز کر دے۔

حق کے مخالفین جب لفظی مخالفت سے حق کی آواز دبانے میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ جارحانہ کارروائیوں پر اتر آتے ہیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا معاملہ نہیں۔ بلکہ خدا کا معاملہ ہے اور کون ہے جو خدا کے ساتھ جارحیت کر کے کامیاب ہو۔

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰی

۱۰۵۔ اور ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور وہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے۔ اور ہم نے تم کو صرف خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ۱۰۶۔ اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے

مُکْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝١٠٦

اتارا تاکہ تم اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ اور اس کو ہم نے بتدریج اتارا ہے۔

قرآن بے آمیز سچائی کا اعلان ہے۔ مگر بے آمیز سچائی ہمیشہ لوگوں کے لیے سب سے کم قابل قبول چیز ہوتی ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے داعی پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ وہ لوگوں کو ضرور منوالے۔ داعی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کامل طور پر سچائی کا اعلان کردے۔

قرآن میں مخاطب کی آخری حد تک رعایت کی گئی ہے۔ اسی مصلحت کی بنا پر قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا گیا ہے۔ تاکہ جو لوگ سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس کو خوب سمجھتے جائیں۔ وہ آہستہ آہستہ ان کے فکر وعمل کا جزء بنتا چلا جائے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝١٠٧ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝١٠٨ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝١٠٩ السجدة

السجدۃ ۴

۱۰۷۔ کہو کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، وہ لوگ جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا تھا جب وہ ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ ۱۰۸۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارا رب پاک ہے۔ بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہوتا ہے۔ ۱۰۹۔ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں اور قرآن ان کا خشوع بڑھا دیتا ہے۔

خدا کا کلام انسان سے عجز وتواضع کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں خدا اپنا کلام خود سنانے نہیں آتا۔ وہ ایک "انسان" کی زبان سے اپنا کلام جاری کراتا ہے۔ اب جو لوگ اپنے اندر کبر کی نفسیات لیے ہوئے ہیں، وہ اس کے آگے جھکنے کو ایک انسان کے آگے جھکنے کے ہم معنی بنا لیتے ہیں اور اس بنا پر اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

اس کے برعکس، جو لوگ کبر کی نفسیات سے خالی ہوں وہ خدا کے کلام کو بس خدا کے کلام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کو انسان کی زبان سے جاری ہونے والے کلام میں خدا کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ وہ اس کے ذریعہ خدا سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ وہ خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے عجز کو اور اپنے عجز کے مقابلہ میں خدا کی بڑائی کو پا لیتے ہیں۔ یہ احساس ان کے سینے کو پگھلا دیتا ہے۔ وہ روتے ہوئے اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔

پہلی قسم کے آدمیوں کی مثال قریش کے سرداروں کی ہے۔ اور دوسری قسم کے آدمیوں کی مثال اہلِ کتاب کے ان مومنین کی جو دورِ اول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

اس آیت میں بظاہر صالحین اہلِ کتاب کا ذکر ہے۔ انھوں نے قدیم آسمانی صحیفوں میں پڑھا تھا کہ ایک آخری پیغمبر آنے والے ہیں۔ جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے اور ان کا ساتھ دیں گے وہ خدا کی خصوصی رحمت کے مستحق قرار

پائیں گے۔ اس بنا پر وہ اس آخری نبی کا پہلے سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ انتظار اتنا شدید تھا کہ جب وہ پیغمبر آیا تو انھوں نے فوراً اس کو پہچان لیا۔ ان کا یہ حال ہوا کہ اس پیغمبر کی لائی ہوئی کتاب (قرآن) کو جب وہ پڑھتے تو شدت احساس سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور وہ روتے ہوئے خدا کے آگے سجدہ میں گر جاتے۔

تاہم یہ صرف اہلِ کتاب کے ایک گروہ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ سارے انسانوں کا معاملہ ہے۔ ہر انسان کے اندر خدا نے پیشگی طور پر حق کی معرفت رکھ دی ہے، گویا کہ ہر انسان پہلے ہی سے خدائی سچائی کا منتظر ہے۔ اب جو لوگ اپنی اس فطرت کو زندہ رکھیں ان کا وہی حال ہوگا جو سابق اہل کتاب کا ہوا۔ وہ اپنی فطرت کے زندہ شعور کی بنا پر خدائی سچائی کو پہچان لیں گے اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کی طرف بے تابانہ دوڑ پڑیں گے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾ ع ۱۲/۱۲

۱۱۰۔ کہو کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، اس کے لیے سب اچھے نام ہیں۔ اور تم اپنی نماز نہ بہت پکار کر پڑھو اور نہ بالکل چپکے چپکے پڑھو۔ اور دونوں کے درمیان کا طریقہ اختیار کرو۔ ۱۱۱۔ اور کہو کہ تمام خوبیاں اس اللہ کے لیے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ بادشاہی میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے۔ اور تم اس کی خوب بڑائی بیان کرو۔

جو لوگ سچائی کو گہرائی کے ساتھ پائے ہوئے نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ ظاہری چیزوں میں الجھے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خدا کو اِس لفظ سے پکارنا افضل ہے اور کوئی کہتا ہے کہ اُس لفظ سے۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں عبادتی فعل زور سے ادا کرنا چاہیے اور کوئی کہتا ہے کہ دھیرے دھیرے سے۔

عرب میں بھی اس قسم کی بحثیں مختلف انداز سے جاری تھیں۔ فرمایا کہ خدا کو جس بہتر نام سے پکارو وہ اسی کا نام ہے۔ اسی طرح عبادت کے بارے میں فرمایا کہ خدا کی عبادت کی ادائگی کا انحصار نہ زور سے بولنے پر ہے اور نہ دھیرے بولنے پر۔ تم عبادت کی اصل روح اپنے اندر پیدا کرو اور اس کی ادائیگی میں اعتدال سے کام لو۔

عبادت کی روح یہ ہے کہ اللہ کی بڑائی کا کامل احساس آدمی کے اندر پیدا ہو جائے۔ اللہ پر ایمان اس کے لیے ایسی کامل اور عظیم ہستی کی دریافت کے ہم معنی بن جائے جس کو کسی سے مدد لینے کی ضرورت نہ ہو، جس کا کوئی شریک اور برابر نہ ہو۔ جس پر کبھی کوئی ایسا حادثہ نہ گزرتا ہو جب کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ یافت جب لفظوں کی صورت میں ڈھل کر زبان سے نکلنے لگے تو اسی کا نام تکبیر ہے۔

۱۸۔ سُوْرَۃُ الْکَھْف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ
لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا
شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ
الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا
حَسَنًا ﴿۲﴾ مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ﴿۳﴾ وَّ یُنۡذِرَ
الَّذِیۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ﴿۴﴾ مَا لَہُمۡ بِہٖ
مِنۡ عِلۡمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِہِمۡ ؕ کَبُرَتۡ کَلِمَۃً تَخۡرُجُ
مِنۡ اَفۡوَاہِہِمۡ ؕ اِنۡ یَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا کَذِبًا ﴿۵﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندہ پر کتاب اتاری، اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔ ۲۔ بالکل ٹھیک، تاکہ وہ اللہ کی طرف سے ایک سخت عذاب سے آگاہ کردے۔ اور ایمان والوں کو خوش خبری دے دے جو نیک اعمال کرتے ہیں کہ ان کے لیے اچھا بدلہ ہے۔ ۳۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۴۔ اور ان لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔ ۵۔ ان کو اس بات کا کوئی علم نہیں اور نہ ان کے باپ دادا کو۔ یہ بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے، وہ صرف جھوٹ کہتے ہیں۔

قرآن پچھلی آسمانی کتابوں کا تصحیح شدہ اڈیشن (corrected version) ہے۔ پچھلی کتابوں میں یہ ہوا کہ بعد کے لوگوں نے موشگافیاں کرکے خدائی تعلیمات کو پُر پیچ بنا دیا۔ دوسرے یہ کہ خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ ابتدائی تعلیم میں انحراف پیدا کیا گیا اور اس طرح اس کے رخ کو بدل دیا گیا۔ قرآن ان دونوں قسم کی انسانی آمیزشوں سے پاک ہے۔ اس میں ایک طرف اصل دین اپنی فطری سادگی کے ساتھ موجود ہے۔ دوسری طرف اس کا رخ سیدھا خدا کی طرف ہے، جیسا کہ باعتبار واقعہ ہونا چاہیے۔

خدا نے یہ اہتمام کیوں کیا کہ وہ دنیا والوں کے پاس اپنی کتاب بھیجے۔ اس کا مقصد لوگوں کو خدا کی اسکیم سے آگاہ کرنا ہے۔ خدا نے انسان کو اس دنیا میں امتحان کی غرض سے آباد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ ہر ایک کا حساب لے گا۔ اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو جہنم میں ڈالے گا یا جنت کے ابدی باغوں میں بسائے گا۔ خدا چاہتا ہے کہ ہر آدمی موت سے پہلے اس مسئلہ سے باخبر ہوجائے تاکہ کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

دنیا میں انسان کی گمراہی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا سہارا بنا لیتا ہے۔ اسی کی ایک قبیح صورت کسی کو خدا کا بیٹا فرض کرلینا ہے۔ مگر اس قسم کا ہر عقیدہ صرف ایک جھوٹ ہے کیوں کہ زمین و آسمان میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل ہو۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝٦ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝٧ وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝٨

٦۔ شاید تم ان کے پیچھے غم سے اپنے آپ کو ہلاک کرڈالو گے، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔ ٧۔ جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے، تاکہ ہم لوگوں کو جانچیں کہ ان میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے۔ ٨۔ اور ہم زمین کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان بنا دیں گے۔

شاید تم اپنے کو ہلاک کرڈالو گے — یہ جملہ بتاتا ہے کہ داعی اگر دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ ہو تو شدت احساس سے اس کا کیا حال ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ حق کا اتمام اس انتہا پر پہنچ کر ہوتا ہے جب یہ کہا جانے لگے کہ داعی شاید اس غم میں اپنے کو ہلاک کرلے گا کہ لوگ حق کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔

ایک دعوت جو دلیل کے اعتبار سے انتہائی واضح ہو، جس کو پیش کرنے والا دردمندی کی آخری حد پر پہنچ کر اس کو لوگوں کے لیے سنجیدہ غور وفکر کا موضوع بنا دے، اس کے باوجود لوگ اسے نہ مانیں تو اس نہ ماننے کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ دنیا کی دل فریبیاں ہیں۔ موجودہ دنیا اتنی پُرکشش ہے کہ آدمی اس سے اوپر اٹھ نہیں پاتا۔ اس لیے وہ ایسی دعوت کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا جو اس کی توجہات کو سامنے کی دنیا سے ہٹا کر اس دنیا کی طرف لے جا رہی ہے جس کی رونقیں بظاہر دکھائی نہیں دیتیں۔

مگر زمین کی دل فریبیاں انتہائی عارضی ہیں۔ وہ امتحان کی ایک مقرر مدت تک ہیں۔ اس کے بعد زمین کی یہ حیثیت ختم کر دی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ صحرا کی طرح بس ایک خشک میدان ہو کر رہ جائے گی۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝٩ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝١٠ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝١١ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝١٢ ع ١٢/١٣

٩۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے بہت عجیب نشانی تھے۔ ١٠۔ جب ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی، پھر انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب، ہم کو اپنے پاس سے رحمت دے اور ہمارے معاملے کو درست کردے۔ ١١۔ پس ہم نے غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال کے لیے (نیند کا پردہ) ڈال دیا۔ ١٢۔ پھر ہم نے ان کو اٹھایا، تاکہ ہم معلوم کریں کہ دونوں گروہوں میں سے کون مدتِ قیام کا زیادہ ٹھیک شمار کرتا ہے۔

اصحاب کہف کا واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے، جو بتاتا ہے کہ سچے اہل ایمان کی زندگی میں کس قسم کے

مراحل پیش آتے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان بعض اوقات حالات کی شدت کی بنا پر کسی ’’غار‘‘ میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔مگر یہ غار جو بظاہر ان کے لیے ایک قبر تھا، وہاں سے زندگی اور حرکت کا ایک نیا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے۔ان کے مخالفین نے جہاں ان کی تاریخ ختم کر دینی چاہی تھی وہیں سے دوبارہ ان کے لیے ایک نئی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔

کہف والے اگر وہی ہیں جو مسیحی تاریخ میں سات سونے والے (seven sleepers) کہے جاتے ہیں تو یہ قصہ شہر افیسس (Ephesus) سے تعلق رکھتا ہے۔یہ قدیم زمانے کا ایک مشہور شہر ہے۔جو ترکی کے مغربی ساحل پر واقع تھا اور جس کے پُرعظمت کھنڈر آج بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔251-249ء میں اس علاقے میں رومی حکمراں ڈیسیس (Desius) کی حکومت تھی۔یہاں بت پرستی کا زور تھا۔اور چاند کو معبود قرار دے کر اسے پوجا جاتا تھا۔اس زمانہ میں حضرت مسیح کے ابتدائی پیروؤں کے ذریعہ یہاں توحید کی دعوت پہنچی اور پھیلنے لگی۔رومی حکمراں جو خود بھی بت پرست تھا، مذہبِ توحید کی اشاعت کو برداشت نہ کرسکا اور حضرت مسیح کے پیروؤں پر سختیاں کرنے لگا۔مذکورہ اصحاب کہف افیسس کے اعلیٰ گھرانوں کے سات نوجوان تھے جنھوں نے غالباً 250ء میں مذہبِ توحید کو قبول کرلیا۔اور اس کے مبلغ بن گئے۔حکومت کی طرف سے ان کی دارو گیر ہوئی تو وہ شہر سے نکل کر قریب کے ایک پہاڑ کی طرف چلے گئے اور وہاں ایک بڑے غار میں چھپ گئے۔

اصحابِ رقیم غالباً انھیں اصحابِ کہف کا دوسرا نام ہے۔رقیم کے معنی مرقوم کے ہیں، یعنی لکھی ہوئی چیز۔کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ خاندانوں کے مذکورہ سات نوجوان جب لاپتہ ہو گئے تو بادشاہ کے حکم سے ان کے نام اور حالات ایک سیسہ کی تختی پر لکھ کر شاہی خزانہ میں رکھ دئے گئے، اس بنا پر ان کا دوسرا نام اصحاب رقیم (تختی والے) پڑ گیا (تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 139)۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ⑬ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ⑭ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ⑮

۱۳۔ہم تم کو ان کا اصل قصہ سناتے ہیں۔وہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید ترقی دی۔ ۱۴۔اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا جب کہ وہ اٹھے اور کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ہم اس کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔اگر ہم ایسا کریں تو ہم بہت بے جا بات کریں گے۔ ۱۵۔یہ ہماری قوم کے لوگوں نے اس کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔یہ ان کے حق میں واضح دلیل کیوں نہیں لاتے۔پھر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔

’’یہ لوگ واضح دلیل کیوں نہیں لاتے‘‘— اس جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد ان نوجوانوں اور قوم کے بڑے لوگوں کے درمیان ایک مدت تک بحث وگفتگو رہی۔ مگر اس درمیان میں ان بڑوں کی طرف سے جو باتیں کہی گئیں ان میں شرک کے حق میں کوئی واضح دلیل نہ تھی۔ اس تجربہ نے ان توحید پرست نوجوانوں کے یقین کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ان کے لیے ناممکن ہوگیا کہ غیر ثابت شدہ چیز کی خاطر ثابت شدہ چیز کو ترک کردیں۔

مذکورہ مخالفت کے بعد اگر وہ بڑوں کی بڑائی کو اہمیت دیتے تو وہ بے یقینی اور تذبذب کا شکار ہوجاتے۔ مگر جب انھوں نے دلیل اور برہان کو اہمیت دی تو اس نے ان کے یقین میں اور اضافہ کردیا۔ کیوں کہ دلیل اور برہان کے اعتبار سے یہ بڑے انھیں بالکل چھوٹے نظر آئے۔ اپنی تمام ظاہری عظمتوں کے باوجود وہ لوگ جھوٹ کی زمین پر کھڑے ہوئے ملے، نہ کہ سچ کی زمین پر۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾

۱۶۔ اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہوگئے ہو اور ان کے معبودوں سے جن کی وہ خدا کے سوا عبادت کرتے ہیں تو اب چل کر غار میں پناہ لو، تمھارا رب تمھارے اوپر اپنی رحمت پھیلائے گا۔ اور تمھارے کام کے لیے سروسامان مہیا کرے گا۔

بندہ جب حق کی خاطر انسانوں سے کٹتا ہے تو عین اسی وقت وہ خدا سے جڑ جاتا ہے۔ حتی کہ وہ اپنے رب سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ وہ اپنے رب سے کلام کرتا ہے اور اس سے اس کا جواب پاتا ہے۔

اصحابِ کہف کا نومسلمانہ یقین، ان کی بے خوف تبلیغ، ان کا سب کچھ چھوڑنے پر راضی ہوجانا مگر حق کو نہ چھوڑنا، ان چیزوں نے ان کو قربت خداوندی کا اعلیٰ مقام عطا کردیا تھا۔ وہ بظاہر جو کچھ کھو رہے تھے، اس سے زیادہ بڑی چیز ان کے لیے وہ تھی جس کو انھوں نے پایا تھا۔ یہی یافت کا وہ احساس تھا جس نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ ہر دوسری چیز کی محرومی گوارا کرلیں مگر حق سے محرومی کو گوارا نہ کریں۔ وہ اس پر راضی ہوگئے کہ وہ اپنے گھر اور شہر کو چھوڑ کر غار میں چلے جائیں اور پھر بھی ان کی یہ امید باقی رہے کہ ان کا خدا ضرور ان کی مدد کرے گا اور ان کے حالات کو درست کردے گا۔

ابنِ جریر نے عطا کے حوالے سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ان کی تعداد سات تھی۔ وہ غار میں داخل ہوکر عبادت کرتے رہتے اور روتے اور اللہ سے مدد مانگتے (تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 148)، یہاں تک کہ بالآخر خدا نے ان پر لمبی نیند طاری کردی۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ

۱۷۔ اور تم سورج کو دیکھتے کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں جانب کو بچا رہتا ہے اور

ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ
مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ
وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا
مُّرْشِدًا ۧ ﴿۱۷﴾ ع ۲ ۱۴

جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے اور وہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو اللہ ہدایت دے، وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو اللہ بے راہ کردے تو تم اس کے لیے کوئی مددگار، راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔

دعوتی دور میں جب اصحاب کہف اور ان کی قوم کے لوگوں کے درمیان کش مکش بڑھی، اسی دوران میں غالباً انھوں نے امکانی اندیشہ کے پیش نظر ایک مخصوص غار کا انتخاب کرلیا تھا۔ یہ غار اتنا وسیع تھا کہ سات آدمی بآسانی اس کے اندر قیام کرسکیں۔ مزید یہ کہ غالباً وہ شمال رُخ تھا۔ اس بنا پر سورج کی روشنی صبح یا شام کسی وقت بھی براہِ راست اس کے اندر نہیں پہنچتی تھی اور ادھر سے گزرنے والا کوئی شخص باہر سے دیکھ کر یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس کے اندر کچھ انسان موجود ہیں۔

جب آدمی ایسا کرے کہ حق کے معاملے میں مصلحت کا رویہ نہ اختیار کرے۔ مشکل ترین حالات میں بھی وہ صبر وشکر کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ رہے تو خدا اس کو ایسے راستوں کی طرف رہنمائی فرماتا ہے جس میں اس کا ایمان بھی محفوظ رہے اور وہ اپنے دعوتی مشن کو بھی نہ کھوئے۔ یہ نصرت اصحابِ کہف کو ان کے مخصوص حالات کے اعتبار سے پوری طرح حاصل ہوئی۔

مزید یہ کہ خدا نے ان کو اپنے خاص کام کے لیے چن لیا۔ انھوں نے جس روحانی بلندی کا ثبوت دیا تھا اس کے بعد وہ خدا کی نظر میں اس قابل ہوگئے کہ ان کو زندگی بعد موت کا حسی ثبوت بنا دیا جائے — اصحاب کہف کا دو سو سال (یا اس سے زیادہ مدّت) تک سو کر دوبارہ اٹھنا اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ
ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَكَلْبُهُمْ
بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ
عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ
مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور تم انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالاں کہ وہ سورہے تھے۔ ہم ان کو دائیں اور بائیں کروٹ بدلواتے رہتے تھے اور ان کا کتا غار کے دہانے پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اگر تم ان کو جھانک کر دیکھتے تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے اور تمھارے اندر ان کی دہشت بیٹھ جاتی۔

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف یہ کیا کہ اصحابِ کہف پر مسلسل نیند طاری کردی۔ اسی کے ساتھ ان کی حفاظت کے مختلف انتظامات فرمادیے۔ مثلاً وہ برابر کروٹیں لیتے رہتے تھے۔ کیوں کہ حضرت ابن عباس

کے الفاظ میں، اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کا جسم زمین کھا جاتی (لَوْ اَنَّہُمْ لَا یُقَلَّبُوْنَ لَاَکَلَتْہُمُ الْاَرْضُ) تفسیر الطبری، جلد 15، صفحہ 191۔ ان کے غار کے دہانہ پر ایک کتا مسلسل بیٹھا رہا۔ یہ غالباً اس لیے تھا کہ کوئی انسان یا جانور اندر داخل نہ ہو سکے۔ مزید یہ کہ غار کے اندر خدا نے ایسا پُر ہیبت ماحول بنا دیا تھا کہ کوئی شخص اگر جھانکنے کی کوشش کرے تو پہلی ہی نظر میں دہشت زدہ ہو کر بھاگ جائے۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٢٠﴾

۱۹۔ اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا تا کہ وہ آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا، تم کتنی دیر یہاں ٹھہرے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم ٹھہرے ہوں گے۔ وہ بولے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی دیر یہاں رہے۔ پس اپنے میں سے کسی کو یہ چاندی کا سکہ دے کر شہر بھیجو، پس وہ دیکھے کہ پاکیزہ کھانا کہاں ملتا ہے، اور تمھارے لیے اس میں سے کچھ کھانا لائے۔ اور وہ نرمی سے جائے اور کسی کو تمھاری خبر نہ ہونے دے۔ ۲۰۔ اگر وہ تمھاری خبر پا جائیں گے تو تم کو پتھروں سے مار ڈالیں گے یا تم کو اپنے دین میں لوٹا لیں گے اور پھر تم کبھی فلاح نہ پاؤ گے۔

اصحابِ کہف جب سو کر اٹھے تو قدرتی طور پر وہ آپس میں ذکر کرنے لگے کہ وہ کتنی مدت تک سوئے ہوں گے۔ مگر زمانہ خدا کے حکم کے تحت ان کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ اس لیے جو مدت دوسروں کے لیے صدیوں میں پھیلی ہوئی تھی وہ اصحابِ کہف کو بس ایک دن کے برابر معلوم ہوئی۔

سو کر اٹھنے کے بعد انھیں بھوک کا احساس ہوا۔ ان کے پاس کچھ چاندی کے سکے تھے۔ انھوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو ایک سکّہ لے کر بھیجا۔ غالباً ان کا خیال ہوگا کہ شہر کے جن حصوں میں عیسائی بستے ہوں گے وہاں حلال کھانا مل سکے گا۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ تلاش کر کے پاکیزہ کھانا لے آنا۔ نیز انھوں نے تاکید کی کہ سارا معاملہ نہایت خوش تدبیری سے انجام دینا۔ کیوں کہ سابقہ تجربہ کی بنا پر انھیں اندیشہ تھا کہ اگر وہ لوگ ہم سے باخبر ہو جائیں گے تو وہ ہمیں دوبارہ بت پرست بنانے کی کوشش کریں گے۔ اور جب ہم راضی نہ ہوں گے تو وہ ہم کو مار ڈالیں گے۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور اس طرح ہم نے ان پر لوگوں کو مطلع کر دیا، تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں۔ جب لوگ آپس میں ان کے معاملے میں جھگڑ رہے تھے۔ پھر کہنے لگے کہ ان کے غار پر ایک عمارت بنا دو۔ ان کا رب ان کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ ان کے معاملہ میں غالب آئے، انھوں نے کہا کہ ہم ان کے غار پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔

انسان سو سال یا اس سے بھی کم مدّت موجودہ زمین پر زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مر کر باقی رہتا ہے اور دوبارہ ایک نئی دنیا میں اٹھتا ہے جہاں اس کے لیے یا ابدی راحت ہے یا ابدی عذاب۔

یہ انسان کا سب سے زیادہ سنگین مسئلہ ہے اور اس پر لوگوں کے درمیان ہمیشہ بحث جاری رہی ہے۔ اس کی اسی اہمیت کی بنا پر خدا نے ایسا کیا کہ عقلی دلیل کے ساتھ اس کے حق میں حسی دلیل کا بھی انتظام فرمایا، تا کہ ''زندگی بعد موت'' کے معاملہ میں کسی کے لیے اس کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مختلف زمانوں میں یہ حسی دلیل مختلف انداز سے دکھائی جاتی رہی ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں اصحاب کہف کا ''موت'' کے بعد دوبارہ غار سے نکلنا اسی قسم کا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں مافوق سائنس (metascience) کی تحقیقات بھی غالباً اُسی نوعیت کی مثالیں ہیں، جن سے زندگی بعد موت کا نظریہ حسی معیار استدلال پر ثابت ہوتا ہے۔

اصحاب کہف دو سو سال (یا اس سے زیادہ مدت کے بعد) جب غار سے نکلے تو ان کے شہر کی دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ غالباً 250ء میں وہ اپنے شہر افیسس سے نکل کر غار میں گئے تھے۔ اس وقت اس علاقہ میں بت پرست حکمراں ڈیسیس کی حکومت تھی۔ اس درمیان میں مسیحی مبلغین کی کوششوں سے رومی بادشاہ قسطنطین (272-337ء) عیسائی ہو گیا اور اس کے بعد سارے رومی علاقہ میں عیسائی مذہب پھیل گیا۔ 447ء میں جب اصحاب کہف دوبارہ اپنے شہر میں واپس آئے تو ان کے شہر میں عیسائیت کا غلبہ ہو چکا تھا۔

جب یہ ساتوں نوجوان غار سے باہر آئے اور شاہی خزانہ میں محفوظ ان کے نام کی تختی، نیز دوسرے قرائن سے تصدیق ہو گئی کہ یہ وہی نوجوان ہیں جو بت پرستی کے دور میں اپنے مسیحی عقائد کی خاطر شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے تو وہ فوراً لوگوں کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔ نیا رومی حکمراں تھیوڈوسیس خود ان سے ملنے اور ان کی برکت لینے کے لیے پیدل چل کر ان کے پاس آیا، اور جب ان نوجوانوں کا انتقال ہوا تو ان کی یادگار کے طور پر ان کے غار کے اوپر ایک عبادت خانہ تعمیر کیا گیا۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ ع ۳ ۵ ۱۵

۲۲۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے، اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ لوگ کہیں گے وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا، یہ لوگ بے تحقیق بات کہہ رہے ہیں، اور کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو کہ میرا رب بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ تھوڑے ہی لوگ ان کو جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے زیادہ ان کے معاملہ میں بحث نہ کرو اور نہ ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے پوچھو۔

اصحاب کہف کے بارہ میں کچھ لوگ غیر ضروری بحثوں میں مبتلا تھے۔ کسی نے کہا کہ ان کی تعداد تین تھی اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

مگر اس قسم کی بحثیں مزاج کی خرابی کی علامت ہیں۔ جب دینی روح زندہ ہو تو سارا زور اصل حقیقت پر دیا جاتا ہے۔ اور جب قوم پر زوال آتا ہے تو اصل روح پس پشت چلی جاتی ہے اور ظاہری تفصیلات بحث ومناظرہ کا موضوع بن جاتی ہیں۔ سچے خدا پرست کو چاہیے کہ وہ ان بحثوں میں نہ پڑے بلکہ اگر کوئی دوسرا شخص اس قسم کے سوالات کرے تو اس کو اجمالی جواب دے کر گزر جائے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؗ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

۲۳۔ اور تم کسی کام کی نسبت یوں نہ کہو کہ میں اس کو کل کردوں گا۔ ۲۴۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ اور جب تم بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرو۔ اور کہو کہ امید ہے کہ میرا رب مجھ کو بھلائی کی اس سے زیادہ قریب راہ دکھادے۔

قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو مدینہ بھیجا کہ وہ یہود سے مل کر محمد کے بارے میں پوچھیں۔ کیوں کہ وہ لوگ نبیوں کا علم رکھتے ہیں۔ دونوں مدینہ آئے اور علماء یہود سے کہا کہ ہم کو ہمارے آدمی کے بارے میں بتاؤ۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ ان سے تین چیزوں کے بارے میں پوچھو۔ اگر وہ تم کو ان کی بابت بتادیں تو وہ پیغمبر ہیں۔ ورنہ وہ متقول (باتیں بنانے والے) ہیں۔ ان میں سے ایک سوال اصحابِ کہف کے نوجوانوں کے بارے میں تھا۔ دوسرا ذوالقرنین کے بارے میں اور تیسرا روح کے بارے میں۔

پریس کے دور سے پہلے عام لوگوں کو اصحاب کہف کی بابت کچھ معلوم نہ تھا۔ یہ قصہ بعض سریانی مخطوطات میں درج تھا جس کی خبر صرف چند خاص علماء کو تھی۔ آپ کے سامنے یہ سوال آیا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے جو بات پوچھی ہے اس کا جواب میں کل دوں گا (أُخۡبِرُکُمۡ بِمَا سَأَلۡتُمۡ عَنۡهُ غَدًا)۔ آپ کو امید تھی کہ کل تک جبریل آجائیں گے اور میں ان سے معلوم کر کے جواب دے دوں گا۔ مگر جبریل کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ پندرہ دن کے بعد سورہ کہف لے کر آئے (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 301)۔

وحی میں اس تاخیر سے مکہ کے مخالفین کو موقع مل گیا۔ انھوں نے اس کو بنیاد بنا کر لوگوں کو آپ سے بد ظن کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ایک معمولی بات کو شوشہ بنا کر جس شخص کی صداقت سے لوگوں کو مشتبہ کرنا چاہتے ہو اس کی صداقت پر اس سے زیادہ یقینی اور اس سے زیادہ بڑی دلیلیں جمع ہونے والی ہیں (إن اللّٰه سیؤتیه من الحجج علی صحة نبوته ما هو ادلّ من قصة اصحاب الکهف) التفسیر المظہری، جلد 6، صفحہ 27۔

یہ بات آج واقعہ بن چکی ہے، آج پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ صداقت پر اتنے دلائل جمع ہو چکے ہیں کہ کوئی ہوش مند آدمی اس سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا۔ آپ کی نبوت آج ایک ثابت شدہ نبوت ہے، نہ کہ محض مدعیانہ نبوت۔

وَ لَبِثُوۡا فِیۡ کَہۡفِہِمۡ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیۡنَ وَ ازۡدَادُوۡا تِسۡعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۚ لَہٗ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَبۡصِرۡ بِہٖ وَ اَسۡمِعۡ ؕ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّلِیٍّ ۫ وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

۲۵۔ اور وہ لوگ اپنے غار میں تین سو سال رہے (کچھ لوگ مدت کے شمار میں) ۹ سال اور بڑھ گئے ہیں۔ ۲۶۔ کہو کہ اللہ ان کے رہنے کی مدت کو زیادہ جانتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا غیب اس کے علم میں ہے، کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا۔ خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں اور نہ اللہ کسی کو اپنے اختیار میں شریک کرتا ہے۔

قتادہ اور مطرف بن عبد اللہ کی تفسیر کے مطابق 300 سال یا 309 سال لوگوں کے قول کی حکایت ہے، نہ کہ خدا کی طرف سے خبر۔ عبد اللہ بن مسعود کی قرأت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اس زمانہ کے اہلِ کتاب غیر مستند قصوں کی بنیاد پر یہ سمجھتے تھے کہ غار میں اصحاب کہف کے قیام کی مدت شمسی کیلنڈر کے لحاظ سے 300 سال ہے اور قمری کیلنڈر کے لحاظ سے 309 سال (تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 151)۔ قرآن نے لوگوں کے اس خیال کو نقل کیا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ کہہ کر اس کو بے بنیاد قرار دے دیا کہ قُلِ اللّٰهُ أَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوا (کہو کہ اللہ زیادہ جانتا ہے کہ وہ غار میں کتنا ٹھہرے)۔

موجودہ زمانہ کے محققین نے دریافت کیا ہے کہ یہ مدت شمسی کیلنڈر کے لحاظ سے 196 سال تھی۔ یہ تحقیق

اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے جو تمام اگلی پچھلی باتوں سے باخبر ہے۔ اور اسی علم کی بنا پر اس نے مذکورہ قول کو قبول نہیں کیا۔ قرآن اگر کوئی انسانی کلام ہوتا تو یقیناً وہ اپنے زمانہ کے مشہور قول کو لے لیتا جو بالآخر بعد کی تحقیق سے ٹکرا جاتا۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

۲۷۔ اور تمھارے رب کی جو کتاب تم پر وحی کی جارہی ہے اس کو سناؤ، خدا کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور اس کے سوا تم کوئی پناہ نہیں پاسکتے۔
۲۸۔ اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھو جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کی رضا کے طالب ہیں۔ اور تمھاری آنکھیں حیاتِ دنیا کی رونق کی خاطر ان سے ہٹنے نہ پائیں۔ اور تم ایسے شخص کا کہنا نہ مانو جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ اور وہ اپنی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے۔

قدیم مکہ میں جن لوگوں نے پیغمبر کا ساتھ دے کر بے آمیز دین کو اپنا دین بنایا تھا ان کے لیے یہ اقدام کوئی سادہ چیز نہ تھی۔ یہ مفادات سے وابستہ نظام کو چھوڑ کر ایک ایسے عقیدہ کا ساتھ دینا تھا جس سے بظاہر کوئی مفاد وابستہ نہ تھا۔ پہلا گروہ نئے دین کو اختیار کرتے ہی وقت کے جمے ہوئے نظام سے کٹ گیا تھا جب کہ دوسرا گروہ پوری طرح وقت کے جمے ہوئے نظام کے زور پر کھڑا ہوا تھا۔ پہلے گروہ کے پاس صرف خدا کی یاد کی باتیں تھیں جس کی اہمیت آخرت میں ظاہر ہوگی جب کہ دوسرا گروہ ان چیزوں کا مالک بنا ہوا تھا جس کی قیمت اسی دنیا کے بازار میں ہوتی ہے۔

یہ ظاہری فرق اگر داعی کو متاثر کر دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کی بے آمیز دعوت کی اہمیت اس کی نظر میں کم ہو جائے گی۔ اور آمیزش والا دین اس کی نظر میں اہمیت اختیار کرلے گا جس کا علم بردار بن کر لوگ دنیا کی رونقیں حاصل کیے ہوئے ہیں۔

مگر یہ بہت بڑی بھول ہے۔ کیوں کہ یہ اس اصل مشن سے ہٹنا ہے جو خدا کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ داعی اگر ایسا کرے تو وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جائے گا۔ وہ خدا کی دنیا میں ایسا ہو جائے گا کہ کوئی درخت اس کو سایہ نہ دے اور کوئی پانی اس کی پیاس نہ بجھائے۔ چنانچہ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ اے محمد، اگر تم نے لوگوں کو قرآن نہ سنایا تو خدا کے مقابلہ میں تمھارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی (يَقُوْلُ إِنْ أَنْتَ يَا مُحَمَّدُ لَمْ تَتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ، فَإِنَّهُ لَا مَلْجَأَ لَكَ مِنَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ

تَعَالَى: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ [5:67]) تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 151۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾

۲۹۔ اور کہو کہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، پس جو شخص چاہے اسے مانے اور جو شخص چاہے نہ مانے۔ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیں گی۔ اور اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا۔ وہ چہروں کو بھون ڈالے گا۔ کیا برا پانی ہوگا اور کیسا برا ٹھکانا۔

جو حق خدا کی طرف سے آتا ہے وہ آخری حد تک صداقت ہوتا ہے۔ اس لیے لوگوں کی رعایت سے اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ خدائی حق میں ترمیم کرنا گویا اس معیار کو تبدیل کرنا ہے۔ جس پر جانچ کر ہر شخص کی حیثیت متعین کی جانے والی ہے۔

انسان کو موجودہ دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ آزمائش لازمی طور پر آزادی چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو کائنات کے بقیہ اجزاء کی طرح مجبور نہیں کیا گیا۔ اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو اپنے آپ کو نظامِ خداوندی کے مطابق بنائے۔ اور چاہے تو اس سے منحرف ہوجائے۔ مگر یہ آزادی صرف عمل کے لیے ہے، نہ کہ انجام کے لیے۔ انسان کا آخری انجام بہرحال وہی ہونا ہے جو خدا کے محکم قانون کے مطابق اس کا ہونا چاہیے۔

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خدائی حق میں ایسی ترمیم کی جائے کہ اس سے ان کی غلط روش کا جواز نکل آئے وہ گمراہی پر سرکشی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے لیے صرف سخت ترین سزا کا انتظار کرنا چاہیے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿٣٠﴾ ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۭ نِعْمَ الثَّوَابُ ۭ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾ ع

۳۰۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے تو ہم ایسے لوگوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ ۳۱۔ جو اچھی طرح کام کریں، ان کے لیے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور وہ باریک اور دبیز ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے اور کیسی اچھی جگہ۔

جولوگ گھمنڈ، مصلحت اور ظاہر پرستی سے خالی ہوتے ہیں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب خدائی صداقت ان کے سامنے ظاہر ہوتی ہے تو وہ اس کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ خواہ وہ صداقت ان کے جیسے ایک انسان کی زبان سے کیوں نہ ظاہر ہوئی ہو۔

وہ اپنے آپ کو حق کے آگے ڈال دیتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیتے ہیں، نہ کہ خود صداقت کو اپنی زندگی کے مطابق ڈھالنے لگیں۔ جولوگ اس طرح حق پرستی کا ثبوت دیں وہ خدا کے محبوب بندے ہیں۔ ان کو آخرت میں شاہانہ انعامات سے نوازا جائے گا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾

۳۲۔ تم ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دئے۔ اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کا احاطہ بنایا اور دونوں کے درمیان کھیتی رکھ دی۔ ۳۳۔ دونوں باغ اپنا پورا پھل لائے، ان میں کچھ کمی نہیں کی۔ اور دونوں باغوں کے بیچ ہم نے نہر جاری کردی۔ ۳۴۔ اور اس کو خوب پھل ملا تو اس نے اپنے ساتھی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ میں تجھ سے مال میں زیادہ ہوں اور تعداد میں بھی زیادہ طاقت ور ہوں۔ ۳۵۔ وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی برباد ہوجائے گا۔ ۳۶۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی۔ اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹا دیا گیا تو ضرور اس سے زیادہ اچھی جگہ مجھ کو ملے گی۔

ایک باغ جو خوب ہرا بھرا ہو، پھر قدرتی آفت سے اچانک ختم ہوجائے، وہ اس شخص کی تمثیل ہے جو دنیا میں دولت اور عزت پاکر گھمنڈ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ دنیا میں کسی انسان کو دولت یا عزت کا جو حصہ ملتا ہے وہ خدا کی طرف سے بطور امتحان ہوتا ہے۔ مگر ظالم انسان اکثر اس کو اپنے لیے انعام یا اپنی قوت بازو کا حاصل سمجھ لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر سرکشی کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے جن کو دولت اور عزت میں کم حصہ ملا ہو۔ اس کی نفسیات ایسی ہوجاتی ہے کہ گویا اس کی دنیا کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اور اگر یہ دنیا ختم ہوکر دوسری دنیا بنی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہاں بھی اس کا حال اچھا نہ ہو جس طرح یہاں اس کا حال اچھا ہے۔

یہ امتحان کی حالت پر انعام کی حالت کو قیاس کرنا ہے۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ
بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ
سَوّٰىكَ رَجُلًا ؕ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَاۤ
اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ
جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا
بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ
وَلَدًا ﴿ۚ۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ
جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿ۙ۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا
غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

۳۷۔اس کے ساتھی نے بات کرتے ہوئے کہا، کیاتم اس ذات سے انکار کررہے ہوجس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے۔ پھر تم کو پورا آدمی بنادیا۔ ۳۸۔لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہےاورمیں اپنے رب کے ساتھ کسی کوشریک نہیں ٹھہراتا۔ ۳۹۔ اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے توتم نے کیوں نہ کہا کہ جواللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اللہ کے بغیر کسی میں کوئی قوت نہیں۔ اگرتم دیکھتے ہو کہ میں مال اوراولاد میں تم سے کم ہوں۔ ۴۰۔توامید ہے کہ میرارب مجھ کوتمھارے باغ سے بہتر باغ دے دے۔اورتمھارے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ باغ صاف میدان ہوکر رہ جائے۔ ۴۱۔ یا اس کا پانی خشک ہوجائے، پھرتم اس کوکسی طرح نہ پاسکو۔

خدا کسی انسان کو دولت دے تو اس کو خدا کا شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہیے۔لیکن اگر ذہن صحیح نہ ہوتو دولت مندی آدمی کے لیے سرکشی کا سبب بن جاتی ہے۔اس کے برعکس اگر ذہن صحیح ہےتومفلسی میں بھی آدمی خدا کونہیں بھولتا۔ جوکچھ ملاہے اس پر قانع رہ کروہ امید رکھتا ہے کہ اس کا خدااس کومزید دے گا۔

آدمی اگر آنکھ کھول کر دنیا میں رہے تو کبھی وہ سرکشی میں مبتلا نہ ہو۔ انسان ایک حقیر وجود کی حیثیت سے پرورش پاتا ہے۔اس کوحادثات پیش آتے ہیں۔ اس کو بیماری اور بڑھاپا لاحق ہوتا ہے۔ پانی اور دوسری چیزیں جن کے ذریعہ وہ اس دنیا میں اپنا ''باغ'' اگاتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے ذاتی قبضہ میں نہیں۔

یہ سب اس لیے ہے کہ آدمی متواضع بن کر دنیا میں رہے۔مگر ظالم انسان کسی چیز سے سبق نہیں لیتا۔اس کو اس وقت تک ہوش نہیں آتا جب تک وہ ہر چیز سے محروم ہوکر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لے کہ اس کے پاس عجز کے سوااور کچھ نہ تھا۔

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ
اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ

۴۲۔ اوراس کے پھل پر آفت آئی تو جو کچھ اس نے اس پرخرچ کیا تھا اس پر وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اوروہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا پڑا تھا۔اوروہ کہنے لگا

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع

کہ اے کاش، میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا۔ ۴۳۔ اور اس کے پاس کوئی جتھا نہ تھا جو خدا کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود بدلہ لینے والا بن سکا۔ ۴۴۔ یہاں سارا اختیار صرف خدائے برحق کا ہے۔ وہ بہترین اجر اور بہترین انجام والا ہے۔

آدمی ایک کام میں اپنی پونجی لگاتا ہے اور اپنی قابلیت صرف کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری قابلیت اور میری پونجی کامیاب نتیجہ کے ساتھ میری طرف لوٹے گی۔ مگر مختلف قسم کے حادثات آتے ہیں اور اس کی امیدوں کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔ آدمی کی کوئی بھی تدبیر یا اس کی کوئی بھی قابلیت اس کو بچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔

خدا موجودہ دنیا میں بار بار اس طرح کے نمونے دکھاتا ہے تاکہ انسان اس سے سبق لے۔ تاکہ وہ خدا کے سوا کسی دوسری چیز کو اہمیت دینے کی غلطی نہ کرے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

۴۵۔ اور ان کو دنیا کی زندگی کی مثال سناؤ۔ جیسے کہ پانی جس کو ہم نے آسمان سے اتارا۔ پھر اس سے زمین کی نباتات خوب گھنی ہوگئیں۔ پھر وہ ریزہ ریزہ ہوگئیں جس کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۶۔ مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں۔ اور باقی رہنے والی نیکیاں تمھارے رب کے نزدیک ثواب اور توقع کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

دنیا آخرت کی تمثیل ہے۔ پانی پا کر زمین جب سرسبز ہو جاتی ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح رہے گی، مگر اس کے بعد موسم بدلتا ہے اور سارا سبزہ سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے۔

یہی حال دنیا کی رونق کا ہے۔ موجودہ دنیا کی رونقیں آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ مگر یہ تمام رونقیں انتہائی عارضی ہیں۔ قیامت بہت جلد ان کو اس طرح ختم کر دے گی کہ ایسا معلوم ہوگا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

دنیا کی رونقیں باقی نہیں رہتیں مگر یہاں ایک اور چیز ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اور وہ انسان کے نیک اعمال ہیں۔ جس طرح زمین میں بیج ڈالنے سے باغ اگتا ہے اسی طرح اللہ کی یاد اور اللہ کی فرماں برداری سے بھی ایک باغ اگتا ہے۔ اس باغ پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ مگر دنیوی باغ کے برعکس یہ دوسرا باغ آخرت میں اگتا ہے اور وہیں وہ اپنے اگانے والے کو ملے گا۔

وَ يَوۡمَ نُسَيِّرُ الۡجِبَالَ وَ تَرَى الۡاَرۡضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرۡنٰهُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡهُمۡ اَحَدًا ۚ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوۡا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا كَمَا خَلَقۡنٰكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍۭ ۡ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ لَكُمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۴۸﴾

۴۷۔ اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے۔ اور تم دیکھو گے زمین کو بالکل کھلی ہوئی۔ اور ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ پھر ہم ان میں سے کسی کو نہ چھوڑیں گے۔ ۴۸۔ اور سب لوگ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کیے جائیں گے۔ تم ہمارے پاس آ گئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمھارے لیے کوئی وعدہ کا وقت مقرر نہیں کریں گے۔

موجودہ دنیا میں جو حالات جمع کیے گئے ہیں وہ محض امتحان کے لیے ہیں۔ امتحان کی مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد یہ حالات باقی نہیں رہیں گے۔ اس کے بعد زمین کی ساری زندگی بخش خصوصیات ختم کر دی جائیں گی۔ وہ ایسی خالی جگہ ہو جائے گی جہاں نہ کسی کے لیے اکڑنے کا سامان ہوگا اور نہ فخر کرنے کا۔

دنیا میں امتحان کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو اختیار کی فضا میں پا رہا ہے۔ مگر قیامت اس فضا کو یکسر ختم کر دے گی۔ اس دن لوگ بے یار و مددگار فضا میں اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے۔ تمام لوگ اپنے مالک کے سامنے اس کا فیصلہ سننے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ خدا کے پاس ہر شخص کی زندگی کا انتہائی مکمل ریکارڈ ہوگا۔ اس کے مطابق وہ کسی کو انعام دے گا اور کسی کے لیے سزا کا حکم سنائے گا۔

موجودہ دنیا میں انسان کی بیک وقت دو حالتیں ہیں۔ ایک اعتبار سے وہ عاجز ہے اور دوسرے اعتبار سے آزاد۔ آدمی اگر اپنے عجز کو دیکھے تو اس کے اندر خدا کی طرف رجوع کا جذبہ پیدا ہوگا۔ مگر انسان صرف اپنی آزادی کی حالت کو دیکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غافل اور سرکش بن کر رہ جاتا ہے۔

وَ وُضِعَ الۡكِتٰبُ فَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُشۡفِقِيۡنَ مِمَّا فِيۡهِ وَ يَقُوۡلُوۡنَ يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّ لَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰٮهَا ۚ وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع ۶ ۵ ۱۸

۴۹۔ اور رجسٹر رکھا جائے گا تو تم مجرموں کو دیکھو گے کہ اس میں جو کچھ ہے وہ اس سے ڈرتے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے خرابی۔ کیسی ہے یہ کتاب کہ اس نے نہ کوئی چھوٹی بات درج کرنے سے چھوڑی ہے اور نہ کوئی بڑی بات۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ سب سامنے پائیں گے۔ اور تیرا رب کسی کے اوپر ظلم نہ کرے گا۔

انسان جو کچھ کرتا ہے وہ سب خدا کے انتظام کے تحت ریکارڈ ہو رہا ہے۔ آدمی کی نیت، اس کا قول اور اس کا عمل سب کائناتی پردہ پر نقش ہو رہے ہیں۔ تاہم یہ انتظام آج دکھائی نہیں دیتا۔ قیامت میں یہ اوٹ ہٹا دی جائے گی۔ اس وقت انسان یہ دیکھ کر دہشت زدہ رہ جائے گا کہ دنیا میں جو کچھ وہ یہ سمجھ کر کر رہا تھا کہ کوئی اس کو جاننے والا نہیں، وہ اتنے کامل طور پر یہاں مندرج ہے کہ اس کی فہرست سے نہ کوئی چھوٹی چیز بچی ہے اور نہ کوئی بڑی چیز۔

قیامت کے دن انسان کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا اس کی ہر چیز اتنی ثابت شدہ ہوگی کہ آدمی جب اپنے عمل کا بدلہ پائے گا تو اس کو یقین ہوگا کہ اس کے ساتھ وہی کیا جا رہا ہے جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا، نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا، وہ جنوں میں سے تھا۔ پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ اب کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا اپنا دوست بناتے ہو، حالاں کہ وہ تمھارے دشمن ہیں۔ یہ ظالموں کے لیے بہت برا بدل ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس ایک عبادت گزار جن تھا۔ وہ بظاہر عابد وزاہد بنا ہوا تھا۔ مگر جب خدا نے آدم کے سامنے جھکنے کا حکم دیا تو وہ گھمنڈ کی بنا پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اب جو لوگ گھمنڈ کے جذبہ کے تحت حق کے سامنے جھکنے سے انکار کریں وہ سب ابلیس کی ذرّیت ہیں۔ خواہ وہ بظاہر عبادت گزار ہی کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں۔

خدا کے سامنے جھکنا دراصل خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص حقیقی معنوں میں خدا کے سامنے جھکنے والا ہو تو جہاں کہیں بھی اس کا سامنا حق سے ہوگا وہ فوراً جھک جائے گا۔ اس کے برعکس، جو شخص ظاہری طور پر سجدہ گزار ہو مگر اپنے اندر گھمنڈ کی نفسیات لیے ہوئے ہو وہ ایسے موقع پر بآسانی سجدہ کرلے گا جہاں اس کی انا (ego) کو ٹھیس نہ لگتی ہو۔ مگر جہاں انا کو جھکانے کی قیمت پر اپنے آپ کو جھکانا پڑے وہاں اچانک وہ سرکش بن جائے گا اور جھکنے سے انکار کر دے گا۔

جب حق کی پکار اٹھے اور کچھ لوگ ابلیس اور اس کی ذریت کے اثر میں آکر اس کو قبول نہ کریں تو گویا وہ ابلیس اور اس کی ذرّیت کو خدا کا بدل بنا رہے ہیں۔ جہاں انھیں خدا کے ڈر سے حق کے آگے جھک جانا چاہیے تھا وہاں وہ جھوٹے معبودوں کے ڈر سے اس کے آگے جھکنے سے انکار کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ بدترین ظالم ہیں۔

بہت جلد انھیں معلوم ہو جائے گا کہ خدا کو چھوڑ کر انھوں نے جن کے اوپر بھروسہ کیا تھا وہ ان کے کچھ کام آنے والے نہیں۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿٥١﴾

۵۱۔ میں نے ان کو نہ آسمانوں اور زمین پیدا کرنے کے وقت بلایا۔ اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت بلایا۔ اور میں ایسا نہیں کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بناؤں۔

لوگ اپنے جن بڑوں کو دنیا کی زندگی میں قابل بھروسہ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اس قدر کمزور ہیں کہ نہ کائنات کے وجود میں ان کا کوئی دخل ہے، اور نہ خود اپنے وجود میں۔ مزید یہ لوگ حق کی دعوت کے مقابلہ میں مضل (گمراہ کرنے والے) کا کردار ادا کر کے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ قطعاً قابل بھروسہ نہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر طرف حق کی کارفرمائی ہو، وہاں ایسی شخصیتیں کس طرح دخیل ہو سکتی ہیں جن کا واحد سرمایہ لوگوں کو حق سے دور کرنا ہے۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿٥٢﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿٥٣﴾ ع ۱۹

۵۲۔ اور جس دن خدا کہے گا کہ جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے ان کو پکارو۔ پس وہ ان کو پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے۔ اور ہم ان کے درمیان (عداوت کی) آڑ کر دیں گے۔ ۵۳۔ اور مجرم لوگ آگ کو دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔

دنیا میں جن شخصیتوں کے بل پر آدمی حق کا انکار کرتا ہے، قیامت میں وہ اس کے کچھ کام نہ آئیں گی۔ آج وہ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں مگر جب حقائق کھلیں گے تو دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے۔ ایسا معلوم ہوگا گویا دونوں کے درمیان ہلاکت خیز رکاوٹ قائم ہو گئی ہے۔ موجودہ دنیا میں وہ اپنے آپ کو مامون و محفوظ سمجھتے ہیں۔ مگر قیامت میں ان کا انجام صرف یہ ہونے والا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا پائیں اور اس سے بھاگنے کی کوئی تدبیر نہ کر سکیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ

۵۴۔ اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لیے ہر قسم کی مثال بیان کی ہے اور انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ ۵۵۔ اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ان کو ہدایت پہنچ چکی، ایمان لانے سے اور

الْهُدٰى وَ يَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

اپنے رب سے بخشش مانگنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں کا معاملہ ان کے لیے بھی ظاہر ہوجائے، یا عذاب ان کے سامنے آ کھڑا ہو۔

موجودہ دنیا میں امتحان کی آزادی ہے۔ اس بنا پر یہاں آدمی حق کا اعتراف نہ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی عذر پالیتا ہے۔ ہر بات کو رد کرنے کے لیے اس کو کچھ نہ کچھ الفاظ مل جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک کھلی ہوئی دلیل کو بے معنی بحثوں سے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ ایسا کرتا ہے کہ جو دلیل دی گئی ہے اس کو نظرانداز کرکے ایک اور چیز کا تقاضا کرتا ہے جو کسی وجہ سے ابھی پیش نہیں کی گئی۔

اس آخری صورت کی ایک مثال یہ ہے کہ پیغمبر نے اپنے مخاطبین کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ اپنا پیغام پیش کیا تو انھوں نے اس پر دھیان نہیں دیا بلکہ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ کہا کہ انکار کی صورت میں تم ہم کو جس عذاب کی خبر دے رہے ہو وہ کہاں ہے، اس کو لا کر ہمیں دکھاؤ۔

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَ يُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَ اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ مَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

۵۶۔ اور رسولوں کو ہم صرف خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں۔ اور منکر لوگ ناحق کی باتیں لے کر جھوٹا جھگڑا کرتے ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ سے حق کو نیچا کردیں اور انھوں نے میری نشانیوں کو اور جو ڈر سنائے گئے ان کو مذاق بنا دیا۔
۵۷۔ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیات کے ذریعہ یاد دہانی کی جائے تو وہ اس سے منہ پھیر لے اور اپنے ہاتھوں کے عمل کو بھول جائے۔ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دئے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے۔ اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ کبھی راہ پر آنے والے نہیں ہیں۔

خدا کی بات سب سے زیادہ سچی بات ہے۔ تمام بہترین دلائل اس کی موافقت کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اس کو ماننا نہیں چاہتے وہ کوئی حقیقی دلیل نہیں پاتے جس کے ذریعہ وہ اسے رد کرسکیں۔ ان کے پاس ہمیشہ صرف بے اصل باتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ اس کو زیر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ وہ ٹھوس دلائل کا مقابلہ جھوٹے اعتراضات سے کرتے ہیں۔ وہ سنجیدہ کام کو مذاق میں گم کردینا چاہتے ہیں۔

یہ سب وہ اس لیے کرتے ہیں کہ داعی کو عوام کی نظر میں بے اعتبار ثابت کرسکیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ

ایسا کر کے وہ خود اپنے آپ کو خدا کی نظر میں بے اعتبار ثابت کر رہے ہیں۔

آدمی کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ حق اور ناحق میں تمیز کر سکے۔ مگر جب وہ اپنی سوجھ بوجھ کو غلط رخ پر استعمال کرتا ہے تو اس کا ذہن اسی غلط رخ پر چل پڑتا ہے جس رخ پر اس نے اس کو چلایا ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ کسی بات کو اس کے صحیح رخ سے دیکھے۔ اور اس کی واقعی اہمیت کو سمجھ سکے۔ وہ آنکھ رکھتے ہوئے بے آنکھ ہو جاتا ہے۔ وہ کان رکھتے ہوئے بے کان ہو جاتا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع ۸

۵۸۔ اور تمھارا رب بخشنے والا، رحمت والا ہے۔ اگر وہ ان کے کیے پر انھیں پکڑے تو فوراً ان پر عذاب بھیج دے، مگر ان کے لیے ایک مقرر وقت ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے۔ ۵۹۔ اور یہ بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا جب کہ وہ ظالم ہو گئے۔ اور ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کیا تھا۔

آدمی حق کے مقابلہ میں سرکشی کرتا ہے تو اس کو فوراً اس کی سزا نہیں ملتی۔ اس سے غلط فہمی میں پڑ کر وہ اپنے کو آزاد سمجھ لیتا ہے اور مزید سرکشی کرنے لگتا ہے۔ حالاں کہ یہ نہ پکڑا جانا، امتحان کی مہلت کی بنا پر ہے، نہ کہ آزادی اور خود مختاری کی بنا پر۔

آدمی سبق لینا چاہے تو ماضی کا انجام اس کے سامنے موجود ہے جس سے وہ حال کے لیے سبق لے سکتا ہے۔ سطح زمین پر بار بار مختلف قومیں اور تہذیبیں ابھری ہیں اور تباہ کر دی گئی ہیں۔ جب پچھلی نسلوں کے ساتھ ایسا ہوا کہ انھیں ان کی سرکشی کی سزا ملی تو اگلی نسلوں کے ساتھ یہی واقعہ کیوں نہیں ہوگا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَاۗءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾

۶۰۔ اور جب موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ میں چلتا رہوں گا، یہاں تک کہ یا تو دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا اسی طرح برسوں تک چلتا رہوں۔ ۶۱۔ پس جب وہ دریاؤں کے ملنے کی جگہ پہنچے تو وہ اپنی مچھلی کو بھول گئے۔ اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی۔ ۶۲۔ پھر جب وہ آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ ہمارا کھانا لاؤ، ہمارے اس سفر سے ہم کو بڑی تکان ہو گئی۔

خدا فرشتوں کے ذریعہ مسلسل دنیا کا انتظام کر رہا ہے۔ انسان چوں کہ اس انتظام کو نہیں دیکھتا، وہ اس کے بھیدوں کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا۔ وہ کم تر واقفیت کی بنا پر طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس کے علاج کے لیے خدا نے بالواسطہ مشاہدہ کا انتظام کیا۔ اس نے اپنے چنے ہوئے بندوں کو مخفی دنیا کا مشاہدہ کرایا تاکہ وہ اس کی حکمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور دوسرے انسانوں کو اس سے باخبر کر دیں۔ یہاں حضرت موسیٰ کے جس واقعہ کا ذکر ہے وہ اسی قسم کا ایک استثنائی واقعہ ہے جس کے ذریعے ان کو خدا کے چھپے ہوئے نظام کی ایک جھلک دکھائی گئی۔

حضرت موسیٰ نے یہ سفر غالباً مصر و سوڈان کے درمیان اپنے ایک نوجوان شاگرد (یوشع بن نون) کے ساتھ کیا تھا۔ خدا نے بطور علامت انھیں بتایا تھا کہ تم چلتے رہو۔ یہاں تک کہ جب تم اس جگہ پہنچو جہاں دو دریا باہم ملتے ہوں تو وہاں تم کو ہمارا ایک بندہ (غالباً فرشتہ بہ شکل انسان) ملے گا۔ تم اس کے ساتھ ہو لینا۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ
نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۫ وَ مَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا
الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي
الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ
فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا
عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا
وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

۶۳۔ شاگرد نے کہا، کیا آپ نے دیکھا، جب ہم اس پتھر کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا۔ اور مجھ کو شیطان نے بھلا دیا کہ میں اس کا ذکر کرتا۔ اور مچھلی عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔ ۶۴۔ موسیٰ نے کہا، اسی موقع کی تو ہمیں تلاش تھی۔ پس دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔ ۶۵۔ تو انھوں نے وہاں ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جس کو ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی تھی اور جس کو اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا۔

حضرت موسیٰ کو مزید علامت یہ بتائی گئی تھی کہ تم جب مطلوبہ مقام پر پہنچو گے تو تمھارے ناشتہ کی مچھلی عجیب طریقہ سے پانی میں چلی جائے گی۔ یہ واقعہ ایک مقام پر ہوا۔ مگر مچھلی شاگرد کے ساتھ تھی اور شاگرد کسی وجہ سے حضرت موسیٰ کو بتا نہ سکا کہ ایسا واقعہ ہوا ہے۔ کچھ آگے بڑھنے کے بعد جب موسیٰ کو معلوم ہوا تو وہ فوراً واپس ہوئے اور مذکورہ مقام پر اس بندہ (خضر) کو پا لیا جس سے ملنے کے لیے انھوں نے یہ لمبا سفر کیا تھا۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ
مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ

۶۶۔ موسیٰ نے اس سے کہا، کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، تاکہ آپ مجھے اس علم میں سے سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ ۶۷۔ اس نے کہا کہ تم

تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا ﴿۶۷﴾ وَ کَیۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰی
مَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ خُبۡرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ
شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعۡصِیۡ لَکَ اَمۡرًا ﴿۶۹﴾
قَالَ فَاِنِ اتَّبَعۡتَنِیۡ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِیۡ عَنۡ شَیۡءٍ
ع ۹ ۱۱/۲۱ حَتّٰۤی اُحۡدِثَ لَکَ مِنۡہُ ذِکۡرًا ﴿٪۷۰﴾

میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ ۶۸۔ اور تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جو تمھاری واقفیت کے دائرے سے باہر ہے۔ ۶۹۔ موسیٰ نے کہا، ان شاء اللہ، آپ مجھ کو صبر کرنے والا پائیں گے اور میں کسی بات میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ ۷۰۔ اس نے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ چلتے ہو تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھنا جب تک کہ میں خود تم سے اس کا ذکر نہ کروں۔

اس بندہ (خضر) کو خدا نے خصوصی علم اور طاقت عطا کی تھی تا کہ اس کے مطابق وہ دنیا کے معاملات میں غیر معمولی تصرف کر سکیں۔ اس علم کے تحت وہ اکثر اوقات عام ضابطہ کے خلاف عمل کرتے تھے۔ اس لیے حضرت موسیٰ کی فرمائش پر انھوں نے کہا کہ تم اس کی برداشت نہیں لا سکتے۔

فَانۡطَلَقَا ٙ وقفة حَتّٰۤی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیۡنَۃِ
خَرَقَہَا ؕ قَالَ اَخَرَقۡتَہَا لِتُغۡرِقَ اَہۡلَہَا ۚ لَقَدۡ
جِئۡتَ شَیۡئًا اِمۡرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّکَ
لَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا
تُؤَاخِذۡنِیۡ بِمَا نَسِیۡتُ وَ لَا تُرۡہِقۡنِیۡ مِنۡ
اَمۡرِیۡ عُسۡرًا ﴿۷۳﴾ فَانۡطَلَقَا ٙ وقفة حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا
غُلٰمًا فَقَتَلَہٗ ۙ قَالَ اَقَتَلۡتَ نَفۡسًا زَکِیَّۃًۢ
بِغَیۡرِ نَفۡسٍ ؕ لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡئًا نُّکۡرًا ﴿۷۴﴾

۷۱۔ پھر دونوں چلے۔ یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس شخص نے کشتی میں چھید کر دیا۔ موسیٰ نے کہا، کیا آپ نے اس کشتی میں اس لیے چھید کیا ہے کہ کشتی والوں کو غرق کر دیں۔ یہ تو آپ نے بڑی سخت چیز کر ڈالی۔ ۷۲۔ اس نے کہا، میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ ۷۳۔ موسیٰ نے کہا، میری بھول پر مجھ کو نہ پکڑیئے اور میرے معاملہ میں سختی سے کام نہ لیجیے۔ ۷۴۔ پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ وہ ایک لڑکے سے ملے تو اس شخص نے اس کو مار ڈالا۔ موسیٰ نے کہا، کیا آپ نے ایک معصوم جان کو مار ڈالا۔ حالاں کہ اس نے کسی کا خون نہیں کیا تھا۔ یہ تو آپ نے ایک نامعقول بات کی۔

اچھی کشتی کو عیب دار بنانا اور چھوٹے بچہ کو ہلاک کرنا بظاہر ایسے کام ہیں جو صحیح نہیں۔ مگر جیسا کہ آگے کی آیات بتاتی ہیں، اس میں نہایت گہری مصلحت چھپی ہوئی تھی۔ یہ بظاہر غلط کام حقیقت کے اعتبار سے بالکل صحیح اور مفید کام تھے۔

اس میں اس مسئلہ کا بھی ایک جواب ہے جس کو عام طور پر خرابی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔ انسانی دنیا کی بہت سی چیزیں جن کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ دنیا کے نظام میں خرابیاں ہیں، مگر وہ حقیقت میں گہری مصلحت پر مبنی ہوتی ہیں۔ موجودہ زندگی میں یقیناً اس مصلحت پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ مگر آخرت میں یہ پردہ باقی نہ رہے گا۔ اس وقت آدمی جان لے گا کہ جو کچھ ہوا، وہی ہونا بھی چاہیے تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٥﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿٧٦﴾ فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿٧٧﴾ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾

☆ ۷۵۔ اس شخص نے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔ ۷۶۔ موسیٰ نے کہا کہ اس کے بعد اگر میں آپ سے کسی چیز کے متعلق پوچھوں تو آپ مجھ کو ساتھ نہ رکھیں۔ آپ میری طرف سے عذر کی حد کو پہنچ گئے۔ ۷۷۔ پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو وہاں کے لوگوں سے کھانے کو مانگا۔ انھوں نے ان کی میزبانی سے انکار کر دیا۔ پھر ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا چاہتی تھی تو اس نے اس کو سیدھا کر دیا۔ موسیٰ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے۔ ۷۸۔ اس نے کہا کہ اب یہ میرے اور تمھارے درمیان جدائی ہے۔ میں تم کو ان چیزوں کی حقیقت بتاؤں گا جن پر تم صبر نہ کر سکے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر جیسے مقربینِ خدا ایک بستی میں پہنچتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بستی والے مہمان سمجھ کر ان کو کھانا کھلائیں۔ مگر بستی والے کھانا کھلانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کا صادق اور مقرب ہونا کافی نہیں ہے کہ وہ دیکھنے والوں کو بھی صادق اور مقرب نظر آئے۔ اگر بستی والوں نے ان کو پہچانا ہوتا تو ضرور وہ ان کو اپنا خصوصی مہمان بناتے اور ان سے برکت حاصل کرتے، مگر ان کے معمولی ظاہری حلیہ کی بنا پر انھوں نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ وہ ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ان کو نہ دیکھ سکے۔

اس ناخوش گوار سلوک کے باوجود حضرت خضر نے بستی والوں کی ایک گرتی ہوئی دیوار سیدھی کر دی۔ خدا کے سچے بندوں کا دوسروں سے سلوک جوابی سلوک نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر حال میں وہی ہوتا ہے جو از روئے حق ان کے لیے درست ہے۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

۷۹۔ کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں محنت کرتے تھے، تو میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کردوں، اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین کر لے لیتا تھا۔

حضرت خضر نے کشتی کو بیکار نہیں کیا تھا بلکہ وقتی طور پر اس کو عیب دار بنا دیا۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ کشتی جس طرف جا رہی تھی اس طرف آگے ایک بادشاہ تھا جو غالباً اپنی کسی جنگی مہم کے لیے اچھی کشتیوں کو زبردستی اپنے قبضہ میں لے رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو ایسا بنا دیا کہ بادشاہ کے کارندے اس کو دیکھیں تو اس کو ناقابلِ توجہ سمجھ کر اسے چھوڑ دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو اس کو چاہیے کہ وہ بددل نہ ہو۔ وہ یہ سوچ کر اس پر راضی ہو جائے کہ خدا نے جو کچھ کیا ہے اس میں اس کے لیے کوئی فائدہ چھپا ہوگا، اگرچہ وہ ابھی اس سے پوری طرح باخبر نہیں۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾

۸۰۔ اور لڑکے کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ماں باپ ایمان دار تھے۔ ہم کو اندیشہ ہوا کہ وہ بڑا ہو کر اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا۔
۸۱۔ پس ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کی جگہ ایسی اولاد دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو اور شفقت کرنے والی ہو۔

لڑکے کی یہ مثال بتاتی ہے کہ خدا اپنے بندوں کی مدد کہاں کہاں کرتا ہے۔ حتی کہ وہ ایسے معاملہ میں بھی ان کی مدد کرتا ہے جس کا انھیں علم تک نہیں ہوتا کہ وہ اس کے لیے اپنے رب سے درخواست کرسکیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ صبر وشکر کا رویہ اختیار کرے۔ وہ ہر حال میں خدا سے خیر کی امید رکھے۔ خدا کلی علم رکھتا ہے، اس لیے وہ کسی بندے کی بھلائی کو اس سے زیادہ جانتا ہے جتنا انسان جزئی علم کی بنا پر نہیں جان سکتا۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ

۸۲۔ اور دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اور اس دیوار کے نیچے ان کا ایک خزانہ دفن تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، پس تمھارے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تمھارے رب

رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ؕ ذٰلِكَ
ع ۱۲ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ؕ ﴿۸۲﴾

کی رحمت سے ہوا۔ اور میں نے اس کو اپنی رائے سے نہیں کیا۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر تم صبر نہ کر سکے۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا ہر وقت موجودہ دنیا کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس نے اگرچہ امتحان کی مصلحت کی بنا پر اس دنیا کا نظام اسباب وعلل کے تحت قائم کر رکھا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اس نظام میں بار بار مداخلت کرتا رہتا ہے۔ خدا کہیں تعمیر کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور کہیں بظاہر تخریب کا۔ مگر وسیع تر مصلحت کے اعتبار سے سب اس کی رحمت ہوتی ہے۔ اور اس بات کا تیقن حاصل کرنا ہوتا ہے کہ اسباب کی آزادانہ گردش میں تخلیق کے اصل مقاصد فوت نہ ہونے پائیں۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ؕ قُلْ
سَاَتْلُوْا عَلَیْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ ﴿۸۳﴾ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ
فِی الْاَرْضِ وَاٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ۙ ﴿۸۴﴾

۸۳۔ اور وہ تم سے ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں۔ کہو کہ میں اس کا کچھ حال تمھارے سامنے بیان کروں گا۔ ۸۴۔ ہم نے اس کو زمین میں اقتدار دیا تھا۔ اور ہم نے اس کو ہر طرح کے اسباب مہیا کیے تھے۔

ذوالقرنین کے لفظی معنی ہیں دو سینگوں والا۔ یعنی وہ بادشاہ جس کی فتوحات کا سلسلہ دنیا کے دونوں کناروں (مشرق ومغرب) تک پہنچا ہوا تھا۔ یہاں ذوالقرنین سے مراد غالباً قدیم ایرانی بادشاہ خسرو (Cyrus) ہے۔ اس کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح ہے۔ اس نے قدیم آباد دنیا کا بڑا حصہ فتح کر ڈالا تھا۔ اور بالآخر ایک جنگ میں مارا گیا۔ وہ نہایت منصف اور عادل بادشاہ تھا۔

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ
الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ
وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ۬ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ
اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ
حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ
ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَ
اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۟

۸۵۔ پھر ذوالقرنین ایک راہ کے پیچھے چلا۔ ۸۶۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے مقام تک پہنچ گیا۔ اس نے سورج کو دیکھا کہ وہ ایک کالے پانی میں ڈوب رہا ہے اور وہاں اس کو ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا کہ اے ذوالقرنین، تم چاہو تو ان کو سزا دو اور چاہو تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ۸۷۔ اس نے کہا کہ جو ان میں سے ظلم کرے گا، ہم اس کو سزا دیں گے۔ پھر وہ اپنے رب کے پاس پہنچایا جائے گا، پھر وہ اس کو سخت سزا دے گا۔ ۸۸۔ اور جو شخص ایمان لائے گا اور

الْحُسْنٰی ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا

نیک عمل کرے گا اس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔

ذوالقرنین غالباً ایران کے مغرب میں فتوحات کرتا ہوا ایشیا مائنر تک پہنچ گیا جہاں ایجین سمندر (Aegean Sea) کا ''سیاہ پانی'' خشکی کی حدبندی کر رہا ہے۔ یہاں ایک شخص ساحل کے کنارے کھڑا ہو کر سمندر کی طرف دیکھے تو شام کے وقت اس کو نظر آئے گا گویا کہ سورج کا گولا پانی میں داخل ہو کر اس کے اندر ڈوب رہا ہے۔ یہ تمثیلی زبان (metaphorical language) میں اس حد کا بیان ہے جہاں تک ذوالقرنین پہنچا تھا۔

ذوالقرنین سمندر کے اس کنارے تک بطور سیاح نہیں آیا تھا بلکہ بطور فاتح آیا تھا۔ یہاں اس وقت جو قوم آباد تھی اس کے اوپر اس کو پورا اختیار مل گیا۔ اس کے اوپر اس کی حکومت قائم ہوگئی۔ بحیثیت حکمراں اس کو کامل اختیار حاصل تھا کہ اس کے ساتھ جو چاہے کرے۔ تاہم ذوالقرنین ایک عادل بادشاہ تھا۔ اس نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اس نے عام اعلان کر دیا کہ ہم صرف اس شخص کے ساتھ سختی کریں گے جو برائی کرتا ہوا پایا جائے۔ جو لوگ امن و نظم کے ساتھ رہیں گے ان کے اوپر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

۸۹۔ پھر وہ ایک راہ پر چلا۔ ۹۰۔ یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کی جگہ پہنچا تو اس نے سورج کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے ہوئے پایا جن کے لیے ہم نے آفتاب کے اوپر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی۔ ۹۱۔ یہ اسی طرح ہے۔ اور ہم ذوالقرنین کے احوال سے باخبر ہیں۔

ذوالقرنین کی دوسری مہم ایران کے مشرق کی طرف تھی۔ وہ فتوحات کرتا ہوا آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں بالکل غیر متمدن لوگ بستے تھے۔ ''ان کے اور آفتاب کے درمیان آڑ نہیں تھی'' کا مطلب غالباً یہ ہے وہ خانہ بدوش تھے اور تعمیر شدہ مکانات میں رہنے کے بجائے کھلے میدانوں میں زندگی گزارتے تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤی اَنْ

۹۲۔ پھر وہ ایک راہ پر چلا۔ ۹۳۔ یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان کے پاس اس نے ایک قوم کو پایا جو کوئی بات سمجھ نہیں پاتی تھی۔ ۹۴۔ انھوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین، یاجوج اور ماجوج ہمارے ملک میں فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم تم کو کوئی محصول اس کے لیے مقرر

تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

کر دیں کہ تم ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دو۔

ذوالقرنین کی تیسری مہم غالباً ایران کے شمال مشرق کی جانب تھی۔ وہ ایسے علاقہ میں پہنچا جہاں بالکل وحشی قسم کے لوگ آباد تھے۔ دوسری قوموں سے ان کا میل جول نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ وہ کوئی اورزبان مشکل ہی سے سمجھ پاتے تھے۔

یہ غالباً بحر کیسپین اور بحر اسود کے درمیان کے پہاڑ تھے۔ یہاں وحشی قبائل دوسری طرف سے آ کر غارت گری کرتے اور پھر پہاڑی درہ کے راستے سے بھاگ جاتے۔ ذوالقرنین نے یہاں دونوں پہاڑوں کے درمیان آہنی دیوار کھڑی کر دی۔

قَالَ مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

۹۵۔ ذوالقرنین نے جواب دیا کہ جو کچھ میرے رب نے مجھے دیا ہے وہ بہت ہے۔ تم محنت سے میری مدد کرو۔ میں تمھارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دوں گا۔ ۹۶۔ تم لوہے کے تختے لا کر مجھے دو۔ یہاں تک کہ جب اس نے دونوں کے درمیانی خلا کو بھر دیا تو لوگوں سے کہا کہ آگ دہکاؤ، یہاں تک کہ جب اس کو آگ کر دیا تو کہا کہ لاؤ اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں ۹۷۔ پس یاجوج اور ماجوج نہ اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ وہ اس میں سوراخ کر سکتے تھے۔ ۹۸۔ ذوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے رب کی رحمت ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اس کو ڈھا کر برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔

موجودہ اشتراکی روس کے علاقہ میں قفقاز پہاڑ (Caucasus Mountains) واقع ہیں۔ ان کا سلسلہ کیسپین سمندر اور بلیک سمندر کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ ہیں جو یورپ اور ایشیا کے درمیان قدرتی دیوار کا کام دیتے ہیں۔ اس کوہستانی سلسلہ میں بعض مقامات پر درے تھے جن سے جنوب کے علاقہ سے یاجوج ماجوج کے وحشی قبائل شمال کی طرف آ جاتے اور ایرانی مملکت کے حصہ میں غارت گری کرتے۔ یہاں پر آج بھی ایک قدیم دیوار کے آثار موجود ہیں۔ اغلب ہے کہ یہی وہ دیوار ہے جو ذوالقرنین نے حفاظتی مقصد کے تحت تعمیر کی تھی۔

دشمن کے مقابلہ میں ''لوہے کی دیوار'' کھڑی کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر عام طور پر لوگوں میں فخر اور گھمنڈ کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ذوالقرنین نے ایسی ناقابل تسخیر دیوار کھڑی کرنے کے بعد بھی اپنی تواضع نہیں کھوئی اس کی نظر اپنی مصنوعات پر نہیں تھی بلکہ خدا کے اختیارات پر تھی اور خدا کے مقابلہ میں کسی انسان کو کوئی زور حاصل نہیں۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ
وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾ وَّعَرَضْنَا
جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾ الَّذِيْنَ
كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا
ع ١١/١٩ ٢ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾

۹۹۔ اور اس دن ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے۔ وہ موجوں کی طرح ایک دوسرے میں گھسیں گے۔ اور صور پھونکا جائے گا پس ہم سب کو ایک ساتھ جمع کریں گے۔ ۱۰۰۔ اور اس دن ہم جہنم کو منکروں کے سامنے لائیں گے۔ ۱۰۱۔ جن کی آنکھوں پر ہماری یاد دہانی سے پردہ پڑا رہا اور وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے۔

قیامت آنے کے بعد موجودہ دنیا ایک اور دنیا بن جائے گی۔ اس وقت غالباً ایسا ہوگا کہ دریاؤں اور پہاڑوں کی موجودہ حدبندیاں توڑ کر ختم کردی جائیں گی۔ انسانوں کا ایک ہجوم ہوگا جو ایک دوسرے سے اسی طرح ٹکرائے گا جس طرح سمندر میں موجیں ٹکراتی ہیں۔

آج لوگوں کو عقل کی آنکھ سے جہنم دکھائی جارہی ہے تو وہ ان کو نظر نہیں آتی۔ قیامت میں لوگوں کو پیشانی کی آنکھ سے جہنم دکھائی جائے گی۔ اس وقت ہر آدمی دیکھ لے گا۔ مگر یہ دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ نصیحت کے ذریعہ جس نے اپنی آنکھ کا پردہ ہٹایا وہی پردہ ہٹانے والا ہے۔ ورنہ قیامت کے دن پردہ ہٹایا جانا تو صرف اس لیے ہوگا کہ سرکشی کرنے والوں کو ان کے آخری انجام تک پہنچا دیا جائے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا
عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا
جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿١٠٢﴾

۱۰۲۔ کیا انکار کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ میرے سوا میرے بندوں کو اپنا کارساز بنائیں۔ ہم نے منکروں کی مہمانی کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

حق کو ماننا خدا کو ماننا ہے اور حق کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا۔ جب بھی آدمی حق کو نہ مانے تو وہ کسی نہ کسی چیز یا شخصیت کے بل پر ایسا کرتا ہے۔ ایسا ہر بھروسہ جھوٹا بھروسہ ہے۔ کیوں کہ اس دنیا میں خدا کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ فیصلہ کے دن ایسے لوگوں کو بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ کیوں کہ بچانے والا تو صرف خدا تھا اور اس کی حمایت کو انھوں نے پہلے ہی سرکشی کر کے کھو دیا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾
اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ
هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ
فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا
وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾

۱۰۳۔ کہو، کیا میں تم کو بتادوں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں۔ ۱۰۴۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت ہوگئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ ۱۰۵۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس سے ملنے کا انکار کیا۔ پس ان کا کیا ہوا برباد ہوگیا۔ پھر قیامت کے دن ہم ان کو کوئی وزن نہ دیں گے۔ ۱۰۶۔ جہنم ان کا بدلہ ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے انکار کیا اور میری نشانیوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔

آدمی دنیا میں عمل کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے عمل کا نتیجہ عزت اور دولت کی صورت میں اس کو مل رہا ہے۔ اپنا کوئی کام اس کو بگڑتا ہوا نظر نہیں آتا۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں کامیاب ہوں۔

مگر یہ سراسر نادانی ہے۔ خدا کے نقشہ میں زندگی کی کامیابی کا معیار آخرت ہے۔ ایسی حالت میں دنیا کی ترقی کو ترقی سمجھنا خدا کے نقشہ کے خلاف اپنا نقشہ بنانا ہے۔ یہ آخرت کو حذف کرکے زندگی کے مسئلہ کو دیکھنا ہے۔ ظاہر ہے ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

خدا اپنی نشانیاں ظاہر کرتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے ذہن کو دنیا میں لگائے ہوئے ہوں وہ آخرت کی نشانیوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ خدا اپنے دلائل کھولتا ہے مگر جو لوگ دنیا کی باتوں میں گم ہوں ان کو آخرت کی دلیلیں اپیل نہیں کرتیں۔ ایسے لوگ ہدایت کے کنارے کھڑے ہو کر بھی ہدایت کو قبول کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ انھوں نے خدا کی باتوں کو وزن نہیں دیا۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ خدا ان کو اپنے یہاں کسی وزن کا مستحق سمجھے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ
لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

۱۰۷۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا ان کے لیے فردوس کے باغوں کی مہمانی ہے۔ ۱۰۸۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ وہاں سے کبھی نکلنا نہ چاہیں گے۔

موجودہ دنیا میں ایمان اور عمل کی زندگی اختیار کرنا زبردست قربانی کا ثبوت دینا ہے۔ یہ چھپی ہوئی جنت کی خاطر نظر آنے والی جنت کو چھوڑنا ہے۔ یہ اس مشکل ترین امتحان میں پورا اترنا ہے جب کہ آدمی مجرد

دلیل کی سطح پر حق کو پہچانتا ہے اور اپنی زندگی اس کے راستہ پر ڈال دیتا ہے، حالاں کہ ایسا کرنے کے لیے وہاں کوئی دباؤ نہیں ہوتا۔

جو لوگ اس معرفت اور اس کارکردگی کا ثبوت دیں ان کا انعام یہی ہے کہ ان کو ابدی راحت و آرام کے باغوں میں داخل کر دیا جائے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾

۱۰۹۔ کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی نشانیوں کو لکھنے کے لیے روشنائی ہو جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں۔

جو لوگ خدا کے پیغام کو نہیں مانتے وہ ایسی چیز کو نہیں مانتے جو تمام ثابت شدہ چیزوں سے زیادہ ثابت شدہ ہے۔ وہ اتنی مسلم ہے جس کو لکھنے کے لیے دنیا کے تمام درختوں کے قلم بھی ناکافی ثابت ہوں۔ تمام سمندروں کو روشنائی کی جگہ استعمال کیا جائے تو سمندر بھی خشک ہو جائے اس سے پہلے کہ کلماتِ رب ختم ہوں۔

مگر انسان کیسا ظالم ہے کہ اس کے باوجود وہ حق کو نہیں پہچانتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی زندگی کو حق کے مطابق نہیں ڈھالتا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾ ع ۱۲ ۹ ۲

۱۱۰۔ کہو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک آدمی ہوں۔ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ پس جس کو اپنے رب سے ملنے کی امید ہو، اس کو چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

پیغمبر خدا یا فرشتہ نہیں ہوتا۔ وہ انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کی مزید خصوصیت صرف یہ ہوتی ہے کہ اس پر غیر مرئی ذریعہ سے خدا کی وحی آتی ہے۔ گویا پیغمبر ایک ایسی ہستی ہے جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے ایک انسان ہے اور اپنی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے نمائندہ خدا۔

یہی وجہ ہے کہ حق کو پانے کے لیے جوہر شناسی کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ حق کو پانا صرف اس شخص کے لیے ممکن ہوتا ہے جو حقیقت کو اس کے غیبی روپ میں دیکھ سکے، جو ''انسان'' کی سطح پر ''پیغمبر'' کو پہچاننے کا ثبوت دے۔

١٩-سُوْرَةُ مَرْيَمَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
كٓهٰيٰعٓصٓ ۝١ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ
زَكَرِيَّا ۝٢ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝٣

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
١۔ کھیعص۔ ٢۔ یہ اس رحمت کا ذکر ہے جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی۔ ٣۔ جب اس نے اپنے رب کو چھپی آواز سے پکارا۔

حضرت زکریا حضرت مریم کے بہنوئی تھے۔ حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا۔ حضرت مریم ابھی صرف چند سال کی تھیں کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ ہیکل کے ناظم اعلیٰ تھے۔ ان کے بعد حضرت زکریا ہیکل کے ناظم اعلیٰ (کاہنوں کے سردار) مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں حضرت مریم اپنی والدہ کی نذر کے مطابق ہیکل کی خدمت میں دے دی گئی تھیں۔ حضرت زکریا چوں کہ حضرت مریم کے قریبی عزیز تھے اور ہیکل کے سردار بھی اس لیے وہی حضرت مریم کی تربیت کے ذمہ دار قرار پائے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے ''چھپی آواز'' میں خدا سے دعا کی۔ یہ دعا حیرت انگیز طور پر پوری ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچی دعا کیا ہے۔ سچی دعا دراصل اس یقین کا بے تابانہ اظہار ہے کہ سارا اختیار صرف خدا کے پاس ہے۔ اسی کے دینے سے آدمی کو ملے گا اور وہ نہ دے تو کبھی کسی کو کچھ نہیں مل سکتا۔ سچی دعا کا سارا رخ صرف ایک خدا کی طرف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچی دعا سب سے زیادہ اس وقت ابلتی ہے جب کہ آدمی تنہائی میں ہو۔ جہاں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسرا نہ پایا جائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ
الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ
شَقِيًّا ۝٤ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَ
كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ
وَلِيًّا ۝٥ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَ
اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝٦

٤۔ زکریا نے کہا، اے میرے رب، میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں۔ اور سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی ہے۔ اور اے میرے رب، تجھ سے مانگ کر میں کبھی محروم نہیں رہا۔ ٥۔ اور میں اپنے بعد رشتہ داروں کی طرف سے اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور میری بیوی بانجھ ہے، پس مجھ کو اپنے پاس سے ایک وارث دے۔ ٦۔ جو میری جگہ لے اور آل یعقوب کی بھی۔ اور اے میرے رب اس کو اپنا پسندیدہ بنا۔

یہ اس بندہ کی زبان سے نکلی ہوئی دعا ہے جو دین کا مشن چلاتے ہوئے بالکل بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور

اہل خاندان میں کوئی شخص اس کو نظر نہیں آتا تھا جو اس کے بعد اس کے مشن کو جاری رکھے۔ ایک طرف اپنا عجز اور دوسری طرف مشن کی اہمیت۔ یہ دونوں احساسات اس کی زبان پر اس دعا کی صورت میں ڈھل گئے جو مذکورہ آیات میں نظر آتے ہیں۔ گویا یہ عام معنوں میں محض ایک بیٹے کی دعا نہ تھی۔ بلکہ اس بات کی دعا تھی کہ مجھے ایک ایسا لائق شخص حاصل ہو جائے جو میرے بعد میرے پیغمبرانہ مشن کو جاری رکھے۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝۷ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝۸

۷۔ اے زکریا، ہم تم کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس سے پہلے اس نام کا کوئی آدمی نہیں بنایا۔ ۸۔ اس نے کہا، اے میرے رب، میرے یہاں لڑکا کیسے ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے۔ اور میں بڑھاپے کے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا ہوں۔

یہ دعا بیٹے کی صورت میں قبول ہوئی۔ ایک ایسا بیٹا جیسا بیٹا عام طور پر لوگوں کے یہاں پیدا نہیں ہوتا۔ ایک شخص جو آخری حد تک بوڑھا ہو چکا ہو اور جس کی بیوی پوری عمر تک بانجھ رہی ہو۔ اس کے یہاں بچہ پیدا ہونا یقیناً ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ اس بنا پر حضرت زکریا کو اس خبر پر خوشی کے ساتھ تعجب بھی ہوا۔ ملنے والی نعمت کے غیر متوقع ہونے کا احساس ان کی زبان سے ان الفاظ میں نکل پڑا کہ میرے یہاں کیسے بچہ پیدا ہوگا جب کہ میں اور میری بیوی دونوں اس اعتبار سے ازکار رفتہ ہو چکے ہیں۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ۝۹ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝۱۰ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝۱۱

۹۔ جواب ملا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے۔ میں نے اس سے پہلے تم کو پیدا کیا، حالاں کہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ ۱۰۔ زکریا نے کہا کہ اے میرے رب، میرے لیے کوئی نشانی مقرر کردے۔ فرمایا کہ تمھاری نشانی یہ ہے کہ تم تین شب و روز لوگوں سے بات نہ کرسکو گے حالاں کہ تم تندرست ہوگے۔ ۱۱۔ پھر زکریا محرابِ عبادت سے نکل کر لوگوں کے پاس آیا اور ان سے اشارے سے کہا کہ تم صبح وشام خدا کی پاکی بیان کرو۔

پہلے انسان کا باپ اور ماں کے بغیر پیدا ہونا جس طرح ایک خدائی معجزہ ہے اسی طرح باپ اور ماں کے ذریعہ بچہ کا پیدا ہونا بھی ایک خدائی معجزہ ہے۔ خواہ یہ ماں باپ بوڑھے ہوں یا جوان۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا ہے

جو انسان کو پیدا کرتا ہے۔ اسی نے پہلے پیدا کیا اور وہی آج بھی پیدا کرنے والا ہے۔ دوسری ہر چیز محض ایک ظاہری بہانہ ہے، نہ کہ حقیقی وجہ۔

حضرت زکریا نے رحمتِ خداوندی کے ملنے کی علامت دریافت کی۔ بتایا گیا کہ تندرست ہونے کے باوجود جب کامل تین رات دن تک لوگوں سے زبان کے ذریعہ بات نہ کرسکو، اس وقت سمجھ لینا کہ حمل قرار پا گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ وقت آیا تو زبان بات چیت سے رک گئی۔ حضرت زکریا اپنے عبادت خانے سے باہر نکلے اور لوگوں سے اشارہ کے ساتھ کہا کہ صبح وشام اللہ کو یاد کرو اور اس کی عبادت واطاعت میں مشغول رہو۔

حضرت زکریا کا غالباً یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ لوگوں کو وعظ ونصیحت فرماتے تھے۔ جب زبان بولنے سے رک گئی تب بھی آپ مقام اجتماع پر آئے اور لوگوں کو نصیحت کی۔ البتہ چونکہ زبان چل نہیں رہی تھی، آپ نے اشارہ کے ساتھ لوگوں کو تلقین فرمائی۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿١٢﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾ ع

۱۲۔ اے یحییٰ، کتاب کو مضبوطی سے پکڑو۔ اور ہم نے اس کو بچپن ہی میں دین کی سمجھ عطا کی۔ ۱۳۔ اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کیا اور وہ پرہیز گار۔ ۱۴۔ اور اپنے والدین کا خدمت گزار تھا۔ اور وہ سرکش اور نافرمان نہ تھا۔ ۱۵۔ اور اس پر سلامتی ہے جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے گا اور جس دن وہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت یحییٰ جب چھوٹے تھے تو لڑکوں نے ایک بار انھیں کھیلنے کے لیے بلایا۔ انھوں نے انکار کردیا اور کہا کہ "ہم اس لیے نہیں بنائے گئے ہیں"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو بچپن سے یہ شعور حاصل تھا کہ زندگی کو بامقصد ہونا چاہیے۔ اسی طرح ان کے اندر پیدائشی طور پر سوز وگداز موجود تھا۔ وہ نفسیاتی گرہوں سے آزاد تھے۔ وہ اپنے والدین کے حقوق ادا کرنے والے تھے۔ وہ سرکشی اور نافرمانی سے بالکل خالی تھے۔

یہی وہ اوصاف ہیں جو آدمی کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ کسی حال میں خدا کی کتاب سے نہ ہٹے۔ اور انہیں اوصاف والا آدمی وہ ہے جس پر دنیا میں بھی خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی خدا کی رحمت۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ
اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ
دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا
فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ
بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ اِنَّمَآ
اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا
زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ
يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ
كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ
لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ
اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾

١٦۔ اور کتاب میں مریم کا ذکر کرو جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہوکر شرقی مکان میں چلی گئی۔ ١٧۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ان سے پردے میں کرلیا پھر ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا جو اس کے سامنے ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ ١٨۔ مریم نے کہا، میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے۔ ١٩۔ اس نے کہا، میں تمھارے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ ٢٠۔ مریم نے کہا۔ میرے یہاں کیسے لڑکا ہوگا، جب کہ مجھ کو کسی آدمی نے نہیں چھوا اور نہ میں بدکار ہوں۔ ٢١۔ فرشتے نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے۔ اور تاکہ ہم اس کو لوگوں کے لیے نشانی بنادیں اور اپنی جانب سے ایک رحمت۔ اور یہ ایک طے شدہ بات ہے۔

حضرت مریم اپنی والدہ کی نذر کے مطابق ہیکل (بیت المقدس) کی خدمت کے لیے دے دی گئی تھیں۔ قدیم ہیکل کا مشرقی حصہ عورتوں کے لیے خاص تھا۔ وہ اس حصہ میں ایک طرف پردہ ڈال کر معتکف ہوگئیں۔ اس کے بعد اچانک ایک روز ایسا ہوا کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک تندرست وتوانا آدمی ان کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اس منظر سے ان کا گھبرا اٹھنا بالکل فطری تھا۔ مگر آدمی نے بتایا کہ وہ فرشتہ ہے۔ اور خدا کی طرف سے اس لیے آیا ہے کہ حضرت مریم کو معجزاتی طور پر ایک بچہ عطا کرے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا اس طرح معجزاتی طور پر پیدا ہونا خدا کی ایک عظیم نشانی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہود آپ کے فرستادۂ خدا ہونے پر شک نہ کریں اور آپ خدا کی طرف سے جو باتیں بتائیں ان کو مان لیں۔ مگر اتنی کھلی ہوئی نشانی کے باوجود انھوں نے حضرت مسیح کا انکار کردیا۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾
فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ
يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾

٢٢۔ پس مریم نے اس کا حمل اٹھالیا اور وہ اس کو لے کر ایک دور کی جگہ چلی گئی۔ ٢٣۔ پھر دردِ زہ اس کو کھجور کے درخت کی طرف لے گیا۔ اس نے کہا، کاش میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بسری چیز ہوجاتی۔

حضرت مریم ایک معزز مذہبی گھرانے کی غیر شادی شدہ خاتون تھیں۔ ایسی ایک خاتون کا حاملہ ہونا اس کے لیے ایک ایسی آزمائش ہے جس سے بڑی کوئی آزمائش نہیں۔ اس پریشانی میں مبتلا ہونے کے بعد وہ خاموشی کے ساتھ ہیکل سے نکلیں اور دور کے ایک مقام (بیت لحم) چلی گئیں۔ جب وقت پورا ہوا اور دردِ زہ کی کیفیت پیدا ہوئی تو وہ بستی سے باہر ایک کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ ایک پاک باز غیر شادی شدہ خاتون پر ایسے وقت میں جو کیفیت گزرے گی اس کی تصویر ان الفاظ میں ملتی ہے — کاش میں اس سے پہلے ختم ہو جاتی اور لوگوں کے حافظہ میں میرا کوئی وجود نہ ہوتا۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْٓ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ ۚ

۲۴۔ پھر مریم کو اس نے اس کے نیچے سے آواز دی کہ غمگین نہ ہو۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ ۲۵۔ اور تم کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ۔ اس سے تمھارے اوپر پکی کھجوریں گریں گی۔ ۲۶۔ پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر اگر تم کوئی آدمی دیکھو تو اس سے کہہ دو کہ میں نے رحمان کا روزہ مان رکھا ہے تو آج میں کسی انسان سے نہیں بولوں گی۔

اتنی نازک آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد حضرت مریم کے لیے تسکین کا صرف ایک ہی ذریعہ ہوسکتا تھا۔ وہ یہ کہ خدا کا فرشتہ ظاہر ہو کر انھیں یقین دلائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عین اس وقت فرشتے نے آ کر آواز دی کہ گھبراؤ مت۔ یہ سب جو ہو رہا ہے یہ خدا کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ تمھارے قریب صاف پانی کا چشمہ رواں کر دیا گیا ہے۔ اور کھجور کا یہ درخت تم کو ہر وقت تازہ پھل مہیا کرے گا۔ اس سے کھاؤ اور پیو۔

بچہ کے سلسلہ میں فرشتہ نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ خدا کے معجزہ سے پیدا ہونے والا یہ خود تمھارے دفاع کے لیے کافی ہے۔ تم بنی اسرائیل کے رواج کے مطابق چپ کا روزہ رکھ لو۔ اور جب کسی آدمی سے تمھارا سامنا ہو اور وہ تم سے پوچھے تو تم بچے کی طرف اشارہ کر دو۔ وہ خود جواب دے کر تم کو بری الذمہ کر دے گا۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ ۖ

۲۷۔ پھر وہ اس کو گود میں لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ لوگوں نے کہا، اے مریم، تم نے بڑا طوفان کر ڈالا۔ ۲۸۔ اے ہارون کی بہن، نہ تمھارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمھاری ماں بدکار تھی۔

فرشتے کی بات سننے کے بعد حضرت مریم کے اندر اعتماد پیدا ہو گیا۔ وہ بچہ کو لے کر اپنے خاندان والوں میں واپس آئیں۔ ان کو اس حال میں دیکھ کر یہود کے تمام لوگ انھیں ملامت کرنے لگے۔ حضرت مریم نے وہی کیا

جو فرشتہ نے انھیں بتایا تھا۔ انھوں نے خود خاموش رہتے ہوئے بچہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ لڑکا کوئی عام قسم کا لڑکا نہیں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم اس سے کلام کرو، وہ گود کا بچہ ہونے کے باوجود تمھارے کلام کو سمجھے گا اور صاف زبان میں تمھارا جواب دے گا۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ
فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۫ؕ
اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۙ﴿۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِيْ
مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ
وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۪ۖ﴿۳۱﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۫
وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ
يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ
حَيًّا ﴿۳۳﴾

۲۹۔ پھر مریم نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا، ہم اس سے کس طرح بات کریں جو کہ گود میں بچہ ہے۔ ۳۰۔ بچہ بولا، میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھ کو کتاب دی اور مجھ کو نبی بنایا۔ ۳۱۔ اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھ کو برکت والا بنایا ہے۔ اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے جب تک میں زندہ رہوں۔ ۳۲۔ اور مجھ کو میری ماں کا خدمت گزار بنایا ہے۔ اور مجھ کو سرکش، بدبخت نہیں بنایا ہے۔ ۳۳۔ اور مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

حضرت مریم کے اشارہ کے باوجود یہود کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایک چھوٹے بچہ سے کس طرح بات کریں۔ اس وقت حضرت مسیح خود بول پڑے۔ ان کی معجزانہ گفتگو میں ایک طرف حضرت مریم کی کامل برأت تھی۔ دوسری طرف یہ ایک پیشگی شہادت تھی۔ تاکہ یہ نومولود جب بڑا ہو کر نبوت کا اعلان کرے تو لوگوں کے لیے آپ کی نبوت پر شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ
فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ
مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا
يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۵﴾

۳۴۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ ۳۵۔ اللہ ایسا نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ وہ پاک ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

حضرت مسیح کی غیر معمولی پیدائش ایک انوکھا واقعہ تھا۔ اس انوکھے واقعہ کی توجیہہ میں مسیحی علماء نے عجیب عجیب عقیدے بنا لیے۔ مگر ہمیشہ توجیہ کی ایک حد ہوتی ہے۔ اور اس حد کے اندر رہ کر ہی کسی چیز کی توجیہہ کی جاسکتی ہے۔ حضرت مسیح کی غیر معمولی پیدائش کی توجیہہ میں ان کو خدا کا بیٹا بنا دینا حد سے باہر جانا

ہے۔ کیوں کہ یہ خدا کی یکتائی کے منافی ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔

نیز یہ کہ کائنات میں بے شمار انوکھے واقعات ہیں جن کو ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ اس دنیا کی ہر چیز ایک انوکھا واقعہ ہے۔ اب اگر مزید ایک انوکھی چیز سامنے آئے تو انسان کو یہ کہنا چاہیے کہ خدا نے جس طرح دوسری بے شمار انوکھی چیزیں پیدا کی ہیں اسی طرح وہ اس انوکھی چیز کا بھی خالق ہے جو آج ہمارے سامنے ظاہر ہوئی ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۳۶ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۳۷ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۸

۳۶۔ اور بے شک اللہ میرا رب ہے اور تمھارا رب بھی، پس تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ ۳۷۔ پھر ان کے فرقوں نے باہم اختلاف کیا۔ پس انکار کرنے والوں کے لیے ایک بڑے دن کے آنے سے خرابی ہے۔ ۳۸۔ جس دن یہ لوگ ہمارے پاس آئیں گے۔ وہ خوب سنتے اور خوب دیکھتے ہوں گے، مگر آج یہ ظالم کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔

حضرت مسیح اور دوسرے تمام پیغمبروں نے ایک ہی صراطِ مستقیم کی طرف لوگوں کو بلایا۔ وہ یہ کہ آدمی خدا کو اپنا رب بنائے اور اسی کی عبادت کرے۔ مگر ہمیشہ یہ ہوا کہ خود ساختہ تاویلات و تشریحات کے ذریعہ اس صراطِ مستقیم سے انحراف کیا گیا۔ کسی نے ایک بات نکالی اور کسی نے دوسری بات۔ اس طرح اختلاف پیدا ہوا اور ایک دین کئی دینوں میں تقسیم ہو گیا۔

دنیا میں حق بات پوری طرح واضح ہے مگر یہاں انسان کو امتحان کی وجہ سے آزادی حاصل ہے۔ وہ چاہے تو مانے اور چاہے تو نہ مانے۔ اس وقتی آزادی کی وجہ سے انسان غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ اس کو دلائل کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ خدا کی صراطِ مستقیم کیا ہے۔ مگر وہ اس کو نہیں مانتا۔ لیکن آخرت میں جب آزادی چھن چکی ہوگی، انسان کی وہی آنکھیں اور وہی کان خوب دیکھنے اور سننے والے بن جائیں گے۔ جو آج ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا کہ وہ دیکھنا اور سننا جانتے ہی نہ ہوں۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۹ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝۴۰ ع
ع ۲ ۲۵ ۵

۳۹۔ اور ان لوگوں کو اس حسرت کے دن سے ڈرا دو جب معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا، اور وہ غفلت میں ہیں۔ اور وہ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ ۴۰۔ بے شک ہم ہی زمین اور زمین کے رہنے والوں کے وارث ہوں گے اور لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔

آدمی دنیا میں ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو اس کو موقع ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ نئی زندگی شروع کرسکے۔ اس کے پاس ساتھی اور مددگار ہوتے ہیں جو اس کو سنبھالنے کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر آخرت کی ناکامی ایسی ناکامی ہے جس کے بعد دوبارہ سنبھلنے کا کوئی امکان نہیں۔ کیسا عجیب حسرت کا لمحہ ہوگا جب آدمی یہ جانے گا کہ وہ سب کچھ کرسکتا تھا مگر اس نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ کرنے کا وقت ہی ختم ہوگیا۔

ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ اپنا مالک آپ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف ایک درمیانی وقفہ ہے۔ پہلے بھی صرف خدا تمام چیزوں کا مالک تھا اور آخر میں بھی یہ صرف خدا ہے جو تمام چیزوں کا مالک ہوگا۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو یہاں حقیقی معنوں میں کوئی مالکانہ حیثیت حاصل ہو۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

۴۱۔ اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کرو۔ بے شک وہ سچا تھا اور نبی تھا۔ ۴۲۔ جب اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ، ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ سنے اور نہ دیکھے، اور نہ تمھارے کچھ کام آسکے۔ ۴۳۔ اے میرے باپ، میرے پاس ایسا علم آیا ہے جو تمھارے پاس نہیں ہے تو تم میرے کہنے پر چلو۔ میں تم کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ ۴۴۔ اے میرے باپ، شیطان کی عبادت نہ کر، بے شک شیطان خدائے رحمان کی نافرمانی کرنے والا ہے۔ ۴۵۔ اے میرے باپ، مجھ کو ڈر ہے کہ تم کو خدائے رحمان کا کوئی عذاب پکڑ لے اور تم شیطان کے ساتھی بن کر رہ جاؤ۔

حضرت ابراہیم عراق میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آزر بت پرست تھے۔ آپ کو نبوت ملی تو آپ نے اپنے والد کو نصیحت کی کہ بتوں کی عبادت چھوڑ دو اور خدا کی عبادت کرو۔ ورنہ تم خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے۔

شیطان کی عبادت کا مطلب خود شیطان کی عبادت نہیں ہے بلکہ شیطان کی بتائی ہوئی چیز کی عبادت ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر یہ جذبہ رکھا گیا ہے کہ وہ کسی کو اونچا درجہ دے کر اس کے آگے اپنے جذباتِ عقیدت کو نثار کرے۔ اس جذبہ کا حقیقی مرکز خدا ہے۔ مگر شیطان مختلف طریقہ سے لوگوں کے ذہن کو پھیرتا ہے تاکہ وہ انسان کو مشرک بنا دے، تاکہ انسان غیر خدا کو وہ چیز دے دے جو اس کو صرف خدا کو دینا چاہیے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾

۴۶۔ باپ نے کہا کہ اے ابرہیم، کیا تم میرے معبودوں سے پھر گئے ہو۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں تم کو سنگسار کردوں گا۔ اور تم مجھ سے ہمیشہ کے

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ ۡ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿٤٨﴾

لیے دور ہو جاؤ۔ ۴۷۔ ابراہیم نے کہا، تم پر سلامتی ہو۔ میں اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ مجھ پر مہربان ہے۔ ۴۸۔ اور میں تم لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور ان کو بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ اور میں اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا۔

حضرت ابراہیم نے جن بتوں پر تنقید کی، وہ سادہ معنوں میں محض پتھر کے ٹکڑے نہ تھے بلکہ وہ ان ہستیوں کے نمائندے تھے جن کی طلسماتی عظمت ماضی کی طویل روایات کے نتیجہ میں لوگوں کے ذہنوں پر قائم ہو چکی تھی۔ اس تقابل میں ''نوجوان ابراہیم'' ایک معمولی شخص نظر آئے اور عراق کے بت عظمتوں کے پہاڑ دکھائی دئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابرہیم کے والد نے حقارت کے ساتھ ان کی نصیحت کو نظر انداز کر دیا۔

حق کی دعوت ایک مقام پر شروع کی جائے اور پھر وہ اس مرحلہ میں پہنچ جائے کہ لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں مگر وہ ماننے کے بجائے جارحیت پر اتر آئیں تو اس وقت داعی اپنے مقام عمل کو تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام ہجرت ہے۔ مقام عمل کی یہ تبدیلی کبھی قریب کے دائرہ میں ہوتی ہے اور کبھی دور کے دائرہ میں۔

دعوت کا عمل ایک خدائی عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی شروع ہوتا ہے ربانی نفسیات کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ مدعو اگر داعی کے ساتھ ظلم وحقارت کا معاملہ کرے تب بھی داعی کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ موجود رہتا ہے۔ اسی طرح داعی اگر اپنے ماحول میں بے یار ومددگار ہو جائے تب بھی وہ مایوس نہیں ہوتا کیوں کہ اس کا اصل سہارا خدا ہوتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ بدستور اس کے ساتھ موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع ۳

۴۹۔ پس جب وہ لوگوں سے جدا ہو گیا۔ اور ان سے جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور ہم نے ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا۔ ۵۰۔ اور ان کو اپنی رحمت کا حصہ دیا اور ہم نے ان کا نام نیک اور بلند کیا۔

آدمی اپنے خاندان اور اپنے گروہ کے ساتھ جیتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی شخص کو اس کے خاندان اور اس کے گروہ سے نکال دینا گویا اس کو بربادی کے صحرا میں دھکیل دینا ہے۔ مگر حضرت ابراہیم کے واقعہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے دکھا دیا کہ جو بندہ خالص اللہ کے لیے بے گھر کیا جائے اس کو اللہ اپنی طرف سے

زیادہ اچھا گھر عطا کر دیتا ہے۔ جو شخص خالص اللہ کے لیے گم نامی میں ڈال دیا جائے اس کو اللہ زیادہ بڑے پیمانہ پر نیک نام بنا دیتا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

۵۱۔ اور کتاب میں موسیٰ کا ذکر کرو۔ بے شک وہ چنا ہوا تھا اور رسول نبی تھا۔ ۵۲۔ اور ہم نے اس کو کوہِ طور کے داہنی جانب سے پکارا اور اس کو ہم نے راز کی باتیں کرنے کے لیے قریب کیا۔ ۵۳۔ اور اپنی رحمت سے ہم نے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر اسے دیا۔

حضرت موسیٰ مدین سے چل کر مصر جا رہے تھے۔ اس سفر میں وہ کوہ طور سے گزرے۔ وہاں خدا نے انھیں پیغمبری عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے پچھلے ہر دور میں اپنے پیغمبر منتخب کیے اور ان کے پاس اپنا کلام بھیجا۔ یہ کلام ہمیشہ جبریل فرشتہ کے ذریعہ آیا۔ مگر حضرت موسیٰ کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہوا کہ اللہ نے ان سے براہِ راست کلام کیا۔ نیز یہ بھی حضرت موسیٰ کی خصوصیت ہے کہ آپ کے لیے خدا نے ایک مزید پیغمبر (حضرت ہارون) مقرر فرمایا جو آپ کا مددگار ہو۔ اس خصوصیت کی وجہ شاید وہ مخصوص حالات ہوں جن میں آپ کو اپنا پیغمبرانہ فرض انجام دینا تھا۔ کیوں کہ آپ کے سامنے ایک طرف فرعون جیسا جابر بادشاہ تھا اور دوسری طرف یہود جیسی قوم جو اپنے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

رحمت و نصرت کے یہ معاملات اپنی انتہائی صورت میں صرف پیغمبروں کے لیے خاص ہیں۔ تاہم اللہ اپنے مومن بندوں کے ساتھ بھی درجہ بدرجہ اسی قسم کا معاملہ فرماتا ہے۔ وہ ان کے حسب استعداد انھیں اپنے کسی کام کو کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ وہ ان پر خاموشی سے اپنی بات القاء کرتا ہے۔ وہ ان کے لیے ایسی خصوصی تائید کا انتظام کرتا ہے جو عام حالات میں کسی کو نہیں ملتی۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

۵۴۔ اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدہ کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ ۵۵۔ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا۔ اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ ۵۶۔ اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو۔ بے شک وہ سچا تھا اور نبی تھا۔ ۵۷۔ اور ہم نے اس کو بلند رتبہ تک پہنچایا۔

حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم کے فرزند تھے۔ حضرت ادریس ایک پیغمبر ہیں جو غالباً حضرت نوح سے پہلے پیدا ہوئے۔ ان پیغمبروں کی دو خاص صفتیں یہاں بیان کی گئی ہیں — سچا ہونا، لوگوں کو نماز (خدا کی عبادت) اور زکوٰۃ (بندوں کے حقوق کی ادائیگی) کی تلقین کرنا۔ ارشاد ہوا ہے کہ ان صفتوں نے ان کو خدا کا پسندیدہ بنا دیا اور وہ انتہائی اعلیٰ درجہ پر پہنچا دئے گئے۔

جن شخصیتوں کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لیے چنا۔ ان کے اندر یہ صفتیں کمال درجہ میں موجود ہوتی تھیں۔ تاہم عام اہلِ ایمان سے بھی یہی صفات مطلوب ہیں اور ان کو بھی درجہ بدرجہ اس کے وہ ثمرات حاصل ہوتے ہیں جو خدا نے ان صفتوں کے لیے ابدی طور پر مقرر کیے ہیں۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾

السجدة ۵

۵۸۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پیغمبروں میں سے اپنا فضل فرمایا۔ آدم کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا۔ اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور ان کو مقبول بنایا۔ جب ان کو خدائے رحمان کی آیتیں سنائی جاتیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے۔

یہاں ان پیغمبروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آدم کی نسل، نوح کی نسل اور ابراہیم کی نسل میں خصوصیت سے پیدا ہوئے جن کو خدا نے اس کا اہل پایا کہ ان کو اپنی خاص ہدایت سے نوازے اور ان کو لوگوں کے سامنے اپنی نمائندگی کے لیے چن لے۔

ان حضرات پر خدا نے اتنے بڑے بڑے انعامات کیوں کیے۔ فرمایا کہ اس کی وجہ ان کا یہ مشترک وصف تھا کہ وہ خدا کی خدائی کے احساس میں اتنا بڑھے ہوئے تھے کہ اس کا کلام سن کر ان کا سینہ ہل جاتا تھا اور وہ روتے ہوئے اس کے آگے زمین پر گر پڑتے تھے۔

''روتے ہوئے سجدہ میں گرنا'' خدا کے عظمت وجلال کے اعتراف کا آخری درجہ ہے۔ جس کو یہ درجہ ملے اس نے گویا اس ایمان کا ذائقہ چکھا جو نبیوں اور رسولوں کے لیے خاص ہے۔

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۖ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰٓئِكَ

۵۹۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشیں ہوئے جنھوں نے نماز کو کھو دیا اور وہ خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے۔ پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے، ۶۰۔ البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک

يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ۙ﴿۶۰﴾

کام کیا تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

پیغمبر کی دعوت کے ذریعہ جو افراد بنتے ہیں ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خواہش پرستی سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ وہ اللہ کو یاد کرنے والے بن جاتے ہیں جس کی ایک متعین صورت کا نام نماز ہے۔ دین کی اصل خدا کی یاد ہے۔ اور نماز اسی خدا کی یاد کی ایک منظم صورت۔

پیغمبروں کو ماننے والوں کی اگلی نسلیں اگر خدا سے غافل ہوجائیں اور خواہش کے پیچھے چلنے لگیں تو خدا کے نزدیک وہ گمراہ لوگ ہیں۔ پیغمبروں سے وابستگی ان کو کوئی فائدہ دینے والی نہیں۔ ایسے لوگ یقیناً اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ ان میں سے صرف وہی لوگ بچیں گے جو دوبارہ اصل دین کی طرف لوٹیں اور حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کریں۔

آخرت کے لیے کوشش کرنے والے کو فوراً اپنی محنتوں اور قربانیوں کا انجام نہیں ملتا۔ اس لیے کوئی شخص شبہ کرسکتا ہے کہ یہ راستہ ایسا ہے جس میں عمل ہے مگر عمل کا انجام نہیں۔ مگر یہ محض غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دنیا کے لیے عمل کرنے والے اپنے عمل کا بدلہ پاتے ہیں اسی طرح آخرت کے لیے عمل کرنے والے بھی اپنے عمل کا بھرپور بدلہ پائیں گے۔ اس معاملہ میں کسی شک میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

جَنّٰتِ عَدۡنِ ِۣالَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ
بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّهٗ کَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِیًّا ﴿۶۱﴾ لَا
یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَ لَهُمۡ
رِزۡقُهُمۡ فِیۡهَا بُکۡرَةً وَّ عَشِیًّا ﴿۶۲﴾ تِلۡكَ الۡجَنَّةُ
الَّتِیۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ کَانَ تَقِیًّا ﴿۶۳﴾

۶۱۔ ان کے لیے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کا رحمان نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ کر رکھا ہے۔ اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے۔ ۶۲۔ اس میں وہ لوگ کوئی فضول بات نہیں سنیں گے بجز سلام کے۔ اور اس میں ان کا رزق صبح و شام ملے گا۔ ۶۳۔ یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔

موجودہ دنیا میں امتحان کی وجہ سے ہر ایک کو آزادی ملی ہوئی ہے۔ یہاں اچھائی کرنے والے بھی آزاد ہیں اور برائی کرنے والے بھی آزاد۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ایک سچے انسان کو کبھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ وہ ذاتی طور پر خواہ کتنا ہی ٹھیک ہو مگر دوسرے لوگوں کی بے ٹھیک باتیں اس کو سکون لینے نہیں دیتیں۔ لوگ اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھا کر ماحول کو گندی باتوں اور بری آوازوں سے بھر دیتے ہیں۔

جنت وہ بستی ہے جس سے اس قسم کے تمام انسان خارج کر دئے جائیں گے۔ وہاں صرف وہ اعلیٰ ذوق کے لوگ آباد کیے جائیں گے جنھوں نے دنیا میں یہ ثبوت دیا تھا کہ وہ کانٹوں کی مانند نہیں جیتے بلکہ

پھول کی مانند رہنا جانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ماحول میں جو زندگی بنے گی وہ بلا شبہ ابدی سلامتی کی جنت ہوگی۔

دنیا میں لغو چیزوں سے بچنا اور سلامتی کا پیکر بن کر زندگی گزارنا ایک سخت ترین عمل ہے۔ اس کے لیے اپنی آزاد زندگی کو خود اپنے ارادہ سے پابند زندگی بنالینا پڑتا ہے۔ یہ مشکل ترین قربانی ہے جس کا ثبوت صرف وہ شخص دے سکتا ہے جو فی الواقع اللہ سے ڈرتا ہو۔ اللہ سے ڈرنے والے ہی دنیا میں جنتی انسان بن کر رہ سکتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ ع ۱۵

۶۴۔ اور ہم (ملائکہ) نہیں اترتے مگر تمھارے رب کے حکم سے۔ اسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے بیچ میں ہے۔ اور تمھارا رب بھولنے والا نہیں۔ ۶۵۔ وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو ان کے بیچ میں ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت پر قائم رہو۔ کیا تم اس کا کوئی ہم صفت جانتے ہو۔

اسلامی دعوت جب مخالفت کے دور میں ہو تو یہ داعی کے لیے بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ داعی ہر روز چاہتا ہے کہ موجودہ کیفیت کو ختم کرنے کے لیے کوئی نیا اقدام کیا جائے۔ جب کہ خدا کا حکم یہ ہوتا ہے کہ صبر اور انتظار کا طریقہ اختیار کرو۔

ایسی ہی کیفیت ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئی۔ حالات کی شدت کے پیش نظر آپ خدا کی طرف سے مزید ہدایت کے منتظر تھے۔ مگر ایک روایت کے مطابق تقریباً چالیس دن تک جبریل نہیں آئے۔ پھر جب وہ آئے تو آپ نے کہا کہ اے جبریل، اتنی دیر کیوں کر دی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم خدا کی مرضی کے پابند ہیں۔ جب خدا کی طرف سے کوئی ہدایت ملتی ہے تو آتے ہیں اور جب ہدایت نہیں ملتی تو نہیں آتے۔

یہ واقعہ بیان کرکے یہاں صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ جو صورت حال جاری ہے اس کو خدا پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود اگر اس کی طرف سے نئی ہدایت نہیں آرہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت یہی مطلوب ہے کہ اس صورت حال کو برداشت کیا جائے۔ اگر حکمت کا تقاضا کچھ اور ہوتا تو یقیناً کوئی اور حکم آتا۔ خدا سے زیادہ کوئی جاننے والا نہیں اس لیے خدا سے بہتر کسی کی رہنمائی بھی نہیں ہوسکتی۔

''رکنے'' والے حالات میں ''اقدام'' کی آیت تلاش کرنا صحیح نہیں۔ ایسا کرنا گویا اس حکم کو قبل از وقت اتارنے کی کوشش کرنا ہے، جو ابھی آدمی کے لیے نہیں اترا۔

وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَامِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾

٦٦۔ اور انسان کہتا ہے، کیا جب میں مرجاؤں گا تو پھر زندہ کرکے نکالا جاؤں گا۔ ٦٧۔ کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا اور وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ٦٨۔ پس تیرے رب کی قسم، ہم ان کو جمع کریں گے اور شیطانوں کو بھی، پھر ان کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔

عرب کے لوگ جو قرآن کے پہلے مخاطب تھے وہ زندگی بعد موت کو مانتے تھے۔ مگر یہ ماننا صرف رسمی ماننا تھا، وہ حقیقی ماننا نہ تھا۔ قرآن میں آخرت سے متعلق جتنے الفاظ ہیں وہ سب پہلے سے ان کی زبان میں موجود تھے۔ مگر ان کی زندگی پر اس ماننے کا کوئی اثر نہ تھا۔ ان کی عملی زندگی ایسی تھی گویا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہے ہوں کہ — زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ مرنے کے بعد کون ہم کو اٹھائے گا اور کون ہمارا حساب لے گا۔

مگر یہ غفلت یا انکار صرف اس لیے ہے کہ آدمی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کرتا۔ اگر وہ غور کرے تو اس کی پہلی پیدائش ہی اس کے لیے اس کی دوسری پیدائش کی دلیل بن جائے۔

یہاں ''شیاطین'' سے مراد برے لیڈر ہیں۔ یہ لیڈر پر فریب الفاظ بول کر عوام کو بہکاتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ وہی کام کرتے ہیں جو شیطان کرتا ہے۔ موجودہ دنیا میں یہ لیڈر عظمت کے مقام پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لیے لوگ ان کو نظر انداز نہیں کر پاتے۔ مگر آخرت میں ان کی عظمت ختم ہوجائے گی۔ وہاں یہ بڑے لوگ بھی اسی طرح ذلت کے گڑھے میں ڈال دئے جائیں گے جس طرح ان کے چھوٹے لوگ۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

٦٩۔ پھر ہم ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو جدا کریں گے جو رحمان کے مقابلہ میں سب سے زیادہ سرکش بنے ہوئے تھے۔ ٧٠۔ پھر ہم ایسے لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو جہنم میں داخل ہونے کے زیادہ مستحق ہیں۔ ٧١۔ اور تم میں سے کوئی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو، یہ تیرے رب کے اوپر لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ ٧٢۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچا لیں گے جو ڈرتے تھے اور ظالموں کو اس میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

حق کو نہ ماننا جرم ہے، مگر حق کو نہ ماننے کی تحریک چلانا اس سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ جولوگ حق کے خلاف تحریک کے قائد بنیں وہ خدا کی نظر میں بدترین سزا کے مستحق ہیں۔ ان کو آخرت میں عام لوگوں کے مقابلہ میں دگنی سزا دی جائے گی۔

قرآن کے الفاظ سے اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام لوگوں کو جہنم سے گزارے گا۔ یہ گزرنا جہنم کے اندر سے نہیں ہوگا بلکہ اس کے اوپر سے ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے گہرے دریا کے اوپر آدمی کھلے پل کے ذریعہ گزر جاتا ہے۔ وہ دریا کی خطرناک موجوں کو دیکھتا ہے مگر وہ اس میں غرق نہیں ہوتا۔ اسی طرح قیامت میں تمام لوگ جہنم کے اوپر سے گزریں گے۔ جو نیک لوگ ہیں وہ آگے جا کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور جو برے لوگ ہیں وہ آگے نہ بڑھ سکیں گے جہنم انھیں پہچان کر ان کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔

اس تجربہ کا مقصد یہ ہوگا کہ جنت میں داخل کیے جانے والے لوگ خدا کی اس عظیم نعمت کا واقعی احساس کرسکیں کہ اس نے کیسی بری جگہ سے بچا کر انھیں کیسی بہتر جگہ پہنچا دیا ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْيًا ﴿٧٤﴾

۷۳۔ اور جب ان کو ہماری کھلی کھلی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلس زیادہ اچھی ہے۔
۷۴۔ اور ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کردیں جو ان سے زیادہ اسباب والی اور ان سے زیادہ شان والی تھیں۔

جولوگ حق ناحق کی بحث میں نہ پڑیں، جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی مصلحتوں کو اہمیت دیں، جو خدا کو خوش کرنے سے زیادہ عوام کو خوش کرنے کا اہتمام کرتے ہوں۔ ایسے لوگ ہمیشہ زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ ان کے گرد زیادہ رونق اور شان جمع ہوجاتی ہے۔ دوسری طرف جولوگ ہر معاملہ میں یہ دیکھیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ جو دنیا کی مصلحتوں کو نظرانداز کریں اور آخرت کی مصلحتوں کو ترجیح دیں۔ جو عوامی رجحان سے زیادہ خدا کا لحاظ کریں۔ ایسے لوگ اکثر ظاہری شان وشوکت والی چیزوں سے محروم رہتے ہیں۔

یہ فرق بہت سے لوگوں کے لیے غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جولوگ دنیوی اعتبار سے بہتر ہیں وہ خدا کے پسندیدہ ہیں اور جولوگ دنیوی اعتبار سے بہتر نہیں وہ خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ مگر یہ معیار سراسر غلط ہے۔ اور ماضی کی تاریخ اس کی تردید کرنے کے لیے کافی ہے۔ کتنے پرفخر سرزمین کے نیچے دفن ہوگئے۔ کتنے محل ہیں جو آج کھنڈر کے سوا کسی اور صورت میں دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾

۷۵۔ کہو کہ جو شخص گمراہی میں ہوتا ہے تو رحمان اس کو ڈھیل دیا کرتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ دیکھ لیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے، عذاب یا قیامت، تو ان کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کا حال برا ہے اور کس کا جتھا کمزور۔

سرکش آدمی کو سرکشی کا موقع ملنا مہلت امتحان کی وجہ سے ہوتا ہے، نہ کہ کسی حق کی بنا پر۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اس فرق کو سمجھ نہیں پاتا۔ وہ وقتی مہلت کو اپنی مستقل حالت سمجھ لیتا ہے۔ اس کی آنکھ اس وقت تک نہیں کھلتی جب تک مدت کے خاتمہ کا اعلان نہ ہوجائے اور اس سے سرکشی کا حق چھین نہ لیا جائے۔

خدا اپنی مصلحت کے تحت کسی کو دنیا ہی میں یہ تجربہ کرادیتا ہے۔ کوئی اسی حال پر باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت اس کو وہ چیز دکھادیتی ہے جس کو وہ زندگی میں دیکھنے پر تیار نہ ہوا تھا۔

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

۷۶۔ اور اللہ ہدایت پکڑنے والوں کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے، اور باقی رہنے والی نیکیاں تمھارے رب کے نزدیک اجر کے اعتبار سے بہترین ہیں اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر۔

ہدایت یاب ہونا یہ ہے کہ آدمی کا شعور صحیح رخ پر جاگ اٹھے۔ ایسے آدمی کے سامنے کوئی صورتِ حال آتی ہے تو وہ اس کی صحیح توجیہہ کرکے اس کو اپنی غذا بنالیتا ہے۔ اس طرح اس کی ہدایت میں یقین اور کیفیت کے اعتبار سے برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی ہدایت جامد چٹان کی طرح نہیں ہوتی بلکہ زندہ درخت کی مانند ہوتی ہے جو برابر بڑھتا چلا جائے۔

جس طرح دنیا کے پیشِ نظر عمل کرنے والا برابر ترقی کرتا رہتا ہے، اسی طرح آخرت کو سامنے رکھ کر عمل کرنے والے کا عمل بھی مسلسل اضافہ پذیر ہے۔ یہ اضافہ پذیری چونکہ آخرت میں ذخیرہ ہورہی ہے۔ اس لیے وہ دنیا میں نظر نہیں آتی۔ مگر قیامت جب پردہ پھاڑ دے گی تو ہر آدمی دیکھ لے گا کہ ہدایت پانے والے کی ہدایت کس طرح بڑھ رہی تھی اور اسی کے ساتھ اس کا عمل بھی۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا

۷۷۔ کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہا کہ مجھ کو مال اور اولاد مل کر رہیں گے۔ ۷۸۔ کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھا ہے یا اس نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا

يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّ
نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾

ہے۔ ۷۹۔ ہرگز نہیں، جو کچھ وہ کہتا ہے اس کو ہم لکھ لیں گے اور اس کی سزا میں اضافہ کریں گے۔ ۸۰۔ اور جن چیزوں کا وہ مدعی ہے، اس کے وارث ہم بنیں گے اور وہ ہمارے پاس اکیلا آئے گا۔

جب آدمی کے پاس دولت اور طاقت کا کوئی حصہ آتا ہے تو اس کے اندر غلط قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایسی روش اختیار کرتا ہے جو اس کی واقعی حیثیت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو اس کو نہیں بولنا چاہیے۔

ایسا ہی ایک واقعہ مکہ میں ہوا۔ عاص بن وائل مکہ کا ایک مشرک سردار تھا۔ حضرت خباب بن الارت کی کچھ رقم اس کے ذمہ باقی تھی۔ انھوں نے رقم کا مطالبہ کیا تو عاص بن وائل نے کہا کہ میں تمھاری رقم اس وقت دوں گا جب کہ تم محمدؐ کا انکار کرو۔ ان کی زبان سے نکلا کہ میں ہرگز محمدؐ کا انکار نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم مرو اور پھر پیدا ہو۔ عاص بن وائل نے یہ سن کر کہا کہ جب میں دوبارہ پیدا ہوں گا (دَعْنِي حَتَّى أَمُوتَ وَأُبْعَثَ) تو وہاں بھی میں مال اور اولاد کا مالک رہوں گا، اس وقت تم مجھ سے اپنی رقم لے لینا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2091)۔

یہ سب جھوٹی خود اعتمادی کی باتیں ہیں اور جھوٹی خود اعتمادی کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا
لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ
يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ ع ۵ ۱۷ ۸

۸۱۔ اور انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنائے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے مددگار بنیں۔ ۸۲۔ ہرگز نہیں، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف بن جائیں گے۔

انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں جو چاہے کرے، مگر اس کو اس کی بدعملی کا انجام نہ بھگتنا پڑے۔ اس قسم کی حفاظت کسی کو اللہ سے نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے اس نے ایسی ہستیاں تجویز کر لیں جو اللہ کی محبوب ہوں اور اس کی طرف سے اللہ کے یہاں سفارشی بن سکیں۔

مگر یہ سب بے بنیاد قیاسات ہیں، جو کسی کے کچھ کام آنے والے نہیں۔ حتی کہ وہ ہستیاں جن کو آدمی نے شریک فرض کر کے ان کے لیے عبادتی مراسم ادا کیے تھے وہ بھی قیامت کے دن اس سے برأت کریں گی۔ انسان کو ان سے نفرت کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو سکے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ

۸۳۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے منکروں پر شیطانوں کو چھوڑ دیا ہے، وہ ان کو خوب ابھار رہے ہیں۔ ۸۴۔ پس تم ان کے لیے جلدی نہ کرو۔

عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمۡ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوۡمَ
نَحۡشُرُ الۡمُتَّقِيۡنَ اِلَى الرَّحۡمٰنِ وَفۡدًا ۙ﴿٨٥﴾
وَّنَسُوۡقُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرۡدًا ۘ﴿٨٦﴾
لَا يَمۡلِكُوۡنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ
عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ۘ﴿٨٧﴾

ہم ان کی گنتی پوری کر رہے ہیں۔ ۸۵۔ جس دن ہم ڈرنے والوں کو رحمان کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے۔ ۸۶۔ اور مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسا ہانکیں گے۔ ۸۷۔ کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا، مگر اس کو جس نے رحمان کے پاس سے اجازت لی ہو۔

آدمی کے سامنے حق اپنی واضح صورت میں آئے مگر وہ اس کو نظر انداز کر دے تو ایسا عمل شیطان کو اپنے اندر راہ دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کا ذہن بالکل مخالف سمت میں چل پڑتا ہے۔ اب ہر دلیل اس کے ذہن میں جا کر الٹ جاتی ہے۔ خدا کی نشانیاں اس کے سامنے آتی ہیں۔ مگر وہ ان کی خود ساختہ توجیہہ کر کے ان کو اپنی سرکشی کی غذا بنالیتا ہے۔

جو شخص جھوٹے سہاروں کو اپنا سہارا سمجھ لے وہ ہمیشہ اسی قسم کی نادانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ صرف اللہ کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں۔ اللہ کا ڈر ان کی نظر میں ان تمام ہستیوں کو حذف کر دیتا ہے جن کو جھوٹا سہارا بنا کر لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں اللہ کے باعزت مہمان بنائے جائیں گے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا ؕ﴿٨٨﴾ لَقَدۡ جِئۡتُمۡ
شَيۡـًٔـا اِدًّا ۙ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرۡنَ مِنۡهُ
وَتَنۡشَقُّ الۡاَرۡضُ وَتَخِرُّ الۡجِبَالُ هَدًّا ۙ﴿٩٠﴾ اَنۡ
دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا ۚ﴿٩١﴾ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لِلرَّحۡمٰنِ
اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ؕ﴿٩٢﴾

۸۸۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ ۸۹۔ یہ تم نے بڑی سنگین بات کہی ہے۔ ۹۰۔ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین ٹکڑے ہو جائے اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں۔ ۹۱۔ اس پر کہ لوگ رحمان کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں۔ ۹۲۔ حالاں کہ رحمان کی یہ شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے۔

خدا کے لیے اولاد ماننا دو وجہوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو یہ کہ خدا کو اپنے لیے مددگار کی ضرورت ہے۔ یا وہ عام انسانوں کی طرح اولاد کی تمنا رکھتا ہے۔ اس لیے اس نے اپنی اولاد بنائی ہے۔ یہ دونوں باتیں بے بنیاد ہیں۔

زمین و آسمان کی بناوٹ اتنی کامل ہے کہ یہ بالکل ناقابل تصور ہے کہ اس کو بنانے اور چلانے والا خدا ایسا ہو جو انسانوں کی طرح کی کمیاں اپنے اندر رکھتا ہو۔ مخلوقات اپنے خالق کا جو تعارف کرا رہی ہیں اس میں خدا کی اولاد کا تصور کسی طرح چسپاں نہیں ہوتا۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي
الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ
عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

۹۳۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی نہیں جو رحمان کا بندہ ہو کر نہ آئے۔ ۹۴۔ اس کے پاس ان کا شمار ہے اور اس نے ان کو اچھی طرح گن رکھا ہے۔ ۹۵۔ اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلا آئے گا۔ ۹۶۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے، ان کے لیے خدا محبت پیدا کردے گا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ بے آمیز حق کو لے کر اٹھتے ہیں وہ عوام کے نزدیک مبغوض ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ملاوٹی سچائی پر قائم ہونے والے لوگ بے ملاوٹ والی سچائی کے علم بردار کو وحشت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔

مگر یہ صرف موجودہ دنیا کا معاملہ ہے۔ آخرت کا معاملہ اس کے بالکل مختلف ہوگا۔ وہاں کا سارا ماحول انھیں لوگوں کے ساتھ ہوگا جو بے آمیز حق پر اپنے آپ کو کھڑا کریں۔ آخرت کی دنیا میں عزت اور مقبولیت تمام تر ان اشخاص کے حصہ میں آئے گی جنھوں نے موجودہ دنیا کی عزت و مقبولیت سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو بے آمیز سچائی کے ساتھ وابستہ کیا تھا۔

ملاوٹی سچائی کی دنیا میں ملاوٹی سچائی پر کھڑا ہونے والا عزت پاتا ہے۔ اسی طرح بے آمیز سچائی کی دنیا میں اس کو عزت ملے گی جو بے آمیز سچائی کی زمین پر کھڑا ہوا تھا۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ
تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ
مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ
تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾ ع ۶ النصف

۹۷۔ پس ہم نے اس قرآن کو تمھاری زبان میں اس لیے آسان کر دیا ہے کہ تم متقیوں کو خوش خبری سنا دو۔ اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو۔ ۹۸۔ اور ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ کیا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا ان کی کوئی آہٹ سنتے ہو۔

خدا کی کتاب انسان کی قابلِ فہم زبان میں ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے مضامین میں ان تمام پہلوؤں کی پوری رعایت موجود ہے جو کسی کتاب کو اس قابل بناتے ہیں کہ اس سے رہنمائی لی جاسکے۔ مگر ان سب کے باوجود قرآن انھیں لوگوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنتا ہے جو سنجیدہ ہوں اور جن کو یہ کھٹک ہو کہ وہ حق اور ناحق کو جانیں۔ وہ ناحق سے بچیں اور حق کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ جو لوگ سنجیدگی اور طلب سے خالی ہوں وہ قرآن کی تعلیمات کو سن کر صرف بے معنی بحثیں کریں گے، وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔

جو لوگ دعوتِ حق کے مخالف بن کر کھڑے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ ایسا کرنے

سے ان کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ ان کے گردوپیش مخالفینِ حق کی تباہی کے واقعات موجود ہوتے ہیں مگر وہ ان سے عبرت نہیں لیتے۔ وہ آخر وقت تک یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ صرف دوسروں کے لیے تھا۔ ان کے اپنے ساتھ کچھ ہونے والا نہیں۔

مگر اللہ کے قانون میں کوئی استثناء نہیں۔ یہاں ہر آدمی کے ساتھ وہی ہونے والا ہے جو دوسرے کے ساتھ ہوا، اچھوں کے لیے اچھا اور بروں کے لیے برا۔

۲۰۔ سُوْرَۃُ طٰهٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

طٰهٰ ① مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ② اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ③ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ④ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ⑤ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ⑥

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ طٰهٰ۔ ۲۔ ہم نے قرآن تم پر اس لیے نہیں اتارا کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ ۳۔ بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لیے جو ڈرتا ہو۔ ۴۔ یہ اس کی طرف سے اتارا گیا ہے جس نے زمین کو اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ ۵۔ وہ رحمت والا ہے، عرش پر قائم ہے۔ ۶۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے۔

قرآن اگرچہ صرف ایک یاددہانی ہے۔ مگر وہ مدعو کے لیے قابل حجت یاددہانی اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کی دعوت دینے والا اپنے آپ کو اس کی راہ میں کھپا دے۔ دوسروں کی خیر خواہی میں وہ اپنے آپ کو اس حد تک نظر انداز کر دے کہ یہ کہا جائے کہ اس نے تو لوگوں کو حق کی راہ پر لانے کی خاطر اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دیا۔

تاہم دعوت کو خواہ کتنا ہی کامل اور معیاری انداز میں پیش کر دیا جائے، عملاً اس سے ہدایت صرف اس بندۂ خدا کو ملتی ہے جو حق شناس ہو۔ جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ دلیل کی سطح پر بات کا واضح ہونا ہی اس کی آنکھ کھولنے کے لیے کافی ہو جائے۔

جس ہستی نے عالم کی تخلیق کی ہے اسی نے قرآن کو بھی نازل کیا ہے۔ اس لیے قرآن اور فطرت میں کوئی تضاد نہیں۔ قرآن ایک ایسی حقیقت کی یاددہانی ہے جس کو پہچاننے کی صلاحیت فطرت انسانی کے اندر پہلے سے موجود ہے۔

وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝٧ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝٨

۷۔ اورتم چاہے اپنی بات پکار کر کہو، وہ چپکے سے کہی ہوئی بات کو جانتا ہے۔ اوراس سے زیادہ خفی بات کو بھی۔ ۸۔ وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔

دنیا میں ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کا مذہب دنیا سے فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف بے آمیز حق کا داعی ہے جس کا مذہب خدا کی قربت پر قائم ہوتا ہے۔ پہلا گروہ اپنے ماحول میں ہر طرف اپنے ساتھی اور مددگار پالیتا ہے۔ اس کو کبھی تنہا ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، حق کا داعی جس معبود کے اوپر کھڑا ہوا ہے وہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ حالات کے طوفان میں بار بار اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ کبھی اپنے دل میں خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کبھی اس کی زبان سے بآواز بلند دعا کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بھری ہوئی دنیا میں وہ اکیلا ہے۔ کوئی اس کا ساتھی اور مددگار نہیں۔

مگر یہ صرف ظاہری حالت ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے حق کا داعی سب سے زیادہ مضبوط سہارے پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ایسے خدا کو پکار رہا ہے جو تنہائی کے الفاظ اور دل کی سرگوشیوں تک سے باخبر ہے۔ وہ اس خدا کو اپنا سہارا بنائے ہوئے ہے جو ان تمام قابلِ قیاس اور ناقابلِ قیاس قوتوں کا مالک ہے جو کسی کی مدد کے لیے درکار ہیں۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝٩ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠

۹۔ اور کیا تم کو موسیٰ کی بات پہنچی ہے۔ ۱۰۔ جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے تمھارے لیے ایک انگارہ لاؤں یا اس آگ پر مجھے راستہ کا پتہ مل جائے۔

حضرت موسیٰ مصر میں پیدا ہوئے۔ وہاں ایک موقع پر ایک قبطی ان کے ہاتھ سے ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد وہ مصر سے نکل کر مدین چلے گئے۔ وہاں وہ کئی سال تک رہے۔ وہیں ایک خاتون سے نکاح کیا اور پھر اپنی اہلیہ کو لے کر واپس مصر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ بکریاں بھی تھیں۔

حضرت موسیٰ اس سفر میں جزیرہ نمائے سینا کے جنوب میں وادی طور کے علاقہ سے گزر رہے تھے۔ رات ہوئی تو تاریکی میں راستہ کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مزید یہ کہ یہ سخت سردی کا موسم تھا۔ اسی دوران انھیں دکھائی دیا کہ دور ایک آگ جل رہی ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ اس کے رخ پر روانہ ہوئے تاکہ سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے آگ حاصل کریں اور وہاں کچھ لوگ ہوں تو ان سے راستہ معلوم کریں۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ؕ﴿۱۱﴾ اِنِّيْٓ اَنَا
رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ
الْمُقَدَّسِ طُوًى ؕ﴿۱۲﴾ وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ
لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا
فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ اِنَّ
السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ
نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا
يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾

۱۱۔ پھر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو آواز دی گئی کہ اے موسیٰ۔ ۱۲۔ میں ہی تمھارا رب ہوں، پس تم اپنے جوتے اتار دو، کیوں کہ تم طُویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ ۱۳۔ اور میں نے تم کو چن لیا ہے۔ پس جو وحی کی جارہی ہے اس کو سنو۔ ۱۴۔ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ ۱۵۔ بے شک قیامت آنے والی ہے۔ میں اس کو چھپائے رکھنا چاہتا ہوں، تا کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ ملے۔ ۱۶۔ پس اس سے تم کو وہ شخص غافل نہ کرے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں پر چلتا ہے کہ تم ہلاک ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ کو جو آگ نظر آئی وہ عام قسم کی آگ نہ تھی بلکہ خدا کی تجلی تھی۔ چنانچہ جب وہ وہاں پہنچے تو انھیں احساس دلایا گیا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔ ان کو تواضع کے ساتھ پوری طرح متوجہ ہونے کے لیے جوتا اتارنے کا حکم ہوا۔ پھر آواز آئی کہ اس وقت تم خدا سے ہم کلام ہو اور خدا نے تم کو اپنی پیغمبری کے لیے چنا ہے۔

اس وقت حضرت موسیٰ کو جو تعلیم دی گئی وہ وہی تھی جو تمام پیغمبروں کو ہمیشہ تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی ایک خدا کو معبود بنانا۔ اسی کی عبادت کرنا۔ اسی کو ہر موقع پر یاد رکھنا۔ پھر حضرت موسیٰ کو زندگی کی اس حقیقت کی خبر دی گئی کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ ایک خاص مدت تک کے لیے خدا نے حقیقتوں کو غیب میں چھپا دیا ہے۔ قیامت میں یہ پردہ پھٹ جائے گا۔ اس کے بعد انسانی زندگی کا اگلا دور شروع ہوگا جس میں ہر آدمی اس عمل کے مطابق مقام پائے گا جو اس نے موجودہ دنیا میں کیا تھا۔

جب ایک آدمی پر خواہشوں کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ آخرت سے بے پروا ہو کر دنیا کے راستوں میں چل پڑتا ہے تو وہ اپنے اس فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے نظریات وضع کرتا ہے۔ وہ اپنی روش کو خوب صورت الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس کو سن کر دوسرے لوگ بھی آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں مومن کو اپنے بارے میں سخت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے آپ کو اس سے بچانا ہے کہ وہ خدا سے غافل اور آخرت فراموش لوگوں کو دیکھ کر ان سے متاثر ہو جائے۔ یا ان کی خوب صورت باتوں کے فریب میں آ کر آخرت پسندانہ زندگی کو کھو بیٹھے۔

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ
عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى
غَنَمِيْ وَ لِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿١٨﴾ قَالَ
اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿١٩﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ
تَسْعٰى ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ وقفة سَنُعِيْدُهَا
سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿٢١﴾

۱۷۔ اور یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ۔ ۱۸۔ اس نے کہا، یہ میری لاٹھی ہے۔ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔ اس میں میرے لیے دوسرے کام بھی ہیں۔ ۱۹۔ فرمایا کہ اے موسیٰ، اس کو زمین پر ڈال دو۔ ۲۰۔ اس نے اس کو ڈال دیا تو یکا یک وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔ ۲۱۔ فرمایا کہ اس کو پکڑ لو اور مت ڈرو، ہم پھر اس کو اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

''تمھارے ہاتھ میں کیا ہے''— یہ سوال حضرت موسیٰ کے شعور کو زندہ کرنے کے لیے تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لاٹھی کا لاٹھی ہونا حضرت موسیٰ کے ذہن میں تازہ ہو جائے۔ تا کہ اگلے لمحہ جب وہ خدا کی قدرت سے سانپ بن جائے تو وہ پوری طرح اس کی قدر و قیمت کا احساس کر سکیں۔

حضرت موسیٰ کی لکڑی کا سانپ بن جانا ویسا ہی ایک انوکھا واقعہ تھا جیسا مٹی اور پانی کا لکڑی بن جانا۔ وہ سب کچھ جو ہم زمین پر دیکھ رہے ہیں وہ سب ایک چیز سے دوسری چیز میں تبدیل ہو جانے کا ہی دوسرا نام ہے— گیس کا پانی میں تبدیل ہونا، مٹی کا درخت میں تبدیل ہونا، وغیرہ۔ عام حالات میں تبدیلی کا یہ عمل تدریجی طور پر ہوتا ہے۔ اس لیے انسان اس کو محسوس نہیں کر پاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی نے دفعۃً سانپ کی صورت اختیار کر لی اس لیے وہ عجیب معلوم ہونے لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے یا ہو رہا ہے وہ سب کا سب خدا کا معجزہ ہے۔ خواہ وہ زمین سے لکڑی کا نکلنا ہو یا لکڑی کا سانپ بن جانا۔ پیغمبروں کے ذریعہ ''غیر معمولی'' معجزہ صرف اس لیے دکھایا جاتا ہے تا کہ آدمی ''معمولی'' معجزات کو دیکھنے کے قابل ہو جائے۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ
مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ
اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ
ع ۱۰/۲۴ طَغٰى ﴿٢٤﴾

۲۲۔ اور تم اپنا ہاتھ اپنی بغل سے ملا لو، وہ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی عیب کے۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ ۲۳۔ تا کہ ہم اپنی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں تمھیں دکھائیں۔ ۲۴۔ تم فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ حد سے نکل گیا ہے۔

پچھلے نبیوں کے واقعات بائبل میں بھی ہیں اور قرآن میں بھی۔ مگر بہت سے مقامات پر قرآن اور بائبل میں بہت بامعنیٰ فرق ہے۔ مثلاً یہاں بائبل میں ہے— موسیٰ نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور

جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا (خروج، 4:7)۔

بائبل حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی سفیدی کو ''کوڑھ'' بتارہی ہے۔ ایسی حالت میں قرآن میں یدِ بیضاء (چمکتا ہاتھ) کے معجزہ کو بیان کرتے ہوئے ''مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ'' کا اضافہ واضح طور پر بتارہا ہے کہ قرآن بائبل سے ماخوذ نہیں۔ بلکہ یہ خدائے عالم الغیب کی طرف سے ہے جو بائبل کی تحریفات کی تصحیح کررہا ہے۔

حضرت موسیٰ کو دو خاص معجزے دئے گئے۔ سانپ کا معجزہ آپ کے لیے گویا طاقت کی علامت تھا۔ اور یدِ بیضاء کا معجزہ اس بات کی علامت کہ آپ ایک روشن صداقت پر قائم ہیں۔

فرعون کا حد سے گزر جانا یہ تھا کہ اس کو اقتدار ملا تو اس نے اپنے کو خدا سمجھ لیا۔ فرعون کے لفظی معنی ہیں سورج کی اولاد۔ قدیم مصری سورج کو سب سے بڑا دیوتا (رب اعلیٰ) سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرعون نے اپنے کو سورج دیوتا کا زمینی مظہر بتایا۔ اس نے اپنے اسٹیچو اور بت بنوا کر مصر کے تمام شہروں میں رکھوا دئے جو باقاعدہ پوجے جاتے تھے۔

اقتدار خدا کی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کو پا کر آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھرنا چاہیے۔ مگر سرکش انسان اقتدار کو پا کر خود اپنے آپ کو خدا سمجھ لیتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ ﴿۲۵﴾ وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ
اَمۡرِیۡ ﴿۲۶﴾ وَ احۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ ﴿۲۷﴾
یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ ﴿۲۸﴾ وَ اجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ
اَهۡلِیۡ ﴿۲۹﴾ هٰرُوۡنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ اشۡدُدۡ بِهٖۤ
اَزۡرِیۡ ﴿۳۱﴾ وَ اَشۡرِکۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ﴿۳۲﴾ کَیۡ
نُسَبِّحَکَ کَثِیۡرًا ﴿۳۳﴾ وَّ نَذۡکُرَکَ کَثِیۡرًا ﴿۳۴﴾
اِنَّکَ کُنۡتَ بِنَا بَصِیۡرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ
سُؤۡلَکَ یٰمُوۡسٰی ﴿۳۶﴾

۲۵۔ موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب، میرے سینہ کو میرے لیے کھول دے۔ ۲۶۔ اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے۔ ۲۷۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ ۲۸۔ تاکہ لوگ میری بات سمجھیں۔ ۲۹۔ اور میرے خاندان سے میرے لیے ایک معاون مقرر کر دے۔ ۳۰۔ ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ ۳۱۔ اس کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط کر دے۔ ۳۲۔ اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے۔ ۳۳۔ تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں۔ ۳۴۔ اور کثرت سے تیرا چرچا کریں۔ ۳۵۔ بے شک تو ہم کو دیکھ رہا ہے۔ ۳۶۔ فرمایا کہ دے دیا گیا تم کو اے موسیٰ تمھارا سوال۔

پیغمبری ملنے کے بعد ایک صورت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کے اندر احساس فخر پیدا ہو۔ مگر اس وقت انھوں نے جو کچھ اللہ سے مانگا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پیغمبری کو فخر کی چیز نہیں سمجھا بلکہ ذمہ داری کی چیز سمجھا۔

اس وقت انھوں نے جو الفاظ کہے وہ سب وہ ہیں جو دعوت کی نازک ذمہ داری کا احساس کرنے والے کی زبان سے نکلتے ہیں۔

داعی کے لیے سینہ کا کھلنا یہ ہے کہ حسب موقع اس کے اندر مؤثر مضامین کا ورود ہو۔ معاملہ کا آسان ہونا یہ ہے کہ مخالفین کبھی دعوت کی راہ بند کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ زبان کی گرہ کھلنا یہ ہے کہ بڑے سے بڑے مجمع میں بلاجھجک دعوت پیش کرنے کا ملکہ پیدا ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو پیغمبرانہ ذمہ داری ادا کرنے کے لیے یہ سب کچھ دیا۔ اسی کے ساتھ ان کی درخواست کے مطابق ان کے بھائی کو ان کے لیے ایک طاقت ور معاون بنا دیا۔

نصرت کا یہ خصوصی معاملہ جو پیغمبر کے ساتھ کیا گیا یہی غیر پیغمبر داعی کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دعوت کے کام سے اپنے آپ کو اس طرح کامل طور پر وابستہ کرے جس طرح پیغمبر نے اپنے آپ کو کامل طور پر وابستہ کیا تھا۔

''تسبیح اور ذکر'' ہی دین کا اصل مقصود ہے۔ مگر تسبیح اور ذکر سے مراد زبان سے کچھ مخصوص الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ کیفیت ہے جو حق کی یافت کے بعد بالکل قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت انسان کا وجود اللہ کے صفاتِ کمال کا اس طرح تجربہ کرتا ہے کہ وہ اس میں نہا اٹھتا ہے۔ وہ خدائی احساس سے اس طرح سرشار ہوتا ہے کہ وہ اس کا مبلغ بن جاتا ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ
اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ
فِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ
فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ
وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً
مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ
اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ
يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ
عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَقَتَلْتَ نَفْسًا

۳۷۔ اور ہم نے تمھارے اوپر ایک بار اور احسان کیا ہے۔ ۳۸۔ جب کہ ہم نے تمھاری ماں کی طرف وحی کی جو وحی کی جارہی ہے۔ ۳۹۔ کہ اس کو صندوق میں رکھو، پھر اس کو دریا میں ڈال دو، پھر دریا اس کو کنارے پر ڈال دے۔ اس کو ایک شخص اٹھالے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے۔ اور میں نے اپنی طرف سے تم پر ایک محبت ڈال دی۔ اور تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔ ۴۰۔ جب کہ تمھاری بہن چلتی ہوئی آئی، پھر وہ کہنے لگی، کیا میں تم لوگوں کو اس کا پتہ دوں جو اس بچے کی پرورش اچھی طرح کرے۔ پس ہم نے تم کو تمھاری ماں کی طرف لوٹا دیا، تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور اس کو غم نہ رہے۔ اور تم نے ایک

فَنَجَّيۡنٰكَ مِنَ الۡغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوۡنًا ۙ۬ فَلَبِثۡتَ سِنِيۡنَ فِىۡۤ اَهۡلِ مَدۡيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوۡسٰى ۝۴۰

شخص کو قتل کر دیا پھر، ہم نے تم کو اس غم سے نجات دی۔ اور ہم نے تم کو خوب جانچا۔ پھر تم کئی سال مدین والوں میں رہے۔ پھر تم ایک اندازہ پر آ گئے، اے موسیٰ۔

مصر کے اصل باشندے قبطی تھے جن کا سیاسی اور مذہبی نمائندہ فرعون تھا۔ وہاں کی دوسری قوم بنی اسرائیل تھی جو حضرت یوسف کے زمانے میں باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰ جس زمانہ میں بنی اسرائیل کے ایک گھر میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں فرعون نے اسرائیل کی نسل ختم کرنے کے لیے یہ حکم دے دیا تھا کہ اسرائیل کے گھروں میں جتنے بچے پیدا ہوں سب قتل کر دیے جائیں۔ حضرت موسیٰ کی ماں نے بچہ کو قتل سے بچانے کے لیے خدائی الہام کے تحت یہ کیا کہ اس کو ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔

یہ ٹوکری بہتے ہوئے فرعون کے محل کے پاس پہنچی۔ وہاں فرعون اور اس کی بیوی نے اس کو دیکھا تو ان کو چھوٹے بچہ پر رحم آ گیا۔ انھوں نے اس کو نکال کر محل کے اندر رکھ لیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ کی بہن کی نشان دہی پر آپ کی ماں آپ کو دودھ پلانے کے لیے مقرر ہوئیں۔ یہ خدا کا ایک کرشمہ ہے کہ جس فرعون کو موسیٰ کا سب سے بڑا دشمن بننا تھا اسی فرعون کے ذریعہ حضرت موسیٰ کی پرورش اور تربیت کرائی گئی۔

حضرت موسیٰ بڑے ہوئے تو ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کے جھگڑے میں انھوں نے قبطی کو تنبیہ کی۔ غیر متوقع طور پر وہ قبطی مر گیا۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ موسیٰ کو گرفتار کر لیا جائے۔ مگر حضرت موسیٰ خفیہ طور پر مصر سے نکل کر مدین پہنچ گئے۔ وہاں کے صحرائی ماحول میں وہ زندگی کے مزید تجربات سے آشنا ہوئے۔ قبطی کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے غیر معمولی دعائیں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس حادثہ کو ان کے لیے مزید تربیت اور تعلیم کا ذریعہ بنا دیا۔

وَ اصۡطَنَعۡتُكَ لِنَفۡسِىۡ ۝۴۱ ۚ اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ اَخُوۡكَ بِاٰيٰتِىۡ وَلَا تَنِيَا فِىۡ ذِكۡرِىۡ ۝۴۲ ۚ اِذۡهَبَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۴۳ ۖۚ فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوۡ يَخۡشٰى ۝۴۴

۴۱۔ اور میں نے تم کو اپنے لیے منتخب کیا۔ ۴۲۔ جاؤ تم اور تمھارے بھائی میری نشانیوں کے ساتھ۔ اور تم دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا۔ ۴۳۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ ۴۴۔ پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔

مختلف تجربات سے گزر کر حضرت موسیٰ تکمیل شعور کے آخری مرحلہ میں پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پیغمبرانہ دعوت کی ذمہ داری سونپ دی۔ اس وقت حضرت موسیٰ کو دو خاص نصیحتیں کی گئیں۔ ایک خدا کے ذکر میں

کمی نہ کرنا۔ دوسرے دعوت میں نرم انداز اختیار کرنا۔

خدا کے ذکر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے قلب و دماغ میں خدا کا یقین اس طرح شامل ہو گیا ہو کہ وہ بار بار اسے یاد آتا رہے۔ آدمی کا ہر مشاہدہ اور اس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے خدائی شعور سے جڑ کر اس کو جگانے والا بن جائے۔ عام انسان مادی غذاؤں پر جیتے ہیں۔ حق کا داعی خدا کی یاد میں جیتا ہے۔ خدا کی یاد مومن کا سرمایہ ہے اور اسی طرح داعی کا بھی۔

دوسری ضروری چیز دعوت میں نرم انداز اختیار کرنا ہے۔ فرعون جیسے سرکش انسان کے سامنے بھیجتے ہوئے یہ ہدایت کرنا ثابت کرتا ہے کہ دعوت کے لیے نرم اور حکیمانہ انداز مطلق طور پر مطلوب ہے۔ مدعو کی طرف سے کوئی بھی سختی یا سرکشی داعی کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی دعوت میں نرمی اور شفقت کا انداز کھو دے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾

۴۵۔ دونوں نے کہا کہ اے ہمارے رب، ہم کو اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا سرکشی کرنے لگے۔ ۴۶۔ فرمایا کہ تم اندیشہ نہ کرو۔ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ ۴۷۔ پس تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، پس تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ اور ان کو نہ ستا۔ ہم تیرے رب کے پاس سے ایک نشانی بھی لائے ہیں۔ اور سلامتی اس شخص کے لیے ہے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ ۴۸۔ ہم پر یہ وحی کی گئی ہے کہ اس شخص پر عذاب ہوگا جو جھٹلائے اور اعراض کرے۔

فرعون نہایت متکبر تھا۔ اقتدار پا کر وہ اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ کو اندیشہ ہوا کہ جب وہ دیکھے گا کہ اس کے سوا کسی اور خدا کا پیغام اس کو سنایا جا رہا ہے تو وہ غصہ میں بھڑک اٹھے گا۔ مگر خدا کا پیغمبر مکمل طور پر خدا کی حفاظت میں ہوتا ہے۔ اس لیے حکم ہوا کہ تم جاؤ اور یہ یقین رکھو کہ فرعون اپنی ساری طاقت اور جبروت کے باوجود تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

بنی اسرائیل قدیم زمانہ کے مسلمان تھے۔ وہ اصلاً ایک موحد قوم تھے۔ مگر مصر کی مشرک قوم کے درمیان رہتے ہوئے وہ مشرکانہ تہذیب سے بری طرح متاثر ہو گئے تھے۔ مزید یہ کہ مشرک حکمرانوں نے بنی اسرائیل کو اس طرح محنت مزدوری میں لگا رکھا تھا کہ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ وہ توحید اور آخرت کی اعلیٰ حقیقتوں کے

بارے میں سوچ سکیں۔ اس لیے حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو مشرکانہ ماحول سے نکالو اور ان کو الگ خطہ زمین میں آباد کرو۔ تاکہ شرک اور جاہلیت کی فضا سے کٹ کر ان کی تربیت ممکن ہو سکے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿٤٩﴾ قَالَ رَبُّنَا
الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿٥٠﴾
قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾ قَالَ
عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ
لَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾

۴۹۔ فرعون نے کہا، پھر تم دونوں کا رب کون ہے، اے موسیٰ۔ ۵۰۔ موسیٰ نے کہا، ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی صورت عطا کی، پھر رہنمائی فرمائی۔ ۵۱۔ فرعون نے کہا، پھر اگلی قوموں کا کیا حال ہے۔ ۵۲۔ موسیٰ نے کہا، اس کا علم میرے رب کے پاس ایک دفتر میں ہے۔ میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔

''تمھارا رب کون ہے'' — فرعون کا یہ جملہ اس معنی میں نہ تھا کہ وہ اپنے سوا کسی خدا سے بے خبر تھا۔ یا کسی برتر خدا کا سرے سے قائل نہ تھا۔ اس کا یہ جملہ دراصل موسیٰ کی بات کی تحقیر تھا، نہ کہ اس کا سرے سے انکار۔

مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے توحید کی تبلیغ کی تھی۔ اب بھی بنی اسرائیل وہاں لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے، جو خدائے واحد پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس طرح مصر میں اگرچہ خدائے برتر کا عقیدہ موجود تھا مگر عملاً وہاں سارا زور اور شان وشوکت فرعون کے گرد جمع تھی۔ وہ مصریوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے سب سے بڑے دیوتا (سورج) کا زمینی مظہر تھا۔ وہ مصر کا اوتار بادشاہ (God-king) تھا اور اس کے بت اور اسٹیچو سارے مصر میں پرستش کی چیز بنے ہوئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں موسیٰ بنی اسرائیل کے ایک فرد تھے جو مصر میں غلاموں اور مزدوروں کی ایک قوم سمجھی جاتی تھی۔ اور اس بنا پر اس کا مذہبی عقیدہ بھی مصر میں ایک ناقابلِ ذکر عقیدہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

دنیا میں بے شمار چیزیں ہیں مگر ہر چیز کی ایک منفرد بناوٹ ہے اور ہر چیز کا ایک متعین طریقِ عمل ہے۔ نہ اس بناوٹ میں کوئی تبدیلی ممکن ہے اور نہ اس طریقِ عمل میں۔ اس سے خود فرعون جیسا سرکش بادشاہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ یہ واقعہ واضح طور پر ایک بالاتر خالق کا وجود ثابت کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ نے یہ بات کہی تو فرعون نے محسوس کیا کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی براہِ راست جواب نہیں ہے۔ اب اس نے بات کو پھیر دیا۔ دلیل کے میدان میں اپنے کو کمزور پا کر اس نے چاہا کہ تعصب کے جذبات کو بھڑکا کر لوگوں کے درمیان اپنی برتری قائم رکھے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ اگر تمھاری بات صحیح ہے تو ہمارے پچھلے بڑوں کا انجام کیا ہوا جو تمھارے نظریہ کے مطابق گمراہ حالت میں مر گئے۔ حضرت موسیٰ نے اس کے

جواب میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ گزرے ہوئے لوگوں کو خدا کے حوالے کرو اور اب اپنے بارے میں غور کرو۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَ ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿۵۴﴾ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

ع ۲ / ۱۱

۵۳۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بنایا۔ اور اس میں تمھارے لیے راہیں نکالیں اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے مختلف قسم کی نباتات پیدا کیں۔ ۵۴۔ کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ۔ اس کے اندر اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔ ۵۵۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

زمین کی پیدائش، بارش کا نظام، نباتات کا اگنا، اور دوسرے اہتمامات جس نے موجودہ دنیا کو زندہ چیزوں کے لیے قابلِ رہائش بنایا ہے، وہ حیرت ناک حد تک عظیم ہیں۔

یہ ایک ''نشانی'' ہے جو ثابت کرتی ہے، اس دنیا کا خالق و مالک ایک عظیم خدا ہے۔ موجودہ دنیا جیسی دنیا کو وجود میں لانے کے لیے اتنی بڑی قدرت درکار ہے جو نہ کسی ''سورج'' کو حاصل ہے اور نہ کسی ''بادشاہ'' کو۔ ایسی حالت میں یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ اس کو بنانے اور چلانے والا ایک برتر خدا ہے۔

پھر اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دنیا عبث دنیا نہیں ہے۔ جو یوں ہی پیدا ہوا اور یوں ہی ختم ہو جائے۔ بامعنی دنیا لازمی طور پر ایک بامعنی انجام چاہتی ہے۔ اسی طرح دنیا کا مشاہدہ بیک وقت توحید کو بھی ثابت کر رہا ہے اور آخرت کو بھی۔

وَ لَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ یٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

۵۶۔ اور ہم نے فرعون کو اپنی سب نشانیاں دکھائیں تو اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ ۵۷۔ اس نے کہا کہ اے موسیٰ، کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ اپنے جادو سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال دو۔ ۵۸۔ تو ہم تمھارے مقابلہ میں ایسا ہی جادو لائیں گے۔ پس تم ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ مقرر کرلو، نہ ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تم۔ یہ مقابلہ ایک ہموار میدان میں ہو۔

حضرت موسیٰ کی دعوت فرعون کے اوپر لمبی مدت تک جاری رہی۔ اس دوران آپ نے اس کے سامنے عقلی دلائل بھی پیش کیے اور حسی معجزے بھی دکھائے۔ مگر وہ حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لایا۔ حضرت موسیٰ کی سچائی کا اقرار فرعون کے لیے اپنی نفی کے ہم معنی ہوتا۔ اور فرعون کی متکبرانہ نفسیات اس میں مانع ہوگئی کہ اپنی نفی کی قیمت پر وہ سچائی کا اقرار کرے۔

حضرت موسیٰ کے عقلی دلائل کو فرعون نے غیر متعلق باتوں کے ذریعے بے اثر کرنے کی کوشش کی اور آپ کے معجزات کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ جادو ہے۔ یعنی ایک ایسی چیز جس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر آدمی مہارت پیدا کر کے اس قسم کا کرشمہ دکھا سکتا ہے۔ اپنی اس ڈھٹائی کو نباہنے کے لیے مزید اس کو یہ کرنا پڑا کہ اس نے کہا کہ ہم بھی اپنے جادوگروں کے ذریعے ویسا ہی کرشمہ دکھا سکتے ہیں جیسا کرشمہ تم نے ہمیں دکھایا ہے۔ گفتگو کے بعد بالآخر یہ طے ہوا کہ آنے والے قومی میلے کے دن ملک کے جادوگروں کو جمع کیا جائے اور سب کے سامنے موسیٰ اور جادوگروں کے درمیان مقابلہ ہو۔

قَالَ مَوۡعِدُكُمۡ يَوۡمُ الزِّيۡنَةِ وَ اَنۡ يُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرۡعَوۡنُ فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰى وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسۡحِتَكُمۡ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰى ﴿٦١﴾

۵۹۔ موسیٰ نے کہا، تمھارے لیے وعدہ کا دن میلے والا دن ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھتے تک جمع کیے جائیں۔ ۶۰۔ فرعون وہاں سے ہٹا، پھر اپنے سارے داؤ جمع کئے، اس کے بعد وہ مقابلہ پر آیا۔ ۶۱۔ موسیٰ نے کہا کہ تمھارا برا ہو، اللہ پر جھوٹ نہ باندھو کہ وہ تم کو کسی آفت سے غارت کر دے۔ اور جس نے خدا پر جھوٹ باندھا وہ ناکام ہوا۔

فرعون نے سارے ملک میں آدمی بھیج کر تمام ماہر جادوگروں کو بلایا۔ جب یہ لوگ میلے کے میدان میں جمع ہوئے تو مقابلہ پیش آنے سے پہلے حضرت موسیٰ نے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر لوگوں کے لیے بالکل نئی چیز نہ تھی، بلکہ یہ ایک قسم کی یاددہانی تھی۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ کی دعوت کے ذریعہ جادوگر اور دوسرے حضرات یقیناً اس بات سے آگاہ ہو چکے تھے کہ موسیٰ کا پیغام کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ موسیٰ شرک کے مقابلے میں توحید کی دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔

اس پس منظر میں حضرت موسیٰ نے اتمام حجت کے طور پر آخری نصیحت کی۔ حضرت موسیٰ نے فرعون اور جادوگروں سے کہا کہ اس معاملہ کو تم لوگ جادو کا معاملہ نہ سمجھو۔ خدا کی نشانی کو جادو کہنا اور انسانی جادو کے ذریعہ اس کو زیر کرنے کی کوشش کرنا بے حد سنگین بات ہے۔ یہ ایک واقعی حقیقت کا مقابلہ ایک سراسر بے حقیقت چیز کے ذریعہ کرنا ہے جس کا یقینی نتیجہ ہلاکت ہے۔ تم بظاہر مجھ کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتے ہو مگر یہ خود خدا کو نعوذ باللہ جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی سرکشی کریں وہ خدا کی دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾

۶۲۔ پھر انھوں نے اپنے معاملہ میں اختلاف کیا۔ اور انھوں نے چپکے چپکے باہم مشورہ کیا۔ ۶۳۔ انھوں نے کہا یہ دونوں یقیناً جادوگر ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمھارے ملک سے نکال دیں اور تمھارے عمدہ طریقہ کا خاتمہ کردیں۔ ۶۴۔ پس تم اپنی تدبیریں اکھٹا کرو۔ پھر متحد ہوکر آؤ اور وہی جیت گیا جو آج غالب رہا۔

حضرت موسیٰ کی ابتدائی تقریر سے جادوگروں کی جماعت میں اختلاف پڑ گیا۔ ان کے ایک گروہ نے کہا کہ یہ جادوگر کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ نبی کا کلام ہے۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ نہیں، یہ شخص ہماری ہی طرح کا ایک جادوگر ہے (تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 301)۔

جادوگر یقینی طور پر اپنے ہم جنسوں کو پہچانتے تھے۔ ان کے تجربہ کار افراد نے محسوس کرلیا کہ یہ جادو کا معاملہ نہیں ہے بلکہ معجزہ کا معاملہ ہے۔ چنانچہ وہ مقابلہ کی ہمت کھو بیٹھے۔ مگر فرعون اور اس کے پرجوش ساتھیوں کے اکسانے پر وہ مقابلہ کے لیے راضی ہوگئے۔

''بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى'' کا مطلب ہے افضل طریقہ۔ اس وقت مصریوں کی زندگی کا پورا ڈھانچہ مشرکانہ عقائد کے اوپر قائم تھا۔ سب سے بڑے دیوتا (سورج) کے جسمانی مظہر کی حیثیت سے فرعون کی شخصیت ان کے سیاسی اور سماجی نظام کی بنیاد بنی ہوئی تھی۔ فرعون نے تعصب کے جذبات کو ابھار کر کہا کہ یہ نظام ہمارا قومی نظام ہے۔ اب اگر توحید کے ان علم برداروں کی جیت ہوگئی تو ہمارا پورا قومی نظام اکھڑ جائے گا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا

۶۵۔ انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ، یا تو تم ڈالو یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں۔ ۶۶۔ موسیٰ نے کہا کہ تم ہی پہلے ڈالو، تو یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے اس کو اس طرح دکھائی دیں گویا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔ ۶۷۔ پس موسیٰ اپنے دل میں کچھ ڈر گیا۔ ۶۸۔ ہم نے کہا کہ تم ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہوگے۔ ۶۹۔ اور جو تمھارے داہنے ہاتھ میں ہے اس کو ڈال دو، وہ اس کو نگل جائے گا جو انھوں نے بنایا ہے۔ یہ جو کچھ انھوں

يُفۡلِحُ السّٰحِرُ حَيۡثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ فَاُلۡقِىَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوۡنَ وَمُوۡسٰى ﴿۷۰﴾

نے بنایا ہے یہ جادوگر کا فریب ہے۔ اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتا، خواہ وہ کیسے آئے۔

۷۰۔ پس جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے۔

مقابلہ اس طرح شروع ہوا کہ جادوگروں نے پہلے اپنی رسّیاں اور لاٹھیاں میدان میں پھینکیں تو ان کی رسّیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر چلتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ تاہم یہ صرف نظر بندی کا معاملہ تھا۔ یعنی رسّیاں اور لاٹھیاں فی الواقع سانپ نہیں بن گئیں تھیں بلکہ جادوگروں نے نظر بندی کے عمل سے حاضرین کی قوت خیالی کو اس طرح متاثر کیا کہ انھیں وقتی طور پر دکھائی دیا کہ رسّیاں اور لاٹھیاں سانپ کی مانند میدان میں چل رہی ہیں۔

اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی میدان میں پھینکی۔ ان کی لاٹھی فوراً بہت بڑا سانپ بن کر میدان میں دوڑنے لگی۔ اس نے جادوگروں کے نظر بندی کے طلسم کو نگل لیا۔ وہ چیزیں جو سانپوں کی شکل میں چلتی ہوئی نظر آتی تھیں، وہ اس کے چھوتے ہی محض رسّی اور لاٹھی ہو کر رہ گئیں۔

جادوگر حضرت موسیٰ کا کلام سن کر پہلے ہی اس سے متاثر ہو چکے تھے۔ اب جب عملی مظاہرہ ہوا تو انھوں نے حضرت موسیٰ کی صداقت کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ انھوں نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ موسیٰ کے پاس جو چیز ہے وہ کوئی انسانی جادو نہیں ہے بلکہ وہ خدائی معجزہ ہے۔ یہ یقین اتنا گہرا تھا کہ انھوں نے اسی وقت حضرت موسیٰ کے دین کو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا۔

قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيۡرُكُمُ الَّذِىۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ ۫ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰى ﴿۷۱﴾

۷۱۔ فرعون نے کہا کہ تم نے اس کو مان لیا اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دیتا۔ وہی تمھارا بڑا ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔ تو اب میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا۔ اور میں تم کو کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ اور تم جان لو گے کہ ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت ہے اور زیادہ دیر تک رہنے والا ہے۔

یہ مقابلہ محض دو قسم کے آدمیوں کے کرتب کا مقابلہ نہ تھا بلکہ وہ توحید اور شرک کا مقابلہ تھا۔ یعنی اس کے ذریعہ سے یہ فیصلہ ہونا تھا کہ صداقت شرک کی طرف ہے یا توحید کی طرف۔ چوں کہ فرعون کی بڑائی کی بنیاد تمام تر شرک کے اوپر قائم تھی اس لیے وہ شرک کی شکست کو برداشت نہ کر سکا اور جادوگروں کے لیے اس سخت ترین سزا کا حکم سنا دیا جو مصر میں قدیم زمانہ میں رائج تھی۔

فرعون جب دلیل کے میدان میں ہار گیا تو اس نے یہ کوشش کی کہ طاقت کے ذریعہ حق کو دبا دے۔ یہ ہر زمانہ میں ارباب اقتدار کی عام نفسیات رہی ہے، خواہ وہ شاہانہ اختیار رکھنے والے اربابِ اقتدار ہوں یا غیر شاہانہ اختیار رکھنے والے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۷۳﴾

۷۲۔ جادوگروں نے کہا کہ ہم تجھ کو ہرگز ان دلائل پر ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے پاس آئے ہیں۔ اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، پس تجھ کو جو کچھ کرنا ہے اسے کر ڈال۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو، اسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو۔ ۷۳۔ ہم اپنے رب پر ایمان لائے تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو بخش دے اور اس جادو کو بھی جس پر تم نے ہمیں مجبور کیا۔ اور اللہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

جادوگروں کے سامنے ایک طرف حضرت موسیٰ کی دلیل تھی، اور دوسری طرف فرعون کی جابرانہ شخصیت۔ یہ دلیل اور شخصیت کا مقابلہ تھا۔ جادوگروں نے شخصیت پر دلیل کو ترجیح دی۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ اس ترجیح کی قیمت انھیں انتہائی مہنگی صورت میں دینی پڑے گی۔

جادوگروں کا ایمان کوئی نسلی یا رسمی ایمان نہ تھا۔ ان کا ایمان ان کے لیے دریافت کے ہم معنی تھا۔ اور جو ایمان کسی آدمی کو دریافت کے طور پر حاصل ہو وہ اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہر دوسری چیز اس کو ہیچ نظر آنے لگتی ہے، خواہ وہ کوئی بڑی شخصیت ہو یا کوئی بڑی دنیوی مصلحت۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ ع ۳ ۲۲ ۱۲

۷۴۔ بے شک جو شخص مجرم بن کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہوگا تو اس کے لیے جہنم ہے، اس میں وہ نہ مرے گا اور نہ جئے گا۔ ۷۵۔ اور جو شخص اپنے رب کے پاس مومن ہو کر آئے گا جس نے نیک عمل کیے ہوں، تو ایسے لوگوں کے لیے بڑے اونچے درجے ہیں۔ ۷۶۔ ان کے لیے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بدلہ ہے اس شخص کا جو پاکیزگی اختیار کرے۔

مجرم بننا کیا ہے۔ مجرم بننا یہ ہے کہ آدمی کے سامنے خدا کی نشانی آئے مگر وہ اس سے نصیحت حاصل نہ کرے۔ اس کے سامنے دلائل کی زبان میں حق کھولا جائے مگر وہ اس کو نظر انداز کردے۔ وہ ظاہری قوتوں اور مادی مصلحتوں سے باہر نکل کر حقیقت کا اعتراف نہ کرسکے۔

ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں سخت ترین سزا ہے۔ دنیا کی کوئی مصیبت، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، بہر حال وہ محدود ہے۔ اور موت کے ساتھ ایک نہ ایک دن ختم ہوجاتی ہے۔ مگر آخرت وہ جگہ ہے جہاں مصیبتوں کا طوفان ہر طرف سے آدمی کو گھیرے ہوئے ہوگا۔ مگر آدمی کے لیے وہاں سے بھاگنا ممکن نہ ہوگا۔ اور نہ وہاں موت آئے گی جو ناقابلِ بیان مصیبتوں کا سلسلہ منقطع کردے۔

جنت اس کے لیے ہے جو اپنے آپ کو پاک کرے۔ پاک کرنا یہ ہے کہ آدمی غفلت کی زندگی کو ترک کرے اور شعور کی زندگی کو اپنائے۔ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچائے جو حق سے روکنے والی ہیں۔ مصلحت کی رکاوٹ سامنے آئے تو اس کو نظر انداز کردے۔ نفس کی خواہش ابھرے تو اس کو کچل دے۔ ظلم اور گھمنڈ کی نفسیات جاگے تو اس کو اپنے اندر ہی اندر دفن کردے۔

یہی لوگ سچے ایمان والے ہیں۔ دنیا میں ان کا ایمان عملِ صالح کے باغ کی صورت میں اگا تھا، آخرت میں وہ ابدی جنتوں کے روپ میں سرسبز شاداب ہوکر انھیں واپس ملے گا۔

وَ لَقَدۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی ۬ اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ فَاضۡرِبۡ لَہُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَکًا وَّ لَا تَخۡشٰی ﴿۷۷﴾ فَاَتۡبَعَہُمۡ فِرۡعَوۡنُ بِجُنُوۡدِہٖ فَغَشِیَہُمۡ مِّنَ الۡیَمِّ مَا غَشِیَہُمۡ ﴿ؕ۷۸﴾ وَ اَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَہٗ وَ مَا ہَدٰی ﴿۷۹﴾

۷۷۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر نکلو۔ پھر ان کے لیے سمندر میں سوکھا راستہ بنالو، تم نہ تعاقب سے ڈرو اور نہ کسی اور چیز سے ڈرو۔ ۷۸۔ پھر فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا پھر ان کو سمندر کے پانی نے ڈھانپ لیا، جیسا کہ ڈھانپ لیا۔ ۷۹۔ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور اس کو صحیح راہ نہ دکھائی۔

جادوگروں سے مقابلہ کے بعد حضرت موسیٰ کئی سال مصر میں رہے۔ ایک طرف انھوں نے فرعون اور قوم فرعون پر اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ دوسری طرف انھوں نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو اجازت دے دو کہ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر مصر سے باہر صحرائے سینا میں چلا جاؤں اور وہاں آزادی کے ساتھ خدائے واحد کی عبادت کروں۔ مگر فرعون نے نہ تو نصیحت قبول کی اور نہ حضرت موسیٰ کو باہر جانے کی اجازت دی۔

آخر کار حضرت موسیٰ نے خدا کے حکم سے خاموش ہجرت کا فیصلہ کیا۔ اس وقت مصر میں جو اسرائیلی یا غیر

اسرائیلی مسلمان تھے، سب پیشگی منصوبہ کے تحت ایک خاص مقام پر جمع ہوئے اور وہاں سے رات کے وقت اجتماعی طور پر روانہ ہوگئے۔

یہ قافلہ بحراحمر کی شمالی خلیج تک پہنچا تھا کہ فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کرتا ہوا وہاں آ گیا۔ پیچھے فرعون کا لشکر تھا اور آگے سمندر کی مانند وسیع خلیج۔ اب حضرت موسیٰ نے خلیج کے پانی پر اپنی لاٹھی ماری۔ خدا کے حکم سے پانی دو ٹکڑے ہوگیا۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی اس کے درمیان خشکی پر چلتے ہوئے دوسری طرف پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر فرعون بھی اس کے اندر داخل ہوگیا۔ مگر فرعون اور اس کا لشکر جیسے ہی درمیان میں پہنچے دونوں طرف کا پانی مل گیا۔ وہ لوگ اس کے اندر غرق ہوگئے — ایک ہی دریا خدا کے وفادار بندوں کے لیے نجات کا راستہ بن گیا۔ اور خدا کے دشمنوں کے لیے موت کا گڑھا۔

لوگ اکثر اپنے قائدین کے بھروسہ پر حق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر فرعون کی مثال بتاتی ہے کہ قائدین کا سہارا نہایت کمزور سہارا ہے۔ اس دنیا میں اصل سہارے والا وہ ہے جو خدا کی آیات کی بنیاد پر اپنی راہ متعین کرے، نہ کہ قوم کے اکابر کی بنیاد پر۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿٨٠﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾

۸۰۔ اے بنی اسرائیل، ہم نے تم کو تمھارے دشمن سے نجات دی اور تم سے طور کے دائیں جانب وعدہ ٹھہرایا۔ اور ہم نے تمھارے اوپر من وسلوی اتارا۔ ۸۱۔ کھاؤ ہماری دی ہوئی پاک روزی اور اس میں سرکشی نہ کرو کہ تمھارے اوپر میرا غضب نازل ہو۔ اور جس پر میرا غضب اترا وہ تباہ ہوا۔ ۸۲۔ البتہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور سیدھی راہ پر رہے تو اس کے لیے میں بہت زیادہ بخشنے والا ہوں۔

خلیج کو پار کرنے کے بعد حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی چلتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ صحرائے سینا میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد کوہ طور کے دامن میں بلا کر خاص اہتمام سے ان کو شریعت عطا کی گئی۔ یہ لوگ چالیس سال تک صحرائے سینا میں رہے۔ یہاں ان کے لیے خصوصی نعمت کے طور پر پانی اور غذا (من وسلویٰ) کا انتظام کیا گیا، جو اس وقت تک مسلسل جاری رہا جب کہ ان کی اگلی نسل فلسطین کے سرسبز علاقہ میں پہنچ گئی۔

اللہ تعالیٰ کے اوپر بندوں کا یہ حق ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے بندوں کے لیے رزق فراہم کرے۔ اور بندوں کے اوپر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ کسی حال میں اس کے ساتھ سرکشی نہ کریں۔ جو لوگ خدا کی نعمتوں کے شکر گزار بن

کر رہیں ان کے لیے خدا کی مزید رحمتیں ہیں۔ اور جو لوگ سرکش بن جائیں ان کے لیے خدا کا شدید عذاب ہے، جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾

۸۳۔ اور اے موسیٰ، اپنی قوم کو چھوڑ کر جلد آنے پر تم کو کس چیز نے ابھارا۔ ۸۴۔ موسیٰ نے کہا، وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں۔ اور میں اے میرے رب، تیری طرف جلد آ گیا تاکہ تو راضی ہو۔ ۸۵۔ فرمایا، تو ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے بعد ایک فتنہ میں ڈال دیا۔ اور سامری نے اس کو گمراہ کر دیا۔

مصر سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے لیے ایک تاریخ مقرر کی کہ اس روز وہ کوہِ طور کے اسی دامن میں دوبارہ آئیں جہاں انھیں ابتداءً پیغمبری ملی تھی۔ یہاں حضرت موسیٰ کو تورات لینے کے لیے اپنی پوری قوم کے ساتھ پہنچنا تھا۔ مگر فرطِ شوق میں وہ تیزی سے روانہ ہو کر مقررہ تاریخ سے کچھ دن پہلے مقام موعود پر آ گئے۔ اور قوم کو پیچھے چھوڑ دیا۔ قوم سے حضرت موسیٰ کی علیحدگی قوم کے لیے فتنہ بن گئی۔ قوم میں بعض مشرکانہ ذہنیت کے لوگ تھے۔ سامری ان کا لیڈر تھا۔ ان لوگوں نے حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر قوم کو بہکایا اور اس کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا کر دیا جیسا کہ مصر میں اس زمانہ میں ہوتا تھا۔

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿٨٦﴾

۸۶۔ پھر موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے لوٹے۔ انھوں نے کہا کہ اے میری قوم، کیا تم سے تمھارے رب نے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا۔ کیا تم پر زیادہ زمانہ گزر گیا۔ یا تم نے چاہا کہ تمھارے اوپر تمھارے رب کا غضب نازل ہو، اس لیے تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو خبر دی کہ تمھاری قوم فتنہ میں مبتلا ہو گئی ہے تو وہ شدید جذبات میں بھرے ہوئے قوم کی طرف واپس آئے۔ انھوں نے ان کو یاد دلایا کہ ابھی ابھی خدا نے تمھارے اوپر اتنے احسانات کیے ہیں اور اپنی اتنی زیادہ نشانیاں تمھارے لیے ظاہر کی ہیں۔ پھر کیسے تم اتنی جلد سب بھول کر گمراہی میں پڑ گئے۔

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے لیے اللہ کی کتاب لینے گئے۔ اور بنی اسرائیل کی بڑی تعداد کچھ لوگوں کی باتوں میں آکر غیر اللہ کی پرستش میں مصروف ہو گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مصر کے مشرکانہ ماحول سے کتنا زیادہ متاثر ہو چکے تھے۔ اور کیوں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ دوبارہ توحید کا پرستار بنانے کے لیے انھیں مصر

کے ماحول سے نکال کر باہر لے جایا جائے۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں جو کچھ کیا وہ دعوت دین کا کام تھا۔ اور آپ نے بنی اسرائیل کے سلسلہ میں جو کچھ کیا وہ تحفظ دین کا کام۔ دونوں کام آپ نے ساتھ ساتھ انجام دئے۔ اس سے دونوں کاموں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ مسلمان اگر بگڑے ہوئے ہوں تو اس بنا پر دعوتِ عام کا کام روکا نہیں جاسکتا۔ اور اگر دعوت عام کا کام کرنا ہو تو وہ اس طرح نہیں کیا جائے گا کہ داخلی اصلاح کا کام بند کردیا جائے۔

قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّۙ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِيَؕ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ۬ وَّ لَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ ع ۱۳ ۱۴

۸۷۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اختیار سے آپ کے ساتھ وعدہ خلافی نہیں کی، بلکہ قوم کے زیورات کا بوجھ ہم سے اٹھوایا گیا تھا تو ہم نے اس کو پھینک دیا۔ پھر اس طرح سامری نے ڈھال لیا۔ ۸۸۔ پس اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا برآمد کردیا۔ ایک مورت جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ پھر اس نے کہا کہ یہ تمھارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود بھی، موسیٰ اسے بھول گئے۔ ۸۹۔ کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ کسی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

بنی اسرائیل کی عورتیں غالباً قدیم رواج کے مطابق بھاری زیورات اپنے جسم پر لادے ہوئی تھیں۔ اس سفر میں قوم نے کہیں پڑاؤ ڈالا تو انھوں نے ان زیورات کو اتار کر ایک جگہ ڈھیر کردیا۔ ان کے درمیان ایک سامری تھا جو مصر کی قدیم صنعت بت سازی کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے ان زیورات کو پگھلایا اور ان سے بچھڑے جیسی ایک مورت بناڈالی۔ یہ بچھڑا اندر سے خالی تھا۔ اور اس طرح ہنرمندی سے بنایا گیا تھا کہ جب اس کے اندر سے ہوا گزرتی تو بیل کی ڈکار کی سی آواز آتی۔ سامری نے بنی اسرائیل کے جاہل عوام سے کہا کہ دیکھو تمہارا معبود تو یہ ہے جو یہاں موجود ہے۔ موسیٰ معبود کی تلاش میں معلوم نہیں کس پہاڑ پر چلے گئے۔

ہر زمانے کے "سامری" اسی طرح عوام کو بے وقوف بناتے ہیں۔ وہ کسی محسوس چیز کو نشانہ بنا کر اسی کو سب سے بڑا حق ثابت کرتے ہیں۔ اور الفاظ کے فریب میں آکر عوام کی ایک بھیڑ ان کے گرد جمع ہوجاتی ہے — محسوس پرستی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ خواہ وہ دور قدیم کا انسان ہو یا دورجدید کا انسان۔

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ

۹۰۔ اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہا تھا کہ اے میری قوم، تم اس بچھڑے کے ذریعہ سے بہک گئے ہو اور تمھارا رب تو رحمان ہے۔ پس

وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝۹۰ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝۹۱

میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ ۹۱۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو اسی کی پرستش میں لگے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ ہمارے پاس لوٹ نہ آئے۔

حضرت موسیٰ کے بعد قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری حضرت ہارون پر تھی۔ انھوں نے قوم کو کافی سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر قوم کے اوپر ان کا وہ دباؤ نہ تھا جو حضرت موسیٰ کا تھا۔ اس لیے ان کے منع کرنے کے بعد بھی لوگ اس سے نہ رکے۔ حضرت ہارون کا اصرار بڑھا تو لوگوں نے کہا کہ اب جو ہو گیا وہ تو اسی طرح جاری رہے گا۔ موسیٰ جب لوٹ کر آئیں گے تو وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔

حضرت ہارون اس وقت اگر کوئی سخت اقدام کرتے تو وہ نتیجہ خیز نہ ہوتا۔ کیوں کہ آپ کے ساتھ جو لوگ تھے ان کی تعداد کم تھی۔ آپ نے بے نتیجہ کارروائی کرنے کے مقابلہ میں اس کو زیادہ مناسب سمجھا کہ وقتی طور پر صبر کا طریقہ اختیار کر لیں۔ اور لوگوں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝۹۲ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝۹۳ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝۹۴

۹۲۔ موسیٰ نے کہا کہ اے ہارون، جب تو نے دیکھا کہ وہ بہک گئے ہیں تو تم کو کس چیز نے روکا کہ تم میری پیروی کرو۔ ۹۳۔ کیا تم نے میرے کہنے کے خلاف کیا۔ ۹۴۔ ہارون نے کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے، تم میری داڑھی نہ پکڑو اور نہ میرا سر۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا لحاظ نہ کیا۔

حضرت موسیٰ نے اپنے بھائی کا سختی کے ساتھ محاسبہ کیا۔ حضرت ہارون نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے کہ میں نے اصلاح کی کوشش نہیں کی اور جاہلوں کے ساتھ مصالحت کر لی۔ بلکہ میں نے پوری قوت کے ساتھ ان کو اس مشرکانہ فعل سے روکنے کی کوشش کی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ قوم کی اکثریت سامری کے فریب میں آکر اس کی ساتھی بن گئی۔ میں نے اصرار کیا تو وہ لوگ جنگ و قتل پر آمادہ ہو گئے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں اصرار جاری رکھتا ہوں تو قوم کے اندر باہمی خون ریزی شروع ہو جائے گی۔

معاملہ اس نوبت تک پہنچنے کے بعد اب مجھے دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔ یا تو باہمی جنگ، یا آپ کی آمد تک اس معاملہ کو ملتوی رکھنا۔ میں نے دوسری صورت کو اَہون (آسان تر) سمجھ کر اس کو اختیار کر لیا— بہت سے مواقع پر دین کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ باہمی لڑائی سے بچنے کے لیے خاموشی کا طریقہ اختیار کر لیا جائے، حتی کہ شرک جیسے معاملہ میں بھی۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ
بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ
الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ
نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ
اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا
لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ
عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي
الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

۹۵۔ موسیٰ نے کہا کہ اے سامری، تمھارا کیا معاملہ ہے۔ ۹۶۔ اس نے کہا کہ مجھ کو وہ چیز نظر آئی جو دوسروں کو نظر نہیں آئی تو میں نے رسول کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی اٹھائی اور وہ اس میں ڈال دی۔ میرے نفس نے مجھ کو ایسا ہی سمجھایا۔ ۹۷۔ موسیٰ نے کہا کہ دور ہو۔ اب تیرے لیے زندگی بھر یہ ہے کہ تو کہے کہ مجھ کو نہ چھونا۔ اور تیرے لیے ایک اور وعدہ یہ ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں۔ اور تو اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو برابر معتکف رہتا تھا، ہم اس کو جلائیں گے پھر اس کو دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے۔ ۹۸۔ تمھارا معبود تو صرف اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔

حضرت موسیٰ کو جب معلوم ہوا کہ اس فعل کا اصل لیڈر سامری ہے تو آپ نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ سامری نے دوبارہ ہوشیاری کا طریقہ اختیار کیا اور بات بناتے ہوئے کہا میں نے جو کچھ کیا ایک کشف کے زیر اثر کیا۔ اور خود رسول کے نقش قدم کی مٹی بھی اس میں برکت کے لیے شامل کر دی۔

پیغمبر کو فریب دینے کی کوشش کی بنا پر سامری کا جرم اور زیادہ شدید ہو گیا۔ بائبل کے بیان کے مطابق اس کو خدا نے کوڑھ کا مریض بنا دیا۔ اس کا جسم ایسا مکروہ ہو گیا کہ لوگ اس کو دیکھ کر دور ہی سے اس سے کترانے لگے۔ سامری نے جھوٹ کی بنیاد پر قوم کا محبوب بننے کی کوشش کی۔ اس کی اسے یہ سزا ملی کہ اس کو قوم کا سب سے زیادہ مبغوض شخص بنا دیا گیا۔ اور آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے۔

بنی اسرائیل کے ذہن میں مشرکانہ مظاہر کی جو عظمت تھی اسی کو ختم کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے یہ کیا کہ لوگوں کے سامنے بچھڑے کو جلا ڈالا اور پھر اس کی خاک کو سمندر کی موجوں میں بہا دیا۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ
سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ
اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَ سَآءَ لَهُمْ يَوْمَ

۹۹۔ اسی طرح ہم تم کو ان کے احوال سناتے ہیں جو پہلے گزر چکے۔ اور ہم نے تم کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے۔ ۱۰۰۔ جو اس سے اعراض کرے گا، وہ قیامت کے دن ایک بھاری بوجھ اٹھائے گا۔ ۱۰۱۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ

الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ
نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾
يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ
طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع ۵ ۱۵ ۱۴

بوجھ قیامت کے دن ان کے لیے بہت برا ہوگا۔ ۱۰۲۔ جس دن صور میں پھونک ماری جائے گی اور مجرموں کو اس دن ہم اس حال میں جمع کریں گے کہ خوف سے ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ ۱۰۳۔ آپس میں چپکے چپکے کہتے ہوں گے کہ تم صرف دس دن رہے ہوگے۔ ۱۰۴۔ ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے۔ جب کہ ان کا سب سے زیادہ واقف کار کہے گا کہ تم صرف ایک دن ٹھہرے۔

پیغمبروں کا انکار کرنے والوں کا جو انجام ہوا وہ گویا دنیا میں اس فیصلہ الٰہی کا جزئی ظہور تھا جو قیامت میں کلی طور پر تمام نوع انسانی کے لیے پیش آنے والا ہے۔ قرآن اسی حقیقت کی ایک یاددہانی ہے۔

دنیا میں آدمی جب حق کو نظر انداز کرتا ہے تو بظاہر یہ بہت ہلکی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر آخرت میں آدمی کا یہ فعل اس کے لیے نہایت بھاری بوجھ بن جائے گا۔ جب خدائی بگل (صور) یہ اعلان کرے گا کہ امتحان کی مدت ختم ہو چکی۔ اس وقت اچانک لوگ اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں پائیں گے۔ جب آدمی پر یہ کھلے گا کہ جس دنیا کو وہ اپنی دنیا سمجھے ہوئے تھے، وہ دراصل خدا کی دنیا تھی تو اس پر اس قدر دہشت طاری ہوگی کہ اس کی ہیئت تک بدل جائے گی۔

موجودہ دنیا میں آدمی آخرت کو اس طرح نظر انداز کرتا ہے جیسے وہ کوئی بہت دور کی چیز ہو۔ مگر قیامت آنے کے بعد آدمی کو ایسا معلوم ہوگا جیسے دنیا کی زندگی تو بس گنتی کے چند روز کی تھی۔ اس کے بعد ساری لمبی زندگی وہی تھی جو آخرت کے عالم میں گزرنے والی تھی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ
نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا
تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ
يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ وَخَشَعَتِ
الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾

۱۰۵۔ اور لوگ تم سے پہاڑوں کی بابت پوچھتے ہیں۔ کہو کہ میرا رب ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔ ۱۰۶۔ پھر زمین کو صاف میدان بنا کر چھوڑ دے گا۔ ۱۰۷۔ تم اس میں نہ کوئی کجی دیکھو گے اور نہ کوئی بلندی۔ ۱۰۸۔ اس دن سب پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے۔ ذرا بھی کوئی کجی نہ ہوگی۔ تمام آوازیں رحمان کے آگے دب جائیں گی۔ تم ایک سرسراہٹ کے سوا کچھ نہ سنو گے۔

قیامت میں موجودہ زمین ایک وسیع اور ہموار فرش کی مانند بنا دی جائے گی۔ اس وقت یہاں نہ پہاڑوں کی

بلندیاں ہوں گی اور نہ دریاؤں کی گہرائیاں۔ تمام انسان دوبارہ پیدا ہو کر اس زمین پر جمع کیے جائیں گے۔ دنیا میں خدا کی آواز خدا کے داعی کی زبان سے بلند ہوتی ہے تو لوگ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر قیامت میں جب خدا براہِ راست لوگوں کو پکارے گا تو سارے انسان کسی ادنیٰ انحراف کے بغیر اس کی آواز کی طرف چل پڑیں گے۔ لوگوں پر اس قدر ہول طاری ہوگا کہ کسی کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلے گا۔ لوگوں کے چلنے کی سرسراہٹ کے سوا کوئی اور آواز نہ ہوگی جو اس وقت لوگوں کو سنائی دے۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

۱۰۹۔ اس دن سفارش نفع نہ دے گی، مگر ایسا شخص جس کو رحمان نے اجازت دی ہو اور اس کے لیے بولنا پسند کیا ہو۔ ۱۱۰۔ وہ سب کے اگلے اور پچھلے احوال کو جانتا ہے۔ اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ۱۱۱۔ اور تمام چہرے اس حی و قیوم کے سامنے جھکے ہوں گے۔ اور ایسا شخص ناکام رہے گا جو ظلم لے کر آیا ہوگا۔ ۱۱۲۔ اور جس نے نیک کام کیے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو اس کو نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی کمی کا۔

سفارش کا مستقل بالذات مؤثر ہونا سراسر باطل ہے۔ خدا نہ تو بندوں کے احوال سے بے خبر ہے کہ کوئی اس کو کسی کے بارے میں بتائے اور نہ وہ کمزور ہے کہ کوئی اس پر دباؤ ڈال سکے۔ البتہ بعض خاص احوال میں خود اللہ تعالیٰ ہی کی یہ منشا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی کی زبان سے جاری ہونے والی ایک قابلِ لحاظ درخواست کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

قیامت میں اصل اہمیت اس کی ہوگی کہ کون شخص خود کیا لے کر آیا ہے۔ جس شخص نے موجودہ دنیا میں اپنی زندگی ناحق پر کھڑی کی ہوگی اس کا آخرت میں ناکام ہونا یقینی ہے۔ وہاں صرف وہی لوگ کامیاب ہوں گے جنھوں نے حالت غیب میں اپنے رب کو پہچانا اور اپنی زندگی کو اس کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

۱۱۳۔ اور اسی طرح ہم نے عربی کا قرآن اتارا ہے اور اس میں ہم نے طرح طرح سے وعید بیان کی ہے تاکہ لوگ ڈریں یا وہ ان کے دل میں کچھ سوچ ڈال دے۔ ۱۱۴۔ پس برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی۔ اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اور کہو کہ اے میرے رب، میرا علم زیادہ کردے۔

خدا نے اپنی کتاب جس میں ہر قسم کے دلائل ہیں، انسانی زبان میں اتاری ہے۔ اور اس زبان کو ہمیشہ کے لیے ایک زندہ زبان بنا دیا ہے۔ اس طرح خدا کی ہدایت کو ایک ایسی چیز بنا دیا گیا ہے جس کو ہر زمانہ کا آدمی پڑھ اور سمجھ سکے۔

داعی جب حق کی دعوت لے کر اٹھے تو اس کے سامنے نتیجہ کے اعتبار سے دو چیزیں ہونی چاہئیں۔ پہلی مطلوب چیز تو یہ ہے کہ سننے والے کے اندر نفسیاتی انقلاب پیدا ہو اور وہ اللہ سے ڈرنے والا بن جائے۔ دوسری اس سے کمتر بات یہ ہے کہ داعی کی بات سننے والے کے ذہن میں سوال بن کر داخل ہو جائے۔

مکہ میں دعوتی مہم کے دوران روزانہ لوگوں کی طرف سے سوالات اٹھائے جاتے تھے اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش فطری طور پر یہ ہوتی تھی کہ قرآن کا وقفۂ نزول کم ہو، تاکہ آپ کو جلد جلد خدائی رہنمائی ملتی رہے۔ فرمایا کہ قرآن جس تدریج سے اتر رہا ہے وہ خدا کا طے شدہ منصوبہ ہے۔ وہ اسی طرح اترے گا اور بہر حال اپنی تکمیل تک پہنچے گا۔ تم مستقبل کے قرآن کو حال میں اتارنے کے خواہش مند نہ بنو۔ البتہ یہ دعا کرو کہ خدا تمھارے فہم قرآن میں اضافہ کرے۔ قرآن کی آیتوں میں جو وسیع مضامین چھپے ہوئے ہیں ان کا ادراک کرنے کی صلاحیت پیدا کردے۔ قرآن کی اگلی آیتوں کے بارے میں تعمیل کے بجائے تمھیں اس حکمت کو جاننے کا خواہش مند ہونا چاہیے کہ قرآن کے نزول میں ترتیب و تدریج کیوں رکھی گئی ہے۔

اس سے یہ نکلتا ہے کہ داعی کو کبھی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ دعوت کے حالات میں جہاد کے مسائل بیان کرنا۔ اصلاحِ افراد کے دور میں اجتماعی اقدام کے احکام سنانا۔ جن مواقع پر صبر مطلوب ہے ان مواقع پر قتال کی آیتوں کے حوالے دینا، یہ سب اسی کے ذیل میں داخل ہے۔ اور اس سے پرہیز کرنا داعی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ
نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ ع ٦ ١١ ١٥
اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط
اَبٰى ﴿١١٦﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ
لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿١١٧﴾

۱۱۵۔ اور ہم نے آدم کو اس سے پہلے حکم دیا تھا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ ۱۱۶۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے انکار کیا۔ ۱۱۷۔ پھر ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ بلاشبہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا نہ دے، پھر تم محروم ہو کر رہ جاؤ۔

خدا کے حکم پر قائم رہنے کے لیے مضبوط ارادہ انتہائی طور پر ضروری ہے۔ آدمی اگر غیر متعلق چیزوں سے متاثر ہو جایا کرے تو وہ یقیناً خدا کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ خدا کے راستہ پر قائم رہنے کے لیے صرف خدا کے حکم کو جاننا کافی نہیں، بلکہ یہ عزم بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ آدمی حکم خداوندی کے خلاف باتوں

سے مزاحمت کرے اوران کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے۔

خدا نے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو فرشتے فوراً سجدہ میں گر گئے۔ مگر شیطان نے سجدہ نہیں کیا۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتوں نے اس معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھا۔ اس کے برعکس، ابلیس نے اس کو انسان کا معاملہ سمجھا۔ جب معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھا جائے تو آدمی کے لیے ایک ہی ممکن صورت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ مگر جب معاملہ کو انسان کا معاملہ سمجھ لیا جائے تو آدمی یہ کرے گا کہ وہ سامنے کے انسان کو دیکھے گا۔ اگر وہ اس سے طاقت ور ہے تو وہ جھک جائے گا۔ اور اگر وہ اس سے طاقت ور نہیں ہے تو وہ جھکنے سے انکار کردے گا، خواہ حق کا واضح تقاضا یہی ہو کہ وہ اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿١١٨﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿١١٩﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿١٢٠﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿١٢١﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿١٢٢﴾

۱۱۸۔ یہاں تمھارے لیے یہ ہے کہ تم نہ بھوکے رہو گے اور نہ تم ننگے ہو گے۔ ۱۱۹۔ اور تم یہاں نہ پیاسے ہو گے، اور نہ تم کو دھوپ لگے گی۔ ۱۲۰۔ پھر شیطان نے ان کو بہکایا۔ اس نے کہا کہ کیا میں تم کو ہمیشگی کا درخت بتاؤں۔ اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی کمزوری نہ آئے۔ ۱۲۱۔ پس ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھالیا تو ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے۔ اور دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے۔ ۱۲۲۔ پھر اس کے رب نے اس کو نوازا۔ پس اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت دی۔

آدم اور ان کی بیوی کو جس جنت میں رکھا گیا تھا وہاں زندگی کی تمام ضرورتیں ان کو بفراغت حاصل تھیں۔ غذا، لباس، پانی، سایہ (مکان) یہ سب چیزیں وہاں خدا کی طرف سے بالکل مفت مہیا کی گئی تھیں۔ موجودہ دنیا میں یہ چیزیں آدمی کو پُرمشقت کسب کے ذریعہ ملتی ہیں، جنت میں یہ چیزیں ان کو کسی مشقت کے بغیر حاصل تھیں۔

ایک درخت کا پھل کھانا آدم کے لیے ممنوع تھا۔ شیطان نے اس درخت کے پھل میں ابدی فائدے بتائے۔ بالآخر آدم اس کی باتوں سے متأثر ہو گئے اور انھوں نے اس درخت کا پھل کھالیا۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگے ہو گئے ہیں۔ یہ گویا ایک علامت تھی کہ خدا کی وہ ضمانت ان سے اٹھالی گئی جس کی وجہ سے وہ اب تک بلا کسب روزی کے مالک تھے۔ اس کے بعد توبہ اور دعا کی وجہ سے آدم کی معافی ہو گئی۔ تاہم وہ

بلا کسب کی روزی والی دنیا سے نکال کر کسب کی روزی والی دنیا میں پہنچا دئے گئے۔ اس طرح زمین پر موجودہ نسل انسانی کا آغاز ہوا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

۱۲۳۔ خدا نے کہا کہ تم دونوں یہاں سے اترو۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔ پھر اگر تمھارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ محروم رہے گا۔ ۱۲۴۔ اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ ۱۲۵۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب، تو نے مجھ کو اندھا کیوں اٹھایا، میں تو آنکھوں والا تھا۔ ۱۲۶۔ ارشاد ہوگا کہ اسی طرح تمھارے پاس ہماری نشانیاں آئیں تو تم نے ان کا کچھ خیال نہ کیا تو اسی طرح آج تمھارا کچھ خیال نہ کیا جائے گا۔ ۱۲۷۔ اور اسی طرح ہم بدلہ دیں گے اس کو جو حد سے گزر جائے اور اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان نہ لائے۔ اور آخرت کا عذاب بڑا سخت ہے اور بہت باقی رہنے والا۔

خدا نے آدم اور ابلیس دونوں کو زمین پر بسایا۔ اس نے ابتدا ہی میں یہ تنبیہ کردی کہ قیامت تک تم دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے مقابلہ جاری رہے گا۔ ابلیس انسانی نسل کو بہکانے میں اپنی ساری کوشش لگا دے گا۔ اس کے جواب میں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنا سب سے بڑا دشمن ابلیس کو سمجھے اور اس کے وسوسوں سے آخری حد تک دور رہنے کی کوشش کرے۔

انسان کی مزید ہدایت کے لیے خدا نے یہ انتظام کیا کہ مسلسل اپنے پیغمبر بھیجے جو انسان کی قابل فہم زبان میں اس کو زندگی کی حقیقت سے باخبر کرتے رہے۔ اب انسان کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ پیغمبر کی ہدایت کو مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ جو شخص اس کو مانے گا اس کو دوبارہ جنت کی راحت سے بھری ہوئی زندگی دے دی جائے گی۔ اور جو شخص نہیں مانے گا اس کی زندگی سخت ترین زندگی ہوگی جس سے وہ کبھی نکل نہ سکے گا۔

ہدایت سے اعراض کرنے والے لوگ آخرت میں اس طرح اٹھیں گے کہ وہ دونوں آنکھوں سے اندھے ہوں

گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو آنکھیں اس لیے دی گئی تھیں کہ وہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر اسے پہچانیں مگر ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے سامنے خدا کی نشانیاں آئیں اور انھوں نے ان کو نہیں پہچانا۔ اس طرح انھوں نے ثابت کیا کہ وہ آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ پھر خدا فرمائے گا کہ ایسے اندھوں کو آنکھ دینے کی کیا ضرورت۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ
الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
ع ١٣ ١٢ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿١٢٨﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ
مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾ؕ
فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ
قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ
اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ
تَرْضٰى ﴿١٣٠﴾

۱۲۸۔ کیا لوگوں کو اس بات سے سمجھ نہ آئی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنے گروہ ہلاک کر دئے۔ یہ ان کی بستیوں میں چلتے ہیں۔ بے شک اس میں اہل عقل کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ ۱۲۹۔ اور اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی اور مہلت کی ایک مدت مقرر نہ ہوتی تو ضرور ان کا فیصلہ چکا دیا جاتا۔ ۱۳۰۔ پس جو یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔ اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو۔ اور دن کے کناروں پر بھی، تاکہ تم راضی ہو جاؤ۔

کسی قوم کو زمین پر عروج حاصل ہو اور پھر وہ ہلاک یا مغلوب کر دی جائے تو اس کی وجہ ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے بندگی کی حد سے تجاوز کیا۔ ہر تباہ شدہ قوم اپنے بعد والوں کے لیے درس عبرت ہوتی ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس طرح کے واقعات سے درس حاصل کرتے ہوں۔

یہاں تسبیح اور نماز کی جو تلقین کی گئی ہے وہ مکی دور کے انتہائی سخت حالات میں کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکار اور مخالفت کے سخت ترین حالات میں نماز اور خدا کی یاد مومن کی ڈھال ہے۔ اس سے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اور فتوحات کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس سے سب کچھ اتنی بڑی مقدار میں مل جاتا ہے کہ آدمی اس کو پا کر راضی ہو جائے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ
اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ
لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿١٣١﴾
وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا

۱۳۱۔ اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جن کو ہم نے ان کے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے دے رکھا ہے۔ اور تمھارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ ۱۳۲۔ اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس

نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں مانگتے۔ رزق تو تم کو ہم دیں گے اور بہتر انجام تو تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

ان آیات کا خطاب اگر چہ بظاہر پیغمبر سے ہے مگر اس کے مخاطب تمام اہلِ ایمان ہیں۔ دنیا میں ایک شخص ایمان اور دعوت کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کی زندگی مشقتوں کی زندگی بن جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ جو لوگ اس قسم کی ذمہ داریوں سے آزاد ہیں وہ آرام اور راحت میں اپنے صبح وشام گزار رہے ہیں۔ اس صورت حال کو نمایاں کر کے شیطان آدمی کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ وہ مومن اور داعی کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو اس ظاہری فرق کے آگے ایک اور فرق ہے اور وہ فرق زیادہ قابل لحاظ ہے۔ وہ فرق یہ کہ دنیا پرست لوگوں کو جو چیز ملی ہے وہ محض امتحان کے لیے ہے اور سراسر وقتی ہے۔ اس کے بعد ابدی زندگی میں ان کے لیے کچھ نہیں۔ دوسری طرف مومن اور داعی کو خدا سے وابستگی اختیار کرنے کے نتیجہ میں جو چیز ملی ہے وہ تمام دنیا کی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ ہے — اللہ کی یاد، آخرت کی فکر، عبادت اور تقویٰ کی زندگی، خدا کے بندوں کو آخرت کی پکڑ سے بچانے کے لیے فکر مند ہونا۔ یہ بھی رزق ہے۔ اور یہ زیادہ اعلیٰ رزق ہے کیوں کہ وہ آخرت میں ایسی بے حساب نعمتوں کی شکل میں آدمی کی طرف لوٹے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَ لَمْ
تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾
وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ
لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا
فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ
وَ نَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ
ع وَ مَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ع

۱۳۳۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ اپنے رب کے پاس سے ہمارے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے۔ کیا ان کو اگلی کتابوں کی دلیل نہیں پہنچی۔ ۱۳۴۔ اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے رب، تو نے ہمارے پاس رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری نشانیوں کی پیروی کرتے۔ ۱۳۵۔ کہو کہ ہر ایک منتظر ہے تو تم بھی انتظار کرو۔ آئندہ تم جان لو گے کہ کون سیدھی راہ والا ہے اور کون منزل تک پہنچا۔

پیغمبر آخر الزماں کی بعثت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیا کہ پچھلے نبیوں کی زبان سے آپ کی آمد کا پیشگی اعلان کیا۔ یہ پیشین گوئیاں آج بھی تمام تحریفات کے باوجود، پچھلی آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔

یہ پیغمبر آخر الزماں کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل تھی۔ مگر دلیل کی قوت کو سمجھنے کے لیے سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ وہ چیز ہے جو ہمیشہ سب سے کم پائی گئی ہے۔

۲۱۔ سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ① مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ② لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ④

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

☆۱۔ لوگوں کے لیے ان کا حساب نزدیک آپہنچا۔ اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کر رہے ہیں۔ ۲۔ ان کے رب کی طرف سے جو بھی نئی نصیحت ان کے پاس آتی ہے، وہ اس کو ہنسی کرتے ہوئے سنتے ہیں۔ ۳۔ ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور ظالموں نے آپس میں یہ سرگوشی کی کہ یہ شخص تو تمھارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ پھر تم کیوں آنکھوں دیکھے اس کے جادو میں پھنستے ہو۔ ۴۔ رسول نے کہا کہ میرا رب ہر بات کو جانتا ہے، خواہ وہ آسمان میں ہو یا زمین میں۔ اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

ہر آدمی جو دنیا میں ہے وہ زندگی سے زیادہ موت سے قریب ہے۔ اس اعتبار سے ہر آدمی اپنے روزِ حساب کے عین کنارے کھڑا ہوا ہے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ کسی بھی یاد دہانی پر توجہ نہیں دیتا، خواہ وہ پیغمبر کے ذریعہ کرائی جائے یا غیر پیغمبر کے ذریعہ۔ حق کے داعی کی بات کو وہ بس ''ایک انسان'' کی بات کہہ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب قرآن کے ذریعہ دعوت شروع کی تو قرآن کا خدائی کلام لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے لگا۔ یہ وہاں کے سرداروں کے لیے بڑی سخت بات تھی۔ کیوں کہ اس سے ان کی قیادت خطرہ میں پڑ رہی تھی۔ قرآن توحید کی دعوت دیتا تھا، اور مکہ کے سردار شرک کے اوپر اپنی سرداری قائم کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے لوگوں کے ذہن کو اس سے ہٹانے کے لیے یہ کیا کہ لوگوں سے کہا کہ اس کلام میں بظاہر جو تاثیر تم دیکھ رہے ہو وہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے۔ اس کا زور صداقت کا زور نہیں بلکہ جادو کا زور ہے۔ یہ جادو بیانی کا معاملہ ہے، نہ کہ آسمانی کلام کا معاملہ۔

اس قسم کی بات کہنے والے لوگ اگرچہ خدا کا نام لیتے ہیں مگر انھیں یقین نہیں کہ خدا انھیں دیکھ اور سن رہا ہے۔ اگر انھیں خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین ہوتا تو وہ ایسی غیر سنجیدہ بات ہرگز اپنی زبان سے نہ نکالتے۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۵ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

۵۔ بلکہ وہ کہتے ہیں، یہ پراگندہ خواب ہیں۔ بلکہ اس کو اس نے گھڑ لیا ہے۔ بلکہ وہ ایک شاعر ہے۔ اس کو چاہیے کہ ہمارے پاس اس طرح کی کوئی نشانی لائے، جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ پچھلے رسول بھیجے گئے تھے۔ ۶۔ ان سے پہلے کسی بستی کے لوگ بھی جن کو ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہیں لائے تو کیا یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

حق کا داعی ہمیشہ حق کی دعوت کو دلیل کے زور پر پیش کرتا ہے۔ مخالفین جب دیکھتے ہیں کہ وہ دلیل سے اس کا توڑ نہیں کر سکتے تو وہ طرح طرح کی باتیں نکال کر عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ شاعرانہ کلام ہے۔ یہ ادبی ساحری ہے۔ یہ ایک دیوانے کے تخیّلات ہیں۔ یہ اپنے جی سے بنائی ہوئی باتیں ہیں، وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوں کہ اہل مکہ کے سامنے کوئی حسی معجزہ نہیں دکھایا تھا۔ اس لیے آپ کی رسالت کو مشتبہ کرنے کے لیے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ اگر خدا کے بھیجے ہوئے ہیں تو پچھلے پیغمبروں کی طرح خدا کے پاس سے کوئی معجزہ لے کر کیوں نہیں آئے۔

مگر تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دلیل سے بات کو نہ مانیں وہ معجزہ کو دیکھ کر بھی اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس لیے لوگوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ دلیل کی زبان میں ان کی نصیحت جاری رکھی جائے، نہ کہ معجزہ دکھا کر ان پر اتمام حجت کر دی جائے۔ کیوں کہ معجزے کو نہ ماننے کے بعد دوسرا مرحلہ ہلاکت ہوتا ہے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷ وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝۸ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَ مَنْ نَّشَآءُ

۷۔ اور تم سے پہلے بھی جس کو ہم نے رسول بنا کر بھیجا، آدمیوں ہی میں سے بھیجا۔ ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے۔ پس تم اہل کتاب سے پوچھ لو، اگر تم نہیں جانتے۔ ۸۔ اور ہم نے ان رسولوں کو ایسے جسم نہیں دئے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں۔ اور وہ ہمیشہ رہنے والے نہ تھے۔ ۹۔ پھر ہم نے ان سے وعدہ پورا کیا۔ پس ان کو اور جس جس کو ہم نے چاہا،

وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٩﴾

بچالیا۔ اور ہم نے حد سے گزرنے والوں کو ہلاک کردیا۔

جو لوگ یہ کہہ کہ پیغمبر کا انکار کرتے تھے کہ یہ تو ہماری طرح کے ایک انسان ہیں، ان سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس اعتراض میں سنجیدہ ہو تو تمھارے لیے معاملہ کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ بہت سی گزری ہوئی ہستیاں جن کو تم پیغمبر تسلیم کرتے ہو، ان کے جاننے والے موجود ہیں۔ پھر ان جاننے والوں سے تحقیق کرلو کہ وہ انسان تھے یا غیر انسان۔ اگر وہ انسان تھے تو موجودہ پیغمبر کو تم صرف اس بنا پر کیسے رد کرسکتے ہو کہ وہ ایک ماں باپ کے ذریعہ عام انسان کی طرح پیدا ہوئے ہیں۔

گزشتہ پیغمبروں کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان کا اقرار یا انکار لوگوں کے لیے محض سادہ قسم کا اقرار یا انکار نہ تھا۔ اس نے دونوں گروہوں کے لیے واضح طور پر الگ الگ نتیجہ پیدا کیا۔ اقرار کرنے والوں نے نجات پائی اور انکار کرنے والے ہلاک کردیے گئے۔ اس لیے اس معاملہ میں تم کو حد درجہ سنجیدہ ہونا چاہیے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ
ع ۱ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠﴾ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ
كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا
اٰخَرِيْنَ ﴿١١﴾ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ
مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿١٢﴾ ۭ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا
اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُسْــَٔلُوْنَ ﴿١٣﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا
ظٰلِمِيْنَ ﴿١٤﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى
جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿١٥﴾

۱۰۔ ہم نے تمھاری طرف ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمھاری یاد دہانی ہے، پھر کیا تم سمجھتے نہیں۔ ۱۱۔ اور کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس ڈالا۔ اور ان کے بعد دوسری قوم کو اٹھایا۔ ۱۲۔ پس جب انھوں نے ہمارا عذاب آتے دیکھا تو وہ اس سے بھاگنے لگے۔ ۱۳۔ بھاگو مت۔ اور اپنے سامان عیش کی طرف اور اپنے مکانوں کی طرف واپس چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے۔ ۱۴۔ انھوں نے کہا، ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم لوگ ظالم تھے۔ ۱۵۔ پس وہ یہی پکارتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایسا کردیا جیسے کھیتی کٹ گئی ہو اور آگ بجھ گئی ہو۔

خدا کی کتاب عام معنوں میں محض ایک کتاب نہیں وہ ایک یاد دہانی ہے۔ وہ اس بات کی چیتاونی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کا آنا اتفاق سے نہیں ہے، وہ ایک خدائی منصوبہ ہے۔ اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ انسان کو آزمائش کے لیے وقتی آزادی دے دی جائے۔ اس کے بعد آدمی جیسا عمل کرے اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے۔ اس حقیقت کا جزئی ظہور ظالم قوموں کی ہلاکت کی صورت میں بار بار ہوتا رہا ہے۔ اور اس کا کلی ظہور قیامت

میں ہوگا۔ جب کہ تمام اگلے پچھلے انسان دوبارہ پیدا کرکے جمع کیے جائیں گے۔

جب خدا کی پکڑ ظاہر ہوتی ہے تو وہ تمام مادی ساز وسامان آدمی کو مصیبت معلوم ہونے لگتے ہیں جن کے بل پر اس سے پہلے وہ حق کی دعوت کو نظر انداز کردیتا تھا۔ مادی سامان جب تک ساتھ نہ چھوڑ دیں وہ غفلت سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اور جب یہ سامان اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اس وقت اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ مگر اس وقت آنکھ کا کھلنا اس کے کام نہیں آتا۔ کیوں کہ اس وقت تمام چیزیں اپنی طاقت کھو چکی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد صرف خدا کسی کے کام آتا ہے، نہ کہ جھوٹے معبود۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

۱۶۔ اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ ۱۷۔ اگر ہم کوئی کھیل بنانا چاہتے تو اس کو ہم اپنے پاس سے بنالیتے، اگر ہم کو یہ کرنا ہوتا۔ ۱۸۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر ماریں گے تو وہ اس کا سر توڑ دے گا تو وہ دفعۃً جاتا رہے گا اور تمھارے لیے ان باتوں سے بڑی خرابی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔

جو لوگ خدا کی دعوت کے بارے میں سنجیدہ نہ ہوں وہ گویا موجودہ دنیا کو ایک قسم کا خدائی کھلونا سمجھتے ہیں۔ جس کا وقتی تفریح کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہو۔ مگر موجودہ دنیا اپنی بے پناہ حکمت ومعنویت کے ساتھ اپنے خالق کا جو تعارف کراتی ہے اس کے لحاظ سے یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خالق کوئی ایسا خدا ہو جس نے اس دنیا کو محض کھیل کے طور پر بنایا ہو۔

موجودہ دنیا میں انسان جیسی انوکھی مخلوق ہے جس کی فطرت میں حق و باطل کی تمیز پائی جاتی ہے۔ دنیا میں ایسی مخلوق کا ہونا جو ایک طریقہ کو حق اور دوسرے طریقہ کو باطل سمجھے اور پھر حق و باطل کے نام پر بار بار مقابلہ پیش آنا ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کوئی ایسا وقت آنے والا ہے جب کہ آخری طور پر یہ بات کھل جائے کہ فی الواقع حق کیا تھا اور باطل کیا۔ اور پھر جس نے حق کا ساتھ دیا ہو اس کو کامیابی حاصل ہو اور جس نے حق کا ساتھ نہ دیا ہو وہ ناکام کردیا جائے۔ جس دنیا میں ایسا ''پتھر'' ہو جو ایک شخص کے ''سر'' کو توڑ دے وہاں کیا ایسا حق نہ ہوگا جو باطل کو باطل ثابت کرسکے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ۚ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾

۱۹۔ اور اسی کے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ کاہلی کرتے ہیں۔ ۲۰۔ وہ رات دن اس کو یاد کرتے ہیں، وہ کبھی نہیں تھکتے۔

زمین وآسمان کی ہر چیز مخلوق ہے۔ ہر چیز وہی کرتی ہے جس کا اسے اوپر سے حکم دیا گیا ہو۔ ساری کائنات میں صرف انسان ہے جو سرکشی کرتا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ یہ کہہ کر سرکشی کرتے ہیں کہ ہمارے اوپر کوئی مالک اور حاکم نہیں۔ ہم آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں۔

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ بھی سرکشی کرتے ہیں۔ البتہ ان کے پاس اپنی سرکشی کی توجیہ دوسری ہوتی ہے۔ وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا شفیع اور وسیلہ مان لیتے ہیں۔ وہ کسی کو خدا کا مقرب مان کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہم ان کے لیے عقیدت واحترام کا اظہار کرتے رہیں تو وہ خدا کے یہاں ہمارے لیے نجات کی سفارش کر دیں گے۔ کچھ لوگ فرشتوں کو اپنا شفیع اور وسلیہ مان لیتے ہیں اور کچھ لوگ کسی دوسری ہستی کو۔

مگر اس قسم کے تمام نظریے مضحکہ خیز حد تک باطل ہیں۔ اگر کسی کو وہ نگاہ حاصل ہو کہ وہ کائناتی سطح پر حقیقت کو دیکھ سکے تو وہ دیکھے گا کہ مفروضہ ہستیاں خود تو خدا کی ہیبت سے اس کے آگے جھکی ہوئی ہیں اور انسان ان کے نام پر دنیا میں سرکش بنا ہوا ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾

۲۱۔ کیا انھوں نے زمین میں سے معبود ٹھہرائے ہیں جو کسی کو زندہ کرتے ہوں۔ ۲۲۔ اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔ پس اللہ، عرش کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ ۲۳۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس پر وہ پوچھا نہ جائے گا اور ان سے پوچھ ہوگی۔

زمین بقیہ کائنات سے الگ نہیں ہے۔ وہ وسیع تر کائنات کے ساتھ مسلسل طور پر مربوط ہے۔ زمین پر زندگی اور سرسبزی اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ بقیہ کائنات اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگی کرے۔ زمین و آسمان کا یہ متوافق عمل ثابت کرتا ہے کہ زمین وآسمان کا انتظام ایک ہی ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ دو کے ہاتھ میں ہوتا تو یقیناً دونوں کے درمیان بار بار ٹکراؤ ہوتا اور زمین پر موجودہ زندگی کا قیام ممکن نہ ہوتا۔

کائنات اپنی بے پناہ عظمت اور معنویت کے ساتھ اپنے جس خالق کا تعارف کراتی ہے وہ یقینی طور پر ایسا خدا ہے جو ہر قسم کی کمیوں سے یکسر پاک ہے۔ یہ موجودہ کائنات کا کمتر اندازہ ہے کہ اس کا خالق ایک ایسی ہستی کو مانا جائے جس کے ساتھ کمیاں اور کمزوریاں لگی ہوئی ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ

۲۴۔ کیا انھوں نے خدا کے سوا اور معبود بنائے ہیں۔ ان سے کہو کہ تم اپنی دلیل لاؤ۔ یہی بات ان لوگوں کی ہے جو میرے ساتھ ہیں اور یہی بات ان لوگوں کی ہے جو مجھ سے پہلے ہوئے۔ بلکہ ان میں

مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

سے اکثر حق کو نہیں جانتے۔ پس وہ اعراض کر رہے ہیں۔ ۲۵۔ اور ہم نے تم سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم میری عبادت کرو۔

ایک خدا کے سوا دوسرے معبود فرض کرنا کسی واقعی دلیل کی بنیاد پر نہیں ہے۔ بلکہ سراسر لاعلمی کی بنیاد پر ہے۔ جو لوگ خدا کے لیے شرکاء مانتے ہیں ان کے پاس اپنے عقیدۂ شرک کے حق میں کوئی دلیل نہیں، نہ علم انسانی میں اور نہ وحی آسمانی میں۔ وہ توحید کے دلائل سن کر ان سے اعراض کرتے ہیں تو اس کی وجہ ان کا استدلالی یقین نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ صرف ان کا تعصب ہے۔ اپنے متعصّبانہ مزاج کی وجہ سے وہ اپنے عقیدہ میں اتنا پختہ ہو گئے ہیں کہ استدلال کے اعتبار سے بے حقیقت ہونے کے باوجود وہ اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۲ ۱۹ ۲

۲۶۔ اور وہ کہتے ہیں کہ رحمن نے اولاد بنائی ہے، وہ اس سے پاک ہے، بلکہ (فرشتے) تو معزز بندے ہیں۔ ۲۷۔ وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کرتے۔ اور وہ اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ۲۸۔ اللہ ان کے اگلے اور پچھلے احوال کو جانتا ہے۔ اور وہ سفارش نہیں کرسکتے، مگر اس کے لیے جس کو اللہ پسند کرے۔ اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ۲۹۔ اور ان میں سے جو شخص کہے گا کہ اس کے سوا میں معبود ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

ایک چیز کو حق اور دوسری چیز کو باطل سمجھنا آدمی سے اس کی آزادی چھین لیتا ہے۔ اس لیے انسان ہمیشہ اس کوشش میں رہا ہے کہ وہ ایسا نظریہ دریافت کرے جس سے حق وباطل کا فرق مٹ جائے۔ جس سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو کہ وہ دنیا میں خواہ جس طرح بھی رہے اس سے یہ پوچھ نہیں ہونے والی ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ویسا کیوں نہیں کیا۔ غیر مذہبی لوگوں نے یہ تسکین انکارِ آخرت کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور مذہبی لوگوں نے مشرکانہ عقیدہ کے ذریعہ۔

فرشتے ایک غیبی مخلوق ہیں۔ پیغمبروں کے ذریعہ انسان کو فرشتوں کی موجودگی کی خبر دی گئی تاکہ وہ خدا کی قدرت کا احساس کرے۔ مگر اس نے فرشتوں کو خدا کی بیٹی بنا کر عجیب وغریب طور پر یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ وہ فرشتوں

کے نام پر کچھ عبادتی رسوم ادا کرتا رہے، اور وہ آخرت میں اپنے باپ سے سفارش کر کے اس کی بخشش کرادیں گے۔

اس قسم کے تمام عقیدے خدا کی خدائی کی نفی ہیں۔ خدا اسی لیے خدا ہے کہ وہ ایسی تمام کمیوں سے پاک ہے۔ اگر وہ ان کمیوں میں مبتلا ہوتا تو وہ خدا نہ ہوتا۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝30

۳۰۔ کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے، پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔ کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے۔

رتق کے معنی کسی چیز کا منھ بند (منضم الاجزاء) ہونا ہے اور فتق کا مطلب اس کا کھل جانا ہے۔ غالباً اس سے زمین وآسمان کی وہ ابتدائی حالت مراد ہے جس کو موجودہ زمانہ میں بِگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق زمین وآسمان کا تمام مادہ ابتداءً ایک بہت بڑے گولے (سپر ایٹم) کی صورت میں تھا۔ معلوم طبیعیاتی قوانین کے مطابق اس وقت اس کے تمام اجزاء اپنی اندرونی مرکز کی طرف کھنچ رہے تھے اور انتہائی شدت کے ساتھ باہم جڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس گولے کے اندر ایک دھماکہ ہوا اور اس کے اجزاء اچانک بیرونی سمت میں پھیلنا شروع ہوئے۔ اس طرح بالآخر وہ وسیع کائنات بنی جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

ابتدائی مادی گولے (سپر ایٹم) میں یہ غیر معمولی واقعہ بیرونی مداخلت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اس طرح آغازِ کائنات کی یہ تاریخ واضح طور پر ایک ایسی ہستی کو ثابت کرتی ہے جو کائنات کے باہر اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور جو اپنی ذاتی قوت سے کائنات کے اوپر اثر انداز ہوتی ہے۔

ہماری دنیا میں ہر جاندار چیز سب سے زیادہ جس چیز سے مرکب ہوتی ہے وہ پانی ہے۔ پانی نہ ہو تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ پانی ہماری زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔ وسیع کائنات میں استثنائی طور پر صرف ایک مقام پر پانی کا پایا جانا واضح طور پر "خصوصی تخلیق" کا پتہ دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایسی کھلی کھلی نشانیوں کے بعد بھی آدمی خدا کو نہیں پاتا۔ اس کے باوجود وہ بدستور محروم پڑا رہتا ہے۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝31 وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ښ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا

۳۱۔ اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے کہ وہ ان کو لے کر جھک نہ جائے اور اس میں ہم نے کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ راہ پائیں۔ ۳۲۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا۔ اور وہ اس کی

مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾

نشانیوں سے اعراض کیے ہوئے ہیں۔ ۳۳۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند بنائے۔ سب ایک ایک مدار میں تیر رہے ہیں۔

یہاں زمین کی چند نمایاں نشانیوں کا ذکر ہے جو انسان کو خدا کی یاد دلاتی ہیں تا کہ وہ اس کا شکر گزار بندہ بنے۔ ان میں سے ایک پہاڑوں کے سلسلے ہیں جو سمندروں کے نیچے کے کثیف مادہ کو متوازن رکھنے کے لیے سطح زمین پر جگہ جگہ ابھر آئے ہیں۔ اس سے مراد غالباً وہی چیز ہے جس کو جدید سائنس میں ارضی توازن (isostasy) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح زمین کا اس قابل ہونا بھی ایک نشانی ہے کہ انسان اس پر اپنے لیے راستے بنا سکتا ہے، کہیں ہموار میدان کی صورت میں، کہیں پہاڑی دروں کی صورت میں اور کہیں دریائی شگاف کی صورت میں۔

آسمان کی ''چھت''، جو ہماری بالائی فضا ہے، اس کی ترکیب اس طرح سے ہے کہ وہ ہم کو سورج کے نقصان دہ شعاعوں سے بچاتی ہے۔ وہ شہاب ثاقب کی مسلسل بارش کو ہم تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہے۔ اسی طرح سورج اور چاند کا ٹکرائے بغیر ایک خاص دائرہ میں گھومنا اور اس کی وجہ سے زمین پر دن اور رات کا باقاعدگی کے ساتھ پیدا ہونا۔

اس قسم کی بے شمار نشانیاں ہماری دنیا میں ہیں۔ آدمی ان کو گہرائی کے ساتھ دیکھے تو وہ خدا کی قدرتوں اور نعمتوں کے احساس میں ڈوب جائے۔ مگر آدمی ان کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ کھلے کھلے واقعات کو دیکھ کر بھی اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔

وَ مَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ الۡخُلۡدَ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ ﴿۳۴﴾ کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ وَ نَبۡلُوۡکُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَیۡرِ فِتۡنَةً ؕ وَ اِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۴۔ اور ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی تو کیا اگر تم کو موت آجائے تو وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ۳۵۔ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور ہم تم کو بری حالت اور اچھی حالت سے آزماتے ہیں پرکھنے کے لیے اور تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔

مکہ میں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے وہ وسائل کے اعتبار سے آپ سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ ان کو اس وقت کے ماحول میں عزت اور برتری حاصل تھی۔ اس فرق کا مطلب ان کے نزدیک یہ تھا کہ وہ حق پر ہیں اور محمدؐ ناحق پر۔ مگر دنیوی چیزوں کی زیادتی اور کمی حق اور ناحق کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ صرف امتحان کے لیے ہوتی ہے۔ یہ خدا کی طرف سے بطور آزمائش ہے۔ دنیوی سامان پا کر اگر کوئی شخص اپنے کو بڑا سمجھنے لگے تو گویا وہ اپنے کو ان چیزوں کا نااہل ثابت کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ

موت کے بعد کی زندگی میں اس کو ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جائے۔

مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناکام کرنے کے لیے ہر قسم کی مخالفانہ کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ حتی کہ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کا خاتمہ کر دیں تاکہ یہ مشن اپنی جڑ سے محروم ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ فرمایا کہ پیغمبر کے خلاف اس قسم کی سازشیں کرنے والے لوگ اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ جس قبر میں وہ دوسرے کو داخل کرنا چاہتے ہیں اسی قبر میں بالآخر انھیں خود بھی داخل ہونا ہے۔ پھر موت کے بعد جب ان کا سامنا مالک حقیقی سے ہوگا تو وہاں وہ کیا کریں گے۔

وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور منکر لوگ جب تم کو دیکھتے ہیں تو وہ سب تم کو مذاق بنا لیتے ہیں۔ کیا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کیا کرتا ہے۔ اور خود یہ لوگ رحمان کے ذکر کا انکار کرتے ہیں۔

قریش کے معبود اکثر ان کی قوم کے اکابر تھے۔ ایک طرف اپنے ان اکابر کی خیالی عظمت ان کے ذہنوں میں بسی ہوئی تھی۔ دوسری طرف پیغمبر تھا جس کی تصویر اس وقت ایک عام انسان سے زیادہ نہ تھی۔ اس تقابل میں پیغمبر انھیں بالکل معمولی نظر آتا۔ وہ حقارت کے ساتھ کہتے کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو ہمارے اکابر پر تنقید کرتا ہے اور اکابر کے جس دین پر ہم قائم ہیں اس کو رد کر کے دوسرا دین پیش کر رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو صرف ایک خدا کی طرف بلاتے تھے۔ مگر انھیں خدا سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ان کی تمام دل چسپیاں اپنے اکابر سے وابستہ تھیں۔ انھوں نے اپنے ان اکابر کو معبود کا درجہ دے رکھا تھا۔ آپ کی دعوت سے چوں کہ ان اکابر پر زد پڑتی تھی۔ اس لیے وہ آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔ وہ بھول گئے کہ معبودوں کو رد کر کے آپ خدا کو پیش کر رہے ہیں، نہ کہ خود اپنی ذات کو۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیْكُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾ لَوْ یَعْلَمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا حِیْنَ لَا یَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِیْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا

۳۷۔ انسان عجلت کے خمیر سے پیدا ہوا ہے۔ میں تم کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، پس تم مجھ سے جلدی نہ کرو۔ ۳۸۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب آئے گا، اگر تم سچے ہو۔ ۳۹۔ کاش، ان منکروں کو اس وقت کی خبر ہوتی جب کہ وہ آگ کو نہ اپنے سامنے سے روک سکیں گے اور نہ اپنے پیچھے سے۔ اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔ ۴۰۔ بلکہ وہ اچانک

يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدِ
اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ
بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٤١﴾ ع

ان پر آجائے گی، پس وہ ان کو بدحواس کردے گی۔ پھر وہ نہ اس کو دفع کرسکیں گے اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ ۴۱۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا۔ پھر جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا تھا ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

عرب کے لوگ آخرت کے منکر نہ تھے۔ وہ آخرت کی اس نوعیت کے منکر تھے جس کی خبر انھیں ان کی قوم کا ایک شخص "محمد بن عبد اللہ" دے رہا تھا۔ انھیں فخر تھا کہ وہ ایک ایسے دین پر ہیں جو ان کی کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس یقین کی تردید کی تو وہ بگڑ گئے۔ وہ اپنی بےخوف نفسیات کی بنا پر یہ کہنے لگے کہ وہ عذاب ہمیں دکھاؤ جس کی تم ہم کو دھمکی دے رہے ہو۔

فرمایا کہ ان کی یہ جلد بازی صرف اس لیے ہے کہ ابھی امتحان کے دور میں ہونے کی وجہ سے وہ عذاب سے دور کھڑے ہوئے ہیں۔ جس دن یہ مہلت ختم ہوگی اور خدا کا عذاب انھیں گھیر لے گا، اس وقت ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ رسول کی دعوت کے بارے میں سنجیدہ نہ ہو کر انھوں نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ
الرَّحْمٰنِ ۭ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ
مُّعْرِضُوْنَ ﴿٤٢﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ
دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ
مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿٤٣﴾

۴۲۔ کہو کہ کون ہے جو رات اور دن میں رحمان سے تمھاری حفاظت کرتا ہے۔ بلکہ وہ لوگ اپنے رب کی یاد دہانی سے اعراض کر رہے ہیں۔ ۴۳۔ کیا ان کے لیے ہمارے سوا کچھ معبود ہیں جو ان کو بچالیتے ہیں۔ وہ خود اپنی حفاظت کی قدرت نہیں رکھتے۔ اور نہ ہمارے مقابلہ میں کوئی ان کا ساتھ دے سکتا ہے۔

خدا کی پکڑ کا مسئلہ کسی دور دراز مستقبل کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ اسی دن رات کے اندر چھپا ہوا ہے جس میں آدمی اپنے آپ کو مامون ومحفوظ سمجھتا ہے۔ مثلاً سورج اور زمین کا فاصلہ اگر نصف کے بقدر گھٹ جائے تو ہمارے دن اتنے گرم ہوجائیں کہ وہ ہم کو آگ کے شعلہ کی طرح جلادیں۔ اس کے برعکس، اگر زمین سے سورج کا فاصلہ دگنا بڑھ جائے تو ہماری راتیں اتنی ٹھنڈی ہوجائیں کہ ہم برف کی طرح جم کر رہ جائیں۔

زمین وآسمان کا یہ حد درجہ موافق نظام جس نے قائم کر رکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ انسان اپنی تمام عقیدتیں اور وفاداریاں اس سے وابستہ کرے، نہ کہ وہ ان جھوٹے معبودوں کی پرستش کرنے لگے جو اس کو کچھ نہیں دے سکتے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۗ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا کا سامان دیا۔ یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر لمبی مدت گزر گئی۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے گھٹاتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر کیا یہی لوگ غالب رہنے والے ہیں۔

مکہ کے لوگ اس زمانہ میں عرب کے قائد سمجھے جاتے تھے۔ یہ قیادت ان کے لیے خدا کی ایک نعمت تھی۔ مگر اس سے انھوں نے کبر کی غذا لی۔ چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حق کا اعلان ہوا تو انھوں نے اپنی متکبرانہ نفسیات کی بنا پر اس کا انکار کر دیا۔

یہ مکہ میں اسلام کا حال تھا۔ مگر باہر کی عوام جو اس قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا نہ تھی ان کے اندر اسلام کی صداقت پھیلتی جا رہی تھی۔ مکہ میں اسلام کو رد کر دیا گیا تھا مگر باہر کے قبائل میں اسلام کو اختیار کیا جا رہا تھا۔ مدینہ کے باشندوں کے بڑے پیمانے پر قبولِ اسلام نے یہ بات آخری طور پر واضح کر دی کہ مکہ کے لوگوں کی قیادت کا دائرہ سمٹتا جا رہا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی تنبیہ تھی۔ مگر جو لوگ بڑائی کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ کسی بھی تنبیہ سے سبق لینے والے نہیں بنتے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

۴۵۔ کہو کہ میں بس وحی کے ذریعہ سے تم کو ڈراتا ہوں۔ اور بہرے پکار کو نہیں سنتے جب کہ انھیں ڈرایا جائے۔ ۴۶۔ اور اگر تیرے رب کے عذاب کا جھونکا انھیں لگ جائے تو وہ کہنے لگیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی، بے شک ہم ظالم تھے۔

''وحی کے ذریعے ڈرانا'' گویا دلیل کے ذریعہ لوگوں کو متنبہ کرنا ہے۔ حق کا داعی ہمیشہ دلیل کی زبان میں اپنی بات کو پیش کرتا ہے۔ اور دلیل ہی کی زبان میں لوگوں کو اسے پہچاننا پڑتا ہے۔ جو لوگ دلیل کے سامنے اندھے بہرے بنے رہیں، ان کی آنکھ صرف اس وقت کھلتی ہے جب کہ خدا کی طاقت کھلے طور پر ظاہر ہو جائے۔ اس وقت ہر سرکش اور متکبر فوراً مان لے گا۔ مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۗ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ

۴۷۔ اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو رکھیں گے۔ پس کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ اور اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو ہم

مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ؀47

اس کو حاضر کردیں گے۔ اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔

’’ترازو‘‘ موجودہ دنیا میں کسی چیز کا وزن معلوم کرنے کی علامت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی معلوم اصطلاح کو آخرت کا معاملہ سمجھانے کے لیے استعمال کیا۔ دنیا کا ترازو مادی چیزوں کو تولتا ہے۔ آخرت میں خدا کا ترازو معنوی حقیقتوں کو تول کر اس کا وزن بتائے گا۔

دنیا میں آدمی کسی چیز کو اسی وقت پاتا ہے جب کہ وہ اس کی قیمت ادا کرے۔ کم قیمت دینے والا کم چیز پاتا ہے۔ اور زیادہ قیمت دینے والا زیادہ چیز۔ یہی معاملہ آخرت میں بھی پیش آئے گا۔ وہاں کی اعلیٰ چیزیں بھی آدمی کو قیمت دے کر ملیں گی۔ قیمت ادا کیے بغیر جس طرح دنیا کی چیز کسی کو نہیں ملتی۔ اسی طرح آخرت کی چیزیں بھی اسی کو ملیں گی جو ان کی ضروری قیمت ادا کردے — قرآن اسی قیمت کی نشان دہی کرنے والی کتاب ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاۗءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ؀48 الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ؀49 وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ؀50 ع ۴

۴۸۔ اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور روشنی اور نصیحت عطا کی خدا ترسوں کے لیے۔ ۴۹۔ جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت کا خوف رکھنے والے ہیں۔ ۵۰۔ اور یہ ایک بابرکت یاد دہانی ہے جو ہم نے اتاری ہے، تو کیا تم اس کے منکر ہو۔

فرقان اور ضیاء اور ذکر جو حضرت موسیٰ کو دیا گیا، یہی خدا کی طرف سے تمام پیغمبروں کو ملا تھا۔ فرقان سے مراد وہ نظریاتی معیار ہے جس کے ذریعہ آدمی حق اور باطل کے درمیان فرق کرسکتا ہے۔ ضیا سے مراد خدا کی رہنمائی ہے جو آدمی کو بے راہی کے اندھیرے سے نکال کر صراطِ مستقیم کے اجالے میں لاتی ہے۔ ذکر سے مراد یاد دہانی ہے۔ یعنی چیزوں کے اندر چھپے ہوئے نصیحت کے پہلو کو کھولنا۔ تاکہ چیزیں لوگوں کے لیے محض چیزیں نہ رہیں بلکہ وہ نصیحت اور معرفت کا خزانہ بن جائیں۔

اس طرح خدا نے انسان کی ہدایت کا انتظام کیا۔ مگر خدائی ہدایت نامہ کو واقعی طور پر اپنے لیے ہدایت بنانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی انجام کا اندیشہ رکھتا ہو۔ اس کی اندیشہ ناک نفسیات اس کو اس حد تک سنجیدہ بنا دے کہ وہ ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں حق وصداقت کو زیادہ اہمیت دینے لگے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ؀51 اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا

۵۱۔ اور ہم نے اس سے پہلے ابراہیم کو اس کی ہدایت عطا کی۔ اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔ ۵۲۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا

هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿٥٢﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿٥٣﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٤﴾

کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو۔ ۵۳۔انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔ ۵۴۔ابرہیم نے کہا کہ بے شک تم اور تمھارے باپ دادا ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا رہے۔

خدا کے یہاں فیض بقدرِ استعداد کا اصول ہے۔ حضرت ابراہیم نے مختلف امتحانات سے گزر کر جس استعداد کا ثبوت دیا تھا اس کو خدا نے جانا اور اس کے مطابق ان کو ہدایت اور معرفت عطا فرمائی۔ یہی معاملہ خدا کا اپنے ہر بندے کے ساتھ ہے۔

حضرت ابراہیم عراق کے قدیم شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ اس وقت یہاں کی زندگی میں پوری طرح شرک چھایا ہوا تھا۔ مشرکانہ ماحول میں پرورش پانے کہ باوجود وہ اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ انھوں نے چیزوں کو خود اپنی عقل سے جانچا اور ماحول کے علی الرغم توحید کی صداقت کو پالیا۔ وہ ایسی دنیا میں تھے جہاں ہر قسم کی عزت اور ترقی شرک سے وابستہ ہو گئی تھی۔ مگر انھوں نے کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ تمام مصلحتوں سے بے نیاز ہو کر قوم کی روش پر تنقید کی اور اس کے سامنے حق کا اعلان کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے — یہی وہ صفات ہیں جو کسی شخص کو اس قابل بناتی ہیں کہ اس کو خدا کی ہدایت حاصل ہو۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿٥٥﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٨﴾

۵۵۔انھوں نے کہا، کیا تم ہمارے پاس سچی بات لائے ہو یا تم مذاق کر رہے ہو۔ ۵۶۔ابراہیم نے کہا، بلکہ تمھارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان کو پیدا کیا۔ اور میں اس بات کی گواہی دینے والوں میں ہوں۔ ۵۷۔اور خدا کی قسم میں تمھارے بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا جب کہ تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے۔ ۵۸۔پس اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا سوا ان کے ایک بڑے کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

حضرت ابراہیم کے زمانے میں مشرکانہ تخیلات لوگوں کے ذہنوں پر اتنا زیادہ چھائے ہوئے تھے کہ ابتداءً وہ حضرت ابراہیم کی تنقید کو غیر سنجیدہ بات سمجھے۔ انھوں نے کہا کہ تم کوئی سوچی سمجھی بات کہہ رہے ہو یا محض تفریح کے طور پر کچھ الفاظ اپنی زبان سے نکال رہے ہو۔

حضرت ابراہیم نے کہا کہ یہ تمھاری مزید ناسمجھی ہے کہ تم اس اہم ترین بات کو غیر سنجیدہ بات سمجھ رہے ہو۔ حالاں کہ تمام زمین وآسمان اس کے حق میں گواہی دے رہے ہیں۔ اگلے دن انھوں نے مزید یہ کیا کہ غیر معمولی جرأت سے کام لے کر ان کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ اس طرح گویا حضرت ابراہیم نے عملاً دکھا دیا کہ یہ بت فی الواقع بھی اتنے ہی بے حقیقت ہیں جتنا میں نے لفظی طور پر تمھیں بتایا تھا۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٩﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ
يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٠﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى
اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالُوْٓا ءَ
اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾
قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ
اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾

۵۹۔ انھوں نے کہا کہ کس نے ہمارے بتوں کے ساتھ ایسا کیا ہے۔ بے شک وہ بڑا ظالم ہے۔ ۶۰۔ لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا تھا جس کو ابرہیم کہا جاتا ہے۔ ۶۱۔ انھوں نے کہا کہ اس کو سب آدمیوں کے سامنے حاضر کرو، تاکہ وہ دیکھیں۔ ۶۲۔ انھوں نے کہا کہ اے ابراہیم، کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے ایسا کیا ہے۔ ۶۳۔ ابراہیم نے کہا، بلکہ ان کے اس بڑے نے ایسا کیا ہے تو ان سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔

اگلے دن جب لوگ بت خانہ میں گئے اور دیکھا کہ وہاں کے بت ٹوٹے پڑے ہیں تو ان کو سخت دھکا لگا۔ بالآخر ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ اس نوجوان کا قصہ معلوم ہوتا ہے جو ہمارے آبائی دین سے منحرف ہے اور اس کے خلاف بولتا رہتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے بتوں کو توڑتے ہوئے بالقصد سب سے بڑے بت کو چھوڑ دیا تھا۔ اب جب وہ بلائے گئے اور ان سے باز پرس ہوئی تو انھوں نے کہا کہ یہ بڑا بت صحیح وسالم موجود ہے۔ اس سے پوچھ لو۔ اگر وہ واقعی معبود ہے تو بول کر تمھیں بتائے گا کہ یہ قصہ ان بتوں کے ساتھ کیسے پیش آیا۔

حضرت ابراہیم نے براہِ راست طور پر کوئی بات نہیں کہی۔ مگر بالواسطہ طور پر انھوں نے وہ بات کہہ دی جو اس موقع پر براہِ راست کلام سے بھی زیادہ مؤثر تھی۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ
لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ

۶۴۔ پھر انھوں نے اپنے جی میں سوچا، پھر وہ کہنے لگے کہ حقیقت میں تم ہی ناحق پر ہو۔ ۶۵۔ پھر اپنے سروں کو جھکا لیا۔ اے ابراہیم، تم جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں۔ ۶۶۔ ابرہیم نے کہا، کیا تم خدا کے

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

سو ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کوئی فائدہ پہنچا سکیں اور نہ کوئی نقصان۔ ۶۷۔ افسوس ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

حضرت ابراہیم کے ان جوابات پر وہ لوگ آپ کو گستاخ ٹھہرا کر بگڑ سکتے تھے۔ جیسا کہ ان مواقع پر عام طور ہوتا ہے۔ تاہم بت پرستی کے باوجود ان میں ابھی زندگی موجود تھی۔ چنانچہ انھوں نے آپ کے جواب کے استدلالی وزن کو محسوس کیا۔ اور شرمندہ ہو کر اپنے برسرِ ناحق ہونے کا اعتراف کیا۔ بعد کو اگر عصبیت کے جذبات نہ ابھر آتے تو یہ تجربہ انھیں ایمان تک پہنچانے کے لیے کافی ہو جاتا۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾

۶۸۔ انھوں نے کہا کہ اس کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو، اگر تم کو کچھ کرنا ہے۔ ۶۹۔ ہم نے کہا کہ اے آگ، تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔ ۷۰۔ اور انھوں نے اس کے ساتھ برائی کرنا چاہا تو ہم نے انھیں لوگوں کو ناکام بنا دیا۔

جو لوگ اختیارات کے مالک ہوتے ہیں وہ دلیل کے میدان میں ہار جانے کے بعد ہمیشہ ظلم کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی حضرت ابراہیم کے ساتھ ہوا۔ بت شکنی کے واقعہ کے بعد جب قوم کے لیڈروں نے محسوس کیا کہ وہ ابراہیم کے مقابلہ میں بے دلیل ہو چکے ہیں تو اب انھوں نے آپ کے اوپر سختیاں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ طاقت کے گھمنڈ میں آ کر ایک روز آپ کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا۔

مگر خدا کا پیغمبر دنیا میں خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کا معاملہ خدا کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس لیے خدا استثنائی طور پر پیغمبر کی غیر معمولی مدد کرتا ہے۔ چنانچہ خدا نے حکم دیا اور آگ آپ کے لیے ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نوعیت کی نصرت غیر پیغمبروں کے لیے بھی نازل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ کے ساتھ اس حد تک وابستہ کریں جس طرح پیغمبر اس کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرتا ہے۔

وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾

۷۱۔ اور ہم نے اس کو اور لوط کو اس زمین کی طرف نجات دے دی جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔ ۷۲۔ اور ہم نے اس کو اسحاق دیا اور مزید برآں یعقوب۔ اور ہم نے ان

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ۙۚ

سب کو نیک بنایا۔۷۳۔اور ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔اور ہم نے ان کو نیک عملی اور نماز کی اقامت اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم بھیجا اور وہ ہماری عبادت کرنے والے تھے۔

حضرت ابراہیم عراق میں پیدا ہوئے۔جب ان کی قوم اور وہاں کا بادشاہ نمرود آپ کا دشمن ہو گیا تو اتمام حجت کے بعد آپ نے اپنا وطن چھوڑ دیا۔اور اللہ کے حکم سے شام و فلسطین کے سرسبز علاقہ کی طرف چلے گئے۔آپ کے ملک والوں نے اگرچہ آپ کا ساتھ نہیں دیا تھا مگر خدا نے آپ کو بیٹے اور پوتے دئے جو آپ کے راستہ پر چلنے والے بنے۔حتی کہ ان کی صالحیت خدا نے اس طرح قبول فرمائی کہ آپ کی نسل میں نبوت کا سلسلہ جاری کر دیا۔

وَ لُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىِٕثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ۙ وَ اَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ؒ

ع ۵ ۲۵

۷۴۔اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا۔اور اس کو اس بستی سے نجات دی جو گندے کام کرتی تھی۔بلاشبہ وہ بہت برے، فاسق لوگ تھے۔۷۵۔اور ہم نے اس کو اپنی رحمت میں داخل کیا۔بے شک وہ نیکوں میں سے تھا۔

حکمت سے مراد معرفت اور علم سے مراد وحی ہے۔حضرت لوط کو یہ چیزیں عطا ہوئیں۔دوسرے تمام پیغمبروں کو بھی یہ چیزیں دی جاتی رہی ہیں۔اب ختم نبوت کے بعد وحی کا قائم مقام قرآن ہے۔تاہم حکمت (معرفت) سے غیر پیغمبروں کو بھی بقدر استعداد حصہ ملتا ہے۔

جن لوگوں پر اللہ کی نظر ہوتی ہے وہ ان کا ولی و کارساز بن جاتا ہے۔وہ ان کو برے لوگوں کے ماحول سے نکال کر اچھے لوگوں کے ماحول میں لے جاتا ہے۔وہ زندگی کے ہر موڑ پر ان کا مددگار بن جاتا ہے۔وہ ان کو وہ حکمت عطا فرماتا ہے جس کے بعد ان کی پوری زندگی رحمتِ خداوندی کے آبشار میں نہا اٹھتی ہے۔

وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ۚ وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾

۷۶۔اور نوح کو جب کہ اس سے پہلے اس نے پکارا تو ہم نے اس کی دعا قبول کی۔پس ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بہت بڑے غم سے نجات دی۔۷۷۔اور ان لوگوں کے مقابلہ میں اس کی مدد کی جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔بے شک وہ بہت برے لوگ تھے۔پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

حضرت نوح نے انتہائی لمبی مدت تک اپنی قوم کو دعوت دی۔ مگر چند لوگوں کے سوا کسی نے اصلاح قبول نہ کی۔ آخر کار حضرت نوح نے اپنی قوم کی ہلاکت کی دعا کی۔ اس کے بعد ایسا سخت سیلاب آیا کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی لوگوں کو بچانے سے عاجز ہوگئیں۔

یہ واقعہ اگر چہ پیغمبر کی سطح پر پیش آیا۔ تاہم عام انسانوں کے لیے بھی اس میں بہت تسکین کا سامان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بگاڑ پیدا کرنے والے بالکل آزاد نہیں ہیں۔ اور سچائی کے لیے اٹھنے والا شخص بالکل اکیلا نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص سچائی سے اس حد تک اپنے آپ کو وابستہ کرے کہ وہ دنیا میں سچائی کا نمائندہ بن جائے تو اس کے بعد وہ دنیا میں اکیلا نہیں رہتا۔ بلکہ خدا اس کے ساتھ ہو جاتا ہے اور جس کے ساتھ خدا ہو جائے اس کو کون زیر کرسکتا ہے۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

۷۸۔ اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے، جب کہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں۔ اور ہم ان کے اس فیصلہ کو دیکھ رہے تھے۔ ۷۹۔ پس ہم نے سلیمان کو اس کی سمجھ دے دی۔ اور ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا کیا تھا۔ اور ہم نے داؤد کے ساتھ تابع کر دیا تھا پہاڑوں کو کہ وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی۔ اور ہم ہی کرنے والے تھے۔ ۸۰۔ اور ہم نے اس کو تمھارے لیے ایک جنگی لباس کی صنعت سکھائی، تا کہ وہ تم کو لڑائی میں محفوظ رکھے۔ تو کیا تم شکر کرنے والے ہو۔

ان آیات میں دو اسرائیلی پیغمبروں کا ذکر ہے۔ ایک حضرت داؤد اور دوسرے ان کے صاحب زادہ حضرت سلیمان۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے انسانی معاملات کا صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت دی۔ حضرت داؤد اللہ کی تسبیح اتنے اعلیٰ طریقہ پر کرتے تھے کہ پہاڑ اور چڑیاں بھی ان کی ہم نوا ہو جاتیں۔ اس طرح اللہ نے انھیں بتایا کہ لوہے کا استعمال کس طرح کیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کے پیغمبروں ہی نے انسان کو بتایا کہ وہ اپنے رب کی تسبیح و عبادت کس طرح کرے۔ مگر ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری ضروری چیزیں بھی انسان کو صحیح طور پر پیغمبروں ہی کے ذریعہ معلوم ہوئیں۔ مثلاً عدلِ اجتماعی کا اصول اور معدنیات کا استعمال بھی پیغمبروں ہی کے ذریعہ انسانوں کے علم میں آیا۔ زندگی سے متعلق ہر ضروری چیز کا ابتدائی علم غالباً پیغمبروں ہی کے ذریعہ انسان کو دیا گیا ہے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾ ۙ

۸۱۔ اور ہم نے سلیمان کے لیے تیز ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔ ۸۲۔ اور شیاطین میں سے بھی ہم نے اس کے تابع کر دیا تھا جو اس کے لیے غوطہ لگاتے تھے۔ اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے اور ہم ان کو سنبھالنے والے تھے۔

یہاں ہواؤں کی تسخیر سے مراد بحری جہاز رانی ہے۔ قدیم زمانہ میں سمندری سفر میں اس وقت انقلاب آیا جب کہ انسان نے بادبانی جہاز بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔ یہ بادبان گویا ہواؤں کو مسخر کرنے کا ذریعہ تھے اور اس زمانہ کے جہازوں کے لیے انجن کا کام کرتے تھے۔ بادبانی جہازوں کی ایجاد نے سمندروں کو زیادہ بڑے پیمانے پر نقل وحمل کے لیے قابل استعمال بنا دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحری جہاز رانی کی سائنس بھی غالباً انسان کو پیغمبروں کے ذریعہ سکھائی گئی۔

اس کے علاوہ جنوں میں سے بھی ایک گروہ کو اللہ نے حضرت سلیمان کے تابع کر دیا تھا۔ وہ ان کے لیے ایسے بڑے بڑے رفاہی کام کرتے تھے جو عام انسان نہیں کر سکتے۔ جدید مشینی دور میں انسانی فائدے کے زیادہ بڑے کام مشینیں انجام دیتی ہیں۔ مشینی دور سے پہلے اس قسم کے بڑے بڑے کاموں کو ممکن بنانے کے لیے خدا نے جنوں کو اپنے پیغمبر کی ماتحتی میں دے دیا تھا۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

۸۳۔ اور ایوب کو جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو بیماری لگ گئی ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ ۸۴۔ تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کو جو تکلیف تھی اس کو دور کر دیا۔ اور ہم نے اس کو اس کا کنبہ عطا کیا اور اسی کے ساتھ اس کے برابر اور بھی، اپنی طرف سے رحمت اور نصیحت، عبادت کرنے والوں کے لیے۔

پیغمبروں کے ذریعہ خدا ہر قسم کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے لیے نمونہ ہوں۔ انھیں میں ایک مثال حضرت ایوب کی ہے۔ حضرت ایوب غالباً نویں صدی قبل مسیح کے اسرائیلی پیغمبر تھے۔ بائبل کے

بیان کے مطابق ابتداءً۔ وہ بہت دولت مند تھے۔ کھیتی، مویشی، مکانات، آل اولاد، ہر چیز کی اتنی کثرت تھی کہ کہا جانے لگا کہ اہلِ مشرق میں کوئی اتنا بڑا آدمی نہیں۔ اس کے باوجود حضرت ایوب بے حد شکر گزار اور وفادار بندے تھے۔ ان کی زندگی اس بات کا نمونہ بن گئی کہ عزت اور دولت پانے کے باوجود کس طرح ایک آدمی متواضع بندہ بنا رہتا ہے۔

مگر شیطان نے اس واقعہ کو لوگوں کے ذہنوں میں الٹ دیا۔ اس نے لوگوں کو سکھایا کہ ایوب کی یہ غیر معمولی خدا پرستی اس لیے ہے کہ ان کو غیر معمولی نعمتیں حاصل ہیں۔ اگر یہ نعمتیں ان کے پاس نہ رہیں تو ان کی ساری شکر گزاری ختم ہو جائے گی۔

اس کے بعد خدا نے آپ کے ذریعہ سے دوسری مثال قائم کی۔ حضرت ایوب کے مویشی مر گئے۔ کھیتیاں برباد ہو گئیں۔ اولاد ختم ہو گئی۔ حتی کہ جسم بھی بیماری کی نذر ہو گیا۔ دوستوں اور رشتہ داروں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ صرف ایک بیوی آپ کے ساتھ باقی رہ گئی۔ مگر حضرت ایوب خدا کے فیصلے پر راضی رہے۔ انھوں نے کامل صبر کا مظاہرہ کیا۔ بائبل کے الفاظ میں:

> ’’تب ایوب نے زمین پر گر کر سجدہ کیا۔ اور کہا ننگا میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو۔ ان سب باتوں میں ایوب نے نہ تو گناہ کیا اور نہ خدا پر بے جا کام کا عیب لگایا‘‘ (ایوب، 1:22)۔

حضرت ایوب نے جب مصیبتوں میں اس طرح صبر و شکر کا مظاہرہ کیا تو نہ صرف آخرت میں ان کے لیے بہترین اجر لکھ دیا گیا بلکہ دنیا میں بھی ان کی حالت بدل دی گئی۔ اور خداوند نے ایوب کو جتنا اس کے پاس پہلے تھا اس کا دو چند اس کو دیا (ایوب، 12:42)۔ حدیث میں اسی کو تمثیل کے الفاظ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ خدا نے جب دوبارہ ایوب کے دن پھیرے تو ان پر سونے کی ٹڈیوں کی بارش کر دی (أَمْطَرَ عَلَيْهِ جَرَادًا مِنْ ذَهَبٍ) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 2533۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٦﴾

۸۵۔ اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو، یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ ۸۶۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا۔ بے شک وہ نیک عمل کرنے والوں میں سے تھے۔

حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم کے صاحب زادے تھے۔ کچھ مفسرین نے حضرت ادریس سے وہ پیغمبر مراد لیا ہے جن کا ذکر بائبل میں حنوک (Enoch) کے نام سے آیا ہے۔ اسی طرح حضرت ذوالکفل سے مراد غالباً وہ نبی ہیں جو بائبل میں حزقی ایل کے نام سے مذکور ہوئے ہیں۔

ان پیغمبروں کی نمایاں صفت صبر بتائی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر تمام خدا پرستانہ اعمال کی بنیاد ہے۔

صبر کا مطلب اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچانا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے نہ بچائے وہ امتحان کی اس دنیا میں کبھی خدا کی پسندیدہ زندگی پر قائم نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر خدا کی تمام رحمتوں کا دروازہ ہے، اس دنیا میں بھی اور موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں بھی۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾

۸۷۔ اور مچھلی والے (یونس) کو، جب کہ وہ اپنی قوم سے برہم ہوکر چلا گیا۔ پھر اس نے یہ سمجھا کہ ہم اس کو نہ پکڑیں گے، پھر اس نے اندھیرے میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے۔ بے شک میں قصوروار ہوں۔ ۸۸۔ تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے نجات دی۔ اور اسی طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں۔

حضرت یونس، عراق کے ایک قدیم شہر نینویٰ کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔ اس وقت نینویٰ کی آبادی ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔ انھوں نے ایک عرصہ تک قوم کو توحید اور آخرت کی طرف بلایا۔ مگر وہ لوگ ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ پیغمبروں کے بارے میں خدا کی سنت یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد اگر قوم بدستور پیغمبر کی منکر بنی رہے تو پیغمبر کو بستی چھوڑنے کا حکم ہوتا ہے اور قوم پر عذاب آجاتا ہے۔ حضرت یونس نے خیال کیا کہ وہ وقت آگیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم ملے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔

شہر سے نکل کر وہ ساحل سمندر پر آئے اور ایک کشتی میں سوار ہوگئے۔ راستے میں کشتی ڈوبنے لگی۔ لوگوں نے سمجھا کہ کوئی غلام اپنے مالک سے بھاگا ہے۔ قدیم رواج کے مطابق اس کا حل یہ تھا کہ اس غلام کو معلوم کر کے اسے دریا میں پھینک دیا جائے۔ قرعہ نکالا گیا تو حضرت یونس کا نام قرعہ میں نکلا۔ چنانچہ انھوں نے آپ کو دریا میں پھینک دیا۔ عین اسی وقت ایک بڑی مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔ مچھلی آپ کو اپنے پیٹ میں لیے رہی اور پھر خدا کے حکم سے آپ کو لا کر ساحل پر ڈال دیا۔ آپ تندرست ہو کر دوبارہ اپنی قوم میں واپس آئے۔

ایک پیغمبر نے دعوت کے محاذ کو صرف تکمیل سے پہلے چھوڑ دیا تو ان کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا۔ پھر ان وارثین پیغمبر کا کیا انجام ہوگا جو دعوت کے محاذ کو یکسر چھوڑے ہوئے ہوں۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ ۚ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَ

۸۹۔ اور زکریا کو، جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب، تو مجھ کو اکیلا نہ چھوڑ۔ اور تو بہترین وارث ہے۔ ۹۰۔ تو ہم نے اس کی دعا

وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ
كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا
رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾

قبول کی اور اس کو یحییٰ عطا کیا۔ اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا۔ یہ لوگ نیک کاموں میں دوڑتے تھے اور ہم کو امید اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے۔ اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

پیغمبر خصوصی انعام یافتہ لوگ ہیں۔ ان کی سب سے بڑی شخصی صفت یہ ہوتی ہے کہ ان کی دوڑ دھوپ دنیا کے لیے نہیں ہوتی۔ بلکہ ان چیزوں کی طرف ہوتی ہے جو آخرت کے اعتبار سے قیمت رکھتی ہوں۔ اللہ کی عظمت کو وہ اس طرح پالیتے ہیں کہ وہی ان کو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ وہ صرف اسی سے ڈرتے ہیں اور صرف اسی کو پکارتے ہیں۔ وہ ہر حال میں خشوع اور تواضع کی روش پر قائم رہتے ہیں۔

یہ چیزیں حضرت زکریا اور دوسرے نبیوں میں کمال درجہ پر تھیں۔ اور اسی بنا پر اللہ نے ان کو اپنی خصوصی نعمتوں سے نوازا۔ عام اہلِ ایمان بھی جس قدر ان اوصاف کا ثبوت دیں گے، اسی قدر وہ خدا کی نصرت وعنایت کے مستحق قرار پائیں گے۔

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ
رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾

۹۱۔ اور وہ خاتون جس نے اپنی ناموس کو بچایا تو ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور اس کو اور اس کے بیٹے کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔

حضرت مریم کی صفت خاص یہ بتائی گئی ہے کہ انھوں نے اپنی شہوت کو قابو میں رکھا۔ اس کا انھیں یہ انعام ملا کہ وہ اس پیغمبر کی ماں بنائی گئیں جو براہ راست معجزۂ خداوندی کے تحت پیدا ہوا۔

یہی بات عام مردوں اور عورتوں کے لیے بھی صحیح ہے۔ ہر ایک کا امتحان موجودہ دنیا میں یہ ہے کہ وہ اپنی شہوتوں اور خواہشوں کو قابو میں رکھے۔ جو شخص جتنا زیادہ اس ضبط کا ثبوت دے گا اسی کے بقدر وہ خدا کی خصوصی عنایتوں میں حصہ دار بنے گا۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا
رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ
بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ ع ۶ ۱۸
مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ
لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾

۹۲۔ اور یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمھارا رب ہوں تو تم میری عبادت کرو۔ ۹۳۔ اور انھوں نے اپنا دین اپنے اندر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب ہمارے پاس آنے والے ہیں۔ ۹۴۔ پس جو شخص نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان والا ہوگا تو اس کی محنت کی ناقدری نہ ہوگی، اور ہم اس کو لکھ لیتے ہیں۔

خدا نے تمام نبیوں کو ایک ہی دین دے کر بھیجا ہے۔ وہ یہ کہ صرف ایک خدا کو اپنا خدا بناؤ اور اور اسی کی عبادت کرو۔ اگر لوگ اسی اصل دین پر قائم رہتے تو سب ایک ہی امت بنے رہتے۔ مگر لوگوں نے اپنی طرف سے نئی نئی بحثیں نکال کر دین کے مختلف ایڈیشن تیار کر لئے۔ کسی نے ایک کو لیا اور کسی نے دوسرے کو۔ اس طرح ایک دین کئی دینوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔

خدا کے یہاں ایمان و عمل کی قیمت ہے، یعنی خدا کی سچی معرفت اور خدا کی سچی تابع داری۔ اس کے سوا جو چیزیں ہیں ان کی خدا کے یہاں کوئی قدردانی نہ ہوگی، خواہ کوئی شخص بطور خود ان کو کتنا ہی زیادہ قابل قدر کیوں نہ سمجھتا ہو۔

وَ حَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿۹۷﴾

۹۵۔ اور جس بستی والوں کے لیے ہم نے ہلاکت مقرر کردی ہے، ان کے لیے حرام ہے کہ وہ رجوع کریں۔ ۹۶۔ یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے۔ ۹۷۔ اور سچا وعدہ نزدیک آلگے گا تو ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی جنھوں نے انکار کیا تھا۔ ہائے ہماری کم بختی، ہم اس سے غفلت میں پڑے رہے۔ بلکہ ہم ظالم تھے۔

کسی بستی کے لیے ایمان میں داخلہ حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قبولِ ایمان کی استعداد ختم ہو جائے۔ جب حق واضح دلائل کے ساتھ سامنے آتا ہے تو آدمی اپنی عین فطرت کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ وہ اس کو پہچانے۔ اب جو لوگ اس پہچان کے بعد حق کا اعتراف کرلیں وہ اپنی فطرت کو باقی رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ دوسری چیزوں کو اہمیت دینے کی بنا پر اس کا اعتراف نہ کریں وہ گویا اپنی فطرت پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ حق کا انکار ہمیشہ اپنی فطرت کو اندھا بنانے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنی فطرت کو اندھا بنانے کا خطرہ مول لیں ان کا انجام یہی ہے کہ ان کے لیے ایمان میں داخل ہونا بالکل ناممکن ہو جائے۔

جو لوگ دلائل کی زبان میں حق کو نہ پہچانیں وہ حق کو صرف اس وقت پہچانیں گے جب کہ قیامت ان کی آنکھ کا پردہ پھاڑ دے گی۔ مگر اس وقت کا پہچاننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ ماننے کا انجام پانے کا وقت ہوگا، نہ کہ ماننے کا۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ
جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ
هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ هُمْ فِيْهَا لَا
يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا
الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا
يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ
اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ
الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ
الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

۹۸۔ بے شک تم اور جن کو تم خدا کے سوا پوجتے تھے، سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ وہیں تم کو جانا ہے۔ ۹۹۔ اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو وہ اس میں نہ پڑتے۔ اور سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۰۰۔ اس میں ان کے لیے چلّانا ہے اور وہ اس میں کچھ نہ سنیں گے۔ ۱۰۱۔ بے شک جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا پہلے فیصلہ ہو چکا ہے، وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ ۱۰۲۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے۔ اور وہ اپنی پسندیدہ چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۰۳۔ ان کو بڑی گھبراہٹ غم میں نہ ڈالے گی۔ اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے۔ یہ ہے تمھارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

عبداللہ بن الزبعری قدیم عرب کا ایک مشہور شاعر تھا۔ یہ آیت اتری تو اس نے لوگوں سے کہا کہ محمدؐ سے پوچھو کہ آپ کے خیال میں خدا کے سوا جتنے معبود ہیں اور جو ان کے عابد ہیں، سب کے سب جہنم میں جائیں گے، تو ہم تو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہود عزیر پیغمبر کی عبادت کرتے ہیں۔ نصاریٰ مسیح پیغمبر کی عبادت کرتے ہیں۔ مشرکین اس نکتہ کو پا کر بہت خوش ہوئے اور آپ سے جا کر سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہر ایک جس نے پسند کیا کہ وہ خدا کے سوا پوجا جائے تو وہ اس کے ساتھ ہوگا جس نے اسے پوجا (كُلُّ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُعْبَدَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَهُوَ مَعَ مَنْ عَبَدَهُ) سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 359۔ اس جواب کے بعد عبداللہ بن الزبعری نے مزید بحث نہیں کی۔ بعد میں اس نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرلیا (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ 199)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اِس آیت کے مصداق یا تو پتھر وغیرہ کے بت ہیں یا وہ معبود جو خود بھی اپنے معبود بنائے جانے پر راضی رہا ہو۔ جس نے خدا کے سوا کسی کو معبود بنایا اور جس نے اپنے معبود بننے کو پسند کیا، دونوں ایک ساتھ اس لیے جہنم میں ڈالے جائیں گے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔

قیامت کا دن انتہائی ہولناک دن ہوگا۔ مگر جن لوگوں کو یہ توفیق ملی کہ وہ قیامت کے آنے سے پہلے قیامت سے ڈرے وہ اس دن کی دہشت سے محفوظ رہیں گے۔ وہ جنت کی راحتوں سے بھری ہوئی دنیا میں داخل کردئے جائیں گے۔

یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَیْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ؕ

۱۰۴۔جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح طومار میں اوراق لپیٹ دئے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی، اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے اور ہم اس کو کر کے رہیں گے۔۱۰۵۔اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔۱۰۶۔اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے۔

کائنات کا موجودہ پھیلاؤ امتحان والی دنیا بنانے کے لیے تھا۔اس کے بعد جب انجام والی دنیا بنانے کا وقت آئے گا تو خدا اس عالم کو سمیٹ دے گا اور غالباً اسی مادہ سے دوسرا عالم بنائے گا جو انجام والے مقاصد کے حسبِ حال ہو۔ایک دنیا کا وجود میں آنا۔یہی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ دوسری دنیا بھی وجود میں لائی جاسکتی ہے۔

موجودہ دنیا میں اکثر برے لوگ بڑائی کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔مگر یہ صرف امتحان کی مدت تک کے لیے ہے۔جب امتحان کی مدت ختم ہوگی اور ابدی طور پر خدا کی معیاری دنیا بنائی جائے گی تو وہاں ہر قسم کی عزت اور راحت صرف ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو موجودہ امتحانی دور میں خدا کے سچے بندے ثابت ہوئے تھے۔ یہ بات موجودہ زبور میں بھی تفصیل سے موجود ہے۔اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر۔خداوند پر توکل کر اور نیکی کر۔ وہ تیری راست بازی کو نور کی طرح اور تیرے حق کو دوپہر کی طرح روشن کرے گا۔کیوں کہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے، صادق زمین کے وارث ہوں گے۔اور وہ اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے (زبور، 37:29)۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَ

۱۰۷۔اور ہم نے تم کو سارے جہان کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔۱۰۸۔کہو کہ میرے پاس جو وحی آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک معبود ہے، تو کیا تم اطاعت گزار بنتے ہو۔ ۱۰۹۔پس اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ میں تم کو صاف طور پر اطلاع کر چکا ہوں۔اور میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے، قریب ہے یا دور۔ ۱۱۰۔بے شک وہ کھلی بات کو بھی جانتا

اِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى
حِیْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا
الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع النصف ۱۹

ہے اوراس بات کو بھی جس کو تم چھپاتے ہو۔ ۱۱۱۔ اور مجھ کو نہیں معلوم شاید وہ تمھارے لیے امتحان ہو اور فائدہ اٹھا لینے کی ایک مہلت ہو۔ ۱۱۲۔ پیغمبر نے کہا کہ اے میرے رب، حق کے ساتھ فیصلہ کردے۔ اور ہمارا رب رحمان ہے، اسی سے ہم ان باتوں پر مدد مانگتے ہیں جو تم بیان کرتے ہو۔

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے سب ایک ہی مقصد کے لیے آئے۔ ان کے ذریعہ خدا یہ چاہتا تھا کہ انسانوں کو حقیقت کا وہ علم دے جس کو اختیار کر کے وہ ابدی جنت کے باشندے بن سکتے ہیں۔ مگر انسان ہر بار پیغمبروں کو رد کرتا رہا۔

اس اعتبار سے تمام پیغمبر خدا کی رحمت تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے ایک خصوصی عنایت کا ذریعہ بنایا۔ خدا نے یہ فیصلہ فرمایا کہ آپ کے ذریعہ ہدایت کے اس دروازے کو ہمیشہ کے لیے کھول دے جو اب تک ان کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔ اس بنا پر آپ کی مدعو قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی فیصلہ تھا کہ اس کو بہر حال حق کے راستے پر لانا ہے۔ تاکہ پیغمبر کے ساتھ ایک طاقت ور جماعت تیار ہو اور وہ دنیا میں انقلاب برپا کر کے تاریخ کے رخ کو موڑ دے۔ رحمت خداوندی کا یہ خصوصی منصوبہ آپ اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ بہ تمام وکمال انجام پایا۔

۲۲۔ سُوْرَةُ الْحَجّ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ
السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ﴿۱﴾ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ
كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ
حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ
بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ﴿۲﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ ۱۔ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو۔ بے شک قیامت کا بھونچال بڑی بھاری چیز ہے۔ ۲۔ جس دن تم اسے دیکھو گے، ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی۔ اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی۔ اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے حالاں کہ وہ مدہوش نہ ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔ ۳۔ اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے۔

يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝٣ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝٤

اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرنے لگتا ہے۔
۴۔اس کی نسبت یہ لکھ دیا گیا ہے کہ جو شخص اس کو دوست بنائے گا، وہ اس کو بے راہ کر دے گا اور اس کو عذاب جہنم کا راستہ دکھائے گا۔

’’دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور حمل والی عورت اپنا حمل گرا دے گی‘‘— یہ تمثیل کی زبان میں قیامت کی ہولناکی کا بیان ہے۔ یعنی اس دن لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ اگر ماں کی گود میں دودھ پینے والا بچہ ہو تو گھبراہٹ کی بنا پر وہ اپنے بچہ کو بھول جائے۔ اور اگر کوئی حاملہ عورت ہو تو شدت ہول سے اس کا حمل ساقط ہو جائے۔

ہماری موجودہ دنیا میں جو بھونچال آتے ہیں وہ قیامت کے واقعہ کا ہلکا سا نمونہ ہیں۔ قیامت کا سب سے بڑا بھونچال جب آئے گا تو آدمی ہر وہ چیز بھول جائے گا جس کو اہمیت دینے کی وجہ سے وہ قیامت کے دن کو بھولا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی عزیز ترین چیز بھی اس دن اس کو یاد نہ رہے گی۔

پیغمبر کی بات علم کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ وہ دلائل سے اس کو ثابت شدہ بناتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے سے باہر کسی صداقت کا اعتراف کرنا نہیں چاہتے وہ اپنے کو برسر حق ظاہر کرنے کے لیے پیغمبر کی بات میں جھوٹی بحثیں نکالتے ہیں۔ اس قسم کی روش خدا کے مقابلہ میں سرکشی کرنے کے ہم معنی ہے۔ جو لوگ اس طرح کی بحثوں کو حق کا پیغام نہ ماننے کے لیے عذر بنائیں وہ گویا شیطان کو اپنا مشیر بنائے ہوئے ہیں۔ وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ خدا کے خوف سے خالی ہیں۔ بے خوفی کی نفسیات آدمی کو اس سے محروم کر دیتی ہے کہ وہ حق کو پہچانے اور اس کا اعتراف کرے۔ وہ نہایت آسانی سے شیطان کا معمول بن جاتا ہے۔ ایسا آدمی صرف قیامت کی چنگھاڑ سے جاگے گا۔ مگر قیامت کا زلزلہ ایسے لوگوں کے لیے صرف جہنم کا دروازہ کھولنے کے لیے آتا ہے، نہ کہ ان کو ہدایت کا راستہ دکھانے کے لیے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا

۵۔ اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اٹھنے کے متعلق شک میں ہو تو ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، شکل والی اور بغیر شکل والی بھی، تاکہ ہم تم پر واضح کریں۔ اور ہم رحموں میں ٹھہرا دیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک معین مدت تک۔ پھر ہم تم کو بچہ بنا کر باہر لاتے ہیں۔ پھر تاکہ تم اپنی پوری جوانی تک پہنچ جاؤ۔ اور تم میں سے کوئی شخص پہلے ہی مرجاتا ہے اور کوئی شخص بدترین عمر تک پہنچا دیا

يَعۡلَمَ مِنۡۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَيۡـًٔا ؕ وَتَرَى الۡاَرۡضَ
هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَ
رَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ ۝٥
ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحۡىِ الۡمَوۡتٰى وَ
اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۙ ۝٦ وَّاَنَّ السَّاعَةَ
اٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِى
الۡقُبُوۡرِ ۝٧

جاتا ہے تاکہ وہ جان لینے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم زمین کو دیکھتے ہو کہ خشک پڑی ہے، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ تازہ ہوگئی اور ابھر آئی اور وہ طرح طرح کی خوشنما چیزیں اگاتی ہے۔ ٦۔ یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ بے جانوں میں جان ڈالتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ٧۔ اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

آخرت کی زندگی کے بارے میں آدمی کو اس لیے شبہ ہوتا ہے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انسان مر چکا ہوگا تو وہ کس طرح دوبارہ زندہ ہو کر کھڑا ہو جائے گا۔ مردہ کائنات دوبارہ زندہ کائنات کیسے بن جائے گی۔

اس شبہ کا جواب خود ہماری موجودہ دنیا کی ساخت میں موجود ہے۔ موجودہ دنیا کیا ہے۔ یہ ایک حالت کا دوسری حالت میں تبدیل ہو جانا ہے۔ وہ چیز جس کو ہم زندہ وجود کہتے ہیں وہ حقیقۃً غیر زندہ وجود کا تغیر ہے۔ انسانی جسم کا تجزیہ بتاتا ہے کہ وہ لوہا، کاربن، کیلشیم، نمکیات، پانی اور گیسوں وغیرہ سے مل کر بنا ہے۔ انسانی وجود کے یہ مرکبات سب کے سب بے جان ہیں۔ مگر یہی غیر ذی روح مادے تبدیل ہو کر ذی روح اشیاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور انسان کی صورت میں چلنے لگتے ہیں۔ پھر جو انسان ایک بار غیر زندہ سے زندہ صورت اختیار کر لیتا ہے وہ اگر دوبارہ غیر زندہ سے زندہ ہیئت میں تبدیل ہو جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

اسی طرح زمین کے سبزہ کو دیکھیے۔ مٹی یا دوسری جن چیزوں سے ترکیب پا کر سبزہ بنتا ہے وہ سب کی سب ابتداءً ان خصوصیات سے خالی ہوتی ہیں جن کے مجموعہ کا نام سبزہ ہے۔ مگر یہی غیر سبزہ تبدیل ہو کر سبزہ بن جاتا ہے۔ تبدیلی کا یہ واقعہ روزانہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ پھر اسی ہونے والے واقعے کا دوسری بار ہونا مستبعد کیوں ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلی دنیا کا وجود میں آنا خود ہی دوسری دنیا کے وجود میں آنے کا ثبوت ہے۔ ایک دنیا کا تجربہ کرنے کے بعد دوسری دنیا کو سمجھنا عقلی اور منطقی طور پر کچھ بھی مشکل نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّ
لَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ ۙ ۝٨ ثَانِىَ عِطۡفِهٖ

٨۔ اور لوگوں میں کوئی شخص ہے جو اللہ کی بات میں جھگڑتا ہے، علم اور ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر۔ ٩۔ تکبر کرتے ہوئے تاکہ وہ اللہ کی راہ سے

لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ⑨ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ⑩ ع ۸

بے راہ کردے۔ اس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی ہوئی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔ ۱۰۔ یہ تمھارے ہاتھ کے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

عرب کے لوگوں نے شرک کو سچائی سمجھ کر اختیار کر رکھا تھا۔ پیغمبر کی دعوتِ توحید سے شرک کو ماننے والوں کے عقائد متزلزل ہوئے تو اس میں ان لوگوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا جو شرک کی زمین پر اپنی سرداری قائم کیے ہوئے تھے۔ ایک عام آدمی کے لیے شرک کو چھوڑنا صرف اپنے آبائی دین کو چھوڑنا ہوتا ہے۔ جب کہ ایک سردار کے لیے شرک کا خاتمہ اس کی سرداری کے خاتمہ کے ہم معنی ہے۔ اس لیے ہر دور میں بے آمیز دین کی دعوت کے سب سے زیادہ مخالف وہ لوگ بن جاتے ہیں جو ملاوٹی دین کی بنیاد پر اپنی قیادت قائم کیے ہوئے ہوں۔

یہ لوگ حق کی دعوت اور اس کے داعی کے بارے میں لایعنی بحثیں پیدا کرتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے زیر اثر عوام دعوت کے بارے میں مشتبہ ہو جائیں۔ اور بدستور اپنے رواجی دین پر قائم رہیں۔

حق کی یہ مخالفت وہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ خود ساختہ دین کی بنیاد پر انھوں نے جو اپنی جھوٹی بڑائی قائم کر رکھی ہے، وہ بدستور قائم رہے۔ ان کو سچائی سے زیادہ اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ خدا کے نزدیک بہت بڑے مجرم ہیں۔ قیامت میں ان کے حصہ میں رسوائی اور عذاب کے سوا کچھ آنے والا نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪

۱۱۔ اور لوگوں میں کوئی ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ پس اگر اس کو کوئی فائدہ پہنچا تو وہ اس عبادت پر قائم ہو گیا۔ اور اگر کوئی آزمائش پیش آئی تو الٹا پھر گیا۔ اس نے دنیا بھی کھو دی اور آخرت بھی، یہی کھلا ہوا خسارہ ہے۔

ایک شخص وہ ہے جو دین کو کامل صداقت کے طور پر دریافت کرتا ہے۔ دین اس کے دل و دماغ پر پوری طرح چھا جاتا ہے۔ وہ کسی تحفظ کے بغیر اپنے آپ کو دین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کی نظر میں ہر دوسری چیز ثانوی بن جاتی ہے۔ یہی شخص خدا کی نظر میں سچا مومن ہے۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو بس اوپری جذبہ سے دین کو مانیں۔ ایسے لوگوں کی حقیقی دلچسپیاں اپنے مفادات

سے وابستہ ہوتی ہیں۔ البتہ سطحی تأثر کے تحت وہ اپنے آپ کو دین سے بھی وابستہ کر لیتے ہیں۔ ان کی یہ وابستگی صرف اس وقت تک کے لیے ہوتی ہے جب تک دین کو اختیار کرنے سے انھیں کوئی نقصان نہ ہو رہا ہو۔ ان کے مفادات پر اس سے کوئی زد نہ پڑتی ہو۔ جیسے ہی انھوں نے دیکھا کہ دین اور ان کا مفاد دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے وہ فوراً ذاتی مفاد کو اختیار کر لیتے ہیں اور دین کو چھوڑ دیتے ہیں۔

یہی دوسری قسم کے لوگ ہیں، جن کو منافق کہا جاتا ہے۔ منافق انسان آخرت کو پانے میں بھی ناکام رہتا ہے اور دنیا کو پانے میں بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں معاملہ میں کامیابی کے لیے ایک ہی لازمی شرط ہے، اور وہ یکسوئی ہے، اور یہی وہ قلبی صفت ہے جس سے منافق انسان ہمیشہ محروم ہوتا ہے۔ وہ اپنے دوطرفہ رجحان کی وجہ سے نہ پوری طرح آخرت کی طرف یکسو ہوتا اور نہ پوری طرح دنیا کی طرف۔ اس طرح وہ دونوں میں سے کسی کی بھی لازمی قیمت نہیں دے پاتا۔ ایسے لوگ دوطرفہ محرومی کی علامت بن کر رہ جاتے ہیں۔

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا
يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا
لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى
وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ
مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

۱۲۔ وہ خدا کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی اور نہ اس کو نفع پہنچا سکتی۔ یہ انتہا درجہ کی گمراہی ہے۔ ۱۳۔ وہ ایسی چیز کو پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے قریب تر ہے۔ کیسا برا کارساز ہے اور کیسا برا رفیق۔ ۱۴۔ بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

خدا کو چھوڑنا ہمیشہ غیر خدا پر بھروسہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی خدا کے سچے راستہ سے ہٹتا ہے یا اس کو نظر انداز کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ غیر خدا کبھی کوئی بت ہوتا ہے اور کبھی بت کے سوا کوئی دوسری چیز۔

مگر اس دنیا میں ایک خدا کے سوا کسی کو کوئی طاقت حاصل نہیں۔ اس لیے آدمی جب خدا کے سوا دوسروں پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ طاقت ور کو چھوڑ کر ایسی موہوم چیز کا سہارا پکڑتا ہے جس کا بحیثیت طاقت کوئی وجود نہیں۔ اس سے زیادہ بھول کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

مزید یہ کہ اپنے آپ کو خدا کے ساتھ وابستہ کرنا صرف ضرورت کا تقاضا نہیں ہے بلکہ وہ حقیقت کا تقاضا بھی ہے۔ وہ انسان کے اوپر خدا کا حق ہے۔ اس لیے جب آدمی خدا کو چھوڑ کر موہوم چیزوں کی طرف جاتا ہے تو اس کا

نقصان فوراً اس کے لیے مقدر ہو جاتا ہے۔اور جہاں تک اس کے نفع کا سوال ہے وہ تو کبھی ملنے والا نہیں۔

غیر خدا کو سہارا بنانے والے بظاہر اس کو اپنے سے اونچا سمجھتے ہیں۔ ورنہ وہ اس کو سہارا ہی نہ بنائیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ غیر خدا جس کو سہارا بنایا جائے اور وہ لوگ جو انھیں اپنا سہارا بنائیں دونوں یکساں درجہ میں مجبور اور بے طاقت ہیں۔

ایسی دنیا میں جو لوگ اس کا ثبوت دیں کہ انھوں نے ماحول سے اوپر اٹھ کر سوچا۔غیر خداؤں کے پرفریب ہجوم میں انھوں نے خدا کو دریافت کیا۔اور پھر صرف آخرت کی خاطر اپنی زندگی کو خدا کی پسند کے راستے پر ڈال دیا وہ اس دنیا کی سب سے قیمتی روحیں ہیں۔خدا ان کی اس طرح قدر دانی کرے گا کہ ان کو جنت کی کامل دنیا میں بسائے گا۔جہاں وہ ابدی طور پر عیش کرتے رہیں۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

۱۵۔ جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ خدا دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا تو اس کو چاہیے کہ وہ ایک رسی آسمان تک تانے۔ پھر اس کو کاٹ ڈالے اور دیکھے کہ کیا اس کی تدبیر اس کے غصہ کو دور کرنے والی بنتی ہے۔ ۱۶۔ اور اس طرح ہم نے قرآن کو کھلی کھلی دلیلوں کے ساتھ اتارا ہے۔اور بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حق کی طرف پکارا تو جو لوگ ناحق کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کیے ہوئے تھے وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔مخالفت بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ایسا معلوم ہوا گویا ناحق کے علم بردار حق کے علم برداروں کا خاتمہ کر دیں گے۔ایسے نازک حالات میں بعض مسلمانوں کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ اگر ہم حق پر ہیں تو خدا ہماری مدد کیوں نہیں کرتا۔حق اور ناحق کی کش مکش میں وہ غیر جانب دار کیوں بنا ہوا ہے۔

فرمایا کہ خدا بلاشبہ ہمیشہ حق کا ساتھ دیتا ہے۔مگر خدا کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ فوراً مداخلت کرے۔ وہ معاملات کے اس حد تک پہنچنے کا انتظار کرتا ہے جہاں ایک فریق کا برسر حق ہونا اور دوسرے فریق کا برسر باطل ہونا پوری طرح ثابت شدہ بن جائے۔جب یہ حد آجاتی ہے اس وقت خدا بلا تاخیر مداخلت کر کے فیصلہ کر دیتا ہے۔

یہ خدا کی سنت ہے۔آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی اس سنت پر راضی کرے۔کیوں کہ اس کے سوا کوئی اور چیز اس زمین و آسمان کے اندر ممکن نہیں۔اس کے سوا ہر راستہ موت کا راستہ ہے، نہ کہ زندگی کا راستہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ

۱۷۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے یہودیت اختیار کی اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور جنھوں نے شرک

اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾

کیا، اللہ ان سب کے درمیان قیامت کے روز فیصلہ فرمائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

اس آیت میں چھ مذہبی گروہوں کا ذکر ہے — مسلمان، یہودی، صابئی، نصاریٰ، مجوس اور مشرکین مکہ۔ یہودی حضرت موسیٰ کو ماننے والے لوگ ہیں۔ اسی طرح صابئی حضرت یحییٰ کو ماننے والے تھے۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو، مجوس زرتشت کو اور مشرکین حضرت ابراہیم کو۔

یہ سارے لوگ ابتداءً توحید پرست تھے۔ مگر بعد کو انھوں نے اپنے دین میں بگاڑ پیدا کرلیا۔ اور اب وہ اسی بگڑے ہوئے دین پر قائم ہیں۔ مسلمانوں کا حال بھی عملاً ایسا ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں کی کتاب اگرچہ محفوظ ہے۔ مگر امتحان کی اس دنیا میں ان کے ہاتھ اس سے بندھے ہوئے نہیں ہیں کہ وہ قرآن وسنت کی خودساختہ تشریح کرکے اپنا ایک دین بنائیں اور اس خودساختہ دین پر قائم ہو کر سمجھیں کہ وہ خدا کے دین پر قائم ہیں۔

خدا کا اصل دین ایک ہے۔ مگر لوگوں کی اپنی تشریحات میں وہ ہمیشہ مختلف ہوجاتا ہے۔ اس لیے جب لوگ خدا کے اصل دین پر ہوں تو ان کے درمیان اتحاد فروغ پاتا ہے۔ مگر جب لوگ خودساختہ دین پر چلنے لگیں تو ہمیشہ ان کے درمیان مذہبی اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ اختلافات لامتناہی طور پر بڑھتے ہیں۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتے۔ تاہم اللہ تعالی کو ہر شخص کا حال پوری طرح معلوم ہے۔ وہ قیامت میں بتادے گا کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا ہے اور جس کو خدا ذلیل کردے تو اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔ بے شک اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

جس طرح انسان کے لیے خدا کا ایک قانون ہے اسی طرح بقیہ کائنات کے لیے بھی خدا کا ایک قانون ہے۔ بقیہ کائنات خدا کے قانون پر بلا اختلاف قائم ہے۔ وہ نہایت اتفاق اور ہم آہنگی کے ساتھ خدا کے مقرر کردہ قانون کی پیروی کررہی ہے۔ یہ صرف انسان ہے جو اختلافات پیدا کرتا ہے وہ خودساختہ تشریح نکال کر نئے نئے راستوں پر چلنے لگتا ہے۔

خدا کی نظر میں وہ لوگ بہت بڑے مجرم ہیں جو خدا کے دین میں اختلافات پیدا کرتے ہیں۔ وہ بے اختلاف کائنات میں اختلاف کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ جس دنیا میں چاروں طرف نہایت وسیع پیمانے پر ''ایک دین'' کا سبق دیا جارہا ہے وہاں وہ ''کئی دین'' وضع کرنے میں مشغول ہیں۔

خدا کی کائنات خدا کی مرضی کا عملی اعلان ہے۔ جو لوگ خدا کے قائم کردہ اس عملی نمونہ کے خلاف چلتے ہیں وہ آج ہی اپنے آپ کو مستحقِ عذاب ثابت کررہے ہیں۔ قیامت اس نتیجہ کا صرف لفظی اعلان کرے گی جس کا عملی اعلان اسی آج کی دنیا میں ہر آن ہورہا ہے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۚ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ؕ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾ ع ۲ ۱۲ ۹

۱۹۔ یہ دو فریق ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا۔ پس جنھوں نے انکار کیا، ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے جائیں گے۔ ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔ ۲۰۔ اس سے ان کے پیٹ کی چیزیں تک گل جائیں گی اور کھالیں بھی۔ ۲۱۔ اور ان کے لیے وہاں لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ ۲۲۔ جب بھی وہ گھبرا کر اس سے باہر نکلنا چاہیں گے تو وہ پھر اس میں ڈھکیل دئے جائیں گے، اور چکھتے رہو جلنے کا عذاب۔

بڑی تقسیم میں تمام گروہ صرف دو ہیں۔ ایک اہل حق، اور دوسرے ان کا انکار کرنے والے۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں اہل حق سے جھگڑتے ہیں وہ بطور خود یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دلائل کا پہاڑ اپنے ساتھ لیے ہوئے ہیں۔ مگر یہ صرف ان کی غیر سنجیدگی ہے جو ان کی بے معنی بحثوں کو انھیں دلیل کے روپ میں دکھاتی ہے۔ وہ چوں کہ حق کا اعتراف کرنا نہیں چاہتے، اس لیے وہ اس کے خلاف جھوٹے جھگڑے کھڑے کرتے ہیں۔ ایسے لوگ آخرت میں اپنے عدم اعتراف کی ایسی سخت سزا پائیں گے جس سے وہ کبھی نکل نہ سکیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ

۲۳۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کی پوشاک ریشم ہوگی۔ ۲۴۔ اور ان کو پاکیزہ قول

الْقَوْلِ ۚۖ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

کی ہدایت بخشی گئی تھی۔ اور ان کو خدائے حمید کا راستہ دکھایا گیا تھا۔

جس دنیا میں ہر طرف پر فریب الفاظ کا جال بچھا ہوا ہو۔ جہاں حق سے پھرے ہوئے لوگ غلبہ حاصل کیے ہوئے ہوں۔ ایسے ماحول میں ایمان کی صداقت کو پہچاننا بلا شبہ سخت مشکل کام ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ ایمان کے اس راستہ پر عملاً اپنے آپ کو ڈال دیا جائے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اقوال کے پر شور ہنگاموں میں قولِ طیب کو پانے کی توفیق ملی۔ جنھوں نے راستوں کے ہجوم میں صراط حمید کو دیکھا اور اس کو پہچان لیا۔ جو لوگ دنیا میں اس عظیم لیاقت کا ثبوت دیں وہ انسانیت کے سب سے زیادہ قیمتی لوگ ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ انھیں جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾ ع ۳ ۱۰

۲۵۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں، جس کو ہم نے لوگوں کے لیے بنایا ہے، جس میں مقامی باشندے اور باہر سے آنے والے برابر ہیں۔ اور جو اس مسجد میں راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا، اس کو ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

حق کا انکار کرنے کی ایک مثال وہ ہے جو قدیم مکہ میں پیش آئی۔ مکہ کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی پر امن تبلیغ کو بھی برداشت نہیں کیا۔ انھوں نے آپ کے اوپر پابندیاں لگائیں۔ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو یک طرفہ طور پر ظلم کا نشانہ بنایا حتی کہ انھوں نے یہ ظلم بھی کیا کہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکا۔

مکہ کے لوگوں کی یہ روش انکار پر سرکشی کا اضافہ تھی۔ جو لوگ ایسے ظالمانہ رویہ کا ثبوت دیں ان کے لیے خدا کے یہاں سخت ترین سزا ہے، خواہ وہ ماضی کے ظالم لوگ ہوں یا حال کے ظالم لوگ۔ اور خواہ ان کی سرکشی کا تعلق حضرت ابراہیم کی تعمیر کردہ مسجد سے ہو یا اس وسیع تر "مسجد" سے جس کو خدا نے زمین کی صورت میں اپنے تمام بندوں کے لیے بنایا ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـــًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَ

۲۶۔ اور جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ بتا دی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو پاک رکھنا، طواف کرنے والوں کے

الْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿٢٦﴾

لیے اور قیام کرنے والوں کے لیے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔

حضرت ابراہیم کا زمانہ چار ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ساری آباد دنیا میں مشرکانہ مذہب چھایا ہوا تھا۔ حتی کہ شرک کے عمومی غلبہ کی وجہ سے تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اب یہ نوبت آ گئی کہ جو بچہ پیدا ہو وہ اپنے ماحول سے صرف شرک کا سبق لے۔

حضرت ابراہیم عراق میں پیدا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ وہ عراق اور شام اور مصر جیسے آباد علاقوں کو چھوڑ کر حجاز کے غیر آباد علاقے میں چلے جائیں اور وہاں اپنی اولاد کو بسا دیں۔ غیر آباد علاقے میں بسانے کا مقصد یہ تھا کہ یہاں الگ تھلگ دنیا میں ایک ایسی نسل پیدا ہو جو شرک سے منقطع ہو کر پرورش پا سکے۔ حضرت ابراہیم نے اسی خدائی منصوبے کے تحت اپنی اولاد کو موجودہ سرزمین مکہ میں لا کر بسا دیا جو اس وقت یکسر غیر آباد تھی۔ اسی کے ساتھ حضرت ابراہیم نے ایک مسجد (خانہ کعبہ) کی تعمیر کی تاکہ وہ اس نئی نسل کے لیے اور بالآخر ساری دنیا کے لیے ایک خدا کی عبادت کا مرکز بن سکے۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٢٩﴾

۲۷۔ اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، وہ تمھارے پاس آئیں گے۔ پیروں پر چل کر اور دبلے اونٹوں پر سوار ہو کر جو کہ دور دراز راستوں سے آئیں گے۔ ۲۸۔ تاکہ وہ اپنے فائدہ کی جگہوں پر پہنچیں اور چند معلوم دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ۔ ۲۹۔ تو چاہیے کہ وہ اپنا میل کچیل ختم کردیں۔ اور اپنی نذریں پوری کریں۔ اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

کعبہ کی تعمیر کا ابتدائی مقصد ان لوگوں کے لیے مرکز عبادت فراہم کرنا تھا، جو ''پیدل'' چل کر وہاں پہنچنے کی مسافت پر ہوں۔ مگر بالآخر اس کو سارے عالم کے لیے ایک خدا کی عبادت کا مرکز بننا تھا۔ اور یہ مقصد پوری طرح حاصل ہوا۔ یہاں پہنچ کر حاجی جو مناسک اور مراسم ادا کرتا ہے، قرآن میں اس کا مختصراً بیان ہے اور احادیث میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔

''تاکہ اپنے فائدوں کے لیے حاضر ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ دین کے فوائد جن کو وہ اعتقادی طور پر مانتے ہیں ان کو یہاں عملی طور پر دیکھیں۔ حج کے لیے آدمی جن مقامات پر حاضر ہوتا ہے ان سے دین خداوندی کی عظیم

تاریخ وابستہ ہے۔ اس بنا پر وہاں جانا اور ان کو دیکھنا دلوں کو پگھلانے کا سبب بنتا ہے۔ وہاں ساری دنیا کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ اس طرح وہاں اسلام کی بین اقوامی وسعت کھلی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ حج کا سالانہ اجتماع مسلمانوں کے اندر عالمی سطح پر اجتماعیت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ آدمی کو اس سفر سے بہت سے دینی اور دنیاوی تجربے حاصل ہوتے ہیں جو اس کے لیے زندگی کی تعمیر میں مددگار بنتے ہیں، وغیرہ۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝٣٠

۳۰۔ یہ بات ہو چکی اور جو شخص اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرے گا تو وہ اس کے حق میں اس کے رب کے نزدیک بہتر ہے اور تمھارے لیے چوپائے حلال کردئے گئے ہیں، سوا ان کے جو تم کو پڑھ کر سنائے جا چکے ہیں، تو تم بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بچو۔

حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے، کیا چیز مقدس ہے اور کیا چیز غیر مقدس، عبادت کے کون سے طریقے درست ہیں اور کون سے طریقے درست نہیں۔ یہ سب باتیں خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے واضح طور پر بتادی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا تغیر وتبدل جائز نہیں۔ ہر تبدیلی جو بطور خود ان چیزوں میں کی جائے وہ اللہ کے نزدیک جھوٹ ہے، بلکہ وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ ان چیزوں میں بالکل لفظی طور پر پیغمبرانہ تعلیمات کی پیروی کرے۔ وہ کسی حال میں ان میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔

یہ امور وہ ہیں جن کی حقیقت صرف خدا کو معلوم ہے۔ آدمی جب ان میں اپنی طرف سے کوئی بات کہتا ہے تو وہ ایسی چیز کے بارے میں اپنی واقفیت کا دعویٰ کرتا ہے جس کی اسے کوئی واقفیت نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جھوٹ ہے، بلکہ اتنا بڑا جھوٹ ہے کہ اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں۔

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۗ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝٣١

۳۱۔ اللہ کی طرف یکسو رہو، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا۔ پھر چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز مقام پر لے جا کر ڈال دے۔

اس کائنات میں مرکزی قوت صرف ایک ہے۔ اور وہ خدائے واحد کی ذات ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو خدا سے جوڑے اس نے اپنے لیے حقیقی ٹھکانا پالیا۔ وہ مضبوط زمین پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے برعکس، جو شخص اپنے آپ کو

خدا سے نہ جوڑے یا ایسا ہو کہ وہ زبان سے خدا کا اقرار کرے مگر اپنا دلی تعلق کسی اور سے وابستہ رکھے۔ وہ گویا اس مرکز سے کٹا ہوا ہے جس کے سوا اس کائنات میں دوسرا کوئی مرکز نہیں۔ ایسے شخص کا حال اس انسان جیسا ہوگا جس کی ایک مثال اوپر کی آیت میں بتائی گئی ہے۔

ذٰلِكَ ۗ وَ مَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآٮِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ ﴿۳۳﴾ ع ۸ ۱۱

۳۲۔ یہ بات ہو چکی۔ اور جو شخص اللہ کے شعائر کا پورا لحاظ رکھے گا تو یہ دل کے تقویٰ کی بات ہے۔ ۳۳۔ تم کو ان سے ایک مقرر وقت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ پھر ان کو قربانی کے لیے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔

شعیرہ (جمع شعائر) کے معنی علامت (symbol) کے ہیں۔ اسلام کی جو عبادات ہیں، ان کا ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک اندرونی پہلو۔ اندرونی پہلو عبادت کا اصل ہے۔ اور جو ظاہری پہلو ہے وہ اسی اندرونی پہلو کی علامت، یا شعیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو شعائر مقرر کیے ہیں، ان کا حق اس طرح ادا نہیں ہوسکتا کہ ظاہری طور پر ان کی تعظیم کرلی جائے۔ ان کا حق ادا کرنے کے لیے دل کا تقویٰ مطلوب ہے۔

ہدی و نیاز کے جانور شعائر اللہ میں سے ہیں۔ وہ ایک حقیقت کی علامت ہیں، نہ کہ وہ بذات خود حقیقت ہے۔ ان جانور کو رنگنا یا اس کا اہتمام کرنا کہ ان پر سواری نہ کی جائے، ان سے کسی قسم کا فائدہ نہ اٹھایا جائے، یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جن سے اللہ خوش ہوتا ہو۔ اللہ کی خوشنودی اس میں ہے کہ جو کچھ کیا جائے اللہ کے لیے کیا جائے۔ اللہ کے یہاں قلبی حالت کی قدر ہے، نہ کہ محض ظاہری حالت کی۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَكًا لِّيَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِيۡمَةِ الۡاَنۡعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسۡلِمُوۡا ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُخۡبِتِيۡنَ ۙ﴿۳۴﴾ الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَ الصّٰبِرِيۡنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمۡ وَالۡمُقِيۡمِى الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۴۔ اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کرنا مقرر کیا تا کہ وہ ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا کیے ہیں۔ پس تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو تم اسی کے ہو کر رہو اور عاجزی کرنے والوں کو بشارت دے دو۔ ۳۵۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ اور جو اُن پر پڑے، اس کو وہ سہنے والے اور نماز کی پابندی کرنے والے اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

انسان اس دنیا میں جو بھی پیداوار حاصل کرتا ہے، خواہ وہ زرعی پیداوار ہو یا حیوانی پیداوار یا صنعتی پیداوار، ان کے بارے میں اس کے اندر دو قسم کی ممکن نفسیات پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ میری اپنی کمائی ہے یا یہ کہ وہ معبودوں کی برکت کا نتیجہ ہے۔ یہ نفسیات سراسر مشرکانہ نفسیات ہے۔

دوسری نفسیات یہ ہے کہ آدمی جو کچھ حاصل کرے اس کو وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز سمجھے۔ عُشر اور زکوٰۃ اور قربانی اسی دوسرے جذبے کے خارجی اظہار کے مقررہ طریقے ہیں۔ آدمی اپنی کمائی کا ایک حصہ خدا کی راہ میں نذر کرتا ہے اور اس طرح وہ اس بات کا عملی اقرار کرتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا عطیہ ہے، نہ کہ محض اس کا اپنا کسب۔

انسان کو اگر صحیح معنوں میں خدا کی معرفت حاصل ہوجائے تو اس کے بعد اس کے دل کا جو حال ہوگا وہ وہی ہوگا جس کو یہاں اِخبات کہا گیا ہے۔ ایسا آدمی ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہوجائے گا۔ اس پر عجز کی کیفیت طاری ہوجائے گی۔ اللہ کے تصور سے اس کا دل دہل اٹھے گا۔ وہ اپنی ہر چیز کو خدا کی چیز سمجھنے لگے گا، نہ کہ اپنی ذاتی چیز۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٣٦﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣٧﴾

۳۶۔ اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے اللہ کی یادگار بنایا ہے۔ ان میں تمھارے لیے بھلائی ہے۔ پس ان کو کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لو۔ پھر جب وہ کروٹ کے بل گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور بے سوال محتاج اور سائل کو کھلاؤ۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمھارے لیے مسخر کردیا تاکہ تم شکر ادا کرو۔ ۳۷۔ اور اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون بلکہ اللہ کو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے ان کو تمھارے لیے مسخر کردیا ہے، تاکہ تم اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائی بیان کرو اور نیکی کرنے والوں کو خوش خبری دے دو۔

دنیا میں اگر اونٹ اور دوسرے مویشی نہ ہوتے، صرف شیر اور ریچھ اور بھیڑیے ہوتے تو ان سے خدمت لینا انسان کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ اور ان کو عمومی پیمانہ پر قربان کرنا تو بالکل ناممکن ہوجاتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے صرف وحشی اور درندہ جانور نہیں پیدا کیے۔ بلکہ کچھ ایسے جانور بھی پیدا کیے جن میں فطری طور پر یہ مزاج موجود ہے کہ وہ اپنے آپ کو انسان کے قابو میں دے دیتے ہیں۔ اور جب انسان ان کو غذا یا قربانی کے لیے ذبح کرتا ہے تو اس وقت ان کی تسخیری فطرت اپنی آخری حد پر پہنچ جاتی ہے۔

قربانی کا طریقہ اس لیے مقرر نہیں کیا گیا ہے کہ خدا کو گوشت اور خون کی ضرورت ہے۔ قربانی تو صرف ایک علامتی فعل ہے۔ جانور کی قربانی اس انسان کی ایک ظاہری تصویر ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے لیے ذبح کر چکا ہے۔ یہ دراصل خود اپنا ذبیحہ ہے جو جانور کے ذبیحہ کی صورت میں ممثل ہوتا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے لیے جانور کی قربانی خود اپنی قربانی کے ہم معنی بن جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ
يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى
نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۨ ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا
اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ
مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ
وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾

۳۸۔ بے شک اللہ ان لوگوں کی مدافعت کرتا ہے جو ایمان لائے۔ بے شک اللہ بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔ ۳۹۔ اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جا رہی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ ۴۰۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے۔ صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، ڈھادئے جاتے۔ اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے۔ بے شک اللہ زبردست ہے، زور والا ہے۔

اللہ کا کوئی بندہ یا کوئی گروہ اپنے آپ کو اللہ کے راستے پر ڈال لے تو وہ اس دنیا میں تنہا نہیں ہوتا۔ غافل اور سرکش لوگ جب اس کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں تو خدا ظالموں کے مقابلہ میں ان کی جانب کھڑا ہو جاتا ہے۔ خدا ابتداءً اپنا نام لینے والوں کے اخلاص کا امتحان لیتا ہے۔ مگر جو لوگ امتحان میں پڑ کر اپنا مخلص ہونا ثابت کر دیں خدا ضرور ان کی مدد پر آجاتا ہے۔ اور ان کے لیے ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ وہ تمام رکاوٹوں پر قابو پاتے ہوئے حق پر کاربند رہ سکیں۔

اہل ایمان کا اصل اقدام صرف دعوت ہے۔ وہ دعوت سے آغاز کرتے ہیں اور برابر دعوت ہی پر قائم رہتے ہیں۔ وہ بوقت ضرورت کبھی جنگ بھی کرتے ہیں مگر ان کی جنگ ہمیشہ دفاع کے لیے ہوتی ہے، نہ کہ جارحیت کے لیے۔

ایک گروہ اگر زیادہ مدت تک اقتدار پر رہے تو اس کے اندر سرکشی اور گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے خدا نے اس دنیا میں "دفع" کا قانون مقرر کیا ہے۔ وہ بار بار ایک گروہ کے ذریعے دوسرے گروہ کو اقتدار کے مقام

سے ہٹاتا ہے۔ اس طرح تاریخ میں سیاسی توازن قائم رہتا ہے۔ اگر خدا ایسا نہ کرے تو لوگوں کی سرکشی یہاں تک بڑھ جائے کہ عبادت خانے جیسے مقدس ادارے بھی ان کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہیں۔

اس دفع کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی گروہ کے اقتدار کو سرے سے ختم کردیا جائے۔ اس کی ایک مثال موجودہ زمانہ میں برطانیہ عظمیٰ کی ہے جس کو وطنی آزادی کی تحریکوں کے ذریعے ختم کیا گیا۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جس کی مثال روس اور امریکا کی شکل میں نظر آتا ہے۔ یعنی ایک کے ذریعے دوسرے پر روک لگانا۔ اور اس طرح بین اقوامی سیاست میں توازن قائم رکھنا۔

واضح ہو کہ مسلمانوں کا فریضہ یہ نہیں ہے کہ وہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کریں، بلکہ یہاں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ اگر حالات کے تحت مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو جائے تو اس وقت ان کی سیاسی ذمہ داری کیا ہوگی۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں غلبہ دیں تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

خدا کی مدد کا مستحق بننے کی شرط خاص یہ ہے کہ آدمی ایسا ہو کہ اس کو اقتدار ملے پھر بھی وہ نہ بگڑے۔ اس کو بڑائی کا مقام ملنا اس کے عجز وتواضع کو بڑھانے والا بن جائے۔ جو لوگ اقتدار سے پہلے کے حالات میں اس طرح صالح ثابت ہوں وہی اقتدار کے بعد کے حالات میں صالح ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں کوئی اقتدار دیا جاتا ہے تو وہ خدا کے آگے جھک جاتے ہیں۔ وہ بندوں کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے معاملات میں وہی کرتے ہیں جس کو خدا پسند کرتا ہے۔ اور اس سے دور رہتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں۔

وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْیَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰی فَاَمْلَیْتُ لِلْكٰفِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ﴿۴۴﴾

۴۲۔ اور اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور ثمود جھٹلا چکے ہیں۔ ۴۳۔ اور قوم ابراہیم اور قوم لوط۔ ۴۴۔ اور مدین کے لوگ بھی۔ اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا۔ پھر میں نے منکروں کو ڈھیل دی۔ پھر میں نے ان کو پکڑ لیا۔ پس کیسا ہوا میرا عذاب۔

''ابراہیم اور موسیٰ کو جھٹلانے والے لوگوں'' سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ لوگ ہیں، نہ کہ وہ لوگ جو اس آیت کے اترنے کے وقت موجود تھے۔ کیوں کہ قرآن کے اترنے کے زمانہ میں تو تمام لوگ ان پیغمبروں کو ماننے والے بنے ہوئے تھے۔

یہی معاملہ ہر پیغمبر کے ساتھ پیش آیا۔ ان کے زمانے کے لوگوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور بعد کے لوگوں نے ان کو عظمت وتقدس کا مقام دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اپنے زمانہ میں مجرد ایک داعی ہوتا ہے۔ مگر بعد کے زمانے میں اس کے نام کے ساتھ عظمتوں کی تاریخ وابستہ ہوجاتی ہے۔ ہر دور کے انسانوں نے یہ ثبوت دیا ہے کہ وہ پیغمبر کو مجرد داعی کے روپ میں پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ پیغمبر کو صرف عظمتوں کے روپ میں پہچاننا جانتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ ہی کا داعیانہ روپ تھے۔ مگر آپ کے زمانہ کے وہی لوگ جو حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ سے وابستگی پر فخر کرتے تھے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے سے انکار کردیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کو ماننے والے حقیقۃً کون لوگ ہیں۔ پیغمبر کو ماننے والے دراصل وہ لوگ ہیں جو ''دعوت'' والے پیغمبر کو پہچانیں۔ جو لوگ صرف ''عظمت'' والے پیغمبر کو پہچانیں وہ تاریخ کے مومن ہیں، نہ کہ حقیقۃً پیغمبر کے مومن۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

۴۵۔ پس کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کردیا اور وہ ظالم تھیں۔ پس اب وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں۔ اور کتنے ہی بیکار کنوئیں اور کتنے پختہ محل جو ویران پڑے ہوئے ہیں۔ ۴۶۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہوجاتے کہ وہ ان سے سمجھتے یا ان کے کان ایسے ہوجاتے کہ وہ ان سے سنتے کیوں کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

خدا کے نزدیک دیکھنے والے وہ لوگ ہیں جو عبرت اور نصیحت کی نظر سے چیزوں کو دیکھیں۔ جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ واقعات کو دیکھیں مگر اس سے نصیحت نہ لے سکیں وہ خدا کی نظر میں اندھے ہیں۔ ان کا دیکھنا جانور کا دیکھنا ہے، نہ کہ انسان کا دیکھنا۔

خدا نے زمین پر نصیحت کے بے شمار سامان پھیلا دئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ قدیم یادگاریں ہیں جو پچھلی قوموں نے دنیا میں چھوڑی ہیں۔ یہ قومیں کبھی عظمت واقتدار کا مقام حاصل کیے ہوئے تھیں۔ مگر آج ان کا نشان ٹوٹے ہوئے کھنڈروں کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ واقعہ ہر انسان کو اس کا انجام یاد دلا رہا ہے مگر جب لوگ دل والی آنکھ کھو دیں تو سر کی آنکھ انھیں کوئی بھی بامعنی چیز نہیں دکھاتی۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ ع

۴۷۔ اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی کیے ہوئے ہیں۔ اور اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔ اور تیرے رب کے یہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے اعتبار سے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ ۴۸۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو میں نے ڈھیل دی اور وہ ظالم تھیں۔ پھر میں نے ان کو پکڑ لیا۔ اور میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

اس دنیا میں کوئی شخص یا قوم اگر سرکشی کرے تو خدا ضرور اس کو پکڑتا ہے۔ مگر خدا کبھی پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔ انسان ایک دن میں بے برداشت ہوسکتا ہے مگر خدا ایک ہزار سال تک بھی بے برداشت نہیں ہوتا۔ خدا نافرمانیوں کو دیکھتا ہے پھر بھی لمبی مدت تک لوگوں کو موقع دیتا ہے تا کہ اگر وہ اصلاح کرنے والے ہوں تو اپنی اصلاح کرلیں۔ خدا کسی فرد یا قوم کو صرف اس وقت پکڑتا ہے جب کہ وہ آخری طور پر اپنا مجرم ہونا ثابت کرچکے ہوں۔

پچھلے لوگوں کے ساتھ خدا نے یہی معاملہ کیا۔ آئندہ کے لوگوں کے ساتھ بھی خدا اپنی اسی سنّت کے تحت معاملہ فرمائے گا۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَ الَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

۴۹۔ کہو کہ اے لوگو، میں تمھارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۵۰۔ پس جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے، ان کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی۔ ۵۱۔ اور جو لوگ ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑے، وہی دوزخ والے ہیں۔

انسان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بالآخر ایک ایسی دنیا میں پہنچنے والا ہے جہاں مومنین اور صالحین کے لیے ابدی راحت ہے اور جو لوگ حق کو نظر انداز کریں اور اس کے مقابلہ میں سرکشی کا رویہ دکھائیں ان کے لیے ابدی آگ کا عذاب۔

اسلامی دعوت کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اس آنے والے دن سے باخبر کردیا جائے۔ کام کی یہ نوعیت خود متعین کررہی ہے کہ داعی کا اصل کام خبردار کرنا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ صرف خدا سے متعلق ہے اور وہی اس کو انجام دے سکتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ
اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ
فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ
اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ لِّيَجْعَلَ مَا
يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ
لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ
فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

۵۲۔ اور ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا تو جب اس نے کچھ پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں ملا دیا۔ پھر اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے کو مٹا دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو پختہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ علم والا، حکمت والا ہے۔ ۵۳۔ تا کہ جو کچھ شیطان نے ملایا ہے، اس سے وہ ان لوگوں کو جانچے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جن کے دل سخت ہیں۔ اور ظالم لوگ مخالفت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ ۵۴۔ اور تا کہ وہ لوگ جن کو علم ملا ہے، وہ جان لیں کہ یہ فی الواقع تیرے رب کی طرف سے ہے، پھر وہ اس پر یقین لائیں۔ اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں۔ اور اللہ ایمان لانے والوں کو ضرور سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

حق کا داعی خواہ وہ پیغمبر ہو یا غیر پیغمبر، اس کے ساتھ ہمیشہ یہ پیش آتا ہے کہ جب وہ خدا کی سچی بات کا اعلان کرتا ہے تو معاندین اس کی بات میں طرح طرح کے شوشے نکالتے ہیں تا کہ لوگوں کو اس کی صداقت کے بارے میں مشتبہ کر دیں۔

اس طرح کے شوشے ہمیشہ بے بنیاد ہوتے ہیں۔ جب وہ پیش کیے جاتے ہیں تو داعی کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان کی وضاحت کر کے اپنی بات کو اور زیادہ ثابت شدہ بنا دے۔ اس سے مخلص لوگوں کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد خدا کے ساتھ ان کا تعلق اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ مگر جو لوگ مخلصانہ شعور سے خالی ہوتے ہیں، یہ شوشے ان کے لیے فتنہ بن جاتے ہیں۔ وہ ان کے فریب میں مبتلا ہو کر حق سے دور چلے جاتے ہیں۔

''اللہ ایمان والوں کو ضرور صراط مستقیم دکھاتا ہے''— اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جو لوگ فی الواقع ایمان کے معاملے میں سنجیدہ ہوں وہ کبھی جھوٹے پروپیگنڈوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ الفاظ کے طلسم سے کبھی دھوکا نہیں کھاتے۔ ان کا ایمان ان کے لیے ایسا علم بن جاتا ہے جو باتوں کو ان کی گہرائی کے ساتھ جان لے، نہ کہ محض باتوں کے ظواہر میں اٹک کر رہ جائے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ
حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ

۵۵۔ اور انکار کرنے والے لوگ ہمیشہ اس کی طرف سے شک میں پڑے رہیں گے، یہاں تک کہ اچانک ان پر قیامت آجائے، یا ایک منحوس

عَذَابُ يَوۡمٍ عَقِيۡمٍ ﴿۵۵﴾ اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ ؕ فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِىۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۵۷﴾ ع

دن کا عذاب آجائے۔ ۵۶۔ اس دن سارا اختیار صرف اللہ کو ہوگا۔ وہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ پس جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔ ۵۷۔ اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

پیغمبر کی دعوت میں دلیل کی عظمت پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ لوگ جو صرف ظاہری عظمتوں کو جانتے ہیں وہ پیغمبر کی معنوی عظمت کو دیکھ نہیں پاتے اور اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ شک وشبہ میں پڑے رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ حق کو ظاہری عظمتوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ حق کو مجرد روپ میں لوگوں کے سامنے لائے تاکہ جو لوگ حقیقت شناس ہیں وہ اس کو پہچان کر اس سے وابستہ ہو جائیں۔ اور جو ظاہر پرست ہیں وہ اس کو نظر انداز کر کے اپنا مجرم ہونا ثابت کریں۔

''آیتوں کو جھٹلانا'' یہ ہے کہ آدمی دلیل کی سطح پر ظاہر ہونے والے حق کو نظر انداز کر دے۔ وہ اس صداقت کو ماننے کے لیے تیار نہ ہو جو مجرد روپ میں اس کے سامنے ظاہر ہوئی ہے۔

وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوۡۤا اَوۡ مَاتُوۡا لَيَرۡزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدۡخِلَنَّهُمۡ مُّدۡخَلًا يَّرۡضَوۡنَهٗ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيۡمٌ حَلِيۡمٌ ﴿۵۹﴾

۵۸۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنا وطن چھوڑا، پھر وہ قتل کر دئے گئے یا وہ مر گئے، اللہ ضرور ان کو اچھا رزق دے گا۔ اور بے شک اللہ ہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ ۵۹۔ وہ ان کو ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ راضی ہوں گے۔ اور بے شک اللہ جاننے والا، حلم والا ہے۔

جو شخص ایمان کے معاملہ میں مخلص ہو اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہر دوسری چیز کی قربانی گوارا کر لیتا ہے۔ مگر ایمان کی قربانی اسے گوارا نہیں ہوتی۔ اس راہ میں اگر وطن چھوڑنا پڑے تو وہ وطن چھوڑ دیتا ہے۔ اس راہ میں قتل ہونا پڑے تو وہ قتل ہو جاتا ہے۔ وہ ایمان کے ساتھ بندھا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔

جو لوگ دنیا کی زندگی میں اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ ایمان کو سب سے قیمتی چیز سمجھتے ہیں، اللہ ان کی اس طرح قدر دانی فرمائے گا کہ انھیں آخرت کی سب سے قیمتی چیز دے دے گا۔ وہ وہاں ابدی طور پر خوشیوں اور راحتوں کی زندگی گزارتے رہیں گے۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿٦٠﴾

۶۰۔ یہ ہو چکا۔ اور جو شخص بدلہ لے ویسا ہی جیسا اس کے ساتھ کیا گیا تھا، اور پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا ہے۔

اہل ایمان کو یہ تلقین کی گئی تھی کہ وہ اس خدا کے طریقہ کو اپنا طریقہ بنائیں جو غفور ورحیم ہے۔ وہ لوگوں کی زیادتیوں سے مسلسل درگزر کرتا ہے۔ اور ان کو معاف فرماتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام کا گروہ عام طور پر اسی اخلاقِ خداوندی پر قائم تھا۔ ان پر ظلم کیا جاتا تھا مگر وہ اس کو برداشت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اشتعال انگیز باتیں کی جاتی تھیں مگر وہ درگزر کرتے تھے۔

تاہم بعض مسلمانوں سے ایسا ہوا کہ ان کے ساتھ زیادتی کی گئی تو فوری جذبہ کے تحت انھوں نے جوابی کارروائی کی۔ ان کو نقصان پہنچایا گیا تو انھوں نے بھی کچھ نقصان پہنچایا۔ دشمنوں نے اس کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا۔ وہ خود اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو بھول گئے۔ البتہ مسلمانوں کے معمولی واقعہ کو ظلم قرار دے کر ان کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔

ایسا کرنا بدترین کمینہ پن ہے۔ جو لوگ اس قسم کے کمینہ پن کا ثبوت دیں، وہ خدا کی غیرت کو چیلنج کرتے ہیں۔ بظاہر وہ ایک مسلمان کو ظالم ثابت کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت کی نظر میں وہ خود سب سے بڑے ظالم ہیں۔ وہ اپنے ظلم کی سخت ترین سزا پا کر رہیں گے۔ اس قسم کے جھوٹے پروپیگنڈوں سے وہ اہل حق کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٦١﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾

۶۱۔ یہ اس لیے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۶۲۔ یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جنھیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں۔ اور بے شک اللہ ہی سب سے اوپر ہے، سب سے بڑا ہے۔

دنیا کا نظام خاموش زبان میں انسان کو زبردست سبق دے رہا ہے۔ یہاں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی آتی ہے اور وہ دن کو ڈھانک لیتی ہے۔ یہاں ہر روز دن آتا ہے اور رات کی تاریکی کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ تمثیل کی زبان میں اس حقیقت کا کائناتی اعلان ہے کہ ایک گروہ اگر شان وشوکت حاصل کیے ہوئے ہو تو اس کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ اس کی شان وشوکت ختم ہونے والی نہیں۔ اسی طرح دوسرا گروہ مظلوم ہے تو اس کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی مظلومیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

جو خدا آسمانی دنیا میں روشنی کو تاریکی کے خانہ میں ڈال دیتا ہے اور تاریکی کو روشنی کا روپ عطا کرتا ہے وہی خدا انسانی دنیا میں بھی اسی قسم کے واقعات رونما کرسکتا ہے۔ یہاں کوئی بھی طاقت نہیں جو خدا کو ایسا کرنے سے روک دے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۡ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۚ ﴿٦٣﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٦٤﴾ ع ۸ ۱۵

۶۳۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر زمین سرسبز ہوگئی۔ بے شک اللہ باریک بیں ہے، خبر رکھنے والا ہے۔ ۶۴۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ بے شک اللہ ہی ہے جو بے نیاز ہے، تعریفوں والا ہے۔

دنیا میں جب ایک آدمی حق کے اوپر اپنی زندگی کھڑی کرتا ہے تو اس کو طرح طرح کی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ شیطان لوگوں کو ورغلاتا ہے اور وہ اس کو ستانے کے لیے جری ہو جاتے ہیں۔ یہ صورت حال بڑی سخت ہوتی ہے۔ اس کو دیکھ کر حق پرست آدمی مایوسی میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔

مگر کائنات زبان حال سے کہتی ہے کہ یہاں کسی بندۂ خدا کے لیے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ خدا ہر سال یہ منظر دکھاتا ہے کہ زمین کا سبزہ گرمی کی شدت سے جھلس جاتا ہے۔ مٹی خشک ویران نظر آنے لگتی ہے۔ بظاہر اس میں زندگی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اس کے بعد بارش برستی ہے۔ اور خشک مٹی میں سبزہ لہلہا اٹھتا ہے۔

یہ خدا کی قدرت کا ایک نمونہ ہے جو ہر سال مادی سطح پر دکھایا جاتا ہے۔ پھر خدا کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ انسانی سطح پر بھی اپنا یہی کرشمہ دکھا دے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٥﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾

۶۵۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے زمین کی چیزوں کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور کشتی کو بھی، وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔ اور اللہ آسمان کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے، مگر یہ کہ اس کے حکم سے۔ بے شک اللہ لوگوں پر نرمی کرنے والا، مہربان ہے۔ ۶۶۔ اور وہی ہے جس نے تم کو زندگی دی، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ پھر وہ تم کو زندہ کرے گا۔ بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

زمین کی تمام چیزیں ایک خاص توازن کو مسلسل اپنے اندر قائم رکھتی ہیں۔ اگر ان کا توازن بگڑ جائے تو چیزیں مفید بننے کے بجائے ہمارے لیے سخت مضر بن جائیں۔ پانی میں دھات کا ایک ٹکڑا ڈالیں تو وہ فوراً ڈوب جائے گا مگر پانی کو خدا نے ایک خاص قانون کا پابند بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ لوہے یا لکڑی کو کشتی کی صورت دے دی جائے تو وہ پانی میں نہیں ڈوبتی۔ خلا میں بے شمار کُرے ہیں۔ ان کو بظاہر گر پڑنا چاہیے۔ مگر وہ خاص قانون کے تحت نہایت صحت کے ساتھ اپنے مدار پر تھمے ہوئے ہیں۔

انسان نے اپنے آپ کو خود نہیں بنایا۔ اس کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ پھر اس کو ایک ایسی دنیا میں رکھا جو اس کے لیے سراپا رحمت ہے۔ مگر آزادی پا کر انسان ایسا سرکش ہو گیا کہ وہ اپنے سب سے بڑے محسن کے احسان کا اعتراف نہیں کرتا۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٦٧﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٧٠﴾

٦٧۔ اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہ مقرر کیا کہ وہ اس کی پیروی کرتے تھے۔ پس وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ اور تم اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو۔ ٦٨۔ اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ ٦٩۔ اللہ قیامت کے دن تمھارے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ ٧٠۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان اور زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ سب کچھ ایک کتاب میں ہے۔ بے شک یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔

عبادت کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کی اندرونی حقیقت اور دوسرے اس کا ظاہری طریقہ۔ اندرونی حقیقت عبادت کا اصل جزء ہے اور ظاہری طریقہ اس کا اضافی جزء۔ مگر کوئی گروہ جب لمبی مدت تک اس پر کاربند رہتا ہے تو وہ اس فرق کو بھول جاتا ہے۔ وہ عبادت کی ظاہری تعمیل ہی کو اصل عبادت سمجھ لیتا ہے۔

اسی کا نام جمود (stagnation) ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جب وہ اگلا پیغمبر بھیجتا ہے تو وہ اس کی شریعت (ظاہری طریقہ) میں کچھ فرق کر دیتا ہے۔ اس فرق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے جمود کو توڑا جائے۔ لوگوں کو ظاہر پرستی کی حالت سے نکال کر زندہ عبادت کرنے والا بنایا جائے۔ اب جو لوگ ظاہری آداب وقواعد ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہوں وہ پیغمبر کی اطاعت سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس

کے برعکس، جو لوگ عبادت کی حقیقت کو جانتے ہیں وہ پیغمبر کے کہنے پر عمل کرنے لگتے ہیں۔ یہ تبدیلی ان کی عبادت میں نئی روح پیدا کردیتی ہے۔ وہ ان کو جامد ایمان کی حالت سے نکال کر زندہ ایمان کی حالت تک پہنچا دیتی ہے۔

یہی وہ خاص حکمت ہے جس کی بنا پر ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کے منسک (طریقِ عبادت) میں بعض فرق رکھا گیا۔ جب کوئی پیغمبر نیا منسک لایا تو جمود میں پڑے ہوئے لوگوں نے اس کے خلاف سخت اعتراضات نکالنے شروع کیے۔ مگر پیغمبروں کو یہ حکم تھا کہ وہ ان امور کو موضوع بحث نہ بننے دیں۔ وہ اصلی اور بنیادی تعلیمات پر اپنی ساری توجہ صرف کریں اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیں۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ مَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾ ع ۹ ۸ ۱۶

۷۱۔ اور وہ اللہ کے سوا ان کی عبات کرتے ہیں جن کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ ان کے بارے میں ان کو کوئی علم ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ ۷۲۔ اور جب ان کو ہماری واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم منکروں کے چہرے پر برے آثار دیکھتے ہو۔ گویا کہ وہ ان لوگوں پر حملہ کردیں گے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ کہو کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ اس سے بدتر چیز کیا ہے۔ وہ آگ ہے۔ اس کا اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جنھوں نے انکار کیا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

خالص توحید کی دعوت ہمیشہ ان لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے جو ایک اللہ کے سوا دوسروں سے اپنی عقیدتیں وابستہ کیے ہوئے ہوں۔ وہ اپنے معبودوں اور اپنی محبوب شخصیتوں پر تنقید کو سن کر بپھر اٹھتے ہیں۔ دعوتِ حق کی تردید سے اپنے آپ کو بے بس پاکر وہ داعیان حق پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا سرے سے خاتمہ کردیں۔

ایسے لوگوں سے کہا گیا کہ تمھارا رویہ سراسر بے عقلی کا رویہ ہے۔ آج تم لفظی تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ کل تمھارا کیا حال ہوگا جب کہ تمھیں اپنی اس روش کی بنا پر آگ کا عذاب برداشت کرنا پڑے گا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

۷۳۔ اے لوگو، ایک مثال بیان کی جاتی ہے تو اس کو غور سے سنو، تم لوگ خدا کے سوا جس چیز کو پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ سب کے سب اس کے لیے جمع ہو جائیں۔ اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے تو وہ اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی گئی وہ بھی کمزور۔ ۷۴۔ انھوں نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ بے شک اللہ طاقت ور ہے، غالب ہے۔

اللہ کے سوا کسی اور کو تقدس کا مقام دینا سراسر بے عقلی کی بات ہے۔ اس لیے مقدس مقام اس کو دیا جاتا ہے جس کے اندر کوئی طاقت ہو۔ اور اس دنیا کا حال یہ ہے کہ یہاں کسی بھی انسان یا غیر انسان کو کوئی حقیقی طاقت حاصل نہیں۔ مکھی ایک انتہائی معمولی چیز ہے۔ مگر زمین و آسمان کی تمام چیزیں مل کر بھی ایک مکھی کو وجود میں نہیں لاسکتیں۔ پھر کسی غیر خدا کو مقدس سمجھنا کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔

اس قسم کے تمام عقیدے دراصل خدا کی خدائی کے کمتر اندازہ (underestimation) پر مبنی ہیں۔ لوگ خدا کو مانتے ہیں مگر وہ اس کی عظمت وقدرت سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ خدا کو ویسا مانیں جیسا کہ اس کو ماننا چاہیے تو انھیں اپنے یہ تمام عقیدے مضحکہ خیز حد تک بے معنی معلوم ہوں۔ وہ خود ہی ایسے تمام عقیدوں سے دست بردار ہوجائیں۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾

۷۵۔ اللہ فرشتوں میں سے اپنا پیغام پہنچانے والا چنتا ہے، اور انسانوں میں سے بھی۔ بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۷۶۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں سارے معاملات۔

اللہ نے جس اسکیم کے تحت انسان کو بنایا اور اس کو زمین پر رکھا، اس کا یہ تقاضا تھا کہ وہ انسانوں کی ہدایت کا انتظام کرے۔ وہ ان کو بتائے کہ جنت کا راستہ کون سا ہے اور جہنم کا راستہ کون سا۔ چنانچہ اس نے یہ انتظام کیا کہ وہ انسانوں میں سے کسی کو پیغمبری کے لیے چنتا ہے۔ اور اس کے پاس فرشتہ کے ذریعہ اپنا کلام بھیجتا ہے۔

اس انتظام کے تحت انسان کو اصل حقیقت سے باخبر کیا جارہا ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ لوگوں کے

اعمال کی نگرانی بھی فرما رہا ہے۔ اس کے بعد جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو تمام لوگ خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے تاکہ اپنی اپنی کارکردگی کے مطابق اپنے انجام کو پائیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٧٧﴾ السجدة عند الشافعي وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٧٨﴾ ع ١٠ / ١٧

۷۷۔ اے ایمان والو، رکوع اور سجدہ کرو۔ اور اپنے رب کی عبادت کرو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ ۷۸۔ اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اسی نے تم کو چنا ہے۔ اور اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، تمھارے باپ ابراہیم کا دین۔ اسی نے تمھارا نام مسلم رکھا۔ اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ بنو۔ پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور اللہ کو مضبوط پکڑو، وہی تمھارا مالک ہے۔ پس کیسا اچھا مالک ہے اور کیسا اچھا مددگار۔

اس آیت کا خطاب اصلاً اصحابِ رسول سے اور تبعاً تمام مومنین قرآن سے ہے۔ اس گروہ کو خدا نے اس خاص کام کے لیے منتخب کیا ہے کہ وہ قیامت تک تمام قوموں کو خدا کے سچے اور حقیقی دین سے باخبر کرتا رہے۔ رسول نے یہی عملِ شہادت اپنے زمانے کے لوگوں پر کیا۔ اور آپ کے پیروؤں کو یہی عمل بعد کو اپنے ہم زمانہ لوگوں پر انجام دینا ہے۔

یہ کام ایک بے حد نازک کام ہے۔ اس کے لیے مجاہدانہ عمل درکار ہے۔ اس کو صرف وہی لوگ حقیقی طور پر انجام دے سکتے ہیں، جو صحیح معنوں میں خدا کے آگے جھکنے والے بن گئے ہوں۔ جو دوسروں کے اتنے زیادہ خیر خواہ ہوں کہ اپنا وقت اور اپنا پیسہ ان کے لیے خرچ کرنے میں خوشی محسوس کریں۔ جو ہر دوسری چیز سے اوپر اٹھ کر صرف ایک خدا پر بھروسہ کرنے والے بن گئے ہوں۔ جو حقیقی معنوں میں لفظ ''مسلم'' کا مصداق ہوں جو ان کے لیے خصوصی طور پر وضع کیا گیا ہے۔

تاہم اس کارِ شہادت کے ساتھ خدا نے ایک خاص معاملہ یہ کیا ہے کہ اس کی راہ کی خارجی رکاوٹوں کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا میں ایسا انقلاب لایا گیا ہے جس نے ان رکاوٹوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، جن کا سابقہ پچھلے نبیوں اور ان کی امتوں کو پیش آتا تھا۔ اب اس کام کے لیے حقیقی رکاوٹ کوئی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قرآن کے حاملین خود ہی اپنی نادانی سے اپنی راہ میں خود ساختہ مشکلیں پیدا کرلیں اور ایک آسان کام کو مصنوعی طور پر مشکل کام بنا ڈالیں۔

۲۳-سُوۡرَۃُ الۡمُؤۡمِنُوۡن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ
صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنِ
اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ
فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِفُرُوۡجِہِمۡ
حٰفِظُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ
اَیۡمَانُہُمۡ فَاِنَّہُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ
ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡعٰدُوۡنَ ۚ﴿۷﴾
وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ﴿۸﴾
وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۘ﴿۹﴾
اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ
الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
☆۱۔ یقیناً فلاح پائی ایمان والوں نے۔ ۲۔ جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں۔ ۳۔ اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ۴۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔ ۵۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ۶۔ سوا اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملکِ یمین میں ہوں کہ ان پر وہ قابل ملامت نہیں۔ ۷۔ البتہ جو اس کے علاوہ چاہیں تو وہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔ ۸۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔ ۹۔ اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۱۰۔ یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں، ۱۱۔ جو فردوس کی وراثت پائیں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

خدا کی اس دنیا میں کامیابی صرف اس شخص کے لیے ہے جو صاحبِ ایمان ہو، جو کسی اور والا نہ ہو کر ایک اللہ والا بن جائے۔ جس کی زندگی اندر سے باہر تک ایمان میں ڈھل گئی ہو۔

جب کسی شخص کو ایمان ملتا ہے تو یہ سادہ سی بات نہیں ہوتی۔ یہ اس کی زندگی میں ایک انقلاب آنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اب وہ اللہ کی عبادت کرنے والا اور اس کے آگے جھکنے والا بن جاتا ہے۔ اس کی سنجیدگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بے فائدہ مشاغل میں وقت ضائع کرنا اس کو ہلاکت معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ خدا کے نام پر نکالتا ہے۔ اور اس سے ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے۔ وہ اپنی شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھنے والا بن جاتا ہے۔ اور اس کو انھیں حدود کے اندر استعمال کرتا ہے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ وہ دنیا میں ایک ذمہ دار آدمی کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ دوسرے کی امانت میں وہ کبھی خیانت نہیں کرتا۔ کسی سے جب وہ کوئی عہد کر لیتا ہے تو وہ کبھی اس کے خلاف نہیں جاتا۔

جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات ہوں وہ اللہ کے مطلوب بندے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے خدا

نے جنت الفردوس کی معیاری دنیا تیار کر رکھی ہے۔ موت کے بعد وہ اس کی فضا میں داخل کر دئے جائیں گے تاکہ ابدی طور پر اس کے اندر عیش کرتے رہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾

۱۲۔ اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ ۱۳۔ پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ ۱۴۔ پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک جنین کی شکل دی۔ پھر جنین کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا۔ ۱۵۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے۔ ۱۶۔ پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

انسان کا بچہ ماں کے پیٹ کے اندر پرورش پاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں استقرار حمل سے لے کر بچہ کی پیدائش تک کی پوری مدت انسان کے لیے ایک چھپی ہوئی چیز کی حیثیت رکھتی تھی۔ بیسویں صدی میں جدید سائنسی ذرائع کے بعد یہ ممکن ہوا ہے کہ پیٹ میں پرورش پانے والے بچہ کا مشاہدہ کیا جائے اور اس کی بابت براہ راست معلومات حاصل کی جائیں۔

قرآن نے چودہ سو سال پہلے انسانی تخلیق کے جو مختلف تدریجی مراحل بتائے تھے، وہ حیرت انگیز طور پر دور جدید کے مشینی مشاہدہ کے عین مطابق ثابت ہوئے ہیں۔ یہ ایک کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جدید تحقیق اور قرآن کے بیان میں اتنی کامل مطابقت ممکن نہ تھی۔

تخلیق کا یہ واقعہ جو ہر روز ماں کے پیٹ میں ہو رہا ہے وہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک حد درجہ باکمال ہستی ہے۔ انسان کی تخلیقِ اول کا حیرت ناک واقعہ جو ہر روز ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے وہی یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ اسی طرح تخلیقِ ثانی کا واقعہ بھی ہوگا۔ اور عین اس کے مطابق ہوگا جس کی خبر نبیوں کے ذریعہ دی گئی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ

۱۷۔ اور ہم نے تمھارے اوپر سات راستے بنائے۔ اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ہوئے۔ ۱۸۔ اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازے کے

السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ
وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا
لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ
فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾
وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ
بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي
الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَ
لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾
وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع ۲

ساتھ۔ پھر ہم نے اس کو زمین میں ٹھہرا دیا۔ اور ہم اس کو واپس لینے پر قادر ہیں۔ ۱۹۔ پھر ہم نے اس سے تمھارے لیے کھجور اور انگور کے باغ پیدا کئے۔ تمھارے لیے ان میں بہت سے پھل ہیں۔ اور تم ان میں سے کھاتے ہو۔ ۲۰۔ اور ہم نے وہ درخت پیدا کیا جو طورِ سینا سے نکلتا ہے، وہ تیل لیے ہوئے اگتا ہے۔ اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی۔ ۲۱۔ اور تمھارے لیے مویشیوں میں سبق ہے۔ ہم تم کو ان کے پیٹ کی چیز سے پلاتے ہیں۔ اور تمھارے لیے ان میں بہت فائدے ہیں۔ اور تم ان کو کھاتے ہو۔ ۲۲۔ اور تم ان پر اور کشتیوں پر سواری کرتے ہو۔

انسان ایک حقیر وجود ہے۔ اس کے مقابلہ میں کائنات دہشت ناک حد تک عظیم ہے۔ مگر کائنات کا سب سے زیادہ حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ وہ انسان کے لیے انتہائی طور پر موافق ہے۔

یہاں وسیع خلا میں ان گنت ستارے اور سیارے تیز رفتاری کے ساتھ گھوم رہے ہیں مگر بے شمار ناموافق امکانات کے باوجود وہ انسان کے لیے کوئی ناموافق صورت حال پیدا نہیں کرتے۔ بارش اگر بہت زیادہ برسنے لگے تو انسانی آبادیاں تباہ ہو جائیں مگر اس کی بھی ایک حد ہے، وہ اس حد سے باہر نہیں جاتی۔ زمین پر پانی کے جو ذخیرے ہیں وہ سب کے سب زمین میں جذب ہو سکتے ہیں یا بھاپ بن کر فضا میں اڑ سکتے ہیں مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا۔

مزید یہ کہ زمین کی صورت میں ایک استثنائی کرہ موجود ہے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص طور پر انسان کی ضروریات کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔ یہاں انسان کی غذائی ضروریات سے لے کر اس کی صنعتی ضروریات تک تمام چیزیں افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ زمین کے جانور بظاہر وحشی مخلوق ہیں مگر ان کو خدا نے طرح طرح سے انسان کے لیے کارآمد بنا دیا ہے۔ ان جانوروں کا پیٹ ایک حیرت انگیز کارخانہ ہے جو گھاس اور چارہ لیتا ہے اور اس کو دودھ اور گوشت جیسی قیمتی چیزوں میں تبدیل کرتا ہے۔ جانوروں میں سے بہت سے جانور ہیں جو جانور ہونے کے باوجود اپنے آپ کو پوری طرح انسان کے قبضہ میں دے دیتے ہیں کہ وہ ان پر سواری کرے اور ان سے دوسرے مختلف فائدے حاصل کرے۔ یہ واقعات اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ انسان اپنے مہربان خدا کو پہچانے اور اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ
يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ
اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ
يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ
اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ
جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

۲۳۔اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا کہ اے میری قوم، تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۲۴۔تو اس کی قوم کے سردار جنھوں نے انکار کیا تھا، انھوں نے کہا کہ یہ تو بس تمھارے جیسا ایک آدمی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمھارے اوپر برتری حاصل کرے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ فرشتے بھیجتا۔ ہم نے یہ بات اپنے پچھلے بڑوں میں نہیں سنی۔ ۲۵۔ یہ تو بس ایک شخص ہے جس کو جنون ہو گیا ہے۔ پس ایک وقت تک اس کا انتظار کرو۔

حضرت نوح جس قوم میں آئے وہ معروف معنوں میں کوئی ''کافر'' قوم نہ تھی۔ بلکہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی امت تھی۔ وہ خدا پر اور رسالت پر عقیدہ رکھتی تھی۔ اس کے باوجود کیوں اس نے حضرت نوح کو خدا کا پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی — نوح اس کو اپنے جیسے ایک آدمی معلوم ہوئے۔

پیغمبر ایک انسان ہوتا ہے وہ ماں باپ کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اپنے زمانہ کے لوگوں کو وہ ہمیشہ اپنے ہی جیسا ایک آدمی دکھائی دیتا ہے۔ یہ صرف بعد کی تاریخ میں ہوتا ہے کہ پیغمبر کا نام لوگوں کو ایک پُرعظمت نام محسوس ہونے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کے ہم عصر پیغمبر کو پہچان نہیں پاتے۔ ان کو پیغمبر ایک ایسا آدمی معلوم ہوتا ہے جو بڑا بننے کے لیے فرضی طور پر پیغمبری کا دعویٰ کرنے لگے۔ وہ پیغمبر کو ایک مجنون سمجھ کر اس کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

ہر امت کا یہ حال ہوا کہ بعد کے زمانہ میں وہ خدا کی تعلیمات کے بجائے اپنے اسلاف کی روایت پر قائم ہوگئی۔ پیغمبر نے آکر جب اصل دینی تعلیمات کو دوبارہ پیش کیا تو پیغمبر کا دین اس کو اسلاف کی روایات سے ہٹا ہوا معلوم ہوا۔ اس کے اپنے ذہنی سانچہ میں اس کو اسلاف برتر نظر آئے اور وقت کا پیغمبر ان کے مقابلہ میں اس کو کمتر دکھائی دیا۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ہر دور میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں کی دعوت ان کے ہم عصروں کے لیے اجنبی بنی رہی۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾
فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ

۲۶۔نوح نے کہا کہ اے میرے رب تو میری مدد فرما کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلا دیا۔ ۲۷۔تو ہم نے اس کو وحی کی کہ تم کشتی تیار کرو ہماری نگرانی میں اور

وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾

ہماری ہدایت کے مطابق۔ تو جب ہمارا حکم آجائے اور زمین سے پانی ابل پڑے تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہوجاؤ۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوا ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہوچکا ہے۔ اور جنھوں نے ظلم کیا ہے، ان کے معاملہ میں مجھ سے بات نہ کرنا۔ بے شک ان کو ڈوبنا ہے۔

حضرت نوح لمبی مدت تک اپنی قوم کو تلقین کرتے رہے۔ مگر ان کی قوم ان کی بات ماننے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ آخر کار حضرت نوح نے دعا کی کہ خدایا، میری دعوت وتبلیغ ان سے امر حق کو منوا نہ سکی۔ اب تو ہی ان پر امرِ حق کو ظاہر کردے۔ مگر جب انسانی عمل کی حد ختم ہو کر خدائی عمل کی حد شروع ہو تو یہ مواخذہ کا وقت ہوتا ہے، نہ کہ وعظ وتلقین کا۔ چنانچہ خدا کا حکم ناقابل تسخیر طوفان کی صورت میں ظاہر ہوا اور چند مومنین نوح کو چھوڑ کر بقیہ ساری قوم غرق ہو کر رہ گئی۔

امر حق کا اعتراف نہ کرنا سب سے بڑا ظلم ہے۔ جو لوگ اس ظلم کا ارتکاب کریں وہ ہمیشہ خدا کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ کوئی دوسری چیز انھیں اس پکڑ سے بچانے والی ثابت نہیں ہوتی۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾

۲۸۔ پھر جب تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جائیں تو کہو کہ شکر ہے اللہ کا جس نے ہم کو ظالم لوگوں سے نجات دی۔ ۲۹۔ اور کہو کہ اے میرے رب، تو مجھے اتار برکت کا اتارنا اور تو بہتر اتارنے والا ہے۔ ۳۰۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں اور بے شک ہم بندوں کو آزماتے ہیں۔

شرک سے بھرے ہوئے ماحول میں جو چند افراد حضرت نوح پر ایمان لائے وہ اسی دن معنوی اعتبار سے خدا کی کشتی میں داخل ہوچکے تھے۔ اس کے بعد جب طوفان کے وقت وہ لکڑی کی بنائی ہوئی کشتی میں بیٹھے تو یہ گویا ان کے ابتدائی فیصلے کی تکمیل تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو فکری طور پر بدی کے طوفان سے بچایا تھا۔ خدا نے ان کو عملی طور پر بدی کے سخت انجام سے بچالیا۔

مومن ہر کامیابی کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہے۔ اسی لیے وہ ہر کامیابی پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور طوفان نوح سے نجات تو کھلا ہوا خدائی نصرت کا واقعہ تھا۔ ایسے موقع پر مومن کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں وہ وہی

ہیں جن کی ایک تصویر مذکورہ آیت میں نظر آتی ہے۔ وہ حال کے لیے خدا کی قدرت کا اعتراف کرتے ہوئے مستقبل کے لیے مزید عنایت کی التجا کرنے لگتا ہے، کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ حال بھی خدا کے قبضہ میں ہے اور مستقبل بھی خدا کے قبضہ میں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٣١﴾
فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٣٢﴾ ع ۲
وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ
كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ
يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَ يَشْرَبُ مِمَّا
تَشْرَبُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَ لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ
اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٣٤﴾

۳۱۔ پھر ہم نے ان کے بعد دوسرا گروہ پیدا کیا۔ ۳۲۔ پھر ان میں سے ایک رسول انھیں میں سے بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۳۳۔ اور اس کی قوم کے سرداروں نے، جنھوں نے انکار کیا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، اور ان کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودگی دی تھی، کہا یہ تو تمھارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو، اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ ۳۴۔ اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی بات مانی تو تم بڑے گھاٹے میں رہوگے۔

حضرت نوح کے مومنین کی نسل بڑھی اور اس پر صدیاں گزر گئیں تو دوبارہ وہ اسی گمراہی میں مبتلا ہوگئے، جس میں ان کے پچھلے لوگ مبتلا ہوئے تھے۔ اس سے مراد غالباً وہی قوم ہے جس کو قوم عاد کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ خدا سے غافل ہو کر غیر خداؤں میں مشغول ہوگئے۔ اب دوبارہ ان کے درمیان خدا کا رسول آیا۔ اور اس نے ان کو حق سے آگاہ کیا۔

مگر دوبارہ یہی ہوا کہ قوم کے سردار پیغمبر کے مخالف بن کر کھڑے ہوگئے۔ یہ سردار وہ لوگ تھے جو وقت کے خیالات سے موافقت کر کے لوگوں کے قائد بنے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ خوش حالی بھی ان کے گرد جمع ہوگئی تھی۔ یہ ایک عام کمزوری ہے کہ جن لوگوں کو دولت اور اقتدار حاصل ہوجائے وہ اس کو اپنے برسر حق ہونے کی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ یہی ان سرداروں کے ساتھ ہوا۔ ان کی خوش حالی اور اقتدار ان کے لیے یہ سمجھنے میں مانع ہوگئے کہ وہ غلطی پر بھی ہوسکتے ہیں۔

انھوں نے دیکھا کہ پیغمبر کے گرد نہ دولت کا ڈھیر جمع ہے اور نہ اس کو اقتدار کی گدی حاصل ہے۔ اس لیے انھوں نے پیغمبر کو حقیر سمجھ لیا۔ وہ اپنی ظاہر پرستی کی بنا پر پیغمبر کی معنوی عظمت کو دیکھنے میں ناکام رہے۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ
عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ
لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا
نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنْ
هُوَ اِلَّا رَجُلُ ِۨ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا
نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

۳۵۔ کیا یہ شخص تم سے کہتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجاؤ گے تو پھر تم نکالے جاؤ گے۔ ۳۶۔ بہت ہی بعید اور بہت ہی بعید ہے جو بات تم سے کہی جارہی ہے۔ ۳۷۔ زندگی تو یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ ۳۸۔ یہ تو بس ایک ایسا شخص ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔ اور ہم اس کو ماننے والے نہیں۔

اس آیت میں آخرت کے بارے میں جو کلمات نقل کیے گئے ہیں وہ کبھی زبان حال سے ادا ہوتے ہیں اور کبھی زبان قال سے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ہمہ تن بس دنیا کی چیزوں میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ آخرت سے اس طرح غافل نظر آتا ہے جیسے کے آخرت اس کے نزدیک بالکل بعید از قیاس بات ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی آخرت سے غفلت اس کو سرکشی کی اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ اپنی زبان سے بھی کہہ دیتا ہے کہ آخرت تو بہت بعید از قیاس چیز ہے۔ اس لیے آج جو کچھ مل رہا ہے اس کو حاصل کرو، کل کے موہوم فائدہ کی خاطر آج کے یقینی فائدہ کو نہ کھوؤ۔

''اس شخص نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے''— اس کلمہ کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی عین اسی جملہ کو اپنی زبان سے ادا کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ داعیٔ حق کو اس طرح نظر انداز کرے جیسے کہ اس کی بات محض ایک سرپھرے شخص کی بات ہے۔ اس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾ قَالَ
عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾
فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ
فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

۳۹۔ رسول نے کہا، اے میرے رب، میری مدد فرما کہ انھوں نے مجھ کو جھٹلا دیا۔ ۴۰۔ فرمایا کہ یہ لوگ جلد ہی پچھتائیں گے۔ ۴۱۔ پس ان کو ایک سخت آواز نے حق کے مطابق پکڑ لیا۔ پھر ہم نے ان کو خس وخاشاک کردیا۔ پس دور ہو ظالم قوم۔

خدا کا پیغمبر جس چیز کے اعلان کے لیے آتا ہے وہ اس کائنات کی سب سے سنگین حقیقت ہے۔ مگر پیغمبر اس حقیقت کو صرف دلیل کے روپ میں ظاہر کرتا ہے۔ وہی لوگ دراصل مومن ہیں جو اس کو دلیل کے روپ میں پہچانیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالہ کردیں۔

جب کوئی گروہ آخری طور پر یہ ثابت کر دے کہ وہ حقیقت کو دلیل کے روپ میں پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو پھر خدا حقیقت کو "صَیْحَہ" کے روپ میں ظاہر کرتا ہے۔ حقیقت ایک ایسی چنگھاڑ بن جاتی ہے جس کا سامنا کرنے کی طاقت کسی کو نہ ہو۔ مگر جب حقیقت صَیْحَہ کے روپ میں ظاہر ہو جائے تو یہ اس کو بھگتنے کا وقت ہوتا ہے، نہ کہ اس کو ماننے کا۔ حقیقت جب صَیْحَہ کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے تو آدمی کے حصہ میں صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ابد تک اپنی اس نادانی پر پچھتاتا رہے کہ اس نے حقیقت کو دیکھا مگر وہ اس کی طرف سے اندھا بنا رہا۔ حقیقت کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی مگر اس نے اس کو سننے کے لیے اپنے کان بند کر لئے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٤٢﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿٤٣﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٤٤﴾

۴۲۔ پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قومیں پیدا کیں۔ ۴۳۔ کوئی قوم نہ اپنے وعدہ سے آگے جاتی اور نہ اس سے پیچھے رہتی۔ ۴۴۔ پھر ہم نے لگاتار اپنے رسول بھیجے۔ جب بھی کسی قوم کے پاس اس کا رسول آیا تو انھوں نے اس کو جھٹلایا۔ تو ہم نے ایک کے بعد ایک کو لگا دیا۔ اور ہم نے ان کو کہانیاں بنا دیا۔ پس دور ہوں وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے۔

پیغمبروں کے بعد ہمیشہ ان کی امتوں میں بگاڑ آتا رہا۔ ان کی اصلاح کے لیے بار بار پیغمبر بھیجے گئے — امت آدم میں حضرت نوح آئے۔ اس کے بعد امت نوح (عاد) میں حضرت ہود آئے۔ پھر امت ہود (ثمود) میں حضرت صالح آئے، وغیرہ۔ مگر ہر بار یہ ہوا کہ وہی لوگ جو ماضی کے پیغمبر کو بلا بحث مانے ہوئے تھے وہ حال کے پیغمبر کو کسی طرح ماننے پر تیار نہ ہوئے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کا پیغمبر طویل روایات کے نتیجے میں قومی فخر کا نشان بن جاتا ہے۔ وہ قوموں کے لیے ان کی قومی تشخص کی علامت ہوتا ہے۔ وہ ان کے لیے قومی ہیرو کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کو مان کر آدمی کے احساس برتری کو تسکین ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے پیغمبر کو کون نہیں مانے گا۔

مگر حال کے پیغمبر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ حال کے پیغمبر کے ساتھ اس کی تاریخ وابستہ نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ عظمت اور تقدس کی روایت شامل نہیں ہوتی۔ اس کو ماننا صرف ایک معنوی حقیقت کے اعتراف کے ہم معنی ہوتا ہے، نہ کہ کسی ہمالیائی عظمت سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے پیغمبروں کو ماننے والے ہمیشہ حال کے پیغمبر کا انکار کرتے رہے۔

"دور ہوں جو ایمان نہیں لاتے" — اس کو لفظ بدل کر کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دور ہوں وہ لوگ جو خدا

کے سفیر کو خدا کے سفیر کی حیثیت سے نہیں پہچان پاتے۔ وہ خدا کے سفیر کو صرف اسی وقت پہچانتے ہیں جب کہ تاریخی عمل کے نتیجے میں وہ ان کا قومی ہیرو بن چکا ہو۔

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَ اَخَاہُ ہٰرُوۡنَ ۬ۙ بِاٰیٰتِنَا وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ۙ۴۵﴾ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَ کَانُوۡا قَوۡمًا عَالِیۡنَ ﴿ۚ۴۶﴾ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُہُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴿ۚ۴۷﴾ فَکَذَّبُوۡہُمَا فَکَانُوۡا مِنَ الۡمُہۡلَکِیۡنَ ﴿۴۸﴾ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ لَعَلَّہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۵۔ پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو بھیجا اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ۔ ۴۶۔ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ مغرور لوگ تھے۔ ۴۷۔ پس انھوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں، حالاں کہ ان کی قوم کے لوگ ہمارے تابع دار ہیں۔ ۴۸۔ پس انھوں نے ان کو جھٹلا دیا، پھر وہ ہلاک کردئے گئے۔ ۴۹۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تاکہ وہ راہ پائیں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون بنی اسرائیل کے فرد تھے۔ بنی اسرائیل اس وقت مصر میں تھے اور وہاں کی حکمراں قوم کے لیے مزدور کی حیثیت رکھتے تھے۔ بنی اسرائیل کی کمتر حیثیت اور ان کے مقابلہ میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کی برتر حیثیت ان کے لیے مانع بن گئی۔ وہ ایک اسرائیلی پیغمبر کو نمائندہ خدا ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ حضرت موسیٰ نے اگر چہ ان کے سامنے نہایت محکم دلائل پیش کئے۔ مگر دلائل کا وزن انھیں اس کے لیے مجبور نہ کر سکا کہ وہ اپنی برتر نفسیات کو بدلیں اور ایک محکوم شخص کی زبان سے ظاہر ہونے والی صداقت کا اعتراف کریں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی مدد کی۔ فرعون اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ غرق کردیا گیا۔ دوسری طرف جن لوگوں نے پیغمبر کا ساتھ دیا تھا۔ ان پر خدا نے یہ احسان فرمایا کہ ان کے پاس اپنا ہدایت نامہ بھیجا جس کو اختیار کرکے آدمی دنیا اور آخرت میں کامیابی کو اپنے لیے یقینی بنا سکتا ہے۔

وَ جَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡیَمَ وَ اُمَّہٗۤ اٰیَۃً وَّ اٰوَیۡنٰہُمَاۤ اِلٰی رَبۡوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیۡنٍ ﴿ؑ۵۰﴾ ع ۳ ۱۸

۵۰۔ اور ہم نے مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو ایک نشانی بنایا اور ہم نے ان کو ایک اونچی زمین پر ٹھکانا دیا جو سکون کی جگہ تھی اور وہاں چشمہ جاری تھا۔

حضرت مسیح کی بغیر باپ کے پیدائش ایک بے حد انوکھا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ کیوں ہوا۔ یہ ایک ''نشانی'' کے طور پر ہوا۔ قدیم زمانہ میں یہود کو حاملِ رسالت گروہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مگر انھوں نے مسلسل سرکشی سے اپنے

لیے اس کا استحقاق کھو دیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ یہ امانت ان سے لے کر بنو اسماعیل کو دے دی جائے۔ چنانچہ یہود کے اوپر آخری اتمام حجت کے لیے ان کے آخری پیغمبر کو معجزاتی انداز میں پیدا کیا گیا۔ اور اس پیغمبر کو مزید غیر معمولی معجزے دیے گئے۔ اس کے باوجود جب یہود آپ کے منکر بنے رہے تو یہ بات آخری طور پر ثابت ہوگئی کہ وہ حامل رسالت بننے کے اہل نہیں ہیں۔

حضرت مسیح کی والدہ حضرت مریم کے لیے یہ انتہائی نازک مرحلہ تھا۔ ایسے حال میں ان کو سخت ضرورت تھی کہ کوئی ایسا گوشہ ہو جہاں وہ لوگوں کی نظروں سے دور ہو کر رہ سکیں۔ وہاں زندگی کی ضروری چیزیں بھی ہوں اور سکون واطمینان بھی حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو اس نازک امتحان میں ڈالا تو اسی کے ساتھ ان کے وطن کے قریب ایک پُرامن گوشہ بھی ان کے لیے مہیا فرما دیا۔

یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴿۵۱﴾ وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾

۵۱۔ اے پیغمبرو، ستھری چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو۔ میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۵۲۔ اور یہ تمھارا دین ایک ہی دین ہے۔ اور میں تمھارا رب ہوں، تو تم مجھ سے ڈرو۔

دین اصلاً صرف ایک ہے۔ اور یہی ایک دین تمام پیغمبروں کو بتایا گیا۔ وہ یہ کہ آدمی خدا کو ایک ایسی عظیم ہستی کی حیثیت سے پائے کہ وہ اس سے ڈرنے لگے۔ اس کے دل ودماغ پر یہ تصور چھا جائے کہ اس کے اوپر ایک خدا ہے۔ وہ ہر حال میں اس کو دیکھ رہا ہے اور وہ موت کے بعد اس سے اس کے تمام اعمال کا حساب لے گا۔

یہ معرفت ہی اصل دین ہے۔ اس معرفت اور اس احساس کے تحت جو زندگی بنے وہ یہی ہوگی کہ آدمی دنیا کی چیزوں میں سے پاکیزہ اور ستھری چیزیں لے گا۔ وہ اپنے معاملات میں نیکی اور بھلائی کا طریقہ اختیار کرے گا۔ خدا کی معرفت کا لازمی نتیجہ خدا کا خوف ہے اور خدا کے خوف کا لازمی نتیجہ نیک زندگی۔

فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰی حِیْنٍ ﴿۵۴﴾ اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِیْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

۵۳۔ پھر لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی پر وہ نازاں ہے۔ ۵۴۔ پس ان کو ان کی بے ہوشی میں کچھ دن چھوڑ دو۔ ۵۵۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو جو مال اور اولاد دیے جا رہے ہیں۔ ۵۶۔ تو ہم ان کو فائدہ پہنچانے میں سرگرم ہیں، بلکہ وہ بات کو نہیں سمجھتے۔

خدا کا دین جب اپنی اصل روح کے ساتھ زندہ ہو تو وہ لوگوں میں خوف پیدا کرتا ہے اور جب دین کی اصل روح نکل جائے تو وہ فخر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ اہلِ دین گروہوں میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ ہر گروہ اپنے حالات کے لحاظ سے کوئی ایسا پہلو لے لیتا ہے جس میں اس کے لیے فخر کا سامان موجود ہو۔ فخر والے دین ہمیشہ کئی ہوتے ہیں اور خوف والا دین ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ بے خوفی کی نفسیات رایوں کا تعدد پیدا کرتی ہے اور خوف کی نفسیات رایوں کا اتحاد۔

موجودہ دنیا میں انسان حالتِ امتحان میں ہے۔ خدا کے علم میں کسی شخص یا گروہ کی جو مدت ہے اس مدت تک اس کو زندگی کا سامان لازماً دیا جاتا ہے۔ اس بنا پر غافل لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ صحیح کر رہے ہیں۔ اگر وہ غلطی پر ہوتے تو ان کا مال و اسباب ان سے چھین لیا جاتا۔ حالاں کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ مال و اسباب مدتِ امتحان کے ختم ہونے پر چھینا جائے، نہ کہ امتحان کے دوران میں ہدایت سے انحراف پر۔

اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾
وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ
الَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ الَّذِیْنَ
یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى
رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓىِٕكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی
الْخَیْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ لَا نُكَلِّفُ
نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَ لَدَیْنَا كِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ
وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

۵۷۔ بے شک جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ ۵۸۔ اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ۵۹۔ اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ ۶۰۔ اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ وہ دیتے ہیں اور ان کے دل کانپتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۶۱۔ یہ لوگ بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ ان پر پہنچنے والے ہیں سب سے آگے۔ ۶۲۔ اور ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو بالکل ٹھیک بولتی ہے۔ اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

جو شخص اللہ کو اس طرح پائے کہ اس پر اللہ کی ہیبت طاری ہوجائے وہ عام انسانوں سے بالکل مختلف انسان ہوتا ہے۔ خوف کی نفسیات اس کو انتہائی حد تک سنجیدہ بنا دیتی ہے۔ اس کی سنجیدگی اس کی ضامن بن جاتی ہے کہ وہ دلائلِ خداوندی کے وزن کو پوری طرح سمجھے اور اس کے آگے فوراً جھک جائے۔ خدا کے سوا ہر چیز اس کی نظر میں اپنا وزن کھودے۔ وہ سب کچھ کر کے بھی یہ سمجھے کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔

موجودہ دنیا میں دوڑ دھوپ کی دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ایک دنیا کی راہ اور دوسری آخرت کی راہ۔ جن لوگوں کے اندر مذکورہ صفات پائی جائیں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کی طرف دوڑنے والے ہیں۔ تاہم آخرت کی طرف

دوڑنا موجودہ دنیا میں ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اس میں انسان سے طرح طرح کی کوتاہیاں ہو جاتی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہر آدمی سے اس کی طاقت کے بقدر ہے، نہ کہ طاقت سے زیادہ۔ ہر آدمی کی استطاعت اور اس کا کارنامہ دونوں کامل طور پر خدا کے علم میں ہیں۔ اور یہی واقعہ اس بات کی ضمانت ہے کہ قیامت میں ہر شخص کو وہ رعایت ملے جو از روئے انصاف اسے ملنی چاہیے۔ اور ہر شخص وہ انعام پائے جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَ لَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

۶۳۔ بلکہ ان کے دل اس کی طرف سے غفلت میں ہیں۔ اور ان کے کچھ کام اس کے علاوہ ہیں وہ ان کو کرتے رہیں گے۔ ۶۴۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کے آسودہ لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے تو وہ فریاد کرنے لگیں گے۔ ۶۵۔ اب فریاد نہ کرو۔ اب ہماری طرف سے تمھاری کوئی مدد نہ ہوگی۔ ۶۶۔ تم کو میری آیتیں سنائی جاتی تھیں تو تم پیٹھ پھیر کر بھاگتے تھے۔ ۶۷۔ اس سے تکبر کرکے۔ گویا کسی قصہ گو کو چھوڑ رہے ہو۔

جو لوگ دنیا پرستی میں غرق ہوں انھیں خدا اور آخرت کی باتوں سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ ان کی دل چسپی کی چیزیں اس سے مختلف ہوتی ہیں جو سچے اہل ایمان کی دل چسپی کی چیزیں ہوتی ہیں۔ خدا اور آخرت کی بات خواہ کتنے ہی مؤثر انداز میں بیان کی جائے، انھیں وہ زیادہ اپیل نہیں کرتی۔ وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کرکے اپنی دوسری دلچسپیوں میں گم رہتے ہیں۔ وہ داعی حق کی مجلس سے اس طرح اٹھ جاتے ہیں جیسے وہ کسی فضول قصہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے۔

مگر جب خدا کی پکڑ آتی ہے تو ایسے لوگ غفلت اور سرکشی کو بھول کر عاجزانہ فریاد کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ خدا کے آگے جھک جاتے ہیں۔ مگر اس وقت کا جھکنا بیکار ہوتا ہے۔ کیوں کہ خدا کے آگے جھکنا اس وقت معتبر ہے جب کہ آدمی خدا کی نشانی کو دیکھ کر جھک گیا ہو۔ جب خدا خود اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے اس وقت جھکنے کی کوئی قیمت نہیں۔

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

۶۸۔ پھر کیا انھوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا۔ یا ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جو ان کے اگلے باپ دادا کے پاس نہیں آئی۔ ۶۹۔ یا انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں۔ اس وجہ سے وہ اس کو

بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ
لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ
اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ
وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ
عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾

نہیں مانتے۔ ۷۰۔ یا وہ کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے۔ بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے۔ اور ان میں سے اکثر کو حق بات بری لگتی ہے۔ ۷۱۔ اور اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع ہوتا تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے۔ بلکہ ہم نے ان کے پاس ان کی نصیحت بھیجی ہے تو وہ اپنی نصیحت سے اعراض کر رہے ہیں۔

حق وہ ہے جو حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہو۔ مگر خواہش پرست انسان یہ چاہنے لگتا ہے کہ حق کو اس کی خواہش کے تابع کر دیا جائے۔ اس قسم کے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ داعی جب حق بات کہتا ہے تو وہ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ وہ حق کے تابع نہیں بننا چاہتے۔ اس لیے وہ چاہنے لگتے ہیں کہ حق کو ان کے تابع کر دیا جائے۔ اپنی اس نفسیات کی بنا پر وہ حق کی آواز پر دھیان نہیں دیتے۔ حق ان کو اجنبی دکھائی دیتا ہے۔ وہ داعی حق کو اس کی اصل حیثیت میں پہچان نہیں پاتے۔ اپنے کو برسرِ حق ظاہر کرنے کے لیے وہ داعی کو مطعون کرنے لگتے ہیں۔

کائنات میں کامل درستگی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس، انسانی دنیا میں ہر طرف فساد اور بگاڑ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام حق کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ یعنی وہی ہونا جو ہونا چاہیے، اور وہ نہ ہونا جو نہ ہونا چاہیے۔ اب اگر کائنات کا نظام بھی انسان کی خواہشوں پر چلنے لگے تو جو فساد انسانی دنیا میں ہے وہی فساد بقیہ کائنات میں بھی برپا ہو جائے گا۔

نصیحت اور تنقید ہمیشہ آدمی کے لیے سب سے زیادہ تلخ چیز ہوتی ہے۔ بہت ہی کم وہ خدا کے بندے ہیں جو نصیحت اور تنقید کو کھلے ذہن کے ساتھ سنیں۔ بیشتر لوگ اس کو نظر انداز کر کے گزر جاتے ہیں۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖۗ وَّ هُوَ
خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَ اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا ربع
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ
لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾

۷۲۔ کیا تم ان سے کوئی مال مانگ رہے ہو تو تمھارے رب کا مال تمھارے لیے بہتر ہے۔ اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔ ۷۳۔ اور یقیناً تم ان کو ایک سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہو۔ ۷۴۔ اور جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ راستہ سے ہٹ گئے ہیں۔

پیغمبر اپنے مخاطبین سے کبھی مالی غرض نہیں رکھتا۔ پیغمبر اور اس کے مخاطبین کا تعلق داعی اور مدعو کا تعلق ہوتا

ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق بے حد نازک تعلق ہے۔ داعی اگر ایک طرف لوگوں کو آخرت کا پیغام دے اور اسی کے ساتھ وہ ان سے دنیا کے مطالبات بھی چھیڑے ہوئے ہو تو اس کی دعوت لوگوں کی نظر میں مذاق بن کر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کسی بھی حال میں اپنے مدعو سے کوئی مادی مطالبہ نہیں کرتا، خواہ اس کی وجہ سے اس کو یک طرفہ طور پر ہر قسم کا نقصان برداشت کرنا پڑے۔

داعی کا اصل معاوضہ خود وہ حق ہوتا ہے جس کو لے کر وہ کھڑا ہوا ہے۔ خدا کی دریافت اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے۔ داعیانہ زندگی گزارنے کے نتیجہ میں اس کو جو ربانی تجربات ہوتے ہیں وہ اس کی روح کو سب سے بڑی غذا فراہم کرتے ہیں۔ اعلیٰ ترین مقصد کے لیے سرگرم رہنے سے جو لذت ملتی ہے وہ اس کی تسکین کا سب سے بڑا سامان ہوتی ہے۔

حق کی دعوت کو وہی شخص مانے گا جس کو آخرت کا کھٹکا لگا ہوا ہو۔ آخرت کا احساس آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے اور سنجیدگی ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ حقیقت کو مانے۔ جو شخص سنجیدہ نہ ہو وہ کبھی حقیقت کو تسلیم نہیں کرے گا، خواہ اس کو دلائل سے کتنا ہی زیادہ ثابت شدہ بنا دیا جائے۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾ حَتّٰى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾ ع

۷۵۔ اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور ان پر جو تکلیف ہے، اس کو دور کر دیں تب بھی وہ اپنی سرکشی میں لگے رہیں گے بہکے ہوئے۔ ۷۶۔ اور ہم نے ان کو عذاب میں پکڑا، لیکن نہ وہ اپنے رب کے آگے جھکے اور نہ انھوں نے عاجزی کی۔ ۷۷۔ یہاں تک کہ جب ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو اس وقت وہ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔

مکی دور میں جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے چند سال کے لیے مکہ والوں کو قحط میں مبتلا کر دیا۔ یہ قحط اتنا شدید تھا کہ بہت سے لوگ مردار کھانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے کہ جب کوئی گروہ سرکشی اختیار کرتا ہے اور نصیحت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تو وہ اس گروہ پر تنبیہی عذاب بھیجتا ہے تاکہ ان کے دل نرم ہوں اور وہ حق بات کی طرف دھیان دے سکیں۔

مگر تاریخ کا تجربہ ہے کہ انسان نہ اچھے حالات سے سبق لیتا ہے اور نہ برے حالات سے۔ دونوں قسم کے حالات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کی طرف رجوع کرے۔ مگر انسان یہ کرتا ہے کہ وہ اچھے حالات کو اپنی تدبیر کا نتیجہ سمجھ لیتا ہے اور برے حالات کو زمانہ کے الٹ پھیر کا۔ اس طرح وہ دونوں ہی قسم کے واقعات سے سبق لینے سے محروم رہتا ہے۔

آدمی اسی طرح غفلت میں پڑا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا کا آخری فیصلہ آجاتا ہے۔ اس وقت وہ حیران رہ جاتا ہے کہ وہ چیز جس کو اس نے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا وہی اس دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے اہم حقیقت تھی۔

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ لَهُ اخْتِلَافُ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾

۷۸۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ۷۹۔ اور وہی ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلایا۔ اور تم اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔ ۸۰۔ اور وہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے رات اور دن کا بدلنا۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں۔

انسان اس کائنات کی وہ خاص مخلوق ہے جس کو استثنائی طور پر سننے اور دیکھنے اور سوچنے کی اعلیٰ صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ یہ خصوصی صلاحیتیں یقیناً کسی خصوصی مقصد کے لیے ہیں۔ وہ مقصد یہ ہے کہ آدمی ان کو حقیقتِ حیات کی معرفت کے لیے استعمال کرے۔ وہ اپنے کان سے اس صداقت کی آواز کو سنے جس کا اعلان یہاں کیا جارہا ہے۔ وہ اپنی آنکھ سے ان نشانیوں کو دیکھے جو اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ وہ اپنی سوچنے کی صلاحیت کو استعمال کر کے ان کی گہرائی تک پہنچے۔ یہی کان اور آنکھ اور دل کا شکر ہے۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں اس شکر کا ثبوت نہ دیں وہ ان انعامات کا استحقاق ہمیشہ کے لیے کھو رہے ہیں۔

خدا کی جو صفات دنیا میں نمایاں ہو رہی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ زندہ کو مُردہ اور مُردہ کو زندہ کرتا ہے۔ یہ خدا بالآخر تمام مرے ہوئے لوگوں کو دوبارہ جمع کرے گا۔ پھر جس طرح وہ رات کو دن بناتا ہے اسی طرح وہ لوگوں کی نگاہوں سے غفلت کا پردہ ہٹا دے گا۔ اس کے بعد اشیاء کی حقیقت لوگوں پر ٹھیک ٹھیک منکشف ہو جائے گی۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْۤا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۸۳﴾

۸۱۔ بلکہ انھوں نے وہی بات کہی جو اگلوں نے کہی تھی۔ ۸۲۔ انھوں نے کہا کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ ۸۳۔ اس کا وعدہ ہم کو اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادا کو بھی دیا گیا۔ یہ محض اگلوں کے افسانے ہیں۔

انسان کو عقل دی گئی ہے۔ عقل کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ معاملات کی گہرائی میں داخل ہو اور اصل حقیقت کو دریافت کرکے اس کو سمجھ سکے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انسان حقیقی معنوں میں اپنی عقل کو استعمال کرے۔ وہ بس ظاہری تأثر کے تحت ایک رائے قائم کرلیتا ہے اور اس کو دہرانے لگتا ہے۔ ماضی کے لوگ بھی ایسا کرتے رہے اور حال کے لوگ بھی یہی کر رہے ہیں۔

موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا شعوری یا لفظی انکار کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کو اس عقیدے کا عملی منکر کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو رسمی طور پر زندگی بعد موت کو مانتے ہوئے عملاً ایسی زندگی گزارتے ہیں جیسے کہ انھیں اس پر یقین نہ ہو کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اور جس طرح آج وہ ہوش وحواس کے ساتھ زندہ ہیں، اسی طرح دوبارہ ہوش وحواس اس کے ساتھ زندہ ہوکر خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

۸۴۔ کہو کہ زمین اور جو کوئی اس میں ہے کس کا ہے، اگر تم جانتے ہو۔ ۸۵۔ وہ کہیں گے کہ اللہ کا ہے۔ کہو کہ پھر تم سوچتے نہیں۔ ۸۶۔ کہو کہ کون مالک ہے سات آسمانوں کا اور کون مالک ہے عرش عظیم کا۔ ۸۷۔ وہ کہیں گے کہ سب اللہ کا ہے۔ کہو، پھر کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۸۸۔ کہو کہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا، اگر تم جانتے ہو۔ ۸۹۔ وہ کہیں گے کہ یہ اللہ کے لیے ہے۔ کہو کہ پھر کہاں سے تم مسحور کیے جاتے ہو۔

ان آیات میں اس تضادِ فکر کا تذکرہ ہے جس میں ہر دور کے بیشتر لوگ مبتلا رہے ہیں۔ خواہ وہ مشرک ہوں یا غیر مشرک۔ بظاہر خدا کو ایک ماننے والے ہوں یا کئی ماننے والے۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ زمین وآسمان کا خالق ایک اللہ ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ وہی اس کو چلا رہا ہے۔ تمام برتر اختیارات اسی کو حاصل ہیں۔ مگر اس ماننے کا جو لازمی تقاضا ہے اس کا کوئی اثر ان کی زندگیوں میں نہیں پایا جاتا۔

اس عظیم اقرار کا تقاضا ہے کہ وہی ان کی سوچ بن جائے۔ خدا کا احساس ان کے اندر خوف بن کر داخل ہوجائے۔ ان کے اندر یہ مادہ پیدا ہو کہ ان کے سامنے حق آئے تو وہ فوراً اس کا اعتراف کرلیں۔ ان کی زندگی پوری کی پوری اسی میں ڈھل جائے۔ مگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اگرچہ عقیدہ کے طور پر خدا کو مانتے ہیں مگر ان کا

عقیدۂ خدا الگ رہتا ہے اور ان کی حقیقی زندگی الگ۔

خدا کا تصور انسان کو مسحور نہیں کرتا۔ البتہ دوسری چیزیں اس کی نظر میں اتنی اہم بن جاتی ہیں جن سے وہ مسحور ہو کر رہ جائے۔ کیسا عجیب ہے انسان کا معاملہ۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٩٠﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٩١﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٩٢﴾ ع

۹۰۔ بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ ۹۱۔ اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور اس کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں۔ ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا۔ اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔ اللہ پاک ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ ۹۲۔ وہ کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے۔ وہ بہت اوپر ہے اس سے جس کو یہ شریک بتاتے ہیں۔

اقتدار کی یہ فطرت ہے کہ وہ تقسیم کو گوارا نہیں کرتا۔ انسانوں میں جب بھی کئی صاحب اقتدار ہوں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو زیر کرنے یا نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ حتی کہ جو قومیں مختلف دیوتاؤں کو مانتی ہیں ان کی میتھالوجی میں کثرت سے دکھایا گیا ہے کہ ایک دیوتا اور دوسرے دیوتا میں لڑائیاں جاری ہیں۔

کائنات میں اس صورت حال کی موجودگی کہ اس کے ایک حصہ اور اس کے دوسرے حصہ میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر حصہ کا خدا ایک ہی ہے۔ اگر ہر حصہ کے الگ الگ خدا ہوتے تو ہر حصہ کا خدا اپنے حصہ کو لے کر الگ ہو جاتا اور اس کے نتیجہ میں کائنات کے مختلف حصوں کی موجودہ ہم آہنگی باقی نہ رہتی۔ مختلف خداؤں کی کشاکش میں کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ ایسی حالت میں توحید کا نظریہ سراپا سچائی ہے اور شرک کا نظریہ سراپا جھوٹ۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿٩٥﴾

۹۳۔ کہو کہ اے میرے رب، اگر تو مجھ کو وہ دکھا دے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ۹۴۔ تو اے میرے رب، مجھ کو ظالم لوگوں میں شامل نہ کر۔ ۹۵۔ اور بے شک ہم قادر ہیں کہ ہم ان سے جو وعدہ کر رہے ہیں وہ تم کو دکھا دیں۔

پیغمبر کی اس دعا کا تعلق خود پیغمبر کے دل کی کیفیت سے ہے، نہ کہ خدا کے عذاب سے۔ پیغمبر کی یہ دعا بتاتی

ہے کہ مومن ہر حال میں خدا سے ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔ خدا کا عذاب جب دوسروں کے لیے آرہا ہو اس وقت بھی مومن کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ وہ عاجزی کے ساتھ خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ انسان صرف خدا کی عنایت سے بچ سکتا ہے نہ کہ اپنے کسی عمل یا اپنی کسی طاقت سے۔

پیغمبر کے منکرین پر خدا کا فیصلہ کبھی پیغمبر کی زندگی میں آتا ہے اور کبھی پیغمبر کی وفات کے بعد۔ آیت کا آخری ٹکڑا بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پر خدا کا یہ فیصلہ آپ کی زندگی ہی میں آیا۔ آپ کے دشمن آپ کی زندگی ہی میں پامال کردئے گئے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٩٧﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿٩٨﴾

۹۶۔ تم برائی کو اس طریقے سے دفع کرو جو بہتر ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ ۹۷۔ اور کہو کہ اے میرے رب، میں پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوسوں سے۔ ۹۸۔ اور اے میرے رب، میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

خدا کا داعی جب لوگوں کو حق کی طرف بلاتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کرتے ہیں۔ وہ اس کو اپنے شر کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس وقت داعی کے اندر بھی جوابی ذہن ابھرتا ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ جن لوگوں نے تمھارے ساتھ برا سلوک کیا ہے تم بھی ان کے ساتھ برا سلوک کرو۔ اگر تم خاموش رہے تو ان کے حوصلے بڑھیں گے اور وہ مزید مخالفانہ کارروائی کرنے کے لیے دلیر ہو جائیں گے۔

مگر اس قسم کے خیالات شیطان کا وسوسہ ہیں۔ شیطان اس نازک موقع پر آدمی کو بہکاتا ہے تاکہ اس کو راہ سے بے راہ کردے۔ ایسے موقع پر داعی اور مومن کو چاہیے کہ وہ شیطانی بہکاووں کے مقابلہ میں خدا کی پناہ مانگے نہ کہ شیطانی بہکاووں کو مان کر اپنے مخالفین کے خلاف انتقامی کارروائیاں کرنے لگے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾ فَاِذَا

۹۹۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے رب، مجھ کو واپس بھیج دے۔ ۱۰۰۔ تاکہ جس کو میں چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کماؤں۔ ہرگز نہیں، یہ محض ایک بات ہے جس کو وہ کہتا ہے۔ اور ان کے آگے ایک پردہ ہے اس دن تک کے لیے جب کہ وہ اٹھائے

نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّ
لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ مَنْ خَفَّتْ
مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَ
هُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

جائیں گے۔ ۱۰۱۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا تو پھر ان کے درمیان نہ کوئی رشتہ رہے گا اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔ ۱۰۲۔ پس جن کے پلے بھاری ہوں گے وہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ ۱۰۳۔ اور جن کے پلے ہلکے ہوں گے تو یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۰۴۔ ان کے چہروں کو آگ جھلس دے گی اور وہ اس میں بدشکل ہو رہے ہوں گے۔

موت آتے ہی آدمی موجودہ دنیا سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک ایسی آڑ قائم ہو جاتی ہے کہ وہ کبھی ادھر واپس نہ ہو سکے۔

آدمی جب موت کے بعد اگلی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اب وہ جان لیتا ہے کہ جس آخرت کو وہ نظر انداز کیے ہوئے تھا وہی دراصل زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ دنیا کے سامان تو صرف اس لیے تھے کہ اس سے آخرت کی کمائی کی جائے، نہ یہ کہ بذاتِ خود انھیں کو اصل مقصود سمجھ لیا جائے۔ چنانچہ موت کے بعد وہ بے اختیار چاہے گا کہ کاش وہ دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے۔ مگر ایسا ہونا ممکن نہیں کیوں کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ کسی آدمی کو صرف ایک بار موقع دیا جائے، دوبارنہیں۔

موجودہ دنیا میں آدمی اپنے ساتھیوں اور رشتہ داروں پر بھروسہ کرتا ہے۔ مگر قیامت میں وہ بالکل تنہا ہوگا۔ وہاں آدمی کا ذاتی عمل اس کے کام آئے گا، اس کے سوا کوئی چیز کسی کے کام آنے والی نہیں۔

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا
تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا
شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ
اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۵۔ کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں تو تم ان کو جھٹلاتے تھے۔ ۱۰۶۔ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہماری بدبختی نے ہم کو گھیر لیا تھا اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ ۱۰۷۔ اے ہمارے رب ہم کو اس سے نکال لے، پھر اگر ہم دوبارہ ایسا کریں تو بے شک ہم ظالم ہیں۔ ۱۰۸۔ خدا کہے گا کہ دور ہو، اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

آخرت کے مناظر آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد کسی کو یہ موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہ دوبارہ موجودہ دنیا میں آکر رہے اور صحیح عمل کا ثبوت دے۔ کیوں کہ دنیا کی زندگی کا مقصد امتحان ہے — اس بات کا امتحان کہ آدمی

دیکھے بغیر جھکتا ہے یا نہیں۔ جب آخرت کا مشاہدہ کرادیا جائے تو اس کے بعد نہ جھکنے کی کوئی قیمت ہے اور نہ واپس بھیجنے کا کوئی امکان۔

آدمی کا امتحان دیکھ کر ماننے میں نہیں ہے بلکہ سوچ کر ماننے میں ہے۔ طالب علم کی جانچ پرچہ آؤٹ ہونے سے پہلے کی جاتی ہے۔ جب پرچہ آؤٹ ہو کر اخباروں میں چھپ چکا ہو، اس کے بعد کسی طالب علم کی جانچ کرنے کا کوئی سوال نہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿١١٠﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿١١١﴾

۱۰۹۔ میرے بندوں میں ایک گروہ تھا جو کہتا تھا کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے، پس تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۰۔ پس تم نے ان کو مذاق بنالیا۔ یہاں تک کہ ان کے پیچھے تم نے ہماری یاد بھلادی اور تم ان پر ہنستے رہے۔ ۱۱۱۔ میں نے ان کو آج ان کے صبر کا بدلہ دیا کہ وہی ہیں کامیاب ہونے والے۔

دنیا کی زندگی میں جب کہ ابھی آخرت کے حقائق آنکھوں کے سامنے نہیں آئے تھے۔ اس وقت خدا کے کچھ بندوں نے خدا کو اس کے جلال وکمال کے ساتھ پہچانا۔ ان کے سامنے حق کی دعوت مجرد دلائل کی سطح پر آئی۔ اس کے باوجود انھوں نے اس پر یقین کیا۔ وہ اس کے بارے میں اس حد تک سنجیدہ ہوئے کہ اسی کو اپنی کامیابی اور ناکامی کا معیار بنا لیا۔ ایک اجنبی حق کے ساتھ اپنی کامل وابستگی کی انھیں یہ قیمت دینی پڑی کہ ماحول میں وہ مذاق کا موضوع بن گئے۔ اس کے باوجود انھوں نے اس سے اپنی وابستگی کو ختم نہیں کیا۔

یہ فکری استقامت ہی سب سے بڑا صبر ہے اور آخرت کا انعام آدمی کو اسی صبر کی قیمت میں ملتا ہے۔ وہی لوگ دراصل کامیاب ہیں جو موجودہ امتحان کی دنیا میں اس صبر کا ثبوت دے سکیں۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿١١٢﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿١١٣﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١١٤﴾

۱۱۲۔ ارشاد ہوگا کہ برسوں کے شمار سے تم کتنی دیر زمین میں رہے۔ ۱۱۳۔ وہ کہیں گے ہم ایک دن رہے یا ایک دن سے بھی کم۔ تو گنتی والوں سے پوچھ لیجیے۔ ۱۱۴۔ ارشاد ہوگا کہ تم تھوڑی ہی مدت رہے۔ کاش تم جانتے ہوتے۔

عیش وہی ہے جو ابدی ہو۔ جو عیش ابدی نہ ہو وہ جب ختم ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بس ایک لمحہ تھا جو آیا اور گزر گیا۔

دنیا کی زندگی میں آدمی اس حقیقت کو بھولا رہتا ہے۔ مگر آخرت میں یہ حقیقت اس پر آخری حد تک کھل جائے گی۔ اس وقت وہ جانے گا۔ مگر اس وقت جاننے کا کوئی فائدہ نہیں۔

دنیا میں آدمی کے سامنے حق آتا ہے مگر وہ اپنے سکون کو برہم کرنا نہیں چاہتا اس لیے وہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ وہ ملنے والے فائدے کی خاطر ملے ہوئے فائدہ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہاں کی عزت، یہاں کا آرام، یہاں کی مصلحتیں اس کو اتنی قیمتی معلوم ہوتی ہیں کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح ایسا کرے کہ ''چیز'' کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو ''بے چیز'' سے وابستہ کر لے۔ حالاں کہ جب عمر کی مہلت پوری ہو گی تو سو سال بھی ایسا معلوم ہوگا جیسے کہ وہ بس ایک دن تھا جو آیا اور ختم ہو گیا۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا
تُرْجَعُوْنَ ﴿١١٥﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿١١٦﴾ وَمَنْ
يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ
فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿١١٧﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ
اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿١١٨﴾ ع ٦ ٢٦ ٦

۱۱۵۔ پس کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔ ۱۱۶۔ پس بہت برتر ہے اللہ، بادشاہِ حقیقی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ مالک ہے عرش عظیم کا۔ ۱۱۷۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے، جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ بے شک منکروں کو فلاح نہ ہو گی۔ ۱۱۸۔ اور کہو کہ اے میرے رب، مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما، تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہیں۔ کوئی انسان با اصول زندگی گزارتا ہے، اور کوئی بے اصول۔ کوئی اَن دیکھی صداقت کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے، اور کوئی صرف دکھائی دینے والی چیزوں میں مشغول رہتا ہے۔ کوئی حق کی دعوت کو اس کی ساری اجنبیت کے باوجود قبول کرتا ہے، اور کوئی اس کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو ظلم سے روکتا ہے، صرف اس لیے کہ خدا نے اس کو ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ کوئی موقع پاتے ہی دوسروں کے لیے ظالم بن جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کا نفس اس سے ایسا ہی کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔

اگر اس دنیا کا کوئی انجام نہ ہو، اگر وہ اسی طرح چلتی رہے اور اسی طرح بالآخر اس کا خاتمہ ہو جائے تو اس کا

مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بے مقصد ہنگامہ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ مگر کائنات کی معنویت اس قسم کے بے معنیٰ نظریہ کی تردید کرتی ہے۔ کائنات کا اعلیٰ نظام اس سے انکار کرتا ہے کہ اس کا خالق ایک غیر سنجیدہ ہستی ہو۔

کائنات اپنے وسیع نظام کے ساتھ جس خالق کا تعارف کرا رہی ہے وہ ایک ایسا خالق ہے جو اپنی ذات میں آخری حد تک کامل ہے۔ ایسے خالق کے بارے میں ناقابلِ قیاس ہے کہ وہ دو مختلف قسم کے انسانوں کا یکساں انجام ہوتے ہوئے دیکھے اور اس کو گوارا کرلے۔ یہ سراسر ناممکن ہے۔ یقیناً ایسا ہونے والا ہے کہ مالکِ کائنات ایک طبقہ کو بے قیمت کردے جس طرح انھوں نے حق کو بے قیمت کیا اور دوسرے طبقہ کی قدردانی کرے جس طرح انھوں نے حق کی قدردانی کی۔

۲۴۔ سُوْرَۃُ النُّوْر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ۝۱ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّ لَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَ لۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝۲ اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ یہ ایک سورہ ہے جس کو ہم نے اتارا ہے اور اس کو ہم نے فرض کیا ہے۔ اور اس میں ہم نے صاف صاف آیتیں اتاری ہیں تاکہ تم یاد رکھو۔ ۲۔ زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور تم کو ان دونوں پر اللہ کے دین کے معاملہ میں رحم نہ آنا چاہیے، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ اور چاہیے کہ دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے۔ ۳۔ زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ۔ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک۔ اور یہ حرام کردیا گیا اہل ایمان پر۔

سورہ نور غزوۂ بنی المصطلق کے بعد 6 ہجری میں نازل ہوئی۔ اس غزوہ میں ایک معمولی واقعہ پیش آیا۔ اس کو شوشہ بنا کر مدینہ کے منافقین نے حضرت عائشہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنا شروع کیا۔ اس سورہ میں ایک طرف حضرت عائشہ کی کامل برأت کردی گئی اور دوسری طرف وہ خاص احکام دئے گئے جو معاشرہ میں اس قسم کی صورت حال پیش آنے کے بعد نافذ کیے جانے چاہئیں۔

اسلامی قانون میں زنا بے حد سنگین جرم ہے۔ تاہم اسلامی قانون دو قسم کے انسانوں میں فرق کرتا ہے۔ ایک وہ جس کے لیے جائز صنفی تعلق کے مواقع موجود ہوں اس کے باوجود وہ ناجائز صنفی تعلق قائم کرے۔ دوسرا

وہ جس کو ابھی جائز صنفی تعلق کے مواقع حاصل نہ ہوئے ہوں۔
''زانی اور زانیہ کو سو کوڑے مارو''— قرآن میں کچھ ایسے قانونی احکام ہیں جو حکومتی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً چوری، زنا، شراب خوری، قذف، قتل، وغیرہ۔ مگر اس قسم کے احکام بہت کم ہیں۔ ان احکام کو وضع کرنے کا مقصد ''معیاری سماج'' بنانا نہیں ہے بلکہ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ سماج میں ضروری نظم برقرار رہے:

It is just to maintain a necessary level of order in society .

عوام کے سامنے سزا دینا دراصل سزا میں عبرت کا پہلو شامل کرنا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ حال کے مجرم کا انجام دیکھ کر مستقبل کے مجرم ڈر جائیں اور اس قسم کا جرم کرنے سے باز رہیں۔ زانی اور زانیہ اگر سزا کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں تو وہ دوبارہ عام مسلمانوں کی طرح ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ توبہ اور اصلاح نہ کریں تو اس کے بعد وہ اس قابل نہیں رہتے کہ اسلامی معاشرہ میں وہ رشتہ اور تعلق کے لیے قبول کیے جا سکیں۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ﴿۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾

۴۔ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر عیب لگائیں، پھر چار گواہ نہ لے آئیں، ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۵۔ لیکن جو لوگ اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

زنا کو شدید جرم قرار دینے کا فطری تقاضا یہ ہے کہ کسی غیر زانی پر زنا کا الزام لگانا بھی شدید جرم ہو۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ جو شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے اور پھر اس کو شرعی قاعدہ کے مطابق ثابت نہ کر سکے، اس کو اَسّی کوڑے مارے جائیں۔ مزید یہ کہ ایسے شخص کو ہمیشہ کے لیے مردود الشہادت قرار دے دیا جائے۔ حتی کہ احناف کے نزدیک توبہ کے بعد بھی اس کی گواہی معاملات میں قبول نہیں کی جائے گی۔

کسی شخص پر جھوٹا الزام لگانا اس کو اخلاقی طور پر قتل کرنے کی کوشش ہے۔ ایسے جرم پر اسلام میں سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ اور اگر کوئی شخص دنیا میں سزا پانے سے بچ جائے تب بھی وہ آخرت کی سزا سے بہرحال نہیں بچ سکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ توبہ کرے اور اللہ سے معافی کا طلب گار ہو۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۶﴾

۶۔ اور جو لوگ اپنی بیویوں پر عیب لگائیں اور ان کے پاس ان کے اپنے سوا اور گواہ نہ ہوں تو ایسے شخص کی گواہی کی صورت یہ ہے کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ بے شک وہ سچا ہے۔

وَ الْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ⑦ وَ يَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ⑧ وَ الْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑨ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ⑩ ع

۷۔ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہو۔ ۸۔ اور عورت سے سزا اس طرح ٹل جائے گی کہ وہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔ ۹۔ اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو اگر یہ شخص سچا ہو۔ ۱۰۔ اور اگر تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا حکمت والا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر بدچلنی کا الزام لگائے اور اس کے پاس خود اپنے بیان کے سوا کوئی عینی گواہ موجود نہ ہو تو اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اس صورت میں معاملہ کا فیصلہ قسم کے ذریعہ کیا جائے گا جس کو شرعی اصطلاح میں لعان کہا جاتا ہے۔

اگر مرد مقررہ طریقہ پر قسم کھالے اور عورت خاموش رہے تو مرد کے بیان کو مان کر عورت کے اوپر مذکورہ سزا نافذ کردی جائے گی۔ اور اگر ایسا ہو کہ عورت بھی مذکورہ طریقہ پر قسم کھا کر کہے کہ وہ بے قصور ہے تو پھر اس کو سزا نہیں دی جائے گی۔ البتہ اس کے بعد دونوں کے درمیان تفریق کرادی جائے گی۔

معاشرت کے معاملات بے حد پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ان معاملات میں انسان جب قانون سازی کرتا ہے تو وہ ایک پہلو کی طرف جھک کر دوسرے پہلو کو مجروح کردیتا ہے۔ خدا کے قانون میں تمام پہلوؤں کی کامل رعایت ہے۔ اس اعتبار سے خدا کا قانون انسان کے لیے بہت بڑی رحمت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑪

۱۱۔ جن لوگوں نے یہ طوفان برپا کیا وہ تمھارے اندر ہی کی ایک جماعت ہے۔ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کے لیے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کمایا۔ اور جس نے اس میں سب سے بڑا حصہ لیا اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔

داعی اگر واقعۃً سچائی پر ہے تو اس کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے ہمیشہ اس کے حق میں مفید ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ جھوٹے پروپیگنڈوں کی حقیقت آخرکار کھل کر رہتی ہے۔ اور جب حقیقت کھلتی ہے تو ایک طرف داعی کا برسرحق ہونا اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے اور جو لوگ اس کے بارے میں مذبذب تھے وہ اس کے بعد یقین کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ عملاً دیکھ لیتے ہیں کہ داعیٔ حق کے مخالفین کے پاس جھوٹے الزام اور بے بنیاد اتہام کے سوا اور کچھ نہیں۔

حضرت عائشہؓ صدیقہ کے خلاف الزام میں سب سے بڑا حصہ لینے والا مشہور منافق عبد اللہ بن ابی تھا۔ اس کے لیے قرآن میں سخت اخروی عذاب کا اعلان کیا گیا۔ مگر دنیا میں اس کو کوئی سزا نہیں دی گئی، یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مر گیا۔ اس واقعہ کے بعد حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اس شخص کو قتل کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا: اے عمرؓ، کیا ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (فَكَيْفَ يَا عُمَرُ إِذَا تَحَدَّثَ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ) سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 291۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے مجرمین کو بھی دنیا میں سزا نہ دی جائے بلکہ ان کے معاملہ کو آخرت کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔

لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝١٢ لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝١٣

۱۲۔ جب تم لوگوں نے اس کو سنا تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ ۱۳۔ یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے۔ پس جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا یہ حق ہے کہ وہ اس کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان کرے۔ دوسرے کے بارے میں بدگمانی کرنا خود اپنی بدنفسی کا ثبوت ہے۔ اور دوسرے کے بارے میں نیک گمان کرنا اپنی نیک نفسی کا ثبوت۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص کسی کے بارے میں بری خبر دے تو فوراً اس سے ثبوت کا مطالبہ کیا جائے۔ جو شخص سنے وہ محض سن کر اس کو دہرانے نہ لگے بلکہ وہ خبر دینے والے سے کہے کہ اگر تم سچے ہو تو شریعت کے مطابق گواہ لے آؤ۔ اگر وہ گواہ لے آئے تو اس کی بات قابلِ لحاظ ہو سکتی ہے۔ اور اگر وہ اپنی بات کے حق میں گواہ نہ لائے تو وہ خود سب سے بڑا مجرم ہے۔ کیوں کہ کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ بلا ثبوت کسی کے اوپر عیب لگانے لگے۔

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝١٤ ۚ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ

۱۴۔ اور اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے، اس کے باعث تم پر کوئی بڑی آفت آجاتی۔ ۱۵۔ جب کہ تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل کر رہے تھے۔ اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے

وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖۗ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾
وَلَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ
نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖۗ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ
عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ
اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾

جس کا تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ اور تم اس کو ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے۔ حالاں کہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے۔ ۱۶۔ اور جب تم نے اس کو سنا تو یوں کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے نکالیں۔ معاذ اللہ، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ ۱۷۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔ ۱۸۔ اللہ تم سے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے۔ اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت حق کے داعی کی تھی۔ داعی کا معاملہ بے حد نازک معاملہ ہوتا ہے۔ کردار کی ایک غلطی اس کے پورے مشن کو ڈھا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جن لوگوں نے یہ کیا کہ ایک اسلامی خاتون کے بارے میں ایک بے بنیاد بات سن کر اس کو اِدھر اُدھر بیان کرنے لگے، انھوں نے سخت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ اگر اللہ تعالی کی خصوصی مدد سے اس الزام کی بروقت تردید نہ ہو گئی ہوتی تو یہ غلطی اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کا سبب بن جاتی۔ اس کے نتیجے میں پورا اسلامی معاشرہ بدگمانیوں کا شکار ہو جاتا۔ مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر آپس میں لڑنے لگتے۔ جس گروہ کے لیے خدا کا منصوبہ یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے شرک کا عالمی غلبہ ختم کیا جائے وہ آپس کی جنگ میں خود اپنے آپ کو ختم کر لیتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ
فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ ع النصف ۲ ۱۰ ۸

۱۹۔ بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۲۰۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ اللہ نرمی کرنے والا، رحمت کرنے والا ہے۔

اس آیت میں ''فاحشہ'' کی اشاعت سے مراد اسی چیز کی اشاعت ہے جس کو اوپر آیت نمبر 11 میں اِفک کہا گیا ہے۔ یعنی کسی کے خلاف بے بنیاد الزام وضع کرنا اور اس کو لوگوں کے اندر پھیلانا۔

بات کہنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی صرف وہ بات اپنے منہ سے نکالے جس کے حق میں اس کے پاس فی الواقع کوئی مضبوط دلیل ہو، جو شرعی طور پر ثابت کی جا سکے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی حقیقی بنیاد کے بغیر

خود اپنے ذہن سے بات گھڑنا اور اس کو لوگوں سے بیان کرنا۔ پہلا طریقہ جائز طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ سراسر ناجائز طریقہ۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے مخالف کے بارے میں کوئی بات ہو تو آدمی اس کی زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ بلا بحث اس کو مان لیتا ہے اور دوسروں سے اس کو بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ نہ صرف غیر ذمہ دارانہ فعل ہے بلکہ وہ بہت بڑا جرم ہے۔ وہ دنیا میں بھی قابل سزا ہے اور آخرت میں بھی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَ مَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اے ایمان والو، تم شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ اور جو شخص شیطان کے قدموں پر چلے گا تو وہ اس کو بے حیائی اور بدی ہی کا کام کرنے کو کہے گا۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔ لیکن اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

شیطان کے قدموں پر چلنا یہ ہے کہ آدمی شیطانی وسوسوں کی پیروی کرنے لگے۔ ایک بے بنیاد بات پر جب کسی کے اندر بدگمانی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں تو یہ ایک شیطانی وسوسہ ہوتا ہے۔ اپنے مخالف کے بارے میں جب آدمی کے اندر منفی خیالات ابھرتے ہیں تو یہ بھی دراصل شیطان ہوتا ہے جو اس کے دل میں رینگتا ہے۔ ایسے جذبات اور خیالات جب کسی کے اندر پیدا ہوں تو اس کو چاہیے کہ وہ اندر ہی اندر ان کو کچل دے، نہ یہ کہ وہ ان کی پیروی کرنے لگے۔ ایسے احساسات کی پیروی کرنا براہ راست شیطان کی پیروی کرنا ہے۔

دوسروں کے خلاف طوفان اٹھانا ایک ایسا عمل ہے جو تواضع کے خلاف ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ خوش گمان ہوتا ہے۔ اور دوسرے کے بارے میں ضرورت سے زیادہ بدگمان۔ یہ دونوں ہی باتیں ایسی ہیں جو ایمان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ اگر آدمی کے اندر ایمانی تواضع پیدا ہو جائے تو وہ اپنے احتساب میں اتنا زیادہ مشغول ہوگا کہ اس کو فرصت ہی نہ ہوگی کہ وہ دوسرے کے احتساب کا جھوٹا جھنڈا اٹھائے۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۽ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا

۲۲۔ اور تم میں سے جو لوگ فضل والے اور وسعت والے ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتے داروں اور مسکینوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دیں گے۔ اور چاہیے کہ وہ

تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾

معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

حضرت عائشہ کے خلاف طوفان اٹھانے والوں میں ایک صاحب مسطح بن اُثاثہ تھے۔ وہ ایک مفلس مہاجر تھے اور حضرت ابوبکر کے دور کے رشتہ دار تھے۔ حضرت ابوبکر اعانت کے طور پر ان کو کچھ رقم دیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ ابوبکر کی صاحب زادی تھیں۔ قدرتی طور پر حضرت ابوبکر کو مسطح بن اثاثہ کے عمل سے تکلیف ہوئی۔ آپ نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ مسطح کی کوئی مدد نہ کریں گے۔

اسلام میں محتاجوں کی مدد ان کی محتاجی کی بنیاد پر ہوتی ہے، نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔ چنانچہ قرآن میں یہ حکم اترا کہ تم میں سے جو لوگ صاحب مال ہیں وہ ذاتی شکایت کی بنا پر بے مال لوگوں کی امداد بند نہ کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کردے۔ اگر تم اپنے لیے خدا سے معافی کے امیدوار ہو تو تمھیں بھی دوسروں کے بارے میں معافی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ آیت سن کر حضرت ابوبکر نے کہا: بَلَى وَاللّٰهِ، إِنِّي لَأُحِبُّ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لِي (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 4-303)۔ ہاں، خدا کی قسم، میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کردے۔ اور دوبارہ مسطح کی امداد جاری کردی۔

مومن کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت خدا کے حکم کی ہوتی ہے۔ خدا کا حکم سامنے آتے ہی وہ فوراً جھک جاتا ہے، خواہ خدا کا حکم اس کی خواہش کے سراسر خلاف کیوں نہ ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

۲۳۔ بے شک جو لوگ پاک دامن، بے خبر، ایمان والی عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی۔ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ ۲۴۔ اس دن جب کہ ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں بھی ان کاموں کی جو کہ یہ لوگ کرتے تھے۔ ۲۵۔ اس دن اللہ ان کو واجبی بدلہ پورا پورا دے گا۔ اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق ہے، کھولنے والا ہے۔

انسان اپنی زبان سے دوسروں کے خلاف برے الفاظ نکالتا ہے۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ دوسروں تک پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہے ہیں۔ آدمی اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں کو دوسروں پر ظلم کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مگر وہ اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ قیامت جب آئے گی تو اس کے ہاتھ اور

پاؤں اس کے ہاتھ اور پاؤں نہ رہیں گے بلکہ وہ خدا کے گواہ بن جائیں گے۔

یہی بے خبری تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔ اگر آدمی کو اس حقیقت حال کا واقعی احساس ہو کہ وہ ایسی دنیا میں ہے جہاں وہ ہر آن خدا کی نگاہ میں ہے، جہاں اس کا ہر عمل خدائی نظام کے تحت ریکارڈ ہو رہا ہے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ وہ ہر لفظ تول کر اپنی زبان سے نکالے۔ وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی طاقت کو انتہائی احتیاط کے ساتھ استعمال کرے۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾ ع ۳

۲۶۔ خبیثات خبیثوں کے لیے ہیں اور خبیث خبیثات کے لیے ہیں۔ اور طیبات طیبوں کے لیے ہیں اور طیب طیبات کے لیے۔ وہ لوگ بَری ہیں ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی ہے۔

خبیثات سے مراد خبیث کلمات ہیں اور اسی طرح طیبات سے مراد طیب کلمات۔ مطلب یہ ہے کہ محض کسی کے برا کہنے سے کوئی شخص برا نہیں ہو جاتا۔ آدمی خود جیسا ہو ویسی ہی بات اس کے اوپر چسپاں ہوتی ہے۔ برے لوگ اچھے لوگوں کے بارے میں بری بات کہیں تو ایسی بات آخر کار خود کہنے والے پر پڑتی ہے اور اچھے لوگ اس سے پوری طرح بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ اپنی ذات میں اچھے ہوں وہ دنیا میں بھی جھوٹے الزامات سے بری ہو کر رہتے ہیں۔ اور آخرت میں تو ان کا بری ہونا بالکل یقینی ہے۔ آخرت میں انھیں مزید اضافہ کے ساتھ خدا کے انعامات ملیں گے۔ کیوں کہ ان کے خلاف ناحق باتیں دراصل اس بات کی قیمت تھیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو ناحق سے کاٹا اور اپنے آپ کو پوری طرح حق کے ساتھ وابستہ کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓي اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ

۲۷۔ اے ایمان والو، تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو اور گھر والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ ۲۸۔ پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل نہ ہو جب تک تم کو اجازت نہ دے دی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے

لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

کہ لوٹ جاؤ تو تم لوٹ جاؤ۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۲۹۔ تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ تم ان گھروں میں داخل ہو جن میں کوئی نہ رہتا ہو۔ ان میں تمھارے فائدے کی کوئی چیز ہو۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

اجتماعی زندگی میں اکثر ملاقات کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اب ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی بلا اطلاع کسی کے یہاں پہنچے اور اچانک اس کے مکان کے اندر داخل ہو جائے۔ یہ طریقہ دونوں ہی کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ اس لیے پیشگی اجازت کو ملاقات کے آداب میں شامل کیا گیا۔

اگر ممکن ہو تو بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے صاحب ملاقات سے رابطہ قائم کیا جائے اور اس سے پیشگی طور پر ملاقات کا وقت مقرر کر لیا جائے۔ اور پھر جب آدمی اس کے مکان پر پہنچے تو اندر داخل ہونے سے پہلے اس کی باقاعدہ اجازت لے۔ تمدنی حالات کے لحاظ سے اس اجازت کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ تاہم ہر طریقہ میں اسلامی شائستگی کی شرط موجود رہنا ضروری ہے۔

اسلام اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کو اعلیٰ ظرفی کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہی اعلیٰ ظرفی ملاقات کے معاملہ میں بھی مطلوب ہے۔ اگر آپ کسی سے ملنے کے لیے اس کے گھر جائیں، اور صاحب خانہ کسی وجہ سے اس وقت ملاقات سے معذرت کرے تو آپ کو خوش دلی کے ساتھ واپس آجانا چاہیے۔ تاہم وہ اجتماعی مقامات اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جہاں اصولاً لوگوں کے لیے داخلہ کی عام اجازت ہوتی ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ مومن مردوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے پاکیزہ ہے۔ بے شک اللہ باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں۔

عورت اور مرد گھر میں اور معاشرہ میں کس طرح رہیں، اس سلسلہ میں یہاں دو اصولی ہدایتیں دی گئی ہیں۔ ایک ہے ستر کو ڈھانکنا۔ اور دوسرے نگاہ کو نیچی رکھنا۔

مرد کے جسم کا وہ حصہ جو اس کو ہر حال میں چھپائے رکھنا ہے وہ ناف سے لے کر گھٹنے تک ہے۔ یہ ستر ہے اور اس کو اپنی بیوی کے سوا کسی اور کے سامنے کھولنا جائز نہیں۔ اِلّا یہ کہ اس نوعیت کی کوئی ضرورت پیش آجائے جب کہ حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ مثلاً طبی معائنہ کے لیے۔

دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ جب مرد اور عورت کا سامنا ہو تو مردوں کو چاہیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ مرد اور عورت کی ملاقات اس طرح بے تکلف انداز میں نہیں ہونی چاہیے جس طرح مرد اور مرد ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مرد اور عورت کی ملاقات میں مرد کی نگاہیں نیچی رہنی چاہئیں۔ اگر اتفاقاً مرد کی نگاہ کسی اجنبی عورت پر پڑ جائے تو وہ فوراً اپنی نظر اس سے ہٹا لے۔ وہ بالقصد دوسری بار اس کی طرف نہ دیکھے۔

غض بصر اور حفاظت فروج کا جو حکم مردوں کے لیے ہے وہی حکم عورتوں کے لیے بھی ہے، جیسا کہ اگلی آیت 31 سے واضح ہے۔

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور مومن عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، مگر جو اس میں سے ظاہر ہو جائے۔ اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہیں۔ اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنے مملوک پر یا زیر دست مردوں پر جو کچھ غرض نہیں رکھتے۔ یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے ابھی ناواقف ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زور سے نہ ماریں کہ ان کی مخفی زینت معلوم ہو جائے، اور اے ایمان والو، تم سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

خواتین کے سلسلہ میں اسلام کے احکام دو پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک وہ جس کا عنوان ستر ہے اور دوسرے وہ جس کا عنوان حجاب ہے۔ ستر کا تعلق جسم کے پردہ سے ہے۔ یعنی عورت خواہ گھر کے اندر ہو یا گھر کے باہر، اس کو اپنے بدن کا کون سا حصہ، کس کے سامنے اور کن حالات میں کھلا رکھنا جائز ہے اور کب کھلا رکھنا جائز نہیں۔

حجاب کا تعلق باہر کے پردہ سے ہے، یعنی اس مسئلہ سے کہ شریعت نے عورت کو کن حالات میں گھر سے باہر نکلنے اور سفر کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان آیات میں بنیادی طور پر ستر کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ حجاب کا مسئلہ آگے سورہ احزاب میں ہے۔

’’اے مومنوتم سب اللہ کی طرف رجوع کرو‘‘— یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ احکام شریعت کی تعمیل کے سلسلہ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ دلوں کے اندر اس کی آمادگی ہو۔ صحابہ اور صحابیات اس معاملہ میں آخری معیاری درجہ پر تھے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ خدا کی قسم میں نے خدا کی کتاب کی تصدیق اور اس کے احکام پر ایمان کے معاملہ میں انصار کی عورتوں سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔ جب سورہ نور کی آیت (وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ) اتری تو ان کے مرد اپنے گھروں کی طرف لوٹے۔ انھوں نے اپنی عورتوں اور لڑکیوں اور بہنوں کو وہ حکم سنایا جو خدا نے ان کے لیے اتارا تھا۔ پس انصار کی عورتوں میں سے ہر عورت فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ کسی نے اپنی کمر پٹی کھول کر اور کسی نے اپنی چادر لے کر اس کا دوپٹہ بنایا اور اس کو اوڑھ لیا۔ اگلے دن صبح کی نماز انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھی تو دوپٹہ کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان کے سروں پر کوّے ہوں (تفسیر ابن ابی حاتم، حدیث نمبر 14406)۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖۗ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ ع ۴ ۸ ۱۰

۳۲۔ اور تم میں جو بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دو۔ اور تمھارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو نکاح کے لائق ہوں ان کا بھی۔ اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ اور اللہ وسعت والا، جاننے والا ہے۔ ۳۳۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں، ان کو چاہیے کہ وہ ضبط کریں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔ اور تمھارے مملوکوں میں سے جو مُکاتَب ہونے کے طالب ہوں تو ان کو مکاتب بنا لو اگر تم ان میں صلاحیت پاؤ۔ اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے۔ اور اپنی لونڈیوں کو پیشہ پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہوں، محض اس لیے کہ دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ تم کو حاصل ہو جائے۔ اور جو شخص ان کو مجبور کرے گا تو اللہ اس جبر کے بعد بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۳۴۔ اور بے شک ہم نے تمھاری طرف روشن آیتیں اتاری ہیں اور ان لوگوں کی مثالیں بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بھی۔

اسلام مرد اور عورت کے لیے شادی شدہ زندگی پسند کرتا ہے۔ کسی بھی عذر کی بنا پر نکاح سے رکنا اسلام میں

درست نہیں۔ کچھ لوگ کسی ذاتی سبب سے غیر شادی شدہ رہ جائیں تو اس وقت اسلام پورے معاشرہ میں یہ روح دیکھنا چاہتا ہے کہ تمام لوگ اس کو ایک مشترک مسئلہ سمجھیں اور اس وقت تک مطمئن نہ ہوں جب تک وہ اس مسئلہ کو شرعی طریقوں سے حل نہ کرلیں۔

کتاب یا مکاتبت کے لفظی معنی ہیں لکھنا۔ اس سے مراد وہ تحریر ہے جس میں کوئی لونڈی یا غلام اپنے آقا سے یہ عہد کرے کہ میں اتنی مدت میں اتنا مال کما کر تجھے دے دوں گا اور اس کے بعد سے میں آزاد ہوں گا۔

اسلام جس زمانہ میں آیا اس وقت عرب میں اور ساری دنیا میں غلام بنانے کا رواج تھا۔ اسلام نے نہایت منظم طور پر اس کو ختم کرنا شروع کیا۔ اسی میں سے ایک طریقہ وہ تھا جس کو مکاتبت کہا جاتا ہے۔ تاہم اسلام نے فک رقبہ (گردنیں چھڑانے) کی یہ مہم اپنے عام اصول کے مطابق تدریج کے تحت چلائی۔ مختلف طریقوں سے غلاموں اور لونڈیوں کو رہا کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ خلافت راشدہ کے آخری دور تک اس ادارہ کا تقریباً خاتمہ ہوگیا۔

قدیم زمانہ میں بعض لوگ اپنی لونڈیوں سے کسب کراتے تھے۔ مدینہ کے منافق عبداللہ بن ابی کے پاس کئی لونڈیاں تھیں جن سے بدکاری کرا کر وہ رقم حاصل کرتا تھا۔ ان میں سے ایک لونڈی نے اسلام قبول کرلیا اور کسب سے باز آنا چاہا تو عبداللہ بن ابی نے اس پر جبر کرنا شروع کیا۔ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ لونڈی عبداللہ بن ابی کے قبضہ سے رہا کرائی گئی۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ اس کی روشنی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق اس میں ایک چراغ ہے۔ چراغ ایک شیشہ کے اندر ہے۔ شیشہ ایسا ہے جیسے ایک چمک دار تارہ۔ وہ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ اس کا تیل ایسا ہے گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی وہ خود بخود جل اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی۔ اللہ اپنی روشنی کی راہ دکھاتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہ ایک مرکب تمثیل ہے۔ اس آیت میں روشنی سے مراد اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ طاق سے مراد انسان کا

دل ہے اور چراغ سے مراد ایمان کی استعداد ہے۔شیشہ اور تیل اسی استعداد کی مزید خصوصیت کو بتا رہے ہیں۔شیشہ اس بات کی تعبیر ہے کہ یہ استعداد قلبِ انسانی میں اس طرح رکھی گئی ہے کہ وہ خارجی اثرات سے پوری طرح محفوظ رہے۔اور شفاف تیل اس بات کی تعبیر ہے کہ اس کی یہ استعداد اتنی قوی ہے کہ وہ بے تاب ہو رہی ہے کہ کب اس کے سامنے حق آئے اور وہ اس کو بلا تاخیر قبول کر لے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کائنات میں روشنی کا واحد ماخذ صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔اسی سے ہر ایک کو روشنی اور ہدایات ملتی ہے۔مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کے اندر فطری طور پر حق کی طلب موجود ہے۔یہ طلب بے حد طاقت ور ہے۔اور اگر اس کو ضائع نہ کیا جائے تو وہ ہر آن اپنا جواب پانے کے لیے بے تاب رہتی ہے۔باعتبار فطرت انسان کی استعدادِ قبول اتنی بڑھی ہوئی ہے گویا وہ کوئی پٹرول ہے کہ آگ اگر اس کے قریب بھی لائی جائے تو وہ فوراً بھڑک اٹھے۔

مومن وہ حقیقی انسان ہے جس نے اپنی فطری استعداد کو ضائع نہیں کیا۔چنانچہ حق کی دعوت سامنے آتے ہی اس کی استعداد جاگ اٹھی۔نور فطرت کے ساتھ نور ہدایت نے مل کر اس کے پورے وجود کو روشن کر دیا۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

۳۶۔ایسے گھروں میں جن کی نسبت اللہ نے حکم دیا ہے کہ وہ بلند کیے جائیں اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے ان میں صبح و شام اللہ کی یاد کرتے ہیں۔ ۳۷۔وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی اور نہ نماز کی اقامت سے اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے۔ وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔ ۳۸۔کہ اللہ انھیں ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے اور ان کو مزید اپنے فضل سے نوازے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

انسانی جسم میں جو مقام دل کا ہے وہی مقام انسانی بستی میں مسجد کا ہے۔انسان کا دل ایمان سے آباد ہوتا ہے اور مسجدیں اللہ کی عبادت سے آباد ہوتی ہیں۔مسجدیں خدا کا گھر ہیں۔وہ اسی لیے بنائی جاتی ہیں کہ وہاں اللہ کی یاد کی جائے۔وہاں آنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس لیے آتے ہیں کہ وہاں کے روحانی ماحول میں اللہ کی طرف متوجہ ہوسکیں۔وہ اس لیے آتے ہیں کہ اپنے آپ کو یکسو کر کے کچھ وقت اللہ کی عبادت میں گزاریں۔

جس انسان کو یہ توفیق ملے کہ وہ اپنی فطرت کی آواز کو پہچان کر خدا پر ایمان لائے۔اور پھر وہ اپنے آپ کو

مسجد والے اعمال میں مشغول کرلے اس کے دل میں اللہ اپنی ہیبت کا احساس ڈال دیتا ہے جو موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قربانی کی سطح پر خدا پرستی کو اختیار کرتے ہیں۔ اور غیر خدا سے کٹ کر خدا والے بنتے ہیں۔

یہی وہ انسان ہے جو اللہ کے یہاں بہترین انعام کا مستحق ہے۔ اللہ اس کو بے حساب فضل عطا فرمائے گا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ۙ39 اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّـجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ۧ40

ع 5

۳۹۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں سراب۔ پیاسا اس کو پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو کچھ نہ پایا۔ اور اس نے وہاں اللہ کو موجود پایا، پس اس نے اس کا حساب چکا دیا۔ اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔
۴۰۔ یا جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا ہو، موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں، اوپر تلے بہت سے اندھیرے، اگر کوئی اپنا ہاتھ نکالے تو اس کو بھی نہ دیکھ پائے۔ اور جس کو اللہ روشنی نہ دے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔

انسانوں کی ایک قسم وہ ہے جس کا ذکر آیت 35 میں تھا۔ یہ وہ انسان ہے جو اپنی فطری استعداد کو زندہ رکھتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایمان کی دولت سے سرفراز ہوتا ہے۔ اب آیت 40-39 میں انسانوں کی مزید دو قسموں کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا تیل دعوتِ حق کی آگ سے بھڑکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ایک قسم وہ ہے جو کسی خودساختہ دین پر قائم رہتی ہے۔ وہ جھوٹی تمناؤں کا ایک محل بنا کر اس میں خوش رہتی ہے۔ یہ لوگ اسی طرح خوش گمانیوں میں پڑے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب موت آتی ہے تو ان کی خوش گمانیوں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اور پھر اچانک انھیں معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو وہ منزل سمجھے ہوئے تھے وہ ہلاکت کے گڑھے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔

دوسری قسم وہ ہے جو کھلم کھلا منکروں اور باغیوں کی ہے۔ یہ لوگ خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر بطور خود ہدایت وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ سراسر ناکام رہتے ہیں۔ کیوں کہ اس دنیا میں ہدایت دینے والا خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ خدا کو چھوڑنے کے بعد آدمی کے حصہ میں اس کے سوا کچھ نہیں رہتا کہ وہ ابدی طور پر اندھیرے میں بھٹکتا رہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ
صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا
يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾

۴۱۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور چڑیاں بھی پر کو پھیلائے ہوئے۔ ہر ایک اپنی نماز کو اور اپنی تسبیح کو جانتا ہے۔ اور اللہ کو معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ ۴۲۔ اور اللہ ہی کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ اور اللہ ہی کی طرف ہے سب کی واپسی۔

انسان سے خدا کا جو مطالبہ ہے اس کو لفظ بدل کر کہیں تو وہ یہ ہے کہ انسان ویسا ہی رہے جیسا کہ از روئے حقیقت اسے رہنا چاہیے۔ یہی دین حق ہے۔ اس اعتبار سے ساری کائنات دین حق پر ہے۔ کیوں کہ اس کائنات کی ہر چیز عین اسی طرح عمل کرتی ہے جیسا کہ فی الواقع اسے عمل کرنا چاہیے۔ انسان کے سوا اس کائنات میں کوئی بھی چیز نہیں جس کے عمل میں اور حقیقت واقعہ میں کوئی ٹکراؤ ہو۔

انھیں بے شمار چیزوں میں سے ایک مثال چڑیا کی ہے۔ چڑیا جب اپنا پر پھیلائے ہوئے فضا میں اڑتی ہے تو وہ اسی حقیقت کا ایک کامل نمونہ ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ابدی حقیقت کی دنیا میں کامل موافقت کر کے تیر رہی ہو۔ گویا اس نے اپنے انفرادی وجود کو حقائق کے وسیع تر سمندر میں گم کر دیا ہو۔

ہر ایک کی ایک تسبیحِ خداوندی ہے اور وہی اس سے مطلوب ہے۔ اسی طرح انسان کی ایک تسبیحِ خداوندی ہے اور وہ اس سے مطلوب ہے۔ انسان اگر اس معاملہ میں غفلت یا سرکشی کا رویہ اختیار کرے تو اس وقت اس کو اس کی سخت قیمت ادا کرنی ہوگی جب خدا کے ساتھ اس کا سامنا پیش آئے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ
بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ
جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ
يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَ
النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي
الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾

۴۳۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ بادلوں کو چلاتا ہے۔ پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے۔ پھر ان کو تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے۔ پھر تم بارش کو دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ سے نکلتی ہے اور وہ آسمان سے —— اس کے اندر کے پہاڑوں سے —— اولے برساتا ہے۔ پھر ان کو جس پر چاہتا ہے گراتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے ان کو ہٹا دیتا ہے۔ اس کی بجلی کی چمک معلوم ہوتا ہے کہ نگاہوں کو اچک لے جائے گی۔ ۴۴۔ اللہ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے۔ بے شک اس میں سبق ہے آنکھ والوں کے لیے۔

یہاں دنیا کے چند واقعات کو بطور تمثیل ذکر کر کے کہا گیا ہے کہ اس میں اہل بصیرت کے لیے عبرت ہے۔ عبرت کے اصل معنی ہیں عبور کرنا، طے کرنا۔ اس سے مراد وہ ذہنی سفر ہے جب کہ آدمی ایک چیز سے دوسری چیز تک پہنچتا ہے۔ جب آدمی ایک واقعہ کو حقیقت سے لنک (link) کرتا ہے۔ جب وہ ایک ظاہری چیز کے اندر اس کے معنوی پہلو کو دیکھ لیتا ہے تو اسی کا نام عبرت ہے۔

بارش کو دیکھیے زمین سے لے کر سورج تک ایک عظیم ہم آہنگ عمل کے نتیجہ میں وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو بارش کہتے ہیں۔ پھر یہ بادل کبھی زندگی بخش مینھ لاتے ہیں اور کبھی انھیں بادلوں سے ہلاکت خیز اولے برسنے لگتے ہیں۔ یہی معاملہ بجلی کی چمک اور رات اور دن کی گردش کا ہے۔ ان ظاہری واقعات میں بے شمار معنوی حقائق چھپے ہوئے ہیں، جو لوگ ان کو دیکھ کر ظاہر کو معنی سے مربوط کر سکیں وہی خدا کی نظر میں بصیرت والے ہیں۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

۴۵۔ اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر ان میں سے کوئی اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے۔ اور ان میں سے کوئی دو پاؤں پر چلتا ہے۔ اور ان میں سے کوئی چار پیروں پر چلتا ہے۔ اللہ پیدا کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۶۔ ہم نے کھول کر بتانے والی آیتیں اتار دی ہیں۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

دنیا کی چیزوں میں بظاہر تعدد ہے۔ اس سے مشرک انسان نے یہ قیاس کیا کہ چیزوں کے خالق بھی متعدد ہیں۔ مگر جب چیزوں کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ ظاہری تعداد اور تنوع کے اندر ایک یکسانیت چھپی ہوئی ہے تو معاملہ بالکل بدل جاتا ہے۔

حیوانات کی لاکھوں قسمیں ہیں۔ مگر گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان سب کی اصل ایک ہے۔ تمام حیوانات کا حیاتیاتی نظام بالکل یکساں ہے۔ اس مطالعہ کے بعد چیزوں کا تعدد اور تنوع خالق کی قدرت کا کرشمہ بن جاتا ہے۔ ایک اعتبار سے جو چیز تعددِ تخلیق کا اظہار معلوم ہو رہی تھی وہ دوسرے اعتبار سے توحید تخلیق کا ثبوت بن جاتی ہے۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں فریب کے درمیان حقیقت کو پانا پڑتا ہے۔ یہاں اپنے آپ کو دھوکا دینے والی باتوں سے اوپر اٹھانا پڑتا ہے۔ تاکہ آدمی حق کا مشاہدہ کر سکے۔ اسی خاص کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدمی کو عقل کی صلاحیت دی ہے۔ جو شخص اس خدائی ٹارچ کو صحیح طور پر استعمال کرے گا وہ راستہ پالے گا۔ اور جو شخص اس کو استعمال نہیں کرے گا اس کے لیے اس دنیا میں بھٹکنے کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

وَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ؕ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع ۶ ۱۲

۴۷۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی۔ مگر ان میں سے ایک گروہ اس کے بعد پھر جاتا ہے۔ اور یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۴۸۔ اور جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ خدا کا رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے۔ ۴۹۔ اور اگر حق ان کو ملنے والا ہو تو وہ اس کی طرف فرماں بردار بن کر آجاتے ہیں۔ ۵۰۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں یا ان کو یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ساتھ ظلم کریں گے۔ بلکہ یہی لوگ ظالم ہیں۔

قدیم مدینہ میں ایک طبقہ وہ تھا جس نے بظاہر اسلام قبول کرلیا تھا مگر وہ اسلام کے معاملہ میں مخلص نہ تھا۔ اس گروہ کو منافق کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ زبان سے تو خدا و رسول کی اطاعت کے الفاظ بولتے تھے مگر جب تجربہ پیش آتا تو وہ خود اپنے عمل سے اپنے اس دعوے کی تردید کردیتے۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مدینہ میں باقاعدہ نوعیت کی اسلامی عدالت ابھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ وہاں ایک طرف یہودی سردار تھے جو سیکڑوں سال سے رواجی طور پر لوگوں کے فیصلے کرتے چلے آرہے تھے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرکے وہاں پہنچ چکے تھے۔ منافقین کا حال یہ تھا کہ اگر کسی مسلمان سے ان کی نزاع ہوجائے اور وہ کہے کہ چلو رسول اللہ کے یہاں اس کا فیصلہ کرالو تو مذکورہ منافق اس کے لیے صرف اس صورت میں راضی ہوتا تھا، جب کہ اس کو یقین ہوتا کہ مقدمے کی نوعیت ایسی ہے کہ فیصلہ اس کے اپنے حق میں ہوجائے گا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو وہ کہتا کہ فلاں یہودی سردار کے یہاں چلو اور اس سے فیصلہ کرالو۔

یہ بظاہر ہوشیاری ہے مگر یہ خود اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔ اس طرح جیتنے والے آخرت میں اس حال میں پہنچیں گے کہ وہ اپنا مقدمہ بالکل ہار چکے ہوں گے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا

۵۱۔ ایمان والوں کا قول تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا

سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾
وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَخْشَ اللّٰهَ وَ
يَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور ہم نے مانا۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔
۵۲۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طاعت
کرے اور وہ اللہ سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے
بچے تو یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہوں گے۔

عام آدمی اپنے مفاد کے تابع ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو اللہ اور رسول کا تابع بنا لے۔ جب خدا اور رسول کا فیصلہ سامنے آجائے تو وہ ہر حال میں وہی کرے جو خدا و رسول کا فیصلہ ہو۔ خواہ وہ اس کی خواہش کے مطابق ہو یا اس کی خواہش کے خلاف۔ خواہ اس میں اس کا مفاد محفوظ ہوتا ہو یا اس میں اس کا مفاد مجروح ہو رہا ہو۔

آخرت کی کامیابی صرف اس شخص کے لیے ہے جس کا ایمان اس کو خدا اور رسول کے حکم کے آگے جھکا دے۔ خدا کا احساس اس کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ وہ اسی سے سب سے زیادہ ڈرنے لگے۔ خدا کی ناراضگی سے اپنے آپ کو بچانا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ
لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ
مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾
قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا
حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَى
الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

۵۳۔ اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، بڑی سخت
قسمیں، کہ اگر تم ان کو حکم دو تو وہ ضرور نکلیں گے۔ کہو
کہ قسمیں نہ کھاؤ، دستور کے مطابق اطاعت
چاہیے۔ بے شک اللہ کو معلوم ہے جو تم کرتے
ہو۔ ۵۴۔ کہو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی
اطاعت کرو۔ پھر اگر تم روگردانی کرو گے تو رسول پر
وہ بوجھ ہے جو اس پر ڈالا گیا ہے اور تم پر وہ بوجھ
ہے جو تم پر ڈالا گیا ہے۔ اور اگر تم اس کی اطاعت
کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔ اور رسول کے ذمہ
صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

جس شخص کے دل میں گہرائی کے ساتھ خدا اترا ہوا ہو اس کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ اس کا احساسِ ذمہ داری اس سے بڑی بڑی قربانیاں کرا دیتا ہے۔ مگر زبانی وعدوں کے وقت وہ دیکھنے والے لوگوں کو گونگا نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس، جو شخص خدا سے تعلق کے معاملہ میں کم ہو وہ الفاظ کے معاملہ میں زیادہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے عمل کی کمی کو الفاظ کی زیادتی سے پورا کرتا ہے۔ اس کے پاس چونکہ کردار کی گواہی نہیں ہوتی اس لیے وہ اپنے کو معتبر ثابت کرنے کے لیے بڑے بڑے الفاظ کا مظاہرہ کرتا ہے۔

جولوگ الفاظ کا کمال دکھا کر دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ سارا معاملہ بس انسانوں کا معاملہ ہے۔ مگر جس شخص کو یقین ہو کہ اصل معاملہ وہ ہے جو خدا کے یہاں پیش آنے والا ہے۔ اس کا سارا انداز بالکل بدل جائے گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار دے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اقتدار دیا تھا۔ اور ان کے لیے ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لیے پسند کیا ہے۔ اور ان کی خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

یہاں جس غلبہ کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا تعلق اولاً رسول اور اصحابِ رسول سے ہے۔ مگر تبعاً اس کا تعلق پوری امت سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلبہ اور اقتدار اہلِ ایمان کے عمل کا نشانہ نہیں۔ وہ ایک خدائی انعام ہے جو ایمان اور عمل کے نتیجہ میں مومنین کی جماعت کو دیا جاتا ہے۔

اس غلبہ کا مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان کو زمین میں استحکام عطا کیا جائے۔ ان کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ دشمنانِ حق کے اندیشوں سے مامون ہو کر رہ سکیں۔ وہ آزادانہ طور پر خدا کی عبادت کریں۔ اور صرف ایک خدا کے بندے بن کر زندگی گزاریں۔ اہل ایمان کے غلبہ کی یہ حالت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک وہ خدا کے شکر کرنے والے بنے رہیں، اور تقویٰ کی کیفیت نہ کھوئیں۔

خلیفہ کے معنی عربی زبان میں جانشین یا بعد کو آنے والے کے ہیں۔ استخلاف یا خلیفہ بنانا یہ ہے کہ ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ پر غلبہ اور استحکام عطا کیا جائے — غلبہ دراصل خدائی امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ خدا ایک کے بعد ایک، ہر قوم کو زمین میں غلبہ دیتا ہے۔ اور اس طرح اس کو جانچتا ہے۔ اہل ایمان کی جماعت کے لیے یہ غلبہ امتحان کے ساتھ ایک انعام بھی ہے۔

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾ ع ۱۳

۵۶۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۵۷۔ جو لوگ انکار کر رہے ہیں ان کی نسبت یہ گمان نہ کرو کہ وہ زمین میں اللہ کو عاجز کر دیں گے۔ اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔

خدا کی رحمت یہ ہے کہ دنیا میں غلبہ اور آخرت میں جنت عطا کی جائے۔ جولوگ خدا کی اس رحمت کا مستحق بننا چاہیں انھیں اپنے اندر تین صفتیں پیدا کرنی چاہئیں۔

ایک اقامت صلوٰۃ۔ اقامت صلوٰۃ صورتاً پنج وقتہ نماز کا نظام قائم کرنے کا نام ہے۔ اور معنوی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ خشوع اور تواضع میں جینے والے بنیں، نہ کہ کبر اور سرکشی میں جینے والے۔

اسی طرح زکوٰۃ کی عملی صورت یہ ہے کہ اپنے اموال میں مقررہ شرح کے مطابق سالانہ ایک رقم نکالی جائے اور اس کو بیت المال کے حوالے کیا جائے اور بیت المال نہ ہونے کی صورت میں مستحقین کو براہِ راست دے دیا جائے۔ اور زکوٰۃ اپنی معنوی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ لوگ خودغرض بن کر نہ رہیں بلکہ وہ دوسروں کے خیر خواہ بن کر رہیں۔ حتیٰ کہ ان کی خیر خواہی اتنی بڑھے کہ اپنی ذات اور اثاثہ میں وہ دوسروں کا حق سمجھنے لگیں۔

رسول کی اطاعت رسول کے زمانے میں ذاتِ رسول کی اطاعت تھی۔ اور بعد کے زمانہ میں سنتِ رسول کی اطاعت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے لیے زندگی کا نمونہ اللہ کا رسول ہو۔ لوگ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں صرف رسولِ خدا کو اپنا رہنما سمجھیں۔ رسول کی رائے سامنے آنے کے بعد لوگ اپنی ذاتی رائے سے دست بردار ہو جائیں۔ رسول آگے ہو اور تمام لوگ اس کے پیچھے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَ لَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾ وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ

۵۸۔ اے ایمان والو، تمھارے مملوکوں کو اور تم میں جو بلوغ کو نہیں پہنچے ان کو تین وقتوں میں اجازت لینا چاہیے— فجر کی نماز سے پہلے، اور دوپہر کو جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمھارے لیے پردے کے ہیں۔ ان کے بعد نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر۔ تم ایک دوسرے کے پاس بکثرت آتے جاتے رہتے ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے۔ اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۵۹۔ اور جب تمھارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو وہ بھی اسی طرح اجازت لیں جس طرح ان کے اگلے اجازت لیتے رہے ہیں۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم اور حکیم ہے۔ ۶۰۔ اور بڑی بوڑھی عورتیں جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں، ان پر کوئی گناہ نہیں

لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ
یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ؕ وَاَنْ
یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۶۰﴾

اگر وہ اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں، بشرطیکہ وہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ اور اگر وہ بھی احتیاط کریں تو ان کے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اوپر معاشرتی احکام بیان ہوئے تھے۔ یہ آیتیں غالباً بعد کو ان کے تتمہ یا توضیح کے طور پر نازل ہوئیں۔ مثلاً اوپر (آیت 31) عورتوں کے لیے گھر کے اندر پردہ کی جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں یہ ہے کہ عورتیں اپنی اوڑھنی کے آنچل اپنے سینہ پر ڈال لیا کریں۔ یہاں (آیت 60) میں اس عام حکم سے ان عورتوں کو الگ کر دیا گیا جو نکاح کی عمر سے گزر چکی ہوں۔ فرمایا کہ اگر وہ اوڑھنی کا اہتمام نہ کریں تو کوئی حرج نہیں۔ یہ دونوں قسم کے احکام ایک ساتھ اتر سکتے تھے۔ مگر ان کے درمیان 29 آیتوں کا فاصلہ ہے۔ ان درمیانی آیات میں دوسرے مضامین ہیں۔ جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے، ابتدائی احکام اترنے کے بعد کچھ عملی سوالات پیدا ہوئے۔ چنانچہ ان کی وضاحت میں یہ آخری آیتیں اتریں اور یہاں شامل کی گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا انداز ترتیب اور تدریج کا انداز ہے، نہ کہ یکبارگی اقدام کا۔ خدا کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ تمام احکام ایک ساتھ بیک وقت نازل کر دے، مگر خدا نے حالات کے اعتبار سے احکام کو بتدریج نازل فرمایا۔

لَیْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ
حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ
اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ
بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ
اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِكُمْ
اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا
مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِیْقِكُمْ ؕ لَیْسَ
عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ
فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ
ع ۸ ۱۴ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

۶۱۔ اندھے پر کوئی تنگی نہیں اور لنگڑے پر کوئی تنگی نہیں اور بیمار پر کوئی تنگی نہیں اور نہ تم لوگوں پر کوئی تنگی ہے کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی ماؤں کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا جس گھر کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں کے گھروں سے، تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ پھر جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو جو بابرکت دعا ہے اللہ کی طرف سے۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

اسلام سے پہلے عرب کا معاشرہ ایک آزاد معاشرہ تھا۔ وہاں کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کے بعد اسلام نے گھروں کے اندر جانے پر پردہ کی پابندیاں عائد کیں جن کا بیان اوپر کی آیتوں میں ہے، تو کچھ لوگوں کو احساس ہوا کہ ان پابندیوں کے بعد ہماری سماجی زندگی بالکل محدود ہو کر رہ جائے گی۔

اس سلسلہ میں یہ وضاحتی آیتیں نازل ہوئیں۔ فرمایا کہ یہ پابندیاں تمھاری سماجی زندگی کو منظم کرنے کے لیے ہیں، نہ کہ تمہاری آزادی کو ختم کرنے کے لیے۔ مثلاً اندھے، لنگڑے اور بیمار اگر اپنے تعلق کے لوگوں سے دور ہو جائیں تو یہ عملاً ان کو بے سہارا کر دینے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ مگر اسلام کا یہ منشا ہرگز نہیں۔ چنانچہ سابقہ احکام میں ضروری گنجائشیں دیتے ہوئے اس کی اصل روح کی نشان دہی فرما دی۔

ارشاد ہوا کہ اسلام کا اصل مطلوب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی سچی خیر خواہی ہو۔ جب ایک آدمی دوسرے کے گھر میں داخل ہو تو وہ سلام کرے۔ اور کہے کہ ''تمھارے اوپر سلامتی ہو اور اللہ کی برکتیں تمھارے اوپر نازل ہوں''۔ یہ روح اگر حقیقی طور پر لوگوں کے اندر موجود ہو تو اکثر اجتماعی خرابیوں کا اپنے آپ خاتمہ ہو جائے گا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ ایمان والے وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین لائیں۔ اور جب وہ کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں تو جب تک تم سے اجازت نہ لے لیں وہاں سے نہ جائیں۔ جو لوگ تم سے اجازت لیتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ پس جب وہ اپنے کسی کام کے لیے تم سے اجازت مانگیں تو ان کو اجازت دے دو۔ اور ان کے لیے اللہ سے معافی مانگو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

جب کچھ لوگ اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ وابستہ کریں تو مختلف اسباب سے بار بار اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ انھیں اکٹھا کیا جائے۔ مثلاً مسلمانوں کے کسی مشترک معاملہ میں مشورہ کرنے کے لیے، کسی اجتماعی مہم پر لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے، وغیرہ۔

ایسے مواقع پر یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں پر اپنے انفرادی تقاضے غالب ہوں وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنی دلچسپی کھو دیتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر چلے جائیں۔ یہ مزاج صحیح اسلامی مزاج نہیں۔ تاہم جو لوگ اس ذہنیت سے پاک ہوں ان میں بھی بعض ایسے افراد ہو سکتے ہیں جو کسی وقتی ضرورت کی بنا پر اجتماع کے ختم ہونے سے پہلے اٹھنا چاہیں۔ ایسے افراد کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذمہ دار شخصیت سے (اور رسول کے زمانہ میں

رسول سے) باقاعدہ اجازت لے کر واپس جاتے ہیں۔ نیز اگر ذمہ دار انھیں کسی وجہ سے اجازت نہ دے تو وہ کسی ناگواری کے بغیر آخر وقت تک کارروائی میں شریک رہتے ہیں۔

جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا ذمہ دار ہو اس کے اندر یہ مزاج ہونا چاہیے کہ کوئی شخص اگر وقتی ضرورت کی بنا پر معذرت پیش کرے تو وہ اس کی معذرت کو دل سے قبول کرے۔ اور اس کے حق میں دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ
كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ
الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ
فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ اَلَاۤ اِنَّ
لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ
مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ
فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾ ع ۹ ۳ ۱۵

۶۳۔ تم لوگ رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے چلے جاتے ہیں۔ پس جو لوگ اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان کو ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آزمائش آجائے۔ یا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑ لے۔
۶۴۔ یاد رکھو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے۔ اللہ اس حالت کو جانتا ہے جس پر تم ہو۔ اور جس دن لوگ اس کی طرف لائے جائیں گے تو جو کچھ انھوں نے کیا تھا، وہ اس سے ان کو باخبر کردے گا۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہاں جس اطاعتِ رسول کا ذکر ہے اس کا تعلق رسول کی زندگی میں رسول سے تھا۔ رسول کے بعد اس کا تعلق ہر اس شخص سے ہے جو مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار بنایا جائے۔

اجتماعی معاملات میں اپنا حصہ ادا کرنے سے جو لوگ کترائیں وہ بطور خود یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اجتماعی کام میں وقت ضائع نہ کرکے اپنے انفرادی معاملہ کو مضبوط کر رہے ہیں۔ مگر جو گروہ اجتماعیت کو کھودے اس کے دشمن اس کے اندر گھسنے کی راہ پالیتے ہیں۔ اس طرح جو بربادی آتی ہے وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے عمومی بربادی ہوتی ہے۔ اس کا نقصان ہر ایک کو پہنچتا ہے، حتی کہ اس کو بھی جو یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے ذاتی معاملات میں پوری توجہ لگا کر اپنے آپ کو محفوظ کرلیا ہے۔

آدمی جب اس قسم کی کمزوری دکھاتا ہے تو بطور خود وہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے انسانوں کے ساتھ کر رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہوتا ہے وہ خدا کے ساتھ کر رہا ہوتا ہے۔ اگر یہ احساس زندہ ہو تو آدمی کبھی اس قسم کی بے اصولی کی جرأت نہ کرے۔

۲۵۔سُوۡرَۃُ الۡفُرۡقَان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝
تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ
لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۝۱ الَّذِیۡ لَہٗ
مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ
وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ
خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ۝۲
وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ
شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ وَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ
ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا وَّ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّ لَا
حَیٰوۃً وَّ لَا نُشُوۡرًا ۝۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔ ۲۔وہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔اور اس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ مقرر کیا۔ ۳۔اور لوگوں نے اس کے سوا ایسے معبود بنائے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے، وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔اور وہ خود اپنے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نفع کا۔اور نہ وہ کسی کے مرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی کے جینے کا اور نہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا۔

''فرقان'' کے لفظی معنی ہیں فرق کرنے والا۔یعنی حق وباطل کے درمیان امتیاز کرنے کا معیار (criterion)۔ یہاں فرقان سے مراد قرآن ہے۔خدا علیم وخبیر بھی ہے اور حاکم مطلق بھی۔اس لیے خدا کی طرف سے ایک کتاب فرقان کا آنا بیک وقت اپنے اندر دو پہلو رکھتا ہے۔ایک یہ کہ وہ یقینی طور پر صحیح ہے اس کی صحت وقطعیت میں کوئی شبہ نہیں۔دوسرے یہ کہ اس کو ماننا اور اس کو نہ ماننا دونوں کا انجام یکساں نہیں ہوسکتا۔

خدا تنہا تمام اختیارات کا مالک ہے۔کوئی اس کی رائے پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔کوئی اس کے اور اس کے فیصلوں کے درمیان حائل نہیں ہوسکتا۔یہی واقعہ اس بات کی ضمانت ہے کہ جو شخص قرآن کو اپنی رہنما کتاب بنائے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو شخص اس کو نظر انداز کرے گا اس کے لیے کسی طرح یہ ممکن نہیں کہ اپنے آپ کو اس ناکامی سے بچائے جو حق کو نظر انداز کرنے والے کے لیے خدا نے مقدر کردیا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکُ ۣافۡتَرٰىہُ
وَ اَعَانَہٗ عَلَیۡہِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ ۚۛ فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا
وَّ زُوۡرًا ۝۴ ۚۛ وَ قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَہَا

۴۔اور منکر لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک جھوٹ ہے جس کو اس نے گھڑا ہے۔اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس میں اس کی مدد کی ہے۔پس یہ لوگ ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے۔ ۵۔اور وہ

فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ
الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ
كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کی بے سند باتیں ہیں جن کو اس نے لکھوالیا ہے۔ پس وہ اس کو صبح وشام سنائی جاتی ہیں۔ ۶۔ کہو کہ اس کو اس نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید کو جانتا ہے۔ بے شک وہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

منکرین بظاہر قرآن کو جھوٹی کتاب کہتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس قول کا رخ پیغمبر کی طرف تھا۔ پیغمبر انھیں دیکھنے میں ایک معمولی انسان دکھائی دیتا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک معمولی انسان ایک غیر معمولی کتاب کا مالک کس طرح ہوسکتا ہے۔

قرآن ہر قسم کے مضامین کو چھوتا ہے — تاریخی، طبیعی، نفسیاتی، معاشرتی، وغیرہ۔ مگر اس میں آج تک کسی واقعی غلطی کی نشاندہی نہ کی جاسکی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جو کائنات کے بھیدوں کو آخری حد تک جاننے والا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن میں بھی غلطیاں ملتیں جس طرح دوسری انسانی کتابوں میں ملتی ہیں۔ یہی واقعہ قرآن کے خدائی کتاب ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

جو لوگ قرآن کے بارے میں بے بنیاد باتیں کہیں وہ بہت زیادہ جسارت کی بات کرتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً خدا کی پکڑ میں آجائیں گے۔ البتہ اگر وہ رجوع کرلیں تو خدا کا یہ طریقہ نہیں کہ اس کے بعد بھی وہ ان سے انتقام لے۔ خدا آدمی کے حال کو دیکھتا ہے، نہ کہ اس کے ماضی کو۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ
يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ
مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ
كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ
الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا
مَّسْحُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ
الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝ ع

۷۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر ڈراتا۔ ۸۔ یا اس کے لیے کوئی خزانہ اتارا جاتا۔ یا اس کے لیے کوئی باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا۔ اور ظالموں نے کہا کہ تم لوگ ایک سحرزدہ آدمی کی پیروی کررہے ہو۔ ۹۔ دیکھو وہ کیسی کیسی مثلیں تمھارے لیے بیان کررہے ہیں۔ پس وہ بہک گئے ہیں، پھر وہ راہ نہیں پاسکتے۔

حق کے ہر داعی کے ساتھ یہ ہوا ہے کہ اس کے زمانہ کے لوگوں نے اس کو حقیر سمجھا۔ اور بعد کے لوگوں نے اس کی پرستش کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی زندگی میں وہ اپنی حقیقی شخصیت کے ساتھ لوگوں کے سامنے ہوتا ہے۔

اس لیے وہ انھیں بس ایک عام انسان کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ مگر بعد کو اس کی شخصیت کے گرد افسانوی قصوں کا ہالہ بن جاتا ہے۔ بعد کے لوگ اس کو مبالغہ آمیز روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس لیے بعد کے لوگ مبالغہ آمیز حد تک اس کی تعظیم وتقدیس کرنے لگتے ہیں۔

بعد کے زمانے میں لوگوں کے ذہنوں میں پیغمبر کی غیر معمولی عظمت قائم ہوجاتی ہے۔ اس لیے کوئی بڑا اپنے آپ کو پیغمبر سے بڑا نہیں پاتا۔ مگر پیغمبر کی زندگی میں اس کی جو ظاہری صورت حال ہوتی ہے وہ وقت کے بڑوں کو موقع دیتی ہے کہ وہ پیغمبر کے مقابلہ میں متکبرانہ نفسیات میں مبتلا ہوسکیں۔ ایسے لوگ جب کچھ لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ پیغمبر کی باتوں کو سن کر متاثر ہورہے ہیں تو وہ ان کے تاثر کو گھٹانے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ایک مجنون ہے، یہ تو ایک سحرزدہ انسان ہے، وغیرہ۔ وہ دلیل کے میدان میں اپنے آپ کو عاجز پاکر عیب لگانے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ حالاں کہ دلیل کے ذریعہ کسی کو رد کرنا عین درست ہے جب کہ عیب لگا کر کسی کو بدنام کرنا سراسر نادرست۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ
ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ
يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۙ
وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾
اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا
وَّ زَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا
مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا
الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّ ادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾
قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ
الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾
لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰى
رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾

۱۰۔ بڑا بابرکت ہے وہ۔ اگر وہ چاہے تو تم کو اس سے بھی بہتر چیز دے دے۔ ایسے باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہوں، اور تم کو بہت سے محل دے دے۔ ۱۱۔ بلکہ انھوں نے قیامت کو جھٹلا دیا ہے۔ اور ہم نے ایسے شخص کے لیے جو قیامت کو جھٹلائے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ ۱۲۔ جب وہ ان کو دور سے دیکھے گی تو وہ اس کا بپھرنا اور دھاڑنا سنیں گے۔ ۱۳۔ اور جب وہ اس کی کسی تنگ جگہ میں باندھ کر ڈال دئے جائیں گے تو وہ وہاں موت کو پکاریں گے۔ ۱۴۔ آج ایک موت کو نہ پکارو، اور بہت سی موت کو پکارو۔ ۱۵۔ کہو کیا یہ بہتر ہے، یا ہمیشہ کی جنت جس کا وعدہ خدا سے ڈرنے والوں سے کیا گیا ہے، وہ ان کے لیے بدلہ اور ٹھکانا ہوگی۔ ۱۶۔ اس میں ان کے لیے وہ سب ہوگا جو وہ چاہیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تیرے رب کے ذمہ ایک وعدہ ہے واجب الادا۔

حق کے مخالفین اکثر حق کے داعی کی ذات کو نشانہ بناتے ہیں۔ وہ داعی کو غیر معتبر ثابت کرنے کے لیے

طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اس طرح وہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ حق کا داعی اگر ان کے معیار پر ہوتا ہے تو وہ اس کی بات مان لیتے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ ان کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حق کا داعی ان کو قابل اعتبار نظر نہیں آتا۔ ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ قیامت کی پکڑ سے بے خوف ہیں، اس لیے وہ غیر ذمہ دارانہ طور پر طرح طرح کے الفاظ بولتے رہتے ہیں۔

حق اور ناحق کے معاملہ کی ساری اہمیت اس بنا پر ہے کہ آخرت میں اس کی بابت پوچھ ہوگی۔ جو لوگ آخرت کی پکڑ کے بارے میں بے خوف ہو جائیں وہ اس کے بالکل لازمی نتیجہ کے طور پر حق اور ناحق کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں رہتے۔ اور جس چیز کے بارے میں آدمی سنجیدہ نہ ہو وہ اس کی اہمیت کو کسی طرح محسوس نہیں کرسکتا، خواہ اس کے حق میں کتنی ہی زیادہ دلیلیں دے دی جائیں۔ ایسے لوگوں کے الفاظ صرف اس وقت ختم ہوں گے جب کہ قیامت کی چنگھاڑ ان سے ان کے الفاظ چھین لے۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَ كَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿١٨﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّ لَا نَصْرًا ۚ وَ مَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿١٩﴾

۱۷۔ اور جس دن وہ ان کو جمع کرے گا اور ان کو بھی جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں، پھر وہ کہے گا، کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا وہ خود راستہ سے بھٹک گئے۔ ۱۸۔ وہ کہیں گے کہ پاک ہے تیری ذات۔ ہمیں یہ سزاوار نہ تھا کہ ہم تیرے سوا دوسروں کو کارساز تجویز کریں۔ مگر تو نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا کا سامان دیا، یہاں تک کہ وہ نصیحت کو بھول گئے اور ہلاک ہونے والے بنے۔ ۱۹۔ پس انھوں نے تم کو تمھاری باتوں میں جھوٹا ٹھہرا دیا۔ اب نہ تم خود ٹال سکتے ہو اور نہ کوئی مدد پا سکتے ہو۔ اور تم میں سے جو شخص ظلم کرے گا ہم اس کو ایک بڑا عذاب چکھائیں گے۔

''ذکر'' کی تشریح مفسر ابن کثیر نے ان الفاظ میں کی ہے: أَيْ: نَسُوا مَا أَنْزَلْتَهُ إِلَيْهِمْ عَلَى أَلْسِنَةِ رُسُلِكَ، مِنَ الدَّعْوَةِ إِلَى عِبَادَتِكَ وَحْدَكَ لَا شَرِيكَ لَكَ (تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 99)۔ یعنی، وہ اس دعوتی پیغام کو بھول گئے جو ان کی طرف تو نے اپنے پیغمبروں کی زبان سے تنہا اور لاشریک اپنی عبادت کے لیے اتارا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی مخاطب قومیں معروف معنوں میں کافر اور مشرک قومیں نہ تھیں۔ وہ دراصل پچھلے انبیاء کی امتیں تھیں۔ ان کے پیغمبروں نے ان کو خدا کی ہدایت پہنچائی۔ مگر زمانہ گزرنے کے بعد وہ دنیا میں مشغول

ہوگئے اور اپنے بزرگوں اور پیغمبروں کے بارے میں یہ عقیدہ بنالیا کہ وہ خدا کے یہاں ان کی بخشش کا ذریعہ بن جائیں گے۔ مگر جب قیامت آئے گی تو اس قسم کے تمام عقیدے باطل ثابت ہوں گے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اللہ کی پکڑ سے بچانے والا خود اللہ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿٢٠﴾ ع ٢ ١١ ١٧

۲۰۔ اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ اور ہم نے تم کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے۔ کیا تم صبر کرتے ہو۔ اور تمھارا رب سب کچھ دیکھتا ہے۔

قرآن کے مخاطبین اوّل حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت موسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو مانتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے سے انکار کردیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گزرے ہوئے پیغمبروں کو اعلیٰ اور افضل ثابت کرنے کے لیے بطور خود طلسماتی کہانیاں وضع کرتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ان کے سابق پیغمبر کی شخصیت ایک پرعجوبہ شخصیت کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ اب اس کے بعد جب ان کا ہم عصر نبی ان کے سامنے آتا ہے تو وہ بظاہر صرف ایک انسان دکھائی دیتا ہے۔ ان کے تصور میں ایک طرف ماضی کا پیغمبر ہوتا ہے جو ان کو فوق البشر ہستی معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف زندہ پیغمبر ہوتا ہے جو صرف ایک بشر کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس تقابل میں وہ حال کے پیغمبر پر یقین نہیں کر پاتے۔ وہ پیغمبری کو مانتے ہوئے پیغمبر کا انکار کردیتے ہیں۔

منکرین کے لیے رسول اور اہل ایمان آزمائش ہیں۔ اور رسول اور اہل ایمان کے لیے منکرین آزمائش ہیں۔ منکرین کی آزمائش یہ ہے کہ وہ رسول کے بظاہر بے عظمت حلیہ میں اس کے اندر چھپی ہوئی عظمت کو دریافت کریں۔ اور اہل ایمان کی آزمائش یہ ہے کہ وہ منکرین کی لایعنی باتوں پر بے برداشت نہ ہوں۔ وہ ہر حال میں صابر و شاکر بنے رہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ

☆۲۱۔ اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے۔ انھوں نے اپنے جی میں اپنے کو بہت بڑا سمجھا اور وہ حد سے گزر گئے ہیں سرکشی میں۔ ۲۲۔ جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے۔ اس دن

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَ قَدِمْنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾

مجرموں کے لیے کوئی خوش خبری نہ ہوگی۔ اور وہ کہیں گے کہ پناہ، پناہ۔ ۲۳۔ اور ہم ان کے ہر عمل کی طرف بڑھیں گے جو انھوں نے کیا تھا اور پھر اس کو اڑتی ہوئی خاک بنادیں گے۔ ۲۴۔ جنت والے اس دن بہترین ٹھکانے میں ہوں گے۔ اور نہایت اچھی آرام گاہ میں۔

جو لوگ داعی کے پیغام کو ماننے کے لیے فرشتے اور خدا کے ظہور کا مطالبہ کریں وہ کوئی واقعی بات نہیں کہتے۔ وہ صرف اپنی غیر سنجیدگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ خدا اور فرشتوں کا ظہور کیا معنی رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے بولنے کا جو موقع ہے وہ صرف اسی وقت تک ہے جب تک حق کو داعی کی سطح پر ظاہر کیا گیا ہو۔ جب حق خدا اور فرشتوں کی سطح پر ظاہر ہو جائے تو وہ فیصلہ کا وقت ہوتا ہے، نہ کہ ماننے اور تصدیق کرنے کا۔

بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ قیامت میں جب خدا پوچھے گا کہ کیا لائے تو میں اپنا فلاں عمل پیش کردوں گا۔ میں کہوں گا کہ فلاں اور فلاں بزرگوں کی نسبت مجھے حاصل ہے۔ مگر قیامت کے آتے ہی اس قسم کی خوش خیالیاں اس طرح بے حقیقت ثابت ہوں گی جیسے گرم لوہے پر پانی کا قطرہ پڑے اور فوراً اڑ جائے۔ اس دن صرف حقیقی عمل کسی کے کام آئے گا، نہ کہ کسی قسم کی جھوٹی خوش خیالی۔

وَ يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَ كَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾ وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰی لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ وَكَذٰلِكَ

۲۵۔ اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا۔ اور فرشتے لگاتار اتارے جائیں گے۔ ۲۶۔ اس دن حقیقی بادشاہی صرف رحمن کی ہوگی۔ اور وہ دن منکروں پر بڑا سخت ہوگا۔ ۲۷۔ اور جس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا، وہ کہے گا کاش، میں نے رسول کی معیت میں راہ اختیار کی ہوتی۔ ۲۸۔ ہائے میری شامت، کاش میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔ ۲۹۔ اس نے مجھ کو نصیحت سے بہکا دیا بعد اس کے کہ وہ میرے پاس آچکی تھی۔ اور شیطان ہے ہی انسان کو دغا دینے والا۔ ۳۰۔ اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ۳۱۔ اور اسی طرح ہم نے مجرموں میں

جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

سے ہر نبی کے دشمن بنائے۔ اور تمھارا رب کافی ہے رہنمائی کے لیے اور مدد کرنے کے لیے۔

جب بھی حق کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ لوگ اس کے دشمن بن جاتے ہیں جو حق کے نام پر ناحق کا کاروبار کررہے ہوں۔ وہ طرح طرح کے شوشے نکال کر داعی کی صداقت کو مشتبہ ثابت کرتے ہیں، اور بہت سے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔

جو لوگ ان جھوٹے لیڈروں کی باتوں پر یقین کر کے حق کے داعی کا ساتھ نہیں دیتے ان پر قیامت کے دن کھل جائے گا کہ لیڈروں کی دلیلیں دلیلیں نہ تھیں۔ وہ محض جھوٹے شوشے تھے جن کو انھوں نے اپنے مفاد کے مطابق پا کر مان لیا، اور اس کو حق سے دور رہنے کا بہانہ بنا لیا۔ اس وقت وہ افسوس کریں گے کہ کیوں انھوں نے ایسا کیا کہ وہ لیڈروں کے جھوٹے شوشوں کے فریب میں پڑے رہے، اور داعی حق کا ساتھ دینے والے نہ بنے۔

مہجور سے مراد متروک ہے، یعنی قرآن کو ماننے کے باوجود اُس کو ایک متروک کتاب (discardedbook) بنا دینا۔ قوم رسول سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے پیغمبر کی دعوت کو قبول کیا، مگر ان کے بعد کی نسلیں اُس پر قائم نہ رہ سکیں۔ جو لوگ زبان سے قرآن کو مانیں، مگر عملی طور پر وہ اس کو ترک کیے ہوئے ہوں، وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے قرآن کو کتابِ مہجور بنا دیا۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۛۚ كَذٰلِكَ ۛۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَ لَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ؕ﴿۳۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ ع

۳۲۔ اور انکار کرنے والوں نے کہا کہ اس کے اوپر پورا قرآن کیوں نہیں اتارا گیا۔ ایسا اس لیے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے۔ ۳۳۔ اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال تمھارے سامنے لائیں، مگر ہم اس کا ٹھیک جواب اور بہترین وضاحت تمھیں بتا دیں گے۔ ۳۴۔ جو لوگ اپنے منہ کے بل جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے، انھیں کا برا ٹھکانا ہے۔ اور وہی ہیں راہ سے بہت بھٹکے ہوئے۔

قرآن جب اترا تو وہ بیک وقت ایک پوری کتاب کی شکل میں نہیں اترا بلکہ جزء جزء کر کے 23 سال میں اتارا گیا۔ اس کو منکرین نے شوشہ بنا لیا اور کہا کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انسان کی کتاب ہے، نہ کہ خدا کی کتاب۔ کیوں کہ خدا کے لیے بیک وقت پوری کتاب بنا دینا کچھ مشکل نہیں۔

فرمایا کہ قرآن محض ایک تصنیف نہیں، وہ ایک دعوت ہے۔ اور دعوت کی مصلحتوں میں سے ایک مصلحت یہ ہے کہ اس کو بتدریج سامنے لایا جائے تا کہ وہ ماحول میں مستحکم ہوتی چلی جائے۔

جو دعوت کامل حق ہو اس کے خلاف ہر اعتراض جھوٹا اعتراض ہوتا ہے۔ اس کے خلاف جب بھی کوئی اعتراض اٹھے اور پھر اس کی سچی وضاحت کر دی جائے تو اس سے دعوت کی صداقت مزید ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں مشتبہ نہیں ہوتی۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۚۖ ﴿٣٥﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ؕ ﴿٣٦﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚۖ ﴿٣٧﴾ وَّ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿٣٨﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿٣٩﴾ وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْۤ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿٤٠﴾

۳۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو مدد گار بنایا۔ ۳۶۔ پھر ہم نے ان سے کہا کہ تم دونوں ان لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا ہے۔ پھر ہم نے ان کو بالکل تباہ کر دیا۔ ۳۷۔ اور نوح کی قوم کو بھی ہم نے غرق کر دیا جب کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور ہم نے ان کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ اور ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۳۸۔ اور عاد اور ثمود کو اور اصحاب الرس کو اور ان کے درمیان بہت سی قوموں کو۔ ۳۹۔ اور ہم نے ان میں سے ہر ایک کو مثالیں سنائیں اور ہم نے ہر ایک کو بالکل برباد کر دیا۔ ۴۰۔ اور یہ لوگ اس بستی پر سے گزرے ہیں جس پر بری طرح پتھر برسائے گئے۔ کیا وہ اس کو دیکھتے نہیں رہے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ دوبارہ اٹھائے جانے کی امید نہیں رکھتے۔

قرآن بار بار جن پیغمبروں کا حوالہ دیتا ہے ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کا ذکر انسانیت کی مدون تاریخ میں جگہ نہ پا سکا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پیغمبروں کے ہم عصر عقلاء نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے بادشاہوں اور فوجی ہیروؤں کے حالات جوش کے ساتھ لکھے کیوں کہ ان کے حالات میں سیاسی پہلو موجود تھا۔ مگر انھوں نے پیغمبروں کو نظر انداز کر دیا کیوں کہ ان کے حالات میں سیاسی ذوق کی تسکین کا سامان موجود نہ تھا۔

عجیب بات ہے کہ یہ مزاج آج بھی مکمل طور پر موجود ہے۔ آج بھی جو لوگ اپنے آپ کو سیاسی پلیٹ فارم پر نمایاں کریں وہ فوراً پریس اور ریڈیو میں جگہ پا لیتے ہیں اور جو لوگ غیر سیاسی میدان میں کام کریں ان کو آج کا انسان بھی زیادہ قابل تذکرہ نہیں سمجھتا۔

انسان سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ واقعات سے سبق لے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر سب سے کم پائی جاتی ہے، موجودہ زمانہ میں بھی اور اس سے پہلے کے زمانہ میں بھی۔

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْ لَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَ سَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

۴۱۔ اور وہ جب تم کو دیکھتے ہیں تو وہ تمھارا مذاق بنا لیتے ہیں۔ کیا یہی ہے جس کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ۴۲۔ اس نے تو ہم کو ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا ہوتا، اگر ہم ان پر جمے نہ رہتے۔ اور جلد ہی ان کو معلوم ہو جائے گا جب وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ سب سے زیادہ بے راہ کون ہے۔

''اگر ہم جمے نہ رہتے تو وہ ہم کو ہمارے دین سے ہٹا دیتا''— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اپنے دین پر قائم رہنے کی وجہ ان کا تعصب تھا نہ کہ کوئی دلیل۔ دلیل کے میدان میں وہ بے ہتھیار ہو چکے تھے۔ مگر تعصب کے بل پر وہ اپنے آبائی دین پر جمے رہے۔ یہی اکثر انسانوں کا حال ہوتا ہے۔ بیشتر انسان محض تعصب کی زمین پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے وہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ دلیل کی زمین پر کھڑے ہوئے ہیں۔

کسی دعوت کا مقابلہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے اس کو دلیل سے رد کرنا۔ دوسرا ہے اس کا مذاق اڑانا۔ پہلا طریقہ جائز ہے اور دوسرا طریقہ سراسر ناجائز۔ جو لوگ کسی دعوت کا مذاق اڑائیں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ دلیل کے میدان میں وہ اپنی بازی ہار چکے ہیں۔ اور اب مذاق اور استہزاء کی باتوں سے اپنی ہار پر پردہ ڈالنا چاہتے ہوں۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾ ع

۴۳۔ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ پس کیا تم اس کا ذمہ لے سکتے ہو۔ ۴۴۔ یا تم خیال کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ تو محض جانوروں کی طرح ہیں بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آسمان کے سایہ کے نیچے اللہ کے سوا پوجے جانے والے معبودوں میں سب سے زیادہ سنگین اللہ کے نزدیک وہ خواہش ہے جس کی پیروی کی جائے (مَا تَحْتَ ظِلِّ السَّمَاءِ مِنْ إِلَٰهٍ يُعْبَدُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَعْظَمُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ مِنْ هَوًى مُتَّبَعٍ) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 7502۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سے بڑا بت آدمی کی خواہش نفس ہے۔ بلکہ یہی اصل بت ہے۔ بقیہ تمام بت صرف خواہش پرستی کے دین کو جائز ثابت کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

خواہش کو اپنا رہبر بنانے کے بعد انسان اسی سطح پر آجاتا ہے جو جانوروں کی سطح ہے۔ جانور سوچ کر کوئی کام نہیں کرتے بلکہ صرف جبلّی تقاضے کے تحت کرتے ہیں۔ اب اگر انسان بھی اپنے سوچنے کی صلاحیت کو کام میں نہ لائے اور صرف خواہش نفس کے تحت چلنے لگے تو اس میں اور جانور میں کیا فرق باقی رہا۔

اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوۡ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَیۡہِ دَلِیۡلًا ﴿ۙ۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضۡنٰہُ اِلَیۡنَا قَبۡضًا یَّسِیۡرًا ﴿۴۶﴾ وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّ النَّوۡمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّہَارَ نُشُوۡرًا ﴿۴۷﴾ وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِہٖ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَہُوۡرًا ﴿ۙ۴۸﴾ لِّنُحۡیِۦَ بِہٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا وَّ نُسۡقِیَہٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ کَثِیۡرًا ﴿۴۹﴾

۴۵۔ کیا تم نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح سائے کو پھیلا دیتا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو وہ اس کو ٹھہرا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔ ۴۶۔ پھر ہم نے آہستہ آہستہ اس کو اپنی طرف سمیٹ لیا۔ ۴۷۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو راحت بنایا اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنایا۔ ۴۸۔ اور وہی ہے جو اپنی رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے۔ اور ہم آسمان سے پاک پانی اتارتے ہیں۔ ۴۹۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے مردہ زمین میں جان ڈال دیں۔ اور اس کو پلائیں اپنی مخلوقات میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو۔

یہاں عام مشاہد کی زبان میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کو موجود زمانہ میں زمین کی محوری گردش کہا جاتا ہے۔ زمین اپنے محور پر ہر 24 گھنٹے میں ایک بار گھوم جاتی ہے۔ اسی سے رات اور دن پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ اگر زمین کی محوری گردش نہ ہو تو زمین کے نصف حصہ پر مسلسل تیز دھوپ رہے۔ اور دوسرے نصف حصہ پر مسلسل رات کی تاریکی چھائی رہے۔ اور اس طرح زمین پر زندگی گزارنا انتہائی حد تک دشوار ہو جائے۔

زمین کے اس نظام میں بہت سی معنوی نصیحتیں موجود ہیں۔ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد لازماً دن کی روشنی آتی ہے۔ اسی طرح ناحق کے بعد حق کا آنا بھی اس زمین پر لازمی ہے۔ رات کو سو کر دوبارہ صبح کو اٹھنا موت کے بعد دوبارہ آخرت کی دنیا میں اٹھنے کی تمثیل ہے، وغیرہ۔

اسی طرح بارش کے نظام میں اس کے مادی پہلو کے ساتھ عظیم معنوی سبق کا پہلو بھی چھپا ہوا ہے۔ جس طرح بارش سے مردہ زمین سرسبز ہو جاتی ہے اسی طرح خدا کی ہدایت اس سینہ کو ایمان اور تقویٰ کا چمنستان بنا دیتی ہے جس کے اندر واقعی صلاحیت ہو، جو بنجر زمین کی طرح بے جان نہ ہو چکا ہو۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۵۰ وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝۵۱ۖ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲

۵۰۔ اور ہم نے اس کو ان کے درمیان طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ وہ سوچیں۔ پھر بھی اکثر لوگ ناشکری کیے بغیر نہیں رہتے۔ ۵۱۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ ۵۲۔ پس تم منکروں کی بات نہ مانو اور اس کے ذریعہ سے ان کے ساتھ بڑا جہاد کرو۔

قرآن میں توحید اور آخرت کے مضامین مختلف انداز اور مختلف اسلوب سے بار بار بیان ہوئے ہیں۔ آدمی اگر سنجیدہ ہو تو یہ مضامین اس کو تڑپا دینے کے لیے کافی ہیں۔ مگر غافل انسان کسی دلیل سے کوئی اثر نہیں لیتا۔

"اس کے ذریعہ جہاد کبیر کرو" سے مراد قرآن کے ذریعہ جہاد کبیر کرنا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ جہاد، بالفاظ دیگر، پُرامن دعوتی جدوجہد ہی اصل جہاد ہے۔ بلکہ یہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ منکر لوگ اگر یہ کوشش کریں کہ اہلِ ایمان کو دعوت کے میدان سے ہٹا کر دوسرے میدان میں الجھائیں تب بھی اہل ایمان کی ساری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے عمل کو قرآنی دعوت کے میدان میں مرتکز رکھیں۔ اور اگر مخالفین کے ہنگاموں کی وجہ سے کسی وقت عمل کا میدان بدلتا ہوا نظر آئے تو ہر ممکن تدبیر کرکے دوبارہ اس کو دعوت کے میدان میں لے آئیں۔

وَ هُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝۵۳ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ۭ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝۵۴

۵۳۔ اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملایا۔ یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا۔ اور اس نے ان کے درمیان ایک پردہ رکھ دیا اور ایک مضبوط آڑ۔ ۵۴۔ اور وہی ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا۔ اور تمھارا رب بڑی قدرت والا ہے۔

جب کسی سنگم پر دو دریا ملتے ہیں یا کوئی بڑا دریا سمندر میں جا کر گرتا ہے تو ایسے مقام پر باہم ملنے کے باوجود دونوں پانی الگ الگ رہتا ہے۔ دونوں کے بیچ میں ایک دھاری دور تک جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ راقم الحروف نے یہ منظر الٰہ آباد میں گنگا اور جمنا کے سنگم پر دیکھا ہے۔ یہ واقعہ اس قدرتی قانون کے تحت ہوتا ہے جس کو سائنسی اصطلاح میں سطحی تناؤ (surface tension) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے تو سمندر کا کھاری پانی ساحلی دریا کے میٹھے پانی کے اوپر چڑھ جاتا ہے۔ مگر سطحی تناؤ دونوں پانی کو بالکل الگ رکھتا ہے۔ اور جب سمندر کا پانی دوبارہ اترتا ہے تو اس کا کھاری پانی اوپر اوپر سے واپس چلا

جاتا ہے اور نیچے کا میٹھا پانی بدستور اپنی سابقہ حالت پر باقی رہتا ہے۔ حتی کہ اسی سطحی تناؤ کے قانون کی وجہ سے یہ ممکن ہوا ہے کہ کھاری سمندروں کے عین بیچ میں میٹھے پانی کے ذخیرے موجود رہیں اور بحری مسافروں کو میٹھا پانی فراہم کرسکیں۔

انسانی جسم کی اصل پانی ہے۔ پانی سے انسان جیسی حیرت انگیز نوع بنی۔ پھر نسبی تعلقات اور سسرالی روابط کے ذریعے اس کی نسل چلتی رہی — اس طرح کے مختلف واقعات جو زمین پر پائے جاتے ہیں ان پر غور کیا جائے تو ان میں خدا کی قدرت کی نشانیاں چھپی ہوئی نظر آئیں گی۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

۵۵۔ اور وہ اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان۔ اور منکر تو اپنے رب کے خلاف مددگار بنا ہوا ہے۔ ۵۶۔ اور ہم نے تم کو صرف خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ۵۷۔ تم کہو کہ میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، مگر یہ کہ جو چاہے وہ اپنے رب کا راستہ پکڑ لے۔

خدا نے انسان کو ایسی دنیا میں رکھا ہے جہاں کی ہر چیز اور اس کا پورا ماحول توحید کی گواہی دیتا ہے۔ مگر انسان اس سے روشنی حاصل نہیں کرتا۔ وہ اپنی گمراہی میں اس حد تک جاتا ہے کہ وہ توحید کے بجائے شرک کی بنیاد پر اپنی زندگی کا نظام بناتا ہے۔ اور جب کوئی خدا کا بندہ انسانوں کو توحید کی طرف پکارنے کے لیے اٹھے تو وہ دعوت توحید کا مخالف بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

تاہم حق کے داعی کو جارحیت کی حد تک جانے کی اجازت نہیں۔ اس کو صرف تلقین اور نصیحت کے دائرہ میں اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ اگر دعوت کارگر نہ ہو رہی ہو تو اس کا یہ کام نہیں کہ وہ دعوت پر جارحیت کا اضافہ کرے۔ اسے جس چیز کا اضافہ کرنا ہے وہ ہے — خدا سے دعا، ہر قسم کے مادی جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کرنا، بے غرضی اور اخلاق کے ذریعہ مخاطب کے دل کو متاثر کرنا۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۸﴾ۚۛ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ

۵۸۔ اور زندہ خدا پر، جو کبھی مرنے والا نہیں، بھروسہ رکھو اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے کے لیے کافی ہے۔ ۵۹۔ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ دن

اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ زَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾ السجدة ع ۵

ہیں۔ پھر وہ تخت پر متمکن ہوا۔ رحمٰن، پس اس کو کسی جاننے والے سے پوچھو۔ ۶۰۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے۔ کیا ہم اس کو سجدہ کریں جس کو تو ہم سے کہے۔ اور ان کا بدکنا اور بڑھ جاتا ہے۔

''رحمان کی بابت جاننے والے سے پوچھو''— اس میں پوچھی جانے والی بات پر زور ہے، نہ کہ پوچھے جانے والے شخص پر۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خدائے رحمان کے کرشموں کو جانے تو وہ تم کو بتائے گا کہ رحمن کی ذات کتنی بلند و برتر ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنس دانوں نے کائنات میں جو تحقیق کی ہے وہ جزئی طور پر اس آیت کی مصداق ہے۔ سائنس دانوں کی تحقیقات سے کائنات کے جو بھید سامنے آئے ہیں وہ اتنے حیرت ناک ہیں کہ ان کو پڑھ کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور اس کا دل بے اختیار خالق کی عظمتوں کے آگے جھک جائے۔

''چھ دن'' سے مراد خدا کے چھ دن ہیں۔ انسان کی زبان میں اس کو چھ ادوار کہا جا سکتا ہے۔ چھ دوروں میں پیدا کرنا ظاہر کرتا ہے کہ کائنات کی تخلیق منصوبہ بند طریقے سے ہوئی ہے۔ اور جو چیز منصوبہ اور اہتمام کے ساتھ وجود میں لائی جائے وہ کبھی عبث نہیں ہو سکتی۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

۶۱۔ بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ (سورج) اور ایک چمکتا چاند رکھا۔ ۶۲۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو یکے بعد دیگرے آنے والا بنایا، اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے اور شکر گزار بننا چاہے۔

برج کے لفظی معنی قلعہ کے ہیں۔ آسمانی برج سے کیا مراد ہے، اس کی کوئی متفقہ تفسیر ابھی تک نہیں کی جا سکی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہو جس کو موجودہ زمانہ میں شمسی نظام کہا جاتا ہے۔ کائنات میں کروڑوں کی تعداد میں شمسی نظام پائے جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جو ہم سے قریب ہے اور جس کے اندر ہماری زمین اور سورج اور چاند واقع ہیں۔

شمسی نظام کی بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی زمین کا سورج کے گرد مسلسل گھومنا ہے۔ اس کی ایک گردش مدار پر ہوتی ہے۔ یہ گردش سال میں پوری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے موسم واقع ہوتے ہیں۔ اس کی دوسری گردش اس کے محور پر ہوتی ہے۔ یہ 24 گھنٹہ میں پوری ہو جاتی ہے اور اس سے رات اور دن پیدا ہوتے ہیں۔

انتھاہ خلا میں حد درجہ صحت کے ساتھ زمین کی گردش اور اس کا انسانی مصلحتوں کے اتنا زیادہ موافق ہونا اتنے حیرت ناک واقعات ہیں کہ جو شخص ان پر غور کرے گا وہ شکر خداوندی کے جذبہ میں غرق ہو کر رہ جائے گا۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿٦٣﴾ وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ﴿٦٤﴾ وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿٦٦﴾ وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾

۶۳۔ اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین میں عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ ۶۴۔ اور جو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ ۶۵۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب کو ہم سے دور رکھ۔ بے شک اس کا عذاب پوری تباہی ہے۔ ۶۶۔ بے شک وہ برا ٹھکانا ہے اور برا مقام ہے۔ ۶۷۔ اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں۔ اور ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

''چلنا'' پوری شخصیت کی علامت ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اللہ کا یقین اتر جائے وہ سراپا عجز و تواضع بن جاتے ہیں۔ خدا کا خوف ان سے بڑائی کا احساس چھین لیتا ہے۔ ان کا چلنا پھرنا اور رہنا سہنا ایسا ہو جاتا ہے جس میں عبدیت کی روح پوری طرح سمائی ہوئی ہو۔

رحمن کے بندوں کا معاملہ اگر صرف اتنا ہی ہو تو کوئی بھی ان سے نہ الجھے۔ مگر خدا کی معرفت انھیں خدا کا داعی بھی بنا دیتی ہے۔ بس یہیں سے ان کا ٹکراؤ دوسروں سے شروع ہو جاتا ہے۔ ان کا اعلان حق باطل پرستوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے اور وہ ان سے ٹکرانے کے لیے آجاتے ہیں۔ مگر یہاں بھی خدا کا خوف انھیں جوابی ٹکراؤ سے روک دیتا ہے۔ وہ ان کے حق میں ہدایت کی دعا کرتے ہوئے ان سے الگ ہو جاتے ہیں۔

خدا کی معرفت ہی کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی بے چینی شامل ہو جاتی ہے۔ وہ نہ صرف دن کے وقت خدا کو بے تابانہ پکارتے رہتے ہیں بلکہ ان کی راتوں کی تنہائیاں بھی خدا کی یاد میں بسر ہونے لگتی ہیں۔

اسی طرح خدا کا احساس انھیں حد درجہ محتاط بنا دیتا ہے۔ وہ ذمہ دارانہ طور پر کماتے ہیں اور ذمہ دارانہ طور پر خرچ کرتے ہیں۔ خدا کے آگے جواب دہی کا احساس انھیں اپنے آمد و خرچ کے معاملے میں معتدل اور محتاط بنا

دیتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ یہ آدمی کی دانائی میں سے ہے کہ وہ اپنی معیشت میں بیچ کی راہ اختیار کرے (مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ رِفْقُهُ فِي مَعِيشَتِهِ) مسند احمد، حدیث نمبر 21695۔ رفقہ ای قصدہ۔

وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾

۶۸۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے ہیں۔ اور وہ اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو قتل نہیں کرتے مگر حق پر۔ اور وہ بدکاری نہیں کرتے۔ اور جو شخص ایسے کام کرے گا تو وہ سزا سے دوچار ہوگا۔ ۶۹۔ قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا۔ اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا۔ ۷۰۔ مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۷۱۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک کام کرے تو وہ درحقیقت اللہ کی طرف رجوع کر رہا ہے۔

اِس آیت میں تین گناہوں کا ذکر ہے۔ شرک اور قتل ناحق اور زنا۔ یہ تینوں گناہ خدا اور بندوں کے حق میں سب سے بڑے گناہ ہیں۔ اللہ پر حقیقی ایمان کی علامت یہ ہے کہ آدمی ان تینوں گناہوں سے دور ہو جائے جو لوگ ان گناہوں میں ملوث ہوں وہ توبہ کر کے ان کے انجام سے بچ سکتے ہیں۔ جو لوگ توبہ اور رجوع کے بغیر مر جائیں ان کے لیے خدا کے یہاں نہایت سخت سزا ہے جس سے وہ کسی حال میں بچ نہ سکیں گے۔

خدا کے نزدیک اصل نیکی یہ ہے کہ آدمی خدا سے ڈرنے والا بن جائے۔ جو نیکی آدمی کو خدا سے بے خوف کرے وہ بدی ہے۔ اور جو بدی آدمی کو خدا سے ڈرائے وہ اپنے انجام کے اعتبار سے نیکی۔

اگر ایک آدمی سے برائی ہو جائے۔ اس کے بعد اس کو خدا کی یاد آئے۔ وہ خدا کی باز پرس کو سوچ کر تڑپ اٹھے اور توبہ اور استغفار کرتے ہوئے خدا کی طرف دوڑ پڑے تو خدا اپنی رحمت سے ایسی برائی کو نیکی کے خانہ میں لکھ دے گا۔ کیوں کہ وہ آدمی کو خدا کی طرف رجوع کرنے کا سبب بن گئی۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ

۷۲۔ اور جو لوگ جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے۔ اور جب کسی بیہودہ چیز سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ ۷۳۔ اور وہ ایسے ہیں کہ جب ان کو ان کے رب کی

عُمۡیَانًا ﴿۷۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا ہَبۡ لَنَا
مِنۡ اَزۡوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعۡیُنٍ وَّ
اجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾

آیتوں کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہوکر نہیں گرتے۔ ۷۴۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو ہماری بیوی اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔

موجودہ دنیا میں جو غلط کام ہیں ان سب کا معاملہ یہ ہے کہ شیطان نے ان کو ظاہری طور پر خوب صورت بنا رکھا ہے۔ ہر باطل پرست اپنے نظریہ کو خوش نما الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ اسی ظاہر فریبی کی وجہ سے لوگ ان چیزوں کی طرف کھنچتے ہیں۔ اگر ان کے اس ظاہری غلاف کو ہٹا دیا جائے تو ہر چیز اتنی مکروہ دکھائی دینے لگے کہ کوئی شخص اس کے قریب جانے کے لیے تیار نہ ہو۔

اس اعتبار سے ہر برائی ایک قسم کا جھوٹ ہے جس میں آدمی مبتلا ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ جھوٹ کو پہچانے۔ وہ ظاہری پردہ کو پھاڑ کر چیزوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھ سکے۔

جب کسی کو ایک ایسی نصیحت کی جائے جس میں اس کی ذات پر زد پڑتی ہو تو وہ فوراً بپھر اٹھتا ہے۔ ایسا شخص خدا کی نظر میں اندھا بہرا ہے۔ کیوں کہ اس نے اپنی آنکھ سے یہ کام نہ لیا کہ وہ حقیقت کو دیکھے۔ اس نے اپنے کان سے یہ کام نہ لیا کہ وہ سچائی کی آواز کو سنے۔ اس نے نصیحت کا استقبال سننے اور دیکھنے والے آدمی کی حیثیت سے نہیں کیا۔ اس نے نصیحت کا استقبال ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے کیا جو سننے اور دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔ خدا کی نظر میں دیکھنے اور سننے والا وہ ہے جو لغو کو دیکھے تو اس سے اعراض کرے اور جب اس کے سامنے سچی نصیحت آئے تو فوراً اس کو قبول کر لے۔

ہر آدمی جو کنبہ والا ہے وہ اپنے کنبہ کا ''امام'' ہے۔ اگر اس کے کنبہ والے متقی ہیں تو وہ متقیوں کا امام ہے۔ اور اگر اس کے کنبہ والے خدا فراموش ہیں تو وہ خدا فراموشوں کا امام۔

اُولٰٓئِکَ یُجۡزَوۡنَ الۡغُرۡفَۃَ بِمَا صَبَرُوۡا وَ
یُلَقَّوۡنَ فِیۡہَا تَحِیَّۃً وَّ سَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِیۡنَ
فِیۡہَا ؕ حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلۡ مَا
یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡ لَا دُعَآؤُکُمۡ ۚ فَقَدۡ
کَذَّبۡتُمۡ فَسَوۡفَ یَکُوۡنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع ۶

۷۵۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کو بالاخانے ملیں گے اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا۔ اور ان میں ان کا استقبال دعا اور سلام کے ساتھ ہوگا۔ ۷۶۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ ہے رہنے کی۔ ۷۷۔ کہو کہ میرا رب تمھاری پروا نہیں رکھتا۔ اگر تم اس کو نہ پکارو۔ پس تم جھٹلا چکے تو وہ چیز عنقریب ہو کر رہے گی۔

جنت کے اونچے بالاخانوں میں وہ لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے دنیا میں اپنے آپ کو حق کی خاطر نیچا کرلیا تھا۔ انھوں نے دنیا میں تواضع اختیار کی تھی اس لیے آخرت میں ان کا خدا انھیں سرفرازی عطا فرمائے گا۔ یہی وہ بات ہے جس کو حضرت مسیح نے ان لفظوں میں ادا فرمایا: مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں۔ آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے (متی 5:3)۔

وہ اوصاف جو کسی آدمی کو جنت میں لے جانے والے ہیں ان کو حاصل کرنا اس شخص کے لیے ممکن ہوتا ہے جو صبر کرنے کے لیے تیار ہو۔ جنت وہ اعلیٰ مقام ہے جہاں آدمی کی تمام خواہشیں کامل طور پر پوری ہوں گی۔ مگر جنت اسی صابر انسان کے حصہ میں آئے گی جس نے دنیا میں اپنی خواہشوں پر کامل روک لگائی ہو۔ جنت صبر کی قیمت ہے۔ اور جہنم اس کے لیے ہے جو دنیا کی زندگی میں صبر کی مطلوبہ قیمت دینے کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔

۲۶۔ سُوْرَۃُ الشُّعَرَاء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

طٰسٓمّٓ ۝۱ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۝۲
لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ۝۳
اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَۃً فَظَلَّتۡ
اَعۡنَاقُہُمۡ لَہَا خٰضِعِیۡنَ ۝۴ وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ
ذِکۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡہُ
مُعۡرِضِیۡنَ ۝۵ فَقَدۡ کَذَّبُوۡا فَسَیَاۡتِیۡہِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا
مَا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ۝۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ طٰسٓمّٓ۔ ۲۔ یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ ۳۔ شاید تم اپنے کو ہلاک کر ڈالو گے اس پر کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ ۴۔ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے نشانی اتار دیں۔ پھر ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔ ۵۔ ان کے پاس رحمان کی طرف سے کوئی بھی نئی نصیحت ایسی نہیں آتی جس سے وہ بے رخی نہ کرتے ہوں۔ ۶۔ پس انھوں نے جھٹلا دیا۔ تو اب عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

حق کی دعوت جب ظاہر ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ کلام مبین میں ظاہر ہوتی ہے۔ کسی دعوت کے خدائی دعوت ہونے کی یہ بھی ایک علامت ہے کہ اس کی ہر بات واضح ہو۔ اس کی ہر بات کھلے ہوئے دلائل پر مبنی ہو ایک شخص اس کا انکار تو کرسکے مگر کوئی شخص واقعی طور پر یہ کہنے کی پوزیشن میں نہ ہو کہ اس کا پیغام میری سمجھ میں نہیں آیا۔

''شاید تم اپنے آپ کو ہلاک کرلو گے'' کا جملہ اس کامل خیر خواہی کو بتا رہا ہے جو داعی کو مدعو کے حق میں ہوتی ہے۔ دعوتی عمل خالص خیر خواہی کے جذبہ سے ابلتا ہے۔ اس لیے داعی جب دیکھتا ہے کہ مدعو اس کے پیغام کو نہیں مان رہا ہے تو وہ اس کے غم میں اس طرح ہلکان ہونے لگتا ہے جس طرح ماں اپنے بچہ کی بھلائی کے لیے ہلکان ہوتی ہے۔ قرآن کا یہ جملہ داعیِ قرآن کی خیر خواہانہ کیفیت کی تصدیق ہے، نہ کہ اس پر تنقید۔

حق کی دعوت خدا کی دعوت ہوتی ہے۔ خدا وہ طاقت ور ہستی ہے جس کے مقابلہ میں کسی کے لیے انکار و سرکشی کی گنجائش نہ ہو۔ مگر یہ صورت حال خود خدا کے اپنے منصوبہ کی بنا پر ہے۔ خدا کو اپنی جنت میں بسانے کے لیے وہ قیمتی انسان درکار ہیں جو فریب سے بھری ہوئی دنیا میں حق کو پہچانیں اور کسی دباؤ کے بغیر اس کے آگے جھک جائیں۔ ایسے انسانوں کا چناؤ ایسے ہی حالات میں کیا جا سکتا تھا جہاں ہر انسان کو فکر و عمل کی پوری آزادی دی گئی ہو۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۷﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۹﴾ ع ۵

۷۔ کیا انھوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں کس قدر طرح طرح کی عمدہ چیزیں اگائی ہیں۔ ۸۔ بے شک اس میں نشانی ہے اور ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ۹۔ اور بے شک تمھارا رب غالب ہے، رحم کرنے والا ہے۔

مٹی کے اندر سے ہرے بھرے درخت کا نکلنا اتنا ہی عجیب ہے جتنا یہ واقعہ کہ مٹی کے اندر سے اچانک ایک زندہ اونٹ نکل آئے اور زمین پر چلنے پھرنے لگے۔ لوگ دوسری قسم کے واقعہ کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ حالاں کہ اس سے زیادہ بڑا واقعہ ہر وقت زمین پر ہو رہا ہے۔ مگر اس میں انھیں کوئی سبق نہیں ملتا۔

اللہ تعالیٰ کو انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ وہ معمولی واقعات میں چھپے ہوئے غیر معمولی پہلوؤں کو دیکھے۔ وہ اسباب کے تحت پیش آنے والے واقعہ میں خدا کی براہِ راست کارفرمائی کا مشاہدہ کرلے۔ جو لوگ اس اعلیٰ بصیرت کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو خدا پر ایمان لانے والے ہیں۔ اور وہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی ابدی رحمتوں میں داخل کیے جائیں گے۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾ۙ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ۭ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ۚ

۱۰۔ اور جب تمھارے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ تم ظالم قوم کے پاس جاؤ۔ ۱۱۔ فرعون کی قوم کے پاس، کیا وہ نہیں ڈرتے۔ ۱۲۔ موسیٰ نے کہا اے میرے رب، مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے۔ ۱۳۔ اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ پس تو ہارون کے پاس پیغام بھیج دے۔ ۱۴۔ اور میرے اوپر ان کا ایک جرم بھی ہے پس میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

حضرت موسیٰ کو مصر کے فرعون پر دین توحید کی تبلیغ کرنی تھی جو اپنے زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے متمدن سلطنت کا بادشاہ تھا۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے فرزند تھے جن کی حیثیت اس وقت کے مصر میں غلاموں اور مزدوروں جیسی تھی۔ قوم فرعون کا ایک شخص حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے بلا ارادہ ہلاک ہو گیا تھا۔ مزید یہ کہ حضرت موسیٰ اپنے اندر قوت بیان کی کمی محسوس فرماتے تھے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام رسانی کے لیے حضرت موسیٰ کا انتخاب فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا ظاہر سے زیادہ آدمی کے باطن کو دیکھتا ہے۔ اور اگر کسی کے اندر باطنی جوہر موجود ہو تو اسی باطنی جوہر کی بنیاد پر اس کو اپنے دین کے لیے منتخب فرمالیتا ہے۔ باطنی جوہر آدمی کو خود پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اگر باعتبار ظاہر کچھ کمی ہو تو وہ خدا کی طرف سے پوری کر دی جاتی ہے۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

۱۵۔ فرمایا کبھی نہیں۔ پس تم دونوں ہماری نشانیوں کے ساتھ جاؤ، ہم تمھارے ساتھ سننے والے ہیں۔ ۱۶۔ پس تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم خداوندِ عالم کے رسول ہیں۔ ۱۷۔ کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ ۱۸۔ فرعون نے کہا، کیا ہم نے تم کو بچپن میں اپنے اندر نہیں پالا۔ اور تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے یہاں گزارے۔ ۱۹۔ اور تم نے اپنا وہ فعل کیا جو کیا۔ اور تم ناشکروں میں سے ہو۔

خدا جس شخص کو اپنی نمائندگی کے لیے منتخب کرے وہ ہر اعتبار سے خدا کی حفاظت میں ہوتا ہے اسی کے ساتھ اس کے لیے مزید اہتمام یہ کیا جاتا ہے کہ اس کو خصوصی نشانیاں دی جاتی ہیں جو اس بات کی صریح علامت ہوتی ہیں کہ اس کا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ مگر انسان اتنا ظالم ہے کہ اس کے باوجود وہ اعتراف نہیں کرتا۔

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے سلسلہ میں فرعون سے جو مطالبہ کیا اس کا تفصیلی مطلب کیا تھا، اس کے بارے میں قرآن میں کوئی وضاحت موجود نہیں ہے۔ تورات کا بیان اس سلسلہ میں حسب ذیل ہے:

(موسیٰ نے فرعون سے کہا) اب تو ہم کو تین دن کی منزل تک بیابان میں جانے دے تا کہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں (خروج، 3:18)۔ میرے لوگوں کو جانے دے تا کہ وہ بیابان میں میرے لیے عید کریں (خروج، 5:1)۔ تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ تم جاؤ اور اپنے خدا کے لیے اسی ملک میں قربانی کرو۔ موسیٰ نے کہا ایسا کرنا مناسب نہیں۔ کیوں کہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے اس چیز کی قربانی کریں گے، جس

سے مصری نفرت رکھتے ہیں۔ سو اگر ہم مصریوں کی آنکھوں کے آگے اس چیز کی قربانی کریں جس سے وہ نفرت رکھتے ہیں تو کیا وہ ہم کو سنگسار نہ کر ڈالیں گے۔ پس ہم تین دن کی راہ بیابان میں جا کر خداوند اپنے خدا کے لیے جیسا وہ ہم کو حکم دے گا قربانی کریں گے (خروج، 27-8:25)۔

بائبل کے بیان سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا یہ سفر ہجرت کے لیے نہیں بلکہ تربیت کے لیے تھا۔ مصر میں گائے مقدس مانی جاتی تھی۔ صدیوں کے عمل سے بنی اسرائیل بھی اس سے متاثر ہو گئے تھے۔ اب حضرت موسیٰ نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو کچھ دنوں کے لیے مصر کے مشرکانہ ماحول سے باہر لے جائیں اور ان کو آزاد فضا میں رکھ کر ان کی تربیت کریں۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾

۲۰۔ موسیٰ نے کہا۔ اس وقت میں نے کیا تھا اور مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ۲۱۔ پھر مجھے تم لوگوں سے ڈر لگا تو میں تم سے بھاگ گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے دانش مندی عطا فرمائی اور مجھ کو رسولوں میں سے بنا دیا۔ ۲۲۔ اور یہ احسان ہے جو تم مجھ کو جتا رہے ہو جب کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اور عصا اور ید بیضا کا معجزہ دکھایا۔ فرعون نے آپ کی اہمیت گھٹانے کے لیے اس وقت آپ کی سابقہ زندگی کی دو باتیں یاد دلائیں۔ ایک، بچپن میں حضرت موسیٰ کا فرعون کے گھر میں پرورش پانا۔ دوسری، ایک قبطی کا قتل۔ حضرت موسیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تمھارے گھر میں میری پرورش کی نوبت خود تمھارے ظلم کی وجہ سے آئی۔ تم چوں کہ بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر رہے تھے اس لیے میری ماں نے یہ کیا کہ مجھ کو ٹوکری میں رکھ کر بہتے دریا میں ڈال دیا۔ اور اس کے بعد خود تم نے مجھے دریا سے نکالا اور مجھ کو اپنے گھر میں رکھا۔ جہاں تک قبطی کے قتل کا معاملہ ہے تو وہ میں نے ارادۃً نہیں کیا۔ میں نے اپنے اسرائیلی بھائی کی طرف سے قبطی کی جارحیت کا دفاع کیا تھا اور وہ اتفاقاً مر گیا۔

حضرت موسیٰ قبطی کے قتل کے بعد مصر کو چھوڑ کر مدین چلے گئے تھے۔ وہاں وہ کئی برس تک رہے۔ شہر کی مصنوعی فضا سے نکل کر دیہات کی فطری فضا میں چند سال گزارنا شاید آپ کی تربیت کے لیے ضروری تھا۔ چنانچہ مدین سے نکل کر جب آپ دوبارہ مصر جانے لگے تو راستہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

۲۳۔ فرعون نے کہا کہ رب العالمین کیا ہے۔ ۲۴۔ موسیٰ نے کہا، آسمانوں اور زمین کا رب اور ان سب کا رب جو ان کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو۔ ۲۵۔ فرعون نے اپنے ارد گرد

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٦﴾ قَالَ
اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ
لَمَجْنُوْنٌ ﴿٢٧﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا
بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالَ لَئِنِ
اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ
الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ
مُّبِيْنٍ ﴿٣٠﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣١﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ
مُّبِيْنٌ ﴿٣٢﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿٣٣﴾ ع ۲/۲۴ ۶
قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾
يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ
فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿٣٥﴾

والوں سے کہا، کیا تم سنتے نہیں ہو۔ ۲۶۔ موسیٰ نے
کہا وہ تمھارا بھی رب ہے۔ اور تمھارے اگلے
بزرگوں کا بھی۔ ۲۷۔ فرعون نے کہا تمھارا یہ رسول
جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے مجنون ہے۔
۲۸۔ موسیٰ نے کہا، مشرق ومغرب کا رب اور جو کچھ
ان کے درمیان ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو۔
۲۹۔ فرعون نے کہا، اگر تم نے میرے سوا کسی کو معبود
بنایا تو میں تم کو قید کر دوں گا۔ ۳۰۔ موسیٰ نے کہا کیا اگر
میں کوئی واضح دلیل پیش کروں تب بھی۔ ۳۱۔ فرعون
نے کہا پھر اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ ۳۲۔ پھر
موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو یکایک وہ ایک کھلا
ہوا اژدھا تھا۔ ۳۳۔ اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو
یکایک وہ دیکھنے والوں کے لیے چمک رہا تھا۔
۳۴۔ فرعون نے اپنے ارد گرد کے سرداروں سے
کہا، یقیناً یہ شخص ایک ماہر جادوگر ہے۔ ۳۵۔ وہ
چاہتا ہے کہ وہ اپنے جادو سے تم کو تمھارے ملک
سے نکال دے۔ پس تم کیا مشورہ دیتے ہو۔

تمھارا رب العالمین کیا ہے — فرعون کا یہ جملہ دراصل استہزاء تھا، نہ کہ سوال۔ مگر حضرت موسیٰ نے کسی جھنجھلاہٹ کے بغیر بالکل معتدل انداز میں اس کا جواب دیا۔ فرعون نے دوبارہ اپنے درباریوں سے یہ کہہ کر حضرت موسیٰ کی تحقیر کی کہ ''سنتے ہو، یہ کیا کہہ رہے ہیں''۔ حضرت موسیٰ نے اس کو بھی نظر انداز کیا اور اپنا سلسلہ کلام بدستور جاری رکھا۔ فرعون نے مشتعل ہو کر حضرت موسیٰ کو دیوانہ قرار دیا۔ مگر اب بھی حضرت موسیٰ نے اپنے اعتدال کو نہیں کھویا۔ فرعون نے قید کی دھمکی دی تو حضرت موسیٰ نے اپنی آخری دلیل (معجزہ) کو اس کے سامنے رکھ دیا۔ اب فرعون کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ مگر اس نے ہار نہ مانی۔ اس نے حضرت موسیٰ کی اہمیت گھٹانے کے لیے کہا کہ یہ کوئی خدائی واقعہ نہیں۔ یہ تو محض ایک ساحرانہ واقعہ ہے۔ اور ہر جادوگر ایسا کرشمہ دکھا سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی دعوت سراسر پرامن دعوت تھی۔ اس کا سیاست اور حکومت سے بھی براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر فرعون نے اپنی قوم کو آپ کے خلاف بھڑکانے کے لیے یہ کہہ دیا کہ وہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ فرعون کی غیر سنجیدگی اسی سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ نے تو خود اپنی قوم کو ساتھ لے کر مصر سے باہر جانے کی بات کی تھی۔ مگر فرعون نے اس کو الٹ کر یہ کہہ دیا کہ موسیٰ ہم لوگوں کو مصر سے باہر نکال دینا چاہتے ہیں۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ
حٰشِرِیْنَ ﴿۳۶﴾ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ ﴿۳۷﴾
فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾
وَّقِیْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾
لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ
الْغٰلِبِیْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا
لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ
الْغٰلِبِیْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ
الْمُقَرَّبِیْنَ ﴿۴۲﴾

۳۶۔ درباریوں نے کہا کہ اس کو اور اس کے بھائی کو مہلت دیجیے۔ اور شہروں میں ہرکارے بھیجئے۔ ۳۷۔ کہ وہ آپ کے پاس تمام ماہر جادو گروں کو لائیں۔ ۳۸۔ پس جادوگر ایک دن مقرر وقت پر اکھٹا کئے گئے۔ ۳۹۔ اور لوگوں سے کہا گیا کہ کیا تم لوگ جمع ہوگے۔ ۴۰۔ تاکہ ہم جادوگروں کا ساتھ دیں اگر وہ غالب رہنے والے ہوں۔ ۴۱۔ پھر جب جادوگر آئے تو انھوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمارے لیے کوئی انعام ہے اگر ہم غالب رہے۔ ۴۲۔ اس نے کہا ہاں، اور تم اس صورت میں مقرب لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے۔

فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ کے معاملہ کو صرف جادو کا معاملہ سمجھا۔ اس لیے جادو کے ذریعہ ان کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کی سوچ جہاں تک پہنچی وہ صرف یہ تھا کہ — موسیٰ اگر لکڑی کو سانپ بنا سکتے ہیں تو ہمارے جادوگر بھی لکڑی کو سانپ بنا سکتے ہیں۔ اس سے آگے کی انھیں خبر نہ تھی۔ وہ موسیٰ کے معاملہ کو انسان کا معاملہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انسان کے ذریعہ اس کا توڑ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس راز کو نہیں جانا کہ موسیٰ کا معاملہ خدا کا معاملہ ہے اور کون انسان ہے جو خدا سے ٹکر لے سکے۔

حضرت موسیٰ اور جادوگروں کے درمیان مقابلہ کے لیے مصریوں کے سالانہ قومی تہوار کا دن مقرر ہوا۔ اور اس کے لیے ایک بہت بڑے میدان کا انتخاب ہوا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوں اور زیادہ سے زیادہ جادوگروں کی حوصلہ افزائی کر سکیں۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾
فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِیَّهُمْ وَ قَالُوْا بِعِزَّةِ
فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقٰى مُوْسٰى
عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾ فَاُلْقِیَ
السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾

۴۳۔ موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا ہو ڈالو۔ ۴۴۔ پس انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں۔ اور کہا کہ فرعون کے اقبال کی قسم، ہم ہی غالب رہیں گے۔ ۴۵۔ پھر موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو اچانک وہ اس فریب کو نگلنے لگا جو انھوں نے بنایا تھا۔ ۴۶۔ پھر جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ ۴۷۔ انھوں نے کہا ہم ایمان لائے رب العالمین پر۔ ۴۸۔ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں ڈالیں تو دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا گویا کہ وہ سانپ بن کر میدان میں دوڑ رہی ہیں۔ مگر یہ کوئی حقیقی تغیر نہ تھا، یہ صرف نظر بندی کا معاملہ تھا۔ اس کے برعکس، حضرت موسیٰ کے عصا کا سانپ بننا عصا کا معجزۂ خداوندی میں ڈھل جانا تھا۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ کا عصا سانپ بن کر میدان میں چلا تو اچانک اس نے جادوگروں کے سارے طلسم کو باطل کر دیا۔ اس کے بعد جادوگروں کی رسّیاں اور لاٹھیاں صرف رسّیاں اور لاٹھیاں ہو کر رہ گئیں جیسا کہ وہ حقیقۃً تھیں۔

جادوگروں نے پہلے حضرت موسیٰ کو اپنی طرح کا ایک جادوگر سمجھا تھا۔ مگر تجربہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ جادو کے فن کو بخوبی جانتے تھے اس لیے وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ جادوگری نہیں ہے بلکہ پیغمبری ہے۔ تاہم ان کے لیے ممکن تھا کہ اب بھی وہ اعتراف نہ کریں اور حضرت موسیٰ کو رد کرنے کے لیے فرعون کی طرح کچھ جھوٹے الفاظ بول دیں۔ مگر ایک زندہ انسان کے لیے یہ ناممکن ہوتا ہے کہ حق کے پوری طرح کھل جانے کے بعد وہ حق کا اعتراف نہ کرے۔ جادوگر اسی قسم کے زندہ انسان تھے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً حضرت موسیٰ کی صداقت کا اعتراف کر لیا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۥ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۚ ﴿٤٩﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۚ ﴿٥٠﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ اَنْ كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۧ ﴿٥١﴾ ع ۳ ۱۸/۷

۴۹۔ فرعون نے کہا، تم نے اس کو مان لیا اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دوں۔ بے شک وہی تمھارا استاد ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔ پس اب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ میں تمھارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ ۵۰۔ انھوں نے کہا کہ کچھ حرج نہیں۔ ہم اپنے مالک کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ۵۱۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری خطاؤں کو معاف کر دے گا۔ اس لیے کہ ہم پہلے ایمان لانے والے بنے۔

جادوگروں کا حضرت موسیٰ پر ایمان لانا فرعون کے لیے زبردست رسوائی کا باعث تھا۔ اس نے اس کے ازالہ کے لیے یہ کیا کہ اس پورے واقعہ کو سازش قرار دے دیا۔ اس نے کہا کہ تم لوگ موسیٰ کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔ اور تم نے جان بوجھ کر ان کے مقابلہ میں اپنی شکست کا مظاہرہ کیا ہے تاکہ موسیٰ کی بڑائی لوگوں کے دلوں پر قائم ہو اور تمھارے لیے اپنا مقصد حاصل کرنا آسان ہو جائے۔ فرعون نے جادوگروں کو اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ تم لوگوں کو بغاوت کی سزا دی جائے گی۔ تمھارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ کر تم کو برسر عام سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔ اس شدید حکم کے باوجود جادوگر بے ہمت نہیں ہوئے۔ وہی جادوگر جو پہلے (آیت 41) فرعون کے اقبال کی قسم

کھا رہے تھے اور اس سے انعام واکرام کی درخواست کر رہے تھے انھوں نے بالکل بے خوف ہو کر کہا کہ تم جو چاہے کرو اب موسیٰ کے دین سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ اس عالی ہمتی کا سبب ایمانی دریافت تھی۔ آدمی کسی چیز کا کھونا اس وقت برداشت کرتا ہے جب کہ اس کو کھو کر وہ زیادہ بڑی چیز پا رہا ہو۔ ایمان سے پہلے جادوگروں کے پاس سب سے بڑی چیز فرعون اور اس کا انعام تھا۔ مگر ایمان کے بعد ان کو خدا اور اس کی جنت سب سے بڑی چیز نظر آنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان سے پہلے جس چیز کی قربانی وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے ایمان کے بعد نہایت خوشی سے وہ اس کی قربانی دینے پر راضی ہو گئے۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝٥٢ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ۝٥٣ اِنَّ هٰۤؤُلَاۗءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ۝٥٤ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَاۗىِٕظُوْنَ ۝٥٥ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ۝٥٦ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝٥٧ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝٥٨ كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝٥٩

۵۲۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو لے کر رات کو نکل جاؤ۔ بے شک تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔ ۵۳۔ پس فرعون نے شہروں میں ہر کارے بھیجے۔ ۵۴۔ یہ لوگ تھوڑی سی جماعت ہیں۔ ۵۵۔ اور انھوں نے ہم کو غصہ دلایا ہے۔ ۵۶۔ اور ہم ایک مستعد جماعت ہیں۔ ۵۷۔ پس ہم نے ان کو باغوں اور چشموں سے نکالا۔ ۵۸۔ اور خزانوں اور عمدہ مکانات سے۔ ۵۹۔ یہ ہوا۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔

برسوں کی دعوتی جدوجہد کے باوجود فرعون حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لایا۔ آخر کار اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے باہر چلے جائیں۔ فرعون کو جب معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل اجتماعی طور پر مصر سے روانہ ہو گئے ہیں۔ تو اس نے اپنے لشکر اور اپنے اعیان سلطنت کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ بظاہر فرعون کا یہ اقدام بنی اسرائیل کے خلاف تھا۔ مگر عملاً وہ خود اس کے اپنے خلاف اقدام بن گیا۔ اس طرح فرعون اور اس کے ساتھی اپنی شان دار آبادیوں کو چھوڑ کر وہاں پہنچ گئے جہاں انھیں یکجائی طور پر سمندر میں غرق ہونا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف فرعون اور اس کے ساتھیوں کو ان کے ظلم کے نتیجے میں اپنی نعمتوں سے محروم کیا جو انھیں مصر میں حاصل تھیں۔ دوسری طرف بنی اسرائیل کے صالحین کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا کہ ان کو ایک مدت کے بعد فلسطین پہنچایا۔ اور وہاں ان کو یہ تمام نعمتیں مزید اضافہ کے ساتھ دے دیں۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝٦٠ فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝٦١ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝٦٢ فَاَوْحَيْنَاۤ

۶۰۔ پس انھوں نے سورج نکلنے کے وقت ان کا پیچھا کیا۔ ۶۱۔ پھر جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو پکڑے گئے۔ ۶۲۔ موسیٰ نے کہا کہ ہرگز نہیں،

اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ
فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾
وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى
وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا
الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾ ع ۸

بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھ کو راہ بتائے گا۔ ۶۳۔ پھر ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو۔ پس وہ پھٹ گیا اور ہر حصہ ایسا ہوگیا جیسے بڑا پہاڑ۔ ۶۴۔ اور ہم نے دوسرے فریق کو بھی اس کے قریب پہنچا دیا۔ ۶۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو اور ان سب کو جو اس کے ساتھ تھے بچالیا۔ ۶۶۔ پھر دوسروں کو غرق کردیا۔ ۶۷۔ بے شک اس کے اندر نشانی ہے۔ اور ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ ۶۸۔ اور بے شک تیرا رب زبردست ہے، رحمت والا ہے۔

فرعون بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا جہاں بنی اسرائیل کے آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون اور اس کا لشکر۔ بنی اسرائیل اس نازک صورت حال کو دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ بائبل کے بیان کے مطابق وہ موسیٰ سے کہنے لگے ”کیا مصر میں قبریں نہ تھیں کہ تم ہم کو وہاں سے مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے“۔

مگر حضرت موسیٰ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر حضرت موسیٰ نے اپنا عصا سمندر کے پانی پر مارا۔ پانی بیچ سے پھٹ گیا۔ دونوں طرف اونچی دیواروں کی مانند پانی کھڑا ہو گیا۔ اور درمیان میں خشک راستہ نکل آیا۔ بنی اسرائیل اس راستہ سے پار ہو کر اگلے کنارہ پر پہنچ گئے۔

یہ منظر دیکھ کر فرعون نے سمجھا کہ وہ بھی اس کھلے ہوئے راستہ سے پار ہو سکتا ہے۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ یہ راستہ نہیں ہے بلکہ خدا کا حکم ہے۔ فرعون اپنے پورے لشکر کے ساتھ اس کے اندر داخل ہو گیا۔ جیسے ہی وہ لوگ بیچ میں پہنچے خدا کے حکم سے سمندر کا کھڑا ہوا پانی دونوں طرف سے مل کر برابر ہو گیا۔ فرعون اپنے تمام لشکر کے ساتھ دفعۃً غرق ہو گیا۔ ایک ہی نقشہ میں ایک گروہ کے لیے نجات چھپی ہوئی تھی اور دوسرے گروہ کے لیے ہلاکت۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ
لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا
نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ
هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ
يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ

۶۹۔ اور ان کو ابراہیم کا قصہ سناؤ۔ ۷۰۔ جب کہ اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو۔ ۷۱۔ انھوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور ہم برابر اس پر جمے رہیں گے۔ ۷۲۔ ابراہیم نے کہا، کیا یہ تمھاری سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو۔ ۷۳۔ یا وہ تم کو نفع نقصان پہنچاتے ہیں۔ ۷۴۔ انھوں نے کہا بلکہ

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٤﴾

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے۔

ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم تھی کہ اس نے باپ دادا کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا وہی خود بھی کرنے لگی۔ دوسری طرف حضرت ابراہیم تھے جنھوں نے خود اپنی عقل سے سوچا۔ انھوں نے ماحول سے اوپر اٹھ کر سچائی کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ یہی وہ صفت خاص ہے جو آدمی کو خدا کی معرفت تک پہنچاتی ہے اور اسی صفت میں جو کمال درجہ پر ہو اس کو خدا اپنے دین کی پیغام بری کے لیے منتخب فرماتا ہے۔

''ہم اپنے بتوں پر جمے رہیں گے'' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم سے گفتگو میں انھوں نے اپنے آپ کو بے دلیل پایا۔ اس کے باوجود وہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ دلیل کی سطح پر شکست کھانے کے باوجود وہ تعصب کی سطح پر اپنے آبائی دین پر قائم رہے۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٥﴾ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٧﴾ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ ﴿٧٩﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿٨١﴾ وَ الَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾

۷۵۔ ابراہیم نے کہا، کیا تم نے ان چیزوں کو دیکھا بھی جن کی عبادت کرتے ہو۔ ۷۶۔ تم بھی اور تمھارے بڑے بھی۔ ۷۷۔ یہ سب میرے دشمن ہیں سوا ایک خداوند عالم کے۔ ۷۸۔ جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ ۷۹۔ اور جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ ۸۰۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔ ۸۱۔ اور جو مجھ کو موت دے گا پھر مجھ کو زندہ کرے گا۔ ۸۲۔ اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ بدلے کے دن میری خطا معاف کرے گا۔

انسان ایک مستقل ہستی کے طور پر دنیا میں آتا ہے۔ اس کے اندر عقل ہے جو خیر اور شر میں فرق کرتی ہے، جو جزئیات سے کلیات اخذ کرتی ہے اور محسوسات سے معقولات تک پہنچ جاتی ہے۔ آدمی کے لیے یہاں نہایت اعلیٰ درجہ پر وہ چیزیں موجود ہیں جو اس کو مسلسل رزق فراہم کرتی ہیں۔ آدمی بیمار ہوتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ یہاں وہ اسباب بھی مکمل طور پر موجود ہیں جن سے فن علاج وجود میں آسکے۔ پھر آدمی دیکھتا ہے کہ بظاہر ساری آزادی کے باوجود وہ موت کے سامنے بے بس ہے۔ وہ ایک خاص عمر کو پہنچ کر مر جاتا ہے۔

ان واقعات کا تعلق ایک خدا کے سوا کسی اور سے نہیں ہوسکتا، پھر کیسے جائز ہے کہ ایک خدا کے سوا کسی اور

کی عبادت کی جائے۔مزید یہ کہ اس معاملے میں آدمی کو حد درجہ سنجیدہ ہونا چاہئے۔کیوں کہ یہی واقعات یہ اشارہ بھی کررہے ہیں کہ جو خدا یہ سب کررہا ہے وہ انسان سے حساب لینے کے لیے اس کو ایک روز اپنے یہاں بلائے گا۔موت اسی بلاوے کے عمل کا آغاز ہے۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

۸۳۔اے میرے رب، مجھ کو حکمت عطا فرما اور مجھ کو نیک لوگوں میں شامل فرما۔ ۸۴۔اور میرا بول سچا رکھ بعد کے آنے والوں میں۔ ۸۵۔اور مجھے باغ نعمت کے وارثوں میں سے بنا۔ ۸۶۔اور میرے باپ کو معاف فرما، بے شک وہ گمراہوں میں سے ہے۔ ۸۷۔اور مجھ کو اس دن رسوا نہ کر جب کہ لوگ اٹھائے جائیں گے۔ ۸۸۔جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ ۸۹۔مگر وہ جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے۔

اس آیت میں ''حکم'' سے مراد فہم صحیح ہے۔یعنی چیزوں کو ویسا ہی دیکھنا جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔نبوت کے بعد کسی بندۂ خدا کے لیے یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 71)۔یعنی، اللہ جس شخص کے لیے خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ دے دیتا ہے)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں جو باتیں کہیں وہ سب قبول ہوگئیں۔مگر اپنے باپ (آزر) کی مغفرت کی دعا قبول نہیں ہوئی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعا تمام تر خدا اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے۔کسی شخص کی دعا کسی دوسرے شخص کو مغفرت نہیں دلا سکتی۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل قیمت ''قلب سلیم'' کی ہے۔قلب سلیم سے مراد قلب صحیح یا پاک دل ہے یعنی وہ دل جو شرک اور نفاق اور حسد اور بغض کے جذبات سے پاک ہو۔بالفاظ دیگر خدا نے پیدائشی طور پر جو دل آدمی کو دیا تھا وہی دل لے کر وہ خدا کے یہاں پہنچے۔کوئی دوسرا دل لے کر وہ خدا کے یہاں حاضر نہ ہو۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ

۹۰۔اور جنت ڈرنے والوں کے قریب لائی جائے گی۔ ۹۱۔اور جہنم گمراہوں کے لیے ظاہر کی جائے گی۔ ۹۲۔اور ان سے کہا جائے گا، کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کرتے تھے۔ ۹۳۔اللہ

اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ
وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾
قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾
فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾
فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ
الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ ع ٥ ٣٦ ٩

کے سوا۔ کیا وہ تمھاری مدد کریں گے، یا وہ اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں۔ ۹۴۔ پھر اس میں اوندھے منہ ڈال دئے جائیں گے۔ وہ اور گمراہ لوگ۔ ۹۵۔ اور ابلیس کا لشکر، سب کے سب۔ ۹۶۔ وہ اس میں باہم جھگڑتے ہوئے کہیں گے۔ ۹۷۔ خدا کی قسم، ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ ۹۸۔ جب کہ ہم تم کو خداوند عالم کے برابر کرتے تھے۔ ۹۹۔ اور ہم کو تو بس مجرموں نے راستہ سے بھٹکایا۔ ۱۰۰۔ پس اب ہمارا کوئی سفارشی نہیں۔ ۱۰۱۔ اور نہ کوئی مخلص دوست۔ ۱۰۲۔ پس کاش ہم کو پھر واپس جانا ہو کہ ہم ایمان والوں میں سے بنیں۔ ۱۰۳۔ بے شک اس میں نشانی ہے۔ اور ان میں اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔ ۱۰۴۔ اور بے شک تیرا رب زبردست ہے، رحمت والا ہے۔

آدمی کی جنت اور جہنم آدمی سے دور نہیں۔ دونوں کے درمیان صرف ایک پردہ حائل ہے۔ قیامت جب اس پردہ کو ہٹائے گی تو ہر آدمی دیکھے گا کہ وہ عین اپنی جنت یا عین اپنی جہنم کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ اگرچہ غافل انسان اس کو بہت دور کی چیز سمجھ رہا تھا۔

''مجرمین'' سے مراد یہاں جھوٹے لیڈر ہیں۔ یہ لوگ اپنے وقت کے سماج میں بڑائی کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے۔ انھوں نے دعوت حق کو صرف اس لیے قبول نہیں کیا کہ اس کے بعد ان کی بڑائی ختم ہوجائے گی۔ ان کا کبران کے لیے حق کے اعتراف میں رکاوٹ بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پیرو بھی دعوتِ حق کو قابلِ لحاظ چیز نہ سمجھ سکے۔

''لیڈروں کو خداوند عالم کے برابر کرنا'' یہ ہے کہ ان کی بات کو وہ درجہ دیا جائے جو خداوند عالم کی بات کا درجہ ہوتا ہے۔ مفسر ابن کثیر نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: أَيْ: نَجْعَلُ أَمْرَكُمْ مُطَاعًا كَمَا يُطَاعُ أَمْرُ رَبِّ الْعَالَمِينَ (تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 150)۔ یعنی، ہم تمھارے حکم کی اطاعت اس طرح کرتے رہے جس طرح رب العالمین کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو دنیا میں اپنے لیڈروں کی بات کو خدا کی بات کی طرح مانتے تھے وہ آخرت میں اپنے لیڈروں کو خود اپنی زبان سے مجرم کہیں گے۔ مگر اس کا انھیں کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ کیوں کہ مجرم اور حق پرست کو پہچاننے کی جگہ دنیا تھی، نہ کہ آخرت۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ۚۖ ﴿١٠٥﴾ اِذْ قَالَ
لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۚ ﴿١٠٦﴾ اِنِّيْ لَكُمْ
رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۚ ﴿١٠٨﴾
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا
عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ
اَطِيْعُوْنِ ۭ ﴿١١٠﴾ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ
الْاَرْذَلُوْنَ ۭ ﴿١١١﴾ قَالَ وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۚ ﴿١١٢﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰي رَبِّيْ لَوْ
تَشْعُرُوْنَ ۚ ﴿١١٣﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ ﴿١١٤﴾
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۭ ﴿١١٥﴾

۱۰۵۔ نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۰۶۔ جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا، کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ ۱۰۷۔ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ ۱۰۸۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو۔ ۱۰۹۔ اور میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ ۱۱۰۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ ۱۱۱۔ انھوں نے کہا کیا ہم تم کو مان لیں، حالاں کہ تمھاری پیروی رذیل لوگوں نے کی ہے۔ ۱۱۲۔ نوح نے کہا کہ مجھ کو کیا خبر جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۱۳۔ ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے، اگر تم سمجھو۔ ۱۱۴۔ اور میں مومنوں کو دور کرنے والا نہیں ہوں۔ ۱۱۵۔ میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

حضرت نوح کی قوم نے ان کو جھٹلایا۔ حالاں کہ ان کی دعوت میں دلیل کا وزن پوری طرح موجود تھا۔ اسی کے ساتھ ان کی سیرت ان کی صداقت کی تصدیق کر رہی تھی۔ حضرت نوح کے بارے میں ان کی قوم کے لوگ جانتے تھے کہ وہ ایک سچے اور امانت دار آدمی ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ حضرت نوح جو دعوت دے رہے ہیں اس سے ان کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں۔ یہ خصوصیات حضرت نوح کو سنجیدہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اور جو آدمی مخلوق کے بارے میں سنجیدہ ہو، وہ خالق کے بارہ میں غیر سنجیدہ نہیں ہوسکتا۔

حضرت نوح کی قوم نے آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالاں کہ اس انکار کے لیے ان کے پاس غیر متعلق باتوں کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی۔ کسی دعوت کو رد کرنے کے لیے یہ کہنا کہ اس کا ساتھ دینے والے معمولی لوگ ہیں یہ دعوت کی تردید نہیں بلکہ خود اپنی تردید ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دلیل کے اعتبار سے اس دعوت کے حق میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں پاتا، تاہم وہ صرف اس لیے اس کا ساتھ دینا نہیں چاہتا کہ اس میں معمولی قسم کے لوگ جمع ہیں۔ اس کو یہ امید نہیں کہ اس کے حلقہ میں شامل ہونے کے بعد اس کو کوئی بڑا مقام حاصل ہو سکے گا۔

قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمَرْجُوْمِيْنَ ۭ ﴿١١٦﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ
كَذَّبُوْنِ ۚۖ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ فَتْحًا

النصف

۱۱۶۔ انھوں نے کہا کہ اے نوح اگر تم باز نہ آئے تو ضرور سنگسار کر دئے جاؤ گے۔ ۱۱۷۔ نوح نے کہا کہ اے میرے رب، میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا۔ ۱۱۸۔ پس تو میرے اور ان کے درمیان

وَ نَجِّنِيْ وَ مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾
فَاَنْجَيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾
ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾
وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾ ع ۶ ۱۸ ۱۰

واضح فیصلہ فرمادے۔ اور مجھ کو اور جو مومن میرے ساتھ ہیں ان کو نجات دے۔ ۱۱۹۔ پھر ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں بچالیا۔ ۱۲۰۔ پھر اس کے بعد ہم نے باقی لوگوں کو غرق کردیا۔ ۱۲۱۔ یقیناً اس کے اندر نشانی ہے، اور ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ ۱۲۲۔ اور بے شک تیرا رب وہی زبردست ہے، رحمت والا ہے۔

حضرت نوح صدیوں تک اپنی قوم کے لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہے۔ مگر انھوں نے آپ کی بات نہ مانی۔ حتی کہ آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ سب لوگ مل کر نوح کو پتھر ماریں، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوجائیں اور پھر صبح وشام ان کی بات سننے سے نجات مل جائے۔ جب قوم اس حد کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ اب اس قوم کا خاتمہ کردیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے جو حضرت نوح کی دعا کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اللہ کے حکم سے حضرت نوح نے ایک بڑی کشتی بنائی، اس میں حضرت نوح کے تمام ساتھی اور ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا رکھ لیا گیا۔ اس کے بعد اللہ نے شدید طوفان بھیجا۔ زمین سے پانی ابلنے لگا اور اوپر سے مسلسل بارش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ کشتی کے سوا ساری زندہ مخلوق فنا ہوگئی۔ یہ ایک تاریخی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا میں نجات سچے اہل ایمان کے لیے ہے اور باقی لوگوں کے لیے یہاں ہلاکت کے سوا کچھ اور مقدر نہیں۔

كَذَّبَتْ عَادُ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ
اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّيْ لَكُمْ
رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ
اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾
اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾
وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾
وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا

۱۲۳۔ عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۲۴۔ جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں۔ ۱۲۵۔ میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں۔ ۱۲۶۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ ۱۲۷۔ اور میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا بدلہ صرف خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۲۸۔ کیا تم ہر اونچی زمین پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بناتے ہو۔ ۱۲۹۔ اور بڑے بڑے محل تعمیر کرتے ہو۔ گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے۔ ۱۳۰۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بن کر ڈالتے ہو۔ ۱۳۱۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔

اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿١٣١﴾ وَ اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ
بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾
وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٣٥﴾

۱۳۲۔اور اس اللہ سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمھیں مدد پہنچائی جن کو تم جانتے ہو۔ ۱۳۳۔ اس نے تمھاری مدد کی چوپایوں اور اولاد سے۔ ۱۳۴۔اور باغوں اور چشموں سے۔۱۳۵۔میں تمھارے اوپر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

عاد وہ قوم ہے جس کو قوم نوح کی تباہی کے بعد دنیا میں عروج ملا (الاعراف، 7:69)۔اس قوم کو اللہ تعالی نے صحت، فارغ البالی اور اقتدار ہر چیز عطا فرمائی۔ ان چیزوں پر اگر وہ شکر کرتے تو ان کے اندر تواضع کا جذبہ ابھرتا۔مگر انھوں نے اس پر فخر کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے اپنے وسائل کا سب سے زیادہ پسندیدہ مصرف یہ بن گیا کہ وہ اپنے معیارِ زندگی کو بڑھائیں۔ وہ اپنے نام کو اونچا کریں۔ وہ اپنی عظمت کے سنگی نشانات قائم کرنے کو سب سے بڑا کام سمجھنے لگیں۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب انھیں کسی سے اختلاف یا شکایت ہوجائے تو ان کی متکبرانہ نفسیات انھیں کسی حد پر رکنے نہیں دیتی۔ وہ اس کے خلاف ہر بے انصافی کو اپنے لیے جائز کر لیتے ہیں۔ وہ اس کو اپنی پوری طاقت سے پیس ڈالنا چاہتے ہیں۔ دنیا کی درستگی انھیں آخرت کی پکڑ سے بے خوف کر دیتی ہے اور جو شخص اپنے آپ کو آخرت کی پکڑ سے محفوظ سمجھ لے، دوسرے لوگ اس کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

جن لوگوں کو خوش حالی اور برتری حاصل ہوجائے ان کے اندر اپنے بارے میں جھوٹا اعتماد پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ جھوٹا اعتماد ان کے لیے اپنے سے باہر کی صداقت کو سمجھنے میں مانع بن جاتا ہے۔ وہ ناصح کی بات کو اہمیت نہیں دیتے، خواہ وہ کتنا ہی قابل اعتبار کیوں نہ ہو، خواہ وہ خدا کا رسول ہی کیوں نہ ہو۔ایسے لوگ اسی وقت مانتے ہیں جب کہ خدا کا عذاب انھیں ماننے پر مجبور کر دے۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ
الْوٰعِظِيْنَ ﴿١٣٦﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿١٣٨﴾
فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾ وَ اِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٤٠﴾ ع ١٨ / ١١

۱۳۶۔ انھوں نے کہا۔ ہمارے لیے برابر ہے، خواہ تم نصیحت کرو یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ ۱۳۷۔ یہ تو بس اگلے لوگوں کی ایک عادت ہے۔ ۱۳۸۔اور ہم پر ہرگز عذاب آنے والا نہیں ہے۔ ۱۳۹۔پس انھوں نے اس کو جھٹلا دیا، پھر ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، بے شک اس کے اندر نشانی ہے۔ اور ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔ ۱۴۰۔اور بے شک تمھارا رب وہ زبردست ہے، رحمت والا ہے۔

قوم عاد کا جھوٹا اعتماد اس کے لیے پیغمبر کی بات کو ماننے میں رکاوٹ بن گیا۔ حتی کہ وہ اس کے پیغام کا مذاق اڑاتی رہی۔ وہ دنیا میں اپنی خوش حالی کو اس بات کی علامت سمجھتی رہی کہ وہ خدا کی انعام یافتہ ہے وہ لوگ اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ دنیا کا اثاثہ آدمی کو بطور امتحان ملتا ہے، نہ کہ بطور استحقاق۔

جب آخری طور پر ثابت ہو گیا کہ وہ حق کو ماننے والے نہیں ہیں تو خدا نے طوفانی ہوا اور شدید بارش بھیجی جو ایک ہفتہ تک مسلسل اپنی تمام خوفناکیوں کے ساتھ رات دن جاری رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم اپنے شان دار تمدن سمیت برباد ہو کر رہ گئی۔ اس قوم کا نشان اب صرف وہ ریگستان ہے جو موجودہ عمان اور یمن کے درمیان دور تک پھیلا ہوا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ علاقہ نہایت شاداب اور آباد تھا۔ مگر اب وہاں کسی قسم کی زندگی نہیں پائی جاتی۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٤١﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ
اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٤٢﴾ اِنِّيْ لَكُمْ
رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٤٣﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٤٤﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٥﴾
اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿١٤٦﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ
عُيُوْنٍ ﴿١٤٧﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿١٤٨﴾
وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿١٤٩﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ
الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٥١﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي
الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿١٥٢﴾

۱۴۱۔ ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۴۲۔ جب ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۴۳۔ میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں۔ ۱۴۴۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ ۱۴۵۔ اور میں تم سے اس پر کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا بدلہ صرف خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۴۶۔ کیا تم کو ان چیزوں میں بے فکری سے رہنے دیا جائے گا جو یہاں ہیں۔ ۱۴۷۔ باغوں اور چشموں میں۔ ۱۴۸۔ اور کھیتوں اور رس بھرے خوشوں والی کھجوروں میں۔ ۱۴۹۔ اور تم پہاڑ کھود کر فخر کرتے ہوئے مکان بناتے ہو۔ ۱۵۰۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ ۱۵۱۔ اور حد سے گزر جانے والوں کی بات نہ مانو۔ ۱۵۲۔ جو زمین میں خرابی کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

عاد کے بعد دوسری قوم جس کو عروج ملا وہ ثمود کی قوم تھی (الاعراف، 7:74)۔ اس قوم کی آبادیاں خیبر اور تبوک کے درمیان اس علاقہ میں تھیں جس کو الحجر کہا جاتا ہے۔ اس قوم کو بھی زبردست خوش حالی اور غلبہ حاصل ہوا۔ مگر اس کے افراد کی بھی ساری توجہ دوبارہ صرف مادی ترقی کی طرف لگ گئی۔ پہاڑوں کو کاٹ کر بڑے بڑے مکان بنانے کا فن غالباً اسی قوم نے شروع کیا۔ جس کی زیادہ ترقی یافتہ صورت اجنتا اور ایلورا کے غاروں کی شکل میں پائی جاتی ہے۔

ہر شخص اور ہر گروہ جس کو دنیا کا ساز و سامان ملتا ہے وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ یہ سب اس کا حق ہے اور وہ جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ مگر یہ سب سے بڑی بھول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا اسباب صرف امتحان کی مدت تک کے لیے ہے۔ اس کے بعد وہ اس طرح چھین لیا جائے گا کہ آدمی کے پاس ان میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

حد سے گزرنے والا (مسرف) وہ شخص ہے جس کے پاس دولت آئے تو وہ شکر کے بجائے فخر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ وہ اقتدار پائے تو تواضع کے بجائے گھمنڈ کرنے لگے۔ اس کو عہدہ دیا جائے تو وہ اس کو خدمت کے بجائے اپنا نام بلند کرنے کے لیے استعمال کرے۔ مواقع کے یہی غلط استعمالات ہیں جو معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ قوم ثمود کے بڑے لوگ اسی قسم کے اسراف میں مبتلا تھے۔ اور ان کے عوام ان کی پیروی کر رہے تھے۔ پیغمبر نے انھیں متنبہ کیا کہ یہ لوگ جن کو تم بڑا سمجھتے ہو وہ تو خود بے راہ ہیں پھر وہ تم کو کیسے راستہ دکھائیں گے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ
اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا
شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَ لَا
تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ
عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾
فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَ
مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾ ع ٨ ١٩ ١٢

۱۵۳۔ انھوں نے کہا، تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔ ۱۵۴۔ تم صرف ہمارے جیسے ایک آدمی ہو، پس تم کوئی نشانی لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ۱۵۵۔ صالح نے کہا یہ ایک اونٹنی ہے۔ اس کے لیے پانی پینے کی ایک باری ہے۔ اور ایک مقرر دن کی باری تمھارے لیے ہے۔ ۱۵۶۔ اور اس کو برائی کے ساتھ مت چھیڑنا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو پکڑ لے گا۔ ۱۵۷۔ پھر انھوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا، پھر وہ پشیمان ہو کر رہ گئے۔ ۱۵۸۔ پھر ان کو عذاب نے پکڑ لیا۔ بے شک اس میں نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ ۱۵۹۔ اور بے شک تمھارا رب وہ زبردست ہے، رحمت والا ہے۔

پیغمبر جس قوم میں اٹھتا ہے وہ کوئی لامذہب قوم نہیں ہوتی۔ وہ پورے معنوں میں ایک مذہبی قوم ہوتی ہے۔ مگر یہ مذہب اس کے بزرگوں کا مذہب ہوتا ہے اور پیغمبر خدا کا مذہب پیش کرتا ہے۔ جو لوگ اپنے بزرگوں کے طریقے کو مقدس سمجھ کر اس پر قائم ہوں وہ کبھی کسی دوسرے طریقے کی اہمیت نہیں سمجھ پاتے، خواہ وہ ان کے پیغمبر کی زبان سے کیوں نہ پیش کیا جائے۔ بزرگوں کے طریقے سے انحراف قوم کی نظر میں اتنا سخت تھا کہ اس نے حضرت صالح کو دیوانہ قرار دے دیا۔ یہ کشمکش لمبی مدت تک جاری رہی۔ آخر انھوں نے مطالبہ کیا کہ

کوئی معجزہ دکھاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک معجزہ ظاہر ہوا۔ جو بیک وقت معجزہ بھی تھا اور قوم کے حق میں خدا کی عدالت بھی۔ یہ ایک اونٹنی تھی جو خرق عادت کے طور پر ظہور میں آئی۔ حضرت صالح نے کہا کہ یہ خدا کی اونٹنی ہے۔ یہ تمھارے کھیتوں اور باغوں میں آزادانہ طور پر گھومے گی اور پانی کا گھاٹ ایک دن صرف اس کے لیے خاص ہوگا۔ قوم نے کچھ دن تک اس اونٹنی کو برداشت کیا اس کے بعد اس کے ایک سرکش آدمی نے اس کو مار ڈالا۔ اس کے صرف تین دن کے بعد پوری قوم شدید زلزلہ سے ہلاک کردی گئی۔

اونٹنی کو ہلاک کرنے کا جرم قوم کے ایک شخص نے کیا تھا مگر جمع کے صیغہ میں فرمایا کہ انھوں نے اس کو ہلاک کرڈالا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہلاک کرنے کے وقت نہ تو قوم کے لوگوں نے اسے روکا اور نہ بعد کو اپنے اس آدمی کو بُرا کہا۔ سارے لوگ اس کی حمایت میں حضرت صالح کے خلاف بولتے رہے۔ ہلاک کرنے والے نے اگر اپنے ہاتھ سے جرم کیا تھا تو بقیہ لوگ دل اور زبان سے اس کے ساتھ شریکِ جرم تھے۔ اس لیے خدا کی نظر میں سب کے سب مجرم قرار پائے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٦٠﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٦١﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٦٢﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٦٣﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٤﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿١٦٦﴾

۱۶۰۔ لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۶۱۔ جب ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا، کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۶۲۔ میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں۔ ۱۶۳۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ ۱۶۴۔ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، میرا بدلہ تو خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۶۵۔ کیا تم دنیا والوں میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو۔ ۱۶۶۔ اور تمھارے رب نے تمھارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑتے ہو، بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔

حضرت لوط جس قوم میں آئے وہ شہوت پرستی میں حد کو پار کرگئی تھی۔ ان کے لیے ان کی بیویاں کافی نہ تھیں۔ وہ نوجوان لڑکوں سے مباشرت کا فعل کرنے لگے تھے۔ حضرت لوط نے انھیں خدا پرستی اور تقویٰ کی تعلیم دی اور برے افعال سے انھیں منع کیا۔

حضرت لوط ان کے درمیان ایک ایسے داعی کی حیثیت سے اٹھے جس کی شخصیت جھوٹ اور فضول گوئی سے صدفی صد پاک تھی۔ قوم سے مادی مفاد کا جھگڑا چھیڑنے سے بھی انھوں نے مکمل پرہیز کیا۔ یہ واقعات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھے کہ حضرت لوط جو کچھ کہہ رہے ہیں پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ مگر چوں کہ آپ کی بات قوم کی روش کے خلاف تھی وہ آپ کی دشمن ہوگئی۔ حضرت لوط کی بات کو وزن دینے کے لیے ضروری تھا

کہ لوگوں کے اندر خدا کا خوف ہو۔ مگر یہی وہ چیز تھی جس سے ان کی قوم کے لوگ پوری طرح خالی ہو چکے تھے۔ پھر وہ پیغمبر کی بات پر دھیان دیتے تو کس طرح دیتے۔

قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ
الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَ اَهْلِيْ مِمَّا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾
اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا
الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا
فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَ
اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾ ع ۹ ۱۶ ۱۳

۱۶۷۔ انھوں نے کہا کہ اے لوط، اگر تم باز نہ آئے تو ضرور تم نکال دیے جاؤ گے۔ ۱۶۸۔ اس نے کہا میں تمھارے عمل سے سخت بیزار ہوں۔ ۱۶۹۔ اے میرے رب، تو مجھ کو اور میرے گھر والوں کو ان کے عمل سے نجات دے۔ ۱۷۰۔ پس ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو بچا لیا۔ ۱۷۱۔ مگر ایک بڑھیا کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں رہ گئی۔ ۱۷۲۔ پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۷۳۔ اور ہم نے ان پر برسایا ایک مینھ۔ پس کیسا برا مینھ تھا جو ان پر برسا جن کو ڈرایا گیا تھا۔ ۱۷۴۔ بے شک اس میں نشانی ہے۔ اور ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ ۱۷۵۔ اور بے شک تیرا رب وہ زبردست ہے، رحمت والا ہے۔

بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق کا علاقہ آج ویران حالت میں نظر آتا ہے۔ مگر 2300-1900 ق م کے زمانہ میں وہ نہایت سرسبز علاقہ تھا۔ قوم لوط اسی علاقہ میں آباد تھی۔ حضرت لوط کی مسلسل تبلیغ کے باوجود انھوں نے اپنی اصلاح نہیں کی حتی کہ وہ آپ کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ اس وقت انھیں زبردست زلزلہ کے ذریعہ ہلاک کر دیا گیا۔ اس برباد شدہ علاقہ کا ایک حصہ بحر مردار کے نیچے دفن ہے اور ایک حصہ کھنڈر بنا ہوا پڑا ہے۔ یہ واقعہ اب سے چار ہزار سال پہلے پیش آیا۔

حضرت لوط کی بیوی اپنے آپ کو قومی روایات سے اوپر نہ اٹھا سکی۔ وہ پیغمبر کی بیوی ہونے کے باوجود اپنے قومی مذہب کی وفادار بنی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب خدا کا عذاب آیا تو وہ بھی عام منکرین کے ساتھ ہلاک کر دی گئی۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ
شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ

۱۷۶۔ اصحاب ایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۷۷۔ جب شعیب نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۷۸۔ میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں۔ ۱۷۹۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات

اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْکَیْلَ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَ اتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۸۴﴾

مانو۔ ۱۸۰۔ اور میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا بدلہ خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۸۱۔ تم لوگ پورا پورا ناپو اور نقصان دینے والوں میں سے نہ بنو۔ ۱۸۲۔ اور سیدھی ترازو سے تولو۔ ۱۸۳۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ ۱۸۴۔ اور اس ذات سے ڈرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور گزشتہ نسلوں کو بھی۔

''ایکہ'' کے لفظی معنی جنگل کے ہیں۔ یہ تبوک کا پرانا نام ہے۔ قوم شعیب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھی۔ وہ جس علاقہ میں آباد ہوئی، اس کا مرکزی شہر تبوک تھا۔ اسی لیے قرآن میں اس کو اصحاب ایکہ کہا گیا ہے۔

تمام اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کی جڑ ''میزان'' میں فرق کرنا ہے۔ صحیح میزان (ترازو) یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو وہ دے جو ازروئے حق انھیں دینا چاہیے۔ اور اپنے لیے وہ لے جو ازروئے حق اسے لینا چاہیے۔ یہی خدائی میزان ہے۔ جب اس میزان میں فرق کیا جاتا ہے تو اسی وقت اجتماعی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ تاہم اس میزان پر قائم ہونے کا راز اللہ کا خوف ہے۔ اگر اللہ کا ڈر دل سے نکل جائے تو کوئی چیز آدمی کو میزان پر قائم نہیں رکھ سکتی۔

خدا کی طرف سے جتنے رسول آئے سب نے اپنی مخاطب قوموں سے کہا کہ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ (میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داعی کے اندر اعتباریت (credibility) کی صفت لازمی طور پر موجود ہونا چاہیے۔ اسی اعتباریت کا ایک پہلو یہ ہے کہ داعی اپنی مدعو قوم سے معاشی اور مادی جھگڑا نہ چھیڑے تاکہ اس کی بے غرض مقصدیت مشتبہ نہ ہو۔ یہ اعتباریت اتنی اہم ہے کہ اس کو ہر حال میں حاصل کرنا ضروری ہے۔ خواہ اس کی خاطر داعی کو اپنے مادی حقوق سے یک طرفہ طور پر دست بردار ہونا پڑے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّیْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ

۱۸۵۔ انھوں نے کہا تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔ ۱۸۶۔ اور تم ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو۔ اور ہم تو تم کو جھوٹے لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں۔ ۱۸۷۔ پس ہمارے اوپر آسمان سے کوئی ٹکڑا گراؤ اگر تم سچے ہو۔ ۱۸۸۔ شعیب نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ ۱۸۹۔ پس انھوں

فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ
وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَ اِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾ ع ۱۶/۱۴

نے اس کو جھٹلا دیا۔ پھر ان کو بادل والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔ ۱۹۰۔ بے شک وہ ایک بڑے دن کا عذاب تھا۔ بے شک اس میں نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ ۱۹۱۔ اور بے شک تمھارا رب زبردست ہے، رحمت والا ہے۔

حضرت شعیب کی قوم کو اپنے آبائی طریقہ کی صداقت پر اس قدر یقین تھا کہ پیغمبر کی بات اس کو الٹی اور بے جوڑ معلوم ہوئی۔ اس نے کہا کہ تم پر شاید کسی نے سخت جادوئی عمل کر دیا ہے۔ اس لیے تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔

ان کا یہ کہنا کہ ہمارے اوپر آسمانی عذاب لاؤ، اس کا رخ خدا کی طرف نہیں بلکہ حضرت شعیب کی طرف تھا۔ وہ حضرت شعیب کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لیے ایسا کہتے تھے۔ کیوں کہ وہ حضرت شعیب کو ایسا نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے کہنے سے آسمانی عذاب آجائے گا۔

آخر کار قوم کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائبان کی طرح ایک بادل نے ان کے اوپر سایہ کر لیا۔ پھر خدا کے حکم سے اس کے اندر سے ایسی آگ برسی جس نے پوری قوم کو مٹا کر رکھ دیا۔

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ
الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ
الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَ
اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ
اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾

۱۹۲۔ اور بے شک یہ خداوند عالم کا اتارا ہوا کلام ہے۔ ۱۹۳۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ ۱۹۴۔ تمھارے دل پر تا کہ تم ڈرانے والوں میں سے بنو۔ ۱۹۵۔ صاف عربی زبان میں۔ ۱۹۶۔ اور اس کا ذکر اگلے لوگوں کی کتابوں میں ہے۔ ۱۹۷۔ اور کیا ان کے لیے یہ نشانی نہیں ہے کہ اس کو بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں۔

قرآن اگرچہ بظاہر ایک انسانی زبان میں ہے۔ مگر اس کی ادبی عظمت اتنی غیر معمولی ہے کہ وہ خود اپنی زبان کے اعتبار سے ایک برتر خدائی کلام ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ قرآن کی صداقت کا مزید ثبوت یہ ہے کہ قرآن کے نزول سے بہت پہلے پیدا ہونے والے پیغمبروں نے اس کی پیشین گوئی کی۔ یہ پیشین گوئی آج بھی تورات اور زبور اور انجیل میں موجود ہے۔ انھیں پیشین گوئیوں کی بنا پر اس زمانہ کے متعدد مسیحی اور یہودی علماء (مثلاً عبداللہ بن سلّام) اس پر ایمان لائے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

خدا کے کلام کا اس طرح خصوصی اہتمام کے ساتھ اترنا کسی بہت خصوصی مقصد کے تحت ہی ہو سکتا ہے، اور وہ مقصد یہ ہے کہ انسان کو آنے والے سخت دن سے آگاہ کیا جائے۔ انذارِ آخرت پچھلی تمام آسمانی کتابوں کا بھی خاص مقصد تھا اور یہی قرآن کا بھی خاص مقصد ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿١٩٨﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿١٩٩﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٢٠٠﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٢٠١﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿٢٠٣﴾

۱۹۸۔اور اگر ہم اس کو کسی عجمی پر اتارتے۔۱۹۹۔پھر وہ ان کو پڑھ کر سناتا تو وہ اس پر ایمان لانے والے نہ بنتے۔۲۰۰۔اسی طرح ہم نے ایمان نہ لانے کو مجرموں کے دلوں میں ڈال رکھا ہے۔۲۰۱۔یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے جب تک سخت عذاب نہ دیکھ لیں۔۲۰۲۔پس وہ ان پر اچانک آجائے گا اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔۲۰۳۔پھر وہ کہیں گے کہ کیا ہم کو کچھ مہلت مل سکتی ہے۔

قرآن عربی زبان میں آیا اور جس پیغمبر نے اسے پیش کیا اس کی بھی مادری زبان عربی تھی۔اس بنا پر منکرین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ یہ تو خود ان کا اپنا کلام ہے۔وہ ایک عرب ہیں اس لیے انھوں نے عربی میں ایک قرآن تصنیف کرلیا۔

مگر اعتراض کا یہ انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ کوئی سنجیدہ اعتراض نہیں ہے۔اور جو لوگ کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہوں وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی شوشہ نکال لیتے ہیں۔مثلاً اگر ایسا کیا جاتا کہ کسی غیر عربی پر یہ عربی قرآن اتار دیا جاتا اور وہ شخص عربی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود عربی قرآن انھیں پڑھ کر سناتا تو وہ فوراً یہ کہہ دیتے کہ ”کوئی عرب اس کو سکھا جاتا ہے“۔

جو لوگ ناحق کی بنیاد پر اپنی زندگی کی عمارت کھڑی کئے ہوئے ہوں ان کے لیے حق کا اعتراف کرنا خود اپنی نفی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ایسے لوگوں کے سامنے جب حق آئے اور وہ ذاتی مصالح کو اہمیت دیتے ہوئے حق کا اعتراف نہ کریں تو انکار کا مزاج ان کی نفسیات میں اس طرح شامل ہوجاتا ہے کہ انھیں دوبارہ اس سے نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٢٠٤﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿٢٠٦﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿٢٠٧﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿٢٠٨﴾ ذِكْرٰى ﵶ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٠٩﴾

۲۰۴۔کیا وہ ہمارے عذاب کو جلد مانگ رہے ہیں۔۲۰۵۔بتاؤ کہ اگر ہم ان کو چند سال تک فائدہ پہنچاتے رہیں۔۲۰۶۔پھر ان پر وہ چیز آجائے جس سے انھیں ڈرایا جارہا ہے۔۲۰۷۔تو یہ فائدہ مندی ان کے کس کام آئے گی۔۲۰۸۔اور ہم نے کسی بستی کو بھی ہلاک نہیں کیا مگر اس کے لیے ڈرانے والے تھے۔۲۰۹۔یاد

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ
لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ
لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

دلانے کے لیے، اور ہم ظالم نہیں ہیں۔ ۲۱۰۔ اور اس کو شیطان لے کر نہیں اترے ہیں۔ ۲۱۱۔ نہ یہ ان کے لیے لائق ہے۔ اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ ۲۱۲۔ وہ اس کو سننے سے روک دئے گئے ہیں۔

پیغمبر کی سطح پر جب خدا کی دعوت ظاہر ہوتی ہے تو وہ اپنی آخری کامل صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کا انکار کرنے والی قوم پر خدا کا عذاب آنا لازمی ہو جاتا ہے۔ تاہم جب تک عذاب عملاً نہ آجائے آدمی اپنے کو محفوظ سمجھتا ہے۔ وہ دعوتِ حق کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں کرتا ہے۔ کبھی پیغمبر کی شخصیت کی تحقیر کرتا ہے۔ کبھی پیغمبر کے لائے ہوئے کلام کو بناوٹی کلام بتاتا ہے۔ کبھی یہ کہتا ہے کہ تمھارے بیان کے مطابق اگر خدا ہمارے ساتھ نہیں تو وہ ہم کو سزا کیوں نہیں دیتا۔

پیغمبر کی ذمہ داری یا پیغمبر کی تبعیت میں داعی کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو امر حق سے آگاہ کر دے۔ اس سے آگے کے تمام معاملات خدا کے ذمے ہیں اور وہی جب چاہتا ہے انھیں ظاہر کرتا ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ
الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ
الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ
اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ
فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾
وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ
يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِي
السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾

۲۱۳۔ پس تم اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو کہ تم بھی سزا پانے والوں میں سے ہو جاؤ۔ ۲۱۴۔ اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ ۲۱۵۔ اور ان لوگوں کے لیے اپنے بازو جھکائے رکھو جو مومنین میں داخل ہو کر تمھاری پیروی کریں۔ ۲۱۶۔ پس اگر وہ تمھاری نافرمانی کریں تو کہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، میں اس سے بری ہوں۔ ۲۱۷۔ اور زبردست اور مہربان خدا پر بھروسہ رکھو۔ ۲۱۸۔ جو دیکھتا ہے تم کو جب کہ تم اٹھتے ہو۔ ۲۱۹۔ اور تمھاری نقل و حرکت نمازیوں کے ساتھ۔ ۲۲۰۔ بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اللہ کے سوا کسی اور کو معبود بنانا اللہ کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے۔ اس کے ارتکاب کے بعد کوئی شخص سزا سے بچ نہیں سکتا۔ حتی کہ وہ شخص بھی نہیں جو زبان و قلم سے توحید کا علم بردار بنا ہوا ہو۔ داعی کا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو پوری طرح شرک سے بچاتے ہوئے لوگوں کو حق کی طرف بلائے، جن میں اس کے قریبی لوگ بدرجہ اولیٰ شامل ہیں۔

حق کا ساتھ دینے کے لیے اپنی بڑائی کے بت کو توڑنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے لوگوں میں بہت کم ایسے افراد نکلتے ہیں جو حق کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ حق کا ساتھ دینے کے لیے وہ لوگ اٹھتے ہیں جو سماج میں کمتر حیثیت رکھتے ہوں۔ یہ واقعہ داعی کے لیے سخت امتحان ہوتا ہے۔ داعی کو اس سے بچنا پڑتا ہے کہ دوسروں کی طرح وہ بھی انھیں حقیر سمجھے، جو لوگ غیر اسلامی سماج میں حقیر بنے ہوئے تھے وہ اسلامی حلقہ میں آکر بھی بدستور حقیر بنے رہیں۔

داعی وہ ہے جس کا خدا سے تعلق اتنا بڑھا ہوا ہو کہ رات کی تنہائیوں میں وہ بے قرار ہو کر اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہو۔ اپنے سجدہ گزار ساتھیوں کی قیمت اس کی نظر میں اتنی زیادہ ہو کہ وہ انھیں کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنالے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾
تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ
السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَآءُ
يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ
يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا
يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا
مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا
اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ ع ۱۱ ۳۶ ۱۵

۲۲۱۔ کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ ۲۲۲۔ وہ ہر جھوٹے گنہ گار پر اترتے ہیں۔ ۲۲۳۔ وہ کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ ۲۲۴۔ اور شاعروں کے پیچھے بے راہ لوگ چلتے ہیں۔ ۲۲۵۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں۔ ۲۲۶۔ اور وہ کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں۔ ۲۲۷۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور انھوں نے اللہ کو بہت یاد کیا اور انھوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور ظلم کرنے والوں کو جلد معلوم ہوجائے گا کہ ان کو کیسی جگہ لوٹ کر جانا ہے۔

پیغمبر کے کلام میں غیر معمولی پن اتنا نمایاں تھا کہ پیغمبر کے منکرین بھی اس کی تردید نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیتے کہ یہ کاہن اور عامل ہیں اور ان کے کلام میں جو غیر معمولی پن ہے، وہ کاہن اور عامل ہونے کی بنا پر ہے، نہ کہ پیغمبر ہونے کی بنا پر۔ اسی طرح وہ قرآن کو شاعر کا کلام بتاتے تھے۔ فرمایا کہ اس بات کی تردید کے لیے یہی کافی ہے کہ پیغمبر کا اور کاہنوں اور شاعروں کا مقابلہ کرکے دیکھا جائے۔ دونوں کی زندگی میں اتنا زیادہ فرق ملے گا کہ کوئی سنجیدہ آدمی ہرگز ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کرسکتا۔

شاعری کی بنیاد تخیل پر ہے، نہ کہ حقائق وواقعات پر۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر لوگ ہمیشہ خیالات کی دنیا میں پرواز کرتے ہیں۔ وہ کبھی ایک قسم کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے قسم کی۔ اس کے برعکس، پیغمبر اور آپ کے

ساتھیوں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں جو سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ان کی زندگیاں قول وعمل کی یکسانیت کی مثالیں ہیں۔ اللہ کی گہری معرفت نے ان کو اللہ کی یاد کرنے والا بنا دیا ہے۔ ان کی احتیاط اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اگر کسی کے خلاف کارروائی کرتے ہیں تو صرف اس وقت کرتے ہیں جب کہ اس نے ان کے اوپر صریح ظلم کیا ہو۔ مستقبل کی نزاکت آدمی کو اس کے حال کے بارے میں سنجیدہ بنا دیتی ہے — جو شخص مستقبل کے بارے میں حساس نہ ہو وہ حال کے بارے میں بھی حساس نہیں ہو سکتا۔

۲۷۔ سُوْرَۃُ النَّمْل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ ۱
هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ ۲ الَّذِيْنَ
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۳ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ
يَعْمَهُوْنَ ۗ ۴ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ
وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۵ وَاِنَّكَ
لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ طٰسٓ۔ یہ آیتیں ہیں قرآن کی اور ایک واضح کتاب کی۔ ۲۔ رہنمائی اور خوش خبری ایمان والوں کے لیے۔ ۳۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۴۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے کاموں کو ہم نے ان کے لیے خوش نما بنا دیا ہے، پس وہ بھٹک رہے ہیں۔ ۵۔ یہ لوگ ہیں جن کے لیے بری سزا ہے اور وہ آخرت میں سخت خسارے میں ہوں گے۔ ۶۔ اور بے شک قرآن تم کو ایک حکیم اور علیم کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔

جب آدمی کے سامنے حق آئے اور وہ کسی تحفظ کے بغیر اس کا اعتراف کر لے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فوراً صحیح رخ پر چل پڑتا ہے۔ اس کی زندگی ہر اعتبار سے درست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص اپنے آپ کو حق کے مطابق ڈھالنے کے لیے تیار نہ ہو وہ مجبور ہوتا ہے کہ خود حق کو اپنے مطابق ڈھالے۔ اسی نفسیاتی کیفیت کا دوسرا نام تزئینِ اعمال ہے۔

ایسا آدمی اپنی روش کو جائز ثابت کرنے کے لیے خود ساختہ دلیلیں تلاش کرتا ہے۔ یہ دلیلیں دھیرے دھیرے اس کے ذہن پر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ وہ اس کو عین درست معلوم ہوتی ہیں۔ اپنا غلط عمل اس کو اپنی جھوٹی توجیہات کی روشنی میں صحیح نظر آنے لگتا ہے۔

جو لوگ دعوتِ حق کے بارے میں سنجیدہ نہ ہوں وہ ہمیشہ تزئینِ اعمال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ عین

اپنی نفسیات کے نتیجہ میں اپنی اصلاح کی طرف سے بالکل غافل ہوجاتے ہیں۔ اپنے غلط کو صحیح سمجھنے کی انھیں یہ بھاری قیمت دینی پڑتی ہے کہ وہ ایسے راستے پر چلتے رہیں جس کی آخری منزل جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ⑦ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑧

۷۔ جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ میں وہاں سے کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا کوئی انگارہ لاتا ہوں تا کہ تم تاپو۔ ۸۔ پھر جب وہ اس کے پاس پہنچا تو آواز دی گئی کہ مبارک ہے وہ جو آگ میں ہے اور جو اس کے پاس ہے۔ اور پاک ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔

قبطی کی موت کے واقعہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین چلے گئے تھے۔ مدین کا علاقہ بحر احمر کی اس شاخ کے مشرقی ساحل پر تھا جس کو خلیج عقبہ کہا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے یہاں تقریباً آٹھ سال گزارے اس کے بعد وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ مصر واپس جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں وہ بحر احمر کی دونوں شاخوں کے درمیان اس پہاڑ کے کنارے پہنچے جس کا قدیم نام طور تھا اور اب اس کو جبل موسیٰ (Gebel Musa) کہا جاتا ہے۔

یہ غالباً سردیوں کی رات تھی۔ حضرت موسیٰ کو دور پہاڑ پر ایک آگ سی چیز نظر آئی۔ وہ اس کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خدا کی تجلی تھی، نہ کہ کوئی انسانی آگ۔

پہاڑ کے اوپر جہاں حضرت موسیٰ نے روشنی دیکھی تھی وہاں آج بھی ایک قدیم درخت موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی وہ درخت ہے جس کے اوپر سے حضرت موسیٰ کو خدا کی آواز سنائی دی تھی۔ یہاں بعد کو عیسائی حضرات نے گرجا اور خانقاہ تعمیر کر دیا جو آج بھی لوگوں کے لیے زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ⑨ وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۖ⑩ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ

۹۔ اے موسیٰ، یہ میں ہوں اللہ، زبردست حکیم۔ ۱۰۔ اور تم اپنا عصا ڈال دو۔ پھر جب اس نے اس کو اس طرح حرکت کرتے ہوئے دیکھا جیسے وہ سانپ ہو تو وہ پیچھے کو مڑا اور پلٹ کر نہ دیکھا۔ اے موسیٰ، ڈرو نہیں، میرے حضور پیغمبر ڈرا نہیں کرتے۔ ۱۱۔ مگر جس نے زیادتی کی۔ پھر اس نے برائی کے بعد اس کو بھلائی سے بدل دیا، تو میں بخشنے والا، مہربان

رَّحِيْمٌ ۝١١ وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ
بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۟ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا
فٰسِقِيْنَ ۝١٢ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً
قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝١٣ وَجَحَدُوْا بِهَا وَ
اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝١٤ ع

ہوں۔ ۱۲۔اورتم اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو، وہ کسی عیب کے بغیر سفید نکلے گا۔ یہ دونوں مل کر نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اوراس کی قوم کے پاس جاؤ۔ بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔ ۱۳۔پس جب ان کے پاس ہماری واضح نشانیاں آئیں، انھوں نے کہا یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ ۱۴۔اورانھوں نے ان کا انکار کیا، حالاں کہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کرلیا تھا، ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے۔ پس دیکھو کیسا برا انجام ہوا مفسدوں کا۔

حضرت موسیٰ پہاڑ پر آگ کے لیے گئے تھے۔مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ پیغمبری کے لیے بلائے گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو خصوصی عطیہ دیتا ہے تو اچانک اور غیر متوقع طور پر دیتا ہے تاکہ وہ اس کو براہِ راست اللہ کی طرف سے سمجھے اوراس کے اندر زیادہ سے زیادہ شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

حضرت موسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) اگرچہ اس وقت کے لحاظ سے ایک مسلم قوم تھی۔مگر اب وہ بالکل بے جان ہو چکی تھی۔دوسری طرف انھیں فرعون جیسے جابر حکمراں کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرنا تھا۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے آغاز ہی میں آپ کو عصا کا معجزہ عطا فرمادیا۔یہ عصا حضرت موسیٰ کے لیے ایک مستقل خدائی طاقت تھا۔اس کے ذریعے سے فرعون کے مقابلہ میں 9 معجزات ظاہر ہوئے۔بنی اسرائیل کے لیے ظاہر ہونے والے معجزات ان کے علاوہ تھے۔حضرت موسیٰ کے معجزات نے آخری حد تک آپ کی صداقت ثابت کر دی تھی۔اس کے باوجود فرعون اوراس کے ساتھیوں نے آپ کا اعتراف نہیں کیا۔اس کی وجہ ان کا ظلم اور علو تھا۔فرعون اوراس کے ساتھی اپنی آزادی پر قید لگانے کے لیے تیار نہ تھے۔مزید یہ کہ وہ جانتے تھے کہ موسیٰ کی بات ماننا اپنی بڑائی کی نفی کرنا ہے۔اور کون ہے جو اپنی بڑائی کی نفی کی قیمت پر سچائی کو مانے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ
لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٥ وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ
كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝١٦

۱۵۔اورہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا۔اوران دونوں نے کہا کہ شکر ہے اللہ کے لیے جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ ۱۶۔اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔اور کہا کہ اے لوگو، ہم کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے، اور ہم کو ہر قسم کی چیز دی گئی۔بے شک یہ کھلا ہوا فضل ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبر اور بادشاہ تھے۔ آپ کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بھی پیغمبر اور بادشاہ ہوئے۔ آپ کی سلطنت فلسطین اور شرق اردن سے لے کر شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی صنعتی معلومات دی تھیں۔ نیز آپ کو معجزاتی طور پر کئی چیزیں عطا ہوئی تھیں۔ مثلاً چڑیوں کی بولیاں سمجھنا۔ اور ان کو تربیت دے کر انھیں خبر رسانی وغیرہ کے لیے استعمال کرنا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اپنے ہم زمانہ لوگوں پر غیر معمولی برتری حاصل تھی۔ مگر اس برتری نے ان کے اندر صرف تواضع کا جذبہ پیدا کیا۔ انھیں جو کچھ حاصل تھا اس کو انھوں نے براہِ راست خدا کا عطیہ قرار دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ سلطنت 965 ق م سے لے کر 926 ق م تک ہے۔ اس لحاظ سے آپ تقریباً چالیس سال حکمراں رہے۔

وَ حُشِرَ لِسُلَیۡمٰنَ جُنُوۡدُہٗ مِنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ وَ الطَّیۡرِ فَہُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوۡا عَلٰی وَادِ النَّمۡلِ ۙ قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ یّٰۤاَیُّہَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰکِنَکُمۡ ۚ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ سُلَیۡمٰنُ وَ جُنُوۡدُہٗ ۙ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا مِّنۡ قَوۡلِہَا وَ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰہُ وَ اَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۷۔ اور سلیمان کے لیے اس کا لشکر جمع کیا گیا، جن اور انسان اور پرندے، پھر ان کی جماعتیں بنائی جاتیں۔ ۱۸۔ یہاں تک کہ جب وہ چونٹیوں کی وادی پر پہنچے۔ ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو، اپنے سوراخوں میں داخل ہوجاؤ، کہیں سلیمان اور اس کا لشکر تم کو کچل ڈالیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ ۱۹۔ پس سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور کہا، اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور یہ کہ میں نیک کام کروں جو تجھ کو پسند ہو اور اپنی رحمت سے تو مجھ کو اپنے نیک بندوں میں داخل کر۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں نہ صرف انسان تھے بلکہ جنات اور پرندے بھی آپ کی فوج میں شامل تھے۔ حضرت سلیمان کا لشکر ایک بار کسی وادی سے گزرا جہاں چیونٹیاں بہت زیادہ تھیں۔ چیونٹیوں نے غیر معمولی طور پر آپ کے لشکر کی عظمت کا اعتراف کیا۔ چیونٹیوں نے اس موقع پر جو گفتگو کی اس کو حضرت سلیمان نے بھی سمجھ لیا۔

اس طرح کا کوئی واقعہ ایک عام انسان کو فخر وغرور میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے۔ مگر حضرت سلیمان اپنے اس حال کو دیکھ کر سراپا شکر بن گئے۔ جو کچھ بظاہر خود انھیں حاصل تھا اس کو انھوں نے پورے طور پر خدا کے خانہ میں ڈال دیا — یہی ہے صالح انسان کا طریقہ۔

وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ اَرَى
الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝٢٠
لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ
لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝٢١ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ
فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ
سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۝٢٢ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً
تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ
عَظِيْمٌ ۝٢٣ وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ
لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا
يَهْتَدُوْنَ ۝٢٤ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ
الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا
تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝٢٥ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝٢٦ (السجدة ۱۸)

۲۰۔ اور سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہا، کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔ ۲۱۔ میں اس کو سخت سزا دوں گا۔ یا اس کو ذبح کر دوں گا، یا وہ میرے سامنے کوئی صاف حجت لائے۔ ۲۲۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس نے آ کر کہا، کہ میں ایک چیز کی خبر لایا ہوں جس کی آپ کو خبر نہ تھی۔ اور میں سبا سے ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔ ۲۳۔ میں نے پایا کہ ایک عورت ان پر بادشاہی کرتی ہے اور اس کو سب چیز ملی ہے۔ اور اس کا ایک بڑا تخت ہے۔ ۲۴۔ میں نے اس کو اور اس کی قوم کو پایا کہ وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں اللہ کے سوا۔ اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دئے، پھر ان کو راستے سے روک دیا، پس وہ راہ نہیں پاتے۔ ۲۵۔ کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیز کو نکالتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ ۲۶۔ اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، مالک عرش عظیم کا۔

سبا (Sabaeans) قدیم زمانہ کی ایک دولت مند قوم تھی۔ اس کا زمانہ 1100 ق م سے لے کر 115 ق م تک ہے۔ اس کا مرکز مارب (یمن) تھا۔ اس علاقہ میں آج بھی اس کے شاندار کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ حضرت سلیمان کے زمانہ میں یہاں ایک عورت (بلقیس) کی حکومت تھی۔ یہ لوگ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ شیطان نے انھیں سکھایا کہ معبود وہی ہو سکتا ہے جو سب سے زیادہ نمایاں ہو۔ سورج چوں کہ تمام دکھائی دینے والی چیزوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس کو معبود سمجھا جائے اور اس کی پرستش کی جائے۔

ہدہد کے ذریعہ حضرت سلیمان کو قوم سبا کے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ ہدہد غالباً آپ کی پرندوں کی فوج سے تعلق رکھتا تھا اور باقاعدہ تربیت یافتہ تھا۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ
الْكٰذِبِيْنَ ۝٢٧ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ

۲۷۔ سلیمان نے کہا، ہم دیکھیں گے کہ تم نے سچ کہا یا تم جھوٹوں میں سے ہو۔ ۲۸۔ میرا یہ خط لے کر جاؤ۔ پھر اس کو ان لوگوں کی طرف ڈال دو۔

اِلَيۡهِمۡ ثُمَّ تَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَانۡظُرۡ مَاذَا
يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا اِنِّىۡۤ اُلۡقِىَ
اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيۡمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَىَّ
ع ۲ ۱۷/۱۷ وَاۡتُوۡنِىۡ مُسۡلِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتۡ يٰۤاَيُّهَا الۡمَلَؤُا
اَفۡتُوۡنِىۡ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ ۚ مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا
حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوۡا نَحۡنُ اُولُوۡا قُوَّةٍ وَّ
اُولُوۡا بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ ۙ وَّ الۡاَمۡرُ اِلَيۡكِ
فَانۡظُرِىۡ مَاذَا تَاۡمُرِيۡنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتۡ اِنَّ
الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡيَةً اَفۡسَدُوۡهَا وَ
جَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ
يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّىۡ مُرۡسِلَةٌ اِلَيۡهِمۡ بِهَدِيَّةٍ
فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

پھر ان سے ہٹ جانا۔ پھر دیکھنا کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ ۲۹۔ ملکہ سبا نے کہا کہ اے دربار والو، میری طرف ایک باوقعت خط ڈالا گیا ہے۔ ۳۰۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے۔ اور وہ ہے— شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ ۳۱۔ کہ تم میرے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس آجاؤ۔ ۳۲۔ ملکہ نے کہا کہ اے درباریو، میرے معاملہ میں مجھے رائے دو۔ میں کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم لوگ موجود نہ ہو۔ ۳۳۔ انھوں نے کہا، ہم لوگ زور آور ہیں۔ اور سخت لڑائی والے ہیں۔ اور فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔ پس آپ دیکھ لیں کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں۔ ۳۴۔ ملکہ نے کہا کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور یہی یہ لوگ کریں گے۔ ۳۵۔ اور میں ان کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ سفیر کیا جواب لاتے ہیں۔

حضرت سلیمان کی قوت وسلطنت ایک خدائی عطیہ تھی۔ اسی طرح آپ نے سبا کی حکومت کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ بھی ایک خدائی معاملہ تھا۔ شاہ عبد القادر دہلوی آیت 37 کے ذیل میں لکھتے ہیں: ’’اور کسی پیغمبر نے اس طرح کی بات نہیں فرمائی۔ سلیمان کو حق تعالیٰ کی سلطنت کا زور تھا جو یہ فرمایا‘‘۔

ملکہ سبا (بلقیس) نے معاملہ کو خالص حقیقت پسندانہ انداز سے دیکھا۔ اس نے یہ رائے قائم کی کہ اگر ہم سلیمان کی طاقت سے ٹکرائیں تو زیادہ امکان یہ ہے کہ ہم ہاریں گے اور پھر ہمارے ساتھ وہی کیا جائے گا جو ہر غالب قوم مغلوب قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر ہم اطاعت قبول کرلیں تو ہم تباہی سے بچ جائیں گے۔ تاہم ملکہ نے ابتدائی اندازوں کے لیے تحفے بھیجنے کا طریقہ اختیار کیا تاکہ معلوم ہوجائے کہ سلیمان ہماری دولت کے خواہش مند ہیں یا اس سے آگے ان کا ہم سے کوئی اصولی مطالبہ ہے۔

حضرت سلیمان نے ملکہ سبا سے سیاسی دست برداری کا مطالبہ کیا۔ ملکہ سبا نے اِس مطالبے کو مان لیا۔ کیوں کہ مطالبہ نہ ماننے کی صورت میں ذلت اور فساد کا اندیشہ تھا، جب کہ مطالبہ ماننے کی صورت میں قومِ سبا کے تمام

تجارتی مفادات بدستور محفوظ رہتے تھے۔ ملکۂ سبا کی اِس روش کو قرآن میں ایک مثبت روش کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ گویا کہ اِس روش کو قرآن کی کھلی ہوئی تائید حاصل ہے۔ اِس سے یہ اصول ملتا ہے کہ کسی وقت دست برداری سے اگر ایک بڑا فائدہ ملتا ہو تو اس دست برداری کو قبول کرلینا چاہیے۔

کوئی قوم جب زوال کا شکار ہوجاتی ہے تو ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی نادانی سے ''ملوک'' کو اپنی بستی میں داخل ہونے کا موقع دیتے ہیں اور جب وہ داخل ہو کر وہ ''اس کو خراب کردیتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کردیتے ہیں'' تو اس کے بعد وہ لوگ شور کرتے ہیں کہ دیکھو، یہ ہمارے اوپر ظلم کررہے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی رہنمائی یہ ہے کہ ملوک کے لشکر کو اس کا موقع ہی نہ دو کہ وہ تمہاری بستیوں میں داخل ہو کر ظلم وفساد کرنے لگے۔ لوگوں کی توجہ ظلم پر ہے۔ جب کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ ظلم کے سبب پر ساری توجہ دی جائے۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿٣٦﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٣٧﴾

۳۶۔ پھر جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچا، اس نے کہا کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ پس اللہ نے جو کچھ مجھے دیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو اس نے تم کو دیا ہے۔ بلکہ تم ہی اپنے تحفہ سے خوش ہو۔ ۳۷۔ ان کے پاس واپس جاؤ۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کرسکیں گے اور ہم ان کو وہاں سے بے عزت کرکے نکال دیں گے۔ اور وہ خوار ہوں گے۔

حضرت سلیمان کو نبوت اور خدا کی معرفت کی شکل میں جو قیمتی دولت ملی تھی، اس کے مقابلہ میں ہر دوسری دولت ان کی نظر میں ہیچ ہوچکی تھی۔ چنانچہ ملکہ سبا کی طرف سے جب ان کے پاس سونے چاندی کے تحفے پہنچے تو انھوں نے ان کی طرف نگاہ بھی نہ کی۔

حضرت سلیمان نے اپنے عمل سے ملکہ سبا کے سفیروں کو یہ تاثر دیا کہ میرا معاملہ اصولی معاملہ ہے، نہ کہ مفاد کا معاملہ۔ مفسر ابن کثیر اس کی تشریح میں یہ الفاظ لکھتے ہیں: أَيْ: أَتُصَانِعُونَنِي بِمَالٍ لِأَتْرُكَكُمْ عَلَى شِرْكِكُمْ وَمُلْكِكُمْ؟! (تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 191)۔ یعنی، کیا تم مال دے کر مجھ کو متاثر کرنا چاہتے ہو کہ میں تم کو تمھارے شرک پر چھوڑ دوں اور تمھاری حکومت تمھارے پاس رہنے دوں۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣٨﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ

۳۸۔ سلیمان نے کہا کہ اے دربار والو، تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے اس سے پہلے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس آئیں۔ ۳۹۔ جنوں میں سے ایک دیو نے کہا، میں اس کو

تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ
اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ
الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ
طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ
هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ
اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾

آپ کے پاس لے آؤں گا اس سے پہلے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں، اور میں اس پر قدرت رکھنے والا، امانت دار ہوں۔ ۴۰۔ جس کے پاس کتاب کا ایک علم تھا اس نے کہا، میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے اس کو لادوں گا۔ پھر جب اس نے تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو اس نے کہا، یہ میرے رب کا فضل ہے۔ تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور جو شخص شکر کرے تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے۔ اور جو شخص ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز ہے، کرم کرنے والا ہے۔

حضرت سلیمان کے پاس اگرچہ غیر معمولی طاقت تھی۔ مگر انھوں نے استعمالِ طاقت کے بجائے مظاہرۂ طاقت کے ذریعہ قوم سبا کو زیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ آپ نے اپنے خصوصی کارندہ کے ذریعہ ملکہ کے تخت کو مارب (Marib) کے محل سے یروشلم (فلسطین) منگوالیا۔ تخت کو منگانے کا واقعہ غالباً اس وقت پیش آیا جب کہ تحفہ کی واپسی کے بعد ملکہ سبا یمن سے فلسطین کے لیے روانہ ہوئی۔ تاکہ وہ حضرت سلیمان کے دربار میں پہنچ کر براہِ راست آپ سے گفتگو کرے۔ ملکہ سبا کا اپنے خدم وحشم کے ساتھ یہ سفر یقیناً اس وقت ہوا ہوگا جب کہ اس کے سفارتی وفد نے واپس جا کر حضرت سلیمان کی حکمت کی باتیں اور آپ کے غیر معمولی کردار کی شہادت دی اور آپ کی غیر معمولی عظمت کا حال بیان کیا۔

مارب سے یروشلم کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ ہزار میل ہے۔ یہ لمبا فاصلہ اس طرح طے ہوا کہ اِدھر حضرت سلیمان کی زبان سے حکم کے الفاظ نکلے اور ادھر زروجواہر سے جڑا ہوا تخت ان کے سامنے رکھا ہوا موجود تھا۔ اس غیر معمولی قوت کے باوجود حضرت سلیمان کے اندر فخر کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ سرتاپا تواضع بن کر خدا کے آگے جھکے رہے۔ دنیوی نعمتیں حقیقۃً فضل کے لیے نہیں ہوتی ہیں، بلکہ وہ ابتلاء (آزمائش) کے لیے ہوتی ہیں۔ دنیوی نعمت کو پا کر آدمی کے اندر کبر و بے نیازی کی کیفیت پیدا نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس کے اندر شکر اور تواضع کا احساس مزید اضافہ کے ساتھ جاگنا چاہیے۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ
تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا
جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ
هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا

۴۱۔ سلیمان نے کہا کہ اس کے تخت کا روپ بدل دو، دیکھیں وہ سمجھ پاتی ہے یا وہ ان لوگوں میں سے ہوجاتی ہے جن کو سمجھ نہیں۔ ۴۲۔ پس جب وہ آئی تو کہا گیا کیا تمھارا تخت ایسا ہی ہے۔ اس نے کہا، گویا کہ یہ وہی ہے۔ اور ہم کو اس سے پہلے

مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾
قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ
حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ قَالَ
اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۭ۬ قَالَتْ رَبِّ
اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾ ع ۳ ۱۴ ۱۸

معلوم ہو چکا تھا۔ اور ہم فرماں برداروں میں تھے۔ ۴۳۔ اور اس کو روک رکھا تھا ان چیزوں نے جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی۔ وہ منکر لوگوں میں سے تھی۔ ۴۴۔ اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ پس جب اس نے اس کو دیکھا تو اس کو خیال کیا کہ وہ گہرا پانی ہے اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں۔ سلیمان نے کہا، یہ تو ایک محل ہے جو شیشوں سے بنایا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب، میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور میں سلیمان کے ساتھ ہو کر اللہ رب العالمین پر ایمان لائی۔

ملکہ سبا اپنے ملک سے روانہ ہو کر بیت المقدس پہنچی۔ یہاں وہ حضرت سلیمان کے محل میں داخل ہوئی تو بالکل انجان طور پر اس کے سامنے ایک تخت لایا گیا۔ اور کہا گیا کہ دیکھو، کیا یہ تمھارا تخت ہے۔ یہ دیکھ کر وہ خدا کی قدرت پر حیران رہ گئی کہ اپنے جس تخت کو وہ مارب کے محل میں محفوظ کر کے آئی تھی وہ پر اسرار طور پر ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے بیت المقدس پہنچ گیا ہے۔

حضرت سلیمان کے محل میں داخل ہو کر ملکہ سبا ایک ایسے مقام پر پہنچی جس کا فرش صاف وشفاف شیشہ کی موٹی تختیوں سے بنایا گیا تھا اور اس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ ملکہ جب چلتے ہوئے یہاں پہنچی تو اس کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کے آگے پانی کا حوض ہے۔ اس وقت اس نے وہی کیا جو پانی میں اترنے والا ہر آدمی کرتا ہے۔ یعنی اس نے غیر ارادی طور پر اپنے کپڑے اٹھا لیے۔

اس طرح گویا کہ عملی تجربہ کی زبان میں اس کو بتایا گیا کہ انسان ظاہر کو دیکھ کر فریب کھا جاتا ہے، مگر اصل حقیقت اکثر اس سے مختلف ہوتی ہے جو ظاہری آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے۔ آدمی ظاہری طور پر سورج اور چاند کو نمایاں دیکھ کر ان کی پرستش کرنے لگتا ہے، حالاں کہ حقیقی خدا وہ ہے جو ان ظواہر سے آگے ہے۔

ملکہ سبا اب تک قومی روایات کے زیر اثر سورج کی پرستش کر رہی تھی۔ مگر حضرت سلیمان کے قریب پہنچ کر اس نے جو کچھ سنا اور جو کچھ دیکھا اس نے اس کے ذہن سے غیر اللہ کی عظمت کا یکسر خاتمہ کر دیا۔ اس نے دینِ شرک کو چھوڑ دیا اور دینِ توحید کو دل وجان سے اختیار کر لیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾
قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ

۴۵۔ اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، کہ اللہ کی عبادت کرو، پھر وہ دو فریق بن کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ ۴۶۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم بھلائی سے پہلے برائی

الْحَسَنَةِ ۚ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَ بِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿٤٧﴾

کے لیے کیوں جلدی کر رہے ہو۔ تم اللہ سے معافی کیوں نہیں چاہتے کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۴۷۔ انھوں نے کہا، ہم تو تم کو اور تمھارے ساتھ والوں کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ تمھاری بری قسمت اللہ کے پاس ہے بلکہ تم تو آزمائے جارہے ہو۔

حضرت صالح علیہ السلام نے توحید خالص کی دعوت شروع کی تو ان کی قوم دو طبقوں میں بٹ گئی۔ جو لوگ قوم کے بڑے تھے وہ اپنی بڑائی میں گم رہے اور حضرت صالح کے بے آمیز دین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ البتہ چھوٹے لوگوں میں سے کچھ افراد نکلے جنھوں نے آپ کی پکار پر لبیک کہا۔

ان دونوں گروہوں میں اختلافی بحثیں شروع ہوگئیں۔ بڑے لوگ پر فخر انداز میں کہتے کہ ہم تمھارے منکر ہیں۔ پھر ہمارے انکار کی پاداش میں جو عذاب تم لاسکتے ہو لے آؤ۔ کبھی کوئی مصیبت پڑتی تو وہ کہہ دیتے کہ صالح اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کی وجہ سے یہ بلا ہمارے اوپر آئی ہے۔ یہ باتیں وہ حضرت صالح اور آپ کی دعوت کی تحقیر کے طور پر کہتے تھے، نہ کہ سنجیدہ خیال کے طور پر۔ ان کی اچھی حالت اور ان کی بری حالت دونوں خدا کی طرف سے تھی۔ مگر اچھی حالت سے انھوں نے جھوٹے فخر کی غذا لی اور بری حالت سے جھوٹی شکایت کی۔

ان کے درمیان حق کے داعی کا اٹھنا ان کے لیے خدا کا ایک امتحان تھا۔ وہ اس آزمائش کے میدان میں کھڑے کر دئے گئے تھے کہ وہ حق کو پہچان کر اس کا ساتھ دیتے ہیں یا اس کے مقابلے میں اندھے بہرے بنے رہتے ہیں۔ مگر وہ دوسری دوسری باتوں میں الجھے رہے اور اصل معاملہ کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿٤٨﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥١﴾

۴۸۔ اور شہر میں نو شخص تھے جو زمین میں فساد کرتے تھے اور وہ اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ ۴۹۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم اس کو اور اس کے لوگوں کو چپکے سے ہلاک کر دیں گے۔ پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے۔ اور بے شک ہم سچے ہیں۔ ۵۰۔ اور انھوں نے ایک تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک تدبیر کی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ ۵۱۔ پس دیکھو کیسا ہوا ان کی تدبیر کا انجام۔ ہم نے ان کو اور ان کی پوری قوم کو ہلاک

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

کر دیا۔ ۵۲۔ پس یہ ہیں ان کے گھر ویران پڑے ہوئے ان کے ظلم کے سبب سے۔ بے شک اس میں سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو جانیں۔ ۵۳۔ اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے اور جو ڈرتے تھے۔

قوم میں نو بڑے سردار تھے۔ وہ اپنے کو بڑا باقی رکھنے کے لیے حق کو چھوٹا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اور اس قسم کی کوشش بلاشبہ خدا کی زمین میں سب سے بڑا فساد ہے۔

ان سرداروں نے آخری مرحلہ میں حضرت صالح کو ہلاک کرنے کی سازش کی۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے خفیہ منصوبہ کے مطابق حضرت صالح کے خلاف کوئی اقدام کریں، خدا نے خود ان کو پکڑ لیا۔ وہ اپنی ساری بڑائی کے باوجود اس طرح برباد کردئے گئے کہ ان کی قدیم بستیوں میں اب صرف ان کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر ان کی یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔

اس قسم کے تاریخی واقعات میں زبردست سبق چھپا ہوا ہے۔ مگر اس سبق کو وہی شخص پائے گا جو اس کو قانونِ الٰہی سے جوڑے۔ اس کے برعکس، جو لوگ اس کو اسبابِ طبیعی سے جوڑیں وہ اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کرسکتے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ

۵۴۔ اور لوط کو جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم بے حیائی کرتے ہو اور تم دیکھتے ہو۔ ۵۵۔ کیا تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو، عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم لوگ بے سمجھ ہو۔ ۵۶۔ پھر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا، لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ لوگ پاک صاف بنتے ہیں۔ ۵۷۔ پھر ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو نجات دی سوا اس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کردیا تھا۔ ۵۸۔ اور ہم نے ان پر برسایا ایک ہولناک برسانا۔ پس کیسا برا برساؤ تھا ان پر جن کو

ع ۱۴ / ۱۹ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٥٨﴾ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٩﴾

آگاہ کیا جاچکا تھا۔ ۵۹۔ کہو حمد ہے اللہ کے لیے اور سلام اس کے ان بندوں پر جن کو اس نے منتخب فرمایا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جن کو وہ شریک کرتے ہیں۔

قوم لوط اپنی لذتیت میں امرد پرستی (pederasty) کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت لوط نے قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ خدا کے بندو، تم کو آنکھ دی گئی ہے کہ دیکھو اور بھلے برُے کی تمیز دی گئی ہے کہ پہچانو۔ پھر کیسے تم وہ کام کرتے ہو جو کھلی ہوئی بے حیائی کا کام ہے۔

قوم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ پیغمبر کی بات کو دلیل سے رد نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ پیغمبر کے خلاف جارحیت پر آمادہ ہو گئے۔ مگر جب یہ نوبت آجائے تو پھر بلا تاخیر خدا کا فیصلہ آجاتا ہے۔ چنانچہ خدا نے آتش فشانی مادہ برسا کر انھیں ہلاک کر دیا۔ اس خدائی فیصلہ سے حضرت لوط کی بیوی بھی نہ بچی جو مشرکوں سے ملی ہوئی تھی۔ خدا کا معاملہ ہر شخص سے اس کے ذاتی عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے، نہ کہ رشتہ اور تعلق کی بنیاد پر۔

تاریخ کے مذکورہ واقعات پر جو شخص غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے ہر دور میں انسان کی رہنمائی کا انتظام کیا اور پھر ان بندوں کی عقیدت سے اس کا سینہ لبریز ہو جائے گا جنھوں نے اپنی زندگی کامل طور پر خدا کے حوالے کر کے خدا کے منصوبۂ ہدایت کی تکمیل کی۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿٦٠﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾

☆ ۶۰۔ بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور تمھارے لیے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس سے رونق والے باغ اگائے۔ تمھارے بس میں نہ تھا کہ تم ان درختوں کو اگا سکتے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ بلکہ وہ راہ سے انحراف کرنے والے لوگ ہیں۔ ۶۱۔ بھلا کس نے زمین کو ٹھہرنے کے لائق بنایا اور اس کے درمیان ندیاں جاری کیں۔ اور اس کے لیے اس نے پہاڑ بنائے۔ اور دو سمندروں کے درمیان پردہ ڈال دیا۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، بلکہ ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

کائنات ناقابل قیاس حد تک عظیم ہے۔ اس کی عظمت کے آگے وہ الفاظ سراسر ناکافی ہو جاتے ہیں جو گمراہ کن انسان اس کی غیر خدائی توجیہ کے لیے بولتا رہا ہے۔ خواہ وہ قدیم مشرک انسان کے بت ہوں یا جدید ملحد انسان کے وہ نظریات جو اسباب اور اتفاقات کی اصطلاحوں میں بیان کیے جاتے ہیں۔

بے شمار اجرام کو پیدا کر کے انھیں اتھاہ خلا میں متحرک کرنا، زمین کو نہایت اعلیٰ اہتمام کے ذریعہ زندگی کے موافق بنانا، پانی اور نباتات جیسی نادر چیزوں کو انتہائی افراط کے ساتھ وجود میں لانا، مسلسل حرکت کرتی ہوئی زمین پر کامل سکون کے حالات پیدا کرنا، دریاؤں اور پہاڑوں کے ذریعہ زمین کو جائے رہائش بنانا، پانی کے سطحی تناؤ (surface tension) کے قانون کے ذریعہ کھاری پانی اور میٹھے پانی کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا، یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات اس سے زیادہ عظیم ہیں کہ کوئی بت انھیں وقوع میں لائے یا کوئی اندھا طبیعی قانون ان کو وجود دے سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک اللہ کے سوا دوسری بنیادوں پر کائنات کی توجیہ کرنا جھوٹی توجیہ کو توجیہ کے قائم مقام بنانا ہے۔ یہ انحراف ہے، نہ کہ فی الواقع کوئی توجیہ۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۶۴﴾

۶۲۔ کون ہے جو بے بس کی پکار کو سنتا ہے اور اس کے دکھ کو دور کر دیتا ہے۔ اور تم کو زمین کا جانشین بناتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے۔ تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔ ۶۳۔ کون ہے جو تم کو خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں راستہ دکھاتا ہے۔ اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ اللہ بہت برتر ہے اس سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۶۴۔ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے۔ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ کہو کہ اپنی دلیل لاؤ، اگر تم سچے ہو۔

ایک حاجت مند کی حاجت پوری ہونا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ تمام کائناتی اسباب اس کے ساتھ موافقت کریں، پھر ایک قادر مطلق خدا کے سوا کون ہے جو اتنے بڑے پیمانہ پر تمام موافق اسباب کو جمع کر سکتا ہو۔

اسی طرح ایک قوم کا ہٹنا اور دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا، سمندری جہاز اور موجودہ زمانہ میں ہوائی جہاز کا امکاناتِ فطرت سے فائدہ اٹھا کر اندھیرے اور اجالے میں سفر کرنا، سمندر سے بھاپ کا اٹھنا اور پھر بارش بن کر برسنا، چیزوں کو عدم سے وجود میں لانا اور پھر ان کو دوبارہ پیدا کرنا۔ انسان کے لیے وسیع پیمانہ پر ہر قسم کے رزق کا بندوبست کرنا، یہ سب خدائی سطح کے کام ہیں۔ اور ایک برتر خدا ہی ان کو انجام دے سکتا ہے۔

یہی زمین پر ظاہر ہونے والے تمام واقعات کا حال ہے۔ یہاں ایک واحد واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے بھی اتنے بے شمار عوامل درکار ہوتے ہیں کہ اس کو وہی ہستی ظہور میں لاسکتی ہے جس کے قبضہ میں ساری کائنات ہو۔ پھر یہ کس قدر بے عقلی کی بات ہے کہ آدمی ایک خدا کے سوا کسی اور کو اپنے جذباتِ عبودیت کا مرکز بنائے۔ وہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی پرستش کرے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ؑ﴿۶۶﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾

ع ۸

۶۵۔ کہو کہ اللہ کے سوا، آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ اور وہ نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ۶۶۔ بلکہ آخرت کے باب میں ان کا علم الجھ گیا ہے۔ بلکہ وہ اس کی طرف سے شک میں ہیں۔ بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں۔ ۶۷۔ اور انکار کرنے والوں نے کہا، کیا جب ہم مٹی ہوجائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی، تو کیا ہم زمین سے نکالے جائیں گے۔ ۶۸۔ اس کا وعدہ ہمیں بھی دیا گیا اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادا کو بھی۔ یہ محض اگلوں کی کہانیاں ہیں۔ ۶۹۔ کہو کہ زمین میں چلو پھرو، پس دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا۔

کسی پیغمبر کے مخاطب آخرت کے مطلق منکر نہ تھے۔ بلکہ وہ اس تصورِ آخرت کے منکر تھے جس کو پیغمبر پیش کرتے تھے۔ لوگ یہ یقین کیے ہوئے تھے کہ آخرت کا مسئلہ ان کے اپنے لیے نہیں ہے بلکہ دوسروں کے لیے ہے۔ پیغمبر نے بتایا کہ آخرت تمھارے لیے بھی ویسا ہی ایک سنگین مسئلہ ہے جیسا کہ وہ دوسروں کے لیے ہے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اپنے بزرگوں سے وابستگی آخرت میں ان کے لیے نجات کا ذریعہ بن جائے گی۔ پیغمبروں نے بتایا کہ آخرت میں صرف خدا کی رحمت آدمی کے کام آئے گی، نہ کہ کسی بزرگ سے وابستگی۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ آخرت کے بارے میں ایک قسم کے ذہنی الجھن میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے بعض سرپھرے کبھی ایسے الفاظ بولتے جیسے کہ وہ آخرت کے منکر ہوں۔ مگر عام لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ نفسِ

آخرت کا انکار نہیں کرتے تھے۔ البتہ پیغمبر کے تصورِ آخرت کو ماننے میں زندگی کی آزادیاں ختم ہوتی تھیں۔ اس لیے ان کا نفس اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں وہ ایسی باتیں کرتے تھے جیسے کہ وہ شک میں ہوں۔ اپنی اسی ذہنی کیفیت کی وجہ سے انھوں نے آخرت کے دلائل پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا۔ اس کے بارے میں وہ اندھے بہرے بنے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کا فیصلہ کرنے کے لیے جو طاقتیں درکار ہیں وہ صرف خدائے عالم الغیب کو حاصل ہیں۔ وہ جزئی طور پر موجودہ دنیا میں بھی اپنا فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ اور وہی آخرت میں کلی طور پر تمام قوموں کے اوپر اپنا فیصلہ نافذ فرمائے گا۔

وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَ مَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾

۷۰۔ اور ان پر غم نہ کرو اور دل تنگ نہ ہو ان تدبیروں پر جو وہ کر رہے ہیں۔ ۷۱۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہے اگر تم سچے ہو۔ ۷۲۔ کہو کہ جس چیز کی تم جلدی کر رہے ہو شاید اس میں سے کچھ تمھارے پاس آلگا ہو۔ ۷۳۔ اور بے شک تمھارا رب لوگوں پر بڑے فضل والا ہے۔ مگر ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔ ۷۴۔ اور بے شک تمھارا رب خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۵۔ اور آسمانوں اور زمین کی کوئی پوشیدہ چیز نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں درج نہ ہو۔

''غم نہ کرو'' کا مطلب داعیٔ حق کو غم سے روکنا نہیں ہے۔ غم تو داعی کی غذا ہے۔ یہ دراصل حق کی بے بسی کی تردید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے ناموافق حالات کے باوجود بہر حال حق کو اور حق کا ساتھ دینے والوں کو کامیابی حاصل ہوگی۔

حق کے داعی کے مخالفین جب حق کے داعی کی مخالفت کرتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک شخص کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ یہ خود خدا کی مخالفت ہے، نہ کہ محض ایک شخص کی مخالفت۔ یہ صورت حال صرف اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک امتحان کی مدت ختم نہ ہوئی ہو۔ امتحان کی مقررہ مدت ختم ہوتے ہی خدا کی طاقتیں ظاہر ہوجاتی ہیں اور وہ مخالفین کا اس طرح خاتمہ کر دیتی ہیں جیسے کہ کبھی ان کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ آدمی کے لیے اس سے بڑی کوئی نادانی نہیں کہ وہ آزمائش کی فرصت کو اپنے لیے سرکشی کی فرصت کے ہم معنی بنا لے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بہت سی چیزوں کو واضح کر رہا ہے جن میں وہ اختلاف

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ
رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ
الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى
الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا
تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾
وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ
اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

رکھتے ہیں۔ ۷۷۔ اور وہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔ ۷۸۔ بے شک تمھارا رب اپنے حکم کے ذریعہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور وہ زبردست ہے، جاننے والا ہے۔ ۷۹۔ پس اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک تم صریح حق پر ہو۔ ۸۰۔ تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ تم بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں۔ ۸۱۔ اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے بچا کر راستہ دکھانے والے ہو۔ تم تو صرف ان کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔

وقت گزرنے پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف معاملات میں حقیقی دین گم ہو جاتا ہے، اور طرح طرح کے منحرف (deviated) نقطۂ نظر دین کے نام سے رائج ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اللہ کی توفیق سے ایک فہم و بصیرت والا آدمی اٹھتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں صحیح دینی نقطۂ نظر کا اعلان کرتا ہے۔ یہ کام بذریعہ قرآن اہل کتاب کے درمیان انجام پایا، اور یہی کام ختم نبوت کے بعد، حدیثِ رسول کے مطابق، علمائے حق کے ذریعہ امت محمدی میں جاری رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس علم کے حامل ہر نسل میں اس کے عادل لوگ ہوں گے، جو اس کو محفوظ رکھیں گے غلو کرنے والوں کی تحریف سے (تَحْرِيفَ الْغَالِينَ)، اہل باطل کے انحراف سے، اور کم علم لوگوں کی غلط تاویلات سے (شرح مشکل الآثار، حدیث نمبر 3884)۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو آنکھ، کان اور دماغ کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ ان صلاحیتوں کو اگر کھلے طریقے سے استعمال کیا جائے تو وہ بے خطا طور پر حقیقتوں کو دیکھنے اور پہچاننے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے آپ کو کسی مصنوعی تصور سے مغلوب کر لے تو اس کی ادراک کی صلاحیتیں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے سامنے حقیقت بے نقاب صورت میں آتی ہے مگر وہ اس سے اس طرح بے خبر رہتا ہے جیسے کہ وہ اندھا بہرا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں اسی شخص کو راستہ دکھایا جا سکتا ہے جو راستہ دیکھنا چاہے۔ جس کے اندر خود راستہ کی تڑپ نہ ہو اس کے لیے کسی رہنما کی رہنمائی کام آنے والی نہیں۔ حق پرست بننے کے لیے سب سے زیادہ جو چیز درکار ہے وہ اعتراف ہے۔ اس دنیا میں اسی شخص کو ہدایت ملتی ہے جس کے اندر یہ مادہ ہو کہ جو بات دلائل سے واضح ہو جائے وہ فوراً اس کو مان لے اور اپنی زندگی کو اس کی ماتحتی میں دے دے۔ جو لوگ خدا کی دعوت کے آگے نہ جھکیں۔ انھیں آخر کار خدا کے فیصلے کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ مگر اس وقت کا جھکنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ
دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ
ع كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَ يَوْمَ نَحْشُرُ
مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ
اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَ لَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا
اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ وَقَعَ الْقَوْلُ
عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَلَمْ
يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ
وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾

۸۲۔ اور جب ان پر بات آپڑے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک دابہ (غیر انسانی مخلوق) نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ۸۳۔ اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گروہ ان لوگوں کا جمع کریں گے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے، پھر ان کی جماعت بندی کی جائے گی۔ ۸۴۔ یہاں تک کہ جب وہ آجائیں گے تو خدا کہے گا کہ تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا حالاں کہ تمھارا علم ان کا احاطہ نہ کرسکا، یا بولو کہ تم کیا کرتے تھے۔ ۸۵۔ اور ان پر بات پوری ہوجائے گی اس سبب سے کہ انھوں نے ظلم کیا، پس وہ کچھ نہ بول سکیں گے۔ ۸۶۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات بنائی تاکہ لوگ اس میں آرام کریں۔ اور دن کہ وہ اس میں دیکھیں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوگا کہ زمین کی موجودہ تاریخ ختم کردی جائے تو آخری طور پر کچھ غیر معمولی نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ انھیں میں سے ایک دابہ (جانور) کا ظہور ہے۔ انسانی داعیوں کی زبان سے جو بات لوگوں نے نہیں مانی اس کا اعلان ایک غیر انسانی مخلوق کے ذریعہ کرایا جائے گا۔ تاہم یہ امتحان کا وقت ختم ہونے کا گھنٹہ ہوگا، نہ کہ امتحان کا وقت شروع ہونے کا اعلان۔

قیامت میں جب تمام لوگ حاضر ہوں گے تو ان کی جماعتیں بنائی جائیں گی۔ ماننے والے ایک طرف کردیے جائیں گے اور نہ ماننے والے دوسری طرف۔ اس کے بعد منکرین سے پوچھا جائے گا کہ تمھارے پاس کون سی علمی دلیل تھی جس کی بنا پر تم نے صداقت کا انکار کیا۔ اس وقت ان کا لاجواب ہونا ثابت کرے گا کہ ان کا انکار محض ضد اور تعصب پر مبنی تھا۔ اگر چہ اپنے کو برسرِ حق ظاہر کرنے کے لیے وہ جھوٹے دلائل پیش کیا کرتے تھے۔ اس وقت ان پر کھلے گا کہ داعی کے ملفوظ کلام کے علاوہ رات اور دن بھی غیر ملفوظ زبان میں ان کو امرحق سے مطلع کر رہے تھے۔ رات کی نیند گویا موت کی تمثیل تھی۔ اور صبح کا جاگنا دوبارہ جی اٹھنے کی تمثیل۔ اعلان حق کے اتنے غیر معمولی اہتمام کے باوجود وہ حق کی دریافت سے محروم رہے۔

وَ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ

۸۷۔ اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو گھبرا اٹھیں گے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں مگر وہ

اللّٰہُ ؕ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَتَرَى
الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ
السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ
شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ مَنْ جَآءَ
بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ
يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ
فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ
اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

جس کو اللہ چاہے۔ اور سب چلے آئیں گے اس کے آگے عاجزی سے۔ ۸۸۔ اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرتے ہو کہ وہ جمے ہوئے ہیں، اور وہ چلیں گے جیسے بادل چلیں۔ یہ اللہ کی کاری گری ہے جس نے ہر چیز کو محکم کیا ہے۔ بے شک وہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ ۸۹۔ جو شخص بھلائی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر ہے، اور وہ اس دن گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔ ۹۰۔ اور جو شخص برائی لے کر آیا تو ایسے لوگ اوندھے منہ آگ میں ڈال دئے جائیں گے۔ تم وہی بدلہ پا رہے ہو جو تم کرتے تھے۔

موجودہ دنیا میں انکار کا اصل سبب انسان کی بے خوفی ہے۔ یہ دراصل بے خوفی کی نفسیات ہے جس کی وجہ سے آدمی حق کو نظر انداز کرتا ہے اور اس کے مقابلہ میں سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہوگی اور اس کی علامت کے طور پر صور پھونک دیا جائے گا تو اچانک لوگ محسوس کریں گے کہ ان کی بے خوفی محض بے خبری کی بنا پر تھی۔ اس دن تمام بڑائیاں ریت کی دیوار کی طرح ڈھ جائیں گی۔ یہ ایسا سخت لمحہ ہوگا کہ انسان تو درکنار پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہوجائیں گے۔ اس وقت سارا عجز ایک طرف ہوجائے گا اور ساری قدرت دوسری طرف۔

اس دن وہ تمام چیزیں بالکل غیر اہم ہوجائیں گی جن کو لوگ دنیا میں اہم سمجھے ہوئے تھے۔ اس دن سارا وزن صرف عمل صالح میں ہوگا۔ اس دن کھونے والے پائیں گے اور پانے والے ابدی طور پر محروم ہو کر رہ جائیں گے۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ
الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۫ وَّاُمِرْتُ اَنْ
اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا
الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ
لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ

۹۱۔ مجھ کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں جس نے اس کو محترم ٹھہرایا اور ہر چیز اسی کی ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداری کرنے والوں میں سے بنوں۔ ۹۲۔ اور یہ کہ قرآن کو سناؤں۔ پھر جو شخص راہ پر آئے گا تو وہ اپنے لیے راہ پر آئے گا اور جو گمراہ ہوا تو کہہ دو کہ میں تو صرف ڈرانے والوں میں

الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۹۲﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ سَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ فَتَعْرِفُوْنَہَا ؕ وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۱/۷

سے ہوں۔ ۹۳۔ اور کہو کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے، وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان لوگے، اور تمھارا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔

اس شہر (مکہ) کا حوالہ قرآن کے مخاطب اول کی رعایت سے ہے۔ تاہم یہ ایک اسلوب کلام کی بات ہے۔ آیت کا اصل مدعا انسان کو اس ابدی حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ اُس کے لیے ایک ہی صحیح رویہ ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ ایک خدا کا عبادت گزار بنے۔

داعی کا کام ''سنانا'' ہے، یعنی امر حق کا اعلان۔ آدمی کو داعی کی لفظی پکار میں معنوی حقیقت کا ادراک کرنا ہے۔ بے زور دعوت میں خدائی طاقت کا جلوہ دیکھنا ہے۔ جو لوگ اس صلاحیت کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے ابدی انعامات کے مستحق قرار دئے جائیں گے۔

''خدا اپنی نشانیاں دکھائے گا''— اس پیشین گوئی کا ایک پہلو قرآن کے مخاطب اول (قریش مکہ) سے تعلق رکھتا ہے جن کو دور اول میں جنگ بدر اور فتح مکہ کی صورت میں خدا کی نشانیاں دکھائی گئیں۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق قرآن کی ابدیت سے ہے۔ اس دوسرے اعتبار سے موجودہ زمانہ میں ظاہر ہونے والی سائنسی نشانیاں بھی اس غیر معمولی پیشین گوئی کے وسیع تر مصداق میں شامل ہیں۔

۲۸۔ سُوْرَۃُ الْقَصَص

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۲﴾ نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَہْلَہَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْہُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَہُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَہُمْ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۴﴾ وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَہُمْ اَئِمَّۃً وَّ نَجْعَلَہُمُ الْوٰرِثِیْنَ ﴿۵﴾ وَنُمَکِّنَ لَہُمْ فِی الْاَرْضِ وَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ طٰسٓمّٓ۔ ۲۔ یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ ۳۔ ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال تم کو ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۴۔ بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی۔ اور اس نے اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس نے کمزور کر رکھا تھا۔ وہ ان کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ بے شک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ ۵۔ اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو زمین میں کمزور کر دئے گئے تھے اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کو

نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿٦﴾

وارث بنا دیں۔ ۶۔ اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں۔ اور فرعون اور ہامان اور ان کی فوجوں کو ان کے ذریعہ وہی دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔

فرعون کو یہاں فساد فی الارض کا مجرم بتایا گیا ہے۔ فرعون کا فساد یہ تھا کہ اس نے مصر کی دو قوموں میں امتیاز کیا۔ قبطی قوم جو اس کی اپنی قوم تھی، اس کو اس نے ہر قسم کے مواقع دئے، اور بنی اسرائیل کو نہ صرف مواقع سے محروم کیا بلکہ ان کے نومولود لڑکوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ تاکہ دھیرے دھیرے ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے۔ فرعون کا یہ عمل فطرت کے نظام میں مداخلت تھا۔ خدا کے قانون میں، نظام فطرت سے مطابقت کا نام اصلاح ہے اور نظام فطرت میں مداخلت کا نام فساد۔

عزت اور بے عزتی کا فیصلہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ خدا نے اس کے برعکس فیصلہ کیا جو فرعون نے فیصلہ کیا تھا۔ خدا نے فیصلہ کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو عزت اور اقتدار دے اور فرعون کو اس کی فوجوں کے ساتھ ہلاک کر دے۔ حضرت موسیٰ کے ذریعہ اتمام حجت کے بعد فرعون نے اپنے کو مستحق عذاب ثابت کر دیا۔ چنانچہ خدا نے اس کو سمندر میں ڈبا کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اور بنی اسرائیل کو مصر سے لے جا کر شام و فلسطین کا حکمراں بنا دیا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٧﴾ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۗ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ﴿٨﴾ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۗ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾

۷۔ اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ اس کو دودھ پلاؤ۔ پھر جب تم کو اس کی بابت ڈر ہو تو اس کو دریا میں ڈال دو۔ اور نہ اندیشہ کرو اور نہ غمگین ہو۔ ہم اس کو تمھارے پاس لوٹا کر لائیں گے۔ اور اس کو پیغمبروں میں سے بنائیں گے۔ ۸۔ پھر اس کو فرعون کے گھر والوں نے اٹھا لیا، تاکہ وہ ان کے لیے دشمن ہو اور غم کا باعث بنے۔ بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر خطاکار تھے۔ ۹۔ اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ آنکھ کی ٹھنڈک ہے، میرے لیے اور تمھارے لیے۔ اس کو قتل نہ کرو۔ کیا عجب کہ یہ ہم کو نفع دے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں۔ اور وہ سمجھتے نہ تھے۔

حضرت موسیٰ کی پیدائش کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے لڑکے ہلاک کیے جا رہے تھے۔ اس بنا پر حضرت

موسیٰ کی والدہ پریشان ہوئیں۔ اس وقت غالباً خواب کے ذریعہ آپ کی والدہ کو یہ تدبیر بتائی گئی کہ وہ آپ کو ایک چھوٹی کشتی میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیں۔ انھوں نے تین ماہ بعد ایسا ہی کیا۔ یہ چھوٹی کشتی بہتے ہوئے فرعون کے محل کے سامنے پہنچی۔ فرعون کی بیوی (آسیہ) ایک نیک بخت خاتون تھیں۔ ان کو حضرت موسیٰ کے معصوم اور پرکشش حلیہ کو دیکھ کر رحم آ گیا۔ چنانچہ ان کے مشورہ پر حضرت موسیٰ فرعون کے محل میں رکھ لیے گئے۔

روایات میں آتا ہے کہ فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ بچہ آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ فرعون نے جواب دیا کہ تمھارے لیے ہے، نہ کہ میرے لیے (لَکِ لا لِی) تاریخ الطبری، جلد 1، صفحہ 390۔ یہ بات غالباً فرعون نے مرد اور عورت کے فرق پر کہی ہوگی مگر بعد کو وہ عین واقعہ بن گئی۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٠ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝١١ۙ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝١٢ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝١٣ع وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝١٤

ع ۱۳ (منزل ۵)

۱۰۔ اور موسیٰ کی ماں کا دل بے چین ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ اس کو ظاہر کر دے اگر ہم اس کے دل کو نہ سنبھالتے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے رہے۔ ۱۱۔ اور اس نے اس کی بہن سے کہا کہ تو اس کے پیچھے پیچھے جا۔ تو وہ اس کو اجنبی بن کر دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو خبر نہیں ہوئی۔ ۱۲۔ اور ہم نے پہلے ہی موسیٰ سے دائیوں کو روک رکھا تھا۔ تو لڑکی نے کہا، کیا میں تم کو ایسے گھر والوں کا پتہ دوں جو اس کو تمھارے لیے پالیں اور وہ اس کی خیر خواہی کریں۔ ۱۳۔ پس ہم نے اس کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اور وہ غمگین نہ ہو۔ اور تاکہ وہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۱۴۔ اور جب موسیٰ اپنی جوانی کو پہنچا اور پورا ہو گیا تو ہم نے اس کو حکمت اور علم عطا کیا اور ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں نیکی کرنے والوں کو۔

حضرت موسیٰ کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے تمام تر اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ حالاں کہ واقعہ کی تفصیلات بتاتی ہیں کہ پورا واقعہ اسباب کے تحت پیش آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ امتحان کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کا ظہور عام طور پر اسباب کے انداز میں ہوتا ہے، نہ کہ طلسمات اور خوارق کے انداز میں۔

حضرت موسیٰ بے بسی کی حالت میں دریا کی موجوں میں ڈالے گئے مگر وہ پوری طرح محفوظ رہ کر ساحل پر پہنچ گئے۔ بادشاہ وقت نے ان کے قتل کا منصوبہ بنایا مگر اللہ نے اسی بادشاہ کے ذریعہ آپ کی پرورش کا انتظام کیا۔ وہ ایک معمولی خاندان میں پیدا ہوئے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو شاہی محل سے وابستہ کرکے اعلیٰ ترین سطح پر ان کے لیے وقت کے علوم و آداب سیکھنے کا انتظام کیا۔ یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت لامحدود ہے۔ کوئی نہیں جو اس کے منصوبہ کو ظہور میں آنے سے روک سکے۔

وَدَخَلَ الۡمَدِيۡنَةَ عَلٰى حِيۡنِ غَفۡلَةٍ مِّنۡ اَهۡلِهَا فَوَجَدَ فِيۡهَا رَجُلَيۡنِ يَقۡتَتِلٰنِ هٰذَا مِنۡ شِيۡعَتِهٖ وَهٰذَا مِنۡ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسۡتَغَاثَهُ الَّذِىۡ مِنۡ شِيۡعَتِهٖ عَلَى الَّذِىۡ مِنۡ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوۡسٰى فَقَضٰى عَلَيۡهِ قَالَ هٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِىۡ فَاغۡفِرۡ لِىۡ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَىَّ فَلَنۡ اَكُوۡنَ ظَهِيۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۵۔ اور شہر میں وہ ایسے وقت داخل ہوا جب کہ شہر والے غفلت میں تھے تو اس نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا دشمنوں میں سے تھا۔ تو جو اس کی قوم میں سے تھا اس نے اس کے خلاف مدد طلب کی جو اس کے دشمنوں میں سے تھا۔ پس موسیٰ نے اس کو گھونسہ مارا۔ پھر اس کا کام تمام کردیا۔ موسیٰ نے کہا کہ یہ شیطان کے کام سے ہے۔ بے شک وہ دشمن ہے، کھلا گمراہ کرنے والا۔ ۱۶۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب، میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ پس تو مجھ کو بخش دے تو خدا نے اس کو بخش دیا۔ بے شک وہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ۱۷۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب، جیسا تو نے میرے اوپر فضل کیا تو میں کبھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔

پیغمبری ملنے سے پہلے کا واقعہ ہے، حضرت موسیٰ مصر کے دار السلطنت میں تھے۔ ایک روز انھوں نے دیکھا کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی لڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ کو اپنا ہم قوم سمجھ کر پکارا کہ ظالم قبطی کے مقابلہ میں میری مدد کیجیے۔ حضرت موسیٰ نے دونوں کو الگ کرنا چاہا تو قبطی آپ سے الجھ گیا۔ آپ نے دفاع کے طور پر اس کو ایک گھونسا مارا۔ وہ اتفاقاً ایسی جگہ لگا کہ قبطی مر گیا۔

قبطی قوم اس وقت بنی اسرائیل پر سخت زیادتیاں کررہی تھیں۔ ایسی حالت میں حضرت موسیٰ اگر اس واقعہ کو قومی نقطۂ نظر سے دیکھتے تو وہ اس کو مجاہدانہ کارنامہ قرار دے کر فخر کرتے۔ مگر انھیں قبطی کی موت پر شدید افسوس ہوا۔ وہ فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اللہ سے معافی مانگنے لگے۔

’’اب میں کسی مجرم کی حمایت نہیں کروں گا‘‘— اس کا مطلب یہ ہے کہ اب میں بلاتحقیق کسی کی حمایت نہیں کروں گا۔ ایک شخص کا بظاہر مظلوم فرقہ سے تعلق رکھنا یا کسی کو ظالم بتا کر اس کے خلاف مدد مانگنا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ فی الواقع بھی دوسرا شخص ظالم ہے، اور فریاد کرنے والا مظلوم۔ اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اصل معاملہ کی تحقیق کی جائے اور صرف اس وقت کسی کی حمایت کی جائے جب کہ غیر جانب دارانہ تحقیق میں اس کا مظلوم ہونا ثابت ہو جائے۔

فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا
الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ
قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٨﴾ فَلَمَّآ
اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ
لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا
قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ
تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ
تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿١٩﴾ وَجَآءَ رَجُلٌ
مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۫ قَالَ يٰمُوْسٰٓى
اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ
اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢٠﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا
خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢١﴾ ع

۱۸۔ پھر صبح کو وہ شہر میں اٹھا ڈرتا ہوا، خبر لیتا ہوا۔ تو دیکھتا ہے کہ وہی شخص جس نے کل مدد مانگی تھی وہی آج پھر اس کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے اس سے کہا، بے شک تم صریح گمراہ ہو۔ ۱۹۔ پھر جب اس نے چاہا کہ اس کو پکڑے جو ان دونوں کا دشمن تھا تو اس نے کہا کہ اے موسیٰ، کیا تم مجھ کو قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح تم نے کل ایک شخص کو قتل کیا۔ تم تو زمین میں سرکش بن کر رہنا چاہتے ہو۔ تم صلح کرنے والوں میں سے بننا نہیں چاہتے۔ ۲۰۔ اور ایک شخص شہر کے کنارے سے دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا اے موسیٰ، دربار والے مشورہ کر رہے ہیں کہ وہ تم کو مار ڈالیں۔ پس تم نکل جاؤ، میں تمھارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ ۲۱۔ پھر وہ وہاں سے نکلا ڈرتا ہوا، خبر لیتا ہوا۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب، مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے۔

اگلے دن وہی اسرائیلی دوبارہ ایک قبطی سے لڑ رہا تھا۔ یہ اس بات کا واضح قرینہ تھا کہ یہ ایک جھگڑالو قسم کا آدمی ہے اور روزانہ کسی نہ کسی سے لڑتا رہتا ہے۔ چنانچہ اپنی قوم کا فرد ہونے کے باوجود حضرت موسیٰ نے اس کو مجرم ٹھہرایا۔ مذکورہ اسرائیلی کا مجرم ہونا اس واقعہ سے مزید ثابت ہو گیا کہ اس اسرائیلی نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ آج اس کی مدد نہیں کر رہے ہیں اور اس کی امید کے خلاف خود اسی کو برا کہہ رہے ہیں تو وہ کمینہ پن پر اتر آیا۔ اس نے غیر ذمہ دارانہ طور پر کل کے قتل کا راز کھول دیا جو ابھی تک کسی کے علم میں نہ آیا تھا۔

اسرائیلی کی زبان سے قاتل کا نام نکلا تو بہت سے لوگوں نے سن لیا۔ چند دن میں اس کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ یہاں تک کہ حکمرانوں میں موسیٰ کے قتل کے مشورے ہونے لگے۔ ایک نیک بخت آدمی کو اس کا پتہ چل گیا۔ وہ خفیہ طور پر حضرت موسیٰ سے ملا اور کہا کہ اس وقت یہی بہتر ہے کہ آپ اس جگہ کو چھوڑ دیں چنانچہ آپ مصر سے نکل کر مَدْیَن کی طرف روانہ ہو گئے۔ مدین خلیج عَقَبہ کے مغربی ساحل پر تھا اور فرعون کی سلطنت کے حدود سے باہر تھا۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿٢٢﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۫ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿٢٣﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿٢٤﴾

۲۲۔ اور جب اس نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا، امید ہے کہ میرا رب مجھ کو سیدھا راستہ دکھادے۔ ۲۳۔ اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچا تو وہاں اُس نے لوگوں کی ایک جماعت کو پانی پلاتے ہوئے پایا۔ اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بکریوں کو روکے ہوئے کھڑی ہیں۔ موسیٰ نے ان سے پوچھا کہ تمھارا کیا ماجرا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم پانی نہیں پلاتے جب تک چرواہے اپنی بکریاں ہٹا نہ لیں۔ اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ ۲۴۔ تو اس نے ان کے جانوروں کو پانی پلایا۔ پھر سائے کی طرف ہٹ گیا۔ پھر کہا کہ اے میرے رب، تو جو چیز میری طرف خیر میں سے اتارے، میں اس کا محتاج ہوں۔

حضرت موسیٰ کا یہ سفر گویا نامعلوم منزل کی طرف سفر تھا۔ ایسے حالات میں مومن کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ پوری طرح آپ کے اوپر طاری تھی۔ آپ دعاؤں کے سایہ میں اپنا قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ تقریباً دس دن کے سفر کے بعد مدین پہنچے۔ گمان غالب ہے کہ آپ بھوکے بھی ہوں گے۔

حضرت موسیٰ نے کمزوروں کی حمایت کے جذبہ کے تحت مدین کی دونوں لڑکیوں کی مدد کی۔ یہ واقعہ ان کے لیے لڑکیوں کے والد تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ یہ بزرگ مدیان بن ابراہیم کی اولاد سے تھے اور حضرت موسیٰ اسحاق بن ابراہیم کی اولاد سے۔ اس اعتبار سے دونوں میں نسلی قربت بھی تھی۔

اس وقت حضرت موسیٰ کی زبان سے یہ دعا نکلی: رَبِّ إِنِّي لِمَآ أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ۔ یہ دعا بتاتی ہے کہ ایسے وقت مومن کا حال کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاملہ کو تمام تر اللہ پر ڈال دیتا ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ بندہ کو جو کچھ ملتا ہے خدا سے ملتا ہے، اور خیر وہی ہے جو اس کو خدا کی طرف سے ملے۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ؗ
قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا
سَقَيْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ
الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا
يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ؗ اِنَّ خَيْرَ مَنِ
اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنِّيْۤ
اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ
عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ
عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ
عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ
اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾ ع ۳

۲۵۔ پھر ان دونوں میں سے ایک لڑکی آئی شرم سے چلتی ہوئی۔ اس نے کہا کہ میرا باپ آپ کو بلا رہا ہے کہ آپ نے ہماری خاطر جو پانی پلایا اس کا آپ کو بدلہ دے۔ پھر جب وہ اس کے پاس آیا اور اس سے سارا قصہ بیان کیا تو اس نے کہا کہ اندیشہ نہ کرو۔ تم نے ظالموں سے نجات پائی۔ ۲۶۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ اس کو ملازم رکھ لیجیے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔ ۲۷۔ اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے ساتھ کردوں۔ اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو۔ پھر اگر تم دس سال پورے کردو تو وہ تمھاری طرف سے ہے۔ اور میں تم پر مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ تم مجھ کو بھلا آدمی پاؤ گے۔ ۲۸۔ موسیٰ نے کہا کہ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کروں تو مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا۔ اور اللہ ہمارے قول و قرار پر گواہ ہے۔

لڑکیاں اس دن معمول سے کچھ پہلے گھر پہنچ گئیں والد نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ آج ایک مسافر نے ہماری بکریوں کو پہلے ہی پانی پلادیا۔ لڑکیوں کے والد نے کہا کہ پھر تم اس مسافر کو گھر کیوں نہ لائیں کہ وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے۔ چنانچہ ایک لڑکی دوبارہ کنویں پر گئی اور حضرت موسیٰ کو بلا کر لے آئی۔

چند دن کے تجربے نے بتایا کہ حضرت موسیٰ محنتی بھی ہیں اور امانت دار بھی۔ چنانچہ مذکورہ بزرگ نے اپنی بیٹی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کو اپنے یہاں مستقل خدمت کے لیے رکھ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں صفات، امانت اور قوت (honesty & hard working) تمام ضروری صفات کی جامع ہیں۔ آدمی کے انتخاب کے لیے معیار مقرر کرنا ہو تو ان دو لفظوں سے بہتر کوئی معیار نہیں ہوسکتا۔ بعد کو مذکورہ بزرگ نے اپنی ایک لڑکی کی شادی بھی حضرت موسیٰ سے کردی۔ تاہم چوں کہ اس وقت انھیں اپنے گھر اور جائداد کی دیکھ بھال کے لیے ایک مرد کی شدید ضرورت تھی، انھوں نے حضرت موسیٰ

کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ آٹھ سال یا دس سال تک ان کے یہاں قیام کریں۔ اس کے بعد وہ جہاں جانا چاہیں جاسکتے ہیں۔

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾

۲۹۔ پھر جب موسیٰ نے مدت پوری کردی اور وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے طور کی طرف سے ایک آگ دیکھی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا آگ کا انگارہ تاکہ تم تاپو۔ ۳۰۔ پھر جب وہ وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے سے برکت والے خطہ میں درخت سے پکارا گیا کہ اے موسیٰ، میں اللہ ہوں، سارے جہان کا مالک۔ ۳۱۔ اور یہ کہ تم اپنا عصا ڈال دو۔ تو جب اس نے اس کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا کہ گویا سانپ ہو، تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔ اے موسیٰ، آگے آؤ اور نہ ڈرو۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ ۳۲۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو، وہ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی مرض کے، اور خوف کے واسطے اپنا بازو اپنی طرف ملالو۔ پس یہ تمھارے رب کی طرف سے دو سندیں ہیں فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جانے کے لیے۔ بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔

حضرت موسیٰ غالباً دس سال مدین میں رہے۔ اس مدت میں سابقہ فرعون مر گیا اور خاندانِ فرعون کا دوسرا شخص مصر کے تخت پر بیٹھا۔ اب آپ اپنی بیوی (اور تورات کے مطابق دو بچوں) کے ساتھ دوبارہ مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں آپ پر طور کا تجربہ گزرا۔

جس خدا نے سینا کے پہاڑ پر ایک انسان سے براہِ راست کلام کیا، وہ خدا تمام انسانوں کو بھی براہِ راست آواز دے کر اپنی مرضی سے باخبر کرسکتا ہے۔ مگر یہ خدا کا طریقہ نہیں۔ براہِ راست خطاب کا مطلب پردہ کو ہٹا دینا ہے، جب کہ امتحان کی مصلحت چاہتی ہے کہ پردہ لازماً باقی رہے۔ چنانچہ خدا اپنا براہِ راست کلام صرف کسی منتخب انسان کے اوپر اتارتا ہے اور بقیہ لوگوں کو اس کے ذریعے سے بالواسطہ طور پر اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ؗ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

۳۳۔ موسیٰ نے کہا اے میرے رب، میں نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کیا ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ ۳۴۔ اور میرا بھائی ہارون وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے زبان میں، پس تو اس کو میرے ساتھ مددگار کی حیثیت سے بھیج کہ وہ میری تائید کرے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلادیں گے۔ ۳۵۔ فرمایا کہ ہم تمھارے بھائی کے ذریعہ تمھارے بازو کو مضبوط کردیں گے اور ہم تم دونوں کو غلبہ دیں گے تو وہ تم لوگوں تک نہ پہنچ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے ساتھ، تم دونوں اور تمھاری پیروی کرنے والے ہی غالب رہیں گے۔

خدا جب کسی کو اپنی دعوت کے کام پر مامور کرتا ہے تو لازمی طور پر اس کو وہ تمام اسباب بھی دیتا ہے جو کارِ دعوت کی مؤثر ادائیگی کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کو ان کے حالات کے لحاظ سے متعدد چیزیں دی گئیں۔ آپ کو ماموریت کی سند کے طور پر خارقِ عادت معجزے عطا کیے گئے۔ آپ کو مددگار دیا گیا جو اعلان حق کے کام میں آپ کا معاون ہو۔ آپ کو شخصی ہیبت دی گئی تاکہ فرعون کی قوم آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرے۔ خدا کی طرف سے یہ مقدر کردیا گیا کہ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھیوں (بنی اسرائیل) ہی کو آخری غلبہ حاصل ہو۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۶﴾ وَ قَالَ مُوْسٰی رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی مِنْ عِنْدِهٖ وَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ قَالَ فِرْعَوْنُ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ ۚ فَاَوْقِدْ لِیْ

۳۶۔ پھر جب موسیٰ ان لوگوں کے پاس ہماری واضح نشانیوں کے ساتھ پہنچا، انھوں نے کہا کہ یہ محض گھڑا ہوا جادو ہے۔ اور یہ بات ہم نے اپنے اگلے باپ دادا میں نہیں سنی۔ ۳۷۔ اور موسیٰ نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے اس کو جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور جس کو آخرت کا گھر ملے گا۔ بے شک ظالم فلاح نہ پائیں گے۔ ۳۸۔ اور فرعون نے کہا کہ اے درباروالو، میں تمھارے لیے اپنے سوا کسی معبود کو

يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ
اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ
الْكٰذِبِيْنَ ۝٣٨

نہیں جانتا تو اے ہامان، میرے لیے مٹی کو آگ دے، پھر میرے لیے ایک اونچی عمارت بنا تاکہ میں موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھوں، اور میں تو اس کو ایک جھوٹا آدمی سمجھتا ہوں۔

ایک شخص اپنے کو بڑا سمجھتا ہو، اس کے سامنے ایک بظاہر معمولی آدمی آئے اور اس پر براہِ راست تنقید کرے تو وہ فوراً بپھر اٹھتا ہے۔ وہ اس کا استہزا کرتا ہے اور اس کا مذاق اڑانے کے لیے طرح طرح کی باتیں کرتا ہے۔ یہی اس وقت فرعون نے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں کیا۔

''میں اپنے سوا کوئی معبود نہیں جانتا'' — کوئی سنجیدہ جملہ نہیں ہے۔ ان الفاظ سے فرعون کا مقصود بیانِ حقیقت نہیں بلکہ تحقیر موسیٰ ہے۔ اسی طرح فرعون نے جب اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ پختہ اینٹ تیار کرکے ایک اونچی عمارت بناؤ تاکہ میں آسمان میں جھانک کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں، تو یہ کوئی سنجیدہ حکم نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ واقعۃً وہ اپنے وزیر کے نام ایک تعمیری فرمان جاری کر رہا ہے۔ یہ صرف حضرت موسیٰ کا استہزا تھا، نہ کہ فی الواقع تعمیر مکان کا کوئی حکم۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ
الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝٣٩
فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝٤٠ وَجَعَلْنٰهُمْ
اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا
يُنْصَرُوْنَ ۝٤١ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا
ع ۴ لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ۝٤٢ وَ
لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ
اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَ
هُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝٤٣

۳۹۔ اور اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ کیا اور انھوں نے سمجھا کہ ان کو ہماری طرف لوٹ کر آنا نہیں ہے۔ ۴۰۔ تو ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا۔ پھر ان کو سمندر میں پھینک دیا۔ تو دیکھو کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔ ۴۱۔ اور ہم نے ان کو سردار بنایا کہ وہ آگ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور قیامت کے دن ان کو مدد نہیں ملے گی۔ ۴۲۔ اور ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگادی۔ اور قیامت کے دن وہ بدحال لوگوں میں سے ہوں گے۔ ۴۳۔ اور ہم نے اگلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب دی۔ لوگوں کے لیے بصیرت کا سامان، اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

حضرت موسیٰ کی تحریک فرد انسانی میں ربانی انقلاب برپا کرنے کی تحریک تھی۔ آپ کا مدعا یہ تھا کہ آدمی

اللہ سے ڈرے اور اللہ کا بندہ بن کر دنیا میں زندگی گزارے۔ آپ کا یہی پیغام دوسرے افراد کے لیے بھی تھا اور یہی اس فرد کے لیے بھی جو ملک کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

یہ ایک عام بات ہے کہ اختیار و اقتدار پا کر آدمی گھمنڈ کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی فرعون کا حال بھی تھا۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو ڈرایا کہ اگر تم متکبر بن کر دنیا میں رہو گے تو خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے۔ مگر فرعون نے نصیحت قبول نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ہلاک کر دیا گیا۔

فرعون قدیم مشرکانہ تہذیب کا امام تھا۔ مشرکانہ تہذیب میں فرعون کو اونچا مقام حاصل تھا۔ مگر مشرکانہ تہذیب نہ صرف مصر سے بلکہ ساری دنیا سے ختم ہو گئی۔ اب دنیا کی آبادی میں زیادہ تر یا تو مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی۔ اور یہ سب کے سب متفقہ طور پر فرعون کو لعنت زدہ سمجھتے ہیں۔ اب دنیا میں کوئی بھی فرعون کی عظمت کو ماننے والا نہیں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى
مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَ
لٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ
وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَمَا
كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً
مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ
مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٤٦﴾

۴۴۔ اور تم پہاڑ کے مغربی جانب موجود نہ تھے جب کہ ہم نے موسیٰ کو احکام دئے اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے۔ ۴۵۔ لیکن ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں پھر ان پر بہت زمانہ گزر گیا۔ اور تم مدین والوں میں بھی نہ رہتے تھے کہ ان کو ہماری آیتیں سناتے۔ مگر ہم ہیں پیغمبر بھیجنے والے۔ ۴۶۔ اور تم طور کے کنارے نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو پکارا، لیکن یہ تمھارے رب کا انعام ہے، تاکہ تم ایک ایسی قوم کو ڈراؤ جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں حضرت موسیٰ کے واقعات اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کر رہے تھے جیسے کہ آپ وہیں موقع پر کھڑے ہوں اور سب کچھ دیکھ اور سن رہے ہوں۔ حالاں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ حضرت موسیٰ کے دو ہزار سال بعد مکہ میں پیدا ہوئے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل تھی کہ قرآن کا کلام خدا کا کلام ہے، کیوں کہ کوئی انسان اس طرح کے بیان پر قادر نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آج کل کی طرح کتابیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس وقت حضرت موسیٰ کے واقعات کا ذکر یہود کی غیر عربی کتابوں میں تھا جن کے صرف چند نسخے یہودی عبادت خانوں میں محفوظ تھے اور یقینی

طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دسترس سے باہر تھے۔ مزید یہ کہ قرآن کے بیانات اور یہودی کتابوں کے بیانات میں بہت سے نہایت بامعنی فرق ہیں اور قرینہ بتاتا ہے کہ قرآن کا بیان ہی زیادہ صحیح ہے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ کے ہاتھ قبطی کی موت قرآن کے بیان کے مطابق بلا قصد ہوئی۔ جب کہ بائبل موسیٰ کے بارے میں کہتی ہے:

’’پھر اس نے اِدھر اُدھر نگاہ کی اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اُس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا۔‘‘ (خروج، 2:12)

کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت موسیٰ جیسی مقدس شخصیت سے قرآن کا بیان مطابقت رکھتا ہے، نہ کہ تورات کا بیان۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اس پر قادر ہوئے کہ کسی ظاہری وسیلہ کے بغیر حضرت موسیٰ کے واقعات اس قدر صحت کے ساتھ قرآن میں پیش کر سکیں۔ اس کا کوئی بھی جواب اس کے سوا نہیں ہوسکتا کہ خدائے عالم الغیب نے یہ باتیں آپ کے اوپر بذریعہ وحی نازل فرمائیں۔

وَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ مُّصِیْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ فَیَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُوْتِیَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی ؕ اَوَ لَمْ یَكْفُرُوْا بِمَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَ قَالُوْۤا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

۴۷۔ اور (اس لیے بھی) کہ ایسا نہ ہو کہ جب ان کے اعمال کے سبب سے کوئی آفت آپڑے تو وہ کہنے لگیں کہ اے ہمارے رب، تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور ہم ایمان والوں میں سے ہوتے۔

۴۸۔ پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو انھوں نے کہا کہ کیوں نہ اس کو ویسا ملا جیسا کہ موسیٰ کو ملا تھا، کیا لوگوں نے اس کا انکار نہیں کیا جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا، انھوں نے کہا کہ دونوں جادوگر ہیں ایک دوسرے کے مددگار، اور انھوں نے کہا کہ ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قدیم مصریوں کے سامنے اپنا پیغام رسالت پیش کیا تو اسی کے ساتھ آپ نے معجزے بھی دکھائے۔ مگر ان لوگوں نے نہیں مانا اور کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم عرب میں دلائل کی بنیاد پر حق کی دعوت پیش کی تو انھوں نے کہا کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو موسیٰ جیسے معجزے کیوں نہیں دکھاتے۔

یہ سب غیر سنجیدہ ذہن سے نکلی ہوئی باتیں ہیں۔ موجودہ دنیا میں حق کو ماننے کے لیے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ ہو۔ جو شخص حق اور ناحق کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو اس کو کوئی بھی چیز حق کے اعتراف پر مجبور نہیں کر سکتی۔ وہ ہر بار نئے عذر تلاش کر لے گا۔ وہ ہر بات کے جواب میں نئے الفاظ پالے گا۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى
مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٤٩ فَاِنْ لَّمْ
يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ
اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ
بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي
ع ۵ ۸ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٥٠ۧ وَ لَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ
الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝٥١ؕ

۴۹۔ کہو کہ تم اللہ کے پاس سے کوئی کتاب لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں سے بہتر ہو، میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو۔ ۵۰۔ پس اگر یہ لوگ تمھارا کہا نہ کرسکیں تو جان لو کہ وہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ۵۱۔ اور ہم نے ان لوگوں کے لیے پے در پے اپنا کلام بھیجا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

حق کے پیغام کو ماننے یا نہ ماننے کا جو اصل معیار ہے وہ یہ ہے کہ پیغام کو خود اس کے جوہر ذاتی کی بنیاد پر جانچا جائے۔ اگر وہ اپنی ذات میں برتر صداقت ہونا ثابت کر رہا ہو تو یہی کافی ہے کہ اس کو مان لیا جائے۔ اس کے بعد اس کو ماننے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

صداقت کا جواب صداقت ہے۔ اگر آدمی صداقت کا انکار کرے اور اس کے جواب میں دوسری اعلیٰ تر صداقت نہ پیش کر سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواہش پرستی کی وجہ سے اس کا انکار کر رہا ہے۔ جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ وہ صداقت کو معقولیت کے ذریعہ رد نہ کرسکیں اور پھر بھی خواہش اور تعصب کے زیر اثر اس کو نہ مانیں وہ بدترین گمراہ لوگ ہیں۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں ظالموں میں شمار ہوں گے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ
النصف يُؤْمِنُوْنَ ۝٥٢ وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا
بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ
مُسْلِمِيْنَ ۝٥٣ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ
مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ
السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝٥٤ وَ اِذَا
سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ

۵۲۔ جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی ہے وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔ ۵۳۔ اور جب وہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے اس کو ماننے والے ہیں۔ ۵۴۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کو ان کا اجر دہرا دیا جائے گا، اس پر کہ انھوں نے صبر کیا۔ اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ ۵۵۔

اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ ۡ لَا نَبۡتَغِى الۡجٰهِلِيۡنَ ﴿۵۵﴾ اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۵۶﴾

اور جب وہ لغوبات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ تم کو سلام، ہم بے سمجھ لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ ۵۶۔ تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور وہی خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں۔

ماننے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ حق ہے، اس لیے ماننا۔ دوسری یہ کہ اپنے گروہ کا ہے اس لیے ماننا۔ ان دونوں میں صرف پہلی قسم کے انسان ہیں جن کو ہدایت کی توفیق ملتی ہے۔ اور اسی قسم کے لوگ تھے جو دور اوّل میں قرآن اور پیغمبر پر ایمان لائے۔

عیسائیوں اور یہودیوں میں ایک تعداد تھی جو قرآن کو سنتے ہی اس کی مومن بن گئی۔ یہ وہ لوگ تھے جو سابق پیغمبروں کی حقیقی تعلیمات پر قائم تھے۔ اس لیے ان کو پیغمبر آخر الزماں کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ انھوں نے نئے پیغمبر کو بھی اسی طرح پہچان لیا جس طرح انھوں نے پچھلے پیغمبروں کو پہچانا تھا۔ مگر اپنے آپ کو اس قابل رکھنے کے لیے انھیں ''صبر'' کے مرحلوں سے گزرنا پڑا۔

انھوں نے اپنے ذہن کو ان اثرات سے پاک رکھا جس کے بعد آدمی حق کی معرفت کے لیے نااہل ہوجاتا ہے۔ یہ وہ تاریخی اور سماجی عوامل ہیں جو آدمی کے ذہن میں خدائی دین کو گروہی دین بنا دیتے ہیں۔ آدمی کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ وہ صرف اس دین کو پہچان سکے جو اس کے اپنے گروہ سے ملا ہو۔ وہ اس دین کو پہچاننے میں ناکام رہے جو اس کے اپنے گروہ کے باہر سے اس کے پاس آئے۔ ان اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے آدمی کو زبردست نفسیاتی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس لیے اس کو صبر سے تعبیر فرمایا۔ ایسے لوگوں کو دہرا اجر دیا جائے گا۔ ایک ان کی اس قربانی کا کہ انھوں نے اپنے سابقہ ایمان کو گروہی ایمان بننے نہیں دیا۔ اور دوسرے ان کی جوہر شناسی کا کہ ان کے سامنے نیا پیغمبر آیا تو انھوں نے اس کو پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہو گئے۔

جن لوگوں کے اندر حق شناسی کا مادہ ہو انھیں کے اندر اعلیٰ اخلاقی اوصاف پرورش پاتے ہیں۔ لوگ ان کے ساتھ برائی کریں تب بھی وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کی مدد کرتے ہیں تاکہ خدا ان کی مدد کرے۔ ان کا طریقہ اعراض کا طریقہ ہوتا ہے، نہ کہ لوگوں سے الجھنے کا طریقہ۔

وَقَالُوۡۤا اِنۡ نَّتَّبِعِ الۡهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفۡ مِنۡ اَرۡضِنَا ؕ اَوَلَمۡ نُمَكِّنۡ لَّهُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا

۵۷۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم تمھارے ساتھ ہو کر اس ہدایت پر چلنے لگیں تو ہم اپنی زمین سے اچک

يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

لیے جائیں گے کیا ہم نے ان کو امن و امان والے حرم میں جگہ نہیں دی۔ جہاں ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر، لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

جس نظام سے آدمی کے فائدے وابستہ ہو جائیں وہ سمجھنے لگتا ہے کہ مجھ کو جو کچھ مل رہا ہے وہ اسی نظام کی بدولت مل رہا ہے۔ آدمی صرف حال کے فائدوں کو جانتا ہے، وہ مستقبل کے فائدوں کو نہیں جانتا۔

یہی معاملہ قدیم مکہ کے مشرکوں کا تھا۔ انھوں نے کعبہ میں تمام عرب قبیلوں کے بت رکھ دئے تھے۔ اس طرح انھیں پورے ملک کی مذہبی سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ اسی طرح ان بتوں کے نام پر جو نذرانے آتے تھے وہ بھی ان کی معاش کا خاص ذریعہ تھے۔

مگر یہ صرف ان کی تنگ نظری تھی۔ خدا کا رسول انھیں ایک ایسے دین کی طرف بلا رہا تھا جو انھیں عالم کی امامت دینے والا تھا، اور وہ ایک ایسے دین کی خاطر اس کو چھوڑ رہے تھے جس کے پاس ملک کے قبیلوں کی معمولی سرداری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

۵۸۔ اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جو اپنے سامانِ معیشت پر نازاں تھیں۔ پس یہ ہیں ان کی بستیاں جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئیں مگر بہت کم، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔ ۵۹۔ اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک ان کی بڑی بستی میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج دے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ہم ہرگز بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر جب کہ وہاں کے لوگ ظالم ہوں۔

دنیا میں کسی کو مادی استحکام حاصل ہو تو وہ بڑائی کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ تاریخ مسلسل یہ سبق دے رہی ہے کہ کسی بھی شخص یا قوم کا مادی استحکام مستقل نہیں۔ جب بھی کسی قوم نے حق کو نظر انداز کیا، ساری عظمت کے باوجود وہ ہلاک کر دی گئی۔

عرب کے جغرافیہ میں اسلام سے پہلے مختلف قومیں ابھریں۔ مثلاً عاد، ثمود، سبا، مدین، قوم لوط وغیرہ۔ ہر ایک کبر میں مبتلا ہو گئی۔ مگر ہر ایک کا کبر زمانہ نے باطل کر دیا۔ اور بالآخر ان کی حیثیت گزری ہوئی کہانی کے سوا

اور کچھ نہ رہی۔ ان قوموں کے کھنڈر چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانی عظمت کی نفی کررہے تھے۔ اس کے باوجود پیغمبر اسلام کے زمانہ میں جن لوگوں کو بڑائی حاصل تھی انھوں نے پیغمبر کو اس طرح جھٹلادیا جیسے کہ ماضی کے واقعات میں ان کے حال کے لیے کوئی نصیحت نہیں۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ
ع ۶ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝٦٠ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ
وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ
مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝٦١

۶۰۔ اور جو چیز بھی تم کو دی گئی ہے تو وہ بس دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی رونق ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ پھر کیا تم سمجھتے نہیں۔ ۶۱۔ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے پھر وہ اس کو پانے والا ہے، کیا وہ اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جس کو ہم نے صرف دنیوی زندگی کا فائدہ دیا ہے، پھر قیامت کے دن وہ حاضر کیے جانے والوں میں سے ہے۔

دنیا میں آدمی کے پاس کتنا ہی زیادہ سازوسامان ہو، بہر حال موت کے وقت وہ آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ موت کے بعد جو چیز آدمی کے ساتھ جاتی ہے وہ اس کے نیک اعمال ہیں، نہ کہ دنیوی عزت اور مادی سازوسامان۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ آدمی چند دن کی کامیابی کے مقابلہ میں ابدی کامیابی کو ترجیح دے۔ وہ دنیا کی تعمیر کے بجائے آخرت کی تعمیر کی فکر کرے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ
الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝٦٢ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ
عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ
اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ
اِلَيْكَ ۡ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ۝٦٣

۶۲۔ اور جس دن خدا ان کو پکارے گا پھر کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم دعوی کرتے تھے۔ ۶۳۔ جن پر بات ثابت ہوچکی ہوگی وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، یہ لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو بہکایا۔ ہم نے ان کو اسی طرح بہکایا جس طرح ہم خود بہکے تھے۔ ہم ان سے براءت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔

یہاں ''شریک'' سے مراد گمراہ لیڈر ہیں۔ یعنی وہ بڑے لوگ جن کی بات لوگوں نے اس طرح مانی جس طرح خدا کی بات ماننی چاہیے۔ قیامت میں جب ان بڑوں کا ساتھ دینے والے لوگ اپنا برا انجام دیکھیں گے تو

ان کا عجیب حال ہوگا۔ وہ پائیں گے کہ جن بڑوں سے وابستہ ہونے پر وہ فخر کرتے تھے، ان بڑوں نے انھیں صرف جہنم تک پہنچایا ہے۔ اس وقت وہ بے زار ہوکر ان سے کہیں گے کہ ہماری بربادی کے ذمہ دار تم ہو۔ ان کے بڑے جواب دیں گے کہ تمھاری اپنی ذات کے سوا کوئی تمھاری بربادی کا ذمہ دار نہیں۔ اگرچہ بظاہر تم ہمارے کہنے پر چلے مگر ہمارا ساتھ تم نے اس لیے دیا کہ ہماری بات تمھاری خواہشات کے مطابق تھی، تم درحقیقت اپنی خواہشات کے پیرو تھے، نہ کہ ہمارے پیرو۔ ہم بھی اپنی خواہشات پر چلے اور تم بھی اپنی خواہشات پر چلے۔ اب دونوں کو ایک ہی انجام بھگتنا ہے۔ ایک دوسرے کو برا کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٦٦﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿٦٧﴾

۶۴۔ اور کہا جائے گا کہ اپنے شریکوں کو بلاؤ تو وہ ان کو پکاریں گے تو وہ ان کو جواب نہ دیں گے۔ اور وہ عذاب کو دیکھیں گے۔ کاش، وہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے۔ ۶۵۔ اور جس دن خدا ان کو پکارے گا اور فرمائے گا کہ تم نے پیغام پہنچانے والوں کو کیا جواب دیا تھا۔ ۶۶۔ پھر اس دن ان کی تمام باتیں گم ہوجائیں گی، تو وہ آپس میں بھی نہ پوچھ سکیں گے۔ ۶۷۔ البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو امید ہے کہ وہ فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔

دنیا میں آدمی جب حق کا انکار کرتا ہے تو وہ کسی بھروسہ پر حق کا انکار کرتا رہے۔ آخرت میں اس سے کہا جائے گا کہ جن کے بھروسہ پر تم نے حق کو نہیں مانا تھا آج ان کو بلاؤ تاکہ وہ تم کو انکار حق کے برے انجام سے بچائیں۔ مگر یہ خدا کے ظہور کا دن ہوگا۔ اور کون ہے جو خدا کے مقابلے میں کسی کی مدد کرسکے۔

دنیا میں آدمی کسی حال میں چپ نہیں ہوتا۔ ہر دلیل کو رد کرنے کے لیے اس کو یہاں الفاظ مل جاتے ہیں۔ مگر یہ سارے الفاظ قیامت میں جھوٹے الفاظ ثابت ہوں گے۔ وہاں آدمی افسوس کرے گا کہ کتنی چھوٹی چیز کی خاطر اس نے کتنی بڑی چیز کو کھودیا۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ

۶۸۔ اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے اور وہ پسند کرتا ہے جس کو چاہے۔ ان کے ہاتھ میں نہیں ہے پسند کرنا۔ اللہ پاک اور برتر ہے اس سے جس کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۶۹۔ اور تیرا رب

صُدُوۡرُهُمۡ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَاۤ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الۡحَمۡدُ فِى الۡاُوۡلٰى وَ
الۡاٰخِرَةِ ۖ وَلَهُ الۡحُكۡمُ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿٧٠﴾

جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۰۔ اور وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کے لیے حمد ہے دنیا میں اور آخرت میں۔ اور اسی کے لیے فیصلہ ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو پیدا کرتا ہے۔ پھر انسانوں میں سے کسی شخص کو وہ کسی خاص کام کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ یہ انتخاب اس کے ذاتی تقدس کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بلکہ خدا کے اپنے فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی شخصیتوں کو مقدس مان کر ان کو خدا کا درجہ دینا سراسر بے بنیاد ہے۔ خدا کی دنیا میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

آدمی حق کا انکار کرنے کے لیے زبان سے کچھ الفاظ بول دیتا ہے۔ مگر اس کے دل میں کچھ اور بات ہوتی ہے۔ وہ ذاتی مصلحتوں کی بنا پر حق کو نہیں مانتا اور الفاظ کے ذریعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ دلیل اور معقولیت کی بنا پر اس کا انکار کر رہا ہے۔ آخرت میں یہ پردہ باقی نہیں رہے گا۔ اس وقت کھلے طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس کے دل میں کچھ اور تھا مگر اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کے لیے وہ کچھ دوسرے الفاظ بولتا رہا۔

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمُ الَّيۡلَ
سَرۡمَدًا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ
يَاۡتِيۡكُمۡ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسۡمَعُوۡنَ ﴿٧١﴾ قُلۡ
اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمُ النَّهَارَ
سَرۡمَدًا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ
يَاۡتِيۡكُمۡ بِلَيۡلٍ تَسۡكُنُوۡنَ فِيۡهِ ؕ اَفَلَا
تُبۡصِرُوۡنَ ﴿٧٢﴾ وَمِنۡ رَّحۡمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيۡلَ
وَالنَّهَارَ لِتَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ
فَضۡلِهٖ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿٧٣﴾

۷۱۔ کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ قیامت کے دن تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے لیے روشنی لے آئے۔ تو کیا تم لوگ سنتے نہیں۔ ۷۲۔ کہو کہ بتاؤ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے لیے رات کو لے آئے جس میں تم سکون حاصل کرتے ہو۔ کیا تم لوگ دیکھتے نہیں۔ ۷۳۔ اور اس نے اپنی رحمت سے تمھارے لیے رات اور دن کو بنایا تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تا کہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر کرو۔

جس زمین پر انسان آباد ہے اس کے بے شمار حیرت ناک پہلوؤں میں سے ایک حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلسل سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ سورج کے گرد اس کی محوری گردش اس طرح ہوتی ہے کہ ہر چوبیس گھنٹے میں اس کا ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اوپر بار بار رات اور دن آتے رہتے ہیں۔ اگر زمین کی

یہ محوری گردش نہ ہوتو کرۂ زمین کے ایک حصہ میں مستقل رات ہوگی اور دوسرے حصہ میں مستقل دن۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موجودہ پُرراحت زمین انسان کے لیے ایک ناقابلِ بیان عذاب خانہ بن جائے گی۔

خلا میں زمین کا اس طرح حد درجہ صحت کے ساتھ مسلسل گردش کرنا اتنا بڑا واقعہ ہے کہ اس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے تمام جن وانس کی طاقتیں بھی ناکافی ہیں۔ قادر مطلق خدا کے سوا کوئی نہیں جو اتنے بڑے واقعہ کو ظہور میں لاسکے۔ ایسی حالت میں یہ کتنی بڑی گمراہی ہے کہ انسان اپنے خوف ومحبت کے جذبات کو ایک خدا کے سوا کسی اور کے ساتھ وابستہ کرے۔

وَ یَوْمَ یُنَادِیْهِمْ فَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَكَآءِیَ
الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَ نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ
اُمَّةٍ شَهِیْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْۤا
اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
ع ۱۵ ۱۰ یَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ ع

۷۴۔ اور جس دن اللہ ان کو پکارے گا پھر کہے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے۔ ۷۵۔ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکال کر لائیں گے۔ پھر لوگوں سے کہیں گے کہ اپنی دلیل لاؤ، تب وہ جان لیں گے کہ حق اللہ کی طرف ہے۔ اور وہ باتیں ان سے گم ہوجائیں گی جو وہ گھڑتے تھے۔

پیغمبر اور پیغمبر کی سچی پیروی کرنے والے داعی قیامت میں خدا کے گواہ بنا کر کھڑے کیے جائیں گے۔ جن قوموں پر انھوں نے خدا کا پیغام پہنچانے کا فرض انجام دیا تھا ان کے بارے میں وہ وہاں بتائیں گے کہ پیغام کو سن کر انھوں نے کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ اس دن ان لوگوں کے تمام بھروسے ختم ہوجائیں گے جنھوں نے غیر اللہ کے اعتماد پر دعوت حق کو نظر انداز کیا تھا۔ اس دن ان کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنی صفائی کرنا چاہیں گے مگر وہ اپنی صفائی کے لیے الفاظ نہ پائیں گے۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى
عَلَیْهِمْ ۪ وَ اٰتَیْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ
لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ ۗ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ
لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ﴿۷۶﴾ وَ
ابْتَغِ فِیْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ
نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ

۷۶۔ قارون، موسیٰ کی قوم میں سے تھا۔ پھر وہ ان کے خلاف سرکش ہوگیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دئے تھے کہ ان کی کنجیاں اٹھانے سے کئی طاقت ور مرد تھک جاتے تھے۔ جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ اتراؤ مت، اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۷۷۔ اور جو کچھ اللہ نے تم کو دیا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو۔ اور دنیا میں سے اپنے حصے کو نہ بھولو۔ اور لوگوں کے

اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾

ساتھ بھلائی کرو جس طرح اللہ نے تمھارے ساتھ بھلائی کی ہے۔ اور زمین میں فساد کے طالب نہ بنو، اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قارون کا نام یہودی کتابوں میں قورح (Korah) آیا ہے۔ وہ بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا۔ مگر وہ اپنی قوم سے کٹ کر فرعون کا وفادار بن گیا۔ اس کی اسے یہ قیمت ملی کہ وہ فرعون کا مقرب بن گیا۔ اس نے اپنی دنیا دارانہ صلاحیت کے ذریعے اتنا کمایا کہ وہ مصر کا سب سے زیادہ دولت مند شخص بن گیا۔ دولت پا کر اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرنا چاہیے تھا۔ مگر دولت نے اس کے اندر فخر کا جذبہ پیدا کیا۔ اپنے معاشی وسائل سے اس کو جو نیکی کمانی چاہیے تھی وہ نیکی اس نے نہیں کمائی۔

زمین میں فساد کرنا کیا ہے۔ اس آیت 77 کے مطابق، زمین میں فساد برپا کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو زیادہ دولت ملے تو وہ اس کو صرف اپنی ذات کے لیے خرچ کرے۔ سمندر میں زمین کا پانی آکر جمع ہوتا ہے تو سمندر پانی کو بھاپ کی شکل میں اڑا کر دوبارہ اس کو پوری زمین پر پھیلا دیتا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں اصلاح کا ایک نمونہ ہے۔ یہی چیز انسان سے اس طرح مطلوب ہے کہ اگر کسی وجہ سے ایک شخص کے پاس زیادہ دولت اکٹھا ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو مختلف طریقوں سے ان لوگوں کی طرف لوٹائے جنھیں معاشی تقسیم میں کم حصہ ملا ہے۔ گویا جمع شدہ دولت کو گردش میں لانا اصلاح ہے اور جمع شدہ دولت کو جمع رکھنا فساد۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ اس نے کہا، یہ مال مجھ کو ایک علم کی بنا پر ملا ہے جو میرے پاس ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں جانا کہ اللہ اس سے پہلے کتنی جماعتوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتی تھیں۔ اور مجرموں سے ان کے گناہ پوچھے نہیں جاتے۔

قارون کا جو کردار یہاں بیان ہوا ہے یہی ہمیشہ صاحبانِ دولت کا کردار رہا ہے۔ دولت مند آدمی سمجھتا ہے کہ اس کو جو کچھ ملا ہے وہ اس کے علم کی بدولت ملا ہے۔ مگر کسی دولت مند کا علم اس کو یہ نہیں بتاتا کہ تم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو دولت ملی مگر ان کی دولت انھیں موت یا ہلاکت سے نہ بچا سکی۔ پھر تم کو وہ کس طرح بچانے والی ثابت ہوگی۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۷۹﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ لَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

۷۹۔ پس وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی پوری آرائش کے ساتھ نکلا۔ جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے انھوں نے کہا، کاش ہم کو بھی وہی ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، بے شک وہ بڑی قسمت والا ہے۔ ۸۰۔ اور جن لوگوں کو علم ملا تھا انھوں نے کہا، تمھارا برا ہو اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ اور یہ انھیں کو ملتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

جس آدمی کے پاس دولت ہو اس کے گرد لازمی طور پر دنیا کی رونق جمع ہو جاتی ہے۔ اس کو دیکھ کر بہت سے نادان لوگ اس کے اوپر رشک کرنے لگتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کو حقیقت کا علم حاصل ہو جائے ان کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ محض چند دن کی رونق ہے اور جو چیز چند روزہ ہو اس کی کوئی قیمت نہیں۔

علمِ حقیقت اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ مگر علمِ حقیقت کا مالک بننے کے لیے صبر کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ یعنی خارجی حالات کا دباؤ قبول نہ کرتے ہوئے اپنا ذہن بنانا۔ ظاہری چیزوں سے غیر متاثر رہ کر سوچنا۔ وقتی کشش کی چیز کو نظر انداز کر کے رائے قائم کرنا۔ یہ بلا شبہ صبر کی مشکل ترین قسم ہے، مگر اسی مشکل ترین امتحان میں پورا اترنے کے بعد آدمی کو وہ چیز ملتی ہے جس کو علم اور حکمت کہا جاتا ہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ ﴿۸۱﴾ وَ اَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَیْكَاَنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۸/۱۱

۸۱۔ پھر ہم نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر اس کے لیے کوئی جماعت نہ اٹھی جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کرتی۔ اور نہ وہ خود ہی اپنے کو بچا سکا۔ ۸۲۔ اور جو لوگ کل اس کے جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ کہنے لگے کہ افسوس، بے شک اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم کو بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس، بے شک انکار کرنے والے فلاح نہیں پائیں گے۔

بائبل کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ نے قارون کے برے اعمال کی وجہ سے اس کے لیے بددعا فرمائی اور وہ اپنے ساتھیوں اور خزانے سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا۔ یہ اللہ کی طرف سے مشاہداتی سطح پر دکھایا گیا کہ خدا پرستی کو چھوڑ کر دولت پرستی اختیار کرنے کا آخری انجام کیا ہوتا ہے۔

دنیا کا رزق دراصل امتحان کا سامان ہے۔ یہ ہر آدمی کو خدا کے فیصلہ کے تحت کم یا زیادہ دیا جاتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ رزق کم ملے تو صبر کرے۔ اور اگر رزق زیادہ ملے تو شکر کرے۔ یہی کسی انسان کے لیے نجات اور کامیابی کا واحد راستہ ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

۸۳۔ یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور آخری انجام ڈرنے والوں کے لیے ہے۔ ۸۴۔ جو شخص نیکی لے کر آئے گا، اس کے لیے اس سے بہتر ہے اور جو شخص برائی لے کر آئے گا تو جو لوگ برائی کرتے ہیں ان کو وہی ملے گا جو انھوں نے کیا۔

جنت کی آبادی میں بسنے کے قابل وہ لوگ ہیں جن کے سینے اپنی بڑائی کے احساس سے خالی ہوں جو خدا کی بڑائی کو اس طرح پائیں کہ اپنی طرف انھیں چھوٹائی کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔

فساد یہ ہے کہ آدمی خدا کی اسکیم سے موافقت نہ کرے۔ وہ خدا کی دنیا میں خدا کی مرضی کے خلاف چلنے لگے۔ جو لوگ کبر سے خالی ہو جائیں وہ لازمی طور پر فساد سے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ اوصاف پیدا ہو جائیں وہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے ابدی باغوں میں بسائے جائیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ

۸۵۔ بے شک جس نے تم پر قرآن کو فرض کیا ہے وہ تم کو ایک اچھے انجام تک پہنچا کر رہے گا۔ کہو کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ ۸۶۔ اور تم کو یہ امید نہ تھی کہ تم پر کتاب اتاری جائے گی، مگر تمھارے رب کی مہربانی سے۔ پس تم منکروں کے مددگار نہ بنو۔ ۸۷۔ اور وہ تم کو اللہ کی

عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

آیتوں سے روک نہ دیں جب کہ وہ تمھاری طرف اتاری جا چکی ہیں۔ اور تم اپنے رب کی طرف بلاؤ اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ ۸۸۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوا اس کی ذات کے۔ فیصلہ اسی کے لیے ہے اور تم لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

پیغمبر کا معاملہ ہر اعتبار سے خدائی معاملہ ہوتا ہے۔ اس کو پیغمبری کسی طلب کے بغیر یک طرفہ طور پر خدا کی طرف سے دی جاتی ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ حق پر قائم ہوتا ہے۔ وہ مامور ہوتا ہے کہ خالص بے آمیز صداقت کا اعلان کرے، خواہ وہ لوگوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ اس کے لیے مقدر ہوتا ہے کہ وہ لازمی طور پر اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچے اور کوئی رکاوٹ اس کے لیے رکاوٹ نہ بننے پائے۔

یہی معاملہ پیغمبر کے بعد پیغمبر کی پیروی میں اٹھنے والے داعی کا ہوتا ہے۔ وہ جس حد تک پیغمبر کی مشابہت کرے گا اسی قدر وہ خدا کے ان وعدوں کا مستحق ہوتا چلا جائے گا جو اس نے اپنے پیغمبروں سے اپنی کتاب میں کیے ہیں۔

۲۹۔ سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ الٓمّٓ۔ ۲۔ کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو جانچا نہ جائے گا۔ ۳۔ اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا ہے جو ان سے پہلے تھے، پس اللہ ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی ضرور معلوم کرے گا۔

آدمی کے مومن و مسلم ہونے کا فیصلہ معمول کے حالات میں کیے جانے والے عمل پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس عمل پر ہوتا ہے جو آدمی غیر معمولی حالات میں کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی حالات وہ غیر معمولی مواقع ہیں جب کہ یہ کھل جاتا ہے کہ آدمی حقیقت میں وہ ہے یا نہیں جس کا دعویٰ وہ اپنے ظاہری عمل سے کر رہا ہے۔ جو لوگ

غیر معمولی حالات میں ایمان واسلام پر قائم رہنے کا ثبوت دیں وہی خدا کے نزدیک حقیقی معنوں میں مومن ومسلم قرار پاتے ہیں۔

جانچ میں پورا اترنا، بالفاظ دیگر، قربانی کی سطح پر ایمان واسلام والا بننا ہے۔ یعنی جب عام لوگ انکار کردیتے ہیں اس وقت تصدیق کرنا۔ جب لوگ شک کرتے ہیں اس وقت یقین کرلینا۔ جب اپنی اَنا کو کچلنے کی قیمت پر مومن بنناہو اس وقت مومن بن جانا۔ جب نہ مان کر کچھ بگڑنے والا نہ ہو اس وقت مان لینا۔ جب ہاتھ روکنے کے تقاضے ہوں اس وقت خرچ کرنا۔ جب فرار کے حالات ہوں اس وقت جمنے کا ثبوت دینا۔ جب اپنے آپ کو بچانے کا وقت ہو اس وقت اپنے آپ کو حوالے کردینا۔ جب سرکشی کا موقع ہو اس وقت سر تسلیم خم کردینا۔ جب سب کچھ لٹا کر ساتھ دینا ہو اس وقت ساتھ دینا۔ ایسے غیر معمولی مواقع پر اندر والا انسان باہر آجاتا ہے۔ اس کے بعد کسی کے لیے یہ موقع نہیں رہتا کہ وہ فرضی الفاظ بول کر اپنے کو وہ ظاہر کرے جو کہ حقیقت میں وہ نہیں ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۷

۴۔ کیا جو لوگ برائیاں کر رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے بچ جائیں گے۔ بہت برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۵۔ جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہے تو اللہ کا وعدہ ضرور آنے والا ہے۔ اور وہ سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔ ۶۔ اور جو شخص محنت کرے تو وہ اپنے ہی لیے محنت کرتا ہے۔ بے شک اللہ جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ ۷۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیا تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کردیں گے اور ان کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے۔

مومن بننا اکثر حالات میں زمانہ کے خلاف چلنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہ اکابر پرستی کے ماحول میں خدا پرست بننا ہے۔ خواہش کو اونچا مقام دینے کے ماحول میں اصول کو اونچا مقام دینا ہے۔ دنیوی مفاد کے لیے جینے کے ماحول میں آخرت کے مفاد کے لیے جینے کا حوصلہ کرنا ہے۔

اس طرح کی زندگی کے لیے سخت مجاہدہ درکار ہے۔ اور اس سخت مجاہدہ پر وہی لوگ قائم رہ سکتے ہیں جو خدا پر کامل یقین رکھتے ہوں۔ جو خدا کی طرف سے ملنے والے انعام ہی کو اپنی امیدوں کا اصل مرکز بنائے ہوئے ہوں۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ ۸ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ۞ ۹

۸۔ اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس کا تجھ کو کوئی علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر۔ تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، پھر میں تم کو بتادوں گا جو کچھ تم کرتے تھے۔ ۹۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیا تو ہم ان کو نیک بندوں میں داخل کریں گے۔

انسان پر تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ جس کا حق ہے وہ اس کے ماں باپ ہیں مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، اسی طرح ماں باپ کے حقوق کی بھی ایک حد ہے۔ اور حدیث کے الفاظ میں وہ حد یہ ہے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں (لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 381۔

ماں باپ کے حقوق اسی وقت تک قابل لحاظ ہیں جب تک وہ خدا کے حقوق سے نہ ٹکرائیں۔ ماں باپ کا حکم جب خدا کے حکم سے ٹکرانے لگے تو اس وقت ماں باپ کا حکم نہ ماننا اتنا ہی ضروری ہوجائے گا جتنا عام حالات میں ماں باپ کا حکم ماننا ضروری ہوتا ہے۔ اسلام میں ماں باپ کے حقوق سے مراد ماں باپ کی خدمت ہے، نہ کہ ماں باپ کی عبادت۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَ لَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۞ ۱۰ وَ لَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۞ ۱۱

۱۰۔ اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ پھر جب اللہ کی راہ میں اس کو ستایا جاتا ہے تو وہ لوگوں کے ستانے کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتا ہے۔ اور اگر تمھارے رب کی طرف سے کوئی مدد آجائے تو وہ کہیں گے کہ ہم تو تمھارے ساتھ تھے۔ کیا اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں جو لوگوں کے دلوں میں ہے۔ ۱۱۔ اور اللہ ضرور معلوم کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور وہ ضرور معلوم کرے گا منافقین کو۔

ایک شخص اپنے کو مومن کہے۔ مگر اس کا حال یہ ہو کہ جب مومن بننے میں فائدہ ہو تو وہ بڑھ چڑھ کر اپنے مومن ہونے کا اظہار کرے۔ مگر جب مومن بننے میں دنیوی نقصان نظر آئے تو وہ فوراً واپس جانے

لگے۔ ایسا آدمی قرآن کی اصطلاح میں منافق ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بظاہر مومن تھے مگر وہ اپنے ایمان کی قیمت دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ وہ عین اسی مقام پر ناکام ہو گئے جہاں انھیں سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع ۱۳

۱۲۔ اور منکر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے راستہ پر چلو اور ہم تمھارے گناہوں کو اٹھالیں گے۔ اور وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہیں۔ بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ ۱۳۔ اور وہ اپنے بوجھ اٹھائیں گے، اور اپنے بوجھ کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔ اور یہ لوگ جو جھوٹی باتیں بناتے ہیں قیامت کے دن اس کی بابت ان سے پوچھ ہوگی۔

افترا (جھوٹ گھڑنا) یہ ہے کہ آدمی خود ایک بات کہے اور اس کو خدا کی طرف منسوب کر دے۔ ہر قسم کی بدعات اور غلط تعبیرات اس میں داخل ہیں۔ اس افترا کی ایک صورت یہ ہے کہ انکار کرنے والے بڑے اپنے چھوٹوں سے یہ کہیں کہ تم ہمارے راستہ پر چلتے رہو، اگر خدا کے یہاں اس پر پوچھا گیا تو ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ خدا نے کسی کو اس قسم کا حق نہیں دیا ہے۔ اس لیے ایسی بات کہنا خدا پر جھوٹ باندھنا ہے۔

آدمی بہت سی باتیں صرف کہنے کے لیے کہہ دیتا ہے۔ اگر وہ اس کے انجام کو دیکھ لے تو وہ کبھی ایسے الفاظ اپنے منہ سے نہ نکالے۔ چنانچہ یہ لوگ جب قیامت کی ہولناکی کو دیکھیں گے تو اس وقت ان کا حال اس سے بالکل مختلف ہوگا جو آج کی دنیا میں ان کا نظر آ رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

۱۴۔ اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا۔ پھر ان کو طوفان نے پکڑ لیا اور وہ ظالم تھے۔ ۱۵۔ پھر ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو بچا لیا۔ اور ہم نے اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔

حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ نبوت سے پہلے بھی آپ ایک صالح انسان تھے اور شریعت آدم پر قائم تھے۔ نبوت ملنے کے بعد آپ باقاعدہ خدا کے داعی بن کر اپنی قوم کو ڈراتے رہے۔ مگر سیکڑوں سال کی محنت

کے باوجود قوم نہ مانی۔ آخر کار چند اصلاح یافتہ افراد کو چھوڑ کر پوری قوم ایک عظیم طوفان میں غرق کر دی گئی۔

ترکی اور روس کی سرحد پر مشرقی اناطولیہ کے پہاڑی سلسلہ میں ایک اونچی چوٹی ہے جس کو ارارات (Ararat) کہا جاتا ہے۔ اس کی بلندی پانچ ہزار میٹر سے زیادہ ہے۔ اس پہاڑ کے اوپر سے اڑنے والے جہازوں کا بیان ہے کہ انھوں نے ارارات کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی پر ایک کشتی جیسی چیز دیکھی ہے۔ چنانچہ اس کشتی تک پہنچنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اہل علم کا خیال ہے یہ وہی چیز ہے جس کو مذہبی روایات میں کشتی نوح کہا جاتا ہے۔

اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کی کشتی کو آج بھی باقی رکھا ہے تاکہ وہ لوگوں کے لیے اس بات کی نشانی ہو کہ خدا کے طوفان سے بچنے کے لیے آدمی کو پیغمبر کی کشتی درکار ہے۔ کوئی دوسری چیز آدمی کو خدا کے طوفان سے بچانے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔

وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ
اتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾
اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ
اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا
يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ
اعْبُدُوْهُ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ
اِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَ مَا
عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾

۱۶۔ اور ابراہیم کو جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۱۷۔ تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو پوجتے ہو اور تم جھوٹی باتیں گھڑتے ہو۔ اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تم کو رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ پس تم اللہ کے پاس رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۸۔ اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں۔ اور رسول پر صاف صاف پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔

ایک خدا کے سوا جس کو بھی آدمی اپنے اعلیٰ جذبات کا مرکز بناتا ہے وہ ایک جھوٹ ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ غیر خدا میں خدائی اوصاف کو فرض کرتا ہے۔ وہ برتر صفات جو صرف خدا کے لیے خاص ہیں ان کو آدمی غیر خدا میں فرض کرتا ہے، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی غیر خدا کا پرستار بنے۔

قدیم مشرکانہ دور میں انسان اس قسم کی صفات بتوں میں فرض کرتا تھا، آج کا انسان بھی یہی کر رہا ہے۔ البتہ آج کے انسان کے بتوں کے نام اس سے مختلف ہیں جو قدیم مشرکوں کے ہوا کرتے تھے۔ قدیم و جدید کا فرق صرف یہ ہے کہ قدیم انسان اگر کھیت کی پیداوار کو کسی مفروضہ دیوتا کی مہربانی سمجھتا تھا تو آج کا انسان اس کے لیے یہ الفاظ بولتا ہے — ہمارا اگرین ریولیوشن ہماری ایگریکلچرل سائنس کا کرشمہ ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ
يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿١٩﴾ قُلْ
سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ
الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٠﴾ۚ يُعَذِّبُ
مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَاِلَيْهِ
تُقْلَبُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي
الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۡ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٢٢﴾ۧ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ع ۲ ٩ ١٤
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَاۗىِٕهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ يَىِٕسُوْا مِنْ
رَّحْمَتِيْ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٣﴾

۱۹۔ کیا لوگوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح خلق کو شروع کرتا ہے، پھر وہ اس کو دہرائے گا۔ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔ ۲۰۔ کہو کہ زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو کہ اللہ نے کس طرح خلق کو شروع کیا، پھر وہ اس کو دوبارہ اٹھائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۱۔ وہ جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا رحم کرے گا۔ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۲۲۔ اور تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو اور نہ آسمان میں، اور تمھارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار۔ ۲۳۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا اور اس سے ملنے کا انکار کیا تو وہی میری رحمت سے محروم ہوئے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

انسان نہیں تھا، اس کے بعد وہ ہو جاتا ہے۔ پھر جو تخلیق ایک بار ممکن ہو وہ دوسری بار کیوں ممکن نہ ہوگی۔ شاہ عبد القادر دہلوی نے اس موقع پر یہ بامعنی نوٹ لکھا ہے: ''شروع تو دیکھتے ہو، دُہرانا اسی سے سمجھ لو''۔

ہر آدمی اپنی ذات میں تخلیقِ اول کی ایک مثال ہے۔ اگر آدمی کو مزید مثالیں درکار ہیں تو وہ خدا کی وسیع دنیا میں مطالعہ اور مشاہدہ کرے۔ وہ دیکھے گا کہ پوری دنیا اسی واقعہ کا زندہ نمونہ ہے۔ خدا نے اپنی دنیا میں یہ نمونے اس لیے قائم کیے کہ انسان تخلیقِ ثانی کے معاملے کو سمجھے اور پھر وہ عمل کرے جو اگلے مرحلۂ حیات میں اس کے کام آنے والا ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا
اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ
النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ

۲۴۔ پھر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا کہ اس کو قتل کر دو یا اس کو جلا دو، تو اللہ نے اس کو آگ سے بچا لیا۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے۔ ۲۵۔ اور اس نے کہا کہ تم نے اللہ کے سوا جو بت بنائے ہیں، بس وہ

الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ
بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّ
مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٢٥
فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى
رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٢٦
وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ
ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ
فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝٢٧

تمھارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے، پھر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا۔ اور آگ تمھارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمھارا مددگار نہ ہوگا۔ ۲۶۔ پھر لوط نے اس کو مانا اور کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ بے شک وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۲۷۔ اور ہم نے عطا کیے اس کو اسحاق اور یعقوب اور اس کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔ اور ہم نے دنیا میں اس کو اجر عطا کیا اور آخرت میں یقیناً وہ صالحین میں سے ہوگا۔

جو چیز کسی معاشرہ میں قومی رواج کی حیثیت حاصل کرلے وہ اس کے ہر فرد کی ضرورت بن جاتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر باہمی تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ اسی سے ہر قسم کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی کے اعتبار سے لوگوں کے درمیان کسی آدمی کی قیمت مقرر ہوتی ہے — قدیم زمانہ میں شرک کی حیثیت اسی قسم کے قومی رواج کی ہوگئی تھی۔

حضرت ابراہیم نے عراق کے لوگوں کو بتایا کہ تم جس بت پرستی کو پکڑے ہوئے ہو وہ محض ایک قومی رواج ہے نہ کہ کوئی واقعی صداقت۔ تمھاری موجودہ زندگی کے ختم ہوتے ہی اس کی ساری اہمیت ختم ہوجائے گی۔ مگر صرف ایک آپ کے بھتیجے لوط تھے جنھوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ قوم آپ کی اتنی دشمن ہوئی کہ اس نے آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ تاہم اللہ نے آپ کو بچالیا۔ آپ کو نہ صرف آخرت کا اعلیٰ انعام ملا بلکہ آپ کو ایسی صالح اولاد دی گئی جس کے اندر چار ہزار سال سے نبوت کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ کے بیٹے اسحاق پیغمبر تھے۔ پھر ان کے بیٹے یعقوب پیغمبر ہوئے اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ تک مسلسل اسی خاندان میں پیغمبری کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت ابراہیم کے ایک اور بیٹے مدیان کی نسل میں حضرت شعیب پیدا ہوئے۔ اسی طرح آپ کے بیٹے اسماعیل خود پیغمبر تھے اور انھیں کی نسل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جن کی پیغمبری قیامت تک جاری ہے۔

حضرت ابراہیم کی اس تاریخ میں باطل پرستوں کے لیے بھی نصیحت ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی روشنی ہے جو حق کی بنیاد پر اپنے آپ کو کھڑا کریں۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ
الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ
الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا
ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾
قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾ ع ۳/۸/۱۵

۲۸۔ اور لوط کو جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔ ۲۹۔ کیا تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور راستہ روکتے ہو۔ اور اپنی مجلس میں برا کام کرتے ہو۔ پس اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لاؤ۔ ۳۰۔ لوط نے کہا کہ اے میرے رب، مفسد لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔

حضرت لوط بابل کو چھوڑ کر اردن کے علاقہ میں آ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبر بنایا اور ان کو قوم لوط کی اصلاح کے کام پر مقرر کیا۔ یہ قوم بحر مردار (Dead Sea) کے قریب سدوم کے علاقہ میں رہتی تھی اور امرد پرستی کی غیر فطری عادت میں مبتلا تھی۔ اسی نسبت سے دوسری برائیاں بھی ان کے اندر عام ہو چکی تھیں۔ مگر انھوں نے اصلاح قبول نہ کی۔

''اللہ کا عذاب لاؤ'' کا اصل رخ حضرت لوط کی طرف تھا، نہ کہ اللہ کی طرف۔ انھوں نے حضرت لوط کو اتنا حقیر سمجھا کہ ان کے نزدیک یہ ناممکن تھا کہ ان کی بات نہ ماننے سے وہ خدا کی پکڑ میں آ جائیں گے۔ چنانچہ بطور مذاق انھوں نے کہا کہ اگر تم واقعی سچے ہو تو ہمارے اوپر خدا کا عذاب لاؤ۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ
اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا
لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۫ وقفة
لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ كَانَتْ مِنَ
الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا
سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا

۳۱۔ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر پہنچے، انھوں نے کہا کہ ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں بے شک اس کے لوگ سخت ظالم ہیں۔ ۳۲۔ ابراہیم نے کہا کہ اس میں تو لوط بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون ہے۔ ہم اس کو اور اس کے گھر والوں کو بچا لیں گے مگر اس کی بیوی کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ ۳۳۔ پھر جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے تو وہ ان سے پریشان ہوا اور دل تنگ ہوا۔ اور انھوں

تَخَفۡ وَ لَا تَحۡزَنۡ ۟ اِنَّا مُنَجُّوۡکَ وَ اَہۡلَکَ اِلَّا امۡرَاَتَکَ کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَہۡلِ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَ لَقَدۡ تَّرَکۡنَا مِنۡہَاۤ اٰیَۃًۢ بَیِّنَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

نے کہا کہ تم نہ ڈرو اور نہ غم کرو۔ ہم تم کو اور تمھارے گھر والوں کو بچالیں گے، مگر تمھاری بیوی کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ ۳۴۔ ہم اس بستی کے باشندوں پر ایک آسمانی عذاب ان کی بدکاریوں کی سزا میں نازل کرنے والے ہیں۔ ۳۵۔ اور ہم نے اس بستی کے کچھ نشان رہنے دئیے ہیں ان لوگوں کی عبرت کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔

قوم لوط کا علاقہ (سدوم، عمورہ) شدید زلزلہ سے تباہ کردیا گیا۔ وہ سرسبز وشاداب وادی جہاں چار ہزار سال پہلے یہ قوم آباد تھی، اب وہاں بحر مردار کا کثیف پانی (extremely saline water) پھیلا ہوا ہے۔

قرآن کے بیان کے مطابق تباہی کا یہ واقعہ خدا کے فرشتوں کے ذریعہ ظہور میں آیا۔ مگر جغرافیہ اور آثار قدیمہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اس علاقہ میں جب ارضی عمل سے پہاڑ ابھرے تو اسی کے ساتھ زمین کے ایک حصہ میں ڈھلان (escarpment) پیدا ہوگیا۔ بعد کو اس ڈھلان کے جنوبی حصہ میں سمندر کا پانی بھر گیا۔ اس طرح وہ خشک حصہ پانی کے نیچے آگیا جس کو اب بحر مردار کا کم گہرا جنوبی کنارہ کہا جاتا ہے — قرآن میں جو چیز خدائی نشان ہے وہ غیر قرآنی مشاہدہ میں صرف ایک طبیعی واقعہ نظر آتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس برباد شدہ بستی کے کھنڈر اب بھی سمندر کے پانی کے نیچے پائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں بہت بڑی عبرت ہے۔ مگر یہ عبرت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو باتوں کو اس کی گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔

وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ ارۡجُوا الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ ﴿۳۶﴾ فَکَذَّبُوۡہُ فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۶۔ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اور آخرت کے دن کی امید رکھو اور زمین میں فساد پھیلانے والے نہ بنو۔ ۳۷۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ پس زلزلہ نے ان کو آ پکڑا۔ پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

حضرت شعیب جس قوم میں آئے وہ ایک تجارت پیشہ قوم تھی۔ وہ لوگ مال کی حرص میں اتنا بڑھے کہ دھوکا اور فریب کے ذریعہ مال کمانے لگے۔ یہی ان کا زمین میں فساد کرنا تھا۔ جائز تجارت حصول معاش کا اصلاحی طریقہ ہے اور دھوکہ اور لوٹ کھسوٹ حصول معاش کا مفسدانہ طریقہ۔

حضرت شعیب نے قوم سے کہا کہ تم دنیا کے پیچھے آخرت سے غافل نہ ہو جاؤ۔ تم لوگ اس طریقہ پر کام کرو جس سے تم آخرت میں اپنے لیے اچھے انجام کی امید کر سکو۔ مگر پیغمبر کی ساری کوششوں کے باوجود قوم نہ مانی۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے قانون کے مطابق ہلاک کر دی گئی۔ جن گھروں کو انھوں نے اپنے لیے زندگی کا گھر سمجھا تھا وہ ان کے لیے موت کا گھر بن گیا۔

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور عاد اور ثمود کو، اور تم پر حال کھل چکا ہے ان کے گھروں سے۔ اور ان کے اعمال کو شیطان نے ان کے لیے خوش نما بنا دیا۔ پھر ان کو راستے سے روک دیا اور وہ ہوشیار لوگ تھے۔

عاد اور ثمود کو بھی خدا کے عذاب نے پکڑ لیا۔ وہ اپنے دنیا کے معاملات میں بہت ہوشیار تھے مگر وہ آخرت کے معاملہ میں بالکل نادان نکلے۔ انھوں نے پہاڑوں کے ذریعہ گھر بنانے کے راز کو جان لیا۔ مگر وہ پیغمبر کے ذریعہ زندگی بنانے کا راز نہ جان سکے۔ اس کی وجہ وہ چیز تھی جس کو تزئین اعمال کہا گیا ہے۔ شیطان نے انھیں اس دھوکہ میں رکھا کہ دنیا کی تعمیر ہی ساری تعمیر ہے۔ اگر دنیا کو بنا لیا تو اس کے بعد کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں۔ مگر یہ فریب ان کے کام نہ آیا اور نہ اس قسم کا فریب آئندہ کسی کے کچھ کام آنے والا ہے۔

جنوبی عرب کا علاقہ جو اب یمن، احقاف، اور حضر موت کے نام سے جانا جاتا ہے، یہی قدیم زمانہ میں عاد کا علاقہ تھا۔ اسی طرح حجاز کے شمالی حصہ میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ اور خیبر سے تیما اور تبوک تک کا علاقہ وہ تھا جس میں ثمود کی آبادیاں پائی جاتی تھیں۔

وَقَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾

۳۹۔ اور قارون کو اور فرعون کو اور ہامان کو اور موسیٰ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے زمین میں گھمنڈ کیا اور وہ ہم سے بھاگ جانے والے نہ تھے۔ ۴۰۔ پس ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے بعض پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی۔ اور ان میں سے بعض کو کڑک نے آ پکڑا۔ اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا۔ اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا۔ اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔

انبیاء کی مخاطب قوموں نے جب اپنے نبی کا انکار کیا تو ان کو زمینی اور آسمانی عذاب سے ہلاک کردیا گیا — قوم لوط پر عاصب (پتھر برسانے والی طوفانی ہوا) کا عذاب آیا۔ عاد اور ثمود اور اصحاب مدین پر صیحہ (رعد وبرق) کا عذاب آیا۔ قارون کے لیے خسف (زمین میں دھنسا دینے) کا عذاب آیا۔ فرعون اور ہامان کے لیے غرق (سمندر کے پانی میں ڈبا دینے) کا عذاب آیا۔

ان تمام عذابوں کا مشترک سبب لوگوں کا گھمنڈ تھا۔ یعنی حق کی دعوت کو اس لیے نہ ماننا کہ اس کو ماننے سے اپنی بڑائی ختم ہوجائے گی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ ع

۴۱۔ جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنائے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ اس نے ایک گھر بنایا۔ اور بے شک تمام گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔ کاش کہ لوگ جانتے۔ ۴۲۔ بے شک اللہ جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں۔ اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۴۳۔ اور یہ مثالیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے رہے ہیں اور ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم والے ہیں۔ ۴۴۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ بے شک اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔

یہاں بتایا گیا ہے کہ "مکڑی" کے گھر کو دیکھ کر جو شخص حقیقت کا سبق پالے وہی دراصل عالم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے نزدیک سچے علم والے کون ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو کتابی بحثوں کے ماہر بنے ہوئے ہوں۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کی دنیا میں پھیلی ہوئی قدرتی نشانیوں سے نصیحت کی غذا لے سکیں۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے واقعات جن کے ذہن میں داخل ہوکر بڑے بڑے سبق میں تبدیل ہوجائیں — یہی علم جب آخری معرفت تک پہنچ جائے تو اسی کا دوسرا نام ایمان ہے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

☆ ۴۵۔ تم اس کتاب کو پڑھو جو تم پر وحی کی گئی ہے۔ اور نماز قائم کرو۔ بے شک نماز بے حیائی سے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

"نماز برائی سے روکتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کیفیت نماز برائی سے روکتی ہے۔ اگر آدمی واقعۃً خدا کے آگے رکوع اور سجدہ کرنے والا ہو تو اس کے اندر ذمہ داری اور تواضع کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ذمہ داری اور تواضع کے احساس سے جو کردار ابھرتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی وہ کرتا ہے جو اسے کرنا چاہیے اور وہ نہیں کرتا جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔

ذکر سے مراد خدا کی یاد ہے۔ جب آدمی کو خدا کی کامل معرفت حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ پوری طرح خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اوپر خدا کا تصور چھا جاتا ہے۔ اس کے اندر خدا کی یاد کا چشمہ بہہ پڑتا ہے۔ اس روحانی درجہ کو پہنچ کر آدمی کی زبان سے خدا کے لیے جو اعلیٰ کلمات نکلتے ہیں انھیں کا نام ذکر ہے۔ یہ ذکر بلاشبہ اعلیٰ ترین عبادت ہے۔

تلاوت وحی سے مراد یہاں تبلیغ وحی ہے۔ یعنی لوگوں کو قرآن سنانا اور اس کے ذریعہ سے انھیں خدا کی مرضی سے باخبر کرنا۔ دعوت و تبلیغ کا یہ کام بے حد صبر آزما کام ہے۔ اس میں اپنے مخالفین کا خیر خواہ بننا پڑتا ہے۔ اس میں فریقِ ثانی کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اس میں اپنے مخاطبین کو مدعو کی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے خواہ وہ خود داعی کے لیے رقیب اور حریف بنے ہوئے ہوں۔

نماز جس طرح عام زندگی میں ایک مومن کو برائی سے روکتی ہے، اسی طرح وہ داعی کو غیر داعیانہ روش سے بچاتی ہے۔ خدا کا داعی وہی شخص بن سکتا ہے جس کے سینہ میں خدا کی یاد سمائی ہوئی ہو، جو اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے آگے جھکنے والا بن گیا ہو۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٤٦﴾

۴۶۔ اور تم اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے، مگر جو ان میں بے انصاف ہیں۔ اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے۔ اور اس پر جو تمھاری طرف بھیجی گئی ہے۔ ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کی فرماں برداری کرنے والے ہیں۔

داعی کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ بحث کریں اور الجھیں ان سے وہ سلام کر کے جدا ہو جائے۔ اور جو لوگ سنجیدہ ہوں ان پر وہ امر حق کو واضح کرنے کی کوشش کرے۔ نیز یہ کہ دعوتی کلام کو حکیمانہ کلام ہونا چاہیے —— اور حکیمانہ کلام کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ اس میں مدعو کی نفسیات کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے۔ داعی اپنی بات کو ایسے اسلوب سے کہتا ہے کہ مدعو اس کو اپنے دل کی بات سمجھے، نہ کہ غیر کی بات سمجھ کر اس سے متوحش ہو جائے۔ داعیانہ کلام ناصحانہ کلام ہوتا ہے، نہ کہ مناظرانہ کلام۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

۴۷۔ اور اسی طرح ہم نے تمھارے اوپر کتاب اتاری۔ تو جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ان لوگوں میں سے بھی بعض ایمان لاتے ہیں۔ اور ہماری آیتوں کا انکار صرف منکر ہی کرتے ہیں۔ ۴۸۔ اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسی حالت میں باطل پرست لوگ شبہ میں پڑتے۔ ۴۹۔ بلکہ یہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے۔ اور ہماری آیتوں کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔

لوگوں میں دو قسم کے افراد ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو پہلے سے سچائی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ لوگ جو بظاہر سچائی کا علم نہیں رکھتے۔ تاہم یہ دوسری قسم کے لوگ بھی فطرت کی سطح پر سچائی سے آشنا ہوتے ہیں۔ اول الذکر اگر حامل کتاب ہیں تو ثانی الذکر حامل فطرت۔

اگر لوگ فی الواقع سنجیدہ ہوں تو وہ فوراً حق کو پہچان لیں گے۔ ایک گروہ اگر اس کو کتابِ آسمانی کی سطح پر پہچان لے گا تو دوسرا گروہ کتابِ فطرت کی سطح پر۔ ہر ایک کو سچائی کی بات اپنے دل کی بات نظر آئے گی۔ مگر اکثر حالات میں لوگ طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر انکار کا مزاج آ جاتا ہے۔ وہ سچائی کا انکار ہی کرتے رہتے ہیں، خواہ اس کی پشت پر کتنے ہی قرائن جمع ہوں اور اس کے حق میں کتنے ہی زیادہ دلائل دے دیے جائیں۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ ع ۵

۵۰۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں۔ کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔ اور میں صرف کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۵۱۔ کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ بے شک اس میں رحمت اور یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ کہو کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کا انکار کیا، وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔

جو لوگ کہتے تھے کہ پیغمبر اسلام کو اس طرح کی نشانیاں کیوں نہیں دی گئیں جیسی نشانیاں مثال کے طور پر موسیٰ کو دی گئی تھیں۔ فرمایا کہ نشانیاں اللہ کے پاس ہیں۔ یعنی نشانیوں (معجزے) کا تعلق خدا سے ہے، نہ کہ پیغمبر سے۔ پیغمبر کی دعوت کا اصل انحصار دلائل پر ہوتا ہے۔ پیغمبر ہمیشہ دلائل کے زور پر اپنی دعوت پیش کرتا ہے۔ البتہ دوسرے مصالح کے تحت خدا کبھی کسی پیغمبر کو نشانی (معجزہ) دے دیتا ہے اور کبھی نہیں دیتا۔

ایمان ایک شعوری واقعہ ہے۔ وہی ایمان ایمان ہے جو دلیل سے مطمئن ہو کر کسی بندہ کے دل میں ابھرا ہو۔ جو شخص دلیل کی روشنی میں جانچ کر کسی چیز کو مانے وہ حق پرست ہے اور جو شخص دوسری غیر متعلق بحثیں نکالے وہ باطل پرست۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

۵۳۔ اور یہ لوگ تم سے عذاب جلد مانگ رہے ہیں۔ اور اگر ایک وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر عذاب آجاتا۔ اور یقیناً وہ ان پر اچانک آئے گا اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ ۵۴۔ وہ تم سے عذاب جلد مانگ رہے ہیں۔ اور جہنم منکروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ ۵۵۔ جس دن عذاب ان کو اوپر سے ڈھانک لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی، اور کہے گا کہ چکھو اس کو جو تم کرتے تھے۔

انسان کے اعمال ہی اس کی جنت ہیں اور انسان کے اعمال ہی اس کی دوزخ۔ ایک شخص جو انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہو، اس کی زندگی کو اگر اس کے معنوی انجام کے اعتبار سے دیکھنا ممکن ہو تو نظر آئے گا کہ اس کے برے اعمال اس کو عذاب بن کر گھیرے ہوئے ہیں۔ اور صرف اتنی سی دیر ہے کہ موت آئے اور اس کو اس کی بنائی ہوئی دنیا میں ڈال دے۔

انسان کی بہت سی سرکشی صرف اپنی حقیقت سے بے خبری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر اس کی یہ بے خبری ختم ہو جائے تو اچانک وہ بالکل دوسرا انسان بن جائے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٥٨﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖۗ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ ۖ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٠﴾

۵۶۔ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، بے شک میری زمین وسیع ہے تو تم میری ہی عبادت کرو۔ ۵۷۔ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۵۸۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کو ہم جنت کے بالا خانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۵۹۔ کیا ہی اچھا اجر ہے عمل کرنے والوں کا جنھوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۶۰۔ اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

ہجرت ایک اعتبار سے طریقِ کار کی تبدیلی ہے۔ یہ تبدیلی کبھی مقام عمل بدلنے کی صورت میں ہوتی ہے، جیسے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ جانا۔ کبھی میدان عمل بدلنے کی صورت میں ہوتی ہے، جیسے صلح حدیبیہ کے ذریعے جنگ کے میدان سے ہٹ کر دعوت کے میدان میں آنا۔

ان آیات میں مکہ کے اہل ایمان سے کہا گیا کہ مکہ کے لوگ اگر تم کو ستاتے ہیں تو تم مکہ کو چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں چلے جاؤ اور وہاں اللہ کی عبادت کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبر اور توکل کا مطلب عبادت پر جمنا ہے، نہ کہ دشمن سے ٹکراؤ پر جمنا۔ اگر ہر حال میں دشمن سے ٹکراتے رہنا مقصود ہوتا تو ان سے کہا جاتا کہ مخالفین سے لڑتے رہو اور وہاں سے کسی حال میں قدم باہر نہ نکالو۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ؕ

۶۱۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو، اور مسخر کیا سورج کو اور چاند کو، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر وہ کہاں سے پھیر دئے جاتے ہیں۔ ۶۲۔ اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ ع

بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۶۳۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے مرجانے کے بعد، تو ضرور وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو کہ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے۔ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

زمین وآسمان کو پیدا کرنا اتنا بڑا واقعہ ہے کہ ایک قادر مطلق خدا ہی اس کو انجام دے سکتا ہے۔ سورج اور چاند کی گردش، بارش کا برسنا اور زمین سے نباتات کا اگنا یہ سب اس سے زیادہ بڑے واقعات ہیں کہ کوئی غیر خدا ان کو وجود میں لا سکے۔

جو لوگ کسی نوعیت کے شرک میں مبتلا ہیں وہ بھی اپنی مفروضہ ہستیوں کے بارے میں یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وہ ان عظیم واقعات کو ظہور میں لائے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ خدا کے سوا دوسروں کی اس امید میں پرستش کرتے ہیں کہ وہ ان کا رزق بڑھا دیں گے۔ حالاں کہ جب ہر قسم کے اعلیٰ اختیارات صرف خدا کو حاصل ہیں تو دوسرا کون ہے جو رزق کی تقسیم میں اثر انداز ہو سکے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ڔ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

۶۴۔ اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اور آخرت کا گھر ہی اصل زندگی کی جگہ ہے، کاش کہ وہ جانتے۔ ۶۵۔ پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں، اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے، پھر جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے جاتا ہے تو وہ فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔ ۶۶۔ تاکہ ہم نے جو نعمت ان کو دی ہے اس کی ناشکری کریں اور چند دن فائدہ اٹھائیں۔ پس وہ عنقریب جان لیں گے۔

انسان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ دنیا کی رونقوں اور دنیا کے مسائل میں اتنا گم ہوتا ہے کہ اس سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا۔ حقیقت کو پانے کے لیے اپنے آپ کو ظاہر سے اوپر اٹھانا پڑتا ہے۔ بیشتر لوگ اپنے آپ کو ظاہر سے اٹھا نہیں پاتے اس لیے بیشتر لوگ حقیقت کو پانے والے بھی نہیں بنتے۔

دنیا میں آدمی کو بار بار ایسے تجربات پیش آتے ہیں جو اس کو اس کا عجز یاد دلاتے ہیں۔ اس وقت اس کے

تمام مصنوعی خیالات ختم ہوجاتے ہیں اور حقیقی فطرت والا انسان جاگ اٹھتا ہے۔ مگر جیسے ہی حالات معتدل ہوئے وہ دوبارہ پہلے کی طرف غافل اور سرکش بن جاتا ہے۔ انھیں نازک تجربات میں سے سفر کا وہ تجربہ ہے جس کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔

آدمی کو جاننا چاہیے کہ آزادی کا یہ موقع اس کو صرف چند دن کی زندگی تک حاصل ہے۔ موت کے بعد اس کے سامنے بالکل دوسری دنیا ہوگی اور بالکل دوسرے مسائل۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ ع ۷

۶۷۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنایا۔ اور ان کے گرد وپیش کے لوگ اچک لیے جاتے ہیں۔ تو کیا وہ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔ ۶۸۔ اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے پاس آچکا۔ کیا منکروں کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہوگا۔ ۶۹۔ اور جو لوگ ہماری خاطر مشقت اٹھائیں گے، ان کو ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔ اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مکہ کا حرم اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب نعمت ہے۔ اللہ نے لوگوں کے اوپر اس کا ایسا رعب بٹھا رکھا ہے کہ وہاں پہنچ کر ظالم اور سرکش بھی اپنا ظلم اور سرکشی بھول جاتے ہیں۔ حرم کا یہ تقدس خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ لوگوں کے دل خدا کے لیے جھک جائیں۔ مگر باطل پرستوں نے یہ کیا کہ غیر خدا میں خدا کے اوصاف فرض کرکے لوگوں کے جذباتِ پرستش کو بالکل غلط طور پر ان کی طرف پھیر دیا۔ ان کا مزید ظلم یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے جب ان کو نصیحت کی کہ ان مفروضہ خداؤں کو چھوڑو اور ایک خدا کے آگے جھک جاؤ تو وہ رسول کے دشمن بن گئے۔

ناحق پرستی کے ماحول میں حق پرست بننا ایک شدید مجاہدہ کا عمل ہے۔ اس میں ملی ہوئی چیز چھنتی ہے۔ حاصل شدہ سکون درہم برہم ہوجاتا ہے۔ مگر اسی محرومی میں ایک عظیم یافت کا راز چھپا ہوا ہے۔ اور وہ معرفت اور بصیرت ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے انسانوں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ مگر ان کے لیے خدا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ دنیا سے کھو کر خدا سے پانے لگتے ہیں۔ وہ مادی راحتوں سے دور ہوکر ربانی کیفیات سے قریب ہوجاتے ہیں۔ ظاہری چیزیں ان سے اوجھل ہوتی ہیں مگر معنوی چیزیں ان پر منکشف ہوجاتی ہیں۔ ان پر وہ گہرے بھید کھلنے لگتے ہیں جن کی بڑے بڑے لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

۳۰۔ سُوْرَةُ الرُّوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ
هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ③ فِيْ بِضْعِ
سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ
يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ④ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ⑤ وَعْدَ
اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُوْنَ ⑥ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ⑦

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ الٓمّٓ ۲۔ رومی پاس کے علاقہ میں مغلوب
ہو گئے۔ ۳۔ اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عنقریب
غالب ہوں گے۔ ۴۔ چند برسوں میں۔ اللہ ہی کے
ہاتھ میں سب کام ہے، پہلے بھی اور پیچھے بھی۔ اور اس
دن ایمان والے خوش ہوں گے۔ ۵۔ اللہ کی مدد
سے۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے۔ اور وہ
زبردست ہے، رحمت والا ہے۔ ۶۔ اللہ کا وعدہ
ہے۔ اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ لیکن اکثر
لوگ نہیں جانتے۔ ۷۔ وہ دنیا کی زندگی کے صرف
ظاہر کو جانتے ہیں، اور وہ آخرت سے بے خبر ہیں۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا میں دو بہت بڑی سلطنتیں تھیں۔ ایک، مسیحی رومی سلطنت۔ دوسرے مجوسی ایرانی سلطنت۔ دونوں میں ہمیشہ رقیبانہ کش مکش جاری رہتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے بعد 603ء کا واقعہ ہے کہ بعض کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ایران نے رومی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ رومیوں کو شکست پر شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ 616ء تک یروشلم سمیت روم کی مشرقی سلطنت کا بڑا حصہ ایرانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت 610ء میں ملی اور آپؐ نے مکہ میں دعوت توحید کا کام شروع کیا۔ اس لحاظ سے یہ عین وہی زمانہ تھا جب کہ مکہ میں توحید اور شرک کی کش مکش جاری تھی۔ مکہ کے مشرکین نے سرحدی واقعہ سے فال لیتے ہوئے مسلمانوں سے کہا کہ ہمارے مشرک بھائیوں (مجوس) نے تمھارے اہل کتاب بھائیوں (مسیحی) کو شکست دی ہے۔ اسی طرح ہم بھی تمھارا خاتمہ کر دیں گے۔

اس وقت قرآن میں حالات کے سراسر خلاف یہ پیشین گوئی اتری کہ دس سال کے اندر رومی دوبارہ ایرانیوں پر غالب آجائیں گے۔ رومی مؤرخین بتاتے ہیں کہ اس کے جلد ہی بعد روم کے شکست خوردہ بادشاہ (ہرقل) میں پُراسرار طور پر تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ 623ء میں اس نے ایران پر جوابی حملہ کیا۔ 624ء میں اس نے ایران پر فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ 627ء تک اس نے اپنے سارے مقبوضہ علاقے ایرانیوں سے واپس لے لیے۔ قرآن کی پیشین گوئی لفظ بلفظ پوری ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کا مصنف خدا ہے۔ خدا کے سوا کوئی بھی مستقبل کے بارے میں اتنا صحیح بیان نہیں دے سکتا۔

مزید یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہار اور جیت براہِ راست خدا کے اختیار میں ہے۔ اسی کے فیصلہ سے کسی کو اقتدار ملتا ہے اور کسی سے اقتدار چھن جاتا ہے۔ ایک قوم کا گرنا اور دوسری قوم کا اٹھنا بظاہر عام دنیوی واقعہ ہے۔ مگر اس ظاہر کا ایک باطن ہے۔ ہر واقعہ کے پیچھے خدا کے فرشتے فیصلہ کن طور پر کام کر رہے ہوتے ہیں، اگرچہ وہ عام انسانی آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتے۔ اسی طرح موجودہ عالم ظاہر کا بھی ایک باطن ہے اور وہ عالم آخرت ہے۔

"وہ دنیا کی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں، اور وہ آخرت سے بے خبر ہیں"۔ دوسرے الفاظ میں، وہ دنیوی عظمت کو تو جانتے ہیں، مگر معنوی عظمت کو نہیں جانتے۔ حالاں کہ معنوی پہلو ہی اصل پہلو ہے۔ مگر کوئی گروہ جب زوال کا شکار ہو جائے تو وہ اس کو سمجھنے سے عاجز رہتے ہیں، اور اس کے ظاہری پہلو میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ
بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴿٨﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ
اَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا
عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا
كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿٩﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا
السُّوْۗآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا
يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٠﴾ ع

۸۔ کیا انھوں نے اپنے جی میں غور نہیں کیا، اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے برحق پیدا کیا ہے۔ اور صرف ایک مقرر مدت کے لیے۔ اور لوگوں میں بہت سے ہیں جو اپنے رب سے ملاقات کے منکر ہیں۔ ۹۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا انجام ہوا۔ ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔ اور انھوں نے زمین کو جوتا اور اس کو اس سے زیادہ آباد کیا جتنا انھوں نے آباد کیا ہے۔ اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا۔ مگر وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ ۱۰۔ پھر جن لوگوں نے برا کام کیا تھا ان کا انجام برا ہوا، اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اور وہ ان کی ہنسی اڑاتے تھے۔

خدا کسی آدمی کو ذکر و فکر کی سطح پر ملتا ہے۔ یعنی آدمی سوچ کے ذریعہ سے خدا کو پاتا ہے۔ خدا نے موجودہ دنیا میں اپنے دلائل بکھیر دیے ہیں، آدمی کی اپنی ذات میں، باہر کی کائنات میں اور پھر پیغمبر کی تعلیمات میں۔ جو لوگ ان خدائی نشانیوں میں غور کریں گے وہی خدا کو پائیں گے۔

دلیل اس دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ ایک شخص کے سامنے سچی دلیل آئے اور وہ اس کو نظر انداز کر دے تو گویا کہ اس نے خدا کو نظر انداز کیا۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کے یہاں ابدی محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآىِٕهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَ كَانُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓىِٕكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

۱۱۔ اللہ خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ اس کو پیدا کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۲۔ اور جس دن قیامت برپا ہوگی اس دن مجرم لوگ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ ۱۳۔ اور ان کے شریکوں میں سے ان کا کوئی سفارشی نہ ہوگا اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہوجائیں گے۔ ۱۴۔ اور جس دن قیامت برپا ہوگی اس دن سب لوگ جدا جدا ہوجائیں گے۔ ۱۵۔ پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا وہ ایک باغ میں مسرور ہوں گے۔ ۱۶۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تو وہ عذاب میں پڑے ہوئے ہوں گے۔ ۱۷۔ پس تم پاک اللہ کی یاد کرو جب تم شام کرتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو۔ ۱۸۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے حمد ہے اور تیسرے پہر اور جب تم ظہر کرتے ہو۔

ایک مکمل دنیا کا موجود ہونا پہلی تخلیق کا یقینی ثبوت ہے۔ پھر جب پہلی تخلیق ممکن ہے تو دوسری تخلیق کیوں ممکن نہیں۔ جو شخص موجودہ دنیا کو مانے اور آخرت کو نہ مانے وہ خود اپنی مانی ہوئی بات کے لازمی تقاضے کا انکار کر رہا ہے۔

''مجرمین'' سے مراد وہ بڑے لوگ ہیں جنھوں نے انکارِ حق کی مہم کی قیادت کی۔ جنھوں نے انکارِ حق کے لیے دلائل فراہم کیے۔ قیامت کا دھماکہ جب نظامِ عالم کو بدلے گا تو اچانک یہ مجرمین دیکھیں گے کہ وہ تمام سہارے بالکل بے بنیاد تھے جن پر انھیں بڑا ناز تھا۔ وہ تمام الفاظ جھوٹے الفاظ ثابت ہوئے جن کو وہ اپنے موقف کے حق میں ناقابلِ تردید دلیل سمجھتے تھے۔ اپنی امیدوں اور خوش خیالیوں کے برعکس جب وہ اِس صورت حال کو دیکھیں گے تو وہ بالکل حیرت زدہ ہو کر رہ جائیں گے۔

قیامت میں انسانوں کی دو تقسیم کی جائے گی۔ ایک، خدا کی حمد و تسبیح کرنے والے لوگ۔ دوسرے، حمد و تسبیح سے خالی لوگ۔ خدا کی حمد و تسبیح کرنے والے لوگ وہ ہیں جو خدا کو اس طرح پائیں کہ وہ ان کی یادوں میں سما جائے۔ وہ ان کے دماغ کی سوچ اور ان کی زبان کا تذکرہ بن جائے۔ اسی حمد و تسبیح کی ایک متعین صورت

کا نام پانچ وقت کی نماز ہے۔ آیت میں صبح کی تسبیح سے مراد فجر کی نماز ہے۔ شام کی تسبیح میں مغرب اور عشاء کی نمازیں شامل ہیں۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد کی تسبیح سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ اور دن کے پچھلے وقت کی تسبیح سے مراد عصر کی نماز۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ
مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ
ع وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ
تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ
مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ
جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

۱۹۔ وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ اور وہ زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم لوگ نکالے جاؤ گے۔ ۲۰۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر یکایک تم بشر بن کر پھیل جاتے ہو۔ ۲۱۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھاری جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

موجودہ دنیا کا ایک عجیب وغریب کرشمہ ایک چیز کا دوسری چیز میں مبدل ہونا ہے۔ یہاں غیر اضافہ پذیر مادہ اضافہ پذیر مادہ میں تبدیل ہو رہا ہے۔ یہاں بے جان مٹی (بالفاظ دیگر ارضی اجزاء) تبدیل ہو کر چلنے اور بولنے والے انسان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ سب کچھ حد درجہ بامعنی طور پر ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر ''مٹی'' جب تبدیل ہو کر انسان بنتی ہے تو اس کا تقریباً نصف حصہ مرد کی صورت میں ڈھل جاتا ہے اور تقریباً نصف حصہ عورت کی صورت میں۔ اسی تقسیم کی بدولت انسانی تہذیب ہزاروں سال سے قائم ہے۔ یہ تبدیلی اور پھر منظم اور متناسب تبدیلی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کے پیچھے ایک قادر مطلق خدا کی کارفرمائی مانی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خدا کی تخلیق پر غور کرے تو اس کو ایسا لگے گا جیسے ہر چیز میں خدا کا جلوہ ہو۔ ہر چیز سے خدا جھانک رہا ہو۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ

۲۲۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری بولیوں اور تمھارے رنگوں کا فرق ہے۔ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں علم والوں کے لیے۔ ۲۳۔ اور اس کی نشانیوں

مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ
فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا
وَّ طَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾

میں سے تمھارا رات اور دن میں سونا اور تمھارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔ ۲۴۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے، خوف کے ساتھ اور امید کے ساتھ۔ اور وہ آسمان سے پانی اُتارتا ہے پھر اس سے زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی نشانی ہے — اس کا عدم سے وجود میں آنا خدا کی قوتِ تخلیق کو بتاتا ہے۔ اس کے اندر بے شمار تنوع خدا کی قدرت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ تمام چیزوں میں حد درجہ معنویت خدا کی صفتِ رحمت کا آئینہ ہے۔ بجلی جیسی تباہ کن چیزوں کی موجودگی خدا کی صفت انتقام کا تعارف ہے۔ زمین کا خشک ہو جانے کے بعد دوبارہ ہرا بھرا ہو جانا تخلیق ثانی کے امکان کو بتا رہا ہے۔

یہ سب خدا کی نشانیاں ہیں۔ مگر یہ نشانیاں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو کائنات کی خاموش پکار پر کان لگائیں۔ جو اپنی عقل اور اپنے علم کو صحیح رخ پر استعمال کریں۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ
بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ
الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ لَهٗ مَنْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ
هُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ هُوَ
اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ ع ۳/۸

۲۵۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جب وہ تم کو ایک بار پکارے گا تو تم اسی وقت زمین سے نکل پڑو گے۔ ۲۶۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اسی کا ہے۔ سب اسی کے تابع ہیں۔ ۲۷۔ اور وہی ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے سب سے برتر صفت ہے۔ اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

اتھاہ خلا میں زمین اور سورج اور سیاروں اور ستاروں کا نظام اس قدر حیرت ناک حد تک نادر واقعہ ہے کہ وہ خود بول رہا ہے کہ وہ کسی قائم رکھنے والے کی قدرت سے قائم ہے۔ اور کسی چلانے والے کے زور پر چل رہا ہے۔ یہ غیر معمولی مدد اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے جدا ہو تو وہ بالکل درہم برہم ہو جائے۔ اس دنیا میں ایک

معمولی ہوائی جہاز بھی پائلٹ کا کنٹرول کھونے کے بعد برباد ہوجاتا ہے، پھر کائنات کا اتنا بڑا کارخانہ کسی کنٹرولر کے کنٹرول کے بغیر کیسے چل سکتا ہے۔

کائنات کا خالق کائنات میں اپنی قدرت کا جو مظاہرہ کر رہا ہے اس کے لحاظ سے اس کے لیے یہ کام آسان تر ہے کہ وہ انسان کو موت کے بعد دوبارہ پیدا کرے۔ تخلیق اول کا جو مظاہرہ کائنات میں ہر آن ہورہا ہے اس کے بعد تخلیق ثانی کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے ایک ثابت شدہ چیز کو ماننا۔ کائنات میں خدا کی قدرت اور اس کی حکمت کا اظہار اتنی اعلیٰ سطح پر ہورہا ہے کہ اس کے بعد کسی بھی کارنامہ کو خدا کی طرف منسوب کرنا کوئی مستبعد چیز نہیں۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾

۲۸۔ وہ تمھارے لیے خود تمھاری ذات سے ایک مثال بیان کرتا ہے۔ کیا تمھارے غلاموں میں کوئی تمھارے اس مال میں شریک ہے جو ہم نے تم کو دیا ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں۔ اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو، اسی طرح ان کا بھی لحاظ کرتے ہو۔ اس طرح ہم آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۲۹۔ بلکہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں نے بلا دلیل اپنے خیالات کی پیروی کر رکھی ہے تو اس کو کون ہدایت دے سکتا ہے جس کو اللہ نے بھٹکا دیا ہو۔ اور کوئی ان کا مددگار نہیں۔

ایک مشترک مال یا جائداد ہو تو اس میں اس کے تمام شرکاء کا حق ہوتا ہے اور ہر شریک کو دوسرے شریک کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مگر خدا کا معاملہ اس قسم کا معاملہ نہیں۔ خدا تنہا تمام کائنات کا مالک ہے۔ خدا کے لیے صحیح مثال آقا اور غلام کی ہے، نہ کہ شرکاء جائداد کی۔ خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان زیادہ بڑے پیمانے پر وہی نسبت ہے جو ایک آقا اور ایک غلام کے درمیان پائی جاتی ہے۔ کوئی شخص اپنے غلام یا نوکر کو اپنے برابر کا درجہ نہیں دیتا۔ اسی طرح کائنات میں کوئی بھی نہیں ہے جس کو خدا کے ساتھ برابری کی حیثیت حاصل ہو۔ خدا کی طرف صرف آقائی ہے اور بقیہ مخلوقات کی طرف صرف محکومی اور غلامی۔

مخلوقات کا اپنے اپنے تخلیقی نظام کا پابند ہونا بتاتا ہے کہ خدا اور مخلوقات کے درمیان صحیح نسبت آقا اور غلام کی ہے۔ اس کے سوا جو نسبت بھی قائم کی جائے گی اس کی بنیاد محض انسانی مفروضے پر ہوگی، نہ کہ کسی واقعی دلیل پر۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

۳۰۔ پس تم یکسو ہوکر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔
۳۱۔ اسی کی طرف متوجہ ہوکر اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ بنو۔
۳۲۔ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا۔ اور بہت سے گروہ ہوگئے۔ ہر گروہ اپنے طریقے پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔

اصل دین ایک ہے۔ اس دین کے تمام اصول کامن سنس (commonsense) پر مبنی ہیں۔ اور وہ دین ہر پیغمبر پر اپنی کامل شکل میں اترا ہے۔ وہ ہے ایک اللہ کی طرف رجوع، ایک اللہ کا ڈر، ایک اللہ کی پرستاری، ہمہ تن ایک اللہ کی طرف متوجہ ہوجانا، یہی دین فطرت ہے۔ یہ دین ابدی طور پر ہر انسان کی نفسیات میں سمویا ہوا ہے۔ نفسیات اور کامن سنس خدا کی تخلیق ہیں۔ اسی طرح قرآن بھی خدا کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے۔ چنانچہ دونوں میں کامل مطابقت ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے کامن سنس کو اس کی فطری حالت پر قائم رکھے تو وہ اسلام کو اپنے کامن سنس کے مطابق پائے گا۔

تمام پیغمبروں نے اسی ایک دین کی تعلیم دی۔ مگر ان کے پیروؤں کی بعد کی نسلوں نے ایک دین کو کئی دین بنا ڈالا۔ کئی دین ہمیشہ ان اضافی بحثوں سے بنتا ہے جو بعد کے لوگ پیغمبروں کی ابتدائی تعلیمات میں پیدا کرتے ہیں۔ عقائد میں نو ایجاد موشگافیاں، عبادات میں خود ساختہ مسائل، زمانہ کے تاثرات کے تحت دین کی نئی نئی تعبیریں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو بعد کے دور میں ایک دین کو کئی دین بنا دیتی ہیں۔ جب یہ اضافے وجود میں آتے ہیں تو لوگ اصل دین کے بجائے اپنے انھیں اضافوں پر سب سے زیادہ زور دینے لگتے ہیں جن کی بدولت وہ دوسرے گروہ سے جدا ہوکر الگ گروہ بنے ہیں۔ ایک گروہ ایک قسم کے اضافہ پر زور دیتا ہے، اور دوسرا گروہ دوسرے قسم کے اضافہ پر۔ اس طرح بالآخر یہ نوبت آتی ہے کہ ایک دین کو ماننے والے عملاً کئی دینی گروہ میں بٹ کر رہ جاتے ہیں۔

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی طرف متوجہ ہوکر۔ پھر جب وہ اپنی طرف سے ان کو مہربانی چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کا

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٤﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ
يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿٣٥﴾

شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔ ۳۴۔ کہ جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس کے منکر ہوجائیں۔ تو چند دن فائدہ اٹھالو، عنقریب تم کو معلوم ہوجائے گا۔ ۳۵۔ کیا ہم نے ان پر کوئی سند اتاری ہے کہ وہ ان کو خدا کے ساتھ شرک کرنے کو کہہ رہی ہے۔

عام حالات میں آدمی اپنے کو بااختیار پاتا ہے۔ اس لیے عام حالات میں وہ مصنوعی طور پر سرکش بنا رہتا ہے۔ مگر جب نازک حالات اس کو اس کی بے بسی کا تجربہ کراتے ہیں، اس وقت اس کے ذہن کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ اس وقت وہ اصلی انسان (man cut to size) بن جاتا ہے جو کہ وہ حقیقۃً ہے۔ اس وقت وہ اپنی عاجزانہ حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

یہ نفسیات کی سطح پر توحید الٰہ کا ثبوت ہے۔ اس طرح انسان کو اس کے ذاتی تجربہ میں حقیقت کا چہرہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر آدمی اتنا نادان ہے کہ جیسے ہی حالات بدلے وہ دوبارہ پہلے کی طرح غفلت اور سرکشی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۭ
وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ
اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿٣٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٣٧﴾ فَاٰتِ ذَا
الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۭ
ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ
وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ
رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا
عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ
وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿٣٩﴾

۳۶۔ اور جب ہم لوگوں کو مہربانی چکھاتے ہیں تو وہ اس سے خوش ہوجاتے ہیں۔ اور اگر ان کے اعمال کے سبب سے ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہوجاتے ہیں۔ ۳۷۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اللہ جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے کم۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔ ۳۸۔ پس رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۳۹۔ اور جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مال میں شامل ہوکر وہ بڑھ جائے، تو اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔ اور جو زکوٰۃ تم دوگے، اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کے یہاں اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔

مومن راحت اور مصیبت دونوں کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ دونوں حالتوں میں خدا کی

طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ راحت میں شکر کرتا ہے اور مصیبت میں صبر۔ اس کے برعکس، غیر مومن کا بھروسہ اپنے آپ پر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اچھے حالات میں نازاں ہوتا ہے اور جب اس کی قوتیں جواب دے جائیں تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اب اس کی آخری حد آ گئی۔ یہ گویا فطرت کی شہادت ہے جو بتاتی ہے کہ پہلا ذہن حقیقی ذہن ہے اور دوسرا ذہن غیر حقیقی ذہن۔

مومن کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مال کو رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مال میں دوسرے ضرورت مندوں کا بھی حصہ لگاتا ہے، خواہ وہ اس کے رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار۔ وہ اپنے مال کو آخرت کا نفع کمانے کے لیے خرچ کرتا ہے، نہ کہ سودخواروں کی طرح صرف دنیا کا نفع کمانے کے لیے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٠﴾ ع ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٤١﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿٤٢﴾

ع ۱۳

۴۰۔ اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر اس نے تم کو روزی دی، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ پھر وہ تم کو زندہ کرے گا۔ کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام کرتا ہو۔ وہ پاک ہے اور برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ ۴۱۔ خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے، تاکہ اللہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں۔ ۴۲۔ کہو کہ زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اس سے پہلے گزرے ہیں۔ ان میں سے اکثر مشرک تھے۔

ایک انسان کا پیدا ہونا، اس کو صبح وشام کا رزق ملنا، اس پر موت واقع ہونا، یہ واقعات اتنے عظیم ہیں کہ ان کے ظہور کے لیے کائناتی قوت درکار ہے۔ اور خالق کائنات کے سوا کوئی بھی مفروضہ ہستی ایسی نہیں جو اس قسم کی کائناتی قوت رکھتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید اپنی دلیل آپ ہے اور شرک اپنی تردید آپ۔

اگر انسان ایک خدا کو اپنا معبود بنائے تو سب کا مرکز توجہ ایک ہوتا ہے۔ اس سے انسانوں کے درمیان اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، جب دوسرے دوسرے معبود بنائے جانے لگیں تو بے شمار چیزیں مرکز توجہ بن جاتی ہیں۔ اس سے افراد اور قوموں میں عناد اور اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ خشکی اور سمندر اور فضا سب فساد سے بھر جاتے ہیں۔

انسان کی بے راہ روی کا مستقل انجام موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔ مگر انسان کی بے راہ روی کا وقتی انجام اسی دنیا میں دکھایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو یاد دہانی ہو۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

۴۳۔ پس اپنا رُخ دینِ قیّم کی طرف سیدھا رکھو، قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایسا دن آجائے جس کے لیے واپسی نہیں ہے۔ اس دن لوگ جدا جدا ہوجائیں گے۔ ۴۴۔ جس نے انکار کیا تو اس کا انکار اسی پر پڑے گا اور جس نے نیک عمل کیا تو یہ لوگ اپنے ہی لیے سامان کر رہے ہیں۔ ۴۵۔ تاکہ اللہ ایمان لانے والوں کو اور نیک عمل کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے۔ بے شک اللہ منکروں کو پسند نہیں کرتا۔

موجودہ دنیا میں اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ ملے ہوئے ہیں۔ آخرت اس لیے آئے گی کہ وہ دونوں قسم کے لوگوں کو الگ الگ کردے۔ اس دن خدا کا انعام ان لوگوں کے لیے ہوگا جو موجودہ دنیا میں صرف خدا والے بن کر رہے۔ اور جن لوگوں کی دلچسپیاں غیر خدا کے ساتھ وابستہ رہیں وہ وہاں ابدی طور پر خدا کی رحمتوں سے محروم کردئے جائیں گے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

۴۶۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے خوش خبری دینے کے لیے، اور تاکہ وہ تم کو اپنی رحمت سے نوازے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں، اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ ۴۷۔ اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو بھیجا ان کی قوم کی طرف۔ پس وہ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنھوں نے جرم کیا تھا۔ اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

بارش سے پہلے ٹھنڈی ہواؤں کا آنا اس بات کا اعلان ہے کہ اس دنیا کا خدا رحمتوں والا خدا ہے۔ سمندری

جہاز رانی تمدن کے لیے انتہائی اہم ہے۔ مگر سمندری جہاز رانی اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ ہوا ایک خاص حد کے اندر رہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہوائی سفر کا بھی بہت گہرا تعلق اس انتظام سے ہے کہ خدا نے زمین کی سطح کے اوپر ہوا کا دبیز غلاف قائم کر رکھا ہے۔

یہ سارا اہتمام اس لیے کیا گیا ہے تاکہ انسان خدا کا شکر گزار بندہ بن کر رہے۔ خدا کے پیغمبر انھیں حقیقتوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے آئے۔ پھر کچھ لوگوں نے ان کو مانا، اور کچھ لوگوں نے ان کا انکار کر دیا۔ اس وقت خدا نے ماننے والوں کی مدد کی اور انکار کرنے والوں کو ہلاک کر دیا۔ یہی معاملہ دونوں قسم کے انسانوں کے ساتھ آخرت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آئے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع

۴۸۔ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ پس وہ بادل کو اٹھاتی ہیں۔ پھر اللہ ان کو آسمان میں پھیلا دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے۔ اور وہ ان کو تہہ بہ تہہ کرتا ہے۔ پھر تم مینھ کو دیکھتے ہو کہ اس کے اندر سے نکلتا ہے۔ پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اسے پہنچا دیتا ہے تو یکایک وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ ۴۹۔ اور وہ اس کے نازل کیے جانے سے قبل، خوشی سے پہلے ناامید تھے۔ ۵۰۔ پس اللہ کی رحمت کے آثار کو دیکھو وہ کس طرح زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد۔ بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۵۱۔ اور اگر ہم ایک ہوا بھیج دیں، پھر وہ کھیتی کو زرد ہوئی دیکھیں تو اس کے بعد وہ انکار کرنے لگیں گے۔ ۵۲۔ تو تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ تم بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جا رہے ہوں۔ ۵۳۔ اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ پر لا سکتے ہو۔ تم صرف اس کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لانے والا ہو۔ پس یہی لوگ اطاعت کرنے والے ہیں۔

آدمی حق کا راستہ اختیار کرے تو اس کو اکثر سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ دور اول میں رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے ساتھ پیش آیا۔ مگر ان حالات میں کسی کے لیے مایوس ہونے کا سوال نہیں۔ جو خدا اتنا رحیم ہے کہ جب کھیتی کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ عالمی نظام کو متحرک کرکے اس کو سیراب کرتا ہے، وہ یقیناً اپنے راستہ پر چلنے والوں کی بھی ضرور مدد فرمائے گا۔ تاہم یہ مدد خدا کے اپنے اندازہ کے مطابق آئے گی۔ اس لیے اگر اس میں دیر ہو تو آدمی کو مایوس اور بددل نہیں ہونا چاہیے۔

خدا کی بات نہایت واضح اور نہایت مدلل بات ہے۔ مگر خدا کی بات کا مومن وہی بنے گا جو چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھے، جو باتوں کو دھیان کے ساتھ سنے۔ جس کے اندر یہ مزاج ہو کہ جو بات سمجھ میں آجائے اس کو مان لے، جس راستہ کا صحیح ہونا معلوم ہو جائے اس پر چلنے لگے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى یَوْمِ الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾

۵۴۔ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت دی، پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کردیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور وہ علم والا، قدرت والا ہے۔ ۵۵۔ اور جس دن قیامت برپا ہوگی، مجرم لوگ قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ اس طرح وہ پھیرے جاتے تھے۔ ۵۶۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان عطا ہوا تھا وہ کہیں گے کہ اللہ کی کتاب میں تو تم روزِ حشر تک پڑے رہے۔ پس یہ حشر کا دن ہے، لیکن تم جانتے نہ تھے۔ ۵۷۔ پس اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا۔

انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ نہایت کمزور بچہ ہوتا ہے۔ پھر درمیان میں طاقت اور جوانی کے کچھ سال گزارنے کے بعد دوبارہ بڑھاپے کی کمزوری آجاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی طاقت اس کی اپنی نہیں ہے۔ وہ اس کو دینے سے ملتی ہے۔ یہ دینے والے کے اختیار میں ہے کہ وہ جب چاہے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔

دنیا کی زندگی میں آدمی آخرت کے لیے فکرمند نہیں ہوتا۔ کیوں کہ قیامت اس کو بہت دور کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف بےخبری کی بات ہے۔ قیامت جب آئے گی تو اس کو ایسا معلوم ہوگا کہ بس

ایک گھڑی پچھلی دنیا میں رہنا ہوا تھا کہ اگلی دنیا کا مرحلہ پیش آ گیا۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝58 كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝59 فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۝60 ع

۵۸۔ اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں۔ اور اگر تم ان کے پاس کوئی نشانی لے آؤ تو جن لوگوں نے انکار کیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم سب باطل پر ہو۔ ۵۹۔ اس طرح اللہ مہر کر دیتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو نہیں جانتے۔ ۶۰۔ پس تم صبر کرو۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور تم کو بے برداشت نہ کر دیں وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے۔

مکہ میں لوگ کہتے تھے کہ اگر تم پیغمبر ہو تو کوئی خارق عادت کرشمہ دکھاؤ۔ مگر ان کے اس مطالبہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خارق عادت کرشمہ اصل مقصد کے اعتبار سے بے فائدہ تھا۔ اسلام کا مقصد تو یہ تھا کہ لوگوں کے عمل میں تبدیلی ہو اور عمل میں تبدیلی فکر کی تبدیلی سے آتی ہے، نہ کہ خارق عادت کرشمہ دکھا کر لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دینے سے۔

چنانچہ قرآن کا سارا زور استدلال پر ہے۔ وہ دلیل کے ذریعہ انسان کے ذہن کو بدلنا چاہتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بنانا چاہتا ہے کہ واقعات کو صحیح رخ سے دیکھے اور معاملات پر صحیح رائے قائم کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا اصل مسئلہ صحت فکر ہے۔ اگر آدمی کے اندر صحیح فکر نہ جاگا ہو تو کرشموں اور معجزوں کو دیکھ کر دوبارہ وہ کوئی ناسمجھی کا لفظ بول دے گا جس طرح وہ اس سے پہلے ناسمجھی کے الفاظ بولتا رہا ہے۔

لاعلمی کی بنا پر مہر لگنا صحت فکر نہ ہونے کی وجہ سے باتوں کو نہ سمجھنا ہے۔ آدمی کے اندر رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ چیزوں کو ان کے صحیح رخ سے نہیں دیکھ پاتا۔ اس بنا پر وہ چیزوں سے اپنے لیے صحیح رہنمائی بھی حاصل نہیں کر پاتا۔ جو اللہ کا بندہ بے آمیز حق کی دعوت لے کر اٹھے اس کو ہمیشہ لوگوں کی طرف سے حوصلہ شکن ردعمل کا سامنا پیش آتا ہے۔ داعی تمام تر آخرت کی بات کرتا ہے جب کہ لوگوں کا ذہن دنیا کے مسائل میں الجھا ہوا ہوتا ہے۔ اس بنا پر لوگ داعی کی تحقیر کرتے ہیں۔ وہ اس کو ہر لحاظ سے نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ماحول میں داعی کی بات بے وزن معلوم ہونے لگتی ہے۔

یہ صورت حال مدعو کے ساتھ داعی کو بھی آزمائش میں ڈال دیتی ہے۔ ایسے وقت میں داعی کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے یقین کو نہ کھوئے۔ اگر حالات کے دباؤ کے تحت اس نے اپنے یقین کو کھو دیا تو وہ ایسی بات بولنے لگے گا جو عام لوگوں کو شاید اہم معلوم ہو، مگر اللہ کی نظر میں اس سے زیادہ غیر اہم بات اور کوئی نہ ہوگی۔

٣١-سُوۡرَةُ لُقۡمَان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
الٓمّٓ ① تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ②
ھُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّلۡمُحۡسِنِیۡنَ ③ الَّذِیۡنَ
یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمۡ
بِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ④ اُولٰٓئِکَ عَلٰی
ھُدًی مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ⑤

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ الٓمّٓ۔ ۲۔ یہ پُرحکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔
۳۔ ہدایت اور رحمت نیکی کرنے والوں کے
لیے۔ ۴۔ جو کہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ
ادا کرتے ہیں۔ اور وہ آخرت پر یقین رکھتے
ہیں۔ ۵۔ یہ لوگ اپنے رب کے سیدھے راستے پر
ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

احسان کا اصل مفہوم ہے کسی کام کو اچھی طرح کرنا۔ محسن کے معنی ہیں اچھی طرح کرنے والا۔ اس دنیا میں کسی کام کے اچھے ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہو۔ اس اعتبار سے محسن وہ شخص ہے جو حقیقت واقعہ کا اعتراف کرے، جس کا عمل وہی ہو جو ہونا چاہیے اور وہ نہ ہو جو نہیں ہونا چاہیے۔

جو لوگ اپنے آپ کو حقیقتِ واقعہ کے مطابق ڈھالنے کا مزاج رکھیں وہی وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے صداقت آتی ہے تو وہ کسی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر اس کو مان لیتے ہیں۔ وہ فوراً ہی اس کے عملی تقاضے پورے کرنے لگتے ہیں — وہ نمازی بن جاتے ہیں جو خدا کا حق ادا کرنے کی ایک علامت ہے۔ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں جو گویا مال کے دائرے میں بندوں کا حق ادا کرنا ہے۔ وہ دنیا پرستی کو چھوڑ کر آخرت پسند بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ آخر کار جہاں ہونا چاہیے وہ آخرت ہی ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَھۡوَ الۡحَدِیۡثِ
لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ
وَّ یَتَّخِذَھَا ھُزُوًا اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ عَذَابٌ
مُّھِیۡنٌ ⑥ وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی
مُسۡتَکۡبِرًا کَاَنۡ لَّمۡ یَسۡمَعۡھَا کَاَنَّ فِیۡۤ
اُذُنَیۡہِ وَقۡرًا فَبَشِّرۡہُ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ⑦
اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمۡ

۶۔ اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو ان باتوں
کا خریدار بنتا ہے جو غافل کرنے والی ہیں، تاکہ
اللہ کی راہ سے گمراہ کرے، بغیر کسی علم کے۔ اور وہ
اس کی ہنسی اڑائے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل
کرنے والا عذاب ہے۔ ۷۔ اور جب ان کو
ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ تکبر کرتا ہوا منہ
موڑ لیتا ہے، جیسے اس نے سنا ہی نہیں، جیسے اس
کے کانوں میں بہراپن ہے۔ تو اس کو ایک
دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔

جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَعْدَ
اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۹﴾

۸۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیا، ان کے لیے نعمت کے باغ ہیں۔ ۹۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

باتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک نصیحت اور دوسری تفریح۔ نصیحت کی بات ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ وہ آدمی سے کچھ کرنے اور کچھ نہ کرنے کے لیے کہتی ہے۔ اس لیے ہر دور میں بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نصیحت کی باتوں سے دلچسپی لیں۔ انسان کا عام مزاج ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ تفریح کی باتوں کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہ نصیحت کی ''کتاب'' کے مقابلہ میں اس کتاب کا زیادہ خریدار بنتا ہے جس میں اس کے لیے ذہنی تفریح کا سامان ہو اور وہ اس سے کچھ کرنے کے لیے نہ کہے۔

جس شخص کا حال یہ ہو کہ وہ اپنی ذات سے آگے بڑھ کر دوسروں کو اس قسم کی تفریحی باتوں میں مشغول کرنے لگے وہ زیادہ بڑا مجرم ہے۔ کیوں کہ وہ اس ذہنی بے راہ روی کا قائد بنا۔ اس نے لوگوں کے ذہن کو بے فائدہ باتوں میں مشغول کر کے انھیں اس قابل نہ رکھا کہ وہ زیادہ سنجیدہ باتوں میں دھیان دے سکیں۔

سب سے بری نفسیات گھمنڈ کی نفسیات ہے۔ جو شخص گھمنڈ کی نفسیات میں مبتلا ہو اس کے سامنے حق آئے گا مگر وہ اپنے کو بلند سمجھنے کی وجہ سے اس کا اعتراف نہیں کرے گا۔ وہ اس کو حقارت کے ساتھ نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائے گا۔ اس کے برعکس معاملہ اہلِ ایمان کا ہے۔ ان کا نصیحت پسند مزاج انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ سچائی کا اعتراف کریں، وہ اپنی زندگی کو تمام تر اس کے حوالہ کر دیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى
فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ
فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۰﴾
هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ
مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۱﴾ ع ۱۰

۱۰۔ اللہ نے آسمانوں کو پیدا کیا، ایسے ستونوں کے بغیر جو تم کو نظر آئیں۔ اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دئے کہ وہ تم کو لے کر جھک نہ جائے۔ اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلا دئے۔ اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا، پھر زمین میں ہر قسم کی عمدہ چیزیں اگائیں۔ ۱۱۔ یہ ہے اللہ کی تخلیق، تو تم مجھ کو دکھاؤ کہ اس کے سوا جو ہیں انھوں نے کیا پیدا کیا ہے۔ بلکہ ظالم لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

کائنات لامتناہی خلا ہے۔ اس کے اندر بے شمار نہایت بڑے بڑے اجرام مسلسل گردش کر رہے ہیں۔ ان اجرام کا اس طرح خلا میں گردش کرتے ہوئے قائم رہنا دہشت ناک حد تک عظیم واقعہ ہے۔ پھر ہماری زمین موجودہ کائنات میں ایک انتہائی استثنائی کرہ ہے جس میں ان گنت انتظامات نے اس کے اوپر انسانی

زندگی کو ممکن بنا دیا ہے۔ انھیں انتظامات میں سے چند یہ ہیں — زمین کی سطح پر پہاڑوں کے ابھار سے توازن قائم ہونا۔ پھر پانی اور زندگی اور نباتات جیسی عجیب چیزوں کی زمین پر افراط کے ساتھ موجودگی۔

ایک خدائے برتر کے سوا کوئی نہیں جو اس عظیم نظام کو قائم رکھ سکے۔ پھر انسان کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کے سوا دوسری چیزوں کو اپنا مرکز پرستش بنائے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑫ وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ⑬

۱۲۔ اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرے گا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔ ۱۳۔ اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے، اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانا، بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

لقمان حکیم کی تاریخی حیثیت کے بارے میں ابھی تک قطعی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ تاہم وہ ایک دانش منداور خدا پرست آدمی تھے۔ قرآن بتاتا ہے کہ لقمان حکیم خدا کے ایک شکر گزار بندے تھے۔ اور اپنے بیٹے کو انھوں نے شرک سے بچنے کی تلقین کی۔ یہ دونوں باتیں ایک ہیں۔ توحید اللہ کو اپنا محسن سمجھنے کے احساس سے ابھرتی ہے۔ اور شرک یہ ہے کہ آدمی اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا محسن سمجھ لے اور اس کے لیے اپنے احسان مندی کے جذبات نچھاور کرنے لگے۔ جب دینے والا صرف ایک ہے تو شکر گزاری بھی صرف ایک ہی کی ہونی چاہیے۔ ''اور جو شخص شکر کرے تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے'' ملے ہوئے پر شکر کا جذبہ آدمی کے اندر حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ نہ ملے ہوئے پر شکایت کا ذہن آدمی کو جھنجلاہٹ اور مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ⑭ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ

النصف

۱۴۔ اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے معاملہ میں تاکید کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ تو میرا شکر کر اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ ۱۵۔ اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جو تم کو معلوم نہیں تو ان کی بات نہ ماننا۔ اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ

ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٥﴾

کرنا۔ اور تم اس شخص کے راستے کی پیروی کرنا جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے۔ پھر میں تم کو بتا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے۔

خدا کے بعد انسان کے اوپر سب سے زیادہ حق ماں باپ کا ہے۔ البتہ اگر ماں باپ کا حکم خدا کے حکم سے ٹکرائے تو اس وقت خدا کا حکم لینا ہے اور ماں باپ کا حکم چھوڑ دینا ہے۔ تاہم اس وقت بھی یہ ضروری ہے کہ ماں باپ کی خدمت کو بدستور جاری رکھا جائے۔

دو مختلف تقاضوں میں یہ توازن حکمت اسلام کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اور اسی اعلیٰ حکمت میں تمام اعلیٰ کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿١٦﴾ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٧﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿١٨﴾ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿١٩﴾ ع ۲ ۸ ۱۱

۱۶۔ اے میرے بیٹے، کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر ہو پھر وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو، اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ باریک بیں ہے، باخبر ہے۔ ۱۷۔ اے میرے بیٹے، نماز قائم کرو، اچھے کام کی نصیحت کرو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ ۱۸۔ اور لوگوں سے بے رخی نہ کر۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چل۔ بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۹۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔

موجودہ زمانہ میں سائنس کی ترقی نے ثابت کیا ہے کہ آڑ اور فاصلہ اضافی الفاظ ہیں۔ ایکسرے شعائیں جسم کے اندر تک دیکھ لیتی ہیں۔ دوربین اور خوردبین کے ذریعہ وہ چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں جو خالی آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ یہ امکان جس کا تجربہ ہم کو محدود سطح پر ہو رہا ہے یہی خدا کے یہاں لامحدود طور پر موجود ہے۔

دین پر خود عمل کرنا یا دوسروں کو دین کی طرف بلانا، دونوں ہی صبر چاہتے ہیں۔ اس کے لیے کرنے سے

پہلے سوچنا پڑتا ہے۔ نفس کی خواہش پر چلنے کے بجائے نفس کے خلاف چلنا پڑتا ہے۔ اپنی بڑائی کو محفوظ کرنے کے بجائے اپنی بڑائی کو کھودینا پڑتا ہے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا پڑتا ہے۔

یہ سب حوصلہ مندی کے کام ہیں، اور حوصلہ مند کردار ہی کا دوسرا نام اسلامی کردار ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۲۰ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۲۱

۲۰۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمھارے کام میں لگا دیا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اس نے اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دیں۔ اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، کسی علم اور کسی ہدایت اور کسی روشن کتاب کے بغیر۔ ۲۱۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں۔ ہم اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اگر شیطان ان کو آگ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو تب بھی۔

موجودہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ وہ انسان کے لیے کامل طور پر سازگار رہے۔ نیز یہ کہ موجودہ دنیا میں ہر وہ چیز افراط کے ساتھ موجود ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔ اس کے باوجود انسان کا یہ حال ہے کہ وہ خالق کائنات کا شکر نہیں کرتا۔ وہ بے معنی بحثیں پیدا کر کے چاہتا ہے کہ لوگوں کی توجہ خدا کی طرف سے پھیر دے۔

انسان کے بے راہ ہونے کا سبب اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عقل کو کام میں نہیں لاتا۔ وہ رواج عام سے ہٹ کر نہیں سوچتا۔ آدمی اگر رواج سے اوپر اٹھ جائے تو خدا کی دی ہوئی عقل خود اس کو صحیح سمت میں رہنمائی کے لیے کافی ہو جائے۔

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۲۲ وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا

۲۲۔ اور جو شخص اپنا رُخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ نیک عمل بھی ہو تو اس نے مضبوط رسی پکڑ لی۔ اور اللہ ہی کی طرف ہے تمام معاملات کا انجام کار۔ ۲۳۔ اور جس نے انکار کیا تو اس کا انکار تم کو غمگین نہ کرے۔ ہماری ہی طرف ہے ان کی واپسی۔ تو ہم

عَمِلُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُہُمۡ قَلِیۡلًا ثُمَّ نَضۡطَرُّہُمۡ اِلٰی عَذَابٍ غَلِیۡظٍ ﴿۲۴﴾

ان کو بتا دیں گے جو کچھ انھوں نے کیا۔ بے شک اللہ دلوں کی بات سے بھی واقف ہے۔ ۲۴۔ ان کو ہم تھوڑی مدت تک فائدہ دیں گے۔ پھر ان کو ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لائیں گے۔

ہر آدمی کا ایک رخ ہوتا ہے جدھر وہ اپنے پورے فکری اور عملی وجود کے ساتھ متوجہ رہتا ہے۔ مومن وہ ہے جس کا رخ پوری طرح خدا کی طرف ہو جائے۔ مومنانہ زندگی دوسرے لفظوں میں خدا رخی (God-oriented) زندگی کا نام ہے۔ اور غیر مومنانہ زندگی غیر خدا رخی زندگی کا۔

جس شخص نے خدا کی طرف رخ کیا اس نے صحیح منزل کی طرف رخ کیا۔ وہ یقیناً اچھے انجام کو پہنچے گا، اس کے برعکس، جو شخص خدا سے غافل ہو کر کسی اور طرف متوجہ ہو جائے وہ بے رخ اور بے منزل ہو گیا۔ اس کو آج کی وقتی زندگی میں کچھ فائدے ہو سکتے ہیں۔ مگر آخرت کی مستقل زندگی میں اس کے لیے عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ﴿۲۶﴾ وَ لَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَۃٍ اَقۡلَامٌ وَّ الۡبَحۡرُ یَمُدُّہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سَبۡعَۃُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ کَلِمٰتُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۷﴾

۲۵۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا، تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ ۲۶۔ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، بے شک اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔ ۲۷۔ اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ، روشنائی بن جائیں، تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

کائنات اتنی وسیع اور اتنی عظیم ہے کہ کوئی بھی شخص ہوش و حواس کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کو خدا کے سوا کسی اور نے بنایا ہے۔ مگر اس حقیقت کو ماننے کے باوجود انسان کا حال یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا دوسری چیزوں کو عظمت کا مقام دیتا ہے۔ یہی وہ غیر معقول رویہ ہے جس کا دوسرا نام شرک ہے۔

خدا کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ وہ لفظوں میں بیان کی جا سکے۔ علوم طبیعی کی تاریخ ہزاروں برس کے دائرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ مگر بے شمار تحقیقات کے باوجود ابھی تک کسی ایک چیز کے بارے میں بھی پوری

معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ انسان کو آج بھی یہ نہیں معلوم کہ خلا میں کتنے ستارے ہیں۔ زمین میں نباتات اور حیوانات کی کتنی قسمیں ہیں۔ درخت کی ایک پتی اور ریت کے ایک ذرّے کی ماہیت کیا ہے۔ سمندر کے اندر کتنے عجائبات چھپے ہوئے ہیں۔ غرض اس دنیا کی کوئی بھی چھوٹی یا بڑی چیز ایسی نہیں جس کے بارے میں انسان کو پوری معلومات حاصل ہوچکی ہوں، یہی واقعہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ درختوں کے قلم اور سمندروں کی سیاہی بھی خدا کے اَن گنت کرشموں کو تحریر کرنے کے لیے کافی نہیں۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۲۸ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۹ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝۳۰ ع ۱۳

۲۸۔ تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا۔ بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۲۹۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا ہے۔ ہر ایک چلتا ہے ایک مقرر وقت تک۔ اور یہ کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۳۰۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔ اور اس کے سوا جن چیزوں کو وہ پکارتے ہیں وہ باطل ہیں اور بے شک اللہ برتر ہے، بڑا ہے۔

انسان اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک زندگی کا وجود میں آنا ممکن ہے۔ اور جب ایک زندگی کا وجود ممکن ہو تو اسی قسم کی دوسری زندگیوں کا وجود میں آنا بدرجۂ اولیٰ ممکن ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی اس واقعہ کا تجربہ کررہا ہے کہ وہ ایک آواز کو سن سکتا ہے۔ وہ ایک منظر کو دیکھ سکتا ہے پھر جب ایک آواز کا سننا اور ایک منظر کا دیکھنا ممکن ہو تو بہت سی آوازوں کو سننا اور بہت سے مناظر کو دیکھنا ناممکن کیوں ہوگا۔

رات کو دن میں داخل کرنا اور دن کو رات میں داخل کرنا کنایہ کی زبان میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں زمین کی محوری گردش کہا جاتا ہے۔ اپنے محور پر کامل صحت کے ساتھ زمین کی مسلسل گردش اور اس طرح کے دوسرے واقعات بتاتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق و مالک ناقابل قیاس حد تک عظیم ہے۔ ایسی حالت میں اس کے سوا کون ہے جس کی عبادت کی جائے۔ جس کو اپنی زندگی میں بڑائی کا مقام دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک خدا کو چھوڑ کر جس کو بھی عظمت کا مقام دیا جاتا ہے وہ صرف ایک جھوٹ ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایک خدا کے سوا کسی کو کوئی عظمت حاصل نہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡفُلۡكَ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمۡ مِّنۡ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ﴿۳۱﴾ وَ اِذَا غَشِيَهُمۡ مَّوۡجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمۡ اِلَى الۡبَرِّ فَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ؕ وَ مَا يَجۡحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوۡرٍ ﴿۳۲﴾

۳۱۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے، تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھائے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے۔ ۳۲۔ اور جب موت ان کے سر پر بادل کی طرح چھا جاتی ہے، وہ اللہ کو پکارتے ہیں اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ پھر جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو ان میں کچھ اعتدال پر رہتے ہیں۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو بدعہد اور ناشکر گزار ہیں۔

سمندر میں کوئی چیز ڈالی جائے تو وہ فوراً ڈوب جائے گی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے پانی کو ایک خاص قانون کا پابند بنا رکھا ہے۔ اس وجہ سے کشتی اور جہاز اتھاہ سمندروں میں نہیں ڈوبتے، وہ انسان کو اور اس کے سامان کو بحفاظت ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم نشانی ہے۔ مگر اس نشانی سے صرف صابر اور شاکر انسان سبق لیتے ہیں۔ صابر وہ ہے جو اپنے آپ کو غلط احساسات کے زیر اثر جانے سے روکے۔ اور شاکر وہ ہے جو اپنے باہر پائی جانے والی حقیقت کا اعتراف کر سکے۔

تاہم جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر بے بس ہے۔ اس وقت وہ ہر ایک کی بڑائی کو بھول کر صرف خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ تجربہ جو کشتی کے مسافروں کو پیش آتا ہے اس سے لوگوں کو سبق لینا چاہیے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو ان واقعات سے سبق لیں اور حق اور عدل کی راہ پر قائم رہیں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت میں پڑے تو خدا کو یاد کر لیا اور مصیبت ہٹی تو دوبارہ سرکش اور احسان فراموش بن گئے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمۡ وَاخۡشَوۡا يَوۡمًا لَّا يَجۡزِىۡ وَالِدٌ عَنۡ وَّلَدِهٖ ۖ وَلَا مَوۡلُوۡدٌ هُوَ جَازٍ عَنۡ وَّالِدِهٖ شَيۡـئًا ؕ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا ۖ وقفة وَلَا يَغُرَّنَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۳۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ ۚ وَيَعۡلَمُ مَا فِى

۳۳۔ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہوگا۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے تو دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے۔ ۳۴۔ بے شک اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے اور وہی بارش برساتا ہے اور وہ جانتا ہے جو

الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ
غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ
ع ۱۴ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۳۴

کچھ رحم میں ہے۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ جاننے والا، باخبر ہے۔

موجودہ دنیا میں امتحان کی مصلحت سے لوگوں کو آزادی دی گئی ہے۔ اس امتحانی آزادی کو آدمی حقیقی آزادی سمجھ لیتا ہے۔ یہی سب سے بڑا دھوکا ہے۔ تمام انسانی برائیاں اسی دھوکہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان جو چاہے کرے کوئی اس کو پکڑنے والا نہیں۔ حالاں کہ آخر کار آدمی کے اوپر اتنا کٹھن وقت آنے والا ہے کہ باپ بیٹا بھی ایک دوسرے کا ساتھ دینے والے نہ بن سکیں گے۔

''قیامت آنے والی ہے تو وہ کب آئے گی'' ایسا سوال کرنا اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ انسان اپنی قریبی اور معلوم دنیا کے بارے میں بھی کل کی خبر نہیں رکھتا۔ مثلاً بارش، پیٹ کا بچہ، معاشی مستقبل، موت، ان چیزوں کے بارے میں کوئی قطعی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔ تاہم اس علمی محدودیت کے باوجود انسان ان حقیقتوں کے واقعہ ہونے کو مانتا ہے۔ اسی طرح قیامت کی گھڑی کے بارے میں بھی اس کو مجمل خبر کی بنیاد پر یقین کرنا چاہیے۔

''اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے''۔ یہاں لڑکی یا لڑکے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہاں صرف یہ ہے کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کی شخصیت کیا ہے، وہ سعید بنے گا یا سرکش، وہ انسانیت کے لیے خیر ہوگا یا شر، اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ سائنس کے نئے طریقے بچے کے صرف جسمانی وجود کو جان سکتے ہیں، وہ بچہ کے روحانی اور فطری وجود کو نہیں جان سکتے۔ سائنس کا دائرہ فزیکل (physical) وجود تک محدود ہے، اسپرچول (spiritual) وجود یا انٹلکچول (intellectual) وجود تک سائنس کی پہنچ نہیں۔ مگر اللہ کا علم انسانی شخصیت کے دونوں پہلوؤں تک محیط ہے۔ اس بارے میں سائنس کی محدودیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ حتیٰ کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی سائنس اس کے صرف فزیکل وجود کو جان سکتی ہے، اس کے اسپرچول وجود کو جاننے کے لیے سائنس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

۳۲۔ سُوْرَةُ السَّجْدَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
الٓمّٓ ۚ ۱ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ
رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ ۲ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ
بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ الٓمّٓ۔ ۲۔ یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے، اس میں کچھ شبہ نہیں، خداوند عالم کی طرف سے ہے۔ ۳۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس کو خود گھڑ لیا ہے۔ بلکہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے،

اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳

تاکہ تم ان لوگوں کو ڈراؤ جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، تاکہ وہ راہ پر آجائیں۔

’’یہ خدا کی کتاب ہے‘‘— بظاہر چند الفاظ کا ایک جملہ ہے۔ مگر یہ اتنا مشکل جملہ ہے کہ تاریخ میں یہ جملہ کہنے کی ہمت حقیقی طور پر ان خاص افراد کے سوا کسی کو نہ ہوسکی جن پر واقعۃً خدا کی کتاب اتری تھی۔ اگر کبھی کسی اور شخص نے یہ جملہ بولنے کی جرأت کی ہے تو وہ یا تو مسخرہ تھا یا پاگل۔ اور اس کا مسخرہ یا پاگل ہونا بعد کو پوری طرح ثابت ہوگیا۔

قرآن اپنا ثبوت آپ ہے۔ اس کا معجزاتی اسلوب، اس کی کسی بات کا سیکڑوں سال میں غلط ثابت نہ ہونا، اس کا اپنے مخالفین پر پوری طرح غالب آنا، یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ قرآن خدا کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ہے۔ اور جب وہ خدا کی کتاب ہے تو لازم ہے کہ ہر شخص اس کی چیتاونی پر دھیان دے، وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۶ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝۷ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ۝۸ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـــِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۹

۴۔ اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں، پھر وہ عرش پر قائم ہوا۔ اس کے سوا نہ تمھارا کوئی مددگار ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ تو کیا تم دھیان نہیں کرتے۔ ۵۔ وہ آسمان سے زمین تک تمام معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف لوٹتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھاری گنتی سے ہزار سال کے برابر ہے۔ ۶۔ وہی ہے پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا۔ زبردست ہے، رحمت والا ہے۔ ۷۔ اس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔ اور اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی۔ ۸۔ پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ ۹۔ پھر اس کے اعضاء درست کیے۔ اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو۔

چھ دنوں (چھ دوروں) میں پیدا کرنے سے مراد تدریج واہتمام کے ساتھ پیدا کرنا ہے۔ کائنات کی تدریجی تخلیق اور اس کا پر حکمت نظام بتاتا ہے کہ اس تخلیق سے خالق کا کوئی خاص مقصد وابستہ ہے۔ پھر کائنات میں مسلسل طور پر بے شمار عمل جاری ہیں۔ اس سے مزید یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والا اس کو منصوبہ بند طور پر چلا رہا ہے۔ انسان ایک حیرت ناک قسم کا زندہ وجود ہے مگر اس کے جسم کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مٹی (ارضی اجزاء) کا مرکب ہے۔ پھر یہ ابتدائی تخلیق ختم نہیں ہو جاتی بلکہ توالد وتناسل کے ذریعہ اس کا سلسلہ مستقل طور پر جاری ہے۔

ان واقعات پر جو شخص غور کرے اس کے ذہن سے ایک خدا کی عظمت کے سوا دوسری تمام عظمتیں حذف ہو جائیں گی۔ وہ خدا کا شکر گزار بندہ بن جائے گا۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو گہرائی کے ساتھ غور کریں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ ہیں جو حمد اور شکر والے بنیں۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا
لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۬ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ
كٰفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾ قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ
الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ
تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ؑ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ ع ۱۱/۱۴
نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَآ
اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا
اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ
نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ
لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ
اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ
یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا
عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

۱۰۔ اور انھوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے۔ بلکہ وہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ۱۱۔ کہو کہ موت کا فرشتہ تمھاری جان قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۲۔ اور کاش تم دیکھو جب کہ یہ مجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوں گے۔ اے ہمارے رب، ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا تو ہم کو واپس بھیج دے کہ ہم نیک کام کریں۔ ہم یقین کرنے والے بن گئے۔ ۱۳۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو اس کی ہدایت دے دیتے۔ لیکن میری بات ثابت ہو چکی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھروں گا۔ ۱۴۔ تو اب مزہ چکھو اس بات کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا۔ ہم نے بھی تم کو بھلا دیا۔ اور اپنے کیے کی بدولت ہمیشہ کا عذاب چکھو۔

انسان کی تخلیقِ اول اس کی تخلیقِ ثانی کے معاملے کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ مگر جب خدا کے سامنے جواب دہی کا یقین نہ ہو تو آدمی تخلیقِ ثانی کا مذاق اڑاتا ہے، وہ غیر سنجیدہ طور پر مختلف باتیں کرتا ہے۔

مگر یہ جسارت صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی کی امتحانی آزادی کی مدت ختم نہ ہوئی ہو۔ جب یہ مدت ختم ہوگی اور آدمی مر کر خدائے ذوالجلال کے سامنے حساب کے لیے کھڑا ہوگا تو اس کے سارے الفاظ گم ہو جائیں گے۔ اس وقت سرکش لوگ کہیں گے کہ ہم نے مان لیا۔ ہم کو دوبارہ زمین میں بھیج دیجیے تاکہ ہم نیک عمل کریں۔ مگر ان کا یہ ماننا بے فائدہ ہوگا۔ خدا کو اگر اس طرح منوانا ہوتا تو وہ دنیا ہی میں لوگوں کو ماننے کے لیے مجبور کر دیتا۔

خدا کے یہاں اس اعتراف کی قیمت ہے، جو بغیر دیکھے کیا گیا ہو۔ دیکھنے کے بعد جو اعتراف کیا جائے اس کی کوئی قیمت نہیں۔

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ﴿١٥﴾ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۡ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾

السجدۃ ۹

۱۵۔ ہماری آیتوں پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو ان کے ذریعہ سے یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ۱۶۔ ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں ڈر سے اور امید سے۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے، وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۱۷۔ تو کسی کو خبر نہیں کہ ان لوگوں کے لیے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

ہدایت کے سلسلہ میں سب سے اہم چیز مادۂ اعتراف ہے۔ ہدایت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے اندر یہ مزاج ہو کہ جب سچائی ان کے سامنے آئے تو وہ فوراً اس کو مان لیں۔ خواہ سچائی بظاہر ایک چھوٹے آدمی کے ذریعہ سامنے آئی ہو، خواہ اس کو ماننا اپنے آپ کو غلط قرار دینے کے ہم معنی ہو، خواہ اس کو مان کر اپنی زندگی کا نقشہ درہم برہم ہوتا ہوا نظر آئے، جن لوگوں کے اندر یہ حوصلہ ہو وہی سچائی کو پالیتے ہیں۔ جو لوگ یہ چاہیں کہ وہ سچائی کو اس طرح مانیں کہ ان کی بڑائی بدستور قائم رہے ایسے لوگوں کو سچائی کبھی نہیں ملتی۔

جو آدمی حق کی خاطر اپنی بڑائی کو کھو دے وہ سب سے بڑی چیز کو پالیتا ہے اور وہ خدا کی بڑائی ہے اس کی زندگی میں خدا اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی یادوں کے ساتھ سوئے اور وہ اس کی یادوں کے ساتھ جاگے۔ اس کے خوف اور امید کے جذبات تمام تر خدا کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ وہ اپنا اثاثہ اس طرح خدا کے حوالے کر دیتا ہے کہ اس میں سے کچھ بچا کر نہیں رکھتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں جنت کے ابدی باغوں میں ٹھنڈی ہوں گی۔

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۚ لَا
يَسْتَوُونَ ﴿١٨﴾ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا
فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا
مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا
عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢٠﴾
وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ
الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَنْ
أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ
عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنْتَقِمُونَ ﴿٢٢﴾ ع ٢ ١١ ١٥

۱۸۔ تو کیا جو مومن ہے وہ اس شخص جیسا ہوگا جو نافرمان ہے۔ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ ۱۹۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے تو ان کے لیے جنت کی قیام گاہیں ہیں، ضیافت ان کاموں کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔ ۲۰۔ اور جن لوگوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا آگ ہے، وہ لوگ جب اس سے نکلنا چاہیں گے تو پھر وہ اسی میں دھکیل دیے جائیں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ آگ کا عذاب چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے۔ ۲۱۔ اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے چھوٹا عذاب چکھائیں گے، شاید کہ وہ باز آجائیں۔ ۲۲۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں کے ذریعہ نصیحت کی جائے، پھر وہ ان سے اعراض کرے۔ ہم ایسے مجرموں سے ضرور بدلہ لیں گے۔

مومن وہ ہے جو خدائی سچائی کا اعتراف کرے۔ اور فاسق وہ ہے جس کے سامنے سچائی آئے تو وہ اپنی ذات کے تحفظ کی خاطر اس کا انکار کردے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف کردار ہیں اور دو مختلف کردار کا انجام ایک جیسا نہیں ہوسکتا۔

موجودہ دنیا میں جو شخص سچائی کا اعتراف کرتا ہے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ سچائی کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے۔ ایسا شخص آخرت میں بڑا بنایا جائے گا۔ اس کے برعکس، جو شخص سچائی کو نظر انداز کرے اس نے اپنی ذات کو بڑا سمجھا، ایسا شخص آخرت کی حقیقی دنیا میں چھوٹا کردیا جائے گا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ
مِنْ لِقَائِهِ ۖ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِبَنِي
إِسْرَائِيلَ ﴿٢٣﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً
يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا
بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ

۲۳۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ تو تم اس کے ملنے میں کچھ شک نہ کرو۔ اور ہم نے اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔ ۲۴۔ اور ہم نے ان میں پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، جب کہ انھوں نے صبر کیا۔ اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔ ۲۵۔ بے شک تیرا رب قیامت کے دن ان کے

بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا
مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾

درمیان ان امور میں فیصلہ کردے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے۔ ۲۶۔ کیا ان کے لیے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی قوموں کو ہلاک کردیا۔ جن کی بستیوں میں یہ لوگ آتے جاتے ہیں۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں، کیا یہ لوگ سنتے نہیں۔

خدا کی کتاب کسی گروہ کو ملنا اس کو امامت عالم کی کنجی عطا کرنا ہے۔ مگر امامت عالم کا مقام کسی گروہ کو اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ صبر کا ثبوت دے۔ لَمَّا صَبَرُوا کی تفسیر لَمَّا صَبَرُوا عَنِ الدُّنْيَا سے کی گئی ہے (تفسیر ابن کثیر، جلد 3، صفحہ 463)۔ یعنی پیشوائی کا مقام انھیں اس وقت ملا جب کہ انھوں نے دنیا سے صبر کیا۔

موجودہ دور میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ خاموش فکری مہم کے ذریعہ فرد کی سطح پر ''تعمیر شعور'' کا کام کیا جائے۔ یہ کام اگر صحیح انداز میں کیا جائے تو کچھ عرصہ کے بعد ایک طرف اعلیٰ صلاحیت کے افراد کی ایک باشعور ٹیم تیار ہوجائے گی۔ دوسری طرف عمومی سطح پر معاشرہ میں صالح تعمیری فضا پیدا ہوجائے گی۔ یہی وہ ''صبر'' ہے، جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

لوگ اسی شخص یا گروہ کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں جو انھیں اپنے سے بلند دکھائی دے۔ جو اس وقت اصول کے لیے جئے جب کہ لوگ مفاد کے لیے جیتے ہیں۔ جو اس وقت انصاف کی حمایت کرے جب کہ لوگ قوم کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔ جو اس وقت برداشت کرے جب کہ لوگ انتقام لیتے ہیں۔ جو اس وقت اپنے کو محرومی پر راضی کرلے جب کہ لوگ پانے کے لیے دوڑتے ہیں۔ جو اس وقت حق کے لیے قربان ہوجائے جب کہ لوگ صرف اپنی ذات کے لیے قربان ہونا جانتے ہیں۔ یہی صبر ہے اور جو لوگ اس صبر کا ثبوت دیں وہی قوموں کے امام بنتے ہیں۔

دین میں نئی نئی تشریح وتعبیر نکال کر جو لوگ اختلافات کھڑے کرتے ہیں وہ اپنے لیے یہ خطرہ مول لے رہے ہیں کہ آخر کار خدا ان کی بات کو رد کردے اور اس کے بعد ابدی ذلت کے سوا اور کچھ ان کے حصہ میں نہ آئے — آدمی اکثر حالات میں سبق نہیں لیتا، یہاں تک کہ جو کچھ دوسروں پر گزرا وہی اس پر بھی نہ گزر جائے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ
الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ
وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ

۲۷۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو چٹیل زمین کی طرف ہانک کرلے جاتے ہیں۔ پھر ہم اس سے کھیتی نکالتے ہیں جس سے ان کے چوپائے کھاتے ہیں اور وہ خود بھی۔ پھر کیا وہ

مَتٰی ھٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ
یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا
اِیْمَانُهُمْ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ
عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع ۳ ۸ ۱۶

دیکھتے نہیں۔ ۲۸۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۲۹۔ کہو کہ فیصلہ کے دن ان لوگوں کا ایمان نفع نہ دے گا جنھوں نے انکار کیا۔ اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ ۳۰۔ تو ان سے اعراض کرو اور منتظر رہو، یہ بھی منتظر ہیں۔

قدیم مکہ میں مشرکین ہر اعتبار سے غالب اور سربلند تھے اور اسلام ہر اعتبار سے پست اور مغلوب ہو رہا تھا۔ چنانچہ مشرکین اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعہ دیا۔ فرمایا، کیا تم خدا کی اس قدرت کو نہیں دیکھتے کہ ایک زمین بالکل خشک اور چٹیل پڑی ہوتی ہے۔ بظاہر یہ ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کبھی سرسبز و شاداب ہو سکے گی۔ مگر اس کے بعد خدا بادلوں کو لا کر اس کے اوپر بارش برساتا ہے تو چند دن میں یہ حال ہو جاتا ہے کہ جہاں خاک اڑ رہی تھی وہاں سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ خدا کی یہی قدرت یہ بھی کر سکتی ہے کہ اسلام کو اس طرح فروغ دے کہ وہی وقت کا غالب فکر بن جائے۔

۳۳۔ سُوْرَۃُ الْاَحْزَاب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ
الْمُنٰفِقِیْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱﴾
وَّاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۲﴾ وَّتَوَكَّلْ عَلَی
اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اے نبی، اللہ سے ڈرو اور منکروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کرو، بے شک اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۲۔ اور پیروی کرو اس چیز کی جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جارہی ہے، بے شک اللہ باخبر ہے اس سے جو تم لوگ کرتے ہو۔ ۳۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اور وہ اللہ کارساز ہونے کے لیے کافی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بے آمیز حق کے داعی تھے۔ اس دنیا میں جو شخص بے آمیز حق کا داعی بن کر اٹھے اس کو نہایت حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ پورے ماحول میں اجنبی بن کر رہ جاتا ہے۔ کسی کا دنیا پرستانہ مذہب داعی کے آخرت پسندانہ دین سے جوڑ نہیں کھاتا۔ کسی کی زمانہ سازی داعی کی بے لاگ حق پرستی سے ٹکراتی ہے۔ کوئی دین کو اپنی قوم پرستی کا ضمیمہ بنائے ہوئے ہوتا ہے، جب کہ داعی کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ دین کو خالص خدا پرستی کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔

ایسی حالت میں داعی اگر ماحول کا دباؤ قبول کرلے تو بہت سے لوگ اس کا ساتھ دینے والے مل جائیں گے۔ اور اگر وہ خالص حق پر قائم رہے تو ایک خدا کے سوا کوئی اور اس کا سہارا نظر نہیں آتا۔ مگر داعی کو کسی حال میں پہلا راستہ نہیں اختیار کرنا ہے۔ اس کو اللہ کے بھروسہ پر خالص حق پر قائم رہنا ہے۔ اور یہ امید رکھنا ہے کہ خدا حکیم اور علیم ہے، وہ ضرور اپنے بندے کی مدد فرمائے گا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـئِْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝۴ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵

۴۔ اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔ اور نہ تمھاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمھاری ماں بنایا اور نہ تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا بیٹا بنا دیا۔ یہ سب تمھارے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ ۵۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ پھر اگر تم ان کے باپ کو نہ جانو تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں اور تمھارے رفیق ہیں۔ اور جس چیز میں تم سے بھول چوک ہوجائے تو اس کا تم پر کچھ گناہ نہیں مگر جو تم دل سے ارادہ کرکے کرو۔ اور اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

آدمی کے سینے میں دو دل نہ ہونا بتاتا ہے کہ تضاد فکری خدا کے تخلیقی منصوبہ کے خلاف ہے۔ جب انسان کو ایک دل دیا گیا تو اس کی سوچ بھی ایک ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی دل میں بیک وقت اخلاص بھی ہو اور نفاق بھی، خدا پرستی بھی ہو اور زمانہ پرستی بھی، انصاف بھی ہو اور ظلم بھی، گھمنڈ بھی ہو اور تواضع بھی۔ آدمی دونوں میں سے کوئی ایک ہی ہوسکتا ہے اور اس کو ایک ہی ہونا چاہیے۔

یہ ایک اصولی بات ہے۔ اسی کے تحت زمانۂ جاہلیت کی رسمیں مثلاً ظِہار و تبنیت آتی ہیں۔ عرب جاہلیت کا ایک رواجی قانون یہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہہ دے کہ أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي (تو میرے اوپر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے) تو اس کی بیوی اس کے اوپر ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتی تھی جس طرح کسی کی ماں اس کے لیے حرام ہوتی ہے۔ اس کو ظِہار کہتے ہیں۔ اسی طرح متبنّٰی (منھ بولے بیٹے) کے معاملے میں بھی ان کا عقیدہ تھا کہ وہ بالکل صلبی بیٹے کی طرح ہوجاتا ہے۔ اس کو ہر معاملہ میں وہی درجہ دے دیا گیا تھا جو حقیقی اولاد کا ہوتا ہے۔ قرآن نے اس رواج کو بالکل ختم کردیا۔ قرآن میں اعلان کیا گیا کہ یہ تخلیقی نظام کے سراسر

خلاف ہے کہ حقیقی ماں اور زبان سے کہی ہوئی ماں یا حقیقی بیٹا اور منھ بولا بیٹا دونوں کی حیثیت بالکل ایک ہوجائے۔

آدمی اگر بے خبری میں کوئی غلطی کرے تو وہ خدا کے یہاں قابلِ معافی ہے۔ مگر جب کسی معاملہ کی حقیقت پوری طرح واضح ہوجائے، اس کے باوجود آدمی اپنی غلط روش کو نہ چھوڑے تو اس کے بعد وہ قابلِ معافی نہیں رہتا۔

اَلنَّبِيُّ اَوۡلٰى بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَاَزۡوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمۡ ؕ وَاُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلٰى بِبَعۡضٍ فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُهٰجِرِيۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَفۡعَلُوۡۤا اِلٰٓى اَوۡلِيٰٓئِكُمۡ مَّعۡرُوۡفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الۡكِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا ﴿۶﴾

۶۔ اور نبی کا حق مومنوں پر ان کی اپنی جان سے بھی زیادہ ہے، اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ اور رشتہ دار خدا کی کتاب میں، دوسرے مومنین اور مہاجرین کی بہ نسبت، ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں سے کچھ سلوک کرنا چاہو۔ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

پیغمبر اپنی زندگی میں ذاتی طور پر اور وفات کے بعد اصولی طور پر اہلِ ایمان کے لیے سب سے زیادہ مقدم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر دنیا میں خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ پیغمبر کی تعلیمات کی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا وجود لوگوں کی نظر میں مقدس وجود ہو۔ حتیٰ کہ اس کی بیویاں بھی لوگوں کے لیے ماؤں کی طرح قابل احترام قرار پائیں۔ پیغمبر اور آپ کی ازواج کے بعد امت کے بقیہ لوگوں کے تعلقات کی اساس یہ ہے کہ رحمی رشتے رکھنے والے الاقرب فالاقرب کے اصول پر ایک دوسرے کے حقدار ٹھہریں گے۔ دینی ضرورت کے تحت وقتی طور پر غیر رشتہ داروں میں حقوق کی شرکت قائم کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ ہجرت کے بعد ابتدائی زمانہ میں مدینہ میں کیا گیا۔ مگر مستقل معاشرتی انتظام کے اعتبار سے حقیقی رشتہ دار ہی اولیٰ اور اقرب ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ نُّوۡحٍ وَّاِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ ۖ وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ۙ﴿۷﴾ لِّيَسۡئَلَ الصّٰدِقِيۡنَ عَنۡ صِدۡقِهِمۡ ۚ وَاَعَدَّ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۸﴾ ع

۷۔ اور جب ہم نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا اور تم سے اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے۔ اور ہم نے ان سے پختہ عہد لیا۔ ۸۔ تاکہ اللہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے، اور منکروں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس منصوبہ کے تحت پیدا کیا ہے وہ امتحان ہے۔ یعنی موجودہ دنیا میں ہر قسم کے اسباب حیات دے کر اس کو آزادانہ ماحول میں رکھنا اور پھر ہر ایک کے عمل کے مطابق اس کو ابدی انعام یا ابدی سزا دینا۔

زندگی کی یہ امتحانی نوعیت لازماً یہ چاہتی ہے کہ آدمی کو اصل صورت حال سے پوری طرح باخبر کردیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کا سلسلہ قائم فرمایا۔ پیغمبری کوئی لاؤڈ اسپیکر کا اعلان نہیں ہے۔ یہ ایک بے حد صبر آزما کام ہے۔ اس لیے تمام پیغمبروں سے نہایت اہتمام کے ساتھ یہ عہد لیا گیا کہ وہ پیغام رسانی کے اس نازک کام کو اس کے تمام آداب اور تقاضوں کے ساتھ انجام دیں گے۔ اور اس میں ہرگز کوئی ادنیٰ کوتاہی نہ کریں گے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱذۡكُرُوا نِعۡمَةَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ إِذۡ جَآءَتۡكُمۡ جُنُودٞ فَأَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيحٗا وَجُنُودٗا لَّمۡ تَرَوۡهَاۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرًا ۝٩ إِذۡ جَآءُوكُم مِّن فَوۡقِكُمۡ وَمِنۡ أَسۡفَلَ مِنكُمۡ وَإِذۡ زَاغَتِ ٱلۡأَبۡصَٰرُ وَبَلَغَتِ ٱلۡقُلُوبُ ٱلۡحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِٱللَّهِ ٱلظُّنُونَا۠ ۝١٠ هُنَالِكَ ٱبۡتُلِيَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ وَزُلۡزِلُوا زِلۡزَالٗا شَدِيدٗا ۝١١

۹۔ اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، جب تم پر فوجیں چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی فوج جو تم کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور اللہ دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۱۰۔ جب کہ وہ تم پر چڑھ آئے، تمھارے اوپر کی طرف سے اور تمھارے نیچے کی طرف سے۔ اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ ۱۱۔ اس وقت ایمان والے امتحان میں ڈالے گئے اور بالکل ہلا دئے گئے۔

غزوۂ احزاب (5ھ) عرب قبائل اور یہود کی طرف سے مدینہ پر مشترک حملہ تھا۔ اس میں حملہ آوروں کی تعداد تقریباً 12 ہزار تھی۔ مسلمان اس عظیم فوج سے لڑنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی تدبیروں کے ذریعے دشمنوں کو اس قدر خوف زدہ کیا کہ تقریباً ایک مہینہ کے محاصرہ کے بعد وہ خود مدینہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اس طرح کے سخت حالات اسلامی دعوت کے ساتھ اس لیے پیش آتے ہیں کہ مسلمانوں کے گروہ سے مخلصین اور غیر مخلصین کو الگ کردیں۔ اور دوسرے یہ کہ دشمن طاقتوں کو دکھا دیں کہ خدا اپنے دین کا خود حامی ہے۔ وہ کسی حال میں اس کو مغلوب ہونے نہیں دے گا۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا
غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ
يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ
فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا
عَوْرَةٌ ۛؕ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا
فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا
ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ
اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ
قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ
مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ
فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا
تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ
يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ
اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

۱۲۔ اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے، وہ کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا وہ صرف فریب تھا۔ ۱۳۔ اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب والو، تمھارے لیے ٹھہرنے کا موقع نہیں، تو تم لوٹ چلو۔ اور ان میں سے ایک گروہ پیغمبر سے اجازت مانگتا تھا، وہ کہتا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، اور وہ غیر محفوظ نہیں۔ وہ صرف بھاگنا چاہتے تھے۔ ۱۴۔ اور اگر مدینہ کے اطراف سے ان پر کوئی گھس آتا اور ان کو فتنہ کی دعوت دیتا تو وہ مان لیتے اور وہ اس میں بہت کم دیر کرتے۔ ۱۵۔ اور انھوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہ پھیریں گے۔ اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی پوچھ ہوگی۔ ۱۶۔ کہو کہ اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمھارے کچھ کام نہ آئے گا۔ اور اس حالت میں تم کو صرف تھوڑے دنوں فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ ۱۷۔ کہو، کون ہے جو تم کو اللہ سے بچائے اگر وہ تم کو نقصان پہنچانا چاہے، یا وہ تم پر رحمت کرنا چاہے۔ اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابلہ میں کوئی حمایتی اور مددگار نہ پائیں گے۔

غزوۂ احزاب میں خطرات کا طوفان دیکھ کر منافق قسم کے لوگ گھبرا اٹھے اور بھاگنے کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ مگر جو سچے اہلِ ایمان تھے وہ اللہ کے اعتماد پر قائم رہے۔ وہ جانتے تھے کہ آگے بھی خدا ہے اور پیچھے بھی خدا ہے۔ اسلام دشمنوں کے خطرہ سے بھاگنا اپنے آپ کو خدا کے خطرہ میں ڈالنا ہے جو کہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر ہم دشمنوں کے مقابلے میں جمے رہے تو اللہ کی مدد ہم کو حاصل ہوگی اور اگر ہم اسلام کے محاذ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں تو آخر کار دنیا میں بھی اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا نہیں سکتے اور آخرت میں خدا کی ہولناک پکڑ اس کے علاوہ ہے۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ
لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ
اِلَّا قَلِيْلًا ۙ ﴿۱۸﴾ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚۖ فَاِذَا جَآءَ
الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ
اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ
فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ
حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ
يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾ يَحْسَبُوْنَ
الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ
الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي
الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ؕ وَلَوْ
كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۲ ۱۸

۱۸۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے روکنے والے ہیں اور جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ۔ اور وہ لڑائی میں کم ہی آتے ہیں۔ ۱۹۔ وہ تم سے بخل کرتے ہیں۔ پس جب خوف پیش آتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ وہ تمھاری طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اس شخص کی آنکھوں کی طرح گردش کررہی ہیں جس پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔ پھر جب خطرہ دور ہوجاتا ہے تو وہ مال کی حرص میں تم سے تیز زبانی کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ لوگ یقین نہیں لائے تو اللہ نے ان کے اعمال اکارت کردئے۔ اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔ ۲۰۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فوجیں ابھی گئی نہیں ہیں۔ اور اگر فوجیں آجائیں تو یہ لوگ یہی پسند کریں گے کہ کاش ہم بدوؤں کے ساتھ دیہات میں ہوں، تمھاری خبریں پوچھتے رہیں۔ اور اگر وہ تمھارے ساتھ ہوتے تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے۔

ایک آدمی وہ ہے جو قربانی کے وقت پیچھے رہ جائے تو اس پر شرمندگی طاری ہوتی ہے۔ اس کا بولنا بند ہوجاتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جو قربانی کے وقت قربانی نہیں دیتا۔ اور پھر دوسروں کو بھی اس سے روکتا ہے۔ یہ کوتاہی پر ڈھٹائی کا اضافہ ہے۔ کوتاہی قابل معافی ہوسکتی ہے مگر ڈھٹائی قابلِ معافی نہیں۔

جن لوگوں کے اندر ڈھٹائی کی نفسیات ہو وہ بظاہر کوئی اچھا عمل کریں تب بھی وہ بے قیمت ہیں۔ کیوں کہ عمل کی اصل روح اخلاص ہے اور وہی ان کے اندر موجود نہیں۔

دین کے لیے قربانی نہ دینا ہمیشہ دنیا کی محبت میں ہوتا ہے۔ آدمی اپنی دنیا کو بچانے کے لیے اپنے دین کو کھو دیتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگ جہاں دیکھتے ہیں کہ دین میں دنیا کا فائدہ بھی جمع ہوگیا ہے تو وہاں وہ خوب اپنے بولنے کا کمال دکھاتے ہیں، تاکہ دین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعلق ظاہر کرکے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکیں مگر جہاں دین کا مطلب قربانی ہو وہاں دین دار بننے سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ
اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾ وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ
الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ
وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا
زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ
عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ
يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ
الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ
اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٢٤﴾

۲۱۔ تمھارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ تھا، اس شخص کے لیے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔ ۲۲۔ اور جب ایمان والوں نے فوجوں کو دیکھا، وہ بولے یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔ اور اس نے ان کے ایمان اور اطاعت میں اضافہ کر دیا۔ ۲۳۔ ایمان والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کر دکھایا۔ پس ان میں سے کوئی اپنا ذمہ پورا کر چکا اور ان میں سے کوئی منتظر ہے۔ اور انھوں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔ ۲۴۔ تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا بدلہ دے اور منافقوں کو عذاب دے اگر چاہے یا ان کی توبہ قبول کرے۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

رسول اور اصحاب رسول کی زندگیاں قیامت تک کے اہلِ ایمان کے لیے خدا پرستانہ زندگی کا نمونہ ہیں، اس بات کا نمونہ کہ اللہ اور آخرت کی امیدواری کے معنی کیا ہیں۔ اللہ کو یاد کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ مشکل حالات میں ثابت قدمی کسے کہتے ہیں۔ خدا کے وعدوں پر بھروسہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ اضافہ پذیر ایمان کیا ہے اور وہ کیوں کر حاصل ہوتا ہے۔ خدا سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

رسول اور اصحابِ رسول نے ان چیزوں کا آخری نمونہ قائم کر دیا۔ شدید ترین حالات میں بھی انھوں نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی۔ انھوں نے ہر معاملہ میں اسلامی فکر اور اسلامی کردار کا کامل ثبوت دیا۔ امتحان کا لمحہ آنے سے پہلے بھی وہ حق پر قائم تھے اور امتحان کا لمحہ آنے کے بعد بھی وہ حق پر قائم رہے۔

پھر رسول اور اصحاب رسول کی زندگیاں ہی اس بات کا نمونہ بھی ہیں کہ خدا کے یہاں کسی کا فیصلہ امتحان کے بغیر نہیں کیا جاتا۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ شدید حالات پیدا کرتا ہے تاکہ سچے اہل ایمان اور جھوٹے دعوے دار ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ اس خدائی قانون میں نہ پہلے کسی کا استثناء تھا اور نہ آئندہ کسی کا استثناء ہوگا۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿٢٥﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿٢٦﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢٧﴾ ع ۳ / ۱۹

۲۵۔ اوراللہ نے منکروں کو ان کے غصے کے ساتھ پھیر دیا کہ ان کی کچھ بھی مراد پوری نہ ہوئی اور مومنین کی طرف سے لڑنے کے لیے اللہ کافی ہوگیا۔ اللہ قوت والا، زبردست ہے۔ ۲۶۔ اور اللہ نے ان اہل کتاب کو جنھوں نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا ان کے قلعوں سے اتارا۔ اور ان کے دلوں میں اس نے رعب ڈال دیا۔ تم ان کے ایک گروہ کو قتل کر رہے ہو اور ایک گروہ کو قید کر رہے ہو۔ ۲۷۔ اور اس نے ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو وارث بنا دیا۔ اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

غزوۂ خندق (احزاب) میں حالات بے حد سخت تھے۔ مگر اس میں باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کا طوفان اور فرشتوں کا لشکر بھیج کر دشمنوں کو اس طرح سراسیمہ کیا کہ وہ خود ہی میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

مدینہ کے یہود (بنوقریظہ) کا مسلمانوں سے صلح اور امن کا معاہدہ تھا۔ مگر جنگ احزاب کے موقع پر انھوں نے غداری کی۔ وہ معاہدہ کو توڑ کر مشرکین کے ساتھی بن گئے۔ جب حملہ آوروں کا لشکر مدینہ سے واپس چلا گیا تو اللہ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقریظہ کی بستیوں پر چڑھائی کی۔ اسلامی فوج نے ان کے قلعوں کو گھیر لیا۔ 25 دن تک محاصرہ جاری رہا۔ آخر میں خود ان کی درخواست پر سعد بن معاذ حَکَم مقرر ہوئے۔ حضرت سعد بن معاذ نے وہی فیصلہ کیا جو خود ان کی کتاب تورات میں ایسے مجرمین کے لیے مقرر ہے۔ یعنی بنو قریظہ کے سب جوان قتل کر دئے جائیں۔ عورتیں اور لڑکے قیدِ غلامی میں لے لیے جائیں اور ان کے مال اور جائداد کو ضبط کر لیا جائے (استثناء 20-10 :14)۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿٢٨﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ

۲۸۔ اے نبی، اپنی بیویوں سے کہو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تم کو کچھ مال و متاع دے کر خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ ۲۹۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ
لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ
مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا
الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾

آخرت کے گھر کو چاہتی ہوتو اللہ نے تم میں سے نیک کرداروں کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔
۳۰۔اے نبی کی بیویو، تم میں سے جو کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے گی، اس کو دہرا عذاب دیا جائے گا۔اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔

ہجرت نے مسلمانوں کی معاشیات کو درہم برہم کر دیا تھا۔مزید یہ کہ ہجرت کے بعد اسلام دشمنوں نے مسلمانوں کو مسلسل جنگ میں الجھا دیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی معاشی حالت بالکل برباد ہو کر رہ گئی۔

اس کا سب سے زیادہ اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑا۔آپ کے گھر والوں کا حال یہ ہوا کہ ناگزیر ضرورت کی فراہمی بھی مشکل ہوگئی۔ یہاں تک کہ آپ کی ازواج نے تنگ آ کر آپ سے نفقہ (خرچ) کا مطالبہ شروع کر دیا۔

ازواج کی طرف سے صرف ضروری خرچ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔اس کو اللہ نے زینتِ دنیا کے مطالبہ سے تعبیر فرمایا۔ یہ دراصل شدتِ اظہار ہے۔اسی طرح ''بے حیائی'' کا لفظ بھی یہاں شدتِ اظہار کے لیے آیا ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے ایک اہم ترین مشن کی تکمیل پر مامور تھے، یعنی دورِ شرک کا خاتمہ اور دورِ توحید کا قیام۔ایسی حالت میں کسی بھی دوسری چیز کو اہمیت دینا آپ کے لیے ممکن نہ تھا۔اس لیے ازواجِ رسول سے فرمایا گیا کہ یا تو صبر اور قناعت کے ساتھ رسول کے ساتھ رہو۔اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو خوش اسلوبی کے ساتھ الگ ہو جاؤ۔خانگی نزاع کھڑی کر کے پیغمبر کے ذہن کو منتشر کرنا کسی طرح بھی قابلِ برداشت نہیں۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ
تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَ
اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ
لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا
تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ
مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

☆۳۱۔اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک عمل کرے گی تو ہم اس کو اس کا دہرا اجر دیں گے۔اور ہم نے اس کے لیے باعزت روزی تیار کر رکھی ہے۔
۳۲۔اے نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔اگر تم اللہ سے ڈرو تو تم لہجہ میں نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ لالچ میں پڑ جائے اور معروف کے مطابق بات کہو۔

پیغمبر کی بیویوں کو معاشرہ میں ایک طرح کا قائدانہ مقام حاصل تھا۔ ایسے لوگوں کو حق کے آگے جھکنے کے لیے اس سے زیادہ قربانی دینی پڑتی ہے جتنی ایک عام آدمی کو دینی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے دہرا انعام کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ عمل کرنے کے لیے دوسروں سے زیادہ قوت ارادی استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے عمل کی قیمت بھی دوسروں سے زیادہ پاتے ہیں۔

پیغمبر کی عورتوں کی اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کا ربط بار بار دوسروں سے قائم ہوتا تھا۔ لوگ دینی امور میں رہنمائی کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ دوسروں سے بات کرو تو کسی قدر خشک انداز سے بات کرو۔ اس طرح بے تکلف انداز میں بات نہ کرو جس طرح ایک محرم رشتہ دار سے بات کی جاتی ہے۔

وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیۡنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ﴿ۚ۳۳﴾ وَاذۡکُرۡنَ مَا یُتۡلٰی فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالۡحِکۡمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیۡفًا خَبِیۡرًا ﴿٪۳۴﴾ ع ۴

۳۳۔ اور تم اپنے گھر میں قرار سے رہو اور سابقہ جاہلیت کی طرح دکھلاتی نہ پھرو۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے آلودگی کو دور کرے اور تم کو پوری طرح پاک کردے۔ ۳۴۔ اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کو یاد رکھو۔ بے شک اللہ باریک بیں ہے، خبر رکھنے والا ہے۔

یہاں ازواجِ رسول کو خطاب کرتے ہوئے مسلم خواتین کو عام ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں کس طرح رہیں۔ ان کو اصولاً اپنے گھر کے دائرہ میں رہنا چاہیے۔ دنیا دار عورتوں کی طرح زیب و زینت کی نمائش ان کا مقصود نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی توجہات کا مرکز یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی عبادت گزار بن جائیں۔ وہ اپنے اثاثہ کو اللہ کے لیے خرچ کریں۔ زندگی کے معاملات میں اللہ اور رسول کا جو حکم ملے اس کو فوراً اختیار کرلیں۔ وہ اللہ اور رسول کی باتوں کو سننے اور سمجھنے میں اپنا وقت گزاریں۔

یہ طرزِ زندگی وہ ہے جو آدمی کو پاک باز بناتا ہے۔ اور پاک باز آدمی ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیۡنَ

۳۵۔ بے شک اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں۔ اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں۔ اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے

وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

والی عورتیں۔ اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں۔اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں۔ اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں۔ اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں—ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مرد یا ایک عورت کو جیسا دیکھنا چاہتا ہے وہ کیا ہے۔ وہ حسب ذیل دس صفات ہیں—اسلام، ایمان، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، روزہ، عفت، ذکر اللہ۔

ان دس الفاظ میں اسلامی عقیدہ اور اسلامی کردار کے تمام پہلو سمٹ آئے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ کے یہاں مغفرت اور انعام کا امیدوار ہو اس کو ایسا بننا چاہیے کہ وہ اللہ کے حکم کے آگے جھکنے والا ہو۔ وہ اللہ پر یقین کرنے والا ہو۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ کے لیے یکسو ہو جائے۔ اس کی زندگی قول اور فعل کے تضاد سے خالی ہو۔ وہ ہر حال میں جما رہنے والا ہو۔ اللہ کی بڑائی کے احساس نے اسے متواضع بنا دیا ہو۔ وہ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کو بھی اپنی ذمہ داری شمار کرتا ہو۔ وہ روزہ دار ہو جو نفس کو کنٹرول کرنے کی تربیت ہے۔ وہ شہوانی خواہشات کے مقابلہ میں عفیف اور پاک دامن ہو۔ اس کے صبح و شام اللہ کی یاد میں بسر ہونے لگیں۔

یہ اوصاف جس طرح مردوں سے مطلوب ہیں اسی طرح وہ عورتوں سے بھی مطلوب ہیں۔ ان اوصاف کے اظہار کا دائرہ بعض اعتبار سے دونوں کے درمیان مختلف ہے۔ مگر جہاں تک خود اوصاف کا تعلق ہے وہ دونوں کے لیے یکساں ہے۔ کوئی عورت ہو یا کوئی مرد وہ اسی وقت خدا کے یہاں قابل قبول ٹھہرے گا جب کہ وہ ان دس صفتوں سے متصف ہو کر خدا کے یہاں پہنچے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ﴿۳۶﴾

۳۶۔ کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اس میں اختیار باقی رہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

انسان کو خودمختار پیدا کیا گیا ہے۔ اس خود مختاری کو اسے خدا کے حوالے کرنا ہے۔ یہی موجودہ دنیا میں انسان کا اصل امتحان ہے۔ وہی شخص ہدایت پر ہے جو اس نازک امتحان میں پورا اترے۔

اس کی ایک مثال دوراول میں زید اور زینب کے نکاح کا واقعہ ہے۔ زید ایک آزاد کردہ غلام تھے۔ اس کے برعکس، زینب قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ کیونکہ وہ امیمہ بنت عبد المطلب کی صاحب زادی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کا نکاح زینب سے کرنا چاہا تو زینب کے گھر والے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ خود زینب نے کہا کہ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ حَسَبًا (تفسیر الطبری، جلد 20، صفحہ 272)۔ مگر جب ان لوگوں کو قرآن کی مذکورہ آیت سنائی گئی تو وہ لوگ فوراً راضی ہو گئے۔ 4 ہجری میں ان کا نکاح کر دیا گیا۔

یہی اسلام کا مزاج ہے اور یہی مزاج ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت میں ہونا چاہیے۔

وَ اِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِ اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ وَ اتَّقِ اللّٰہَ وَ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ وَ تَخۡشَی النَّاسَ ۚ وَ اللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡہَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَہَا لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِیَآئِہِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡہُنَّ وَطَرًا ؕ وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اور جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے انعام کیا اور تم نے انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو۔ اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور تم لوگوں سے ڈر رہے تھے اور اللہ زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زید اس سے اپنی غرض تمام کر چکا، ہم نے تم سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے۔ جب کہ وہ ان سے اپنی غرض تمام کرلیں۔ اور اللہ کا حکم ہونے والا ہی تھا۔

حضرت زید کے ساتھ حضرت زینب کا نکاح 4 ہجری میں ہوا۔ مگر نباہ نہ ہو سکا اور اگلے سال دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ حضرت زید نے جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے طلاق کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ نے سبب پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنے خاندانی شرف کی وجہ سے میرے مقابلہ میں بڑائی کا احساس رکھتی ہیں (تَتَعَظَّمُ عَلَيَّ لِشَرَفِهَا) تفسیر البغوی، جلد 3، صفحہ 642۔ تاہم آپ نے انھیں روکا۔ بار بار کی درخواست پر آخر کار آپ نے انھیں علیحدگی کی اجازت دے دی۔ زید اور زینب کے نکاح سے اولاً یہ رسم توڑی گئی تھی کہ معاشرتی فرق کو نکاح میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ مگر جب ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی تو اب اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہوئی کہ زینب کو ایک اور غلط رسم کے توڑنے کا ذریعہ بنایا جائے۔

قدیم جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کو بالکل حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ ہر اعتبار

سے اس کے وہی حقوق تھے جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ اس رسم کو توڑنے کی بہترین صورت یہ تھی کہ طلاق کے بعد حضر زینب کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر دیا جائے۔ زید رسول اللہ کے متبنیٰ تھے۔ حتی کہ ان کو زید بن محمد کہا جانے لگا تھا۔ ایسی حالت میں منہ بولے بیٹے کی مطلقہ عورت سے آپ کا نکاح کرنا اس رسم کے خلاف ایک دھما کہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ متبنیٰ کی منکوحہ باپ پر حرام ہے جس طرح حقیقی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشگی طور پر بتایا جا چکا تھا کہ اگر دونوں میں علیحدگی ہوئی تو اس جاہلی رسم کو توڑنے کی تدبیر کے طور پر زینب کو آپ کے نکاح میں دے دیا جائے گا۔ چوں کہ اس قسم کا نکاح قدیم ماحول میں زبردست بدنامی کا ذریعہ ہوتا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کو روکتے رہے کہ اگر وہ طلاق نہ دیں تو میں اس شدید آزمائش سے بچ جاؤں گا۔ مگر جو چیز علم الٰہی میں مقدر تھی وہ ہو کر رہی۔ زید نے زینب کو طلاق دیدی اور اس رسم کو توڑنے کی عملی تدبیر کے طور پر 5 ہجری میں زینب کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا گیا۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ
لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَ
كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۨ ﴿٣٨﴾ الَّذِيْنَ
يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَ لَا
يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ
حَسِيْبًا ﴿٣٩﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ
رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ
النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٤٠﴾ ع

۳۸۔ پیغمبر کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو۔ یہی اللہ کی سنت ان پیغمبروں کے معاملہ میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں۔ اور اللہ کا حکم ایک قطعی فیصلہ ہوتا ہے۔ ۳۹۔ وہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔ ۴۰۔ محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

اِس واقعہ کے بعد حسب توقع آپ کے خلاف زبردست پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ کہا جانے لگا کہ پیغمبر نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا، حالانکہ بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہوتی ہے۔ فرمایا کہ — محمد کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان کی صرف لڑکیاں ہیں۔ وہ مردوں میں سے کسی کے باپ ہی نہیں۔ زید بن حارثہ ان کے صرف منھ بولے بیٹے تھے اور منھ بولا بیٹا واقعی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے مطلقہ سے نکاح آپ کے لیے جائز نہ ہو۔

آپ خدا کے پیغمبر تھے، پھر بھی آپ کے ساتھ اتنے اتار چڑھاؤ کے واقعات کیوں پیش آئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر پر اگرچہ خدا کی وحی آتی ہے۔ مگر اس کو عام انسانوں کی طرح رہنا ہوتا ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں اس کو بھی ویسے ہی حالات پیش آتے ہیں جیسے حالات دوسروں کو پیش آتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پیغمبر کی زندگی عام انسانوں پر حجت نہ بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرانہ رہنمائی حقیقی حالات کے

ڈھانچہ میں دی جاتی ہے، نہ کہ مصنوعی حالات کے ڈھانچہ میں۔

خاتم النبیین کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ آپ نبیوں کی مہر ہیں۔ خاتم کا لفظ اسٹیمپ (stamp) کے لیے نہیں آتا ہے بلکہ سیل (seal) کے لیے آتا ہے، یعنی آخری عمل۔ لفافہ کو سیل کرنے کا مطلب اس کو آخری طور پر بند کرنا ہے کہ اس کے بعد نہ کوئی چیز اس کے اندر سے باہر نکلے اور نہ باہر سے اندر جائے۔ چنانچہ عربی میں قوم کا خاتم قوم کے آخری شخص کو کہا جاتا ہے (خاتِمُ القَوْمِ آخرہم) لسان العرب، جلد 12، صفحہ 164۔ اس واقعہ کے ذیل میں آپ کے خاتم النبیین ہونے کے اعلان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد چونکہ کوئی اور نبی آنے والا نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ تمام خدائی باتوں کا اظہار آپ کے ذریعہ سے کر دیا جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿۴۱﴾ وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾

۴۱۔ اے ایمان والو، اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔ ۴۲۔ اور اس کی تسبیح کرو صبح اور شام۔ ۴۳۔ وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ اور وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔ ۴۴۔ جس روز وہ اس سے ملیں گے، ان کا استقبال سلام سے ہوگا۔ اور اس نے ان کے لیے باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔

جب ملاوٹی دین کا غلبہ ہو، اس وقت سچے دین کو اختیار کرنا ہمیشہ مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اہل ایمان کے دل میں بعض اوقات دل شکستگی اور مایوسی کے جذبات طاری ہونے لگتے ہیں۔ اس سے بچنے کی صرف ایک ہی یقینی صورت ہے — ظاہری ناخوش گواریوں کے پیچھے جو خوش گوار پہلو چھپا ہوا ہے، اس پر نظر کو جمائے رکھنا۔

لوگ مادیات کے بل پر جیتے ہیں۔ مومن کو افکار (ideas) کے بل پر جینا پڑتا ہے۔ افکار کی سطح پر جینا یہ ہے کہ آدمی اللہ کی یادوں میں جینے لگے فرشتوں کا غیر مسموع کلام اسے سنائی دینے لگے۔ اس کو صحیح مقصد کی شکل میں جو فکری دریافت ہوئی ہے اس کو وہ سب سے بڑی چیز سمجھے۔ دنیا کو دے کر آخرت میں جو کچھ ملنے والا ہے اس پر وہ پوری طرح راضی اور مطمئن ہو جائے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ

۴۵۔ اے نبی، ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ۴۶۔ اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ۔

لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ فَضۡلًا كَبِيۡرًا ﴿۴۷﴾ وَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ وَدَعۡ اَذٰىهُمۡ وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۴۸﴾

۴۷۔ اور مومنوں کو بشارت دے دو کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔
۴۸۔ اور تم منکروں اور منافقوں کی بات نہ مانو اور ان کے ستانے کو نظر انداز کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے۔

شاہد، مبشر، نذیر، داعی، یہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ پیغمبر کا مشن یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرے۔ وہ لوگوں کو جنت اور جہنم کی خبر دے۔ یہ ایک دعوتی عمل ہے اور اسی دعوتی عمل کی بنیاد پر پیغمبر آخرت کی عدالت میں ان لوگوں کے بارے میں گواہی دے گا جس پر اس نے امر حق پہنچایا اور پھر کسی نے مانا اور کسی نے نہ مانا۔

پیغمبر کا جو مشن ہے وہ امت مسلمہ کا مشن بھی ہے۔ اس راہ میں لوگوں کی طرف سے اذیتیں پیش آتی ہیں۔ کوئی ساتھ نہیں دیتا اور کوئی وقتی طور پر ساتھ دیتا ہے اور پھر جھوٹے الفاظ بول کر الگ ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں صرف خدا پر بھروسہ ہی وہ چیز ہے جو پیغمبر (یا اس کی پیروی کرنے والے داعی) کو دعوتی عمل پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے جو کچھ پیش آئے اس پر صبر کرنا اور اس کو نظر انداز کرنا اور ہر حال میں خدا پر اپنی نظر جمائے رکھنا، یہی اسلامی دعوت کا کام کرنے والے کا اصل سرمایہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَكَحۡتُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ فَمَا لَكُمۡ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ عِدَّةٍ تَعۡتَدُّوۡنَهَا ۚ فَمَتِّعُوۡهُنَّ وَسَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اے ایمان والو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو ان کے بارے میں تم پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کا تم شمار کرو۔ پس ان کو کچھ متاع دے دو اور خوبی کے ساتھ ان کو رخصت کر دو۔

ایک شخص کسی عورت سے نکاح کرے لیکن ملاقات کی نوبت آنے سے پہلے اس کو طلاق دے دے تو ایسی حالت میں عدت کی وہ پابندی نہیں ہے جو عام نکاح میں ہوتی ہے۔ البتہ اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے کہ جس طرح باعزت انداز میں دونوں کے درمیان تعلق کا معاملہ ہوا تھا اسی طرح باعزت طور پر دونوں کے درمیان جدائی کا معاملہ بھی کیا جائے۔ اس خاتون کا اگر مہر باندھا گیا تھا تو مرد کو مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا ورنہ عرف اور حیثیت کے مطابق کچھ دے کر خوب صورتی سے رخصت کر دیا جائے۔ عورت اگر چاہے تو فوراً ہی دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ اس صورت میں اس کے لیے عدت گزارنے کی شرط نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ
اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ
اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ
وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ
مَعَكَ ؗ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا
لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ
خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ
عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ
حَرَجٌ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰

۵۰۔ اے نبی، ہم نے تمھارے لیے حلال کردیں تمھاری وہ بیویاں جن کی مہر تم دے چکے ہو اور وہ عورتیں بھی جو تمھاری مملوکہ ہیں جو اللہ نے غنیمت میں تم کو دی ہیں اور تمھارے چچا کی بیٹیاں اور تمھاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمھارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمھاری خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہو۔ اور اس مسلمان عورت کو بھی جو اپنے آپ کو پیغمبر کو دے دے، بشرطیکہ پیغمبر اس کو نکاح میں لانا چاہے، یہ خاص تمھارے لیے ہے، مسلمانوں سے الگ۔ ہم کو معلوم ہے جو ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور ان کی باندیوں کے بارے میں فرض کیا ہے، تاکہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

عام مسلمانوں کے لیے بیویوں کی آخری تعداد کو چار تک محدود رکھا گیا ہے۔ مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ پابندی نہیں تھی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی خصوصی اجازت کے تحت چار سے زیادہ نکاح کیا۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ رسول کے اوپر کوئی تنگی نہ رہے۔

تنگی سے مراد پیغمبرانہ مشن کی ادائیگی میں تنگی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف دعوتی اور اصلاحی تقاضوں کے تحت ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ آپ زیادہ عورتوں کو اپنے نکاح میں لاسکیں۔ اسی دینی مصلحت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے چار کی قید نہیں رکھی۔ مثال کے طور پر حضرت عائشہ سے نکاح میں یہ مصلحت تھی کہ ایک کم عمر اور ذہین خاتون آپ کی مستقل صحبت میں رہیں تاکہ آپ کے بعد لمبی مدت تک لوگوں کو دین سکھاتی رہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ آپ کی وفات کے بعد نصف صدی تک امت کے لیے ایک زندہ کیسٹ ریکارڈر بنی رہیں۔ اسی طرح حضرت میمونہ بنت الحارث اور حضرت اُم حبیبہ سے نکاح کا یہ فائدہ ہوا کہ خالد بن ولید اور ابو سفیان بن حرب کی مخالفت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی، وغیرہ۔

تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِيْۤ اِلَيْكَ مَنْ
تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ

۵۱۔ تم ان میں سے جس جس کو چاہو دور رکھو اور جس کو چاہو اپنے پاس رکھو۔ اور جن کو دور کیا تھا ان میں سے پھر کسی کو طلب کرو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اس میں زیادہ توقع ہے کہ ان کی آنکھیں

وَ لَا یَحْزَنَّ وَ یَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ
اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا
حَلِیْمًا ﴿۵۱﴾ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ
تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ
حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ
عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ﴿۵۲﴾ ع

ٹھنڈی رہیں گی، اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی۔ اور وہ اس پر راضی رہیں جو تم ان سب کو دو۔ اور اللہ جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ اور اللہ جاننے والا ہے، بردبار ہے۔ ۵۲۔ ان کے علاوہ اور عورتیں تمھارے لیے حلال نہیں ہیں۔ اور نہ یہ درست ہے کہ تم ان کی جگہ دوسری بیویاں کرلو، اگرچہ ان کی صورت تم کو اچھی لگے، مگر جو تمھاری مملوکہ ہو۔ اور اللہ ہر چیز پر نگراں ہے۔

جہاں کئی خواتین کا مسئلہ ہو وہاں شکایت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئی بیویاں تھیں اس بنا پر اندیشہ تھا کہ حقوقِ زوجیت کے بارے میں خواتین کو عدم مساوات کی شکایت ہو اور اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکسوئی کے ساتھ دینی مہم کی ادائیگی نہ فرما سکیں۔ اس لیے اعلان فرمایا کہ پیغمبر کا معاملہ خصوصی معاملہ ہے۔ وہ عام مسلمانوں کی طرح حقوق زوجیت میں مساوات کے پابند نہیں ہیں۔ حقوقِ زوجیت کی رعایت اور حقوقِ اسلام کی رعایت میں ٹکراؤ ہو تو پیغمبر کے لیے جائز ہوگا کہ وہ حقوقِ اسلام کی رعایت کو ترجیح دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عام ضابطہ سے مستثنیٰ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خواتین کے اندر شکایتی ذہن کی پیدائش کو روکا جاسکے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اختیار کو عملاً بہت ہی کم استعمال فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ
النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ
نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ ۙ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا
فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ
لِحَدِیْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ
فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ ٞ وَ اللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ
وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ
وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ
وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا

۵۳۔ اے ایمان والو، نبی کے گھروں میں مت جایا کرو مگر جس وقت تم کو کھانے کے لیے اجازت دی جائے، ایسے طور پر کہ اس کی تیاری کے منتظر نہ رہو۔ لیکن جب تم کو بلایا جائے تو داخل ہو۔ پھر جب تم کھا چکو تو اُٹھ کر چلے جاؤ اور باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہو۔ اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے۔ مگر وہ تمھارا لحاظ کرتے ہیں۔ اور اللہ حق بات کہنے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اور جب تم ازواجِ رسول سے کوئی چیز مانگو تو پردے کی اوٹ سے مانگو۔ یہ طریقہ تمھارے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔ اور تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ

رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿۵۳﴾ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾

کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ تم ان کے بعد ان کی بیویوں سے کبھی نکاح کرو یہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین بات ہے۔ ۵۴۔تم کسی چیز کو ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ تو اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں حکم دیتے ہوئے مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ ان کی گھریلو معاشرت کے آداب کس قسم کے ہونے چاہئیں— وہ دوسروں کے گھروں میں داخل ہوں تو اجازت لے کر داخل ہوں۔ کھانے یا کسی اور ضرورت کے لیے کسی کے یہاں بلایا جائے تو صرف بقدر ضرورت وہاں بیٹھیں اور فراغت کے بعد فوراً واپس ہو جائیں۔ دوسروں سے ملنے جائیں تو غیر ضروری باتوں سے شدید پرہیز کریں۔ عورتوں سے متعلق کوئی کام ہو تو پردے کی آڑ سے اس کو انجام دیں، وغیرہ۔

معاشرتی زندگی میں آدمی کو صرف اپنی خواہش یا ضرورت نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس کو نہایت شدت سے یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس کے رویہ سے دوسرے شخص کو تکلیف نہ پہنچے۔ اس کی غیر ضروری باتیں دوسرے کا وقت ضائع کرنے والی نہ ہوں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْۤ اٰبَآئِهِنَّ وَلَاۤ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَاۤ اِخْوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَاۤ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۵۵﴾

۵۵۔پیغمبر کی بیویوں پر اپنے باپوں کے بارے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور نہ اپنے بیٹوں کے بارے میں اور نہ اپنے بھائیوں کے بارے میں اور نہ اپنے بھتیجوں کے بارے میں اور نہ اپنے بھانجوں کے بارے میں اور نہ اپنی عورتوں کے بارے میں اور نہ اپنی لونڈیوں کے بارے میں۔ اور تم اللہ سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔

اوپر کی آیت میں مَردوں کے لیے یہ ممانعت تھی کہ وہ ازواج رسول کے سامنے نہ آئیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ محرم رشتہ دار اور میل جول کی عورتیں ان پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں۔ یہاں جن رشتوں کا ذکر ہے اس میں وہ رشتے بھی آجائیں گے جو ان کے حکم میں داخل ہوں۔ اس قرآنی ہدایت کی مزید تفصیل سورہ نور (آیت 31) میں موجود ہے۔

تمام احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت ہو یا مرد اس کے دل میں اللہ کا ڈر ہو۔ وہ یہ سمجھ کر زندگی گزارے کہ اللہ ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا
تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ
اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا
فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۸﴾ ع

۵۶۔ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو، تم بھی اس پر درود وسلام بھیجو۔ ۵۷۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں۔ اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۵۸۔ اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اذیت دیتے ہیں بغیر اس کے کہ انھوں نے کچھ کیا ہو تو انھوں نے بہتان کا اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں خدا کے دین کا اظہار کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ اللہ کا جو بندہ اس طرح کے مقدس کام کے لیے اٹھے اس کو خدا اور اس کے فرشتوں کی کامل تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ہم نوائی کرنا خدا اور اس کے فرشتوں کی ہم نوائی کرنا ہوتا ہے۔ اور اس سے اعراض کرنا خدا اور اس کے فرشتوں سے اعراض کرنا ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا وہ اپنے خیال کے مطابق صرف ایک انسان کو ستا رہے تھے۔ مگر وہ بھول گئے کہ وہ خدا کے نمائندہ کو ستا رہے ہیں۔ اور جو لوگ خدا کے نمائندہ کو ستائیں، انھوں نے مالک کائنات کی نظر میں ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو ملعون بنا لیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ
الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ
جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا
يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾ لَئِنْ
لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ
بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾
مَّلْعُوْنِيْنَ ۛ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا

۵۹۔ اے نبی، اپنی بیویوں سے کہو اور اپنی بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہ نیچے کر لیا کریں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس سے جلدی پہچان ہو جائے گی تو وہ ستائی نہ جائیں گی۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۶۰۔ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو مدینہ میں جھوٹی خبریں پھیلانے والے ہیں، اگر وہ باز نہ آئے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر وہ تمھارے ساتھ مدینہ میں بہت کم رہنے پائیں گے۔ ۶۱۔ پھٹکارے ہوئے، جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں

تَقْتِيْلًا ۝٦١ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝٦٢

گے۔ ۶۲۔ یہ اللہ کا دستور ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں۔اور تم اللہ کے دستور میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

مسلمان عورت جب کسی ضرورت سے اپنے گھر کے باہر نکلے تو وہ کس طرح نکلے۔اس کو ایسے لباس میں نکلنا چاہیے جو اس بات کا ایک خاموش اعلان ہو کہ وہ ایک شریف اور حیادار عورت ہے۔وہ سنجیدہ ضرورت کے تحت باہر نکلی ہے، نہ کہ تفریح اور دل لگی کے لیے۔سادہ کپڑے، حیادار چال، چادر یا برقعہ سے جسم ڈھکا ہوا ہونا اسی کی ایک علامت ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جسمانی نمائش کے ساتھ باہر نکلنا دوسروں کو دعوتِ التفات دینا ہے۔ اور جسمانی نمائش کے بغیر نکلنا گویا عمل کی زبان میں دوسروں سے یہ کہنا ہے کہ میں صرف اپنے کام سے باہر نکلی ہوں، مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔

''دل کے مریضوں'' سے یہاں مراد غالباً یہود ہیں۔کیوں کہ وہی لوگ مسلمانوں کو اور مسلم خواتین کو زیادہ پریشان کر رہے تھے اور یہی لوگ تھے جو مذکورہ تنبیہ کے مطابق قتل کیے گئے یا شہر سے نکال دئے گئے تھے۔

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا
عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ
تَكُوْنُ قَرِيْبًا ۝٦٣ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ
اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝٦٤ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۚ لَا
يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝٦٥ يَوْمَ تُقَلَّبُ
وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا
اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝٦٦ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ
اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا
السَّبِيْلَا ۝٦٧ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ
الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝٦٨ ع ۸/۵

۶۳۔لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔کہو کہ اس کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے۔اور تم کو کیا خبر، شاید قیامت قریب آگئی ہو۔ ۶۴۔ بے شک اللہ نے منکروں کو رحمت سے دور کر دیا ہے۔اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار ہے۔ ۶۵۔اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ نہ کوئی حامی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔ ۶۶۔جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے۔وہ کہیں گے، اے کاش، ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ ۶۷۔اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب، ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انھوں نے ہم کو راستے سے بھٹکا دیا۔ ۶۸۔اے ہمارے رب ، ان کو دہرا عذاب دے اور ان پر بھاری لعنت کر۔

قیامت کی تاریخ پوچھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ قیامت کے آنے کو سرے سے مانتے ہی نہ

تھے۔ یہ دراصل قیامت کا استہزاء نہ تھا بلکہ قیامت کی خبر دینے والے کا استہزا تھا۔ وہ نفس قیامت کے منکر نہ تھے بلکہ قیامت کی اس نوعیت کے منکر تھے جس کی رسول اور اصحاب رسول انھیں خبر دے رہے تھے۔

ان کی اصل غلطی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے قومی اکابر کو بڑا سمجھا اور پیغمبر کو بڑا نہ سمجھا۔ اس لیے انھیں اپنے قومی اکابر کی بات قابل لحاظ نظر آئی اور پیغمبر کی بات قابل لحاظ نظر نہ آئی۔ چنانچہ قیامت میں جب اصل حقیقت کھلے گی تو وہ افسوس کریں گے کہ کاش ہم جھوٹی بڑائی اور سچی بڑائی کے فرق کو سمجھتے اور جھوٹی بڑائی کے فریب میں مبتلا ہو کر گمراہ نہ ہوتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا ﴿٦٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٧٠﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧١﴾

۶۹۔ اے ایمان والو، تم ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی تو اللہ نے اس کو ان لوگوں کی باتوں سے بری ثابت کیا۔ اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا۔ ۷۰۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ ۷۱۔ وہ تمھارے اعمال سدھارے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

''یہودیوں کی طرح پیغمبر کو نہ ستاؤ'' سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت ایک واقعہ سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے کہ ایک بار آپ کے پاس کچھ مال آیا۔ آپ نے اس کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس کے بعد انصار میں سے ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا: خدا کی قسم محمد نے اس تقسیم سے اللہ کی رضا اور آخرت کا گھر نہیں چاہا ہے (وَاللَّهِ مَا أَرَادَ مُحَمَّدٌ بِقِسْمَتِهِ الَّتِي قَسَمَهَا وَجْهَ اللَّهِ وَلَا الدَّارَ الْآخِرَةَ) سنن الترمذی، حدیث نمبر 3896۔ اس واقعہ کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کی رحمت موسیٰ پر ہو۔ ان کو اس سے زیادہ اذیت دی گئی مگر انھوں نے صبر کیا (رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَى مُوسَى، لَقَدْ أُوذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هَذَا فَصَبَرَ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 4335۔

کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے سدید کلام۔ دوسرا ہے غیر سدید کلام۔ سدید کلام وہ ہے جو عین مطابقِ حقیقت ہو۔ جو واقعاتی تجزیہ پر مبنی ہو۔ جو ٹھوس دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس کے برعکس، غیر سدید کلام وہ ہے جس میں حقیقت کی رعایت شامل نہ ہو۔ جس کی بنیاد ظن و گمان پر قائم ہو جس کی حیثیت محض رائے زنی کی ہو، نہ کہ حقیقتِ واقعہ کے اظہار کی۔ اول الذکر کلام مومنانہ کلام ہے اور ثانی الذکر کلام منافقانہ کلام۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿٧٢﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧٣﴾ ع

۷۲۔ ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ ۷۳۔ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے۔ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر توجہ فرمائے۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

امانت سے مراد اختیار ہے۔ اختیار کو امانت اس لیے فرمایا کہ وہ اللہ کی ایک چیز ہے جس کو اس نے عارضی مدت کے لیے انسان کو بطور آزمائش دیا ہے تاکہ انسان خود اپنے ارادہ سے خدا کا تابع دار بنے۔ امانت، دوسرے لفظوں میں، اپنے اوپر خدا کا قائم مقام بننا ہے۔ اپنے آپ پر وہ کرنا ہے جو خدا ستاروں اور سیاروں پر کر رہا ہے۔ یعنی اپنے اختیار سے اپنے آپ کو خدا کے کنٹرول میں دے دینا۔

اس کائنات میں صرف اللہ حاکم ہے اور تمام چیزیں اسی کی محکوم ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی کہ وہ ایک ایسی آزاد مخلوق پیدا کرے جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے اختیار سے وہی کرے جو خدا اس سے کروانا چاہتا ہے۔ یہ اختیاری اطاعت بڑی نازک آزمائش تھی۔ آسمان اور زمین اور پہاڑ بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتے۔ تاہم انسان نے شدید اندیشہ کے باوجود اس کو قبول کر لیا۔ اب انسان موجودہ دنیا میں خدا کی ایک امانت کا امین ہے۔ اس کو اپنے اوپر وہی کرنا ہے جو خدا دوسری چیزوں پر کر رہا ہے۔ انسان کو اپنے آپ پر خدا کا حکم چلانا ہے۔ انسان حالتِ امتحان میں ہے اور موجودہ دنیا اس کے لیے وسیع امتحان گاہ۔

یہ امانت ایک بے حد نازک ذمہ داری ہے۔ کیوں کہ اسی کی وجہ سے جزا و سزا کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری مخلوقات مجبور و مقہور ہیں۔ اس لیے ان کے واسطے جزا و سزا کا مسئلہ نہیں۔ انسان آزاد ہے۔ اس لیے وہ جزا و سزا کا مستحق بنتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امانت کو آدم کے سامنے پیش کیا۔ تو آدم نے پوچھا کہ امانت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اگر تم اچھا کرو گے تو تم کو اس کا بدلہ ملے گا اور اگر تم برا کرو گے تو تم کو سزا دی جائے گی (إِنْ أَحْسَنْتَ جُزِيتَ، وَإِنْ أَسَأْتَ عُوقِبْتَ) تفسیر الطبری، جلد 20، صفحہ 338۔

٣٤۔سُوْرَۃُ سَبَا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی
الۡاَرۡضِ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ ہُوَ
الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ① یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی
الۡاَرۡضِ وَ مَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَ مَا یَنۡزِلُ مِنَ
السَّمَآءِ وَ مَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَ ہُوَ الرَّحِیۡمُ
الۡغَفُوۡرُ ②

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔تعریف خدا کے لیے ہے جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اسی کی تعریف ہے آخرت میں اور وہ حکمت والا، جاننے والا ہے۔ ۲۔وہ جانتا ہے جو کچھ زمین کے اندر داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے، اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے۔اور وہ رحمت والا، بخشنے والا ہے۔

کائنات اپنے خالق کا تعارف ہے۔اس کی ہیبت ناک وسعت خالق کی عظمت کو بتاتی ہے۔اس کا حد کمال تک موزوں ہونا بتاتا ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا ایک کامل و مکمل ہستی ہے۔اس کے تمام اجزاء کا حددرجہ توافق کے ساتھ عمل کرنا ثابت کرتا ہے کہ اس کا چلانے والا انتہائی حد تک حکیم اور علیم ہے۔کائنات کا انسان کے لیے مکمل طور پر سازگار ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا خالق اپنی مخلوقات کے لیے بے حد رحیم و کریم ہے۔

جو شخص کائنات پر غور کرے گا وہ خدا کے جلال و کمال کے احساس سے سرشار ہو جائے گا۔وہ یقین کرلے گا کہ ازل سے ابد تک عظمتیں صرف ایک خدا کے لیے ہیں اس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَاۡتِیۡنَا السَّاعَۃُ ؕ قُلۡ
بَلٰی وَ رَبِّیۡ لَتَاۡتِیَنَّکُمۡ ۙ عٰلِمِ الۡغَیۡبِ ۚ لَا یَعۡزُبُ
عَنۡہُ مِثۡقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی
الۡاَرۡضِ وَ لَاۤ اَصۡغَرُ مِنۡ ذٰلِکَ وَ لَاۤ اَکۡبَرُ اِلَّا
فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ③ٝ لِّیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ
رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ④ وَ الَّذِیۡنَ سَعَوۡ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا
مُعٰجِزِیۡنَ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مِّنۡ رِّجۡزٍ

۳۔اور جنھوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ کہو کہ کیوں نہیں۔قسم ہے میرے پروردگار عالم الغیب کی، وہ ضرور تم پر آئے گی۔اس سے ذرہ برابر کوئی چیز مخفی نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ بڑی، مگر وہ ایک کھلی کتاب میں ہے۔ ۴۔تاکہ وہ ان لوگوں کو بدلہ دے جو ایمان لائے اور نیک کام کیا۔یہی لوگ ہیں جن کے لیے معافی ہے اور عزت کی روزی۔ ۵۔اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو عاجز کرنے کی

اَلِیْمٌ ۝٥ وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْٓ
اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ھُوَ الْحَقَّ ۙ وَ یَھْدِیْٓ
اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۝٦

کوشش کی، ان کے لیے سختی کا دردناک
عذاب ہے۔ ٦۔ اور جن کو علم دیا گیا ہے وہ، اس
چیز کو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھارے
پاس بھیجا گیا ہے، جانتے ہیں کہ وہ حق ہے اور وہ
خدائے عزیز اور حمید کا راستہ دکھاتا ہے۔

قرآن کے مخاطبین قیامت کے منکر نہ تھے۔ وہ صرف اِس کے منکر تھے کہ قیامت ان کے لیے رسوائی اور عذاب بن کر آئے گی۔ موجودہ دنیا میں وہ اپنے کو مادی اعتبار سے محفوظ حالت میں پاتے تھے۔ اس لیے ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اگلی دنیا میں پہنچ کر وہ غیر محفوظ کیوں کر ہو جائیں گے۔

مگر یہ قیاس سراسر باطل ہے۔ موجودہ دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کی تخلیق اخلاقی اصولوں پر ہوئی ہے۔ اور جب کائنات کی تخلیق اخلاقی بنیاد پر ہوئی ہے تو اس کا آخری فیصلہ بھی لازماً اخلاقی بنیاد پر ہونا چاہیے نہ کہ کسی اور مزعومہ بنیاد پر۔

حیات اور کائنات کی یہ حقیقت تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ قرآن کا مشن یہ ہے کہ اس حقیقت کو وہ اس کی خالص اور بے آمیز صورت میں ظاہر کر دے۔ اب جو لوگ اس کے مخالف بن کر کھڑے ہوں وہ زبردست جسارت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ خدا کے یہاں وہ سخت ترین سزا کے مستحق قرار دئے جائیں گے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھَلْ نَدُلُّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ
یُّنَبِّئُکُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّکُمْ لَفِیْ
خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۝٧ۚ اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ
جِنَّۃٌ ۭ بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ فِی
الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ ۝٨ اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی
مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَ
الْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِھِمُ الْاَرْضَ اَوْ
نُسْقِطْ عَلَیْھِمْ کِسَفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ ۭ اِنَّ فِیْ
ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۝٩ ع

٧۔ اور جنھوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں، کیا ہم تم کو
ایک ایسا آدمی بتائیں جو تم کو خبر دیتا ہے کہ جب تم
بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو پھر تم کو نئے سرے
سے بننا ہے۔ ٨۔ کیا اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا
ہے یا اس کو کسی طرح کا جنون ہے۔ بلکہ جو لوگ
آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہی عذاب میں اور دور
کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ٩۔ تو کیا انھوں نے
آسمان اور زمین کی طرف نظر نہیں کی جو ان کے
آگے ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ اگر ہم چاہیں تو ان
کو زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے
ٹکڑا گرا دیں۔ بے شک اس میں نشانی ہے ہر
اس بندے کے لیے جو متوجہ ہونے والا ہو۔

مکہ کے لوگ رسول اور اصحابِ رسول کو حقیر سمجھتے تھے، اس لیے وہ ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس کی اصل وجہ آخرت کے بارے میں ان کی بے یقینی تھی۔ آخرت کی پکڑ کا اندیشہ ان کے دلوں میں نہ تھا۔ اس لیے وہ آخرت کی باتوں کے متعلق زیادہ سنجیدہ بھی نہ ہوسکے۔

اس دنیا میں سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ آدمی صحتِ فکر سے محروم ہوجائے۔ ایسا آدمی کسی چیز کو اس کے صحیح روپ میں نہیں دیکھ پاتا۔ کھلی ہوئی حقیقتوں سے بھی اس کو نصیحت حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً اوپری فضا سے مسلسل بے شمار پتھر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ زمین کی طرف آتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پتھر انسانی بستیوں پر برسنے لگیں تو انسانی نسل کا خاتمہ ہوجائے۔ اسی طرح زمین کے نیچے کا زیادہ حصہ گرم پگھلا ہوا لاوا ہے۔ اگر وہ غیر محدود طور پر پھٹ پڑے تو سطح زمین کی ہر چیز جل کر ختم ہوجائے۔ مگر خدا اپنے خصوصی انتظام کے تحت ایسا ہونے نہیں دیتا۔ آسمان اور زمین میں اس قسم کی واضح نشانیاں ہیں جو انسان کے عجز کو بتا رہی ہیں۔ مگر آدمی جب صحتِ فکر سے محروم ہوجائے تو کوئی نشانی اس کو ہدایت دینے والی نہیں بنتی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ
اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿۱۰﴾
اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ
وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ﴿۱۱﴾

۱۰۔ اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے بڑی نعمت دی۔ اے پہاڑو تم بھی اس کے ساتھ تسبیح میں شرکت کرو۔ اور اسی طرح پرندوں کو حکم دیا۔ اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کردیا۔ ۱۱۔ کہ تم کشادہ زرہیں بناؤ اور کڑیوں کو اندازے سے جوڑو اور نیک عمل کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔

ایک مومن جب خدا کی یاد سے سرشار ہوکر اس کی تسبیح کرتا ہے تو اس وقت وہ ساری کائنات کا ہم نوا ہوتا ہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزیں تسبیح خداوندی میں اس کی شریک آواز ہوجاتی ہیں۔ تاہم کائنات کی یہ ہم نوائی خاموش زبان میں ہوتی ہے۔ مگر حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت دی کہ جب وہ تسبیح کرتے تو پہاڑ اور چڑیاں محسوس طور پر آپ کے ساتھ تسبیح خوانی میں شریک ہوجاتیں۔

اسی طرح حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے لوہے کی صنعت سکھائی۔ انھوں نے لوہے کے پگھلانے اور ڈھالنے کے فن کو ترقی دی کہ وہ نہایت باریک کڑیوں کی زرہیں بنانے لگے جن کو آدمی کپڑے کی طرح پہن سکے۔ اس وقت دنیا میں یہ فن موجود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست طور پر فرشتوں کے ذریعہ یہ فن آپ کو سکھایا۔

مومن صنعت اور سائنس میں بڑی بڑی ترقیاں کرسکتا ہے۔ مگر اس کے لیے لازم ہے کہ وہ انسانی ترقی کو صرف اصلاح کے دائرہ میں استعمال کرے۔ وہ جو کچھ کرے اس احساسات کے تحت کرے کہ آخر کار اس کو جواب دہی کے لیے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

۱۲۔ اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کردیا، اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ کی ہوتی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینہ کی۔ اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہادیا۔ اور جنّات میں سے ایسے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے۔ اور ان میں سے جو کوئی ہمارے حکم سے پھرے تو ہم اس کو آگ کا عذاب چکھائیں گے۔ ۱۳۔ وہ اس کے لیے بناتے جو وہ چاہتا، عمارتیں اور تصویریں اور حوض جیسے لگن اور جمی ہوئی دیگیں — اے آل داؤد، شکر گزاری کے ساتھ عمل کرو اور میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے سمندری سفر اور سمندری تجارت کو بہت ترقی دی تھی۔ انھوں نے اعلیٰ درجہ کے بادبانی جہاز تیار کیے۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل یہ ہوا کہ ان کے سمندری جہازوں کو اکثر موافق ہوا ملتی تھی۔ اس طرح تانبا پگھلا کر سامان بنانے کا فن بھی ان کے زمانہ میں بہت ترقی کر گیا۔ ان غیر معمولی قوتوں سے حضرت سلیمان مختلف قسم کے تعمیری اور اصلاحی کام لیتے تھے۔ انھیں میں سے ان چیزوں کی تیاری بھی تھی جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔

انسان سراپا خدا کا احسان ہے۔ اس لیے اس کے اندر سب سے زیادہ خدا کے شکر اور احسان مندی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر سب سے کم پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ امتحان کی دنیا میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اسباب کے پردہ میں ملتا ہے۔ اس لیے آدمی اس کو اسباب کا نتیجہ سمجھ لیتا ہے۔ مگر یہی انسان کا اصل امتحان ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اسباب کے ذریعہ ملتی ہوئی چیز کو خدا سے ملتا ہوا دیکھے۔ بظاہر اپنی عقل اور محنت سے حاصل ہونے والی چیز کو براہِ راست خدا کا عطیہ سمجھے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

۱۴۔ پھر جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو کسی چیز نے ان کو اس کے مرنے کا پتہ نہیں دیا مگر زمین کے کیڑے نے، وہ اس کے عصا کو کھاتا تھا۔ پس جب وہ گر پڑا تب جنوں

الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۱۴﴾

پر کھلا کہ اگر وہ غیب کو جانتے تو اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آیا تو وہ اپنا عصا ٹیکے ہوئے تھے اور جنوں سے کوئی تعمیری کام کرا رہے تھے۔ موت کے فرشتے نے آپ کی روح قبض کر لی۔ مگر آپ کا بے جان جسم عصا کے سہارے بدستور قائم رہا۔ جنات یہ سمجھ کر اپنے کام میں لگے رہے کہ آپ ان کے قریب موجود ہیں اور نگرانی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد عصا میں دیمک لگ گئی۔ ایک عرصہ کے بعد دیمک نے عصا کو کھوکھلا کر دیا تو آپ کا جسم زمین پر گر پڑا۔ اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔

یہ واقعہ اس صورت میں غالباً اس لیے پیش آیا تا کہ لوگوں کے اس غلط عقیدہ کی عملی تردید ہو جائے کہ جنّات غیب کا علم رکھتے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾

۱۵۔ سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن میں نشانی تھی۔ دو باغ دائیں اور بائیں، اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر کرو۔ عمدہ شہر اور بخشنے والا رب۔ ۱۶۔ پس انھوں نے سرتابی کی تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے باغوں کو دو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں بدمزہ پھل اور جھاؤ کے درخت اور کچھ تھوڑے سے بیر۔ ۱۷۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کا بدلہ دیا اور ایسا بدلہ ہم اسی کو دیتے ہیں جو ناشکر ہو۔

سبا قدیم زمانہ میں ایک نہایت ترقی یافتہ قوم تھی۔ اس کی آبادیاں موجودہ یمن میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا مرکزی شہر مارب تھا۔ زمانہ قبل مسیح میں اس نے زبردست ترقی کی۔ اور تقریباً ایک ہزار سال تک عروج پر رہی۔ ایک طرف وہ لوگ خشکی اور سمندر کے ذریعہ اپنی تجارتیں پھیلائے ہوئے تھے۔ دوسری طرف انھوں نے بند بنائے۔ مارب کے قریب ان کا ایک بڑا بند تھا جو 14 میٹر اونچا اور تقریباً 600 میٹر لمبا تھا۔ اس کے ذریعہ پہاڑی نالوں کا پانی روک کر نہریں نکالی گئی تھیں۔ اور ان سے زمینوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔ اس طرح علاقہ میں اتنی سرسبزی آئی کہ آدمی جہاں کھڑا ہو تو دائیں اور بائیں اس کو باغ ہی باغ دکھائی دے۔

یہ تمام ترقیاں خدائی انتظامات کی وجہ سے ممکن ہوئیں۔ اس لیے سبا کے لوگوں کو خدا کا شکر گزار بننا چاہیے تھا۔ مگر وہ غفلت اور سرکشی میں پڑ گئے جیسا کہ عام طور پر خوش حال قوموں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد سدّ مارب (Marib Dam) میں شگاف پڑنا شروع ہوا۔ یہ گویا ابتدائی تنبیہ تھی۔ مگر وہ ہوش میں نہ آئے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

کے بیان کے مطابق ساتویں صدی عیسوی میں ایک زلزلے نے بند کو ناقابل مرمت حد تک توڑ دیا۔ اس کے نتیجہ میں ایسا سیلاب آیا جس سے پورا علاقہ تباہ ہوگیا۔ مزید یہ کہ زرخیز مٹی ختم ہوجانے کی وجہ سے یہ علاقہ بعد کو صرف جنگلی جھاڑیوں کے لیے موزوں رہ گیا۔

وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

۱۸۔ اور ہم نے ان کے اور ان کی بستیوں کے درمیان ، جہاں ہم نے برکت رکھی تھی، ایسی بستیاں آبادکیں جو نظر آتی تھیں۔ اور ہم نے ان کے درمیان سفر کی منزلیں ٹھہرادیں۔ ان میں رات دن امن کے ساتھ چلو۔ ۱۹۔ پھر انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب، ہمارے سفروں کے درمیان دوری ڈال دے۔ اور انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو ہم نے ان کو افسانہ بنا دیا اور ہم نے ان کو بالکل تتر بتر کردیا۔ بے شک اس میں نشانی ہے ہر صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے۔

برکت والی بستیوں سے مراد شام کا سرسبز وشاداب علاقہ ہے۔ اس سرسبز علاقہ میں یمن سے شام تک خوبصورت آبادیوں کی قطاریں چلی گئی تھیں۔ ان کے درمیان سفر ایک قسم کی خوش گوار سیر بن گیا تھا۔ یہ ماحول اپنی حقیقت کے اعتبار سے ربانی جذبات پیدا کرنے والا تھا۔ گویا کہ خدا نے یہاں ایک خاموش سائن بورڈ لگادیا ہو کہ —— بے خوف وخطر چلو اور اپنے رب کا شکر کرو۔

مگر سبا کے غافل لوگ اس خدائی کتبہ کو نہ پڑھ سکے۔ انھوں نے اپنے رویہ سے ان خدائی نعمتوں کا استحقاق کھو دیا۔ چنانچہ وہ اس طرح مٹے کہ وہ ماضی کی داستان بن گئے۔ علاقہ کی تباہی کے بعد سبا کے مختلف قبائل اپنے وطن سے نکل کر دور دور کے علاقوں میں منتشر ہوگئے۔

قوم سبا کے واقعہ میں ہر انسان کے لیے اس بات کا سبق ہے کہ خدا کے شکر گزار بنو تو تمہارے لیے سب کچھ ہے اور ناشکری کروگے تو تمھارا انجام دوبارہ وہی ہوگا جو قوم سبا کا ہوا۔ یہ واقعات تاریخ کے معلوم واقعات ہیں۔ مگر ان کو جاننے والا حقیقۃً وہ ہے جو ان سے یہ سبق لے کہ اس کو خوش حالی ملے تو وہ فخر میں مبتلا نہ ہو۔ اس کو جو کچھ ملے اس کو خدا کا عطیہ سمجھ کر وہ خدا کا شکر گزار بن جائے۔

وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ مَا

۲۰۔ اور ابلیس نے ان کے اوپر اپنا گمان سچ کردکھایا۔ پس انھوں نے اس کی پیروی کی، مگر ایمان والوں کا ایک گروہ۔ ۲۱۔ اور ابلیس کو ان

كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ
يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ
ع ۲ ۱۲ ۸ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۟ (۲۱)

کے اوپر کوئی اختیار نہ تھا، مگر یہ کہ ہم معلوم کرلیں ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے (الگ کر کے) جو اس کی طرف سے شک میں ہیں اور تمھارا رب ہر چیز پر نگراں ہے۔

ابلیس یا اس کے نمائندے ہمیشہ انسان کے خلاف اپنا منصوبہ بناتے ہیں۔ ایسے موقع پر انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان کے منصوبہ کا شکار نہ ہو۔ اور اس طرح وہ ان کو ناکام بنا دے۔ مگر سبا کے لوگ دوسرے لوگوں کی طرح اس دانائی کا ثبوت نہ دے سکے۔ وہ شیطانی ترغیبات کے زیر اثر آ کر تباہی کے راستہ پر چل پڑے۔ صرف تھوڑے سے حق پرست تھے جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔

شیطان کو یا اس کے نمائندہ کو خدا نے کسی کے اوپر عملی اختیار نہیں دیا ہے۔ اس کو صرف بہکانے کا اختیار ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ انسان کو آزمائش ہو۔ اس آزمائش میں پورا اترنے والا شخص وہ ہے جو شیطانی ترغیبات سے غیر متاثر رہ کر حق و صداقت پر قائم رہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ
لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا
فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا
لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ (۲۲) وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ
عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ
عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا
الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۳)

۲۲۔ کہو کہ ان کو پکارو جن کو تم نے خدا کے سوا معبود سمجھ رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان دونوں میں ان کی کوئی شرکت ہے۔ اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ ۲۳۔ اور اس کے سامنے کوئی شفاعت کام نہیں آتی مگر اس کے لیے جس کے لیے وہ اجازت دے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی تو وہ پوچھیں گے کہ تمھارے رب نے کیا فرمایا۔ وہ کہیں گے کہ حق بات کا حکم فرمایا۔ اور وہ سب سے اوپر ہے، سب سے بڑا ہے۔

اگرچہ ہر دور میں بیشتر لوگ آخرت کو مانتے رہے ہیں مگر ہر دور میں شیطان نے ایسے خود ساختہ عقیدے لوگوں کے درمیان رائج کر دئے جنھوں نے ان کو آخرت کی پکڑ سے بے خوف کر دیا۔ انھیں میں سے ایک یہ فرضی عقیدہ بھی ہے کہ بعض ہستیوں کو خدا کے یہاں اتنا مقام حاصل ہے کہ وہ اپنی سفارش سے جس کو چاہیں بخشوا سکتے ہیں۔

مگر اس قسم کا ہر عقیدہ خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ ہے۔ یہ واقعہ بھی کیسا عجیب ہے کہ جن ہستیوں کا اپنا یہ حال ہے کہ خدا کی عظمت کے احساس نے انھیں سراسیمہ کر رکھا ہے، ان کے بارے میں ان کے پرستاروں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ خدا کے یہاں ان کی نجات کے لیے کافی ہو جائیں گے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
قُلِ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝٢٤ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ
اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝٢٥ قُلْ
يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ
وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ۝٢٦ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ
اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝٢٧

۲۴۔ کہو کہ کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ کہو کہ اللہ۔ اور ہم ہیں اور تم ہیں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی ہیں۔ ۲۵۔ کہو کہ جو قصور ہم نے کیا اس کی کوئی پوچھ تم سے نہ ہو گی۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی بابت ہم سے نہیں پوچھا جائے گا۔ ۲۶۔ کہو کہ ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان وہ حق کے مطابق، فیصلہ فرمائے گا۔ اور وہ فیصلہ کرنے والا ہے، علم والا ہے۔ ۲۷۔ کہو، مجھے ان کو دکھاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر خدا کے ساتھ ملا رکھا ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

کائنات ناقابلِ قیاس حد تک وسیع ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر کمال درجہ کی حکمت اور معنویت پائی جاتی ہے۔ ایسی کائنات خدائے عزیز وحکیم ہی کا کارنامہ ہوسکتی ہے۔ کوئی بھی شخص سنجیدہ طور پر یہ گمان نہیں کرسکتا کہ وہ دوسری ہستیاں اس کے خالق ومالک ہیں جن کو جدید یا قدیم انسان نے خدا کے سوا فرض کر رکھا ہے۔ پھر خدا کے سوا کون ہوسکتا ہے جس کو اس کائنات میں بڑائی کا مقام حاصل ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کا مطالعہ تمام مشرکانہ نظریات کو باطل ٹھہراتا ہے۔ اس کائنات میں وہ تمام عقیدے بے جوڑ ثابت ہوتے ہیں جن میں ایک خدا کے سوا کسی اور کے لیے کسی قسم کی بڑائی تسلیم کی گئی ہو۔ ایسی حالت میں وہی نظریہ صحیح ہوسکتا ہے جو ایک خدا کی بنیاد پر بنے۔ جس نظریہ میں ایک خدا کے سوا کسی اور ہستی کی کارفرمائی مانی جائے وہ اپنی تردید آپ ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا
وَّنَذِيْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٢٨
وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ۝٢٩ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا
تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ۝٣٠ ع النصف ۳

۲۸۔ اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۲۹۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۳۰۔ کہو کہ تمھارے لیے ایک خاص دن کا وعدہ ہے کہ اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکتے ہو اور نہ آگے بڑھ سکتے ہو۔

ہر نبی نے براہِ راست طور پر صرف اپنی قوم کے اوپر دعوتی کام کیا۔ اور یہی عملاً ممکن تھا۔ اسی طرح

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بھی براہِ راست طور پر اپنی ہی قوم کے لیے منذر اور مبشر بنے (الانعام، 6:92)۔مگر چوں کہ آپ پر نبوت ختم ہوگئی اس لیے اب تمام قوموں کے لیے حکماً آپ ہی منذر اور مبشر ہیں۔ اپنے زمانے میں مخاطبین اول پر جس طرح آپ نے انذار وتبشیر کا کام کیا اسی طرح بعد کے زمانے میں دوسرے تمام مخاطبین پر آپ کی امت کو نیابۃً انذار وتبشیر کا کام کرنا ہے۔ یہ سارا کام آپ کی نبوت کے تسلسل میں شمار ہوگا۔آپ کی زندگی میں کیا جانے والا دعوتی کام براہِ راست طور پر آپ کے دائرۂ نبوت میں داخل ہے۔اور آپ کی دنیوی زندگی کے بعد کیا جانے والا کام بالواسطہ طور پر۔

پیغمبر کا کام ہمیشہ صرف پہنچانا ہوتا ہے۔اس کے بعد قوموں کے عملی انجام کا فیصلہ کرنا خدا کا کام ہے، موجودہ دنیا میں بھی اور آئندہ آنے والی دنیا میں بھی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِۨ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَاۗءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

۳۱۔اور جن لوگوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ اس قرآن کو مانیں گے اور نہ اس کو جو اس کے آگے ہے۔اور اگر تم اس وقت کو دیکھو جب کہ یہ ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔ ایک دوسرے پر بات ڈالتا ہوگا۔ جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے، وہ بڑا بننے والوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان والے ہوتے۔ ۳۲۔ بڑا بننے والے کمزور لوگوں کو جواب دیں گے۔ کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روکا تھا۔ جب کہ وہ تم کو پہنچ چکی تھی، بلکہ تم خود مجرم ہو۔ ۳۳۔اور کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے، نہیں بلکہ تمھاری رات دن کی تدبیروں سے، جب کہ تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائیں۔ اور وہ اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے جب کہ وہ عذاب دیکھیں گے۔اور ہم منکروں کی گردن میں طوق ڈالیں گے۔وہ وہی بدلہ پائیں گے جو وہ کرتے تھے۔

حقیقت کا انکار سب سے بڑا جرم ہے۔ دنیا میں اس جرم کا انجام سامنے نہیں آتا۔ اس لیے دنیا میں آدمی بے خوف ہو کر حقیقت کا انکار کر دیتا ہے۔مگر آخرت میں جب انکار حق کا برا انجام لوگوں کے اوپر ٹوٹ پڑے گا تو اس وقت لوگوں کا عجیب حال ہوگا۔

عوام اپنے جن بڑوں پر دنیا میں فخر کرتے تھے وہاں ان بڑوں کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرا کر وہ ان پر لعنت کریں گے۔ بڑے ان کو جواب دیں گے کہ اپنے آپ کو شرمندگی سے بچانے کے لیے ہمیں ملزم نہ ٹھہراؤ، یہ ہم نہ تھے بلکہ تمھاری اپنی خواہشیں تھیں جنھوں نے تم کو گمراہ کیا۔ ہمارا ساتھ تم نے صرف اس لیے دیا کہ ہماری بات تمھاری اپنی خواہشوں کے مطابق تھی۔ تم ایسا دین چاہتے تھے جس میں اپنے آپ کو بدلے بغیر دین دار بننے کا کریڈٹ حاصل ہو جائے اور وہ ہم نے تم کو فراہم کر دیا۔ تم نے ہمارا پھندا خود اپنی گردن میں ڈالا، ورنہ ہمارے پاس کوئی طاقت نہ تھی کہ ہم اس کو تمھاری گردن میں ڈال دیتے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ
مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾
وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ
بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۳۵﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ
بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ
عَمِلَ صَالِحًا ۫ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ
بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾
وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ
اُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ قُلْ اِنَّ
رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ
وَیَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ
یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۳۹﴾

۳۴۔ اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ ۳۵۔ اور انھوں نے کہا کہ ہم مال اور اولاد میں زیادہ ہیں اور ہم کبھی سزا پانے والے نہیں۔ ۳۶۔ کہو کہ میرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے کم کر دیتا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۳۷۔ اور تمھارے مال اور تمھاری اولاد وہ چیز نہیں جو درجہ میں تم کو ہمارا مقرب بنا دے، البتہ جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیا، ایسے لوگوں کے لیے ان کے عمل کا دونا بدلہ ہے۔ اور وہ بالا خانوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ ۳۸۔ اور جو لوگ ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کے لیے سرگرم ہیں وہ عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔ ۳۹۔ کہو کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے کشادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے تو وہ اس کا بدلہ دے گا۔ اور وہ بہتر رزق دینے والا ہے۔

جن لوگوں کے پاس قوت اور مال آجائے ان کو موجودہ دنیا میں بڑائی کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ چیز

ان کے اندر جھوٹا اعتماد پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو جب آخرت سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ اس کو اہمیت نہیں دے پاتے۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ دنیا میں جب خدا نے ان کو عزت دی ہے تو آخرت میں وہ انھیں بے عزت کر دے گا۔

یہی جھوٹا اعتماد ہر دور کے بڑوں کے لیے دعوت حق کو نہ ماننے کا سب سے بڑا سبب رہا ہے۔ اور وقت کے بڑے لوگ جب ایک چیز کو حقیر کر دیں تو چھوٹے لوگ بھی اس کو حقیر سمجھ لیتے ہیں۔ اس طرح خواص اور عوام دونوں حق کو قبول کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

دنیا کا مال واسباب امتحان ہے، نہ کہ انعام۔ دنیا کے مال واسباب کی زیادتی نہ کسی آدمی کے مقرب ہونے کی علامت ہے اور نہ اس کی کمی اس کے غیر مقرب ہونے کی۔ اللہ کے یہاں قربت کا مقام اسی شخص کے لیے ہے جو اس بات کا ثبوت دے کہ جو کچھ اس کو دیا گیا تھا اس میں وہ خدا کی یادوں کے ساتھ جیا اور خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کا اپنے آپ کو پابند رکھا۔ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کے ابدی انعامات کے مستحق قرار دئے جائیں گے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿٤٠﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿٤١﴾ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿٤٢﴾

۴۰۔ اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا پھر وہ فرشتوں سے پوچھے گا، کیا یہ لوگ تمھاری عبادت کرتے تھے۔ ۴۱۔ وہ کہیں گے پاک ہے تیری ذات، ہمارا تعلق تجھ سے ہے، نہ کہ ان لوگوں سے، بلکہ یہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ انھیں کے مومن تھے۔ ۴۲۔ پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اور ہم ظالموں سے کہیں گے کہ آگ کا عذاب چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

فرشتے انسان کو نظر نہیں آتے۔ یہ دراصل پیغمبر ہیں جنھوں نے انسان کو فرشتوں کے وجود کی خبر دی۔ یہ خبر انھیں اس لیے دی گئی تھی کہ وہ خدا کے عظمت وجلال کو محسوس کریں اور پوری طرح اس کی عبادت میں لگ جائیں۔ مگر شیطان نے عجیب وغریب طور پر لوگوں کو سکھایا کہ براہِ راست خدا کا تقرب حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ وہ فرشتوں کی عبادت کریں اور ان کے ذریعے سے خدا کا تقرب حاصل کریں۔ چنانچہ ساری دنیا میں فرشتوں کے بت بنا کر ان کی عبادت شروع کر دی گئی۔ دیوی دیوتاؤں کا عقیدہ بھی دراصل فرشتوں ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جو فرشتہ بارش پر مقرر تھا اس کو بارش کا دیوتا سمجھ لیا گیا۔ جو فرشتہ ہوا پر مقرر تھا اس کو ہوا کا دیوتا سمجھ لیا گیا، وغیرہ۔

فرشتے آخرت میں ایسے عبادت گزاروں سے برأت ظاہر کریں گے۔ آخرت میں ان کو نہ خدا کی مدد حاصل ہوگی اور نہ فرشتوں کی۔ وہ ہمیشہ کے لیے بے یارومددگار ہو کر رہ جائیں گے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا
هٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا
كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ
اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿٤٣﴾ وَ مَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ
يَّدْرُسُوْنَهَا وَ مَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ
مِنْ نَّذِيْرٍ ؕ﴿٤٤﴾ وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ
وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا
ع ۵ ۹ رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٤٥﴾

۴۳۔ اور جب ان کو ہماری کھلی کھلی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو بس ایک شخص ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان سے روک دے جن کی تمھارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ اور انھوں نے کہا، یہ تو محض ایک جھوٹ ہے گھڑا ہوا۔ اور ان منکروں کے سامنے جب حق آیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے۔ ۴۴۔ اور ہم نے ان کو کتابیں نہیں دی تھیں جن کو وہ پڑھتے ہوں۔ اور ہم نے تم سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا۔ ۴۵۔ اور ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا اور یہ اس کے دسویں حصہ کو بھی نہیں پہنچے جو ہم نے ان کو دیا تھا۔ پس انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا، تو کیسا تھا ان پر میرا عذاب۔

قرآن اپنے مخاطبین کے سامنے کھلے کھلے دلائل دے رہا تھا۔ مخاطبین دلیل سے اس کا توڑ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ عوام کو اس سے روکنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کی اس کامیابی کا واحد راز یہ تھا کہ انھوں نے لوگوں کو یہ کہہ کر اس کی طرف سے مشتبہ کر دیا کہ یہ ہمارے اسلاف کے طریقہ کے خلاف ہے۔ قرآن میں جو معجزانہ ادب تھا اس کا انکار ناممکن تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا کہ یہ محض جادو بیانی کا کرشمہ ہے، وحی الٰہی ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض قلم کا زور ہے، نہ کہ علم حقیقت کا زور — تاریخ کا یہ تجربہ نہایت عجیب ہے کہ ہر دور کے لوگوں کے لیے دلیل کے مقابلہ میں تعصب زیادہ طاقت ور ثابت ہوا ہے۔

قرآن کے مخاطبین کے پاس قرآن کا انکار کرنے کے لیے یا تو عقلی دلائل ہوتے جن کے ذریعہ وہ اس کو رد کر سکتے یا ان کے پاس کوئی دوسری آسمانی کتاب ہوتی جس سے قرآن کی تردید نکالی جا سکتی۔ مخاطبین قرآن کے پاس ان دونوں میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ مزید یہ کہ دنیوی ترقی میں بھی وہ دوسری قوموں سے بہت زیادہ پیچھے تھے۔ جن لوگوں کا یہ حال ہو وہ اگر دعوتِ حق کا انکار کرتے ہیں تو اس کی وجہ ہٹ دھرمی ہے، نہ کہ معقولیت۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَعِظُكُمۡ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِيۡرٌ لَّكُمۡ بَيۡنَ يَدَىۡ عَذَابٍ شَدِيۡدٍ ﴿۴۶﴾ قُلۡ مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَكُمۡ ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۴۷﴾

۴۶۔ کہو، میں تم کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، یہ کہ تم خدا کے واسطے کھڑے ہو جاؤ، دو دو اور ایک ایک، پھر سوچو۔ تمھارے ساتھی کو جنون نہیں ہے، وہ تو بس ایک سخت عذاب سے پہلے تم کو ڈرانے والا ہے۔ ۴۷۔ کہو کہ میں نے تم سے کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمھارا ہی ہے۔ میرا معاوضہ تو بس اللہ کے اوپر ہے۔ اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

پیغمبر کے معاصرین نے پیغمبر کی دعوت کا انکار کر دیا۔ مگر اس کے پیچھے ضد اور تعصب کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ ضد اور تعصب سے خالی ہو کر سوچتے، خواہ اکیلے اکیلے سوچتے، یا چند آدمی مل کر اجتماعی طور پر غور کرتے، تو وہ پاتے کہ ان کا پیغمبر کوئی دیوانہ آدمی نہیں ہے۔ آپ کی سابقہ زندگی آپ کی سنجیدگی کی گواہی دیتی۔ آپ کا دردمندانہ انداز بتاتا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی آپ کے دل کی آواز ہے۔ آپ کے کلام کا حکیمانہ اسلوب اس کی صحت کی داخلی شہادت نظر آتا۔ آپ کا کسی معاوضہ کا طالب نہ ہونا ظاہر کرتا کہ آپ نے اس کام کو محض اللہ کی خاطر شروع کیا ہے، نہ کہ ذاتی تجارت کی خاطر۔ غیر جانب دارانہ غور و فکر میں وہ جان لیتے کہ آپ کی بے قراری جنون کی بے قراری نہیں ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ جس خطرہ سے ڈرانے کے لیے اٹھے ہیں اس کو اپنی آنکھوں سے آتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ مگر وہ دعوت حق کے بارے میں سنجیدہ نہ تھے اس لیے یہ کھلے ہوئے حقائق ان کو نظر بھی نہ آسکے۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّىۡ يَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ ۚ عَلَّامُ الۡغُيُوۡبِ ﴿۴۸﴾ قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَمَا يُبۡدِئُ الۡبَاطِلُ وَمَا يُعِيۡدُ ﴿۴۹﴾ قُلۡ اِنۡ ضَلَلۡتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰى نَفۡسِىۡ ۚ وَاِنِ اهۡتَدَيۡتُ فَبِمَا يُوۡحِىۡۤ اِلَىَّ رَبِّىۡ ؕ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ قَرِيۡبٌ ﴿۵۰﴾

۴۸۔ کہو کہ میرا رب حق کو (باطل پر) مارے گا، وہ چھپی چیزوں کو جاننے والا ہے۔ ۴۹۔ کہو کہ حق آ گیا اور باطل نہ آغاز کرتا ہے اور نہ اعادہ۔ ۵۰۔ کہو کہ اگر میں گمراہی پر ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا رب میری طرف بھیج رہا ہے۔ بے شک وہ سننے والا ہے، قریب ہے۔

دنیا کی تخلیق حق پر ہوئی ہے۔ یہاں سارا زور حق کی طرف ہے۔ یہاں تمام دلائل حق کی تائید کرتے ہیں۔ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے یہاں باطل کو کوئی زور اور کوئی دلیل حاصل نہیں۔ ایسی حالت میں یہ ہونا چاہیے کہ حق یہاں ہمیشہ سر بلند رہے اور باطل یہاں سراسر بے وزن ہو کر رہ جائے مگر عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں حق

اتنا طاقتور نہیں کہ وہ خود اپنے زور پر باطل کا خاتمہ کردے اور باطل اتنا بے وقعت نہیں کہ اس کی بنیاد پر کسی شخص کے لیے عزت اور سربلندی حاصل کرنا ممکن نہ ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں آزمائش کا قانون جاری ہے۔ اس لیے یہاں باطل کو بھی ابھرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر یہ صورت حال عارضی طور پر صرف امتحان کی مدت تک ہے۔ قیامت آتے ہی یہ غیر واقعی صورت حال یکسر ختم ہو جائے گی۔ اس وقت تمام نظری اور عملی زور صرف حق کی طرف ہوگا اور باطل سراسر بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

یہ واقعہ اپنی کامل صورت میں قیامت میں ظاہر ہوگا۔ مگر جب اللہ چاہتا ہے اس کو جزئی طور پر موجودہ دنیا میں ظاہر کردیتا ہے تاکہ لوگوں کے لیے سبق ہو۔ دور اول میں اسلام کا غلبہ اسی قسم کا ایک جزئی اظہار تھا۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہوا اور توحید کو شرک کے اوپر بالاتری حاصل ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر یہ آیت تھی: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (17:81) سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 417۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّ قَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ يَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾ ع ۶ ۹ ۱۲

۵۱۔ اور اگر تم دیکھو، جب یہ گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ پس وہ بھاگ نہ سکیں گے اور قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔ ۵۲۔ اور وہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ اور اتنی دور سے ان کے لیے اس کا پانا کہاں۔ ۵۳۔ اور اس سے پہلے انھوں نے اس کا انکار کیا۔ اور بن دیکھے دور جگہ سے باتیں پھینکتے رہے۔ ۵۴۔ اور ان کے اور ان کی آرزو میں آڑ کر دی جائے گی، جیسا کہ اس سے پہلے ان کے ہم مشربوں کے ساتھ کیا گیا۔ وہ بڑے دھوکے والے شک میں پڑے رہے۔

موجودہ دنیا میں آدمی حق کا انکار کرتا ہے تو فوراً اس کا انجام سامنے نہیں آتا۔ یہ صورت حال اس کو انکار حق کے معاملہ میں ڈھیٹ بنا دیتی ہے۔ وہ حق کی دعوت کو سنجیدہ توجہ کے قابل نہیں سمجھتا۔ وہ حقارت آمیز الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ وہ بے پروائی کے ساتھ اس کو رد کر دیتا ہے۔ وہ اس پر اس طرح غیر ذمہ دارانہ انداز میں تبصرہ کرتا ہے جیسے کہ وہ کسی لحاظ کا مستحق ہی نہیں۔

مگر جب دنیا کا موجودہ نظام ختم ہوگا تو اچانک سارا معاملہ بالکل بدل جائے گا۔ اب آدمی کو نظر آئے گا کہ وہی چیز سب سے زیادہ اہم تھی جس کو وہ سب سے زیادہ نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی ساری

اکڑ ختم ہوجائے گی۔ وہ اس حق کا والہانہ اعتراف کرنے لگے گا جس کو وہ دنیا میں کسی توجہ کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ مگر اب وقت نکل چکا ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا کہ اعتراف کی قیمت عالم غیب میں تھی، عالم شہود میں اعتراف کی کوئی قیمت نہیں۔

''شک مریب'' کا مطلب ہے تردد میں ڈالنے والا شک۔ یہ منکرین کی نفسیاتی حالت کی تصویر ہے۔ دنیا میں جو حق ان کے سامنے پیش کیا جارہا تھا وہ زبان و بیان کے اعتبار سے اتنا طاقت ور تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے بس پاتے تھے کہ دلیل کے ذریعہ اس کو رد کرسکیں۔ مگر یہ حق چونکہ ان کے ذہنی سانچہ کے خلاف تھا اس لیے وہ اس کو قبول کرنے پر بھی آمادہ نہ ہو سکے۔ اس دوطرفہ صورت حال نے انھیں ایک قسم کے اندرونی خلجان میں مبتلا رکھا۔ یہاں تک کہ موت کے فرشتہ نے آکر وہ پردہ ان کی آنکھ سے ہٹا دیا جس کو انھیں خود اپنے ہاتھ سے ہٹانا تھا۔ مگر وہ اس کو ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۳۵۔سُوْرَةُ فَاطِر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ① مَا یَفۡتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنۡ رَّحۡمَۃٍ فَلَا مُمۡسِکَ لَہَا ۚ وَ مَا یُمۡسِکۡ ۙ فَلَا مُرۡسِلَ لَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ②

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ تعریف اللہ کے لیے ہے، آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا، فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار۔ وہ پیدائش میں جو چاہے زیادہ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۔ اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں۔ اور جس کو وہ روک لے تو کوئی اس کو کھولنے والا نہیں۔ اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے پیغام رسانی کے لیے اور اپنے احکام کی تنفیذ کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر شیطان نے لوگوں کو سکھایا کہ فرشتے مستقل بالذات حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ دنیا میں برکت اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ کچھ قومیں لات اور منات جیسے ناموں سے ان کی فرضی تصویریں بنا کر ان کی عبادت کرنے لگیں۔ کچھ قوموں نے ان کو دیوی دیوتا قرار دے کر انھیں پوجنا شروع کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں قانون فطرت (law of nature) کی تعظیم بھی اسی گمراہی کا جدید ایڈیشن ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فرشتے ہوں یا قانون فطرت، سب ایک خدا کے محکوم ہیں۔ سب ایک خدا کے کارگزار

ہیں، خواہ وہ دو بازوؤں والے ہوں یا 600 بازوؤں والے یا 600 کروربازوؤں والے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝٣ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝٤

۳۔ اے لوگو، اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو تم کہاں سے دھوکا کھا رہے ہو۔ ۴۔ اور اگر یہ لوگ تم کو جھٹلائیں تو تم سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر جھٹلائے جا چکے ہیں۔ اور سارے امور اللہ ہی کی طرف رجوع ہونے والے ہیں۔

انسان اپنی زندگی کے لیے بے شمار چیزوں کا محتاج ہے۔ مثلاً روشنی، پانی، ہوا، خوراک، معدنیات وغیرہ۔ ان میں سے ہر چیز ایسی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لیے کائناتی طاقتوں کا متحدہ عمل درکار ہے۔ ایک خدا کے سوا کون ہے جو اتنے بڑے واقعہ کو ظہور میں لانے کی طاقت رکھتا ہو۔ مشرک اور ملحد لوگ بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ ان اسباب حیات کی فراہمی ایک خدا کے سوا کوئی اور کرسکتا ہے۔ پھر جب ان تمام چیزوں کا خالق اور منتظم ایک خدا ہے تو اس کے سوا دوسروں کو معبود بنانا کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔

تاریخ کا یہ عجیب تجربہ ہے کہ جو لوگ خدا کے سوا دوسروں کو بڑائی کا مقام دئے ہوئے ہوں وہ ان کو چھوڑ کر خدا کو اپنا بڑا بنانے پر راضی نہیں ہوتے، خواہ اس کی دعوت پیغمبرانہ سطح پر کیوں نہ دی جارہی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ مانے ہوئے کو مانتے ہیں۔ جب کہ پیغمبر پر یقین کرنے کا مطلب اس وقت یہ ہوتا ہے کہ آدمی نہ مانے ہوئے کو مانے۔ اس قسم کے ایمان کو حاصل کرنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی خود اپنی فکری قوتوں کو بیدار کرے، وہ اپنی ذاتی بصیرت سے سچائی کو دریافت کرے۔ اور بلا شبہ یہ کسی انسان کے لیے ہمیشہ سب سے زیادہ مشکل کام رہا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝٥ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝٦ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ

۵۔ اے لوگو، بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ تو دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور نہ وہ بڑا دھوکہ باز تم کو اللہ کے باب میں دھوکہ دینے پائے۔ ۶۔ بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے تو تم اس کو دشمن ہی سمجھو وہ تو اپنے گروہ کو اسی لیے بلاتا ہے کہ وہ دوزخ والوں میں سے ہوجائیں۔

عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۬ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۷ ع

۷۔ جن لوگوں نے انکار کیا، ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا، ان کے لیے معافی ہے اور بڑا اجر ہے۔

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ زندگی کی نوعیت کے بارے میں جو خبر دی ہے وہ بظاہر ایک خیالی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ آدمی فوراً ان سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، دنیا کی چیزیں حقیقی نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ آدمی آج ہی ان سے دوچار ہو رہا ہے۔ موت اور زلزلہ اور حادثات آدمی کو چوکنّا کرتے ہیں۔ یہ گویا قیامت سے پہلے قیامت کی اطلاع ہیں۔ مگر شیطان فوراً ہی لوگوں کے ذہن کو یہ کہہ کر پھیر دیتا ہے کہ یہ سب اسباب کے تحت پیش آنے والے واقعات ہیں، نہ کہ خدائی مداخلت کی تحت۔ مگر اس قسم کا ہر خیال شیطان کا فریب ہے۔ وہ دن آنا لازمی ہے جب کہ جھوٹ اور سچ میں تفریق ہو۔ جب کہ اچھے لوگوں کو ان کی اچھائی کا انعام ملے اور برے لوگوں کو ان کی برائی کی سزا دی جائے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖؗ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۸

۸۔ کیا ایسا شخص جس کو اس کا برا عمل اچھا کر کے دکھایا گیا، پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا، پس اللہ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ پس ان پر افسوس کر کے تم اپنے کو ہلکان نہ کرو۔ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کو یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ سوچے اور حق اور ناحق کے درمیان تمیز کر سکے۔ جو آدمی اپنی اس فطری صلاحیت کو استعمال کرتا ہے وہ ہدایت پاتا ہے۔ اور جو شخص اس فطری صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا وہ ہدایت نہیں پاتا۔

آدمی کے سامنے جب حق آئے تو فوراً اس کے ذہن کو جھٹکا لگتا ہے۔ اس وقت اس کے لیے دو راستے ہوتے ہیں۔ اگر وہ حق کا اعتراف کر لے تو اس کا ذہن صحیح سمت میں چل پڑتا ہے۔ وہ حق کا مسافر بن جاتا ہے اس کے برعکس، اگر ایسا ہو کہ کوئی مصلحت یا کوئی نفسیاتی پیچیدگی اس کے سامنے آئے اور وہ اس سے متاثر ہو کر حق کا اعتراف کرنے سے رک جائے تو اس کا ذہن اپنے عدم اعتراف کو جائز ثابت کرنے کے لیے باتیں گھڑنا شروع کرتا ہے۔ وہ اپنے برے عمل کو اچھا عمل ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک ذہنی بیماری ہے۔ اور جو لوگ اس قسم کی ذہنی بیماری میں مبتلا ہو جائیں وہ کبھی حق کا اعتراف نہیں کر پاتے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں مر کر وہ خدا کے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ تا کہ اپنے کیے کا انجام پائیں۔

وَ اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝

۹۔ اور اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ پھر وہ بادل کو اٹھاتی ہیں۔ پھر ہم اس کو ایک مردہ دیس کی طرف لے جاتے ہیں۔ پس ہم نے اس سے زمین کو اس کے مردہ ہوجانے کے بعد پھر زندہ کردیا۔ اسی طرح ہوگا دوبارہ جی اٹھنا۔
۱۰۔ جو شخص عزت چاہتا ہو تو عزت تمام تر اللہ کے لیے ہے۔ اسی کی طرف پاکیزہ کلام چڑھتا ہے اور عملِ صالح اس کو اوپر اٹھاتا ہے۔ اور جو لوگ بری تدبیریں کر رہے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی تدبیریں نابود ہو کر رہیں گی۔

موجودہ دنیا آخرت کی تمثیل ہے۔ بارش ایک معلوم واقعہ کی صورت میں نامعلوم واقعہ کو ممثل کررہی ہے۔ بارش کیا ہے۔ بارش پوری کائنات کے ایک متحدہ عمل کا نتیجہ ہے۔ سورج اور ہوا اور سمندر اور کشش اور دوسرے بہت سے عالمی اسباب کامل ہم آہنگی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ بارش ظہور میں آتی ہے جو خشک زمین پر زندگی پیدا کردے۔

بارش کا یہ عمل ثابت کرتا ہے کہ کائنات کا ناظم پوری کائنات پر کامل اختیار رکھتا ہے۔ وہ ایک واقعہ کو اپنے منصوبہ کے تحت ظہور میں لاتا ہے۔ اور پھر اس کے مٹنے کے بعد اس کو دوبارہ ظاہر کردیتا ہے، خواہ اس کو دوبارہ ظاہر کرنے کے لیے پوری کائنات کو متحرک کرنا پڑے۔

مُردہ زمین کو دوبارہ سرسبز کرنا، اور مردہ انسان کو دوبارہ زندہ کرنا، دونوں یکساں درجہ کے واقعات ہیں۔ پھر جب پہلا واقعہ ممکن ثابت ہوجائے تو اس کے بعد اسی کے مماثل دوسرے واقعہ کا ممکن ہونا اپنے آپ ثابت ہوجاتا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، اس لیے یہاں عزت وقتی طور پر ایک غیر مستحق کو بھی مل جاتی ہے۔ مگر آخرت میں ساری عزت ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو واقعی اس کا استحقاق رکھتے ہوں۔ اس استحقاق کا معیار کلمہ طیب اور عمل صالح ہے۔ یعنی اللہ کو اس طرح پانا کہ وہی آدمی کی یاد بن جائے جس میں وہ جیے۔ وہی اس کا عمل بن جائے جس میں وہ اپنی قوتیں صرف کرے۔ جو لوگ اس طرح اپنی زندگی کی تعمیر کریں خدا ان کا مددگار بن جاتا ہے اور جن لوگوں کا خدا مددگار بن جائے انھیں زیر کرنے والا کوئی نہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑪

۱۱۔ اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر پانی کی بوند سے، پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔ اور کوئی عورت نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔ اور نہ کوئی عمر والا بڑی عمر پاتا ہے اور نہ کسی کی عمر گھٹتی ہے مگر وہ ایک کتاب میں درج ہے۔ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔

پہلا انسان ارضی اجزا سے بنایا گیا۔ پھر خدا نے انسان کو ایک بوند میں بہ شکل بیج رکھ دیا۔ پھر انسانوں کو عورت اور مرد میں تقسیم کر کے ان کے جوڑے سے انسانی نسل چلائی۔ یہ واقعہ خدا کی بے پناہ قدرت کو بتاتا ہے۔

پھر ایک بچہ جب پیٹ میں پرورش پانا شروع کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ پیٹ کے اندر وہ تمام موافق اسباب بلا طلب موجود ہیں جو اس کو نا گزیر طور پر مطلوب تھے۔ یہ واقعہ مزید ثابت کرتا ہے کہ بچے کا پیدا کرنے والا بچے کی ضرورتوں کو پہلے سے جانتا تھا ورنہ وہ پیشگی طور پر اس کا اتنا مکمل انتظام کس طرح کرتا ہے۔

یہی معاملہ عمر کا ہے۔ کوئی شخص اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی عمر کا تعین کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کا معاملہ تمام تر کسی خارجی ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے کم عمر میں اٹھا لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے لمبی عمر دے دیتا ہے۔ ان سارے واقعات میں ایک خدا کے سوا کسی کا کوئی دخل نہیں پھر کیسے درست ہو سکتا ہے کہ آدمی ایک خدا کے سوا کسی اور سے اندیشہ رکھے، وہ کسی اور سے امیدیں قائم کرے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ڰ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ⑫ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ڮ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ

۱۲۔ اور دونوں دریا یکساں نہیں۔ یہ میٹھا ہے، پیاس بجھانے والا، پینے کے لیے خوش گوار۔ اور یہ کھاری کڑوا ہے۔ اور تم دونوں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور زینت کی چیز نکالتے ہو جس کو تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو جہازوں کو کہ وہ اس میں پھاڑتے ہوئے چلتے ہیں۔ تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔ ۱۳۔ وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور وہ داخل کرتا ہے دن کو رات میں۔ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے۔ ہر ایک چلتا ہے ایک مقرر وقت کے لیے۔ یہ اللہ ہی تمھارا رب ہے، اسی کے لیے بادشاہی ہے۔ اور اس کے سوا تم جنھیں

دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ
لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا
اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ
بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾ ع

پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے بھی مالک نہیں۔ ۱۴۔ اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور اگر وہ سنیں تو وہ تمھاری فریاد رسی نہیں کرسکتے۔ اور وہ قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کریں گے۔ اور ایک باخبر کی طرح کوئی تم کو نہیں بتا سکتا۔

زمین پر پانی کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے، وسیع سمندروں میں کھاری پانی کی صورت میں، اور دریاؤں اور جھیلوں اور چشموں میں میٹھے پانی کی صورت میں۔ یہ پانی آدمی کے لیے بے شمار فوائد کا ذریعہ ہے۔ وہ پینے کے لیے اور آب پاشی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے آبی جانور حاصل ہوتے ہیں جو انسان کے لیے قیمتی خوراک ہیں۔ کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصہ میں پھیلے ہوئے سمندر گویا وسیع آبی سڑکیں ہیں جنھوں نے سفر اور باربرداری کو بے حد آسان کردیا ہے۔ سمندروں سے موتی اور دوسری قیمتی چیزیں حاصل ہوتی ہیں، وغیرہ۔

پھر وسیع خلا میں خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے جن میں بے شمار فائدے ہیں۔ اس نے زمین کو سورج کے گرد اپنے محور پر کامل حساب کے ساتھ گھمار کھا ہے جس سے رات اور دن پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح کے بے شمار کائناتی انتظامات ہیں جو صرف خدا کے قائم کردہ ہیں۔ پھر خدا کے سوا کون ہے جو انسان کے جذبۂ شکر کا مستحق ہو۔ اتھاہ طاقتیں رکھنے والا خدا انسان کی حاجتیں پوری کرسکتا ہے یا وہ مفروضہ معبود جو کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ
هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ
وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ ۚ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَ
اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ
شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ
يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ
وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ
الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

۱۵۔ اے لوگو، تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو بے نیاز ہے، تعریف والا ہے۔ ۱۶۔ اگر وہ چاہے تو تم کو لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے۔ ۱۷۔ اور یہ اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ ۱۸۔ اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور اگر کوئی بھاری بوجھ والا اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے تو اس میں سے ذرا بھی نہ اٹھایا جائے گا، اگرچہ وہ قرابت والا کیوں نہ ہو۔ تم تو صرف انھیں لوگوں کو ڈراسکتے ہو جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو شخص پاک ہوتا ہے وہ اپنے لیے پاک ہوتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان انتہائی حد تک غیر محفوظ (vulnerable) ہے۔ انسان کا سارا معاملہ فطرت کے خاص توازن پر منحصر ہے۔ یہ توازن باقی نہ رہے تو ایک لمحہ میں انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

سورج اگر اپنے موجودہ فاصلہ کو ختم کرکے زمین کے قریب آجائے تو اچانک تمام انسان جل بھن کر خاک ہو جائیں۔ زمین کے اندر اس کا بڑا حصہ بے حد گرم مادہ کی صورت میں ہے۔ اس گرم مادہ کی حرکت اوپر کی طرف ہو جائے تو سطح زمین پر ایسا زلزلہ پیدا ہو کہ تمام آبادیاں کھنڈر بن کر رہ جائیں۔ اوپری فضا سے ہر وقت شہابی پتھر (meteors) برستے رہتے ہیں۔ اگر موجودہ انتظام بگڑ جائے تو یہ شہابیے ایک ایسی سنگ باری کی صورت اختیار کرلیں جس سے کسی حال میں بھی بچاؤ ممکن نہ ہو۔ اس طرح کے بے شمار ہلاکت خیز امکانات ہر وقت انسان کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو مکمل طور پر محتاج ہے۔ انسان کو خدا کی ضرورت ہے، نہ کہ خدا کو انسان کی ضرورت۔

قیامت کا بوجھ خود اپنے گناہوں کا بوجھ ہوگا، نہ کہ اینٹ پتھر کا بوجھ۔ اینٹ پتھر کے بوجھ میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کا حصہ دار بن سکتا ہے مگر خود اپنے برے عمل سے جو رسوائی اور تکلیف کسی شخص کو لاحق ہو وہ انتہائی ذاتی نوعیت کا عذاب ہوتا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کے لیے حصہ دار بننے کا سوال نہیں۔

حقیقت نہایت واضح ہے مگر حقیقت کو وہی شخص سمجھتا ہے جو اس کو سمجھنا چاہے۔ جو شخص اس بارے میں سنجیدہ ہی نہ ہو کہ حقیقت کیا ہے، اور بے حقیقت کیا، اس کو کوئی بات سمجھائی نہیں جاسکتی۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ
وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٢١﴾ وَمَا
يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ
يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي
الْقُبُورِ ﴿٢٢﴾ إِنْ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ ﴿٢٣﴾ إِنَّا
أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِن مِّنْ
أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٤﴾ وَإِن يُكَذِّبُوكَ
فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ
رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ
الْمُنِيرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَكَيْفَ
ع ۳ ۱۲ ۱۵ كَانَ نَكِيرِ ﴿٢٦﴾

۱۹۔ اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں۔ ۲۰۔ اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا۔ ۲۱۔ اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔ ۲۲۔ اور زندہ اور مردہ برابر نہیں ہوسکتے۔ بے شک اللہ سناتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ اور تم ان کو سنانے والے نہیں بن سکتے جو قبروں میں ہیں۔ ۲۳۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ ۲۴۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ ۲۵۔ اور اگر یہ لوگ تم کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں، انھوں نے بھی جھٹلایا۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلے ہوئے دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے۔ ۲۶۔ پھر جن لوگوں نے نہ مانا ان کو میں نے پکڑ لیا، تو دیکھو کہ کیسا ہوا ان کے اوپر میرا عذاب۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو امید روشنی سے کی جاسکتی ہے وہ تاریکی سے نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح سایہ سے جو چیز ملے گی وہ دھوپ سے ملنے والی نہیں۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسانوں میں کچھ آنکھ والے ہوتے ہیں اور کچھ اندھے ہوتے ہیں۔ آنکھ والا فوراً اپنے راستہ کو دیکھ کر اسے پہچان لیتا ہے۔ مگر جو اندھا ہو وہ صرف بھٹکتا پھرے گا۔ اس کو کبھی اپنے راستہ کی پہچان نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح اندرونی معرفت کے اعتبار سے بھی دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک جان دار اور دوسرے بے جان۔ جاندار انسان وہ ہے جو باتوں کو اس کی گہرائی کے ساتھ دیکھتا ہے۔ جو لفظی فریب کا پردہ پھاڑ کر معانی کا ادراک کرتا ہے۔ جو سطحی پہلوؤں سے گزر کر حقیقتِ واقعہ کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، جو چیزوں کو ان کے جوہر کے اعتبار سے پرکھتا ہے، نہ کہ محض ان کے ظاہر کے اعتبار سے۔ جس کی نگاہ ہمیشہ اصل حقیقت پر رہتی ہے، نہ کہ غیر متعلق موشگافیوں پر۔ جو اس کا تحمل نہیں کرسکتا کہ سچائی کو جان لینے کے بعد وہ اپنے آپ کو اس سے وابستہ نہ کرے۔ یہی جاندار لوگ ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کو موجودہ دنیا میں حق کو قبول کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ اور جو لوگ اس کے برعکس صفات رکھتے ہوں، وہ مردہ انسان ہیں۔ وہ امتحان کی اس دنیا میں کبھی قبول حق کی توفیق نہیں پاتے۔ وہ دعوت حق کے مقابلہ میں اندھے بنے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مر کر خدا کے یہاں چلے جاتے ہیں تاکہ اپنے اندھے پن کا انجام بھگتیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

۲۷۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کردئے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ، مختلف رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔

۲۸۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔

بادل سے ایک ہی پانی برستا ہے مگر اس سے مختلف قسم کی چیزیں اگتی ہیں۔ اچھے درخت بھی اور جھاڑ جھنکاڑ بھی۔ اسی طرح ایک ہی مادہ ہے جو پہاڑوں کی صورت میں منجمد ہوتا ہے مگر ان میں کچھ سرخ و سفید ہیں اور کچھ بالکل کالے۔ اسی طرح جاندار بھی سب ایک غذا کھاتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی انسان کے لیے کارآمد ہے اور کوئی بے کار۔

اس سے معلوم ہوا کہ فیض خواہ عام ہو مگر اس سے فائدہ ہر ایک کو اس کی اپنی استعداد کے مطابق پہنچتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ دعوتِ حق کی صورت میں خدا کی جو رحمت بکھیری جاتی ہے وہ اگرچہ

بذات خود ایک ہوتی ہے مگر مختلف انسان اپنے اندرونی مزاج کے مطابق اس سے مختلف قسم کا تاثر قبول کرتے ہیں۔ کوئی شخص حق کی دعوت میں اپنی روح کی غذا پالیتا ہے۔ وہ فوراً اس کو قبول کرکے اپنے آپ کو اس سے وابستہ کردیتا ہے اور کسی کی نفسیات اس کے لیے حق کو ماننے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ وہ اس سے بدکتا ہے، حتی کہ اس کا مخالف بن کر کھڑا ہوجاتا ہے۔

حق کی دعوت جس شخص کے لیے اس کے دل کی آواز ثابت ہو وہی علم والا انسان ہے۔ اس کے اندر فطرت کی خدائی روشنی زندہ تھی۔ اس لیے اس نے حق کے ظاہر ہوتے ہی اس کو پہچان لیا۔ اس کے مقابلہ میں وہ لوگ جاہل ہیں جو اپنی فطرت کی روشنی پر پردہ ڈالے ہوئے ہوں اور جب حق ان کے سامنے بے نقاب ہو تو اس کو پہچاننے میں ناکام رہیں۔

''اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں'' معرفت الٰہی کا اصل ذریعہ کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت کی نشانیوں پر غور کرنا ہے۔ اِس کا علم خشیت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے قرآن میں فطرت کے مشاہدہ اور کائناتی نشانیوں پر غور وفکر کے لیے بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾ وَ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۳۱﴾

۲۹۔ جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی۔
۳۰۔ تاکہ اللہ ان کو ان کا پورا اجر دے۔ اور ان کے لیے اپنے فضل سے اور زیادہ کردے۔ بے شک وہ بخشنے والا ہے، قدر داں ہے۔
۳۱۔ اور ہم نے تمھاری طرف جو کتاب وحی کی ہے وہ حق ہے، اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس کے پہلے سے موجود ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔

حضرت یعقوب حضرت ابراہیم کے پوتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام پیغمبر بنی اسرائیل کی نسل میں پیدا ہوتے رہے۔ تقریباً دو ہزار سال تک پیغمبری کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر بعد کے دور میں ان کے اندر زوال آگیا، اور وہ اس قابل نہ رہے کہ کتاب الٰہی کے حامل بن سکیں۔ چنانچہ دوسری زندہ قوم (بنواسماعیل) کو کتابِ الٰہی کا حامل بننے کے لیے منتخب کیا گیا۔ بنواسماعیل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اسی فیصلہ الٰہی کی تعمیل تھی۔ اس آیت میں ''منتخب بندوں'' سے مراد یہی بنواسماعیل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنواسماعیل کے سامنے قرآن پیش کیا تو ان میں تین قسم کے لوگ نکلے۔ ایک وہ جو اس کے مخالف بن کر کھڑے ہوگئے۔ دوسرے وہ جنھوں نے درمیانی راہ اختیار کی۔ تیسرا گروہ آگے بڑھنے والوں کا تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر اسلام کی عظیم تاریخ بنائی۔

قرآن کا ساتھ دینے کے لیے انھیں ہر قسم کی راحت سے محروم ہونا پڑا۔ اس کے نتیجے میں ان کی زندگی عملاً صبر اور مشقت کی زندگی بن گئی۔ اس قربانی کی قیمت انھیں آخرت میں اس طرح ملے گی کہ خدا انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ کے لیے غم اور تکلیف سے محفوظ ہوجائیں گے۔

اہل جنت کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ اللہ کا شکر ہے، جس نے ہم سے حزن کو ختم کردیا۔ دنیا میں غم وحزن کا تجربہ آخرت کے معاملہ کا ایک تعارف ہے۔ دنیا میں حزن کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آخرت میں خدا اپنے کمال قدرت سے اہل جنت کے لیے حزن کو ختم کردے گا۔ اس کے بعد خدا کی ابدی جنت لازوال خوشیوں کی آرام گاہ بن جائے گی۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ
عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ
مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ
بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ؕ ﴿٣٢﴾
جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا
مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ
فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٣٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ
اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ
شَكُوْرُ ۙ ﴿٣٤﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ
فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا
فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿٣٥﴾

۳۲۔ پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ پس ان میں سے کچھ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور ان میں سے کچھ بیچ کی چال پر ہیں۔ اور ان میں سے کچھ اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ یہی سب سے بڑا فضل ہے۔ ۳۳۔ ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے، وہاں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے، اور وہاں ان کا لباس ریشم ہوگا۔ ۳۴۔ اور وہ کہیں گے، شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔ بے شک ہمارا رب معاف کرنے والا، قدر کرنے والا ہے۔ ۳۵۔ جس نے ہم کو اپنے فضل سے آباد رہنے کے گھر میں اُتارا، اس میں ہم کو نہ کوئی مشقت پہنچے گی اور نہ کبھی تکان لاحق ہوگی۔

حضرت یعقوب حضرت ابراہیم کے پوتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام پیغمبر بنی اسرائیل کی نسل میں پیدا ہوتے رہے۔ تقریباً دو ہزار سال تک پیغمبری کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر بعد کے دور میں ان کے اندر زوال آ گیا، اور وہ اس قابل نہ رہے کہ کتابِ الٰہی کے حامل بن سکیں۔ چنانچہ دوسری زندہ قوم (بنواسماعیل) کو کتابِ الٰہی کا حامل بننے کے لیے منتخب کیا گیا۔

بنواسماعیل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اسی فیصلہ الٰہی کی تعمیل تھی۔ اس آیت میں ''منتخب بندوں'' سے مراد یہی بنواسماعیل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنواسماعیل کے سامنے قرآن پیش کیا تو ان میں تین قسم کے لوگ نکلے۔ ایک وہ جو اس کے مخالف بن کر کھڑے ہو گئے۔ دوسرے وہ جنھوں نے درمیانی راہ اختیار کی۔ تیسرا گروہ آگے بڑھنے والوں کا تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر اسلام کی عظیم تاریخ بنائی۔

قرآن کا ساتھ دینے کے لیے انھیں ہر قسم کی راحت سے محروم ہونا پڑا۔ اس کے نتیجے میں ان کی زندگی عملاً صبر اور مشقت کی زندگی بن گئی۔ اس قربانی کی قیمت انھیں آخرت میں اس طرح ملے گی کہ خدا انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ کے لیے غم اور تکلیف سے محفوظ ہو جائیں گے۔

اہل جنت کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ اللہ کا شکر ہے، جس نے ہم سے حزن کو ختم کر دیا۔ دنیا میں غم و حزن کا تجربہ آخرت کے معاملہ کا ایک تعارف ہے۔ دنیا میں حزن کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آخرت میں خدا اپنے کمال قدرت سے اہل جنت کے لیے حزن کو ختم کر دے گا۔ اس کے بعد خدا کی ابدی جنت لازوال خوشیوں کی آرام گاہ بن جائے گی۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝۳۶ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝۳۷ ع ۱۱/۱۶

۳۶۔ اور جنھوں نے انکار کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان کی قضا آئے گی کہ وہ مر جائیں اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ہر منکر کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ ۳۷۔ اور وہ لوگ اس میں چلائیں گے اے ہمارے رب، ہم کو نکال لے۔ ہم نیک عمل کریں گے، اس سے مختلف جو ہم کیا کرتے تھے۔ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی کہ جس کو سمجھنا ہوتا وہ سمجھ سکتا۔ اور تمھارے پاس ڈرانے والا آیا۔ اب چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

دنیا میں حق کا انکار کرنے والے آخرت میں حق کا مکمل اعتراف کریں گے۔ مگر یہ اعتراف ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ آخرت کا اعتراف مجبور انسان کا اعتراف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو جو اعتراف مطلوب ہے وہ اختیاری اعتراف ہے، نہ کہ جبری اعتراف۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۳۸ هُوَ الَّذِيْ

۳۸۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جاننے والا ہے۔ بے شک وہ دل کی باتوں سے بھی باخبر ہے۔ ۳۹۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین میں آباد

جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

کیا۔ تو جو شخص انکار کرے گا اس کا انکار اسی پر پڑے گا۔ اور منکروں کے لیے ان کا انکار، ان کے رب کے نزدیک، ناراضی ہی کے بڑھنے کا باعث ہوتا ہے۔ اور منکروں کے لیے ان کا انکار اُن کے خسارہ ہی میں اضافہ کرے گا۔

اس آیت میں خلیفہ سے مراد پچھلی قوموں کا خلیفہ بننا ہے۔ ''تم کو زمین میں خلیفہ بنایا'' کا مطلب ہے پچھلی قوموں کے گزرنے کے بعد تم کو ان کی جگہ زمین میں آباد کیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ ایک قوم کو زمین میں بسنے اور عمل کرنے کا موقع دیتا ہے۔ پھر جب وہ قوم اپنی نااہلی ثابت کر دیتی ہے تو اس کو ہٹا کر دوسری قوم کو اس کی جگہ لے آتا ہے۔ اس طرح زمین پر ایک کے بعد ایک قوم کی آبادکاری کا سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

موجودہ زمانہ میں فطرت کے جو قوانین دریافت ہوئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہاں اس کا امکان ہے کہ اندھیرے میں کسی چیز کا فوٹو لیا جائے۔ بظاہر نہ سنائی دینے والی آواز کو مشین کی مدد سے قابل سماعت بنایا جاسکے۔ تخلیق میں اس طرح کے امکانات خالق کی قدرت کا تعارف ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا خالق ایک ایسی ہستی ہے جو غیب کو جانے اور دل کے اندر چھپی ہوئی بات کو سن سکے۔ گویا انسان کا معاملہ ایک ایسے علیم اور قدیر خدا سے ہے جس سے نہ کسی جرم کو چھپایا جاسکتا اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس کے فیصلہ کو کسی طرح بدلوایا جاسکے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾

۴۰۔ کہو، ذرا تم دیکھو اپنے ان شریکوں کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، مجھ کو دکھاؤ کہ انھوں نے زمین میں سے کیا بنایا ہے۔ یا ان کی آسمانوں میں کوئی حصہ داری ہے۔ یا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی کسی دلیل پر ہیں، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے صرف دھوکہ کی باتوں کا وعدہ کر رہے ہیں۔ ۴۱۔ بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمینوں کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے سوا کوئی اور ان کو تھام نہیں سکتا۔ بے شک وہ تحمل والا ہے، بخشنے والا ہے۔

کائنات کی تخلیق اور اتھاہ خلا میں بے شمار اجرام سماوی کا نظام ہیبت ناک حد تک عظیم ہے۔ یہ بالکل ناقابل قیاس ہے کہ اس عظیم کارنامہ کو جزئی یا کلّی طور پر ان ہستیوں میں سے کسی کی طرف منسوب کیا

جا سکے جن کو لوگ بطور خود معبود بنا کر پوجتے ہیں۔ اسی طرح اس کا بھی ثبوت نہیں کہ خدا نے خود یہ خبر دی ہو کہ کوئی اور ہے جو اس کے ساتھ خدائی میں شریک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غیر اللہ کی پرستش کا سارا معاملہ صرف فریب پر قائم ہے۔ اس قسم کا فریب اسی وقت تک چلے گا جب تک قیامت نہ آئے۔ قیامت کے آتے ہی ان کا اس طرح خاتمہ ہو جائے گا جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ﴿٤٢﴾ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿٤٤﴾

۴۲۔ اور انھوں نے اللہ کی تاکیدی قسمیں کھائی تھیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ ہر ایک امت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے۔ پھر جب ان کے پاس ایک ڈرانے والا آیا تو صرف ان کی بیزاری ہی کو ترقی ہوئی۔
۴۳۔ زمین میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے، اور ان کی بری تدبیروں کو۔ اور بری تدبیروں کا وبال تو بری تدبیر کرنے والوں ہی پر پڑتا ہے۔ تو کیا یہ اسی دستور کے منتظر ہیں جو اگلے لوگوں کے باب میں ظاہر ہوا۔ پس تم خدا کے دستور میں نہ کوئی تبدیلی پاؤ گے اور نہ خدا کے دستور کو ٹلتا ہوا پاؤ گے۔
۴۴۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، اور وہ قوت میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور خدا ایسا نہیں کہ کوئی چیز اس کو عاجز کر دے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ بے شک وہ علم والا ہے، قدرت والا ہے۔

عرب کے لوگ جب سنتے کہ یہود نے اور دوسری قوموں نے اپنے نبیوں کی نافرمانی کی تو وہ پرجوش طور پر کہتے کہ اگر ایسا ہو کہ ہمارے درمیان کوئی نبی آئے تو ہم اس کو پوری طرح مانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ مگر جب ان کے درمیان ایک پیغمبر آیا تو وہ اس کے مخالف بن گئے۔

یہ نفسیات کسی نہ کسی شکل میں تمام لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے کو حق پسند کے روپ میں ظاہر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب بھی کوئی صحیح بات اس کے سامنے آئے گی تو وہ ضرور اس کو مان لے گا۔ مگر جب حق کھلے کھلے دلائل کے ساتھ آتا ہے تو وہ اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ حتی کہ اس کا مخالف بن جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انکارِ حق کسی خاص قوم کی خصوصیت نہیں۔ وہ انسانی نفسیات کی عام خصوصیت ہے۔ حق کو ماننا اکثر حالات میں اپنی بڑائی کو ختم کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ آدمی اپنی بڑائی کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ حق کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ حق کا انکار ضرور اس کے بس میں ہے مگر حق کے انکار کے انجام سے اپنے آپ کو بچانا ہرگز اس کے بس میں نہیں۔

وَلَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوۡا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَہۡرِہَا مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ لٰکِنۡ یُّؤَخِّرُہُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِعِبَادِہٖ بَصِیۡرًا ﴿۴۵﴾ ع ۵ / ۱۷

۴۵۔ اور اگر لوگوں کے اعمال پر اللہ ان کو پکڑتا تو زمین پر وہ ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا، لیکن وہ ان کو ایک مقرر مدت تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے۔

انسان کو دنیا میں عمل کی آزادی دی گئی تھی۔ مگر اس نے اس کا غلط استعمال کیا۔ یہ غلطیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اگر انسان کو اس کی غلط کاریوں پر فوراً پکڑا جانے لگے تو زمین سے انسانی نسل کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر انسان کی آزادی برائے امتحان ہے، اور اس امتحان کی ایک مدت مقرر ہے۔ ایک فرد کی مدت موت تک ہے اور مجموعی طور پر پوری انسانیت کی مدت قیامت تک۔ اسی بنا پر انسان کی نسل زمین پر باقی ہے۔ تاہم جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ مہلت کی مقرر مدت سے پہلے کسی کو نہیں پکڑتا۔ اسی طرح یہ بھی ایک سنگین حقیقت ہے کہ مہلت کی مقرر مدت گزر جانے کے بعد وہ ضرور انسان کو پکڑے گا۔ کوئی شخص اس کی پکڑ سے بچنے والا نہیں۔

۳۶۔ سُوۡرَۃُ یٰسٓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

یٰسٓ ۚ ﴿۱﴾ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ﴿۳﴾ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ؕ﴿۴﴾ تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۵﴾ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُہُمۡ فَہُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۶﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ یٰسٓ۔ ۲۔ قسم ہے باحکمت قرآن کی۔ ۳۔ بے شک تم رسولوں میں سے ہو۔ ۴۔ نہایت سیدھے راستے پر۔ ۵۔ یہ خدائے عزیز اور رحیم کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ ۶۔ تاکہ تم ان لوگوں کو ڈرا دو جن کے اگلوں کو نہیں ڈرایا گیا۔ پس وہ بے خبر ہیں۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کے پیغمبر ہونے کا ثبوت خود وہ قرآن حکیم ہے جس کو آپ نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ میرے اوپر خدا کی طرف سے اترا ہے۔ قرآن کے حکیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کا داعی ہے۔ یعنی وہ اس راستے کی طرف رہنمائی کر رہا ہے جو بالکل سیدھا اور سچا ہے۔ اس کی کوئی بات عقل اور

فطرت سے ٹکرانے والی نہیں۔ قرآن کے نزول کو اب ڈیڑھ ہزار سال ہو رہے ہیں۔ مگر آج تک اس میں کسی خلاف عقل یا خلافِ فطرت بات کی نشان دہی نہ کی جاسکی۔ قرآن کی یہی امتیازی صفت اس کے کتابِ الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

''تا کہ تم قوم کو ڈرا دو'' میں قوم سے مراد بنو اسماعیل ہیں۔ ہر نبی اولاً اپنی قوم کے لیے آتا ہے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام کی اولین مخاطب بھی ان کی اپنی قوم تھی۔ مگر چونکہ آپ کے بعد نبوت ختم ہوگئی۔ اس لیے اب قیامت تک کے لیے آپ کی نبوت کا تسلسل جاری ہے۔ فرق یہ ہے کہ بنو اسماعیل پر آپ نے براہِ راست حجت تمام کی اور آپ کے بعد مختلف اقوام پر دعوت اور اتمام حجت کا کام آپ کی نیابت میں آپ کی امت کو انجام دینا ہے۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ ٧ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۞ ٨ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۞ ٩ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ ١٠ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ ۞ ١١

۷۔ ان میں سے اکثر لوگوں پر بات ثابت ہو چکی ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۸۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں۔ سو وہ ٹھوڑیوں تک ہیں، پس ان کے سر اونچے ہو رہے ہیں۔ ۹۔ اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کر دی ہے اور ایک آڑ ان کے پیچھے کر دی ہے۔ پھر ہم نے ان کو ڈھانک دیا تو ان کو دکھائی نہیں دیتا۔ ۱۰۔ اور ان کے لیے یکساں ہے، تم ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۱۱۔ تم تو صرف اس شخص کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر چلے اور خدا سے ڈرے بن دیکھے۔ تو ایسے شخص کو معافی کی اور باعزت ثواب کی بشارت دے دو۔

آدمی کی گردن میں طوق بھرا ہوا ہو تو اس کا سر اٹھا رہ جائے گا اور وہ نیچے کی چیز کو نہ دیکھ سکے گا۔ یہ ان مغرور لوگوں کی تصویر ہے جو اپنی بڑائی میں اتنا گم ہوں کہ اپنے سے باہر کی کوئی حقیقت انھیں دکھائی ہی نہ دے۔ ایسے لوگوں کو کبھی حق کے اعتراف کی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔

ہدایت پانے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ آدمی کے اندر اعتراف کا مادہ ہو، اس کو خدا کے سامنے حاضری کا کھٹکا لگا ہوا ہو۔ وہ کلی صداقت سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہو سکے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو حق کے ظاہر ہوتے ہی اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اللہ کا سب سے بڑا انعام پاتے ہیں۔

إِنَّا نَحۡنُ نُحۡيِ ٱلۡمَوۡتَىٰ وَنَكۡتُبُ مَا قَدَّمُواْ وَ
ءَاثَٰرَهُمۡۚ وَكُلَّ شَيۡءٍ أَحۡصَيۡنَٰهُ فِيٓ إِمَامٖ
ع ۱۲/۱۸ مُّبِينٖ ﴿١٢﴾

۱۲۔ یقیناً ہم مُردوں کو زندہ کریں گے۔ اور ہم لکھ رہے ہیں جو انھوں نے آگے بھیجا اور جو انھوں نے پیچھے چھوڑا۔ اور ہر چیز ہم نے درج کر لی ہے ایک کھلی ہوئی کتاب میں۔

جدید تحقیقات نے بتایا ہے کہ انسان اپنے منھ سے جو آواز نکالتا ہے وہ نقوش کی صورت میں فضا میں محفوظ ہوجاتی ہے۔ اسی طرح انسان جو عمل کرتا ہے اس کا عکس بھی حرارتی لہروں کی شکل میں مستقل طور پر دنیا میں موجود ہوجاتا ہے۔ گویا اس دنیا میں ہر آدمی کی ویڈیو ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ انسان کے علم کے بغیر اور اس کے ارادہ سے آزاد اس کا قول اور عمل مکمل طور پر محفوظ کیا جارہا ہو اور کسی بھی لمحہ اس کو دہرایا جاسکے۔

وَٱضۡرِبۡ لَهُم مَّثَلًا أَصۡحَٰبَ ٱلۡقَرۡيَةِ إِذۡ
جَآءَهَا ٱلۡمُرۡسَلُونَ ﴿١٣﴾ إِذۡ أَرۡسَلۡنَآ
إِلَيۡهِمُ ٱثۡنَيۡنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزۡنَا
بِثَالِثٖ فَقَالُوٓاْ إِنَّآ إِلَيۡكُم مُّرۡسَلُونَ ﴿١٤﴾
قَالُواْ مَآ أَنتُمۡ إِلَّا بَشَرٞ مِّثۡلُنَا وَمَآ
أَنزَلَ ٱلرَّحۡمَٰنُ مِن شَيۡءٍ إِنۡ أَنتُمۡ إِلَّا
تَكۡذِبُونَ ﴿١٥﴾ قَالُواْ رَبُّنَا يَعۡلَمُ إِنَّآ
إِلَيۡكُمۡ لَمُرۡسَلُونَ ﴿١٦﴾ وَمَا عَلَيۡنَآ إِلَّا
ٱلۡبَلَٰغُ ٱلۡمُبِينُ ﴿١٧﴾ قَالُوٓاْ إِنَّا تَطَيَّرۡنَا
بِكُمۡۖ لَئِن لَّمۡ تَنتَهُواْ لَنَرۡجُمَنَّكُمۡ
وَلَيَمَسَّنَّكُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٞ ﴿١٨﴾ قَالُواْ
طَٰٓئِرُكُم مَّعَكُمۡۚ أَئِن ذُكِّرۡتُمۚ بَلۡ أَنتُمۡ
قَوۡمٞ مُّسۡرِفُونَ ﴿١٩﴾

۱۳۔ اور ان کو بستی والوں کی مثال سناؤ، جب کہ اس میں رسول آئے۔ ۱۴۔ جب کہ ہم نے ان کے پاس دو رسول بھیجے تو انھوں نے دونوں کو جھٹلایا، پھر ہم نے تیسرے سے ان کی تائید کی، انھوں نے کہا کہ ہم تمھارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ ۱۵۔ لوگوں نے کہا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو اور رحمان نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، تم محض جھوٹ بولتے ہو۔ ۱۶۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم بے شک تمھارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ ۱۷۔ اور ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔ ۱۸۔ لوگوں نے کہا کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں، اگر تم لوگ باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کریں گے اور تم کو ہماری طرف سے سخت تکلیف پہنچے گی۔ ۱۹۔ انھوں نے کہا کہ تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہے، کیا اتنی بات پر کہ تم کو نصیحت کی گئی۔ بلکہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔

بستی سے مراد غالباً مصر کی بستی ہے۔ یہاں بیک وقت دو پیغمبر (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون) لوگوں کو

خبردار کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ مگر انھوں نے انکار کیا۔ پھر ان کی اپنی قوم سے تیسرا شخص اٹھا اور اس نے دونوں رسولوں کی تائید کی۔ اس تیسرے شخص سے مراد غالباً وہی رجل مومن ہے جس کا ذکر قرآن میں سورہ مومن میں تفصیل سے آیا ہے۔

ہر زمانہ میں آدمی کے لیے سب سے زیادہ تلخ چیز یہ رہی ہے کہ اس کو ایسی نصیحت کی جائے جو اس کے مزاج کے خلاف ہو۔ ایسی بات سن کر آدمی فوراً بگڑ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ معتدل ذہن کے ساتھ اس پر غور نہیں کرپاتا۔ وہ اس کو دلیل کے اعتبار سے نہیں جانچتا بلکہ ضد اور نفرت کے تحت اس کے خلاف غیر متعلق باتیں کہتا رہتا ہے۔ کسی بات کو دلیل سے جانچنا حد کے اندر رہنا ہے اور بے دلیل مخالفت کرنا حد سے باہر نکل جانا۔

وَجَآءَ مِنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ رَجُلٌ يَّسۡعٰى قَالَ يٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا يَسۡـَٔـلُكُمۡ اَجۡرًا وَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۲۱﴾

۲۰۔ اور شہر کے دور مقام سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا، اے میری قوم، رسولوں کی پیروی کرو۔ ۲۱۔ ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتے۔ اور وہ ٹھیک راستے پر ہیں۔

دونوں رسول اس وقت بظاہر بالکل بے زور تھے۔ مگر تیسرے شخص نے اپنے آپ کو انھیں کے ساتھ وابستہ کیا۔ حق اور ناحق کے مقابلہ میں آدمی کو حق کا ساتھ دینا پڑتا ہے، خواہ وہ طاقت ور کے مقابلہ میں کمزور کا ساتھ دینے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

تیسرے شخص نے قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ رسول تم سے اجر نہیں مانگتے، اور وہ ہدایت یاب بھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف بے غرضی آدمی کے ہدایت یاب ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ بے غرض اور نیک نیت ہونے کے باوجود آدمی کی بات دلیل کے معیار پر پرکھی جائے گی اور وہ اسی وقت صحیح سمجھی جائے گی جب کہ وہ دلیل کے معیار پر پوری اترے۔

وَمَا لِىَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنۡ يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّىۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يُنۡقِذُوۡنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّىۡۤ اِذًا لَّفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّىۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّكُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ ﴿۲۵﴾ قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَـنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِىۡ

☆ ۲۲۔ اور میں کیوں نہ عبادت کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۲۳۔ کیا میں اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤں۔ اگر رحمٰن مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش میرے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھ کو چھڑا سکیں گے۔ ۲۴۔ بے شک اس وقت میں ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا۔ ۲۵۔ میں تمھارے رب پر

يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ
الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾

ایمان لایا تو تم بھی میری بات سن لو۔ ۲۶۔ ارشاد ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس نے کہا کاش، میری قوم جانتی۔ ۲۷۔ کہ میرے رب نے مجھ کو بخش دیا اور مجھ کو عزت والوں میں شامل کر دیا۔

مردِ حق نے اپنی زندگی خطرہ میں ڈال کر پیغمبروں کی دعوت کی تائید کی تھی۔ اس کا یہ عمل اتنا قیمتی تھا کہ اس کے بعد اس کو جنت میں داخل کر دیا گیا۔ جنت میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنی ظالم قوم کو برا نہیں کہتا۔ بلکہ یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش وہ لوگ میرا انجام جانتے تو وہ حق کے مخالف نہ بنتے۔ یہ سچے مومن کی تصویر ہے۔ مومن ہر حال میں لوگوں کا خیر خواہ ہوتا ہے، خواہ لوگ اس کے ساتھ کیسا ہی ظالمانہ سلوک کریں۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ
مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ
اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾
يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ
اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ
اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا
مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع

۲۸۔ اور اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری، اور ہم فوج نہیں اتارا کرتے۔ ۲۹۔ بس ایک دھما کہ ہوا تو یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے۔ ۳۰۔ افسوس ہے بندوں کے اوپر، جو رسول بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔ ۳۱۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں۔ اب وہ ان کی طرف واپس آنے والی نہیں۔ ۳۲۔ اور ان میں کوئی ایسا نہیں جو اکٹھا ہو کر ہمارے پاس حاضر نہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کسی قوم کی ہلاکت کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو اتنا ہی کافی ہوتا ہے زمینی اسباب کو اس کے خلاف کر دیا جائے۔ ساری آسمانی طاقتوں کو اس کے خلاف استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

پیغمبروں کا استہزا کیوں کیا گیا، اس کا جواب خود لفظ ''استہزاء'' میں موجود ہے۔ استہزا کرنے والے ہمیشہ اس انسان کا استہزاء کرتے ہیں جو ان کو حقیر دکھائی دیتا ہو۔ پیغمبروں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ پیغمبر کی شخصیت کو ان کے ہم زمانہ لوگوں نے اِس سے کم سمجھا کہ ان کی زبان سے خدائی صداقت کا اعلان ہو اس لیے انھوں نے پیغمبروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔

وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚۖ اَحْيَيْنٰهَا وَ
اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ
فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ
ثَمَرِهٖ ۙ وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا
يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ
كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ
مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

۳۳۔ اور ایک نشانی ان کے لیے مردہ زمین ہے۔ اس کو ہم نے زندہ کیا اور اس سے ہم نے غلہ نکالا۔ پس وہ اس میں سے کھاتے ہیں۔ ۳۴۔ اور اس میں ہم نے کھجور کے اور انگور کے باغ بنائے۔ اور اس میں ہم نے چشمے جاری کیے۔ ۳۵۔ تاکہ لوگ اس کے پھل کھائیں۔ اور اس کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۳۶۔ پاک ہے وہ ذات جس نے سب چیز کے جوڑے بنائے۔ ان میں سے بھی جن کو زمین اگاتی ہے اور خود ان کے اندر سے بھی۔ اور ان میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے۔

زمین کی سطح پر زرخیز مٹی کا جمع ہونا، اس کے لیے پانی اور دھوپ اور ہوا کا انتظام، پھر بیج کے اندر نشوونما کی صلاحیت، اس طرح کے بے شمار معلوم اور غیر معلوم اسباب ہیں جو بالآخر غلہ اور پھل اور سبزی کی شکل اختیار کرکے انسان کی خوراک بنتے ہیں۔ یہ پورا نظام انسان کے بنائے بغیر بنا ہے۔ اس کو وجود میں لانا اور اس کو قائم رکھنا سراسر خدا کی رحمت سے ہوتا ہے۔ اگر انسان اس پر سوچے تو وہ شکر کے جذبہ سے بھر جائے۔

پھر اسی نظام میں ایک عظیم تر حقیقت کی نشانی بھی موجود ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں جوڑے کا اصول کارفرما ہے۔ پھر جب کائنات کا نظام اس اصول پر قائم ہے کہ یہاں تمام چیزیں اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنی تکمیل کریں تو موجودہ دنیا کا بھی ایک جوڑا ہونا چاہیے جس کے ملنے سے اس کی تکمیل ہوتی ہو۔ اس طرح موجودہ دنیا میں جوڑے کا نظام آخرت کے امکان کو ثابت کردیتا ہے۔

وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا
هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ الشَّمْسُ تَجْرِيْ
لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ
الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ
كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ

۳۷۔ اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں تو وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ ۳۸۔ اور سورج، وہ اپنی ٹھہرائی ہوئی راہ پر چلتا رہتا ہے۔ یہ عزیز اور علیم کا باندھا ہوا اندازہ ہے۔ ۳۹۔ اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کردیں، یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا

لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

ہے جیسے کھجور کی پرانی شاخ۔ ۴۰۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات، دن سے پہلے آسکتی ہے۔ اور سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔

زمین اور چاند اور سورج سب کا ایک مدار مقرر ہے۔ سب اپنے اپنے مدار پر حد درجہ صحت کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ اس گردش سے مختلف مظاہر وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً زمین پر رات اور دن کا پیدا ہونا، چاند کا کم وبیش ہو کر فلکیاتی کیلنڈر کا کام کرنا، وغیرہ۔ یہ نظام کروروں سال سے قائم ہے اور پھر بھی اس میں کسی قسم کا کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

یہ مشاہدہ خدا کی اتھاہ قدرت کا ایک تعارف ہے۔ اگر آدمی اس سے سبق لے تو ایک خدا کی عظمت اس کے ذہن پر اس طرح چھائے کہ دوسری تمام عظمتیں اپنے آپ اس کے ذہن سے حذف ہو جائیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾

۴۱۔ اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ ۴۲۔ اور ہم نے ان کے لیے اسی کے مانند اور چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔ ۴۳۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں، پھر نہ کوئی ان کی فریاد سننے والا ہو اور نہ وہ بچائے جا سکیں۔ ۴۴۔ مگر یہ ہماری رحمت ہے اور ان کو ایک وقتِ معین تک فائدہ دینا ہے۔

ہماری دنیا میں خشکی بھی ہے اور سمندر بھی۔ اور ہمارے اوپر وسیع فضا بھی۔ خدا نے اس دنیا میں ایسے امکانات رکھ دئے ہیں کہ آدمی تینوں میں سے کسی حصہ میں بھی سفر سے عاجز نہ ہو۔ وہ خشکی میں اور پانی اور فضا میں یکساں طور پر سفر کر سکے۔

یہ تمام سفر سراسر خدا کے انتظام کے تحت ممکن ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے لیے اتنی بڑی رحمت ہیں کہ انسان اگر ان پر غور کرے تو وہ بالکل اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دے، اور کبھی سرکشی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ

۴۵۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس سے ڈرو جو تمھارے آگے ہے اور جو تمھارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۴۶۔ اور ان کے رب کی

اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا
مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ
اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾

نشانیوں میں سے کوئی نشانی بھی ان کے پاس ایسی نہیں آتی جس سے وہ اعراض نہ کرتے ہوں۔ ۴۷۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرو تو جن لوگوں نے انکار کیا وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ ہم ایسے لوگوں کو کھلائیں جن کو اللہ چاہتا تو وہ ان کو کھلا دیتا۔ تم لوگ تو کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔

آدمی کے پیچھے اس کے اعمال ہیں، اور اس کے آگے حساب کتاب کا دن ہے۔ زندگی گویا عمل کی دنیا سے انجام کی دنیا کی طرف سفر ہے۔ یہ بے حد نازک صورتِ حال ہے۔ آدمی کو اس کا واقعی احساس ہو تو وہ کانپ اٹھے۔ مگر آدمی نہ غور کرتا ہے اور نہ کوئی نشانی اس کی آنکھ کھولنے والی ثابت ہوتی۔ وہ جھوٹی تاویلوں کے ذریعہ اپنے اعمال کو صحیح ثابت کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مر جاتا ہے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
تَاْخُذُهُمْ وَ هُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
تَوْصِيَةً وَّلَاۤ اِلٰۤى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع وَنُفِخَ ع ۳ ۱۸ ۲
فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ
يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ
مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ
الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

۴۸۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۴۹۔ یہ لوگ بس ایک چنگھاڑ کی راہ دیکھ رہے ہیں جو ان کو آ پکڑے گی۔ اور وہ جھگڑتے ہی رہ جائیں گے۔ ۵۰۔ پھر وہ نہ کوئی وصیت کر پائیں گے اور نہ اپنے لوگوں کی طرف لوٹ سکیں گے۔ ۵۱۔ اور صور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔ ۵۲۔ وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی، ہماری قبر سے کس نے ہم کو اٹھایا — یہ وہی ہے جس کا رحمن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔ ۵۳۔ بس وہ ایک چنگھاڑ ہوگی، پھر یکایک سب جمع ہو کر ہمارے پاس حاضر کر دئے جائیں گے۔

جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ آخرت کی طرف سے اس طرح بے فکر رہتے ہیں گویا کہ آخرت کوئی بہت دور کی چیز ہے۔ ان میں سے جو لوگ زیادہ غیر سنجیدہ ہیں وہ بعض اوقات آخرت کا مذاق بھی اڑانے لگتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنی اسی غفلت میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ قیامت انھیں اس

طرح دفعۃً پکڑ لے گی کہ وہ اس کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

حدیث میں ہے کہ اسرافیل صور اپنے منھ میں لیے ہوئے عرش کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب حکم ہو اور وہ اس میں پھونک مار دیں۔ صور کا پھونکا جانا ایسا ہی ہے جیسے امتحان کا وقت ختم ہو جانے کا گھنٹہ بجنا۔ اس کے فوراً بعد دنیا کا نظام بدل جائے گا۔ اس کے بعد انجام کا مرحلہ شروع ہوگا، جب کہ آج ہم عمل کے مرحلہ سے گزر رہے ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّ لَا تُجْزَوْنَ
اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ اَصْحٰبَ
الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَ
اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ
مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّ لَهُمْ مَّا
يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ
رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾

۵۴۔ پس آج کے دن کسی شخص پر کوئی ظلم نہ ہوگا، اور تم کو وہی بدلہ ملے گا جو تم کرتے تھے۔
۵۵۔ بے شک جنت کے لوگ آج اپنے مشغلوں میں خوش ہوں گے۔
۵۶۔ وہ اور ان کی بیویاں، سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔
۵۷۔ ان کے لیے وہاں میوے ہوں گے اور ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ مانگیں گے۔
۵۸۔ ان کو سلام کہلایا جائے گا مہربان رب کی طرف سے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے عمل کے معنوی نتائج سامنے نہیں آتے۔ آخرت وہ جگہ ہے جہاں ہر آدمی اپنے عمل کے معنوی نتائج کو پائے گا۔ جو شخص یہاں صرف وقتی مفادات کے لیے سرگرم رہا وہ آخرت کی ابدی دنیا میں اس طرح اٹھے گا کہ وہاں وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ اس کے برعکس، جو لوگ اعلیٰ مقصد کے لیے جئے وہ وہاں شاندار انجام میں خوش ہو رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات اس کے علاوہ ہوں گی۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمْ اَعْهَدْ
اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ
لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا
كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ

۵۹۔ اور اے مجرمو، آج تم الگ ہو جاؤ۔
۶۰۔ اے اولادِ آدم، کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کر دی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔
۶۱۔ اور یہ کہ تم میری ہی عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے۔
۶۲۔ اور اس نے تم میں سے ایک کثیر گروہ کو گمراہ کر دیا۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے۔
۶۳۔ یہ ہے جہنم، جس کا

الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۳﴾ اِصۡلَوۡهَا الۡیَوۡمَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۶۴﴾ اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاهِهِمۡ وَ تُکَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ تَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۶۵﴾

تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ۶۴۔اب اپنے کفر کے بدلے میں اس میں داخل ہوجاؤ۔ ۶۵۔آج ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ یہ لوگ کرتے تھے۔

موجودہ زندگی میں اچھے لوگ اور برے لوگ ایک ہی دنیا میں رہتے ہیں۔ اگلی زندگی میں دونوں کی دنیائیں الگ الگ کردی جائیں گی۔ شیطان کے بندے شیطان کے ساتھ اور رحمان کے بندے رحمان کے ساتھ۔

کوئی آدمی شیطان کے نام پر شیطان کی پرستش نہیں کرتا۔ مگر بالواسطہ طور پر غیر اللہ کا ہر پرستار دراصل شیطان کا پرستار ہے۔ کیونکہ وہ شیطان ہی کی تزئین کے تحت ایسا کررہا ہے۔ مثلاً فرشتوں اور قومی بزرگوں کی پرستش اس طرح شروع ہوئی کہ شیطان نے ان کے بارے میں جھوٹے عقیدے لوگوں کے ذہن میں ڈالے اور لوگ ان شیطانی ترغیبات سے متاثر ہوکر ان کی پرستش کرنے لگے۔

جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان کی کھال ایک قسم کا ریکارڈر ہے جس پر آدمی کی بولی ہوئی آوازیں مرتسم ہوجاتی ہیں اور ان کو دہرایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک نشانی ہے جو اس بات کو قابل فہم بنارہی ہے کہ کس طرح آخرت میں آدمی کے ہاتھ اور پاؤں آدمی کے احوال سنانے لگیں گے۔

وَلَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰۤی اَعۡیُنِهِمۡ فَاسۡتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۶۶﴾ وَ لَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰهُمۡ عَلٰی مَکَانَتِهِمۡ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مُضِیًّا وَّ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۶۷﴾ ع وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَکِّسۡهُ فِی الۡخَلۡقِ ؕ اَفَلَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۶۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھوں کو مٹا دیتے۔ پھر وہ راستہ کی طرف دوڑتے تو ان کو کہاں نظر آتا۔ ۶۷۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ ہی پر ان کی صورتیں بدل دیتے تو وہ نہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔ ۶۸۔ اور ہم جس کی عمر زیادہ کردیتے ہیں، تو اس کو اس کی پیدائش میں پیچھے لوٹا دیتے ہیں، تو کیا وہ سمجھتے نہیں۔

انسان کو آنکھ اور ہاتھ پاؤں اور دوسری جو صلاحیتیں حاصل ہیں ان کو پاکر وہ سرکش بن جاتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ سوچے تو یہی واقعہ اس کی نصیحت کے لیے کافی ہوجائے کہ یہ صلاحیتیں اس کی اپنی بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ خالق کے دینے سے اس کو ملی ہیں۔ اور جب دینے والا کوئی اور ہو تو اس نے جس طرح دیا ہے اسی طرح وہ ان کو واپس لے سکتا ہے۔

مزید یہ کہ بڑھاپے کی صورت میں اس امکان کی ایک جھلک عملاً بھی لوگوں کو دکھائی جارہی ہے۔ آدمی جب زیادہ بوڑھا ہوتا ہے تو اس کی تمام طاقتیں بھی چھن جاتی ہیں۔ حتی کہ وہ دوبارہ ویسا ہی کمزور اور محتاج ہوجاتا ہے جیسا کہ وہ اس وقت تھا جب کہ وہ ایک چھوٹا بچہ تھا۔ مگر انسان اتنا نادان ہے کہ اس کے باوجود وہ کوئی سبق نہیں لیتا۔

وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ ﴿۷۰﴾

۶۹۔ اور ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا اور نہ یہ اس کے لائق ہے۔ یہ تو صرف ایک نصیحت ہے اور واضح قرآن ہے۔ ۷۰۔ تاکہ وہ اس شخص کو خبردار کردے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہوجائے۔

قرآن کا معجزانہ اسلوب سننے والوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ چنانچہ مخالفین نے لوگوں کے تاثر کو گھٹانے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ ایک شاعرانہ کلام ہے، نہ کہ کوئی خدائی کلام۔

مگر یہ سراسر بے اصل بات ہے۔ قرآن میں انتھاہ حد تک جو سنجیدہ فضا ہے، اس میں حقائق غیب کا جو بے مثال انکشاف ہے، اس میں معرفت حق کی جو اعلیٰ ترین تعلیمات ہیں، اس میں شروع سے آخر تک جو نادر اتحادِ خیال ہے، اس میں خدا کی خدائی کی جو ناقابلِ بیان جھلکیاں ہیں، وہ سب یقینی طور پر اشارہ کررہی ہیں کہ قرآن اس سے برتر کلام ہے کہ اس کو انسانی شاعری کہا جاسکے۔

مگر حقیقت کو ہمیشہ زندہ لوگ مانتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کی صداقت بھی صرف زندہ انسانوں کو نظر آئے گی، مُردہ انسان اس کو دیکھنے والے نہیں بن سکتے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَاۤ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَ مِنْهَا یَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ لَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ

۷۱۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے، تو وہ ان کے مالک ہیں۔ ۷۲۔ اور ہم نے ان کو ان کا تابع بنادیا، تو ان میں سے کوئی ان کی سواری ہے اور کسی کو وہ کھاتے ہیں۔ ۷۳۔ اور ان کے لیے ان میں فائدے ہیں اور پینے کی چیزیں بھی، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۷۴۔ اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود

يُنْصَرُوْنَ ﴿٧٤﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٦﴾

بنائے کہ شاید ان کی مدد کی جائے۔ ۷۵۔ وہ ان کی مدد نہ کرسکیں گے، اور وہ ان کی فوج ہوکر حاضر کیے جائیں گے۔ ۷۶۔ تو ان کی بات تم کو غمگین نہ کرے، ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔

مویشی جانور ایک قسم کے زندہ علامت ہیں جو بتاتے ہیں کہ مادی دنیا کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ انسان اس کو مسخر کرکے اس کو استعمال کرسکے۔ مادی دنیا کی اسی صلاحیت کے اوپر انسانی تہذیب کی پوری عمارت قائم ہے۔ اگر گھوڑے اور بیل میں بھی وہی وحشیانہ مزاج ہو جو ریچھ اور بھیڑئے میں ہوتا ہے یا لوہا اور پٹرول اسی طرح انسان کے قابو سے باہر ہوں جس طرح زمین کے اندر کا آتش فشانی مادہ انسان کے قابو سے باہر ہے تو تہذیبِ انسانی کا ارتقاء ناممکن ہو جائے۔

جس خالق نے یہ عظیم احسانات کیے ہیں، انسان کو چاہیے تھا کہ وہ اسی کا شکر کرے اور اسی کا عبادت گزار بنے۔ مگر وہ دوسروں کو اپنا معبود بناتا ہے، اور جب اس کو نصیحت کی جائے تو وہ اس پر دھیان نہیں دیتا۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی سرکشی ہے جس کے انجام سے بچنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ﴿٧٩﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿٨٠﴾ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ڲ بَلٰي ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿٨١﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ

۷۷۔ کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو ایک بوند سے پیدا کیا، پھر وہ صریح جھگڑالو بن گیا۔ ۷۸۔ اور وہ ہم پر مثال چسپاں کرتا ہے اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ وہ کہتا ہے کہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جب کہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں۔ ۷۹۔ کہو، ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اور وہ سب طرح پیدا کرنا جانتا ہے۔ ۸۰۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کردی۔ پھر تم اس سے آگ جلاتے ہو۔ ۸۱۔ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کردے۔ ہاں وہ قادر ہے۔ اور وہی ہے اصل پیدا کرنے

شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۸۲﴾
فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ
اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع ۵ / ۶

والا، جاننے والا۔ ۸۲۔ اس کا معاملہ تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۸۳۔ پس، پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

انسان اپنا خالق آپ نہیں۔ وہ بلا شبہ خالق کی مخلوق ہے۔ اس واقعہ کا تقاضا تھا کہ انسان کے اندر عجز کی صفت پائی جائے۔ مگر وہ حقیقت پسندی کو کھو کر ایسی بحثیں کرتا ہے جو اس کی حیثیت عجز سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

انسان کی اور کائنات کی تخلیق اول ہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ یہ تخلیق دوسری بار بھی ممکن ہے۔ مگر اس کو نظر انداز کر کے انسان یہ بحث نکالتا ہے کہ مردہ انسان دوبارہ زندہ انسان کیسے بن جائے گا۔ انسان کا مُردہ ہو کر پھر زندہ حالت میں تبدیل ہونے کا واقعہ بلا شبہ قیامت میں ہوگا۔ مگر دوسری چیزوں میں یہ امکان آج ہی نظر آ رہا ہے۔ مثلاً درخت کو دیکھو۔ درخت بظاہر ہرا بھرا ہوتا ہے۔ مگر جب وہ کاٹ کر لکڑی کی صورت میں جلایا جاتا ہے تو وہ بالکل ایک مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے جس کو آگ کہتے ہیں۔ ایک چیز کا بدل کر بالکل دوسری چیز بن جانا ایک ثابت شدہ واقعہ ہے۔ بقیہ چیزوں میں خدا آج ہی اس کو ممکن بنا رہا ہے۔ انسانوں کے لیے وہ قیامت میں اس کو ممکن بنائے گا۔ مگر یہ منوانے کے لیے نہیں ہوگا بلکہ اس لیے ہوگا کہ انسان کو اس کی سرکشی کا بدلہ دیا جائے۔

۳۷۔ سُوْرَۃُ الصّٰفّٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ﴿۲﴾
فَالتّٰلِیٰتِ ذِكْرًا ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴿۴﴾
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا
وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿۵﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے قطار در قطار صف باندھنے والے فرشتوں کی۔ ۲۔ پھر ڈانٹنے والوں کی جھڑک کر۔ ۳۔ پھر ان کی جو نصیحت سنانے والے ہیں۔ ۴۔ کہ تمھارا معبود ایک ہی ہے۔ ۵۔ آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور سارے مشرقوں کا رب۔

پیغمبر کے ذریعہ جن غیبی حقیقتوں کی خبر دی گئی ہے ان میں سے ایک فرشتہ کا وجود ہے۔ یہاں فرشتوں کے تین خاص کام بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مکمل طور پر خدا کے تابع ہیں، وہ ادنیٰ سرتابی کے بغیر صف بہ صف

اس کی تعمیل کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ پھر فرشتوں کا ایک گروہ وہ ہے جو انسانوں پر خدائی سزا کا نفاذ کرتا ہے، خواہ وہ آفات اور حادثات کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔ فرشتوں کا تیسرا عمل یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خدا کے بندوں پر خدا کی نصیحت اتارتے ہیں، عام انسانوں پر الہام یا القاء کی شکل میں اور پیغمبروں پر وحی کی شکل میں۔

خدا ہی ان فرشتوں کا مالک ہے جن کو عام انسان نہیں دیکھتا۔ اور خدا ہی آسمان وزمین کا مالک بھی ہے جن کو ہر آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ ایسی حالت میں خدا کے سوا جس کو بھی معبود بنایا جائے گا وہ ایسا معبود ہوگا جس کو معبود بننے کا حق نہیں۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ۝۶ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷

۶۔ ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے سجایا ہے۔ ۷۔ اور ہر شیطانِ سرکش سے اس کو محفوظ کیا ہے۔

سماءِ دنیا سے مراد غالباً وسیع خلا کا وہ حصہ ہے جو انسان کے قریب واقع ہے اور جس کو آدمی کسی آلہ کی مدد کے بغیر خالی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے۔

جس طرح انسان ایک بااختیار مخلوق ہے اسی طرح جنات بھی بااختیار مخلوق ہیں۔ چنانچہ وہ خلا میں پرواز کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اوپر اٹھ کر ملاءِ اعلیٰ (عالم بالا) تک پہنچیں اور وہاں سے مستقبل کی خبریں لے آئیں۔ مگر سماءِ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ایسے محکم انتظامات فرمائے ہیں کہ وہ یہیں سے مار کر لوٹا دئے جاتے ہیں اور اس سے اوپر جانے کا موقع نہیں پاتے۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝۸ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝۹ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝۱۰ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۝۱۱ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۝۱۲ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝۱۳ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝۱۴ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ

۸۔ وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگا سکتے اور وہ ہر طرف سے مارے جاتے ہیں۔ ۹۔ بھگانے کے لیے، اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے۔ ۱۰۔ مگر جو شیطان کوئی بات اچک لے تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ۱۱۔ پس ان سے پوچھو کہ ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا ان چیزوں کی جو ہم نے پیدا کی ہیں۔ ہم نے ان کو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ۱۲۔ بلکہ تم تعجب کرتے ہو اور وہ مذاق اُڑا رہے ہیں۔ ۱۳۔ اور جب ان کو سمجھایا جاتا ہے تو وہ سمجھتے نہیں۔ ۱۴۔ اور

مُّبِيۡنٌ ۚۖ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا
ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ ﴿۱۶﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ ﴿۱۷﴾
قُلۡ نَعَمۡ وَاَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾

جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو وہ اس کو ہنسی میں ڈال دیتے ہیں۔ ۱۵۔ اور کہتے ہیں کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے۔ ۱۶۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو پھر ہم اُٹھائے جائیں گے۔ ۱۷۔ اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی۔ ۱۸۔ کہو کہ ہاں، اور تم ذلیل بھی ہو گے۔

زمین و آسمان کی صورت میں جو کائنات ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے وہ اتنی پیچیدہ اور اتنی عظیم ہے کہ اس کے بعد انسانوں کو دوسری دنیا میں پیدا کرنا مقابلۃً ایک چھوٹا کام نظر آنے لگتا ہے۔ جس خالق کی قوتِ تخلیق کا عظیم تر نمونہ ہمارے سامنے موجود ہے اسی خالق سے اس سے چھوٹی تخلیق ناممکن یا مستبعد کیوں۔

انسانی جسم کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام تر زمینی اجزاء کا ایک مجموعہ ہے۔ زمین میں پائے جانے والے مادے (پانی، کیلشیم، لوہا، سوڈیم، ٹنگسٹین وغیرہ) کی ترکیب سے انسان بنا ہے۔ یہ تمام اجزاء ہماری دنیا میں بہت افراط کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ پھر جن اجزاء کی ترکیب سے خالق نے ایک بار انسان کو بنا کر کھڑا کر دیا انھیں اجزاء کی ترکیب سے وہ دوبارہ کیوں ایسا نہیں کر سکتا۔

فَاِنَّمَا هِىَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۹﴾
وَقَالُوۡا يٰوَيۡلَنَا هٰذَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوۡمُ
ع ۵/۲ الۡفَصۡلِ الَّذِىۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۱﴾ ع اُحۡشُرُوا
الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَاَزۡوَاجَهُمۡ وَمَا كَانُوۡا
يَعۡبُدُوۡنَ ۙ ﴿۲۲﴾ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰى
الربع صِرَاطِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۲۳﴾ الربع وَقِفُوۡهُمۡ اِنَّهُمۡ
مَّسۡـُٔوۡلُوۡنَ ۙ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمۡ لَا تَنَاصَرُوۡنَ ﴿۲۵﴾ بَلۡ هُمُ
الۡيَوۡمَ مُسۡتَسۡلِمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۱۹۔ پس وہ تو ایک جھڑکی ہوگی، پھر اسی وقت وہ دیکھنے لگیں گے۔ ۲۰۔ اور وہ کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی، یہ تو جزاء کا دن ہے۔ ۲۱۔ یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔ ۲۲۔ جمع کرو ان کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے ساتھیوں کو اور ان معبودوں کو۔ ۲۳۔ جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے؛ پھر ان سب کو دوزخ کا راستہ دکھاؤ۔ ۲۴۔ اور ان کو ٹھہراؤ، ان سے کچھ پوچھنا ہے۔ ۲۵۔ تم کو کیا ہوا کہ تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔ ۲۶۔ بلکہ آج تو وہ فرماں بردار ہیں۔

موجودہ دنیا میں اگلی زندگی کا معاملہ ایک خبر کے طور پر بتایا جا رہا ہے۔ آدمی اس خبر کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مگر آخرت میں اگلی زندگی کا معاملہ ایک سنگین حقیقت بن کر لوگوں کے اوپر ٹوٹ پڑے گا۔ اس وقت آدمی اپنی سرکشی بھول کر اپنے آپ کو خدا کے سامنے ڈال دے گا۔ یہ ناقابلِ بیان حد تک ہولناک منظر ہوگا۔ اس وقت میدانِ حشر میں لوگوں کا جو حال ہوگا اس کا ایک نقشہ ان آیتوں میں دیا گیا ہے۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾
قَالُوْۤا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ ﴿۲۸﴾
قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۹﴾ وَ مَا كَانَ
لَنَا عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا
طٰغِیْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَیْنَا قَوْلُ رَبِّنَاۤ ۖۗ اِنَّا
لَذَآىٕقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَیْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِیْنَ ﴿۳۲﴾
فَاِنَّهُمْ یَوْمَىٕذٍ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

۲۷۔اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر سوال وجواب کریں گے۔ ۲۸۔کہیں گے، تم ہمارے پاس دائیں طرف سے آتے تھے۔ ۲۹۔ وہ جواب دیں گے، بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہیں تھے۔ ۳۰۔اور ہمارا تمھارے اوپر کوئی زور نہ تھا، بلکہ تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ ۳۱۔پس ہم سب پر ہمارے رب کی بات پوری ہوکر رہی، ہم کو اس کا مزہ چکھنا ہی ہے۔ ۳۲۔ ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود بھی گمراہ تھے۔ ۳۳۔ پس وہ سب اس دن عذاب میں مشترک ہوں گے۔

یہ عوام اور لیڈروں کی گفتگو ہے۔ قیامت میں عوام اپنی بربادی کی ذمہ داری اپنے گمراہ لیڈروں پر ڈالیں گے اور کہیں گے کہ آپ لوگوں نے ہمیں طرح طرح سے بہکایا۔ لیڈر کہیں گے کہ تمھارا یہ الزام غلط ہے۔ کوئی بہکانے والا کسی کو نہیں بہکاتا۔ تم لوگوں کے اندر خود سرکشی کا مزاج تھا۔ ہماری بات تم کو اپنے مزاج کے موافق نظر آئی اس لیے تم نے اس کو مان لیا۔ تم نے حقیقۃً اپنی خواہشات کا ساتھ دیا، نہ کہ ہمارا۔ دونوں کا جرم ایک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قیامت میں لیڈر اور پیرو دونوں ایک ہی مشترک انجام سے دوچار ہوں گے۔ نہ لیڈر کی عظمت اس کو عذاب سے بچا سکے گی اور نہ عوام کا یہ عذر ان کو بچانے والا بنے گا کہ ہم تو بے علم تھے، ہم کو لیڈروں نے گمراہ کیا۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمْ
كَانُوْۤا اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ
یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾ۙ وَ یَقُوْلُوْنَ اَىٕنَّا لَتَارِكُوْۤا
اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿۳۶﴾ؕ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ
صَدَّقَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّكُمْ لَذَآىٕقُوا
الْعَذَابِ الْاَلِیْمِ ﴿۳۸﴾ۚ وَ مَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾ۙ

۳۴۔ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ۳۵۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ تکبر کرتے تھے۔ ۳۶۔ اور وہ کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ ۳۷۔ بلکہ وہ حق لے کر آیا ہے۔ اور وہ رسولوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے۔ ۳۸۔ بے شک تم کو دردناک عذاب چکھنا ہوگا۔ ۳۹۔ اور تم کو اسی کا بدلہ دیا جارہا ہے جو تم کرتے تھے۔

''جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو وہ گھمنڈ کرتے تھے''— اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خدا کے مقابلے میں گھمنڈ کرتے تھے۔ ایسا کوئی بھی نہیں کرتا۔ خدا کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کوئی اس کے مقابلہ میں بڑا بننے کی جرأت کرے۔ ان کا گھمنڈ دراصل خدا کے پیغام بر کے مقابلہ میں تھا، نہ کہ خود خدا کے مقابلہ میں۔

پیغمبر کے پیغام توحید کی زد ان اکابر پر پڑتی تھی جن کے نام پر وہ اپنے مشرکانہ اعمال میں مبتلا تھے۔ اب ایک طرف پیغمبر ہوتا اور دوسری طرف ان کے مفروضہ اکابر۔ چوں کہ پیغمبر بظاہر انھیں اپنے اکابر سے کم دکھائی دیتا تھا، اس لیے وہ پیغمبر کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ وہ اپنے مفروضہ اکابر کے ساتھ وابستہ رہ کر سمجھتے کہ وہ بڑوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دلیل کا زور بلاشبہ پیغمبر کی طرف ہوتا تھا مگر ظاہری عظمت انھیں اپنے بڑوں میں دکھائی دیتی تھی۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ ظاہری عظمت کے مقابلہ میں دلیل کی طاقت ہمیشہ بے اثر ثابت ہوئی ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝٤٠ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۝٤١ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ۝٤٢ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝٤٣ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝٤٤ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝٤٥ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝٤٦ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ۝٤٧ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝٤٨ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ۝٤٩

۴۰۔ مگر جو اللہ کے چنے ہوئے بندے ہیں۔ ۴۱۔ ان کے لیے معلوم رزق ہوگا۔ ۴۲۔ میوے، اور وہ نہایت عزت سے ہوں گے۔ ۴۳۔ آرام کے باغوں میں۔ ۴۴۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ۴۵۔ ان کے پاس ایسا پیالہ لایا جائے گا جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا۔ ۴۶۔ صاف شفاف پینے والوں کے لیے لذت۔ ۴۷۔ نہ اس میں کوئی ضرر ہوگا اور نہ اس سے عقل خراب ہوگی۔ ۴۸۔ اور ان کے پاس نیچی نگاہ والی، بڑی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی۔ ۴۹۔ گویا کہ وہ انڈے ہیں جو چھپے ہوئے رکھے ہوں۔

موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں لوگوں کو آزادانہ عمل کا موقع دے کر ان کا انتخاب کیا جا رہا ہے۔ جو لوگ اپنے قول و عمل سے اس کا ثبوت دیں گے کہ وہ جنت کی لطیف اور نفیس دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہیں، ان کو ان کا خدا اپنی جنت میں بسانے کے لیے چن لے گا۔ وہاں انھیں ہر قسم کی اعلیٰ نعمتیں فراہم کی جائیں گی۔ اور پھر ان سے کہا جائے گا کہ راحتوں اور لذتوں کے باغات میں ابدی طور پر آباد رہو۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝٥٠ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝٥١

۵۰۔ پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات کریں گے۔ ۵۱۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ملاقاتی تھا۔ ۵۲۔ وہ کہا کرتا تھا

يَقُوۡلُ اَءِنَّكَ لَمِنَ الۡمُصَدِّقِيۡنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتۡنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيۡنُوۡنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلۡ اَنۡتُمۡ مُّطَّلِعُوۡنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنۡ كِدْتَّ لَتُرۡدِيۡنِ ۙ﴿۵۶﴾ وَلَوۡلَا نِعۡمَةُ رَبِّىۡ لَـكُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِيۡنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَ ۙ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰى وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثۡلِ هٰذَا فَلۡيَعۡمَلِ الۡعٰمِلُوۡنَ ﴿۶۱﴾

کہ کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو۔ ۵۳۔ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا ہم کو جزا ملے گی۔ ۵۴۔ کہے گا، کیا تم جھانک کر دیکھو گے۔ ۵۵۔ تو وہ جھانکے گا اور وہ اس کو جہنم کے بیچ میں دیکھے گا۔ ۵۶۔ کہے گا کہ خدا کی قسم، تم تو مجھ کو تباہ کر دینے والے تھے۔ ۵۷۔ اور اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں بھی انھیں لوگوں میں ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ ۵۸۔ کیا اب ہم کو مرنا نہیں ہے۔ ۵۹۔ مگر پہلی بار جو ہم مر چکے اور اب ہم کو عذاب نہ ہوگا۔ ۶۰۔ بے شک یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۶۱۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

جنت لطیف ترین سرگرمیوں کی دنیا ہوگی۔ وہاں دلچسپ ملاقاتیں ہوں گی۔ وہاں پُرلطف مشاہدات ہوں گے۔ وہاں ایک دوسرے کے درمیان آفاقی سطح پر گفتگوئیں ہوں گی۔ ہر قسم کی محدودیت اور ہر قسم کی ناخوش گواری کا وہاں خاتمہ ہو چکا ہوگا۔

آخرت کو ماننے سے مراد سادہ طور پر صرف اس کو مان لینا نہیں ہے۔ بلکہ آخرت کے معاملہ کو اتنا حقیقی اور اتنا اہم سمجھنا ہے کہ وہ آدمی کی پوری زندگی پر چھا جائے۔ آدمی اپنا سب کچھ آخرت کے لیے لگا دے۔ جو لوگ ایسے آخرت پسندوں کو دیوانہ سمجھتے تھے وہ آخرت میں ان کی کامیابیاں دیکھ کر دم بخود رہ جائیں گے۔ دوسری طرف آخرت پسندوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے شاندار انجام کو اس طرح حیرت کے ساتھ دیکھیں گے جیسے کہ انھیں یقین نہ آرہا ہو کہ ان کے چھوٹے سے عمل کا خدا نے انھیں اتنا بڑا بدلہ دے دیا ہے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ انسان جو ایسی جنت کا حریص نہ ہو، جو ایسی جنت کے لیے عمل نہ کرے۔

اَذٰ لِكَ خَيۡرٌ نُّزُلًا اَمۡ شَجَرَةُ الزَّقُّوۡمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلۡنٰهَا فِتۡنَةً لِّلظّٰلِمِيۡنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخۡرُجُ فِىۡۤ اَصۡلِ الۡجَحِيۡمِ ۙ﴿۶۴﴾ طَلۡعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوۡسُ الشَّيٰطِيۡنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمۡ لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡهَا فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ؕ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمۡ عَلَيۡهَا لَشَوۡبًا مِّنۡ

۶۲۔ یہ ضیافت اچھی ہے، یا زقوم کا درخت۔ ۶۳۔ ہم نے اس کو ظالموں کے لیے فتنہ بنایا ہے۔ ۶۴۔ وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی تہ سے نکلتا ہے۔ ۶۵۔ اس کا خوشہ ایسا ہے جیسے شیطان کا سر۔ ۶۶۔ تو وہ لوگ اس سے کھائیں گے۔ پھر اسی سے پیٹ بھریں گے۔ ۶۷۔ پھر

حَمِيۡمٍؕ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَا۟اِلَى الۡجَحِيۡمِ ﴿۶۸﴾
اِنَّهُمۡ اَلۡفَوۡا اٰبَآءَهُمۡ ضَآلِّيۡنَۙ ﴿۶۹﴾ فَهُمۡ عَلٰٓى
اٰثٰرِهِمۡ يُهۡرَعُوۡنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَهُمۡ اَكۡثَرُ
الۡاَوَّلِيۡنَۙ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا فِيۡهِمۡ مُّنۡذِرِيۡنَ ﴿۷۲﴾
فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِيۡنَۙ ﴿۷۳﴾ اِلَّا
ع عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۷۴﴾

ان کو کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا۔ ۶۸۔ پھر ان کی واپسی دوزخ ہی کی طرف ہوگی۔ ۶۹۔ انھوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہی میں پایا۔ ۷۰۔ پھر وہ بھی انھیں کے قدم بقدم دوڑتے رہے۔ ۷۱۔ اور ان سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گمراہ ہوئے۔ ۷۲۔ اور ہم نے ان میں بھی ڈرانے والے بھیجے۔ ۷۳۔ تو دیکھو، ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جن کو ڈرایا گیا تھا۔ ۷۴۔ مگر وہ جو اللہ کے چنے ہوئے بندے تھے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ دوزخ میں زقوم کا درخت ہوگا اور دوزخی لوگ جب بھوک سے بے قرار ہوں گے تو اس کو کھائیں گے (الواقعہ، 56:52)

قرآن میں یہ خبر دی گئی تو قدیم عرب کے لوگوں نے اس کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ ایک سردار نے کہا کہ آتش دوزخ کے درمیان درخت کیسے اُگے گا۔ جب کہ آگ درخت کو جلا دیتی ہے۔ ایک اور سردار نے کہا: محمد ہم کو زقوم سے ڈراتے ہیں۔ حالانکہ زقوم بربر زبان میں کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں۔ ابوجہل کچھ لوگوں کو اپنے گھر لے گیا اور اپنی خادمہ سے کہا کہ کھجور اور مکھن لے آؤ۔ وہ لائی تو ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ لو اس کو کھاؤ۔ یہی وہ زقوم ہے جس کی محمد تم کو دھمکی دے رہے ہیں (تَزَقَّمُوا، فَهَذَا الزَّقُّومُ الَّذِي يُخَوِّفُكُمْ بِهِ مُحَمَّدٌ) تفسیر الطبری، جلد 21، صفحہ 53۔

اس قسم کے قرآنی بیانات مخالفین کے لیے بہترین ہتھیار تھے جن کے ذریعہ وہ عوام کی نظر میں قرآن کو غیر معتبر ثابت کر سکیں۔ اللہ کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ قرآن میں ایسا لفظ استعمال نہ کرے جس میں مخالفین کے لیے شوشہ نکالنے کا موقع ہو، مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہو رہا ہے۔ آدمی کو نجات یافتہ بننے کے لیے یہ ثبوت دینا ہے کہ اس نے شوشے کی باتوں سے بچ کر اصل حقیقت پر دھیان دیا۔ اس نے غلط فہمیوں کو عبور کر کے کلام کی حقیقی مدعا کو پایا۔ اس نے ذہنی انحراف کے مواقع ہوتے ہوئے اپنے ذہن کو انحراف سے بچایا۔

اللہ کے چنے ہوئے بندے وہ ہیں جو رواجی دین سے اوپر اٹھ کر سچائی کو دریافت کریں۔ جو ظواہر سے بلند ہو کر معانی کا ادراک کریں۔ جو خدا کے بشری نمائندہ کو پہچان کر اس کے ساتھی بن جائیں۔

وَلَقَدۡ نَادٰٮنَا نُوۡحٌ فَلَنِعۡمَ الۡمُجِيۡبُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَ
نَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۷۶﴾ وَ

۷۵۔ اور ہم کو نوح نے پکارا تو ہم کیا خوب پکار سننے والے ہیں۔ ۷۶۔ اور ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بہت بڑے غم سے بچا لیا۔ ۷۷۔ اور ہم

جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾

نے اس کی نسل کو باقی رہنے والا بنایا۔ ۷۸۔ اور ہم نے اس کے طریقہ پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ ۷۹۔ سلام ہے نوح پر تمام دنیا والوں میں۔ ۸۰۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ ۸۱۔ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ ۸۲۔ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کردیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ان کی دشمن ہوگئی۔ انھوں نے قوم کے مقابلہ میں مدد کے لیے اللہ کو پکارا تو اللہ نے بہترین طور پر آپ کی مدد کی۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ جب اللہ کا ایک بندہ اللہ کو پکارتا ہے تو اللہ کی طرف سے وہ اس کا بہترین جواب پاتا ہے۔ مگر اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ایک اور بات کو شامل کیا جائے۔ وہ یہ کہ حضرت نوح ساڑھے نو سو سال تک کام کرتے رہے۔ انھوں نے صبر اور حکمت اور خیر خواہی کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قوم کو دعوت دی۔ اس طرح لمبی مدت کے بعد وہ وقت آیا کہ وہ قوم کے خلاف اللہ کو پکاریں اور اللہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ان کی مدد پر آجائے۔

حضرت نوح کے مخالفین ایک ہولناک طوفان میں اس طرح ہلاک ہوئے کہ ان کی پوری نسل ختم ہوگئی اس کے بعد دوبارہ جو نسل چلی وہ انھیں چند افراد کے ذریعہ چلی جو حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں بچا لیے گئے تھے۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾

۸۳۔ اور اسی کے طریقہ والوں میں سے ابراہیم بھی تھا۔ ۸۴۔ جب کہ وہ آیا اپنے رب کے پاس قلبِ سلیم کے ساتھ۔ ۸۵۔ جب اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو۔ ۸۶۔ کیا تم اللہ کے سوا من گھڑت معبودوں کو چاہتے ہو۔ ۸۷۔ تو خداوندِ عالم کے باب میں تمھارا کیا خیال ہے۔

حضرت ابراہیم بھی اسی دین پر تھے جس دین پر حضرت نوح تھے۔ تمام نبیوں کی دعوت ہمیشہ ایک رہی ہے۔ وہ یہ کہ آدمی قلب سلیم کے ساتھ خدا کے یہاں پہنچے۔

قلب سلیم کے معنی ہیں پاک دل۔ یعنی آفات سے محفوظ دل۔ یہی اصل چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کو انسان سے مطلوب ہے۔ اللہ نے انسان کو فطرت صحیح پر پیدا کرکے دنیا میں بھیجا۔ اب اس کا امتحان یہ ہے کہ وہ دنیا کے فتنوں سے اپنے آپ کو بچائے۔ وہ ہر قسم کی نفسی اور شیطانی آلودگی سے پاک رہ کر خدا کے یہاں پہنچے۔

یہی پاک اور محفوظ انسان ہیں جن کو خدا اپنی جنتوں میں بسائے گا۔

شرک خدا کی تصغیر ہے۔ آدمی خدا کو سب سے بڑے کی حیثیت سے نہیں پاتا اس لیے وہ دوسری بڑائیوں میں گم ہو کر ان کی پرستش کرنے لگتا ہے۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ
سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾
فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾
مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا
بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾
قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَ اللّٰهُ
خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ
بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ
كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَ قَالَ
اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ
هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ
حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

۸۸۔ پھر ابراہیم نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی۔
۸۹۔ پس کہا کہ میں بیمار ہوں۔ ۹۰۔ پھر وہ لوگ اس
کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ۹۱۔ تو وہ ان کے بتوں میں
گھس گیا، کہا کہ کیا تم کھاتے نہیں ہو۔ ۹۲۔ تم کو کیا ہوا
کہ تم کچھ بولتے نہیں۔ ۹۳۔ پھر ان کو مارا پوری قوت
کے ساتھ۔ ۹۴۔ پھر لوگ اس کے پاس دوڑے
ہوئے آئے۔ ۹۵۔ ابراہیم نے کہا، کیا تم لوگ ان
چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود تراشتے ہو۔ ۹۶۔ اور اللہ
ہی نے پیدا کیا ہے تم کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جن
کو تم بناتے ہو۔ ۹۷۔ انھوں نے کہا، اس کے لیے
ایک مکان بناؤ پھر اس کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈال
دو۔ ۹۸۔ پس انھوں نے اس کے خلاف ایک
کارروائی کرنی چاہی تو ہم نے انھیں کو نیچا کر دیا۔
۹۹۔ اور اس نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف
جا رہا ہوں، وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۱۰۰۔ اے
میرے رب، مجھ کو اولادِ صالح عطا فرما۔ ۱۰۱۔ تو ہم
نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔

حضرت ابراہیم کی قوم کے لوگ غالباً کسی تیوہار میں شرکت کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے۔ آپ کے گھر والوں نے آپ سے بھی چلنے کے لیے کہا۔ آپ نے توریہ کے انداز میں ان سے معذرت کر لی۔ جب تمام لوگ چلے گئے تو رات کے وقت آپ بت خانہ میں داخل ہوئے اور اس کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ یہ آپ نے اس وقت کیا جب کہ مسلسل دعوت کے ذریعہ آپ ان پر اتمام حجت کر چکے تھے۔ جب انھوں نے دلائل سے بتوں کا بے حقیقت ہونا تسلیم نہیں کیا تو بتوں کو توڑ کر آپ نے عمل کی زبان میں بتایا کہ ان بتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگر حقیقت ہوتی تو وہ اپنے آپ کو توڑے جانے سے بچا لیتے۔

آپ کی اس آخری کارروائی کے بعد قوم نے بھی اپنی آخری کارروائی کی۔ انھوں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا مگر اللہ نے آپ کو آگ سے بچا لیا۔ اس کے بعد آپ اپنے وطن (عراق) کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس وقت آپ نے دعا کی کہ خدایا تو میرے یہاں صالح اولاد پیدا کرتا کہ میں اس کو تعلیم وتربیت کے ذریعہ مومن ومسلم بناؤں اور وہ میرے بعد دعوت توحید کا تسلسل جاری رکھے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي
الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ
يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ
اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ
لِلْجَبِيْنِ ۚ﴿١٠٣﴾ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۙ﴿١٠٤﴾ قَدْ
صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٠٥﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا
الْمُبِيْنُ ﴿١٠٦﴾ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠٧﴾
وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ﴿١٠٨﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى
اِبْرٰهِيْمَ ﴿١٠٩﴾ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٠﴾
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١١﴾ وَبَشَّرْنٰهُ
بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾ وَبٰرَكْنَا
عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا
ع ٣ ٣٩ مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿١١٣﴾

۱۰۲۔ پس جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر
کو پہنچا، اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے، میں خواب
میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تم سوچ لو کہ
تمھاری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا کہ اے میرے
باپ، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے آپ اس کو کر ڈالیے،
ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابروں میں سے پائیں گے۔
۱۰۳۔ پس جب دونوں مطیع ہو گئے اور ابراہیم نے
اس کو ماتھے کے بل گرا دیا۔ ۱۰۴۔ اور ہم نے اس کو
آواز دی کہ اے ابراہیم، ۱۰۵۔ تم نے خواب کو سچ کر
دکھایا۔ بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ
دیتے ہیں۔ ۱۰۶۔ یقیناً یہ ایک کھلی ہوئی آزمائش
تھی۔ ۱۰۷۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی کے عوض
اس کو چھڑا لیا۔ ۱۰۸۔ اور ہم نے اس پر پچھلوں میں
ایک گروہ کو چھوڑا۔ ۱۰۹۔ سلامتی ہو ابراہیم پر۔ ۱۱۰۔ ہم
نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ ۱۱۱۔
بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ ۱۱۲۔ اور
ہم نے اس کو اسحاق کی خوش خبری دی، ایک نبی
صالحین میں سے۔ ۱۱۳۔ اور ہم نے اس کو اور اسحاق کو
برکت دی۔ اور ان دونوں کی نسل میں اچھے بھی ہیں اور
ایسے بھی جو اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والے ہیں۔

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں شرک کا اس طرح عمومی غلبہ ہوا کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اب جو بچہ پیدا ہوتا وہ ماحول کے اثر سے شرک میں اتنا پختہ ہو جاتا کہ کوئی بھی دعوتی کوشش اس کے ذہن کو شرک

سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم جب طویل دعوتی جدوجہد کے بعد عراق سے نکلے تو ان کے ساتھ صرف دو مومن تھے۔ ایک آپ کی اہلیہ سارہ، دوسرے آپ کے بھتیجے لوط۔

لوگ دعوت کے ذریعے توحید کے راستہ پر نہیں آرہے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ ہوا کہ ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو شرک کی فضا سے الگ ہو کر پرورش پائے۔ اس کے لیے حجاز کے علاقہ کا انتخاب ہوا جو بے آب و گیاہ ہونے کی وجہ سے بالکل غیر آباد پڑا ہوا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس غیر آباد علاقہ میں ایک شخص کو آباد کیا جائے اور اس سے توالد وتناسل کے ذریعہ ایک محفوظ نسل تیار کی جائے۔ مگر اس وقت حجاز مکمل طور پر ایک خشک صحرا تھا اور اس خشک صحرا میں کسی شخص کو آباد کرنا اس کے جیتے جی ذبح کر دینے کے ہم معنی تھا۔ حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کے حق میں اسی ذبیحہ کا حکم دیا اور انھوں نے پوری طرح مطیع ہو کر اپنے بیٹے کو اس ذبیحہ کے لیے حاضر کر دیا۔

حضرت ابراہیم کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق تھے۔ ان کی نسل میں مسلسل نبوت جاری رہی یہاں تک کہ بنو اسماعیل میں آخری نبی پیدا ہو گئے۔ انھوں نے مذکورہ ''محفوظ نسل'' کو استعمال کر کے وہ انقلاب برپا کیا جس نے ہمیشہ کے لیے شرک کو غالب فکر کی حیثیت سے ختم کر دیا۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿١١٤﴾ وَ
نَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿١١٥﴾
وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٦﴾
وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿١١٧﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١١٨﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي
الْاٰخِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿١٢٠﴾
اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ اِنَّهُمَا
مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٢٢﴾

۱۱۴۔ اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا۔
۱۱۵۔ اور ان کو اور ان کی قوم کو ایک بڑی مصیبت سے نجات دی۔ ۱۱۶۔ اور ہم نے ان کی مدد کی تو وہی غالب آنے والے بنے۔
۱۱۷۔ اور ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب دی۔
۱۱۸۔ اور ہم نے ان دونوں کو سیدھا راستہ دکھایا۔
۱۱۹۔ اور ہم نے ان کے طریقہ پر پیچھے والوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ ۱۲۰۔ سلامتی ہو موسیٰ اور ہارون پر۔ ۱۲۱۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ ۱۲۲۔ بے شک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کی مدد کی اور ان کو فرعون کے ظلم سے نجات دی۔ یہاں سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوا۔ یہ دعوت الی اللہ کے ذریعے ہوا۔ حضرت موسیٰ نے فرعون پر حق کی تبلیغ کی۔ لمبی جدوجہد کے ذریعہ آپ نے اس کو اتمام حجت تک پہنچایا۔ اس کے بعد وہ وقت آیا کہ فرعون کو مجرم قرار دے کر اسے

ہلاک کیا جائے۔ اور حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو غلبہ حاصل ہو۔

اس سیاق میں صراط مستقیم دکھانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ فرعون کے مسئلہ کا صحیح حل ان پر کھولا گیا۔ بنی اسرائیل کے لیے اگر چہ یہ ایک قومی مسئلہ تھا مگر اس کا حل انھیں دعوت کی شکل میں بتایا گیا۔ چنانچہ انھیں جو غلبہ ملا وہ ان کو دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں ملا، نہ کہ فرعون کے خلاف معروف قسم کی قومی جدوجہد کے نتیجہ میں۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

۱۲۳۔ اور الیاس بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ ۱۲۴۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۲۵۔ کیا تم لوگ بعل کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑ دیتے ہو۔ ۱۲۶۔ اللہ کو، جو تمھارا بھی رب ہے اور تمھارے اگلے باپ دادا کا بھی۔ ۱۲۷۔ پس انھوں نے اس کو جھٹلایا تو وہ پکڑے جانے والوں میں سے ہوں گے۔ ۱۲۸۔ مگر جو اللہ کے خاص بندے تھے۔ ۱۲۹۔ اور ہم نے اس کے طریقہ پر پچھلوں میں ایک گروہ کو چھوڑا۔ ۱۳۰۔ سلامتی ہو الیاس پر۔ ۱۳۱۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ ۱۳۲۔ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

حضرت الیاس علیہ السلام غالباً حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ ان کا زمانہ نویں صدی قبل مسیح ہے۔ اس زمانہ میں اسرائیل (فلسطین) کا یہودی بادشاہ اخی اب (Ahab) اور لبنان میں فنیقی قوم (Phoenicians) کی حکومت تھی جو مشرک تھی اور بعل نامی بت کی پوجا کرتی تھی۔ اخی اب نے مشرک بادشاہ کی لڑکی سے شادی کرلی۔ اس مشرک شہزادی کے اثر سے یہودیوں کے درمیان بعل کی پرستش شروع ہوگئی۔ اس وقت حضرت الیاس نے یہودیوں کو ڈرایا اور ان کو خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلایا جو ان کا اصل آبائی دین تھا۔ حضرت الیاس کے حالات تفصیل سے بائبل میں موجود ہیں۔

حضرت الیاس کے زمانہ میں صرف تھوڑے سے یہودیوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ بیشتر تعداد نے آپ کی مخالفت کی۔ حتی کہ وہ آپ کے قتل کے درپے ہوگئے۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر سزائیں بھیجیں۔ مگر بعد کو یہودیوں کے یہاں حضرت الیاس (ایلیا) کو بہت اونچا مقام ملا۔ اب وہ یہودیوں کی تاریخ میں بہت بڑے نبی شمار کیے جاتے ہیں۔

وَ اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ
وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي
الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ
اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ
بِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ ع ۴ ۲۵ ۸

۱۳۳۔ اور بے شک لوط بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ ۱۳۴۔ جب کہ ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو نجات دی۔ ۱۳۵۔ مگر ایک بڑھیا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔ ۱۳۶۔ پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۳۷۔ اور تم ان کی بستیوں پر گزرتے ہو صبح کو بھی ۱۳۸۔ اور رات کو بھی، تو کیا تم نہیں سمجھتے۔

حضرت لوط حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ وہ بحر مردار کے علاقہ میں سدوم اور عمورہ کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے جن کے باشندے غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا تھے۔ مگر انھوں نے ہدایت قبول نہیں کی۔ آخر کار ان پر خدا کی آفت آئی اور حضرت لوط اور ان کے چند ساتھیوں کو چھوڑ کر سب کے سب ہلاک کر دئے گئے۔

قوم لوط کی بستیوں کے کھنڈر بحر مردار کے کنارے موجود تھے اور قریش کے لوگ جب تجارت کے لیے شام اور فلسطین جاتے تو وہ راستہ میں ان برباد شدہ بستیوں کو دیکھتے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اسی حادثہ کو جانتا ہے جو خود اس کے اپنے اوپر پڑے۔ دوسروں کے انجام سے وہ کبھی سبق نہیں لیتا۔

وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ
اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ
الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ
مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْ لَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ
الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ
يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ النصف
سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ
يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ
يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى
حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

۱۳۹۔ اور بے شک یونس بھی رسولوں میں سے تھا۔ ۱۴۰۔ جب کہ وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی پر پہنچا۔ ۱۴۱۔ پھر قرعہ ڈالا تو وہی خطا وار نکلا۔ ۱۴۲۔ پھر اس کو مچھلی نے نگل لیا۔ اور وہ اپنے کو ملامت کر رہا تھا۔ ۱۴۳۔ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا۔ ۱۴۴۔ تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس کے پیٹ ہی میں رہتا۔ ۱۴۵۔ پھر ہم نے اس کو ایک میدان میں ڈال دیا اور وہ نڈھال تھا۔ ۱۴۶۔ اور ہم نے اس پر ایک بیل دار درخت اگا دیا۔ ۱۴۷۔ اور ہم نے اس کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا۔ ۱۴۸۔ پھر وہ لوگ ایمان لائے تو ہم نے ان کو فائدہ اٹھانے دیا ایک مدت تک۔

حضرت یونس علیہ السلام کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح ہے۔ وہ عراق کے قدیم شہر نینویٰ (Nineveh) میں رسول بنا کر بھیجے گئے۔ ایک مدت تک تبلیغ کے بعد آپ نے اندازہ کیا کہ قوم ایمان لانے والی نہیں ہے۔ آپ نے شہر چھوڑ دیا۔ آگے جانے کے لیے آپ غالباً دجلہ کے کنارے ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ کشتی زیادہ بھری ہوئی تھی۔ درمیان میں پہنچ کر ڈوبنے کا اندیشہ ہوا۔ چنانچہ کشتی کو ہلکا کرنے کے لیے قرعہ ڈالا گیا کہ جس کا نام نکلے اس کو دریا میں پھینک دیا جائے۔ قرعہ حضرت یونس کے نام نکلا اور کشتی والوں نے آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ اس وقت خدا کے حکم سے ایک بڑی مچھلی نے آپ کو نگل لیا اور آپ کو لے جا کر دریا کے کنارے خشکی میں ڈال دیا۔ حضرت یونس نے اپنی قوم کو قبل از وقت چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اللہ کا حکم ہوا کہ آپ دوبارہ اپنی قوم کی طرف واپس جائیں۔ آپ نے دوبارہ آ کر تبلیغ کی تو شہر کے تمام سوا لاکھ باشندے مومن بن گئے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ داعی کے لیے صبر انتہائی حد تک ضروری ہے۔ حتی کہ اس وقت بھی جب کہ لوگوں کا رویہ بظاہر مایوسی پیدا کرنے والا بن جائے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

۱۴۹۔ پس ان سے پوچھو، کیا تمھارے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے۔ ۱۵۰۔ کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور وہ دیکھ رہے تھے۔ ۱۵۱۔ سن لو، یہ لوگ صرف من گھڑت کے طور پر ایسا کہتے ہیں ۱۵۲۔ کہ اللہ اولاد رکھتا ہے اور یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔ ۱۵۳۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں پسند کی ہیں۔ ۱۵۴۔ تم کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسا حکم لگا رہے ہو۔ ۱۵۵۔ پھر کیا تم سوچ سے کام نہیں لیتے۔ ۱۵۶۔ کیا تمھارے پاس کوئی واضح دلیل ہے۔ ۱۵۷۔ تو اپنی کتاب لاؤ اگر تم سچے ہو۔

شیطان کی ترغیب یا انسانوں کی غلط تعبیر سے اکثر غیبی حقیقتوں کے بارے میں بہت بڑی بڑی گمراہیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھیں میں سے ایک فرشتوں کے متعلق کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ انتہائی حد تک بے بنیاد اور غیر معقول بات ہے۔ اس کی غلطی اس سادہ سی بات سے ثابت ہے کہ خدا کو اگر اپنی مدد کے لیے اولاد درکار تھی تو وہ اپنے لیے بیٹے بناتا۔ وہ اپنے لیے بیٹیاں کیوں بناتا جو خود مشرکین کے نزدیک کمزوری کی علامت ہیں۔

وَ جَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَ لَقَدْ
عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۙ﴿۱۵۸﴾
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ
اَنْتُمْ عَلَیْهِ بِفٰتِنِیْنَ ۙ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ
الْجَحِیْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ
مَّعْلُوْمٌ ۙ﴿۱۶۴﴾ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۚ﴿۱۶۵﴾ وَ اِنَّا
لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

۱۵۸۔ اور انھوں نے خدا اور جنات میں بھی رشتہ داری قرار دی ہے۔ اور جنوں کو معلوم ہے کہ یقیناً وہ پکڑے ہوئے آئیں گے۔ ۱۵۹۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ ۱۶۰۔ مگر وہ جو اللہ کے چنے ہوئے بندے ہیں۔ ۱۶۱۔ پس تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ ۱۶۲۔ خدا سے کسی کو پھیر نہیں سکتے۔ ۱۶۳۔ مگر اس کو جو جہنم میں پڑنے والا ہے۔ ۱۶۴۔ اور ہم میں سے ہر ایک کا ایک متعین مقام ہے۔ ۱۶۵۔ اور ہم خدا کے حضور بس صف بستہ رہنے والے ہیں۔ ۱۶۶۔ اور ہم اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

گمراہ قومیں جنات کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ رکھتی ہیں گویا کہ جنات خدا کے حریف اور مدمقابل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جنوں کے ہاتھ میں بدی کی طاقتیں ہیں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نیکی کی طاقتیں۔ یہ دونوں جس کو چاہیں مصیبت میں ڈال دیں اور جس کو چاہیں کامیاب بنا دیں۔ جیسا کہ مجوس خدائی میں ثنویت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک یزداں نیکی کا خدا ہے اور اہرمن برائی کا خدا۔

انسان اپنے جھوٹے مفروضات کی بنا پر دنیا میں فرشتوں کی عبادت کرتا ہے۔ اور خود فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کے حضور تابعدار خادم کی طرح صف بستہ کھڑے رہتے ہیں اور ہر وقت صرف ایک اللہ کی بڑائی کا اعلان کرتے ہیں۔

وَ اِنْ كَانُوْا لَیَقُوْلُوْنَ ۙ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا
ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۙ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ
یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا
الْمُرْسَلِیْنَ ۚۖ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۪﴿۱۷۲﴾
وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ
حَتّٰى حِیْنٍ ۙ﴿۱۷۴﴾ وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾

۱۶۷۔ اور یہ لوگ کہا کرتے تھے۔ ۱۶۸۔ کہ اگر ہمارے پاس پہلوں کی کوئی تعلیم ہوتی۔ ۱۶۹۔ تو ہم اللہ کے خاص بندے ہوتے۔ ۱۷۰۔ پھر انھوں نے اس کا انکار کر دیا تو عنقریب وہ جان لیں گے۔ ۱۷۱۔ اور اپنے بھیجے ہوئے بندوں کے لیے ہمارا یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ۱۷۲۔ کہ بے شک وہی غالب کیے جائیں گے۔ ۱۷۳۔ اور ہمارا لشکر ہی غالب رہنے والا ہے۔ ۱۷۴۔ تو کچھ مدت تک ان سے اعراض کرو۔ ۱۷۵۔ اور دیکھتے رہو، عنقریب وہ بھی دیکھ لیں گے۔

قدیم زمانہ میں عربوں کا حال یہ تھا کہ جب وہ سنتے کہ یہود نے اور دوسری قوموں نے اپنے رسولوں کا انکار کیا تو وہ پر فخر طور پر کہتے کہ یہ لوگ بہت بدبخت تھے۔ اگر ہمارے پاس رسول آتا تو ہم اس کی قدردانی کرتے اور اس کا ساتھ دیتے۔ مگر جب ان کے اندر اللہ نے ایک رسول بھیجا تو وہ اس کے منکر ہو گئے۔ جس طرح دوسرے لوگ اپنے رسولوں کے منکر ہوئے تھے — ایسا حق آدمی کو خوب دکھائی دیتا ہے جس کی زد دوسروں پر پڑتی ہو۔ مگر جس حق کی زد خود آدمی کی اپنی ذات پر پڑے اس سے وہ اس طرح بے خبر ہو جاتا ہے جیسے اس کو دیکھنے کے لیے اس کے پاس آنکھ ہی نہیں۔

حق کے داعیوں کی بات کو لوگ نظر انداز کرتے ہیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ حق کے داعی اس دنیا میں خدا کے لشکر ہیں۔ حق کے داعیوں کی بات ہر حال میں بلند و بالا ہو کر رہتی ہے، خواہ مخالفت کرنے والے اس کی کتنی ہی زیادہ مخالفت کریں۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿١٧٦﴾ فَاِذَا نَزَلَ
بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿١٧٧﴾ وَ
تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿١٧٨﴾ وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ
يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧٩﴾ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ
عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٨٠﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٢﴾ ع ٥

۱۷۶۔ کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ ۱۷۷۔ پس جب وہ ان کے صحن میں اترے گا تو بڑی ہی بری ہو گی ان لوگوں کی صبح جن کو اس سے ڈرایا جا چکا ہے۔ ۱۷۸۔ تو کچھ مدت کے لیے ان سے اعراض کرو۔ ۱۷۹۔ اور دیکھتے رہو، عنقریب وہ خود دیکھ لیں گے۔ ۱۸۰۔ پاک ہے تیرا رب، عزت کا مالک، ان باتوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ ۱۸۱۔ اور سلام ہے پیغمبروں پر۔ ۱۸۲۔ اور ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب ہے سارے جہان کا۔

پیغمبر لوگوں سے کہتے تھے کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمھارے اوپر خدا کا عذاب آجائے گا۔ مگر لوگ اس بات کو بے حقیقت سمجھتے رہے اور اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا پیغمبر انھیں اس سے بہت کم نظر آتا تھا کہ اس کی بات نہ ماننے سے ان پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے۔

تاہم ان کے تمسخر اور استہزاء کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ فوراً ان کے اوپر عذاب آجائے کیونکہ عذابِ الٰہی کے اترنے کے لیے حجت کی تکمیل ضروری ہے۔ اس لیے پیغمبروں کو حکم ہوتا ہے کہ وہ صبر اور اعراض کرتے رہیں، یہاں تک کہ علم الٰہی کے مطابق مقررہ مدت پوری ہو جائے۔

۳۸۔سُوۡرَةُ صٓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ؕ﴿۱﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ
کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ﴿۲﴾ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ
قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّ لَاتَ حِیۡنَ
مَنَاصٍ ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ صٓ۔ قسم ہے نصیحت والے قرآن کی۔ ۲۔ بلکہ جن لوگوں نے انکار کیا وہ گھمنڈ اور ضد میں ہیں۔ ۳۔ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کردیں، تو وہ پکارنے لگے اور وہ وقت بچنے کا نہ تھا۔

''ذکر'' کے اصل معنی یاد دہانی کے ہیں۔ یاد دہانی کسی ایسی چیز کی کرائی جاتی ہے جو بطور واقعہ پہلے سے موجود ہو۔ قرآن کے ذی الذکر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ان حقیقتوں کو ماننے کی دعوت دیتا ہے جو انسانی فطرت میں پہلے سے موجود ہیں۔ قرآن کی کوئی بات اب تک خلاف واقعہ یا خلاف فطرت نہیں نکلی۔ یہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ قرآن سراسر حق ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ قرآن کو نہ مانیں ان کے نہ ماننے کا سبب یقینی طور پر نفسیاتی ہے، نہ کہ عقلی۔ ان کا نہ ماننا کسی دلیل کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اس کو مان کر ان کی بڑائی ختم ہوجائے گی۔

قرآن اُس دعوت توحید کا تسلسل ہے جو پچھلے ہر دور میں مختلف نبیوں کے ذریعہ جاری رہی ہے۔ پچھلے زمانوں میں جن لوگوں نے اس دعوت کا انکار کیا وہ ہلاک کردئے گئے۔ حال کے منکرین کو ماضی کے منکرین کے اس انجام سے سبق لینا چاہیے۔

وَ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ ۫ وَ قَالَ
الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۚ﴿۴﴾ اَجَعَلَ
الۡاٰلِہَۃَ اِلٰـہًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ
عُجَابٌ ﴿۵﴾ وَ انۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡہُمۡ اَنِ امۡشُوۡا
وَ اصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِہَتِکُمۡ ۚۖ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ
یُّرَادُ ۚ﴿۶﴾ مَا سَمِعۡنَا بِہٰذَا فِی الۡمِلَّۃِ الۡاٰخِرَۃِ ۚۖ
اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ ۚ﴿۷﴾ ءَاُنۡزِلَ عَلَیۡہِ

۴۔ اور ان لوگوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس ان میں سے ایک ڈرانے والا آیا۔ اور انکار کرنے والوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہے، جھوٹا ہے۔ ۵۔ کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک معبود کردیا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ ۶۔ اور ان کے سردار اُٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، یہ کوئی مطلب کی بات ہے۔ ۷۔ ہم نے یہ بات پچھلے مذہب میں نہیں سنی، یہ صرف ایک بنائی ہوئی بات ہے۔ ۸۔ کیا ہم سب میں سے اسی شخص پر کلام

الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ
ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۸ۭ

الٰہی نازل کیا گیا۔ بلکہ یہ لوگ میری یاد دہانی کی طرف سے شک میں ہیں۔ بلکہ انھوں نے اب تک میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔

’’پیغمبر اسلام‘‘ کا نام آج ایک عظیم نام ہے۔ کیوں کہ بعد کی پر عظمت تاریخ نے اس کو عظیم بنا دیا ہے۔ مگر ابتدا میں جب آپ نے مکہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تو لوگوں کو آپ صرف ایک معمولی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہی معمولی آدمی وہ شخص ہے جس کو خدا نے اپنے کلام کا مہبط بننے کے لیے چنا ہے — جب تاریخ بن چکی ہو تو ایک اندھا آدمی بھی پیغمبر کو پہچان لیتا ہے۔ مگر تاریخ بننے سے پہلے پیغمبر کو پہچاننے کے لیے جوہر شناسی کی صلاحیت درکار ہے، اور یہ صلاحیت وہ ہے جو ہر دور میں سب سے زیادہ کم پائی گئی ہے۔

قرآن کا غیر معمولی طور پر موثر کلام، قرآن کے مخالفین کو مبہوت کر دیتا تھا۔ مگر صاحب قرآن کی معمولی تصویر دوبارہ انھیں شبہ میں ڈال دیتی تھی۔ اس لیے وہ اس کو رد کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کبھی اس کو جادوگر کہتے، کبھی جھوٹا بتاتے، کبھی کہتے کہ اس کے پیچھے کوئی مادی غرض شامل ہے، کبھی کہتے کہ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے بزرگوں کی بات صحیح نہ ہو اور اس معمولی آدمی کی بات صحیح ہو۔

’’اپنے معبودوں پر جمے رہو‘‘ کا لفظ بتاتا ہے کہ دلیل کے میدان میں وہ اپنے آپ کو عاجز پارہے تھے، اس لیے انھوں نے تعصب کے نعرہ پر اپنے لوگوں کو قرآنی سیلاب سے بچانے کی کوشش کی۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَاۗىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ
الْوَهَّابِ ۹ۚ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۣ فَلْيَرْتَقُوْا فِي
الْاَسْبَابِ ۱۰ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ
الْاَحْزَابِ ۱۱ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ
عَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ۱۲ۙ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ
لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْــــَٔيْكَةِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الْاَحْزَابُ ۱۳
اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۱۴ۧ وَ ع ۱۴/۱۲

۹۔ کیا تیرے رب کی رحمت کے خزانے ان کے پاس ہیں جو زبردست ہے، فیاض ہے۔ ۱۰۔ کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کی بادشاہی ان کے اختیار میں ہے۔ پھر وہ سیڑھیاں لگا کر چڑھ جائیں۔ ۱۱۔ ایک لشکر یہ بھی یہاں تباہ ہوگا سب لشکروں میں سے۔ ۱۲۔ ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور میخوں والا فرعون، ۱۳۔ اور ثمود اور قوم لوط اور اصحاب ایکہ نے جھٹلایا۔ یہ لوگ بڑی بڑی جماعتیں تھے۔ ۱۴۔ ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب نازل ہو کر رہا۔ ۱۵۔ اور یہ

مَا يَنۡظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنۡ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾ وَقَالُوۡا رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ يَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۱۶﴾

لوگ صرف ایک چنگھاڑ کے منتظر ہیں ، جس کے بعد کوئی ڈھیل نہیں ۔ ۱۶۔ اور انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ، ہمارا حصہ ہم کو حساب کے دن سے پہلے دے دے ۔

خدا کی رحمت ہدایت اس طرح تقسیم نہیں ہوتی کہ جس شخص کو دنیوی عظمت ملی ہوئی ہو اسی کو خدا کی ہدایت بھی دے دی جائے ۔ اگر دنیوی عظمت لوگوں کو خدا کے یہاں عظیم بنانے والی ہوتی تو ایسے لوگوں کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ جس شخص کو چاہیں خدا کی رحمت پہنچائیں اور جس سے چاہیں اسے روک دیں ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا اپنی رحمت کی تقسیم خود اپنے معیار پر کرتا ہے ، نہ کہ ظاہر پرست انسانوں کے بنائے ہوئے معیار پر ۔

پیغمبر کا انکار کرنے والے کہتے کہ جس خدائی عذاب سے تم ہم کو ڈرا رہے ہو اس خدائی عذاب کو لے آؤ ۔ یہ جرأت ان کے اندر اس لیے پیدا ہوتی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان پر خدا کا عذاب آنے والا ہی نہیں ۔ ان کو بتایا گیا کہ جن بتوں کے بل پر تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے ہو ، اسی قسم کے بتوں کے بل پر پچھلی قوموں نے بھی اپنے کو محفوظ سمجھا اور اپنے رسولوں کے ساتھ سرکشی کی ۔ مگر وہ سب کی سب ہلاک کردی گئیں ۔ پھر تم آخر کس طرح بچ جاؤ گے ۔

اِصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَيۡدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾ اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِىِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ۙ﴿۱۸﴾ وَالطَّيۡرَ مَحۡشُوۡرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَ شَدَدۡنَا مُلۡكَهٗ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡحِكۡمَةَ وَفَصۡلَ الۡخِطَابِ ﴿۲۰﴾

۱۷۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو ، اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو قوت والا ، رجوع کرنے والا تھا ۔ ۱۸۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کردیا کہ وہ اس کے ساتھ صبح اور شام تسبیح کرتے تھے ۔ ۱۹۔ اور پرندوں کو بھی جمع ہو کر ۔ سب اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے ۔ ۲۰۔ اور ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کی ، اور اس کو حکمت عطا کی ۔ اور معاملات کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت دی ۔

دین میں صبر کی بے حد اہمیت ہے ۔ مگر انسان کی اذیتوں پر صبر وہی شخص کرسکتا ہے جو انسان کے معاملہ کو خدا کے خانہ میں ڈال سکے ۔ جو شخص خدا کی حمد و تسبیح میں ڈوبا ہوا ہو اسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ انسان کی طرف سے کہی جانے والی ناخوش گوار باتوں کو نظر انداز کردے ۔

حضرت داؤد اسی صفت کا اعلیٰ نمونہ تھے ۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوت اور سلطنت دی تھی ۔

مگر ان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ وہ کائنات میں بلند ہونے والی خدائی تسبیحات میں گم رہتے تھے۔ وہ پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر اتنے وجد کے ساتھ حمد خداوندی کا نغمہ چھیڑتے کہ پورا ماحول ان کا ہم آواز ہوجاتا تھا۔ درخت اور پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح خوانی میں شامل ہوجاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو جو حکومت دی تھی وہ نہایت مستحکم حکومت تھی۔ اس استحکام کا راز تھا حکمت اور فصلِ خطاب۔ حکمت سے مراد یہ ہے کہ وہ معاملات میں ہمیشہ حکیمانہ اور دانش مندانہ انداز اختیار کرتے تھے۔ اور فصلِ خطاب کا مطلب یہ ہے کہ وہ بروقت صحیح فیصلہ لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہی دونوں چیزیں ہیں جو کسی حکمراں کو صالح حکمراں بناتی ہیں۔ اس کے اندر حکمت ہونا اس بات کا ضامن ہے کہ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گا جو فائدے سے زیادہ نقصان کا سبب بن جائے۔ اور فصل خطاب اس کا ضامن ہے کہ اس کا فیصلہ ہمیشہ منصفانہ فیصلہ ہوگا۔

وَ هَلۡ اَتٰىكَ نَبَؤُا الۡخَصۡمِ ۘ اِذۡ تَسَوَّرُوا الۡمِحۡرَابَ ۙ﴿۲۱﴾ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنۡهُمۡ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ۚ خَصۡمٰنِ بَغٰى بَعۡضُنَا عَلٰى بَعۡضٍ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَنَا بِالۡحَقِّ وَلَا تُشۡطِطۡ وَاهۡدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾

۲۱۔ اور کیا تم کو خبر پہنچی ہے مقدمہ والوں کی جب کہ وہ دیوار پھاند کر عبادت خانہ میں داخل ہوگئے۔ ۲۲۔ جب وہ داؤد کے پاس پہنچے تو وہ ان سے گھبرا گیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ ڈریں نہیں، ہم دو فریقِ معاملہ ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے تو آپ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیجیے، بے انصافی نہ کیجیے اور ہم کو راہ راست بتائیے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت داؤد نے تین دن کی باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایک دن دربار اور فصل مقدمات کے لیے۔ دوسرے دن اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے کے لیے۔ تیسرے دن الگ رہ کر خالص خدا کی عبادت کے لیے۔ ایک روز جب کہ ان کا عبادتی دن تھا وہ اپنے محل کے مخصوص حصہ میں اکیلے عبادت میں مشغول تھے کہ دو آدمی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگئے اور ان کے کمرۂ عبادت میں آکر کھڑے ہوگئے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی اس لیے آپ کچھ گھبرا اٹھے۔ ان دونوں آدمیوں نے اطمینان دلایا اور کہا کہ ہم دو فریق ہیں۔ آپ سے ایک جھگڑے کا فیصلہ لینے کے لیے یہاں حاضر ہوئے ہیں۔

اِنَّ هٰذَاۤ اَخِیْ ۟ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً
وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۟ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا
وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ
بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰی نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا
مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیْلٌ مَّا
هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ
وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴿۲۴﴾ السجدۃ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَ
اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰی وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

۲۳۔ یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ وہ بھی میرے حوالے کر دے۔ اور اس نے گفتگو میں مجھ کو دبا لیا۔ ۲۴۔ داؤد نے کہا، اس نے تمھاری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملانے کا مطالبہ کرکے واقعی تم پر ظلم کیا ہے۔ اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں۔ مگر وہ جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اور داؤد کو خیال آیا کہ ہم نے اس کا امتحان کیا ہے، تو اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا۔ اور رجوع ہوا۔ ۲۵۔ پھر ہم نے اس کی وہ (غلطی) معاف کردی۔ اور بے شک ہمارے یہاں اس کے لیے تقرب ہے اور اچھا انجام۔

آنے والے دونوں آدمیوں نے جو مقدمہ پیش کیا وہ کوئی حقیقی مقدمہ نہ تھا بلکہ تمثیل کی زبان میں خود حضرت داؤد علیہ السلام کی کسی بات پر انھیں متنبہ کرنا تھا۔ چنانچہ مقدمہ کا فیصلہ دیتے دیتے آپ کو اپنا وہ معاملہ یاد آ گیا جو مذکورہ مثال سے ملتا جلتا تھا۔ آپ نے فوراً اس سے رجوع کر لیا اور اللہ کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

حضرت داؤد کو اس وقت زبردست اقتدار حاصل تھا۔ مگر انھوں نے آنے والوں کو نہ تو کوئی سزا دی اور نہ انھیں برا بھلا کہا۔ یہی اللہ کے سچے بندوں کا طریقہ ہے۔ ان کے اندر کسی معاملہ میں ضد نہیں ہوتی۔ انھیں جب ان کی کسی خامی کی طرف توجہ دلائی جائے تو وہ فوراً اس کو مان کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں، خواہ وہ با اقتدار حیثیت کے مالک ہوں اور خواہ متوجہ کرنے والے نے انھیں بے ڈھنگے طریقہ سے متوجہ کیا ہو۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ
فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ
الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ
الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ
عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾ ع

۲۶۔ اے داؤد، ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ (حاکم) بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو، وہ تم کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے۔

ایک حاکم ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ یا تو وہ معاملات کا فیصلہ اپنی چاہت کے مطابق کرے گا یا اصولِ حق کے مطابق۔ جو حاکم معاملات کا فیصلہ اپنی چاہ اور خواہش کے مطابق کرے وہ راہ سے بھٹک گیا۔ خدا کے یہاں اس کی سخت پکڑ ہوگی۔ اس کے برعکس، جو حاکم معاملات کا فیصلہ حق وانصاف کے اصول کا پابند رہ کر کرے وہی راہِ راست پر ہے۔ خدا کے یہاں اس کو بے حساب انعامات دئے جائیں گے۔

یہ ہدایت جس طرح ایک حاکم کے لیے ہے اسی طرح وہ عام انسانوں کے لیے بھی ہے۔ ہر آدمی کو اپنے دائرہ اختیار میں وہی کرنا ہے جو اس آیت میں بااقتدار حاکم کے لیے بتایا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿٢٧﴾ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٩﴾

۲۷۔ اور ہم نے زمین اور آسمان اور جو ان کے درمیان ہے عبث نہیں پیدا کیا، یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے انکار کیا، تو جن لوگوں نے انکار کیا ان کے لیے بربادی ہے آگ سے۔ ۲۸۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کی مانند کر دیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں، یا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے۔ ۲۹۔ یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

دنیا کی چیزوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پورا نظام نہایت حکیمانہ بنیادوں پر قائم ہے حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک الل ٹپ نظام ہو اور اس میں کوئی بات یقینی نہ ہو۔ دو امکان میں سے ایک مناسب تر امکان کا پایا جانا اس بات کا قرینہ ہے کہ اس دنیا کو پیدا کرنے والے نے اس کو ایک بامقصد منصوبہ کے تحت بنایا ہے۔ پھر جو دنیا اپنی ابتدا میں بامقصد ہو وہ اپنی انتہا میں بے مقصد کیوں کر ہو جائے گی۔

اسی طرح اس دنیا میں ہر آدمی آزاد اور خود مختار ہے۔ مشاہدہ دوبارہ بتاتا ہے کہ لوگوں میں کوئی شخص وہ ہے جو حقیقت کا اعتراف کرتا ہے اور اپنے اختیار سے اپنے آپ کو سچائی اور انصاف کا پابند بناتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص وہ ہے جو حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ بے قید ہو کر جو چاہے بولتا ہے اور جس طرح چاہے عمل کرتا ہے۔ عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی کہ جب یہاں دو قسم کے انسان ہیں تو ان کا انجام یکساں ہو کر رہ جائے۔

دنیا کی اس صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو زندگی کے متعلق قرآن کا بیان ہی زیادہ مطابق حال نظر آئے گا، نہ کہ ان لوگوں کا بیان جو زندگی کی تشریح اس کے برعکس انداز میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ
اَوَّابٌ ؕ﴿۳۰﴾ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ
الْجِيَادُ ۙ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ
عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ
بِالْحِجَابِ ۟﴿۳۲﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا
بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

۳۰۔ اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا۔ بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔ ۳۱۔ جب شام کے وقت اس کے سامنے تیز رو، عمدہ گھوڑے پیش کیے گئے۔ ۳۲۔ تو اس نے کہا، میں نے دوست رکھا مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے، یہاں تک کہ چھپ گیا اوٹ میں۔ ۳۳۔ ان کو میرے پاس واپس لاؤ۔ پھر وہ جھاڑنے لگا پنڈلیاں اور گردنیں۔

حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام ایک عظیم سلطنت کے حکمراں تھے۔ ایک روز ان کی فوج کے اصیل اور تربیت یافتہ گھوڑے ان کے سامنے لائے گئے۔ پھر ان کی دوڑ ہوئی۔ یہاں تک کہ گھوڑے دوڑتے ہوئے دور کے منظر میں گم ہوگئے۔ اور پھر وہ دوبارہ واپس آئے۔

اس قسم کا منظر ہمیشہ نہایت شان دار ہوتا ہے۔ ان کو دیکھ کر عام انسان فخر اور گھمنڈ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مگر حضرت سلیمان کا حال یہ ہوا کہ وہ اس پر فخر منظر کو دیکھ کر خدا کو یاد کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ گھوڑے اپنی شان دکھانے کے لیے پسند نہیں کیے ہیں بلکہ صرف خدا کے لیے پسند کیے ہیں۔ گھوڑے کی شکل میں انھیں خدا کی عظیم کاریگری نظر آئی۔ اور وہ خدا کی عظمت کے اعتراف کے طور پر گھوڑوں کی گردنوں اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگے — مومن ہر چیز میں خدا کی شان دیکھتا ہے اور غیر مومن ہر چیز میں اپنی شان۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ
جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ
وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ
تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۙ﴿۳۶﴾ وَ
الشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۙ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيْنَ
مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا
فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ

۳۴۔ اور ہم نے سلیمان کو آزمایا۔ اور ہم نے اس کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا۔ ۳۵۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب، مجھ کو معاف کردے اور مجھ کو ایسی سلطنت دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بے شک تو بڑا دینے والا ہے۔ ۳۶۔ تو ہم نے ہوا کو اس کے تابع کردیا۔ وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا۔ ۳۷۔ اور جنات کو بھی اس کا تابع کردیا۔ ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور۔ ۳۸۔ اور دوسرے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہتے۔ ۳۹۔ یہ ہمارا عطیہ ہے تو خواہ اس کو

عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٠﴾ ع

دو یاروکو، بے حساب۔ ۴۰۔ اور اس کے لیے ہمارے یہاں قرب ہے اور بہتر انجام۔

ہر انسان سے کوتاہی ہوتی ہے۔ مگر خدا کے نیک بندوں کے لیے کوتاہی ایک عظیم بھلائی بن جاتی ہے کیونکہ وہ کوتاہی کے بعد اور زیادہ خشوع کے ساتھ اپنے رب کی طرف پلٹتے ہیں اور پھر اور زیادہ انعام کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام سے بھی ایک موقع پر کوئی اجتہادی انداز کی کوتاہی ہوگئی۔ جب آپ پر حقیقت واضح ہوئی تو آپ شدید اِنابت کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے درگزر فرمایا اور مزید یہ انعام کیا کہ آپ کو عظیم سلطنت عطا فرمائی اور آپ کو ایسے غیر معمولی اختیارات دئے جو کسی اور انسان کو حاصل نہیں ہوئے۔

''ہم نے ہوا کو اس کے تابع کر دیا۔ وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا۔'' اس حقیقت کو موجودہ زمانے میں ہوائی جہاز کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔ ہوائی جہاز کا سفر ایک اعلیٰ ربانی تجربے کا ذریعہ ہے۔ ہوائی جہاز گویا ایک اڑتا ہوا تخت (flying throne) ہے جو ایک سنجیدہ انسان کو خدا کی اتھاہ عظمت کے تصور سے لرزا دیتا ہے۔ وہ ایک طرف، خدا کی قدرت اور دوسری طرف، اپنے عجز کا لرزہ خیز تجربہ کراتا ہے۔ یہ انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی انعام ہے جس کا نمایاں آغاز سلیمان علیہ السلام کے ذریعہ ہوا۔ پہلے گھوڑا انسانی حکم کے تحت زمین پر چلتا تھا۔ اس کے بعد سمندری جہاز انسانی حکم کے تحت پانی پر چلنے لگے۔ اب میکانیکل دور میں کار انسانی حکم کے تحت سڑک پر دوڑتی ہے اور ہوائی جہاز امر انسانی کے تحت فضا میں اڑتے ہیں۔ ایک عارف انسان جب سڑک پر دیکھتا ہے کہ ایک شخص موٹر سائیکل پر سوار ہے۔ اور موٹر سائیکل اس کے ''امر'' کے تحت اس کو ادھر سے ادھر لے جارہی ہے تو اس کو قرآن کی آیت تَجْرِي بِأَمْرِهِ (اس کے حکم سے چلتی تھی) یاد آجاتی ہے۔ مگر وہ اس سے فخر کی غذا لینے کے بجائے تواضع اور شکر کی غذا لیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا تھا (النمل، 27:40)۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ﴿٤١﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿٤٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي

۴۱۔ اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔ ۴۲۔ اپنا پاؤں مارو۔ یہ ٹھنڈا پانی ہے، نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔ ۴۳۔ اور ہم نے اس کو اس کا کنبہ عطا کیا اور ان کے ساتھ ان کے برابر اور بھی، اپنی طرف سے رحمت کے طور پر اور عقل

اُلِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

والوں کے لیے نصیحت کے طور پر۔ ۴۴۔ اور اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مُٹھا لو اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو۔ بے شک ہم نے اس کو صابر پایا۔ بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔

حضرت ایوب علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے۔ ان کا زمانہ غالباً نویں صدی قبل مسیح ہے۔ ان کو کافی مال و دولت حاصل تھی۔ مگر مال و دولت میں گم ہونے کے بجائے وہ خدا کی عبادت کرتے اور لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے تھے۔ کچھ غلط قسم کے لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ایوب کو جب اتنا زیادہ مال و دولت حاصل ہے تو وہ دین دار نہ بنیں گے تو اور کیا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر حجت قائم کرنے کے لیے حضرت ایوب کو مفلس بنا دیا۔ مگر وہ بدستور اللہ کے عبادت گزار بنے رہے۔ انھوں نے کہا کہ ''خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو'' (ایوب 1:21)۔

شریر لوگ اب بھی چپ نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اصل امتحان تو یہ ہے کہ وہ جسمانی تکلیف میں مبتلا ہوں اور پھر بھی صبر و شکر پر قائم رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ نمونہ بھی دکھایا۔ حضرت ایوب کو سخت جِلدی بیماری لاحق ہوئی اور ان کے تمام جسم پر پھوڑے ہو گئے۔ مگر وہ بدستور صبر و شکر کی تصویر بنے رہے۔ جب لوگوں پر حجت تمام ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کے لیے ایک چشمہ جاری کیا جس میں نہانے سے ان کا جسم بالکل تندرست ہو گیا۔ اور مال و اولاد بھی دوبارہ مزید اضافہ کے ساتھ عطا فرمائے۔

حضرت ایوب نے بیماری کی حالت میں کسی بات پر قسم کھالی تھی کہ اچھے ہو گئے تو اپنی بیوی کو سو لکڑیاں ماریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کو پورا کرنے کی یہ تدبیر انھیں بتائی کہ ایک جھاڑو لو جس میں ایک سو سینکیں ہوں اور اس سے ہلکے طور پر ایک بار اپنی بیوی کو مارو — اس سے معلوم ہوا کہ مخصوص حالات میں حیلہ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم کو باطل نہ کرتا ہو۔ خدا جب اپنے دین کے لیے کسی کو استعمال کرے اور وہ شخص کسی تحفظ کے بغیر اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دے تو خدا اس کو دوبارہ اس سے زیادہ دے دیتا ہے جتنا اس سے مذکورہ عمل کے دوران چھنا تھا۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۚ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ

۴۵۔ اور ہمارے بندوں، ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو، وہ ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے۔ ۴۶۔ ہم نے ان کو ایک خاص بات کے ساتھ مخصوص کیا تھا کہ وہ آخرت کی یاد دہانی ہے۔ ۴۷۔ اور وہ ہمارے یہاں چنے ہوئے نیک لوگوں

الْاَخْيَارِؕ۝۴۷ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِؕ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِؕ۝۴۸

میں سے ہیں۔ ۴۸۔ اور اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو یاد کرو، سب نیک لوگوں میں سے تھے۔

یہاں چند پیغمبروں کا ذکر کرکے ارشاد ہوا ہے کہ وہ ہاتھ والے اور آنکھ والے تھے۔ یعنی ان کو جسمانی قوت اور ذہنی بصیرت دونوں اعلیٰ درجہ میں حاصل تھی۔ ایک طرف وہ عملی صلاحیت کے مالک تھے۔ دوسری طرف انھوں نے اس معرفت کا ثبوت دیا کہ وہ چیزوں کو صحیح نظر سے دیکھنے اور معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ خدا نے ان کو اپنے پیغام کی پیغام بری کے لیے چن لیا۔

خدا کا خاص کام کیا ہے جس کے لیے وہ انسانوں میں سے اپنے پیغمبر چنتا ہے۔ وہ ہے آخرت کے گھر کی یاددہانی۔ پیغمبروں کا خاص مشن ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ انسان کو اس حقیقت سے باخبر کریں کہ انسان کی اصل منزل آخرت ہے۔ اور انسان کو اسی کی تیاری کرنا چاہیے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے اور اس دنیا میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس کو اس سنگین مسئلہ سے آگاہ کیا جائے۔

هٰذَا ذِكْرٌؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍۙ۝۴۹ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُۚ۝۵۰ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ۝۵۱ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ۝۵۲ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ۝۵۳ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍۚ۝۵۴

الثلثۃ

۴۹۔ یہ نصیحت ہے، اور بے شک اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اچھا ٹھکانا ہے۔ ۵۰۔ ہمیشہ کے باغ جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔ ۵۱۔ وہ ان میں تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اور بہت سے میوے اور مشروبات طلب کرتے ہوں گے۔ ۵۲۔ اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی۔ ۵۳۔ یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے روز حساب آنے پر وعدہ کیا جاتا ہے۔ ۵۴۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

جنت کے دروازے ان لوگوں کے لیے کھولے جاتے ہیں جو اپنے دل کے دروازے نصیحت کے لیے کھولیں۔ جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ یہی وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی نعمتوں کے حصہ دار ہوں گے۔

قرآن میں آخرت کی جن نعمتوں کا ذکر ہے وہ سب وہی ہیں جو دنیا میں بھی انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ مگر دونوں میں زبردست فرق ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں یہ نعمتیں وقتی اور ابتدائی شکل میں دی گئی ہیں اور آخرت میں یہ نعمتیں ابدی اور انتہائی شکل میں دی جائیں گی۔ مزید یہ کہ ان اعلیٰ نعمتوں کے ساتھ ہر قسم کے خوف اور

اندیشہ کو حذف کردیا جائے گا جن کا حذف ہونا موجودہ دنیا میں کسی طرح ممکن نہیں۔

هٰذَا ؕ وَ اِنَّ لِلطّٰغِیْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ
یَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ
فَلْیَذُوْقُوْهُ حَمِیْمٌ وَّ غَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّ اٰخَرُ مِنْ
شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ
لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا
بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ
لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ
قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی
النَّارِ ﴿۶۱﴾ وَ قَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا
نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِیًّا
اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾ اِنَّ ذٰلِكَ
لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾ ع ۲۴ ۱۳

۵۵۔ یہ بات ہو چکی، اور سرکشوں کے لیے برا ٹھکانا ہے۔ ۵۶۔ جہنم، اس میں وہ داخل ہوں گے۔ پس کیا ہی بری جگہ ہے۔ ۵۷۔ یہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہے، تو یہ لوگ ان کو چکھیں۔ ۵۸۔ اور اس قسم کی دوسری اور بھی چیزیں ہوں گی۔ ۵۹۔ یہ ایک فوج تمھارے پاس گھسی چلی آرہی ہے، ان کے لیے کوئی خوش آمدید نہیں۔ وہ آگ میں پڑنے والے ہیں۔ ۶۰۔ وہ کہیں گے بلکہ تم، تمھارے لیے کوئی خوش آمدید نہیں۔ تمھیں تو یہ ہمارے آگے لائے ہو، پس کیسا برا ہے یہ ٹھکانا۔ ۶۱۔ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، جو شخص اس کو ہمارے آگے لایا اس کو تو دونا عذاب دے، جہنم میں۔ ۶۲۔ اور وہ کہیں گے، کیا بات ہے کہ ہم ان لوگوں کو یہاں نہیں دیکھ رہے ہیں جن کو ہم برے لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ ۶۳۔ کیا ہم نے ان کو مذاق بنالیا تھا یا ان سے نگاہیں چوک رہی ہیں۔ ۶۴۔ بے شک یہ بات سچی ہے، اہل دوزخ کا باہم جھگڑنا۔

جہنم ان تکلیفوں کی ابدی اور انتہائی شکل ہے جن کا موجودہ دنیا میں کوئی شخص تصور کرسکتا ہے۔ دنیا میں سرکشی کرنے والے اور سچائی کو جھٹلانے والے لوگ جب جہنم میں اکٹھا ہوں گے تو ان کے لیڈر اور پیروکار آپس میں تکرار کریں گے۔ وہ پیروکار جو اپنے لیڈروں کی عظمت پر فخر کرتے تھے وہ وہاں اپنا انجام دیکھ کر ان پر لعنت بھیجیں گے۔ اس کا ایک نقشہ ان آیات میں دکھایا گیا ہے۔

سچائی کا انکار کرنے والے جب آخرت میں اپنا برا انجام دیکھیں گے تو وہاں وہ ان لوگوں کو یاد کریں گے جنھوں نے سچائی کا ساتھ دیا تھا اور اس بنا پر وہ اپنے ماحول میں حقیر بن گئے تھے۔ ان کے متعلق منکرین کہتے تھے کہ یہ اکابر کی توہین کرنے والے ہیں۔ یہ آبائی دین سے منحرف ہوگئے ہیں۔ انھوں نے ملت سے الگ اپنا راستہ بنایا ہے۔ یہ منکرین اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے اور ان کو ناحق پر۔ مگر آخرت میں معاملہ بالکل برعکس

ہو جائے گا۔ اس وقت ان پر کھلے گا کہ جن کو حقیر سمجھ کر وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے، وہی آخرت کی سرفرازی میں سب سے آگے درجہ پائے ہوئے ہیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٠﴾

۶۵۔ کہو کہ میں تو صرف ایک ڈرانے والا ہوں۔ اور کوئی معبود نہیں مگر اللہ، یکتا اور غالب۔ ۶۶۔ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں، وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔ ۶۷۔ کہو کہ یہ ایک بڑی خبر ہے۔ ۶۸۔ جس سے تم بے پرواہ ہو رہے ہو۔ ۶۹۔ مجھ کو عالمِ بالا کی کچھ خبر نہ تھی جب کہ وہ آپس میں تکرار کر رہے تھے۔ ۷۰۔ میرے پاس تو وحی بس اس لیے آتی ہے کہ میں ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

یہاں جس اختصام (تکرار) کا ذکر ہے وہ وہی ہے جو اگلی آیت میں منقول ہے یعنی آدم کی تخلیق کے وقت ابلیس کا بحث وتکرار کرنا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ شیطان پہلے روز سے آدم کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ پر فریب باتوں کے ذریعہ اولادِ آدم کو سیدھے راستہ سے بھٹکاتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ہوشیار رہے اور اس سے پوری طرح بچنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلہ میں آدمی کی پیدائش کے وقت جو اختصام ہوا اور اس کو قرآن میں بیان کیا گیا وہ سراسر وحی تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ملأ اعلیٰ میں موجود نہ تھے کہ ذاتی واقفیت کی بنیاد پر اس کو بیان کر سکتے۔

سب سے اہم خبر انسان کے لیے یہ ہے کہ اس کو زندگی کی اس نوعیت سے آگاہ کیا جائے کہ شیطان ہر لمحہ اس کے پیچھے لگا ہوا ہے، وہ اس کی سوچ اور اس کے جذبات میں داخل ہو کر اس کو گمراہ کر رہا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس خطرے سے اپنے آپ کو بچائے۔ پیغمبر ایک اعتبار سے اسی لیے آئے کہ انسان کو اس نازک خطرہ سے آگاہ کر دیں۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿٧١﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٧٢﴾ فَسَجَدَ

۷۱۔ جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ ۷۲۔ پھر جب میں اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں

الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝٧٣ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ
اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٧٤ قَالَ
يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ
بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ
الْعَالِيْنَ ۝٧٥ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ
مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝٧٦ قَالَ
فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝٧٧ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ
لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٧٨

گر پڑنا۔ ۷۳۔ پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ ۷۴۔ مگر ابلیس کہ اس نے گھمنڈ کیا اور وہ انکار کرنے والوں میں سے ہوگیا۔ ۷۵۔ فرمایا کہ اے ابلیس، کس چیز نے تجھ کو روک دیا کہ تو اس کو سجدہ کرے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ یہ تو نے تکبر کیا یا تو بڑے درجہ والوں میں سے ہے۔ ۷۶۔ اس نے کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔ ۷۷۔ فرمایا کہ تو یہاں سے نکل جا، کیوں کہ تو مردود ہے۔ ۷۸۔ اور تجھ پر میری لعنت ہے جزاء کے دن تک۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک انتہائی اعلیٰ مخلوق کی حیثیت سے بنایا۔ اور اس کی علامت کے طور پر فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ وہ اس کو سجدہ کریں۔ اس کے بعد جب ایسا ہوا کہ ابلیس نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تو وہ ہمیشہ کے لیے ملعون قرار پا گیا۔ مگر اس سنگین واقعہ کی اہمیت صرف ابلیس کے اعتبار سے نہ تھی بلکہ خود آدم کے لیے بھی اس کی بے حد اہمیت تھی۔

آدم کے آگے جھکنے سے انکار کرکے ابلیس ابدی طور پر نسلِ آدم کا حریف بن گیا۔ اس طرح انسانی تاریخ اول روز سے ایک نئے رخ پر چل پڑی۔ اس واقعہ نے طے کردیا کہ انسان کے لیے زندگی کا سفر کوئی سادہ سفر نہیں ہوگا بلکہ شدید مزاحمت کا سفر ہوگا۔ اس کو ابلیس کے بہکاؤں اور اس کی پرفریب تدبیروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو صحیح راستہ پر قائم رکھنا ہوگا تاکہ وہ سلامتی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچ سکے۔

انسان اور جنت کے درمیان شیطان کی فریب کاریاں حائل ہیں۔ جو شخص شیطان کی فریب کاریوں سے اپنے آپ کو بچائے وہی جنت کے ابدی باغوں میں داخل ہوگا۔ اور جو لوگ شیطان کی فریب کاریوں کا پردہ پھاڑنے میں ناکام رہیں وہی وہ لوگ ہیں جو جنت سے محروم رہ گئے۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝٧٩
قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝٨٠ اِلٰى يَوْمِ
الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝٨١ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ
لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٨٢ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ

۷۹۔ ابلیس نے کہا کہ اے میرے رب، مجھ کو مہلت دے اس دن تک کے لیے جب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ ۸۰۔ فرمایا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ۸۱۔ وقت معین تک کے لیے۔ ۸۲۔ اس نے کہا کہ تیری عزت کی قسم، میں ان

الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٨٣﴾ قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ
اَقُوْلُ ۚ ﴿٨٤﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ
تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٥﴾

سب کو گمراہ کرکے رہوں گا۔ ۸۳۔ بجز تیرے ان بندوں کے جنھیں تونے خالص کرلیا ہے۔ ۸۴۔ فرمایا، تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں۔ ۸۵۔ کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان تمام لوگوں سے بھر دوں گا جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں شیطان کو پورا موقع دیا گیا ہے کہ وہ انسان کو بہکائے۔ مگر شیطان اسی وقت تک بہکا سکتا ہے جب تک حقیقت غیب میں چھپی ہوئی ہو۔ قیامت جب غیب کا پردہ پھاڑے گی تو سب کچھ سامنے آجائے گا۔ اس کے بعد نہ کوئی بہکانے والا باقی رہے گا اور نہ کوئی بہکنے والا۔

مخلص کا مطلب ہے کھوٹ سے خالی ہونا۔ عبد مخلص وہ ہے جو نفسیاتی بیماریوں سے پاک ہو۔ شیطان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کو کوئی عملی زور حاصل نہیں۔ وہ ہمیشہ تزئین کے ذریعہ انسانوں کو بہکاتا ہے۔ یعنی باطل کو حق کے روپ میں دکھانا۔ بے اصل باتوں کو خوبصورت الفاظ میں پیش کرنا۔ سیدھی بات میں شوشہ نکال کر لوگوں کو اس کی طرف سے مشتبہ کردینا۔ تاہم شیطان کی اس تزئین سے وہی لوگ فریب کھاتے ہیں جو اپنے اندر نفسیاتی کھوٹ لیے ہوئے ہوں۔ اور جو لوگ اپنی نفسیات کو اس کی فطری حالت پر باقی رکھیں اور اپنی عقل کو کھلے طور پر استعمال کریں وہ فوراً شیطانی فریب کو پہچان لیتے ہیں۔ وہ کبھی اس کی تزئین سے گمراہ نہیں ہوتے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا
مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿٨٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿٨٨﴾ ع ۵ ۲۴ ۱۴

۸۶۔ کہو کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔ ۸۷۔ یہ تو بس ایک نصیحت ہے دنیا والوں کے لیے۔ ۸۸۔ اور تم جلد اس کی دی ہوئی خبر کو جان لو گے۔

داعی کی ایک لازمی صفت یہ ہے کہ وہ مدعو سے اجر کا طالب نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اور مدعو کے درمیان کوئی مادی جھگڑا نہیں کھڑا کرتا۔ قرآن کی دعوت آخرت کی دعوت ہے۔ اس لیے جو شخص ایسا کرے کہ وہ ایک طرف قرآن کی دعوتِ آخرت کا علم بردار ہو، اور اسی کے ساتھ مدعو قوم سے مادی مطالبات کی مہم بھی چلائے وہ مدعو کی نظر میں ایک غیر سنجیدہ آدمی ہے۔ اور جو آدمی خود اپنی غیر سنجیدگی ثابت کردے اس کی بات پر کون دھیان دے گا۔

اسی طرح داعی اپنی طرف سے بنا کر کوئی بات نہیں کہتا۔ وہ بس وہی کہتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو ملا ہے۔ مسروق تابعی کہتے ہیں کہ ہم عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ اے لوگو، جو شخص کچھ جانتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بولے۔ اور جو شخص نہ جانتا ہو تو اس کو یہ کہنا چاہیے کہ اللہ ہی زیادہ جانتا ہے۔

یہ علم کی بات ہے کہ آدمی جس چیز کو نہ جانے اس کے بارہ میں کہہ دے کہ اللہ زیادہ جانتا ہے۔ کیوں کہ اللہ عزوجل نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ کہو کہ میں اس پر تم سے اجر نہیں مانگتا اور میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4809)۔

اسی طرح داعی کی یہ صفت ہے کہ وہ دعوت کو نصیحت کے روپ میں پیش کرے۔ اس کا کلام خیر خواہانہ کلام ہو، نہ کہ مناظرانہ کلام۔

۳۹۔ سُوْرَۃُ الزُّمَر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۝۱ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ۝۲ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ فِیۡ مَا ہُمۡ فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ۬ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ۝۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ یہ کتاب اللہ کی طرف سے اُتاری گئی ہے جو زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۲۔ بے شک ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف حق کے ساتھ اتاری ہے، پس تم اللہ ہی کی عبادت کرو، اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ ۳۔ آگاہ، دینِ خالص صرف اللہ کے لیے ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے حمایتی بنا رکھے ہیں، کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا سے قریب کردیں۔ بے شک اللہ ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کردے گا جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔ اللہ ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، حق کو نہ ماننے والا ہو۔

قرآن حقیقتِ واقعہ کا خدائی بیان ہے۔ اس کا حکیمانہ اسلوب اور اس کے غیر معمولی طور پر پختہ مضامین اس بات کا داخلی ثبوت ہیں کہ یہ واقعۃً خدا ہی کی طرف سے ہے۔ کوئی انسان اس قسم کا غیر معمولی کلام پیش کرنے پر قادر نہیں۔

دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا مطلب ہے عبادت کو اللہ کے لیے خالص کرنا۔ یعنی یہ کہ تم صرف ایک اللہ کی عبادت کرو، اپنی عبادت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے (اي فاعبد اللّٰہ وحدہ مخلصاً لہ فی عبادتک)، صفوۃ التفاسیر، جلد 3، صفحہ 64۔

ہر انسان کے اندر پراسرار طور پر عبادت کا جذبہ موجود ہے۔ یعنی کسی کو بڑا تصور کرکے اس کے لیے استعجاب (awe) کا احساس پیدا ہونا جس ہستی کے بارے میں آدمی کے اندر یہ احساس پیدا ہوجائے اس کو وہ سب سے زیادہ مقدس سمجھتا ہے۔ اس کے آگے اس کی پوری ہستی جھک جاتی ہے۔ اس کی جناب میں وہ غیر معمولی قسم کے احترام وآداب کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتا ہے اور اسی سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس کی یاد سے اس کی روح کو لذت ملتی ہے۔ وہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا بن جاتا ہے۔

اسی کا نام عبادت (یا پرستش) ہے۔ اور یہ عبادت صرف ایک خدا کا حق ہے۔ مگر انسان ایسا کرتا ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہوئے عبادت میں غیر خدا کو شریک کرتا ہے۔ وہ غیر خدا کے لیے عبادتی افعال انجام دیتا ہے۔ یہی انسان کی اصل گمراہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خدائی ناقابل تقسیم ہے اسی طرح عبادت کی بھی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ④ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ⑤

۴۔ اگر اللہ چاہتا کہ وہ بیٹا بنائے تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا چن لیتا، وہ پاک ہے۔ وہ اللہ ہے، اکیلا، سب پر غالب۔ ۵۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک ٹھہری ہوئی مدت پر چلتا ہے۔ سن لو کہ وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔

آدمی کے اندر فطری طور پر یہ جذبہ ہے کہ وہ خدا کی طرف لپکے، وہ خدا کی پرستش کرے۔ شیطان کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس جذبہ کو خدا کی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف موڑ دے۔ اس کے لیے وہ لوگوں کے ذہن میں ڈالتا ہے کہ خدا کی بارگاہ اونچی ہے، تم براہ راست خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے تم کو بزرگوں کے وسیلہ سے خدا تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ بٹھاتا ہے کہ جس طرح انسانوں کی اولاد ہوتی ہے اسی طرح خدا کی بھی اولاد ہے۔ اور خدا کو خوش رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم خدا کی اولاد کو خوش رکھو۔ جدید مادہ پرستی بھی اسی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے جس نے آدمی کے جذبہ پرستش کو خالق سے ہٹا کر مخلوق کی طرف کردیا ہے۔

اس قسم کی تمام باتیں خدا کی تصغیر ہیں۔ جو خدا شمسی نظام کو چلا رہا ہے اور جس نے عظیم کائنات کو سنبھال رکھا ہے وہ یقیناً اس سے بلند ہے کہ اس کے یہاں کسی کی سفارش چلے یا اس کے بیٹے بیٹیاں ہوں۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝٦

٦۔ اللہ نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر اس نے اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور اسی نے تمھارے لیے نر و مادہ چوپایوں کی آٹھ قسمیں اُتاریں۔ وہ تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں بناتا ہے، ایک خلقت کے بعد دوسری خلقت، تین تاریکیوں کے اندر۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کہاں سے پھیرے جاتے ہو۔

اولاً ایک انسان وجود میں آیا۔ پھر عین اس کے مطابق اس کا ایک جوڑا نکالا گیا۔ اس طرح ابتدائی مرد وعورت کے ذریعہ انسانی نسل چلی۔ پھر انسان کی ضرورت کے لیے اس سے باہر اللہ تعالیٰ نے بے شمار چیزیں بنائیں۔ بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے (نر و مادہ کو ملا کر آٹھ قسمیں) تہذیب کے ابتدائی دور میں ہزاروں سال تک انسان کی معیشت کا ذریعہ بنی رہیں۔ پھر جب تہذیب اگلے مرحلہ میں پہنچی تو دوسری بے شمار چیزوں کو انسان نے استعمال کرنا شروع کیا جن کو خدا نے اول روز سے ایسا بنا رکھا تھا کہ انسان ان کو اپنے کام میں لا سکے۔ جس طرح پالتو جانور طبیعی طور پر انسان کے لیے مسخر ہیں۔ اسی طرح گیسیں اور معدنیات بھی مسخر کی ہوئی ہیں۔ ورنہ انسان ان کو استعمال نہ کر سکے۔ مذکورہ آٹھ قسموں کی مثال بطور علامت ہے، نہ کہ بطور حصر۔

انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں یہاں جن تین تاریکیوں کا ذکر ہے اس سے مراد تین پردے ہیں۔ اولاً پیٹ کی دیوار، پھر رحم مادر کا پردہ، اور پھر جنین کی بیرونی جھلّی:

The mother’s abdominal wall, the wall of the uterus, and the amniochorionic membrance.

یہ سارا نظام اتنا حیرت ناک حد تک پیچیدہ اور عظیم ہے کہ خالق کائنات کے سوا کوئی اور ان کو ظہور میں نہیں لا سکتا۔ پھر اس کے سوا کون اس قابل ہے کہ اس کو معبود کا درجہ دیا جائے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۫ وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ

٧۔ اگر تم انکار کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ اور وہ اپنے بندوں کے لیے انکار کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر تم شکر کرو تو وہ اس کو تمھارے لیے پسند کرتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔ پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھاری واپسی ہے۔ تو وہ تم کو بتا دے

عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۷

گا جو تم کرتے تھے۔ بے شک وہ دلوں کی بات کو جاننے والا ہے۔

خدا کو ماننا اور اس کا شکر گزار بننا خود انسانی عقل کا تقاضا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے اور حقیقتِ واقعہ کا اعتراف بلاشبہ سب سے بڑا عقلی تقاضا ہے۔

آخرت عدلِ کامل کا ظہور ہے اور یہ ناممکن ہے کہ عدل کامل کی دنیا میں وہ ناقص صورت حال جاری رہے جو موجودہ دنیا میں نظر آتی ہے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی عین وہی ثابت ہو جو کہ فی الواقع وہ ہے، اور عین وہی پائے جس کا وہ حقیقۃً مستحق تھا۔ موجودہ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ آخرت اس لیے آئے گی کہ وہ دنیا کی اس کمی کو دور کرے، وہ ناقص دنیا کو آخری حد تک کامل دنیا بنا دے۔

وَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيۡبًا اِلَيۡهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعۡمَةً مِّنۡهُ نَسِىَ مَا كَانَ يَدۡعُوۡۤا اِلَيۡهِ مِنۡ قَبۡلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنۡدَادًا لِّيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعۡ بِكُفۡرِكَ قَلِيۡلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۝۸ اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيۡلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ وَيَرۡجُوۡا رَحۡمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۹ ع ۱ ۹ ۱۵

۸۔ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے، اس کی طرف رجوع ہو کر۔ پھر جب وہ اس کو اپنے پاس سے نعمت دے دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لیے وہ پہلے پکار رہا تھا اور وہ دوسروں کو اللہ کا برابر ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ وہ اس کی راہ سے گمراہ کر دے۔ کہو کہ تو اپنے کفر سے تھوڑے دن فائدہ اٹھا لے، بے شک تو آگ والوں میں سے ہے۔ ۹۔ بھلا کوئی شخص رات کی گھڑیوں میں سجدہ اور قیام کی حالت میں عاجزی کر رہا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہو۔ کہو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت تو وہی لوگ پکڑتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

ہر آدمی پر ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ جن چیزوں کو اپنا سہارا سمجھ رہا تھا وہ بھی اس نازک لمحہ میں اس کے مددگار نہیں بنتے۔ اس وقت آدمی سب کچھ بھول کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس طرح مصیبت کی گھڑیوں میں ہر آدمی جان لیتا ہے کہ ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر مصیبت دور ہوتے ہی وہ دوبارہ پہلے کی طرح بن جاتا ہے۔

انسان کی مزید سرکشی یہ ہے کہ وہ اپنی نجات کو خدا کے سوا دوسری چیزوں کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے۔ کچھ لوگ اس کو اسباب کا کرشمہ بتاتے ہیں اور کچھ لوگ فرضی معبودوں کا کرشمہ۔ آدمی اگر غلطی کرکے خاموش رہے تو یہ صرف ایک شخص کا گمراہ ہونا ہے۔ مگر جب وہ اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اس کی جھوٹی توجیہ کرنے لگے تو وہ گمراہ ہونے کے ساتھ گمراہ کرنے والا بھی بنا۔

ایک انسان وہ ہے جس کو صرف مادی غم بے قرار کرے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کو خدا کی یاد بے قرار کردیتی ہو۔ یہی دوسرا انسان دراصل خدا والا انسان ہے۔ اس کا اقرارِ خدا حالات کی پیداوار نہیں ہوتا، وہ اس کی شعوری دریافت ہوتا ہے۔ وہ خدا کو ایک ایسی برتر ہستی کی حیثیت سے پاتا ہے کہ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے سب ایک خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوجاتے ہیں۔ اس کی بے قراریاں رات کے لمحات میں بھی اس کو بستر سے جدا کردیتی ہیں۔ اس کی تنہائی غفلت کی تنہائی نہیں ہوتی بلکہ خدا کی یاد کی تنہائی بن جاتی ہے۔

علم والا وہ ہے جس کی نفسیات میں خدا کی یاد سے ہلچل پیدا ہوتی ہو، اور بے علم والا وہ ہے جس کی نفسیات کو صرف مادی حالات بیدار کریں۔ وہ مادی جھٹکوں سے جاگے اور اس کے بعد دوبارہ غفلت کی نیند سو جائے۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑩

۱۰۔ کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔ جو لوگ اس دنیا میں نیکی کریں گے ان کے لیے نیک صلہ ہے۔ اور اللہ کی زمین وسیع ہے۔ بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

آدمی کو جب اللہ کی گہری معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والا بن جاتا ہے۔ اللہ کی عظمتوں کا ادراک اس کو اللہ کے آگے پست کردیتا ہے۔ اس کی عملی زندگی اللہ کے احکام کی پابندی میں گزرنے لگتی ہے۔ وہ اس معاملہ میں اس حد تک سنجیدہ ہوجاتا ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ دے مگر اللہ کو نہ چھوڑے۔

ایمان کے اوپر زندگی کی تعمیر کرنا آدمی کے لیے زبردست امتحان ہے۔ اس امتحان میں وہی لوگ پورے اترتے ہیں جن کے لیے ایمان اتنی قیمتی دولت ہو کہ اس کی خاطر وہ ہر دوسری چیز پر صبر کرنے کے لیے راضی ہوجائیں۔ ایمانی زندگی عمل کے اعتبار سے صبر والی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ جو لوگ صبر کی قیمت پر مومن بننے کے لیے تیار ہوں وہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے اعلیٰ انعامات میں حصہ دار بنائے جائیں گے۔

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ﴿۱۱﴾ وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۲﴾ قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۳﴾ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۵﴾ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ یٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾

۱۱۔ کہو، مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ ہی کی عبادت کروں، اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ ۱۲۔ اور مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے خود مسلم بنوں۔ ۱۳۔ کہو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۱۴۔ کہو کہ میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ ۱۵۔ پس تم اس کے سوا جس کی چاہے عبادت کرو۔ کہو کہ اصلی گھاٹے والے تو وہ ہیں، جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن گھاٹے میں ڈالا۔ سن لو یہی کھلا ہوا گھاٹا ہے۔ ۱۶۔ ان کے لیے ان کے اوپر سے بھی آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے سے بھی۔ یہ چیز ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اے میرے بندو، پس مجھ سے ڈرو۔

پیغمبر کی اصل دعوت یہ ہوتی ہے کہ لوگ صرف ایک خدا کے پرستار بنیں۔ اس کے سوا دوسری تمام چیزوں کی پرستاری چھوڑ دیں۔ پیغمبر کے لیے یہ معروف معنوں میں صرف قیادتی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ سب سے پہلے خود اس پر قائم ہوتا ہے۔ پیغمبر کو یقین ہوتا ہے کہ آدمی کے نفع اور نقصان کا اصل فیصلہ آخرت میں ہونے والا ہے۔ اس لیے وہ خود اپنی زندگی کو آخرت کی راہ میں لگاتا ہے اور دوسروں کو اس کی طرف لگنے کی دعوت دیتا ہے۔

پیغمبر کے کام کی یہ نوعیت داعی کے کام کی نوعیت کو بتا رہی ہے۔ حق کا داعی وہی شخص ہے جس کے لیے حق اس کا ذاتی مسئلہ بن جائے۔ جس کی دعوت اس کی اندرونی حالت کا ایک بے تابانہ اظہار ہو، نہ کہ لاؤڈ اسپیکر کی طرح صرف ایک خارجی پکار۔

وَ الَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْۤا اِلَی اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰی ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ

۱۷۔ اور جو لوگ شیطان سے بچے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور وہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے، ان کے لیے خوش خبری ہے، تو میرے بندوں کو خوش خبری دے دو۔ ۱۸۔ جو بات کو غور سے سنتے

فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑱

ہیں۔ پھر اس کے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے۔ اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔

موجودہ دنیا فتنہ کی دنیا ہے۔ یہاں حقیقتیں اپنی آخری بے نقاب شکل میں ظاہر نہیں ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر بات کو غلط معنی پہنایا جاسکتا ہے۔ شیطان اسی امکان کو استعمال کرکے لوگوں کو راہ راست سے بھٹکاتا ہے۔ جب بھی کوئی حق سامنے آتا ہے تو شیطان اس کو غلط معنی پہنا کر لوگوں کے ذہن کو پھیرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ قول کے احسن پہلو سے ہٹا کر قول کے غیر احسن پہلو کو لوگوں کے سامنے لاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ آدمی کو اس عقل کا ثبوت دینا ہے کہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرے۔ وہ شیطانی فریب کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھ سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی کان سے نہیں، اصل میں دماغ سے سنتا ہے۔ آدمی جب کسی کی بات سنے یا کسی کی زبان سے کوئی کلمہ نکل جائے تو صرف لفظ نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے یہ دیکھنا چاہیے کہ واقعی اس سے کیا مراد ہے۔ جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت دیں وہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو خدائی سچائی کو پائیں گے اور جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت دینے میں ناکام رہیں، ان کے لیے اس دنیا میں اس کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں کہ وہ قول کے غیر احسن پہلوؤں میں الجھے رہیں اور خدا کے یہاں شیطان کے پرستار کی حیثیت سے اٹھائے جائیں۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِى النَّارِ ⑲ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ⑳

۱۹۔ کیا جس پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی، پس کیا تم ایسے شخص کو بچا سکتے ہو جو کہ آگ میں ہے۔ ۲۰۔ لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرے، ان کے لیے بالاخانے ہیں جن کے اوپر اور بالاخانے ہیں، بنے ہوئے۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

ہر آدمی اپنے اعمال کے انجام کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ جنت والے کو جنتی فضا گھیرے ہوئے ہے اور جہنم والے کو جہنمی فضا گھیرے ہوئے ہے۔ غیر مرئی حقیقتوں کو دیکھنے والی نگاہ ہو تو لوگ جنت والے انسان کو اسی دنیا میں جنت میں دیکھیں اور جہنم والے انسان کو اسی دنیا میں جہنم میں گھرا ہوا پائیں۔

جنت آرزوؤں کی اس دنیا کی آخری معیاری صورت ہے جس کو آدمی دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے مگر وہ اس کو حاصل نہیں کر پاتا۔ اس جنت کی قیمت اللہ کا تقویٰ ہے۔ جو لوگ دنیا میں خوفِ خدا کا ثبوت دیں گے وہی جنت کی بے خوف زندگی کے مالک بنیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ
زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ ع ۲ ۱۲ ۱۶
صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ
فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ
اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾

۲۱۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس کو زمین کے چشموں میں جاری کر دیا۔ پھر وہ اس سے مختلف قسم کی کھیتیاں نکالتا ہے، پھر وہ خشک ہوجاتی ہے، تو تم اس کو زرد دیکھتے ہو۔ پھر وہ اس کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ بے شک اس میں نصیحت ہے عقل والوں کے لیے۔ ۲۲۔ کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا، پس وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر ہے۔ تو خرابی ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کی نصیحت کے معاملہ میں سخت ہو گئے۔ یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔

زمین پر بارش کا حیرت انگیز نظام، پھر اس سے سبزہ کا اگنا، پھر فصل کی تیاری، ان مادی واقعات میں بے شمار معنوی نصیحتیں ہیں۔ مگر ان نصیحتوں کو وہی لوگ پاتے ہیں جو باتوں کی گہرائی میں اترنے کا مزاج رکھتے ہوں۔

ایک طرف اللہ نے خارجی دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا کہ اس کی ہر چیز حقیقتِ اعلیٰ کی نشانی بن گئی۔ دوسری طرف انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھ دیں کہ وہ ان نشانیوں کو پڑھے اور ان کو سمجھ سکے۔ اب جو لوگ اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھیں اور ان سے کام لے کر دنیا کی چیزوں پر غور کریں، ان کے سینے میں معرفت کے دروازے کھل جائیں گے۔ اور جو لوگ اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ نہ رکھ سکیں وہ نصیحتوں کے ہجوم میں بھی نصیحت لینے سے محروم رہیں گے۔ وہ دیکھ کر بھی کچھ نہ دیکھیں گے اور سن کر بھی کچھ نہ سنیں گے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا
مَّثَانِيَ ۖۗ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ
يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ
وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ
يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ
فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے۔ ایک ایسی کتاب آپس میں ملتی جلتی، بار بار دہرائی ہوئی، اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور ان کے دل نرم ہوکر اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ اس سے وہ ہدایت دیتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ اور جس کو اللہ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ایک بہترین کتاب انسان کو عطا کی ہے۔ اس کی دو خاص صفتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ متشابہ (ملتی جلتی) ہے۔ یعنی وہ ایک بے تضاد کتاب ہے۔ اس کے ایک جزء اور اس کے دوسرے جزء میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ قرآن کی یہ صفت بتاتی ہے کہ یہ کتاب بیانِ حقیقت پر مبنی ہے۔ اگر اس کے بیانات عین حقیقت نہ ہوتے تو ضرور اس کے مختلف اجزاء کے درمیان اختلاف اور عدم یکسانیت (inconsistency) پیدا ہو جاتی۔

قرآن کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ مثانی (دہرائی ہوئی) کتاب ہے یعنی اس کے مضامین بار بار مختلف پیرایوں سے دہرائے گئے ہیں۔ قرآن کی یہ صفت اس کے کتابِ نصیحت ہونے کو بتاتی ہے۔ نصیحت کرنے والا ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی بات سننے والے کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی بات کو مختلف انداز سے بیان کرتا ہے۔ یہی حکمت اعلیٰ ترین انداز میں قرآن میں بھی ہے۔

انسان کے اندر یہ خصوصیت ہے کہ جب وہ کوئی دہشت ناک خبر سنتا ہے تو اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے وجود میں ایک قسم کی عاجزانہ نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال سنجیدہ انسان کا قرآن کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ قرآن میں زندگی کی سنگین حقیقتوں کو انتہائی موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے انسان جیسی مخلوق اگر واقعۃً اس کو سمجھ کر پڑھے تو اس کے جسم کے اوپر وہی کیفیت طاری ہوگی جو کسی سنگین خبر کو سن کر فطری طور پر اس کے اوپر طاری ہونا چاہیے۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ قِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝٢٤ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝٢٥ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝٢٦

۲۴۔ کیا وہ شخص جو قیامت کے دن اپنے چہرے کو برے عذاب کی سپر بنائے گا، اور ظالموں سے کہا جائے گا کہ چکھو مزہ اس کمائی کا جو تم کرتے تھے۔ ۲۵۔ ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تو ان پر عذاب وہاں سے آ گیا جدھر سے ان کا خیال بھی نہ تھا۔ ۲۶۔ تو اللہ نے ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب اور بھی بڑا ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔

آدمی کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے چہرہ کو چوٹ سے بچائے۔ مگر قیامت کا عذاب آدمی کو اس طرح گھیرے ہوئے ہوگا کہ وہاں ممکن نہ ہوگا کہ آدمی اپنے جسم کے کسی حصہ کو اس کی زد میں آنے سے روک سکے۔ وہ ناقابلِ دفاع عذاب کے سامنے اس طرح کھڑا ہوا ہوگا گویا وہ خود اپنے چہرہ کو اس کے مقابلہ میں سپر بنائے ہوئے ہے۔

اللہ کی نظر میں سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ آدمی کے سامنے حق آئے اور وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ ایسے لوگ کسی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢٨﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿٣١﴾ ع ۳ ۱۷

۲۷۔ اور ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ ۲۸۔ یہ عربی قرآن ہے، اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، تاکہ لوگ ڈریں۔ ۲۹۔ اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک شخص کی جس کی ملکیت میں کئی ضدی آقا شریک ہیں۔ اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہوگا۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۳۰۔ تم کو بھی مرنا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔ ۳۱۔ پھر تم لوگ قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کروگے۔

قرآن کے بیانات انسان کی معلوم زبان اور انسان کے معلوم دائرہ کے اندر ہوتے ہیں تاکہ کسی کے لیے اس کا سمجھنا مشکل نہ ہو۔

یہاں تمثیل کی زبان میں بتایا گیا ہے کہ شرک کے مقابلہ میں توحید کا اصول زیادہ معقول اور زیادہ مطابقِ فطرت ہے۔ ایک طرف خارجی کائنات بتاتی ہے کہ یہاں ایک ہی ارادہ کی کارفرمائی ہے۔ اگر یہاں کئی ارادوں کی کارفرمائی ہوتی تو کائنات کا نظام اس قدر ہم آہنگی کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ دوسری طرف انسان کی ساخت بھی ایسی ہے جو وفاداری میں وحدت کو پسند کرتی ہے۔ یہ بات انسانی ساخت کے سراسر خلاف ہے کہ ایک انسان پر بیک وقت کئی مختلف قسم کی وفاداریوں کی ذمہ داری ہو اور نتیجۃً وہ ایک کو بھی نباہ نہ سکے۔

تمام دلائل وقرائن یہی بتاتے ہیں کہ صرف ایک خدا ہے جو انسان کا خالق اور اس کا معبود ہے۔ موجودہ دنیا میں یہ حقیقت اپنے جیسے انسان کی زبان سے سنائی جاتی ہے۔ قیامت میں خود خالق کائنات اس حقیقت کا اعلان فرمائے گا۔ اس وقت کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اس امر کا انکار کرسکے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿٣٣﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ

☆ ۳۲۔ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ اور سچائی کو جھٹلادیا جب کہ وہ اس کے پاس آئی۔ کیا ایسے منکروں کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہوگا۔ ۳۳۔ اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی، یہی لوگ اللہ سے

رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۴ۚۖ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۳۵

ڈرنے والے ہیں۔ ۳۴۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب ہے جو وہ چاہیں گے، یہ بدلہ ہے نیکی کرنے والوں کا۔ ۳۵۔ تاکہ اللہ ان سے ان کے برے عملوں کو دور کردے اور ان کے نیک کاموں کے عوض ان کو ان کا ثواب دے۔

ہر وہ نظریہ جو مطابقِ حقیقت نہ ہو وہ اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ ہر دور میں لوگ اسی قسم کے جھوٹ پر جی رہے ہوتے ہیں۔ اللہ کا داعی اس لیے اٹھتا ہے کہ وہ ایسے جھوٹ کا جھوٹ ہونا ثابت کرے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنے جھوٹ پر قائم رہیں وہ ڈھٹائی کرنے والے لوگ ہیں۔ وہ جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔ اور جو لوگ رجوع کرکے حق کے ساتھی بن جائیں وہی وہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی برائیوں کو ان کے اعمال سے حذف کردے گا اور ان کے نیک اعمال کی بنا پر ان کی قدردانی فرمائے گا۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۶ۚ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ۝۳۷

۳۶۔ کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں۔ اور یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں، اور اللہ جس کو گمراہ کردے اس کو کوئی راستہ دکھانے والا نہیں۔ ۳۷۔ اور اللہ جس کو ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا اللہ زبردست، انتقام لینے والا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کے داعی تھے۔ مگر آپ کا طریقہ یہ نہ تھا کہ ”خدا ایک ہے“ کے مثبت اعلان پر اکتفا فرمائیں۔ اسی کے ساتھ آپ ان غیر خدائی ہستیوں کی تردید بھی فرماتے تھے جن کو لوگوں نے بطور خود معبود کا درجہ دے رکھا تھا۔ آپ کی دعوت کا یہی دوسرا جزء لوگوں کے لیے ناقابل برداشت بن گیا۔

یہ غیر خدائی ہستیاں دراصل ان کے قومی اکابر تھے۔ صدیوں سے وہ ان کی کرامت کی مبالغہ آمیز داستانیں سنتے آرہے تھے۔ ان کے ذہن پر ان ہستیوں کی عظمت اس طرح چھا گئی تھی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تقدس کی تردید فرمائی تو ان کی سمجھ میں کسی طرح نہ آیا کہ وہ غیر مقدس کیسے ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دو ورنہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ یا تم کو جنون ہو جائے گا (لَتَكُفَّنَّ عَنْ شَتْمِ آلِهَتِنَا أَوْ لَيُصِيبَنَّكَ مِنْهُمْ خَبَلٌ أَوْ جُنُونٌ) تفسیر البغوی، جلد 4، صفحہ 90۔

مگر حق کے داعی کو حکم ہے کہ وہ اس قسم کی باتوں کی پروانہ کرے۔ وہ اللہ کے بھروسے پر اثباتِ توحید اور تردیدِ شرک کا دوگونہ کام جاری رکھے۔ کیوں کہ اس کے بغیر امر حق پوری طرح واضح نہیں ہوسکتا۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ
بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ
بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ
حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾
قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ
عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ
عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ
مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ
لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ
مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ
عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾ ع

۳۸۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو، تمھارا کیا خیال ہے، اللہ کے سوا تم جن کو پکارتے ہو، اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کرسکتے ہیں، یا اللہ مجھ پر کوئی مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی مہربانی کو روکنے والے بن سکتے ہیں۔ کہو کہ اللہ میرے لیے کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ۳۹۔ کہو کہ اے میری قوم، تم اپنی جگہ عمل کرو، میں بھی عمل کررہا ہوں، تو تم جلد جان لوگے۔ ۴۰۔ کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کس پر وہ عذاب آتا ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں۔ ۴۱۔ ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اُتاری ہے۔ پس جو شخص ہدایت حاصل کرے گا وہ اپنے ہی لیے حاصل کرے گا۔ اور جو شخص بے راہ ہوگا تو اس کا بے راہ ہونا اسی پر پڑے گا۔ اور تم ان کے اوپر ذمہ دار نہیں ہو۔

انسان ہر دور میں غیر اللہ کی عبادت کرتا رہا ہے۔ مگر کوئی شخص یہ کہنے کی ہمت نہیں کرتا کہ اس کی انھیں پسندیدہ ہستیوں نے زمین وآسمان کو بنایا ہے۔ یا تکلیف اور آرام کے واقعات کے حقیقی اسباب ان کے اختیار میں ہیں۔ اس بے یقینی کے باوجود لوگوں کا یہ یقین بڑا عجیب ہے کہ وہ اپنے جھوٹے معبودوں کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔

جب داعی کی دلیلیں مدعو پر بے اثر ثابت ہوں تو اس وقت اس کے پاس کہنے کی جو بات ہوتی ہے وہ یہ کہ —— تم جو چاہے کرو، جب آخری فیصلے کا دن آئے گا تو وہ بتادے گا کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر۔ یہ دلیل کے بعد یقین کا اظہار ہے، اور داعی کا آخری کلمہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اللہ ہی وفات دیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت۔ پھر وہ ان کو روک لیتا ہے جن کی موت کا فیصلہ کر چکا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک کے لیے رِہا کر دیتا ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

نیند کے وقت آدمی پر بے خبری کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے نیند گویا موت کے مشابہ ہے۔ پھر جب آدمی سو کر اٹھتا ہے تو دوبارہ وہ ہوش کی حالت میں آجاتا ہے۔ یہ گویا موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کی تصویر ہے۔

اس قانونِ فطرت کے تحت ہر آدمی کو آج ہی ابتدائی سطح پر دکھایا جا رہا ہے کہ وہ کس طرح مرے گا اور کس طرح وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ اسی دنیوی واقعہ میں اپنے لیے آخرت کا سبق پالے گا۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ

۴۳۔ کیا انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے۔ کہو، اگرچہ وہ نہ کچھ اختیار رکھتے ہوں اور نہ کچھ سمجھتے ہوں۔ ۴۴۔ کہو، سفارش ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۴۵۔ اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل کڑھتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو اس وقت وہ خوش ہو جاتے ہیں۔
۴۶۔ کہو کہ اے اللہ، آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، غائب اور حاضر کے جاننے والے، تو اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۴۷۔ اور اگر ظلم کرنے والوں کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین

لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا
يَحْتَسِبُوْنَ ۝٤٧ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا
وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٤٨

میں ہے اور اسی کے برابر اور بھی، تو وہ قیامت کے دن سخت عذاب سے بچنے کے لیے ان کو فدیہ میں دے دیں۔ اور اللہ کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا۔ ۴۸۔ اور ان کے سامنے آجائیں گے ان کے برے اعمال اور وہ چیز ان کو گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔

عرب کے مشرکین جن کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا کے یہاں وہ ان کی شفاعت کرنے والے بن جائیں گے وہ حقیقۃً پتھر کے بت نہ تھے۔ یہ وہ بزرگ ہستیاں تھیں جن کی علامت کے طور پر انھوں نے پتھر کے بت بنا رکھے تھے۔ ان کے شفعاء دراصل ان کے قومی اکابر تھے جن کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ ان کا دامن پکڑے رہو، وہ خدا کے یہاں تمھارے لیے کافی ہو جائیں گے۔

جو لوگ غیر اللہ کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ بنائیں، دھیرے دھیرے ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ان کی ساری عقیدتیں اور شیفتگیاں ان ہی غیر خدائی شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہیں۔ ان شخصیتوں کی بڑائی کا چرچا کیا جائے تو اس کو سن کر وہ خوب خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ایک خدا کی بڑائی بیان کی جائے تو ان کی روح کو اس سے کوئی غذا نہیں ملتی۔

ایسے لوگوں کے سامنے خواہ کتنے ہی طاقت ور دلائل کے ساتھ توحید خالص کو بیان کیا جائے وہ اس کو ماننے والے نہیں بنتے۔ ان کی آنکھ صرف اس وقت کھلتی ہے جب کہ قیامت کا پردہ پھاڑ کر خدا کا جلال بےنقاب ہو جائے۔ آج آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ اعتراف کے الفاظ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا مگر جب وہ وقت آئے گا تو وہ چاہے گا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے سب اس سے بچنے کے لیے فدیہ میں دے ڈالے۔ مگر وہاں آدمی کے اپنے اعمال کے سوا کوئی چیز نہ ہوگی جو اس کے کام آسکے۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا
خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى
عِلْمٍ ؕ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا
يَعْلَمُوْنَ ۝٤٩ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝٥٠
فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَ الَّذِيْنَ

۴۹۔ پس انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہم کو پکارتا ہے، پھر جب ہم اپنی طرف سے اس کو نعمت دے دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو مجھ کو علم کی بنا پر دیا گیا ہے، بلکہ یہ آزمائش ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۵۰۔ ان سے پہلے والوں نے بھی یہ بات کہی تو جو کچھ وہ کماتے تھے وہ ان کے کام نہ آیا۔ ۵۱۔ پس ان پر وہ برائیاں آپڑیں جو انھوں نے کمائی تھیں۔ اور ان

ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا
كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥١﴾ اَوَلَمْ
يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ
وَ يَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ ع

لوگوں میں سے جو ظالم ہیں ان کے سامنے بھی ان کی کمائی کے برے نتائج جلد آئیں گے۔ وہ ہم کو عاجز کردینے والے نہیں ہیں۔ ۵۲۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے۔ اور وہی تنگ کردیتا ہے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔

دنیا میں آدمی کو جب کوئی چیز ملتی ہے تو وہ اس کو اپنی لیاقت کا نتیجہ سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔ حالاں کہ دنیا کی چیزیں آزمائش کا سامان ہیں، نہ کہ لیاقت کا انعام۔ اسی حقیقت کو جاننا سب سے بڑا علم ہے۔ دنیا کی چیزوں کو آدمی اگر اپنی لیاقت کا نتیجہ سمجھ لے تو اس سے اس کے اندر فخر اور گھمنڈ کی نفسیات ابھرے گی۔ اس کے برعکس، جب آدمی ان کو آزمائش کا سامان سمجھتا ہے تو اس کے اندر شکر اور تواضع کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

رزق دنیا کی کمی یا زیادتی تمام تر انسانی اختیار سے باہر کی چیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے باہر کوئی قوت ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کس کو زیادہ ملے اور کس کو کم دیا جائے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ رزق کا فیصلہ شخصی لیاقت کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ اس کا فیصلہ کسی اور بنیاد پر ہوتا ہے۔ وہ بنیاد یہی ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، نہ کہ انعام کی جگہ۔ اس لیے یہاں کسی کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کے امتحان کا پرچہ ہوتا ہے۔ امتحان لینے والا اپنے فیصلہ کے تحت کسی کو کوئی پرچہ دیتا ہے اور کسی کو کوئی پرچہ۔ کسی کو ایک قسم کے حالات میں آزماتا ہے اور کسی کو دوسرے قسم کے حالات میں۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا
تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ
الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ
الرَّحِيْمُ ﴿٥٣﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ
مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا
تُنْصَرُوْنَ ﴿٥٤﴾

۵۳۔ کہو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۵۴۔ اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرماں بردار بن جاؤ اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے، پھر تمھاری کوئی مدد نہ کی جائے۔

جن لوگوں کے سینے میں حساس دل ہے ان کو جب خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو ان کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ اب تک ان سے جو گناہ ہوئے ہیں ان کا معاملہ کیا ہوگا۔ اسی طرح خدا پرستانہ زندگی اختیار کرنے کے

بعد بھی آدمی سے بار بار کوتاہیاں ہوتی ہیں اور اس کی حساسیت دوبارہ اس کو ستانے لگتی ہے۔ حتی کہ یہ احساس بعض لوگوں کو مایوسی کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔

ایسے لوگوں کے لیے اللہ نے اپنی کتاب میں یہ اعلان فرمایا کہ انھیں یقین کرنا چاہیے کہ ان کا معاملہ ایک ایسے خدا سے ہے جو غفور ورحیم ہے۔ وہ آدمی کے ماضی کو نہیں بلکہ اس کے حال کو دیکھتا ہے۔ وہ آدمی کے ظاہر کو نہیں بلکہ اس کے باطن کو دیکھتا ہے۔ وہ آدمی سے وسعت کا معاملہ فرماتا ہے، نہ کہ خوردہ گیری کا معاملہ۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ ازسرِ نو اس کو اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیتا ہے، خواہ اس سے کتنا ہی بڑا قصور کیوں نہ ہو گیا ہو۔

وَ اتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَ اسْتَكْبَرْتَ وَ كُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾

۵۵۔ اور تم پیروی کرو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہتر پہلو کی، قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ ۵۶۔ کہیں کوئی شخص یہ کہے کہ افسوس میری کوتاہی پر جو میں نے خدا کی جناب میں کی، اور میں تو مذاق اُڑانے والوں میں شامل رہا۔ ۵۷۔ یا کوئی یہ کہے کہ اگر اللہ مجھ کو ہدایت دیتا تو میں بھی ڈرنے والوں میں سے ہوتا۔ ۵۸۔ یا عذاب کو دیکھ کر کوئی شخص یہ کہے کہ کاش، مجھے دنیا میں دوبارہ جانا ہو تو میں نیک بندوں میں سے ہو جاؤں۔ ۵۹۔ ہاں تمھارے پاس میری آیتیں آئیں پھر تو نے ان کو جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو منکروں میں شامل رہا۔ ۶۰۔ اور تم قیامت کے دن ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھو گے جنھوں نے اللہ پر جھوٹ بولا تھا۔ کیا متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہوگا۔ ۶۱۔ اور جو لوگ ڈرتے رہے، اللہ ان لوگوں کو کامیابی کے ساتھ نجات دے گا، اور ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خدا کے کلام میں بہتر اور غیر بہتر کی تقسیم نہیں۔ نہ قرآن میں ایسا ہے کہ اس کی کچھ آیتیں بہتر ہیں اور کچھ

آیتیں غیر بہتر اور نہ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں یہ فرق ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب باعتبار حقیقت بہتر ہے اور کوئی کتاب غیر بہتر۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کو عمل کی آزادی ہے۔ یہاں اس کے لیے یہ موقع ہے کہ ایک کلام کو خواہ سیدھے رخ سے لے یا الٹے رخ سے۔ وہ چاہے کلام کے اصل مدعا پر دھیان دے یا اس میں بے جا شوشے نکالے اور اس کو غلط معنی پہنائے۔ کلام الٰہی کا مذاق اڑانا اسی کی ایک مثال ہے۔ آدمی ایک آیت کو لے کر اس میں الٹا مفہوم نکالتا ہے اور پھر اس خود ساختہ مفہوم کی بنا پر اس کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔

دنیا میں آدمی اپنے آپ کو چھپائے ہوئے ہے۔ وہ محض تکبر کی بنیاد پر حق کو نہیں مانتا اور ایسے الفاظ بولتا ہے گویا کہ وہ اصول کی بنیاد پر اس کا انکار کر رہا ہے۔ مگر قیامت کے دن آدمی کا چہرہ اس کی اندرونی حالت کا مظہر بن جائے گا۔ اس وقت آدمی کا اپنا چہرہ بتائے گا کہ وہ جس حق میں ''غیر بہتر'' پہلو نکال کر اس کا منکر بنا رہا وہ صرف اس کے جھوٹے الفاظ تھے۔ ورنہ حق بذات خود بالکل صاف اور واضح تھا۔ اس وقت وہ افسوس کرے گا مگر اس وقت کا افسوس کرنا اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾ ۧ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ ع ۲ ۱۲ ۱۶
اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ
عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ
فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

۶۲۔ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ ۶۳۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ ۶۴۔ کہو کہ اے نادانو، کیا تم مجھ کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کے لیے کہتے ہو۔ ۶۵۔ اور تمھاری طرف اور تم سے پہلے والوں کی طرف بھی وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا عمل ضائع ہو جائے گا۔ اور تم خسارہ میں رہو گے۔ ۶۶۔ بلکہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور شکر کرنے والوں میں سے بنو۔

کائنات کی موجودگی اس کے خالق کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح کائنات جتنے بامعنی اور جس قدر منظم طور پر چل رہی ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ ہر آن ایک نگرانی کرنے والا اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ کائنات میں اس کے خالق کی نشانی پالے گا اور اسی طرح اس کے ناظم اور مدبر کی نشانی بھی۔

ایسی حالت میں جو لوگ ایک خدا کے سوا دوسری ہستیوں کے عبادت گزار بنتے ہیں وہ ایک ایسا عمل

کررہے ہیں جس کی موجودہ کائنات میں کوئی قیمت نہیں۔ کیوں کہ خالق اور وکیل جب صرف ایک ہے تو اسی کی عبادت آدمی کو نفع دے سکتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا گویا ایسے معبود کو پکارنا ہے جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ ٭ۖ وَ الۡاَرۡضُ
جَمِیۡعًا قَبۡضَتُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ السَّمٰوٰتُ
مَطۡوِیّٰتٌۢ بِیَمِیۡنِہٖ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا
یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۶۷﴾ وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِی
السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ
اللّٰہُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِیۡہِ اُخۡرٰی فَاِذَا ہُمۡ قِیَامٌ
یَّنۡظُرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ وَ اَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ
رَبِّہَا وَ وُضِعَ الۡکِتٰبُ وَ جِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ
وَ الشُّہَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ ہُمۡ لَا
یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۹﴾ وَ وُفِّیَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ
وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿٪۷۰﴾ ع

۶۷۔ اور لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ اور زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ ۶۸۔ اور صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر جس کو اللہ چاہے۔ پھر دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا تو یکا یک سب کے سب اُٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔ ۶۹۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی۔ اور کتاب رکھ دی جائے گی اور پیغمبر اور گواہ حاضر کیے جائیں گے۔ اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ ۷۰۔ اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

اکثر گمراہیوں کی جڑ خدا کا کمتر اندازہ ہے۔ آدمی دوسری عظمتوں میں اس لیے گم ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی اتھاہ عظمت کا پتہ نہیں۔ وہ اپنے اکابر سے وابستگی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے تو اسی لیے سمجھتا ہے کہ اس کو معلوم نہیں کہ خدا اس سے زیادہ بڑا ہے کہ وہاں کوئی شخص اپنی زبان کھولنے کی جرأت کر سکے۔ قیامت جب لوگوں کی آنکھ کا پردہ ہٹائے گی تو ان کو معلوم ہوگا کہ خدا تو اتنا عظیم تھا جیسے کہ زمین ایک چھوٹے سکہ کی طرح اس کی مٹھی میں ہو اور آسمان ایک معمولی کاغذ کی طرح اس کے ہاتھ میں لپٹا ہوا ہو۔

جس طرح امتحان ہال میں امتحان کے ختم ہونے پر الارم بجتا ہے اسی طرح موجودہ دنیا کی مدت ختم ہونے پر صور پھونکا جائے گا۔ اس کے بعد سارا نظام بدل جائے گا۔ اس کے بعد ایک نئی دنیا بنے گی۔ ہماری موجودہ دنیا سورج کی روشنی سے روشن ہوتی ہے۔ جو صرف محسوس مادی اشیاء کو ہمیں دکھا پاتی ہے۔ آخرت کی دنیا براہِ راست خدا کے نور سے روشن ہوگی۔ اس لیے وہاں یہ ممکن ہوگا کہ معنوی حقیقتوں کو بھی کھلی آنکھ سے دیکھا جا سکے۔

اس وقت تمام لوگ خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔ دنیا میں لوگوں نے پیغمبروں کو اور ان کی تبعیت میں اٹھنے والے داعیوں کو نظر انداز کیا تھا۔ مگر آخرت میں لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ لوگوں کے مستقبل کا فیصلہ وہاں اسی بنیاد پر کیا جا رہا ہے کہ کس نے ان کا ساتھ دیا اور کس نے ان کا انکار کر دیا۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝

۷۱۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا وہ گروہ گروہ بنا کر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اس کے دروازے کھول دئے جائیں گے اور اس کے محافظ ان سے کہیں گے، کیا تمھارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغمبر نہیں آئے جو تم کو تمھارے رب کی آیتیں سناتے تھے اور تم کو تمھارے اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں، لیکن عذاب کا وعدہ منکروں پر پورا ہو کر رہا۔
۷۲۔ کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ پس کیسا برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔

حق سے اعراض وانکار کرنے کے درجے ہیں۔ اسی لحاظ سے جہنم والوں کے بھی درجے ہیں۔ آخرت میں ان کو ان کے درجات کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جائے گا اور پھر ہر گروہ کو جہنم کے اس طبقہ میں ڈال دیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ اس موقع پر جہنم کی نگرانی کرنے والے فرشتوں کی گفتگو سے اس منظر کی تصویر کشی ہو رہی ہے جو لوگوں کے جہنم میں داخل ہونے کے وقت پیش آئے گی۔

جو لوگ موجودہ دنیا میں حق کو نہیں مانتے ان کے نہ ماننے کی اصل وجہ ہمیشہ تکبر ہوتا ہے۔ تاہم ان کا تکبر حقیقۃً حق کے مقابلہ میں نہیں ہوتا بلکہ وہ حق کو پیش کرنے والے شخص کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ حق کو پیش کرنے والا بظاہر ایک آدمی کو اپنے سے چھوٹا دکھائی دیتا ہے اس لیے وہ آدمی حق کو بھی چھوٹا سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کو حقارت کے ساتھ نظر انداز کر دیتا ہے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ

۷۳۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرے وہ گروہ درگروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھول دئے جائیں گے اور اس کے محافظ

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝٧٣ وَ قَالُوا
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ
وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ
حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝٧٤ وَ
تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ
الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ
بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝٧٥ ع

ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم پر، خوش حال رہو، پس اس میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے۔ ۷۳۔ اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔ پس کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ ۷۴۔ اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد اور تسبیح کرتے ہوں گے۔ اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ساری حمد اللہ کے لیے ہے، عالم کا خداوند۔

جنت میں جانے والے وہ لوگ ہیں جن میں تقویٰ کی صفت پائی جائے۔ جب آدمی خدا کی بڑائی کو اس طرح پائے کہ اس کے اندر سے اپنی بڑائی کا احساس ختم ہو جائے تو اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ اپنے عجز اور خدا کی قدرت کا احساس اس کو اندیشہ ناک بنا دیتا ہے۔ وہ خدا کے معاملہ میں حد درجہ محتاج ہو جاتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ آخرت میں اس کا خدا اس کے ساتھ کیا معاملہ فرمائے گا۔ جن لوگوں نے دنیا میں اسی طرح خوف کیا وہی آخرت کی بے خوف زندگی کے وارث قرار دئے جائیں گے۔

اہل جنت کے ساتھ آخرت میں وہ معاملہ کیا جائے گا جو دنیا میں شاہی مہمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان کو کمال اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کی قیام گاہوں کی طرف لے جایا جائے گا۔ جب وہ جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو بے اختیار ان کی زبان پر حمد اور شکر کے کلمات جاری ہو جائیں گے۔ جنت میں ان کے لیے نہ صرف اعلیٰ قیام گاہیں ہوں گی بلکہ وہاں سیر اور ملاقات کے لیے آنے جانے پر کوئی روک نہ ہوگی۔ سفر اور مواصلات کی اعلیٰ ترین سہولتیں وافر مقدار میں حاصل ہوں گی۔

حمد کی مستحق صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔ مگر موجودہ امتحان کی دنیا میں اس کا ظہور نہیں ہوتا۔ آخرت حمد الٰہی کے کامل ظہور کا دن ہوگا۔ اس وقت تمام تر زبانیں اور سارا ماحول حمد خداوندی کے نغمہ سے معمور ہو جائے گا۔ تمام جھوٹی بڑائیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہاں صرف ایک بستی ہوگی جس کا آدمی نام لے۔ وہاں صرف ایک بڑائی ہوگی جس کی بڑائی سے سرشار ہو کر وہ اس کی حمد کرے۔

۴۰۔ سُوْرَةُ الْمُؤْمِن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

حٰمٓ ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ
الْعَلِيْمِ ② غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ
شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ حٰمٓ۔ ۲۔ یہ کتاب اتاری گئی ہے اللہ کی
طرف سے جو زبردست ہے، جاننے والا ہے۔
۳۔ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا
ہے۔ سخت سزا دینے والا، بڑی قدرت والا، اس
کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

''عزیز وعلیم'' کے الفاظ یہاں قرآن کے حق میں بطور دلیل استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن کے اترنے کے وقت ایک پیشین گوئی تھی، آج یہ ایک ثابت شدہ واقعہ ہے۔

قرآن دور سائنس سے پہلے انتہائی ناموافق حالات میں اترا۔ مگر عین اپنے دعوے کے مطابق اس نے اپنے مخالفوں کے اوپر غلبہ حاصل کیا۔ عرب کے مشرکین اور یہود اور عظیم رومی اور ایرانی سلطنتیں سب کی سب اس کی دشمن تھیں مگر اس نے بہت تھوڑے عرصہ میں سب کو مغلوب کرلیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدائے عزیز وغالب کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

قرآن کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ کامل طور پر ایک صحیح کتاب ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس بعد بھی قرآن کی کوئی بات حقیقتِ واقعہ کے خلاف نہیں نکلی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا نازل کرنے والا علیم وخبیر ہے اس سے زمین وآسمان کی کوئی بات مخفی نہیں۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل سے یکساں طور پر باخبر ہے۔

یہی خدا انسان کا حقیقی معبود ہے۔ اس کی قدرت اور اس کے علم کا یہ تقاضا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو جمع کرکے ان کا حساب لے۔ پھر پورے عدل کے ساتھ ہر ایک کا فیصلہ کرے۔ جو لوگ خدا کی طرف رجوع ہوئے ان کو معاف کردے اور جنھوں نے سرکشی کی انھیں ان کے برے اعمال کی سزا دے۔

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ④ كَذَّبَتْ
قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ
وَ هَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ

۴۔ اللہ کی آیتوں میں وہی لوگ جھگڑے نکالتے ہیں
جو منکر ہیں، تو ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا تم کو
دھوکے میں نہ ڈالے۔ ۵۔ ان سے پہلے نوح کی
قوم نے جھٹلایا، اور ان کے بعد کے گروہ نے بھی۔
اور ہر امت نے ارادہ کیا کہ اپنے رسول کو پکڑ لیں

وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ⑤ وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ⑥

اور انھوں نے ناحق کے جھگڑے نکالے، تاکہ وہ اس سے حق کو پسپا کردیں تو میں نے ان کو پکڑ لیا۔ پھر کیسی تھی میری سزا۔ ٦۔ اور اسی طرح تیرے رب کی بات ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہے جنھوں نے انکار کیا کہ وہ آگ والے ہیں۔

یہاں آیات اللہ سے مراد وہ دلائل ہیں جو دعوت حق کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیے گئے ہوں۔ جو لوگ خدا کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہوں وہ ان دلائل میں غیر متعلق بحثیں پیدا کرکے لوگوں کو اس شبہ میں ڈالتے ہیں کہ یہ دعوت حق کی دعوت نہیں ہے بلکہ محض ایک شخص (داعی) کی ذہنی اپج ہے۔

اس قسم کا جھوٹا مجادلہ بہت بڑا جرم ہے۔ تاہم موجودہ امتحان کی دنیا میں ایسے لوگوں کو ایک مقرر مدت تک مہلت حاصل رہتی ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے وہی برا انجام مقدر ہے جو قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود وغیرہ کا ہوا۔ جن لوگوں نے اپنے کو بڑا سمجھا تھا وہ چھوٹے کردئے گئے۔ اور جن لوگوں کو چھوٹا سمجھ لیا گیا تھا وہ اللہ کے نزدیک بڑے قرار پائے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ⑦ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ⑧ وَ قِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَ مَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑨ ع

٧۔ جو عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے ارد گرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں، اس کی حمد کے ساتھ۔ اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور وہ ایمان والوں کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب، تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پس تو معاف کردے ان لوگوں کو جو توبہ کریں اور تیرے راستے کی پیروی کریں اور تو ان کو جہنم کے عذاب سے بچا۔ ٨۔ اے ہمارے رب، اور تو ان کو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ اور ان کو بھی جو صالح ہوں، ان کے والدین اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے، بے شک تو زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ٩۔ اور ان کو برائیوں سے بچالے۔ اور جس کو تو نے اس دن برائیوں سے بچایا تو ان پر تو نے رحم کیا۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

جو اللہ کے بندے بے آمیز حق کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں ان کو ہمیشہ ستایا جاتا ہے۔ ان کو ماحول میں حقیر بنا دیا جاتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ ظاہر پرست انسانوں کے درمیان ان کا یہ حال ہوتا ہے، عین اسی وقت زمین و آسمان ان کے برسرِ حق ہونے کی تصدیق کر رہے ہوتے ہیں۔ کائنات کا انتظام کرنے والے فرشتے ان کے حسنِ انجام کے منتظر ہوتے ہیں۔ وقتی دنیا میں ناقابلِ تذکرہ سمجھے جانے والے لوگ ابدی دنیا میں اس مقام عزت پر ہوتے ہیں کہ اللہ کے مقرب ترین فرشتے بھی ان کے حق میں دعائیں کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۝١٠ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝١١ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝١٢

۱۰۔ جن لوگوں نے انکار کیا، ان کو پکار کر کہا جائے گا، خدا کی بیزاری تم سے اس سے زیادہ ہے جتنی بیزاری تم کو اپنے آپ پر ہے۔ جب تم کو ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے۔ ۱۱۔ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، تو نے ہم کو دوبار موت دی اور دوبار ہم کو زندگی دی۔ پس ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، تو کیا نکلنے کی کوئی صورت ہے۔ ۱۲۔ یہ تم پر اس لیے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے۔ اور جب اس کے ساتھ شریک کیا جاتا تو تم مان لیتے۔ پس فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے جو عظیم ہے، بڑے مرتبہ والا ہے۔

موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی شکل میں اپنی رحمت بھیجی۔ مگر لوگوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اس کا انجام آخرت میں یہ سامنے آئے گا کہ اس قسم کے لوگ اللہ کی رحمت سے بالکل محروم کر دئے جائیں گے۔ دنیا میں انھوں نے خدا کی رحمت کو نظر انداز کیا تھا، آخرت میں خدا کی رحمت انھیں نظر انداز کر دے گی۔

اس وقت انکار کرنے والے لوگ کہیں گے کہ خدایا، تو نے ہم کو مٹی سے پیدا کیا۔ گویا کہ ہم مُردہ تھے پھر تو نے ہمارے اندر جان ڈالی۔ اس کے بعد اپنی عمر پوری کر کے دوسری بار ہم پر موت آئی۔ اور اب ہم دوبارہ آخرت کی دنیا میں اٹھائے گئے ہیں۔ اس طرح تو ہم کو دوبار موت اور دوبار زندگی دے چکا ہے۔ اب اگر تو ہم کو تیسرا موقع دے اور پھر ہم کو دنیا میں بھیج دے کہ ہم وہاں رہیں اور پھر مر کر عالم آخرت میں حاضر ہوں تو ہم وہاں تیری سچائی کا اعتراف کریں گے اور نیک عمل کی زندگی گزاریں گے۔

مگر ان کی یہ درخواست سنی نہیں جائے گی۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے بارے میں یہ ثبوت دیا کہ وہ سچائی کا ادراک اس وقت نہیں کر سکتے جب کہ سچائی ابھی غیب میں چھپی ہوئی ہو۔ وہ صرف ظاہری خداؤں

کو پہچان سکتے ہیں، وہ غیبی خدا کو پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اور خدا کے یہاں ایسے ظاہر پرستوں کی کوئی قیمت نہیں۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾

۱۳۔ وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمھارے لیے رزق اُتارتا ہے۔ اور نصیحت صرف وہی شخص قبول کرتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ ۱۴۔ پس اللہ ہی کو پکارو، دین کو اسی کے لیے خالص کرکے، خواہ منکروں کو ناگوار کیوں نہ ہو۔ ۱۵۔ وہ بلند درجوں والا، عرش کا مالک ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی بھیجتا ہے، تاکہ وہ ملاقات کے دن سے ڈرائے۔ ۱۶۔ جس دن کہ وہ ظاہر ہوں گے۔ اللہ سے ان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ آج بادشاہی کس کی ہے۔ اللہ واحد قہار کی۔ ۱۷۔ آج ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ ملے گا۔ آج کوئی ظلم نہ ہوگا۔ بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

آیت نمبر 13 میں تین باتیں کہی گئی ہیں — نشانیوں (آیات) کا ظاہر ہونا۔ اِن نشانیوں سے رزقِ خداوندی کا ملنا۔ یہ رزق صرف اُن افراد کو ملتا ہے جن کے اندر انابت کی صفت پائی جائے۔ آیات سے مراد وہ نشانیاں (signs) ہیں جو تخلیق میں ظاہر ہوئی ہیں۔ رزق سے مراد وہ ربانی اسباق (divine lessons) ہیں جو اِن نشانیوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ انابت کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ یہ ربانی سبق کن خوش قسمت افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی وہ انسان جو حق کا متلاشی بنے، تاکہ وہ خدائی نشانیوں (divine signs) سے مسلسل اپنے لیے ایمانی رزق حاصل کرتا رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں بے شمار نشانیاں ہیں جو تمثیل کی زبان میں حقیقت کا درس دے رہی ہیں۔ انھیں میں سے ایک نشانی بارش کا نظام ہے۔ یہ مادّی واقعہ وحی کے معنوی معاملہ کو ممثل (represent) کر رہا ہے۔ جس طرح بارش زرخیز زمین کے لیے مفید ہے اور بنجر زمین کے لیے غیر مفید، اسی طرح وحی بھی خدا کی معنوی بارش ہے۔ جن لوگوں نے اپنے سینے کھلے رکھے ہوں ان کے اندر یہ بارش داخل ہو کر ان کے وجود کو سرسبز و شاداب کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس، جن لوگوں کے دل غیر خدائی بڑائیوں سے بھرے ہوئے ہوں وہ گویا بنجر زمین ہیں۔ وہ وحی کے فائدوں سے محروم رہیں گے۔

اللہ اپنے بندوں سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ جس بندہ کو اہل پاتا ہے اس کو اپنے پیغام کی پیغام رسانی کے لیے چن لیتا ہے۔ اس پیغام کا خاص نشانہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو آنے والے دن سے آگاہ کیا جائے جب کہ وہ بادشاہ کائنات کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے جس سے کسی کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں۔ اور نہ کوئی ہے جو اس کے فیصلہ پر اثر انداز ہو سکے۔

وَ اَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡاٰزِفَةِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَى
الۡحَنَاجِرِ كٰظِمِيۡنَ ۬ؕ مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ حَمِيۡمٍ وَّ
لَا شَفِيۡعٍ يُّطَاعُ ؕ ﴿۱۸﴾ يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَ
مَا تُخۡفِى الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾ وَ اللّٰهُ يَقۡضِىۡ
بِالۡحَقِّ ؕ وَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا
يَقۡضُوۡنَ بِشَىۡءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيۡعُ
الۡبَصِيۡرُ ﴿۲۰﴾ ع

۱۸۔ اور ان کو قریب آنے والی مصیبت کے دن سے ڈراؤ جب کہ دل حلق تک آپہنچیں گے، وہ غم سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات مانی جائے۔ ۱۹۔ وہ نگاہوں کی خیانت کو جانتا ہے اور ان باتوں کو بھی جن کو سینے چھپائے ہوئے ہیں۔ ۲۰۔ اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ اور جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بے شک اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو ہر طرح کے مواقع حاصل ہیں۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ اس سے آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ اپنی موجودہ عارضی حالت کو مستقل حالت سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ یہ مواقع جو انسان کو ملے ہیں وہ بطور امتحان ہیں نہ کہ بطور استحقاق۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی موجودہ تمام مواقع اس سے چھن جائیں گے۔ اس وقت انسان کو معلوم ہوگا کہ اس کے پاس عجز کے سوا اور کچھ نہیں جس کے سہارے وہ کھڑا ہو سکے۔

آدمی چاہتا ہے کہ بے قید زندگی گزارے۔ اسی مزاج کی وجہ سے آدمی غیر خدا کو بطور خود خدائی میں شریک بناتا ہے تاکہ ان کے نام پر وہ اپنی بے راہ روی کو جائز ثابت کر سکے۔ مگر قیامت میں جب حقیقت بے پردہ ہو کر سامنے آئے گی تو آدمی جان لے گا کہ یہاں خدا کے سوا کوئی نہ تھا جس کو کسی قسم کا اختیار حاصل ہو۔

اَوَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ
كَانُوۡا هُمۡ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِى
الۡاَرۡضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ ؕ وَ مَا
كَانَ لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ

۲۱۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ ان سے بہت زیادہ تھے قوت میں اور ان آثار کے اعتبار سے بھی جو انھوں نے زمین میں چھوڑے۔ پھر اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑ لیا اور کوئی ان کو اللہ سے بچانے والا نہ

كَانَتْ تَّأْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

تھا۔ ۲۲۔ یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے انکار کیا۔ تو اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ طاقت ور ہے سخت سزا دینے والا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں کثرت سے ایسے واقعات ہیں کہ ایک قوم ابھری اور پھر مٹ گئی۔ ایک قوم جس نے زمین پر شاندار تمدن کھڑا کیا، آج اس کا تمدن کھنڈر کی صورت میں زمین کے نیچے دبا ہوا پڑا ہے۔ ایک قوم جس کو کسی وقت ایک زندہ واقعہ کی حیثیت حاصل تھی، آج وہ صرف ایک تاریخی واقعہ کے طور پر قابل ذکر سمجھی جاتی ہے۔

اس قسم کے واقعات لوگوں کے لیے معلوم واقعات ہیں مگر لوگوں نے ان واقعات کو ارضی حوادث یا سیاسی انقلاب کے خانہ میں ڈال رکھا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب خدائی فیصلے تھے جو سچائی کے انکار کے نتیجے میں ان قوموں پر نازل ہوئے۔ اگر ہم کو وہ نگاہ حاصل ہو جس سے ہم معنوی حقیقتوں کو دیکھ سکیں تو ہم کو نظر آئے گا کہ ہر واقعہ خدا کے فرشتوں کے ذریعہ انجام پا رہا تھا، اگرچہ بظاہر دیکھنے والوں کو وہ دنیوی اسباب کے تحت ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْۤا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَ مَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾

۲۳۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ اور کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ۔ ۲۴۔ فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا، تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک جادوگر ہے، جھوٹا ہے۔ ۲۵۔ پھر جب وہ ہماری طرف سے حق لے کر ان کے پاس پہنچا، انھوں نے کہا کہ ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو جو اس کے ساتھ ایمان لائیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو۔ اور ان منکروں کی تدبیر محض بے اثر رہی۔

پیغمبروں کو عام دلائل کے ساتھ مزید ایسی معجزاتی تائید حاصل رہتی ہے جو ان کے فرستادۂ خدا ہونے کا انتہائی واضح ثبوت ہوتی ہے۔ مگر حق کو ماننا ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے جو بلاشبہ کسی انسان کے لیے مشکل ترین قربانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی کھلے کھلے دلائل کے باوجود فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ کی نبوت کا اقرار نہیں کیا۔

اس کے بجائے انھوں نے ایک طرف عوام کو یہ تاثر دینا شروع کیا کہ موسیٰ کا دعویٰ بے حقیقت ہے اور ان کے معجزے محض جادو کا کرشمہ ہیں۔ دوسری طرف انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کی تعداد کو گھٹانے

کے لیے اپنی سابقہ پالیسی کو مزید شدت کے ساتھ جاری کردیا جائے۔ تاکہ موسیٰ اپنی قوم (بنی اسرائیل) کے اندر اپنے لیے مضبوط بنیاد نہ پاسکیں۔ مگر انھیں معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی یہ تدبیر موسیٰ کے مقابلہ میں نہیں بلکہ خدا کے مقابلہ میں کررہے ہیں اور خدا کے مقابلہ میں کسی کی کوئی تدبیر کبھی کارگر نہیں ہوتی۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿٢٦﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٢٧﴾ ع

۲۶۔ اور فرعون نے کہا، مجھ کو چھوڑو، میں موسیٰ کو قتل کرڈالوں اور وہ اپنے رب کو پکارے، مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمھارا دین بدل ڈالے یا ملک میں فساد پھیلادے۔ ۲۷۔ اور موسیٰ نے کہا کہ میں نے اپنے اور تمھارے رب کی پناہ لی ہر اس متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔

''تمھارا دین بدل ڈالے'' کا مطلب ہے تمھارا مذہب بدل ڈالے۔ یعنی تم جس مذہبی طریقہ پر ہو اور جو تمھارے اکابر سے چلا آرہا ہے، وہ ختم ہوجائے اور لوگوں کے درمیان نیا مذہب رائج ہوجائے۔

فساد سے مراد بدامنی ہے۔ یعنی موسیٰ کو اپنے ہم قوموں میں ساتھ دینے والے مل جائیں گے۔ اور ان کو لے کر وہ ملک میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم شروع ہی میں انھیں قتل کردیں۔

حق کو ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ آدمی کی متکبرانہ نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اپنے کو اونچا رکھنے کی خاطر حق کو نیچا کردینا چاہتا ہے۔ مگر حق کا مددگار اللہ رب العالمین ہے۔ ابتداءً خواہ اس کے مخالفین بظاہر اس کو دبالیں مگر اللہ کی مدد اس بات کی ضمانت ہے کہ آخری کامیابی بہرحال حق کو حاصل ہوگی۔

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿٢٨﴾ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ

۲۸۔ اور آلِ فرعون میں سے ایک مومن شخص، جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، وہ بولا کیا تم لوگ ایک شخص کو صرف اس بات پر قتل کردوگے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، حالاں کہ وہ تمھارے رب کی طرف سے کھلی ہوئی دلیلیں بھی لے کر آیا ہے۔ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا۔ اور اگر وہ سچا ہے تو اس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کر رہے گا جس کا وعدہ وہ تم سے کرتا ہے۔ بے شک اللہ ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزرنے والا

الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَ مَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

ہو، جھوٹا ہو۔ ۲۹۔اے میری قوم، آج تمھاری سلطنت ہے کہ تم زمین میں غالب ہو۔ پھر اللہ کے عذاب کے مقابل ہماری کون مدد کرے گا، اگر وہ ہم پر آ گیا۔فرعون نے کہا، میں تم کو وہی رائے دیتا ہوں جس کو میں سمجھ رہا ہوں، اور میں تمھاری رہنمائی ٹھیک بھلائی کے راستہ کی طرف کر رہا ہوں۔

یہاں جس رجل مومن کا ذکر ہے وہ فرعون کے شاہی خاندان کا ایک فرد تھا اور غالباً وہ دربار کے اعلیٰ عہدیداروں میں سے تھا۔ یہ بزرگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ توحید سے متاثر ہوئے۔ تاہم وہ ایمان چھپائے ہوئے تھے۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ فرعون حضرت موسیٰ کو قتل کرنے کا ارادہ کر رہا ہے تو وہ کھل کر حضرت موسیٰ کی حمایت پر آ گئے۔ انھوں نے نہایت مؤثر اور نہایت حکیمانہ انداز میں حضرت موسیٰ کی مدافعت فرمائی۔

اس واقعہ میں ایک نصیحت یہ ہے کہ تبلیغ ایک ایسی طاقت ہے کہ خود دشمن کی صفوں میں اپنے ہمدرد اور ساتھی پیدا کر لیتی ہے، خواہ وہ دشمن خاندان فرعون جیسا ظالم اور متکبر کیوں نہ ہو۔

وَ قَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

۳۰۔اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا کہ اے میری قوم، میں ڈرتا ہوں کہ تم پر اور گروہوں جیسا دن آ جائے۔ ۳۱۔ جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والوں پر آیا۔ اور اللہ اپنے بندوں پر کوئی ظلم کرنا نہیں چاہتا۔ ۳۲۔ اور اے میری قوم، میں ڈرتا ہوں کہ تم پر چیخ پکار کا دن آ جائے۔ ۳۳۔جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے۔ اور تم کو خدا سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

فرعون نے حضرت موسیٰ کو دنیا کی سزا سے ڈرایا تھا، اس کے جواب میں رَجُل مومن نے فرعون کو آخرت کی سزا سے ڈرایا۔ حق کے داعی کا طریقہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ لوگ دنیا کی فکر کرتے ہیں، داعی آخرت کے لیے فکر مند ہوتا ہے۔ لوگ دنیا کی اصطلاحوں میں بولتے ہیں، داعی آخرت کی اصطلاحوں میں کلام کرتا ہے۔ لوگ دنیا کے مسائل کو سب سے زیادہ قابل ذکر سمجھتے ہیں، داعی کے نزدیک سب سے زیادہ قابل ذکر مسئلہ وہ ہوتا ہے جس کا تعلق آخرت سے ہو۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۚ ۝۳۴ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝۳۵

۳۴۔ اور اس سے پہلے یوسف تمھارے پاس کھلے ہوئے دلائل کے ساتھ آئے تو تم ان کی لائی ہوئی باتوں کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے، یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو تم نے کہا کہ اللہ ان کے بعد ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شک کرنے والے ہوتے ہیں۔ ۳۵۔ جو اللہ کی آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو۔ اللہ اور ایمان والوں کے نزدیک یہ سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ مہر کر دیتا ہے ہر مغرور، سرکش کے دل پر۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں مصر کے لوگوں کی اکثریت آپ کی نبوت کی قائل نہیں ہوئی۔ مگر آپ کی وفات کے بعد جب ملکی سلطنت کا نظام بگڑنے لگا تو مصریوں کو آپ کی عظمت کا احساس ہوا۔ اب وہ کہنے لگے کہ یوسف کا وجود مصر کے لیے بہت بابرکت تھا۔ ایسا رسول اب کہاں آئے گا۔ حضرت یوسف اگرچہ خدا کے پیغمبر تھے مگر اسی کے ساتھ وہ ایک انسان بھی تھے۔ اس بنا پر لوگوں کے لیے یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ — ''کیا ضروری ہے کہ یوسف کے کمالات پیغمبری کی بنا پر ہوں، یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ ایک ذہین انسان ہوں اور اس بنا پر انھوں نے کمالات ظاہر کیے ہوں''۔ اسی طرح کی باتیں تھیں جن کو لے کر مصر کے لوگ آپ کے بارے میں شک میں مبتلا ہوگئے۔

حق خواہ کتنا ہی واضح ہو، موجودہ امتحان کی دنیا میں ہمیشہ اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ آدمی کوئی شبہ کا پہلو نکال کر اس کا منکر بن جائے۔ اب جو لوگ اپنے اندر سرکشی اور گھمنڈ کا مزاج لیے ہوئے ہوں۔ جو یہ سمجھتے ہوں کہ حق کو مان کر وہ اپنی بڑائی کھودیں گے۔ وہ عین اپنے مزاج کے تحت انھیں شبہات میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ان شبہات کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ وہی ان کے دل ودماغ پر چھا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے معاملہ میں سیدھے انداز سے سوچ نہیں پاتے۔ وہ ہمیشہ اس کے منکر بنے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مرجاتے ہیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۙ ۝۳۶ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ

۳۶۔ اور فرعون نے کہا کہ اے ہامان، میرے لیے ایک اونچی عمارت بنا، تاکہ میں راستوں پر پہنچوں۔ ۳۷۔ آسمانوں کے راستوں تک، پس

فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ
كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ
صُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَ مَا كَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ
ع ۹ تَبَابٍ ع ﴿۳۷﴾

موسیٰ کے معبود کو جھانک کر دیکھوں، اور میں تو اس کو جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی خوشنما بنا دی گئی اور وہ سیدھے راستے سے روک دیا گیا۔ اور فرعون کی تدبیر غارت ہو کر رہی۔

فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے جو بات کہی وہ کوئی سنجیدہ بات نہیں تھی بلکہ محض ایک وقتی تدبیر (کید) کے طور پر تھی۔ اس نے دیکھا کہ رجل مومن کی معقول اور مدلّل تقریر سے دربار کے لوگ متاثر ہو رہے ہیں، اس لیے اس نے چاہا کہ ایک شوشہ کی بات نکالے تاکہ حضرت موسیٰ کی دعوت سنجیدہ بحث کا موضوع نہ بنے بلکہ مذاق کا موضوع بن کر رہ جائے۔

''بدعملی کا خوشنما بننا'' یہ ہے کہ آدمی کچھ خوش نما الفاظ بول کر حق کو رد کر دے۔ یہی آدمی کی گمراہی کی اصل جڑ ہے۔ یعنی حقیقی دلائل کے مقابلہ میں شوشہ کی بات کو اہمیت دینا، کھلی بے راہ روی کو جھوٹی توجیہات میں چھپانے کی کوشش کرنا وغیرہ۔ ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ جو حق محکم دلیل کے اوپر کھڑا ہوا ہو اس کو بے بنیاد شوشے نکال کر مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔

وَ قَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ
سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ
الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ٘ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ
دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا
یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا
مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ
یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ
حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَ یٰقَوْمِ مَا لِیْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى
النصف النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ ؕ
تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا

۳۸۔ اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا کہ اے میری قوم، تم میری پیروی کرو، میں تم کو صحیح راستہ بتا رہا ہوں۔ ۳۹۔ اے میری قوم، یہ دنیا کی زندگی محض چند روزہ ہے اور اصل ٹھہرنے کا مقام آخرت ہے۔ ۴۰۔ جو شخص برائی کرے گا تو وہ اس کے برابر بدلہ پائے گا۔ اور جو شخص نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، وہاں وہ بے حساب رزق پائیں گے۔ ۴۱۔ اور اے میری قوم، کیا بات ہے کہ میں تو تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھ کو آگ کی طرف بلا رہے ہو۔ ۴۲۔ تم مجھ کو بلا رہے ہو کہ میں خدا کے ساتھ کفر کروں اور ایسی چیز کو اس کا شریک بناؤں جس کا

لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ وَّاَنَا اَدۡعُوۡكُمۡ اِلَى الۡعَزِيۡزِ الۡغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدۡعُوۡنَنِىۡۤ اِلَيۡهِ لَيۡسَ لَهٗ دَعۡوَةٌ فِى الدُّنۡيَا وَلَا فِى الۡاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ هُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذۡكُرُوۡنَ مَاۤ اَقُوۡلُ لَكُمۡ‌ؕ وَاُفَوِّضُ اَمۡرِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۴۴﴾

مجھے کوئی علم نہیں۔ اور میں تم کو زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلا رہا ہوں۔ ۴۳۔ یقینی بات ہے کہ تم جس چیز کی طرف مجھ کو بلاتے ہو اس کی کوئی آواز نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔ اور بے شک ہم سب کی واپسی اللہ ہی کی طرف ہے اور حد سے گزرنے والے ہی آگ میں جانے والے ہیں۔ ۴۴۔ پس تم آگے چل کر میری بات کو یاد کرو گے۔ اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک اللہ تمام بندوں کا نگراں ہے۔

دربارِ فرعون کے مومن کی یہ تقریر نہایت واضح ہے۔ نیز وہ ایک نمونہ کی تقریر ہے جو یہ بتاتی ہے کہ حق کے داعی کا اندازِ خطاب کیا ہونا چاہیے اور یہ کہ دعوت حق کا اصل نکتہ کیا ہے۔

''میں تم کو خداوند عالم کی طرف بلاتا ہوں۔ اور تم جس کی طرف مجھے بلا رہے ہو اس کو پکارنے کا کوئی فائدہ نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں''— یہ فقرہ رجل مومن کی پوری تقریر کا خلاصہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرعون کے دربار میں جو چیز زیر بحث تھی وہ کیا تھی۔ وہ یہ تھی کہ خدا کو پکارا جائے یا انسان کے بنائے ہوئے بتوں کو پکارا جائے۔ رجل مومن نے کہا کہ خدا تو ایک زندہ اور غالب حقیقت ہے، اس کو پکارنا ایک حقیقی معبود کو پکارنا ہے۔ مگر تمھارے اصنام صرف تمھارے وہم کی ایجاد ہیں۔ وہ نہ دنیا میں تمھیں کوئی فائدہ دے سکتے اور نہ آخرت میں۔ جب ان کا کوئی حقیقی وجود ہی نہیں تو ان سے کوئی حقیقی فائدہ کیسے مل سکتا ہے (اَلۡوَثَنَ لَا يَنۡفَعُ وَلَا يَضُرُّ) تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 145۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوۡا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ‌ۚ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا‌ ۚ وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ ۛ اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ ﴿۴۶﴾

۴۵۔ پھر اللہ نے اس کو ان کی بری تدبیروں سے بچا لیا۔ اور فرعون والوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ ۴۶۔ آگ، جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔ اور جس دن قیامت قائم ہوگی، فرعون والوں کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔

فرعون کے دربار کا رجل مومن پیغمبر نہیں تھا۔ مگر تنہا ہونے کے باوجود اللہ نے اس کو فرعون کے ظالمانہ منصوبوں سے بچا لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر انبیاء کو بھی حمایتِ حق کی وہ نصرت ملتی ہے جس کا وعدہ انبیاء سے کیا گیا ہے۔

انسانوں کے اخروی انجام کا باقاعدہ فیصلہ اگرچہ قیامت میں ہوگا، مگر موت کے بعد جب آدمی اگلی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو فوراً ہی اس پر کھل جاتا ہے کہ وہ پچھلی دنیا میں کیا کرکے یہاں آیا ہے اور اب اس کے لیے کون سا انجام مقدر ہے۔ اس طرح شعور کی سطح پر وہ موت کے بعد ہی اپنے انجام سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اور جسمانی سطح پر وہ قیامت میں خدا کی عدالت قائم ہونے کے بعد اس سے دوچار ہوگا۔

وَ اِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا
لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ
اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿٤٧﴾ قَالَ
الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ
قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿٤٨﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي
النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ
عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ
تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ
قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ
ضَلٰلٍ ﴿٥٠﴾ ع ۵ ۱۴ ۱۰

۴۷۔ اور جب وہ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو کمزور لوگ بڑا بننے والوں سے کہیں گے کہ ہم تمھارے تابع تھے، تو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی حصہ ہٹا سکتے ہو۔ ۴۸۔ بڑے لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی اس میں ہیں۔ اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ ۴۹۔ اور جو لوگ آگ میں ہوں گے وہ جہنم کے نگہبانوں سے کہیں گے کہ تم اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمارے عذاب میں سے ایک دن کی تخفیف کر دے۔ ۵۰۔ وہ کہیں گے، کیا تمھارے پاس تمھارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آئے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں، نگہبان کہیں گے پھر تم ہی درخواست کرو۔ اور منکروں کی پکار اکارت ہی جانے والی ہے۔

اِن آیتوں میں جہنم کا ایک منظر دکھایا گیا ہے۔ دنیا میں جو لوگ بڑے بنے ہوئے تھے وہ وہاں اپنی ساری بڑائی بھول جائیں گے۔ وہ عوام جو یہاں اپنے بڑوں پر فخر کرتے تھے وہ وہاں اپنے بڑوں سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔ دنیا میں جو لوگ حق کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے وہ وہاں عاجزانہ طور پر حق کے آگے جھک جائیں گے۔ مگر آخرت کا جھکنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿٥١﴾ يَوْمَ لَا
يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ

۵۱۔ بے شک ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں، اور اس دن بھی جب کہ گواہ کھڑے ہوں گے، ۵۲۔ جس دن ظالموں کو ان کی معذرت کچھ فائدہ نہ دے گی اور

لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿٥٢﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى
وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿٥٣﴾ هُدًى وَّ
ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿٥٤﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ
اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٥٥﴾

ان کے لیے لعنت ہوگی اوران کے لیے برا ٹھکانا ہوگا۔ ۵۳۔ اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا کی اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا۔ ۵۴۔ رہنمائی اور نصیحت عقل والوں کے لیے۔ ۵۵۔ پس تم صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے اور اپنے قصور کی معافی چاہو۔ اور صبح وشام اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ۔

پیغمبر اور پیغمبر کے پیروؤں کے لیے خدا کی مدد کا یقینی وعدہ ہے۔ مگر اس مدد کا استحقاق ہمیشہ صبر کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ صبر کی یہ اہمیت اس لیے ہے تاکہ اہل حق مکمل طور پر اہل حق ٹھہریں اور ظالم مکمل طور پر ظالم ثابت ہوجائیں۔ اس تفریقی مرحلہ کو لانے کے لیے اہلِ حق کو یک طرفہ طور پر صبر کرنا پڑتا ہے۔

اہل حق کا یہ صبر انھیں دنیا میں خدا کی مدد کا مستحق بناتا ہے۔ اور اسی صبر کے ذریعہ وہ اس قابل ثابت ہوتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن ظالموں کے مقابلہ میں خدا کے گواہ بن کر کھڑے ہوں۔

خدا کی طرف سے کتاب آتی ہے وہ انسانوں کی ہدایت اور نصیحت ہی کے لیے آتی ہے۔ مگر یہ نصیحت صرف ان لوگوں کو فائدہ دیتی ہے جو عقل والے ہوں۔ یعنی وہ لوگ جو مصلحتوں میں بندھے ہوئے نہ ہوں۔ جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر اس پر غور کرسکیں، جو باتوں کو دلیل کے اعتبار سے جانچتے ہوں، نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔ یہی خدا کی ہدایت کے ساتھ عقل والا معاملہ کرنا ہے۔ جو لوگ خدا کی ہدایت کے ساتھ بے عقلی کا معاملہ کریں وہ ظالم ہیں اور جو لوگ خدا کی ہدایت کے ساتھ عقل والا معاملہ کریں وہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہوئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ
سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ
مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿٥٦﴾

۵۶۔ جو لوگ کسی سند کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں، ان کے دلوں میں صرف بڑائی ہے کہ وہ اس تک کبھی پہنچنے والے نہیں، پس تم اللہ کی پناہ مانگو، بے شک وہ سُننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔

حق اتنا واضح اور اتنا مدلّل ہے کہ اس کو سمجھنا کسی کے لیے بھی مشکل نہیں۔ مگر جب بھی حق ظاہر ہوتا ہے تو وہ کسی ''انسان'' کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے حق کا اعتراف عملاً حامل حق کے اعتراف کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ حق کو ماننے پر راضی نہیں ہوتے جو اپنے اندر بڑائی کی نفسیات لیے ہوئے ہوں۔

ایسے لوگوں کو ڈر ہوتا ہے کہ حق کا اعتراف کرتے ہی وہ حاملِ حق کے مقابلہ میں اپنی برتری کھودیں گے۔ اپنی اسی نفسیات کی وجہ سے وہ اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ مگر خدا نے اپنی دنیا کے لیے مقدر کر دیا ہے کہ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہ ہوں۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٥٨﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٩﴾

۵۷۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی نسبت زیادہ بڑا کام ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۵۸۔ اور اندھا اور آنکھوں والا یکساں نہیں ہو سکتا، اور نہ ایمان دار اور نیکوکار اور وہ جو برائی کرنے والے ہیں۔ تم لوگ بہت کم سوچتے ہو۔ ۵۹۔ بے شک قیامت آ کر رہے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔

کائنات کی عظمت اپنے خالق کی عظمت کا تعارف ہے۔ یہ عظمت اتنی بے پناہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں انسان کو دوبارہ پیدا کرنا نسبتاً ایک بہت زیادہ آسان کام ہے۔ اس طرح کائنات کی موجودہ تخلیق انسان کے تخلیقِ ثانی کے امکان کو ثابت کر رہی ہے۔

اس کے بعد انسانی سماج کو دیکھا جائے تو آخرت کی دنیا کا آنا ایک اخلاقی ضرورت معلوم ہونے لگتا ہے۔ سماج میں ایسے لوگ بھی ہیں جو حقیقت کو دیکھنے والی بصیرت کا ثبوت دیتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو حقیقت کے مقابلہ میں بالکل اندھے بنے ہوں۔ اسی طرح سماج میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر حال میں انصاف پر قائم رہتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بھی جو انصاف سے ہٹ جاتے ہیں اور معاملات میں ظالمانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انسان کا اخلاقی احساس کہتا ہے کہ ان دونوں قسم کے انسانوں کا انجام یکساں نہیں ہونا چاہیے۔

ان باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آخرت کا ظہور عقلی طور پر ممکن بھی ہے اور اخلاقی طور پر ضروری بھی۔

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿٦٠﴾ ع ۶ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ

۶۰۔ اور تمھارے رب نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو پکارو، میں تمھاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ ۶۱۔ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی

مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۶۲﴾ کَذٰلِکَ یُؤۡفَکُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۶۳﴾

تا کہ تم اس میں آرام کرو، اور دن کو روشن کیا۔ بے شک اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ ۶۲۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے، ہر چیز کا پیدا کرنے والا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کہاں سے بہکائے جاتے ہو۔ ۶۳۔ اسی طرح وہ لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

زمین پر رات اور دن کا باقاعدہ نظام اور اس طرح کے دوسرے حیات بخش واقعات اس سے زیادہ بڑے ہیں کہ کوئی انسان یا تمام مخلوقات مل کر بھی ان کو ظہور میں لاسکیں۔ یہ ایک کھلا ہوا قرینہ ہے جو بتاتا ہے کہ جو خالق ہے وہی اس لائق ہے کہ اس کو معبود بنایا جائے۔ آدمی کو چاہیے کہ اسی کے آگے جھکے اور اسی سے امیدیں قائم کرے۔

مگر آدمی خالقِ کائنات سے عبادت اور دعا کا حقیقی تعلق قائم نہیں کر پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی غیر خالق میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ زندہ یا مردہ بتوں میں اٹکے ہوئے ہوتے ہیں جس کو شرک کہا جاتا ہے۔ اور کچھ لوگ خود اپنی ذات میں اٹکے ہوئے ہوتے ہیں جس کا دوسرا نام کبر ہے۔ خدا بار بار ایسے دلائل ظاہر کرتا ہے جو اس فریب کی تردید کرنے والے ہوں۔ مگر انسان کوئی نہ کوئی جھوٹی توجیہ کر کے انھیں نظر انداز کر دیتا ہے۔

اس قسم کا ہر رویہ خالق کائنات کی ناقدری ہے۔ اور جو لوگ خالق کائنات کی ناقدری کریں وہ جہنم کے سوا کہیں اور جگہ نہیں پاسکتے۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ وَ رَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚۖ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۴﴾ ہُوَ الۡحَیُّ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ فَادۡعُوۡہُ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۴۔ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور آسمان کو چھت بنایا اور تمھارا نقشہ بنایا پس عمدہ نقشہ بنایا۔ اور اس نے تم کو عمدہ چیزوں کا رزق دیا۔ یہ اللہ ہے تمھارا رب، پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔ ۶۵۔ وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تم اسی کو پکارو، دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ ساری تعریف اللہ کے لیے جو رب ہے سارے جہان کا۔

زمین پر ان گنت اسباب جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا ہے کہ انسان جیسی مخلوق اس کے اوپر تمدن کی تعمیر کر سکے۔ اسی طرح زمین کے اوپر جو فضا ہے اس میں بھی بے شمار موافق انتظامات ہیں جن میں اگر معمولی فرق بھی پیدا ہو جائے تو انسانی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ پھر انسان کی بناوٹ اتنے اعلیٰ انداز میں ہوئی ہے کہ وہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے اس دنیا کی سب سے برتر مخلوق بن گیا ہے — جس خالق نے یہ سب کیا ہے اس کے سوا کون اس قابل ہو سکتا ہے کہ انسان اس کا پرستار بنے۔

خدا کے لیے دین کو خالص کر کے اسے پکارنا یہ ہے کہ دینی و مذہبی نوعیت کا تعلق صرف ایک اللہ سے ہو۔ اللہ کے سوا کسی سے دینی و مذہبی قسم کا لگاؤ باقی نہ رہے۔

قُلۡ اِنِّیۡ نُهِیۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الۡبَیِّنٰتُ مِنۡ رَّبِّیۡ ۫ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ثُمَّ لِتَكُوۡنُوۡا شُیُوۡخًا ۚ وَ مِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّتَوَفّٰی مِنۡ قَبۡلُ وَ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ ﴿۶۸﴾ ع ۸ ۱۲

۶۶۔ کہو، مجھے اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، جب کہ میرے پاس کھلی ہوئی دلیلیں آچکیں۔ اور مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے آپ کو رب العالمین کے حوالے کر دوں۔ ۶۷۔ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تم کو بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر وہ تم کو بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچو، پھر تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی مر جاتا ہے۔ اور تاکہ تم مقرر وقت تک پہنچ جاؤ اور تاکہ تم سوچو۔ ۶۸۔ وہی ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے۔ پس جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس وہ اس کو کہتا ہے کہ ہو جا، بس وہ ہو جاتا ہے۔

ان آیات میں فطرت کے کچھ واقعات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے ''یہ اس لیے ہے تاکہ تم غور کرو'' — گویا فطرت کے یہ مادی واقعات اپنے اندر کچھ معنوی سبق لیے ہوئے ہیں۔ اور انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ غور کر کے اس چھپے ہوئے سبق تک پہنچے۔

فطرت کے جن واقعات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ہیں — بے جان مادہ کا تبدیل ہو کر جان دار چیز بن جانا، انسان کا تدریجی انداز میں نشوونما پانا۔ جوانی تک پہنچ کر پھر آدمی پر بڑھاپا طاری ہونا، زندہ انسان کا دوبارہ مر جانا، کبھی کم عمری میں اور کبھی زیادہ عمر میں، یہ واقعات خالق کی مختلف صفات کا تعارف ہیں۔ اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا وجود میں لانے والا ایک ایسا خدا ہے جو قادر اور حکیم ہے، وہ سب پر غالب اور بالا دست ہے۔

اگر آدمی ان واقعات سے حقیقی سبق لے تو اس کا ذہن پکار اٹھے گا کہ ایک خدا ہی اس کا سزاوار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کو اپنا آخری مطلوب سمجھا جائے۔ عالم کا یہ نقشہ بزبان حال ان تمام معبودوں کی تردید کر رہا ہے جو ایک خدا کو چھوڑ کر بنائے گئے ہوں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿٦٩﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَ بِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٠﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ﴿٧١﴾ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿٧٢﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٣﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿٧٥﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٦﴾

۶۹۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں۔ وہ کہاں سے پھیرے جاتے ہیں۔ ۷۰۔ جنھوں نے کتاب کو جھٹلایا اور اس چیز کو بھی جس کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا، تو عنقریب وہ جانیں گے۔ ۷۱۔ جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور زنجیریں، وہ گھسیٹے جائیں گے۔ ۷۲۔ جلتے ہوئے پانی میں۔ پھر وہ آگ میں جھونک دئے جائیں گے۔ ۷۳۔ پھر ان سے کہا جائے گا، کہاں ہیں وہ جن کو تم شریک کرتے تھے۔ ۷۴۔ اللہ کے سوا۔ وہ کہیں گے — وہ ہم سے کھوئے گئے بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو پکارتے نہ تھے۔ اس طرح اللہ گمراہ کرتا ہے منکروں کو۔ ۷۵۔ یہ اس سبب سے کہ تم زمین میں ناحق خوش ہوتے تھے اور اس سبب سے کہ تم گھمنڈ کرتے تھے۔ ۷۶۔ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ پس کیسا برا ٹھکانا ہے گھمنڈ کرنے والوں کا۔

ناحق پر خوش ہونے والے اور گھمنڈ کرنے والے کون تھے، یہ وقت کے بڑے لوگ تھے۔ ان کو کچھ دنیا کا سامان اور دنیا کی بڑائی مل گئی۔ اس کی وجہ سے وہ ناز اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی مادی کامیابی نے ان کے اندر غلط طور پر یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ پائے ہوئے لوگ ہیں۔ حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف محروم لوگ تھے۔

وقت کے یہ بڑے اولاً حق کے منکر بنتے ہیں۔ پھر ان کی پیروی میں عوام بھی حق کا انکار کرنے لگتے ہیں۔
ان آیات میں اگلی دنیا کا وہ منظر دکھایا گیا ہے جب کہ یہ لوگ اپنی متکبرانہ روش کی سزا پانے کے لیے جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ ان کی جھوٹی بڑائی آخر کار انھیں جہاں پہنچائے گی وہ صرف ابدی ذلّت ہے جس سے نکلنے کی کوئی صورت ان کے لیے نہ ہوگی۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ پس صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ پھر جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ ہم تم کو دکھا دیں گے، یا تم کو وفات دیں گے، پس ان کی واپسی ہماری ہی طرف ہے۔

یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ حق کے داعیوں کی مدد کرے گا اور حق کے مخالفین کو مغلوب کرے گا۔ مگر اس وعدہ کا تحقق صبر کے بعد ہوتا ہے۔ داعی کو یک طرفہ طور پر فریق ثانی کی ایذاؤں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی سنت کے مطابق اس کے وعدہ کے ظہور کا وقت آجائے۔
مخالفین حق کی اصل سزا وہ ہے جو انھیں آخرت میں ملے گی۔ تاہم موجودہ دنیا میں انھیں اس کا ابتدائی تجربہ کرایا جاتا ہے، اگرچہ ہمیشہ ایسا کیا جانا ضروری نہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾ ع ۸ ۱۳

۷۸۔ اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے، ان میں سے کچھ کے حالات ہم نے تم کو سنائے ہیں اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو نہیں سنائے۔ اور کسی رسول کا یہ مقدور نہ تھا کہ وہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی لے آئے۔ پھر جب اللہ کا حکم آگیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا۔ اور غلط کار لوگ اس وقت خسارے میں رہ گئے۔

قرآن میں رسولوں کے احوال بطور تاریخ نہیں بیان ہوئے ہیں بلکہ بطور نصیحت بیان ہوئے ہیں۔ اس لیے قرآن میں رسولوں کے احوال محدود طور پر صرف اتنا ہی بتائے گئے ہیں جتنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک نصیحت کے لیے ضروری تھے۔
رسول کا اصل کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کا پیغام اس کے تمام ضروری آداب اور تقاضوں کے ساتھ

لوگوں تک پہنچا دے۔ اس کے بعد جہاں تک معجزہ کا تعلق ہے وہ تمام تر اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنی مصلحت کے تحت کبھی انھیں ظاہر کرتا ہے اور کبھی ظاہر نہیں کرتا۔

معجزے زیادہ تر ان قوموں کو دکھائے گئے ہیں جن کی سرکشی کی بنا پر خدا کا فیصلہ تھا کہ انھیں ہلاک کر دیا جائے۔ اس لیے آخری طور پر اتمام حجت کے لیے انھیں معجزہ بھی دکھایا گیا۔ مگر پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کا معاملہ یہ تھا کہ اس کا بڑا حصہ بالآخر مومن بننے والا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو امکانی طور پر یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ وہ تاریخ کے پہلے گروہ بنیں جس نے محض دلیل کی بنیاد پر حق کا اعتراف کیا اور اپنے آزاد ارادہ سے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس لیے ان لوگوں کے مطالبہ کو نادانی پر محمول کرتے ہوئے انھیں خارق عادت معجزے نہیں دکھائے گئے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿٨١﴾

۷۹۔ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے مویشی بنائے تا کہ تم بعض سے سواری کا کام لو اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ۸۰۔ اور تمھارے لیے ان میں اور بھی فائدے ہیں۔ اور تا کہ تم ان کے ذریعہ سے اپنی حاجت تک پہنچو جو تمھارے دلوں میں ہو اور ان پر اور کشتی پر تم سوار کیے جاتے ہو۔ ۸۱۔ اور وہ تم کو اور بھی نشانیاں دکھاتا ہے تو تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے۔

انسان کو اپنی زندگی اور تمدن کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ مثلاً غذا، سواری، مختلف قسم کی صنعتیں، سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا۔ یہ سب چیزیں موجودہ دنیا میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ خدا نے دنیا کی چیزوں کو اس طرح بنایا ہے وہ ہمیشہ انسان کے تابع رہیں اور انسان ان کو اپنی ضرورتوں کے لیے جس طرح چاہے استعمال کر سکے۔

یہ تمام چیزیں گویا خدا کی نشانیاں ہیں۔ وہ غیبی حقیقتوں کا مادی زبان میں اعلان کر رہی ہیں۔ یہ اعلان اگرچہ بالواسطہ زبان میں ہے مگر انسان کا بھلا اسی میں ہے کہ وہ بالواسطہ زبان میں کہی ہوئی بات کو سمجھے۔ کیوں کہ خدا جب براہِ راست زبان میں کلام کرے تو وہ مہلتِ عمل کے ختم ہونے کا اعلان ہوتا ہے، نہ کہ عمل شروع کرنے کا۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی

۸۲۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ وہ ان سے زیادہ تھے، اور قوت میں اور نشانیوں میں، جو کہ وہ زمین پر چھوڑ گئے،

الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ
وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٨٣﴾
فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ
وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُ
يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ
اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ
ع ٩ ١٤ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾

وہ ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ پس ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی۔ ۸۳۔ پس جب ان کے پیغمبران کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تو وہ اپنے اس علم پر نازاں رہے جو ان کے پاس تھا، اور ان پر وہ عذاب آپڑا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ ۸۴۔ پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا، وہ کہنے لگے کہ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم انکار کرتے ہیں جن کو ہم اس کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ ۸۵۔ پس ان کا ایمان ان کے کام نہ آیا جب کہ انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہی اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں جاری رہی ہے، اور اس وقت انکار کرنے والے خسارے میں رہ گئے۔

علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علم جس سے دنیا کی ترقیاں حاصل ہوتی ہیں۔ دوسرا علم وہ ہے جو آخرت کی کامیابی کا راستہ بتاتا ہے۔ جن لوگوں کے پاس دنیا کا علم ہو ان کے علم کا شاندار نتیجہ فوری طور پر دنیا کی ترقیوں کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ اس کے برعکس، جس شخص کے پاس آخرت کا علم ہو اس کے علم کے نتائج فوری طور پر محسوس شکل میں سامنے نہیں آتے۔

یہ فرق ان لوگوں کے اندر برتری کی نفسیات پیدا کر دیتا ہے جو دنیا کا علم رکھتے ہوں۔ چنانچہ ایسی قوموں کے پاس جب ان کے پیغمبر آئے تو انھوں نے اپنے کو زیادہ سمجھا اور پیغمبر کو کم خیال کیا۔ حتی کہ وہ ان کا مذاق اڑانے لگے۔ مگر اللہ نے ان قوموں کو ان کی تمام قوتوں اور شاندار ترقیوں کے باوجود ہلاک کر دیا۔ اب ان کے تاریخی آثار یا تو کھنڈر کی شکل میں ہیں یا زمین کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے ایک تاریخی مثال قائم کر دی کہ — مستقل کامیابی کا راز علم آخرت میں ہے، نہ کہ علم دنیا میں۔

ان قوموں نے ابتداءً اپنے پیغمبروں کا انکار کیا۔ پیغمبروں کے پاس دلیل کی قوت تھی۔ مگر یہ قومیں دلیل کی قوت کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ آخر کار خدا نے عذاب کی زبان میں انھیں امر واقعی سے آگاہ کیا۔ اس وقت وہ لوگ جھک کر اقرار کرنے لگے۔ مگر یہ اقرار ان کے کام نہ آیا۔ کیوں کہ اقرار وہ مطلوب ہے جو دلیل کی بنیاد پر ہو۔ اس اقرار کی کوئی قیمت نہیں جو عذاب کو دیکھ کر کیا جائے۔

۴۱-سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
حٰمٓ ۚ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۚ ﴿۲﴾
كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ۙ ﴿۳﴾ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ
اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾ وَقَالُوْا
قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ
اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ
فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ حٰمٓ۔ ۲۔ یہ بڑے مہربان، نہایت رحم والے کی طرف سے اُتارا ہوا کلام ہے۔ ۳۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ ۴۔ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ پس ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے اعراض کیا۔ پس وہ نہیں سن رہے ہیں۔ ۵۔ اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس سے پردے میں ہیں جن کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے۔ اور ہمارے اور تمھارے درمیان میں ایک حجاب ہے۔ پس تم اپنا کام کرو، ہم بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔

پیغمبر کی دعوت بے آمیز دین کی دعوت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس لوگوں کا حال یہ ہے کہ اکثر وہ اپنے اکابر کے دین پر ہوتے ہیں۔ ان کے اوپر ان کی قومی روایات اور زمانی افکار کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر پیغمبر کا بے آمیز دین ان کے فکری ڈھانچہ میں نہیں بیٹھتا۔ وہ ان کو اجنبی دکھائی دیتا ہے۔ یہ فرق پیغمبر اور لوگوں کے درمیان ایک ذہنی دیوار کی طرح حائل ہوجاتا ہے۔ لوگ پیغمبر کی دعوت کو اس کے اصل روپ میں دیکھ نہیں پاتے۔ اس لیے وہ اس کو ماننے پر بھی تیار نہیں ہوتے۔

پیغمبر کی دعوت بجائے خود انتہائی مدلّل ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی بات ہے۔ مگر مذکورہ ذہنی دیوار اتنی طاقت ور ثابت ہوتی ہے کہ انسان اس سے نکل کر پیغمبر کی دعوت کو دیکھ نہیں پاتا۔ خدا انسان کے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھولتا ہے مگر انسان اس کے اندر داخل نہیں ہوتا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ

۶۔ کہو، میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ میرے پاس یہ وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود بس ایک ہی معبود ہے، پس تم سیدھے رہو اسی کی طرف اور اس سے

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝٦ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝٧ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ
مَمْنُوْنٍ ۝٨ ع ٨ ١٥

معافی چاہو۔ اور خرابی ہے مشرکوں کے لیے۔ ۷۔ جو زکوۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔ ۸۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا ان کے لیے ایسا اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں۔

حق کی دعوت جب اٹھتی ہے "بشر" کی سطح پر اٹھتی ہے۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بشر خدا کی زبان میں کلام کرے۔ اس لیے وہ اس کے منکر بن جاتے ہیں مگر خدا کی سنّت یہی ہے کہ وہ بشر کی زبان سے اپنی بات کا اعلان کرائے۔ جو شخص داعی کی بشریت سے گزر کر اس کے الٰہی کلام کو نہ پہچان سکے وہ موجودہ امتحان کی دنیا میں ہدایت سے محروم رہے گا۔

آخرت کو ماننا وہی معتبر ہے جس کے ساتھ کامل توحید اور انفاق فی سبیل اللہ پایا جائے۔ جو شخص اللہ کو حقیقی طور پر پالے وہ کسی اور عظمت میں اٹکا ہوا نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جو شخص اللہ کو حقیقی طور پر پالے وہ اپنے مال کو خدا سے بچا کر نہیں رکھ سکتا۔

فَاسْتَقِيْمُوْا اِلَيْهِ کا مطلب ہے أَخْلِصُوا لَهُ الْعِبَادَةَ (تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 164)۔ یعنی، تمہاری ساری توجہ صرف اللہ کی طرف ہو تمھاری دعا اور عبادت کا مرجع صرف ایک اللہ ہو۔ تمھاری سوچ تمام تر خدا رخی سوچ بن جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا کے ابدی انعامات دئے جائیں گے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ
فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ
رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٩ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ
مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا
فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝١٠ ثُمَّ
اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ
لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا
طَاۗىِٕعِيْنَ ۝١١ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ

۹۔ کہو کیا تم لوگ اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں بنایا، اور تم اس کے ہم سر ٹھہراتے ہو، وہ رب ہے تمام جہان والوں کا۔ ۱۰۔ اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے۔ اور اس میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں۔ اور اس میں اس کی غذائیں ٹھہرا دیں چار دن میں، پورا ہوا پوچھنے والوں کے لیے۔ ۱۱۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور وہ دھواں تھا۔ پھر اس نے آسمان اور زمین سے کہا کہ تم دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ ۱۲۔ پھر اس نے دو

يَوْمَيْنِ وَ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۱۲﴾

دن میں اس کے سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اُس کا حکم بھیج دیا۔ اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی، اور اس کو محفوظ کر دیا۔ یہ عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے۔

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کی تخلیق کئی دوروں میں تدریجی طور پر ہوئی ہے۔ تدریجی تخلیق دوسرے لفظوں میں منصوبہ بند تخلیق ہے۔ اور جب کائنات کی تخلیق منصوبہ بند انداز میں ہوئی ہے تو یقینی ہے کہ اس کا ایک منصوبہ ساز ہو جس نے اپنے مقرر منصوبہ کے تحت اس کو ارادۃً بنایا ہو۔

اسی طرح یہاں زمین کے اوپر جگہ جگہ پہاڑ ہیں جو زمین کے توازن کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں کروڑوں قسم کے ذی حیات ہیں۔ ہر ایک کو الگ الگ رزق درکار ہے۔ مگر ہر ایک کا رزق اس طرح کامل مطابقت کے ساتھ موجود ہے کہ جس کو جو روزی درکار ہے وہ اپنے قریب ہی اس کو پالیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمام چیزیں ابتداءً منتشر ایٹم کی صورت میں تھیں۔ پھر وہ مجتمع ہو کر الگ الگ اشیاء کی صورت میں متشکل ہوئیں۔ اسی طرح کائنات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وسیع کائنات کی تمام چیزیں ایک ہی قانون فطرت میں نہایت محکم طور پر جکڑی ہوئی ہیں۔

یہ مشاہدات واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا خالق علیم اور خبیر ہے۔ وہ قوت اور غلبہ والا ہے۔ پھر دوسرا کون ہے جس کو انسان اپنا معبود قرار دے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

۱۳۔ پس اگر وہ اعراض کرتے ہیں تو کہو کہ تم کو اسی طرح کے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عذاب عاد اور ثمود پر نازل ہوا۔ ۱۴۔ جب کہ ان کے پاس رسول آئے، ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے کہ اللہ کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہمارا رب چاہتا تو وہ فرشتہ اُتارتا، پس ہم اس چیز کے منکر ہیں جس کو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔

دعوت حق کا انکار خدا کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ یہ انکار اگر پیغمبر کی دعوت کے مقابلہ میں ہو تو اس کی سزا اسی موجودہ دنیا سے شروع ہو جاتی ہے، جیسا کہ عاد و ثمود وغیرہ قوموں کے ساتھ پیش آیا۔ اور اگر عام داعیوں کا معاملہ ہو تو ان کے انکار کا انجام آخرت میں سامنے آئے گا۔

دعوتِ حق کا اصل نکتہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انسان خدا کا عبادت گزار بنے۔ وہ غیر اللہ کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ سے اپنے خوف و محبت کے جذبات وابستہ کرے۔ مگر ہر دور میں ایسا ہوا کہ پیغمبر کی شخصیت ان کے معاصرین کو اس سے کم نظر آئی کہ خدا انھیں اپنے پیغام رسانی کے لیے چنے۔ اس لیے انھوں نے پیغمبروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ
قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ
الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا
بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ
رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ
عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ
الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَاَمَّا
ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى
فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ ۚ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا
يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع ۲ ۱۰ ۱۶

۱۵۔ عاد کا یہ حال تھا کہ انھوں نے زمین میں بغیر کسی حق کے گھمنڈ کیا، اور انھوں نے کہا، کون ہے جو قوت میں ہم سے زیادہ ہے۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ قوت میں ان سے زیادہ ہے اور وہ ہماری نشانیوں کا انکار کرتے رہے۔ ۱۶۔ تو ہم نے چند منحوس دنوں میں ان پر سخت طوفانی ہوا بھیج دی تاکہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب چکھائیں، اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے اور ان کو کوئی مدد نہ پہنچے گی۔ ۱۷۔ اور وہ جو ثمود تھے، تو ہم نے ان کو ہدایت کا راستہ دکھایا مگر انھوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھے پن کو پسند کیا، تو ان کو عذاب ذلت کے کڑکے نے پکڑ لیا ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے۔ ۱۸۔ اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور ڈرنے والے تھے۔

آدمی ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں زمین و آسمان کی عظمتیں اس کی بڑائی کی نفی کر رہی ہیں۔ جہاں موت کا واقعہ ہر روز انسان کو حقیر اور بے زور ثابت کر رہا ہے۔ اس کے باوجود آدمی بڑا بنتا ہے۔ پھر بھی وہ اس گمان میں رہتا ہے کہ وہ زور والا ہے۔

خدا بار بار حقیقت کا اعلان کراتا ہے۔ وہ بار بار انسان کی بڑائی کے دعوے کو باطل ثابت کر رہا ہے۔ مگر کوئی اس وقت تک نصیحت نہیں لیتا جب تک اسے مٹا نہ دیا جائے۔ عاد و ثمود اور دوسری قوموں کے کھنڈر اسی کی مثال ہیں۔ انھوں نے جن دنوں کو اپنے لیے مبارک سمجھ رکھا تھا وہی دن خدا کے حکم سے ان کے لیے منحوس دن بن کر رہ گئے۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ
فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا
شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَ
جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوْا
لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا
اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ
خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢١﴾ وَ
مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ
سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ
وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ
بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى
لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ
الْمُعْتَبِيْنَ ﴿٢٤﴾

۱۹۔ اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف جمع کیے جائیں گے، پھر وہ جدا جدا کیے جائیں گے۔ ۲۰۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آجائیں گے، ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے اعمال کی گواہی دیں گی۔ ۲۱۔ اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے، تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی۔ وہ کہیں گی کہ ہم کو اسی اللہ نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو بولنے والا بنا دیا ہے۔ اور اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا اور اسی کے پاس تم لائے گئے ہو۔ ۲۲۔ اور تم اپنے کو اس سے چھپا نہ سکتے تھے کہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھاری کھالیں تمھارے خلاف گواہی دیں، لیکن تم اس گمان میں رہے کہ اللہ تمھارے بہت سے ان اعمال کو نہیں جانتا جو تم کرتے ہو۔ ۲۳۔ اور تمھارے اسی گمان نے جو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا، پس تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گئے۔ ۲۴۔ پس اگر وہ صبر کریں تو آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے، اور اگر وہ معافی مانگیں تو ان کو معافی نہیں ملے گی۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن انسان کی کھال اور اس کے اعضاء اس کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ موجودہ زمانہ میں نطقِ جلدی (skinspeech) کے نظریے نے اس کو عملی طور پر ثابت کر دیا ہے۔ اب یہ معلوم کیا گیا ہے کہ انسان کا ہر بول اس کے جسم کی کھال پر مرتسم ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کو دوبارہ اسی طرح سنا جا سکتا ہے جس طرح مشینی طور پر ریکارڈ کی ہوئی آواز کو دوبارہ سنا جاتا ہے۔ خدا چونکہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا اس لیے انسان سمجھتا ہے کہ خدا اس کو دیکھتا نہیں ہے۔ یہی غلط فہمی آدمی کے اندر سرکشی پیدا کرتی ہے۔ اگر آدمی جان لے کہ خدا ہر لمحہ اس کو دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا رویہ بالکل بدل جائے۔ آخرت میں خدا کے سامنے آنے کے بعد آدمی اطاعت کا اظہار کرے گا۔ مگر وہ اس کے لیے بے فائدہ ہوگا۔ کیونکہ اطاعت حالت غیب میں قابل اعتبار ہے، نہ کہ حالت شہود میں۔

وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع ۳ ۱۷

۲۵۔ اور ہم نے ان پر کچھ ساتھی مسلط کر دئے تو انھوں نے ان کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز ان کو خوش نما بنا کر دکھایا۔ اور ان پر وہی بات پوری ہو کر رہی جو جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں پر پوری ہوئی جو ان سے پہلے گزر چکے تھے۔ بے شک وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے۔

موجودہ دنیا میں ایک طرف خدا کے داعی ہیں جو انسان کو حق کی نصیحت کرتے ہیں۔ دوسری طرف استحصال پسند لیڈر ہیں جو خوشنما باتیں کر کے انسان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں جو لوگ خدا کی نصیحت پر توجہ نہ دیں وہ ان لیڈروں کی باتوں میں آ کر غیر حقیقی راستوں میں دوڑ پڑتے ہیں۔

یہ استحصال پسند لیڈر لوگوں کو ان کے ماضی کا حسین خواب دکھاتے ہیں۔ وہ ان کے سامنے ان کے مستقبل کا خوبصورت نقشہ پیش کرتے ہیں۔ جو لوگ ایسے لیڈروں کے جھوٹے الفاظ سے دھوکا کھا کر ان کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں ان کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو کر رہ جائیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۲۸﴾

۲۶۔ اور کفر کرنے والوں نے کہا اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو، تا کہ تم غالب رہو۔ ۲۷۔ پس ہم انکار کرنے والوں کو سخت عذاب چکھائیں گے اور ان کو ان کے عمل کا بدترین بدلہ دیں گے۔ ۲۸۔ یہ اللہ کے دشمنوں کا بدلہ ہے، یعنی آگ۔ ان کے لیے اس میں ہمیشگی کا ٹھکانا ہوگا، اس بات کے بدلے میں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

وَالْغَوْا فِيْهِ کی تشریح حضرت عبد اللہ بن عباس نے عَيِّبُوْهُ کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی قرآن اور صاحب قرآن میں عیب لگاؤ اور اس طرح لوگوں کو اس سے دور کردو (تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 174)۔

کسی بات یا کسی شخص کے بارے میں اظہار رائے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تنقید، دوسرا تعییب۔ تنقید کا مطلب ہے حقائق کی بنیاد پر زیر بحث امر کا تجزیہ کرنا۔ اس کے برعکس، تعییب یہ ہے کہ آدمی زیر بحث مسئلہ پر دلائل پیش نہ کرے۔ وہ صرف اس میں عیب نکالے وہ اس پر الزام لگا کر اس کو مطعون کرے۔

تنقید کا طریقہ سراسر جائز طریقہ ہے۔ مگر تعییب کا طریقہ اہلِ کفر کا طریقہ ہے۔ مزید یہ کہ تعییب کا طریقہ خدا

کی نشانیوں کا انکار ہے۔ کیوں کہ ہر سچی دلیل خدا کی ایک نشانی ہے۔ جو لوگ دلیل کے آگے نہ جھکیں اور عیب جوئی اور الزام تراشی کا طریقہ اختیار کر کے اس کو دبانا چاہیں وہ گویا خدا کی نشانی کا انکار کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ آخرت میں نہایت سخت سزا کے مستحق قرار دئے جائیں گے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ
اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ
اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا
تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا
تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ
تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ
اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنْ
غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾ ع ۴ / ۱۸

۲۹۔ اور کفر کرنے والے کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں ان لوگوں کو دکھا جنھوں نے جنوں اور انسانوں میں سے ہم کو گمراہ کیا، ہم ان کو اپنے پاؤں کے نیچے ڈالیں گے، تاکہ وہ ذلیل ہوں۔ ۳۰۔ جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے، پھر وہ ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے اترتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور اس جنت کی بشارت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ۳۱۔ ہم دنیا کی زندگی میں تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ اور تمھارے لیے وہاں ہر چیز ہے جس کا تمھارا دل چاہے اور تمھارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو گے۔ ۳۲۔ غفور رحیم کی طرف سے مہمانی کے طور پر۔

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک وہ جو شیطانوں اور جھوٹے لیڈروں کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں خوب ایک دوسرے سے دوستی رکھتے ہیں۔ مگر آخرت میں صورت حال بالکل برعکس ہوگی۔ وہاں پیروی کرنے والے لوگ جب دیکھیں گے کہ ان کے جھوٹے رہنماؤں نے ان کو صرف جہنم میں پہنچایا ہے تو وہ ان سے سخت متنفر ہو جائیں گے۔ اور چاہیں گے کہ انھیں حقیر و ذلیل کر کے اپنے دل کی تسکین حاصل کریں۔

دوسرے انسان وہ ہیں جو خدا کے فرشتوں کو اپنا ساتھی بنائیں۔ ایسے لوگ دنیا سے لے کر آخرت تک فرشتوں کو اپنا ہم نشین پاتے ہیں۔ فرشتے ان کے دل پر ربانی احساسات اتارتے ہیں۔ وہ مشکل حالات میں ان کو قلبی سکون عطا کرتے ہیں۔ وہ لطیف تجربات کے ذریعہ انھیں خدا کی بشارتیں سناتے ہیں۔ پھر یہی فرشتے آخرت میں ان کا استقبال کر کے ان کو جنت کے باغات میں داخل کریں گے۔

وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا تَسۡتَوِى الۡحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِىۡ بَيۡنَكَ وَبَيۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقّٰٮهَاۤ اِلَّا الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا يُلَقّٰٮهَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِيۡمٍ ﴿۳۵﴾ وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۳۶﴾

۳۳۔اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ ۳۴۔اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ ۳۵۔اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیب والا ہے۔ ۳۶۔اور اگر شیطان تمھارے دل میں کچھ وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ مانگو۔ بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

قرآن کی دعوت اللہ کی طرف بلانے کی دعوت ہے۔انسان کو اس کے رب سے جوڑنا، انسان کو خدا کی یاد میں جینے والا بنانا، انسان کے اندر یہ شعور ابھارنا کہ وہ ایک خدا کو اپنا مرکز توجہ بنالے۔ یہی قرآنی دعوت کا اصل نشانہ ہے۔اور بلاشبہ اس پکار سے بہتر کوئی پکار نہیں۔

مگر خدا کا داعی صرف وہ شخص بنتا ہے جو اپنی دعوت میں اس حد تک سنجیدہ ہو کہ جو کچھ دوسروں سے منوانا چاہتا ہے اس کو وہ خود سب سے پہلے مان چکا ہو، وہ دوسروں سے جو کچھ کرنے کے لیے کہہ رہا ہے، خود سب سے پہلے اس کا کرنے والا بن جائے۔

داعی کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ یک طرفہ حسن سلوک کرے۔ دوسرے لوگ برائی کریں تب بھی وہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے۔ وہ اشتعال کے مقابلہ میں اعراض اور اذیت رسانی کے مقابلہ میں صبر کا طریقہ اختیار کرے۔ یک طرفہ حسن سلوک میں اللہ تعالیٰ نے زبردست تسخیری طاقت رکھی ہے۔خدا کا داعی خدا کی بنائی ہوئی اس فطرت کو جانتا ہے اور اس کو آخری حد تک استعمال کرتا ہے، خواہ اس کے لیے اس کو اپنے جذبات کو کچلنا پڑے، خواہ اس کی خاطر اپنے اندر پیدا ہونے والے رد عمل کو ذبح کرنے کی نوبت آجائے۔

جب بھی داعی کے اندر اس قسم کا خیال آئے کہ فلاں بات کا جواب دینا ضروری ہے، فلاں ظلم کے خلاف ضرور کارروائی کی جانی چاہیے ورنہ دشمن دلیر ہو کر اور زیادہ زیادتیاں کرے گا تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ مومن اور داعی کا فرض ہے کہ وہ ایسے خیال سے خدا کی پناہ مانگے، نہ کہ اس کے پیچھے دوڑنا شروع کردے۔

وَ مِنۡ اٰیٰتِہِ الَّیۡلُ وَ النَّہَارُ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ ؕ
لَا تَسۡجُدُوۡا لِلشَّمۡسِ وَ لَا لِلۡقَمَرِ وَ اسۡجُدُوۡا
لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَہُنَّ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ
تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۳۷﴾ فَاِنِ اسۡتَکۡبَرُوۡا فَالَّذِیۡنَ عِنۡدَ
رَبِّکَ یُسَبِّحُوۡنَ لَہٗ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ ہُمۡ لَا
یَسۡـَٔمُوۡنَ ﴿۳۸﴾ السجدة السجدۃ ۱۱

۳۷۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے رات اور دن اور سورج اور چاند۔ تم سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا، اگر تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔ ۳۸۔ پس اگر وہ تکبر کریں تو جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں وہ شب و روز اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ کبھی نہیں تھکتے۔

انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کی ظاہر پرستی ہے۔ قدیم زمانہ کے انسان کو سورج اور چاند اور ستارے سب سے زیادہ نمایاں نظر آئے۔ اس لیے اس نے ان مظاہر کو خدا سمجھ لیا اور ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں مادی تہذیب کی جگمگاہٹ لوگوں کو نمایاں دکھائی دے رہی ہے۔ اس لیے اب مادی تہذیب کو وہ مقام دے دیا گیا ہے جو قدیم زمانہ میں سورج اور چاند کو حاصل تھا۔ حالانکہ خواہ سورج اور چاند ہوں یا دوسرے مظاہر سب کے سب خدا کی مخلوق ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ خالق کا پرستار رہے نہ کہ اس کی مخلوقات کا۔

تکبر کرنے والوں کا تکبر دعوت کے مقابلے میں نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ داعی کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ وقت کے بڑوں کو بظاہر داعی اپنے سے چھوٹا نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ اس کو چھوٹا سمجھ لیتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کی طرف سے پیش کئے جانے والے پیغام کو بھی۔

وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنَّکَ تَرَی الۡاَرۡضَ خَاشِعَۃً
فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہَا الۡمَآءَ اہۡتَزَّتۡ وَ رَبَتۡ ؕ
اِنَّ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاہَا لَمُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ اِنَّہٗ عَلٰی
کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۳۹﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ
فِیۡۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخۡفَوۡنَ عَلَیۡنَا ؕ اَفَمَنۡ یُّلۡقٰی
فِی النَّارِ خَیۡرٌ اَمۡ مَّنۡ یَّاۡتِیۡۤ اٰمِنًا یَّوۡمَ
الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ اِنَّہٗ بِمَا
تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۴۰﴾

۳۹۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تم زمین کو فرسودہ حالت میں دیکھتے ہو، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ بے شک جس نے اس کو زندہ کر دیا، وہ مُردوں کو بھی زندہ کر دینے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۰۔ جو لوگ ہماری آیتوں کو الٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا جو آگ میں ڈالا جائے گا وہ اچھا ہے یا وہ شخص جو قیامت کے دن امن کے ساتھ آئے گا۔ جو کچھ چاہے کرلو، بے شک وہ دیکھتا ہے جو تم کر رہے ہو۔

سوکھی زمین میں بارش کا برسنا اور اس سے سبزہ کا اگنا ایک ایسا مظہر ہے جو ہر آدمی کے سامنے بار بار آتا

ہے۔ یہ ایک معنوی حقیقت کی مادی تمثیل ہے۔ اس طرح انسان کو بتایا جاتا ہے کہ خدا نے یہاں اس کے خشک وجود کو سرسبز وشاداب کرنے کا وسیع انتظام کر رکھا ہے۔ زمین کی مٹی پانی کو اپنے اندر داخل ہونے دیتی ہے اس وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ بارش اس کو سرسبز وشاداب کرنے کا ذریعہ بنے۔ اِسی طرح انسان اگر خدا کی ہدایت کو اپنے اندر اترنے دے تو اس کا وجود بھی ہدایت پا کر لہلہا اٹھے گا۔

خدا کی ہدایت سے فیض یاب نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان خدا کی باتوں میں الحاد (انحراف) کرتا ہے۔ خدا کی رہنمائی اس کے سامنے آتی ہے تو وہ اس کو سیدھے مفہوم میں نہیں لیتا۔ بلکہ اس میں ٹیڑھ نکال کر اس کو منحرف کر دیتا ہے۔ اس طرح خدا کی رہنمائی اس کے ذہن کا جزء نہیں بنتی۔ وہ اس کی روح کو غذا دینے والی ثابت نہیں ہوتی۔

خدا کی رہنمائی کو سیدھی طرح قبول کرنے والوں کے لیے جنت کا انعام ہے، اور خدا کی رہنمائی میں ٹیڑھا مفہوم نکالنے والوں کے لیے جہنم کا عذاب۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿41﴾ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿42﴾ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴿43﴾

۴۱۔ جن لوگوں نے اللہ کی نصیحت کا انکار کیا جب کہ وہ ان کے پاس آ گئی، اور بے شک یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ ۴۲۔ اس میں باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، یہ حکیم اور حمید کی طرف سے اتاری گئی ہے۔ ۴۳۔ تم کو وہی باتیں کہی جا رہی ہیں جو تم سے پہلے رسولوں کو کہی گئی ہیں۔ بے شک تمھارا رب مغفرت والا ہے اور دردناک سزا دینے والا بھی۔

قرآن ایک زبردست کتاب ہے اور اس کے زبردست ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ باطل نہ آگے سے اس میں آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔ یعنی اس میں کسی طرف سے دخل اندازی کا کوئی امکان نہیں، نہ براہِ راست اس میں کوئی بگاڑ پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ بالواسطہ۔

یہ ایک انتہائی غیر معمولی پیشین گوئی ہے۔ اس عالم اسباب میں اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کی حامل ایک طاقتور قوم مستقل طور پر موجود رہے۔ پچھلے نبیوں کی تعلیمات سے اس کی عدم مطابقت ظاہر نہ ہو سکے۔ کوئی شخص کبھی قرآن کا جواب لکھنے پر قادر نہ ہو۔ علوم کا ارتقا اس کی کسی بات کو کبھی غلط ثابت نہ کرے۔ تاریخ کا اتار چڑھاؤ کبھی اس پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ قرآن کی زبان (عربی) ہمیشہ ایک زندہ زبان کے طور پر باقی رہے۔

قرآن کے نزول کے بعد کی لمبی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تمام اسباب حیرت انگیز طور پر اس کے حق میں جمع رہے ہیں۔ ان تمام واقعات کی یکجائی اس قدر غیر معمولی ہے کہ قرآن کے سوا کوئی بھی دوسری کتاب نہیں جس کے حق میں وہ ڈیڑھ ہزار برس کی مدت تک مسلسل جمع رہے ہوں۔ یہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔

قرآن کی عظمت کو دلیل کی سطح پر پانا مطلوب ہے، نہ کہ طاقت کی سطح پر۔ طاقت کی سطح پر اس کی عظمت قیامت میں ظاہر ہوگی۔ مگر یہ ظہور صرف اس لیے ہوگا کہ جن لوگوں نے دلیل کی سطح پر خدا کی سچائی کو نہیں مانا تھا انھیں ذلیل کر کے خدا کی سچائی کو ماننے پر مجبور کیا جائے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ ع ۵ ۱۲ ۱۹

۴۴۔ اور اگر ہم اس کو عجمی قرآن بناتے تو وہ کہتے کہ اس کی آیتیں صاف صاف کیوں نہیں بیان کی گئیں۔ کیا عجمی کتاب اور عربی لوگ۔ کہو کہ وہ ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور وہ ان کے حق میں اندھا پن ہے۔ یہ لوگ گویا کہ دور کی جگہ سے پکارے جا رہے ہیں۔

قرآن عربی زبان میں اترا تو مخالفین نے کہا یہ تو محمد کی اپنی مادری زبان ہے، عربی میں کوئی کتاب بنا کر پیش کر دینا ان کے لیے کیا مشکل ہے۔ اگر وہ واقعی پیغمبر ہوتے تو خدا کی مدد سے وہ اچانک کسی اجنبی زبان میں کلام کرنے لگتے۔

اس طرح کی بات ہمیشہ غیر سنجیدہ لوگ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ غیر سنجیدہ ہوں ان کی زبان کبھی بند نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اگر ایسا ہو کہ پیغمبر آ کر عرب کے لوگوں سے یونانی یا سُریانی یا فارسی زبان میں کلام کرنے لگے تو اس وقت لوگوں کو کہنے کے لیے یہ الفاظ مل جائیں گے — کیسا عجیب ہے یہ پیغمبر۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ مگر وہ ایسی زبان میں بولتا ہے جس کو اس کے مخاطبین سمجھ ہی نہ سکتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ حق کو صرف وہ لوگ قبول کر پاتے ہیں جو حق کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں۔ جو لوگ حق کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہوں وہ واضح ترین بات کو بھی سمجھ نہیں سکتے۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی کو بہت دور سے پکارا جائے۔ ایسا شخص کچھ آواز تو سنے گا مگر وہ اصل بات کو سمجھنے سے محروم رہے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

۴۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو اس میں اختلاف پیدا کیا گیا۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور یہ لوگ اس کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے۔ ۴۶۔ جو شخص نیک عمل کرے گا تو اپنے ہی لیے کرے گا اور جو شخص برائی کرے گا تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ اور تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

پچھلے پیغمبروں کے ذریعہ جب خدائی سچائی منکشف کی گئی تو کچھ لوگوں نے اس کو مانا اور کچھ لوگوں نے نہیں مانا۔ یہی معاملہ اس وقت بھی پیش آیا جب کہ پیغمبر آخر الزماں کی بعثت ہوئی۔

خدائی سچائی کے ساتھ یہ اختلافی معاملہ انسان کیوں کرتا ہے۔ اس کی وجہ موجودہ امتحانی حالت ہے۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں سچائی جب بھی ظاہر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پردہ بھی لگا رہتا ہے۔ لوگ اسی پردہ میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ جس پردہ کو انھیں پھاڑنا تھا اس کو وہ اپنے لیے شک وشبہ کا سبب بنا لیتے ہیں۔

مگر یہ شک قیامت میں کسی کے لیے عذر نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان حق کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں تھا۔ انسان اپنے دنیا کے مفاد کے معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تمام پردوں کو پھاڑ کر اس کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنے آخرت کے مفاد کے بارے میں سنجیدہ ہو جائے تو وہ شک کے تمام پردوں کو پھاڑ کر حقیقت کو اس کی بے نقاب صورت میں دیکھ لے۔

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴿۴۷﴾ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا

☆ ۴۷۔ قیامت کا علم اللہ ہی سے متعلق ہے۔ اور کوئی پھل اپنے خول سے نہیں نکلتا اور نہ کوئی عورت حاملہ ہوتی اور نہ جنتی ہے، مگر یہ سب اس کی اطلاع سے ہوتا ہے۔ اور جس دن اللہ ان کو پکارے گا کہ میرے شریک کہاں ہیں، وہ کہیں گے کہ ہم آپ سے یہی عرض کرتے ہیں کہ ہم میں کوئی اس کا مدعی نہیں۔ ۴۸۔ اور جن کو وہ پہلے

كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿٤٨﴾

پکارتے تھے وہ سب ان سے گم ہو جائیں گے، اور وہ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے کوئی بچاؤ کی صورت نہیں۔

درخت سے ایک پھل کا نکلنا یا ماں کے پیٹ سے ایک زندہ وجود کا پیدا ہونا اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی واقعہ ہے جیسا موجودہ دنیا کے اندر سے آخرت کی دنیا کا برآمد ہونا۔

پھل کیا ہے، وہ بے پھل کا پھل میں تبدیل ہونا ہے۔ انسان کیا ہے، وہ بے انسان کا انسان کی صورت اختیار کرنا ہے۔ یہی آخرت کا معاملہ بھی ہے۔ آخرت بھی دراصل غیر آخرت کا آخرت میں تبدیل ہونے کا دوسرا نام ہے۔ پہلی قسم کی تبدیلی ہر روز ہمارے سامنے واقعہ بن رہی ہے۔ پھر اسی نوعیت کے ایک اور واقعہ (موجودہ دنیا کا آخرت میں تبدیل ہونا) ناقابل قیاس کیوں ہو۔

آخرت کا دن حقیقتوں کے آخری ظہور کا دن ہوگا۔ جب وہ دن آئے گا تو تمام جھوٹی بنیادیں ڈھ پڑیں گی جن پر لوگوں نے موجودہ دنیا میں اپنی زندگیوں کو کھڑا کر رکھا تھا۔

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۫ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿٤٩﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۫ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿٥٠﴾

۴۹۔ اور انسان بھلائی مانگنے سے نہیں تھکتا، اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ ۵۰۔ اور اگر ہم اس کو تکلیف کے بعد جو کہ اسے پہنچی تھی، اپنی مہربانی کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے یہ تو میرا حق ہی ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی۔ اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹا یا گیا تو اس کے پاس بھی میرے لیے بہتری ہی ہے۔ پس ہم ان منکروں کو ان کے اعمال سے ضرور آگاہ کریں گے۔ اور ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

مصیبت کا لمحہ انسان کے لیے اپنی دریافت کا لمحہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب مصیبت پڑتی ہے تو وہ خودسری کو بھول کر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ جان لیتا ہے کہ وہ عبد ہے اور خدا اس کا معبود۔

مگر جب خدا اس کی مصیبت کو اس سے دور کر دیتا ہے اور اس کو آسائش کا سامان عطا کرتا ہے تو اس کے بعد وہ فوراً اپنی سابقہ حالت کو بھول جاتا ہے۔ وہ ملی ہوئی نعمت کو اسباب کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور اس کو اپنی

تدبیر اور لیاقت کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کی نفسیات ایسی ہو جاتی ہے گویا کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس کے بعد نہ دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ خدا کی عدالت میں کھڑا ہونا ہے۔ مزید یہ کہ اس کی آسودہ حالی اس کو اس غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے کہ یہاں جب میرا حال اچھا ہے تو اگلی دنیا میں بھی ضرور میرا حال اچھا ہوگا۔

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾

۵۱۔ اور جب ہم انسان پر فضل کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے اور اپنی کروٹ پھیر لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لمبی لمبی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے۔ ۵۲۔ کہو کہ بتاؤ، اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے آیا ہو، پھر تم نے اس کا انکار کیا تو اس شخص سے زیادہ گمراہ اور کون ہوگا جو مخالفت میں بہت دور چلا جائے۔

انسان کو نعمت اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ اس کو خدا کا عطیہ قرار دے کر اس کا شکر ادا کرے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ نعمت پا کر سرکش بن جاتا ہے۔ البتہ جب انسان پر کوئی تکلیف پڑتی ہے تو اس وقت وہ خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ مگر مجبورانہ پکار کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ نعمت کے وقت بھی خدا کے آگے جھکے اور تکلیف کے وقت بھی۔

انسان کی یہی نفسیات ہے جو اس کو حق کے انکار پر آمادہ کرتی ہے۔ حق کسی کو مجبور نہیں کرتا، وہ اختیارانہ جھکاؤ کا طالب ہوتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کے اندر اختیارانہ جھکاؤ کا مادہ نہیں ہوتا وہ ایسے حق کو نظرانداز کر دیتے ہیں جس کو نظرانداز کر دینے سے بظاہر ان کے اوپر کوئی آفت ٹوٹ پڑنے والی نہ ہو۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴿۵۴﴾ ع ۶

۵۳۔ ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔ اور کیا یہ بات کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز کا گواہ ہے۔ ۵۴۔ سن لو، یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔ سن لو، وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

دنیا میں جتنے لوگ بھی اٹھے ہیں سب کی کہانی حال کی کہانی ہے، کسی کی کہانی مستقبل کی کہانی نہیں۔ کیونکہ کسی کا مستقبل بھی اس کے حال کی تصدیق کرنے والا نہ بن سکا۔ ایسی دنیا میں ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہ

پیشین گوئی کی گئی کہ قرآن کے بعد ظاہر ہونے والے واقعات وحقائق قرآن کی تصدیق کرتے چلے جائیں گے۔ قرآن آئندہ آنے والے تمام زمانوں میں اپنی صداقت کو نہ صرف باقی رکھے گا بلکہ مزید واضح اور مدلل کرتا چلا جائے گا۔ قرآن ہمیشہ وقت کی کتاب رہے گا۔

یہ بات حیرت انگیز طور پر صد فی صد درست ثابت ہوئی ہے۔ علمی تحقیقات، تاریخی واقعات، زمانی انقلابات سب قرآن کے حق میں جمع ہوتے چلے گئے۔ حتی کہ آج غیر مسلم محققین بھی گواہی دے رہے ہیں کہ قرآن اپنی نادر خصوصیات کی بنا پر خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ کسی انسانی تصنیف میں ایسی ابدی خصوصیات پائی نہیں جاسکتیں (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی کتاب ''عظمتِ قرآن'')۔

اس کھلی ہوئی حقیقت کے باوجود جو لوگ قرآن کی صداقت کے آگے نہ جھکیں وہ صرف یہ ثابت کررہے ہیں کہ ان کی بے خوفی کی نفسیات نے ان کو غیر سنجیدہ بنا دیا ہے۔ کیوں کہ غیر سنجیدہ انسان ہی سے اس قسم کی غیر معقول روش ظاہر ہوسکتی ہے کہ وہ کھلے کھلے شواہد کو دیکھے اور اس کے باوجود اس کا اقرار نہ کرے۔

۴۲۔ سُوۡرَۃُ الشُّوۡرٰی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

حٰمٓ ① عٓسٓقٓ ② کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ وَ اِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۙ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ③ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ④ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ مِنۡ فَوۡقِہِنَّ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ⑤ وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہُ حَفِیۡظٌ عَلَیۡہِمۡ ۫ۖ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ⑥

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ حٰمٓ۔ ۲۔ عٓسٓقٓ۔ ۳۔ اسی طرح اللہ غالب وحکیم وحی کرتا ہے تمھاری طرف اور ان کی طرف جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ ۴۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ سب سے اوپر ہے، سب سے بڑا۔ ۵۔ قریب ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے پھٹ پڑے، اور فرشتے اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں اسی کی حمد کے ساتھ اور زمین والوں کے لیے معافی مانگتے ہیں۔ سن لو کہ اللہ ہی معاف کرنے والا، رحمت کرنے والا ہے۔ ۶۔ اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنائے ہیں، اللہ ان کے اوپر نگہبان ہے اور تم ان کے اوپر ذمہ دار نہیں۔

اگر آدمی کو لامحدود نگاہ حاصل ہوجائے تو وہ دیکھے گا کہ یہاں ایک خدا ہے جو سارے زمین وآسمان کا مالک ہے۔ اس کی طاقت اتنی زبردست ہے کہ کائنات اس کی ہیبت سے گویا پھٹی جارہی ہے۔ فرشتے جو

براہِ راست خدا کی خدائی سے باخبر ہیں وہ ہر آن خشیت میں ڈوبے ہوئے اس کی حمد وتسبیح کر رہے ہیں۔ پھر وہ دیکھے گا کہ خدا اپنی قدرت خاص سے انسانوں میں سے بعض افراد کو چنتا ہے اور انھیں بالواسطہ انداز میں اپنا کلام پہنچاتا ہے تاکہ وہ تمام انسانوں کو حقیقتِ واقعہ سے باخبر کردیں۔ انسان اگرچہ ان حقیقتوں کو براہِ راست طور پر نہیں دیکھتا مگر وہ عقل کے ذریعہ بالواسطہ طور پر ان کا ادراک کرسکتا ہے۔ یہی آدمی کا اصل امتحان ہے۔ انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بصارت سے دکھائی نہ دینے والی چیزوں کو بصیرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ پیغمبروں کے کلام میں خدا کی آواز سنے اور اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔ وہ دیکھے بغیر اس طرح مان لے گویا کہ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

قیامت کے دن کسی کے لیے یہ بات عذر نہ بن سکے گی کہ اس نے حقیقت کو براہِ راست نہ دیکھا تھا۔ کیوں کہ موجودہ امتحان کی دنیا میں حقیقت کو براہِ راست دکھانا مطلوب ہی نہیں۔ اگر اصل پیغام کسی شخص تک پوری طرح پہنچ جائے تو اس کے بعد خدا کے نزدیک اس پر حجت قائم ہوجاتی ہے۔ حقیقت کا دلیل کی زبان میں ظاہر ہوجانا ہی کافی ہے کہ اس کو انکارحق کا مجرم قرار دے کر وہ سزا دی جائے جو منکرینِ حق کے لیے مقدر ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ⑦

۷۔ اور ہم نے اسی طرح تمھاری طرف عربی قرآن اُتارا ہے تاکہ تم مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرا دو، اور ان کو جمع ہونے کے دن سے ڈرا دو جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ آگ میں۔

پیغمبر کی دعوت کا اصل نشانہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کردیا جائے کہ آخر کار وہ خدا کے سامنے حاضر کیے جانے والے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کے عمل کے مطابق کسی کے لیے ابدی جنت کا فیصلہ ہوگا اور کسی کے لیے ابدی جہنم کا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے آئے۔ آپ کی بعثت کے دو دور ہیں ایک براہِ راست دوسرا بالواسطہ۔ آپ کی براہِ راست بعثت مکہ اور اطرافِ مکہ کے لیے تھی۔ اس کی تکمیل آپ نے خود اپنی زندگی میں فرمادی۔ آپ کی بالواسطہ بعثت بواسطۂ امت تمام عالم کے لیے ہے۔ آپ کی یہ دوسری بعثت جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ عرب کے سامنے عربی زبان میں اپنا پیغام پہنچایا۔ آپ کے بعد آپ کی امت کو بھی آپ کی نیابت میں اسی اصول پر اپنا دعوتی فریضہ انجام دینا ہے۔ اس کو ہر قوم کے سامنے اس کی اپنی زبان میں حق کا پیغام پہنچانا ہے۔ جب تک کسی قوم کو اس کی اپنی زبان میں پیغام نہ پہنچایا جائے اس پر پیغام رسانی کا حق ادا نہ ہوگا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ
يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ
مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۸ اَمِ اتَّخَذُوْا
مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ
يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۹ وَ ع ۹ ۲
مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى
اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖۗ وَ
اِلَيْهِ اُنِيْبُ ۱۰

۸۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا، لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا کوئی حامی ومددگار نہیں۔ ۹۔ کیا انھوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، پس اللہ ہی کارساز ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۰۔ اور جس کسی بات میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک غیر معمولی رحمت کا دروازہ کھولا ہے جو کسی اور کے لیے نہیں کھولا۔ وہ ہے خود اپنے ارادہ سے اللہ کی ہدایت کو اختیار کرنا۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ کے غیر معمولی انعام کا مستحق بننا۔ لوگوں کا مختلف راستے اختیار کرنا اسی آزادی کی قیمت ہے۔ یہ اختلاف یقیناً ایک ناپسندیدہ چیز ہے مگر اس قیمتی انسان کو چننے کی اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں۔

خدا نے اگرچہ انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ مگر اس کی ہدایت کے لیے انسان کے اندر اور اس کے باہر اتنا زیادہ سامان رکھا گیا ہے کہ اگر آدمی واقعۃً سنجیدہ ہو تو وہ کبھی غلط راستہ اختیار نہ کرے۔ ایسی حالت میں جو لوگ غلط راستہ اختیار کریں وہ بہت بڑے ظالم ہیں۔ وہ خدا کے یہاں ہرگز معافی کے قابل نہ ٹھہریں گے۔

اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان دنیا میں جو اختلاف پیدا ہوتا ہے اس کا آخری فیصلہ دنیا میں نہیں ہوسکتا۔ دنیا کا حال یہ ہے کہ یہاں ہر آدمی اپنے موافق الفاظ پالیتا ہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ جھوٹ کو بھی سچ کے روپ میں ظاہر کیا جاسکے۔ مگر یہ صرف موجودہ زندگی کے مرحلہ تک ہے۔ جہاں انسان کا مقابلہ انسان سے ہے۔ اگلی زندگی میں انسان کا مقابلہ خدا سے ہوگا۔ وہاں کسی کے لیے یہ ناممکن ہوجائے گا کہ اپنے آپ کو پرفریب الفاظ کے پردہ میں چھپا سکے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ
مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ
اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ

۱۱۔ وہ آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تمھاری جنس سے تمھارے جوڑے پیدا کیے اور جانوروں کے بھی جوڑے بنائے۔ اس کے ذریعہ وہ تمھاری نسل چلاتا ہے۔ کوئی چیز اس

شَیۡءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱۱﴾ لَهٗ
مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ یَبۡسُطُ
الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِکُلِّ
شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۲﴾

کے مثل نہیں اور وہ سننے والا، دیکھنے والا
ہے۔ ۱۲۔ اسی کے اختیار میں آسمانوں اور زمین کی
کنجیاں ہیں۔ وہ جس کے لیے چاہتا ہے زیادہ
روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم کر دیتا
ہے۔ بے شک وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

زمین وآسمان کی صورت میں جو واقعہ ہمارے سامنے ہے وہ اتنا عظیم واقعہ ہے کہ یہ ناقابل قیاس ہے کہ ان معبودوں میں سے کسی معبود نے ان کو وجود عطا کیا ہو جن کی لوگ خدا کے سوا تعظیم وتقدیس کرتے ہیں۔ اِسی طرح انسانوں اور جانوروں کے اندرونی نظام میں ان کی نسل کی بقا کا انتظام اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کو حقیقی طور پر نہ کسی انسان کی طرف منسوب کیا جاسکتا اور نہ خدا کے سوا معبودوں میں سے کسی معبود کی طرف۔ یہ سب کام اتنے غیر معمولی ہیں کہ بے مثل خدا ہی کی طرف انھیں جائز طور پر منسوب کیا جاسکتا ہے۔

خالق کی جو صفات اس کی مخلوقات کے مشاہدہ کے ذریعہ ہمارے علم میں آتی ہیں وہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہ خالق کس قدر عظیم ہے۔ وہ سمیع وبصیر ہے۔ وہ ہر قسم کے اعلیٰ اختیارات کا مالک ہے۔ کسی کو جو کچھ ملتا ہے اسی کے دئے سے ملتا ہے اور کسی سے جو کچھ چھنتا ہے اسی کے چھیننے سے چھنتا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے، اس کے جیسا کوئی اور نہیں۔

شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوۡحًا
وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِهٖۤ
اِبۡرٰهِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا
الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ ؕ کَبُرَ عَلَی
الۡمُشۡرِکِیۡنَ مَا تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَیۡهِ ؕ اَللّٰهُ
یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ
یُّنِیۡبُ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اللہ نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے
جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی وحی ہم
نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے
ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ دین کو
قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔ مشرکین پر
وہ بات بہت گراں ہے جس کی طرف تم ان کو
بلا رہے ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف چن
لیتا ہے۔ اور وہ اپنی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے
جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تمام پیغمبر ایک ہی دین لے کر آئے۔ اور وہ دینِ توحید ہے۔ مگر ان پیغمبروں کے ماننے والے بعد کو الگ الگ دینی فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ اس کی وجہ مرکز توجہ میں تبدیلی تھی۔ پیغمبروں کے اصل دین میں مرکز توجہ تمام تر خدا تھا۔ ہر ایک کی تعلیم یہ تھی کہ صرف ایک خدا کے پرستار بنو۔ مگر ان کی امتوں نے بعد کو اپنا مرکز توجہ تبدیل کر دیا۔ وہ خدا کے بجائے غیر خدا کے پرستار بن گئے۔

قدیم عرب کے لوگ ابتداءً حضرت ابراہیم کی امت تھے۔ مگر بعد کو اپنے کچھ بزرگوں کی عظمت ان کے ذہنوں پر اس قدر چھائی کہ انھیں کو انھوں نے اپنا مرکز توجہ بنالیا۔ حتی کہ ان کے بت بنا کر وہ ان کو پوجنے لگے۔ یہود حضرت موسیٰ کی امت تھے۔ مگر انھوں نے اپنی نسل کو مخصوص نسل سمجھ لیا۔ ان کی توجہات اپنی نسل کی طرف اتنا زیادہ مائل ہوئیں کہ بالآخر خدائی دین ان کے یہاں نسلی دین بن کر رہ گیا۔ وہ پیغمبر آخرالزماں کے صرف اس لیے منکر ہوگئے کہ وہ ان کی اپنی نسل میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اِسی طرح عیسائی حضرت عیسیٰ کی امت تھے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا پیغمبر ماننے کے بجائے ان کو خدا کا بیٹا فرض کرلیا۔ اس طرح بعد کو انھوں نے جو دین بنایا اس میں ابنیت مسیح نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی۔

خدا کو اپنے بندوں سے جو دین مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ وہ خالص توحید پر قائم ہوں۔ صرف ایک خدا ان کی تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔ یہی اقامتِ دین ہے۔ اس مرکز توجہ میں تبدیلی کا دوسرا نام شرک ہے۔ اور جب لوگوں میں شرک آتا ہے تو فوراً تفریق اور اختلاف شروع ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ توحید کی صورت میں مرکز توجہ ایک رہتا ہے، جبکہ شرک کی صورت میں مرکز توجہ کئی بن جاتے ہیں۔

پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اگرچہ اپنے متن کے اعتبار سے محفوظ دین ہے۔ مگر آپ کی امت محفوظ امت نہیں۔ امت کے لوگوں کے لیے بدستور یہ امکان کھلا ہوا ہے کہ وہ نئی نئی چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنائیں۔ وہ خودساختہ تشریح وتعبیر کے ذریعہ اصل دین میں تبدیلیاں کریں اور پھر ایک دین کو عملاً کئی دین بنا کر رکھ دیں۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور جو لوگ متفرق ہوئے وہ علم آنے کے بعد ہوئے، صرف آپس کی ضد کی وجہ سے۔ اور اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک وقت معین تک کی بات طے نہ ہوچکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کردیا جاتا۔ اور جن لوگوں کو ان کے بعد کتاب دی گئی وہ اس کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال دیا ہے۔

علم آنے کے بعد متفرق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دین حق کی دعوت بلند ہو اور پھر بھی آدمی اس سے الگ رہے۔ یا اس کا مخالف بن کر کھڑا ہوجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالی نے دین کو اس کے خالص انداز میں کھولا۔ اب چاہیے تھا کہ تمام وہ لوگ جو خدا کے طالب ہیں وہ آپ کے ساتھ جڑ جائیں۔ مگر وہ آپ کے ساتھ جڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ پچھلے نبیوں کے ساتھ اپنے آپ کو منسوب کرکے وہ لوگوں کے درمیان دین داری کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہی ان کے لیے کافی ہے حالانکہ جب دین صحیح کی

دعوت بلند ہو تو تمام لوگوں کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے گھروندوں کو ڈھا دیں اور دین صحیح کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کریں۔ جو لوگ ایسا نہ کریں وہ خدا کے نزدیک مجرم ہیں، خواہ وہ غیر دین دار ہوں یا بظاہر دین دار۔

دینِ حق کی دعوت جب اٹھتی ہے تو کچھ لوگ ''بغی'' کی بنیاد پر اس کے منکر بن جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ شک کی بنیاد پر اس سے دور رہتے ہیں۔ بغی سے مراد حسد اور تکبر ہے۔ یہ ان لوگوں کا معاملہ ہے جو ماحول میں بڑائی کا مقام حاصل کیے ہوئے ہوں۔ حق کو ماننے میں انھیں بڑائی کے مقام سے نیچے اترنا پڑتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے آپ کو چھوٹا کرنے پر راضی نہیں ہوتے اس لیے وہ حق کی دعوت کو چھوٹا کرنے میں سرگرم ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے موقف کو جائز ثابت کر سکیں۔

شک اور تردد کا معاملہ اکثر عوام الناس کے ساتھ پیش آتا ہے۔ داعی کی بات انھیں دلیل کی سطح پر وزنی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ان اکابر کو چھوڑنا بھی ان کے لیے مشکل ہوتا ہے جن کی عظمت ان کے ذہن پر پہلے سے قائم ہو چکی ہو۔ یہ دو طرفہ تقاضے ان کے لیے آخری فیصلہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ پہلے گروہ نے اگر تکبر کی نفسیات کے تحت حق کو نظر انداز کیا تھا تو دوسرا گروہ شک کی نفسیات کے تحت اس کو اختیار نہیں کر پاتا۔ حق کو قبول کرنے سے یہ بھی محروم رہتا ہے اور وہ بھی۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾

۱۵۔ پس تم اسی کی طرف بلاؤ اور اس پر جمے رہو جس طرح تم کو حکم ہوا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ اور کہو کہ اللہ نے جو کتاب اُتاری ہے میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا رب ہے اور تمھارا رب بھی۔ ہمارا عمل ہمارے لیے اور تمھارا عمل تمھارے لیے۔ ہم میں اور تم میں کچھ جھگڑا نہیں۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کے پاس جانا ہے۔ ۱۶۔ اور جو لوگ اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہیں، بعد اس کے کہ وہ مان لیا گیا، ان کی حجت ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

یہاں ''کتاب'' سے مراد وہ اصل دین ہے جو پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا گیا۔ ''اہواء'' سے مراد وہ خود ساختہ اضافے ہیں جو انسانوں نے خود اپنی طرف سے دین حق میں کیے۔ پیغمبر کو حکم دیا گیا کہ تم بس

اصل دین پر جمے رہو۔ حتی کہ دعوتی مصلحت کی بنا پر بھی تم کو ایسا نہیں کرنا ہے کہ لوگوں کے خود ساختہ دین کے ساتھ رعایت کرنے لگو۔ تمھارا کام عدل کرنا ہے۔ یعنی مذہبی اختلافات کا فیصلہ کرکے یہ بتانا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ کون سا حصہ وہ ہے جو خدا کی طرف سے ہے اور کون سا حصہ انسانی آمیزش کے تحت دین میں شامل کر لیا گیا ہے۔

''ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے جھگڑنے کے باوجود ہم ایسا نہیں کریں گے کہ ہم بھی تم سے جھگڑنے لگیں۔ تم منفی رویہ اختیار کرو تب بھی ہم یک طرفہ طور پر اپنے مثبت رویہ پر قائم رہیں گے۔ داعی کی ذمہ داری صرف حق کا پیغام پہنچانے کی ہے۔ اس کے علاوہ جو چیزیں ہیں ان کو وہ خدا کے حوالہ کر دیتا ہے۔

جو لوگ حق کو قبول کرلیں ان کو تنگ کرنا اور ان کو بے کار بحثوں میں الجھانا نہایت ظالمانہ کام ہے۔ ایسا کرنے والے اپنے آپ کو اس خطرہ میں مبتلا کر رہے ہیں کہ آخرت میں ان پر خدا کا غضب ہو اور ان کو سخت عذاب میں ڈال دیا جائے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۸﴾

۱۷۔ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اُتاری اور ترازو بھی۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ گھڑی قریب ہو۔ ۱۸۔ جو لوگ اس کا یقین نہیں رکھتے وہ اس کی جلدی کر رہے ہیں۔ اور جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ برحق ہے۔ یاد رکھو کہ جو لوگ اس گھڑی کے بارے میں جھگڑتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

جس طرح مادی چیزوں کو تولنے کے لیے ترازو ہوتی ہے اسی طرح معنوی حقیقتوں کو تولنے کے لیے خدا نے اپنی کتاب اتاری ہے۔ خدا کی کتاب حق اور باطل کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کسوٹی ہے۔ ہر دوسری چیز کو خدا کی کتاب پر جانچا جائے گا، نہ یہ کہ خدا کی کتاب کو دوسری چیزوں پر جانچا جانے لگے۔

پیغمبر کے زمانہ میں جو لوگ آپ کی مخالفت کر رہے تھے ان کی غلطی یہ تھی کہ ان کی قومی روایات اور ان کے اکابر کے اقوال و اعمال سے ان کے یہاں جو دین بنا تھا اس کو معیار مان کر اسی کی روشنی میں وہ خدا کی کتاب کو دیکھتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے صحیح بات یہ تھی کہ وہ قومی روایات اور بزرگوں کے اقوال و افعال کو خدا کی کتاب کی روشنی میں دیکھیں۔ جو چیز خدا کی کتاب کے معیار پر پوری اترے اس کو لیں اور جو چیز

خدا کی کتاب کے معیار پر پوری نہ اترے اس کو چھوڑ دیں۔

جانچنے کا یہ کام موجودہ دنیا میں آدمی کو خود کرنا ہے۔ آخرت میں یہ کام خدا کی طرف سے انجام دیا جائے گا۔ عقل مند وہ ہے جو قیامت میں تولے جانے سے پہلے اپنے آپ کو تول لے۔ کیونکہ قیامت کی تول آخری فیصلہ کے لیے ہوگی، نہ کہ عمل کی مہلت دینے کے لیے۔

اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ
ع۲
هُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ ﴿۱۹﴾ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ
حَرۡثَ الۡاٰخِرَۃِ نَزِدۡ لَہٗ فِیۡ حَرۡثِہٖ ۚ وَ مَنۡ
کَانَ یُرِیۡدُ حَرۡثَ الدُّنۡیَا نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا وَ مَا
لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ نَّصِیۡبٍ ﴿۲۰﴾

۱۹۔ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے۔ اور وہ قوت والا زبردست ہے۔ ۲۰۔ جو شخص آخرت کی کھیتی چاہے ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے۔ اور جو شخص دنیا کی کھیتی چاہے ہم اس کو اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

دنیا کی زندگی امتحان کے لیے ہے۔ یہاں ہر آدمی کو بقدر امتحان ضروری اسباب دئے جاتے ہیں۔ اب جو شخص آخرت پسند ہو وہ موجودہ دنیا کے اسباب کو آخرت کی تعمیر کے لیے استعمال کرے گا اور اس کے نتیجہ میں آخرت میں مزید اضافہ کے ساتھ اپنا انعام پائے گا۔

اس کے برعکس، جو شخص دنیا پسند ہو وہ صرف موجودہ دنیا کے پیش نظر عمل کرے گا۔ ایسا شخص یقیناً موجودہ دنیا میں اپنا پھل پا سکتا ہے۔ مگر آخرت میں وہ سراسر محروم رہے گا۔ جب اس نے آخرت کے لیے کچھ کیا ہی نہ تھا تو کیسے ممکن ہے کہ آخرت میں اس کو کچھ دیا جائے۔

اَمۡ لَہُمۡ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَہُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا
لَمۡ یَاۡذَنۡۢ بِہِ اللّٰہُ ؕ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃُ الۡفَصۡلِ
لَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَہُمۡ عَذَابٌ
اَلِیۡمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا
کَسَبُوۡا وَ ہُوَ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ ۚ لَہُمۡ

۲۱۔ کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ اور اگر فیصلے کی بات طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کا فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۲۲۔ تم ظالموں کو دیکھو گے کہ وہ ڈر رہے ہوں گے اس سے جو انھوں نے کمایا۔ اور وہ ان پر ضرور پڑنے والا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں

مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

گے۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے، یہی بڑا انعام ہے۔ ۲۳۔ یہ چیز ہے جس کی خوش خبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا۔ کہو کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر قرابت داری کی محبت۔ اور جو شخص کوئی نیکی کرے گا ہم اس کے لیے اس میں بھلائی بڑھا دیں گے۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا ہے، قدرداں ہے۔

جب ایک بات خدا کی کتاب سے ثابت نہ ہو، اس کے باوجود آدمی اس کے حق ہونے پر اصرار کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو خدا کے برابر ٹھہرا رہا ہے۔ وہ خدا کے سوا دوسروں کو یہ حق دے رہا ہے کہ وہ انسان کے لیے اس کا دین وضع کریں۔ یہ ایک بے حد سنگین بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''دین'' کی نوعیت کی کوئی چیز مقرر کرنے کا حق صرف ایک خدا کو ہے۔ خدا کے سوا کسی اور کو یہ حق دینا کھلا ہوا شرک ہے۔ اور شرک ایک ایسا جرم ہے جو خدا کے یہاں کسی طرح معاف ہونے والا نہیں۔

''میں تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر یہ کہ قرابت داری کی محبت'' — یہ بات پیغمبر کی زبان سے اس وقت کہلائی گئی جب کہ آپ کے قبیلہ قریش کے لوگ آپ کی دعوت کی راہ میں سخت ترین رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ ان حالات میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم میرا دین قبول نہیں کرتے تو نہ کرو مگر کم از کم قرابت داری کا لحاظ کرتے ہوئے اذیت رسانی سے تو باز رہو۔ بالفاظ دیگر، اگر تم کو مجھ سے مذہبی اختلاف ہے تو اپنے اختلاف میں تم اخلاق اور شرافت کی سطح سے نہ گر جاؤ۔ اس طرح گویا بالواسطہ انداز میں یہ بتایا گیا کہ آپ کی دعوت کے مخالفین صرف مخالفین نہیں ہیں بلکہ وہ اخلاقی مجرم بھی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اخلاق کی سطح پر غلط ثابت کر رہے ہیں جس کی اہمیت خود ان کے نزدیک بھی مسلم ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَ

۲۴۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔ پس اگر اللہ چاہے تو وہ تمھارے دل پر مہر لگا دے۔ اور اللہ باطل کو مٹاتا ہے اور حق کو ثابت کرتا ہے اپنی باتوں سے۔ بے شک وہ دلوں کی باتیں جانتا ہے۔ ۲۵۔ اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے

يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۲۶﴾

اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۲۶۔ اور وہ ان لوگوں کی دعائیں قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا۔ اور وہ ان کو اپنے فضل سے، زیادہ دے دیتا ہے۔ اور جو انکار کرنے والے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ یہاں حق حق کے روپ میں سامنے آتا ہے اور باطل باطل کے روپ میں نمایاں ہوتا ہے۔ اگر ایک جھوٹی روح ہے تو اس سے کبھی سچا کلام ظاہر نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کسی غیر پیغمبر کے لیے ممکن نہیں کہ وہ پیغمبر کی زبان میں کلام کر سکے۔ ایک شخص پیغمبر نہ ہو اور جھوٹ بول کر اپنے کو پیغمبر بتائے تو اس کے کلام میں لازماً جھوٹے پیغمبر کا انداز پیدا ہو جائے گا۔ کوئی شخص مصنوعی طور پر کبھی سچے پیغمبر کے انداز میں نہیں بول سکتا۔

''اگر اللہ چاہے تو وہ تمھارے دل پر مہر لگا دے''— اس کا مطلب بدلے ہوئے الفاظ میں یہ ہے کہ اگر تم اللہ پر جھوٹ باندھتے تو اس وقت مشیت خداوندی کے تحت تمھارے دل پر مہر لگ جاتی۔ ایسی حالت میں خود قانون قدرت کے تحت یہ ہوتا کہ تمھاری زبان اس پاکیزہ ربانی کلام کے اظہار سے عاجز ہو جاتی جس کا کھلا ہوا نمونہ تمھارے کلام میں نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر کا اعلیٰ کلام خود اس کے پیغمبر خدا ہونے کا ثبوت ہے۔ اگر وہ واقعی خدا کا پیغمبر نہ ہوتا تو اس کی زبان سے کبھی ایسا اعلیٰ کلام ظاہر نہیں ہوسکتا تھا۔

جو لوگ حق کی مخالفت کرتے ہیں وہ اپنے دل کی آواز کے تحت ایسا نہیں کرتے، بلکہ محض ضد اور عناد کے تحت اس کے مخالف بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ گویا خود اپنے ضمیر کی عدالت کے سامنے مجرم بن رہے ہیں، ان کے اوپر خدا کی حجت تمام ہو چکی ہے، اِلّا یہ کہ آدمی توبہ کرے اور اللہ سے معافی کا خواستگار ہو۔

وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَ يَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَ هُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ

۲۷۔ اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی کو کھول دیتا تو وہ زمین میں فساد کرتے۔ لیکن وہ اندازے کے ساتھ اتارتا ہے جتنا چاہتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔ ۲۸۔ اور وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہ کام بنانے والا ہے، قابلِ تعریف ہے۔ ۲۹۔ اور اُسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا۔ اور وہ جاندار جو اس

وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾

نے ان کے درمیان پھیلائے ہیں۔ اور وہ ان کو جمع کرنے پر قادر ہے جب وہ ان کو جمع کرنا چاہے۔

زمین پر انسانی زندگی کا انحصار پانی پر ہے۔ مگر پانی تمام تر خدا کے اختیار میں ہے۔ خدا اگر پانی فراہم نہ کرے تو انسان خود سے پانی حاصل نہیں کرسکتا۔ اسی طرح رزق کی تقسیم بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس تقسیم میں خدا آدمی کے ظرف کو دیکھتا ہے۔ اور ہر ایک کو اس کے ظرف کے بقدر عطا کرتا ہے۔ اگر لوگوں کو ان کے ظرف سے زیادہ دیا جانے لگے تو لوگ سرکش بن جائیں اور زمین میں ہر طرف ظلم وفساد پھیل جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کسان جب دانے کو بکھیرتا ہے تو وہ اس کو سمیٹنے پر بھی قادر ہوتا ہے۔ یہ انسانی مشاہدہ اس بات کا قرینہ ہے کہ خدا بھی اسی طرح اپنی بکھری ہوئی مخلوقات کو سمیٹ کر اپنی عدالت میں لاسکتا ہے۔ جہاں یکجائی طور پر لوگوں کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے۔ جس خالق کے لیے پیدا کرکے بکھیرنا ممکن تھا اس کے لیے موت کے بعد دوبارہ سمیٹنا کیوں ناممکن ہوجائے گا۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿٣٠﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٣١﴾

۳۰۔ اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمھارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے پہنچتی ہے، اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کردیتا ہے۔ ۳۱۔ اور تم زمین میں خدا کے قابو سے نکل نہیں سکتے۔ اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی کام بنانے والا ہے اور نہ کوئی مددگار۔

موجودہ دنیا کو اسباب کے قانون کے تحت بنایا گیا ہے۔ یہاں آدمی پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ واضح طور پر اس کی اپنی ہی کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کوتاہی کرتا ہے مگر وہ اس کے بُرے انجام سے بچ جاتا ہے۔

دنیا کے یہ واقعات اس لیے ہیں کہ آدمی ان سے سبق لے۔ جب وہ دیکھے کہ لوگ جو کچھ پارہے ہیں وہ اپنے عمل کے بقدر پارہے ہیں تو اس سے وہ یہ نصیحت لے کہ آخرت میں بھی اسی طرح ہر شخص اپنے عمل کے مطابق انجام پائے گا۔ اسی طرح جب وہ دیکھے کہ آدمی نے ایک کوتاہی کی مگر وہ اس کے انجام سے بچ گیا تو وہ اس سے یہ سبق حاصل کرے کہ خدا نہایت مہربان ہے۔ اگر آدمی اس کی طرف رجوع ہو تو وہ اپنی رحمتِ خاص سے اس کو اس کی کوتاہیوں کے انجام سے بچاسکتا ہے۔ ایمان جب گہرا ہو تو آدمی کا یہی حال ہوجاتا ہے۔ وہ دنیا کے واقعات میں آخرت کی تصویر دیکھنے لگتا ہے۔

وَ مِنۡ اٰیٰتِہِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ
کَالۡاَعۡلَامِ ﴿ؕ۳۲﴾ اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ
فَیَظۡلَلۡنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَہۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ
ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿ۙ۳۳﴾ اَوۡ
یُوۡبِقۡہُنَّ بِمَا کَسَبُوۡا وَ یَعۡفُ عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿۫۳۴﴾
وَّ یَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا
لَہُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿۳۵﴾

۳۲۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ جہاز سمندر میں چلتے ہیں جیسے پہاڑ۔ ۳۳۔ اگر وہ چاہے تو وہ ہوا کو روک دے پھر وہ سمندر کی سطح پر ٹھہرے ہوئے رہ جائیں۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر کرنے والا، شکر کرنے والا ہے۔ ۳۴۔ یا وہ ان کو تباہ کردے ان کے اعمال کے سبب سے اور معاف کردے بہت سے لوگوں کو۔ ۳۵۔ اور تا کہ جان لیں وہ لوگ جو ہماری نشانیوں میں جھگڑتے ہیں کہ ان کے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں۔

انسان سمندر میں اپنی کشتی دوڑاتا ہے اور فضا میں اپنے جہاز اڑاتا ہے۔ یہ صرف اس لیے ممکن ہوتا ہے کہ خدا نے فطرت کے قانون کو ہمارے لیے سازگار بنا رکھا ہے۔ فطرت کے قوانین اگر ہم سے سازگاری نہ کریں تو نہ ہماری کشتیاں سمندروں میں دوڑیں اور نہ ہمارے جہاز ہواؤں میں اڑیں۔

زندگی کے ہر واقعہ میں نصیحت ہے مگر واقعات سے نصیحت کی خوراک لینے کے لیے صبر وشکر کا مزاج ضروری ہے۔ زندگی میں کبھی تکلیف پیش آتی ہے اور کبھی آرام۔ تکلیف کے وقت آدمی کو ظاہری حالات سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے تا کہ وہ واقعہ کو دوسرے رخ سے دیکھ سکے۔ اور یہ چیز صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ اِسی طرح آرام کے وقت اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بظاہر اپنی کوششوں سے ملنے والی چیز کو خدا کی طرف سے ملنے والی چیز سمجھا جائے۔ اور یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کے اندر وہ اعلیٰ شعور پیدا ہوچکا ہو جس کو شکر کہا جاتا ہے۔

نشانیوں میں جھگڑنا یہ ہے کہ جب کسی واقعہ میں خدائی نصیحت کے پہلو کی نشاندہی کی جائے تو آدمی اس کو نہ مانے اور واقعہ کو دوسرے دوسرے معنی پہنانے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں سرکش ہیں اور کسی کی سرکشی صرف موجودہ دنیا میں چل سکتی ہے، وہ آخرت میں ہرگز چلنے والی نہیں۔

فَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ
الدُّنۡیَا ۚ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی لِلَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿ۚ۳۶﴾

۳۶۔ پس جو کچھ تم کو ملا ہے وہ محض دنیوی زندگی کے برتنے کے لیے ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور وہ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

آخرت کا چاہنے والا وہی بن سکتا ہے جو اللہ پر بھروسہ کرنے والا ہو۔ جب بھی آدمی آخرت کی طرف بڑھتا ہے تو دنیا کے فائدے اس کو خطرے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ دنیا کی مصلحتیں اس کو چھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی حالت میں جو چیز آدمی کو آخرت کے راستہ پر ثابت قدم رکھتی ہے وہ صرف یہ کہ اس کو خدا کے وعدوں پر بھروسہ ہو اس کو یقین ہو، کہ خدا کی خاطر وہ دنیا میں جتنا کھوئے گا اس سے بہت زیادہ وہ آخرت میں خدا کی طرف سے پائے گا۔

دنیا کی ہر نعمت وقتی ہے اور آخرت کی نعمتیں ابدی ہیں جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اور ابدی نعمت کے مقابلہ میں وقتی نعمت کی کوئی حقیقت نہیں۔

وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ
وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ۚ﴿۳۷﴾ وَالَّذِیْنَ
اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ
شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۚ﴿۳۸﴾
وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ
یَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ
فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا
یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ
فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ؕ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا
السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ
یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ
لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾ ع ۴ ۱۴ ۵

۳۷۔ اور وہ لوگ جو بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کردیتے ہیں۔ ۳۸۔ اور وہ جنھوں نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کیا اور نماز قائم کیا اور وہ اپنا کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ انھیں دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۳۹۔ اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ ۴۰۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی۔ پھر جس نے معاف کردیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمّے ہے۔ بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ ۴۱۔ اور جو شخص اپنے مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں کے اوپر کچھ الزام نہیں۔ ۴۲۔ الزام صرف ان پر ہے جو لوگوں کے اوپر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۴۳۔ اور جس شخص نے صبر کیا اور معاف کردیا تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں۔

ایمان جب حقیقی معنوں میں کسی کو حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کے اندر انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر

ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے۔ یہاں ایک بندۂ خدا کی جن خصوصیات کا ذکر ہے وہ سب وہی ہیں جو اس ایمانی شخصیت کے نتیجے میں کسی کے اندر ظاہر ہوتی ہیں۔

ایسے شخص کے اندر حقیقتِ واقعہ کے اعتراف کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ وہ خدا کے خدا ہونے اور اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ خدا کی ایک پکار بلند ہو تو اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس پر لبیک نہ کہے۔ ایمانی شعور اس کو صحیح اور غلط کے بارے میں حساس بنا دیتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو کرنا چاہئے اور وہ نہیں کرتا جو نہیں کرنا چاہئے۔

اپنی حیثیت واقعی کا اعتراف اس کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے جو اس سے غصہ، ظلم اور سرکشی کا مزاج چھین لیتا ہے، یہی تواضع اس کو مجبور کرتا ہے کہ اجتماعی معاملات میں وہ دوسروں کے مشورہ سے فائدہ اٹھائے وہ محض اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر اقدام سے پرہیز کرے۔ دوسروں کے ساتھ اس کا رشتہ خیر خواہی کا ہوتا ہے، نہ کہ ضد اور استحصال کا۔ ایسا آدمی دوسروں کے خلاف کبھی جارحیت نہیں کرتا۔ دوسروں کے خلاف وہ جب بھی اقدام کرتا ہے تو دفاع کے طور پر کرتا ہے اور اتنا ہی کرتا ہے جتنا ان کے ظلم کو روکنے کے لیے ضروری ہو۔ وہ عین اشتعال انگیز حالات میں بھی اس کے لیے تیار رہتا ہے کہ لوگوں کو معاف کر دے اور انھوں نے اس کے ساتھ جو برائی کی ہے اس کو بھول جائے۔

بندۂ مومن یہ سارے کام اپنے جذبۂ ایمان کے تحت کرتا ہے تاہم اللہ اس کی قدردانی اس طرح فرماتا ہے کہ اس کو اہلِ ہمت اور اولوالعزم کے خطاب سے نوازتا ہے، اور اس کو ابدی نعمتوں کے باغ میں داخل کر دیتا ہے۔

وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۚ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ

۴۴۔ اور جس شخص کو اللہ بھٹکا دے تو اس کے بعد اس کا کوئی کارساز نہیں۔ اور تم ظالموں کو دیکھو گے کہ جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو وہ کہیں گے کہ کیا واپس جانے کی کوئی صورت ہے۔ اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے۔ ۴۵۔ وہ ذلت سے جھکے ہوئے ہوں گے۔ چھپی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے۔ اور ایمان والے کہیں گے کہ خسارے والے وہی لوگ ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ سُن لو، ظالم لوگ دائمی عذاب میں رہیں گے۔ ۴۶۔ اور ان کے

يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ﴿۴۶﴾

لیے کوئی مددگار نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کریں۔ اور خدا جس کو بھٹکا دے تو اس کے لیے کوئی راستہ نہیں۔

اِس دنیا میں ہدایت کو دلیل کے ذریعہ کھولا جاتا ہے۔ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا قانون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں صرف وہ شخص ہدایت پاتا ہے جو اس صلاحیت کا ثبوت دے کہ وہ دلیل کی زبان میں بات کو سمجھ سکتا ہے۔ دلیل کے ذریعہ کسی بات کا ثابت ہوجانا اس کے لیے کافی ہے کہ وہ اس کے آگے جھک جائے جو لوگ دلیل سے نہ مانیں ان کو اس دنیا میں کبھی ہدایت نہیں مل سکتی۔

جو شخص موجودہ دنیا میں دلیل کے آگے نہیں جھکتا وہ اپنے آپ کو اس خطرہ میں ڈالتا ہے کہ قیامت میں اس کو خدائی طاقت کے آگے جھکایا جائے۔ مگر قیامت کا جھکنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ آدمی کو ذلیل کرنے کے لیے ہوگا، نہ کہ اس کو انعام کا مستحق بنانے کے لیے۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾

۴۷۔ تم اپنے رب کی دعوت قبول کرو اس سے پہلے کہ ایسا دن آجائے جس کے لیے خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا۔ اس دن تمھارے لیے کوئی پناہ نہ ہوگی اور نہ تم کسی چیز کو رد کرسکو گے۔ ۴۸۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے تم کو ان کے اوپر نگراں بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ تمھارا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔ اور انسان کو جب ہم اپنی رحمت سے نوازتے ہیں تو وہ اس پر خوش ہوجاتا ہے۔ اور اگر ان کے اعمال کے بدلے میں ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو آدمی ناشکری کرنے لگتا ہے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ جو صورت حال بھی اس کے سامنے آئے، وہ اس میں صحیح ردعمل پیش کرے۔ مگر انسان ایسا نہیں کرتا۔ اس کو جب کوئی کامیابی ملتی ہے تو وہ فخر و ناز کی نفسیات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اور جب وہ کسی مصیبت میں پڑتا ہے تو وہ منفی جذبات کا اظہار کرنے لگتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو دعوت حق کے مقابلہ میں صحیح ردعمل پیش نہیں کرپاتے۔ ان کا غیر حقیقت پسندانہ مزاج یہاں بھی ان کو غیر حقیقت پسند بنا دیتا ہے۔ دعوت حق کا صحیح ردعمل یہ ہے کہ آدمی فوراً اس کی حقانیت کا اعتراف کرلے۔ مگر آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ اس کو اپنی ساکھ کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دعوت کو مان کریں اس کو

پیش کرنے والے کے سامنے چھوٹا ہو جاؤں گا۔ یہ احساس اس کے لیے حق کو قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ اس کی صداقت پر یقین کرنے کے باوجود اپنی ذاتی مصلحتوں کی بنا پر اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

۴۹۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے۔ ۵۰۔ یا ان کو جمع کر دیتا ہے بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی۔ اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ بے شک وہ جاننے والا ہے، قدرت والا ہے۔

دین کی اساس اس تصور پر قائم ہے کہ اس کائنات میں ہر قسم کا اختیار صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں، خواہ وہ زمین وآسمان کے نظام کو چلانا ہو یا ایک انسان کو اولاد عطا کرنا۔ آدمی جو کچھ پاتا ہے خدا کے دئے سے پاتا ہے اور وہی جب چاہتا ہے اس کو اس سے چھین لیتا ہے۔

خدا کے بارے میں یہ عقیدہ ہی آدمی کے اندر وہ صحیح احساس پیدا کرتا ہے جس کو ''عبدیت'' کہا جاتا ہے اور خدا کے بارے میں یہ عقیدہ ہی آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اس روش کو اپنائے جس کا الٰہی شریعت میں حکم دیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾

۵۱۔ اور کسی آدمی کی یہ طاقت نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کسی فرشتے کو بھیجے کہ وہ وحی کر دے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ بے شک وہ سب سے اوپر ہے، حکمت والا ہے۔ ۵۲۔ اور اسی طرح ہم نے تمھاری طرف بھی وحی کی ہے، ایک روح اپنے حکم سے۔ تم نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا، اس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور بے شک تم ایک سیدھے راستے

صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَی اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ ع

کی طرف رہنمائی کررہے ہو۔ ۵۳۔ اس اللہ کے راستے کی طرف جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔سن لو، سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

موجودہ دنیا میں کوئی انسان براہِ راست خدا سے ہم کلام نہیں ہوسکتا۔ انسان کا عجز اس قسم کے کلام میں مانع ہے۔ چنانچہ پیغمبروں پر خدا کا جو کلام اترا وہ بالواسطہ انداز میں اترا۔ بالواسطہ خطاب کے کئی طریقے ہیں ان کی مثالیں مختلف پیغمبروں کی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔

ایک عالم جب کوئی کتاب لکھتا ہے یا ایک مفکر جب کوئی کلام پیش کرتا ہے تو اس کے ماضی میں ایسے اسباب موجود ہوتے ہیں جو اس کے علمی اور فکری کارنامہ کی توجیہہ کرسکیں۔ مگر پیغمبر کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ پیغمبر کی نبوت کے بعد کی زندگی اس کی نبوت سے پہلے کی زندگی سے سراسر مختلف ہوتی ہے۔ غیر پیغمبر کا حال کا کلام اس کی ماضی کی زندگی کا تسلسل نظر آتا ہے۔ مگر پیغمبر کی زبان سے بعد از نبوت جو کلام جاری ہوتا ہے وہ اس کے قبل از نبوت کلام سے اتنا زیادہ ممتاز ہوتا ہے کہ پیغمبر کے ماضی سے اس کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ یہ ایک واضح قرینہ ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ پیغمبر کا کلام خدائی کلام ہے، نہ کہ عام انسانی کلام۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ کا دیا ہوا قرآن اور آپ کی اپنی زبان سے نکلا ہوا کلام، دونوں آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔ کوئی شخص جو عربی زبان جانتا ہو اور وہ ان دونوں کو تقابلی طور پر دیکھے تو وہ دونوں کے درمیان کھلا ہوا فرق پائے گا۔ حدیث کی زبان واضح طور پر محمد بن عبد اللہ کی زبان ہے اور قرآن کی زبان واضح طور پر خدا کی زبان۔

۴۳۔ سُوْرَةُ الزُّخْرُف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ ﴿۴﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ حٰمٓ۔ ۲۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی۔ ۳۔ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۴۔ اور بے شک یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے، بلند اور پر حکمت۔

اُمّ الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ لوح محفوظ میں اللہ تعالیٰ نے اس اصل دین کو ثبت کر رکھا ہے جو اس کو انسانوں سے مطلوب ہے۔ یہی اصل دین مختلف زبانوں میں مختلف پیغمبروں پر اترا۔

اور وہ پیغمبر آخر الزماں پر عربی زبان میں اتارا گیا۔ اب عربی قرآن ہی موجودہ دنیا میں اصل دینِ خداوندی کا نمائندہ ہے۔ حاملینِ قرآن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو ہر زبان میں منتقل کرکے اسے تمام قوموں تک پہنچائیں تاکہ اس دین کو جس طرح عربوں نے سمجھا اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس کو سمجھ سکیں۔

قرآن کا بلند اور پر حکمت ہونا اس کے کتاب الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ قرآن کی زبان اور اس کے مضامین خدائی عظمت کے ہم سطح ہیں، اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ قرآن اگر انسانی کلام ہوتا تو اس میں وہ غیر معمولی عظمت نہ پائی جاتی جو اب اس میں پائی جارہی ہے۔

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ ﴿۵﴾ وَكَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِىٍّ فِى الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۶﴾ وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۷﴾ فَاَهۡلَكۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۸﴾

۵۔ کیا ہم تمھاری نصیحت سے اس لیے صرف نظر کرلیں گے کہ تم حد سے گزرنے والے ہو۔ ۶۔ اور ہم نے اگلے لوگوں میں کتنے ہی نبی بھیجے۔ ۷۔ اور ان لوگوں کے پاس کوئی نبی نہیں آیا جس کا انھوں نے مذاق نہ اُڑایا ہو۔ ۸۔ پھر جو لوگ ان سے زیادہ طاقت ور تھے ان کو ہم نے ہلاک کردیا۔ اور اگلے لوگوں کی مثالیں گزر چکیں۔

آج دنیا میں بے شمار ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو پچھلے پیغمبروں کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ان پیغمبروں کا (بشمول پیغمبر اسلام) ان کے ہم زمانہ لوگوں نے مذاق کیوں اڑایا۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پچھلے لوگ وحشی تھے اور آج کے لوگ مہذب ہیں۔ یہ صرف زمانہ کا فرق ہے۔ آج لمبی مدت گزرنے کے بعد ہر پیغمبر کے ساتھ تاریخی عظمت کا زور شامل ہو چکا ہے۔ اس لیے آج ہر ظاہر بیں پیغمبر کو پہچان لیتا ہے۔ مگر پیغمبر اپنے زمانہ کے لوگوں کو صرف ایک عام انسان نظر آتا تھا۔ اس وقت پیغمبر کی پیغمبرانہ حیثیت کو پہچاننے کے لیے حقیقت بیں نگاہ درکار تھی۔ اور بلا شبہ حقیقت بیں نگاہ دنیا میں ہمیشہ سب سے کم پائی گئی ہے۔

دعوت حق کے مخاطبین خواہ کتنا ہی زیادہ غلط رویہ اختیار کریں، داعی یک طرفہ طور پر صبر کرتے ہوئے اپنے دعوتی عمل کو جاری رکھتا ہے۔ تاآنکہ وہ وقت آجائے جب کہ خدا اپنی طرف سے کوئی فیصلہ فرمادے۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ الۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۹﴾ الَّذِىۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا وَّجَعَلَ لَكُمۡ فِيۡهَا

۹۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ ان کو زبردست، جاننے والے نے پیدا کیا۔ ۱۰۔ جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنایا۔ اور اس میں

سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٠﴾ وَالَّذِيْ نَزَّلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً
مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿١١﴾ وَالَّذِيْ خَلَقَ
الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ
وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿١٢﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى
ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا
اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ
سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿١٣﴾ وَاِنَّآ
اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿١٤﴾

تمھارے لیے راستے بنائے تا کہ تم راہ پاؤ۔ ۱۱۔اور جس نے آسمان سے پانی اُتارا ایک اندازے کے ساتھ۔ پھر ہم نے اس سے مُردہ زمین کو زندہ کر دیا، اسی طرح تم نکالے جاؤ گے۔ ۱۲۔ اور جس نے تمام قسمیں بنائیں اور تمھارے لیے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ ۱۳۔ تا کہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر بیٹھو۔ پھر تم اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو جب کہ تم ان پر بیٹھو۔ اور کہو کہ پاک ہے وہ جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا۔ اور ہم ایسے نہ تھے کہ ان کو قابو میں کرتے۔ ۱۴۔ اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

ہر زمانہ میں بیشتر انسان یہ مانتے رہے ہیں کہ کائنات کا خالق و مالک خدا ہے اور وہی ہے جس نے ہمیں زندگی کے تمام سامان دئے ہیں۔ کائنات کو وجود میں لانا اور زمین پر سامانِ حیات کی فراہمی اتنا بڑا کام ہے کہ کسی شخص کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اس کو ایک خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکے۔

اس اقرار کا تقاضا ہے کہ انسان سب سے زیادہ خدا کی طرف متوجہ ہو۔ اس کی زندگی خدا رخی زندگی ہو جائے۔ مگر انسان دوسری چیزوں کو اپنا مقصود بناتا ہے، وہ غیر خدا کو اپنی توجہات کا مرکز ٹھہرا لیتا ہے۔

اللہ تعالی نے حقیقت کو اپنے پیغمبروں کے ذریعہ کھولا ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے دنیا کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ وہ حقائق معنوی کی عملی تمثیل بن گئی ہے۔ مثلاً یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو مر کر دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ اس حقیقت کو نباتات کی سطح پر بار بار دکھایا جا رہا ہے۔ انسان ہر سال یہ دیکھتا ہے کہ زمین خشک ہو گئی۔ اس کے بعد بارش ہوتی ہے اور زمین دوبارہ سرسبز ہو جاتی ہے۔ یہ ایک اشارہ ہے کہ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

موجودہ دنیا کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ حیرت انگیز طور پر انسان کے موافق ہے۔ یہاں کی تمام چیزیں اس انداز پر بنائی گئی ہیں کہ انسان ان کو جس طرح چاہے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ جب خدا کی دنیا کی کسی چیز کو اپنے لیے استعمال کرے تو اس کا دل خدا کے آگے جھک جائے، اس کی زبان سے اعتراف و دعا کے کلمات ابلنے لگیں۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ ع ۱۵
بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ اِذَا بُشِّرَ
اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ
وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَ مَنْ
يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ
مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ
عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ
سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

۱۵۔ اور ان لوگوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا جزء ٹھہرایا۔ بے شک انسان کھلا ہوا ناشکرا ہے۔ ۱۶۔ کیا خدا نے اپنی مخلوقات میں سے بیٹیاں پسند کیں اور تم کو بیٹوں سے نوازا۔ ۱۷۔ اور جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خبر دی جاتی ہے جس کو وہ رحمٰن کی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ ۱۸۔ کیا وہ جو آرائش میں پرورش پائے اور جھگڑے میں بات نہ کہہ سکے۔ ۱۹۔ اور فرشتے جو رحمان کے بندے ہیں ان کو انھوں نے عورت قرار دے رکھا ہے۔ کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے۔ ان کا یہ دعویٰ لکھ لیا جائے گا اور ان سے پوچھ ہوگی۔

خدا کے ساتھ غیر خدا کو شریک کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کسی کو خدا کا شریک ذات ٹھہرائے مثلاً فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں ماننا، حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بتانا، یا وحدت الوجود کا نظریہ جو تمام چیزوں کو خدا کے اجزاء قرار دے کر کائنات کی تشریح کرتا ہے۔ اس قسم کے تمام عقیدے محض بے بنیاد مفروضے ہیں۔ ان کے حق میں کوئی بھی حقیقی دلیل موجود نہیں۔

یہاں عورت کی صنفی خصوصیات کو دو جامع لفظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ وہ طبعاً آرائش پسند ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مقابلہ کے وقت پُرزور انداز میں کلام نہیں کر پاتی۔ عورت کے اندر یہ صنفی کمی ایک حقیقت ہے اور اسی بنا پر اسلام میں یہ تقسیم کی گئی ہے کہ مرد بیرونی کام کا ذمہ دار ہے اور عورت اندرونی کام کی ذمہ دار۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ
بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾
اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ
مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ
اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ
مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ

۲۰۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔ ان کو اس کا کوئی علم نہیں۔ وہ محض بے تحقیق بات کر رہے ہیں۔ ۲۱۔ کیا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے تو انھوں نے اس کو مضبوط پکڑ رکھا ہے۔ ۲۲۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔ ۲۳۔ اور

قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع ۲ ۸ النصف

اسی طرح ہم نے تم سے پہلے جس بستی میں کوئی نذیر بھیجا تو اس کے خوش حال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان کے پیچھے چلے جارہے ہیں۔ ۲۴۔ نذیر نے کہا، اگرچہ میں اس سے زیادہ صحیح راستہ تمھیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ ۲۵۔ تو ہم نے ان سے انتقام لیا، پس دیکھو کہ کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔

موجودہ دنیا میں انسان جو بھی کام کرنا چاہتا ہے وہ اس کے مواقع پالیتا ہے۔ اس سے اکثر لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں صحیح کر رہے ہیں۔ اگر وہ غلطی پر ہوتے تو وہ اپنے طریقہ کو چلانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ اس قسم کی باتیں اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جن کو خوش حال طبقہ کہا جاتا ہے۔

مگر یہ زبردست غلط فہمی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر طریقہ کا چل پڑنا اس لیے ہے کہ یہاں امتحان کی آزادی ہے۔ آخرت کی دنیا میں امتحان کی مدت ختم ہوجائے گی۔ اس لیے وہاں کسی کے لیے یہ موقع بھی باقی نہ رہے گا۔

ہر دور میں پیغمبروں کے دین کا مقابلہ سب سے زیادہ آبائی دین سے پیش آیا ہے۔ ''آباء'' قوموں کی نظر میں اکابر کا درجہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں وقت کا پیغمبر انھیں اصاغر میں سے نظر آتا ہے اس بنا پر ان کے لیے ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ بڑوں کے دین کو چھوڑ کر چھوٹے کے دین کو اختیار کرلیں۔ مگر انھیں ''چھوٹوں'' کی تکذیب پر ان قوموں پر وہ عذاب آیا جس کے متعلق ان کا گمان تھا کہ وہ صرف ''بڑوں'' کی تکذیب پر آسکتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ ۙ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ

۲۶۔ اور جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ ۲۷۔ مگر وہ جس نے مجھ کو پیدا کیا، پس بے شک وہ میری رہنمائی کرے گا۔ ۲۸۔ اور ابراہیم یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع

رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٩﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ
قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٠﴾

کریں۔ ۲۹۔ بلکہ میں نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا کا سامان دیا یہاں تک کہ ان کے پاس حق آیا اور رسول کھول کر سنادینے والا۔ ۳۰۔ اور جب ان کے پاس حق آ گیا، انھوں نے کہا کہ یہ جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جس کلمۂ توحید کا ذکر ہے وہ ان کی دعوتی زندگی کے آخری دور میں نکلا تھا۔ یہ کلمہ محض چند الفاظ کا مجموعہ نہ تھا۔ وہ ایک عظیم تاریخ کا خلاصہ تھا۔ حضرت ابراہیم جب سن شعور کو پہنچے تو انھیں یہ دریافت ہوئی کہ انسان کا معبود صرف ایک ہے۔ اس کے سوا تمام معبود باطل اور بے حقیقت ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کی تعمیر اسی عقیدہ پر کی۔ خاندان اور قوم کے اندر اسی کی تبلیغ کی۔ وہ کسی مصلحت کا لحاظ کیے بغیر لمبی مدّت تک اس پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ ان کا موحد ہونا ہی ان کی حیثیتِ عرفی بن گیا۔ اس طرح کی ایک لمبی زندگی گزارنے کے بعد جب وہ مذکورہ کلمہ کہہ کر اپنے وطن سے روانہ ہوئے تو ان کا کلمہ قدرتی طور پر کلمۂ باقیہ بن گیا۔ وہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ حضرت ابراہیم کا ذکر آتے ہی وہ لوگوں کو یاد آجاتا تھا۔

حضرت ابراہیم کی اس طاقت ورروایت کو ان کے بعد کی نسل میں نشانِ راہ کا کام دینا چاہئے تھا۔ مگر دنیا کی دلچسپیوں نے بعد کے لوگوں کو اس سے غافل کر دیا۔ حتی کہ وہ اس معاملے میں اتنے بے شعور ہو گئے کہ بعد کے زمانہ میں جب خدا کا ایک بندہ انھیں ان کا ماضی کا سبق یاد دلانے کے لیے اٹھا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ
مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ
رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ
مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا
بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ
بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ
خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٣٢﴾ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ
النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ

۳۱۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُتارا گیا۔ ۳۲۔ کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ان کی روزی کو تو ہم نے تقسیم کیا ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے تا کہ وہ ایک دوسرے سے کام لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ ۳۳۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو جو لوگ رحمن کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے ہم ان

بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ ع

کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنادیتے اور زینے بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں۔ ۳۴۔ اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی اور تخت بھی جن پر وہ تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔ ۳۵۔ اور سونے کے بھی، اور یہ چیزیں تو صرف دنیا کی زندگی کا سامان ہیں اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے۔

پیغمبر اسلام جب مکہ میں ظاہر ہوئے تو اس وقت وہ لوگوں کو ایک معمولی انسان نظر آتے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ خدا کو اگر اپنا کوئی نمائندہ ہماری ہدایت کے لیے بھیجنا تھا تو اس نے عرب کی مرکزی بستیوں (مکہ اور طائف) کی کسی عظیم شخصیت کو اس کے لیے کیوں نہیں چنا۔ مگر یہ ان کی نظر کی کوتاہی تھی۔ انسان صرف حال کو دیکھ پاتا ہے جب کہ پیغمبر اسلام کی عظمت کو سمجھنے کے لیے مستقبل کو دیکھنے والی نظر درکار تھی۔ چونکہ لوگوں کو اس قسم کی دوربیں نظر حاصل نہ تھی، وہ پیغمبر اسلام کی عظمت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔

پیغمبر اسلام کو کم سمجھنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی زندگی میں مادی چیزوں کی رونق لوگوں کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ مگر ان مادی چیزوں کی خدا کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیزیں خدا کی نظر میں اتنی غیر اہم ہیں کہ وہ چاہے تو لوگوں کو سونے چاندی کا ڈھیر دے دے۔ مگر خدا نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ لوگ انھیں چیزوں میں اٹک کر رہ جائیں گے۔ وہ اس سے آگے بڑھ کر حقیقت کو نہ پاسکیں گے۔

وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

۳۶۔ اور جو شخص رحمن کی نصیحت سے اعراض کرتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ ۳۷۔ اور وہ ان کو راہِ حق سے روکتے رہتے ہیں۔ اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ ۳۸۔ یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آئے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب کی دوری ہوتی۔ پس کیا ہی برا ساتھی تھا۔ ۳۹۔ اور جب کہ تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تم کو کچھ بھی فائدہ نہیں دے گی کہ تم عذاب میں ایک دوسرے کے شریک ہو۔

نصیحت سے اعراض کرنا یہ ہے کہ آدمی حقیقت کا اعتراف نہ کرے۔ خدائی حقیقت اس کے سامنے

ایسے دلائل کے ساتھ آئے جس کا وہ انکار نہ کرسکتا ہو مگر وہ اپنی مصلحتوں کے تحفظ کی خاطر اس کو نظرانداز کردے۔

ایسا شخص اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لیے اس کے خلاف جھوٹی باتیں کرتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ شیطان کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اس کے اوپر مسلط ہوجائے، وہ اس کی عقل کو غلط رخ پر دوڑانے لگے۔ فرضی توجیہات میں مشغول کرکے شیطان اس کو یقین دلاتا رہتا ہے کہ تم حق پر ہو۔ یہ فریب صرف اس وقت ٹوٹتا ہے جب کہ آدمی کی موت آتی ہے اور وہ خدا کے سامنے آخری حساب کے لیے کھڑا کردیا جاتا ہے۔

دنیا میں آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ اس کو اپنا دوست اور ساتھی بنالیتا ہے جو اس کے جھوٹ کی تائید کرے۔ مگر آخرت میں وہ ایسے تمام ساتھیوں پر لعنت کرے گا۔ وہ چاہے گا کہ وہ اس سے اتنا دور ہوجائیں کہ وہ نہ ان کی شکل دیکھے اور نہ ان کی آواز سنے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ
مَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ
بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ
الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ
مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ
اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَ
اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَ سَوْفَ
تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ
ع الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ ع

۴۰۔ پس کیا تم بہروں کو سناؤ گے یا تم اندھوں کو راہ دکھاؤ گے اور ان کو جو کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ ۴۱۔ پس اگر ہم تم کو اٹھالیں تو ہم ان سے بدلہ لینے والے ہیں۔ ۴۲۔ یا تم کو دکھادیں گے وہ چیز جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ پس ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں۔ ۴۳۔ پس تم اس کو مضبوطی سے تھامے رہو جو تمھارے اوپر وحی کیا گیا ہے۔ بے شک تم ایک سیدھے راستے پر ہو۔ ۴۴۔ اور یہ تمھارے لیے اور تمھاری قوم کے لیے نصیحت ہے۔ اور عنقریب تم سے پوچھ ہوگی۔ ۴۵۔ اور جن کو ہم نے تم سے پہلے بھیجا ہے ان سے پوچھ لو کہ کیا ہم نے رحمن کے سوا دوسرے، معبود ٹھہرائے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے۔

آنکھ والا اپنی آنکھ کو بند کرلے تو اس کو کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ کان والا اپنے کان کو بند کرلے تو اس کو کچھ سنائی نہیں دے گا۔ اسی طرح جو شخص اپنی عقل کو استعمال نہ کرے، وہ عقل کو معطل کرکے اپنی خواہش کے رخ پر چلنے لگے تو ایسے شخص کو سمجھانا بجھانا بالکل بےکار رہتا ہے۔ سمجھنے کا کام عقل کے ذریعہ ہوتا ہے اور اپنی عقل کے اوپر اس نے اپنی خواہشات کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ تاہم مدعو کا رویہ خواہ کچھ بھی ہو، داعی کو اپنا دعوتی کام ہر حال میں جاری رکھنا ہے، یہاں تک کہ اتمام حجت کے مرحلے تک پہنچ جائے۔

حق کا داعی اگرچہ ایک انسان ہوتا ہے مگر حق کا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ آدمی حق کے داعی کا انکار کر کے سمجھتا ہے کہ وہ حق کی زد سے بچ گیا۔ حالانکہ عین اسی وقت وہ خدا کی زد میں آجاتا ہے۔ آدمی اگر اس راز کو جانے تو وہ حق کے داعی کو نظر انداز کرتے ہوئے کانپ اٹھے گا۔ کیونکہ وہ جانے گا کہ حق کے داعی کو نظر انداز کرنا خود حق کو نظر انداز کرنا ہے اور حق کو نظر انداز کرنا خدا کو نظر انداز کرنا ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٦﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۡ وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٤٩﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿٥٠﴾

۴۶۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے امراء کے پاس بھیجا تو اس نے کہا کہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں۔ ۴۷۔ پس جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ اس پر ہنسنے لگے۔ ۴۸۔ اور ہم ان کو جو نشانیاں دکھاتے تھے وہ پہلی نشانی سے بڑھ کر ہوتی تھیں۔ اور ہم نے ان کو عذاب میں پکڑا تاکہ وہ رجوع کریں۔ ۴۹۔ اور انھوں نے کہا کہ اے جادوگر، ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو، اس عہد کی بنا پر جو اس نے تم سے کیا ہے، ہم ضرور راہ پر آجائیں گے۔ ۵۰۔ پھر جب ہم نے وہ عذاب ان سے ہٹا دیا تو انھوں نے اپنا عہد توڑ دیا۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اور عصا اور یدِ بیضا کا معجزہ دکھایا۔ اس کو دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری ہنسنے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے موسیٰ کو ان کی دعوت میں نہیں دیکھا بلکہ ان کی شخصیت میں دیکھا۔ انھیں نظر آیا کہ موسیٰ کی شخصیت بظاہر ان کی اپنی شخصیت سے کم ہے۔ اسی طرح معجزہ کے متعلق انھوں نے خیال کیا کہ یہ محض جادو ہے، اور ایسا جادو ملک کے دوسرے جادوگر بھی دکھا سکتے ہیں۔

حق کی دعوت کے سلسلے میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ لوگ داعی کی شخصیت کو دیکھ کر دعوت کو رد کر دیتے ہیں۔ وہ نشانیوں کو عام واقعات پر قیاس کر کے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

فرعون اور اس کے ساتھیوں نے جب حضرت موسیٰ کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بہت سے تنبیہی عذاب بھیجے تاکہ وہ دوبارہ رجوع کریں۔ ان تنبیہی عذابوں کا ذکر سورۂ اعراف (35-133) میں موجود ہے۔ یہ تمام عذاب حضرت موسیٰ کی دعا پر آئے اور حضرت موسیٰ کی دعا پر ختم ہوئے۔ یہ ایک مزید سبب تھا کہ ان کے

اندر رجوع کی کیفیت پیدا ہو۔ مگر وہ رجوع نہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دلیل سے نہ مانیں وہ سے بھی نہیں مانتے، اِلّا یہ کہ آخرت کا نہ لوٹنے والا عذاب انھیں آخری طور پر اپنے گھیرے میں لے لے۔

وَ نَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ۬ وَّ لَا یَكَادُ یُبِیْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْ لَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ ﴿۵۶﴾ ع ۵ ۱۱

۵۱۔ اور فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا کہ اے میری قوم، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے، اور یہ نہریں جو میرے نیچے بہہ رہی ہیں۔ کیا تم لوگ دیکھتے نہیں۔ ۵۲۔ بلکہ میں بہتر ہوں اس شخص سے جو کہ حقیر ہے۔ اور صاف بول نہیں سکتا۔ ۵۳۔ پھر کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن آپڑے یا فرشتے اس کے ساتھ جمع ہو کر آتے۔ ۵۴۔ پس اس نے اپنی قوم کو بے عقل کر دیا۔ پھر انھوں نے اس کی بات مان لی۔ یہ نافرمان قسم کے لوگ تھے۔ ۵۵۔ پھر جب انھوں نے ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا۔ اور ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔ ۵۶۔ پھر ہم نے ان کو ماضی کی داستان بنا دیا اور دوسروں کے لیے ایک نمونۂ عبرت۔

حق کا انکار کرنے والوں نے ہمیشہ حق کے داعی کی معمولی حیثیت کو دیکھ کر حق کا انکار کیا ہے۔ مصر میں فرعون کی حیثیت یہ تھی کہ وہ ملک کا حکمراں تھا۔ دریائے نیل سے نکلی ہوئی نہریں اس کے حکم سے جاری تھیں۔ عزت کے تمام سروسامان اس کے گرد جمع تھے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت موسی بظاہر ایک معمولی انسان دکھائی دیتے تھے۔ اسی فرق کو پیش کر کے فرعون نے اپنی قوم کو بہکایا۔ حضرت موسی کا انکار کرنے میں قوم اس کے ساتھ ہو گئی۔

بظاہر اسی قسم کے دلائل کی بنیاد پر فرعون کی قوم نے فرعون کا ساتھ دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ قوم کی اپنی کمزوری تھی، نہ کہ فرعون کے دلائل کی مضبوطی۔ اس وقت حضرت موسی کا ساتھ دینا اپنی زندگی کے بنے بنائے نقشہ کو توڑنا تھا۔ اور بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بنے ہوئے نقشہ کو توڑ کر حق کا ساتھ دینے کی جرأت کریں۔ چنانچہ فرعون پر جب انکار حق کے نتیجہ میں خدا کا عذاب آیا تو اس کی قوم بھی اسی کے ساتھ عذاب الٰہی کی زد میں آ گئی۔

وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ
مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿٥٧﴾ وَ قَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ
هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ
قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿٥٨﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا
عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ ﴿٥٩﴾
وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي
الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ
فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ
مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ وَ لَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ
لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾

۵۷۔ اور جب ابن مریم کی مثال دی گئی تو تمھاری قوم کے لوگ اس پر چلا اُٹھے۔ ۵۸۔ اور انھوں نے کہا کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ۔ یہ مثال وہ تم سے صرف جھگڑنے کے لیے بیان کرتے ہیں۔ بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔ ۵۹۔ عیسیٰ تو بس ہمارا ایک بندہ تھا جس پر ہم نے فضل فرمایا اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ایک مثال بنا دیا۔ ۶۰۔ اور اگر ہم چاہیں تو تمھارے اندر سے فرشتے بنا دیں۔ جو زمین میں تمھارے جانشیں ہوں۔ ۶۱۔ اور بے شک عیسیٰ قیامت کا ایک نشان ہیں، تو تم اس میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ ۶۲۔ اور شیطان تم کو اس سے روکنے نہ پائے، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

موجودہ دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آدمی ہر بات کا الٹا مفہوم نکال سکے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا: لَيْسَ أَحَدٌ يُعْبَدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ فِيهِ خَيْرٌ (اللہ کے سوا جس کی پرستش کی جائے اس میں کوئی خیر نہیں) اس کو سن کر مخالفین نے کہا کہ عیسائی لوگ مسیح کو پوجتے ہیں پھر کیا مسیح میں کوئی خیر نہیں (مسند احمد، حدیث نمبر 2918)۔ ظاہر ہے کہ یہ محض ایک شوشہ تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی تھی وہ عابد کی نسبت سے تھی نہ کہ معبود کی نسبت سے، اور اگر اس کو معبود کی نسبت سے مانا جائے تب بھی واضح طور پر اس سے مراد وہ غیر معبود تھے جو اپنے معبود بنائے جانے پر راضی ہوں۔ آدمی اگر بات کو اس کے صحیح رخ سے نہ لے تو ہر بات کو وہ الٹے معنی پہنا سکتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی درست بات کیوں نہ ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت ایک اعتبار سے فرشتوں کے مشابہ تھی۔ اس پر آنجناب کو بہت سے لوگوں نے معبود بنالیا۔ مگر حضرت مسیح کی ملکوتی تخلیق خدا کی قدرت کی مثال تھی نہ کہ خود حضرت مسیح کی ذاتی قدرت کی مثال۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے لیے اس قسم کی تخلیق کچھ بھی مشکل نہیں۔ وہ چاہے تو زمین کی تمام آبادی کو فرشتوں کی آبادی بنا دے۔ پھر بھی یہ فرشتے فرشتے ہی رہیں گے، وہ معبود نہیں ہو جائیں گے۔

حضرت مسیح کو یہ معجزہ دیا گیا کہ وہ مُردہ کو زندہ کر دیتے تھے۔ مٹی کے پتلے میں پھونک مار کر اسے جاندار بنا دیتے تھے۔ یہ دراصل ایک خدائی نشانی تھی جو زندگی بعد موت کے امکان کو بتانے کے لیے ظاہر کی گئی تھی۔ مگر لوگوں نے اس سے اصل سبق تو نہیں لیا۔ البتہ حضرت مسیح کو فوق البشر سمجھ کر انھیں پوجنے لگے۔ اسی طرح

خدائی نشانیاں ہمیشہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کو اگر نشانی سمجھا جائے تو ان سے زبردست نصیحت ملتی ہے۔ اور اگر انھیں نشانی کے بجائے کچھ اور سمجھ لیا جائے تو وہ آدمی کو صرف گمراہی میں ڈالنے کا سبب بن جائیں گی۔

شیطان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ خدائی نشانیوں سے آدمی کو سبق نہ لینے دے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ فیصلہ ہونے والا ہے کہ شیطان کو آدمی کے اوپر کامیابی حاصل ہوئی یا آدمی کو شیطان کے اوپر۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾

۶۳۔ اور جب عیسیٰ کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ آیا، اس نے کہا کہ میں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں تم پر واضح کردوں بعض باتیں جن میں تم اختلاف کررہے ہو۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۶۴۔ بے شک اللہ ہی میرا رب ہے اور تمھارا رب بھی، تو تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ ۶۵۔ پھر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا، ایک دردناک دن کے عذاب سے۔

یہاں حکمت سے مراد دین کی روح ہے اور صراط مستقیم سے مراد وہی چیز ہے جس کو آیت میں خدا کا خوف، اس کی عبادت اور رسول کی اطاعت کہا گیا ہے۔ یہی اصل دین ہے۔ یہود نے بعد کو یہ کیا کہ انھوں نے روح دین کھودی اور دین کے بنیادی احکام میں موشگافیوں کے ذریعے بے شمار نئے نئے مسائل پیدا کیے۔ یہ مسائل آج بھی یہود کی کتابوں میں موجود ہیں۔

انھیں خود ساختہ اضافوں کی وجہ سے ان کے اندر اختلافی فرقے بنے۔ کسی نے ایک اختلافی مسئلہ پر زور دیا، کسی نے دوسرے اختلافی مسئلہ پر۔ اس طرح ان کے یہاں ایک دین کئی دین بن گیا۔ حضرت مسیح اس لیے آئے کہ وہ یہود کو بتائیں کہ دین میں اصل اہمیت روح کی ہے، نہ کہ ظواہر کی۔ اور یہ کہ آدمی کو نجات جس چیز پر ملے گی وہ اس دین کی پیروی پر ملے گی جو خدا نے بھیجا ہے، نہ کہ اس دین پر جو تم لوگوں نے بطور خود وضع کر رکھا ہے۔

حضرت مسیح نے بتایا کہ اصل دین یہ ہے کہ تم اللہ سے ڈرو۔ صرف ایک اللہ کے عبادت گزار بنو۔ زندگی کے معاملات میں رسول کے نمونہ کی پیروی کرو۔ اس کے سوا تم نے اپنی بحثوں اور موشگافیوں سے جو بے شمار مسائل بنا رکھے ہیں وہ تمھارے اپنے اضافے ہیں۔ ان اضافوں کو چھوڑ کر اصل دین پر قائم ہو جاؤ —— حضرت مسیح کی یہ باتیں آج بھی انجیلوں میں موجود ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٦﴾ اَلْاَخِلَّآءُ
يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا
الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَ ع ٦ ١١ ١٢
لَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ
وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ
بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا
تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٧١﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ
اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٢﴾ لَكُمْ فِيْهَا
فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٣﴾

٦٦۔ یہ لوگ بس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان پر اچانک آپڑے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ ٦٧۔ تمام دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، بجز ڈرنے والوں کے۔ ٦٨۔ اے میرے بندو، آج تم پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہوگے۔ ٦٩۔ جو لوگ ایمان لائے اور فرماں بردار رہے۔ ٧٠۔ جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمھاری بیویاں، تم شاد کیے جاؤ گے۔ ٧١۔ ان کے سامنے سونے کی رکابیاں اور پیالے پیش کیے جائیں گے۔ اور وہاں وہ چیزیں ہوں گی جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی۔ اور تم یہاں ہمیشہ رہو گے۔ ٧٢۔ اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنا دئے گئے اس کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔ ٧٣۔ تمھارے لیے اس میں بہت سے میوے ہیں جن میں سے تم کھاؤ گے۔

انسان آزاد نہیں ہے۔ اس کو بہر حال حقیقت کے آگے جھکنا ہے۔ اگر وہ داعی کی دلیل کے آگے نہیں جھکتا تو اس کو خدائی طاقت کے آگے جھکنا پڑے گا۔ مگر خدائی طاقت فیصلہ کے لیے ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے اس وقت کا جھکنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

دنیا میں آدمی جب حق کے خلاف رویہ اختیار کرتا ہے تو اس کو بہت سے دوست مل جاتے ہیں جو اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ آدمی ان دوستوں کے بل پر ڈھیٹ بنتا چلا جاتا ہے۔ مگر یہ سارے دوست قیامت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ قیامت میں صرف وہ دوستی باقی رہے گی جو اللہ کے خوف کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔

دنیا میں حق پرستی کی زندگی خطرات میں گھری ہوئی ہوتی ہے۔ مگر آخرت میں اس کا بدلہ اس شان دار صورت میں ملے گا کہ آدمی وہاں ہر قسم کے اندیشے اور تکلیف سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لے گا۔ اس خدائی وعدہ پر جو لوگ یقین کریں وہی موجودہ دنیا میں حق پر قائم رہ سکیں گے۔ خدا آخرت میں انھیں وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ دے دے گا جو انھوں نے دنیا میں خدا کی خاطر کھویا تھا۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾

۷۴۔ بے شک مجرم لوگ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں رہیں گے۔ ۷۵۔ وہ ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اس میں مایوس پڑے رہیں گے۔ ۷۶۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی ظالم تھے۔ ۷۷۔ اور وہ پکاریں گے کہ اے مالک، تمھارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ فرشتہ کہے گا تم کو اسی طرح پڑے رہنا ہے۔ ۷۸۔ ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے مگر تم میں سے اکثر لوگ حق سے بیزار رہے۔ ۷۹۔ کیا انھوں نے کوئی بات ٹھہرالی ہے تو ہم بھی ایک بات ٹھہرالیں گے۔ ۸۰۔ کیا ان کا گمان ہے کہ ہم ان کے رازوں کو اور ان کے مشوروں کو نہیں سن رہے ہیں۔ ہاں، اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے رہتے ہیں۔

امید ہمیشہ تکلیف کے احساس کو کم کر دیتی ہے۔ آدمی کسی تکلیف میں مبتلا ہو اور اسی کے ساتھ اس کو یہ امید ہو کہ یہ تکلیف ایک روز ختم ہو جائے گی تو آدمی کے اندر اس کو سہنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر جہنم کی تکلیف وہ تکلیف ہے جس سے نکلنے کی کوئی امید انسان کے لیے نہ ہوگی۔ جہنم میں فرشتوں کو مدد کے لیے پکارنا جہنم والوں کی بے بسی کا بے تابانہ اظہار ہوگا۔ ورنہ پکارنے والا خود جانتا ہوگا کہ خدا کا فیصلہ آخری طور پر ہو چکا ہے۔ اب وہ کسی طرح ٹلنے والا نہیں۔

جہنم میں کسی کا داخل ہونا سراسر اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہوگا۔ انسان کو اللہ تعالی نے اعلیٰ درجہ کی سمجھ دی۔ اس کے سامنے حق کی راہیں کھولیں۔ مگر انسان نے جانتے بوجھتے حق کو نظر انداز کیا۔ اس کی سرکشی یہاں تک پہنچی کہ وہ حق کے داعی کو مٹانے اور برباد کرنے کے درپے ہو گیا۔ ایسی حالت میں اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس کو دائمی طور پر عذاب میں ڈال دیا جائے۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾

۸۱۔ کہو کہ اگر رحمن کے کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوں۔ ۸۲۔ آسمانوں اور زمین کا خداوند، عرش کا مالک۔ وہ ان باتوں سے پاک ہے جس کو لوگ بیان

فَذَرۡهُمۡ يَخُوۡضُوۡا وَ يَلۡعَبُوۡا حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۸۳﴾

کرتے ہیں۔ ۸۳۔ پس ان کو چھوڑ دو کہ وہ بحث کریں اور کھیلیں، یہاں تک کہ وہ اس دن سے دوچار ہوں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔

''اگر خدا کی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کروں''— یہ جملہ بتاتا ہے کہ پیغمبر جس عقیدہ کا اعلان کر رہا ہے وہ اسی کو عین حقیقت سمجھتا ہے۔ وہ قومی تقلید اور گروہی تعصب کی زمین پر نہیں کھڑا ہوا ہے بلکہ دلیل کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ وہ اس عقیدہ کا داعی اس لیے ہے کہ تمام حقائق اس کی صداقت کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داعی کا معاملہ شعورِ حقیقت کا معاملہ ہوتا ہے، نہ کہ قومی تقلید کا معاملہ۔

خدا کا تخلیقی کارخانہ جو زمین و آسمان کی صورت میں پھیلا ہوا ہے وہ بتاتا ہے کہ اس کا خدا صرف ایک خدا ہے۔ کائنات اپنے وسیع نظام کے ساتھ اس سے انکار کرتی ہے کہ اس کا خدا ایک سے زیادہ ہو سکتا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِىۡ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِى الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۸۴﴾ وَتَبٰرَكَ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ۚ وَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۴۔ اور وہی ہے جو آسمان میں خداوند ہے اور وہی زمین میں خداوند ہے اور وہ حکمت والا، علم والا ہے۔ ۸۵۔ اور بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کی بادشاہی آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اور اسی کے پاس قیامت کی خبر ہے۔ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

زمین و آسمان نہایت ہم آہنگی کے ساتھ مسلسل عمل کر رہے ہیں۔ ان کے اندر کامل طور پر واحد حکمت اور واحد علم پایا جاتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں ایک ہی خدا ہے جو زمین و آسمان دونوں کا نظام تنہا چلا رہا ہے۔

کائنات بیک وقت خدا کی بے پناہ قدرت کا بھی تعارف کراتی ہے اور اسی کے ساتھ خدا کی بے پناہ رحمت کا بھی۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی سب سے زیادہ خدا سے ڈرے، وہ سب سے زیادہ اسی سے امید رکھے۔ جو لوگ دنیا میں اس شعور اور اس کردار کا ثبوت دیں وہی وہ لوگ ہیں کہ جب وہ خدا کے یہاں پہنچیں گے تو خدا ان کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔

وَلَا يَمۡلِكُ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَـقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾ وَلَـئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ

۸۶۔ اور اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے، مگر وہ جو حق کی گواہی دیں گے اور وہ جانتے ہوں گے۔ ۸۷۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے

لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٨٧﴾ وَقِيْلِهٖ
يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾
فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ ۭ فَسَوْفَ
يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾

پیدا کیا ہے تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے، پھر وہ کہاں بھٹک جاتے ہیں۔ ۸۸۔ اور اس کو رسول کے اس کہنے کی خبر ہے کہ اے میرے رب، یہ ایسے لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے۔ ۸۹۔ پس ان سے درگزر کرو اور کہو کہ سلام ہے تم کو، عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا۔

قیامت میں پیغمبر اور داعیانِ حق جو شفاعت کریں گے وہ حقیقتاً شفاعت نہیں ہے بلکہ شہادت ہے۔ یعنی ایسی بات کی گواہی دینا جس کو آدمی ذاتی طور پر جانتا ہو۔ آخرت میں جب لوگوں کا مقدمہ پیش ہوگا تو سارے علم کے باوجود اللہ مزید تائید کے طور پر ان لوگوں کو کھڑا کرے گا جو قوموں کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے ان کے سامنے حق کا پیغام پیش کیا۔ پھر کسی نے مانا اور کسی نے نہیں مانا۔ کسی نے حق کا ساتھ دیا اور کوئی حق کا مخالف بن کر کھڑا ہو گیا۔ یہی تجربہ جو ان صالحین پر براہِ راست گزرا اس کو وہ خدا کے سامنے پیش کریں گے۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کہ کوئی گواہ عدالت میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر ایک سچا بیان دے۔ اس کے سوا کسی کو قیامت میں یہ اختیار حاصل نہ ہوگا کہ وہ کسی مجرم کا شافع بن کر کھڑا ہو اور اس کے بارے میں اس خدائی فیصلہ کو بدل دے جو ازروئے واقعہ اس کے بارے میں ہونے والا تھا۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے حضور کوئی شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے۔

دعوتِ حق کا کام سراسر نصیحت کا کام ہے۔ آخری مرحلہ میں جب کہ داعی پر یہ واضح ہو جائے کہ لوگ کسی طرح ماننے والے نہیں ہیں اس وقت بھی داعی لوگوں کے لیے خدا سے دعا کرتا ہے۔ لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر کرتے ہوئے وہ لوگوں کا خیر خواہ بنا رہتا ہے۔

۴۴۔ سُوْرَةُ الدُّخَان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
حٰمٓ ﴿١﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿٢﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ
فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿٣﴾
فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿٤﴾ اَمْرًا مِّنْ
عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿٥﴾ رَحْمَةً

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ حٰم۔ ۲۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی۔ ۳۔ ہم نے اس کو ایک برکت والی رات میں اُتارا ہے، بے شک ہم آگاہ کرنے والے تھے۔ ۴۔ اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ طے کیا جاتا ہے۔ ۵۔ ہمارے حکم سے، بے شک ہم تھے بھیجنے والے۔

مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۙ۝۶
رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۘ
اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝۷ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ
وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ
الْاَوَّلِيْنَ ۝۸

۶۔ تیرے رب کی رحمت سے، وہی سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔ ۷۔ آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ ۸۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تمھارا بھی رب اور تمھارے اگلے باپ دادا کا بھی رب۔

قرآن کا کتاب مبین ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ اور جب وہ خدا کی کتاب ہے تو اس کی خبریں اور پیشین گوئیاں بھی قطعی ہیں، ان کے بارہ میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن کے نزول کا آغاز ایک خاص رات کو ہوا۔ یہ رات اہم خدائی فیصلوں کے لیے مقرر ہے۔ قرآن کا نزول کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ ایک نئی تاریخ کے ظہور کا فیصلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو فیصلہ کی رات میں نازل کیا گیا۔ قرآن اولاً حق کا اعلان تھا۔ وہ شرک کو باطل اور توحید کو برحق بتانے کے لیے آیا۔ پھر وہ اسی بنیاد پر قوموں کے درمیان فرق کرنے والا تھا۔ چنانچہ یہ فرق عملاً کیا گیا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں پہلی بار شرک کا دور ختم ہو کر توحید کا دور شروع ہو گیا۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝۹ فَارْتَقِبْ
يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ۝۱۰
يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۱
رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا
مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ
جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۙ۝۱۳ ثُمَّ تَوَلَّوْا
عَنْهُ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۘ۝۱۴ اِنَّا
كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ
عَآئِدُوْنَ ۘ۝۱۵ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ
الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝۱۶

۹۔ بلکہ وہ شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں۔ ۱۰۔ پس انتظار کرو اس دن کا جب آسمان ایک کھلے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ ۱۱۔ وہ لوگوں کو گھیر لے گا۔ یہ ایک دردناک عذاب ہے۔ ۱۲۔ اے ہمارے رب، ہم پر سے عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔ ۱۳۔ ان کے لیے نصیحت کہاں، اور ان کے پاس رسول آچکا تھا کھول کر سنانے والا۔ ۱۴۔ پھر انھوں نے اس سے پیٹھ پھیری اور کہا کہ یہ تو ایک سکھایا ہوا دیوانہ ہے۔ ۱۵۔ ہم کچھ وقت کے لیے عذاب کو ہٹا دیں، تم پھر اپنی اسی حالت پر آجاؤ گے۔ ۱۶۔ جس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ، اس دن ہم پورا بدلہ لیں گے۔

قرآن کے یہ مخاطبین جس معاملہ میں شک میں پڑے ہوئے تھے وہ خدا کے وجود کا معاملہ نہ تھا۔ بلکہ خدا کی توحید کا معاملہ تھا۔ وہ روایتی طور پر خدا کو مانتے ہوئے عملاً اپنے اکابر کے دین پر قائم تھے۔

قرآن نے ان اکابر کو بے بنیاد ثابت کیا۔ مگر وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو بے دلیل پا رہے تھے۔ دوسری طرف اپنے اکابر کی عظمت کو اپنے ذہن سے نکالنا بھی انھیں ناممکن نظر آتا تھا۔ اس دوطرفہ تقاضوں نے انھیں شک میں مبتلا کر دیا۔ خدا کا داعی انھیں اس سے کم نظر آیا کہ اس کے کہنے سے وہ اپنے مفروضہ اکابر کو چھوڑ دیں۔

جو لوگ نصیحت کے ذریعے حق کو نہ مانیں وہ اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال رہے ہیں کہ ان کو عذاب کے ذریعہ اسے ماننا پڑے۔ اس وقت وہ اعتراف کریں گے۔ مگر اس وقت کا اعتراف کرنا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿١٧﴾ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَىَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٨﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّىْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٩﴾ وَاِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿٢٠﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِىْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿٢١﴾

۱۷۔ اور ان سے پہلے ہم نے فرعون کی قوم کو آزمایا۔ اور ان کے پاس ایک معزز رسول آیا۔ ۱۸۔ کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو۔ میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں۔ ۱۹۔ اور یہ کہ اللہ کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمھارے سامنے ایک واضح دلیل پیش کرتا ہوں۔ ۲۰۔ اور میں اپنے اور تمھارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔ ۲۱۔ اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو تم مجھ سے الگ رہو۔

حق کی دعوت کا اٹھنا گویا خدا کی طاقت کا دلیل کے روپ میں ظاہر ہونا ہے۔ اس طرح خدا غیب میں رہ کر انسان کی سطح پر اپنا اعلان کراتا ہے۔ اس بنا پر حق کی دعوت اس کے مخاطبین کے لیے آزمائش بن جاتی ہے۔ حقیقت شناس لوگ اس کو پہچان کر اس کے آگے جھک جاتے ہیں۔ اور جو ظاہر بیں ہیں وہ اس کو غیر اہم سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مگر حق کی دعوت کو ٹھکرانے کے بعد آدمی اس کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔ پیغمبر کے زمانہ میں اس انجام بد کا آغاز موجودہ زندگی ہی میں ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرعونِ مصر کا ہوا۔ اور پیغمبر کے بعد ایسے لوگوں کا انجام موت کے بعد سامنے آئے گا۔ مزید یہ کہ پیغمبر کو خدا کی خصوصی نصرت حاصل ہوتی ہے۔ کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اس کو ہلاک کر سکے۔

الثلثة

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾
فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾
وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ
مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ
عُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾
وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۟ وَ
اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ
السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۲۹ ۱۴

۲۲۔ پس موسیٰ نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ ۲۳۔ تو اب تم میرے بندوں کو رات ہی رات میں لے کر چلے جاؤ، تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔ ۲۴۔ اور تم دریا کو تھما ہوا چھوڑ دو، ان کا لشکر ڈوبنے والا ہے۔ ۲۵۔ انھوں نے کتنے ہی باغ اور چشمے۔ ۲۶۔ اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات۔ ۲۷۔ اور آرام کے سامان جن میں وہ خوش رہتے تھے، سب چھوڑ دیے۔ ۲۸۔ اسی طرح ہوا اور ہم نے دوسری قوم کو ان کا مالک بنادیا۔ ۲۹۔ پس نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین، اور نہ ان کو مہلت دی گئی۔

لمبی مدت تک حضرت موسیٰ کی تبلیغی کوششوں کے بعد قوم فرعون پر اتمام حجت ہو گیا۔ اب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ مجرم ہیں۔ اس وقت حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم (بنی اسرائیل) کے ساتھ مصر سے نکل کر باہر چلے جائیں۔ حضرت موسیٰ روانہ ہوئے یہاں تک وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ اس وقت دریا کا پانی ہٹ گیا اور آپ کے لیے پار ہونے کا راستہ نکل آیا۔

فرعون اپنے لشکر کے ساتھ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرتا ہوا آرہا تھا۔ اس نے جب دریا میں راستہ بنتے ہوئے دیکھا تو اس نے سمجھا کہ جس طرح موسیٰ پار ہو گئے ہیں وہ بھی اسی طرح پار ہو سکتا ہے۔ مگر دریا کا راستہ سادہ معنوں میں صرف راستہ نہ تھا بلکہ وہ خدا کا حکم تھا اور خدا کا حکم اس وقت موسیٰ کے لیے نجات کا تھا اور فرعون کے لیے ہلاکت کا۔ چنانچہ جب فرعون اور اس کا لشکر دریا میں داخل ہوئے تو دونوں طرف کا پانی برابر ہو گیا۔ فرعون مع اپنے لشکر کے اس میں غرق ہو گیا۔

دنیا کی نعمتیں جس کو ملتی ہیں اکثر وہ ان کو اپنی ذاتی چیز سمجھ لیتا ہے حالانکہ کسی کے لیے بھی وہ ذاتی نہیں ہیں۔ خدا جب چاہے کسی کو دے اور جب چاہے اس سے چھین کر اسے دوسروں کے حوالے کر دے۔

وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ
الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ
كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدِ
اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾

۳۰۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت والے عذاب سے نجات دی۔ ۳۱۔ یعنی فرعون سے، بے شک وہ سرکش اور حد سے نکل جانے والوں میں سے تھا۔ ۳۲۔ اور ہم نے ان کو اپنے علم کی رو

وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

سے دنیا والوں پر ترجیح دی۔ ۳۳۔ اور ہم نے ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔

دنیا میں ایک قوم کا گرنا اور دوسری قوم کا ابھرنا اتفاقی طور پر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ظالم قوم اپنی ظالمانہ کارروائیوں سے دوسری قوم پر غالب آ گئی۔ یہ تمام تر خدا کے فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ خدا ہے جو اپنے فیصلہ کے تحت ایک کے لیے مغلوبیت کا اور دوسرے کے لیے غلبہ کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور وہ جو کچھ فیصلہ کرتا ہے اپنے علم کی بنا پر کرتا ہے، نہ کہ اَلل ٹپ طور پر۔

علم الٰہی کے مطابق فیصلہ ہونے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے بر بنائے استحقاق ہوتا ہے۔ خدا اپنے کلی علم کے تحت قوموں کو دیکھتا ہے۔ پھر وہ جس کو بااستحقاق پاتا ہے اس کے حق میں غلبہ کا فیصلہ کرتا ہے اور جس کو بے استحقاق دیکھتا ہے اس کو مغلوب ومعزول کر دیتا ہے۔

اقوام کی زندگی میں ایسی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ان کے ساتھ جو فیصلہ ہوا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوا ہے۔ اگر آدمی کی بصیرت زندہ ہو تو وہ ان نشانیوں میں ان اسباب کی جھلک پا لے گا جس کے تحت خدا نے قوموں کے حق میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ہے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۳۷﴾

۳۴۔ یہ لوگ کہتے ہیں۔ ۳۵۔ بس یہی ہمارا پہلا مرنا ہے اور ہم پھر اٹھائے نہیں جائیں گے۔ ۳۶۔ اگر تم سچے ہو تو لے آؤ ہمارے باپ دادا کو۔ ۳۷۔ کیا یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے تھے، ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، بے شک وہ نافرمان تھے۔

ہر دور میں انسان کی گمراہی کی جڑ یہ رہی ہے کہ اس نے موت کے بعد زندگی میں اپنا یقین کھو دیا۔ کچھ لوگوں کی بے یقینی کا اظہار ان کی زبان سے بھی ہو جاتا ہے، اور کچھ لوگ زبان سے نہیں کہتے۔ مگر ان کا دل اس یقین سے خالی ہوتا ہے کہ انھیں مر کر دوبارہ اٹھنا ہے اور اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

اس غلط فہمی کا نفسیاتی سبب اکثر یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اپنی مضبوط حیثیت کو دیکھ کر آدمی گمان کر لیتا ہے کہ وہ کبھی بے حیثیت ہونے والا نہیں۔ حالانکہ پچھلی قوموں کے واقعات اس فریب کی تردید کرنے کے لیے کافی ہیں۔

تبع قدیم یمن کے حمیر قبیلہ کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ 300 قبل مسیح سے 115 قبل مسیح تک ان کو عروج حاصل رہا۔ قدیم عرب میں ان کی عظمت کا بڑا چرچا تھا۔ قرآن کے ابتدائی مخاطبین (قریش) کے لیے قوم تبع کا

ابھرنا اور گرنا ایک معلوم اور مشہور بات تھی۔ یہ ان کے لیے اس بات کا ثبوت تھا کہ اس دنیا میں مجازات کا قانون جاری ہے۔ اسی طرح تمام لوگوں کے لیے کوئی نہ کوئی ''قوم تبع'' ہے جو اپنے انجام سے ان کو سبق دے رہی ہے۔ مگر انسان ہمیشہ یہ کرتا ہے کہ اس طرح کے واقعات کو عادت کے مطابق ہونے والا واقعہ سمجھ لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے وہ سبق نہیں لے پاتا جو ان کے اندر خدا نے چھپا رکھا تھا۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾ ع ۲ ۱۳ ۱۵

۳۸۔ اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ ۳۹۔ ان کو ہم نے حق کے ساتھ بنایا ہے لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ۴۰۔ بے شک فیصلے کا دن ان سب کا طے شدہ وقت ہے۔ ۴۱۔ جس دن کوئی رشتہ دار کسی رشتہ دار کے کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی کچھ حمایت کی جائے گی۔ ۴۲۔ ہاں مگر وہ جس پر اللہ رحم فرمائے۔ بے شک وہ زبردست ہے، رحمت والا ہے۔

زمین و آسمان کے نظام پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق نہایت بامعنی انداز میں ہوئی ہے۔ پوری کائنات ایک مقصد کے تحت عمل کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس دنیا میں انسان کے لیے شاندار تمدن کی تعمیر ناممکن ہو جائے۔

آخرت کا عقیدہ اسی کائناتی معنویت کی توسیع ہے۔ جو کائنات اتنے بامعنی انداز میں بنائی گئی ہو، ناممکن ہے کہ وہ سراسر بے معنی طور پر ختم ہو جائے۔ کائنات کی موجودہ معنویت اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ ایک بامعنی اور بامقصد انجام پر ختم ہونے والی ہے۔ آخرت اسی بامعنی اور بامقصد انجام کا دوسرا نام ہے۔

دنیا کا موجودہ مرحلہ آزمائش کا مرحلہ ہے۔ اس لیے آج دنیا کی معنویت میں ہر آدمی اپنا حصہ پا رہا ہے۔ مگر جب آخرت آئے گی تو اس وقت دنیا کی معنویت میں صرف ان لوگوں کو حصہ ملے گا جو خدا کے نزدیک فی الواقع اس کے مستحق قرار پائیں۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ

۴۳۔ زقوم کا درخت ۴۴۔ گنہگار کا کھانا ہوگا۔ ۴۵۔ تیل کی تلچھٹ جیسا، وہ پیٹ میں کھولے گا۔ ۴۶۔ جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔ ۴۷۔ اس کو

الْحَمِيْمِ ۝۴۶ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ
الْجَحِيْمِ ۝۴۷ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ
عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝۴۸ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْكَرِيْمُ ۝۴۹ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝۵۰

پکڑو اور اس کو گھسیٹتے ہوئے جہنم کے بیچ تک لے جاؤ۔ ۴۸۔ پھر اس کے سر پر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب انڈیل دو۔ ۴۹۔ چکھ اس کو، تو بڑا معزز، مکرم ہے۔ ۵۰۔ یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک کرتے تھے۔

یہاں اور دوسرے مقامات پر جہنم کی جو تصویر قرآن میں پیش کی گئی ہے وہ ہر زندہ شخص کو تڑپا دینے کے لیے کافی ہے۔ جو شخص بھی اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدہ ہو اس کو یہ الفاظ ہلا کر رکھ دیں گے۔ وہ جہنمی راستے کو چھوڑ کر جنتی راستے کی طرف دوڑ پڑے گا۔

مگر جو لوگ حقیقتوں کے بارے میں سنجیدہ نہ ہوں، جو صرف اپنی خواہشات کو جانتے ہوں اور ان کی اپنی خواہشات کے باہر حقائق کی جو دنیا ہے اس کے بارے میں وہ غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوں، وہ اس خبر کو سنیں گے اور اس کو نظر انداز کر دیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ الفاظ ایسے ہی ہیں جیسے پتھر پر پانی ڈالا جائے اور وہ اس کے اندرون کو تر کیے بغیر بہہ جائے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝۵۱ فِيْ جَنّٰتٍ
وَّعُيُوْنٍ ۝۵۲ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ
وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۵۳ كَذٰلِكَ ۟ وَ
زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۵۴ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ
فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ۝۵۵ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ
اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ
الْجَحِيْمِ ۝۵۶ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۵۷

۵۱۔ بے شک خدا سے ڈرنے والے امن کی جگہ میں ہوں گے۔ ۵۲۔ باغوں اور چشموں میں۔ ۵۳۔ باریک ریشم اور دبیز ریشم کے لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ۵۴۔ یہ بات اسی طرح ہے، اور ہم ان سے بیاہ دیں گے حوریں بڑی بڑی آنکھ والی۔ ۵۵۔ وہ اس میں طلب کریں گے ہر قسم کے میوے نہایت اطمینان سے۔ ۵۶۔ وہ وہاں موت کو نہ چکھیں گے مگر وہ موت جو پہلے آچکی ہے اور اللہ نے ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیا۔ ۵۷۔ یہ تیرے رب کے فضل سے ہوگا، یہی ہے بڑی کامیابی۔

ان الفاظ میں انسان کی پسند کی اس دنیا کی تصویر ہے جو اس کے خوابوں میں بسی ہوئی ہے۔ ہر آدمی اپنی پسند کی اس دنیا کو پانا چاہتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں وہ اس کو حاصل نہیں کر پاتا۔ یہ

خوابوں کی دنیا مزید اضافہ کے ساتھ اس کو جنت میں حاصل ہوجائے گی۔
ہر قسم کے ڈر سے خالی یہ دنیا ان لوگوں کو ملے گی جو دنیا میں اللہ سے ڈرے تھے۔ ابدی نعمتوں سے بھری ہوئی یہ زندگی ان کا حصہ ہوگی جنھوں نے اس کی خاطر دنیا کی وقتی نعمتوں کو قربان کیا تھا۔ آخرت کی اس عظیم کامیابی میں وہ لوگ داخل ہوں گے جنھوں نے اس کو پانے کے لیے اپنی دنیا کی کامیابی کو خطرہ میں ڈالنے کا حوصلہ کیا تھا۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾
فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

۵۸۔ پس ہم نے اس کتاب کو تمھاری زبان میں آسان بنادیا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ ۵۹۔ پس تم بھی انتظار کرو، وہ بھی انتظار کررہے ہیں۔

قرآن بلاشبہ ایک عظیم کتاب ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ نہایت آسان کتاب ہے مگر اس کا آسان ہونا نصیحت کے اعتبار سے ہے۔ یعنی جو شخص اس سے حق کو جاننا چاہتا ہے وہ اس کو اپنے لیے نہایت آسان پائے گا۔ مگر جو شخص تلاش حق کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو اس کے لیے قرآن میں کوئی آسانی نہیں۔
موجودہ دنیا میں آدمی کے سنجیدہ ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ "انتظار" کی نفسیات نہ رکھتا ہو۔ یعنی حقیقت کا دلیل کی سطح پر ظاہر ہونا ہی اس کے لیے کافی ہوجائے کہ وہ اس کو مان لے۔ جو شخص دلیل کی سطح پر ثابت شدہ ہوجانے کے بعد اس کو نہ مانے وہ گویا کہ اس بات کا انتظار کررہا ہے کہ حقیقت برہنہ ہوکر اس کے سامنے آجائے۔ مگر جب حقیقت برہنہ ہوکر سامنے آتی ہے تو منوانے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے آتی ہے کہ اعتراف کرنے والوں کی قدردانی کرے اور جنھوں نے اس سے پہلے اعتراف نہیں کیا تھا انھیں ہمیشہ کے لیے اندھے پن کے غار میں ڈال دے۔

۴۵۔ سُوْرَۃُ الجَاثِیَۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ
الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ حٰم۔ ۲۔ یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ اللہ غالب، حکمت والے کی طرف سے۔ ۳۔ بے شک آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لیے۔ ۴۔ اور تمھارے بنانے میں اور ان حیوانات

مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝٤
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ ۝٥ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ
بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ
يُؤْمِنُوْنَ ۝٦

ہیں جو اس نے زمین میں پھیلا رکھے ہیں۔ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں۔ ۵۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس رزق میں جس کو اللہ نے آسمان سے اُتارا، پھر اس سے زمین کو زندہ کردیا اس کے مرجانے کے بعد، اور ہواؤں کی گردش میں بھی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔ ۶۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم حق کے ساتھ تمھیں سنا رہے ہیں۔ پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے۔

یہ کہنا کہ قرآن عزیز وحکیم خدا کی طرف سے اترا ہے، گویا خود اپنی طرف سے ایک ایسا قطعی معیار دینا ہے جس پر اس کی صداقت کو جانچا جا سکے۔ خدائے عزیز کی طرف سے اس کے اترنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کتاب کو زیر نہ کر سکے گا۔ قرآن ہر حال میں اپنے مخالفین پر غالب آ کر رہے گا۔

یہ بات مکی دور میں کہی گئی تھی۔ اس وقت حالات سراسر قرآن کے خلاف تھے۔ مگر بعد کی تاریخ نے حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کی۔ قرآن کی دعوت کو تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔

اسی طرح خدائے حکیم کی طرف سے اترنے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے مضامین سب کے سب عقل ودانش پر مبنی ہوں۔ یہ بات بھی ڈیڑھ ہزار سال سے مسلسل درست ثابت ہوتی جا رہی ہے۔ قرآن دورِ سائنس سے پہلے اترا۔ مگر دورِ سائنس میں بھی قرآن کی کوئی بات عقل کے خلاف ثابت نہ ہو سکی۔

اس کے علاوہ جو کائنات انسان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اس کی تمام چیزیں قرآن کے پیغام کی تصدیق بن گئی ہیں۔ تاہم یہ تصدیق صرف ان لوگوں کے لیے تصدیق بنے گی جن کے اندر یقین کرنے کا ذہن ہو جو نشانیوں کی زبان میں ظاہر کی جانے والی بات کو پانے کی استعداد رکھتے ہوں۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝٧ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ
تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ
يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٨ وَاِذَا
عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَا ۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ

۷۔ خرابی ہے ہر شخص کے لیے جو جھوٹا ہو۔ ۸۔ جو خدا کی آیتوں کو سنتا ہے جب کہ وہ اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، پھر وہ تکبر کے ساتھ اَڑا رہتا ہے، گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ پس تم اس کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ ۹۔ اور جب وہ ہماری

أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٩﴾ مِنْ
وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا
كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠﴾ هٰذَا
هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ
عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿١١﴾ ع ١١/١٧

آیتوں میں سے کسی چیز کی خبر پاتا ہے تو وہ اس کو مذاق بنالیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ ۱۰۔ ان کے آگے جہنم ہے۔ اور جو کچھ انھوں نے کمایا وہ ان کے کچھ کام آنے والا نہیں۔ اور نہ وہ جن کو انھوں نے اللہ کے سوا کارساز بنایا۔ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ ۱۱۔ یہ ہدایت ہے، اور جنھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا، ان کے لیے سختی کا دردناک عذاب ہے۔

حق کا اعتراف اکثر حالات میں اپنی بڑائی کو کھونے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ آدمی اپنی بڑائی کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ حق کا اعتراف بھی نہیں کرتا۔ مگر حق کے آگے نہ جھکنا خدا کے آگے نہ جھکنا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کے یہاں سخت ترین عذاب ہے۔

آدمی اگر چہ تکبر کی بنا پر حق سے اعراض کرتا ہے تاہم اپنے رویہ کے جواز کے لیے وہ نظریاتی دلیل پیش کرتا ہے۔ مگر اس دلیل کی حقیقت جھوٹے الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایسا آدمی کسی چیز کو غلط مفہوم دے کر اس کو شوشہ بناتا ہے۔ اور اس شوشہ کی بنیاد پر حق کا اور اس کے داعی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ ایسے لوگ سخت ترین سزا کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ وہ بدعملی پر سرکشی کا اضافہ کررہے ہیں۔ اس سرکشی پر انھیں جو چیز آمادہ کرتی ہے وہ ان کی دنیوی حیثیت ہے۔ مگر کسی کی دنیوی حیثیت آخرت میں اس کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ
فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿١٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ
مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿١٣﴾

۱۲۔ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخر کردیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ ۱۳۔ اور اس نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کردیا، سب کو اپنی طرف سے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

پانی بظاہر ڈبانے والی چیز ہے۔ مگر اللہ تعالی نے اس کو ایسے قوانین کا پابند بنایا ہے کہ اتھاہ سمندروں کے اوپر بڑے بڑے جہاز ایک طرف سے دوسری طرف چلتے ہیں اور بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہی

معاملہ پوری کائنات کا ہے۔کائنات اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ پوری طرح انسان کے تابع ہے۔انسان جس طرح چاہے اس کو اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔موجودہ دنیا کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ ممکن ہوا ہے کہ یہاں انسان اپنے لیے شاندار تمدن کی تعمیر کر سکے۔

کائنات کا موجودہ ڈھانچہ ہی اس کا آخری اور واحد ڈھانچہ نہیں ہے۔وہ دوسرے بے شمار طریقوں سے بھی بن سکتی تھی۔مگر مختلف امکانات میں سے وہی ایک امکان واقعہ بنا جو ہمارے لیے مفید تھا۔یہ ایک نشانی ہے جس میں غور کرنے والے غور کریں تو وہ اس میں اپنے لیے عظیم الشان سبق پا سکتے ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

۱۴۔ ایمان والوں سے کہو کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا کے دنوں کی امید نہیں رکھتے، تا کہ اللہ ایک قوم کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔ ۱۵۔ جو شخص نیک عمل کرے گا تو اس کا فائدہ اسی کے لیے ہے۔اور جس شخص نے برا کیا تو اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

جن لوگوں کو یہ یقین نہ ہو کہ ان کے اوپر خدائی فیصلہ کا دن آنے والا ہے، وہ ظلم کرنے میں جری ہوتے ہیں۔وہ حق کے داعی کو ہر ممکن طریقے سے ستاتے ہیں۔اس وقت داعی کے دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔مگر داعی کو چاہیے کہ وہ آخر وقت تک مدعو سے درگزر کرے۔وہ اپنی توجہ تمام تر دعوت پر لگائے رہے اور لوگوں کو بداعمالیوں پر گرفت کے معاملہ کو خدا کے حوالہ کر دے۔

داعی کی کوشش کی قدر و قیمت اس اعتبار سے متعین نہیں ہوتی کہ اس نے کتنے لوگوں کو حق کی طرف موڑا۔اس کی کوشش کی قدر و قیمت خدا کے یہاں اس اعتبار سے متعین ہوتی ہے کہ وہ خود کتنا زیادہ حق پر قائم رہا۔حق کا داعی ہونے کے تقاضوں کو خود اس نے کتنا زیادہ پورا کیا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ ۚ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ

۱۶۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی اور ان کو پاکیزہ رزق عطا کیا اور ہم نے ان کو دنیا والوں پر فضیلت بخشی۔ ۱۷۔ اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں۔پھر انھوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا تھا،

رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا
كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى
شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ
اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ
يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ
وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

آپس کی ضد کی وجہ سے۔ بے شک تیرا رب قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کردے گا ان چیزوں کے بارے میں جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے۔ ۱۸۔ پھر ہم نے تم کو دین کے ایک واضح طریقہ پر قائم کیا۔ پس تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ ۱۹۔ یہ لوگ اللہ کے مقابلہ میں تمھارے کچھ کام نہیں آسکتے۔ اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ اور ڈرنے والوں کا ساتھی اللہ ہے۔ ۲۰۔ یہ لوگوں کے لیے بصیرت کی باتیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین کریں۔

''بنی اسرائیل کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت دی''— یہ وہی بات ہے جو امت محمدی کے ذیل میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ ''تم خیر امت ہو''۔ کسی گروہ کو خدا کی کتاب کا حامل بنانا اس کو دوسری قوموں پر ہدایت کا ذمہ دار بنانا ہے۔ یہی اس کا افضل الامم یا خیر الامم ہونا ہے۔

اصولی طور پر بنی اسرائیل کی حیثیت بھی اسی طرح عالمی تھی جس طرح امت مسلمہ کی حیثیت عالمی ہے۔ مگر بنی اسرائیل نے اپنی کتاب میں تحریفات کرکے ہمیشہ کے لیے اپنا یہ استحقاق کھو دیا۔

دین کی اصل تعلیمات میں ہمیشہ وحدت ہوتی ہے۔ مگر علماء کے اضافے اس میں اختلاف اور تعدد پیدا کردیتے ہیں۔ ہر عالم اپنے ذوق کے لحاظ سے الگ الگ اضافے کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر عالم اور اس کے متبعین اپنے اضافوں کو صحیح اور دوسرے کے اضافوں کو غلط ثابت کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ اس طرح دینی فرقے بننا شروع ہوتے ہیں اور آخر کار یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ ایک دین کئی دینوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔

بنی اسرائیل نے جب دین منزّل کو دین محرّف کی حیثیت دے دی اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ نے قرآن اتارا۔ چونکہ آپ کے بعد کوئی پیغمبر آنے والا نہ تھا۔ اس لیے اللہ نے خصوصی اہتمام کے ساتھ قرآن کو محفوظ کردیا تاکہ دوبارہ یہ صورت نہ پیدا ہو کہ اللہ کا دین انسانی اضافوں میں گم ہوکر رہ جائے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ
نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

۲۱۔ کیا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی مانند کردیں گے جو ایمان لائے اور

سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَ مَمَاتُھُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

نیک عمل کیا۔ ان سب کا جینااور مرنا یکساں ہوجائے ۔ بہت برا فیصلہ ہے جووہ کرر ہے ہیں ۔
۲۲۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کوحکمت کے ساتھ پیدا کیااور تا کہ ہر شخص کواس کے کیے کابدلہ دیا جائے اوران پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

جوشخص یہ خیال کرے کہ آدمی اچھابن کرر ہے یا برابن کر، سب برابر ہے۔آخرکار دونوں ہی کو مرکرمٹ جاناہے، وہ نہایت غلط خیال اپنے دماغ میں قائم کرتا ہے۔ایسا سمجھنااس شعورِعدل کے خلاف ہے جوہر آدمی کی فطرت میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔ نیز یہ کائنات کی اس معنویت کا انکار کرنا ہے جو اس کے نظام میں کمال درجہ میں پائی جاتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اندرونی فطرت اوراس کے باہر کی وسیع کائنات دونوں اس کوسراسر باطل ثابت کرتے ہیں کہ زندگی کو ایک ایسی بے مقصد چیز سمجھ لیا جائے جس کا کوئی انجام سامنے آنے والانہیں۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّھْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ کیاتم نے اس شخص کو دیکھاجس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنارکھا ہے اور اللہ نے اس کے علم کے باوجود اس کوگمراہی میں ڈال دیااور اس کے کان اوراس کے دل پرمہر لگادی اوراس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔پس ایسے شخص کو کون ہدایت دے سکتا ہے،اس کے بعد کہ اللہ نے اس کوگمراہ کردیا ہو، کیاتم دھیان نہیں کرتے۔

خواہش کواپنا معبود بنانے کامطلب خواہش کواپنی زندگی میں سب سے برترمقام دینا ہے جوشخص اپنی خواہش کے تحت سوچے اوراپنی خواہش کے تحت عمل کرے وہ گویااپنی خواہش ہی کواپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔
آدمی کی عقل صحیح اورغلط کو پہچاننے کی کامل صلاحیت رکھتی ہے۔مگر جوشخص اپنی عقل کواپنی خواہش کا تابع بنالے اس کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ اس کے سامنے حق کے دلائل آتے ہیں مگر وہ ان کے وزن کو محسوس نہیں کرپاتا۔ وہ ہربات کے جواب میں ایک جھوٹی توجیہ پیش کرکے اسے رد کردیتا ہے۔آدمی کی یہ روش آخرکار اس کی عقلی قوتوں کومسخ کردیتی ہے۔اس کے کان الفاظ سنتے ہیں مگران کے معانی تک ان کی پہنچ نہیں ہوتی۔ اس کی آنکھ حقیقت کو دیکھتی ہے مگر وہ اس سے سبق نہیں لے پاتی۔اس کے دل تک ایک بات پہنچتی ہے مگر وہ اس کے دل کوتڑپانے والی نہیں بنتی۔

عقلی قوتوں کو خدا نے ہدایت کے داخلہ کا دروازہ بنایا ہے۔ مگر جو شخص اپنی خواہش پرستی میں ان دروازوں کو بند کر لے اس کے اندر ہدایت داخل ہوگی تو کس راستہ سے داخل ہوگی۔

وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ
وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ
بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ
اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ
حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ
یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یَجْمَعُكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا
رَیْبَ فِیْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
ع ۳ ۵ ۱۹ یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع

۲۴۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری اِس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی اور زندگی نہیں۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو صرف زمانہ کی گردش ہلاک کرتی ہے۔ اور ان کو اس باب میں کوئی علم نہیں۔ وہ محض گمان کی بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ ۲۵۔ اور جب ان کو ہماری کھلی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ۲۶۔ کہو کہ اللہ ہی تم کو زندہ کرتا ہے پھر وہ تم کو مارتا ہے پھر وہ قیامت کے دن تم کو جمع کرے گا، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

''ہم کو زمانہ کی گردش ہلاک کرتی ہے'' عام لوگوں کا قول نہیں۔ اس طرح کی باتیں ہمیشہ مخصوص افراد کرتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو اپنی ذہانت کی وجہ سے اکثر سماج کے فکری نمائندہ کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ تاہم یہ باتیں وہ محض قیاس کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ وہ کسی حقیقی علم کی بنیاد پر ایسا نہیں کہتے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر جو بات کہتا ہے اس کی بنیاد ٹھوس حقیقت پر قائم ہے۔

ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص نہیں تھا۔ پھر وہ پیدا ہو کر موجود ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ مر جاتا ہے۔ گویا یہاں ہر آدمی کو موت کے بعد زندگی ملتی ہے اور زندگی کے بعد وہ دوبارہ مر جاتا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ جس طرح پہلی بار موت کے بعد زندگی ہوئی، اسی طرح دوسری بار بھی موت کے بعد زندگی ہوگی۔

اس سے واضح طور پر زندگی بعد موت کا ممکن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ مطالبہ کرنا غلط ہے کہ جو لوگ کل دوبارہ پیدا ہونے والے ہیں ان کو آج پیدا کر کے دکھاؤ۔ کیوں کہ موجودہ دنیا امتحان کے لیے ہے۔ اور اگر موجودہ دنیا میں اگلی دنیا کا حال دکھا دیا جائے تو امتحان کی مصلحت باقی نہیں رہ سکتی۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَیَوْمَ
تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَىِٕذٍ یَّخْسَرُ

۲۷۔ اور اللہ ہی کی بادشاہی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن

الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

اہلِ باطل خسارے میں پڑ جائیں گے۔ ۲۸۔ اور تم دیکھو گے کہ ہر گروہ گھٹنوں کے بَل گر پڑے گا۔ ہر گروہ اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا۔ آج تم کو اس عمل کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کر رہے تھے۔ ۲۹۔ یہ ہمارا دفتر ہے جو تمھارے اوپر ٹھیک ٹھیک گواہی دے رہا ہے۔ ہم لکھواتے جا رہے تھے جو کچھ تم کرتے تھے۔

جو لوگ اللہ کی بنیاد پر دنیا میں کھڑے ہوں وہ حق کی بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس کے سوا کسی اور بنیاد پر کھڑے ہوں وہ باطل کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام لوگ آخرت میں بے زمین ہو کر رہ جائیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے جس چیز کو بنیاد سمجھ رکھا تھا وہ کوئی بنیاد ہی نہ تھی۔ وہ محض دھوکا تھا جو حقیقت حال کے کھلتے ہی ختم ہو گیا۔

اعمال کو لکھوانے سے مراد معروف معنوں میں قلم سے لکھوانا نہیں ہے۔ بلکہ اعمال کو ریکارڈ کرانا ہے۔ انسان کی نیت، اس کا قول اور اس کا عمل سب نہایت صحت کے ساتھ خدائی انتظام کے تحت ریکارڈ ہو رہا ہے۔ آخرت میں انسان کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا وہ عین اس ریکارڈ کے مطابق ہوگا۔ یہ ریکارڈ اتنا زیادہ حقیقی ہوگا کہ کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ اس سے انکار کر سکے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۰﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾

۳۰۔ پس جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے تو ان کا رب ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یہی کھلی ہوئی کامیابی ہے۔ ۳۱۔ اور جنھوں نے انکار کیا، کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں۔ پس تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔ ۳۲۔ اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، اور ہم اس پر یقین کرنے والے نہیں۔

تکبر سے مراد خدا کے مقابلہ میں تکبر نہیں ہے بلکہ خدا کے داعی کے مقابلہ میں تکبر ہے۔ خدا کی بات کو ماننا موجودہ دنیا میں عملاً خدا کے داعی کی بات کو ماننے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اب جو لوگ تکبر میں مبتلا ہوں وہ اس

کو اپنے مرتبہ سے کم تر سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی بات مان لیں۔ چنانچہ وہ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ تکبر کی نفسیات سے خالی ہوں وہ فوراً اس کے آگے جھک جاتے ہیں۔ پہلے گروہ کے لیے خدا کا غضب ہے اور دوسرے گروہ کے لیے خدا کی رحمت۔

ایک انسان جب حق کا انکار کرتا ہے تو اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لیے وہ طرح طرح کی باتیں کرتا ہے۔ وہ کبھی داعی کو ناقابل اعتماد ثابت کرتا ہے کبھی داعی کے پیغام میں شک وشبہ کا پہلو نکالتا ہے۔ مگر قیامت کے دن کھل جائے گا کہ یہ سب مجرمانہ ذہن سے نکلی ہوئی باتیں تھیں، نہ کہ حق پرستانہ ذہن سے نکلی ہوئی باتیں۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٣٤﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٣٥﴾

۳۳۔ اور ان پر ان کے اعمال کی برائیاں کھل جائیں گی اور وہ چیز ان کو گھیر لے گی جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ ۳۴۔ اور کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو بھلا دیں گے جس طرح تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلائے رکھا۔ اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے اور کوئی تمھارا مددگار نہیں۔ ۳۵۔ یہ اس وجہ سے کہ تم نے اللہ کی آیتوں کا مذاق اُڑایا۔ اور دنیا کی زندگی نے تم کو دھوکہ میں رکھا۔ پس آج وہ اس سے نکالے جائیں گے اور نہ ان کا عذر قبول کیا جائے گا۔

موجودہ دنیا میں آدمی جب برائی کرتا ہے تو اس کے برے نتائج فوراً اس کے سامنے نہیں آتے۔ یہ چیز اس کو دلیر بنا دیتی ہے۔ اس کو جب اس کی بدعملی سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ اس کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مگر آخرت میں اس کی برائیوں کے نتائج اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ وہ اپنی بداعمالیوں میں پوری طرح گھر چکا ہوگا۔ اس وقت وہ اس حق کا اقرار کرلے گا جس کو دنیا میں اس نے اتنا بے قیمت سمجھا تھا کہ وہ اس کا مذاق اڑاتا رہا۔

آخرت میں انسان اس حق کا اقرار کرے گا جس کو وہ دنیا میں جھٹلاتا رہا۔ مگر وہاں اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ حق کا اقرار غیب کی سطح پر قیمت رکھتا ہے، نہ کہ شہود کی سطح پر۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ

۳۶۔ پس ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب ہے آسمانوں کا اور رب ہے زمین کا، رب ہے تمام عالم کا۔ ۳۷۔ اور اسی کے لیے بڑائی

فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۖ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٣٧ ع

ہے آسمانوں اور زمین میں۔ اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

کائنات بے پناہ حد تک عظیم ہے، اس لیے اس کا خالق ومالک بھی وہی ہوسکتا ہے جو بے پناہ حد تک عظیم ہو۔ اور یہ عظیم ہستی ایک خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ کوئی آدمی سنجیدگی کے ساتھ جرأت نہیں کرسکتا کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو کائنات کا خالق ومالک قرار دے۔ پھر جب کائنات کا خالق ومالک صرف ایک ہستی ہے تو لازم ہے کہ ساری تعریف بھی اس کی ہو۔ انسان اپنی ساری توجہ اسی کی طرف لگائے، وہ اس کو اپنا سب کچھ بنالے۔

موجودہ دنیا میں انسان کا وہی رویہ صحیح رویہ ہے جو کائنات کی عظمت وحکمت کے مطابق ہو۔ جس رویہ میں کائنات کی عظمت وحکمت سے مطابقت نہ پائی جائے وہ باطل ہے۔ ایسا رویہ انسان کو کامیابی تک پہنچانے والا نہیں۔

۴۶۔ سُوْرَۃُ الْاَحْقَاف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

حٰمٓ ۝١ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝٢ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝٣

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

☆۱۔ حٰمٓ۔ ۲۔ یہ کتاب اللہ زبردست، حکمت والے کی طرف سے اُتاری گئی ہے۔ ۳۔ ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ اور معین مدت کے لیے۔ اور جو لوگ منکر ہیں وہ اس سے بے رخی کرتے ہیں جس سے ان کو ڈرایا گیا ہے۔

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس میں ہر طرف حکمت اور معنویت ہے۔ پھر ایک ایسا کارخانہ جو اپنے آغاز میں بامعنی ہو وہ اپنے اختتام میں بے معنی کیسے ہوجائے گا۔

حق اپنی ذات میں نہایت محکم چیز ہے۔ وہ کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ جب لوگوں کے سامنے حق پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس کا انکار کردیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں لوگوں کو حق کی صرف خبر دی جارہی ہے۔ آخرت میں یہ ہوگا کہ حق واقعہ بن کر لوگوں کے اوپر ٹوٹ پڑے گا۔ اس وقت وہی لوگ حق کے سامنے ڈھہ پڑیں گے جو اس سے پہلے حق کو غیر اہم سمجھ کر اس کو نظر انداز کررہے تھے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝۵ وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝۶

۴۔ کہو کہ تم نے غور بھی کیا ان چیزوں پر جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے زمین میں کیا بنایا ہے، یا ان کا آسمان میں کچھ ساجھا ہے، میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچّے ہو۔ ۵۔ اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اس کا جواب نہیں دے سکتے، اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہیں۔ ۶۔ اور جب لوگ اکٹھا کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کے منکر بن جائیں گے۔

مفسر ابن کثیر نے یہاں ''کتاب'' سے مراد نقلی دلیل اور ''أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ'' سے مراد عقلی دلیل لی ہے (أَيْ لَا دَلِيلَ لَكُمْ لَا نَقْلِيًّا وَلَا عَقْلِيًّا عَلَى ذَلِكَ) تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 252۔

علم حقیقۃً صرف دو ہے۔ ایک الہامی علم (Revealedknowledge)۔ یعنی وہ علم جو پیغمبروں کے ذریعہ سے انسانوں تک پہنچا۔ دوسرا ثابت شدہ علم (Establishedknowledge)۔ یعنی وہ علم جس کا علم ہونا انسانی تحقیقات اور تجربات سے ثابت ہوگیا ہو۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی علم یہ نہیں بتاتا کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کوئی اور ہستی ہے جو خدائی کے لائق ہے۔ اور جب علم کے دو ذریعوں میں سے کوئی ذریعہ شرک کی گواہی نہ دے تو مشرکانہ عقیدہ انسان کے لیے کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔ جو شخص خدا کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو اپنا سہارا بنائے۔ وہ سہارا آخرت کے دن اس سے برأت کرے گا، نہ کہ وہ اس کا مددگار بنے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷ؕ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ

۷۔ اور جب ہماری کھلی کھلی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو منکر لوگ اس حق کی بابت، جب کہ وہ ان کے پاس پہنچتا ہے، کہتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ ۸۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہے۔ کہو کہ اگر میں نے اس کو اپنی طرف سے بنایا ہے تو تم لوگ مجھ کو ذرا بھی اللہ سے بچا نہیں سکتے۔ جو باتیں تم

كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۸﴾

بناتے ہو، اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ اور وہ بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

قدیم عرب میں قرآن کے مخاطبین قرآن کے پیغام کو یہ کہہ کر رد کردیتے تھے کہ یہ ہمارے اکابر کے دین کے خلاف ہے۔ اور چونکہ لوگوں کے اوپر اکابر کی عظمت بیٹھی ہوئی تھی وہ اس کو مان کر قرآن کے پیغام سے متوحش ہوجاتے تھے۔ مگر قرآن کا ایک اور پہلو تھا اور وہ اس کا ادبی اعجاز تھا۔ ہر عربی داں محسوس کررہا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی کلام ہے۔ اس دوسرے پہلو سے قرآن کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے انھوں نے کہہ دیا کہ یہ ''سحر'' ہے۔ یعنی یہ جادو بیانی کا کرشمہ ہے نہ کہ حقیقت بیانی کا کمال۔

یہ صحیح ہے کہ بعض انسانوں کے کلام میں غیر معمولی ادبیت ہوتی ہے مگر انسانی کلام کی ادبیت کی ایک حد ہے۔ قرآن کا ادبی اعجاز اس حد سے بہت آگے ہے۔ قرآن کی ادبی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ اس کو انسانی دماغ کا کرشمہ کہا جاسکے۔

جب فریق ثانی ضد پر اتر آئے تو اس وقت ایک سنجیدہ انسان یہ کرتا ہے کہ وہ یہ کہہ کر چپ ہوجاتا ہے کہ میرا اور تمھارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ تاہم یہ پسپائی نہیں بلکہ ایک اقدامی تدبیر ہے۔ آدمی جب ایک ضدی کے سامنے چپ ہوجائے تو وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے سے ہٹا کر خود اس کو اس کے ضمیر کے سامنے کھڑا کردیتا ہے تاکہ اس کے اندر احساس کا کوئی درجہ ہو تو وہ بیدار ہوجائے۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾ ع

۹۔ کہو کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔ اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمھارے ساتھ کیا۔ میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کے ذریعہ آتا ہے اور میں تو صرف ایک کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔ ۱۰۔ کہو، کیا تم نے کبھی سوچا کہ اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہو اور تم نے اس کو نہیں مانا، اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اس جیسی کتاب پر گواہی دی ہے۔ پس وہ ایمان لایا اور تم نے تکبر کیا۔ بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

مشرکین مکہ کی نظر میں یہود علوم دین کے حامل تھے۔ ان کو وہ پیغمبروں والی قوم سمجھتے تھے۔ تجارتی سفروں میں مشرکین اور یہود کی باہمی ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں ایک نزاعی شخصیت بنے ہوئے تھے تو مکہ کے کچھ مشرکین نے بعض یہودیوں سے آپ کے بارے میں پوچھا۔ اس دوران کسی یہودی عالم نے ان کو بتایا کہ ہماری کتابوں کے مطابق ایک پیغمبر اس علاقہ میں آنے والے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہی پیغمبر ہوں۔ اس یہودی شخص نے بالواسطہ انداز میں آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ تاریخ سے ثابت ہو رہا تھا کہ خدا کے پیغمبر خدا کی کتاب لے کر آتے ہیں۔ قدیم آسمانی کتابوں میں یہ لکھا ہوا تھا کہ بنو اسماعیل میں ایسا ایک پیغمبر آنے والا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اور آپ کی زندگی میں وہ تمام علامتیں واضح طور پر پائی جا رہی تھیں جو پیغمبروں میں ہوتی ہیں۔ ان علامات اور قرائن کی موجودگی میں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا انکار کر رہے تھے وہ کسی معقولیت کی وجہ سے نہیں کر رہے تھے بلکہ محض اس لیے کر رہے تھے کہ ایک شخص جس کو اب تک وہ ایک معمولی آدمی سمجھتے تھے اس کو خدا کا پیغمبر ماننے میں ان کی بڑائی ٹوٹ جائے گی۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ ان کے سامنے حق آئے تو متکبرانہ نفسیات کا شکار ہو جائیں، ایسے لوگوں کا ذہن ہمیشہ ان کو غلط رخ پر لے جاتا ہے۔ وہ صحیح سمت میں ان کی رہنمائی نہیں کرتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ⑪

۱۱۔ اور انکار کرنے والے، ایمان لانے والوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر یہ کوئی اچھی چیز ہوتی تو وہ اس پر ہم سے پہلے نہ دوڑتے۔ اور چوں کہ انھوں نے اس سے ہدایت نہیں پائی تو اب وہ کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔

ابتداءً جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بنے ان میں کئی ایسے لوگ تھے جو غریب اور غلام طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً بلال، عمار، صہیب، خباب، وغیرہ۔ اسی کے ساتھ آپ پر ایمان لانے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو عرب کے معزز خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً ابوبکر بن ابی قحافہ، عثمان بن عفان، علی ابن ابی طالب، وغیرہ۔ مگر آپ کے مخالفین صرف پہلی قسم کے لوگوں کا ذکر کرتے تھے، وہ دوسری قسم کے لوگوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کو جب کسی سے ضد ہو جاتی ہے تو وہ اس کے بارے میں یک رخا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور صرف انھیں پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے جس کے ذریعہ اسے اس کی تحقیر کا موقع ملتا ہو۔

اسی طرح یہ ایک واقعہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وہی تھی جو پچھلے تمام پیغمبروں کی دعوت تھی۔ آپ ایک ابدی صداقت کو لے کر آئے تھے۔ اس واقعہ کو آپ کے مخالفین ان لفظوں میں بھی بیان کر سکتے تھے کہ ''یہ ایک بہت پرانا سچ ہے''۔ مگر انھوں نے یہ کہہ دیا کہ ''یہ ایک بہت پرانا جھوٹ ہے''۔ ناانصافی کی یہ قسم قدیم زمانہ کے انسانوں میں بھی پائی جاتی تھی اور آج بھی وہ پوری طرح لوگوں کے اندر پائی جا رہی ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَ
هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ اُولٰۗىِٕكَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

۱۲۔ اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب تھی رہنما اور رحمت۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو اس کی تصدیق کرتی ہے، عربی زبان میں، تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے ظلم کیا۔ اور وہ خوش خبری ہے نیک لوگوں کے لیے۔ ۱۳۔ بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۱۴۔ یہی لوگ جنت والے ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے، ان اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔

قرآن کی صداقت کی ایک دلیل یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابیں اس کی پیشین گوئی کرتی رہی ہیں۔ یہ پیشین گوئیاں آج بھی انجیل اور تورات میں موجود ہیں۔ اس طرح قرآن اپنی سابق آسمانی پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر آیا ہے۔ وہ ان کی پیشگی اطلاع کو سچ کر دکھاتا ہے۔ یہ ایک واضح قرینہ ہے جو ثابت کرتا ہے کہ قرآن، واقعتاً ایک خدائی کتاب ہے۔ ورنہ سیکڑوں اور ہزاروں سال پہلے اس کی پیشگی خبر دینا کیسے ممکن ہوتا۔

''قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا'' کے سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد اس کے فرائض کی ادائیگی پر قائم رہنا ہے (ثُمَّ اسْتَقَامُوا عَلَى أَدَاءِ فَرَائِضِهِ) تفسیر الطبری، جلد 20، صفحہ 425۔

ایمان ایک مقدس عہد ہے۔ زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ ایک روش آدمی کے عہدِ ایمان کے مطابق ہوتی ہے اور ایک روش اس کے عہد ایمان کے غیر مطابق۔ ایسے مواقع پر جس شخص نے اپنے عہد ایمان کے مطابق عمل کیا اس نے استقامت دکھائی اور جو شخص اپنے عہد ایمان کے مطابق عمل نہ کر سکا وہ استقامت دکھانے میں ناکام رہا۔

استقامت کا ثبوت نہ دینے والے لوگ ظالم لوگ ہیں ان کا دعوائے ایمان انھیں کچھ فائدہ نہ دے گا اور جن لوگوں نے استقامت کا ثبوت دیا وہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے ابدی باغوں میں بسائے جائیں گے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ړ اِنِّىْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

۱۵۔ اور ہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے۔ اس کی ماں نے تکلیف کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا۔ اور تکلیف کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کا حمل میں رہنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو وہ کہنے لگا کہ اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسان کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ اور میری اولاد میں بھی مجھ کو نیک اولاد دے۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ ۱۶۔ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول کریں گے اور ان کی برائیوں سے ہم درگزر کریں گے، وہ اہل جنت میں سے ہوں گے، سچا وعدہ جو ان سے کیا جاتا تھا۔

انسانی نسل کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایک ماں اور ایک باپ کے ذریعہ وجود میں آتا ہے جو اس کی پرورش کر کے اس کو بڑا بناتے ہیں۔ یہ گویا انسان کی تربیت کا فطری نظام ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اس کے ذریعے سے انسان کے اندر حقوق وفرائض کا شعور پیدا ہو۔ اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو کہ اسے اپنے محسن کا احسان ماننا ہے اور اس کا حق ادا کرنا ہے۔ یہ جذبہ بیک وقت انسان کو دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور اسی کے ساتھ خالق ومالک خدا کے عظیم تر حقوق کو ادا کرنے کی تعلیم بھی۔

جو لوگ فطرت کے معلم سے سبق لیں۔ جو لوگ اپنے شعور کو اس طرح بیدار کریں کہ وہ اپنے والدین سے لے کر اپنے خدا تک ہر ایک کے حقوق کو پہچانیں اور ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں، وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کی ابدی رحمتوں کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔

وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ج

۱۷۔ اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ میں بیزار ہوں تم سے۔ کیا تم مجھ کو یہ خوف دلاتے ہو کہ میں قبر سے نکالا جاؤں گا، حالاں کہ مجھ سے پہلے

وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٧﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿١٨﴾

بہت سی قومیں گزر چکی ہیں اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے ہیں کہ تیری خرابی ہو، تو ایمان لا، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ یہ سب اگلوں کی کہانیاں ہیں۔ ۱۸۔ یہ وہ لوگ جن پر اللہ کا قول پورا ہوا ان گروہوں کے ساتھ جو ان سے پہلے گزرے، جنوں اور انسانوں میں سے۔ بے شک وہ خسارے میں رہے۔

جو اولاد اپنے والدین کی فرماں بردار ہو وہ خدا کی بھی فرماں بردار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، نافرمان اولاد کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی عمر کو پہنچتے ہی بھول جاتے ہیں کہ ان کے والدین نے بے شمار مصیبتیں اٹھا کر ان کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔

کسی شخص کے سب سے زیادہ خیر خواہ اس کے والدین ہوتے ہیں۔ والدین اپنی اولاد کو جو مشورہ دیتے ہیں وہ سراسر بے غرضانہ خیر خواہی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے صالح والدین کے مشوروں کا سب سے زیادہ لحاظ کرے۔ جو شخص اپنے صالح والدین کے مشوروں پر انھیں جھڑک دے وہ اپنی اس روش سے ظاہر کرتا ہے کہ وہ نہایت سنگ دل انسان ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سب سے زیادہ خسارہ میں پڑنے والے ہیں۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٩﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿٢٠﴾ ع ۲

۱۹۔ اور ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کے اعتبار سے درجے ہوں گے۔ اور تا کہ اللہ سب کو ان کے اعمال پورے کردے اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ ۲۰۔ اور جس دن انکار کرنے والے آگ کے سامنے لائے جائیں گے، تم اپنی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانی کرتے تھے۔

ایک شخص کے سامنے حق آتا ہے اور وہ دنیوی مصلحت اور مادی مفاد کی خاطر اس کو اختیار نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اہمیت دی۔ اس نے طیبات آخرت کے مقابلہ میں طیبات دنیا کو اپنے لیے پسند کرلیا۔

اسی طرح اپنی بڑائی کا احساس آدمی کے لیے بے حد لذیذ چیز ہے۔ جب ایسا ہو کہ اپنی بڑائی کا گھروندا توڑ کر حق کو قبول کرنا ہو اور آدمی اپنی بڑائی کو بچانے کے لیے حق کو قبول نہ کرے، اس وقت بھی گویا اس نے طیبات دنیا کو ترجیح دی اور طیبات آخرت کو ناقابل لحاظ سمجھ کر چھوڑ دیا۔

ایسے تمام لوگ جنھوں نے دنیا کی طیبات کی خاطر آخرت کی طیبات کو نظر انداز کیا وہ آخرت میں ذلّت کے عذاب سے دوچار ہوں گے۔ جس کا عمل جس درجہ کا ہوگا اسی کے بقدر وہ اپنے عمل کا انجام آخرت میں پائے گا۔

وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَاۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ٘ۖ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

۲۱۔ اور عاد کے بھائی (ہود) کو یاد کرو۔ جب کہ اس نے اپنی قوم کو احقاف میں ڈرایا — اور ڈرانے والے اس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آئے — کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۲۲۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو۔ پس اگر تم سچے ہو تو وہ چیز ہم پر لاؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو۔ ۲۳۔ اس نے کہا کہ اس کا علم تو اللہ کو ہے، اور میں تو تم کو وہ پیغام پہنچا رہا ہوں جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے، لیکن میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہو۔

قوم عاد جنوبی عرب کے اس علاقہ میں آباد تھی جس کو اب الربع الخالی کہا جاتا ہے۔ اس قوم نے کافی ترقی کی۔ مگر اس کی ترقیوں نے اس کو غفلت اور سرکشی میں مبتلا کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے ایک فرد حضرت ہود کو پیغمبر بنا کر اس کی طرف بھیجا۔

حضرت ہود نے قوم کو ڈرایا۔ مگر وہ اصلاح قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ اس نے اپنے پیغمبر کا استقبال جہالت سے کیا۔ آخر کار وہ خدا کی پکڑ میں آ گئی۔ اس پر ایسا سخت عذاب آیا کہ اس کا سرسبز اور شاندار علاقہ محض ایک خشک صحرا بن کر رہ گیا۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَاؕ بَلْ هُوَ مَا

۲۴۔ پس جب انھوں نے اس کو بادل کی شکل میں اپنی وادیوں کی طرف آتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا۔

اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۙ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا
فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ
نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

نہیں بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کی تم جلدی کر رہے تھے۔ ایک آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے۔ ۲۵۔ وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے اکھاڑ پھینکے گی۔ پس وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مجرموں کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں۔

عذاب کے بادل کو عاد کے لوگ بارش کا بادل سمجھے۔ وہ اس کی حقیقت کو صرف اس وقت سمجھ سکے جب کہ عذاب کی آندھی نے ان کی بستیوں میں داخل ہو کر ان کو بالکل کھنڈر بنا دیا، انسان اتنا ظالم ہے کہ وہ ایک لمحہ پہلے تک بھی حق کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ صرف اس وقت اعتراف کرتا ہے جب کہ اعتراف کرنے کا موقع اس سے چھین لیا گیا ہو۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا
لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ
سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ
شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ
بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَقَدْ ع
اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا
الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ
الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ
بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

۲۶۔ اور ہم نے ان لوگوں کو ان باتوں میں قدرت دی تھی کہ تم کو ان باتوں میں قدرت نہیں دی اور ہم نے ان کو کان اور آنکھ اور دل دیے، مگر وہ کان ان کے کچھ کام نہ آئے، اور نہ آنکھیں اور نہ دل۔ کیوں کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ ۲۷۔ اور ہم نے تمھارے آس پاس کی بستیاں بھی تباہ کر دیں۔ اور ہم نے بار بار اپنی نشانیاں بتائیں تا کہ وہ باز آئیں۔ ۲۸۔ پس کیوں نہ ان کی مدد کی انھوں نے جن کو انھوں نے خدا کے تقرب کے لیے معبود بنا رکھا تھا۔ بلکہ وہ سب ان سے کھوئے گئے اور یہ ان کا جھوٹ تھا اور ان کی گھڑی ہوئی بات تھی۔

قریش کے سرداروں کو جو دنیوی مرتبہ حاصل تھا اس نے انہیں سرکش بنا رکھا تھا۔ ان کو یاد دلایا گیا کہ اپنے پڑوس کی قوم عاد کو دیکھو۔ اس کو تمدنی اعتبار سے تم سے بھی زیادہ بڑا درجہ حاصل تھا۔ اس کے باوجود جب

خدا کا فیصلہ آیا تو اس کی ساری بڑائی غارت ہو کر رہ گئی۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز اس کا سہارا نہ بن سکی جن کو انہوں نے اپنا سہارا سمجھ رکھا تھا۔

انسان آخر کار خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں چھوٹا ہونے والا ہے۔ مگر دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ اسی دنیا میں آدمی کو بار بار دوسروں کے مقابلہ میں چھوٹا ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح کے واقعات خدا کی نشانیاں ہیں۔ آدمی اگر ان نشانیوں سے سبق لے تو آخرت کے دن چھوٹا کیے جانے سے پہلے وہ خود اپنے آپ کو چھوٹا کر لے۔ وہ آخرت سے پہلے اسی دنیا میں حقیقت پسند بن جائے۔

انسان کے سامنے مختلف قسم کے واقعات خدائی نشانی بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر وہ اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔ وہ ان سے سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

وَ اِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾ وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾

۲۹۔ اور جب ہم جنات کے ایک گروہ کو تمھاری طرف لے آئے، وہ قرآن سننے لگے۔ پس جب وہ اس کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ چپ رہو۔ پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ ڈرانے والے بن کر اپنی قوم کی طرف واپس گئے۔ ۳۰۔ انھوں نے کہا کہ اے ہماری قوم، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد اُتاری گئی ہے، ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس کے پہلے سے موجود ہیں۔ وہ حق کی طرف اور ایک سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ۳۱۔ اے ہماری قوم، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمھارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تم کو دردناک عذاب سے بچائے گا۔ ۳۲۔ اور جو شخص اللہ کے داعی کی دعوت پر لبیک نہیں کہے گا تو وہ زمین میں ہرا نہیں سکتا اور اللہ کے سوا اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ ایسے لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔

نبوت کے دسویں سال مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بے حد سخت ہو چکے تھے۔ اس وقت آپ نے مکہ سے طائف کی طرف سفر فرمایا کہ شاید آپ کو کچھ ساتھ دینے والے مل سکیں۔ مگر وہاں کے لوگوں

نے آپ کا بہت بڑا استقبال کیا۔ واپسی میں آپ رات گزارنے کے لیے نخلہ کے مقام پر ٹھہرے۔ یہاں آپ نماز میں قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنات کے ایک گروہ نے قرآن کو سنا۔ اور وہ اسی وقت اس کے مومن بن گئے — ایک گروہ قرآن کو رد کر رہا تھا۔ مگر عین اسی وقت دوسرا گروہ قرآن کو قبول کر رہا تھا۔ اور اتنی شدت کے ساتھ قبول کر رہا تھا کہ اسی وقت وہ اس کا مبلغ بن گیا۔

اللہ کے داعی کی بات کو رد کرنا گویا خدا کے منصوبہ کو رد کرنا ہے۔ مگر انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خدا کے منصوبہ کو رد کر سکے۔ اس لیے ایسی کوشش کرنے والے کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خود رد ہو کر رہ جاتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

۳۳۔ کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے نہیں تھکا، اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کردے، ہاں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۴۔ اور جس دن یہ انکار کرنے والے آگ کے سامنے لائے جائیں گے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں، ہمارے رب کی قسم۔ ارشاد ہوگا پھر چکھو عذاب اس انکار کے بدلے جو تم کررہے تھے۔

زمین و آسمان جیسی عظیم کائنات کا وجود میں آنا، اور پھر اربوں سال سے اس کا نہایت صحت اور ہم آہنگی کے ساتھ چلتے رہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا عظیم ترین طاقتوں کا مالک ہے۔ نیز یہ کہ اس کائنات کو وجود میں لانا اس کے لیے عجز کا باعث نہیں بنا۔ تخلیق کا عمل اگر اسے تھکا دیتا تو تخلیق کے بعد وہ اتنی صحت کے ساتھ چلتی ہوئی نظر نہ آتی۔

خدا کی عظیم طاقت وقدرت کا مظاہرہ جو کائنات کی سطح پر ہو رہا ہے وہ یہ یقین کرنے کے لیے کافی ہے کہ انسانی نسل کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس سے اس کے اعمال کا حساب لینا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے سامنے حقیقت آتی ہے مگر وہ اس کو نہیں مانتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں حقیقت کے انکار کا انجام فوراً سامنے نہیں آتا۔ آخرت میں انکار کا ہولناک انجام ہر آدمی کے سامنے ہوگا۔ اس وقت وہ انتہائی حد تک سنجیدہ ہو جائے گا اور اس حقیقت کا فوراً اقرار کرلے گا جس کو موجودہ دنیا میں وہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ
لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا
يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ
نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ
الْفٰسِقُوْنَ ۝٣٥

۳۵۔ پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا۔ اور ان کے لیے جلدی نہ کرو جس دن یہ لوگ اس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے تو گویا کہ وہ دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ یہ پہنچادینا ہے۔ پس وہی لوگ برباد ہوں گے جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔

حق کی دعوت دینے والے کو ہمیشہ صبر کی زمین پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ عجلت سے بچتے ہوئے صابرانہ عمل کرنا یہ ہے کہ آدمی جذباتی انداز میں دوڑ پڑنے کے بجائے سوچ سمجھ کر عمل کرے، اور ایک ایک قدم پختہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ دعوتی میدان میں صبر کرنا دراصل اس کا نام ہے کہ مدعو کی ایذا رسانیوں کو داعی یک طرفہ طور پر نظر انداز کرے۔ وہ مدعو کے ضد اور انکار کے باوجود یک طرفہ خیر خواہی کے ساتھ اس کو مسلسل دعوت پہنچاتا رہے۔ داعی اپنے مدعو کا ہر حال میں خیر خواہ بنا رہے۔ خواہ مدعو کی طرف سے اس کو کتنی ہی زیادہ ناخوش گواریوں کا تجربہ کیوں نہ ہو رہا ہو۔ یہ یک طرفہ صبر اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر مدعو کے اوپر خدا کی حجت تمام نہیں ہوتی۔

خدا کے تمام پیغمبروں نے ہر زمانہ میں اسی طرح صبر و استقامت کے ساتھ دعوت حق کا کام کیا ہے۔ آئندہ بھی پیغمبروں کی نیابت میں جو لوگ دعوت حق کا کام کریں ان کو اسی نمونہ پر دعوت کا کام کرنا ہے۔ خدا کے یہاں داعی کا مقام صرف انہیں لوگوں کے لیے مقدر ہے جو یک طرفہ برداشت کا حوصلہ دکھا سکیں۔

۴۷۔ سُوْرَۃُ مُحَمَّد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝١ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى
مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ
سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝٢ ذٰلِكَ بِاَنَّ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا، اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں کر دیا۔ ۲۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور اس چیز کو مانا جو محمد پر اُتارا گیا ہے۔ اور وہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے، اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔

الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ③

۳۔ یہ اس لیے کہ جن لوگوں نے انکار کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی۔ اور جو لوگ ایمان لائے انھوں نے حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے ہے۔ اس طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کی مثالیں بیان کرتا ہے۔

قدیم عرب میں جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا اور آپ کی مخالفت کی ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ انھوں نے چوں کہ شعوری سطح پر دین داری کا ثبوت نہیں دیا اس لیے ان کے وہ اعمال بھی بے قیمت قرار پائے جو وہ روایتی دینداری کی سطح پر انجام دے رہے تھے۔

قدیم عرب کے لوگ اپنے آپ کو ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی امت سمجھتے تھے۔ انھیں خانہ کعبہ کا منتظم ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ان کے یہاں کسی نہ کسی شکل میں نماز، روزہ، حج کا رواج بھی موجود تھا۔ حاجیوں کی خدمت، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، مہمانوں کی تواضع کا بھی ان کے یہاں چرچا تھا۔ یہ سب کام اگرچہ وہ بظاہر کر رہے تھے مگر وہ ان کی شعوری دینداری کا حصہ نہ تھے۔ وہ محض روایتی طور پر ان کی زندگی کا جزء بنے ہوئے تھے۔ ان اعمال کو وہ اس لیے کر رہے تھے کہ وہ صدیوں سے ان کے درمیان رائج چلے آرہے تھے۔

مگر وقت کے پیغمبر کو پہچاننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے شعور کو متحرک کریں۔ وہ ذاتی معرفت کی سطح پر اسے پائیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت قدیم روایات کا زور شامل نہ تھا اس لیے آپ کو وہی شخص پہچان سکتا تھا جو ذاتی شعور کی سطح پر حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جب انھوں نے وقت کے پیغمبر کا انکار کیا تو یہ ثابت ہو گیا کہ ان کی دینداری محض روایت کے تحت ہے، نہ کہ شعور کے تحت۔ اور اللہ کو شعوری دین داری مطلوب ہے، نہ کہ محض روایتی دینداری۔

اس کے برعکس، جو لوگ وقت کے پیغمبر پر ایمان لائے۔ انھوں نے یہ ثبوت دیا کہ وہ شعور کی سطح پر دین دار بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا کے یہاں قابل قبول اور قابل انعام قرار پائے۔ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ ماضی کے زور پر ماننے والے لوگ حال کی معرفت کے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کی نظر سے دیکھنے والے اپنی نظر سے دیکھنے میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ڎ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ڔ ذٰلِكَ ڔ وَلَوْ

۴۔ پس جب منکروں سے تمھارا مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکو تو ان کو مضبوط باندھ لو۔ پھر اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑنا ہے یا معاوضہ لے کر، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یہ ہے کام۔ اور اگر

يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۴﴾ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ﴿۵﴾ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴿۶﴾

اللہ چاہتا تو وہ ان سے بدلہ لے لیتا، مگر تاکہ وہ تم لوگوں کو ایک دوسرے سے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے، اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ ۵۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا اور ان کا حال درست کردے گا۔ ۶۔ اور ان کو جنت میں داخل کرے گا جس کی اُس نے انھیں پہچان کرادی ہے۔

یہاں انکار کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اتمام حجت کے باوجود ایمان نہیں لائے اور مزید یہ کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ناحق جنگ چھیڑ دی اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفاعی قدم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حکم دیا گیا کہ جب ان سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو ان سے لڑ کر ان کا زور توڑ دو، تاکہ وہ آئندہ دعوت حق کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

اسلامی تعلیم کے مطابق، جنگ دشمن کے خلاف نہیں بلکہ حملہ آور کے خلاف ہے۔ اسلام میں جنگ کی اجازت ہے مگر یہ اجازت صرف ان حالات میں ہے جب کہ اعراض کے باوجود فریقِ ثانی حملہ کردے اور حقیقی دفاع کی صورت پیدا ہو جائے (الحج، 22:39؛ التوبۃ، 9:13)۔ مسلمان اگر کسی کو اپنا دشمن سمجھیں تو ان کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اس کے خلاف حملہ کردیں۔ ایسے لوگوں کے مقابلہ میں اوّل و آخر جو حق دیا گیا ہے وہ پُرامن دعوت ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ متشددانہ جارحیت کے خلاف دفاعی جنگ اسلام میں جائز ہے، مگر وہ بھی اس وقت جب کہ جنگ سے اعراض کی تمام کوششیں ناکام ہوگئی ہوں۔ پیغمبر اسلام کا عملی نمونہ اس کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون رہا ہے کہ جن قوموں نے اپنے پیغمبروں کا انکار کیا وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک کردی گئیں۔ مگر پیغمبر آخر الزماں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ شرک کا دور ختم کیا جائے اور توحید کی بنیاد پر ایک نئی تاریخ وجود میں لائی جائے۔ ایسے تاریخ ساز انسانوں کا انتخاب سخت ترین حالات ہی میں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ مخالفین کی طرف سے چھیڑی ہوئی جنگ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں کو داخل کرکے یہی فائدہ حاصل کیا گیا۔

جنت مومن کی ایک انتہائی معلوم چیز ہے۔ وہ نہ صرف پیغمبر سے اس کی خبر سنتا ہے بلکہ اپنی بڑھی ہوئی معرفت کے ذریعہ وہ اس کا تصوراتی ادراک بھی کرلیتا ہے۔ جنت کے پہچان کا تعلق موجودہ دنیا سے ہے، نہ کہ آخرت کی دنیا سے۔ جو شخص آخرت اور جنت کے بارے میں بہت زیادہ سوچتا ہے، وہ جنت کے بارے میں سراغ (clues) پالیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو جنت کے متشابہ (similar) بنایا ہے (البقرہ، 2:25)۔ جب ایک مومن خدا کی کتاب میں اور اس کائنات میں غور وفکر کرتا ہے تو وہ اِس حقیقت کو

دریافت کرلیتا ہے کہ موجودہ دنیا، جہاں خدا نے اس کو رہنے کا موقع دیا ہے، وہ جنت کے مشابہ دنیا ہے۔ غیب میں چھپی ہوئی جنت کا یہی گہرا ادراک ہے جو آدمی کو یہ حوصلہ دیتا ہے کہ وہ قربانی کی قیمت پر اس کا طالب بن سکے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی شخص آج کی دنیا کو قربان کر کے کل کی جنت کا امیدوار نہ بنے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ یَنۡصُرۡكُمۡ وَ یُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ ﴿۷﴾ وَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا فَتَعۡسًا لَّهُمۡ وَ اَضَلَّ اَعۡمَالَهُمۡ ﴿۸﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَرِهُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَهُمۡ ﴿۹﴾ اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ ۫ وَ لِلۡكٰفِرِیۡنَ اَمۡثَالُهَا ﴿۱۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوۡلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ اَنَّ الۡكٰفِرِیۡنَ لَا مَوۡلٰی لَهُمۡ ﴿۱۱﴾ ع ۱۱ ۵

۷۔ اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدموں کو جما دے گا۔ ۸۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا ان کے لیے تباہی ہے اور اللہ ان کے اعمال کو ضائع کر دے گا۔ ۹۔ یہ اس سبب سے کہ انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے اُتاری ہے۔ پس اللہ نے ان کے اعمال کو اکارت کر دیا۔ ۱۰۔ کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ وہ اُن لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، اللہ نے ان کو اُکھاڑ پھینکا اور منکروں کے سامنے انھیں کی مثالیں آنی ہیں۔ ۱۱۔ یہ اس سبب سے کہ اللہ ایمان والوں کا کارساز ہے اور منکروں کا کوئی کارساز نہیں۔

واقعات کو ظہور میں لانے والا خدا ہے۔ مگر وہ واقعات کو اسباب کے پردہ میں ظہور میں لاتا ہے۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ باطل کا زور ٹوٹے اور حق کو دنیا میں غلبہ اور استحکام حاصل ہو۔ مگر اس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کچھ ایسے افراد درکار ہیں جو اس خدائی عمل کا انسانی پردہ بنیں۔ یہی وہ معاملہ ہے جس کو یہاں خدا کی نصرت کرنا کہا گیا ہے۔

جب ایک گروہ خدا کی نصرت کے لیے اٹھتا ہے تو وہ اسی کے ساتھ دوسرا کام یہ کرتا ہے کہ وہ منکرین کا منکرین ہونا ثابت کرتا ہے۔ خدا کی نصرت کرنے والے افراد انتہائی سنجیدگی اور خیر خواہی کے ساتھ لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ ہر خلاف حق رویہ سے بچتے ہوئے دین کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ حق کے حق ہونے کو آخری حد تک ثابت شدہ بنا دیتے ہیں۔ اس طرح منکرین کے اوپر وہ اتمام حجت ہو جاتا ہے جو آخرت کے فیصلہ کے لیے اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

باطل پرست لازماً زیر ہوتے ہیں اور حق پرست لازماً ان کے اوپر غالب آتے ہیں، بشرطیکہ حق

پرست گروہ اُس عمل کو انجام دے جو خدا کی سنت کے مطابق خدا کی حمایت کو حاصل کرنے کے لیے انجام دینا چاہیے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾

۱۲۔ بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا، وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جیسے کہ چوپائے کھائیں، اور آگ ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ ۱۳۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو قوت میں تمھاری اس بستی سے زیادہ تھیں جس نے تم کو نکالا ہے۔ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ پس کوئی ان کا مددگار نہ ہوا۔

عرب میں جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا ان کو آپ نے یہ پیشگی خبر دی کہ تم جو کھا پی رہے ہو تو یہ مت سمجھو کہ تم آزاد ہو تم پوری طرح خدا کی گرفت میں ہو۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر تم اپنے انکار پر قائم رہے تو خدا کے قانون کے مطابق تم تباہ کر دیے جاؤ گے۔

یہ واقعہ عین پیشین گوئی کے مطابق ظہور میں آیا۔ توحید کے علم بردار غالب آئے اور جو لوگ شرک کے علم بردار بنے ہوئے تھے وہ ہمیشہ کے لیے نابود ہو گئے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ۬ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ

۱۴۔ کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہے، وہ اس کی طرح ہو جائے گا جس کی بدعملی اس کے لیے خوش نما بنا دی گئی ہے اور وہ اپنی خواہشات پر چل رہے ہیں۔ ۱۵۔ جنت کی مثال، جس کا وعدہ ڈرنے والوں سے کیا گیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جس میں تغیر نہ ہوگا اور نہریں ہوں گی دودھ کی جس کا مزہ نہیں بدلا ہوگا اور نہریں ہوں گی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی اور نہریں ہوں گی شہد کی جو بالکل صاف ہوگا۔ اور ان کے لیے وہاں

مَغۡفِرَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ؕ کَمَنۡ ہُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ وَ سُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَہُمۡ ﴿۱۵﴾

ہر قسم کے پھل ہوں گے۔ اور ان کے رب کی طرف سے بخشش ہوگی۔ کیا یہ لوگ ان جیسے ہوسکتے ہیں جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے اور ان کو کھولتا ہوا پانی پینے کے لیے دیا جائے گا۔ پس وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

بینہ (دلیل) پر کھڑا ہونا اپنی زندگی کی تعمیر حقیقت واقعہ کی بنیاد پر کرنا ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص اہواء (اپنی خواہشات) پر کھڑا ہوتا ہے وہ حقیقت واقعہ سے انحراف کرتا ہے، وہ خدا کی دنیا میں خدا کی مرضی کے خلاف اپنی دنیا بنانا چاہتا ہے۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں دونوں گروہ بظاہر یکساں مواقع پا رہے ہیں۔ مگر آخرت کی حقیقی دنیا میں صرف پہلا گروہ خدا کی ابدی نعمتوں میں سے حصہ پائے گا اور دوسرا گروہ ہمیشہ کے لیے ذلیل وناکام ہو کر رہ جائے گا۔

وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡکَ ۚ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِکَ قَالُوۡا لِلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۟ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ ﴿۱۶﴾ وَ الَّذِیۡنَ اہۡتَدَوۡا زَادَہُمۡ ہُدًی وَّ اٰتٰہُمۡ تَقۡوٰىہُمۡ ﴿۱۷﴾

۱۶۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تمھاری طرف کان لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ تمھارے پاس سے باہر جاتے ہیں تو علم والوں سے پوچھتے ہیں کہ انھوں نے ابھی کیا کہا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی۔ اور وہ اپنی خواہشوں پر چلتے ہیں۔ ۱۷۔ اور جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی تو اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور ان کو ان کی پرہیزگاری عطا کرتا ہے۔

منافق آدمی کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ سنجیدہ مجلس میں بیٹھتا ہے تو بظاہر بہت باادب نظر آتا ہے مگر اس کا ذہن دوسری دوسری چیزوں میں لگا رہتا ہے وہ مجلس میں بیٹھ کر بھی مجلس کی بات نہیں سن پاتا۔ چنانچہ جب وہ مجلس سے باہر آتا ہے تو دوسرے اصحاب علم سے پوچھتا ہے کہ "حضرت نے کیا فرمایا"۔

یہ وہ قیمت ہے جو اپنی خواہش پرستی کی بنا پر انھیں ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے اوپر اپنی خواہش کو غالب کر لیتے ہیں۔ وہ دلیل کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے ان کے احساسات کند ہو جاتے ہیں۔ ان کی عقل اس قابل نہیں رہتی کہ وہ بلند حقیقتوں کا ادراک کر سکے۔

اس کے برعکس، جو لوگ حقیقتوں کو اہمیت دیں، جو سچی دلیل کے آگے جھک جائیں، وہ اس عمل سے

اپنی فکری صلاحیت کو زندہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی معرفت میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کو ابدی طور پر جمود سے نا آشنا ایمان حاصل ہو جاتا ہے۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ ع

۱۸۔ یہ لوگ تو بس اس کے منتظر ہیں کہ قیامت ان پر اچانک آجائے تو اس کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں۔ پس جب وہ آجائے گی تو ان کے لیے نصیحت حاصل کرنے کا موقع کہاں رہے گا۔ ۱۹۔ پس جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے۔ اور اللہ جانتا ہے تمھارے چلنے پھرنے کو اور تمھارے ٹھکانوں کو۔

زلزلہ کے آنے کی پیشگی اطلاع سے جو شخص چوکنّا نہ ہو وہ گویا زلزلہ کے آنے کا منتظر ہے۔ کیوں کہ ہر اگلا لمحہ زلزلہ کو اس کے قریب لا رہا ہے۔ اسی طرح قیامت کی چیتاونی سے آدمی متنبہ نہیں ہوتا مگر جب قیامت اس کے سر پر ٹوٹ پڑے گی تو وہ اعتراف کرنے لگے گا۔ مگر اس وقت کا اعتراف اسے فائدہ نہ دے گا۔ کیونکہ اعتراف وہ ہے جو پردہ اٹھنے سے پہلے کیا جائے۔ پردہ اٹھنے کے بعد اعتراف کی کوئی قیمت نہیں۔

استغفار دراصل احساس عجز کا ایک اظہار ہے۔ قیامت کی ہولناکی کا یقین اور اللہ کی قدرت اور اس کے ہر چیز سے باخبر ہونے کا احساس آدمی کے اندر جو نفسیاتی ہیجان پیدا کرتا ہے وہ ہر لمحہ لطیف کلمات میں ڈھلتا رہتا ہے۔ انھیں کلمات کو ذکر اور دعا اور استغفار کہا جاتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۗ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿۲۰﴾ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿۲۱﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ

۲۰۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورہ کیوں نہیں اُتاری جاتی۔ پس جب ایک واضح سورہ اُتار دی گئی اور اس میں جنگ کا بھی ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے، وہ تمھاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔ پس خرابی ہے ان کی۔ ۲۱۔ حکم ماننا ہے اور بھلی بات کہنا ہے۔ پس جب معاملہ کا قطعی فیصلہ ہو جائے تو اگر وہ اللہ سے سچے رہتے تو ان کے لیے بہت بہتر

تَوَلَّيۡتُمۡ اَنۡ تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَتُقَطِّعُوۡۤا اَرۡحَامَكُمۡ ﴿٢٢﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمۡ وَاَعۡمٰٓى اَبۡصَارَهُمۡ ﴿٢٣﴾

ہوتا۔ ۲۲۔ پس اگر تم پھر گئے تو اس کے سوا تم سے کچھ متوقع نہیں کہ تم زمین میں فساد کرو اور آپس کی قرابتوں کو قطع کرو۔ ۲۳۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی رحمت سے دور کیا، پس ان کو بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

منافق کی پہچان یہ ہے کہ وہ الفاظ میں سب سے آگے اور عمل میں سب سے پیچھے ہو۔ جہاد سے پہلے وہ جہاد کی باتیں کرے اور جب جہاد واقعۃً پیش آجائے تو وہ اس سے بھاگ کھڑا ہو۔

سچے اہل ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت سننے اور ماننے کے لیے تیار رہے اور جب کسی سخت اقدام کا فیصلہ ہو جائے تو اپنے عمل سے ثابت کر دے کہ اس نے خدا کو گواہ بنا کر جو عہد کیا تھا اس عہد میں وہ پورا اترا۔

منافق لوگ جہاد سے بچنے کے لیے بظاہر امن پسندی کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر عملاً صورت حال یہ ہے کہ جہاں انہیں موقع ملتا ہے وہ فوراً شر پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ حتی کہ جن مسلمانوں سے ان کی قرابتیں ہیں ان کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے ان کے دشمنوں کے مددگار بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں ملعون ہیں۔ ملعون ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس سے چھن جائے۔ وہ آنکھ رکھتے ہوئے بھی نہ دیکھے اور کان رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ سنے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰى قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا ﴿٢٤﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ ارۡتَدُّوۡا عَلٰٓى اَدۡبَارِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡهُدَى ۙ الشَّيۡطٰنُ سَوَّلَ لَهُمۡ ؕ وَاَمۡلٰى لَهُمۡ ﴿٢٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لِلَّذِيۡنَ كَرِهُوۡا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيۡعُكُمۡ فِىۡ بَعۡضِ الۡاَمۡرِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِسۡرَارَهُمۡ ﴿٢٦﴾ فَكَيۡفَ اِذَا تَوَفَّتۡهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ يَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ ﴿٢٧﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوۡا مَاۤ

۲۴۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں۔ ۲۵۔ جو لوگ پیٹھ پھیر کر ہٹ گئے، بعد اس کے کہ ہدایت ان پر واضح ہو گئی، شیطان نے ان کو فریب دیا اور اللہ نے ان کو ڈھیل دے دی۔ ۲۶۔ یہ اس سبب سے ہوا کہ انھوں نے ان لوگوں سے جو کہ خدا کی اُتاری ہوئی چیز کو ناپسند کرتے ہیں، کہا کہ بعض باتوں میں ہم تمھارا کہنا مان لیں گے۔ اور اللہ ان کی رازداری کو جانتا ہے۔ ۲۷۔ پس اس وقت کیا ہوگا جب کہ فرشتے ان کی روحیں قبض کرتے ہوں گے، ان کے منہ اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے۔ ۲۸۔ یہ اس سبب سے کہ انھوں نے

اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ
اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ ع

اس چیز کی پیروی کی جو اللہ کو غصہ دلانے والی تھی اور انھوں نے اس کی رضا کو ناپسند کیا۔ پس اللہ نے ان کے اعمال اکارت کردیے۔

قرآن نصیحت کی کتاب ہے مگر کسی چیز سے نصیحت لینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی نصیحت کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ اگر کوئی غلط جذبہ آدمی کے اندر داخل ہو کر اس کو نصیحت کے بارے میں غیر سنجیدہ بنادے تو وہ کبھی نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، خواہ نصیحت کو کتنا ہی اچھے انداز میں بیان کیا گیا ہو۔

دین کا کوئی ایسا حکم سامنے آئے جس میں آدمی کو اپنی خواہشات اور مفادات کی قربانی دینی ہو تو شیطان فوراً آدمی کو کوئی جھوٹا عذر سمجھا دیتا ہے۔ اور موجودہ دنیا میں مہلت امتحان کی وجہ سے آدمی کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اس جھوٹے عذر کو عملاً بھی اختیار کرلے۔ مگر یہ سب کچھ صرف چند دنوں تک کے لیے ہے۔ موت کا وقت آتے ہی ساری صورت حال بالکل مختلف ہوجائے گی۔

یہاں نفاق کے لیے ارتداد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر معلوم ہے کہ مدینہ کے ان منافقین کو ارتداد کی مقررہ سزا نہیں دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتداد ایک فوجداری جرم نہیں ہے، بلکہ وہ ایک فکری جرم ہے، اور فکری انحراف کرنے والا تبلیغ ودعوت کا موضوع ہوتا ہے، نہ کہ سزا کا موضوع۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی کتاب: حکمتِ اسلام کا مضمون ''مرتد اور ارتداد'')

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ
لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ
لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَ
لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾

۲۹۔ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے، کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ ان کے کینے کو کبھی ظاہر نہ کرے گا۔ ۳۰۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان کو تمھیں دکھا دیتے، پس تم ان کی علامتوں سے ان کو پہچان لیتے۔ اور تم ان کے اندازِ کلام سے ضرور ان کو پہچان لوگے۔ اور اللہ تمھارے اعمال کو جانتا ہے۔

منافقین کی بیماری یہ تھی کہ ان کے سینوں میں حسد (ضغن) تھا۔ منافق مسلمانوں کو اپنے مخلص برادران دین سے یہ حسد کیوں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کی ہر ترقی انھیں مخلص مسلمانوں کے حصہ میں جاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ چیز منافقین کے لیے بے حد شاق تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ ہم ایسی مہم میں اپنا جان ومال کیوں کھپائیں جس میں دوسروں کی حیثیت بڑھے، جس میں دوسروں کو بڑائی حاصل ہوتی ہو۔

منافقین اپنے ظاہری رویہ میں اپنی اس اندرونی حالت کو چھپاتے تھے مگر سمجھدار لوگوں کے لیے وہ چھپا ہوا

نہ تھا۔ منافقین کا مصنوعی لہجہ، ان کی درد سے خالی آواز بتا دیتی تھی کہ اسلام سے ان کا تعلق محض دکھاوے کا تعلق ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں قلبی تعلق۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَاۡ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

۳۱۔ اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے تاکہ ہم ان لوگوں کو جان لیں جو تم میں جہاد کرنے والے ہیں اور ثابت قدم رہنے والے ہیں اور ہم تمھارے حالات کی جانچ کرلیں۔ ۳۲۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا اور رسول کی مخالفت کی جب کہ ہدایت ان پر واضح ہو چکی تھی، وہ اللہ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اور اللہ ان کے اعمال کو ڈھا دے گا۔

آدمی جب ایمان کو لے کر کھڑا ہوتا ہے تو اس پر مختلف حالات پیش آتے ہیں۔ یہ حالات اس کے ایمان کا امتحان ہوتے ہیں۔ وہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ قربانی کی قیمت پر اپنے مومن ہونے کا ثبوت دے۔ وہ اپنے نفس کو کچلے۔ وہ اپنے مادی مفادات کو نظر انداز کرے۔ وہ لوگوں کی ایذا رسانی کو برداشت کرے۔ حتی کہ جان و مال کو کھپا کر اپنے ایمان پر قائم رہے۔

مومن کو اس قسم کے حالات میں ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ غیر مومنین کو کھلی آزادی حاصل ہوتا کہ وہ اہل ایمان کے خلاف ہر قسم کی کارروائیاں کر سکیں۔ ان کارروائیوں کے ذریعہ ایک طرف مخالفین کا جرم ثابت شدہ بنتا ہے۔ دوسری طرف ان شدید حالات میں اہل ایمان ثابت قدم رہ کر دکھا دیتے ہیں کہ وہ واقعی مومن ہیں اور اس قابل ہیں کہ خدا کی معیاری دنیا میں بسانے کے لیے ان کا انتخاب کیا جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْۤا اِلَى السَّلْمِ ۖۗ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖۗ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾

۳۳۔ اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔ ۳۴۔ بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، پھر وہ منکر ہی مر گئے، اللہ ان کو کبھی نہ بخشے گا۔ ۳۵۔ پس تم ہمت نہ ہارو اور صلح کی درخواست نہ کرو۔ اور تم ہی غالب رہو گے۔ اور اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ اور وہ ہرگز تمھارے اعمال میں کمی نہ کرے گا۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض مسلمانوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر وہ لاالٰہ الا اللہ کا اقرار کرلیں تو کوئی گناہ ان کو نقصان نہ پہنچائے گا۔اس پر یہ آیت 33 اتری۔اس کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ ایمان کے ساتھ اطاعت کو جمع کرے۔وہ نہ صرف بے ضرر احکام کی پیروی کرے بلکہ وہ ان احکام کا بھی پیرو بنے جن کے لیے اپنے نفس کو کچلنا اور اپنے مفاد کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے۔اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے سابقہ اعمال اس کو کچھ فائدہ نہیں دیں گے۔

کمزور مسلمانوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کا ساتھ اس شرط پر دیتے ہیں کہ وقت کے بڑوں کی ناراضگی مول نہ لینی پڑے۔جب وہ دیکھتے ہیں کہ حق کا ساتھ دینا وقت کے بڑوں کو ناراض کرنے کا سبب بن رہا ہے تو وہ ان کی طرف جھک جاتے ہیں، خواہ یہ بڑے حق کے منکر ہوں اور خواہ وہ حق کو روکنے والے بنے ہوئے ہوں۔

جو لوگ حق کا انکار کریں اور اس کے مخالف بن کر کھڑے ہوجائیں وہ کبھی اللہ کی رحمت نہیں پاسکتے۔پھر جو لوگ ایسے منکرین کا ساتھ دیں، ان کا انجام ان سے مختلف کیوں ہوگا۔

اسلام میں جنگ بھی ہے اور صلح بھی۔مگر وہ جنگ اسلامی جنگ نہیں جو اشتعال کی بنا پر لڑی جائے۔اسی طرح وہ صلح بھی اسلامی صلح نہیں جس کا محرک بزدلی اور کم ہمتی ہو۔کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں چیزیں سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت کی جائیں، نہ کہ محض جذباتی ردعمل کے تحت۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ۭ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝٣٦ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝٣٧ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝٣٨ ع ۸

۳۶۔ دنیا کی زندگی تو محض ایک کھیل تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تم کو تمھارے اجر عطا کرے گا اور وہ تمھارے مال تم سے نہ مانگے گا۔ ۳۷۔ اگر وہ تم سے تمھارے مال طلب کرے پھر آخر تک طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تمھارے کینے کو ظاہر کردے۔ ۳۸۔ ہاں، تم وہ لوگ ہو کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے، پس تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کرتے ہیں۔اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ اپنے ہی سے بخل کرتا ہے۔اور اللہ بے نیاز ہے، تم محتاج ہو۔اور اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمھاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

ایمان اور تقوی کی زندگی اختیار کرنے میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ دنیا کے فائدے اور دنیا کی رونقیں

ہیں۔آدمی جانتا ہے کہ وہ کون سا رویہ ہے جو آخرت میں اس کو کامیاب بنانے والا ہے۔مگر وقتی مصلحتوں کا خیال اس کے اوپر غالب آتا ہے اور وہ بے راہ روی کی طرف چلا جاتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے حق میں بے حد مہربان ہے۔وہ کبھی انسان سے اتنا بڑا مطالبہ نہیں کرتا جو اس کے لیے ناقابل برداشت ہو۔ جس کے نتیجہ میں یہ ہو کہ اس کا بھرم کھل جائے اور اس کی چھپی ہوئی بشری کمزوریاں لوگوں کے سامنے آجائیں۔

اسلام خدا کا دین ہے۔مگر اس کی اشاعت اور حفاظت کا کام اس عالم اسباب میں انسانی گروہ کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔مسلمان یہی انسانی گروہ ہیں۔مسلمان اگر اپنے فریضہ کو انجام دیں تو وہ خدا کی نظر میں باقیمت ٹھہریں گے۔لیکن اگر وہ اس فریضہ کو انجام دینے میں ناکام رہیں تو اللہ دوسری قوموں کو ایمان کی توفیق دے گا اور ان کے ذریعہ اپنے دین کا تسلسل باقی رکھے گا۔

۴۸۔ سُوْرَۃُ الْفَتْح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ
اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ
نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾ وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ بے شک ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی۔
۲۔تا کہ اللہ تمھاری اگلی اور پچھلی خطائیں معاف کردے۔اور تمھارے اوپر اپنی نعمت کی تکمیل کردے۔ اور تم کو سیدھا راستہ دکھائے۔ ۳۔اور اللہ تم کو زبردست مدد عطا کرے۔

6ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تا کہ وہاں عمرہ ادا کرسکیں۔آپ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تھے کہ مکہ کے مشرکین نے آگے بڑھ کر آپ کو روک دیا اور کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔اس کے بعد بات چیت شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان ایک معاہدہ صلح قرار پایا۔

یہ معاہدہ بظاہر یک طرفہ طور پر مشرکین کی شرائط پر ہوا تھا۔اصحاب رسول اس سے سخت کبیدہ خاطر تھے۔ وہ اس کو ذلت کی صلح سمجھتے تھے۔مگر آپ حدیبیہ سے واپس ہو کر ابھی راستہ ہی میں تھے کہ یہ آیت اتری — ’’ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی‘‘۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس معاہدہ کے تحت یہ قرار پایا تھا کہ دس سال تک مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان لڑائی نہیں ہوگی۔لڑائی کا بند ہونا دراصل دعوت کا دروازہ کھلنے کے ہم معنی تھا۔ہجرت کے بعد مسلسل جنگی حالات کے نتیجہ میں دعوت کا کام رک گیا تھا۔اب جنگ بندی نے دونوں فریقوں کے درمیان کھلے تبادلۂ خیال کی فضا پیدا کردی۔

اس طرح اس معاہدہ نے میدانِ مقابلہ کو بدل دیا۔ پہلے دونوں فریقوں کا مقابلہ جنگ کے میدان میں ہوتا تھا جس میں فریق ثانی برتر حیثیت رکھتا تھا۔ اب مقابلہ نظریہ کے میدان میں آ گیا۔ اور نظریہ کے میدان میں شرک کے مقابلہ میں توحید کو واضح طور پر برتری حیثیت حاصل تھی۔ یہی اس معاملہ میں ''سیدھا راستہ'' تھا۔ یعنی وہ راستہ جس نے توحید کے علم برداروں کے لیے فتح کو یقینی بنایا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۴﴾ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۙ﴿۵﴾ وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۶﴾ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۷﴾

۴۔ وہی ہے جس نے مومنوں کے دل میں اطمینان اُتارا، تا کہ ان کے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور بڑھ جائے۔ اور آسمانوں اور زمین کی فوجیں اللہ ہی کی ہیں۔ اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۵۔ تا کہ اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور تا کہ اللہ ان کی برائیاں ان سے دور کر دے۔ اور یہ اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے۔ ۶۔ اور تا کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے جو اللہ کے ساتھ برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کی گردش انھیں پر ہے۔ اور ان پر اللہ کا غضب ہوا اور ان پر اس نے لعنت کی۔ اور ان کے لیے اس نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ۷۔ اور آسمانوں اور زمین کی فوجیں اللہ ہی کی ہیں۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

یہاں ''سکینت'' سے مراد اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونا ہے۔ حدیبیہ کے سفر میں مخالفین اسلام نے طرح طرح سے مسلمانوں کو اشتعال دلانے کی کوشش کی تا کہ وہ مشتعل ہو کر کوئی ایسی کارروائی کریں جس کے بعد ان کے خلاف جارحیت کا جواز مل جائے۔ مگر مسلمان ہر اشتعال کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتے رہے۔ وہ آخری حد تک اعراض کی پالیسی پر قائم رہے۔

خدا چاہے تو اپنی براہ راست قوت سے باطل کو زیر کردے، اور حق کو غلبہ عطا فرمائے۔ پھر خدا کیوں ایسا کرتا ہے کہ وہ ''صلح حدیبیہ'' جیسے حالات میں ڈال کر اہل ایمان کو ان کا سفر کراتا ہے۔ اس کا مقصد ایمان والوں کے ایمان میں اضافہ ہے۔ آدمی جب اپنے اندر انتقام کی نفسیات کو دبائے اور ایک سرکش قوم سے اس لیے صلح کر لے کہ دعوت حق کا تقاضا یہی ہے تو وہ اپنے شعوری فیصلہ کے تحت وہ کام کرتا ہے جس کو کرنے کے لیے اس کا دل راضی نہ تھا۔ اس طرح وہ اپنے شعور ایمان کو بڑھاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایسی ربانی کیفیات کا مہبط بناتا ہے جس کو کسی اور تدبیر سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اس عمل کا یہ فائدہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے جنت والے لوگ الگ ہوجاتے ہیں اور جہنم والے لوگ الگ۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٨﴾ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٠﴾ ع

۸۔ بے شک ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ۹۔ تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو۔ اور تم اللہ کی تسبیح کرو صبح و شام۔ ۱۰۔ جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ پھر جو شخص اس کو توڑے گا، اس کے توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اور جو شخص اس عہد کو پورا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے شاہد کا ترجمہ اظہار حق کنندہ (حق کا اظہار کرنے والا) کیا ہے۔ یہی اس لفظ کا صحیح ترین مفہوم ہے۔ پیغمبر کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کا اعلان و اظہار کردے۔ وہ واضح طور پر بتادے کہ موت کے بعد کی ابدی زندگی میں کن لوگوں کے لیے خدا کا انعام ہے اور کن لوگوں کے لیے خدا کی سزا۔

ایسے ایک شاہد حق کا کھڑا ہونا اس کے مخاطبین کے لیے سب سے زیادہ سخت امتحان ہوتا ہے۔ ان کو ایک بشر کی آواز میں خدا کی آواز کو سننا پڑتا ہے۔ ایک بظاہر انسان کو خدا کے نمائندہ کے روپ میں دیکھنا پڑتا ہے۔ ایک انسان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے یہ سمجھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنا ہاتھ خدا کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔ جو لوگ اس اعلیٰ معرفت کا ثبوت دیں ان کے لیے خدا کے یہاں بہت بڑا اجر ہے اور جو لوگ اس امتحان میں ناکام رہیں ان کے لیے سخت ترین سزا۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ
شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ
يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ
قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ
اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ
كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾ بَلْ ظَنَنْتُمْ
اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى
اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ
ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۲﴾
وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ
اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾

۱۱۔ جو دیہاتی پیچھے رہ گئے وہ اب تم سے کہیں گے کہ ہم کو ہمارے اموال اور ہمارے بال بچوں نے مشغول رکھا، پس آپ ہمارے لیے معافی کی دعا فرمائیں۔ یہ اپنی زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ تم کہو کہ کون ہے جو اللہ کے سامنے تمھارے لیے کچھ اختیار رکھتا ہو، اگر وہ تم کو کوئی نقصان یا کوئی نفع پہنچانا چاہے، بلکہ اللہ اس سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔
۱۲۔ بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور مومنین کبھی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر نہ آئیں گے۔ اور یہ خیال تمھارے دلوں کو بہت بھلا نظر آیا اور تم نے بہت برے گمان کیے۔ اور تم برباد ہونے والے لوگ ہو گئے۔ ۱۳۔ اور جو ایمان نہ لایا اللہ پر اور اس کے رسول پر تو ہم نے ایسے منکروں کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ۱۴۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، وہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں خواب دیکھا تھا کہ آپ مکہ کا سفر برائے عمرہ کر رہے ہیں اس کے مطابق آپ مع اصحاب مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر اس وقت حالات بے حد خراب تھے۔ شدید اندیشہ تھا کہ قریش سے ٹکراؤ ہو اور مسلمان بری طرح مارے جائیں۔ چنانچہ مکہ کے قریب پہنچ کر قریش نے مسلمانوں کی جماعت پر پتھر پھینکے اور طرح طرح سے چھیڑا تاکہ وہ مشتعل ہو کر لڑنے لگیں۔ اور قریش کو ان کے خلاف جارحیت کا موقع ملے۔ مگر مسلمانوں کے یک طرفہ صبر واعراض نے اس کا موقع آنے نہیں دیا۔

اطرافِ مدینہ کے بہت سے کمزور مسلمان اسی اندیشہ کی بنا پر سفر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ جب آپ بحفاظت واپس آ گئے تو یہ لوگ آپ کے پاس اپنی وفاداری ظاہر کرنے کے لیے آئے۔ اور آپ سے معافی مانگنے لگے۔ مگر ان کو معافی نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا عذر جھوٹا عذر تھا، نہ کہ سچا عذر۔ اللہ کے یہاں سچا عذر ہمیشہ قابلِ قبول ہوتا ہے اور جھوٹا عذر ہمیشہ ناقابلِ قبول۔

ان لوگوں کا خدا کے رسول کے ساتھ سفر میں شریک نہ ہونا بے یقینی کی وجہ سے تھا، نہ کہ کسی واقعی عذر کی بنا پر۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے پرخطر سفر سے دور رہ کر وہ اپنے مفادات کو محفوظ کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ نفع اور نقصان کا مالک خدا ہے۔ اگر خدا نہ بچائے تو کسی کی حفاظتی تدبیریں اس کو بچانے والی نہیں بن سکتیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی بربادی ہے اور آخرت میں بھی بربادی۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ⑮

۱۵۔ جب تم غنیمتیں لینے کے لیے چلو گے تو پیچھے رہ جانے والے لوگ کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی بات کو بدل دیں۔ کہو کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے۔ تو وہ کہیں گے بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو، بلکہ یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں۔

صلح حدیبیہ سے پہلے یہود مسلمانوں کی دشمنی میں بہت جری تھے۔ کیوں کہ اس سے پہلے انہیں اس معاملہ میں قریش کا پورا تعاون حاصل تھا۔ حدیبیہ میں قریش سے ناجنگ معاہدہ نے یہود کو قریش سے کاٹ دیا۔ اس کے بعد وہ اکیلے رہ گئے۔ اس سے خیبر، تیما، فدک وغیرہ کے یہودیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ چنانچہ صلح کے تین مہینے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی تو وہاں کے یہود نے لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور ان کے کثیر اموال مسلمانوں کو غنیمت میں ملے۔

کمزور ایمان کے لوگ جو حدیبیہ کے سفر کو پرخطر سمجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تھے، اب انہوں نے چاہا کے وہ یہودیوں کے خلاف کارروائی میں شریک ہوں اور مال غنیمت میں اپنا حصہ حاصل کریں۔ مگر ان کو ساتھ جانے سے روک دیا گیا۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو خطرہ مول لے وہ نفع حاصل کرے۔ آدمی جب خطرہ مول لیے بغیر حاصل کرنا چاہے تو گویا وہ قانون الٰہی کو بدل دینا چاہتا ہے۔ مگر اس دنیا میں خدا کے قانون کو بدلنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ

۱۶۔ پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے کہو کہ عنقریب تم ایسے لوگوں کی طرف بلائے جاؤ گے جو بڑے زور آور ہیں، تم ان سے لڑو گے یا وہ اسلام لائیں گے۔ پس اگر تم حکم مانو گے تو اللہ تم کو اچھا اجر دے گا اور اگر تم روگردانی کرو گے، جیسا کہ تم

مِّنۡ قَبۡلُ يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶﴾ لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ وَمَنۡ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبۡهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۷﴾ ع

اس سے پہلے روگردانی کر چکے ہو تو وہ تم کو دردناک عذاب دے گا۔ ۱۷۔ نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اس کو اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور جو شخص روگردانی کرے گا اس کو وہ دردناک عذاب دے گا۔

جن لوگوں نے حدیبیہ (6ھ) کے موقع پر کمزوری دکھائی تھی وہ اس کے نتیجہ میں ملنے والے انعام سے تو محروم رہے۔ مگر ان کے لیے دروازہ اب بھی بند نہ تھا۔ کیوں کہ توحید کی مہم کو ابھی دوسرے بڑے بڑے معرکے پیش آنے باقی تھے۔ فرمایا گیا کہ اگر تم نے آئندہ پیش آنے والے ان مواقع پر قربانی کا ثبوت دیا تو دوبارہ تم خدا کی رحمتوں کے مستحق ہو جاؤ گے۔

اس قسم کا امتحان آدمی کے مومن یا منافق ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جنہیں کوئی واقعی عذر لاحق ہو۔ مجبورانہ کوتاہی کو اللہ معاف فرما دیتا ہے۔ مگر جو کوتاہی مجبوری کے بغیر کی جائے وہ اللہ کے یہاں قابل معافی نہیں۔

لَقَدۡ رَضِىَ اللّٰهُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ يُبَايِعُوۡنَكَ تَحۡتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَثَابَهُمۡ فَتۡحًا قَرِيۡبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيۡرَةً يَّاۡخُذُوۡنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيۡرَةً تَاۡخُذُوۡنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمۡ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيۡدِىَ النَّاسِ عَنۡكُمۡ ۚ وَلِتَكُوۡنَ اٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَيَهۡدِيَكُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخۡرٰى لَمۡ

۱۸۔ اللہ ایمان والوں سے راضی ہو گیا جب کہ وہ تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، اللہ نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ پس اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو انعام میں ایک قریبی فتح دے دی۔ ۱۹۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی جن کو وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۲۰۔ اور اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جن کو تم لو گے، پس یہ اس نے تم کو فوری طور پر دے دیا۔ اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دئے اور تاکہ اہل ایمان کے لیے یہ ایک نشانی بن جائے۔ اور تاکہ وہ تم کو سیدھے

تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢١﴾

راستے پر چلائے۔ ۲۱۔ اور ایک فتح اور بھی ہے جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے۔ اللہ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

حدیبیہ کے سفر میں ایک موقع پر یہ خبر پھیلی کہ قریش نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا جو ان کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کے طور پر گئے تھے۔ یہ ایک جارحیت کا معاملہ تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیکر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے چودہ سو اصحاب سے یہ بیعت لی کہ وہ مر جائیں گے مگر دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ اسلام کی تاریخ میں اس بیعت کا نام بیعت رضوان ہے۔

یہ بیعت جس مقام پر لی گئی وہ مدینہ سے ڈھائی سو میل اور مکہ سے صرف بارہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ گویا مسلمان اپنے مرکز سے بہت دور تھے اور قریش اپنے مرکز سے بہت قریب۔ مسلمان عمرہ کی نیت سے نکلے تھے۔ اس لیے ان کے پاس محض سفری سامان تھا جب کہ قریش ہر قسم کے جنگی سامان سے مسلح تھے۔ ایسے نازک موقع پر یہ صرف لوگوں کا جذبۂ اخلاص تھا جس نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیں۔ کیوں کہ کوئی ظاہری دباؤ وہاں سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

''اللہ نے ان کے دلوں کا حال جانا اور سکینت نازل فرمائی''— اس سے مراد وہ رنج و اضطراب ہے جو حدیبیہ کی بظاہر یک طرفہ صلح سے صحابہ کے دلوں میں پیدا ہوا تھا۔ تاہم انہوں نے خدا کے اس حکم کو صبر و سکون کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس کے نتیجہ میں چند ماہ بعد ہی اس کے فائدے ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اس معاہدہ نے قریش کو یہود کے محاذ سے الگ کر دیا اور اس طرح یہود کو مسخر کرنا آسان ہو گیا۔ جنگی حالات ختم ہونے کی وجہ سے اسلام کی اشاعت بہت تیزی سے بڑھی، یہاں تک کہ خود قریش کو دعوت کی راہ سے مسخر کر لیا گیا جن کو جنگ کی راہ سے مسخر کرنا مشکل بنا ہوا تھا۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿٢٤﴾

۲۲۔ اور اگر یہ منکر لوگ تم سے لڑتے تو وہ ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے، پھر وہ نہ کوئی حمایتی پاتے اور نہ مددگار۔ ۲۳۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے۔ اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ ۲۴۔ اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔ اور اللہ تمھارے کاموں کو دیکھ رہا تھا۔

پیغمبر کے مخاطبینِ اول کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ ان کے انکار کے بعد وہ انہیں ہلاک کر دیتا ہے۔

حدیبیہ کے موقع پر قریش کا انکار آخری طور پر سامنے آ گیا تھا۔ ایسی حالت میں اگر جنگ کی نوبت آتی تو مسلمانوں کی تقویت کے لیے خدا کے فرشتے اترتے اور وہ مسلمانوں کا ساتھ دے کر ان کے دشمنوں کا خاتمہ کر دیتے۔

مگر مشرکین کے سلسلہ میں اللہ کی مصلحت یہ تھی کہ انہیں ہلاک نہ کیا جائے۔ بلکہ ان کی غیر معمولی انسانی صلاحیتوں کو اسلام کے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو نا جنگ معاہدہ کی طرف رہنمائی فرمائی۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝25

۲۵۔ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی روکے رکھا کہ وہ اپنی جگہ پر نہ پہنچیں۔ اور اگر (مکہ میں) بہت سے مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم لاعلمی میں پیس ڈالتے، پھر ان کے باعث تم پر بے خبری میں الزام آتا، تاکہ اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے، اور اگر وہ لوگ الگ ہو گئے ہوتے تو ان میں جو منکر تھے ان کو ہم دردناک سزا دیتے۔

قریش کے سرداروں نے پیغمبر کے خلاف اپنی دشمنانہ حرکتوں سے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بنالیا تھا اور اس قابل بنالیا تھا کہ ان سے جنگ کی جائے۔ مگر ایک عظیم تر مصلحت کی خاطر ان سے جنگ کے بجائے صلح کر لی گئی۔ وہ مصلحت یہ تھی کہ اس وقت قریش کی جماعت میں بہت سے دوسرے لوگ بھی تھے جو یا تو اپنے دل میں شرک سے تائب ہو کر توحید پر ایمان لا چکے تھے یا ایسے لوگ تھے جن کی صالحیت کی بنا پر یقینی تھا کہ حالات کے معتدل ہوتے ہی وہ اسلام قبول کر لیں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کے درمیان جنگ نہ ہونے دی۔ تاکہ وہ لوگ مومن بن کر دنیا میں اپنا اسلامی حصہ ادا کریں۔ اور آخرت میں خدا کا انعام حاصل کریں۔ اللہ کی نظر میں ہر دوسری مصلحت کے مقابلہ میں دعوت کی مصلحت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ

۲۶۔ جب انکار کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت، پھر اللہ نے اپنی طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر، اور اللہ نے ان کو تقویٰ کی بات پر

التَّقْوٰی وَ کَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۲۶﴾ ع

جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

جس آدمی کے اندر اللہ کا ڈر پیدا ہو جائے اس کے دل سے ایک اللہ کے سوا ہر دوسری چیز کی اہمیت نکل جاتی ہے۔ وہ صرف ایک اللہ کو ساری اہمیت دینے لگتا ہے۔ حدیبیہ کا موقع صحابہ کے لیے اسی قسم کا ایک شدید امتحان تھا جس میں وہ پورے اترے۔ اس موقع پر فریقِ ثانی نے جاہلانہ ضد اور قومی عصبیت کا زبردست مظاہرہ کیا۔ مگر صحابہ ہر چیز کو خدا کے خانہ میں ڈالتے چلے گئے۔ ان کے متقیانہ مزاج نے ان کو اس سخت امتحان میں جوابی ضد اور جوابی عصبیت سے بچایا۔ وہ مسلسل اشتعال انگیزی کے باوجود آخر وقت تک مشتعل نہیں ہوئے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ۙ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴿۲۷﴾

۲۷۔ بے شک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا جو مطابقِ واقعہ ہے۔ بے شک اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے، امن کے ساتھ، بال مونڈتے ہوئے اپنے سروں کے اور کترتے ہوئے، تم کو کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ پس اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہیں جانی، پس اس سے پہلے اس نے ایک فتح دے دی۔

حدیبیہ کا سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خواب پر ہوا تھا۔ آپ نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ آپ مکہ پہنچ کر عمرہ ادا فرما رہے ہیں۔ اس خواب کو لوگوں نے خدا کی بشارت سمجھا اور مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر حدیبیہ میں قریش نے روکا اور بالآخر عمرہ ادا کیے بغیر لوگوں کو واپس آنا پڑا۔ اس سے بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ کیا پیغمبر کا خواب سچا نہ تھا۔ مگر یہ محض شبہ تھا۔ کیونکہ خواب میں یہ صراحت نہ تھی کہ عمرہ اسی سال ہوگا۔ چنانچہ خود معاہدہ کی شرائط کے مطابق اگلے سال ذوالقعدہ 7ھ میں یہ عمرہ پورے امن وامان کے ساتھ ادا کیا گیا۔ اس عمرہ کو اسلامی تاریخ میں عمرۃ القضاء کہا جاتا ہے۔

اس سال عمرہ کا التوا ایک عظیم مصلحت کی قیمت پر ہوا تھا۔ یہ مصلحت کہ اس کے ذریعہ قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ طے پایا اور نتیجۃً دعوت کے کام کے لیے موافق فضا پیدا ہوئی۔ یہ خود ایک فتح تھی۔ کیوں کہ اس کے ذریعہ سے علم بردارانِ شرک کے اوپر آخری اور کلی فتح کا دروازہ کھلا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸

۲۸۔ اور اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تا کہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ اور اللہ کافی گواہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک یہ کہ آپ پیغمبر تھے اور دوسرے یہ کہ آپ پیغمبر آخر الزماں تھے۔ آپ کے بعد کوئی اور پیغمبر آنے والا نہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ کو بھی وہی کام کرنا تھا جو تمام پیغمبروں نے کیا، یعنی توحید کا اعلان اور آخرت کا انذار و تبشیر۔

دوسری حیثیت کا معاملہ مختلف تھا۔ دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپ کے ذریعہ وہ تاریخی حالات پیدا کرنا مطلوب تھا جو کتاب الٰہی اور سنت نبوی کی حفاظت کی ضمانت بن جائیں۔ تا کہ دوبارہ وہ خلا پیدا نہ ہو جس کے نتیجہ میں پیغمبر بھیجنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس دوسرے پہلو کا تقاضا تھا کہ آپ کی دعوت صرف "اعلان" پر ختم نہ ہو بلکہ وہ "انقلاب" تک پہنچے۔ انقلاب سے مراد عالمی تاریخ میں وہ تبدیلی پیدا کرنا ہے، جس کے بعد وہ حالات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں، جس کی وجہ سے بار بار خدا کی ہدایت معدوم یا محرف ہو گئی اور اس کی ضرورت پیش آئی کہ نیا پیغمبر آ کر دوبارہ ہدایت کو اصلی صورت میں زندہ کرے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ښ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڗ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَــظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹ ع ۱۲/۴

۲۹۔ محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھو گے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے، ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ اور موٹا ہوا، پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گا، وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے تا کہ ان سے منکروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ نے ان سے معافی کا اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

پیغمبر اسلام کو ایک عظیم تاریخی کردار ادا کرنا تھا جس کو قرآن میں اظہارِ دین کہا گیا ہے۔ اس تاریخی کردار کے لیے آپ کو اعلیٰ انسانوں کی ایک جماعت درکار تھی۔ یہ جماعت حضرت اسماعیل کو عرب کے صحرا میں آباد کر کے ڈھائی ہزار سال کے اندر تیار کی گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بنو اسماعیل کا یہ گروہ تاریخ کا جاندار ترین گروہ تھا۔ ان کی یہ بالقوہ صلاحیت جب قرآن سے فیض یاب ہوئی تو پروفیسر مارگولیتھ کے الفاظ میں، عرب کی یہ قوم ہیرووں کی ایک قوم (a nation of heroes) میں تبدیل ہوگئی۔ اس گروہ کی اہمیت خدا کی نظر میں اتنی زیادہ تھی کہ ان کے بارے میں اس نے پیشگی طور پر اپنے پیغمبروں کو باخبر کر دیا تھا۔ چنانچہ تورات میں ان کی انفرادی خصوصیت درج کر دی گئی تھی اور انجیل میں ان کی اجتماعی خصوصیت۔

اس گروہ کے فرد فرد کی یہ خصوصیت بتائی کہ وہ منکروں کے لیے سخت اور مومنوں کے لیے نرم ہیں۔ یعنی ان کا رویہ اصول کے تحت متعین ہوتا ہے، نہ کہ محض خواہشات اور جذبات کے تحت۔ شاہ عبد القادر صاحب اس کی تشریح میں لکھتے ہیں ”جو تندی اور نرمی اپنی خو ہو وہ سب جگہ برابر چلے اور جو ایمان سے سنور کر آئے وہ تندہی اپنی جگہ اور نرمی اپنی جگہ“۔ اسی طرح ان کے افراد کا مزاج یہ ہے کہ وہ خدا کے آگے جھکنے والے اور اس کی عبادت اور ذکر میں لگے رہنے والے ہیں۔ خدا کی طرف ان کی توجہ اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اس کا نشان ان کے چہروں پر نمایاں ہو رہا ہے۔ اصحاب رسول کی یہ صفات اس تفصیل کے ساتھ موجودہ محرف تورات میں نہیں ملتیں۔ تاہم کتاب استثناء (33:2) میں قدسیوں (Saints) کا لفظ ابھی تک موجود ہے۔

البتہ انجیل کی پیشین گوئی آج بھی مرقس (4:26-32) اور متی (13:31-32) میں موجود ہے۔ یہ تمثیل کی زبان میں اس بات کا اعلان ہے کہ اسلام کی دعوت ایک پودے کی طرح مکہ سے شروع ہوگی۔ پھر وہ بڑھتے بڑھتے ایک طاقتور درخت بن جائے گی۔ یہاں تک کہ اس کا استحکام اس درجہ کو پہنچ جائے گا کہ اہل حق اس کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور اہل باطل غصہ و حسد میں مبتلا ہوں گے کہ وہ چاہنے کے باوجود اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

۴۹۔ سُوْرَةُ الْحُجُرٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ اے ایمان والو، تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

رسول کی رائے سے اپنی رائے کو اوپر کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی صورت یہ تھی کہ مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے کوئی آدمی بڑھ بڑھ کر باتیں کرے، وہ آپ کی بات پر اپنی بات کو

مقدم کرنا چاہیے۔ بعد کے زمانہ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا اور رسول کی دی ہوئی ہدایت سے آزاد ہو کر اپنی رائے قائم کرنے لگے۔

اس قسم کی غفلت ہمیشہ اس لیے ہوتی ہے کہ آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ اللہ اس کے اوپر نگراں ہے۔ اگر وہ جانے کہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی آواز انسانوں تک پہنچنے سے پہلے اللہ تک پہنچ رہی ہے تو آدمی کی زبان رک جائے، وہ بولنے سے زیادہ چپ رہنے کو اپنے لیے پسند کرنے لگے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۳ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

۲۔ اے ایمان والو، تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ ۳۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، وہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے معافی ہے اور بڑا ثواب ہے۔ ۴۔ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ ۵۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تم خود ان کے پاس نکل کر آجاؤ تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

اطراف مدینہ کے بدوی قبائل شعوری اعتبار سے زیادہ پختہ نہ تھے۔ ان کے سرداروں کا حال یہ تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو آپ کو مخاطب کرتے ہوئے یا رسول اللہ کہنے کے بجائے یا محمد کہتے۔ ان کی گفتگو متواضعانہ نہ ہوتی بلکہ متکبرانہ ہوتی۔ اس سے انھیں منع کیا گیا۔ رسول دنیا میں خدا کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے اس طرح کی ناشائستگی خدا کے سامنے ناشائستگی ہے، جو کہ آدمی کو بالکل بے قیمت بنا دینے والی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی لائی ہوئی ہدایت دنیا میں آپ کی قائم مقام ہے۔ اب اس مقدس ہدایت کے ساتھ وہی تابعداری مطلوب ہے جو تابعداری رسول کی زندگی میں رسول کی ذات کے ساتھ مطلوب ہوتی تھی۔

اللہ کا ڈر آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ کسی کے دل میں اگر واقعۃً اللہ کا ڈر پیدا ہو جائے تو وہ خود اپنے مزاج کے تحت وہ باتیں جان لے گا جس کو دوسرے لوگ بتانے کے بعد بھی نہیں جانتے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ۝٦ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝٧ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝٨

۶۔ اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔ ۷۔ اور جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لے تو تم بڑی مشکل میں پڑ جاؤ لیکن اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب بنا دیا، اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ راہ راست پر ہیں۔ ۸۔ اللہ کے فضل اور انعام سے، اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

کوئی آدمی دوسرے شخص کے بارے میں اگر ایسی خبر دے جس میں اس شخص پر کوئی الزام آتا ہو تو ایسی خبر کو محض سُن کر مان لینا ایمانی احتیاط کے سراسر خلاف ہے۔ سننے والے پر لازم ہے کہ وہ اس کی ضروری تحقیق کرے، اور جو رائے قائم کرے غیر جانب دارانہ تحقیق کے بعد کرے، نہ کہ تحقیق سے پہلے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب اس قسم کی خبر ایک شخص کو ملتی ہے تو اس کے ساتھی فوراً اس کے خلاف اقدام کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ سخت غیر ذمہ داری کی بات ہے۔ نہ کسی آدمی کو ایسی خبر پر قبل از تحقیق کوئی رائے قائم کرنا چاہیے اور نہ اس کے ساتھیوں کو قبل از تحقیق اقدام کا مشورہ دینا چاہیے۔

جو لوگ واقعی ہدایت کے راستہ پر آجائیں ان کے اندر بالکل مختلف مزاج پیدا ہوتا ہے۔ دوسروں پر الزام تراشی سے انھیں نفرت ہو جاتی ہے۔ غیر تحقیقی بات پر بولنے سے زیادہ اس پر چپ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا یہ مزاج اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ ان کو خدا کی رحمتوں میں سے حصہ ملا ہے۔ وہ ایمان فی الواقع ان کی زندگیوں میں اترا ہے جس کا وہ اپنی زبان سے اقرار کر رہے ہیں۔

وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى

۹۔ اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ

أَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا
بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا ۖ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُقْسِطِيْنَ ﴿٩﴾ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ
فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
ع تُرْحَمُوْنَ ﴿١٠﴾

وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۱۰۔ اہلِ ایمان سب بھائی ہیں، پس اپنے بھائیوں کے درمیان ملاپ کراؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

مسلمان آپس میں کس طرح رہیں، اس کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ اس طرح رہیں جس طرح بھائی بھائی آپس میں رہتے ہیں۔ دینی رشتہ خونی رشتہ سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر دو مسلمان آپس میں لڑ جائیں تو بقیہ مسلمانوں کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ان کے درمیان مزید آگ بھڑکائیں۔ بلکہ انھیں بھائیوں والے جذبے کے تحت دونوں کے درمیان مصالحت کے لیے اٹھ جانا چاہیے۔

دو مسلمان جب آپس میں لڑیں تو ایک صورت یہ ہے کہ بقیہ مسلمان غیر جانبدار بن جائیں۔ یا اگر وہ دخل دیں تو اس طرح کہ خاندانی اور گروہی عصبیت کے تحت ''اپنوں'' سے مل کر ''غیروں'' سے لڑنے لگیں۔ یہ تمام طریقے اسلام کے خلاف ہیں۔ صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اصل معاملہ کی تحقیق کی جائے اور جو شخص حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جائے اور جو شخص ناحق پر ہو اس کو مجبور کیا جائے کہ وہ معاملہ کے منصفانہ فیصلہ پر راضی ہو۔

اللہ سے ڈرنے والا آدمی کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کو لڑتے ہوئے دیکھ کر اس سے لذت لے۔ وہ ایسے منظر کو دیکھ کر تڑپ جائے گا۔ اس کا مزاج اسے مجبور کرے گا کہ وہ دونوں کے درمیان تعلقات کو درست کرانے کی کوشش کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اللہ پر ایمان اللہ کی رحمتوں کا دروازہ کھولنے کا سبب بن جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ
عَسٰى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ
نِّسَآءٍ عَسٰى أَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ
لَا تَلْمِزُوْا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ ۖ
بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ ۚ وَمَنْ
لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿١١﴾

۱۱۔ اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام دینا برا ہے۔ اور جو باز نہ آئیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر بڑا بننے کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص کی کوئی بات مل جائے تو وہ اس کو خوب نمایاں کرتا ہے تاکہ اس طرح اپنے کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا ثابت کرے۔ وہ دوسرے کا مذاق اڑاتا ہے، وہ دوسرے پر عیب لگاتا ہے، وہ دوسرے کو برے نام سے یاد کرتا ہے

تا کہ اس کے ذریعہ سے اپنے بڑائی کے جذبہ کی تسکین حاصل کرے۔

مگر اچھا اور برا ہونے کا معیار وہ نہیں ہے جو آدمی بطور خود مقرر کرے۔ اچھا دراصل وہ ہے جو خدا کی نظر میں اچھا ہو اور برا وہ ہے جو خدا کی نظر میں برا ٹھہرے۔ اگر آدمی کے اندر فی الواقع اس کا احساس پیدا ہو جائے تو اس سے بڑائی کا جذبہ چھن جائے گا۔ دوسرے کا مذاق اڑانا، دوسرے کو طعنہ دینا، دوسرے پر عیب لگانا، دوسرے کو برے لقب سے یاد کرنا، سب اس کو بے معنی معلوم ہونے لگیں گے۔ کیونکہ وہ جانے گا کہ لوگوں کے درجہ ومرتبہ کا اصل فیصلہ خدا کے یہاں ہونے والا ہے۔ پھر اگر آج میں کسی کو حقیر سمجھوں اور آخرت کی حقیقی دنیا میں وہ باعزت قرار پائے تو میرا اس کو حقیر سمجھنا کس قدر بے معنی ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اے ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور ٹوہ میں نہ لگو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

سنجیدگی اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وقتی تجربہ کی بنا پر کبھی کلی رائے قائم نہ کی جائے۔ اس قسم کی رائے کو شریعت میں سوءِ ظن کہا گیا ہے، یعنی بدگمانی۔ انسان کے بارے میں بدگمانی کے تحت رائے قائم کرنا بے حد سنگین ہے۔ کیوں کہ اس میں اخلاقی پہلو شامل ہے اور وہ آدمی کو گناہ کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے۔

ایک آدمی کسی شخص کے بارے میں بدگمان ہو جائے تو اس کی ہر بات اس کو غلط معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے بارے میں اس کا ذہن منفی رخ پر چل پڑتا ہے۔ اس کی خوبیوں سے زیادہ وہ اس کے عیوب تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کی برائیوں کو بیان کر کے اسے بے عزت کرنا اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔

اکثر سماجی خرابیوں کی جڑ بدگمانی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی اس معاملہ میں چوکنا رہے۔ وہ بدگمانی کو اپنے ذہن میں داخل نہ ہونے دے۔

آپ کو کسی سے بدگمانی ہو جائے تو آپ اس سے مل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ مگر یہ سخت غیر اخلاقی فعل ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کو برا کہا جائے جب کہ وہ اپنی صفائی کے لیے وہاں موجود نہ ہو۔ وقتی طور پر کبھی آدمی سے اس قسم کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہ اللہ سے ڈرنے والا ہے تو وہ اپنی غلطی پر ڈھیٹ نہیں ہوگا۔ اس کا خوف خدا اس کو فوراً اپنی غلطی پر متنبہ کرے گا، وہ اپنی روش کو چھوڑ کر اللہ سے معافی کا طالب بن جائے گا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔

انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق ہوتے ہیں۔ کوئی سفید ہے اور کوئی کالا۔ کوئی ایک نسل سے ہے اور کوئی دوسری نسل سے۔ کوئی ایک جغرافیہ سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی دوسرے جغرافیہ سے۔ یہ تمام فرق صرف تعارف کے لیے ہیں، نہ کہ امتیاز کے لیے۔ اکثر خرابیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس قسم کے فرق کی بنا پر ایک دوسرے کے درمیان فرق کرنے لگتے ہیں۔ اس سے وہ تفریق اور تعصب وجود میں آتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انسان اپنے آغاز کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی اگر کوئی بنیاد ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کون اللہ سے ڈرنے والا ہے اور کون اللہ سے ڈرنے والا نہیں۔ اور اس کا بھی صحیح علم صرف خدا کو ہے، نہ کہ کسی انسان کو۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾

۱۴۔ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا، اور ابھی تک ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو اللہ تمھارے اعمال میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا۔ بے شک اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ۱۵۔ مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انھوں نے شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہی سچے لوگ ہیں۔

مدینہ کے اطراف میں کئی چھوٹے چھوٹے قبیلے تھے۔ یہ لوگ ہجرت کے بعد اسلام میں داخل ہو گئے مگر ان کا اسلام کسی گہرے ذہنی انقلاب کا نتیجہ نہ تھا۔ اللہ کی نظر میں اسلام پر ایمان لانے والا وہ ہے جو اسلام کو ایک ایسی حقیقت کے طور پر پائے جو اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، جو لوگ اس خدا کے دین کو قبول کریں وہ ایک لازوال یقین کو پا لیتے ہیں۔ وہ قربانی کی حد تک اس پر قائم رہنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

آدمی کوئی اچھا کام کرے تو وہ اس کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا اظہار اس کے عمل کو باطل کر دینے والا ہے۔ اچھا عمل حقیقۃً وہ ہے جو اللہ کے لیے کیا جائے۔ پھر اللہ جب خود ہر بات کو جانتا ہے تو اس کے اعلان و اظہار کی کیا ضرورت۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع ۲/۸/۱۴

۱۶۔ کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو۔ حالاں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۱۷۔ یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ کہو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی۔ اگر تم سچے ہو۔ ۱۸۔ بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے۔ اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

کوئی شخص اسلام میں داخل ہو یا اس کے ہاتھ سے کوئی اسلامی کام انجام پائے تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ اللہ کی مدد سے ہوا ہے۔ ایمان اور عمل سب کا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے۔ اس لیے جب بھی کسی کو کسی خیر کی توفیق ملے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔

اس کے بجائے اگر وہ اپنے ہم مذہبوں پر اس کا احسان جتانے لگے تو گویا وہ زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ یہ کام میں نے اللہ کو دکھانے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ انسانوں کو دکھانے کے لیے کیا تھا۔ خدا ہر چیز سے براہِ راست واقفیت رکھتا ہے، جو شخص خدا کے لیے عمل کرے اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا خدا اس کے عمل کو بتائے بغیر دیکھ رہا ہے۔

۵۰۔ سُوْرَۃُ قٓ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ﴿۱﴾ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ قٓ۔ قسم ہے باعظمت قرآن کی۔ ۲۔ بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس انھیں میں سے ایک ڈرانے والا آیا، پس منکروں نے کہا کہ یہ تعجب کی چیز ہے۔ ۳۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی

تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝۵

ہوجائیں گے، یہ دوبارہ زندہ ہونا بہت بعید ہے۔ ۴۔ ہم کو معلوم ہے جتنا زمین ان کے اندر سے گھٹاتی ہے اور ہمارے پاس کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔ ۵۔ بلکہ انھوں نے حق کو جھٹلایا ہے جب کہ وہ ان کے پاس آچکا ہے، پس وہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔

پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے ہم زمانہ لوگ ان کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ البتہ جب بعد کا زمانہ آتا ہے تو لوگ آسانی کے ساتھ ان کی پیغمبرانہ حیثیت کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اپنے ہم زمانہ لوگوں کو ''اپنے برابر کا ایک شخص'' نظر آتا ہے۔ یہ بات ان کے لیے تعجب خیز بن جاتی ہے کہ جس شخص کو وہ اپنے برابر کا سمجھے ہوئے تھے وہ اچانک بڑا بن کر ان کو نصیحت کرنے لگے۔ مگر بعد کے زمانہ میں پیغمبر کے ساتھ عظمتوں کی تاریخ وابستہ ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لیے بعد کے لوگوں کو وہ ''اپنے سے برتر شخص'' دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے زمانے میں پیغمبر کی پیغمبرانہ حیثیت کو ماننا لوگوں کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر، ابتدائی دور کے لوگوں کے سامنے پیغمبر ایک نزاعی شخصیت کے روپ میں ہوتا ہے۔ اور بعد کے لوگوں کے سامنے ثابت شدہ شخصیت کے روپ میں۔ دور اول کے لوگوں کو اپنے اور پیغمبر کے درمیان خلا کو پر کرنے کے لیے شعوری سفر طے کرنا پڑتا ہے، جب کہ بعد کے زمانہ میں یہ خلا خود تاریخ پر کر چکی ہوتی ہے۔

جو لوگ پیغمبر کی پیغمبری پر شبہ کر رہے ہوں ان کی نظر میں پیغمبر کی ہر بات مشتبہ ہو جاتی ہے حتی کہ وہ بات بھی جس کا عقیدہ روایتی طور پر ان کے یہاں موجود ہوتا ہے۔ تاہم یہ باتیں لوگوں کے لیے عذر نہیں بن سکتیں۔ پیغمبر کو نہ ماننے والے اگر اس کی کتاب کی ناقابلِ تقلید ادبی عظمت پر غور کریں تو وہ اس کے لانے والے کو خدا کا پیغمبر ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۷ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۸ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

۶۔ کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، ہم نے کیسا اس کو بنایا اور اس کو رونق دی اور اس میں کوئی رخنہ نہیں۔ ۷۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ ڈال دئے اور اس میں ہر قسم کی رونق کی چیز اُگائی۔ ۸۔ سمجھانے کو اور یاد دلانے کو ہر اس بندے کے لیے جو رجوع کرے۔ ۹۔ اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اُتارا، پھر اس سے

مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ۝٩ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝١٠ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝١١

ہم نے باغ اُگائے اور کاٹی جانے والی فصلیں۔ ۱۰۔اور کھجوروں کے لمبے درخت جن میں تہہ بہ تہہ خوشے لگتے ہیں۔۱۱۔ بندوں کی روزی کے لیے۔اور ہم نے اس کے ذریعہ سے مُردہ زمین کو زندہ کیا۔اسی طرح زمین سے نکلنا ہوگا۔

کائنات کی معنویت، اس کی تخلیقی حکمت، اس کا ہر قسم کے نقص سے خالی ہونا، اس کا انسانی ضرورتوں کے عین مطابق ہونا، یہ واقعات ہر صاحبِ عقل کو غور وفکر پر مجبور کرتے ہیں۔اور جو شخص سنجیدگی کے ساتھ کائنات کے نظام پر غور کرے وہ مخلوقات کے اندر اس کے خالق کو پالے گا۔ وہ دنیا کے اندر آخرت کی جھلک دیکھ لے گا، کیوں کہ آخرت کی دنیا دراصل موجودہ دنیا ہی کا دوسرا لازمی روپ ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ۝١٢ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ۝١٣ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝١٤ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝١٥ ع ۱۵

۱۲۔ ان سے پہلے نوح کی قوم اور اصحاب الرس اور ثمود۔ ۱۳۔اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی۔ ۱۴۔ اور ایکہ والے اور تبع کی قوم نے بھی جھٹلایا، سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ پس میرا ڈرانا ان پر واقع ہو کر رہا۔ ۱۵۔کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز رہے۔ بلکہ یہ لوگ از سرِ نو پیدا کرنے کی طرف سے شبہ میں ہیں۔

قرآن نے تاریخ کا جو تصور پیش کیا ہے، اس کے مطابق یہاں بار بار ایسا ہوا ہے کہ پیغمبروں کے انکار کے نتیجہ میں ان کی مخاطب قومیں ہلاک کردی گئیں۔ یہاں انہیں ہلاک شدہ قوموں میں سے کچھ قوموں کا ذکر بطورِ مثال فرمایا گیا ہے۔قوموں کی یہ ہلاکت دراصل آخرت کا ایک حصہ ہے۔منکرین حق کے لیے جو عذاب آخرت میں مقدر ہے اس کا ایک جزء اسی آج کی دنیا میں دکھا دیا جاتا ہے۔

دنیا کی پہلی تخلیق اس کی دوسری تخلیق کے امکان کو ثابت کر رہی ہے۔اگر آدمی سنجیدہ ہو تو آخرت کو ماننے کے لیے اس کے بعد اسے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝١٦ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ

۱۶۔ اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں ان باتوں کو جو اس کے دل میں آتی ہیں۔اور ہم رگِ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ ۱۷۔ جب دو لینے والے لیتے رہتے ہیں جو

وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ
اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾

کہ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہیں۔ ۱۸۔ کوئی لفظ وہ نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک مستعد نگراں موجود ہے۔

دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں ''ریکارڈنگ'' کا ناقابلِ خطا نظام موجود ہے۔ انسان کی سوچ اس کے ذہنی پردہ پر ہمیشہ کے لیے نقش ہورہی ہے۔ انسان کا ہر بول ہوائی لہروں کی صورت میں مستقل طور پر باقی رہتا ہے۔ انسان کا عمل حرارتی لہروں کے ذریعہ خارجی دنیا میں اس طرح محفوظ ہوجاتا ہے کہ اس کو کسی بھی وقت دہرایا جاسکے۔ یہ سب آج کی معلوم حقیقتیں ہیں۔ اور یہ معلوم حقیقتیں قرآن کی اس خبر کو قابل فہم بنارہی ہیں کہ انسان کی نیت، اس کا قول اور اس کا عمل سب کچھ خالق کے علم میں ہے۔ انسان کی ہر چیز فرشتوں کے رجسٹر میں درج کی جارہی ہے۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا
كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ
يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا
سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ
هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ
حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ
عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ ؕ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ ۙ
مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ﴿۲۵﴾ ۙ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ
اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿۲۶﴾
قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ
ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ
قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ
ع الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ ع

۱۹۔ اور موت کی بے ہوشی حق کے ساتھ آپہنچی۔ یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔ ۲۰۔ اور صور پھونکا جائے گا، یہ ڈرانے کا دن ہوگا۔ ۲۱۔ ہر شخص اس طرح آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ ۲۲۔ تم اس سے غفلت میں رہے۔ پس ہم نے تمھارے اوپر سے پردہ ہٹادیا۔ پس آج تمھاری نگاہ تیز ہے۔ ۲۳۔ اور اس کے ساتھ کا فرشتہ کہے گا، یہ جو میرے پاس تھا حاضر ہے۔ ۲۴۔ جہنم میں ڈال دو ناشکر، مخالف کو۔ ۲۵۔ نیکی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، شبہ ڈالنے والا۔ ۲۶۔ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بنائے، پس اس کو ڈال دو سخت عذاب میں۔ ۲۷۔ اس کا ساتھی شیطان کہے گا کہ اے ہمارے رب، میں نے اسے سرکش نہیں بنایا بلکہ وہ خود راہ بھولا ہوا، دور پڑا تھا۔ ۲۸۔ ارشاد ہوگا، میرے سامنے جھگڑا نہ کرو اور میں نے پہلے ہی تم کو عذاب سے ڈرادیا تھا۔ ۲۹۔ میرے یہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔

ان آیات میں موت اور اس کے بعد قیامت کا منظر کھینچا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہاں ان لوگوں پر کیا بیتے گی

جو موجودہ امتحان کی دنیا میں اپنے کو آزاد پا کر سرکش بنے ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ منظر کشی اتنی بھیانک ہے کہ زندہ آدمی کو تڑپا دینے کے لیے کافی ہے۔

یَوۡمَ نَقُوۡلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امۡتَلَاۡتِ وَتَقُوۡلُ
هَلۡ مِنۡ مَّزِيۡدٍ ۝٣٠ وَ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّةُ
لِلۡمُتَّقِيۡنَ غَيۡرَ بَعِيۡدٍ ۝٣١ هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ
لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيۡظٍ ۝٣٢ مَنۡ خَشِىَ الرَّحۡمٰنَ
بِالۡغَيۡبِ وَجَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِيۡبِ ۝٣٣ ادۡخُلُوۡهَا
بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ ۝٣٤ لَهُمۡ مَّا
يَشَآءُوۡنَ فِيۡهَا وَلَدَيۡنَا مَزِيۡدٌ ۝٣٥

۳۰۔ جس دن ہم جہنم سے کہیں گے، کیا تو بھر گئی۔ اور وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے۔ ۳۱۔ اور جنت ڈرنے والوں کے قریب لائی جائے گی، کچھ دور نہ رہے گی۔ ۳۲۔ یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر رجوع کرنے والے اور یاد رکھنے والے کے لیے۔ ۳۳۔ جو شخص رحمان سے ڈرا بن دیکھے اور رجوع ہونے والا دل لے کر آیا۔ ۳۴۔ داخل ہو جاؤ اس میں سلامتی کے ساتھ، یہ دن ہمیشہ رہے گا۔ ۳۵۔ وہاں ان کے لیے وہ سب ہوگا جو وہ چاہیں۔ اور ہمارے پاس مزید ہے۔

خدا کی ابدی جنت کے مستحق کون لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہے۔ جو لوگ بن دیکھے ڈرے وہی وہ لوگ ہیں جو اس دن ڈر اور غم سے محفوظ رہیں گے جب ڈر لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ اللہ کا خوف آدمی کے اندر جنت والے اوصاف پیدا کرتا ہے اور اللہ سے بے خوفی جہنم والے اوصاف۔

وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَشَدُّ
مِنۡهُمۡ بَطۡشًا فَنَقَّبُوۡا فِى الۡبِلَادِ ؕ هَلۡ مِنۡ
مَّحِيۡصٍ ۝٣٦ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰى لِمَنۡ
كَانَ لَهٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَى السَّمۡعَ وَهُوَ
شَهِيۡدٌ ۝٣٧

۳۶۔ اور ہم ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، وہ قوت میں ان سے زیادہ تھیں، پس انھوں نے ملکوں کو چھان مارا کہ ہے کوئی پناہ کی جگہ۔ ۳۷۔ اس میں یاددہانی ہے اس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہو یا وہ کان لگائے متوجہ ہو کر۔

قومیں ابھرتی ہیں اور عروج کو پہنچ جاتی ہیں مگر جب وہ اپنی بداعمالی کے نتیجہ میں خدا کی زد میں آتی ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ زمین میں کہیں کوئی جگہ نہیں ہوتی جہاں وہ بھاگ کر پناہ لے سکیں۔ تاریخ کے ان واقعات میں زبردست نصیحت ہے۔ مگر نصیحت وہ شخص لے گا جس کے اندر یا تو سوچنے کی صلاحیت زندہ ہو کہ وہ خود

واقعات کے خاموش پیغام کو اخذ کر سکے۔ یا اس کے اندر سننے کی صلاحیت زندہ ہو کہ جب اس کو بتایا جائے تو وہ اس کے اندرون تک بلا روک ٹوک پہنچے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾

۳۸۔ اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دن میں بنایا اور ہم کو کچھ تکان نہیں ہوئی۔ ۳۹۔ پس جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرو حمد کے ساتھ، سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے۔ ۴۰۔ اور رات میں اس کی تسبیح کرو اور سجدوں کے پیچھے۔

زمین وآسمان کو چھ دنوں، بالفاظ دیگر چھ ادوار میں پیدا کرنا بتاتا ہے کہ خدا کا طریقہ تدریجی عمل کا طریقہ ہے۔ اور جب خدا ساری طاقتوں کا مالک ہونے کے باوجود واقعات کو تدریج کے ساتھ لمبی مدت میں ظہور میں لاتا ہے تو انسان کو بھی چاہیے کہ وہ جلد بازی سے بچے، وہ صابرانہ عمل کے ذریعہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

دعوت کا عمل شروع سے آخر تک صبر کا عمل ہے۔ اس میں انسان کی طرف سے پیش آنے والی تلخیوں کو سہنا پڑتا ہے۔ اس میں نتیجہ سامنے دکھائی نہ دینے کے باوجود اپنے عمل کو جاری رکھنا پڑتا ہے۔ اس صبر آزما عمل پر وہی شخص قائم رہ سکتا ہے جس کی صبح وشام ذکر اور عبادت میں گزرتی ہوں، جو انسانوں سے نہ پا کر خدا سے پا رہا ہو، جو سب کچھ کھو کر بھی احساس محرومی کا شکار نہ ہو سکے۔

''ہم کو تکان نہیں ہوتی'' ایک ضمنی فقرہ ہے۔ موجودہ محرف بائبل میں ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا (خروج 20:11)۔ یہ فقرہ اسی کی تصحیح وتردید ہے۔ آرام وہ کرتا ہے جو تھکے۔ خدا کو تکان نہیں ہوتی اس لیے اس کو آرام کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾

۴۱۔ اور کان لگائے رکھو کہ جس دن پکارنے والا بہت قریب سے پکارے گا۔ ۴۲۔ جس دن لوگ بالیقین چنگھاڑ کو سنیں گے وہ نکلنے کا دن ہوگا۔ ۴۳۔ بے شک ہم ہی جِلاتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔ ۴۴۔ جس دن زمین ان پر سے کھل جائے گی، وہ سب دوڑتے ہوں گے، یہ اکٹھا کرنا ہمارے لیے آسان ہے۔

قیامت کی کوئی تاریخ مقرر نہیں۔ کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا اور اسرافیل صور میں پھونک مار کر اس کی اچانک آمد کی اطلاع دے دیں گے۔

جو لوگ خدا سے غافل ہیں وہ قیامت کو دور کی چیز سمجھتے ہیں۔ مگر جو سچا مومن ہے وہ ہر آن اس اندیشہ میں رہتا ہے کہ کب صور پھونک دیا جائے اور کب قیامت آجائے۔ صور پھونکے جانے کے بعد زمین و آسمان کا نقشہ بدل چکا ہوگا اور تمام لوگ ایک نئی دنیا میں جمع کیے جائیں گے تاکہ اپنے اپنے عمل کے مطابق اپنا ابدی انجام پا سکیں۔

نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِجَبَّارٍ ۟ فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ یَّخَافُ وَعِیۡدِ ﴿۴۵﴾ ع ۳

۴۵۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ اور تم ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔ پس تم قرآن کے ذریعہ اُس شخص کو نصیحت کرو جو میرے ڈرانے سے ڈرے۔

قرآن میں بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ تمہارا کام صرف پہنچا دینا ہے تمہارا کام لوگوں کو بدلنا نہیں ہے۔ دوسری طرف قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ خدا تمہارے ذریعہ سے دین حق کو تمام دینوں پر غالب کرے گا۔

یہ دو بات دراصل پیغمبر اسلام کی دو مختلف حیثیتوں کے اعتبار سے ہے۔ آپ ایک اعتبار سے ''رسول اللہ'' تھے۔ دوسرے اعتبار سے آپ ''خاتم النبیین'' تھے۔ رسول اللہ ہونے کی حیثیت سے آپ کا کام وہی تھا جو تمام پیغمبروں کا تھا۔ یعنی امرِ حق کو لوگوں تک پوری طرح پہنچا دینا۔ مگر خاتم النبیین ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کو یہ بھی مطلوب تھا کہ آپ کے ذریعہ سے وہ اسباب پیدا کیے جائیں جو ہدایت الٰہی کو مستقل طور پر محفوظ کر دیں۔ تاکہ دوبارہ پیغمبر بھیجنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ آپ کی اس دوسری حیثیت کا تقاضا تھا کہ آپ کے ذریعہ سے وہ انقلاب لایا جائے جو شرک کے غلبہ کو ختم کر دے اور اسلام کو ایک ایسی غالب قوت کی حیثیت سے قائم کر دے جو ہمیشہ کے لیے ہدایت الٰہی کی حفاظت کی ضمانت بن جائے۔

۵۱۔ سُوۡرَۃُ الذّٰرِیٰت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَ الذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ﴿۳﴾ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد اُڑانے والی ہیں۔
۲۔ پھر وہ اٹھا لیتی ہیں بوجھ۔ ۳۔ پھر وہ چلنے لگتی ہیں آہستہ۔ ۴۔ پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملہ۔
۵۔ بے شک تم سے جو وعدہ کیا جا رہا ہے وہ سچ

لَوَاقِعٌ ۝٦ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝٧
اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝٨ يُّؤْفَكُ عَنْهُ
مَنْ اُفِكَ ۝٩

ہے۔ ٦۔ اور بے شک انصاف ہونا ضرور ہے۔ ٧۔ قسم ہے جال دار آسمان کی۔ ٨۔ بے شک تم ایک اختلاف میں پڑے ہوئے ہو۔ ٩۔ اس سے وہی پھرتا ہے جو پھیرا گیا۔

یہاں بارش کے عمل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ پہلے تیز ہوائیں اٹھتی ہیں۔ پھر مختلف مراحل سے گزر کر وہ بادلوں کو چلاتی ہیں۔ اور پھر وہ کسی گروہ پر بارانِ رحمت برساتی ہیں اور کسی گروہ پر سیلاب کی صورت میں تباہ کاریاں لاتی ہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ خدا کی اس دنیا میں ''تقسیم امر'' کا قانون ہے۔ یہاں کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو دیا جاتا ہے اور کسی سے چھین لیا جاتا ہے۔ یہ ایک اشارہ ہے جو بتاتا ہے کہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں انسان کے ساتھ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ وہاں تقسیم امر کا یہ اصول اپنی کامل صورت میں نافذ ہوگا۔ ہر ایک کو حد درجہ انصاف کے ساتھ وہی ملے گا جو اسے ملنا چاہیے اور وہ نہیں ملے گا جس کو پانے کا وہ مستحق نہ تھا۔

آسمان میں بے شمار ستارے ہیں۔ یہ سب کے سب اپنے اپنے مداروں میں گھوم رہے ہیں۔ اگر ان کی مجموعی تصویر بنائی جائے تو وہ کسی خانہ دار جال کی مانند ہوگی۔ اس قسم کا حیرت ناک نظام اپنے اندر گہری معنویت کا اشارہ کرتا ہے۔ جو لوگ اپنی عقل کو استعمال کریں وہ اس میں سبق پائیں گے۔ اور جو لوگ اپنی عقل کو استعمال نہ کریں ان کے لیے وہ ایک بے معنی رقص ہے جس کے اندر کوئی سبق نہیں۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝١٠ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ
سَاهُوْنَ ۝١١ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٢
يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝١٣ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ
هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝١٤ اِنَّ
الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝١٥ اٰخِذِيْنَ مَآ
اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ
مُحْسِنِيْنَ ۝١٦ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا
يَهْجَعُوْنَ ۝١٧ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝١٨
وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝١٩

١٠۔ مارے گئے اٹکل سے باتیں کرنے والے۔ ١١۔ جو غفلت میں بھولے ہوئے ہیں۔ ١٢۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کب ہے بدلہ کا دن۔ ١٣۔ جس دن وہ آگ پر رکھے جائیں گے۔ ١٤۔ چکھو مزہ اپنی شرارت کا، یہ ہے وہ چیز جس کی تم جلدی کر رہے تھے۔ ١٥۔ بے شک ڈرنے والے لوگ باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔ ١٦۔ لے رہے ہوں گے جو کچھ ان کے رب نے ان کو دیا، وہ اس سے پہلے نیکی کرنے والے تھے۔ ١٧۔ وہ راتوں کو کم سوتے تھے۔ ١٨۔ اور صبح کے وقتوں میں وہ معافی مانگتے تھے۔ ١٩۔ اور ان کے مال میں سائل اور محروم کا حصہ تھا۔

کسی بات کو سمجھنے کے لیے سب سے ضروری شرط سنجیدگی ہے۔ جو لوگ ایک بات کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہوں وہ اس کے قرائن و دلائل پر دھیان نہیں دیتے۔ اس لیے وہ اس کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ وہ اس کا مذاق اڑا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کو سنجیدہ غور وفکر کا موضوع سمجھا جائے۔ ایسے لوگوں کو منوانا کسی طرح ممکن نہیں۔ وہ صرف اس وقت اعتراف کریں گے جب کہ ان کی غلط روش ایک ایسا عذاب بن کر ان کے اوپر ٹوٹ پڑے جس سے چھٹکارا پانا کسی طرح ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

سنجیدہ لوگوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کی سنجیدگی ان کو محتاط بنا دیتی ہے۔ ان سے سرکشی کا مزاج رخصت ہو جاتا ہے۔ ان کا بڑھا ہوا احساس انہیں راتوں کو بھی بیدار رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کے اوقات خدا کی یاد میں بسر ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنے مال کو اپنی محنت کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو خدا کا عطیہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس میں دوسروں کا بھی حق سمجھنے لگتے ہیں جس طرح وہ اس میں اپنا حق سمجھتے ہیں۔

وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَ فِيْٓ
اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٢١﴾ وَ فِي السَّمَاۗءِ
رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿٢٢﴾ فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَ
الْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ
تَنْطِقُوْنَ ﴿٢٣﴾ ع
۲۳ ۱۸

۲۰۔ اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے۔ ۲۱۔ اور خود تمھارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں۔ ۲۲۔ اور آسمان میں تمھاری روزی ہے اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ۲۳۔ پس آسمان اور زمین کے رب کی قسم، وہ یقینی ہے جیسا کہ تم بولتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ موجودہ معلوم دنیا بعد کو آنے والی نامعلوم دنیا کی نشانی بن گئی ہے۔ زمین میں پھیلے ہوئے مادی واقعات اور انسان کے اندر چھپے ہوئے احساسات دونوں بالواسطہ انداز میں اس واقعہ کی پیشگی خبر دے رہے ہیں، جو موت کے بعد براہ راست انداز میں انسان کے سامنے آنے والا ہے۔ انہیں نشانیوں میں سے ایک نشانی نطق (بولنا) ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ آخرت میں جو کچھ ملے گا وہ خود آدمی کے اپنے اعمال ہوں گے جو اس کی طرف لوٹا دیے جائیں گے (إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ إِلَيْكُمْ) المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 4511۔ گویا آخرت کی دنیا موجودہ دنیا ہی کا مثنیٰ (counterpart) ہے۔ آدمی کا نطق اسی امکان کا ایک جزئی مظاہرہ ہے۔ آدمی کی آواز ٹیپ پر ریکارڈ کر دی جائے اور پھر ٹیپ کو بجایا جائے تو عین وہی آواز اس سے نکلتی ہے جو انسان کی آواز تھی۔ ٹیپ کی آواز انسان کی اصل آواز کا مثنیٰ (counterpart) ہے۔ اس طرح آواز جزئی سطح پر اس واقعہ کا تجربہ کرا رہی ہے جو کلی سطح پر آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے۔

''وہ یقینی ہے تمہارے نطق کی طرح''، یعنی جب تمہارے نطق کی تکرار ممکن ہے تو تمہارے وجود کی تکرار

کیوں ممکن نہیں۔ انسانی ہستی کے ایک جزء کی کامل تکرار کا مشاہدہ اسی دنیا میں ہو رہا ہے، اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انسانی ہستی کے کامل مجموعہ کی تکرار بھی ہو سکتی ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۙ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾

۲۴۔ کیا تم کو ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات پہنچی۔ ۲۵۔ جب وہ اس کے پاس آئے۔ پھر ان کو سلام کیا۔ اس نے کہا تم لوگوں کو بھی سلام ہے — کچھ اجنبی لوگ ہیں۔ ۲۶۔ پھر وہ اپنے گھر کی طرف چلا اور ایک بچھڑا بھنا ہوا لے آیا۔ ۲۷۔ پھر اس کو ان کے پاس رکھا، اس نے کہا، آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں۔ ۲۸۔ پھر وہ دل میں ان سے ڈرا۔ انھوں نے کہا کہ ڈرو مت۔ اور ان کو ذی علم لڑکے کی بشارت دی۔ ۲۹۔ پھر اس کی بیوی بولتی ہوئی آئی، پھر ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگی کہ بوڑھی، بانجھ۔ ۳۰۔ انھوں نے کہا کہ ایسا ہی فرمایا ہے تیرے رب نے۔ بے شک وہ حکمت والا جاننے والا ہے۔

ان آیتوں میں اس منظر کا بیان ہے جب کہ حضرت ابراہیم کے پاس خدا کے فرشتے آئے تا کہ انہیں بڑھاپے میں اولاد کی بشارت دیں۔ حضرت ابراہیم قدیم عراق میں پیدا ہوئے۔ وہ لمبی مدت تک اپنی قوم کو توحید اور آخرت کا پیغام دیتے رہے۔ مگر آپ کی بیوی اور آپ کے ایک بھتیجے کے سوا کوئی بھی شخص آپ کی بات ماننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ آپ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے۔

اب آپ کے مشن کا تسلسل باقی رکھنے کے لیے دوسری ممکن صورت صرف یہ تھی کہ آپ کے یہاں اولاد پیدا ہو اور آپ اس کو تربیت دے کر تیار کریں۔ باپ اور بیٹے کے درمیان خونی تعلق ہوتا ہے۔ یہ خونی تعلق ایک اضافی طاقت بن جاتا ہے جو بیٹے کو اپنے باپ کے ساتھ ہر حال میں جوڑے رکھے اور اس کو اس کا ہم خیال بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو آخر عمر میں دو لڑکے عطا کیے۔ ایک، حضرت اسحاق جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل میں دعوت توحید کا تسلسل جاری رہا۔ دوسرے، حضرت اسماعیل جن کے ذریعہ عرب کے صحرا میں ایک ایسی نسل تیار کرنے کا کام لیا گیا جو پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر آپ کے تاریخی مشن کی تکمیل کرے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾
قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾
لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾
مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾
فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾
فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ
الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَ تَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ
يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾

☆۳۱۔ ابراہیم نے کہا کہ اے فرشتو، تم کو کیا مہم درپیش ہے۔ ۳۲۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم (قوم لوط) کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ۳۳۔ تاکہ ہم اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائیں۔ ۳۴۔ جو نشان لگائے ہوئے ہیں تمھارے رب کے پاس ان لوگوں کے لیے جو حد سے گزرنے والے ہیں۔ ۳۵۔ پھر وہاں جتنے ایمان والے تھے ان کو ہم نے نکال لیا۔ ۳۶۔ پس وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا کوئی مسلم گھر نہ پایا۔ ۳۷۔ اور ہم نے اس میں ایک نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم اس وقت فلسطین میں تھے۔ قریب ہی بحر مردار کے پاس سدوم وعمورہ کی بستیاں تھیں۔ جہاں قوم لوط کے لوگ آباد تھے۔ حضرت لوط کی طویل تبلیغ کے باوجود وہ لوگ خدا فراموشی کی زندگی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ حضرت لوط اور ان کے ساتھی اللہ کے حکم سے باہر آگئے۔ مذکورہ فرشتوں نے زلزلہ اور آندھی اور کنکروں کی بارش سے پوری قوم کو ہلاک کر دیا۔

قوم لوط دو ہزار سال پہلے ختم ہوگئی۔ مگر اس کا تباہ شدہ مسکن (بحر مردار کا جنوبی علاقہ) آج بھی ان لوگوں کو سبق دے رہا ہے جو واقعات سے سبق لینے کا مزاج رکھتے ہوں۔

وَ فِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوْ
مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي
الْيَمِّ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَ فِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ
اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾ وَ فِيْ
ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾

۳۸۔ اور موسیٰ میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے اس کو فرعون کے پاس ایک کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ بھیجا۔ ۳۹۔ تو وہ اپنی قوت کے ساتھ پھر گیا۔ اور کہا کہ یہ جادوگر ہے یا مجنون ہے۔ ۴۰۔ پس ہم نے اس کو اور اس کی فوج کو پکڑا، پھر ان کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ سزاوارِ ملامت تھا۔ ۴۱۔ اور عاد میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے ان پر ایک بے نفع ہوا بھیج دی۔ ۴۲۔ وہ جس چیز پر سے بھی گزری، اس کو ریزہ ریزہ کر کے

فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ
وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ
وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ
ع ۲ قَبْلُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾

چھوڑ دیا۔ ۴۳۔ اور ثمود میں بھی نشانی ہے جب کہ ان سے کہا گیا کہ تھوڑی مدت تک کے لیے فائدہ اُٹھالو۔ ۴۴۔ پس انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی، پس ان کو کڑک نے پکڑ لیا۔ اور وہ دیکھ رہے تھے۔ ۴۵۔ پھر وہ نہ اُٹھ سکے۔ اور نہ اپنا بچاؤ کر سکے۔ ۴۶۔ اور نوح کی قوم کو بھی اس سے پہلے، بے شک وہ نافرمان لوگ تھے۔

فرعون مصر نے حضرت موسیٰ کے معجزوں کو جادو قرار دیا۔ آپ کا وہ یقین جو آپ کے برسر حق ہونے کو ظاہر کر رہا تھا اس کو اس نے جنون سے تعبیر کیا تھا۔ اسی کا نام تلبیس ہے۔ اور یہی تلبیس ہمیشہ ان لوگوں کا طریقہ رہا ہے جو دلیل کے باوجود حق کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔

حق کے مقابلہ میں اس قسم کی سرکشی کرنے والے لوگ کبھی خدا کی پکڑ سے نہیں بچتے۔ فرعون اسی بنا پر ہلاک کیا گیا۔ اور قوم عاد اور قوم ثمود اور قوم نوح بھی اسی بنا پر تباہ و برباد کر دی گئی۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کی دنیا میں کوئی اور فائدہ اس تھوڑے سے فائدہ کے سوا مقدر نہیں جو امتحان کی مصلحت کے تحت انہیں محدود مدت کے لیے حاصل ہوا تھا۔

وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا
لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ
الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا
زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْٓا اِلَى
اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ وَ
لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ
نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾

۴۷۔ اور ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا اور ہم کشادہ کرنے والے ہیں۔ ۴۸۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا، پس کیا ہی ہم خوب بچھانے والے ہیں۔ ۴۹۔ اور ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے تاکہ تم دھیان کرو۔ ۵۰۔ پس دوڑو اللہ کی طرف، میں اس کی طرف سے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۵۱۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بناؤ، میں اس کی طرف سے تمھارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

''ہم آسمان کو کشادہ کرنے والے ہیں'' اس فقرہ میں غالباً کائنات کی اس نوعیت کی طرف اشارہ ہے جو صرف حال میں دریافت ہوئی ہے۔ یعنی کائنات کا مسلسل اپنے چاروں طرف پھیلنا۔ کائنات کا اس طرح پھیلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو کسی پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے۔ کیوں کہ اس پھیلاؤ کا مطلب یہ

ہے کہ اپنی ابتدا میں وہ سکڑی ہوئی تھی۔ معلوم مادی قانون کے مطابق کائنات کے اس ابتدائی گولے کے تمام اجزا اندر کی طرف کھنچے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں ان کا بیرونی طرف سفر کرنا کسی خارجی مداخلت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور خارجی مداخلت کو ماننے کے بعد خدا کا ماننا لازم ہوجاتا ہے۔

ہماری دنیا کا نظام انتہائی بامعنی نظام ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کی تخلیق کسی اعلیٰ مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے زمین کو فساد سے بھر رکھا ہے۔ بامعنی کائنات میں یہ بے معنی واقعہ بالکل بے جوڑ ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ایک ایسی دنیا بنے جو ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہو۔

یہاں دوبارہ موجودہ دنیا کے اندر ایک ایسا واقعہ موجود ہے جو اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ اور وہ ہے یہاں کی تمام چیزوں کا جوڑے جوڑے ہونا، مادہ میں مثبت اور منفی ذرے، نباتات میں نر اور مادہ، انسان میں عورت اور مرد۔ اس سے کائنات کا یہ مزاج معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشیاء کی کمی کو اس کے جوڑے کے ذریعہ مکمل کرنے کا قانون رائج ہے۔ یہ ایک قرینہ ہے جو آخرت کے امکان کو ثابت کرتا ہے آخرت کی دنیا گویا موجودہ دنیا کا دوسرا جوڑا ہے جس سے مل کر ہماری دنیا اپنے آپ کو مکمل کرتی ہے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿٥٢﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿٥٤﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٥﴾

۵۲۔ اسی طرح ان کے اگلوں کے پاس کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو انھوں نے ساحر یا مجنون نہ کہا ہو۔ ۵۳۔ کیا یہ ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے چلے آرہے ہیں، بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔ ۵۴۔ پس تم ان سے اعراض کرو، تم پر کچھ الزام نہیں۔ ۵۵۔ اور سمجھاتے رہو کیوں کہ سمجھانا ایمان والوں کو نفع دیتا ہے۔

ایک سنجیدہ آدمی اگر کسی بات کی دلیل مانگے تو دلیل سامنے آنے کے بعد وہ اس کو مان لیتا ہے۔ مگر جو لوگ سرکشی کا مزاج رکھتے ہوں انہیں کسی بھی دلیل سے چپ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہر دلیل کو نہ ماننے کے لیے دوبارہ کچھ نئے الفاظ پالیں گے۔ حتی کہ اگر ان کے سامنے ایسی دلیل پیش کردی جائے جس کا توڑ ممکن نہ ہو تو وہ یہ کہہ کر اسے نظر انداز کردیں گے کہ یہ تو جادو ہے۔

یہ ان لوگوں کا حال ہے جن کو قوم کے اندر بڑائی کا درجہ مل گیا ہو۔ ایسے لوگوں کے لیے ان کی بڑائی کا احساس اس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کی زبان سے جاری ہونے والی سچائی کو مان لیں۔

ایسے لوگ اگر دعوت حق کو نہ مانیں تو داعی کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ وہ ان دوسرے لوگوں میں اپنے حامی پالے گا جو جھوٹی بڑائی کے احساس میں مبتلا ہونے سے بچے ہوئے ہوں۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

۵۶۔ اور میں نے جن اور انسان کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ ۵۷۔ میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلائیں۔ ۵۸۔ بے شک اللہ ہی روزی دینے والا، زور آور، زبردست ہے۔ ۵۹۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا، ان کا ڈول بھر چکا ہے جیسے ان کے ساتھیوں کے ڈول بھرے تھے، پس وہ جلدی نہ کریں۔ ۶۰۔ پس منکروں کے لیے خرابی ہے ان کے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے۔

خدا ہر قسم کا ذاتی اختیار رکھتا ہے۔ تاہم فرشتوں کو اس نے اپنی وسیع سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر انسانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان اس لیے پیدا نہیں کیے گئے کہ وہ خدا کی کسی شخصی یا انتظامی ضرورت کو پورا کریں۔ ان کی پیدائش کا واحد مقصد خدا کی عبادت ہے۔ عبادت کا مطلب اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکانا ہے، اپنے آپ کو پوری طرح خدا کا پرستار بنا دینا ہے۔

اس عبادت کا خلاصہ معرفت ہے۔ چنانچہ ابن عباس نے الا لیعبدون کی تشریح الا لیعرفون سے کی ہے (المجالسۃ وجواہر العلم، اثر نمبر 225)۔ یہی تفسیر ابن جُریج (تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 425) اور مجاہد تابعی (البحر المحیط، جلد 9، صفحہ 562) نے بھی کی ہے۔ یعنی انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کو بطور دریافت کے پائے۔ وہ بن دیکھے خدا کو پہچانے۔ اسی کا نام معرفت ہے۔ اس معرفت کے نتیجہ میں آدمی کی جو زندگی بنتی ہے اسی کو عبادت و بندگی کہا جاتا ہے۔

پانی کا ڈول بھرنے کے بعد ڈوب جاتا ہے اسی طرح آدمی کی مہلت عمل پوری ہونے کے بعد فوراً اس کی موت آجاتی ہے۔ جو شخص ڈول بھرنے سے پہلے اپنی اصلاح کرلے اس نے اپنے آپ کو بچا یا۔ اور جو شخص آخر وقت تک غافل رہا وہ ہلاک ہو گیا۔

ظالم لوگ اگر پکڑے نہ جارہے ہوں تو انہیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ چھوڑ دیے گئے ہیں۔ وہ اس لیے آزاد ہیں کہ خدا کا طریقہ جلدی پکڑنے کا طریقہ نہیں، نہ اس لیے کہ خدا انہیں پکڑنے والا نہیں۔

۵۲۔ سُوْرَةُ الطُّوْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَ الطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ
مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّ الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ وَ السَّقْفِ
الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ
رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾ يَّوْمَ
تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ
سَيْرًا ؕ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾
الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ﴿۱۲﴾ يَوْمَ
يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ
الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ
اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْۤا اَوْ لَا
تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے طور کی۔ ۲۔ اور لکھی ہوئی کتاب کی۔
۳۔ کشادہ ورق میں۔ ۴۔ اور آباد گھر کی۔ ۵۔ اور
اونچی چھت کی۔ ۶۔ اور ابلتے ہوئے سمندر کی۔
۷۔ بے شک تمھارے رب کا عذاب واقع ہو کر
رہے گا۔ ۸۔ اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں۔ ۹۔ جس
دن آسمان ڈگمگائے گا۔ ۱۰۔ اور پہاڑ چلنے لگیں
گے۔ ۱۱۔ پس خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں
کے لیے۔ ۱۲۔ جو باتیں بناتے ہیں کھیلتے
ہوئے۔ ۱۳۔ جس دن وہ جہنم کی آگ کی طرف
ڈھکیلے جائیں گے۔ ۱۴۔ یہ ہے وہ آگ جس کو تم
جھٹلاتے تھے۔ ۱۵۔ کیا یہ جادو ہے یا تم کو نظر
نہیں آتا۔ ۱۶۔ اس میں داخل ہو جاؤ۔ پھر تم
صبر کرو یا صبر نہ کرو، تمھارے لیے یکساں ہے۔ تم
وہی بدلہ پا رہے ہو جو تم کرتے تھے۔

طور صحرائے سینا کا وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ کو پیغمبری دی گئی۔ کتاب مسطور سے مراد تورات ہے۔ بیت معمور سے مراد زمین اور سقف مرفوع سے مراد آسمان ہے۔ بحر مسجور سے مراد موجیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ یہ چیزیں شاہد ہیں کہ خدا کی پکڑ کا دن یقیناً آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہی خبر پیغمبروں کے ذریعہ دیتا رہا ہے۔ قدیم آسمانی کتابوں میں یہی بات درج ہے۔ زمین و آسمان اپنی خاموش زبان میں اس کا اعلان کر رہے ہیں۔ سمندر کی موجیں ہر سننے والے کو اس کی کہانی سنا رہی ہیں۔

انسان کو اپنے عمل کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔ یہ بات آج پیشگی اطلاع کی صورت میں بتائی جا رہی ہے۔ جو لوگ پیشگی اطلاع سے ہوش میں نہ آئیں ان پر ان کی غفلت اور سرکشی کل کے دن ایک دردناک عذاب کی صورت میں آپڑے گی اور پھر وہ اس سے بھاگنا چاہیں گے مگر وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہ جا سکیں گے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ ﴿۱۷﴾ فٰكِهِيْنَ
بِمَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ
الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ
وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾

۱۷۔ بے شک متقی لوگ باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ ۱۸۔ وہ خوش دل ہوں گے ان چیزوں سے جو ان کے رب نے انھیں دی ہوں گی، اور ان کے رب نے ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالیا۔ ۱۹۔ کھاؤ اور پیو مزہ کے ساتھ اپنے اعمال کے بدلہ میں۔ ۲۰۔ تکیہ لگائے ہوئے صف بہ صف تختوں کے اوپر۔ اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ان سے بیاہ دیں گے۔

انسان کا سب سے بڑا جرم حق کو جھٹلانا ہے۔ اس سے بقیہ تمام جرائم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی سب سے بڑی نیکی حق کا اعتراف ہے، تمام دوسری نیکیاں اسی سے بطور نتیجہ ظاہر ہوتی ہیں۔

حق کو ماننے سے آدمی کی بڑائی ٹوٹتی ہے۔ یہ کسی انسان کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس پر وہی لوگ پورے اترتے ہیں جن کو اللہ کے ڈر نے آخری حد تک سنجیدہ بنا دیا ہو۔ جو لوگ اس سب سے بڑی نیکی کا ثبوت دیں وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کے لیے جنت کی ابدی نعمتوں کے دروازے کھول دیے جائیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ
اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ
عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ
رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا
يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۲﴾ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ
فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ
لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۲۴﴾ وَ اَقْبَلَ
بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْٓا اِنَّا
كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ

۲۱۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ان کی راہ پر ایمان کے ساتھ چلی، ان کے ساتھ ہم ان کی اولاد کو بھی جمع کریں گے، اور ان کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے۔ ہر آدمی اپنی کمائی میں پھنسا ہوا ہے۔ ۲۲۔ اور ہم ان کی پسند کے میوے اور گوشت ان کو برابر دیتے رہیں گے۔ ۲۳۔ ان کے درمیان شراب کے پیالوں کے تبادلے ہو رہے ہوں گے جو لغویت اور گناہ سے پاک ہوگی۔ ۲۴۔ اور ان کی خدمت میں بچے دوڑتے پھر رہے ہوں گے، گویا کہ وہ حفاظت سے رکھے ہوئے موتی ہیں۔ ۲۵۔ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات کریں گے۔ ۲۶۔ وہ کہیں گے کہ ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں

عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾ اِنَّا كُنَّا
مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿٢٨﴾ ع ۴۸ ۳

ڈرتے رہتے تھے۔ ۲۷۔ پس اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہم کو لُو کے عذاب سے بچالیا۔ ۲۸۔ ہم اس سے پہلے اسی کو پکارتے تھے، بے شک وہ نیک سلوک والا، مہربان ہے۔

آخرت میں ایسا نہیں ہوگا کہ ایک شخص کا گناہ دوسرے شخص کے اوپر ڈال دیا جائے۔ اور نہ کوئی شخص ایمان وعمل کے بغیر جنت میں داخلہ پا سکے گا۔ البتہ اہل جنت کے ساتھ ایک خاص فضل کا معاملہ یہ ہوگا کہ والدین اگر جنت کے بلند درجہ میں ہوں اور ان کی اولاد کسی اور درجے میں تو اولاد کو بھی ان کے والدین کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ تاکہ انھیں مزید خوشی حاصل ہو سکے۔

جنت کی لطیف دنیا میں داخلہ کا مستحق صرف وہ شخص ہوگا جس کا حال یہ تھا کہ اپنے بیوی بچوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اس کو اللہ کا خوف تڑپائے ہوئے تھا، اور جس نے اپنی امیدوں اور اپنے اندیشوں کو صرف ایک اللہ کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔ گھر کے باہر ہو یا گھر کے اندر جنت کا امیدوار انسان مواخذہ (accountability) کی نفسیات کے تحت زندگی گزارتا ہے، نہ کہ بے خوفی کی نفسیات کے تحت۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ
وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿٢٩﴾ ؕ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ
نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿٣٠﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا
فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿٣١﴾ ؕ اَمْ
تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ
طَاغُوْنَ ﴿٣٢﴾ ۚ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٣﴾ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ
كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿٣٤﴾ ؕ

۲۹۔ پس تم نصیحت کرتے رہو، اپنے رب کے فضل سے تم نہ کاہن ہو اور نہ مجنون۔ ۳۰۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے۔ ہم اس پر گردشِ زمانہ کے منتظر ہیں۔ ۳۱۔ کہو کہ انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ ۳۲۔ کیا ان کی عقلیں ان کو یہی سکھاتی ہیں یا یہ سرکش لوگ ہیں۔ ۳۳۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن کو خود بنا لایا ہے۔ بلکہ وہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ ۳۴۔ پس وہ اس کے مانند کوئی کلام لے آئیں، اگر وہ سچے ہیں۔

جب آدمی ایک دعوت کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے دلیل پائے، اس کے باوجود وہ اس کو ماننا نہ چاہے تو وہ یہ کرتا ہے کہ داعی کی ذات میں عیب لگانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ کلام کے بجائے متکلم کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ یہی وہ نفسیات تھی جس کے تحت پیغمبر کے مخاطبین نے آپ کو شاعر اور مجنون کہنا شروع کیا۔ وہ آپ کی دعوت کو دلیل سے رد نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ آپ کے بارے میں ایسی باتیں کہنے لگے جن سے آپ کی شخصیت مشتبہ ہو جائے۔

مگر پیغمبر خدا سے لے کر بولتا ہے۔ اور جو انسان خدا سے لے کر بولے اس کا کلام اتنا ممتاز طور پر دوسروں کے کلام سے مختلف ہوتا ہے کہ اس کے مثل کلام پیش کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اور یہ واقعہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے کہ اس کا کلام خدائی کلام ہے، وہ عام معنوں میں محض انسانی کلام نہیں۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ؕ﴿٣٥﴾
اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا
يُوْقِنُوْنَ ؕ﴿٣٦﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ
هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ؕ﴿٣٧﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ
فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ؕ﴿٣٨﴾ اَمْ
لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ؕ﴿٣٩﴾

۳۵۔ کیا وہ کسی خالق کے بغیر پیدا ہو گئے یا وہ خود ہی خالق ہیں۔ ۳۶۔ کیا زمین اور آسمان کو انھوں نے پیدا کیا ہے، بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔ ۳۷۔ کیا ان کے پاس تمھارے رب کے خزانے ہیں یا وہ داروغہ ہیں۔ ۳۸۔ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر وہ باتیں سُن لیا کرتے ہیں، تو ان کا سُننے والا کوئی کھلی ہوئی دلیل لے آئے۔ ۳۹۔ کیا اللہ کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے۔

خدا کی طرف سے جن صداقتوں کا اعلان ہوا ہے وہ سب پوری طرح معقول ہیں۔ آدمی اگر دھیان دے تو وہ بہ آسانی ان کو سمجھ سکتا ہے۔ پھر بھی لوگ کیوں ان کا انکار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ آخرت کے بارے میں لوگوں کی بے یقینی ہے۔ لوگوں کو زندہ یقین نہیں کہ آخرت میں ان سے حساب لیا جائے گا۔ اس لیے وہ ان امور میں سنجیدہ نہیں۔ اور اسی لیے وہ ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اگر جزائے اعمال کا یقین ہو تو آدمی فوراً ان باتوں کو سمجھ جائے جن کو سمجھنا اس کے لیے نہایت مشکل ہو رہا ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ
مُّثْقَلُوْنَ ؕ﴿٤٠﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ
يَكْتُبُوْنَ ؕ﴿٤١﴾ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ؕ﴿٤٢﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ
اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٣﴾

۴۰۔ کیا تم ان سے معاوضہ مانگتے ہو کہ وہ تاوان کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ ۴۱۔ کیا ان کے پاس غیب ہے کہ وہ لکھ لیتے ہیں۔ ۴۲۔ کیا وہ کوئی تدبیر کرنا چاہتے ہیں، پس انکار کرنے والے خود ہی اس تدبیر میں گرفتار ہوں گے۔ ۴۳۔ کیا اللہ کے سوا ان کا اور کوئی معبود ہے۔ اللہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے۔

مدعو گروہ ہمیشہ مادہ پرستی کی سطح پر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مدعو کو اگر یہ احساس ہو کہ داعی اس سے اس کی کوئی مادی چیز لینا چاہتا ہے تو وہ فوراً اس کی طرف سے متوحش ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اپنے اور مخاطبین کے درمیان کسی قسم کے مادی مطالبہ کی بات کبھی نہیں آنے دیتا۔ وہ اپنے اور مخاطبین کے درمیان

آخر وقت تک بے غرضی کی فضا باقی رکھتا ہے۔ خواہ اس کے لیے اسے یک طرفہ طور پر مادی نقصان برداشت کرنا پڑے۔

داعی جب اپنی دعوت کے حق میں اس حد تک سنجیدگی کا ثبوت دے دے تو اس کے بعد وہ خدا کی اس نصرت کا مستحق ہوجاتا ہے کہ منکرین کی ہر تدبیر ان کے اوپر الٹی پڑے۔ وہ کسی بھی طرح داعی کو مغلوب کرنے میں کامیاب نہ ہوں۔

وَ اِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

۴۴۔ اور اگر وہ آسمان سے کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں تو وہ کہیں گے کہ یہ تہ بہ تہ بادل ہے۔ ۴۵۔ پس ان کو چھوڑ دو، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس میں ان کے ہوش جاتے رہیں گے۔ ۴۶۔ جس دن ان کی تدبیریں ان کے کچھ کام نہ آئیں گی اور نہ ان کو کوئی مدد ملے گی۔ ۴۷۔ اور ان ظالموں کے لیے اس کے سوا بھی عذاب ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

قدیم مکہ کے لوگوں کا یہ حال کیوں تھا کہ اگر وہ آسمان سے کوئی عذاب کا ٹکڑا گرتے ہوئے دیکھیں تو کہہ دیں کہ یہ بادل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ خدا کو یا خدائی طاقتوں کو مانتے نہ تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں پیغمبر کے پیغمبر ہونے میں شک تھا۔ انہیں یقین نہ تھا کہ ان کے سامنے بظاہر انہیں جیسا جو ایک شخص ہے اس کا انکار کرنا ایسا جرم ہے کہ اس کی وجہ سے ہلاکت کا پہاڑ گر پڑے گا۔

پیغمبر اسلام کی شخصیت اپنے زمانہ میں لوگوں کے لیے ایک نزاعی شخصیت تھی۔ وہ اس طرح ایک ثابت شدہ شخصیت نہ تھی، جس طرح آج وہ لوگوں کو نظر آتی ہے۔ مگر اس دنیا میں آدمی کا امتحان یہی ہے کہ وہ شبہات کے پردہ کو پھاڑ کر حقیقت کو دیکھے۔ وہ بظاہر ایک نزاعی شخصیت کو ثابت شدہ شخصیت کے روپ میں دریافت کرے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع ۲ ۲۱ ۴

۴۸۔ اور تم صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ بے شک تم ہماری نگاہ میں ہو۔ اور اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ، جس وقت تم اٹھتے ہو۔ ۴۹۔ اور رات کو بھی اس کی تسبیح کرو، اور ستاروں کے پیچھے ہٹنے کے وقت بھی۔

"خدا کا فیصلہ آنے تک صبر کرو" کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب کی طرف سے ہر قسم کی ناگوار باتوں کے پیش آنے کے باوجود دعوت کا کام اس وقت تک جاری رکھو جب تک خود خدا کے نزدیک اس کی حد نہ آجائے۔ جب یہ حد آتی ہے تو اس وقت خدا کا فیصلہ ظاہر ہو کر حق اور ناحق کے فرق کو عملی طور پر ظاہر کر دیتا ہے جس کو اس سے پہلے صرف نظری طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

اس پوری مدت میں داعی مکمل طور پر خدا کی حفاظت میں ہوتا ہے۔ داعی کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ اور یہ یقین رکھے کہ اللہ اس کو ہر آن اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے۔

۵۳۔ سُوۡرَۃُ النَّجۡم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَ مَا
غَوٰی ۚ﴿۲﴾ وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ
اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ۙ﴿۵﴾
ذُوۡ مِرَّۃٍ ؕ فَاسۡتَوٰی ۙ﴿۶﴾ وَ ہُوَ بِالۡاُفُقِ
الۡاَعۡلٰی ؕ﴿۷﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ﴿۸﴾ فَکَانَ قَابَ
قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی ۚ﴿۹﴾ فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ
اَوۡحٰی ؕ﴿۱۰﴾ مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾
اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾ وَ لَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً
اُخۡرٰی ۙ﴿۱۳﴾ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۱۴﴾
عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی ؕ﴿۱۵﴾ اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ
مَا یَغۡشٰی ۙ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ﴿۱۷﴾
لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی ﴿۱۸﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے ستارے کی جب کہ وہ غروب ہو۔ ۲۔ تمھارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ گمراہ ہوا ہے۔ ۳۔ اور وہ اپنے جی سے نہیں بولتا۔ ۴۔ یہ ایک وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔ ۵۔ اس کو زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے۔ ۶۔ عاقل اور دانا نے۔ پھر وہ نمودار ہوا۔ ۷۔ اور وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔ ۸۔ پھر وہ نزدیک ہوا۔ پس وہ اتر آیا۔ ۹۔ پھر دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ ۱۰۔ پھر اللہ نے وحی کی اپنے بندہ کی طرف جو وحی کی۔ ۱۱۔ جھوٹ نہیں کہا رسول کے دل نے جو اس نے دیکھا۔ ۱۲۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جو اس نے دیکھا ہے۔ ۱۳۔ اور اس نے ایک بار اور بھی اس کو اترتے ہوئے دیکھا۔ ۱۴۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ ۱۵۔ اس کے پاس ہی بہشت ہے آرام سے رہنے کی۔ ۱۶۔ جب کہ سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ ۱۷۔ نگاہ بہکی نہیں اور نہ حد سے بڑھی۔ ۱۸۔ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ستاروں کا غروب ایک علامتی لفظ ہے جس کے ذریعہ ستاروں کی گردش کے محکم نظام کی طرف اشارہ کیا گیا۔ مادی دنیا میں ستاروں کا نظام ایک بے خطا نظام ہے، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ وحی ونبوت کی صورت میں خدا نے جو روحانی نظام قائم کیا ہے وہ بھی ایک بے خطا نظام ہو۔

فرشتہ اور وحی کی صورت میں رسول کا تجربہ حقیقی تجربہ ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے قرآن کا بیان کافی ہے۔ قرآن کا معجزانہ کلام قرآن کو خدا کی کتاب ثابت کرتا ہے۔ اور جس کتاب کا خدا کی کتاب ہونا ثابت ہوجائے اس کا ہر بیان خود قرآن کے زور پر مستند تسلیم کیا جائے گا۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ
الْاُخْرٰى ﴿٢٠﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾
تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾ اِنْ هِيَ اِلَّاۤ
اَسْمَاۤءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَاۤؤُكُمْ مَّاۤ
اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ
اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ
جَاۤءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾ اَمْ لِلْاِنْسَانِ
مَا تَمَنّٰى ﴿٢٤﴾ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾ ع ۲۵ ۵

۱۹۔ بھلا تم نے لات اور عُزّیٰ پر غور کیا ہے۔ ۲۰۔ اور تیسرے ایک اور منات پر۔ ۲۱۔ کیا تمھارے لیے بیٹے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں۔ ۲۲۔ یہ تو بہت بے ڈھنگی تقسیم ہوئی۔ ۲۳۔ یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اُتاری۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور نفس کی خواہش کی، حالاں کہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت آچکی ہے۔ ۲۴۔ کیا انسان وہ سب پالیتا ہے جو وہ چاہے۔ ۲۵۔ پس اللہ کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا۔

لات اور عزیٰ اور منات قدیم عرب کے بت تھے۔ لات طائف میں تھا۔ عزیٰ مکہ کے قریب نخلہ میں اور منات مدینہ کے قریب قُدَید میں۔ یہ تینوں ان کے عقیدہ کے مطابق خدا کی بیٹیاں تھیں، اور وہ ان کو پوجتے تھے۔ اس قسم کا عقیدہ بلاشبہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ خود اپنی تردید آپ ہے۔ ان مشرکین کا حال یہ تھا کہ وہ بیٹیوں کو اپنے لیے ذلت کی چیز سمجھتے تھے۔ فرمایا کہ غور کرو، خدا جو بیٹا اور بیٹی دونوں کا خالق ہے، وہ اپنے لیے اولاد بناتا تو بیٹیاں بناتا۔

''کیا انسان وہ سب پالیتا ہے جو وہ چاہے''—— اس کی تشریح کرتے ہوئے شاہ عبد القادر دہلوی لکھتے ہیں ''یعنی بت پوجے سے کیا ملتا ہے، ملے وہ جو اللہ دے''۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ
شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَ

۲۶۔ اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی کام نہیں آسکتی، مگر بعد اس کے کہ اللہ اجازت دے جس کو وہ چاہے اور پسند کرے۔

يَرْضٰى ﴿٢٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿٢٧﴾ وَمَا
لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ
وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿٢٨﴾ۚ
فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ
اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٢٩﴾ؕ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ
الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ
سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿٣٠﴾ ربع

۲۷۔بے شک جولوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کوعورتوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ۲۸۔حالاں کہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں۔وہ محض گمان پر چل رہے ہیں۔اور گمان امرِ حق میں ذرا بھی مفید نہیں۔ ۲۹۔پس تم ایسے شخص سے اعراض کرو جو ہماری نصیحت سے منہ موڑے۔اور وہ دنیا کی زندگی کے سوا اور کچھ نہ چاہے۔ ۳۰۔ان کی سمجھ بس یہیں تک پہنچی ہے۔تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے بھٹکا ہوا ہے۔اور وہ اس کو بھی خوب جانتا ہے جو راہِ راست پر ہے۔

پتھر کے بت بنا کر ان کو پوجنا، فرشتوں کو خدا کی بیٹی بتانا، سفارشوں کی بنیاد پر جنت کی امید رکھنا یہ سب غیر سنجیدہ عقیدے ہیں۔اور غیر سنجیدہ عقیدے ہمیشہ اس ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو پکڑ کا خوف نہ رکھتا ہو۔خوف لایعنی کلام کا قاتل ہے۔اور جو شخص بے خوف ہو اس کا دماغ لایعنی کلام کا کارخانہ بن جائے گا۔

جولوگ بے خوفی کی نفسیات میں مبتلا ہوں، ان سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ایسے لوگ دلیل اور معقولیت پر دھیان نہیں دیتے، اس لیے وہ امرِ حق کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ان سے مقابلہ کرنے کی ایک ہی ممکن تدبیر ہے۔وہ یہ کہ ان سے اعراض کیا جائے۔تاہم اللہ تعالیٰ ہر شخص کی اندرونی حالت کو جانتا ہے اور وہ اس کے مطابق ہر شخص سے معاملہ فرمائے گا۔

''پس تم ایسے شخص سے اعراض کرو جو ہماری نصیحت سے منہ موڑے''۔یہ نہیں فرمایا کہ قاتل عمن تولی (تم ایسے شخص سے جنگ کرو جو ہماری نصیحت سے منہ موڑے) یا حارب عمن تولی (تم ایسے شخص سے لڑائی کرو جو ہماری نصیحت سے منہ موڑے)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا بنیادی اصول ٹکراؤ (conflict) نہیں ہے، بلکہ اعراض (avoidance) ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ
لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا
وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿٣١﴾ۚ
اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ

۳۱۔اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، تاکہ وہ بدلہ دے برا کام کرنے والوں کو ان کے کیے کا اور بدلہ دے بھلائی والوں کو بھلائی سے۔ ۳۲۔جو کہ بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے بچتے ہیں، مگر کچھ

اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ ع

آلودگی۔ بے شک تمھارے رب کی بخشش کی بڑی سمائی ہے۔ وہ تم کو خوب جانتا ہے جب کہ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔ اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں جنین کی شکل میں تھے۔ تو تم اپنے کو مقدس نہ سمجھو۔ وہ تقویٰ والوں کو خوب جانتا ہے۔

کائنات اپنے حد درجہ محکم نظام کے ساتھ بتا رہی ہے کہ اس کا خالق و مالک بے حد طاقت ور ہے۔ یہی واقعہ یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ وہ انسان کو پکڑے گا اور جب وہ انسان کو پکڑے گا تو کسی بھی شخص کے لیے اس کی پکڑ سے بچنا ممکن نہ ہوگا۔

انسان کو بشری کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے انسان سے فرشتوں جیسی پاکیزگی کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پوری طرح بتا دیا ہے کہ اس کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ تاہم انسان کے لیے ''لَمَم'' کی معافی ہے۔ یعنی وقتی جذبہ کے تحت کسی برائی میں پڑ جانا، بشرطیکہ آدمی فوراً بعد ہی اس کو محسوس کرے اور شرمندہ ہو کر اپنے رب سے معافی مانگے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾

۳۳۔ بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اعراض کیا۔ ۳۴۔ تھوڑا سا دیا اور رک گیا۔ ۳۵۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے۔ پس وہ دیکھ رہا ہے۔ ۳۶۔ کیا اس کو خبر نہیں پہنچی اس بات کی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے۔ ۳۷۔ اور ابراہیم کی، جس نے اپنا قول پورا کر دیا۔ ۳۸۔ کہ کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ۳۹۔ اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا۔ ۴۰۔ اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب دیکھی جائے گی۔ ۴۱۔ پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا۔ ۴۲۔ اور یہ کہ سب کو تمھارے رب تک پہنچنا ہے۔

بہت سے لوگ ہیں جو تھوڑا سا حق کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ پھر ان کے مفادات ان پر غالب آتے ہیں اور وہ دوبارہ اپنی پچھلی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی غلط روش کی تاویل کے لیے طرح طرح کے خوبصورت عقیدے بنا لیتے ہیں۔ مگر یہ صرف ان کے جرم کو بڑھاتا ہے، کیوں کہ یہ غلطی پر سرکشی کے اضافہ کے ہم معنی ہے۔

پیغمبروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو حقیقت کھولی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر آدمی کو لازماً اپنے عمل کا بدلہ پانا ہے، نہ کوئی شخص اپنے عمل کے انجام سے بچ سکتا اور نہ کوئی دوسرا شخص کسی کو بچانے والا بن سکتا۔ جو لوگ اس پیغمبرانہ چیتاونی سے متنبہ نہ ہوں، ان سے بڑا نادان خدا کی اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ
اَمَاتَ وَ اَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ
الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا
تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَ اَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾
وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ
الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾

۴۳۔ بے شک وہی ہنساتا ہے اور رلاتا ہے۔ ۴۴۔ اور وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ ۴۵۔ اور اسی نے دونوں قسم، نر اور مادہ کو پیدا کیا۔ ۴۶۔ ایک بوند سے جب کہ وہ ٹپکائی جائے۔ ۴۷۔ اور اسی کے ذمہ ہے دوسری بار اٹھانا۔ ۴۸۔ اور اسی نے دولت دی اور سرمایہ دار بنایا۔ ۴۹۔ اور وہی شعریٰ کا رب ہے۔

دنیا کے ہر واقعہ کا تعلق ایسے ماورائی اسباب سے ہوتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس کے ظہور پر قادر نہیں ہوسکتا۔ خوشی اور غم، موت و حیات، تخلیقی نظام، امیری اور غریبی، سب ایک بلند و برتر طاقت کا کرشمہ ہیں۔ قدیم انسان ستاروں کو سبب حیات سمجھتا تھا، موجودہ زمانہ میں قانون فطرت کو سبب حیات سمجھ لیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب کے اوپر بھی ایک سبب ہے اور وہ خدائے رب العالمین ہے۔ پھر اس کے سوا کسی اور کو مرکز توجہ بنانا انسان کے لیے کس طرح جائز ہوسکتا ہے۔

وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ
اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا
هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَ الْمُؤْتَفِكَةَ
اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾

۵۰۔ اور اللہ ہی نے ہلاک کیا عادِ اول کو۔ ۵۱۔ اور ثمود کو۔ پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ ۵۲۔ اور قوم نوح کو اس سے پہلے، بے شک وہ نہایت ظالم اور سرکش لوگ تھے۔ ۵۳۔ اور الٹی ہوئی بستیوں کو بھی پھینک دیا۔ ۵۴۔ پس ان کو ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا۔ ۵۵۔ پس تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔

ایک قوم ترقی کرتی ہے۔ وہ دوسری قوموں سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ بظاہر ناممکن نظر آنے لگتا ہے کہ کوئی اس کو مغلوب کرسکے۔ اس کے بعد ایسے اسباب ہوتے ہیں کہ وہ قوم ہلاک ہوجاتی ہے یا تنزل کا شکار ہو کر تاریخ گزشتہ کا موضوع بن جاتی ہے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانوں کے اوپر بھی کوئی طاقت ہے، جو قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کرتی ہے۔ تاریخ کے یہ واضح واقعات بھی اگر انسان کو سبق نہ دیں تو وہ کون سا واقعہ ہوگا جس سے انسان اپنے لیے سبق لے۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿٥٦﴾ اَزِفَتِ
الْاٰزِفَةُ ﴿٥٧﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿٥٩﴾
وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿٦١﴾
ع ۳ السجدۃ ۱۳ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿٦٢﴾

۵۶۔ یہ ایک ڈرانے والا ہے پہلے ڈرانے والوں
کی طرح۔ ۵۷۔ قریب آنے والی قریب آگئی۔
۵۸۔ اللہ کے سوا کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں۔
۵۹۔ کیا تم کو اس بات سے تعجب ہوتا ہے۔
۶۰۔ اور تم ہنستے ہو اور تم روتے نہیں۔ ۶۱۔ اور تم
تکبر کرتے ہو۔ ۶۲۔ پس اللہ کے لیے سجدہ کرو
اور اسی کی عبادت کرو۔

پیغمبروں کی تاریخ جو قرآن میں بتائی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق کا انکار اور اس کا برا انجام دونوں ہاتھ کی دو انگلیوں کی طرح ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ آدمی کے اندر اگر احساس ہو تو وہ انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتے ہی خدا کی پکڑ کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھنے لگے، اور سرکشی کا طریقہ چھوڑ کر اطاعت کا طریقہ اختیار کرلے۔ مگر انسان اتنا زیادہ مدہوش ہے کہ اپنے سامنے کی چیز بھی اس کو نظر نہیں آتی۔

۵۴۔ سُوْرَۃُ الْقَمَر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿١﴾ وَاِنْ
يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ
مُّسْتَمِرٌّ ﴿٢﴾ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ
وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ
الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ﴿٤﴾ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ
فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ﴿٥﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ
يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ﴿٦﴾ خُشَّعًا
اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ
كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ﴿٧﴾ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى
الدَّاعِ ؕ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴿٨﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔ ۲۔ اور
وہ کوئی بھی نشانی دیکھیں تو وہ اعراض ہی کریں گے۔
اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا
ہے۔ ۳۔ اور انھوں نے جھٹلادیا اور اپنی خواہشوں
کی پیروی کی اور ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ ۴۔ اور
ان کو وہ خبریں پہنچ چکی ہیں جس میں کافی عبرت
ہے۔ ۵۔ نہایت درجہ کی حکمت، مگر تنبیہات ان کو
فائدہ نہیں دیتیں۔ ۶۔ پس ان سے اعراض کرو،
جس دن پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف
پکارے گا۔ ۷۔ آنکھیں جھکائے ہوئے قبروں
سے نکل پڑیں گے گویا کہ وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں
ہیں۔ ۸۔ بھاگتے ہوئے پکارنے والے کی
طرف، منکر کہیں گے کہ یہ دن بڑا سخت ہے۔

خدا موجودہ دنیا میں ایسے واقعات برپا کرتا ہے جو قیامت کو پیشگی طور پر قابلِ فہم بنانے والے ہوں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہجرت سے چند سال پہلے پیش آیا۔ جب کہ لوگوں نے دیکھا کہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو، جس طرح چاند ٹوٹا ہے اسی طرح پوری دنیا ٹوٹے گی اور پھر نئی دنیا بنائی جائے گی۔

اس طرح کے واقعات میں بلاشبہ سبق ہے۔ مگر ان واقعات سے سبق لینا اسی وقت ممکن ہے جبکہ آدمی اپنی عقل سے اس کے بارے میں سوچے۔ جن لوگوں کے اوپر ان کی خواہشات غالب آ گئی ہوں وہ ان کو دیکھ کر کہہ دیں گے کہ ''یہ جادو ہے'' وہ واقعات کی توجیہہ اپنی خواہش کے مطابق کر کے ان کو اپنے لیے غیر موثر بنا لیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے بڑی سے بڑی دلیل بھی بے معنی ہے۔ وہ اسی وقت ہوش میں آئیں گے جب کہ قیامت کی چنگھاڑ ظاہر ہو اور ان سے ہوش میں آنے کا موقع چھین لے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَ
قَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ﴿٩﴾ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ
مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿١٠﴾ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ
السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿١١﴾ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ
عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿١٢﴾
وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿١٣﴾ تَجْرِیْ
بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ
تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٥﴾ فَكَيْفَ
كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ﴿١٦﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾

۹۔ ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا، انھوں نے ہمارے بندے کی تکذیب کی اور کہا کہ دیوانہ ہے اور جھڑک دیا۔ ۱۰۔ پس اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں، تو بدلہ لے۔ ۱۱۔ پس ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش سے کھول دیے۔ ۱۲۔ اور زمین سے چشمے بہا دیے۔ پس سب پانی ایک کام پر مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا۔ ۱۳۔ اور ہم نے اس کو ایک تختوں اور کیلوں والی (کشتی) پر اُٹھا لیا۔ ۱۴۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی رہی۔ اس شخص کا بدلہ لینے کے لیے جس کی ناقدری کی گئی تھی۔ ۱۵۔ اور اس کو ہم نے نشانی کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر کوئی ہے سوچنے والا۔ ۱۶۔ پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ۱۷۔ اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے اکابر اپنی جھوٹی عظمتوں میں گم تھے۔ وہ حضرت نوح علیہ السلام کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عذاب الٰہی کی زد میں آ گئے۔ ان پر یہ عذاب

ہولناک سیلاب کی صورت میں آیا۔ ساری قوم اپنی آبادیوں سمیت میں غرق ہوگئی۔ البتہ حضرت نوح علیہ السلام اوران کے ساتھی خدا کے حکم سے ایک کشتی میں سوار ہوگئے۔ یہ کشتی چلتی ہوئی کوہ ارارات پر جا کر ٹھہر گئی۔

ارارات ترکی میں واقع ہے۔ وہ وہاں کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹی ۱۶۸۵۳ فٹ اونچی ہے۔ بعض ہوابازوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے ارارات کی برفانی چوٹی کے اوپر سے اڑتے ہوئے وہاں کشتی جیسی ایک چیز برف میں دھنسی ہوئی دیکھی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فرعون موسیٰ کی لاش جس طرح اہرام کے اندر دفن تھی اور انیسویں صدی کے آخر میں برآمد ہو کر خدا کی نشانی (یونس، 10:92) بن گئی۔ اسی طرح شاید کسی وقت کشتی نوح بھی دریافت ہو اور وہ لوگوں کے لیے خدا کی نشانی بن جائے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۱۸﴾
اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ
نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ
اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ
وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ
ع ۲۲ ۸ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾

۱۸۔ عاد نے جھٹلایا تو کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ۱۹۔ ہم نے ان پر ایک سخت ہوا بھیجی مسلسل نحوست (سخت سردی) کے دن میں۔ ۲۰۔ وہ لوگوں کو اُکھاڑ پھینکتی تھی جیسے کہ وہ اکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے ہوں۔ ۲۱۔ پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ۲۲۔ اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کردیا، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا۔

قوم عاد جب خدا کے عذاب کی مستحق ہوگئی تو خدا نے ان پر ایسی تیز آندھی بھیجی جس میں لوگوں کا زمین پر ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔ آندھی انھیں اس طرح اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھی کہ کوئی دیوار سے جا کر ٹکراتا تھا اور کوئی درخت سے۔ کسی کی چھت اس کے سر پر گر پڑی۔ یہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ انسان بالکل بے بس ہے، خدا کے مقابلہ میں اس کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا
مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّ
سُعُرٍ ﴿۲۴﴾ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا
بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا
مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا
النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾

۲۳۔ ثمود نے ڈرسنانے والوں کو جھٹلایا۔ ۲۴۔ پس انھوں نے کہا کیا ہم اپنے ہی اندر کے ایک آدمی کے کہے پر چلیں گے، اس صورت میں تو ہم غلطی اور جنون میں پڑ جائیں گے۔ ۲۵۔ کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت اتری ہے، بلکہ وہ جھوٹا ہے، بڑا بننے والا۔ ۲۶۔ اب وہ کل کے دن جان لیں گے کہ کون جھوٹا ہے اور بڑا بننے والا ہے۔ ۲۷۔ ہم اونٹنی کو بھیجنے والے ہیں ان کے لیے

وَ نَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ
شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى
فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۰﴾ اِنَّآ
اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا
كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾

آزمائش بنا کر، پس تم ان کا انتظار کرو، اور صبر کرو۔ ۲۸۔ اوران کو آگاہ کردو کہ پانی ان میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ہر ایک باری پر حاضر ہو۔ ۲۹۔ پھر انھوں نے اپنے آدمی کو پکارا، پس اس نے وار کیا اور اونٹنی کو کاٹ ڈالا۔ ۳۰۔ پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ۳۱۔ ہم نے ان پر ایک چنگھاڑ بھیجی، تو وہ باڑھ والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح ہو کر رہ گئے۔ ۳۲۔ اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کردیا، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا۔

پیغمبر ہمیشہ عام انسان کے روپ میں آتا ہے، اس لیے انسان اس کو پہچان نہیں پاتا، اسی طرح خدا کی اونٹنی بھی بظاہر عام اونٹنی کی طرح تھی۔ اس لیے ثمود کے لوگ اس کو پہچان نہ سکے، اور اس کو مار ڈالا۔ موجودہ دنیا اسی بات کا امتحان ہے۔ یہاں لوگوں کو بظاہر ایک عام آدمی میں خدا کے نمائندہ کو دیکھنا ہے۔ بظاہر ایک عام اونٹنی میں خدا کی اونٹنی کو پہچان لینا ہے۔ جو لوگ اس امتحان میں ناکام رہیں وہ کبھی ہدایت کے راستہ کو نہیں پاسکتے۔

قرآن اگرچہ گہرے معانی کی کتاب ہے۔ مگر اس کے انداز بیان میں حد درجہ وضوح (Clarity) ہے۔ اس وضوح کی بنا پر قرآن کا سمجھنا ہر آدمی کے لیے آسان ہو گیا ہے، خواہ وہ ایک عام آدمی ہو یا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی۔ شاہ عبد القادر صاحب نے آیت کا ترجمہ کیا ہے: ''ہم نے آسان کیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا''۔ مطلب یہ کہ قرآن میں دینی حقائق کو مدلل اور قابل فہم انسانی زبان میں پیش کر دیا گیا ہے۔ پھر کوئی ہے جو اس پر دھیان دے اور اس سے اپنے لیے نصیحت اور اصلاح کا سامان حاصل کرے۔ اس آیت میں کتاب الٰہی پر غور وفکر کے لیے ابھارا گیا ہے۔ قرآن کے اندر آدمی کے قلب و دماغ کے لیے جو ربانی غذا رکھی گئی ہے، اس میں سے اپنا حصہ لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۢ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ
بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ ۙ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ كَذٰلِكَ
نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ
بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَ لَقَدْ

۳۳۔ لوط کی قوم نے ڈرسنانے والوں کو جھٹلایا۔ ۳۴۔ ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ہوا بھیجی۔ صرف لوط کے گھر والے اس سے بچے، ان کو ہم نے بچالیا سحر کے وقت۔ ۳۵۔ اپنی جانب سے فضل کرکے۔ ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں اس کو جو شکر کرے۔ ۳۶۔ اور لوط نے ان کو ہماری پکڑ سے

رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ ع

ڈرایا، پھر انھوں نے اس ڈرانے میں جھگڑے پیدا کیے۔ ۳۷۔ اور وہ اس کے مہمانوں کو اس سے لینے لگے۔ پس ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں۔ اب چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ۳۸۔ اور صبح سویرے ان پر عذاب آپڑا جو ٹھہر چکا تھا۔ ۳۹۔ اب چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ۴۰۔ اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا۔

حضرت لوط کی دعوت اٹھی تو کچھ لوگوں نے اس کا اعتراف کرلیا، وہ حق کو بڑا مان کر اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں چھوٹا کرنے پر راضی ہو گئے۔ مگر اکثر افراد نے ایسا نہیں کیا۔ وہ دلائل کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کو رد کرنے کے لیے جھوٹی بحثیں نکالتے رہے۔ دعوت حق کے مقابلہ میں اس قسم کی روش بہت بڑا جرم ہے، چنانچہ اعتراف کرنے والوں کو چھوڑ کر انکار کرنے والے پکڑ لیے گئے۔ یہ ایک مثال ہے کہ اس دنیا میں حق کا انکار کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے اور حق کا اعتراف کرنے والوں کے لیے نجات۔

وَ لَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

۴۱۔ اور فرعون والوں کے پاس پہنچے ڈرانے والے۔ ۴۲۔ انھوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو ایک غالب اور قوت والے کے پکڑنے کی طرح پکڑا۔

فرعون اپنے وقت کا انتہائی طاقت ور بادشاہ تھا۔ مگر حق کا انکار کرنے کے بعد وہ اللہ کی نظر میں بے قیمت ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایک عاجز انسان کی طرح ہلاک کر دیا گیا۔ اس دنیا میں حق کے ساتھ کھڑا ہونے والا آدمی زور آور ہے اور حق کے خلاف کھڑا ہونے والا آدمی بے زور۔

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ

۴۳۔ کیا تمھارے منکر ان لوگوں سے بہتر ہیں یا تمھارے لیے آسمانی کتابوں میں معافی لکھ دی گئی ہے۔ ۴۴۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایسی جماعت ہیں جو غالب رہیں گے۔ ۴۵۔ عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔ ۴۶۔ بلکہ قیامت ان کے وعدہ کا وقت ہے

وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ
فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ
عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾

اور قیامت بڑی سخت اور بڑی کڑوی چیز ہے۔ ۴۷۔ بے شک مجرم لوگ گمراہی میں اور بے عقلی میں ہیں۔ ۴۸۔ جس دن وہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے۔ چکھو مزا آگ کا۔

پچھلے پیغمبروں کا انکار کرنے والوں کے ساتھ جو واقعات پیش آئے ان میں پیغمبر آخر الزماں کا انکار کرنے والوں کے لیے نصیحت تھی۔ مگر انہوں نے اس سے نصیحت نہ لی۔ یہی تمام قوموں کا حال ہے۔ کھلی نشانیوں کے باوجود ہر قوم نے اپنے آپ کو محفوظ اور مستثنیٰ قوم سمجھ لیتی ہے۔ ہر قوم دوبارہ وہی سرکشی کرتی ہے جو پچھلی قوموں نے کی اور اس کے نتیجہ میں وہ خدائی عذاب کی مستحق ہو گئیں۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ وَمَآ اَمْرُنَآ
اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ
اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَكُلُّ
شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّ
كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ
نَهَرٍ ۙ﴿۵۴﴾ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ
مُّقْتَدِرٍ ع ﴿۵۵﴾ ع ۳ ۱۵ ۱۰

۴۹۔ ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اندازہ سے۔ ۵۰۔ اور ہمارا حکم بس یکبارگی آجائے گا جیسے آنکھ کا جھپکنا۔ ۵۱۔ اور ہم ہلاک کر چکے ہیں تمھارے ساتھ والوں کو، پھر کیا کوئی ہے سوچنے والا۔ ۵۲۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا، سب کتابوں میں درج ہے۔ ۵۳۔ اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے۔ ۵۴۔ بے شک ڈرنے والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔ ۵۵۔ وہ بیٹھے ہوں گے سچی بیٹھک میں، قدرت والے بادشاہ کے پاس۔

دنیا کی ہر چیز کا ایک مقرر ضابطہ ہے۔ یہی اصول انسان کے معاملہ میں بھی ہے۔ انسان کو ایک مقرر ضابطہ کے تحت موجودہ دنیا میں عمل کا موقع دیا گیا ہے۔ اور مقرر ضابطہ ہی کے تحت اس کو عمل کے مقام سے ہٹا کر انجام کے مقام میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ خالق کی قدرت جو موجودہ کائنات میں ظاہر ہوئی ہے وہ یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ معاملہ عین اپنے وقت پر بلا تاخیر پیش آئے گا۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں ریکارڈنگ کا نظام اس حقیقت کا پیشگی اعلان ہے کہ ہر ایک کے ساتھ عین وہی معاملہ کیا جائے گا جو اس کے عمل کے مطابق ہو۔ تاہم یہ باتیں اسی شخص کی سمجھ میں آئیں گی جو اپنے اندر یہ مزاج رکھتا ہو کہ وہ واقعات پر غور کرے۔ اور ظاہر سے گزر کر باطن میں چھپی ہوئی حقیقتوں کو دیکھ سکے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو پوری آزادی حاصل ہے۔ اس لیے موجودہ دنیا میں یہ ممکن ہے آدمی مقعدِ کذب (جھوٹی نشست) پر بھی بیٹھ کر نمایاں ہو سکے۔ وہ جھوٹ کی زمین پر عزت اور مرتبہ

کا مقام حاصل کرلے۔مگر آخرت میں کسی کے لیے ایسا ممکن نہ ہوگا۔آخرت میں عزت اور کامیابی صرف ان لوگوں کو ملے گی جو مقعد صدق (سچی نشست) پر بیٹھنے والے ہوں۔جنہوں نے فی الواقع اپنے آپ کو سچ کی زمین پر کھڑا کیا ہو۔آخرت میں خدا کی قدرت کامل کا ظہور اس بات کی ضمانت بن جائے گا کہ وہاں مقعد صدق کے سوا کسی اور مقعد پر بیٹھنا کسی کے کچھ کام نہ آسکے۔

۵۵۔سُوْرَةُ الرَّحْمٰن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلرَّحْمٰنُ ۝١ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝٢ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝٣
عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝٤ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ
بِحُسْبَانٍ ۝٥ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝٦
وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝٧ اَلَّا
تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝٨ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ
وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝٩

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔رحمان نے۔ ۲۔قرآن کی تعلیم دی۔ ۳۔اس نے انسان کو پیدا کیا۔ ۴۔اس کو بولنا سکھایا۔
۵۔سورج اور چاند کے لیے ایک حساب ہے۔
۶۔اور ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔
۷۔اور اس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس نے ترازو رکھ دی۔ ۸۔کہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو۔
۹۔اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور تول میں نہ گھٹاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا۔اس کو نطق کی انوکھی صلاحیت دی جو ساری معلوم کائنات میں کسی کو حاصل نہیں۔پھر انسان سے جو عادلانہ روش مطلوب تھی اس کا عملی نمونہ اس نے کائنات میں قائم کر دیا۔انسان کے گردوپیش کی پوری دنیا عین اسی اصولِ عدل پر قائم ہے جو انسان سے اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے اور قرآن میں اسی عدل کو لفظی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔قرآن خدائی عدل کا لفظی اظہار ہے اور کائنات خدائی عدل کا عملی اظہار۔بندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے قول وعمل کو اسی ترازو سے ناپتے رہیں۔وہ نہ لینے میں بے انصافی کریں اور نہ دینے میں۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝١٠ فِيْهَا
فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝١١
وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّيْحَانُ ۝١٢ فَبِاَيِّ

۱۰۔اور زمین کو اس نے خلق کے لیے رکھ دیا۔
۱۱۔اس میں میوے ہیں اور کھجور ہیں جن کے اوپر غلاف ہوتا ہے۔ ۱۲۔اور بھس والے اناج بھی ہیں اور خوشبودار پھول بھی۔ ۱۳۔پھر تم اپنے رب کی

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿١٣﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ
مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ ﴿١٤﴾ وَ خَلَقَ الۡجَآنَّ
مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ﴿١٥﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿١٦﴾ رَبُّ الۡمَشۡرِقَیۡنِ وَ رَبُّ
الۡمَغۡرِبَیۡنِ ﴿١٧﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿١٨﴾ مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ یَلۡتَقِیٰنِ ﴿١٩﴾
بَیۡنَهُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ ﴿٢٠﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢١﴾ یَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ
وَ الۡمَرۡجَانُ ﴿٢٢﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٣﴾ وَ لَهُ الۡجَوَارِ الۡمُنۡشَـٰٔتُ فِی
النصف الۡبَحۡرِ كَالۡاَعۡلَامِ ﴿٢٤﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
ع ١ تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٥﴾

کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۱۴۔ اس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹی سے۔ ۱۵۔ اور اس نے جنات کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔ ۱۶۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۱۷۔ اور وہ مالک ہے دونوں مشرق کا اور دونوں مغرب کا۔ ۱۸۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۱۹۔ اس نے چلائے دو دریا، مل کر چلنے والے۔ ۲۰۔ دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ ۲۱۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۲۲۔ ان دونوں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے۔ ۲۳۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۲۴۔ اور اسی کی ہیں جہاز، سمندر میں اونچے کھڑے ہوئے جیسے پہاڑ۔ ۲۵۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

اس دنیا کا بیشتر حصہ ستاروں پر مشتمل ہے جو سراپا آگ ہیں۔ جنّات اسی آگ کے مادہ سے بنائے گئے ہیں۔ مگر انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی معاملہ ہے کہ اس کو ''مٹی'' سے بنایا گیا ہے جو وسیع کائنات میں انتہائی نادر چیز ہے۔

زمین ساری کائنات میں ایک انوکھا استثناء ہے۔ یہاں وہ تمام اسباب حد درجہ توازن اور تناسب کے ساتھ مہیا کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ انسان جیسی مخلوق کے لیے رہنا اور تمدن کی تعمیر کرنا ممکن ہو سکے۔ انہیں انتظامات میں سے ایک انتظام زمین میں مشرقین اور مغربین کا ہونا ہے۔ جاڑے کے موسم میں سورج کے طلوع وغروب کے مقامات دوسرے ہوتے ہیں۔ اور گرمی کے موسم میں دوسرے اس لحاظ سے اس کے مشرق ومغرب کئی ہو جاتے ہیں۔ یہ موسمی فرق فضا میں زمین کے محوری جھکاؤ (Axial tilt) کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ جھکاؤ کائنات کا ایک انتہائی انوکھا واقعہ ہے۔ اور اس سے بے شمار تمدنی فائدے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔

ناقابل قیاس حد تک وسیع کائنات میں انسان اور زمین کا یہ استثناء خدا کی نعمت وقدرت کا ایسا عظیم معاملہ ہے کہ انسان کسی بھی طرح اس کا شکر ادا کرنے پر قادر نہیں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ
ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٨﴾ يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿٢٩﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٠﴾

۲۶۔ جو بھی زمین پر ہے، وہ فنا ہونے والا۔
۲۷۔اور تیرے رب کی ذات باقی رہے گی،
عظمت والی اور عزت والی۔۲۸۔ پھر تم اپنے
رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۲۹۔اسی سے
مانگتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ہر روز
اس کا ایک کام ہے۔ ۳۰۔ پھر تم اپنے رب کی کن
کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں ہر چیز فنا پذیر ہے۔اشیاء کا فنا پذیری کے باوجود موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا خالق اور منتظم غیر فانی ہے۔اگر وہ غیر فانی نہ ہوتا تو اشیاء کا وجود ہی نہ ہوتا۔یا اگر ہوتا تو اب تک ان کا وجود مٹ چکا ہوتا۔

دنیا کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دنیا کی کسی چیز کے اندر تخلیق کی طاقت نہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اشیاء اپنی بقا کے لیے جن چیزوں کی محتاج ہیں وہ ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہیں۔یہ واقعہ دوبارہ خالق کی بے پایاں قدرت کو بتاتا ہے۔یہ حقیقتیں اتنی واضح ہیں کہ کسی سنجیدہ آدمی کے لیے ان کا انکار ممکن نہیں۔

خدا کی نشانیاں اس دنیا میں اتنی زیادہ ہیں کہ ایک سنجیدہ انسان کے لیے ان کو نظر انداز کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔مگر انسان اتنا ظالم ہے کہ وہ نشانیوں کے ہجوم میں بھی ان نشانیوں کا انکار کرتا ہے۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿٣١﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٢﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ
الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ
اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا
تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿٣٣﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٤﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ
وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿٣٥﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٦﴾

۳۱۔ ہم جلدی فارغ ہونے والے ہیں تمھاری
طرف، اے دو بھاری قافلو۔ ۳۲۔ پھر تم اپنے
رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۳۳۔اے
جنوں اور انسانوں کے گروہ۔اگر تم سے ہو سکے کہ تم
آسمانوں اور زمین کی حدود سے نکل جاؤ تو نکل
جاؤ، تم نہیں نکل سکتے بغیر سند کے۔ ۳۴۔ پھر تم
اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۳۵۔تم
پر چھوڑے جائیں گے آگ کے شعلے اور دھواں تو
تم بچاؤ نہ کر سکو گے۔ ۳۶۔ پھر تم اپنے رب کی کن
کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔جب تک امتحان کی مدت ختم نہیں ہوتی ہر شخص سرکشی کرنے کے لیے

آزاد ہے۔ مگر کامل آزادی کے باوجود کوئی جن وانس اس پر قادر نہیں کہ وہ کائنات کی حدود سے باہر چلا جائے۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انسان پوری طرح خدا کی گرفت میں ہے امتحان کی مدت ختم ہونے پر جب وہ لوگوں کو پکڑے گا تو کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ اس سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٨﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿٣٩﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٠﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ ﴿٤١﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٢﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٤٣﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿٤٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٥﴾ ع

۳۷۔ پھر جب آسمان پھٹ کر کھال کے مانند سرخ ہو جائے گا۔ ۳۸۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۳۹۔ پس اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کی بابت پوچھ نہ ہوگی۔ ۴۰۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۴۱۔ مجرم پہچان لیے جائیں گے اپنی علامتوں سے، پھر پکڑا جائے گا پیشانی کے بال سے اور پاؤں سے۔ ۴۲۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۴۳۔ یہ جہنم ہے جس کو مجرم لوگ جھوٹ بتاتے تھے۔ ۴۴۔ وہ پھریں گے اس کے درمیان اور کھولتے پانی کے درمیان۔ ۴۵۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔

انکار اور سرکشی کی وجہ ہمیشہ بے خوفی ہوتی ہے۔ قیامت کا ہولناک لمحہ جب سامنے آئے گا تو مجرم اپنی سرکشی بھول جائیں گے۔ موجودہ دنیا میں جس حق کو وہ طاقت ور دلائل کے باوجود ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے، قیامت میں اس کو بلا بحث مان لیں گے۔ مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ اللہ کی قدرتوں کو غیب میں ماننا معتبر ہے، نہ کہ اس کے ظاہر ہو جانے کے بعد۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿٤٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٧﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿٤٨﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٩﴾ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿٥٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥١﴾ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ

۴۶۔ اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے، اس کے لیے دو باغ ہیں۔ ۴۷۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۴۸۔ دونوں بہت شاخوں والے۔ ۴۹۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۵۰۔ ان کے درمیان دو چشمے جاری ہوں گے۔ ۵۱۔ پھر تم

زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾
مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ
وَ جَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا
تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ
یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ کَاَنَّهُنَّ
الْیَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ
رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ
اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا
تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔
۵۲۔دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں۔
۵۳۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ
گے۔ ۵۴۔ وہ تکیہ لگائے ایسے بچھونوں پر بیٹھے
ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے۔اور
پھل ان باغوں کا جھک رہا ہوگا۔۵۵۔ پھر تم اپنے
رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۵۶۔ان میں
نیچی نگاہ والی عورتیں ہوں گی، جنھیں ان لوگوں سے
پہلے نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا نہ کسی جن نے۔
۵۷۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔
۵۸۔وہ ایسی ہوں گی جیسے کہ یاقوت اور مرجان۔
۵۹۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔
۶۰۔نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہے۔ ۶۱۔ پھر تم
اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

وسیع تقسیم کے اعتبار سے جنت کے دو بڑے درجے ہیں۔ ان آیات میں دو باغوں والی جس جنت کا ذکر ہے وہ پہلے درجہ والی جنت ہے۔ اس جنت میں شاہانہ درجہ کی نعمتیں مہیا ہوں گی۔ یہ اعلیٰ نعمتیں ان لوگوں کو ملیں گی جن پر اللہ کا فکر اتنا غالب ہوا کہ موجودہ دنیا میں ہی انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے کھڑا کرلیا۔ انہوں نے احسان کے درجہ میں اللہ سے تعلق کا ثبوت دیا۔

وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ
رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِیْهِمَا
عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا
تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِیْهِمَا فَاکِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ
رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾
فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ

۶۲۔اور ان کے سوا دو باغ اور ہیں۔ ۶۳۔ پھر تم
اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔
۶۴۔دونوں گہرے سبز سیاہی مائل۔ ۶۵۔ پھر تم
اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔
۶۶۔ان میں دو چشمے ہوں گے ابلتے ہوئے۔
۶۷۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو
جھٹلاؤ گے۔ ۶۸۔ان میں پھل اور کھجور اور
انار ہوں گے۔ ۶۹۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن
نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۷۰۔ان میں خوب سیرت،

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ ع ۳

خوب صورت عورتیں ہوں گی۔ ۷۱۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۷۲۔ حوریں خیموں میں رہنے والیاں۔ ۷۳۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۷۴۔ ان سے پہلے ان کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔ ۷۵۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۷۶۔ تکیہ لگائے سبز مسندوں پر اور قیمتی نفیس بچھونے پر۔ ۷۷۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ۷۸۔ بڑا بابرکت ہے تیرے رب کا نام بڑائی والا اور عظمت والا۔

ان آیات میں دوسری جنت کا ذکر ہے۔ وہ بھی پہلی جنت کی طرح دو باغوں والی ہوگی۔ یہ جنت عام اہل تقویٰ کے لیے ہوگی۔ موجودہ دنیا کی نعمتوں کے اعتبار سے اس جنت کی نعمتیں بھی اگرچہ ناقابل قیاس حد تک زیادہ ہوں گی مگر اول الذکر جنت کے مقابلہ میں وہ دوسرے درجہ کی جنت ہوگی۔ یہ جنتیں اس خالق و مالک کے شایانِ شان ہوں گی جس کی عظمتوں اور قدرتوں کے نمونے موجودہ دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں اور جن کو دیکھنے والے آج ہی دیکھ رہے ہیں۔

۵۶۔ سُوْرَةُ الْوَاقِعَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿۲﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿۳﴾ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴿۶﴾ وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿۷﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ جب واقع ہونے والی واقع ہوجائے گی۔ ۲۔ اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں۔ ۳۔ وہ پست کرنے والی، بلند کرنے والی ہوگی۔ ۴۔ جب کہ زمین ہلا ڈالی جائے گی۔ ۵۔ اور پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوجائیں گے۔ ۶۔ پھر وہ پراگندہ غبار بن جائیں گے۔ ۷۔ اور تم لوگ تین قسم کے ہوجاؤ گے۔

موجودہ دنیا میں آدمی دیکھتا ہے کہ اس کو آزادی حاصل ہے کہ جو چاہے کرے۔ اس لیے آخرت کی پکڑ کی

بات اس کے ذہن میں نہیں بیٹھتی۔ مگر اگلی دنیا کا بننا اتنا ہی ممکن ہے جتنا موجودہ دنیا کا بننا۔ جب وہ وقت آئے گا تو سارا نظام تلپٹ ہوجائے گا۔ اوپر کے لوگ نیچے ہوجائیں گے۔ اور نیچے کے لوگ اوپر دکھائی دیں گے۔ اس وقت انسان اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے تین گروہوں میں تقسیم ہوجائیں گے السابقون، اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال۔

فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ ﴿٨﴾
وَ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ
الْمَشْـَٔمَةِ ؕ ﴿٩﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۚ ﴿١٠﴾
اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ ﴿١١﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿١٢﴾
ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ ﴿١٣﴾ وَ قَلِيْلٌ مِّنَ
الْاٰخِرِيْنَ ؕ ﴿١٤﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ ﴿١٥﴾
مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿١٦﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ
وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۙ ﴿١٧﴾ بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ ۙ
وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ ﴿١٨﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا
يُنْزِفُوْنَ ۙ ﴿١٩﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ ﴿٢٠﴾ وَ
لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ؕ ﴿٢١﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۙ ﴿٢٢﴾
كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۚ ﴿٢٣﴾ جَزَآءًۢ بِمَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا
وَّلَا تَاْثِيْمًا ۙ ﴿٢٥﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿٢٦﴾

۸۔ پھر دائیں والے، پس کیا خوب ہیں دائیں والے۔ ۹۔ اور بائیں والے، کیسے برے لوگ ہیں بائیں والے۔ ۱۰۔ اور آگے والے تو آگے ہی والے ہیں۔ ۱۱۔ وہ مقرب لوگ ہیں۔ ۱۲۔ نعمت کے باغوں میں۔ ۱۳۔ ان کی بڑی تعداد اگلوں میں سے ہوگی۔ ۱۴۔ اور تھوڑے پچھلوں میں سے ہوں گے۔ ۱۵۔ جڑاؤ تختوں پر۔ ۱۶۔ تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ۱۷۔ پھر رہے ہوں گے ان کے پاس بچے ہمیشہ رہنے والے۔ ۱۸۔ آب خورے اور کوزے لیے ہوئے اور پیالہ صاف شراب کا۔ ۱۹۔ اس سے نہ دردسر ہوگا اور نہ عقل میں فتور آئے گا۔ ۲۰۔ اور میوے کہ جو چاہیں چن لیں۔ ۲۱۔ اور پرندوں کا گوشت جو ان کو مرغوب ہو۔ ۲۲۔ اور بڑی آنکھوں والی حوریں۔ ۲۳۔ جیسے موتی کے دانے اپنے غلاف کے اندر۔ ۲۴۔ بدلہ ان کاموں کا جو وہ کرتے تھے۔ ۲۵۔ اس میں وہ کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ ۲۶۔ مگر صرف سلام سلام کا بول۔

یہاں اہل جنت کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک، مقربین خاص۔ دوسرے، عام انعام یافتہ لوگ۔ یہ فرق نوعیتِ ایمان کے اعتبار سے ہے، نہ کہ زمانہ کے اعتبار سے۔ اصل یہ ہے کہ پیغمبر کے دور میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہیں، ان کا ایمان شعوری دریافت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ میرٹ (merit) کی بنیاد پر اسلام کو قبول کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے بعد والوں کی اکثریت کا اسلام نسلی اسلام ہوتا ہے۔ اس لیے قیامت کے دن مقربین لوگوں کی تعداد پہلے لوگوں میں زیادہ ہوگی، اور بعد کے لوگوں میں کم ہوگی۔

السابقون وہ لوگ ہیں جو حق کے سامنے آتے ہی شعوری دریافت کے تحت فوراً اس کو قبول کرلیں۔ وہ بلا تاخیر اپنے آپ کو حق کے حوالے کردیں۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن کون لوگ اللہ کے سایہ میں سب سے پہلے جگہ پائیں گے۔ لوگوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ کہ جب ان کے سامنے حق آیا تو انہوں نے اس کو قبول کرلیا۔ اور جب ان سے حق مانگا گیا تو انہوں نے اس کو دیا۔ اور دوسروں کے معاملہ میں انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو فیصلہ ان کا خود اپنے بارے میں تھا (الَّذِينَ إِذَا أُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوهُ، وَإِذَا سُئِلُوهُ بَذَلُوهُ، وَحَكَمُوا لِلنَّاسِ كَحُكْمِهِمْ لِأَنْفُسِهِمْ) مسند احمد، حدیث نمبر 24379۔

دعوت کے دور اول میں جو افراد آگے بڑھ کر اسلام قبول کرتے ہیں ان کے لیے اسلام ایک دریافت ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کی جو نسلیں ہیں وہ اسلام کو وراثت کے طور پر پاتی ہیں۔ دریافت اور وراثت کا یہی فرق ہے جو پہلے گروہ کا مرتبہ دوسرے گروہ سے بلند کردیتا ہے۔ قدرتی طور پر دوسرا گروہ تعداد میں زیادہ ہوتا ہے اور پہلا گروہ کم۔ آخرت میں دوسرے گروہ کے لیے اگر عام انعامات ہیں تو پہلے گروہ کے لیے شاہانہ انعامات۔

وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿٢٧﴾
فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿٢٨﴾ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿٢٩﴾ وَّ
ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿٣٠﴾ وَّ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿٣١﴾ وَّ
فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿٣٢﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا
مَمْنُوْعَةٍ ﴿٣٣﴾ وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿٣٤﴾ اِنَّآ
اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿٣٥﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿٣٦﴾
ع ٢٨ / ١٤ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿٣٧﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٣٨﴾ ثُلَّةٌ
مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٩﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٠﴾

۲۷۔ اور داہنے والے، کیا خوب ہیں داہنے والے۔ ۲۸۔ بیری کے درختوں میں جن میں کانٹا نہیں۔ ۲۹۔ اور کیلے تہہ بہ تہہ۔ ۳۰۔ اور پھیلے ہوئے سائے۔ ۳۱۔ اور بہتا ہوا پانی۔ ۳۲۔ اور کثرت سے میوے۔ ۳۳۔ جو نہ ختم ہوں گے اور نہ کوئی روک ٹوک ہوگی۔ ۳۴۔ اور اونچے بچھونے۔ ۳۵۔ ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے۔ ۳۶۔ پھر ان کو کنواری رکھا ہے۔ ۳۷۔ دل ربا اور ہم عمر۔ ۳۸۔ داہنے والوں کے لیے۔ ۳۹۔ اگلوں میں سے ایک بڑا گروہ ہوگا۔ ۴۰۔ اور پچھلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ۔

اصحاب الیمین (دائیں طرف والے) سے مراد عام اہل جنت ہیں۔ اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اپنے عقیدہ اور کردار کے اعتبار سے صالح تھے۔ ان کو ایمانی اعتبار سے اگرچہ اعلی شعوری درجہ حاصل نہ تھا تاہم وہ خدا اور رسول کے لیے مخلص تھے اور اپنی زندگی میں انصاف اور خدا ترسی کے راستہ پر قائم رہے۔ اس گروہ میں دور اول کے بھی کافی لوگ ہوں گے اور دور ثانی کے بھی کافی لوگ۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ۬ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿٤١﴾ فِيْ
سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ ﴿٤٢﴾ وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿٤٣﴾ لَّا
بَارِدٍ وَّ لَا كَرِيْمٍ ﴿٤٤﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ
مُتْرَفِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ
الْعَظِيْمِ ﴿٤٦﴾ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ۬ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا
تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٤٧﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا
الْاَوَّلُوْنَ ﴿٤٨﴾ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ
الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ۬ اِلٰى مِيْقَاتِ
يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٥٠﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ
الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿٥١﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ
زَقُّوْمٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٥٣﴾
فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿٥٤﴾ فَشٰرِبُوْنَ
شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿٥٥﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٥٦﴾

۴۱۔اور بائیں والے، کیسے برے ہیں بائیں
والے۔ ۴۲۔آگ میں اور کھولتے ہوئے پانی
میں۔ ۴۳۔اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں۔
۴۴۔نہ ٹھنڈا اور نہ عزت کا۔ ۴۵۔یہ لوگ اس
سے پہلے خوش حال تھے۔ ۴۶۔اور وہ بھاری
گناہ پر اصرار کرتے رہے۔ ۴۷۔اور وہ کہتے
تھے، کیا جب ہم مرجائیں گے اور ہم مٹی اور
ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا ہم پھر اُٹھائے جائیں
گے۔ ۴۸۔اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی۔
۴۹۔کہو کہ اگلے اور پچھلے۔ ۵۰۔سب، جمع کیے
جائیں گے ایک مقرر دن کے وقت پر۔
۵۱۔پھر تم لوگ، اے بہکے ہوئے اور جھٹلانے
والے، ۵۲۔زقوم کے درخت میں سے کھاؤ گے۔
۵۳۔پھر اس سے اپنا پیٹ بھرو گے۔
۵۴۔پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پیو گے۔
۵۵۔پھر پیاسے اونٹوں کی طرح پیو گے۔
۵۶۔یہ ان کی مہمانی ہوگی انصاف کے دن۔

اصحاب الشمال (بائیں طرف والے) سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے عذاب کا فیصلہ کیا جائے گا۔ دنیا میں انہیں جو چیزیں ملی تھیں انہوں نے ان کو دھوکے میں ڈال دیا۔ وہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنائے رہے۔ جو اس دنیا میں کسی انسان کا سب سے بڑا جرم ہے۔ وہ آخرت کو اس طرح بھولے رہے گویا کہ وہ آنے والی ہی نہیں۔ ایسے لوگ فیصلہ کے دن سخت عذاب کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْ لَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿٥٧﴾
اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿٥٨﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ
اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿٥٩﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ
الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿٦٠﴾ عَلٰٓى اَنْ

۵۷۔ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر تم تصدیق کیوں
نہیں کرتے۔ ۵۸۔کیا تم نے غور کیا اس چیز پر جو
تم ٹپکاتے ہو۔ ۵۹۔کیا تم اس کو بناتے ہو یا ہم
ہیں بنانے والے۔ ۶۰۔ہم نے تمھارے درمیان
موت مقدر کی ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں۔

تُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى
فَلَوْ لَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
تَحْرُثُوْنَ ﴿٦٣﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ
الزّٰرِعُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا
فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ بَلْ
نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٦٧﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ
تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ
اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ
اُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ
الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿٧١﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ
اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿٧٢﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا
تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَسَبِّحْ
بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾ الثلثة ع ۲ ۳۶ ۱۵

۶۱۔ کہ تمھاری جگہ تمھارے جیسے پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں بنا دیں جن کو تم جانتے نہیں۔ ۶۲۔ اور تم پہلی پیدائش کو جانتے ہو، پھر کیوں سبق نہیں لیتے۔ ۶۳۔ کیا تم نے غور کیا اس چیز پر جو تم بوتے ہو۔ ۶۴۔ کیا تم اس کو اُگاتے ہو یا ہم ہیں اُگانے والے۔ ۶۵۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیں، پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ۔ ۶۶۔ ہم تو تاوان میں پڑ گئے۔ ۶۷۔ بلکہ ہم بالکل محروم ہو گئے۔ ۶۸۔ کیا تم نے غور کیا اس پانی پر جو تم پیتے ہو۔ ۶۹۔ کیا تم نے اس کو بادل سے اُتارا ہے۔ یا ہم ہیں اُتارنے والے۔ ۷۰۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو سخت کھاری بنا دیں۔ پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ ۷۱۔ کیا تم نے غور کیا اس آگ پر جس کو تم جلاتے ہو۔ ۷۲۔ کیا تم نے پیدا کیا ہے اس کے درخت کو یا ہم ہیں اس کے پیدا کرنے والے۔ ۷۳۔ ہم نے اس کو یاددہانی بنایا ہے، اور مسافروں کے لیے فائدہ کی چیز۔ ۷۴۔ پس تم اپنے عظیم رب کے نام کی تسبیح کرو۔

ماں کے پیٹ سے انسان کا پیدا ہونا، زمین سے کھیتی کا اگنا، بادل سے پانی کا برسنا، ایندھن سے آگ کا حاصل ہونا، یہ سب چیزیں براہ راست خدا کی طرف سے ہیں۔ آدمی کو ان کے ملنے پر خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ان کو خدا کا عطیہ سمجھنا چاہیے، نہ کہ اپنے عمل کا نتیجہ۔

ان واقعات میں غور کرنے والے کے لیے بے شمار نصیحتیں ہیں۔ ان میں موجودہ زندگی کے بعد دوسری زندگی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح ان میں یہ نشانی ہے کہ جس نے ان کو دیا ہے وہ ان کو چھین بھی سکتا ہے۔ پھر اسی کا ایک نمونہ پانی کا معاملہ ہے۔ پانی کا ذخیرہ سمندروں کی صورت میں ہے جو کہ زیادہ تر کھاری ہیں۔ پانی کا تقریباً 98 فی صد حصہ سمندر میں ہے۔ اور سمندر کے پانی کا 1/10 حصہ نمک ہوتا ہے۔ یہ خدا کے قانون کا کرشمہ ہے کہ سمندر سے جب پانی کے بخارات اٹھتے ہیں تو خالص پانی اوپر اڑ جاتا ہے اور نمک نیچے رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بارش کا عمل ازالۂ نمک (desalination) کا ایک عظیم آفاقی عمل ہے۔ اگر یہ قدرتی

اہتمام نہ ہوتو سارا کا سارا پانی ویسا ہی کھاری ہوجائے جیسا سمندر کا پانی ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی برف اور دریاؤں میں بہنے والا پانی سب کے سب سخت کھاری ہوں، زمین پر پانی کے اتھاہ ذخیروں کے باوجود میٹھے پانی کا حصول انسانیت کے لیے سخت ناقابل حل مسئلہ بن جائے۔ آدمی اگر اس کو سوچے تو اس کا سینہ حمدِ خداوندی کے جذبہ سے بھر جائے گا۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾

۷۵۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مواقع کی۔ ۷۶۔ اور اگر تم غور کرو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔ ۷۷۔ بے شک یہ ایک عزت والا قرآن ہے۔ ۷۸۔ ایک محفوظ کتاب میں۔ ۷۹۔ اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنائے گئے ہیں۔ ۸۰۔ اترا ہوا ہے پروردگار عالم کی طرف سے۔ ۸۱۔ پھر کیا تم اس کلام کے ساتھ بے اعتنائی برتتے ہو۔ ۸۲۔ اور تم اپنا حصہ یہی لیتے ہو کہ تم اس کو جھٹلاتے ہو۔

مواقع کا لفظ موقع کی جمع ہے اس کے معنی ہیں گرنے کی جگہ۔ چنانچہ بارش ہونے کی جگہ کو مواقع القطر کہا جاتا ہے۔ یہاں ستاروں کے مواقع سے مراد غالباً ستاروں کے مدار (orbits) ہیں۔ کائنات میں بے شمار نہایت بڑے بڑے ستارے ہیں۔ وہ حد درجہ صحت کے ساتھ اپنے اپنے مدار پر گھوم رہے ہیں۔

یہ واقعہ دہشت ناک حد تک عظیم ہے۔ جو شخص اس خلائی نظام پر غور کرے گا وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اس کائنات کا خالق ناقابل قیاس حد تک عظیم ہے۔ پھر ایسے خالق کی طرف سے جو کتاب آئے وہ بھی یقیناً عظیم ہوگی۔ اور قرآن بلاشبہ ایسی ہی ایک عظیم کتاب ہے۔

قرآن جس طرح لوح محفوظ میں تھا، ٹھیک اسی طرح وہ فرشتوں کے ذریعہ پیغمبر تک پہنچا۔ اور آج تک وہ اسی طرح محفوظ ہے۔ قدیم زمانہ کی کوئی بھی دوسری کتاب نہیں جو اس طرح کامل طور پر محفوظ ہو۔ یہ واقعہ خود اس کتاب کی عظمت کا ثبوت ہے۔ ایسی ایک کتاب سے جو شخص ہدایت حاصل نہ کرے اس کی محرومی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَاَنْتُمْ حِیْنَىٕذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ

۸۳۔ پھر کیوں نہیں، جب کہ جان حلق میں پہنچتی ہے۔ ۸۴۔ اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ۸۵۔ اور ہم تم سے زیادہ اس شخص سے قریب ہوتے ہیں مگر تم نہیں دیکھتے۔ ۸۶۔ پھر کیوں

غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ
الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ وَّ جَنَّتُ
نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ
الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ
الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾ وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ
الضَّآلِّيْنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾ وَّ تَصْلِيَةُ
جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾
ع ۳/۲۲/۱۲ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾

نہیں، اگر تم محکوم نہیں ہو۔ ۸۷۔ تو تم اس جان کو کیوں نہیں لوٹالاتے، اگر تم سچے ہو۔ ۸۸۔ پس اگر وہ مقربین میں سے ہو۔ ۸۹۔ تو راحت ہے اور عمدہ روزی ہے اور نعمت کا باغ ہے۔ ۹۰۔ اور اگر وہ اصحابِ یمین میں سے ہو۔ ۹۱۔ تو تمھارے لیے سلامتی، تو اصحاب یمین میں سے ہے۔ ۹۲۔ اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو۔ ۹۳۔ تو گرم پانی کی ضیافت ہے۔ ۹۴۔ اور جہنم میں داخل ہونا۔ ۹۵۔ بے شک یہ قطعی حق ہے۔ ۹۶۔ پس تم اپنے عظیم رب کے نام کی تسبیح کرو۔

موت کا واقعہ اس بات کا آخری ثبوت ہے کہ انسان خدائی طاقتوں کے آگے بالکل بے بس ہے۔ ہر آدمی لازماً ایک مقررہ وقت پر مر جائے گا، اور کوئی نہیں جو اس کو موت کے فرشتے سے بچا سکے۔ ایسی حالت میں آدمی کو سب سے زیادہ موت کے بعد کے مسئلہ کے بارے میں فکر مند ہونا چاہیے۔ موت سے پہلے کی زندگی میں جن لوگوں نے جنت والے اعمال کیے ہیں ان کو موت کے بعد کی زندگی میں جنت ملے گی۔ اس کے برعکس، جو لوگ دنیا میں خدا سے دور تھے وہ آخرت میں بھی خدا کی رحمتوں سے دور رکھے جائیں گے۔ ان کی ضیافت کے لیے وہاں گرم پانی ہے اور ان کے رہنے کے لیے وہاں آگ کی دنیا۔

۵۷۔ سُوْرَةُ الْحَدِيْد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۲﴾ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَ
الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِيْ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ ۲۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے۔ وہ جِلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۳۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۴۔ وہی ہے

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ
وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَ مَا
يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَ اللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ ۭ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵ يُوْلِجُ
الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۭ وَ هُوَ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶

جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں،
پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ جانتا ہے جو کچھ زمین
کے اندر جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو
کچھ آسمان سے اُترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا
ہے، اور وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو، اور
اللہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۵۔ آسمانوں اور
زمین کی سلطنت اسی کی ہے، اور اللہ ہی کی طرف
لوٹتے ہیں سارے امور۔ ٦۔ وہ رات کو دن میں
داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے،
اور وہ دل کی باتوں کو جانتا ہے۔

کائنات زبانِ حال سے اپنے خالق کی جن صفات کی خبر دے رہی ہے، قرآن میں انھیں صفات کو الفاظ کی صورت دے دی گئی ہے۔ یہاں جب ایک چیز ظاہر ہوتی ہے تو وہ عمل کی زبان میں کہہ رہی ہوتی ہے کہ کوئی اس کا ظاہر کرنے والا ہے۔ اور جب وہ چیز ختم ہوتی ہے تو وہ اس بات کا عملی اعلان کر رہی ہوتی ہے کہ کوئی اس کا ختم کرنے والا ہے۔ اسی طرح دوسری تمام صفتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات اگر خدا کی عملی تسبیح ہے تو قرآن خدا کی لفظی تسبیح۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ
مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ
وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷ وَ مَا لَكُمْ لَا
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا
بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ
بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ
وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا
تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ

۷۔ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ
کرو اس چیز میں سے جس میں اس نے تم کو امین
بنایا ہے، پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور
خرچ کریں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ ۸۔ اور تم
کو کیا ہوا کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ حالاں
کہ رسول تم کو بلا رہا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ
اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے، اگر تم مومن ہو۔
۹۔ وہی ہے جو اپنے بندے پر واضح آیتیں اُتارتا
ہے تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے
آئے، اور اللہ تمھارے اوپر نرمی کرنے والا ہے،
مہربان ہے۔ ۱۰۔ اور تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ کے
راستہ میں خرچ نہیں کرتے، حالاں کہ سب آسمان

وَ الْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ؑ ۱۰

اور زمین آخر میں اللہ ہی کا رہ جائے گا۔تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ کریں اور لڑیں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور لڑے، اور اللہ نے سب سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

اسلام کی دعوت جب اٹھتی ہے تو وہ اپنے ابتدائی مرحلہ میں ’’آیات بینات‘‘ کے اوپر کھڑی ہوتی ہے۔ دوسرا دور وہ ہے جب کہ اس کو ماحول میں ’’فتح‘‘ حاصل ہو جائے۔ پہلے دور میں صرف وہ لوگ اسلام کے لیے قربانی دینے کا حوصلہ کرتے ہیں جو دلائل کی سطح پر کسی چیز کی عظمت کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مگر جب اسلام کو فتح وغلبہ حاصل ہو جائے تو ہر آدمی اس کی عظمت کو دیکھ لیتا ہے اور ہر آدمی آگے بڑھ کر اس کے لیے جان ومال پیش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

ابتدائی دور میں اسلام کے لیے خرچ کرنے والے کو یک طرفہ طور پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ دوسرے دور میں یہ حال ہو جاتا ہے کہ آدمی جتنا خرچ کرتا ہے اس سے زیادہ وہ دو مختلف شکلوں میں اس کا انعام اسی دنیا میں پا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کا درجہ اللہ کے یہاں یکساں نہیں۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۚ ۱۱ یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۚ ۱۲ یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ؕ ۱۳ یُنَادُوْنَهُمْ

۱۱۔ کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، کہ وہ اس کو اس کے لیے بڑھائے، اور اس کے لیے باعزت اجر ہے۔ ۱۲۔ جس دن تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دائیں چل رہی ہوگی— آج کے دن تم کو خوش خبری ہے باغوں کی جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، یہ بڑی کامیابی ہے۔ ۱۳۔جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ ہمیں موقع دو کہ ہم بھی تمھاری روشنی سے کچھ فائدہ اٹھا لیں۔ کہا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پھر روشنی تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔

اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

۱۴۔ وہ ان کو پکاریں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں، مگر تم نے اپنے آپ کو فتنہ میں ڈالا اور راہ دیکھتے رہے اور شک میں پڑے رہے اور جھوٹی امیدوں نے تم کو دھوکہ میں رکھا، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا اور دھوکے باز نے تم کو اللہ کے معاملہ میں دھوکہ دیا۔ ۱۵۔ پس آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تمھارا ٹھکانا آگ ہے۔ وہی تمھاری رفیق ہے۔ اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

سچا اسلام جب ماحول میں اجنبی ہو، اس وقت سچے اسلام کی طرف بڑھنا اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس وقت اسلام کی حقیقت پر شبہات کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ اس وقت اسلام کی راہ میں خرچ کرنا ایسا ہوتا ہے گویا امید موہوم پر کسی کو قرض دینا۔ شک اور تردد کی فضا ہر طرف لوگوں کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ خدا کے وعدوں کے مقابلہ میں لوگوں کو اپنے سامنے کے فائدے زیادہ یقینی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے وقت میں اپنی جان و مال کو اسلام کے حوالہ کرنا زبردست قوت فیصلہ چاہتا ہے۔ ایسے وقت میں وہی شخص آگے بڑھنے کی ہمت کرتا ہے جو عقل و بصیرت کی طاقت سے چیزوں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

جو لوگ دنیا میں اس بصیرت کا ثبوت دیں ان کی بصیرت قیامت کے دن ان کے لیے روشنی بن جائے گی جس میں وہ وہاں کے مشکل مراحل میں اپنا سفر طے کر سکیں۔ جو بصیرت دنیا میں ان کی رہنما بنی تھی وہی بصیرت آخرت میں بھی اللہ کی مدد سے ان کے لیے رہنما کا کام انجام دے گی۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾

۱۶۔ کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔ ۱۷۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد، ہم نے تمھارے لیے نشانیاں بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو۔

یہ آیتیں جس وقت نازل ہوئیں اس وقت اسلام اگرچہ مادی قوت نہیں بنا تھا۔ مگر دلائل اور تنبیہات کا زور اس وقت بھی پوری طرح اس کی پشت پر موجود تھا۔ ایسی حالت میں جو شخص دلائل کا زور محسوس نہ کرے اور خدائی تنبیہات جس کو ہلانے والی نہ بن سکیں وہ اپنے اس عمل سے صرف یہ ثبوت دے رہا ہے کہ وہ بے حسی کے مرض میں مبتلا ہے۔ مٹی میں پانی ملنے کے بعد تروتازگی پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر انسان اگر کھلے کھلے دلائل کو سن کر بھی نہ جاگے تو یہ کیسی عجیب بات ہوگی۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾ ع

۱۸۔ بے شک صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں۔ اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کو قرض دیا، اچھا قرض، تو ان کے لیے بڑھایا جائے گا اور ان کے لیے باعزت اجر ہے۔ ۱۹۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر اور ان کی روشنی ہے، اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ کے لوگ ہیں۔

اللہ کی رضا کے لیے دوسروں کو مال دینا اور دین کی ضرورتوں پر خرچ کرنا بہت بڑا عمل ہے۔ جو مرد اور عورت اس طرح خرچ کریں وہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کا ثبوت دیا۔ انہوں نے حق کے خلاف شبہات کے ماحول میں حق کو دیکھا اس لیے ان کا یہ عمل آخرت میں ان کے لیے روشنی بن جائے گا۔ وہ خدا کی نشانیوں کو ماننے والے قرار پائیں گے۔ ان کو اللہ کے گواہ کا درجہ دیا جائے گا، یعنی آخرت کی عدالت میں لوگوں کے احوال بتانے والے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ؕ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ

۲۰۔ جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ کھیل اور تماشہ ہے اور زینت اور باہمی فخر اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔ جیسے کہ بارش کہ اس کی پیداوار کسانوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہوجاتی ہے، پھر تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے۔ اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے معافی اور رضامندی بھی۔

الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿٢٠﴾ سَابِقُوْٓا اِلٰى
مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ
يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٢١﴾

اور دنیا کی زندگی دھوکے کی پونجی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ۲۱۔ دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ وہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں، یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ اس کو دیتا ہے جسے وہ چاہتا ہے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔

دنیا میں اللہ نے آخرت کی مثالیں قائم کردی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال کھیتی کی ہے۔ کھیتی جب پانی پا کر تیار ہوتی ہے تو تھوڑے دنوں کے لیے اس کی سرسبزی نہایت پر کشش معلوم ہوتی ہے۔ مگر بہت جلد گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ ساری سرسبزی اچانک ختم ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس کو کاٹ کر اسے چورا چورا کردیا جاتا ہے۔

اسی طرح موجودہ دنیا کی رونق بھی چند روزہ ہے۔ آدمی اس کو پا کر دھوکے میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ اسی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ مگر اس کے بعد جب وہ خدا کی طرف لوٹایا جائے گا تو اس پر کھلے گا کہ دنیا کی رونقوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ
اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ
نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٢٢﴾
لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ
اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ
فَخُوْرِ ۙ ﴿٢٣﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ
النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٤﴾

۲۲۔ کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمھاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں، بے شک یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔ ۲۳۔ تا کہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے کھویا گیا۔ اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا، اور اللہ اترانے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ ۲۴۔ جو کہ بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور جو شخص اعراض کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔

دنیا میں کسی چیز کا ملنا یا کسی چیز کا چھننا دونوں امتحان کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیشگی طور پر مقرر فرما دیا ہے کہ کس شخص کو اس کے امتحان کا پرچہ کن کن صورتوں میں دیا جائے گا۔ آدمی کو اصلاً جس چیز پر توجہ دینا چاہیے وہ یہ نہیں کہ اس کو کیا ملا اور اس سے کیا چھینا گیا بلکہ یہ کہ اس نے کس موقع پر کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ صحیح اور مطلوب ردعمل یہ ہے کہ آدمی سے کھویا جائے تو وہ دل برداشتہ نہ ہو اور جب اس کو ملے تو وہ اس کی بنا پر فخر و غرور میں مبتلا نہ ہوجائے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دونوں حالتوں کا استقبال معتدل نفسیات کے ساتھ کرے۔ ظاہری

کامیابی بھی اس کے لیے فکری غذا کا ذریعہ ہو، اور ظاہری ناکامی بھی اس کی روحانیت میں اضافہ کرے۔ کوئی بھی واقعہ اس کے ذہن کو اس طرح ڈسٹرب نہ کرے کہ وہ مثبت طور پر سوچنے کے قابل نہ رہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۵ ع

ع ۳ ۶ ۱۹

۲۵۔ ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ اُتارا کتاب اور ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اُتارا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بِن دیکھے، بے شک اللہ طاقت والا، زبردست ہے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مادی چیزیں انسانی اخلاقیات کے لیے تمثیل کا کام کرتی ہیں۔ یہاں اس سلسلہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک، میزان اور دوسرے، ترازو۔

دین میں دو چیزیں مطلوب ہیں۔ ایک پیروئ دین، اور دوسری حمایت دین۔ ترازو گویا پیروی دین کی علامتی تمثیل ہے۔ جس طرح ترازو پر کسی چیز کا کم وبیش ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کی کتاب بھی حق کی ترازو ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اپنے اعمال خدا کی کتاب پر جانچ کر دیکھتے رہیں کہ وہ کس حد تک درست ہیں اور کس حد تک درست نہیں۔

اسی طرح لوہا گویا حمایت دین کی علامتی مثال ہے۔ خدا کے دین کی نصرت وہ لوگ کر سکتے ہیں، جن کے اندر حدیدی کردار ہو، یعنی وہ لوگ جو قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) کے حامل ہوں، جن کے قول پر پورا اعتماد کیا جا سکے، جو مشکل حالات میں بھی کوئی کمزوری نہ دکھائیں، جو نفس اور شیطان کے دباؤ کے مقابلے میں اسٹیل کی طرح بے لچک ثابت ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی دین کا کوئی معاملہ پڑے تو وہاں آدمی کو لوہے کی طرح مضبوط ثابت ہونا چاہیے۔ اس کو فولادی قوت کے ساتھ دین کا دفاع کرنا چاہیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۶ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۥ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ

۲۶۔ اور ہم نے نوح کو اور ابراہیم کو بھیجا۔ اور ان کی اولاد میں ہم نے پیغمبری اور کتاب رکھ دی۔ پھر ان میں سے کوئی راہ پر رہے اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔ ۲۷۔ پھر انھیں کے نقش قدم پر ہم نے اپنے رسول بھیجے اور انھیں کے نقش قدم پر عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے اس کو انجیل دی۔ اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں

الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

میں شفقت اور رحمت رکھ دی۔اور رہبانیت کو انھوں نے خود ایجاد کیا ہے،ہم نے اس کو ان پر نہیں لکھا تھا۔مگر انھوں نے اللہ کی رضا مندی کے لیے اس کو اختیار کرلیا،پھر انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی،پس ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ان کو ہم نے ان کا اجر دیا۔اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔

اللہ کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے سب ایک ہی دین لے کر آئے۔مگر بعد کے زمانہ میں لوگوں نے پیغمبر کے نام پر بدعتیں ایجاد کرلیں۔اس کی ایک مثال حضرت مسیح علیہ السلام کے پیرو ہیں۔حضرت مسیح کے ذمہ صرف دعوت کا کام تھا۔آپ کی پیغمبرانہ ذمہ داری میں قتال شامل نہ تھا۔چنانچہ آپ نے سب سے زیادہ داعیانہ اخلاق پر زور دیا۔اور داعیانہ اخلاق سراسر رافت ورحمت پر مبنی ہوتا ہے۔آپ نے اپنے پیرووٴں سے کہا کہ وہ لوگوں کے مقابلہ میں یک طرفہ طور پر رافت ورحمت کا طریقہ اختیار کریں۔مگر حضرت مسیح کے بعد آپ کے پیرو اس مصلحت کو سمجھ نہ سکے۔ان کا یہ مزاج انہیں رہبانیت کی طرف بہالے گیا۔اعراض دنیا کی جو تعلیم انہیں دعوت کے مقصد سے دی گئی تھی اس کو انھوں نے مزید مبالغہ کے ساتھ ترکِ دنیا کے لیے اختیار کرنا شروع کردیا۔

”رہبانیت“ سے مراد یہ ہے کہ آدمی خدا کے نام پر دنیا کو چھوڑ دے۔حضرت مسیح کے پیرووٴں کا ترکِ دنیا مذہب کے نام پر غلو سے پیدا ہوا تھا۔ان کو جس زہد کی تعلیم دی گئی تھی، وہ نفسیاتی زہد تھا۔مگر انھوں نے نفسیاتی زہد کے حکم کو جسمانی زہد کے معنی میں لے لیا۔قرآن کے مطابق،مومن وہ انسان ہے جو انسانوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے،مگر اس کی توجہ خدا کی طرف لگی رہتی ہے۔وہ بظاہر مادی کام میں مشغول دکھائی دیتا ہے،مگر اس کا ذہن روحانی سطح پر سرگرم رہتا ہے۔وہ دنیا میں رہتے ہوئے ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو آخرت میں بسیرا لیے ہوئے ہو(النور،24:37)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ۙ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ ع

۲۸۔اے ایمان والو،اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔اللہ تم کو اپنی رحمت سے دو حصے عطا کرے گا۔اور تم کو روشنی عطا کرے گا جس کو لے کر تم چلو گے۔اور تم کو بخش دے گا۔اور اللہ بخشنے والا،مہربان ہے۔۲۹۔تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

"اے ایمان لانے والو" سے مراد حضرت مسیح پر ایمان لانے والے ہیں۔ جو لوگ پچھلے پیغمبر کو مانتے ہوں، اوراب وہ پیغمبر آخر الزماں کی صداقت کو دریافت کر کے ان پر ایمان لائیں تو ان کے لیے دہرا اجر ہے۔ اسی طرح جو لوگ نسلی طور پر مسلمان ہیں وہ دوبارہ اسلام کا مطالعہ کریں اور اپنے اندر اسلامی شعور پیدا کر کے از سر نو مومن و مسلم بنیں تو وہ بھی اللہ کے یہاں دہرے اجر کے مستحق قرار پائیں گے۔

۵۸۔ سُوْرَۃُ الْمُجَادَلَۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ①

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

☆ ۱۔ اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تم سے جھگڑتی تھی اور اللہ سے شکوہ کر رہی تھی، اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب میں رواج تھا کہ کوئی مرد اگر اپنی بیوی سے کہہ دیتا کہ أنتِ عليّ كظهر أمّي (تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ) تو وہ عورت ہمیشہ کے لیے اس مرد پر حرام ہو جاتی۔ اس کو ظہار کہا جاتا تھا۔ مدینہ کے ایک مسلمان اوس بن صامت انصاری نے اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کو ایک بار یہی لفظ کہہ دیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور واقعہ بتایا۔ آپ نے قدیم رواج کے اعتبار سے فرمادیا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ تم اس پر حرام ہو گئی ہو۔ خولہ کو پریشانی ہوئی کہ میرا گھر اور میرے بچے برباد ہو جائیں گے۔ وہ فریاد وزاری کرنے لگیں۔ اس پر یہ آیتیں اتریں اور بتایا گیا کہ ظہار کے بارے میں اسلامی حکم کیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ② وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا

۲۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا۔ اور یہ لوگ بے شک ایک نامعقول اور جھوٹ بات کہتے ہیں، اور اللہ معاف کرنے والا، بخشنے والا ہے۔

۳۔ اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اس سے رجوع کریں جو انھوں نے کہا تھا تو ایک گردن کو آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ آپس میں ہاتھ لگائیں۔ اس سے تم کو نصیحت کی

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۳﴾ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ
فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ
ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴﴾

جاتی ہے، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔
۴۔ پھر جو شخص نہ پائے تو روزے ہیں دو مہینے
کے لگاتار، اس سے پہلے کہ وہ آپس میں ہاتھ
لگائیں۔ پھر جو شخص نہ کر سکے تو ساٹھ مسکینوں کو
کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم اللہ اور اس کے
رسول پر ایمان لاؤ۔ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور
منکروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اسلام میں صورت اور حقیقت کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس قدیم رواج کو تسلیم نہیں کیا کہ جو عورت حقیقی ماں نہ ہو وہ محض ماں کا لفظ بول دینے سے کسی کی ماں بن جائے۔ اس قسم کا فعل ایک لغو بات تو ضرور ہے مگر اس کی وجہ سے فطرت کے قوانین بدل نہیں سکتے۔

قرآن میں بتایا گیا کہ محض ظہار سے کسی آدمی کی بیوی پر طلاق نہیں پڑے گی۔ البتہ اس آدمی پر لازم کیا گیا کہ وہ پہلے کفارہ ادا کرے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنی بیوی کے پاس جائے۔ کسی غلطی کے بعد جب آدمی اس طرح کفارہ ادا کرتا ہے تو وہ دوبارہ اپنے یقین کو زندہ کرتا ہے۔ وہ اس اصول میں اپنے عقیدہ کو از سرِ نو مستحکم بناتا ہے جس کو وہ غفلت یا نادانی سے چھوڑ بیٹھا تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا
كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ
اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵﴾ ۚ
يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا
عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۶﴾ ع

۵۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت
کرتے ہیں، وہ ذلیل ہوں گے جس طرح وہ لوگ
ذلیل ہوئے جو ان سے پہلے تھے اور ہم نے واضح
آیتیں اُتار دی ہیں، اور منکروں کے لیے ذلت کا
عذاب ہے۔ ۶۔ جس دن اللہ ان سب کو اُٹھائے
گا اور ان کے کیے ہوئے کام ان کو بتائے گا۔ اللہ
نے اس کو گن رکھا ہے۔ اور وہ لوگ اس کو بھول
گئے، اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز۔

حق کی مخالفت کرنا خدا کی مخالفت کرنا ہے۔ اور خدا کی مخالفت کرنا اس ہستی کی مخالفت کرنا ہے جس سے مخالفت کر کے آدمی خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ خدا سے آدمی نہ اپنی کسی چیز کو چھپا سکتا اور نہ کسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا

۷۔ تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں
میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کوئی سرگوشی تین

هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ۖ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝٧ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَىٰ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ۚ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا ۖ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝٨

آدمیوں کی نہیں ہوتی جس میں چوتھا اللہ نہ ہو۔ اور نہ پانچ کی سرگوشی ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس سے کم کی یا زیادہ کی۔ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں، پھر وہ ان کو ان کے کیے سے آگاہ کرے گا قیامت کے دن۔ بے شک اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔ ۸۔ کیا تم نے نہیں دیکھا جن کو سرگوشیوں سے روکا گیا تھا، پھر بھی وہ وہی کر رہے ہیں جس سے وہ روکے گئے تھے۔ اور وہ گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں، اور جب وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو تم کو ایسے طریقہ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے تم کو سلام نہیں کیا۔ اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہم کو عذاب کیوں نہیں دیتا۔ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے، وہ اس میں پڑیں گے، پس وہ برا ٹھکانا ہے۔

کائنات اپنے انتہائی پیچیدہ نظام کے ساتھ یہ گواہی دے رہی ہے کہ وہ ہر آن کسی بالاتر طاقت کی نگرانی میں ہے۔ کائنات میں نگرانی کی شہادت یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان بھی مسلسل طور پر اپنے خالق کی نگرانی میں ہے۔ ایسی حالت میں حق کے خلاف خفیہ سرگرمیاں دکھانا صرف ایسے اندھے لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو خدا کی صفتوں کو نہ براہ راست طور پر ملفوظ قرآن میں پڑھ سکیں اور نہ بالواسطہ طور پر غیر ملفوظ کائنات میں۔

بعض یہود اور منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آتے تو وہ السلام علیکم (آپ پر سلامتی ہو) کہنے کے بجائے السام علیکم (آپ پر موت آئے) کہتے۔ یہ ہمیشہ سے سطحی انسانوں کا طریقہ رہا ہے۔ سطحی لوگ ایک سچے انسان کو بے قدر کرکے اپنے ذہن میں خوش ہوتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ساری پھیلی ہوئی خدائی عین اس وقت بھی اس سچے انسان کا اعتراف کر رہی ہوتی ہے جب کہ اپنے محدود ذہن کے مطابق وہ اس کی تحقیر و تردید کے لیے اپنا آخری لفظ استعمال کر چکے ہوں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ

۹۔ اے ایمان والو، جب تم سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو۔ اور تم نیکی اور پرہیزگاری کی سرگوشی کرو۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے پاس تم جمع کیے جاؤ گے۔

تُحْشَرُوْنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ یہ سرگوشی شیطان کی طرف سے ہے تاکہ وہ ایمان والوں کو رنج پہنچائے، اور وہ ان کو کچھ بھی رنج نہیں پہنچا سکتا مگر اللہ کے حکم سے۔ اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

خفیہ سرگوشیاں کرنا عام حالات میں ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ تاہم کبھی کارخیر کے لیے بھی خفیہ سرگوشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں اصل فیصلہ کن چیز نیت ہے۔ خفیہ سرگوشی اگر اچھی نیت سے کی جائے تو جائز ہے اور اگر وہ بری نیت سے کی جائے تو ناجائز۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِى الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ اے ایمان والو، جب تم کو کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو تم کھل کر بیٹھو، اللہ تم کو کشادگی دے گا۔ اور جب کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو تم اُٹھ جاؤ۔ تم میں سے جو لوگ ایمان والے ہیں اور جن کو علم دیا گیا ہے، اللہ ان کے درجے بلند کرے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔

مجلس کے آداب کے تحت کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو پیچھے کر کے دوسرے شخص کو آگے بٹھایا جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کی امید کے خلاف کہہ دیا جاتا ہے کہ اب آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ ایسی باتوں کو عزت کا سوال بنانا شعوری پستی کا ثبوت ہے۔ اور جو شخص ان باتوں کو عزت کا سوال نہ بنائے اس نے یہ ثبوت دیا کہ شعوری اعتبار سے وہ بلند درجہ کو پہنچا ہوا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا

۱۲۔ اے ایمان والو، جب تم رسول سے رازدارانہ بات کرو تو اپنی رازدارانہ بات سے پہلے کچھ صدقہ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ پھر اگر تم نہ پاؤ تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۱۳۔ کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تم اپنی رازدارانہ گفتگو سے پہلے صدقہ دو۔ پس اگر تم ایسا نہ کرو، اور اللہ نے تم کو معاف کر دیا، تو تم نماز

الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ
رَسُوْلَہٗ ط وَاللّٰہُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع ۲

قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔

اللہ تعالی کو یہ مطلوب تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف وہی لوگ ملیں جو فی الواقع سنجیدہ مقصد کے تحت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ غیر ضروری قسم کے لوگ چھانٹ دئے جائیں جو اپنی بے فائدہ باتوں سے صرف وقت ضائع کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس لیے یہ اصول مقرر کیا گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کا ارادہ کرو تو پہلے اللہ کے نام پر کچھ صدقہ کرو۔ اور اگر اس کی قدرت نہ ہو تو کوئی دوسری نیکی کرو۔

یہ حکم اگرچہ اصلاً رسول کے لیے مطلوب تھا۔ مگر رسول کے بعد بھی امت کے رہنماؤں کے حق میں وہ حالات کے اعتبار سے درجہ بدرجہ مطلوب ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ
عَلَیْہِمْ ط مَا ہُمْ مِّنْکُمْ وَ لَا مِنْہُمْ لا وَ
یَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَہُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾
اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا ط اِنَّہُمْ سَآءَ
مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَہُمْ
جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَلَہُمْ عَذَابٌ
مُّہِیْنٌ ﴿۱۶﴾

۱۴۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ کا غضب ہوا۔ وہ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے ہیں، اور وہ جھوٹی بات پر قسم کھاتے ہیں حالاں کہ وہ جانتے ہیں۔ ۱۵۔ اللہ نے ان لوگوں کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، بے شک وہ برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔ ۱۶۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، پھر وہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، پس ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

مدینہ کے منافقین اسلام کی جماعت میں شامل تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہود سے بھی ملے ہوئے تھے۔ یہی ہمیشہ ان لوگوں کا حال ہوتا ہے، جو حق کو پوری یکسوئی کے ساتھ اختیار نہ کرسکیں۔ ایسے لوگ بظاہر سب سے ملے ہوئے ہوتے ہیں مگر حقیقۃً وہ صرف اپنے مفاد کے وفادار ہوتے ہیں۔ خواہ وہ قسمیں کھا کر اپنے حق پرست ہونے کا یقین دلا رہے ہوں۔

لَنْ تُغْنِیَ عَنْہُمْ اَمْوَالُہُمْ وَلَآ اَوْلَادُہُمْ مِّنَ
اللّٰہِ شَیْئًا ط اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ط ہُمْ فِیْہَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ یَوْمَ یَبْعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا

۱۷۔ ان کے مال اور ان کی اولاد ان کو ذرا بھی اللہ سے نہ بچا سکیں گے۔ یہ لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۸۔ جس دن اللہ ان سب کو اُٹھائے گا تو وہ اس سے بھی اسی

فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ
اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾
اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ
اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ
الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي
الْاَذَلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ
رُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۱﴾

طرح قسم کھائیں گے جس طرح تم سے قسم کھاتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی چیز پر ہیں، سن لو کہ یہی لوگ جھوٹے ہیں۔
۱۹۔ شیطان نے ان پر قابو حاصل کرلیا ہے، پھر اس نے ان کو خدا کی یاد بھلادی ہے۔ یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ سن لو کہ شیطان کا گروہ ضرور برباد ہونے والا ہے۔
۲۰۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہی لوگ سب سے زیادہ ذلیل لوگ ہیں۔
۲۱۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔ بے شک اللہ قوت والا، زبردست ہے۔

مفاد پرست آدمی جب دعوتِ حق کی مخالفت کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو محفوظ کر رہا ہے مگر اس وقت وہ دہشت زدہ، ہو کر رہ جائے گا۔ جب آخرت میں وہ دیکھے گا کہ جن چیزوں پر اس نے بھروسہ کر رکھا تھا وہ فیصلہ کے اس وقت میں اس کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

منافق آدمی اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتا ہے۔ حتی کہ وہ قسمیں کھا کر اپنے اخلاص کا یقین دلاتا ہے۔ یہ سب کر کے وہ سمجھتا ہے کہ ’’وہ کسی چیز پر ہے‘‘۔ اس نے اپنے حق میں کوئی واقعی بنیاد فراہم کرلی ہے۔ مگر قیامت کا دھما کہ جب حقیقتوں کو کھولے گا اس وقت وہ جان لے گا کہ یہ محض شیطان کے سکھائے ہوئے جھوٹے الفاظ تھے جن کو وہ اپنے بے قصور ہونے کا یقینی ثبوت سمجھتا رہا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْۤا
اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ
عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ
الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

۲۲۔ تم ایسی قوم نہیں پاسکتے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان والے کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے۔ اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے۔ اور وہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا

فِيهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ۭ
أُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع ۳

جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں، اور اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی حزبُ اللہ کے لیے ہے۔ حزب اللہ (اللہ کی جماعت) کون لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان سب سے بڑی حقیقت کے طور پر راسخ ہو گیا ہو۔ جن کو اللہ سے اتنی گہری نسبت حاصل ہو کہ ان کو اللہ کی طرف سے روحانی فیض پہنچنے لگے۔ پھر یہ کہ خدائی حقیقتوں سے ان کی وابستگی اتنی گہری ہو کہ اسی کی بنیاد پر ان کی دوستیاں اور دشمنیاں قائم ہوں۔ وہ سب سے زیادہ ان لوگوں سے قریب ہوں جو خدائی صداقت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اور جو لوگ خدائی صداقت سے دور ہیں وہ بھی ان سے دور ہو جائیں، خواہ وہ ان کے اپنے عزیز اور رشتہ دار کیوں نہ ہوں۔

۵۹۔ سُوْرَۃُ الْحَشْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ
وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ
دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؔ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ
يَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ
حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ
حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ
الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ
وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي
الْاَبْصَارِ ﴿۲﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں سب چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۲۔ وہی ہے جس نے اہل کتاب منکروں کو ان کے گھروں سے پہلی ہی بار اکٹھا کر کے نکال دیا۔ تمھارا گمان نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور وہ خیال کرتے تھے کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچا لیں گے، پھر اللہ ان پر وہاں سے پہنچا جہاں سے ان کو خیال بھی نہ تھا۔ اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اُجاڑ رہے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی۔ پس اے آنکھ والو، عبرت حاصل کرو۔

مدینہ کے مشرق میں یہودی قبیلہ بنو نضیر کی آبادی تھی۔ ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

درمیان صلح کا معاہدہ تھا۔ مگر انہوں نے بار بار عہد شکنی کی۔ آخر کار 4ھ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کیے کہ مسلمانوں نے ان کو مدینہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد وہ خیبر اور شام کے علاقے میں جا کر آباد ہو گئے۔ مگر ان کی سازشی سرگرمیاں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق کی خلافت کے زمانہ میں وہ اور دوسرے یہودی قبائل جزیرۂ عرب سے نکلنے پر مجبور کر دیے گئے۔ اس کے بعد وہ لوگ شام میں جا کر آباد ہوئے۔

''اللہ ان پر وہاں سے پہنچا جہاں ان کو گمان بھی نہ تھا'' کی تشریح اگلے فقرہ میں موجود ہے۔ یعنی اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ انہوں نے بیرونی طور پر ہر قسم کی تیاریاں کیں۔ مگر جب مسلمانوں کی فوج نے ان کی آبادی کو گھیر لیا تو ساری طاقت کے باوجود ان پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ انہوں نے لڑنے کا حوصلہ کھو دیا۔ اور بلا مقابلہ ہتھیار ڈال دیا۔

وَ لَوْ لَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ؕ وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ④ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ⑤

۳۔ اور اگر اللہ نے ان پر جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو وہ دنیا ہی میں ان کو عذاب دیتا، اور آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔ ۴۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔ اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ سخت عذاب والا ہے۔ ۵۔ کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا تو یہ اللہ کے حکم سے، اور تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔

یہود کو جو سزا دی گئی، وہ اللہ کے قانون کے تحت تھی۔ یہ سزا ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو پیغمبر کے مخالف بن کر کھڑے ہوں۔ بنونضیر کے محاصرہ کے وقت ان کے باغات کے کچھ درخت جنگی مصلحت کے تحت کاٹے گئے تھے۔ یہ بھی براہِ راست خدا کے حکم سے ہوا۔ تاہم یہ کوئی عام اصول نہیں۔ یہ ایک استثنائی معاملہ ہے جو پیغمبر کے براہِ راست مخاطبین کے ساتھ ایک یا دوسری شکل میں اختیار کیا جاتا ہے۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

۶۔ اور اللہ نے ان سے جو کچھ اپنے رسول کی طرف لوٹایا تو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ اور لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر

قَدِيْرٌ ⑥ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ لِذِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑦ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ ⑧

ہے۔ ۷۔ جو کچھ اللہ اپنے رسول کو بستیوں والوں کی طرف سے لوٹائے تو وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، تا کہ وہ تمھارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اور رسول تم کو جو کچھ دے اس کو تم لے لو اور وہ جس چیز سے تم کو روکے اس سے تم رُک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔
۸۔ ان مفلس مہاجروں کے لیے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے ہیں۔ وہ اللہ کا فضل اور رضامندی چاہتے ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔

دشمن کا جو مال لڑائی کے بعد ملے وہ غنیمت ہے اور جو مال لڑائی کے بغیر ہاتھ لگے وہ فئی ہے۔ غنیمت میں پانچواں حصہ نکالنے کے بعد بقیہ سب لشکر کا حصہ ہے۔ اور فئی سب کا سب اسلامی حکومت کی ملکیت ہے جو مصالح عامہ کے لیے خرچ کیا جائے گا۔

اسلام چاہتا ہے کہ مال کسی ایک طبقہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ وہ ہر طبقہ کے درمیان پہنچے۔ اسلام میں معاشی جبر نہیں ہے۔ تاہم اس کے معاشی قوانین اس طرح بنائے گئے ہیں کہ دولت سمٹ کر چند لوگوں میں محدود نہ ہو جائے، بلکہ وہ ہر سوسائٹی کے تمام لوگوں میں گردش کرتی رہے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِىْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ ۠ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ ⑨ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا

۹۔ اور جو لوگ پہلے سے مدینہ میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں، جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۰﴾ ع

۱۰۔اور جو ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کینہ نہ رکھ، اے ہمارے رب،تو بڑا شفیق اور بڑا مہربان ہے۔

ہجرت کے بعد جو مسلمان اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ پہنچے، ان کا مدینہ آنا مدینہ کے باشندوں (انصار) پر ایک بوجھ تھا۔مگر انہوں نے نہایت خوش دلی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب اموال آئے تو آپ نے ان کا حصہ مہاجرین کے درمیان تقسیم کیا۔اس پر بھی انصارِ مدینہ کے اندر ان کے لیے کوئی رنجش پیدا نہیں ہوئی۔اس کے بعد بھی وہ ان کے اتنے قدرداں رہے کہ ان کے حق میں ان کے دل سے بہترین دعائیں نکلتی رہیں۔یہی وہ عالی حوصلگی ہے جو کسی گروہ کو تاریخ ساز گروہ بناتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ نَافَقُوْا یَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَ لَا نُطِیْعُ فِیْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّ اِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَیُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲﴾

۱۱۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو نفاق میں مبتلا ہیں۔وہ اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا ہے، اگر تم نکالے گئے تو ہم بھی تمھارے ساتھ نکل جائیں گے۔اور تمھارے معاملہ میں ہم کسی کی بات نہ مانیں گے۔اور اگر تم سے لڑائی ہوئی تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ۱۲۔اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔اور اگر ان سے لڑائی ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔اور اگر ان کی مدد کریں گے تو ضرور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، پھر وہ کہیں مدد نہ پائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنونضیر کی جلاوطنی کا اعلان کیا تو منافقین ان کی حمایت پر آ گئے۔انہوں نے بنونضیر سے کہا کہ تم اپنی جگہ جمے رہو، ہم ہر طرح تمہاری مدد کریں گے۔مگر منافقین کی یہ باتیں محض ان کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے کے لیے تھیں۔وہ اس پیشکش میں ہرگز مخلص نہ تھے۔چنانچہ جب مسلمانوں نے بنونضیر کو گھیر لیا تو منافقین میں سے کوئی بھی ان کی مدد پر نہ آیا—مفاد پرست گروہ کا ہر زمانہ میں یہی کردار رہا ہے۔

لَاَ اَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ
اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝۱۳ لَا
يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ
مِنْ وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ
تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۴ۚ

۱۳۔ بے شک تم لوگوں کا ڈر ان کے دلوں میں اللہ سے زیادہ ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ ۱۴۔ یہ لوگ سب مل کر تم سے کبھی نہیں لڑیں گے، مگر حفاظت والی بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ میں۔ ان کی لڑائی آپس میں سخت ہے۔ تم ان کو متحد خیال کرتے ہو اور ان کے دل جدا جدا ہو رہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔

خدا کی طاقت بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔ مگر انسانوں کی طاقت کھلی آنکھ سے نظر آتی ہے۔ اس بنا پر ظاہر پرست لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے تو بے خوف رہتے ہیں مگر انسانوں میں اگر کوئی زور آور دکھائی دے تو وہ فوراً اس سے ڈرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ خدا کے بارے میں ان کی بے شعوری انہیں ان کی دنیا کے بارے میں بھی بے شعور بنا دیتی ہے۔

ایسے لوگ جن کو صرف منفی مقصد نے متحد کیا ہو وہ زیادہ دیر تک اپنا اتحاد باقی نہیں رکھ پاتے کیونکہ دیرپا اتحاد کے لیے مثبت بنیاد درکار ہے اور وہ ان کے پاس موجود ہی نہیں۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا
وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۵ۚ
كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ
فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكَ اِنِّىْٓ اَخَافُ
اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ
اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ
جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۷ۧ ع

۱۵۔ یہ ان لوگوں کی مانند ہیں جو ان سے کچھ ہی پہلے اپنے کیے کا مزہ چکھ چکے ہیں، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۱۶۔ جیسے شیطان جو انسان سے کہتا ہے کہ منکر ہو جا، پھر جب وہ منکر ہو جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تم سے بری ہوں۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہان کا رب ہے۔ ۱۷۔ پھر انجام دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور ظالموں کی سزا یہی ہے۔

مدینہ کے منافقین بنو نضیر کو مسلمانوں کے خلاف ابھار رہے تھے۔ انہوں نے اس واقعہ سے سبق نہیں لیا کہ جلد ہی پہلے قریش اور قبیلہ بنو قینقاع ان کے خلاف اٹھے۔ مگر ان کو زبردست شکست ہوئی۔ جو لوگ شیطان

کو اپنا مشیر بنائیں ان کا حال ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ وہ واقعات سے نصیحت نہیں لیتے۔ پہلے وہ جوش وخروش کے ساتھ لوگوں کو مجرمانہ افعال پر ابھارتے ہیں۔ پھر جب اس کا بھیانک انجام سامنے آتا ہے تو وہ طرح طرح کے الفاظ بول کر یہ چاہتے ہیں کہ اس کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بری کرلیں۔ مگر اس قسم کی کوششیں ایسے لوگوں کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والی ثابت نہیں ہوسکتیں۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ
مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۱۸ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ
فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۱۹
لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۲۰

۱۸۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا بھیجا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ باخبر ہے اس سے جو تم کرتے ہو۔ ۱۹۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے ان کو خود ان کی جانوں سے غافل کردیا، یہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۲۰۔ دوزخ والے اور جنت والے برابر نہیں ہوسکتے۔ جنت والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔

انسانی زندگی کو "آج" اور "کل" کے درمیان تقسیم کیا گیا ہے۔ موجودہ دنیا انسان کا آج ہے اور آخرت کی دنیا اس کا کل ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں جو کچھ کرے گا اس کا لازمی انجام اس کو آنے والی طویل تر زندگی میں بھگتنا پڑے گا۔

یہی اصل حقیقت ہے اور اسی حقیقت کا دوسرا نام اسلام ہے۔ انسان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اس حقیقتِ واقعی کو ہمیشہ ذہن میں رکھے۔ جو شخص اس حقیقت واقعی سے غافل ہوجائے اس کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ جائے گی۔ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کا کوئی فرق نہیں۔ مسلمانوں کو اس کا فائدہ اسی وقت ملے گا جب کہ واقعۃً وہ اس پر قائم ہوں۔ مسلمان اگر غفلت میں پڑ جائیں تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو اس سے پہلے غفلت میں پڑنے والے یہود کا ہوا۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ
خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ
وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَفَكَّرُوْنَ ۲۱ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ

۲۱۔ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا، اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں۔ ۲۲۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا، وہ بڑا مہربان ہے، نہایت رحم والا ہے ۲۳۔ وہی اللہ

الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ
الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا
يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ
الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا
فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿٢٤﴾

ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ سب عیبوں سے پاک، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زور آور، عظمت والا۔ اللہ اس شرک سے پاک ہے جو لوگ کر رہے ہیں۔
۲۴۔ وہی اللہ ہے پیدا کرنے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا، اسی کے لیے ہیں سارے اچھے نام۔ ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے، اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

قرآن اس عظیم حقیقت کا اعلان ہے کہ انسان آزاد نہیں ہے بلکہ اس کو اپنے تمام اعمال کی جواب دہی اللہ کے سامنے کرنی ہے، جو انتہائی طاقت ور ہے۔ اور ہر ایک کے اعمال کو بذات خود پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ یہ خبر اتنی سنگین ہے کہ پہاڑ تک کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر انسان اتنا غافل اور بے حس ہے کہ وہ اس ہولناک خبر کو سن کر بھی نہیں تڑپتا۔

اللہ کے اسماء جو یہاں بیان کیے گئے ہیں وہ ایک طرف اللہ کی ذات کا تعارف ہیں۔ دوسری طرف وہ بتاتے ہیں کہ وہ ہستی کیسی عظیم ہستی ہے جو انسانوں کی خالق ہے اور ان کے اوپر ان کی نگرانی کر رہی ہے۔ اگر آدمی کو واقعتاً اس کا احساس ہو جائے تو وہ اللہ کی حمد و تسبیح میں سراپا غرق ہو جائے گا۔

کائنات اپنی تخلیقی معنویت کی صورت میں خدا کی صفات کا آئینہ ہے۔ وہ خود حمد و تسبیح میں مصروف ہو کر انسان کو بھی حمد و تسبیح کا سبق دیتی ہے۔

۶۰۔ سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ
عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ
كَفَرُوْا بِمَا جَاۗءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ
الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ
اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَاۗءَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اے ایمان والو، تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہو حالاں کہ انھوں نے اس حق کا انکار کیا جو تمھارے پاس آیا، وہ رسول کو اور تم کو اس بنا پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان لائے — اگر تم میری راہ میں جہاد اور میری رضا

مَرْضَاتِيْ ۗ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۗ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ① اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْۗءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۭ ② لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ③

مندی کی طلب کے لیے نکلے ہو۔ تم چھپا کر انھیں دوستی کا پیغام بھیجتے ہو۔ اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔ ۲۔ اگر وہ تم پر قابو پا جائیں تو وہ تمھارے دشمن بن جائیں گے۔ اور وہ اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے تم کو آزار پہنچائیں گے۔ اور چاہیں گے کہ تم بھی کسی طرح منکر ہو جاؤ۔ ۳۔ تمھارے رشتہ دار اور تمھاری اولاد قیامت کے دن تمھارے کام نہ آئیں گے، وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا، اور اللہ دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ کی طرف اقدام کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ نے اس کا پورا منصوبہ نہایت خاموشی کے ساتھ بنایا تاکہ مکہ والے مقابلہ کی تیاری نہ کرسکیں۔ اس وقت ایک بدری صحابی حاطب بن ابی بلتعہ نے اس منصوبہ کو ایک خط میں لکھا اور اس کو خفیہ طور پر مکہ والوں کے نام روانہ کر دیا۔ تاکہ مکہ والے ان سے خوش ہو جائیں اور ان کے اہل وعیال کو نہ ستائیں جو مکہ میں مقیم ہیں۔ مگر وحی کے ذریعہ آپ کو اس کی اطلاع ہوگئی اور قاصد کو راستہ ہی میں پکڑ لیا گیا۔ اس قسم کا ہر فعل ایمانی تقاضے کے خلاف ہے۔

جب یہ صورت حال ہو کہ اسلام اور غیر اسلام کے الگ الگ محاذ بن جائیں تو اس وقت اہل اسلام کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ غیر اسلامی محاذ سے دل چسپی کا تعلق توڑ لیں۔ خواہ غیر اسلامی محاذ میں ان کے عزیز اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ حق کو ماننا اور حق کا انکار کرنے والوں سے قلبی تعلق رکھنا دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔

سورہ فصلت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایک شخص اگر بظاہر تمہارا دشمن ہو تب بھی تم اس کے ساتھ احسن طریق پر معاملہ کرو، عین ممکن ہے کہ وہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے (41:34)۔ اسی طرح سورہ الممتحنہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جن لوگوں نے تم سے قتال نہیں کیا ان سے تم کو بھلائی کا معاملہ کرنا چاہیے۔ مگر اللہ اس سے روکتا ہے کہ تم ان لوگوں سے بھلائی کے ساتھ معاملہ کرو جو تمہارے ساتھ قتال کر رہے ہیں (60:8)۔

ان دونوں آیتوں کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ قرآن عدو (enemy) اور مُقاتل (combatant) کے درمیان فرق کرتا ہے۔ قرآن کا حکم یہ ہے کہ بظاہر اگر کوئی شخص یا گروہ تمہارا دشمن ہو تب بھی تم کو اس کے ساتھ اچھا تعلق قائم رکھنا چاہیے تاکہ دعوت کا عمل معتدل انداز میں جاری رہے۔ ظاہری دشمنی کو میل جول (interaction) میں رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے کیوں کہ میل جول سے دعوت کا عمل جاری رہتا ہے اور دعوت

کا عمل دشمن کو بھی دوست بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ البتہ مُحارب یا مُقاتل (combatant) کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یعنی وہ لوگ جو عملاً یک طرفہ طور پر اہل ایمان کے خلاف جنگ چھیڑ دیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ہنگامی اصول یا جنگی اخلاقیات کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ حتی کہ ان کے ساتھ اس وقت تک قطع تعلق بھی کیا جا سکتا ہے جب تک وہ جنگ سے باز نہ آئیں۔ اسی اصول کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔

یہ ایک بے حد اہم فرق ہے جس کو عملی زندگی میں اختیار کرنا ضروری ہے۔ اہل ایمان اگر اس فرق کو نہ سمجھیں تو وہ دشمن سے بھی مقاتل جیسا معاملہ کرنے لگیں گے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے دعوتی مصالح مجروح ہوں گے اور دعوت و تبلیغ کا مطلوب عمل رک جائے گا۔ صحیح یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ بالفعل مسلح جنگ چھیڑ دے اس کے مقابلہ میں تو سخت احتیاط کا برتاؤ کیا جائے گا۔ حتی کہ معتدل تعلق سے بھی پرہیز کیا جائے گا۔ کیوں کہ یہ اندیشہ ہے کہ اس کے ذریعہ مُحارب فریق اہل ایمان کے جنگی راز معلوم کر لے۔ مگر جہاں تک عام انسان کا تعلق ہے تو ظاہری دوستی یا ظاہری دشمنی کا لحاظ کیے بغیر ہر ایک سے یکساں انسانی تعلق قائم رکھا جائے گا۔ تا کہ اسلام کا دعوتی عمل غیر منقطع طور پر جاری رہے، وہ کسی حال میں رکنے نہ پائے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَ مَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۴﴾ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۵﴾ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ

۴۔ تمھارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں اچھا نمونہ ہے، جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم الگ ہیں تم سے اور ان چیزوں سے جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، ہم تمھارے منکر ہیں اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور بیزاری ظاہر ہو گئی، یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لاؤ۔ مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں آپ کے لیے معافی مانگوں گا، اور میں آپ کے لیے اللہ کے آگے کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے رب، ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا اور ہم تیری طرف رجوع ہوئے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ ۵۔ اے ہمارے رب، ہم کو منکروں کے لیے فتنہ نہ بنا، اور اے ہمارے رب ہم کو بخش دے، بے شک تو زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۶۔ بے شک تمھارے لیے ان کے اندر اچھا نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو۔ اور جو شخص روگردانی کرے گا تو

ع الْحَمِيْدُ ۝٦ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ
بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَ اللّٰهُ
قَدِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٧

اللہ بے نیاز ہے، تعریفوں والا ہے۔ ۷۔ امید ہے کہ اللہ تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان دوستی پیدا کردے جن سے تم نے دشمنی کی۔ اور اللہ سب کچھ کرسکتا ہے، اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابتداءً خیر خواہانہ انداز میں اپنے خاندان کو توحید کا پیغام دیا۔ جب اتمام حجت کے باوجود وہ لوگ منکر بنے رہے تو آپ ان سے بالکل جدا ہو گئے۔ مگر یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ کیوں کہ اعلان براءت کا مطلب منکرینِ حق کو یہ دعوت دینا تھا کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے اہل ایمان کو ستائیں۔ دلیل کے میدان میں شکست کھانے کے بعد طاقت کے میدان میں اہل ایمان کو ذلیل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد حضرت ابراہیم نے جو دعا کی اس میں خاص طور سے فرمایا کہ — اے ہمارے رب ہم کو ان ظالموں کے ظلم کا تختۂ مشق نہ بنا۔

عزیزوں اور رشتہ داروں سے اعلان براءت عام معنوں میں اعلان عداوت نہیں ہے۔ یہ داعی کی طرف سے اپنے یقین کا آخری اظہار ہے۔ اس اعتبار سے اس میں بھی ایک دعوتی قدر شامل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص ''پیغام'' کی زبان سے متاثر نہیں ہوا تھا، ''یقین'' کی زبان اس کو جیتنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي
الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ
تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُقْسِطِيْنَ ۝٨ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ
الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ
دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰۤى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ
تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ۝٩

۸۔ اللہ تم کو ان لوگوں سے نہیں روکتا جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی۔ اور تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے بھلائی کرو اور تم ان کے ساتھ انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۹۔ اللہ بس ان لوگوں سے تم کو منع کرتا ہے جو دین کے معاملہ میں تم سے لڑے اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا۔ اور تمھارے نکالنے میں مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو، اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

جہاں تک عدل وانصاف کا تعلق ہے وہ ہر ایک سے کیا جائے گا، خواہ فریق ثانی دشمن ہو یا غیر دشمن۔ مگر دوستی کا تعلق ہر ایک سے درست نہیں۔ دوستی صرف اسی کے ساتھ جائز ہے جو اللہ کا دوست ہو یا کم از کم یہ کہ وہ اللہ کا دشمن نہ ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ
مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ
بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا
تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ
لَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ
وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ
الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ
اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ وَ اِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ
مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا
الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ
اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ
مُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱

۱۰۔ اے ایمان والو، جب تمھارے پاس مسلمان
عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کو جانچ لو۔ اللہ
ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ پس اگر تم جان
لو کہ وہ مومن ہیں تو ان کو منکروں کی طرف نہ
لوٹاؤ۔ نہ وہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ
ان عورتوں کے لیے حلال ہیں۔ اور منکر شوہروں
نے جو کچھ خرچ کیا وہ ان کو ادا کردو۔ اور تم پر کوئی
گناہ نہیں اگر تم ان سے نکاح کرلو جب کہ تم ان
کے مہران کو ادا کردو۔ اور تم منکر عورتوں کو اپنے
نکاح میں نہ روکے رہو۔ اور جو کچھ تم نے خرچ کیا
ہے اس کو مانگ لو۔ اور جو کچھ منکروں نے خرچ
کیا وہ بھی تم سے مانگ لیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے، وہ
تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے، اور اللہ جاننے
والا، حکمت والا ہے۔ ۱۱۔ اور اگر تمھاری بیویوں
کے مہر میں سے کچھ منکروں کی طرف رہ جائے،
پھر تمھاری نوبت آئے تو جن کی بیویاں گئی ہیں ان
کو ادا کردو جو کچھ انھوں نے خرچ کیا۔ اور اللہ
سے ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

یہاں صلح حدیبیہ کے بعد پیدا شدہ حالات کی روشنی میں اسلام کے بعض ان قوانین کو بتایا گیا ہے جن کا تعلق مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان پیش آنے والے عائلی مسائل سے ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ
عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا
يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا يَاْتِيْنَ
بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ
وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ

۱۲۔ اے نبی، جب تمھارے پاس مومن عورتیں
اس بات پر بیعت کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے
ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی۔ اور وہ چوری نہ
کریں گی۔ اور وہ بدکاری نہ کریں گی۔ اور وہ اپنی
اولاد کو قتل نہ کریں گے۔ اور وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں
کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی۔ اور وہ کسی
معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں گی تو تم ان

لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

سے بیعت لے لو اور ان کے لیے اللہ سے بخشش کی دعا کرو، بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

اس آیت میں وہ شرطیں بتائی گئی ہیں جن کا اقرار لے کر کسی عورت کو اسلام میں داخل کیا جاتا ہے۔ ان شرطوں میں دو شرط کی حیثیت بنیادی ہے۔ یعنی شرک نہ کرنا اور رسول کی نافرمانی نہ کرنا۔ باقی تمام مذکور اور غیر مذکور تقاضے اپنے آپ ان دو شرطوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا
يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾ ع ۲ النصف ۸

۱۳۔ اے ایمان والو، تم ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن کے اوپر اللہ کا غضب ہوا، وہ آخرت سے ناامید ہو گئے ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے منکر ناامید ہیں۔

آسمانی کتاب کو ماننے والے یہود اور اس کو نہ ماننے والے کافر آخرت کے اعتبار سے ایک سطح پر ہیں۔ کھلے ہوئے کافروں کو امید نہیں ہوتی کہ کوئی شخص دوبارہ اپنی قبر سے اٹھے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی ہوتا ہے جو یہود کی طرح ایمان لانے کے بعد غفلت اور بے حسی میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ آخرت کا لفظی اقرار کرنے کے باوجود ان کی عملی زندگی ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی کھلے ہوئے منکرین کی زندگی۔

۶۱۔ سُوْرَةُ الصَّفّ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ
هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا
عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا
كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ غالب ہے حکیم ہے۔ ۲۔ اے ایمان والو، تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ ۳۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرو نہیں۔ ۴۔ اللہ تو ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے راستہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

انسان کے سوا جو کائنات ہے اس میں کہیں تضاد نہیں۔ اس دنیا میں لکڑی ہمیشہ لکڑی رہتی ہے۔ اور جو چیز

اپنے آپ کو لوہا اور پتھر کے روپ میں ظاہر کرے وہ حقیقی تجربہ میں بھی لوہا اور پتھر ہی ثابت ہوتی ہے۔ انسان کو بھی ایسا ہی بننا چاہیے۔ انسان کے کہنے اور کرنے میں مطابقت ہونی چاہیے، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ آدمی کو اپنے کہنے کی یہ قیمت دینی پڑے کہ ہر قسم کی دشواریوں کے باوجود وہ صبر کا پہاڑ بن جائے۔

قبولِ اسلام کی صداقت کا معیار اتحادِ اسلام ہے۔ اسلام کے قائلین اگر اسلام کے لیے متحد ہو کر جدو جہد نہ کرسکیں تو ان کا قول اللہ کی نظر میں مقتِ کبیر (سخت ناپسندیدہ بات) کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی کوئی قیمت نہ دنیا میں ہے، نہ آخرت میں۔ چوں کہ اختلاف یا فرق فطرتِ انسانی کا حصہ ہے، اِس لیے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ ایسی حالت میں اختلاف (dissent) کے مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ نا کام طور پر اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ لوگوں کو اُس اصول کی تعلیم دی جائے جس کو ’اختلاف کے باوجود اتحاد‘ کہا جاتا ہے۔ یعنی رائے (opinion) کی سطح پر اختلاف کے باوجود سماجی تعلق کی سطح پر اتفاق۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝۵

۵۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، تم لوگ کیوں مجھ کو ستاتے ہو، حالاں کہ تم کو معلوم ہے کہ میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ پس جب وہ پھر گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے درمیان آئے۔ بنی اسرائیل اس وقت ایک زوال یافتہ قوم تھے۔ ان کے اندر یہ حوصلہ باقی نہیں رہا تھا کہ جو کہیں وہی کریں۔ اور جو کریں وہی کہیں۔ چنانچہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کے ہاتھ پر ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے اور اسی کے ساتھ ہر قسم کی بدعہدی اور نافرمانی میں بھی مبتلا رہتے تھے۔ حتی کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ اپنے برے سلوک کو جائز ثابت کرنے کے لیے وہ خود حضرت موسیٰ پر جھوٹے جھوٹے الزام لگاتے تھے۔ بائبل میں خروج اور گنتی کے ابواب میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

عہد کرنے کے بعد عہد کی خلاف ورزی آدمی کو پہلے سے بھی زیادہ حق سے دور کر دیتی ہے۔

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا

۶۔ اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل، میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کا جو مجھ سے پہلے سے موجود ہے، اور خوش خبری دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا۔ پھر جب وہ ان کے پاس

سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۶﴾ وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی
عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ وَ ہُوَ یُدۡعٰۤی اِلَی
الۡاِسۡلَامِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ
الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۷﴾ یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ
بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَ اللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ
الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸﴾ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ
بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی
الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۹﴾ ع

کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے کہا، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ ۷۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے حالاں کہ وہ اسلام کی طرف بلایا جارہا ہو، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ۸۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منہ سے بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ ۹۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ، تاکہ وہ اس کو سب دینوں پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات اس بات کا ثبوت تھے کہ آپ خدا کے پیغمبر ہیں۔ مگر یہود نے ان معجزات کو جادو کا کرشمہ کہہ کر ان کو نظر انداز کردیا۔ اسی طرح قدیم آسمانی کتابوں میں واضح طور پر پیغمبر آخرالزماں کی پیشگی خبر موجود تھی۔ مگر جب آپ آئے تو یہود اور نصاریٰ دونوں نے آپ کا انکار کردیا۔ انسان اتنا ظالم ہے کہ وہ کھلی کھلی حقیقتوں کا اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔

اظہار دین کی آیت قرآن میں تین مقامات پر آئی ہے: سورہ التوبہ (9:33)، سورہ الفتح (48:28)، سورہ الصّف (61:9)۔ اس سے مراد فکری غلبہ ہے، نہ کہ اسلام کے تمام قوانین کو بزور نافذ کرنا۔ کیوں کہ آیت میں اظہار کا لفظ ہے، نہ کہ نفاذ کا۔ یعنی خدا اور مذہب کے بارے میں جتنے غیر موحدانہ عقائد دنیا میں ہیں ان کو نظریاتی طور پر زیر کر کے توحید کے عقیدہ کو غالب فکر کی حیثیت دے دی جائے۔ بقیہ تمام عقائد ہمیشہ کے لیے فکری طور پر مغلوب ہو کر رہ جائیں۔ اس لیے تینوں مقامات پر آیت کے الفاظ یہ ہیں: لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ (تاکہ وہ اس کو سب دینوں پر غالب کردے)۔ یہ الفاظ نہیں ہیں: لیظہرہ علی الناس (لوگوں کے اوپر غالب کردے)۔ اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حکومتی قوانین انسانوں پر نافذ ہوتے ہیں، نہ کہ دین یا ادیان پر۔ خدا کا یہ منصوبہ تھا کہ ''مشرکین'' نے خدا اور رسول کے نام پر جو خود ساختہ مذہب بنا رکھے ہیں ان کو نظریاتی طور پر مغلوب کر کے دین اسلام کو فکری اور تاریخی حیثیت سے غالب کردیا جائے۔ قرآن میں یہ پیشین گوئی انتہائی ناموافق حالات میں 3ھ میں نازل ہوئی تھی۔ مگر بعد کو وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔ یہ کام پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ مکمل طور پر انجام پایا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ
تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ

۱۰۔ اے ایمان والو، کیا میں تم کو ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ ۱۱۔ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی

رَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ
وَ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ
تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۱۱﴾ يَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ وَ يُدۡخِلۡكُمۡ
جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ وَ مَسٰكِنَ
طَيِّبَةً فِىۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۙ﴿۱۲﴾
وَ اُخۡرٰى تُحِبُّوۡنَهَا ؕ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتۡحٌ
قَرِيۡبٌ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾

راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو، یہ
تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۱۲۔اللہ
تمھارے گناہ معاف کردے گا اور تم کو ایسے باغوں
میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں
گی۔اور عمدہ مکانوں میں جو ہمیشہ رہنے کے باغوں
میں ہوں گے، یہ ہے بڑی کامیابی۔ ۱۳۔اور ایک
اور چیز بھی جس کی تم تمنا رکھتے ہو، اللہ کی مدد اور فتح
جلدی، اور مومنوں کو بشارت دے دو۔

تجارت میں آدمی پہلے دیتا ہے، اس کے بعد اس کو واپس ملتا ہے۔ دین کی جدوجہد میں بھی آدمی کو اپنی قوت اور اپنا مال دینا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی ایک قسم کی تجارت ہے۔ البتہ دنیوی تجارت کا نفع صرف دنیا میں ملتا ہے اور دین کی تجارت کا نفع مزید اضافہ کے ساتھ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ پھر اسی ''تجارت'' سے غلبہ کی راہ بھی کھلتی ہے جو موجودہ دنیا میں کسی گروہ کو باعزت زندگی حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَ اللّٰهِ كَمَا
قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ لِلۡحَوَارِيّٖنَ مَنۡ
اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ
اَنۡصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡۢ بَنِىۡۤ
اِسۡرَآءِيۡلَ وَكَفَرَتۡ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدۡنَا الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا عَلٰى عَدُوِّهِمۡ فَاَصۡبَحُوۡا ظٰهِرِيۡنَ ﴿۱۴﴾ ع ۲ ۵ ۱۰

۱۴۔اے ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو۔ جیسا کہ
عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا، کون اللہ کے
واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم
ہیں اللہ کے مددگار، پس بنی اسرائیل میں سے کچھ
لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے انکار کیا۔ پھر
ہم نے ایمان لانے والوں کی ان دشمنوں کے
مقابلہ میں مدد کی، پس وہ غالب ہوگئے۔

یہود کی اکثریت نے اگرچہ حضرت مسیح علیہ السلام کو رد کردیا مگر ان میں سے کچھ لوگ (حواریین) ایسے تھے جنہوں نے پورے اخلاص اور وفاداری کے ساتھ آپ کا ساتھ دیا۔ اور آپ کے پیغمبرانہ مشن کو آگے بڑھایا۔ یہی چند لوگ اللہ کی نظر میں مومن قرار پائے اور بقیہ تمام یہود پچھلے پیغمبروں کو ماننے کے باوجود کافر قرار پاگئے۔

یہاں جس غلبہ کا ذکر ہے وہ مجموعی اعتبار سے مومنین مسیح کا مجموعی اعتبار سے منکرین مسیح پر غلبہ ہے۔ حضرت مسیح کے بعد رومی شہنشاہ قسطنطین دوم (337-272ء) نے نصرانیت قبول کرلی جس کی سلطنت شام و فلسطین تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد رومی رعایا بہت بڑی تعداد میں عیسائی ہوگئی۔ چنانچہ یہود ان کے محکوم ہوگئے۔ موجودہ زمانہ میں بھی یہودیوں کی حکومت اسرائیل ہر اعتبار سے عیسائیوں کے ماتحت ہے۔

۶۲ ۔ سُوۡرَةُ الۡجُمُعَة

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ
الۡمَلِكِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ۝١ هُوَ
الَّذِيۡ بَعَثَ فِي الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ
يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ
الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۗ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ
لَفِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۝٢ وَّاٰخَرِيۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا
يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝٣ ذٰلِكَ
فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۝٤

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اللہ کی تسبیح کر رہی ہے وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے — جو بادشاہ ہے، پاک ہے، زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۲۔ وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول انھیں میں سے اُٹھایا، وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ ۳۔ اور دوسروں کے لیے بھی ان میں سے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ ۴۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

انسان کی ہدایت کے لیے رسول بھیجنا خدا کی انھیں صفات کا انسانی سطح پر ظہور ہے جن صفات کا ظہور مادی اعتبار سے کائنات کی سطح پر ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور اسی طرح دوسرے پیغمبروں کا کام خاص طور پر دو رہا ہے۔ ایک، خدا کی وحی کو لوگوں تک پہنچانا، دوسرا، لوگوں کے شعور کو بیدار کرنا تاکہ وہ خدائی باتوں کو سمجھیں اور اپنی حقیقی زندگی کے ساتھ ان کو مربوط کر سکیں۔ یہی دو کام آئندہ بھی دعوت و اصلاح کی جدوجہد میں مطلوب رہیں گے، یعنی تعلیم قرآن اور ذہنی تربیت۔

مَثَلُ الَّذِيۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىةَ ثُمَّ لَمۡ
يَحۡمِلُوۡهَا كَمَثَلِ الۡحِمَارِ يَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ؕ
بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِي الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝٥
قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ هَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّكُمۡ
اَوۡلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ

۵۔ جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا پھر انھوں نے اس کو نہ اُٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہو۔ کیا ہی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ۶۔ کہو کہ اے یہودیو، اگر تمھارا گمان ہے کہ تم دوسروں کے مقابل میں اللہ کے محبوب ہو تو تم

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٦ وَ لَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ۝٧ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ
تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ
اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٨ ع

موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو۔ ۷۔ اور وہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے، ان کاموں کی وجہ سے جن کو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ۸۔ کہو کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تمھیں آکر رہے گی، پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے کے پاس لے جائے جاؤ گے، پھر وہ تم کو بتا دے گا جو تم کرتے رہے ہو۔

کسی گروہ کے لیے حاملِ کتاب ہونے کے دو درجے ہیں، ایک یہ کہ وہ ''انسان'' کی سطح پر اس کا حامل بنے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ ''حیوان'' کی سطح پر اس کا حامل بنا ہوا ہو۔ خدا کی کتاب جب کسی قوم کو دی جاتی ہے تو اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ اس کو اپنے اندر اتارے اور اس کو اپنی زندگی میں اپنائے۔ مگر جو قوم اس معنی میں کتاب آسمانی کی حامل نہ بن سکے اس کی مثال اس گدھے کی سی ہوگی جس کے اوپر علمی کتابیں لدی ہوئی ہوں اور اس کو کچھ خبر نہ ہو کہ اس کے اوپر کیا ہے۔

ایک حقیقی انسان جب کتابِ خداوندی کا حامل ہو تو اس کا پورا وجود اس کتاب کا حامل بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت شعوری طور پر ربانی پرسنالٹی میں ڈھل جاتی ہے۔ حیوان کی سطح پر حاملِ کتاب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا ''جسم'' تو کتاب الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہوتا ہے، مگر ان کی ''روح'' کتابِ الٰہی کی حامل نہیں ہوتی۔ ظاہری طور پر وہ اپنے ہاتھ میں خدا کی کتاب کو تھامے ہوئے ہوتے ہیں، مگر ان کا دل اور دماغ اس کی روشنی اور حرارت سے خالی ہوتا ہے۔

آسمانی کتاب کی حامل پچھلی قوموں نے اپنے بعد کے زمانوں میں اگرچہ عملی طور پر خدا کے دین کو چھوڑ رکھا تھا، اس کے باوجود وہ اس کو اپنے قومی فخر کا نشان بنائے ہوئے تھے۔ مگر اس قسم کا فخر کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔ ایسا فخر ہمیشہ جھوٹا فخر ہوتا ہے۔ اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آدمی جس دین کو اپنے فخر کا سامان بنائے ہوئے ہوتا ہے اس کے لیے وہ قربانی دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ تاہم جب موت آئے گی تو ایسے لوگ جان لیں گے کہ دنیا میں وہ جس فخر پر جی رہے تھے وہ آخرت میں انھیں ذلت کے سوا اور کچھ دینے والا نہیں — دینِ الٰہی کا حامل صرف وہ انسان ہے جو شعوری سطح پر دین کا حامل ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ
الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٩ فَاِذَا قُضِيَتِ

۹۔ اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۱۰۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو

الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٠﴾ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿١١﴾ ع ٢ ١٢

زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۱۱۔ اور جب وہ کوئی تجارت یا کھیل تماشہ دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اور تم کو کھڑا ہوا چھوڑ دیتے ہیں، کہو کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے، اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنے خالق اور مالک کی یاد میں مشغول ہو، مگر دنیا میں آدمی بیک وقت دو تقاضوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک، معاش کا تقاضا، اور دوسرا، دین کا تقاضا۔ ان میں سے ہر تقاضا ضروری ہے۔ البتہ ان کے درمیان اس طرح تقسیم ہونی چاہیے کہ معاشی سرگرمیاں دینی تقاضے کے ماتحت ہوں۔ آدمی کو اجازت ہے کہ وہ جائز حدود میں معاش کے لیے دوڑ دھوپ کرے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اس کو جو معاشی کامیابی حاصل ہو، اس کو وہ سراسر اللہ کا فضل سمجھے۔ نیز معاشی سرگرمی کے دوران برابر اللہ کو یاد کرتا رہے۔ اسی کے ساتھ اس کو ہمیشہ تیار رہنا چاہیے کہ جب بھی دین کے کسی تقاضے کے لیے پکارا جائے تو اس وقت وہ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر دین کے کام کی طرف دوڑ پڑے۔

انسان اس حقیقت کو بھول کر تجارت اور لہو میں مشغول رہتا ہے، اور خدا کی یاد کو چھوڑ دیتا ہے۔ آج کے انسان کی دلچسپی صرف دو ہے — مفاد یا تفریح۔ مدینہ میں ایک بار عین جمعہ کے خطبہ کے وقت کچھ لوگ اٹھ کر بازار چلے گئے۔ اس پر مذکورہ آیتیں اتریں۔ اس حکم کا تعلق اگرچہ براہ راست طور پر جمعہ سے ہے مگر بالواسطہ طور پر ہر دینی کام سے ہے۔ جب بھی کسی خاص دینی مقصد کے لیے لوگوں کو جمع کیا جائے تو امیر کی اجازت کے بغیر اُٹھ کر چلے جانا سخت محرومی کی بات ہے۔

٦٣ ۔ سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١﴾ ج اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ جب منافق تمھارے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔ ۲۔ انھوں نے اپنی قسموں

سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۝٢ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا
فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝٣

کو ڈھال بنا رکھا ہے، پھر وہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، بے شک نہایت برا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۳۔ یہ اس سبب سے ہے کہ وہ ایمان لائے پھر انھوں نے کفر کیا، پھر ان کے دلوں پر مہر کردی گئی، پس وہ نہیں سمجھتے۔

یہ کسی آدمی کے نفاق کی علامت ہے کہ وہ بڑی بڑی باتیں کرے۔ اور قسم کھا کر اپنی بات کا یقین دلائے۔ مخلص آدمی اللہ کے خوف سے دبا ہوا ہوتا ہے۔ وہ زبان سے زیادہ دل سے بولتا ہے۔ منافق آدمی صرف انسان کو اپنی آواز سنانے کا مشتاق ہوتا ہے، اور مخلص آدمی خدا کو سنانے کا۔

جب ایک شخص ایمان لاتا ہے تو وہ ایک سنجیدہ عہد کرتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کے عملی مواقع آتے ہیں، جہاں ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس عہد کے مطابق عمل کرے۔ اب جو شخص ایسے مواقع پر اپنے دل کی آواز کو سن کر عہد کے تقاضے پورے کرے گا۔ اس نے اپنے عہد ایمان کو پختہ کیا۔ اس کے برعکس، جس کا یہ حال ہو کہ اس کے دل نے آواز دی مگر اس نے دل کی آواز کو نظر انداز کر کے عہد کے خلاف عمل کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دھیرے دھیرے اپنے عہد ایمان کے معاملہ میں بے حس ہوجائے گا — یہی مطلب ہے دل پر مہر کرنے کا۔

وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ
يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ
مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ
هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ز اَنّٰى
يُؤْفَكُوْنَ ۝٤ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ
رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝٥
سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ
تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝٦

۴۔ اور جب تم انھیں دیکھو تو ان کے جسم تم کو اچھے لگتے ہیں، اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو تم ان کی بات سنتے ہو، گویا کہ وہ لکڑیاں ہیں ٹیک لگائی ہوئی۔ وہ ہر زور کی آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہی لوگ دشمن ہیں، پس ان سے بچو۔ اللہ ان کو ہلاک کرے، وہ کہاں پھرے جاتے ہیں۔ ۵۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اللہ کا رسول تمھارے لیے استغفار کرے تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں۔ اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تکبر کرتے ہوئے بے رخی کرتے ہیں۔ ۶۔ ان کے لیے یکساں ہے، تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا مغفرت کی دعا نہ کرو۔ اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا۔ اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

منافق آدمی مصلحت پرستی کے ذریعہ اپنے مفادات کو محفوظ رکھتا ہے۔ وہ حق ناحق کی بحث میں نہیں

پڑتا۔ اس لیے ہر ایک سے اس کا بناؤ رہتا ہے۔ اس کی زندگی غم سے خالی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اس کے جسم کو فربہ بنا دیتی ہیں۔ وہ لوگوں کے مزاج کی رعایت کرکے بولتا ہے۔ اس لیے اس کی باتوں میں ہر ایک اپنے لیے دل چسپی کا سامان پا لیتا ہے۔ مگر یہ بظاہر ہرے بھرے درخت حقیقۃً صرف سوکھی لکڑیاں ہوتے ہیں جن میں کوئی زندگی نہ ہو۔ وہ اندر سے بزدل ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کا دنیوی مفاد ہر دینی مفاد سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ایسے لوگ ایمان کے بلند بانگ مدعی ہونے کے باوجود خدا کی ہدایت سے یکسر محروم ہیں۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۞ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ ع ۸ ۱۲

۷۔ یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں ان پر خرچ مت کرو یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں۔ اور آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔ ۸۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا۔ حالاں کہ عزت اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے، مگر منافقین نہیں جانتے۔

قدیم مدینہ میں دو قسم کے مسلمان تھے۔ ایک مہاجر اور دوسرے انصار۔ مہاجرین مکہ سے بے وطن ہو کر آئے تھے۔ ان کا سب سے بڑا ظاہری سہارا مقامی مسلمان (انصار) تھے۔ اس بنا پر دنیا پرست لوگوں کو مہاجر بے عزت دکھائی دیتے تھے اور انصار ان کی نظر میں باعزت لوگ تھے۔ حتی کہ ایک موقع پر عبد اللہ بن ابی نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ان مہاجرین کی حقیقت کیا ہے۔ اگر ہم ان کو اپنی بستی سے نکال دیں تو دنیا میں کہیں ان کو ٹھکانا نہ ملے۔

اس قسم کے الفاظ اسی شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہو کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔ وہی جس کو چاہے دے اور وہی جس سے چاہے چھین لے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۞ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ

۹۔ اے ایمان والو، تمھارے مال اور تمھاری اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں، اور جو ایسا کرے گا تو وہی گھاٹے میں پڑنے والے لوگ ہیں۔ ۱۰۔ اور ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آجائے، پھر وہ کہے کہ اے میرے رب، تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ ۱۱۔ اور اللہ

الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱ ع

ہر گز کسی جان کو مہلت نہیں دیتا جب کہ اس کی میعاد آجائے، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

ہر آدمی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ مگر مال اور اولاد انسان کو اس سب سے بڑے مسئلے سے غافل کر دیتے ہیں۔ انسان کو جاننا چاہیے کہ مال اور اولاد مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہیں۔ وہ اس لیے کسی کو دیے جاتے ہیں کہ وہ ان کو اللہ کے کام میں لگائے۔ وہ ان کو اپنی آخرت بنانے میں استعمال کرے مگر نادان آدمی ان کو بذات خود مقصود سمجھ لیتا ہے۔ ایسے لوگ جب اپنے آخری انجام کو پہنچیں گے تو وہاں ان کے لیے حسرت وافسوس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

۶۴۔ سُوْرَۃُ التَّغَابُن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۴

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر چیز جو زمین میں ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی منکر ہے اور کوئی مومن، اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۳۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر پیدا کیا اور اس نے تمھاری صورت بنائی تو نہایت اچھی صورت بنائی، اور اسی کی طرف ہے لوٹنا۔ ۴۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اور اللہ دلوں تک کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

''کائنات اللہ کی تسبیح کر رہی ہے''، کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس حقیقت کو قرآن میں کھولا ہے، کائنات سراپا اس کی تصدیق بنی ہوئی ہے، وہ زبان حال سے حمد وستائش کی حد تک اس کی تائید کر رہی ہے۔ اس دوطرفہ اعلان کے باوجود جو لوگ مومن نہ بنیں انہیں اس کے بعد تیسرے اعلان کا انتظار کرنا چاہیے جب کہ تمام لوگ خدا کے یہاں جمع کیے جائیں گے، تاکہ خود مالک کائنات کی زبان سے اپنے بارے میں آخری فیصلہ کو سنیں۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۫ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٦﴾

۵۔ کیا تم کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنھوں نے اس سے پہلے انکار کیا، پھر انھوں نے اپنے کیے کا وبال چکھا اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ٦۔ یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ آئے، تو انھوں نے کہا کہ کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے۔ پس انھوں نے انکار کیا اور منہ پھیر لیا، اور اللہ ان سے بے پرواہ ہوگیا، اور اللہ بے نیاز ہے، تعریف والا ہے۔

قدیم زمانہ میں رسولوں کے ذریعہ جو تاریخ بنی وہ انسانوں کے لیے مستقل نمونہ عبرت ہے۔ مثلاً عاد اور ثمود اور اہل مدین اور قوم لوط وغیرہ کے درمیان پیغمبر آئے۔ ان پیغمبروں کے پاس اپنی صداقت بتانے کے لیے کوئی غیر بشری کمال نہ تھا، بلکہ صرف دلیل تھی۔ دلیل کی سطح پر انکار نے ان قوموں کو عذاب کا مستحق بنا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ دلیل کی سطح پر حق کو پہچانے۔ جو شخص دلیل کی سطح پر حق کو پہچاننے میں ناکام رہے، وہ ہمیشہ کے لیے حق سے محروم ہو کر رہ جائے گا۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٧﴾ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٨﴾ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ

۷۔ انکار کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز دوبارہ اٹھائے نہ جائیں گے۔ کہو کہ ہاں، میرے رب کی قسم، تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، پھر تم کو بتایا جائے گا جو کچھ تم نے کیا ہے، اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ ۸۔ پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے اُتارا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۹۔ جس دن وہ تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا، یہی دن ہار جیت کا دن ہوگا۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان لایا ہوگا اور اس نے نیک عمل کیا ہوگا، اللہ اس کے گناہ اس سے دور کر دے گا اور اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ اس میں رہیں

الْعَظِيْمُ ﴿٩﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٠﴾ ع ١٥

گے۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔ ۱۰۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ آگ والے ہیں، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

لوگ دنیا کو ہار جیت (تغابن) کی جگہ سمجھتے ہیں۔ کسی شخص کو یہاں کامیابی مل جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جو شخص یہاں ناکامی سے دوچار ہو وہ لوگوں کی نظر میں حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی ہار بھی بے قیمت ہے اور یہاں کی جیت بھی بے قیمت۔

ہار جیت کا اصل مقام آخرت ہے۔ ہارنے والا وہ ہے جو آخرت میں ہارے اور جیتنے والا وہ ہے جو آخرت میں جیتے، اور وہاں کی ہار جیت کا معیار بالکل مختلف ہے۔ دنیا میں ہار جیت ظاہری مادیات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اور آخرت کی ہار جیت خدائی اخلاقیات کی بنیاد پر ہوگی۔ اس وقت دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ یہاں سارا معاملہ بالکل بدل گیا ہے۔ جس پانے کو لوگ پانا سمجھ رہے تھے وہ دراصل کھونا تھا، اور جس کھونے کو لوگوں نے کھونا سمجھ رکھا تھا، وہی دراصل وہ چیز تھی جس کو پانا کہا جائے۔ اسی دن کی ہار ہار ہے اور اسی دن کی جیت جیت۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ
مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا
الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿١٢﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَ
عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٣﴾

۱۱۔ جو مصیبت بھی آتی ہے اللہ کے اذن سے آتی ہے۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو راہ دکھاتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۱۲۔ اور تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر تم اعراض کرو گے تو ہمارے رسول پر بس صاف صاف پہنچادینا ہے۔ ۱۳۔ اللہ، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

کوئی مصیبت اپنے آپ نہیں آتی، ہر مصیبت خدا کی طرف سے آتی ہے۔ اور اس لیے آتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان کو ہدایت عطا کی جائے۔ مصیبت آدمی کے دل کو نرم کرتی ہے۔ اور اس کی سوئی ہوئی نفسیات میں ہلچل پیدا کرتی ہے۔ مصیبت کے جھٹکے آدمی کے ذہن کو جگانے کا کام کرتے ہیں۔ اگر آدمی اپنے آپ کو منفی ردعمل سے بچائے تو مصیبت اس کے لیے بہترین ربانی معلم بن جائے گی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ
وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ

۱۴۔ اے ایمان والو، تمھاری بعض بیویاں اور بعض اولاد تمھارے دشمن ہیں، پس تم ان سے ہوشیار رہو، اور اگر تم معاف کردو اور درگزر کرو اور

تَعۡفُوۡا وَ تَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ
رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ
فِتۡنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۵﴾ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا وَ
اَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ
نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۶﴾ اِنۡ
تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ لَكُمۡ وَ
يَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ۙ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ
الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۸﴾ ع ۲ ۸ ۱۲

بخش دو تو اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔
۱۵۔ تمھارے مال اور تمھاری اولاد آزمائش کی چیز
ہیں، اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔
۱۶۔ پس تم اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔ اور سنو
اور مانو اور خرچ کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اور
جو شخص دل کی تنگی سے محفوظ رہا تو ایسے ہی لوگ
فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۷۔ اگر تم اللہ کو اچھا
قرض دو گے تو وہ اس کو تمھارے لیے کئی گنا
بڑھا دے گا اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ قدرداں
ہے، بُردبار ہے۔ ۱۸۔ غائب اور حاضر کو جاننے
والا ہے، زبردست ہے، حکیم ہے۔

انسان کو سب سے زیادہ تعلق اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ آدمی ہر دوسرے معاملے میں اصول کی باتیں کرتا ہے مگر جب اپنی اولاد کا معاملہ آتا ہے تو وہ بے اصول بن جاتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اولاد کسی آدمی کو بزدلی اور بخل پر مجبور کرنے والے ہیں (إِنَّ الْوَلَدَ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ) سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3666۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا، پھر کہا جائے گا کہ اس کے بیوی بچے اس کی نیکیاں کھا گئے (يُؤْتَى بِرَجُلٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُقَالُ: أَكَلَ عِيَالُهُ حَسَنَاتِهِ) تخریج احادیث الکشاف للزیلعی، حدیث نمبر 1357۔

انسان اپنے بچوں کی خاطر اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا۔ حالانکہ اگر وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو مختلف شکلوں میں اللہ اس کی طرف اس سے بہت زیادہ لوٹائے گا جتنا اس نے اللہ کی راہ میں دیا تھا۔

۶۵۔ سُوۡرَةُ الطَّلَاق

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ
لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
رَبَّكُمۡ ۚ لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا
يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اے پیغمبر، جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو ان
کی عدت پر طلاق دو اور عدت کو گنتے رہو، اور اللہ
سے ڈرو جو تمھارا رب ہے۔ ان عورتوں کو ان کے
گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، اِلّا یہ کہ وہ
کوئی کھلی ہوئی بے حیائی کریں، اور یہ اللہ کی

وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴿۱﴾ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۬ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾

حدیں ہیں، اور جو شخص اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، تم نہیں جانتے شاید اللہ اس طلاق کے بعد کوئی نئی صورت پیدا کردے۔ ۲۔ پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو ان کو یا تو معروف کے مطابق رکھ لو یا معروف کے مطابق ان کو چھوڑ دو اور اپنے میں سے دو معتبر گواہ بنا لو اور ٹھیک اللہ کے لیے گواہی دو۔ یہ اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کے لیے راہ نکالے گا۔ ۳۔ اور اس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ گیا ہو، اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس کے لیے کافی ہے، بے شک اللہ اپنا کام پورا کرکے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔

اسلام میں استثنائی طور پر طلاق کی اجازت دی گئی ہے۔ تاہم اس کا ایک طریقِ کار مقرر کیا گیا ہے جو خاص وقفہ کے درمیان پورا ہوتا ہے۔ اس طرح طلاق کے عمل کو کچھ حدود کا پابند کر دیا گیا ہے۔ ان حدود کا مقصد یہ ہے کہ فریقین کے درمیان آخر وقت تک واپسی کا موقع باقی رہے۔ اور طلاق کا واقعہ کسی قسم کے خاندانی یا سماجی فساد کا ذریعہ نہ بنے — وہی طلاق اسلامی طلاق ہے جس کے پورے عمل کے دوران خدا کے خوف کی روح جاری و ساری رہے۔

وَ الّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّ الّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴿۴﴾ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ

۴۔ اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں، اگر تم کو شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینہ ہے۔ اور اسی طرح ان کی بھی عدت جن کو حیض نہیں آیا، اور حاملہ عورتوں کی عدت اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے، اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کے لیے اس کے کام میں آسانی کر دے گا۔ ۵۔ یہ اللہ کا

اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ
سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝۵

حکم ہے جو اس نے تمھاری طرف اُتارا ہے۔ اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کے گناہ اس سے دور کردے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا۔

شریعت نے طلاق اور دوسرے معاملات میں انسان کو کچھ ضوابط کا پابند کیا ہے۔ یہ ضوابط بظاہر انسان کی آزادانہ طبیعت کے لیے رکاوٹ ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ نعمت ہیں۔ ان ضوابط کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی بہت سے غیر ضروری نقصانات سے بچ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں ہر نقصان کی تلافی کسی نہ کسی طرح کی جاتی ہے۔ تاہم یہ تلافی صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جو فطرت کے دائرہ سے باہر نہ جائے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا
تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ
اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ
حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ
اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ
تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝۶ لِيُنْفِقْ
ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ
فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا
اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝۷ ع ۱۷

۶۔ تم ان عورتوں کو اپنی وسعت کے مطابق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لیے انھیں تکلیف نہ پہنچاؤ، اور اگر وہ حمل والیاں ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ ان کا وضع حمل ہوجائے۔ پھر اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انھیں دو۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کو نیکی سکھاؤ۔ اور اگر تم آپس میں ضد کرو تو کوئی اور عورت دودھ پلائے گی۔ ۷۔ چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہیے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرے۔ اللہ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اتنا ہی جتنا اس کو دیا ہے، اللہ سختی کے بعد جلد ہی آسانی پیدا کردے گا۔

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ آدمی معاملات میں فریق ثانی کے ساتھ فراخ دلی کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ صبر کے ساتھ خلاف مزاج باتوں کو سہے۔ ناگواریوں کے باوجود دوسرے کا حق ادا کرے۔ جب آدمی ایسا کرتا ہے تو وہ صرف فریق ثانی کے لیے اچھا نہیں کرتا بلکہ خود اپنے لیے بھی اچھا کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کرتا ہے اور حقیقت پسندی کا مزاج بلاشبہ اس دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا زینہ ہے۔

عائلی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کہا گیا ہے کہ ''اللہ سختی کے بعد جلد ہی آسانی پیدا کردے گا''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں امکانات کی کوئی حد نہیں، ہر بار جب امکان ختم ہوتا ہے تو وہیں زیادہ بڑا امکان آدمی کے لیے

موجود رہتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی نقصان صرف نقصان نہیں، یہاں ہر نقصان کے ساتھ ایک فائدہ کا پہلو لگا ہوا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے، اس میں کبھی کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ جب ایک امکان کا سرا اس کے ہاتھ نکل جائے تو وہ کھوئی ہوئی چیز کا ماتم کرنے میں وقت ضائع نہ کرے، بلکہ وہ نئے امکان کو دریافت کرکے اس کا استعمال شروع کردے۔ عین ممکن ہے کہ اس تدبیر کے ذریعہ وہ پہلے سے زیادہ بڑی کامیابی اپنے لیے حاصل کرلے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا
وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ
عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝٨ فَذَاقَتْ وَبَالَ
اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝٩ اَعَدَّ
اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي
الْاَلْبَابِ ۚۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝١٠ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ
اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ
يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ
اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝١١

۸۔ اور بہت سی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور اس کے رسولوں کی، پس ہم نے ان کا سخت حساب کیا اور ہم نے ان کو ہولناک سزا دی۔ ۹۔ پس انھوں نے اپنے کیے کا وبال چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ ہوا۔ ۱۰۔ اللہ نے ان کے لیے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ پس اللہ سے ڈرو، اے عقل والو جو کہ ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمھاری طرف ایک نصیحت اُتاری ہے۔ ۱۱۔ ایک رسول جو تم کو اللہ کی کھلی ہوئی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، تاکہ ان لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا اس کو وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ نے اس کو بہت اچھی روزی دی۔

تاکہ اہل ایمان کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آئے — اس موقع پر یہ بات عائلی قانون کے بارے میں ہے۔ قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں توہمات کا غلبہ تھا۔ طرح طرح کے توہماتی عقائد نے مرد اور عورت کے تعلقات کو غیر فطری بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا۔ قرآن نے ان توہمات کو ختم کیا اور دوبارہ مرد اور عورت کے تعلقات کو فطرت کی بنیاد پر قائم کیا۔ اس انتظام کے بعد بھی جو لوگ اصلاحی راستہ کو اختیار نہ کریں، ان کے لیے خدا کی دنیا میں گھاٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔

''عقل والو اللہ سے ڈرو'' کا فقرہ بتاتا ہے کہ تقوی کا سرچشمہ عقل ہے۔ آدمی اپنے عقل وشعور کو کام میں لاکر ہی اس درجہ کو حاصل کرتا ہے جس کو شریعت میں تقوی کہا گیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ
مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ
اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ
ع ۲ ۵ ۱۸ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ع ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اللہ ہی ہے جس نے بنائے سات آسمان اور انھیں کی طرح زمین بھی۔ ان کے اندر اس کا حکم اترتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اللہ نے اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ سے مراد اگر سات زمینیں ہیں تو علم الافلاک (Astronomy) ابھی تک اس تعداد کو دریافت نہیں کر سکا ہے۔ انسانی معلومات کے مطابق، تادم تحریر، موجودہ زمین ساری کائنات میں ایک استثناء ہے۔ اس لیے یہ اللہ کو معلوم ہے کہ اس آیت کا واقعی مطلب کیا ہے۔

''تاکہ تم جانو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''— اس سے معلوم ہوتا ہے اللہ کو انسان سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ ''علم'' ہے، یعنی ذات خداوندی کا شعور۔ کائنات کا عظیم کارخانہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ انسان اس کے ذریعہ خالق کو پہچانے وہ اس کے ذریعہ خدا کی بے پایاں قدرت کی معرفت حاصل کرے۔

۶۶۔ سُوْرَۃُ التَّحْرِیْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ
تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِیْمٌ ﴿۱﴾ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ
اَیْمَانِكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ
الْحَكِیْمُ ﴿۲﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اے نبی، تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہے، اپنی بیویوں کی رضامندی چاہنے کے لیے، اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ ۲۔ اللہ نے تم لوگوں کے لیے تمھاری قسموں کا کھولنا مقرر کر دیا ہے، اور اللہ تمھارا کارساز ہے، اور وہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

بیویوں کے پیدا کردہ بعض اندرونی مسائل کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں یہ قسم کھالی کہ میں شہد نہیں کھاؤں گا۔ مگر پیغمبر کا عمل اس کی امت کے لیے نمونہ بن جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ شرعی طریقہ کے مطابق کفارہ ادا کر کے اپنی قسم کو توڑ دیں۔ اور شہد نہ کھانے کے عہد سے اپنے آپ کو آزاد کر لیں۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ آئندہ آپ کے امتی اس کو تقویٰ کا معیار سمجھ کر شہد کھانے سے پرہیز کرنے لگیں۔

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ
حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ

۳۔ اور جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے ایک بات چھپا کر کہی، تو جب اس نے اس کو بتا دیا اور اللہ نے نبی کو اس سے آگاہ کر دیا تو نبی نے کچھ بات

عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا
نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ
نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۳ اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى
اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَ اِنْ تَظٰهَرَا
عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ
الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ
ظَهِیْرٌ ۴ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ
یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ
مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىِٕحٰتٍ
ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا ۵

بتائی اور کچھ ٹال دی، پھر جب نبی نے اس کو یہ بات بتائی تو اس نے کہا کہ آپ کو کس نے اس کی خبر دی۔ نبی نے کہا کہ مجھ کو بتایا جاننے والے نے، باخبر نے۔ ۴۔ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو تمھارے دل جھک پڑے ہیں، اور اگر تم دونوں نبی کے مقابلہ میں کاروائیاں کروگی تو اس کا رفیق اللہ ہے اور جبریل اور صالح اہل ایمان اور ان کے علاوہ فرشتے اس کے مددگار ہیں۔ ۵۔ اگر نبی تم سب کو طلاق دے دے تو اس کا رب تمھارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں اس کو دیدے، مسلمہ، باایمان، فرماں بردار، توبہ کرنے والی، عبادت کرنے والی، روزہ دار، بیوہ اور کنواری۔

مذکورہ معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج نے آپ کے گھر میں جو پیچیدگی پیدا کی تھی، اس پر متنبہ کرنے کے لیے آپ کی ازواج سے الٹی میٹم کے انداز میں کلام کیا گیا۔ اس سے زندگی کے معاملات میں عورتوں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورتیں اگر صحیح معنوں میں اپنے شوہروں کی رفاقت کریں تو وہ ان کا ''نصف بہتر'' بن جاتی ہیں۔ اور اگر وہ سچی رفیق ثابت نہ ہوں تو وہ ایک بامقصد انسان کے پورے منصوبہ کو خاک میں ملاسکتی ہیں۔

سائحات کا ایک اور مطلب ہے، سفر کرنے والی عورتیں۔ سورہ التوبہ میں مومن مردوں کے لیے السائحون (9:112) کا لفظ آیا ہے، یعنی سفر کرنے والے مرد۔ اسی طرح یہاں مومن عورتوں کو سائحات کہا گیا ہے۔ اس سے مراد مجرد سفر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صاحبِ ایمان کا سفر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائحون اور سائحات سے مراد وہ مومنین اور مومنات ہیں جن کی ربانی سوچ کی بنا پر ان کی نہ صرف گھر کی زندگی بلکہ ان کا سفر بھی معرفت کا سفر بن جائے۔ سفر وحضر کے دوران جو تخلیقی مشاہدات اُن کے سامنے آئیں، وہ اُن کے مومنانہ ذہن کی بنا پر اُن کے لیے معرفتِ حق میں ڈھلتے چلے جائیں۔ وہ مخلوق میں خالق کا جلوہ دیکھیں۔ وہ فطرت کے مظاہر میں خالق کے کرشموں کا ادراک کریں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ
نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَیْهَا
مَلٰٓىِٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ

۶۔ اے ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے گھروالوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے، اس پر تندخو اور زبردست فرشتے مقرر ہیں، اللہ ان کو جو حکم دے اس میں وہ

اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ع ۱۹

اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہ وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔ ۷۔ اے لوگو جنھوں نے انکار کیا، آج عذر نہ پیش کرو، تم وہی بدلہ میں پا رہے ہو جو تم کرتے تھے۔

موجودہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو حق سمجھتا ہے۔ مگر بیوی بچوں سے بڑھا ہوا تعلق اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ حق کے طریقے کو چھوڑ دے اور وہی کرے جو اس کے بیوی بچے چاہتے ہیں۔ مگر یہ زبردست بھول ہے۔ انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ آج جن بچوں کی رعایت کرنے میں وہ اس حد تک جاتا ہے کہ حق کی رعایت کرنا بھول جاتا ہے، وہ بچے اپنی اس روش کے نتیجہ میں کل ایسے جہنمی کارندوں کے حوالے کیے جائیں گے جو مشینی انسان (Robot) کی طرح بے رحم ہوں گے اور ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں کریں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۸۔ اے ایمان والو، اللہ کے آگے سچی توبہ کرو۔ امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے گناہ معاف کردے اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جس دن اللہ نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہی ہوگی، وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب، ہمارے لیے ہماری روشنی کو کامل کردے اور ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو آزمائشی حالات میں رکھا گیا ہے۔ اس لیے انسان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس کی تلافی کے لیے توبہ، یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنا۔ توبہ کی اصل حقیقت شرمندگی ہے۔ آدمی کو اگر واقعتاً اپنی غلطی کا احساس ہو تو وہ سخت شرمندہ ہوگا اور اس کی شرمندگی اس کو مجبور کرے گی کہ وہ آئندہ ایسا فعل نہ کرے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ شرمندگی ہی توبہ ہے (اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ) مسند احمد، حدیث نمبر 3568۔ ایک صحابی نے کہا کہ سچی توبہ یہ ہے کہ آدمی رجوع کرے اور پھر اس فعل کو نہ دہرائے (يَتُوبُ ثُمَّ لَا يَعُودُ) الزھد لأبی داؤد، حدیث نمبر 134۔

توبہ وہ ہے جو سچی توبہ (توبۃ النصوح) ہو۔ محض الفاظ دہرا دینے کا نام توبہ نہیں۔ حضرت علی نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنی کسی غلطی کے بعد زبان سے توبہ توبہ کہہ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جھوٹے لوگوں کی توبہ ہے (تَوْبَةُ الْكَذَّابِينَ) التذكرة بأحوال الموتى للقرطبي، صفحہ 215۔ سچی توبہ آخرت کی روشنی ہے اور جھوٹی توبہ آخرت کا اندھیرا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝٩ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝١٠

۹۔ اے نبی، منکروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو، اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ ۱۰۔ اللہ منکروں کے لیے مثال بیان کرتا ہے نوح کی بیوی کی اور لوط کی بیوی کی، دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، پھر انھوں نے ان کے ساتھ خیانت کی تو وہ دونوں اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ کام نہ آسکے، اور دونوں کو کہہ دیا گیا کہ آگ میں داخل ہو جاؤ، داخل ہونے والوں کے ساتھ۔

''منافقین کے ساتھ جہاد کرو'' کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کا سخت احتساب کرو۔ یہ ایک دائمی حکم ہے۔ معاشرہ کے بڑوں اور ذمہ داروں کو چاہیے کہ وہ معاشرہ کے افراد پر مستقل نظر رکھیں۔ اور جب بھی کوئی مسلمان غلط روش اختیار کرے تو اس کو روکنے کی وہ ہر ممکن کوشش کریں جو ان کے امکان میں ہے۔

خدا کے یہاں آدمی کا صرف اپنا عمل کام آئے گا حتی کہ بزرگوں سے نسبت یا صالحین سے رشتہ داری بھی وہاں کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔ حضرت نوح اور حضرت لوط خدا کے پیغمبر تھے۔ مگر ان کی بیویاں دشمنانِ حق سے بھی قلبی تعلق کا رشتہ قائم کیے ہوئے تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر کی بیوی ہونے کے باوجود وہ دوزخ کی مستحق قرار پائیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝١١ۙ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝١٢ ع

۱۱۔ اور اللہ ایمان والوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے فرعون کی بیوی کی، جب کہ اس نے کہا کہ اے میرے رب، میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھ کو فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور مجھ کو ظالم قوم سے نجات دے۔ ۱۲۔ اور عمران کی بیٹی مریم، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کے کلمات کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی، اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی۔

فرعون ایک کافر اور ظالم شخص تھا۔ مگر اس کی بیوی آسیہ بنت مزاحم ایمان دار اور باعمل خاتون تھی۔ بیوی نے جب اپنے آپ کو صحیح روش پر قائم رکھا تو شوہر کی غلط روش اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔ شوہر جہنم میں داخل کیا گیا اور بیوی کو جنت کے باغوں میں جگہ ملی۔ آسیہ کی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت خدا کے پڑوس میں رہنے کا نام ہے۔

أَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا دراصل کنایہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔ بچپن سے جوانی تک وہ پوری طرح بے داغ رہیں۔ چنانچہ اللہ نے ان کو معجزاتی پیغمبر کی پیدائش کے لیے چنا۔ بعض روایات کے مطابق جبریل فرشتہ نے ان کے گریبان میں پھونک ماری، جس سے استقرار حمل ہوا اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے۔

٦٧۔ سُوْرَةُ الْمُلْك

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝
تَبٰرَكَ الَّذِىۡ بِيَدِهِ الۡمُلۡكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرُ ۝١ الَّذِىۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۝٢ الَّذِىۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوۡرٍ ۝٣ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ ۝٤

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
☆١۔ بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ٢۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔ ٣۔ جس نے بنائے سات آسمان اوپر تلے، تم رحمن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے، پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ ٤۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو، نگاہ ناکام تھک کر تمھاری طرف واپس آجائے گی۔

خدا کی اسکیم کے مطابق، تخلیقِ انسانی کا مقصد پوری تاریخ سے ایسے افراد کا انتخاب ہے، جو عمل کے اعتبار سے احسن ہونے کا ثبوت دیں۔ یہاں عمل کا لفظ اپنے جامع معنی میں ہے، یعنی عمل کی ہر قسم کے اعتبار سے احسن۔ انسان کو عمل کے کن پہلوؤں کے اعتبار سے احسن ثابت ہونا چاہیے۔ یہ بات قرآن کی دوسری آیتوں پر غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس سلسلے میں چند آیتیں یہ ہیں:

1۔ احسن باعتبار معرفت: مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ (5:83)، 2۔ احسن باعتبار کلام: وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (16:125)، 3۔ احسن باعتبار اخلاق: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (41:34)، 4۔ احسن باعتبار ہمسائگی: وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا (4:69)، 5۔ احسن باعتبار سلوک: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا (56:25)، وغیرہ۔

اس قسم کی صفات جنت میں جاکر انسان کے اندر پیدا نہیں ہوں گے، بلکہ اسی دنیا میں انسان کو اپنے اندر یہ صفات پیدا کرنا ہے۔ یعنی ان پہلوؤں کے اعتبار سے جو لوگ موجودہ دنیا کی زندگی میں احسن العمل ثابت ہوں، وہ اللہ کی نظر میں قابلِ انتخاب افراد ہیں۔ فرشتوں کے ریکارڈ کے مطابق، ایسے لوگوں کو منتخب کرکے ایک ایسی دنیا میں جمع کیا جائے گا، جو ابدی ہوگی، اور جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے (3:133)۔

جب ایک شخص موجودہ دنیا کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو یہاں ایک تضاد نظر آتا ہے۔ انسان کے سوا جو بقیہ کائنات ہے وہ انتہائی حد تک منظم اور کامل ہے۔ اس میں کہیں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس، انسانی زندگی میں ظلم و فساد نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ انسان کی علیحدہ نوعیت ہے۔ انسان اس دنیا میں حالت امتحان میں ہے۔ امتحان لازمی طور پر عمل کی آزادی چاہتا ہے۔ اسی عمل کی آزادی نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ دنیا میں ظلم و فساد کر سکے۔

انسانی دنیا کا ظلم انسانی آزادی کی قیمت ہے۔ اگر یہ حالات نہ ہوں تو ان قیمتی انسانوں کا انتخاب کیسے کیا جائے گا جنھوں نے ظلم کے مواقع پاتے ہوئے ظلم نہیں کیا۔ جنھوں نے سرکشی کی طاقت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو سرکشی سے بچایا۔

وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝٥ وَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝٦ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّ هِيَ تَفُوْرُ ۝٧ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝٨ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ۬ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۖۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝٩ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝١٠ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝١١

۵۔ اور ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں سے سجایا ہے۔ اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور ہم نے ان کے لیے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۶۔ اور جن لوگوں نے اپنے رب کا انکار کیا، ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ ۷۔ جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے، وہ اس کا دھاڑنا سنیں گے۔ اور وہ جوش مارتی ہوگی، ۸۔ معلوم ہوگا کہ وہ غصہ میں پھٹ پڑے گی۔ جب اس میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا، اس کے داروغہ اس سے پوچھیں گے، کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ ۹۔ وہ کہیں گے کہ ہاں، ہمارے پاس ڈرانے والا آیا۔ پھر ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور ہم نے کہا کہ اللہ نے کوئی چیز نہیں اُتاری، تم لوگ بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ ۱۰۔ اور وہ کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم دوزخ والوں میں سے نہ ہوتے۔ ۱۱۔ پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، پس لعنت ہو دوزخ والوں پر۔

قرآن میں جگہ جگہ جہنم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ جہنم اگرچہ آج انسان کے لیے ناقابل مشاہدہ ہے۔ مگر وہ کائنات کی معنویت میں بالواسطہ طور پر نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت میں برے لوگوں کی پکڑ نہ ہونے والی ہو تو موجودہ کائنات کی ساری معنویت ناقابل توجیہ ہو کر رہ جائے گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۲﴾ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ
اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾
اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾ ع ۱۴

۱۲۔ جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ ۱۳۔ اور تم اپنی بات چھپا کر کہو یا پکار کر کہو، وہ دلوں تک کی باتوں کو جانتا ہے ۱۴۔ کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے، اور وہ باریک بیں ہے، خبر رکھنے والا ہے۔

آخرت کے عذاب کا موجودہ دنیا میں ناقابلِ مشاہدہ ہونا عین خدائی منصوبہ کے مطابق ہے۔ خدا کو ان انسانوں کا انتخاب کرنا ہے جو بن دیکھے اس کی عظمت کو مانیں، جو بن دیکھے اس کے فرمان بردار بن جائیں۔ اور ایسے لوگوں کا اندازہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ لوگوں کے اخروی انجام کو ان کی نگاہوں سے اوجھل رکھا جائے، تاکہ آدمی جو کچھ کرے اپنے آزادارادہ کے تحت کرے، نہ کہ مجبورانہ حکم کے تحت۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ
مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾
ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ
الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي
السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ؕ
فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾

۱۵۔ وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے پست کر دیا تو تم اس کے راستوں میں چلو اور اس کے رزق میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف ہے اُٹھنا۔ ۱۶۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے، پھر وہ لرزنے لگے۔ ۱۷۔ کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو گئے کہ وہ تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے، پھر تم جان لو کہ کیسا ہے میرا ڈرانا۔ ۱۸۔ اور انھوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے۔ تو کیسا ہوا میرا انکار۔

زمین پر ہر چیز نہایت توازن کی حالت میں ہے۔ اسی توازن نے زمین کو انسان کے لیے قابلِ رہائش بنا رکھا ہے۔ اس توازن میں اگر معمولی سا بھی فرق پڑ جائے تو انسان کی زندگی برباد ہو کر رہ جائے۔ جو متوازن دنیا ہمیں حاصل ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا، اور توازن ٹوٹنے کی صورت میں جو تباہ کن حالات پیدا ہو سکتے ہیں اس کے لیے اللہ سے پناہ مانگنا، یہی وہ چیز ہے جو انسان سے اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ
يَقْبِضْنَ ؔۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ
بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ
جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ

۱۹۔ کیا وہ پرندوں کو اپنے اوپر نہیں دیکھتے پر پھیلائے ہوئے اور وہ ان کو سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو ان کو تھامے ہوئے ہو۔ بے شک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۰۔ آخر کون ہے کہ وہ تمھارا لشکر بن کر رحمٰن کے

الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۚ﴿۲۰﴾ اَمَّنْ هٰذَا
الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ
لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾

مقابلہ میں تمھاری مدد کر سکے۔ انکار کرنے والے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ۲۱۔ آخر کون ہے جو تم کو روزی دے اگر اللہ اپنی روزی روک لے، بلکہ وہ سرکشی پر اور بدکنے پر اڑ گئے ہیں۔

پرندوں کا فضا میں اڑنا، رزق کا زمین سے نکلنا اور اس طرح کے دوسرے واقعات انتہائی حیرت انگیز ہیں۔ حضرت ابوذر غفاری کہتے ہیں کہ کوئی چڑیا بھی اگر فضا میں اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ہم کو ایک علم کی یاد دلاتے تھے (وَمَا يَتَقَلَّبُ طَائِرٌ جَنَاحَيْهِ فِي السَّمَاءِ، إِلَّا ذَكَّرَنَا مِنْهُ عِلْمًا) الزہد لوکیع بن الجراح، حدیث نمبر 522۔ بلاشبہ چڑیا کا فضا میں اڑنا قدرت الٰہی کی ایک عظیم نشانی ہے۔ قدیم زمانہ میں قدرت الٰہی کی اس نشانی (sign) کو صرف پراسرار عقیدہ کے طور پر مانا جاتا تھا، مگر آج اس کو ایک سائنسی حقیقت کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اب سائنسی دور میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج جب ایک ہوائی جہاز فضا میں اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا ہے تو اس کے لیے ہوائی جہاز سے باہر ایک بہت بڑا انفراسٹرکچر درکار ہوتا ہے۔ ٹیک آف (take off) کے مقام پر بھی، اور لینڈنگ (landing) کے مقام پر بھی۔ اِس انفراسٹرکچر کے بغیر کوئی جہاز ایک مقام سے دوسرے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح چڑیا کو فضا میں اڑنے کے لیے ایک خارجی انفراسٹرکچر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بلاشبہ اللہ رب العالمین کا قائم کیا ہوا کائناتی انفراسٹرکچر ہے۔ اس کے بغیر چڑیوں کے لیے ایک جگہ سے اڑنا اور فضا میں تیر کر دوسری جگہ اترنا ممکن نہیں۔ آدمی ان واقعات پر غور کرے تو وہ خدائی احساس میں گم ہو جائے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں خدا سے سرکشی کرتا ہے جہاں اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی چیزیں اس کو صرف خدا کی اطاعت کا سبق دے رہی ہیں۔

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ
يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾ قُلْ
هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ
الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا
تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي
الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

۲۲۔ کیا جو شخص اوندھے منہ چل رہا ہے وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ شخص جو سیدھا ایک صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے۔ ۲۳۔ کہو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمھارے لیے کان اور آنکھ اور دل بنائے۔ تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ۲۴۔ کہو کہ وہی ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلایا اور تم اسی کی طرف اکٹھا کیے جاؤ گے۔

انسان کو سننے اور دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اب کوئی انسان وہ ہے کہ جو کچھ سنا اسی پر چل پڑا، جو دیکھا اس کو بس اس کے ظاہر کے اعتبار سے مان لیا۔ جو بات ایک بار ذہن میں آ گئی اسی پر جم گیا۔ یہ انسان وہ ہے جو جانور کی طرح سر جھکائے ہوئے بس ایک ڈگر پر چلا جا رہا ہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو سنی ہوئی بات کی تحقیق کرے۔ جو دیکھی ہوئی بات کو مزید زیادہ صحت کے ساتھ

جاننے کی کوشش کرے۔ جو اپنے ذاتی خول سے باہر نکل کر سچائی کو دریافت کرے۔ یہ دوسرا انسان وہ ہے جو سیدھا ہو کر ایک ہموار راستہ پر چلا جا رہا ہے — سمع و بصر و فواد کی صلاحیت آدمی کو اس لیے دی گئی ہے کہ وہ حق کو پہچانے، نہ یہ کہ وہ اندھے بہرے کی طرح اس سے بے خبر رہے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَ
اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً
سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا
الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ
اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ
يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾ قُلْ هُوَ
الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ
فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾ قُلْ
اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ
يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾ ع

۲۵۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۲۶۔ کہو کہ یہ علم اللہ کے پاس ہے اور میں صرف کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۲۷۔ پس جب وہ اس کو قریب آتا ہوا دیکھیں گے تو ان کے چہرے بگڑ جائیں گے جنھوں نے انکار کیا، اور کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کو تم مانگا کرتے تھے۔ ۲۸۔ کہو کہ اگر اللہ مجھ کو ہلاک کر دے اور ان لوگوں کو جو میرے ساتھ ہیں، یا ہم پر رحم فرمائے تو منکروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا۔ ۲۹۔ کہو، وہ رحمن ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر ہم نے بھروسہ کیا۔ پس عنقریب تم جان لوگے کہ کھلی ہوئی گمراہی میں کون ہے۔ ۳۰۔ کہو کہ بتاؤ، اگر تمھارا پانی نیچے اتر جائے تو کون ہے جو تمھارے لیے صاف پانی لے آئے۔

مخاطب جب دلیل سے نہ مانے تو داعی یقین کا کلمہ بول کر اس کے اندرون کو جھنجھوڑتا ہے۔ یہ آیتیں گویا اسی قسم کے یقین کے کلمات ہیں۔ آدمی کے اندر اگر کچھ بھی احساس زندہ ہو تو یہ آخری کلمات اس کو تڑپا دیتے ہیں۔ مگر جس شخص کا احساس بالکل بجھ چکا ہو وہ کسی تدبیر سے بھی نہیں جاگتا۔ وہ ''پانی'' کی قیمت کو صرف اس وقت تسلیم کرتا ہے جب کہ اس کو پانی سے محروم کر کے صحرا میں ڈال دیا گیا ہو۔

۶۸۔ سُوْرَةُ الْقَلَم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿۱﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ
رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾ وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ نٓ، قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لوگ لکھتے ہیں۔ ۲۔ تم اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں

مَمْنُوْنٍ ۝۳ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴ فَسَتُبْصِرُ وَ يُبْصِرُوْنَ ۝۵ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝۶ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۷

ہو۔۳۔اور بے شک تمھارے لیے اجر ہے کبھی ختم نہ ہونے والا۔۴۔اور بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو۔۵۔پس عنقریب تم دیکھو گے اور وہ بھی دیکھیں گے۔۶۔کہ تم میں سے کس کو جنون تھا۔۷۔تمھارا رب ہی خوب جانتا ہے، جو اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے، اور وہ راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ سے مراد تاریخی ریکارڈ ہے۔تاریخ کی شکل میں انسانی یادداشت کا جو ریکارڈ جمع ہوا ہے اس میں قرآن ایک استثنائی کتاب ہے۔اور صاحب قرآن ایک استثنائی شخصیت۔اس استثناء کی اس کے سوا اور کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ قرآن کو خدا کی کتاب مانا جائے۔اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا پیغمبر۔

اعلیٰ اخلاق سے مراد برتر اخلاق کا طریقہ ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔اس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی، بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے، خواہ دوسرے اس کے ساتھ بُرائی ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق یہی دوسرا اخلاق تھا۔اِسی روش کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ: تم لوگ امعہ نہ بنو (لَا تَكُوْنُوا إِمَّعَةً) یعنی یہ طرزِ عمل کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔اور اگر وہ ہمارے ساتھ ظلم کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ظلم کریں گے۔بلکہ تم اپنے آپ کو اس کے لیے آمادہ کرو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ برا سلوک کریں تب بھی ہم ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2007)۔اس قسم کا اخلاق ثابت کرتا ہے کہ آپ ایک بااصول انسان تھے۔آپ کی شخصیت حالات کی پیداوار نہ تھی۔بلکہ خود اپنے اعلیٰ اصولوں کی پیداوار تھی۔آپ کا یہ اعلیٰ اخلاق آپ کے اس دعوے کے عین مطابق ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹ وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝۱۱ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝۱۳ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝۱۴ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۵

۸۔پس تم ان جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مانو۔۹۔وہ چاہتے ہیں کہ تم نرم پڑ جاؤ تو وہ بھی نرم پڑ جائیں۔۱۰۔اور تم ایسے شخص کا کہنا نہ مانو جو بہت قسمیں کھانے والا ہو۔۱۱۔بے وقعت ہو، طعنہ دینے والا ہو، چغلی لگاتا پھرتا ہو۔۱۲۔نیک کام سے روکنے والا ہو، حد سے گزر جانے والا ہو، حق مارنے والا ہو۔۱۳۔سنگ دل ہو، مزید برآں بے نسب ہو۔۱۴۔اس سبب سے کہ وہ مال و اولاد والا ہے۔۱۵۔جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں

سَنَسِمُہٗ عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ ﴿۱۶﴾

تو وہ کہتا ہے کہ یہ اگلوں کی بے سند باتیں ہیں۔
۱۶۔عنقریب ہم اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

''جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مانو'' کا مطلب یہ ہے کہ جھٹلانے والے اس قابل نہیں کہ ان کا کہنا مانا جائے۔ایک طرف حق کا علم بردار ہے جو دلیل پر کھڑا ہوا ہے جس کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں۔دوسری طرف اس کے مخالفین ہیں جن کے پاس جھوٹی باتوں اور پست کردار کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔داعی حق کا اعتماد صداقت پر ہے اور اس کے مخالفین کا اعتماد اپنی مادی حیثیت پر۔حق کا داعی اصول کا پابند ہے۔اس کے برعکس، اس کے مخالفین کے سامنے کوئی اصول نہیں۔وہ کبھی ایک بات کہتے ہیں اور کبھی دوسری بات۔اگر کسی شخص کے اندر عقل ہو تو یہی فرق یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ کون شخص حق پر ہے اور کون شخص ناحق پر۔

اِنَّا بَلَوۡنٰہُمۡ کَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَیَصۡرِمُنَّہَا مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۱۷﴾ۙ وَ لَا یَسۡتَثۡنُوۡنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَیۡہَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّکَ وَ ہُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصۡبَحَتۡ کَالصَّرِیۡمِ ﴿۲۰﴾ۙ فَتَنَادَوۡا مُصۡبِحِیۡنَ ﴿۲۱﴾ۙ اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰی حَرۡثِکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰرِمِیۡنَ ﴿۲۲﴾ فَانۡطَلَقُوۡا وَ ہُمۡ یَتَخَافَتُوۡنَ ﴿۲۳﴾ۙ اَنۡ لَّا یَدۡخُلَنَّہَا الۡیَوۡمَ عَلَیۡکُمۡ مِّسۡکِیۡنٌ ﴿۲۴﴾ۙ وَّ غَدَوۡا عَلٰی حَرۡدٍ قٰدِرِیۡنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوۡہَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ﴿۲۶﴾ۙ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوۡسَطُہُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ لَوۡ لَا تُسَبِّحُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقۡبَلَ بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَلَاوَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَاۤ اِنَّا کُنَّا طٰغِیۡنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰی رَبُّنَاۤ اَنۡ یُّبۡدِلَنَا خَیۡرًا مِّنۡہَاۤ

۱۷۔ ہم نے ان کو آزمائش میں ڈالا ہے، جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ جب کہ انھوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح سویرے ضرور اس کا پھل توڑیں گے۔ ۱۸۔اور انھوں نے ان شاء اللہ نہیں کہا۔ ۱۹۔پس اس باغ پر تیرے رب کی طرف سے ایک پھرنے والا پھر گیا اور وہ سو رہے تھے۔ ۲۰۔ پھر صبح کو وہ ایسا رہ گیا جیسے کٹی ہوئی فصل۔ ۲۱۔پس صبح کو انھوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔ ۲۲۔ کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو اگر تم کو پھل توڑنا ہے۔ ۲۳۔ پھر وہ چل پڑے اور وہ آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔ ۲۴۔ کہ آج کوئی محتاج تمھارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ ۲۵۔ اور وہ اپنے کو نہ دینے پر قادر سمجھ کر چلے۔ ۲۶۔ پھر جب باغ کو دیکھا تو کہا کہ ہم راستہ بھول گئے۔ ۲۷۔ بلکہ ہم محروم ہو گئے۔ ۲۸۔ان میں جو بہتر آدمی تھا اس نے کہا، میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ ۲۹۔انھوں نے کہا کہ ہمارا رب پاک ہے۔ بے شک ہم ظالم تھے۔ ۳۰۔ پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو الزام دینے لگے۔ ۳۱۔انھوں نے کہا،

اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿٣٢﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾ ع

افسوس ہے ہم پر، بے شک ہم حد سے نکلنے والے لوگ تھے۔ ۳۲۔شاید ہمارا رب ہم کو اس سے اچھا باغ اس کے بدلے میں دے دے، ہم اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ۳۳۔اسی طرح آتا ہے عذاب ،اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔

اس دنیا میں آدمی جو کچھ کماتا ہے۔وہ بظاہر کھیت سے یا اور کسی چیز سے ملتا ہوا نظر آتا ہے۔مگر حقیقۃً وہ خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ان کا شکرانہ یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کو اپنی ذاتی چیز نہ سمجھ لے، ان کو خدا کا عطیہ سمجھے اور اس میں دوسرے بندگان خدا کا حصہ نکالے اس کی کمائی میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے گا۔خدا کی نعمت پانے کے بعد ”مناع للخیر“ (بھلائی کو روکنے والا) بن جانا خدا کو سخت ناپسند ہے۔جو شخص اپنی کمائی کو اپنی لیاقت کا نتیجہ سمجھے اور دوسروں کا حق انہیں دینے پر راضی نہ ہو۔اس کی کمائی اس کو فائدہ نہ دے سکے گی۔اس قسم کا فعل نہ صرف آخرت میں آدمی کے لیے بوجھ بنے گا، بلکہ اندیشہ ہے کہ دنیا میں بھی ملی ہوئی نعمت اس سے چھین لی جائے۔یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔کبھی وہ کسی کے لیے دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے اور آخرت میں تو لازماً وہ ہر ایک کے حق میں ظاہر ہوگا۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٣٤﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ؕ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿٣٧﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿٣٨﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿٤٠﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿٤١﴾

۳۴۔بے شک ڈرنے والوں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔ ۳۵۔کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کے برابر کر دیں گے۔ ۳۶۔تم کو کیا ہوا،تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔ ۳۷۔کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو۔ ۳۸۔اس میں تمھارے لیے وہ ہے جس کو تم پسند کرتے ہو۔ ۳۹۔کیا تمھارے لیے ہمارے اوپر قسمیں ہیں قیامت تک باقی رہنے والی کہ تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم فیصلہ کرو۔ ۴۰۔ان سے پوچھو کہ ان میں سے کون اس کا ذمہ دار ہے۔ ۴۱۔کیا ان کے کچھ شریک ہیں،تو وہ اپنے شریکوں کو لائیں اگر وہ سچے ہیں۔

خدا سے نہ ڈرنے والا آدمی صرف سامنے کی چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔اس کے مقابلہ میں خدا سے ڈرنے والا وہ ہے جو غیبی حقیقت کے بارے میں سنجیدہ ہو جائے۔یہ دو بالکل الگ الگ کردار ہیں اور دونوں کا انجام یقینی طور پر یکساں نہیں ہوسکتا۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَ قَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَذَرْنِيْ وَ مَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾

۴۲۔ جس دن حقیقت سے پردہ اُٹھایا جائے گا اور لوگ سجدہ کے لیے بلائے جائیں گے تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ ۴۳۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ان پر ذلت چھائی ہوگی، اور وہ سجدہ کے لیے بلائے جاتے تھے اور صحیح سالم تھے۔ ۴۴۔ پس چھوڑو مجھ کو اور ان کو جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں، ہم ان کو آہستہ آہستہ لا رہے ہیں جہاں سے وہ نہیں جانتے۔ ۴۵۔ اور میں ان کو مہلت دے رہا ہوں، بے شک میری تدبیر مضبوط ہے۔

قیامت میں جب خدا عیاناً سامنے آجائے گا تو تمام ایمان والے لوگ اپنے رب کے سامنے سجدہ میں گر جائیں گے جس طرح وہ پچھلی زندگی میں اس کے آگے سجدہ میں گرے ہوئے تھے۔ مگر ظہورِ خداوندی کے وقت سجدہ کی یہ توفیق صرف سچے مومنین کو حاصل ہوگی۔ جو لوگ دنیا میں جھوٹا سجدہ کرتے تھے ان کی کمر اس وقت اکڑ جائے گی جس طرح باعتبار حقیقت وہ دنیا میں اکڑی ہوئی تھی۔ ایسے لوگ سجدہ کرنا چاہیں گے مگر وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ یہ مخلص اہل ایمان کی سب سے بڑی قدردانی ہوگی کہ خدا خود ظاہر ہو کر ان کا سجدہ قبول کرے۔ اس کے مقابلہ میں ایمان کا جھوٹا دعوی کرنے والوں کے لیے یہ سب سے زیادہ رسوائی کا لمحہ ہوگا کہ ان کا خالق و مالک ان کے سامنے ہے اور وہ اس کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کرنے پر قادر نہیں۔

''سجدہ'' کرنے سے محروم ہونا حسرت کے وسیع تجربہ کی ایک نمائندہ مثال ہے جس سے قیامت کے دن منکر انسان دوچار ہوگا (البقرہ، 2:167)۔ اس دن اللہ رب العالمین اپنے تمام جلال و کمال کے ساتھ انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ اس وقت آدمی خدا کو دیکھنا چاہے گا، مگر منکر انسان خدا کو دیکھ نہ سکے گا۔ کیوں کہ وہ دنیا میں خدا کو دیکھنے کے لیے اندھا بنا رہا، وہ خدا کی حمد کرنا چاہے گا، مگر وہ اس کی حمد نہ کر سکے گا۔ کیوں کہ دنیا میں خدا کی حمد کرنے سے اس کی زبان گونگی ہوگئی تھی، وہ خدا کی باتوں کو سننا چاہے گا، مگر وہ اس کو سن نہ سکے گا۔ کیوں کہ دنیا میں خدا کی باتوں کو سننے کے لیے اس نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ وہ چاہے گا کہ اپنے رب کی عظمت کے اعتراف میں اس کے آگے جھک جائے، مگر وہ اس کے آگے جھک نہ سکے گا۔ کیوں کہ دنیا میں وہ اس کے آگے جھکنے کو تیار نہ ہو سکا۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ

۴۶۔ کیا تم ان سے معاوضہ مانگتے ہو کہ وہ اس کے تاوان سے دبے جا رہے ہیں۔ ۴۷۔ یا ان کے پاس غیب ہے پس وہ لکھ رہے ہیں۔ ۴۸۔ پس اپنے رب کے فیصلہ تک صبر کرو اور مچھلی

كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَ هُوَ
مَكْظُوْمٌ ؕ﴿۴۸﴾ لَوْ لَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾
فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَ
اِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ
بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ يَقُوْلُوْنَ
اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ ع

والے کی طرح نہ بن جاؤ، جب اس نے پکارا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ ۴۹۔ اگر اس کے رب کی مہربانی اس کے شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا۔ ۵۰۔ پھر اس کے رب نے اس کو نوازا، پس اس کو نیکوں میں شامل کر دیا۔ ۵۱۔ اور یہ منکر لوگ جب نصیحت کو سنتے ہیں تو اس طرح تم کو دیکھتے ہیں گویا اپنی نگاہوں سے تم کو پھسلا دیں گے، اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے۔ ۵۲۔ اور وہ جہان والوں کے لیے صرف ایک نصیحت ہے۔

مچھلی والے سے مراد حضرت یونس ہیں۔ انھوں نے نینویٰ کے لوگوں کو خدا کے دین کی دعوت دی۔ مگر ان لوگوں کی طرف سے جلد مثبت رسپانس نہ ملنے کی وجہ سے وہ ان سے غصہ ہو گئے اور نینویٰ چھوڑ کر چلے گئے۔ خدا کو ان کی یہ روش پسند نہ آئی، اور وہ خدا کے حکم سے ایک بڑی مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے، جس کو سورہ الانبیاء، آیت 87 میں ظلمات کہا گیا ہے، یعنی شدید تاریکی۔ حضرت یونس اس تاریکی سے صرف اس وقت باہر آئے جب کہ انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ یہی معاملہ تمام اہل ایمان کا ہے۔ داعی اور مدعو کا رشتہ بے حد نازک رشتہ ہے۔ داعی کو یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو حسن اخلاق کا پابند بنانا پڑتا ہے۔ مدعو بے دلیل باتیں کرے، وہ داعی کو حقیر سمجھے، وہ داعی پر جھوٹا الزام لگائے۔ وہ خواہ کچھ بھی کرے، داعی کو ہر حال میں اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچانا ہے۔ داعی کی کامیابی کا راز دو چیزوں میں چھپا ہوا ہے — مدعو کی زیادتیوں پر صبر اور مدعو سے کوئی مادی غرض نہ رکھنا۔

۶۹ ـ سُوْرَۃُ الْحَاقَّۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا
الْحَآقَّةُ ؕ﴿۳﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ
بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا
بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾ وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ
صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ وہ ہونے والی۔ ۲۔ کیا ہے وہ ہونے والی۔ ۳۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ ہونے والی۔ ۴۔ ثمود اور عاد نے اس کھڑ کھڑانے والی چیز کو جھٹلایا۔ ۵۔ پس ثمود، تو وہ ایک سخت حادثہ سے ہلاک کر دئے گئے۔ ۶۔ اور عاد، تو وہ ایک تیز و تند ہوا سے ہلاک کیے گئے۔ ۷۔ اس کو اللہ نے مسلسل سات

وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ
فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ ۞٧
فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۞٨ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ
وَ مَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۚ ۞٩
فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً
رَّابِيَةً ۞١٠ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي
الْجَارِيَةِ ۙ ۞١١ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ
اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۞١٢

رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا، پس تم دیکھتے ہو کہ وہاں وہ اس طرح گرے ہوئے پڑے ہیں گویا کہ وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔ ۸۔ تو کیا تم کو ان میں سے کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے۔ ۹۔ اور فرعون اور اس سے پہلے والوں نے اور الٹی ہوئی بستیوں نے جرم کیا۔ ۱۰۔ انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ نے ان کو بہت سخت پکڑا۔ ۱۱۔ اور جب پانی حد سے گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کرایا۔ ۱۲۔ تاکہ ہم اس کو تمھارے لیے یادگار بنا دیں۔ اور یاد رکھنے والے کان اس کو یاد رکھیں۔

کچھ لوگ کھلے طور پر آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو زبان سے آخرت کا انکار نہیں کرتے مگر ان کے دل میں ساری اہمیت بس اسی دنیا کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی زندگی میں اور کھلے ہوئے منکرین کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ دونوں گروہ باعتبار حقیقت ایک ہیں۔ اور دونوں ہی اللہ کے نزدیک آخرت کو جھٹلانے والے ہیں۔ ایک گروہ اگر زبانی طور پر اس کو جھٹلا رہا ہے تو دوسرا گروہ عملی طور پر۔

ایسے تمام لوگ خدا کے قانون کے مطابق ہلاکت میں پڑنے والے ہیں۔ پیغمبروں کے زمانہ میں یہ ہلاکت موجودہ دنیا میں سامنے آگئی اور بعد کے لوگوں کے لیے وہ آخرت میں سامنے آئے گی۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس دنیا میں کھلی آنکھ کے ساتھ رہے۔ وہ دنیا کی تخلیقات میں خالق کو پہچانے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ ۞١٣ وَّ
حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً
وَّاحِدَةً ۙ ۞١٤ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ ۞١٥
وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ ۞١٦
وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ
رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ ۞١٧ يَوْمَئِذٍ
تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۞١٨

۱۳۔ پس جب صور میں یکبارگی پھونک ماری جائے گی۔ ۱۴۔ اور زمین اور پہاڑوں کو اُٹھا کر ایک ہی بار میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ ۱۵۔ تو اس دن واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی۔ ۱۶۔ اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس روز بالکل بودا ہوگا۔ ۱۷۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے، اور تیرے رب کے عرش کو اس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔ ۱۸۔ اس دن تم پیش کیے جاؤ گے۔ تمھاری کوئی بات پوشیدہ نہ ہوگی۔

موجودہ دنیا میں آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ اصل حقیقتیں اس سے اوجھل ہیں۔ خدا اور آخرت

یہاں مکمل طور پر غیب میں ہیں ۔انسان نظر آتا ہے مگر خدا نظر نہیں آتا۔کیوں کہ موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے مطابق بنائی گئی ہے۔قیامت کے آتے ہی یہ حالت بدل جائے گی۔یہ امتحان کی مدت کے ختم ہونے کا اعلان ہوگا۔اس وقت موجودہ دنیا توڑ کر نئی دنیا نئے تقاضوں کے مطابق قائم کی جائے گی۔خدا کا جلال آج بالواسطہ طور پر ظاہر ہورہا ہے،اس وقت خدا اپنے تمام جلال کے ساتھ براہ راست طور پر ظاہر ہوجائے گا۔جنت،دوزخ ،فرشتے،سب آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔اس حقیقی عالم کی نسبت سے انسان کی جو اصل حیثیت ہے وہ پوری طرح کھل جائے گی۔دنیا میں آدمی اپنے حقیقی وجود کو ایک ظاہری پردہ میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔وہ بے زور ہو کر بھی زور آور دکھائی دیتا ہے۔آخرت میں وہ اپنے اصلی اور حقیقی روپ میں بے پردہ ہوجائے گا۔آدمی اپنی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے جیسا ہے ویسا ہی وہ ظاہر کے اعتبار سے ہوجائے گا۔اس سے بچے ہوئے صرف وہ لوگ ہوں گے جن کو رب العالمین اپنی رحمتوں میں لے لے،جن کو وہ اپنی مغفرت میں ڈھانپ لے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿19﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿20﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿21﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿22﴾ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿23﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿24﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ﴿25﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿26﴾ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿27﴾ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ﴿28﴾ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ﴿29﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿30﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿31﴾ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿32﴾ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿33﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿34﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا

۱۹۔پس جس شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ لو،میرا اعمال نامہ پڑھو۔ ۲۰۔میں نے گمان رکھا تھا کہ مجھ کو میرا حساب پیش آنے والا ہے۔ ۲۱۔پس وہ ایک پسندیدہ عیش میں ہوگا۔ ۲۲۔اونچے باغ میں۔ ۲۳۔اس کے پھل جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ ۲۴۔کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ،ان اعمال کے بدلے میں جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔ ۲۵۔اور جس شخص کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا،تو وہ کہے گا— کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا جاتا۔ ۲۶۔اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ ۲۷۔کاش وہی موت فیصلہ کن ہوتی۔ ۲۸۔میرا مال میرے کام نہ آیا۔ ۲۹۔میرا اقتدار ختم ہوگیا۔ ۳۰۔اس شخص کو پکڑو، پھر اس کو طوق پہناؤ۔ ۳۱۔پھر اس کو جہنم میں داخل کردو۔ ۳۲۔پھر ایک زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے اس کو جکڑ دو۔ ۳۳۔یہ شخص خدائے عظیم پر ایمان نہ رکھتا تھا۔ ۳۴۔اور وہ غریبوں کو کھانا کھلانے پر نہیں ابھارتا تھا۔ ۳۵۔پس آج

حَمِيۡمٌ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ غِسۡلِيۡنٍ ﴿۳۶﴾ لَّا
يَاۡكُلُهٗۤ اِلَّا الۡخَاطِئُوۡنَ ﴿۳۷﴾ ع

یہاں اس کا کوئی ہمدرد نہیں۔ ۳۶۔اور زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا نہیں۔ ۳۷۔اس کو گناہ گاروں کے سوا کوئی نہ کھائے گا۔

انسان موجودہ دنیا میں پیدائش کی بنیاد پر داخل ہوتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والا، ماں کے پیٹ سے نکل کر موجودہ دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہ کسی انسان کے لیے اس دنیا میں پہلا داخلہ ہے۔ یہ داخلہ ہر انسان کو محض پیدائش کی بنیاد پر مل جاتا ہے۔ مگر یہ داخلہ عارضی داخلہ ہے۔ موت کے بعد انسان دوبارہ خدا کی ابدی نعمتوں والی دنیا میں داخل ہوگا۔ یہ داخلہ مستقل ہوگا۔ پہلا داخلہ ہر انسان کو پیدائش کی بنیاد پر اپنے آپ مل جاتا ہے۔ لیکن دوسرے داخلے کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ دوسرا داخلہ کسی انسان کو صرف استحقاق (merrit) کی بنیاد پر ملے گا۔ پہلے دور حیات کی حیثیت یہ ہے کہ وہ استحقاق ثابت کرنے کا دور ہے۔ پہلے دورِ حیات میں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کرے کہ وہ خدا کے ابدی انعام کا واقعی حقدار ہے۔ خدا کی دنیا میں پہلے داخلہ کے ساتھ مصیبت شامل تھی (البلد، 90:4)۔ اس کے برعکس، یہ دوسرا داخلہ نیک عمل کرنے والوں کے لیے تمام تر ھنیئًا (pleasure) کا داخلہ ہوگا۔ پہلا داخلہ امتحان کے لیے تھا، اور دوسرا داخلہ امتحان کی بنیاد پر انعام حاصل کرنے کے لیے ہوگا۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے کیے پر مگن ہے ہر آدمی اپنے کام کو سونا (gold) سمجھتا ہے، ان پر وہ فخر کرتا ہے۔ مگر کوئی سونا اسی وقت سونا ہے جب کہ وہ سنار کی کسوٹی پر بھی سونا ثابت ہو۔ آخرت میں خدا ہر آدمی کے عمل کو اپنی کسوٹی پر جانچے گا۔ جس کا عمل وہاں کی جانچ میں درست ثابت ہو اسی کا عمل خدا کی نظر میں قیمتی ہے۔ اس کے برعکس، جس انسان کا عمل خدا کے معیار کے مطابق نہیں ہوگا وہ قیامت کے دن کائناتی کوڑاخانے میں ڈال دیا جائے گا۔ آخرت کی دنیا میں کامیابی اس شخص کے لیے ہے جو موجودہ دنیا میں خدا سے ڈر کر زندگی گزارے۔ اور جو شخص موجودہ دنیا میں نڈر ہو کر رہے اور بندوں کے مقابلہ میں سرکشی کرے وہ آخرت میں سخت ترین عذاب میں پھنس کر رہ جائے گا۔

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا
تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ﴿۴۰﴾ وَّ
مَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾
وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾
تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوۡ تَقَوَّلَ
عَلَيۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ
بِالۡيَمِيۡنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِيۡنَ ﴿۴۶﴾

۳۸۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو۔ ۳۹۔ اور جن کو تم نہیں دیکھتے۔ ۴۰۔ بے شک یہ ایک باعزت رسول کا کلام ہے۔ ۴۱۔ اور وہ کسی شاعر کا کلام نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ ۴۲۔ اور یہ کسی کاہن کا کلام نہیں، تم بہت کم غور کرتے ہو۔ ۴۳۔ خداوند عالم کی طرف سے اُتارا ہوا ہے ۴۴۔ اور اگر وہ کوئی بات گھڑ کر ہمارے اوپر لگاتا، ۴۵۔ تو ہم اس کا

فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾ ع ۲ ۱۵ ۲

دایاں ہاتھ پکڑتے۔ ۴۶۔ پھر ہم اس کی رگِ دل کاٹ دیتے۔ ۴۷۔ پھر تم میں سے کوئی اس سے ہم کو روکنے والا نہ ہوتا۔ ۴۸۔ اور بلاشبہ یہ یاددہانی ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ ۴۹۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے ہیں۔ ۵۰۔ اور وہ منکروں کے لیے پچھتاوا ہے۔ ۵۱۔ اور یہ یقینی حق ہے۔ ۵۲۔ پس تم اپنے ربِ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔

قرآن براہ راست اللہ کا کلام ہے۔ قرآن انسانی فطرت کی تلاش کا جواب ہے۔ بہت سے انسانوں نے اس میں اپنی تلاشِ فطرت کا جواب پایا ہے۔ سرآرتھر کیتھ (Arthur Keith, 1866-1955) نے اپنی کتاب میں قدیم مصر کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلامی دور میں مصریوں کو مسلمانوں کی تلوار نے فتح نہیں کیا بلکہ اس کو مسلمانوں کے قرآن نے فتح کیا:

The Egyptians were conquered not by the sword but by the Koran. (*A New Theory of Human Evolution*, p. 303, ed. 1950)

کسی قوم کے اندر اتنی سنجیدہ تبدیلی شاعری یا کہانت وغیرہ سے پیدا نہیں ہوسکتی، یہ تبدیلی صرف اسی کلام سے پیدا ہوسکتی ہے، جو انسانی فطرت کو ایڈریس کرے، اور اس کے فطری تلاش کا جواب ہو۔ یہ کلام صرف اس خدا کا نازل کردہ کلام ہوسکتا ہے جو انسانی فطرت کو پیدا کرنے والی ذات ہے، کوئی دوسرا کلام نہیں۔

جو کچھ تم دیکھتے ہو اور جو کچھ تم نہیں دیکھتے سب اس کلام کی صداقت پر گواہ ہے — اس کا مطلب یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت جو معلومات انسان کی دسترس میں آچکی تھیں اور جو بعد کے زمانہ میں اس کی دسترس میں آنے والی تھیں، دونوں اس کلام کی حقانیت ثابت کرنے والی ہیں۔ اس کلام کے برحق ہونے کی تردید نہ حال کا علم کررہا ہے اور نہ مستقبل کا علم اس کی تردید کرسکے گا۔ اس کے باوجود جو لوگ اس کو نہ مانیں وہ اپنے بارے میں صرف یہ ثابت کررہے ہیں کہ وہ حق اور ناحق کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں۔

۷۰۔ سُوْرَةُ الْمَعَارِج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ مانگنے والے نے عذاب مانگا واقع ہونے والا۔ ۲۔ منکروں کے لیے کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں۔ ۳۔ اللہ کی طرف سے جو سیڑھیوں کا مالک

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ
مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ
صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ﴿۶﴾ وَّ
نَرٰىهُ قَرِيْبًا ؕ﴿۷﴾ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ
كَالْمُهْلِ ۙ﴿۸﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ﴿۹﴾ وَلَا
يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۚ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ
الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ
بِبَنِيْهِ ۙ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ ۙ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ
الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ
يُنْجِيْهِ ۙ﴿۱۴﴾

ہے۔ ۴۔اس کی طرف فرشتے اور جبریل چڑھ کر جاتے ہیں، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ ۵۔پس تم صبر کرو، بھلی طرح کا صبر۔ ۶۔ وہ اس کو دور دیکھتے ہیں۔ ۷۔ اور ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں۔ ۸۔جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا۔ ۹۔اور پہاڑ دھنے ہوئے اون کی طرح۔ ۱۰۔اور کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔ ۱۱۔وہ ان کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ کاش، اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں۔ ۱۲۔اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی۔ ۱۳۔ اور اپنے کنبہ کو جو اسے پناہ دینے والا تھا۔ ۱۴۔اور تمام اہل زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچالے۔

قیامت کے منظر کو موجودہ دنیا میں حقیقی طور پر کھولا نہیں جا سکتا۔ تاہم قرآن میں جگہ جگہ ان کو اشارہ یا تمثیل میں بتایا گیا ہے تاکہ آدمی ان کا مجمل احساس کر سکے۔ قیامت جب آئے گی تو وہ اتنی ہولناک ہوگی کہ آدمی اپنے ان رشتوں اور مفادات کو بھول جائے گا جن کو آج وہ اتنا اہم سمجھے ہوئے ہے کہ ان کی خاطر وہ حق کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۙ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۚ﴿۱۶﴾
تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰى ۙ﴿۱۷﴾ وَ جَمَعَ
فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ﴿۱۹﴾ اِذَا
مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ
مَنُوْعًا ۙ﴿۲۱﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى
صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۪ۙ﴿۲۳﴾ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ
حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۪ۙ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۪ۙ﴿۲۵﴾
وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۪ۙ﴿۲۶﴾ وَ
الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۚ﴿۲۷﴾

۱۵۔ ہرگز نہیں، وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی۔ ۱۶۔ جو کھال اُتار دے گی۔ ۱۷۔وہ ہر اس شخص کو بلائے گی جس نے پیٹھ پھیری اور اعراض کیا۔ ۱۸۔ جمع کیا اور سینت کر رکھا۔ ۱۹۔بے شک انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے۔ ۲۰۔ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا اُٹھتا ہے۔ ۲۱۔اور جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو وہ بخل کرنے لگتا ہے۔ ۲۲۔ مگر وہ نمازی۔ ۲۳۔ جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ ۲۴۔اور جن کے مالوں میں متعین حق ہے۔ ۲۵۔سائل اور محروم کا۔ ۲۶۔اور جو انصاف کے دن پر یقین رکھتے ہیں۔ ۲۷۔اور جو

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ وَالَّذِيْنَ
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ
مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ
لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ
بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى
صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ
مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع

اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ۲۸۔ بے شک ان کے رب کے عذاب سے کسی کو نڈر نہ ہونا چاہیے۔ ۲۹۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۳۰۔ مگر اپنی بیویوں سے یا اپنی مملوکہ عورتوں سے، پس ان پر ان کو کوئی ملامت نہیں۔ ۳۱۔ پھر جو شخص اس کے علاوہ کچھ اور چاہے تو وہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ۳۲۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کو نباہتے ہیں۔ ۳۳۔ اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔ ۳۴۔ اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۳۵۔ یہی لوگ جنتوں میں عزت کے ساتھ ہوں گے۔

ان آیات میں مختصر طور پر دونوں قسم کے انسانوں کی صفات بیان کر دی گئی ہیں۔ ان لوگوں کی بھی جو جنت میں داخل کیے جانے کے مستحق قرار پائیں گے اور ان لوگوں کی بھی جن کے اعمال انھیں قیامت کے دن جہنم میں گرانے کا سبب بنیں گے۔

محروم کی تشریح امام مالک نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جو رزق سے محروم رہا (أَنَّهُ الَّذِي يُحْرَمُ الرِّزْقَ) تفسیر القرآن من الجامع لابن وہب، جلد 2، صفحہ 35۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے ایک جانور کو دیکھا جو بھوکا تھا اور بظاہر اس کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی انھیں میں سے ہے جس کو قرآن میں محروم کہا گیا ہے (تفسیر القرطبی، جلد 17، صفحہ 39)۔ اصل یہ ہے کہ ایمان جب کسی آدمی کے دل میں جگہ پاتا ہے تو وہ اس کو انتہائی سنجیدہ اور انتہائی حساس بنا دیتا ہے۔ وہ نہ صرف سائل کی ضرورت پوری کرنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، بلکہ اس کا احساس یہ ہو جاتا ہے کہ ہر محروم کا اس کے اوپر حق ہے، خواہ وہ انسان ہو یا جانور یا کوئی درخت۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾
عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾
اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ
نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

۳۶۔ پھر ان منکروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ تمھاری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ ۳۷۔ دائیں سے اور بائیں سے گروہ در گروہ۔ ۳۸۔ کیا ان میں سے ہر شخص یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت کے باغ میں داخل کر لیا جائے گا۔ ۳۹۔ ہر گز نہیں، ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔

جو لوگ ناحق پر کھڑے ہوئے ہوں وہ اس وقت اپنی حیثیت کو ختم ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں جب کہ ان کے سامنے حق کی کھلی کھلی دعوت پیش کر دی جائے۔ وہ ایسی دعوت کو زیر کرنے کے لیے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان کی نامعقول روش انھیں جہنم کی طرف لے جا رہی ہوتی ہے۔ مگر اپنی جھوٹی خوش فہمی کے تحت وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ وہ جنت کی طرف اپنا تیز رفتار سفر طے کر رہے ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ یَخُوْضُوْا وَیَلْعَبُوْا حَتّٰی یُلٰقُوْا یَوْمَهُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْیَوْمُ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ ع ۲ ۹ ۸

۴۰۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی، ہم اس پر قادر ہیں۔ ۴۱۔ کہ بدل کر ان سے بہتر لے آئیں، اور ہم عاجز نہیں ہیں۔ ۴۲۔ پس ان کو چھوڑ دو کہ وہ باتیں بنائیں اور کھیل کریں، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ ۴۳۔ جس دن قبروں سے نکل پڑیں گے دوڑتے ہوئے، جیسے وہ کسی نشانہ کی طرف بھاگ رہے ہوں۔ ۴۴۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی۔ ان پر ذلت چھائی ہوگی، یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ تھا۔

زمین پر اجالے اور اندھیرے کا فرق، مشرق اور مغرب کا بدلنا زمین کی اس انوکھی خصوصیت کی بنا پر ہوتا ہے جس کو محوری جھکاؤ (axial tilt) کہتے ہیں۔ اس دنیا میں ہر جگہ ایک ہی وقت میں شام یا ایک وقت میں صبح نہیں ہوتی۔ بلکہ مختلف وقتوں میں ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن میں مختلف انداز میں اشارے کیے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک ''مشرقوں اور مغربوں کا رب'' (70:40) ہے۔ یعنی اس مالک کائنات کی قسم، جو زمین پر بے شمار مشرق اور بے شمار مغرب پیدا کرتا ہے۔ سورج کی گرد زمین کی گردش بلاشبہ حیران کن حد تک ایک عظیم واقعہ ہے۔ زمینی گردش کے اس سسٹم کی وجہ سے زمین پر مختلف قسم کے موسم پیدا ہوتے ہیں۔ سورج کی نسبت سے اگر زمین میں یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو زمین انسان کے لیے بہت کم مفید ہوتی۔ اس جھکاؤ نے زمین کو انسان کے لیے بہت زیادہ مفید بنا دیا۔ یہ واقعہ خاموش زبان میں اعلان کر رہا ہے کہ اس کائنات کا مالک بے پناہ حکمت والا اور بے پناہ قدرت والا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین کی یہ حیرت ناک گردش اتنی صحت کے ساتھ مسلسل قائم نہ رہ سکے۔

جس دنیا میں کم بہتر کو زیادہ بہتر بنانے کی ایسی مثال موجود ہو، اس دنیا میں اسی نوعیت کے دوسرے واقعات کا ظہور میں آنا کچھ بھی مستبعد نہیں۔ ان کھلی کھلی نشانیوں کے باوجود جو لوگ نصیحت نہ پکڑیں وہ بلاشبہ غیر سنجیدہ لوگ ہیں۔ اور غیر سنجیدہ لوگ صرف اس وقت نصیحت پکڑتے ہیں جب کہ وہ اس کے لیے مجبور کر دیے گئے ہوں۔

۷۱-سُوْرَۃُ نُوْح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ
قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ
اَلِیۡمٌ ① قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ
مُّبِیۡنٌ ۙ② اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ
اَطِیۡعُوۡنِ ۙ③ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ
یُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ اَجَلَ
اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ کُنۡتُمۡ
تَعۡلَمُوۡنَ ④

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کردو، اس سے پہلے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے۔ ۲۔اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں تمھارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۳۔کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۴۔اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر کرے گا اور تم کو ایک متعین وقت تک باقی رکھے گا۔ بے شک جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آجاتا ہے تو پھر وہ ٹالا نہیں جاتا۔ کاش، تم اس کو جانتے۔

حضرت نوح غالباً حضرت آدم کے بعد سب سے پہلے پیغمبر ہیں۔ اس وقت کے بگڑے ہوئے انسانوں کو انہوں نے جو پیغام دیا اس کو یہاں تین لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ عبادت، تقویٰ، اطاعتِ رسول۔ یعنی غیر اللہ کی پرستش چھوڑ کر ایک اللہ کی پرستش کرنا، دنیا میں اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنا، اور ہر معاملہ میں اللہ کے رسول کو اپنے لیے قابلِ تقلید نمونہ سمجھنا۔ یہی ہر زمانہ میں تمام پیغمبروں کی اصل دعوت رہی ہے۔ اور یہی خود قرآن کی اصل دعوت ہے۔

''اے میری قوم کے لوگو!'' اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کا نظریہ دو قومی نظریہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک قومی نظریہ تھا۔ یعنی جو قومیت پیغمبر کے مخاطبین کی تھی وہی قومیت پیغمبر کی تھی۔ تمام پیغمبر مدعو کو اپنی قوم سمجھتے تھے۔ پیغمبر اور اُس کے مخاطبین کے درمیان جو فرق تھا، وہ قومیت کا فرق نہ تھا بلکہ عقیدہ اور مذہب کا فرق تھا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا ۙ⑤
فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ⑥ وَ اِنِّیۡ کُلَّمَا
دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ
اٰذَانِہِمۡ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَ اَصَرُّوۡا وَ اسۡتَکۡبَرُوا

۵۔ نوح نے کہا کہ اے میرے رب، میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا۔ ۶۔مگر میری پکار نے ان کی دوری ہی میں اضافہ کیا۔ ۷۔اور میں نے جب بھی ان کو بلایا کہ تو انھیں معاف کردے تو انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور

اسْتِكْبَارًا ۚ ﴿٧﴾ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ ﴿٨﴾
ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ
اِسْرَارًا ۙ ﴿٩﴾ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ
كَانَ غَفَّارًا ۙ ﴿١٠﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ
مِّدْرَارًا ۙ ﴿١١﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَ
يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۭ ﴿١٢﴾ مَا
لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ ﴿١٣﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ
اَطْوَارًا ﴿١٤﴾ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ
سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ ﴿١٥﴾ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ
فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿١٦﴾ وَ
اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ ﴿١٧﴾ ثُمَّ
يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿١٨﴾ وَ
اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ ﴿١٩﴾
ع لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۧ ﴿٢٠﴾

اپنے اوپر اپنے کپڑے لپیٹ لیے اور ضد پر اَڑ گئے اور بڑا گھمنڈ کیا۔ ۸۔ پھر میں نے ان کو برملا پکارا۔ ۹۔ پھر میں نے ان کو کھلی تبلیغ کی اور ان کو چپکے سے سمجھایا۔ ۱۰۔ میں نے کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ ۱۱۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارش برسائے گا۔ ۱۲۔ اور تمھارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا۔ اور تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا۔ اور تمھارے لیے نہریں جاری کرے گا۔ ۱۳۔ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے لیے عظمت کے متوقع نہیں ہو۔ ۱۴۔ حالاں کہ اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا۔ ۱۵۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے۔ ۱۶۔ اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔ ۱۷۔ اور اللہ نے تم کو زمین سے خاص اہتمام سے اگایا۔ ۱۸۔ پھر وہ تم کو زمین میں واپس لے جائے گا۔ اور پھر اس سے تم کو باہر لے آئے گا۔ ۱۹۔ اور اللہ نے تمھارے لیے زمین کو ہموار بنایا۔ ۲۰۔ تاکہ تم اس کے کھلے راستوں میں چلو۔

حضرت نوح کی اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا اندازِ دعوت بھی عین وہی تھا جو قرآن میں لوگوں کو دعوت دینے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ حضرت نوح نے کائناتی واقعات سے استدلال کرتے ہوئے اپنی دعوت پیش کی۔ انھوں نے اجتماعی خطاب بھی کیا اور انفرادی گفتگوئیں بھی کیں۔ لوگوں کا اصلاح پر لانے کے لیے انھوں نے اپنی ساری کوشش صرف کر ڈالی۔ مگر قوم آپ کی بات ماننے پر راضی نہ ہوئی۔

حضرت نوح نے اپنی قوم کی گمراہیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائی، پھر کہا کہ تم لوگوں کو کیا ہوا کہ تم اللہ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو۔ یعنی تم اللہ کی بڑائی کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتے، اللہ کی عظمت وجلال سے ڈرتے کیوں نہیں۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے لیے عظمت کے متوقع نہیں ہو) کی تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس نے ان الفاظ میں کی ہے: لَا تُعَظِّمُونَ اللّٰهَ حَقَّ عَظَمَتِهِ (تفسیر الطبری، جلد 23، صفحہ 296)۔ یعنی اللہ کی عظمت اس طرح نہیں مانتے جس طرح اس کی

عظمت ماننا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرک انسان خدا کا منکر نہیں ہوتا۔ حضرت نوح کی قوم اللہ کو مانتی تھی، مگر تعظیم وتوقیر، حب شدید اور خوف شدید کا جو درجہ اللہ کو دینا چاہیے، وہ درجہ انھوں نے اپنے قومی اکابر کو دے رکھا تھا جن کا نام آگے آیت نمبر 23 میں ذکر کیا گیا ہے۔ مشرک انسان کی گمراہی یہ ہے کہ خدا کے لیے اس کے پاس صرف لفظی اظہار ہوتا ہے، اور دوسری ہستیوں کے لیے قلبی کیفیات۔ حضرت نوح کی قوم اللہ کا اقرار کرتی تھی، مگر اس پر اللہ کی عظمت کا احساس اس طرح چھایا ہوا نہ تھا جس طرح کسی انسان پر چھایا ہوا ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی خدا پرستی کا اصل معیار ہے۔ جو شخص خدا کی عظمت میں جی رہا ہو وہ خدا پرست ہے۔ اور جس کا دل خدا کی عظمت کے احساس میں ڈوبا ہوا نہ ہو، وہ خدا پرست نہیں۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَ اتَّبَعُوْا
مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۚ﴿۲۱﴾
وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۚ﴿۲۲﴾ وَ قَالُوْا لَا
تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا
سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا یَغُوْثَ وَ یَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۚ﴿۲۳﴾ وَ
قَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا ۚ۬ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ
اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾ مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا
فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ۬ فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾

۲۱۔ نوح نے کہا کہ اے میرے رب، انھوں نے میرا کہا نہ مانا اور ایسے آدمیوں کی پیروی کی جن کے مال اور اولاد نے ان کے گھاٹے ہی میں اضافہ کیا۔ ۲۲۔ اور انھوں نے بڑی تدبیریں کیں۔ ۲۳۔ اور انھوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ اور تم ہرگز نہ چھوڑنا وَد کو اور سواع کو اور یغوث کو اور یعوق کو اور نَسر کو۔ ۲۴۔ اور انھوں نے بہت لوگوں کو بہکا دیا۔ اور اب تو ان گمراہوں کی گمراہی میں ہی اضافہ کر۔ ۲۵۔ اپنے گناہوں کے سبب سے وہ غرق کیے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کر دئے گئے۔ پس انھوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا۔

حضرت نوح کی دعوت کا لوگوں نے کیوں انکار کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو حضرت نوح کے مقابلہ میں ان لوگوں کی باتیں زیادہ قابل لحاظ نظر آئیں جو دنیاوی لحاظ سے بڑائی کا درجہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ وقت کے بڑوں نے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں دعوت حق کا انکار کیا۔ اور جو چھوٹے تھے انہوں نے اس لیے انکار کیا کہ ان کے بڑے اس کے منکر بنے ہوئے تھے۔

حضرت نوح کے مخالفین نے حضرت نوح کے خلاف بڑی بڑی تدبیریں کیں۔ ان میں سے ایک خاص تدبیر یہ تھی کہ انہوں نے کہا کہ نوح ہمارے اکابر (ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر) کے خلاف ہیں۔ یہ پانچوں قدیم زمانہ کے صالح افراد تھے۔ بعد کو وہ دھیرے دھیرے لوگوں کی نظر میں مقدس بن

گئے۔ حتیٰ کہ لوگوں نے انہیں پوجنا شروع کردیا۔ ان کے نام پر لوگوں کو حضرت نوح کے خلاف بھڑکانا آسان تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ کہہ کر آپ کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ کردیا کہ آپ بزرگوں کے راستہ کو چھوڑ کر نئے راستہ پر چل رہے ہیں۔

وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾ ع

۲۶۔ اور نوح نے کہا کہ اے میرے رب، تو ان منکروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ ۲۷۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا، وہ بدکار اور سخت منکر ہی ہوگا۔ ۲۸۔ اے میرے رب، میری مغفرت فرما۔ اور میرے ماں باپ کی مغفرت فرما اور جو میرے گھر میں مومن ہو کر داخل ہو، تو اس کی مغفرت فرما۔ اور سب مومن مردوں اور مومن عورتوں کو معاف فرمادے اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر۔

حضرت نوح کی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بگاڑ اپنی آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ معاشرے کی کنڈیشننگ (conditioning) بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ پورے معاشرے میں گمراہ عقائد و خیالات اس طرح چھا گئے تھے کہ جو بچہ اس معاشرہ میں پیدا ہو کر اٹھتا، وہ آخر کار قوم ہی کے مذہب کو اختیار کرتا تھا، یعنی گمراہی کی راہ پر چل پڑتا تھا۔ جب معاشرہ اس درجہ کو پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کے لیے اس کے سوا کچھ اور مقدر نہیں ہوتا کہ ''طوفان نوح'' کے ذریعہ اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔

۷۲۔ سُوْرَةُ الْجِنّ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ﴿١﴾ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ﴿٢﴾ وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کہو کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے قرآن سنا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔ ۲۔ جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔

صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾ وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۙ﴿۴﴾ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ﴿۵﴾ وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۙ﴿۶﴾ وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۙ﴿۷﴾

۳۔اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے۔اس نے نہ کوئی بیوی بنائی ہے اور نہ اولاد۔ ۴۔اور یہ کہ ہمارا نادان شخص اللہ کے بارے میں بہت خلافِ حق باتیں کہتا تھا۔ ۵۔اور ہم نے گمان کیا تھا کہ انسان اور جن، خدا کی شان میں کبھی جھوٹ بات نہ کہیں گے۔ ۶۔ اور یہ کہ انسانوں میں کچھ ایسے تھے جو جنات میں سے بعض کی پناہ لیتے تھے،تو انھوں نے جنوں کا غرور اور بڑھا دیا۔ ۷۔اور یہ کہ انھوں نے بھی گمان کیا، جیسا تمھارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو نہ اُٹھائے گا۔

یہاں انسان کے سوا ایک اور مخلوق آباد ہے جس کو جن کہتے ہیں۔انسان اس کو نہیں دیکھتا۔قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر ان کا ذکر کیا گیا ہے۔سورۃ جن کی ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں میں بھی گمراہ اور ہدایت یاب دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔انسانوں میں جس طرح نادان رہنما عوام کو بہکاتے ہیں۔اسی طرح جنوں میں بھی نادان رہنما ہیں۔اور وہ پر فریب الفاظ بول کر انہیں راستہ سے بھٹکاتے رہتے ہیں۔

سچا رہنما کون ہے، امتِ موسیٰ کے حوالے سے قرآن میں اس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے: وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (32:24)۔اور ہم نے ان میں امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، جب کہ انھوں نے صبر کیا، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔دوسرے الفاظ میں، سچے رہنما وہ لوگ ہیں، جو سادگی، سنسیر ٹی (sincerity)، ماڈسٹی (modesty) اور انسانی خیر خواہی اور امانت داری کی صفت کے حامل ہوں، جو اپنی صابرانہ روش کی بنا پر مثبت سوچ کے تحت رہنمائی کے لیے اٹھیں۔وہ کنڈیشنڈ ذہن سے اوپر اٹھ کر چیزوں کو دیکھیں اور جو درست راستہ ہو اس کی طرف رہنمائی کریں۔یہی لوگ اللہ کے نزدیک درست رہنما ہیں، اسی قسم کے رہنماؤں کو اللہ کی طرف سے قبولیت (acceptance) حاصل ہوتی ہے۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ۙ﴿۸﴾ وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴿۹﴾ وَّ اَنَّا لَا

۸۔اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو ہم نے پایا کہ وہ سخت پہرے داروں اور شعلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ۹۔ اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے، سو اب جو کوئی سننا چاہتا ہے تو وہ اپنے لیے ایک تیار شعلہ پاتا ہے۔

نَدۡرِیۡۤ اَشَرٌّ اُرِیۡدَ بِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ
اَرَادَ بِهِمۡ رَبُّهُمۡ رَشَدًا ﴿۱۰﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا
الصّٰلِحُوۡنَ وَ مِنَّا دُوۡنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا
طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ نُّعۡجِزَ
اللّٰهَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَنۡ نُّعۡجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّ
اَنَّا لَمَّا سَمِعۡنَا الۡهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنۡ
یُّؤۡمِنۡۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخۡسًا وَّ لَا
رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّ اَنَّا مِنَّا الۡمُسۡلِمُوۡنَ وَ مِنَّا
الۡقٰسِطُوۡنَ ؕ فَمَنۡ اَسۡلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوۡا
رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ اَمَّا الۡقٰسِطُوۡنَ فَكَانُوۡا
لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

۱۰۔اور ہم نہیں جانتے کہ یہ زمین والوں کے لیے کوئی برائی چاہی گئی ہے یا ان کے رب نے ان کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔ ۱۱۔اور یہ کہ ہم میں بعض نیک ہیں اور بعض اور طرح کے۔ہم مختلف طریقوں پر ہیں۔ ۱۲۔اور یہ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم زمین میں اللہ کو ہرا نہیں سکتے۔اور نہ بھاگ کر اس کو ہرا سکتے ہیں۔ ۱۳۔اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت کی بات سنی تو ہم اس پر ایمان لائے۔پس جو شخص اپنے رب پر ایمان لائے گا تو اس کو نہ کسی کمی کا اندیشہ ہوگا، اور نہ زیادتی کا۔ ۱۴۔اور یہ کہ ہم میں بعض فرماں بردار ہیں اور ہم میں بعض بے راہ ہیں، پس جس نے فرماں برداری کی تو انھوں نے بھلائی کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ ۱۵۔اور جو لوگ بے راہ ہیں تو وہ دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔

قرآن کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ وہ کتاب ہدایت ہے۔قرآن حقائقِ فطرت کا اعلان ہے۔قرآن کے ذریعہ آدمی سچائی کی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ہمارے پاس آنکھ ہے۔مگر جب تک کوئی روشنی اندھیرے کو نہ ہٹائے ہم باہر کی چیزوں کو دیکھ نہیں سکتے۔قرآن یہی روشنی ہے۔وہ انسان کو بصیرت کی نعمت عطا کرتا ہے ۔قرآن سننے والے جنوں نے قرآن کو سن کر نہ صرف فوراً اسے مان لیا بلکہ اسی کے ساتھ وہ اس کے مبلغ بن گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سچا کلام جب زندہ لوگوں کے کانوں تک پہنچتا ہے تو وہ بیک وقت دو قسم کے اثرات پیدا کرتا ہے—اس کی سچائی کا کھلے دل سے اعتراف، اور اس کی تبلیغ عام۔

قدیم عرب میں بہت سے لوگ تھے جن کو حنفاء کہا جاتا تھا۔ حنفاء کہا جاتا تھا، یعنی سچائی کے متلاشی۔آج کل کی زبان میں وہ سچائی کے متلاشی تھے۔ان کی اندرونی طلب ایک چیز کو چاہتی تھی مگر ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔مگر جب قرآن اترا اور انھوں نے اس کو پڑھا تو قرآن کی باتیں ان کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوئیں۔انھوں نے بڑھ کر اس کو قبول کر لیا۔قرآن ان کے ذہن کے لیے اطمینان اور ان کے دل کے لیے تسکین کا ذریعہ بن گیا۔ٹھیک اسی طرح آج بھی بے شمار لوگ ہیں جو حق کے متلاشی ہیں۔مگر ان کو نہیں معلوم کہ وہ حق کیا ہے اور کہاں ہے۔ان میں سے کسی شخص کو جب قرآن پڑھنے کو ملتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ قرآن ہی وہ ہدایت نامہ ہے جس کی تلاش اس کی روح کر رہی تھی۔وہ آگے بڑھ کر قرآن کے دین کو اختیار کر لیتا ہے۔وہ قرآن کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ
لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿١٦﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ
وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا
صَعَدًا ﴿١٧﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ
اللّٰهِ اَحَدًا ﴿١٨﴾ وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ
يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾ قُلْ
اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ
اَحَدًا ﴿٢٠﴾ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ
لَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ
اللّٰهِ اَحَدٌ ۥ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ
مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿٢٣﴾

۱۶۔ اور (مجھے وحی کی گئی ہے کہ) یہ لوگ اگر راستہ
پر قائم ہو جاتے تو ہم ان کو خوب سیراب کرتے۔
۱۷۔ تاکہ اس میں ان کو آزمائیں، اور جو شخص
اپنے رب کی یاد سے اعراض کرے گا تو وہ اس کو
سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔ ۱۸۔ اور یہ کہ
مسجدیں اللہ کے لیے ہیں پس تم اللہ کے ساتھ کسی
اور کو نہ پکارو۔ ۱۹۔ اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو
پکارنے کے لیے کھڑا ہوتو لوگ اس پر ٹوٹ
پڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ۲۰۔ کہو کہ میں
صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ
کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ۲۱۔ کہو کہ میں تم لوگوں
کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی
بھلائی کا۔ ۲۲۔ کہو کہ مجھ کو اللہ سے کوئی بچا نہیں
سکتا۔ اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ پا سکتا ہوں۔
۲۳۔ بس اللہ ہی کی طرف سے پہنچا دینا اور اس
کے پیغاموں کی ادائیگی ہے اور جو شخص اللہ اور اس
کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لیے جہنم
کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

دنیا میں دو قسم کے انسان پائے جاتے ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جو حق کا متلاشی رہا، اور جب حق اس کے سامنے آیا تو اس نے فوراً قبول کرلیا۔ اس کو خدا نے بڑائی دی تو اس نے تواضع کی صورت میں اس کو پیش کیا۔ اس کا احتساب کیا گیا تو اس نے عجز کی نفسیات کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے اپنے مال کو خدا کے راستہ میں استعمال کیا۔ اس نے لوگوں کے اوپر قابو پایا تو وہ ان کے لیے انصاف اور خیر خواہی کا پیکر بن گیا، وغیرہ۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ اس نے اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کی۔ ایسے ہی انسانوں کے لیے جنت کی ابدی زندگی ہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کی شخصیت منفی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس کو جب موقع ملا تو اس نے اپنی بڑائی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس کو اس نے اپنی نمود و نمائش میں خرچ کیا۔ اس نے کسی کے اوپر غلبہ پایا تو اس کی بربادی کے منصوبے بنائے، وغیرہ۔ ایسا آدمی گویا اپنے اندر شیطان کی انڈسٹری قائم کیے ہوئے ہے۔ موت کے بعد اس کی یہ پیداوار اسے گھیرے گی۔ وہ اپنے آپ کو خود اپنے بنائے ہوئے جہنم میں پھنسا ہوا پائے گا۔

موجودہ دنیا کا نظام امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا گیا ہے۔ اسی لیے سچائی یہاں صرف پیغام رسانی کی حد

تک سامنے لائی جاتی ہے۔ اگر امتحان کی مصلحت نہ ہو اور غیب کا پردہ ہٹا دیا جائے تو لوگ دیکھیں گے کہ فرشتوں سے لے کر جنات کے صالحین تک سب خدا کی خدائی کا اعتراف کر رہے ہیں اور ساری کائنات سراپا اس کی تصدیق بنی ہوئی ہے۔ سائنس دانوں کی زندگیوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں سائنس کے نام پر کچھ لوگوں نے خدا کا انکار کیا۔ مگر بڑے بڑے سائنس دانوں میں تقریباً تمام سائنس داں کسی نہ کسی طور پر خدا کے وجود کا اقرار کرتے تھے۔ مثلاً جرمن سائنس داں، پروفیسر کارل ٹرال (Carl Troll 1899-1975) نے کہا — میری زندگی کا حاصل بحیثیت سائنٹسٹ اور جغرافیہ داں یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ خالق کا شکر گزار ہو گیا ہوں:

"The fruit of my life as a scientist and geographer is to have become more and more deeply grateful to our Creator."

حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾ ع ۲ ۹ ۱۲

۲۴۔ یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو وہ جان لیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کون تعداد میں کم ہے۔ ۲۵۔ کہو کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرے رب نے اس کے لیے لمبی مدت مقرر کر رکھی ہے۔ ۲۶۔ غیب کا جاننے والا وہی ہے۔ وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ ۲۷۔ سوا اس رسول کے جس کو اس نے پسند کیا ہو، تو وہ اس کے آگے اور پیچھے محافظ لگا دیتا ہے۔ ۲۸۔ تاکہ اللہ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں اور وہ ان کے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس نے ہر چیز کو گن رکھا ہے۔

اللہ نے دنیا کو پیدا کرنے کے بعد یہاں انسان کو آباد کیا، اور پیغمبر اور داعیوں کے ذریعے یہ انتظام فرمایا کہ انسانوں کے پاس مسلسل طور پر ایسے افراد آئیں، جو انسان کو بتائیں کہ خالق کا مقصدِ تخلیق (creation plan) کیا ہے۔ یہ انتظام اس لیے کیا گیا ہے، تاکہ انسان کو پیشگی طور پر پوری بات معلوم ہو جائے، اور وہ اس کے مطابق زندگی گزار کر جنت کے انعام کا اپنے آپ کو مستحق بنائے۔ حق کا داعی بظاہر ایک عام انسان ہوتا ہے اس لیے وہ لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں جن کے اوپر اس کی دعوت کی زد پڑ رہی ہو۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ داعیِ حق کے خلاف کارروائی خود خدا کے خلاف کارروائی ہے۔ داعیِ حق خدا کا نمائندہ ہوتا ہے، وہ خدا کی جانب سے لوگوں کے اوپر خدا کی حجت قائم کرتا ہے۔ سورہ النساء میں ہے: رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ

عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (4:165)۔ یعنی اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت (excuse) باقی نہ رہے۔ اب کون ہے جو خدا کے مشن کے خلاف کارروائی کر کے کامیاب ہو۔

۷۳۔ سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾
نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ
رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ
قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿۵﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اے کپڑے میں لپٹنے والے۔ ۲۔ رات میں قیام کر مگر تھوڑا حصہ۔ ۳۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کردو۔ ۴۔ یا اس سے کچھ بڑھا دو، اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ۵۔ ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔

''ٹھہر ٹھہر کر پڑھو'' کا مطلب یہ ہے کہ مفہوم پر دھیان دیتے ہوئے پڑھو۔ جب آدمی ایسا کرے تو قاری اور قرآن کے درمیان ایک دوطرفہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ قرآن اس کے لیے ایک الٰہی خطاب ہوتا ہے اور اس کا دل ہر آیت پر اس خطاب کا جواب دیتا چلا جاتا ہے۔ جب قرآن میں اللہ کی بڑائی کا ذکر آتا ہے تو قاری کا پورا وجود اس کی بڑائی کے احساس سے دب جاتا ہے۔ جب قرآن میں خدا کے احسانات بتائے جاتے ہیں تو اس کو سوچ کر قاری کا دل خدا کے شکر سے بھر جاتا ہے۔ جب قرآن میں خدا کی پکڑ کا بیان ہوتا ہے تو قاری اس کو پڑھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ جب قرآن میں کوئی حکم بتایا جاتا ہے تو قاری کے اندر یہ جذبہ مستحکم ہوتا ہے کہ وہ اس حکم کو اختیار کر کے اپنے رب کا فرماں بردار بنے۔

''بھاری قول'' سے مراد انذار کا وہ حکم ہے جو اگلی سورہ المدثر آیت 3 میں آرہا ہے (قُمْ فَأَنْذِرْ)۔ یعنی آخرت کے مسئلہ سے لوگوں کو آگاہ کردے۔ یہ کام بلاشبہ اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس کے لیے داعی کو بے آمیز حق پر کھڑا ہونا پڑتا ہے، خواہ وہ تمام لوگوں کے درمیان اجنبی بن جائے۔ اس کو لوگوں کی ایذاؤں کو برداشت کرنا پڑتا ہے تا کہ اس کے اور مخاطبین کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ آخر وقت تک باقی رہے۔ اس کو یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو صبر اور اعراض کا پابند کرنا پڑتا ہے۔ تا کہ کسی بھی حال میں اس کی داعیانہ حیثیت مجروح نہ ہونے پائے۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ
قِيْلًا ؕ﴿۶﴾ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ؕ﴿۷﴾

۶۔ بے شک رات کا اٹھنا سخت روندتا ہے اور بات ٹھیک نکلتی ہے۔ ۷۔ بے شک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے۔ ۸۔ اور اپنے رب کا نام یاد

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ﴿٨﴾ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿٩﴾ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿١٠﴾ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿١١﴾ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿١٢﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٣﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿١٤﴾

کرو اور اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ سب سے الگ ہو کر۔ ۹۔ وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، پس تم اس کو اپنا کارساز بنالو۔ ۱۰۔ اور لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔ اور بھلی طرح ان سے الگ ہو جاؤ۔ ۱۱۔ اور جھٹلانے والے خوش حال لوگوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو اور ان کو تھوڑی ڈھیل دے دو۔ ۱۲۔ ہمارے پاس، بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے۔ ۱۳۔ اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے۔ ۱۴۔ جس دن زمین اور پہاڑ ہلنے لگیں گے اور پہاڑ ریت کے پھسلتے ہوئے تودے ہو جائیں گے۔

اس آیت میں أشد وطأ کا لفظ قیامِ لیل کی نسبت سے آیا ہے۔ یعنی اس سے نفس روندا جاتا ہے، اور اقوم قیلا کا تعلق فہم کلام سے ہے۔ یعنی اس سے آدمی اس قابل بنتا ہے کہ وہ کلام کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھ سکے۔ یہ بات بظاہر پیغمبر اسلام کے بارے میں آئی ہے۔ تاہم پیغمبر کی اتباع کے اعتبار سے اس کا تعلق پوری امت سے ہے۔ اس میں پیغمبر کے حوالے سے پوری امت کے لیے رزق کا سامان موجود ہے۔

قرآن کی اس آیت میں وطأ شدید کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام رات کے وقت دیر تک کھڑے ہو کر عبادت کرتے تھے، اس سے آپ کے اوپر شدید بوجھ پڑتا تھا، گویا کہ آپ کا جسم روندا جا رہا ہے۔ اس وطأ شدید کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے آپ کے اندر قول اقوم کی صلاحیت پیدا ہوتی تھی۔ اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ جسمانی تعب آدمی کے لیے ایک قسم کا زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس سے آدمی کی سوچ بیدار رہوتی ہے۔ اس سے آدمی کے دماغ کی کھڑکیاں کھلتی ہیں۔ اس سے آدمی کے اندر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت جاگتی ہے۔ غالباً اس وطأ شدید میں دوسرے وہ دینی اعمال بھی شامل ہیں، جن میں آدمی کو شدید تعب کا تجربہ ہو۔ جو گویا آدمی کی شخصیت کو رونڈ ڈالے۔ جس میں آدمی کا یہ حال ہو کہ اس کی شخصیت گویا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس گئی ہے۔ اگر ایسا ہو تو وہ آدمی کے اندر اعلیٰ فہم کی صلاحیت پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

''سبح طویل'' سے مراد دعوتی سرگرمی ہے، یعنی دعوت و تبلیغ کی مجاہدانہ مصروفیت۔ بے آمیز حق کی دعوت لے کر اٹھنا مشکل ترین مہم کے لیے اٹھنا ہے۔ ایسا شخص پورے ماحول میں ایک غیر مطلوب شخص بن جاتا ہے۔

ایسی حالت میں حق کا داعی جس واحد ہستی کو اپنا مونس اور کارساز پاتا ہے وہ اس کا خدا ہے۔ وہ نہ صرف دل میں اپنے خدا کو یاد کرتا رہتا ہے بلکہ وہ رات کے وقتوں میں بھی اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ رات کا وقت فراغت کا وقت ہے۔ رات کے سناٹے میں اس کا زیادہ موقع ہوتا ہے کہ آدمی پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔ دعوت حق کے کٹھن راستہ میں داعی کا اصل ہتھیار یہی ہے۔

تبتل کا مطلب نفسیاتی تبتل ہے، نہ کہ راہبانہ زندگی اختیار کرنا۔ یعنی، اللہ رب العالمین کو اپنا سول کنسرن (sole concern) بنانا، اس سے حب شدید کا تعلق قائم کرنا، خدارخی زندگی (God-oriented life) اختیار کرنا، وغیرہ (تبتل قلبك عما سوى ربك تبتيلا فتبتل لله تعالى) تفسیر المظہری، جلد 10، صفحہ 110۔ آج کی زبان میں اس کو ڈسٹریکشن (distraction) سے دور رہنا کہا جا سکتا ہے۔ انسان کے لیے سچائی سے انحراف کا سب سے بڑا سبب ڈسٹریکشن ہوتا ہے۔

سچے داعی کا یہ طریقہ ہے کہ اس کو مدعو کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مدعو سے نہیں الجھتا، بلکہ وہ خدا کی طرف دوڑتا ہے۔ وہ آخری حد تک اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچاتا ہے۔ اور ردعمل کی نفسیات سے بلند ہو کر کام کرنا ہی وہ واحد لازمی شرط ہے جو کسی شخص کو حقیقی معنوں میں حق کا داعی بناتی ہے۔

ہجر جمیل کے لفظی معنیٰ ہیں — خوبصورتی کے ساتھ چھوڑنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں ستانے والوں کے ساتھ حسن اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ ان کے معاملہ میں تمہارا طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مثبت ردعمل کا طریقہ ہونا چاہیے۔ تم کو چاہیے کہ اُن کے معاملہ میں درگزر کرو، اور اُن کے برے انداز کے مقابلہ میں تم اُن کے ساتھ اچھا انداز اختیار کرو۔ ہجر جمیل (حسن اعراض) بظاہر دوسرے کے مقابلہ میں ہوتا ہے مگر اُس کا تعلق خود اپنی ذات سے ہے۔ مومن آخری حد تک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے اندر اعلیٰ اسلامی احساس ہمیشہ زندہ رہے۔ کسی بھی حال میں اُس کے اندر کمی (erosion) نہ ہونے پائے۔ صبر اور حسن اعراض مومن کے لیے ایک خود حفاظتی تدبیر ہے۔ یہ اپنے آپ کو اس سے بچانا ہے کہ اُس کے سینے میں غیر مومنانہ نفسیات کی پرورش ہونے لگے۔

ہجر جمیل کی کوئی ایک لگی بندھی صورت نہیں۔ حالات کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ تاہم جو صورت بھی اختیار کی جائے وہ سوچے سمجھے منصوبہ کی بنیاد پر ہوگی، نہ کہ بلا سوچے سمجھے ردعمل کی حیثیت سے۔ اس کا بنیادی مقصد اعراض کرنا ہوگا، نہ کہ اُلجھ جانا۔ وہ ہمیشہ امن کے اصول پر ہوگی، نہ کہ تشدد کے اصول پر۔ اس کے پیچھے کبھی بھی نفرت اور انتقام کا جذبہ نہیں ہوگا بلکہ صرف یہ جذبہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح حسن تدبیر کے ذریعہ معاملہ کو ٹال دیا جائے تاکہ مومنانہ زندگی کی گاڑی معمول کے مطابق اپنے مطلوب رُخ پر چلنے لگے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ فَعَصَىٰ

۱۵۔ ہم نے تمھاری طرف ایک رسول بھیجا ہے، تم پر گواہ بنا کر، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔ ۱۶۔ پھر فرعون نے رسول کا کہا

فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾
فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ
الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۖۗ ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ
وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ
ع شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ع ﴿۱۹﴾

نہ مانا تو ہم نے اس کو پکڑا سخت پکڑنا۔ ۱۷۔ پس اگر تم نے انکار کیا تو تم اس دن کے عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کردے گا۔ ۱۸۔ جس میں آسمان پھٹ جائے گا، بے شک اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ ۱۹۔ یہ ایک نصیحت ہے، پس جو چاہے اپنے رب کی طرف راہ اختیار کرلے۔

پیغمبر کا آنا حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ یہی فیصلہ پہلے موسیٰ اور فرعون کے درمیان ہوا تھا۔ پھر یہی فیصلہ پیغمبر اسلام اور قریش کے درمیان ہوا۔ جو لوگ دنیا میں خدا کے داعی کے آگے نہ جھکیں وہ اپنے لیے یہ خطرہ مول لے رہے ہیں کہ آخرت میں انھیں خدا کے عذاب کے آگے جھکنا پڑے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ
الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ
مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ
اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ
مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ
وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ
فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ۖۗ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا
تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ
اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ
ع اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ع ﴿۲۰﴾

۲۰۔ بے شک تمھارا رب جانتا ہے کہ تم دوتہائی رات کے قریب یا آدھی رات یا ایک تہائی رات قیام کرتے ہو، اور ایک گروہ تمھارے ساتھیوں میں سے بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ ٹھہراتا ہے، اس نے جانا کہ تم اس کو پورا نہ کرسکو گے پس اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب قرآن سے پڑھو جتنا تم کو آسان ہو۔ اس نے جانا کہ تم میں بیمار ہوں گے اور کتنے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں زمین میں سفر کریں گے، اور دوسرے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ پس اس میں سے پڑھو جتنا تم کو آسان ہو، اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض دو اچھا قرض۔ اور جو بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے یہاں موجود پاؤ گے۔ وہ بہتر ہے اور ثواب میں زیادہ، اور اللہ سے معافی مانگو، بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

تیسیر کے لفظی معنی ہیں، آسان کرنا۔ یہاں تیسیر کا لفظ ابتدائی مفہوم کے لحاظ سے تہجد کی قرأت کے لیے ہے۔ مگر اپنے توسیعی مفہوم کے لحاظ سے اس کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے۔ یعنی

زندگی کے ہر معاملہ میں آسان اور قابلِ عمل طریقہ اختیار کرنا۔

دین میں جو فرض اعمال ہیں وہ عام انسان کی استطاعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مقرر کیے گئے ہیں۔مگر یہ فرائض صرف لازمی حدود کو بتاتے ہیں۔اس لازمی حد کے آگے بھی مطلوب اعمال ہیں۔مگر وہ نوافل ہیں۔مثلاً پنج وقتہ نمازوں کے بعد تہجد، زکوۃ کے بعد مزید انفاق، وغیرہ۔یہ آدمی کے اپنے حوصلے کا امتحان ہے کہ وہ کتنا زیادہ عمل کرتا ہے اور آخرت میں کتنا زیادہ انعام کا مستحق بنتا ہے۔حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو(أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللهِ أدومها وَإِنْ قَلَّ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 6099۔

۷۴۔سُوۡرَۃُ الۡمُدَّثِّر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾ وَثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ ۪ۙ﴿۴﴾ وَالرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ ۪ۙ﴿۵﴾ وَ لَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَکۡثِرُ ۪ۙ﴿۶﴾ وَ لِرَبِّکَ فَاصۡبِرۡ ؕ﴿۷﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اے کپڑے میں لپٹنے والے۔ ۲۔ اُٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ ۳۔اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ ۴۔اور اپنے کپڑے کو پاک رکھ۔ ۵۔اور گندگی کو چھوڑ دے۔ ۶۔اور ایسا نہ کرو کہ احسان کرو اور بہت بدلہ چاہو۔ ۷۔اور اپنے رب کے لیے صبر کرو۔

اس دنیا میں اصل پیغمبرانہ کام انذار ہے۔یعنی آخرت میں پیش آنے والے سنگین مسئلہ سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے، جس کا دل اللہ کی بڑائی سے لبریز ہو۔جو اچھے اخلاق کا مالک ہو۔جو ہر قسم کی برائی سے دور ہو۔جو بدلہ کی امید کے بغیر نیکی کرے۔جو دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں پر یک طرفہ صبر کرسکے۔

ان آیات کی روشنی میں یہ اصول ملتا ہے کہ حالات کے لحاظ سے صرف انھی احکام پر عمل کرو جو ممکن ہیں۔یعنی جو کام نتیجہ رخی ہو، اس کی طرف توجہ دو۔بقیہ معاملات کو مستقبل کے لیے چھوڑ دو۔یہ گویا پانچ نکاتی پروگرام تھا جو ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔اگرچہ اس وقت مکہ میں اس کے سوا بہت سے مسائل تھے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ، اس وقت جن کاموں کے لیے نتیجہ خیز جدو جہد ممکن ہے، ان پر محنت کرو، اور جن کاموں میں بروقت نتیجہ خیز عمل ممکن نہیں ہے ان سب کو انتظار کے خانہ میں ڈال دو۔یہ اصول فرد (individual) کے لیے بھی ہے، اور اجتماع (society) کے لیے بھی۔

انذار سے مراد وہی چیز ہے، جس کو دعوت الی اللہ کہا جاتا ہے۔تکبیر رب یہ ہے کہ آدمی کا دل اور دماغ

اللہ کی عظمت کو شعوری طور پر دریافت کرے۔ اس کا دل اللہ کی عظمت کے احساس سے تڑپ اٹھے۔ اپنے چھوٹا ہونے اور اللہ کے بڑا ہونے کا عرفان اس کو انسان اصلی (man cut to size) بنادے، یعنی متواضع انسان۔ اللہ کی عظمت کا اعتراف اس کی زبان پر جاری ہوجائے۔ اور دعوت کی شکل میں وہ اپنی اس دریافت کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے والا بن جائے۔ اسی کے ساتھ یہاں دعوت کا طریقہ (method) بھی بتادیا گیا ہے۔ وہ طریقہ ہے رُجز کے معاملے کو نظر انداز کرتے ہوئے دعوت کا کام کرنا۔ رُجز کا لفظی مطلب گندگی ہے۔ پیغمبر اسلام حنفاء میں سے تھے، انھوں نے اس پوری مدت میں کوئی غیر اخلاقی کام نہیں کیا، کبھی کسی قسم کی گندگی کے فعل یا بُری عادت میں مبتلا نہیں ہوئے۔ پھر گندگی چھوڑنے کا مطلب کیا ہے۔ یہاں رُجز اپنے لفظی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس معنی میں ہے کہ ایسے فعل سے اعراض کرو، جو باعتبارِ نتیجہ رجز تک پہنچنے والا ہو۔ امام رازی نے اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: كُلّ مَا يُؤَدِّي إِلَى الرُّجْزِ فَاهْجُرْهُ (تفسیر الرازی، جلد 30، صفحہ 699)۔ یعنی ہر وہ چیز جو رجز تک پہنچانے والی ہو، اس کو چھوڑ دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں رُجز کا لفظ باعتبارِ نتیجہ (in terms of result) ہے۔ یعنی جو چیز بظاہر غلط نہ ہو، لیکن نتیجہ کے اعتبار سے وہ غلط انجام تک پہنچانے والی ہو، اس کو چھوڑ دو۔ اسی طرح یہ بھی کہ رکاوٹ والی چیزوں سے نہ الجھتے ہوئے اپنا کام جاری رکھو۔ یعنی مسائل اور مواقع کو ایک دوسرے سے ڈی لنک (delink) کرو، اور مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کرو۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ﴿٨﴾ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ﴿١٠﴾ ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ﴿١١﴾ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ﴿١٢﴾ وَبَنِينَ شُهُودًا ﴿١٣﴾ وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا ﴿١٤﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ﴿١٥﴾ كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ﴿١٦﴾ سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ﴿١٧﴾

۸۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا۔ ۹۔ تو وہ بڑا سخت دن ہوگا۔ ۱۰۔ منکروں پر آسان نہ ہوگا۔ ۱۱۔ چھوڑ دو مجھ کو اور اس شخص کو جس کو میں نے پیدا کیا اکیلا۔ ۱۲۔ اور اس کو بہت سامال دیا۔ ۱۳۔ اور پاس رہنے والے بیٹے۔ ۱۴۔ اور سب طرح کا سامان اس کے لیے مہیا کردیا۔ ۱۵۔ پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اس کو اور زیادہ دوں۔ ۱۶۔ ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔ ۱۷۔ عنقریب میں اس کو ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔

جو آدمی اپنے آپ کو اس حال میں پاتا ہے کہ اس کے پاس مال بھی ہے اور ساتھیوں کی فوج بھی، اس کے اندر جھوٹا اعتماد پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ موجودہ دنیا میں جس طرح میرے احوال درست ہیں اسی طرح وہ آخرت میں بھی درست رہیں گے۔ مگر قیامت کے آتے ہی ساری صورت حال بدل جائے گی۔ وہ شخص جو دنیا میں ہر طرف آسانیاں دیکھ رہا تھا، وہ قیامت کے دن اپنے آپ کو ناقابل عبور دشواریوں کے درمیان گھرا ہوا پائے گا۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾
ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ
عَبَسَ وَ بَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾
فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ
اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾

۱۸۔ اس نے سوچا اور بات بنائی۔ ۱۹۔ پس وہ ہلاک ہوا، اس نے کیسی بات بنائی۔ ۲۰۔ پھر وہ ہلاک ہو، اس نے کیسی بات بنائی۔ ۲۱۔ پھر اس نے دیکھا۔ ۲۲۔ پھر اس نے تیور چڑھائے اور منہ بنایا۔ ۲۳۔ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔ ۲۴۔ پھر بولا یہ تو محض ایک جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ ۲۵۔ یہ تو بس آدمی کا کلام ہے۔

حق کو ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ تکبر ہے۔ جو لوگ ماحول میں بڑائی کا درجہ حاصل کرلیں وہ حق کا اعتراف اس لیے نہیں کرتے کہ اس کا اعتراف کرنے سے ان کی بڑائی ختم ہوجائے گی۔ اپنے اس عدم اعتراف کو چھپانے کے لیے وہ مزید یہ کرتے ہیں کہ داعی کے کلام میں عیب نکالتے ہیں۔ وہ داعی پر الزام لگا کر اس کی حیثیت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا
سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَ لَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ
لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ وَ مَا جَعَلْنَآ
اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّ مَا جَعَلْنَا
عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اِيْمَانًا وَّ لَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَ لِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا
مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ
يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ
اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾ ع ۳۱ ۱۵

۲۶۔ میں اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کروں گا۔ ۲۷۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے دوزخ۔ ۲۸۔ نہ باقی رہنے دے گی اور نہ چھوڑے گی۔ ۲۹۔ کھال جھلس دینے والی۔ ۳۰۔ اس پر ۱۹ فرشتے ہیں۔ ۳۱۔ اور ہم نے دوزخ کے کارکن صرف فرشتے بنائے ہیں۔ اور ہم نے ان کی جو گنتی رکھی ہے وہ صرف منکروں کو جانچنے کے لیے، تاکہ یقین حاصل کریں وہ لوگ جن کو کتاب عطا ہوئی۔ اور ایمان والے اپنے ایمان کو بڑھائیں اور اہل کتاب اور مومنین شک نہ کریں، اور تاکہ جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے اور منکر لوگ کہیں کہ اس سے اللہ کی کیا مراد ہے۔ اس طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور تیرے رب کے لشکر کو صرف وہی جانتا ہے، اور یہ تو صرف سمجھانا ہے لوگوں کے واسطے۔

جہنم کے احوال جو قرآن میں بتائے گئے ہیں وہ سب ان دیکھی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہنم میں 19 فرشتوں کا ہونا بھی اسی نوعیت کی چیز ہے۔ آدمی اگر موشگافی کرے تو یہ چیزیں اس کے شبہات میں اضافہ کریں گی۔ لیکن اگر مجمل ایمان کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس قسم کی باتوں سے آدمی کے خوفِ آخرت میں اضافہ ہوگا۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝٣٢ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝٣٣
وَالصُّبْحِ إِذَآ أَسْفَرَ ۝٣٤ إِنَّهَا لَإِحْدَى
الْكُبَرِ ۝٣٥ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ۝٣٦ لِمَن شَآءَ
مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۝٣٧ كُلُّ نَفْسٍ
بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝٣٨ إِلَّآ أَصْحَٰبَ
الْيَمِينِ ۝٣٩ فِى جَنَّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ۝٤٠
عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۝٤١ مَا سَلَكَكُمْ فِى
سَقَرَ ۝٤٢ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝٤٣
وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝٤٤ وَكُنَّا
نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ ۝٤٥ وَكُنَّا نُكَذِّبُ
بِيَوْمِ الدِّينِ ۝٤٦ حَتَّىٰٓ أَتَىٰنَا
الْيَقِينُ ۝٤٧ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَٰعَةُ
الشَّٰفِعِينَ ۝٤٨

۳۲۔ ہرگز نہیں، قسم ہے چاند کی۔ ۳۳۔ اور رات کی جب کہ وہ جانے لگے۔ ۳۴۔ اور صبح کی جب وہ روشن ہوجائے۔ ۳۵۔ یقیناً دوزخ بڑی چیزوں میں سے ہے۔ ۳۶۔ انسان کے لیے ڈراوا۔ ۳۷۔ ان کے لیے جو تم میں سے آگے کی طرف بڑھے یا پیچھے کی طرف ہٹے۔ ۳۸۔ وہ شخص اپنے اعمال کے بدلے میں رہن ہے۔ ۳۹۔ دائیں والوں کے سوا۔ ۴۰۔ وہ باغوں میں ہوں گے، پوچھتے ہوں گے۔ ۴۱۔ مجرموں سے۔ ۴۲۔ تم کو کیا چیز دوزخ میں لے گئی۔ ۴۳۔ وہ کہیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔ ۴۴۔ اور ہم غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ ۴۵۔ اور ہم بحث کرنے والوں کے ساتھ بحث کرتے تھے۔ ۴۶۔ اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ ۴۷۔ یہاں تک کہ وہ یقینی بات ہم پر آگئی۔ ۴۸۔ تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ فائدہ نہ دے گی۔

اس دنیا میں گردش کا نظام ہے۔ زمین پر ہر روز ایسا ہوتا ہے کہ یہاں رات آتی ہے اور زمین گہری تاریکی میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کے بعد دن نکلتا ہے اور ہر چیز دوبارہ سورج کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ اسی کی وجہ سے چاند کی تاریخیں بدلتی ہیں اور زمین پر باری باری رات اور دن آتے ہیں۔ یہ گردش اور تبدیلی کا نظام گویا ایک اشارہ ہے کہ اسی طرح موجودہ دور بدل کر آخرت کا دور آئے گا۔ جو لوگ اس نظام پر غور کریں، وہ چاہیں گے کہ ''رات'' کے آنے سے پہلے اپنے ''دن'' کو استعمال کرلیں۔ وہ جہنم والے اعمال سے بھاگیں گے اور جنت والے اعمال کو اختیار کریں گے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کی اصل حقیقت چھپی ہوئی ہے، آخرت میں ہر آدمی کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے

گی۔ آج ہماری زندگی ’’رات‘‘ کے دور سے گزر رہی ہے، موت کے بعد ہم ’’دن‘‘ کے دور میں پہنچ جائیں گے۔آج آدمی ایک قسم کے پردہ میں ہے۔ وہ دلیل پر قائم نہ ہونے کے باوجود خوش نما الفاظ بول کر لوگوں کو اپنے بارے میں غلط فہمی میں ڈالے ہوئے ہے۔مگر جب آخرت کا سورج طلوع ہوگا تو وہ تاریکی کے ان تمام پردوں کو پھاڑ دے گا۔اس وقت ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں دکھائی دینے لگے گا۔

’’ہر انسان اپنے کیے میں پھنسا ہوا ہے‘‘ سورہ الانعام میں ہے: لوگ خود اپنے کیے کے حوالے کر دے جائیں گے (6:70)۔ سورہ الزمر میں ہے: قیامت میں لوگوں سے کہا جائے گا کہ چکھو جو تم کماتے تھے (39:24)۔ یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ یہ تمھارا اپنا کیا ہے جو تمھاری طرف لوٹایا جائے گا (إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ إِلَيْكُمْ) حلیۃ الاولیاء، جلد 5، صفحہ 125۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی ایک انڈسٹری (کارخانہ) ہے۔انڈسٹری کیا ہے۔انڈسٹری وہ نظام ہے جس کے اندر خام مال ڈالا جائے اور پھر وہ تیار شدہ سامان کی صورت میں برآمد ہو۔مومن ربانی اعمال کی انڈسٹری ہے اور غیر مومن شیطان کی انڈسٹری۔ ہر آدمی جو کچھ ہے اس کے مطابق وہ اپنی پیداوار کا ڈھیر لگا رہا ہے۔دنیا میں جو انسان کانٹوں کی فصل اگاتا ہے وہ اپنے آپ کو کانٹوں میں پھنسا ہوا پائے گا۔اس کے برعکس، جو انسان ربانی عمل کی فصل اگاتا ہے وہ جنت کے باغوں میں ابدی زندگی کا مستحق ٹھہرے گا۔

کون لوگ جہنم میں جائیں گے۔آیات (42-46) میں چار چیزوں کو جہنم میں جانے کا سبب بتایا گیا ہے: نمازی نہ ہونا، محتاجوں کا سہارا نہ بننا، حق کی دعوت کے خلاف فضول بحثیں نکالنا، روزِ جزا کو نہ ماننا۔اس کا برعکس انجام ان لوگوں کا ہوگا جنھوں نے اپنی زندگیوں میں نماز کو داخل کیا ہو، کم زور اور بے سہارا لوگ جن کے دلوں میں اپنے لیے نرم گوشہ پاتے ہوں، جن کا سینہ حق کی آواز کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا ہو۔ جو یہ سمجھ کر دنیا میں زندگی گزارتے ہوں کہ ایک روز ان کو عالم الغیب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ایسے لوگوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔وہ خدا کے باغوں میں ہمیشہ کے لیے داخل کر دے جائیں گے۔

نماز کیا ہے۔اللہ کے آگے جھک جانا، اللہ کو اپنا سب کچھ بنا لینا۔جب آدمی اس طرح اپنے رب کو پالیتا ہے تو اس کی پوری زندگی اور اس کے تمام معاملات میں اللہ کا رنگ اس طرح چھا جاتا ہے کہ کسی وقت اس سے جدا نہیں ہوتا۔اسی کا ایک انتہائی ظاہرہ نماز ہے۔

’’محتاج کو کھانا کھلانا‘‘ اس تعلق کی ایک علامت ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے ہونی چاہیے۔بندۂ مومن بےتابانہ طور پر چاہتا ہے کہ اس کا خدا اس کا سہارا بنے۔اس لیے اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ اس سے مختلف سلوک کرے جو وہ اپنے رب سے اپنے لیے چاہتا ہے۔

دعوتِ حق کا ظہور دراصل خدا کا ظہور ہے۔اس کے خلاف ایسی بحثیں نکالنا جس سے لوگ حق کے بارے میں شبہ میں پڑ جائیں، اللہ کے نزدیک بدترین جرم ہے۔جن لوگوں نے حق کی دعوت کے خلاف بحث وتکرار کی، انھوں نے گویا خدا کے ساتھ زبان درازی کی جرأت کی۔ایسے لوگوں پر خدا سخت غضب ناک ہوتا ہے۔وہ خدا کی رحمتوں سے سب سے زیادہ دور کر دیے جاتے ہیں۔ روزِ جزا کا یقین تمام نیکیوں کا سب سے بڑا محرک

ہے۔ اور روز جزا پر یقین نہ ہونا تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔ جنت اس کے لیے ہے جو دنیا میں اس طرح رہے گویا کہ وہ آخرت کو دیکھ رہا ہے اور جہنم اس کے لیے ہے جو دنیا میں اس طرح زندگی گزارے گویا کہ آخرت کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿٥٥﴾ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾ ع

۴۹۔ پھر ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں۔ ۵۰۔ گویا کہ وہ وحشی گدھے ہیں۔ ۵۱۔ جو شیر سے بھاگے جا رہے ہیں۔ ۵۲۔ بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے نوشتے دئے جائیں۔ ۵۳۔ ہرگز نہیں، بلکہ یہ لوگ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ ۵۴۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے۔ ۵۵۔ پس جس کا جی چاہے، اس سے نصیحت حاصل کرے۔ ۵۶۔ اور وہ اس سے نصیحت حاصل نہیں کریں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ وہی ہے جس سے ڈرنا چاہیے اور وہی ہے بخشنے کے لائق۔

نصیحت خواہ کتنی ہی مدلل ہو، سننے والے کے لیے وہ اسی وقت موثر بنتی ہے جب کہ وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ اگر سننے والا سنجیدہ نہ ہو تو نصیحت اس کے دل میں نہیں اترے گی، جو دلیل ایک سنجیدہ انسان کو تڑپا دیتی ہے وہ صرف اس کی لایعنی بحثوں میں اضافہ کرنے کا باعث بنے گی۔

اللہ اپنے دین کی پیغام بری کے لیے ہمیشہ ایسے شخص کو چنتا ہے جس کے جاننے والے اس کو ایک پسندیدہ شخص کی حیثیت سے جانتے ہوں۔ جس کی صلاحیت اور صالحیت کی وجہ سے اس کی قوم کے لوگوں نے اس کے بارے میں اونچی اونچی امیدیں باندھ رکھی ہوں (ہود، 11:62)۔ مگر جب وہ حق کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو اچانک لوگ اس سے بدک جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت بے آمیز حق کی دعوت ہوتی ہے، اور بے آمیز حق انسان کے لیے ہمیشہ سب سے زیادہ مبغوض چیز رہا ہے۔ پیغمبر کی بے آمیز دعوت ان تمام لوگوں کو متوحش کر دیتی ہے جو ملاوٹی دین یا خود ساختہ مذہب کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کیے ہوئے تھے۔

انسان کی گمراہی کبھی یہ نہیں رہی ہے کہ وہ ناحق کا علم بردار بن کر کھڑا ہوا ہو۔ انسان کی گمراہی یہ ہے کہ وہ حق کے ساتھ ناحق کو ملائے ہوئے ہو۔ وہ حق کا نام لے مگر اسی کے ساتھ اپنی عقیدتوں اور وفاداریوں کو اس نے ناحق کے لیے خاص کر رکھا ہو۔ پیغمبر کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو ہر ایک کو اس میں اپنا حقیقی چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ کسی کو اپنی شخصیت کا بت گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کسی کو اپنے دلائل کا غبارہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی کو

اپنی شان وشوکت بے رونق ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کسی کو ایسا لگتا ہے کہ اگر اس نے اس حق کو مان لیا تو اس کو اپنے بنے بنائے ڈھانچہ کو اجاڑ دینا پڑے گا، وغیرہ۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بظاہر دعوت کو پسند کرتے ہیں۔ مگر ان کا کیس کنڈیشننگ کا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ داعی کے اعلیٰ اسلوب اور اس کے پیغام کی عمومی کشش کی وجہ سے اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ مگر کوئی نہ کوئی وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ وہ کسی چیز کو اپنے مزاج کے خلاف پا کر حق کی دعوت سے دور ہوجاتے ہیں۔ یہ وہ چند اسباب ہیں، جن کی بنا پر لوگ داعیٔ حق کی آواز سے اس طرح بدک جاتے ہیں جیسے کوئی زندہ شیر اچانک سامنے کھڑا ہوجائے تو لوگ اس کے وجود کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوں۔

اللہ نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے۔ اس لیے حق کو یہاں ریاضیات (mathematics) کی مانند قطعی استدلال یا ناقابلِ انکار انداز میں پیش نہیں کیا جاتا ہے۔ ریاضیات میں دو اور دو مل کر یقینی طور پر چار ہوجاتے ہیں۔ مگر حالتِ امتحان کی وجہ سے موجودہ دنیا میں حق پر شبہ کا پردہ ڈال دیا گیا، اس لیے حق سے صرف وہی لوگ نصیحت حاصل کر پاتے ہیں، جو ڈی کنڈیشنڈ ذہن (de-conditioned mind) کے حامل ہوں۔

۷۵۔ سُوْرَةُ الْقِيَامَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝١ وَلَآ اُقْسِمُ
بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝٢ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ
اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝٣ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى
اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝٤ بَلْ يُرِيْدُ
الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝٥ يَسْـَٔلُ
اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝٦ فَاِذَا بَرِقَ
الْبَصَرُ ۝٧ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝٨ وَجُمِعَ
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝٩ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ
يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝١٠ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝١١
اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ۝١٢ يُنَبَّؤُا

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔
۲۔ اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے
والے نفس کی۔ ۳۔ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ
ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے۔ ۴۔ کیوں
نہیں، ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے
پور پور تک درست کردیں۔ ۵۔ بلکہ انسان چاہتا
ہے کہ وہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے۔ ۶۔ وہ
پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا۔ ۷۔ پس
جب آنکھیں خیرہ ہوجائیں گی۔ ۸۔ اور چاند بے
نور ہوجائے گا۔ ۹۔ اور سورج اور چاند اکھٹا
کردئے جائیں گے۔ ۱۰۔ اس دن انسان کہے گا
کہ کہاں بھاگوں۔ ۱۱۔ ہرگز نہیں، کہیں پناہ
نہیں۔ ۱۲۔ اس دن تیرے رب ہی کے پاس

يُنَبَّؤُا الۡاِنۡسَانُ يَوۡمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰى نَفۡسِهٖ بَصِيۡرَةٌ ۙ﴿۱۴﴾ وَّ لَوۡ اَلۡقٰى مَعَاذِيۡرَهٗ ﴿۱۵﴾

ٹھکانا ہے۔ ۱۳۔اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ ۱۴۔ بلکہ انسان خود اپنے آپ کو جانتا ہے۔ ۱۵۔ چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔

انسان کے اندر پیدائشی طور پر یہ شعور موجود ہے کہ وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرے۔ وہ عین اپنی فطرت کے تحت یہ چاہتا ہے کہ برائی کرنے والے کو سزا ملے اور بھلائی کرنے والے کو انعام دیا جائے۔ یہی وہ شعور ہے جس کو قرآن میں نفس لوامہ کہا گیا ہے۔ یہ نفس لوامہ عالم آخرت کے حقیقی ہونے کی ایک نفسیاتی شہادت ہے۔ اس داخلی شہادت کے بعد جو شخص اس کے تقاضے پورے نہ کرے، وہ گویا اپنی ہی مانی ہوئی بات کا انکار کر رہا ہے۔

نفس لوامہ وہی چیز ہے جس کو آج کی زبان میں ضمیر کہا جاتا ہے۔ یہ صلاحیت آدمی کے اندر آزادانہ طور پر کام کرتی ہے۔ وہ اس کی عقل اور اس کی خواہش دونوں سے غیر متاثر رہ کر بار بار اس کو یہ بتاتی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ہر موقع پر انسان کو آواز دیتی ہے۔ لیکن یہ رہنمائی خاموش زبان (unspoken language) میں ہوتی ہے۔ یہ ضمیر گویا خدا کی عدالت ہے۔ یہ فطری الارم اپنے صحیح وقت پر بجتا ہے، اور انسان یقینی طور پر اس کو سنتا ہے۔ وہ پیشگی طور پر انسان کو اس کی غلطیوں سے خبردار کرتا ہے۔ وہ بار بار اس کو بتاتا ہے کہ اس کے لیے درست رویہ کیا ہے اور غلط رویہ کیا ہے۔ اس کے باوجود انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح زندگی گزارتا ہے جیسے کہ قیامت کا دن آنے والا نہیں ہے جب کہ اس سے اس کے قول وعمل کا حساب لیا جائے گا۔

جو آدمی اس قسم کا رویہ اختیار کرے وہ گویا خود اپنی فطرت کا انکار کر رہا ہے۔ خود اس کا اندر کا ضمیر اس کو آواز دیتا ہے مگر وہ اس کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ضمیر پیشگی طور پر اس کے حق میں خدائی فیصلہ کا اعلان ہے۔ آدمی اگر اس آواز پر کان لگائے تو وہ موت سے پہلے ہی یہ جان لے گا کہ موت کے بعد اس کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔

لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَ قُرۡاٰنَهٗ ۚ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ۚ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾

۱۶۔ تم اس کے پڑھنے پر اپنی زبان نہ چلاؤ تاکہ تم اس کو جلدی سیکھ لو۔ ۱۷۔ ہمارے اوپر ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا۔ ۱۸۔ پس جب ہم اس کو سنائیں تو تم اس سنانے کی پیروی کرو۔ ۱۹۔ پھر ہمارے اوپر ہے اس کو بیان کر دینا۔

خدا کے دین میں ذمہ داری بقدر استطاعت کا اصول ہے۔ استطاعت سے زیادہ کا مکلف بنانا اللہ کا طریقہ نہیں۔ یہ اصول فرد (individual) کے لیے بھی ہے، اور اجتماع (society) کے لیے بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم پر وحی اترتی تو آپ اس کو لینے میں جلدی فرماتے۔ اس سے آپ کو منع کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں مزید فرمایا کہ قرآن کا جو حصہ اتر چکا ہے اور جو تم کو مخاطب بنا رہا ہے، اس پر ساری توجہ صرف کرو، نہ کہ قرآن کے اس بقیہ حصہ پر جو ابھی اترا نہیں اور جس نے ابھی تم کو مخاطب نہیں بنایا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس وقت جس حصۂ قرآن کا ایک شخص مکلف ہے اسی پر اس کو سب سے زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ جس حصۂ قرآن کا ایک شخص مکلف نہ ہو اس کے پیچھے دوڑنا ''عجلت'' ہے جو قرآنی حکمت کے سراسر خلاف ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُوْنَ
الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾
اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ
بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾
كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَ قِيْلَ مَنْ ۜ
رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ
السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ
الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾

۲۰۔ ہر گز نہیں، بلکہ تم چاہتے ہو جو جلد آئے۔ ۲۱۔ اور تم چھوڑتے ہو جو دیر میں آئے۔ ۲۲۔ کچھ چہرے اس دن بارونق ہوں گے۔ ۲۳۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ ۲۴۔ اور کچھ چہرے اس دن اداس ہوں گے۔ ۲۵۔ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا معاملہ کیا جائے گا۔ ۲۶۔ ہر گز نہیں، جب جان حلق تک پہنچ جائے گی۔ ۲۷۔ اور کہا جائے گا کہ کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا۔ ۲۸۔ اور وہ گمان کرے گا کہ یہ جدائی کا وقت ہے۔ ۲۹۔ اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔ ۳۰۔ وہ دن ہوگا تیرے رب کی طرف جانے کا۔

آخرت کی طرف سے غفلت کی وجہ ہمیشہ صرف ایک ہوتی ہے، اور وہ حبِّ عاجلہ ہے۔ یعنی اپنے عمل کا فوری نتیجہ چاہنا۔ آخرت کے لیے عمل کا نتیجہ دیر میں ملتا ہے۔ اس لیے آدمی اس کو نظر انداز کر دیتا ہے، اور دنیا کے لیے عمل کا نتیجہ فوراً ملتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے آدمی اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی پر آخر کار موت طاری ہوتی ہے اور اس کی تمام کامیابیوں کو باطل کر دیتی ہے۔ مگر کوئی شخص اس سے سبق نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ خود اس کی موت کا لمحہ آجائے اور وہ اس سے سبق لینے کی مہلت چھین لے۔

اس حقیقت پر غور کیا جائے تو آدمی اس نتیجے تک پہنچے گا کہ خالق کے تخلیقی نقشہ (creationplan) کے مطابق ہمارا مطلوب آج کی دنیا میں حاصل ہونے والا نہیں۔ انسان تمام مخلوقات میں استثنائی طور پر کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ فطرت کی زبان میں انسان کے سوال کا جواب ہے۔ فطرت کا یہ تقاضا بتاتا ہے کہ انسان کا مطلوب کل کے دورِ حیات میں ملنے والا ہے، آج کے دورِ حیات میں اس کا ملنا فطرت کے قانون کے مطابق مقدر ہی نہیں۔

فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰى ۙ﴿۳۱﴾ وَ لٰكِنْ كَذَّبَ وَ
تَوَلّٰى ۙ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ؕ﴿۳۳﴾
اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۙ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ؕ﴿۳۵﴾
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ؕ﴿۳۶﴾ اَلَمْ
يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۙ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً
فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۙ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ
الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ؕ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ
عَلٰۤى اَنْ يُّحْـيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾ ع ۲/۱۸

۳۱۔ تو اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی۔ ۳۲۔ بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا۔ ۳۳۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں کی طرف چلا گیا۔ ۳۴۔ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے۔ ۳۵۔ پھر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے۔ ۳۶۔ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ بس یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ ۳۷۔ کیا وہ ٹپکائی ہوئی منی کی ایک بوند نہ تھا۔ ۳۸۔ پھر وہ علقہ ہو گیا، پھر اللہ نے بنایا، پھر اعضا درست کیے۔ ۳۹۔ پھر اس کی دو قسمیں کر دیں، مرد اور عورت۔ ۴۰۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے۔

اللہ کی تخلیقات میں اور زندگی کے تجربات میں رزقِ ربانی کے آئٹم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ انسان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تمام قسم کے ڈسٹریکشن سے بچائے، تا کہ وہ خدائی نشانیوں (divine signs) سے مسلسل اپنے لیے ایمانی رزق حاصل کرتا رہے۔ مثلاً انسان ابتداءً اپنی ماں کی پیٹ میں ایک بوند کی مانند داخل ہوتا ہے۔ پھر وہ بڑھ کر علقہ (جونک) کی مانند ہو جاتا ہے۔ پھر مزید ترقی ہوتی ہے اور اس کے اعضاء اور نقوش بنتے ہیں۔ پھر وہ مرد یا عورت بن کر باہر آتا ہے۔ یہ تمام حیرت ناک تصرفات انسان کی کوشش کے بغیر ہوتے ہیں۔ پھر قدرت کا جو نظام روزانہ یہ عجائب ظہور میں لا رہا ہے اس کے لیے موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا بنا دینا کیا مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچائی کو ماننے میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ لوگوں کی انانیت اور غیر سنجیدگی (insincerity) ہے، نہ کہ دلائل و قرائن کی کمی۔

۷۶۔ سُوْرَۃُ الدَّھْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ
يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴿۱﴾ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ
مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖۗ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا
بَصِيْرًا ﴿۲﴾ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ
اِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کبھی انسان پر زمانہ میں ایک وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ ۲۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط بوند سے پیدا کیا، ہم اس کو پلٹتے رہے۔ پھر ہم نے اس کو سننے والا، دیکھنے والا بنا دیا۔ ۳۔ ہم نے اس کو راہ سمجھائی، چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا انکار کرنے والا۔

قرآن ساتویں صدی عیسوی میں اترا۔ اس وقت ساری دنیا میں کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ رحم مادر میں انسان کا آغاز ایک مخلوط نطفہ سے ہوتا ہے۔ یہ صرف بیسویں صدی کی بات ہے کہ انسان نے یہ جانا کہ انسان اور (حیوان) کا ابتدائی نطفہ دو اجزاء سے مل کر بنتا ہے۔ ایک، عورت کا بیضہ (Ovum) اور دوسرے، مرد کا نطفہ (Sperm)۔ یہ دونوں خوردبینی اجزاء جب باہم مل جاتے ہیں، اس وقت رحم مادر میں وہ چیز بننا شروع ہوتی ہے، جو بالآخر انسان کی صورت اختیار کرتی ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے قرآن میں نطفہ امشاج (مخلوط نطفہ) کا لفظ آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔

قرآن میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہ استثنائی مثالیں واضح طور پر قرآن کو خدا کی کتاب ثابت کرتی ہیں۔ اور جب یہ بات ثابت ہوجائے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے تو اس کے بعد قرآن کا ہر بیان مجرد قرآن کا بیان ہونے کی بنیاد پر درست ماننا پڑے گا۔

اللہ نے انسان کو زمین پر آزاد مخلوق کی حیثیت سے آباد کیا ہے۔ یہ آزادانہ حیثیت نہ فرشتوں کو حاصل ہے، اور نہ سورج اور چاند کو۔ اور پھر اس کو راہ دکھادی گئی— بے اعترافی (ناشکری) کی راہ اور اعتراف (شکر گزاری) کی راہ۔ اعتراف ایک ملکوتی مزاج ہے، اور بے اعترافی ایک شیطانی مزاج۔ اعتراف سے آدمی کے اندر تواضع (modesty) کا مزاج پیدا ہوتا ہے، اور بے اعترافی سے اِس کے برعکس غیر متواضع مزاج پیدا ہوتا ہے۔ آدمی ہر لمحہ اِن دو امکانات کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک رویہ اختیار کرنے سے وہ متواضع انسان بن جاتا ہے، جو کسی انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ اور دوسرا رویہ اختیار کرنے سے وہ ایک غیر متواضع انسان بن جاتا ہے، جو کسی انسان کے لیے سب سے بُری صفت ہے۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کا مطلوب صرف ایک ہے، اور وہ ہے پوری انسانی تاریخ سے صالح افراد کا انتخاب۔ وہ افراد جو اپنے ذہن کو استعمال کریں، اور پھر وہ خود دریافت کردہ معرفت پر کھڑے ہوں۔ یہ افراد وہ ہیں جو ہر قسم کے ہنگاموں کے باوجود اپنے آپ کو آزادی کے صحیح استعمال پر قائم رکھیں، جو اپنی ذہنی قوتوں کو استعمال کرتے ہوئے اور نبیوں کی ہدایت سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ کو دریافت کریں اور اپنی زندگی کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق بنائیں۔ اِسی قسم کے صالح افراد اللہ کو مطلوب ہیں۔ اللہ اپنے خصوصی انتظام کے تحت پوری تاریخ میں مسلسل طور پر ایسے ہی صالح افراد کا انتخاب کر رہا ہے۔

پوری کائنات اللہ رب العالمین کی مجبورانہ حمد کررہی ہے۔ اس معاملے میں انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے آزادانہ طور پر خدائی سچائی کو دریافت کرے، اور کسی جبر کے بغیر وہ خدا کی حمد کرے، اور الحمد للہ کلچر کو اپنائے۔ یہی خود دریافت کردہ معرفت (self-discovered realization) وہ چیز ہے جو انسان کو ابدی جنت میں داخلے کا مستحق بناتی ہے۔ اب یہ انسان کے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص ناشکری کا طریقہ اختیار کرے اس کے لیے آخرت میں ابدی ناکامی ہے۔ اور جو شخص شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرے اس کے لیے جنت کی نعمتیں۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا
وَّسَعِيْرًا ۝٤ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ
كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝٥ عَيْنًا يَّشْرَبُ
بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝٦
يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ
مُسْتَطِيْرًا ۝٧ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ
مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝٨ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ
لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا
شُكُوْرًا ۝٩ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا
قَمْطَرِيْرًا ۝١٠ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ
وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝١١ وَجَزٰىهُمْ بِمَا
صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝١٢ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى
الْاَرَآىِٕكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا
زَمْهَرِيْرًا ۝١٣ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ
قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝١٤ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ
مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ۝١٥
قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝١٦

۴۔ ہم نے منکروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ۵۔ نیک لوگ ایسے پیالے سے پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ ۶۔ اس چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے۔ وہ اس کی شاخیں نکالیں گے۔ ۷۔ وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں اور ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی۔ ۸۔ اور اس کی محبت پر کھانا کھلاتے ہیں محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو۔ ۹۔ ہم جو تم کو کھلاتے ہیں تو اللہ کی خوشی چاہنے کے لیے۔ ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکرگزاری۔ ۱۰۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ ۱۱۔ پس اللہ نے ان کو اس دن کی سختی سے بچالیا۔ اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمائی۔ ۱۲۔ اور ان کے صبر کے بدلہ میں ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا کیا۔ ۱۳۔ ٹیک لگائے ہوں گے وہ اس میں تختوں پر، اس میں نہ وہ گرمی سے دوچار ہوں گے اور نہ سردی سے۔ ۱۴۔ جنت کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے اور اس کے پھل ان کے بس میں ہوں گے۔ ۱۵۔ اور ان کے آگے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ ۱۶۔ شیشے چاندی کے ہوں گے، جن کو بھرنے والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا۔

دنیا میں انسان کو آزاد پیدا کیا گیا، اور پھر اس کو راہ دکھا دی گئی، ناشکری کی راہ اور شکرگزار زندگی کی راہ۔ اب یہ انسان کے اپنے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص ناشکری کا طریقہ اختیار کرے اس کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔ اور جنت کی نعمتیں ان کو ملیں گی، جو صبر اور شکر کی روش پر قائم رہیں۔ ان کا حال یہ ہو جائے گویا کہ وہ موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور اس کے زیر اثر سارا کام کر رہے ہیں۔ وہ جب کوئی عہد کریں، خواہ ایمان کا عہد ہو یا قول و قرار کا عہد، تو وہ اس کو اس

طرح پورا کریں جیسے وہ بے پناہ یقین کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر انھوں نے اس کو پورا نہ کیا تو جہنم کی آگ انھیں پکڑے گی۔ ان کا ایمان باللہ ان پر جن باتوں کو لازم کر رہا ہے اور ان کا عہد ان کو جن چیزوں کا پابند بنا رہا ہے، ان کو وہ اس طرح پورا کریں جیسے وہ ایک ایسی سرحد پر کھڑے ہوئے ہیں جہاں ان کے لیے دو میں سے صرف ایک چیز کے انتخاب کا سوال ہے— قول و قرار کے تقاضوں کو پورا کرنا یا جانتے بوجھتے اپنے آپ کو جہنم کے الاؤ میں گرا دینا۔ آخرت کے احساس ہی کے تحت ان کے اندر جو دوسری خصوصیت پیدا ہوتی ہے وہ بندوں کے ساتھ مہربانی ہے۔ مثلاً وہ اپنے لیے اپنے رب سے مہربانی چاہتے ہیں اس لیے وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ مہربانی کرتے ہیں۔ وہ بھوکے کو کھلاتے ہیں تاکہ خدا ان کو کھلائے، وہ کمزوروں کو سہارا دیتے ہیں تاکہ خدا ان کو سہارا دے۔ وہ انسانوں کی طرف سے ڈالی ہوئی تکلیفوں کو معاف کرتے ہیں تاکہ خدا ان کی غلطیوں کو معاف کر دے۔ یہ کام وہ بدلہ اور انسانوں کی تعریف حاصل کرنے کے لیے نہیں کرتے۔ اس کا محرک تمام تر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کے دن جب وہ خدا کے سامنے تمام کمزوروں سے زیادہ کمزور حالت میں کھڑے ہوں، اس وقت ان کا خدا ان کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے بلکہ ان کی مدد فرمائے۔ دنیا کی زندگی میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک ان کے لیے دراصل ایک عملی دعا ہوتی ہے۔

دنیا کی زندگی دراصل صبر کا امتحان ہے۔ صبر کی ایک قسم وہ ہے جو باہر کی دنیا کے خلاف ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی ماحول کی رکاوٹوں کا خاموش مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دینی سفر کو جاری رکھتا ہے۔ مگر سب سے بڑا صبر وہ ہے جو خود اپنے خلاف پیش آتا ہے۔ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آنے کی وجہ سے اپنے بھائی کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، ایسے موقع پر منفی جذبات کی روش سے اپنے کو روکنا پڑتا ہے۔ کسی کی ترقی اور مقبولیت کو دیکھ کر اس کے خلاف حسد جاگ اٹھتا ہے۔ اس وقت دشمن جیسی بے رحمانہ نظر سے اپنے دل کو ٹٹولنا پڑتا ہے تاکہ حسد اور رقابت کے بیج کو نکال پھینکا جائے۔ کبھی آدمی ایک شخص کو اچھا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا نیازمندانہ انداز ہوتا ہے اور کبھی ایک شخص کو برا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا تنقید و احتساب کا مزاج ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اپنے آپ کو کھینچ کر ایسے مقام پر لے جانا پڑتا ہے جہاں وہ تعریف و تنقید سے بلند ہو کر دوسروں کے بارے میں رائے قائم کر سکے۔ دوسروں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کے بغیر کوئی شخص دین دار نہیں بنتا اور انسان کا خیر خواہی پر قائم ہونا صبر کے بغیر ممکن نہیں۔

وَ يُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا
زَنۡجَبِيۡلًا ۚ﴿۱۷﴾ عَيۡنًا فِيۡهَا تُسَمّٰى
سَلۡسَبِيۡلًا ﴿۱۸﴾ وَ يَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ
مُّخَلَّدُوۡنَ ۚ اِذَا رَاَيۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُؤۡلُؤًا

۱۷۔ اور وہاں ان کو ایک اور جام پلایا جائے گا جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ ۱۸۔ یہ اس میں ایک چشمہ ہے جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ۱۹۔ اور ان کے پاس پھر رہے ہوں گے ایسے بچے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔ تم انھیں دیکھو تو

مَّنۡثُوۡرًا ﴿۱۹﴾ وَ اِذَا رَاَیۡتَ ثَمَّ رَاَیۡتَ
نَعِیۡمًا وَّ مُلۡکًا کَبِیۡرًا ﴿۲۰﴾ عٰلِیَہُمۡ ثِیَابُ
سُنۡدُسٍ خُضۡرٌ وَّ اِسۡتَبۡرَقٌ ۫ وَّ حُلُّوۡۤا
اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّۃٍ ۚ وَ سَقٰہُمۡ رَبُّہُمۡ شَرَابًا
طَہُوۡرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ ہٰذَا کَانَ لَکُمۡ جَزَآءً
وَّ کَانَ سَعۡیُکُمۡ مَّشۡکُوۡرًا ﴿۲۲﴾ ع

سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دئے گئے ہیں۔ ۲۰۔ اور تم جہاں دیکھو گے، وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ ۲۱۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے اور دبیز ریشم کے کپڑے بھی۔ اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور ان کا رب ان کو پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ ۲۲۔ بے شک یہ تمھارا صلہ ہے اور تمھاری کوشش مقبول ہوئی۔

یہ برتر جنت کا بیان ہے جہاں زیادہ برتر ایمان کا ثبوت دینے والے لوگ بسائے جائیں گے۔ اس جنت کے باشندوں کو شاہانہ نعمتیں حاصل ہوں گی۔ وہ کون لوگ ہیں جن کی کوششیں آخرت میں سعی مشکور کا درجہ حاصل کریں گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ہولنا کیوں کا اتنا شدید احساس رکھتے ہوں کہ وہ ان کے اوپر ایک قسم کا آسمانی محاسب بن کر چھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کل کی دنیا کے لیے جینا، دکھائی دینے والے ''جنت اور جہنم'' کو نظر انداز کر کے نہ دکھائی دینے والے جنت وجہنم کے لیے سرگرم ہونا ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اس میں ہر وقت آدمی کے صبر کا امتحان ہے۔ اس راہ میں کہیں ملتے ہوئے فائدوں سے محرومی کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی خارجی مجبوری کے بغیر خود سے اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی بے حرمتی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کہیں زیادہ کو چھوڑ کر کم پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ کہیں قدرت رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں کو روک لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی مقبولیت کو دفن کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ کہیں شہرت اور استقبال کے راستے کو چھوڑ کر گم نامی کے طریقے کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ غرض جنت کی طرف سفر کا سارا معاملہ صبر وبرداشت کا معاملہ ہے۔ جو اپنے آپ کو خدا کی خاطر دبانے اور کچلنے کے لیے تیار نہ ہو وہ کبھی اس راہ کو طے نہیں کر سکتا: قَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَیۡلَکُمۡ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّمَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَ لَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوۡنَ (28:80)۔ جن لوگوں کو علم ملا تھا انھوں نے کہا، تمہارا برا ہو، اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ اور یہ انھیں کو ملتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِیۡلًا ﴿ۚ۲۳﴾
فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَ لَا تُطِعۡ مِنۡہُمۡ اٰثِمًا
اَوۡ کَفُوۡرًا ﴿ۚ۲۴﴾ وَ اذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ بُکۡرَۃً

۲۳۔ ہم نے تم پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے۔ ۲۴۔ پس تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو اور ان میں سے کسی گناہ گار یا ناشکر کی بات نہ مانو۔ ۲۵۔ اور اپنے رب کا نام صبح وشام یاد کرو۔

وَّ اَصِيۡلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّيۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهٗ وَسَبِّحۡهُ
لَيۡلًا طَوِيۡلًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوۡنَ
الۡعَاجِلَةَ وَ يَذَرُوۡنَ وَرَآءَهُمۡ يَوۡمًا
ثَقِيۡلًا ﴿۲۷﴾ نَحۡنُ خَلَقۡنٰهُمۡ وَ شَدَدۡنَاۤ
اَسۡرَهُمۡ ۚ وَ اِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَهُمۡ
تَبۡدِيۡلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ ۚ فَمَنۡ شَآءَ
اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوۡنَ
اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا
حَكِيۡمًا ﴿۳۰﴾ يُّدۡخِلُ مَنۡ يَّشَآءُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ
وَالظّٰلِمِيۡنَ اَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۳۱﴾ ع ۲

۲۶۔ اور رات کو بھی اس کو سجدہ کرو۔ اور اس کی تسبیح کرو رات کے طویل حصہ میں۔ ۲۷۔ یہ لوگ جلدی ملنے والی چیز کو چاہتے ہیں اور انھوں نے چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو۔ ۲۸۔ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ہم ہی نے ان کے جوڑ بند مضبوط کیے، اور جب ہم چاہیں گے انھیں جیسے لوگ ان کی جگہ بدل لائیں گے۔ ۲۹۔ یہ ایک نصیحت ہے۔ پس جو شخص چاہے، اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرلے۔ ۳۰۔ اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ ۳۱۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے، اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

خدا سے گہرا تعلق اور صبر، یہ دونوں دعوت کی لازمی شرائط ہیں۔ جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں، وہاں دعوت بھی یقینی طور پر نہیں ہوگی۔ صبر داعی کا اخلاق ہے۔ صبر ہی کے ذریعہ وہ حالات پیدا ہوسکتے ہیں جب کہ کوئی شخص دعوتی مواقع کو استعمال کرسکے۔ جو آدمی اللہ کے لیے ناخوشگوار باتوں پر صبر کرنے کے لیے تیار نہ ہو، وہ دنیا میں داعی کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

حق کی دعوت کو نہ ماننے کے دو خاص سبب ہوتے ہیں۔ یا تو آدمی کے سامنے دنیا کا مفاد ہوتا ہے، اور مفاد سے محرومی کا اندیشہ اس کو حق کی طرف بڑھنے نہیں دیتا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ آدمی تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہو اور اس کا تکبر اس میں مانع بن جائے کہ وہ اپنے سے باہر کسی کی بڑائی کو تسلیم کرے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ دعوتِ حق کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ مگر حق کے داعی کو حکم ہے کہ وہ ان کا لحاظ کیے بغیر اپنا کام صبر کے ساتھ جاری رکھے۔

حب عاجلہ (جلدی ملنے والی چیز کی چاہت) کا مزاج پہلے بھی انسان کے اندر تھا، مگر اب وہ اتنا زیادہ عام ہوچکا ہے کہ شاید اس میں کوئی استثنا باقی نہیں رہا۔ اعلان یا اعلان کے بغیر ہر ایک کا نشانہ یہ ہے کہ ابھی اور اسی وقت (right there, right now)۔ اس نظریہ کے ماننے والوں کا کہنا یہ ہے کہ اگر اب نہیں تو کب:

If not now, when?

جو لوگ ایسا کہتے ہیں، وہ یقیناً سوچے بغیر ایسا کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ حقیقت کے اعتبار سے اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آج حاصل کرلو، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج بھی کیوں ہمارا مطلوب حاصل نہیں ہوتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان نے یہ چاہا کہ وہ اس دنیا میں اپنی خواہش (desire) کو پورا کرے، مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ ہر آدمی اپنی خواہش کو پورا کیے بغیر اس دنیا سے چلا گیا۔ اِس المیہ کا سبب صرف ایک ہے فانی دنیا میں اُس چیز کو پانے کی کوشش کرنا جو صرف آخرت کی ابدی دنیا میں ملنے والی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی شروع کرنے سے پہلے خالق کے تخلیقی نقشے کو جانے۔ اِس دنیا میں حقیقی کامیابی صرف اُس انسان کے لیے مقدر ہے جو خالق کے نقشے کے مطابق، اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

۷۷۔ سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ﴿۲﴾
وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ﴿۴﴾
فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ﴿۶﴾
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے ہواؤں کی جو چھوڑ دی جاتی ہیں۔ ۲۔ پھر وہ طوفانی رفتار سے چلتی ہیں۔ ۳۔ اور بادلوں کو اُٹھا کر پھیلاتی ہیں۔ ۴۔ پھر معاملہ کو جدا کرتی ہیں۔ ۵۔ پھر یاد دہانی ڈالتی ہیں۔ ۶۔ عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر۔ ۷۔ جو وعدہ تم سے کیا جارہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والا ہے۔

سمندر سے بھاپ اٹھ کر فضا میں جاتی ہے اور بادل بن جاتی ہے۔ ان بادلوں کو ہوائیں اڑا کر ایک طرف سے دوسری طرف لے جاتی ہیں۔ وہ ایک علاقہ میں بارش برسا کر سرسبزی کا سامان کرتی ہیں اور دوسرے علاقہ کو خشک چھوڑ دیتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا کا نظام ایک اور دوسرے کے درمیان فرق کرنے کے اصول پر قائم ہے۔ موجودہ دنیا میں اس اصول کا اظہار جزئی صورت میں ہورہا ہے اور آخرت میں اس اصول کا اظہار اپنی کامل صورت میں ہوگا۔

ہواؤں کی یہ نوعیت آدمی کے لیے یاددہانی ہے۔ ان کا کسی کے لیے رحمت اور کسی کے لیے زحمت بننا اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ موجودہ دنیا میں جب دو مختلف قسم کے انسان ہیں تو ان کے لیے خدا کا فیصلہ دو الگ الگ صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ پھر ہواؤں کی یہ نوعیت خدا کی طرف سے اتمام حجت بھی ہے۔ اس مظاہرہ کے بعد کسی کے لیے معذرت کی کوئی گنجائش نہیں۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿۸﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ
فُرِجَتْ ﴿۹﴾ وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا
الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾ لِاَيِّ يَوْمٍ
اُجِّلَتْ ﴿۱۲﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴿۱۳﴾ وَ مَآ
اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿۱۴﴾ وَيْلٌ
يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ نُهْلِكِ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾
كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيْلٌ
يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾

۸۔ پس جب ستارے بے نور ہوجائیں گے۔
۹۔اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۱۰۔اور جب
پہاڑ ریزہ ریزہ کردئے جائیں گے۔۱۱۔اور جب
پیغمبر وقتِ معین پر جمع کیے جائیں گے۔ ۱۲۔ کس
دن کے لیے وہ ٹالے گئے ہیں۔ ۱۳۔فیصلہ کے
دن کے لیے۔ ۱۴۔ اورتم کو کیا خبر کہ فیصلہ کا دن کیا
ہے۔ ۱۵۔تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے
لیے۔ ۱۶۔ کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا۔
۱۷۔ پھر ہم ان کے پیچھے بھیجتے ہیں پچھلوں کو۔
۱۸۔ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔
۱۹۔خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔

جب قیامت آئے گی تو دنیا کا موجودہ نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ جولوگ موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو زور آور سمجھتے ہیں اوراس بنا پر دعوت حق کو نظر انداز کرتے ہیں، وہ اس دن اپنے آپ کو اس حال میں پائیں گے کہ ان سے زیادہ بے زور اور کوئی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں کچھ اور لوگ ہوں گے جن کی حقیقت آخرت کے دن لوگوں کے سامنے آئے گی۔ وہ دیکھیں گے کہ ایک شخص جس کو انھوں نے دنیا کی زندگی میں اس کے معمولی حالات کی بنا پر غیر اہم سمجھا تھا وہ اپنے اندر اہمیت کا پہاڑ لیے ہوئے تھا۔ ایک شخص جس کو دنیا کی مجلسوں میں کہیں عزت کی جگہ نہیں ملی تھی وہ فرشتوں کی زیادہ باعزت مجالس میں اپنے صبح وشام کے اوقات گزار رہا تھا۔ ایک شخص جس کو وقت کے بڑوں نے رد (reject) کردیا تھا وہی وہ شخص تھا جس کو خدا کی طرف سے مقبولیت کی سند ملی ہوئی تھی ۔ایک شخص جس کو دنیا کے لوگ بے دین قرار دے کر حقارت کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے اس کا نام خدا کے یہاں دین داروں کی فہرست میں سب سے اوپر لکھا ہوا تھا۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ
قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾
فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ
يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ
الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّ

۲۰۔ کیا ہم نے تم کو ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں
کیا۔ ۲۱۔ پھر اس کو ایک محفوظ جگہ رکھا۔
۲۲۔ایک مقرر مدت تک۔ ۲۳۔ پھر ہم نے
ایک اندازہ ٹھہرایا، ہم کیسا اچھا اندازہ ٹھہرانے
والے ہیں۔ ۲۴۔ خرابی ہے اس دن جھٹلانے
والوں کی۔ ۲۵۔ کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والا نہیں
بنایا۔ ۲۶۔زندوں کے لیے اور مردوں کے لیے۔

جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾

۲۷۔اورہم نے اس میں اونچے پہاڑ بنائے اورتم کو میٹھا پانی پلایا۔ ۲۸۔اس روز خرابی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس پر غور کرنے والا اس کے آئینہ میں آخرت کو دیکھ لیتا ہے۔اگر کسی انسان کی فطرت زندہ ہے تو وہ زور کرے گی اور وہ حق کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے گا اور اگر فطرت کی چنگاری بجھ چکی ہے تو وہ حق سے دور ہو جائے گا۔مگر خدا کی دنیا میں جو لوگ حق کو جھٹلاتے ہیں ان سے بڑا مجرم اور کوئی نہیں۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ ع ۲۱

۲۹۔ چلو اس چیز کی طرف جس کو تم جھٹلاتے تھے۔ ۳۰۔چلو تین شاخوں والے سایہ کی طرف۔ ۳۱۔جس میں نہ سایہ ہے اور نہ وہ گرمی سے بچاتا ہے۔ ۳۲۔وہ انگارے برسائے گا جیسے کہ اونچا محل۔ ۳۳۔زرد اونٹوں کی مانند۔ ۳۴۔اس دن خرابی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۳۵۔یہ وہ دن ہے جس میں لوگ بول نہ سکیں گے۔ ۳۶۔اور نہ ان کو اجازت ہوگی کہ وہ عذر پیش کریں۔ ۳۷۔خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۳۸۔ یہ فیصلہ کا دن ہے۔ہم نے تم کو اور اگلے لوگوں کو جمع کرلیا۔ ۳۹۔پس اگر کوئی تدبیر ہو تو مجھ پر تدبیر چلاؤ۔ ۴۰۔خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔

آخرت کی ہولناکیاں جب سامنے آئیں گی تو انسان ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔اس وقت ان لوگوں کا بولنا بند ہو جائے گا جو دنیا میں اس طرح بولتے تھے جیسے کہ ان کے الفاظ کا ذخیرہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔اس وقت صاف نظر آئے گا کہ کون شخص ناحق پر تھا اگر چہ وہ خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو حق پرست ثابت کیے ہوئے تھا۔کون شخص اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش میں مبتلا تھا اگر چہ زبان سے وہ اللہ کا نام لیتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا

۴۱۔ بے شک ڈرنے والے سایہ میں اور چشموں میں ہوں گے۔ ۴۲۔اور پھلوں میں جو وہ چاہیں۔ ۴۳۔مزے کے ساتھ کھاؤ اور پیو۔اس عمل کے

هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٤٣ اِنَّا كَذٰلِكَ
نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ۝٤٤ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝٤٥ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ
مُّجْرِمُوْنَ ۝٤٦ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝٤٧
وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝٤٨
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝٤٩ فَبِاَيِّ
حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝٥٠ ع ٢/٢٢

بدلے میں جوتم کرتے تھے۔ ۴۴۔ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ ۴۵۔خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۶۔کھاؤ اور برت لو تھوڑے دن، بے شک تم گناہ گار ہو۔ ۴۷۔خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۸۔اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھکو تو وہ نہیں جھکتے۔ ۴۹۔خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۵۰۔اب اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔

موجودہ دنیا میں خدا کی نعمتیں وقتی طور پر امتحان کی غرض سے رکھی گئی ہیں۔آخرت میں خدا کی نعمتیں ابدی طور پر زیادہ کامل صورت میں ظاہر ہوں گی۔آج ان نعمتوں میں ہر ایک حصہ پا رہا ہے۔مگر آخرت کی اعلیٰ نعمتیں صرف ان لوگوں کا حصہ ہوں گی جنھوں نے آزادی کے حالات میں اطاعت کی۔جو اس وقت جھکے جب کہ وہ جھکنے کے لیے مجبور نہ تھے۔جو لوگ قول پر جھکیں ان کے لیے جنت ہے اور جو لوگ ویل (قیامت کی تباہی) کو دیکھ کر جھکیں ان کے لیے جہنم۔

۷۸۔سُوْرَۃُ النَّبَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١ عَنِ النَّبَاِ
الْعَظِيْمِ ۝٢ الَّذِیْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝٣
كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٤ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٥
اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝٦ وَّالْجِبَالَ
اَوْتَادًا ۝٧ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝٨ وَّ جَعَلْنَا
نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝٩ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝١٠ وَّ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
☆ ۱۔لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ۲۔اس بڑی خبر کے بارے میں۔ ۳۔جس میں وہ لوگ مختلف ہیں۔ ۴۔ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے۔ ۵۔ہرگز نہیں۔عنقریب وہ جان لیں گے۔ ۶۔کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا۔ ۷۔اور پہاڑوں کو میخیں۔ ۸۔اور تم کو ہم نے بنایا جوڑے جوڑے۔ ۹۔اور نیند کو بنایا تمھاری تکان دور کرنے کے لیے۔ ۱۰۔اور ہم نے رات کو پردہ بنایا۔ ۱۱۔اور ہم نے دن کو معاش کا وقت

جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ
سَبْعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۳﴾
وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾
لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ﴿۱۷﴾

بنایا۔ ۱۲۔اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔ ۱۳۔ اور ہم نے اس میں ایک چمکتا ہوا چراغ رکھ دیا۔ ۱۴۔اور ہم نے پانی بھرے بادلوں سے موسلا دھار پانی برسایا۔ ۱۵۔تا کہ ہم اس کے ذریعہ سے اُگائیں غلہ اور سبزی۔ ۱۶۔اور گھنے باغ۔ ۱۷۔ بے شک فیصلہ کا دن ایک مقرر وقت ہے۔

عرب کے لوگ آخرت کے منکر نہ تھے۔ البتہ وہ آخرت کی اس نوعیت کے منکر تھے جس کی انھیں قرآن میں خبر دی جا رہی تھی۔ یعنی انھیں اس باب میں شبہ تھا کہ ''محمد'' کو نہ ماننے سے وہ آخرت کے عالم میں ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔

موجودہ دنیا میں جو طبیعی واقعات ہیں وہ آخرت کے دن کی طرف اشارہ کرنے والے ہیں۔ ہماری دنیا کا حال تقاضا کرتا ہے کہ اسی کے مطابق اس کا ایک مستقبل ہو۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس عظیم آغاز کا ایک عظیم انجام آنے والا ہے۔ یہ دنیا یوں ہی بے انجام ختم ہو جانے والی نہیں۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾
وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾ وَّ
سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ اِنَّ جَهَنَّمَ
كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾
لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا
بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا ﴿۲۵﴾
جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ
حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ
شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ
نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾ ع

۱۸۔جس دن صور پھونکا جائے گا، پھر تم فوج در فوج آؤ گے۔ ۱۹۔اور آسمان کھول دیا جائے گا، پھر اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔ ۲۰۔اور پہاڑ چلا دئے جائیں گے تو وہ ریت کی طرح ہو جائیں گے۔ ۲۱۔ بے شک جہنم گھات میں ہے۔ ۲۲۔سرکشوں کا ٹھکانا۔ ۲۳۔ اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ ۲۴۔اس میں نہ وہ کسی ٹھنڈک کو چکھیں گے اور نہ پینے کی چیز کو۔ ۲۵۔مگر گرم پانی اور پیپ۔ ۲۶۔ بدلہ ان کے عمل کے موافق۔ ۲۷۔وہ حساب کا اندیشہ نہیں رکھتے تھے۔ ۲۸۔اور انھوں نے ہماری آیتوں کو بالکل جھٹلا دیا۔ ۲۹۔اور ہم نے ہر چیز کو لکھ کر شمار کر رکھا ہے۔ ۳۰۔ پس چکھو کہ ہم تمھاری سزا ہی بڑھاتے جائیں گے۔

دنیا میں سرکشی انسان کو بہت لذیذ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ وہ اس کی انا کو تسکین دیتی ہے۔ مگر انسان کی

سرکشی جب آخرت میں اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ظاہر ہوگی تو صورت حال بالکل مختلف ہوجائے گی۔ جس چیز سے آدمی دنیا میں لذت لیا کرتا تھا، اب وہ اس کے لیے ایک بھیانک عذاب بن جائے گی۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿٣١﴾ حَدَآئِقَ وَ
اَعْنَابًا ﴿٣٢﴾ وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿٣٣﴾ وَّ كَاْسًا
دِهَاقًا ﴿٣٤﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا
كِذّٰبًا ﴿٣٥﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً
حِسَابًا ﴿٣٦﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا
بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾
يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙۖ لَّا
يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ
صَوَابًا ﴿٣٨﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ
اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿٣٩﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ
عَذَابًا قَرِيْبًا ۖۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ
يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿٤٠﴾ ع ۲

۳۱۔ بے شک ڈرنے والوں کے لیے کامیابی ہے۔ ۳۲۔ باغ اور انگور۔ ۳۳۔ اور نوخیز ہم سن لڑکیاں ۳۴۔ اور بھرے ہوئے جام۔ ۳۵۔ وہاں وہ لغو اور جھوٹی بات نہ سنیں گے۔ ۳۶۔ بدلہ تیرے رب کی طرف سے ہوگا، ان کے عمل کے حساب سے۔ ۳۷۔ رحمٰن کی طرف سے جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کا رب ہے، کوئی قدرت نہیں رکھتا کہ اس سے بات کرے۔ ۳۸۔ جس دن روح اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا مگر جس کو رحمن اجازت دے، اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔ ۳۹۔ یہ دن برحق ہے، پس جو چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا بنالے۔ ۴۰۔ ہم نے تم کو قریب آجانے والے عذاب سے ڈرادیا ہے۔ جس دن آدمی اس کو دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اور منکر کہے گا، کاش میں مٹی ہوتا۔

جنت کا ماحول لغو اور جھوٹی باتوں سے پاک ہوگا۔ اس لیے جنت کی لطیف ونفیس دنیا میں بسانے کے لیے صرف وہی لوگ چنے جائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اس اہلیت کا ثبوت دیا ہو کہ وہ لغو اور جھوٹ سے دور رہ کر زندگی گزارنے کا ذوق رکھتے ہیں۔

جب قیامت آئے گی اور سارے لوگ خدا کے حضور جمع کیے جائیں گے تاکہ وہ اپنی اس کمائی کو دیکھیں جو انھوں نے اپنے آگے کے لیے کی تھی۔ اس وقت منکر اور سرکش کا یہ حال ہوگا کہ جب وہ اپنے انجام کو دیکھے گا تو کہہ اٹھے گا: ''اے کاش میں مٹی ہوتا''۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ جب آپ کا آخر وقت آگیا تو آپ کے صاحبزادے آپ کا سر اپنی ران پر رکھے ہوئے تھے حضرت عمر نے کہا: اے عبد اللہ، میرا رخسار زمین سے

ملادے (أَلْصِقْ خَدِّي بِالْأَرْضِ يَا عَبْدَ اللّٰهِ)۔ آپ کے صاحبزادے نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اپنا چہرہ زمین پر رکھ کر کہا: اے عمر تیری خرابی ہے اور تیری ماں کی خرابی ہے، اگر خدا نے مجھے معاف نہ کیا۔ اس کے بعد آپ کی وفات ہوگئی (وَيْلَكَ وَوَيْلَ أُمِّكَ يَا عُمَرُ إِنْ لَمْ يَغْفِرِ اللّٰهُ لَكَ. ثُمَّ قُبِضَ رَحِمَهُ اللّٰهُ) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 579۔

جو بات کافر کی زبان سے آخرت میں نکلے گی وہ مومن کی زبان سے اسی دنیا میں نکل رہی ہے۔ کافر موت کے بعد آنے والی دنیا میں چاہے گا کہ کاش وہ مٹی میں مل جاتا۔ مومن موت سے پہلے کی دنیا میں کہہ رہا ہے کہ مجھے مٹی میں ملادو۔ خدا جب سامنے ظاہر ہوجائے گا تو کس کی مجال ہے کہ اس سے سرکشی کرے۔ اس وقت ہر آدمی اس کے سامنے جھک جائے گا۔ مگر خدا کے لیے جھکنا صرف وہ معتبر ہے جو خدا کے سامنے آنے سے پہلے ہو۔ یہی کافر اور مومن کا فرق ہے۔ کافر اس وقت جھکے گا جب خدا کی ذات اس کے سامنے ظاہر ہوجائے۔ مگر مومن وہ انسان ہے جو اس وقت خدا کے لیے جھک جاتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔ دنیا میں لوگ خدا کے نافرمان صرف اس لیے ہیں کہ خدا آج ان کے سامنے موجود نہیں۔ جب خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ دکھائی دینے لگے تو کوئی اس کے سامنے سرکشی نہیں کر سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر آخرت میں گزرنے والا ہے وہ مومن پر اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ کافر خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑے گا۔ مومن وہ ہے جو خدا کو دیکھے بغیر ڈھ پڑے۔

۷۹۔ سُوۡرَةُ النّٰزِعٰت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝
وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۝١ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۝٢
وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۝٣ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۝٤
فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۝٥ يَوۡمَ تَرۡجُفُ
الرَّاجِفَةُ ۝٦ تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝٧ قُلُوۡبٌ
يَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝٨ اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝٩
يَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِى الۡحَافِرَةِ ۝١٠
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝١١ قَالُوۡا تِلۡكَ اِذًا

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے جڑ سے اُکھاڑنے والی ہواؤں کی۔
۲۔ اور قسم ہے آہستہ چلنے والی ہواؤں کی۔
۳۔ اور قسم ہے تیرنے والے بادلوں کی۔ ۴۔ پھر سبقت کر کے بڑھنے والوں کی۔ ۵۔ پھر معاملہ کی تدبیر کرنے والوں کی۔ ۶۔ جس دن ہلا دینے والی ہلا ڈالے گی۔ ۷۔ اس کے پیچھے ایک اور آنے والی چیز آئے گی۔ ۸۔ کتنے دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔ ۹۔ ان کی آنکھیں جھک رہی ہوں گی۔ ۱۰۔ وہ کہتے ہیں کیا ہم پہلی حالت میں پھر واپس ہوں گے۔ ۱۱۔ کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہوجائیں

كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿١٢﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ
وَّاحِدَةٌ ﴿١٣﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿١٤﴾

گے۔ ۱۲۔انھوں نے کہا کہ یہ واپسی تو بڑے گھاٹے کی ہوگی۔۱۳۔ وہ تو بس ایک ڈانٹ ہوگی۔ ۱۴۔ پھر یکا یک وہ میدان میں موجود ہوں گے۔

ہر سال دنیا میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ بظاہر ہر طرف سکون ہوتا ہے۔اس کے بعد تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ وہ بادلوں کو اڑانا شروع کرتی ہیں۔ پھر وہ بارش برساتی ہیں۔ جلد ہی بعد لوگ دیکھتے ہیں کہ جہاں خالی زمین تھی وہاں ایک نئی دنیا نکل کر کھڑی ہوگئی ہے۔فطرت کا یہ واقعہ آخرت کے امکان کو بتاتا ہے۔ یہ تمثیل کی زبان میں بتا رہا ہے کہ موجودہ دنیا کے اندر سے آخرت کی دنیا کا برآمد ہونا اتنا ہی ممکن ہے جتنا خالی زمین سے سرسبز زمین کا ظہور میں آنا۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿١٥﴾ اِذْ نَادٰىهُ
رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٦﴾ اِذْهَبْ
اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿١٧﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ
اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ
فَتَخْشٰى ﴿١٩﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿٢٠﴾
فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿٢١﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿٢٢﴾
فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿٢٣﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ
الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ
وَالْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ
يَّخْشٰى ﴿٢٦﴾ ع ۲۶

۱۵۔ کیا تم کو موسیٰ کی بات پہنچی ہے۔ ۱۶۔ جب کہ اس کے رب نے اس کو طُویٰ کی مقدس وادی میں پکارا۔ ۱۷۔ فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہوگیا ہے۔ ۱۸۔ پھر اس سے کہو، کیا تجھ کو اس بات کی خواہش ہے کہ تو درست ہوجائے۔ ۱۹۔ اور میں تجھ کو تیرے رب کی راہ دکھاؤں پھر تو ڈرے۔ ۲۰۔ پس موسیٰ نے اس کو بڑی نشانی دکھائی۔ ۲۱۔ پھر اس نے جھٹلایا اور نہ مانا۔ ۲۲۔ پھر وہ پلٹا کوشش کرتے ہوئے۔ ۲۳۔ پھر اس نے جمع کیا، پھر اس نے پکارا۔ ۲۴۔ پس اس نے کہا کہ میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔ ۲۵۔ پس اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑا۔ ۲۶۔ بے شک اس میں نصیحت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔

حقیقتِ واقعہ کا اعتراف سب سے بڑا قول ہے، اور حقیقتِ واقعہ سے مطابقت سب سے بڑا عمل۔ فرضی الفاظ بول کر حقیقی کریڈٹ لینے کی کوشش کرنا جھوٹی ہوشیاری ہے۔ بناوٹی بات حقیقتِ واقعہ کا بدل نہیں بن سکتی، خواہ اس کو کتنا ہی زیادہ خوبصورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہو۔ حقیقتِ واقعہ کا طوفان فرضی الفاظ کو اس طرح بہالے جاتا ہے جس طرح کوئی آندھی تنکوں کے ڈھیر کو۔ فرعون اور اس طرح کے دوسرے منکرین کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ جو شخص حقیقت واقعہ کا انکار کرے وہ لازماً اس کی سزا پا کر رہتا ہے۔ یہ تاریخی مثالیں آدمی کی عبرت کے لیے کافی ہیں۔ مگر کوئی عبرت کی بات صرف اس شخص کے لیے عبرت کا ذریعہ بنتی ہے جو اندیشہ کی نفسیات رکھتا ہو۔ جو کسی عمل کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھے، نہ کہ صرف اس کے آغاز کے اعتبار سے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾

۲۷۔ کیا تمھارا بنانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا، اللہ نے اس کو بنایا۔ ۲۸۔ اس کی چھت کو بلند کیا پھر اس کو درست بنایا۔ ۲۹۔ اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔ ۳۰۔ اور زمین کو اس کے بعد پھیلایا۔ ۳۱۔ اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔ ۳۲۔ اور پہاڑوں کو قائم کر دیا۔ ۳۳۔ سامانِ حیات کے طور پر تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے۔

کائنات کی صورت میں جو واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے وہ اتنا زیادہ بڑا ہے کہ اس کے بعد ہر دوسرا واقعہ اس سے چھوٹا ہو جاتا ہے۔ پھر جس دنیا میں بڑے واقعہ کا ظہور ممکن ہو وہاں چھوٹے واقعہ کا ظہور کیوں ممکن نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں قرآن کی یہ خبر کہ انسان کو دوبارہ پیدا ہونا ہے، ایک ایسی خبر ہے جس کو قابل فہم بنانے کے لیے پہلے ہی سے بہت بڑے پیمانے پر معلوم اسباب موجود ہیں۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿٤٢﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿٤٣﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿٤٤﴾ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿٤٥﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿٤٦﴾ ع

۳۴۔ پھر جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا۔ ۳۵۔ جس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا۔ ۳۶۔ اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کر دی جائے گی۔ ۳۷۔ پس جس نے سرکشی کی۔ ۳۸۔ اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ ۳۹۔ تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا۔ ۴۰۔ اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا۔ ۴۱۔ تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔ ۴۲۔ وہ قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب کھڑی ہوگی۔ ۴۳۔ تم کو کیا کام اس کے ذکر سے۔ ۴۴۔ یہ معاملہ تیرے رب کے حوالے ہے۔ ۴۵۔ تم تو بس ڈرانے والے ہو اس شخص کو جو ڈرے۔ ۴۶۔ جس روز یہ اس کو دیکھیں گے تو گویا وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے، مگر ایک شام یا اس کی صبح۔

آدمی دو چیزوں کے درمیان ہے۔ ایک موجودہ دنیا جو سامنے ہے۔ اور دوسری آخرت کی دنیا جو غیب میں

ہے۔غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی کی سرگرمیوں کا رخ موجودہ دنیا کی طرف ہو جائے۔اس کو اپنے مادی مفادات سے دلچسپی ہو، وہ اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگا ہوا ہو۔وہ انھیں چیزوں کے لیے متحرک ہوتا ہو جس میں اس کے دنیوی معاملات درست ہوتے ہوں، جس میں اس کی شخصیت چمکتی ہو، جس میں اس کے احساس برتری کو تسکین ملتی ہیں۔

اس کے برعکس، اسلامی زندگی آخرت رخی زندگی (Akhirat-oriented life) ہوتی ہے۔مومن کی دلچسپیوں کا مرکز آخرت ہوتا ہے۔وہ ہمیشہ اخروی مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔اس کو خدا کے یہاں سرخ رو ہونے کا شوق رہتا ہے۔اس کی توجہ، اس کی تمنائیں، اس کی سرگرمیاں سب آخرت کے گھر کو بنانے کی طرف لگی رہتی ہیں۔مختصر یہ کہ غیر مومن دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور مومن آخرت میں۔غیر مومن مرنے کے بعد اپنی آخرت کو دیکھے گا اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے۔مگر یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو اپنے نفس کی خواہشوں پر کنٹرول کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم کے صحیفہ میں تھا: عقلمند پر لازم ہے جب تک اس کی عقل مغلوب نہ ہو جائے کہ اس کے لیے دن میں کچھ مخصوص اوقات ہوں۔وہ وقت جب کہ وہ اپنے رب سے باتیں کرے۔وہ وقت جب کہ وہ اپنا محاسبہ کرے۔وہ وقت جب کہ وہ خدا کی کاریگری میں غور کرے۔اور وہ وقت جب کہ وہ اپنی کھانے پینے کی ضرورت کے لیے کوشش کرے۔اور عقلمند پر لازم ہے کہ وہ صرف تین رخ پر اپنی کوشش جاری رکھے— آخرت کا سامان حاصل کرنے کے لیے یا ضروری معاش کمانے کے لیے یا اس لذت کے لیے جو اس کے لیے حرام نہیں کی گئی۔اور عقلمند پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو جاننے والا (بصیر) ہو۔وہ اپنے معاملہ کی طرف متوجہ رہنے والا ہو۔وہ اپنی زبان کا نگراں ہو۔اور اس کے عمل میں سے اتنا کلام کافی ہے کہ وہ بہت کم بولے الا یہ کہ اس کا کوئی فائدہ ہو (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔

۸۰۔سُوْرَۃُ عَبَسَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ② وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ③ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ⑤

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ترش رو ہوا اور بے رخی برتی۔ ۲۔اس بات پر کہ اندھا اس کے پاس آیا۔ ۳۔اور تم کو کیا خبر کہ وہ سدھر جائے۔ ۴۔یا نصیحت کو سنے تو نصیحت اس کے کام آئے۔ ۵۔جو شخص بے پروائی برتتا ہے۔

فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۗ ﴿٦﴾ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا
يَزَّكّٰى ۗ ﴿٧﴾ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ ﴿٨﴾
وَ هُوَ يَخْشٰى ۙ ﴿٩﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ ﴿١٠﴾
كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ ﴿١١﴾ فَمَنْ شَآءَ
ذَكَرَهٗ ۘ ﴿١٢﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ ﴿١٣﴾
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ ﴿١٤﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ ﴿١٥﴾
كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۗ ﴿١٦﴾

۶۔تم اس کی فکر میں پڑتے ہو۔ ۷۔ حالاں کہ تم پر
کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ نہ سدھرے۔ ۸۔اور
جو شخص تمھارے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے۔ ۹۔اور
وہ ڈرتا ہے۔ ۱۰۔تو تم اس سے بے پروائی برتتے
ہو۔ ۱۱۔ ہرگز نہیں ، یہ تو ایک نصیحت ہے۔
۱۲۔پس جو چاہے یاددہانی حاصل کرے۔
۱۳۔وہ ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں۔
۱۴۔ بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں۔ ۱۵۔کاتبوں کے
ہاتھوں میں۔ ۱۶۔معزز، نیک۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مکہ میں قریش کے سرداروں سے دعوتی گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتوم وہاں آگئے۔ انہوں نے کہا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، عَلِّمْنِي مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ (تفسیر الطبری، جلد 24، صفحہ 103)۔ یعنی، اے اللہ کے رسول، اللہ نے جو کچھ آپ کو سکھایا ہے اس میں سے مجھے سکھائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے موقع پر ایک اندھے شخص کا آنا ناگوار گزرا۔ اس پر یہ آیتیں اتریں۔ ان آیات میں بظاہر خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر حقیقۃً اس واقعہ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ اللہ کی نظر میں ان بڑوں کی کوئی قیمت نہیں جو دین سے پھرے ہوئے ہوں۔ اللہ کے نزدیک قیمتی انسان صرف وہ ہے جس کے اندر خشیت والی روح ہو، خواہ بظاہر وہ ایک اندھا آدمی دکھائی دیتا ہو۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۗ ﴿١٧﴾ مِنْ اَيِّ
شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۗ ﴿١٨﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ
فَقَدَّرَهٗ ۙ ﴿١٩﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۙ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ
اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ ﴿٢١﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۗ ﴿٢٢﴾
كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۗ ﴿٢٣﴾ فَلْيَنْظُرِ
الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۙ ﴿٢٤﴾ اَنَّا صَبَبْنَا
الْمَآءَ صَبًّا ۙ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ

۱۷۔ برا ہو آدمی کا، وہ کیسا ناشکر ہے۔ ۱۸۔اس کو
اللہ نے کس چیز سے پیدا کیا ہے۔ ۱۹۔ایک بوند
سے۔ اس کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے اندازہ
ٹھہرایا۔ ۲۰۔ پھر اس کے لیے راہ آسان کردی۔
۲۱۔ پھر اس کو موت دی، پھر اس کو قبر میں لے گیا۔
۲۲۔ پھر جب وہ چاہے گا اس کو دوبارہ زندہ کردے
گا۔ ۲۳۔ ہرگز نہیں، اس نے پورا نہیں کیا جس
کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔ ۲۴۔ پس انسان کو
چاہیے کہ وہ اپنے کھانے کو دیکھے۔ ۲۵۔ہم نے
پانی برسایا اچھی طرح۔ ۲۶۔ پھر ہم نے زمین کو

شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضۡبًا ﴿۲۸﴾ وَّ زَیۡتُوۡنًا وَّ نَخۡلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلۡبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاکِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّکُمۡ وَ لِاَنۡعَامِکُمۡ ﴿۳۲﴾

اچھی طرح پھاڑا۔ ۲۷۔ پھر اگائے اس میں غلے۔ ۲۸۔ اور انگور اور ترکاریاں۔ ۲۹۔ اور زیتون اور کھجور۔ ۳۰۔ اور گھنے باغ۔ ۳۱۔ اور پھل اور سبزہ۔ ۳۲۔ تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے سامانِ حیات کے طور پر۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو زندہ رہنے کے لیے مسلسل خوراک کی ضرورت ہے۔ اس خوراک کا انتظام ہماری زمین پر نہایت وسیع پیمانہ پر کیا گیا ہے، جب کہ اس انتظام میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ اس خوراک کا ایک انتظام وہ ہے جو ہمارے لیے زرعی پیداوار کی صورت میں کیا گیا ہے، زمین پر پانی کا انتظام اور پانی کے ذریعہ طرح طرح کے غلے اور میوے کا پیدا ہونا۔ اس زرعی پیداوار کی حیثیت ہمارے لیے براہ راست خوراک کی ہے۔ دوسری خوراک وہ ہے جس کو بالواسطہ طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی حیوانات کا زمینی پیداوار کو کھا کر اس کو گوشت کی صورت میں تبدیل کرنا۔

اس نعمت کا تقاضا ہے کہ انسان دنیا میں خدا پرست بن کر رہے۔ یہ خدا پرستی جو انسان سے مطلوب ہے اس کا محرک اصلاً شکر ہے۔ انسان اپنی تخلیق کو سوچے اور اپنے گردوپیش کے قدرتی انتظامات پر غور کرے تو لازماً اس کے اندر اپنے رب کے بارے میں شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس شکر اور احسان مندی کے جذبہ کے تحت جس عمل کا ظہور ہوتا ہے اسی کا نام خدا پرستی ہے — آخرت کی عزتیں اور کامیابیاں صرف ایسے ہی لوگوں کا حصہ ہوں گی۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ یَوۡمَ یَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِیۡهِ ﴿۳۴﴾ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیۡهِ ﴿۳۵﴾ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیۡهِ ﴿۳۶﴾ لِکُلِّ امۡرِیًٔ مِّنۡهُمۡ یَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ یُّغۡنِیۡهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِکَةٌ مُّسۡتَبۡشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَ وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ عَلَیۡهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرۡهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکَفَرَةُ الۡفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ ع ۵

۳۳۔ پس جب وہ کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور برپا ہوگا۔ ۳۴۔ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے۔ ۳۵۔ اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے۔ ۳۶۔ اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ۳۷۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن ایسا فکر ہوگا جو اس کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔ ۳۸۔ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے۔ ۳۹۔ ہنستے ہوئے، خوشی کرتے ہوئے۔ ۴۰۔ اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اُڑ رہی ہوگی۔ ۴۱۔ ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ ۴۲۔ یہی لوگ منکر ہیں، ڈھیٹ ہیں۔

سچائی کو نہ ماننا اور اس کے مقابلہ میں سرکشی دکھانا سب سے بڑا جرم ہے، ایسے لوگ آخرت میں بالکل بے قیمت ہو کر رہ جائیں گے۔ اور جو لوگ سچائی کا اعتراف کریں اور اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیں وہی آخرت میں باقیمت انسان ٹھہریں گے۔ آخرت کی عزتیں اور کامیابیاں صرف ایسے ہی لوگوں کا حصہ ہوں گی۔

۸۱۔ سُوۡرَۃُ التَّکۡوِیۡرِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ۪ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۪ۙ﴿۴﴾ وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۪ۙ﴿۵﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۪ۙ﴿۶﴾ وَ اِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۪ۙ﴿۷﴾ وَ اِذَا الۡمَوۡءٗدَۃُ سُئِلَتۡ ۪ۙ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ ۚ﴿۹﴾ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ۪ۙ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتۡ ۪ۙ﴿۱۱﴾ وَ اِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱۲﴾ وَ اِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ ۪ۙ﴿۱۳﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ؕ﴿۱۴﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ ۲۔ اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ ۳۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ ۴۔ اور جب دس مہینہ کی حاملہ اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ ۵۔ اور جب وحشی جانور اکٹھا ہو جائیں گے۔ ۶۔ اور جب سمندر بھڑکا دئے جائیں گے۔ ۷۔ اور جب ایک ایک قسم کے لوگ اکٹھا کیے جائیں گے۔ ۸۔ اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔ ۹۔ کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔ ۱۰۔ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ ۱۱۔ اور جب آسمان کھل جائے گا۔ ۱۲۔ اور دوزخ بھڑکائی جائے گی۔ ۱۳۔ اور جب جنت قریب لائی جائے گی۔ ۱۴۔ ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

قرآن میں جگہ جگہ قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ قیامت جب آئے گی تو دنیا کا موجودہ توازن ٹوٹ جائے گا۔ اس دن تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع ہوں گے کہ ایک مالک کائنات کے سوا سب آوازیں پست ہوں گی۔ اس دن زبان والے بے زبان ہو جائیں گے۔ اس وقت انسان اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کرے گا۔ اس دن نیکی کے سوا دوسری تمام چیزیں اپنا وزن کھو دیں گی۔ مظلوم کو مکمل حق ہو گا کہ وہ ظالم سے اپنے ظلم کا بدلہ لے لے۔ قدیم زمانہ میں بعض عرب قبائل لڑکے کو اپنے لیے عزت اور طاقت کا نشان سمجھتے تھے اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو اس کو اپنے لیے شرمندگی کا سبب خیال کرتے تھے۔ یہ احساس کبھی اتنا شدید ہوتا کہ اپنی لڑکی کو پیدا ہونے کے بعد زندہ دفن کر دیتے۔ یہ قدیم دور کا فیمیل فیوٹی سائڈ

(female foeticide) تھا۔ دور جدید میں بھی رحم مادر میں ہی بچیوں کے قتل سلسلہ جاری ہے۔ یہ گویا انسانی ظلم کی ایک نمائندہ مثال ہے۔ اس آیت کا اولین مصداق قدیم زمانہ کے عربوں کا یہی رواج ہے، تاہم توسیعی طور پر اس حکم میں اسی نوعیت کے دوسرے واقعات بھی شامل ہوں گے۔ اس قسم کے تمام لوگ گویا اپنے آپ کو اسی مجرمانہ کٹہرے میں کھڑا کر رہے ہیں جہاں عرب کا وہ قدیم انسان کھڑا ہوا ہے، جس نے اپنی بے گناہ بیٹی کو گڑھے میں ڈھکیل کر اوپر سے مٹی ڈال دی تھی۔

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ ﴿۱۶﴾
وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبۡحِ اِذَا
تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ﴿۱۹﴾
ذِىۡ قُوَّةٍ عِنۡدَ ذِى الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٍ ﴿۲۰﴾
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ ﴿۲۱﴾ وَ مَا صَاحِبُكُمۡ
بِمَجۡنُوۡنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِيۡنِ ﴿۲۳﴾
وَ مَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ ﴿۲۴﴾ وَ مَا هُوَ
بِقَوۡلِ شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ ﴿۲۵﴾ فَاَيۡنَ
تَذۡهَبُوۡنَ ﴿۲۶﴾ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ
لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ
يَّسۡتَقِيۡمَ ﴿۲۸﴾ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ
اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۹﴾ ع

۱۵۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، ۱۶۔ چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی۔ ۱۷۔ اور رات کی جب وہ جانے لگے۔ ۱۸۔ اور صبح کی جب وہ آنے لگے۔ ۱۹۔ کہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ ۲۰۔ قوت والا، عرش والے کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ ۲۱۔ اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے۔ ۲۲۔ اور تمھارا ساتھی دیوانہ نہیں۔ ۲۳۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے۔ ۲۴۔ اور وہ غیب کی باتوں کا حریص نہیں۔ ۲۵۔ اور وہ شیطان مردود کا قول نہیں۔ ۲۶۔ پھر تم کدھر جارہے ہو۔ ۲۷۔ یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ ۲۸۔ اس کے لیے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے۔ ۲۹۔ اور تم نہیں چاہ سکتے، مگر یہ کہ اللہ رب العالمین چاہے۔

کائنات کی کسی چیز کے اوپر لفظوں میں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ اس کو کس نے بنایا۔ مگر معنوی طور پر اس کے ہر جزء پر خالق کی شہادت ثبت (stamped) ہے، جس کو انسان خود سے دریافت کرسکتا ہے۔ اگر دیکھنے والی نگاہ ہو تو آدمی ہر چیز کو دیکھ کر پکار اٹھے گا: بلاشبہ یہ خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ کوئی دوسرا اس کو بنا نہیں سکتا۔

زمین پر رات دن کا آنا اور انسان کے مشاہدہ میں ستاروں کے مقامات کا بدلنا زمین کی محوری گردش کی بنا پر ہوتا ہے۔ کائنات انتہائی وسیع ہونے کے باوجود انسان جیسی مخلوق کے لیے انتہائی طور پر غیر موافق ہے۔ ساری معلوم کائنات میں صرف زمین ہی ایک ایسا کرہ ہے جہاں لائف سپورٹ سسٹم کی بنا پر انسان زندہ رہتا ہے

اورتمدن کی تعمیر کرتا ہے۔ بے حد وسیع کائنات میں زمین کا استثناء واضح طور پر اس کا ثبوت ہے کہ خالق نے بالارادہ زمین پر استثنائی حالات پیدا کیے ہیں۔ اس اعتبار سے ان الفاظ کا مطلب یہ ہوگا کہ زمین کا استثنائی نظام اور اس کی محوری گردش اس بات پر گواہ ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور قرآن خدا کا کلام جو فرشتہ کے ذریعہ ان پر اترا ہے۔

زمین کا استثنائی نظام اور اس کی محوری گردش اس کائنات کا انتہائی نادر اور انتہائی عظیم واقعہ ہے۔ یہ واقعہ گویا ایک ماڈل ہے جو وحی کے معاملہ کو ہمارے لیے قابل فہم بناتا ہے۔ اگر یہ تصور کیجیے کہ زمین اپنے استثنائی لائف سپورٹ سسٹم کے ساتھ محور پر گردش کرتی ہوئی وسیع خلا میں سورج کے گرد گھوم رہی ہے تو ایسا محسوس ہوگا کہ گویا ریموٹ کنٹرول کا کوئی طاقت ور نظام ہے جو اس کو انتہائی صحت کے ساتھ کنٹرول کر رہا ہے۔ فرشتہ کے ذریعہ ایک انسان اور خدا کے درمیان ربط قائم ہونا بھی اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہے۔ پہلا واقعہ تمثیل کے روپ میں دوسرے واقعہ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

۸۲۔ سُوۡرَۃُ الۡاِنۡفِطَار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ
انۡتَثَرَتۡ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾ وَ اِذَا
الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا
قَدَّمَتۡ وَ اَخَّرَتۡ ؕ﴿۵﴾ یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ مَا
غَرَّکَ بِرَبِّکَ الۡکَرِیۡمِ ۙ﴿۶﴾ الَّذِیۡ خَلَقَکَ
فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۙ﴿۷﴾ فِیۡۤ اَیِّ صُوۡرَۃٍ مَّا شَآءَ
رَکَّبَکَ ؕ﴿۸﴾ کَلَّا بَلۡ تُکَذِّبُوۡنَ بِالدِّیۡنِ ۙ﴿۹﴾
وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ کِرَامًا
کَاتِبِیۡنَ ۙ﴿۱۱﴾ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ
الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ﴿ۚ۱۳﴾ وَ اِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ
جَحِیۡمٍ ﴿ۚۖ۱۴﴾ یَّصۡلَوۡنَہَا یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۱۵﴾ وَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۲۔ اور جب ستارے بکھر جائیں گے۔ ۳۔ اور جب سمندر بہہ پڑیں گے۔ ۴۔ اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ ۵۔ ہر شخص جان لے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ ۶۔ اے انسان، تجھ کو کس چیز نے اپنے ربِ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ۷۔ جس نے تجھ کو پیدا کیا، پھر تیرے اعضاء کو درست کیا، پھر تجھ کو متناسب بنایا۔ ۸۔ اُس نے جس صورت میں چاہا، تم کو ترتیب دے دیا۔ ۹۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہو۔ ۱۰۔ حالاں کہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ ۱۱۔ معزز لکھنے والے۔ ۱۲۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۱۳۔ بے شک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ ۱۴۔ اور بے شک گنہ گار دوزخ میں۔ ۱۵۔ انصاف کے دن وہ اس میں ڈالے جائیں

مَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿١٦﴾ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا
يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ
الدِّيْنِ ﴿١٨﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ
شَيْـًٔا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿١٩﴾

گے۔ ۱۶۔ وہ اس سے جدا ہونے والے نہیں۔ ۱۷۔ اور تم کو کیا خبر کہ انصاف کا دن کیا ہے۔ ۱۸۔ پھر تم کو کیا خبر کہ انصاف کا دن کیا ہے۔ ۱۹۔ اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی۔ اور معاملہ اس دن اللہ ہی کے اختیار میں ہوگا۔

انسان معلوم کائنات کی سب سے زیادہ بامعنی مخلوق ہے۔ انسان کو ایک ایسا جسم دیا گیا ہے، جو انتہائی حدتک موزوں ہے۔ اس کو ایک ایسا دماغ دیا گیا ہے، جس سے بہتر عطیہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کے ساتھ جس دنیا میں انسان کو رکھا گیا ہے، وہ بھی ناقابلِ بیان حدتک انسانی ضروریات کے مطابق ہے۔

عطیہ ہمیشہ اپنے ساتھ ذمہ داری لاتا ہے۔ یہی فطری اصول انسان کے معاملہ میں بھی ہے۔ انسان کو جو غیر معمولی عطیہ ملا ہے وہ خود اس بات کا اعلان ہے کہ اس کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی جڑی ہوئی ہیں۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ انسان خدا کی نعمتوں کو خدا کی امانت سمجھے۔ وہ خدا کے عطیات میں خدا کی مرضی کے مطابق تصرّف کرے۔

انسان کی بامعنی تخلیق ایک انتہائی بامعنی مقصد کے لیے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک دن اس کو انصاف کی عدالت میں کھڑا کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس نے خدا کی دی ہوئی چیزوں میں صحیح تصرف کیا۔ اور وہ کون ہے جو اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ یہ انصاف کا دن جو موت کے بعد آنے والا ہے، اس دن خدا تمام انسانوں کو اپنے ریکارڈ کے مطابق جانچے گا، اس جانچ میں جو لوگ پورے اتریں ان کے لیے جنت ہے، اور جو لوگ اس جانچ میں پورے نہ اتریں ان کے لیے جہنم۔

قرآن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ بالآخر انصاف کا ایک دن آنے والا ہے جب کہ تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کے عمل کے مطابق ان کو سزا یا انعام دیا جائے گا۔ یہ خبر دنیا کی موجودہ صورت حال کے عین مطابق ہے۔ انسان کی بامعنی تخلیق اس خبر میں اپنی توجیہ پالیتی ہے۔ اسی طرح انسان کے قول وعمل کی ریکارڈنگ کا نظام جو موجودہ دنیا میں پایا جاتا ہے وہ اس خبر کے بعد پوری طرح قابلِ فہم بن جاتا ہے۔ (قول وعمل کی ریکارڈنگ کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب مذہب اور جدید چیلنج میں ملاحظہ فرمائیں)

احادیث میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ علامتیں اگر ظاہر ہوجائیں تو انسان کو کم سے کم یہ کرنا ہے کہ وہ قیامت کے معاملے میں چوکنا ہوجائے۔ وہ مزید اضافے کے ساتھ قیامت کے بارے میں سوچنے لگے۔ دورِ جدید میں گلوبل وارمنگ کے گہرے سائنسی مطالعہ اور مشاہدہ کی بنا پر سائنسی حلقوں میں اب اِس طرح کے الفاظ بولے جارہے ہیں— اب قیامت زیادہ دور نہیں:

Doomsday is not far

سائنس داں یہ بھی مانتے ہیں کہ اِس عمل کو روکنا، انسان کے بس سے باہر ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ انسان زیادہ سے زیاہ توبہ اور انابت کرے۔

۸۳۔ سُوْرَۃُ الْمُطَفِّفِيْن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا
عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۫﴿۲﴾ وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ
وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ؕ﴿۳﴾ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ
اَنَّہُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۙ﴿۵﴾ یَّوۡمَ
یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ﴿۶﴾ کَلَّاۤ اِنَّ
کِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِیۡ سِجِّیۡنٍ ؕ﴿۷﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ
مَا سِجِّیۡنٌ ؕ﴿۸﴾ کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ؕ﴿۹﴾ وَیۡلٌ
یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یُکَذِّبُوۡنَ
بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۱۱﴾ وَ مَا یُکَذِّبُ بِہٖۤ اِلَّا کُلُّ
مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ ۙ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا قَالَ
اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ؕ﴿۱۳﴾ کَلَّا بَلۡ ٜ رَانَ عَلٰی
قُلُوۡبِہِمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ کَلَّاۤ اِنَّہُمۡ
عَنۡ رَّبِّہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ؕ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّہُمۡ
لَصَالُوا الۡجَحِیۡمِ ؕ﴿۱۶﴾ ثُمَّ یُقَالُ ہٰذَا الَّذِیۡ
کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ؕ﴿۱۷﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔
۲۔ جو لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں۔ ۳۔اور
جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔
۴۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ وہ اُٹھائے جانے
والے ہیں۔ ۵۔ایک بڑے دن کے لیے۔
۶۔جس دن تمام لوگ خداوندِ عالم کے سامنے
کھڑے ہوں گے۔ ۷۔ ہرگز نہیں، بے شک گنہ
گاروں کا اعمال نامہ سجین میں ہوگا۔ ۸۔ اور تم کیا
جانو کہ سجین کیا ہے۔ ۹۔ وہ ایک لکھا ہوا دفتر
ہے۔ ۱۰۔ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں
کی۔ ۱۱۔ جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔
۱۲۔ اور اس کو وہی شخص جھٹلاتا ہے جو حد سے
گزرنے والا ہو، گناہ گار ہو۔ ۱۳۔جب اس کو
ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ
اگلوں کی کہانیاں ہیں۔ ۱۴۔ ہرگز نہیں، بلکہ ان
کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔
۱۵۔ ہرگز نہیں، بلکہ اس دن وہ اپنے رب سے
اوٹ میں رکھے جائیں گے۔ ۱۶۔ پھر وہ دوزخ
میں داخل ہوں گے۔ ۱۷۔ پھر کہا جائے گا کہ یہی
وہ چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

تطفیف کا لفظی معنی ہے ناپ تول میں کمی کرنا۔تجارت کو منصفانہ بنیاد پر قائم کرنا، شریعتِ الٰہی کا ایک اہم اصول ہے۔اس سلسلے میں قرآن میں ایک بنیادی حکم یہ دیا گیا ہے کہ تجارتی سودے میں کوئی تاجر نہ کم تولے، اور نہ کم ناپے، بلکہ ناپ اور تول میں پوری طرح عدل سے کام لے۔ مثلاً: وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ (11:84)۔یعنی ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ أَشۡیَاءَهُمۡ (26:183)۔یعنی لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ (55:9)۔یعنی اور تول میں نہ گھٹاؤ۔

مگر سورہ المطففین کی آیات 6-1 میں ایک اور حکم آیا ہے۔ اِس سورہ کے حکم اور دوسری سورتوں کے حکم میں بظاہر لفظی اعتبار سے مشابہت ہے، یعنی دونوں میں ناپ اور تول کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مگر دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ دوسری سورتوں میں دینے کے وقت یک طرفہ طور پر کم تولنے یا کم ناپنے کا ذکر ہے۔ مگر اِس سورہ میں برعکس طور پر یہ کہا گیا ہے: وہ لوگ جو دوسروں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں، اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ اس فرق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری سورتوں میں تاجرانہ بدمعاملگی سے منع کیا گیا ہے۔ مگر سورہ المطففین میں جو بات ہے، اُس کا تعلق تجارتی معاملے سے نہیں ہے۔ یہاں ناپ اور تول کی زبان بطور تمثیل استعمال کی گئی ہے۔ یہاں ناپ اور تول کی مثال سے ایک سماجی برائی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ دراصل ایک ناپسندیدہ انسانی کردار ہے، جس کو ناپ اور تول کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کا مزاج یہ ہو کہ اپنے معاملے میں اُن کا معیار کچھ ہو، اور دوسروں کے معاملے میں اُن کا معیار کچھ اور۔ ان کا یہ حال ہو کہ ان کو جب اپنے لیے لینا ہو تو وہ بھرپور طور پر لیں۔ اور جب دوسروں کو دینا ہو تو وہ کمی کر کے دوسروں کو دیں۔ یہ تفریق ایک ایسی اخلاقی برائی ہے جو آدمی کو تباہی کے سوا کہیں اور نہیں پہنچاتی۔ اس معاملہ کا تعلق زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔

اپنے اور غیر میں اس قسم کا ہر فرق تطفیف ہے۔ جس آدمی کے اندر اس قسم کا مزاج ہو اس کے اندر کبھی جنتی شخصیت پیدا نہیں ہو سکتی (صحیح البخاری، حدیث نمبر 13)۔ اس قسم کا مزاج آدمی کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش رک جائے اس کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی ترقی کے اعلیٰ مراحل طے کرنے سے محروم رہے اور آخر کار وہ اسی حال میں مر جائے۔

ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں سے اپنا پورا حق وصول کرے۔ مگر اعلیٰ انسانی کردار یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو بھی ان کا پورا پورا حق ادا کرے۔ وہ دوسروں کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کر رہا ہے۔ جو لوگ خود پورا لیں اور دوسروں کو کم دیں وہ آخرت میں اس حال میں پہنچیں گے کہ وہاں وہ برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

جو اپنے لیے پورا وصول کر رہا ہے وہ گویا اس بات کو جانتا ہے کہ آدمی کو اس کا پورا حق ملنا چاہیے۔ ایسی حالت میں جب وہ دوسروں کو دینے کے وقت انہیں کم دیتا ہے تو وہ دوسروں کے حقوق کے بارے میں اپنی حساسیت کو گھٹاتا ہے۔ جو شخص بار بار اس طرح کا عمل کرے اس پر بالآخر وہ وقت آئے گا جب کہ دوسروں کے حقوق کے بارے میں اس کی حساسیت بالکل ختم ہو جائے۔ اس کے دل کے اوپر پوری طرح اس کے برے عمل کا زنگ لگ جائے۔

خدا اس دنیا میں اپنی صفات کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ آخرت میں وہ اپنی ذات کے ساتھ ظاہر ہوگا، جو آدمی صفات کی صورت میں خدا کو نہ دیکھ سکے، وہ ذات کی صورت میں بھی خدا کو دیکھنے سے محروم رہے گا۔ انسان کے لیے بلاشبہ سب سے بڑی محرومی وہ ہوگی جب کہ خدا اپنے جمال و کمال کے ساتھ آخرت میں ظہور فرمائے گا، مگر حال یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ وہاں کھڑے ہوں گے، مگر وہ اپنے اندھے پن کی وجہ سے اس کو دیکھنے کی سعادت نہیں پائیں گے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَ
مَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ
مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ
الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ
يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ
النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾
خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ
الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾
عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾
وَ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا
فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ
لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ مَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ
حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ
الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ
يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا
يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع ۳۶/۸

۱۸۔ ہرگز نہیں، بے شک نیک لوگوں کا اعمال نامہ علّیّین میں ہے۔ ۱۹۔ اور تم کیا جانو علّیّین کیا ہے۔ ۲۰۔ لکھا ہوا دفتر ہے۔ ۲۱۔ مقرب فرشتوں کی نگرانی میں۔ ۲۲۔ بے شک نیک لوگ آرام میں ہوں گے۔ ۲۳۔ وہ تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے۔ ۲۴۔ ان کے چہروں میں تم آرام کی تازگی محسوس کروگے۔ ۲۵۔ ان کو شراب خالص، مہر لگی ہوئی پلائی جائے گی۔ ۲۶۔ جس پر مشک کی مہر ہوگی۔ اور یہ چیز ہے جس کی حرص کرنے والوں کو حرص کرنا چاہیے۔ ۲۷۔ اور اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ ۲۸۔ ایک ایسا چشمہ جس سے مقرب لوگ پئیں گے۔ ۲۹۔ بے شک جو لوگ مجرم تھے وہ ایمان والوں پر ہنستے تھے۔ ۳۰۔ اور جب وہ ان کے سامنے سے گزرتے تو وہ آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے۔ ۳۱۔ اور جب وہ اپنے لوگوں میں لوٹتے تو دل لگی کرتے ہوئے لوٹتے۔ ۳۲۔ اور جب وہ ان کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بھکے ہوئے لوگ ہیں۔ ۳۳۔ حالاں کہ وہ ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ ۳۴۔ پس آج ایمان والے منکروں پر ہنستے ہوں گے۔ ۳۵۔ وہ تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔ ۳۶۔ واقعی منکروں کو ان کے کیے کا خوب بدلہ ملا۔

انسان موجودہ دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنے صبح وشام گزارتا ہے۔ مختلف تجربات کے دوران یہاں اس کی زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ ان تجربات کے ذریعے شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ یہی موجودہ دنیا حقیقی دنیا ہے۔ اس کے مقابلے میں اس کو محسوس ہوتا ہے کہ آخرت کی دنیا تصوراتی دنیا (imaginary world) ہے۔ اس ظاہری فرق کی بنا پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا تفکیری عمل (thinking process) موجودہ دنیا کے لیول پر جاری ہوجاتا ہے۔ اس کی سوچ اور اس کی منصوبہ بندی میں عملاً آخرت کا

کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔ اس بنا پر موجودہ دنیا میں اکثر لوگ اس بات کے حریص نہیں ہوتے کہ دوسروں کو ان کا پورا حق ادا کریں۔ ان کی ساری دلچسپی اس میں ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے اپنا حق بھرپور وصول کرسکیں۔

مگر یہ روش خدا کی اسکیم کے خلاف ہے۔ موجودہ دنیا میں کچھ چیزیں وقتی طور پر اہم دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن آخرت کا دور ایک مختلف دور ہوگا۔ ایسے لوگ آخرت میں محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ عقلمند لوگ وہ ہیں جو سب سے زیادہ اس بات کے حریص بنیں کہ وہ دوسروں کو بھرپور طور پر ان کا حق ادا کریں، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں بھرپور طور پر خدا کی نعمتوں کے مستحق قرار پائیں گے۔

جو لوگ آخرت کے دور میں اس طرح داخل ہوں کہ انھوں نے اپنے آپ کو وہاں کے تقاضوں کے مطابق تیار نہ کیا ہو تو وہ وہاں کامل طور پر بے جگہ ہو جائیں گے۔ ان کو آخرت کے دور حیات میں حسرت کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوگا۔ مثلاً جو لوگ برتری کی تقریر کرنے کے ماہر ہوں، وہ لوگ آخرت کی دنیا میں بے زبان (speechless) ہو جائیں گے۔ کیوں کہ وہاں صرف ایک ہی زبان کی قیمت ہوگی، اور وہ ہے تواضع (modesty) کی زبان۔ جو لوگ غیر خدا کی بڑائی میں جیتے ہوں، وہ آخرت کے دور میں بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ کیوں کہ آخرت کے دور میں صرف ان لوگوں کو مقام ملے گا، جو خدا کی بڑائی میں جینے والے ہوں۔ جو لوگ نفرت (hate) کے الفاظ بولنے کے ماہر ہوں، وہ آخرت کے دور میں اپنی قیمت کھو دیں گے۔ کیوں کہ آخرت میں محبت انسانی کا کلچر ہوگا، نہ کہ نفرت انسانی کا کلچر۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج کی دنیا میں جو لوگ بڑے دکھائی دیتے ہیں، وہ کل آنے والی دنیا کے دور حیات میں آخری حد تک چھوٹے دکھائی دینے لگیں گے۔ اس کے برعکس، جو شخص آخرت کی خاطر اپنی دنیوی مصلحتوں کو نظر انداز کر دے وہ دنیا پرستوں کی نظر میں حقیر بن جاتا ہے۔ مگر جب آخرت آئے گی تو معلوم ہوگا کہ وہی لوگ ہوشیار تھے جن کو دنیا میں نادان سمجھ لیا گیا تھا۔

۸۴۔ سُوْرَۃُ الْاِنْشِقَاق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ① وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ
حُقَّتْ ② وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ③ وَ اَلْقَتْ
مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ④ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ
حُقَّتْ ⑤ يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى
رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ⑥ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۲۔ اور وہ اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اسی لائق ہے۔ ۳۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ ۴۔ اور وہ اپنے اندر کی چیزوں کو اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔ ۵۔ اور وہ اپنے رب کا حکم سن لے گی اور وہ اسی لائق ہے۔ ۶۔ اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف جا رہا ہے، پھر اس سے

كِتٰبَهٗ بِيَمِيۡنِهٖ ۙ﴿۷﴾ فَسَوۡفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا
يَّسِيۡرًا ۙ﴿۸﴾ وَّيَنۡقَلِبُ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ؕ﴿۹﴾
وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾
فَسَوۡفَ يَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيَصۡلٰى سَعِيۡرًا ؕ﴿۱۲﴾
اِنَّهٗ كَانَ فِىۡۤ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ؕ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنۡ
لَّنۡ يَّحُوۡرَ ۛ﴿۱۴﴾ بَلٰٓى ۛ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ
بَصِيۡرًا ؕ﴿۱۵﴾ فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾ وَالَّيۡلِ
وَمَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾ وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾
لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ؕ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمۡ لَا
يُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيۡهِمُ الۡقُرۡاٰنُ
لَا يَسۡجُدُوۡنَ ؕ السجدة ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا (السجدة ۱۳)
يُكَذِّبُوۡنَ ۖ﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُوۡعُوۡنَ ۖ﴿۲۳﴾
فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۙ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ
مَمۡنُوۡنٍ ع ﴿۲۵﴾ (ع ۲۵ / ۹)

ملنے والا ہے۔ ۷۔ تو جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ ۸۔ اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ ۹۔ اور وہ اپنے لوگوں کے پاس خوش خوش آئے گا۔ ۱۰۔ اور جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا۔ ۱۱۔ وہ موت کو پکارے گا۔ ۱۲۔ اور جہنم میں داخل ہوگا۔ ۱۳۔ وہ اپنے لوگوں میں بےغم رہتا تھا۔ ۱۴۔ اس نے خیال کیا تھا کہ اس کو لوٹنا نہیں ہے۔ ۱۵۔ کیوں نہیں، اس کا رب اس کو دیکھ رہا تھا۔ ۱۶۔ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی۔ ۱۷۔ اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے۔ ۱۸۔ اور چاند کی جب وہ پورا ہوجائے۔ ۱۹۔ کہ تم کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔ ۲۰۔ تو انھیں کیا ہوگیا کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ ۲۱۔ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ خدا کی طرف نہیں جھکتے۔ ۲۲۔ بلکہ منکرین جھٹلا رہے ہیں۔ ۲۳۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں۔ ۲۴۔ پس ان کو ایک درد ناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ ۲۵۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے، ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔

یہاں قیامت سے متعلق جو بات کہی گئی ہے وہ بظاہر نامعلوم دنیا کے بارے میں ایک خبر کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم ایسے شواہد موجود ہیں جو اس کی صداقت کا قرینہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال موجودہ دنیا ہے۔ ایک دنیا کی موجودگی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ دوسری ایسی ہی یا اس سے مختلف دنیا وجود میں آسکتی ہے۔ دوسرے، قرآن میں ایسے غیر معمولی پہلوؤں کا موجود ہونا جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب عظمت قرآن)

ان واضح قرائن کے بعد جو لوگ آخرت پر یقین نہ کریں اور آخرت فراموشی میں زندگی گزاریں وہ یقیناً ایسا جرم کر رہے ہیں جس کی سزا وہی ہوسکتی ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا۔

دنیا میں زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے گھر والوں کے درمیان آخرت کا فکر مند بن کر

رہنا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو آخرت میں جنت کی بے خوف دنیا میں داخلے کا موقع ملے گا۔ آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہوگا کہ اُنھیں آسان حساب کے ذریعے جنت میں پہنچادیا جائے گا۔ اِس کے برعکس، جو لوگ اپنے گھر والوں کے درمیان اِس طرح رہیں کہ ان کو آخرت کی کوئی پروانہ ہو، یعنی وہ لوگ جن کی زندگی خاندان رُخی (family-oriented) زندگی ہوتی ہے۔ وہ اپنا سارا وقت اور اپنا پیسہ اپنے اہلِ خاندان میں خرچ کرتے ہیں اور مطمئن رہتے ہیں کہ میں نے اپنے وقت اور اپنے پیسے کا صحیح استعمال کیا۔ وہ اپنے اہلِ خانہ کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی دل چسپیوں اور سرگرمیوں کا مرکز ان کے اہلِ خاندان ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی پکڑ سے بے خوف ہو کر اپنے گھر والوں کے درمیان خوش وخرم زندگی گزارتے ہیں، جو لوگ اِس طرح زندگی گزاریں، وہ کبھی خدا کے مطلوب بندے نہیں بن سکتے، خدا کی ابدی رحمتوں میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں۔ وہ آخرت کی دنیا میں دوبارہ خوشیوں کی زندگی سے محروم رہیں گے — جو شخص دنیا میں ڈرا، اس کو آخرت میں دوبارہ ڈرایا نہیں جائے گا۔

۸۵۔ سُوۡرَۃُ الۡبُرُوۡج

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۝۱ وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۝۲ وَشَاہِدٍ وَّ مَشۡہُوۡدٍ ۝۳ قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۝۵ اِذۡ ہُمۡ عَلَیۡہَا قُعُوۡدٌ ۝۶ وَّ ہُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُہُوۡدٌ ۝۷ وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۝۸ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ۝۹ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَتُوۡبُوۡا فَلَہُمۡ عَذَابُ جَہَنَّمَ وَ لَہُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ ۝۱۰ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔ ۲۔ اور وعدہ کیے ہوئے دن کی۔ ۳۔ اور دیکھنے والے کی اور دیکھی ہوئی کی۔ ۴۔ ہلاک ہوئے خندق والے۔ ۵۔ جس میں بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ ۶۔ جب کہ وہ اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ۷۔ اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کررہے تھے، وہ اس کو دیکھ رہے تھے۔ ۸۔ اور ان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ ایمان لائے اللہ پر جو زبردست ہے، تعریف والا ہے۔ ۹۔ اسی کی بادشاہی آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۰۔ جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے، ۱۱۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا ان کے

الْاَنْهٰرُ ۬ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ۝١١ اِنَّ بَطْشَ
رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝١٢ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ
وَيُعِيْدُ ۝١٣ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝١٤
ذُوالْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝١٥ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝١٦
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝١٧ فِرْعَوْنَ
وَثَمُوْدَ ۝١٨ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ
تَكْذِيْبٍ ۝١٩ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ۝٢٠
بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝٢١ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝٢٢ ع ٢٢

لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، یہ بڑی کامیابی ہے۔ ۱۲۔ بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ ۱۳۔ وہی آغاز کرتا ہے اور وہی لوٹائے گا۔ ۱۴۔ اور وہ بخشنے والا ہے، محبت کرنے والا ہے۔ ۱۵۔ عرشِ بریں کا مالک۔ ۱۶۔ کرڈالنے والا جو چاہے۔ ۱۷۔ کیا تم کو لشکروں کی خبر پہنچی ہے۔ ۱۸۔ فرعون اور ثمود کی۔ ۱۹۔ بلکہ یہ منکر جھٹلانے پر لگے ہوئے ہیں۔ ۲۰۔ اور اللہ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ۲۱۔ بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے۔ ۲۲۔ لوح محفوظ میں لکھا ہوا۔

کائنات کا نظام تقاضا کرتا ہے کہ آخری فیصلہ کا ایک دن آئے۔ اسی دن کی خبر تمام پیغمبر اور ان کے سچے نائب دیتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود جو لوگ حق کا اعتراف نہ کریں بلکہ حق کے داعیوں کے دشمن بن جائیں وہ ایسی سرکشی کرتے ہیں جس کے ہولناک انجام سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ تاہم جو لوگ ہر قسم کی مشکلات کے باوجود صداقت کی آواز پر لبیک کہیں وہ خدائے مہرباں کی طرف سے ایسا انعام پائیں گے جس سے بڑا انعام اور کوئی نہیں۔

اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ تمام پیدا ہونے والے انسانوں کو ان کی موت سے پہلے بتا دیا جائے کہ ان کے بارے میں خالق کا تخلیقی پلان (creationplan) کیا ہے۔ قبل از موت زندگی کیا ہے اور بعد از موت زندگی کیا ہے۔ اسی لیے اس کام کو قرآن میں دوسرے مقام پر انذار و تبشیر کا کام قرار دیا گیا ہے۔ اس خاص کام کے لیے خدا نے ہر زمانے میں اپنے پیغمبر بھیجے اور اب ختمِ نبوت کے بعد یہی کام آپ کے امتیوں کو انجام دینا ہے۔ جو شخص انذار و تبشیر کے اس کام کو انجام دے وہ داعی ہے، اور جس کے اوپر اس کام کو انجام دیا جائے وہ مدعو ہے۔ داعی اور مدعو کے اس تعلق کو یہاں شاہد اور مشہود کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"ہلاک ہوئے خندق والے"۔ قدیم زمانے میں ساری دنیا میں مذہبی جبر کا کلچر قائم تھا، یعنی مذہبی عدم رواداری (religious intolerance) کا کلچر۔ اِس کلچر نے قدیم زمانے میں پُرامن دعوتی عمل (peaceful Dawah work) کو عملاً ناممکن بنا دیا تھا۔ خدا کا کوئی پیغمبر جب ایک نئے مذہب کی تبلیغ کرتا تو مروجہ مذہب کے ذمے دار پیغمبر کے خلاف تشدد کرنے لگتے۔ یہ رواج خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھا، کیوں کہ خدا نے اپنے تخلیقی پلان کے تحت، ہر انسان کو فکر اور اظہارِ خیال کی کامل آزادی عطا کی ہے۔ مذہبی جبر کا نظام خدا کی دی ہوئی آزادی کو منسوخ کرنے کے ہم معنی تھا۔ خدا کو مطلوب تھا کہ مذہبی جبر کا یہ

مصنوعی نظام ختم ہو اور مذہبی آزادی کا فطری نظام قائم ہو جائے۔ اِس لیے اللہ تعالی نے قرآن میں رسول اور اصحابِ رسول کو یہ حکم دیا کہ ہر قیمت پر اِس مصنوعی نظام کو ختم کرو، خواہ اس کے لیے تم کو جنگ کرنا پڑے (8:39)۔ صحابیِ رسول عبد اللہ بن عمر کے مطابق، رسول اور اصحابِ رسول نے اِس حکمِ خداوندی کی تعمیل کی، یہاں تک کہ اِس جبری نظام کا خاتمہ ہو گیا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4515)۔

آسمانی کتابوں میں قرآن استثنائی طور پر ایک محفوظ کتاب ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ قرآن کو خدا کی خصوصی مدد حاصل ہے۔ اس کو زیر کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

”اور اللہ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے“۔ اس میں اہل ایمان کے لیے خوش خبری ہے۔ یہ آیت اہل ایمان کے لیے حوصلہ کی آیت ہے۔ یعنی اہل ایمان اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ اللہ ان کے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کے درمیان ہے، وہ اسلام کی مخالفت کرنے والوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۸۶۔ سُوۡرَةُ الطَّارِق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا
الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾ اِنۡ كُلُّ
نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾ فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ
مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾
يَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَ التَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾
اِنَّهٗ عَلٰى رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ يَوۡمَ تُبۡلَى
السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنۡ قُوَّةٍ وَّ لَا
نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ۙ﴿۱۱﴾ وَ
الۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ۙ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ
فَصۡلٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّ مَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ ؕ﴿۱۴﴾ اِنَّهُمۡ
يَكِيۡدُوۡنَ كَيۡدًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّ اَكِيۡدُ كَيۡدًا ۚ﴿۱۶﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ ۲۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے۔ ۳۔ چمکتا ہوا تارہ۔ ۴۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر نگہبان نہ ہو۔ ۵۔ تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ۶۔ وہ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ ۷۔ جو نکلتا ہے پیٹھ اور سینے کے درمیان سے۔ ۸۔ بے شک وہ اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ ۹۔ جس دن چھپی ہوئی باتیں پرکھی جائیں گی۔ ۱۰۔ اس وقت انسان کے پاس کوئی زور نہ ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ ۱۱۔ قسم ہے آسمان چکر مارنے والے کی۔ ۱۲۔ اور پھوٹ نکلنے والی زمین کی۔ ۱۳۔ بے شک یہ دوٹوک بات ہے۔ ۱۴۔ اور وہ ہنسی کی بات نہیں۔ ۱۵۔ وہ تدبیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ۱۶۔ اور میں بھی

ع فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾

تدبیر کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ ۱۷۔ پس منکروں کو ڈھیل دے، ان کو ڈھیل دے تھوڑے دنوں۔

انسان کے اوپر ستارہ کا چمکنا تمثیل کی زبان میں اس واقعہ کی یاددہانی ہے کہ کوئی دیکھنے والا اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دیکھنے والا انسان کے اعمال کو ریکارڈ کررہا ہے۔ وہ موت کے بعد دوبارہ انسان کو پیدا کرے گا۔ اوراس سے اس کے تمام اعمال کا حساب لے گا۔ یہ صرف امتحان کی مہلت ہے جو انسان کے درمیان اوراس وقت کے درمیان حد فاصل بنی ہوئی ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کا وہ انجام سامنے آجائے گا جس سے آج وہ بظاہر بہت دور نظر آتا ہے۔

کائنات کا خالق اپنی ذات کے اعتبار سے غیب میں ہے۔ مگر اپنے تخلیقی عمل کے اعتبار سے وہ کائنات کی ہر چیز میں نمایاں ہے۔ انسان اگر سنجیدگی کے ساتھ کائنات پر غور کرے تو وہ یقینی طور پر خدا کو پالے گا۔ وہ اس حقیقت کو جان لے گا کہ موجودہ کائنات میں اس کے لیے صرف خدا کی اطاعت کا رویہ درست ہے۔ خدا کے ساتھ سرکشی کرنے والے کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ موجودہ زمانے میں اہلِ سائنس نے یہ دریافت کیا ہے کہ کائنات ایک ذہین کائنات (intelligent universe) ہے۔ کائنات اتنی حیرت ناک ہے کہ اگر اس کو سوچا جائے، تو رونگٹے کھڑے ہوجائیں، اور بدن میں کپکپی طاری ہوجائے۔ زمین میں اور بقیہ کائنات میں اتنی زیادہ نشانیاں ہیں کہ اگر کوئی آدمی ان میں سنجیدگی سے (sincerely) غور کرے، تو یہ کائنات اس کے لیے خدا کی معرفت اور جلال وجمال کا آئینہ بن جائے۔

جس طرح مخلوقات اپنے خالق کی نشانیاں دکھاتی ہیں۔ اسی طرح انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے، ایک انتہائی بامعنی مخلوق ہے۔ انسان کی تخلیق میں ایک انتہائی ذہین ڈیزائن (intelligent design) پائی جاتی ہے۔ اِس تخلیق میں یہ واضح اشارہ موجود ہے کہ انسان سے اس کے خالق کو اِس دنیا میں ایک مثبت کردار (positive role) مطلوب ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ عام طور پر انسان اس کے برعکس منفی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یہ بلاشبہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

۸۷۔ سُوْرَةُ الْاَعْلٰى

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿۱﴾ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۲﴾ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴿۳﴾ وَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ اپنے رب کے نام کی پاکی بیان کر جو سب سے اوپر ہے۔ ۲۔ جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا۔ ۳۔ اور جس نے ٹھہرایا، پھر راہ بتائی۔ ۴۔ اور جس نے چارہ نکالا۔ ۵۔ پھر اس کو سیاہ کوڑا بنادیا۔

اَحْوٰی ۝۵ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی ۝۶ اِلَّا
مَاشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا
يَخْفٰی ۝۷ وَ نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰی ۝۸ فَذَكِّرْ
اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰی ۝۹ سَيَذَّكَّرُ مَنْ
يَّخْشٰی ۝۱۰ وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَی ۝۱۱ الَّذِیْ
يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰی ۝۱۲ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا
وَلَا يَحْيٰی ۝۱۳ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی ۝۱۴ وَ
ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی ۝۱۵ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۱۶ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ
اَبْقٰی ۝۱۷ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝۱۸
صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰی ۝۱۹ ع ۱ ۱۹ ۱۲

۶۔ہم تم کو پڑھائیں گے پھر تم نہیں بھولو گے۔
۷۔مگر جو اللہ چاہے، وہ جانتا ہے کھلے کو بھی اور اس
کو بھی جو چھپا ہوا ہے۔ ۸۔اور ہم تم کو لے چلیں
گے آسان راہ۔ ۹۔ پس نصیحت کرو اگر نصیحت فائدہ
پہنچائے۔ ۱۰۔ وہ شخص نصیحت قبول کرے گا جو
ڈرتا ہے۔ ۱۱۔ اور اس سے گریز کرے گا، وہ جو
بدبخت ہوگا۔ ۱۲۔ وہ پڑے گا بڑی آگ میں۔
۱۳۔ پھر نہ وہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔
۱۴۔کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا۔
۱۵۔اور اپنے رب کا نام لیا، پھر نماز پڑھی۔
۱۶۔ بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو۔
۱۷۔اور آخرت بہتر ہے اور پائیدار ہے۔
۱۸۔یہی اگلے صحیفوں میں بھی ہے۔ ۱۹۔ موسیٰ
اور ابراہیم کے صحیفوں میں۔

انسان کی اور دنیا کی تخلیق میں واضح طور ایک منصوبہ بندی ہے۔ یہ منصوبہ بندی تقاضا کرتی ہے کہ اس کی تخلیق کا کوئی مقصد ہو۔ یہی مقصد ہے جو وحی کے ذریعہ انسان کے اوپر کھولا گیا ہے۔ تاہم وحی سے وہی شخص نصیحت قبول کرے گا جس کے اندر سنجیدگی کا مزاج ہو۔ یہی اعلیٰ شخصیت کا حامل انسان ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو ربانی شخصیت (آل عمران، 3:79) کی حیثیت سے تیار کرتا ہے۔ جو اپنے آپ کو ہر قسم کے دنیوی محرکات (worldly motivation) سے اوپر رکھتا ہے۔ اسی قسم کے انسان کے اندر سوچنے اور نصیحت لینے کا مزاج ہوتا ہے۔ وہ اپنی اصلاح میں لگے رہتے ہیں۔ اس پر جو حال بھی گزرے، اس کو وہ آبجکٹیو (objective) انداز میں دیکھتے ہیں، نہ کہ ردعمل کے انداز میں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے اپنے آپ کو کامل طور پر متعصّبانہ فکر (biased thinking) سے پاک کیا، اور اس کے اندر اعتراف کا مادہ ہو۔ وہ کسی رائے کو سچائی کے اعتبار سے دیکھے گا، نہ یہ کہ وہ کس شخص کی رائے ہے۔ ایسے لوگ خدا کے ابدی انعامات میں داخل کیے جائیں گے۔ اور جن لوگوں کی سرکشی ان کے لیے نصیحت قبول کرنے میں رکاوٹ بن جائے، ان کا انجام صرف یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے آگ میں جلتے رہیں۔

۸۸۔ سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝١ وُجُوْهٌ
يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝٢ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝٣
تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝٤ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ
اٰنِيَةٍ ۝٥ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ
ضَرِيْعٍ ۝٦ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝٧
وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝٨ لِّسَعْيِهَا
رَاضِيَةٌ ۝٩ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝١٠ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا
لَاغِيَةً ۝١١ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝١٢ فِيْهَا سُرُرٌ
مَّرْفُوْعَةٌ ۝١٣ وَّ اَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۝١٤ وَّ
نَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۝١٥ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۝١٦
اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝١٧
وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝١٨ وَاِلَى الْجِبَالِ
كَيْفَ نُصِبَتْ ۝١٩ وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ
سُطِحَتْ ۝٢٠ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝٢١
لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝٢٢ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ
كَفَرَ ۝٢٣ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۝٢٤
اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝٢٥ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا
حِسَابَهُمْ ۝٢٦ ع ۲۶ ۱۳ النصف

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کیا تم کو اس چھا جانے والی کی خبر پہنچی ہے۔
۲۔ کچھ چہرے اس دن ذلیل ہوں گے۔
۳۔ محنت کرنے والے تھکے ہوئے۔ ۴۔ وہ دہکتی
ہوئی آگ میں پڑیں گے۔ ۵۔ کھولتے ہوئے
چشمے سے پانی پلائے جائیں گے۔ ۶۔ ان کے
لیے کانٹوں والے جھاڑ کے سوا اور کوئی کھانا نہ
ہوگا۔ ۷۔ جو نہ موٹا کرے اور نہ بھوک مٹائے۔
۸۔ کچھ چہرے اس دن بارونق ہوں گے۔ ۹۔ اپنی
کمائی پر خوش ہوں گے۔ ۱۰۔ اونچے باغ میں۔
۱۱۔ وہ اس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔
۱۲۔ اس میں بہتے ہوئے چشمے ہوں گے۔ ۱۳۔
اس میں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے۔
۱۴۔ اور آب خورے، سامنے چنے ہوئے۔ ۱۵۔ اور
برابر بچھے ہوئے گدے۔ ۱۶۔ اور قالین ہر طرف
بچھے ہوئے۔ ۱۷۔ تو کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ
وہ کیسے پیدا کیا گیا۔ ۱۸۔ اور آسمان کو کہ وہ کس
طرح بلند کیا گیا۔ ۱۹۔ اور پہاڑوں کو کہ وہ کس
طرح کھڑا کیا گیا۔ ۲۰۔ اور زمین کو کہ وہ کس
طرح بچھائی گئی۔ ۲۱۔ پس تم یاد دہانی کر دو، تم بس
یاد دہانی کرنے والے ہو۔ ۲۲۔ تم ان پر داروغہ
نہیں۔ ۲۳۔ مگر جس نے روگردانی کی اور انکار
کیا۔ ۲۴۔ تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔
۲۵۔ ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے۔
۲۶۔ پھر ہمارے ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔

آدمی دیکھتا ہے کہ اونٹ جیسا عجیب الخلقت جانور اس کا مطیع ہے۔ آسمان اپنی ساری عظمتوں کے باوجود اس کے لیے مسخر ہے۔ زمین ہماری کسی کوشش کے بغیر ہمارے لیے حددرجہ موافق بنی ہوئی ہے۔ یہ واقعات سوچنے والے کو خدا اور آخرت کی یاددہانی کراتے ہیں۔ جو لوگ دنیا کے اس نظام سے یاددہانی کی غذا لیں انھوں نے اپنے لیے خدا کی ابدی نعمتوں کا استحقاق ثابت کیا۔ اور جو لوگ غفلت میں پڑے رہیں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ وہ صرف اس قابل ہیں کہ ان کو ہر قسم کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم کردیا جائے۔

دعوت آخری حد تک ایک پرامن نصیحت کا نام ہے، نہ کہ بزور کسی نظریہ کو نافذ کرنے کا نام۔ یعنی داعی کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ آخر وقت تک حکیمانہ انداز میں خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا رہے۔ جہاں تک نتیجہ (result) کا تعلق ہے، وہ اس کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کردے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے دور کے ایک عامل کے نام ایک خط میں اس طرح لکھا تھا: وَإِنَّ اللّٰهَ جَلَّ ثَنَاؤُهُ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَاعِيًا إِلَى الْإِسْلَامِ وَلَمْ يَبْعَثْهُ جَابِيًا (الخراج لابی یوسف، صفحہ 144)۔ یعنی اللہ تعالی نے بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی بنا کر بھیجا ہے، اللہ نے آپ کو ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔

دوسرے الفاظ میں، پیغمبر کا مشن ٹیکس وصولی کا نظام (حکومت) قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ پیغمبر کا مشن پرامن دعوت ہے۔ یعنی پرامن طریقہ کار کے ذریعہ لوگوں کو باخبر کیا جائے کہ موجودہ دنیا میں ان کو کس قسم کی زندگی گزارنی چاہیے، جو ان کو آخرت کی زندگی میں کامیاب کرنے والی ہو۔ جس کے نتیجہ میں وہ دنیا میں اللہ کی مدد کے مستحق قرار پائیں، اور آخرت میں ان کو جنت کے باغوں میں داخل کیا جائے۔ جہاں وہ ابدی طور پر حزن اور خوف سے پاک زندگی گزاریں۔ پیغمبر کا مشن قرآن کے الفاظ میں انذار اور تبشیر کا مشن ہے، یعنی اللہ کی پکڑ سے بچانا اور اللہ کے انعام کی خوش خبری دینا۔ پیغمبر کا مشن افراد کو ایڈریس کرنے کا مشن ہے۔ پیغمبر کا مشن یہ ہے کہ ہر فرد اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کے مطابق بنائے، تاکہ وہ ابدی طور پر اللہ کی رحمتوں کا مستحق قرار پائے۔

٨٩۔ سُوْرَةُ الْفَجْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالْفَجْرِ ۝١ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝٢ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝٣ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝٤ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝٥ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨ وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ قسم ہے فجر کی۔ ۲۔ اور دس راتوں کی ۳۔ اور جفت اور طاق کی۔ ۴۔ اور رات کی جب وہ چلنے لگے۔ ۵۔ کیوں، اس میں تو عقل مند کے لیے کافی قسم ہے۔ ۶۔ تم نے نہیں دیکھا، تمھارے رب نے عاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ ۷۔ ستونوں والے ارم کے ساتھ۔ ۸۔ جن کے برابر کوئی قوم ملکوں میں پیدا

بِالْوَادِ ﴿۹﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ﴿۱۰﴾ الَّذِیْنَ
طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾
فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ اِنَّ
رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾

نہیں کی گئی۔ ۹۔اورثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشیں۔ ۱۰۔اور میخوں والے فرعون کے ساتھ۔ ۱۱۔جنھوں نے ملکوں میں سرکشی کی۔ ۱۲۔ پھر ان میں بہت فساد پھیلایا۔ ۱۳۔تو تمھارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ ۱۴۔بے شک تمھارا رب گھات میں ہے۔

انسان موجودہ دنیا میں جو نظام بناتا ہے، اور انسان کے باہر بقیہ کائنات میں جو نظام ہے، دونوں میں تقابل (comparison) کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے دونوں دنیاؤں میں ایک بنیادی فرق ہے، جو خدا کی قدرت کا پتہ دیتی ہے۔ انسان کی دنیا میں کوششوں کے باوجود بہت سی ناپسندیدہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً انسانی صنعت کی ترقی اپنے ساتھ بہت سی ناپسندیدہ چیزیں لاتی ہے۔ فضائی آلودگی، بے روزگاری کا مسئلہ وغیرہ۔ مگر اسی دنیا میں بڑے پیمانے پر خدائی صنعت قائم ہے، اور وہ کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی۔ اسی حقیقت کو یہاں فرعون کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ’’جنھوں نے ملکوں میں سرکشی کی، پھر ان میں بہت فساد پھیلایا‘‘۔ دوسری طرف کائنات میں بڑے پیمانے پر خدا کا فطری نظام قائم ہے، مگر وہاں، قرآن کے الفاظ میں، سب اپنے اپنے دائرہ میں تیر رہے ہیں (36:40)۔ یعنی انسانی دنیا ناپسندیدہ واقعات سے بھری ہوئی ہے، مگر خدا کی قائم کردہ مادی دنیا برعکس طور پر اس قسم کے ناپسندیدہ واقعات سے خالی ہے۔ خدا کی قائم کردہ مادی دنیا انتہائی صحت (accuracy) کے ساتھ قائم ہے۔ آدمی اس حقیقت پر غور کرے تو بے اختیار وہ پکار اٹھے: **فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ** (23:14)۔ یعنی، پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ
وَنَعَّمَهٗ ۙ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّاۤ
اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَیَقُوْلُ
رَبِّیْۤ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ
الْیَتِیْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ
الْمِسْكِیْنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا
لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

۱۵ ۔پس انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی۔ ۱۶۔ اور جب وہ اس کو آزماتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ ۱۷۔ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ ۱۸۔ اور تم مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے۔ ۱۹۔اور تم وراثت کو سمیٹ کر کھا جاتے

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿٢٣﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِیْ ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّ لَا يُوْثِقُ وَ ثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾

ہو۔ ۲۰۔ اور تم مال سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہو۔ ۲۱۔ ہرگز نہیں، جب زمین کو توڑ کر ریزہ ریزہ کردیا جائے گا۔ ۲۲۔ اور تمھارا رب آئے گا اور فرشتے آئیں گے قطار در قطار۔ ۲۳۔ اور اس دن جہنم لائی جائے گی، اس دن انسان کو سمجھ آئے گی، اور اب سمجھ آنے کا موقع کہاں۔ ۲۴۔ وہ کہے گا، کاش میں اپنی زندگی میں کچھ آگے بھیجتا۔ ۲۵۔ پس اس دن نہ تو خدا کے برابر کوئی عذاب دے گا۔ ۲۶۔ اور نہ اس کے باندھنے کے برابر کوئی باندھے گا۔

دنیا میں آدمی کو دو قسم کے احوال پیش آتے ہیں، کبھی پانا اور کبھی محروم ہوجانا۔ دنیا میں زیادہ ملنا نہ تو عزت افزائی ہے، اور نہ کم ملنا اہانت۔ دوسرے الفاظ میں، دنیوی ترقی تعظیم وتکریم نہیں ہے۔ یہ دونوں حالتیں ابتلا (امتحان) کے لیے ہیں۔ اس لیے اقتصادی تنگی کو اہانت سمجھنا بھی غلط ہے، اور اقتصادی خوش حالی کو اکرام سمجھنا بھی غلط ہے۔ وہ اس جانچ کے لیے ہیں کہ آدمی کسی حالت میں کون سا ردعمل پیش کرتا ہے۔ جس شخص کا معاملہ یہ ہو کہ جب اس کو کچھ ملے تو وہ فخر کرنے لگے اور جب اس سے چھینا جائے تو وہ منفی نفسیات میں مبتلا ہوجائے، ایسا شخص امتحان میں ناکام ہوگیا۔ اس کے برعکس، دوسرا انسان وہ ہے کہ جب اس کو ملا تو اس نے خدا کے سامنے جھک کر اس کا شکر ادا کیا، اور جب اس سے چھینا گیا تو دوبارہ اس نے خدا کے آگے جھک کر اپنے عجز کا اقرار کیا۔ یہی دوسرا انسان ہے جس کو آگے کی آیت (نمبر 27) میں نفسِ مطمئنہ کہا گیا ہے، یعنی مطمئن روح۔ بائبل میں ہے کہ جب حضرت ایوب نے اپنی مصیبت کی خبر سنی تو انھوں نے کہا: ''خُداوند نے دِیا اور خُداوند نے لے لِیا۔ خُداوند کا نام مُبارک ہو۔'' اِن سب باتوں میں ایُّوب نے نہ تو گُناہ کِیا اور نہ خُدا پر بیجا کام کا عَیب لگایا (ایوب، 22-1:21)۔

دوبارہ جب مصیبت آئی تو انھوں نے کہا: ''جب خداوند اچھی چیز دیتا ہے ہم انہیں قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح سے تمہیں تکلیفوں کو بھی بنا شکایت کے ضرور برداشت کرنا چاہیے۔'' ان ساری باتوں کے باوجود بھی ایوب نے گناہ نہیں کیا۔ وہ خدا کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں بولے (ایوب، 2:10)۔ دنیا میں آدمی کو مال کی صورت میں یا کسی اور صورت میں جو چیزیں ملتی ہیں وہ سب اس کے لیے امتحان کا پرچہ ہیں۔ وہ

بذات خود مطلوب نہیں ہیں بلکہ ایک اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ وہ مقصد یہ ہے کہ انسان ان چیزوں کو اس طرح استعمال کرے کہ وہ آئندہ آنے والی ابدی زندگی میں اس کی نجات کا ذریعہ بن سکیں۔

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيٓ اِلٰى
رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ
عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾ ع

۲۷۔ اے نفسِ مطمئن۔ ۲۸۔ چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ ۲۹۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں۔ ۳۰۔ اور داخل ہو میری جنت میں۔

نفس مطمئنہ کا مطلب غم سے پاک دل نہیں ہے بلکہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک روح (complex-free soul) ہے۔ اسی حقیقت کو سورہ الشعراء (آیت 89) اور سورہ الصافات (آیت 84) میں قلبِ سلیم کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جو شخص دنیا میں اپنی فطرت کو آلائش (conditioning) سے بچائے اور صحیح فطرت کے ساتھ آخرت میں پہنچے۔ مومن کی زندگی دنیا میں کبھی غم سے خالی نہیں ہوتی۔ غم سے خالی زندگی کا مقام جنت ہے (فاطر،35:34)۔ انسان سے دنیا کی زندگی میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ دنیا میں وہ دنیا کے غم کو لے کر نہ جئے بلکہ آخرت کے غم کو لے کر جئے۔ حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے ایک شخص کو دعا سکھائی: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطْمَئِنَّةً، تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ، وَتَرْضَى بِقَضَائِكَ، وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 7490)۔ اے اللہ تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جو تیرے اوپر مطمئن ہو، تجھ سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو، تیرے فیصلہ پر راضی ہو۔ تیرے دیے ہوئے پر قانع ہو۔ نفس مطمئنہ کا مقام اس شخص کو ملتا ہے جو کائنات میں خدا کی نشانیوں پر غور کرے۔ جو تاریخ کے واقعات سے عبرت ونصیحت کی غذا لے سکے۔ جو اس بات کا ثبوت دے کہ جب اس کی ذات میں اور حق میں ٹکراؤ ہوگا تو وہ اپنی ذات کو نظر انداز کردے گا اور حق کو قبول کرلے گا۔ جو ایک بار حق کو مان لینے کے بعد پھر اس کو کبھی نہ چھوڑے، خواہ اس کی خاطر اسے اپنے آپ کو کچلنا پڑے، اور خواہ اس کے نتیجہ میں اس کی زندگی ویران ہوجائے۔

جنت کے معاشرے میں وہ خوش قسمت افراد جگہ پائیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو نفس اور شیطان کی ترغیبات سے بچایا، جس نے اپنے اندر مکمل معنوں میں مثبت انسان کی تعمیر کی، جس نے دنیا کی زندگی میں یہ ثابت کیا کہ وہ انٹیگریٹیڈ پرسنالٹی (integratedpersonality) کا حامل انسان ہے — یہی وہ صفات ہیں جن سے متصف افراد کو ایک لفظ میں، نفسِ مطمئنہ (complex-freesoul) کہا جاسکتا ہے، یعنی ربانی انسان۔ انھیں صفات کے حامل افراد کو جنت میں آبادکاری کے لیے منتخب کیا جائے گا۔

۹۰۔ سُوْرَةُ الْبَلَدِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
لَاۤ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِہٰذَا
الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ لَقَدۡ خَلَقۡنَا
الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ﴿۴﴾ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ
عَلَیۡہِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾ یَقُوۡلُ اَہۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾
اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ اَحَدٌ ؕ﴿۷﴾ اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ
عَیۡنَیۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَ ہَدَیۡنٰہُ
النَّجۡدَیۡنِ ۚ﴿۱۰﴾ فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ ﴿۫ۖ۱۱﴾ وَ مَاۤ
اَدۡرٰىکَ مَا الۡعَقَبَۃُ ؕ﴿۱۲﴾ فَکُّ رَقَبَۃٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوۡ
اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ ۙ﴿۱۴﴾ یَّتِیۡمًا
ذَا مَقۡرَبَۃٍ ۙ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ ؕ﴿۱۶﴾ ثُمَّ
کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَ
تَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَۃِ ؕ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ
الۡمَیۡمَنَۃِ ؕ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا ہُمۡ
اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَۃِ ؕ﴿۱۹﴾ عَلَیۡہِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَۃٌ ﴿۲۰﴾ ع ۱ / ۱۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ ۲۔ اور تم
اس میں مقیم ہو۔ ۳۔ اور قسم ہے باپ کی اور اس کی
اولاد کی۔ ۴۔ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا
ہے۔ ۵۔ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا زور
نہیں۔ ۶۔ کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال خرچ
کر دیا۔ ۷۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں
دیکھا۔ ۸۔ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں
دیں۔ ۹۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ۔ ۱۰۔ اور
ہم نے اس کو دونوں راستے بتا دئے۔ ۱۱۔ پھر وہ
گھاٹی پر نہیں چڑھا۔ ۱۲۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے
وہ گھاٹی۔ ۱۳۔ گردن کو چھڑانا۔ ۱۴۔ یا بھوک
کے زمانے میں کھلانا۔ ۱۵۔ قرابت دار یتیم کو۔
۱۶۔ یا خاک نشیں محتاج کو۔ ۱۷۔ پھر وہ ان لوگوں
میں سے ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو
صبر کی اور ہمدردی کی نصیحت کی۔ ۱۸۔ یہی لوگ
نصیب والے ہیں۔ ۱۹۔ اور جو ہماری آیتوں کے
منکر ہوئے، وہ بدبختی والے ہیں۔ ۲۰۔ ان پر
آگ چھائی ہوئی ہوگی۔

انسان کسی حال میں اپنے آپ کو مشقتوں سے آزاد نہیں کر پاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کسی بالاتر قوت کے ماتحت ہے۔ اسی طرح انسان کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ کوئی برتر آنکھ بھی ہے جو اس کو دیکھ رہی ہے۔ انسان کی قوتِ نطق اشارہ کرتی ہے کہ اس کے اوپر بھی ایک صاحبِ نطق ہے جس نے اس کو نطق کی صلاحیت دی۔ اور اس کو ہدایت کا راستہ دکھایا۔ آدمی اگر حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو پہچان لے تو یقیناً وہ خدا کو بھی پہچان لے گا۔

''ہم نے انسان کو مشقت (کبد) میں پیدا کیا ہے'' یہ ایک عام انسانی تجربہ ہے کہ زندگی مشقتوں سے خالی نہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں بھی ''کبد'' کی یہ صورتِ حال بدستور باقی ہے۔ علمی تحقیقات سے بھی یہی

ثابت ہوا ہے۔ روسی ماہر نفسیات نمیلو (Anton Vitalievich Nemilov) نے لکھا ہے — یہ ناقابل تصور ہے کہ انسانی زندگی المیہ سے خالی ہو۔

> Human life is unthinkable without tragedies, without the tragic element. The more highly developed and nearer to perfection man is, the greater are the possibilities for tragic conflicts. (Biological Tragedy of Woman, p. 13-15)

لیکن خدا کے تخلیقی نقشہ سے بے خبری کی بنا پر لوگ اس کی نوعیت کو سمجھ نہیں پاتے ہیں اور غلط ردعمل کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ مشقت جب خود فطرت کے قانون کے مطابق انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے تو ہمیں اس کو مان کر زندگی گزارنا چاہیے، نہ کہ اس کا انکار کر کے۔

جہاد کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں اپنا آپ کو تھکانا ہے۔ اسی کو یہاں ''نجد'' کہا گیا ہے، جس کا لفظی مطلب ہے بلند مقام۔ یعنی دین پر عمل کرنا گویا اپنے آپ کو اُونچائی پر چڑھانا ہے۔ یہ شدید مراحل کیا ہیں، یہ شدید مراحل وہ ہیں جب کہ انسان کو غیر مطلوب حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ غیر مطلوب حالات وہ مواقع ہیں، جن سے گزرتے ہوئے انسان صبر کا طریقہ اختیار کر کے اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔

خدا نے انسان کو دو قسم کی بلندیوں پر چڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک انسان کے ساتھ منصفانہ سلوک اور انسان کی ضرورتوں میں اس کے کام آنا۔ دوسری چیز اللہ پر ایمان ویقین ہے۔ یہ ایمان ویقین جب آدمی کے اندر گہرائی کے ساتھ اترتا ہے تو وہ آدمی کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ دوسروں کے لیے بھی نافع بن جاتا ہے۔ ایسا انسان دوسروں کو بھی اسی حق پر لانے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس کو وہ خود اختیار کیے ہوئے ہے۔

۹۱۔ سُوْرَۃُ الشَّمْس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَ الشَّمْسِ وَ ضُحٰهَا ۝١ وَ الْقَمَرِ اِذَا
تَلٰىهَا ۝٢ وَ النَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝٣ وَ
الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝٤ وَالسَّمَآءِ وَ مَا
بَنٰىهَا ۝٥ وَالْاَرْضِ وَ مَا طَحٰىهَا ۝٦ وَ
نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۝٧ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا
وَ تَقْوٰىهَا ۝٨ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝٩ وَ
قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝١٠ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ چڑھنے کی۔
۲۔ اور چاند کی جب کہ وہ سورج کے پیچھے آئے۔
۳۔ اور دن کی جب کہ وہ اس کو روشن کر دے۔ ۴۔ اور
رات کی جب وہ اس کو چھپائے۔ ۵۔ اور آسمان کی
اور جیسا کہ اس کو بنایا۔ ۶۔ اور زمین کی اور جیسا کہ اس
کو پھیلایا۔ ۷۔ اور جان کی جیسا کہ اس کو ٹھیک
کیا۔ ۸۔ پھر اس کو سمجھ دی، اس کی بدی کی اور اس
کی نیکی کی۔ ۹۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک
کیا۔ ۱۰۔ اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

بِطَغْوٰىهَآ ﴿۱۱﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿۱۲﴾
فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ
وَ سُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا
فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ
فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾ ع

۱۱۔ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ ۱۲۔جب کہ اٹھ کھڑا ہوا ان کا سب سے بڑا بدبخت۔ ۱۳۔تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا کہ اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے سے خبردار۔ ۱۴۔تو انھوں نے اس کو جھٹلایا، پھر اونٹنی کو مار ڈالا، پھر ان کے رب نے ان پر ہلاکت نازل کی ان کے گناہ کے سبب، پھر سب کو برابر کردیا۔ ۱۵۔وہ نہیں ڈرتا کہ اس کے پیچھے کیا ہوگا۔

انسان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے سہ گانہ انتظام کیا ہے۔ایک طرف کائنات اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ خدا کی مرضی کا عملی اظہار بن گئی ہے۔دوسری طرف انسان کے اندر نیکی اور بدی کا وجدانی شعور رکھ دیا گیا ہے۔اس کے بعد مزید اہتمام یہ فرمایا کہ پیغمبروں کے ذریعہ حق وباطل اور ظلم وانصاف کو لوگوں کی قابلِ فہم زبان میں کھول کر بتا دیا گیا۔اس کے بعد بھی جو لوگ راہ راست پر نہ آئیں وہ بلاشبہ ظالم ہیں۔آخرت میں وہی شخص کامیاب ہوگا جس نے اپنے آپ کو اس ہدایت کے مطابق سنوارا، اور وہ شخص نامراد ہوگا جس نے اپنے آپ کو بگاڑا۔

آیت 10-8 خالق کے تخلیقی نقشے کا بیان ہے۔خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق، ہر عورت اور مرد کو اس کے خالق نے مکمل آزادی دی ہے۔اس کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنے اختیار کے مطابق سوچے اور اس پر عمل کرے۔لیکن خالق نے ہر انسان کے اندر فطرت یا ضمیر کی فیکلٹی رکھ دی ہے۔ضمیر (conscience) انسان کا صحیح گائڈ ہے۔ اب یہ انسان کا اپنا چوائس (choice) ہے کہ وہ ضمیر کی آواز کو سنے یا اس کا انکار کردے۔''کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا''، یعنی جس نے ضمیر یا فطرت کی آواز سنی اور اپنا تزکیہ کیا۔ تزکیہ کا لفظی مطلب نمو یا افزائش (to flourish) ہے۔اِس نمو کی ایک مادّی مثال درخت ہے۔درخت ایک بیج کی نمو پذیری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ایک بیج موافق ماحول پا کر بڑھنا شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک ہرا بھرا درخت بن جاتا ہے۔یہی معاملہ انسانی تزکیہ کا بھی ہے۔تزکیہ کے بغیر وہ اعلیٰ شخصیت نہیں بنتی جس کو قرآن میں ربانی شخصیت (3:79) کہا گیا ہے۔

تزکیہ کا ایک اور مطلب تطہیر (purification) ہے۔جس طرح خام لوہا (ore) مختلف قسم کے شدید مراحل سے گزر کر ایک بامعنیٰ مشین کی صورت اختیار کرتا ہے، اسی طرح انسان کی شخصیت بھی مختلف قسم کے شدید مراحل سے گزر کر ایک مزکی شخصیت (purified soul) کی صورت اختیار کرتی ہے۔مثلاً انسان کی ایگو پر ضرب لگے اور وہ عدل پر قائم رہے، انسان کو کوئی بڑائی ملے لیکن وہ متواضع (modest) بنا رہے، جب انسان کے اندر کسی کے خلاف نفرت جاگ اٹھے اور وہ پھر بھی اس کے لیے اپنی خیر خواہی کو باقی رکھے، وغیرہ۔ یہی وہ مواقع ہیں جو انسان کا تزکیہ کرتے ہیں اور انسان کے اندر اعلیٰ شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔اس امتحان میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جس کے اندر صبر کی صفت پائی جائے۔ یہی وہ مزّکی انسان ہے جس کو قرآن کے

مطابق، آخرت کی ابدی جنت میں داخلہ ملے گا (20:76)۔ یعنی جنت کی اعلیٰ دنیا میں صرف ان افراد کو داخلہ ملے گا جنھوں نے موجودہ دنیا میں اپنا تزکیہ کیا تھا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی ایک اعتبار سے اس بات کی علامت تھی کہ حق دار کا احترام کرو اور اس کا حق ادا کرو، خواہ وہ بے بس اور کمزور کیوں نہ ہو۔ ایک وجود جو بظاہر محض ''اونٹنی'' نظر آرہا ہے، عین ممکن ہے کہ وہ خدا کا نشان ہو جو لوگوں کی جانچ کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں، دنیا میں عمل کے دوران ہر آدمی اپنے آپ کو کسی نہ کسی ڈھنگ سے تیار کر رہا ہے۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کا طریقہ اپناتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اندر ایک ایسی شخصیت تعمیر کر رہے ہیں جس میں تقویٰ ہو، اخلاقی شعور ہو، حق پرستی ہو، احساس ذمہ داری ہو، ظواہر کے مقابلہ میں جواہر کی قدر ہو، سطحی باتوں کے بجائے اعلیٰ حقائق کی اہمیت ہو، خودغرضی کے بجائے اصول پسندی ہو، وغیرہ۔ اسی قسم کے انسان خدا کی نظر میں کامیاب ہیں۔

۹۲۔ سُوْرَةُ اللَّيْل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَ الَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا
تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۙ﴿۳﴾
اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى
وَاتَّقٰى ۙ﴿۵﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ
لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَ
كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾
وَ مَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾ اِنَّ
عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۫ۖ﴿۱۲﴾ وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ
وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ﴿۱۴﴾ لَا
يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ﴿۱۵﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے رات کی جب کہ وہ چھا جائے۔ ۲۔ اور
دن کی جب کہ وہ روشن ہو۔ ۳۔ اور اس کی جو اس
نے پیدا کیے نر اور مادہ۔ ۴۔ کہ تمھاری کوششیں
الگ الگ ہیں۔ ۵۔ پس جس نے دیا اور وہ ڈرا۔
۶۔ اور اس نے بھلائی کو سچ مانا۔ ۷۔ تو اس کو ہم
آسان راستہ کے لیے سہولت دیں گے۔ ۸۔ اور
جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا۔ ۹۔ اور بھلائی کو
جھٹلایا۔ ۱۰۔ تو ہم اس کو سخت راستہ کے لیے
سہولت دیں گے۔ ۱۱۔ اور اس کا مال اس کے کام
نہ آئے گا جب وہ گڑھے میں گرے گا۔ ۱۲۔ بے
شک ہمارے ذمہ ہے راہ بتانا۔ ۱۳۔ اور بے شک
ہمارے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا۔ ۱۴۔ پس
میں نے تم کو ڈرا دیا بھڑکتی ہوئی آگ سے۔
۱۵۔ اس میں وہی پڑے گا جو بڑا بدبخت ہے۔

تَوَلّٰی ﴿۱۶﴾ وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ﴿۱۷﴾ الَّذِیْ یُؤْتِیْ
مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ
نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ
الْاَعْلٰی ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ﴿۲۱﴾

۱۶۔جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔ ۱۷۔اور ہم اس سے بچادیں گے زیادہ ڈرنے والے کو۔ ۱۸۔جو اپنا مال دیتا ہے پاکی حاصل کرنے کے لیے۔ ۱۹۔اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ ۲۰۔مگر صرف اپنے خدائے برتر کی خوشنودی کے لیے۔ ۲۱۔اور عنقریب وہ خوش ہوجائے گا۔

دنیا میں تمام چیزیں جوڑے جوڑے ہیں۔نر اور مادہ، رات اور دن، مثبت ذرہ اور منفی ذرہ، میٹر اور اینٹی میٹر۔ اس دنیا کی ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے۔یہ واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات میں مقصدیت ہے۔ایسی بامقصد کائنات میں یہ ناممکن ہے کہ یہاں اچھا عمل اور برا عمل دونوں بالکل یکساں انجام پر ختم ہو۔کائنات اپنے خالق کا جو تعارف کرا رہی ہے اس سے یہ بات مطابقت نہیں رکھتی۔

اس زمین پر خدا ہر 24 گھنٹہ کے اندر شام کو صبح میں تبدیل کرتا ہے۔یعنی وہ ہر روز رات کی تاریکی ختم کرکے دن کا اجالا پھیلا رہا ہے۔اس طرح خدا دکھا رہا ہے کہ اس دنیا میں مایوسی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ہر اندھیرے کے بعد اجالا ہے۔ایسی حالت میں خدا کی کتاب کے حاملین کے لیے ''اندھیرا (مایوسی)'' کا کوئی موقع نہیں ہے۔

خدا نے انسان کو آزمائش کے لیے پیدا کیا (الملک، 67:2)۔اس بنا پر موجودہ دنیا میں انسان کو مکمل آزادی دی گئی ہے۔ یہ آزادی انسان کا ذاتی حق نہیں بلکہ وہ امتحان کی مہلت ہے۔جو شخص خدا کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی گزارے گا اس کو خدا ابدی جنت میں جگہ دے گا اور جو شخص خدا کے نقشہ کے خلاف چلے گا اس کو خدا ابدی جہنم میں ڈال دے گا۔یہ نقشۂ حیات کیا ہے۔اس کو بتانے کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے اوپر لی ہے۔اس حقیقت کو یہاں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: بے شک ہمارے ذمہ ہے راہ بتانا۔یعنی یہ خدا کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسان کو صحیح راستہ دکھائے:

Surely it is for God to guide mankind.

اس مقصد کے لیے خدا نے ایک قابل اعتماد انتباہی نظام (warning system) قائم کیا۔اس انتباہ کے لیے خدا نے یہ کیا کہ انسان کی تاریخ کے آغاز ہی سے اپنے پیغمبر انسان کے پاس بھیجنا شروع کیا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے (النساء، 4:165)۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ لوگوں کو آگاہ کرنے کا یہ کام امتِ محمدی کے ذریعہ انجام دیا جائے۔جیسا کہ سورہ البقرہ (2:143) اور سورہ الحج (22:78) میں ہے کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ بنو۔

خدائی اصولوں کے تحت زندگی گزارنا انسان کو مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بظاہر مشکل اپنے اندر آسانی لیے ہوئے ہے کیوں کہ وہ انسان کو ابدی نجات کی طرف لے جانے والی ہے۔ اللہ کا تعلق اپنے بندوں سے صرف حاکم کا نہیں، بلکہ مددگار کا بھی ہے۔ وہ اپنے ان بندوں کا راستہ ہموار کرتا ہے، جو اس کی طرف چلنا چاہیں۔ اس کے برعکس، جو لوگ سرکشی کا راستہ اختیار کریں وہ انہیں سرکشی کے راستہ پر دوڑنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ انسان اس دنیا میں جب بھی کوئی کام کرتا ہے تو وہ اللہ کی توفیق سے کرتا ہے۔ یعنی اللہ جب کسی انسان کے اندر استعداد دیکھتا ہے تو وہ اس کو توفیق عطا کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کامل آزادی ملی ہے۔ وہ جس طرح چاہے عمل کرے، جس طرح چاہے نہ کرے۔ لیکن جس دنیا میں انسان کو عمل کرنا ہے، وہ دنیا اللہ کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ انسان کے باہر کی پوری دنیا کامل طور پر اللہ کی تخلیق ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان جب کچھ کرنا چاہے تو خارجی دنیا اس کے ساتھ مساعدت (support) کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اگرچہ اپنے عمل کے لیے آزاد ہے، لیکن وہ کوئی عمل اس وقت کرپاتا ہے، جب کہ اللہ کا نظام اس کے ساتھ موافقت کرے۔ اسی لیے انسان کو ہمیشہ اللہ سے مدد کی دعا کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس دنیا میں وہ کوئی کام اسی وقت کرسکتا ہے، جب کہ اس کو اللہ کی مدد ملتی رہے۔

اسلام میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ آدمی اپنی کمائی کو صرف اپنے لیے خاص نہ کرے بلکہ اس میں سے دوسروں کو بھی دے۔ اپنے کمائے ہوئے مال کو صرف اپنے اوپر خرچ کرنا اور اس میں سے خدا کا اور انسان کا حصہ نہ نکالنا اسلام میں سخت گناہ ہے۔ کوئی شخص اگر اپنا مال دوسرے کو اس لیے دے کہ اس نے اس کے اوپر احسان کیا تھا تو یہ دینا اگرچہ کوئی برائی نہیں مگر صرف اس قسم کے عطیہ سے اسلامی تعلیم کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ احسان اتارنے کے لیے یا کسی اور جوابی فائدہ کے لیے دینے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کے لیے اسلام میں اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

کوئی آدمی جب اپنے مال کا ایک حصہ دوسرے کو دیتا ہے یہ اس کی طرف سے ایک قسم کی قربانی ہوتی ہے۔ یہ اپنی ایک محبوب چیز میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے، صرف اس لیے کہ وہ ضرورت مند ہے اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ مال والے لوگ اپنے مال کو دوسرے ضرورت مندوں کی مدد پر خرچ کریں۔ قرآن کے مطابق، کوئی آدمی نیکی کا درجہ نہیں پاسکتا جب تک وہ اپنے محبوب اثاثہ میں سے دوسروں کو نہ دے (3:92)۔ یہ گویا محبت کی قربانی ہے۔ اور محبت کی قربانی ہی وہ سب سے بڑی قربانی ہے جو آدمی کی داخلی تطہیر کرتی ہے اور اس کو روحانی ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔ جسم کی پاکی پانی سے ہوتی ہے، اور روح کی پاکی قربانی سے۔ آپ کے جسم پر کیچڑ لگ جائے تو آپ اس کو پانی کے ذریعہ پاک کرسکتے ہیں۔ لیکن آدمی کی اندرونی ہستی میں جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو محبوب چیزوں کی قربانی ہی کے ذریعہ پاک کیا جاسکتا ہے۔

۹۳۔ سُوْرَةُ الضُّحٰى

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَالضُّحٰى ۝١ وَ الَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝٢ مَا وَدَّعَكَ
رَبُّكَ وَ مَا قَلٰى ۝٣ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ
الْاُوْلٰى ۝٤ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝٥
اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝٦ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا
فَهَدٰى ۝٧ وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝٨ فَاَمَّا
الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝٩ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا
تَنْهَرْ ۝١٠ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝١١ ع ۱۱ ۱۸

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔قسم ہے روزِ روشن کی۔ ۲۔ اور رات کی جب وہ چھاجائے ۔ ۳۔تمھارے رب نے تم کو نہیں چھوڑا، اور نہ وہ تم سے بیزار ہوا۔ ۴۔اور یقیناً آخرت تمھارے لیے دنیا سے بہتر ہے۔ ۵۔اور عنقریب اللہ تجھ کو دے گا، پھر تو راضی ہوجائے گا۔ ۶۔کیا اللہ نے تم کو یتیم نہیں پایا، پھر اُس نے تم کو ٹھکانا دیا۔ ۷۔اور تم کو متلاشی پایا تو تم کو راہ دکھائی۔ ۸۔اور تم کو نادار پایا تو تم کو غنی کر دیا۔ ۹۔پس تم یتیم پر سختی نہ کرو۔ ۱۰۔اور تم سائل کو نہ جھڑکو۔ ۱۱۔اور تم اپنے رب کی نعمت بیان کرو۔

نبوت کے ابتدائی زمانہ میں جو سورتیں اتریں، ان میں سے ایک سورہ الضحیٰ ہے۔ اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں دن بھی آتا ہے اور رات بھی۔ دونوں کے ملنے سے یہاں کا نظام مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کے ڈیولپمنٹ کے لیے بھی سختی اور نرمی دونوں کا پیش آنا ضروری ہے۔ ایک شخص جب دعوت حق کا کام لے کر اٹھتا ہے تو لوگوں کی طرف سے اس کو کبھی اچھا جواب ملتا ہے کبھی برا، کبھی روشن حالات سامنے آتے ہیں کبھی تاریک۔ فرمایا کہ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ۔ اس دنیا میں ایک بندہ خدا کے ساتھ سختی کے حالات اس لیے پیش آتے ہیں کہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوں۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں اس لیے ڈالی جاتی ہیں۔ تا کہ اس کا مستقبل اس کے حال سے زیادہ بہتر ہو سکے۔ کیوں کہ یہی دنیا کا نظام ہے۔ یہاں روشنی اور تاریکی دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ حق کے مسافر کو بھی کبھی امیدوں سے سابقہ پیش آئے گا، کبھی اندیشوں سے ۔ یہ سفر کبھی ہموار فضا میں طے نہیں ہوتا۔ اگرچہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی اپنے دین کے خادموں کی مدد کرے گا، تاہم داعی کو اپنی ساری توجہ آخرت کی منزل پر لگائے رکھنا چاہیے جو ہر قسم کے خیر اور سکون کا واحد ابدی مقام ہے۔ داعی کی نظر ان چیزوں پر نہیں ہونی چاہیے جو ابھی اس کو نہیں ملی ۔ بلکہ اس کو دیکھنا چاہیے کہ جو چیزیں مل چکی ہیں ان کا حق ادا ہو رہا ہے یا نہیں۔

اگلی آیتوں میں حق کی ادائیگی کی صورت بتا دی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتیم پیدا ہوئے ، پھر اللہ نے

آپ کو بہترین سرپرست عطا فرمایا۔ جب یتیمی کا تجربہ ہوا تو اس تجربے نے آپ کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ کوئی چیز آپ سے کھوئی گئی ہے۔ یہ احساس آخر کار حق کی تلاش کی صورت میں اُبھرا۔ اس طرح آپ تلاشِ حق میں سرگرداں ہوئے، تو اللہ نے آپ کے لیے حق کا دروازہ کھول دیا۔ آپ بظاہر بے مال تھے، پھر اللہ نے آپ کو آپ کی اہلیہ (خدیجہ) کے ذریعہ صاحبِ مال بنا دیا۔ یہ ایک تاریخی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کمزوروں کی مدد کرے تاکہ وہ اللہ کی مدد کا مستحق بنے۔ اس کا کلام نعمتِ خداوندی کے اظہار کا کلام ہو تاکہ اللہ اس پر اپنی نعمتوں کا اتمام فرمائے۔

اللہ نے کہا کہ تم یتیم ہو گئے تھے، اللہ نے تمھاری یتیمی کی تلافی کا انتظام کیا۔ اس لیے تمھارے دل میں ان لوگوں کی جگہ ہونا چاہیے جو اپنے پیدائشی حالات کے نتیجہ میں بے جگہ ہو گئے ہوں۔ تم بے مال تھے، اللہ نے تم کو معاشی سہارا فراہم کیا۔ اس لیے تم کو بھی محروموں اور ضرورت مندوں کا خیر خواہ بنا چاہیے تم راہ سے بھٹکے ہوئے تھے اللہ نے تم کو ہدایت یاب کیا۔ اس لیے تم اس احسان کا شکر اس طرح ادا کرو کہ لوگوں کو ہدایت کے راستے پر لانے کی کوشش کرو۔ جو نعمت ہدایت تم کو ملی ہے اس ہدایت کو دوسروں تک پہنچاؤ۔

''سائل کو نہ جھڑکو'' کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی حق کی تلاش میں اللہ کے سامنے سائل بنے تو اللہ نے تم سے بے نیازی نہیں برتی۔ یتیم اور نادار اور بے راہ ہونے کے باوجود پوری طرح تمھاری طرف توجہ دی اور تم کو تمھارے سوال کا مکمل جواب عطا فرمایا۔ تمھارا بھی یہ حال ہونا چاہیے کہ جو کوئی تمھارے پاس اپنا سوال لے کر آئے، جو بھی تم سے حق کو جاننا چاہے اس کو تم نہ جھڑکو — یہ ایک انتہائی صورت کا حکم ہے۔ کیوں کہ نیاز مندانہ سوال پر تو کوئی بھی شخص کسی کو نہیں جھڑکتا۔ سائل کو جھڑکنے کی نوبت اسی وقت آتی ہے جب کہ اس نے اپنے سوال کو بے ڈھنگے اور نامعقول انداز سے پیش کیا ہو۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی سختی کے ساتھ سوال کرے تم اپنے جواب میں سختی کا طریقہ نہ اختیار کرو بلکہ ہر حال میں نرمی اور شفقت کے ساتھ اس کا جواب دو۔ اس سورت میں بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔ مگر وہ ہر انسان کے لیے ایک عمومی تعلیم ہے۔

''اور تم اپنے رب کی نعمت بیان کرو''۔ اس کی تشریح ابن ہشام نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: یعنی اللہ کی طرف سے نبوت کی جو نعمت اور عزت تم کو ملی ہے، اس کو بیان کرو (أَيْ بِمَا جَاءَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ نِعْمَتِهِ وَكَرَامَتِهِ مِنَ النُّبُوَّةِ فَحَدِّثْ)، اس کا چرچا کرو، اور اس کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو بیان کرنے لگے، جو اللہ نے آپ پر اور آپ کے ذریعہ تمام بندوں پر انعام فرمائی تھی۔ ابتدا میں آپ تنہائی میں ان باتوں کو لوگوں سے بیان کرتے تھے جن پر آپ کو اعتماد تھا (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 243)۔ پھر دھیرے دھیرے آپ کا پیغام پورے عرب میں پھیل گیا۔

۹۴۔ سُوْرَۃُ الْاِنْشِرَاح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝١ وَوَضَعْنَا عَنْكَ
وِزْرَكَ ۝٢ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝٣ وَ
رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝٤ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ
يُسْرًا ۝٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦ فَاِذَا
فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨ ع ٨ ١٩

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا۔ ۲۔ اور تمھارا وہ بوجھ اُتار دیا۔ ۳۔ جس نے تمھاری پیٹھ جھکا دی تھی۔ ۴۔ اور ہم نے تمھارا ذکر بلند کیا۔ ۵۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ۶۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ ۷۔ پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو محنت کرو۔ ۸۔ اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت جاننے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ آپ کی تلاش حق کی سرگردانی اس نوبت کو پہنچ گئی تھی کہ زندگی آپ کے لیے ایک ایسا بوجھ بن گئی جو آپ کی کمر توڑے دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقیقت کا علم دے کر آپ کی تلاش کو معرفت میں تبدیل کر دیا۔ حقائق کی معرفت کے لیے آپ کا سینہ کھل گیا۔ پھر آپ نے مکہ میں توحید کی دعوت شروع کی تو بظاہر سخت مخالفتوں کا سامنا پیش آیا۔ مگر انھیں مخالفتوں کے ذریعہ یہ ہوا کہ آپ کا چرچا سارے ملک میں پھیل گیا۔

''مشکل کے ساتھ آسانی ہے''۔ خدا نے اس دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہر عسر کے ساتھ یسر کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی مسئلہ کبھی کُلّی معنوں میں مسئلہ نہیں ہوتا، بلکہ ہر مسئلہ کے ساتھ ہمیشہ مواقع موجود رہتے ہیں۔ یہاں ہر خاتمہ ایک نئے آغاز کو لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں کسی کے لیے کسی بھی حال میں مایوسی کی ضرورت نہیں۔ انسان اگر مثبت ذہن کے ساتھ معاملے میں غور کرے تو ہر عسر میں اس کو یسر کا پہلو مل جائے گا۔ عسر کا مطلب ہے پرابلم، اور یسر کا مطلب موقع (opportunity)۔ مسائل کے ساتھ ہمیشہ مواقع موجود رہتے ہیں یعنی پرابلم کے درمیان موجود مواقع کو جاننا، اور منصوبہ بند انداز میں ان کو اویل (avail) کرنا، یہی زندگی کا اصول ہے۔ اس لیے آدمی کو یہ حکمت اختیار کرنا چاہیے کہ وہ مسائل کو نظر انداز کرے اور مواقع کو استعمال کرے:

Ignore the problems and avail the opportunities.

شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے ساتھ کوئی سٹ بیک (set back) پیش آئے تو وہ نہ گھبرائے اور نہ وہ مایوس ہو۔ اگر وہ اپنے ہوش وحواس کو برقرار رکھے تو بہت جلد وہ دوبارہ اپنے حق میں ایک نیا امکان پالے گا۔ وہ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کر کے دوبارہ ترقی اور کامیابی کی منزل پر پہنچ جائے گا۔ یہی موجودہ دنیا کے لیے اللہ کا قانون ہے۔ یہاں ابتداءً انسان کے ساتھ عسر کے حالات پیش آتے ہیں۔ لیکن اگر وہ صبر کے ساتھ اپنے مقصد پر جما رہے تو یہ عسر اس کے لیے نئے یسر تک پہنچنے کا زینہ بن جاتا ہے۔

اس دنیا میں انسان تنہا نہیں بلکہ اس کا ایک پاسبان ہے یعنی اللہ رب العالمین، جو ہر مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف دیکھے، وہ اپنی استطاعت کے بقدر اپنی جدوجہد کو برابر جاری رکھے۔ کیوں کہ خدا بلاشبہ کارساز ہے۔ مگر وہ اسی شخص کا کارساز بنتا ہے جو اس کو اپنا کارساز بنائے، جو اس پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے حوالے کردے۔

۹۵۔ سُوْرَۃُ التِّيْن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ﴿١﴾ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ﴿٢﴾ وَ
هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ﴿٣﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ
فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿٤﴾ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ
سٰفِلِيْنَ ۙ﴿٥﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ﴿٦﴾ فَمَا
يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ؕ﴿٧﴾ اَلَيْسَ اللّٰهُ
بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨﴾ ع ٨ / ٢

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے تین کی اور زیتون کی۔ ۲۔ اور طورِ سینا کی۔ ۳۔ اور اس امن والے شہر کی۔ ۴۔ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ ۵۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ ۶۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے تو ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ ۷۔ تو اب کیا ہے جس سے تم بدلہ ملنے کو جھٹلاتے ہو۔ ۸۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں۔

تین اور زیتون دو پہاڑوں کے نام ہیں، جن کے قریب بیت المقدس واقع ہے، یعنی حضرت مسیح کا مقام عمل۔ طور سینین سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ پر خدا نے وحی فرمائی۔ بلد امین سے مراد مکہ ہے جہاں پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ صلاحیتیں اس لیے ہیں کہ انسان پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر کیے جانے والے حق کو پہچانے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنائے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ عزت اور بلندی کا ابدی مقام پائیں گے۔ اس کے برعکس، جو لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں کو خدا کی مرضی کے تابع نہ کریں، ان سے موجودہ نعمتیں بھی چھین لی جائیں گی اور کامل محرومی کے سوا کوئی جگہ نہ ہوگی جہاں ان کو ٹھکانا مل سکے — پیغمبروں کی بعثت اور پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والے نتائج اس کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔

انسان احسنِ تقویم کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ احسنِ تقویم کو دوسری جگہ صورتِ احسن (الزمر، 39:64) کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی انسان اپنے امکان (potential) کے اعتبار سے اعلیٰ ترین مخلوق کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ ان تمام صفتوں کا حامل ہے جو اس کو جنت میں آبادکاری کا مستحق بنائیں۔ انسان واحد مخلوق ہے جو اپنی

ساخت کے اعتبار سے، معیار پسند (idealist) اور کمال پسند (perfectionist) واقع ہوا ہے۔ یہ انسانی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان جس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ اس کا ہیبی ٹیٹ (habitat) نہیں۔ ایک سائنس داں نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اس کے لیے نہیں بنائی گئی تھی:

It appears that man has strayed into a
world that was not made for him.

انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان یہ عدم مطابقت ہر عورت اور ہر مرد کے لیے ایک فطری حقیقت کی یاد دہانی ہے۔ اگر آدمی حق کی تلاش میں سنجیدہ ہو تو انسانی زندگی کا یہ پہلو اس کے لیے ایک ایسا سراغ (clue) بن جائے گا جس پر غور کرتے ہوئے وہ زندگی کی اصل حقیقت کو دریافت کر لے۔ موجودہ دنیا اس کے لیے صرف ایک عارضی قیام گاہ ہے، وہ اس کا ہیبی ٹیٹ نہیں۔ جنت میں داخلہ سے پہلے انسان کو موجودہ زمین پر عارضی طور پر بسایا گیا ہے۔ یہاں ہر قسم کے امتحانی اسباب رکھے گئے ہیں۔ ان اسباب کو پہچاننا اور ان کا شکار ہوئے بغیر زندگی کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھنا یہی وہ شرط ہے جو انسان کو اس کی مطلوب دنیا (جنت) تک پہنچانے والی ہے۔ یہی جنتی دنیا احسن تقویم کا اصل جائے مقام ہے۔ اِس معاملے میں کسی بھی انسان کا کوئی استثنا نہیں۔

جو لوگ زمینی زندگی میں خدا کے تخلیقی اسکیم کے مطابق زندگی نہ گزار سکیں، وہ پیدائشی طور پر احسنِ تقویم ہوتے ہوئے بھی اسفل السافلین میں جا گریں گے، یعنی وہ سارے امکان کے باوجود ابدی محرومی کا کیس بن کر رہ جائیں گے۔ اس حقیقت کو یہاں 'پھر ہم نے اس کو سب سے نیچے پھینک دیا' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یہ بات دوسری سورتوں میں دوسرے الفاظ میں کہی گئی ہے۔ مثلاً اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (103:2)۔ یعنی، بیشک انسان گھاٹے میں ہے۔

انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ پوری انسانی تاریخ پر منطبق ہوتے ہیں۔ اول دن سے اب تک جو عورت یا مرد اس کرۂ ارض پر پیدا ہوئے، اُن سب کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا کہ تمام انسان احسنِ تقویم کے ساتھ پیدا ہوئے، مگر وہ محدود مدت کے بعد مر گئے اور اُن کی بنائی ہوئی دنیا خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے بالکل اجڑ گئی۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اِس کا مستحق بنائے کہ موت کے بعد اس کو ابدی جنت میں داخلہ ملے جو کہ انسان کا اصل ہیبی ٹیٹ ہے۔

صرف اعلیٰ مقصد ہی انسان کی زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے۔ وہ اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنی صلاحیتوں کے صحیح استعمال کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرے اور خدا کی پسند والی زندگی گزارے۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کے یہاں بہت بڑا انعام ہے۔ جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں ان کا انجام کامل گھاٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔

۹۶۔ سُوْرَةُ الْعَلَق

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۚ ﴿۱﴾ خَلَقَ
الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَ رَبُّكَ
الۡاَكۡرَمُ ۙ ﴿۳﴾ الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ ﴿۴﴾ عَلَّمَ
الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ ؕ ﴿۵﴾ كَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ
لَيَطۡغٰٓى ۙ ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى ؕ ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰى
رَبِّكَ الرُّجۡعٰى ؕ ﴿۸﴾ اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يَنۡهٰى ۙ ﴿۹﴾
عَبۡدًا اِذَا صَلّٰى ؕ ﴿۱۰﴾ اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَانَ عَلَى
الۡهُدٰٓى ۙ ﴿۱۱﴾ اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰى ؕ ﴿۱۲﴾ اَرَءَيۡتَ
اِنۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ ﴿۱۳﴾ اَلَمۡ يَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ
يَرٰى ؕ ﴿۱۴﴾ كَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ ۙ لَنَسۡفَعًۢا
بِالنَّاصِيَةِ ۙ ﴿۱۵﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ ﴿۱۶﴾
فَلۡيَدۡعُ نَادِيَهٗ ۙ ﴿۱۷﴾ سَنَدۡعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ ﴿۱۸﴾
كَلَّا ؕ لَا تُطِعۡهُ وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ ۩ ﴿۱۹﴾ ع ۱۹ ۲۱ السجدة ۱۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔
۲۔ پیدا کیا انسان کو علق سے۔ ۳۔ پڑھ اور تیرا رب
بڑا کریم ہے ۴۔ جس نے علم سکھایا قلم سے۔ ۵۔ انسان
کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔ ۶۔ ہرگز نہیں،
انسان سرکشی کرتا ہے۔ ۷۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے کو
بے نیاز دیکھتا ہے۔ ۸۔ بے شک تیرے رب ہی
کی طرف لوٹنا ہے۔ ۹۔ کیا تم نے دیکھا اس شخص
کو جو منع کرتا ہے۔ ۱۰۔ ایک بندہ کو جب وہ نماز
پڑھتا ہو۔ ۱۱۔ تمھارا کیا خیال ہے، اگر وہ ہدایت
پر ہو۔ ۱۲۔ یا وہ تقوی کی ہدایت کر رہا ہو۔ ۱۳۔ تمھارا
کیا خیال ہے، اگر اس نے جھٹلایا اور روگردانی
کی۔ ۱۴۔ کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔
۱۵۔ ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آیا تو ہم پیشانی کے بال
پکڑ کر اس کو کھینچیں گے۔ ۱۶۔ اس پیشانی کو جو
جھوٹی، گناہ گار ہے۔ ۱۷۔ اب وہ بلالے اپنے
حامیوں کو۔ ۱۸۔ ہم بھی دوزخ کے فرشتوں کو
بلائیں گے۔ ۱۹۔ ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مان
اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے معمولی مادی اجزاء سے پیدا کیا۔ پھر اس کو یہ نادر صلاحیت دی کہ وہ پڑھے اور الفاظ کے ذریعہ معانی کا ادراک کر سکے۔ پھر انسان کو یہ مزید صلاحیت دی گئی کہ وہ قلم کو استعمال کرے اور اس طرح اپنے علم کو مدون اور محفوظ کر سکے۔ قراءت کی صلاحیت اگر آدمی کو خود پڑھنے کے قابل بناتی ہے تو قلم اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے علم کو وسیع پیمانہ پر دوسروں تک پہنچا سکے۔ جو لوگ حق کے مقابلہ میں سرکشی کریں اور حق کا راستہ اختیار کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں، ان کا انجام بہت برا ہے۔ ایسے حالات میں حق کے داعی کا اصل سہارا یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے۔ وہ لوگوں سے محروم ہو کر خدا سے پائے، وہ لوگوں سے دور ہو کر لوگوں کے خدا سے قریب ہو جائے۔

اس سورہ کی ابتدائی پانچ آیتیں وہ ہیں جو پیغمبر اسلام پر سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ قرآن میں اترا ہوا یہ پہلا کلام الٰہی بتاتا ہے کہ کسی حقیقی عمل کا آغاز کیا ہے۔ یہ آغاز علم ہے۔ یعنی انسان کو باشعور بنانا۔ انسان کے اندر ذہنی تبدیلی لانا، انسان کے اندر فکری انقلاب پیدا کرنا۔ یہی انسانوں کے درمیان کسی حقیقی تحریک کا آغاز ہے۔ اس دنیا میں وہی انسانی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے جو شعور کی بیداری سے اپنے کام کا آغاز کرے۔

چودہ سو سال پہلے قرآن میں ''اقرأ'' کا حکم آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خدائی کلام ہے۔ رسول اللہ نے علم کا پیغام دیا جو ابدی اہمیت کا حامل تھا۔ جو حال سے لے کر مستقبل تک انسان کے کام آنے والا تھا۔ اور جو اپنے وسیع انطباق کے اعتبار سے دوسرے تمام شعبوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ جب پہلی وحی اتری اس وقت عرب میں بہت سے مسائل تھے۔ مثلاً سماجی اعتبار سے وہاں پانی نہیں تھا، وہاں محفوظ راستے نہیں تھے، رومیوں اور ایرانیوں کا عرب علاقوں میں سیاسی دخل اندازی، سماج میں مختلف قسم کے جرائم، دینی اعتبار سے یہ مسئلہ تھا کہ توحید کے مرکز کعبہ میں 360 بت رکھے ہوئے، وغیرہ۔ ایک شخص جس کو صرف انسانی نظر حاصل ہو وہ اسی قسم کے ظاہری مسائل میں الجھ جائے گا۔ مگر قرآن میں جو پہلی آیت اتری وہ یہ نہیں تھی کہ — طہر الکعبۃ من الاصنام (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو) یا قاتل الفرس والروم (ایران و روم سے جنگ کرو) یا انفذ حدود اللہ علی المجرمین (مجرموں پر حدود نافذ کرو)۔ ان مسائل کا ذکر نہ کرتے ہوئے قرآن کی پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ یہ تھی کہ ''پڑھ'' (اِقرأ)، یعنی علم حاصل کرو۔ ''اقرأ'' ابدی رہنمائی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں، ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے عمل کا آغاز ہمیشہ علم اور شعوری بیداری سے کرنا چاہیے۔ یہ نہایت اہم خدائی اصول ہے۔

''ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے۔ اِس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے''۔ یہاں ایک انسانی کردار کے حوالے سے ایک انسانی نفسیات کو بتایا گیا ہے۔ یہی نفسیات اکثر لوگوں کی سرکشی کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ نفسیات، بے نیازی کی نفسیات ہے۔ بے نیازی کی نفسیات جب ترقی کرتی ہے تو وہ خود رائی، سرکشی اور گھمنڈ جیسی برائیوں کا سبب بن جاتی ہے۔

ایک شخص کے پاس اتنا مال آجائے کہ وہ کسی کا محتاج نہ رہے۔ ایک شخص جسمانی اعتبار سے اتنا طاقت ور ہو کہ وہ کسی کی مدد کے بغیر خود اپنا ہر کام کرلے۔ ایک شخص کے اندر اتنی زیادہ ذہنی صلاحیت ہو کہ وہ کسی کے مشورے کے بغیر خود اپنی عقل سے باتوں کو سمجھ لے اور اپنے عمل کا کامیاب منصوبہ بنا سکے۔ جس شخص کے اندر اِس قسم کی اضافی خصوصیت پائی جائے، وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بے نیاز سمجھ لیتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اُس کا یہ ذہن بن جاتا ہے کہ مجھے کسی کے اوپر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں، میں خود اپنے ہر کام کو انجام دے سکتا ہوں۔

بے نیازی کی یہ نفسیات انسان کے ذہنی اور روحانی ارتقا کے لیے قاتل ہے۔ ایسے آدمی کا ذہنی ارتقا (intellectual development) رک جائے گا اور اپنی بے نیازانہ نفسیات کی بنا پر اس کو یہ محسوس بھی نہ ہوگا کہ میرے اندر ذہنی ارتقا کا عمل رک گیا ہے۔ بے نیازی بظاہر کوئی برائی نہیں، لیکن اپنے نتیجے کے اعتبار

سے، وہ ایک سنگین برائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ بے نیازی آخر کار آدمی کو کبر (arrogance) تک پہنچاتی ہے اور بلا شبہ کبر سے زیادہ تباہ کن کوئی اور چیز انسان کے لیے نہیں۔

''سجدہ کر اور قریب ہو جا''۔ سجدہ کیا ہے۔ یہ آدمی کی داخلی حالت کا خارجی اظہار ہے۔ آدمی کے دل میں اپنے رب کی عظمت کا شدید احساس طاری ہوا، وہ اللہ کے کمالِ قدرت کے مقابلے میں کمالِ عجز کو سوچ کر تڑپ اٹھا۔ اس کی یہ داخلی کیفیت جسمانی اعتبار سے اس حالت میں ڈھل گئی کہ وہ سجدہ میں گر پڑا۔ خدا کے آگے جھکنا اطاعت کی علامت ہے، اور سجدہ قربتِ خداوندی کی انتہا۔ سجدہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو آخری حد تک اللہ کے آگے ڈال دیا ہے۔ اس نے اپنے پورے وجود کو اللہ کے حوالہ کر دیا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان کو حقیقی خدا کی قربت کا تجربہ کراتا ہے۔

۹۷۔ سُوْرَةُ الْقَدْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۚۖ ① وَ مَاۤ
اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ؕ ② لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۙ۬
خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ؕؔ ③ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ
الرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۛۙ ④
سَلٰمٌ ۛ۫ هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۠ ⑤ ع ۵ ۲۲

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ ہم نے اس کو اُتارا ہے شب قدر میں۔ ۲۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ ۳۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ ۴۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کی اجازت سے اُترتے ہیں، ہر حکم لے کر۔ ۵۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے، صبح نکلنے تک۔

سال کی ایک خاص رات (غالباً ماہ رمضان کے اخیر عشرہ کی کوئی رات) اللہ تعالیٰ کے یہاں فیصلہ کی رات ہے۔ دنیا کے انتظام کے متعلق جو کام اس سال میں مقدر ہیں ان کے نفاذ کی تعیین کے لیے خدا کے خصوصی منصوبہ کے تحت اس رات کو فرشتے بڑی تعداد میں اترتے ہیں۔ اس قسم کی ایک خاص رات میں قرآن کا نزول شروع ہوا۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رات کو زمین پر فرشتوں کی کثرت ہوتی ہے۔ اس سے زمین پر خاص طرح کا روحانی ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اب جو لوگ اپنے اندر روحانیت بیدار کیے ہوئے ہوں وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کے اندر غیر معمولی روحانی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو ان کے دینی عمل کی قدر و قیمت عام حالات سے بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ فرشتوں کی کثرت کی بنا پر لیلۃ القدر کی رات امن کی رات (nightofpeace) بن جاتی ہے۔

اس سورہ میں رات کا لفظ انسان کی نسبت سے آیا ہے۔ یعنی وہ انسان جس کو اس رات کا فیض حاصل

ہوجائے، جولوگ اپنی ذہنی بیداری کی بنا پر اس رات کو پہچانیں، اور اس سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں، ان کے اندر مبنی بر اسلام شخصیت بنے گی۔ ایسے لوگ مکمل معنوں میں امن پسند انسان (peacefulperson) بن جائیں گے۔ ان کے اندر کامل معنوں میں پرامن سوچ (peacefulthinking) پیدا ہوجائے گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے شب قدر کا علم دیا گیا، اور میں مسجد سے نکلا کہ تم لوگوں کو بتادوں۔ اتنے میں دو مسلمان لڑ گئے۔ اس لیے وہ علم اٹھا لیا گیا (فَتَلَاحَى رَجُلَانِ فَرُفِعَتْ) مسند احمد، حدیث نمبر 22672۔ گویا جب لوگ باہمی لڑائی جھگڑے کی سطح پر ہوں تو علمِ الٰہی کی روشنی ان سے دور ہوجاتی ہے۔ خدائی کلام کو سننے کے لیے ان کے کان بہرے ہوجاتے ہیں۔ معرفتِ خداوندی کا فیضان اسی قلب پر اترتا ہے، جو دل دوسروں کے خلاف بغض وحسد سے خالی ہو۔ جس کا سینہ دوسروں کے خلاف نفرت کا کوڑا خانہ بنا ہوا ہو، اس میں علم خداوندی کو لے کر چلنے والے پاک فرشتے قدم نہیں رکھتے۔

پرامن انسان بننا کوئی سادہ بات نہیں۔ پرامن انسان بننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان جس کا دل منفی سوچ (negative thoughts) سے خالی ہو، وہ انسان جس کے اندر کامل معنوں میں تواضع (modesty) ہو، وہ انسان جو ہر قسم کے ڈسٹریکشن (distraction) سے بچا ہوا ہو، وہ انسان جو اپنی روحانی بلندی کی بنا پر اعلیٰ حقائق میں جینے والا بن گیا ہو۔

امن پسند انسان سے مراد وہ انسان ہے جس کے لیے قرآن میں نفس مطمئن (89:27) اور قلب سلیم (26:89) جیسے الفاظ آئے ہیں۔ پرامن انسان وہ ہے جس کا دل غیر اللہ کی فکر سے خالی ہوجائے، جس کے دماغ میں اللہ کی نسبت سے کوئی کنفیوزن (confusion) باقی نہ رہے۔

۹۸۔ سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾ وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ؕ﴿۴﴾ وَ مَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے انکار کیا، وہ باز آنے والے نہیں جب تک ان کے پاس واضح دلیل نہ آجائے۔ ۲۔ اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔ ۳۔ جن میں درست مضامین لکھے ہوں۔ ۴۔ اور جو لوگ اہل کتاب تھے وہ واضح دلیل آجانے کے بعد ہی مختلف ہوگئے۔ ۵۔ حالاں کہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں۔ اس کے

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ
الْقَيِّمَةِ ؕ﴿٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ﴿٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ
الْبَرِيَّةِ ؕ﴿٧﴾ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ
عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ
اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ
لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ع﴿٨﴾ ع ۸ ۲۲

لیے دین کو خالص کر دیں، یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں، اور یہی درست دین ہے۔
۶۔ بے شک اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں پڑیں گے، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔
۷۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے، وہ لوگ بہترینِ خلائق ہیں۔
۸۔ ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرے۔

عرب کے مشرکین اور اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ آپ کوئی معجزہ دکھائیں۔ یا فرشتہ آسمان سے آ کر ہم سے کلام کرے تب ہم آپ کی رسالت مانیں گے۔ مگر اس قسم کا مطالبہ کرنے والے ہمیشہ غیر سنجیدہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے لوگوں نے اس طرح کے مطالبے کیے، مگر مطالبہ پورا ہونے کے باوجود وہ مومن نہ بن سکے۔

دین کسی قسم کے خارجی ہنگامے کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ کی دنیا میں بسیرا لینے کا نام ہے۔ کوئی بھی دینی عمل، خواہ وہ روزہ ہو یا اور کوئی عبادت، ہر ایک اللہ تعالی کے یہاں اسی وقت قبول ہوتا ہے جب کہ اس میں اخلاص کی اسپرٹ پائی جائے۔ جو عمل اخلاص سے خالی ہو، اللہ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ پچھلی امتوں میں جو واقعہ پیش آیا، وہ یہ تھا کہ اُن کو اللہ کی کتاب دی گئی تھی، لیکن ان کی بعد کی نسلوں کے درمیان کتاب کی تشریح و توضیح میں علماء کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کی بنا پر امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ اختلاف کا یہی واقعہ، فطرت کے قانون کے مطابق، امتِ مسلمہ کی بعد کی نسلوں میں پیش آئے گا۔ دونوں کا مشترک سبب ایک ہے۔ وہ یہ ہے کہ امت کی ابتدائی نسل میں دین اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے زندہ ہوتا ہے۔ لوگوں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دین اصلاً اسپرٹ کا نام ہے۔ لیکن بعد کے دور میں زوال کی بنا پر اسپرٹ مفقود ہو جاتی ہے اور لوگ دین کے فارم کو اصل دین سمجھ لیتے ہیں۔ دورِ زوال میں اِن تبدیلیوں کی بنا پر دینِ خداوندی کا وہ حال ہو جاتا ہے جس کو ایک حدیثِ رسول میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ، وَلَا يَبْقَى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهُ، مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 1763)۔ یعنی دورِ زوال میں اسلام کا صرف نام باقی رہے گا اور قرآن کا صرف رسم الخط باقی رہے گا۔ مسجدیں آباد ہوں گی، مگر وہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔

چوں کہ فارم میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے، اِس لیے امت جب زوال کا شکار ہوکر فارم پر قائم ہوجائے تو ہمیشہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے اختلاف آتا ہے، پھر فرقہ بندی ہوتی ہے اور پھر مختلف گروہوں کے درمیان تشدد شروع ہوجاتا ہے۔ اِس اختلاف کی بنا پر دین میں رایوں کا اختلاف بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عام انسان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا اصل دین (دینِ قیم) کیا ہے۔

خدا کا دینِ قیم یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کی عبادت کرے۔ وہ دل سے اس کا چاہنے والا بن جائے۔ وہ نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔ یہی خدا کی طرف سے آنے والا اصل دین ہے۔ سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اس دینِ قیم کو اختیار کریں۔ اور سب سے برے لوگ وہ ہیں جو اس دین قیم کو اختیار نہ کریں یا اس کے سوا کوئی اور دین وضع کریں اور اس خود ساختہ دین کو دین قیم کا نام دے دیں۔

دورِ زوال میں امت کی اصلاح کا صحیح طریقہ صرف ایک ہے۔ امام مالک بن انس (وفات 179ھ) اپنے استاد وہب ابن کیسان کے حوالے سے کہتے ہیں: إِنَّهُ لَا يُصْلِحُ آخِرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا مَا أَصْلَحَ أَوَّلَهَا، قُلْتُ لَهُ: يُرِيدُ مَاذَا؟ قَالَ يُرِيدُ التُّقَى (مسند الموطا للجوہری، حدیث نمبر 783)۔ یعنی بلاشبہ اس امت کے دورِ آخر کی اصلاح بھی اسی طریقے کی پیروی سے ہوگی جس طریقہ کی پیروی سے امت کے دور اول کی اصلاح ہوئی۔ میں (راوی) نے پوچھا کہ اس سے ان کی مراد کیا ہوتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی مراد ہوتی تھی: تقوی۔ اہل تقوی یعنی وہ لوگ جو دنیا کے بجائے اللہ سے راضی ہوجائے۔ آخرت میں خوش گواریوں پر رضامندی اسی قسم کے لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ یہی اسپرٹ (spirit) انسان کو جنت میں لے جائے گی۔

۹۹۔ سُوْرَۃُ الزِّلْزَال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ② وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ③ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ④ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ⑤ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ⑥ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ⑦ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ⑧ ع

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ جب زمین شدت سے ہلادی جائے گی۔ ۲۔ اور زمین اپنا بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ ۳۔ اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا۔ ۴۔ اس دن وہ اپنے حالات بیان کرے گی۔ ۵۔ کیوں کہ تمھارے رب کا اس کو یہی حکم ہوگا۔ ۶۔ اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے، تاکہ ان کے اعمال انھیں دکھائے جائیں۔ ۷۔ پس جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا۔ ۸۔ اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا۔

قیامت کا زلزلہ مدتِ امتحان کے ختم ہونے کا اعلان ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب لوگوں سے وہ آزادی چھن گئی جو امتحان کی مصلحت کی بنا پر انہیں حاصل تھی۔ اب وہ وقت آ گیا جب لوگوں کو ان کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ آج خدا کی دنیا بظاہر خاموش ہے۔ مگر جب حالات بدلیں گے تو یہاں کی ہر چیز بولنے لگے گی۔

دنیا میں آدمی ظالمانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ سچائی کے پیغام کو ٹھکراتا ہے۔ وہ حق دار کو اس کا حق ادا کرنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ جس پر قابو پا جاتا ہے اس کے اوپر خداوند بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو صداقت کا معیار بنالیتا ہے۔ وہ دنیا میں اس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ یہاں آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جس طرح چاہے اپنے اختیارات کو استعمال کرے۔ مزید یہ کہ ہر آدمی کے پاس الفاظ کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے جس سے وہ اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو چھپا سکے۔ ہر آدمی کے پاس خوبصورت تاویلات ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کر سکے۔

یہ سب کچھ یہاں بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے مگر ساری کائنات خاموش کھڑی ہوئی اس کو دیکھ رہی ہے۔ درختوں کی پتیاں، سورج، چاند اور زمین و آسمان، وغیرہ ایک غیر جانب دار تماشائی کی طرح کھڑے رہتے ہیں، وہ حق کی حمایت میں اپنا کوئی بیان نہیں دیتے۔ دنیا میں بولنے والی زبان صرف ایک ہی نظر آتی ہے اور وہ انسان کی زبان ہے۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حق کی پامالی کو دیکھتا ہے اور اس سے بے تعلقی ظاہر کرتا ہے۔ وہ خود غرضیوں اور مصلحتوں کے تحت بولتا ہے۔ وہ طاقت ور کی طرف داری کرتا ہے خواہ وہ باطل پر ہو اور کمزور کو نظر انداز کرتا ہے خواہ وہ حق پر ہو۔ ایک ایسی کائنات جہاں چڑیوں کے سریلے نغمے بلند ہوتے ہوں۔ جہاں سورج روزانہ دنیا کو روشن کرتا ہو، وہاں کوئی حق کی حمایت میں بولنے والا نہیں۔ وہاں کوئی بے انصافی کا پردہ پھاڑنے والا نہیں۔

آنے والی قیامت اس سوال کا جواب ہے۔ قیامت کے دن کائنات کا مالک اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ اس دن حق کی حکمرانی ہوگی۔ اس دن زمین و آسمان کی تمام چیزیں بول پڑیں گی۔ حتی کہ آدمی کے اپنے اعضا بھی سچائی کی گواہی دینے لگیں گے (فصلت، 41:20)۔ موجودہ زمانہ کی ایجادات نے ثابت کیا ہے کہ بے جان چیزیں بھی ''بولنے'' کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسٹوڈیو میں کیے ہوئے عمل کو فلم اور ریکارڈ پوری طرح دہرا دیتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ دنیا گویا بہت بڑا خدائی اسٹوڈیو ہے۔ اس کے اندر انسان جو کچھ کرتا ہے یا جو کچھ بولتا ہے وہ سب ہر لمحہ محفوظ ہو رہا ہے۔ اور جب وقت آئے گا تو ہر ایک کی کہانی کو یہ دنیا اس طرح دہرا دے گی کہ اس کی کوئی بھی بات اس سے بچی ہوئی نہ ہوگی، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔

قیامت کے دن عزت والا وہ ہوگا جو خدا کے نزدیک حق پر تھا اور وہ تمام لوگ ذلت کی ابدی دنیا میں دھکیل دیے جائیں گے جو خدا کے نزدیک ناحق پر چل رہے تھے۔

١٠٠۔ سُوۡرَۃُ الۡعٰدِیٰت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝
وَ الۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡمُوۡرِیٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾
فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرۡنَ بِہٖ نَقۡعًا ۙ﴿۴﴾
فَوَسَطۡنَ بِہٖ جَمۡعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ
لَکَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیۡدٌ ۚ﴿۷﴾
وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ؕ﴿۸﴾ اَفَلَا یَعۡلَمُ
اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ﴿۹﴾ وَ حُصِّلَ مَا فِی
الصُّدُوۡرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ
لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾ ع ۱ ۱۱ ۲۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ ۲۔ پھر ٹاپ مار کر چنگاری نکالنے والے۔ ۳۔ پھر صبح کے وقت چھاپہ مارنے والے۔ ۴۔ پھر اس میں غبار اُڑانے والے۔ ۵۔ پھر اس وقت فوج میں گھس جانے والے۔ ۶۔ بے شک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ ۷۔ اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔ ۸۔ اور وہ مال کی محبت میں بہت شدید ہے۔ ۹۔ کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب وہ قبروں سے نکالا جائے گا۔ ۱۰۔ اور نکالا جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے۔ ۱۱۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے خوب باخبر ہوگا۔

گھوڑا ایک نہایت وفادار جانور ہے۔ وہ اپنے مالک کے لیے اپنے آپ کو آخری حد تک قربان کردیتا ہے، حتی کہ جنگ کے میدان میں بھی وہ اپنے مالک کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ یہ گویا ایک علامتی مثال ہے جو انسان کو بتاتی ہے کہ اسے کیسا بننا چاہیے۔ انسان کو بھی اپنے رب کا اسی طرح وفادار بننا چاہیے جیسا کہ گھوڑا انسان کا وفادار ہوتا ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں۔

ایک حدیثِ رسول میں خدا کے وفادار بندوں کی مثال اس طرح بیان کی گئی ہے: عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: مَثَلُ الْمُؤْمِنِ وَمَثَلُ الْإِيمَانِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ، عَلَى آخِيَّتِهِ يَجُولُ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى آخِيَّتِهِ، وَإِنَّ الْمُؤْمِنَ يَسْهُو، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى الْإِيمَانِ (مسند احمد، حدیث نمبر 11335)۔ ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کی مثال اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی ہے، جو اپنے کھونٹے سے بندھا رہ کر چاروں طرف گھومتا ہے، پھر اپنے کھونٹے کے پاس واپس آجاتا ہے۔ مومن سے بھی غفلت ہوتی ہے، پھر وہ ایمان کی طرف واپس آجاتا ہے۔

اس دنیا میں جانور اپنے مالک کا شکر گزار ہے مگر انسان اپنے رب کا شکر گزار نہیں۔ یہاں جانور اپنے مالک کا حق پہچانتا ہے مگر انسان اپنے رب کا حق نہیں پہچانتا۔ یہاں جانور اپنے مالک کی اطاعت میں سرگرم ہے۔ مگر انسان اپنے رب کی اطاعت میں سرگرم نہیں۔

انسان اسی جانور کی قدر کرتا ہے جو اس کا وفادار ہو۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ اس راز کو نہ جانے کہ خدا کے یہاں وہی انسان قابلِ قدر ٹھہرے گا جو خدا کی نظر میں اس کا وفادار ثابت ہو۔ مگر مال کی محبت اس کو اندھا بنا دیتی ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت کو جاننے سے محروم رہتا ہے جس کا وہ خود اپنے قریبی حالات میں تجربہ کر چکا تھا۔

یہ صورتِ حال اسی طرح باقی رہنے والی نہیں۔ انسان کی موت اس بات کا الارم ہے کہ وہ مکمل طور پر خدا کی پکڑ میں ہے۔ موت دراصل، حساب و کتاب کی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ وہاں انسان کو اس خدا کی عدالت کے سامنے کھڑا ہونا ہے جس سے انسان کی کوئی بھی بات چھپی ہوئی نہیں۔

١٠١۔ سُوْرَةُ الْقَارِعَة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلْقَارِعَةُ ﴿١﴾ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٢﴾ وَ مَآ
اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٣﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ
كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿٤﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿٥﴾ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ
مَوَازِيْنُهٗ ﴿٦﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾ وَ
اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٨﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾
ع ١١/٢٦ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿١٠﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿١١﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
١۔ کھڑکھڑانے والی۔ ٢۔ کیا ہے کھڑکھڑانے والی۔ ٣۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی۔ ٤۔ جس دن لوگ پتنگوں کی طرح بکھرے ہوئے ہوں گے۔ ٥۔ اور پہاڑ دھنکے ہوئے رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔ ٦۔ پھر جس شخص کا پلہ بھاری ہوگا۔ ٧۔ وہ دل پسند آرام میں ہوگا۔ ٨۔ اور جس شخص کا پلہ ہلکا ہوگا۔ ٩۔ تو اس کا ٹھکانا گڑھا ہے۔ ١٠۔ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے۔ ١١۔ بھڑکتی ہوئی آگ۔

قیامت کا بھونچال ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ لوگوں کے تمام استحکامات درہم برہم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ایک نیا عالم بنے گا جہاں سارا وزن صرف حق میں ہوگا، بقیہ تمام چیزیں اپنا وزن کھو دیں گی۔ موجودہ دنیا میں انسانوں کی پسند کا رواج ہے۔ یہاں انسانوں کی نسبت سے چیزوں کا وزن قائم ہوتا ہے۔ آخرت کی دنیا خدا کی دنیا ہے۔ وہاں خدا کی پسند کے اعتبار سے ایک چیز وزن دار ہوگی اور دوسری چیز بالکل بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔ اگر انسان کو آخرت کا زندہ یقین ہو تو وہ ہر قسم کی منفی باتوں سے رک جائے گا۔ کیوں کہ وہ سوچے گا کہ قیامت آتے ہی اس کی منفی باتیں اتنا زیادہ بے وزن ہو جائیں گی کہ کوئی اس کو سننے والا بھی نہ ہوگا۔ حتی کہ اس کے اپنے الفاظ بھی اس کا اپنا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

میزان کا مطلب تول (scale) ہے۔ یہ ایک تمثیل کی زبان میں ہے۔ یہ ایک کیفیاتی حقیقت (qualitative reality) کو کمیاتی زبان (quantitative term) میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی معنوی بات

کومادی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔آخرت میں اعمال کا درجہ ان کی معنوی اہمیت کے اعتبار سے ہوگا، معروف قسم کے ترازو اور باٹ سے نہیں۔ کسی آدمی نے جو عمل کیا ہو، اس کا ایک ظاہری پہلو ہوتا ہے، مگر آخرت میں اعمال کا درجہ ان کے معنوی پہلو کے اعتبار سے ہوگا۔ مثلاً ایک شخص نے درہم و دینار دیا، اور دوسرے شخص نے نیت کے اعتبار سے بڑا کام کیا۔ آخرت میں اس عمل کا درجہ زیادہ ہوگا، جو نیت کے اعتبار سے بڑا عمل ہو۔

دنیا میں اعمال کا وزن ظاہر کے اعتبار سے ہوتا ہے، آخرت میں اعمال کا وزن ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ہوگا۔ جس آدمی کے عمل میں جتنا زیادہ اخلاص ہوگا اتنا ہی زیادہ وزنی قرار پائے گا۔ جو عمل اخلاص سے خالی ہو وہ آخرت میں بالکل بے وزن ہو کر رہ جائے گا، خواہ موجودہ دنیا میں ظاہر بینوں کو وہ کتنا ہی زیادہ باوزن دکھائی دے رہا ہو۔

ثابت بن حجاج کہتے ہیں کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق نے کہا: اپنے آپ کو تول لو قبل اس کے کہ تمھیں تولا جائے۔ اپنا حساب کرلو قبل اس کے کہ تمھارا حساب کیا جائے اور بڑی پیشی کے لیے اپنے کو تیار کرلو کیوں کہ کل کے حساب کے مقابلہ میں آج اپنا حساب لینا زیادہ آسان ہے (حَاسِبُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا، وَتَزَيَّنُوا لِلْعَرْضِ الأَكْبَرِ، وَإِنَّمَا يَخِفُّ الحِسَابُ يَوْمَ القِيَامَةِ عَلَى مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ فِي الدُّنْيَا) سنن الترمذی، حدیث نمبر 2459۔

کسی آدمی کا عمل نیت کے اعتبار سے کس درجے کا عمل ہے، یہ صرف اللہ کو معلوم ہے۔ دنیا میں اس کو متعین نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ایک شخص بہت پیسہ دیتا ہے مگر دکھاوے کے لیے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا شخص کم دیتا ہے، مگر اس کی نیت خالص ہے۔ دنیا میں اعمال کا وزن ظاہر کے اعتبار سے ہوتا ہے، آخرت میں اعمال کا وزن ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ہوگا۔ قرآن میں جس تول کا ذکر ہے، وہ آخرت کا تول ہے، جو کہ کیفیت کے اعتبار سے ہوگا، نہ کہ کمیت کے اعتبار سے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کیفیت کے اعتبار سے کسی چیز کی قدر و قیمت متعین کرنا، دنیا میں ممکن نہیں، یہ صرف آخرت کے میزان میں ممکن ہوگا۔ دنیا میں ہم اس معاملے کو اجمالی طور پر جان سکتے ہیں، نہ کہ متعین صورت میں۔

۱۰۲۔ سُوْرَۃُ التَّکَاثُر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۴﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ﴿۵﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ بہتات کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا۔ ۲۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔ ۳۔ ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لو گے۔ ۴۔ پھر ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لو گے۔ ۵۔ ہرگز نہیں، اگر تم یقین کے ساتھ جانتے۔ ۶۔ کہ تم ضرور دوزخ

لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ٪﴿۸﴾ ع ۸ ۲۷

کو دیکھو گے۔ ۷۔ پھر تم اس کو یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔ ۸۔ پھر اس دن یقیناً تم سے نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھ ہوگی۔

موجودہ دنیا طرح طرح کی مادی چیزوں کا ایک وسیع دسترخوان ہے، یہ چیزیں دنیا میں امتحان کے لیے رکھی گئی ہیں، نہ کہ آزادانہ استفادہ کے لیے۔ آدمی اگر ان چیزوں کو امتحان کی نظر سے دیکھے تو وہ بقدرِ ضرورت ان کو حاصل کرے گا اور احتیاط اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ان کو استعمال کرے گا۔ لیکن آدمی عام طور پر ذمہ دارانہ رویہ پر قائم نہیں رہ پاتا۔ مادی چیزوں کی کشش اس کو اپنی طرف اس طرح کھینچتی ہے کہ وہ ان ہی کی طرف دوڑ پڑتا ہے مزید یہ کہ اس کی حرص کہیں نہیں رکتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے وہ اپنے پورے وجود کو دنیا کی کمائی میں مشغول کردیتا ہے۔ وہ اسی حال میں اپنے صبح و شام بسر کرتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجاتا ہے، وہ اپنی زندگی بھر کی کمائی کو موجودہ دنیا میں چھوڑ کر آخرت کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ اس وقت اچانک وہ اپنے آپ کو اس حال میں پاتا ہے کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو زندگی کے اگلے مرحلے میں اس کے کام آسکے۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمائے، وہ زیادہ سے زیادہ ساز و سامان اپنے پاس جمع کرے۔ وہ اسی دھن میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ جمع کرنے کی چیز تو دوسری تھی اور میں کسی اور چیز کو جمع کرنے میں مصروف رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی چیزوں کا اضافہ صرف آدمی کی مسئولیت کو بڑھاتا ہے۔ اور آدمی اپنی نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی کامیابی میں اضافہ کر رہا ہے۔

خالق نے اس دنیا میں انسان کو جو نعمتیں دی ہیں، اس کے ساتھ ایک لازمی ذمہ داری وابستہ ہے۔ آخرت میں انسان سے یہ پوچھا جائے کہ تم نے زندگی میں ملی ہوئی نعمتوں پر منعم کا اعتراف کیا یا تم نے بے اعترافی کی زندگی گزاری۔ اس کی وضاحت ایک حدیثِ رسول سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک بار بھوک کی حالت میں تھے۔ ایک انصاری آپ کو اور چند صحابہ کو اپنے ساتھ اپنے باغ لے گئے۔ وہاں درخت سے کھجور کا خوشہ توڑ لائے اور پانی پیش کیا۔ آپ نے کھجور کھا کر پانی پیا، پھر آپ نے فرمایا: یہ بھی ان نعمتوں میں سے ہے، جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ تم سے سوال کیا جائے گا (هَذَا مِنَ النَّعِيمِ الَّذِي تُسْأَلُونَ عَنْهُ) مسند البزار، حدیث نمبر 205۔

''کھجور'' کو ایسے پھل کے طور پر لیا جائے جو صرف انسانی محنت کا نتیجہ ہے تو کھانے والے نے ''کھجور'' کو تخلیق خداوندی کے طور پر دریافت نہیں کیا۔ وہ اس کو انسانی محنت کے طور پر دیکھ سکا، مگر وہ اس کو خدائی صنعت کے طور پر دیکھنے سے محروم رہا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور وہ بہت دور پڑا ہوگا صراط مستقیم سے سے (17:72)۔

۱۰۳۔ سُوْرَةُ الْعَصْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَالْعَصْرِ ۙ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ ② اِلَّا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا
بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③ ع ۲۸

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔قسم ہے زمانے کی۔ ۲۔ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ ۳۔مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور نیک عمل کیا اور انھوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

زمانہ کیا ہے۔ گزرتا ہوا وقت۔ زمانے کے گزرتے ہوئے دھارے میں انسان بھی بہہ رہا ہے۔ ہمارا حال ہر آن ماضی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ ہر لمحہ انسان کا کاؤنٹ ڈاؤن (countdown) ہو رہا ہے۔ انسان ہر لمحہ زندگی سے موت کی طرف جا رہا ہے۔ یہ فطرت کا ایک لازمی قانون ہے۔ اس قانون کو دوبارہ الٹی طرف چلایا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کی مقررہ عمر اگر 80 سال ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ ہر گزرنے والا دن اس کی عمر میں ایک دن کمی کا اعلان ہے۔ انسان کے لیے خسران سے بچنے کا راستہ یہ ہے وہ زندگی ختم ہونے سے پہلے منصوبہ تخلیق کے مطابق اپنی عمر کو استعمال کر لے۔

اس دنیا میں کامیابی کے لیے آدمی کو بالارادہ کوشش کرنا ہے، جب کہ ناکامی اس کی طرف اپنے آپ چلی آ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی مہلتِ عمر کو استعمال نہ کرے تو آخر کار اس کے حصہ میں جو چیز آئے گی وہ صرف ہلاکت ہے۔ کامیاب ہونے کے لیے آدمی کو خود عمل کرنا ہے۔ جب کہ ناکامی کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سورہ العصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے، لوگو، اس شخص پر رحم کرو، جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ اس پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتی رہتی ہے اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ عمر کا موقع اگر بے عملی میں یا برے کاموں میں کھو دیا جائے تو یہی انسان کا گھاٹا ہے (تفسیر کبیر امام رازی، جلد 32، ص 278)۔

خدا کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، انسان کی زندگی کا زیادہ بڑا حصہ وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والا ہے۔ موت سے پہلے کی زندگی اس کے پورے عرصہ حیات کا محض ایک ابتدائی وقفہ ہے۔ یہی مختصر وقت انسان کا اصل سرمایہ ہے۔ کیوں کہ اسی پر اس کی آئندہ آنے والی طویل تر زندگی کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس مختصر وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس میں معمولی غفلت بھی ناقابل تلافی نقصان کی صورت میں انسان کو بھگتنی پڑے گی۔

اپنے وقت کو صحیح استعمال کرنے والا وہ ہے جو موجودہ دنیا میں تین باتوں کا ثبوت دے۔ ایک ایمان،

یعنی حقیقت کا شعور اور اس کا اعتراف۔ دوسرے عمل صالح، یعنی وہی کرنا جو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرنا جو نہیں کرنا چاہیے۔ تیسرے حق وصبر کی تلقین، یعنی حقیقت کا اتنا گہرا ادراک کہ آدمی اس کا داعی اور مبلغ بن جائے۔

اس دنیا میں ایک کامیاب زندگی پانے کے لیے صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ آدمی جب خلافِ ایمان باتوں کا چھوڑنا برداشت کرتا ہے، اسی وقت اس کو ایمان کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ اپنی خواہشوں پر بریک لگاتا ہے، اسی وقت عملِ صالح کو اختیار کرنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ جب وہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوشگواریوں پر صبر کرتا ہے، اسی وقت وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو حق کی نصیحت کرسکے۔

۱۰۴۔ سُوْرَۃُ الْھُمَزَۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۚ﴿۳﴾ کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ ۫﴿ۖ۴﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحُطَمَۃُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّہَا عَلَیۡہِمۡ مُّؤۡصَدَۃٌ ۙ﴿۸﴾ فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ ٪﴿۹﴾ ع ۱ ۹ ۲۹

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ تباہی ہے ہر طعنہ دینے والے، عیب نکالنے والے کے لیے۔ ۲۔ جس نے مال کو سمیٹا اور گن گن کر رکھا۔ ۳۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ ۴۔ ہرگز نہیں، وہ پھینکا جائے گا روندنے والی جگہ میں۔ ۵۔ اور تم کیا جانو کہ وہ روندنے والی جگہ کیا ہے۔ ۶۔ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ۔ ۷۔ جو دلوں تک پہنچے گی۔ ۸۔ وہ ان پر بند کردی جائے گی۔ ۹۔ اونچے اونچے ستونوں میں۔

کسی سے اختلاف ہو تو آدمی اس کو دلیل سے رد کرسکتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں کہ آدمی اس پر عیب لگائے، اس کو بدنام کرے، اس کو الزام تراشی کا نشانہ بنائے۔ پہلی بات جائز ہے مگر دوسری بات سراسر ناجائز۔

جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی دنیوی حیثیت محفوظ و مستحکم ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے شخص پر بے بنیاد الزام لگانے سے ان کا اپنا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ مگر یہ صرف نادانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا آگ کے گڑھے میں چھلانگ لگانا ہے۔ ایسا آگ کا گڑھا جس سے نکلنے کی کوئی سبیل ان کے لیے نہ ہوگی۔

اختلاف کے وقت اہل ایمان کا رویہ کیا ہونا چاہیے، اس کو ایک واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو صحابی، سعد بن ابی وقاص اور خالد بن الولید کے درمیان کسی معاملے پر بات کرتے ہوئے کوئی ذاتی نزاع پیدا ہوگئی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک شخص نے حضرت سعد سے حضرت خالد

کی برائی بیان کی۔ تو سعد نے کہا: دور رہو، ہم دونوں کے درمیان جو معاملہ ہے، وہ ہمارے دین تک نہیں پہنچے گا (فَإِنَّ مَا بَيْنَنَا لَمْ يَبْلُغْ دِينَنَا) مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر 25535۔

اجتماعی زندگی میں باہمی نزاع کا پیدا ہونا، ایک عام بات ہے، لیکن اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ ذاتی معاملے کو دین سے الگ رکھیں۔ ذاتی شکایت کو وہ ایک دوسرے کے دین تک نہ لے جائیں۔ ذاتی اختلاف کے باوجود وہ دینی اعتبار سے ایک دوسرے کے اعتراف میں کمی نہ آنے دیں۔

۱۰۵۔ سُوۡرَۃُ الۡفِیۡل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَہُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ۙ﴿۳﴾ تَرۡمِیۡہِمۡ بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَہُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ٪﴿۵﴾

ع ۵۳

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ ۲۔ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا۔ ۳۔ اور ان پر چڑیاں بھیجیں جھنڈ کی جھنڈ۔ ۴۔ جو ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے۔ ۵۔ پھر اللہ نے اس کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔

ابرہہ چھٹی صدی عیسوی میں جنوبی عرب کا ایک مسیحی حبشی حکمراں تھا۔ اس نے مذہبی جنون کے تحت 570ء میں مکہ پر حملہ کیا تاکہ کعبہ کو ڈھا کر ختم کر دے۔ اس کے ساتھ ساٹھ ہزار آدمیوں کا لشکر تھا جس میں تقریباً ایک درجن ہاتھی بھی شامل تھے۔ اسی بنا پر وہ لوگ اصحابِ فیل (ہاتھی والے) کہے گئے۔ جب یہ لوگ مکہ کے قریب پہنچے تو ہاتھیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اسی کے ساتھ پرندوں کے جھنڈ آئے جن کی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں تھیں۔ انھوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر گرائیں تو سارا لشکر عجیب وغریب قسم کی بیماری میں مبتلا ہو گیا اور گھبرا کر واپس بھاگا، مگر ابرہہ سمیت اس کے بیشتر افراد راستہ ہی میں ہلاک ہو گئے۔

یہ واقعہ عین اس سال پیش آیا جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مظاہرہ تھا کہ پیغمبر اسلام کو غلبہ کی نسبت دی گئی ہے۔ آپ کے ساتھ یا آپ کے دین کے ساتھ جو بھی ٹکرائے گا وہ لازماً مغلوب ہو کر رہے گا۔

یہاں جس واقعہ کا ذکر ابرہہ کے ریفرنس میں ہے، وہ صرف ایک وقتی واقعہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کی ایک سنت کا بیان ہے۔ وہ یہ کہ حق کی دعوت کو لے کر اٹھنے والے کی مدد نہ صرف معمول کے اسباب کے ذریعہ کی جاتی ہے، بلکہ اگر ضرورت ہو تو غیر معمولی اسباب کے تحت بھی اس کی مدد کی جاتی ہے۔ 570ء میں ابرہہ کے

حملہ کے وقت اللہ تعالیٰ نے چڑیوں کے جھنڈ کے ذریعے حق کی مدد فرمائی۔ موجودہ زمانے میں یہی مدد سیکولر نارم (secular norm) کے ذریعہ کی جارہی ہے۔

۱۰۶۔ سُوْرَۃُ قُرَیْش

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ
وَ الصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا
الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ
وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ٪﴿۴﴾ ع ۱ / ۳۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ اس واسطے کہ قریش مانوس ہوئے۔
۲۔ جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس۔ ۳۔ تو
ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت
کریں۔ ۴۔ جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا
اور خوف سے ان کو امن دیا۔

قریش ایک تجارتی قوم تھے۔ گرمی کے زمانہ میں ان کے تجارتی قافلے شام اور فلسطین کی طرف جاتے تھے، اور سردیوں کے زمانہ میں وہ یمن کی طرف تجارتی سفر کرتے تھے۔ انہیں تجارتوں پر ان کی معاشیات کا انحصار تھا۔ قدیم زمانہ میں جب کہ تاجروں کو لوٹنا عام تھا، قریش کے قافلے راستے میں لوٹے نہیں جاتے تھے۔ اس کی وجہ کعبہ سے ان کا تعلق تھا۔ قریش کعبہ کے خادم اور متولی تھے اور لوگوں کے ذہنوں پر چوں کہ کعبہ کا بہت زیادہ احترام تھا۔ وہ کعبہ کے خادموں اور متولیوں کا بھی احترام کرتے تھے اور اس بنا پر وہ ان کو نہیں لوٹتے تھے۔

یہاں حکمتِ دعوت کے تحت قریش کو یہ واقعہ یاد دلاتے ہوئے انہیں اسلام کی طرف بلایا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ بڑی ناشکری کی بات ہوگی کہ تم بیت اللہ کے دنیوی فائدے تو حاصل کرو، اور اس سے وابستہ ہونے کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کو پورا نہ کرو۔ جو خدا انسان کو مادی فائدے پہنچاتا ہے اسی خدا کی اس کو عبادت بھی کرنی چاہیے۔

یہاں داعی گروہ کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ وہ یہ کہ خدا نہ صرف داعی گروہ کی مدد کرتا ہے، بلکہ وہ اس گروہ کی بھی مدد کرتا ہے جو ابھی صرف پوٹنشل داعی گروہ کی حیثیت رکھتا ہو، حتی کہ اگر اسباب کے اعتبار سے، اس کی حفاظت کے مواقع نہ ہوں تو خدا ایسے گروہ کو اپنی خصوصی نصرت کے ذریعے بچائے گا، جیسا کہ قریش مکہ، جو کہ پوٹنشل داعی گروہ کی حیثیت رکھتے تھے، ان کو واقعۂ فیل کے وقت خدا کی خصوصی نصرت کے ذریعے بچایا گیا۔

۱۰۷۔ سُوۡرَۃُ الۡمَاعُوۡن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾
فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَا یَحُضُّ
عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ﴿۳﴾ فَوَیۡلٌ
لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ
سَاہُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾ وَ
یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ٪﴿۷﴾ ع ۲۲

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کیا تم نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو انصاف کے دن کو جھٹلاتا ہے۔ ۲۔ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ ۳۔ اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں ابھارتا۔ ۴۔ پس تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے۔ ۵۔ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ ۶۔ وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں۔ ۷۔ اور معمولی ضرورت کی چیزیں بھی نہیں دیتے۔

اس سورہ میں دین کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سورہ میں سب سے پہلے نتیجہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ان چیزوں کا ذکر ہے، جو کسی انسان کو اس نتیجہ تک پہنچانے والی ہیں۔ جو لوگ دنیا میں اس طرح زندگی گزاریں، جیسے حیوان زندگی گزارتا ہے تو وہ اپنے عمل سے اس بات کا مظاہرہ کررہے ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا ایک بے مقصد دنیا ہے۔ وہ کسی مقصد کے بغیر شروع ہوئی، اور کسی مقصد تک پہنچے بغیر ختم ہوجائے گی۔ ایسے لوگوں کے لیے آخری انجام ویل ہے، یعنی تباہ کن ناکامی۔ ایسے لوگوں کی ظاہری علامت کیا ہے۔ اس سورہ میں پہلی بات روز جزاء (Day of Judgement) کو نہ ماننا ہے۔ آخرت کی پکڑ کا یقین آدمی کو نیک عمل بناتا ہے۔ جس آدمی کے اندر آخرت کی پکڑ کا یقین نہ رہے وہ نیکی کی ہر بات سے خالی رہے گا۔ وہ اللہ کی عبادت گزاری سے غافل ہوجائے گا۔ وہ اپنے آپ کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھے گا۔ مثلاً یتیم اور نادار لوگ۔ وہ بے زور آدمی کو دھکا دینے میں بھی نہیں شرمائے گا۔ وہ غریبوں کے حقوق ادا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھے گا۔ حتی کہ وہ لوگوں کو ایسی چیز دینے کا بھی روادار نہ ہوگا جس کے دینے میں اس کا کوئی حقیقی نقصان نہیں، خواہ وہ دیا سلائی کی ایک ڈبیہ ہو یا کسی کے حق میں خیر خواہی کا ایک بول۔

اس قسم کے لوگ جو کچھ کماتے ہیں، اس کو صرف وہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ دوسروں کے لیے ان کی کمائی میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ وہ اگر بظاہر دین دار ہوں، تب بھی ان کی دین داری صرف کچھ ظواہر کے معنی میں ہوتی ہے۔ ان کی دین داری دین کی حقیقی اسپرٹ سے خالی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے لیے معمولی درجہ میں بھی دینے والے نہیں بنتے۔

نماز دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جس کو یہاں ''صلاۃ سہو'' (غفلت کی نماز) کے الفاظ میں بیان کیا گیا

ہے۔یعنی وہ نماز جس میں آدابِ نماز کی پیروی نہیں کی گئی ہو۔اس نماز سے آدمی کو کچھ نہیں ملتا، بلکہ ایسے نمازیوں کے لیے خدا کے یہاں خرابی اور ویل ہے۔ دوسری نماز وہ ہے، جس کو قرآن میں صلاۃ خشوع (ڈر اور عاجزی کی نماز) کہا گیا ہے۔یہی وہ نماز ہے جس کی بنیاد پر اللہ کا مطلوب نماز کلچر پیدا ہوتا ہے۔نماز کلچر کیا ہے، اس کو قرآن میں مختلف مقام پر بیان کیا گیا ہے— خدا کی قربت (96:19)،قلبِ خاشع کے ساتھ زندگی گزارنا (23:2) ، وقت کی پابندی (4:103) ، فحشاء اور منکر سے رکنا (29:45) ، اجتماعی زندگی گزارنا (2:43)، صابرانہ مزاج کے ساتھ دنیا میں رہنا (32:15)، قربانی کی اسپرٹ کا حامل ہونا (108:2) ،سہو کی نفسیات سے بچنا (107:5) ، یادِ الٰہی میں جینا (20:14) ،اپنے معاملات کا نگراں بن جانا (70:34) ،مستقل مزاج ہونا (70:23) ، پاکیزگی کے ساتھ رہنا (5:6) ،مرکزرُخی زندگی گزارنا (2:143)، وغیرہ۔حقیقی نماز وہ ہے جو نمازی کے اندر ان تمام صفات کو پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

۱۰۸۔سُوْرَۃُ الْکَوْثَر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۟ۙ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ
وَانْحَرْ ۟ؕ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۟ ③ ع ۲۲

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ہم نے تم کو کوثر دے دیا۔ ۲۔ پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ ۳۔ بے شک تمھارا دشمن ہی بے نام ونشان ہے۔

کوثر کا مطلب ہے خیر کثیر۔یعنی بہت زیادہ بھلائی اور بہتری۔ کیسے ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ جو انسان کے لیے ناپسندیدہ واقعہ ہو، وہ اس کے لیے خیر کثیر کا ذریعہ بن جائے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے، جو مسائل کو اگنور کر کے مواقع کو اویل کرنا جانتے ہوں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے آمیز حق کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔اس قسم کا کام موجودہ دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ چنانچہ آپ کو اس دعوت کی راہ میں اپنی ہر چیز کھودینی پڑی۔آپ اپنی قوم سے کٹ گئے۔آپ کی معاشی زندگی برباد ہوگئی۔آپ کی اولاد کا مستقبل تاریک ہو گیا۔تھوڑے لوگوں کے سوا کسی نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔مگرانھیں حوصلہ شکن حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر اتری کہ تم کو ہم نے کوثر (خیر کثیر) دے دیا۔ یعنی ہر قسم کی اعلیٰ ترین کامیابی۔قرآن کی یہ پیشین گوئی بعد کے سالوں میں کامل طور پر پوری ہوئی۔

پیغمبر اسلام کو یہ خیر کثیر کمال کے درجے میں دیا گیا۔یہی وعدہ درجہ بدرجہ پیغمبر اسلام کے امتیوں سے بھی ہے۔البتہ بعد کی امتیوں کو وہ ان کے عملی استحقاق کے اعتبار سے دیا جائے گا۔یعنی ان کے لیے بھی ''خیر کثیر'' ہے بشرطیکہ وہ اس خالص دین کو لے کر اٹھیں جس کو پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب لے کر اٹھے تھے۔اس خیر کثیر کا تعلق دنیا سے لے کر آخرت تک ہے، وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

’’اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو‘‘ یہ آیت دین کے دو پہلوؤں کو بتاتی ہے۔ ایک عجزوتواضع، اوردوسرے ایثاروقربانی۔ نماز عجز کی علامت ہے اورجانور کی قربانی علامت ہے ایثار کی۔ یہ گویا دو بنیادیں ہیں، جن کے اوپر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اللہ کے مقابلہ میں عجز مطلوب ہے، اور بندوں کے مقابلہ میں ایثار درکار ہے۔ اللہ بڑا ہے، ہم چھوٹے ہیں۔ اللہ دینے والا ہے، ہم پانے والے ہیں۔ اللہ آقا ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ کے مقابلہ میں واحد چیز جومطلوب ہوسکتی ہے، وہ عجزو تواضع ہی ہے۔ یہاں بندے کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے بےکمال ہونے کو مانے، وہ اللہ کے مقابلہ میں عاجزی اورفرماں برداری کا طریقہ اختیار کرے۔ قربانی کا عمل کئی اعتبار سے بندوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اس اخلاقی برتاؤ اورانسانی سلوک کا خلاصہ ہے جوقربانی کرنے والے کواپنے معاشرہ کے اندر پیش آتا ہے۔

توسیعی مفہوم کے اعتبار سے صلوٰۃ اورنحر کا مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے پروپیگنڈے کونظر انداز کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اللہ سے تعلق قائم کرو، تاکہ شکر کا جذبہ پوری طرح برقرار رہے۔ ’نحر‘ کا مطلب یہ ہے کہ جودعوتی مشن تم کو دیا گیا ہے، قربانی کی سطح پر تم اس مشن کو جاری رکھو۔ مخالفین کی مخالفت تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچاسکے گی، وہ خود ناکام ونامراد ہوکر رہ جائیں گے۔

۱۰۹۔ سُوۡرَۃُ الۡکٰفِرُوۡن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ٪﴿۶﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کہو کہ اے منکرو۔ ۲۔ میں ان کی عبادت نہیں کروں گا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔ ۳۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہوجس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ ۴۔ اور میں ان کی عبادت کرنے والا نہیں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔ ۵۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہوجس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ ۶۔ تمھارے لیے تمھارا دین، اورمیرے لیے میرا دین۔

یہ سورۃ مکہ کے آخری زمانہ میں اتری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً ایک عرصہ تک ’’اے میری قوم‘‘ کے لفظ سے لوگوں کو پکارتے رہے۔ مگر جب اتمام حجت کے باوجود انھوں نے نہ مانا تو خدا نے انھیں ایہا الکافرون (اے انکار کرنے والو) کے لفظ سے خطاب فرمایا۔ اس مرحلہ میں یہ فقرہ دراصل کلمۂ براءت ہے، نہ کہ کلمۂ دعوت۔

عربی زبان میں کفر کے معنٰی انکار کے ہیں اور کافر کا مطلب ہے، انکار کرنے والا۔ کافر ایک شخصی کردار ہے، کافر کسی قوم کا اجتماعی لقب نہیں۔ ’’اے منکرو‘‘ یہاں قانون کی زبان استعمال نہیں کی گئی ہے، بلکہ ہم رنگ

کی زبان (language of hammering) استعمال کی گئی ہے۔ ہیمرنگ کی زبان قانون اور منطق کی زبان نہیں ہوتی۔ اُس میں شدتِ کلام کا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد زمانۂ رسالت کے مخصوص اہل کفر ہیں جنھوں نے یک طرفہ طور پر دشمنی اور جارحیت کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ یہ طرزِ خطاب پورے قرآن میں صرف ایک بار اسی ایک سورہ میں استعمال ہوا ہے۔ کافر یا کفّار یا کافرون کے الفاظ تو قرآن میں متعدد بار آئے ہیں۔ مگر ایھا الکافرون جیسے متعین خطاب کی صورت میں اس کا استعمال قرآن میں کسی اور مقام پر نہیں ہوا ہے۔ مفسرین کی کثیر تعداد کی رائے کے مطابق، یہاں الکافرون میں الف لام عہد کا ہے۔ یعنی وہ ایک گروہ خاص کے لیے متعین طور پر آیا ہے، نہ کہ عمومی طور پر ہر اُس شخص کے لیے جو مسلم گروہ سے باہر ہو۔ اس سلسلے میں کچھ مفسرین کے اقوال یہ ہیں: المخاطبون کفرۃ مخصوصون (تفسیر النسفی، جلد 3، صفحہ 687)۔ یعنی اس کے مخاطب مخصوص منکرین ہیں۔ وَعَنَى بِالْكَافِرِينَ قَوْمًا مُعَيَّنِينَ. لَا جَمِيعَ الْكَافِرِينَ (تفسیر القرطبی، جلد 20، صفحہ 226)۔ یعنی اس سے مراد منکرین کا متعین گروہ ہے، نہ کہ تمام منکرین۔ خطاب لجماعة مخصوصة (تفسیر المظہری، جلد 10، صفحہ 354)۔ یعنی یہ خطاب ایک مخصوص جماعت سے ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد کچھ مخصوص لوگ ہیں، اُس کو عمومی طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اس سے مراد ہمیشہ کے لیے صرف قدیم منکرینِ قریش رہیں گے جو پیغمبر اسلام کے معاصر تھے اور پیغمبرانہ اتمام حجت کے باوجود، جنھوں نے پیغمبر کی بات کو ماننے سے انکار کیا۔ زمانۂ نبوت کے بعد کے لوگوں کو ایھا الإنسان (اے لوگو!) کے لفظ سے خطاب کیا جائے گا، نہ کہ ایھا الکافرون (اے منکرو!) کے لفظ سے۔ اب یہی اندازِ خطاب ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اِس کے تقریباً آٹھ سال بعد مکہ فتح ہوا، اور مکہ کے تمام لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اسی واقعہ کی طرف اگلی سورہ (النصر) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ مسلمان کسی نسلی گروہ کا نام ہے اور نہ کافر کسی نسلی گروہ کا نام۔ دونوں ہی کا مدار اس پر ہے کہ کس کو معرفتِ خداوندی ملی اور کس کو معرفتِ خداوندی نہیں ملی، اور معرفت خداوندی فرد کی کوشش کا نتیجہ ہے، وہ نسلی طور پر منتقل ہونے والی وراثت نہیں۔ اس لیے مسلسل ایسا ہوگا کہ مسلمانوں کی بعد کی نسلیں خدا کی معرفت سے دور ہوتی رہیں گی اور غیر مسلموں میں سے کچھ لوگ سچائی کی دریافت کرتے رہیں گے۔ اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ قومیت کا مدار مذہب پر نہ ہو بلکہ ہوم لینڈ پر ہو۔ کیوں کہ مذہب کی تقسیم بدلتی رہتی ہے، جب کہ ہوم لینڈ کی تقسیم عموماً نہیں بدلتی۔

دین کا آغاز معرفت (realization) سے ہوتا ہے۔ انسان جب آفاق وانفس پر غور کرتا ہے تو اُس کو ایک عظیم خالق کی دریافت ہوتی ہے۔ خالق کی عظمت کا احساس اُس کے پورے وجود پر چھا جاتا ہے۔ وہ بے اختیار چاہنے لگتا ہے کہ وہ اپنے خالق کے آگے اپنے پورے وجود کے ساتھ خود کو سرینڈر (surrender) کردے، وہ اپنے پورے وجود کو اللہ کے آگے ڈال دے۔ اس کے دل میں اللہ کے لیے حب شدید کے احساس امنڈنے لگتے ہیں۔ اس کو اندیشہ ہوتا ہے تو صرف اللہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ احساس، معرفت کا ایک فطری نتیجہ ہے اور اِسی فطری نتیجے کا نام عبادت ہے۔ عبادت اپنے ظاہر کے اعتبار سے، ایک فارم ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار

سے، وہ مومن کے اندر پیدا ہونے والے داخلی طوفان کا ایک خارجی ظہور ہے۔ عابد انسان کی پوری زندگی اندر سے باہر تک عبادت بن جاتی ہے۔ عبادت ایک عارف انسان کی طرف سے اپنے رب کا قولی اور عملی اعتراف ہے۔

میرے لیے میرا دین، تمہارے لیے تمہارا دین — یہ دوسروں کے دین کی تصدیق نہیں۔ یہ ایک طرف اپنے حق پر جمے رہنے کا آخری اظہار ہے۔ اور دوسری طرف وہ مخاطب کی اس حالت کا اعلان ہے کہ تم اب ضد کی اس آخری حد پر آ گئے ہو جہاں سے کوئی شخص جلدی پلٹتا نہیں ہے۔

۱۱۰۔ سُوْرَةُ النَّصْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ① وَرَاَيْتَ
النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ②
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
تَوَّابًا ③ ع ۳ ۳۵

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

۱۔ جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح۔ ۲۔ اور تم دیکھو گے کہ لوگ خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں فوج در فوج۔ ۳۔ تو اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ اور اس سے بخشش مانگو، بے شک وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

قرآن میں فتح (victory) کا لفظ اس معنی میں دو سورتوں میں آیا ہے، سورہ النصر اور سورہ الفتح۔ سورہ النصر میں فتح کا لفظ سیاسی فتح کے معنی میں ہے، یعنی مکہ کی فتح۔ لیکن سورہ الفتح میں یہ لفظ سیاسی فتح کے معنی میں نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سورہ معاہدۂ حدیبیہ کے وقت اتری تھی، اور معاہدہ حدیبیہ میں رسول اور اصحابِ رسول کو کوئی سیاسی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ حدیبیہ کا سفر رسول اور اصحابِ رسول نے اس لیے کیا تھا کہ مکہ جا کر عمرہ ادا کریں، لیکن اس وقت مکہ پر قریش کا غلبہ تھا۔ انھوں نے آپ کو اجازت نہ دی اور آپ کو اور آپ کے اصحاب کو عمرہ کی ادائیگی کے بغیر درمیان سے مدینہ کی طرف واپس ہونا پڑا تھا۔

اس سورہ میں صرف فتح کا لفظ آیا ہے، جب کہ سورہ الفتح میں فتح مبین (clear victory) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا سورہ الفتح میں جس فتح کا ذکر ہے، وہ اللہ کی نظر میں رسول اور اصحابِ رسول کے لیے زیادہ بڑی فتح تھی۔ یہ زیادہ بڑی فتح کیا تھی، یقیناً وہ کوئی ایسی چیز تھی، جو سیاسی فتح (political victory) کے علاوہ تھی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مبین مواقع دعوت کے فتح (unlock) کے معنی میں تھی۔ معاہدہ حدیبیہ کے ذریعہ دونوں فریق اس کے پابند ہو گئے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی لڑائی نہیں کریں گے۔ معاہدہ حدیبیہ دراصل امن کا معاہدہ تھا:

Makkah was a victory in terms of territory, and
Hudaybiyah was a victory in terms of opportunity.

رسول اور اصحاب رسول کو یہ موقع مل گیا کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر کھلے طور پر دعوت الی اللہ کا کام کرسکیں۔ دوسری فتوحات میں اگر سیاسی فتوحات حاصل ہوتی ہیں تو معاہدہ حدیبیہ نے یہ امکان کھول دیا کہ دعوت کے ذریعہ انسانوں کو فتح کیا جاسکے۔ گویا اللہ کی نظر میں ملک کی فتح سے زیادہ بڑی چیز انسان پر فتح حاصل کرنا ہے۔

اللہ کی وہ مدد جس کا نام فتح ہے، وہ ہمیشہ دعوت کی راہ سے آتی ہے۔ لوگوں کو جوق در جوق دین خدا کے دائرے میں داخل کیا جانا، یہی اللہ کی سب سے بڑی مدد ہے۔ اور اسی راہ سے اہل دین فتح وغلبہ کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ (10-9ھ) میں وہ حالات پیدا ہوئے جب کہ لوگ بہت بڑی تعداد میں خدا کے دین میں داخل ہوگئے۔ اور اس کے ذریعہ فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔

مومن کی فتح اس کے احساس عجز میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ اپنے بظاہر صحیح کام پر بھی خدا سے معافی مانگتا ہے۔ وہ بظاہر اپنی کوششوں سے ملنے والی کامیابی کو بھی خدا کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔

۱۱۱۔ سُوۡرَۃُ اللَّھَب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ
اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ؕ﴿۲﴾
سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ۚۖ﴿۳﴾
وَّ امۡرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ ۚ﴿۴﴾ فِیۡ
جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ٪﴿۵﴾ ع ۵ ۳۶

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہوجائے۔ ۲۔ نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ وہ جو اس نے کمایا۔ ۳۔ وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا۔ ۴۔ اور اس کی بیوی بھی جو ایندھن لیے پھرتی ہے سر پر۔ ۵۔ اس کی گردن میں رسی ہے بٹی ہوئی۔

''ابولہب اور اس کی بیوی'' ایک اعتبار سے دو انسانی کردار ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے وہ مذہبی جبر کی دو نمائندہ مثالیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ نے مکہ کے باشندوں کو اس کی طرف بلایا۔ مگر وہ لوگ آپ کی مخالفت کرنے لگے۔ مخالفین میں جو لوگ سب سے آگے تھے، ان میں آپ کے چچا عبد العزّٰی (ابولہب) اور اس کی بیوی ام جمیل بھی تھی۔ ایک مرتبہ ابولہب نے منفی ردِّ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا: ''تمہارا برُا ہو، کیا تم نے یہی کہنے کے لیے ہم کو بلایا تھا (مستخرج ابی عوانہ، حدیث نمبر 262)۔ ابولہب اور اس کی بیوی کی مثال سے گویا یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ اب وہ دور آنے والا ہے، جب کہ مذہبی جبر کا ماحول پیدا کرنے والے خواہ کتنی ہی کوششیں کرلیں، وہ ناکام رہیں گے۔

خدا کو مطلوب تھا کہ مذہبی جبر کا یہ مصنوعی نظام ختم ہو اور مذہبی آزادی کا فطری نظام قائم ہوجائے۔ قدیم زمانے میں جن مشرک گروہوں کو خلافتِ ارضی کا رول ادا کرنے کا موقع ملا، مگر انھوں نے ناحق طور پر ساری

دنیا میں جبر کی حکومت (despotic rule) کا نظام قائم کر دیا۔ اِس دور میں انسان کو مذہبی آزادی حاصل نہ تھی۔ اِس دور میں ہر جگہ وہ کلچر قائم تھا جس کو مذہبی تشدد کا دور کہا جاتا ہے۔ اللہ نے کثیر تعداد میں پیغمبر بھیجے، تاکہ وہ انسان کو خدا کے منصوبہ تخلیق سے باخبر کریں۔ لیکن پیغمبروں کی پُر امن دعوتی کوششیں مذہبی جبر کی وجہ سے عملاً غیر موثر ہوگئیں۔ اِس کے بعد وہ خدائی فیصلہ آیا جس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (8:29)۔ قرآن کی اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، اُس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ اہل شرک اپنے جبر کی بنا پر سیاسی غلبہ کا جواز ختم کر چکے ہیں، ان کے غلبہ کو توڑ کر دورِ مذہبی آزادی کا آغاز کرو، تاکہ انسان کے اوپر اللہ کی ابدی رحمتوں کے دروازے کھلیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے واقعتاً ایسا ہی کیا۔ پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں نے دورِ قدیم کی تقریباً پوری آباد دنیا میں وہ کام کیا جس کو ہنری پرین (Henri Pirenne) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے —اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ تاریخ کے روایتی نظام کا خاتمہ ہو گیا:

Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was over-thrown. (History of Western Europe, p. 46)

ابولہب (اور اس کی بیوی) دعوتِ حق کے اس مخالف کی تاریخی علامت ہے جو آخری حد تک مذہبی آزادی کا دشمن بن جائے۔ اس کردار سے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ پیش آیا، اسی طرح آپ کی امت کے دوسرے داعیوں کو بھی اس سے سابقہ پیش آسکتا ہے۔ تاہم اگر داعی حقیقی معنوں میں اللہ کے لیے اٹھا ہے تو اللہ کی مدد اس کا ساتھ دے گی۔ ابولہب جیسے لوگوں کی معاندانہ کوششیں اللہ کی مدد سے بے اثر ہو جائیں گی۔ اپنے تمام ذرائع اور وسائل کے باوجود وہ برباد ہو کر رہے گا۔ وہ اپنے عناد میں خود جلے گا، وہ خدا کے داعی کو جس برے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا وہیں وہ خود ابدی طور پر پہنچا دیا جائے گا۔

۱۱۲۔ سُوۡرَةُ الۡاِخۡلَاص

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ① اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ② لَمۡ يَلِدۡ ۙ
وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ۙ ③ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ④ ع ۱/ ۴۸

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کہو، وہ اللہ ایک ہے۔ ۲۔ اللہ بے نیاز ہے۔
۳۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔
۴۔ اور کوئی اس کے برابر کا نہیں۔

قرآن کا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ یہ سورہ توحید کی سورہ ہے۔ اسلام کی بنیاد دو اصولوں پر قائم ہے۔ ایک، خدا پر ایمان۔ دوسرے، تمام انسانوں کے لیے مفید بننا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2004)۔ ایک خدا کا تصور اسلام کا مرکزی تصور ہے۔ یہی عقیدہ اسلام کا اصل سرا ہے، اور یہی اسلام کی تعلیمات کا واحد

سرچشمہ۔ اس سورہ میں خدا کے تصور کو ان تمام آمیزشوں سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے جس میں ہر زمانہ کا انسان مبتلا رہا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ خدا ایک ہے، بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا کے ایک ہونے کا مطلب کیا ہے۔ یعنی خدا کئی نہیں، خدا صرف ایک ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں، وہ بذات خود ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اس سے بلند ہے کہ انسانوں کی طرح وہ کسی کی اولاد ہو یا اس کی کوئی اولاد ہو۔ وہ ایسی یکتا ذات ہے جس کا کسی بھی اعتبار سے کوئی مثل اور برابر نہیں۔

موجودہ زمانے میں علمِ انسانیات (anthropology) کے نام سے ایک مستقل شعبۂ علم وجود میں آیا ہے۔ اِس علم کے تحت، ہر دور کے انسانی سماجوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اِس مطالعے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ہر زمانے کے سماج میں انسان کے اندر خدا کا عقیدہ پایا جاتا تھا، یعنی ایک ایسی فوق الطبیعی ہستی (supernatural being) کا عقیدہ، جو قائم بالذات (self-existent) ہے، جس نے تمام چیزوں کو پیدا کیا، جو تمام عالمِ موجودات کو کنٹرول کر رہا ہے، جس کے قبضۂ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں — جس انسان کو حقیقی خدا کی دریافت ہوجائے، وہ صرف خدا کی عبادت کرے گا، وہ مخلوق کی عبادت نہیں کرے گا۔ وہ خدا کی مخلوق کے ساتھ اچھے اخلاق کا معاملہ کرے گا۔

۱۱۳۔ سُوْرَةُ الْفَلَق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝١ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝٢ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝٣ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝٤ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝٥

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کہو، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی۔ ۲۔ ہر چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔ ۳۔ اور تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے۔ ۴۔ اور گرہوں میں پھونک مارنے والوں کے شر سے۔ ۵۔ اور حاسد کے شر سے، جب کہ وہ حسد کرے۔

اللہ وہ ہے جو رات کی تاریکی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے صبح کی روشنی نکالتا ہے۔ یہی خدا ایسا کر سکتا ہے کہ وہ آفتوں کے سیاہ بادل کو انسان سے ہٹائے اور اس کو عافیت کے اجالے میں لے آئے۔

موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے۔ اس لیے یہاں خیر کے ساتھ شر بھی شامل ہے۔ اس دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں سچ کے مقابلے میں جھوٹ ہمیشہ خوش نما ہوتا ہے۔ حقیقی نفع کے مقابلے میں فرضی نفع ہمیشہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ مخلصانہ بات کے مقابلے میں منافقانہ بات ہمیشہ خوب صورت ہوتی ہے۔ نصیحت کے مقابلے میں خوش کرنے والی بات سننے میں زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ حقیقی تاریخ کے مقابلے میں، فرضی قصہ کہانیاں زیادہ دل چسپ ہوتی ہیں۔ حقیقت پسندانہ کلام کے مقابلے میں رومانوی کلام ہمیشہ زیادہ دل کش

نظر آتا ہے۔ کارآمد بات کے مقابلے میں بے فائدہ بات آدمی کو زیادہ پرکشش معلوم ہوتی ہے، وغیرہ۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔

اس شر سے بچنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ آدمی اس کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ حاصل کرے۔ یہ شر بہت قسم کے ہیں۔ مثلاً وہ شر جو بد باطن لوگ رات کی تاریکی میں کرتے ہیں۔ جادو کرنے والے لوگ جو اکثر گرہوں میں پھونک مار کر جادو کا عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر جلن میں مبتلا ہو جائیں اور اس کو اپنی حاسدانہ کارروائیوں کا شکار بنائیں۔ اسی طرح مومن بندہ کو ہر وقت چوکنا بن کر رہنا ہے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ تکبر، بے اعترافی، حسد، انتقام، خودغرضی، عصبیت اور سرکشی، وغیرہ خود اس کی شخصیت کا حصہ بن جائے اور وہ خدا کے راستے سے دور ہو جائے۔ وہ امانی (غیر حقیقی باتوں) سے مسحور ہو کر حقیقت پسندی کے راستے سے ہٹ جائے۔ وہ منافقانہ باتوں کے فریب میں آ کر مخلصانہ بات کو قبول نہ کر سکے۔ اِس دنیا میں ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ آدمی سونے کے ملمّع کو سونا سمجھ کر لے لے اور پھر وہ سخت نقصان میں پھنس جائے۔ اِس دنیا میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خوش نما باتوں سے متاثر نہ ہو، وہ ٹھوس حقائق کی روشنی میں اپنی رائے بنائے۔ دانش مند صرف وہ شخص ہے جو اِس معیار پر پورا اترے۔ مومن کو ایسے تمام اعمال اور افراد سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے جو اس کو خدا کے راستے سے دور کرنے کا ذریعہ بنیں۔ اور بلاشبہ اللہ ہی یہ طاقت رکھتا ہے کہ شر کی تمام قسموں سے انسان کو پناہ دے سکے۔

۱۱۴۔ سُوْرَةُ النَّاس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ ① مَلِكِ النَّاسِ ۙ ②
اِلٰهِ النَّاسِ ۙ ③ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ
الْخَنَّاسِ ۙ ④ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ
صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ ⑤ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ⑥ ع

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔
۱۔ کہو، میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی۔ ۲۔ لوگوں کے بادشاہ کی۔ ۳۔ لوگوں کے معبود کی۔ ۴۔ اس کے شر سے جو وسوسہ ڈالے اور چھپ جائے۔ ۵۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ ۶۔ جن میں سے، اور انسان میں سے۔

اللہ نے انسان کو ہر اعتبار سے ایک کامل وجود دیا، لیکن انسان کو کسی بھی اعتبار سے ذاتی اختیار حاصل نہیں۔ انسان مکمل طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس کو لازمی طور پر پناہ کی ضرورت ہے۔ اِس عجز کی تلافی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی دریافت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کو ڈسکور کرے۔ قادرِ مطلق خدا کے مقابلے میں اپنے عجزِ تام کو شعوری طور پر دریافت کرنا، یہی معرفت کا آغاز ہے۔ یعنی یہ دریافت کہ

ایک خدا کے سوا کوئی اور اس کو پناہ نہیں دے سکتا۔ خدا ہی تمام انسانوں کا رب ہے، وہی لوگوں کا بادشاہ ہے، وہی لوگوں کا معبود ہے۔ پھر اس کے سوا کون ہے جو شر اور فتنہ کے مقابلہ میں لوگوں کا سہارا بنے۔ اِس دریافت کے بغیر کسی انسان کے اوپر معرفت کا دروازہ نہیں کھلتا۔

سب سے زیادہ خطرناک فتنہ جس سے انسان کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیے وہ شیطان ہے۔ وہ سب سے زیادہ خطرناک اس لیے ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی اصل حیثیت کو چھپاتا ہے۔ اور پرفریب تدبیروں سے انسان کو بہکاتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اُس کا ایک حصہ یہ ہے:

هَذِهِ الشَّيَاطِينُ يَحُومُونَ عَلَى أَعْيُنِ بَنِي آدَمَ، أَنْ لَا يَتَفَكَّرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَلَوْلَا ذَلِكَ لَرَأَوُا الْعَجَائِبَ (مسند احمد، جلد 2، صفحہ 353)۔ یعنی یہ شیاطین، بنی آدم کی آنکھ کے سامنے منڈلاتے رہتے ہیں، تاکہ وہ آسمان و زمین میں خدائی قدرت پر غور نہ کریں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یقیناً وہ عجائب کو دیکھیں۔

یہ کائناتی واقعات دراصل خدائی نشانیاں (divine signs) ہیں، وہ تخلیق (creature) کی صورت میں اپنے خالق (Creator) کا تعارف ہیں۔ انسان اگر کھلی آنکھ سے دیکھے تو وہ اِن واقعات میں خدائی عجائبات کا مشاہدہ کرے گا۔ لیکن شیطان آدمی کے ذہن میں ایسی باتیں ڈالتا ہے کہ وہ اِن کائناتی واقعات کو صحیح زاویۂ نظر سے نہ دیکھ سکے۔ شیطان آدمی کے ذہن میں یہ تصور ڈالتا ہے کہ یہ سب واقعات خودکار قوانین کا نتیجہ ہیں، نہ کہ خدائی قدرت کا نتیجہ۔ شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی اِن واقعات کو نصیحت کے پہلو سے نہ دیکھے، بلکہ وہ صرف اِس نظر سے دیکھے کہ کس طرح اُن سے مادّی فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی اپنے اردگرد کے واقعات کو فار گرانٹیڈ (for granted) لیتا رہے، وہ اُن کے بارے میں زیادہ غور وفکر نہ کرے۔ یہی وہ شیطانی وسوسے ہیں جو انسان کو حقائق کی صحیح معرفت سے محروم کردیتے ہیں۔

قرآن میں بار بار بتایا گیا ہے کہ انسان کا اصل دشمن شیطان ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ شیطان کے معاملے میں ہوشیار رہے۔ اس دنیا میں ہر انسان شیطانی حملوں کی زد میں ہے۔ ہر انسان شیطانی وسوسہ کا شکار ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ آدمی کا ایمانی شعور بہت زیادہ بیدار ہو۔ شیطان کے فتنوں سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو حق اور ناحق میں تمیز کرسکے۔ وہ سمجھ سکے کہ کون سی بات حقیقی بات ہے اور کون سی بات وہ ہے جو حقیقی بات نہیں۔ یہ وسوسہ اندازی کرنے والے صرف معروف شیاطین ہی نہیں ہیں۔ انسانوں میں بھی ایسے شیطان نما لوگ ہیں جو مصنوعی روپ میں سامنے آتے ہیں اور پرفریب الفاظ کے ذریعہ آدمی کے ذہن کو پھیر کر اس کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دیتے ہیں:

عَنْ أَبِي ذَرٍّ، قَالَ: أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ فَجَلَسْتُ، فَقَالَ:

يَا أَبَا ذَرٍّ، هَلْ صَلَّيْتَ؟ قُلْتُ: لَا. قَالَ: قُمْ فَصَلِّ، قَالَ: فَقُمْتُ فَصَلَّيْتُ ثُمَّ جَلَسْتُ، فَقَالَ: يَا أَبَا ذَرٍّ، تَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ شَيَاطِينِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ قَالَ. قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، وَلِلْإِنْسِ شَيَاطِينُ؟ قَالَ: نَعَمْ (مسند احمد، حدیث نمبر 21546)۔ یعنی، حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ اس وقت مسجد میں تھے۔ میں بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا، اے ابوذر کیا تم نے نماز پڑھی۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا اٹھو اور نماز پڑھو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اٹھا اور نماز پڑھی اور پھر میں آ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابوذر، جن وانس کے شیطانوں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگو۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔

جس نے اپنے آپ کو جن وانسان کے شیطانی فریب سے بچایا، وہی اللہ کی نظر میں کامیاب انسان ہے۔ فتنوں سے خدا کی پناہ مانگنا دوطرفہ عمل ہے۔ ایک طرف خدا کی عنایت کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد یہ ہے کہ فتنوں کے مقابلہ میں اپنے شعور کو بیدار کیا جائے تا کہ آدمی زیادہ باہوش طور پر اس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے۔

دہلی، 19 جولائی 1986

❋❋❋

تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضامین اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جیسے خدا کی معرفت، قربِ الٰہی، ذکرِ الٰہی، فکرِ آخرت، اسلامی دعوت، تعمیری سوچ، امن اور روحانیت، وغیرہ۔ اسی کے ساتھ تذکیر القرآن میں قرآن کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو عصری اسلوب میں نمایاں کیا گیا ہے۔ اور اس بات کو اجاگر کیا گیا ہے کہ غور و فکر کے ذریعہ کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں سے کیسے سبق حاصل کیا جائے۔ اس لحاظ سے تذکیر القرآن، قرآن مجید کے سچے طالبِ علم کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔ یہ تفسیر عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

Goodword Books